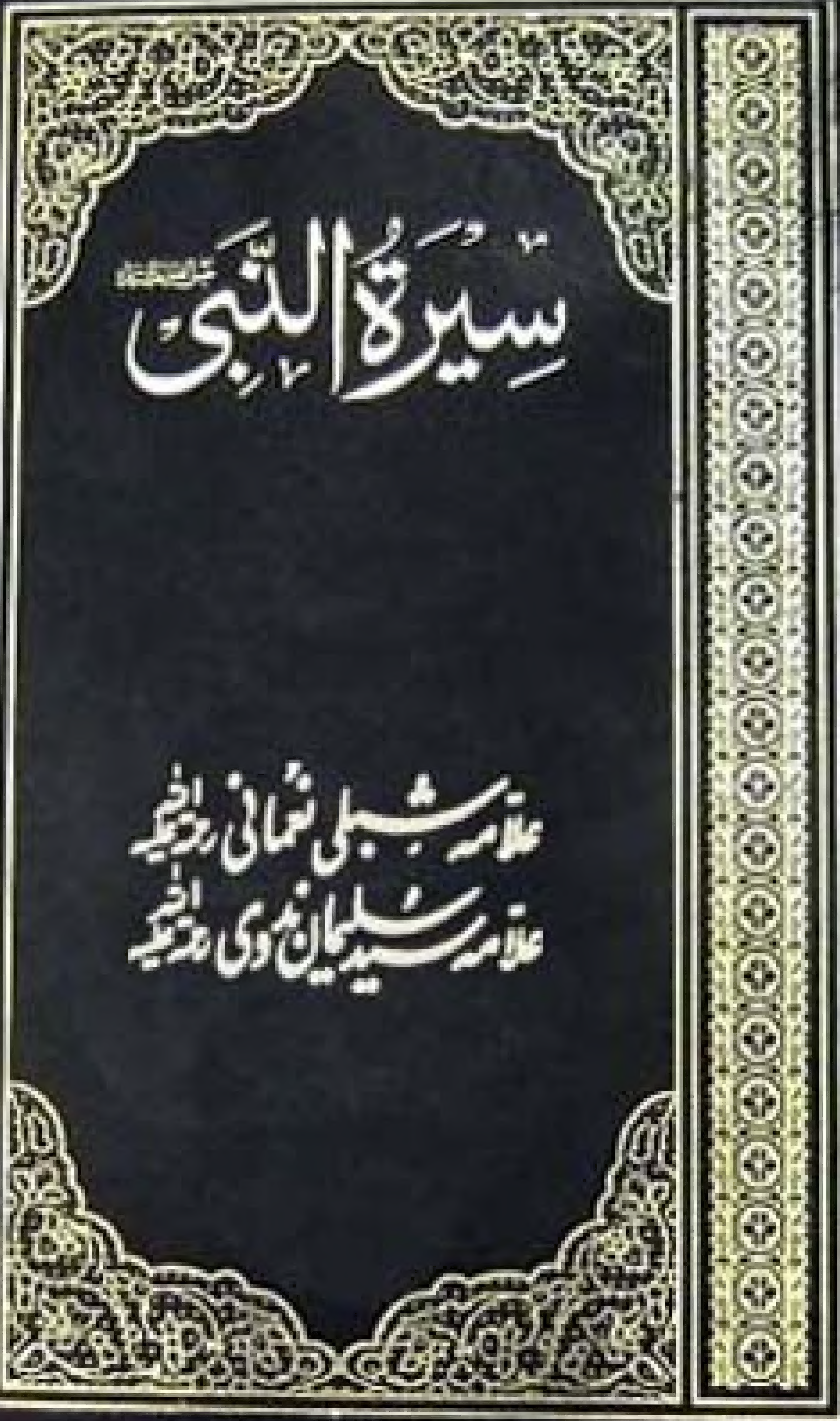

سیرۃ النبی ﷺ

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی مکمل اور مستند و مقبول عام سوانح حیات

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد اول

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نام کتاب ـــــ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مصنف ـــــ علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی
تاریخ طباعت ـــــ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ
تعداد ـــــ ایک ہزار
پریس ـــــ آر۔ زیڈ پیکجز، لاہور

فہرست مضامین سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم (حصہ اول)

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مقدمہ	۱۸	اسلامی فن روایت کا پہلا اصول	۳۹	قیاس و درایت	
(فن روایت)		اسماء الرجال کی تدوین		صحابہ میں دو گروہ	
سیرت نبوی کی تالیف کی ضرورت	〃	اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں	تا	محدثین اور درایت حدیث	
پیغمبروں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم		تحقیق روایت کا اصول قرآن و		روایت بالمعنیٰ	
کی تاریخی فضیلت۔	تا	حدیث میں۔		روایت احاد	۶۲
سیرت کی ضرورت عملی حیثیت سے		دوسرا اصول درایت	۴۰	نتائج مباحث مذکورہ	۶۳
علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت		درایت کی ابتدا۔	۴۱	یورپین تصنیفات سیرت پر	۶۴
سیرت اور حدیث کا فرق	۲۴	محدثین کے اصول درایت		یورپ کی پیغمبر اسلام سے ابتدائی واقفیت	〃
فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ	۲۵	روایت کے اصول	تا	سترہویں اور اٹھارہویں صدی	۶۵
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی تحریریں	۲۶	موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول	۴۳	اخیر اٹھارہویں صدی کی تصنیفات	۶۶
مغازی	۲۷	فن سیرت پر تبصرہ	۴۴	مصنفین یورپ کی تین قسمیں	تا
تصنیف و تالیف کی ابتدا حکومت		امہات کتب سیرت		یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب	۷۰
کی طرف سے ہوئی	۲۹	کتب حدیث و سیرت میں فرق		یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ	۷۱
حضرت عائشہؓ کی روایتیں	〃	فن سیرت میں محدثین کی مسامحت	تا	اس کتاب کی تصنیف و ترتیب	
مغازی پر خاص توجہ	۳۰	تصانیف سیرت میں کتب		کے اصول	〃
امام زہری اور فن سیرت		حدیث سے بے اعتنائی		کتاب کے حصے	۷۲
امام زہری کے تلامذۂ سیرت		مصنفین سیرت کی تدلیس		استناد اور حوالے	۷۳
موسیٰ بن عقبہ اور سیرت		اصول روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا		مقدمہ	
محمد بن اسحاق اور سیرت	تا	رواۃ کا اختلاف		تاریخ عرب قبل اسلام	۷۳
واقدی اور سیرت		تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث		عرب	〃
ابن ہشام اور سیرت		واقعات میں سلسلۂ علت و معلول		عرب کی وجہ تسمیہ	〃
ابن سعد اور سیرت		نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت		عرب کا جغرافیہ	۷۴
امام بخاری اور سیرت		کا معیار		عرب کی قدیم تاریخ کے ماخذ	〃
امام طبری اور سیرت		کمسن راویوں کی روایت		عرب کے اقوام و قبائل	۷۵
فہرست متقدمین علمائے سیرت	۳۳	راویوں میں فقاہت کی شرط		عرب کی قدیم حکومتیں	۷۶
فہرست متاخرین علمائے سیرت	۳۸	روایت میں راوی کے قیاس کو دخل		تہذیب و تمدن	۷۸
صحت ماخذ	۳۹	فن روایت پر خارجی اسباب کا اثر		عرب کے مذاہب	۸۱

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
اللہ کا اعتقاد	۸۲	حضرت حلیمہؓ سعدیہ	۱۱۰	ورقہ بن نوفل کے پاس جانا اور	
نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت	۸۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی		اس کا تسکین دینا	۱۲۷
مذہب حنیفی	۸۴	باپ حضرت حارث	״	وحی کا کچھ دن کیلئے رُک جانا	״
کیا عرب میں ان مذاہب نے		رضاعی بھائی بہن	۱۱۱	ورقہ کے تسکین دینے کی روایت	״
کچھ اصلاح کی؟	۸۵	مدینہ کا سفر	״	کی تنقید	״
سلسلۂ اسماعیلی	۸۷	حضرت آمنہ کی وفات	۱۱۲	دعوتِ اسلام کا آغاز	۱۲۸
حضرت اسماعیلؑ کہاں آباد ہوئے	״	عبدالمطلب کی کفالت	״	تین سال تک دعوت کا اخفاء	״
ذبیح کون ہے؟	۸۹	ابوطالب کی کفالت	״	سب سے پہلے جو لوگ اسلام لائے	״
مقامِ قربانی	۹۲	شام کا سفر	۱۱۳	حضرت ابوبکرؓ کا اسلام	״
قربانی کی یادگار	۹۳	بحیرا راہب کا قصہ	تا	ان کے اسلام لانے کا دیگر معززین	״
قربانی کی حقیقت	۹۵	اس قصہ کی تنقید	۱۱۴	قریش پر اثر	״
مکہ معظمہ	۹۸	حرب فجار کی شرکت	۱۱۵	اسلام کیونکر پھیلا	۱۲۹
خانہ کعبہ کی تعمیر	۱۰۰	حلف الفضول میں شرکت	//	پہلا سبب	״
حضرت اسماعیلؑ کی قربانی	۱۰۲	تعمیر کعبہ	۱۱۶	دوسرا سبب	״
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۰۴	شغلِ تجارت	۱۱۷	تیسرا سبب	۱۳۰
سلسلۂ نسب	״	تزویجِ خدیجہؓ	۱۶۸	دعوت کا اعلان	//
سلسلۂ نسب نبویؐ	״	جستہ جستہ واقعات (قبل نبوت)	۱۱۹	قریش کے سامنے کوہِ صفا پر آپؐ	
سلسلہ نسب نبویؐ کی تحقیق	״	حدود سفر (قبل نبوت)	״	کی سب سے پہلی تقریر	״
خاندانِ قریش	۱۰۵	مراسم شرک سے اجتناب	۱۲۰	قریش کی مخالفت اور اسکے اسباب	۱۳۱
قصی	۱۰۶	موحدین کی ملاقات	۱۲۱	پہلا سبب	۱۳۲
ہاشم	۱۰۷	قس بن ساعدہ کے قصہ کی تنقید	۱۲۲	دوسرا سبب	״
عبدالمطلب	تا	احباب خاص (قبل نبوت)	۱۲۳	تیسرا سبب	۱۳۳
عبداللہ		**آفتابِ رسالتؐ کا طلوع**	۱۲۵	چوتھا سبب	״
آمنہ	۱۰۸	مراسم جاہلیت اور لہو ولعب		پانچواں سبب	۱۳۴
ظہورِ قدسی	۱۰۹	سے فطری اجتناب۔	״	مدت تک قریش کے تحمل کے اسباب	۱۳۵
ولادت	״	غارِ حرا میں عبادت	״	ابوطالب کی نصیحت اور آنحضرت	
تاریخ ولادت	״	یہ عبادت کیا تھی؟	۱۲۶	صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب	۱۳۶
رضاعت	۱۱۰	رویائے صادقہ سے نبوت کا آغاز	۱۲۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو	״
ثوبیہ	״	فرشتہ کا پہلی بار نظر آنا	״	ایذا رسانی۔	

مضمون	صفحہ
عقبہ کی آپؐ سے درخواست اور آپؐ کا جواب	۱۳۶
حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام	۱۳۷
تعذیبِ مسلمین	۱۳۹
مسلمانوں پر ظلم و ستم کے طریقے	"
بلاکشانِ اسلام	تا
مسلمانوں کے استقلال اور وفاداری کی تعریف ایک عیسائی کے قلم سے	۱۴۱
ہجرتِ حبش (۵؁ نبوی)	۱۴۲
اس ہجرت کا فائدہ	"
مہاجرینِ حبش	۱۴۳
قریش کی سفارت نجاشی کے پاس	۱۴۴
دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور اس کا اثر	"
مسلمانوں کی وفاداری نجاشی کیساتھ	تا
مہاجرینِ حبش کی واپسی	
تلک الغرانیق العلیٰ کی بحث	
اہل مکہ کی ایذا رسانی	
حضرت ابوبکرؓ کا ارادۂ ہجرت	۱۴۷
شعبِ ابی طالب میں محصور ہونا (محرم ۷؁ نبوی)	۱۴۸
محاصرہ سے آزادی	"
حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات	۱۴۹
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غمزدہ ہونا اور قریش کی ایذا رسانی	تا
طائف کا سفر اور واپسی	
مطعم کا آپکو اپنی پناہ میں لینا	۱۵۱
قبائل کا دورہ	۱۵۲
قریش کی آپؐ کو ایذا رسانی	۱۵۳

مضمون	صفحہ
مسلمانوں کا گھبرانا اور آپؐ کا تسلی دینا	۱۵۴
مدینہ منورہ اور انصار	۱۵۵
انصار کی قدیم تاریخ	"
اہل مدینہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلی ملاقات	۱۵۶
انصار کے اسلام کی ابتداء	۱۵۷
بیعتِ عقبہ اولیٰ ۱۱؁ نبویؐ	۱۵۸
بیعتِ عقبہ ثانیہ ۱۳؁ نبویؐ	۱۵۹
نقبائے انصار	"
صحابہ کی ہجرتِ مدینہ	۱۶۰
۱؁ھ	
ہجرت	۱۶۱
ہجرت کی خدا کی طرف سے اجازت	"
آپؐ کے قتل کے مشورے	
حضرت علیؓ کو امانتیں سپرد کرنا اور ان کو اپنے بستر پر لٹانا	۱۶۲
کفار کا محاصرہ اور ناکامی	"
ہجرتِ مدینہ	"
حضرت ابوبکرؓ کی معیت	"
غارِ ثور میں چھپنا اور کفار کا تعاقب	۱۶۳
بعض روایتوں کی تنقید	"
مدینہ کی طرف کوچ اور راستہ کا حال	"
قریش کا آپؐ کی گرفتاری کیلئے اشتہار	۱۶۴
سراقہ بن جعشم کا واقعہ	"
آپؐ کی آمد کی خبر مدینہ میں پہنچنا	"
اہل مدینہ کا جوشِ مسرت اور سامانِ استقبال	"
قباء میں نزول	۱۶۵
حضرت علیؓ کا آکر مل جانا	"

مضمون	صفحہ
قباء میں مسجد کی تعمیر	۱۶۵
قباء میں داخلہ کی تاریخ	"
مدینہ میں داخلہ	۱۶۶
آپؐ کی پہلی نماز جمعہ اور پہلا خطبہ	"
انصار کا ترانۂ مسرت	"
حضرت ابوایوب کے گھر اترنا	۱۶۷
اہل بیت کا مکہ سے بلوانا	"
مسجد نبویؐ اور حجروں کی تعمیر	"
اذان کی ابتداء اور رکعاتِ نماز	۱۶۹
مواخاۃ اور طریقۂ مواخاۃ	"
انصار کا ایثار	۱۷۰
صفہ اور اصحابِ صفہ	۱۷۳
مدینہ کے یہود اور ان سے معاہدہ	۱۷۴
۱؁ھ کے واقعاتِ متفرقہ	۱۷۶
حضرت کلثوم و اسعد کی وفات	"
حضرت عبداللہ بن زبیر کی ولادت	"
چار رکعت کی فرضیت	"
۲؁ھ	
تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات	۱۷۷
تحویلِ قبلہ شعبان ۲؁ھ	"
اس کے اسباب	"
سلسلۂ غزوات	۱۸۰
مدینہ کی مشکلات	"
قریش کی برافروختگی	تا
منافقین اور یہودیوں کی سازش	
مدینہ میں مسلمانوں کی بے اطمینانی	
سامان	
آیتِ جہاد کا نزول	۱۸۲
بدر سے پہلے کی مہمیں	۱۸۳

مضمون	صفحہ
قبائل سے معاہدہ	۱۸۳
خلفائے قریش کا حملہ	تا
سریۂ ابن جحش	
حضرمی کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل	۱۸۵
غزوۂ بدر رمضان ۲ھ	۱۸۶
قریش کی مدینہ پر حملہ کی تیاری	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ سے نکلنا اور صحابہ سے مشورہ	〃
چاہِ بدر پر قیام	۱۸۷
میدانِ جنگ	
قریش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ترحم	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ الٰہی میں مناجات	۱۸۸
لڑائی کا آغاز	۱۸۹
ابوجہل کا قتل	۱۹۱
امیہ کا قتل	〃
مسلمانوں کی فتح اور اسکے اسباب	۱۹۲
مقتولینِ بدر کی تدفین	۱۹۳
گرفتارانِ بدر اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک۔	〃
قیدیوں کی نسبت مشورہ	۱۹۴
فدیہ لے کر آزاد کرنا	〃
عتابِ الٰہی کا نازل ہونا	〃
نزولِ عتاب کا سبب	〃
حضرت عباسؓ کی گرفتاری	〃
حضرت ابوالعاصؓ کی گرفتاری	
ان کی رہائی اور اسلام	۱۹۵
مقتولینِ بدر کا اثر قریش پر	〃
عمیر بن وہب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے آنا اور اسلام لانا	۱۹۶
غزوۂ بدر کا بیان قرآن مجید میں	〃
غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر	۲۰۰
غزوہ بدر کا اصلی سبب	〃
قرآن مجید سے اس پر استدلال	۲۰۱
احادیث سے اس پر استدلال	۲۰۳
قرآن سے استدلال	۲۰۵
اول قرینہ	〃
دوم	〃
سوم	〃
چہارم	۲۰۶
پنجم	〃
ششم	〃
ہفتم	۲۰۷
غزوۂ بدر کا اصلی سبب	۲۰۸
ایک ضروری نکتہ	۲۱۰
غزوۂ بدر کے نتائج	〃
غزوۂ سویق ذی حجہ ۲ھ	۲۱۱
حضرت فاطمہ زہراؓ کی شادی	〃
روزہ کی فرضیت	۲۱۲
دوگانۂ عید	〃
غزوۂ بنی قینقاع	〃

۳ھ

غزوۂ احد

مضمون	صفحہ
غزوۂ احد	۲۱۳
اس جنگ کے لئے قریش کا سامان	〃
خواتین قریش کی شرکت	۲۱۴
حضرت عباسؓ کا قریش کے ارادہ سے مطلع کرنا	۲۱۴
مسلمانوں کی مدافعت کیلئے تیاری	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلح ہونا	〃
مسلمان سپاہیوں کی جمعیت	〃
۳۰۰ منافقین کی علیحدگی	〃
مسلمان بچوں کی شرکتِ جنگ کیلئے بیقراری	۲۱۵
فریقین کی صف بندی	〃
خاتونانِ قریش کا ترانۂ جنگ	〃
آغازِ جنگ	〃
حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ کا نکلنا	۲۱۶
حضرت حمزہؓ کی شہادت	〃
علمبردارِ قریش کا قتل ہونا	〃
مسلمان حملہ آور	〃
مسلمان تیراندازوں کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا	۲۱۷
قریش کا عقب سے حملہ	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی غلط خبر اڑانا۔	〃
مسلمانوں کا پیچھے ہٹ جانا اور بے ترتیبی	〃
ایک مسلمان کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے غلطی سے مارا جانا	〃
بعض صحابہ کی جاں نثاریاں	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی ہونا	۲۱۸
مشرکین کیلئے دعائے خیر کرنا	〃
حضرت ابوطلحہؓ اور حضرت سعدؓ کی قدراندازی	〃
آپؐ کا مشرکین پر اظہار افسوس	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مع چند رفقاء کے پہاڑی پر چڑھ جانا	۲۱۹
مدینہ میں آپکے قتل کی غلط خبر پہنچنا	〃
حضرت فاطمہؓ کا پہنچنا اور زخم دھونا	〃

مضمون صفحہ
ابوسفیان اور حضرت عمرؓ کا سوال و جواب ۲۱۹
دو مسلمانوں کی شہادت 〃
ہند کی حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ بے ادبی ۲۲۰
خاتونان اسلام کی اس جنگ میں خدمات 〃
حضرت صفیہؓ کا استقلال 〃
ایک انصاریہ کی فدویت 〃
مسلمان شہداء کی تعداد اور ان کی تجہیز کا سامان ۲۲۱
قریش کا تعاقب 〃
ابوسفیان کی دوبارہ حملہ کی نیت 〃
مسلمانوں کا آگے بڑھنا 〃
مدینہ کی طرف واپسی ۲۲۲
حضرت حمزہؓ کا ماتم 〃
حضرت امام حسنؓ کی ولادت 〃
حضرت حفصہؓ سے نکاح 〃
حضرت ام کلثومؓ کا حضرت عثمانؓ سے نکاح 〃
حکم وراثت کا نزول 〃
نکاح مشرکہ کی تحریم 〃
سنہ ۴ھ
سلسلۂ غزوات و سرایا
قبائل کی اسلام سے دشمنی اور حملہ ۲۲۳
سرایا کی کثرت کے اسباب 〃
سریہ ابی سلمہ 〃
سریہ ابن انیس 〃
سریۂ بیر معونہ ۲۲۴
واقعۂ رجیع 〃
حضرت زیدؓ کی شہادت ۲۲۵
واقعات متفرقہ ۲۲۶

مضمون صفحہ
امام حسینؓ کی ولادت ۲۲۶
حضرت زیدؓ بن ثابت کا عبری زبان سیکھنا 〃
حضرت ام سلمہؓ کا نکاح 〃
یہودیوں کا مقدمہ فیصلہ کرنا 〃
بعض مورخین کے نزدیک حرمت شراب کا حکم 〃
سنہ ۲، ۳، ۴ھ
یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ ۲۲۷
یہودیوں کی اخلاقی حالت 〃
یہودیوں کی نفرت اسلام سے ۲۲۸
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان کے ساتھ مدارات 〃
یہودیوں کی شرارتیں 〃
یہودیوں کا قریش کے ساتھ اتحاد ۲۲۹
غزوۂ بنی قینقاع ۲۳۱
قتل کعب بن اشرف یہودی ۲۳۲
غزوۂ بنی نضیر ۲۳۴
سنہ ۵ھ
غزوۂ مریسیع، واقعہ افک وغزوۂ احزاب ۲۳۷
انمار اور ثعلبہ کی تیاری اور فرار
تا
دومۃ الجندل میں کفار کا اجتماع
غزوۂ مریسیع یا بنی مصطلق ۲۳۸
حضرت جویریہؓ کا واقعہ ۲۳۹
حضرت جویریہؓ کے نکاح کا اثر 〃
واقعۂ افک ۲۴۰
غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق
خندق کا کھودا جانا 〃
خندق کھودنے میں آنحضرت صلی اللہ

مضمون صفحہ
علیہ وسلم کی شرکت ۲۴۱
صحابہ کا ترانہ 〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تین دن کا فاقہ ۲۴۲
صف آرائی 〃
بنو قریظہ کی معاہدہ شکنی 〃
منافقین کی جنگ سے علیحدگی 〃
ایک مہینہ تک مدینہ کا محاصرہ ۲۴۳
غطفان سے معاہدہ کرنے سے صحابہ کی ناراضامندی 〃
کفار کا مدینہ پر عام حملہ 〃
حضرت علیؓ اور عمرو بن عبدود کی جنگ ۲۴۴
دوسرے کافروں کا حملہ اور موت 〃
نمازوں کا قضا ہونا 〃
بنو قریظہ کا مستورات کے قلعہ پر حملہ کا ارادہ کرنا ۲۴۵
حضرت صفیہؓ کی بہادری 〃
طوفان اور کفار کی شکست 〃
حضرت نعیمؓ بن مسعود ثقفی کی تدبیر اور کفار میں پھوٹ 〃
طبل بازگشت 〃
حضرت سعدؓ بن معاذ کی شہادت ۲۴۷
بنو قریظہ کا خاتمہ 〃
بنو قریظہ کا خاتمہ اپنی شریعت کے مطابق ۲۴۸
بنو قریظہ کے اسباب قتل کی تحقیق ۲۴۹
ریحانہ کا غلط واقعہ ۲۵۰
حضرت زینبؓ سے نکاح ۲۵۱
غلط واقعات کی تردید 〃
پردہ کا حکم ۲۵۳
متبنّیٰ کی بیوی سے نکاح کا جواز 〃

مضمون — صفحہ

لعان اور ظہار ۲۵۴
تیمم 〃

۶ھ

صلح حدیبیہ، بیعت رضوان

حدیبیہ ۲۵۵
کعبہ اور مکہ معظمہ 〃
ارادۂ عمرہ ۲۵۶
قریش کی روکنے کے لئے تیاری 〃
صلح کے پیغام 〃
بدیل اور عروہ کی سفارت ۲۵۷
حضرت ابوبکرؓ کا جوش 〃
حضرت مغیرہؓ کی ڈانٹ 〃
عروہ کا متاثر ہونا 〃
قریش کا غدارانہ حملہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عفو ۲۵۸
حضرت عثمانؓ کا سفیر بن کر جانا 〃
بیعت رضوان 〃
سہیل کا سفیر بن کر آنا 〃
صلح نامہ کی عبارت پر تنازعہ 〃
شرائط صلح ۲۵۹
حضرت ابوجندلؓ کا پابہ زنجیر قریش کی قید سے بھاگ کر آنا ۲۶۰
حضرت عمرؓ اور عام مسلمانوں کا شرائط صلح سے ملال ۲۶۱
حضرت ابوبکرؓ کا ان کو سمجھانا 〃
قربانی کا حکم دینا اور صحابہ کا تعلل 〃
قربانی کرنے کے لئے ازدحام 〃
سورہ فتح کا نزول 〃
صلح حدیبیہ کے مصالح 〃
نومسلموں کی واپسی کی شرائط کا منسوخ ہونا ۲۶۲

۶ھ (آخر)

سلاطین کو دعوت اسلام ۲۶۳
قیصر روم اور نامۂ اسلام 〃
ابوسفیان اور قیصر روم ۲۶۴
قیصر کا متاثر ہونا ۲۶۵
نامۂ مبارک 〃
اہل دربار کی برہمی 〃
خسرو پرویز اور نامۂ اسلام ۲۶۶
خسرو پرویز کی برہمی اور انجام 〃
نجاشی اور نامۂ اسلام ۲۶۷
نجاشی کا اسلام 〃
حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح 〃
عزیز مصر اور نامۂ اسلام ۲۶۸
عزیز مصر کا جواب 〃
حضرت ماریہ قبطیہؓ 〃
رئیس یمامہ کا جواب 〃
رئیس غسان کی برہمی اور حملہ کی تیاری 〃
حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص کا اسلام ۲۶۹

۷ھ

خیبر، ادائے عمرہ

خیبر ۲۷۰
غزوۂ خیبر کے اسباب، 〃
ذی قرد ۲۷۲
غزوۂ خیبر کا اہتمام شان ۲۷۳
مدینہ سے روانگی 〃
علم نبوی 〃
صحابہ کا ترانہ ۲۷۳
خاتونان کی فوج میں شرکت ۲۷۴
غطفان کی روک تھام ۲۷۵
خیبر پر حملہ 〃
بعض قلعوں کی اطاعت سے سرتابی 〃
مرحب اور حضرت علیؓ کی جنگ ۲۷۶
فاتح خیبر ۲۷۷
مال غنیمت کی تقسیم 〃
حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق ۲۷۸
خزانۂ خیبر کے چھپانے کے جرم میں یہودی سرداروں کی سزا کی تحقیق ۲۷۹
ماہ حرام میں جہاد کا مسئلہ ۲۸۲
تقسیم زمین ۲۸۳
ملکی حالت اور احکام فقہی 〃
وادی القرا اور فدک ۲۸۴
ادائے عمرہ 〃

۸ھ

غزوہ موتہ، فتح مکہ، غزوہ حنین و اوطاس و طائف ۲۸۶
غزوۂ موتہ 〃
حضرت زیدؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت ۲۸۷
حضرت خالدؓ کی سپہ سالاری 〃
شہداء کا ماتم 〃
غزوۃ الفتح مکہ ۲۸۹
قریش پر فوج کشی کے اسباب 〃
قریش سے مصالحت کی کوشش 〃
ابوسفیان کا سفیر بن کر آنا ۲۹۰
حضرت حاطبؓ بن بلتعہ کی غلطی 〃

مضمون	صفحہ
فوجوں کی مکہ کی سمت روانگی	۲۹۱
ابوسفیان دربارِ رسالت میں	〃
اُن کا ایمان لانا	〃
کوکبۂ نبوی کا نظارہ	〃
قریش کو امان	۲۹۲
خانۂ کعبہ کی تطہیر	〃
خطبۂ فتح	۲۹۳
خطبہ کے اصولی مطالب	〃
قریش کو عفو عام	۲۹۴
قریش سے بیعتِ ایمان	۲۹۵
ہندہ کا آنا	〃
ہندہ کا مکالمہ	〃
صفوان بن امیہ، عبداللہ بن زبعری اور عکرمہ کا اسلام	〃
اشتہاریانِ قتل	۲۹۶
اشتہاریانِ قتل کی تحقیق	〃
خزائنِ حرم	۲۹۸
فتح مکہ اور بُت شکنی	〃
غزوۂ حنین	۳۰۰
حنین	〃
ہوازن اور ثقیف کا اجتماع	〃
درید بن الصمہ شاعر کی گفتگو	۳۰۱
عبداللہ بن حدرد کا تحقیقِ حال کے لئے جانا	〃
حنین کی طرف روانگی	〃
مسلمانوں کی ابتدائی شکست	۳۰۲
ابتدائی شکست کے اسباب	۳۰۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقلال اور صحابہ کو ندا۔	۳۰۵

مضمون	صفحہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رجز اور مسلمانوں کا سنبھلنا	۳۰۵
دشمنوں کی شکست	〃
اوطاس	۳۰۶
درید کا قتل	〃
اسیرانِ جنگ میں حضرت شیماؓ آپ کی رضاعی بہن	〃
محاصرۂ طائف	〃
قلعہ شکن آلات کا استعمال	۳۰۷
محاصرہ اٹھا لینا	〃
تقسیمِ غنائم	〃
مؤلفۃ القلوب پر بخشش	〃
بعض انصار کا سوءِ ظن	۳۰۸
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُراثر تقریر	〃
اسیرانِ جنگ کی عام رہائی	۳۰۹
واقعات متفرقہ	〃
حضرت ابراہیم کی ولادت اور وفات	〃
کسوف کی نمازِ باجماعت	〃
حضرت زینبؓ کا انتقال	〃
سنہ ۹ھ	
ایلاء اور تخییر، غزوۂ تبوک	
مسجدِ ضرار، حج، اسلام	۳۱۰
واقعہ ایلاء	〃
ایلاء کے اسباب کی تحقیق	〃
قرآن اور واقعۂ ایلاء	۳۱۱
حضرت عمرؓ کی روایت واقعۂ ایلاء کی نسبت	۳۱۲
آیتِ تخییر	۳۱۴
مظاہرۂ ازواجِ مطہرات کی تحقیق	〃

مضمون	صفحہ
روایات کاذبہ	۳۱۵
غزوۂ تبوک	۳۱۸
غزوۂ تبوک کا سبب	〃
اجتماعِ افواج	۳۱۹
منافقین کی دراندازی	〃
صحابہ کا جوش اور ایثار	〃
۳۰ ہزار فوج کی روانگی	〃
سرحد کے عیسائی سرداروں سے مصالحت	〃
واپسی اور خیر مقدم کا ترانہ	۳۲۰
مسجدِ ضرار	〃
حج الاسلام اور اعلانِ برأت	〃
حضرت ابوبکرؓ کا امیر الحج ہونا	۳۲۱
مسلمانوں کا پہلا حج	〃
حضرت علیؓ کا اعلانِ برأت کرنا	〃
واقعات متفرقہ	۳۲۲
زکوٰۃ کا حکم نازل ہونا	〃
جزیہ کا آغاز	〃
سود کی حرمت	〃
نجاشی کی وفات اور جنازہ کی نمازِ غائبانہ	〃
غزوات پر دوبارہ نظر	۳۲۳
مغازی اور سیرت کا فرق	〃
غزواتِ نبوی کی نسبت غلط خیال	〃
عرب اور جنگ و غارت گری	〃
ثار کا عقیدہ	۳۲۴
لوٹ کا مال	۳۲۶
احکام کا تدریجی نزول	〃
جنگ میں وحشیانہ افعال	۳۲۸
فتوحاتِ نبوی کے اسباب اور الموانع	۳۳۰

مضمون صفحہ
غزوہ اور سریہ کا فرق ۲۳۱
غزوات اور سرایا کے مختلف اغراض 〃
بغرضِ تفتیشِ دشمن 〃
سریۂ ابن جحشؓ 〃
بغرضِ مدافعت 〃
سریۂ غطفان 〃
سریۂ ابو سلمہؓ ۲۳۲
سریۂ عبداللہ بن انیسؓ 〃
غزوۂ ذات الرقاع 〃
غزوۂ دومۃ الجندل 〃
غزوۂ مریسیع 〃
سریۂ فدک 〃
سریۂ بشر بن سعد ۲۳۳
سریۂ عمروؓ بن العاص 〃
قریش کی تجارت کی روک ٹوک 〃
امن و امان قائم کرنا ۲۳۴
امن و امان کا فرض اور اسلام 〃
سریۂ زید بن حارثہ ۲۳۵
سریۂ دومۃ الجندل 〃
سریۂ خبط یا سیف البحر 〃
غزوۂ غابہ ۲۳۶
بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب 〃
مارگولیوس کی غلطی 〃
اصل سبب 〃
غزوۂ بنو سلیم ۲۳۷
غزوۂ ذات الرقاع
سریۂ عکاشہ 〃
سریۂ علیؓ بن ابی طالب 〃
غزوۂ بنو لحیان 〃

مضمون صفحہ
سریۂ عمرؓ بن الخطاب ۲۳۷
سریۂ کعب بن عمیرؓ 〃
اشاعتِ اسلام کے لئے سرایا ۲۳۸
سریۂ بیر معونہ 〃
سریۂ مرثد 〃
غزوۂ بنو لحیان 〃
سریۂ ابن ابی العوجاء 〃
سریۂ کعب بن عمیر 〃
داعیانِ اسلام کو حملہ کرنے کی ممانعت 〃
حضرت خالدؓ کی غلطی کا معاوضہ ۲۳۹
بت شکنی کے لئے سرایا بھیجنے کے اسباب 〃
جنگی اصلاحات 〃
عربوں کے مقابلہ میں عرب کے بعض وحشی جنگی افعال کو ابتداءً کیوں اختیار کیا گیا ۲۴۰
سپاہیوں کو احکام کہ بوڑھے بچے اور عورتیں قتل نہ ہوں 〃
صبر کی ممانعت 〃
عہد کی پابندی ۲۴۱
قاصدوں کو امان 〃
اسیرانِ جنگ سے عرب کا برتاؤ ۲۴۲
صلیبی عیسائیوں کا برتاؤ 〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ 〃
قیدیانِ بدر کے ساتھ 〃
بنت حاتم طائی کے ساتھ سلوک 〃
قرآن مجید اور اسیرانِ جنگ 〃

مضمون صفحہ
سپاہیوں کو راستہ روک کر ٹھہرنے کی ممانعت ۲۴۲
مالِ غنیمت کی تحقیر ۲۴۳
مالِ غنیمت کی محبت 〃
غزوۂ حنین میں اسی سبب سے شکست ہوئی 〃
مالِ غنیمت کی خواہش جہاد کے ثواب کو کم کرتی ہے ۲۴۴
اس نصیحت کا صحابہ پر اثر 〃
لوٹ کی ممانعت 〃
لڑائی عبادت بن گئی ۲۴۵
اغراضِ جہاد 〃
دفعِ فساد 〃
انسدادِ مظالم 〃
فریضۂ امر معروف و نہی عن منکر ۲۴۶
مالِ غنیمت کے مصارف کی تحدید 〃
جہاد بھی نماز ہے 〃
ایک نکتہ 〃
جہاد عبادت بن گیا 〃
فاتح و پیغمبر کا فرق 〃
شوق عبادت 〃
خاتمہ جلد اوّل ۲۴۷

*

فہرست مضامین

سیرت النبیؐ حصہ دوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
		حدودِ شام	۲۶	افتاء	۴۰
اسلام کی امن کی زندگی	۸	(وفودِ عرب)	۲۷	فصلِ قضایا	۴۱
قیامِ امن	"	مزینہ	"	توقیعات و فرامین	"
عرب کی عام بدامنی	"	بنو تمیم	۲۸	مہمان داری	"
بیرونی خطرات	۱۰	بنو سعد	۲۹	عیادتِ مرضیٰ	۴۲
یہودیوں کی قوت	"	اشعریین ۹ھ	"	احتساب	"
اُن کے انسداد کی تدابیر	۱۲	دوس (۷ھ)	۳۰	اصلاح بین الناس	۴۳
اشاعتِ اسلام	۱۴	بنو حارث بن کعب	"	کتّاب	۴۴
مکہ میں اشاعتِ اسلام	"	طے	۳۱	حکام اور ولاۃ	۴۵
اوس و خزرج کا اسلام	۱۷	عدی بن حاتم	"	حکام کا امتحان	۴۶
مدینہ میں اشاعتِ اسلام	"	ثقیف	"	محصلین زکوٰۃ و جزیہ	۴۷
مزینہ کا اسلام	۱۸	نجران	۳۴	قضاۃ	۵۰
بدر کے بعض قریشیوں کا اسلام	"	بنو اسد	۳۵	پولیس	"
اشجع کا اسلام	"	بنو فزارہ	"	جلّاد	"
جہینہ کا اسلام	"	کندہ (۱۰ھ)	"	غیر قوموں سے معاہدے	"
دعاۃ کا تقرر	۲۰	عبد القیس	۳۶	اصنافِ محاصل و مخارج	۵۱
دعاۃ کے نام	۲۱	بنو عامر بن صعصعہ	"	جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی	۵۳
مقاماتِ دعوت	"	تمیم وغیرہ کی سفارت	۳۷	(مذہبی انتظامات)	۵۵
یمن	۲۲	(تاسیس حکومت الٰہی)	۳۸	دعاۃ اور معلمین اسلام	"
نجران	۲۴	اسلامی حکومت کی غرض و غایت	"	ان کی تعلیم و تربیت	۵۷
بحرین	۲۵	انتظامِ ملکی	۴۰	مساجد کی تعمیر	۵۸
عمان	۲۶	امیر العسکری	"	ائمہ نماز کا تقرر	۶۰

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
مؤذنین	۶۲	شراب کی حرمت	۸۶	خدام خاص	۱۱۹	معمولات نماز	۱۳۰
تاسیس و تکمیل شریعت	۶۳	سود کی حرمت	۸۹	**شمائل**	۱۲۱	معمولات خطبہ	۱۳۱
اسلام کے اکثر فرائض بتدریج تکمیل کو پہنچے ہیں	"	**سنہ ۱۰ھ**				معمولات سفر	۱۳۳
		سال آخیر حجۃ الوداع اختتام فرض نبوت	۹۱	حلیۂ اقدس	"	معمولات جہاد	۱۳۴
عقائد اور اسلام کے اصول اولین	۶۵			مہر نبوت	"	معمولات عیادت وغیرہ	"
				موئے مبارک	۱۲۲	معمولات ملاقات	۱۳۵
عقائد	"	حجۃ الوداع	"	رفتار	"	معمولات عامہ	۱۳۶
عبادات	۶۷	خطبۂ نبویؐ اور اصول	تا	گفتگو	"		
طہارت	"	شریعت کا اعلان عام	۱۰۲	خندہ و تبسم	"	**مجالس نبویؐ**	۱۳۷
تیمم	۶۸	**سنہ ۱۱ھ**		لباس	۱۲۳	دربار نبوت	"
نماز	۶۹			انگوٹھی	۱۲۴	مجالس ارشاد	۱۳۸
نماز جمعہ اور عیدین	۷۲	**وفات**	۱۰۳	خود و زرہ	"	آداب مجلس	"
صلوٰۃ خوف	۷۳	علالت کی ابتداء	"	غذا اور طریقۂ طعام	"	اوقات مجلس	۱۳۹
روزہ	"	قرطاس کا واقعہ	تا	معمولات طعام	۱۲۵	عورتوں کیلئے مخصوص مجلس	۱۴۰
زکوٰۃ	۷۵	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ		خوش لباسی	"	طریقۂ ارشاد	"
حج	۷۶			مرغوب رنگ	"	مجالس میں شگفتہ مزاجی	۱۴۱
حج کی اصلاحات	۷۷	وفات	۱۱۱	نامرغوب رنگ	"	فیض صحبت	۱۴۲
معاملات	۷۹	تجہیز و تکفین	۱۱۲	خوشبو کا استعمال	۱۲۶	**خطابت نبویؐ**	۱۴۳
وراثت	"	**متروکات**	۱۱۴	لطافت پسندی	"		
وصیت	۸۰			سواری کا شوق	۱۲۷	طرز بیان	"
وقف	۸۱	زمین	"	اسپ دوانی	"	خطبات کی نوعیت	۱۴۴
نکاح و طلاق	"	جانور	۱۱۵			اثر انگیزی	۱۴۹
حدود و تعزیرات	۸۲	اسلحہ	۱۱۶	**معمولات**	۱۲۹	**عبادات نبویؐ**	۱۵۲
حلال و حرام	۸۵	آثار متبرکہ	۱۱۷	صبح سے شام تک کے معمولات	"		
ماکولات میں حلال و حرام	"	مسکن مبارک	"	خواب	"	دعا اور نماز	"
		دایہ	۱۱۹	عبادت شبانہ	۱۳۰	روزہ	۱۵۵

مضمون	صفحہ
زکوٰۃ	۱۵۶
حج	۱۵۷
دوامِ ذکرِ الٰہی	〃
ذوق و شوق	۱۵۸
میدانِ جنگ میں یادِ الٰہی	۱۵۹
خشیتِ الٰہی	۱۶۱
گریہ و بکا	〃
محبتِ الٰہی	۱۶۳
توکل علی اللہ	۱۶۴
صبر و شکر	۱۶۷
اخلاقِ نبویؐ	۱۷۲
اخلاقِ نبویؐ کا جامع بیان	۱۷۳
مداومتِ عمل	۱۷۴
حسنِ خلق	۱۷۶
حسنِ معاملہ	۱۸۰
عدل و انصاف	۱۸۲
جود و سخا	۱۸۳
ایثار	۱۸۶
مہمان نوازی	۱۸۷
گداگری اور سوال	
سے نفرت	۱۸۹
صدقہ سے پرہیز	۱۹۰
تحفے قبول کرنا	〃
تحفے دینا	۱۹۱
عدمِ قبولِ احسان	〃
عدمِ تشدد	۱۹۱
تقشف ناپسند تھا	۱۹۳
عیب جوئی اور مداحی	۱۹۴
کی ناپسندیدگی	〃
سادگی اور بے تکلفی	۱۹۵
امارت پسندی سے اجتناب	〃
مساوات	۱۹۸
تواضع	۱۹۹
تعظیم اور بے جا مدح	
کی ناپسندیدگی	۲۰۱
شرم و حیا	۲۰۲
اپنے ہاتھ سے کام کرنا	〃
دوسروں کے کام کر دینا	۲۰۳
عزم و استقلال	۲۰۴
شجاعت	۲۰۵
راست گفتاری	۲۰۶
ایفائے عہد	۲۰۷
زہد و قناعت	۲۰۸
عفو و حلم	۲۱۰
دشمنوں سے عفو و درگزر	
اور حسنِ سلوک	۲۱۴
کفار اور مشرکین کے	
ساتھ برتاؤ	۲۱۷
یہود و نصاریٰ کے	
ساتھ برتاؤ	۲۱۹
غریبوں کے ساتھ	
محبت و شفقت	۲۲۰
دشمنانِ جان سے عفو و درگزر	۲۲۲
دشمنوں کے حق میں	
دعائے خیر	۲۲۴
بچوں پر شفقت	۲۲۵
غلاموں پر شفقت	۲۲۷
مستورات کے ساتھ برتاؤ	۲۲۸
حیوانات پر رحم	۲۳۰
رحمت و محبت عام	۲۳۱
رقیق القلبی	۲۳۲
عیادت و تعزیت	۲۳۳
لطفِ طبع	۲۳۴
اولاد سے محبت	۲۳۵
ازواجِ مطہراتؓ	۲۳۸
حضرت خدیجہؓ	〃
حضرت سودہؓ	۲۳۹
حضرت عائشہؓ	۲۴۰
حضرت حفصہؓ	۲۴۲
زینب ام المساکین	۲۴۳
حضرت ام سلمہؓ	۲۴۴
حضرت زینبؓ	۲۴۵
حضرت جویریہؓ	۲۴۶
حضرت ام حبیبہؓ	〃
حضرت میمونہؓ	۲۴۷
حضرت صفیہؓ	۲۴۸
اولاد	۲۴۹
اولاد کی تعداد	〃
حضرت قاسمؓ	〃
حضرت زینبؓ	〃
حضرت رقیہؓ	۲۵۱
حضرت ام کلثومؓ	〃
حضرت فاطمۃ الزہراؓ	۲۵۲
حضرت ابراہیمؓ	۲۵۳
ازواجِ مطہرات کے ساتھ برتاؤ	۲۵۵
معاشرت کے چند مؤثر واقعات	〃
ازواجِ مطہرات اور اہل و عیال کی سادہ زندگی	۲۵۸
انتظامِ خانگی	۲۵۹
اہل و عیال کے مصارف کا انتظام	〃
خاتمہ	〃

فہرست مضامین

سیرت النبی حصہ سوم

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
دلائل و معجزات	۱۵	اشاعرہ اور معتزلہ میں نتیجہ کا اختلاف نہیں۔	۴۴
روحانی نوامیس کا وجود۔	"	خرق عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلۂ	"
نبوت کے فطری روحانی آثار۔	"	اسباب وعلل پر یقین ہے۔	
نبوت کے روحانی نوامیس جسمانی قوانین پر حکمران ہیں۔	۱۶	سلسلۂ اسباب وعلل پر علم انسانی کو احتوا نہیں۔	"
نبوت کے روحانی نوامیس کے اسباب وعلل سے ہم اسی		حقیقی علت خدا کی قدرت وارادہ ہے۔	۴۵
طرح لاعلم ہیں جس طرح جسمانی قوانین کے۔	"	مولانا روم اور اسباب وعلل اور معجزہ کی حقیقت۔	"
انبیاء کا اصل معجزہ خود اُن کا سرتاپا وجود ہے۔	"	علت خاصیت اور اثر کی حقیقت۔	۴۷
انبیاء کے کامل پیرو اُن سے معجزہ نہیں مانگتے تھے۔	۱۷	اسباب وعلل محض عادی ہیں۔	۴۸
معاندین معجزوں کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے۔	"	اسباب عادیہ کا علم صرف تجربہ سے ہوتا ہے۔	"
معجزوں سے کن کو فائدہ پہنچتا ہے؟	"	اسباب وعلل کا علم بدلتا رہتا ہے۔	۴۹
ان واقعات کا اصطلاحی نام۔	"	اسباب وعلل کا علم تجربہ سے ہوتا ہے۔	۵۰
دلائل وبراہین وآیات کا تعلق انبیاء کی سیرتوں سے۔	۱۸	علامہ ابن تیمیہ کا بیان کہ اسباب وعلل تجربی ہیں۔	۵۲
دلائل وآیات کا تعلق سیرت محمدی سے۔	"	تجربات کی بنا شہادت اور روایت اور تاریخ پر ہے۔	۵۴
دلائل ومعجزات اور عقلیت۔	۱۹	فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں۔	"
دلائل ومعجزات اور فلسفۂ قدیمہ وعلم کلام	۲۱	تاریخی شہادتوں کے شرائط استشہاد۔	۵۵
خواص نبوت کے متعلق فارابی کے خیالات۔	"	مسلمانوں کا علم روایت۔	"
اطلاع غیب۔	۲۲	نادیدہ واقعات پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف روایات کی شہادت ہے	۵۶
رویت وکلام ملائکہ۔	۲۳	خبر احاد پر بھی عقلاً یقین ہوتا ہے۔	۵۷
خوارق عادات۔	"	واقعات پر یقین کے لئے اصل بنیاد امکان اور	"
وحی ومشاہدہ	۲۴	عدم امکان کی بحث نہیں، بلکہ روایت کے ثبوت اور	"
معجزات	۲۵	عدم ثبوت کی ہے۔	
اسباب خفیہ کی توجیہ بے کار ہے۔	۴۱	جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیے۔	"
علمائے اسلام کی غلطی کا سبب۔		معجزات دراصل تجربیات کے خلاف نہیں ہوتے۔	۵۹

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں۔	۵۸	تنویم۔	۹۲
خلاصہ مباحث۔	۵۹	معجزاتِ شفا	۹۳
یقینِ معجزات کے اصول نفسی۔	"	عام تجربات۔	"
امام غزالی اور یقین اور اذعان کی صورتیں۔	"	رویائے صادقہ۔	۹۴
معجزہ اور سحر کا فرق۔	۶۱	حقیقی اسرارِ نبوت۔	۹۵
معجزہ دلیلِ نبوت ہو سکتا ہے یا نہیں؟	۶۴	حقیقی آیاتِ نبوت کی عام مثالیں۔	"
امام غزالی کی تقریر۔	۶۷	مقدماتِ ثلثہ۔	۹۸
امام رازی کی تقریر۔	۶۸	اصلی بحث یقین کی ہے۔	۹۹
مولانا روم کے حقائق۔	"	یقین معجزات	"
صحابہؓ کو کیونکر رسالت کا یقین آیا۔	۷۲	یقین کی ماہیت۔	"
دلائل و معجزات اور فلسفۂ جدیدہ	۷۵	نظریاتِ حکمت کا یقین۔	۱۰۰
مفہوم نبوت۔	"	یکسانی کا جذبہ۔	"
مفہوم معجزہ۔	"	نظریاتِ فلسفہ کا یقین۔	۱۰۱
ترتیب مباحث۔	۷۶	مشاہدات کا یقین۔	۱۰۲
امکان معجزات	"	نفسیاتِ یقین۔	۱۰۴
ہیوم کا استدلال۔	۷۷	خواہشِ یقین۔	۱۰۵
قوانین فطرت کی حقیقت۔	۸۰	موانع و مویداتِ یقین۔	"
شہادت معجزات	۸۶	نفسیاتِ یقین کی شہادت واقعاتِ سیرت سے۔	۱۰۶
امکان، وقوع کے لئے کافی نہیں۔	"	غایت معجزات	۱۰۹
ہیوم کا فتویٰ۔	"	معجزہ منطقی دلیل نہیں۔	"
ہیوم کا تعصب	۸۷	معجزہ کی اصلی غایت۔	"
کافی شہادت	۸۸	پہلی صورت۔	۱۱۱
ہیوم کا صریح تناقض	۸۹	بعض وسوسوں کا جواب۔	۱۱۲
انتہائی استبعاد۔	۹۰	ایک اور اعتراض۔	۱۱۴
استبعاد معجزات	"	دوسری صورت	"
فطرت کی یکسانی۔	"	اس صورت کے مختلف احتمالات۔	۱۱۵
ایجادات سائنس۔	۹۱	یقین معجزہ کے شرائط۔	۱۱۷

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
لُبِّ لباب آیات و دلائل اور قرآن مجید	۱۲۱	شق قمر آخری نشان ہدایت تھا۔	۱۶۵
انبیاء اور آیات و دلائل۔	۱۲۳	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزۂ ہلاکت۔	۱۶۶
قرآن مجید اور اصطلاح آیات و دلائل۔	〃	غزوۂ بدر معجزۂ ہلاکت تھا۔	۱۷۰
لفظ آیت اور معجزہ کی حقیقت۔	۱۲۴	سحر اور معجزہ کا فرق اور ساحر اور پیغمبر میں امتیاز۔	۱۷۳
آیات اللہ۔	۱۲۵	معجزات اور نشانات سے کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے؟	۱۷۵
آیات و دلائل کی دو قسمیں، ظاہری اور باطنی۔	۱۲۸	صداقت کی نشانی صرف ہدایت ہے۔	۱۷۷
نبوت کی باطنی نشانیاں واقعات کی روشنی میں۔	〃	آیات و دلائل نبوی کی تفصیل	۱۷۸
قرآن مجید اور نبوت کی باطنی علامات۔	۱۳۱	خصائص النبوۃ۔	۱۷۹
ظاہری آیات اور نشانات	۱۳۴	مکالمۂ الٰہی۔	۱۸۱
ظاہری نشانات صرف معاندین طلب کرتے ہیں۔	〃	وحی۔	۱۸۲
کفار کا معجزہ طلب کرنا نفی معجزہ کی دلیل نہیں۔	〃	نزول ملائکہ	۱۸۸
معاندین کو معجزہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔	۱۳۶	نزول جبریل۔	〃
معاندین کو معجزہ سے بھی ایمان کی دولت نہیں ملتی۔	۱۳۸	فرشتہ۔ میکائیل کا نزول۔	۱۹۴
بایں ہمہ انبیاء معاندین کو معجزات دکھاتے ہیں اور		عام ملائکہ کا نزول۔	〃
وہ اعراض کرتے ہیں۔	۱۴۱	عالم رؤیا۔	۱۹۹
اسلئے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے۔	۱۴۳	رؤیائے تمثیلی۔	۲۰۳
معجزہ کے انکار یا تاخیر کے اسباب۔	۱۴۴	مشاہدات و مسموعات	۲۱۱
عقیدۂ معجزات کی اصلاح۔	۱۴۸	عالم بیداری، اسراء یا معراج	〃
مسئلہ اسباب و علل میں افراط و تفریط۔	۱۵۱	انبیاء اور سیر ملکوت۔	۲۱۶
قرآن مجید اسباب و مصالح کا قائل ہے۔	۱۵۲	معراج نبویؐ۔	۲۱۸
لیکن علت حقیقی قدرت و مشیت ہے۔	۱۵۵	معراج نبوی کا وقت، تاریخ اور تعداد وقوع۔	〃
قرآن میں سنت اللہ کا مفہوم۔	۱۵۷	معراج کی صحیح روایتیں۔	۲۲۱
قرآن میں فطرۃ اللہ کا مفہوم۔	۱۵۸	معراج کا واقعہ۔	۲۲۲
معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے۔	۱۵۹	کفار کی تکذیب۔	۲۲۸
معجزہ کی باعتبار خرق عادت کے چار قسمیں ہیں۔	〃	کیا آپ نے معراج میں خدا کو دیکھا؟	۲۳۰
اہل ایمان پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں۔	۱۶۰	معراج جسمانی تھی یا روحانی، خواب تھا یا بیداری۔	۲۳۳
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزۂ ہدایت۔	۱۶۴	معراج کے بحالت بیداری ہونے پر صحیح استدلال۔	۲۳۷

مضمون — صفحہ

مدعیان رویا کا مقصود بھی رویا سے عام خواب نہیں۔ ٢٣٧
رویائے صادقہ کی تاویل۔ ٢٣٨
رویا سے مقصود روحانی ہے۔ "
قرآن مجید اور معراج ٢٤٦
معراج کے اسرار، علامات، احکام، بشارتیں اور انعامات "
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی القبلتین ہونا۔ "
بنی اسرائیل کی مدت تولیت کا اختتام ٢٤٧
کفار مکہ کے نام آخری اعلان۔ ٢٤٩
معراج کے احکام و وصایا۔ ٢٥١
ہجرت اور عذاب۔ ٢٥٣
نماز پنجگانہ کی فرضیت۔ ٢٥٥
ہجرت کی دعا۔ "
نبوت قرآن، قیامت، معراج اور معجزات پر اعتراضات۔ ٢٥٦
حضرت موسیٰ کے واقعات اور حالات سے استشہاد۔ ٢٥٨
معراج کے انعامات۔ ٢٦٠
معراج کا پُراسرار منظر۔ "
شق صدر یا شرح صدر ٢٦٣
شق صدر کی ضعیف روایتیں۔ ٢٦٤
حماد بن سلمہ کی روایت میں ان کا وہم۔ ٢٦٨
دو دفعہ شق صدر ہو تو اس کی تاویل۔ ٢٦٩
شق صدر کی صحیح کیفیت۔ ٢٧٠
شق صدر کی حقیقت۔ "
شرح صدر کے لئے مناسب موقع اور مصلحت۔ ٢٧٣
آیات و دلائل نبوی قرآن مجید میں ٢٧٤
قرآن مجید میں آپ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے؟ "
قرآن مجید سے آپ کے صاحب معجزہ ہونے کی دلیل۔ ٢٧٥
قرآن مجید میں آپ کے دلائل اور معجزات مذکور ہیں ٢٧٦
معجزۂ قرآن ٢٧٧
فصاحت و بلاغت ٢٨٠
یکسانی اور عدم اختلاف "
قوت تاثیر۔ "
تعلیم و ہدایت۔ ٢٨١
قرآن کا جواب لانے کی قدرت نہیں ٢٨٢
ایک امی کی زبان سے ادا ہو
حفظ و بقا کا وعدہ۔
قوت دلائل۔ "
امیت۔ ٢٨٨
ذات نبوی کی حفاظت۔ ٢٩٥
لیلۃ الجن۔ ٢٩٨
جنوں کی انقلاب آسمانی کی تلاش اور ان کا مشرف باسلام ہونا۔ "
شق قمر۔ ٣٠٥
غلبہ روم کی پیشین گوئی۔ ٣٠٩
دیگر آیات و دلائل نبوی قرآن مجید میں ٣١٣
طیر ابابیل کی نشانی۔ "
شہاب ثاقب کی کثرت۔ "
شرح صدر۔ ٣١٤
مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر۔ "
قریش پر قحط سالی کا عذاب۔ "
موقع ہجرت کی معجزانہ نشانیاں۔ ٣١٥
خواب میں کفار کا کم دیکھنا۔ ٣١٦
مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کرکے دکھانا۔ "

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دونا نظر آنا۔	۲۱۶	حضرت آمنہ کا خواب۔	۲۲۹
فرشتوں کی آمد۔	۲۱۷	ولادت نبوی کی پیشین گوئیاں یہود و نصاریٰ میں۔	۲۳۰
میدانِ جنگ میں پانی برسانا۔	〃	بت خانوں میں غیبی آوازیں۔	〃
لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا۔	۲۱۸	شق صدر۔	〃
آپؐ کا کنکری پھینکنا۔	〃	مبارک قدم ہونا۔	〃
غزوۂ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ۔	〃	بے ستری میں آپؐ کا غش کھا کر گرنا۔	۲۳۱
غزوۂ احزاب کی خبر۔	۲۱۹	نیند طاری ہونا۔	〃
غزوہ احزاب میں آندھی۔	〃	صدائے غیب۔	〃
غزوۂ حنین میں نصرت۔	〃	پتھروں سے سلام کی آواز۔	۲۳۲
غیب پر اطلاع۔	۲۲۰	خواب میں فرشتوں کی آمد۔	〃
بنو نضیر کی سازش کی اطلاع۔	〃	اشیا میں اثر	۲۳۳
مہاجرینِ حبش کو بشارت۔	〃	ستون کا رونا۔	〃
ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی۔	۲۲۱	منبر ہلنے لگنا۔	〃
مدینہ میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہوگا۔	〃	چٹان کا پارہ پارہ ہو جانا۔	〃
دینی اور دنیاوی شہنشاہی کا وعدہ۔	۲۲۲	درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز۔	۲۳۴
قبائل عرب کی شکست ہوگی۔	〃	پہاڑ کا ہلنا۔	〃
قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے۔	۲۲۳	آپؐ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا۔	〃
فتح مکہ کی پیشین گوئیاں۔	۲۲۴	کھانوں سے تسبیح کی آواز۔	۲۳۵
خیبر اور حنین کی فتح کی پیشین گوئی۔	〃	زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا۔	〃
یہود کو اعلان۔	۲۲۵	درختوں کا چلنا۔	〃
یہود کی دائمی ناکامی	۲۲۶	خوشۂ خرما کا چلنا۔	۲۳۶
روم کی قوت ٹوٹ جائے گی۔	〃	درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا۔	〃
خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں۔	۲۲۷	بے دودھ کی بکری نے دودھ دیا۔	〃
وفات نبوی کی پیشین گوئی۔	〃	سست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا۔	۲۳۸
آیات و دلائل نبویہ بروایاتِ صحیح	۲۲۸	اندھیرے میں روشنی ہونا۔	〃
علاماتِ نبوت	۲۲۹	جانور کا سجدہ کرنا۔	〃
قبل بعثت	〃	جانور کا آپؐ کے مرتبہ کو پہچاننا۔	۲۳۹

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
حافظہ بڑھ جانا۔	۳۳۹	حضرت ابو طلحہؓ کے حق میں برکت اولاد کی دعا۔	۳۵۰
شفائے امراض	۳۴۰	حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے حق میں دعائے ہدایت۔	〃
حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہونا۔	〃	اونٹ کا تیز ہو جانا۔	〃
ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہو جانا۔	〃	بیمار کا اچھا ہونا۔	〃
تلوار کے زخم کا اچھا ہونا۔	〃	سواری کی قوت آجانا۔	۳۵۱
اندھے کا اچھا ہونا۔	۳۴۱	ایک مغرور کا ہاتھ شل ہو جانا۔	〃
بلا دور ہونا۔	〃	قبیلہ دوس کا اسلام ہونا۔	〃
گونگے کا بولنا۔	〃	رفع بے پردگی کے لئے دعا۔	〃
مرض نسیان کا دور ہو جانا۔	〃	سلطنت کسریٰ کی تباہی۔	〃
بیمار کا تندرست ہونا۔	۳۴۲	دعائے برکت کا اثر۔	۳۵۲
ایک جلے ہوئے بچے کا اچھا ہو جانا۔	〃	طویل عمر کی دعا۔	〃
جنون کا دور ہونا۔	〃	ایک بچہ کی ہدایت کے لئے دعا۔	〃
استجابت دعا	۳۴۳	اشیاء میں اضافہ	۳۵۳
قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا۔	〃	تھوڑے سے کھانے میں ستر اسی آدمیوں کا سیر ہو جانا	〃
رؤسائے قریش کے حق میں بددعا۔	۳۴۴	چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا۔	〃
حضرت عمرؓ کا اسلام۔	〃	کھانے میں حیرت انگیز برکت۔	۳۵۴
سراقہ کے گھوڑے کا پاؤں دھنس جانا۔	۳۴۶	گھی کی مقدار میں برکت۔	〃
مدینہ کی آب و ہوا کے لئے دعا۔	〃	جو کی مقدار میں برکت۔	〃
قحط کا دور ہونا اور پانی کا برسنا۔	۳۴۷	کھانے میں حیرت انگیز اضافہ۔	〃
حضرت انسؓ کے حق میں دعائے برکت۔	۳۴۸	تھوڑی سی زادِ راہ میں غیر معمولی برکت۔	۳۵۵
حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعائے علم۔	〃	تھوڑی سی زادِ راہ میں عظیم برکت۔	〃
حضرت ام حرامؓ کے حق میں دعائے شہادت۔	〃	آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت۔	〃
ایک نوجوان کی ہدایت کے لئے دعا۔	〃	تھوڑے سے کھانے میں غیر معمولی برکت۔	〃
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی شفا پانے کے لئے دعا۔	۳۴۹	قلیل تعداد میں کثیر برکت۔	۳۵۶
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا	〃	ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت۔	〃
حضرت عروہؓ کے حق میں دعائے برکت۔	〃	دودھ کے ایک پیالہ کی برکت۔	〃
حضرت ابو امامہ باہلیؓ کے حق میں دعائے سلامتی۔	〃	بکری کے دست میں برکت۔	〃

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
بکری کے تھنوں میں برکت۔	۲۵۷	حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کی اطلاع۔	۳۷۵
ایک وسق جو کی برکت۔	〃	خود اپنی وفات کی اطلاع۔	۳۷۶
توشہ دان کا ہمیشہ بھرا رہنا۔	۲۵۸	فتح یمن کی خبر۔	〃
تھوڑی کھجوروں میں برکت۔	〃	فتح شام کی خبر۔	〃
پانی جاری ہونا	۲۵۹	فتح عراق کی خبر۔	〃
مشکیزہ سے پانی ابلنا۔	〃	خوزستان وکرمان کی فتوحات اور ترکوں سے جنگ۔	〃
انگلیوں سے پانی جاری ہونا۔	〃	فتح مصر کی بشارت اور ایک واقعہ کا حوالہ۔	۳۷۷
پانی کا بڑھ جانا۔	〃	غزوۂ ہند کی خبر۔	〃
انگلیوں کی برکت۔	۲۶۰	بحر روم کی لڑائیاں۔	〃
انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا۔	〃	بیت المقدس کی فتح۔	۳۷۸
کل سے پانی بڑھ جانا۔	〃	فتح قسطنطنیہ کی بشارت۔	〃
ہاتھ منہ دھونے کی برکت۔	〃	فتح روم کا اشارہ۔	〃
انگلیوں کی برکت۔	〃	فاتح عجم کا اشارہ۔	
انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا۔	۲۶۱	مرتدین کی اطلاع۔	۳۷۹
تھوڑے پانی میں کثیر برکت۔	〃	حضرت زینبؓ کی وفات کی اطلاع۔	〃
انگلیوں سے پانی ابلنا۔	〃	ام ورقہ کو شہادت کی خوشخبری۔	
ایک اور واقعہ۔	〃	خلفاء کی بشارت۔	
اطلاع غیب۔	۲۶۲	بارہ خلفاء۔	۳۸۰
اہل کتاب کے سوالات کا جواب دینا۔	۲۶۹	خلافت راشدہ کی مدت۔	〃
اخبار غیب یا پیشین گوئی	۲۷۲	شیخین کی خلافت کی پیشین گوئی۔	〃
فتوحات عظیمہ کی اطلاع۔	〃	مسلمانوں کی دولت کی کثرت اور فتنوں کے ظہور سے	۳۸۱
قیصر وکسریٰ کی بربادی کی خبر۔	۲۷۳	آگاہ کرنا۔	
ساز و سامان کی بشارت۔	۲۷۴	حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد فتنوں کا ظہور ہوگا۔	〃
امن و امان کی بشارت۔	〃	فتنے مشرق کی جانب سے اٹھیں گے۔	۳۸۲
ابوصفوان کے قتل کی خبر۔	〃	حضرت عثمانؓ کو فتنہ کی اطلاع۔	〃
نام بنام مقتولین بدر کی خبر۔	۲۷۵	حضرت عمرؓ اور عثمانؓ شہید ہوں گے۔	
فاتح خیبر کی تعیین۔	〃	حضرت علی مرتضیٰ کی مشکلات و شہادت۔	۳۸۳

مضمون	صفحہ
جنگِ جمل کی خبر۔	۳۸۳
حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی جنگ۔	〃
حضرت عمارؓ شہید ہوں گے۔	〃
امام حسنؓ کی مصالحت۔	〃
نوخیز حکمرانانِ قریش کے ہاتھوں اسلام کی تباہی۔	۳۸۴
یزید کی تخت نشینی کی بلا اسلام پر۔	〃
امام حسینؓ کی شہادت۔	〃
خوارج کی اطلاع۔	〃
مختار اور حجاج کی اطلاع۔	۳۸۵
حجاز میں ایک آگ۔	〃
ایک صدی یا ایک دور کے بعد انقلاب۔	۳۸۶
چار دوروں کے بعد پورا انقلاب۔	〃
مدعیان کاذب۔	۳۸۷
منکرین حدیث۔	〃
تجارت کی کثرت اور اس میں عورتوں کی کثرت۔	〃
اہل یورپ کی کثرت۔	〃
سود کی کثرت۔	〃
یہودیوں سے جنگ۔	۳۸۸
حجاز کا انقطاع مصر، شام اور عراق سے۔	〃
اہل یورپ سے شام میں جنگ۔	۳۸۹
مسلمانوں کے خلاف تمام دنیا کی قومیں اٹھ کھڑی ہوں گی	〃
معجزاتِ نبویؐ کے متعلق غیر مستند روایات	۳۹۰
کتب دلائل اور ان کے مصنفین کا درجہ۔	〃
معجزات کے متعلق غلط اور موضوع روایتوں کے پیدا ہونے کے اسباب۔	۳۹۴
آپ کی برتری اور جامعیت کا تخیل۔	۳۹۵

مضمون	صفحہ
غیبی آوازوں اور پیشین گوئیوں سے نبوت کی تصدیق کا شوق	۳۹۶
شاعرانہ تخیل کو واقعہ سمجھ لینا۔	۳۹۷
آئندہ کے واقعات کو اشارات میں ولادت کے موقع پر بیان کرنا۔	〃
معجزات کی تعداد بڑھانے کا شوق۔	〃
الفاظ کی نقل میں بے احتیاطی۔	۳۹۸
مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت؛	۳۹۹
موضوعات و مناکیر میں سے مشہور عام روایات کی تنقید۔	〃
۱۔ سب سے پہلے نور محمدیؐ کی تخلیق ہوئی۔	〃
۲۔ نور محمدیؐ کا حضرت آدمؑ سے درجہ بدرجہ حضرت آمنہ تک منتقل ہونا۔	〃
۳۔ نور محمدیؐ جب عبدالمطلب کے سپرد ہوا تو ان سے خوارق عادات ظہور میں آئے۔	۴۰۰
۴۔ عبدالمطلب کے پاس آکر ایک کاہن کا ان کے ایک نتھنے میں نبوت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت بتانا۔	〃
۵۔ ایک کاہنہ کا حضرت عبداللہ کی پیشانی میں نور محمدیؐ کا پہچاننا اور ان سے اپنی تمنا کا اظہار کرنا۔	〃
۶۔ قریش کی دو سو عورتوں کا عبداللہ سے شادی نہ ہونے کے غم میں عمر بھر کنوارے رہنے کی زندگی بسر کرنا۔	۴۰۱
۷۔ کسریٰ کے چودہ کنگروں کا گرنا اور نہر ساوہ کا خشک ہونا۔	〃
۸۔ بوقت ولادت غیب سے آواز آنا اور مشرق و مغرب کی ساری زمین کا روشن ہو جانا۔	۴۰۲
۹۔ قبل ولادت حضرت آمنہ کو خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سردارِ دو جہاں ہونے کی خوشخبری سنانا اور "احمد" و "محمد" نام رکھنے کی ہدایت کرنا۔	〃
۱۰۔ حضرت آمنہ کے دردِ زہ کے وقت تمام ستاروں کا زمین پر جھک جانا	〃

مضمون	صفحہ
۱۱. حضرت آمنہ کے ایام حمل میں علامت حمل ظاہر نہ ہونا، اور نہ ایام حمل میں سخت گرانی کا بار محسوس کرنا، کسی گرانی اور تکلیف کا احساس کرنا۔	۴۰۲
۱۲. بوقت ولادت آسمانوں اور جنتوں کے دروازے کھلنا، فرشتوں کا باہم بشارت دینا وغیرہ وغیرہ	۴۰۳
۱۳. مجالس میلاد کی رونق افزا روایت	〃
۱۴. آنحضرتؐ کا شکم مادر میں آنا، قریش کے جانوروں کا بولنا وغیرہ وغیرہ۔	〃
۱۵. حضرت عبداللہ کی ولادت کے وقت ان کے چہرہ پر سورج کی روشنی کا ہونا۔	۴۰۵
۱۶. بوقت ولادت حضرت آمنہ کو تین آدمیوں کا دکھائی دینا ایک کے ہاتھ میں آفتابہ، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت وغیرہ وغیرہ۔	〃
۱۷. بوقت ولادت حضرت آمنہ کو ابر کا ٹکڑا نظر آنا اور اس سے طرح طرح کی آوازوں کا نکلنا۔	۴۰۶
۱۸. بعد ولادت مشرق و مغرب کا روشن ہو جانا اور آپؐ کا دونوں ہاتھوں سے ٹیک دے کر زمین پر گر پڑنا۔	۴۰۷
۱۹. ولادت کی شب ایک یہودی کا سرداران قریش کے پاس آکر ولادت کی تحقیق کرنا۔	〃
۲۰. حضرت عباسؓ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گہوارہ میں چاند سے باتیں کرتے ہوئے دیکھنا۔	۴۰۸
۲۱. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گہوارہ میں کلام فرمانا۔	〃
۲۲. حلیمہ سعدیہ کا آنا، آپ کا ان کو دیکھ کر مسکرانا وغیرہ۔	〃
۲۳. عہد طفولیت میں شق صدر ہونا۔	۴۱۰
۲۴. حضرت حلیمہ کے پاس زمانۂ قیام میں بعض یہودیوں کا آپؐ کو نبی آخر الزمان پہچان کر قتل کرنے کی کوشش کرنا۔	〃

مضمون	صفحہ
۲۵. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں کھیلنا اور بادل کا دھوپ سے سایہ کئے رہنا۔	۴۱۱
۲۶. بحیرہ راہب کے قصہ کی تنقید۔	〃
۲۷. نسطورا راہب کے قصہ پر تنقیدی نظر	۴۱۳
۲۸. قریش کے باہمی معاہدہ کے کاغذ کو دیمک کا چاٹ لینا۔	۴۱۴
۲۹. غار ثور میں پناہ لینا اور مکڑیوں کا جالے تن دینا وغیرہ وغیرہ	〃
۳۰. آپؐ کا بے دودھ والی بکری کے تھن میں ہاتھ لگانا اور اس سے دودھ نکل آنا۔	〃
واقعہ ام معبد کی تنقید	-
مدنی معجزات زیادہ محفوظ ہیں جن کی روایات میں تین تین نوعیتوں کی روایتیں ہیں۔	〃
بشارات	۴۲۱
یہود اور نصاریٰ میں بشارات کی اہمیت	〃
حضرت ابراہیمؑ کی دعا قرآن میں۔	〃
حضرت ابراہیمؑ کی دعا توراۃ میں	۴۲۲
حضرت اسماعیلؑ کی بشارت۔	〃
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعائے ابراہیمی کے مصداق تھے۔	۴۲۳
حضرت عیسیٰؑ کی بشارت قرآن و انجیل میں۔	۴۲۴
بشارت عیسوی کے مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے	〃
صحابہ کا بیان کہ توریت میں آنحضرتؐ کی یہ بشارت ہے۔	۴۲۸
اشعیاء نبی کی بشارت۔	۴۲۹
اشعیاء نبی کی بشارت اور صحابہ کے بیان میں تطبیق۔	۴۳۰
اشعیاء نبی کی ایک ایک علامت کی تطبیق آنحضرتؐ کے حالات سے۔	۴۳۱
قرآن میں توراۃ کی ایک بشارت نبوی کا حوالہ۔	۴۳۳
حضرت موسیٰ کی بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے	〃

مضمون	صفحہ
متعلق اور اس کی آپ کے حالات سے تطبیق۔	۴۳۳
قرآن مجید میں انجیل کی ایک بشارت کا حوالہ۔	تا
انجیل میں اس بشارت کا ذکر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	
کی اس حالت سے تطبیق۔	۴۳۸
حضرت موسیٰ کی ایک اور بشارت آپ کے متعلق اور	۴۳۹
اس کی تطبیق آیات قرآنی سے۔	
عیسائیوں میں دانیال کی پیشین گوئی کے ذریعے سے فرشتے	
کا انتظار اور آنحضرت کا ظہور۔	〃
ملک الختان کی تصحیح۔	
دانیال کی پیشین گوئی کی عبارت اور اس کی تطبیق۔	〃
قیصر روم اور ابن ناطور کی تصریح کہ ملک الختان آپ ہی ہیں۔	۴۴۳
عیسائیوں اور یہودیوں میں اس وقت ایک نبی کا انتظار۔	۴۴۴
یہودیوں اور عیسائیوں کا توراۃ اور انجیل کی	
پیشین گوئیوں کی علامتیں آپ میں پانا۔	〃
خصائص محمدیؐ	۴۴۸
خصائص محمدی محدود اور معدود ہیں۔	〃
خصائص محمدی کی دو قسمیں، خصائص ذاتی اور	〃
خصائص نبوتی۔	〃
خصائص ذاتی	۴۵۰
نبوت اور لوازم نبوت۔	〃
امور متعلقہ نکاح۔	〃
نماز شبانہ	۴۵۲
نماز چاشت اور قربانی۔	〃
عصر کے بعد نماز دوگانہ۔	〃
صوم وصال۔	۴۵۳
صدقہ، زکوٰۃ کی حرمت، صدقہ زکوٰۃ۔	〃

مضمون	صفحہ
خصائص نبویؐ	۴۵۴
خصائص نبوی کا شمار۔	〃
رعب و نصرت۔	〃
سجدہ گاہ عام۔	۴۵۶
پیروؤں کی کثرت۔	〃
دعوت عام۔	۴۵۷
جوامع الکلم۔	〃
تکمیل دین۔	۴۵۹
دائمی معجزہ۔	〃
ختم نبوت	〃
شفاعت اولین۔	۴۶۴
فضائل اخروی۔	۴۶۷
خاتمہ جلد سوم۔	۴۶۸

⁂

فہرست مضامین

سیرت النبیؐ جلد چہارم

مضمون	صفحہ
مقدمہ	۱۴
منصب نبوت	〃
کتاب کا موضوع	〃
آپ کے پیغمبرانہ کارنامے	〃
نبی اور مصلح اور حکیم	۱۵
نبوت کی حقیقت اور خصوصیات	〃
نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ۔	۱۷
تفصیلی ثبوت کے تین طریقے	〃
پہلا طریقہ	〃
دوسرا طریقہ	〃
تیسرا طریقہ	۱۸
نبی کی ضرورت	۱۹
نبی کی عصمت	۲۰
نبی کی محبوبیت	〃
مصلحین	〃
مصلحین کے اقسام	۲۱
نبی کی دو بعثتیں	〃
بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب	۲۲
بعثت کا زمانہ	〃
نبی کی یقینی کامیابی	〃
ایک شبہ اور اس کا جواب	۲۹
نبی اور غیر نبی کے امتیازات	۳۳
نبوت کے لوازم اور خصوصیات	۳۶
وہبی استعداد	۳۸
غیبی علم	۴۰
علم انسانی کے ماخذ	〃
ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب۔	۴۱
غیر مادی علم	۴۳
علم غیب	۴۶
غیب کی حقیقت	۴۷
وحی اور ملکۂ نبوت	۵۰
کتاب اور سنت	۵۱
وحی متلو اور وحی غیر متلو	〃
احادیث قرآن کا بیان ہیں	۵۳
الہام واجتہاد وحکمت	〃
نبوت	۵۴
علوم نبویؐ کے اقسام	۵۵
عصمت اور بے گناہی	۵۹
بعض شبہات کا ازالہ	۵۳
نکتہ	۶۵
نبی کی بشریت	۶۸
اجتہاد نبوی میں خطا	۷۴
اس خطا کے معنی	〃
پانچ اجتہادی علوم پر تنبیہ الٰہی	۷۵
پہلا واقعہ	〃
دوسرا واقعہ	۷۶
تیسرا واقعہ	۷۸
چوتھا واقعہ	۷۹
پانچواں واقعہ	۷۹
ایک غلط استدلال	۸۱
عقل بشری	۸۳
ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت	۸۵
حکمت	〃
کتاب وحکمت کی تعلیم	۹۳
علم	۹۴
علم وحکم	۹۵
شرح صدر	۹۷
تبیین کتاب	۱۰۱
ارائت	۱۰۲
رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے	۱۰۴
تزکیہ	۱۰۵
نور	〃
آیات وملکوت کی رویت	〃
سماع غیب	۱۰۶
تبلیغ ودعوت	〃
ایک شبہ کا ازالہ	۱۰۸
انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ	۱۱۱
نبوت کی غرض وغایت	۱۱۲
تائید ونصرت	۱۱۴
خاتمہ	۱۱۵
شب ظلمت	۱۱۶
پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت۔	〃

مضمون	صفحہ
ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟	۱۱۷
مجوسِ فارس	〃
عیسائی روم	۱۲۰
ہندوستان	۱۲۵
یہود	۱۲۷
ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت	۱۳۴
خدا کا اعتقاد	〃
ملائکہ کی الوہیت	۱۳۵
جنات کی الوہیت	۱۳۶
بت پرستی	〃
ستارہ پرستی	۱۴۰
جن و شیاطین اور بھوت پلیت	〃
کہانت	۱۴۳
اوہام پرستی	۱۴۴
جنگ جوئی	〃
شراب خواری	۱۴۵
قمار بازی	۱۵۳
سود خوری	۱۵۴
لوٹ مار	۱۵۵
چوری	۱۵۶
سفاکی و بے رحمی و وحشت	۱۵۷
زنا اور فواحش	〃
بے شرمی و بے حیائی	۱۵۸
عورتوں پر ظلم	۱۵۹
وحشت و جہالت۔	۱۶۱
عربوں کے خصوصیات اور خیر الامم بننے کی اہلیت	۱۶۲
صحتِ نسب	〃
کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے	۱۶۳
محکوم نہ تھے۔	〃
کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے	۱۶۴
وہ زمین کے وسط میں آباد تھے	〃
بعض اخلاقی خوبیاں	〃
شجاع و بہادر تھے	〃
پرجوش تھے	〃
حق گو تھے	〃
عقل و دانش والے تھے	۱۶۵
ذہین اور حافظہ کے تیز تھے	〃
فیاض تھے	〃
مساوات پسند تھے	〃
عملی تھے	۱۶۶
ان اوصاف کی مصلحت	〃
صبحِ سعادت	۱۶۷
ایک قوم کا انتخاب	〃
اصلاح و ہدایت کی مشکلات	۱۶۸
جہالت	〃
آبائی دین و راہ و رسم کی پابندی	۱۷۲
توہم پرستی	۱۷۴
قبائل کی خانہ جنگیاں	۱۷۶
سیاسی مشکلات	۱۷۹
ذریعہ معاش	۱۸۰
رفعِ شک	۱۸۲
تبلیغِ نبوی اور اُسکے اصول اور اسکی کامیابی کے اسباب	۱۸۴
فریضۂ تبلیغ	〃
تبلیغ کی اہمیت	۱۸۵
اس کی وسعت	〃
تبلیغ کے اصول	۱۸۷
قولِ لین	۱۸۸
اعراض اور قولِ بلیغ	〃
تیسیر و تبشیر	〃
تدریج	۱۸۹
تالیفِ قلب	〃
دعوتِ عقل	〃
مذہب میں زبردستی نہیں	۱۹۱
میدانِ جنگ میں تبلیغ	۱۹۲
مسلح تبلیغی جماعتیں	۱۹۵
تبلیغ و دعوت کی تنظیم	〃
مبلغوں کی تعلیم و تربیت	۱۹۶
دعوت بالقرآن	۱۹۷
اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب	〃
قبولِ اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی؟	۱۹۸
اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع	۱۹۹
ایک ضروری نکتہ	۲۰۳
موانع کا ازالہ	۲۰۴
اسلام یا محمد رسول اللہ کا پیغمبرانہ کام	۲۰۹
تعلیماتِ نبوی کی ہمہ گیری	[illegible]
اسلام کے چار حصے	۲۱۲

مضمون	صفحہ
عقائد	۲۱۳
عقائد کی حقیقت اور اہمیت	〃
اللہ تعالیٰ پر ایمان	۲۱۸
اصلاحِ عقائد	〃
تعددِ خدا کا ابطال	〃
بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا	۲۲۰
درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد	۲۲۲
خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں	۲۲۳
حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے	۲۲۴
غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم	〃
صفاتِ الٰہی کی توحید	۲۲۵
مخفی قوتوں کا ابطال	۲۲۶
اوہام وخرافات کا ابطال	۲۲۸
کفارہ اور شفاعت کے معنی کی تردید	۲۲۹
اجرامِ سماوی کی قدرت کا انکار	۲۳۴
غیر خدا کی قسم سے روکنا	۲۳۵
خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں	۲۳۶
مشتبہاتِ شرک کی ممانعت	۲۳۷
قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا	〃
ریا اور عدمِ اخلاص بھی معنوی شرک ہے	〃
توحید اور اس کے ایجابی اصول وارکان	۲۴۰
اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل	〃
توحید پر عقلی دلیلیں	۲۴۶
توحید کی تکمیل	۲۴۸
خدا کی حقیقی عظمت	〃
انسان کا مرتبہ	۲۵۰
خدا کا جامع اور مانع تخیل	۲۵۳
اسماء وصفات	۲۵۴
صفاتِ جمالی	۲۶۲
صفاتِ جلالی	۲۶۴
نکتہ	〃
صفاتِ کمالی	۲۶۵
صفاتِ وحدانیت	〃
صفاتِ وجودی	〃
علم	〃
قدرت	۲۶۶
نکتہ	۲۶۷
تنزیہہ	〃
ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر	۲۶۸
خدا کا ڈر اور پیار	۲۷۲
محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم	〃
محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت	۲۷۵
تعلیماتِ اسلامی میں محبتِ الٰہی کے مظاہر	〃
فرشتوں پر ایمان	۲۸۷
ملائکہ کے معنی	〃
ملائکہ کا تخیل مذاہبِ قدیمہ میں	〃
ملائکہ کا تخیل فلسفہ میں	〃
یونانی مصری فلسفہ میں	〃
قدیم یونانی فلسفہ میں	〃
صابیون میں ملائکہ کا تخیل	۲۸۸
اسلام میں فرشتوں کی حقیقت	〃
اس عقیدہ کی عقلی حیثیت	〃
آیات واحادیث میں ملائکہ کا ذکر	۲۹۱
ملائکہ کے فرائض	۲۹۳
فلسفہ ومذاہب کی ملائکہ کے متعلق باہم اتفاق	۲۹۷
فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد	۲۹۸
رسولوں پر ایمان	۲۹۹
ایک عام غلط فہمی کا ازالہ	〃
نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں	
تمام دنیا میں پیغمبر آئے	۳۰۰
تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف	۳۰۱
پیغمبروں میں تفریق کی ممانعت	〃
پیغمبروں کی غیر محدود تعداد	〃
مختلف فیہ پیغمبروں کی رسالت کا اقرار	۳۰۲
پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار	۳۰۳
پیغمبروں کا منصب اور فرائض	〃
پیغمبروں کی عصمت	〃
قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ	۳۰۴
وہ انبیا جنکا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے	۳۰۵
ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول	〃
انبیاء کی باہمی ترجیح کا مسئلہ	۳۰۶
کتبِ الٰہی پر ایمان	۳۰۷
کتابِ الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد	〃
اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو	〃
تمام کتبِ الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے	۳۰۸
انبیائے قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف	〃
چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	〃
اس عقیدہ کا اثر سیاسیاتِ عالم پر	۳۱۰
اقوامِ عالم کی قانونی تقسیم اور انکے حقوق	〃
مسلمان	〃
اہلِ کتاب	〃
شبہ اہلِ کتاب	〃
کفار اور مشرکین	〃

مضمون	صفحہ
وحدۃ الادیان	۲۱۱
تمام سچے مذاہب ایک ہیں	〃
دین اور شرعۃ، منسک، مناہج کا فرق	〃
صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے	۲۱۲
وحدتِ دین پر قرآن کی شہادت	〃
وحدتِ دین کی دعوتِ عام	۲۱۳
دین قیم	〃
اسلام اور مذاہب قدیمہ کا اتحاد	۲۱۴
دین ہمیشہ ایک رہا	〃
شرعہ اور مناہج میں تبدیلی ہوئی	۲۱۵
اس کی مثالیں	〃
تبدیل قبلہ	〃
خانۂ کعبہ کے حج کی تعیین	〃
یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں	
پر عمل کرنے کی ہدایت۔	〃
مسلمانوں کو شریعت اسلام پر عمل کرنے کا حکم	۲۱۶
صحیفۂ محمدیؐ نے اگلی کتابوں کی تصدیق کی	〃
اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر	
اہل اہواء کی پیروی کی۔	〃
حدود میں شریعتوں کا اختلاف ناگزیر ہے	۲۱۷
یہود و نصاریٰ فروعی اختلافات پر	
ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے۔	〃
وہ مسلمانوں کو یہودیت و نصرانیت	۲۱۸
کی دعوت دیتے تھے۔	〃
اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی	
کی جانب۔	۲۱۹
اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں	〃
خطاب	
قبول عمل کے لئے ایمان شرط ہے	〃

مضمون	صفحہ
ایمان و عمل کیلئے نبی کی تصدیق ضروری ہے	۲۲۰
اسلام کامل تمام رسولوں کی تصدیق ہے	〃
یہود و نصاریٰ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے	
اس لئے اصل اسلام سے ہٹ گئے	〃
یہود و نصاریٰ کا حسن عمل	〃
اسلام کا اصل الاصول توحید کامل اور	
رسالت عمومی ہے۔	۲۲۱
اسلام کا ہدایت تامہ ہونا	〃
توحید کامل کے بغیر نجات کلی کا کوئی	
مستحق نہیں۔	〃
نبوتِ محمدیؐ کا دعویٰ	〃
دعوت محمدی میں ہدایت کی بشارت	〃
اہل مذاہب اور تمام انسانوں کو دعوت	
محمدی کیوں پیش کی گئی۔	۲۲۲
تکمیل دین	〃
قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الٰہی کی	
تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا۔	〃
حضرت موسیٰ کی بشارت ایک آنے	۲۲۳
والے نبی کے لئے	
موعود: الامر و تکملہ، آعاد اور اسکا دعویٰ	〃
وحی الٰہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	〃
تکمیل دین کے اثرات مظاہر	〃
قرآن کا مہیمن ہونا	〃
قرآن کا تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں	
اور تعلیموں پر مشتمل ہونا۔	〃
قرآن محفوظ ہے اور رہے گا	〃
اگلی کتابیں تحریفات و تصرفات سے نہ بچ سکیں	〃
قدیم مذاہب دائمی نہ تھے اسلئے دائمی	〃
حفاظت کا وعدہ نہ تھا۔	

مضمون	صفحہ
قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری	
اللہ تعالیٰ پر	۲۲۳
قرآن کے لفظ و عبارت و معنی کی	
حفاظت کے لئے وعدہ الٰہی۔	۲۲۴
قرآن کا غالب ہونا۔	〃
ختم نبوت	〃
وحدتِ ادیان اور دین اسلام	〃
تمام مذاہب سابقہ کا اصل دین	〃
صحیفۂ محمدیؐ نے اہل کتاب کو	
وحدتِ دین کی دعوت دی۔	〃
وحدتِ دین کی حقیقت صحیفۂ محمدی میں	۲۲۵
پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان	۲۲۶
یہ اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری	
کڑی ہے۔	〃
آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم	〃
آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے	〃
قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے	
زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے۔	۲۲۷
آئندہ زندگی کے دو دور یعنی برزخ و بعثت	〃
تورات و انجیل میں برزخ و بعثت	
کی تفصیل نہیں۔	۲۲۸
اسلام اور یوم آخرت کی تفصیل	〃
اسلام میں تین دور ہائے حیات، دنیا	〃
برزخ اور قیامت ان تینوں دوروں	
میں فرق۔	〃
ا۔ برزخ	۲۲۹
قرآن مجید میں لفظ برزخ اور اسکے معنی	〃
قبر و برزخ کا عرف عام ہے	
موت و حیات کی منزلیں	

مضمون صفحہ
قرآن میں دو موتوں اور دو حیاتوں ۲۳۰
کا ذکر۔
دونوں موتوں اور حیاتوں کی تشریح ″
عالم برزخ کی کیفیت ″
نیند اور موت کی مشابہت ″
نیند اور موت کا فرق ″
قرآن میں موت کی تعبیر نیند سے ″
برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے ″
قرآن میں دوسری زندگی کے لئے
بعث کا لفظ۔ ″
خواب میں لذت والم ۲۳۱
خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثرانداز ہے؟ ″
عالم خواب کی لذت والم کا خاتمہ
بیداری میں۔ ″
اور بیداری کی لذت والم کا خاتمہ ″
عالم خواب میں۔
عالم خواب کے لذائذ و آلام کے فلسفیانہ
اسباب وعلل۔ ″
بھولے ہوئے احساسات ومعلومات
کا خواب میں متشکل ہو کر نظر آنا۔ ۲۳۲
اچھے اور بُرے اعمال کے نقوش ″
ذہن انسانی کے گوشوں میں تمثیلی
خواب اور اس کی مثالیں۔ ″
جسم انسانی میں مختلف مادوں کی کمی بیشی ″
سے خواب میں ان کے مناسب مجسم
شکلیں اور اس کی مثالیں ″
اعمال انسانی کا خواب میں اپنے مناسب
قالب میں مجسم ہونا اور انکی مثالیں۔ ۲۳۳
اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں ″

مضمون صفحہ
اعمال کی تمثیلات احادیث میں ۲۳۴
گناہوں کی تمثیلی سزائیں ″
آنحضرتؐ کے ایک رویائے صادقہ
میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی
سزاؤں کے مناظر ″
ان تمثیلات کی تعبیر وتشریح ۲۳۵
علم النفس سے انسان کی لاعلمی ۲۳۶
تصوری یقین اور خارجی وجود کا
باہمی تعلق۔ ″
قرآن پاک میں یقین کی دو قسمیں ″
علم الیقین اور عین الیقین۔ ″
علم الیقین کے حصول کا ذریعہ
ایمان سے ″
علم الیقین کے ذریعہ دوزخ
کا مشاہدہ دنیا میں۔ ″
موت کے بعد حجاب مادیت کا اٹھنا ۲۳۷
اور اعمال کے تمثیلی نتائج کو کسی
حد تک دیکھنا۔ ″
قیام روز جزا پر تمام رازہائے
سربستہ کا فاش ہوجانا۔ ″
احوال برزخ کا عین الیقین ″
موت کے بعد عالم برزخ کی ابتدا ″
عالم برزخ میں جزا اور سزا کے لئے ۲۳۸
مشاہدہ کی شہادتیں قرآن مجید میں ″
موت کے بعد خدا کی طرف روح
کی بازگشت ۲۳۹
موت کے بعد قرآن مجید میں خدا کی طرف
بازگشت کی اصطلاح اور اسکا مفہوم ″
اسی وقت کا سوال ۲۴۰

مضمون صفحہ
موت کے سماں کا خاکہ قرآن مجید میں ۲۴۰
جسم سے روح کی علیحدگی کے بعد سزا کا دور ″
سزا قانون عمل کے مطابق انسانی اعمال
کا نتیجہ ہے۔ ″
نیکوکاروں کو بشارتیں ″
برزخ کا عذاب وراحت ۲۴۱
برزخ میں عذاب وثواب کے مناظر
برزخ اور اس کے عذاب وثواب کا تذکرہ
قرآن مجید میں۔ ″
قبر کی اصطلاح ۲۴۴
احادیث میں برزخ کا اصطلاحی نام قبر ہے ″
قبر کا مفہوم ″
قبر ارواح ونفوس کی دنیا ہے ″
قبر کی روحیں جسم خاکی کے بجائے جسم مثالی
میں متشکل ہوتی ہیں۔ ″
جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت
والم کا احساس ہوتا ہے۔ ″
بعض سعید روحیں جسم خاکی کی شکل کی قید سے
آزاد کردی جاتی ہیں۔ ″
مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات ″
سوال وجواب ۲۴۵
قبر میں فرشتوں کا توحید ورسالت کے
متعلق سوال۔ ″
قبر کے سوال وجواب کا ذکر قرآن مجید میں ″
سوال وجواب کا اصل مفہوم ۲۴۶
برزخ میں ارواح کا مسکن ۲۴۸
آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل ۲۴۹
قیامت اور جزائے اعمال
کیا کبھی دنیا سے حیات پر [illegible] ″

مضمون — صفحہ

نظام کائنات کی بربادی کی پیشنگوئی
اہل سائنس کی طرف سے۔ ۲۵۰
قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی 〃
کتابوں میں۔ 〃
قیامت 〃
قیامت کے نام قرآن میں 〃
قیامت کے اوصاف ۲۵۱
قیامت میں فساد نظام ہوگا 〃
اس کی شہادتیں قرآن مجید سے 〃
بعد قیامت ایک نئے آسمان اور
نئی زمین کی تعمیر ۲۵۳
پچھلی دنیا کے نتائج پر اس کی بنا
قیامت کی حقیقت 〃
صور قیامت ۲۵۵
عربوں کا انکار قیامت سے ۲۵۶
اسی لئے اسلام میں توحید کے بعد سب سے
زیادہ زور قیامت کے عقیدہ پر دیا گیا 〃
عقیدہ قیامت اصول دین کیوں ہے؟ 〃
قیامت پر قرآنی دلائل ۲۵۷
حشر جسمانی ۲۶۰
روحانی زندگی کا تصور نئی جسمانی
زندگی سے زیادہ دشوار ہے 〃
حشر جسمانی ہوگا 〃
جسم و جسد ۲۶۳
کہ کوئی نیا جسمانی پیکر ہوگا 〃
انی پیکر جسم خاکی کی خصوصیات 〃
ولوازم سے الگ ہو۔ 〃
خلق جدید 〃
ذمہ داری، درجہ بدرجہ ۲۶۴

مضمون — صفحہ

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی
جسم رہتا ہے۔ ۲۶۵
اخروی جسم کیسا ہوگا؟ 〃
جزا اور سزا ۲۶۷
جزا اور سزا دیگر مذاہب میں۔ 〃
عالم آخرت کا فہم و ادراک ۲۷۰
عالم آخرت کو مادی دنیا کی زبان محاورات
میں سمجھایا گیا ہے۔ 〃
اس طرز افہام سے فلسفی و عامی دونوں
تشفی پاتے ہیں۔ 〃
اخروی وقائع کے سمجھانے کے لئے
مادی الفاظ کا استعمال ۲۷۱
وجود کے موجودہ قوانین فطرت اور ان
کے خصوصیات ولوازم 〃
مادی دنیا کے قوانین فطرت اور سلسلہ علت
ومعلول اسی مادی عالم کے ہیں۔ 〃
ضروری نہیں کہ موجودہ قوانین فطرت
وہاں بھی کارفرما ہوں۔ 〃
اصول جزا 〃
اصول فطرت صرف مادیات تک محدود نہیں 〃
اعمال کے لوازم و نتائج 〃
عقاب وثواب رد عمل ہے ۲۷۲
حصول راحت کا اصول ۲۷۳
نامۂ عمل ۲۷۴
کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتی 〃
اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں 〃
قرآن مجید میں اس اصول کی تشریح اور ۲۷۵
اس پر شہادتیں۔
اعضاء کی شہادت 〃

مضمون — صفحہ

میزان ۲۷۶
حساب ۲۷۷
جنت و دوزخ ۲۷۸
جنت انسان کی وراثت ہے 〃
حضرت آدمؑ کا زمین پر آنا ان کی پیدائش
سے پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ 〃
آدمؑ اور بنو آدم کی اصلی جگہ جنت ہے 〃
جنت کے دو درخت، نیک و بد کی پہچان
کا، اور زندگی جاوید کا۔ 〃
آدمؑ کو نیک و بد کی شناخت کے
درخت سے روکا گیا۔ 〃
شیطان نے حیات جاوداں کا درخت کہہ کر
نیک و بد کی شناخت کے درخت کو بتا دیا۔ 〃
حیات جاوداں سے مقصود کیا ہے؟ 〃
نیک و بد کی تمیز ہی شرعی تکلیف کا
باعث ہے۔ 〃
آدمؑ کو نیک و بد کی تمیز کا فطری الہام 〃
انسان کا تکلیف شرعی کی امانت کو قبول
کرنا، اور حیات جاوداں کا حصول سعی
وعمل پر موقوف ہونا۔ ۲۸۰
زمین پر بنو آدمؑ کی چار چیزوں کھانے،
پینے، پہننے اور اوڑھنے کی ضروریات کا
پیدا ہونا 〃
مذہب نے ان ضروریات اربعہ کے جائز
طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے
احتراز کی تلقین کی۔ ۲۸۱
جنت کی وراثت کا وعدۂ الٰہی 〃
انسانی جزا و سزا کے تین گھر 〃
انسان کا پہلا دار الجزاء یعنی دنیا کا گھر 〃

مضمون	صفحہ
یہ دار الجزاء فانی ہے۔	۳۸۴
یہ دار الجزاء دار الاصلاح بھی ہے	۳۸۵
انسان کی تنبیہ و اصلاح کے مراتب	″
نیکی سے برائی کا کفارہ	″
توبہ کفارہ ہے	۳۸۶
مصائب کی تنبیہ اور کفارہ	۳۸۷
عذاب الٰہی کا مقصد	″
عذاب برزخ بھی کفارہ ہے	۳۸۹
عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے	۳۹۱
عذاب انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے	۳۹۲
انسان کی تخلیق رحمت کیلئے ہے	۳۹۳
دوزخ	″
دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے	″
گناہ روحانی بیماری کا اور عذاب	۳۹۴
اسکے نتیجۂ بد کا اصطلاحی نام ہے	″
دوزخ کی مثال شفاخانہ ہے	۳۹۵
دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی	″
گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے	″
دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور	″
اور نجات۔	
اس کی تصریحات احادیث میں	[illegible]
شرک و کفر کی بخشائش نہیں	۳۹۸
کیا دوزخ کی انتہا ہے؟	″
دوزخ رحمت الٰہی کی چھینٹوں سے	
بالآخر سرد ہو جائے گی۔	۳۹۹
اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	″
دوزخ کی انتہا قرآن مجید میں	
مشیت پر ہے	۴۰۰
کفار و مشرکین کے عذاب کی انتہا	

مضمون	صفحہ
مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔	۴۰۰
قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے	
تسلسل وجود پر دلالت نہیں کرتی۔	۴۰۱
قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع	
کی تصریح کی گئی۔	″
قرآن مجید سے اس کی تشریح اس کی	
شہادت حدیثوں میں۔	۴۰۲
دفع شبہہ	″
قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دوزخ	
کے دوام کا شبہہ۔	″
اس شبہہ کا ازالہ	۴۰۳
چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے	
الگ نہ ہونے کی تشریح۔	″
ان آیات کا مفہوم	″
اللہ تعالیٰ کے وعدہ ثواب و عذاب	″
میں فرق۔	
مشرکین و کفار کی معافی کی صریح	″
تصریح کیوں نہیں۔	تا
عقیدۂ کفار اور عقیدہ کرم اور	
عقیدۂ مغفرت۔	۴۰۵
عذاب طویل کا سبب	۴۰۶
مشرک و کافر کا آخر انجام	″
جمہور کے نزدیک عذاب دوزخ کا دوام	۴۰۸
بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی	
تمثیلی ہے۔	۴۱۰
تمثیلی سزا کے معنی	″
اس کی مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے	″
دوزخ کی جسمانی سزائیں	۴۱۱
جسمانی سزاؤں کی تصریح قرآن مجید سے	۴۱۲

مضمون	صفحہ
دوزخ میں روحانی سزائیں	۴۱۳
ان کی تصریح قرآن مجید سے	۴۱۴
جنت	۴۰۵
جنت کے نام	″
جنت کا دوام	″
اس کی تصریح قرآن مجید میں	″
دائمی قیام سے اہل جنت کا جنت	″
میں گھبرانا، ان کی جبلت و فطرت	″
کے خلاف ہوگا۔	″
غیر فانی بادشاہی	۴۱۸
جنت کے عیش و مسرت کی تعبیر	
آسمانی بادشاہی سے۔	″
عیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	″
آسمانی بادشاہی کے اجمال کی	
تفصیل۔	″
جنت کے لئے باغ کا استعارہ کیوں	
لیا گیا ہے؟	۴۱۹
استعارہ میں ایک نکتہ	″
سامان جنت کے دنیاوی نام	۴۲۰
جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی	
سے بلند تر حقائق۔	″
اسکی شہادت قرآن مجید و احادیث سے	″
جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں	۴۲۱
اسکی شہادت قرآن مجید اور احادیث سے	″
لطف و مسرت کا تصور	۴۲۵
لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	″
جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری	″
ہوگی۔	″
جنت، جہاں کوئی جسمانی و روحانی	

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
آزار نہیں۔	۴۲۶	عقیدہ قضا و قدر کا نتیجہ پستی، سستی		اہل ایمان عمل رشتہ ساختہ	۴۵۰
جنت، جہاں رشک و حسد نہیں	۴۲۷	و دون ہمتی نہیں۔	۴۴۱	تمام نیکیاں [illegible] ایک جڑ ایمانی	
وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	″	اس کا نتیجہ بلندی استقلال اور صبر و		کی شاخیں ہیں۔	″
جنت ارتقائے روحانی ہے	۴۲۸	ثبات ہے۔	″	ایمان کے بعد عمل کی ضرورت	۴۵۱
مسئلہ ارتقاء کے اصول بقائے اصلح	″	غلط فہمی کا ازالہ	۴۴۲	ایمان ملزوم اور اعمال اس کے	″
کامل روحانی مدارج کے ارتقا ہیں	″	قضا و قدر اور سعی عمل کی باہمی تطبیق	″	لوازم ہیں۔	″
امن و سلامتی کا گھر	۴۲۹	پہلے فسق اور نافرمانی ہوتی ہے	″	خاتمہ	۴۵۲
مقام رحمت	۴۳۰	اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے		★	
مقام نور	۴۳۱	ضلالت کا ظہور ہوتا ہے۔	″		
مقام رضوان	″	جبر و قدر کا لاینحل مسئلہ	۴۴۳		
مقام طیب و طاہر	۴۳۲	قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو			
مقام تسبیح و تہلیل	۴۳۳	صورتیں، یا تو خاموشی یا جبر کی تلقین	″		
صبح و شام کی روزی	۴۳۴	آنحضرتؐ نے اس راز کو فاش کیا	۴۴۴		
مقام قرب	″	بیک وقت دو صداقتیں	″		
دیدار الٰہی	″	صحیفۂ محمدیؐ میں ان دونوں صداقتوں			
ان تعلیمات کا عملی اثر	۴۳۵	کی تفصیل اور ان کی تشریح۔	″		
عرب کا ایمان و یقین اور صحابہؓ		ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے			
کی خشیت الٰہی۔	۴۳۶	پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ۔	۴۴۵		
قضا و قدر	۴۳۸	خیر و شر کا مفہوم اسلام میں	″		
کیا عقیدۂ قضا و قدر ایمانیات		اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دیتا			
میں ہے۔	″	کی تفسیر	۴۴۶		
عقیدۂ قضا و قدر کا ماحصل	″	بندہ کی مشیت	۴۴۷		
اس عقیدہ کی تعلیم قدیم مذاہب میں	″	اللہ کی گمراہی کن کے لئے ہے	″		
خاتم النبیینؐ کی تعلیم نے اس کی کیا	″	نتیجۂ بحث۔	″		
تکمیل کی اور کیا اثرات پیدا ہوئے	۴۳۹	ایمان کے نتائج	۴۴۹		
اصطلاح قضا و قدر کی تشریح	″	ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے	″		
اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت	۴۴۰	اسلام میں ایمان و عمل کی جامعیت	″		
عقیدۂ قضا و قدر کی تاریخ	۴۴۱	درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے	″		

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد پنجم (۵)

مضمون صفحہ

دیباچہ ۷

عمل صالح ۱۱

ایمان کے بعد عمل صالح کی اہمیت ۱۱
اعمال صالحہ کی قسمیں ۱۵
عبادات 〃
اخلاق 〃
معاملات 〃

عبادات ۱۶

اسلام اور عبادت ۱۶
اسلامی عبادات کی خصوصیات ۱۸
صرف ایک خدا کی عبادت ۲۰
خارجی رسوم کا وجود نہیں 〃
درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں ۲۱
خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں 〃
مکان کی قید نہیں 〃
انسانی قربانی کی ممانعت ۲۲
حیوانی قربانی میں اصلاح 〃
مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت ۲۴
تجرد، ترک لذائذ، ریاضات اور تکالیف ۲۴
شاقہ عبادت نہیں 〃
عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں ۲۵
اسلام میں عبادت کا وسیع مفہوم ۳۰
عبادات چہارگانہ اعمال چہارگانہ کا ۳۵
عنوان ہیں۔

نماز ۳۷

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم ۴۲
اسلام میں نماز کا مرتبہ 〃
نماز کی حقیقت ۴۴
نماز کی روحانی غرض وغایت ۴۶
نماز کیلیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت ۴۷
ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے ۴۹
نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے 〃
نماز میں نظام وحدت کا اصول ۵۰
نماز میں جسمانی حرکات 〃
ارکانِ نماز ۵۱
قیام ۵۲
رکوع 〃
سجدہ 〃
نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے ۵۶
نماز کی دعا 〃
اس دعائے محمدی کا موازنہ دوسرے انبیاء ۵۹
کی مخصوص دعاؤں سے 〃
حضرت موسیٰ کی نماز کی دعا ۶۰
زبور میں حضرت داؤد کی نماز کی دعا 〃
انجیل میں نماز کی دعا ۶۱
نماز کیلیے تعیین اوقات کی ضرورت ۶۲
نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں ۶۳
نماز کیلیے مناسب فطری اوقات ۶۴
اسلامی اوقاتِ نماز میں ایک نکتہ ۶۵
اسلام میں طریق و اوقاتِ نماز ۶۶
نمازوں کی پابندی و نگرانی ۶۷
نماز کے اوقات مقرر ہیں 〃
وہ اوقات کیا ہیں؟ 〃

اوقات کی تکمیل ۷۰

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل ۷۰
ایک نکتہ ۷۳
جمع بین الصلاتین 〃
اوقات پنجگانہ اور آیت اسراء ۷۴

مضمون	صفحہ
دلوک کی تحقیق	۷۵
اوقات نماز کا ایک اور راز	۷۷
اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت	″
اطراف النہار کی تحقیق	″
ایک اور طریقۂ ثبوت	۷۸
نماز پنجگانہ احادیث و سنت میں	۷۹
تہجد اب نفل ہو گئی، لیکن کیوں؟	۸۱
قبلہ	″
رکعتوں کی تعداد	۸۷
نماز کے آدابِ باطنی	۸۹
اقامتِ صلوٰۃ	″
قنوت	″
خشوع	۹۰
تبتل	″
تضرع	۹۱
اخلاص	″
ذکر	″
فہم و تدبر	″
نماز کے اخلاقی تمدنی اور معاشرتی فائدے	۹۵
ستر پوشی	″
طہارت	۹۶
صفائی	۹۷
پابندیٔ وقت	″
صبح خیزی	۹۸
خدا کا خوف	″
ہشیاری	″

مضمون	صفحہ
مسلمان کا امتیازی نشان	۹۹
جنگ کی تصویر	۱۰۰
دائمی تنبہ اور بیداری	″
الفت و محبت	۱۰۱
غم خواری	″
اجتماعیت	″
کاموں کا تنوع	۱۰۲
تربیت	″
نظم جماعت	۱۰۳
مساوات	″
مرکزی اطاعت	″
معیارِ فضیلت	۱۰۴
روزانہ کی مجلس عمومی	″
عرب کی روحانی کایا پلٹ	۱۰۵

زکوٰۃ
۱۱۰

مضمون	صفحہ
زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم	۱۱۰
زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں	″
اسلام کی اس راہ میں تکمیل	۱۱۱
اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت	۱۱۲
زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل	۱۱۳
زکوٰۃ کی مدت کی تعیین	۱۱۶
زکوٰۃ کی مقدار	۱۱۷
انفاق	″
زکوٰۃ	″
نکتہ	۱۱۸

مضمون	صفحہ
جانوروں پر زکوٰۃ	۱۲۰
نصاب مال کی تعیین	۱۲۱
زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات	۱۲۲
دو ضرورتمندوں میں ترجیح	۱۲۴
اسلام میں زکوٰۃ کے مصارفِ ہشتگانہ	۱۲۶
مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد	۱۲۷
غلامی کا انسداد	″
مسافر	″
جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت	۱۲۸
زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات	″
تزکیۂ نفس	۱۲۹
باہمی اعانت کی عملی تدبیر	۱۳۰
دولتمندی کی بیماریوں کا علاج	۱۳۲
اشتراکیت کا علاج	۱۳۸
اقتصادی اور تجارتی فائدے	۱۳۹
فقراء کی اصلاح	۱۴۰
صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصۃً لوجہ اللہ ادا کیا جائے	۱۴۱
صدقہ چھپا کر دیا جائے	۱۴۳
بلند ہمتی اور عالی خیالی	
فقراء اور مساکین کی اخلاقی اصلاح	۱۴۶

مضمون	صفحہ
روزہ	۱۴۸
روزہ کا مفہوم	۱۴۸
روزہ کی ابتدائی تاریخ	〃
روزہ کی مذہبی تاریخ	۱۴۹
روزہ کی حقیقت	۱۵۱
رمضان کی ماہیت	۱۵۲
فرضیت صیام کا مناسب موقع سنہ ۲ھ	۱۵۴
ایام روزہ کی تحدید	〃
ایک نکتہ	۱۵۵
روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب	۱۶۰
روزہ میں اصلاحات	۱۶۱
روزہ کے مقاصد	۱۶۴
حاملِ قرآن کی پیروی	۱۶۵
شکریہ	〃
تقویٰ	۱۶۶
حج	۱۷۲
مکہ	۱۷۲
بیت اللہ	۱۷۳
حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی اور	۱۷۴
اس کے شرائط	〃
ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے	۱۷۵
اسلام قربانی ہے	۱۷۶
یہ قربانی کہاں ہوئی!	۱۷۷
مکہ اور کعبہ	۱۷۸
حج، ابراہیمی یادگار ہے	۱۸۰
حج کی حقیقت	۱۸۳
حج کی اصلاحات	۱۸۵
حج کے ارکان	۱۹۰
احرام	〃
طواف	〃
حجرِ اسود کا استلام	〃
صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا	۱۹۱
وقوفِ عرفہ	۱۹۲
قیام مزدلفہ	〃
منیٰ کا قیام	〃
قربانی	۱۹۳
حلقِ راس	〃
رمیِ جمار	۱۹۴
ان رسوم کی غایت	〃
حج کے آداب	۱۹۵
حج کی مصلحتیں اور حکمتیں	۱۹۶
مرکزیت	۱۹۸
رزق و ثمرات	۲۰۱
قربانی کی اقتصادی حیثیت	۲۰۲
ابراہیمی دعا کی مقبولیت	〃
تجارت	۲۰۳
روحانیت	۲۰۶
تاریخیت	۲۰۷
خالص روحانیت	۲۰۷
حج مبرور	۲۰۸
جہاد	۲۱۰
لفظ جہاد کی تشریح	۲۱۰
جہاد کی قسمیں	۲۱۲
جہادِ اکبر	〃
جہاد بالعلم	〃
جہاد بالمال	〃
ہر نیک کام جہاد ہے	۲۱۴
جہاد بالنفس	۲۱۵
دائمی جہاد	۲۱۶
عباداتِ قلبی	۲۱۷
تقویٰ	۲۱۷
اخلاص	〃
توکل	〃
صبر	〃
شکر	〃
تقوے	۲۱۸
تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے	۲۱۸
اہلِ تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں	۲۱۹
کامیابی اہلِ تقویٰ کے لیے ہے	〃

مضمون	صفحہ
اہلِ تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں	۲۲۰
معیتِ الٰہی سے سرفراز ہیں	″
قبولیت اہلِ تقویٰ ہی کو حاصل ہے	″
تقویٰ والے کون ہیں؟	″
تقویٰ کی حقیقت کیا ہے	″
اسلام میں برتری کا معیار	۲۲۳
اخلاص	۲۲۴
اخلاص کا مفہوم اور تشریح	۲۲۴
توکل	۲۲۷
توکل کے غلط معنی	۲۲۸
توکل کے حقیقی معنی اور قرآنی تشریح	۲۲۹
صبر	۲۳۵
صبر کے لغوی معنی	۲۳۵
وقتِ مناسب کا انتظار کرنا	″
بے قرار نہ ہونا	۲۳۶
مشکلات کو خاطر میں نہ لانا	۲۳۷
درگذر کرنا	۲۳۸
ثابت قدمی	۲۳۹
ضبطِ نفس	۲۴۲
ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا	۲۴۴
صبر کے فضائل اور انعامات	″
فتح مشکلات کی کنجی، صبر اور دعا	۲۴۵
شکر	۲۴۷
شکر کی تعریف	۲۴۷
لفظ کفر کی تشریح	۲۴۸
شکر، اصلِ ایمان ہے	″
حمد	۲۴۹
جسمانی نعمتوں کا شکریہ	″
مالی نعمتوں کا شکریہ، احسان	″
احسان کا شکریہ احسان ہے	۲۵۱
خاتمہ	۲۵۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم

مضمون | صفحہ

اخلاق ۸
اسلام اور اخلاق حسنہ ۹
تزکیہ ۱۰
حکمت ״
حقوق عباد کی اہمیت ۱۱
اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق ۱۲
اخلاق حسنہ اور ایمان ۱۳
اخلاق حسنہ اور تقویٰ ۱۴
اخلاق حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف ״
اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف ۱۵
اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں ۱۶
ایمان کے اوصاف و لوازم ۱۸
اخلاق حسنہ صفات الٰہی کا پرتو ہیں۔ ۱۹
اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ۲۰
بے پردہ زندگی ۲۱
قول کے ساتھ عمل ۲۲
کامل و مکمل ۲۳
اخلاقی تعلیم کا تنوع ۲۴
اسلام کا فلسفۂ اخلاق ۲۵
بے غرضی ۲۸
نیت ״
جدید فلسفۂ اخلاق کی تائید ۲۹
اخلاق کیلئے ایمان کی شرط ۳۰
غرض و غایت ۳۱
ضمیر کی آواز ۳۲
مسرت و انبساط ۳۴
رضائے الٰہی ۳۵
مذہب میں اخلاق کا بنیادی اصول ۳۷
خوف و رجاء ۴۱
اخلاق اور رہبانیت ۴۲
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۴۵
اس کے چند شرائط ۴۷
تجسس اور غیبت کی ممانعت ۴۸
توسط اور اعتدال ۴۹
عدل اور احسان ۵۰
قانون اور اخلاق ۵۱
عفو اور انتقام ۵۲
عفو و درگذر کی تعلیم ۵۵
برائی کی جگہ نیکی ۵۷
اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ ۶۰
تفصیل اور ہمہ گیری ۶۰
اخلاقی تعلیمات کا احاطہ ۶۱
تورات کے اخلاقی احکام ۶۲
انجیل کے اخلاقی احکام ۶۳
اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصاء۔ ״
قرآنی اخلاق کی فہرست ״
احادیث کے اخلاقیات کی فہرست۔ ۶۴
اخلاقی جزئیات کا استقصاء ۶۵
منکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ۔ ۶۹

مضمون صفحہ
سود کی حرمت میں جزئیات ۷۰
کا احاطہ
رشوت کی حرمت میں استقصاء ۷۱
مسیحی اخلاق کی کمزوری ″
نطشے کا اعتراض مسیحی ″
اخلاق پر۔ ″
اسلامی اخلاق کا اعتدال ۷۲
نفوس کا اختلاف استعداد ″
ہر شخص کی حسب ضرورت ″
اصلاح۔ ″
قوتِ غضب اور قوتِ ″
شہوت میں تعدیل۔ ″
مسیحی اور اسلامی اخلاقیات
کا فرق۔ ۷۳
مسیحی اخلاق کی کمزوریاں ″
لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر ۷۴
اسلام اور بلند اخلاق ″
تقدیر، توکل، صبر و شکر ۷۵
اپنے دشمنوں سے پیار کرو ۷۶
کفار اور مشرکین سے عدم موالات ۷۹
سختی کا جائز موقع ۸۴
خدا کے لیے محبت اور خدا ۸۷
کے لیے ناراضی۔ ″
اسلام میں کسی سے دائمی یا
موروثی نفرت کی تعلیم نہیں۔ ۸۸
ترکِ ہجو ۹۰
اخلاق اور محبت الٰہی ۹۱

مضمون صفحہ
تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب ۹۳
اخلاقی تعلیمات کی قسمیں ۱۰۱
حقوق اور فرائض ″
فضائلِ اخلاق اور رذائلِ اخلاق ″
آداب ″
حقوق و فرائض ۱۰۱
حقوق کے معنی ۱۰۱
حقوق کی وسعت ۱۰۲
حقوق کی ترتیب ۱۰۴
والدین کا حق ۱۰۵
اولاد کا حق ۱۱۳
اصولی تعلیم ″
اولاد کشی کا انسداد ۱۱۴
رضاعت و حضانت ۱۱۹
تعلیم و تربیت ۱۲۰
حقوقِ زوجین ۱۲۲
مرد کو کس عورت کے مارنے
کا اختیار دیا گیا ہے۔ ۱۲۹
اہل قرابت کے حقوق ۱۳۳
ہمسایہ کے حقوق ۱۳۶
یتیموں کے حقوق ۱۴۰

مضمون صفحہ
بیوہ کے ساتھ حسن سلوک ۱۴۴
حاجت مندوں کے حقوق ۱۴۶
بیمار کے حقوق ۱۴۸
غلاموں کے حقوق ۱۵۰
مہمان کے حقوق ۱۵۲
مسلمانوں کے باہمی حقوق ۱۵۴
انسانی برادری کا حق ۱۶۰
جانوروں کے حقوق ۱۶۲
فضائل اخلاق ۱۶۶
فضائل کی مختصر فہرست ۱۶۷
صدق ۱۷۰
زبان کی سچائی ۱۷۴
دل کی سچائی ۱۷۵
عمل کی سچائی ″
سخاوت ۱۷۹
عفت و پاکبازی ۱۸۹
دیانتداری اور امانت ۱۹۹
شرم و حیاء ۲۰۳
رحم ۲۰۷
عدل و انصاف ۲۱۰
عہد کی پابندی ۲۱۶
احسان ۲۲۰
عفو و درگذر ۲۲۶
حلم اور تحمل و بردباری ۲۳۲
رفق و لطف ۲۳۵

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
تواضع وخاکساری	۲۳۹	جھوٹی قسمیں کھانا	۲۸۰	خود بینی وخود ستائی	۳۴۱
خوش کلامی	۲۴۱	وعدہ خلافی	۲۸۵	فضول خرچی	۳۴۳
ایثار	۲۴۳	خیانت اور بد دیانتی	۲۸۶	حسد	۳۴۵
اعتدال اور میانہ روی	۲۴۴	غداری اور دغابازی	۲۸۸	فحش گوئی	۳۴۹
خودداری یا عزتِ نفس	۲۴۶	بہتان	۲۸۹	رذائل پر مختصر تبصرہ	۳۵۴
شجاعت اور بہادری	۲۵۳	چغل خوری	۲۹۱		
تعداد کی قلت وکثرت	۲۵۵	غیبت اور بدگوئی	۲۹۵	**آداب**	۳۵۵
موت کا وقت مقرر ہے	۲۵۶	دورُخاپن	۲۹۹		
شہادت اور غزا کا رتبہ	۲۵۸	بدگمانی	۳۰۰	فطری آداب	۳۵۵
استقامت	۲۶۱	مداحی اور خوشامد	۳۰۱	طہارت اور [illegible] کے آداب	۳۵۷
حق گوئی	۲۶۵	بخل	۳۰۲	کھانے پینے کے آداب	۳۶۱
استغناء	۲۶۷	حرص وطمع	۳۰۸	آدابِ مجلس	۳۶۴
		بے ایمانی	۳۱۰	آدابِ ملاقات	۳۶۶
رذائل	۲۷۰	چوری	۳۱۲	آدابِ گفتگو	۳۷۰
		ناپ تول میں کمی بیشی	۳۱۴	باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب	۳۷۴
رذائل کے معنی	۲۷۰	چھپا کر لینا	۳۱۶	آدابِ سفر	۳۷۶
رذائل کے قرآنی نام	؍	رشوت	۳۱۸	آدابِ خواب	۳۷۷
فحشاء، منکر اور بغی	۲۷۱	سود خواری	۳۲۰	آدابِ لباس	۳۷۹
فحشاء کے معنی	؍	شراب خواری	۳۲۲	آدابِ مسرت	۳۸۳
منکر کے معنی	۲۷۲	غیظ وغضب	۳۲۶	آدابِ ماتم	۳۸۶
بغی کے معنی	؍	بغض وکینہ	۳۲۷	متفرق آداب	۳۸۸
اخلاق ذمیمہ بُرے کیوں ہیں	۲۷۳	ظلم	۳۲۹	آداب کا فلسفہ	۳۸۹
رذائل کی ترتیب	؍	فخر وغرور	۳۳۲	حکمتِ ربانی کا چشمۂ نور	۳۹۲
جھوٹ	۲۷۴	ریا	۳۳۸		

فہرست مضامین
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ہفتم

مضمون	صفحہ
مقدمہ	۹
معاملات	"
ساتویں جلد کا موضوع معاملات	"
معاملات کے حدود	"
معاملات سے ہماری مراد	۱۰
اس کام کا اشکال	"
دیگر مذاہب اور معاملات	۱۱
معاملات کے ماخذ	"
قانون سازوں کی بیچارگی	"
جمہوریت کی ناکامی	۱۲
صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی لاچاری	"
قانونِ الٰہی کی ضرورت	"
کتاب اور میزان	"
قانونِ الٰہی کی دائمی یکسانی	۱۴
فطری حقوق و معاملات کی یکسانی	"
قانون کا بنیادی تخیل	۱۵
قانونِ الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت	"
ایک اصولی فرق	"

مضمون	صفحہ
اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت	۱۷
عہد نبوی میں نظامِ حکومت	۳۸
سلطنت اور دین کا تعلق	۶۸
سلطنت اور ملکیت کی حقیقت	۷۷
اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے	"
لفظ ملک الملوک کی ممانعت	۷۸
اُمتِ مسلمہ کی بعثت	۸۷
قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ	۹۷
حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے	۱۰۱

سرنامہ

ایک گدائے بے نوا شہنشاہِ کونین کے دربار میں،
اخلاص و عقیدت کی نذر لے کر آیا ہے،
زچشم آستیں بَر دار و گوہر را تماشا کُن

"شبلی"
شوال ۱۳۳۰ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ طبع چہارم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اوّل

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت بخشی وہ مصنف اور جامع دونوں کے لیے بڑی نعمت ہے، جس پر اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔

نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرت کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمداں کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاد سے ہونی چاہیے، استاد کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا، اگر کبھی بضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا۔ مسودہ کا مبیضہ مصنف کے سامنے ہو چکا تھا، اس لئے اس مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کر دی، بجز اس کے کہ بعض مقامات پر مصنف کے اشاروں کے مطابق بعض چیزوں کا اضافہ ہلالین میں کر دیا جس کی تصریح دیباچہ میں موجود ہے۔

اس کے بعد اس نسخہ کی نقل در نقل چھپتی رہی، اور مقابلہ اور تصحیح ماخذ کی ضرورت نہیں سمجھی، لیکن اس اثنا میں کبھی کبھی مراجعت کے وقت بعض مقاموں پر تصحیح اور اضافہ کی نئی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور اس کے مطابق ایک نسخہ پر یہ تصحیحات اور اضافے وقتاً فوقتاً کرتا رہا۔

اس دفعہ جب نئے نسخہ کے چھاپنے کی ضرورت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کتاب کے مسودہ کو اصل ماخذوں سے ملا کر دیکھا جائے اور مقابلہ اور مطابقت کی جائے، یہ بڑا مشکل کام تھا، بیسیوں کتابوں کو پھر سے دیکھنا، اور ہزاروں صفحوں کو الٹنا، متعدد مختلف روایتوں کو پرکھنا اور ضرورت کے مقام پر حاشیے لکھنا، خود ایک مستقل تصنیف کے برابر محنت تھی، مجھے یہ لکھنے میں بڑی خوشی ہے کہ لائق عزیز مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی اس کام میں میرے دست و بازو ثابت ہوئے۔ واقعات کی تلاش اور جانچ، روایتوں کی چھان بین، اصل عبارتوں سے مسودہ کی تطبیق اور حدیث اور سیرت کی کتابوں کی طرف از سر نو مراجعت میں اُن سے بڑی مدد ملی،

کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچمداں جامع کو مصنف کے نظریہ سے اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفع شبہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا، بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ دو چار جگہ میں عدد کی غلطی جو اردو ہندسوں میں اکثر ہو جاتی ہے اصل مبیضہ میں بھی موجود تھی، مراجعت کے وقت اُن کی غلطی معلوم ہوئی، اور اب ان کی تصحیح کر دی گئی، مثلاً حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ کی قیمت سوا روپے چھپ گئی تھی حالانکہ وہ سوا سو ہے، اسی طرح غزوۂ احزاب میں کفار کے لشکر کی تعداد ۲۴ ہزار درج ہوئی تھی، حالانکہ وہ بعض روایت میں ۱۴ ہزار لیکن صحیح روایات میں دس ہزار ہے۔

مولانا کی زندگی میں اس کی تصنیف کے وقت ان کو بعض کتابیں قلمی ملی تھیں، جیسے روض الانف جس سے پورا استفادہ دقت طلب تھا، اب وہ چھپ گئی ہے، بعض کتابوں کی اُن کو تلاش ہی رہی مگر ان کو مل نہ سکیں، جیسے کتاب البدایہ والنہایہ ابن کثیر، مصنفؒ سے اکثر حسرت کے ساتھ سُنا کہ افسوس تاریخ ابن کثیر نہیں ملتی، وہ مل جاتی تو ساری مشکلیں حل ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب وہ چھپ کر عام ہو گئی، مستدرک حاکم اس وقت تک نا پید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی، غرض ان کتابوں کے ہاتھ آجانے سے بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے، چنانچہ اس نسخہ کی تصحیح و اضافہ میں ان سے کام لیا گیا۔

اس نسخہ کی تیاری میں جن خاص باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) پوری کتاب کے واقعات کو ازسرِ نو حدیث و سیر کی کتابوں سے ملا کر دیکھا گیا ہے اور اس میں جہاں نقص نظر آیا دور کیا گیا ہے۔

(۲) تصحیح بیان، دفعِ شبہ، رفعِ ابہام اور تشریح کے لئے بہت سے توضیحی حواشی بڑھائے گئے ہیں۔

(۳) مصنف کا کوئی بیان اگر نقد اور تنبیہ کے قابل معلوم ہوا تو اس پر نقد اور تنبیہ کی گئی ہے۔

(۴) کہیں کہیں حوالے چھوٹ گئے تھے، اس نسخہ میں ان کو بڑھا دیا گیا ہے، کہیں صرف کتابوں کے نام تھے، اس دفعہ ان کے صفحے یا باب بھی لکھ دیئے گئے۔

(۵) جہاں صرف صفحوں کے حوالے تھے، ابواب اور فصول کے حوالے بھی دے دیئے گئے تاکہ جس کے پاس ماخذ کی کتاب کا جو ایڈیشن ہو اس میں نکال کر دیکھ لیا جا سکے۔

(۶) طبع اوّل کے بعد سے سیرت یا حدیث کی جو نئی کتابیں چھپی تھیں اُن سے استفادہ کر کے اگر کوئی نئی بات ان میں ملی ہے تو اس کا اضافہ کیا گیا۔

(۷) اگر کوئی حوالہ پہلے کسی نیچے درجے کا تھا اور بعد کو اُس سے اعلیٰ درجہ کا حوالہ ملا تو اس کو بڑھایا گیا۔

(۸) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک کے ساتھ صلعم کے اختصار کے بجائے پورا صلی اللہ علیہ وسلم لکھنے کا اہتمام کیا گیا تاکہ اس تساہل سے درود پڑھنے کی برکت سے ناظرین کو محرومی نہ ہو۔

غزوۂ بدر کی روایتوں کی تنقید کے سلسلہ میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خامۂ قلم سے حضرت کعبؓ بن مالک صحابی کی روایت پر نامناسب تنقید نکل گئی تھی جس سے ایک گونہ ایک جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا، جس پر مجھے شرمندگی ہے، اور اب میں اپنی اس غلطی و نادانی کو مانی

کہ اس عبارت کو قلم زد کر کے صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی برأت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواست گار ہوں۔

بندہ ہمان بہ کہ ز تقصیرِ خویش
عذر بہ درگاہِ خدا آورد

جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخہ سے ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہو۔ اب یہ موجودہ نسخہ طبع اوّل سے بہت سی باتوں میں بہتر ہوگیا ہے، اس موجودہ نسخہ میں انسانی استطاعت کے مطابق پوری طرح تصحیح کی بھی کوشش کی گئی ہے، تاہم انسان، انسان ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، کسی ناظرِ کتاب کو اب بھی کوئی غلطی معلوم ہو تو وہ ضرور مطلع فرما کر ممنونِ کرم کریں۔

آخر میں پاک پروردگار کی بارگاہِ عالی میں دُعا ہے کہ وہ میری خطا و نسیان سے درگزر فرما کر اس خدمت کو قبول کا شرف بخشے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش مستفید فرما کر اس گنہگار کے لئے بخشائش کا ذریعہ بنائے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہیچمدان
سید سلیمان ندوی
یکم جمادی الثانیہ ۱۳۶۴ھ

لے یہ عبارت سیرۃ النبی جلد اول طبع اول کے صفحہ [illegible] کی سطر ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور طبع مابعد کے صفحہ ۳۲۳ کی سطر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷ میں ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ طبع دوم

سیرت نبوی جلد اول طبع اول کو شائع ہوئے آج چار برس ہوئے، اس اثنا میں خداوند تبارک و تعالیٰ نے اس کو جو مقبولیت عطا فرمائی وہ ہم خاکساران دار المصنفین کے لئے فخر و نازش کا سرمایہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ عام قدردانوں نے اس کو جان و دل سے خریدا، اور امراء اور والیان ممالک نے اس کی خدمت کو سعادت دارین سمجھا بلکہ خواص اور علماء کے طبقہ نے بھی اس کی قدرشناسی کی۔

ہندوستان میں اہل علم کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس نے اپنے اپنے فن کی میزان نقد میں سیرت کے مضامین و تحقیقات کو نہ تولا، حفاظ نے اس کی آیات قرآنی کو پڑھا، محدثین نے اس کی حدیثیں جانچیں، ادیبوں نے اس کے عربی اشعار اور ترجموں پر نقد کیا، علمائے انساب نے اسماء کی تنقیح کی، منجموں اور حساب دانوں نے اس کے زائچوں اور تاریخوں پر نظر ثانی کی، اہل تاریخ و سیر نے واقعات کی جانچ پڑتال کی، اور ہم ممنون ہیں کہ نہایت خلوص و محبت سے انھوں نے اپنے نتائج افکار سے ہم کو مطلع کیا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا۔

طبع اول میں جیسا کہ خاتمہ میں ہم نے اقرار کیا تھا، چھاپہ کے اغلاط اور سہو کے چند مسامحات رہ گئے تھے، اس طبع میں جہاں تک امکان انسانی ہے تصحیح کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور یقین ہے کہ انشاءاللہ یہ اغلاط اور مسامحات سے پاک ہوگا، جو لوگ سیرت پر نقد کرنا چاہتے ہوں ان کو یہی نسخہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

طبع اول بڑی تقطیع پر شائع ہوئی تھی، لوگوں کا اصرار تھا کہ طبع ثانی کتابی تقطیع پر شائع ہو، تاکہ وہ بہ آسانی ہر وقت استعمال میں آسکے، یہ ان کی تعمیل ہے، انشاء اللہ ہر جلد کے طبع اول کی بڑی تقطیع کے بعد طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر شائع ہوتی رہے گی۔

سید سلیمان ندوی
۲۸، ذیقعدہ ۱۳۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبعِ اوّل

سیرتِ نبویؐ جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے، آج سات سال کے بعد اس کی پہلی جلد شائقین کے ہاتھ میں جاتی ہے، میں اپنا دل اس وقت مسرت آمیز اطمینان سے لبریز پاتا ہوں کہ استاد مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ میں جو فرض میرے سپرد کیا تھا، الحمد للہ کہ اُس کے ایک حصہ سے آج سبکدوش ہوتا ہوں ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

لیکن اس مسرت اور اطمینان کے ساتھ یہ حسرت ناک منظر بھی سامنے ہے کہ مصنف اپنی چار سال کی جانکاہ محنت کا ثمرہ خود اپنے ہاتھ سے قوم کی نذر نہ کر سکا، اور حسنِ عقیدت کے جو پھول سینکڑوں چمن کدوں سے چن کر ان کے ہاتھ آئے تھے، ان کو آستانۂ نبوت پر وہ خود نہ چڑھا سکا۔

مصنف مرحوم کو سیرتِ نبویؐ کے لکھنے کا خیال "الفاروق" کے بعد ہی پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ سنہ ۱۳۲۳ھ میں اس کا ایک مختصر سا حصہ یعنی غزوۂ اُحد تک وہ لکھ بھی چکے تھے کہ بعض مشکلات کی بناء پر رُک گئے لیکن ملک کا تقاضائے شوق برابر جاری رہا، بالآخر انھوں نے سنہ ۱۳۳۰ھ میں اس بارِ امانت کے اٹھانے کا آخری فیصلہ کر لیا، چنانچہ پچاس ہزار روپے کے سرمایہ کے لئے انھوں نے قوم میں مرافعہ پیش کیا، سیکڑوں مسلمان اس خدمت کے لئے آگے بڑھے، اُن میں فقرائے اُمت بھی تھے اور امرائے ملت بھی، لیکن یہ سعادتِ اخروی ازل ہی سے خادمۃ الملۃ النبویۃ مخدومۃ الامۃ المحمدیۃ نواب سلطان جہان بیگم تاج الہند فرمانروائے بھوپال متع اللہ المسلمین بطول بقائہا و دوام ملکہا کے لئے مقدر تھی، اس لئے وہ سب کے آگے بڑھیں اور سوانح نگارِ نبوت کو دوسرے آستانوں سے بے نیاز کر کے اس سرمایۂ سعادت کو اپنے خزانۂ عامرہ میں شامل کر لیا، فرمانروا خواتینِ اسلام نے جو مذہبی کارنامے اب تک انجام دیئے ہیں آئندہ مورخ غالباً اس کارنامہ کو ان میں سب سے بڑا قرار دے گا، کہ اس کا تعلق اُس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جو اسلام کی تاریخ میں کائنات کی سب سے بڑی ہستی ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد شاید دوبارہ اس خدمت گزاری کے لئے مسلمانوں میں قرعہ اندازی ہوتی لیکن فرمانروائے بھوپال نے مصنف کے جانشینوں کے لئے بھی سلسلۂ فیض کو برابر جاری رکھا مصنف مرحوم کے منشا کے مطابق اس موقع پر منشی محمد امین صاحب مہتمم تاریخ بھوپال کا نام لینا بھی ضروری ہے جن کی مرحوم جنبانی سے نسیمِ سعادت کے یہ جھونکے اس باغِ قدس میں دوبارہ آئے۔

مصنف مرحوم نے جو مسودہ چھوڑا تھا اس میں اس حصہ تک مبیضہ صاف تھا، البتہ تین چار مقامات پر اضافہ کی علامت بنی تھی اور مطالب کا اشارہ تھا، ان کو بڑھا دیا گیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کی تکمیل کے بعد ان کو خیال آیا کہ قدیم مورخین کی طرح سنہ وار واقعات کی ترتیب رکھ کر ہر سنہ کے آخر میں جزئی حالات، واقعاتِ متفرقہ کے عنوان سے لکھ دیئے جائیں، چنانچہ مبیضہ پر سنہ ۶ھ تک اپنے قلم سے وہ لکھ سکے، یہ امانت جب میرے سپرد ہوئی تو میں نے بقیہ سنین کے آخر میں اسی قسم کے جزئیاتِ متفرقہ کا اضافہ کر دیا، حواشی یا حوالے کہیں کہیں چھوٹ گئے تھے، وہ ڈھونڈ کر لکھے، لیکن اس کی کامل احتیاط کی گئی کہ جامع کا کوئی لفظ بلکہ کوئی حرف مصنف کی عبارت میں نہ ملنے پائے، چنانچہ ان تمام جزئی اضافوں کو قوسین کے اندر جگہ دی گئی ہے، اس بناء بر لفظ "صلعم" یا جملہ ہائے معترضہ کے علاوہ جو چند فقرے اور عبارتیں قوسین میں ہیں وہ اضافہ ہیں۔

یہ پہلے خیال تھا کہ جلدِ اول کو وفات تک وسعت دی جائے، لیکن جب کتابت شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضخامت ۸۰۰ صفحہ کو پہنچ جائے گی، اور اس سے جلد کی نفاست کو صدمہ پہنچے گا، سامانِ طبع کی گرانی سے جو تعویق پیدا ہو رہی تھی، اس نے مجبور کیا کہ اس کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ پہلی جلد سلسلۂ جنگ و غزوات پر ختم کر دی گئی، اور دوسری جلد اسلام کی امن کی زندگی، تنظیم و تنسیق، اشاعتِ اسلام، وفات اور اخلاق کی الگ کر دی گئی، خداوند تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس کی طبع و اشاعت کی توفیق عطا فرمائے حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

مصنف مرحوم کتاب کا سرنامہ لکھنے نہ پائے تھے، اُن کے مسودات میں اتفاقاً یہ تحریر قلمزدہ مل گئی اس کو غنیمت سمجھ کر تبرکاً داخلِ کتاب کیا جاتا ہے۔

جامع
سید سُلیمان ندوی
دار المصنفین اعظم گڑھ
۲۰ ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

دیباچہ

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مجلّد دوم

سیرت نبویؐ مجلّد اول ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں شائع ہوئی۔ اب مجلّد دوم ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کے اوسط میں شائع ہوئی ہے۔ شائقین کا تقاضا ہے کہ جلد سے جلد اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں، لیکن شاید اُن مشکلات کا اُن کو علم نہیں جو عالمگیر جنگ نے زندگی کے ہر شعبہ میں پیدا کر دی ہیں، گو ایک سال سے زیادہ ہوا کہ جنگ کا عملاً خاتمہ ہو گیا، لیکن باایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ صلح کا آغاز نہیں ہوا اور اس خاتمۂ جنگ سے زندگی کے مشکلات میں ذرا کمی نہیں ہوئی۔ جلد اول کے تکلیف دہ تجربہ کے بعد یہ طے کر لیا گیا تھا کہ دوسری جلد خود مطبع معارف میں چھپے گی، لیکن مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس مشین نہ تھی۔ بڑی تلاش و جستجو سے مشین ہاتھ آئی تو کاغذ کا قحط نظر آیا۔ جلد اول میں جن اصناف کے کاغذ لگ چکے تھے ان کا ملنا دشوار ہو گیا۔ دیسی کاغذ کے ۲۰۰ رم بھی بیک وقت نہ مل سکے۔ یہ دقت کسی طرح ختم ہوئی تو لوح (ٹائیٹل پیج) کے کاغذ کی مشکل پڑی۔ لکھنؤ سے لے کر کلکتہ اور بمبئی تک کے کارخانے چھان مارے گئے، مگر خاطر خواہ کاغذ دستیاب نہ ہوا، آخر جو بھی مل سکا اور جس طرح بھی بنا یہ جلد اختتام کو پہنچی۔ والحمدُ للہ علیٰ ذٰلک۔

پہلی جلد نبوت کے پُرآشوب عہد غزوات پر مشتمل تھی اور دوسری جلد نبوت کی سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے۔ نبوت کی بست و سہ سالہ زندگی میں پہلی جلد بیس سال کے کارناموں کا مجموعہ تھی اور یہ جلد بقیہ آخری تین سال کے واقعات کا ذخیرہ ہے اور اس کے بعد اخلاق و شمائل شریفہ اور ازواج مطہرات و اولادِ کرام کا تذکرہ ہے۔

مصنف مرحوم کی وفات کے بعد جب اس جلد کا تمام قلمی سرمایہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے اس میں بہت سے ابواب کی کمی محسوس ہوئی جن کے اضافہ کے بغیر یہ جلد ناتمام نظر آتی تھی، لیکن مصنف کے مسودہ میں اضافہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر کار مدت کے حیص بیص کے بعد میں نے طے کر لیا کہ اُن کو لکھنا ہی چاہیئے، چند روز کے بعد مجھے اتفاقاً مولانا کے ہاتھ کی ایک یادداشت ملی جو وفات سے پانچ ماہ پیشتر ایک سفینہ میں لکھی تھی، اس کا عنوان

یادداشت اخیر تھا۔ اس یادداشت کو پڑھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے یہ دیکھا کہ جن ابواب کو میں ضروری سمجھتا تھا مصنف مرحوم نے بھی اپنی آخری یادداشت میں ان کا اضافہ ضروری قرار دیا تھا اور گویا وہ ایک وصیت نامہ تھا جس کو فرشتۂ غیب نے اُن کے دست و قلم سے میری تسلّی کے لئے پہلے ہی لکھوا دیا تھا۔

ع حل ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد

اخلاق کے باب کو مصنف مرحوم نے تکمیل کو نہیں پہنچایا تھا، بہت سے عنوانات سادہ تھے۔ بہت سے عنوانات کو شروع کر کے آئندہ اضافہ کے لئے ناتمام بصورتِ بیاض چھوڑ دیا تھا، جامع نے ان کو لکھ کر بطور تکملہ کتاب میں شامل کر دیا۔ بہت سے ضروری حواشی بھی جا بجا بڑھائے گئے ہیں، چنانچہ جیسا کہ جلد اوّل کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا ہے اضافہ اور تکملہ اور حواشی کی تمام عبارتیں ہلالین کے اندر کر دی گئی ہیں، تاکہ مصنف اور جامع کی عبارتیں باہم مختلط نہ ہونے پائیں۔

جامع

سید سلیمان ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی الہ واصحبہ اجمعین!

خدا کا شکر ہے کہ اس نے چند در چند مزاحمتوں کے باوجود سیرت پاک کی تیسری جلد کی تکمیل و انجام کا سامان بہم پہنچایا، اور ایک گنہگار کو توفیق بخشی کہ ان اوراق کو ترتیب دے کر اپنے سیاہ اعمالنامہ کے دھونے کے لئے آب رحمت کے چند قطرے فراہم کر سکے۔ دوسری جلد ۱۳۳۹ھ (۱۹۲۰ء) میں چھپ کر نکلی تھی، چار برس کے بعد یہ ۹۰۰ صفحوں کا مجموعہ مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس مجموعہ کی تالیف و ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ صواب کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے بعد نہ ہوا ہو، والعصمۃ للہ وحدہ۔

ان اوراق کی تالیف میں ہم اپنے ان محسنوں کے شکر گزار ہیں جنہوں نے ان کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا، خصوصاً اور غواصی میں مخدومنا مولانا حمید الدین صاحب کے مشوروں نے فائدہ پہنچایا ہے، رفیق کار مولانا عبد السلام صاحب ندوی نے معجزات کے جزئی واقعوں کے فراہم کرنے میں مدد کی ہے، ہماری جماعت میں بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبد الباری ندوی (معلم فلسفہ جدیدہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن) سے بڑھ کر فلسفہ جدیدہ کا کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفہ جدیدہ کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں ان سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے معجزات اور فلسفہ جدیدہ کا باب لکھ کر عنایت کیا ہے جو اس کتاب کے ص ۵۰ سے شروع ہو کر ۷۱ پر تمام ہوا ہے۔

کہیں کہیں آپ کو احادیث کی بعض غیر مطبوعہ کتابوں مثلاً بیہقی، ابو یعلی، ابن راہویہ، ابن ابی شیبہ، بزار وغیرہ کے حوالے دوسری مطبوعہ کتب احادیث کے حوالوں کے ساتھ تائیداً ملیں گے، ہم نے ان کے حوالوں میں دوسرے معتبر شارحین حدیث اور مصنفین سیرت مثلاً ابن کثیر، ابن حجر، ابن قیم، سیوطی وغیرہ پر بھروسہ کیا ہے، معجزات کے جزئی واقعات میں ایک دو مقام پر قوی روایتوں کے ساتھ اگر ضعیف روایتوں کو جگہ دی گئی ہے تو ان سے مقصود صرف یہ ہے کہ قوی روایتوں سے جس نوع کے معجزات ثابت ہیں، اس نوع کے معجزات کی دوسری تائیدیں بھی گو اس رتبہ کی نہیں مگر موجود ہیں۔

کتاب میں کہیں کہیں غلطیاں؎ رہ گئی ہیں جن کی آخر میں غلط نامہ کے اضافہ سے تلافی کی کوشش کی گئی ہے۔

اس راہ کی ایک منزل آج اور تمام ہوئی، لیکن قلم کے مسافر کو آرام نہیں کہ اب چوتھی منزل اس کے سامنے ہے، احباب دعا کریں کہ یہ جلد چہارم ان کی خدمت میں جلد پیش ہو سکے۔

سید سلیمان ندوی
۱۷ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ

؎ اب جدید کتابت و طباعت میں یہ اغلاط دور کر دی گئی ہیں (ناشر جدید)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع سوم

سیرت النبی کی یہ تیسری جلد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت حقیقت نبوت اور فضائل و معجزات پر مشتمل ہے، تیسری دفعہ چھپ کر اب منظر عام پر آرہی ہے۔ اسی اثنا میں بعض مباحث پر جدید تحقیقیں سامنے آئیں اس لئے پوری کتاب پر نظر ثانی کی گئی۔ روایتوں اور حوالوں کو اصل ماخذوں سے دوبارہ ملایا گیا، اگر اختلاف نظر آیا تو تصحیح کی گئی، کوئی پہلے سے زیادہ مستند حوالہ ملا تو اس کا اضافہ کیا گیا، کوئی عبارت اگر مشتبہ تھی تو اس شبہ کو دور کیا گیا خصوصیت کے ساتھ معراج کے جسمانی و روحانی یا حالت بیداری یا خواب کے ہونے کے مسئلہ کو صاف کیا گیا۔

معجزات کی روایتوں کی اصل سے پھر تطبیق کی گئی اور کہیں کہیں حواشی کے اضافہ سے بعض نئے فوائد بڑھائے گئے، کہیں کہیں عبارت کے اغلاق کو بھی دور کیا گیا ہے۔

ایک ظلوم وجہول انسان کی طاقت میں تحقیق کی جو حد تھی اس نے اپنی وسعت کے مطابق وہ پوری صرف کی ہے، اس پر بھی عصمت کا دعویٰ نہیں، اہل نظر سے التماس ہے کہ اگر اب بھی کوئی قابل اصلاح چیز نظر آئے تو مؤلف کو مطلع کر کے جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

حسن خاتمہ کا طالب
سید سلیمان ندوی
۱۰ شوال ۱۳۶۶ھ، ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء
دار القضا بھوپال

دیباچہ طبع اول

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ ؛

اے باز کن درِ معانی   بر ما بکلیدِ آسمانی
ہر چہ از تو گمان برم بیرونی   آن من بوم و تو زآن برونی
شاہِ رسل و شفیعِ مرسل   خورشیدِ یسیں و نورِ اول
سلطانِ ممالکِ رسالت،   طغرائے صحیفۂ جلالت   (خسرو)

پیشِ نظر کتاب "سیرت النبیؐ" کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے، اس کا موضوع منصب نبوت ہے، اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصوصیات کی تشریح کی ہے، اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی و روحانی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح و بسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے، اس کے بعد آپ کے تعلیمات و ارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا، وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے، عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات، خیال تھا کہ عقائد و عبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں، مگر جیوں جیوں مسافرِ قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اس قدر بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود کر دیا گیا، دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق و فوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا، جس میں ہم انشاء اللہ یہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن و معاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوقِ نساء، غلامی، جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے، پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعت کا پایۂ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورہ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی و اخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں، مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ و ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے، اس لئے ان صفحات کو ان کے مصنفِ گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں، بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ

کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کی پوری تشریح استناد و استدلال اور دلچسپی کے ساتھ فراہم کر کے خدمت میں پیش کیا جائے، قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ ہونے سے بچ کر ہر پیشِ نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس رُخ سے موازنہ کیا گیا ہے کہ اسلام کی تکمیل شان نمایاں ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنیکے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ اکمل تر تعلیمات دینے کے ہیں بلکہ انکی تکمیل کرنے والے کے ہیں مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اسکی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے اور جیسا کہ خود اسکا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اسکا شریک نہیں ہے کہ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔

انکی تکمیل مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور انکی بحث کتنی نازک ہے، اس لئے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جد و جہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کروں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہبری کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقے کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدون اور مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقے کے نہیں "اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو دی تھی، چنانچہ ان اوراق میں انہی چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى میں مذکور ہیں یعنی خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قدم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس لئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوندا میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنا، اور ہم کو سیدھی راہ دکھا۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ (اعراف ۲۳)	جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔
وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ (زمر)	اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا (بقرہ)	ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرما۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد
توقیعِ قبولِ روزیش باد

طالبِ رحمت
سلیمان ندوی
۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ
(دار المصنفین اعظم گڈھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبیؐ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول و عقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمد للہ والمنۃ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت وغیر ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیتِ عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علما۔ اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین و آفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملأ اعلیٰ کی خوشنودی و رضامندی بھی اس تحریر مؤلف کے شاملِ حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے اس میں طبع اول کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لئے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔ و اعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیأت اعمالنا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اول چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لئے ۶۱۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۰ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لئے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۵۰۴ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کر لے تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۰ رجب ۱۳۵۲ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الۡعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ وَ سَلٰمٌ عَلَی الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

دِیباچہ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گناہگار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے۔ اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حُسنِ قبول کے لیے کھول دیا ہے۔

موضوع اس جلد کا موضوع عبادت ہے اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام و انواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت و حکمت اور اس باب میں گذشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذاتِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطاکار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے، اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستے سے نہ ہٹے جو صراطِ مستقیم ہے اور وہ سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہ اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ جو بات کہی گئی ہے اگر صحیح ہے تو خدا کی طرف سے ہے اور اگر غلط ہے تو نفسِ خطاکار کا قصور ہے۔

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیر کے واقعات سے نہیں جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام

کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا، سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔

اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

"چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلو پیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا، گو لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا" (بنام مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی ص ۱۰۴)

سیرۃ جلد اول کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان "منصب نبوت" رکھا تھا اور لکھا تھا:

"دوسرا حصہ منصب نبوت کے متعلق ہے، نبوت کا فرض تعلیم عقائد، اوامر و نہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لیے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لیے کافی ہو سکتا ہے" (جلد اول طبع اول ص ۴، و طبع دوم ص ۹)

گذشتہ چوتھی جلد، یا پانچویں جلد اور آئندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل و تشریح ہیں منصب نبوت، عرب کی گذشتہ حالت اور تعلیم عقائد جو چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں، اخلاق و معاشرت کے نقشوں کے لیے چھٹی جلد اور بقیہ اوامر و نواہی کے لیے جو معاملات سے متعلق ہیں، ساتویں جلد ہوگی، ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل و تشریح میں مصنف اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے۔ ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیونکر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ∴ آنچہ استاذ مرا گفت ہماں می گویم

حسنِ قبول اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسن قبول کی سند عطا فرمائی۔

قبولِ خاطر و لطفِ خدا داد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا یہ کتاب وہاں قبول ہوگی ان کے اس ارشاد کی

تصدیق زمانہ کے واقعات سے ہوگئی۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے، ہندوستان و بیرونِ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی، ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظرِ طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لیکر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابلِ توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد اللہ پیدا ہوگیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد اس کتاب کے حسنِ قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جونہی شائع کیا اس کی خدمت کے لیے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی جس کا تارِ نفس محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے وابستہ تھا یعنی ملتِ محمدی کی خادمہ اور امتِ محمدی کی مخدومہ متعہا اللہ نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے کشور بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے)، نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گذرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لیے نہ تھا جو مر چکا بلکہ اس خدا کے لیے تھا جس کو موت نہیں، اس لیے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی، مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا:۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت کہ ابرِ فیضِ سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقیدِ روایت ہائے تاریخی تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل کہ جن میں اک فقیرِ بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے

جب اس فقیر بے نوا کی وفات ہوئی تو سرکارِ عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ "فقیر بے نوا تو چل بسا، اب سلطان کی باری ہے"۔ آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقیدِ روایت کے ساتھ ساتھ "زر افشانی" کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جواں بخت کے سپرد کر گئیں جس نے فرائضِ حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اُٹھایا اور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی، سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہٗ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیرِ سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں خلد اللہ ملکہٗ۔

۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰحضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک و الممالک نظام الملک نظام الدولہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہٗ کی پیشگاہ خسروی میں پیش کیا۔ حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ و آقا حضرت سرورِ کائنات، فخرِ موجودات سید المرسلین، محبوب رب العلمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ الوف

التحیات والصلوات کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے، سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور و محظوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس۔ کے لیے تین دفعہ اور تین برس کے لیے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا، بے حد مدد ملی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا، جو کچھ باقی ہے دُعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے اور آخر میں خوش قسمت سعدی کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے ؎

منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر ⁂ ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

مؤلف
سید سلیمان ندوی
شبلی منزل، اعظم گڑھ
۲۲ رجب ۱۳۵۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الکتاب والحکمۃ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ نبی الرحمۃ
وعلی الہ واصحابہ اولی العزم والھمۃ

اے تو بہمیں صفت سزاوار نام تو گرہ کشائے ہر کار
اے کردہ ز گنج خانۂ راز برآدمیاں در سخن باز
عالم ز تو شد بحکمت آباد حکمت ز تو یافت آدمی زاد

* * *

در قربت حضرت مقدس پیغمبر پاک، رہبرم بس
گنجینۂ کیمیائے عالم پیش از ہمہ پیشوائے عالم
نامش بسریر پادشاہی توقیع سپیدی و سیاہی

(خسرو)

سیرت نبوی کے سلسلہ کی چھٹی جلد آج ناظرین کے سامنے ہے یہ ان اخلاقی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے مسلمانوں کو بتائی اور سکھائی گئیں، یہ عجیب بات ہے کہ مذہب کے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے، عملی حیثیت سے عام لوگ اسکو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں۔ اسی لیے عوام کے اس وہم کو دور، اور قوموں کی ترقی و تہذیب میں اخلاق کی صحیح اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان اوراق میں اس باب کے ہر گوشہ پر اچھی طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ملت کی تعمیر کا اہم جزء اخلاق کی صحیح تربیت ہے۔

کتاب میں اس نکتہ کی طرف کہ اخلاق حسنہ "اسمائے حسنیٰ" کا پرتو ہیں۔ بار بار اشارہ کیا گیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ کوئی مخلوق، خالق کی کسی صفت میں برابر کا شریک نہیں ہو سکتا۔ ایسا سمجھنا سراسر شرک ہے، بات اتنی ہے کہ بندہ کے جس وصف کو خدائے تعالیٰ کی جس صفت سے مناسبت ہوتی ہے اس پر اس صفت کا اطلاق مجازاً کر دیتے ہیں، جیسے خدا کے علم کے سامنے بندہ کے علم کا مرتبہ اتنا بھی نہیں ہے، جتنا سمندر کے سامنے قطرہ کا ہے۔ مگر خدا کی اس صفتِ علم کے ساتھ ساتھ بندہ کے اس وصف کو بھی علم کہہ دیتے ہیں، حالانکہ حقیقی صفتِ علم خدا میں ہے، بندہ میں نہیں، لیکن چونکہ خدائے تعالیٰ اپنی صفتِ علم سے بندہ میں ایک انکشافی شان پیدا کر دیتا ہے اس لیے بندگی اس ادنیٰ انکشافی شان کو بھی علم کہہ دیتے ہیں[1]۔ ورنہ درحقیقت ان دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، یہی حال اللہ تعالیٰ اور بندہ کے دوسرے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھئے معارف لدنیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، ص ۲۳۔ مطبوعہ مدینہ بجنور۔

صفات اور اوصاف کے اشتراک کا ہے، اسی لیے بہت سے اہل حق اور اہل تحقیق کے نزدیک ان دونوں میں اوصاف کا اشتراک، اشتراک بادنیٰ مناسبت ہے اور بس، لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (شوریٰ: ۲۰)

کتاب میں چند موقعوں پر مختلف مذہبوں سے اسلام کا موازنہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تعلیمات کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس سے مقصود وہ تعلیمات و ہدایات ہیں جو آج اُن کی طرف منسوب صحیفوں میں پائی جاتی ہیں، یا ان کے موجودہ پیرو اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر صادق کی تعلیم ہر اعتراض سے بلند اور ہر خردہ گیری سے پاک ہے، اور نبوت کے جس دور میں جو ربانی تعلیم آئی وہ اس کے لیے بالکل مناسب تھی، یہاں تک کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی ہمیشہ کے لیے تکمیل فرما دی گئی۔

کتاب میں کہیں کہیں فقہی مسئلے آگئے ہیں، چونکہ اس کتاب کا اصل موضوع احکام کا اخلاقی پہلو ہے اس لیے فقہی جزئیات اور تفصیلات میں اُلجھا نہیں گیا ہے ایسے موقع پر اگر شک و شبہ ہو تو ضروری ہے کہ ان جزئیات اور تفصیلات کو فقہ کی کتابوں میں دیکھ لیا جائے۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اخلاق کی مذہبی اہمیت ظاہر کی گئی ہے پھر کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اخلاق کا ایک فلسفہ مرتب کیا جائے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ تعلیم کی کچھ خصوصیتیں گنائی گئی ہیں۔ پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کے مختلف عنوانوں سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کی گئی ہے۔

فضائل، رذائل اور آداب کے بعض بعض عنوان میرے رفیق کار مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے لکھے ہیں، جن کو میں نے گھٹا بڑھا کر شامل کر لیا ہے۔ موصوف کی اس قلمی اعانت کا شکر گزار ہوں۔

آیات و احادیث سے احکام کے استنباط اور مصالح و حکم کی تشریح میں اپنے ذوق و فکر کی رہبری سے چارہ نہ تھا۔ سہو و خطا انسان کی فطرت ہے، پھر کیونکر دعویٰ کروں کہ اس میں میرا فکر و ذوق آزاد رہا ہے۔

سلسلۂ سیرت کے بانی حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ کو مدت سے خواب میں نہیں دیکھا تھا۔ اس حصہ کے جب آخری ابواب زیر ترتیب تھے تو میں نے ان کو خواب میں دیکھا کہ ان کے سامنے اس کے بعض اجزاء پڑے ہیں اور وہ اس کا کوئی صفحہ پڑھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں (رحمہ اللہ تعالیٰ)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اوراق کو قبول فرمائے اور ابنائے ملت میں اس آئینہ محمدی کو دیکھ کر اپنی اخلاقی شکل و صورت کی تزئین و آرائش کا ذوق پیدا کرے اور وہ سمجھیں کہ ایمان و عبادت کی درستی کی بڑی عملی نشانی اسلام کی روشنی میں اخلاق و عادات کی درستی ہے۔

طالب رحمت
سید سلیمان ندوی
(۴ر ذیحجہ ۱۳۵۷ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؀

پیش لفظ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین
وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ؀

سیرت النبیؐ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانیوالی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاعِ گرانمایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔ ع

مادح خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرتؐ کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل و معجزات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثتِ محمدی اور سیرت نبویؐ کی وسعت و جامعیت، اس کی بے خطار رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیاتِ انسانی و نسلِ آدم کے لیے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لیے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحبؒ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوی پر ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ انکی کتابِ زندگی کا آخری ورق اُلٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے، لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلۂ سیرت النبیؐ کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات، وسعتِ نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعتِ اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت

رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اُس میں شریعتِ اسلامی اور تعلیماتِ نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں اُن صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنۂ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گزشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیاتِ مستعار کی تھوڑی سی فرصت رہ گئی تھی قلم میں خطباتِ مدارس اور سیرت النبیؐ کی جلد سوم، چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آبشارِ علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانے سے استفادہ کا ہر وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک مبصر و ماہر فن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصلِ مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو، اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرت النبیؐ کے میخانے کے میخوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لیے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سُنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا اور انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں ضخامت میں بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں میں نہیں ملیں گی، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کر لیا ہے، اس لیے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہو گیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اُٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لیے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

> "اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کیجائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے، اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلق اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نصف اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیجانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے[1]"

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں :-

> "اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۷ر جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا، اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے[2]۔"

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آگئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لیجانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آسکتی ہیں مثلاً اس کتاب میں "معاملات" کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے' میزان کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے، سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدتِ مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست و حکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لیے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا ایسی صورت میں اُن کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں :-

> "اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے[3]۔"

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات جمع کر دیئے ہیں، اور یہ سیرت نبویؐ کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے' لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم سے حسبِ ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں :-

"اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیامِ سلطنت اس دعوت

---

[1] سیرۃ النبیؐ جلد۷، مقدمہ ص ۵ [2] ایضاً ص ۶ [3] مقدمہ ص ۲۳ ؛

کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیے بمنزلۂ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومتِ صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکونِ خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں، اس لیے وہ عرضاً مطلوب تھے[1]۔"

اور اس کی تائید کے لیے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دینِ مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریق دین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبالؒ نے صحیح کہا ہے :-

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

اس لیے خطباتِ مدارس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ

"اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدودِ حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرمانروا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔" اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے[2]۔

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافتِ اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہو گئی ہے، نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لیے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے[3]۔

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات

---

[1] مقدمہ ص ۷، ۳۴ [2] مقدمہ ص ۹۴ [3] مقدمہ ص

اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں "نقش سلیمانی" ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثار قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگار نبوی، متکلم اسلام اور نابغہ عصر، استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبیؐ کی کسی جلد پر یہ ہیچمدان پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لیے اس پر ایک "ناقص" کا کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء ابوالحسن علی ندوی ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

* * *

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی!

کہ محرم نیست خسرو را زباں در گفت گوئے تو

دارالمصنفین، اعظم گڑھ ہیچمدان مور سلیمان

۲۲ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ، ۷ جولائی ۱۹۸۰ء سید صباح الدین عبدالرحمان

---

[1] اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ میں جو صفحات نمبر دیئے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں، اس ایڈیشن میں نمبر صفحات تبدیل ہو گئے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے، یعنی پہلے ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد و تقویٰ، عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کئے جائیں اور پھر تمام عالم میں اُن کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو اُن کی تعلیم دلائی جائے، ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے، اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں، اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام کیا جائے بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے، دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اور اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اُس نے اس قسم کے نفوسِ قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائلِ اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتبِ درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر و نگیں بھی ہو

---

[1] یہاں پر کتاب کی اس عبارت بالا کے مخاطب اہل کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں، وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر

اور گوشہ نشیں بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجدہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی، یہ برزخِ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفۂ یزدانی، عالم کون کی آخری معراج ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع دنیا میں اگر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور ہے کہ اُس کی زبان کا ایک ایک حرف، اُس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اُس کے حلیۂ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کے کام آئے، لیکن

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔

لیکن چونکہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیا علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ (بقرہ ۴۰) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے،

اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالات نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:۔

تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ مِنْھُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ وَ اٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (بقرہ ۳۳)

یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے اُن میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبریل) سے فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالاتِ نبوت و فضائلِ اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات اور مصالحِ الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیا میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے، یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شہرت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت بہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیائے کرام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات و فضائل سے متصف نہ تھے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیانِ مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، اُن کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں، جناب مسیحؑ کی ۳۳ سالہ زندگی میں سے صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحانِ دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے، اس کا ذریعہ صرف موجودہ تورات ہے جو حضرت موسیٰؑ کے ۳۰۰ برس بعد عالمِ وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ اُن کے کارنامے اور اصولِ تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر اُن کا ناتمام عکس اُترا اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ داں ہے اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام اربابِ مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اُسی قدر عزیز ہے جس قدر دوسرے کو ہے اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی، جس میں جامعیتِ کبریٰ کا وصف نمایاں تھا؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے کہ دنیا میں وہ کون شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلم بند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع و شباہت، رفتار و گفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے (محمد عربی فدیتہ بابی و امی)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت و رحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں، اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کی اور اے عمر! تمہاری مثال نوحؑ و موسیٰؑ کی ہے یعنی ایک فریق سے رحم و کرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا (دیکھئے مستدرک حاکم غزوۂ بدر)

اس حدیث میں اسی نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوالِ مبارکہ میں رونما رہا ہے لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی، اس لئے بہ ضرورت احوال آپ کے تمام کمالات نبوت آپ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوتے، اور آپ کی نبوت کے آفتاب عالمتاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل ہدایت بنی اور ظلمت کدہ عالم کا ہر گوشہ آپ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پُر نور ہوا، صلی اللہ علیہ وسلم، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسر شان پیدا ہو کر اس سے ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (معارف محرم و صفر ۱۳۵۶ھ) میں مضمون "خلیل کی بشریت" میں۔

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصدِ تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالاتِ زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیلِ راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی و عمل، جدّ و جہد، ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندرِ اعظم کے کارنامہ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصہ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو شخص کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں وہ کس وسعت اور استقصاء و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں تا کہ مراحلِ زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فردِ کامل اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہِ مذکورہ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں بلکہ تمام عالم کو اس وجودِ مقدسؐ کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نام مبارک محمد (رسول اللہ) ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیْہِ وَسَلِّمْ صَلٰوۃً کَثِیْرًا کَثِیْرًا، یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے اور مختصر یہ ہے کہ مجموعہ ضروریاتِ دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرضِ اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرتِ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں،

اگلے زمانہ میں سیرت کی ضرورت صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علمِ کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضینِ حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرارِ نبوت بھی جزوِ مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حاملِ وحی اور پیغمبرِ الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے۔ آج کل مسلمانوں کو چند در چند ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبرِ اسلامؐ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے، تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں

اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو پیغمبر کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے جس نے اگر مجمعِ انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصبِ نبوت میں فرق نہیں آتا کہ اس کے دامنِ اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنھوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرت نبویؐ پر ایک بلسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام بظاہر آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، اُن کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی

---

[1] اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے جو آجکل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فنِ حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً صحیح بخاری، مسلم تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ "سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی"؟ اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں، فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا، چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہوئیں مثلاً سیرت ابن ہشام سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ، ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں، البتہ زمانۂ مابعد میں مغازی کے سوا اور اور چیزیں بھی داخل کر لی گئیں مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فنِ حدیث سے ایک الگ چیز ہے یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو متقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابلِ ترجیح ہے، ہم اس موقع پر دو ایک واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں،

غزوات میں ایک غزوہ ذوقرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل

جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاذ تھے، سیرت نبوی میں لکھتے ہیں:۔

ولیعلم الطالب ان السیرا   تجمع ما صح وما قد انکرا

یعنی طالب فن کو جاننا چاہیے کہ سیرت میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، اور پھر نہایت تحقیق و تنقید سے ایک

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کا واقعہ ہے، اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے۔

لا یختلف اهل السیر ان غزوة ذی قرد کانت قبل الحدیبیة فیکون ما وقع فی حدیث سلمة من وهم بعض الرواة۔

اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے، وہ کسی راوی کا وہم ہوگا،

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں۔

فعلی هذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوة ذی قرد اصح مما ذکره اهل السیر

تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں انھوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے جو آج بھی موجود ہے اس میں انھوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے اس لئے نہ کر سکے۔

حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ودل هذا علی انه کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیه اهل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وان ذلک کان منه قبل تضلعه منها ولخروج نسخ کتابه وانتشاره لم یتمکن من تغییره۔

(زرقانی بر مواہب جلد ۳ ص ۱۱)

اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انھوں نے ارباب سیر سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں گے اور یہ کہ یہ امر ان سے مہارت فن کے قبل صادر ہوا لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

(۲) ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا، لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

واما شیخه الدمیاطی فادعی غلط الحدیث

باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انھوں نے حدیث کی نسبت

مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصاء کے ساتھ دیکھنا، اور اُن سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بدقسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لیے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی جس میں قابل عربی دان اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بدقسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال اور اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلم بند کیے گئے، اور اس زمانہ میں کیے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا، طبقات ابن سعد، کتاب الصحابہ لابن السکن، کتاب لعبد اللہ بن علی بن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابۃ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب الازرق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی، طبقات ابن ماکولا، اسد الغابۃ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابہ، صرف انہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

الصحیح وان جمیع اہل السیر علی خلافہ (فتح الباری جزء ہفتم صفحہ ۲۲۲)	غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہٖ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی، جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخذ ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہٖ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

(۳) مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں اس سے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

(۴) جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرت کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدماء سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ ہماری اس عبارت کا کہ سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی، اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

[1] ان کتابوں کا ذکر استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔

بزرگوں کے حالات ہیں ہیں، کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقاء میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درجِ تحریر ہو سکے ہیں؟

سیرت نبویؐ کے متعلق قدماء نے جو ذخیرہ مہیا کیا، اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کر دیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جا سکتا ہے اور کہاں تک تحقیق اور تنقید کی ضرورت ہے۔

فنِ سیرت کی ابتداء اور تحریری سرمایہ عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۳ھ میں) ہوا، اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نبطی خط تھا جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہو گئے ہیں، اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے، اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کر لی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتداء کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اوّل اوّل جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا، ان کے نام یہ تھے۔ ابوجاد، ہواز، حُطّی، کلمون، سعفص، قریشات (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کئے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا، وہ تین شخص قبیلۂ بولان (قبیلۂ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرّۃ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرینِ قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمرو بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا جو بنو مخلد ابن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کر لیا تھا، اور تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی، جو عبدالمطلب ابن ہاشم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے

حق عبد المطلب بن هاشم من اهل مكة	یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرضہ فلاں
على فلان ابن فلان الحميرى من اهل وزل	شخص پر ہے جو صنعاء کا رہنے والا ہے یہ چاندی کے ہزار

---

[1] یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

صنعا علیه الف درهم فضة کیلا بالحدیدة ومتی دعاه بها اجابه شهد الله والملکان۔

درہم ہیں جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا، خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا اور شاید کراماً کاتبین کا اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔[1]

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں سترہ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، ابو حذیفہؓ، ابو سفیانؓ، شفاءؓ بنت عبداللہ وغیرہ۔[2]

بدر کی لڑائی جو ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر اُن کو لکھنا سکھا دے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہیں، اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔[3]

ان واقعات سے معلوم ہوگا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوتی تھیں یا نہیں، اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلم بند کر لینے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں۔

لَا تکتبوا عنّی ومن کتب عنّی غیر القرآن فلیمحهُ۔

مجھ سے جو سنو اس کو قلم بند نہ کرو (بجز قرآن کے) اور کسی نے قلمبند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیئے۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیونکہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں بعض صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپؐ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ صحابہؓ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمروؓ مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے

---

[1] ابن ندیم ص ۷، طبع مصر۔ [2] فتوح البلدان ذکر خط ص ۴۷۲ مطبوعہ یورپ [3] طبقات ابن سعد غزوہ بدر ص ۱۴۔

تھے لکھ لیا کرتے تھے، قریش نے اُن کو منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی میں، اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمرؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آپؐ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے[1]۔ خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلمبند کر لیا کرتے تھے، "صادقہ"[2] تھا۔

ایک دفعہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، اُن کے نام قلم بند کئے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام دفتر میں درج کئے گئے[3]۔

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ "جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے، تو وہ ایک چُنگ نکال لاتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھ لی تھیں"۔

متعدد قبائل کو آپ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے وہ تحریری تھے اور کتبِ احادیث میں بعینہا منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوتِ اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلمبند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

(۱) جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ وغیرہ نے قلمبند کیں۔

(۲) تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ)، اور فرامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کے نام بھیجے۔

(۳) خطوط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین اور امراء کے نام ارسال فرمائے۔

(۴) پندرہ سو صحابہؓ کے نام۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانہ سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں[8]۔

مغازی عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس

---

[1] ابو داؤد جلد ۲ ص ۷۷، [2] جامع بیان العلم للقاضی ابن عبد البر مطبوعہ مصر ص ۷۲، میں صادقہ کا ذکر ہے [3] صحیح بخاری باب الجہاد [4] بخاری جلد ۱ ص ۲۱ و ۲۲ صحیفۂ علی و کتابۃ الرجل من الیمن [5] سنن ابن ماجہ ص ۱۴۰ و جلد ۱ ص ۱۵۵، ۱۵۶ [6] بخاری جلد ۱ ص ۸ و ایضاً ص ۱۵ [7] بخاری جلد ۱ ص ۱۵ [8] تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، تذکرہ امام بخاری۔

لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی، لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا، خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اقوال و افعال پر توجہ کی جن کو شریعت سے تعلق تھا، اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوۂ اُحد کے ذکر میں سائب بن یزید سے یہ روایت نقل کی ہے۔

صحبت عبد الرحمن بن عوف و طلحۃ بن عبید اللہ و المقداد و سعداً فما سمعت احداً منھم یحدث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا انی سمعت طلحۃ یحدث عن یوم احد

میں عبد الرحمٰن بن عوف اور طلحہؓ بن عبید اللہ اور مقداد اور سعد کی صحبت میں رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سُنا بجز اس کے کہ طلحہؓ غزوہ اُحد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور طلحہؓ و مقدادؓ و سعدؓ وقاص اکابر صحابہؓ میں ہیں، اور اُن سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے بجز اُس کے کہ طلحہؓ جنگ اُحد کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنا لیا تھا وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے خواص میں اُس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اُسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی، امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ثلثۃ کتب لیس لھا اصول المغازی والملاحم والتفسیر۔

تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل کی مراد اُن خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے۔

اما کتب التفسیر فمن اشھرھا کتابا الکلبی و مقاتل بن سلیمان وقد قال احمد فی تفسیر الکلبی من اولہ الی آخرہ کذب۔

باقی تفسیر کی کتابیں تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔

پھر لکھتے ہیں:۔

واما المغازی فمن اشھرھا کتاب محمد بن اسحاق وکان یاخذ من اھل الکتاب وقد قال الشافعی کتب الواقدی کذب۔

باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد ابن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت

احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتدا سلطنت کی وجہ سے ہوئی

صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنو امیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الامراء۔	ہم لوگ علم کا قلم بند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر قدماء کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضیین ہے[1]

امیر معاویہؓ کے بعد عبد الملک بن مروان نے جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، سعید بن جبیر جو اعلم العلماء تھے، اُن کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی، عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے اُن ہی کی تفسیر ہے عطاء کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آ گیا تھا[2]

حضرت عمر بن عبد العزیز کا زمانہ آیا تو انھوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی، تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی مدون اور قلم بند کی جائیں، سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، اُن سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلم بند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے، علامہ ابن عبد البر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں۔

عن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمر بن عبد العزيز بجمع السنن فكتبناها دفترا دفترا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترا۔[3]	سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبد العزیز نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے دفتر کے دفتر لکھے، عمر نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانہ کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاذ اور مدینہ کے قاضی تھے ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا۔

حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے، یعنی اُن سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں، اس لئے عمر بن عبد العزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا عمرۃ بن عبد الرحمن ایک خاتون تھیں، اُن کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، وہ بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمر بن

---

[1] فہرست ابن الندیم ص ۹۴ [2] میزان الاعتدال ترجمہ عطاء بن دینار [3] مطبوعہ مصر ص ۲۰۶ [4] طبقات ابن سعد جز ثانی قسم ثانی ص ۱۳۴۔

عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلم بند کر کے بھیج دیں[1]۔

مغازی پر خاص توجہ

اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبوی کا خاص حلقۂ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری[2] المتوفی سنہ ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے، ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں۔

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں اُن کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انھوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر جاتے، جوان بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین عورتوں سے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور حالات پوچھتے اور قلم بند کرتے، وہ نسباً قریشی تھے، سنہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا، سنہ ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر و منزلت کی، کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مقربین خاص میں داخل تھے، ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم اُن کے سپرد کی تھی، سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پائی[3]۔

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقۂ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے، جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں اُن لوگوں کا امتیازی وصف "صاحب المغازی" لکھا جاتا ہے۔

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق۔ موسیٰ بن عقبہ خاندان زبیر کے غلام تھے، عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک اُن کے شاگرد ہیں، امام مالک اُن کے نہایت مداح تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، اُن کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں،

(۱) مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انھوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا،

(۲) عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کیے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں جو اُن کے نزدیک صحیح

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن محمد و عمرۃ بنت عبدالرحمن و طبقات ابن سعد جزء دوم حصہ دوم ص ۱۳۴ [2] تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ [3] تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم)

ثابت ہوتیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتبِ مغازی کے مختصر ہے۔

(۳) چونکہ روایتِ حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغازِ شباب ہی سے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے تھے، اور حدیثیں سُن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے، لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبرسن میں اس فن کو سیکھا تھا، ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق نے فنِ مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امامِ فنِ مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرتِ عام میں اگرچہ واقدی اُن سے کم نہیں، لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلّمۂ عام ہے، اور اس لئے انکی شہرت بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انسؓ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آنے پائے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں، ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے، امام مالکؒ ان کے سخت مخالف ہیں، لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں اُن کی روایت نہیں لی لیکن جزء القراۃ میں ان سے روایت کی ہے، تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہیں۔

فنِ مغازی کو انھوں نے اس قدر ترقی دی اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اسی قسم کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابنِ عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف اُن کی تصنیف کے رُتبہ کو نہیں پہنچی۔

ابنِ حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ اُن یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے، اور چونکہ یہ واقعات انھوں نے یہودیوں سے سُنے ہوں گے اس لئے اُن پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے اور اُن کو ثقہ سمجھتے تھے، ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابوبکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا، اس کا قلمی نسخہ الہ آباد میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے، چونکہ

---

[1] تہذیب التہذیب۔

اصل کتاب آج کم ملتی ہے، اس لئے آج اُس کی جو یادگار موجود ہے، وہ یہی ابنِ ہشام کی کتاب ہے۔

ابنِ ہشام کا نام عبد الملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مؤرخ تھے، حمیر کے قبیلہ سے تھے اور غالبًا اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے، انھوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں اُن کی تفسیر بھی لکھی ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرتِ ابن اسحاق کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اُس کو نظم کیا، چنانچہ ابو نصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی ۶۶۳ھ و عبد العزیز بن احمد المعروف بہ سعد دیری المتوفی فی حدود ۶۹۷ھ و ابو اسحاق انصاری تلمسانی و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی ۷۹۳ھ نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریبًا دس ہزار شعر ہیں اور اس کا نام فتح الغریب فی سیرت الحبیب ہے۔

واقدی خود تو قابلِ ذکر نہیں، لیکن اُن کے تلامذۂ خاص میں سے ابنِ سعد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابنِ سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عمومًا لکھا ہے کہ گو اُن کے استاد (واقدی) قابلِ اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں، خطیب بغدادی نے اُن کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں۔

کان من اهل العلم والفضل والفهم والعدالة صنف کتابًا کبیرًا فی طبقات الصحابة والتابعین الی وقته فاجاد فيه واحسن[1]۔

یہ موالیِ بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے، لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، بلاذری جو مشہور مورخ ہیں انہی کے شاگرد ہیں، ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

اُن کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں ہیں، اور یہ حصہ دراصل سیرت نبوی ہے، باقی جلدیں صحابہؓ (و تابعین) کے حالات میں ہیں، اور چونکہ صحابہؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریبًا ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہِ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیبِ خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزاء فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جابجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ) میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے

---

[1] تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن سعد۔

واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کرلی جاسکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں، چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں اُن کے نام مذکور ہیں، لیکن چونکہ نام کے سوا اُن کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں، نہ اُن کا آج وجود ہے، اس لئے ہم اُن کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

سیرت کے سلسلہ میں الگ تاریخی تصنیفات ہیں، اُن میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں، یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں، ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے، وہ بھی دراصل سیرت نبوی ہے، اُن میں سب سے مقدم اور قابلِ استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں، لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے، اس میں سیرت نبوی کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں، یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں، اور اُن میں بھی کوئی ترتیب نہیں، کبیر البتہ بڑی ہے، میں نے اُس کا نسخہ جامع اباصوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانحِ نبوی اس میں بہت کم ہیں اور جستہ جستہ واقعات بلاترتیب مذکور ہیں۔

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، امام طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین اُن کے فضل وکمال، وثوق اور وسعتِ علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں، میں کسی کو اُن سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے اُن کی نسبت لکھا ہے کہ "شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے" لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے۔

ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین۔	یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اس موقع پر لکھا ہے کہ ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں۔ تمام مستند اور مفصل تاریخیں مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفدا وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی۔

جو لوگ خاص فنِ سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، اُن کا اور اُن کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں[1]۔

---

[1] ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آتے ہیں،

حالات	سنہ وفات	نام مصنف
حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے، حضرت عائشہؓ کے آغوش تربیت میں پلے تھے، سیرت میں مغازی میں کثرت سے ان کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے کان عالماً بالسیرۃ، صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی۔	؁۹۴ھ	عروہ بن زبیر
مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی و سیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں۔“	؁۱۰۹ھ	شعبی
یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارات اور پیشین گوئیاں کثرت سے انہی سے مروی ہیں۔	؁۱۱۴ھ	وہب بن منبہ
مشہور تابعی ہیں، حضرت انسؓ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں، مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔	؁۱۲۱ھ	عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری
ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔	؁۱۲۴ھ	محمد بن مسلم بن شہاب زہری
نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبویؐ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔	؁۱۲۸ھ	یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس ابن شریق الثقفی
ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔	؁۱۴۱ھ	موسیٰ بن عقبۃ الاسدی
زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انھوں نے لیں محدثین کا بیان ہے کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، فن سیرت میں انکے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔	؁۱۴۶ھ	ہشام بن عروہ ابن زبیر
ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔	؁۱۵۰ھ	محمد بن اسحٰق بن یسار المطلبی

عمر بن راشد الازدی	سنہ ۱۵۲ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد اُن کا دوسرا درجہ ہے، اساطین علم حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب اُن کی تصنیف ہے، جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبد الرحمن بن عبد العزیز الاوسی	سنہ ۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے اُن سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے، ابن سعد نے اُن کے متعلق لکھا ہے، کان عالمًا بالسیرۃ۔
محمد بن صالح بن دینار التمار	سنہ ۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاد ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہے، ابو الزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو
ابو معشر نجیح المدنی	سنہ ۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے ثوری اور واقدی نے اُن سے روایت کی ہے گو محدثین نے روایت حدیث میں تضعیف کی ہے لیکن سیرت و مغازی میں اُن کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے، امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فن میں صاحب نظر ہیں، ابن ندیم نے اُن کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے کتب سیرت میں اُن کا نام کثرت سے آتا ہے۔
عبد اللہ بن جعفر ابن عبد الرحمن المخزومی	سنہ ۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہ کے پڑپوتے تھے، فن حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے، سیرت نبویؐ کے اکابر علما میں تھے، ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "من رجال اہل المدینۃ علمًا بالمغازی"۔
عبد الملک بن محمد بن ابی بکر ابن عمرو بن حزم الانصاری		فن حدیث و سیر میں اُن کا خاندان ہمیشہ نامور رہا، اُن کے دادا وہ شخص ہیں جنھوں نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی، اُن کے رشتہ کی دادی عمرہؓ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی، خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ اُن سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد سنہ ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن ارباب نقد کے نزدیک اُن کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبد اللہ ابن الطفیل البکائی	سنہ ۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگوں کے واسطۃ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھر بار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل

		کھڑے ہوتے تھے اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے محدثین کی بارگاہ میں گو اُن کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرت کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور اُن کی سیرت کے راوی ہیں، رے کے قاضی تھے اہلِ نقد کے نزدیک قابلِ احتجاج نہیں لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیرتہائے نبوی کہتے ہیں، طبری میں اُن کے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں
ابو محمد یحییٰ بن سعید ابن ابان الاموی	۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفینِ مغازی میں اُن کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے، شام میں اُن کے زمانہ میں اُن سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے اُن کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات کی تعداد ستر ہے، جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابنِ اسحاق کے شاگرد ہیں، فنِ روایت و حدیث میں اُن کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے اُن کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بلقب صاحب المغازی لیا ہے انھوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد ۲ ص ۱۰)
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	۲۰۷ھ	سیرت نبویؐ کے متعلق اُن کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے کہ اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اُس کا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں،
یعقوب بن ابراہیم الزہری	۲۰۸ھ	حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں اُن کا یہ رتبہ تھا کہ ابن معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبد الرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	۲۱۱ھ	ثقاتِ محدثین میں ان کا شمار ہے مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبد الرزاق مرتد بھی ہو جائیں تب بھی ہم اُن سے روایتِ حدیث ترک

		نہیں کر سکتے" آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابل سند ہیں، فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک بن ہشام الحمیری	۲۱۸ یا ۲۱۳ھ	ان کا ذکر گزر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائینی	۲۲۵ھ	ابومعشر نجیح اور سلمٰن بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے، تاریخ و انساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں، لیکن مورخین کے امام ہیں، اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں اُن کی کتاب نہایت مبسوط ہے اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کئے ہیں۔
عمر بن شبۂ البصری	۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری اور ابونعیم اُن کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبویؐ میں اُن کا خاص رسالہ ہے، جس کا موضوع گزشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی حالات و عادات و اخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علماء نے شروح و حواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہؓ اُن کی تالیف ہے جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابوبکر احمد بن ابی خیثمۂ البغدادی	۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد اور تاریخ و سیر کے جلیل القدر عالم تھے، "تاریخ کبیر اُن کی تصنیف ہے جس میں سیرت نبویؐ کا حصہ بھی شامل ہے
محمد بن عائذ دمشقی		ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے، حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔

یہ قدماء کی تصنیفات تھیں، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہٖ مستقل تصنیفات تھیں، اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الأنف: سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمٰن سہیلی ہے، جنھوں نے ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں اور تمام مصنفین مابعد سیرت نبوی کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق اُن کے خوشہ چیں ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی: حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرت سید البشر ہے، قریباً سو صفحوں میں ہے، پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ خلاطی: علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے، ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرتِ گازرونی: شیخ ظہیر الدین علی بن محمد گازرونی المتوفی ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے۔

سیرت ابنِ ابی طے: مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدة المتوفی ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرت مغلطائی: مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے، علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرفُ المصطفیٰ: حافظ ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، اُن میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ: للحافظ ابن الجوزی۔

الکتفا۔ فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثہ، حافظ ابو الربیع سلیمان بن موسیٰ الکلاعی المتوفی ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اُس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدُالبر: ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عُیونُ الاثر: ابن سید الناس کی تصنیف ہے، ابن سید الناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے اور ہمارے پیشِ نظر ہے۔

نور النبراس، فی سیرت ابن سید الناس عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم ابن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ منظوم: حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ

---

[1] بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

[2] ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان سے ہے۔

میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ: مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم مرتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب: یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی: مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ سیرت نبوی کے واقعات جو قلم بند کیے گئے، وہ تقریباً نبوت کے سو برس کے بعد قلم بند ہوئے اس لیے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلم بند کیے جاتے ہیں، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لیے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلہ روایت میں آئے کون لوگ تھے؟ کیسے تھے؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بیں؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، اُن کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے، ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسما - الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر[۱] کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ جاتی ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی دان فاضل ہیں مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ ان ہی کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سینکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے:۔

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح و تعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ امام احمد بن حنبل نے اُن کی نسبت لکھا ہے "کہ میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا" اُن کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا، اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی۔	خاص ضعیف الروایۃ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی ۲۶۱ھ۔	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے۔
رجال امام عبد الرحمٰن بن حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ۔	بہت ضخیم کتاب ہے۔
رجال امام دارقطنی۔	مشہور محدث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔
کامل ابن عدی۔	اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

یہ کتابیں قریباً آج نابید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب تہذیب الکمال ہے جو علامہ مزی ابویوسف بن الزکی کی تصنیف ہے جنھوں نے ۷۴۲ھ میں وفات پائی، علاء الدین مغلطائی المتوفی ۷۶۲ھ نے تیرہ جلدوں میں اسکا تکملہ لکھا، علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے اس کا اختصار کیا، اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے، در بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب "تہذیب التہذیب" لکھی، جو بارہ جلدوں میں ہے اور آج کل حیدرآباد سے شائع ہوئی ہے۔ مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوتے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب "میزان الاعتدال" ہے جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا، جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، التقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبۃ ذہبی، انساب سمعانی تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گزری ہیں۔

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کر دی تھی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (حجرات-۱)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

حدیث ذیل بھی اسی کو مؤید ہے۔

كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔

آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کر دے۔

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء

یہ اصول بھی درحقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا، حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ میں آگئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین میں شریک تھے، اور اسی بناء پر حد قذف جاری کی گئی، قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِنْكُمْ (نور-۲)

جن لوگوں نے تہمت لگائی وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں مِنْكُمْ کی تفسیر حسب ذیل کی ہے۔

جماعة من المومنين۔

یعنی یہ تہمت لگانے والے مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی برأت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے

وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ (نور-۲)

اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایۃ ہیں یا نہیں؟ پھر اُن کی شہادت لی جاتی، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سُننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلاف قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے، قطعاً سمجھ لینا چاہئے کہ غلط ہے، اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتداء خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہاء میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا تو حضرت، عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایۃ نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اُن کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انھوں نے تسلیم نہیں کی اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہے[1]

جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں:

---

[1] جامع ترمذی باب الوضوء

قال ابن الجوزی وکل حدیث رأیتہ یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انہ موضوع فلا یتکلف اعتبارہ ای لا تعتبر رواتہ ولا تنظر فی جرحہم او یکون مما یدفعہ الحس والمشاہدۃ او مباینا لنص الکتاب والسنۃ المتواترۃ او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شیٔ من ذلک التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر وبالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وہذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والطرقیۃ ومن رکۃ المعنی لا تاکلوا القرعۃ حتی تذبحوہا ولذا جعل بعضہم ذلک دلیلا علی کذب راویہ وکل ہذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی کقصۃ غیاث مع المہدی۔ او انفرادہ عمن لم یدرکہ بما لم یوجد عند غیرہما او الانفرادہ بشیٔ مع کونہ مما یلزم المکلفین علمہ وقطع العذر فیہ کما قررہ الخطیب فی اول الکفایۃ او بامر جسیم یتوفر الدواعی علی نقلہ کحصر العدو الحاج عن البیت۔

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ موضوع ہے اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث قابل اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو، یا نص کتاب اور سنت متواترہ اور اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہو (اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں بہت پائی جاتی ہیں) یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں، مثلاً غیاث کا واقعہ خلیفہ مہدی کے ساتھ۔۔ یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے نہ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے اس سے ملا تک نہ ہو یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب بغدادی نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

(۱) جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

(۲) جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

(۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

---

(۱) فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۱، افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق نقل کی ہیں، یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں، بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔

(۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو، اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

(۵) جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

(۶) معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

(۷) وہ روایت رکیک المعنی ہو، مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

(۸) جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی، اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

(۹) جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو، باایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

(۱۰) جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

ملا علی قاری نے جو موضوعات کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً یہ کہ "جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے جس کے ستر زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر ہزار لغت ہوتے ہیں۔"

(۲) وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بینگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے۔"

(۳) وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

(۴) جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ "دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔"

(۵) وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا۔"

(۶) وہ حدیثیں جن میں آئندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے مثلاً یہ کہ "فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا۔"

(۷) وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں، مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے۔ یا یہ کہ مسلمان شیریں ہوتا ہے اور شیرینی پسند کرتا ہے۔"

(۸) وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں مثلاً "عوج بن عنق کا قد تین ہزار گز کا تھا۔"

(۹) وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً "دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے۔" کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

(۱۰) وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

(۱۱) جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

(۱۲) وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں، حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا اور اُن کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں، مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی: ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) اس معاہدہ پر سعد بن معاذؓ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

(۲) دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

(۳) اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

(۴) دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

(۵) خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، اُن سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

(۶) عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے۔

(۷) اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیئے گئے۔

تبصرہ

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۱- سیرت پر اگرچہ آج بھی سینکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین چار کتابوں پر منتہی ہوتا ہے، سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر انہی کتابوں سے لئے گئے ہیں (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے اس سے اس مقام پر بحث نہیں)، اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیئے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑ دیتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑے سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلم بند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم اُن کا یہ رتبہ ہے کہ امام بخاری اپنے رسالہ "جزء القراۃ" میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں اور اُن کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لیے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور، اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن اُن کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصل کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے۔ بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ وہ ضعیف ہے اور میں نے اس کو ترک کر دیا۔ ابوحاتم کہتے ہیں "وہ استناد کے قابل نہیں"۔ نسائی کہتے ہیں، "وہ ضعیف ہے"۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لیے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے۔ باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبری کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

سیرت کی کتابوں کی کم پائگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں حاجت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرت منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالبُ ان السیرَ ا	طالب کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں سبھی طرح کی روایتیں
تجمع ما صحّ وما قد اُنکر ا	ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں شائع ہوگئیں اور بڑے بڑے علما نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل میں لکھتے ہیں۔

قد رواہ من صنف فی عمل یوم ولیلۃ	اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنھوں نے
کابن السنی وابی نعیم وفی مثل ھذہ الکتب	رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں مثلاً ابن السنی
احادیث کثیرۃ موضوعۃ لا یجوز الاعتماد	اور ابو نعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں
علیھا فی الشریعۃ باتفاق العلماء۔	موجود ہیں جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علما کا
	اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انھوں نے کہا، اے خدا میں تجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے، خدا نے کہا "تم نے محمدؐ کو کیونکر جانا" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اس سے میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا" خدا نے کہا "آدم! تم نے سچ کہا، اور محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا" حاکم نے اس حدیث کو نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، علامہ ابن تیمیہؒ حاکم کا یہ قول نقل کرکے لکھتے ہیں۔

واما تصحیح الحاکم لمثل ھذا الحدیث و امثاله فھذا مما انکرہ علیه ائمة العلم بالحدیث وقالوا ان الحاکم یصحح احادیث وھی موضوعة مکذوبة عند اھل المعرفة بالحدیث … وکذلك احادیث کثیرة فی مستدرکه یصححھا وھی عند ائمة اھل العلم بالحدیث موضوعة

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک موقع پر ابوالشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کرکے لکھتے ہیں (ص ۱۰۵ و ۱۰۶)

وفیھا احادیث کثیرة قویة صحیحة وحسنة واحادیث کثیرة ضعیفة موضوعة واھیة وکذلك ما یرویه خیثمة بن سلیمان فی فضائل الصحابة وما یرویه ابو نعیم الاصبھانی فی فضائل الخلفاء فی کتاب مفرد وفی اول حلیة الاولیاء… وما یرویه ابوبکر الخطیب وابو الفضل بن ناصر وابو موسی المدینی وابو القاسم بن عساکر والحافظ عبدالغنی وامثالھم ممن له معرفة بالحدیث۔

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں، جو قوی ہیں، اور حسن ہیں اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خیثمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں اور وہ حدیثیں جو ابونعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور حلیۃ الاولیاء کے اول میں، اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابوالفضل اور ابوموسیٰ مدینی اور ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ روایت کرتے ہیں۔

غور کرو، ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے اور ان

---

[1] کتاب التوسل مطبوعہ المنار ص ۱۰، و نیز تذکرۃ [illegible]

کے سوا اور روایتوں میں سلسلۂ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعات مُلا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ قیامت کے دن خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا، امام ابن جریر طبری نے سُنا تو بہت برہم ہوئے، اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشین نہیں"، اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں۔[1]

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلّم ہے کہ حدیث اور روایت میں امام بخاری اور مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل ومناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابونعیم، بزاز، طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق وتنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ وجود میں آئے تو ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، ابونعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابونعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سِیَر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیئے ہیں، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیئے، محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں مذکور ہیں اکثر منقطع ہیں، صحابہؓ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جس کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر متصل نہیں، اور اسی بنا پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابونعیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے[2] کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے، جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لے گیا، اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق ومغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں۔

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے، لیکن اُن کی اکثر روایتیں جو سیرت ابن ہشام اور طبقات

---

[1] موضوعات ملا علی قاری ص ۳۰ مطبوعہ دہلی۔ [2] مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے اس میں پہلے سے بھی مبالغہ آمیز باتیں ہیں میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔

ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں

۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، اُن کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں، جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں، مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا کی لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن اُبی کو یہ خط لکھا کہ تم نے محمد کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے، اُن کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد دونوں کا استیصال کر دیں گے[1]، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفین سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ اُن کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اُس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ودل هذا علی انه کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیه اهل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وان ذلک کان منه قبل تضلعه منها ولخروج نسخ کتابه وانتشاره لم یتمکن من تغییره۔[2]

یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے رجوع کیا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔

۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں، اُن سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں، انہی کے نام سے کیں، اُن کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا، اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آ سکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے، اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ابن سعد کی اصل کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے صحابہؓ کے متعلق اُن سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم

---

[1] غزوہ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصل الفاظ نقل کریں گے [2] زرقانی جلد ۲ ص ۱۱۔

نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں، اور جن کا ذکر اوپر گزر چکا اسی بنا پر کیں۔

اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجاتے، تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے (گو دونوں راوی ثقہ ہیں)، اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا، لیکن صحابہؓ میں آکر یہ اصول بیکار ہو جاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ اتفاقاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہو جاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں اکثر اُن سے استناد کرتے ہیں، انھوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (ص ۱۰ و ۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من رآه صلى الله عليه وسلم، يوماً ما او زاره لماماً او اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب وانما نعني به الذين لازموه وعزّروه ونصروه واتّبعوا النّور الّذي انزل معه اولٰئك هم المفلحون۔

یہ مقولہ کہ صحابہ سب عادل ہیں ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتفاقاً دیکھ لیا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غرض کے لئے ملا، اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بالتزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہؓ سے مخصوص کر دیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت اُن سے بے جا نہیں، لیکن اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہو سکتیں، خصوصاً اُن روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

۵- ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلومات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر،

اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کفار پر حملہ کرنے اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادۂ جنگ اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

۶- یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے اور پیش آسکتا ہے تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائے گی، لیکن فرض کرو، وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو غیر معمولی ہے، تجربۂ عام کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا، تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاجِ ثبوت ہے اس لئے اب راوی کا معمولی درجۂ وثوق کافی نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہیے۔

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے یا مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابلِ اعتبار ہو گی، محدثین کا اس پر استدلال ہے کہ محمودؓ بن الربیع ایک صحابیؓ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انھوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا، اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہو سکتی[1] ہے۔

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے کہ کم سن کی روایت قابلِ حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے:

ولکن قد منع قوم القبول هنا ای فی مسئلة الصبی خاصة فلم یقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبی مظنة عدم الضبط	لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت سے منع کرتی ہے خصوصاً بچوں کی روایت کے مسئلہ میں، بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں

---

[1] یہ پوری بحث فتح المغیث ص ۱۶۶ تا ۱۶۸ میں ہے۔

وھو وجه للشافعية.... وكذا كان ابن المبارك يتوقف في تحديث الصبي۔

(كتاب مذكور ص ۱۶۴)

کرتی، شوافع کی بھی یہی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ ابن مبارک بھی بچہ کی حدیث روایت کرنے میں توقف کرتے ہیں۔

لیکن اثبات ونفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے یا وہ بوڑھا تھا یا اس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا تو اس روایت میں شبہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا تو شبہ ہوگا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟۔

فقہاء نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے۔

قبول اخبار الصبي المميز فيما طريقه المشاهدة بخلاف ما طريقه النقل كالافتاء ورواية الاخبار ونحوه (نسخه مطبوعه لكهنؤ ص۱۲۲)

باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں مقبول ہے لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں مثلاً فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں۔

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے۔

ثم الضبط نوعان ظاهر وباطن فالظاهر ضبط معناه من حيث اللغة، والباطن ضبط معناه من حيث تعلق الحكم الشرعي به وهو الفقه ومطلق الضبط الذي هو شرط في الراوي هو الضبط ظاهرا عند الاكثر لانه يجوز نقل الخبر بالمعنى فيلحقه تهمة تبديل المعنى بروايته قبل الحفظ او قبل العلم حين سمع ولهذا المعنى قلت الرواية عن اكثر الصحابة لتعذر هذا المعنى قال وهذا الشرط وان كان على ما بينا فان اصحاب الحديث قل ما يعتبرونه في حق الطفل دون المغفل فانه متى صح عندهم سماع الطفل او حضوره اجازوا روايته (ص ۱۲۱)

پھر ضبط[1] کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بناء پر متعلق ہے، اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے اکثروں کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے، کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے، اسی بناء پر سنتے وقت قلت حفظ یا قلت علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہ ہوسکتا ہے یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہؓ نے بہت کم حدیثیں روایت کیں کیونکہ مفہوم کا بعینہٖ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے لیکن محدثین بچہ کے حق میں کم بے عقل کے حق میں نہیں اس کا اعتبار کرتے بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں حاضر ہونے کے قابل ہوگیا تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔

---

[1] ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے، اُن کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحر العلوم، امام فخر الاسلام کا مذہب نقل کرکے لکھتے ہیں۔

و وجه قول الامام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع وقلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعبارات مختلفة ثم ان تلك العبارات ليست مترادفة بل قد روي ذلك المعنى بعبارات مجازية فاذا كان الراوي غير فقيه احتمل الخطاء في فهم المعنى المراد الشرعي.... ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمداً الى الصحابي معاذ الله عن ذلك

(شرح مسلم مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۳۲)

امام فخر الاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ روایت باللفظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مرادف بھی نہیں بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں، اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا تو احتمال ہوگا کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذ اللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ "واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اُسی درجہ کی اہم ہونی چاہیئے" بے خبر نہ تھے، امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں۔

اذا روينا عن النبي (صلى الله عليه وسلم) في الحلال والحرام والاحكام شددنا في الاسانيد وانتقدنا في الرجال واذا روينا في الفضائل والثواب والعقاب سهلنا في الاسانيد وتسامحنا في الرجال (فتح المغيث ص ۱۲۰)

جب ہم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں، اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انگاری کرتے اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ابن اسحاق رجل نكتب عنه هذه الاحاديث يعني المغازي ونحوها واذا جاء الحلال والحرام اردنا قوما هكذا وقبض اصابع يديه الاربع

(فتح المغيث ص ۱۲۰)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں اُن سے روایت کی جاسکتی ہیں لیکن جب حلال وحرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے "۔" درکار ہیں، یہ کہہ کر انھوں نے چار انگلیاں بند کرکے دبالیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بناء پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے، اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ حلال وحرام میں اُن کی شہادت معتبر نہیں لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے، یہ وہی اصول ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو، اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیئے، اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

نوعیتِ واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بناء پر ان کا مذہب ہے کہ جو

روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں، منار میں ہے:

والراوی ان اعرف بالفقه والتقدم فی الاجتهاد کالخلفاء الراشدين والعبادلة كان حديثه حجة يترك به القياس خلافا لمالك وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه كانس وابی هريرة ان وافق حديثه القياس عمل به وان خالفه لم يترك الا بالضرورة۔

راوی اگر تفقہ و اجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدینؓ یا عبادلہؓ تھے، تو اس کی حدیث حجت ہوگی اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائے گا (بخلاف امام مالک کے)، اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ ہیں، تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا (نورالانوار ص ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت ابوہریرہؓ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے کیونکہ اکثر علماء کے نزدیک حضرت ابوہریرہؓ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث یہ بات ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقرا سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ازواجِ مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہو گئے تھے تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبوی میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے[1] کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلافِ الفاظ مذکور ہے، کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:-

وان الاخبار التی تشاع ولو كثر ناقلوها ان لم يكن مرجعها الى امر حسی من مشاهدة او سماع لا تستلزم الصدق فان جزم الانصاری فی روايته بوقوع التطليق وكذا جزم الناس الذين رآهم عمرؓ عند المنبر بذالك محمول على انه شاع بينهم ذلك من شخص بناء على التوهم الذی توهمه من

جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو اُن کے راوی کثرت سے ہوں، لیکن اگر اُن خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضرور نہیں، چنانچہ انصاری نے اور اُن صحابہؓ نے جن کو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہوگا کہ کسی شخص نے آنحضرتؐ کو دیکھا کہ آپ نے ازواجِ مطہراتؓ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عادت

---

[1] صحیح مسلم باب فی الایلاء۔

اعتزال النبی نساءہ فظن لکونہ لم تجر عادتہ بذالک انہ طلقہن فاشاع انہ طلقہن فشاع ذالک فتحدث الناس بہ واخلق بھذا الذی ابتدار باشاعۃ ذالک ان یکون من المنافقین کما تقدم۔

نہ تھی، اس لئے اس نے یہ قیاس کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، اس نے یہ خبر پھیلا دی، اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہوگا۔

(فتح الباری شرح بخاری طبع اول مصر جلد ۹ ص ۲۵۰)

غور کرو، مسجد نبویؐ میں تمام صحابہؓ جمع ہیں، اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دے دی، صحابہؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں، اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجر نے بڑی جرأت کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اول منافقین میں سے ہوگا، حضرت عائشہ صدیقہؓ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں جن میں سے ایک واقعۂ افک ہے، اُن کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیئے، جو حافظ ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا، یعنی یہ کہ منافقین نے اُن کی طرف منسوب کر دیئے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

۸۔ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ اُن کا قلم تلوار سے نہیں دبا۔ حدیثوں کی تدوین بنو امیہ کے زمانہ میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آل فاطمہ کی توہین کی، اور جمعہ میں سر منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا، سینکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں، عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کر دی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے اور بنو امیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اُسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں اُن کو ہونا چاہیئے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین اگر تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے وقت موجود ہوتا تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔" وہیں سر دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے امیرالمومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں)، وہاں موجود تھا، اُس کو کس نے پوچھا، مامون الرشید کو بھی اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر مؤثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ اُن پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتدا ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر

تھے اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھ گیا، جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ و شاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں، ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں، اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہ تھا لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں، اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بین نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتہ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنو نضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) ارباب سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے" لیکن مورخین یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب نہیں دیتے اور یونہی گزر جاتے ہیں۔

۹۔ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل یا مسلمات یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں، اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گزر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیان روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا، انکار کر دے گا، کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ بات خلاف عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

(۱) تلک الغرانیق العلی کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیئے، جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابل اعتبار کہا تھا اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لارتد کثیر ممن اسلم ولم　　　اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے

ينقل ذلك۔

حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وجميع ذلك لا يتمشى على القواعد فان الطرق اذا كثرت وتباينت مخارجها دلّ ذلك على ان لها اصلًا[1]۔

یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے ماخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دفعہ جھوٹ بولے تھے، امام رازی نے اس حدیث سے اس بناء پر انکار کیا ہے کہ اُس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں، علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

فليس بشئ اذ الحديث صحيح ثابت وليس فيه نسبة محض الكذب الى الخليل وكيف السبيل الى تخطية الراوي مع قوله اني سقيم و بل فعله كبيرهم هذا وعن سارة اختي اذ ظاهر هذه الثلاثة بلا ريب غير مرادٍ[2]۔

امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث ثابت ہے اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیلؑ کی طرف نہیں ہے اور راوی کا تخطیہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے انی سقیم اور بل فعلہ کبیرھم ھذا اور سارۃ اختی کیونکہ ان تینوں قولوں میں ظاہر لفظ قطعاً مراد نہیں۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف مثالیں نقل کیں۔

اُن کے مقابل میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بناء پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے، اور یہ طریقہ خود صحابہ کرامؓ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے، اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں

(۱) حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ اس کی بناء پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی (کے استعمال) سے بھی وضو کریں، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا، بھتیجے جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو[3]۔

(۲) صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضرت علیؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے، حضرت ابن عباسؓ اُس کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ:۔

---

[1] فتح الباری جلد ۸ ص ۲۲۳ مطبوعہ مصر۔ [2] قسطلانی جلد ۵ ص ۲۸۹ [3] ابن ماجہ و ترمذی حدیث الوضوء مما مست النار

واللہ ما قضی بھذا علیؓ الا ان یکون ضل۔	خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو کر کیا ہے لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے اس لئے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا۔

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ[1] کے پاس لوگ ایک کتاب لائے جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلم بند تھے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹا دی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

(۱) صحیح بخاری (باب الصلوٰۃ النوافل جماعۃ) میں ہے کہ محمود بن ربیعؓ نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص خالصاً خدا کے لئے لا الٰہ الا اللہ کہے گا خدا اس پر آگ حرام کر دے گا، اس جلسہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی موجود تھے جن کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مہینہ تک قیام فرمایا تھا، حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے یہ حدیث سن کر کہا۔

واللہ ما اظن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قال ما قلت قط۔	خدا کی قسم میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا

محمد بن الربیعؓ صحابی تھے، اور حضرت ابو ایوبؓ کو اُن کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا، تاہم چونکہ یہ حدیث اُنکے نزدیک قرآن کے خلاف تھی حضرت ابو ایوبؓ اُس پر یقین نہ لاسکے اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ فرمایا ہوگا۔ اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عقبان) سے کر لی لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا، حضرت ابو ایوبؓ کو جن اسباب کی بنا پر محمود بن الربیعؓ کی روایت میں شبہ پیدا ہوا، عقبان پر بھی وہی شبہ پیدا ہو سکتا تھا حضرت ابو ایوبؓ خدانخواستہ محمودؓ کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے کہ انہوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہ راوی اول کی نسبت بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بعض صحابہؓ سے کہا تھا کہ تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو لیکن سامعہ غلطی کر جاتا ہے۔

(۲) حضرت عمارؓ بن یاسر نے حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت عمرؓ کو یقین نہیں آیا بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے یہ الفاظ کہے اتق اللہ یا عمار یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو، چنانچہ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے حضرت ابو موسیٰؓ نے اس روایت سے استدلال کیا تو حضرت عبداللہؓ نے کہا ہاں، لیکن عمرؓ کو عمار کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی۔[3]

(۳) حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انھوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے۔

---

[1] نووی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب طامورہ کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبائی میں جوڑ کر جمع کرتے تھے اور لپیٹ کر رکھتے تھے)۔ [2] صحیح مسلم کتاب الجنائز ص ۳۰۰ [3] صحیح بخاری باب التیمم۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (بنی اسرائیل) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(۵) اسی طرح جب اُن کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگانِ بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سُنتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ نے غلطی کی[1]، اس روایت کے راوی اگرچہ عبداللہ بن عمرؓ تھے جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ نے اس بناء پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ اُن کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے، اور حضرت عائشہ کا اجتہاد جس کی بناء پر انھوں نے روایت سے انکار کیا صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بناء پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

(۶) ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دے دی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں، فاطمہؓ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں، جن کو اُن کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں، تو آپ نے اُن کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انھوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اُس نے یاد رکھا یا بھول گئی، امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہؓ کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو، پھر حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا واقعہ نقل کیا[2]

صحابہؓ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بناء پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو اُن کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

(۱) ایک ضعیف حدیث ہے کہ جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی وہ شہید ہوا حافظ ابن القیم زاد المعاد میں اس حدیث کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں،

فلو کان اسناد ھذا الحدیث کالشمس کان غلطا ووھما[3] اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ:۔

اقض بینی وبین ھذا الکاذب الآثم الغادر الخائن[4] میرے اور اس جھوٹے مجرم دھوکہ باز خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔ [2] صحیح مسلم کتاب الجنائز۔ [3] زاد المعاد حصہ ثانی مطبوعہ کانپور ص ۹۹۔ [4] نووی شرح صحیح مسلم ذکر حدیث مذکور

چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ کسی مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخوں سے یہ الفاظ نکال دیئے، علامہ مازری اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:۔

اذا انسدت طرق تاویلہا نسبنا الکذب الی رواتہا۔	جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

(۳) بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو اُن کا قد ساٹھ گز کا تھا، حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

ویشکل علی ھذا ما یوجد الان من آثار الامم السالفۃ کدیار ثمود فان مساکنھم تدل علی ان قاماتھم لم تکن مفرطۃ الطول علی حسب ما یقتضیہ الترتیب السابق ..... ولم یظھر الان ما یزیل ھذا الاشکال۔[3]	اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم ثمود کے مکانات ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے ..... اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔

(۴) صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وقد استشکل الاسماعیلی ھذا الحدیث من اصلہ وطعن فی صحتہ[4]۔	اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے لیکن اسماعیلی کا درجہ فنِ حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے، اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہے لیکن قابلِ لحاظ ہو سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

(۵) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا جس نے زنا کیا تھا، اس پر بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں، اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لئے اُن کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ اس بنا پر اُن کو سزا دی جا سکتی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وقد استنکر ابن عبد البر قصۃ عمرو بن میمون ھذہ وقال فیھا اضافۃ الزنا الی غیر مُکلّف واقامۃ الحدّ علی البھائم[5]۔	ابن عبدالبر نے میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے اگر سند صحیح ہے تو

---

[1] نووی شرح مسلم کتاب الجہاد باب الفئی [2] فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۱۹ صفحہ ۱ [3] الحق [4] فتح الباری مطبوعہ مصر ص ۳۰۳ جلد ۸ [5] فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۷ ص ۱۳۲

غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے۔

(۶) صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (حجرات ۱)	اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیتِ قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں، اور یہاں عبداللہ بن اُبی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اُس کے موافق ہیں یا نہیں۔

(۷) ایک بڑا امر طلب روایت بالمعنی کا ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے بعینہٖ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا اُن کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرائے ہیں، اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے، اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمر، ابو زرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سینکڑوں راویوں میں صرف دو چار اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے، اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے۔

ان قلت لكم اني احدثكم كما سمعت فلا تصدقوني، انما هو المعنى۔	اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہٖ وہی ادا کر دیتا ہوں تو تم میری بات نہ مانو، میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کئے ہیں۔

جو صحابہؓ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت اُن کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابنِ ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا، میں نے کبھی اُن کو یہ کہتے نہیں سُنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ ایک

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الصلح، روایت میں جھگڑنے کی تفصیل ہے ہم نے محض خلاصہ ذکر کر دیا ہے [۲] صحیح ترمذی کتاب العلل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے

دن اُن کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعۃً سر جھکا لیا، پھر میری نظر اُن پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کہا یا یوں، یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم یا اس کے مشابہ۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے تو خوف زدہ ہو جاتے اور کہتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا یا یوں فرمایا تھا، امام شعبی کہتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ میں نے سعدؓ بن مالک کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انھوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت نہیں کی (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا، انھوں نے کہا، میں جب سے اسلام لایا، میں نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیے کہ اپنا گھر آگ میں بنا لے۔[1]

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا۔

ایاکم وکثرۃ الحدیث عنی۔[2]
خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں غلطی کا ہو جانا ممکن ہے، اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بناء پر انکار کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی۔

ان المیت لیعذب ببکاء الحی۔
مردوں پر نوحہ کیا جائے تو اُن پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا۔

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطی۔[3]
تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا۔

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء۔[4]
ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

۱۱۔ ایک اور بحث روایت آحاد کی ہے، روایتِ احاد وہ ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا موید نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و

---

[1] یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں دیکھو ص ۴ و ۵ مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ [2] ابن ماجہ ص ۵ [3] صحیح مسلم کتاب الجنائز [4] مسلم کتاب الجنائز

ظنی ہونے کے متعلق اہلِ فن کا اختلاف ہے، معتزلہ روایاتِ احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ درحقیقت انکارِ بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعاتِ زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلاحجت و اصرار فوراً الیقین کر لیتے ہیں، ہم میں سے ایک شخص اگر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے" اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبرِ احاد ہے، اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں لیکن یہ درحقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کا طرزِ عمل اس کے مخالف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر اُن کو بلوا بھیجا، اور واپسی کا سبب پوچھا، انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ، حضرت عمرؓ نے کہا اس روایت پر گواہ لاؤ ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہِ نبوت میں برسوں رہے تھے اور انھوں نے یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا دعویٰ کیا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے۔ مغیرہ بن شعبہ نے شہادت دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی، اور جب ایک اور صحابی محمدؓ بن مسلمہ نے شہادت دی، تب حضرت ابوبکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی، اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔

اسی بنا پر روایت احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، اُن سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایاتِ احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے" تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے"، تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپ ایک بار سفید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے" تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپ برہنہ تن باہر نکل آئے"

(اس قسم کی ایک روایت ہے)، تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحثِ مذکورہ گزشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق صحابۂ کبارؓ کا جو طرزِ عمل پیش کیا ہے اور علمائے فنِ حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیثِ صحیحہ میں، پھر عام احادیث میں کرنی چاہیئے، اگر نہ ملے تو روایاتِ سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتبِ سیرت محتاج تنقیح ہیں، اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روائتیں باعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورتِ اختلاف احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواۃ اربابِ فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیئے۔

(۷) روایات میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جزو شامل ہے۔

(۸) اسبابِ خارجی کا کس قدر اثر ہے۔

(۹) جو روایات عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلّم اور قرائنِ حال کے خلاف ہوں گی، لائقِ حجت نہ ہوں گی۔

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایاتِ احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیئے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آ سکتا ہے کہ اسلامی فنِ روایت عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے، علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت کتنی جانفشانی کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی کی ہے، کیا اس اہتمام و اعتناء کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگارانِ پیغمبرِ اسلام میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے[1]؟

⁂

---

[1] زیادت از ص ۰۰۰ تا ۹، تس

یورپین تصنیفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی، جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف ہلڈبرٹ سے لے کر جو ۱۱۳۰ء میں موجود تھا، آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ اُن کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ اُن کے وسائلِ معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوءِ ظن کا کہاں تک اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں، کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو جابجا ان تصنیفات سے کام لینا یا ان سے تعرض کرنا پڑتا ہے۔

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا، جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا، ایک یورپین مصنف لکھتا ہے۔

> "عیسائیت اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی، وہ صرف تھراتی اور حکم بجالاتی تھی، لیکن جب قلبِ فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو اُن قوموں نے جو اُن کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں، منہ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے[1]۔"

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے۔

> "وہ تمام قصص، اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ میں رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان اُن کو سُن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض و عداوت سے بھری ہوتی ہیں، جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں، ان کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں، ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا، اور حسب ترتیب درجات اُن کے تین خدا تسلیم کیے جاتے تھے، ماہوم یا ماہون یا نافومیڈ (یعنی محامڈ)، اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان، ان کا خیال تھا کہ محمدؐ نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی، اور سب سے عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمنِ اصنام تھا) لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا۔

---

[1] محمد اینڈ محمڈنزم از باسورتھ اسمتھ صاحب ایم اے ص ۹۳
BOSWORTH SMITH IS MOHAMMADE MOHAMEDANISM

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب ہوئے اور اُن کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انھوں نے توڑ ڈالا، اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے "ایلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا، اُس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور اس کو گالیاں دیں، اور اُس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی، اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اُس کے ٹکڑے کر ڈالے، اور ماہوم کو جو اُن کا دوسرا دیوتا تھا، ایک گڑھے میں ڈال دیا، اس کو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا، اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی، اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی، اور از سرِ نو تلف شدہ بتوں کو بنایا، اسی بناء پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا، تو اُس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتھوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا"۔

ایک دوسرا شاعر ریچ خدا سے دعا کرتا ہے کہ "وہ ماہوم کے بُت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے"، اس کے بعد وہ امراء کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے، "اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرماگان کے بتوں کو اوندھا کر دو، اور اُن کو آگ میں ڈال دو، اور اُن کو اپنے خداوند کی نذر کر دو۔"

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی

سترھویں صدی کے سنین وسطی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، یورپ کی جدوجہد، سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی، وہ مستشرقینِ یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادر الوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوتے، اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سُن سکا۔

اس دور کی خصوصیتِ اول یہ ہے کہ سُنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع معلوماتِ سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے، اس بناء پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو جماعتیں الگ ہو گئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

---

[1] کتاب ہنری دی کاسٹری بزبان عربی مطبوعہ مصر از صفحہ ۸ تا ۱۰۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہوگیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے اربی نیوس (ARP) مارگولیوس ایڈورڈ پوکاک (POCOCKE) اور ہاٹنجر (HATTINJER) ذکر کے قابل ہیں، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی سنہ ٩٢٩ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا، اور ابن العمید المکین المتوفی سنہ ١٢٧٣ء جو سلاطین مصر کا ایک درباری تھا، اور ابوالفرج ابن العبری الملطی المتوفی سنہ ١٢٨٦ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، اربی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک نسخہ شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے اورنٹیلسٹ کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے، اور قیمتی تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں سنہ ١٧٧٨ء میں ایک ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی، اس کی تقلید میں انگریزوں نے بمقام کلکتہ سنہ ١٧٨٤ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور سنہ ١٧٨٨ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد سنہ ١٧٩٥ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا، اور آخرکار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کرکے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں اور ان میں اکثر کا یوروپین زبانوں میں ترجمہ ہوگیا، سب سے پہلے رسک (REISKE) المتوفی سنہ ١٧٧٤ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کی، سنہ ١٨٠٩ء میں کیپٹن اے متھوس (A.N. MATHEWS) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا، سنہ ١٨٥٦ء میں وان کریمر (KREMER) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی۔ سنہ ١٨٦٠ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی گوٹنگن (GOTTINGEN) سے اشاعت کی، اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قتیبہ کی تاریخ معارف طبع کرائی سنہ ١٨٦٤ء میں ڈاکٹر ویل (G. WEIL) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا، سنہ ١٨٦٤ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرنسیس باربرد [illegible] [illegible] اور [illegible] نے شائع کی، واقدی [illegible] (WUST [illegible]) نے سنہ ١٨٨٢ء

میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان محمد بہ مدینہ برلن سے شائع کیا، ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے ہوٹسما (HOUTASMA) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو جلدوں میں چھپی، ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۱ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادر الوجود تاریخ بارتھ (J. BARTH) اور نولدیکی (NOLDEKE) وغیرہ نے شائع کی، اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (SACHUU) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادر الوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۴ء سے گزشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگاران پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

آکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:

"محمدؐ کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے۔[1]"

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جو بہ تخصیص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی۔ بی (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وایٹ (واعظ آکسفورڈ)	؍؍	بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام	۱۸۰۰ء
۳	گارڈفری ہگنس، ایم آر اے ایس	؍؍	آپالوجی	۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے اے مولر	جرمن	اسلامزم	۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی	فرانس	اسلام و قرآن	از ۱۸۳۱ء تا ۱۸۴۳ء
۶	اڈورڈ لین	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام کتاب محمد پیغمبر	۱۸۴۵ء و ۱۸۴۶ء
۸	کارلائل	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	۱۸۴۹ء
۹	کوسن ڈی پرسیوال	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء

---

[1] مارگولیتھ، محمد، دیباچہ صفحہ ا۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱۰	واشنگٹن ارونگ	انگلستان	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۲۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر	جرمن	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر	〃	ترجمہ وتحشیہ واقدی	سنہ ۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمدؐ"	سنہ ۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی	ہولینڈ	"تاریخ اسلام	سنہ ۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	سنہ ۱۸۶۱ء
۱۶	ڈی لین		سیرت محمدؐ	〃
۱۷	میور	انگلستان	سیرت محمدؐ	〃
۱۸	برتھالمی سینٹ ہلیر	فرانس	محمدؐ وقرآن	سنہ ۱۸۶۵ء
۱۹	نولدیکی	جرمن	مضامین قرآن واسلام	سنہ ۱۸۶۹ء
۲۰	دوشیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	〃
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	〃	محمدؐ	سنہ ۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس	فرانس	تاریخ بانی اسلام	سنہ ۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمدؐ اور اسلام	سنہ ۱۸۷۵ء
۲۴	باسورتھ اسمتھ	〃	〃	〃
۲۵	سیدیو	فرانس	تاریخ عرب	سنہ ۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن	جرمن	تبصرہ بر واقدی	سنہ ۱۸۸۲ء
۲۷	اہل کراہل	جرمنی	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈ زیہر		مطالعہ اسلام	سنہ ۱۸۹۰ء
۲۹	رینان	فرانس	تاریخ مذاہب	سنہ ۱۸۹۲ء
۳۰	ایچ گریم	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری	فرانس	اسلام پر خیالات	سنہ ۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بوہل	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	سنہ ۱۹۰۳ء
۳۳	والسٹن	انگلینڈ	آدھ گھنٹہ محمدؐ کے ساتھ	سنہ ۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ	〃	محمدؐ	〃
۳۵	کوئل	〃	محمدؐ اور اسلام	سنہ ۱۸۹۴ء

۳۶	پرنس کاتیانی	اٹالیہ	تاریخ کبیر محمد واسلام وسلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ	انگلینڈ	اسلام کا روحانی واخلاقی پایہ	سنہ ۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں۔

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کا قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں، کہ راکھ کے ڈھیر میں بھی سونے کے ذرّے نکال سکتے ہیں لیکن قلیلٌ ما ھم۔

(۲) عربی زبان اور علم ادب وتاریخ وفلسفہ، اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہبِ اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارع اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے اس کی وسعتِ معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کا کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرتِ مطالعہ، تفحص، کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ؎

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعوےٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب وافترا، اور تاویل وتعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی دان ہیں، کئی سال مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں اکر شاہی

کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گزری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ اول اول انہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

(۱) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفاتِ سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو چنانچہ اس کی بحث اوپر گزر چکی۔ مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں، مثلاً سیف، سُدّی، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایۃ ہیں، اس لئے عام اور معمولی واقعات میں اُن کی شہادت کافی ہو سکتی ہے لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے اُن کے لئے یہ سرمایہ بے کار ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بروایاتِ صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ جو ہیں (مثلاً مارگولیس) تو اوّلاً وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سینکڑوں خرمنِ معلومات کو جلانے کیلئے کافی ہے

(۲) دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصولِ تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کر لی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ اسمائے رجال کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر

---

[1] یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا لیکن اس کے فقرے اکثر یورپین مصنفین نے نقل کئے ہیں اور ہماری نظر سے گزرے ہیں۔

ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرآن اور قیاسات کے خلاف ہو اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کر لی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً اہل یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتے ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ زمانہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جرأت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں، اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ یورپین مصنفین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے لیکن مدینہ جا کر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعۃً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے اور اس کے جو لوازم ہیں یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲) کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔

(۳) مذہب کی اشاعت جبر اور زور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہئے کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار پر بھی ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں۔

اصول تصنیف اور ترتیب ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، اس کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اس طرح نظر نہیں ڈالی، اس

لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، اُن کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں میں ڈھونڈتے ہیں، جہاں عنوان یا مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیے اور جب اُن کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں اس لئے اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈ کر مہیا کئے، جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، اُن کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تا امکان کدو کاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے اُن کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس سلسلہ روایت کی تحقیق مقصود ہو، بآسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگزاشتوں کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا اُن کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے اس کتاب کے پانچ حصے ہیں[1]۔

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک عام حالات اور واقعات و غزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواج مطہراتؓ کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاح اعمال اور اخلاق ہے، اس بناء پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتداء اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ دکھایا ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے، اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ الگ باب باندھتے ہیں لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور

---

[1] اب یہ کتاب سات حصوں میں مرتب ہو گئی ہے اور ترتیب بھی بدل گئی ہے۔

امکان سے بحث کرنے کی ضرورت نہ پیش آئی، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیرِ طعام وغیرہ اُن کو اُس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے یعنی یورپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایۂ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں اُن سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں اُن کے جوابات۔

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا، وہ شائع کر دیا جائے گا۔

اسناد اور حوالے تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں۔

(۱) صرف انہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو خود میری نظر سے گزری ہیں۔

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں، اُن کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کد و کاوش نہیں کی ہے۔

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے، قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گزر چکی ہے اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کون سا نسخہ تھا۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۔

عرب

وجہ تسمیہ عرب کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف رائیں ہیں، اہل لغت کہتے ہیں کہ عرب اور اعراب کے معنی فصاحت اور زبان آوری کے ہیں، اور چونکہ اہل عرب اپنی زبان آوری کے سامنے تمام دنیا کو ہیچ سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے اپنے آپ کو عرب اور دنیا کی اور تمام قوموں کو عجم (ژولیدہ بیان) کہہ کر پکارا۔

بعض کی رائے ہے کہ عرب اصل میں عربۃ تھا، قدیم اشعار میں عرب کے بجائے عربۃ آیا ہے۔

ورجّت باحة العربات رجّا ترقرق فی مناکبها الدماءُ
وعربةُ ارض جدّ فی الشر اهلُها کما جدّ فی شرب النقاخ ظماءُ
وعربةُ ارض ما یحِل حرامُها من الناس الا اللوذعیُّ الحُلاحل

عربہ کے معنی سامی زبانوں میں دشت اور صحرا کے ہیں اور چونکہ عرب کا بڑا حصہ دشت و صحرا ہے اس لئے تمام ملک کو عرب کہنے لگے۔

جغرافیہ عرب کے حدود اربعہ یہ ہیں:

مغرب : بحیرۂ قلزم۔
مشرق : خلیج فارس اور بحر عمان۔
جنوب : بحر ہند۔

شمال : کی حدود بہت مختلف فیہ ہیں، بعض مملکت حلب اور فرات تک اُس کی حدود کو وسعت دیتے ہیں سینا کا جزیرہ نما جس کا نام التیہ ہے، اکثر مصنفین عرب و یورپ اس کو مصر میں شمار کرتے ہیں لیکن جیالوجی کی رو سے وہ عرب سے متعلق ہے۔

عرب کی پیمائش باقاعدہ اب تک نہیں ہوئی، تاہم اس قدر یقینی ہے کہ وہ جرمن اور فرانس سے چوگنا زیادہ وسیع ہے، طول تقریباً پندرہ سو، عرض چھ سو میل اور مجموعی رقبہ بارہ لاکھ میل مربع ہے۔

ملک کا بڑا حصہ ریگستان ہے، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے، سب سے بڑا طویل السلسلہ پہاڑ جبل السراۃ ہے، جو جنوب میں یمن سے شروع ہو کر شمال میں شام تک چلا گیا ہے، اس کی سب سے اونچی چوٹی آٹھ ہزار فٹ بلند ہے، بعض حصے زرخیز اور شاداب بھی ہیں۔

چاندی اور سونے کی کانیں کثرت سے ہیں، علامہ ہمدانی نے "صفۃ جزیرۃ العرب" میں ایک ایک کان کا نشان دیا ہے، قریش جو تجارت کیا کرتے تھے، مورخین نے لکھا ہے زیادہ تر ان کا مال تجارت چاندی ہوتی تھی، برٹن صاحب نے مدین کی طلائی معادن پر خاص ایک کتاب لکھی ہے[1]۔

قدیم تاریخ کے ماخذ اسلام سے قبل عرب کی تاریخ کے ماخذ حسب ذیل ہیں:

(۱) زمانۂ جاہلیہ کی بعض تصنیفات جو سلاطین حیرہ کے کتب خانہ میں محفوظ تھیں، اور جو ابن ہشام کو ہاتھ آئی تھیں، اور جن کا ذکر علامہ موصوف نے کتاب التیجان میں کیا ہے۔

(۲) زبانی روایتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں، عرب کا حافظہ نہایت قوی تھا، یہاں تک کہ آج اشعار جاہلیت کا جو وسیع ذخیرہ موجود ہے، اسلام کے زمانہ تک زبانی ہی روایت ہوتا چلا آتا تھا، اس بنا پر عرب کی قدیم تاریخ کا کافی سرمایہ محفوظ تھا، عرب کی جو قومیں معدوم ہو چکیں مثلاً طسم، جدیس، عاد، ثمود، ان کے متعلق بھی اس قدر تاریخی روایتیں محفوظ تھیں کہ ان کے ذریعہ سے مورخین اسلام، عرب کی تاریخ قدیم پر متعدد تصنیفات مرتب کر سکے، مثلاً ہشام کلبی نے طسم، جدیس، تبابعۂ یمن اور دیگر سلاطین عرب پر متعدد کتابیں لکھیں، جن کا ذکر ابن الندیم نے فہرست صفحہ ۹۶ میں کیا ہے۔

(۳) اشعار جاہلیت جن میں سے اکثر سلاطین اور اقوام اور عمارات عرب کا ذکر ہے، یہ اشعار صفۃ جزیرۃ العرب اور معجم البلدان میں کثرت سے موجود ہیں، انہی قدیم ماخذوں سے علامہ ہمدانی نے اپنی کتاب الاکلیل مرتب کی ہے جس کا آٹھواں باب خاص سلاطین حمیر کے آثارات قدیمہ اور حمیری کتبات پر مشتمل ہے۔

---

[1] THE GOLD MINES OF MIDIAN اس کتاب کا ذکر نہایت تفصیل کے ساتھ جغرافیہ العالم مطبوعہ بیروت [illegible] میں ہے۔

(۴) یورپ کی قدیم تصنیفات مثلاً مصنفین یونان نے تھیوفراسٹس (جو حضرت عیسیٰ سے چار سو برس قبل تھا) سے لے کر بطلیموس تک بہت سے قبائل عرب کے نام لکھے ہیں، اور اُن کی آبادیوں کے نام بھی بتائے ہیں، رومن مورخ پلینی نے بھی عرب کے متعلق لکھا ہے، گو نہایت مختصر ہے۔

(۵) عرب کی قدیم ویران شدہ عمارتوں کے کتبات جو قدمائے اسلام نے دریافت کئے تھے، اور جو آج کل یورپ نے نہایت کثرت سے مہیا کئے ہیں۔

عرب کے اقوام وقبائل مورخین عرب نے اقوام وقبائل عرب کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔

عرب بائدہ: یعنی عرب کے قدیم ترین قبائل جو اسلام سے بہت پہلے فنا ہو چکے تھے۔

عرب عاربہ: بنو قحطان جو عرب بائدہ کے بعد عرب کے اصلی باشندے تھے اور جن کا اصلی مسکن ملک یمن تھا۔

عرب مستعربہ: بنو اسماعیل یعنی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو حجاز میں آباد تھی۔

ظہور اسلام کے وقت بنو قحطان اور بنو اسماعیل جن کو عدنانی قبائل بھی کہتے ہیں، ملک کے اصلی باشندے تھے، اور ان کے علاوہ خال خال یہودیوں کی آبادی تھی، اس بنا پر درحقیقت ملک عرب اس وقت تین مختلف عناصر سے مرکب تھا، ہر عنصر کا قوام بے شمار قبائل وفروع سے تھا جو یمن سے شام تک ہر قطعۂ زمین میں پھیلے ہوئے تھے اُن کی پھر مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں، چونکہ اس کتاب میں اکثر اُن کے نام آئیں گے، اس بنا پر ان کا ایک مختصر خاکہ درج ذیل ہے۔

بنو قحطان

اس خاندان کی تین بڑی شاخیں ہیں:-

(۱) قضاعہ (۲) کہلان (۳) ازد، حمیر بھی اسی کی شاخ ہے، جو یمن کے فرماں روا تھے، لیکن واقعات کو اُن سے کوئی تعلق نہیں۔

(۱) قبائل قضاعہ:- عام علمائے انساب قضاعہ کو بنو قحطان میں داخل کرتے ہیں، اور ہم بھی یہاں ان کی پیروی کرتے ہیں ورنہ ازروئے تحقیق وہ بنو اسماعیل ہیں، بہرحال اُن کی حسب ذیل شاخیں ہیں۔

بنو کلب، بنو تنوخ، بنو جرم، بنو جہینہ، بنو نہد، بنو عذرہ، بنو اسلم، بلی، سلیح، خجم، تغلب، نمر، اسد، تیم اللات، کلب۔

(۲) کہلان:-

بجیلہ، خثعم، ہمدان، کندہ، مذحج، طے، لخم، جذام، عاملہ۔

(۳) ازد:- انصار اسی کی شاخ تھے۔

اوس، خزرج، خزاعہ، غسان، دوس۔

مشہور عدنانی قبائل جن کا آخری مورث مضر ہے، حسب ذیل ہیں، قبائل مضر اولاً بنی خندف اور بنو قیس دو خاندانوں

پر منقسم ہوگیا ہے۔

لہ یہاں سے عرب کی قدیم حکومتوں تک زیادت ہے "ش ن"

۱۔ خندف

ہذیل، کنانہ، اسد، ضبہ، مزینہ، رباب تیم، ہون۔

ان میں سے ہر ایک کے متعدد فروع ہیں۔

اصول	فروع
کنانہ۔	قریش، دول۔
ہون۔	قارہ۔
رباب	عدی، تیم، عکل، ثور۔
تمیم	مقاعس، قریع، بہدلہ، یربوع، ریاح، ثعلبہ، کلیب۔

۲۔ قیس

عدوان، غطفان، اعصر، سلیم، ہوازن۔

ان میں بعض کے فروع یہ ہیں:۔

غطفان۔	عبس، ذبیان، فزارہ، مرہ۔
اعصر	غنی، باہلہ۔
ہوازن	سعد، نصر، جشم، ثقیف، سلول، بنو عامر۔ (عامر کی شاخیں بنو ہلال، بنو نمیر، بنو کعب ہیں)

یہود

بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ۔

عرب کی قدیم حکومتیں

بنو قحطان و آل اسماعیل نے اسلام سے پہلے متعدد حکومتیں قائم کی تھیں، جن کے جستہ جستہ واقعات کہیں ملتے ہیں کتبوں اور دیگر مورخین کی تصریحوں سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں پانچ متمدن سلطنتیں گذریں۔

(۱) معینی	معین یمن میں ایک مقام کا نام ہے جو کسی زمانہ میں سلطنت کا پایۂ تخت تھا۔
(۲) سبائی	یعنی قوم سبا۔
(۳) حضر موتی	حضر موت، یمن کا مشہور مقام ہے۔
(۴) قتبانی	قتبان، عدن میں ایک مقام ہے جو آجکل گمنام ہے۔
(۵) نابتی	حضرت اسماعیلؑ کے ایک بیٹے کا نام نابت تھا، یہ سلسلہ انہی کی طرف منسوب ہے۔

معینی سلطنت، جنوبی عربستان میں تھی، اس کے صدر مقامات قرن اور معین تھے، کتبوں سے تقریباً پچیس ، کا پتہ چلتا ہے، محققین یورپ میں اختلاف ہے کہ معینی اور سبائی حکومتیں ہم زمان تھیں یا متقدم و متاخر، گلاز

کا خیال ہے کہ معینی حکومت بہت متقدم ہے، اور حضرت عیسیٰؑ سے پندرہ سو برس قبل موجود تھی، لیکن مولر کا بیان ہے کہ کوئی معینی کتبہ آٹھ سو برس قبل مسیح سے پہلے کا نہیں ملتا، اس بناء پر سبائی اور معینی دونوں ہم عصر ہیں۔

سبائی دور، جیسا کہ کتبوں سے ثابت ہوتا ہے، حضرت عیسیٰؑ سے سات سو برس قبل سے ہے، اس سلطنت کا پایۂ تخت مآرب تھا، اس زمانہ کے سنگی کتبے بہ کثرت موجود ہیں، حضرت عیسیٰؑ سے ایک سو پندرہ برس قبل تک اس حکومت کا پتہ چلتا ہے، اس دور کے بعد حمیر کا زمانہ ہے، حمیر نے مآرب پر قبضہ کر کے اس کو پائے تخت بنالیا۔

قریباً ۱۱۵ قبل مسیح میں حمیر نے سبائی حکومت پر قبضہ کر لیا، کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حمیر میں چھبیس فرماں روا گزرے، حمیر کے بعض کتبوں میں سنہ وسال بھی کندہ ہے، اُن کے عہدِ حکومت میں رومی سلطنت نے عرب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن یہ کوشش پہلی بھی تھی اور آخری بھی، اے لیس گالس، جس نے حضرت عیسیٰؑ سے ۱۸ برس قبل عرب پر چڑھائی کی تھی، بالکل ناکامیاب رہا، اس کے رہبر دغابازی سے اس کو صحرا میں لے گئے اور ریگستان میں پہنچ کر اس کا سارا لشکر تباہ ہو گیا؎۔

حمیر نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا، اسی زمانہ کے قریب حبشیوں نے عرب کے جنوب میں حکومت قائم کرنا شروع کی اور ایک زمانہ میں حمیریوں کو شکست دے کر اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اس عہد کا ایک کتبہ جو آجکل ہاتھ آیا ہے، اس پر یہ الفاظ ہیں۔

> "رحمان، مسیح اور روح القدس کی قدرت وفضل ورحمت سے اس یادگاری پتھر پر ابرہہ نے کتبہ لکھا جو کہ بادشاہ حبش ارا حیس ذی ان کا نائب الحکومۃ ہے۔"

سبا اور حمیر کی عظمت اور اقتدار اور وسعتِ فتوحات کی روایتیں عرب میں اس قدر متواتر ہیں کہ ان کے قدر مشترک سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اشعار میں بھی کثرت سے واقعات مذکور ہیں، عربوں کے خیال کے موافق سلاطین حمیر نے ایران کے انتہائی مقامات فتح کر لئے تھے، ذوالقرنین جن کو عوام سکندر کہتے ہیں، اہل عرب کے نزدیک اسی حمیری خاندان کا فرماں روا تھا، شاہنامہ میں مذکور ہے کہ کیکاؤس کو شاہ ہاماوران نے گرفتار کر لیا تھا، علامہ ثعلبی نے تاریخ ایران میں (جو اب یورپ میں چھپ کر شائع ہو گئی ہے) لکھا ہے کہ ہاماوران حمیر کا بادشاہ تھا، اور ہاماوران دراصل وہی عربی حمیر ہے، علامہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ سوداپہ جو کیکاؤس کی زوجہ تھی، اور فردوسی کے بیان کے موافق سیاؤش پر عاشق ہو گئی تھی، اسی حمیری بادشاہ کی بیٹی تھی، اس کا اصلی نام سعدیٰ تھا، ایرانیوں نے اپنے تلفظ میں اس کو سوادبہ کر لیا تھا۔

یورپ کی تحقیقات حال سے بھی سبا اور حمیر کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے، پروفیسر نولدیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے۔

"ولادتِ مسیحؑ سے ہزار سال قبل جنوبی و غربی عرب یعنی یمن جو حمیر اور سبا کا ملک تھا، اور جو اپنی بارش

؎ یہ تمام تفصیل انسائیکلوپیڈیا کے اس آرٹیکل سے ماخوذ ہے، جو جی ڈبلو تھیاچر صاحب نے عرب پر لکھا ہے نیز لٹریری ہسٹری آف دی عربس مولفہ رینالڈ نکلسن پروفیسر کیمبرج ص ۴ تا ۹۔

گرما کے باعث زراعت کے لئے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس رتبہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستایش کو تحریک ہوتی ہے، اور اہل یونان و روم نے اس کو "دولتمند عرب" کا جو لقب دیا تھا، وہ بے جا نہ تھا ...... تورات میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و شوکت کی شہادت دیتی ہیں چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمان سے ملاقات کا قصہ خاص طرح پر قابل ذکر ہے (۱۔ سلاطین ۱۰۔ آیت ۱ تا ۱۰)

قوم ثمود کی عمارات سے ڈاؤتی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا ہے، نیز قوم نابت نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انہی سے حاصل کی ہے۔

کتابت کا فن جو سبائیوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا، اب اس کو خود انھوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا، یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری جانب ابی سینیا تک اس کو پھیلا دیا[1]"

نابتی حکومت، جو شام کے حدود سے متصل تھی، اور جو قوم ثمود کی مرادف یا اُن کی قائم مقام تھی، اس کی نسبت فارسٹر صاحب اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں:

"ان مختصر بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ زمانہ قدیم میں نابت کا نام اور اثر نہ صرف ریگستانی اور صحرائی عرب پر مشتمل تھا بلکہ حجاز و نجد کے صوبہائے عظیمہ پر بھی حاوی تھا، نابتی جہاں ایک طرف منافع تجارت سے بہرہ ہونے میں کمال رکھتے تھے، وہاں دوسری طرف بطور پیچھے بنو اسمٰعیل کے خطرات جنگ کے لئے بالکل مستعد رہتے تھے، فلسطین و شام میں ان کی غارت گریوں اور خلیج عرب میں مصری جہازات پر اُن کی رہزنی نے بارہا تاجداران مقدونیہ کو ان کی دشمنی پر آمادہ کر دیا، لیکن روما کی مجموعی قوت سے پیشتر کوئی شے انھیں روک نہ سکی، اور روما کی اطاعت بھی انھوں نے اسٹرابو کے زمانہ میں بالکل مجبورانہ اور مشتبہ انداز سے قبول کیا[2]"

یہ قدیم سلطنتوں کا حال تھا، اسلام کے قبل یہ تمام سلطنتیں برباد ہو چکی تھیں، اُن کے بجائے یمن میں صرف بڑے بڑے سردار رہ گئے تھے، جن کو قیل یا مقول کہتے تھے، عراق میں آل منذر کا خاندان قائم تھا، جو فارس کے زیر اثر تھے، خورنق اور سدیر عرب کی مشہور عمارتیں اسی سلسلہ کی یادگار ہیں، شام کے حدود میں غسانی خاندان فرمانروا تھا، جو قیصران روم کا ماتحت تھا، اور جس کا اخیر فرمانروا جبلہ بن الایہم غسانی تھا۔

تہذیب و تمدن تہذیب و تمدن کے لحاظ سے عرب کے مختلف حصے بالکل مختلف حالت رکھتے تھے۔ موسیو لیبان[3] فرنساوی نے اصول عمران کی بنا پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کا تمدن کسی زمانہ میں اوج کمال تک

---

[1] مورخین کی تاریخ عالم جلد ۸، یعنی ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ، تمہید از مقالہ نوشتہ پروفیسر نولڈیکی ص ۵۔

[2] تاریخی جغرافیہ عرب از ریورنڈ فارسٹر جلد اول از ص ۲۲۰ تا ۲۲۱

[3] تمدن عرب۔

پہنچ چکا تھا، کیونکہ اصول ارتقاء کے رو سے کوئی قوم محض وحشت کی حالت سے دفعۃً اعلیٰ درجہ کی تہذیب و تمدن تک نہیں پہنچ سکتی۔

یہ ایک قیاسی استدلال ہے، تاریخ سے بھی اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے بعض حصے مثلاً یمن کسی زمانہ میں انتہا درجہ کی ترقی تک پہنچ چکے تھے، یورپ کے محققین آثار قدیمہ جنھوں نے یمن کے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی ہے، اور پرانے کتبوں کو پڑھا ہے، وہ یمن کی قدیم تہذیب و تمدن کا اعتراف کرتے ہیں۔

صنعاء اور قلیس کے ذکر میں یاقوت حموی نے معجم میں قدیم آثارات عجیبہ کا تذکرہ کیا ہے، اور گو اس میں کچھ مبالغہ بھی ہے تاہم اصلیت کا حصہ بھی کچھ کم نہیں۔

اسی طرح عرب کے وہ مقامات جو ایران اور شام سے متصل تھے، مثلاً حیرہ جو آل نعمان کا پایۂ تخت تھا، اور حوران جو خاندان غسان کا صدر مقام تھا، تہذیب و تمدن سے خالی نہ تھے۔

مورخین عرب کا دعویٰ ہے کہ یمن نے ایک زمانہ میں اس حد تک ترقی کی تھی کہ وہاں کے سلاطین نے تمام ایران فتح کر لیا تھا، چنانچہ سمرقند کی وجہ تسمیہ یہ بتلاتے ہیں کہ یمن کا ایک بادشاہ جس کا نام شمر تھا، اس نے سمرقند کو کھدوا کر برباد کر دیا تھا، اس بنا پر ایرانی اس مقدس کو شمر کند کہنے لگے، پھر معرب ہو کر سمرقند ہو گیا۔

عظیم الشان قلعوں اور عمارتوں کے آثار جو اب بھی کچھ کچھ باقی ہیں، اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ اس ملک میں کبھی اعلیٰ درجہ کا تمدن موجود تھا، علامہ ہمدانی نے الاکلیل میں تمام آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ صفۃ جزیرۃ العرب[1] میں لکھتے ہیں۔

المشهور من محافد الیمن وقصورها القدیمة التی ذکرتها العرب فی الشعر والمثل ...... کثیرة الذی فیها من الشعر باب واسع وقد جمع ذالک کله الکتاب الثامن من الاکلیل۔

یمن کے مشہور قدیم قصر اور ایوان جن کا ذکر اہل عرب نے اشعار اور امثال میں کیا ہے...... کثرت سے ہیں، اور ان کے متعلق اشعار کا ایک دفتر ہے، اکلیل کے آٹھویں باب میں ان سب کو جمع کر دیا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے کہ میں اس موقع پر صرف ان کے نام گنا دیتا ہوں، اور وہ یہ ہیں۔

غُمدان، تُلفُم، ناعط، صِرواح، سَلحین، ظَفار، ھَکِر، ضَہر، شِبام، غَیمان، بَینون، رِیام، بُراقش، مَعین، رَوثان، اَریاب، ہِند، ھُنیدہ، عَمران، نُجَیر۔

ان میں سے غمدان اور ناعط کا حال معجم البلدان میں تفصیل سے مذکور ہے، اور اس کی عظمت و رفعت کے متعلق ایسی باتیں نقل کی ہیں، جن پر ایشیائی مبالغہ کا دھوکہ ہوتا ہے، سلحین کی نسبت لکھا ہے کہ ۸۰ برس میں تعمیر ہوا، شبام کے حال میں لکھا ہے:۔

لهم فیها حصون عجیبة هائلة۔

ان میں ان کے متعدد ہیبت انگیز قلعے ہیں،

قلعہ ناعط وہب بن منبہ کے زمانہ تک موجود تھا، اس کے ایک کتبہ کو محدث موصوف نے پڑھا تو معلوم ہوا

---

[1] ج ۱ ص ۲۰۲، ۲۰۳ تن۔

کہ سولہ سو برس کی تعمیر ہے۔ آج کل یورپ کے محققین نے ان مقامات میں جا کر جو تحقیقات کی ہے اس سے بھی حیرت انگیز تمدن کی تصدیق ہوتی ہے، تھیاچر صاحب اپنے آرٹیکل میں لکھتے ہیں:[1]

> "جنوبی عربستان میں جہاں حضرت عیسیٰؑ سے صدیوں پہلے ایک ترقی یافتہ تمدن موجود تھا، قلعوں اور شہر پناہوں کے آثار اب تک موجود ہیں، اور ان کا ذکر متعدد سیاحوں نے کیا ہے…… یمن اور حضرموت میں یہ آثار کثرت سے ہیں، اور اکثر پر اب تک کتبے موجود ہیں، صنعا کے قریب ایک قلعہ تھا، جس کو قزوینی نے آثار البلاد میں دنیا کے عجائب ہفت گانہ میں سے ایک قرار دیا ہے دیگر قلعوں کے لئے دیکھو جرنل جرمن اورنٹیل سوسائٹی جلد ۱ صفحہ ۲۰ سے آگے، مآرب جو قدیم سبائی دارالسلطنت تھا، اس کے آثار قدیمہ کو ارنو، ہالیوے اور گلاذر نے دیکھا ہے۔
>
> مآرب کے مشہور آثار میں سے ایک بڑی خندق کے آثار باقی ہیں، ان کو دیکھ کر مدان کے دوبارہ تعمیر شدہ حوض یاد آتے ہیں، ان کی اہمیت اس وقت ظاہر ہوئی، جب گلاذر نے وہ دو طویل الذیل کتبے شائع کئے جن میں ان کے عیسوی قرن پنجم و ششم میں دوبارہ تعمیر کا ذکر ہے، یمن میں بمقام حران ایک اور خندق ہے جس کا طول تقریباً چار سو پچاس فٹ ہے۔"

لیکن عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات میں تہذیب و تمدن کی یہ حالت نہ تھی، عربی زبان نہایت وسیع ہے، باوجود اس کے جن چیزوں کو تمدن اور اسباب معاشرت سے تعلق ہے، ان کے لئے خاص عربی زبان میں الفاظ نہیں ملتے بلکہ ایران یا روم سے مستعار آئے ہیں، سکہ کے لئے ایک لفظ بھی موجود نہیں، درہم اور دینار دونوں غیر زبان کے الفاظ ہیں، درہم یونانی لفظ درخم ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو انگریزی میں ڈرام ہو گیا، چراغ معمولی چیز ہے: تاہم اس کے لئے عربی میں کوئی لفظ نہ تھا، چراغ کو لے کر سراج کر لیا، پھر ایک مصنوعی لفظ بنایا، مصباح یعنی ایک آلہ ہے جس سے صبح بنائی جاتی ہے، کوزہ کے لئے کوئی لفظ نہیں، کوزہ کو کوز کر لیا ہے، لوٹے کو ابریق کہتے ہیں، جو آب ریز کا معرب ہے، تشت فارسی لفظ تھا، اسی کو عربی میں طست کر لیا ہے، پیالہ کو کاس کہتے ہیں، وہی کاسہ فارسی لفظ ہے کرتہ کو عربی میں قرطق کہتے ہیں، یہ بھی فارسی ہے، پاجامہ کو سروال کہتے ہیں جو شلوار کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جب ایسی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے لفظ نہ تھے، تو تمدن کے بڑے بڑے سامان کے لئے کہاں سے لفظ آتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب نے کسی زمانہ میں جو ترقی کی تھی آس پاس کے ممالک کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر کی تھی، اس لئے جو مقامات ان ممالک سے دور تھے، اسی اصلی حالت پر رہ گئے۔

احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، مسئلہ حجاب کے شان نزول میں بخاری وغیرہ میں مذکور ہے کہ اس زمانہ تک گھروں میں جائے ضرور[2] نہ تھی، مستورات رفع حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں، ترمذی باب الفقر میں ہے کہ اس وقت تک چھلنیاں نہ تھیں، جو کو پھونک کر اڑاتے تھے جو رہ جاتا تھا وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی ایک حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا مضمون "عرب"، [2] بیت الخلاء، لیٹرین۔

گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، ابوداؤد میں ایک صحابی کی روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں تھا، لیکن میں نے آپ سے حشرات الارض[1] کا حرام ہونا نہیں سنا[2]، اگرچہ اس حدیث کی شرح میں محدثین لکھتے ہیں کہ ایک راوی کے نہ سننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حشرات الارض کی حرمت نہیں بیان کی، لیکن اس سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب حشرات الارض کھاتے تھے، تاریخ اور ادب میں بتصریح موجود ہے کہ عرب کھنکھجورا، گوہ، گرگٹ، اسی اور جانوروں کا چمڑا کھاتے تھے۔

عرب کے مذاہب عرب میں اسلام سے پہلے مختلف مذاہب تھے، بعضوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے زمانہ یا فطرت (قانونِ قدرت) ہے، خدا کوئی چیز نہیں، ان ہی لوگوں کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ-۳)	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے ہماری دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو مارتا ہے تو زمانہ مارتا ہے۔

بعض خدا کے قائل تھے، لیکن قیامت اور جزا و سزا کے منکر تھے، اُن کے مقابلہ میں قرآن مجید نے قیامت کے ثبوت پر اس طرح استدلال کیا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ (یٰسٓ-۵)	کہہ دو کہ (ہڈیوں کو، وہی دوبارہ زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا۔

بعض خدا اور جزا و سزا کے بھی قائل تھے لیکن نبوت کے منکر تھے۔ ان کا ذکر اس آیت میں ہے۔

وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ (الفرقان-۱)	اور کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھاتا پیتا اور بازار میں چلتا پھرتا ہے۔
قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل-۱۱)	کہتے ہیں کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟

ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے تو اس کو فرشتہ ہونا چاہیے جو حاجات انسانی سے منزہ ہو، لیکن عموماً لوگ بت پرست تھے، وہ بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کہتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کے وسیلے ہیں[3]۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (زمر-۱)	ہم ان بتوں کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں۔

قبیلہ حمیر جو یمن میں رہتا تھا، آفتاب پرست تھا، کنانہ چاند کو پوجتے تھے، قبیلہ بنی تمیم دبران کی عبادت کرتا تھا، اسی طرح قیس، شعریٰ کی، قبیلہ اسد عطارد کی، اور لخم و جذام مشتری کی پرستش کرتے تھے۔ مشہور بتوں اور اُن کے پوجنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

---

[1] حشرات الارض کیڑے مکوڑے کو کہتے ہیں۔

[2] ابوداؤد جلد دوم صفحہ ۱۷۱، باب فی اکل حشرات الارض۔

[3] یہ تمام تفصیل "ملل ونحل" شہرستانی میں مذاہب عرب کے ذکر میں ہے۔

نام بُت	مقام	قبیلہ جو اس بُت کو پوجتے تھے۔
لات۔	طائف۔	ثقیف۔
عُزّیٰ۔	مکۂ معظمہ۔	قریش و کنانہ۔
منات۔	مدینہ منورہ۔	اوس، خزرج اور غسان۔
ودّ۔	دومۃ الجندل۔	کلب۔
سُواع۔		ہذیل۔
یغوث۔		مذحج اور قبائلِ یمن۔
یعوق۔		ہمدان۔

سب سے بڑا بُت ہُبل تھا، جو کعبہ کی چھت پر منصوب تھا، قریش لڑائیوں میں اُس کی جے پکارتے تھے۔

عرب میں بُت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لُحَیّ تھا، اس کا اصلی نام ربیعہ ابن حارثہ تھا، عرب کا مشہور قبیلہ خزاعہ اسی کی نسل سے ہے، عمرو سے پہلے جرہم کعبہ کے متولی تھے، عمرو نے لڑ کر جرہم کو مکہ سے نکال دیا اور خود حرم کا متولی ہوگیا، وہ ایک دفعہ شام کے کسی شہر میں گیا، وہاں کے لوگوں کو بُت پوجتے دیکھا، تو پوچھا کہ اُن کو کیوں پوجتے ہو، انھوں نے کہا یہ حاجت روا ہیں، لڑائیوں میں فتح دلاتے ہیں، قحط پڑتا ہے تو پانی برساتے ہیں، عمرو نے چند بُت اُن سے لے لئے اور لا کر کعبہ کے آس پاس قائم کئے، کعبہ چونکہ عرب کا مرکز تھا، اس لئے تمام قبائل میں بُت پرستی کا رواج ہوگیا، ان میں سب سے قدیم بُت مناۃ تھا، یہ سمندر کے کنارے قدید کے قریب نصب تھا، اوس اور خزرج یعنی مدینہ کے لوگ اسی پر قربانی چڑھاتے تھے، اور جب کعبہ کا حج کر کے آتے تھے تو احرام یہیں اتارتے تھے، ہذیل اور خزاعہ بھی اس کی پرستش کرتے تھے[1]۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان (ذکر مکہ) میں لکھا ہے کہ عرب میں بت پرستی کی عام اشاعت کی وجہ یہ ہوئی کہ قبائلِ عرب جو تمام اطراف سے حج کو آتے تھے، واپس جاتے ہوئے حرم کے پتھروں کو اٹھا لیتے تھے، اور ان کو اصنامِ کعبہ کی صورت پر تراش کر اُن کی عبادت کرتے تھے۔

اللہ کا اعتقاد عرب گو قریباً سب کے سب بت پرست تھے، لیکن اس کے ساتھ یہ اعتقاد ان کے دل سے کبھی نہیں گیا، کہ اصلی خدائے برتر اور چیز ہے، اور وہی تمام عالم کا خالق ہے، اس خالقِ اکبر کو وہ اللہ کہتے تھے قرآن مجید میں ہے:-

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ (عنکبوت - ۶)	اور ان لوگوں (کافروں) سے تو پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا، اور چاند اور سورج کو کس نے تابعدار بنا رکھا ہے تو بول اٹھیں گے کہ اللہ پھر کدھر بہکے جا رہے ہیں

---

[1] یہ تمام تفصیل معجم البلدان ذکر منات میں ہے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ یُشْرِكُوْنَ (عنکبوت ۷)

پھر جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب خدا ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف پہنچا دیتا ہے تو شرک کرنے لگتے ہیں۔

قرآن مجید نے تیرہ سو برس پہلے جس حقیقت کا اظہار کیا، آج تحقیقاتِ آثارِ قدیمہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، مذاہب و اخلاق کی انسائیکلو پیڈیا[1] میں مشہور مستشرق نولدیکی کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

> "اللہ" جو صفا کے کتبوں میں "ھلہ" لکھا ہوا ہے، نباتی اور دیگر قدیم باشندگان عرب شمالی کے نام کا ایک جزء تھا مثلاً "زید اللہی"..... نباتی کتبات میں اللہ کا نام بطور ایک علیحدہ معبود کے نہیں ملتا، لیکن صفا کے کتبات میں ملتا ہے، متاخرین مشرکین میں اللہ کا نام نہایت عام ہے، ولہاسن نے عرب قدیم کے لٹریچر میں بہت سی عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں اللہ کا لفظ بطور ایک معبود اعظم کے مستعمل ہوا ہے، نباتی کتبات میں ہم بار بار کسی دیوتا کا نام پاتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا لقب شامل ہے، اس سے ولہاسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ کا لقب جو پہلے مختلف معبودوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، رفتہ رفتہ زمانہ مابعد میں صرف ایک عظیم ترین معبود کے لئے بطور علم کے مخصوص ہو گیا۔"

نصرانیت اور یہودیت اور مجوسیت اگرچہ زمانہ اور مدت کا تعین مشکل ہے، لیکن یہ تینوں مذہب ایک مدت دراز سے عرب میں رائج ہو چکے تھے، علامہ ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ قبائل ربیعہ و غسان نصرانی تھے، قضاعہ میں بھی اس مذہب کا اثر پایا جاتا تھا، نصرانیت کو اس قدر ترقی ہو چکی تھی کہ خود مکہ معظمہ میں ایسے لوگ موجود تھے مثلاً ورقہ بن نوفل، جو عبرانی زبان میں انجیل کو پڑھ سکتے تھے، متعدد ایسے لوگ تھے جنھوں نے شام میں جا کر تعلیم پائی تھی۔

حمیر، بنو کنانہ، بنو حرث بن کعب، کندہ، یہ قبائل یہودی تھے، مدینہ منورہ میں یہود نے پورا غلبہ پا لیا تھا اور تورات کی تعلیم کے لئے متعدد درسگاہیں قائم تھیں، جن کو بیت المدارس کہتے تھے، حدیث کی کتابوں میں اسی نام سے ان کا ذکر آتا ہے، قلعہ خیبر کی تمام آبادی یہودی تھی، امرء القیس کا ہم عصر مشہور شاعر سموئل بن عادیا جس کی وفاداری آج تک عرب میں ضرب المثل ہے، یہودی تھا۔

اہل کتاب کی روایتیں مکہ معظمہ میں اس قدر رواج پا چکی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تھا، اور اس میں بنی اسرائیل کے واقعات مذکور ہوتے تھے، تو کفار بدگمانی کرتے تھے، کہ کوئی یہودی یا عیسائی آپ کو سکھاتا ہے، خود قرآن مجید میں ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (نحل ۱۴)

اور ہم جانتے ہیں کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ محمد کو کوئی آدمی سکھاتا ہے۔

قرآن مجید میں اس خیال کا ابطال بھی کر دیا ہے جس کی تفصیل مناسب وقت پر آئے گی۔

قبیلہ تمیم مجوسی تھا، زرارہ تمیمی نے جو اس قبیلہ کا مشہور رئیس تھا، اسی بنا پر اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔

---

[1] ج ۱ ص ۶۶۳۔

گو اس پر اس کو ندامت ہوئی، اقرع بن حابس بھی مجوسی[1] تھا۔

مذہب حنیفی دین ابراہیمی کا ام الاصول توحید خالص تھی زمانہ کے امتداد اور جہالت کے شیوع سے یہ اصول اگرچہ شرک آلود ہو گیا تھا، یہاں تک کہ خود خانۂ خدا میں بتوں کی پرستش ہوتی تھی، تاہم بالکل فنا نہیں ہو سکتا تھا، عرب میں کہیں کہیں اس کا دھندلا سا نشان نظر آتا تھا، جو لوگ صاحب بصیرت تھے، ان کو یہ منظر نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتا تھا کہ انسان عاقل، جماد لایعقل کے سامنے سر جھکائے، اس بناء پر بت پرستی کی برائی کا خیال بہتوں کے دل میں آیا، لیکن اس کا تاریخی زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی پہلے شروع ہوتا ہے۔ ابن اسحاق[2] نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ کسی بت کے سالانہ میلہ میں ورقہ ابن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے، ان لوگوں کے دل میں دفعۃً یہ خیال آیا کہ یہ کیا بے ہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں، جو نہ سنتا ہے، نہ دیکھتا ہے، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ چاروں قریش کے خاندان سے تھے ورقہ حضرت خدیجہؓ کے برادر عم زاد تھے، زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے، عبداللہ بن جحش حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے عثمان عبدالعزیٰ کے پوتے تھے۔

زید دین ابراہیمی کی تلاش میں شام گئے، وہاں یہودی اور عیسائی پادریوں سے ملے، لیکن کسی سے تسلی نہیں ہوئی، اس لئے اس اجمالی اعتقاد پر اکتفا کیا کہ میں ابراہیم کا مذہب قبول کرتا ہوں، صحیح بخاری میں (باب بنیان الکعبہ سے پہلے) حضرت اسماءؓ (دختر حضرت ابوبکر صدیقؓ) سے روایت ہے کہ میں نے زید کو اس حالت میں دیکھا کہ کعبہ سے پیٹھ لگائے لوگوں سے کہتے تھے، اے اہل قریش، تم میں سے کوئی شخص بجز میرے، ابراہیم کے دین پر نہیں ہے۔

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، زید ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس رسم کی مخالفت کی، جب کوئی شخص ایسا ارادہ کرتا تو وہ جا کر اس لڑکی کو مانگ لیتے، اور خود اس کی پرورش کرتے۔

صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے زید کو دیکھا تھا اور ان سے صحبت رہی تھی، ورقہ اور عبداللہ بن جحش اور عثمان بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ کے قریب امیہ بن ابی صلت نے جو طائف کا رئیس اور مشہور شاعر تھا، بت پرستی کی مخالفت کی، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں زبیر بن بکار کی سند سے لکھا ہے کہ امیہ نے زمانہ جاہلیت میں آسمانی کتابیں پڑھی تھیں اور بت پرستی چھوڑ کر دین ابراہیمی اختیار کر لیا تھا۔

امیہ کا دیوان آج بھی موجود ہے، اگرچہ اس کا بڑا حصہ جعلی ہے، تاہم اصلی کلام بھی اس میں پایا جاتا ہے، وہ غزوۂ بدر تک زندہ رہا، عتبہ جو رئیس مکہ اور امیر معاویہؓ کا نانا تھا، امیہ کا ماموں زاد بھائی تھا، امیہ نے اس کے قتل کی خبر سنی تو اس کو سخت صدمہ ہوا، اور نہایت پُر درد مرثیہ لکھا، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اسلام قبول نہ کر سکا۔

شمائل میں ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ردیف تھے، انھوں نے امیہ کا ایک

---

[1] معارف ابن قتیبہ [2] سیرت ابن ہشام مطبوعہ مصر ص ۷۶۔

شعر پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور" انھوں نے سو شعر پڑھے، ہر شعر کے ختم ہونے پر آپ فرماتے جاتے تھے کہ "اور" اخیر میں آپ نے فرمایا کہ "امیہ مسلمان ہوتے ہوتے رہ گیا"۔

ابن ہشام نے بُت پرستی کی مخالفت کرنے والوں میں انہی چاروں کا نام لکھا ہے، لیکن اور تاریخی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اور متعدد اہلِ نظر پیدا ہو گئے تھے، جنھوں نے بُت پرستی سے توبہ کی تھی، ان میں سب سے زیادہ مشہور شخص عرب کا نامور خطیب قس بن ساعدۃ الایادی ہے، اس کا تذکرہ آگے آتا ہے، ایک شخص قیس بن نشبہ تھا، جس کی نسبت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں خدا پرست ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

یہ تحقیق نہیں کہ دینِ ابراہیمی کو دینِ حنیفی کیوں کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں یہ لفظ موجود ہے، لیکن اس کے معنی میں اختلاف ہے، مفسرین لکھتے ہیں کہ چونکہ اس دینِ فطرت میں بُت پرستی سے انحراف تھا اس لئے اس کو حنیفی کہتے ہیں کیونکہ حنف کے معنی انحراف کے ہیں، عبرانی اور سریانی زبان میں حنیف کے معنی منافق اور کافر کے ہیں، ممکن ہے کہ بُت پرستوں نے یہ لقب دیا ہو اور موحدین نے فخریہ قبول کر لیا ہو۔

یہ امر اکثر روایتوں سے ثابت ہے کہ عرب اور خصوصاً مکہ اور مدینہ میں متعدد اشخاص بُت پرستی کے منکر ہو گئے تھے، اور ملتِ ابراہیمی کی جستجو میں تھے، یہ اس لئے کہ مجددِ ملتِ ابراہیمی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا تھا۔

ان چند راہ طلب اور حقیقت جو اشخاص کے وجود کی بنا پر مصنفین یورپ کہتے ہیں کہ مذہب صحیح اور توحید خالص کا رواج عام عرب میں اسلام سے پہلے بھی موجود تھا، لیکن اگر یہ صحیح ہے تو یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اسلام کے ظہور پر اس قدر کیوں ہنگامہ برپا ہوا۔

کیا عرب میں ان مذاہب نے کچھ اصلاح کی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، عرب میں تمام مشہور مذاہب موجود تھے، یہودیت بھی نصرانیت بھی، مجوسیت بھی، حنیفیت بھی، اور عقلی بلند پروازی کی معراج الحاد بھی، لیکن ان سب کا نتیجہ کیا تھا عقائد کے لحاظ سے یا تو خداؤں کی وہ کثرت جس کو نصرانیت نے بہت گھٹایا، تاہم تین کی تعداد سے کم نہ کر سکی اس کے ساتھ یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ خود سولی پر چڑھ کر تمام بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ بن گئے یا توحید تھی لیکن خدا اس قسم کا تھا جو آدمیوں سے کشتی لڑتا تھا[1]۔

بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہ تھی، قمار بازی، شراب خوری، زنا کاری کا رواج عام تھا بے حیائی کی یہ حالت کہ سب سے بڑا نامور شاعر امراء القیس جو شہزادہ بھی تھا قصیدہ میں اپنی پھوپھی زاد بہن کے ساتھ اپنی بدکاری کا قصہ مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اور یہ قصیدہ کعبہ پر آویزاں کیا جاتا ہے۔

لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہِ تیغ کرنا عموماً جائز

---

[1] یہ مارگولیوس کا بیان ہے لہ توراۃ تکوین آیت ۲۲ تا ۱۹ میں حضرت یعقوب کے خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل سے مذکور ہے۔

تھا عیسائیوں کے بیان کے مطابق عرب قبل اسلام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ عیسائیت سے متاثر تھا۔ تاہم اس اثر کا کیا نتیجہ تھا؟ اس کو خود عیسائی مورخین کی زبانی سے سننا چاہیئے۔ ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے:۔

> "عیسائیوں نے عرب کو پانچ سو برس تبشیر و تلقین کی، اس پر بھی خال خال عیسائی نظر آتے تھے یعنی بنو حارث نجران میں، بنو حنیف یمامہ میں اور کچھ بنی طے میں عیسائی تھے، باقی خیریت ..... بالآخر عرب کو حیث المذہب دیکھیے، تو اس کی سطح پر عیسائیوں کی ضعیف کوششوں کی کچھ خفیف سی موجیں لہراتی نظر آتی تھیں، اور یہود کی قوت بھی کبھی بڑی شدت سے طغیانی کرتی نظر آتی تھی، لیکن بت پرستی اور بنو اسماعیل کے بیہودہ اعتقادات کا دریا ہر سمت سے جوش مارتا ہوا کعبہ سے آکر ٹکراتا تھا"[1]

یہ حالت صرف عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ تمام دنیا میں یہی تاریکی چھائی ہوئی تھی (اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں آئے گی) کیا اس عام ظلمت، اس عالمگیر تیرگی، اس وسیع اور ہمہ گیر تاریکی میں ایک آفتاب عالمتاب کی حاجت نہ تھی۔

⁂

---

[1] میور صاحب کی لائف آف محمد جلد ۱۔ دیباچہ۔

سلسلۂ اسماعیلی

یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ مورخین عرب نے عرب کی تین قسمیں کی ہیں۔

عرب کی وہ قدیم قومیں جو بالکل برباد ہو گئیں مثلاً طسم وجدیس وغیرہ۔

خالص عرب جو قحطان کی اولاد ہیں مثلاً اہل یمن اور انصار اور تیسرا سلسلۂ اسماعیلی۔

حضرت اسمٰعیلؑ جب مکہ میں آباد ہوئے تو حوالی مکہ میں بنو جرہم آباد تھے، حضرت اسمٰعیلؑ نے اس خاندان میں شادی کی، اس سے جو اولاد ہوئی وہ عرب مستعربہ کہلاتی ہے، اب عرب کا بڑا حصہ اسی خاندان سے ہے۔

پیغمبر اسلام اور خود اسلام کی تاریخ تمام تر اسی اخیر سلسلہ سے وابستہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ ہی کے خاندان سے ہیں اور جو شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت ہوئی، وہی ہے جو حضرت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی تھی قرآن مجید میں ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا (حج، ع ۱۰)	تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب، اُسی نے اس سے پہلے تمہارا نام مسلم رکھا (اور اس قرآن میں بھی)

لیکن یورپ کے بہت سے متعصب مورخ سرے سے ان حقائق کے منکر ہیں یعنی نہ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ عرب میں آئے نہ انھوں نے کعبہ کی بنیاد ڈالی، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہیں۔

چونکہ ان مباحث نے مذہبی تعصب کی صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ توقع مشکل ہے کہ ہم اس بحث کو اس طرح طے کر سکیں گے کہ استدلال کی بنیاد یورپ کے مسلمات پر رکھی جائے۔

جو واقعات مختلف فیہ ہیں، بہت ہیں، لیکن اصولی امور صرف دو ہیں، جن میں دونوں فریق کا کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتا، یہ اصول جس فریق کے موافق طے ہوں اس کے فرعی جزئیات بھی اسی کے موافق تسلیم کر لینے چاہئیں اصول مذکورہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ عرب میں آکر آباد ہوئے یا نہیں؟

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو قربانی کرنا چاہا تھا یا حضرت اسمٰعیلؑ کو؟

حضرت اسمٰعیلؑ کہاں آباد ہوئے

یہود مدعی ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح ہیں، اس بنا پر وہ قربانی گاہ کا موقع شام بتاتے ہیں، لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسحٰقؑ نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ تھے تو قربانی گاہ کے موقع کی نسبت عرب ہی کی روایتیں تسلیم کرنی پڑیں گی، اور اس حالت میں تاریخ کی تمام کڑیاں متصل ہو جائیں گی۔

توراۃ میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اولاد حضرت ہاجرہ کے بطن سے ہوئی جس کا نام اسمٰعیلؑ رکھا گیا، حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے، حضرت اسمٰعیلؑ جب بڑے ہوئے تو حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ گستاخی کرتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ ہاجرہ اور اس کے

---

[۱] اس کا مرجع بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے اور بعض نے اللہ تعالیٰ کو اور یہی صحیح ہے جیسا کہ آیات سے صاف ظاہر ہے

بیٹے کو گھر سے نکال دو، ان واقعات کے بعد تورات کے خاص الفاظ یہ ہیں :-

> تب ابراہیمؑ نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہؑ کے کاندھے پر دھرا اور اس لڑکے کو بھی رخصت کیا، وہ روانہ ہوئی، بیر سبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اس نے اس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا، اور آپ اسکے سامنے ایک تیر کے پٹے پر دور جا کر بیٹھی کیونکہ اس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں، سو وہ سامنے بیٹھی اور چلا چلا کر روئی، تب خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا، اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے، خدا نے سنی اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا، اور جا کر اپنی مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا، اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا، اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا، اور وہ فاران کے بیابان میں رہا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے ایک عورت بیاہنے کو لی۔ (توراۃ سفر پیدائش باب ۲۱)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ جب گھر سے نکالے گئے تو بالکل بچہ تھے، چنانچہ حضرت ہاجرہؑ نے مشک کو اور ان کو کاندھے پر اٹھایا، عربی توراۃ میں صاف یہ الفاظ ہیں۔

واضعًا ایاھا علی کتفھا والولد۔

حضرت ابراہیمؑ نے مشک اور بچہ دونوں کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھا۔

لیکن تورات میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی تھی، اور جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کا ختنہ کیا تو حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر ۱۳ برس کی اور حضرت ابراہیمؑ کی ننانوے برس کی تھی[1] یہ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے گھر سے نکالے جانے کا واقعہ ختنہ کے بعد کا ہوگا اس لئے اس وقت قطعًا ان کی عمر ۱۳ برس سے زیادہ تھی اور اس سن کا لڑکا اتنا چھوٹا نہیں ہوتا کہ ماں اسے کندھے پر اٹھائے پھرے، اس واقعہ سے غرض یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر اس وقت اتنی ہو چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ ان کو اور ان کی والدہ کو اصلی مقام سکونت سے کسی اور مقام پر لا کر آباد کر سکتے تھے۔

تورات کی عبارت مذکورہ میں تصریح ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ فاران میں رہے اور تیر اندازی کرتے رہے، عیسائی کہتے ہیں کہ فاران اس صحرا کا نام ہے جو فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، اس لئے حضرت اسمٰعیلؑ کا عرب میں آنا خلاف واقعہ ہے جغرافیہ دانان عرب عمومًا متفق ہیں کہ فاران حجاز کے پہاڑ کا نام ہے، چنانچہ معجم البلدان میں صاف تصریح ہے لیکن عیسائی مصنفین اس سے اتفاق نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ ایک بڑی طول طویل بحث پر مبنی ہے جو مباحثہ اور مناظرہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس لئے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں، البتہ اس قدر بتانا ضروری ہے کہ عرب کی حد شمالی کسی زمانہ میں کس حد تک وسیع تھی۔

موسیو لیبان، تمدن عرب میں لکھتے ہیں۔

---

[1] پیدائش باب ۱۷، ۲۴-۲۵

"اس جزیرے کی حد شمالی اس قدر صاف اور آسان نہیں ہے یعنی یہ حد اس طرح پر قائم ہوتی ہے کہ غزہ سے جو فلسطین کا ایک شہر اور بحر متوسط پر واقع ہے، ایک خط جنوب بحر لوط تک کھینچا جائے اور وہاں سے دمشق اور دمشق سے دریائے فرات تک، اور دریائے فرات کے کنارے کنارے لا کر خلیج فارس میں ملا دیا جائے، پس اس خط کو عربستان کی حد شمالی کہہ سکتے ہیں۔

اس بنا پر عرب کے حجازی حصہ کا فاران میں محسوب ہونا خلاف قیاس نہیں، توراۃ میں جہاں حضرت اسماعیل کی جائے سکونت کا بیان ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں:۔

"اور وہ حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے جس سے سور کو جاتے ہیں، بستے تھے۔"[1]

اس تحدید میں مصر کے سامنے جو زمین پڑتی ہے وہ عرب ہی ہو سکتا ہے، نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں جس قدر اعتنا ہے، بنو اسرائیل کے ساتھ ہے، بنی اسمٰعیل کا ذکر محض ضمنی طور پر آجاتا ہے، اور اس وجہ سے حضرت اسمٰعیل کا عرب میں آباد ہونا بہ تصریح نہیں ملتا، لیکن مختلف تلمیحات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کا عرب میں آباد ہونا ایک مسلّم امر تھا، عہد جدید میں جس کو عیسائی وحی الٰہی سمجھتے ہیں، پولوس کا ایک خط گلیتون کے نام ہے، اس میں یہ عبارت ہے۔

"ابراہیم کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی سے، دوسرا آزاد سے پر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا سو وعدے کے طور پر یہ باتیں تمثیل بھی مانی جاتی ہے، اس لئے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ سے جو ہوا دہ نرے غلام جنتی ہے، یہ ہاجرہ ہے، کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے۔"[2]

اگرچہ معلوم نہیں کہ اصلی عبارت کیا تھی، اُردو اور عربی دونوں ترجمے ناصاف ہیں، تاہم اس قدر واضح ہے کہ پولوس جو حضرت عیسیٰؑ کے سب سے بڑے جانشین ہیں، حضرت ہاجرہؑ کو عرب کا کوہ سینا کہتے تھے، اگر حضرت ہاجرہ عرب میں آباد نہ ہوئی ہوتیں تو ان کو عرب کا کوہ سینا کہنا کیا معنی رکھتا ہے آگے چل کر مکہ کے ذکر میں یہ بحث زیادہ مؤید ہو جائے گی۔

ذبیح کون ہے؟

توراۃ اگرچہ یہودیوں کی عدم احتیاط، اغراض ذاتی اور زمانہ کے انقلابات سے سرتاپا مسخ ہو گئی ہے اور خصوصاً پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس میں جو تصریحات اور تلمیحات تھیں، یہود کے دست تصرف نے ان کو بالکل برباد کر دیا ہے، تاہم حقائق کے عناصر اب بھی ہر جگہ موجود ہیں، توراۃ میں گو تصریحاً حضرت اسحاقؑ کا ذبیح ہونا لکھا ہے لیکن مطاوی کلام میں اس بات کے قطعی دلائل موجود ہیں کہ وہ ہرگز ذبیح نہ تھے، اور نہ ہو سکتے تھے، امور ذیل کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

۱۔ شریعت سابقہ کے رو سے قربانی صرف اُس جانور یا آدمی کی ہو سکتی تھی، جو پہلوٹا بچہ ہو، اسی بنا پر ہابیل نے جن مینڈھوں کی قربانی کی تھی، وہ پہلونٹے بچے تھے۔

خدا نے حضرت موسیٰؑ سے جہاں لاویوں کے متعلق احکام ارشاد فرمائے وہاں فرمایا ہے۔

ان لی کل بکر فی بنی اسرائیل من الناس   کیونکہ بنو اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹا بچہ

---

[1] سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ [2] باب ۴ آیت ۲۴۔

والبهائم۔

میرے لئے ہے (عدد ۸-۱۷)

۲۔ پہلوٹھے بچہ کی افضلیت کسی حالت میں زائل نہیں ہو سکتی، تورات میں ہے کہ اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ ہو اور دوسری غیر مرغوبہ، تو فضیلت اسی اولاد کو ہوگی جو پہلوٹھی ہو، گو وہ غیر مرغوبہ سے ہو۔

فانه اول قدرته وله حق البكورية۔
(سفر تثنیہ، اصحاح ۲۱ آیت ۱۵ و ۱۷)

کیونکہ وہ اس کی پہلی قدرت ہے، اور اسی کو اولاد اولین ہونے کا حق ہے۔

۳۔ جو اولاد خدا کو نذر کر دی جاتی تھی، اس کو باپ کا ترکہ نہیں ملتا تھا، تورات میں ہے۔

فی ذلك الوقت افرز الرب سبط لاوی ليحملوا تابوت عهد الرب ولكی يقفوا امام الرب ليخدموه ويباركوا باسمه الى هذا اليوم لاجل ذلك لم يكن للاوی قسم ولا نصيب مع اخوته الرب هو نصيبه (توراۃ، اصحاح ۱۰۔ آیت ۸ و ۹)

تب خدا نے لاوی کی اولاد کو اس لئے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تا کہ خدا کے آگے کھڑا ہو تا کہ وہ خدا کی خدمت کریں اور اس کے نام سے آج تک برکت لیں، یہی وجہ ہے کہ لاویوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترکہ نہیں ملا، کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔

۴۔ جو شخص خدا کی نذر کر دیا جاتا تھا، وہ سر کے بال چھوڑ دیتا تھا اور معبد کے پاس جا کر منڈاتا تھا، جس طرح آج حج میں احرام کھولنے کے وقت بال منڈاتے ہیں، تورات میں ہے۔

فها انك تحبلين وتلدين ابنا ولا يعلو موسى راسه لان الصبی يكون نذيرا لله (توراۃ، قضاۃ، اصحاح ۱۳-۵)

اب تو حاملہ ہوگی اور بچہ جنے گی اور اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے کیونکہ یہ بچہ خدا کے لئے نذر کیا جائے گا۔

۵۔ جو شخص خدا کو خادم بنایا جاتا تھا، اس کے لئے خدا کے سامنے کا لفظ استعمال کرتے تھے (تورات سفر عدد ۱۶-۹ و ۲۰ و سفر تکوین ۱۸ و تثنیہ ۱۰-۸)

۶۔ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس میں قید تھی کہ وہ بیٹا قربان کیا جائے جو اکلوتا ہو، اور محبوب ہو (توراۃ تکوین، اصحاح ۲۲ آیت ۱)

اب اصل مسئلہ پر غور کرو، لیکن پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں قربانی کرنا، اور خدا پر نذر چڑھانا ایک بات تھی یعنی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ بچہ کو فلاں معبد میں قربانی چڑھا دو، تو اس کے یہ معنی تھے کہ وہ اس معبد کی خدمت اور مجاورت کے لئے گھر سے الگ کر دیا جائے، لیکن یہ لفظ جب جانوروں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا تو حقیقی قربانی کے معنی مراد ہوتے تھے، تورات میں خدا کی زبان سے مذکور ہے۔

لان لی كل بكر فی بنی اسرائيل من الناس والبهائم (عدد اصحاح ۸-۱۷)

کیونکہ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا ہر پہلوٹھا بچہ میرے لئے ہے۔

اسی اصحاح میں تصریح کے ساتھ مذکور ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ تو بنی اسرائیل میں سے لاویوں کو، ان کو خدا کے سامنے پیش کر کہ خدا کے لئے خاص کر دیئے جائیں، اور یہ لوگ ان لاویوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیں جو

قربانی کی جائیں (اختصارًا)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں بیٹے کی قربانی کا جو حکم ہوا تھا، اس سے بھی یہی مراد تھی کہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اس خواب کو عینی اور حقیقی سمجھا اور اس لئے بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی لیکن بعد میں ظاہر ہوا کہ وہ تمثیلی خواب تھا، اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو خانۂ خدا کی خدمت کے لئے خاص کر دیا، اور جو شرطیں قربانی کی تھیں قائم رکھیں۔

بیان مذکورۂ بالا کے ذہن نشین کرنے کے بعد دلائل ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) حضرت اسحاقؑ کی ولادت حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد ہے، اس بنا پر حضرت اسحاقؑ اکلوتے بیٹے نہیں اور چونکہ قربانی کے لئے اکلوتے بیٹے کی شرط ہے، اس لئے حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا حکم نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲) حضرت اسحٰقؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا تمام ترکہ دیا، بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ کو صرف پانی کی ایک مشک دے کر رخصت کیا، یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسحٰقؑ کو قربانی یعنی معبد پر نذر نہیں چڑھایا تھا

(۳) حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان میں مدت تک یہ رسم قائم رہی کہ لوگ سر کے بال نہیں منڈاتے تھے، حج میں احرام کے زمانہ تک جو بال نہیں منڈاتے، یہ اسی سنتِ اسماعیلی کی یادگار ہے۔

(۴) جو الفاظ قربانی اور نذر چڑھانے کے لئے ملت ابراہیمی میں استعمال کئے جاتے تھے، وہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے لئے استعمال کئے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ کے لئے، تورات میں ہے کہ جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔

لیت اسمٰعیل یعیش امامک۔ کاش اسماعیل تیرے سامنے زندہ رہتا۔

تورات میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (سامنے زندہ رہنا) انہی معنوں میں ہوا ہے۔

(۵) حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کی محبوب ترین اولاد تھے، تورات جو تمام تر حضرت اسحٰقؑ کی یکطرفہ داستان ہے، اس میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے جو امتیازی خصائص بیان کئے ہیں یہ ہیں کہ حضرت اسحٰقؑ خدا کے وعدہ اور عہد کا مظہر ہیں اور حضرت اسمٰعیلؑ دعوت ابراہیمؑ ہیں، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور خواہش سے پیدا ہوئے اسی بنا پر خدا نے ان کا نام اسمٰعیل رکھا، کیونکہ اسمٰعیل دو لفظوں سے مرکب ہے، سمع اور ایل۔ سمع کے معنی "سنے" کے، اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا سن لی۔ تورات میں ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ اسمٰعیلؑ کے بارے میں، میں نے تیری سن لی، حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے حضرت اسحٰقؑ کی خوشخبری دی تو حضرت ابراہیمؑ نے اس موقع پر بھی حضرت اسمٰعیلؑ کو یاد کیا، غرض چونکہ حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا جو حکم ہوا تھا اس میں قید تھی کہ محبوب ترین بیٹا ہو، اس لئے حضرت اسمٰعیلؑ ہی ذبیح ہو سکتے ہیں نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔

(۶) حضرت اسحاقؑ کی جب خدا نے بشارت دی تو ساتھ ہی یہ بھی بشارت دی کہ میں اس کی نسل سے ابدی

لہ تورات تکوین ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ کہ تکوین اصحاح ۱۶ ۔ سہ تکوین اصحاح ۱۷، ۲۰ ۔

عہد باندھوں گا، تورات میں ہے۔

"پھر خدا نے کہا بلکہ تیری بیوی سارہ تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسحٰقؑ رکھے گا اور میں ابدی عہد اس کی نسل سے قائم کروں گا۔" (تورات، تکوین اصحاح ۱۷، آیت ۱۹)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تورات میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اور فرشتہ نے ندا دی کہ ہاتھ کو روک لو تو فرشتہ نے یہ الفاظ کہے۔

"خدا کہتا ہے کہ چونکہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنے اکلوتے بیٹے کو بچا نہیں رکھا میں تجھ کو برکت دوں گا اور تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور ساحل بحر کی ریتی کی طرح پھیلا دوں گا۔" (تورات تکوین اصحاح ۲۲ آیت ۱۵)

اب غور کرو کہ خدا نے جب حضرت اسحاقؑ کی بشارت ہی کے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس کی نسل قائم رکھوں گا تو یہ کیونکر ممکن تھا کہ جس وقت تک حضرت اسحاقؑ کی اولاد نہیں پیدا ہوئی تھی[1] ان کی قربانی کا حکم ہوتا، لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبیح تسلیم کیا جائے تو تمام نصوص منطبق ہو جاتے ہیں، حضرت اسمٰعیلؑ اکبر اولاد تھے، محبوب تر تھے، قربانی کے وقت بالغ یا قریب البلوغ تھے، قربانی سے پہلے ان کی کثرتِ نسل کی بشارت نہیں دی گئی، تورات میں تصریح ہے کہ چونکہ ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرنا چاہا، اس لئے اس بیٹے کی کثرتِ نسل کا وعدہ کیا گیا، یعنی یہ کثرت نسل اسی قربانی کے صلہ میں تھی، اس لئے ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت اسحٰقؑ کی تکثیر نسل کا وعدہ تو ان کی ولادت ہی کے وقت ہو چکا تھا، جو کسی انعام و صلہ کے معاوضہ میں نہ تھا۔

مقام قربانی ۷۔ تورات میں قربانی گاہ کو جو موقع بتایا ہے وہ "موریا" ہے، یہودی کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کا ہیکل تھا، عیسائی کہتے ہیں یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی۔ لیکن یورپ کے محققوں نے ان دونوں دعووں کی تغلیط کی ہے، سر اسٹانلی لکھتے ہیں۔

"حضرت ابراہیمؑ صبح کے وقت اپنے خیمہ سے نکل کر اس مقام پر گئے جہاں ان کو خدا نے حکم دیا تھا لیکن یہ موریا کا پہاڑ نہیں ہے جیسا کہ یہود کا دعویٰ ہے، نہ عیسائیوں کے خیال کے موافق قبر مقدس کے گرجا کے پاس ہے، یہ قیاس تو یہودیوں کے قیاس سے بھی زیادہ بعید ہے اور اس سے بھی بعید مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ وہ جبل عرفات ہے[2] غالباً یہ مقام جریزیم کے پہاڑ پر ہے اور وہی قربانی گاہ سے مشابہ مقام ہے۔"

اس سے تو اتنا ثابت ہوا کہ موریا کے تعین میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعوے غلط ہیں، باقی یہ امر کہ مسلمانوں کا دعویٰ بھی غلط ہے، اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

موریا کی تعیین میں جو اختلاف پیدا ہوا، اس نے ایک اور اختلاف پیدا کر دیا یعنی یہ کہ یہ لفظ کسی مقام کا نام ہے یا وصفی معنی رکھتا ہے، بہت سے مترجموں نے اس کو ایک مشتق لفظ سمجھا، اور اس لئے اس کا ترجمہ تورات کے بعض

---

[1] یہ مسلّم ہے کہ حضرت اسحٰقؑ کی اولاد حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے بعد پیدا ہوئی (تکوین اصحاح ۲۵۔ آیت ۱۱)

[2] یہ غلط ہے مسلمان عرفات کو نہیں بلکہ منیٰ کو قربانی گاہ سمجھتے ہیں

نسخوں میں بلوطات عالیہ اور بعض میں زمین بلند اور بعض میں مقام لکھ دیا گیا، لیکن زیادہ صائب الرائے لوگوں نے اس کو مقام کا نام سمجھا اور اس لئے لفظ کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ بحال خود رہنے دیا، لیکن امتداد زمانہ اور بے پروائی سے لفظ کی ہئیت بدل گئی، یعنی مریا کا مورہ ہو گیا خصوصاً اس وجہ سے کہ عبرانی زبان میں دونوں لفظوں کا املا قریب قریب ہے۔

مورہ کی نسبت تورات میں تصریح ہے کہ عرب میں واقع ہے، تورات میں ہے۔

وکان جیش المدیانیین شمالیہم عند تل مورۃ فی الوادی (قضاۃ۔ اصحاح ۷۔ آیت ۲)	اور مدیانیوں[1] کی فوج شمال کی جانب مورہ کی پہاڑی پر وادی میں تھی (مدیان عرب میں واقع ہے۔

تمام واقعات اور قرائن کو پیش نظر رکھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ لفظ مورہ نہیں بلکہ مروہ ہے جو مکہ معظمہ کی پہاڑی ہے اور جہاں اب سعی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

عرب کی روایات قرآن مجید کی تصریح، احادیث کی تعیین تمام چیزیں اس قیاس سے اس قدر مطابق ہوتی جاتی ہیں کہ اس قسم کا تطابق بغیر صحت واقعہ کے ممکن نہیں، تفصیل اس کی یہ ہے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "قربانی گاہ یہ ہے اور مکہ کی تمام پہاڑیاں اور گھاٹیاں قربانی گاہ ہیں[2]"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مروہ میں قربانی نہیں ہوتی تھی، بلکہ منیٰ میں ہوتی تھی، جو مکہ سے تین میل پر ہے، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مروہ ہی کو قربانی گاہ فرمایا، یہ اسی بنا پر تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہیں حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی تھی۔

قرآن مجید میں ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (حج ۴)	پھر قربانی کے جانوروں کی جگہ کعبہ ہے۔
هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ ۱۳)	قربانی جو کہ کعبہ میں پہنچے۔

مروہ بالکل کعبہ کے مقابل اور اس کے قریب ہے، ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی اصلی جگہ کعبہ ہے منیٰ نہیں، لیکن جب حجاج کی کثرت ہوئی تو کعبہ کے حدود کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی۔

قربانی کی یادگار

یہودی حضرت اسحاقؑ کی اولاد ہیں، اس لئے اگر حضرت اسحٰقؑ ذبیح ہوتے تو اس کی کوئی یادگار ان کے یہاں موجود ہوتی، بخلاف اس کے حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان بلکہ تمام مسلمانوں میں جو حضرت اسمٰعیلؑ کی روحانی اولاد ہیں، قربانی کی تمام رسمیں آج تک موجود ہیں۔

اولاد اسمٰعیلؑ میں قربانی کی تمام یادگاریں موجود ہیں، اور حج جو کہ ایک بڑا فریضہ اسلام ہے، تمام تر اسی قربانی کی یادگار ہے، چنانچہ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا نے بیٹے کی قربانی کا حکم دینا چاہا تو پکارا، اے ابراہیمؑ! حضرت ابراہیمؑ نے

---

[1] مدین عرب کی زمین ہے اور عرب کو اکثر مدیانیوں کہتے ہیں، اور مدین کی زمین شام کے جنوب سے یمن کے شمال تک ہے اور یہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں جو قطورا سے تھے (ضمیمہ بائبل ص ۴۰)۔

[2] موطا امام مالک۔

کہا "میں حاضر ہوں"۔

حج کے وقت مسلمان جو ہر قدم پر لبیک کہتے چلتے ہیں، یہ وہی ابراہیمی الفاظ ہیں، جن کا لفظی ترجمہ وہی ہے "میں حاضر ہوں"۔

۲۔ شریعتِ ابراہیمی میں دستور تھا کہ جس کو قربان گاہ پر چڑھاتے تھے یا خدا کے لئے نذر دیتے تھے وہ بار بار معبد یا قربان گاہ کے پھیرے کرتا تھا۔

حج میں صفا و مروہ کے درمیان جو سات بار سعی کرتے ہیں، یہ اسی کی یادگار ہے۔

۳۔ نذر کے فرائض میں ایک یہ تھا کہ ایام نذر تک بال نہیں کترواتے تھے حج میں بھی یہی دستور ہے، جب احرام اتارتے ہیں تب بال کترواتے یا منڈاتے ہیں، خود قرآن مجید میں اس شعار کا ذکر ہے۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ (فتح۔ ۳) سروں کو منڈائے ہوئے۔

۴۔ حج کا ایک ضروری رکن قربانی ہے، یہ وہی حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یادگار ہے، اسی بناء پر قرآن مجید میں فرمایا ہے:۔

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ. (صافات۔ ۳) اور حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کے بدلے ہم نے ایک بڑی قربانی قائم کی

یہ دلائل تورات کی تصریحات و کنایات کی بناء پر تھے، قرآن مجید کے رو سے قطعاً اسمٰعیلؑ کا ذبیح ہونا ثابت ہے اگرچہ بہت سے مفسرین نے غلطی سے یہودیوں ہی کی روایت کی تائید کی ہے، قرآن مجید میں قربانی کا واقعہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ۝ رَبِّ
هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ۝
فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي
الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ط
(صافات۔ ۳)

اور حضرت ابراہیم نے کہا میں اپنے خدا کی طرف جاؤں گا وہ مجھ کو راستہ دکھائے گا، خدایا مجھ کو وہ اولاد دے کہ جو نیک چلن ہو تو ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، پھر جب وہ لڑکا اس کے ساتھ چلنے لگا تو ابراہیم نے کہا بیٹے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں تیری کیا رائے ہے۔

آیت بالا میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اولاد کے لئے دعا مانگی اور خدا نے قبول کی اور وہی لڑکا قربانی کے لئے پیش کیا گیا۔

تورات سے ثابت ہے کہ جو لڑکا حضرت ابراہیمؑ کی دعا سے پیدا ہوا، وہ حضرت اسمٰعیل ہیں، اور اسی لئے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا کہ خدا نے ان کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی درخواست سُنی، اس بناء پر اس آیت میں جس کا ذکر ہے وہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں، اسحاقؑ نہیں

قربانی کے واقعہ کی تفصیل اور اختتام کے بعد حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کا ذکر ہے، اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ جس کا ذکر اوپر ہوا وہ حضرت اسحٰقؑ نہیں، بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں۔

لہ توراۃ تکوین اصحاح ۲۲ آیت ۱ لہ توراۃ تکوین اصحاح ۱۷۔ آیت ۲۰۔

مسلمانوں کا نام جو مسلم رکھا گیا، یہ وہ نام ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے ایجاد کیا تھا، قرآن مجید میں ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ (حج - ۱۰)
تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب اسی نے پہلے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا۔

اس تسمیہ کی تاریخ قربانی سے شروع ہوتی ہے یعنی حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو قربانی کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ مجھ کو خدا کا یہ حکم ہوا ہے تمہاری کیا رائے ہے؟ تو حضرت اسمٰعیلؑ نے نہایت استقلال کے ساتھ گردن جھکا دی کہ یہ سر حاضر ہے، اس موقع پر خدا نے "اَسْلَمَا" کا لفظ استعمال کیا جو اسلام سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی "تسلیم" اور "حوالہ کر دینے" کے ہیں۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا (صافات - ۳)
پھر جب دونوں نے اپنے آپ کو (ہمارے) حوالہ کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا سب سے بڑا عظیم الشان کارنامہ تسلیم و رضا ہے یعنی جب قربانی کا حکم ہوا تو باپ بیٹے دونوں نے بے عذر گردنیں جھکا دیں، یہ وصف مقبول بارگاہ ہوا، اور پھر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا یہی شعار مذہبی قرار پایا، اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے پیروان ملت کا نام مسلم رکھا۔

قربانی، ایثار، اور اسلام درحقیقت یہ سب مترادف الفاظ ہیں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ ہی نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا، اگر حضرت اسحاقؑ قربانی ہوتے تو یہ لقب ان کی اولاد یا انکی امت کو ملتا۔

قربانی کی حقیقت

اس مسئلہ کی حقیقت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے، جب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا، اس سے اصل مقصود کیا تھا، قدیم زمانہ میں بت پرست قومیں اپنے معبودوں پر اپنی اولاد کو بھینٹ چڑھا دیا کرتی تھیں، یہ رسم ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ سے پہلے موجود تھی، مخالفین اسلام کا خیال ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی بھی اسی قسم کا حکم تھا لیکن یہ سخت غلطی ہے[2] اکابر صوفیا نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو خواب دکھائے جاتے ہیں، دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی

---

[1] ابھی گزشتہ صفحات کے حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ بعض مفسرین نے قرب لفظ کی وجہ سے سمّی کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قرار دیا ہے تابعین میں حضرت ابن زید اور حضرت حسن بصری کا یہی مسلک ہے اور ابو حیان نے اسی کی تائید کی ہے لیکن صحابہ میں حضرت ابن عباسؓ اور تابعین میں مجاہد، ضحاک، قتادہ، اور سفیان نے اللہ کی طرف ضمیر پھیری ہے اور یہ معنی لیتے ہیں کہ تمہارا نام مسلم قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے رکھا اور اس قرآن میں بھی اس نے تمہارا یہ نام رکھا۔ "س"

[2] اس مقام پر مصنف کی یہ عبارت مزید تشریح کی محتاج ہے، مصنف نے جیسا کہ لکھا ہے کہ رؤیا دو قسم کے ہوتے ہیں ایک عینی جس میں صورت واقعہ بعینہٖ دکھائی جاتی ہے اور دوسری تمثیلی جس میں صورت واقعہ کسی مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو بہت سے علماء نے تسلیم کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ خواب کی اس دوسری قسم میں اصل مقصود رؤیا کی دوسری مثالی صورت ہوتی ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے ماں باپ کو آفتاب و ماہتاب اور بھائیوں کو ستاروں کی شکل میں دیکھنا یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ کی وبا کو ایک بڑھیا کی شکل میں دیکھنا اور احد میں مسلمان شہداء کو ذبح گایوں کے رنگ میں دیکھنا۔ محدث خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں۔

اور تمثیلی، عینی میں بعینہٖ وہی چیز مقصود ہوتی ہے جو خواب میں نظر آتی ہے۔ تمثیلی میں تشبیہ اور تمثیل کے پیرایہ میں کسی مطلب کو پورا ادا کرنا ہوتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خواب دکھایا گیا تھا، اس سے یہ مراد تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لئے نذر چڑھا دیں، یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں، بلکہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے جائیں، تورات میں جا بجا قربانی کا لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔

(حاشیہ مسلسل گزشتہ)

وبعض الرویا مثل یضرب لیتاول علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ وبعض الرویا لا یحتاج الی ذلک بل یاتی کالمشاهدۃ۔

(فتح الباری جلد ۱۲ ص ۴۰۲)

بعض خواب تمثیلی ہوتے ہیں جن کو اس مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا ہے کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب اس کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں۔

امام ابوبکر ابن العربی مالکی احکام القرآن میں اسی حقیقت کا ذکر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس رویا کے ضمن میں یوں فرماتے ہیں کہ بعض رویا نام کی طرح ہوتے ہیں (یعنی عینی و تصریحی جو بالکل لفظاً لفظاً واقعہ کے عین مطابق ہوتے ہیں) اور بعض مثل کنیتوں کی طرح ہوتے ہیں یعنی کسی مناسبت معنوی کے سبب سے وہ کسی دوسرے ہم شکل واقعہ کی صورت میں دکھلائے جاتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ خواب اسی دوسری قسم کا تھا (احکام القرآن ج ۲ ص ۱۹۶، مصر)

مصنف سیرت نے اس مقام پر ان ہی بعض علماء کی تقلید کر کے حضرت ابراہیمؑ کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے اور اسی بنا پر ان کو یہ کہنے کی ضرورت ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اس خواب کو جو تمثیلی تھا، اپنی خطائے اجتہادی سے عینی و حقیقی سمجھے اور اس کی بعینہٖ تعمیل پر آمادہ ہو گئے، لیکن عین وقت پر ان کو وحی الٰہی نے ان کی اس اجتہادی خطا پر متنبہ کر دیا اور حضرت اسماعیلؑ کی بعینہٖ قربانی سے روک کر ان کی جگہ جانور کی قربانی پیش کی۔

ہیچمدان جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو محبت الٰہی سے سرشار تھے خطائے اجتہادی سے نہیں بلکہ غلبۂ شوقِ اطاعت و محبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بالکل بعینہٖ و بلفظہٖ کرنے پر آمادہ ہو گئے، تاکہ اس ابتلا میں وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پورے اتریں اور اپنی طرف سے بیٹے کی جان کی قربانی کی جگہ اس کی خدمت توحید و تولیت کعبہ کے لئے وقف کر دینے کی تاویل کا سہارا لے کر نفس کی متابعت کے شبہ اور دھوکے سے بھی پاک رہیں، تا آنکہ اللہ تعالیٰ خود اس حقیقت کو اپنے لفظوں میں واضح فرما دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی، آواز آئی۔

یَا اِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (صافات ۳) وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (صافات)

ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کی عوض میں دیا۔

اور امت پر یہ قربانی اسی تمثیلی رنگ میں واجب ٹھہرائی گئی، یعنی جسمانی اطاعت و قربانی کی تمثیل، جانور کی قربانی کی شکل میں۔ یہ تشریح ان بعض علماء کی متابعت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس رویا کو تمثیلی سمجھتے ہیں اور نہ جمہور علماء اس رویا کو عینی ہی سمجھتے ہیں، لیکن عین اس وقت جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پر عمل کر کے اپنی طرف سے فرزند کے ذبح کی پوری عزیمت کر کے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا، اور بعینہٖ اس کی تعمیل کرنی چاہی گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہو سکتی ہے (گو یہ غلطی قائم نہیں رہتی بلکہ خدا اس پر متنبہ کر دیتا ہے) اس بناء پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیئے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی اور فرمایا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ (صافات - ۳)

تو نے خواب کو سچا کیا، ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزا دیتے ہیں۔

بہر حال یہاں اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ قربانی سے مقصود خدمت کعبہ کے لئے نذر چڑھانا تھا، نذر چڑھانے کے لئے شریعت سابقہ میں جو لفظ مستعمل تھا وہ خدا کے سامنے تھا، تورات میں یہ محاورہ نہایت کثرت سے آیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیلؑ کے حق میں خدا سے جو دعا کی وہ ان لفظوں میں تھی۔

لیت اسمٰعیل یعیش امامك (تورات تکوین اصحاح، آیت) کاش اسمٰعیل تیرے سامنے زندگی کرتا۔

اسی خواہش کے مطابق ان کو خواب میں تمثیلی پیرایہ میں حکم دیا گیا کہ وہ بیٹے کی قربانی کریں، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں حضرت اسحٰقؑ کی قربانی کا نہیں بلکہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔

(حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اپنے کام کو پورا کر چکے تھے، اور تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں رہی تھی کہ وحی الٰہی نے آواز دی، اے ابراہیم! تم نے اپنا کام پورا کر دیا اور اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، اب اس کی جگہ ملت ابراہیم کی یہ سنت عظیم جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

ظاہر ہے کہ بہر دو صورت یہ جانور کی قربانی جیسا کہ بعض ائمہ محققین نے لکھا ہے نفس کی قربانی کی تمثیل ہے اور اس قربانی کا گوشت اس روز عید میں قربانی کنندہ کے لئے برکت، احباب کے لئے تحفہ اور فقراء کے لئے سامان دعوت بنا۔

مزید تفصیل کے لئے معارف ذی حجہ ۱۳۵۵ھ مضمون "ذبح عظیم" اور معارف صفر ۱۳۵۶ھ کے شذرات ملاحظہ ہوں۔

⁂

مکہ معظمہ

حضرت اسماعیلؑ کی بحث مسکن میں گزر چکا کہ وہ عرب تھا، مقام ذبح کی تعیین میں یہ ثابت ہو چکا کہ وادی مکہ تھا، اس بنا پر مکہ کی نسبت ایک بحث نہایت قدیم زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

متعصب عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ اس شہر کی قدامت کا دعویٰ مسلمانوں کا خاص دعویٰ ہے، قدیم تاریخوں[1] میں اس کا نشان نہیں ملتا، اس بناء پر ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

مکہ کا قدیم اور اصلی نام بکہ ہے، قرآن مجید میں یہی نام ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا (آل عمران ۱۰)	پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لئے بنایا گیا وہ "بکہ" میں تھا۔

کتاب زبور ۸۴-۶ میں ہے۔

"بکہ کی وادی میں گزرتے ہوتے اسے ایک کنواں بناتے، برکتوں سے مورۃ کو ڈھانک لیتے، قوت سے قوت تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔"

اس عبارت میں بکہ کا جو لفظ ہے، یہ وہی مکہ معظمہ ہے، لیکن اگر اس لفظ کو اسم علم کے بجائے مشتق قرار دیں تو اس کے معنی "رونے" کے ہوں گے، اور یہ وہی عربی لفظ بکا ہے، چونکہ یہود و نصاریٰ ہمیشہ مکہ کی وقعت مٹانے کے درپے رہتے آئے، اس لئے بہت سے مترجمین نے عبارت مذکور میں بکہ کا ترجمہ رونا کر دیا ہے، لیکن ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس حالت میں وادی بکا کے کیا معنی ہوں گے؟ زبور کی عبارت مذکورہ کی اوپر کی آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نشید میں حضرت داؤدؑ نے مکہ معظمہ اور مروہ اور قربان گاہ اسماعیلی کی نسبت اپنا شوق اور حسرت ظاہر کی ہے، اوپر کی عبارت یہ ہے (حضرت داؤدؑ خدا سے کہتے ہیں) اے فوجوں کے خدا تیرے مسکن کس قدر شیریں ہیں، میرا نفس خدا کے گھر کا مشتاق بلکہ عاشق ہے ..... اے خدا! تیرے قربان گاہ میرے مالک اور میرے خدا ہیں، مبارک ہو ان لوگوں کی جو تیرے گھر میں ہمیشہ رہتے ہیں، اور تیری تسبیح پڑھتے ہیں، اس کے بعد بکہ والی آیتیں ہیں اب غور کرو حضرت داؤدؑ جس مقام کے پہنچنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں، وہ اس مقام پر صادق آسکتا ہے جس میں حسب ذیل باتیں پائی جائیں،

(۱) قربانی گاہ ہو۔

(۲) حضرت داؤدؑ کے وطن سے دور ہو کہ وہاں تک سفر کر کے جائیں،

(۳) وہ وادیٔ بکہ کہلاتا ہو۔

---

[1] مرگولیوس اپنی کتاب میں لکھتا ہے اگرچہ مذہبی خیال کی وجہ سے مسلمانوں نے اپنے مذہبی مرکز کو نہایت قدیم البنا قرار دیا ہے لیکن صحیح روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مکہ کی سب سے قدیم عمارت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صرف چند پشت قبل تعمیر ہوئی تھی، مرگولیوس نے اس کے ثبوت میں اسناد کا حوالہ بھی دیا ہے اور ہم کو بھی اس کی صحت سے انکار نہیں، لیکن اس کل بیان میں مغالطہ ہے جس کو ہم نے اصل کتاب میں ظاہر کر دیا ہے۔

(۴) وہاں مقام مروہ بھی ہو، ان باتوں کو پیش نظر رکھو تو قطعاً یقین ہو جائے گا کہ بکہ وہی مکہ معظمہ اور مورہ وہی مروہ ہے، اس کے ساتھ یہ بھی اندازہ ہوگا کہ یہودی کس طرح تعصب سے الفاظ کو ادل بدل کر دیتے ہیں یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ، ڈاکٹر ہسٹنگس نے "ڈکشنری آف دی بائبل" "وادی بکا" پر جو آرٹیکل لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اس لفظ سے اگر کوئی واقعی وادی مراد ہے تو وہ حسب ذیل ہو سکتی ہے۔

(۱) ایک وادی ہے جس میں ہو کر زائرین بیت المقدس جاتے ہیں۔

(۲) وادی اخور ہے، جو یشوع باب ۷، آیات ۲۴-۲۶ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۳) وادی رفائیون ہے جو سامویل دوم باب ۵ آیات ۱۸، ۲۲ وغیرہ میں مذکور ہے۔

(۴) کوہ سینا کی ایک وادی ہے۔

(۵) بیت المقدس تک جو کاروانی راستہ شمال سے آتا ہے، اس راستہ کی آخری منزل ہے (دیکھو رینان کی کتاب "حیاتِ عیسیٰ" باب ۴)

لیکن کیا عجیب بات ہے ڈاکٹر ہسٹنگس کو اتنے احتمالاتِ کثیرہ میں کہیں مکہ معظمہ کا پتہ نہیں لگتا۔ مصرعہ

ہما ورق کہ سیہ گشتہ مدعا اینجا ست

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ جن جن وادیوں کا نام لیا ہے، ان میں ایک کو بھی بکا کے لفظ سے کسی قسم کی مناسبت نہیں، یہاں تک کہ ایک حرف بھی مشترک نہیں، بخلاف اس کے بکا اور بکہ بالکل ایک لفظ ہیں، فرق اسی قدر ہے جس قدر ایک ہی لفظ کے تلفظ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

جدید انسائیکلوپیڈیا میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عنوان سے جو مضمون ہے وہ مرگیولس کا ہے، اس میں مکہ معظمہ کی نسبت لکھا ہے کہ:-

"قدیم تاریخوں میں اس شہر کا نام نہیں ملتا بجز اس کے کہ زبور (۸۴-۶) وادی بکہ" کا لفظ ہے۔[1]

لیکن مرگیولس صاحب اس تاریخی شہادت کو ضعیف سمجھتے ہیں۔

پروفیسر دوزی جو فرانس کا مشہور محقق اور عربی دان عالم ہے، وہ لکھتا ہے۔[2]

"بکہ" وہی مقام ہے جس کو یونانی جغرافیہ دان ماکروبہ لکھتے ہیں"

لیکن مارگیولس کو پروفیسر دوزی کے بیان پر بھی اعتماد نہیں،

کارلائل صاحب نے اپنی کتاب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لکھا ہے کہ:-

"رومن مورخ سیسلس نے کعبہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دنیا کے تمام معبدوں سے قدیم و اشرف ہے اور یہ ولادت مسیح سے پچاس برس پہلے کا ذکر ہے۔"

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۷، ص ۲۹۹، ۱۰ ر زماں ایڈیشن [2] ایضاً

اگر کعبہ حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے موجود تھا تو مکہ بھی قریباً اسی زمانہ کا شہر ہوگا کیونکہ جہاں کہیں کوئی مشہور معبد ہوتا ہے اس کے آس پاس ضرور کوئی نہ کوئی شہر یا گاؤں آباد ہو جاتا ہے۔

یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کا عرض اور طول بطلیموس[1] کے جغرافیہ میں حسب ذیل ہے۔

"طول ۷۸ درجہ عرض ۲۰ درجہ"

بطلیموس نہایت قدیم زمانہ کا مصنف ہے، اگر اس نے اپنے جغرافیہ میں مکہ کا ذکر کیا ہے تو اس سے زیادہ قدامت کی کیا سند درکار ہے۔

مارگولس نے جس بنا پر مکہ معظمہ کی قدامت سے انکار کیا ہے وہ یہ ہے کہ اصابہ میں تصریح ہے کہ مکہ میں سب سے پہلی عمارت جو تعمیر ہوئی وہ سعید بن یا سعد بن عمرو نے تعمیر کی، لیکن مارگولس کو یہ معلوم نہیں کہ مورخین نے جا بجا یہ بھی تصریح کی ہے کہ چونکہ اہل عرب کعبہ کے مقابل یا آس پاس عمارات بنانے کو کعبہ کی بے ادبی سمجھتے تھے، اس لئے عمارتیں نہیں بنوائیں بلکہ خیموں اور شامیانوں میں رہتے تھے، اور اس طرح مکہ ہمیشہ سے خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر

دنیا میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی، ایران، ہند، مصر، یورپ میں عالمگیر اندھیرا تھا، قبول حق ایک طرف، اس وسیع خطہ خاک میں گز بھر زمین نہیں ملتی تھی جہاں کوئی شخص خالص خدائے واحد کا نام لے سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب کلدان میں یہ صدا بلند کرنی چاہی تو آگ کے شعلوں سے کام پڑا، مصر آئے، ناموس کو خطرہ کا سامنا ہوا، فلسطین پہنچے، کسی نے بات تک نہ پوچھی، خدا کا جہاں نام لیتے تھے، شرک اور بت پرستی کے غلغلہ میں آواز دب دب کر رہ جاتی تھی، معمورۂ عالم کے صفحے، نقشہائے باطل سے ڈھک چکے تھے اب ایک سادہ، بے رنگ، ہر قسم کے نقش و نگار سے معرا ورق درکار تھا، جس پر طغرائے حق لکھا جاتے، یہ صرف حجاز کا صحرائے ویران تھا جو تمدن اور عمران کے داغ سے کبھی داغدار نہیں ہوا تھا۔

حضرت ابراہیمؑ، حضرت ہاجرہؑ اور اسمٰعیلؑ کو عرب میں لائے اور ان کو یہیں آباد کیا، حضرت سارہؑ نے جیسا کہ توراۃ میں ہے، کچھ عرصہ کے بعد انتقال کیا، حضرت ابراہیمؑ مکہ میں چلے آئے، حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہو چکے تھے اعلان حق میں ایک ہم آواز ہاتھ آیا، دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی[2]۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ (بقرہ ۔ ۱۵) — اور جب کہ ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ خدا کی دیواریں اٹھا رہے تھے۔

گھر بن چکا تو وحی الٰہی نے آواز دی۔

وَطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّائِفِیْنَ وَالْقَائِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ — ہمارا گھر طواف کرنے والوں میں نماز میں قیام کرنے والوں

---

[1] بطلیموس کے جغرافیہ کا ترجمہ عباسیوں کے زمانہ میں ہو گیا تھا، مسعودی اور ابن الندیم نے اکثر اس کے حوالے دیئے ہیں۔

[2] محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد رکھی تھی، مزید توضیح کے لئے سیرۃ النبی جلد چہارم باب ہفتم عنوان مکہ اور کعبہ میں دیکھئے۔ "س"

السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا
وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ۔
(سورۂ حج - ۴)

رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک کر اور تمام
لوگوں کو پکار دے کہ حج کو آئیں، پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی
ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔

اس وقت اعلان و اشتہار کے وسائل نہیں تھے، ویران جگہ تھی اور آدمی کا کوسوں تک پتہ نہ تھا، ابراہیمؑ کی آواز حدود حرم سے باہر نہیں جا سکتی تھی لیکن وہی معمولی آواز کہاں کہاں پہنچی، مشرق سے مغرب تک، شمال سے جنوب تک اور زمین سے آسمان تک۔

علامہ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو تعمیر کی اس کا عرض و طول حسب ذیل تھا۔

بلندی ——— زمین سے چھت تک ۹ گز۔
طول ——— حجر اسود سے رکن شامی تک ۳۲ گز۔
عرض ——— رکن شامی سے غربی تک ۲۲ گز۔

عمارت بن چکی تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ ایسے مقام پر لگا دوں جہاں سے طواف شروع کیا جائے، تاریخ مکہ موسوم بہ اعلام باعلام بیت الحرام میں ہے۔

فقال ابراهيم لاسماعيل عليهما الصلوة والسلام يا اسماعيل ايتني الحجر اضعه حتى يكون علما للناس يبتدؤن منه الطواف۔

پھر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لا دو تاکہ میں ایسی جگہ نصب کر دوں جہاں سے لوگ طواف شروع کریں۔

خدا کا یہ گھر ایسا سادہ تعمیر ہوا تھا کہ نہ چھت تھی نہ کواڑ اور نہ چوکھٹ بازو تھے، جب قصی بن کلاب کو کعبہ کی تولیت حاصل ہوئی تو انھوں نے قدیم عمارت گرا کر نئے سرے سے تعمیر کی اور کھجور کے تختوں کی چھت ڈالی[1]۔

کعبہ کی برکت اور کشش سے لوگ آس پاس آباد ہونے لگے چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ جرہم آکر آباد ہوا، اس قبیلہ میں مضاض بن عمرو جرہمی ایک ممتاز شخص تھے، حضرت اسمٰعیلؑ نے ان کی لڑکی سے شادی کی، ان سے بارہ اولاد ہوئی جن کے نام توراۃ میں مذکور ہیں، ان میں سے اکثر اہل عرب قیدار کی اولاد ہیں، حضرت اسماعیلؑ کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت کعبہ کے متولی ہوئے، ان کے مرنے کے بعد ان کے نانا مضاض نے یہ منصب حاصل کیا، اور کعبہ کی تولیت خاندان اسمٰعیلؑ سے نکل کر جرہم کے خاندان میں آگئی، لیکن پھر ایک اور قبیلہ خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا اور مدت تک اسی خاندان میں یہ منصب رہا، حضرت اسمٰعیلؑ کا خاندان موجود تھا لیکن اس نے کچھ مزاحمت نہیں کی قصی بن کلاب کا زمانہ آیا تو انھوں نے اپنا آبائی حق حاصل کیا، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

حرم کعبہ پر سب سے پہلے جس نے پردہ چڑھایا وہ یمن کا حمیری بادشاہ اسعد تبع تھا، یمن میں خاص قسم کی چادریں بنی جاتی ہیں، جن کو برد یمانی کہتے ہیں، یہ پردہ انہی چادروں سے تیار کیا گیا تھا، قصی بن کلاب کے زمانہ سے تمام باشندوں پر ایک محصول لگا دیا گیا جس سے پردہ تیار کیا جاتا تھا، علامہ ازرقی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی

---

[1] اعلام بحوالہ کتاب النسب از ابن بکار و ابن الماوردی۔

یمنی پردہ چڑھایا تھا، لیکن اس روایت کے سلسلہ کا ایک راوی واقدی[1] ہے۔

خدا کا گھر سیم و زر کی نقش آرائیوں کا محتاج نہ تھا، لیکن دولت اور ملک کی ترقی کے یہ لوازم ہیں، اس لئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے کعبہ کے ستونوں پر سونے کے پتر چڑھائے، عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں ۳۶ ہزار اشرفیاں اس کام کے لئے بھیجیں، امین الرشید نے ۱۸ ہزار اشرفیاں نذر کیں، کہ دروازہ کی چوکھٹ وغیرہ طلائی بنوا دی جائے، اعلام (تاریخ مکہ) میں عہد بہ عہد کی طلاکاریوں کی تفصیل لکھی ہے لیکن یہ واقعات عہد نبوت کے بعد کے ہیں، جو ہماری کتاب کا موضوع نہیں، اور سچ یہ ہے کہ آفتاب پر سونا چڑھانا ضروری بھی نہیں۔

حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی

خدا کا گھر بن چکا تو ضرورت تھی کہ اس کی تولیت اور خدمت کے لئے کوئی نفس قدسی تمام مشاغل سے الگ ہو کر اپنی زندگی اس پر نذر چڑھا دے، اس قسم کی نذر کو ابراہیمی شریعت میں قربانی سے تعبیر کرتے تھے، تورات میں یہ محاورہ بہ کثرت آتا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں انبیاء علیہم السلام پر جو وحی آتی ہے اس کے مختلف انواع ہیں، جن میں سے ایک خواب بھی ہے، چنانچہ صحیح بخاری باب بدء الوحی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی جو ابتداء ہوئی خواب سے ہوئی، یہ خواب کبھی تمثیلی ہوتا ہے، جس طرح حضرت یوسفؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا، بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب دکھلایا گیا کہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں، انھوں نے اس خواب کو عینی سمجھا اور بعینہٖ اس کی تعمیل پر آمادہ ہوئے۔

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے استقلال اور جاں نثاری پر اعتماد تھا، لیکن یہ تحقیق طلب تھا کہ پانزدہ سالہ نوجوان بھی اپنی گردن پر چھری چلتے دیکھ سکتا ہے یا نہیں؟ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى۔ (صٰفٰت)	بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تو بتا، تیری کیا رائے ہے۔

بیٹے نے نہایت استقلال سے جواب دیا۔

---

[1] حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں قباطی کا پردہ چڑھایا تھا جو مصر میں بنا جاتا ہے ان کے بعد معمول ہو گیا کہ ہر خلیفہ اپنے عہدِ خلافت میں پردہ چڑھاتا تھا، بنو امیہ نے دیبا کا پردہ چڑھایا تھا، مامون الرشید ہر سال تین پردے چڑھاتا تھا۔ حج کے زمانہ میں دیبائے احمر کا، رجب میں قباطی کا، عید الفطر میں دیبائے سفید کا، مصر میں جب سلطان صالح ابن سلطان قلاوون بادشاہ ہوا تو مصر کے دو گاؤں پردہ کے مصارف کے لئے وقف کر دیئے۔ جب ترکی خاندان قسطنطنیہ میں حکمران ہوا تو سلطان سلیمان نے چند گاؤں اور اضافہ کر دیئے (اعلام باعلام بیت اللہ الحرام) خانہ کعبہ پر پردہ چڑھانے کی تاریخ بہ تفصیل فتوح البلدان بلاذری اور تاریخ مکہ ازرقی اور معجم البلدان وغیرہ میں ہے، ہم نے آخر تصنیف یعنی اعلام کو لیا ہے کہ وہ ان سب کے بعد کی تصنیف اور جامع ہے۔

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۔ (صٰفّٰت ۳)

ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے وہ کر گزریئے، خدا نے چاہا تو میں ثابت قدم رہوں گا۔

اب ایک طرف نوّے سالہ پیر ضعیف ہے، جس کو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے، جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے، اور اب باپ ہی کا مہر پرور ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ، قدسی، فضائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں، اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعۃً عالم قدس سے آواز آتی ہے۔

يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ (صٰفّٰت ۔ ۳)

ابراہیم! تو نے خواب کو سچ کر دکھایا ہم نیک بندوں کو اسی طرح اچھا بدلہ دیا کرتے ہیں۔

طفلیانِ ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کیا، اس کا صلہ یہی تھا کہ یہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اس کی یادگار رہ جائے۔

⁂

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

سلسلۂ نسب

سلسلۂ نسب سلسلۂ نسب یہ ہے، محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوئے بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ ابن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

صحیح بخاری (باب مبعث النبی) میں یہیں تک ہے، لیکن امام بخاری نے اپنی تاریخ میں عدنان سے حضرت ابراہیم تک نام گنائے ہیں یعنی عدنان بن ادد بن المقوم ابن تارح بن یشجب بن یعرب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے، جن کا ذکر توراۃ میں بھی ہے، ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت پھیلی، انہی کی اولاد میں عدنان ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہی کے خاندان سے ہیں، عرب کے نسب دان تمام پشتوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے، چنانچہ اکثر نسب ناموں میں عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک صرف آٹھ نو پشتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیل تک اگر صرف نو دس پشتیں ہوں تو یہ زمانہ تین سو برس سے زیادہ نہ ہوگا، اور یہ امر بالکل تاریخی شہادتوں کے خلاف ہے، علامہ سہیلی روض الانف (ص ۸) میں لکھتے ہیں۔

ویستحیل فی العادۃ ان یکون بینھما اربعۃ آباء او سبعۃ کما ذکر ابن اسحاق او عشرۃ او عشرون فان المدۃ اطول من ذلک کلہ۔	اور یہ عادۃً محال ہے کہ دونوں میں ۴ یا ۷ پشتوں کا فاصلہ ہو، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا، ۱۰، ۲۰ پشتیں ہوں کیونکہ زمانہ اس سے بہت زیادہ ہے۔

علامہ موصوف نے بہت سے تاریخی حوالوں اور شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ عدنان سے حضرت اسمٰعیل تک ۴۰ پشتوں کا فاصلہ ہے، اس غلطی نے بعض عیسائی مورخوں کو اس بات کا موقع دیا ہے کہ سرے سے اس بات کے منکر ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاندان ابراہیمؑ سے ہیں[1]۔

اس غلطی کی زیادہ وجہ یہ ہوئی کہ اہل عرب زیادہ تر مشہور آدمیوں کے نام پر اکتفا کرتے تھے اور بیچ کی پڑھیاں

---

[1] سر ولیم صاحب نے صریحاً یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسمٰعیل کے خاندان سے نہ تھے ان کے الفاظ یہ ہیں، یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیل کی اولاد سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیل کی نسل سے ثابت کئے جائیں، اُن کی عین حیات میں پیدا ہوئی تھی، اور اس طرح پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے، اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے۔ لیکن ایک طرف سر ولیم میور صاحب کا تنہا شبہ ہے اور دوسری طرف بیسیوں یورپین اور یہودی مورخین ہیں، جو نہ صرف خاندان قریش کو بلکہ تمام شمالی عرب و حجاز کو ابراہیمی النسل تسلیم کرتے ہیں (دیکھو فارسٹر صاحب کا جغرافیہ تاریخی عرب)

کو چھوڑ دیتے تھے، اس کے علاوہ اہل عرب کے نزدیک چونکہ عدنان کا حضرت اسمٰعیلؑ کے خاندان سے ہونا قطعی اور یقینی تھا اس لئے وہ صرف اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ عدنان تک سلسلۂ نسب صحیح طور سے نام بنام پہنچ جائے، اوپر کے اشخاص کا نام لینا غیر ضروری سمجھتے تھے، اس لئے چند مشہور آدمیوں کا نام لے کر چھوڑ دیتے تھے تاہم عرب میں ایسے محققین بھی تھے جو اس فرو گذاشت سے واقف تھے، علامہ طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ مجھ سے بعض نسب دانوں نے بیان کیا کہ میں نے عرب میں ایسے علماء دیکھے جو معد سے لے کر اسمٰعیلؑ تک ۴۰ پشتوں کے نام لیتے تھے، اور اس شہادت میں عرب کے اشعار پیش کرتے تھے، اس شخص کا یہ بھی بیان تھا کہ میں نے اس سلسلہ کو اہل کتاب کی تحقیقات سے ملایا تو پشتوں کی تعداد برابر تھی، البتہ ناموں میں فرق تھا۔ اسی مورخ نے ایک اور موقع پر لکھا ہے کہ شہر تدمر میں ایک یہودی تھا جس کا نام ابو یعقوب تھا، وہ مسلمان ہو گیا تھا، اس کا بیان تھا کہ ارمیا پیغمبر کے منشی نے عدنان کا جو نسب نامہ لکھا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے۔ اس شجرے میں بھی عدنان سے لے کر حضرت اسمٰعیلؑ تک چالیس نام ہیں، بہر حال یہ واقعہ یقینی ہے کہ عدنان حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عدنان کے خاندان سے ہیں۔

بنائے خاندان قریش

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ ابًا عن جدٍ معزز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور انہی کی اولاد قریشی ہے، حافظ عراقی سیرت منظوم میں لکھتے ہیں۔

---

[1] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ ص ۱۱۱۸ ۔ [2] تاریخ طبری مطبوعہ یورپ ج ۳ ص ۱۱۰۵ ۔ [3] تاریخ عرب کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے لیکن مارگولیس نے نہایت کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کو مبتذل ثابت کیا جائے، ان کے الفاظ یہ ہیں، یہ بالکل ظاہر ہے کہ محمد ایک غریب اور ادنیٰ خاندان سے تھے، اس کے بعد صاحب موصوف نے حسب ذیل استدلال پیش کئے ہیں (۱) قرآن مجید میں ہے کہ قریش کو حیرت تھی کہ ان میں ایسا پیغمبر کیوں نہ بھیجا گیا جو شریف خاندان سے ہوتا (۲) پیغمبر کے عروج کے زمانہ میں قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس درخت سے تشبیہ دی جو گھورے پر جمتا ہے (۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ایک شخص نے مولیٰ کے لفظ سے خطاب کیا تو آپ نے اس لقب سے انکار کیا (۴) فتح مکہ کے دن آپ نے فرمایا کہ آج شرفائے کفار کا خاتمہ ہو گیا۔ قرآن شریف کے الفاظ یہ ہیں وقالوا لولا نزل هذا القرآن على رجل من القريتين عظيم ۔ یعنی کفار کہتے ہیں کہ یہ قرآن دو شہروں (مکہ و طائف) کے کسی رئیس پر کیوں نہ اترا، عظیم اور شریف دو الگ لفظ ہیں، قرآن میں عظیم کا لفظ ہے، اہل عرب دولت اور اقتدار والے کو عظیم کہتے تھے، انکو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرافت سے نہیں بلکہ جاہ و دولت سے انکار تھا، دوسرا استدلال اگر صحیح ہو تو دشمن کی ہر بات کو صحیح ماننا چاہیے، کفار نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیوانہ، جادو زدہ، شاعر سب کچھ کہا، ان میں سے کونسی بات صحیح ہے، بے شبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مولیٰ اور سید کے لفظ سے انکار کیا لیکن متعدد حدیثوں میں صاف تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا مجھ کو سید اور مولیٰ نہ کہو، مولیٰ اور سید خدا ہے، قرآن میں ہر جگہ خدا ہی کو مولیٰ کہا ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاندانی شرافت کا ابطال کیونکر ہوتا ہے، اخیر استدلال بھی حیرت انگیز ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کم نسبی کیونکر ثابت ہوتی ہے، اکثر شرفائے مکہ سے مراد میاں جبارین و متکبرین مکہ ہیں۔ مارگولیس صاحب نے یہ دلائل نولڈیکی سے نقل کئے ہیں جو مشہور جرمنی مستشرق ہے،

ع این خانہ ہمہ آفتاب است۔

أما قریش فالاصح فہر   جماعها والاکثرون النضر

قصی

نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی خلیل خزاعی تھے، قصی نے خلیل کی صاحبزادی سے جس کا نام حبی تھا شادی کی تھی، اس تعلق سے خلیل نے مرتے وقت وصیت کی کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قصی نے ایک دار المشورہ قائم کیا، جس کا نام دار الندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، نکاح اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے۔

قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کئے جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ[2] اور رفادہ جو خدام حرم کا سب سے بڑا منصب تھا، انہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سینکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، چنانچہ قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی انہی کی ایجاد ہے جس پر ایام حج میں چراغ جلاتے تھے، چنانچہ عقد الفرید میں تصریح کی ہے۔ قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب اول انہی کو ملا، چنانچہ علامہ ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لئے ان کو قریش کہتے ہیں، کیونکہ تقریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، اسی بنا پر ان کو مجمع بھی کہتے تھے، چنانچہ شاعر کہتا ہے۔

قصی ابوکم من یسمی مجمعا
بہ جمع اللہ القبائل من فہر

قصی کی چھ اولاد تھی، عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ، عبد بن قصی، تخمر، برہ۔ قصی نے مرتے وقت حرم محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبد الدار کو دیئے، اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے، لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی، اور انہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے، عبد مناف کے چھ بیٹے تھے، ان میں سے ہاشم نہایت صاحب صولت اور بااثر تھے، انہوں نے بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبد الدار کو دیئے گئے، واپس لے لئے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں

---

[1] زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰۔ [2] سقایہ یعنی حاجیوں کو آب زمزم پلانا اور رفادہ حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔

[3] قصی بن کلاب کا مفصل تذکرہ طبقات ابن سعد جزو اول مطبوعہ لیڈن ۱۳۲۲ھ صفحہ ۳۶ سے لے کر ۴۲ تک ہے، قریش کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ قریش کے معنی جمع کرنے کے ہیں، قصی نے لوگوں کو ایک رشتہ میں منسلک کیا، اس لئے قریش کہلائے بعض کہتے ہیں کہ ایک مچھلی کا نام ہے جو تمام مچھلیوں کو کھا جاتی ہے، چونکہ قصی بہت بڑے سردار تھے اس لئے ان کو اس مچھلی سے تشبیہ دی عام خیال یہ ہے کہ قریش قصی یا کسی اور شخص کا نام ہے، لیکن امام سہیلی کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قبیلہ کا نام ہے، جس طرح قبائل عرب جانوروں کے نام پر نام رکھتے تھے مثلاً اسد، نمر وغیرہ، مورخین یورپ کا خیال ہے کہ قبائل جانوروں کی پرستش کرتے تھے اور انہی جانوروں کے نام سے مشہور ہو جاتے تھے، لیکن عربی تاریخوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا۔

عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں، بالآخر اس پر صلح ہوگئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔

ہاشم ہاشم نے اپنے فرض کو نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو نہایت سیر چشمی سے کھانا کھلاتے تھے، چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، قیصر روم سے خط و کتابت کر کے فرمان لکھوایا کہ قریش جب اس کے ملک میں اسباب تجارت لے کر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے حبش کے بادشاہ نجاشی سے بھی اسی قسم کا فرمان حاصل کیا، چنانچہ اہل عرب جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لیے جایا کرتے تھے، اس زمانہ میں انگوریہ (انقرہ)، جو ایشیائے کوچک کا مشہور شہر ہے، قیصر کا پایۂ تخت تھا، تجار قریش انگوریہ میں جاتے تو قیصر نہایت عزت اور حرمت سے خیر مقدم کرتا تھا۔

عرب میں راستے محفوظ نہ تھے، ہاشم نے مختلف قبائل میں دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلہ میں کاروانِ قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائے گا اور ان سے خرید و فروخت کرے گا، یہ سبب تھا کہ عرب میں باوجود عام لوٹ مار کے قریش کا قافلۂ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔

ایک دفعہ مکہ میں قحط پڑا، ہاشم نے اس قحط میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اس وقت سے ان کا نام ہاشم مشہور ہو گیا، عربی زبان میں چورا کرنے کو ہشم کہتے ہیں، جس کا اسم فاعل ہاشم ہے۔

ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے، راستہ میں مدینہ میں ٹھہرے، وہاں سال کے سال بازار لگتا تھا، بازار میں گئے تو ایک عورت کو دیکھا جس کے حرکات و سکنات سے شرافت اور فراست کا اظہار ہوتا تھا، اس کے ساتھ حسین اور جمیل بھی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ خاندان بنی نجار سے ہے اور سلمیٰ نام ہے، ہاشم نے اس سے شادی کی درخواست کی اس نے قبول کر لی، غرض نکاح ہو گیا، شادی کے بعد یہ شام کو چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا، سلمیٰ کو حمل رہ گیا تھا، لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام شیبہ رکھا گیا، اس نے قریباً ۸ برس تک مدینہ میں پرورش پائی، ہاشم کے بھائی جن کا نام مطلب تھا، ان کو یہ حالات معلوم ہوئے تو فوراً مدینہ روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر بھتیجے کی جستجو کی، سلمیٰ نے ان کے آنے کا حال سنا تو بلا بھیجا، تین دن مہمان رہے، چوتھے دن شیبہ کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ روانہ ہوئے، ان کی عمر ۸ برس کی تھی، یہاں آ کر ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا۔

عبدالمطلب کے لفظی معنی "مطلب کا غلام" ہیں، اس لئے ارباب سیر نے وجہ تسمیہ میں بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، جن میں صحیح تر یہ ہے کہ چونکہ مطلب نے ان کی پرورش کی تھی، اور یہ یتیم تھے، اس لئے عرب کے محاورہ کے مطابق "غلام مطلب" مشہور ہو گئے، عبدالمطلب کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ چاہ زمزم جو ایک مدت سے اَٹ کر گم ہو گیا تھا، انھوں نے اس کا پتہ لگایا اور کھدوا کر نئے سرے سے درست کروایا۔

انھوں نے منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے، خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو

لہ امالی ابو علی قالی۔ لہ طبری ص ۱۰۸۸ و ۱۰۸۹ و ۲۵؛ لہ ملخصاً دیکھو زرقانی جلد اول ص ۸۵۔

کس کے نام پر نکلتا ہے، اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا، یہ اُن کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں، اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربانی کیجیے، ان کو چھوڑ دیجیے، عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا، عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیئے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا، عبدالمطلب نے سو اونٹ قربانی کئے اور عبداللہ بچ گئے، یہ واقدی کی روایت ہے، ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

عبدالمطلب کے دس یا بارہ بیٹوں میں سے پانچ شخصوں نے اسلام یا کفر کی خصوصیت کی وجہ سے شہرت عام حاصل کی یعنی ابولہب، ابوطالب، عبداللہ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ، عام طور پر مشہور ہے کہ ابولہب کا اصلی نام اور ہے خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ نے دیا، لیکن یہ غلطی ہے، ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ یہ لقب خود عبدالمطلب نے دیا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ ابولہب نہایت حسین اور جمیل تھا اور عرب میں گورے چہرے کو شعلۂ آتش کہتے ہیں، فارسی میں بھی آتشیں رخسار ہے،

عبداللہ قربانی سے بچ گئے تو عبدالمطلب کو اُن کی شادی کی فکر ہوئی، قبیلۂ زہرہ میں وہب بن عبد مناف کی صاحبزادی جن کا نام آمنہ تھا، قریش کے تمام خاندانوں میں ممتاز تھیں، وہ اس وقت اپنے چچا وہیب کے پاس رہتی تھیں، عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا، انھوں نے منظور کیا اور عقد ہو گیا اسی موقع پر خود عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا شادی کی، حضرت حمزہؓ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں، ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوئیں، اور اس بنا پر حضرت حمزہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خالہ زاد بھائی بھی ہیں۔

دستور تھا کہ نوشاہ شادی کے بعد ۳ دن تک سسرال میں رہتا تھا، عبداللہ تین دن سسرال میں رہے اور پھر گھر چلے آئے، اس وقت ان کی عمر تقریباً سترہ برس سے کچھ زیادہ تھی۔

عبداللہ تجارت کے لئے شام کو گئے، واپس آتے ہوئے مدینہ میں ٹھہرے اور بیمار ہو کر یہیں رہ گئے عبدالمطلب کو یہ حال معلوم ہوا تو اپنے بڑے بیٹے حارث کو خبر لانے کے لئے بھیجا، وہ مدینہ میں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا، چونکہ یہ خاندان میں سب سے زیادہ محبوب تھے، تمام خاندان کو سخت صدمہ ہوا۔

عبداللہ نے ترکہ میں اونٹ، بکریاں اور ایک لونڈی چھوڑی تھی، جس کا نام اُمّ ایمنؓ تھا، یہ سب چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترکہ میں ملیں، ام ایمنؓ کا اصلی نام برکت تھا۔

---

[1] سیرت ابن ہشام و برحاشیہ زاد المعاد صفحہ ۵۱، [2] شرح زرقانی جلد اول صفحہ ۹۰، [3] طبقات ابن سعد جز اول قسم اول ص ۶۲

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

ولادت

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے، سیارگانِ فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخِ کہن مدتہائے دراز سے اسی صبحِ جان نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر و باد کی تردستیاں، عالمِ قدس کے انفاسِ پاک، توحیدِ ابراہیمؑ، جمالِ یوسفؑ، معجز طرازیِ موسیٰؑ، جان نوازیِ مسیحؑ، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں اور شاہنشاہِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جان نواز، وہی ساعتِ ہمایوں، وہی دورِ فرخ فال ہے، اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا، لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکتِ روم، اوجِ چین کے قصرہائے فلک بوس گر پڑے، آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی، آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیمِ عبداللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہِ حرم، حکمرانِ عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہِ کونین۔

شمسۂ نہ مسندِ ہفت اختراں — ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست — ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
امی و گویا بہ زبانِ فصیح — از الفِ آدم و میمِ مسیح
رسمِ ترنج است کہ در روزگار — پیش دہد میوہ پس آرد بہار

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللّٰھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

تاریخِ ولادت

تاریخِ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے دلائلِ ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپؐ کی ولادت ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ[1] مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔

---

[1] محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیمؑ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں گہن لگا تھا اور سنہ ۱۰ھ تھا اور اس وقت آپؐ کی عمر کا تریسٹھواں سال تھا۔

آپ کا نام محمد رکھا گیا، اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا تھا۔

رضاعت

سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد ثوبیہ نے دودھ پلایا، جو ابولہب کی لونڈی تھی[1]

حلیمہ سعدیہ

ثوبیہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو دودھ پلایا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ شہر کے رؤسا اور شرفا، شیرخوار بچوں کو اطراف کے قصبات اور دیہات میں بھیج دیتے تھے، یہ رواج اس غرض سے تھا کہ بچے بدوؤں میں پل کر فصاحت کا جوہر پیدا کرتے تھے[1] اور عرب کی خالص خصوصیات محفوظ رہتی تھیں۔

شرفائے عرب نے مدت تک اس رسم کو محفوظ رکھا، یہاں تک کہ بنوامیہ نے دمشق میں پایۂ تخت قائم کیا اور شاہانہ شان و شوکت میں کسریٰ و قیصر کی ہمسری کی، تاہم ان کے بچے صحراؤں میں بدوؤں کے گھر میں پلتے تھے، ولید بن عبدالملک خاص اسباب سے نہ جا سکا اور حرم شاہی میں پلا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانِ بنوامیہ میں صرف ولید ہی ایک شخص تھا جو عربی صحیح نہیں بول سکتا تھا[2]

غرض دستور مذکور کی بنا پر سال میں دو مرتبہ دیہات سے شہر میں عورتیں آیا کرتی تھیں، اور شرفائے شہر اپنے شیرخوار بچوں کو ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے، اس دستور کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے چند روز بعد قبیلہ ہوازن کی چند عورتیں بچوں کی تلاش میں آئیں، ان میں حضرت حلیمہ سعدیہ بھی تھیں[3]، اتفاق سے ان کو کوئی بچہ ہاتھ نہیں آیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (۲) ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ (سنہ ۱ ھ) کا محرم ۷ جنوری ۵۷۱ء کو ۸ بجکر ۲۰ منٹ پر لگا تھا

(۳) اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۴۰ برس پیچھے ہٹیں تو آپ کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے جس میں ازروئے قواعد ہیئت، ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

(۴) تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸ سے لے کر ۱۲ تک میں منحصر ہے

(۵) ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تھی

[1] بخاری باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب۔ امام سہیلی نے بہ تفصیل یہ واقعات لکھے ہیں اور یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں اس لئے فصیح ہوں کہ قبیلہ بنی سعد میں پلا ہوں (الروض الانف ج اول ص ۱۰۹) سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ محمد کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی ان کے اخلاق آزادانہ مستغنی عن الغیر تھے جس کی وجہ ان کا پانچ سال تک بنی سعد میں بسر کرنا تھا اور اسی وجہ سے ان کی تقریر جزیرہ نمائے عرب کے خالص نمونہ کے موافق تھی۔ [2] ابن اثیر ج ۵ صفحہ ۹ طبع لیڈن۔ [3] سہیلی نے لکھا ہے کہ عرب میں دودھ پلانا اور اس کی اجرت لینا شریفانہ کام نہیں خیال کیا جاتا تھا، اسی بنا پر عرب میں مثل ہے، الحرۃ لا تاکل بثدییھا، اس بنا پر سہیلی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سال قحط پڑا تھا، اس لئے مجبوراً حضرت حلیمہؓ اور ان کے قبیلہ نے یہ خدمت گوارا کی تھی، لیکن تمام تاریخوں میں ہے کہ مکہ میں ہر سال باہر سے عورتیں اس کام کے لئے آیا کرتی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ اس کام کو معیوب سمجھنا عرب کا عام خیال نہ تھا، یہ خیال اہل شہر اور امرا کے ساتھ مخصوص ہوگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے اُن کو مقرر کرنا چاہا تو ان کو خیال آیا کہ یتیم بچے کو لے کر کیا کروں گی، لیکن خالی ہاتھ بھی نہ جا سکتی تھیں، اس لئے حضرت آمنہ کی درخواست قبول کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر گئیں، ان کی ایک صاحبزادی تھیں، جن کا نام شیما تھا ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اُنس تھا، وہی آپؐ کو کھلایا کرتی تھیں، دو برس کے بعد حلیمہ آپؐ کو مکہ میں لائیں، اور آپؐ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کیا، لیکن چونکہ اس زمانہ میں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، آپؐ کی والدہ نے فرمایا کہ واپس لے جاؤ، چنانچہ دوبارہ گھر میں لائیں، اس میں اختلاف ہے کہ آپؐ حضرت حلیمہؓ کے یہاں کتنے برس تک رہے، ابن اسحاق نے وثوق کے ساتھ ۶ برس لکھا ہے۔

ہوازن کا قبیلہ فصاحت و بلاغت میں مشہور ہے، ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم سب میں فصیح تر ہوں، کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے"[1] بنی سعد ہوازن ہی کے قبیلہ کو کہتے ہیں۔

حضرت حلیمہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، عہد نبوت میں جب وہ آپؐ کے پاس آئیں تو آپؐ میری ماں میری ماں کہہ کر لپٹ گئے، یہ دلچسپ واقعات آگے آئیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے وفات کر گئیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ابن ابی خیثمہ نے "تاریخ" میں، ابن جوزی نے "حدا" میں، منذری نے "مختصر سنن ابی داؤد" میں، ابن حجر نے اصابہ میں ان کے اسلام لانے کی تصریح کی ہے، حافظ مغلطائی نے اُن کے اسلام پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام "التحفۃ الجسیمہ فی اثبات اسلام حلیمہ" ہے۔

حضرت حلیمہؓ کے شوہر یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی باپ کا نام حارث ابن عبد العزیٰ ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد مکہ میں آئے اور اسلام لائے۔

حارثؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ یہ تم کیا کہتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا ہاں وہ دن آئے گا کہ میں آپ کو دکھا دوں گا کہ میں سچ کہتا تھا، حارثؓ مسلمان ہو گئے۔

رضاعی بہن بھائی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار رضاعی بھائی بہن تھے جن کے نام یہ ہیں، عبد اللہ، انیسہ، حذیفہ اور حذافہ جو شیما کے لقب سے مشہور تھیں، ان میں سے عبد اللہ اور شیما کا اسلام لانا ثابت ہے، باقیوں کا حال معلوم نہیں۔

مدینہ کا سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جب چھ برس کی ہوئی تو آپؐ کی والدہ آپؐ کو لے کر مدینہ گئیں چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کی ننہال خاندان نجار میں تھیں، وہیں ٹھہریں، اس سفر میں ام ایمنؓ بھی ساتھ تھیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ تھیں، مورخین نے لکھا ہے کہ آپؐ کی والدہ اس ننہالی رشتہ کی وجہ سے مدینہ گئیں، لیکن یہ رشتہ دور کا رشتہ تھا، قیاس میں نہیں آتا کہ صرف اتنے سے تعلق سے اتنا بڑا سفر کیا جائے میرے نزدیک بعض مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ حضرت آمنہ اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کے لئے گئی تھیں جو مدینہ

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۱۔ [2] زرقانی ج ۳ ص ۲۰۰۔ [3] اصابہ فی احوال الصحابہ مطبوعہ مصر مطبع سعادت جلد ۱ ص ۸۳۔

میں مدفون ہے۔ بہرحال ایک مہینہ تک مدینہ میں مقیم رہیں، واپس ہوتے ہوئے جب مقام ابواء[1] میں پہنچیں تو ان کا انتقال ہوگیا، اور یہیں مدفون ہوئیں، ام ایمنؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر مکہ میں آئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام مدینہ کی بہت سی باتیں یاد رہ گئی تھیں، جب آپؐ قیام مدینہ کے زمانہ میں ایک دفعہ بنو عدی کے منازل پر گزرے تو فرمایا کہ اسی مکان میں میری والدہ ٹھہری تھیں، یہی وہ تالاب ہے جس میں میں نے تیرنا سیکھا تھا، اسی میدان میں، میں انیسہ ایک لڑکی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔[2]

عبدالمطلب کی کفالت

والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دامن تربیت میں لیا، ہمیشہ آپؐ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔[3]

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی اور حجون میں مدفون ہوئے، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر آٹھ برس کی تھی، عبدالمطلب کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے، اور فرط محبت سے روتے جاتے تھے، عبدالمطلب نے مرنے کے وقت اپنے بیٹے ابوطالب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سپرد کی، ابوطالب نے اس فرض کو جس خوبی سے ادا کیا، اس کی تفصیل آگے آتی ہے، یہ واقعہ خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عبدالمطلب کی موت نے بنو ہاشم کے رتبۂ امتیاز کو دفعۃً گھٹا دیا، اور یہ پہلا دن تھا کہ دنیوی اقتدار کے لحاظ سے بنو امیہ کا خاندان بنو ہاشم پر غالب آگیا، عبدالمطلب کی مسند ریاست پر اب حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں سے صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباس کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

ابوطالب کی کفالت

عبدالمطلب کے دس بیٹے مختلف ازواج سے تھے، ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ اور ابوطالب ماں جائے بھائی تھے، اس لئے عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب ہی کے آغوش تربیت میں دیا، ابوطالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے تھے، سوتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر سوتے اور باہر جاتے تو ساتھ لے کر جاتے۔

غالباً جب آپؐ کی عمر دس بارہ برس کی ہوئی تو آپ نے بکریاں چرائیں، فرانس کے ایک نامور مورخ نے لکھا ہے:

---

[1] ایک گاؤں کا نام ہے جو جحفہ سے ۲۳ میل پر واقع ہے۔ [2] طبقات ابن سعد جلد ا صفحہ ۷۳۔ [3] عبدالمطلب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھنا ایک مسلم واقعہ ہے لیکن مارگولیس صاحب کو دادا کا پوتے پر مہربان ہونا بھی گوارا نہیں فرماتے ہیں کہ یتیم لڑکے کی حالت کچھ اچھی نہ تھی اور اخیر زندگی میں ان کے چچا حمزہ نے نشہ کی حالت میں محمدؐ کو طنزاً اپنے باپ کا غلام کہا تھا (لائف آف محمدؐ از مارگولیس صفحہ ۴۸ تا ۴۹) حضرت حمزہؓ کے جس قول سے استدلال ہے، مارگولیس خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نشہ کی حالت تھی، اس کی تفصیل جیسا کہ بخاری (غزوۂ بدر وغیرہ) میں ہے یہ ہے کہ بدر کے مال غنیمت سے حضرت علیؓ کو دو اونٹ ملے تھے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی، حضرت حمزہؓ شراب میں مخمور ادھر سے گزرے اور اونٹ کا پیٹ پھاڑ کر دل اور جگر کا کباب بنایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، اور ان کو ملامت کی، حضرت حمزہؓ سخت مخمور تھے اس حالت میں وہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تھے کیا اس حالت کا کوئی بیان شہادت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ابوطالب چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ذلیل رکھتے تھے اس لئے ان سے بکریاں چرانے کا کام لیتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عرب میں بکریاں چرانا معیوب کام نہ تھا، بڑے بڑے شرفاء اور امراء کے بچے بکریاں چراتے تھے خود قرآن مجید میں ہے وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ. اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم کی گلہ بانی کا دیباچہ تھا، زمانۂ رسالت میں آپ اس سادہ اور پرلطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ آپ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے، صحابہ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے، آپ نے فرمایا جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں زیادہ مزے کے ہوتے ہیں، یہ میرا اس زمانہ کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا

شام کا سفر

ابوطالب تجارت کا کاروبار کرتے تھے، قریش کا دستور تھا، سال میں ایک دفعہ تجارت کی غرض سے شام کو جایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تقریباً بارہ برس کی ہوگی کہ ابوطالب نے حسب دستور شام کا ارادہ کیا، سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب سے اس قدر محبت تھی کہ جب ابوطالب چلنے لگے تو آپ ان سے لپٹ گئے، ابوطالب نے آپ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا، عام مورخین کے بیان کے موافق بحیرا کا مشہور واقعہ اسی سفر میں پیش آیا، اس واقعہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب ابوطالب بُصریٰ میں پہنچے تو ایک عیسائی راہب کی خانقاہ میں اترے، جس کا نام بحیرا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا یہ سید المرسلین ہیں لوگوں نے پوچھا تم نے کیونکر جانا، اس نے کہا جب تم لوگ پہاڑ سے اترے تو جس قدر درخت اور پتھر تھے سب سجدے کے لئے جھک گئے۔

یہ روایت مختلف پیرایوں میں بیان کی گئی ہے، تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سرولیم میور، ڈریپر، مارگولیوس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتادیئے تھے، انہی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اور اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

---

[1] طبقات ابن سعد صفحہ ۸۰ و صحیح بخاری کتاب الاجارۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے کہ میں قراریط پر مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا، قراریط کے معنی میں اختلاف ہے، ابن ماجہ کے شیخ یعنی سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط قیراط کی جمع ہے، اور قیراط درہم یا دینار کے ٹکڑے کا نام ہے، اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے، اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو جیاد کے قریب ہے، ابن جوزی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے، علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے (عینی ج ۵ ص ۴۲۱) نور النبراس میں یہ بحث اور زیادہ تفصیل سے ہے، اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

[2] ڈریپر صاحب معرکۂ مذہب و سائنس میں لکھتے ہیں، بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی۔ آپ

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیئے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیئے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے زیادہ مستند طریقہ یہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے، اس کے متعلق تین باتیں قابل لحاظ ہیں

(۱) ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ حسن اور غریب ہے، اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں جانتے۔ حسن کا مرتبہ صحیح حدیث سے کم ہوتا ہے اور جب غریب ہو تو اس کا رتبہ اس سے بھی گھٹ جاتا ہے۔

(۲) اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمن بن غزوان ہے، اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمن منکر حدیثیں بیان کرتا ہے، جن میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے جس میں بحیرا کا واقعہ مذکور ہے۔

(۳) حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے، علامہ ذہبی نے تلخیص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع سمجھتا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔

(۴) اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور ابو بکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے، حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابو بکرؓ بچے تھے۔

(۵) اس حدیث کے اخیر راوی ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں، وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعدؒ میں جو سلسلۂ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے، کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے ناتربیت یافتہ لیکن اخاذ دماغ نے نہ صرف اپنے اتالیق کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا، بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں (عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام) کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پالیا تھا۔ سر ولیم میور صاحب نے بھی نہایت آب و رنگ سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ نے قائم کیا وہ سب اسی سفر اور اس کے مختلف تجارب و مشاہدات کے نتائج تھے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض ان عیسائی اساتذہ کا تعلیم یافتہ ہوتا تو ممکن تھا کہ توحید خالص کا وہ ولولہ و تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اس کے سینہ میں پیدا ہو سکتا، جو قرآن کے ہر صفحہ میں نظر آتا ہے۔

[1] نبراس فی شرح عیون السیر لابن سید الناس اور زرقانی اور میزان الاعتدال اور اصابہ تذکرہ عبدالرحمن ابن غزوان مستدرک حاکم مع تلخیص ج ۲ ص ۶۱۵، [2] [3] جزو اول قسم اول ص ۷۵، [4]

اپنے اوپر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں دونوں کا نام نہیں لیتا ہے۔

(۶) حافظ ابن حجر رواۃ پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں، لیکن چونکہ حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کی شرکت بداہۃً غلط ہے اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے، لیکن حافظ ابن حجر کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں، عبدالرحمٰن بن غزوان کی نسبت خود انہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا، اس کی طرف سے اس وجہ سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے ممالیک کی روایت نقل کی ہے: ممالیک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔

حرب فجار کی شرکت

عرب میں اسلام کے آغاز تک لڑائیوں کا جو متواتر سلسلہ چلا آتا ہے، ان میں یہ جنگ سب سے زیادہ مشہور اور خطرناک تھی۔

یہ لڑائی قریش اور قیس کے قبیلہ میں ہوئی تھی، قریش کے تمام خاندان نے اس معرکہ میں اپنی اپنی الگ فوجیں قائم کی تھیں، آل ہاشم کے علم بردار زبیر بن عبدالمطلب تھے اور اسی صف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے، بڑے زور کا معرکہ ہوا، اول قیس، پھر قریش غالب آئے اور بالآخر صلح پر خاتمہ ہو گیا، اس لڑائی میں قریش کا رئیس اور سپہ سالار اعظم حرب بن امیہ تھا جو ابوسفیان کا باپ اور امیر معاویہ کا دادا تھا۔

چونکہ قریش اس جنگ میں برسر حق تھے اور خاندان کے ننگ و نام کا معاملہ تھا اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی، لیکن جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے، آپ نے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا، امام سہیلیؒ نے صاف تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جنگ نہیں کی، ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وانما لم يقاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم مع اعمامه فى الفجار وقد بلغ سن القتال لانها كانت حرب فجار وكانوا ايضا كلهم كفارا ولم ياذن الله لمؤمن ان يقاتل الا ليكون كلمة الله هى العليا۔

اور آپ نے اس لڑائی میں جنگ نہیں کی حالانکہ آپ لڑائی کی عمر کو پہنچ چکے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لڑائی ایام الحرام میں پیش آئی تھی نیز یہ وجہ تھی کہ فریقین کافر تھے اور مسلمانوں کو لڑائی کا حکم صرف اس لئے خدا نے دیا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

اس لڑائی کو فجار اس لئے کہتے ہیں کہ ایام الحرام میں یعنی ان مہینوں میں پیش آئی تھی جن میں لڑنا ناجائز تھا۔

حلف الفضول

لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سینکڑوں گھرانے برباد کر دیئے تھے اور قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس پھرے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سربراہ تھے یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندان ہاشم، زہرہ اور تیم، عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔[2]

---

[1] جامع نے بحیرا راہب کے قصہ کی مکمل تنقید سیرۃ النبی جلد سوم باب مشہور عام واقعات معجزات کی واقعی حیثیت میں کی ہے اس کو ملاحظہ فرمایا جائے (س)۔ [2] طبقات جلد ا ص ۸۲۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی بلائے[1] تو میں حاضر ہوں

اس معاہدہ کو حلف الفضول اس لئے کہتے ہیں کہ اول اول اس معاہدہ کا خیال جن لوگوں کو آیا ان کے نام میں لفظ فضیلت کا مادہ داخل تھا یعنی فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل، یہ لوگ جرہم اور قطورا کے قبیلے کے تھے، اگرچہ یہ معاہدہ بے کار گیا اور کسی کو یاد بھی نہ رہا چنانچہ قریش نے نئے سرے سے بنیاد ڈالی، تاہم بانی اول کو نیک نیتی کا یہ ثمرہ ملا کہ ان کے نام کی یادگار اب تک باقی ہے۔

تعمیر کعبہ

کعبہ کی عمارت صرف قد آدم اونچی تھی، اور دیواروں پر چھت نہ تھی جس طرح ہمارے ملک میں عیدگاہیں ہوتی ہیں، چونکہ عمارت نشیب میں تھی، بارش کے زمانہ میں شہر کا پانی حرم میں آتا تھا، اس کی روک کیلئے بالائی حصہ پر بنوا دیا گیا تھا، لیکن وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا، بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ موجودہ عمارت ڈھا کر نئے سرے سے زیادہ مستحکم بنائی جائے۔ حسن اتفاق یہ کہ جدہ کے بندرگاہ پر ایک تجارتی جہاز کنارہ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا، قریش کو خبر لگی تو ولید بن مغیرہ نے جدہ پہنچ کر جہاز کے تختے مول لے لئے، جہاز میں ایک رومی معمار تھا جس کا نام باقوم تھا، ولید اس کو ساتھ لایا، اور تمام قریش نے مل کر تعمیر شروع کی، مختلف قبائل نے عمارت کے مختلف حصے آپس میں تقسیم کر لئے تھے کہ کوئی اس شرف سے محروم نہ رہ جائے، لیکن جب حجر اسود کے نصب کرنے کا موقع آیا تو سخت جھگڑا پیدا ہوا، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھ سے انجام پائے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا، تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبو لیتا تھا، اس موقع پر بھی بعض دعوے داروں نے یہ رسم ادا کی، چار دن تک یہ جھگڑا برپا رہا، پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا رائے دی کہ کل صبح کو سب سے پہلے جو شخص آئے وہی ثالث قرار دے دیا جائے، سب نے یہ رائے تسلیم کی، دوسرے دن تمام قبائل کے معزز آدمی موقع پر پہنچے، کرشمہ ربانی دیکھو کہ صبح کو سب سے پہلے لوگوں کی نظریں جس پر پڑیں، وہ جمال جہاں تاب چہرۂ محمدی تھا، لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہ کیا کہ اس شرف سے تنہا بہرہ ور ہو، آپ نے فرمایا جو قبائل دعوے دار ہیں، سب کا ایک ایک سردار انتخاب کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چادر بچھا کر حجر اسود کو اس میں رکھ دیا اور سرداروں سے کہا کہ چادر کے چاروں کونے تھام لیں اور اوپر کو اٹھائیں، جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرما دیا، یہ گویا اشارہ تھا کہ دین الٰہی کی عمارت کا آخری تکمیلی پتھر بھی ان ہی

---

[1] مسند ج ۱ ص ۱۹۰، ۱۹۳ لیکن امام سہیلی نے مسند حارث بن اسامہ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نام اس لئے پڑا کہ اس معاہدہ میں یہ الفاظ تھے، ترد الفضول علی اهلها

[2] مسند طیالسی جلد اول ص ۱۸، مستدرک حاکم جلد اول ص ۴۵۸

ہاتھوں سے نصب ہوگا۔[1]

اسی طرح ایک سخت لڑائی آپ کے حسن تدبیر سے رک گئی، کعبہ کی عمارت اب مسقف کر دی گئی، لیکن چونکہ سامان تعمیر کافی نہ تھا، ایک طرف زمین کا کچھ حصہ چھوڑ کر بنیادیں قائم کی گئیں اور اس حصے کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی کہ پھر موقع ہوگا تو کعبہ کے اندر لے لیں گے، یہی حصہ ہے جس کو آج حطیم کہتے ہیں، اور جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد نبوت ارادہ فرمایا تھا کہ دیوار ڈھا کر نئے سرے سے عمارت بنائی جائے لیکن پھر خیال ہوا کہ نئے نئے مسلمان ہیں، دیوار کعبہ کے ڈھانے سے بدگمان ہو جائیں گے۔[2]

شغل تجارت

عرب اور خصوصاً قریش یعنی بنی اسمعیل ظہور اسلام کے ہزاروں برس پہلے سے تجارت پیشہ تھے[4] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ ہاشم نے قبائل عرب سے تجارتی معاہدے کر کے اس خاندانی طریقۂ اکتساب کو اور زیادہ مستحکم اور باقاعدہ کر دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بھی تاجر تھے، اس بنا پر سن رشد کو پہنچنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب فکر معاش کی طرف توجہ ہوئی تو تجارت سے بہتر کوئی پیشہ نظر نہ آیا۔

ابو طالب کے ساتھ آپ بچپن میں بھی بعض تجارتی سفر کر چکے تھے، جس سے ہر قسم کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اور آپ کے حسن معاملہ کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی۔ لوگ عموماً اپنا سرمایہ کسی تجربہ کار اور امین شخص کے ہاتھ میں دے کر اس کے منافع میں شرکت کر لیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوشی کے ساتھ اس شرکت کو گوارا فرماتے تھے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شرکائے تجارت کی شہادتوں سے جو احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کس دیانت اور راست بازی کے ساتھ اس کام کو انجام دیتے تھے۔

تاجر کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نادر مثال ایفائے عہد اور اتمام وعدہ کی ہو سکتی ہے، لیکن منصب نبوت سے پہلے مکہ کا تاجر امین اس اخلاقی نظیر کا بہترین نمونہ تھا، حضرت عبد اللہؓ بن ابی الحمسا ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ بعثت سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ معاملہ ہو چکا تھا کچھ باقی تھا، میں نے وعدہ کیا کہ پھر آؤں گا، اتفاق سے تین دن تک مجھ کو اپنا وعدہ یاد نہ آیا، تیسرے دن جب وعدہ گاہ پر پہنچا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی جگہ منتظر پایا، لیکن اس خلاف وعدہ سے آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آیا، صرف اس قدر فرمایا کہ تم نے مجھے زحمت دی، میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔[5]

کاروبار تجارت میں ہمیشہ آپ اپنا معاملہ صاف رکھتے تھے، نبوت سے پہلے بھی جن لوگوں سے تجارت میں

---

[1] یہ ایک حدیث کی طرف تلمیح ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ میں نبوت کی عمارت کا آخری پتھر ہوں، یعنی مکمل مذہب اور خاتم الرسل ہوں۔

[2] یہ واقعات ابن ہشام، طبقات، طبری میں متفرقاً اور زرقانی جلد اول ص [illegible] میں مجتمعاً مذکور ہیں، اخیر کا واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے، بخاری میں یہ بھی ہے کہ قریش جب کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے اور دوش مبارک پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے تھے یہاں تک کہ شانے چھل گئے تھے۔

[3] اضافہ و زیادہ۔ [4] توراۃ تکوین قصہ یوسف۔ [5] سنن ابی داؤد ج ۲، ص [illegible] مطبع محمدی کتاب الادب باب فی العدۃ۔

آپؐ کا سابقہ تھا، وہ بھی اس کی شہادت دیتے تھے۔ سائبؓ نامی ایک صحابی جب مسلمان ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے ان کی تعریف کی، آپؐ نے فرمایا، میں تم سے زیادہ ان کو جانتا ہوں، سائبؓ نے کہا، آپؐ پر میرے ماں باپ قربان، آپ میرے شریک تجارت تھے، لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا فکنت لا تداری ولا تماری[1]۔ قیسؓ بن سائب مخزومی ایک اور صحابی بھی آپؐ کے شریک تجارت تھے، وہ بھی انہی الفاظ کے ساتھ آپؐ کے حسن معاملہ کی شہادت دیتے ہیں[2]۔

تجارت کی غرض سے شام و بصریٰ اور یمن کے متعدد سفر آپؐ نے کئے تھے۔

تزویج خدیجہ

حضرت خدیجہؓ ایک معزز خاتون تھیں، ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ملتا ہے، اور اس رشتہ کے لحاظ سے وہ آپؐ کی چچیری بہن تھیں، انکی دو شادیاں پہلے ہو چکی تھیں، اب وہ بیوہ تھیں، چونکہ نہایت شریف النفس اور پاکیزہ اخلاق تھیں، جاہلیت میں لوگ ان کو طاہرہ کے نام سے پکارتے تھے، نہایت دولت مند تھیں، طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ جب اہل مکہ کا قافلہ تجارت کو روانہ ہوتا تھا تو اکیلا ان کا سامان تمام قریش کے برابر ہوتا تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اب پچیس برس کی ہو چکی تھی، متعدد قومی کاموں میں آپؐ شریک ہو چکے تھے، تجارت کے کاروبار کے ذریعہ سے لوگوں کے ساتھ معاملات پیش آتے تھے، اس بنا پر آپ کے حسن معاملہ، راستبازی، صدق و دیانت اور پاکیزہ اخلاق کی عام شہرت ہو چکی تھی، یہاں تک کہ زبان خلق نے آپؐ کو امین کا لقب دے دیا تھا، حضرت خدیجہؓ نے ان اسباب کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ میرا مال تجارت لے کر شام کو جائیں، جو معاوضہ میں اوروں کو دیتی ہوں آپؐ کو اس کا مضاعف دوں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا اور مال تجارت لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔

واپس آنے کے تقریباً تین مہینہ کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے پاس شادی کا پیغام دیا، ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے چچا عمرو بن اسد زندہ تھے، عرب میں عورتوں کو یہ آزادی حاصل تھی کہ شادی بیاہ کے متعلق خود گفتگو کر سکتی تھیں، اور اس میں بالغہ نابالغہ کی قید نہ تھی، حضرت خدیجہؓ نے چچا کے ہوتے خود براہ راست تمام مراتب طے کئے، تاریخ معین پر ابوطالب اور تمام رؤسائے خاندان جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، حضرت خدیجہؓ کے مکان پر آئے، ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور پانسو طلائی درہم مہر قرار پایا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد زندہ تھے، اور ان کی موجودگی میں نکاح ہوا، لیکن شراب میں مخمور تھے، جب ہوش میں آئے تو نکاح کا حال سن کے برہم ہوئے کہ برابر کا جوڑ نہیں۔

لیکن یہ روایت صحیح نہیں، امام سہیلی نے بہ تصریح اور بہ دلیل ثابت کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے والد جنگ فجار کے قبل انتقال کر چکے تھے۔

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۱، [2] اصابہ ج ۵ ص ۳۵۲، ترجمہ حضرت قیسؓ بن سائب۔

حضرت خدیجہؓ جس مکان میں رہتی تھیں وہ آج بھی (حسب بیان مورخ طبری) انہی کے نام سے مشہور ہے[2] امیر معاویہؓ نے اس مکان کو خرید کر مسجد بنا دیا۔

شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی، اور پہلے دو شوہروں سے دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں، ان کے نام اور مفصل حالات آگے آئیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر اولاد ہوئی، بجز حضرت ابراہیمؑ کے حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ہوئی ان کے حالات آگے تفصیل سے آئیں گے۔

جستہ جستہ واقعات

یہ واقعات تھے جن میں تاریخی ترتیب معلوم ہے، اس لئے مسلسل لکھے گئے، ان امور کے سوا جستہ جستہ واقعات کا بھی پتہ لگتا ہے، چونکہ ان کے سنین اور تاریخیں غیر معلوم ہیں، اس لئے ان کو عام سلسلہ سے الگ یکجا لکھنا زیادہ موزوں ہوگا۔

حدود سفر

اہل مکہ عموماً تجارت کی غرض سے سفر کرنے کے عادی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس تقریب سے متعدد سفر کئے، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گزر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپ کا تشریف لے جانا ثابت ہے، عرب میں مختلف مقامات میں جو بازار قائم تھے، ان میں سے حباشہ کا ذکر ابن سید الناس نے کیا ہے، حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا ان میں جرش بھی ہے، جو یمن میں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے، اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپؐ دو دفعہ تشریف لے گئے، اور ہر دفعہ حضرت خدیجہؓ نے معاوضہ میں ایک اونٹ دیا۔[3]

نبوت کے جس سال آپؐ کی خدمت میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے، ان میں جب بحرین سے عبدالقیس کا وفد آیا، تو آپ نے بحرین کے ایک ایک مقام کا نام لے کر وہاں کا حال پوچھا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپؐ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں، آپؐ نے فرمایا میں نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔ موزخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپؐ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ کو اور وسعت دی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے، کہ آپؐ نے بحری سفر بھی کیا تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار اور طوفان کی کیفیت کی ایسی صحیح تصویر ہے، جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے[4]، مورخ مذکور کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ آپؐ مصر بھی

---

[1] حضرت خدیجہؓ کے نکاح کے واقعات ابن ہشام، ابن سعد و طبری میں باختلاف اجمال و تفصیل و اثبات و نفی مذکور ہیں، میں نے قرائن سے جو روایت زیادہ قابل اعتبار پائی نقل کی ہے، یکجا تمام حالات دیکھنے ہوں تو زرقانی جلد اول ص ۲۳۰ سے ۲۳۹ تک دیکھنا چاہیئے۔

[2] حضرت خدیجہؓ کے مکان کا ذکر صرف طبری نے کیا ہے، ابن حنبل (مسند ابن عباس) میں واقعات مذکور ہیں۔

[3] نور النبراس فی شرح ابن سید الناس، مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۰۰۔ [4] مارگولیس ص ۵۵۔

تشریف لے گئے تھے، اور ڈیڈسی (بحر میت) کا بھی معائنہ کیا تھا، لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہیں[۱]۔

مراسم شرک سے اجتناب

یہ قطعاً ثابت ہے کہ آپ بچپن اور شباب میں بھی جب کہ منصب پیغمبری سے ممتاز نہیں ہوئے تھے، مراسم شرک سے ہمیشہ مجتنب رہے۔

ایک دفعہ قریش نے آپ کے سامنے کھانا لاکر رکھا، یہ کھانا بتوں کے چڑھاوے کا تھا، جانور جو ذبح کیا گیا تھا کسی بت کے نام پر ذبح کیا گیا تھا، آپ نے کھانے سے انکار کیا[۲]۔

نصاریٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کے اعتقادات میں جو تغیر ہوا ہے وہ عہد نبوت سے ہوا ہے، ورنہ اس سے پہلے آپ کا طرز عمل وہی تھا جو آپ کے خاندان اور اہل شہر کا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے پہلے صاحبزادہ کا نام عبد العزیٰ[۳] رکھا تھا، اور یہ روایت خود امام بخاری کی تاریخ صغیر میں موجود ہے، لیکن یہ روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کیونکر استدلال ہو سکتا ہے۔

حضرت خدیجہؓ اسلام سے پہلے بت پرست تھیں، انہوں نے یہ نام رکھا ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک منصب ارشاد پر مامور نہیں ہوئے تھے، اس لئے آپ نے تعرض نہ فرمایا ہوگا، اور اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت فی نفسہ بھی ثابت نہیں، اس روایت کا سب سے زیادہ ترجیح سلسلہ وہ ہے جو امام بخاری نے تاریخ صغیر میں روایت کیا ہے، اس کا ایک راوی اسمٰعیل ہے جس کا پورا نام اسمٰعیل بن ابی اویس ہے، اگرچہ بعض محدثین نے اس کی توثیق کی ہے لیکن گروہ کثیر کی رائے حسب ذیل ہے۔

معاویہ بن صالح	اسمٰعیل اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔
یحییٰ بن مخلد	وہ جھوٹ بولتا ہے اور محض ہیچ ہے۔
امام نسائی	ضعیف اور غیر ثقہ ہے۔
نصر بن سلمہ مروزی	وہ کذاب ہے۔
دارقطنی	میں اس کو صحیح روایت کے لئے پسند نہیں کرتا۔
سیف بن محمد	وہ جھوٹ حدیثیں بناتا ہے۔
سلمہ بن شبیب	مجھ سے اس نے خود اقرار کیا کہ جب کبھی کسی بات میں اختلاف ہوتا تھا تو میں ایک حدیث بنا لیتا تھا۔

---

[۱] یورپین مورخین جن کی بنیاد صرف قیاس و رائے پر ہوتی ہے اگر اس قسم کے واقعات بیان کریں تو کوئی تعجب نہیں ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے حد نظر کی مضحکہ انگیز روایت ہے بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر بحرین تشریف لے جانے کی روایت صحیح ہے تو خلیج فارس آپ نے دیکھا ہوگا، بحر میت کا مشاہدہ بھی ممکن ہے کیونکہ اس کا موقع عرب و شام کے درمیان میں ہے جہاں سے آپ کئی بار تجارت کے ساتھ گزرے ہوں گے۔ [۲] صحیح بخاری باب مناقب ذکر زید بن عمرو بن نفیل، یہ حدیث امام بخاری نے اور ابواب میں بھی نقل کی ہے اس کے الفاظ میں اجمال رہ گیا ہے جو اس روایت میں صاف ہو گیا ہے، مسند ابن حنبل جلد اول ص ۱۸۹ میں ایک روایت ہے جس میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کو اس کھانے پر بلایا اور زید نے انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تاریخ سے کبھی بتوں پر ذبح کیا ہوا کھانا نہیں کھایا لیکن اس روایت کے راویوں کا حال نہیں تھا اور یوں بھی بخاری کے سامنے اس روایت کی کیا وقعت ہے۔ [۳] عزیٰ ایک بت کا نام تھا

یہ امر واقعی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے بت پرستی کی برائی شروع کر دی تھی۔ اور جن لوگوں پر آپ کو اعتماد تھا، ان کو اس بات سے منع فرماتے تھے۔ (مستدرک حاکم جلد سوم ذکر زید بن حارثہ)

موحدین کی ملاقات

اس میں شبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے فیض الٰہی کی خفیف شعاعیں عرب میں چمکنی شروع ہو گئی تھیں، چنانچہ قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمرو بن نفیل نے بت پرستی سے انکار کر دیا تھا۔ ان میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید سے ملاقات کی تھی جس کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے، ورقہ عیسائی ہو گئے تھے اور چونکہ حضرت خدیجہ کے برادر عم زاد تھے اور مکہ ہی میں رہتے تھے اس لئے قیاس ہوتا ہے کہ آپ ان سے بھی ملے ہوں گے، بعض روایتوں میں ہے کہ ان سے آپ کی دوستی تھی

ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مجمع میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ اکثر اہل ادب نے نقل کیا ہے، چونکہ اس کے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفیٰ ہیں، اس سے عیسائی مؤرخوں نے قیاس کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طرز یہیں سے لیا ہے۔ چنانچہ بعض فقرے یہ ہیں۔

ایها الناس اسمعوا وعوا، و اذا وعیتم فانتفعوا، انه من عاش مات، ومن مات فات

مسٹر مارگولیوس نے اس کے برخلاف ایک حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے اور اس کے ثبوت میں دعویٰ سے زیادہ حیرت انگیز [illegible] کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ دونوں سونے سے پہلے ایک بت کی پرستش کر لیا کرتے تھے جس کا نام عزیٰ تھا۔ مصنف موصوف نے اس کی سند میں امام حنبل کی روایت (جلد ۴ صفحہ ۲۲۲) پیش کی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

حدثنی جار لخدیجة بنت خویلد انه سمع النبی صلی الله علیه وسلم وهو یقول لخدیجة ای خدیجة والله لا اعبد اللات والعزی والله لا اعبد ابدا. قال فتقول خدیجة خل اللات خل العزی قال کانت صنمهم التی کانوا یعبدون ثم یضطجعون.

حضرت خدیجہ بنت خویلد کے ایک ہمسایہ نے بیان کیا کہ میں نے آنحضرت کو حضرت خدیجہ سے یہ کہتے سنا کہ اے خدیجہ خدا کی قسم میں لات اور عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا خدیجہ کہتی تھیں کہ لات کو چھوڑیے عزیٰ کو جانے دیجئے یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے۔ اس نے کہا کہ عزیٰ وہ بت تھے جن کی پرستش اہل عرب سونے سے پیشتر کیا کرتے۔

ایک معمولی عربی داں بھی سمجھ سکتا ہے کہ عبارت مذکورہ میں کانوا کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اہل عرب لات و عزیٰ کی پرستش کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہوتا تو تثنیہ کا صیغہ ہوتا نہ کہ جمع کا، اس کے علاوہ خود اسی روایت میں لات و عزیٰ کی پرستش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنا مذکور ہے، مارگولیوس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزیٰ کے نام پر ایک خاکی رنگ کی بھیڑ ذبح کی تھی لیکن مصنف موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا بلکہ ولہوزن کا حوالہ دیا ہے (دیکھو مارگولیوس کی کتاب ص ۷۰) [illegible] معجم البلدان ایک جغرافیہ کی کتاب ہے [illegible] روایت اس مضمون کی موجود ہے [illegible] [illegible]

ماهو آت آت، اصغوا نبات، وارزاق واقوات، وآباء وامهات، واحیاء واموات، وجمیع واشتات، آیات ان

فی السماء لخبرا، وان فی الارض لعبرا، لیل داج، وسماء ذات ابراج، وبحار ذات امواج، مالی اری الناس

یذهبون ولا یرجعون، ارضوا بالمقام فاقاموا، ام ترکوا هناک فناموا، این من بنی وشید وزخرف

ونجد، وغره المال والولد، این من بغی وطغی۔

قس بن ساعدہ کی روایت اور اس کا خطبہ مختصر و مطول بہ عبارات مختلفہ بغوی، ازدی، بیہقی، جاحظ وغیرہ نے نقل کیا ہے لیکن وہ سرتاپا مصنوعی اور موضوع ہے، اس کے رواۃ عموماً ناقابل سند بلکہ کذاب ہیں، چنانچہ سیوطی نے موضوعات میں اس روایت کے تمام طریقوں کو نقل کر کے ان کے رواۃ سے بحث کی ہے، اور علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ کے اقوال تفصیل سے نقل کیے ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ روایت مختلف طریقوں سے مروی ہے، لیکن ہر طریقہ میں کوئی نہ کوئی راوی ایسا ہے جو موضوع حدیثیں بنایا کرتا تھا، اس کا ایک مشترک راوی محمد بن حجاج ہے، اس کی نسبت ابن معین کا قول ہے کہ کذاب اور خبیث ہے، ابن عدی نے لکھا ہے کہ ہریسہ کی حدیث اسی نے وضع کی ہے، ایک طریقہ کا راوی سعید بن ہبیرہ ہے، اس کی نسبت ابن حبان نے لکھا ہے کہ ثقہ لوگوں کی زبانی جھوٹی حدیثیں روایت کرتا تھا یا تو وہ خود یہ حدیثیں تصنیف کرتا تھا یا اور لوگ اس کے لئے بنا دیا کرتے، ایک طریقہ کے راوی قاسم بن عبداللہ اور احمد بن سعید ہیں، اور یہ دونوں حدیث بنانے میں بدنام ہیں، بیہقی نے اس روایت کے متعلق ایک بڑا قصہ نقل کیا ہے، جس میں حضرت ابوبکرؓ نے قس بن ساعدہ کا پورا خطبہ اپنی یاد سے بیان کیا ہے، یہ روایت پوری کی پوری موضوع ہے[1]۔ حافظ ابن حجر نے اس روایت کے اور طریقے بھی نقل کئے ہیں اور ان کی تضعیف کی ہے[2]۔

---

[1] یہ پوری تفصیل لآلی المصنوعہ مطبوعہ مصر ص ۹۵ تا ۱۰۰ میں ہے، ایک نکتہ یہاں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے، بنو امیہ اور عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ اس زمانہ کے شعرا اور ادبا خود سے اشعار اور خطبے تصنیف کرتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعراء اور خطباء کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق جس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاری نے جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا، علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال (مطبوعہ مصر ص ۲۲) میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دے دیتے تھے کہ ان کے بارے میں اشعار کہہ دو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت زیدؓ، ابوبکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابوطالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہر ان اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں مثلاً سریۂ عبیدۃ بن الحارث میں (ابن ہشام جلد دوم ص ۳ مطبوعہ مصر) حضرت ابوبکرؓ کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اور لکھا ہے:

واکثر اهل العلم بالشعر ینکر هذه القصیدة لابی بکر۔

اور اکثر اہل علم اور فن شعر والے اس بات کے منکر ہیں کہ یہ قصیدہ حضرت ابوبکرؓ کا ہے۔

[2] یہ وضع مختلف اغراض سے کی جاتی تھی، زیادہ اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی یا اور کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے، مثلاً یہی قس بن ساعدہ کا خطبہ، اس میں یہ فقرے بھی ہیں

احباب خاص نبوت سے پہلے جو لوگ آپ کے احباب خاص تھے، سب نہایت پاکیزہ اخلاق، بلند رتبہ اور عالی منزلت تھے، ان میں سب سے مقدم حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں آپ کے شریک صحبت رہے[1]۔ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی حکیم بن حزام جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے، وہ بھی احباب خاص میں سے تھے[2]، حرم کا منصب رفادۃ انہی کے ہاتھ میں تھا، دار الندوۃ کے بھی یہی مالک تھے، چنانچہ اسلام کے بعد امیر معاویہؓ کے ہاتھ ایک لاکھ درہم پر بیچ ڈالا لیکن یہ کل رقم خیرات کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں ۵ برس بڑے تھے اگرچہ یہ مدت تک یعنی ہجرت کے آٹھویں سال تک ایمان نہیں لائے لیکن اس حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نبیا قد حان حینہ واظلکم اوانہ فطوبی لمن	ایک پیغمبر کا زمانہ قریب آگیا ہے سو اس کو مبارکی ہے جو اس پر
من بہ فہداہ وویل لمن خالفہ وعصاہ۔	ایمان لائے گا اور وہ اس کو ہدایت کرے گا اور تباہی ہے اس
(اللآلی المصنوعہ ص ۲)	کے لئے جو اس کی مخالفت اور نافرمانی کرے گا

ابوطالب کے نام سے جو ایک قصیدہ ابن ہشام وغیرہ نے نقل کیا ہے (ابن ہشام ۹۳، ۹۴) سرتاپا موضوع ہے اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں

فاصبح فینا احمد فی ارومۃ تقصر عنہ سورۃ المتطاول
فایدہ رب العباد بنصرہ واظہر دینا حقہ غیر باطل

(اس قصیدہ کو سرتاپا موضوع کہنے کے بجائے جیسا کہ مصنفؒ نے کہا ہے اکثر کہنا صحیح ہے کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الاستسقاء، خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے وبعض اهل العلم بالشعر ینکر اکثرها یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں۔ س) اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید و معاد کے متعلق جو باتیں ہیں ان کے مطابق اشعار تصنیف کرتے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں ان کو دیکھ کر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھ کر یہ اشعار کہے ہیں مثلاً

فقلت لہ اذہب بہرون فادعوا الی اللہ فرعون الذی کان طاغیا
وقولا لہ انت رفعت ہذہ بلا عمد ارفق اذا بک بانیا
وقولا لہ انت سویت وسطہا منیرا اذا ما جنہ اللیل ہادیا

ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیوس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے چنانچہ کہتے ہیں قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے (صفحہ ۶۰ تا صفحہ ۶۳)، ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا آج یورپ والے اُلٹے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطباء اور شعراء سے معتقدات و خیالات لے کر دعویٰ کرتے تھے لیکن ادب کا نکتہ شناس اور فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب و روایت میں مہارت کے لئے ابھی ایک زمانہ درکار ہے اور جب وہ زمانہ آئے گا تو یورپ کو اپنی بدمذاقی پر خود شرم آئے گی

[1] اصابہ ذکر حضرت ابوبکرؓ (حضرت ابوبکرؓ کا نام عبداللہ تھا، اصابہ میں اسی نام کے ذیل میں حضرت ابوبکرؓ کا حال لکھا ہے) ص ۳۴۲ ج ۲۔ [2] اصابہ ذکر حکیم بن حزام اسد الغابہ ص ۴۹ ج ۲۔

ت سے نہایت محبت رکھتے تھے، ایک دفعہ ذی یزن کا اسباب نیلام ہوا تھا، اس میں ایک عمدہ حلہ تھا انہوں نے پچاس اشرفیوں میں اس کو خریدا اور مدینہ لے کر آئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کریں، آپ نے فرمایا کہ میں مشرکوں کا ہدیہ نہیں قبول کرتا، البتہ قیمت لو تو لے سکتا ہوں، مجبور ہو کر انھوں نے قیمت لینی گوارا کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لے لیا۔[1]

حضرت ضمادؓ بن ثعلبہ جو ازد کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں طبابت اور جراحی کا پیشہ کرتے تھے، یہ بھی احباب میں سے تھے، نبوت کے زمانہ میں یہ مکہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھا کہ راستہ میں جا رہے ہیں اور پیچھے لونڈوں کا غول ہے، مکہ کے کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہتے تھے، لونڈوں کا غول دیکھ کر ضماد کو بھی قیاس ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا محمدؐ! میں جنون کا علاج کر سکتا ہوں، آپ نے حمد و ثنا کے چند مؤثر جملے ادا کئے، ضماد مسلمان ہو گئے۔ اس واقعہ کو مختصراً مسلم و نسائی نے بھی لکھا ہے، لیکن زیادہ تفصیل مسند امام احمد بن حنبل (ج ۱ ص ۳۰۲) میں ہے، جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تجارت کے کاروبار میں شریک تھے ان میں سے ایک صاحب قیس بن سائب مخزومی تھے، مجاہد بن جبیر جو مشہور مفسر گزرے ہیں، انہی کے غلام تھے، ان کا بیان ہے کہ شرکاء کے ساتھ آپؐ کا معاملہ نہایت صاف رہتا تھا اور کبھی کوئی جھگڑا یا مناقشہ پیش نہیں آتا تھا۔[2]

---

[1] مسند امام حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۰۳ [2] استیعاب جلد ۲ صفحہ ۵۳۹ و اصابہ ذکر ص

آفتابِ رسالتؐ کا طلوع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں پیدا ہوئے، مکہ بت پرستی کا مرکز اعظم تھا، خود کعبہ میں تین سو ساٹھ بت تھے۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا تمغائے امتیاز صرف اس قدر تھا کہ اس صنم کدہ کے متولی اور کلید بردار تھے، باایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بتوں کے آگے سر نہیں جھکایا۔ دیگر رسومِ جاہلیت میں بھی کبھی شرکت نہیں کی، قریش نے اس بنا پر کہ ان کو عام لوگوں سے ہر بات میں ممتاز رہنا چاہیے، یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ ایام حج میں قریش کے لیے عرفات جانا ضرور نہیں اور یہ کہ جو لوگ باہر سے آئیں وہ قریش کا لباس اختیار کریں ورنہ اُن کو عریاں ہوکر کعبہ کا طواف کرنا ہوگا،[2] چنانچہ اسی بنا پر طوافِ عریاں کا عام رواج ہوگیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں میں کبھی اپنے خاندان کا ساتھ نہ دیا۔

عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہوکر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق و شوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کے لیے کھڑے ہوگئے، وہیں نیند آگئی، اٹھے تو صبح ہوچکی تھی، ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیق الٰہی نے بچا لیا کہ تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے۔[3]

یہ فطرت سلیم اور نیک سرشتی کا اقتضا تھا لیکن ایک شریعتِ کبریٰ کی تاسیس، ایک مذہب کامل کی تشیید اور رہنمائی کونین کے منصب عظیم کے لیے کچھ اور درکار تھا، اسی زمانہ کے قریب میں اور حق پرستوں ورقہ، زید، عثمان بن حویرث کے دل میں خیال آیا کہ جماد لایعقل کے آگے سر جھکانا حماقت ہے، چنانچہ مذہب حق کی تلاش کے لیے نکلے لیکن ناکامی کی دیوار سے سر ٹکرا کر رہ گئے، ورقہ اور عثمان عیسائی ہوگئے اور زید یہ کہتے کہتے مرگئے "اے خدا! اگر مجھ کو یہ معلوم ہوتا کہ تجھ کو کس طریقے سے پوجنا چاہیے تو میں اسی طریقہ سے تجھ کو پوجتا"۔[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے دنیاوی تعلقات تھے، تجارت کا کاروبار تھا، متعدد اولادیں تھیں، تجارت کی ضرورت سے اکثر سفر کرنا پڑتا تھا، لیکن دستِ قدرت کو جو کام لینا تھا وہ ان تمام مشاغل سے بالاتر تھا، دنیا اور دنیا کے تمام کام آپؐ کو ہیچ نظر آتے تھے، تاہم مطلوب حقیقی کا اب تک پتہ نہ تھا۔

مکہ معظمہ سے تین میل پر ایک غار تھا جس کو حرا کہتے ہیں، آپؐ مہینوں وہاں جاکر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے، کھانے

---

[1] ابن ہشام مطبوعہ مصر ۱۲۹۵ھ جلد اول صفحہ ۶۰ [2] ابن ہشام صفحہ ۶۹ [3] بزار و مستدرک بحوالہ نسیم الریاض ج ۲ اول صفحہ ۶۰۹ و خصائص الکبریٰ سیوطی ج ۱ صفحہ ۸۸ [4] سر ولیم میور صاحب لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں لکھتے ہیں: ہماری تمام تصنیفات محمدؐ کے بارہ میں ان کے بالپن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی پر جو اہل مکہ میں کمیاب تھیں، متفق ہیں۔

پینے کا سامان ساتھ لے جاتے، وہ ختم ہو چکتا تو پھر گھر پر تشریف لاتے اور پھر واپس جا کر مراقبہ میں مصروف ہوتے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ غارِ حرا میں تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے، یہ عبادت کیا تھی؟ عینی شرح بخاری میں ہے۔

قیل ما کان صفۃ تعبدہ اجیب بان ذلک کان بالتفکر والاعتبار۔	یہ سوال کیا گیا ہے کہ آپ کی عبادت کیا تھی؟ جواب یہ ہے کہ غور و فکر اور عبرت پذیری۔

یہ وہی عبادت تھی جو آپ کے دادا ابراہیم علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کی تھی، ستاروں کو دیکھا تو چونکہ تجلی کی جھلک تھی، دھوکا ہوا، چاند نکلا تو اور بھی شبہ ہوا، آفتاب پر اس سے زیادہ، لیکن جب سب نظروں سے غائب ہو گئے تو بے ساختہ پکار اٹھے۔

لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۔ ۔ ۔ ۔	میں فانی چیزوں کو نہیں چاہتا۔
اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام)	میں اپنا منہ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان پیدا کیا۔

ایک مغربی مورخ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کی کیفیت اس طرح ادا کی ہے:۔

> سفر و حضر میں ہر جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ہزاروں سوال پیدا ہوتے تھے، میں کیا ہوں، یہ غیر متناہی عالم کیا ہے، نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں، کیا کوہ حرا کی چٹانیں، کوہ طور کی سر بفلک چوٹیاں، کھنڈر اور میدان، کسی نے ان سوالوں کا جواب دیا، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ گنبد گرداں، گردش لیل و نہار، چمکتے ہوئے ستارے برستے ہوئے بادل، کوئی ان سوالوں کا جواب نہ دے سکا۔[۱]

نبوت کا دیباچہ یہ تھا کہ خواب میں آپ پر اسرار منکشف ہونے شروع ہوئے۔ جو کچھ آپ خواب میں دیکھتے تھے بعینہٖ وہی پیش آتا تھا، ایک دن جب کہ آپ حسب معمول غار حرا میں مراقبہ میں مصروف تھے، فرشتہ غیب نظر آیا کہ آپ سے کہہ رہا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۔ (اقرأ)	پڑھ اس خدا کا نام جس نے کائنات کو پیدا کیا جس نے آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ تیرا خدا کریم ہے وہ جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا، وہ جس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اسے معلوم نہ تھیں۔

آپ گھر واپس تشریف لائے تو جلال الہٰی سے لبریز تھے۔

آپ نے حضرت خدیجہؓ سے تمام واقعہ بیان کیا، وہ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عبری زبان جانتے

---

[۱] کارلائل ہیروز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے انواع میں سے ایک خواب بھی ہے، صحیح بخاری کے شروع میں ہے: اول ما بدئ به رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحة فی النوم، بخاری کتاب التعبیر میں زیادہ صاف طریقہ پر یہ مسئلہ ادا کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری باب بدء الوحی و کتاب التعبیر، یہ روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہؓ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئی تھیں، محدثین کی اصطلاح میں ایسی روایت کو مرسل کہتے ہیں، لیکن صحابہؓ کا مرسل محدثین کے نزدیک قابل حجت ہے کیونکہ متروک راوی بھی صحابہ ہی ہوں گے۔

تھے اور توریت وانجیل کے ماہر تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ پر اترا تھا۔

روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈر پیدا ہوا، حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ متردد نہ ہوں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا، پھر وہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں، انھوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بے شبہ یہ الفاظ نکلے "مجھ کو ڈر ہے"، لیکن یہ تردد، یہ ہیبت، یہ اضطراب جلال الٰہی کا تاثر اور نبوت کے بارِ گراں کی عظمت کا تخیل تھا، آپ نے کیا دیکھا؟ ناموس اعظم نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کرسکتیں۔

صحیح بخاری باب التعبیر میں ہے کہ چند روز تک جب وحی رک گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاتے تھے کہ اپنے آپ کو گرادیں، دفعۃً حضرت جبرئیل نظر آتے تھے اور کہتے تھے "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) تم واقعی خدا کے پیغمبر ہو" اس سے آپ کو اس وقت تسکین ہوجاتی تھی، لیکن جب پھر وحی کچھ دنوں کے لئے رک جاتی تھی تو پھر آپ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرادینا چاہتے تھے اور پھر حضرت جبرئیل نمایاں ہوکر تسکین دیتے کہ آپ واقعی خدا کے پیغمبر ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کے حصہ اول کی شرح میں معترضین کا یہ اعتراض نقل کیا ہے کہ "ایک پیغمبر کو نبوت میں کیونکر شک ہوسکتا ہے اور ہو تو کسی عیسائی کے تسکین دینے سے کیا تسکین ہوسکتی ہے"، پھر ایک مشہور محدث کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ نبوت ایک امرِ عظیم ہے، اس کا تحمل دفعۃً نہیں ہوسکتا، اس لئے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب کے ذریعہ سے مانوس کیا گیا، پھر جب دفعۃً فرشتہ نظر آیا تو آپ اقتضائے بشریت سے خوف زدہ ہوگئے، حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسکین دی، پھر جب ورقہ نے تصدیق کی تو آپ کو پورا یقین ہوگیا، محدث مذکور کے الفاظ یہ ہیں:۔

فلما سمع کلامہ ایقن بالحق واعترف بہ۔	جب آپ نے ورقہ کا کلام سنا تو آپ کو حق کا یقین آگیا اور آپ نے اس کا اعتراف کیا۔

محدث مذکور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ وحی بار بار اس لئے رک جاتی تھی کہ آپ رفتہ رفتہ اس کے برداشت کرنے کے قابل ہوجائیں[1]۔

لیکن جب کہ ترمذی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبوت سے پہلے سفر شام میں (بمقام بصریٰ) جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے تھے، اس کی تمام شاخیں آپ پر جھک آئیں، جس سے بحیرا نے آپ کے نبی ہونے کا یقین کیا؛ جب کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میں اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو نبوت سے پہلے مجھ کو سلام کیا کرتا تھا"؛ جب کہ صحاح میں موجود ہے کہ نبوت سے پہلے فرشتوں نے آپ کا سینہ چاک کیا اور جسمانی آلائشیں نکال کر پھینک دیں، تو خود ان روایتوں کے روایت کرنے والے کیونکر یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ کا نظر آنا ایسا واقعہ تھا جس سے آپ اس قدر

---

[1] فتح الباری شرح صحیح بخاری کتاب التعبیر جلد ۱۲ صفحہ ۳۱۰، مطبوعہ مصر۔

خوف زدہ ہو جاتے تھے کہ ایک دفعہ تسکین ہو کر بھی بار بار اضطراب ہوتا تھا، اور آپ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دینے کا ارادہ کرتے تھے اور بار بار حضرت جبرئیل کو اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی تھی، کیا اور کسی پیغمبر کو بھی ابتدائے وحی میں کبھی شک ہوا تھا؟ حضرت موسیٰ نے درخت سے آواز سنی کہ "میں خدا ہوں" تو کیا ان کو کوئی شبہ پیدا ہوا؟ حافظ ابن حجر وغیرہ کی پیروی کرنے کی ہم کو ضرورت نہیں، ہم کو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ خود اصل روایت بہ سند مرفوع متصل ہے یا نہیں؟ یہ روایت امام زہری کے بلاغات میں سے ہے یعنی سند کا سلسلہ زہری تک ختم ہو جاتا ہے اور آگے نہیں بڑھتا، چنانچہ خود شارحین بخاری نے تصریح کر دی ہے، یہ ظاہر ہے کہ ایسے عظیم الشان واقعہ کے لئے سند منقطع کافی نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیشِ نظر تھیں، اگر آپ کا فرض اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغِ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُرخطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس کے لئے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیض یابِ صحبت رہ چکے تھے جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بنا پر آپ کے صدقِ دعویٰ کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے، یہ لوگ حضرت خدیجہؓ آپ کی حرم محترم تھیں، حضرت علیؓ تھے جو آپ کی آغوشِ تربیت میں پلے تھے، زیدؓ تھے جو آپ کے آزاد کردہ غلام اور بندۂ خاص تھے، حضرت ابوبکرؓ تھے جو برسوں سے فیضیابِ خدمت تھے، سب سے پہلے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو یہ پیغام سنایا، وہ سننے سے پہلے مومن تھیں، پھر اور بزرگوں کی باری آئی اور سب ہمہ تن اعتقاد تھے۔

حضرت ابوبکرؓ دولت مند، ماہر انساب، صاحب الرائے اور فیاض تھے، ابن سعد نے لکھا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے، غرض ان اوصاف کی وجہ سے مکہ میں ان کا عام اثر تھا اور معززینِ شہر ان سے ہر بات میں مشورہ لیتے تھے، اربابِ روایت کا بیان ہے کہ کبار صحابہؓ میں سے حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فاتحِ ایران، حضرت طلحہؓ سب انہی کی ترغیب اور ہدایت سے اسلام لائے ان کی وجہ سے یہ چرچا چپکے چپکے اور لوگوں میں بھی پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان سابقین اولین میں عمارؓ، خبابؓ بن الارت، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، طلحہؓ، ارقمؓ، سعیدؓ بن زید عبداللہؓ بن مسعود، عثمانؓ بن مظعون، عبیدہؓ اور صہیبؓ رومی زیادہ ممتاز ہیں۔

لیکن جو کچھ ہوا پوشیدہ طور پر ہوا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمانِ خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے، نماز کا جب وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز ادا کرتے، ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ حرم ہی میں ادا کرتے تھے، کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی، ایک دفعہ آپ حضرت

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابۃ میں بزرگانِ موصوف کا تذکرہ ملاحظہ کرنا چاہیے۔ [2] دیکھو ریاض النضرۃ محب الطبری مطبوعہ مصر ص ۵۱

[3] کامل ابن اثیر ج ۲ ص ۱۵ ذکر الاختلاف فی اول من اسلم۔

علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاق سے آپ کے چچا ابوطالب آنکلے، اُن کو اس جدید طریقہ عبادت پر تعجب ہوا، کھڑے ہوگئے اور بغور دیکھتے رہے، نماز کے بعد پوچھا کہ یہ کون سا دین ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا۔ ابوطالب نے کہا میں اس کو اختیار تو نہیں کرسکتا لیکن تم کو اجازت ہے، اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہوسکے گا۔

یہ تاریخ اسلام کا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا؟ مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی، لیکن ایک خاص پہلو پر ہمیں نگاہ ڈال لینی چاہیئے، یعنی یہ کہ اوائل اسلام میں جب کہ اسلام لانا جان و مال سے ہاتھ دھونا تھا، کون لوگ اور کس قسم کے لوگ ایمان لائے؟ اس زمانہ میں جو لوگ اسلام لائے ان میں چند خصائص مشترک تھے اس قسم کے (لیکن بالعکس) مشترک خصائص ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے جنھوں نے شدت سے مخالفت کی، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

(۱) اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاش حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک اور پاکیزہ اخلاق تھے مثلاً حضرت ابوبکرؓ، جاہلیت میں بھی عفیف، پارسا اور صدق و دیانت میں مشہور تھے۔ عثمان بن مظعون صوفی مزاج تھے اور اسلام سے پہلے شراب چھوڑ چکے تھے، اسلام کے بعد چاہتے تھے کہ راہب بن جائیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔ صہیبؓ عبداللہ بن جدعان کے تربیت یافتہ تھے جو اسلام سے پہلے تارک شراب ہوکر وفات پاچکے تھے، حضرت ابوذرؓ جن کا اسلام لانے والوں میں چھٹا یا ساتواں نمبر تھا۔ ان کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے بت پرستی چھوڑ چکے تھے اور غیر متعین طریقہ سے جس طرح اُن کے ذہن میں آتا تھا خدا کا نام لیتے تھے اور نماز پڑھتے تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال سُنا تو اپنے بھائی کو بھیجا کہ صحیح خبر لائیں، وہ مکہ میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر قرآن مجید کی سورتیں سُنیں، واپس جاکر ابوذرؓ سے کہا، میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کو لوگ مرتد کہتے ہیں وہ مکارم اخلاق سکھاتا ہے اور جو کلام سناتا ہے وہ شعر نہیں کوئی اور چیز ہے، تمہارا طریقہ اس سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ابوذرؓ کو تسکین نہیں ہوئی، خود مکہ میں آئے، زبانِ مبارک سے آپؐ کا ارشاد سنا اور اسلام قبول کرلیا، وہ تمام عمر دنیاوی تعلقات سے الگ رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کے لئے زر و مال کا جمع کرنا جائز نہیں، چنانچہ اس بنا پر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں اُن کو مدینہ سے دور بھیج دیا تھا۔

(۲) بعض صحابہؓ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کرچکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے، لیکن اس اجمالی اعتقاد کے سوا اور کچھ نہیں جانتے تھے اور اس لئے تلاش حق میں سرگرداں تھے، انہی میں زید بھی تھے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، انھوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ برس پہلے وفات پائی، لیکن ان کے صاحبزادے سعید موجود تھے، وہ باپ کے ارشادات سُن چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو ان کو وہ رہنما ہاتھ آگیا جس کی جستجو میں اُن کے باپ دنیا سے چلے

---

[1] حضرت ابوذرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بخاری و مسلم دونوں میں مذکور ہے لیکن باہم اختلاف ہے، میں نے دونوں کو جمع کرلیا ہے، لیکن اختصار کے لحاظ سے بہت سی باتیں چھوڑ دیں۔

گئے اور وہ اب تک سرگشتہ تھے۔

(۳) یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب اعظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے، بلکہ اکثر ایسے تھے مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابو فکیہؓ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت و جاہ کے دربار میں جگہ بھی نہیں مل سکتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو لے کر حرم میں جاتے تو رؤسائے قریش ہنسی کرتے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِنَا (انعام - ۱)

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔

کفار کے نزدیک ان کا افلاس اُن کی تحقیر کا سبب تھا لیکن یہی چیز تھی جس کی وجہ سے ایمان کی دولت سب سے پہلے ان ہی کے ہاتھ آسکتی تھی، دولت و مال ان کے دلوں کو سیاہ نہیں کر چکا تھا، فخر و غرور ان کو انقیاد حق سے روک نہیں سکتا تھا، ان کو یہ ڈر نہ تھا کہ اگر بت پرستی چھوڑ دیں گے تو کعبہ کا کوئی منصب عظیم ہاتھ سے جاتا رہے گا، غرض اُن کے دل ہر قسم کے زنگ سے پاک تھے اور حق کی شعاعیں اُن پر دفعۃً پرتو افگن ہو سکتی تھیں، یہی سبب ہے کہ انبیاء کے ابتدائی پیرو ہمیشہ نادار اور مفلس لوگ ہوتے تھے، عیسائیت کے ارکان اولین ماہی گیر تھے، حضرت نوحؑ کے متبعین خاص کی نسبت کفار کو اعلانیہ کہنا پڑا،

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيۡنَ هُمۡ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاۡىِ
وَمَا نَرٰى لَـكُمۡ عَلَيۡنَا مِنۡ فَضۡلٍۢ بَلۡ نَظُنُّكُمۡ كٰذِبِيۡنَ (ہود)

اور ہم تو بظاہر یہ دیکھتے ہیں کہ تیری پیروی انہی لوگوں نے کی جو رذیل ہیں اور
ہم تو تم میں کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ تم سب جھوٹے ہو

یہ سابقین اسلام جس قسم کا راسخ ایمان لائے تھے اس کی تفصیل آگے آتی ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ قریش کی سخت خونخواریاں، جور و ظلم کے شدائد، دولت و مال کی انتہائی ترغیبیں، کوئی چیز ان کو متزلزل نہ کر سکی اور آخر انہی کمزور ہاتھوں نے قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ دیا۔

تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا۔

فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ (حجر - ۶)

اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔

اور نیز حکم آیا،

وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ (شعراء - ۱۱)

اور اپنے نزدیک کے خاندان والوں کو خدا سے ڈرا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر پکارا، "یا معشر القریش"! لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا، سب نے کہا ہاں! کیونکہ تم کو ہمیشہ سے ہم نے سچ بولتے دیکھا ہے، آپ نے فرمایا۔ تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر عذاب شدید نازل ہوگا۔ یہ سن کر سب لوگ جن میں ابولہب آپ کا چچا بھی شامل تھا، سخت برہم ہو کر واپس چلے گئے۔ (صحیح بخاری جلد ۲، ص ۷۰۲)

چند روز کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو، یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندان عبد المطلب مدعو کیا گیا، حمزہ، ابو طالب، عباس سب شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کو کفیل ہے۔ اس بارگراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟

تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعۃً حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا، گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا[1]

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص (جن میں ایک سیزدہ سالہ نوجوان ہے) دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن آگے چل کر زمانہ نے بتا دیا کہ یہ سراپا سچ تھا

اب مسلمانوں کی ایک معتد بہ جماعت تیار ہو گئی تھی جن کی تعداد چالیس سے زیادہ تھی۔ آپ نے حرم کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کیا۔ کفار کے نزدیک یہ حرم کی سب سے بڑی توہین تھی، اس لئے دفعۃً ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور ہر طرف سے لوگ آپ پر ٹوٹ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربیب حضرت حارثؓ بن ابی ہالہ گھر میں تھے ان کو خبر ہوئی، دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانا چاہا، لیکن ہر طرف سے ان پر تلواریں برس پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ اسلام کی راہ میں یہ پہلا خون تھا جس سے زمین رنگین ہوئی[2]

قریش کی مخالفت اور اس کے اسباب

مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی۔ قریش کا خاندان جو تمام عرب پر مذہبی حکومت رکھتا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہمسایگان خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے، اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس تعلق سے قریش کا کاروبار زیادہ پھیلتا گیا یہاں تک کہ متعدد محکمے اور بڑے بڑے مناصب قائم کئے گئے جن کی تفصیل یہ ہے[3]

منصب	منصب کی تفصیل	کس خاندان کو کون منصب حاصل تھا	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کون لوگ ان مناصب پر فائز تھے؟
حجابہ	کعبہ کی کلید برداری اور تولیت		عثمان بن طلحہ
رفادہ	غریب حجاج کی خبرگیری	خاندان نوفل	حارث بن عامر
سقایۃ	حجاج کے پانی پلانے کا انتظام	خاندان ہاشم	حضرت عباسؓ
مشورہ		خاندان اسد	یزید بن ربیعۃ الاسود
دیات المغارم	خون بہا کا فیصلہ کرنا	خاندان امیہ	حضرت ابوبکرؓ
عقاب	علم برداری	خاندان امیہ	ابوسفیان
قبہ	خیمہ و خرگاہ کا انتظام اور سواروں کی افسری	خاندان مخزوم	ولید بن مغیرہ

---

[1] طبری نے "تاریخ" جلد ۳ صفحہ ۱۱۷۱ اور تفسیر جلد ۱۹ صفحہ ۶۸ میں عبد الغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطہ سے اس کو روایت کیا ہے پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا مذبذب ہے۔ اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعف ہیں مگر وجوہ وضع نہیں ہیں۔

[2] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر حارث بن ابی ہالہ۔

[3] یہ تمام تفصیل عقد الفرید جلد دوم صفحہ ۳۸ میں ہے۔

سفارت و منافرت	سفیر ہو کر جانا اور جن قبیلوں میں یہ نزاع پیش آئے کہ شریف تر کون ہے؟ اس کا فیصلہ کرنا۔	خاندانِ عدی	حضرت عمرؓ
ازلام و ایسار	محکمۂ مال کا انتظام	خاندانِ جمح	صفوان بن امیہ
اموال	مہتمم خزانہ	خاندان سہم	حرث بن قیس

آغازِ اسلام میں جو لوگ قریش کے رؤسائے اعظم تھے اور جن کی عظمت و اقتدار کا اثر تمام مکہ پر تھا، ان کے نام یہ ہیں:۔

ابوسفیان بن حرب (حضرت معاویہؓ کے باپ)	حرب فجار میں انہی کا باپ قریش کا سپہ سالار تھا۔
ابولہب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا)	
ابوجہل۔	ولید بن مغیرہ کا بھتیجا اور اپنے قبیلہ کا سردار۔
ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ)	قریش کا رئیس اعظم تھا۔
عاص بن وائل سہمی (حضرت عمرو بن العاص کا باپ)	نہایت دولت مند، کثیر الاولاد اور صاحب اثر تھا۔
عتبہ بن ربیعہ (امیر معاویہؓ کا نانا)	نہایت شریف الطبع اور صاحب ریاست تھا

ان کے علاوہ اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث بن کلدۃ، اخنس بن شریق ثقفی، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط صاحب اثر تسلیم کئے جاتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ خاندان ہاشم اور بنو امیہ برابر کے حریف تھے اور دونوں میں مدت سے رشک و رقابت چلی آتی تھی۔

پہلا سبب

ناتربیت یافتہ اور تند خو قوموں کا خاصہ ہے کہ کوئی تحریک جو ان کے آبائی رسم و عقائد کے خلاف ہو ان کو سخت برہم کر دیتی ہے، اس کے ساتھ ان کی مخالفت محض زبانی مخالفت نہیں ہوتی اور ان کی تشنگی انتقام کو خون کے سوا کوئی چیز بجھا نہیں سکتی، آج ہندوستان اس قدر مہذب ہو گیا ہے لیکن اب بھی کسی عام مسئلہ مذہبی کی مخالفت کی جائے تو ایک حشر برپا ہو جاتا ہے اور حکومت موجودہ اگر منتظم اور صاحب جبروت نہ ہوتی تو اس زمین پر بارہا خون کا بادل برس چکا تھا۔

عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے مزین تھی، جن میں ہبل خدائے اعظم تھا، یہی بت ہر قسم کے خیر و شر کے مالک تھے، پانی برساتے تھے، اولادیں دیتے تھے، معرکہ ہائے جنگ میں فتحیں دلاتے تھے، خدا یا تو سرے سے نہ تھا یا تھا تو وجود معطل تھا۔

دوسرا سبب

اسلام کا اصل فرض اس طلسم کو دفعۃً برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت اقتدار اور عالمگیر اثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا اسی قدر مخالفت میں زیادہ سرگرم تھے۔

قریش کا رئیس اعظم حرب بن امیہ تھا، چنانچہ حرب فجار میں وہی سپہ سالار اعظم تھا، لیکن حرب کے مرنے کے بعد

اس کا بیٹا ابوسفیان اس منصب عظیم کے حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے ولید بن المغیرہ نے اپنی لیاقت اور اثر سے ریاست حاصل کی، ابوجہل اس کا بھتیجا تھا اور وہ بھی قریش میں امتیاز رکھتا تھا۔

ابوسفیان گو اپنے باپ کا منصب نہ حاصل کر سکا لیکن بنو امیہ کے خاندان کا سردار وہی تھا، خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ کبیر السن ابولہب تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی چچا تھا۔ قبیلہ سہم میں سب سے زیادہ بااثر عاص بن وائل تھا جو نہایت دولت مند اور کثیر الاولاد تھا۔

قریش کی عنان حکومت انہی روسا کے ہاتھ میں تھی اور یہی لوگ تھے جنہوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی۔ قریش کے اور اکابر مثلاً اسود بن مطلب، اسود بن عبد یغوث، نضر بن الحرث، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط انہی لوگوں کے زیر اثر تھے اور اس وجہ سے اعدائے اسلام میں ان کے نام ہر جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ قریش کا یہ خیال تھا کہ نبوت کا منصب اعظم اگر کسی کو ملتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف - ۳)	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دو شہروں (مکہ و طائف) میں سے کسی رئیس اعظم پر اترتا یعنی ولید بن ربیعہ یا ابو مسعود ثقفی،

عرب میں ریاست کے لئے دولت اور اولاد سب سے پہلی اور ضروری شرط تھی، اولاد کی نسبت اکثر وحشی قوموں میں (ہندوستان میں بھی) یہ خیال رہا ہے کہ جو شخص صاحب اولاد نہ ہو وہ عالم آخرت کی برکات سے محروم رہتا ہے، ہندوؤں میں بھی یہ خیال ہے کہ اولاد کے بغیر انسان کو پوری نجات نہیں مل سکتی۔

قریش میں اوصاف مذکورہ کے لحاظ سے جو لوگ ریاست کا استحقاق رکھتے تھے وہ ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف، عاص بن وائل سہمی اور ابو مسعود ثقفی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف سے بالکل خالی تھے، دولت کے غبار سے آپ کا دامن پاک تھا اور اولاد ذکور سال دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہی۔

تیسرا سبب قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ ابرہۃ الاشرم (بادشاہ حبش) جو کعبہ کے ڈھانے کو آیا تھا، عیسائی تھا، یہی وجہ تھی کہ قریش عیسائیوں کے مقابلوں میں پارسیوں کو زیادہ پسند کرتے تھے، ایران اور روم کی جنگ میں ایرانیوں کو فتح ہوئی تو قریش نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور مسلمان شکستہ ہوئے، چنانچہ یہ آیت اتری۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ (روم - ۱)	قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے لیکن یہ لوگ مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر غالب آ جائیں گے۔ خدا ہی کو اختیار ہے پہلے بھی اور پیچھے بھی اور تب مسلمان اللہ کی مدد سے خوشی منائیں گے۔

اسلام اور نصرانیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں قبلہ بیت المقدس تھا، اور مدینہ منورہ میں بھی ایک مدت تک یہی قبلہ رہا۔ ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبب ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی۔ قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے

بنو ہاشم و بنو امیہ، عبد المطلب نے اپنے زور اور اثر سے بنو ہاشم کا پلہ بھاری کر دیا تھا، لیکن ان کے بعد اس خاندان میں کوئی صاحب اثر نہیں پیدا ہوا، ابو طالب دولت مند نہ تھے، عباس دولت مند تھے لیکن فیاض نہ تھے، ابولہب بدچلن تھا اس پر بنو امیہ کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندان بنو امیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا، اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، بدر کے سوا باقی تمام لڑائیاں ابوسفیان ہی نے برپا کیں اور وہی ان لڑائیوں میں رئیس لشکر رہا۔

عقبہ بن ابی معیط جو سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کے دوش مبارک پر اونٹ کی اوجھ لا کر ڈالی تھی اموی تھا۔ بنو امیہ کے بعد جس قبیلہ کو بنو ہاشم کی برابری کا دعویٰ تھا وہ بنو مخزوم تھے، ولید بن المغیرہ اسی خاندان کا رئیس تھا، اس لئے اس قبیلہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی ابوجہل کی ایک تقریر سے اس بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک دفعہ اخنس ابن شریق، ابوجہل کے پاس گیا اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ ابوجہل نے کہا ہم اور بنو عبد مناف (یعنی آل ہاشم) ہمیشہ حریف مقابل رہے، انہوں نے مہمان داریاں کیں تو ہم نے بھی کیں، انہوں نے خون بہا دیئے تو ہم نے بھی دیئے، انہوں نے فیاضیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، یہاں تک کہ جب ہم نے ان کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا، تو اب بنو ہاشم پیغمبری کے دعوے دار ہیں، خدا کی قسم! ہم اس پیغمبر پر کبھی ایمان نہیں لا سکتے۔[1]

پانچواں سبب

ایک بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان بنو ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا[2]، اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان کرتے تھے دوسری طرف ان بداخلاقیوں میں سخت دارو گیر کرتے تھے جس سے ان کی عظمت و اقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں اور گو طریقہ بیان عام ہوتا تھا لیکن لوگ جانتے تھے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝
أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِينَ ۝ (سورہ قلم)

اور اس شخص کے کہنے میں نہ آ، جو بات بات میں قسم کھاتا ہے، بداختر ہے، طعان ہے، چغلیاں لگاتا ہے، لوگوں کو اچھے کاموں سے روکتا ہے، حد سے بڑھ گیا ہے، بد ہے، تند خو ہے اور ان سب باتوں کے ساتھ جھوٹا نسب بناتا ہے اس لئے کہ وہ مالدار اور لڑکوں والا ہے۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝ نَاصِيَةٍ

دوسرے کی نسبت کہ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر

---

[1] ابن ہشام صفحہ ۱۸۰، مطبوعہ مصر۔ [2] حرم میں ایک سونے کا ہرن مدت سے خزانہ میں محفوظ تھا، ابولہب نے چرا کر فروخت کر دیا، یہ واقعہ تمام تاریخوں میں مذکور ہے، ابن قتیبہ نے بھی معارف (صفحہ ۵۵ مطبوعہ مصر) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (سورہ علق)

پیشانی کہ جو جھوٹی اور خطاکار ہے۔

ممکن تھا کہ وعظ و پند کا نرم طریقہ اختیار کیا جاتا، لیکن عرب کی قومی نخوت، دولت و اقتدار کا فخر، ریاست کا زعم، ان چیزوں کے ہوتے ہوئے جب تک ضرب نہایت سخت نہ ہوتی کارگر نہ ہوتی، اس لئے بڑے بڑے جبابر اس طرح مخاطب کئے جاتے تھے۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا وَمَهَّدْتُ لَهُ تَمْهِيدًا ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا (مدثر-۱)

مجھ کو اور اس کو تنہا چھوڑ دو، میں نے اس کو پیدا کیا، پھر بہت سا مال دیا، بیٹے دیئے، سامان دیا، پھر چاہتا ہے کہ میں اس کو اور دوں ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا دشمن ہے۔

یہ خطاب ولید بن مغیرہ کے ساتھ ہے جو قریش کا سرتاج تھا اور یہ الفاظ اس شخص کی زبان سے ادا ہوتے تھے جس کو کوئی ظاہری جاہ و اقتدار حاصل نہ تھا، لیکن مخالفت کی جو سب سے بڑی وجہ تھی اور جس کا اثر تمام قریش بلکہ تمام عرب پر یکساں تھا، یہ تھا کہ جو معبود سینکڑوں برس سے عرب کے حاجت روائے عام تھے اور جن کے آگے وہ ہر روز پیشانی رگڑتے تھے، اسلام ان کا نام و نشان مٹاتا تھا اور ان کے شان میں کہتا تھا۔

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (سورۂ انبیاء-۷)

بلاشبہ تم اور جن چیزوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو سب دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔

قریش کے تحمل کے اسباب

ان اسباب کے ساتھ جن میں سے ہر ایک قریش کو سخت مشتعل کر دینے کے لئے کافی تھا، توقع یہ تھی کہ اعلان دعوت کے ساتھ سخت خوں ریزیاں شروع ہو جائیں لیکن قریش نے تحمل سے کام لیا اور اس کے ناگزیر اسباب تھے، قریش خانہ جنگیوں میں تباہ ہو چکے تھے اور حرب فجار کے بعد اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ لڑائی کے نام سے ڈرتے تھے، قبیلہ پرستی کی وجہ سے لڑائی صرف اتنی سی بات پر شروع ہو جاتی تھی کہ کسی قبیلہ کا کوئی آدمی قتل کر دیا جائے، مقتول کا قبیلہ بغیر کسی تحقیق کے انتقام کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا اور جب تک بدلہ نہ لے لیا جائے یہ آگ نہیں بجھ سکتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر آمادہ ہونا قریش کے لئے نہایت آسان تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ بنو ہاشم خون کا انتقام نہ چھوڑیں گے اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ تمام مکہ جنگ میں مبتلا ہو جائے گا۔ بہت سے لوگ اسلام لا چکے تھے اور قریباً کوئی قبیلہ ایسا باقی نہ تھا جس میں دو ایک شخص اسلام نہ لا چکے ہوں، اس لئے اسلام اگر جرم تھا تو صرف ایک شخص اس کا مجرم نہ تھا بلکہ سینکڑوں تھے اور سب کا استیصال کرنا ممکن نہ تھا، رؤسائے قریش میں متعدد ایسے تھے جو شریف النفس تھے، وہ بدنفسی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے خیال میں ایک نیکی کی بنا پر مخالفت کرتے تھے، اس بنا پر وہ چاہتے تھے کہ معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو جائے۔

غرض جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان دعوت کیا اور بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کے چند معززوں نے ابو طالب سے آکر شکایت کی، ابو طالب نے نرمی سے سمجھا کر رخصت کر دیا، لیکن چونکہ بنائے نزاع قائم تھی

---

(۱) یہ آیت غالباً انہی لوگوں کی شان میں ہے وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی سے تو لوگوں کو منع کرتے تھے لیکن آپ کے دعوئی نبوت سے دور رہتے تھے۔ (اصابہ ذکر ابی طالب بحوالہ عبدالرزاق ۔ ۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ادائے فرض سے باز نہ آسکتے تھے اس لئے یہ سفارت دوبارہ ابوطالب کے پاس آئی۔ اس میں تمام رؤسائے قریش یعنی عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، ابوسفیان، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ شریک تھے، ان لوگوں نے ابوطالب سے کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے ہم کو احمق ٹھہراتا ہے، اس لئے یا تو تم بیچ میں سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آؤ کہ ہم دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔ ابوطالب نے دیکھا کہ اب حالت نازک ہو گئی ہے، قریش اب تحمل نہیں کرسکتے اور میں تنہا قریش کا مقابلہ نہیں کرسکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختصر لفظوں میں کہا "جان عم! میرے اوپر اتنا بار نہ ڈال کہ میں اٹھا نہ سکوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری پشت و پناہ جو کچھ تھے ابوطالب تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اب ان کے پائے ثبات میں بھی لغزش ہے، آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا "خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند لاکر دے دیں، تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا، خدا اس کام کو پورا کرے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا" آپ کی پُراثر آواز نے ابوطالب کو سخت متاثر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا "جا! کوئی شخص تیرا بال بیکا نہیں کرسکتا"[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور دعوت اسلام میں مصروف ہوئے، قریش اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ نہ کرسکے لیکن طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، راہ میں کانٹے بچھاتے تھے، نماز پڑھنے میں جسم مبارک پر نجاست ڈال دیتے تھے، بدزبانیاں کرتے تھے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن ابی معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ قریش متحیر تھے کہ آپ یہ سب سختیاں کیوں جھیلتے ہیں انسانی دماغ ایسی سخت نفس کشی اور جانبازی کا مقصد جاہ و دولت اور نام و نمود کی خواہش کے سوا اور کیا کرسکتا ہے؟ قریش نے بھی یہی خیال کیا۔ اس بنا پر عتبہ بن ربیعہ قریش کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا۔ محمد! کیا چاہتے ہو؟ کیا مکہ کی ریاست؟ کیا کسی بڑے گھرانے میں شادی؟ کیا دولت کا ذخیرہ؟ ہم یہ سب کچھ مہیا کرسکتے ہیں اور اس پر بھی راضی ہیں کہ کل مکہ تمہارا زیر فرمان ہو جائے، لیکن ان باتوں سے باز آؤ۔ عتبہ کو اس درخواست کی کامیابی کا پورا یقین تھا، لیکن ان سب ترغیبات کے جواب میں آپ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حٰم السجدہ ۱۰)	اے محمدؐ! کہدے کہ میں تمہیں جیسا آدمی ہوں مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک خدا ہے بس سیدھے اسکی طرف جاؤ اور اسی سے معافی مانگو
قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (حٰم السجدہ ۲)	کہدے کہ کیا تم لوگ خدا کا انکار کرتے ہو جس نے دو دن میں یہ زمین پیدا کی اور تم خدا کے شریک قرار دیتے ہو وہی سارے جہان کا پروردگار ہے؟

عتبہ واپس گیا تو وہ عتبہ نہ تھا، اس نے قریش سے جاکر کہہ دیا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے، میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آجائیں گے تو یہ تمہاری

---

[1] ابن ہشام صفحہ ۱۰۹ امام بخاری نے بھی یہ واقعہ تاریخ میں اختصار کے ساتھ نقل ہے۔

ہی عزت ہے ورنہ عرب ان کو خود فنا کر دے گا، لیکن قریش نے یہ رائے نامنظور کی۔

حضرت حمزہؓ اور عمرؓ کا اسلام ۶ نبوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام میں سے حضرت حمزہؓ کو آپ سے خاص محبت تھی، وہ آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کے کھیلے تھے، دونوں نے ثویبہ کا دودھ پیا تھا اور اس رشتہ سے بھائی بھائی تھے، وہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، ان کا مذاق طبیعت سپاہ گری اور شکار افگنی تھا، معمول تھا کہ منہ اندھیرے تیر کمان لے کر نکل جاتے، دن دن بھر شکار میں مصروف رہتے، شام کو واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے، طواف کرتے، قریش کے رؤسا صحنِ حرم میں الگ الگ دربار جما کر بیٹھا کرتے تھے، حضرت حمزہؓ ان لوگوں سے صاحب سلامت کرتے، کبھی کبھی کسی کے پاس بیٹھ جاتے، اس طریقہ سے سب سے یارانہ تھا اور سب لوگ ان کی قدر و منزلت کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخالفین جس بے رحمی سے پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی دیکھا نہ جا سکتا تھا، ایک دن ابوجہل نے رُو در رُو آپ کے ساتھ نہایت گستاخیاں کیں، ایک کنیز دیکھ رہی تھی، حضرت حمزہؓ شکار سے آئے تو اس نے تمام ماجرا کہا، حضرت حمزہؓ غصہ سے بے تاب ہو گئے، تیر و کمان ہاتھ میں لئے حرم میں آئے اور ابوجہل سے کہا "میں مسلمان ہو گیا ہوں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوشِ حمایت میں انھوں نے اسلام کا اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے بالآخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دین حق یہی[1] ہے، دو ہی چار روز کے بعد حضرت عمرؓ بھی اسلام لائے۔

حضرت عمرؓ[2] کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتابِ رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہیں رہی تھی، چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ اسلام لائے، حضرت سعید کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا، اس تعلق سے فاطمہ بھی مسلمان ہو گئیں، اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیم بن عبد اللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن حضرت عمرؓ ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھے، ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے، یہاں تک کہ قبیلہ میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے، ان کے دشمن بن گئے، لبینہؓ ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ دم لے لوں تو پھر ماروں گا، لبینہؓ کے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زد و کوب سے دریغ نہیں کرتے تھے، لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا، ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بد دل نہ کر سکے، آخر مجبور ہو کر (نعوذ باللہ) خود ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا، تلوار کمر سے لگا سیدھے

---

[1] حضرت حمزہؓ کے اسلام کا واقعہ سب نے لکھا ہے لیکن یہ اخیر واقعہ میں نے صرف "روض الانف" میں دیکھا ہے۔ [2] حضرت عمرؓ کا قبول اسلام تک الفاروق میں مفصل لکھ چکا ہوں اسی کو بعینہٖ یہاں نقل کر دیا ہے کہیں کہیں بعض الفاظ یا جملے بدل دیئے ہیں، حاشیہ نے حضرت عمرؓ کے اسلام کے واقعہ کی دوسری روایتیں سیرۃ النبی جلد سوم باب استجابت دعا میں مفصل درج کر دی ہیں، وہاں دیکھی جائیں۔ "س"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا۔

ع آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

راہ میں اتفاقاً نعیم بن عبد اللہ مل گئے، ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو، خود تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔ فوراً پلٹے اور بہن کے ہاں پہنچے، وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، اُن کی آہٹ پاکر چپ ہو گئیں اور قرآن کے اجزا۔ چھپا لئے۔ لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑ چکی تھی، بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی؟ بولیں کچھ نہیں۔ انہوں نے کہا میں سن چکا ہوں، تم دونوں مرتد ہو گئے ہو، یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریبان ہوئے اور جب ان کی بہن بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، یہاں تک کہ اُن کا جسم لہولہان ہو گیا، لیکن اسلام کی محبت اس سے بالاتر تھی۔ بولیں کہ عمر! جو بن آئے کرو، لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔ ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا۔ بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، اُن کے جسم سے خون جاری تھا، دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی۔ فرمایا تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ، فاطمہؓ نے قرآن کے اجزا۔ لاکر سامنے رکھ دیے۔ اٹھا کر دیکھا تو یہ سورۃ تھی۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (حدید۔۱)	زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے خدا کی تسبیح پڑھتا ہے اور خدا ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (حدید۔۱)	خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔

تو بے اختیار پکار اٹھے کہ۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔	میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور یہ کہ محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا، پناہ گزین تھے، حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی، چونکہ شمشیر بکف گئے تھے صحابہؓ کو تردد ہوا، لیکن حضرت حمزہؓ نے کہا آنے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے ورنہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے اور ان کا دامن پکڑ کے فرمایا کیوں عمر! کس ارادے سے آیا ہے؟ نبوت کی پُرجلال آواز نے ان کو کپکپا دیا، نہایت خضوع کے ساتھ عرض کیا کہ ایمان لانے کے لئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے اور ساتھ ہی تمام صحابہؓ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا کہ مکہ کی تمام پہاڑیاں گونج اٹھیں۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے نے اسلام کی تاریخ میں نیا دور پیدا کر دیا۔ اس وقت تک اگرچہ چالیس پچاس آدمی اسلام لا چکے تھے، عرب کے مشہور بہادر حضرت حمزہؓ سید الشہداء نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا، تاہم مسلمان اپنے فرائض

---

[1] انساب الاشراف بلاذری و طبقات ابن سعد و اسد الغابہ و ابن عساکر و کامل ابن الاثیر۔

مذہبی علانیہ نہیں ادا کرسکتے تھے اور کعبہ میں نماز پڑھنا تو بالکل ناممکن تھا، حضرت عمرؓ کے اسلام کے ساتھ دفعتاً یہ حالت بدل گئی، انھوں نے علانیہ اسلام ظاہر کیا، کافروں نے اول اول بڑی شدت کی لیکن وہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی، ابن ہشام نے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔

فلما اسلم عمر قاتل قریشا حتی صلّی عند الکعبة وصلینا معه۔

جب عمرؓ اسلام لائے تو قریش سے لڑے یہاں تک کہ کعبہ میں نماز پڑھی اور اس کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی پڑھی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اتفاق سے عاص بن وائل آنکلا اس نے پوچھا کیا ہنگامہ ہے؟ لوگوں نے کہا عمر مرتد ہوگئے۔ عاص بن وائل نے کہا تو کیا ہوا؟ میں نے عمر کو پناہ دی۔

تعذیبِ مسلمین

رسوخ عزم، قوتِ ارادہ، شدتِ عمل انسان کے اصلی جوہر ہیں اور داد کے قابل ہیں، لیکن انہی اوصاف کا رُخ جب بدل جاتا ہے تو وہ سخت دلی، بے رحمی، درندہ طبعی اور سفاکی کا مہیب قالب اختیار کرلیتے ہیں، اسلام جب آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہؓ کو ان کے قبیلے نے اپنے حصارِ حفاظت میں لے لیا تو قریش کا طیش و غضب ہر طرف سے سمٹ کر اُن غریبوں پر ٹوٹا جن کا کوئی یار و مددگار نہ تھا، ان میں کچھ غلام اور کنیزیں تھیں، کچھ غریب الوطن تھے، جو دو ایک پشت سے مکہ میں آرہے تھے اور کچھ کمزور قبیلوں کے آدمی تھے جو کسی قسم کی عظمت و اقتدار نہیں رکھتے تھے۔ قریش نے ان کو اس طرح ستانا شروع کیا کہ جور و ستم کی تاریخ میں اس کی مثال پیدا کرنا قریش کی یکتائی کی تحقیر ہے۔

یہ آسان تھا کہ مسلمانوں کے خس و خاشاک سے سرزمینِ عرب دفعۃً پاک کردی جاتی لیکن قریش کا نشۂ انتقام اس سے اُتر نہیں سکتا تھا۔ مسلمان اگر اپنے مذہب پر قائم رہ کر پیوندِ خاک کردیئے جاتے تو اس میں جس قدر قریش کی تعریف نکلتی اس سے زیادہ اُن بیکسوں کا صبر و استقلال داد طلب ہوتا۔ قریش کی شان اس وقت قائم رہ سکتی تھی جب یہ لوگ جادۂ اسلام سے پھر کر قریش کے مذہب میں آجاتے یا شاید ان کو مسلمانوں کی سخت جانی کا امتحان لینا اور اس کی داد دینا منظور تھا۔

قریش میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا دل واقعی اس حالت پر جلتا تھا کہ ان کا مدتوں کا بنا بنایا کارخانہ درہم برہم ہوا جاتا ہے، اُن کے آبا و اجداد کی تحقیر کی جاتی ہے، قابلِ احترام معبودوں کی عظمت مٹی جاتی ہے، یہ لوگ صرف حسرت و افسوس کرکے رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ چند خام طبعوں کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ عتبہ، عاص بن وائل وغیرہ اسی قسم کے لوگ تھے، لیکن ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ کا معیار اس سے زیادہ بلند تھا۔

مسلمانوں پر ظلم کے طریقے

بہرحال قریش نے جور و ظلم کے عبرت ناک کارنامے شروع کئے جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی، تو وہ غریب مسلمانوں کو پکڑتے، عرب کی تیز دھوپ، ریتلی زمین کو دوپہر کے وقت جلتا توا بنا دیتی ہے، وہ ان غریبوں کو اسی توے پر لٹاتے چھاتی پر بھاری پتھر رکھ دیتے کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، بدن پر گرم بالو بچھاتے، لوہے کو آگ پر گرم کرکے ان سے داغتے

پانی میں ڈبکیاں دیتے۔ یہ مصیبتیں اگرچہ تمام بےکس مسلمانوں پر عام تھیں، لیکن ان میں جن لوگوں پر قریش زیادہ مہربان تھے، اُن کے نام یہ ہیں۔

حضرت خبابؓ بن الارت تمیم کے قبیلہ سے تھے، جاہلیت میں غلام بنا کر فروخت کر دیئے گئے تھے، ام انمار نے خرید لیا تھا، یہ اس زمانہ میں اسلام لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے گھر میں موجود تھے اور صرف چھ سات شخص اسلام لا چکے تھے، قریش نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، ایک دن کوئلے جلا کر زمین پر بچھائے، جب چت لٹایا، ایک شخص چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ بدلنے نہ پائیں، یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ خبابؓ نے مدتوں کے بعد جب یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کیا تو پیٹھ کھول کر دکھائی کہ برص کے داغ کی طرح بالکل سفید تھی[2]۔ حضرت خبابؓ جاہلیت میں لوہاری کا کام کرتے تھے، اسلام لائے تو بعض لوگوں کے ذمہ اُن کا بقایا تھا، مانگتے تو جواب ملتا جب تک محمد کا انکار نہ کرو گے، ایک کوڑی نہ ملے گی، یہ کہتے کہ نہیں جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں[3]۔

حضرت بلالؓ، یہ وہی حضرت بلالؓ ہیں جو مؤذن کے لقب سے مشہور ہیں، حبشی النسل اور امیہ بن خلف کے غلام تھے جب ٹھیک دوپہر ہو جاتی تو امیہ ان کو جلتی بالو پر لٹاتا اور پتھر کی چٹان سینہ پر رکھ دیتا کہ جنبش نہ کرنے پائیں، اُن سے کہتا کہ اسلام سے باز آؤ ورنہ یوں ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا لیکن اس وقت بھی اُن کی زبان سے اَحَد اَحَد کا لفظ نکلتا جب یہ کسی طرح متزلزل نہ ہوئے تو گلے میں رسی باندھی اور لونڈوں کے حوالہ کیا، وہ ان کو شہر کے اس سرے سے اس سرے تک گھسیٹتے پھرتے تھے لیکن اب بھی وہی رٹ تھی اَحَد اَحَد[1]۔

حضرت عمارؓ یمن کے رہنے والے تھے ان کے والد یاسرؓ مکہ میں آئے، ابوحذیفہ مخزومی نے اپنی کنیز سے جس کا نام سمیہؓ تھا شادی کر دی تھی، عمارؓ اسی کے پیٹ سے پیدا ہوئے، یہ جب اسلام لائے تو ان سے پہلے صرف تین شخص اسلام لا چکے تھے، قریش ان کو جلتی ہوئی زمین پر لٹاتے اور اس قدر مارتے کہ بےہوش ہو جاتے۔ ان کے والد اور والدہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا تھا۔

حضرت سمیہؓ حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں اُن کو ابوجہل نے اسلام لانے کے جرم میں برچھی ماری اور وہ ہلاک ہو گئیں۔

حضرت یاسرؓ حضرت عمارؓ کے والد تھے، یہ بھی کافروں کے ہاتھ سے اذیت اٹھاتے اٹھاتے ہلاک ہو گئے۔

حضرت صہیبؓ یہ رومی مشہور ہیں لیکن درحقیقت رومی نہ تھے، اُن کے والد سنان کسریٰ کی طرف سے اُبلہ کے حاکم تھے اور ان کا خاندان موصل میں آباد تھا، ایک دفعہ رومیوں نے اس نواح پر حملہ کیا اور جن لوگوں کو قید کر کے لے گئے ان میں حضرت صہیبؓ بھی تھے، یہ روم میں پلے اس لئے عربی زبان اچھی طرح بول نہ سکتے تھے، ایک عرب نے اُن کو خریدا اور مکہ میں لایا، یہاں عبداللہ بن جدعان نے اُن کو خرید کر کے آزاد کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت اسلام شروع کی تو یہ اور عمارؓ بن یاسر ایک ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] یہ واقعات ابن سعد نے حضرت بلالؓ، صہیبؓ کے حال میں بتفصیل لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور، جزء ثالث، تذکرۂ صحابہ۔

[2] طبقات ابن سعد جلد سوم، تذکرۂ خبابؓ۔ [3] صحیح بخاری صفحہ ۹۱۰ جلد ۲ [illegible]

کے پاس آئے، آپ نے اسلام کی ترغیب دی اور یہ مسلمان ہو گئے۔ قریش ان کو اس قدر اذیت دیتے تھے کہ ان کے حواس مختل ہو جاتے تھے، جب انھوں نے مدینہ کو ہجرت کرنی چاہی تو قریش نے کہا اپنا سارا مال و متاع چھوڑ جاؤ تو جا سکتے ہو، انھوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔

حضرت ابو فکیہہؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے اور حضرت بلالؓ کے ساتھ اسلام لائے۔ امیہ کو جب یہ معلوم ہوا تو ان کے پاؤں میں رسی باندھی اور آدمیوں سے کہا کہ گھسیٹتے ہوئے لے جائیں اور تپتی ہوئی زمین پر لٹائیں، ایک گبریلا راہ میں جا رہا تھا، امیہ نے ان سے کہا "تیرا خدا یہی تو نہیں ہے"؟ انھوں نے کہا "میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالےٰ ہے"، اس پر امیہ نے اس زور سے اُن کا گلا گھونٹا کہ لوگ سمجھے دم نکل گیا، ایک دفعہ ان کے سینہ پر اتنا بھاری پتھر رکھ دیا کہ اُن کی زبان نکل پڑی۔

حضرت لبینہؓ یہ بے چاری ایک کنیز تھیں، حضرت عمرؓ اس بے کس کو مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے تھے کہ میں نے تجھ کو رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں، وہ نہایت استقلال سے جواب دیتیں کہ اگر تم اسلام نہ لاؤ گے تو خدا اس کا انتقام لے گا۔

حضرت زنیرہؓ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اور اس وجہ سے حضرت عمرؓ اسلام سے پہلے، ان کو جی کھول کر ستاتے، ابو جہل نے اُن کو اس قدر مارا کہ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

حضرت نہدیہؓ اور ام عبیسؓ۔ یہ دونوں بھی کنیزیں تھیں اور اسلام لانے کے جرم میں سخت سے سخت مصیبتیں جھیلتی تھیں۔

حضرت ابو بکرؓ کے دفتر فضائل کا یہ پہلا باب ہے کہ انھوں نے ان مظلوموں میں سے اکثروں کی جان بچائی، حضرت بلالؓ، عامرؓ بن فہیرہ، لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ سب کو بھاری بھاری داموں خریدا اور آزاد کر دیا، یہ لوگ وہ تھے جن کو قریش نے نہایت جسمانی اذیتیں پہنچائیں، ان سے کم درجہ پر وہ تھے جن کو طرح طرح سے ستاتے تھے۔

حضرت عثمانؓ جو کبیر السن اور صاحب جاہ و اعزاز تھے، جب اسلام لائے تو دوسروں نے نہیں بلکہ خود اُن کے چچا نے رسی سے باندھ کر مارا، حضرت ابو ذرؓ جو ساتویں مسلمان ہیں جب مسلمان ہوئے اور کعبہ میں اپنے اسلام کا اعلان کیا تو قریش نے مارتے مارتے ان کو لٹا دیا، حضرت زبیرؓ بن العوام جن کا مسلمان ہونے والوں میں پانچواں نمبر تھا جب اسلام لائے تو اُن کے چچا اُن کو چٹائی میں لپیٹ کر ان کے ناک میں دھواں دیتے تھے، حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی سعیدؓ بن زید جب اسلام لائے تو حضرت عمرؓ نے ان کو رسیوں سے باندھ دیا۔

لیکن یہ تمام مظالم، یہ جلا دانہ بے رحمیاں، یہ عبرت خیز سفاکیاں، ایک مسلمان کو بھی راہ حق سے متزلزل نہ کر سکیں، ایک نصرانی مورخ نے نہایت سچ کہا ہے:-

---

۱؎ ابن الاثیر ذکر تعذیب المستضعفین ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ عمارؓ اس وقت ایمان لائے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارقمؓ کے مکان میں چلے آئے تھے اور تیس شخص سے زیادہ اسلام لا چکے تھے ۲؎ حضرت عمرؓ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے ۳؎ طبقات ترجمہ عثمانؓ بن عفان ۴؎ بخاری جلد ا ص ۵۴۴ ۵؎ باب اسلام ابی ذرؓ ۶؎ ریاض النضرۃ طبع مصر جلد ۲ ۷؎ بخاری ص ۵۴۵ ۸؎ اس وقت حضرت عمرؓ اسلام نہیں لائے تھے۔ تم۔

عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خصائل نے وہ درجہ نشۂ دینی کا آپ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے، جب عیسیٰ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے، اُن کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے، برعکس اس کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔[1]

ہجرت حبش ۵ نبوی

قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا تو رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کی ہجرت کر جائیں، حبش قریش کا قدیم تجارت گاہ تھا وہاں کے حالات پہلے سے معلوم تھے، اہل عرب حبش کے فرماں روا کو نجاشی[2] کہتے تھے اور اس کے عدل و انصاف کی عام شہرت تھی۔ جاں نثاران اسلام ہر قسم کی تکلیف جھیل سکتے تھے اور ان کا پیمانۂ صبر لبریز نہیں ہو سکتا تھا لیکن مکہ میں رہ کر فرائض اسلام کا آزادی سے بجالانا ممکن نہ تھا، اس وقت حرم کعبہ میں کوئی شخص بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتا تھا حضرت عبداللہؓ بن مسعود جب اسلام لائے تو انہوں نے کہا میں اس فرض کو ضرور ادا کروں گا، لوگوں نے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے، حرم میں گئے اور مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہو کر سورۃ الرحمٰن پڑھنا شروع کی، کفار ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر طمانچے مارنے شروع کئے، اگرچہ انہوں نے جہاں تک پڑھنا تھا پڑھ کر دم لیا لیکن واپس گئے تو چہرہ پر زخم کے نشان لے کر گئے، حضرت ابوبکرؓ جاہ و اقتدار میں دیگر رؤسائے قریش سے کم نہ تھے لیکن آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے اور اسی بنا پر ایک بار ہجرت کے لئے آمادہ ہو گئے۔

اس کے علاوہ ہجرت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ جو شخص اسلام لے کر جہاں جاتا وہاں اسلام کی شعاعیں خود بخود پھیلتی تھیں، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایما سے اول اول گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ حضرت عثمانؓ بن عفان۔	مع اپنی زوجۂ محترمہ حضرت رقیہؓ کے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں۔
۲۔ حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت سہلہؓ بنت سہیل تھا۔	ان کا باپ عتبہ قریش کا مشہور سردار تھا، لیکن چونکہ سخت کافر تھا اس لئے ان کو گھر چھوڑنا پڑا۔
۳۔ حضرت زبیرؓ بن العوام۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی اور مشہور صحابی تھے۔
۴۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر۔	ہاشم کے پوتے تھے۔
۵۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔	مشہور صحابی اور عشرۂ مبشرہ میں شمار کئے جاتے ہیں، قبیلۂ زہرہ سے تھے اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہالی رشتہ دار تھے۔

---

[1] اپالوجی گاڈفری ہیگنس، ترجمہ اردو صفحہ ۹۶، ۱۰۰ مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء [2] نجاشی حبشی لفظ نگوس کی تعریب ہے جس کے معنی حبشی میں بادشاہ کے ہیں نجاشی کا نام اصحمہ تھا، بخاری باب موت النجاشی۔ تاریخ طبری صفحہ ۱۱۸۱ جلد ۳۔ بخاری باب ہجرت مدینہ۔

۶ حضرت ابو سلمہؓ ابن عبد الاسد مخزومی مع اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہ کے۔	یہ ام سلمہؓ وہی ہیں جو ابو سلمہ کے مرنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں
۷ حضرت عثمانؓ بن مظعون جمحی۔	مشہور صحابی ہیں۔
۸ حضرت عامرؓ بن ربیعہ مع اپنی زوجہ کے جن کا نام حضرت لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ تھا	سابقین اولین میں ہیں، بدر میں شریک تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سفر حج میں ان کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا تھا (اصابہ)
۹ حضرت ابو سبرۃؓ بن ابی رہم۔	ان کی ماں برہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں، یہ سابقین فی الاسلام میں ہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے کہ یہ ہجرت ثانیہ میں گئے۔
یا[1]	
۱۰ حضرت ابو حاطبؓ بن عمرو۔	بدر میں شریک تھے (امام زہری کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ہجرت کی ہے (اصابہ)
حضرت سہیل بن بیضا۔	
۱۱ حضرت عبد اللہ بن مسعود۔	مشہور صحابی اور مجتہدین صحابہ میں داخل ہیں۔

ان لوگوں نے ۵ نبوی ماہ رجب میں سفر کیا۔ حسن اتفاق یہ کہ جب یہ لوگ بندرگاہ پر پہنچے تو دو تجارتی جہاز حبش کو جا رہے تھے۔ جہاز والوں نے سستے کرایہ پر ان کو بٹھا لیا، ہر شخص کو صرف پانچ درہم دینے پڑے، قریش کو خبر ہوئی تو بندرگاہ تک تعاقب میں آئے لیکن موقع نکل چکا تھا۔

عام مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت انہی لوگوں نے کی جن کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا لیکن فہرست مہاجرین میں ہر درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، حضرت عثمانؓ بنو امیہ سے تھے جو سب سے زیادہ صاحب اقتدار خاندان تھا متعدد بزرگ مثلاً زبیرؓ اور مصعبؓ، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہیں، عبد الرحمنؓ بن عوف اور

---

[1] حبشہ کے مہاجرین اول کی تعداد اور ان کے تعین میں کسی قدر اختلاف ہے:-

ابن اسحاق نے مردوں میں ان ہی دس آدمیوں کا نام لیا ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود کے متعلق وہ یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ ہجرت اولیٰ میں نہیں، بلکہ ہجرت ثانیہ میں تھے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۲) واقدی نے مردوں میں گیارہ صاحبوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے حضرت ابو سبرہؓ اور حضرت ابو حاطبؓ دونوں کو مہاجرین میں شمار کیا ہے اور ابن اسحاق ان میں سے ایک کو تسلیم کرتے ہیں، اس سلسلے میں واقدی سے ایک بڑی فروگذاشت یہ ہوئی کہ انہوں نے گیارہ مردوں کو مہاجرین حبش بتلایا لیکن جب مہاجرین کی فہرست گنائی تو اس میں بارہ آدمیوں کا نام لیا یعنی حضرت عبد اللہؓ بن مسعود کا بھی اضافہ کیا (زرقانی علی المواہب ج اول ص ۳۱۴) حافظ ابن حجر نے واقدی کی اس فروگذاشت پر گرفت کی ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۱۴۲) ابن سعد نے انہی تمام مہاجرین کا نام لیا ہے جن کا ذکر واقدی نے کیا ہے (ابن سعد ج اول ص ۱۳۶) ابن سید الناس نے بھی بروایت زہری بارہ آدمیوں کا ذکر کیا ہے مگر انہوں نے حضرت زبیرؓ کے بجائے حضرت سلیطؓ بن عمرو کا نام لیا ہے (عیون الاثر اول ص ۱۱۵) بعض دوسرے سیرت نگار جو بارہ مرد مہاجرین کو تسلیم کرتے ہیں وہ حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل بن بیضا کے بجائے حضرت حاطبؓ بن حارث اور حضرت اخرمؓ بن عمرو کا نام لیتے ہیں (زرقانی اول ص ۳۱۴) اسی طرح ہجرت کرنے والی خواتین میں بعض لوگ حضرت ابو سبرہؓ کی بیوی حضرت ام کلثوم بنت سہیل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دایہ حضرت ام ایمنؓ کا اضافہ کرتے ہیں۔ س، ح یہ تمام تفصیل طبری میں ہے۔

ابو سبرہؓ معمولی لوگ نہ تھے، اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ قریش کا ظلم و ستم بےکسوں پر محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے خاندان والے بھی اُن کے ظلم و ستم سے محفوظ نہ تھے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ مظلوم تھے اور جن کو انگاروں کے بستر پر سونا پڑا تھا یعنی حضرت بلالؓ، عمارؓ، یاسرؓ وغیرہ، ان لوگوں کا نام مہاجرین حبش کی فہرست میں نظر نہیں آتا، اس لئے یا تو اُن کی بے سر و سامانی اس حد تک پہنچی تھی کہ سفر کرنا بھی ناممکن تھا یا یہ کہ درد کے لذت آشنا تھے اور اس لطف کو چھوڑ نہ سکتے تھے۔

دلم ز جورِ تو آسودہ است و می نالم   کہ غیر پیلے نہ برد لذت خدنگ ترا

نجاشی کے بدولت مسلمان حبش میں امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے، لیکن قریش یہ خبریں سن سن کر پیچ و تاب کھاتے تھے، آخر یہ رائے ٹھہری کہ نجاشی کے پاس سفارت بھیجی جائے کہ ہمارے مجرموں کو اپنے ملک سے نکال دو، عبد اللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص (فاتح مصر) اس کام کے لئے منتخب ہوئے[1]۔ نجاشی اور اس کے درباریوں میں سے ایک ایک کے لئے گراں بہا تحفے مہیا کئے گئے[2] اور نہایت سر و سامان سے یہ سفارت حبش کو روانہ ہوئی، یہ سفراء نجاشی سے پہلے درباری پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں نذریں پیش کیں اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے، ہم نے ان کو نکال دیا تو آپ کے ملک میں بھاگ آئے، کل ہم بادشاہ کے دربار میں اُن کے متعلق جو درخواست پیش کریں، آپ بھی ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے دن سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ ہمارے مجرم ہم کو حوالہ کر دیئے جائیں، درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور کہا تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرست دونوں کے مخالف ہے۔

مسلمانوں نے اپنی طرف سے گفتگو کرنے کے لئے حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کو انتخاب کیا، انہوں نے اس طرح تقریر شروع کی۔

> "اَیُّھَا الْمَلِكُ: ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے، اس اثناء میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا، جس کی شرافت اور صدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خوں ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے، اس جرم پر ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ اسی گمراہی میں پھر واپس آ جائیں۔"

نجاشی نے کہا جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو، حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں

---

[1] مسند احمد ج ۱ ص ۲۰۲،

[2] ابن ہشام نے لکھا ہے کہ مکہ کا بڑا تحفہ چمڑا تھا اور کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل مکہ شام وغیرہ کو جو مال تجارت لے جاتے تھے وہ بھی چمڑا ہوتا تھا (مسند امام ابن حنبل میں تصریح ہے کہ یہ تحفہ چمڑا ہی تھا مسند اہل البیت)

پڑھیں، نجاشی پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر کہا خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں، یہ کہہ کر سفرائے قریش سے کہا، تم واپس جاؤ، میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔

دوسرے دن عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا حضور! آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے ہیں؟ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا کہ اس سوال کا جواب دیں، ان لوگوں کو تردد ہوا کہ اگر حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے، ناراض ہو جائے گا، حضرت جعفرؓ نے کہا کچھ ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیے۔

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے، نجاشی نے کہا تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق کیا اعتقاد رکھتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے کہا، ہمارے پیغمبرؐ نے بتایا ہے کہ عیسیٰ خدا کا بندہ اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہے۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا لیا اور کہا "واللہ جو تم نے کہا عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں"۔ بطریق جو دربار میں موجود تھے نہایت برہم ہوئے، نتھنوں سے خرخراہٹ کی آواز آنے لگی، نجاشی نے اُن کے غصہ کی کچھ پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیر بالکل ناکامیاب آئے۔[1]

اسی اثنا میں کسی دشمن نے نجاشی کے ملک پر حملہ کیا، نجاشی اس کے مقابلہ کے لئے خود گیا، صحابہؓ نے مشورہ کیا کہ ہم میں سے ایک شخص جاتے اور خبر بھیجتا رہے کہ اگر ضرورت ہو تو ہم بھی نجاشی کی مدد کے لئے آئیں حضرت زبیرؓ اگرچہ سب سے زیادہ کم سن تھے، لیکن انہوں نے اس خدمت کے لئے اپنے کو پیش کیا، مشک کے سہارے نیل تیر کر رزمگاہ میں پہنچے۔ ادھر صحابہؓ نجاشی کی فتح کے لئے خدا سے دُعا مانگتے تھے، چند روز کے بعد حضرت زبیرؓ واپس آئے اور خوشخبری سنائی کہ نجاشی کو خدا نے فتح دی۔[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰ کتاب التفسیر، ص [3] مارگولیس صاحب نے ہجرت حبش کی بھی بڑی نازک اور دُور از نظر وجہ تلاش کر کے پیدا کی ہے فرماتے ہیں کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ قریش سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے اور یہ پہلے سنا تھا کہ کعبہ کے گرانے کے لئے ابرہۃ الاشرم جو آیا تھا وہ حبش ہی کا تھا اس لئے انہوں نے چاہا کہ بادشاہ حبش سے سازش کر کے اس کو مکہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دیں تاکہ قریش کا زور ٹوٹ جائے، اسی غرض سے ہجرت کا بہانہ کر کے اپنے اصحاب کو حبش بھیجا لیکن پھر یہ سمجھے کہ نجاشی اگر مکہ میں آیا تو خود مکہ پر قابض ہو جائے گا محمد کو کیا ہاتھ آئے گا، اس بنا پر اس ارادے سے باز رہے۔" یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔

صاحب موصوف کو حضرت جعفرؓ کی تقریر و مکالمت میں اس بنا پر شک ہے کہ نجاشی عربی زبان سے ناواقف تھا، حالانکہ اس زمانہ میں اوّلاً تو عربی زبان عام طور سے حبش میں بہت سے مختلف لوگ سمجھ سکتے تھے اگرچہ دونوں زبانیں باہم نہایت قریب ہیں ثانیاً، درباروں میں ترجمان ہوتے تھے جیسا کہ ابوسفیان اور قیصر روم کے باہمی مکالمہ میں مذکور ہے، بخاری باب بدء الوحی" ہے۔

[2] یہ تمام واقعات مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲ میں مذکور ہیں، ابن ہشام نے بھی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن طبری اور ابن سعد نے حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی تقریر کا ذکر نہیں کیا ہے، امام ابن حنبل اور ابن ہشام کا سلسلہ روایت یہ ہے۔ محمد بن اسحاق، زہری، ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام مخزومی، ام سلمہؓ یہ سب رواۃ ثقہ ہیں اور سب سے اخیر راوی حضرت ام سلمہؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ اور خود اس واقعہ میں شریک تھیں وہ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں نہیں آئی تھیں، بلکہ اپنے پہلے شوہر

حبش میں کم و بیش ۸۳ مسلمان ہجرت کر کے گئے، چند روز آرام سے گزرنے پائے تھے کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سن کر اکثر صحابہؓ نے مکہ معظمہ کا رخ کیا، لیکن شہر کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے اس لئے بعض لوگ واپس چلے گئے اور اکثر چھپ چھپ کر مکہ میں آ گئے۔

یہ روایت طبری اور اکثر تاریخوں میں مذکور ہے اور ممکن ہے کہ صحیح ہو، لیکن ان کتابوں میں اس خبر کے مشہور ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے، جب آپؐ نے یہ آیت پڑھی: وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى. تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے۔

تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى۔

یعنی (یہ بت) معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپ کی متابعت کی، اس روایت کا یہ آخری حصہ کہ چند کافروں کے سوا تمام جن و انس نے حضورؐ کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا، صحیح ہے، جیسا کہ صحیح بخاری باب ہٰ میں (قول فاسجدوا للہ واعبدوا) مذکور ہے، مگر باقی حصہ بے ہودہ اور ناقابل ذکر ہے اور اکثر کبار محدثین مثلاً بیہقی، قاضی عیاض، علامہ عینی، حافظ منذری، علامہ نووی نے اس کو باطل اور موضوع لکھا ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ بہت سے محدثین نے اس روایت کو بہ سند نقل کیا ہے، ان میں طبری، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابو معشر شہرت عام رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ حافظ ابن حجر کو جن کے کمال فن حدیث پر زمانہ کا اتفاق ہے اس روایت کی صحت پر اصرار ہے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

وقد ذكرنا ان ثلاثة اسانيد منها على شرط الصحيح وهي مراسيل يحتج بمثلها من يحتج بالمراسيل.

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس روایت کی تین سندیں صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور یہ روایتیں مرسل ہیں اور ان سے وہ لوگ استدلال کر سکتے ہیں جو مرسل روایتوں کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کی عادت تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے ملا دیتے، قرآن مجید کی آیت ذیل میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ)

اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں گڑبڑ کر دو شاید تم غالب آؤ۔

قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے تھے۔

واللات والعزى ومناة الثالثة الاخرى فانهن الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى۔

لات اور عزیٰ اور تیسرے بت منات کی قسم یہ بلند و بزرگ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابوسلمہ بن عبدالاسد کے ساتھ حبش میں ہجرت کر کے گئی تھیں، مورخ یعقوبی نے بھی بتفصیل یہ واقعہ لکھا ہے۔

۱؎ کتاب التفسیر سورۂ نجم ص ۔ ۲؎ دیکھو زرقانی بر مواہب لدنیہ و شفائے قاضی عیاض و عینی شرح بخاری تفسیر سورۂ نجم و نور النبراس علامہ نووی کے یہ الفاظ ہیں لا یصح فیہ شیء لا من جہۃ النقل ولا من جہۃ العقل اور علامہ عینی لکھتے ہیں فلا صحۃ لہ نقلا ولا عقلا ۔ ۳؎ دیکھو مواہب لدنیہ اور زرقانی واقعہ ہجرت حبشہ ۔ ۴؎ زرقانی بر مواہب ج اول صفحہ ۳۰۲ ۔ ۵؎ معجم البلدان لفظ عزیٰ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورہ والنجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپ کی آواز میں ملاکر پڑھ دیئے ہوں گے، دور کے لوگوں کو (کفار میں سے) اشتباہ ہوا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے وہ الفاظ ادا کیے، اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہوگا تو لوگوں نے کہا ہوگا کہ کسی شیطان نے آپ کی طرف سے وہ فقرے کہہ دیئے ہوں گے، اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کرلی کہ شیطان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیئے اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے، اس لئے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کرلیا، یہ صرف قیاس نہیں بلکہ اگلے محققین نے بھی تصریح کی ہے۔ مواہب میں ہے۔

قیل انه لما وصل الی قوله ومناة الثالثة الاخری خشی المشرکون ان یاتی بعدها بشیء یذم الهتهم فبادروا الی ذلک الکلام فخلطوه فی تلاوة النبی صلی الله علیه وسلم علی عادتهم فی قولهم لا تسمعوا لهذا القران والغوا فیه او المراد بالشیطان شیطان الانس۔

بعض لوگوں نے کہا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت پہنچے ومناۃ الثالثۃ الاخری تو مشرکوں کو یہ ڈر پیدا ہوا کہ اب ان کے معبودوں کی کچھ برائی کا بیان ہوگا اس بنا پر انہوں نے جھٹ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت میں یہ فقرے غلط کرکے پڑھ دیئے جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ کہتے کہ قرآن پر کان نہ لگاؤ اور اس میں گڑبڑ مچادو یا شیطان سے شیطان آدمی مراد ہے۔

جو لوگ حبش سے واپس آگئے تھے، اہل مکہ نے اب ان کو اور زیادہ ستانا شروع کیا اور اس قدر اذیت دی کہ وہ دوبارہ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، لیکن اب کی ہجرت کچھ آسان نہ تھی، کفار نے سخت مزاحمت کی تاہم جس طرح ہو سکا بہت سے صحابہ جن کی تعداد تقریباً سو تک پہنچتی ہے مکہ سے نکل گئے اور حبش میں اقامت اختیار کی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تو کچھ لوگ فوراً واپس چلے آئے اور جو لوگ رہ گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں اُن کو بُلالیا[1]۔

کفار کی ایذا و تعدی اب کمزوروں اور بے کسوں پر محدود نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کا قبیلہ معزز اور طاقتور تھا اُن کے یاور اور انصار بھی کم نہ تھے، تاہم وہ بھی کفار کے ظلم سے تنگ آگئے اور بالآخر حبش کی ہجرت کا ارادہ کیا، برک الغماد جو مکہ معظمہ سے یمن کی سمت پانچ دن کی راہ ہے، وہاں تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوگئی جو قبیلہ قارہ کا رئیس تھا، اس نے پوچھا کہاں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا "میری قوم مجھ کو رہنے نہیں دیتی، چاہتا ہوں کہ کہیں الگ جاکر خدا کی عبادت کروں"۔ ابن الدغنہ نے کہا، یہ نہیں ہوسکتا کہ تم جیسا شخص مکہ سے نکل جائے میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں۔ تو حضرت ابوبکرؓ اس کے ساتھ واپس آئے۔ ابن الدغنہ مکہ پہنچ کر تمام سرداران قریش سے ملا اور کہا کہ ایسے شخص کو نکالتے ہو جو مہمان نواز ہے، مفلسوں کا مددگار ہے، رشتہ داروں کو پالتا ہے، مصیبتوں میں کام آتا ہے۔ قریش نے کہا لیکن شرط یہ ہے کہ ابوبکرؓ نمازوں میں چپکے جو چاہیں پڑھیں، آواز سے قرآن پڑھتے ہیں تو

---

[1] یہ تمام تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے۔ بعض مورخوں نے اس ہجرت ثانیہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

[2] زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۳۰۰۔ ذکر ہجرت ثانیہ حبش۔

ہماری عورتوں اور بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند روز یہ پابندی اختیار کی لیکن آخر انھوں نے گھر کے پاس ایک مسجد بنائی اور اس میں خضوع و خشوع کے ساتھ بآواز قرآن پڑھتے تھے، وہ نہایت رقیق القلب تھے قرآن پڑھتے تو بے اختیار روتے، عورتیں اور بچے ان کو دیکھتے اور متاثر ہوتے، قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی، اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اب میں تمہاری حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، مجھ کو خدا کی حفاظت بس ہے، میں تمہارے جوار سے استعفیٰ دیتا ہوں۱؎،

محرم ۷ نبوی شعب ابوطالب میں محصور ہونا

قریش دیکھتے تھے کہ اس روک ٹوک پر بھی اسلام کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے، عمرؓ اور حمزہؓ جیسے لوگ ایمان لا چکے، نجاشی نے مسلمانوں کو پناہ دی، سفرا بے نیل مرام واپس آئے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس لئے اب یہ تدبیر سوچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص نہ خاندان بنی ہاشم سے قربت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا نہ ان سے ملے گا نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ [illegible] صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لئے حوالہ نہ کر دیں۲؎، یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا [illegible] کعبہ پر آویزاں کیا گیا۔

ابوطالب مجبور ہو کر تمام خاندان ہاشم کے ساتھ شعب ابوطالب میں پناہ گزیں ہوئے، تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ طلح کے پتے کھا کھا کر رہتے تھے، حدیثوں میں جو صحابہؓ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلح کی پتیاں کھا کھا کر بسر کرتے تھے یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے، چنانچہ سہیلی نے روض الانف میں تصریح کی ہے۔ حضرت سعد وقاصؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا ہاتھ آ گیا، میں نے [illegible] پانی سے دھویا پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔

ابن سعد نے روایت کی ہے کہ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو باہر آواز آتی تھی، قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس بھی آتا تھا، ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھا، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے، راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا، اتفاق سے ابوالبختری کہیں سے آگیا، وہ اگرچہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا اور کہا کہ ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کیلئے بھیجتا ہے تو کیوں روکتا ہے۔

مسلسل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں، بالآخر دشمنوں ہی کو ترس آیا اور خود انہی کی طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی، ہشام عامری خاندان بنو ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا، وہ چوری چھپے بنو ہاشم کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا، ایک دفعہ وہ زہیر کے پاس جو عبدالمطلب کے نواسے تھے گیا اور کہا کیوں زہیر! تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ

۱؎ یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب ہجرت مدینہ میں ہے۔ ۲؎ اس معاہدہ کا ذکر طبری نے اور ابن سعد وغیرہ نے تفصیل سے کیا ہے لیکن یہ الفاظ کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کے لئے حوالہ کر دیں صرف مواہب لدنیہ میں مذکور ہیں [illegible] روض الانف

تک نصیب نہ ہو؟ زہیر نے کہا، کیا کروں تنہا ہوں، ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر پھینک دوں۔ ہشام نے کہا میں موجود ہوں۔ دونوں مل کر مطعم بن عدی کے پاس گئے اور ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن الاسود نے بھی ساتھ دیا، دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا، اے اہل مکہ! کیا انصاف ہے؟ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور بنو ہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو، خدا کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ چاک نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔ ابوجہل برابر سے بولا، ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے جب یہ لکھا گیا تھا اس وقت بھی ہم راضی نہ تھے، غرض مطعم نے ہاتھ بڑھا کر دستاویز چاک کر دی، مطعم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن الاسود، ابوالبختری، زہیر سب ہتھیار باندھ باندھ کر بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے[1]۔ بقول ابن سعد یہ سنہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ اسی زمانہ میں معراج واقع ہوئی جس کی تفصیل تیسرے حصہ میں آئے گی، اسی زمانے میں نماز پنجگانہ فرض ہوئی۔

سنہ ۱۰ نبوی حضرت خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اب شعب ابی طالب سے نکلے تھے اور چند روز قریش کے جور و ظلم سے امان ملی تھی کہ ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا۔

ابوطالب کی وفات کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے، آپ نے فرمایا مرتے مرتے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔ ابوجہل اور ابن ابی امیہ نے کہا، ابوطالب! کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔ بالآخر ابوطالب نے کہا میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا، میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔ آپ نے فرمایا "میں آپ کے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کر دے"[2]۔

یہ بخاری اور مسلم کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ مرتے وقت ابوطالب کے ہونٹ ہل رہے تھے حضرت عباسؓ نے (جو اس وقت تک کافر تھے) کان لگا کر سنا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم نے جس کلمہ کے لئے کہا تھا، ابوطالب وہی کہہ رہے ہیں[3]۔ اس بنا پر ابوطالب کے اسلام کے متعلق اختلاف ہے لیکن چونکہ بخاری کی روایت عموماً صحیح مانی جاتی ہے، اس لئے محدثین زیادہ تر ان کے کفر ہی کے قائل ہیں، لیکن محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابوطالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے اسی بنا پر علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "روایت مرسل ہے"[4]۔ ابن اسحاق کے سلسلہ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ یہ دونوں ثقہ ہیں، لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے

---

[1] یہ تفصیل ابن ہشام، طبری وغیرہ میں مذکور ہے، اخیر واقعہ صرف ابن سعد نے بیان کیا ہے۔ [2] صحیح بخاری باب الجنائز، اور مسلم "ابوطالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے بخاری میں نہیں۔ [3] ابن ہشام مطبوعہ مصر صفحہ ۱۴۱ [4] عینی کتاب الجنائز ج ۴ صفحہ ۲۰۲۔

اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجۂ استناد میں چنداں فرق نہیں۔

ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو جاں نثاریاں کیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ پر نثار کرتے تھے، آپؐ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا، آپؐ کی خاطر محصور ہوئے، فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے، تین تین برس تک آب و دانہ بند رہا، کیا یہ محبت، یہ جوش، یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی؟

ابو طالب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ۳۵ برس عمر میں بڑے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے نہایت محبت تھی، ایک دفعہ وہ بیمار پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے کہا بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا نہیں مانگتا کہ مجھ کو اچھا کر دے۔ آپ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، "خدا تیرا کہنا مانتا ہے"۔ آپ نے فرمایا کہ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے"۔

ابو طالب کی وفات کے چند ہی روز بعد حضرت خدیجہؓ نے بھی وفات پائی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے ابو طالب سے پہلے انتقال کیا، اب آپ کے مددگار اور غمگسار دونوں اٹھ گئے، صحابہؓ خود اپنی حالت میں مبتلا تھے، یہی زمانہ ہے جو اسلام کا سخت ترین زمانہ ہے اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (سالِ غم) فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجہؓ نے رمضان سنہ نبوی میں وفات کی، ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی، مقام حجون میں دفن کی گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی قبر میں اترے، اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔

ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کے اٹھ جانے کے بعد قریش کو کس کا پاس تھا، اب وہ نہایت بے رحمی اور بے باکی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے لگے، ایک دفعہ آپؐ راہ میں جا رہے تھے، ایک شقی نے آ کر فرقِ مبارک پر خاک ڈال دی، اسی حالت میں آپ گھر میں تشریف لائے، آپ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں، آپ کا سر دھوتی تھیں اور جوشِ محبت سے روتی جاتی تھیں، آپ نے فرمایا، "جان پدر! رو نہیں خدا تیرے باپ کو بچا لے گا"۔

---

(۱) مصنف کے اس نظریہ سے مجھے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ بخاری کی روایت کے راوی حضرت مسیبؓ ہیں جو صحابی ہیں، ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی اسی لئے مراسیل صحابہ حجت ہیں اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے، خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے اس لئے دونوں روایتوں کو یکساں نہیں قرار دیا جا سکتا، علاوہ بریں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے جس میں ذکر ہے کہ حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کے چچا ابو طالب کو آپ سے کیا فائدہ پہنچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے لئے آپ کے دشمنوں سے برسر پرخاش رہتے تھے، فرمایا، وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں جس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے، اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے، اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا، اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری باب قصۂ ابی طالب میں اسی موقع پر موجود ہے۔ (س) (۲) اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ابو طالب ج۷ و اسد الغابہ تذکرہ تفصیل ابن سعد کی سب سے طبری اور ابن ہشام ذکر وفات حضرت خدیجہؓ

اہل مکہ سے تو قطعی ناامیدی تھی، اس لئے آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں دعوت اسلام فرمائیں۔ طائف میں بڑے بڑے امراء اور ارباب اثر رہتے تھے، ان میں عمیر کا خاندان رئیس القبائل تھا۔ یہ تین بھائی تھے، عبدیالیل، مسعود، حبیب، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی، ان تینوں نے جو جواب دیئے وہ نہایت عبرت انگیز تھے۔ ایک نے کہا، "اگر تجھ کو خدا نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو کعبہ کا پردہ چاک کر رہا ہے"۔ دوسرے نے کہا، "کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی نہیں ملتا تھا"۔ تیسرے نے کہا، "میں بہرحال تجھ سے بات نہیں کر سکتا تو اگر سچا ہے تو تجھ سے گفتگو کرنا خلاف ادب ہے اور جھوٹا ہے تو گفتگو کے قابل نہیں"۔

ان بدبختوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، طائف کے بازاریوں کو ابھار دیا کہ آپؐ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ یہ مجمع دو رویہ صف باندھ کر کھڑا ہوا۔ جب آپؐ ادھر سے گزرے تو آپ کے پاؤں پر پتھر مارنے شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ جب آپ زخموں سے چور ہو کر بیٹھ جاتے تو بازو تھام کر کھڑا کر دیتے تھے۔ جب آپؐ پھر چلنے لگتے تو پتھر برساتے، ساتھ ساتھ گالیاں دیتے اور تالیاں بجاتے جاتے۔ آخر آپؐ نے ایک باغ میں انگور کی ٹٹیوں میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ کا تھا جو باوجود کفر کے شریف الطبع اور نیک نفس تھا اس نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو اپنے غلام کے ہاتھ جس کا نام عداس تھا، انگور کا خوشہ ایک کشتی میں رکھ کر بھیجا۔ اس سفر میں حضرت زید بن حارثہ بھی ساتھ تھے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف سے پھر کر چند روز نخلہ میں قیام کیا، پھر حرا میں تشریف لائے اور مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا کہ مجھ کو اپنی حمایت میں لے سکتے ہو، عرب کا شعار تھا کہ جب کوئی ان سے طالب حمایت ہوتا تو گو دشمن ہوتا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ مطعم نے یہ درخواست منظور کی، بیٹوں کو بلا کر کہا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں جاؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف لائے، مطعم اونٹ پر سوار ساتھ تھا حرم کے پاس آیا تو پکارا کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں آئے، نماز ادا کی اور دولت خانہ کو واپس گئے مطعم اور اس کے بیٹے آپؐ کو تلواروں کے سایہ میں لائے۔[2]

مطعم نے کفر کی حالت میں غزوہ بدر سے پہلے وفات کی۔ حضرت حسانؓ جو دربار رسالت کے شاعر تھے انہوں نے

---

[1] یہ پوری تفصیل مواہب لدنیہ بحوالہ موسیٰ بن عقبہ اور طبری و ابن ہشام میں ہے۔ ٹ کیا عجیب بات ہے کہ ایک ہی واقعہ دو مختلف نگاہوں کو کس طرح مختلف نظر آتا ہے، مارگولیس نے (نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر کو سوء تدبیر میں داخل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طائف مکہ سے بالکل قریب اور ان کے زیر اثر تھا اور وہاں رؤسائے مکہ کے باغ تھے جن کی وجہ سے ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اس لئے جب مکہ کے تمام رؤسا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تھے تو طائف کے لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی! لیکن سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا زور اعتقاد اور اعتماد علی النفس تھا کہ باوجود تمام ناامیدیوں کے وہ تنہا ایک مخالف شہر میں آگئے اور تبلیغ اسلام کا فرض ادا کیا، ع والفضل ما شهدت به الاعداء۔

[2] ابن سعد صفحہ ۱۴۲، کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے جو ابن اسحاق کی روایت ہے، تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کر دیئے ہیں۔

مرثیہ لکھا، زرقانی نے یہ مرثیہ بدر میں نقل کیا[1] ہے اور لکھا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں، مطعم کا یہ کام بے شبہ مدح کا مستحق تھا، لیکن آج کل کے مسلمان حضرت حسانؓ اور زرقانی سے زیادہ شیفتۂ اسلام ہیں، اس لئے معلوم نہیں حضرت حسانؓ کا یہ فعل آج بھی پسند کیا جا سکتا ہے، یا نہیں؟۔

قبائل کا دورہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب حج کا زمانہ آتا اور عرب کے قبائل ہر طرف سے آکر مکہ کے آس پاس اترتے تو آپ ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور تبلیغ اسلام فرماتے، عرب میں مختلف مقامات پر میلے لگتے تھے جن میں دور دور کے قبائل آتے تھے، آپ اُن میلوں میں جاتے اور اسلام کی تبلیغ فرماتے۔

ان میلوں میں سے عکاظ جو اہل عرب کا قومی اور علمی دنگل تھا اور مجنہ اور ذوالمجاز کا نام مورخین نے خاص طور پر لیا ہے، قبائل عرب میں سے بنو عامر، محارب، فزارہ، غسان، مرہ، حنیفہ، سلیم، عبس، بنو نصر، کندہ، کلب، حارث بن کعب، عذرہ، حضارمہ[2] ور قبائل ہیں، ان سب قبائل کے پاس آپ تشریف لے گئے، لیکن ابولہب ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتا اور جب آپ کسی مجمع میں تقریر کرتے تو برابر سے کہتا کہ دین سے پھر گیا ہے اور جھوٹ کہتا ہے[3]۔

بنی حنیفہ یمامہ میں آباد تھے، ان لوگوں نے نہایت تلخی کے ساتھ جواب دیا، مسیلمہ کذاب جس نے آگے چل کر نبوت کا دعویٰ کیا، اسی قبیلہ کا رئیس تھا۔

قبیلہ بنو ذہل بن شیبان کے پاس جب آپ گئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی ساتھ تھے، حضرت ابوبکرؓ نے مفروق سے کہا تم نے کسی پیغمبر کا تذکرہ سنا ہے، وہ یہی ہیں۔ مفروق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رُخ کر کے کہا "برادر قریش! تم کیا تلقین کرتے ہو؟" آپ نے فرمایا، خدا ایک ہے اور میں اس کا پیغمبر ہوں اور یہ آیتیں پڑھیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (انعام آیت ۱۵۱)

کہہ دو کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ خدا نے کیا چیزیں حرام کی ہیں یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کا حق خدمت بجالاؤ اور اپنے بچوں کو افلاس کے خیال سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیں گے، فحش باتوں کے پاس نہ جاؤ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ، اور آدمی کی جان جس کو خدا نے حرام کیا ہے ناحق ہلاک نہ کرو۔

اس قبیلہ کے رؤسا مفروق، مثنیٰ اور ہانی بن قبیصہ تھے اور وہ سب اس موقع پر موجود تھے، ان لوگوں نے کلام کی تحسین کی، لیکن کہا کہ مدتوں کا خاندانی دین دفعتاً چھوڑ دینا زود اعتقادی ہے، اس کے علاوہ ہم کسریٰ کے زیر اثر ہیں اور معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم اور کسی کے اثر میں نہ آئیں گے، آپ نے ان کی اس راست گوئی کی تحسین کی اور فرمایا کہ خدا اپنے دین کی آپ مدد کرے گا[4]۔

قبیلہ بنو عامر کے پاس گئے تو ایک شخص نے جس کا نام (بحیرہ بن) فراس تھا، آپ کی تقریر سن کر کہا، یہ شخص مجھ

---

[1] زرقانی ج ۱ ص ۳۰۵ [2] ابن سعد نے ان تمام قبائل کا ذکر کیا ہے [3] مستدرک حاکم جلد اول ص ۱۵ حیدرآباد دکن [4] ابن ہشام شرح روض الانف بحوالہ قاسم بن ثابت۔

کو ہاتھ آجائے تو میں تمام عرب کو مسخر کرلوں۔ پھر آپ سے پوچھا کہ اگر ہم تمہارا ساتھ دیں اور تم اپنے مخالفوں پر غالب آجاؤ تو تمہارے بعد ریاست ہم کو ملے گی؟ آپ نے فرمایا سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے کہا، ہم اپنا سینہ عرب کی آماجگاہ بنائیں اور حکومت دوسروں کے ہاتھ آئے، ہم کو یہ غرض نہیں۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی

اسباب مذکورۂ بالا کی بنا پر قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت کی اور چاہا کہ آپ کو اس قدر ستائیں کہ آپ مجبور ہو کر تبلیغ اسلام سے دستبردار ہو جائیں، سوء اتفاق یہ کہ جو اکابر آپ کے ہمسایہ تھے یعنی ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف، نضر بن حارث، منبہ بن حجاج، عقبہ بن ابی معیط، حکم بن ابی العاص، سب قریش کے سربرآوردہ رؤسا تھے اور یہی سب سے بڑھ کر آپ کے دشمن تھے، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کانٹے بچھاتے، نماز پڑھتے وقت ہنسی اڑاتے، سجدہ میں آپ کی گردن پر اوجھڑی لا کر ڈال دیتے، گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچتے کہ گردن مبارک میں بدھیاں پڑ جاتیں۔ آپ کی روحانی قوت اثر کو دیکھ کر لوگ جادوگر کہتے، دعوائے نبوت کو سن کر مجنون کہتے۔ باہر نکلتے تو شریر لڑکے پیچھے پیچھے غول باندھ کر چلتے۔ نماز جماعت میں قرآن زور سے پڑھتے تو قرآن، قرآن کے لانے والے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن کے اتارنے والے (خدا) کو گالیاں دیتے۔

ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش بھی موجود تھے، ابوجہل نے کہا کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدہ میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا۔ عقبہ نے کہا، یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں، چنانچہ اوجھ لا کر آپ کی گردن پر ڈال دی، قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے، کسی نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو خبر کی، وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں اور اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بددعائیں دیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں کسی مجمع عام میں دعوت اسلام کا وعظ فرماتے تو ابولہب جو آپ کے ساتھ ساتھ برابر سے کہتا جاتا کہ یہ جھوٹ کہتا ہے۔ ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب کہ میں اسلام نہیں لایا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار ذوالمجاز میں گئے اور گھس کر لوگوں سے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو۔ ابوجہل آپ پر خاک پھینکتا جاتا تھا اور کہتا کہ اس کے فریب میں نہ آنا، یہ چاہتا ہے کہ تم لات و عزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔ طائف میں کفار نے آپ کو جو اذیتیں پہنچائیں، ان کا بیان پیچھے گزر چکا۔

ایک دفعہ آپ حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ نے آپ کی گردن میں چادر لپیٹ کر نہایت زور سے کھینچی، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آگئے اور آپ کا شانہ پکڑ کر عقبہ کے ہاتھ سے چھڑایا اور کہا کہ اس شخص کو قتل کرتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔

جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں نہایت سرگرم تھے اور رات دن اسی شغل میں رہتے تھے ان

---

[1] طبری ج ۳ ص ۱۲۰۵۔ ابن سعد ج ۱ ص ۱۳۵۔ مسند امام حنبل ج ۱۔ صحیح بخاری ص ۵۴۶۔ صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوٰۃ والجزیۃ والموادعۃ و صحیح مسلم مغازی ج ۲ ص ۱۰۱۔ مسند امام حنبل ج ۴ ص ۶۳۔ صحیح بخاری باب مالقی صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ بمکۃ۔

کے نام جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں لکھے ہیں حسب ذیل ہیں۔

ابوجہل، ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس بن عدی، ولید بن المغیرہ، امیہ، ابی بن خلف، ابوقیس بن فاکہ بن المغیرہ، عاص بن وائل، نضر بن حارث، منبہ بن الحجاج، زہیر بن ابی امیہ، سائب بن صیفی، اسود بن عبد الاسد، عاص بن سعید بن العاص، عاص بن ہاشم، عقبہ بن ابی معیط، ابن الاصدی، ہذلی، حکم بن ابی العاص، عدی بن حمراء۔

یہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ اور ان میں سے اکثر صاحب جاہ و [illegible]ار تھے، یہ جو کچھ ہوا، گو نہایت درد انگیز اور حسرت خیز تھا لیکن تعجب انگیز نہ تھا۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ہے کہ نامانوس اور اجنبی صدائیں برغبت سن لی گئی ہوں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو سینکڑوں برس تک قوم کی نفرت اور وحشت کا سامنا رہا۔ یونان دنیا کی شائستگی کا معلم اول ہے، تاہم اسی حکمت کدہ میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دار و رسن[ع] کا منظر پیش آیا۔ اس بنا پر عرب اور قریش نے جو کچھ کیا وہ سلسلہ واقعات کی غیر معمولی کڑی نہ تھی لیکن غور طلب یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کیا۔

سقراط (زہر کا) پیالہ پی کر فنا ہو گیا، حضرت نوح علیہ السلام نے مخالفت سے تنگ آ کر ایک قیامت خیز طوفان کی استدعا کی اور دنیا کا ایک بڑا حصہ برباد ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تیس چالیس شخصوں کی مختصر جماعت پیدا کر کے بروایت نصاریٰ سولی پر چڑھ گئے، لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض ان سب سے بالاتر تھا، حضرت خبابؓ بن الارت نے جب قریش کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ آپ ان کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے؟ تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ "تم سے پہلے وہ لوگ گزرے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے جاتے اور چیر ڈالے جاتے تھے، تاہم وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے۔ خدا اس کام کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ شتر سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو گا۔"[1]

*

[ع] حضرت مسیح کو سولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے اور کہا ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے تھے۔ انسانی معلومات کی ترقی کے ساتھ قرآن کریم کی صداقت خود بخود واضح ہوتی جا رہی ہے چند سو سال پہلے انجیل برناباس کا نسخہ دریافت ہوا تھا اس میں برناباس نے نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یہودا اسکریوتی مصلوب ہوا تھا۔ حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی دینے سے کچھ پہلے آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ (ملخص حاشیہ بائبل سے قرآن تک کا مقدمہ ص ۲۶ و ص ۲۷) منجانب مرحوم شیخ محمد محی الدین سواتی۔

---

[1] صحیح بخاری، باب ما لقی النبی و اصحابہ من المشرکین، ذکر ایام جاہلیہ۔

مدینہ منورہ اور انصار

آفتاب کی روشنی دُور پہنچ کر تیز ہو جاتی ہے۔ شمیم گل باغ سے نکل کر عطر فشاں بنتی ہے۔ آفتاب اسلام طلوع مکہ میں ہوا لیکن کرنیں مدینہ کے افق پر چمکیں، مدینہ کا اصلی نام یثرب ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہاں آکر قیام کیا تو اس کا نام "مدینۃ النبی" یعنی "پیغمبر کا شہر" پڑ گیا اور پھر مختصر ہو کر مدینہ مشہور ہو گیا، یہ شہر مدتوں سے آباد ہے، قدیم زمانہ میں یہودی آکر یہاں آباد ہوئے۔ ان کی نسلیں کثرت سے پھیلیں اور مدینہ کے اطراف اُن کے قبضہ میں آگئے۔ انھوں نے مدینہ اور اس کے حوالی میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے اور ان میں حکومت رکھتے تھے (یہود کے متعلق زائد تحقیق آگے آئے گی)

انصار اصل میں یمن کے رہنے والے اور قحطان کے خاندان سے تھے، یمن میں جب مشہور سیلاب آیا جس کو "سیل عرم" کہتے ہیں، یہ لوگ یمن سے نکل کر مدینہ میں آباد ہوئے، یہ دو بھائی تھے اوس اور خزرج۔ تمام انصار ان ہی دو کے خاندان سے ہیں[1]۔ یہ خاندان جب یثرب میں آیا تو یہود نہایت اقتدار اور اثر رکھتے تھے، آس پاس کے مقامات ان کے قبضہ میں تھے اور دولت و مال سے مالا مال تھے۔ چونکہ آل و اولاد کی کثرت سے بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے اس لئے دور دور تک بستیاں بسا لی تھیں، انصار کچھ زمانہ تک اُن سے الگ رہے لیکن اُن کا زور اور اثر دیکھ کر بالآخر اُن کے حلیف[2] بن گئے، ایک مدت تک یہ حالت قائم رہی، لیکن اب انصار کا خاندان پھیلتا جاتا تھا اور اقتدار حاصل کرتا جاتا تھا، یہود نے پیش بینی کے لحاظ سے ان سے معاہدہ توڑ دیا۔

یہودیوں میں ایک رئیس فطیون پیدا ہوا جو نہایت عیاش اور بدکار تھا، اس نے یہ حکم دیا کہ جو دوشیزہ لڑکی بیاہی جائے پہلے اس کے شبستانِ عیش میں آئے۔ یہود نے اس کو گوارا کر لیا تھا، لیکن جب انصار کی نوبت آئی تو انھوں نے سرتابی کی، اس زمانہ میں انصار کا سردار ایک شخص مالک بن عجلان تھا۔ اس کی بہن کی شادی ہوئی تو وہ عین شادی کے دن گھر سے نکلی اور اپنے بھائی مالک بن عجلان کے سامنے سے بے پردہ گزری۔ مالک کو غیرت آئی اٹھ کر گھر میں آیا اور بہن کو سخت ملامت کی، اس نے کہا "ہاں! لیکن کل جو کچھ ہوگا اس سے بھی بڑھ کر ہے"، دوسرے دن حسب دستور جب مالک کی بہن دُلہن بن کر فطیون کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑے پہن کر سہیلیوں کے ساتھ گیا اور فطیون کو قتل کر کے شام کو بھاگ گیا، یہاں غسانیوں کی حکومت تھی اور ابو جبیلہ حکمران تھا۔ اس نے یہ حالات سُنے تو ایک فوج گراں لے کر آیا اور اوس اور خزرج کے رؤسا کو بلا کر ان کو خلعت اور صلے دیئے، پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو دھوکے سے قتل کرا دیا، یہود کا زور اب ٹوٹ گیا اور انصار نے نئے سر سے

---

[1] انصار کے نسب اور مدینہ میں آباد ہونے کی پوری تفصیل وفاء الوفا جلد اول صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۵ میں مذکور ہے۔

[2] جو قبیلے آپس میں ایک دوسرے کی اعانت و شرکت کا (بحلف) معاہدہ کرتے تھے وہ باہم حلیف کہلاتے تھے۔

سے عزت حاصل کی۔

انصار نے مدینہ اور حوالیِ مدینہ میں کثرت سے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے۔ اوس اور خزرج ایک مدت تک باہم متحد رہے، لیکن پھر عرب کی فطرت کے موافق خانہ جنگیاں شروع ہوگئیں اور سخت خونریز لڑائیاں ہوئیں، سب سے اخیر لڑائی میں جس کو بعاث کہتے ہیں ایسے زور کا معرکہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے تمام نامور دلیر لڑ کر مر گئے۔ انصار اب اس قدر ضعیف ہو گئے کہ انھوں نے قریش کے پاس سفارت بھیجی کہ ہم کو حلیف بنا لیجئے لیکن ابوجہل نے معاملہ درہم برہم کر دیا۔

انصار گو بت پرست تھے تاہم چونکہ یہود سے میل جول تھا اس لئے نبوت اور کتبِ آسمانی سے گوش آشنا تھے۔ یہود سے گو انصار اک گونہ رقابت رکھتے تھے، لیکن اُن کے علمی فضل و کمال کے معترف تھے، یہود نے مدینہ میں جو علمی مدارس قائم کئے تھے اور جن کو بیت المدراس کہتے تھے (بخاری وغیرہ میں نام مذکور ہے) ان میں تورات کی تعلیم ہوتی تھی۔ انصار جاہل تھے اس لئے ان پر یہود کے علمی تفوق کا خواہ مخواہ اثر پڑتا تھا، یہاں تک کہ انصار میں سے جس کے اولاد زندہ نہ رہتی تھی، وہ منت مانتا تھا کہ بچہ زندہ رہے گا تو یہودی بنا دیا جائے گا۔[1] یہودی عموماً یہ یقین رکھتے تھے کہ ایک پیغمبر ابھی اور آنے والا ہے، اس بناء پر انصار بھی ایک پیغمبرِ موعود کے نام سے آشنا تھے۔

انصار میں ایک شخص سوید بن صامت جو شاعری اور جنگ آوری میں ممتاز تھا اس کو امثالِ لقمان کا نسخہ ہاتھ آگیا تھا جس کو وہ کتابِ آسمانی سمجھتا تھا۔ وہ ایک دفعہ حج کو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حالات سُنے تو خود اس کے پاس تشریف لے گئے، اُس نے امثالِ لقمان پڑھ کر سنایا، آپ نے فرمایا، میرے پاس اس سے بھی بہتر چیز ہے، یہ کہہ کر قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، سوید نے تحسین کی، اگرچہ وہ مدینہ واپس آکر جنگ بعاث میں مارا گیا لیکن اسلام کا معتقد ہو چکا تھا۔

سوید شجاعت اور شاعری دونوں میں کمال رکھتا تھا ایسے شخص کو اہلِ عرب "کامل" کہتے تھے اور اسی بناء پر سوید اسی لقب سے پکارا جاتا تھا۔ سوید کے میلانِ اسلام کا اثر انصار پر پڑ چکا تھا۔

اوس اور خزرج کے معرکوں میں اوس کو جب شکست ہوئی تو اوس کے عمائد قریش کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلہ میں اُن کو حلیف بنائیں، اس سفارت میں ایاس بن معاذ بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو آپ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، اوس نے ساتھیوں سے

---

[1] وفاء الوفا، یہ واقعہ مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے اور وفاء الوفا میں یہ تمام روایتیں مذکور ہیں۔ [2] بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۲۰ کتاب الاکراہ باب فی بیع المکرہ ونحوہ فی الحق وغیرہ، [3] اکثر کتب تفسیر میں لا اکراہ فی الدین کی تفسیر دیکھو۔ [4] البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ صفحہ ۱۴۶۔

[5] سوید کا ذکر ابن ہشام میں ہے لیکن روض الانف میں زیادہ تفصیل ہے، اصابہ میں بھی اس کا حال ہے لیکن نسب میں اختلاف ہے امثالِ لقمان کا ذکر نہیں ہے، طبری میں بھی سوید کا پورا واقعہ مع اس کے اشعار کے مذکور ہے (دیکھو ص ۲۰۷)

کہا، خدا کی قسم! تم جس غرض کے لئے آئے ہو یہ کام اس سے بہتر ہے، لیکن قافلہ سالار یعنی ابوالعیس نے کنکریاں اٹھا کر ان کے منہ پر ماریں اور کہا کہ ہم اس کام کے لئے نہیں آئے، اس کے بعد بعاث کا معرکہ پیش آیا اور ایاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ مرتے وقت ایاس کی زبان پر تکبیر جاری تھی۔[1]

انصار کے اسلام لانے کی ابتدا سنہ ۱۱ نبوی

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا حج کے زمانہ میں رؤسائے قبائل کے پاس جا کر تبلیغ اسلام فرمایا کرتے تھے، اس سال رجب سنہ ۱۱ نبوی میں بھی آپ حسب معمول قبائل کے پاس تشریف لے گئے، عقبہ کے پاس جہاں اب مسجد العقبہ ہے خزرج کے چند اشخاص آپ کو نظر آئے، آپ نے ان سے نام و نسب پوچھا، انہوں نے کہا خزرج، آپ نے دعوت اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں سنائیں، ان لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا، دیکھو یہود ہم سے اس اولیت میں بازی نہ لے جائیں، یہ کہہ کر سب نے ایک ساتھ اسلام قبول کیا، یہ چھ شخص تھے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔[2]

---

[1] طبری و اصابہ میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور ہے، اصابہ میں لکھا ہے کہ ایاس کا حال امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۴۷)

[2] مدینہ منورہ کے یہ حضرات جو پہلے پہل اسلام لائے، بعض مصنفین سیرت نے ان کے اسی قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ بیعت عقبہ اولیٰ کے عنوان سے کیا ہے، یہ عنوان کتب سیرت کے ناظرین کے لئے اس وقت یقیناً التباس کا موجب بن جاتا ہے جب وہ دوسری کتابوں مثلاً مستدرک حاکم ج ۲ ص ۶۲۴، ابن کثیر علی حاشیہ فتح البیان ج ۹ ص ۲۲۲ میں دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں بارہ آدمی تھے، اسی اختلاف روایت کے سبب سے بعض مصنفین سیرت بیعت عقبہ ثانیہ میں بارہ آدمی اور بعض ۷۳ آدمی بتلاتے ہیں، حالانکہ اصل صورت یہ ہے کہ چھ یا آٹھ آدمی جو شروع شروع میں اسلام لائے، ان کے واقعہ قبول اسلام کا عنوان بیعت عقبہ اولیٰ نہیں بلکہ ابتدائے اسلام انصار ہونا چاہیے اور دوسرے سال جب کہ گیارہ یا بارہ آدمی حاضر خدمت ہوئے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ ہے، حضرت عبادۃ بن الصامت نے بالصراحت فرمایا ہے کہ انا احد عشر فی العقبۃ الاولیٰ من العام المقبل، اس روایت میں حضرت عبادۃ العام المقبل میں بیعت عقبہ اولیٰ کا ہونا فرماتے ہیں اور اس میں گیارہ آدمیوں کے ہونے کی صراحت فرماتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس سے پہلے جو لوگ آ کر اسلام قبول کر چکے تھے اس کا تعلق بیعت عقبہ اولیٰ سے نہیں ہے۔

جب لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کا نام بیعت عقبہ اولیٰ رکھا ہے وہ تین بیعت عقبہ کا اعلان دیتے ہیں یعنی ایک یہ بیعت عقبہ اولیٰ، دوسری وہ بیعت عقبہ جس میں گیارہ یا بارہ آدمی اسلام لائے اور تیسری وہ بیعت عقبہ جس میں ۷۲ افراد مشرف با اسلام ہوئے اور [illegible] واقعے ایک ایک سال کے فصل سے حج کے موسم میں پیش آئے اور جن لوگوں نے انصار کے ابتدائے اسلام کے واقعہ کو صرف ابتدائے اسلام انصار کے عنوان سے ذکر کیا ہے انہوں نے گیارہ آدمیوں والی بیعت کو بیعت عقبہ اولیٰ اور ۷۳ والی بیعت کو بیعت عقبہ ثانیہ کے عنوان سے ذکر کیا ہے (مزید تفصیل تاریخ خمیس اول صفحہ ۳۰۷، ۳۱۶، ۳۱۷ [illegible])

[3] سیرت حلبیہ

[4] مستدرک ج ۲ صفحہ ۶۲۴ [illegible]

۱۔ ابو الہیثم بن تیہان۔	
۲۔ ابو امامہ اسعد بن زرارہ	(صحابہ میں سب سے پہلے انہی نے ۱ھ میں وفات پائی)
۳۔ عوف بن حارث	(بدر میں وفات پائی)
۴۔ رافع بن مالک بن عجلان	اس وقت تک جس قدر قرآن اتر چکا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عنایت فرمایا، جنگ احد میں شہید ہوئے،
۵۔ قطبہ بن عامر بن حدیدہ	(تینوں عقبات میں شریک رہے)
۶۔ جابر بن عبداللہ (بن رئاب)	(یہ مشہور صحابی حضرت جابر بن عبداللہ بن عمرو کے علاوہ تھے) بدر وغیرہ میں شریک تھے۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ ۱۲ نبوی

دوسرے سال بارہ شخص مدینہ منورہ سے آئے اور بیعت کی، اس کے ساتھ اس بات کی بھی خواہش کی کہ احکامِ اسلام کے سکھانے کے لئے کوئی معلم ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔ مصعبؓ ہاشم بن عبد مناف کے پوتے اور سابقینِ اسلام میں سے تھے، غزوۂ بدر میں لشکر کی علمبرداری کا منصب انہی کو ملا تھا۔ وہ مدینہ میں آکر اسعد بن زرارہ کے مکان پر ٹھہرے جو مدینہ کے نہایت معزز رئیس تھے، روزانہ معمول تھا کہ انصار کے ایک ایک گھر کا دورہ کرتے، لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے، روزانہ ایک دو نئے آدمی اسلام قبول کرتے۔ رفتہ رفتہ مدینہ سے قبا تک گھر گھر اسلام پھیل گیا، صرف خطمہ، وائل، واقف کے چند گھرانے باقی رہ گئے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ واقعات تفصیل سے لکھے ہیں۔

قبیلۂ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ تھے، قبیلہ پر ان کا یہ اثر تھا کہ ہر کام میں ان کے اشاروں پر چلتے تھے، مصعبؓ نے جب اُن کے پاس جا کر اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے پہلے نفرت ظاہر کی، لیکن جب مصعبؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں تو پھر موم تھا، ان کا اسلام لانا تمام قبیلۂ اوس کا اسلام قبول کر لینا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) علی المواہب ج ۱ ص ۳۶۲، ص ۳۶۷) س ن

[1] یہ واقعات تمام تاریخوں میں مذکور ہیں، ہم نے زرقانی کو پیش نظر رکھا ہے، کیونکہ اس نے تمام مختلف روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان لوگوں کی تعداد بعضوں نے آٹھ بیان کی ہے اسعدؓ بن زرارہ اور ابو الہیثم کا پہلے سے موجود ہونا ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے، دیکھو کتاب مذکور جزء ثالث انصار بدریین صفحہ ۱۲

واقدی کا بیان ہے کہ اسعدؓ بن زرارہ اس واقعہ سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے (بعضوں نے ابو الہیثم بن تیہان کی جگہ عقبہ بن عامر بن نابی کا نام لیا ہے اور بعض نے جابر بن رئاب کے بجائے عبادہ بن صامت کو جگہ دی ہے۔" س

بیعت عقبہ ثانیہ ۱۲ نبوی

اگلے سال بہتر شخص حج کے زمانہ میں آئے اور اپنے ساتھیوں سے جو بت پرست تھے، چھپ کر بمقام منیٰ (عقبہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی اس موقع پر حضرت عباسؓ بھی جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، انھوں نے انصار سے خطاب کر کے کہا "گروہ خزرج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں، دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں، اگر مرتے دم تک ان کا ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ ابھی سے جواب دیدو"۔

حضرت براءؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں" وہ اسی قدر کہنے پائے تھے کہ ابو الہیثمؓ نے بات کاٹ کر کہا۔ "یا رسول اللہ! ہم سے اور یہود سے تعلقات ہیں۔ بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے، ایسا تو نہ ہو کہ جب آپ کو قوت اور اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے جائیں"۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمہارا خون میرا خون ہے، تم میرے اور میں تمہارا ہوں"۔

آپ نے اس گروہ میں سے بارہ شخص نقیب انتخاب کئے، جن کے نام خود انصار نے پیش کئے تھے، ان میں نو خزرج کے اور تین اوس کے تھے، ان کے نام حسب روایت ابن سعد حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اُسیدؓ بن حضیر	جنگ بعاث میں انہی کے باپ اوس کے سردار تھے۔
۲۔ ابو الہیثمؓ بن تیہان	
۳۔ سعدؓ بن خیثمہ	جنگ بدر میں شہید ہوئے۔
۴۔ اسعدؓ بن زرارہ	ان کا ذکر اوپر گزر چکا ہے یہ امام نماز تھے۔
۵۔ سعدؓ بن الربیع	جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔
۶۔ عبد اللہؓ بن رواحہ	مشہور شاعر ہیں، جنگ موتہ میں شہید ہوئے۔
۷۔ سعدؓ بن عبادۃ	معزز اور مشہور صحابی ہیں، سقیفۂ بنی ساعدہ میں ان ہی نے پہلے خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔
۸۔ منذرؓ بن عمرو	بیر معونہ میں شہید ہوئے۔
۹۔ براءؓ بن معرور	بیعت عقبہ میں انہی نے انصار کی طرف سے تقریر کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے۔
۱۰۔ عبد اللہؓ بن عمرو	جنگ احد میں شہید ہوئے۔
۱۱۔ عبادۃؓ بن الصامت	مشہور صحابی ہیں اُن سے اکثر حدیثیں مروی ہیں،
۱۲۔ رافعؓ بن مالک	جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں پر انصار سے بیعت لی یہ تھیں، شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور افتراء کے مرتکب نہ ہوں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن سے جو اچھی بات کہیں گے اس سے

مانی نہ کریں گے۔[1]

جب انصار بیعت کر رہے تھے تو سعدؓ بن زرارہ نے کھڑے ہو کر کہا بھائیو! یہ بھی خبر ہے کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم اور جن وانس سے جنگ ہے۔

سب نے کہا، ہاں ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں۔

بارہ شخص جو نقیب انتخاب کیے گئے رئیس القبائل تھے، اُن کا اسلام قبول کرنا تمام انصار کا اسلام قبول کرنا تھا۔ صبح کو اس بیعت کی اڑتی سی خبر پھیلی، قریش انصار کے پاس آئے اور شکایت کی، انصار کے ساتھ جو بُت پرست تھے ان کو اس بات کی خبر نہ تھی انہوں نے تکذیب کی کہ ایسا ہوتا تو ہم سے کیونکر چھپ سکتا تھا۔

مدینہ میں اسلام کو پناہ حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اجازت دی کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں، قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے روک ٹوک شروع کی لیکن چوری چھپے لوگوں نے ہجرت شروع کر دی رفتہ رفتہ اکثر صحابہ چلے گئے، صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ رہ گئے، جو لوگ مفلسی سے مجبور تھے وہ مدت تک نہ جا سکے۔

یہ آیت اُن ہی کی شان میں ہے۔

وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (نساء۔ ۱۰)	کمزور مرد، عورتیں اور بچے جو یہ کہتے ہیں، کہ اے خدا! ہم کو اس شہر سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

* * *

---

[1] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ عقبہ اولیٰ کی شرائط ہیں، اخیر بیعت اس بات پر ہوئی تھی کہ انصار آپؐ کی جان کی حفاظت کریں گے۔

سنہ ۱ھ

ہجرت

اس وقت جبکہ دعوتِ حق کے جواب میں ہر طرف سے تلوار کی جھنکاریں سُنائی دے رہی تھیں، حافظِ عالم نے مسلمانوں کو دارالامان مدینہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا لیکن خود وجودِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو ان ستم گاروں کا حقیقی ہدف تھا اپنے لئے حکمِ خدا کا منتظر تھا۔ مکہ کے باہر اطراف میں جو صاحبِ اثر مسلمان ہو چکے تھے وہ جان نثارانہ اپنی حفاظت کی خدمت پیش کرتے تھے۔ قبیلہ دوس ایک محفوظ قلعہ کا مالک تھا۔ اس کے رئیس طفیل بن عمرو نے اپنا قلعہ پیش کیا کہ آپ یہاں ہجرت کر آئیں، لیکن آپ نے انکار فرمایا۔ اسی طرح بنی ہمدان کے ایک شخص نے بھی یہی خواہش کی تھی، بعد کو اس نے کہا کہ وہ اپنے اہلِ قبیلہ کو مطلع کر کے آئندہ سال آئے گا۔ لیکن کارسازِ قضا و قدر نے یہ شرف صرف انصار کے لئے مخصوص کیا تھا۔ چنانچہ قبل ہجرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ دارالہجرۃ ایک پُر باغ و بہار مقام ہے۔ خیال تھا کہ وہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا لیکن وہ شہر مدینہ نکلا۔

نبوت کا تیرہواں سال شروع ہوا اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحی الٰہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پُر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاریؒ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ انہی سے سُن کر کہا ہوگا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب مسلمان مدینہ جا کر طاقت پکڑتے جاتے ہیں اور وہاں اسلام پھیلتا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے دارالندوہ میں جو دارالشوریٰ تھا اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلہ کے رؤسا یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبیر بن مطعم، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری، ابن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن حزام، ابوجہل، نبیہ و منبہ، امیہ بن خلف وغیرہ وغیرہ یہ سب شریک تھے، لوگوں نے مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا محمد کے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا جلاوطن کر دینا کافی ہے۔ ابوجہل نے کہا ہر قبیلہ سے ایک شخص انتخاب ہو اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے۔ اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا۔ اور آل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس اخیر رائے پر اتفاق ہو گیا اور جھٹ پٹے سے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانۂ مبارک کا محاصرہ کر لیا۔ اہل عرب زنانہ مکان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الدلیل علی ان قاتل نفسہ لا یکفر۔ مستدرک ج ۲ ص ۶۱۳ و زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۳۵۹۔

[2] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی، تاہم آپ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مال و اسباب امانت رکھنا ہوتا تھا، آپ ہی کے پاس لا کر رکھتا تھا، اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپ کو قریش کے ارادہ کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی اس بنا پر حضرت علیؓ کو بلا کر فرمایا کہ مجھ کو ہجرت کا حکم ہو چکا ہے، میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا، تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو، صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا، حضرت علیؓ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمین ہے، لیکن فاتح خیبر کے لئے قتل گاہ، فرش گل تھا۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابو بکرؓ کے گھر پر گئے، دستور کے موافق دروازہ پر دستک دی، اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا، کچھ مشورہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو۔ بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا اور کوئی نہیں ہے (اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی)، آپ نے فرمایا، مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے نہایت بے تابی سے کہا "میرا باپ آپ پر فدا ہو، کیا مجھ کو بھی ہمرہی کا شرف حاصل ہو گا؟" ارشاد ہوا "ہاں"۔ حضرت ابو بکرؓ نے ہجرت کے لئے چار مہینے سے دو اونٹنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر تیار کی تھیں، عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں، محسن عالم کو کسی کا احسان گوارا نہیں ہو سکتا تھا، ارشاد ہوا "اچھا مگر بہ قیمت"۔ حضرت ابو بکرؓ نے مجبوراً قبول کیا، حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں، ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبد اللہؓ بن زبیر کی ماں تھیں، سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا، نطاق جس کو عورتیں کمر سے لپیٹتی تھیں پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا، یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سوتا چھوڑ کر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"۔ حضرت ابو بکرؓ سے پہلے سے قرار داد ہو چکی تھی، دونوں صاحب پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو رہے، یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہ خلائق ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبد اللہ جو نوخیز جوان تھے، شب کو غار میں ساتھ سوتے، صبح منہ اندھیرے، شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں، جو کچھ خبر ملتی شام کو آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے۔ حضرت ابو بکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لاتا اور آپ اور حضرت ابو بکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی، لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرت ص [illegible] [2] صحیح بخاری باب ہجرت ص [illegible] [3] یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے، پہاڑ کی چوٹی قریباً ایک میل بلند ہے، سمندر یہاں سے دکھائی دیتا ہے، دیکھو زرقانی ج ۱ صفحہ [illegible]

تھیں، اسی طرح تین راتیں غار میں گزریں[1]۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو پلنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت علیؓ تھے۔ ظالموں نے آپ کو پکڑ کر اور حرم میں لے جا کر تھوڑی دیر محبوس رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے، ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانہ تک آ گئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ غمزدہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آ گئے ہیں کہ اگر اپنے قدم پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ) گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آ گئے تو خدا نے حکم دیا۔ دفعۃً ببول کا درخت اُگا اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپا لیا، ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسلا بنا کر انڈے دیے۔ حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدنیہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے اور زرقانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں، لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں، اس روایت کا اصلی راوی عون بن عمرو ہے۔ اس کی نسبت امام فن رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے "لاشیٔ" یعنی ہیچ ہے، امام بخاری نے کہا ہے کہ وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے وہ مجہول الحال ہے، چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے[2]۔

بہرحال چوتھے دن آپ غار سے نکلے، عبداللہ بن اریقط ایک کافر جس پر اعتماد تھا، رہنمائی کے لئے اُجرت پر مقرر کر لیا گیا، وہ آگے آگے راستہ بتاتا جاتا تھا، ایک رات دن برابر چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت دھوپ سخت ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سایہ میں آرام فرمالیں، چاروں طرف نظر ڈالی، ایک چٹان کے نیچے سایہ نظر آیا، سواری سے اتر کر زمین جھاڑی، پھر اپنی چادر بچھا دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا تو تلاش میں نکلے کہ کہیں کچھ کھانے کو مل جائے تو لائیں۔ پاس ہی ایک چرواہا بکریاں چرا رہا تھا، اس سے کہا ایک بکری کا تھن گرد و غبار سے صاف کر دے، پھر اس کے ہاتھ صاف کرائے اور دودھ دوہا، برتن کے منہ پر کپڑا لپیٹ دیا کہ گرد نہ پڑنے پائے، دودھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور تھوڑا سا پانی ملا کر پیش کیا۔ آپ نے پی کر فرمایا کہ کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں آیا۔ آفتاب اب ڈھل چکا تھا، اس لئے آپ وہاں سے روانہ ہوئے[3]۔

قریش نے اشتہار دیا تھا کہ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکرؓ کو گرفتار کر کے لائے گا، اس کو ایک

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح بخاری باب الہجرۃ میں ہے (باب مناقب المہاجرین) میں بعض مزید حالات ہیں وہ بھی ہم نے شامل کر لئے ہیں (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۲۳۴)

[2] سیرت النبی ج ۳ صفحہ ۳۰۰ میں ضمنی مشہور عام دلائل و معجزات کی روایتی حیثیت، ان روایات پر مفصل تنقید کی گئی ہے۔

[3] یہ پوری تفصیل حرف بحرف صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین میں ہے، ہم نے تمام جزئیات اس لئے نقل کیں کہ اس سے حضرت ابوبکرؓ کی صفائی پسندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

خون بہا کے برابر یعنی سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔ سراقہ بن جعشم نے سنا تو انعام کے لالچ میں نکلا۔ عین اس حالت میں کہ آپ روانہ ہو رہے تھے، اس نے آپ کو دیکھ لیا اور گھوڑا دوڑا کر قریب آ گیا، لیکن گھوڑے نے ٹھوکر کھائی وہ گر پڑا۔ ترکش سے فال کے تیر نکالے کہ حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ جواب میں "نہیں" نکلا، لیکن سو اونٹوں کا گراں معاوضہ ایسا نہ تھا کہ تیر کی بات مان لی جاتی۔ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور آگے بڑھا، اب کی گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر فال دیکھی، اب بھی وہی جواب تھا، لیکن مکرر تجربہ نے اس کی ہمت پست کر دی، اور یقین ہو گیا کہ یہ کچھ اور آثار ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر قریش کے اشتہار کا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ مجھ کو امن کی تحریر لکھ دیجئے، حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر فرمان امن لکھ دیا۔[1]

حسن اتفاق یہ کہ حضرت زبیرؓ شام سے تجارت کا مال لے کر آ رہے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں چند بیش قیمت کپڑے پیش کئے جو اس بے سروسامانی میں غنیمت تھے۔[2]

ابن سعد نے طبقات میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں گنائی ہیں، اگرچہ عرب کے نقشوں میں آج ان کا نشان نہیں ملتا، تاہم عقیدت مند صرف نام سے لذت یاب ہو سکتے ہیں۔ خرار، ثنیۃ المرہ، لقف، مدلجۃ، مرجح، حدائد، اذاخر، رابغ (یہ مقام آج بھی حجاج کے رستہ میں آتا ہے، یہاں آپ نے مغرب کی نماز پڑھی) ذا سلم، عثانیۃ، قاحۃ، عرج، جدوات، رکوبۃ، عقیق، حجاتۃ۔

تشریف آوری کی خبر مدینہ میں پہلے پہنچ چکی تھی، تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا، معصوم بچے فخر اور جوش میں کہتے تھے، "پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آ رہے ہیں"، لوگ ہر روز تڑکے سے نکل نکل کر شہر کے باہر جمع ہوتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت کے ساتھ واپس چلے جاتے۔ ایک دن انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ اے اہل عرب! لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آ گیا، تمام شہر تکبیر کی آواز سے گونج اٹھا، انصار ہتھیار سج سج کر بیتابانہ گھروں سے باہر نکل آئے۔

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلہ پر جو بالائی آبادی ہے اس کو عالیہ اور قبا۔ کہتے ہیں، یہاں انصار کے بہت سے خاندان آباد تھے، ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا اور کلثوم بن الہدم خاندان کے افسر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پہنچے تو تمام خاندان نے جوشِ مسرت میں اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ یہ فخر ان کی قسمت میں تھا کہ میزبانِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی مہمانی قبول کی، انصار ہر طرف سے جوق در جوق آتے اور جوشِ عقیدت کے سلام عرض کرتے۔[3]

اکثر اکابر صحابہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مدینہ میں آ چکے تھے، وہ بھی انہی کے گھر میں اترے تھے

---

[1] سراقہ بعد میں اسلام لائے اور جب ایران فتح ہوا اور کسریٰ کے زیورات لوٹ میں آئے تو حضرت عمرؓ نے انہی کو وہ زیورات پہنا کر عالم کی نیرنگی کا تماشا دکھایا۔ [2] صحیح بخاری باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پریشانی میں بھی دوات قلم ساتھ تھا۔ [3] صحیح بخاری صفحہ ۵۵۵ طبقات ابن سعد سیرت نبوی صفحہ ۱۵۱۔

چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ، مقدادؓ، خبابؓ، سہیلؓ، صفوانؓ، عیاضؓ، عبداللہ ابن مخرمہؓ، وہبؓ بن سعد، معمرؓ بن ابی سرح، عمیرؓ بن عوف، اب تک انہی کے مہمانؓ تھے۔ جناب امیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کے تین دن بعد مکہ سے چلے تھے وہ بھی آگئے اور یہیں ٹھہرے۔ تمام مورخین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف چار دن قیام فرمایا لیکن صحیح بخاری میں چودہ دن ہے اور یہی قرین قیاس ہے یہاں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا حضرت کلثومؓ کی ایک افتادہ زمین تھی جہاں کھجوریں سکھائی جاتی تھیں یہیں دستِ مبارک سے مسجد کی بنیاد ڈالی، یہی مسجد ہے جس کی شان میں قرآن مجید میں ہے :۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ	وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن پرہیزگاری پر رکھی گئی
یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ۔ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ	ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تم اس میں کھڑے رہو
اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ۔ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ۔	اس میں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی بہت پسند ہے اور خدا صاف
(توبہ ۱۳۰)	رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مسجد کی تعمیر میں مزدوروں کے ساتھ آپ خود بھی کام کرتے تھے۔ بھاری بھاری پتھروں کے اٹھاتے وقت جسم مبارک خم ہو جاتا تھا عقیدت مند آتے اور عرض کرتے۔ ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ چھوڑ دیں ہم اٹھا لیں گے، آپ اس کی درخواست قبول فرماتے، لیکن پھر اسی وزن کا دوسرا پتھر اٹھا لیتے[2]۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ شاعر تھے وہ بھی مزدوروں کے ساتھ شریک تھے اور جس طرح مزدور کام کرنے کے وقت تھکن مٹانے کو گاتے جاتے ہیں، وہ یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔

اَفْلَحَ مَنْ یُّعَالِجُ الْمَسَاجِدَا	وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے۔
وَیَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قَائِمًا وَّقَاعِدًا	اور اٹھتے بیٹھتے" قرآن پڑھتا ہے۔
وَلَا یَبِیْتُ اللَّیْلَ عَنْهُ رَاقِدًا	اور رات کو جاگتا رہتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر ہر قافیہ کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے[3]۔

قبا میں اسلام کا داخلہ اسلام کے دورِ خاص کی ابتدا ہے اس لئے مورخین نے اس تاریخ کو زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ اکثر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ آٹھ ربیع الاول ۱۳ نبوی (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) تھی محمد بن موسیٰ خوارزمی نے لکھا ہے کہ جمعرات کا دن اور فارسی ماہ تیر کی چوتھی تاریخ اور رومی ماہ ایلول ۹۲۳ اسکندری کی دسویں تاریخ تھی۔ مورخ یعقوبی نے ہیئت دانوں سے یہ زائچہ نقل کیا ہے۔

---

[1] ابن سعد تذکرہ کلثوم بن ہدم۔ [2] وفاء الوفا بحوالہ طبرانی کبیر (ج ا ص ۱۸۰) [3] وفاء الوفا بحوالہ ابن شیبہ ج ا ص ۱۹۱ مصر۔

[4] عینی شرح بخاری جلد دوم صفحہ ۳۰۵ (عینی مطبوعہ قسطنطنیہ میں مطبع کی غلطی سے تسعاً سبعاً کو لکھا گیا ہے اس کو تسعاً پڑھنا چاہیے)۔ رومی ماہ ایلول کی دسویں کی بجائے جدید طریقہ حساب سے بیسویں تاریخ ہوتی ہے۔ خوارزمی نے جمعہ کا دن بتایا ہے لیکن جدید حساب سے دوشنبہ کا دن آتا ہے۔

آفتاب	برج سرطان میں	۲۴ درجہ ۶ دقیقہ پر
زحل	برج اسد میں	۲ درجہ
مشتری	برج حوت میں	۶ درجہ
زہرہ	برج اسد میں	۱۳ درجہ
عطارد	برج اسد میں	۱۵ درجہ

چودہ دن کے بعد (جمعہ کو) آپ شہر کی طرف تشریف فرما ہوئے، راہ میں بنی سالم کے محلہ میں نماز کا وقت آگیا۔ جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی، نماز سے پہلے خطبہ دیا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی نماز جمعہ اور سب سے پہلا خطبہ نماز تھا۔ لوگوں کو جب تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تو ہر طرف سے لوگ جوش مسرت سے پیش قدمی کے لئے دوڑے، آپ کے ننھالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے۔ قبا سے مدینہ تک دو رویہ جاں نثاران کی صفیں تھیں، راہ میں انصار کے خاندان آتے تھے، ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا حضور یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے؛ آپ منت کا اظہار فرماتے اور دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم تھا کہ پردہ نشین خاتونیں چھتوں پر نکل آئیں اور گانے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا۔ چاند نکل آیا ہے۔ مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ۔ کوہ وداع کی گھاٹیوں سے۔
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا۔ ہم پر خدا کا شکر واجب ہے۔ مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ۔ جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں۔

معصوم لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی تھیں۔

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِي النَّجَّارِ — ہم خاندان نجار کی لڑکیاں ہیں۔
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ — محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اچھا ہمسایہ ہے۔

آپ نے ان لڑکیوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ کیا تم مجھ کو چاہتی ہو؟ بولیں "ہاں"! فرمایا کہ میں بھی تم کو چاہتا ہوں۔

جہاں اب مسجد نبوی ہے اس سے متصل حضرت ابو ایوب انصاری کا گھر تھا کوکبۂ نبوی یہاں پہنچا، سخت کشمکش تھی کہ آپ کی میزبانی کا شرف، کس کو حاصل ہو؟ قرعہ ڈالا گیا اور آخر یہ دولت حضرت ابو ایوب کے حصہ میں آئی

---

[1] خوارزمی کے حساب کے مطابق روز ورود (ہجرت) مان لیا جائے تو ۱۴ دن کے بعد جمعہ ہوگا۔ یہ واقعہ بخاری کے متعدد ابواب مسجد، ہجرت وغیرہ میں مذکور ہے۔ وفا، الوفا، جلد اول صفحہ ۱۸۰۔ ان اشعار کے متعلق زرقانی میں نہایت محققانہ و محدثانہ بحث کی ہے اور ابن قیم کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ ثنیۃ الوداع شام کی طرف ہے نہ کہ مکہ کی طرف۔ مواہب میں لکھا ہے کہ یہ اشعار طبرانی نے شیخین کی شرط پر روایت کئے ہیں۔ بخاری میں بھی یہ اشعار منقول ہیں مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر، لیکن ان دونوں روایتوں میں کچھ تناقض نہیں ممکن ہے دونوں موقعوں پر یہ اشعار پڑھے گئے ہوں۔ ابو ایوب کا نام خالد ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ میں اسی نام سے ان کا ذکر کیا ہے اور وہیں یہ واقعہ لکھا ہے۔ اکثر سیر اور تواریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ چونکہ ہر شخص اپنے گھر میں آپ کے آنے کی درخواست کرتا تھا، آپ نے فرمایا کہ میرے ناقہ کو چھوڑ دو وہ خدا کی طرف سے مامور ہے، چنانچہ ناقہ حضرت ابو ایوب کے گھر کے سامنے جا کر بیٹھ

حضرت ابو ایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا، انھوں نے بالائی منزل پیش کی، لیکن آپ نے زائرین کی آسانی کے لئے نیچے کا حصہ پسند فرمایا۔ ابو ایوبؓ دو وقتہ آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے اور آپ جو چھوڑ دیتے ابو ایوبؓ اور اُن کی زوجہ کے حصہ میں آتا۔ کھانے میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کا نشان پڑا ہوتا، ابو ایوبؓ تبرکاً وہیں انگلیاں ڈالتے۔[1]

ایک دن اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا، اندیشہ ہوا کہ پانی چھن کر نیچے جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو، گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا، حضرت ابو ایوبؓ نے اس کو ڈال دیا کہ پانی جذب ہو کر رہ جائے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات مہینہ تک یہیں قیام فرمایا، اس اثنا میں جب مسجد نبویؐ اور آس پاس کے حجرے تیار ہو گئے تو آپؐ نے نقل مکان فرمایا، تفصیل آگے آتی ہے۔

مدینہ میں آکر آپ نے حضرت زیدؓ اور اپنے غلام ابو رافعؓ کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم دے کر بھیجا کہ مکہ جا کر صاحبزادیوں اور حرم نبویؐ کو لے آئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبد اللہؓ کو لکھا کہ وہ بھی اپنی ماں اور بہنوں کو لے کر چلے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سے حضرت رقیہؓ حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبش میں تھیں، حضرت زینبؓ کو ان کے شوہر نے آنے نہ دیا، زیدؓ صرف حضرت فاطمہ زہراؓ اور حضرت ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ (زوجہ محترم نبوی) کو لے کر آئے، حضرت عائشہؓ اپنے بھائی عبد اللہ کے ساتھ آئیں۔[3]

مسجد نبویؐ اور ازواج مطہراتؓ کے حجروں کی تعمیر

مدینہ میں قیام کے بعد سب سے پہلا کام ایک خانۂ خدا کی تعمیر تھی، اب تک یہ معمول تھا کہ مویشی خانہ میں یا جہاں موقع ملتا تھا آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ دولت کدہ کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی جس پر کچھ قبریں تھیں، کچھ کھجور کے درخت تھے، آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر فرمایا "میں یہ زمین بقیمت لینا چاہتا ہوں" وہ بولے کہ ہم قیمت لیں گے، لیکن آپ سے نہیں بلکہ خدا سے۔ چونکہ اصل میں وہ زمین دو یتیم بچوں کی تھی، آپ نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا، ان یتیم بچوں نے بھی اپنی کائنات نذر کرنی چاہی لیکن آپؐ نے گوارا نہ کیا، حضرت ابو ایوبؓ نے قیمت ادا کی۔ قبریں اکھڑوا کر زمین ہموار کر دی گئی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ شہنشاہ دو عالم پھر مزدوروں کے لباس میں تھے، صحابہ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی، اس لئے آپؐ نے انہی کے گھر پر قیام فرمایا لیکن صحیح مسلم (باب الہجرۃ) میں ہے کہ جب لوگوں میں آپ کی میزبانی کے متعلق جھگڑا ہوا تو آپ نے فرمایا میں بنو نجار کے ہاں اتروں گا جو عبد المطلب کے ماموں ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً ایسا کیا تھا، حضرت ابو ایوبؓ اسی خاندان سے تھے، امام بخاری نے تاریخ صغیر میں تصریح کی ہے کہ ابو ایوب کے گھر ٹھہرنا اسی قرابت کی وجہ سے تھا۔ [1] اصابہ ذکر ابو ایوبؓ [illegible] [2] [illegible] [3] [illegible]

[illegible]

[illegible]

ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے[1]،

اللھم لا خیر الا خیر الآخرۃ	اے خدا کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔
فاغفر الانصار والمہاجرۃ	اے خدا مہاجرین اور انصار کو بخشش دے۔

یہ مسجد ہر قسم کے تکلفات سے بری اور اسلام کی سادگی کی تصویر تھی، یعنی کچی اینٹوں کی دیواریں، برگ خرما کا چھپر کھجور کے ستون تھے، قبلہ بیت المقدس کی طرف رکھا گیا، لیکن جب قبلہ بدل کر کعبہ کی طرف ہو گیا تو شمالی جانب ایک نیا دروازہ قائم کر دیا گیا، فرش چونکہ بالکل خام تھا، بارش میں کیچڑ ہو جاتی تھی، ایک دفعہ صحابہ نماز کے لئے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی نشست گاہ پر بچھا لیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد کے ایک سرے پر ایک مسقف چبوترہ تھا جو صفہ کہلاتا تھا، یہ ان لوگوں کے لئے تھا جو اسلام لاتے تھے اور گھر بار نہیں رکھتے تھے۔

مسجد نبوی جب تعمیر ہو چکی تو مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہراتؓ کے لئے مکان بنوائے اس وقت تک حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ عقد نکاح میں آ چکی تھیں، اس لئے دو ہی حجرے بنے جب اور ازواج آ گئیں تو اور مکانات بنتے گئے، یہ مکانات کچی اینٹوں کے تھے، ان میں سے پانچ کھجور کی ٹٹیوں سے بنے تھے، جو حجرے اینٹوں کے تھے، ان کے اندرونی حجرے بھی ٹٹیوں کے تھے، ترتیب یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ بنت جحش کے مکانات شامی جانب تھے اور حضرت عائشہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت سودہؓ مقابل جانب تھیں، یہ مکانات مسجد سے اس قدر متصل تھے کہ جب آپ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تو مسجد سے سر نکال دیتے اور ازواج مطہراتؓ گھر میں بیٹھے بیٹھے آپ کے بال دھو دیتی تھیں۔

یہ مکانات چھ چھ، سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے، چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا، دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا[2]۔ راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے[3]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمسایہ میں جو انصار رہتے تھے ان میں حضرت سعدؓ بن عبادہ، حضرت سعدؓ بن معاذ، حضرت عمارہؓ بن حزم اور حضرت ابو ایوبؓ رئیس اور دولت مند تھے، یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دودھ بھیج دیا کرتے تھے اور اسی پر آپ بسر فرماتے تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہ نے التزام کر لیا تھا کہ رات کے کھانے پر ہمیشہ اپنے ہاں سے ایک بڑا بادیہ بھیجا کرتے تھے، جن میں کبھی سالن کبھی

---

[1] بخاری باب المساجد و باب الہجرۃ و حج و باب البیوع و عینی شرح بخاری ج ۲ صفحہ ۲۰ و زرقانی نے طبقات ابن سعد، سیرت نبوی صفحہ ۹۶۔

[2] مکانات نبوی کا حال طبقات ابن سعد جزء ۸ صفحہ ۱۱۰ و وفاء الوفاء میں تفصیل سے ہے۔ [3] بخاری باب صلوۃ علی الفراش۔

دودھ بھی کم ہوتا تھا۔ حضرت انسؓ کی ماں حضرت ام انسؓ نے اپنی جائیداد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما کر اپنی دایہ حضرت ام ایمن کو دے دیا اور خود فقر و فاقہ اختیار فرمایا۔

اذان کی ابتدا

اسلام کے تمام عبادات کا اصلی مرکز وحدت و اجتماع ہے، اس وقت تک کسی خاص علامت کے نہ ہونے کی وجہ سے نماز جماعت کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ وقت کا اندازہ کر کے آتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ تھا آپ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیے جائیں، جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں، لیکن اس میں زحمت تھی، صحابہؓ کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائے دیں کسی نے کہا نماز کے وقت مسجد میں ایک علم کھڑا کر دیا جائے، لوگ دیکھ دیکھ کر آتے جائیں گے، آپ نے یہ طریقہ ناپسند فرمایا، عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں اعلان نماز کے جو طریقے ہیں وہ بھی آپ کی خدمت میں عرض کیے گئے لیکن آپ نے حضرت عمرؓ کی رائے پسند کی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان دیں، اس سے ایک طرف تو نماز کی اطلاع عام ہو جاتی تھی اور دوسری طرف دن میں پانچ دفعہ دعوت اسلام کا اعلان ہو جاتا تھا۔

صحاح ستہ کی بعض کتابوں میں ہے کہ اذان کی تجویز عبداللہ بن زیدؓ نے پیش کی تھی جو انھوں نے خواب میں دیکھی تھی، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں توارد ہوا لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔[3]

بخاری میں صرف تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بوق اور ناقوس کی تجویزیں پیش کی گئیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اذان کی تجویز پیش کی اور آپ نے اس کے موافق حضرت بلالؓ کو بلا کر اذان کا حکم دیا خواب کا ذکر نہیں۔

مواخاۃ

مہاجرین مکہ معظمہ سے بے سر و سامان آئے تھے، گو ان میں دولت مند اور خوشحال بھی تھے لیکن کافروں سے چھپ کر نکلے تھے اس لئے کچھ ساتھ نہ لا سکے تھے۔

اگرچہ مہاجرین کے لئے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا تاہم ایک مستقل انتظام کی ضرورت تھی، مہاجرین نذر اور

---

[1] طبقات ابن سعد جلد کتاب النساء صفحہ ۱۰۰ [2] صحیح بخاری صفحہ ۵۵ باب فضل التہجد [3] ابو داود باب بدء الاذان و بخاری باب الاذان، بخاری میں زید کے واقعہ کا ذکر نہیں ہے یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں بھی ہے لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے دوسرے لوگوں کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے یہ پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت میں ہے کہ اولا تبعثون رجلا ینادی بالصلوٰۃ کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور الصلوٰۃ جامعۃ کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمایا اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی۔ فتح الباری و نووی و زرقانی و روض الانف باب بدء الاذان میں یہ تفصیلات [illegible] مذکور ہیں۔

خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے، تاہم چونکہ بالکل نکھرے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیال فرمایا کہ انصار اور اُن میں رشتۂ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپؐ نے انصار کو طلب فرمایا، حضرت انسؓ بن مالک جو اس وقت دس سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے۔ مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، پھر مہاجرین اور انصار سے دو دو شخص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ درحقیقت بھائی بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے، سعدؓ بن ربیع جو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بھائی قرار پائے اُن کی دو بیویاں تھیں، عبدالرحمٰن سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیجئے لیکن انھوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا[1]۔

انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا نخلستان تھے، روپے پیسے تو اُس زمانے میں تھے نہیں[2]، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیئے جائیں، مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی طرف سے انکار کیا، انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود انجام دے لیں گے، جو کچھ پیداوار ہو گی اس میں سے نصف حصہ مہاجرین کا ہو [illegible]

یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا، کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائیداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا اور بھائی بند محروم رہتے، یہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل تھی:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا
بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ
آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (انفال ۔۸)

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے
جہاد کیا اور وہ لوگ جنھوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد
کی یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔

جنگ بدر کے بعد جب مہاجرین کو اعانت کی ضرورت نہ رہی تو یہ آیت اتری۔

وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ (انفال ۔۱۰)

ارباب قرابت ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اُس وقت سے یہ قاعدہ جاتا رہا، چنانچہ کتب تفسیر و حدیث میں بہ تصریح مذکور ہے[3]۔

۴ھ میں بنو نضیر جب جلا وطن ہوئے اور اُن کی زمین اور نخلستان قبضہ میں آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ مہاجرین نادار ہیں، اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ نئے مقبوضات تنہا ان کو دے دیئے جائیں اور تم اپنے نخلستان واپس لے لو۔ انصار نے عرض کی کہ نہیں ہمارے نخلستان بھائیوں ہی کے قبضہ میں رہنے دیجئے اور نئے بھی انہی کو عنایت فرمایئے[4]۔

---

[1] مواخاۃ کا ذکر اور ایک ایک کا نام ابن ہشام صفحہ ۱۷۸ میں ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا واقعہ صحیح بخاری کتاب المناقب باب اخاء النبی [illegible] [2] صحیح بخاری صفحہ ۳۱۲ [3] صحیح بخاری صفحہ ۳۱۲ [4] صحیح بخاری کتاب التفسیر آیہ واولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض [5] فتوح البلدان مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۰۔

دنیا انصار کے اس ایثار پر ہمیشہ ناز کرے گی، لیکن یہ بھی دیکھو کہ مہاجرین نے کیا کیا؟ حضرت سعد بن الربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو ایک ایک چیز کا جائزہ دے کر نصف لے لینے کی درخواست کی تو انہوں نے کہا، خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے، مجھ کو صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے، انہوں نے قینقاع کا جو مشہور بازار تھا جا کر راستہ بتا دیا، انھوں نے کچھ گھی کچھ پنیر خریدا اور شام تک خرید و فروخت کی، چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی، رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو یہ ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا ہو جاتی ہے، ان کا اسباب تجارت سات سات سو اونٹوں پر لد کر آتا تھا اور جس دن مدینہ میں پہنچتا تمام شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔[2]

بعض صحابہ نے دکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ سنح میں تھا جہاں وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔[3] حضرت عثمانؓ بنو قینقاع کے بازار میں چھوہروں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔[4] حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے تھے۔[5] اور شاید ان کی اس تجارت کی وسعت ایران تک پہنچ گئی تھی۔[6] اور صحابہؓ نے بھی اسی قسم کی چھوٹی بڑی تجارت شروع کر دی تھی۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ پر لوگوں نے جب کثرت روایت کی بنا پر اعتراض کیا کہ اور صحابہؓ تو اس قدر روایت نہیں کرتے تو انہوں نے کہا، اس میں میرا کیا قصور ہے؟ اور لوگ بازار میں تجارت کرتے تھے اور میں رات دن بارگاہ نبوت میں حاضر رہتا تھا، پھر جب خیبر فتح ہوا تو تمام مہاجرین نے یہ نخلستان انصار کو واپس کر دیئے، صحیح مسلم باب الجہاد میں ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما فرغ من قتال اھل خیبر وانصرف الی المدینۃ ردّ المھاجرون الی الانصار منائحھم التی کانوا منحوھم من ثمارھم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب جنگ خیبر سے فارغ ہوئے اور مدینہ واپس آئے تو مہاجرین نے انصار کے عطیے جو نخلستان کی صورت میں تھے واپس کر دیئے۔

مہاجرین کے لئے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس جو افتادہ زمینیں تھیں ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انھوں نے اپنے مسکونہ مکانات دے دیئے، سب سے پہلے حضرت حارثہ بن نعمان نے اپنی زمین پیش کی، جو زہرہ مسجد نبوی کے عقب میں آباد ہوئے، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے یہاں ایک قلعہ (جس کو گڑھی کہنا زیادہ موزوں ہوگا) بنوایا، حضرت زبیر بن العوام کو ایک وسیع زمین ہاتھ آئی، حضرت عثمانؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت عبیدؓ کو انصار نے اپنے مکانات کے پہلو میں زمینیں دیں، مواخاۃ کے رشتے سے جو لوگ آپس میں بھائی بھائی تھے، ان میں سے بعض حضرات کے نام یہ ہیں۔[8]

---

[1] صحیح بخاری میں دو مختلف موقعوں پر یہ واقعہ مذکور ہے (کتاب البیوع رباب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب اخاء النبی بین المہاجرین والانصار، باب الولیمہ، والولیمۃ ولو بشاۃ) [2] اسد الغابہ ج ۳ صفحہ ۳۱۴ و صفحہ ۳ وغیرہ میں یہ واقعہ مذکور ہے۔ [3] ابن سعد ج ۳ صفحہ ۱۳ [4] مسند امام حنبل ج ۱ صفحہ ۶۲ [5] مسند ابن حنبل جلد ۲ صفحہ ۳ [6] ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۲۹ [7] یہ پوری تفصیل معجم البلدان مدینہ منورہ کے ذکر میں ہے [8] یہ تفصیل ابن ہشام صفحہ ۱۹۱ میں ہے۔

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکرؓ	حضرت خارجہؓ بن زید انصاری
حضرت عمرؓ	حضرت عتبانؓ بن مالک انصاری
حضرت عثمانؓ	حضرت اوسؓ بن ثابت انصاری
حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ	حضرت سعدؓ بن معاذ انصاری
حضرت زبیرؓ بن العوام	حضرت سلامۃؓ بن وقش
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت ابوایوبؓ انصاری
حضرت عمارؓ بن یاسر	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت ابوذر غفاریؓ	حضرت منذرؓ بن عمرو
حضرت سلمان فارسیؓ	حضرت ابودرداءؓ
حضرت بلالؓ	حضرت ابورویحہؓ
حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ	حضرت عبادؓ بن بشر
حضرت سعیدؓ بن زید بن عمرو بن نفیل	حضرت ابیؓ بن کعب

مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لئے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چندروزہ انتظام ہو جائے لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراض اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا۔

اسلام تہذیب اخلاق وتکمیل فضائل کی شہنشاہی ہے۔ اسی سلطنت الٰہی کے لئے وزراء، ارباب تدبیر، سپہ سالاران لشکر، ہر قابلیت کے لوگ درکار ہیں۔ شرف صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہو چکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہو چکا تھا کہ ان کی درسگاہ تربیت سے اور ارباب استعداد بھی تربیت پا کر نکلیں۔ اس بنا پر جن لوگوں میں رشتہ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحاد مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لئے ضرور ہے۔ تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحاد مذاق ملحوظ رکھا گیا اور جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ اتنی کم مدت میں سینکڑوں اشخاص کی طبیعت اور مذاق کا صحیح اور پورا اندازہ کرنا قریباً ناممکن ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ شان نبوت کی خصوصیات میں سے ہے۔

حضرت سعیدؓ بن زید عشرہ مبشرہ میں ہیں۔ ان کے والد زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ملت ابراہیمؑ کے پیرو ہو چکے تھے اور گویا اسلام کے مقدمۃ الجیش تھے حضرت سعیدؓ نے ان ہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی اس لئے اسلام کا نام سننے کے ساتھ ہی انھوں نے لبیک کہا، ان کی ماں بھی ان کے ساتھ یا ان سے پہلے اسلام لائیں۔ حضرت عمرؓ ان ہی کے گھر میں اور ان ہی کی ترغیب سے اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے، وفضل کے لحاظ سے فضلائے صحابہ میں تھے، ان کی اخوت حضرت ابیؓ بن کعب سے قائم کی گئی جنھوں نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ حضرت عمرؓ ان کو سید المسلمین کہتے تھے، بارگاہ نبوت میں منصب انشا پر سب سے پہلے وہی ممتاز ہوئے

فن قرأت کے وہ امام تسلیم کئے جاتے ہیں[1]۔

حضرت ابو حذیفہؓ عتبہ بن ربیعہ کے فرزند تھے جو قریش کا رئیس اعظم تھا اس مناسبت سے ان کو حضرت عباد بن بشر کا بھائی بنایا گیا جو قبیلہ اشہل کے سردار تھے۔

حضرت ابو عبیدہؓ جراح جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امین الامۃ کا خطاب دیا تھا ایک طرف تو فاتح شام ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، دوسری طرف اسلام کے مقابلہ میں پدری اور فرزندی کے جذبات ان پر کچھ اثر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ غزوہ بدر میں جب ان کے باپ اُن کے مقابلہ میں آئے تو انھوں نے پہلے حقوق ابوت کی مراعات کی لیکن بالآخر اسلام پر باپ کو قربان کر دینا پڑا۔ اُن کی تربیت میں حضرت سعدؓ بن معاذ دیئے گئے جو قبیلہ اوس کے رئیس اعظم تھے۔ ان میں بھی ایثار کا یہ وصف نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بنو قریظہ ان کے حلیف تھے اور عرب میں حلیف کا رشتہ اخوت اور ابوت کے برابر ہوتا تھا، تاہم بنو قریظہ میں جب اسلام کا مقابلہ پیش آیا تو انھوں نے اپنے چار سو حلیفوں کو اسلام پر نثار کر دیا۔

حضرت بلالؓ اور حضرت ابو رویحہؓ حضرت سلمانؓ فارسی اور حضرت ابو درداءؓ حضرت عمارؓ بن یاسر اور حضرت حذیفہؓ بن یمان حضرت مصعبؓ اور حضرت ابو ایوبؓ میں وہ وحدت موجود تھی جس کی بدولت نہ صرف شاگرد بلکہ استاد بھی شاگرد سے اثر پذیر ہو سکتا تھا حضرت عبد الرحمنؓ بن عوف مدینہ میں آئے تو بیر سر پر رکھ کر بیچتے تھے حضرت سعدؓ بن الربیع کی صحبت میں جو امیر الامراء تھے دولت اور امارت کے جس درجہ پر پہنچے ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

انصار نے مہاجرین کی مواسات اور ہمدردی کا جو حق ادا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے عرض کی کہ پہلے ہمارے بھائی مہاجروں کو اتنی ہی زمین عنایت فرمایئے، تب ہم لینا منظور کریں گے۔

ایک دفعہ ایک فاقہ زدہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے گھر میں دریافت فرمایا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب آیا کہ صرف پانی۔ آپ نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کوئی ہے جو اُن کو آج اپنا مہمان بنائے۔ حضرت ابو طلحہؓ نے عرض کی کہ میں حاضر ہوں۔ غرض وہ اپنے گھر لے گئے لیکن وہاں بھی برکت تھی۔ بیوی نے کہا صرف بچوں کا کھانا موجود ہے۔ انھوں نے بیوی سے کہا چراغ بجھا دو اور جو کھانا مہمان کے سامنے لا کر رکھ دو۔ تینوں ساتھ کھانے پر بیٹھے، میاں بیوی بھوکے بیٹھے رہے اور اس طرح ہاتھ چلاتے رہے کہ گویا کھا رہے ہیں۔ اسی واقعہ کے بارے میں یہ آیت اتری ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر) اور گو ان کو خود تنگی ہو تاہم اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

صفہ اور اصحاب صفہ

اصحاب صفہ اسلامی لغت کا ایک متداول لفظ ہے، مگر اس کی حقیقت سے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

صفہ سائبان کو کہتے ہیں، یہ ایک سائبان تھا جو مسجد نبوی کے ایک کنارہ پر مسجد سے ملا ہوا تیار کیا گیا تھا جس

---

[1] اصابہ ذکر ابی بن کعب ۔ [2] صحیح بخاری فضائل انصار ۔ [3] صحیح بخاری و فتح الباری فضائل انصار

میں سے اکثر تو مشاغل دینی کے ساتھ ہر قسم کے کاروبار یعنی تجارت یا زراعت وغیرہ بھی کرتے تھے لیکن چند لوگوں نے اپنی زندگی صرف عبادت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت پذیری پر نذر کر دی تھی، ان لوگوں کے بال بچے نہ تھے اور جب شادی کر لیتے تھے تو اس حلقہ سے نکل آتے تھے، ان میں ایک ٹولی دن کو جنگل سے لکڑیاں چن لاتی اور بیچ کر اپنے بھائیوں کے لئے کچھ کھانا مہیا کرتی۔

یہ لوگ دن کو بارگاہ نبوت میں حاضر رہتے اور حدیثیں سنتے اور رات کو اسی چبوترہ (صفہ) پر پڑ رہتے۔[1] حضرت ابوہریرہؓ بھی انہی لوگوں میں تھے، ان میں سے کسی کے پاس چادر اور تہمد دونوں چیزیں کبھی ساتھ مہیا نہ ہو سکیں، چادر کو گلے سے اس طرح باندھ لیتے کہ رانوں تک لٹک آتی، اکثر انصار کھجور کی بھری ہوئی شاخیں توڑ کر لاتے اور چھت میں لٹکا دیتے، کھجوریں جو ٹپک ٹپک کر گرتیں یہ اٹھا کر کھا لیتے، کبھی دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، یہ لوگ شریک نماز ہوتے لیکن بھوک اور ضعف سے عین نماز کی حالت میں گر پڑتے، باہر کے لوگ آتے اور ان کو دیکھتے تو کہتے کہ دیوانے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کہیں سے صدقہ کا کھانا آتا تو سب ان کے پاس بھیج دیتے اور جب دعوت کا کھانا آتا تو ان کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، اکثر ایسا ہوتا کہ راتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو مہاجرین اور انصار پر تقسیم کر دیتے یعنی اپنے مقدور کے موافق ہر شخص ایک ایک دو دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور ان کو کھانا کھلائے۔

حضرت سعد بن عبادہ نہایت فیاض اور دولت مند تھے، وہ کبھی کبھی اسی اسی مہمانوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتے۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے درخواست کی کہ میرے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے نیل پڑ گئے ہیں، مجھ کو ایک کنیز عنایت ہو تو فرمایا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور صفہ والے بھوکے رہیں۔ راتوں کو عموماً یہ لوگ عبادت کرتے اور قرآن مجید پڑھا کرتے، ان کے لئے ایک معلم مقرر تھا اس کے پاس جا کر پڑھتے۔[3] اسی بنا پر ان میں سے اکثر قاری کہلاتے تھے، دعوت اسلام کے لئے کہیں بھیجنا ہوتا تو یہی لوگ بھیجے جاتے تھے، غزوہ معونہ میں انہی میں سے ستر آدمی اسلام سکھانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔[4]

ان کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی، کل مجموعی تعداد ۴۰۰ تک پہنچی تھی لیکن کبھی ایک زمانہ میں اس قدر تعداد نہیں ہوئی نہ صفہ میں اس قدر گنجائش تھی۔ ان لوگوں کا مفصل[5] حال ابن الاعرابی احمد بن محمد البصری المتوفی ۳۴۰ھ (جو ابن مندہ کے استاد تھے) نے ایک الگ تصنیف میں لکھا ہے، سلمی نے بھی ان کے حالات میں ایک الگ کتاب لکھی ہے۔[6]

مدینہ کے یہود اور اُن سے معاہدہ

مورخین عرب کا بیان ہے کہ مدینہ کے یہود نسلاً یہودی تھے اور اس تقریب سے عرب میں آئے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو عمالقہ

---

[1] صحیح ترمذی باب معیشۃ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] زرقانی ج ۱ ص ۴۰۴ مصر (ذکر اصحاب صفہ و مسجد نبوی) [3] زرقانی ج ۱ ص ۳۴۰ مصر (ذکر اصحاب صفہ) [4] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ [5] حافظ سیوطی نے دو صفحہ کا ایک رسالہ اصحاب صفہ کے نام سے لکھا ہے، اس رسالہ میں سو آدمیوں کے نام بہ ترتیب ہجا مذکور ہیں۔ [6] اصحاب صفہ کے حال بخاری باب المغازی وغیرہ، اور صحیح مسلم میں جستہ جستہ مذکور ہیں، زرقانی نے اور کتابوں سے لے کر اضافہ کیا ہے، میں نے یہ واقعات بخاری و مسلم کے علاوہ زرقانی جلد ۱ سے روایت لکھے ہیں نیز مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۳۷ میں بھی ہیں۔

کے مقابلہ کے لئے بھیجا تھا لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، یہود گو تمام دنیا میں پھیلے لیکن انھوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے، آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں، بخلاف اس کے عرب کے یہودیوں کے نام نضیر، قینقاع، مرحب، حارث وغیرہ ہوتے تھے، جو خالص عربی نام ہیں، یہود عموماً بزدل اور دنی الطبع ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے لڑنے کے لئے کہا تو بولے :۔

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ
(مائدہ ۱۱)

تم مع اپنے خدا کے جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔

بخلاف[1] اس کے مدینہ کے یہود نہایت دلیر، شجاع اور بہادر تھے۔ ان قرائن عقلی کے علاوہ ایک بڑے مورخ یعقوبی نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے۔

ثم كانت وقعة بنی النضير وهو فخذ من جذام الا انهم تهودوا وكذلك قريظة[2]

پھر بنو نضیر کا معرکہ ہوا، یہ قبیلہ جذام کا ایک خاندان تھا لیکن یہودی ہو گیا تھا اور اسی طرح قریظہ بھی۔

مورخ مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ میں ایک روایت لکھی ہے کہ یہ جذام کے قبیلے تھے، کسی زمانہ میں عمالقہ سے اور اُن کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور شام سے نقل مکان کر کے حجاز چلے آئے۔ یہ تین قبیلے تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور قریظہ، مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اور مضبوط برج اور قلعے بنا لئے تھے۔

انصار کے جو دو قبیلے تھے یعنی اوس اور خزرج۔ ان میں باہم جو اخیر معرکہ ہوا تھا (جنگ بعاث) اس نے انصار کا زور بالکل توڑ دیا تھا، یہود اس مقصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے کہ انصار باہم کبھی متحد نہ ہونے پائیں۔

ان اسباب کی بنا پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو پہلا کام یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح اور منضبط ہو جائیں۔ آپؐ نے انصار اور یہود کو بلا کر حسب ذیل شرائط پر ایک معاہدہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا۔ یہ معاہدہ ابن ہشام میں پورا مذکور ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے چلا آتا تھا، اب بھی قائم رہے گا۔
۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔
۳۔ یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
۴۔ یہود یا مسلمانوں کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کرے گا۔
۵۔ کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔
۶۔ مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے۔

---

[1] مسٹر مرگولیوس نے یہود کے متعلق تفصیل سے محققانہ بحث کی ہے، ان کا میلان رائے یہ ہے، اور غالباً صحیح ہے کہ یہودیوں کی اس بڑی آبادی میں ایک دو خاندان اصلی یہود بھی تھے، عرب جو یہودی ہوتے گئے وہ بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

[2] یعقوبی جلد ۲ صفحہ ۴۹ [3] مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۴۷۔

۷۔ کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہو گا لیکن مذہبی لڑائی اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

واقعاتِ متفرقہ

اس سال انصار میں سے دو نہایت معزز شخصوں نے جو مقربین خاص میں تھے، وفات پائی حضرت کلثوم بن ہدم اور حضرت اسعدؓ بن زرارہ، کلثومؓ وہ شخص ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قبا میں تشریف لائے تو انہی کے مکان میں ٹھہرے، اکثر بڑے بڑے صحابہؓ بھی انہی کے گھر اترے تھے حضرت اسعدؓ بن زرارہ اُن چھ شخصوں میں ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مکہ میں جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور ابن سعد کی روایت کے موافق ان چھ شخصوں میں جس نے سب سے پہلے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا یہی اسعدؓ تھے۔ یہ فخر بھی انہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہی نے مدینہ میں آکر جمعہ کی نماز قائم کی۔

چونکہ یہ قبیلہ بنی نجار کے نقیب تھے اس لیے ان کی وفات کے بعد اس قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اُن کے بجائے کوئی شخص اس منصب پر مقرر کیا جائے۔ چونکہ یہ احتمال تھا کہ کوئی شخص مقرر ہوگا، تو اوروں کو رشک ہوگا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں خود تمہارا نقیب ہوں"۔ چونکہ آپ کی ننھیال اسی قبیلہ میں تھی اس لیے اور قبائل کو رشک اور منافست کا موقع نہ ملا۔

حضرت اسعدؓ کی وفات کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت صدمہ ہوا۔ منافقین اور یہود نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر پیغمبر ہوتے تو ان کو یہ صدمہ کیوں پہنچتا۔ آپ نے سُنا تو فرمایا۔

لا املك لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئا (طبری ص۱۲۶۱)	میں اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے خدا کے ہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عین اُسی زمانہ میں دو بڑے رئیسان کفر نے بھی وفات پائی۔ یعنی ولید بن المغیرہ جو حضرت خالدؓ کا باپ تھا اور عاص بن وائل سہمی جس کے بیٹے حضرت عمروؓ بن عاص ہیں جو فاتح مصر اور حضرت امیر معاویہؓ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی زمانہ میں حضرت عبداللہؓ بن زبیر کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد حضرت زبیرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھیرے بھائی تھے اور ان کی والدہ (حضرت اسماءؓ) حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اور حضرت عائشہؓ کی بہن تھیں، اب تک مہاجرین میں سے کسی کے اولاد نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ مشہور ہو گیا تھا کہ یہودیوں نے جادو کر دیا ہے، حضرت عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے تو مہاجرین نے خوشی کا نعرہ مارا۔

اب تک نمازوں میں صرف دو رکعتیں تھیں اب ظہر و عصر و عشاء میں چار چار ہو گئیں۔ لیکن سفر کے لیے اب بھی وہی دو رکعتیں قائم رہیں۔

*

؎ طبری ص ۱۲۶۱، ۱۲۶۲

سـ۲ـھ

تحویلِ قبلہ و آغازِ غزوات

(اس سال سے اسلام کی زندگی میں دو عظیم الشان واقعات پیدا ہوتے ہیں، ایک یہ کہ اسلام اپنے لئے ایک خاص قبلہ قرار دیتا ہے جو اب ۴۵ کروڑ قلوب کا مرکز ہے، دوسرا یہ کہ دشمنانِ اسلام اب مخالفت کے لئے تلوار اٹھاتے ہیں اور مسلمان اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوتے ہیں)

تحویلِ قبلہ، شعبان سـ۲ـھ ہر گروہ، ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے ایک خاص امتیازی شعار ہوتا ہے جس کے بغیر اس قوم کی مستقل ہستی قائم نہیں ہو سکتی، اسلام نے یہ شعار قبلۂ نماز قرار دیا جو اصل مقصد کے علاوہ اور بہت سے حِکم و اسرار کا جامع ہے۔ اسلام کا خاص نمایاں وصف مساواتِ عام جمہوریت اور توحیدِ جنس ہے، یعنی تمام مسلمان یکساں اور متحد الجہۃ نظر آئیں۔ مذہب اسلام کا رکن اعظم نماز ہے جس سے ہر روز پانچ وقت کام پڑتا ہے۔ نماز کی اصلی صورت یہ ہے کہ جمعیت اور افرادِ کثیر کے ساتھ ادا کی جائے۔ لیکن اس طرح کہ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی منفرد ہستیاں مٹ کر ایک ہستی بن جائے۔ اسی بناء پر نمازِ جماعت میں ایک امام ہوتا ہے کہ مقتدیوں کی ایک ایک حرکت اُس کے اشاروں سے وابستہ ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ سب کا مرجع عمل بھی ایک نظر آئے۔ یہی اصول ہے جس کی بناء پر نماز کے لئے ایک قبلہ قرار پایا اور اس شعار کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ اس قبلہ کی طرف رخ کرنا ہی کفر کے دائرہ سے نکل آنا ہے۔ اب صرف یہ بحث باقی تھی کہ قبلہ کس سمت قرار دیا جائے۔ یہودی اور عیسائی بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کی قومی اور مذہبی ہستی بیت المقدس سے وابستہ تھی، لیکن ابراہیمؑ بت شکن کے جانشین کے لئے صرف کعبہ قبلہ ہو سکتا تھا جو اس موحدِ اعظم کی یادگار اور توحیدِ خالص کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے دو ضرورتیں ایک ساتھ درپیش تھیں۔ ملتِ ابراہیمی کی تاسیس و تجدید کے لحاظ سے کعبہ کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ مشکل تھی کہ قبلہ کی جو اصلی غرض ہے یعنی امتیاز اور اختصاص، وہ نہیں حاصل ہوتی تھی، کیونکہ مشرکین اور کفار بھی کعبہ ہی کو اپنا قبلہ سمجھتے تھے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم کے سامنے نماز ادا کرتے تھے جس کا رُخ بیت المقدس کی طرف تھا۔ اس طرح دونوں قبلے سامنے آجاتے تھے۔ مدینہ میں دو گروہ آباد تھے۔ مشرکین جن کا قبلہ کعبہ تھا اور اہل کتاب جو بیت المقدس کی سمت نماز ادا کرتے تھے۔ شرک کے مقابلہ میں یہودیت اور نصرانیت دونوں کو ترجیح تھی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مدت یعنی تقریباً ۱۶ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز ادا کی لیکن جب مدینہ میں

اسلام زیادہ پھیل گیا تو اب کوئی ضرورت نہ تھی کہ اصل قبلہ کو چھوڑ کر دوسری طرف رُخ کیا جاتا، اس بنا پر یہ آیت اُتری اور دفعۃً قبلہ بدل گیا۔[1]

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ (بقرہ - ١٨)

تو اپنا منہ مسجد الحرام کی طرف پھیر دو اور جہاں کہیں ہو اسی طرف منہ پھیرو۔

تحویلِ قبلہ نے یہودیوں کو سخت برہم کر دیا، ان کو مشرکین کے مقابلہ میں مذہبی تفوق کا دعویٰ تھا اور اسلام سے پہلے مشرکین بھی اُن کے مذہبی امتیاز کے معترف تھے۔ یہاں تک کہ (جیسا ابو داؤد میں روایت ہے) جن لوگوں کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی وہ منتیں مانتے تھے کہ بچہ زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنائیں گے، اسلام نے ان کے اس مذہبی احساس کو صدمہ پہنچایا، تاہم چونکہ اب تک اسلام کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا اس لئے وہ فخر کرتے تھے کہ اسلام بھی انہی کے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے۔ جب اسلام نے قبلہ بھی بدل دیا تو ان کی ناراضی اور برہمی کا پیالہ بالکل لبریز ہو گیا، انہوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چونکہ ہر بات میں ہماری مخالفت کرنا چاہتے ہیں اس لئے قبلہ بھی مخالفت کے ارادہ سے بدل دیا ہے۔ دو دلے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ قبلہ بدلنے کی چیز نہیں اور اس سے بے استقلالی اور تزلزلِ اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بنا پر قبلہ کی اصلیت اور ضرورت اور تحویلِ قبلہ کے مصالح کے متعلق چند آیتیں اتریں جن سے یہ مشکلیں حل ہوتی ہیں۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ
مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا
عَلَيْهَا قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ،
وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا
إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ
يَنْقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً
إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ
(بقرہ - ١٧)

سفہاء یہ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں کا جو قبلہ تھا، اس سے ان کو کس نے پھیر دیا، کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب خدا ہی کا ہے۔ تیرا جو پہلے قبلہ تھا (کعبہ) اس کو جو ہم نے پھر قبلہ کر دیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ پیغمبر کا پیرو کون ہے اور پیچھے پھر جانے والا کون ہے؟ اور بے شبہ یہ قبلہ نہایت گراں اور ناگوار ہے بجز ان لوگوں کے جن کو خدا نے ہدایت کی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ

پورب پچھم رُخ کرنا ہی کوئی ثواب کی بات نہیں ثواب تو یہ ہے کہ آدمی خدا پر، قیامت پر، ملائکہ پر، خدا کی کتابوں پر، پیغمبروں پر ایمان لائے

---

[1] اس مضمون میں جس قدر واقعات ہیں وہ صحیح بخاری (حدیث قبلہ نماز) اور فتح الباری شرح صحیح بخاری سے ماخوذ ہیں۔

وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	اور خدا کی محبت میں عزیزوں کو، یتیموں کو، مسکینوں
ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ	کو، مسافروں کو، سائلوں کو، غلاموں کو (آزاد کرانے میں)
السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ (بقرہ - ۲۲)	اپنی دولت دے۔

ان آیتوں میں خدا نے پہلے یہ بتایا کہ قبلہ خود کوئی مقصود بالذات چیز نہیں، خدا کی عبادت کے لئے پورب پچھم سب برابر ہیں، خدا ہر جگہ ہے، ہر سمت ہے، ہر طرف ہے، پھر قبلہ کی تعیین کی ضرورت بتائی کہ وہ اختصاصی شعار ہے اور اصلی اور نمائشی مسلمانوں کو الگ کر دیتا ہے۔

بہت سے یہودی تھے جو منافقانہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ نماز میں بھی شرکت کرتے تھے۔ یہ اسلام کے لئے مار آستین تھے۔ لیکن جب قبلہ بیت المقدس کے بجائے کعبہ سے بدل گیا تو نفاق کا راز بالکل فاش ہو گیا۔ کوئی یہودی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ جو چیز اس کی قومیت، مذہب بلکہ اس کی ہستی کی بنیاد ہے (یعنی بیت المقدس) اسی سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔ پھر دوبارہ خدا نے اس نکتہ کو زیادہ واضح کر دیا کہ کسی خاص قبلہ کی طرف رُخ کرنا اصلی ثواب نہیں بلکہ ثواب درحقیقت ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نام ہے۔

*

سلسلۂ غزوات[1]

کیا عجیب بات ہے ارباب سیر مغازی کی داستان جس قدر زیادہ درازنفسی اور بلند آہنگی سے بیان کرتے ہیں، یورپ اسی قدر اس کو زیادہ شوق سے جی لگا کر سنتا ہے اور چاہتا ہے کہ داستان اور پھیلتی جائے کیونکہ اس کو اسلام کے جور و ستم کا جو مرقع آراستہ کرنا ہے اس کے نقش و نگار کے لئے لہو کے چند قطرے نہیں بلکہ چشمہ ہائے خون درکار ہیں۔

یورپ کے تمام مورخوں نے سیرت نبویؐ کو اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ زبردستی مسلمان بنائے جائیں۔ لیکن یہ خیال چونکہ واقع میں غلط اور سرتاپا غلط ہے اس لئے مغازی کی ابتدا سے پہلے ضرور ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کیا جائے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام جب تک مکہ میں تھا مصائب گوناگوں کا آماجگاہ تھا۔ مدینہ میں آ کر اس کی کلفتیں دور ہوئیں۔ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ مکہ میں جو مصیبت تھی گو سخت تھی لیکن تنہا اور منفرد تھی۔ مدینہ میں آ کر وہ متعدد اور گوناگوں بن گئی۔ مکہ کل ایک قوم تھا۔ مدینہ میں انصار کے ساتھ یہود بھی تھے جو عادات، خصائل، مذہب اور دیانت میں انصار سے بالکل مختلف اور ان کے حریفِ مقابل تھے۔ اس پر ایک تیسری قسم (منافقین) کا اضافہ ہوا جو مارِ آستین ہونے کی وجہ سے دونوں سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ اگر قابو میں آجاتا تو حرم کی وسعتِ اثر کی وجہ سے تمام عرب کی گردنیں خم ہو جاتیں لیکن مدینہ کا اثر چار دیواری تک محدود تھا۔ مدینہ اب تک بیرونی خطرات سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ ہونے نے اس کو قریش کے غیظ و غضب کا تاراج گاہ بنا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو چند ہی روز کے بعد قریش نے عبداللہ بن اُبی کو جو واقعہ ہجرت کے قبل رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاجپوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لئے تیاری کر لی تھی[2] خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے۔

انکم آویتم صاحبنا وانا نقسم باللّٰہ لتقاتلنّہ او لتخرجنّہ او لنسیرنّ الیکم باجمعنا حتی	تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ ان کو قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال

---

[1] غزوات کا سلسلہ جن اسباب سے پیدا ہوا اور جس قسم کے واقعات غزوات میں پیش آئے ان کے لئے ہم نے ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کیونکہ ضمنی طریقے سے وہ ادا نہیں ہو سکتے تھے، لیکن یہ عنوان اچھی طرح سے اسی وقت ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ تمام غزوات سرسری نظر سے گزر جائیں، اس لئے ہم نے اس کو تمام غزوات کے بعد لکھا ہے۔ ناظرین ابھی سے اس کا خیال رکھیں

[2] بخاری باب والتعلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین (زن)

نقتل مقاتلتکم و نستبیح نسائکم۔ (سنن ابو داؤد صفحہ ۷۰ جلد ۲ باب خبر النضیر)

(ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو گرفتار کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ عبداللہ کے پاس تشریف لے گئے۔ اس کو سمجھایا کہ کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے؟ چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے اس لیے عبداللہ اس نکتہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ بدر کے بعد قریش نے اسی مضمون کا خط لکھا۔ چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

(تاہم قریش کی شہ سے منافقین و یہود مدینہ کا سر پھر چکا تھا۔ اسی زمانہ میں یعنی بدر سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو الحارث بن خزرج کے محلہ میں سوار ہو کر تشریف لے گئے۔ ایک جگہ مشرکین و منافقین مدینہ یہود اور بعض مسلمان بیٹھے تھے۔ گدھے کے چلنے سے گرد اڑی تو عبداللہ بن ابی نے منہ پر کپڑا ڈال دیا اور حقارت سے بولا "گرد نہ اڑاؤ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجمع کو سلام کیا اور کچھ قرآن کی آیتیں سنائیں۔ عبداللہ نے کہا "اے شخص مجھ کو یہ پسند نہیں، اگر تمہاری بات سچ بھی ہو تو ہماری مجلس میں آ کر ہم کو نہ ستایا کرو، جو تمہارے پاس جائے اس سے بیان کیا کرو" مسلمان اس تحقیر سے برافروختہ ہو گئے اور قریب تھا کہ کشت و خون ہو جاتے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو ٹھنڈا کیا)

اسی زمانہ کے قریب حضرت سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے۔ امیہ بن خلف سے اور ان سے مدت کا یارانہ تھا اور یہ تعلق اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔ اس تعلق سے حضرت سعدؓ اب بھی امیہ ہی کے مہمان ہوئے۔ ایک دن وہ امیہ کو لے کر کعبہ کے طواف کو نکلے، اتفاق سے ابوجہل سامنے سے آ گیا۔ امیہ سے اس نے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ امیہ نے کہا "سعد ہیں"۔ ابوجہل نے کہا، تم لوگوں نے صابیوں (کفار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل اسلام کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) کو پناہ دی ہے میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آ سکو، خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو زندہ کر واپس نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت سعدؓ نے کہا۔ اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا راستہ روک دیں گے (یعنی شام کی تجارت کا راستہ)

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیر اثر تھے[3]۔ اس بناء پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا۔ ہجرت کے چھٹے سال تک یمن وغیرہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۶ھ میں جب بحرین سے عبدالقیس کی سفارت آئی تو لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ مضر کے قبائل ہم کو

---

[1] صحیح مسلم صفحہ ۹۳ جلد ۲ و بخاری باب مذکور [2] یہ پورا واقعہ مزید تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری باب المغازی کی ابتداء میں مذکور ہے

[3] ابن ہشام واقعات وفود میں ہے و ذلک ان قریشا کانوا امام الناس و قادۃ العرب لاینکرون ذلک وکانت قریش ہی التی نصبت الحرب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ تک پہنچنے نہیں دیتے۔ اس لئے ہم صرف ایام حج میں جب کہ لڑائی عموماً موقوف ہو جاتی ہے آپ کی خدمت میں آسکتے ہیں[۱]۔

قریش نے انہی باتوں پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ جیسا کہ انھوں نے عبد اللہ بن اُبی کو لکھا تھا اس کی تیاریاں کر رہے تھے کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلام کا استیصال کر دیں۔ مدت تک یہ حال رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو جاگ کر بسر کرتے تھے۔ صحیح نسائی میں ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اول ما قدم المدینۃ یسھر من اللیل۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول جب مدینہ میں آئے تو راتوں کو جاگا کرتے تھے۔

صحیح بخاری باب الجہاد میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دیتا"۔ چنانچہ حضرت سعدؓ بن وقاص نے ہتھیار لگا کر رات بھر پہرہ دیا، تب آپ نے آرام فرمایا۔ اس سے بڑھ کر حاکم کی روایت ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔

عن ابی بن کعب قال لما قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ المدینۃ واٰوتھم الانصار رمتھم العرب عن قوس واحدۃ وکانوا لا یبیتون الا بالسلاح ولا یصبحون الا فیہ[۲]۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ جب مدینہ آئے اور انصارؓ نے ان کو پناہ دی تو تمام عرب ایک ساتھ ان سے لڑنے کو آمادہ ہو گئے۔ صحابہؓ صبح تک ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔

مورخین مغازی کی ابتدا انہی واقعات سے کرتے ہیں کہ اسی سال خدا نے جہاد کی اجازت دی، لیکن ایک دقیقہ بین انہی کی تصریحات سے پتہ لگا سکتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا، مواہب لدنیہ اور زرقانی میں لکھا ہے کہ خدا نے ۱۲ صفر ۲ھ میں جہاد کی اجازت دی، اس کی سند میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

اول اٰیۃ نزلت فی الاذن بالقتال اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ (زرقانی بحوالہ صحیح نسائی جلد ۱ صفحہ ۴۴۹)	پہلی آیت جو قتال کی اجازت میں نازل ہوئی وہ یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ الخ یعنی جن سے لڑائی کی جاتی ہے مسلمان ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

تفسیر ابن جریر میں ہے کہ قتال کے متعلق سب سے پہلے جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ بقرہ - ۲۴	اور خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھو کہ دونوں آیتوں میں انہی لوگوں سے لڑنے کی اجازت ہے جو پہلے مسلمانوں سے لڑنے

---

[۱] وفد بنی عبد القیس کے ذکر میں صحیح بخاری اور دیگر تمام کتابوں میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

[۲] لباب فی اسباب النزول للسیوطی سورۂ نور آیت وعد اللہ الذین آمنوا منکم الخ۔ مستدرک میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔

آتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان درحقیقت لڑنے پر مجبور کئے جاتے تھے۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے پہلا کام حفاظت خود اختیاری کی تدبیر تھی، نہ صرف اپنی اور مہاجرین کی بلکہ انصار کی بھی کیونکہ اس جرم میں کہ انصار نے مسلمانوں کو پناہ دی ہے، قریش نے مدینہ کی بربادی کا فیصلہ کر لیا اور اپنے تمام قبائل متحدہ میں یہ آگ بھڑکا دی تھی۔ اس بناء پر آپ نے دو تدبیریں اختیار کیں۔

اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو اُن کا مایۂ غرور تھی بند کر دی جائے تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یاد ہوگا کہ حضرت سعدؓ بن معاذ نے مکہ میں ابوجہل کو اسی کی دھمکی دی تھی۔

دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب وجوار کے جو قبائل ہیں اُن سے امن وامان کا معاہدہ ہو جائے۔

بدر سے پہلے جو مہمیں بھیجی گئیں

غرض ان حالات کی بناء پر غزوۂ بدر سے پہلے سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں مکہ کی طرف روانہ کی جانے لگیں، ابواء کی مہم سے پہلے جو صفر ۲ھ میں واقع ہوئی اور جس میں آپ نے خود شرکت فرمائی تھی، ارباب سیر نے تین مہم کا ذکر کیا ہے جن کو اُن کی زبان میں سریہ کہتے ہیں، سریۂ حمزہؓ، سریۂ عبیدہؓ بن حارث، سریۂ سعدؓ بن ابی وقاص، لیکن ان میں سے کسی مہم میں کوئی کشت وخون نہیں ہوا، یا بیچ بچاؤ ہوگیا یا بچ کر نکل گئے۔ ارباب سیر نے ان سرایا کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ قریش کے تجارتی قافلہ کو چھیڑنے کے لئے بھیجے جاتے تھے، یعنی حضرت سعدؓ کی تہدید کے مطابق اُن کی شامی تجارت کو بند کرنا مقصود تھا۔ مخالفین کہتے ہیں کہ صحابہ کو غارت گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن یہ الزام کس قدر جہالت پر مبنی ہے کہ اول تو اسلام کی شریعت میں یہ سخت تر گناہ ہے۔ ثانیاً واقعہ کیا بتاتا ہے؟ کیا ان میں سے کسی مہم میں بھی مذکور ہے کہ صحابہ نے قافلہ کا مال لوٹ لیا؟ ثالثاً اگر ان سرایا کا مقصد لوٹنا اور ڈاکہ ڈالنا ہی ہوتا تھا تو قریش کے قافلۂ تجارت کے سوا یہ مقصد کہیں اور نہیں حاصل ہو سکتا تھا؟

جہینہ

اطراف کے جن قبائل کے پاس معاہدہ کے لئے مہم بھیجی گئی ان میں سب سے پہلے جہینہ کا قبیلہ ہے۔ جہینہ کا قبیلہ مدینہ سے تین منزل پر آباد تھا اور اُن کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان سے معاہدہ ہوا کہ وہ فریقین سے یکساں تعلقات رکھیں گے، یعنی دونوں سے الگ رہیں گے۔

صفر ۲ھ میں آپ ساٹھ مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور ابواء تک گئے (جس کے قریب ہی غزوۂ ابواء یا غزوۂ ودان واقع ہوا) اور جہاں آپ کی والدہ ماجدہ کا مزار ہے۔ ابواء کا صدر مقام فرع ہے جو ایک وسیع قصبہ ہے اور جہاں قبیلۂ مُزینہ آباد ہے اور جو مدینہ سے تقریباً ۸ منزل (۸۰ میل) ہے۔ یہ مدینہ کی آخر سرحد ہے۔ ان اطراف میں قبیلۂ بنو ضمرہ آباد تھا اور یہ نواح اُن کی حدود حکومت میں داخل تھے۔ یہاں آپ نے

---

[1] اس واقعہ کا ذکر مورخین نے مستقل طور پر نہیں کیا بلکہ جہاں سب سے پہلے سریۂ حمزہؓ کا ذکر کیا ہے وہاں مجدی جہنی (رئیس قبیلہ) کی نسبت لکھا ہے کان موادعاً للفریقین، یعنی اس نے دونوں فریقوں سے صلح کر رکھی تھی۔

چند روز قیام کر کے بنو ضمرہ سے معاہدہ کیا، جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے یہ الفاظ تھے۔

هٰذا كتاب من محمد رسول الله لبني ضمرة فانهم امنون على اموالهم وانفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا في دين الله ما بل بحر صوفة وان النبي اذا دعاهم لنصره اجابوه۔

(روض الانف ج ۲ صفحہ ۵۸ زرقانی ج ۱ صفحہ ۳۹۵)

یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے، بنو ضمرہ کیلئے ان لوگوں کا مال اور جان محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔

تمام محدثین مغازی کی ابتدا اسی واقعہ سے کرتے ہیں۔ صحیح بخاری میں بھی اسی کو اول الغزوات قرار دیا ہے۔

قریباً ایک مہینہ کے بعد کرز بن جابر فہری نے جو مکہ کے رؤسا میں تھا مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مویشی لوٹ لئے۔ اس کا تعاقب کیا گیا لیکن وہ بچ کر نکل گیا تھا (کرز بعد کو مسلمان ہوئے اور فتح مکہ میں تنہا راہ چلتے شہید ہوئے)

جمادی الثانی یعنی اس واقعہ کے تیسرے مہینے آپ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور مقام ذو العشیرۃ پہنچ کر بنو مدلج سے معاہدہ کیا۔ یہ مقام مدینہ سے ۹ منزل پر ینبوع کے نواح میں ہے۔

بنو مدلج، بنو ضمرہ کے حلیف تھے اور چونکہ بنو ضمرہ پہلے اسلام کے معاہدہ میں داخل ہو چکے تھے، اس لئے انہوں نے آسانی سے یہ شرطیں منظور کر لیں[2]

چند روز کے بعد یعنی رجب ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا، یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں مکہ سے ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔ آپ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک خط دے کر فرمایا تھا کہ دو دن کے بعد اس کو کھولنا، حضرت عبداللہؓ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو، اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لئے آتے تھے، سامنے سے نکلے، حضرت عبداللہؓ نے ان پر حملہ کیا، ان میں سے ایک

---

[1] اصابہ ذکر کرز فہری۔

[2] میں تسلیم کرتا ہوں کہ مؤرخین نے دونوں پہلے واقعوں کی نسبت لکھا ہے کہ ان کا مقصد قریش کے کاروان کا لوٹنا تھا لیکن اتفاق سے کارواں ہاتھ نہ آیا اور بچ کر نکل گیا۔ لیکن میں واقعات کا پابند ہوں، رائے اور قیاس سے غرض نہیں اس قدر واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مقامات تک گئے اور وہاں کے قبائل سے معاہدہ کیا، اس سے آگے مؤرخین کا قیاس ہے کہ قریش کے کارواں پر حملہ کرنا مقصود تھا، گو یہ مقصود حاصل نہ ہو سکا، اگر خدانخواستہ کارواں کا لوٹنا ہی مقصود ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ اس قدر بے تدبیر فرض کرنا پڑے گا کہ ہر مرتبہ ناکامیابی ہوتی تھی اور قافلہ بچ بچ کر نکل جاتا تھا یہاں تک کہ بار بار تجربہ کے بعد بھی بدر میں اسی قسم کی ناکامیابی ہوئی اور قافلہ صحیح و سلامت نکل گیا۔

شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہؓ نے مدینہ میں آکر یہ واقعہ بیان کیا اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی، غنیمت کے قبول کرنے سے بھی آپ نے انکار فرمایا۔ صحابہؓ نے حضرت عبداللہؓ سے برہم ہو کر کہا۔

صنعتم مالم تؤمروا به وقاتلتم في الشهر الحرام ولم تؤمروا بقتال (طبری صفحہ ۱۲۷۵)	تم نے وہ کام کیا (قافلہ لوٹنا) جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہِ حرام میں لڑے حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔

جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے، عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا جو حرب بن امیہ (امیر معاویہؓ کے دادا) کا حلیف تھا۔ حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاستِ عام اُسی کو حاصل ہوتی تھی۔ جو لوگ گرفتار ہوئے یعنی عثمان و نوفل، دونوں مغیرہ کے پوتے تھے۔ مغیرہ ولید کا باپ، حضرت خالدؓ کا دادا اور حرب کے بعد دوسرے درجے کا رئیس تھا۔ اس بنا پر اس واقعہ نے تمام قریش کو مشتعل کر دیا۔ اور ثار یعنی انتقام خون کی بنیاد قائم ہو گئی۔ معرکہ بدر کا سلسلہ اسی واقعہ سے وابستہ ہے۔ حضرت عروہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے انھوں نے تصریح کی ہے کہ غزوۂ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش سے پیش آئیں سب کا سبب یہی حضرمی کا قتل ہے۔ علامہ طبری لکھتے ہیں۔

وكان الذي هاج وقعة بدر وسائر الحروب التي كانت بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين مشركي قريش فيما قال عروة بن الزبير ما كان من قتل واقد بن عبد الله السهمي عمرو بن الحضرمي	اور جس چیز نے بدر کے واقعہ کو ابھارا اور وہ تمام لڑائیاں چھیڑ دیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین قریش میں پیش آئیں، سب کا سبب یہی تھا کہ واقد سہمی نے حضرمی کو قتل کر دیا تھا۔

چونکہ غزوۂ بدر تمام غزوات کی اصلی بنیاد ہے اس لئے ہم پہلے اس واقعہ کو سادہ صورت میں لکھ کر پھر تفصیل سے اس کے متعلق گفتگو کریں گے۔

*

لہ اصابہ ترجمہ علا حضرمی۔ ۲ہ طبری صفحہ ۱۲۷۴ تہ طبری صفحہ ۱۲۸۳ آخر

غزوۂ بدر

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (آل عمران آیت ۱۲۳)

رمضان سنہ ۲ھ

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا ہے یہ مقام اسی نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے، مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں، عبداللہ بن ابی کو انھوں نے خط لکھ بھیجا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دو یا ہم آکر ان کے ساتھ تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں، قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آکر غارت گری کر گیا تھا، حملہ کے لئے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا، اس لئے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا، اس سرو سامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل[1] دے دی۔

نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔ قافلہ ابھی شام سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ حضرمی کے قتل کا اتفاقیہ واقعہ پیش آگیا جس نے قریش کی آتش غضب کو اور بھڑکا دیا، اسی اثنا میں یہ غلط خبر مکہ معظمہ میں پھیل گئی کہ مسلمان قافلہ کے لوٹنے کو آرہے ہیں۔ قریش کے غیظ و غضب کا بادل بڑے زور شور سے اٹھا اور تمام عرب پر چھا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہ کو جمع کیا اور واقعہ کا اظہار فرمایا، حضرت ابوبکرؓ وغیرہ نے جاں نثارانہ تقریریں کیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی طرف دیکھتے تھے، کیونکہ انصار نے بیعت کے وقت صرف یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تلوار اٹھائیں گے جب دشمن مدینہ پر چڑھ آئیں، حضرت سعدؓ بن عبادہ (سردار خزرج) نے اٹھ کر کہا "کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ خدا کی قسم! آپ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔

یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، بخاری میں ہے کہ حضرت مقدادؓ نے کہا کہ ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم لوگ آپ کے داہنے سے، بائیں سے، سامنے سے، اور پیچھے سے لڑیں گے، ان کی اس تقریر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ دمک اٹھا۔

غرض ۱۲ رمضان سنہ ۲ھ کو آپ تقریباً تین سو جاں نثاروں کے ساتھ شہر سے نکلے۔ ایک میل چل کر فوج کا

---

[1] ابن سعد میں ابوسفیان سردار قافلہ کا قول لکھا ہے: واللہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ نش فصاعداً الا بعث بہ معنا۔ ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی اس لئے انہوں نے اس واقعہ کو محض ایک واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا لیکن ان کو احساس نہیں کہ مکہ کو تمام سرمایہ کے لگا دینے کی ضرورت کیا تھی۔

جائزہ لیا جو کم عمر تھے واپس کر دیے گئے ۱؎ ایسے پُرخطر موقع پر بچوں کا کام نہیں، عمیرؓ بن ابی وقاص ایک کمسن بچہ تھے جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، عمیرؓ کے بھائی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے کمسن سپاہی کے گلے میں تلوار حمائل کی ۲؎ اب فوج کی کل تعداد ۳۱۳ تھی جس میں ساٹھ مہاجر اور باقی انصار تھے، چونکہ غیبت کی حالت میں منافقین اور یہود کی طرف سے اطمینان نہ تھا اس لئے ابولبابہ بن عبدالمنذر کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ مدینہ کو واپس جائیں۔ عالیہ (مدینہ کی بالائی آبادی) پر عاصم بن عدی کو مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد آپ بدر کی طرف بڑھے، جدھر سے اہل مکہ کی آمد کی خبر تھی، دو خبر رساں بسبسؓ اور عدی آگے روانہ کر دیے گئے تھے کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔ روحا، منصرف، ذات، اجلال، معلات اثیل سے گزرتے ہوئے ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آگئے ہیں ۳؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں رک گئے اور فوجیں اتر پڑیں۔

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے تھے، ہزار آدمی کی جمعیت تھی، سو سواروں کا رسالہ تھا رؤسائے قریش سب شریک تھے، ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا، اس لئے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امرائے قریش یعنی عباس (ابن مطلب) عتبہ بن ربیعہ، حارث بن عامر، نضر بن الحارث، ابوجہل، امیہ وغیرہ وغیرہ، باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے ۴؎ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

قریش کو بدر کے قریب پہنچ کر جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان کا قافلہ خطرہ کی زد سے نکل گیا ہے تو قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداران نے کہا، اب لڑنا ضروری نہیں، لیکن ابوجہل نے نہ مانا، زہرہ اور عدی کے لوگ واپس چلے گئے۔ باقی فوج آگے بڑھی، قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا، بخلاف اس کے مسلمانوں کی طرف چشمہ یا کنواں تک نہ تھا، زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے، حضرت حبابؓ بن منذر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے، حضرت حبابؓ نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنوئیں بے کار کر دیے جائیں ۵؎ آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جا بجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنالیے گئے کہ غسل اور وضو کے کام آئیں۔ اس قدرتی احسان کا خدا نے قرآن مجید میں بھی ذکر کیا ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ پ ۹ (انفال ۲۰) ع ۱۶	اور جب کہ خدا نے آسمان سے پانی برسایا کہ تم کو پاک کرے۔

پانی پر اگرچہ قبضہ کر لیا گیا لیکن ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض عام تھا، اس نے دشمنوں کو بھی پانی لینے

۱؎ ابن سعد صفحہ ۹۔ ۲؎ کنز العمال بروایت ابن عساکر ج ۵۔ ۳؎ معارف ابن قتیبہ باب المطعمین من قریش فی غزوۃ بدر۔ ۴؎ سیرت ابن اسحاق بروایت ابن ہشام غزوۂ بدر۔ ۵؎ ابن ہشام۔

کی عام اجازت تھی۔ یہ رات کا وقت تھا۔ تمام صحابہؓ نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا، لیکن صرف ایک ذات تھی (ذاتِ نبوی) جو صبح تک بیدار اور مصروفِ دعا رہی۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لئے آواز دی۔ بعد نماز جہاد پر وعظ فرمایا۔

قریش جنگ کے لئے بے تاب تھے تاہم کچھ نیک دل بھی تھے جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے، ان میں حکیم بن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردارِ فوج عتبہ سے جا کر کہا۔ آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادگار رہ جائے۔ عتبہ نے کہا کیونکر؟ حکیم نے کہا قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے، وہ آپ کا حلیف تھا۔ آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے۔ عتبہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاق رائے ضرور تھا، حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا، عتبہ کا پیغام سن کر بولا۔ ہاں عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا۔ عتبہ کے فرزند حضرت ابو حذیفہؓ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے۔ اس بناء پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لئے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔

ابوجہل نے حضرمی کے بھائی ابو عامر کو بلا کر کہا۔ دیکھتے ہو تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آکر نکلا جاتا ہے، عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے گرد اڑا کر واعمرہ واعمرہ کا نعرہ مارنا شروع کیا اس واقعہ نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا، اور کہا کہ میدانِ جنگ بتا دے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے۔ یہ کہہ کر مغفر مانگا لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہ اترا، مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ کو خون سے آلودہ کرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ صحابہؓ نے میدان کے کنارے ایک چھپر کا سائبان تیار کیا کہ آپؐ اس میں تشریف رکھیں، حضرت سعدؓ بن معاذ دروازہ پر تیغ بکف کھڑے ہوئے کہ کوئی ادھر نہ بڑھنے پائے۔ اگرچہ بارگاہِ الٰہی سے فتح ونصرت کا وعدہ ہو چکا تھا، عناصرِ عالم آمادۂ مدد تھے، ملائکہ کی فوجیں ہمرکاب تھیں، تاہم عالمِ اسباب کے لحاظ سے آپؐ نے اصولِ جنگ کے مطابق فوجیں مرتب کیں، مہاجرین کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عنایت فرمایا، خزرج کے علم بردار حضرت حبابؓ بن منذر اور اوس کے حضرت سعدؓ بن معاذ مقرر ہوئے۔

صبح ہوتے ہوتے آپؐ نے صف آرائی شروع کی۔ دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اس کے اشارہ سے صفیں قائم کرتے تھے کہ کوئی شخص تل بھر آگے یا پیچھے نہ رہنے پاتے۔ لڑائی میں شور وغل عام بات ہے لیکن منع کر دیا گیا کہ کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلنے پاتے، اس موقع پر بھی جب کہ دشمن کی عظیم الشان تعداد مقابل تھی اور مسلمانوں کی طرف ایک آدمی بھی آکر بڑھ جاتا تو کچھ نہ کچھ مسرت ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ تن وفا تھے

حضرت حذیفہؓ بن الیمان اور (حضرت) حسیلؓ دو صحابی کہیں سے آرہے تھے، راہ میں کفار نے روکا کہ محمد (صلی اللہ

---

(۱) ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۰۶ (۲) منتخب کنز العمال غزوۂ بدر بروایت مسند ابن حنبل وابن ابی شیبہ۔

علیہ وسلم) کی مدد کو جا رہے ہیں[1] انھوں نے انکار کیا اور عدم شرکت کا وعدہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورتِ حال عرض کی، فرمایا ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے۔

اب دو صفیں آمنے سامنے مقابل تھیں، حق و باطل، نور و ظلمت، کفر و اسلام۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ (اٰل عمران - ۲)

جو لوگ باہم لڑے ان میں تمہارے لیے عبرت کا نشان ہے ایک خدا کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکر خدا تھا۔

یہ عجیب منظر تھا، اتنی بڑی دنیا میں توحید کی قسمت صرف چند جانوں پر منحصر تھی، صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت خضوع کی حالت طاری تھی، دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے "خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے آج پورا کر" محویت اور بے خودی کے عالم میں چادر کندھے پر سے گر گر پڑتی تھی اور آپ کو خبر تک نہ ہوتی تھی، کبھی سجدہ میں گرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "خدایا! اگر یہ چند نفوس آج مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا" اس بے قراری پر بندگانِ خاص کو رقت آگئی، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی، حضور! خدا اپنا وعدہ وفا کرے گا، آخر روحانی تسکین کے ساتھ،

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (قمر - ۳)

فوج کو شکست دی جائے گی اور وہ پشت پھیر دیں گے۔

پڑھتے ہوئے لبِ مبارک فتح کی پیشین گوئی سے آشنا ہوئے، قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں، تاہم آپؐ نے صحابہؓ کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائیں تو تیر سے روکو۔

یہ معرکہ ایثار اور جاں بازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا، دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکرؓ تلوار کھینچ کر نکلے[2]، عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہؓ (عتبہ کے فرزند تھے) اس کے مقابلہ کو آئے، حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی[3]۔

لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ سب سے پہلے عامر حضرمی جس کو بھائی کے خون کا دعویٰ تھا آگے بڑھا، مہجع حضرت عمرؓ کا غلام اس کے مقابلہ کو نکلا اور مارا گیا۔

عتبہ جو سردارِ لشکر تھا، ابوجہل کے طعنے سے سخت برہم تھا سب سے پہلے وہی بھائی اور بیٹے کو لے کر میدان میں نکلا اور مبارز طلبی کی، عرب میں دستور تھا کہ نامور لوگ کوئی امتیازی نشان لگا کر میدانِ جنگ میں جاتے تھے عتبہ کے سینہ پر شتر مرغ کے پر تھے، حضرت عوفؓ، حضرت معاذؓ، حضرت عبد اللہؓ بن رواحۃ مقابلے کو نکلے، عتبہ نے نام پوچھا اور جب یہ معلوم ہوا کہ انصار ہیں تو عتبہ نے کہا ہم کو تم سے غرض نہیں، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خطاب کر کے پکارا کہ محمدؐ! یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں[4]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد

---

[1] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد کتاب الجہاد والسیر۔ [2] استیعاب ذکر عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ۔ [3] سیرت ابن ہشام (ج ۱ ص ۲۸۸ مطبع محمد علی صبیح مصر)۔

[4] کتب حدیث میں جو الفاظ ہیں مختلف ہیں، ابو داؤد (کتاب الجہاد) میں ہے کہ عتبہ نے کہا کہ ہم کو اپنے برادران عم زاد سے غرض ہے تم سے کام نہیں، انصاری محدثین نے اس کا مطلب یہ قرار دیا ہے کہ اس سے انصار کی توہین منظور نہ تھی بلکہ یہ غرض تھی کہ انتقام خون

کے مطابق انصار ہٹ آئے اور حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہؓ میدان میں آئے چونکہ یہ لوگ خود پہنے تھے جس سے چہرے چھپ گئے تھے، عتبہ نے پوچھا تم کون ہو؟ سب نے نام و نسب بتائے۔ عتبہ نے کہا "ہاں! اب ہمارا جوڑ ہے۔"[1]

عتبہ حضرت حمزہؓ سے اور ولید حضرت علیؓ سے مقابل ہوا اور دونوں مارے گئے، لیکن عتبہ کے بھائی شیبہ نے حضرت عبیدہؓ کو زخمی کیا۔ حضرت علیؓ نے بڑھ کر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت عبیدہؓ کو کندھے پر اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ حضرت عبیدہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپ نے فرمایا نہیں، تم نے شہادت پائی؛ حضرت عبیدہؓ نے کہا۔ آج ابو طالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے شعر کا مستحق میں ہوں۔

ونسلمه حتی نصرع حوله — ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کریں گے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں
ونذهل عن ابنائنا والحلائل — اور ہم اپنے بیٹوں اور بیبیوں سے بھلا دیئے جائیں۔

سعید بن العاص کا بیٹا عبیدہ، سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ میں ابوکرش ہوں، حضرت زبیرؓ اس کے مقابلہ کو نکلے اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں، تاک کر آنکھ میں برچھی ماری وہ زمین پر گرا اور مر گیا؛ برچھی اس طرح پیوست ہو گئی تھی کہ حضرت زبیرؓ نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی لیکن دونوں سرے خم ہو گئے۔ یہ برچھی یادگار رہی، یعنی حضرت زبیرؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگ لی، پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی، پھر حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس آئی۔[2]

حضرت زبیرؓ نے اس معرکہ میں کئی کاری زخم اٹھائے، شانہ پر جو زخم تھا اتنا گہرا تھا کہ اچھے ہو جانے پر اس میں انگلی چلی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کے بیٹے (عروۃ) بچپن میں ان زخموں سے کھیلا کرتے تھے، جس تلوار سے لڑتے تھے وہ لڑتے لڑتے گر گئی تھی، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہوئے تو عبدالملک نے عروۃ سے کہا، تم زبیرؓ کی تلوار پہچان لو گے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ عبدالملک نے پوچھا کیونکر؟ بولے کہ بدر کے معرکہ میں اس میں دندانے پڑ گئے تھے۔ عبدالملک نے تصدیق کی اور یہ مصرع پڑھا۔ بهن فلول من قراع الکتائب عبدالملک نے تلوار عروہ کو دے دی انہوں نے اس کی قیمت لگوائی تو تین ہزار ٹھہری، اس کے قبضہ پر چاندی کا کام تھا۔[3]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کا مطالبہ قریش سے ہے انصار سے نہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مکہ والے انصار کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے صحیح روایتوں میں مذکور ہے کہ جب ابوجہل انصار کے ہاتھ سے مارا گیا تو مرتے وقت اس نے کہا، کاش! مجھ کو فلاحوں (کاشتکار) کے سوا کسی اور نے مارا ہوتا، انصار کھیتی باڑی کا پیشہ کرتے تھے جو قریش کے نزدیک عیب تھا۔

[1] ابن سعد غزوہ بدر و بدایہ و نہایہ ابن کثیر ج ۳ ص ۲۷۴ مصر مع زرقانی۔ ان واقعات میں روایتیں مختلف ہیں اور قریباً سب ہم مرتبہ ہیں اس لئے جو روایت اختیار کر لی جائے قابل الزام نہیں۔ [2] صحیح بخاری۔ غزوہ بدر میں پورا واقعہ منقول ہے۔

[3] و [4] پوری تفصیل صحیح بخاری غزوہ بدر کے ذکر میں ہے۔

اب عام حملہ شروع ہوگیا، مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے لیکن ادھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سربسجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔

ابوجہل کی شرارت اور دشمنیِ اسلام کا عام چرچا تھا۔ اس بنا پر انصار میں سے معوذؓ اور معاذؓ دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آ جاتے گا یا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعۃً مجھ کو دائیں بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا کہ ابوجہل کہاں ہے؟ میں نے پوچھا برادر زادہ! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟ بولا کہ میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھ لوں گا یا اُسے قتل کر دوں گا یا خود لڑ کر مارا جاؤں گا۔ میں جواب نہیں دینے پایا تھا کہ دوسرے نوجوان نے بھی مجھ کو کانوں میں یہی باتیں کیں۔ میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ دونوں جوان عفراء کے بیٹے تھے؎ "معوذ و معاذ" ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آکر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا لیکن تسمہ باقی لگا رہا۔ معاذؓ نے عکرمہ کا تعاقب کیا، وہ بچ کر نکل گیا۔ معاذؓ اسی حالت میں لڑ رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی، ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہوگیا اور اب وہ آزاد تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا کہ کفار کے ساتھ جو لوگ آئے ہیں ان میں ایسے بھی لوگ ہیں جو خوشی سے نہیں بلکہ قریش کے جبر سے آئے ہیں۔ ان لوگوں کے نام بھی آپ نے بتا دیئے تھے ان میں ابوالبختری بھی تھا۔ مجذر کی نظر (جو انصار کے حلیف تھے) ابوالبختری پر پڑی۔ مجذر نے کہا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے قتل سے منع فرمایا ہے اس لئے تجھ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ابوالبختری کے ساتھ اس کا ایک رفیق بھی تھا ابوالبختری نے کہا اس کو بھی؟ مجذر نے کہا "نہیں"۔ ابوالبختری نے کہا تو میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کے لئے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ کہہ کر ابوالبختری یہ رجز پڑھتا ہوا مجذر پر حملہ آور ہوا اور مارا گیا۔

لن یسلم ابن حُرّۃ زمیلہ۔
حتی یموت او یری سبیلہ۔

شریف زادہ اپنے رفیق کو چھوڑ نہیں سکتا جب تک کہ مر
نہ جائے یا وہ اپنا راستہ نہ دیکھ لے۔

عتبہ اور ابوجہل کے مارے جانے سے قریش کا پائے ثبات اکھڑ گیا اور فوج میں بے دلی چھا گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید دشمن امیہ بن خلف بھی جنگِ بدر میں شریک تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے اس سے کسی زمانہ میں عہد کیا تھا کہ وہ مدینہ میں آئے گا تو یہ اس کی جان کے ضامن ہوں گے۔ بدر میں اس دشمنِ خدا سے انتقام لینے کا خوب موقع تھا۔ لیکن چونکہ عہد کی پابندی اسلام کا شعار ہے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے چاہا کہ وہ بچ کر نکل جائے، اس کو لے کر ایک پہاڑ پر چلے گئے۔ اتفاق یہ کہ حضرت بلالؓ نے دیکھ لیا، انصار کو خبر کر دی، دفعۃً لوگ ٹوٹ پڑے انھوں نے امیہ کے بیٹے کو آگے کر دیا، لوگوں نے اس کو قتل کر دیا لیکن اس پر

؎ بعض روایتوں میں معاذ بن عمرو معاذ بن عفراء ہے۔

بھی قناعت نہ کی اور امیہ کی طرف بڑھے، انھوں نے امیہ سے کہا، تم زمین پر لیٹ جاؤ۔ یہ لیٹ گیا تو وہ اس پر چھا گئے کہ لوگ اس کو مارنے نہ پائیں، لیکن لوگوں نے ان کی ٹانگوں کے اندر سے ہاتھ ڈال کر اس کو قتل کر دیا حضرت عبدالرحمنؓ کی بھی ایک ٹانگ زخمی ہوئی اور زخم کا نشان مدتوں تک قائم رہا۔

ابوجہل اور عتبہ وغیرہ کے قتل کے بعد قریش نے سپر ڈال دی اور مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا، حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی)، نوفل، اسود بن عامر، عبداللہ بن زمعۃ اور بہت سے بڑے بڑے معزز لوگ گرفتار ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے ابوجہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے جا کر لاشوں میں دیکھا تو زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بولے تو ابوجہل ہے؟ اس نے کہا، ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا تو یہ فخر کی کیا بات ہے۔ ابوجہل نے ایک دفعہ ان کو تھپڑ مارا تھا، انھوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ ابوجہل نے کہا او بکری چرانے والے! دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔

مغربی مورخین کو جن کے نزدیک عالم اسباب میں جو کچھ ہے صرف اسباب ظاہری کے نتائج ہیں، حیرت ہے کہ تین سو بیدل آدمیوں نے ایک ہزار جن میں سو سواروں کا رسالہ تھا کیونکر فتح ہوئی۔ لیکن تائیدِ آسمانی نے بارہا ایسے حیرت انگیز مناظر دکھائے ہیں، تاہم اس واقعہ میں ظاہر بینوں کے اطمینان کے سامان بھی موجود ہیں۔ اوّل تو قریش میں باہم اتفاق نہ تھا، عتبہ سردار لشکر لڑنے پر راضی نہ تھا، قبیلۂ زہرہ کے لوگ بدر تک آ کر واپس چلے گئے پانی برسنے سے موقع جنگ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ قریش جہاں صف آرا تھے وہاں کیچڑ اور دلدل کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل تھا قریش مرعوب ہو کر اسلامی فوج کا تخمینہ غلط کر رہے تھے یعنی اپنی تعداد سے دوگنا، چنانچہ قرآن مجید میں ہے۔

یَرَوۡنَھُمۡ مِّثۡلَیۡھِمۡ رَاۡیَ الۡعَیۡنِ (آل عمران - ۲) وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے آپ سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔

کفار کی فوج میں کوئی ترتیب اور صف بندی نہ تھی، بخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دستِ مبارک میں تیر لے کر نہایت ترتیب سے صفیں درست کی تھیں، مسلمان رات کو اطمینان سے سوئے تھے، صبح اٹھے تو تازہ دم تھے۔ بخلاف اس کے کفار بے اطمینانی کی وجہ سے رات کو سو نہ سکے تھے۔

تاہم یہ اسباب بھی ان کا اجتماع اور تہیہ ہی تائید الٰہی ہے، پھر قریش اور مسلمانوں کی فوج کا باہم مقابلہ کرو تو نظر آئے گا کہ عام فوجی نظر کیا مسلمانوں کی فتح کی مقتضی تھی؟ قریش کی فوج میں بڑے بڑے دولت مند تھے جو تنہا تمام فوج کی رسد کا سامان کرتے تھے، مسلمانوں کے پاس کچھ نہ تھا۔ قریش کی تعداد ایک ہزار تھی مسلمان صرف ۳۰۰ تھے۔ قریش میں سو سوار تھے مسلمانوں کی فوج میں صرف دو گھوڑے تھے۔ مسلمانوں میں بہت کم سپاہی تمام ہتھیاروں سے پورے تھے اور ادھر قریش کا ہر سپاہی لوہے میں غرق تھا۔

باایں ہمہ خاتمۂ جنگ پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں سے صرف ۱۴ شخصوں نے شہادت پائی جن میں ۶ مہاجر اور باقی

یہ پورا واقعہ صحیح بخاری میں ہے لیکن چونکہ کتاب المغازی میں نہیں بلکہ کتاب الوکالۃ میں ہے اس لیے ارباب سیر کی نظر نہیں پڑی۔ بخاری غزوۂ بدر ایضاً

انصار تھے، لیکن دوسری طرف قریش کی اصلی طاقت ٹوٹ گئی اور رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قریش کے سپہ سالار تھے، ایک ایک کر کے مارے گئے، اُن میں شیبہ، عتبہ، ابوجہل، ابوالبختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج قریش کے سرتاج تھے، قریباً ستر آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اسیرانِ جنگ میں سے عقبہ اور نضر بن حارث قتل کر دیئے گئے، باقی گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے ان میں حضرت عباسؓ، عقیل (حضرت علیؓ کے بھائی)، ابوالعاص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد) بھی تھے۔

لڑائیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی، آپ اس کو زمین میں دفن کرا[1] دیتے تھے، لیکن اس موقع پر کشتوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا، ایک وسیع کنواں تھا تمام لاشیں آپ نے اس میں ڈلوا دیں لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس جگہ سے ہٹائی جائے اس لئے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔

اسیرانِ جنگ جب مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو حضرت سودہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ) بھی تشریف رکھتی تھیں، ان قیدیوں میں ان کے عزیز سہیل بن عمرو بھی تھے، اُن پر نگاہ پڑی تو بے ساختہ بول اٹھیں کہ تم نے بھی عورتوں کی طرح خود بیڑیاں پہن لیں، یہ نہ ہو سکا کہ لڑ کر مر جاتے۔ اسیرانِ جنگ دو دو، چار چار صحابہ کو تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہؓ نے اُن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے تھے[2] اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی تھے، اُن کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھی کو واپس دیتے اور یہ اس بناء پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے[3]۔

(قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا (مثلہ) تو گو نبی ہوں لیکن خدا اس کی جزاء میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا[4]

حضرت عباسؓ کے بدن پر کرتا نہ تھا، لیکن اُن کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ اُن کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا، عبداللہ بن اُبی (رئیس المنافقین) نے کہ حضرت عباسؓ کا ہم قد تھا اپنا کرتہ منگوا کر دیا، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کے لئے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا[5]۔ عام روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آ کر صحابہ سے مشورہ کیا کہ اسیرانِ جنگ کے معاملہ میں کیا کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں، فدیہ لے کر چھوڑ دیئے جائیں لیکن حضرت

---

[1] روض الانف [2] ابن ہشام [3] طبری صفحہ ۱۳۳۸ [4] ایضاً صفحہ ۱۳۴۲ [5] صحیح بخاری صفحہ ۴۲۲ (باب الکسوۃ للاساری)

عمرؓ کے نزدیک اسلام کے معاملہ میں دوست دشمن، عزیز و اقارب، قریب و بعید کی تمیز نہ تھی، اس لئے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب قتل کر دیئے جائیں اور ہم میں سے ہر شخص اپنے عزیز کو آپ قتل کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا اس پر خدا کا عتاب آیا اور یہ آیت اتری،

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (انفال۔۹) اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ یہ عتاب ربانی سن کر رو پڑے۔

یہ روایت تمام تاریخوں میں مذکور اور احادیث میں بھی موجود ہے، لیکن سبب عتاب کے بیان میں اختلاف ہے، ترمذی میں جو روایت ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس وقت تک مال غنیمت کے متعلق احکام نہیں آئے تھے، عرب کے عام دستور کے موافق صحابہؓ غنیمت میں مصروف ہو گئے اس پر عتاب آیا لیکن چونکہ اس کے متعلق پہلے کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا اس لئے یہ جرم معاف کر دیا گیا اور حکم دیا کہ مال غنیمت جو ہاتھ آچکا حلال ہے، قرآن مجید میں عتاب کے بعد یہ الفاظ ہیں،

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (انفال۔۹) تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال طیب ہے۔

اس آیت میں صاف تصریح ہے کہ مال جو ہاتھ آیا تھا وہ حلال کر دیا گیا اور وہ مال غنیمت تھا، غرض صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مال غنیمت کے لوٹنے پر تھا، صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپؐ رونے لگے اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا ابکی الذی عرض علی اصحابك من اخذهم الفداء (یعنی تمہارے ساتھیوں نے جو فدیہ لیا اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا اس پر میں رو رہا ہوں، عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیران جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا۔ چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ (انفال۔۹) کسی نبی کو یہ مناسب نہیں کہ بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے لوگوں کو قیدی بنائے۔

لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدان جنگ میں جب تک کافی خونریزی نہ ہو چکے قیدی بنانا مناسب نہیں۔ اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خونریزی سے پہلے گرفتار کر لئے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کئے جا سکتے ہیں۔

بہرحال اسیران جنگ سے چار چار ہزار درہم فدیہ لیا گیا، لیکن جو لوگ ناداری کی وجہ سے فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے وہ چھوڑ دیئے گئے ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے اُن کو حکم ہوا کہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو چھوڑ دیئے جائیں گے، حضرت زیدؓ بن ثابت نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔

انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ حضرت عباسؓ ہمارے بھانجے ہیں، ہم اُن کا

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۴۷ [2] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۴۔

فدیہ چھوڑ دیتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا[1]، اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا فدیہ کی عام مقدار چار، چار ہزار درہم تھی لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا، حضرت عباسؓ دولت مند تھے، اس لیے ان سے بھی زیادہ رقم وصول کی گئی۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی اس میں قریب و بعید، عزیز و بیگانہ، عام و خاص کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے (لیکن ایک طرف تو ادائے فرض کی یہ مساوات تھی، دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباسؓ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے، لوگوں نے ان کی گرہ کھولی تو آپ نے آرام فرمایا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابو العاص بھی اسیران جنگ میں آئے تھے، ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں، کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیج دیں، حضرت زینبؓ کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہؓ نے جہیز میں ان کو ایک قیمتی ہار دیا تھا، حضرت زینبؓ نے زر فدیہ کے ساتھ وہ ہار بھی گلے سے اتار کر بھیج دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ۲۵ برس کا محبت انگیز واقعہ یاد آگیا، آپ بے اختیار رو پڑے اور صحابہ سے فرمایا کہ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو، سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا۔

(ابو العاص رہا ہو کر مکہ آئے اور حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیا۔ ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے، چند سال کے بعد بڑے سر و سامان سے شام کی تجارت لے کر نکلے، واپسی میں مسلمان دستوں نے ان کو مع تمام مال و اسباب گرفتار کر لیا، اسباب ایک ایک سپاہی پر تقسیم ہو گیا، یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے، انھوں نے پناہ دی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا، کہ اگر مناسب سمجھو تو ابو العاص کا اسباب واپس کر دو، پھر تسلیم کی گردنیں جھک گئیں اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگہ تک لا لا کر واپس کر دیا، اب یہ دار الیاسہ تھا جو خالی جاتا ابو العاص مکہ آئے اور تمام شرکاء کو حساب سمجھا کر دولت اسلام سے فائز ہوئے اور کہہ دیا کہ میں اس لئے یہاں آ کر اور حساب سمجھا کر جاتا ہوں تاکہ یہ نہ کہو کہ ابو العاص ہمارا روپیہ کھا کر تقاضے کے ڈر سے مسلمان ہو گیا[2]

بدر کی خبر مکہ میں پہنچی تو گھر گھر ماتم تھا لیکن غیرت کی وجہ سے قریش نے منادی کرا دی کہ کوئی شخص رونے نہ پائے[3]، اس لڑائی میں اسود کے تین لڑکے مارے گئے تھے اس کا دل امنڈا آتا تھا لیکن قومی عزت کی وجہ سے رو نہیں سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ ایک دن کسی طرف سے رونے کی آواز آئی، سمجھا کہ قریش نے رونے کی اجازت دے دی ہے، نوکر سے کہا دیکھنا کون روتا ہے؟ کیا رونے کی اجازت ہو گئی، میرے سینہ میں آگ لگ رہی ہے جی کھول کر رو لوں تو تسکین ہو جائے۔ آدمی نے آ کر کہا ایک عورت کا اونٹ گم ہو گیا ہے اس کے لئے رو رہی ہے۔ اسود کی زبان سے بے اختیار یہ شعر نکلے:

اتبکی ان یضل لہا بعیر اونٹ کے گم ہونے پر روتی ہے
ویمنعہا من النوم السہود اور اس کو نیند نہیں آتی (اونٹ پر

---

[1] بخاری صفحہ ۵۷۲ ج اول کتاب المغازی ۔ [2] تاریخ طبری صفحہ ۱۳۴۸ و ابوداؤد [3] تاریخ طبری

وما تبکی علی بکر ولکن	مت رو، بدر پر آنسو بہا، جہاں
علی بدر تقاصرت الجدود	قسمت نے کمی کی، تجھ کو رونا ہے
فبکی ان بکیت علی عقیل	تو عقیل پر رو اور حارث پر رو جو
وبکی حارثا اسد الاسود	شیروں کا شیر تھا۔

(عمیر بن وہب قریش میں اسلام کا سخت دشمن تھا وہ اور صفوان بن امیہ حجر میں بیٹھے مقتولین بدر کا ماتم کر رہے تھے، صفوان نے کہا "خدا کی قسم! اب جینے کا مزہ نہیں"۔ عمیر نے کہا سچ کہتے ہو، اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر آتا، میرا بیٹا بھی وہاں قید ہے۔ صفوان نے کہا تم قرض کی اور بچوں کی فکر نہ کرو، ان کا میں ذمہ دار ہوں۔ عمیر نے گھر آ کر تلوار زہر میں بجھائی اور مدینہ پہنچا حضرت عمرؓ نے اس کے تیور دیکھ لئے۔ گلا دبائے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے۔ آپ نے فرمایا عمرؓ چھوڑ دو۔ عمیر قریب آ جاؤ۔ پوچھا کس ارادے سے آئے؟ جواب دیا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ فرمایا تلوار کیوں حمائل ہے؟ عمیر نے کہا آخر تلواریں بدر میں کس کام آئیں؟ فرمایا، کیوں نہیں۔ تم نے اور صفوان نے حجر میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی؟ عمیر آپ کی یہ بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔ بے اختیار ہو کر بولا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے شک تم پیغمبر ہو۔ بخدا میرے اور صفوان کے سوا اس معاملہ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ قریش جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر سننے کے منتظر تھے انھوں نے عمیر کے مسلمان ہونے کی خبر سنی۔

حضرت عمیرؓ مسلمان ہو کر مکہ واپس آئے۔ جہاں کا ہر ذرہ اس وقت مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا ان کو اسلام کے دوستوں سے جس شدت کے ساتھ عداوت تھی اسی شدت سے وہ اب دشمنان اسلام کے دشمن تھے، یہاں پہنچ کر انھوں نے اسلام کی دعوت کو پھیلایا اور ایک مجمع کثیر کو اس روشنی سے منور کر دیا)

غزوۂ بدر کا بیان قرآن میں

اس غزوہ کو دیگر غزوات پر جو امتیازات حاصل ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ خود خدا نے اپنے کلام پاک میں اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور ایک خاص سورہ (انفال)، بدر کے احسانات و نعم کی تفصیل اور بعض مسائل متعلقہ بدر کی توضیح کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ واقعہ کی اصل حقیقت جاننے کے لئے آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح ماخذ موجود نہیں۔

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ	مومن وہ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل
قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ	جائیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کا ایمان
اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ الَّذِیْنَ	بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہیں جو نماز
یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ	بہ پابندی پڑھتے ہیں اور خدا نے جو ان کو روزی دی ہے اس
اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ	سے راہ خدا میں بھی کچھ دیتے ہیں یہ ہیں سچے مومن، ان کے
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ	لئے خدا کے پاس رتبے ہیں، بخشش ہے اور اچھی روزی ہے

---

[1] (یہ تمام واقعات تاریخ طبری میں بحوالہ عروہ بن زبیر مذکور ہیں ص ۱۳۵۴)

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠
وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ
يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا
يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۔
وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ
وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ
وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ
دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ
وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۔ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ
فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ
الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۔ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى
وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ
اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۔ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ
اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ
بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ
عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۔ اِذْ يُوْحِيْ
رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ
وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔
ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۔ وَمَنْ
يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ
اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔

جس طرح اے پیغمبر تیرا خدا تجھ کو حق پر تیرے گھر سے (مدینہ) نکال لایا حالانکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس سے ناخوش تھا وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑتا ہے، گویا کہ وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور وہ موت کو دیکھ رہے ہیں اور جب خدا تم سے قریش کے قافلہ اور قریش کی فوج میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ہے تم چاہتے ہو کہ بے خلش والا گروہ تم کو مل جائے (یعنی قافلہ) اور خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنے حکم سے ثابت کرے اور باطل کو مٹائے گو گنہگار اس سے رنجیدہ ہوں، یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے اس نے تمہاری سنی (اور) کہا میں تمہاری لگاتار ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا، خدا نے یہ صرف مسلمانوں کی خوشی اور اطمینان قلب کے لئے کیا اور فتح تو صرف خدا کے پاس ہے، خدا غالب و دانا ہے۔ یاد کرو جب تمہارے چین کے لئے اپنی طرف سے اونگھ تم پر طاری کر رہا تھا اور آسمان سے پانی برسا رہا تھا کہ تم کو پاک کرے اور شیطان کی ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دل مضبوط کرے اور ثابت قدم رکھے۔ یاد کرو جب خدا فرشتوں کو حکم دے رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنا، میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ کافروں کی گردنیں مارو اور ہر جوڑ پر مارو، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کی ہے اور جو خدا اور خدا کے رسول سے دشمنی کرے گا خدا اس کو سخت عذاب دینے والا ہے یہ ہے عذاب اس کا مزہ چکھو، کافروں کے لئے عذاب دوزخ ہے مسلمانو! جب میدان جنگ میں کافروں کے مقابل آؤ تو پشت نہ پھیرو اور بجز اس کے کہ لڑنے کے لئے مڑے یا کسی دستہ کی طرف پھرے جو کوئی پشت پھیرے وہ خدا کا غضب لئے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور کیا برا ٹھکانا ہے مسلمانو! ان کافروں کو تم نے نہیں مارا لیکن خدا نے مارا، اور اے محمد! تم نے

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ۔ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ وَاَطِيْعُوا

نہیں پھینکا جب تم نے پھینکا، لیکن خدا نے پھینکا کہ اپنی طرف سے اہل ایمان کو اچھا انعام دے خدا دانا اور بینا ہے اور کافروں کے داؤ پیچ کو کمزور کرنے والا ہے اگر تم فتح چاہتے تھے تو فتح آ چکی اب اگر تم رک جاؤ تو بہتر ہے اور اگر تم پھر مخالفت پر آمادہ ہو گے تو ہم پھر مسلمانوں کی مدد کریں گے، یاد رکھو کہ تمہاری جمعیت کچھ مفید نہیں گو وہ کتنی ہی کثیر ہو اور خدا مومنوں کے ساتھ ہے۔

(انفال-۲)

(۲) اور جان لو کہ جو مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اہل قرابت کیلئے یتیموں کے لئے، مسکینوں کے لئے اور مسافروں کیلئے ہے اگر خدا پر تم ایمان لا چکے ہو اور حق و باطل میں فرق کر دینے والے دن میں (یعنی بدر میں) خدا نے اپنے بندہ پر جو (فتح) اتاری اس کو مان چکے، جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، جب تم قریب کے میدان میں اور قریش کی فوج دور کے میدان میں اور قافلہ تم سے نیچے تھا۔ اگر تم ایک دوسرے سے وقت مقرر کر کے آتے تو وقت میں اختلاف ہو جاتا لیکن خدا نے یہ اس لئے کر دیا تاکہ جو ہونے والا تھا خدا اس کو کر دے تاکہ جس کو مرنا ہو وہ بھی دلیل دیکھ کے مرے اور جس کو زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کے زندہ رہے اور بیشک خدا سننے والا اور جاننے والا ہے، یاد کرو جب خدا تم کو جنگ کی حالت میں ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اگر زیادہ کر کے دکھاتا تو تم سست پڑ جاتے اور باہم جھگڑ پڑتے لیکن خدا نے محفوظ رکھا، وہ سینوں کے بھید سے واقف ہے، جب تمہاری نظر میں خدا ان کو تھوڑا دکھا رہا تھا اور تم کو ان کی نگاہ میں تاکہ جو ہونے والا ہے خدا اس کو پورا کرے اور اسی کے طرف تمام معاملے پھرتے ہیں، مسلمانو! جب کسی

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ
رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ
الصّٰبِرِيْنَ. وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ
النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ،
(انفال)

دستہ فوج سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو اور خدا کو اکثر یاد کیا کرو تاکہ کامیاب ہو اور خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور جھگڑا نہ کرو ورنہ سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، مستقل رہو خدا مستقل لوگوں کے ساتھ ہے اور ان لوگوں (یعنی قریش) کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور دکھاوے کے ساتھ اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے اور خدا ان کے تمام کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔

(۳) مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى
يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ، تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا
وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ،
لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ، فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا
طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ،
(انفال-۹)

(۳) پیغمبر کے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاآنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے، تم دنیا کی دولت چاہتے ہو (قیدی ہوں گے تو فدیہ ہاتھ آئے گا) اور خدا آخرت چاہتا ہے خدا توانا اور دانا ہے۔ اگر خدا کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لیا اس پر دردناک عذاب پہنچتا، اب جو کچھ تم کو غنیمت میں ملا کھاؤ وہ حلال طیب ہے اور خدا سے ڈرا کرو خدا آمرزگار اور مہربان ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ
الْاَسْرٰۤى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا
يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، وَاِنْ يُّرِيْدُوْا
خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ
فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ،
(انفال-۱۰)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہو کہ خدا اگر تمہارے دلوں میں کچھ نیکی دیکھے گا تو تم سے جو لیا گیا ہے اس کے بدلہ وہ نیکی عطا کرے گا اور تمہیں معاف کرے گا وہ بخشش اور مہربانی والا ہے اور اگر یہ قیدی تجھ سے خیانت کرنا چاہتے ہیں تو اس سے پہلے وہ خدا کے ساتھ خیانت کر چکے ہیں اس لئے تو خدا نے اُن کو تمہارے قابو میں کر دیا۔ خدا باخبر اور دانا ہے۔

خدا نے اسی احسان کو اُحد کے موقع پر یاد دلایا ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (آل عمران-۱۳)

یقیناً خدا نے تمہاری مدد کی بدر میں، جب تم کمزور تھے تو خدا سے ڈرو، تاکہ تم شکرگزار بن جاؤ۔

⁂

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

سادہ واقعات بیان کرنے کے بعد اب وقت آیا ہے کہ محققانہ طور سے اس بات پر بحث کی جائے کہ غزوۂ بدر کا مقصد جیسا کہ عام مورخین نے بیان کیا ہے، کاروانِ تجارت کو لوٹنا تھا یا قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔

میں اس بات سے خوب واقف ہوں کہ تاریخ اور محکمۂ عدالت میں فرق ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ تاریخ کا اندازِ بیان مقدمہ دیوانی یا فوجداری کے فیصلہ لکھنے سے بالکل مختلف ہے۔ میں اس کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میرا منصب واقعہ نگاری ہے، فیصلہ نویسی نہیں۔ لیکن موقع ایسا آپڑا ہے کہ ایک واقعہ تاریخی نے مقدمۂ عدالت کی حیثیت حاصل کرلی ہے، اس لئے مجھ کو اپنے مقصد سے ہٹ کر فصل مقدمہ کا قلم ہاتھ میں لینا پڑتا ہے، اس بات کا مجھ کو مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلہ میں عام مورخین اور اربابِ سیر میرے حریفِ مقابل ہیں۔ نہایت جلد نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دنیا پر فتح پا سکتا ہے۔ سلسلۂ کلام کے اچھی طرح پیشِ نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے ہم کو بتا دینا چاہیے کہ (ہماری تحقیقات کی رو سے) واقعہ کی اصلی صورت کیا تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرمی کے قتل نے تمام مکہ کو جوشِ انتقام سے لبریز کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی پیش آگئیں۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے پُرحذر رہتے تھے اور جیسا کہ ایسی حالتوں میں عام قاعدہ ہے غلط خبریں خود بخود مشہور ہو کر پھیل جاتی ہیں، اسی اثناء میں ابوسفیان قافلۂ تجارت کے ساتھ شام گیا اور ابھی وہ شام میں تھا کہ یہ خبر وہاں مشہور ہوگئی کہ مسلمان قافلہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ ابوسفیان نے وہیں سے مکہ کو آدمی دوڑایا کہ قریش کو خبر ہو جائے۔ قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مدینہ میں یہ مشہور ہوا کہ قریش ایک جمعیتِ عظیم لے کر مدینہ آ رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کا قصد کیا اور بدر کا معرکہ پیش آیا۔

اس بحث کے فیصلہ کے لئے سب سے پہلے ان واقعات کو یکجا لکھ دینا چاہیے جن پر دونوں فریق کا اتفاق ہے تاکہ وہ انفصالِ بحث میں اصولِ موضوعہ کے طور پر کام آئیں، وہ یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائیگا۔

(۲) کتبِ حدیث میں صحت کے لحاظ سے باہم جو فرقِ مراتب ہے اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی کہ قریش بڑی تیاری کے ساتھ مکہ سے نکلے ہیں تو آپ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر ان کا استمزاج کیا، مہاجرین نے نہایت جوش کے ساتھ آمادگی ظاہر کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی مرضی دریافت کرنا چاہتے تھے، یہ دیکھ کر سعدؓ یا اور کوئی معزز انصاری اٹھے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ ہم وہ لوگ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپ حکم دیں تو ہم آگ اور سمندر میں کود پڑیں۔ یہ بھی مسلّم ہے کہ صحابہ میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو شرکت سے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں تصریح ہے۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ (انفال)

اور مسلمانوں کا ایک گروہ قطعی ناخوش تھا۔

علاوہ ارباب سیر اور محدثین نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی رضامندی جو خاص طور پر دریافت کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار نے مکہ میں جب آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو صرف یہ اقرار کیا تھا کہ جب کوئی دشمن خود مدینہ پر حملہ آور ہوگا تو انصار مقابلہ کریں گے، یہ اقرار نہ تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر بھی لڑیں گے۔

ان واقعات کے بعد اب مرکز بحث یہ ہے کہ یہ واقعات کہاں پیش آئے؟ ارباب سیر لکھتے ہیں کہ مدینہ سے جب آپ نکلے تو صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود تھا۔ دو چار منزل چل کر معلوم ہوا کہ قریش فوجیں لئے چلے آتے ہیں اس وقت آپ نے مہاجرین اور انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں۔ آگے کے واقعات یہیں پیش آئے لیکن کتب سیر، تاریخ اور دیگر تمام شہادتوں سے بالاتر ایک اور چیز ہمارے پاس موجود ہے (قرآن) جس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہئے۔

كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ
فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ . يُجَادِلُونَكَ
فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ
وَهُمْ يَنظُرُونَ . وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى
الطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ
ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَن
يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ؕ
(انفال ع ۱)

جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآنحالیکہ
مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا یہ لوگ حق کے
ظاہر ہونے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا
کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے ہیں اور موت کو آنکھوں سے
دیکھ رہے ہیں اور جبکہ خدا تم سے یہ وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں
میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کانٹے
والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں
سے قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

(۱) ترکیب نحوی کے رو سے وَاِنَّ میں جو واؤ ہے، حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہئے۔

(۲) آیت مذکورہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے ایک کاروان تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی، ارباب سیر کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروان تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ دونوں میں ایک کا وعدہ ہے؟ اس لئے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آگئی تھیں، کہ ادھر ابو سفیان کاروان تجارت لے کر چلا ہے اور ادھر قریش جنگ کے سروسامان کے ساتھ مکہ سے نکل چکے ہیں۔

(۳) سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکورۂ بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحب شوکت یعنی کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لئے آرہے تھے آیت

میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے، خدا نے اُن لوگوں پر ناراضی ظاہر کی اور فرمایا:

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (انفال ع-۱)	اور تم چاہتے تھے کہ بے خرخشہ والا گروہ تم کو ہاتھ آجائے اور خدا یہ چاہتا ہے کہ اپنی باتوں سے حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا؟ میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

(۴) اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں، ان میں فاتح خیبرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ سید الشہداؓ بھی ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے، باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بتصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور اُن کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لئے جاتا ہے۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (انفال-۱)	اور مسلمانوں کی ایک جماعت کارہ تھی، وہ تجھ سے حق ظاہر ہوئے پیچھے بھی جھگڑا کرتی تھی، گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جارہے ہیں۔

اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب، یہ پہلو تہی کس بنا پر تھی، اس سے پہلے بارہا (بقول ارباب سیر) قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کے لئے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیج دیئے گئے تھے اور کبھی ان کو خطر نہیں پہنچا تھا، اس دفعہ اسی قافلہ کا اتنا ڈر ہے کہ تین سو چیدہ اور منتخب فوج ہے اور پھر لوگ ڈر کے مارے سہمے جاتے ہیں، یہ قطعی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی کہ قریش مکہ سے جمعیت عظیم لے کر مدینہ پر آرہے ہیں۔

(۵) قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپؐ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری تفسیر سورۂ نساء میں تصریحاً مذکور ہے، آیت یہ ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً (نساء - ۱۳)	بجز معذوروں کے، وہ لوگ جو بیٹھ رہے اور وہ لوگ جو خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں برابر نہیں ہوسکتے، خدا نے مجاہدین کو جو مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں درجہ میں فضیلت دی ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا، یہ آیت سن کر حضرت عبداللہ بن مکتومؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس فانطلقوا
حتی نزلوا بدرا۔

(۲) ووردت علیھم روایا قریش وفیھم غلام
اسود لبنی الحجاج فاخذوہ فکان اصحاب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یسألونہ عن
ابی سفیان واصحابہ فیقول مالی علم بابی سفیان
ولکن ھذا ابوجھل وعتبۃ وشیبۃ وامیۃ بن
خلف فاذا قال ذلک ضربوہ فقال نعم انا اخبرکم
ھذا ابوسفیان فاذا ترکوہ فسألوہ فقال مالی
بابی سفیان علم ولکن ھذا ابوجھل وعتبۃ وشیبۃ
وامیۃ بن خلف فی الناس فاذا قال ھذا ایضا ضربوہ
ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائم یصلی فلما رأی
ذالک انصرف قال والذی نفسی بیدہ لتضربوہ
اذا صدقکم وتترکوہ اذا کذبکم۔

(صحیح مسلم باب غزوۂ بدر)

کہ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو شرکت جنگ کی دعوت دی لوگ
چل پڑے اور بدر پر اترے

(۲) اور پہلے قریش کا ہراول دستہ آگیا اس میں بنی حجاج کا
ایک حبشی غلام تھا، مسلمانوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس
سے ابوسفیان کا حال پوچھنے لگے، وہ کہتا تھا مجھے ابوسفیانؓ
کی خبر نہیں لیکن یہ ابوجہل، عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف آ
رہے ہیں، جب وہ یہ کہتا تو لوگ اس کو مارتے، وہ
کہتا اچھا ابوسفیان کا بتاتا ہوں تب اُس کو چھوڑ دیتے
تو پھر پوچھتے تو وہ کہتا مجھ کو ابوسفیان کی خبر نہیں لیکن ابوجہل
عتبہ، شیبہ، امیہ بن خلف رؤسائے قریش آ رہے ہیں لیکن
جب وہ یہ کہتا تب بھی اس کو مارتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نماز میں مشغول تھے آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا قسم ہے اس ذات
کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جب وہ سچ کہتا ہے
تو تم اس کو مارتے ہو اور جب جھوٹ بولتا ہے تو
تم چھوڑ دیتے ہو۔

حدیث کے پہلے ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اسی وقت آپؐ نے انصارؓ ومہاجرین سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اور یہ مطلقاً ثابت ہے کہ ابوسفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لئے آپؐ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی ورنہ اگر باہر نکل کر یہ معاملہ پیش آتا جیسا کہ کتب سیرت میں مذکور ہے تو اس وقت انصار وہاں کہاں ہوتے؟ اور نیز اس ٹکڑے میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کے بعد لوگوں کو شرکت کی دعوت دی، حالانکہ ارباب سیر کے مطابق واقع یہ ہونا چاہئے کہ انصار معاہدہ اور معمول سابق کے خلاف شرکت کے لئے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اُن کا عندیہ دریافت فرمایا اور اس کے بعد شرکت کے لئے آمادہ کیا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک مجنونانہ بات ہے۔

حدیث کے دوسرے ٹکڑے سے بوضاحت تمام محقق ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے یا کسی اور طریقہ سے یہ پہلے ہی معلوم تھا کہ تجارتی قافلہ کا نہیں بلکہ جنگی فوج کا مقابلہ ہے، گو عام لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو۔ اس حدیث میں ایک گرہ اور کھولنی ہے۔ اگر پہلے صرف ابوسفیان کا آنا معلوم ہوا تھا اور قریش کے حملہ کی خبر نہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اصرار اور سر و سامان سے کیوں اجتماع کا اہتمام فرماتے، اس لئے ابوسفیان کی آمد کے بجائے موقع کا اقتضاء یہ ہے کہ یہ ہو کہ جب مشرکین مکہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی۔ چنانچہ اسی واقعہ کو ان ہی الفاظ کے

اپنے اندھے پن کا عذر کیا۔ اس پر وہیں یہ ٹکڑا نازل ہوا غَیرُ اُولِی الضَّرَرِ یعنی معذوروں کے سوا۔ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔

(۶) کفار قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (انفال)	اور (ان) لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائشی اور خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان اور دکھاوے کے لئے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ اس میں اظہار شان اور دکھاوے کی کیا بات تھی اور خدا کی راہ سے لوگوں کو روکنا کیا تھا؟ البتہ چونکہ درحقیقت وہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تھے جس سے مقصود اپنے زور اور قوت کا اعلان و نمائش اور اسلام کی ترقی کا انسداد تھا اس لئے خدا نے اس کو غرور و نمائش اور صد عن سبیل اللہ کہا۔

قرآن مجید کے بعد احادیث نبویؐ کا درجہ ہے۔ احادیث کی متعدد کتابوں میں غزوۂ بدر کا مفصل و مجمل ذکر ہے لیکن حضرت کعبؓ والی حدیث کے سوا اور کسی حدیث میں یہ واقعہ میری نظر سے نہیں گزرا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت کے لوٹنے کے لئے نکلے تھے۔

حضرت کعبؓ کی حدیث یہ ہے۔

عن عبداللہ بن کعب قال کعب لم اتخلف عن رسول اللہ صلعم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ تبوک غیر انی کنت تخلفت فی غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف عنها انما خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینہ وبینھم علی غیر میعاد۔	کعبؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا، بجز غزوۂ تبوک کے اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہ تھا اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لئے نکلے تھے کہ خدا نے دونوں فریق کو اچانک متقابل کر دیا۔

اس کے برخلاف حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔

(۱) عن انس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان قال فتکلم ابوبکرؓ فاعرض عنہ ثم تکلم عمرؓ فاعرض عنہ فقام سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الی برک الغماد لفعلنا قال فندب	(۱) انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مشورہ طلب کیا حضرت ابوبکرؓ بولے تو آپ نے توجہ نہ فرمائی، پھر حضرت عمرؓ بولے آپ نے اُن کی طرف بھی توجہ نہ کی پھر حضرت سعدؓ بن عبادہؓ کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب ہم انصار کی طرف ہے؟ خدا کی قسم! اگر دریا میں سواری ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر برک الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم کریں گے حضرت انسؓ کہتے ہیں

ساتھ امام احمد بن حنبل نے مسند میں[1]، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن جریر نے تاریخ میں اور بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے اور اس کو صحیح[2] کہا ہے اور اس کے راوی معرکۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ علی بن ابی طالب ہیں۔

عن علی قال لما قدمنا المدینه اصبنا من ثمارها فاجتویناها واصابنا بها وعك وكان النبی صلی اللہ علیه وسلم یتخبر عن بدر فلما بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم الی بدر وبدر بئر فسبقنا المشرکین الیها (اس کے بعد بدر کے تمام واقعات وجزئیات مذکور ہیں)	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے اس لیے ہم لوگ بیمار ہوگئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو پوچھا کرتے، جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو چلے، بدر ایک کنویں کا نام ہے وہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

اس میں صاف تصریح ہے کہ مشرکین مکہ کے حملہ کی خبر سن کر آپ نکلے تھے اور بدر آکر قیام فرمایا تھا، اس پوری حدیث میں ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا ذکر تک نہیں ہے، ان قطعی نصوص کے بعد اگرچہ کسی اور استدلال کی ضرورت نہیں لیکن اطمینان قلبی کے طور پر واقعات ذیل پر لحاظ کرنا چاہیے۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے قریش کے قافلوں پر حملہ کرنے کے لئے جس قدر سرایا بھیجے وہ جن میں بیس تیس آدمی سے لے کر سو سو، دو دو سو تک کی جمعیت تھی ان میں کبھی کسی انصاری کو نہیں بھیجا، ارباب سیر اس خاص امر کو بہ تصریح لکھتے ہیں اور اس تصریح کی اس لئے ضرورت سمجھتے ہیں کہ انصار نے بیعت کے وقت مدینہ سے باہر نکلنے کا اقرار نہیں کیا تھا اس بنا پر اگر اس دفعہ بھی مدینہ سے نکلنے کے وقت صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو انصار ساتھ نہ ہوتے حالانکہ اس واقعہ میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی، یعنی کل فوج ۳۰۵ تھی، جن میں ۶۴ مہاجرین اور باقی سب انصار تھے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ جس وقت مدینہ سے آپ نکلے یہ خبر آچکی تھی کہ قریش مدینہ پر آرہے ہیں، اسی بنا پر آپ نے انصار کو مخاطب کیا کیونکہ معاہدۂ بیعت کے موافق اب انصار سے کام لینے کا وقت آچکا تھا۔

(۲) مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام کو جایا کرتا تھا، مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا، مدینہ سے مکہ تک جس قدر قبائل آباد تھے عموماً قریش کے زیر اثر تھے، بخلاف اس کے مدینہ سے شام تک کے حدود تک قریش کا اثر نہ تھا، اس بنا پر اگر کاروان تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا، یہ بالکل خلاف قیاس ہے کہ کاروان تجارت شام سے آرہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو چکی ہے اور آپ بجائے اس کے کہ شام کی طرف بڑھیں مکہ کی طرف جاتے ہیں اور پانچ منزل مکہ کی طرف جاکر خبر آتی ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا اور قریش سے جنگ پیش آجاتی ہے۔

(۳) واقعات کی ترتیب یہ ہے

(۱) قریش نے عبداللہ بن اُبی کو خط لکھا کہ محمد اور اُن کے رفقاء کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ آکر تم کو بھی برباد کر دیں گے (بحوالہ سنن ابی داؤد اوپر گزر چکا)

(۲) ابوجہل نے سعدؓ بن معاذ سے کہا کہ تم نے ہمارے مجرموں کو پناہ دی ہے، اگر امیہ کی ضمانت نہ ہوتی تو تم

---

[1] جلد اول ص ۱۱۷۔ [2] منتخب کنز العمال غزوۂ بدر جلد ۳ ص ۹۸۔

کو قتل کر دیا۔

(۳) کرز بن جابر نے جمادی الثانی سنہ ۲ھ میں مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹ لوٹ لئے۔

(۴) اس کے بعد ہی رجب سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہؓ بن جحش کو تجسس کے لئے بھیجا کہ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لائیں۔

(۵) عبداللہؓ بن جحش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے خلاف قریش کا ایک مختصر سا قافلہ لوٹ لیا اور ایک آدمی قتل اور دو اسیر کئے۔

قریش نے مکہ میں جو کچھ مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اس کو پیش نظر رکھو، پھر یہ خیال کرو کہ اُن کا جوشِ انتقام کسی طرح کم نہیں ہوتا اور وہ عبداللہ بن اُبی کو لکھتے ہیں کہ ہم مدینہ آکر تم کو اور محمدؐ دونوں کو فنا کر دیں گے، کرز فہری مدینہ میں چھاپہ مارتا ہے، اسی اثناء میں قریش کا اشتعال اس سے اور بڑھ جاتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن جحش نے ان کا قافلہ لوٹ لیا اور اُن کے دو معزز خاندان کے ممبر اسیر کر لئے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ قریش صبر کرتے ہیں اور کسی قسم کے انتقام کا ارادہ نہیں کرتے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قافلہ کو جس میں مکہ کی کل کائنات تھی لوٹنے کے لئے نکلتے ہیں تب مجبوراً اُن کو مدافعت کے لئے نکلنا پڑتا ہے۔ اس پر بھی بدر کے قریب پہنچ کر جب اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ بچ کر نکل گیا تو اُن کے بڑے بڑے سردار اور خود عتبہ جو سالارِ لشکر تھا رائے دیتا ہے کہ اب لڑنے کی ضرورت نہیں واپس چلنا چاہیئے۔ کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے موافق ہے۔

(۴) ارباب سیر عموماً لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں صحابہؓ کو کاروانِ تجارت پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو لوگوں نے چنداں مستعدی ظاہر نہیں کی، کیونکہ لوگ سمجھے کہ کوئی مہم اور معرکہ جہاد نہیں ہے بلکہ صرف تحصیلِ غنیمت ہے، اس لئے جن لوگوں کو مالِ غنیمت کی حاجت تھی وہ گئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انصار میں جس قدر اعیانِ قوم اور سرِ لشکر تھے سب کے زر و مال کے محتاج اگر تھے تو مہاجرین تھے لیکن جانے والوں میں انصار کی تعداد مہاجرین سے دگنی تگنی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے استمزاج کے جواب میں جن لوگوں نے جاں نثارانہ فقرے کہے تھے، مہاجرین میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و مقدادؓ تھے اور انصار میں حضرت سعدؓ بن عبادہ تھے، حضرت سعدؓ بن عبادہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اور مدینہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے اس لئے قطعاً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت سعدؓ نے یہ جواب مدینہ ہی میں دیا تھا اور وہیں قریش کے حملہ کا حال معلوم ہو گیا تھا اور اس لئے یہ قطعی ہے کہ مدینہ ہی میں اس بات کی ضرورت پیش آئی تھی کہ انصار کا استمزاج لیا جائے۔

(۵) عام ارباب سیر بلکہ احادیث کی کتابوں میں بھی منقول ہے کہ غزوۂ بدر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری غزوۂ بدر

لوگوں کو چلنے کی ترغیب دی تو کچھ لوگ آمادہ ہوئے اور کسمسائے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جہاد یا غزوہ میں صرف قافلہ کا مال لوٹنا ہے، اس لئے یہ اپنی مرضی پر موقوف ہے جس کا جی چاہے جائے جس کا جی چاہے نہ جائے طبری میں ہے۔

قالوا لما سمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بابی سفیان مقبلا من الشام ندب المسلمین الیھم وقال ھذہ عیر قریش فیھا اموالھم فاخرجوا الیھا لعل اللّٰہ ان ینفلکموھا فانتدب الناس فخف بعضھم وثقل بعضھم وذلک انھم لم یظنوا ان رسول اللّٰہ یلقی حربا (صفحہ ۱۲۹۲)

لوگوں نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان کا شام سے روانہ ہونا سنا تو مسلمانوں کو بلایا اور فرمایا کہ یہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں ان کا مال ہے چلو شاید خدا تم کو اس میں سے مال غنیمت دلوادے، لوگ آمادہ ہوئے لیکن بعضوں نے پہلوتہی کی، کیونکہ وہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی لڑائی تو پیش نہیں آئے گی۔

لیکن یہ واقعات صریح آیات قرآنی کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں یہ تصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اُن کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔

وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۝ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ (انفال-۱)

اور مسلمانوں کا ایک فریق نکلنے سے ناراض تھا، وہ تجھ سے حق کے متعلق جھگڑتا تھا، بعد اس کے کہ حق ظاہر ہوگیا تھا، وہ گویا موت کی طرف ہنکارے جا رہے ہیں۔

(۶) تمام کتب احادیث اور سیر میں تصریح ہے کہ مدینہ منورہ سے ایک میل چل کر مقام بیرابی عنبہ میں آپؐ نے فوج کا جائزہ لیا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ اس بنا پر واپس بھیج دیئے گئے کہ اُن کی عمریں پندرہ برس سے کم تھیں یا یہ کہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، اگر صرف قافلہ کا لوٹنا مقصود ہوتا تو یہ کام نوخیز نوجوان زیادہ خوبی سے انجام دے سکتے تھے لیکن چونکہ واقع میں جہاد مقصود تھا جو ایک فریضۂ الٰہی ہے اور اس کے لئے بلوغ کی قید ہے اس لئے نابالغ لوگ واپس کر دیئے گئے کہ اس کے اہل نہیں۔

(۷) حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب میں روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو قافلۂ قریش پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو خیثمہؓ نے جو ایک انصاری تھے اپنے بیٹے سعدؓ سے کہا کہ مجھے جانے دو اور تم یہاں مستورات کی خبرگیری کرو، سعدؓ نے کہا حضور! اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور میں آپ کو اپنے اوپر ترجیح دیتا لیکن یہ شہادت کا درجہ ہے میں اس کو کیونکر چھوڑ سکتا ہوں۔ چنانچہ قرعہ اندازی ہوئی اور سعدؓ کے نام قرعہ نکلا، سعدؓ شریک جنگ ہو کر شہید ہوئے۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ قافلہ لوٹنا نہیں بلکہ جہاد پیش نظر تھا اور لوگوں کو دولت شہادت کے حاصل ہونے کی آرزو ہے۔

---

[1] باب تذکرہ سعد بن خیثمہؓ (اصابہ) اور طبقات میں یہ واقعہ باختلاف الفاظ منقول ہے۔

غزوۂ بدر کا اصلی سبب

عرب کا خاصۂ قومی تھا کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی آدمی کسی طریقے سے کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جاتا تھا تو ایک سخت ہنگامہ کا در قائم ہو جاتا تھا۔ دونوں طرف ٹڈی دل امنڈ آتا تھا اور خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔ یہ لڑائیاں مدتوں تک قائم رہتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے تاہم یہ سلسلہ بند نہیں ہوتا تھا۔ عرب لکھے پڑھے نہ تھے تاہم مقتول کا نام کاغذ پر درج ہو کر خاندان میں ورثاً بلا آتا تھا، بچوں کو یہ نام یاد کرایا جاتا تھا کہ بڑے ہو کر اس خون کا انتقام لینا ہے۔ داحس اور بسوس کی قیامت خیز لڑائیاں جو چالیس چالیس برس قائم رہیں اور جن میں ہزاروں لاکھوں جانیں برباد ہو گئیں اسی بناء پر ہوئیں۔ عربی زبان میں انتقام کو ثار کہتے ہیں اور یہ عرب کی قومی تاریخ کا سب سے بڑا اہم لفظ ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں حضرت عبداللہ بن جحش[1] کے واقعہ میں عمرو بن حضرمی قتل کر دیا گیا تھا۔ حضرمی عتبہ بن ربیعہ کا حلیف تھا جو تمام قریش کا سردار تھا۔ بدر اور تمام غزوات کا سلسلہ اسی خون کا انتقام تھا۔ عروہ بن زبیر (حضرت عائشہؓ کے بھانجے) نے اس واقعہ کو بتصریح بیان کیا ہے۔

وکان الذی ھاج وقعة بدر وسائر الحروب التی کانت بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبین مشرکی قریش فیما قال عروة بن الزبیر ما کان من قتل واقد بن عبد اللہ التمیمی عمرو بن الحضرمی (تاریخ طبری صفحہ ۱۲۸۴)

جس چیز نے غزوۂ بدر اور دیگر تمام لڑائیاں برپا کیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین عرب کے درمیان واقع ہوئیں وہ جیسا کہ عروہ بن زبیر کا بیان ہے، عمرو بن حضرمی کا قتل کیا جانا ہے جس کو واقد بن عبداللہ تمیمی نے قتل کر دیا تھا۔

ایک عام غلطی جس نے واقعہ بحث طلب میں غلطی پیدا کر دی ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے جو لڑائی کفار سے ہوئی وہ بدر تھی، حالانکہ بدر سے پہلے لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں، عروہ بن الزبیر نے غزوۂ بدر کے متعلق عبدالملک کو جو خط لکھا تھا اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں۔

ان ابا سفیان بن حرب اقبل من الشام فی قریب من سبعین راکبا من قبائل قریش فذکروا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ وقد کانت الحرب بینھم فقتلت قتلی وقتل ابن الحضرمی فی اناس بنخلة واسرت اساری من قریش وکانت تلک الوقعة ھاجت الحرب بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ابوسفیان بن حرب تقریباً ستر سوار کے ساتھ شام سے آ رہا تھا جو کل کے کل قریشی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے اس کا تذکرہ کیا اور دونوں فریق میں لڑائی شروع ہو چکی تھی اور ادھر کے چند لوگ جن میں ابن حضرمی بھی تھا مارے جا چکے تھے اور کچھ قید ہو چکے تھے اور اسی واقعہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش میں جنگ برپا کر دی تھی اور یہی

---

[1] عبداللہؓ بن جحش جن کی سرداری میں یہ قتل واقع ہوا، حضرت حمزہؓ کے بھانجے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں بھائی تھے، قاتل یعنی واقد بن عبداللہ حضرت عمرؓ کے خاندان کے حلیف تھے اور حضرت عمرؓ کے آغاز خلافت تک زندہ رہے، دیکھو طبقات ابن سعد، ذکر عبداللہ بن جحش و واقد بن عبداللہ۔

وبین قریش واول ما اصاب بہ بعضہم بعضاً من الحرب وذالک قبل خروج ابی سفیان واصحابہ الی الشام (طبری ص ۱۲۸۵)

سب سے پہلے واقعہ تھا جس میں دونوں فریق سے ایک دوسرے کو صدمہ پہنچا اور یہ لڑائی ابوسفیان کی روانگی شام سے پہلے وقوع میں آچکی تھی۔

اس میں تصریح ہے کہ ابوسفیان جب شام کو روانہ بھی نہیں ہوا تھا اسی وقت لڑائی شروع ہو چکی تھی غزوۂ بدر ابوسفیان کی واپسی شام کے بعد واقع ہوا ہے۔ اصلیت واقعہ کی تحقیق کا سب سے بڑا اصلی ذریعہ یہ ہے کہ خود حریفانِ جنگ کی شہادت بہم پہنچائی جائے۔ اس قسم کی شہادتیں بہت کم ہاتھ آسکتی ہیں لیکن خوش قسمتی سے یہاں اس قسم کی شہادت موجود ہے۔ حضرت حکیمؓ[1] بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) غزوۂ بدر میں شریک تھے اور اس وقت تک کافر تھے۔ وہ عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ برس بڑے تھے اور گو زمانۂ جاہلیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت رکھتے تھے اور نبوت کے بعد بھی یہ محبت قائم رہی، تاہم فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے۔ وہ رؤسائے قریش میں تھے۔ حرم کا ایک بڑا منصب یعنی رفادہ ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ دارالندوہ کے مہتمم اور مالک بھی وہی تھے۔ وہ مروان بن حکم کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔ ایک دفعہ وہ مروان سے ملنے گئے۔ مروان نے نہایت تعظیم و تکریم کی، صدر مجلس سے اٹھ کر ان کے پاس آبیٹھا اور کہا[2] بدر کا واقعہ بیان کیجئے۔ انہوں نے واقعہ کے ابتدائی حالات بیان کرکے کہا کہ جب ہماری فوجیں میدان میں اتریں تو میں عتبہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے یہ کہا۔

یا ابا الولید هل لك ان تذهب بشرف هذا الیوم ما بقیت، قال افعل ماذا؟ قلت انکم لا تطلبون من محمد الا دم ابن الحضرمی وهو حلیفك فتحمل دیته فترجع بالناس۔

اے ابوالولید! کیا تم چاہتے ہو کہ تمام عمر کے لئے ساری نیک نامی تم ہی کو ہاتھ آئے؟ عتبہ نے کہا کیونکر؟ میں نے کہا تم یعنی قریش محمدؐ سے ابن حضرمی کے خون کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے اور وہ تمہارا حلیف تھا اس لئے تم اس کا خون بہا ادا کر دو کہ سب لوگ واپس چلے جائیں۔

عتبہ نے یہ تجویز پسند کی لیکن ابوجہل نے نہ مانا اور حضرمی کے بھائی عامر حضرمی کو بلا کر کہا خون کا بدلہ سامنے ہے، اٹھ کر قوم سے دہائی دو۔ عامر عرب کے دستور کے موافق ننگا ہو گیا اور پکارا۔

واعمراه واعمراه۔ ہائے عمر (حضرمی) ہائے عمر۔

آغاز جنگ کے وقت سب سے پہلے جو شخص میدان جنگ میں نکلا وہ یہی عامر حضرمی تھا۔

حکیم بن حزام اور عامر حضرمی غزوۂ بدر تک کافر تھے، عتبہ و ابوجہل جو سردارانِ قریش تھے کفر پر تادم مرگ قائم رہے۔ اگرچہ اس درجہ کے لوگ غزوۂ بدر کو حضرمی کے خون کا انتقام سمجھتے تھے اور سمجھتے رہے، تو ہم کو کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے کہ اوروں نے جو اس کے سینکڑوں برس بعد پیدا ہوئے اس کا سبب قافلۂ تجارت کا بچانا

---

[1] اصابہ تذکرہ حکیمؓ بن حزام [2] طبری ص ۱۳۱۲ از سیرت ابن ہشام بعنوان ذکر غزوۂ بدر۔

[3] پوری تفصیل طبری ص ۱۳۱۲ تا ۱۳۱۰ میں ہے۔

کما۔ وشتان بینھما

ایک ضروری نکتہ گو یہ امر اب قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ غزوۂ بدر کا سبب کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا تاہم اس گرہ کا کھولنا ضرور ہے کہ ایسے صاف اور صریح واقعہ کے متعلق تمام ارباب سیر نے متفقاً کیوں غلطی کی، اور صحیح بخاری وغیرہ میں یہ تصریحات کیوں پائی جاتی ہیں؟ بدر کی ابتداء قافلہ ہی پر حملہ کرنے کی غرض سے ہوئی تھی۔

اصل یہ ہے کہ اصولِ جنگ کے موافق اکثر غزوات میں یہ ظاہر نہیں کیا جاتا تھا کہ کدھر جانا اور کس غرض سے جانا مقصود ہے، صحیح بخاری (غزوۂ تبوک) میں حضرت کعبؓ بن مالک جو مشہور صحابی ہیں ان کا قول نقل کیا ہے

ولم یکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یرید غزوۃ الا ورّی بغیرھا

(اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تھے تو کسی اور موقع کا توریہ فرماتے تھے

توریہ کے معنی شارحین بخاری نے یہ لکھے ہیں کہ آپ ایسے موقع پر مبہم اور محتمل المعنیین الفاظ استعمال فرماتے تھے۔ گو میرے نزدیک یہ کلیہ اس معنی میں صحیح نہیں تاہم واقعات کے استقصا سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بعض موقعوں پر واقعہ اس طرح مبہم رکھا جاتا تھا کہ لوگ مختلف قیاس پیدا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر میں سعد بن خیثمہؓ کو پہلے ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ قافلہ نہیں بلکہ فوج کا مقابلہ ہے، بخلاف اس کے صحیح بخاری میں ان ہی کعبؓ بن مالک کا قول منقول ہے کہ بدر میں صرف قافلہ سے تعرض کرنا مقصود تھا۔

دیباچہ میں ہم لکھ آئے ہیں کہ راوی (جس میں صحابہؓ بھی داخل ہیں) بہت سے موقعوں پر جو واقعہ بیان کرتا ہے وہ حقیقت میں واقعہ نہیں بلکہ اس کا استنباط ہوتا ہے، یعنی اس نے اس کو یوں ہی سمجھا۔ بدر میں بھی یہی صورت پیش آئی اور اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صحابہؓ نے مختلف قیاس کئے اور جو قیاس مذاقِ عام کے مناسب تھا وہی پھیل گیا۔

بدر کے نتائج بدر کے معرکہ نے مذہبی اور ملکی حالات پر گوناگوں اثرات پیدا کئے اور حقیقت میں یہ اسلام کی ترقی کا قدمِ اولین تھا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے رؤسا جن میں سے ایک ایک اسلام کی ترقی کی راہ میں سدِ آہنی تھا فنا ہوگئے۔ عتبہ اور ابوجہل کی موت نے قریش کی ریاست عامہ کا تاج ابوسفیان کے سر پر رکھا جس سے دولتِ اموی کا آغاز ہوا لیکن قریش کے اصلی زور وطاقت کا معیار گھٹ گیا۔

مدینہ میں اب تک عبداللہ بن ابی بن سلول اعلانیہ کافر تھا۔ لیکن اب بظاہر وہ اسلام کے دائرہ میں آگیا، گو تمام عمر منافق رہا اور اسی حالت میں جان دی۔ قبائل عرب جو سلسلۂ واقعات کا رُخ دیکھتے تھے، اگرچہ رام نہیں ہوتے لیکن سہم گئے۔

ان موافق حالات کے ساتھ مخالف اسباب میں بھی انقلاب شروع ہوگیا، یہود سے معاہدہ ہوچکا تھا کہ وہ ہر معاملہ میں یک سُو رہیں گے، لیکن اس فتح نمایاں نے ان میں حسد کی آگ بھڑکا دی اور وہ اس کو ضبط نہ کرسکے چنانچہ اس کی تفصیل یہودیوں کے واقعات میں بالتفصیل آئی ہے۔

قریش کو پہلے صرف حضرمی کا رونا تھا، بدر کے بعد ہر گھر ماتم کدہ تھا اور مقتولین بدر کے انتقام کے لئے مکہ کا بچہ بچہ مضطر تھا چنانچہ سویق کا واقعہ اور اُحد کا معرکہ اسی جوش کا مظہر تھا۔

غزوہ سویق، ذی الحجہ ۲ھ

ابوسفیان اب قریش کا رئیس تھا، اس منصب کا سب سے بڑا فرض عتبہ؛ بدر کا انتقام تھا، اس نے بدر سے مشرکین کی واپسی پر منت مانی تھی کہ جب تک مقتولانِ بدر کا انتقام نہ لے لے گا غسل جنابت نہ کرے گا، نہ سر میں تیل ڈالے گا، چنانچہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینہ پر بڑھا۔ یہود کی نسبت معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں مدد دیں گے، اس نے پہلے حیی بن اخطب کے پاس گیا لیکن اس نے دروازہ کھولا نہیں، مایوس ہو کر سلام بن مشکم کے پاس آیا وہ یہود بنی نضیر کا سردار تھا اور تجارتی خزانہ اسی کے زیر اہتمام رہتا تھا اس نے بڑے جوش سے استقبال کیا خوشگوار کھانے کھلائے، شراب پلائی، مدینہ کے مخفی راز بتائے۔ صبح کو ابوسفیان عُریض پر حملہ آور ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ ایک انصاری کو جن کا نام سعدؓ بن عمرو تھا قتل کیا، چند مکانات اور گھاس کے انبار جلا دیئے۔ ان باتوں سے اس کے نزدیک قسم پوری ہو گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ کو خبر ہوئی تو آپ نے تعاقب کیا۔ ابوسفیان کے پاس رسد کا سامان صرف ستو تھا، گھبراہٹ میں ستو کے بورے پھینکتا گیا جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ عربی میں ستو کو سویق کہتے ہیں، اس لئے یہ واقعہ غزوۂ سویق کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت فاطمہ زہراؓ کی شادی ذی الحجہ ۲ھ

حضرت فاطمہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں سب سے کم سن تھیں، اب ان کی عمر اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے، ابن سعدؒ نے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ جو خدا کا حکم ہوگا، پھر حضرت عمرؓ نے جرأت کی، ان کو بھی آپ نے کچھ جواب نہیں دیا، بلکہ وہی الفاظ فرمائے، لیکن بظاہر یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی، حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں ابن سعد کی اکثر روایتیں حضرت فاطمہؓ کے حال میں روایت کی ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہرحال حضرت علیؓ نے جب درخواست کی تو آپ نے حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی، وہ چپ رہیں، یہ ایک طرح کا اظہار رضا تھا آپ نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا ہے، بولے کچھ نہیں، آپ نے فرمایا، اور وہ حطمیہ زرہ کیا ہوئی؟ (جنگ بدر میں ہاتھ آئی تھی) عرض کی وہ تو موجود ہے آپ نے فرمایا بس وہ کافی ہے۔

ناظرین کو خیال ہوگا کہ بڑی قیمتی چیز ہوگی، لیکن اگر وہ اس کی مقدار جاننا چاہتے ہیں تو جواب یہ ہے کہ صرف سواسو[1] روپیے زرہ کے سوا اور جو کچھ حضرت علیؓ کا سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک بوسیدہ یمنی چادر تھی حضرت علیؓ نے یہ سب سرمایہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے نذر کیا حضرت علیؓ اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پاس رہتے تھے شادی کے بعد ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں حضرت حارثہ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے جن میں سے وہ کئی

---

[1] غلطی سے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سوا دو نے چھپ گیا ہے اس کی تصحیح کر دی جاتی ہے۔ س

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نذر کر چکے تھے، حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ انہی سے کوئی اور مکان دلوا دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کہاں تک، اب ان سے کہتے شرم آتی ہے۔ حضرت حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضورؐ میں اور میرے پاس جو کچھ ہے سب آپؐ کا ہے۔ خدا کی قسم! میرا جو مکان آپ لے لیتے ہیں مجھ کو اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جاتے۔ غرض انہوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا حضرت فاطمہؓ اس میں اٹھ گئیں۔

شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عالم کو جو جہیز دیا، وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے، ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور دو مٹی کے گھڑے تھے۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا لیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے[1]، دروازہ پر کھڑے ہو کر اذن مانگا، پھر اندر آئے، ایک برتن میں پانی منگوایا، دونوں ہاتھ اس میں ڈالے اور حضرت علیؓ کے سینے اور بازوؤں پر پانی چھڑکا، پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں، ان پر بھی پانی چھڑکا، اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سے سب سے افضل تر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔

واقعات متفرقہ سنہ ۲ھ

رزین کے بیان کے مطابق اسی سال رمضان مبارک کے روزے فرض ہوئے۔ صدقۂ عیدالفطر کا حکم بھی اسی سال سے جاری ہوا، پہلے آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس میں اس صدقہ کے فضائل بیان فرمائے، پھر صدقہ کا حکم دیا۔

عیدالفطر کی نماز باجماعت عیدگاہ میں بھی اسی سال ادا فرمائی، اس سے پہلے عید کی نماز نہیں ہوتی تھی۔

ارباب سیر کی ترتیب کے مطابق غزوۂ بنی قینقاع کا ذکر بھی اسی سال کے واقعات میں ہونا چاہیے تھا لیکن اتصال و تسلسل واقعہ کی بنا پر وہ آئندہ مذکور ہوگا

⁂

---

[1] یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد و اصابہ سے ماخوذ ہے۔

سنہ ۳ھ

غزوۂ احد[1]

وَلَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (آل عمران ۱۴۰)[2]

عرب میں صرف ایک شخص کا قتل لڑائی کا ایک سلسلہ چھیڑ دیتا تھا جو سیکڑوں برس تک ختم نہیں ہو سکتا تھا فریقین میں سے جس کو شکست ہوتی تھی وہ انتقام کو ایسا فرض موبد جانتا تھا جس کے ادا کئے بغیر اس کی ہستی قائم نہیں رہ سکتی تھی، بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے تھے جن میں اکثر وہ تھے جو قریش کے تاج و افسر تھے اس بنا پر تمام مکہ جوش انتقام سے لبریز تھا قریش کا کاروان تجارت جو جنگ بدر کے زمانہ میں نفع کثیر کے ساتھ شام سے واپس آرہا تھا، اس کا راس المال حصہ داروں کو تقسیم کر دیا گیا تھا لیکن زر منافع امانت کے طور پر محفوظ تھا

قریش کو کشتگان بدر کے ماتم سے فرصت ملی تو اس فرض کے ادا کا خیال آیا چند سرداران قریش جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، ان لوگوں کو جن کے عزیز و اقارب جنگ بدر میں قتل ہو چکے تھے، ساتھ لے کر ابوسفیان کے پاس گئے اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہماری قوم کا خاتمہ کر دیا، اب انتقام کا وقت ہے ہم چاہتے ہیں کہ مال تجارت کا جو نفع اب تک جمع ہے وہ اس کام میں صرف کیا جائے۔ یہ ایک ایسی درخواست تھی جو پیش ہونے سے پہلے قبول کر لی گئی تھی لیکن قریش کو اب مسلمانوں کے قوت و زور کا اندازہ ہو چکا تھا وہ جانتے تھے کہ جنگ بدر میں جس سامان سے وہ گئے تھے اس سے اب کچھ زیادہ درکار ہے، عرب میں جوش پھیلانے اور دلوں کے گرمانے کا سب سے بڑا آلہ شعر تھا قریش میں دو شاعر، شاعری میں مشہور تھے، عمرو جمحی اور مسافع، عمرو جمحی غزوۂ بدر میں گرفتار ہوگیا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقتضائے رحم سے اس کو رہا کر دیا تھا قریش کی درخواست پر وہ اور مسافع مکہ سے نکلے، اور تمام قبائل قریش میں اپنی آتش بیانی سے آگ لگا آئے۔

لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوش جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونان حرم تھیں جس لڑائی میں خاتونیں ساتھ ہوتی تھیں، عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوگی تو عورتیں بے حرمت ہوں گی، بہت سی عورتیں ایسی تھیں جن کی اولاد جنگ بدر میں قتل ہو چکی تھی اس لئے وہ خود جوش انتقام سے لبریز تھیں اور انھوں نے منتیں مانی تھیں کہ اولاد کے قاتلوں کا خون پی کر دم لیں گے، غرض جب فوجیں تیار ہوئیں تو بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتیں بھی فوج میں شامل ہوئیں، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں[3]۔

---

[1] مدینہ منورہ سے شمالی جانب قریباً ڈیڑھ دو میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ کا نام ہے [2] صحیح بخاری باب غزوۂ احد میں ہے کہ یہ آیت غزوۂ احد میں نازل ہوئی [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳۸۵، زرقانی ج ۲ صفحہ ۳ نے ان چھ خواتین کے سوا سلافہ بنت سعد و عمرہ بنت علقمہ دو اور خاتونوں کا ذکر کیا ہے ان میں خناس و عمرہ کے سوا باقی خواتین بعد کو مسلمان ہوگئیں۔ خناس اور عمرہ کے اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں (زرقانی علی المواہب ۲۔ س)

۱۔	ہند	عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ماں۔
۲۔	اُم حکیم	عکرمہ (فرزند ابوجہل) کی بیوی۔
۳۔	فاطمہ (بنت ولید)	حضرت خالد کی بہن۔
۴۔	برزۃ	مسعود ثقفی (جو طائف کا رئیس تھا) اس کی بیٹی۔
۵۔	ریطۃ	عمرو بن العاص کی زوجہ۔
۶۔	خناس	حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں۔

حضرت حمزہؓ نے ہند کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا۔ جبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، اس بنا پر ہند نے وحشی کو جو جبیر کا غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتا تھا حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگزاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔

حضرت عباسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا گو اسلام لا چکے تھے لیکن اب تک مکہ ہی میں مقیم تھے انھوں نے تمام حالات لکھ کر ایک تیز رو قاصد کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجے اور قاصد کو تاکید کی کہ تین رات دن میں مدینہ پہنچ جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے پانچویں شوال ۳ھ کو دو خبر رساں جن کے نام انس اور مونس تھے خبر لانے کے لئے بھیجے، انھوں نے آ کر اطلاع دی کہ قریش کا لشکر مدینہ کے قریب آ گیا اور مدینہ کی چراگاہ (عریض) کو ان کے گھوڑوں نے صاف کر دیا۔ آپ نے حبابؓ بن منذر کو بھیجا کہ فوج کی تعداد کی خبر لائیں، انھوں نے آ کر صحیح تخمینہ سے اطلاع دی، چونکہ شہر پر حملہ کا اندیشہ تھا، ہر طرف پہرے بٹھا دیئے گئے۔ حضرت سعدؓ ابن عبادۃ اور حضرت سعدؓ بن معاذ ہتھیار لگا کر تمام رات مسجد نبوی کے دروازہ پر پہرہ دیتے رہے۔

صبح کو آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے عموماً اور انصار میں سے اکابر نے رائے دی کہ عورتیں باہر قلعے میں بھیج دی جائیں اور شہر میں پناہ گزین ہو کر مقابلہ کیا جائے۔ عبداللہ بن ابی سلول جو اب تک کبھی شریک مشورہ نہیں کیا گیا تھا اس نے بھی یہی رائے دی، لیکن ان نوخیز صحابہؓ نے جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے اس بات پر اصرار کیا کہ شہر سے نکل کر حملہ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر تشریف لائے، اب لوگوں کو ندامت ہوئی کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا، سب نے عرض کی کہ ہم اپنی رائے سے باز آتے ہیں، ارشاد ہوا کہ پیغمبر کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے۔

قریش بدھ کے دن مدینہ کے قریب پہنچے اور کوہ احد پر پڑاؤ ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن نماز جمعہ پڑھ کر ایک ہزار صحابہ کے ساتھ شہر سے نکلے، عبداللہ بن ابی تین سو کی جمعیت لے کر آیا تھا، لیکن یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میری رائے نہ مانی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اب صرف سات سو صحابہؓ رہ گئے ان میں ایک سو زرہ پوش تھے، مدینہ سے نکل کر فوج کا جائزہ لیا گیا اور جو لوگ کمسن تھے واپس کر دیئے گئے۔ ان میں حضرت

لہ طبری ج ۳ ص [illegible] مطبوعہ یورپ، خمیس، زرقانی ج ۲ صفحہ [illegible]۔

زیدؓ بن ثابت، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت ابو سعید خدریؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمر اور حضرت عرابہ اوسی بھی تھے لیکن جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب حضرت رافعؓ بن خدیج سے کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی ترکیب چل گئی اور وہ لے لئے گئے۔ سمرۃ ایک نوجوان جو ان کے ہم سن تھا انھوں نے یہ دلیل پیش کی کہ میں رافعؓ کو لڑائی میں پچھاڑ لیتا ہوں اس لئے اگر ان کو اجازت ملتی ہے تو مجھ کو بھی ملنی چاہیئے دونوں کا مقابلہ کرایا گیا، اور سمرہؓ نے رافعؓ کو زمین پر دے مارا اس بنا پر ان کو اجازت مل گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی حضرت مصعبؓ بن عمیر کو علم عنایت کیا حضرت زبیرؓ بن العوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے، حضرت حمزہؓ کو اُس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے، پشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں، اس لئے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کہ گو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں، حضرت عبداللہ بن جبیر ان تیر اندازوں کے افسر مقرر ہوئے۔

قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انھوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے، سواروں کا دستہ صفوان بن امیہ کی کمان میں تھا جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیر اندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، دو سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں۔

سب سے پہلے طبل جنگ کے بجائے خاتونانِ قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی بڑھیں جن میں کشتگانِ بدر کا ماتم اور انتقام خون کے رجز تھے، ہند (ابوسفیان کی بیوی) آگے آگے اور چودہ عورتیں ساتھ ساتھ تھیں، اشعار یہ تھے،

نحن بناتُ طارق	ہم آسمانوں کے تاروں کی بیٹیاں ہیں،
نمشي على النمارق	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تُقبلوا نعانق	اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی
او تدبروا نفارق	اور پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے۔

لڑائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ابو عامر جو مدینہ منورہ کا ایک مقبولِ عام شخص تھا اور مدینہ چھوڑ کر مکہ میں آباد ہو گیا تھا، ڈیڑھ سو آدمیوں کے ساتھ میدان میں آیا، اسلام سے پہلے زہد اور پارسائی کی بنا پر تمام مدینہ اس کی عزت کرتا تھا، چونکہ اس کو خیال تھا کہ انصار جب اُس کو دیکھیں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دینگے میدان میں آکر پکارا "مجھ کو پہچانتے ہو؟ میں ابو عامر ہوں" انصار نے کہا "ہاں او بدکار! ہم تجھ کو پہچانتے ہیں خدا تیری آرزو بر نہ لائے"۔

---

[۱] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۳۹۱ (یہ طبری کی روایت ہے لیکن بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافعؓ کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیراندازی میں کمال رکھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی۔ (ابن ہشام ذکر غزوۂ احد و زرقانی ج ۲ صفحہ ۲۹ و ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۱۴) [۲] الاصابہ ص ۹۳

قریش کا علم بردار طلحہ صف سے نکل کر پکارا! کیوں مسلمانو! تم میں کوئی ہے کہ یا مجھ کو جلد دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھوں بہشت میں پہنچ جائے۱۔ حضرت علیؓ مرتضیٰ نے صف سے نکل کر کہا "میں ہوں"، یہ کہہ کر تلوار ماری اور طلحہ کی لاش زمین پر تھی۔ طلحہ کے بعد اس کے بھائی عثمان نے جس کے پیچھے پیچھے عورتیں اشعار پڑھتی آتی تھیں علم ہاتھ میں لیا اور رجز پڑھتا ہوا حملہ آور ہوا

ان علی اہل اللواء حقا	علم بردار کا فرض ہے کہ نیزہ کو خون میں رنگ دے
ان تخضب الصعدۃ او تندقا	یا وہ ٹکرا کر ٹوٹ جائے

حضرت حمزہؓ مقابلہ کو نکلے اور شانہ پر تلوار ماری کہ کمر تک اتر آئی، ساتھ ہی اُن کی زبان سے یہ نکلا کہ میں ساقی حجاج کا بیٹا ہوں۔

اب عام جنگ شروع ہوگئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابودجانہؓ فوجوں کے دل میں گھس گئے اور صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ حضرت ابودجانہؓ عرب کے مشہور پہلوان تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دستِ مبارک میں تلوار لے کر فرمایا کون اس کا حق ادا کرتا ہے؟ اس سعادت کے لیے دفعۃً بہت سے ہاتھ بڑھے لیکن یہ فخر حضرت ابودجانہؓ کے نصیب میں تھا۔ اس غیر متوقع عزت نے اُن کو بادۂ شجاعت سے مست کر دیا۔ سر پر سرخ رومال باندھا اور اکڑتے تنتے ہوئے فوج سے نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن اس وقت پسند ہے۔ حضرت ابودجانہؓ فوجوں کو چیرتے، لاشوں پر لاشے گراتے بڑھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہند سامنے آگئی، اس کے سر پر تلوار رکھ کر اٹھالی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اس قابل نہیں کہ عورت پر آزمائی جائے۔

حضرت حمزہؓ دو دستی تلوار مارتے جاتے تھے اور جس طرف بڑھتے تھے صفیں کی صفیں صاف ہو جاتی تھیں۔ اسی حالت میں سباع غبشانی سامنے آگیا، پکارے کہ او ختانۃ النسا کے بچے! کہاں جاتا ہے، یہ کہہ کر تلوار ماری، وہ خاک پر ڈھیر تھا۔

وحشی جو ایک حبشی غلام تھا اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حمزہؓ کو قتل کرے تو آزاد کر دیا جائے گا، وہ حضرت حمزہؓ کی تاک میں تھا۔ حضرت حمزہؓ برابر آئے تو اس نے چھوٹا سا نیزہ جس کو حربہ کہتے ہیں اور جو حبشیوں کا خاص ہتھیار ہے پھینک کر مارا جو ناف میں لگا اور پار ہوگیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح پرواز کر گئی۲۔

کفار کے علم بردار لڑ لڑ کر قتل ہو جاتے تھے تاہم علم گرنے نہیں پاتا تھا، ایک کے گرنے سے پہلے دوسرا جانباز بڑھ کر علم کو ہاتھ میں لے لیتا۔ ایک شخص نے جس کا نام صواب تھا جب علم ہاتھ میں لیا تو کسی نے بڑھ کر اس زور سے تلوار ماری کہ دونوں ہاتھ ساتھ کٹ کر گر پڑے لیکن وہ قومی علم کو اپنی آنکھوں سے خاک پر نہیں دیکھ سکتا تھا، علم کے گرنے کے ساتھ سینہ کے بل زمین پر گرا اور علم کو سینہ سے دبا لیا۔ اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مارا گیا کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ علم دیر تک خاک پر پڑا رہا، آخر ایک بہادر خاتون عمرۃ بنت علقمہ، دلیرانہ بڑھی اور علم کو ہاتھ میں لے کر بلند کیا

---

۱ یہ اس بات پر طنز تھا کہ مسلمان ایسا سمجھتے تھے ۲ صحیح بخاری باب قتل حمزہ صفحہ ۵۸۳ ۳ ابن ہشام و طبری [illegible]

یہ دیکھ کر ہر طرف سے قریش سمٹ آئے، اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم گئے، ابو عامر کفار کی طرف سے لڑ رہا تھا، مگر اس کے بیٹے حضرت حنظلہؓ اسلام لا چکے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باپ کے مقابلہ میں لڑنے کی اجازت مانگی، لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا باپ پر تلوار اٹھائے، حضرت حنظلہؓ نے کفار کے سپہ سالار (ابوسفیان) پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ ان کی تلوار ابوسفیان کا فیصلہ کر دے، دفعتاً پہلو سے شداد بن الاسود نے جھپٹ کر ان کے وار کو روکا اور ان کو شہید کر دیا، تاہم لڑائی کا پلہ مسلمانوں ہی کی طرف تھا، علمبرداروں کے قتل اور حضرت علیؓ اور حضرت ابو دجانہؓ کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، مبارز نازنینیں جو دف تیز سے دلوں کو ابھار رہی تھیں بدحواسی کے ساتھ پیچھے ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں نے لوٹ شروع کر دی، یہ دیکھ کر تیر انداز جو پشت پر مقرر کئے گئے تھے، وہ بھی غنیمت کی طرف جھکے

حضرت عبد اللہؓ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ رک نہ سکے، تیر اندازوں کی جگہ خالی دیکھ کر خالد نے عقب سے حملہ کیا، عبد اللہؓ بن جبیر چند جانبازوں کے ساتھ جم کر لڑے لیکن سب کے سب شہید ہو گئے، اب راستہ صاف تھا، خالد نے سواروں کے دستہ کے ساتھ نہایت بے جگری سے حملہ کیا، لوگ لوٹنے میں مصروف تھے، مڑ کر دیکھا تو تلواریں برس رہی ہیں، بدحواسی میں دونوں فوجیں اس طرح باہم مل گئیں کہ خود مسلمان مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت مصعبؓ بن عمیر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صورت میں مشابہ اور علمبردار تھے، ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا اور غل مچ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت پائی، اس آواز سے عام بدحواسی چھا گئی، بڑے بڑے دلیروں کے پاؤں اکھڑ گئے، بدحواسی میں اگلی صفیں پچھلی صفوں پر ٹوٹ پڑیں اور دوست دشمن کی تمیز نہ رہی، حضرت حذیفہؓ کے والد یمان، اس کشمکش میں آ گئے اور ان پر تلواریں برس پڑیں، حضرت حذیفہؓ چلاتے رہے کہ میرے باپ ہیں لیکن کون سنتا تھا، غرض وہ شہید ہو گئے اور حضرت حذیفہؓ نے ایثار کے لہجہ میں کہا، مسلمانو! خدا تم کو بخش دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا تو صرف گیارہ مسلمان پہلو میں تھے جن میں حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت ابو بکرؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت ابو دجانہؓ، حضرت طلحہؓ کا نام بہ تخصیص معلوم ہے[1]، صحیح بخاری میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ رہ گئے تھے۔

اس ہلچل اور اضطراب میں اکثروں نے تو بالکل ہمت ہار دی لیکن جانبازوں کا بھی زور نہیں چلتا تھا جو جہاں تھا وہیں گھر کر رہ گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کو خبر نہ تھی، حضرت علیؓ تلوار چلاتے اور دشمنوں کی صفیں الٹتے جاتے تھے لیکن کعبۂ مقصود (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا پتہ نہ تھا، حضرت انسؓ کے چچا ابن نضر لڑتے بھڑتے موقع سے آگے نکل گئے، دیکھا تو حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیا ہے، پوچھا یہاں کیا کرتے ہو؟ بولے اب لڑ کر کیا کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو شہادت پائی، ابن نضر نے کہا ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے، یہ کہہ کر فوج میں گھس گئے اور لڑ کر شہادت پائی، لڑائی کے بعد جب ان کی لاش دیکھی گئی تو اسی سے زیادہ تیر، تلوار اور نیزے کے زخم تھے، کوئی شخص پہچان نہ سکا، ان کی بہن نے انگوٹھی دیکھ کر پہچانا۔

---

[1] صحیح بخاری غزوہ [illegible] رضی اللہ عنہ [illegible] سیر کی روایت سے صحیح بخاری میں یہ واقعہ مذکور ہے لیکن حضرت عمرؓ کا نام نہیں۔

جاں نثارانِ خاص برابر لڑتے جاتے تھے لیکن نگاہیں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھونڈتی تھیں۔ سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک کی نظر پڑی، چہرۂ مبارک پر مغفر تھا لیکن آنکھیں نظر آتی تھیں، حضرت کعبؓ نے پہچان کر پکارا "مسلمانو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں"[1] یہ سُن کر ہر طرف سے جاں نثار ٹوٹ پڑے۔ کفار نے اب ہر طرف سے ہٹ کر اسی رُخ پر زور دیا۔ دل کا دل ہجوم کر کے بڑھتا تھا لیکن ذوالفقار کی بجلی سے یہ بادل پھٹ پھٹ کر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ہجوم ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کون مجھ پر جان دیتا ہے؟" زیادؓ بن سکن پانچ انصاری لے کر اس خدمت کے ادا کرنے کے لیے بڑھے اور ایک ایک نے جانبازی سے لڑ کر جانیں فدا کر دیں۔ حضرت زیادؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان کا لاشہ قریب لاؤ۔ لوگ اٹھا کر لائے۔ کچھ کچھ جان باقی تھی، قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دی[2]

بچہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے کہ بوقتِ جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

ایک بہادر مسلمان اس عالم میں بھی بے پروائی کے ساتھ کھڑا کھجوریں کھا رہا تھا، اس نے بڑھ کر پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ آپ نے فرمایا جنت میں۔ اس بشارت سے بے خود ہو کر وہ اس طرح کفار پر ٹوٹ پڑا کہ مارا گیا[3]۔

عبد اللہ بن قمیہ جو قریش کا مشہور بہادر تھا، صفوں کو چیرتا پھاڑتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگیا اور چہرۂ مبارک پر تلوار ماری، اس کے صدمہ سے مغفر کی دو کڑیاں چہرۂ مبارک میں چبھ کر رہ گئیں۔ چاروں طرف سے تلواریں اور تیر برس رہے تھے، یہ دیکھ کر جاں نثاروں نے آپ کو دائرہ میں لے لیا، ابو دجانہؓ جھک کر سپر بن گئے۔ اب جو تیر آتے تھے ان کی پیٹھ پر آتے تھے۔ حضرت طلحہؓ نے تلواروں کو ہاتھ پر روکا، ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا بے درد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تیر برسا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے

ربِّ اغفر قومی فانھم لا یعلمون اے خدا میری قوم کو بخش دے وہ جانتے نہیں۔[4]

حضرت ابو طلحہؓ جو حضرت انسؓ کے علاتی باپ تھے، مشہور تیر انداز تھے، انھوں نے اس قدر تیر برسائے کہ دو تین کمانیں اُن کے ہاتھ میں ٹوٹ ٹوٹ کر رہ گئیں، انھوں نے سپر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر اوٹ کر لیا تھا کہ آپ پر کوئی وار نہ آنے پائے، آپ کبھی گردن اٹھا کر دشمنوں کی فوج کی طرف دیکھتے تو عرض کرتے کہ آپ گردن نہ اٹھائیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر لگ جائے، میرا سینہ سامنے ہے[5]۔ حضرت سعدؓ بن وقاص بھی مشہور تیر انداز تھے اور اس وقت آپ کے رکاب میں حاضر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ترکش ان کے آگے ڈال دیا اور فرمایا "تم پر میرے ماں باپ قربان۔ تیر مارتے جاؤ[6]"

اسی حالت میں آپ کی زبان سے عبرت کے لہجہ میں یہ لفظ نکلا "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۵ و صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۱۰۰، باب ثبوت الجنۃ للشہید۔ [2] صحیح مسلم غزوۂ احد میں ہے کہ سات انصاری تھے اور ساتوں نے باری باری اپنی جانیں فدا کیں۔ [3] بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۹۔ [4] صحیح مسلم غزوۂ احد ج ۲ ص ۱۰۸۔ [5] صحیح بخاری صفحہ ۵۸۱۔ [6] صحیح بخاری غزوۂ احد صفحہ ۵۸۰۔

کرتی ہے ۔ بارگاہِ خداوندی میں یہ الفاظ ناپسند ہوئے اور یہ آیت اتری

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ۔ تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں

چنانچہ صحیح بخاری غزوۂ احد میں یہ واقعہ مذکور ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثابت قدموں کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے کہ دشمن ادھر نہیں آسکتے تھے ۔ ابوسفیان نے دیکھ لیا، فوج لے کر پہاڑی پر چڑھا لیکن حضرت عمرؓ اور چند صحابہؓ نے پتھر برسائے جس سے وہ آگے نہ بڑھ سکا۔

آپ کی وفات کی خبر مدینہ میں پہنچی تو اخلاص شعار نہایت بے تابی کے ساتھ دوڑے، جناب فاطمہ زہراؓ نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علیؓ سپر میں بھر کر پانی لائے۔ جناب سیدہؓ دھوتی تھیں لیکن خون نہیں تھمتا تھا، بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلایا اور زخم پر رکھ دیا، خون فوراً تھم گیا

ابوسفیان سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پکارا کہ یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟

آپ نے حکم دیا، کوئی جواب نہ دے۔ ابوسفیان نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کا نام لے کر پکارا اور جب کچھ آواز نہ آئی تو پکار کر بولا سب مارے گئے۔ حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا، بول اٹھے ”او دشمنِ خدا ہم سب زندہ ہیں“

ابوسفیان نے کہا۔

اُعْلُ هُبَلُ ۔ اے ہبل تو اونچا رہ۔

صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کہا

اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلُّ ۔ خدا اونچا اور بڑا ہے۔

ابوسفیان نے کہا۔

لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ ۔ ہمارے پاس عزیٰ ہے تمہارے پاس نہیں۔

صحابہؓ نے کہا،

اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ ۔ خدا ہمارا آقا ہے اور تمہارا کوئی آقا نہیں۔

ابوسفیان نے کہا، آج کا دن بدر کے دن کا جواب ہے۔ فوج کے لوگوں نے مردوں کے ناک کان کاٹ لیے ہیں، میں نے یہ حکم نہیں دیا تھا، لیکن مجھ کو معلوم ہوا تو کچھ رنج بھی نہیں[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مستورات اور بچوں کو حضرت یمانؓ اور حضرت ثابتؓ کی حفاظت میں مدینہ کے پاس کے قلعوں میں بھیج دیا تھا۔ ان لوگوں کو شکست کی خبر معلوم ہوئی تو سب کو چھوڑ کر احد کی طرف بڑھے حضرت ثابتؓ مشرکوں کے ہاتھ سے مارے گئے، حضرت یمانؓ کو مسلمان ہجوم عام میں پہچان نہ سکے اُن پر تلواریں برس پڑیں۔ اُن کے صاحبزادے حضرت حذیفہؓ نے ہرچند ”ہاں ہاں“ کہا اور بتایا کہ میرے باپ ہیں لیکن ہنگامہ

---

[1] [illegible] صحیح بخاری غزوۂ احد [illegible] تفصیل [illegible] غزوۂ احد کے ذکر میں ہے

ین کون سنتا تھا، حذیفہؓ یہ کہہ کر رہ گئے کہ مسلمانو! خدا تمہارے اس گناہ کو بخش دے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یمانؓ کا خون بہا مسلمانوں کی طرف سے ادا کرنا چاہا لیکن حضرت حذیفہؓ نے معاف کر دیا۔ ابن ہشام یں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے۔ صحیح بخاری میں بھی ہے لیکن مختصر ہے۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ ان کے ناک کان کاٹ لیے۔ ہندؓ (حضرت امیر معاویہؓ کی ماں) نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی، لیکن گلے سے اُتر نہ سکا اس لئے اُگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر خوار لکھا جاتا ہے، اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ ہند فتح مکہ میں ایمان لائی۔ جس طرح ایمان لائی وہ عبرت خیز ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اس غزوہ میں اکثر خاتونانِ اسلام نے بھی شرکت کی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت امِ سلیمؓ جو حضرت انسؓ کی ماں تھیں زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو دیکھا کہ پائنچے چڑھائے ہوئے مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔ مشک خالی ہو جاتی تھی تو جا کر بھر لاتی تھیں[1]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام سلیطؓ نے بھی جو حضرت ابو سعید خدریؓ کی ماں تھیں یہی خدمت انجام دی[2]۔

عین اس وقت جب کہ کافروں نے عام حملہ کر دیا تھا اور آپؐ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تھے حضرت ام عمارہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئیں اور سینہ سپر ہو گئیں۔ کفار جب آپؐ پر بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ ابن قمیہ جب دراتا ہوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا تو حضرت ام عمارہؓ نے بڑھ کر روکا، چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا۔ انھوں نے بھی تلوار ماری لیکن وہ دُہری زرہ پہنے ہوئے تھے اس لئے کارگر نہ ہوئی[3]۔

حضرت صفیہؓ (حضرت حمزہؓ کی بہن) شکست کی خبر سن کر مدینہ سے نکلیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے صاحبزادے حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں، لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہو رہیں اور مغفرت کی دعا مانگی[4]۔

انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر سب اس معرکہ میں مارے گئے تھے، باری باری تین سخت حادثوں کی صدا اس کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی۔ لیکن وہ ہر بار صرف یہی پوچھتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں! لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آکر چہرۂ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی[5]

---

[1] صفحہ ۵۸۱ کتاب المغازی غزوۂ احد [2] صحیح بخاری صفحہ ۵۸۲ ذکر ام سلیطؓ [3] ابن ہشام صفحہ ۵۶۴، مطبع محمد علی مصر [4] طبری (۱۴۲۱) [5] طبری صفحہ ۱۴۲۵۔

کل مصیبۃ بعدک جلل
تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا
اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

مسلمانوں کی طرف سے ستر آدمی مارے گئے، جن میں زیادہ تر انصار تھے لیکن مسلمانوں کے افلاس کا یہ حال تھا کہ اتنا کپڑا بھی نہ تھا کہ شہداء کی پردہ پوشی ہو سکتی۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر ایک صحابی تھے کہ ان کا پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا اور سر چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتا، آخر پاؤں اذخر کی گھاس سے چھپا دیئے گئے۔ یہ وہ حیرت انگیز منظر تھا کہ بعد کو بھی یہ ذکر مسلمانوں کو یاد آجاتا تو آنکھیں تر ہو جاتیں۔ شہداء بے غسل اسی طرح خون میں لتھڑے ہوئے دو دو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کئے گئے۔ جس کو قرآن زیادہ یاد ہوتا اس کو مقدم کیا جاتا۔ ان شہداء پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی[1][2]۔ آٹھ برس کے بعد وفات سے ایک دو برس پہلے جب آپ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپ پر رقت طاری ہوئی اور اس طرح آپ نے پُر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہو اور اس کے بعد آپ نے خطبہ دیا کہ مسلمانو! تم سے یہ خوف نہیں کہ پھر مشرک بن جاؤ گے لیکن یہ ڈر ہے کہ دنیا میں نہ پھنس جاؤ۔[3]

دونوں فوجیں جب میدان سے الگ ہوئیں تو مسلمان زخم سے چور تھے تاہم یہ خیال کر کے کہ ابو سفیان مسلمانوں کو مغلوب سمجھ کر دوبارہ حملہ آور نہ ہو، آپ نے مسلمانوں کی طرف روئے خطاب کر کے فرمایا کہ کون ان کا تعاقب کرے گا، فوراً ستر آدمیوں کی ایک جماعت اس مہم کے لئے تیار ہو گئی جن میں حضرت ابوبکرؓ و زبیرؓ بھی داخل تھے۔[4]

ابو سفیان احد سے روانہ ہو کر جب مقام روحا پہنچا، یہاں خیال آیا کہ کام ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے گمان تھا، دوسرے ہی دن آپ نے اعلان کرا دیا کہ کوئی واپس نہ جائے، چنانچہ حمراء الاسد تک جو مدینہ سے ۸ میل ہے تشریف لے گئے۔ قبیلہ خزاعہ اس وقت تک ایمان نہیں لایا تھا لیکن در پردہ اسلام کا طرف دار تھا۔ اس کا رئیس معبد خزاعی شکست کی خبر سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہاں جا کر ابو سفیان سے ملا۔ ابو سفیان نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، معبد نے کہا میں دیکھتا آتا ہوں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس سر و سامان سے آرہے ہیں کہ ان کا مقابلہ ناممکن ہے، غرض ابو سفیان واپس گیا۔[5]

یہی واقعہ ہے جس کو مؤرخین نے تکثیر غزوات کے شوق میں ایک نیا غزوہ بنا لیا ہے اور حمراء الاسد کا ایک نیا عنوان قائم کیا ہے۔

---

[1] یہ صحیح بخاری کی روایت ہے لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہؓ پر تو خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہداء پر بھی نماز جنازہ پڑھی۔ یہ شہداء ایک ایک کر کے اور بعض نو نو دس دس کر کے لائے جاتے تھے اور آپ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے اور حضرت حمزہؓ کی لاش مبارک ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی۔ (شرح معانی الآثار طحاوی باب الصلوٰۃ علی الشہداء و نصب الرایہ زیلعی باب احادیث الصلوٰۃ علی الشہید و مغازی واقدی ص ۳۰۰ مطبوعہ کلکتہ)

[2] یہ تمام واقعات صحیح بخاری غزوہ احد کے متفرق ابواب میں ہیں۔

[3] بخاری صفحہ ۵۸۴۔

[4] طبری صفحہ ۱۴۲۸، ۱۴۲۹

[5] مسند احمد ج ۲ ص ۸۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو تمام مدینہ ماتم کدہ تھا۔ آپ جس طرف سے گزرتے تھے گھروں سے ماتم کی آوازیں آتی تھیں۔ آپ کو عبرت ہوئی کہ سب کے عزیز و اقارب ماتم داری کا فرض ادا کر رہے ہیں، لیکن حمزہؓ کا کوئی نوحہ خواں نہیں ہے۔ رقت کے جوش میں آپ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

اما حمزۃ فلا بواکی له[۱] لیکن حمزہؓ کا کوئی رونے والا نہیں۔

انصار نے یہ الفاظ سنے تو تڑپ اٹھے۔ سب نے جا کر اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو دروازہ پر پردہ نشینانِ انصار کی بھیڑ تھی اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند تھا۔ ان کے حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا تمہاری ہمدردی کا شکر گزار ہوں، لیکن مُردوں پر نوحہ کرنا جائز نہیں (عرب میں دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بین کرتی تھیں، کپڑے پھاڑ لیتی تھیں، گال نوچتی، گالوں پر تھپڑ مارتی تھیں اور چیخنی چلاتی تھیں۔ یہ رسم بد اسی دن سے بند کر دی گئی اور فرمایا گیا کہ آج سے کسی مُردہ پر نوحہ نہ کیا جائے یہ بھی بعد کو ارشاد ہوا کہ اس طرح ماتم کرنا مسلمان کی شان نہیں[۲])

(قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں غزوۂ اُحد کا مفصل ذکر موجود ہے)

واقعات متفرقہ ۳ھ اسی سال یعنی ۳ھ میں حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ رمضان کی پندرہویں تاریخ تھی، اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ سے جو حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں اور غزوۂ بدر کے زمانہ میں بیوہ ہو گئی تھیں نکاح کیا۔ اسی سال حضرت عثمانؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے شادی کی۔

وراثت کا قانون بھی اسی سال نازل ہوا۔ اب تک وراثت میں ذوی الارحام کا کوئی حصہ نہ تھا، انکے حقوق کی بھی تفصیل کی گئی۔ مشرکہ کا نکاح مسلمان سے اب تک جائز تھا، اس سال اس کی بھی تحریم نازل ہوئی۔

*

---

[۱] ابن ہشام (غزوہ احد) اور مسند احمد (ج ۲ ص ۸۴) [۲] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

۴ھ

سلسلۂ غزوات و سرایا

تمام قبائل عرب بجز ایک دو کے اسلام کے دشمن تھے۔ دشمنی زیادہ تر اس بنا پر تھی کہ ہر قبیلہ بت پرستی کو اپنا دین و آئین سمجھتا تھا، اسلام اسی کو مٹاتا تھا، اس کے ساتھ قریش کا اثر تمام عرب پر تھا، حج کے زمانہ میں تمام قبائل مکہ میں جمع ہوتے تھے اور قریش ان کو اسلام کی دشمنی پر برانگیختہ کرتے تھے، ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ تمام قبائل کی وجہ معاش لوٹ اور غارت گری تھا اور اسلام اس کو صرف قولاً بلکہ عملاً بھی روکتا تھا اس لئے وہ جانتے تھے کہ اسلام اگر قائم ہو گیا تو ہمارے ذرائع معاش بند ہو جائیں گے۔ تاہم بدر کی فتح نے ایک عام رعب بٹھا دیا تھا جس کی وجہ سے تمام قبیلے اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھ گئے۔ لیکن احد کی شکست نے حالت بدل دی اور دوبارہ تمام قبائل دفعۃً اٹھ کھڑے ہوئے۔ سیرت نبوی میں سرایا (چھوٹی چھوٹی لڑائیوں) کا جو ایک وسیع سلسلہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے اسی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ عام مورخوں نے اگرچہ اپنی عادت کے موافق ان لڑائیوں کے ذکر میں ان کے اسباب سے بحث نہیں کی لیکن ابن سعد نے طبقات میں اور اور ائمہ فن نے قریباً ہر واقعہ کا سبب لکھ دیا ہے۔ یعنی کسی خاص قبیلے نے مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدافعت کے لئے فوجیں بھیجیں۔

سریہ ابی سلمہ

۱۔ سب سے پہلے محرم ۴ھ میں طلحہ اور خویلد نے اپنے قبیلہ کو جو فید کے کوہستانی علاقہ قطن میں رہتا تھا مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابو سلمہ کو ایک سو پچاس مہاجرین اور انصار کے ساتھ اس طرف روانہ کیا، یہ خبر سن کر ان کی جماعت منتشر ہو گئی۔[2]

سریہ ابن انیس

۲۔ اس کے بعد محرم ۴ھ میں سفیان بن خالد جو قبیلہ لحیان کا تھا اور جو کوہستان عرنہ کا رئیس تھا مدینہ پر حملہ کا قصد کیا۔ اس کے مقابلہ کے لئے آپ نے حضرت عبد اللہ بن انیس کو بھیجا جنھوں نے لطائف الحیل سے موقع حاصل کیا اور سفیان کو قتل کر دیا۔[3]

---

[1] غزوہ اور سریہ میں جو فرق ہے اس کی نسبت علمائے سیرت مختلف الرائے ہیں۔ زیادہ مقبول یہ رائے ہے کہ جس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے وہ غزوہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں صحابہ افسر مقرر کرکے بھیج دیئے جاتے تھے وہ سریہ کہلاتا تھا۔

[2] ابن سعد صفحہ ۳۵ جلد ۲ قسم اول، اصل عبارت یہ ہے۔ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان طلحۃ وسلمۃ ابنی خویلد قد سارا فی قومہما ومن اطاعہما یدعونہم الی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[3] طبقات ابن سعد صفحہ ۳۶۔ اصل عبارت یہ ہے، وذلک انہ بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سفیان بن خالد الہذلی قد جمع الجموع لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

صفر ۴ھ میں ابو براء[1] کلابی جو قبیلۂ کلاب کا رئیس تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ چند لوگوں کو میرے ساتھ کر دیجئے کہ میری قوم کو اسلام کی دعوت دیں۔ آپ نے فرمایا مجھ کو نجد کی طرف سے ڈر[2] ہے۔ ابو براء نے کہا ان کا میں ضامن ہوں۔ آپ نے منظور فرمایا اور ستر انصار ساتھ کر دیئے۔ یہ لوگ نہایت مقدس اور درویش تھے اور اکثر اصحاب صفہ میں سے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ دن بھر لکڑیاں چنتے، شام کو فروخت کر کے کچھ اصحاب صفہ کے نذر کرتے کچھ اپنے لئے رکھتے۔

بیر معونہ

ان لوگوں نے بیر معونہ پہنچ کر قیام کیا اور حرام بن ملحان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دے کر عامر بن طفیل (ابن مالک بن جعفر کلابی عامری) کے پاس بھیجا جو قبیلہ کا رئیس تھا۔ عامر نے حرام کو قتل کر دیا اور آس پاس کے جو قبائل تھے یعنی عُصَیّہ، رعل، ذکوان سب کے پاس آدمی دوڑا دیئے کہ تیار ہو کر آئیں۔ ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا اور عامر کی سرداری میں آگے بڑھا۔ صحابۂ حرام کی واپسی کے منتظر تھے۔ جب دیر لگی تو خود روانہ ہوئے راستہ میں عامر کی فوج کا سامنا ہوا۔ کفار نے ان کو گھیر لیا اور سب[3] کو قتل کر دیا، صرف عمروؓ[4] بن امیہ کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی میں تجھ کو آزاد کرتا ہوں، یہ کہہ کر ان کی چوٹی کاٹی اور چھوڑ دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا۔ مہینہ بھر نماز فجر میں ان ظالموں کے حق میں بددعا کی۔ حضرت عمروؓ بن امیہ نے (واپسی میں راستہ میں) بنی عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا تھا (جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امان دے چکے تھے، مگر حضرت عمروؓ بن امیہ کو اس کا علم نہ تھا، وہ یہ سمجھے کہ ہم نے بنی عامر سے ان کی اس بے وفائی کا بدلہ لے لیا جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے ساتھ کیا ہے) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو آپ نے اس پر ناراضی ظاہر فرمائی اور دونوں کے خون بہا ادا کرنے کا اعلان فرمایا۔[5]

واقعۂ رجیع

انہی دنوں عضل اور قارہ جو دو مشہور قبیلے ہیں، ان کے چند آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا ہے، چند لوگوں کو ہمارے ہاں بھیجئے کہ اسلام کے عقائد اور احکام

---

[1] ابو براء بعد کو اسلام لائے یا نہیں؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے، ذہبی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ وہ اسلام نہیں لائے، اصابہ میں ہے کہ ان کے قبول اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے تاہم بعض روایات کی بنا پر ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسلام لائے تھے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۳۔

[2] اور یہ کچھ بے جا بھی نہ تھا، عامر بن طفیل جو ان اطراف کا رئیس تھا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ میرے تمہارے درمیان تین باتیں ہیں، بادیہ کے مالک تم ہو اور شہروں کا میں ہوں یا اپنے بعد مجھ کو اپنا جانشین بناؤ ورنہ غطفان۔

[3] صحابہ کی اس جماعت میں حضرت کعب بن زید بھی تھے، کفار نے یہ سمجھا کہ یہ بھی شہید ہو گئے ہیں، لیکن ان میں جان باقی تھی اور بعد کو زندہ بچ رہے اور غزوۂ خندق میں شہید ہوئے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۵-۹۶

[4] حضرت عمروؓ بن امیہ اور حضرت منذرؓ بن محمد عقبہ انصاری پیچھے تھے، جب یہ مقام حادثہ پر پہنچے تو حضرت منذرؓ کو شہید کر دیا گیا اور حضرت عمروؓ بن امیہ کو قید کر لیا گیا اور بعد کو وہ چھوڑ دیئے گئے۔ زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۶

[5] البدایہ والنہایہ ابن کثیر جلد ۴ زرقانی ج ۲ صفحہ ۹۳۔

بھیجا ہیں، آپؐ نے دس شخص ساتھ کر دیئے۔ اُن کے سردار حضرت عاصمؓ بن ثابت تھے، یہ لوگ جب مقام رجیع پہنچے جو عُسفان اور مکہ کے وسط میں ہے تو ان غداروں نے بدعہدی کی اور قبیلۂ بنو لحیان کو اشارہ کیا کہ ان کا کام تمام کر دیں، بنو لحیان دو سو آدمی لے کر جن میں ایک سو تیر انداز تھے، ان لوگوں کے تعاقب میں چلے اور ان کے قریب آ گئے۔ ان لوگوں نے بڑھ کر ایک ٹیکرے پر پناہ لی، تیر اندازوں نے ان سے کہا کہ اُتر آؤ، ہم تم کو پناہ دیتے ہیں حضرت عاصمؓ نے کہا، میں کافر کی پناہ میں نہیں آتا، یہ کہہ کر خدا سے خطاب کیا کہ اپنے پیغمبر کو خبر پہنچا دے۔ غرض وہ مع سات آدمیوں کے لڑ کر تیر اندازوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے (قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ عاصمؓ کے بدن سے گوشت کا ایک لوتھڑا کاٹ لائیں کہ ان کی شناخت ہو، قدرتِ خداوندی نے شہید مسلم کی یہ تحقیر گوارا نہ کی، شہد کی مکھیوں نے لاش پر پہرہ ڈال دیا، قریش ناکام پھر گئے) لیکن (تین)[1] شخصوں نے جن (میں سے دو) کے نام حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ (بن الدثنہ) تھے، کافروں کے وعدہ پر اعتماد کیا اور ٹیکرے سے اُتر آئے۔ کافروں نے بدعہدی کر کے ان کی مشکیں کس لیں اور مکہ میں لے جا کر بیچ ڈالا، حضرت خبیبؓ نے جنگِ اُحد میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا، اس لئے ان کو حارث کے لڑکوں[2] نے خرید لیا کہ باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے چند روز ان ہی کے گھر میں رہے، ایک دن حارث کی نواسی کو کھیلا رہے تھے۔ اتفاقؔ سے ہاتھ میں چھری[3] تھی بچی کی ماں اتفاقاً کہیں سے آ گئی۔ دیکھا کہ حضرت خبیبؓ کے ہاتھ میں ننگی چھری ہے، کانپ اٹھی، حضرت خبیبؓ نے کہا۔ کیا تو یہ سمجھی کہ میں اس کو قتل کر دوں گا؟ ہمارا یہ کام نہیں، خاندانِ حارث ان کو حرم کے حدود سے باہر لے گیا اور قتل کرنا چاہا، انھوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ قاتلوں نے اجازت دی۔ انھوں نے دو رکعت نماز پڑھ کر کہا، دیر تک پڑھنے کو جی چاہتا تھا لیکن تم کو خیال ہو گا کہ موت سے ڈرتا ہوں، پھر یہ اشعار پڑھے۔

وما ان ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان للہ مصرعی
وذلک فی ذات الالہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع

جب میں اسلام کیلئے قتل کیا جا رہا ہوں تو مجھ کو اس کی
پرواہ نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤں گا۔ یہ جو کچھ ہے خدا
خدا کے لئے ہے اگر وہ چاہے گا تو جسم کے ان پارہ پارہ
ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا۔

اسی زمانہ سے دستور ہے کہ جب کسی کو قتل کرتے ہیں تو مقتول پہلے دو رکعت نماز ادا

---

[1] بخاری (کتاب المغازی) نے اس موقع پر جو تیسرے بزرگ کا ذکر کیا ہے ان کا نام نہیں لکھا ہے، ابن اسحاق نے ان کا نام حضرت عبداللہؓ بن طارق بتایا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ اسی وقت اسی موقع پر شہید کر دیئے گئے، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ ایمان سے آگے چل کر مکہ کے راستے میں بمقام ظہران ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، زرقانی ج ۲ صفحہ ۶۶۔

[2] حارث کے بیٹے ابو سروعہ جنھوں نے حضرت خبیبؓ کو شہید کیا تھا، بعد کو مسلمان ہوئے اور شرفِ صحابیت سے سرفراز ہوئے زرقانی ج ۲ صفحہ ۶۸۔ [3] صحیح بخاری میں اُسترا لکھا ہے۔

کرلیتا ہے۔ (اور یہ مستحب سمجھا جاتا ہے)

دوسرے صاحب حضرت زیدؓ تھے، ان کو صفوان بن امیہ نے قتل کے ارادہ سے خریدا تھا، ان کے قتل کے وقت قریش کے معزز سردار تماشا دیکھنے آئے، جن میں ابوسفیان بھی تھا جب قاتل نے تلوار ہاتھ میں لی تو ابوسفیان نے کہا "سچ کہنا اس وقت تمہارے بدلے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل کئے جاتے تو کیا تم اس کو اپنی خوش قسمتی نہ سمجھتے" بولے "خدا کی قسم! میں تو اپنی جان کو اس کے برابر بھی عزیز نہیں رکھتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں میں کانٹا چبھ جائے" صفوان کے غلام نسطاس نے ان کی گردن مار دی۔

ان لڑائیوں کا سلسلہ یہود کی لڑائیوں سے مل جاتا ہے اور چونکہ یہود کے واقعات اور ان کی سرگزشت تاریخ اسلام سے گوناگوں تعلقات رکھتی ہے، اس لئے ہم ان کے واقعات مستقل حیثیت سے لکھتے ہیں، اور اس غرض کے لئے کسی قدر ہم کو پچھلے زمانہ کی طرف واپس آنا پڑے گا۔

واقعات متفرقہ ۴ھ

اسی سال شعبان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔

اسی سال ازواج مطہراتؓ میں سے حضرت زینب بنت خزیمہؓ نے انتقال فرمایا جن سے اسی سال نکاح بھی ہوا تھا۔

اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ لیں اور فرمایا کہ مجھ کو یہود پر اطمینان نہیں، تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت زیدؓ نے صرف پندرہ دن میں عبرانی زبان سیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں عبری زبان سے لوگ بہت کچھ آشنا تھے۔

اسی سال شوال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح فرمایا۔

اسی سال یہودیوں نے آپ کے سامنے ایک یہودی کا مقدمہ پیش کیا اور آپ نے توراۃ کے مطابق رجم کا حکم دیا (تفصیل ان واقعات کی دوسرے حصوں میں آئے گی)

بعض مورخین کے نزدیک شراب کی حرمت کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا لیکن اس میں روایتیں نہایت مختلف ہیں، پوری تحقیق احکام شرعیہ کے ذکر میں آئے گی۔

★

لہ طبری صفحہ ۱۴۳۱ وطبقات ابن سعد اشارۃ اور اکثر جزئیات واقعہ صحیح بخاری غزوۃ الرجیع سے لئے گئے ہیں نیز صحیح بخاری ہل یستاسر ومن لم یستاسر وصلی رکعتین عند القتل ۔ اس نماز کے استحباب کی اصل وجہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خبیبؓ کے اس فعل کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کو پسند فرمایا (شرح سیر کبیر سرخسی اول صہ۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس استحسان نے اس نماز کو استحباب کا درجہ عطا فرمایا (الروض الانف ج ۲ صہ۱۷۱) محدثین کی اصطلاح میں اس صورت حال کو تقریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں یعنی حضورؐ کے سامنے کوئی فعل کیا گیا ہو یا حضورؐ کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو اور حضورؐ کو اس کی اطلاع ملی ہو مگر آپؐ نے اس پر انکار نہ فرمایا ہو تو اس سے بھی اس فعل کا مسنون و مستحب یا جائز ہونا سمجھا جاتا ہے (ش) تلہ نسطاس نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ زرقانی ج ۲ صہ۱۲۷ و صہ۷۱۔

یہودیوں کے ساتھ معاہدہ اور جنگ

سنہ ۲ھ و سنہ ۳ھ و سنہ ۴ھ

اوپر گزر چکا ہے کہ یہود مدت دراز سے مدینہ پر فرماں روا تھے۔ انصار نے آکر ان کے ساتھ تعلقات پیدا کئے اور رفتہ رفتہ حریفانہ اقتدار حاصل کیا۔ لیکن جنگِ بعاث نے اُن کی قومی طاقت توڑ دی اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ یہود سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتے۔

یہود کے تین قبیلے تھے، قینقاع، نضیر، قریظہ، یہ سب مدینہ کے اطراف اور حوالی میں آباد تھے اور عموماً زمیندار، دولت مند، تجارت پیشہ اور صناع تھے۔ قینقاع زرگری کا پیشہ کرتے تھے اور چونکہ سب میں زیادہ بہادر اور شجاع تھے اس لئے ہمیشہ اُن کے پاس اسلحۂ جنگ کے ذخیرے تیار رہتے تھے۔ انصار عموماً اُن کے مقروض اور زیر بار رہتے تھے۔ ملکی اور تجارتی افسری کے ساتھ اُن لوگوں کا مذہبی اور علمی اثر بھی تھا۔ انصار عموماً بت پرست اور جاہل تھے اس بنا پر وہ یہود کو عزت کی آنکھ سے دیکھتے اور اُن کو اپنے سے زیادہ مہذب اور شائستہ سمجھتے تھے جن لوگوں کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے وہ منت مانتے تھے کہ ہمارا بیٹا زندہ رہے گا تو ہم اس کو یہودی بنادیں گے[1]۔ چنانچہ مدینہ میں اس قسم کے بہت سے جدید الیہودیۃ موجود تھے۔

یہود میں امتدادِ زمانہ سے نہایت اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہو گئے تھے۔ ان کے امتیازی خصائص زندگی یہ تھے کہ ہر طرف لین دین کا کاروبار پھیلا رکھا تھا اور تمام آبادی اُن کے قرضوں میں زیر بار تھی اور چونکہ تنہا وہی صاحبِ دولت تھے اس لئے نہایت بے رحمی سے سود کی بڑی شرحیں مقرر کرتے تھے اور قرضہ کی کفالت میں لوگوں کے بال بچے یہاں تک کہ مستورات کو رہن رکھواتے تھے۔ کعب اشرف نے خود اپنے انصاری دوستوں سے یہی درخواست کی[2] تھی اور مختلف طریقوں سے لوگوں کے مال اور جائداد پر تصرف کرتے تھے۔

طماعی اور حرص کی شدت سے یہ حالت تھی کہ معصوم بچوں کو دو چار روپے کے زیور کے لئے پتھر سے مار ڈالتے تھے[3]۔ دولت کی بہتات سے زنا اور بدکاری کا عام رواج تھا اور چونکہ زیادہ تر امراء اس کے مرتکب ہوتے تھے اس لئے ان کو سزا نہیں دے سکتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہاری شریعت میں زنا کی سزا صرف دُرّہ مارنا ہے؟ اس نے کہا نہیں بلکہ سنگسار کرنا ہے لیکن ہمارے شرفا میں زنا کی کثرت ہو گئی اور جب کوئی شریف اس جرم میں پکڑا جاتا تو ہم اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ البتہ عام آدمیوں کو یہ

---

[1] ابوداؤد (ج ۲ ص ۹) کتاب الجہاد باب الاسیر [2] بخاری و مسلم ذکر قتل کعب اشرف [3] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۱۰۱۰ کتاب الدیات، باب اذا قتل بحجر او بعصا۔

سزا دیتے تھے۔ بالآخر یہ قرار پایا کہ سنگسار کرنے کی سزا دُرّہ سے بدل دی جائے تاکہ شریف اور رذیل سب کو یکساں سزا دی جاسکے۔

اسلام مدینہ میں آیا تو یہود کو نظر آیا کہ اب اُن کا جابرانہ اور خود غرضانہ اقتدار قائم نہیں رہ سکتا، اسلام جس قدر روز بروز مدینہ میں پھیلتا جاتا تھا۔ اسی قدر یہودیوں کے مذہبی وقار کو جو ان کو مدتوں سے حاصل تھا زوال ہوتا جاتا تھا۔ مدینہ کے مشرکین میں یہودیت جو تدریجاً پھیل رہی تھی دفعۃً رک گئی۔ نئے نئے فتوحات کی بدولت انصار جس قدر دولت مند ہوتے جاتے تھے، یہودیوں کے قرض کے شکنجوں سے آزاد ہوتے جاتے تھے، یہودیوں میں جو اخلاق بد عموماً پھیلے ہوئے تھے اور جن پر دولت مندی اور مذہبی پیشوائی نے پردہ ڈال رکھا تھا، اب ان کا راز فاش ہونے لگا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ ان سے معاہدہ کیا تھا کہ اُن کے جان و مال سے کچھ تعرض نہیں کیا جائے گا اور اُن کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ لیکن منصب نبوت کی حیثیت سے ذمائم اخلاق پر وعظ اور تذکیر آپ کا فرض نبوت تھا۔ قرآن مجید میں اُن کے اخلاق کی پردہ دری پر صاف صاف آیتیں نازل ہوتی تھیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ (مائدہ - ۶)	وہ جھوٹ باتوں کے سننے والے اور مالِ حرام کے بڑے کھانے والے ہیں۔
وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (مائدہ - ۹)	اور تو ان میں سے اکثروں کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں۔
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (نساء - ۲۲)	اور چونکہ یہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ یہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔

ان اسباب نے تمام یہود میں اسلام کی طرف سے سخت ناراضی پھیلادی، انھوں نے طرح طرح سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتیں دینی اور اسلام کے خلاف کوششیں کرنی شروع کیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ ان کی ہر طرح کی ایذا رسانیوں کو برداشت کریں۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۚ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (آل عمران ع ۱۹)	اور اہل کتاب اور مشرکوں سے تم بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے اور اگر صبر کیے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

یہودیوں نے معمول کر لیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ کرتے تو بجائے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ کے اَلسَّامُ عَلَيْكَ کہتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ تجھ کو موت آئے[1]۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں انھوں نے سُنا تو ان کو سخت غصہ آیا اور بے اختیار ہو کر بول اٹھیں کہ کم بختو! تم کو موت آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ

---

[1] اسباب النزول واحدی صفحہ ۱۴۰ مصر و صحیح مسلم ص ۹۴ ذکر رجم الیہود ۲ ہر

وسلم نے فرمایا کہ نرمی سے کام لو، حضرت عائشہؓ نے کہا، آپ نے کچھ سنا بھی کہ لوگوں نے کیا کہا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں، لیکن یہ کافی ہے کہ میں نے علیک کہہ دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف معاملات اور درگزر ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، اکثر معاشرت کی باتوں میں یہود کے ساتھ اتفاق فرماتے اور ان کی مذہبی توقیر قائم رکھنا چاہتے تھے، اہل عرب کی عادت تھی کہ بالوں میں مانگ نکالتے تھے، بخلاف اس کے یہودی بالوں کو یوں ہی چھوڑ دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہودیوں ہی کی موافقت کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے۔

وکان یحب موافقة اهل الکتاب فیما لم یؤمر فیه بشیٔ (ج ۲ ص ۸۷۷ کتاب اللباس باب الفرق) (بخاری)	اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چیزوں میں جن میں کوئی خاص حکم الٰہی نہیں ہوتا تھا اہلِ کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں آپ نے بھی حکم دیا کہ لوگ عاشورہ کا روزہ رکھیں، کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپؐ تعظیماً کھڑے ہو جاتے۔

ایک دفعہ ایک یہودی نے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت اس طرح بیان کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں، اس پر ایک انصاری کو غصہ آگیا، انھوں نے اس کو تھپڑ مارا، یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے فرمایا، مجھ کو اور پیغمبروں پر (ایسی فضیلت نہ دو جس سے ان کا نقص لازم آئے) قیامت کے دن لوگ بے ہوش ہو جائیں گے اور سب سے پہلے مجھ کو ہوش آئے گا، اس وقت میں دیکھوں گا کہ موسیٰؑ عرش کا پایہ تھامے کھڑے ہیں۔

احکامِ الٰہی جو قرآن مجید میں نازل ہو رہے تھے سرتاپا اہلِ کتاب کے ساتھ مدارات اور معاشرت کی ترغیب میں تھے۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ (مائدہ۔ ۱)	اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے۔

عموماً ان کی قدر و منزلت کا خیال دلایا جاتا تھا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ۔ ۵)	اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کا خیال کرو، جو میں نے تم کو دیں اور یہ کہ میں نے تم کو تمام عالم پر فضیلت دی ہے۔

تبلیغ اسلام کی حیثیت سے جو کچھ اس وقت اُن کے سامنے پیش کیا جاتا تھا صرف اس قدر تھا۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ	کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جس کو ہم تم دونوں یکساں مانتے ہیں، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ

---

[1] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے۔ [2] بخاری جلد اول صفحہ ۵۶۲ باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین قدم المدینۃ۔ [3] بخاری ج ۱ ص ۱۷۵۔ [4] کتاب الجنائز [5] بخاری ج ۲ ص ۶۶۷ تفسیر سورۂ اعراف۔

شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْہَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (اٰل عمران-۷)

پوجیں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا رب نہ بنائے تو اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہدو کہ اچھا تم گواہ رہو، ہم تو مسلمان ہیں۔

ان باتوں میں سے ایک بھی اُن کے معتقدات اور مزعومات کے خلاف نہ تھی، لیکن ان تمام مہربانیوں اور اظہارِ لطف و مدارۃ کا جو صلہ تھا یہ تھا کہ انھوں نے ہر طرح سے اسلام کی خانہ براندازی کا عزم کر لیا، اسلام کی عظمت اور وقار کم کرنے کے لئے مشرکوں سے کہتے تھے کہ مذہب میں مسلمانوں سے تو تم ہی اچھے ہو۔

وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ہٰۤؤُلَآءِ اَہْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (نساء-۸)

اور کافروں کی نسبت کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے یہ زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

مذہب اسلام کی بے اعتباری پھیلانے کے لئے یہاں تک آمادہ ہوئے کہ مسلمان ہو کر پھر مرتد ہو جائیں تاکہ لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا؟

وَقَالَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ اَہْلِ الْکِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْہَ النَّہَارِ وَاکْفُرُوْۤا اٰخِرَہٗ لَعَلَّہُمْ یَرْجِعُوْنَ (اٰل عمران-۸)

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔

ان باتوں کے علاوہ اسلام کی بربادی کی مُلکی تدبیریں اختیار کیں، وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کو جو قوت ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انصار کے دو قبیلے اوس اور خزرج جو باہم لڑتے بھڑتے رہتے تھے، اسلام نے باہم ان کو متحد کر دیا ہے۔ ان دونوں کو اگر پھر لڑوایا جائے تو اسلام خود بخود فنا ہو جائے گا۔ عرب میں پچھلی کینہ آوریوں کو تازہ کر دینا نہایت آسان کام تھا، ایک دفعہ دونوں قبیلوں کے بہت سے آدمی جلسہ میں بیٹھ کر بات چیت کر رہے تھے۔ چند یہودیوں نے اس صحبت میں جا کر جنگِ بعاث کا تذکرہ چھیڑا، یہ وہ لڑائی تھی جس میں انصار کے یہ دونوں قبیلے آپس میں لڑے تھے اور اسی لڑائی نے ان کی تمام قوت برباد کر دی تھی، اس لڑائی کے تذکرہ نے دونوں کو پرانے واقعے یاد دلائے اور دفعۃً عداوت کی دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی، لعن طعن سے گزر کر تلواریں کھنچ گئیں۔ حسنِ اتفاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی۔ آپ نے فوراً موقع پر پہنچ کر وعظ و پند سے دونوں فریق کو ٹھنڈا کیا۔ اس پر یہ آیت اتری۔[1]

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ (اٰل عمران-۱۰)

مسلمانو! اگر تم اہل کتاب کے بعض لوگوں کا کہنا مانو گے تو وہ تم کو ایمان لاتے بعد پھر کافر بنا دیں گے۔

منافقین کا ایک گروہ پہلے سے موجود تھا، جو اگرچہ بظاہر مسلمان ہو گیا تھا لیکن درحقیقت اسلام کا سخت

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ للحافظ ابن حجر العسقلانی مطبوعہ مصر ج ۱ صفحہ ۸۸۔

دشمن تھا، اس گروہ کا سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، یہودیوں نے اس کو نہایت آسانی سے درپردہ ملا لیا اور اُن کے ساتھ مل کر سازش شروع کی۔ اتفاق یہ کہ عبداللہ بن ابی پہلے سے بھی بنی نضیر کا حلیف اور ہم پیمان تھا۔

قریش نے بدر سے پہلے عبداللہ بن اُبی کو لکھا تھا کہ مسلمانوں کو نکال دو، ورنہ ہم آکر تمہارا استیصال کردیں گے لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، تو بدر کے بعد انہوں نے یہود کو خط لکھا۔

انکم اهل الحلقة والحصون وانکم لتقاتلن صاحبنا او لنفعلن کذا وکذا ولا یحول بیننا وبین خدم نسآئکم شیء[1]	تم لوگوں کے پاس اسلحۂ جنگ اور قلعہ جات ہیں، تم ہمارے حریف (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ یہ یہ کریں گے اور یہ کہ کوئی چیز ہم کو تمہاری عورتوں کے کڑوں تک پہنچنے سے روک نہ سکے گی۔

ابوداؤد نے چونکہ بنو نضیر کے ذکر میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، اس لئے صرف بنو نضیر کا نام لیا ہے ورنہ قریش کا خط عام یہود کے نام تھا اور نتیجہ بھی عام تھا، اسی بناء پر محدث حاکم نے بنو نضیر اور قینقاع دونوں کے واقعہ کو ایک ہی واقعہ خیال کیا ہے، غرض اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو گھر سے نکلتے تھے تو یہودیوں کی وجہ سے جان کا خطرہ رہتا تھا، حضرت طلحہؓ بن براء ایک صحابی تھے، انہوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ اگر میں رات کے وقت مروں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کرنا، اس لئے کہ یہود کی طرف سے ڈر ہے، ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ پر حادثہ گزر جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابوداؤد وغیرہ کی سند سے پورا واقعہ نقل کیا ہے[2]۔

شوال ۲ھ غزوہ بنی قینقاع

بدر کی فتح نے یہود کو زیادہ اندیشہ ناک کر دیا، ان کو علانیہ نظر آیا کہ اسلام اب ایک طاقت بنا جاتا ہے اور چونکہ قبائل یہود میں سب سے زیادہ جری اور بہادر بنو قینقاع[3] تھے، اس لئے سب سے پہلے انہی نے اعلانِ جنگ کی جرأت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معاہدہ کیا تھا، سب سے پہلے ان ہی نے اس کی عہد شکنی کی، ابن ہشام وطبری نے ابن اسحاق کی روایت سے عاصم بن قتادہ انصاری کی روایت نقل کی ہے۔

ان بنی قینقاع کانوا اول یہود نقضوا ما بینهم وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحاربوا فیما بین بدر واُحد۔	بنو قینقاع پہلے یہود تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو جو ان میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا توڑ ڈالا اور بدر اور اُحد کے درمیانی زمانہ میں مسلمانوں سے لڑائی کی۔

ابن سعد نے غزوہ بنو قینقاع کے ذکر میں لکھا ہے۔

فلما کانت وقعة بدر اظهروا البغی والحسد ونبذوا العهد والمرة (زرقانی جلد ۱ ص ۵۲۶)	واقعہ بدر میں یہودیوں نے شورش اور حسد ظاہر کیا اور عہد کو توڑ ڈالا۔

---

[1] سنن ابی داؤد، ذکر نضیر، کتاب الخراج والامارۃ۔ [2] ملخصاً اصابہ ترجمہ طلحہ بن براء۔ [3] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول صـ ۱۹ تم

ایک اتفاقیہ سبب پیش آگیا جس نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک انصاری کی بیوی مدینہ کے بازار میں ایک یہودی کی دکان میں (نقاب پوش) آئیں۔ یہودیوں نے ان کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بیتاب ہو گیا اور اس نے یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے مسلمان کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ خدا سے ڈرو، ایسا نہ ہو تم پر بھی بدر والوں کی طرح عذاب آئے۔ بولے کہ ہم قریش نہیں ہیں، ہم سے معاملہ پڑے گا تو ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اس کا نام ہے۔ چونکہ ان کی طرف سے نقض عہد اور اعلان جنگ ہو گیا تھا مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائی کی۔ وہ قلعہ بند ہوئے۔ پندرہ دن تک محاصرہ رہا۔ بالآخر اسی پر راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فیصلہ کریں گے ان کو منظور ہو گا۔ عبداللہ بن ابی ان کا حلیف تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ وہ جلاوطن کر دئیے جائیں۔ غرض وہ اذرعات میں جو شام کے علاقہ میں ہے جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ سات سو شخص تھے جن میں تین سو زرہ پوش تھے۔ یہ شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔

قتل کعب بن اشرف ربیع الاول ۳ھ

یہودیوں میں کعب بن اشرف ایک مشہور شاعر تھا۔ اس کے باپ اشرف نے جو قبیلہ طے سے تھا مدینہ میں بنو نضیر کا حلیف ہو کر اس قدر عزت اور اعتبار کیا کہ ابو رافع بن ابی الحقیق جو یہود کے مقتدا اور تاجر الحجاز جس کا خطاب تھا اس کی لڑکی سے شادی کی۔ کعب اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس دو طرفہ رشتہ داری کی بناء پر کعب یہود اور عرب سے برابر کا تعلق رکھتا تھا اور شاعری کی وجہ سے قوم پر اس کا عام اثر تھا۔ رفتہ رفتہ دولت مندی کی وجہ سے تمام یہودیان عرب کا رئیس بن گیا۔ یہودی علماء اور پیشوایان مذہب کی تنخواہیں مقرر کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے اور علمائے یہود اس سے ماہواریں لینے آئے تو اس نے ان لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق رائے دریافت کی اور جب اپنا ہم خیال بنا لیا تب ان کے مقررہ روزینہ جاری کئے۔

اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ بدر کی لڑائی میں سرداران قریش مارے گئے تو اس کو نہایت صدمہ ہوا۔ تعزیت کے لئے مکہ گیا۔ کشتگان بدر کے پردرد مرثیے جن میں انتقام کی ترغیب تھی لوگوں کو جمع کر کے نہایت درد سے پڑھتا اور روتا اور رلاتا تھا۔ ابن ہشام نے ان واقعات کے ساتھ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے اشعار اکثر مصنوعی ہیں تاہم جہاں تک اس زمانے کی زبان معلوم ہوتی ہے ہم ایک دو شعر نقل کرتے ہیں۔

---

[1] عام ارباب سیر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قتل کر دینا چاہتے تھے عبداللہ بن ابی کے اصرار سے مجبور ہو گئے۔ لیکن سنن ابی داؤد میں جس طرح یہ واقعہ مذکور ہے اس سے اس قیاس کی غلطی ثابت ہوتی ہے

[2] صحیح بخاری باب قتل النائم المشرک [3] الخمیس صفحہ ۴۶۴ [4] زرقانی (ج ۲ صفحہ ۹) بہ حوالہ ابن اسحاق وغیرہ۔

طحنت رحی بدر لمہلک اہلہ	جنگ بدر کی چکی نے اہل بدر کو پیس ڈالا۔
ولمثل بدر تستہل وتدمعُ	بدر جیسے واقعات کے لئے رونا پیٹنا چاہیئے
کم قد اصیب بہ من ابیض ماجد	کتنے شریف سپید و بارونق چہرے جن کے یہاں
ذی بہجۃ تأوی الیہ الضُّیَّعُ	اہل حاجت پناہ لیتے تھے، مارے گئے۔

مدینہ میں واپس آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہنا اور لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے برخلاف برانگیختہ کرنا شروع کیا۔[1] عرب میں شاعری کا وہ اثر تھا جو آج یورپ میں بڑے بڑے ملکی مدبروں کی پرجوش تقریروں اور نامور اخبارات کی تحریروں کا ہوتا ہے، تنہا ایک شاعر قبیلہ کے قبیلہ میں شعر کے ذریعے آگ لگا دیتا تھا۔

ایک روایت میں ہے کہ مکہ میں چالیس آدمی لے کر گیا، وہاں ابوسفیان سے ملا اور اس کو بدر کے انتقام پر برانگیختہ کیا اور ابوسفیان سب کو لے کر حرم میں آیا، سب نے حرم کا پردہ تھام کر معاہدہ کیا کہ بدر کا انتقام لیں گے۔

اس پر اکتفا نہ کر کے قصد کیا کہ چپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرا دے۔ علامہ یعقوبی اپنی تاریخ میں بونضیر کے واقعہ میں لکھتے ہیں:

کعب بن الاشرف الیہودی الذی اراد ان یمکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	کعب بن اشرف یہودی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکے میں قتل کر دینا چاہا۔

اس روایت کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں (ذکر کعب بن اشرف میں) عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ کعب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت میں بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ تشریف لائیں تو دھوکے سے آپ کو ہلاک کر دیں۔ حافظ ابن حجر نے گو لکھا ہے کہ اس روایت کی سند میں ضعف ہے لیکن جب قرائن اور دیگر شواہد موجود ہیں تو یہ ضعف رفع ہو جاتا ہے۔

فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ نے بعض صحابہؓ سے شکایت کی اور آپ کی مرضی سے حضرت محمد بن مسلمہ نے بمشورہ رؤسائے اوس جا کر اس کو ربیع الاول ۳ھ میں قتل کر دیا۔ ارباب روایت نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن مسلمہ نے آپ کی خدمت میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ "ہم کو کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔" ارباب سیر نے اس کے معنی یہ لگائے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ باتیں کہنے کی اجازت مانگی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، کیونکہ "الحَرْبُ خُدْعَةٌ" یعنی لڑائی میں دھوکہ دینا جائز ہے لیکن بخاری کی روایت میں صرف یہ لفظ ہے۔

فأذن لی ان اقول۔	ہم کو اجازت دی جائے کہ ہم گفتگو کریں۔

---

[1] ابوداؤد میں ہے وکان کعب بن الاشرف یہجو النبی صلی اللہ علیہ وسلم ویحرض علیہ کفار قریش (ابوداؤد ج ۲ باب کیف کان اخراج الیہود کتاب الخراج والامارۃ) نیز ابن سعد میں ہے کان رجلا شاعرا یہجو النبی واصحابہ ویحرض علیہم (تفسیر ابن جریر طبری ج ۵ میں ہے ان کعب بن الاشرف انطلق الی المشرکین من کفار قریش فاستجاشہم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وامرہم ان یغزوہ (نیز لکھ خمیس ص ۴۱۲) غالباً یہ دوسرا واقعہ ہے ابن خمیس نے اس کے متعلق مزید تفصیل بیان کی ہے کہ ج ۱، ص ۴۱۲ نیز لکھ ابن سعد مغازی ص ۲۱۔

اس سے غلط گوئی کی اجازت کہاں نکلتی ہے؟ لیکن جو گفتگو ہوئی اس سے کعب اور عموماً یہود کے اخلاق اور دلی خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا، ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پناہ دے کر تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا اور ہم سے بار بار صدقہ مانگا جاتا ہے، اب تم سے کچھ رکھ کر قرض لینا ہے۔ کعب نے کہا تم خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتا جاؤ گے، اچھا قرض کے لئے اپنی بیویوں کو رہن رکھو، محمد بن مسلمہ نے کہا، تمہارے اس حسن وجمال کے سبب سے ہم کو اپنی بیویوں پر وفاداری کا یقین نہیں، اس نے کہا، اچھا اپنے بچوں کو گرو رکھو، انہوں نے کہا، اس سے تو تمام عرب میں ہماری بدنامی ہوگی، ہم اپنے ہتھیار گرو رکھیں گے اور تم جانتے ہو آج کل ان کی جیسی ضرورت ہے۔[1]

صحیح بخاری میں جو روایت ہے اس میں قتل کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ان لوگوں نے دوستانہ طریقے سے اس کو گھر سے بلایا، پھر بال سونگھنے کے بہانہ سے اس کی چوٹی پکڑ لی اور قتل کر ڈالا۔[2] لیکن روایت میں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کی اجازت دی تھی، اس وقت تک عرب میں ان طریقوں سے قتل کرنا معیوب بات نہ تھی، آگے چل کر نہایت مفصل طور سے ایک مستقل عنوان میں یہ بحث آئے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح تدریج کے ساتھ عرب کے ان طریقوں کی اصلاح کی۔

غزوہ بنو نضیر ربیع الاول ۴ھ

حضرت عمرو بن امیہ نے قبیلۂ عامر کے (جو) دو آدمی قتل کر دیئے تھے اور جن کا خون بہا اب تک واجب الادا تھا اور جس کا ایک حصہ معاہدہ کی رو سے یہود بنی نضیر پر واجب الادا تھا، اس کے مطالبہ[3] کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے، انھوں نے قبول کیا لیکن درپردہ یہ سازش کی کہ ایک شخص چھپے سے بالاخانہ پر چڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر گرا دے۔ اتفاق سے اس وقت آپ بالاخانہ کی دیوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔

عمرو بن جحاش ایک یہودی اس ارادہ سے کوٹھے پر چڑھا۔ آپ کو اس کے ارادہ کا حال معلوم ہو گیا اور آپ فوراً مدینہ واپس چلے آئے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قریش نے بنو نضیر کو کہلا بھیجا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دو، ورنہ ہم خود آ کر تمہارا بھی استیصال[4] کر دیں گے۔ بنو نضیر پہلے سے اسلام کے دشمن تھے، قریش کے پیغام نے ان کو اور زیادہ آمادہ کیا۔ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ تیس آدمیوں کو لے کر آئیں، ہم بھی اپنے احبار کو لے کر آئیں گے۔ آپ کا کلام

---

[1] زرقانی ج ۲ ص ۱۳ (صحیح بخاری قتل کعب بن اشرف)۔ [2] صحیح بخاری باب قتل کعب (کتاب المغازی)۔ [3] بنی نضیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے متعلق جو گفتگو کی اس کی دو تشریحیں کی گئی ہیں، ایک تشریح تو وہ ہے جس کو مصنف نے اختیار فرمایا ہے دوسری تشریح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر سے جو گفتگو فرمائی تھی اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبیلۂ عامر کو دیت کس طرح ادا کی جائے اور ان کے یہاں دیت کا دستور کیا ہے؟ بنی نضیر اور قبیلۂ عامر کے باہم تعلقات اچھے تھے اس لئے ان سے اس مسئلہ میں گفتگو قرین قیاس بھی ہے (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۲۶۴)۔ [4] یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے جو صحیح ترین مغازی ہے یہ عبارت نقل کی ہے وکانوا قد دسوا الی قریش فی قتالہ صلی اللہ علیہ وسلم فحضوھم علی القتال ودلوھم علی العورۃ (زرقانی ص ۷۹ ج ۲) یعنی ان لوگوں نے قریش سے درپردہ سازش کر کے ان کو آمادہ جنگ کیا اور ان کو مخفی موقع بتائے۔

ہیں کہ اگر ہمارے احبار آپ کی تصدیق کریں گے تو ہم کو بھی کچھ عذر نہ ہوگا، چونکہ وہ بغاوت کی تیاری کر چکے تھے۔ آپ نے کہلا بھیجا کہ جب تک تم ایک معاہدہ نہ لکھ دو میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ آپ یہود بنی قریظہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے تجدید معاہدہ کی درخواست کی۔ انھوں نے تعمیل کی۔ بنو نضیر کے سامنے یہ نظیر موجود تھی کہ ان کے برادران دینی نے معاہدہ لکھ دیا ہے لیکن وہ کسی طرح معاہدہ کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ بالآخر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ آپ تین آدمی لے کر آئیں۔ ہم بھی تین عالم ساتھ لے کر آتے ہیں۔ یہ علما اگر آپ پر ایمان لائیں گے تو ہم بھی لائیں گے۔ آپ نے منظور فرمایا۔ لیکن راہ میں آپ کو ایک صحیح ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہود تلواریں باندھ کر تیار ہیں کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو قتل کر دیں[1]

بنو نضیر کی سرکشی کے مختلف اسباب تھے۔ وہ نہایت مضبوط قلعوں میں پناہ گزین تھے جن کا فتح کرنا آسان نہ تھا، اس کے ساتھ عبداللہ بن اُبی نے کہلا بھیجا تھا کہ تم اطاعت نہ کرنا۔ بنو قریظہ تمہارا ساتھ دیں گے۔ اور میں دو ہزار آدمی لے کر تمہاری اعانت کروں گا۔ قرآن مجید میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَىِٕنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِیْعُ فِیْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ (حشر-۲)

تم نے دیکھا منافق اپنے کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ تم نکلو گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور ہم تمہارے باب میں کسی کا کہنا نہ مانیں گے، اور اگر تم سے کوئی لڑا تو ہم بھی تمہاری مدد کو آئیں گے۔

لیکن بنو نضیر کے تمام خیالات غلط نکلے۔ بنو قریظہ نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور منافق اعلانیہ اسلام کے مقابلہ میں اٹھ نہیں سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیا، قلعہ کے گرد جو اُن کے نخلستان تھے اُن کے چند درخت کٹوا دیئے۔ سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ سب نخلستان نہیں کاٹا گیا بلکہ صرف لینہ جو ایک خاص قسم کی کھجور ہے اور عرب کی عام خوراک نہیں ہے اس کے درخت کٹوا دیئے گئے تھے۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآىِٕمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ (سورہ حشر-۱)

تم نے لینہ کے جو درخت کٹوائے اور جس قدر قائم رہنے دیئے سب خدا کے حکم سے تھا تاکہ خدا فاسقوں کو رسوا کرے۔

ممکن ہے کہ درختوں کے جھنڈ سے کمین گاہ کا کام لیا جاتا ہو، اس لئے وہ صاف کرا دیئے گئے کہ محاصرہ

---

[1] یہ تمام تفصیل سنن ابی داؤد (خبر النضیر کتاب الخراج والامارۃ) میں ہے تعجب ہے کہ ارباب سیرت ابوداؤد کی اس روایت سے بالکل بے خبر ہیں۔ [2] فتح الباری واقعہ غزوہ بنو نضیر جلد سابع صفحہ ۲۵۵ فتح الباری میں یہ روایت ابن مردویہ سے نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنو نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی عیاری کا ارادہ کیا تھا۔ بخاری میں ترجمۃ الباب یہ ہے۔ باب حدیث بنی النضیر ومخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الیہم فی دیۃ وما ارادوا من الغدر برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔

بالآخر بنو نضیر اس شرط پر راضی ہوئے کہ جس قدر مال و اسباب اونٹوں پر لے جا سکیں لے جائیں اور مدینہ سے باہر نکل جائیں چنانچہ سب گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر نکل گئے۔ ان میں سے معزز رؤسا مثلاً سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن الربیع، حیئ بن اخطب خیبر چلے گئے۔ وہاں لوگوں نے اُن کا اس قدر احترام کیا کہ خیبر کا رئیس تسلیم کر لیا۔ اس واقعہ کو اس غرض سے یاد رکھنا چاہیے کہ یہ غزوہ خیبر کی داستان کا دیباچہ ہے۔

بنو نضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان سے نکلے کہ جشن کا دھوکہ ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے، ساتھ ساتھ باجا بجتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروۃ بن الورد عبسی مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سر و سامان کی سواری کبھی ان کی نظر سے نہیں گزری تھی[2]۔ ہتھیار[3] کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا، اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔ ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور یہودی ان کو اتحادِ مذہب کی وجہ سے ساتھ لئے جاتے تھے انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۔ یعنی مذہب میں زبردستی نہیں ہے۔

ابوداؤد نے کتاب الجہاد باب فی الاسیر یکرہ علی الاسلام کے عنوان کے نیچے اس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے نقل کیا ہے۔

*

---

[1] مصنف کے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام احمد کے نزدیک درخت وغیرہ میدان جنگ میں اسی وقت کاٹے جاتے ہیں جب کہ کاٹے بغیر چارہ کار نہ ہو، محدثین نے امام احمد کا یہ قول اسی واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے۔ نیز اس موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ اسحاق کا قول ہے کہ اگر دشمن درختوں کے آڑ میں ہو تو ان میں آگ لگا دینا سنت ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان ائمہ کے نزدیک اس موقع پر درخت کا کاٹنا جنگی ضرورت کا اقتضا تھا۔ عمدۃ القاری ج ۶ ص ۱۹۱۔ [2] طبری ص ۱۴۵۲۔ [3] یہ تفصیل طبری میں ہے (ص ۱۴۵۳)۔

۵ھ

غزوۂ مریسیع، واقعۂ افک و غزوۂ احزاب

قریش اور یہود کی متفقہ سازش نے اب مکہ سے لے کر مدینہ تک آگ لگا دی، جس قدر قبائل تھے سب نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، سب سے پہلے انمار اور ثعلبہ نے یہ ارادہ کیا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوگئی۔ ۱۰ محرم ۵ھ کو آپ مدینہ سے چار سو صحابہ کو لے کر نکلے اور ذات الرقاع تک تشریف لے گئے لیکن آپ کی آمد سن کر وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے۔[1]

ربیع الاول ۵ھ میں یہ خبر آئی کہ دومۃ الجندل میں کفار کی ایک عظیم الشان فوج جمع ہو رہی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار جمعیت لے کر مدینہ سے نکلے، ان کو خبر ہوئی تو وہ بھاگ گئے۔

غزوۂ مریسیع یا بنی مصطلق شعبان ۵ھ

خزاعہ ایک قبیلہ تھا جو قریش کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ قریش کو ایک زمانہ میں یہ خیال آیا کہ ہم ابراہیمؑ کی نسل سے ہیں۔ اس لئے ہم کو اوروں سے ہر باب میں ممتاز ہونا چاہیے۔ حج کا ایک بڑا رکن عرفات کے میدان میں قیام کرنا ہے لیکن چونکہ یہ میدان حرم کی حدود سے باہر ہے، قریش نے یہ قاعدہ قرار دیا کہ لوگ عرفات جائیں لیکن ہم کو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں ٹھہرنا چاہیے جو حدودِ حرم کے اندر ہے۔ اسی قسم کی اور امتیازی باتیں قائم کیں، ان خصائص کی بنا پر اپنا لقب احمس رکھا، لیکن اس قدر فیاضی کی کہ جو لوگ ان پابندیوں کو قبول کر لیتے تھے ان کو بھی یہ لقب دے دیتے اور ان سے رشتہ ناطہ کرتے تھے۔ قبیلۂ خزاعہ کو بھی یہ شرف عطا کیا تھا۔

خزاعہ کا ایک خاندان بنو المصطلق کہلاتا تھا، وہ مقام مریسیع میں جو مدینہ منورہ سے ۹ منزل ہے، آباد تھا، اس خاندان کا رئیس حارث بن ابی ضرار تھا۔ اس نے قریش کے اشارہ سے یا خود مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو مزید تحقیقات کے لئے حضرت زیدؓ بن خصیب کو بھیجا، انہوں نے واپس آکر خبر کی تصدیق کی، آپ نے صحابہؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲ شعبان کو فوجیں مدینہ سے روانہ ہوئیں۔ مریسیع میں خبر پہنچی کہ حارث کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا۔ لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے انھوں نے صف آرائی کی اور دیر تک

---

[1] ابن سعد غزوہ ذات الرقاع صفحہ ۴۳ (صحیح بخاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزوہ ذات الرقاع خندق کے بعد واقع ہوا، صلوٰۃ الخوف سب سے پہلے اسی غزوہ میں ادا کی گئی)، [2] ابن اسحٰق نے جس کی پیروی طبری اور ابن ہشام نے کی ہے، اس غزوہ کو ۶ھ میں ذکر کیا ہے، موسیٰ بن عقبہ کی روایت ہے کہ ۵ھ میں واقع ہوا، امام بخاری نے بھی صحیح میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے لیکن غلطی سے ۵ھ کے بجائے ابن عقبہ کی طرف ۴ھ کی نسبت کی ہے، علامہ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۷ صفحہ ۳۳۲) میں بیہقی، حاکم، موسیٰ بن عقبہ اور ابو معشر کی روایتوں سے ۵ھ کو ترجیح دی ہے ابن سعد نے بھی ۵ھ ہی لکھا ہے تفصیل کے لئے دیکھو فتح الباری ص [illegible]۔ [3] یہ واقعات ابن ہشام نے تفصیل سے لکھے ہیں۔

جم کر تیر برساتے رہے، مسلمانوں نے دفعۃً ایک ساتھ حملہ کیا تو اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دس آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے جن کی تعداد تقریباً ۶۰۰ تھی، غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور چار پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

یہ ابن سعد کی روایت ہے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ ابن سعد نے اس روایت کو بھی نقل کیا ہے لیکن لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحیحین کی روایت بھی اصول حدیث کی رو سے حجت نہیں ہے کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا، اس لئے یہ روایت اصطلاحِ محدثین میں منقطع[4] ہے۔

یہ لڑائی ایک معمولی لڑائی تھی۔ لیکن اتفاق سے بعض شہرت پذیر واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے اس لڑائی کا خاص عنوان قائم کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی فوج میں داخل ہو گئے تھے، یہ بدباطن ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے، ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ انصاری نے عرب کے قدیم طریقہ پر یاللانصار کا نعرہ مارا (انصار کی جے) مہاجر نے بھی یا معاشر المہاجرین کے نعرہ سے جواب دیا، نعرے سُن کر قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے۔ لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ عبداللہ بن اُبی جو رئیس المنافقین تھا، اس کو موقع ہاتھ آیا۔ انصار سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بلا کر اتنا کر دیا کہ اب وہ خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں، وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا ہے، تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے۔"

یہ واقعہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر کہا حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، غصہ سے بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ کسی کو ارشاد ہو اس منافق کی گردن اڑا دے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چرچا پسند کرتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ والوں کو قتل کر دیا کرتے[5] ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ عبداللہ بن اُبی جس درجہ کا منافق اور دشمنِ اسلام تھا اس کے صاحبزادے کا نام بھی عبداللہ تھا اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن اُبی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں۔ یہ سُن کر وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں، لیکن اگر یہ مرضی ہے تو مجھ ہی کو حکم ہو، میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو حکم دیں اور میں غیرت و محبت کے جوش میں آ کر قاتل کو قتل کر دوں۔ آپ

---

[1] باب العتق [2] کتاب الجہاد والسیر [3] طبقات ابن سعد جلد مغازی صفحہ ۴۵، ۴۶ [4] معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صرف آغاز سند کو ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے ورنہ متن حدیث کے بعد تصریح ہے کہ حدثنی ہذا الحدیث عبداللہ ابن عمر و کان فی ذالک الجیش یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے (مسلم کتاب الجہاد و بخاری کتاب العتق) اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں باقی رہتی ہے (س) [5] دیکھو صحیح بخاری صفحہ ۴۹۸۔

نے اطمینان دلایا کہ قتل کی بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔ یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ جب وہ مرا تو کفن کے لئے آپؐ نے خود پیراہن مبارک عنایت فرما کر جنازہ کی نماز پڑھائی، حضرت عمرؓ نے دامن تھام لیا کہ منافق کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں؟ لیکن دریائے کرم کا بہاؤ کون روک سکتا تھا۔

حضرت جویریہؓ کا واقعہ

لڑائی میں جو لوگ گرفتار ہوئے ان میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں جو حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ ابن اسحاق کی روایت ہے جو بعض حدیث کی کتابوں میں بھی ہے کہ تمام اسیران جنگ لونڈی، غلام بنا کر تقسیم کر دیئے گئے، حضرت جویریہؓ، حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصہ میں آئیں، انھوں نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ مکاتبت کر لو یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو۔ حضرت ثابتؓ نے منظور کیا، حضرت جویریہؓ کے پاس روپیہ نہ تھا، چاہا کہ لوگوں سے چندہ مانگ کر یہ رقم ادا کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آئیں، حضرت عائشہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔

ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ کی زبانی روایت کی ہے جو یقیناً ان کی ذاتی رائے ہے کہ چونکہ حضرت جویریہؓ نہایت شیریں ادا تھیں، میں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے دیکھا تو سمجھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان کے حسن وجمال کا وہی اثر ہوگا جو مجھ پر ہوا، غرض وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں (آپؐ نے فرمایا اگر اس سے بہتر برتاؤ تمہارے ساتھ کیا جائے تو قبول کرو گی؟ انھوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہاری طرف سے میں روپیہ ادا کر دوں اور تم کو اپنی زوجیت میں لے لوں، حضرت جویریہؓ نے کہا میں نے منظور کیا، آپؐ نے تنہا وہ تمام رقم ادا کر دی اور ان سے شادی کر لی۔

یہ ابن اسحاق کی روایت ہے جو ابن ہشام اور ابوداؤد دونوں میں موجود ہے لیکن دوسرے طریق روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ (حارث)، رئیس عرب تھا، حضرت جویریہؓ جب گرفتار ہوئیں تو حارث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی، میری شان اس سے بالاتر ہے، آپؐ اس کو آزاد کر دیں، آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ حارث نے جا کر جویریہ سے کہا کہ محمدؐ نے تیری مرضی پر رکھا، دیکھنا مجھ کو رسوا نہ کرنا۔ انھوں نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے شادی کر لی۔

یہ روایت حافظ ابن حجر نے اصابہ میں، ابن مندہ سے نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن سعد میں بھی یہ روایت مذکور ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت بھی کی ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے ان کا زر فدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہو گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا۔

اس نکاح کا اثر

حضرت جویریہؓ سے جب آپؐ نے نکاح کیا تو تمام اسیران جنگ جو اہل فوج کے

؎ یہ تمام واقعات نہایت تفصیل سے ابن سعد اور طبری نے لکھے ہیں اور صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں بھی مذکور ہیں۔ ؎ ابوداؤد کتاب العتاق۔

حصہ میں آگئے تھے دفعۃً رہا کر دیئے گئے۔ فوج نے کہا کہ جس خاندان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کرلی وہ غلام نہیں ہو سکتا[1]۔

واقعۂ افک

واقعۂ افک یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی سے واپسی میں پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا ہے لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ لوگوں نے یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ "بالکل افترا ہے"، اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ البتہ اس واقعہ سے یہ اندازہ کرنا چاہیئے کہ محض جھوٹ اور بے ہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی، لیکن بعض مسلمان بھی دھوکہ میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی، جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

آج کل کے عیسائی مورخوں نے بھی قدیم منافقوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔ یہ تمام لڑائیاں اُس عام جنگ کا پیش خیمہ تھیں جو تمام عرب اور یہود متفقہ قوت سے کرنا چاہتے تھے اور جس کو جنگِ احزاب کہتے ہیں۔

غزوۂ احزاب یعنی عرب کی متحدہ جنگ ذوقعدہ ۵ھ

بنو نضیر[2] مدینہ سے نکل کر خیبر پہنچے تو انھوں نے ایک نہایت عظیم الشان سازش شروع کی۔ اُن کے رؤسا میں سے سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن الربیع وغیرہ مکہ معظمہ گئے اور قریش سے مل کر کہا اگر ہمارا ساتھ دو تو اسلام کا استیصال کر دیا جا سکتا ہے۔ قریش اس کے لئے ہمیشہ تیار تھے۔ قریش کو آمادہ کرکے یہ لوگ قبیلۂ غطفان کے پاس گئے اور ان کو لالچ دیا کہ خیبر کا نصف محاصل اُن کو ہمیشہ دیا کریں گے، اور یہ پہلے سے بھی تیار تھے، (قصۂ غزوۂ معونہ میں یاد ہوگا کہ عامر رئیس قبیلہ نے اسی غطفان کے حملہ کی دھمکی دی تھی) اسلئے یہ فوراً تیار ہو گئے۔ بنو اسد غطفان کے حلیف تھے، غطفان نے اُن کو کہلا بھیجا کہ تم بھی فوجیں لے کر آؤ۔ قبیلۂ بنو سلیم سے قریش کی قرابت تھی اس تعلق سے انھوں نے بھی ساتھ دیا۔ بنو سعد کا قبیلہ یہود کا حلیف تھا، اس بنا پر یہود نے اُن کو بھی آمادہ کیا۔ غرض تمام قبائلِ عرب سے لشکرِ گراں تیار ہو کر مدینہ کی طرف بڑھا۔ فتح الباری میں تصریح ہے کہ اُن کی تعداد (دس ہزار) تھی[5]۔

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب العتق (باب فی بیع المکاتب اذا فسخت المکاتبۃ)۔ [2] طبری میں ہے فان الذی جر غزوۃ رسول اللہ الخندق فیما قیل ما کان من اجلاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر من دیارہم (ج ۳ ص ۱۴۶۳)، مغازی کی سب سے زیادہ معتبر کتاب مغازی موسیٰ بن عقبہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ج ۷، ص ۳۰۳) غزوہ احزاب کے ذکر میں اس کی یہ عبارت نقل کی ہے۔ خرج حیی بن اخطب بعد قتل بنی النضیر الی مکۃ یحرض قریشا علی حرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخرج کنانۃ بن الربیع بن ابی الحقیق یسعی فی بنی غطفان ویحضہم علی قتال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لہم نصف تمر خیبر فاجابہ عیینۃ بن حصن بن حذیفۃ بن بدر الفزاری الی ذلک وکتبوا الی حلفائہم من بنی اسد فاقبل الیہم طلحۃ بن خویلد فیمن اطاعہ (الخ)۔ [3] صحیح بخاری غزوۃ الرجیع [4] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول ص ۴۷ [5] فتح الباری ج ۷، ص ۳۰۳۔

یہ لشکر تین مستقل فوجوں میں تقسیم تھا، غطفان کی فوجیں عیینہ بن حصن فزاری کی کمان میں تھیں جو عرب کا مشہور سردار تھا۔ بنو اسد طلیحہ کی افسری میں تھے اور ابوسفیان (بن حرب) سپہ سالار کل تھا۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبریں سنیں تو صحابہؓ سے مشورہ کیا، حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کی وجہ سے خندق کے طریقے سے واقف تھے۔ انھوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنا مصلحت نہیں، ایک محفوظ مقام میں لشکر جمع کیا جائے اور گرد خندق کھود لی جائے۔ خندق دراصل فارسی کندہ کا معرب ہے جس کے معنی کھودے گئے کے ہیں، کاف خ سے اور ہائے ہوز قاف سے بدل گئی ہے، جس طرح پیادہ سے بیدق ہو گیا ہے۔

تمام لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا اور خندق کھودنے کے آلات مہیا کئے گئے۔ مدینہ میں تین جانب مکانات اور نخلستان کا سلسلہ تھا جو شہر پناہ کا کام دیتا تھا۔ صرف شامی رُخ کھلا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار صحابہؓ کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر اسی مقام میں خندق کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ ذوقعدہ ۵ھ کی ۸ تاریخ تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدود خود قائم کئے۔ داغ بیل ڈال کر دس دس آدمیوں پر دس دس گز زمین تقسیم کی۔ خندق کا عمق پانچ گز رکھا گیا۔ بیس دن میں ۳ ہزار متبرک ہاتھوں سے انجام پائی۔[۳]

یاد ہوگا کہ جب مسجد نبوی بن رہی تھی تو سرورِ دو جہاں مزدوروں کی صورت میں تھے۔ آج بھی وہی عبرت انگیز منظر ہے۔ جاڑے کی راتیں ہیں، تین تین دن کا فاقہ ہے۔ مہاجرین اور انصار اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد لاد کر پھینکتے ہیں اور جوشِ محبت میں ہم آواز ہو کر کہتے ہیں۔

نحن الذین بایعوا محمدا　　علی الجہاد ما بقینا ابدا

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مٹی پھینک رہے ہیں، شکم مبارک پر گرد اٹ گئی ہے۔ اسی حالت میں یہ رجز زبان پر ہے۔

واللہ لولا اللہ ما اہتدینا　　ولا تصدّقنا ولا صلّینا
فانزلن سکینۃ علینا　　وثبت الاقدام ان لاقینا
ان الاولی قد بغوا علینا　　اذا ارادوا فتنۃ ابینا

اَبَینا کا لفظ جب آتا تھا تو آواز زیادہ بلند ہو جاتی تھی اور مکرر کہتے تھے۔[۴] اس کے ساتھ انصار کے حق میں دعا بھی دیتے جاتے تھے اور یہ موزوں الفاظ زبان پر آتے تھے

اللّٰھم ان لا خیر الا خیر الآخرۃ　　فبارک فی الانصار والمہاجرۃ

پتھر کھودتے کھودتے اتفاقاً ایک سخت چٹان آ گئی، کسی کی ضرب کام نہیں دیتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول صہ ۴۷۔ [۲] افسروں کی یہ تفصیل پورے لشکر کی نہیں ہے بلکہ مصنف نے صرف مشہور قبائل کے فوجی افسروں کا تذکرہ کر دیا ہے اس سلسلہ میں مورخین نے دوسرے قبائل کے فوجی افسروں کے نام بھی بتاتے ہیں چنانچہ بنو سلیم سفیان بن عبد شمس کی افسری میں تھے، قبیلہ اشجع کا سردار مسعود بن رخیلہ تھا، بنو مرۃ حارث بن عوف کے ماتحت تھے، حارث اور طلیحہ بعد کو مسلمان ہو گئے تھے (زرقانی ج ۲ صہ ۱۱۲)

[۳] طبقات ابن سعد ج ۲ قسم اول صہ ۴۷۔ [۴] ایضاً [۵] صحیح بخاری غزوۂ احزاب۔

علیہ وسلم تشریف لائے، تین دن کا فاقہ تھا اور پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا، آپ نے دست مبارک سے پھاوڑا مارا تو چٹان ایک تودۂ خاک تھی۔[1]

سلع کی پہاڑی کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی گئی، مستورات شہر کے محفوظ قلعوں میں بھیج دی گئیں اور چونکہ بنو قریظہ کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے حضرت سلمہؓ بن اسلم ۲۰۰ آدمیوں کے ساتھ متعین کئے گئے کہ ادھر سے حملہ نہ ہونے پائے۔

بنو قریظہ کے یہود اب تک الگ تھے، لیکن بنو نضیر نے ان کے ملا لینے کی کوشش کی، حیی بن اخطب حضرت صفیہؓ کا باپ، خود قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا، اس نے ملنے سے انکار کیا، حیی نے کہا میں فوجوں کا دریائے بے کراں لایا ہوں، قریش اور تمام عرب امنڈ آیا ہے اور ہر ایک محمدؐ کے خون کا پیاسا ہے یہ موقع ہاتھ سے جانے دینے کے قابل نہیں، اب اسلام کا خاتمہ ہے، کعب اب بھی راضی نہ تھا، اس نے کہا میں نے محمدؐ کو ہمیشہ صادق الوعد پایا، ان سے عہد شکنی کرنا خلاف مروت ہے لیکن حیی کا جادو رائیگاں نہیں جاسکتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال معلوم ہوا تو تحقیق اور اتمام حجت کے لئے سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو بھیجا اور فرمادیا کہ اگر درحقیقت بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے تو وہاں سے آکر اس خبر کو مبہم لفظوں میں بیان کرنا کہ لوگوں میں بے دلی نہ پھیلنے پائے۔ دونوں صاحبوں نے بنو قریظہ کو معاہدہ یاد دلایا تو انھوں نے کہا ہم نہیں جانتے محمدؐ کون ہیں اور معاہدہ کیا چیز ہے؟

غرض بنو قریظہ نے اس بے شمار فوج میں اور اضافہ کردیا۔ قریش، یہود اور قبائل عرب کی دس ہزار فوجیں تین حصوں میں تقسیم ہو کر مدینہ کی تین طرف اس زور و شور سے حملہ آور ہوئیں کہ مدینہ کی زمین دہل گئی۔

اس معرکہ کی تصویر خود اللہ تعالیٰ نے کھینچی ہے۔

إِذْ جَآءُوكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ	جب دشمن اوپر کی طرف اور نشیب کی طرف سے آپڑے اور
زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَ	جب آنکھیں ڈگمگنے لگیں اور کلیجے منہ میں آگئے اور تم خدا کی نسبت
تَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَ	طرح طرح کے گمان کرنے لگے تب مسلمانوں کی جانچ کا وقت آیا
زُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا - (سورۂ احزاب - ۲)	اور وہ بڑے زور کے زلزلے میں ڈال دیئے گئے۔

فوج اسلام میں منافقوں کی تعداد بھی شامل تھی جو بظاہر مسلمانوں کے ساتھ تھے لیکن موسم کی سختی، رسد کی قلت متواتر فاقے، راتوں کی بے خوابی، بے شمار فوجوں کا ہجوم ایسے واقعات تھے جنھوں نے ان کا پردہ فاش کردیا، آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگنی شروع کی کہ ہمارے گھر محفوظ نہیں، ہم کو شہر میں واپس چلے جانے کی اجازت دی جائے۔

يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ	کہتے ہیں کہ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں بلکہ
إِنْ يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا (احزاب ۲)	ان کو بھاگنا مقصود ہے۔

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ احزاب۔

لیکن جاں نثاران اسلام کا طلائے اخلاص اسی کسوٹی پر آزمانے کے قابل تھا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا	جب مسلمانوں نے قبائل کی فوجیں دیکھیں تو بول اٹھے کہ یہ وہی ہے
وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	جس کا وعدہ خدا نے اور اس کے رسول نے کیا تھا اور خدا اور اس کا
وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا۔ (احزاب - ۳)	رسول دونوں سچے تھے اور اس بات نے ان کے یقین اور اطاعت کو اور بھی بڑھا دیا

قریباً ایک مہینہ تک اس سختی سے محاصرہ قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ پر تین تین فاقے گزر گئے۔ ایک دن صحابہؓ نے بے تاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے شکم کھول کر دکھائے کہ پتھر بندھے ہیں، لیکن جب آپؐ نے شکم مبارک کھولا تو ایک کے بجائے دو پتھر تھے۔[1] محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی ہے جو باہر نکل کر محاصرین کی خبر لائے؟ تین دفعہ آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے، لیکن حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب[2] دیا۔

محاصرین نے ادھر تو خندق کا محاصرہ کر رکھا تھا، اُدھر دوسری سمت اس غرض سے مدینہ پر حملہ کرنا چاہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اہل و عیال یہیں قلعوں میں پناہ گزین تھے۔

محاصرین خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے اس لئے دور سے تیر اور پتھر برساتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خندق کے مختلف حصوں پر فوجیں تقسیم کر دی تھیں جو محاصرین کے حملوں کا مقابلہ کرتی تھیں، ایک حصہ خود آپؐ کے اہتمام میں تھا۔

محاصرہ کی سختی دیکھ کر آپؐ کو خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ انصار ہمت ہار جائیں، اس لئے آپؐ نے غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کرنا چاہا کہ مدینہ کی پیداوار کا ایک ثلث ان کو دے دیا جائے حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت سعد بن معاذؓ کو جو رؤسائے انصار تھے بلا کر مشورہ کیا، دونوں نے عرض کی اگر یہ خدا کا حکم ہے تو انکار کی مجال نہیں، لیکن اگر رائے ہے تو یہ عرض ہے کہ کفر کی حالت میں بھی کوئی شخص ہم سے خراج مانگنے کی جرأت نہ کر سکا اور اب تو اسلام نے ہمارا پایہ بہت بلند کر دیا ہے، یہ استقلال دیکھ کر آپؐ کو اطمینان ہوا حضرت سعدؓ نے معاہدہ کا کاغذ ہاتھ میں لے کر تمام عبارت مٹا دی اور کہا ان لوگوں سے جو بن آئے کر دکھائیں۔

اب مشرکوں کی طرف سے حملہ کا یہ انتظام کیا گیا کہ قریش کے مشہور جنرل یعنی ابوسفیان، خالد بن ولید، عمرو بن العاص، ضرار بن الخطاب، ہبیرہ کا ایک ایک دن مقرر ہوا، ہر جنرل اپنی باری کے دن پوری فوج کو لے کر لڑتا

---

[1] شمائل ترمذی، عرب کی عادت تھی کہ سخت بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھتے تھے جس سے کمر نہیں جھکنے پاتی تھی۔

[2] صحیح بخاری ذکر غزوہ احزاب و صحیح مسلم کتاب الفضائل، لیکن ابن ہشام میں اس موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان کا نام ہے، اس لئے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بدلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیق حال کے لئے حضرت حذیفہؓ اور بنو قریظہ کی تحقیق خبر کے لئے حضرت زبیرؓ گئے تھے، یہ تفصیل واقدی وغیرہ کی روایتوں میں کی ہے، فتح الباری ج ۷ صفحہ ۳۱۲، زرقانی ج ۲ صفحہ ۱۳۵، ابن سعد طبری صفحہ ۱۴۷۳ تا ۱۴۷۴

تھا خندق کو عبور نہیں کر سکتے تھے، لیکن خندق کا عرض چونکہ زیادہ نہ تھا اس لئے باہر سے پتھر اور تیر برساتے تھے۔ چونکہ اس طریقہ میں کامیابی نہیں ہوئی اس لئے قرار پایا کہ اب عام حملہ کیا جائے، تمام فوجیں یکجا ہوئیں، قبائل کے تمام سردار آگے آگے تھے۔ خندق ایک جگہ سے اتفاقاً کم عریض تھی۔ یہ موقع حملہ کے لئے انتخاب کیا گیا عرب کے مشہور بہادروں یعنی ضرار، جبیرہ، نوفل، عمرو بن عبدود نے خندق کے اس کنارے سے گھوڑوں کو مہمیز کیا تو اس پار تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور بہادر عمرو بن عبدود تھا وہ ایک ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا۔ جنگ بدر میں زخمی ہو کر واپس چلا گیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ جب تک انتقام نہ لوں گا بالوں میں تیل نہ ڈالوں گا اس وقت اس کی عمر نوے برس کی تھی۔ تاہم سب سے پہلے وہی آگے بڑھا اور عرب کے دستور کے موافق پکارا کہ مقابلہ کو کون آتا ہے، حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا "میں"۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ یہ عمرو بن عبدود ہے حضرت علیؓ بیٹھ گئے۔ لیکن عمرو کی آواز کا اور کسی طرف سے جواب نہیں آتا تھا۔ عمرو دوبارہ پکارا اور پھر وہی ایک صدا جواب میں تھی۔ تیسری دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عمرو ہے تو حضرت علیؓ نے عرض کی ہاں میں جانتا ہوں کہ یہ عمرو ہے۔ غرض آپ نے اجازت دی، خود دستِ مبارک سے تلوار عنایت کی، سر پر عمامہ باندھا۔

عمرو کا قول تھا کہ کوئی شخص دنیا میں اگر مجھ سے تین باتوں کی درخواست کرے تو ایک ضرور قبول کروں گا حضرت علیؓ نے عمرو سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ تیرا قول ہے۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت علیؓ	میں درخواست کرتا ہوں کہ تو اسلام لا۔
عمرو	یہ نہیں ہو سکتا۔
حضرت علیؓ	لڑائی سے واپس چلا جا۔
عمرو	میں خاتونانِ قریش کا طعنہ نہیں سن سکتا۔
حضرت علیؓ	مجھ سے معرکہ آرا ہو۔

عمرو ہنسا اور کہا مجھ کو امید نہ تھی کہ آسمان کے نیچے یہ درخواست بھی میرے سامنے پیش کی جائے گی۔ حضرت علیؓ پیادہ تھے۔ عمرو کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا۔ گھوڑے سے اتر آیا اور پہلی تلوار گھوڑے کے پاؤں پر ماری کہ کونچیں کٹ گئیں۔ پھر پوچھا کہ تم کون ہو؟ آپ نے نام بتایا۔ اس نے کہا میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا۔ آپ نے فرمایا "ہاں لیکن میں چاہتا ہوں"۔ عمرو اب غصہ سے بے تاب تھا۔ پر تلے سے تلوار نکالی اور آگے بڑھ کر وار کیا۔ حضرت علیؓ نے سپر پر روکا، لیکن تلوار سپر میں ڈوب کر نکل آئی اور پیشانی پر لگی، گو زخم کاری تاہم یہ طغرا آپ کی پیشانی پر یادگار رہ گیا۔ قاموس میں لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کو ذوالقرنین بھی کہتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی پیشانی پر دو زخموں کے نشان تھے، ایک عمرو کے ہاتھ کا اور ایک ابن ملجم کا۔ دشمن کا وار ہو چکا تو حضرت علیؓ نے وار کیا ان کی تلوار شانہ کاٹ کر نیچے اتر آئی۔ ساتھ ہی حضرت علیؓ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا اور فتح کا اعلان ہو گیا۔ عمرو کے بعد ضرار اور جبیرہ نے حملہ کیا لیکن جب ذوالفقار کا ہاتھ بڑھا تو پیچھے ہٹنا پڑا۔ حضرت عمرؓ نے ضرار کا تعاقب کیا۔ ضرار نے مڑ کر برچھے کا وار کرنا چاہا لیکن روک لیا اور کہا عمر! اس احسان کو یاد رکھنا۔

نوفل بھاگتے ہوئے خندق میں گرا، صحابہ نے تیر مارنے شروع کیے اس نے کہا مسلمانو! میں شریفانہ موت چاہتا ہوں، حضرت علیؓ نے درخواست منظور کی اور خندق میں اتر کر مارا کہ شریفوں کے شایان تھا۔

حملہ کا یہ دن بہت سخت تھا، تمام دن لڑائی رہی، کفار ہر طرف سے تیر اور پتھروں کا مینہ برسا رہے تھے، اور ایک دم کے لئے یہ بارش تھمنے نہ پاتی تھی۔ یہی دن ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں، متصل تیر اندازی اور سنگ باری سے جگہ سے ہٹنا ناممکن تھا۔

مستورات جس قلعہ میں تھیں بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا۔ یہودیوں نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے قلعہ پر حملہ کیا، ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہا تھا۔ حضرت صفیہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی) نے دیکھ لیا۔ مستورات کی حفاظت کے لئے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کر دیئے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ نے ان سے کہا کہ اتر کر اس کو قتل کر دو، ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتہ دے گا، حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہو گیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، اس بناء پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا، حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ، حسانؓ نے کہا جانے بھی دیجئے مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں، حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو کہ یہودی مرعوب ہو جائیں، لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینا پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے اس خیال سے پھر انہوں نے حملہ کی جرأت[3] نہ کی۔

محاصرہ کو جس قدر طول ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے جاتے تھے۔ دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آگیا، خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولہوں پر الٹ الٹ جاتے تھے، اس واقعہ نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا، اسی بنا پر قرآن مجید نے اس بادِ صرصر کو عسکرِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب ۲۰)	مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

نعیم بن مسعود اشجعی ایک غطفانی رئیس تھے، قریش اور یہود دونوں ان کو مانتے تھے وہ اسلام لا چکے تھے

---

[1] یہ حالات اگرچہ اجمالاً تمام کتابوں میں ہیں، لیکن ہم نے جو تفصیل لکھی ہے ابن سعد اور خمیس سے ماخوذ ہے۔

[2] اس امر میں محدثین میں سخت اختلاف ہے کہ چار نمازیں قضا ہوئیں یا ایک، اور چار قضا ہوئیں تو ایک ہی دن یا کئی دن، یا کئی دن کی ملا کر، زرقانی میں یہ بحث مفصل ہے۔

[3] زرقانی بحوالہ طبرانی و بزار و ابو یعلی بسند حسن، دیکھو صفحہ ۱۰۹ جلد ۲، و ابن ہشام۔

لیکن کفار کو ابھی اس کا علم نہ تھا انھوں نے قریش اور یہود سے الگ الگ جا کر اس قسم کی باتیں کہیں جس سے دونوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ نعیم نے اس تفرقہ اندازی میں دونوں سے ایسی باتیں کہیں جن سے دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہو جائیں اور اس بنا پر کہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے الحرب خدعة کی تعلیم کی تھی۔ لیکن ابن اسحاق نے روایت کی سند نہیں نقل کی اور اگر کرتے بھی تو ابن اسحاق کا یہ پایہ نہیں کہ ایسا واقعہ محض ان کی سند سے قبول کر لیا جائے۔ اس کے علاوہ واقعات اس قسم کے جمع تھے کہ دونوں فریقوں کا اتحاد بغیر اس کے توڑ دیا جا سکتا تھا کہ کوئی غلط بات بیان کی جائے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بھی اس قدر مذکور ہے کہ نعیم نے یہود سے کہا کہ قریش تو چار دن کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے، تمہارا اور مسلمانوں کا ہم وطنی کا ساتھ ہے اس لئے تم کیوں بیچ میں پڑ کر ہمیشہ کے لئے لڑائی مول لیتے ہو، اور اگر اس پر آمادہ ہی ہو تو قریش سے کہو کہ وہ کچھ معزز آدمی ضمانت کے طور پر تمہارے ہاں بھجوا دیں کہ اگر قریش لڑائی کا فیصلہ کئے بغیر جانا چاہیں تو تم ان لوگوں کو روک لینا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود بنو قریظہ اول اول نقض عہد پر راضی نہ تھے اور کہتے تھے کہ ہم محمدؐ سے معاہدہ کیوں توڑیں؟ لیکن حیی بن اخطب نے اسی شرط پر ان کو راضی کیا تھا کہ قریش چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر تمہارے پاس آجاؤں گا۔ قریش اس قسم کی ضمانت نہیں منظور کر سکتے تھے اس لئے جب انھوں نے انکار کیا ہوگا تو دونوں میں خود بخود پھوٹ پڑ گئی ہوگی، اس کے لئے ایک صحابی کو دروغ بیانی کی کیا ضرورت تھی۔

بہرحال موسم کی سختی، محاصرہ کا امتداد، آندھی کا زور، رسد کی قلت، یہود کی علیحدگی، یہ تمام اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے کہ قریش کے پائے ثبات اب ٹھہر نہیں سکتے تھے، ابوسفیان نے فوج سے کہا رسد ختم ہو چکی، موسم کا یہ حال ہے، یہود نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب محاصرہ بے کار ہے، یہ کہہ کر طبل رحیل بجنے کا حکم دیا، غطفان بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ بنو قریظہ محاصرہ چھوڑ کر اپنے قلعوں میں چلے آئے اور مدینہ کا افق ۲۰، ۲۲ دن تک

لہ مصنف کے اس قیاس کی تائید مغازی موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کو مختصراً مصنف ابن ابی شیبہ میں اور تفصیل کے ساتھ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ اس روایت کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں شرکت اسی شرط کے ساتھ کی تھی کہ قریش ضمانت کے طور پر اپنے کچھ معزز آدمی بنو قریظہ کے سپرد کریں گے لیکن انھوں نے اپنی یہ شرط پوری نہیں کی اور اس لئے ان کے دل میں قریش کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوئی اور انھوں نے خفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کے ساتھ مصالحت کا پیغام بھیجا کہ بنو نضیر کو جو خیبر کو جلا وطن کر دیئے گئے تھے پھر مدینہ آنے کی اجازت دے دی جائے۔ نعیم بن مسعود ثقفی جو اسی موقع پر مسلمان ہونے آئے تھے ایک ایسے آدمی تھے جو پیٹ کے ہلکے تھے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دانستہ راز کے طور پر بنو قریظہ کے اس مخفی پیغام کا ذکر فرما دیا۔ انھوں نے جا کر یہ قریش تک پہنچا دیا، اس سے قریش کو بنو قریظہ سے بدگمانی پیدا ہو گئی اور اس طرح قریش اور بنو قریظہ کے اتفاق کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ دیکھئے مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب غزوۂ خندق والبدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۴

غبار آلود رہ کر صاف ہو گیا۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (احزاب ۳)

اور خدا نے کافروں کو غصہ میں بھرا ہوا ہٹا دیا کہ ان کو کچھ ہاتھ نہ آیا اور مسلمانوں کو لڑنے کی نوبت نہ آنے دی

اس معرکہ میں فوج اسلام کا جانی نقصان کم ہوا لیکن انصار کا سب سے بڑا بازو ٹوٹ گیا، یعنی حضرت سعد بن معاذ جو قبیلہ اوس کے سردار تھے زخمی ہوئے اور پھر جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے زخم کھانے کا واقعہ مؤثر اور عبرت انگیز ہے، حضرت عائشہؓ جس قلعہ میں پناہ گزین تھیں، حضرت سعد بن معاذ کی ماں بھی وہیں ان کے ساتھ تھیں، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ میں قلعہ سے نکل کر باہر پھر رہی تھی، عقب سے پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی، مڑ کر دیکھا سعدؓ ہاتھ میں حربہ لئے جوش کی حالت میں بڑی تیزی سے بڑھے جا رہے ہیں اور یہ شعر زبان پر ہے

لَبِّث قلیلًا یدرک الهیجا جَمَل   لا بأس بالموت اذا الموت نزل
ذرا ٹھہر جاؤ کہ لڑائی میں ایک اور شخص پہنچ جائے   وقت جب آ گیا تو موت سے کیا ڈر ہے

حضرت سعدؓ کی ماں نے سنا تو پکاریں بیٹا دوڑ کر جا تو نے دیر لگا دی، سعدؓ کی زرہ اس قدر چھوٹی تھی کہ دونوں ہاتھ باہر تھے، حضرت عائشہؓ نے سعدؓ کی ماں سے کہا کاش سعدؓ کی زرہ لمبی ہوتی، اتفاق یہ کہ ابن العر نے تاک کر کھلے ہوئے ہاتھ پر تیر مارا جس سے اکحل کی رگ کٹ گئی، خندق کا معرکہ ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مسجد کے صحن میں ایک خیمہ کھڑا کرایا اور ان کی تیمارداری شروع کی، اس لڑائی میں رفیدہ ایک خاتون شریک تھیں جو اپنے پاس دوائیں رکھتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، یہ خیمہ انہی کا تھا اور وہ علاج کی نگران تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دست مبارک میں مشقص لے کر داغا لیکن پھر ورم کر آیا، دوبارہ داغا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا، کئی دن کے بعد لیکن بنو قریظہ کی ہلاکت کے بعد زخم کھل گیا اور انہوں نے وفات پائی۔

بنو قریظہ کا خاتمہ

اوپر گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز قیام میں یہود کے ساتھ معاہدہ کیا تھا اور ان کو جان و مال و مذہب ہر چیز میں امن و آزادی بخشی تھی لیکن جب قریش نے ان کو تحریص و تہدید کا خط لکھا تو وہ آمادہ بغاوت ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے تجدید معاہدہ کرنا چاہی، بنو نضیر نے انکار کیا اور جلاوطن کر دیئے گئے، لیکن بنو قریظہ نے نئے سرے سے معاہدہ کر لیا، چنانچہ ان کو امن دے دیا گیا، صحیح مسلم میں ان واقعات کو اختصار کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

---

۱ ابن ہشام وطبری و خمیس۔ ۲ یہ خمیس کا بیان ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ (ذکر رفیدہ) میں امام بخاری کی ادب المفرد سے نقل کیا ہے کہ رفیدہ ایک خاتون تھیں جو زخمیوں کا علاج کرتی تھیں، حضرت سعدؓ انہی کے پاس علاج کے لئے رکھے گئے تھے، ابن سعد نے رفیدہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ ان کا ایک خیمہ مسجد نبوی کے پاس تھا اس میں وہ بیماروں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ صحیح بخاری میں بھی رفیدہ کے خیمہ اور ان کے جراح خانہ کا ذکر ہے۔ ۳ مسلم باب الفداء ۴ واقدی نے حیی بن اخطب کی زبانی بنو قریظہ کے اس معاہدہ سے مکر جانے کے واقعہ کو ان کی سازشی چال ظاہر کیا ہے، حیی بن اخطب نے کہا کہ وہ اس لئے مکر گئے ہیں تاکہ موقع پا کر سے مل کر مسلمانوں پر حملہ کر سکیں۔ مغازی واقدی صفحہ ۳۶۲ کلکتہ۔

عن ابن عمر ان یہود بنی النضیر وقریظۃ حاربوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاجلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی النضیر واقر قریظۃ ومن علیہم (صحیح مسلم ذکر اجلاء الیہود من الحجاز)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ بنو نضیر اور قریظہ کے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کی تو آپ نے بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا اور قریظہ کو رہنے دیا اور ان پر احسان کیا۔

بنو نضیر جب جلا وطن ہوئے تو ان کے رئیس الاعظم حیی بن اخطب، ابو رافع سلام ابن ابی الحقیق خیبر میں جا کر آباد ہوئے اور وہاں ریاست عام حاصل کر لی۔ جنگ احزاب انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ قبائل عرب میں دورہ کر کے تمام ملک میں آگ لگا دی اور قریش کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ اس وقت تک بنو قریظہ معاہدے پر قائم تھے، لیکن حیی بن اخطب نے ان کو بہکا کر توڑ لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ خدانخواستہ اگر قریش حملے سے دست بردار ہو کر چلے گئے تو میں خیبر چھوڑ کر یہیں آرہوں گا۔ چنانچہ اس نے یہ عہد وفا کیا۔

قریظہ نے احزاب میں علانیہ شرکت کی اور شکست کھا کر ہٹ آئے تو اسلام کے سب سے بڑے دشمن حیی بن اخطب کو ساتھ لائے۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا آخری فیصلہ کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب سے فارغ ہو کر حکم دیا کہ ابھی لوگ ہتھیار نہ کھولیں اور قریظہ کی طرف بڑھیں۔ قریظہ اگر صلح و آشتی سے پیش آتے تو قابل اطمینان تصفیہ کے بعد ان کو امن دیا جاتا۔ لیکن وہ مقابلہ کا فیصلہ کر چکے تھے۔ فوج سے آگے بڑھ کر جب حضرت علیؓ ان کے قلعوں کے پاس پہنچے تو انہوں نے علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) گالیاں دیں۔ غرض ان کا محاصرہ کیا گیا اور تقریباً ایک مہینہ محاصرہ رہا۔ بالآخر انہوں نے درخواست پیش کی کہ حضرت سعدؓ بن معاذ جو فیصلہ کریں ہم کو منظور ہے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ اور ان کا قبیلہ (اوس) قریظہ کا حلیف اور ہم عہد تھا۔ عرب میں یہ تعلق ہم نسبی سے بڑھ کر تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کی۔

قرآن مجید میں جب تک کوئی خاص حکم نہیں آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ کے احکام کی پابندی فرماتے تھے۔ چنانچہ اکثر مسائل مثلاً قبلۂ نماز، رجم، قصاص، بالمثل وغیرہ وغیرہ میں جب تک خاص وحی نہیں آئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توراۃ ہی کی پابندی فرمائی۔ حضرت سعدؓ نے جو فیصلہ کیا یعنی یہ کہ لڑنے والے قتل کئے جائیں۔ عورتیں اور بچے قید ہوں، مال و اسباب غنیمت قرار دیا جائے، توراۃ کے مطابق تھا۔ توراۃ کتاب

۱؎ مسٹر ولیم میور صاحب ارباب سیر کی یہ روایت تسلیم نہیں کرتے کہ بنو قریظہ نے اس جنگ میں کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید میں جہاں احزاب کا ذکر ہے وہاں اس کا ذکر ضرور ہوتا۔ لیکن قرآن میں صاف الفاظ یہ ہیں وانزل الذین ظاہروہم من اہل الکتاب، مظاہرۃ (امداد) سے بڑھ کر اور کون لفظ درکار ہے۔ ۲؎ طبری (ج ۳ ص ۱۴۹۷) ابن ہشام ص ۱۴۹ ج دوم ۳؎ طبری ج ۳ ص ۱۴۸۵ میں ہے حتی اذا دنا من الحصون سمع منہا مقالۃ قبیحۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منہم ۴؎ صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۸ باب جواز قتال من نقض العہد وجواز انزال اہل الحصون علی حکم حاکم عدل اہل للحکم ص، اور نیز بخاری باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ

تثنیہ، اصحاح ۲۰- آیت ۱۰ میں ہے۔

"جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لئے تُو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے، اگر وہ صلح تسلیم کرلیں اور تیرے لئے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو تُو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلادے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے باقی بچے عورتیں جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لئے مال غنیمت ہوں گے۔"

احادیث میں مذکور ہے کہ سعد نے جب یہ فیصلہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ آسمانی فیصلہ کیا، یہ اسی توراۃ کے حکم کی طرف اشارہ تھا۔ یہودیوں کو جب یہ حکم سنایا گیا تو جو فقرے ان کی زبان سے نکلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اسی فیصلہ کو حکم الٰہی کے موافق سمجھتے تھے۔

حیی بن اخطب جو ان تمام فتن کا بانی تھا مقتل میں لایا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس نے منہ اٹھا کر دیکھا اور یہ فقرے کہے۔

اما واللہ ما لمت نفسی فی عداوتک ولکن من یخذل اللہ یخذل۔	ہاں خدا کی قسم مجھ کو اس کا افسوس نہیں کہ میں نے کیوں تیری عداوت کی لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص خدا کو چھوڑ دیتا ہے خدا بھی اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

ایھا الناس انہ لا باس بامر اللہ کتاب وقدر وملحمۃ کتبھا اللہ علی بنی اسرائیل۱؎۔	لوگو! خدا کے حکم کی تعمیل میں کچھ مضائقہ نہیں، یہ ایک حکم الٰہی تھا، یہ لکھا ہوا تھا ایک سزا تھی جو خدا نے بنی اسرائیل پر لکھی تھی۔

حیی بن اخطب کی نسبت یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جب وہ جلاوطن ہو کر خیبر جا رہا تھا تو اس نے یہ معاہدہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کسی کو مدد نہ دے گا۲؎ اس معاہدہ پر اس نے خدا کو ضامن کیا تھا لیکن احزاب میں اس نے اس معاہدہ کی جس طرح تعمیل کی اس کا حال ابھی گزر چکا۔

بنو قریظہ کے متعلق مخالفین اسلام نے بڑے زور کے ساتھ ظلم و بے رحمی کا اعتراض کیا ہے، لیکن واقعات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آ کر ان کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کیا جس میں ان کے مذہب کو پوری آزادی دی گئی اور جان و مال کی حفاظت کا اقرار کیا گیا۔

۲۔ بنو قریظہ رتبہ میں بنو نضیر سے کم تھے، یعنی بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کو صرف آدھا خون بہا دینا پڑتا تھا، بخلاف اس کے بنو قریظہ پورا خون بہا ادا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) علیہ وسلم من الاحزاب میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے۔ مسٹر مارگولیوس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ سعد بن معاذ کو اس جنگ میں ایک قریظی نے تیر سے زخمی کیا تھا جس سے وہ بالآخر ہلاک ہو گئے اس لئے انہوں نے بنو قریظہ کی نسبت ایسا بیرحمانہ فیصلہ کیا لیکن وہ تیر انداز ابن العرقہ قریشی تھا قریظی نہ تھا۔ صحیح بخاری مسلم میں صاف تصریح ہے۔ ۱؎ یہ دونوں عبارتیں ابن ہشام (غزوہ بنی قریظہ) میں ہیں۔ طبری میں بھی قریباً یہی الفاظ ہیں۔ ۲؎ بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۱ ۳؎ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ کتاب المغازی باب بنی قریظہ میں بھی مذکور ہے۔

نے بنو قریظہ پر یہ احسان کیا کہ ان کا درجہ بنو نضیر کے برابر کر دیا۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی جلا وطنی کے وقت بنو قریظہ سے دوبارہ تجدید معاہدہ کی۔

۴۔ باوجود ان باتوں کے عہد شکنی کی اور جنگ احزاب میں شریک ہوئے۔

۵۔ ازواج مطہراتؓ قلعہ میں حفاظت کے لئے بھیج دی گئی تھیں، ان پر حملہ کرنا چاہا۔

۶۔ حُیَی بن اخطب جو بغاوت کے جرم میں جلا وطن کر دیا گیا تھا جس نے تمام عرب کو برانگیختہ کر کے جنگ احزاب قائم کر دی تھی اس کو اپنے ساتھ لائے جو آتش جنگ کے اشتعال کا دیباچہ تھا۔

ان حالات کے ساتھ بنو قریظہ کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جا سکتا تھا۔

یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ عرب میں مخالفت کا معاہدہ اخوت حقیقی کے برابر تھا۔ بنو قریظہ انصار کے حلیف تھے اور اسی بنا پر تمام انصار (اوس) نے ان کی نہایت الحاح کے ساتھ سفارش کی حضرت سعدؓ بن معاذ اوس کے سردار تھے اور دراصل معاہدہ کے وہی ذمہ دار تھے۔ وہ سخت کشمکش میں تھے۔ ان کے حلیفوں کی موت وحیات کا مسئلہ تھا۔ جن کی حمایت پر کل انصار (اوس) مُصر تھے۔ لیکن حضرت سعدؓ بن معاذ اس فیصلہ کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

مقتولین کی تعداد ارباب سیر نے ۹۰۰ سے زائد بیان کی ہے لیکن صحاح میں ۴۰۰ ہے۔ ان میں صرف ایک عورت تھی اور وہ اس قصاص میں ماری گئی تھی کہ اس نے قلعہ پر سے ایک پتھر گرا کر ایک مسلمان (خلادؓ) کو قتل کر دیا تھا۔ اس عورت نے جس جرأت اور دلیری سے جان دی، سنن ابی داؤد میں وہ حسب ذیل حیرت انگیز طریقے سے مذکور ہے۔

اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی ہے۔ قتل گاہ میں مجرم آتے اور عدم کو روانہ ہوتے جاتے تھے۔ ایک ایک کا نام پکارا جا رہا تھا اور یہ آوازِ ربا صدا بار بار اس کے کانوں میں آتی تھی لیکن وہ بے تکلف حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتی جاتی اور بات بات پر ہنستی جاتی تھی، دفعۃً قاتل نے اس کا نام پکارا، وہ بے تکلف اٹھ کھڑی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہاں؟ بولی میں نے ایک جرم کیا تھا اس کی سزا اٹھانے جاتی ہوں، خوشی خوشی قتل گاہ میں آئی اور تلوار کے نیچے سر رکھ دیا۔ حضرت عائشہؓ جب اس واقعہ کو بیان کرتی تھیں تو نہایت حیرت کے لہجہ میں بیان کرتی تھیں۔

ریحانہ کا غلط واقعہ

مستند ارباب سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریظہ کے قیدیوں میں سے ایک یہودی عورت جس کا نام ریحانہ تھا اس کی نسبت حکم دیا کہ الگ کر لی جائے اور پھر چند روز کے بعد اس کو اپنے حرم میں داخل کر لیا چنانچہ جن مورخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لونڈیوں سے بھی متمتع ہوتے تھے، انہوں نے دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک یہی ریحانہ اور دوسری ماریہ قبطیہ۔ عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو صحیح قرار دے کر نہایت ناگوار صورت میں دکھایا ہے۔ ایک مورخ نہایت طعن آمیز الفاظ میں لکھتا ہے کہ بانی اسلام جب سات سو مقتولین کی لاشوں کے تڑپنے کا تماشا دیکھ چکا تو گھر پر آکر تفریح خاطر کے لئے ......

لہ ابوداؤد جلد ۲ کتاب الدیات باب النفس بالنفس۔ لہ ابن ہشام غزوۂ بنی قریظہ۔ لہ ابوداؤد کتاب الجہاد، باب قتل النساء۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرے سے یہ واقعہ ہی غلط ہے۔

ریحانہ کے حرم میں داخل ہونے کی جس قدر روایتیں ہیں سب واقدی یا ابن اسحاق سے ماخوذ ہیں لیکن واقدی نے بتصریح بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا تھا۔ ابن سعد نے واقدی کی جو روایت نقل کی ہے اس میں خود ریحانہ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔

فاعتقنی و تزوجنی	پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو آزاد کر دیا اور مجھ سے نکاح کر لیا

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں محمد بن الحسن کی تاریخ مدینہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے یہ الفاظ ہیں۔

وکانت ریحانۃ القرظیۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم تسکنہ۔	اور ریحانہ قرظیہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترم تھیں اس مکان میں رہتی تھیں۔

حافظ ابن مندہ کی کتاب (طبقات الصحابہ) تمام محدثین مابعد کا ماخذ ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں[1]۔

واستسری ریحانۃ من بنی قریظۃ ثم اعتقہا فلحقت باھلہا واحتجبت وھی عند اھلہا۔	ریحانہ کو گرفتار کیا اور پھر آزاد کر دیا تو وہ اپنے خاندان میں چلی گئیں اور وہیں پردہ نشین ہو کر رہیں۔

حافظ ابن حجر اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

وھذہ فائدۃ جلیلۃ اغفلہا ابن الاثیر

حافظ ابن مندہ کی عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر دیا تھا اور وہ اپنے خاندان میں جا کر بیویوں کی طرح پردہ نشین ہو کر رہیں۔

ہمارے نزدیک محقق واقعہ یہی ہے اور اگر یہی مان لیا جائے کہ وہ حرم نبوی میں آئیں تو تب بھی قطعاً وہ منکوحات میں تھیں کنیز نہ تھیں[2]۔

حضرت زینبؓ سے نکاح

اس سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا۔ نکاح ایک معمولی بات ہے اور اس کی تفصیل کا موقع ازواج مطہراتؓ کا عنوان ہے لیکن اس واقعہ میں ایسے حالات جمع ہو گئے جنھوں نے مخالفین کے نزدیک اس کو ایک مہتم بالشان مسئلہ بنا دیا

---

[1] دیکھو اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر ریحانہ ج ۴ ص ۳۰۹۔

[2] حضرت ریحانہؓ کے متعلق کتب سیر میں تین قسم کی روایتیں ہیں، ایک یہ کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اپنے خاندان والوں کے پاس جا کر پردہ نشین ہو کر رہیں، یہ روایت ابن مندہ کی ہے۔ مگر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت نہیں۔ دوسری قسم کی روایت یہ ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے مثل دیگر امہات المومنینؓ کے رکھنا چاہا مگر انھوں نے اس کی غیر معمولی ذمہ داری محسوس کر کے باندی بن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا قبول کیا، یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ تیسری قسم کی روایت یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مختار بنا دیا تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا، یہ روایت واقدی کی ہے۔ ابن سعد نے واقدی سے مختلف سلسلوں سے اسی روایت کو ذکر کیا ہے اور واقدی نے اسی کو اثبت کہا ہے۔ دیکھئے کتاب البدایہ ابن کثیر ج ۴ [illegible] اور امام زہری نے بھی زوجیت ہی کی تائید کی ہے بحوالہ سابق تفصیل کے لئے دیکھئے اصابہ ذکر ریحانہ۔

عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کو نہایت آب و رنگ سے لکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص و نکتہ چینی (معاذ اللہ) کے لئے ان کے نزدیک اور کوئی واقعہ بکار آمد نہیں ہو سکتا۔

ہم اس واقعہ کو تفصیل سے لکھتے ہیں جس سے اس نکتہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ آنحضرت کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کا موقع جو دشمنوں کو ہاتھ آتا ہے، اس کا اصلی مخرج کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیدؓ کو جو آپ کے آزاد کردہ غلام تھے متبنّٰی بنا لیا تھا جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو آپ نے ان کی شادی حضرت زینبؓ سے کرنی چاہی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھیری بہن تھیں (ان کی ماں امیمہ عبد المطلب کی بیٹی تھیں) لیکن چونکہ وہ غلام رہ چکے تھے اس لئے حضرت زینبؓ کو یہ نسبت گوارا نہ تھی

وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم اراد ان يزوجها زيد بن حارثة مولاه فكرهت ذلك[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح اپنے غلام زیدؓ سے کر دینا چاہا تو انھوں نے ناپسند کیا۔

لیکن بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل ارشاد کے لحاظ سے راضی ہو گئیں۔ تقریباً ایک سال تک حضرت زیدؓ کے نکاح میں رہیں، لیکن دونوں میں ہمیشہ شکر رنجی رہتی تھی، یہاں تک کہ زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر شکایت کی اور ان کو طلاق دینا چاہا۔

جاء زيد بن حارثة فقال يا رسول الله ان زينب اشتد على لسانها وانا اريد ان اطلقها[2]

زیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ زینب مجھ سے زبان درازی کرتی ہیں اور میں ان کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اُن کو سمجھاتے تھے کہ طلاق نہ دیں، قرآن مجید میں ہے۔

وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ۔ (احزاب - ۵)

اور جب کہ تم اس شخص سے جس پر خدا نے اور تم نے احسان کیا تھا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو نکاح میں لئے رہو اور خدا سے خوف کرو۔

لیکن کسی طرح صحبت برآ نہ ہو سکے اور آخر حضرت زیدؓ نے اُن کو طلاق دے دی۔ حضرت زینب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بہن تھیں اور آپ ہی کی تربیت میں پلی تھیں۔ آپ کے فرمانے سے انہوں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا جو اُن کے نزدیک اُن کے خلاف شان تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو مساوات اسلامی قائم کرنا چاہتے تھے اس میں آزاد و غلام کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہرحال جب وہ مطلقہ ہو گئیں تو آپ نے ان کی دلجوئی کے لئے خود ان سے نکاح کر لینا چاہا لیکن عرب میں اس وقت تک متبنّٰی اصلی بیٹے کے برابر سمجھا جاتا تھا، اس لئے عام لوگوں کے خیال سے آپ تامل فرماتے تھے لیکن چونکہ یہ محض جاہلیت کی رسم تھی اور اس کا مٹانا مقصود تھا، اسلئے یہ آیت نازل ہوئی

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ۔ (احزاب - ۵)

اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپاتے ہو جس کو خدا ظاہر کر دینے والا ہے اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنا خدا سے چاہیئے۔

غرض آپ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا اور جاہلیت کی ایک قدیم رسم کہ متبنّٰی اصلی بیٹے کا حکم رکھتا ہے

---

[1] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم [2] فتح الباری تفسیر سورۂ احزاب بحوالہ روایت عبد الرزاق از معمر از قتادہ۔

مٹ گئی۔ اس پر منافقوں اور بدگویوں نے بہت طعنے دیئے لیکن امرِ حق کے اجراء میں مطاعن کا آماجگاہ بننا لازمی ہے۔

واقعہ کی اصلی اور سادہ حقیقت یہ تھی، مخالفوں نے اس واقعہ کو جس طرح بیان کیا ہے گو سرتاپا کذب و افترا ہے لیکن ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے رنگ آرائی کے لئے سیاہی ہمارے ہی ہاں سے مستعار لی ہے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زید سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے، زید نہ تھے حضرت زینبؓ کپڑے پہن رہی تھیں، اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھ لیا اور یہ الفاظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔

سبحان اللہ العظیم سبحان اللہ مصرف القلوب[1]۔	پاک ہے خدائے برتر، پاک ہے وہ خدا جو دلوں کو پھیر دیتا ہے۔

حضرت زیدؓ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ زینبؓ اگر آپ کو پسند آگئی ہوں تو میں اُن کو طلاق دے دوں۔

میں نے یہ بے ہودہ روایت اپنے دل پر سخت جبر کر کے نقل کی ہے۔ نقل کفر کفر نباشد۔ یہی روایت ہے جو عیسائی مؤرخوں کا مایۂ استناد ہے۔ لیکن ان غریبوں کو یہ معلوم نہیں کہ اصولِ فن کے لحاظ سے یہ روایت کس پایہ کی ہے، مؤرخ طبری نے یہ روایت واقدی کے ذریعہ سے نقل کی ہے جو مشہور کذاب اور دروغ گو ہے اور جس کا مقصد اس قسم کی بے ہودہ روایتوں سے یہ تھا کہ عباسیوں کی عیش پرستی کے لئے سند ہاتھ آئے۔

طبری کے علاوہ اور لوگوں نے بھی اسی قسم کی بے ہودہ روایتیں نقل کی ہیں لیکن محدثین نے ان کو اس قابل نہیں سمجھا کہ ان سے تعرض کیا جائے۔ حافظ ابن حجر سخت روایت پرست ہیں۔ تاہم فتح الباری (سورۂ احزاب کی تفسیر) میں جہاں اس واقعہ سے بحث کی ہے لکھتے ہیں۔

ووردت آثار اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بها۔	اور، اور بہت سی روایتیں آئی ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور اکثر مفسرین نے اُن کو نقل کر دیا ہے ان روایتوں میں مشغول نہ ہونا چاہیے۔

حافظ ابن کثیر جو مشہور محدثین میں ہیں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ذکر ابن ابی حاتم و ابن جریر ھٰھنا آثارا عن بعض السلف رضی اللہ عنہم احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها وقد روی الامام احمد ھٰھنا ایضا من روایة حماد بن زید عن ثابت عن انس رضی اللہ عنہ فیہ غرابة ترکنا سیاقہ ایضا۔	ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض اسلاف سے چند روایتیں نقل کی ہیں۔ جن کو ہم اس لئے نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ غلط ہیں اور امام احمد نے بھی اس واقعہ کے متعلق انسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جو غریب ہے ہم نے اس کا ذکر بھی چھوڑ دیا ہے۔

---

[1] تاریخ طبری آغاز واقعات ۵ ہجری۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت منافقوں کا بہت زور تھا، حضرت عائشہؓ پر لوگوں نے جو تہمت لگائی وہ بھی اسی سال کا واقعہ ہے۔ منافقین ان خبروں کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ جاتی تھیں یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کی تہمت میں خود چند مسلمان بھی آلودہ ہو گئے جن کو شریعت کے موافق قذف کی سزا دی گئی، یہی روایتیں ہیں جو بچی کھچی غیر محتاط کتابوں میں باقی رہ گئیں، لیکن وہ محدثین جن کا معیارِ تحقیق بلند ہے اور وہ ثقاہتِ روایت کے حاکمانِ مجاز ہیں، مثلاً امام بخاری، امام مسلم وغیرہ، اُن کے ہاں ان روایتوں کا ذکر تک نہیں آتا۔

واقعات متفرقہ ۵ھ

اس سال کی تاریخ مذہبی میں سب سے اہم واقعات عورتوں کے متعلق متعدد اصلاحی احکام کا نزول ہے۔ اب تک مسلمان عورتیں عام جاہلانہ طریق سے چلتی پھرتی تھیں اور اسی قسم کے لباس و زیور پہنتی تھیں۔ اب حکم ہوا کہ شریف عورتیں گھر سے نکلیں تو ایک بڑی چادر اوڑھ کر گھونگھٹ نکال لیا کریں، جس سے منہ بھی چھپ جائے، آنچل سینہ پر ڈال کر چلیں، پاؤں تھٹک جھٹک کر نہ چلیں، پردہ کی اوٹ سے بولیں، تصنع اور بناؤ کی بولی نہ بولیں۔ ازواج مطہراتؓ کے لئے غیر مردوں کے سامنے آنا قطعاً ممنوع ہوا۔

منہ بولے لڑکے کی بیوی سے جاہلیت میں بیاہ ناجائز تھا، اس رسم کی اصلاح بھی اسی سال ہوئی۔

زنا کی سزا سو کوڑے بھی اسی سال نازل ہوئی، عفیف عورتوں پر الزام لگانا جاہلیت کا ایک معمولی فعل تھا اور ان کمزوروں کے پاس اس حملہ کے روکنے کے لئے کوئی قانونی سپر نہ تھی۔ اس سال حد قذف نازل ہوئی جس کی رو سے بغیر شہادت کے تنہا اتہام جرم قرار دیا گیا۔ بصورت عدم وجودِ شہادت لعان کا طریقہ بتایا گیا یعنی زن و شو دونوں اپنی سچائی اور فریقِ ثانی کی دروغ گوئی کا بحلف اظہار کریں اور اس کے بعد ان میں تفرقہ کر دیا جائے۔

عرب میں ایک قسم کی طلاق جاری تھی جس کو ظہار کہتے ہیں۔ اس سال اس قسم کی طلاق غیر مؤثر قرار دی گئی اور اس کے لئے کفارہ مقرر کیا گیا۔

پانی نہ ملنے کی حالت میں تیمم کی مشروعیت بھی اسی سال کا حکم ہے، بروایتِ صحیح نمازِ خوف کا حکم قرآن مجید میں اسی سال نازل ہوا، جس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی۔

*

---

[1] بخاری جلد ۲ ص [illegible]، وسیرت گازرونی قلمی، ابوداؤد جلد ۱ ص [illegible] وغیرہ فتح الباری جلد ۸ صفحہ [illegible]، دیکھنا چاہئے۔ یہ تمام احکام سورۂ نور میں بتقریب واقعہ افک ۵ھ میں نازل ہوئے۔

سنہ ۶ ھ

صلح حدیبیہ وبیعتِ رضوان

ذوقعدہ سنہ ۶ ھ

مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر ایک کنواں ہے جس کو حدیبیہ کہتے ہیں، گاؤں بھی اسی کنوئیں کے نام سے مشہور ہوگیا، چونکہ معاہدہ صلح یہیں لکھا گیا اس لئے اس واقعہ کو صلح حدیبیہ کہتے ہیں۔

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ نہایت اہم یعنی اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ ہے اور اسی بنا پر باوجود اس کے کہ وہ صرف ایک صلح کا معاہدہ تھا اور صلح بھی بظاہر مغلوبانہ تھی تاہم خدا نے قرآن مجید میں اس کو فتح مبین کا لقب دیا ہے۔ کعبہ اسلام کا اصلی مرکز تھا، اسلام کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے قائم کی تھی اور یہ لقب اسلام بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج ۔ ۱۰) ابراہیم ہی ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شریعت ملی وہ کوئی نئی شریعت نہ تھی بلکہ وہی ابراہیمی شریعت تھی۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (الحج ۔ ۱۰) تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

زمانہ کے امتداد سے گو انہی کی اولاد بت پرست بن گئی تھی، تاہم کعبہ جو ابراہیمی یادگار تھا، عرب کا قبلہ گاہ عام تھا، تمام عرب اس کو اپنا مشترک ورثہ آبائی سمجھتا تھا، نہ صرف وہ لوگ جو حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے تھے بلکہ وہ بھی جو قحطانی تھے اور جن کا سلسلۂ نسب اس خاندان سے الگ تھا، عرب کے قبائل سال بھر آپس میں لڑتے رہتے تھے اور یہی غارت گریاں ان کی بقائے زندگانی کا ذریعہ تھیں کیونکہ ان کی معاش بھی اسی پر منحصر تھی، تاہم چار مہینے تک جو اشہر حرم کہلاتے تھے، تمام لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں۔ قبائل عرب دور دور سے سفر کر کے آتے اور اس قبلہ گاہ عام میں عبادت اور عقیدت کے رسوم بجا لاتے تھے۔ وہ قبائل جن میں سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہوتا تھا اب یکجا جمع نظر آتے تھے اور شیر و شکر ہو کر ملتے تھے کہ گویا بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان بجبر مکہ سے نکالے گئے تھے لیکن یہ خیال ان کے دل سے نہیں گیا تھا اور نہ جا سکتا تھا کہ کعبہ پر ان کا بھی کم از کم اسی قدر حق ہے جس قدر اور قبائل کا ہے، اس کے ساتھ مکہ سے مسلمانوں کو گوناگوں تعلقات تھے اور وہ ان کا قدیم اور محبوب وطن تھا۔

مکہ کی یاد ایک پھانس تھی جو ہر وقت ان کے کلیجے میں کھٹکتی رہتی تھی، حضرت بلالؓ مکہ میں اس قدر ستائے گئے تھے، تاہم ان کو جب مکہ یاد آتا تو روتے تھے اور پکار کر یہ اشعار پڑھتے تھے[1]

---

[1] یہ اشعار صحیح بخاری میں بھی مذکور ہیں (باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ المدینۃ) ۔

الا لیت شعری ھل ابیتنّ لیلۃً	آہ! کیا پھر کبھی وہ دن آسکتا ہے کہ میں مکہ کی وادی میں
بوادٍ وحولی اذخرٌ و جلیلٌ	ایک رات بسر کروں اور میرے پاس اذخر اور جلیل ہوں
وھل اردن یوماً میاہ مَجَنَّۃ	اور کیا وہ دن بھی ہو گا کہ میں مجنہ کے چشموں پر اتروں
وَھَل یُبْدُوَنَّ لی شامۃٌ وطفیلٌ	اور شامہ و طفیل مجھ کو دکھائی دیں۔

اکثر مہاجرین جان بچا کر نکل آئے تھے لیکن خاندان اور بال بچے وہیں رہ گئے تھے۔

اسلام کے فرائض چہارگانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور احتمال نہ ہو، عمرہ[1] کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ لیے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی جائے۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں بند ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے، ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہم رکاب ہوئے مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہوگئیں، یعنی قربانی کے اونٹ ساتھ تھے ان کی گردنوں میں قربانی کی علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیے گئے۔

احتیاط کے لیے قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیج دیا گیا کہ قریش کے ارادہ کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد مکہ میں کبھی نہیں آسکتے، غرض قریش نے بڑے زور و شور سے مقابلہ کی تیاری کی، قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا وہ جمعیت عظیم لے کر آئے، مکہ سے باہر بلدح ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔ خالد بن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔ دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا، مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آگئے ہیں اس لیے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غمیم کے قریب پہنچ گئی تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی، وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر مقام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا، لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آگیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقا تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب

---

[1] وساق معہ الھدی واحرم بالعمرۃ لیامن الناس من حربہ (ابن ہشام)

آ رہا ہے، وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ[1] کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں، جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے، ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک مدت معین کے لئے معاہدہ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی اگر وہ راضی نہیں تو اس خدا کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو کر دے۔ بدیل نے جا کر قریش سے کہا کہ محمد کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں، اجازت دو تو کہوں۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہم کو محمد کے پیغام سننے کی ضرورت نہیں لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرطیں پیش کیں، عروۃ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا، کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں۔ بولے ہاں۔ عروۃ نے کہا میری نسبت تم کو کوئی بدگمانی تو نہیں، سب نے کہا نہیں۔ عروۃ نے کہا، اچھا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں خود جا کر معاملہ طے کر دوں، محمد نے معقول شرطیں پیش کی ہیں۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، قریش کا پیغام سنایا اور کہا محمد فرض کرو کہ تم نے قریش کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے اپنی قوم کو خود برباد کر دیا ہو؟ اس کے سوا اگر لڑائی کا رخ بدلا تو تمہارے ساتھ یہ جو بھیڑ ہے گرد کی طرح اڑ جائے گی، حضرت ابوبکرؓ کو اس بدگمانی پر اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا کہ کیا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ عروۃ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا ابوبکر۔ عروۃ نے کہا میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا لیکن ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے جس کا بدلا ابھی تک میں ادا نہیں کر سکا۔

عروۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے تکلفانہ طریقہ سے گفتگو کر رہا تھا اور جیسا کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ بات کرتے کرتے مخاطب کی داڑھی پکڑ لیتے ہیں، وہ ریش مبارک پر بار بار ہاتھ ڈالتا تھا حضرت مغیرہؓ بن شعبہ جو ہتھیار لگائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھڑے تھے، اس جرأت کو گوارہ نہ کر سکے، عروۃ سے کہا اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ بڑھ کر واپس نہ جا سکے گا، عروۃ نے حضرت مغیرہؓ کو پہچانا اور کہا او دغاباز! کیا میں تیری دغابازی کے معاملہ میں تیرا کام نہیں کر رہا ہوں (حضرت مغیرہؓ نے چند آدمی قتل کر دیئے تھے جن کا خون بہا عروۃ نے اپنے پاس سے ادا کیا تھا)

عروۃ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی حیرت انگیز عقیدت کا جو منظر دیکھا اس نے اس کے دل پر عجیب اثر کیا، قریش سے جا کر کہا کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، یہ عقیدت اور وارفتگی کہیں نہیں دیکھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ کوئی شخص ان کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا، وہ وضو کرتے ہیں تو پانی جو گرتا ہے اس پر خلقت ٹوٹ پڑتی ہے، بلغم یا تھوک گرتا ہے تو عقیدت کیش

---

[1] عمرہ گویا ایک چھوٹا سا حج ہے جس میں حج کی اکثر رسمیں ادا کی جاتی ہیں (یعنی اس میں حرم کے باہر میقات سے احرام باندھ کر صفا اور مروہ کے درمیان سعی اور کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے اور بال منڈوائے یا کتروائے جاتے ہیں)

انھوں ہاتھ لیتے ہیں اور چہرہ اور ہاتھوں میں مَل لیتے ہیں۔

چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراشؓ بن امیہ کو قریش کے پاس بھیجا لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا تھا مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گزرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو، لیکن یہ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامنِ عفو اس سے زیادہ وسیع تھا، آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دے دی۔ قرآن مجید میں اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ
بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (فتح - ۳)

اور وہ وہی خدا ہے جس نے مکہ میں ان لوگوں کا ہاتھ تم سے اور تمہارا[1] ہاتھ ان سے روک دیا، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا۔

بیعتِ رضوان

بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لیے حضرت عمرؓ[2] کو انتخاب کیا لیکن انھوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھ کو بچا سکے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا وہ اپنے ایک عزیز ابان بن سعید کی حمایت میں مکہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہؓ نے جن میں مرد و زن دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دستِ مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعۃ الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ
تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ
السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا

خدا مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا تو خدا نے ان پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی۔

قریش نے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا وہ نہایت فصیح و بلیغ مقرر تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو خطیبِ قریش کا خطاب دیا تھا۔ قریش نے ان سے کہہ دیا صلح صرف اس شرط پر ہو سکتی ہے کہ محمدؐ اس سال واپس چلے جائیں۔

سہیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیر تک صلح کے شرائط پر گفتگو رہی۔ بالآخر چند شرطوں پر اتفاق ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلا کر حکم دیا کہ معاہدہ کے الفاظ قلم بند کریں۔ حضرت علیؓ نے عنوان پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا۔

---

[1] بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب وکتابۃ الشروط۔ [2] ان آیتوں کی شان نزول میں بھی سخت اختلاف ہے لیکن زیادہ معتبر یہی روایت ہے۔ [3] زرقانی ج ۲ ص ۲۲۳۔

عرب کا قدیم طریقہ تھا کہ خطوط کی ابتداء میں باسمک اللّٰھم لکھتے تھے، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے وہ آشنا نہ تھے، اس بناء پر سہیل بن عمرو نے کہا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بجائے وہی قدیم الفاظ لکھے جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا، آگے کا فقرہ تھا۔ ھٰذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسول اللہ۔ یعنی وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلیم کیا، سہیل نے کہا، اگر ہم آپ کو پیغمبر ہی تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا کیا تھا، آپ صرف اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھوائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گو تم تکذیب کرتے ہو لیکن خدا کی قسم! میں خدا کا پیغمبر ہوں، یہ کہہ کر آپ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ اچھا خالی میرا نام لکھو، حضرت علیؓ سے زیادہ کون فرمان گزار ہو سکتا تھا، لیکن عالم محبت میں ایسے مقام بھی پیش آتے ہیں جہاں فرمانبری سے انکار کرنا پڑتا ہے، حضرت علیؓ نے کہا میں ہرگز آپ کا نام نہ مٹاؤں گا، آپ نے فرمایا اچھا مجھ کو دکھاؤ میرا نام کہاں ہے؟ حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھ دی، آپ نے "رسول اللہ" کا لفظ مٹا دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا نہیں آتا تھا اسی بناء پر آپ کو اُمّی کہتے ہیں۔ یہ واقعہ مسلم میں جہاں منقول ہے لکھا ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ مٹا کر "ابن عبداللہ" لکھ دیا۔ بخاری میں چونکہ یہ واقعہ عام روایت کے خلاف ہے اس لئے ایک معرکۃ الآراء مباحثہ بن گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کا کام روزمرہ جب نظر سے گزرتا رہتا ہے تو ناخواندہ شخص بھی اپنے نام سے حرف آشنا ہو جاتا ہے اس سے اُمّیت میں فرق نہیں آتا۔ بے شبہ اُمّی ہونا آپ کا فخر ہے اور خود قرآن مجید میں یہ وصف شرف و عزت کے موقع پر استعمال ہوا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (اعراف-۱۶)

شرائطِ صلح یہ تھیں۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کر کے چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں اور نیام بھی جُلُبّان (تھیلا وغیرہ) میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے مقیم ہیں ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی مکہ میں رہ جانا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں جائے تو واپس نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں، اتفاق یہ کہ عین اس وقت جب کہ معاہدہ لکھا جا رہا تھا سہیل کے صاحبزادے (حضرت ابو جندلؓ) جو اسلام لا چکے تھے اور مکہ میں کافروں نے ان کو قید کر رکھا تھا اور طرح طرح کی

---

[1] صحیح بخاری کی اس روایت میں حضرت علیؓ کا نام اور ان کی گفتگو مذکور نہیں یہ تصریح بخاری کی اس روایت میں ہے جو کہ کتاب المغازی باب عمرۃ القضاء میں مذکور ہے، صحیح مسلم میں بھی یہ واقعہ منقول ہے۔

[2] یہ تمام شرائط کتب سیر کے علاوہ صحیح مسلم (صلح حدیبیہ) میں بھی ہیں۔

اذیتیں دیتے تھے، کسی طرح بھاگ کر پاؤں میں بیڑیاں پہنے ہوئے آئے اور سب کے سامنے گر پڑے، سہیل نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صلح کی تعمیل کا یہ پہلا موقع ہے، اس (ابوجندلؓ) کو شرائطِ صلح کے مطابق مجھ کو واپس دے دو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابھی معاہدہ قلم بند نہیں ہو چکا، سہیل نے کہا، تو ہم کو صلح بھی منظور نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا ان کو یہیں رہنے دو۔ سہیل نے نامنظور کیا۔ آپؐ نے چند دفعہ اصرار کیا لیکن سہیل کسی طرح راضی نہ ہوا، مجبوراً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کرنا۔ ابوجندلؓ کو کافروں نے اس طرح مارا تھا کہ ان کے جسم پر نشان تھے، مجمع کے سامنے تمام زخم دکھائے اور کہا برادرانِ اسلام! کیا پھر مجھ کو اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں اسلام لا چکا ہوں۔ کیا پھر مجھ کو کافروں کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ تمام مسلمان تڑپ اٹھے، حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپؐ پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، ہاں ہم حق پر ہیں، حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپؐ نے فرمایا، میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا خدا میری مدد کرے گا، حضرت عمرؓ نے کہا کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے، حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی، حضرت ابوبکرؓ نے کہا، وہ پیغمبر خدا ہیں جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں اُن سے سرزد ہوئیں تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارہ کے لئے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی، غلام آزاد کئے۔ بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے، لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ تمام باتیں گنائی ہیں۔

اس حالت کا گوارا کرنا گو صحابہ کی اطاعت شعاری کا سخت خطرناک امتحان تھا، ایک طرف بظاہر یہ اسلام کی توہین ہے، حضرت ابوجندلؓ بیڑیاں پہنے، ۱۴ سو جاں نثارانِ اسلام سے استغاثہ کرتے ہیں، سب کے دل جوش سے لبریز ہیں اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرا ایما ہو جائے تو تلوار فیصلہ قاطع کے لئے موجود ہے، دوسری طرف معاہدہ پر دستخط ہو چکے ہیں اور ایفائے عہد کی ذمہ داری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوجندلؓ کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

یا ابا جندل اصبر واحتسب فان اللہ جاعل لک
ولمن معک من المستضعفین فرجا ومخرجا انا عقدنا
بیننا وبین القوم صلحا وانا لا نغدر بہم (ابن ہشام)

ابوجندل! صبر اور ضبط سے کام لو، خدا تمہارے لئے اور مظلوموں کے
لئے کوئی راہ نکالے گا، صلح اب ہو چکی اور ہم ان لوگوں سے
بدعہدی نہیں کر سکتے۔

غرض حضرت ابوجندلؓ کو اسی طرح پابزنجیر واپس جانا پڑا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ یہیں قربانی کریں لیکن لوگ اس قدر دل شکستہ تھے کہ ایک شخص بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے[1] تین دفعہ بار بار کہنے پر بھی ایک شخص آمادہ نہ ہوا، آنحضرت

---

[1] صحیح بخاری کتاب الشروط [illegible] کتاب الشروط [illegible]

صلی اللہ علیہ وسلم گوشہ میں تشریف لے گئے اور ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی، انہوں نے کہا آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپؐ نے باہر آکر خود قربانی کی اور بال منڈاتے۔ اب جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو سب نے قربانیاں کیں اور احرام اتارا۔ صلح کے بعد تین دن تک آپؐ نے حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ پھر روانہ ہوئے تو راہ میں یہ سورہ اتری۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا (فتح-۱)

ہم نے تجھ کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔

تمام مسلمان جس چیز کو شکست سمجھتے تھے، خدا نے اس کو فتح کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا یہ فتح ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں! صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی اور مطمئن ہو گئے۔ نتائج مابعد نے اس راز سربستہ کی عقدہ کشائی کی، اب تک مسلمان اور کفار ملتے جلتے نہ تھے، اب صلح کی وجہ سے آمد و رفت شروع ہوئی، خاندان اور تجارتی تعلقات کی وجہ سے کفار مدینہ میں آتے، مہینوں قیام کرتے اور مسلمانوں سے ملتے جلتے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلامی مسائل کا تذکرہ آ جاتا تھا، اس کے ساتھ ہر مسلمان اخلاص، حسن عمل، نیکوکاری، پاکیزہ اخلاقی کی ایک زندہ تصویر تھا، جو مسلمان مکہ جاتے تھے ان کی صورتیں بھی یہی مناظر پیش کرتی تھیں، اس سے خود بخود کفار کے دل اسلام کی طرف کھنچے آتے تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ اس معاہدۂ صلح سے لے کر فتح مکہ تک اس قدر کثرت سے لوگ اسلام لاتے کہ کبھی نہیں لائے تھے حضرت خالدؓ (فاتح شام) اور حضرت عمروؓ بن عاص (فاتح مصر) کا اسلام بھی اس زمانے کی یادگار ہے۔ معاہدۂ صلح میں یہ جو شرط تھی کہ جو مسلمان مکہ سے چلا آئے گا وہ پھر مکہ کو واپس کر دیا جائے گا، اس میں صرف مرد داخل تھے عورتیں نہ تھیں۔ عورتوں کے متعلق خاص یہ آیت اتری۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَکُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُھٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْھُنَّ ۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِھِنَّ ۔ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْھُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْھُنَّ اِلَی الْکُفَّارِ ۔ لَا ھُنَّ حِلٌّ لَّھُمْ وَلَا ھُمْ یَحِلُّوْنَ لَھُنَّ ۔ وَاٰتُوْھُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اَنْ تَنْکِحُوْھُنَّ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ ۔ وَلَا تُمْسِکُوْا بِعِصَمِ الْکَوَافِرِ (ممتحنہ-۲)

مسلمانو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچ لو، خدا ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اب اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو، نہ وہ عورتیں کافروں کے قابل ہیں اور نہ کافر ان عورتوں کے قابل ہیں، اور ان عورتوں پر ان لوگوں نے جو خرچ کیا ہو وہ تم ان کو دے دو اور تم ان سے شادی کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کے مہر ادا کر دو، اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔

جو مسلمان مکہ میں مجبوری سے رہ گئے تھے، چونکہ کفار ان کو سخت تکلیفیں دیتے تھے اس لئے وہ بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عتبہؓ بن اسید (ابوبصیر) بھاگ کر مدینہ آئے۔ قریش نے آنحضرت

---

[1] صلح حدیبیہ کے واقعات صحیح بخاری میں نہایت تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اصل موقع یعنی غزوات کے ذکر میں نہیں بلکہ کتاب الشروط میں اس بنا پر ارباب سیر کی نگاہ سے یہ واقعات رہ گئے۔ غزوات میں جستہ جستہ واقعات ہیں، ہم نے ان کو بھی لیا ہے، باقی جزئیات صحیح مسلم اور ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص بھیجے کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عتبہؓ سے فرمایا کہ واپس جاؤ۔ عتبہ نے عرض کی کہ کیا آپ مجھ کو کافروں کے پاس بھیجتے ہیں کہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا، خدا اس کی کوئی تدبیر نکالے گا۔ حضرت عتبہؓ مجبوراً دو کافروں کی حراست میں واپس گئے لیکن مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر انھوں نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا۔ دوسرا شخص جو بچ رہا اس نے مدینے میں آکر آنحضرت صلی اللہ سے شکایت کی، ساتھ ہی ابوبصیر بھی پہنچے اور عرض کی کہ آپؐ نے عہد کے موافق اپنی طرف سے مجھ کو واپس کر دیا اب آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں، یہ کہہ کر مدینہ سے چلے گئے اور مقام عیص میں جو سمندر کے کنارے ذو مَروۃ کے پاس ہے، رہنا اختیار کیا۔ مکہ کے بےکس اور ستم رسیدہ لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ جان بچانے کا ایک ٹھکانہ پیدا ہو گیا ہے تو چوری چھپے بھاگ بھاگ کر یہاں آنے لگے۔ چند روز کے بعد اچھی خاصی جمعیت ہو گئی، اور اب ان لوگوں نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ قریش کا کاروانِ تجارت جو شام کو جایا کرتا تھا، اس کو روک لیتے تھے، ان حملوں میں جو مالِ غنیمت مل جاتا تھا وہ ان کی معاش کا سہارا تھا۔

قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ بھیجا کہ معاہدہ کی اس شرط سے ہم باز آتے ہیں، اب جو مسلمان چاہے مدینہ جا کر آباد ہو سکتا ہے، ہم اس سے تعرض نہ کریں گے۔ آپؐ نے آوارہ وطن مسلمانوں کو لکھ بھیجا کہ یہاں چلے آؤ، چنانچہ ابوجندلؓ اور ان کے ساتھی مدینہ میں آکر آباد ہو گئے اور کاروانِ قریش کا راستہ بدستور کھل گیا۔

مستورات میں سے حضرت ام کلثومؓ جو رئیس مکہ (عقبہ بن ابی معیط) کی صاحبزادی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں، مدینہ ہجرت کر کے آئیں لیکن ان کے ساتھ ان کے دونوں بھائی عمارہؓ اور ولید بھی آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو واپس دے دیجیے۔ آپؐ نے منظور نہیں فرمایا۔ صحابہؓ میں سے جن لوگوں کی ازواج مکہ میں رہ گئی تھیں اور اب تک کافرہ تھیں، صحابہ نے ان کو طلاق دے دی۔

*

؎ یہ تفصیل اکتفاء کلاعی سے خمیس نے نقل کی ہے۔

سلاطین کو اسلام کی دعوت

(آخر ۶ھ یا شروع ۷ھ)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا کے کانوں میں پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن تمام صحابہؓ کو جمع کیا اور خطبہ دیا۔ ایہا الناس! خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، دیکھو حواریینِ عیسٰیؑ کی طرح اختلاف نہ کرنا، جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو۔ اس کے بعد آپ نے قیصرِ روم، شہنشاہِ عجم، عزیزِ مصر اور رؤسائے عرب کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے، جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے اُن کی تفصیل یہ ہے[1]۔

حضرت دحیہؓ کلبی۔	قیصرِ روم
حضرت عبد اللہؓ بن حذافہ سہمی۔	خسرو پرویز کجکلاہِ ایران۔
حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ۔	عزیزِ مصر۔
حضرت عمروؓ بن امیہ۔	نجاشی بادشاہ حبش۔
حضرت سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمس۔	رؤسائے یمامہ۔
حضرت شجاعؓ بن وہب الاسدی۔	رئیس حدودِ شام، حارث غسانی۔

ایرانیوں نے چند برس پہلے بلادِ شام پر حملہ کر کے رومیوں کو شکست دی تھی جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں غُلِبَتِ الرُّوْمُ میں ہے، ہرقل نے اس کے انتقام کے لئے بڑے سروسامان سے فوجیں تیار کیں اور ایرانیوں پر حملہ کر کے اُن کو سخت شکست دی تھی اس کا شکرانہ ادا کرنے کے لئے وہ حمص سے بیت المقدس آیا تھا اور اس شان سے آیا تھا کہ جہاں چلتا تھا زمین پر فرش اور فرش پر پھول بچھائے جاتے تھے[2]۔

شام میں عرب کا جو خاندان قیصر کے زیرِ حکومت رہا کرتا تھا وہ غسانی خاندان تھا اور اس کا پایۂ تخت بصریٰ تھا جو دمشق کے علاقہ میں ہے اور آج کل حوران کہلاتا ہے، اس زمانہ میں اس خاندان کا تخت نشین حارث غسانی تھا، دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک بھیجیں بصریٰ میں حارث غسانی کو لا کر دیا، اس نے قیصر کے پاس

---

[1] طبری (ج ۳ ص ۱۵۶۰) اور ابن ہشام (باب خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی الملوک (ص ۹۷۱))۔ [2] ہرقل کا پورا واقعہ فتح الباری (ج اول ص ۳۰ و ۳۱) شرح صحیح بخاری سے لیا گیا ہے، اصل صحیح بخاری (بدء الوحی) کیف کان بدء الوحی و کتاب الجہاد باب دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الاسلام والنبوۃ میں مجمل واقعہ ہے، زائد تفصیلیں حافظ ابن حجر نے اور کتابوں سے بڑھائی ہیں۔

بیت المقدس میں بھیج دیا۔ قیصر کو خط ملا تو اس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق یہ کہ ابوسفیان تجارِ عرب کے ساتھ غزہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی اُن کو غزہ سے جاکر لائے۔

قیصر نے بڑے سامان سے دربار منعقد کیا، خود تاجِ شاہی پہن کر تخت پر بیٹھا تخت کے چاروں طرف بطارقہ، قیس اور رہبان کی صفیں قائم کیں۔ اہلِ عرب کی طرف مخاطب ہو کر کہا تم میں سے اس مدعیٔ نبوت کا رشتہ دار کون ہے۔ ابوسفیان نے کہا میں۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

قیصر	مدعیٔ نبوت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان	شریف ہے۔
قیصر	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	اس خاندان میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	جن لوگوں نے یہ مذہب قبول کیا ہے وہ کمزور لوگ ہیں یا صاحب اثر؟
ابوسفیان	کمزور لوگ ہیں۔
قیصر	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان	بڑھتے جاتے ہیں۔
قیصر	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟
ابوسفیان	نہیں۔
قیصر	وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان	ابھی تک تو نہیں کی، لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہوا ہے اس میں دیکھیں وہ عہد پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟
قیصر	تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی؟
ابوسفیان	ہاں۔
قیصر	نتیجۂ جنگ کیا رہا؟
ابوسفیان	کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔
قیصر	وہ کیا سکھاتا ہے؟
ابوسفیان	کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے مترجم کے ذریعہ سے کہا کہ تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے

خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان سے کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز اور تقویٰ و عفاف کی ہدایت کرتا ہے، اگر یہ سچ ہے تو میری قدمگاہ تک اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، اگر وہاں جا سکتا تو خود اُسکے پاؤں دھوتا۔

اس گفتگو کے بعد حکم دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پڑھا جائے۔

فرمانِ رسالت کے یہ الفاظ تھے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد عبد اللہ و رسولہ الی ھرقل عظیم الروم، سلام علی من اتبع الھدیٰ اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام اسلم تسلم یؤتک اللہ اجرک مرتین فان تولیت فان علیک اثم الاریسیین وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمدؐ کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے، اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں اسلام لا تو سلامت رہے گا خدا تجھ کو دوگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا، اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کو چھوڑ کر خدا نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔

قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اس سے بطارقہ اور اہل دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامۂ مبارک کے پڑھے جانے پر اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہل عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اس کے دل میں نورِ اسلام آ چکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی۔[1]

---

[1] یہ پوری گفتگو صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے، ابتدائے کتاب میں بھی اور باب الجہاد میں بھی، مسند ابن حنبل صفحہ [illegible] جلد ۳ میں ہے کہ حضرت دحیہؓ کے ساتھ قیصر نے اپنا ایک سفیر خط کا جواب دے کر خدمت نبویؐ میں بھیجا تھا اور سفیر کو نبوت کے چند سوالات بتا دیئے تھے، اس نے سوالات پوچھے، آپؐ نے جوابات دیئے اور آخر بغیر اسلام لائے وہ واپس گیا، لیکن یہ حدیث صحیح نہیں، اس میں ہے کہ قیصر کا خط پڑھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ کو بلایا اور انھوں نے پڑھ کر سنایا حالانکہ وہ اس وقت اسلام بھی نہیں لائے تھے، جامع کے نزدیک حسب تحقیق ابن حجر فتح الباری ج ۸ صفحہ ۹ و زرقانی ج ۳ ص ۸۸ و ۸۹ یہ واقعہ دوسرا ہے اور اس کے بعد کا ہے اور خود اس حدیث میں تصریح ہے کہ یہ تبوک کا واقعہ ہے اور غزوۂ تبوک فتح مکہ کے بعد رجب ۹ھ میں پیش آیا ہے اور حضرت معاویہؓ اس سے ایک یا دو سال پہلے حدیبیہ یا فتح مکہ میں مسلمان ہو چکے تھے مگر تبوک میں حضرت معاویہؓ

خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے نام جو نامۂ مبارک حضرت عبد اللہ بن حذافہ لے کر گئے تھے، یہ تھا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الہدیٰ وآمن باللہ ورسولہ واشہد ان لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس۔

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے محمد پیغمبر کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور پیغمبر خدا پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور یہ کہ خدا نے مجھ کو تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پہ ہوگا۔

خسرو پرویز بڑی شوکت و شان کا بادشاہ تھا، اس کی سلطنت میں دربار کو جو عظمت و جلال حاصل ہوا کبھی نہیں ہوا تھا۔ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، نامہ مبارک میں پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے؛ پھر نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا، لیکن چند روز کے بعد خود سلطنت عجم کے پرزے اڑ گئے۔

نظامی نے شیریں خسرو میں یہ داستان مفصل لکھی ہے اور اسلامی جوش سے لکھی ہے۔ ہم اس کے چند اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں:-

دراں دوراں کہ گیتی رام او بود — زمشرق تا بہ مغرب نام او بود!
رسول ما بہ حجت ہائے قاہر — نبوت در جہاں می کرد ظاہر
گہے با سنگ خارا راز می گفت — گہے ریگش حکایت باز می گفت
خلائق را ز دعوت جام در داد — بہ ہر کشور صلائے عام در داد
بفرمود از عطا عطرے سرشتند — بہ نام ہر یکے سطرے نوشتند
چو از نام نجاشی باز پرداخت! — ز بہر نام خسرو نامہ ساخت
چو قاصد عرضہ کرد آں نامہ نو — بجوشید از غضب اندام خسرو!
ز تیزی گشت ہر مویش سنانی — ز گرمی ہر رگش آتش فشانی
سوادے دید روشن ہیبت انگیز — نوشتہ از محمد سوئے پرویز
چو عنوان گاہ عالم تاب را دید — تو گفتی سگ گزیدہ آب را دید
غرور پادشاہی بردش از راہ! — کہ گستاخی کہ یارد؟ با چو من شاہ
کرا زہرہ کہ با ایں احترامم — نویسد نام خود بالائے نامم!
رخ از گرمی چو آتش گاہ خود کرد — بخود اندیشۂ بد کرد، و بد کرد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی شرکت کہیں مذکور نہیں، یہ روایت اسی سند کے ساتھ کتاب الاموال ابو عبید القاسم بن سلام (ص ۲۰ مصر) میں بھی موجود ہے لیکن اس میں خسرو پرواز ہے۔

دریدآں نامہ گردن شکن را ... نہ نامہ بلکہ نام خویشتن را
فرستادہ چو دید آں خشمناکی ... بہ رجعت پائے خود را کرد خاکی
ازاں آتش کہ آں دود منی داشت ... چراغ آگہاں[1] را آگہی داشت[2]
زگرمی آں چراغ گردن افراز ... دعا را داد چوں پروانہ پرواز
عجم را زاں دعا کسریٰ درافتاد ... کلاہ از تارک کسریٰ درافتاد
نہ بے شاہنشہے کز بیم و امید ... قلم رانده برافریدون جمشید

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد خسرو پرویز نے گورنر یمن کو جس کا نام باذان تھا فرمان بھیجا کہ کسی شخص کو حجاز بھیجو کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر میرے دربار میں لائے۔ باذان نے دو شخصوں کو جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرہ تھا، مدینہ منورہ روانہ کیا۔ ان دونوں نے بارگاہ رسالت میں آکر عرض کی کہ شہنشاہ عالم (کسریٰ) نے تم کو بلایا ہے، اگر تعمیل حکم نہ کرو گے تو وہ تم کو اور تمہارے ملک کو برباد کر دے گا۔ آپؐ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور کہہ دینا کہ اسلام کی حکومت کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچے گی۔ یہ لوگ پیغام پہنچا کر یمن میں آئے تو خبر آئی کہ شیرویہ (خسرو پرویز کا بیٹا) نے خسرو پرویز کو قتل کر ڈالا۔[3]

نجاشی (بادشاہ حبش) کو آپؐ نے دعوت اسلام کا جو خط بھیجا تھا اس کے جواب میں اس نے عریضہ بھیجا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ خدا کے سچے پیغمبر ہیں، حضرت جعفر طیارؓ جو ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے یہیں موجود تھے۔ نجاشی نے اُن کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی۔ ابن اسحاقؒ نے روایت کی ہے کہ نجاشی نے اپنے بیٹے کو ساٹھ مصاحبوں کے ساتھ بارگاہ رسالت میں عرض نیاز کے لئے بھیجا لیکن جہاز سمندر میں ڈوب گیا اور یہ سفارت ہلاک ہو گئی۔[4]

عام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ نجاشی نے ۹ھ میں وفات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف رکھتے تھے اور یہ خبر سن کر آپؐ نے غائبانہ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح مسلم میں تصریح کی ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپؐ نے پڑھی وہ یہ نہ تھا۔ لیکن ابن قیم نے ارباب سیر کی روایت کی تائید کی ہے اور مسلم کی روایت کے اس ٹکڑا کو راوی کا وہم بتایا ہے۔[5]

جو لوگ ہجرت کر کے حبش چلے گئے تھے، ان میں حضرت ام حبیبہؓ (حضرت امیر معاویہؓ کی بہن) بھی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو لکھ بھیجا کہ ام حبیبہؓ کو شادی کا پیغام سنا دو اور میرے پاس بھیج دو۔ نجاشی نے خالدؓ بن سعید ابن العاص کو مقرر کیا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایجاب و قبول ادا کیا۔ نجاشی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مہر ادا کیا جس کی تعداد چار سو اشرفیاں تھیں۔ نکاح کے بعد حضرت ام حبیبہؓ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوئیں اور مدینہ کی بندرگاہ میں اتریں۔ آنحضرت

---

[1] آگہاں یعنی ارباب علم چراغ آگہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ [2] آگہی داشت یعنی خبر کی۔ [3] طبری ج ۳ ص ۱۵۷۱

[4] طبری ج ۳ ص ۱۵۶۹۔ [5] زاد المعاد، ص ۱

صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خیبر میں تشریف رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نجاشی کے حالات حضرت ام حبیبہؓ سے پوچھا کرتے تھے[1]۔

عزیز مصر (مقوقس) کو آپ نے جو خط لکھا تھا اس کے جواب میں اس نے عربی زبان میں یہ خط لکھا۔

لمحمد بن عبد اللّٰہ من المقوقس عظیم القبط سلام علیك، اما بعد فقد قرأت کتابك وفهمت ما ذکرت فیه وما تدعو الیه وقد علمت ان نبیا بقی وکنت اظن ان یخرج من الشام وقد اکرمت رسولك وبعثت الیك بجاریتین لهما مکان من القبط عظیم وکسوة واهدیت الیك بغلة لترکبها والسلام علیك۔

محمد بن عبداللہ کے نام مقوقس رئیس قبط کی طرف سے سلام علیک کے بعد، میں نے آپ کا خط پڑھا اور اس کا مضمون اور مطلب سمجھا، مجھ کو اس قدر معلوم تھا کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظہور کریں گے میں نے آپ کے قاصد کی عزت کی اور دو لڑکیاں[2] بھیجتا ہوں جن کی قبطیوں میں (مصر کی قوم) بہت عزت کی جاتی ہے اور میں آپ کے لئے کپڑا اور سواری کا ایک خچر بھیجتا ہوں۔

بایں ہمہ عزیز مصر اسلام نہیں لایا، دو لڑکیاں جو بھیجی تھیں، ان میں ایک ماریہ قبطیہ تھیں جو حرم نبوی میں داخل ہوئیں، دوسری سیرینؓ تھیں جو حضرت حسانؓ کی ملک میں آئیں، خچر کا نام دلدل تھا جس کا ذکر اکثر حدیث کی کتابوں میں آتا ہے، جنگ حنین میں آپ اسی پر سوار تھے۔ طبری نے لکھا ہے کہ ماریہ اور سیرین حقیقی بہنیں تھیں اور حضرت حاطبؓ ابن بلتعہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقوقس کے پاس خط دے کر بھیجا تھا، ان کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمت نبوی میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کر چکی تھیں۔ اس واقعہ کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ دونوں خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کر چکی تھیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ کے حرم میں آئیں۔

رؤسائے عرب کو جو خط لکھے گئے تھے اُن کے بھی جواب مختلف آئے۔ ہوذہ ابن علی رئیس یمامہ نے لکھا تم جو باتیں کہتے ہو وہ نہایت اچھی ہیں۔ اگر حکومت میں کچھ میرا بھی حصہ ہو تو میں تمہاری اقتدا کے لئے تیار ہوں اسلام ہوس ملک کے لئے نہیں آیا تھا۔ آپ نے فرمایا "زمین کا ایک ٹکڑا بھی ہو تو میں نہ دوں گا"۔

حارث غسانی جو حدود شام کا رئیس تھا اور رومیوں کے ماتحت اطراف کے عربوں میں حکومت کرتا تھا، خط پڑھ کر برہم ہوا اور فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ مسلمان اس جرم کی پاداش میں ہر وقت اس کے حملہ کے منتظر رہتے تھے اور آخر موتہ اور تبوک وغیرہ کی لڑائیاں پیش آئیں[3]۔

---

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۵۶۱۔ [2] ہم نے جاریہ کا ترجمہ لڑکی کیا ہے، عربی میں جاریہ لڑکی کو بھی کہتے ہیں اور لونڈی کو بھی ارباب سیرت ماریہ قبطیہ کو لونڈی کہتے ہیں۔ لیکن مقوقس نے جو لفظ ان کی نسبت لکھا ہے یعنی کہ مصریوں میں بڑی عزت ہے، یہ لونڈیوں کی شان میں استعمال نہیں کیے جاسکتے۔ [3] اور جن رؤسائے قبائل اور امرائے عرب کو دعوتی خطوط لکھے گئے تھے ان کی تفصیل دوسری جلد کے تبلیغی واقعات میں آئے گی۔

واقعات متفرقہ ۶ھ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عمرو بن العاص کا اسلام

حدیبیہ کی صلح کو خدا نے فتح کہا ہے لیکن اجسام کی نہیں قلوب کی، اسلام کو اپنی اشاعت کے لئے امن درکار تھا اور وہ اس صلح سے حاصل ہوگیا، اس صلح کو خود دشمن فتح سمجھتے تھے۔ قریش اور مسلمانوں میں اب تک جو معرکے ہوئے فوجی حیثیت سے قریش کی صف میں ہر جگہ خالد بن ولید کا نام ممتاز نظر آتا ہے، جاہلیت میں رسالہ کی افسری ان ہی کے سپرد تھی۔ اُحد میں قریش کے اکھڑے ہوئے پاؤں ان ہی کی کوشش سے سنبھلے تھے، حدیبیہ کے موقع پر بھی قریش کا طلایہ ان ہی کی زیر افسری نظر آیا تھا، لیکن قریش کا یہ سپہ سالار اعظم بھی آخر اسلام کے حملہ کاری سے نہ بچ سکا۔

صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالدؓ نے مکہ سے نکل کر مدینہ کا رُخ کیا۔ راستہ میں حضرت عمروؓ بن العاص ملے پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ بولے اسلام لانے جاتا ہوں، آخر کب تک؟ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا۔ ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔ دونوں صاحب ایک ساتھ بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے اور اب وہ جوہر جو اسلام کی مخالفت میں صَرف ہو رہا تھا، اسلام کی محبت میں صَرف ہونے لگا۔

فتح مکہ میں حضرت خالدؓ جب ایک مسلمان دستہ کے افسر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے گزرے تو آپؐ نے پوچھا کون ہے؟ لوگوں نے کہا خالدؓ ہیں۔ آپ نے فرمایا "خدا کی تلوار ہے"۔

غزوہ موتہ میں جب حضرت جعفرؓ، زیدؓ بن حارثہ اور عبد اللہؓ بن رواحہ کے بعد حضرت خالدؓ نے اپنے ہاتھ میں علم لیا تو مسلمان خطرہ سے باہر تھے۔

عہدِ خلافت میں ایک (خالدؓ) نے شام کا ملک قیصر سے چھین لیا اور دوسرا (عمروؓ بن العاص) مصر کا فاتح ہوا۔

* * *

---

[1] اصابہ ابن حجر بروایت ابن اسحاق ج اول ص ۴۱۳ [2] ترمذی مناقب۔

۷ھ

خیبر

آخر ۶ھ یا اوائل ۷ھ

خیبر غالباً عبرانی لفظ ہے جس کے معنی قلعہ کے ہیں، یہ مقام مدینہ منورہ سے آٹھ منزل پر ہے۔ یورپین سیاحوں میں ڈاؤٹی کئی مہینے تک یہاں ۱۸۷۷ء میں مقیم رہا، اس نے مدینہ سے اس مقام کا فاصلہ ۲۰۰ میل لکھا ہے وہ نخلستان جس کے کنارے پر خیبر ہے نہایت زرخیز ہے، یہاں یہود نے نہایت مضبوط متعدد قلعے بنائے تھے جن میں سے بعض کے آثار اب تک باقی ہیں، عرب میں یہودی قوت کا یہ سب سے بڑا مرکز تھا، مدینہ سے جب رؤساے بنو نضیر جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہوئے تو انھوں نے تمام عرب کو اسلام کی مخالفت پر برانگیختہ کر دیا جس کا پہلا مظہر احزاب کا معرکہ تھا، ان رؤسا میں سے حیی بن اخطب جنگ قریظہ میں قتل ہوا، جس کے بعد ابورافع سلام بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا، یہ بہت بڑا تاجر اور صاحب اثر تھا، قبیلہ غطفان جو عرب کا بہت بڑا صاحب اثر قبیلہ تھا ان کی آبادی خیبر سے متصل تھی اور ہمیشہ سے یہود خیبر کے حلیف اور ہم عہد تھے، ۶ھ میں سلام نے خود جا کر قبیلہ غطفان اور اُن کے آس پاس کے قبیلوں کو اسلام کے مقابلہ کے لئے آمادہ کیا، یہاں تک کہ ایک عظیم الشان فوج لے کر مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپ کے ایما سے (رمضان ۶ھ میں حضرت عبداللہ بن عتیک ایک خزرجی انصاری کے ہاتھ سے اپنے قلعہ خیبر میں سوتا ہوا مارا گیا) سلام کے بعد یہودیوں نے اُسیر بن رزام کو مسند ریاست پر بٹھایا، اُس نے قبائل یہود کو جمع کر کے تقریر کی اور کہا کہ میرے پیش روؤں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلہ میں جو تدبیریں اختیار کیں وہ غلط تھیں صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دارالریاست پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا اس غرض سے اُسیر نے غطفان اور دیگر قبائل میں دورہ کیا اور ایک فوج گراں تیار کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبریں پہنچیں تو آپ نے اس افواہ پر اعتماد نہیں کیا بلکہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا کہ خود خیبر جا کر اصل

۱؎ مارگولیوس ص ۳۵۹، ۲؎ ابن خلدون جلد ۲ ذکر قبائل عرب، ۳؎ تاریخ خمیس ج ۲ ص ۴۳ باب غزوۂ خیبر، ۴؎ ابن سعد ص ۶۶ اصلی الفاظ یہ ہیں۔

كان ابورافع بن ابى الحقيق قد اجلب فى غطفان ومن حوله من	ابورافع نے غطفان اور آس پاس کے مشرکین عرب کو جنگ پر آمادہ کیا
مشركى العرب وجعل لهم الجعل العظيم لحرب رسول الله	تھا اور ایک بہت بڑی جمعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کیلئے جمع کیا

صحیح بخاری باب قتل ابی رافع میں ہے وکان ابورافع یؤذی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویعین علیہ یعنی ابورافع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچایا کرتا تھا اور آپ کے دشمنوں کو آپ کے مقابلہ میں مدد دیا کرتا تھا، اس امداد و اعانت کی تفصیل بروایت عروہ فتح الباری ج ۷ ص ۲۶۳ میں مفصل مذکور ہے ۵؎ زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۱۹۵ مصر (؟)

واقعہ کی تحقیق کریں۔ چنانچہ وہ چند آدمیوں کو لے کر خیبر گئے اور چھپ کر خود اُسیر کی زبانی اُس کے مشورے اور تدبیریں سُنیں۔ یہ حالات آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کئے۔ آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو ۳۰ آدمی دے کر خیبر کو روانہ کیا۔ ان لوگوں نے اُسیر سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس لئے بھیجا ہے کہ اگر تم حاضر ہو جاؤ تو خیبر کی حکومت تم کو دے دی جائے۔ چنانچہ وہ ۳۰ آدمی لے کر خیبر سے نکلا اور احتیاط کی بنا پر یہ مخلوط قافلہ اس طرح چلا کہ دو دو شخص ہم رکاب چلتے تھے، جن میں ایک یہودی دوسرا مسلمان ہوتا تھا۔ قرقرہ پہنچ کر اُسیر کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی، اس نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عبداللہؓ بن انیس سے تلوار چھیننی چاہی۔ انھوں نے کہا او دشمن خدا! بدعہدی کرنا چاہتا ہے، یہ کہہ کر سواری بڑھائی اور جب اُسیر زد پر آگیا تو تلوار ماری کہ اُس کی ران کٹ گئی۔ وہ گھوڑے سے گرا، گرتے گرتے اس نے حضرت عبداللہؓ کو زخمی کیا اب مسلمان پیش دستی کر کے یہود پر ٹوٹ پڑے۔ نتیجہ جنگ یہ تھا کہ یہود میں ایک کے سوا کوئی نہیں بچا یہ اخیر ۶ھ یا محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

خیبر اب اسلام کا سب سے بڑا حریف اور اسلام کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ ان لوگوں نے مکہ جا کر قریش کے ذریعہ سے تمام عرب میں بغاوت کی ایک عالمگیر جنبش پیدا کر دی جس نے واقعہ احزاب میں مرکز اسلام (مدینہ منورہ) کو متزلزل کر دیا تھا، یہ کوشش اگرچہ ناکام رہی لیکن جو دست و بازو کام کر رہے تھے اب بھی موجود تھے جن لوگوں نے جنگ احزاب برپا کرائی تھی ان میں زیادہ با اثر ابن ابی الحقیق کا خاندان تھا، جو قبیلہ بنی نضیر سے تھا اور مدینہ سے جلا وطن ہو کر آیا تھا اس نے خیبر کے مشہور قلعہ قموص پر قبضہ کیا تھا سلّام بن ابی الحقیق جس کا ذکر ابھی اوپر گزر چکا ہے اسی خاندان کا رئیس تھا اس کے قتل کے بعد اس کا بھتیجا کنانہ بن الربیع بن ابی الحقیق خاندان کی ریاست پر ممتاز ہوا خیبر کے یہود ادھر تو غطفان سے اسلام کے مقابلہ کے لئے سازش کر رہے تھے ادھر مدینہ کے منافقین انکو مسلمانوں کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے اور ان کو ہمت دلاتے تھے کہ مسلمان تم سے سر نہیں ہوسکتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ ان لوگوں سے معاہدہ ہو جائے، اس بنا پر آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجا تھا لیکن ادھر تو یہود خود سخت دل اور ایک بدگمان قوم تھی، ادھر منافقین ان کو ابھارتے تھے اسی زمانہ میں راس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے اہل خیبر کے پاس کہلا بھیجا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں لیکن تم ان سے نہ ڈرنا ان کی ہستی کیا ہے مٹھی بھر آدمی ہیں جن کے پاس ہتھیار تک نہیں۔ یہود نے یہ سُن کر کنانہ اور ہوذہ بن قیس کو غطفان کے پاس بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرو تو ہم نخلستان کی نصف پیداوار تم کو دیں گے (ایک روایت میں ہے کہ غطفان نے اس کو منظور کیا۔[2]

---

[1] یہ واقعات ابن سعد سے منقول ہیں، بہت سی کتابوں میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن انیس نے خود ابتدا کی اور اسیر بن رزام کو قتل کر دیا، لیکن صحیح واقعہ وہی ہے جو ابن سعد سے منقول ہے اور وہی اس معرکہ کی وجہ ہو سکتا ہے۔

[2] تاریخ خمیس ۲ صفحہ ۴۳۔ عام روایتوں میں گو یہ ہے کہ غطفان نے مسلمانوں کے خوف سے اس کو منظور نہیں کیا، تاہم یہ ظاہر ہے کہ ان کی اس ناطرفداری پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ س

غطفان کا ایک قوت ور قبیلہ بنو فزارہ تھا ان کو جب معلوم ہوا کہ خیبر والے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ خود خیبر میں آئے کہ ہم تمہارے ساتھ شریک ہو کر لڑیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے بنو فزارہ کو خط لکھا کہ تم خیبر والوں کی مدد سے باز آؤ، خیبر فتح ہو جائے گا تو تم کو بھی حصہ دیا جائے گا۔ لیکن بنو فزارہ نے انکار کیا۔[1]

ذی قرد محرم ۷ھ

غطفان کی شرکت جنگ کا دیباچہ یہ تھا کہ ذی قرد کی چراگاہ پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنیوں کی چراگاہ تھی اسی قبیلہ کے چند آدمیوں نے بہ سرداری عبد الرحمٰن ابن عیینہ چھاپہ مارا اور بیس اونٹنیاں پکڑ کر لے گئے۔ حضرت ابوذرؓ کے صاحبزادے کو جو اونٹنیوں کی حفاظت پر متعین تھے قتل کر دیا اور ان کی بیوی کو گرفتار کر کے لے گئے (مسلمانوں نے جب تعاقب کیا تو وہ درہ میں گھس گئے وہاں عیینہ بن حصن جو قبائل غطفان کا سپہ سالار تھا ان کی امداد کو موجود تھا، مسلمانوں میں حضرت سلمہؓ بن الاکوع ایک مشہور تیر انداز صحابی تھے سب سے پہلے ان کو اس غارت گری کا علم ہوا، انہوں نے واصباحاہ کا نعرہ مارا اور دوڑ کر حملہ آوروں کو جا لیا، وہ اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے، سلمہؓ نے تیر برسانے شروع کیے، حملہ آور بھاگ نکلے، انہوں نے تعاقب کیا اور لڑ بھڑ کر تمام اونٹنیاں چھڑا لائے، دربار نبوت میں آکر عرض کی کہ میں دشمنوں کو پیاسا چھوڑ آیا ہوں، اگر سو آدمی مل جائیں تو ایک ایک کو گرفتار کر کے لاتا ہوں۔ آپ نے رحمت عام کے لحاظ سے فرمایا:

ملکت فاسجح: قابو پا جاؤ تو عفو سے کام لو۔

اس واقعہ کے تین دن[2] بعد خیبر کی جنگ پیش آئی۔

خیبر کا آغاز اور غزوات کی بہ نسبت ایک امتیاز خاص رکھتا ہے اور اگرچہ ارباب سیر کی نظر اس نکتہ پر نہیں پڑی

---

[1] یہ واقعہ معجم البلدان لفظ جنفا کے ذیل میں موسیٰ بن عقبہ کی مغازی سے بالفاظہا نقل کیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔

روی موسیٰ بن عقبۃ عن ابن شہاب قال کانت بنو فزارۃ ممن قدم علی اھل خیبر لیعینوھم فراسلھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا یعینوھم وسألھم ان یخرجوا عنھم۔ الخ ج ۳ ص ۱۵۲ مصر

[2] یہ واقعہ بخاری و مسلم میں بھی منقول ہے لیکن زیادہ تفصیل ابن سعد و ابن اسحاق سے لی گئی ہے تمام ارباب سیر نے متفقاً اس واقعہ کو خیبر کے واقعہ سے ایک سال ماقبل بیان کیا ہے لیکن امام طبری نے بروایت سلمہ جو اس غزوہ کے ہیرو تھے اور نیز امام بخاری نے صاف تصریح کی ہے کہ خیبر سے تین دن پہلے کا واقعہ ہے، حافظ ابن حجر نے ارباب سیر کا بیان لکھ کر لکھا ہے۔

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر۔
تو اس بنا پر جو کچھ صحیح بخاری میں غزوہ ذی قرد کے متعلق مذکور ہے وہ ارباب سیر کی روایت سے زیادہ صحیح ہے۔

حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عیینہ بن حصن نے ذو قرد پر دو دفعہ حملہ کیا تھا، عام ارباب سیر جس کا تذکرہ کرتے ہیں وہ پہلا حملہ تھا اور یہ بالکل قرین قیاس ہے (فتح الباری ج ۷، ص ۳۵۲ باب غزوہ ذی قرد) ت۔ عام ارباب سیر کو غزوہ خیبر بلکہ تمام غزوات کے متعلق چونکہ کسی سبب کی تلاش و جستجو نہیں اس لئے ان کو اس سے کچھ بحث نہیں کہ واقعات کا تسلسل اور غزوات کے اسباب کیا ہیں، لیکن زیادہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

کہ اس امتیاز کے اسباب کیا تھے؟ تاہم واقعہ کی حیثیت سے امتیازی امور ان کی زبان سے بھی بلا قصد نکل گئے ہیں، سب سے مقدم یہ کہ جب آپ نے خیبر کا قصد کیا تو اعلان عام کر دیا کہ:۔

لا یخرج معنا الا راغب فی الجہاد (ابن سعد) ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ آئیں جو طالب جہاد ہوں

اب تک جو لڑائیاں وقوع میں آئیں محض دفاعی تھیں، یہ پہلا غزوہ ہے جس میں غیر مسلم رعایا بنائے گئے طرزِ حکومت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اسلام کا اصلی مقصد تبلیغ دعوت ہے، اب اگر کوئی قوم اس دعوت کی سدِ راہ نہ ہو تو اسلام کو اس سے نہ تو جنگ ہے نہ اس کے رعایا بنانے کی ضرورت ہے صرف معاہدہ صلح کافی ہے جس کی بہت سی مثالیں اسلام میں موجود ہیں، لیکن جب کوئی قوم خود اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اس کو مٹا دینا چاہے تو اسلام کو مدافعت کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا پڑتی ہے اور اس کو اپنے زیر اثر رکھنا پڑتا ہے، خیبر اس قاعدہ کے موافق اسلام کا پہلا مفتوحہ ملک تھا۔

غزوات کے خاتمہ کے بعد یہ بحث بہ تفصیل آئے گی کہ ایک مدت تک لوگ جہاد کو عرب کے قدیم طریقہ کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے، اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔

غرض آپ غطفان اور یہود کے حملہ کی مدافعت کے لئے مدینہ سے محرم ۷ھ میں حضرت سباع بن عرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا افسر مقرر کر کے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت ام سلمہؓ ساتھ تھیں۔ فوج کی تعداد سولہ سو تھی جن میں ۲۰۰ سوار اور باقی پیدل تھے، اس وقت تک لڑائیوں میں علم کا رواج نہ تھا، چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہوتی تھیں، یہ پہلی مرتبہ تھا کہ آپ نے تین علم تیار کرائے، دو حضرت حباب بن منذر اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کو عنایت ہوئے اور خاص علمِ نبوی جس کا پھریرا حضرت عائشہؓ کی چادر سے تیار ہوا تھا، جناب امیرؓ کو مرحمت ہوا۔ فوج جب روانہ ہوئی تو حضرت عامرؓ بن الاکوع (جو مشہور شاعر تھے) یہ رجز پڑھتے ہوئے آگے چلے۔

اللّٰھم لولا انت ما اھتدینا اے خدا! اگر تو ہدایت نہ کرتا تو ہم ہدایت نہ پاتے
ولا تصدقنا ولا صلینا نہ خیرات کرتے اور نہ روزہ رکھتے۔

---

(۱) یہاں لوگ سے مراد منافقین ہیں، یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کے لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں سخت مقابلہ پیش آنے اور مالِ غنیمت کے نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے، چنانچہ ان ہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کئے جائیں، اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلائے کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال و متاع نہ ہو (زرقانی و ابن سعد باب غزوۂ خیبر) "ن"۔ (۲) ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۷۷، میں جمادی الاولیٰ ۷ھ ہے جو بہ تحقیق مذکورۂ بالا صحیح نہیں "ن"۔

فاغفر فداء لك ما اتقينا	ہم تجھ پر فدا ہوں، ہم جو احکام نہیں بجا لاتے
وَالقِيَنْ سكينة علينا	ان کو معاف کر دے اور ہم پر تسلی نازل کر
انا اذا صيح بنا اتينا	ہم جب فریاد میں پکارے جاتے ہیں تو پہنچ
وثبت الاقدام ان لاقينا	جاتے ہیں اور جب مڈبھیڑ ہو تو ہم کو ثابت قدم
وبالصياح عولوا علينا	رکھ لوگوں نے پکار کر ہم سے استغاثہ چاہا ہے۔

یہ اشعار صحیح مسلم و بخاری میں نقل کئے ہیں، مسند ابن حنبل میں بعض اشعار[1] زیادہ ہیں (پہلے دو مصرع کسی قدر اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم (خیبر) میں بھی ہیں۔

ان الذين قد بغوا علينا	جن لوگوں نے ہم پر دست درازی کی ہے جب
اذا ارادوا فتنة ابينا	وہ کوئی فتنہ برپا کرنا چاہتے ہیں تو ہم ان سے
ونحن عن فضلك ما استغنينا	دبتے نہیں اور اے خدا ہم تیری عنایت سے بے نیاز نہیں۔

راہ میں ایک میدان آیا، صحابہؓ نے تکبیر کے نعرے بلند کئے چونکہ تعلیم و تلقین کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا اور بات بات میں نکات شریعت کی تعلیم ہوتی رہتی تھی۔ ارشاد ہوا کہ آہستہ، کیونکہ کسی بہرے اور دور دراز کو نہیں پکار رہے ہو، تم جس کو پکارتے ہو وہ تمہارے پاس ہی ہے[2]۔

اس غزوہ میں چند خاتونیں بھی اپنی خواہش سے فوج کے ساتھ ہو لی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے اُن کو بلا بھیجا اور غضب کے لہجہ میں فرمایا، تم کس کے ساتھ آئیں اور کس کے حکم سے آئیں؟ بولیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہم اس لئے آئے ہیں کہ چرخہ کات کر کچھ پیدا کریں گے اور اس کام میں مدد دیں گے، ہمارے پاس زخمیوں کے لئے دوائیں بھی ہیں اس کے علاوہ ہم تیر اٹھا کر لائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح کے بعد جب مال غنیمت تقسیم کیا تو ان کا بھی حصہ لگایا، لیکن یہ حصہ کیا تھا؟ زر و جواہر نہ تھے مال و اسباب نہ تھا، درہم و دینار نہ تھے، بلکہ صرف کھجوریں تھیں، تمام مجاہدین کو یہی ملا تھا اور ان پردہ نشینوں نے بھی یہی پایا تھا۔

یہ واقعہ ابوداؤد (باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ) میں مذکور ہے، حدیث اور سیرت کی تمام کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر غزوات میں مستورات ساتھ رہتی تھیں جو زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی اور پیاسوں کو پانی پلاتی تھیں، جنگ اُحد میں حضرت عائشہؓ کا مشک میں پانی بھر بھر کر لانا اور زخمیوں کو پلانا اوپر گزر چکا ہے، لیکن یہ امر کہ عورتیں میدان جنگ سے تیر اٹھا اٹھا کر بھی لاتیں اور مجاہدین کو دیتی تھیں، صرف ابوداؤد نے ذکر کیا ہے لیکن سند صحیح متصل سے ذکر کیا ہے، اس لئے شک کی گنجائش نہیں، یوں بھی عرب کی مستورات سے کم سے کم یہی توقع کی جا سکتی ہے۔

---

[1] ان اشعار میں صاف تصریح ہے کہ تعدی اور حملہ کی ابتداء دشمنوں کی طرف سے تھی، اشعار کے بعض بعض الفاظ میں روایات کا اختلاف ہے

[2] صحیح بخاری غزوہ خیبر۔

چونکہ معلوم تھا کہ غطفان اہل خیبر کی مدد کو آئیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام رجیع میں فوجیں اتاریں جو غطفان اور خیبر کے بیچ میں ہے۔ اسباب باربرداری، خیمہ وخرگاہ اور مستورات یہاں چھوڑ دی گئیں، اور فوجیں خیبر کی طرف بڑھیں۔ غطفان یہ سن کر کہ اسلامی فوجیں خیبر کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہتھیار سج کر نکلے، لیکن آگے بڑھ کر جب ان کو معلوم ہوا کہ خود ان کا گھر خطرہ میں ہے تو واپس چلے گئے۔

خیبر میں چھ قلعے تھے۔ سالم، قموص، نطاۃ، قصارہ، شق، مربط، اور جیسا کہ یعقوبی نے تصریح کی ہے، ان میں بیس ہزار سپاہی موجود تھے، ان سب میں قموص نہایت مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا، مرحب عرب کا مشہور پہلوان جو ہزار سوار کے برابر مانا جاتا تھا اسی قلعہ کا رئیس تھا۔ ابن ابی الحقیق کا خاندان جس نے مدینہ سے جلاوطن ہو کر خیبر کی ریاست حاصل کر لی تھی یہیں رہتا تھا۔

لشکر اسلام جب خیبر کے قریب یعنی مقام صہبا میں پہنچا تو نماز عصر کا وقت آچکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ٹھہر کر نماز عصر ادا کی، پھر کھانا طلب فرمایا۔ رسد کا ذخیرہ صرف ستو تھا، وہی آپ نے بھی پانی میں گھول کر نوش فرمایا۔ رات ہوتے ہوتے فوج اسلام خیبر کے سواد میں پہنچ گئی، عمارتیں نظر آئیں تو آپ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ٹھہر جاؤ۔ پھر خدا کا نام لے کر یہ دعا مانگی۔

انا نسئلک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا و خیر ما فیھا و نعوذ بک من شرھا و شر اھلھا و شر ما فیھا (ابن ہشام)	اے خدا! ہم تجھ سے اس گاؤں کی اور گاؤں والوں کی اور گاؤں کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ یہ آپ کا معمول عام تھا۔ یعنی جب کسی مقام میں داخل ہوتے تھے تو پہلے یہ دعا مانگ لیتے تھے۔ چونکہ سنت نبوی یہ تھی کہ رات کو کسی مقام پر حملہ نہیں کیا جاتا تھا اس لئے رات یہیں بسر کی، صبح کو خیبر میں داخلہ ہوا۔ یہودیوں نے مستورات کو ایک محفوظ مقام میں پہنچا دیا، رسد اور غلہ قلعہ ناعم میں یکجا کیا اور فوجیں قلعہ نطاۃ اور قموص میں فراہم کیں، سلام بن مشکم بیمار تھا، تاہم اس نے سب سے زیادہ حصہ لیا اور خود قلعہ نطاۃ میں آ کر فوج میں شرکت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود جنگ نہ تھا، لیکن جب یہود نے بڑے سروسامان کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تو آپ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے وعظ فرمایا اور جہاد کی ترغیب دی۔ تاریخ خمیس میں اس موقع پر لکھا ہے:۔

ولما تیقن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان الیہود تحارب وعظ اصحابہ ونصحھم وحرضھم علی الجہاد	اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین ہو گیا کہ یہود لڑنے پر آمادہ ہیں تو آپ نے صحابہ کو نصیحت کی اور جہاد کی ترغیب دی۔

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر فوجیں بڑھیں، حضرت محمودؓ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا اور دیر تک لڑتے رہے، لیکن چونکہ سخت گرمی تھی، تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الربیع نے

---

[1] یہ تفصیل معجم البلدان (ج ۴ صفحہ ۲۹۱) ذکر رجیع میں ہے۔ [2] طبری (۱۔۳۔ صفحہ ۱۵۷۵) اصل عبارت یہ ہے فبلغنی ان غطفان لما سمعت بمنزل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر جمعوا ثم خرجوا لیظاہروا یہود علیہ حتی اذا ساروا [illegible] [3] تاریخ یعقوبی (ج ۲ صفحہ ۵۶) [4] صحیح بخاری۔

قلعہ کی فصیل سے چکی کا[1] پاٹ ان کے سر پر گرایا جس کے صدمہ سے وفاتؓ پائی، لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔

ناعم کے بعد اور قلعے بہ آسانی فتح ہوتے گئے لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا، اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بھیجا لیکن دونوں ناکام واپس آئے۔ طبری میں روایت ہے کہ جب خیبر میں قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہ جم سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی کی، لیکن فوج نے اُن کی نسبت خود یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے اس کے راوی عوف ہیں، ان کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے، لیکن بندار جب اُن کی روایت بیان کرتے ہیں تو کہتے تھے کہ وہ رافضی اور شیطان تھا، یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن ان کی شیعیت سب کو تسلیم ہے اور گو شیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھاگنے کا واقعہ بیان کیا جائے شیعہ کی زبان سے اس روایت کا رتبہ کیا رہ جاتا ہے؟ اس کے علاوہ اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں لیکن محدثین کو اس بات میں شبہ ہے کہ اُن کی جو روایتیں باپ کے سلسلہ سے منقول ہیں صحیح بھی ہیں یا نہیں؟

تاہم اس قدر ضرور صحیح ہے کہ اس مہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے تھے لیکن فتح کا فخر کسی اور کی قسمت میں تھا، جب مہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر خدا فتح دے گا اور جو خدا اور خدا کے رسول کو چاہتا ہے اور خدا اور خدا کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔[2] یہ رات نہایت امید اور انتظار کی رات تھی، صحابہؓ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی کہ دیکھیے یہ تاجِ فخر کس کے ہاتھ آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا پر کبھی حکومت اور سروری کی تمنا نہیں کی لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علی میں مذکور ہے، اُن کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنا میں ان کی خودداری بھی قائم نہ رہ سکی۔ صبح کو دفعتاً یہ آواز کانوں میں آئی کہ "علیؓ کہاں ہیں؟"[3] یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی کیونکہ جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور ہیں۔ غرض حسبِ طلب وہ حاضر ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن لگایا اور دعا فرمائی۔ جب اُن کو علم عنایت ہوا تو انھوں نے عرض کی کہ کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنا لیں، ارشاد ہوا کہ بہ نرمی ان پر اسلام کو پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری ہدایت سے اسلام لائے تو سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ لیکن یہود اسلام یا صلح کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہو سکتے تھے مرحب قلعہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا باہر نکلا۔

قد علمت خیبر انی مرحب
شاکی السلاح بطل مجرب

خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، دلیر ہوں، تجربہ کار ہوں، سلاح پوش ہوں۔

---

[1] ابن ہشام نے دو موقعوں پر اس واقعہ کا الگ ٹکڑا لکھا ہے، یہ تفصیل خمیس سے لی گئی ہے۔

[2] یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔

[3] یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور صحیح بخاری میں منقول ہے۔

مرحب کے سر پر یمنی زرد رنگ کا مغفر اور اس کے اوپر سنگی خود تھا۔ قدیم زمانہ میں گول پتھر بیچ سے خالی کر لیتے تھے یہی خود کہلاتا تھا مرحب کے جواب میں حضرت علیؓ نے یہ رجز پڑھا۔

انا الذی سمتنی امی حیدرہ	میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام شیر رکھا تھا
کلیث غابات کریہ المنظرہ	میں شیر نیستاں کی طرح مہیب و بدمنظر ہوں۔

مرحب بڑے طمطراق سے آیا لیکن حضرت علیؓ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور ضربت کی آواز فوج تک پہنچی۔[1] پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں، "معالم التنزیل" میں ہے کہ حضرت علیؓ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا لیکن ذوالفقار خود اور سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی، مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا تو اتفاق سے حضرت علیؓ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ کر گر پڑی۔ آپ نے قلعہ کا در جو سرتاپا پارہ سنگ تھا اکھاڑ کر اس سے سپر کا کام لیا۔ اس واقعہ کے بعد ابو رافع نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا چاہا تو جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔ یہ روایتیں ابن اسحاق اور حاکم نے روایت کی ہیں لیکن بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کہ:۔

کلہا واہیۃ	سب لغو روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد فرخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت منکر ہے۔ ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تو بیچ کے ایک راوی کا نام سرے سے چھوڑ دیا ہے اور دوسرے میں اس مشترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں جن کو امام بخاری اور ابوداؤد اور دارقطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔[2]

ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ اور واقدی کا بیان ہے کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے مارا تھا، مسند ابن حنبل اور نووی شرح صحیح مسلم میں بھی ایک روایت ہے لیکن صحیح مسلم (اور حاکم ج ۳ ص ۳۹) میں حضرت علیؓ ہی کو مرحب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے اور یہی اصح الروایات ہے۔

غرض یہ قلعہ (قموص) ۲۰ دن کے محاصرہ کے بعد فتح ہو گیا۔ ان معرکوں میں ۹۳ یہود مارے گئے، جن میں حارث، مرحب، اسیر، یاسر، عامر زیادہ مشہور ہیں، صحابہؓ میں سے ۱۵ بزرگوں نے شہادت حاصل کی جن کے نام ابن سعد نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔

فتح کے بعد زمین مفتوحہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ لیکن یہود نے درخواست کی کہ زمین ہمارے قبضے میں رہنے دی جائے، ہم پیداوار کا نصف حصہ ادا کریں گے۔ یہ درخواست منظور ہوئی۔ بٹائی کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہؓ بن رواحہ کو بھیجتے تھے وہ غلہ کو دو حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے تھے کہ اس میں سے جو حصہ چاہو

---

[1] طبری صفحہ ۱۵۷۰ یہ اشعار اور مختصر واقعات صحیح مسلم غزوۂ خیبر میں بھی ہیں۔

[2] میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان۔

لے تو یہود اس عدل پر متحیر ہو کر کہتے تھے کہ زمین اور آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں[1]۔ خیبر کی زمین تمام مجاہدین پر جو اس جنگ میں شریک تھے تقسیم کر دی گئی۔ اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خمس بھی تھا۔

عام روایت ہے کہ مال غنیمت میں سے خُمس کے علاوہ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خاص طور پر کر لیا جاتا تھا جس کو صفی کہتے ہیں۔ اس بنا پر حضرت صفیہؓ (زوجہ کنانہ بن الربیع) کو آپؐ نے لے لیا اور آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا

حضرت صفیہؓ کے واقعہ کی تحقیق

حضرت صفیہؓ کی نسبت بعض کتب حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ان کو دحیہ کلبیؓ کو دیا تھا، پھر کسی نے اُن کے حسن کی تعریف کی تو اُن سے مانگ لیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو سات لونڈیاں دیں۔ مخالفین نے اس روایت کو نہایت بدنما پیرایہ میں ادا کیا ہے اور جب اصل روایت میں اتنی بات موجود ہے تو ظاہر ہے کہ مخالف اس سے کہاں تک کام لے سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت صفیہؓ کا یہ واقعہ حضرت انسؓ سے منقول ہے لیکن خود حضرت انسؓ سے متعدد روایتیں ہیں اور وہ باہم مختلف ہیں، بخاری کی جو روایت غزوۂ خیبر کے ذکر میں ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ جب قلعۂ خیبر فتح ہوا تو لوگوں نے آپؐ کے سامنے حضرت صفیہؓ کے حُسن کا ذکر کیا، آپؐ نے اُن کو اپنے لئے لے لیا۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔

فلما فتح اللہ علیہ الحصن ذکر لہ جمال صفیۃ بنت حیی بن اخطب وقد قتل زوجہا وکانت عروسا فاصطفاہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم لنفسہ	جب خدا نے قلعہ فتح کرا دیا تو لوگوں نے آپؐ سے صفیہ بنت حیی کے حسن و جمال کی تعریف کی (ان کا شوہر اس جنگ میں مارا گیا تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے لئے پسند کر لیا۔

لیکن بخاری کتاب الصلوٰۃ (باب ما یذکر فی الفخذ) و صحیح مسلم (باب فضل عتق الامۃ) میں خود حضرت انسؓ کی یہی روایت اس طریقہ سے منقول ہے کہ جب لڑائی کے بعد قیدی جمع کئے گئے تو حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان میں سے ایک لونڈی مجھ کو عنایت ہو، آپؐ نے ان کو اختیار دیا کہ خود جا کر کوئی لونڈی لے لو، انھوں نے حضرت صفیہؓ کو انتخاب کیا۔ لیکن لوگوں کو اعتراض ہوا۔ ایک شخص نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

یا نبی اللہ اعطیت دحیۃ صفیۃ بنت حیی سیدۃ قریظۃ والنضیر لا تصلح الا لک	اے پیغمبر خدا! آپؐ نے صفیہ کو دحیہ کے حوالہ کیا، وہ قریظہ و نضیر کی رئیسہ ہے اور آپؐ کے سوا اور کوئی اس کے لائق نہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا[2]۔ ابوداؤد[3] میں یہ دونوں روایتیں ہیں

---

[1] فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۶)، فتح خیبر و طبری ص ۱۵۹۹ (اصل روایت ابوداؤد باب المساقات میں موجود ہے۔ [2] صحیح مسلم جلد ۱ صفحہ ۴۶۰ باب فضل عتق الامۃ ثم تزوجہا۔ [3] ابوداؤد باب ما جاء فی سہم الصفی۔

اور دونوں حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ابوداؤد کی شرح میں مازری (مشہور محدث) کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو اس لئے حضرت دحیہؓ سے لے کر ان سے عقد کیا کہ:

لما فيه من انتهاكها مع مرتبتها وكونها بنت سيدهم۔	چونکہ وہ عالی رتبہ اور رئیس یہود کی صاحبزادی تھیں اس لئے ان کا کسی اور کے پاس جانا اُن کی توہین تھی۔

حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں اس کے قریب قریب لکھا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت صفیہؓ خاندان کے تباہ ہونے کے بعد خاندان سے باہر بیوی یا کنیز بن کر رہتیں وہ رئیس خیبر کی بیٹی تھیں، ان کا شوہر بھی قبیلۂ نضیر کا رئیس تھا۔ باپ اور شوہر دونوں قتل کئے جا چکے تھے، اس حالت میں اُن کے پاس خاطر، حفظِ مراتب اور رفعِ غم کے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے عقد میں لے لیں۔ وہ کنیز ہو کر بھی رہ سکتی تھیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی خاندانی عزت کے لحاظ سے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر نکاح پڑھایا، بلکہ مسند ابن حنبل میں ہے کہ آپ نے ان کو اختیار دیا کہ وہ آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائیں یا آپ کے نکاح میں آنا قبول کریں۔ انھوں نے دوسری صورت پسند کی یعنی یہ کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آجائیں[1]، حسن خلق، رحم اور مصیبت زدہ کی چارہ نوازی کے علاوہ سیاسی اور مذہبی حیثیت سے بھی یہ کارروائی نہایت موزوں اور بجا تھی، اس قسم کے طرزِ عمل سے عرب کو اسلام کی طرف رغبت اور کشش ہوتی تھی کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ورثہ کے ساتھ بھی کس قسم کا محسنانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت جویریہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور اس سلوک کا جو اثر ہوا وہ اوپر گزر چکا ہے۔

فتح کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز خیبر میں قیام کیا، اگرچہ یہود کو کامل امن و امان دیا گیا، اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کی گئی تاہم ان کا طرزِ عمل مفسدانہ اور باغیانہ رہا۔ پہلا دیباچہ یہ تھا کہ ایک دن زینب نے جو سلام بن مشکم کی بیوی اور مرحب کی بھاوج تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند صحابہ کے ساتھ دعوت کی آپ نے فرطِ کرم سے قبول فرمایا، زینب نے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، آپ نے ایک لقمہ کھا کر ہاتھ کھینچ لیا لیکن حضرت بشرؓ بن براء نے پیٹ بھر کر کھایا اور زہر کے اثر سے بالآخر ہلاک ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زینب کو بلا کر پوچھا، اس نے جرم کا اقبال کیا۔ یہود نے کہا، ہم نے اس لئے زہر دیا کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو زہر خود اثر نہ کرے گا اور پیغمبر نہیں ہیں تو ہم کو آپ کے ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ اس بنا پر آپ نے زینب سے تعرض نہیں فرمایا لیکن جب دو تین دن کے بعد حضرت بشرؓ زہر کے اثر سے انتقال کر گئے تو وہ قصاص میں قتل کر دی گئی۔

ایک دفعہ صحابہ میں سے حضرت عبد اللہؓ بن سہیل اور حضرت محیصہؓ قحط سالی کے زمانہ میں خیبر گئے، یہود نے حضرت عبد اللہ کو دھوکے سے قتل کر کے ایک نہر میں ڈال دیا۔ حضرت محیصہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۳۸ [illegible]

خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا کہ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے قتل کیا؟ عرض کیا کہ حضور وہ تو پچاس مسلمانوں کو قتل کر کے بھی جھوٹی قسم کھا لیں گے، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں کیا اور بیت المال سے مقتول کا خون بہا دلا دیا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں یہود نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو سوتے میں کوٹھے پر سے گرا دیا کہ ان کا ہاتھ اور پاؤں ٹوٹ گیا، اس طرح ہمیشہ فساد انگیزیاں کرتے رہتے تھے، مجبور ہو کر حضرت عمرؓ نے ان کو شام کے اضلاع میں جلاوطن کر دیا (یہ جملہ معترضہ سلسلہ کلام میں آگیا تھا)

خیبر کے واقعات میں ارباب سیر نے ایک سخت غلط روایت نقل کی ہے، اور وہ اکثر کتابوں میں منقول ہو کر متداول ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اول آپ نے یہود کو اس شرط پر امن عام دیا تھا کہ کوئی چیز نہ چھپائیں گے۔ لیکن جب کنانہ بن الربیع نے خزانہ بتانے سے انکار کیا تو آپ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ سختی کر کے اس سے خزانہ کا پتہ لگائیں، حضرت زبیرؓ چقماق جلا کر اس کے سینے کو داغتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی جان نکلنے کے قریب ہو گئی۔ بالآخر آپ نے کنانہ کو قتل کرا دیا اور تمام یہودی لونڈی غلام بنا لیے گئے[2]۔

اس روایت کا اس قدر حصہ صحیح ہے کہ کنانہ قتل کر دیا گیا، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ خزانہ بتلانے سے انکار کرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا، طبری میں تصریح ہے۔

ثم دفعه رسول الله الى محمد بن مسلمة فضرب	پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کنانہ کو محمد بن مسلمہ کے حوالہ کیا انھوں
عنقه باخيه محمود بن مسلمة (ص ۱۵۸۲)	نے اپنے بھائی محمود بن مسلمہ کے قصاص میں اس کو قتل کر دیا۔

باقی روایت کا یہ حال ہے کہ یہ روایت طبری اور ابن ہشام دونوں نے ابن اسحاق سے روایت کی ہے لیکن ابن اسحاق نے اوپر کے کسی راوی کا نام نہیں بتایا، محدثین نے رجال کی کتابوں میں تصریح کی ہے کہ ابن اسحاق یہودیوں سے مغازی نبویؐ کے واقعات روایت کرتے تھے، اس روایت کو بھی انہی روایتوں میں سمجھنا چاہیے اور یہی وجہ ہے کہ ابن اسحاق ان راویوں کا نام نہیں لیتے۔

کسی شخص پر خزانہ بتانے کے لیے اس قدر سختی کرنا کہ اس کے سینہ پر چقماق سے آگ جھاڑی جائے، رحمۃ للعالمین کی شان اس سے بہت ارفع ہے، وہی شخص جو اپنے زہر دینے والے سے مطلق تعرض نہیں کرتا، کیا چند سکوں کے لیے کسی کو آگ سے جلانے کا حکم دے سکتا ہے۔

اصل واقعہ اس قدر تھا کہ کنانہ بن ابی الحقیق کو اس شرط پر امان دی گئی تھی کہ کسی قسم کی بدعہدی اور خلاف بیانی نہ کرے گا (بلکہ ایک روایت میں ہے کہ) اس نے یہ بھی منظور کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف اس نے کچھ کیا تو وہ قتل کا مستحق ہوگا۔

---

[1] فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۸) اور صحیح بخاری مطبع مصطفائی جلد اول صفحہ ۳۰۰ (باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک) [2] یہ تفصیل تاریخ طبری میں مذکور ہے، ابن ہشام میں بھی اس کے قریب قریب ہے [3] فتوح البلدان بلاذری (ص ۲۴) [4] ابو داؤد باب حکم ارض خیبر [5] طبقات ابن سعد غزوہ خیبر سطر ۲۳۔

کنانہ نے بدعہدی کی اور جو امن اس کو دیا گیا تھا ٹوٹ گیا۔ کنانہ نے محمود بن مسلمہ کو قتل کیا تھا۔ اب اس کے قصاص میں وہ قتل کر دیا گیا، جیسا کہ ابھی ہم نے طبری کی روایت سے نقل کیا ہے۔

اب دیکھو اس روایت میں کیا کیا واقعات اضافہ ہو گئے۔

(۱) قتل کا واقعہ کنانہ کے ساتھ خاص تھا، خزانہ کے چھپانے کا وہی مجرم تھا، محمود بن مسلمہ کو اسی نے قتل کیا تھا اس لئے وہی قتل بھی کیا جا سکتا تھا۔ اضافہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ابن سعد نے بکر بن عبد الرحمٰن سے جو روایت متصل نقل کی ہے، اس میں کنانہ کے ساتھ اس کے بھائی کا بھی نام بڑھا دیا ہے یعنی دونوں قتل کئے گئے۔

فضرب اعناقهما وسبی اهلیهما[1]

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو قتل کرا دیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنایا۔

(۲) یہاں تک بھی خیریت تھی لیکن ابن سعد نے عفان بن مسلم سے جو روایت نقل کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ وسیع ہو گئی ہے، یعنی دونوں بھائیوں کے ساتھ تمام یہودی گرفتار اور لونڈی غلام بنا لئے گئے۔

فلما وجد المال الذی غیبوه فی مسك الجمل سبی نساءهم۔[2]

تو جب وہ خزانہ مل گیا جس کو انہوں نے اونٹ کی کھال میں چھپا رکھا تھا تو ان کی عورتیں گرفتار کیں اور لونڈیاں بنا لیں۔

لیکن جب یہ روایتیں محدثانہ اصول تنقید سے جانچی جاتی ہیں تو چھلکے اترتے جاتے ہیں اور اصل حقیقت رہ جاتی ہے۔ یہود کا قتل اور زن و بچہ کا گرفتار ہونا ایک طرف خود صحیح بخاری سے ثابت ہے کہ کنانہ کا بھائی تک قتل نہیں کیا گیا اور حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت تک موجود تھا، صحیح بخاری میں ہے۔

فلما اجمع عمر علی ذلك اتاه احد بنی ابی الحقیق فقال یا امیر المؤمنین: تخرجنا وقد اقرنا محمد وعاملنا علی الاموال۔[3]

پھر جب حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ کر لیا تو ابو الحقیق کا ایک بیٹا ان کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المؤمنین آپ ہم کو نکالتے ہیں حالانکہ ہم کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنے دیا تھا اور خراج پر معاملہ کیا تھا۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں تصریح کی ہے کہ یہ وہی کنانہ بن ابی الحقیق کا بھائی تھا۔

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں عام روایتوں کی وسعت کو گھٹا کر اس حد تک پہنچایا کہ:

ولم یقتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الصلح الا ابنی ابی الحقیق۔ (ذکر غزوہ خیبر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے بعد ابی الحقیق کے دونوں بیٹوں کے سوا اور کسی کو قتل نہیں کیا۔

لیکن حافظ موصوف کو اگر صحیح بخاری کی عبارت مذکورہ بالا پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ تعداد اور بھی گھٹ جاتی۔

ابو داؤد میں جہاں ارض خیبر کا عنوان باندھا ہے، صرف ابن ابی الحقیق کا قتل کیا جانا لکھا ہے۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابو داؤد میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعیۃ (حیی بن اخطب کے چچا) سے پوچھا تھا کہ وہ

---

[1] طبقات ابن سعد غزوہ خیبر حصہ اول صفحہ ۷۷ [2] طبقات ابن سعد غزوہ خیبر صفحہ ۸۰ [3] صحیح بخاری ج ۱ المطبع مصطفائی صفحہ ۳۱۴ باب اذا اشترط فی المزارعۃ اذا شئت اخرجتک۔

خزانہ کیا ہوا؛ اس نے کہا لڑائیوں میں صرف ہوگیا، باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف کنانہ کے قتل کا حکم دیا۔ یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ کنانہ کا قتل محمود بن مسلمہ کے قصاص میں ہوا تھا، ورنہ اگر خزانہ کے چھپانے کا جرم قتل کا سبب ہوتا تو اس جرم کے مجرم اور بھی تھے۔

مورخین نے پہلی غلطی یہ کی کہ کنانہ کے قتل کا سبب اخفائے خزانہ سمجھے اور چونکہ اس جرم میں اور لوگ بھی شریک تھے اس لئے یہ تعمیم خود بخود پیدا ہوگئی کہ کنانہ کا تمام خاندان قتل کر دیا گیا۔

ایک اور نکتہ اس قدر معلوم و مسلم ہے کہ خیبر کا واقعہ محرم میں پیش آیا۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس ارادہ سے مدینہ سے نکلے تو محرم کی اخیر تاریخیں تھیں محرم میں لڑائی شرعاً ممنوع ہے اس لئے محدثین اور فقہا میں اس کی توجیہ کے متعلق اختلاف پیدا ہوا۔ بہت سے فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ اوائل میں البتہ ان مہینوں میں لڑائی شرعاً ممنوع تھی لیکن پھر وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ علامہ ابن قیم نے لکھا ہے کہ حرمت کا پہلا حکم جو نازل ہوا تھا وہ اس آیت کی رو سے تھا۔

قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ (بقرہ ـ ۲۷) کہہ دو کہ اس مہینہ میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور خدا کی راہ سے روکنا ہے

پھر سورۂ مائدہ میں یہ آیت اتری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ (مائدہ-۱) مسلمانو! خدا کی حد بندیوں کی اور ماہ حرام کی بے حرمتی نہ کرو۔

یہ پچھلی آیت پہلی آیت کے آٹھ برس بعد نازل ہوئی۔ اس وسیع زمانہ تک تو حرمت کا حکم باقی رہا۔ اب وہ کون سی آیت یا حدیث ہے جس سے یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

وَلَيْسَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا سُنَّةِ رَسُولِهِ نَاسِخٌ لِحُكْمِهَا۔ اور خدا کی کتاب اور حدیث میں ان آیتوں کے حکم کا کوئی ناسخ نہیں۔

مجوزین نے یہ استدلال کیا ہے کہ فتح حرم، طائف کا محاصرہ، بیعۃ رضوان، یہ سب ماہ حرام میں ہوئے تھے اس لئے اگر ماہ حرام میں لڑائی جائز نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیونکر جائز رکھتے۔ حافظ ابن القیم نے جواب دیا ہے کہ ماہ حرام میں ابتداءً جنگ کرنا حرام ہے لیکن اگر دشمن کا مدافعہ مقصود ہے تو بالاتفاق جائز ہے وہ سب واقعات دفاعی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش دستی نہیں کی تھی بلکہ دفاع کیا گیا تھا۔ بیعت رضوان اس لئے لی گئی تھی کہ یہ خبر مشہور ہوگئی تھی کہ کفار نے حضرت عثمانؓ کو جو سفیر ہو کر گئے تھے، قتل کر دیا۔ طائف کا محاصرہ کوئی مستقل جنگ نہ تھی بلکہ غزوۂ حنین کا بقیہ تھا جس میں خود کفار ہر طرف سے جمع ہو کر حملہ آور ہوتے تھے۔ فتح حرم کا واقعہ حدیبیہ کی شکست کا نتیجہ تھا جس کی ابتداء قریش نے کی تھی[1]۔

حافظ ابن القیم نے نہایت صحیح جواب دیا لیکن خاص خیبر کے معاملہ میں وہ اس گرہ کو نہ کھول سکے اور بحث نامنفصل رہ گئی۔ حافظ ابن القیم کے استاد علامہ ابن تیمیہ کو بھی اس موقع پر اشتباہ ہوا انھوں نے الجواب الصحیح لمن بدل

---

[1] زاد المعاد ذکر غزوۂ خیبر

دین المسیح میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قدر لڑائیاں کیں سب دفاعی تھیں، صرف بدر اور خیبر اس سے مستثنیٰ ہیں، لیکن اگر علامہ موصوف زیادہ استقصا کرتے تو ثابت ہوتا کہ بدر اور خیبر بھی مستثنیٰ نہیں بدر کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ خیبر کے ماسبق واقعات کو ترتیب دے کر دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ یہود اور غطفان مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

تقسیم زمین

خیبر کی زمین دو برابر حصوں میں تقسیم کی گئی، نصف بیت المال، مہمانی اور سفارت وغیرہ کے مصارف کے لئے خاص کر لیا گیا، باقی نصف مجاہدین پر جو اس غزوہ میں شریک تھے، مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ کل فوج کی تعداد چودہ سو تھی، دو سو سوار تھے، سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لئے پیدل سے دوگنا ملتا تھا۔ اس بناء پر یہ تعداد اٹھارہ سو کے برابر تھی، اس حساب سے کل جائیداد کے اٹھارہ سو حصے کئے گئے اور ہر مجاہد کے حصہ میں ایک حصہ آیا، جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عام مجاہدین کے برابر ایک ہی حصہ ملا۔[1]

ولرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل سہم احدہم — اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی عام لوگوں کی طرح ایک حصہ تھا۔

ملکی حالت اور احکام فقہی

خیبر کی فتح سے اسلام کی ملکی اور سیاسی حالت کا نیا دور شروع ہوتا ہے، اسلام کے حقیقی دشمن صرف دو تھے، مشرکین اور یہود، اگرچہ مذہباً باہم مختلف تھے لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر اُن میں اتحاد پیدا ہو گیا تھا، مدینہ کے یہود عموماً انصار کے حلیف تھے، اسی طرح خیبر کے یہود غطفان کے حلیف تھے، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ کے لئے مکہ اور مدینہ کے مشرکین اور منافقین سب مل کر نفسِ واحدہ ہو گئے تھے۔ خیبر کی فتح کے بعد یہود کی قوت بالکل ٹوٹ گئی اور مشرکین کا ایک بازو جاتا رہا۔

اب تک اسلام چاروں طرف سے نرغہ کی حالت میں تھا اس بنا پر بجز عقائد اور ضروری عبادات کے شریعت کے اور احکام کی تاسیس و تعلیم کا موقع نہ تھا شریعت کے احکام جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے حالات کے اقتضا سے بتدریج آئے ہیں چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی، خیبر کی فتح سے ادھر تو یہود کی فتنہ انگیزیوں سے نجات ملی اُدھر حدیبیہ کی صلح سے مشرکین کی طرف سے فی الجملہ اطمینان حاصل ہوا، اس بناء پر اب مسلمان جدید فقہی احکام کی تعمیل کے قابل ہو چکے تھے، ارباب سیر نے غزوۂ خیبر کے تذکرہ میں عموماً ذکر کیا ہے کہ اس موقع پر متعدد جدید فقہی احکام نازل[2] ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی تبلیغ کی، اُن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) پنجوں سے شکار کرنے والے پرند حرام ہوئے۔

(۲) درندہ جانور حرام کر دیئے گئے۔

(۳) گدھا اور خچر حرام کر دیا گیا۔

(۴) اب تک معمول تھا کہ لونڈیوں سے فوراً تمتع جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب استبراء کی قید ہو گئی یعنی اگر وہ حاملہ

---

[1] فتوح البلدان بلاذری، ذکر غزوۂ خیبر (ابو داؤد و حکم ارض خیبر میں ہے۔ النبی صلی اللہ علیہ وسلم معہم لہ سہم کسہم احدہم)

[2] یہاں نزول سے وحی متلو یعنی قرآن مراد نہیں ہے۔

ہے تو وضعِ حمل تک ورنہ ایک مہینہ تک تمتع جائز نہیں۔

(۵) چاندی سونے کا بہ تفاضل خریدنا حرام ہوا۔

(۶) بعض روایتوں میں ہے کہ متعہ بھی اسی غزوہ میں حرام ہوا۔

وادی القریٰ اور فدک

تیماء اور خیبر کے درمیان ایک وادی ہے جس میں بہت سی بستیاں آباد ہیں اس کو وادی القریٰ کہتے ہیں، قدیم زمانہ میں عاد و ثمود یہاں آباد تھے۔ یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ عاد و ثمود کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ اسلام سے پہلے ان بستیوں میں یہود آکر آباد ہو گئے اور زراعت اور آب رسانی کو بہت ترقی دی اور اب یہود کا مخصوص مرکز بن گیا تھا۔[1]

خیبر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی القریٰ کا رخ کیا لیکن لڑنا مقصود نہ تھا، مگر یہود پہلے سے تیار تھے، انہوں نے فوراً تیر اندازی شروع کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محمل آپ کے غلام (حضرت مدعمؓ) اتار رہے تھے کہ ایک تیر آیا اور وہ جاں بحق ہوئے۔ عام مورخین نے یہود کی تیاری کا ذکر نہیں کیا ہے، لیکن امام بیہقی نے صاف تصریح کی ہے۔

وقد استقبلنا یہود بالرمی ولم نکن علی تعبیۃ[2]	یہود ہمارے مقابلہ کو تیر چلاتے ہوئے نکلے اور ہم تیار نہ تھے۔

بہر حال جنگ شروع ہو گئی لیکن تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہود نے سپر ڈال دی اور خیبر کے شرائط کے موافق صلح ہو گئی۔

ادائے عمرہ

صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں آکر عمرہ ادا کریں گے اور تین دن قیام کر کے واپس چلے جائیں گے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال عمرہ ادا کرنا چاہا اور اعلان کرا دیا کہ جو لوگ واقعہ حدیبیہ میں شریک تھے ان میں سے کوئی رہ نہ جائے، چنانچہ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں مر چکے تھے، سب نے یہ سعادت حاصل کی۔ معاہدہ میں شرط تھی کہ مسلمان مکہ میں آئیں تو ہتھیار ساتھ نہ لائیں، اس لئے اسلحہ جنگ بطن یاجج میں جو مکہ سے آٹھ میل ادھر ہے چھوڑ دیئے گئے اور دو سو سواروں کا ایک دستہ اسلحہ کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لبیک کہتے ہوئے حرم کی طرف بڑھے، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اونٹ کی مہار تھامے ہوئے آگے آگے یہ رجز پڑھتے جاتے تھے۔[3]

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ	کافرو! سامنے سے ہٹ جاؤ!
الیوم نضربکم علی تنزیلہ	آج جو تم نے اترنے سے روکا تو ہم تلوار کا وار کریں گے
ضربا یزیل الہام عن مقیلہ	وہ وار جو سر کو خوابگاہ سر سے الگ کر دے
ویذھل الخلیل عن خلیلہ	اور دوست کے دل سے دوست کی یاد بھلا دے۔

صحابہ کا ہجوم غفیر ساتھ تھا اور برسوں کی دیرینہ تمنا اور فرض مذہبی بڑے جوش کے ساتھ ادا کر رہا تھا، اہل مکہ کا

---

[1] معجم البلدان لفظ قرٰی ج ۷، ص [illegible]۔ [2] زرقانی بر مواہب بحوالہ بیہقی باب الجہاد ذکر غلول ج ۲ ص ۲۱۳۔

[3] یہ اشعار اور یہ واقعہ ترمذی نے شمائل میں نقل کیا ہے۔

خیال تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے، اس بنا پر آپؐ نے حکم دیا کہ لوگ طواف کے تین پہلے پھیروں میں اکڑتے ہوئے چلیں، عربی زبان میں اس کو "رمل" کہتے ہیں۔ چنانچہ آج تک یہ سنت باقی ہے۔

اہل مکہ نے اگرچہ چار و ناچار عمرہ کی اجازت دے دی تھی تاہم ان کی آنکھیں اس منظر کے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھیں۔ رؤسائے قریش نے عموماً شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ تین دن کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا محمدؐ سے کہہ دو کہ شرط پوری ہو چکی اب مکہ سے نکل جائیں۔ حضرت علیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپؐ اسی وقت روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت حضرت حمزہؓ کی صغیر السن صاحبزادی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس "چچا چچا"[1] کہتی دوڑی آئیں۔ حضرت علیؓ نے ہاتھوں میں اٹھا لیا لیکن حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) اور زیدؓ بن حارثہ نے اپنے دعوے پیش کئے۔ حضرت جعفرؓ کہتے تھے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے۔ زیدؓ کہتے تھے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے۔ اس رشتہ سے یہ میری بھتیجی ہے۔ حضرت علیؓ کو دعویٰ تھا کہ میری ہمشیرہ بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے دعوے مساوی الدرجہ دیکھ کر ان کو اسماءؓ کی گود میں دیا، وہ امامہ کی خالہ تھیں، پھر فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر[2] ہوتی ہے۔

*

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رشتہ میں ان کے بھائی تھے لیکن انہوں نے تعظیماً کہا، یا اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حمزہؓ دونوں رضاعی بھائی تھے۔

[2] اس واقعہ کا بڑا حصہ صحیح بخاری سے ماخوذ ہے بعض زائد تفصیلیں زرقانی سے لی گئی ہیں جو کتب حدیث کے حوالہ سے زرقانی نے نقل کی ہیں۔

۸ھ

غزوۂ مُوتہ

جمادی الاولیٰ ۸ھ

مُوتہ شام میں ایک مقام کا نام ہے جو بلقاؔ سے اس طرف ہے۔ عرب میں جو مشرقی تلواریں مشہور ہیں وہ یہیں بنتی تھیں۔ کثیر مشہور شاعر کہتا ہے۔

صَوارِمُ یجلوھا بموتۃ صَیقلُ — وہ تلواریں جن کو موتہ میں صیقل گر جلا دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ بُصریٰ یا قیصر روم کے نام ایک خط لکھا تھا۔ عرب اور شام کے سرحدی علاقوں میں جو عرب رؤسا حکمران تھے ان میں ایک شُرحبیل بن عمرو بھی تھا جو اسی علاقہ بلقا کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔ یہ عربی خاندان ایک مدت سے عیسائی تھا اور شام کے سرحدی مقامات میں حکمران تھا۔ یہ خط حارثؓ بن عمر لے کر گئے تھے شُرحبیل نے ان کو قتل کر دیا۔ اس کے قصاص کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ زیدؓ بن حارثہ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، سپہ سالاری ملی اور ارشاد ہوا کہ اگر ان کو دولت شہادت نصیب ہو تو جعفر طیارؓ اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ فوج کے سردار ہوں۔ حضرت زیدؓ غلام تھے گو آزاد ہو چکے تھے۔ حضرت جعفر طیارؓ حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ معزز انصاری اور مشہور شاعر تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو تعجب ہوا کہ حضرت جعفرؓ و حضرت عبداللہ بن رواحہ کے ہوتے حضرت زیدؓ کو افسر کرنا کس بنا پر ہے؟ چنانچہ لوگوں میں چرچے ہوتے لیکن اسلام جس مساوات عام کے قائم کرنے کے لئے آیا تھا اس کے لئے اسی قسم کا ایثار درکار تھا۔ حضرت اسامہؓ کی مہم میں جس میں تمام مہاجرین کو شرکت کا حکم ہوا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی زیدؓ کے صاحبزادے حضرت اسامہؓ کو فوج کا افسر مقرر کیا تھا۔ اس وقت بھی لوگوں میں چرچے ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو خطبہ دیا اور فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کے باپ کی افسری پر بھی اعتراض کیا تھا حالانکہ یقیناً وہ افسری کے قابل تھے چنانچہ صحیح بخاری بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید فی مرضہ الذی توفی فیہ (باب المغازی) میں بہ تفصیل یہ واقعہ منقول ہے۔ گو یہ مہم قصاص لینے کی غرض سے تھی لیکن چونکہ تمام مہمات کا اصلی محور تبلیغ اسلام تھا ارشاد ہوا کہ پہلے ان کو دعوتِ اسلام دی جائے۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو جنگ کی ضرورت نہیں، یہ بھی حکم

---

[1] معجم البلدان لفظ موتہ ج ۸ صفحہ ۱۹۰؛ [2] صحیح بخاری غزوۂ موتہ [3] فتح الباری جلد ۷ صفحہ ۳۹۳-۳۰؛
[4] طبقات ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۹۳ ق۔

ہوا کہ اظہار ہمدردی کے لئے اس مقام پر جانا جہاں حارثؓ بن عمیر نے ادائے فرض میں جان دی ہے، ثنیۃ الوداع تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود فوج کی مشایعت کے لئے تشریف لے گئے۔ صحابہؓ نے پکار کر دعا کی کہ خدا سلامت اور کامیاب لائے۔

فوج مدینہ سے روانہ ہوئی تو جاسوسوں نے شرحبیل کو خبر دی جس نے مقابلہ کے لئے کم و بیش ایک لاکھ فوج تیار کی، ادھر خود قیصر روم (ہرقل) قبائل عرب کی بے شمار فوج لے کر مآب میں خیمہ زن ہوا جو بلقا کے اضلاع میں ہے۔ حضرت زیدؓ نے یہ حالات سن کر چاہا کہ ان واقعات سے دربار رسالت کو اطلاع دی جائے اور حکم کا انتظار کیا جائے لیکن حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ نے کہا، ہمارا اصل مقصد فتح نہیں بلکہ دولت شہادت[1] ہے جو ہر وقت حاصل ہو سکتی ہے۔

غرض یہ مختصر گروہ آگے بڑھا اور ایک لاکھ فوج پر حملہ آور ہوا۔ حضرت زیدؓ برچھیاں کھا کر شہید ہوئے ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے علم ہاتھ میں لیا، گھوڑے سے اتر کر پہلے خود اپنے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار ماری کہ اس کی کونچیں کٹ گئیں۔ پھر اس بے جگری سے لڑے کہ تلواروں سے چور ہو کر گر پڑے۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمر کا بیان ہے کہ میں نے ان کی لاش دیکھی تھی، تلواروں اور برچھیوں کے ۹۰ زخم تھے لیکن سب کے سب سامنے کی جانب تھے پشت نے یہ داغ نہیں اٹھایا تھا۔ حضرت جعفرؓ کے بعد عبد اللہؓ بن رواحہ نے علم ہاتھ میں لیا اور وہ بھی داد شجاعت دے کر شہید ہوئے۔

اب حضرت خالدؓ سردار بنے اور نہایت بہادری سے لڑے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں[3] لیکن ایک لاکھ سے تین ہزار کا کیا مقابلہ تھا، بڑی کامیابی یہی تھی کہ اپنی فوج کو دشمن کی زد سے بچا لائے۔ جب یہ شکست[4] خوردہ فوج مدینہ کے قریب پہنچی اور اہل شہر ان کی مشایعت کو

---

[1] ابن ہشام غزوہ موتہ ص [2] صحیح بخاری [3] صحیح بخاری غزوہ موتہ ص [4] مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے لیکن جیسا کہ صحیح بخاری غزوۂ موتہ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا، فتح اللہ علیہم۔ ارباب سیر اور اہل روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں۔ ایک فریق کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ اور فتح یہ ہے کہ مسلمان اس قلت تعداد اور کفار اپنی کثرت کے باوجود تھک کر غیر منفصل جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کے مقابلہ سے ہٹ آئے۔ تیسرا فریق یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو فتح کفار کے ایک خاص دستہ کے مقابلہ میں حاصل ہوئی اور اس سے مال غنیمت بھی حاصل کیا۔ چوتھا بیان یہ ہے کہ مسلمانوں کا غلبہ یہ ہے کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں اتنے بڑے لشکر کے حملوں کو روک دیا اور بسلامت پیچھے ہٹ آئے، اس مقام پر فتح الباری، روض الانف سہیلی اور البدایہ ابن کثیر ملاحظہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری

نکلے تو لوگ غم خواری کے بجائے ان کے چہروں پر خاک پھینکتے تھے کہ او فرارو! تم خدا کی راہ سے بھاگ آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کا سخت صدمہ ہوا۔ حضرت جعفرؓ سے آپ کو خاص محبت تھی ان کی شہادت کا نہایت قلق تھا۔ آپ مسجد میں جا کر غمزدہ بیٹھے، اسی حالت میں ایک شخص نے آکر کہا کہ جعفر کی مستورات رو رہی ہیں اور ماتم کر رہی ہیں۔ آپ نے منع کرا بھیجا۔ وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آتیں۔ آپ نے دوبارہ بھیجا وہ پھر گئے اور واپس آکر عرض کی کہ ہم لوگوں کی نہیں چلتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے منہ میں خاک بھر دو۔ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ خدا کی قسم! تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک ڈالنا) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔

*

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری نہیں بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو، اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے پہلے مدینہ چلا آیا تھا تفصیل کے لئے دیکھئے فتح الباری و روض الانف سہیلی والبدایہ ابن کثیر باب غزوۂ موتہ ص

فتح مکہ

رمضان ۸ھ مطابق جنوری ۶۳۰ء

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا،

جانشینِ ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کا سب سے مقدم فرض، توحیدِ خالص کا احیاء، اور حرمِ کعبہ کا آلائش سے پاک کرنا تھا، لیکن قریش کے پے در پے حملوں اور عرب کی مخالفتِ عام نے پورے اکیس برس تک اس فرض کو روک رکھا، صلح حدیبیہ کی بدولت اتنا ہوا کہ چند روز کے لئے امن و امان قائم ہو گیا اور دلدادگانِ حرم ایک دفعہ یادگارِ ابراہیمی کو غلط انداز نظر سے دیکھ آئے لیکن معاہدہ حدیبیہ بھی قریش سے نہ نبھ سکا، علم و عفو و تحمل کی حد ہو چکی، اب وقت آگیا کہ آفتابِ حق حجابہائے حائل کو چاک کر کے باہر نکل آئے۔

صلح حدیبیہ کی بناء پر قبائلِ عرب میں خزاعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف ہو گئے تھے اور ان کے حریف بنو بکر نے قریش سے مخالفت کا معاہدہ کر لیا تھا۔ ان دونوں حریفوں میں مدت سے لڑائیاں چلی آتی تھیں اسلام کے ظہور نے عرب کو ادھر متوجہ کیا تو وہ لڑائیاں رک گئیں اور اب تک رکی رہیں، کیونکہ قریش اور عرب کا سارا زور اسلام کے مقابلہ میں صرف ہو رہا تھا۔ صلح حدیبیہ نے لوگوں کو مطمئن کیا تو بنو بکر سمجھے کہ اب انتقام کا وقت آگیا۔ دفعتاً وہ خزاعہ پر حملہ آور ہوتے اور رؤسائے قریش نے علانیہ ان کو مدد دی، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو وغیرہ نے راتوں کو صورتیں بدل کر بنو بکر کے ساتھ تلواریں چلائیں خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی۔ بنو بکر رک گئے کہ حرم کا احترام ضرور ہے لیکن ان کے رئیسِ اعظم نوفل نے کہا یہ موقع پھر کبھی ہاتھ نہیں آسکتا، غرض عین حدودِ حرم میں خزاعہ کا خون بہایا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے کہ دفعتاً یہ صدا بلند ہوئی۔

لاھُمَّ انّی ناشدٌ محمّدا،	اے خدا! میں محمد کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور
حلفَ ابینا وابیہ الاتلدا	ان کے قدیم خاندان میں ہوا ہے۔ اے پیغمبر خدا ہماری اعانت کر
فانصر رسولَ اللہ نصرًا اعتدا،	اور خدا کے بندوں کو بلا، سب اعانت کے لئے حاضر ہوں گے۔
وادعُ عبادَ اللہ یاتوا مددا،	

معلوم ہوا کہ خزاعہ کے چالیس ناقہ سوار جن کا پیش رو عمرو بن سالم ہے، فریاد لے کر آئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات سنے تو آپ کو سخت رنج ہوا، تاہم آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی منظور کی جائے۔

---

[1] طبری صفحہ ۱۶۲۰ (و ۱۶۲۱) ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۹۹ میں کچھ اور نام بھی ہیں۔ [2] طبقات ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۹۷۔

(۱) مقتولوں کا خون بہا دیا جائے۔

(۲) قریش، بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) اعلان کر دیا جائے کہ حدیبیہ کا معاہدہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ بن عمر نے قریش کی زبان سے کہا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے[1]۔ لیکن قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش کو ندامت ہوئی۔ انھوں نے ابو سفیان کو سفیر بنا کر بھیجا کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی تجدید کرا لائیں۔ ابو سفیان نے مدینہ آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی۔ بارگاہِ رسالت سے کچھ جواب نہ ملا۔ ابو سفیان نے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کو بیچ میں ڈالنا چاہا لیکن سب نے کانوں پر ہاتھ رکھا۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر جنابِ فاطمہ زہراؓ کے پاس آیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پانچ برس کے بچے تھے۔ ابو سفیان نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اگر یہ بچہ اتنا زبان سے کہہ دے کہ میں نے دونوں فریقوں میں بیچ بچاؤ کرا دیا تو آج سے عرب کا سردار پکارا جائے گا۔" جنابِ سیدہؓ نے فرمایا: "بچوں کو ان معاملات میں کیا دخل؟" بالآخر ابو سفیان نے حضرت علیؓ کے ایما سے مسجدِ نبوی میں اعلان کر دیا کہ میں نے معاہدہ حدیبیہ کی تجدید کر دی[2]۔

ابو سفیان نے مکہ میں جا کر لوگوں سے یہ واقعہ بیان کیا تو سب نے کہا یہ نہ صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھ جائیں، نہ جنگ ہے کہ لڑائی کا سامان کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی تیاریاں کیں، اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں۔ احتیاط کی گئی کہ اہلِ مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ایک معزز صحابی تھے۔ انھوں نے قریش کو مخفی خط لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی۔ حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت ابو مرثدؓ غنوی کو بھیجا کہ قاصد سے خط چھین لائیں۔ خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو تمام لوگوں کو حاطب کے افشائے راز پر حیرت ہوئی۔ حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے اور عرض کی کہ حکم ہو تو ان کی گردن اڑا دوں، لیکن جبینِ رحمت پر شکن نہ تھی۔ ارشاد ہوا: "عمرؓ! تم کو کیا معلوم ہے کہ خدا نے اہلِ بدر کو مخاطب کر کے کہہ دیا ہو کہ تم سے مواخذہ نہیں ہے۔"

حضرت حاطبؓ کے عزیز و اقارب اب تک مکہ میں تھے اور ان کا کوئی حامی نہ تھا اس لئے انھوں نے قریش پر احسان رکھنا چاہا کہ اس کے صلہ میں اُن کے عزیزوں کو ضرر نہ پہنچائیں گے۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہی عذر پیش کیا اور آپ نے قبول فرمایا۔

غرض ۱۰ رمضان ۸ھ کو کوکبۂ نبوی نہایت عظمت و شان سے مکہ معظمہ کی طرف بڑھا۔ دس ہزار آراستہ فوجیں رکاب میں تھیں، قبائلِ عرب راہ میں آ کر ملتے جاتے تھے۔ مر الظہران پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور فوجیں دور دور

---

[1] زرقانی (ج ۲ ص ۳۳۶) نے یہ واقعہ مغازی ابن عائذ سے نقل کیا ہے تعجب ہے کہ اور مورخین اور ارباب سیر ایسے ضروری واقعہ کو قلم انداز کر گئے۔ [2] زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۳ تا ۳۳۴ [3] زرقانی علی المواہب ج ۲ ص ۳۳۹ تا ۳۴۰

تک پھیل گئیں۔ یہ مقام مکۂ معظمہ سے ایک منزل یا اس سے بھی کم فاصلہ پر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تمام فوج نے الگ الگ آگ روشن کی جس سے تمام صحرا وادی ایمن بن گیا۔ فوج کی آمد کی بھنک قریش کے کانوں میں پڑ چکی تھی۔ تحقیق کے لئے انھوں نے حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) ابوسفیان اور بدیل بن ورقا کو بھیجا۔ خیمۂ نبوی کی دربانی پر جو دستہ متعین تھا اس نے ابوسفیان کو دیکھ لیا۔ حضرت عمرؓ جذبۂ انتقام کو ضبط نہ کر سکے۔ تیز قدمی سے آگے بڑھے اور بارگاہِ رسالت میں آکر عرض کی کہ کفر کے استیصال کا وقت آگیا۔ لیکن حضرت عباسؓ نے جان بخشی کی درخواست کی۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ عرض کیا۔ حضرت عباسؓ نے کہا "عمر! اگر یہ شخص تمہارے قبیلہ کا آدمی ہوتا تو تم اس قدر سخت دلی نہ کرتے۔" حضرت عمرؓ نے کہا، آپ یہ نہ فرمائیں! آپ جس دن ایمان لائے تھے مجھ کو جو مسرت ہوئی تھی خود میرا باپ خطاب اسلام لاتا تو مجھ کو اس قدر خوشی نہ ہوتی[1]۔

ابوسفیان کے تمام پچھلے کارنامے اب سب کے سامنے تھے اور ایک ایک چیز اس کے قتل کی دعوے دار تھی۔ اسلام کی عداوت، مدینہ پر بار بار حملہ، قبائل عرب کا اشتعال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خفیہ قتل کرانے کی سازش، ان میں سے ہر چیز اس کے خون کی قیمت ہو سکتی تھی، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور چیز (عفو نبوی) تھی، اس نے ابوسفیان کے کان میں آہستہ سے کہا کہ خوف کا مقام نہیں:

صحیح بخاری میں ہے کہ گرفتار ہونے کے ساتھ ابوسفیان نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن طبری وغیرہ میں اس اجمال کی تفصیل میں حسب ذیل مکالمہ لکھا ہے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	کیوں ابوسفیان! کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟
ابوسفیان	کوئی اور خدا ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	کیا اس میں کوئی شبہ ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں؟
ابوسفیان	اس میں تو ذرا شبہ ہے۔

بہرحال ابوسفیان نے اسلام کا اظہار کیا اور اس وقت گو اُن کا ایمان متزلزل تھا، لیکن مؤرخین لکھتے ہیں کہ بالآخر وہ سچے مسلمان بن گئے۔ چنانچہ غزوۂ طائف میں ان کی ایک آنکھ زخمی ہوئی اور یرموک میں وہ بھی جاتی رہی۔

لشکرِ اسلام جب مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر کھڑا کر دو کہ افواج الٰہی کا جلال آنکھوں سے دیکھیں۔ کچھ دیر کے بعد دریائے اسلام میں تلاطم شروع ہوا۔ قبائل عرب کی موجیں جوش مارتی ہوئی بڑھیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا، پھر جہینہ، سعد بن ہُذیم، سلیم، ہتھیاروں میں ڈوبے ہوئے تکبیر کے نعرے مارتے ہوئے نکل گئے۔ ابوسفیان ہر دفعہ مرعوب ہو کر

---

[1] اصل واقعہ صحیح بخاری میں کافی تفصیل کے ساتھ موجود ہے لیکن مزید تفصیل اور جزئیات حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں موسیٰ بن عقبہ اور ابن عائذ وغیرہ سے نقل کئے ہیں میں نے ان کو بھی لے لیا ہے۔ بعض واقعات طبری سے ماخوذ ہیں۔ [2] طبری ج ۳ ص ۱۶۳۲۔

جلتے تھے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سروسامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں، ابوسفیان نے متحیر ہو کر پوچھا یہ کون لشکر ہے، حضرت عباسؓ نے نام بتایا۔ دفعۃً سردار فوج حضرت سعدؓ بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے ہوئے برابر سے گزرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے۔

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ۔ آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھتا جاتا تھا حضرت زبیرؓ بن العوام علمبردار تھے۔ ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا؟ سعد بن عبادہ کیا کہتے ہوئے گئے؟ ارشاد ہوا کہ سعد بن عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعد بن عبادہ سے لے کر ان کے بیٹے کو دے دیا جائے۔ مکہ پہنچ کر آپ نے حکم دیا کہ علم نبوی مقام حجون پر نصب کیا جائے۔ حضرت خالدؓ کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔[1]

اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اس کو امن دیا جائے گا۔ تاہم قریش کے ایک گروہ نے مقابلہ کا قصد کیا اور خالدؓ کی فوج پر تیر برسائے، چنانچہ تین صاحب یعنی حضرت کرزؓ بن جابر فہری اور حضرت حُبیشؓ بن اشعر اور حضرت سلمہ بن المیلا نے شہادت پائی۔ حضرت خالدؓ نے مجبور ہو کر حملہ کیا۔ یہ لوگ ۱۳ لاشیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلواروں کا چمکنا دیکھا تو حضرت خالدؓ سے بازپرس کی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ ابتداء مخالفین نے کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضورؐ قیام کہاں فرمائیں گے؟ کیا اپنے قدیم مکان میں؟ شریعت میں مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ ابوطالب (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم) نے جب انتقال کیا تھا تو ان کے صاحبزادے عقیل اس وقت کافر تھے، اس لئے وہی وارث ہوئے، انہوں نے یہ مکانات ابوسفیان کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقیل نے گھر کہاں چھوڑا کہ اس میں اتروں اس لئے مقام خیف میں ٹھہروں گا۔ (جہاں قریش نے ہمارے خلاف کفر کی تائید پر باہم عہد و پیمان کیا تھا)

خدا کی شان، حرم محترم جو خلیل بت شکن کی یادگار تھا، اس کی آغوش میں ۳۶۰ بت جاگزیں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے،

---

[1] یہ خاص صحیح بخاری کی روایت ہے۔ مصنف نے یہاں حضرت عروہؓ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے۔ صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالدؓ مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے فتح الباری ج ۸ ص ۸۔ [2] ان کی شہادت کا ذکر صحیح بخاری میں بھی ہے۔ [3] صحیح بخاری فتح مکہ میں حضرت اسامہؓ بن زید سے جو روایت ہے اس میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے یہ ارشاد فتح مکہ کے موقع پر کیا لیکن اس میں خیف کے قیام کا ذکر نہیں لیکن جو روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا اور اس میں خیف کی تصریح ہے ابن حجر نے یہ تطبیق کی ہے کہ ممکن ہے کہ دونوں موقعوں پر لوگوں کے سوال پر یہ ارشاد فرمایا ہو، فتح الباری ج ۸ ص ۱۲ و ج ۳ ص ۳۶۔ س ن۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ (جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ) اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا[1]

حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کی چیز تھی۔

عین کعبہ کے اندر بہت سے بت تھے جن کو قریش خدا مانتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ میں داخل ہونے سے پہلے حکم دیا کہ سب نکلوا دیئے جائیں۔ حضرت عمرؓ نے اندر جا کر جس قدر تصویریں تھیں وہ بھی مٹا دیں حرم ان آلائشوں سے پاک ہو چکا تو آپؐ نے عثمان بن طلحہ سے جو کعبہ کے کلید بردار تھے کنجی طلب کی اور دروازہ کھلوایا آپؐ حضرت بلالؓ اور طلحہؓ کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے کعبہ کے اندر تکبیریں کہیں لیکن نماز نہیں ادا کی۔

خطبۂ فتح

شاہنشاہی اسلام کا یہ پہلا دربار عام تھا، خطبۂ سلطنت یعنی بارگاہِ احدیت کی تقریر خلافت الٰہی کے منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کی جس کا خطاب صرف اہل مکہ سے نہیں بلکہ تمام عالم سے تھا۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ الا کل ماثرۃ اودم اومال یُدّعٰی فھو تحت قدمی ھاتین الا سدانۃ البیت وسقایۃ الحاج ۔۔۔۔ یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالاٰباء الناس من اٰدم وادم من تراب۔

ایک خدا کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس نے اپنا وعدہ سچا کیا اس نے اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا توڑ دیا ال تمام مفاخر تمام انتقامات خونبہائے قدیم تمام خونبہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں، صرف حرم کعبہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں، اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار خدا نے مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔

پھر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (ابن ہشام مختصراً) اِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ (الحجرات۔ ۲۰ و بخاری)

لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے تاکہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو، خدا دانا اور واقف کار ہے، خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی۔

تمام عقائد اور اعمال کا اصل الاصول اور دعوتِ اسلام کا اصلی پیغام توحید ہے، اس لئے سب سے پہلے اسی سے ابتدا کی گئی۔

خطبہ کے اصولی مطالب

عرب میں دستور تھا، کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا تھا تو اس کے خون کا انتقام لینا خاندانی فرض قرار پاجاتا تھا، یعنی اگر اس وقت قاتل نہ ہاتھ آسکا تو خاندانی فرض

---

[1] اس موقع پر اس پوری آیت کے پڑھنے کا ذکر ابن سعد فتح مکہ میں ہے، صحیح بخاری فتح مکہ میں الفاظ آئے ہیں جاء الحق وزہق الباطل وما یبدی الباطل وما یعید، یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا۔ تن مع صحیح بخاری فتح مکہ۔

میں مقتول کا نام لکھا جاتا اور سینکڑوں برس گزرنے کے بعد بھی انتقام کا فرض ادا کیا جاتا تھا۔ قاتل اگر مر چکا ہے تو اس کے خاندان یا قبیلے کے آدمی کو قتل کرتے تھے۔ اسی طرح خون بہا کا مطالبہ بھی اباً عن جدٍ چلا آتا تھا۔ یہ خون کا انتقام عرب میں سب سے بڑے فخر کی بات تھی۔ اس طرح اور بہت سی لغو باتیں مفاخر قومی میں داخل ہو گئی تھیں، اسلام ان سب کے مٹانے کے لیے آیا تھا اور اس بنا پر آپ نے (اس طریق) انتقام اور خون بہا اور نیز اور تمام غلط مفاخر کی نسبت فرمایا کہ میں نے ان کو پاؤں سے کچل دیا۔

عرب اور تمام دنیا میں نسل اور قوم وخاندان کے امتیاز کی بنا پر ہر قوم میں فرقِ مراتب قائم کیے گئے تھے جس طرح ہندوؤں نے چار ذاتیں قائم کیں اور شودر کو وہ درجہ دیا جو جانوروں کا درجہ ہے اور اس کے ساتھ یہ بندش کر دی کہ وہ کبھی اپنے رتبہ سے ایک ذرہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ اسلام کا سب سے بڑا احسان جو اس نے تمام دنیا پر کیا، مساوات عام قائم کرنا تھا یعنی عرب وعجم، شریف ورذیل، شاہ وگدا، سب برابر ہیں، ہر شخص ترقی کر کے ہر انتہائی درجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیت پڑھی اور پھر توضیح فرمائی کہ تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جبارانِ قریش سامنے تھے۔ ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب سے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ وسنان نے پیکرِ قدسی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے۔ وہ بھی تھے جن کی تشنہ لبی خونِ نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجہ میں پوچھا، تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں۔

یہ لوگ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے پکار اٹھے کہ:۔

اخٌ کریمٌ وابن اخٍ کریم۔ تو شریف بھائی ہے اور شریف برادر زادہ ہے

ارشاد ہوا۔

لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء۔ تم پر کچھ الزام نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔

کفار مکہ نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی مملوکات سے دستبردار ہو جائیں۔

نماز کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے بام کعبہ پر چڑھ کر اذان دی، وہی سرکش جو ابھی رام ہو چکے تھے ان کی آتش غیرت پھر مشتعل تھی۔ عتاب بن اسید نے کہا، خدا نے میرے باپ کی عزت رکھ لی کہ اس آواز کے

سننے سے پہلے اس کو دنیا سے اٹھا لیا۔ ایک اور سردار نے کہا: اب جینا بے کار ہے۔[1]

مقام صفا میں آپ ایک بلند مقام پر بیٹھے، جو لوگ اسلام قبول کرنے آتے تھے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے، مردوں کی باری ہو چکی تو مستورات آئیں، عورتوں سے بیعت لینے کا یہ طریقہ تھا کہ ان سے ارکانِ اسلام اور محاسنِ اخلاق کا اقرار لیا جاتا تھا۔ پھر پانی کے ایک لبریز پیالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دستِ مبارک ڈبو کر نکال لیتے تھے،[2] آپ کے بعد عورتیں اسی پیالہ میں ہاتھ ڈالتی تھیں اور بیعت کا معاہدہ پختہ ہو جاتا تھا۔

ان مستورات میں ہند بھی آئی، یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی حضرت حمزہؓ کو اسی نے قتل کرایا تھا اور ان کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی۔ وہ نقاب پہن کر آئی، شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اس کو پہچاننے نہ پائے۔ بیعت کے وقت اس نے (نہایت دلیری بلکہ گستاخی سے باتیں کیں جو حسب ذیل ہیں۔[3]

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔
ہند	یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہرحال ہم کو منظور ہے۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	چوری نہ کرنا۔
ہند	میں اپنے شوہر (ابوسفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں۔
رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)	اولاد کو قتل نہ کرنا
ہند	ربیناھم صغارا وقتلتھم کبارا فانت وھم اعلم ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا بڑے ہوتے تو جنگ بدر[5] میں آپ نے ان کو مار ڈالا، اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں۔[4]

رؤسائے عرب میں دس شخص تھے جو قریش کے سرتاج تھے، ان میں صفوان بن امیہ جدہ بھاگ گئے تھے۔ عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ رئیس عرب مکہ سے جلاوطن ہوا جاتا ہے۔ آپ نے علامتِ امان کے طور پر اپنا عمامہ عنایت کیا، عمیر جدہ پہنچ کر ان کو واپس لائے۔ حنین کے معرکہ تک یہ اسلام نہیں لائے (بعد کو مسلمان ہو گئے)[6]

عبد اللہ بن زبعری عرب کے مشہور شاعر جو (پہلے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجویں کہا کرتے تھے اور قرآن مجید

---

[1] ابن ہشام (حضرت عتابؓ بعد کو مسلمان ہو گئے) [2] اصابہ تذکرہ عتاب بن اسید (ج ۲ ص ۴۵۱) [3] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۴۲

[4] طبری ج ۳ ص ۱۶۴۳ مختصراً [5] جنگ بدر میں ہند کے لڑکے کافروں کے ساتھ شریک ہو کر لڑے اور لڑ کر مارے گئے تھے

[6] طبری ج ۳ ص ۱۶۴۲ و اصابہ ذکر صفوان بن امیہ

پر نکتہ چینیاں کرتے تھے، نجران بھاگ گئے لیکن پھر آکر اسلام لائے۔

ابو جہل کے بیٹے عکرمہ یمن چلے گئے، لیکن ان کی حرم (ام حکیم) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امان لی اور جاکر یمن سے لائیں، یہ واقعہ ابو جہل سے کہنے کے قابل نہیں کہ اس کا جگر بند کفر کی گود سے نکل کر اسلام کے آغوش میں آگیا اور اب ہم اس کو حضرت عکرمہؓ کہتے ہیں۔

اشتہاریان قتل

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو اہل مکہ کو امن عطا کیا تھا تاہم دس[1] شخصوں کی نسبت حکم دیا کہ جہاں ملیں قتل کر دیئے جائیں۔ ان میں سے بعض مثلاً عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ خونی مجرم تھے اور قصاص میں قتل کئے گئے، لیکن متعدد ایسے تھے کہ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ میں ستایا کرتے تھے یا آپ کی ہجو میں اشعار کہا کرتے تھے، ان میں سے ایک عورت اس جرم میں قتل کی گئی کہ وہ آپ کے ہجو یہ اشعار گایا کرتی تھی۔

لیکن محدثانہ تنقید کی رو سے یہ بیان صحیح نہیں، اس جرم کا مجرم تو سارا مکہ تھا، کفار قریش میں سے دو چار کے سوا کون تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت سے سخت ایذائیں نہیں دیں۔ بایں ہمہ ان ہی لوگوں کو یہ مژدہ سنایا گیا کہ انتم الطلقاء، جن لوگوں کا قتل بیان کیا جاتا ہے وہ تو نسبۃً کم درجہ کے مجرم تھے، حضرت عائشہؓ صدیقہ کی یہ روایت صحاح ستہ میں موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ خیبر میں جس یہودی عورت نے آپ کو زہر دیا اس کی نسبت لوگوں نے دریافت بھی کیا کہ اس کے قتل کا حکم ہوگا، ارشاد ہوا کہ نہیں، خیبر کے کفرستان میں ایک یہودیہ زہر دے کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے جانبر ہو سکتی ہے

---

[1] ابن ہشام ص ن ۲، طبری ج ۳ ص ۱۶۴۲۔ [2] حافظ مغلطائی نے پندرہ نام مختلف حوالوں سے جمع کئے ہیں جو خود محدثین کے نزدیک غیر محتاط ہیں، عام ارباب سیرت نے دس شخصوں کے نام لئے ہیں، ابن اسحاق نے آٹھ نام گنائے ہیں، ابو داؤد اور دارقطنی کی روایت سے صرف چھ ہیں، بخاری میں صرف ابن خطل کا واقعہ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ تحقیق کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔

عام روایت کی رو سے جن دس شخصوں کی سزائے موت کا اعلان کیا گیا تھا ان کا حال یہ ہے کہ وہ شدید مجرم تھے، تاہم سات شخص خلوص سے ایمان لائے اور ان کو معافی دے دی گئی، صرف چار شخص قتل ہوئے تین مرد اور ایک عورت، عبداللہ بن خطل، مقیس بن صبابہ، حویرث بن نقیر اور ابن خطل کی لونڈی قریبہ۔ ابن خطل اور ابن صبابہ دونوں خونی مجرم تھے، ابن خطل نے جو اسلام لاچکا تھا اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کرکے مرتد ہوگیا تھا، مقیس بن صبابہ کا واقعہ یہ ہے کہ اس کا ایک بھائی ایک انصاری کے ہاتھ سے غلطی سے مارا گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دیت ادا کرادی تھی، تاہم مقیس منافقانہ اسلام لایا اور غدر سے اس انصاری کو قتل کردیا اور حویرث نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں کے ساتھ جب وہ ہجرت کر رہی تھیں شرارت کی تھی اور ان دونوں کو اونٹوں سے گرادینا چاہتا تھا، حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اس کو قتل کردیا، قریبہ جو ابن خطل کی لونڈی تھی مکہ کی ایک مغنیہ تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں گیت گایا کرتی تھی عہ

عہ دیکھو زرقانی اور ابن ہشام ذکر فتح مکہ۔

تو حرم میں اس سے کم درجہ کے مجرم عفو نبوی سے کیونکر محروم رہ سکتے ہیں۔

اگر درایت پر قناعت نہ کی جائے تو روایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ بالکل ناقابلِ اعتبار رہ جاتا ہے صحیح بخاری[1] میں صرف ابن خطل کا قتل مذکور ہے، اور یہ عموماً مسلّم ہے کہ وہ قصاص میں قتل کیا گیا، مقیس کا قتل بھی شرعی قصاص تھا۔ باقی جن لوگوں کی نسبت حکمِ قتل کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستایا کرتے تھے وہ روایتیں صرف ابن اسحاق تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں یعنی اصولِ حدیث کی رو سے وہ روایت منقطع ہے، جو قابلِ اعتبار نہیں، ابن اسحاق کا فی نفسہٖ جو درجہ ہے وہ ہم کتاب کے دیباچہ میں لکھ آئے ہیں۔

سب سے زیادہ معتبر روایت جو اس بارہ پیش کی جا سکتی ہے وہ ابوداؤد کی روایت[2] ہے جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ چار شخصوں کو کہیں امن نہیں دیا جا سکتا، لیکن ابوداؤد نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس روایت کی سند جیسی چاہیے مجھ کو نہیں ملی۔ پھر اس کے بعد ابن خطل کی روایت نقل کی ہے

---

[1] بخاری فتح مکہ ص ۶۱۴۔ [2] ابوداؤد باب قتل الاسیر۔ [3] ابوداؤد نے باب قتل الاسیر میں اس معنی کی تین روایتیں درج کی ہیں، پہلی وہ روایت ہے جس کا ذکر مصنف نے اخیر میں کیا ہے، یہ روایت احمد بن المفضل، اسباط بن نصر، اسدی کبیر، مصعب بن سعد اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ہے، اس میں چار مرد اور دو عورتوں کے قتل کا حکم مذکور ہے، ان میں سے ایک ابن ابی سرح ہے جس کو حضرت عثمانؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے بغیر آپ کی خدمت میں لا کر پیش کیا اور اس کو کچھ دیر کے تامل کے بعد پناہ دی اور وہ مسلمان ہوا، اس روایت میں احمد بن مفضل اور اسباط بن نصر اور سدی کبیر تینوں پر علمائے رجال نے جرحیں کی ہیں اور خصوصاً اسباط ابن نصر پر اور زیادہ جرحیں ہیں، یہ روایت اسی سلسلہ سے نسائی نے باب قتل المرتد میں اور حاکم نے مستدرک کتاب المغازی میں اس کو نقل کیا ہے، اس سلسلہ کے یہ تینوں راوی شیعہ ہیں اور حاکم نے مستدرک میں اس پہلو سے اپنا اظہارِ خیال کر دیا ہے، ابوداؤد کی دوسری روایت عمرو بن عثمان بن عبدالرحمٰن بن سعید مخزومی سے ہے کہ انھوں نے اپنے دادا سے اور انھوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار مردوں اور دو عورتوں کے بارہ میں فرمایا کہ ان کو پناہ نہیں دی جا سکتی، ان دو عورتوں میں سے جو دونوں مغنیہ لونڈیاں تھیں ایک مسلمان ہو گئی اور ایک قتل کی گئی، اس روایت کے متعلق ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے شیخ ابوالعلاء سے اس کی سند اچھی طرح سمجھی نہیں، یہی روایت اسی سلسلہ سے دارقطنی اواخر کتاب الحج میں ہے، اس میں سند کے آخر میں یوں ہے، عمرو بن عثمان نے اپنے باپ سے اور انھوں نے اپنے دادا سے یہ روایت سُنی، اس سے ظاہر ہے کہ سند کے اسی حصہ میں ابوداؤد کو شک ہے، ابوداؤد کی تیسری روایت میں صرف ابن خطل کے قتل کا ذکر ہے جو صحیح بخاری کی روایت سے بھی ثابت ہے، بیہقی نے حکم بن عبدالملک، قتادہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے ایک روایت کی ہے جس میں تین مرد اور ایک عورت یعنی چار شخصوں کے قتل کا حکم ہے، تین مرد یہ ہیں، ابن خطل، مقیس بن صبابہ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح اور عورت کا نام ام سارہ تھا، عبداللہ بن سعد کے قتل کی ایک انصاری نے نذر مانی تھی مگر حضرت عثمانؓ کی سفارش سے ان کی جان بخشی ہوئی اور ام سارہ وہی عورت ہے جو فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کرنے کا خط خفیہ لے چلی تھی، اس روایت میں حکم بن عبدالملک مطلقاً ناقابلِ اعتبار ہے اور اس کی اس روایت کو عقیلی نے لکھا ہے کہ کوئی تائید اس کے رفقاء میں سے کسی نے نہیں کی ہے۔ تہذیب ابن حجر۔ "س"۔

(اور شرح میں جو روایت ہے) اس کا ایک راوی احمد بن المفضل ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث لکھا ہے اور ایک راوی اسباط بن نصر ہے جس کی نسبت نسائی کا قول ہے کہ قوی نہیں ہے۔ اگرچہ صرف اس قدر جرح کسی روایت کے نامعتبر ہونے کے لیے کافی نہیں، لیکن واقعہ جس قدر اہم ہے اس کے لحاظ سے راوی کی اس قدر جرح بھی روایت کے مشکوک ہونے کے لیے کافی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض سرداران قریش جو مخالفین اسلام کے پیشرو تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر سن کر مکہ سے بھاگ گئے، لیکن یہ صرف ابن اسحاق کا قیاس ہے کہ وہ اس وجہ سے بھاگے تھے کہ ان کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ ان اشتہاری مفروروں میں ابن اسحاق نے عکرمہ کو بھی شمار کیا ہے جو ابوجہل کے فرزند تھے۔ لیکن موطائے امام مالک میں جس کی نسبت امام شافعی کا قول ہے کہ آسمان کے نیچے (قرآن کے علاوہ) کوئی کتاب اس سے زیادہ صحیح نہیں، یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے۔

> "حارث بن ہشام کی صاحبزادی ام حکیم، عکرمہ بن ابوجہل کی زوجہ تھیں، وہ فتح مکہ کے دن اسلام لائیں، لیکن ان کے شوہر عکرمہ بن ابوجہل اسلام سے بھاگ کر یمن چلے گئے، ام حکیم یمن گئیں اور ان کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور مکہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی، پھر ان سے بیعت لی۔ (کتاب النکاح)

یہ بات بھی اس موقع پر خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ جن لوگوں کو امن دیا جاتا تھا وہ اسلام پر مجبور نہیں کیے جاتے تھے۔ تمام مورخین اور ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ حنین کی لڑائی میں جو فتح مکہ کے بعد پیش آئی لشکر اسلام میں مکہ کے بہت سے کفار بھی شامل تھے جو اس وقت تک کافر تھے اور شکست بھی زیادہ تر اسی وجہ سے ہوئی کہ پہلے حملہ میں انہی کافروں کے قدم اکھڑے اور اس ابتری کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم بھی نہ ٹھہر سکے۔

خزائن حرم

حرم میں نذور اور ہدایا کا خزانہ ایک مدت سے جمع ہوتا چلا آتا تھا وہ محفوظ رکھا گیا لیکن مجسمہ جات اور تصویریں برباد کر دی گئیں، ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے مجسمے بھی تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی تھی[1] جس سے لوگوں نے قیاس کیا کہ کسی زمانہ میں عیسائیت کا اثر زیادہ غالب ہو گیا تھا۔ رنگین تصویریں جو دیواروں پر تھیں مٹانے پر بھی ان کے دھندلے نشان رہ گئے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیر تک باقی رہے[2]۔

مکہ معظمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام پندرہ دن تک رہا۔ جب یہاں سے روانہ ہوتے تو حضرت معاذؓ بن جبل کو اس خدمت پر مقرر کرتے گئے کہ لوگوں کو اسلام کے مسائل اور احکام سکھائیں۔

فتح مکہ اور بت شکنی

فتح مکہ کا اصلی مقصد اشاعت توحید اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا، کعبہ میں سینکڑوں بت تھے، جن میں ہبل بھی تھا جو بت پرستوں کا خدائے اعظم تھا، یہ انسان کی صورت کا تھا اور

---

[1] فتح الباری ذکر فتح مکہ [2] فتح الباری ذکر فتح مکہ، اخبار مکہ ازرقی میں بہ تفصیل یہ واقعات مذکور ہیں،

یاقوتِ احمر سے بنا تھا سب سے پہلے جس نے اس کو کعبہ میں لاکر رکھا تھا خزیمہ بن مدرکہ تھا جو مضر کا پوتا اور عدنان کا پڑپوتا تھا، ہبل کے سامنے سات تیر رہتے تھے جن پر "لا" و "نعم" لکھا ہوا تھا، عرب جب کوئی کرنا چاہتے تھے تو ان تیروں پر قرعہ ڈالتے اور "ہاں" یا "ناں" جو کچھ نکلتا اس پر عمل کرتے۔ جنگ احد میں ابوسفیان نے اسی ہبل کی جے پکاری تھی، وہ عین کعبہ کے اندر تھا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے آ ر بتوں کے ساتھ وہ بھی برباد کر دیا گیا۔

مکہ کے اطراف میں اور بہت سے بڑے بڑے بُت تھے جن کے لئے حج کی رسمیں ادا کی تی تھیں، ان میں سب سے بڑے لات، مناۃ اور عزّٰی تھے۔ عزّٰی قریش کا اور لات اہل طائف کا معبود تھا۔ یہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلہ پر نخلہ ایک مقام ہے، عزّٰی یہیں منصوب تھا۔ بنو شیبان اس کے متولی تھے۔ اہل رب کا اعتقاد تھا کہ خدا جاڑوں میں "لات" کے ہاں اور گرمیوں میں "عزّٰی" کے ہاں بسر کرتا ہے۔ عزّٰی کے سامنے عرب ، تمام مناسک لو رسوم بجا لاتے تھے جو کعبہ میں بجا لاتے تھے، اس کا طواف کرتے اور اس پر قربانیاں چڑھاتے تھے[2]۔

مناۃ کا تخت گاہ مشلّل تھا جو قدید کے پاس مدینہ منورہ سے سات میل ادھر ہے وہ ایک بن گھڑا پتھر تھا، ازد، غسان، اوس اور خزرج اس کا حج کرتے تھے، عمرو بن لحی نے جو اصنام قائم کئے تھے یہ ان سب میں بالاتر تھا، اوس اور خزرج جب کعبہ کا حج کرتے تو احرام اتارنے کی رسم (بال منڈانا) اسی کے پاس آکر ادا کرتے تھے[3]۔ قبیلہ ہذیل کا بُت سواع تھا جو ینبع کے اطراف رہاط میں تھا، یہ ایک پتھر تھا، اس کے متولی بنو لحیان تھے۔

بُت پرستی کے یہ وہ طلسم تھے جن میں سارا عرب گرفتار تھا، اب ان کی بربادی کا وقت آچکا تھا اور دفعۃً ہر جگہ خاک اڑنے لگی۔

*

---

[1] معجم البلدان ذکر ہبل بحوالہ ہشام بن محمد کلبی۔ [2] یہ تمام تفصیل زرقانی جلد دوم صفحہ [illegible] میں ہے۔ [3] معجم البلدان ذکر مناۃ۔

ہوازن وثقیف

غزوۂ حنین واوطاس وطائف

شوال ۸ھ

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

حُنین حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل[1] ہے، یہ اس کے دامن میں ہے۔ اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں[2]۔ ہوازن ایک بڑے قبیلہ کا نام ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔

اسلام کی فتوحات کا دائرہ گو وسیع ہوتا جاتا تھا لیکن اہل عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا قبلۂ اعظم یعنی مکہ اب تک محفوظ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر قریش پر غالب آگئے اور مکہ فتح ہو گیا تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں۔ مکہ جب فتح ہوا تو تمام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کیا[3]، لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر پڑا۔ یہ قبیلے نہایت جنگ جو اور فنون جنگ سے واقف تھے۔ اسلام کو جس قدر غلبہ ہوتا جاتا تھا، یہ زیادہ مضطر ہوتے تھے[4] کہ ان کی ریاست اور امتیاز کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ اس بنا پر فتح مکہ کے بعد ہوازن اور ثقیف کے روسا نے یہ سمجھ لیا کہ اب ان کی باری ہے۔ اس لئے انھوں نے ایک دوسرے سے مل کر مشورہ کیا اور آپس میں قرارداد ہو گئی کہ مسلمانوں کے خلاف جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں، ایک عام حملہ کر دیا جائے۔

اس قرارداد کے مطابق یہ قبائل بڑے زور شور کے ساتھ خود حملہ کے لئے بڑھے، جوش کا یہ عالم تھا کہ ہر قبیلہ اپنا تمام اہل وعیال لے کر آیا تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔

---

[1] یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے، مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے (س) [2] قاضی عیاض کی یہی رائے ہے لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے۔ فتح الباری و زرقانی ذکر غزوہ ہوازن واوطاس (س)۔ [3] صحیح بخاری ذکر فتح مکہ بعد باب مقام النبی بمکہ۔ [4] مارگولیوس صاحب لکھتے ہیں۔ حکومت اسلامی کی وسعت اور استحکام سے بدوی قبائل جن کو ریگستان کی آزادی بہت عزیز تھی نہایت خائف تھے۔

اس معرکہ میں اگرچہ ثقیف اور ہوازن کی تمام شاخیں شریک تھیں تاہم کعب اور کلاب الگ رہے، (فوج کی سرداری کے لئے انتخاب (تو) مالک بن عوف[1] کا کیا گیا جو قبیلہ ہوازن کا رئیس اعظم تھا (لیکن مشیر کی حیثیت سے) درید بن الصمۃ (کو بھی ساتھ لے لیا گیا جو عرب کا مشہور شاعر اور قبیلہ جشم کا سردار تھا، اس کی شاعری اور بہادری کے معرکے اب تک عرب کی تاریخ میں یادگار ہیں لیکن اس کی عمر سو برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ تاہم چونکہ عرب اس کو مانتا تھا اور اس کی رائے و تدبیر پر تمام ملک کا اعتماد تھا۔ خود مالک بن عوف نے اس سے شرکت کی درخواست کی۔ پلنگ پر اٹھا کر اس کو میدان جنگ میں لاتے۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون سا مقام ہے؟ لوگوں نے کہا "اوطاس"۔ بولا کہ ہاں یہ مقام جنگ کے لئے موزوں ہے، اس کی زمین نہ بہت سخت ہے نہ اس قدر نرم کہ پاؤں دھنس جائیں۔ پھر پوچھا کہ یہ بچوں کے رونے کی آوازیں کیسی آرہی ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ بچے اور عورتیں ساتھ آئی ہیں کہ کوئی شخص پاؤں پیچھے نہ ہٹائے۔ بولا کہ جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ میدان جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے، بدقسمتی سے اگر شکست ہوئی تو عورتوں کی وجہ سے اور بھی ذلت ہوگی، پھر پوچھا کہ کعب اور کلاب بھی شریک ہیں یا نہیں؟ اور جب یہ معلوم ہوا کہ ان معزز قبیلوں کا ایک شخص بھی میدان جنگ میں نہیں تو کہا اگر آج کا دن عزت و شرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب غیر حاضر نہ ہوتے۔

اس کی رائے تھی کہ میدان سے ہٹ کر کسی محفوظ مقام میں فوجیں جمع کی جائیں اور وہیں اعلان جنگ کیا جائے لیکن مالک ابن عوف نے جو تیس سالہ نوجوان تھا جوشِ شباب میں اس رائے کے قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ آپ خرف ہو چکے، آپ کی عقل بے کار ہو چکی ہے[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (مکہ میں) ان واقعات کی خبر پہنچی تو آپ نے تصدیق کے لئے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد کو بھیجا، وہ جاسوس بن کر حنین میں آئے اور کئی دن تک فوج میں رہ کر تمام حالات تحقیق کئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجبوراً مقابلہ کی تیاریاں کیں، رسد اور سامان جنگ کے لئے قرض کی ضرورت پیش آئی۔ عبداللہ بن ربیعہ جو ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے، نہایت دولت مند تھے، ان سے تیس ہزار درہم قرض لئے[3] صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا، لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلحہ جنگ مستعار مانگے، اس نے سو زرہیں اور ان کے لوازمات پیش کئے[4]

شوال ۸ھ مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سر و سامان سے حنین پر بڑھیں کہ بعض صحابہ کی زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکل گیا کہ "آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے؟" لیکن بارگاہ

---

[1] مالکؓ بن عوف غزوۂ طائف کے بعد مسلمان ہو گئے تھے اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جنگ قادسیہ میں شریک اور دمشق کے حاکم ہوئے۔ زرقانی ج ۳ ص ۲۶۔ [2] یہ تمام تفصیل طبری میں ہے (ج ۳ ص ۱۶۵۵ تا ۱۶۵۷)۔ [3] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۶۔ [4] اصابہ میں امام بخاری سے بھی یہ روایت نقل کی ہے لیکن اس میں دس ہزار کی تعداد ہے۔ [5] موطا میں ہے کہ جب آپ نے اس سے ہتھیار مانگے تو اس نے کہا جبراً یا طوعاً (یعنی جبراً مانگتے ہو تو میں نہیں دیتا) آپ نے فرمایا جبراً نہیں طوعاً (ابوداؤد باب الضمانۃ میں بھی اسی قسم کی روایت ہے)

ایزدی میں یہ نازش ناپسندیدہ تھی۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ۔ (توبہ ۔ ۴)

اور حنین کا دن یاد کرو جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے لیکن وہ کچھ کام نہ آئی اور زمین باوجود وسعت کے تنگی کرنے لگی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسولؐ پر اور مسلمانوں پر تسلی نازل کی اور ایسی فوجیں بھیجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور کافروں کو عذاب دیا اور کافروں کی سزا یہی ہے۔

فتح کے بجائے وہلہ اول میں مطلع صاف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے بھی کوئی پہلو میں نہ تھا[1]۔ حضرت ابو قتادہؓ جو شریک جنگ تھے اُن کا بیان ہے کہ جب لوگ

---

[1] لیکن اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقتوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے، تفصیل آگے آئے گی (مصنف نے آئندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں ہو سکا ہے اس لئے تفصیل کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند باتیں قابلِ تشریح ہیں۔

(۱) پہلی یہ کہ مصنف نے اول وہلہ میں مسلمانوں کی شکست تسلیم کی ہے، یہ ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے لیکن حدیث صحیح کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کے تیر اندازوں نے موقع پا کر تیر اندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی، انتشار اور پراگندگی پیدا ہوگئی۔ بخاری میں حضرت براءؓ کے الفاظ یہ ہیں،

وانا لما حملنا عليهم انكشفوا فاكببنا على الغنائم فاستقبلنا بالسهام (بخاری غزوة حنين)

اور ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انہوں نے ہم کو تیروں پر دھر لیا۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض ہی سے شریک ہوتے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکہ دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیمؓ نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ان طلقاء کو قتل کر دیجئے انہی کی وجہ سے شکست ہوئی ہے الفاظ یہ ہیں،

اقتل من بعدنا من الطلقاء انهزموا بك۔

(غزوة النساء مع الرجال)

ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان ہی نے آپؐ کو شکست دلوائی۔

امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لم يحصل الفرار من جميعهم وانما فتحه عليهم من في قلبه مرض من مسلمة اهل مكة المؤلفة ومشركيها الذين لم يكونوا اسلموا وانما كانت هزيمتهم فجأة لانصبابهم عليهم دفعة واحدة

سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مکہ کے مولفۃ القلوب میں جو منافق تھے اور مکہ کے مشرکین جو اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، انہوں نے بھاگنا شروع کیا تھا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے

بھاگ نکلے تو میں نے ایک کافر کو دیکھا کہ ایک مسلمان کے سینہ پر سوار ہے۔ میں نے عقب سے اس کے شانہ پر تلوار ماری جو زرہ کو کاٹ کر اندر اتر گئی۔ اس نے مڑ کر مجھ کو اس زور سے دبوچا کہ میری جان پر بن گئی، لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ورشقهم بالسهام وان خلفه اهل مكة معهم ممن لم يستقر الايمان في قلبه وممن يتربص بالمسلمين الدوائر وفيهم نساء وصبيان خرجوا للغنيمة (غزوہ حنین)	ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر تھے اس میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو غنیمت کے لئے آئے تھے۔

مورخ طبری نے اس موقع پر مکہ کے ان طلقاء کی زبان سے جو فقرے نقل کئے ہیں وہ بھی اسی راز کی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ اہل مکہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے (ج ۳ ص ۱۰۶ لائیڈن) متقدم مفسروں میں سے ابن جریر طبری نے لکھا ہے ان الطلقاء انجفلوا يومئذ بالناس وجلوا عن النبي صلى الله عليه وسلم (ابن جریر طبری ج [illegible]) عہد متوسط کے مفسروں میں سے ابوحیان اندلسی کے الفاظ یہ ہیں۔

يقال ان الطلقاء من اهل مكة فروا وقصدوا القاء الهزيمة في المسلمين (بحر المحیط ج ۵ ص ۲۴)	کہا جاتا ہے کہ مکہ کے طلقاء بھاگے تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے۔

متاخر مفسروں میں سے صاحب روح المعانی نے تفسیر سورۂ توبہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔

وكان اول من انهزم الطلقاء مكرا منهم وكان ذلك سببا لوقوع الخلل وهزيمة غيرهم (ج ۱۰ ص ۶۶)	سب سے پہلے طلقاء مکہ فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے اس سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہوئی۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی۔

اس سلسلہ میں بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انسؓ والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

فادبروا عنه حتى بقي وحده۔	لوگ پیچھے ہٹ گئے یہاں تک کہ آپ تنہا رہ گئے۔

مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے وہاں کوئی نہ تھا، اسی لئے اسی روایت میں حضرت انسؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے لبیک یا رسول اللہ ابشر نحن معک (ہم حاضر ہیں یا رسول اللہؐ آپ خوش ہوں کہ ہم آپ کے پاس ہیں) اسی باب میں حضرت انسؓ کی ایک روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے الفاظ یہ ہیں۔

لبيك يا رسول الله وسعديك نحن بين يديك	ہم حاضر ہیں یا رسول اللہؐ ہم آپ کے سامنے ہیں۔

(بخاری غزوۂ طائف)

حافظ ابن حجر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی اور رفقائے خاص کے پاس رہنے کی تطبیق ان الفاظ میں کی ہے۔

ويجمع بين قوله حتى بقي وحده وبين الاخبار الدالة على انه بقي معه جماعة بان مراده بقي وحده متقدما على العدو والذين ثبتوا	اور اس قول میں کہ حضورؐ تنہا رہ گئے اور ان واقعات میں جو اس پر دال ہیں کہ حضورؐ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی تطبیق یہ ہے کہ حضورؐ دشمن کے سامنے سب سے آگے مقام پر تھے جو آپ کے

پھر وہ ٹھنڈا ہو کر گر پڑا، اسی اثنا میں، میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا، پوچھا کہ مسلمانوں کا کیا حال ہے؟ بولے کہ قضائے الٰہی یہی تھی۔[1]

شکست کے مختلف اسباب تھے، مقدمۃ الجیش میں جو حضرت خالدؓ کی افسری میں تھا زیادہ تر فتح مکہ کے جدید الاسلام نوجوان تھے، وہ جوانی کے غرور میں اسلحۂ جنگ پہن کر بھی نہیں آئے تھے، فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معه کانوا وراءه (ج ۸ ص ۲۳ مصر) ساتھ ثابت قدم تھے وہ آپ کے پیچھے تھے۔

دوسرے یہ کہ بخاری ہی میں حضرت براءؓ کی جو روایت ہے اس میں حضرت براءؓ تصریح کرتے ہیں کہ ابوسفیان بن حارث اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے اور آپ کی سواری کی لگام تھامے تھے (غزوۂ حنین بخاری)

مسلم میں حضرت عباسؓ کے پر زور الفاظ یہ ہیں کہ میں نے اور ابوسفیان بن حارث نے حضورؐ سے علیحدگی اختیار نہیں کی۔

فلزمت انا وابوسفیان بن الحارث بن عبد المطلب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فلم نفارقہ (مسلم غزوہ حنین)

صحیحین کی ان روایات کے سوا روایاتِ ذیل بھی پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

(۱) ابن ابی شیبہ کی ایک مرسل روایت میں جو حکم بن عتیبہ سے مروی ہے، چار آدمیوں کا حضورؐ کی خدمت میں باقی رہنا بتایا گیا ہے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

(۲) ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سو آدمی بھی نہیں باقی رہ گئے تھے (ترمذی ابواب الجہاد باب ما جاء فی الثبات عند القتال)

(۳) مسند احمد (ج اول ص ۴۵۳) و حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اسی آدمی باقی رہ گئے تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۱)

(۴) بیہقی نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے (زرقانی ج ۳ ص ۲۲) ابونعیم نے دلائل میں سو کی تفصیل بتائی ہے کہ تیس سے کچھ زائد مہاجرین تھے، بقیہ انصار تھے (فتح الباری ج ۸ ص ۲۳)

(۵) ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت مہاجرین، انصار اور اہل بیت میں سے حسب ذیل اصحاب موجود تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب، حضرت ابوسفیانؓ بن حارث، حضرت جعفر بن ابی سفیان بن حارث، حضرت فضلؓ بن عباس، حضرت ربیعہؓ، حضرت ایمن بن زید، حضرت ایمنؓ بن ام ایمن۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انسؓ کے الفاظ بقی وحدہ اپنے ظاہری معنی پر باقی نہیں رہ سکتے، حافظ ابن حجر نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ آگے تھے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے، لیکن اس کی صاف توجیہ یہ ہے کہ ان الفاظ سے ثابت قدم رہنے والوں کی کمی کا ظاہر کرنا مقصود ہے ورنہ حقیقت یہ نہ تھی۔ دوسری روایت میں ثابت قدم رہنے والوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی مختلف توجیہیں کی گئی ہیں (ملاحظہ ہو زرقانی ج ۳ ص ۲۳) لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت سرورِ کونینؐ کے آس پاس تھے اور تھوڑی تھوڑی تعداد میں حضورؐ کے پاس پہنچنے لگے یہاں تک کہ تمامی جماعت حضورؐ کے گرد جمع ہو گئی، اسی وجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتلائی ہے۔ ن۔

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین (ج ۲ ص ۶۱۸) ۱۲ ش۔ [2] بخاری باب الجہاد و باب من صف اصحابہ عند الہزیمۃ و نزل عن دابتہ ۱۲ ش۔

لوگ تھے جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔ ہوازن قدر اندازی میں تمام عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے میدانِ جنگ میں ان کا ایک تیر بھی خالی نہیں جاتا تھا۔ کفار نے معرکہ گاہ میں پہلے پہنچ کر مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیر اندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں، کھوؤں اور دروں میں جا بجا جما دیئے تھے۔ فوج اسلام نے صبح کے وقت جب خوب اُجالا بھی نہیں ہوا تھا حملہ کیا، میدانِ جنگ اس قدر نشیب میں تھا کہ پاؤں تھم نہیں سکتے تھے۔ حملہ آوروں کا بڑھنا تھا کہ سامنے سے ہزاروں فوجیں ٹوٹ پڑیں۔ اُدھر کمین گاہوں سے قدر اندازوں کے دستے نکل آئے اور تیروں کا مینہ برسا دیا۔ مقدمۃ الجیش ابتری کے ساتھ بے قابو ہو کر پیچھے ہٹا اور پھر تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ صحیح بخاری میں ہے فادبروا عنہ حتی بقی وحدہ، یعنی سب لوگ ٹل گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے۔

تیروں کا مینہ برس رہا تھا۔ بارہ ہزار فوجیں ہوا ہو گئی تھیں، لیکن ایک پیکرِ مقدس پا بر جا تھا جو تنہا ایک فوج ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم بلکہ مجموعۂ کائنات تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یا معشر الانصار! آواز کے ساتھ صدا آئی "ہم حاضر ہیں"۔ پھر آپ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا۔ اب بھی وہی آواز آئی۔ آپ سواری سے اُتر پڑے اور جلالِ نبوت کے لہجہ میں فرمایا "میں خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں"۔

بخاری کی دوسری روایت میں ہے۔

انا النبی لا کذب۔	میں پیغمبر ہوں، یہ جھوٹ نہیں ہے۔
انا ابن عبد المطلب	میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔

حضرت عباسؓ نہایت بلند آواز تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ انھوں نے نعرہ مارا۔

یا معشر الانصار۔	او گروہِ انصار!
یا اصحاب الشجرۃ۔	او اصحاب الشجرۃ (بیعت رضوان والے)

اس پُر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعۃً پلٹ پڑی جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے انھوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے، دفعۃً لڑائی کا رنگ بدل گیا، کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ بنو مالک (ثقیف کی ایک شاخ تھی) جم کر لڑے لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے۔ اور جب ان کا علم بردار عثمان بن عبد اللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ، طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی جس کے ساتھ سپہ سالارِ لشکر

لـه مصنف کا یہ فقرہ واضح نہیں ہے، مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ عمدۃ القاری جلد ہشتم صفحہ ۱۵۵ مصر اور شرح مسلم نووی غزوۃ الفتح مع الرجال میں ہے لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے اس لئے مہاجرین و انصار جیسا استقلال و ثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ (ش) ؎ بخاری باب الجہاد (باب مذکور نہیں) ؎ صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۶۲۱ (غزوہ طائف)

(مالک بن عوف) بھی تھا۔

اوطاس

درید بن الصمہ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عامرؓ اشعری کے ماتحت، تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کے لئے بھیج دی (حضرت ابو عامرؓ درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علم اسلام اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا) درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا۔ ربیعہؓ بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی۔ اس نے کہا "تیری ماں نے تجھ کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے" پھر کہا کہ "میرے محمل میں تلوار ہے نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس واپس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا" ربیعہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی تو اس نے کہا، خدا کی قسم! درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا[1] تھا۔

اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی، ان میں حضرت شیماؓ بھی تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن تھیں، لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انھوں نے کہا "میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں" لوگ تصدیق کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے، انھوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی کہ ایک دفعہ بچپن میں آپؐ نے دانت سے کاٹا تھا یہ اس کا نشان ہے۔ فرطِ محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کے لئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت کی باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے[2]۔ انھوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا، چنانچہ عزت و احترام کے ساتھ پہنچا دی گئیں۔

محاصرۂ طائف

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزین ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ طائف نہایت مضبوط مقام تھا۔ طائف اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی۔ یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا، ابو سفیان (حضرت امیر معاویہؓ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی۔ کفارِ مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا۔ یہاں کے لوگ فنِ جنگ سے بھی واقف تھے۔ طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جُرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ، ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا[3] تھا۔

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہل شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیقیں اور جا بجا قدر انداز متعین کئے[4]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے مال غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا۔ حضرت خالدؓ مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے، غرض محاصرہ

---

[1] (مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۹۹) [2] طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۶ مطبوعہ یورپ [3] طبقات ابن سعد و اصابہ و طبری (ج ۳ ص ۱۶۶۵)

[4] طبری (ج ۳) ص ۱۶۶۹ مطبوعہ یورپ) [5] تاریخ خمیس جلد دوم صفحہ ۱۲۲ و ابن سعد۔

ہوا اور اسلام میں یہ موقع پہلا تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے، دبابہ پر اہل قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نوفل ابن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے اگر کوشش جاری رہے تو پکڑ لی جائے گی لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں، چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ صحابہ نے عرض کی کہ آپ ان کو بد دعا دیں، آپ نے یہ دعا دی[1]۔

اللّٰھم اھد ثقیفا و ائت لھم۔	اے خدا ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔

تقسیم غنائم

محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے، غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیران جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اسیران جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے۔ لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا مال غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے، چار حصے حسب قاعدہ اس فوج کو تقسیم کئے گئے، خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنھوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے[2]، انہی کو قرآن مجید میں مؤلفۃ القلوب کہا ہے، قرآن مجید میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے ہیں، ان لوگوں کا نام بھی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

ابوسفیان مع اولاد۔	۳۰۰ اونٹ اور ۱۲۰ اوقیہ چاندی۔
حکیم بن حزام۔	۲۰۰ اونٹ۔
نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی۔	۱۰۰ اونٹ۔
صفوان بن امیہ۔	۱۰۰ اونٹ۔
قیس بن عدی۔	۱۰۰ اونٹ۔
سہیل بن عمرو۔	۱۰۰ اونٹ۔
حویطب بن عبد العزیٰ۔	۱۰۰ اونٹ۔

(ان کے علاوہ تین غیر مکی نو مسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ۔
عیینہ بن حصن (فزاری)	۱۰۰ اونٹ۔
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ۔

---

[1] ابن سعد، جزء مغازی ص ۱۱۵، ق۔ [2] طبقات ابن سعد، جزء مغازی ص ۱۱۰، ق۔

ان کے سوا مہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا وہ فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں، لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں[1]

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی عموماً اہل مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے، اس پر انصار کو رنج ہوا، بعضوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں[2]، بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے[3]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چرچے سُنے انصار کو طلب فرمایا۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے، آپؐ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ حضور: ہمارے سر برآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔ صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انھوں نے کہا، آپؐ نے جو سُنا صحیح ہے[4]۔

آپؐ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فنِ بلاغت میں نہیں مل سکتی، انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا۔

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو دولت مند کیا"۔

آپؐ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔

آپؐ نے فرمایا "نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی"[5]

یہ کہہ کر آپؐ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو، لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو لے کر اپنے گھر آؤ"[6]

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ ہم کو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں، اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہوگئیں، آپؐ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں، میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں دیا بلکہ تالیفِ قلب کے لئے دیا۔

حنین کے اسیرانِ جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے، ایک معزز سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] طبقات ابن سعد جزء، مغازی ص۱۱۰ اور زرقانی علی المواہب ج ۳ ص ۳۷۔ [2] صحیح بخاری غزوۂ طائف [3] صحیح بخاری مطبوعہ مطبع نظامی ص۶۲۱ [4] صحیح بخاری ص۶۲۱ باب غزوۂ طائف۔ [5] صحیح بخاری ص۶۲۱ باب غزوۂ طائف و فتح الباری ج ۸ ص ۴۱ تا ۴۲
[6] صحیح بخاری و فتح الباری، پوری تفصیل فتح الباری میں ہے۔

خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیران جنگ رہا کر دیئے جائیں، یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمؓ اسی قبیلہ کی تھیں، رئیسِ قبیلہ (زُہیر بن صُرد) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر کہا جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں انہی میں تیری پھوپھیاں اور تیری خالائیں ہیں، خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور تجھ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خاندانِ عبد المطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے۔ لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔ نماز ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی۔ آپؐ نے فرمایا، مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے۔ لیکن میں تمام مسلمانوں سے اُن کے لئے سفارش کرتا ہوں۔ مہاجرین اور انصار بول اٹھے۔ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعۃً آزاد ہوگئے[1]۔

واقعات متفرقہ حضرت ماریہؓ کے بطن سے اسی سال ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بچہ سے نہایت محبت تھی ڈیڑھ سال (۱۷ یا ۱۸ مہینے) زندہ رہا۔ جس دن ابراہیم نے وفات پائی، سورج گرہن ہوا۔ عرب کا عقیدہ تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم الشان انسان کی موت کی علامت ہے۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ ابراہیم کی موت کا نتیجہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "سورج اور چاند خدا کی قدرت ہیں، کسی کے مرنے اور جینے سے اُن میں گرہن نہیں لگتا۔" اس کے بعد آپؐ نے کسوف کی نماز باجماعت ادا فرمائی[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

*

---

[1] طبری جلد ۳ صفحہ ۱۶۷۲ [2] بخاری باب کسوف۔

۹ھ

واقعہ ایلاء و تخییر و غزوہ تبوک

ایلاء اور تخییر ۹ھ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زاہدانہ اور تمام زخارفِ دنیوی سے بیگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، آئے دن فاقے ہوتے رہتے تھے، مدت العمر دو وقت برابر سیر ہو کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ ازواج مطہراتؓ اس جنسِ لطیف میں شامل تھیں جن کی مرغوب ترین چیز عموماً زیب و زینت اور ناز و نعمت ہے، اور گو شرفِ صحبت نے ان کو تمام ابنائے جنس سے ممتاز کر دیا تھا تاہم بشریت بالکل معدوم نہیں ہو سکتی تھی، خصوصاً وہ دیکھتی تھیں کہ فتوحاتِ اسلام کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور غنیمت کا سرمایہ اس قدر پہنچ گیا ہے کہ اس کا ادنیٰ حصہ بھی ان کی راحت و آرام کے لئے کافی ہو سکتا ہے، ان واقعات کا اقتضاء تھا کہ ان کے صبر و قناعت کا جام لبریز ہو جاتا تھا۔

ازواجِ مطہراتؓ بڑے بڑے گھرانوں کی خاتونیں تھیں، حضرت ام حبیبہؓ تھیں جو رئیسِ قریش کی صاحبزادی تھیں، حضرت جویریہؓ تھیں جو قبیلۂ بنی المصطلق کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ تھیں جن کا باپ خیبر کا رئیس اعظم تھا، حضرت عائشہؓ تھیں جو حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت حفصہؓ تھیں جن کے والد فاروقِ اعظمؓ تھے۔ بشریت کے اقتضاء سے ان میں منافست بھی تھی اور حریف کے مقابلہ میں اپنے رتبہ اور شان کا خیال رہتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر ایک کو جو شدید محبت تھی وہ باسایہ تراٗنی پسندم کی حد تک تھی۔

ایک دفعہ کئی دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے زیادہ بیٹھے جس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آ گیا تھا انہوں نے آپؐ کے سامنے پیش کیا۔ آپؐ کو شہد بہت مرغوب تھا، آپؐ نے نوش فرمایا۔ اس میں وقت مقررہ سے دیر ہو گئی، حضرت عائشہؓ کو رشک ہوا، حضرت حفصہؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہمارے یا تمہارے گھر میں آئیں تو کہنا چاہیئے کہ آپؐ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے (مغافیر کے پھولوں سے شہد کی مکھیاں رس چوستی ہیں) آنحضرت صلی اللہ

---

[1] بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ ذوالحجہ ۵ھ کا واقعہ ہے، اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ بعض روایتوں میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ نزول حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے لیکن آگے چل کر حضرت عمرؓ کی روایت میں مذکور ہے کہ جب اس حادثہ کی مبہم خبر سے مسلمانوں میں اضطراب دیکھا تو سمجھے کہ غسان کا بادشاہ حملہ آور ہوا جس کی اطلاع پہلے ہو چکی تھی۔ غسان کا حادثہ ۹ھ میں ہونے والا تھا۔ حافظ ابن حجر اور شیخ دمیاطی نے یہ دلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اوائل ۹ھ کا واقعہ ہے (دیکھو فتح الباری ج ۹ صفحہ ۲۰۵)

علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ میں شہد نہ کھاؤں گا۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔

يَآ أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ (تحریم-۱)

اے پیغمبر اپنی بیویوں کی خوشی کے لئے تم خدا کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام کیوں کرتے ہو۔

علامہ عینی نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے۔

فان قلت کیف جاز لعائشۃ وحفصۃ الکذب والمواطاۃ التی فیہا ایذاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلت کانت عائشۃ صغیرۃ مع انہا وقعت منہا من غیر قصد الایذاء بل علی ماھو من جبلۃ النساء فی الغیرۃ علی الضرائر (تفسیر سورۃ تحریم)

اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو جھوٹ بولنا او آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازش کرنا کیونکر جائز تھا تو جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کم سن تھیں ان کے علاوہ ان کا مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عورتیں اپنی سوکنوں کے مقابلہ میں رشک سے تدبیریں اختیار کرتی ہیں اس طرح کی ایک تدبیر تھی۔

لیکن علامہ موصوف کا جواب تسلیم کرنا مشکل ہے، اول تو یہ واقعہ ایلاء کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ سترہ برس کی ہو چکی تھیں۔ دوسرے حضرت عائشہؓ کم سن تھیں لیکن ازواج مطہراتؓ جو اس میں شریک ہوئیں وہ تو پوری عمر کی تھیں، خود حضرت حفصہؓ کی عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت ۳۵ برس کی تھی۔

ہمارے نزدیک مغافیر کی بو کا اظہار کرنا کوئی جھوٹ بات نہ تھی، تمام روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لطیف المزاج تھے اور رائحہ کی ذرا سی ناگواری کو برداشت نہیں فرما سکتے تھے، مغافیر کے پھولوں میں اگر کسی قسم کی کرختگی ہو تو تعجب کی بات نہیں، البتہ ازواج مطہراتؓ کا ایکا کرنا بظاہر محل اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن یہ کسی کا اعتقاد نہیں کہ ازواج مطہراتؓ معصوم تھیں یا اپنے انجاح مقصد کے لئے جائز وسائل نہیں اختیار کرتی تھیں اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی راز کی بات حضرت حفصہؓ سے فرمائی اور تاکید کر دی کہ کسی سے نہ کہنا، لیکن انھوں نے حضرت عائشہؓ سے کہہ دیا، اس پر یہ آیت اتری۔

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ۔ (تحریم-۱)

اور جب کہ پیغمبرؐ نے اپنی بعض بیویوں سے راز کی بات کہی اور انھوں نے فاش کر دی اور خدا نے پیغمبر کو اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے اس کا کچھ حصہ ان سے کہا اور کچھ چھوڑ دیا پھر جب ان سے کہا کہ آپ کو کس نے خبر دی، پیغمبر نے کہا مجھ کو خدائے عالم خبیر نے خبر دی۔

شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ نے باہم مظاہرہ کیا یعنی دونوں نے اس پر اتفاق کیا کہ دونوں مل کر زور ڈالیں، اس پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی شان میں یہ آیتیں اتریں۔

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم، اس واقعہ کو بخاری کتاب الطلاق میں زیادہ تفصیل سے لکھا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ اس تدبیر میں اور ازواج مطہراتؓ بھی شریک کر لی گئیں اور جس نے اول اس کا اظہار کیا وہ حضرت سودہؓ تھیں [illegible] مسند احمد ج ۶ ص ۲۲۱ و [illegible] عمدۃ القاری ج ۹ ص ۲۲ [illegible]

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ
تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَ
صَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ
ظَهِيرٌ۔ (سورہ تحریم-۱)

اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو تمہارے دل مائل
ہو چکے ہیں اور اگر ان کے (یعنی رسول اللہؐ) کے مقابلہ میں
ایکا کرو تو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان اور سب کے بعد
فرشتے رسول اللہ کے مددگار ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے جن معاملات کی وجہ سے ایکا کیا تھا وہ خاص تھے لیکن توسیعِ نفقہ کے تقاضے میں تمام ازواجِ مطہراتؓ شریک تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز ہوئی کہ آپؐ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہراتؓ سے نہ ملیں گے۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانے میں آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا، آپؐ نے بالاخانہ[1] پر تنہا نشینی اختیار کی۔ واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپؐ نے تمام ازواج کو طلاق دی۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کو ہم حضرت عمرؓ کی زبان سے[2] نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے دلچسپ اور پُراثر تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس بیان میں کچھ ابتدائی واقعات بھی آگئے ہیں جن سے اصل معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں اور ایک انصاری (اوس بن خولی یا عتبان بن مالک) ہمسایہ تھے اور معمول تھا کہ باری باری سے ایک دن بیچ دے کر ہم دونوں خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

قریش کے لوگ عورتوں پر قابو رکھتے تھے اور ان پر غالب رہتے تھے لیکن جب مدینہ میں آئے تو یہاں انصار کی عورتیں مردوں پر غالب تھیں، ان کا انداز دیکھ کر ہماری عورتوں نے بھی ان کی تقلید شروع کی۔ ایک دن میں نے اپنی بیوی کو کسی بات پر ڈانٹا، انھوں نے الٹ کر جواب دیا۔ میں نے کہا، تم میری بات کا جواب دیتی ہو۔ بولیں تم کیا ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ان کو برابر کا جواب دیتی ہیں یہاں تک کہ دن بھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روٹھی رہتی ہیں۔ میں نے دل میں کہا غضب ہو گیا، اٹھ کر حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ) کے پاس آیا اور پوچھا کہ کیا تو واقعی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رات بھر روٹھی رہتی ہے۔ حفصہ نے اقرار کیا، میں نے کہا تجھ کو یہ خیال نہیں کہ رسولؐ کی ناراضی خدا کی ناراضی ہے۔ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرا خیال فرماتے ہیں ورنہ تجھ کو طلاق دے چکے ہوتے۔ پھر حضرت ام سلمہؓ کے پاس گیا اور ان سے بھی یہی شکایت کی۔ بولیں کہ عمر!

---

[1] بالاخانہ کے لئے احادیث میں مشربہ کا لفظ آیا ہے، مشربہ کے نام سے زیادہ تر مشربۂ ام ابراہیم (ماریہ) مشہور ہے، اسی لئے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ وہی بالاخانہ تھا لیکن یہ قطعاً غلط ہے، مشربۂ ام ابراہیم مدینہ سے باہر واقع تھا، حضرت عمرؓ کی جو روایت تمام صحاح میں موجود ہے اور جس کو مصنف نے آگے نقل کیا ہے اس سے بھی مستفاد ہوتا ہے کہ یہ وہ مقام تھا حضرت حفصہؓ کے گھر اور مسجد نبوی سے بالکل متصل تھا کہ حضرت عمرؓ دوڑ دوڑ کر کبھی ادھر کبھی ادھر جاتے تھے۔ ابوداؤد میں تصریح ہے کہ یہ مشربہ حضرت عائشہؓ کے حجرہ کا بالاخانہ تھا جو مسجد نبوی ہی سے متصل دیگر ازواجِ مطہراتؓ کے حجروں کے برابر تھا (ابوداؤد باب الامام یصلی من قعود)۔

[2] یہ واقعہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب یعنی کتاب النکاح، طلاق، کتاب العلم میں باختلافِ عبارت منقول ہے، صحیح مسلم باب النکاح میں بھی کئی طریقوں سے مذکور ہے۔ ان روایتوں میں باہم جزئیات میں اختلاف ہے، ہم نے تا امکان سب روایتوں کو جمع کیا ہے۔

تم ہر معاملہ میں دخل دینے لگے یہاں تک کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ازواج کے معاملات میں بھی دخل دیتے ہو، میں چپ رہ گیا اور اٹھ کر چلا آیا۔

کچھ رات گئی میرے ہمسایہ انصاری باہر سے آئے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹ کھٹایا، میں گھبرا کر اٹھا اور دروازہ کھول کر پوچھا خیر ہے؟ انھوں نے کہا غضب ہو گیا، میں نے کہا کیا غسانی[1] مدینہ پر چڑھ آئے۔ بولے کہ نہیں اس سے بھی بڑھ کر یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کو طلاق دے دی، میں صبح کو مدینہ آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز فجر ادا کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر بالاخانہ میں تنہا جا کر بیٹھ گئے۔ میں حفصہ کے پاس آیا تو دیکھا وہ بیٹھی رو رہی ہے۔ میں نے کہا تجھ سے پہلے ہی کہا تھا۔ حفصہ کے پاس سے اٹھ کر مسجد نبوی میں آیا دیکھا تو صحابہ منبر کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، میں ان کے پاس بیٹھ گیا لیکن طبیعت کو سکون نہیں ہوتا تھا، اٹھ کر بالاخانہ کے پاس آیا اور رباح (خادم خاص) سے کہا اطلاع کرو، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا، میں اٹھ کر پھر مسجد میں آیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بے تاب ہو کر بالاخانہ کے نیچے آیا اور دربان سے دوبارہ اذن طلبی کی درخواست کی، جب کچھ جواب نہیں ملا تو میں نے پکار کر کہا رباح! میرے لئے اذن مانگ۔ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال ہے کہ میں حفصہ کی سفارش کرنے آیا ہوں، خدا کی قسم! رسول اللہ فرمائیں تو حفصہ کی گردن اڑا دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی، اندر گیا تو دیکھا کہ آپ کھری چارپائی[2] پر لیٹے ہیں اور جسم مبارک پر بانوں کے نشان پڑ گئے ہیں ادھر ادھر نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہوئے تھے ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کھونٹی پر لٹک رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبب پوچھا، میں نے عرض کی اس سے بڑھ کر رونے کا اور کیا موقع ہوگا؟ قیصر و کسریٰ باغ و بہار کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ پیغمبر ہو کر آپ کی یہ حالت ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہیں کہ قیصر و کسریٰ دنیا لیں اور ہم آخرت۔

میں نے عرض کی، کیا آپ نے ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ نے فرمایا "نہیں" میں اللہ اکبر پکار اٹھا پھر عرض کی کہ مسجد میں تمام صحابہ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو جا کر خبر کر دوں کہ واقعہ غلط ہے، چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ آپ بالاخانہ سے اتر آئے اور عام باریابی کی اجازت ہو گئی۔ اس کے بعد آیت تخییر

---

[1] غسانی عرب کا ایک خاندان تھا جو شام میں رومیوں کے ماتحت کام کرتا تھا، وہ رومیوں کی تحریک سے مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

[2] بعض روایتوں میں حصیر (چٹائی) کا لفظ آیا ہے اور بعض میں سریر (چارپائی) ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ وہ تھی چارپائی لیکن چٹائی جس سے بُنی جاتی ہے اس سے بنی ہوئی تھی (فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۲۵۰)۔

[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق ۲۹ روز بالاخانہ پر تشریف فرما رہے، حضرت عمرؓ کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر روز کا، اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے۔ مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۹ دن تک گویا حضرت عمرؓ اور صحابہؓ کو واقعہ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا، اسی بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن صرف آخر کے [illegible] بیان آخر روز کا واقعہ [illegible] راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا بخاری کی اس روایت سے۔

نازل ہوئی۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا۔ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (احزاب۔۴)	اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہ دے کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور دنیا کا زیب و آرائش مطلوب ہے تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر بہ طریق احسن رخصت کر دوں اور اگر خدا، خدا کا رسول اور آخرت مطلوب ہے تو خدا نے تم میں سے نیکوکاروں کے لئے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔

اس آیت کی رو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ ازواج مطہرات کو مطلع فرما دیں کہ دو چیزیں تمہارے سامنے ہیں۔ دنیا اور آخرت۔ اگر تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو رخصتی جوڑے دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم خدا اور رسول اور زندگانی ابدی کی طلب گار ہو تو خدا نے نیکوکاروں کے لئے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ مہینہ ختم ہو چکا تھا، آپ بالاخانہ سے اترے اور چونکہ ان تمام معاملات میں حضرت عائشہؓ پیش پیش تھیں۔ ان کے پاس تشریف لے گئے اور مطلع فرمایا۔ انہوں نے کہا میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں تمام اور ازواج مطہراتؓ نے بھی یہی جواب دیا۔

ایلاء، تخییر، مظاہرہ حفصہ و عائشہ، یہ واقعات عام طور پر اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ گویا مختلف زمانوں کے واقعات ہیں اور ان سے ایک ظاہر بین یہ دھوکہ کھا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہراتؓ کے ساتھ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ بسر کرتے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تینوں واقعے ہم زمان اور ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ صحیح بخاری کتاب النکاح (باب موعظۃ الرجل ابنتہ) میں حضرت ابن عباسؓ کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرۂ ازواج مطہراتؓ سے انعزال افشائے راز، آیتِ تخییر کا نزول سبب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں۔

حافظ ابن حجر انعزال کے متعدد اسباب لکھ کر لکھتے ہیں۔

وهذا هو اللائق بمكارم اخلاقه صلى الله عليه وسلم وسعة صدره وكثرة صفحه وان ذلك لم يقع منه حتى تكرر موجبه منهن۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۵)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کشادہ دلی اور کثرت عفو کے یہی مناسب ہے اور آپ نے اس وقت تک ایسا نہیں کیا ہوگا جب تک ان سے اس قسم کی حرکتیں متعدد بار ظہور پذیر نہ ہوئیں۔

مظاہرہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی اس سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی ضرر رساں سازش تھی جس کا اثر بہت پُر خطر تھا آیت مذکورہ یہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کتاب النکاح باب موعظۃ للرجل ابنتہ لحال زوجہا اور کتاب اللباس باب ما کان یتجوز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اللباس میں مذکور ہے، یہ صاف تصریح موجود ہے اس بنا پر وہ فقرہ کو یوں پڑھنا چاہیئے ”جب ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا“

وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَ جِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (تحریم-۱)

اور اگر تم دونوں (حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ) رسولؐ کے برخلاف ایکا کرو تو خدا اس کا مولا ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور ان سب کے ساتھ فرشتے بھی مددگار ہیں۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ اگر ان دونوں کا ایکا قائم رہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کو خدا اور جبریل اور نیک مسلمان موجود ہیں اور اسی پر بس نہیں بلکہ فرشتے بھی اعانت کے لئے تیار ہیں۔

روایتوں سے مظاہرہ کا جو سبب معلوم ہوتا ہے وہ صرف یہی کہ اس کے ذریعہ سے وہ نفقہ کی توسیع چاہتی تھیں اور اگر ماریہ قبطیہ کی روایت تسلیم کر لی جائے تو صرف یہ کہ وہ الگ کر دی جائیں، لیکن یہ ایسی کیا اہم باتیں ہیں اور حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ کی کسی قسم کی سازش ایسی کیا پُرخطر ہو سکتی ہے جس کی مدافعت کے لئے ملاء اعلیٰ کی اعانت کی ضرورت ہو، اس بنا پر بعضوں نے قیاس کیا ہے کہ یہ مظاہرہ کوئی معمولی معاملہ نہ تھا، مدینہ منورہ میں منافقین کا ایک گروہ کثیر موجود تھا جن کی تعداد ۳۰۰ تک بیان کی گئی ہے۔ یہ شریر النفس ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی تدبیر سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان اور رفقائے خاص میں پھوٹ ڈلوا دیں (ابن حجر نے اصابہ میں اُمّ جلدح کے حال میں لکھا ہے وکانت تحرش بین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم (وہ ازواجِ مطہرات کو باہم بھڑکایا کرتی تھیں) افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آ چکی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پندرہ دن تک حضرت عائشہؓ سے کبیدہ خاطر رہے، حضرت حسانؓ افک میں شریک ہو گئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی حمنہ جو حضرت زینبؓ کی بہن تھیں سازش میں آگئی تھیں چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں، حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریک تہمت تھے، مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا، غرض اگر حضرت عائشہؓ کی برأت پر وحی نہ آ جاتی تو ایک فتنہ عظیم برپا ہو چکا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ جب ازواجِ مطہراتؓ کی کشش خاطر اور کبیدگی اور تنگ طلبی کا حال منافقوں کو معلوم ہوا تو ان بدنفسوں نے اشتعال دے کر بھڑکانا چاہا ہو گا، چونکہ مظاہرہ کے ارکانِ اعظم حضرت عائشہؓ و حضرت حفصہؓ تھیں، ان کو خیال ہوا ہو گا کہ اُن کے ذریعہ سے اُن کے والدین (حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ) کو اس سازش میں شریک کر لینا ممکن ہے، لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کو رسولؐ کی خاک پر قربان کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ کو اذن نہ ملا تو انھوں نے پکار کر کہا کہ ارشاد ہو تو حفصہ کا سر لے کر آؤں، آیت میں روئے سخن منافقین کی طرف ہے۔ یعنی اگر عائشہؓ و حفصہؓ سازش بھی کریں گی اور منافقین اس سے کام لیں گے تو خدا پیغمبرؐ کی اعانت کے لئے موجود ہے اور خدا کے ساتھ جبریلؑ و ملائکہ بلکہ تمام عالم ہے۔

روایاتِ کاذبہ

ان واقعات میں کذابین رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مورخین و اربابِ سیر نے یہ روائتیں اپنی تصانیف میں استناداً درج کر دیں، اس لئے ہم اس بحث کو کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔

اس قدر عموماً مسلّم ہے اور خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہراتؓ کی خاص

سے کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرلی تھیں، اختلاف اس میں ہے کہ وہ کیا چیز تھی؟ بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ ماریہ قبطیہ ایک کنیز تھیں جن کو عزیز مصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحفۃً بھیجا تھا۔ ماریہ قبطیہ کی روایت تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے جن میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راز جو حضرت حفصہؓ نے فاش کر دیا تھا انہی ماریہ قبطیہ کا راز تھا۔ اگرچہ یہ روایتیں بالکل موضوع اور ناقابل ذکر ہیں لیکن چونکہ یورپ کے اکثر مورخوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار اخلاق پر جو حرف گیریاں کی ہیں ان کا کل سرسبد یہی ہیں اس لئے ان سے تعرض کرنا ضروری ہے۔ ان روایتوں میں واقعہ کی تفصیل کے متعلق اگرچہ نہایت اختلاف ہے لیکن اس قدر سب کا قدر مشترک ہے کہ ماریہ قبطیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موطوءہ کنیزوں میں تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کی ناراضی کی وجہ سے ان کو اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔

حافظ ابن حجر شرح صحیح بخاری تفسیر سورۂ تحریم میں لکھتے ہیں۔

ووقع عند سعید بن منصور باسناد صحیح الی مسروق قال حلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لحفصۃ لا یقرب امتہ۔ (فتح ص ۵۰۲ ج ۸)	اور سعید بن منصور نے سند صحیح کے ساتھ جو مسروق تک منتہی ہوتی ہے یہ روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی کنیز سے مقاربت نہ کریں گے۔

اس کے بعد حافظ موصوف نے مسند (ہیثم بن کلیب) اور طبرانی سے متعدد روایتیں نقل کی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے۔

وللطبرانی من طریق الضحاک عن ابن عباس قال دخلت حفصۃ بیتہا فوجدتہ یطأ ماریۃ فعاتبتہ۔ (فتح الباری مطبوعہ مصر ج ۸ ص ۵۰۳)	اور طبرانی نے ضحاک کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت حفصہؓ اپنے گھر میں گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ماریہ کے ساتھ ہم بستر دیکھا اس پر انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معاتب کیا۔

ابن سعد اور واقدی نے اس روایت کو زیادہ بدنما پیرایوں میں نقل کیا ہے۔ ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں محض افترا اور بہتان ہیں۔

علامہ عینی شرح صحیح بخاری باب النکاح جلد ۵ صفحہ ۳۸۴ میں لکھتے ہیں۔

والصحیح فی سبب نزول الآیۃ انہ فی قصۃ العسل لا فی قصۃ ماریۃ المروی فی غیر الصحیحین و قال النووی ولم تات قصۃ ماریۃ من طریق صحیح	اور آیت کی شان نزول کے باب میں صحیح روایت یہ ہے کہ وہ شہد کے واقعہ میں ہے، ماریہ کے قصہ کے باب میں نہیں ہے جو صحیحین کے سوا اور کتابوں میں مذکور ہے نووی نے کہا ہے کہ ماریہ کا واقعہ کسی صحیح طریقے سے مروی نہیں ہے

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، طبرانی، مسند ہیثم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ان کتابوں میں عموماً جس قسم کی رطب و یابس روایتیں مذکور ہیں اس کے لحاظ سے جب تک ان کی صحت کے متعلق کوئی خاص تصریح نہ ہو لائق التفات نہیں۔ حافظ ابن حجر نے ان میں ایک طریقہ کی توثیق کی ہے یعنی وہ روایت جس کے راوی اخیر مسروق ہیں، لیکن

؎ فتح الباری تفسیر سورۂ تحریم۔

اوّلاً تو اس روایت میں ماریہ قبطیہ کا نام مطلق نہیں، صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہؓ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ میں اپنی کنیز کے پاس نہ جاؤں گا اور وہ مجھ پر حرام ہے، اس کے علاوہ مسروقؒ تابعی ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا اس لئے یہ روایت اصولِ حدیث کی رُو سے منقطع ہے یعنی اس کا سلسلۂ سند صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس حدیث کے ایک اور طریقہ کو حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں صحیح کہا ہے لیکن اس طریقہ کا ایک اور راوی عبدالملک رقاشی ہیں جن کی نسبت دارقطنی نے لکھا ہے۔

کثیر الخطاء فی الاسانید والمتون یحدث عن حفظہ

سندوں میں اور اصل الفاظِ حدیث میں بہت خطا کرتے ہیں۔

یہ امر مسلّم ہے کہ ماریہ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں[۱] مذکور نہیں ہے، یہ بھی تسلیم ہے کہ سورۂ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے۔ امام نوویؒ نے جو ائمہ محدثین میں سے ہیں صاف تصریح کی ہے کہ ماریہ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں، حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیر الخطا ہے۔ ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استناد کے قابل ہے۔

یہ بحث اصولِ روایت کی بنا پر تھی، درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدوکاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کئے جاسکتے، نہ کہ اس ذاتِ پاک کی طرف جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

*

---

[۱] یعنی ماریہ کے نام سے اور مشہور لغو واقعات کے شمول کے ساتھ نہیں ورنہ نسائی باب الغیرۃ میں اس قدر مذکور ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے اصرار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا لیکن اس کا ایک راوی مجروح ہے۔ ن۔

غزوۂ تبوک

رجب سنہ ۹ ھ مطابق نومبر سنہ ۶۳۵ء

تبوک ایک مشہور مقام ہے جو مدینہ اور دمشق کے وسط میں نصف راہ پر مدینہ سے چودہ منزل ہے۔

جنگ موتہ کے بعد سے رومی سلطنت نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، غسانی خاندان جو شام میں رومیوں کے زیر اثر حکومت کر رہا تھا مذہباً عیسائی تھا اس لئے قیصر روم نے اسی کو اس مہم پر متعین کیا، مدینہ میں یہ خبریں اکثر مشہور ہوتی رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء کے واقعہ میں حضرت عمرؓ سے جب عتبان بن مالک نے دفعۃً آکر یہ کہا کہ "غضب ہو گیا" تو انھوں نے کہا کیوں خیر ہے؟ کیا غسانی آگئے۔

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے، انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہیں تقسیم کر دی ہیں۔ اس فوج میں لخم، جذام اور غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور مقدمۃ الجیش بلقاء تک آگیا ہے، مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انتقال کیا اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں۔ اس بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوجیں روانہ کیں۔

بہر حال یہ خبریں تمام عرب میں پھیل گئیں اور قرائن اس قدر قوی تھے کہ غلط ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کی تیاری کا حکم دیا۔ سوء اتفاق یہ کہ سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں، ان اسباب سے لوگوں کو گھر سے نکلنا نہایت شاق تھا، منافقین جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے، ان کا پردہ فاش ہو چلا، وہ خود بھی جی چراتے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے کہ:

لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ۔   گرمی میں نہ نکلو۔

سویلم ایک یہودی تھا، اس کے گھر پر منافقین جمع ہوتے اور لوگوں کو لڑائی پر جانے سے روکتے، چونکہ ملک پر رومیوں کے حملہ کا اندیشہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام قبائل عرب سے فوجیں اور مالی اعانت طلب کی، صحابہ میں سے حضرت عثمانؓ نے دو سو اوقیہ چاندی اور دو سو اونٹ پیش کئے۔ اکثر صحابہ نے بڑی بڑی رقمیں لا کر حاضر کیں، تاہم بہت سے مسلمان اس بنا پر جانے سے رہ گئے کہ سفر کا سامان نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ

---

[1] بخاری ذکر واقعہ ایلا [2] مواہب لدنیہ مع زرقانی ج ۳ ص ۶۳ [3] مارگولیوس صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حنین میں انصار مال غنیمت سے محروم رہے تھے اس لئے وہ بے دل ہو گئے تھے کہ ہم کیا لڑیں جب فوائد جنگ دوسروں کو حاصل ہوں گے لیکن یہ مارگولیس صاحب کا حسن ظن ہے، قرآن نے خود بتا دیا ہے تو قیاس کی کیا حاجت ہے، ص ۴۱۴ [4] ابن ہشام [5] ابن سعد جزء المغازی ص ۱۱۸ [6] زرقانی جلد ۳ ص ۶۹ ص ۶۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور اس درد سے روتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر رحم آیا، تاہم ان کے چلنے کا کچھ سامان نہ ہو سکا، انہی کی شان میں سورۂ توبہ کی یہ آیتیں اتری ہیں۔

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ إِذَا مَآ أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ
أَجِدُ مَآ أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ
مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔
(توبہ-۱۲)

اور نہ ان لوگوں پر کچھ اعتراض ہے کہ جب تمہارے پاس آئے کہ ہم کو سواری دیجئے اور تم نے کہا کہ میرے پاس سواری کہاں ہے جس پر تم کو سوار کر سکوں تو وہ واپس گئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ افسوس ہمارے پاس خرچ نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا جب آپ مدینہ سے تشریف لے جاتے تو کسی کو شہر کا حاکم مقرر فرما کر جاتے چونکہ اس غزوہ میں بخلاف اور معرکوں کے ازواج مطہراتؓ ساتھ نہیں گئی تھیں، اہل حرم کی حفاظت کے لئے کسی عزیز خاص کا رہنا ضرور تھا اس لئے اب کے یہ منصب جناب امیرؓ کو ملا۔ لیکن انہوں نے شکایت کی کہ آپ مجھ کو بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جاتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہ نسبت ہو جو ہارون کو موسیٰؑ کے ساتھ تھی[1]

غرض آپ تیس ہزار فوج کے ساتھ مدینہ سے نکلے جس میں دس ہزار گھوڑے تھے[2]۔ راہ میں وہ عبرتناک مقامات تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، یعنی قوم ثمود کے مکانات جو پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے تھے، چونکہ اس مقام پر عذاب الٰہی نازل ہو چکا تھا، آپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص یہاں قیام نہ کرے، نہ پانی پیئے اور نہ کسی کام میں لائے۔

تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ خبر صحیح نہ تھی لیکن اصلیت سے بالکل خالی بھی نہ تھی۔ غسانی رئیس عرب میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا، صحیح بخاری (غزوہ تبوک) میں جہاں حضرت کعبؓ بن مالک کا واقعہ مذکور ہے لکھا ہے کہ شام سے ایک قاصد آیا اور حضرت کعبؓ بن مالک کو رئیس غسان کا ایک خط دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے سنا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہاری قدر نہ کی، اس لئے تم میرے پاس چلے آؤ، میں تمہاری شان کے موافق تم سے برتاؤ کروں گا۔ حضرت کعبؓ معتوب نبویؐ تھے لیکن انہوں نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔

تبوک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن تک قیام کیا۔ آئلہ[3] کا سردار جس کا نام یوحنا تھا، حاضر خدمت ہو کر جزیہ دینا منظور کیا، ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا۔ جس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ردائے مبارک عنایت فرمائی[4]۔ جرباء اور اذرح کے عیسائی بھی حاضر ہوئے اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کی، دومۃ الجندل جو دمشق سے پانچ منزل پر ہے وہاں ایک عربی سردار جس کا نام اکیدر تھا، قیصر کے زیر اثر تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو چار سو (بیس) کی جمعیت کے ساتھ اس کے مقابلہ کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ نے اس کو گرفتار کیا اور اس شرط پر رہائی دی کہ خود دربار رسالت میں حاضر ہو کر شرائط صلح پیش کرے، چنانچہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مدینہ میں

---

[1] صحیح بخاری غزوہ تبوک [2] طبقات ابن سعد (جزء مغازی ص ۱۱۹) [3] یہ مقام خلیج عقبہ کے پاس ہے (دارگولوس)

[4] زرقانی بحوالہ ابن ابی شیبہ (ج ۳ صفحہ ۸۰)

آیا، آپؐ نے اس کو امان دی۔

تبوک سے جب آپؐ واپس پھرے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو لوگ عالمِ شوق میں استقبال کو نکلے، یہاں تک کہ پردہ نشینانِ حرم بھی جوش میں گھروں سے نکل پڑیں اور لڑکیاں یہ اشعار گاتی نکلیں[۱]۔

طلع البدرُ علینا	من ثنیات الوداع	وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چاند طلوع ہوا۔
وجب الشکر علینا	ما دعا للّٰہ داع	جب تک خدا کا پکارنے والا کوئی دنیا میں باقی ہے ہم پر خدا کا شکر فرض ہے۔

مسجدِ ضرار منافقین ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ مسلمانوں میں کسی طرح پھوٹ ڈال دو۔ ایک مدت سے وہ اس خیال میں تھے کہ مسجد قبا کے توڑ پر وہیں ایک اور مسجد اس حیلہ سے بنائیں کہ جو لوگ ضعف یا کسی اور وجہ سے مسجد نبوی میں نہ پہنچ سکیں، یہاں آکر نماز ادا کر لیا کریں، ابو عامر جو انصار میں سے عیسائی ہو گیا تھا اس نے منافقین سے کہا کہ تم سامان کرو، میں قیصر کے پاس جا کر وہاں سے فوجیں لاتا ہوں کہ اس ملک کو اسلام سے پاک کر دوں[۲]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک تشریف لے جانے لگے تو منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کے لئے ایک مسجد تیار کی ہے آپؐ چل کر اس میں ایک دفعہ نماز پڑھا دیں تو مقبول ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا اس وقت میں مہم پر جا رہا ہوں۔ جب تبوک سے واپس پھرے تو مالک اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ جا کر مسجد میں آگ لگا دیں، اسی مسجد کی شان میں یہ آیتیں اُتری ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّکُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ، لَا تَقُمْ فِیْہِ اَبَدًا لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْہِ فِیْہِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَھَّرُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّھِّرِیْنَ ،

(توبہ ۔ ۱۳)

اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد ضرار اور پھوٹ ڈالنے اور کفر کی غرض سے تیار کی اور اس غرض سے کہ جو لوگ پہلے سے خدا اور رسولؐ سے لڑتے ہیں ان کو ایک کمین گاہ ہاتھ آئے اور وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف بھلائی کے لحاظ سے ایسا کیا اور خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹ کہتے ہیں، محمدؐ! تو کبھی اس مسجد میں جا کر نہ کھڑا ہو وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ تو اس میں نماز پڑھے، وہاں ایسے لوگ ہیں جن کو صفائی محبوب ہے اور خدا صفائی پسند کرنے والوں کو چاہتا ہے۔

حجِ اسلام اور اعلانِ برأت مکہ ۸ھ میں فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن و امان قائم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سال مشرکین ہی کے اہتمام سے ارکانِ حج انجام پائے مسلمانوں نے حضرت عتابؓ بن اسید کے ساتھ جو مکہ کے امیر مقرر ہوتے تھے، فریضۂ حج ادا کیا۔ اب ۹ھ پہلا موقع ہے کہ کعبہ کفر و شرک کی ظلمت سے پاک ہو کر عبادت ابراہیمی کا مرکز قرار پاتا ہے۔ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ذیقعدہ یا ذوالحجہ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لئے

(۱؎ زرقانی ج ۳ ص ۹۲) ۲؎ زرقانی بحوالۂ ابن جریر (ج ۳ ص ۹۱) ۔

روانہ فرمایا، ان میں حضرت ابوبکرؓ قافلہ سالار، حضرت علیؓ نقیب اسلام اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت جابرؓ، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہم معلم تھے، قربانی کے لئے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) بیس اونٹ ساتھ تھے۔

قرآن نے اس حج کو حج اکبر کہا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ رسم حج اصلی ابراہیمی سنت میں جلوہ گر ہوئی۔ اس حج کا مقصد یہ تھا کہ خانۂ خلیل میں عہدِ جاہلیت کے اختتام اور حکومتِ اسلام کی ابتداء کا اعلان کیا جائے، مناسک و رسوم حج کی عام طور سے تعلیم دی جائے، زمانۂ جاہلیت کے رسوم و عادات کا ابطال کیا جائے۔

حضرت ابوبکرؓ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی، یوم النحر میں خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل بیان کئے، اس کے بعد حضرت علیؓ کھڑے ہوئے، سورۂ برأت کی ۴۰ آیتیں پڑھ کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں نہ داخل ہو سکے گا۔ نہ کوئی برہنہ اب حج کرنے پائے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے ان کے نقضِ عہد کے سبب سے آج سے چار مہینے کے بعد ٹوٹ جائیں گے، حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ نے اس اعلان کی اس زور زور سے منادی کی کہ گلا پڑ پڑ گیا[2] سورۂ برأت کی ابتدائی آیتیں جن میں خدا نے اس اعلان کا حکم فرمایا وہ یہ ہیں

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ
وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى
الْكٰفِرِيْنَ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ
يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ
رَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا

اے مسلمانو! جن مشرکین سے تم نے معاہدہ کیا تھا اور انہوں نے (لیا معاہدہ توڑ دیا) ان کی خدا اور خدا کے رسول کی طرف سے کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب (اے معاہدہ شکن مشرکو!) چار مہینے کی تم کو مہلت ہے اس میں تم ملک میں چلو پھرو اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز نہ کر سکو گے، حج اکبر کے دن لوگوں کو اعلان عام ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان مشرکین کا اب ذمہ دار نہیں اگر (تم اے مشرکین!) توبہ کر لو تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر اب بھی پھرے رہو تو یقین کر لو کہ تم خدا کو ہرا نہ سکو گے۔ اے پیغمبر! تو کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دے لیکن وہ مشرکین جن سے تم نے معا

---

(۱) بخاری کتاب المناسک باب لا یطوف عریان، و باب حج ابی بکرؓ بالناس و تفسیر سورۃ البراءۃ (ش) (۱) سورۂ توبہ میں ہے یوم الحج الاکبر مصنف نے اس حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہ لکھی ہے اس کو بھی گو بعض علما نے اختیار کیا ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلہ میں حج اکبر ہے اور عمرہ حج اصغر ہے، ملاحظہ ہو روح المعانی ج ۱۰ صفحہ ۴۶ (ش)

[2] ابن حنبل ص ۲۹۹ ج ۲، عام تفصیل زرقانی ج ۳ ص ۱۰۰ وغیرہ میں موجود ہے (ش) (۲) ان آیات میں یہ بیان ہے کہ مسجد حرام کے پاس (صلح حدیبیہ میں) جو معاہدے ہوئے تھے وہ ٹوٹ گئے۔ لیکن وہ معاہدے تو فتح مکہ سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے اور اس کے بعد کفار سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا، مصنف نے اسی بنا پر اپنے ایک مکتوب ج ۲ ص ۴۱ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیتیں ۸ھ میں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی ہوں گی اور شاید اسی لئے مصنف نے یہ واقعات قلم انداز کر دیئے ہیں لیکن خاکسار جامع کا خیال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ معاہدہ کے متعلق یہ آیتیں گو ۸ھ میں نازل ہوئی ہوں لیکن ان کا عام اعلان مع دیگر ضروری احکام کے جیسا کہ صحاح ستہ کی مستند روایات میں مذکور ہے ۹ھ کے موسم حج میں ہوا ہو۔ (ش)

عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (ع-۱)

کیا اور انہوں نے اس کے ایفاء میں تمہارے ساتھ کچھ کمی نہ کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں انہوں نے تمہارے دشمنوں کی مدد کی تو ان کا معاہدہ کو تم پورا کرو۔ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ (رکوع ۴)

اے مسلمانو! مشرکین تو ناپاک ہیں، اب وہ اس سال کے بعد کعبہ کے قریب نہ آئیں۔

(طبری نے بواسطہ سدی روایت کی ہے کہ اس اعلان کے بعد کفار عام طور سے مسلمان ہو گئے[1])

واقعاتِ متفرقہ

نو سال کے بعد اب ملک میں امن و امان کا دور شروع ہوا۔ اب حصول دولت کے مواقع حاصل تھے، اس بناء پر زکوٰۃ کا حکم اس سال نازل ہوا اور تحصیلِ زکوٰۃ کے لئے عمال قبائل میں مقرر ہوئے[2]۔

اسلام کے سایہ میں بعض غیر مسلم قومیں بھی داخل ہو چکی تھیں ان کے جزیہ کی یہ آیت اتری۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ ۴)

تا آنکہ چھوٹے بن کر وہ جزیہ نہ ادا کریں۔

سود کی تحریم بھی اسی سال نازل ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلانِ عام فرمایا

نجاشی جس کے ظلِ حمایت میں مسلمانوں نے چند سال حبشہ میں بسر کئے، اس نے اسی سال انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفات کا خود اعلان فرمایا کہ مسلمانو! آج تمہارے برادرِ صالح اصحمہ نے وفات پائی اس کے لئے دعائے مغفرت مانگو۔ اس کے بعد نجاشی کے لئے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔

*

(لہ فتح ج ۴ صد ۲۱۲) (تہ طبری جلد ۴ صد ۱۸۲۲) (س)

غزوات پر دوبارہ نظر

کتاب کا یہ حصہ سادہ سوانح زندگی پر محدود ہے۔ بحث و تدقیقات اور رفع شکوک کے لیے دوسرے حصے ہیں اس بنا پر مناسب یہ تھا کہ غزوات کے متعلق جو مباحث ہیں انہی حصوں میں لکھے جاتے، لیکن کتب سیر میں کثرت اور اہمیت دونوں حیثیتوں سے جو واقعات زیادہ تر نمایاں ہیں صرف غزوات ہیں۔ اگر صرف تصانیف سیرت کو پیش نظر رکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر سوانح عمری غزوات ہی کا نام ہے۔ چنانچہ پہلے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ سیرت نہیں بلکہ مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ مثلاً مغازی ابن عقبہ، مغازی ابن اسحاق مغازی واقدی، یہ انداز تحریر آج تک چلا آیا، اس لئے اگر یہ طرز بالکل بدل دیا جائے تو جو شخص کوئی قدیم تصنیف پہلے پڑھ چکا ہوگا وہ اس جدید تصنیف کو پڑھ کر سمجھے گا کہ سیرت کے بجائے کوئی اور چیز پڑھ رہا ہے۔ ان اسباب سے ہم کو بھی غزوات کو تفصیل سے لکھنا پڑا، لیکن غزوات کو پڑھ کر جو سوالات دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، ان کو دوسرے موقع کے لئے اٹھا رکھنا ناظرین کے اضطراب کا باعث ہوگا۔

غیر مذہب والوں نے غزوات کے مقاصد اور اسباب کے سمجھنے میں سخت غلطیاں کی ہیں، نہ صرف بدنیتوں نے بلکہ نیک دلوں نے بھی، لیکن یہ تعجب کی بات نہیں، اسباب ایسے جمع ہیں کہ اس قسم کی غلطیوں پر نہ صرف دوستوں کو بلکہ دشمنوں کو بھی معذور رکھ سکتے ہیں۔

عرب اور جنگ و غارت گری

اس باب میں سب سے مقدم اور سب سے اہم اس حقیقت کا معلوم کرنا ہے کہ عرب کی قومیت کو جنگ و غارت گری سے کیا تعلق ہے؟ ہر قوم کے اخلاق و عادات، رسوم و معاملات، محاسن و اوصاف، معائب و مثالب، غرض اس کی کل قومی زندگی کا ایک خاص اساس الامر ہوتا ہے کہ سب چیزیں اُسی سے بنتی اور اسی سے نشو و نما پاتی ہیں، عرب میں یہ چیز جنگ و غارت گری تھی اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ عرب ایک ویران ملک تھا کسی قسم کی پیداوار وہاں نہیں ہوتی تھی، لوگ ان پڑھ اور جاہل تھے خورش اور پوشش کا قدرتی سامان صرف بھیڑ بکریاں اور اونٹ تھے کہ ان کا دودھ اور گوشت کھاتے اور بالوں کو بُن کر کمل بناتے تھے، لیکن یہ جائیداد بھی ہر شخص کو نصیب نہ تھی یا تھی تو بقدر ضرورت نہ تھی اس لئے حملہ اور غارت گری شروع ہوئی اور معاش کا سب سے بڑا بلکہ تنہا ذریعہ غارت گری قرار پایا، ابوعلی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے،

وذلک انھم کانوا یکرھون ان تتوالی علیھم ثلاثۃ اشھر لا تمکنھم الغارۃ فیھا لان معاشھم کان من الغارۃ	(یہ اس لئے کہ وہ ناپسند کرتے تھے کہ ان پر تین ماہ متواتر ایسے گزر جائیں کہ وہ غارت گری نہ کر سکیں کیونکہ ان کی معاش کا ذریعہ یہی تھا)

چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں غنم کہتے ہیں، اس لئے لوٹ کے

کتاب الامالی جز اول [illegible] مطبوعہ مصر۔

مال کو عربی میں "غنیمت"[1] کہنے لگے۔ اس لفظ نے پھر یہ وسعت حاصل کی کہ قیصر و کسریٰ کا تاج و تخت لٹ کر آیا تو اسی نام سے پکارا گیا، رفتہ رفتہ یہی لفظ عربی قوم، عربی زبان، عربی تاریخ کا سب سے زیادہ محبوب، سب سے زیادہ زبان زد، سب سے زیادہ وسیع الاثر لفظ بن گیا۔ آج بھی ایک سلطان ایک رئیس، ایک شیخ القبائل اپنے عزیز و اقارب کو سفر کے وقت رخصت کرتا ہے تو کہتا ہے سالمًا غانمًا یعنی سالم آنا اور لوٹ کر لانا۔ ہماری زبان میں سب سے عزیز چیز کو جو "غنیمت" کہتے ہیں، مثلاً آپ کا تشریف لانا نہایت غنیمت ہے۔ یہ وہی لفظ ہے اور عربی زبان سے آیا ہے۔ عسرت معاش کی وجہ سے تمام عرب میں غارت گری اور جنگ عام ہو گئی تھی تمام قبائل ایک دوسرے پر ڈاکہ ڈالتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ صرف حج کے زمانہ میں مذہبی خیال سے چار مہینے مخصوص کر دیئے تھے جن کو اشہر حرم کہتے تھے، ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، لیکن متصل تین تین مہینہ تک معاش کا معطل رہنا سخت گراں تھا اس لئے نسیئ ایک رسم ایجاد کر لی تھی، یعنی ان مہینوں کو حسب ضرورت دوسرے مہینوں سے بدل لیتے تھے۔

حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح (تفسیر سورۂ توبہ) میں لکھتے ہیں۔

کانوا یجعلون المحرم صفرًا ویجعلون صفرًا المحرم لئلا یتوالی علیھم ثلاثۃ اشھر لا یتعاطون فیھا القتال (۱)۔	وہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم کر دیا کرتے تھے تاکہ پے در پے تین مہینہ تک لڑائی سے محروم نہ ہو جائیں (ج ۸ ص ۲۲۳)

ثار کا عقیدہ لڑائی کا اصلی ابتدائی سبب یہ تھا لیکن جب یہ سلسلہ چھڑا تو اور اسباب بھی پیدا ہو گئے اور یہ اسباب اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے اصلی سبب سے کم نہ تھے۔ ان میں سب سے مقدم اور شدید الاثر ثار کا قانون تھا، یعنی جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ کو اس کا انتقام لینا فرض ہو جاتا تھا، گو سینکڑوں برس گزر جاتے تھے اور قاتل بلکہ اس کے خاندان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا تاہم جب تک قاتل کے قبیلے کے ایک آدمی کو قتل کر نہیں لیتا تھا قومی فرض سے ادا نہیں ہو سکتا تھا اسی کو ثار کہتے ہیں اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک معمولی قتل پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک مسلسل لڑائیاں قائم ہو جاتی تھیں اسی طریقہ کے ابطال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اعلان کیا تھا اور اپنے قبیلہ کے قاتلوں کا خون معاف کر دیا تھا لیکن صحرا نشین عربوں میں آج تک یہ طریقہ قائم اور ان کے قومی خصائص کا جزو اعظم ہے۔

ثار کے متعلق عجیب عجیب قسم کے معتقدات پیدا ہو گئے تھے، مثلاً یہ کہ مقتول جب مر جاتا ہے تو اس کی روح پرند بن جاتی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہیں لیا جاتا مقام قتل پر شور کرتی رہتی ہے کہ "مجھ کو پلاؤ میں پیاسی ہوں"، اس پرند کو صدیٰ یا ہام کہتے تھے۔ ابو دواد ایادی کہتا ہے۔

سلط الموت والمنون علیھم   فلھم فی صدی المقابر ھام

ان پر موت مسلط ہو گئی اور مقبروں کے صدیٰ میں ان کے لئے ہام ہے۔

ذوالاصبع العدوانی کا شعر ہے۔

---

[1] یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے اب تک نہیں آئی تھی۔

یا عمرو وان لا تدع شتمی ومنقصتی　　اضرب بک حیث تقول الھامۃ اسقونی

اے عمرو! اگر تو مجھ کو گالی دینا اور میری تحقیر کرنا نہ چھوڑے گا تو میں تجھ کو اس طرح ماروں گا کہ الو کے آکر مجھ کو سیراب کرو۔

ایک یہ خیال تھا کہ جس مقتول کا انتقام نہیں لیا جاتا اس کی قبر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے، عمرو بن معدی کرب کی بہن مقتول کی زبان سے کہتی ہے۔

واترک فی قبر بصعدۃ مظلم　　خون بہا لوگے تو میں اندھیری قبر میں پڑا رہوں گا۔

اسی بنا پر خون بہا لینے کو عیب سمجھتے تھے، اسی شاعرہ کا مصرع ہے۔

ومشوا باذان النعام المصلم　　اور خون بہا لینا ہے تو پھر شترمرغ کا کان پکڑ کر لے جاؤ

غیرت اور حمیت کی بنا پر اس بات کو عیب سمجھتے تھے کہ مقتول پر نوحہ کیا جائے۔

ولا تراھم وان جلت مصیبتھم　　مع البکاۃ علی من مات یبکونا

گو کتنی ہی بڑی مصیبت ہو لیکن ان کو مرنے والے پر روتا ہوا نہ دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم

معاذ الالٰہ ان ینوح نساءنا　　علی ھالک او ان نضج من القتل

خدا نہ کرے کہ ہماری عورتیں مقتول پر نوحہ کریں یا ہم قتل سے گھبرا جائیں۔

مقتول پر نوحہ کرتے تھے تو اس وقت کرتے تھے جب خون کا انتقام لے لیتے تھے۔

من کان مسرورا بمقتل مالک　　فلیات نسوتنا بوجہ نھار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا وہ دن کو ہماری عورتوں کے پاس آئے۔

لیجد النساء حواسر یندبنہ　　یلطمن اوجھھن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں ننگے سر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کو اپنے چہروں پر دوہتر مار رہی ہیں۔

ایک خیال یہ تھا کہ جو شخص زخم کھا کر مرتا ہے اس کی روح زخم کی راہ سے نکلتی ہے، ورنہ ناک کی راہ سے نکلتی ہے اور یہ نہایت عیب سمجھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر بیماری سے مرنے کو حتف انفہ کہتے تھے یعنی ناک کی موت۔ اور ایسے مرنے کو نہایت عار سمجھتے تھے۔

فما مات منا سیدٌ حتف انفہ　　ولا طُلَّ منا حیث کان قتیلُ

ہمارا کوئی سردار ناک کی راہ سے نہیں مرا اور نہ ہمارے کسی مقتول کا خون بدر ہوا۔

رفتہ رفتہ عرب کے تمام قومی مفاخر اور اخلاق و عادات کا اصل محور جنگ بن گیا تھا یعنی اُن کے اوصاف و اخلاق میں جس چیز کا اصلی سبب تلاش کیا جائے یہی چیز نکلتی تھی، یہی چیز تھی جس نے ایک مدت تک قبائل عرب کو اسلام لانے سے باز رکھا، حضرت عمروؓ بن مالک جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا، بنو عقیل پر ہمارا تار باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں چنانچہ اسی وقت بنو عقیل پر جو اسلام لا چکے تھے حملہ آور ہوئے، اور خود حضرت عمروؓ بن مالک نے ان میں شرکت کی اگرچہ ان

کو بہت ندامت ہوئی کہ اُن کے ہاتھ سے ایک مسلمان مارا گیا۔[1]

لوٹ کا مال چونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں لڑائیوں کی اصل بنیاد ضرورتِ معاش سے شروع ہوئی تھی۔ اس لئے عرب کے نزدیک مالِ غنیمت سے زیادہ کوئی شے محبوب نہ تھی اور ذرائع معاش میں سب سے زیادہ حلال و طیب اسی کو سمجھتے تھے۔ یہ خیال اس قدر دلوں میں راسخ اور رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا کہ اسلام کے بعد بھی ایک مدت تک قائم رہا اور جس طرح شارع نے ممنوعاتِ شرعیہ کو بتدریج حرام اور ممنوع کیا تھا، غنیمت کے متعلق نہایت تدریج اور آہستگی سے کام لینا پڑا۔

شراب کو جب شارع نے حرام کرنا چاہا تو پہلے یہ آیت اتری۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ (بقرہ-۲۷)	لوگ تجھ سے شراب اور قمار کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔

اللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيَانًا شَافِيًا۔	اے خدا شراب کے متعلق ہم کو صاف احکام بتا۔

پھر یہ آیت اتری۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى (نساء-۷)	نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

چنانچہ نماز کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک شخص منادی پکارتا کہ کوئی شخص نشہ میں نماز کو نہ آئے، پھر یہ آیت اتری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ (مائدہ-۱۲)	مسلمانو! شراب، جوا، انصاب، فال کے تیر یہ سب ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو کہ غالباً تم فلاح پاؤ گے۔ شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ شراب اور قمار کے ذریعہ سے تم لوگوں میں عداوت اور بغض ڈالے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو تم باز آؤ گے۔

باوجود اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کے متعلق اس قدر تاکید و تصریح کی سخت خیال کی کہ جس قسم کے برتنوں میں شراب پیتے تھے توڑوا دیئے، لوگوں نے عرض کی کہ شراب کا سرکہ بنالیں اس سے بھی منع فرمایا۔ ان سب باتوں پر بھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض لوگوں نے شرابیں پیں اور جب ان سے باز پرس کی گئی تو انھوں نے نیک نیتی سے کہا کہ نیک اور اچھے آدمیوں کے لئے شراب کہاں حرام ہے، قرآن مجید میں خود شراب کی حرمت کے بعد یہ تصریح موجود ہے۔[2]

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عمرو بن مالک ج ۳ ص ۱۱۳ [2] مسند امام احمد بن حنبل مطبوعہ مصر (ج ۲) ص ۳۵۱ و ابو داؤد کتاب الاشربۃ باب تحریم الخمر۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا (مائدہ - ۱۰)

جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے انھوں نے جو کچھ کھایا (یعنی شراب پی) ان پر کچھ الزام نہیں۔

اس موقع پر بہت سے صحابہ موجود تھے، حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا کہ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے کہا یہ ان صحابہ کی نسبت ہے جو شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے مر گئے، حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور ان لوگوں کو سزا دی۔ چنانچہ یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری میں مذکور ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ جب کوئی چیز زمانہ دراز سے رسم و عادت میں داخل ہو جاتی ہے تو اس کے آثار اور مخفی نتائج مدتوں تک قائم رہتے ہیں اور غنیمت کا بھی یہی حال ہے۔

سب سے پہلے جنگ بدر میں قبل اس کے کہ مال غنیمت یکجا جمع کیا جاتا، لوگ غنیمت میں مصروف ہو گئے اس پر یہ آیت اتری۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (انفال - ۹)

اگر خدا کی طرف سے پہلے سے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو جو کچھ لیا اس پر تم کو عذاب ہوتا۔

چنانچہ صحیح ترمذی تفسیر انفال میں یہ واقعہ بہ تصریح مذکور ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا تھا کہ جو شخص کسی کافر کو قتل کرے گا اس کا مال و اسباب قاتل کو ملے گا۔ اس بنا پر لوگوں نے مسلوبہ مال کا دعویٰ کیا، جو صحابہ لڑے نہ تھے بلکہ علم اور رایت کے محافظ تھے ان کا دعویٰ تھا کہ اس میں ہمارا بھی حق ہے۔ اس پر یہ آیت اتری۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال - ۱)

لوگ تجھ سے مال غنیمت کے متعلق پوچھتے ہیں کہہ دے غنیمت خدا اور رسول کی ہے۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مجاہدین مال غنیمت کا خود دعویٰ نہیں کر سکتے، اس کی تقسیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے جس طرح آپ چاہیں تقسیم فرمائیں۔ اس سے اتنا ہوا کہ لڑائیوں میں ہر شخص خود لوٹ کر جو چیز چاہتا تھا لیتا تھا، بند ہو گیا، لیکن میدان جنگ کے علاوہ اور موقعوں پر لوٹ مار مدتوں موقوف نہیں ہوا۔ سنن ابی داؤد[1] میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں شریک تھے، بھوک کی سخت تکلیف ہوئی، اتفاقاً سامنے بکریاں نظر پڑیں، ان کو لوٹ لائے اور ذبح کر کے ہانڈیاں چڑھا دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ تشریف لائے اور کمان جو ہاتھ میں تھی اس سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا کہ لوٹ کی چیز مردہ سے بڑھ کر حلال نہیں۔

خیبر کی لڑائی سنہ ۷ھ میں ہوئی، اس وقت تک یہ حال تھا کہ امن کے بعد لوگوں نے یہودیوں کے جانور اور پھل لوٹ لئے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت غصہ آیا، آپ نے تمام صحابہ کو جمع کیا اور فرمایا۔

ان اللّٰہ تعالیٰ لم یحل لکم ان تدخلوا بیوت اھل الکتاب الا باذن ولا ضرب نسائھم ولا اکل

خدا نے تم لوگوں کے لئے یہ نہیں جائز کیا ہے کہ اہل کتاب کے گھروں میں گھس جاؤ مگر بہ اجازت، اور نہ یہ کہ ان کی عورتوں

---

[1] سنن ابی داؤد باب النفل، کتاب الجہاد، باب فی النھی عن النھبۃ۔

ثمارهم اذا اعطوکم الذی علیهم (سنن ابی داؤد تعشیر الذمۃ اذا اختلفوا فی التجارۃ) کو روا نہیں کہ ان کے پھل کھا جاؤ، جب کہ وہ تم کو وہ ادا کریں جو ان پر فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ غنیمت کے ساتھ لوگوں کا جو شغف ہے کم ہو جائے، لیکن مدت تک غنیمت کی محبت اور وارفتگی نہ گئی۔ غزوہ اُحد میں صرف اس وجہ سے شکست ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ تیر اندازوں کو سخت تاکید فرما دی تھی کہ گو لڑائی کی کچھ حالت ہو تم اپنی جگہ سے نہ ہٹنا، تاہم جب فتح ہوئی تو لوگ بے اختیار لوٹ میں مصروف ہو گئے۔ ان کا ہٹنا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر پشت کی طرف سے حملہ کر دیا۔ حنین میں بھی شکست کی اصل وجہ یہی تھی کہ قبل از وقت لوگوں نے غنیمت لوٹنی شروع کر دی تھی۔

"غنیمت" اس قدر محبوب تھی کہ بعض صاحبوں کو کسی کافر کے مسلمان ہونے پر اس بنا پر رنج ہوا کہ اسلام لانے کی وجہ سے اس کا مال نہ مل سکا۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک سریہ میں حملہ کرنا چاہا۔ قبیلہ والے روتے ہوئے آئے۔ انہوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو تو تمہاری جان اور مال بچ جائے گا۔ انہوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ اور ان کو امن دے دیا گیا۔ جب یہ اپنے ساتھیوں میں آئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ:

احرمتنا الغنیمۃ۔ تم نے ہم کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ لوگ گئے تو آپ نے ان صحابی کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی کے بدلے (جس کو تم نے چھوڑ دیا) اس، اس قدر ثواب ملے گا۔

سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ مدت تک لوگ یہ سمجھا کیے کہ غنیمت حاصل کرنا ثواب کا کام ہے۔ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک شخص جہاد پر جانا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کچھ مال ہاتھ آئے، آپ نے فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔ یہ جواب انہوں نے اگر لوگوں سے بیان کیا تو لوگوں کو بہت تعجب ہوا اور ان سے کہا کہ تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا پھر جا کر پوچھو۔ انہوں نے دوبارہ پوچھا اور وہی جواب ملا۔ لوگوں نے پھر ان کو بھیجا، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں۔

وحشیانہ افعال عرب میں لڑائیوں کی شدت اور وسعت نے نہایت وحشیانہ رسمیں قائم کر دی تھیں جن میں سے چند کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) اسیران جنگ کو جب قتل کرتے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کرتے تھے بلکہ آگ میں جلا دیتے تھے۔

(۲) غفلت یا نیند کی حالت میں دفعۃً دشمن پر جا پڑتے تھے اور قتل و غارت گری شروع کر دیتے تھے، یہ طریقہ

---

۱ ابوداؤد باب ما یقول اذا اصبح، کتاب الادب ۲ سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب فی من یغزو و یلتمس الدنیا ۳ مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران ص ۳۴۲۔

عام اور کثرت سے رائج تھا، بہت سے بہادر اس خاص طریقہ میں زیادہ ممتاز تھے اور ان کو فاتک یا فتاک کہتے تھے، تابط شرا، سلیک، ابن السلکہ اسی قسم کے لوگ تھے۔

(۳) زندوں کو آگ میں جلا دیتے تھے، عمرو بن منذر عرب کا ایک بادشاہ تھا، اس کے بھائی کو جب بنو تمیم نے قتل کر دیا تو اس نے منت مانی کہ ایک کے بدلے سو آدمیوں کو قتل کروں گا، چنانچہ بنو تمیم پر حملہ کیا، وہ لوگ بھاگ گئے صرف ایک بڑھیا رہ گئی تھی جس کا نام حمراء تھا اس کو گرفتار کر کے زندہ آگ میں ڈال دیا۔ اتفاق یہ کہ ایک سوار جس کا نام عمار تھا آنکلا، عمرو نے پوچھا تو کیوں آیا؟ اس نے کہا میں کئی دن کا بھوکا تھا، دھواں اٹھتے دیکھا تو سمجھا کھانا ہوگا، عمرو نے حکم دیا کہ وہ بھی آگ میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ جریر نے اپنے شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

واخزاکم عمرو کما قد خزیتم   فادرک عمارا شقی البراجم

(۴) بچوں کو نشانہ بنا کر تیروں سے مارتے تھے، داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے ضمانت کے طور پر رکھے تھے، حذیفہ نے جو بنو ذبیان کا رئیس تھا ان بچوں کو لے جا کر ایک وادی میں کھڑا کیا اور ان کو نشانہ بنا کر تیر اندازی کرتا تھا، اتفاق سے کوئی لڑکا نہ مرا تو دوسرے دن پھر شکار کیا جاتا تھا چنانچہ دوسرے دن یہ تفریح انگیز جانبازی پھر شروع ہوتی تھی، اور لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے۔

(۵) قتل کا ایک طریقہ یہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے، غطفان اور عامر کی لڑائی میں اسی خوف سے حکم بن الطفیل نے اپنے آپ کو خود گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا جیسا کہ عقد الفرید میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

عرینہ کے لوگ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بظاہر اسلام لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام کو پکڑ لے گئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے، پھر ان کی آنکھوں اور زبان میں کانٹے چبھوئے یہاں تک کہ وہ تڑپ تڑپ کر مر گئے۔[2]

(۶) مرنے کے بعد بھی انتقام کا جوش طرح طرح کی نفرت انگیز صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا، مردوں کے ہاتھ پاؤں کان، ناک وغیرہ کاٹ لیتے تھے، ہند نے جنگ احد میں اسی رسم کے موافق حضرت حمزہؓ اور دیگر شہداء کے اعضا کاٹ کر ہار بنایا اور گلے میں پہنا تھا۔

(۷) منت مانتے تھے کہ دشمن پر قابو ہاتھ آئے گا تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے، سلافہ کے دو بیٹے جنگ احد میں عاصم کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، اس بنا پر سلافہ نے منت مانی کہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب ڈال کر پیئے گا۔[3] یہ بھی معمول تھا کہ مقتول کا کلیجہ نکال کر کھا جاتے تھے، ہند نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا لیا تھا اس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔

---

[1] مجمع الامثال ص [illegible]۔ [2] یہ واقعہ تمام کتب حدیث میں مذکور ہے لیکن یہ تفصیل طبقات ابن سعد جلد ۲ قسم اول صفحہ [illegible] میں ہے، مسلم میں صرف آنکھوں کا اندھا کرنا مذکور ہے۔ [3] طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ [illegible] (سریۂ مرثد بن ابی مرثد) [illegible]۔

(۸) حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر ڈالتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ عامر بن طفیل عرب کا مشہور بہادر اور رئیس ہوازن کہتا ہے،

بقرنا الحبالی من شنوءة بعدما خبطن بغيف الوهج فيها وخثعما

غزوات نبوی کے اسباب اور انواع

تفصیل مذکورۂ بالا کے بعد اب ہم اس واقعہ کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ غزوات نبوی کن اسباب سے وجود میں آئے۔ اور شارع علیہ السلام نے طریقۂ قدیم میں کیا اصلاحیں فرمائیں۔ مورخین نے غزوہ کے لفظ کو اس قدر وسعت دی ہے کہ امن و امان قائم رکھنے کے لئے دو چار آدمی بھی کہیں بھیج دیئے گئے تو اس کو بھی انھوں نے غزوہ میں شمار کر لیا۔ غزوہ کے علاوہ ایک اور لفظ ہے یعنی سریہ۔ غزوہ اور سریہ میں لوگوں کے نزدیک یہ فرق ہے کہ غزوہ میں کم سے کم آدمیوں کی ایک خاص تعداد ضروری ہے۔ سریہ میں کوئی قید نہیں، ایک آدمی بھی کہیں لڑائی کی دیکھ بھال کو بھیج دیا گیا تو یہ بھی سریہ ہے، بعضوں کے نزدیک غزوہ کے لئے یہ شرط ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس میں شرکت کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جن واقعات کو مورخین سریہ کہتے ہیں، وہ چند قسموں پر منقسم ہے۔

(۱) محکمۂ تفتیش یعنی دشمنوں کی نقل و حرکت کی خبر رسانی۔

(۲) دشمنوں کے حملہ کی خبر سن کر مدافعت کے لئے پیش قدمی کرنا۔

(۳) قریش کی تجارت کی روک ٹوک تاکہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت دیں۔

(۴) امن و امان قائم کرنے کے لئے تعزیری فوجیں بھیجنا۔

(۵) اشاعت اسلام کے لئے لوگ بھیجے گئے اور حفاظت کے خیال سے کچھ فوج ساتھ کر دی گئی، اس صورت میں تاکید کر دی جاتی تھی کہ تلوار سے کام نہ لیا جائے۔

غزوہ کی صرف دو صورتیں تھیں،

(۱) دشمنوں نے دار الاسلام پر حملہ کیا، اور ان کا مقابلہ کیا گیا۔

(۲) یہ معلوم ہوا کہ دشمن مدینہ پر حملہ کی تیاری کر رہے ہیں اور پیش قدمی کی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو لڑائیاں واقع ہوئیں یا اس قسم کے جو واقعات پیش آئے انہی مختلف اغراض سے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے چلے آئے تو قریش نے فیصلہ کیا کہ اسلام کو مٹا دیا جائے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اسلامی تحریک قائم رہی تو ایک طرف ان کے مذہب کو صدمہ پہنچے گا، دوسری طرف تمام عرب میں ان کا جو تفوق اور اثر اور مرجعیت عام ہے سب جاتا رہے گا۔ اس بناء پر ایک طرف تو قریش نے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کیں اور دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکا یا کہ یہ نیا گروہ اگر کامیاب ہو گیا تو تمہاری آزادی بلکہ ہستی بھی فنا ہو جائے گی۔

؎ یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ یہ بحث تمام تر تاریخی حیثیت سے ہے جہاد کی اصل حقیقت پر بحث کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گی۔

بیعت عقبہ میں جب انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا برادران من! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے اعلان جنگ ہے۔ اوپر ہم مسند دارمی وغیرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو تمام عرب مدینہ پر حملہ کے لئے تیار ہو گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ میں مہاجرین اور انصار رات کو سوتے تھے تو ہتھیار باندھ کر سوتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے (بحوالہ ابوداؤد) کہ قریش نے عبداللہ ابن ابی کو پیغام بھیجا تھا کہ محمد کو وہاں سے نکال دو ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمد دونوں کا فیصلہ کر دیں گے:

محکمہ تفتیش ان واقعات کی بنا پر ضرور تھا کہ اسلام اور دارالاسلام کی حفاظت کے لئے ضروری تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس سلسلہ کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ خبر رسانی اور جاسوسی کا انتظام وسیع پیمانہ پر کیا جائے چنانچہ ابتدا ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انتظام پر توجہ کی۔ وقتاً فوقتاً کثرت سے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں گو محض خبر رسانی کے لئے جاتی تھیں لیکن حفاظت کی غرض سے مسلح اور جمعیت کی صورت میں جاتی تھیں۔

یہی واقعات ہیں جن کو مؤرخین سرایا سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس کا مقصد کسی قافلہ کا لوٹنا یا کسی جماعت پر بے خبری کی حالت میں جا پڑنا ہوتا تھا۔ ایک بڑا قرینہ اس بات کا کہ ان دستوں کے بھیجنے سے حملہ کرنا مقصود نہیں ہوتا تھا یہ ہے کہ دستے اکثر دس دس، بارہ بارہ آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے سے آدمی لڑنے کے لئے نہیں بھیجے جا سکتے تھے مثلاً سنہ ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ کی طرف بھیجا اور ایک سربمہر تحریر دی کہ دو دن کے بعد اس خط کو کھولنا، دو دن کے بعد انہوں نے کھولا تو اس میں یہ الفاظ تھے۔

فسر حتی تنزل نخلة بين مكة والطائف فترصد بها قريشا وتعلم لنا من اخبارهم۔	برابر چلے جاؤ، یہاں تک کہ نخلہ میں جا کر ٹھہرو جو مکہ اور طائف کے بیچ میں ہے اور قریش کی دیکھ بھال کرتے رہو اور ان کی خبریں دریافت کرو۔
(طبری صفحہ ۱۲۷۴)	

مدافعت اس انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ جب کوئی مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتا تو فوراً خبر ہو جاتی اور پیش دستی کر کے فوجیں بھیج دی جاتیں۔ اکثر سرایا اسی قسم کے تھے اور چونکہ ہم ان کا ذکر زیادہ تر غلط انداز کراتے ہیں اس لئے مثال کے طور پر چند سرایا کا ذکر کرتے ہیں اور قدمائے ارباب سیر کی تصریحات سے ثابت کرتے ہیں کہ یہ مہمیں مدافعت کی غرض سے تھیں۔

سریہ غطفان

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان جمعا من بني ثعلبة ومحارب بذي امر قد	اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ قبیلہ بنو ثعلبہ اور محارب کی ایک فوج ذو امر تک اس

۱؎ باب فی خبر النضیر ۲؎ سریہ [illegible]

تجمعوا يريدون ان يصيبوا من اطراف رسول الله صلى الله عليه وسلم جمعهم رجل منهم يقال له دُعثور بن الحارث الخ (طبقات صـ۲۳)

غرض سے جمع ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف حملہ کرے، اس فوج کو ایک شخص نے فراہم کیا جس کا نام دعثور ہے۔

سریہ ابوسلمہ ۴ھ

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان طليحة وسلمة ابنی خويلد قد سارا فی قومهما ومن اطاعهما يدعونهم الى حرب رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ (ابن سعد صـ۳۰)

اس سریہ کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ طلیحہ اور سلمہ (پسران خویلد) دونوں اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔

سریہ عبداللہ بن انیس بغرض قتل سفیان بن خالد ۳ھ

وذلك انه بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان سفيان بن خالد الهذلى ثم اللحيانى وكان ينزل عرنة وما والاها فی ناس من قومه وغيرهم قد جمع الجموع لرسول الله صلى الله عليه وسلم۔

ابن انیس اس لئے بھیجے گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ سفیان بن خالد اپنے قبیلہ کو اور باہر کے لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لئے جمع کر رہا ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع

فاخبر اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ان انمار وثعلبة قد جمعوا لهم الجموع ..... فمضى۔

ایک جاسوس نے آکر صحابہ کو اطلاع کی کہ انمار اور ثعلبہ تم مسلمانوں سے لڑنے کیلئے فوجیں جمع کر رہے ہیں، آپ چل کھڑے ہوئے۔

غزوۂ دومۃ الجندل

قالوا بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان بدومة الجندل جمعا كثيرا وانهم يريدون ان يدنوا من المدينة (ابن سعد صـ۴۴)

رواۃ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں ایک گروہ کثیر جمع ہے اور مدینہ پر بڑھنا چاہتا ہے۔

غزوۂ مریسیع ۵ھ

ان بنی المصطلق من خزاعة وهم من حلفاء بنی مُدلج وكان راسهم وسيدهم الحارث بن ابی ضرار فسار فی قومه ومن قدر عليه من العرب فدعاهم الى حرب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجابوه (ابن سعد صـ۴۵)

قبیلہ بنو مصطلق خزاعہ کی شاخ ہے اور یہ لوگ بنو مدلج کے حلیف ہیں اور ان کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا وہ اپنی قوم کو اور نیز اور لوگوں کو جو اس کے قابو میں تھے لے کر چلا اور لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کی دعوت دی اور لوگوں نے منظور کی۔

سریۂ علی بن ابی طالب بطرف فدک ۶ھ

بلغ رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لهم جمعا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بنو سعد فدک میں یہود

یریدون ان یغزوا بهم خیبر۔	خیبر کی کمک کے لئے فوج جمع کر رہے ہیں۔

سریۂ بشیر بن سعد، شوال ۷ھ

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جمعاً من غطفان بالجناب قد واعدهم عیینة بن حصن لیکون معهم لیزحفوا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ غطفان کا ایک گروہ مقام جناب میں جمع ہے اور ان سے عیینہ بن حصن نے وعدہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہوگا۔

سریۂ عمرو بن العاص ذات سلاسل ۸ھ - یہ مقام مدینہ سے ۸ منزل ہے۔

بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جمعاً من قضاعة قد تجمعوا یریدون ان یدنوا الی اطراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ قضاعہ کا ایک گروہ جمع ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے۔

قریش کی تجارت کی روک ٹوک

بخاری کے حوالہ سے ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ قریش اور مسلمانوں میں جنگ چھڑنے سے پہلے، ابوجہل نے حضرت معاذ انصاری سے کعبہ میں یہ کہا تھا کہ اگر تم لوگ محمدؐ کو نکال نہ دو گے تو تم کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، انہوں نے جواب دیا تھا کہ تم نے اگر ہم کو کعبہ میں آنے سے روکا تو ہم تمہاری شام کی تجارت روک دیں گے (مکہ سے شام کو جو قافلہ جاتا تھا مدینہ اس کی راہ میں پڑتا تھا) کعبہ مسلمانوں کی خاص چیز تھی، کیونکہ کعبہ جس نے تعمیر کیا تھا مسلمان اسی کے دین (ابراہیمی) کے پیرو تھے، باوجود اس کے قریش نے مسلمانوں کو عموماً حج اور عمرہ سے روک دیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کا کاروانِ تجارت روک دیا جائے کہ وہ مجبور ہو کر مسلمانوں کو کعبہ کے اندر جانے کی اجازت دے دیں۔

بعض سرایا قبل حدیبیہ

سرایا کے ذکر میں اکثر جگہ اہل سیر لکھتے ہیں کہ "تعرض لعیر قریش" یعنی اس لئے فوجیں بھیجی گئیں یا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے کہ کاروانِ قریش کی روک ٹوک کی جائے۔ یہ تمام مہمات اسی غرض کے لئے تھیں لیکن چونکہ قریش تجارت کے لئے بھی ہتھیار بند ہو کر نکلتے تھے اور کم از کم سو دو سو کی جمعیت ساتھ لے کر جاتے تھے، اس لئے روک ٹوک میں کبھی کبھی مقابلہ پیش آ جاتا تھا اور جب قریش شکست کھا کر بھاگ جاتے تھے تو مالِ تجارت غنیمت میں ہاتھ آتا تھا، اہل سیر غلطی سے ان واقعات کو اس پیرایہ میں لکھتے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا ہی اصل مقصد تھا۔

یہی روک ٹوک تھی جس کی بناء پر قریش نے بالآخر حدیبیہ کی صلح کر لی، جس کی رو سے مسلمانوں کو چند خاص پابندیوں کے ساتھ حج کی اجازت مل گئی، قریش پر کاروانِ تجارت کی روک ٹوک کا اس قدر اثر پڑتا تھا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے مکہ میں جب اپنے اسلام کا اعلان کیا اور قریش نے اس جرم میں ان کو مارنا پیٹنا شروع کیا تو حضرت عباسؓ نے کہا کہ غفار کا قبیلہ تمہارے کاروانِ تجارت کے سرِ راہ واقع ہے، تمہاری اس حرکت سے برہم ہو کر وہ راستہ نہ روک دے، یہ تدبیر پوری کارگر ہوئی اور انہوں نے ڈر کر حضرت ابوذرؓ کو چھوڑ دیا، صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی خواہش کے مطابق جب یہ طے ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے مسلمانوں کو واپس دے

دیئے گئے اور ان نو مسلموں نے مکہ سے بھاگ کر شام کی راہ میں اپنا ایک مستقر قائم کر لیا اور قریش کی تجارت کی راہ کو غیر مامون کر دیا، تو قریش نے بالآخر اجازت دے دی کہ جو مسلمان چاہے مکہ سے مدینہ چلا جائے، ان کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ ہوگی (پھر آئندہ سال انھوں نے مسلمانوں کو حج و عمرہ کی اجازت بھی دے دی، اس کے بعد پھر کبھی مسلمانوں نے قریش کے کاروانِ تجارت سے تعرض نہیں کیا، بلکہ خود اس کی حفاظت کے لئے فوج بھیجتے تھے)

امن و امان قائم کرنا

اوپر گزر چکا ہے کہ عرب میں اس سرے سے اُس سرے تک مطلق امن و امان نہ تھا، تمام قبائل باہم لڑتے رہتے تھے، یہاں تک کہ محترم مہینوں میں بھی بہانے نکال کر مہینوں کے نام بدل دیتے تھے اور لڑتے تھے۔ تجارت بالکل غیر محفوظ تھی، قافلوں کا لوٹ لینا عام بات تھی جیسا کہ بدقسمتی سے آج بھی بدو قافلوں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے اس لئے بھیجا تھا کہ نہ صرف وعظ و پند بلکہ دست و بازو سے بھی تمام عرب بلکہ تمام دنیا میں امن و امان قائم کریں۔ کیونکہ خون ریزی اور قتل سے زیادہ کوئی چیز خدا کو ناپسند نہیں۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (مائدہ۔ ۵)	اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر معاوضہ (یا زمین میں فساد) کے قتل کر دیا اس نے تمام عالم کو قتل کر دیا۔
وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ۔ ۲۵)	اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔
اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ (مائدہ۔ ۵)	جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کا ایک ہاتھ اور دوسرے طرف کا پاؤں کاٹ ڈالا جائے یا جلا وطن کر دیئے جائیں۔

احادیث میں ہے کہ جب حضرت عدیؓ (حاتم طائی کے بیٹے) اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا کہ خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک شتر سوار صنعاء سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا یا بھیڑیئے کے سوا کہ اس کی بکریاں نہ اٹھا لے جائے، اور کسی کا ڈر نہ ہوگا، یہ ابو داؤد کے الفاظ ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ خدا اس کام کو اس طرح پورا کرے گا کہ ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور آ کر کعبہ کی زیارت کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا؛ حضرت عدیؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی

---

[1] فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۱۲ [2] صحیح بخاری باب ما لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و اصحابہ من المشرکین بمکۃ۔

[3] باب علامات النبوۃ۔

آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت حیرہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اس کو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔

بہت سے واقعات ہیں جن کو اہل سیر سرایا میں شمار کرتے ہیں، وہ محض تجارت کی آزادی اور عام امن و امان قائم کرنے کی غرض سے تھے، دو تین مثالیں ہم درج کرتے ہیں۔

سریہ زید بن حارثہ

۶ھ میں حضرت زیدؓ مال تجارت لے کر شام گئے، واپس آتے ہوئے جب وادی قریٰ کے قریب پہنچے تو بنو فزارہ کے لوگوں نے آ کر ان کو مارا پیٹا اور تمام مال و اسباب چھین لے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے تھوڑی سی فوج بھیجی، جس نے ان لوگوں کو سزا دی[1]۔

اسی سال میں اس سے پہلے حضرت دحیہ کلبیؓ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خط دے کر قیصر کے پاس بھیجا تھا، شام سے واپس آ رہے تھے۔ جب حسمیٰ پہنچے تو ہنید نے چند آدمیوں کے ساتھ ان پر ڈاکہ ڈالا اور جو کچھ ان کے پاس تھا سب چھین لیا، صرف بدن کے کپڑے (وہ بھی جو پرانے اور پھٹے تھے) چھوڑ دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے تدارک کے لئے حضرت زیدؓ کو بھیجا[2]۔

۵ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر لگی کہ دومۃ الجندل میں جو مدینہ منورہ سے شام کی جانب پندرہ منزل پر ہے ایک بڑا گروہ جمع ہو گیا ہے جو تاجروں کو ستاتا ہے اس کے تدارک کے لئے آپ خود تشریف لے گئے۔ مجمع منتشر ہو چکا تھا، لیکن آپ نے چند روز تک وہاں قیام کیا اور انتظام کے لئے تمام اطراف میں فوج کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بھیج دیں[3]۔

(یہ حالت کچھ مسلمان تاجروں کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد کفار قریش کے کاروان تجارت کی بھی اسی طرح حفاظت کی جاتی تھی۔

سریہ خبط یا سیف البحر

۸ھ میں قریش کا کاروان تجارت شام سے واپس آ رہا تھا، قبیلۂ جہینہ کی طرف سے اطمینان نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح کی سرداری میں تین سو مسلمانوں کی جمعیت جس میں حضرت عمرؓ بھی داخل تھے، مدینہ سے ۵ دن کی مسافت پر روانہ فرمایا، مسلمانوں نے اس فرض کو اس طرح انجام دیا کہ کھانے کو کچھ نہ رہا تو ایک ایک چھوہارے پر دن دن بھر گزر دیا[4]۔

صحیح مسلم میں یہ واقعہ مفصل مذکور ہے لیکن اس سریہ کی غرض مختلف راویوں نے مختلف بیان کی ہے (اصل راوی حضرت جابرؓ ہیں جو اس واقعہ میں شریک تھے، ایک روایت میں ہے کہ جہینہ سے لڑنے کو یہ مہم بھیجی گئی تھی[5] (کتب مغازی میں بھی یہی مذکور ہے)، دوسری روایتوں کے الفاظ یہ ہیں۔

(۱) نتلقیٰ عیر قریش۔ قافلہ قریش سے ملنے کے لئے (۲) نرصد عیر قریش۔ قافلہ قریش کی دیکھ بھال کے لئے۔

اس سے مقصود عام طور سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قافلہ قریش کے لوٹنے کے لئے، لیکن یہ صریح غلطی

---

[1] طبقات ابن سعد ص ۶۵، جلد غزوات [2] ابن سعد ص ۶۳ [3] ایضاً ص ۴۴ جلد غزوات [4] ابن سعد جزء مغازی سریہ خبط [5] صحیح مسلم باب اباحۃ میتۃ البحر، صحیح بخاری باب غزوہ سیف البحر میں بھی یہ روایتیں ہیں۔

ہے کیونکہ یہ زمانہ تو صلح حدیبیہ کا تھا، اس بنا پر ان الفاظ کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ مہم قافلہ قریش کی مخالفت اور عیینہ کو روکنے کے لئے بھیجی گئی تھی، حافظ ابن حجر کی بھی یہی تحقیق[1] ہے۔

غزوۂ غابہ

عرب کی جسارت اور رہزنی کی عادت کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ہر دفعہ ان کو سخت سے سخت سزائیں ملتی تھیں، تاہم وہ کسی طرح جرائم سے باز نہیں آتے تھے، یہاں تک کہ غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا ڈاکے ڈالتے تھے۔ سنہ ۵ھ میں قبیلہ فزارہ کی آبادی میں قحط پڑا، عیینہ بن حصن جو یہاں کا رئیس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط کرم سے اس کو اجازت دی کہ اسلامی حدود میں جو سیراب تھے مویشی چرائے، لیکن سنہ ۶ھ میں اسی عیینہ نے غابہ پر جو مدینہ کا چراگاہ تھا حملہ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیس اونٹنیاں لوٹ لیں، حضرت ابوذرؓ کے بیٹے جو چراگاہ کے محافظ تھے ان کو قتل کر دیا چنانچہ ارباب سیر اس واقعہ کو غزوۂ غابہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

عرب کا تمام ملک جو اسلام کا دشمن ہو گیا اور اخیر فتح مکہ تک کفار سے جو لڑائیاں جاری رہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ عرب کی معاش کا بڑا ذریعہ رہزنی، قطاع الطریق اور قتل و غارت تھا، اسلام ان چیزوں کو مٹاتا تھا اس لئے عرب اسلام سے بڑھ کر کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھ سکتے تھے۔

بے خبری میں حملہ کرنے کا سبب

عرب کے قبائل دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو کسی خاص مقام پر مستقل سکونت رکھتے تھے۔ دوسرے وہ جو خیمہ نشین اور بادیہ گرد تھے، ان کا کوئی خاص مستقر نہ تھا، جہاں چشمہ یا سبزہ زار دیکھا خیمے ڈال دیئے۔ جب وہاں بھی پانی نہ رہا تو خبر رساں کسی اور مقام کی خبر لاتے اور وہاں چل دیتے۔ ان قبائل کو عربی میں اصحاب الوبر کہتے ہیں، زیادہ تر جو قبائل ڈاکے ڈالا کرتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے اسی قسم کے قبائل تھے، ان کا انتظام اور ان کی روک ٹوک سخت مشکل تھی، ان کی تنبیہ کے لئے فوجیں جاتی تھیں تو یہ پہاڑوں پر بھاگ جاتے تھے اور قابو میں نہیں آتے تھے اس لئے مجبوراً جو فوجیں ان پر بھیجی جاتی تھیں، غفلت میں بھیجی جاتی تھیں کہ وہ بھاگ نہ جانے پائیں۔

اکثر سرایا کے بیان میں اہل سیر نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ فوجیں بھیجیں جو راتوں کو چلتی تھیں اور بے خبری کی حالت میں موقع پر پہنچ کر حملہ کرتی تھیں اور قبائل کو لوٹ لیتی تھیں، اس قسم کے واقعات تمام کتابوں میں کثرت سے منقول ہیں اور انہی واقعات سے یورپ کے لوگوں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ اسلام نے دشمن پر ڈاکہ ڈالنا اور لوٹ مار کرنا جائز رکھا ہے۔ اسی بنا پر مارگولیوس نے یہ استدلال کیا ہے کہ چونکہ بہت دنوں تک مسلمانوں کے پاس معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ قبائل پر بے خبری میں حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لایا کرتے تھے۔

لیکن جب زیادہ تفحص اور استقرا۔ اور کد و کاوش سے تمام واقعات بہم پہنچائے جائیں تو ثابت ہو گا کہ یہ ایک حملہ انہی قوموں پر کیا جاتا تھا جن کی نسبت یہ احتمال ہوتا تھا کہ ان کو خبر ہو گی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا کسی اور مقام پر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ان لوگوں کو خبر ہوتی اور وہ کسی طرف چل دیتے۔ اس قسم کے چند واقعات

---

[1] فتح الباری جز ۷ صفحہ ۳۹۵ و ۳۹۲

ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں آپ خود تشریف لے گئے اور بعض میں کچھ دستے بھیج دیے۔

غزوہ بنو سلیم س۲ھ (ابن سعد صفحہ ۲۴)

واغذّ السیر فوجدھم قد تفرقوا فی میاھھم فرجع۔

اور بہت تیزی سے بڑھ گئے لیکن وہ لوگ اپنے چشموں کی طرف چل دیتے تھے (اس لئے لوٹ آئے)

غزوہ ذات الرقاع س۴ھ

وھربت الاعراب الی رؤس الجبال۔

اور اعراب پہاڑ کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عکاشہ س۶ھ

ووجّہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عکاشۃ بن محصن الی الغمر فی اربعین رجلا فخرج سریعا یغذّ السیر فھربوا۔ (ص ۶۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عکاشہ بن محصن کو ۴۰ آدمیوں کے ساتھ بھیجا وہ بڑھ گئے۔ لیکن وہ لوگ بھاگ گئے۔

سریہ علیؓ بن ابی طالب الی بنی سعد س۶ھ

فبعث الیھم علیؓ ابن ابی طالب فی مائۃ رجل فسار اللیل وکمن النھار حتی انتھی الی الھمج فاغاروا علیھم فاخذ واخمس مائۃ بعیر والفی شاۃ وھربت بنو سعد بالظعن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو سو آدمیوں کے ساتھ بھیجا وہ راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ رہتے تھے یہاں تک کہ مقام ہمج پہنچ گئے پھر ان لوگوں پر حملہ کیا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں لوٹیں اور بنو سعد مستورات کو لے کر بھاگ گئے۔

غزوہ بنو لحیان س۶ھ

فسمعت بھم بنو لحیان فھربوا فی رؤس الجبال۔

بنو لحیان نے ان کی آمد کی خبر سنی تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔

سریہ عمرؓ بن خطاب بہ طرف تربہ س۷ھ

فکان یسیر اللیل ویکمن النھار فاتی الخبر ھوازن فھربوا وجاء عمر بن الخطاب محالھم فلم یلق منھم احدا۔

راتوں کو چلتے تھے اور دن کو چھپ جاتے تھے، ہوازن کو خبر لگ گئی تو وہ فرار ہوگئے، حضرت عمرؓ ان کے جائے قیام پر پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔

سریہ کعب بن عمیر ربیع الاول س۸ھ

اس سریہ کا یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ شخصوں کو شام کی طرف بھیجا۔ ذات اطلاح پہنچ کر ان لوگوں کو ایک بڑی جماعت نظر آئی۔ ان لوگوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے انکار کر دیا اور ان پر تیر اندازی شروع کی۔ مجبور ہو کر یہ لوگ بھی لڑے اور بالآخر سب شہید ہوئے، صرف ایک صاحب بچے، انھوں نے آکر خبر کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے انتقام لینا چاہا لیکن وہ لوگ یہ مقام چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ ابن سعد میں یہ الفاظ ہیں:

وھمّ بالبعث الیھم فبلغہ انھم قد ساروا

ان پر فوج بھیجنے کا ارادہ کیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ اور

الی موضع آخر۔ کہیں چلے گئے۔

اشاعت اسلام ان اغراض کے علاوہ اور جو سرایا بھیجے گئے ان کی غرض اشاعتِ اسلام ہوتی تھی لیکن چونکہ ملک میں امن و امان نہ تھا اور نیز دشمنوں نے اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا رکھی تھی، لیکن دعوت اسلام کے لئے جو سرایا جاتے تھے ان کی زندگی ہمیشہ معرضِ خطر میں رہتی تھی۔

سریہ بیر معونہ صفر ۴ھ میں ستر داعیانِ اسلام کی جماعت قبیلۂ کلاب رئیسِ قبیلہ کی دعوت پر اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجی گئی، لیکن بیرِ معونہ کے قریب قبائل رعل و ذکوان کے ہاتھ سے کل کی کل شہید ہوئی صرف ایک صاحب بچ گئے تھے جنھوں نے مدینہ آکر خبر کی۔

سریہ مرثد اسی زمانہ میں یعنی صفر ۴ھ میں قبیلہ عضل و قارہ نے تعلیم و ارشاد کے لئے دعاۃ اسلام کے بھیجنے کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عاصمؓ، حضرت خبیبؓ، حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد وغیرہ دس صاحبوں کو اس غرض کے لئے روانہ فرمایا، مقام رجیع میں پہنچ کر بنو لحیان نے ان پر حملہ کیا اور ایک کے سوا کل صاحب شہید کر دیئے گئے۔ ۶ھ میں بنو لحیان کی تعزیر کے لئے مہم گئی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، وہ سُن گُن پا کر بھاگ گئے تھے

سریہ ابن ابی العوجاء ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داعیوں کی ایک جماعت جس میں پچاس آدمی شامل تھے، قبیلہ بنی سلیم کے پاس بھیجی، اس گروہ کے سردار ابن ابی العوجاءؓ تھے، انھوں نے بنو سلیم کو دعوت دی لیکن ان لوگوں نے انکار کیا اور تیر اندازی شروع کی، یہ لوگ بھی لڑے لیکن پچاس آدمی قبیلہ کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ رئیسِ فوج یعنی ابن ابی العوجاء کے سوا سب شہید ہوگئے۔

سریہ کعب ابن عمیر ربیع الاول ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعبؓ بن عمیر غفاری کو پندرہ آدمیوں کی جمعیت کے ساتھ دعوتِ اسلام کے لئے ذات اطلاح کی طرف روانہ کیا، یہ مقام شام کے حدود میں وادی القریٰ سے اس طرف ہے۔ ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ کی لیکن جواب وہی تیغ و سنان تھا، یہاں تک کہ یہ جماعت بھی کل کی کل شہید ہوئی، صرف ایک صاحب بچ گئے جنھوں نے مدینہ میں آکر خبر کی۔

اس بنا پر اکثر دعوتِ اسلام کے لئے جو سرایا بھیجے جاتے تھے ان کے ساتھ حفاظت کی غرض سے کچھ فوج بھی ساتھ کر دی جاتی تھی لیکن اس صورت میں بتصریح افسروں کو کہہ دیا جاتا تھا کہ صرف اشاعتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی بھڑائی کی اجازت نہیں، مثلاً فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا اور ۳۰۰ آدمیوں کی جمعیت، ساتھ کر دی تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں۔

بعثه الی بنی جذیمة داعیًا الی الاسلام ولم یبعثه مقاتلا (۱۰۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا، دعوتِ اسلام کے لئے نہ لڑنے کے لئے۔

علامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں۔

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث فیما حول مکۃ السرایا تدعوا الی اللہ عز وجل ولم یامرھم بقتال۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں سرایا بھیجے دعوت اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے بھی حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رو ہو کر کہا "اے خدا! خالدؓ نے جو کچھ کیا میں اس سے بری ہوں"۔[1] تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے۔ پھر حضرت علیؓ کو بھیجا جنھوں نے ایک ایک بچہ کا، یہاں تک کہ کتوں کا خون بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی۔ یہ واقعہ باختلاف الفاظ[2] حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔

اسی طرح سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو جب ۳۰۰ سواروں کے ساتھ یمن بھیجا تو آپ نے فرمایا۔

فاذا نزلت بساحتھم فلا تقاتلھم حتی یقاتلوک (ابن سعد مغازی صفحہ ۱۲۲)

جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔

اسی سلسلہ میں وہ سرایا بھی داخل ہیں جو فتح مکہ کے بعد بت شکنی کے لئے اطراف ملک میں روانہ کئے گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام عرب میں مختلف قبیلوں کے الگ الگ بت خانے تھے۔ فتح مکہ کے بعد جب عام طور سے قبائل نے اسلام قبول کر لیا تو بتوں کی عظمت اور جباری کا جابلانہ اور وہم پرستانہ تخیل بعض قبائل سے دفعۃً نہ مٹ سکا۔ اب گو وہ ان کو لائق پرستش نہیں سمجھتے تھے تاہم ان کے دلوں پر ان اصنام کی دراتنۃً ایک مدت سے جو ہیبت بیٹھی ہوئی تھی اس سے یہ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان باطل پرستیوں کے مرکز کو خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیں جاہلوں کو یقین تھا کہ ان مقدس پتھروں کا ایک ریزہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا تو آسمان ٹوٹ پڑے گا، زمین پھٹ جائے گی، مصائب اور بلاؤں کا ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔

اہل طائف نے بیعت کرتے ہوئے شرط پیش کی تھی کہ ان کا بت خانہ ایک سال تک ڈھایا نہ جائے گا اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور نہ فرمایا تو دوسری شرط پیش کی کہ ہم ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں گے۔ بعض اور نومسلم قبائل بھی اس ادائے فرض میں جھجکتے تھے، اس بنا پر ان مقامات میں چند راسخ العقیدہ اور صحیح الفہم مسلمان بھیجے گئے کہ وہ ان کی طرف سے اس فرض کو انجام دیں، چنانچہ سریۂ خالدؓ ابن ولید بت خانہ عزیٰ، سریۂ عمروؓ بن العاص بت خانہ سواع، سریۂ سعد بن زید اشہلی بت خانہ مناۃ، سریۂ ابو سفیان و مغیرہ بن شعبہ بت خانہ لات، سریۂ جریر بت خانہ ذی الخلصۃ، سریۂ طفیل بن عمرو دوسی بت خانہ ذی الکفین اور سریۂ علی بن ابی طالب بت خانہ فلس کے توڑنے کو روانہ کئے گئے۔[3]

جنگی اصلاحات

جنگ افعال انسانی کا بدترین منظر ہے۔ عرب کی جنگ تو ظلم و توحش، قساوت، سفاکی، بے دردی اور درندگی کا تماشاگاہ تھی۔ لیکن اعجاز نبوت سے یہی چیز تمام نقائص سے پاک ہو کر ایک مقدس فرض انسانی بن گئی۔ کسی ملک میں جب ہزاروں برس سے ظلم و غارت گری متوارث چلی آتی ہے تو

---

[1] تاریخ طبری صفحہ ۱۶۵۱ و ۲۰۰ [2] صحیح بخاری غزوہ ذی الخلصۃ [3] اس باب کی تمام تر واقعات ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہیں۔

شروع شروع میں مہذب سے مہذب حکومت کو بھی چند روز قدیم اصول اور طرزِ عمل کو اختیار کرنا پڑتا ہے جس کو طبی اصطلاح میں علاج بالمثل کہہ سکتے ہیں، آغازِ اسلام میں حملہ آور جنگ کے وقت بعض واقعات اس قسم کے ملتے ہیں جو پہلے سے رائج تھے. مثلاً جاہلیت میں دستور تھا کہ دشمن پر بے خبری کی حالت میں جا پڑتے تھے اور قتل و قید کرتے تھے. اسلام نے اس طریقہ کو مٹایا لیکن ابتداء ہی میں اگر اس پر عمل کیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ دشمن ہمیشہ دفعۃً حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا کرتے اور مسلمان اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکتے، یا کرتے تو پہلے ان کو خبر کرتے جس کے بعد وہ کہیں ٹل جاتے، یا اپنی حفاظت کا سامان کر لیتے. لیکن جس قدر اسلام کو زور و قوت حاصل ہوتی گئی اسی قدر وہ قدیم طریقے مٹتے گئے. یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سب کا خاتمہ ہو گیا. اسلام سے پہلے جنگ کا جو طریقہ تھا اور جس قسم کے وحشیانہ افعال عمل میں آتے تھے ان کو ہم تفصیل سے اُوپر لکھ آئے ہیں. ان صفحات کو دوبارہ سامنے رکھ لو اور اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا اصلاحیں کیں؟ اس بات کو قطعاً روک دیا کہ عورتیں، بوڑھے بچے، صغیر السنّ، نوکر، خادم لڑائیوں میں قتل کیے جائیں. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی مہم پر فوج بھیجی جاتی تو سردارِ فوج کو جو احکام دیے جاتے ان میں ایک یہ لازمی حکم بھی ہوتا[2]. ابوداؤد میں یہ حکم ان الفاظ میں مذکور ہے۔

لاتقتلوا شیخا فانیا ولا طفلا ولا صغیرا ولا امرأۃ۔

کسی کہن سال بڈھے کو، کمسن کو، عورت کو قتل نہ کرو۔

غزوات میں بھی کسی عورت کی لاش آپؐ کی نظر سے گزرتی تو آپؐ نہایت سختی سے منع فرماتے، صحیح مسلم میں متعدد[1] حدیثیں اس کے متعلق مذکور ہیں۔

اسلام سے پہلے معمول تھا کہ دشمن کو گرفتار کر لیتے تو کسی چیز سے باندھ کر اس کو تیروں کا نشانہ بناتے یا تلوار سے قتل کرتے، عربی میں اس طریقہ کو صبر کہتے تھے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روک دیا۔ ایک دفعہ حضرت خالدؓ کے صاحبزادے (عبدالرحمٰن) نے ایک لڑائی میں چند آدمیوں کو گرفتار کر کے اسی طرح قتل کرایا تھا. حضرت ابوایوب انصاریؓ نے سنا تو کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا وہ اس سے منع فرماتے تھے. خدا کی قسم! میں مرغ کو بھی اس طرح مارنا جائز نہیں رکھتا. عبدالرحمٰن نے اسی وقت کفارۂ گناہ کے طور پر چار غلام آزاد کر دیے[3].

لڑائیوں میں عہد کی کچھ پابندی نہ تھی. جنگِ معونہ وغیرہ میں کفار نے مسلمانوں کے ساتھ یہی معاملہ کیا یعنی قول و قسم لے کر مسلمانوں کو ساتھ لوا گئے اور گھر لے جا کر قتل کر ڈالا. قرآن مجید میں انہی واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ (توبہ-۲)

کسی مسلمان کے متعلق وہ نہ قسم کا لحاظ رکھتے ہیں نہ ذمہ داری کا، ان کی قسم، قسم نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تاکید کی کہ جو عہد کیا جائے ہر حال میں اس کی پابندی کی جائے. قرآن مجید

---

[1] صحیح مسلم باب الجہاد [2] کتاب الجہاد فی باب فی دعاء المشرکین، ابوداؤد میں یہ باب کتاب الجہاد میں مکرر ہے یہاں پہلا باب مراد ہے۔

[3] ابوداؤد جلد ۲ صفحہ۱ (باب قتل الاسیر بالنبل) ص۹۔

میں اس کے متعلق جا بجا تاکیدی اور صاف احکام ہیں، عہدِ نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں پابندیٔ عہد کی حیرت انگیز مثالیں ملتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے تھے تو بہت سے صحابہ مجبوریوں کی وجہ سے مکہ ہی میں رہ گئے تھے، ان میں حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد بھی تھے، جنگِ بدر کے موقع پر حضرت حذیفہؓ بن یمان اور ان کے والد کہیں سے آ رہے تھے، کفار نے ان کو پکڑ لیا کہ تم مدینہ جا کر پھر ہمارے مقابلہ کو آؤ گے، انھوں نے کہا ہمارا مقصد صرف مدینہ جانا ہے۔ کفار نے اُن سے عہد لے کر چھوڑ دیا۔ یہ لوگ مقامِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور یہ دیکھ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے مصروفِ جنگ ہیں، خود بھی اس سعادت کی آرزو کی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو باز رکھا کہ تم معاہدہ کر چکے ہو۔

ابو رافع کو قریش نے قاصد بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا۔ بارگاہِ نبوت میں آکر اُن پر یہ اثر ہوا کہ مسلمان ہو گئے اور عرض کی اب میں کافروں میں واپس نہ جاؤں گا، آپؐ نے فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کو روک لینا عہد کے خلاف ہے۔ اس وقت واپس جاؤ پھر آجانا۔

صلحِ حدیبیہ میں جب حضرت ابو جندلؓ پابہ زنجیر آئے اور بدن کے داغ دکھائے کہ قریش مجھ کو قید کرکے اس طرح ستاتے ہیں، آپؐ نے فرمایا ہاں! لیکن قریش سے معاہدہ ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ آئے گا تو ہم قریش کے پاس بھیج دیں گے۔ اس پر حضرت ابو جندلؓ نے رو کر تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ لوگ جوشِ رقت سے بیقرار ہو گئے اور قریب تھا کہ قابو سے باہر ہو جائیں، حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے۔ حضرت ابو بکرؓ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار جاتے تھے، یہ سب کچھ تھا لیکن پابندیٔ عہد کی قیمت ان سب خطرات سے زیادہ تھی، حضرت ابو جندلؓ کو پابہ زنجیر واپس جانا پڑا۔

اسلام سے پہلے قاصدوں کا قتل کر دینا ممنوع نہ تھا، صلحِ حدیبیہ سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے پاس جو قاصد بھیجا تھا، قریش نے اس کی سواری کے اونٹ کو مار ڈالا اور قاصد کو بھی قتل کر دینا چاہا، لیکن باہر والوں نے بچا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قاصد کبھی قتل نہ کئے جائیں، مسیلمہ نے جب قاصد بھیجا اور اُس نے گستاخانہ گفتگو کی تو آپؐ نے فرمایا کہ قاصد کا قتل کرنا دستور نہیں ورنہ تو قتل کر دیا جاتا۔ مؤرخین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ اس دن سے یہ ایک قاعدہ بن گیا کہ قاصد قتل نہیں کئے جاتے تھے۔

اسیرانِ جنگ کے ساتھ عرب نہایت بُرا سلوک کرتے تھے اور تمام قوموں میں بھی یہی طریقہ جاری تھا جنگِ صلیبی میں یورپین سلطنتیں جب مسلمانوں کو لڑائیوں میں گرفتار کرتی تھیں تو ان سے جانوروں کی طرح کام لیتی تھیں علامہ ابن جبیر جب حروبِ صلیبیہ کے زمانے میں عسقلان سے گزرے ہیں تو یہ حالت دیکھ کر تڑپ گئے چنانچہ لکھتے ہیں،

لہ ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۲۳ (باب فی الامام یستجن بہ فی العہود)

ومن الفجائع التی یعاینہا من حلّ بلادھم اسری المسلمین یرسفون فی القیود ویصرفون فی الخدمة الشاقة واسیرات المسلمات کذلک فی اسوقہن خلاخل الحدید فتتفطر لہم الافئدة۔	اور منجملہ ان درد انگیز حالات کے جو ان شہروں میں نظر آتے ہیں اسیران اسلام ہیں جو بیڑیاں پہنے نظر آتے ہیں اور جن سے سخت محنت شاقہ لی جاتی ہے اور اسی طرح مسلمان عورتیں پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے پہنے سخت محنت شاقہ سے کام کرتی ہیں جن کو دیکھ کر دل پھٹا جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسیران جنگ کی نسبت تاکید کی کہ اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچنے پائے، اسیران بدر کو جب آپ نے صحابہ کے حوالے کیا تو تاکید کی کہ کھانے پینے کی تکلیف نہ ہونے پائے، چنانچہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کرتے تھے اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے تھے، غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر تھے سب چھوڑ دیئے گئے اور آپ نے ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے مصر کے کپڑے کے عنایت فرمائے۔ چنانچہ ابن سعد نے اس واقعہ کی تصریح کی ہے۔

حاتم طائی کی بیٹی جب گرفتار ہو کر آئی تو آپ نے عزت و حرمت سے مسجد کے ایک گوشہ میں اس کو مقیم کیا اور فرمایا کہ کوئی تمہارے شہر کا آجائے تو میں اس کے ساتھ تم کو رخصت کردوں، چنانچہ چند روز کے بعد سفر کا سامان کر کے ایک شخص کے ساتھ یمن بھجوا دیا۔

قرآن مجید میں جہاں خدا نے بندگان خاص کے اوصاف بتائے ہیں وہاں فرمایا ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔ (دہر-۱)	اور یہ لوگ خدا کی محبت میں مسکین کو، یتیم کو اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

معمول تھا کہ جب کسی قوم پر حملہ ہوتا تو اہل فوج چاروں طرف دُور دُور پھیل جاتے جس سے راستے بند ہو جاتے گھروں میں آنا جانا مشکل ہو جاتا۔ راہگیروں کا مال و متاع لٹ جاتا، یہ طریقہ ایک مدت سے چلا آتا تھا، ایک لڑائی میں قدیم دستور کے مطابق یہی حرکتیں لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ آپ نے منادی کرا دی کہ جو شخص ایسا کرے گا اس کا جہاد، جہاد نہیں۔

ابوداؤد میں (حضرت معاذ بن انس) سے روایت ہے۔

غزوت مع نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوة کذا وکذا فضیّق الناس المنازل وقطعوا الطریق فبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم منادیاً ینادی فی الناس انّ من ضیّق منزلاً وقطع طریقاً فلا جہاد لہ۔[2]	میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر ان کو تنگ کیا، لوٹا مارا، آپ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کی کہ جو دوسروں کو گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حکم دیا کہ لوگ ادھر اُدھر پھیل نہ جایا کریں تو لوگ اس

---

[1] رحلہ ابن جبیر طبع یورپ ۱۹۰۷ء ص ۳۰۰ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۳۴۳ باب ما یؤمر من انضمام العسکر و سعتہ

طرح سمٹ کر پڑاؤ ڈالتے تھے کہ ایک چادر تان دی جاتی تو سب اس کے نیچے آجاتے۔

سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مال غنیمت کے ساتھ لوگوں کو اس قدر شغف تھا کہ لڑائیوں کا بہت بڑا سبب یہی ہوتا تھا۔ اس کی اصلاح میں نہایت تدریج سے کام لینا پڑا، جاہلیت میں تو غنیمت محبوب ترین چیز تھی تعجب یہ ہے کہ اسلام میں بھی ایک مدت تک اس کو ثواب کی چیز سمجھتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

یرید الجهاد فی سبیل الله وهو یبتغی عرضاً من عرض الدنیا فقال النبی صلی الله علیه وسلم لا اجر له فاعظم ذلک الناس وقالوا للرجل عد لرسول الله صلی الله علیه وسلم فلعلک لم تفهمه (ابوداؤد جلد ا ص ۳۴۲ باب فیمن یغزو ویلتمس الدنیا) ج	ایک شخص خدا کی راہ میں جہاد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ دنیاوی فائدہ بھی چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا، یہ لوگوں کو بہت عجیب معلوم ہوا اور لوگوں نے اس شخص سے کہا کہ پھر جاکر پوچھ، غالباً تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب نہیں سمجھا۔

بار بار لوگ دوبارہ دریافت کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور ان کو یقین نہیں آتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہوگا۔ بالآخر جب آپ نے تیسری دفعہ بھی یہی کہا کہ لا اجر لہ یعنی اس کو کچھ ثواب نہیں ملے گا تب لوگوں کو یقین لایا۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو ایک قبیلہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔ ان میں سے ایک صاحب صف سے آگے نکل گئے۔ قبیلہ والے روتے ہوئے آئے انھوں نے کہا لا الٰہ الا اللہ کہو تو بچ جاؤ گے۔ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور حملہ سے بچ گئے۔ اس پر ساتھیوں نے ان کو ملامت کی کہ تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔ ابوداؤد میں صحابی کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے۔

فلامنی اصحابی وقالوا احرمتنا الغنیمة۔ (ابوداؤد باب ما یقول اذا اصبح کتاب الادب)	مجھ کو میرے ساتھیوں نے ملامت کی، تم نے ہم لوگوں کو غنیمت سے محروم کر دیا۔

جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر ان کی شکایت کی تو آپ نے ان کی تحسین کی اور فرمایا کہ تم کو ایک ایک آدمی (جو چھوڑ دیئے گئے) کے بدلے اتنا اتنا ثواب ملے گا (ابوداؤد)۔

قرآن مجید میں غنیمت کی نسبت "متاع دنیوی" کا لفظ آتا تھا اور اس کی طرف انہماک اور دل دادگی پر ملامت کی جاتی تھی، جنگ احد میں جب اس بنا پر شکست ہوئی کہ کچھ لوگ کفار کا مقابلہ چھوڑ کر غنیمت میں مصروف ہو گئے تو یہ آیت اتری۔

مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ (آل عمران ۱۶۰)	تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلب گار تھے اور کچھ آخرت کے۔

جنگ بدر میں لوگوں نے جب اجازت سے پہلے غنیمت لوٹنی شروع کر دی (یا) بقول بعض مفسرین فدیہ کی خواہش سے لوگوں کو گرفتار کیا تو یہ آیت اتری۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایؤمر من انضمام العسکر

تُرِیۡدُوۡنَ عَرَضَ الدُّنۡیَا وَاللّٰہُ یُرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ (انفال ۹) تم لوگ دنیا کی پونجی چاہتے ہو، اور خدا آخرت چاہتا ہے۔

باوجود ان تمام تصریحات اور بار بار کی تاکید کے غزوۂ حنین میں جو ۸ھ میں واقع ہوا تھا اس وجہ سے شکست ہوئی کہ لوگ غنیمت کے لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔ صحیح بخاری غزوۂ حنین کے ذکر میں ہے۔

فاقبل المسلمون علی الغنائم واستقبلونا بالسہام۔ تو مسلمان غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور کافروں نے ہم کو تیروں پر رکھ لیا۔

اس بنا پر موقع بہ موقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلہ کو زیادہ تصریح سے بیان فرماتے تھے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کوئی شخص غنیمت کے لئے، کوئی نام کے لئے، کوئی اظہار شجاعت کے لئے جہاد کرتا ہے، کس کا جہاد خدا کی راہ میں سمجھا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا۔[1] جو شخص اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا بول بالا ہو۔

بالآخر آپ نے یہ فرما دیا کہ گو جہاد کسی نیت سے کیا جائے لیکن اگر مجاہد مال غنیمت قبول کرتا ہے تو دو تہائی ثواب کم ہو جاتا ہے پورا ثواب اسی وقت ملتا ہے جب غنیمت کو مطلق ہاتھ نہ لگائے، صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

ما من غازیۃ تغزو فی سبیل اللہ فیصیبون الغنیمۃ الا تعجلوا ثلثی اجرھم من الاخرۃ ویبقی لھم الثلث وان لم یصیبوا غنیمۃ تم لھم اجرھم۔[2] جو غازی خدا کی راہ میں لڑتا ہے اور مال غنیمت لیتا ہے وہ آخرت کے ثواب کا دو ثلث یہیں لے لیتا ہے اور آخرت میں اس کا حصہ صرف ایک تہائی رہ جاتا ہے البتہ اگر غنیمت مطلق نہ لے تو اس کو آخرت میں پورا اجر ملے گا۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ غنیمت جو سب سے محبوب چیز تھی دلوں سے اتر گئی اور جہاد سے صرف اعلائے کلمۃ اللہ مقصود رہ گیا۔ واقعہ ذیل سے اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

حضرت واثلہؓ بن الاسقع ایک صحابی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک کی مہم پر روانہ ہوئے تو ان کے پاس سامان نہ تھا، مدینہ میں آواز دیتے پھرے کہ کوئی ہے جو ایسے شخص کو سواری دے کہ جو کچھ مال غنیمت ہاتھ آئے گا اس میں وہ برابر کا شریک ہو گا۔" ایک انصاری نے سواری اور خوراک سب اپنے ذمہ لی، اس مہم میں کئی اونٹ ہاتھ آئے، حضرت واثلہؓ واپس آکر انصاری کے پاس سب اونٹ لے گئے اور کہا، یہ وہ اونٹ ہیں جن کی نسبت میں نے شرط کی تھی کہ آپ بھی اس میں حصہ دار ہوں گے، انہوں نے کہا" ان کو تم ہی لو، میرا شرکت سے کچھ اور ارادہ تھا یعنی اونٹ میں نہیں بلکہ جہاد کے ثواب میں شرکت مقصود تھی۔[3]

دوران جنگ میں دشمن کے مال اور جائیداد کا لوٹنا بھی عام رواج تھا خصوصاً جب کہ رسد ٹھہر جاتی تھی اور کھانے پینے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا تو ہر حال میں یہ فعل جائز سمجھا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی

---

[1] بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا و صحیح مسلم کتاب الامارۃ ج ۲۔ [2] صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب بیان ثواب من غزا فغنم و ابوداؤد باب فی السریہ ج ۲۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی باب الرجل یکری دابتہ علی النصف او السہم ج ۲۔

اور سرے سے اس طریقہ کو روک دیا، ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے اور نہایت تنگ حالی اور مصیبت پیش آئی۔ اتفاق سے بکریوں کا ریوڑ نظر آیا، سب ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپ موقع پر تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا اور ہانڈیاں اُبال کھا رہی تھیں، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی آپ نے اس سے ہانڈیاں اُلٹ دیں اور سارا گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا "لوٹ کا مال مُردار گوشت کے برابر ہے"۔[1]

لڑائی عبادت بن گئی

اسلام نے جہاد کو جو بظاہر ایک ظالمانہ کام ہے اس قدر پاک اور منزہ کر دیا کہ وہ افضل ترین عبادت بن گئی، جہاد کا مقصد یہ قرار دیا کہ مظلوموں کو ظلم سے بچائے۔ جابر اور ظالم لوگ آدمیوں پر دست ستم دراز نہ کرنے پائیں۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ (حج - ۶)	جن لوگوں سے لوگ لڑائی کرتے ہیں ان کو اس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ ان پر ظلم کیا گیا اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے وہ لوگ جو اپنے گھروں سے صرف اس بنا پر نکال دیئے گئے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب خدا ہے۔

ملک میں جو ہمیشہ فتنہ و فساد برپا رہتا تھا اور لوگ امن و امان سے بسر نہیں کر سکتے تھے۔ جہاد اس غرض سے تھا کہ فساد کو مٹا دے اور امن قائم کر دے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (انفال - ۵)	اور ان سے لڑو تاکہ فتنہ نہ رہے۔

جو لوگ خدا پر اور جزا و سزا پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اس وجہ سے اُن کے نزدیک ہر قسم کے ظلم و ستم جائز تھے اور اُن کو جائز و ناجائز کی کچھ تمیز نہ تھی جہاد سے اُن کا زیر کرنا اور ان لوگوں کو ان کے ظلم سے بچانا مقصود قرار دیا گیا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (توبہ - ۴)	ان لوگوں سے لڑو جو نہ خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ قیامت پر اور جن کاموں کو خدا اور رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اس کو حرام نہیں سمجھتے

جہاد میں فتح پانے اور زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مقصد یہ نہیں قرار دیا گیا کہ فاتح مال و دولت اور حکومت کا لطف اٹھائیں بلکہ یہ غرض قرار دی گئی کہ لوگوں کو عبادت و ریاضت اور فقراء کی دستگیری کی تلقین کریں اور اچھی باتیں پھیلائیں اور بُرے کاموں سے لوگوں کو روک دیں۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج - ۶)	وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین پر قبضہ دیں تو وہ نماز کے پابند ہوں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بُری باتوں سے روکیں گے۔

کسی ملک کی فتح سے جو مال و دولت ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا خاص حصہ ہوتا تھا جس کو وہ اپنے مصارف خاص میں

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد جلد ثانی (باب فی النہی عن النہبیٰ اذا کان فی الطعام قلّة) نسخ

استعمال کرتا تھا اور دربار کے امرا درجہ بدرجہ اس سے مستفید ہوتے تھے لیکن اس کا مصرف یہ قرار دیا۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ (انفال - ۵)	اور جان لو کہ تم کو جو کچھ مال غنیمت ملے تو اس کا پانچواں حصہ خدا کا ہے، اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا۔

جہاد نہ صرف حقیقت کے لحاظ سے بلکہ صورۃً بھی عبادت بنا دیا گیا۔ مجاہدین کو تاکید تھی کہ عین جنگ کے وقت بھی خدا کا نام لیتے رہیں۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (انفال - ۶)	مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تم کامیاب ہو گے۔

نماز میں جس طرح اٹھتے بیٹھتے تکبیر و تسبیح یعنی اللہ اکبر اور سبحان ربی الاعلیٰ کہتے ہیں جہاد میں بھی یہی حکم تھا، حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ ہم جب کسی بلندی پر چڑھتے تھے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور جب نیچے اترتے تو سبحان اللہ کہتے تھے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تھے تو تین دفعہ اللہ اکبر کہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد پر جا رہے تھے، صحابہ زور زور سے تہلیل و تکبیر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس قدر شور سے نہیں کہنا چاہیے کیونکہ خدا جس کو تم پکارتے ہو وہ بہرہ نہیں ہے[2] بعینہٖ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو نماز میں پکار کر قرآن پڑھنے سے منع فرمایا تھا۔

نکتہ:- ابوداؤد میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جہاد میں دستور تھا کہ چڑھائیاں آتی تھیں تو تکبیر کہتے تھے اور اتار آتا تھا تو تسبیح پڑھتے تھے، نماز بھی اسی اصول پر قائم کی گئی یعنی سر اٹھاتے ہیں تو اللہ اکبر اور سجدہ میں جاتے ہیں تو سبحان اللہ کہتے ہیں۔ اس روایت میں ادائے مطلب میں ذرا فرق آگیا ہے، جہاد کے اصول پر نماز نہیں قائم کی گئی بلکہ جہاد میں نماز کا طریقہ ملحوظ رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ نماز ابتدائے اسلام سے وجود میں آئی اور جہاد کی تاریخ ہجرت کے بعد سے شروع ہوتی ہے، بہر حال اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ نماز اور جہاد دونوں میں ایسی مشابہت تھی کہ ایک کو اصل اور دوسرے کو اس کی نقل سمجھتے تھے۔[3]

غرض وہی جنگ جو ہر طرح کے ظلم و ستم اور جہالت و وحشت کا مجموعہ تھی، اسلام کی تعلیم ربانی نے اس کو اعلائے کلمۃ اللہ، قیام امن، رفع مفاسد، نصرت مظلوم اور تسبیح و تہلیل کی صورت میں بدل دیا۔

فاتح اور پیغمبر کا امتیاز

جہاد کے معرکوں میں آپ کے ہاتھ میں گو تیغ و سپر اور جسم مبارک پر خود و مغفر ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی پیغمبر اور سپہ سالار کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ عین اس وقت جب کہ معرکہ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے

---

[1] اس پانچویں حصہ کے سوا باقی تمام مال غنیمت مجاہدین کا حق ہے [2] کتاب الجہاد باب التکبیر عند الحرب [3] ابوداؤد کتاب الجہاد در باب مایقول اذا سافر، جلد ا صفحہ ۵، مطبوعہ مجتبائی، اصل عبارت یہ ہے وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذا ہبطوا سبحوا فوضعت الصلوٰۃ علیٰ ذلک۔

ہیں جس طرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمن کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہیں، عین اس حالت میں آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ دعا آسمان کی طرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں ہے معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدتِ جنگ میں تین بار خبر لینے آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا، فاتحِ بے سلاح زمین سے مٹھی بھر خاک اٹھا لیتا ہے اور دشمن کی طرف پھینکتا ہے، دفعۃً فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے۔

حنین میں دشمن نے دفعۃً اس زور سے حملہ کیا کہ تمام فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ۱۲۰۰۰ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی پہلو میں نہیں، سامنے سے دس ہزار قدر انداز تیر برساتے آرہے ہیں، لیکن مرکزِ حق اپنی جگہ پر قائم ہے اور ایک پُر جلال آواز آرہی ہے۔

انا النبی لا کذب۔ میں پیغمبر ہوں اور جھوٹا پیغمبر نہیں ہوں۔

عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں، ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہاتھ پاؤں کٹ کٹ کر زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آرہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعۃً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں، سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوفِ نماز میں رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، شور و جانبازی، غیظ و غضب اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے، صفیں دو دو رکعتیں ادا کر کے دشمن کے مقابل پر چلی جاتی ہیں، ان کے بجائے لڑنے والے نماز میں شامل ہو جاتے ہیں، یہ دو رکعتیں ادا کر کے پھر اپنی پہلی خدمت پر واپس چلے جاتے ہیں اور مشغولین جنگ آکر بقیہ نمازیں پوری کر لیتے ہیں، لیکن یہ تبدیلیاں فوجوں میں ہوتی ہیں، امام (رسولؐ) اول سے آخر تک عبادتِ الٰہی میں مصروف ہے۔

تعلیم و ارشاد، ہدایت و تلقین، تہذیب و تزکیہ کا کام ہر وقت جاری ہے، عین فتح کے وقت جب کہ مجاہدین فتح کے نشہ میں چور ہیں، مالِ غنیمت فروخت ہو رہا ہے، ایک ایک کو ہزاروں کی رقمیں وصول ہو رہی ہیں ایک صحابی خوش خوش آتے ہیں اور جوشِ مسرت میں کہتے ہیں، یا رسول اللہ! آج میں نے مالِ غنیمت سے جس قدر نفع اٹھایا کبھی نہیں اٹھایا تھا، پورے تین سو اوقیہ ہاتھ آئے (اوقیہ دس روپیہ کے برابر ہوتا ہے) آپ فرماتے ہیں کہ میں اس سے بھی زیادہ نفع بتاؤں؟ وہ بڑے شوق سے پوچھتے ہیں کیا؟ ارشاد ہوتا ہے نماز فرض کے بعد دو رکعتیں

تَمَّ الْمُجَلَّدُ الْاَوَّلُ مِنَ السِّیْرَۃِ النَّبَوِیَّۃِ عَلٰی صَاحِبِہَا الصَّلٰوۃُ وَالتَّحِیَّۃُ

لہ چند خاص ص۔ کہ ابو داؤد، باب التجارۃ فی الغزو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کی امن کی زندگی

۹ھ، ۱۰ھ اور ۱۱ھ

قیامِ امن، اشاعتِ اسلام، تاسیسِ خلافت، تکمیلِ شریعت

قیامِ امن[1]

گزشتہ ابواب پڑھ لینے کے بعد یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں رہتی کہ اس وقت گو فطری صلاحیت و استعداد کی رُو سے عرب کا ذرہ ذرہ ستارہ تھا لیکن وہ کسی ایک نظامِ شمسی کے تابع نہ تھا۔ یوں تو تمام جزیرۂ عرب ایک واحد ملک اور ایک متحد قوم تھا تاہم نہ تو کبھی تاریخ نے اس کے مُلکی و قومی اتحاد کا نشان دیا اور نہ سیاسی حیثیت سے کسی زمانہ میں تمام عرب ایک پرچم کے نیچے جمع ہوا، جس طرح گھر گھر کا الگ الگ خدا تھا، اسی طرح قبیلہ قبیلہ کے جدا رئیس تھے۔ جنوبی عرب میں حمیری اذوا۔ اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، شمالی عرب میں بکرؔ، تغلبؔ، شیبانؔ، ازدؔ، قضاعہؔ، کندہؔ، لخمؔ، جذامؔ، بنو حنیفہؔ، طےؔ، اسدؔ، ہوازنؔ، غطفانؔ، اوسؔ، خزرجؔ، ثقیفؔ اور قریشؔ وغیرہ کی الگ الگ ٹولیاں تھیں، جو دن رات خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتی تھیں، بکرؔ و تغلبؔ کی چہل سالہ جنگ کا ابھی ابھی خاتمہ ہوا تھا کندہ اور حضرموت کے قبائل کٹ کٹ کر فنا ہو چکے تھے، اوس و خزرج لڑ لڑ کر اپنے ایک ایک سردار کو کھو چکے تھے خاص حرم اور اشہر حرم میں بنو قیس اور قریش کے درمیان حرب فُجّار کا سلسلہ جاری تھا اور اس طرح تمام ملک معرکہ کار زار بنا ہوا تھا۔ پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار جرائم پیشہ قبائل آباد تھے، تمام ملک قتل و غارت گری اسفاکی خونریزی کے خطرات میں گھرا تھا، تمام قبائل غیر مختتم سلسلۂ جنگ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ انتقام، ثار، اور خون بہا کی پیاس سینکڑوں اور ہزاروں اشخاص کے قتل کے بعد بھی نہیں بجھتی تھی، مُلک کا ذریعہ معاش غارت گری کے بعد فقط تجارت تھی، لیکن تجارت کے قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تک گزرنا محال تھا، حیرہ کے عرب بادشاہ اگرچہ شمالی عربستان میں اثر اور اقتدار رکھتے تھے تاہم ان کا تجارتی سامان بھی عکاظ کے بازاروں میں بآسانی پہنچ سکتا تھا، شہور حج گویا عرب کے مقدس مہینے تھے، بایں ہمہ لڑائیوں کے جواز کے لئے وہ کبھی بڑھا اور کبھی گھٹا دیئے

---

[1] پورا باب اضافہ از صفحہ ۱ تا ۱۰۱

جاتے تھے۔ ابو علی قالی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے۔

وذالك لانهم كانوا يكرهون ان تتوالى عليهم ثلاثة اشهر لا تمكنهم الاغارة فيها لان معاشهم كان من الاغارة (جلد ۱ ص ۴)	یہ اس لئے کہ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ تین مہینے متصل ان پر غارت گری کے بغیر گزر جائیں، کیونکہ غارت گری ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔

بہت سے جرائم پیشہ قبائل کے ذریعۂ معاش کے لئے یہی موسم بہار تھا۔ مکہ کے آس پاس اسلم وغفار وغیرہ قبائل آباد تھے، جو حاجیوں کا اسباب چرانے میں بدنام تھے۔ طے نہایت ممتاز اور نامور قبیلہ تھا، لیکن دزدان طے بھی اپنی شہرت میں اُن سے کم نہ تھے۔ سلیک ابن السلکہ اور تابط شرا عرب کے مشہور شاعر تھے۔ لیکن ان کی شاعری کا تمام تر سرمایہ صرف اپنی چوری اور حیلہ گری کے پُر فخر کارنامے تھے۔

ملک میں اضطراب اور بدامنی کا یہ حال تھا کہ عبد القیس جو بحرین کا ایک طاقتور قبیلہ تھا ۵ھ تک مضری قبائل کے ڈر سے اشہر حرم کے سوا اور مہینوں میں حجاز کا رُخ نہیں کر سکتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد بھی جب ملک میں سکون شروع ہو چکا تھا، مدینہ سے مکہ تک سفر خطرناک تھا اور راہ میں لوگ ڈاکے ڈالتے رہتے تھے۔ ہجرت کے پانچ چھ برس کے بعد بھی شام کے تجارتی قافلے دن دہاڑے لُوٹ لئے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی خود دار الاسلام کے چراگاہوں میں بھی چھاپے مارے جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو ملک کے امن وامان کی بشارت دیتے تھے کہ ایک زمانہ آئے گا جب حیرہ سے ایک خاتون محمل نشین تنہا سفر کرے گی اور خدا کے سوا کسی کا اُس کو خوف نہ ہوگا تو لوگوں کو تعجب آتا تھا۔ ۹ھ میں ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرا مال ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ آپ نے فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب مکہ کو قافلے بے نگہبان جایا کریں گے۔ اتنے بڑے ملک میں صرف حرم کی سرزمین ایسی تھی جہاں لوگوں کو اطمینان میسر آسکتا تھا۔ خدا نے قرآن مجید میں اہل مکہ پر اپنا سب سے بڑا احسان یہی جتایا ہے۔

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (ایلاف)	ان کو چاہیے کہ اُس گھر کے اس مالک کو پوجیں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور بدامنی کو دور کر کے ان کو امن بخشا۔
اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (عنکبوت)	کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے ایک امن والا حرم ان کیلئے بنایا اسکے باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ اسکے چاروں طرف سے آدمی اچک لے جاتے ہیں

خود اسلام کا کیا حال تھا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عام الحزن کے بعد تین برس تک متصل تمام قبائل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرتے رہے کہ مجھے امان میں لے کر صرف اتنا موقع دلا دو کہ خدا کی آواز لوگوں تک پہنچا سکوں لیکن کوئی حامی نہیں بھرتا تھا، تمام مسلمان عرب کی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے تھے۔ تلاش امن کے لئے افریقہ و حبش کے ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے جو عرب میں رہ گئے تھے وہ ہر وقت خائف و ترساں رہتے تھے۔ قرآن مجید

---

[1] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان [4] ابوداؤد کتاب الادب باب الحذر [5] طبقات ابن سعد جزء و مغازی ص ۲۰۰-۲۴، ۵، [6] دیکھو زادالمعاد سہیلی و غزوہ غابہ [7] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [8] بخاری ص ۱۹۰

مسلمانوں کی اسی حالت کا ذکر ان آیتوں میں کرتا ہے

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ (انفال)	یاد کرو جب تم ملک میں تھوڑے اور کمزور تھے، ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو اُچک نہ لیں۔

اسی ملکی شورش اور بدامنی کا یہ نتیجہ تھا کہ ملک میں کوئی تحریک بھی بغیر خود حفاظتی فوجی تدبیر کے کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل فرض اسلام کی دعوت تھی، اس کے لئے تیغ و خنجر اور فوج و لشکر کی حاجت نہ تھی، لیکن ایک طرف تو دشمن برابر حملہ کرتے چلے آتے تھے اور دوسری طرف ہر جگہ دعاۃ اسلام کی جانیں معرضِ خطر میں رہتی تھیں، تجارت کے قافلے جن پر اصل میں ملک کی معاش کا دار و مدار تھا غیر مامون تھے۔ چنانچہ اس قسم کے تفصیلی واقعات غزواتِ نبوی کے اسباب و انواع میں گذر چکے ہیں۔

بیرونی خطرات

بہرحال یہ تو ملک کی اندرونی حالت تھی، بیرونی خطرات بھی کچھ کم نہ تھے، ملک کے تمام سرسبز و زرخیز صوبے روم و فارس دو عظیم الشان طاقتوں کے پنجہ میں تھے، تقریباً ساٹھ برس سے ایرانی یمن، عمان اور بحرین کے مالک بن بیٹھے تھے اور اُن کے زیرِ اقتدار برائے نام عرب رؤسا حکمران تھے۔ حدودِ عراق میں آلِ منذر کی حکومت کو مٹا کر ایرانیوں نے اندرونِ ملک میں بھی پیش قدمی شروع کر دی تھی، حجاز میں اسلام کی جو تحریک پھیل رہی تھی اس کو بھی وہ اپنے ہی حدود میں سمجھتے تھے، چنانچہ ۶ھ میں شاہ ایران نے یمن کے ایرانی گورنر کو فرمان بھیجا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو"

رومیوں نے حدودِ شام میں قبضہ کر لیا تھا، آلِ غسان اور چھوٹے چھوٹے عرب رؤسا نے جنھوں نے مدت سے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا اُن کی ماتحتی قبول کر لی تھی، ۸ھ کے بعد رومی ان عیسائی رؤسائے عرب کی مدد سے مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہے تھے جس کا ظہور واقعۂ تبوک اور موتہ وغیرہ کی صورت میں ہوا۔

یہودیوں کی قوت

رومیوں نے دوسری صدی عیسوی میں یہودیوں سے شام و فلسطین کی برائے نام حکومت بھی چھین لی تھی اور وہ مجبوراً حدودِ شام سے قلبِ حجاز تک پیچھے ہٹ آئے تھے اور اپنے لئے مدینہ سے شام تک متصل قلعے قائم کر لئے تھے، یہ مقامات اُن کے جنگی استحکامات بھی تھے اور تجارتی گودام بھی قریظہ، قینقاع، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ اُن کی بڑی بڑی چھاؤنیاں تھیں، قرآن مجید میں حسب ذیل آیات میں یہودیوں کے انہی قلعوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ (حشر)	وہ قلعہ بند آبادیوں میں یا دھس کے نیچے چھپے بغیر یوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکتے۔
وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ (احزاب)	خدا نے ان یہودیوں کو جنھوں نے ان کی مدد کی تھی، اُن کے قلعوں سے اتارا۔

---

[1] معجم البلدان یاقوت میں ان مقامات کے حالات پڑھو، نیز کتب مغازی وسیر میں ان کے حالات دیکھو، بخاری میں الباب قتل کعب بن اشرف ورافع بن خدیج۔

زمانۂ قدیم میں مالی کاروبار کی وسعت نے اسپین اور دیگر ممالک یورپ میں اُن کو جس طرح ملک کی پالٹیکس کا خطرناک عنصر بنا دیا تھا، بعینہٖ یہی حال اُن کا عرب میں بھی تھا۔ ان چند قلعوں کے بھروسے پر وہ اسلام کی قوت کو بالکل نظر میں نہیں لاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد لڑائیاں صرف اُن کی شرارت سے لڑنی پڑیں، بدر میں جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو بہ فخر کہتے تھے "بے چارے مکہ کے قریش لڑنا کیا جانیں، مسلمانوں کو ہمارے قلعوں سے مقابلہ پڑے تو معلوم ہو"۔

غرض عرب کا ملک اس قدر متعدد اور مختلف اندرونی اور بیرونی خطرات میں مبتلا تھا کہ اس کی اصلاح و تدبیر کے لئے عام انسانی دست و بازو بے کار تھے، خدا کا غیر مرئی ہاتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آستین میں پوشیدہ تھا وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ ہجرت کے بعد آٹھ برس کی متواتر کوششوں اور پیہم اصلاحات کا یہ نتیجہ ہوا کہ محال نے امکان بلکہ واقعہ کی صورت اختیار کر لی، عرب کے سیاسی ضعف کا تمام تر راز نااتفاقی اور باہمی جنگ و جدال میں مضمر تھا اور اس نااتفاقی اور خانہ جنگی کا سبب صرف یہ تھا کہ تمام عرب مختلف خاندانوں اور نسلوں میں منقسم تھا، تمام ملک کے اجتماع اور اتحاد کے لئے ان میں کوئی مستحکم رشتہ موجود نہ تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عرب کی شیرازہ بندی کے لئے اسلام کا رشتہ قائم کیا إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (حجرات) اور دفعۃً اس روحانی رشتہ نے خون، قرابت اور نسل کے تار و پود ادھیڑ دیے اور صرف ایک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ کی برقی رو اب تمام عرب کی اتحادی روح کو حرکت دے رہی ہے، خدائے پاک نے قرآن مجید میں اس اجتماع اور اتحاد کے وجود کو اپنی مخصوص نعمت فرمایا۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ إِخْوَانًا (آل عمران)

خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ تم باہم ایک دوسرے کے دشمن تھے، خدا نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر اس کے لطف و محبت سے بھائی بھائی ہو گئے۔

خدا نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ محمدؐ! یہ تیرا کام نہ تھا، اس میں خود خداوند مقلب القلوب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِينَ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهٗ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (انفال - ۸)

وہ خدا ہی ہے جس نے محمدؐ! اپنی نصرت اور مسلمانوں کے ذریعہ تجھ کو قوت بخشی اور اسی نے مسلمانوں کے دل باہم جوڑ دیے اگر تم تمام دنیا کے خزانے بھی لٹا دیتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتا لیکن خدا نے ان کے دل باہم جوڑ دیئے وہ زبردست حکمت والا ہے۔

ہجرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان جو مواخاۃ اور برادری قائم کرائی تھی وہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی اور اس کی آخری کڑی وہ خطبہ تھا جو فتح مکہ کے موقع پر دیا گیا، قرآن مجید نے اپنے متواتر ارشادات میں فتنہ و فساد فی الارض کو مکروہ ترین فعل انسانی قرار دیا اور اس فعل کے مرتکب کے لئے سخت سزائیں مقرر کیں، چوری کے لئے قطع ید کی سزا متعین کی، رہزنی کے لئے قتل، پھانسی، قطع ید اور جلاوطنی کی تعزیر

جاری کیں۔ سورۂ مائدہ میں خون ریزی اور قتل و سفاکی کے انسداد کے لئے قصاص کا قانون نازل ہوا۔ عملاً ملک میں قیام امن کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار فوجیں بھیجیں، رہزن قبائل پر چھاپے مارے، حجاز میں جن قبائل کا پیشہ چوری تھا وہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے[2]۔ فوجداری اور دیوانی کے مقدمات کے فیصلے کے لئے قوانین وضع ہوئے اور جا بجا عمال کا تقرر ہوا۔

لیکن یہ سب جو کچھ ہوا وہ انسانوں کی ظاہری فطرت کی پابندی تھی، ورنہ ایک پیغمبر کا فرض ایک مقنن اور ایک عام مدبر کے فرائض سے بدرجہا بلند ہے۔ اسلام کے قانون تعزیرات نے جو کچھ کام کیا، قرآن کا روحانی اثر اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض تلقین اس سے پہلے فرد قرارداد جرم کی دفعات کو بالکل مٹا دیتا تھا۔ قانون و خوف تعزیر صرف بازاروں میں اور انسانوں کے عام مجمعوں میں جرائم سے باز رکھ سکتا ہے لیکن دعوت اسلام کے فیض اثر نے دلوں کو بالکل خدا کے سامنے کر دیا جو رات کی تاریکیوں میں بھی دیکھتا تھا اور مقفل دروازوں کی کھڑکیوں سے بھی جھانکتا تھا اور اب تک تمام ملک میں امن و امان تھا اور یہ عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق لوگ صنعاء سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتے تھے اور خشیت الٰہی کے سوا کوئی اور خوف راستہ میں نہ تھا[3]۔ ایک یورپین مورخ نے جس کے قلم نے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح کے لئے بہت کم جنبش کی ہے (مارگولیوس) وہ بھی ان الفاظ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔

> "محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہ گیا تھا۔ آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دار السلطنت مقرر کیا گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔"[4]

بیرونی خطرات کے انسداد کے لئے خدا نے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیے۔ قریش اور منافقین مدینہ کے اشتعال سے یہودیوں نے اسلام کو پامال کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود چور ہو گئے۔ ۳ھ سے لے کر ۷ھ تک متواتر لڑائیاں پیش آئیں اور آخر فتح خیبر پر ان کی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ رومیوں نے اور حدود شام کے عیسائی عربوں نے اسلام کے استیصال کا بیڑہ اٹھایا۔ عیسائی رؤسائے عرب میں سب سے زیادہ طاقتور اور پر زور غسانی تھے جو رومیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے تھے۔ بہرا، وائل، بکر، لخم، جذام، عاملہ وغیرہ عرب قبائل ان کے ماتحت تھے۔ ان کے علاوہ دومۃ الجندل، ایلہ، جرباء، اذرح، تبالہ اور جرش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے عیسائی و یہودی رئیس تھے۔ غسانیوں کے حملہ کی ابتدا جس طرح ہوئی وہ اوپر گزر چکا ہے۔ حارث بن عمیر جو شاہ بصریٰ کے دربار میں دعوت اسلام کا خط لے کر گئے تھے ان کو غسانیوں نے راستہ میں قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار مسلمانوں کا ایک دستہ تادیب و انتقام کے لئے روانہ فرمایا۔ غسانی ایک لاکھ کا ٹڈی دل لے کر میدان میں

---

[1] دیکھو غزوات نبوی پر دوبارہ نظر۔ [2] صحیح بخاری ذکر غفار و اسلم۔ [3] صحیح بخاری۔

[4] لائف آف محمد، مارگولیوس ص ۴۱۱۔

آئے اور خبر تھی کہ رومی بھی اسی قدر فوج لئے ہوئے موقع سے قریب مواب میں پڑے ہیں۔ تاہم مٹھی بھر مسلمان آدمیوں کے اس جنگل سے نہ ڈرے اور کچھ عزیز جانیں کھو کر فوج کو میدانِ جنگ سے ہٹا لائے۔ اس جنگ کا نام غزوۂ موتہ ہے۔

اس کے بعد سنہ ۹ھ میں غزوۂ تبوک پیش آیا۔ دم بدم خبریں آتی رہتی تھیں کہ رومی حملہ آوری کے لئے عیسائی عربوں کی ایک فوجِ گراں ترتیب دے رہے ہیں اور ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی فوج کو تقسیم کر چکے ہیں۔ یہ بھی خبر تھی کہ غسانی فوج کی آراستگی میں مصروف ہیں اور گھوڑوں کی نعلبندی بھی کر رہے ہیں۔ اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار صحابہ کے ساتھ پیش قدمی فرمائی اور بیس دن تک دشمنوں کی آمد کا انتظار کرتے رہے، لیکن کوئی مقابل نہ آیا۔ تاہم اس پیش قدمی کا فائدہ یہ ہوا کہ غسانیوں کے علاوہ تمام رؤسا نے رومیوں کو چھوڑ کر اسلام کی حمایت قبول کر لی۔ سنہ ۱۱ھ میں زمانہ مرض الموت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ بن زیدؓ کے زیرِ افسری رومیوں کے مقابلہ کے لئے پھر فوجیں روانہ فرمائیں لیکن اس مہم کا اختتام عہدِ صدیقی میں ہوا۔

ایرانیوں کی حکومت زندگی کے آخری دور کو پہنچ چکی تھی۔ سنہ ۸ھ میں دعاۃِ اسلام کے پہنچنے کے ساتھ ہی بے مقابلہ وجنگ یمن، عمان اور بحرین میں ان کی قبائے حکومت کا تار تار الگ ہو گیا۔

غرض نو دس برس کی متواتر اور پیہم کوششوں سے اور مافوقِ طاقتِ بشری، تائیدات کے سبب سے اب تمام ملک میں امن وامان قائم ہو گیا۔ قریش اور یہود کی سازشوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ قبائل کی خانہ جنگیاں مٹ گئیں، تمام رہزن اور ڈاکو جتھے رام ہو گئے۔ بیرونی خطرات کا انسداد ہو گیا۔ اب موقع ملا کہ صلح وآشتی کے ساتھ حسبِ فرمانِ الٰہی اصل مقصود کی طرف توجہ کی جائے۔

*

لہ اوپر کے تمام واقعات کی تفصیل اور حوالے غزوۂ موتہ اور تبوک کے ذکر میں گزر چکے ہیں۔

تبلیغ و اشاعتِ اسلام

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا اور نہ صرف اعلان بلکہ ہر قسم کے جائز اور صحیح وسائل سے تمام عالم کو حلقۂ اسلام میں لانا تھا، اس کے لئے تیغ و خنجر اور فوج و عسکر کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اس قدر کافی تھا کہ دعوتِ حق کی صدا اطرافِ عالم میں پہنچ جانے پائے، لیکن مکہ میں تیرہ برس تک اعدائے اسلام اسی کے سدِّ راہ رہے، حج کے موقع پر عرب کے تمام قبائل دور دراز مقامات سے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کے پاس جاتے اور صرف یہ درخواست کرتے کہ قریش مجھ کو پیغام پہنچانے سے روکتے ہیں تم اس کا موقع دلادو اور خود دو، لیکن قریش کے اثر سے ہزاروں لاکھوں میں سے ایک بھی اس کی حامی نہیں بھرتا تھا۔ تاہم آفتابِ حق کی کرنیں ان کثیف بادلوں میں سے بھی چھن چھن کر سطحِ قلوب پر پڑتی تھیں اور اکناف و حوالی کو روشن کرتی جاتی تھیں، اسلام کو صرف اشتہار اور اعلان کی ضرورت تھی اور یہ کام خود اعدائے اسلام نے انجام دیا، جب حج کا زمانہ آتا تو رؤسائے قریش عام گزرگاہوں پر خیمے لگاتے باہر کے لوگ اُن سے ملنے آتے، اور چونکہ بعثتِ نبویؐ کا چرچا پھیل چکا تھا، لوگ اس کی حقیقت دریافت کرتے اور نہ کرتے تو قریش خود حفظِ ما تقدم کے لئے اُن سے کہتے کہ ہمارے شہر میں ایک بدعقیدہ پیدا ہوا ہے جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتا ہے، یہاں تک کہ لات و عزیٰ تک کو برا کہتا ہے۔

بدعقیدہ کو عربی میں "صابی" کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یا اس وجہ سے کہ اسلام کے بعض فرائض مثلاً نماز کی صورت، صابئین کے اعمال سے ملتے جلتے ہیں، قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ کو صابی کا لقب دیا تھا اور بالآخر اس لقب سے تمام عرب میں آپ کا نام مشہور[1] ہو گیا۔ صحیح بخاری کتاب المغازی میں ایک صحابی سے روایت ہے کہ میں جب چھوٹا تھا تو مکہ کے آنے جانے والوں سے سنا کرتا تھا کہ مکہ میں ایک مدعی نبوت پیدا ہوا[2] ہے۔ ملک میں جب آپ کا نام مشہور ہوا تو اگرچہ جمہورِ عام پر مخالف اثر پڑا اور اُن میں سے کسی شخص نے آپ کی طرف رُخ نہیں کیا، لیکن اتنا بڑا وسیع ملک اُن لوگوں سے خالی نہیں ہو سکتا تھا جن کو یہ شوق پیدا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ عرب میں ایسے لوگوں کی خاصی جماعت پیدا ہو گئی تھی جو بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کے متجسس تھے، بعض لوگ اس حد سے ترقی کر کے حنفی بن گئے تھے جن کا تذکرہ آغاز کتاب میں گزر چکا ہے، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں متعدد ایسے صحابہ کا ذکر کیا ہے جو یمن وغیرہ دور دراز مقامات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیقِ حال کے لئے مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور مخفی طور سے اسلام لا کر واپس گئے، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ[3] یمنی اور طفیل بن عمرو دوسی یمنی، کے خاندان میں جو اسلام پھیلا اُس کی

---

[1] صحیح بخاری کتاب التیمم [2] کتاب المغازی ص ۹۱۵ [3] اضافہ (قصہ ابوذرؓ)

ابتداء قیام مکہ ہی کے زمانہ میں ہوتی تھی۔

طفیل بن عمرو کا اسلام

طفیل بن عمرو دوسی عرب کا مشہور شاعر تھا اور چونکہ عرب میں شعراء کا اثر بہت تھا یعنی وہ قبیلہ کے قبیلہ کو جدھر چاہتے تھے اُدھر کر دیتے تھے، اس لئے قریش نے کوشش کی کہ وہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچنے پائے۔ لیکن ایک دفعہ جب اُس نے اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید پڑھتے سُنا تو وہ فوراً مسلمان ہو گیا اور اس کے اسی زمانہ میں قبیلۂ دوس میں بھی اسلام پھیلنے لگا۔ تاہم عام قبیلہ نے طفیل کی دعوت قبول نہ کی، وہ رنجیدہ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! دوس نے نافرمانی کی اُن پر بددعا کیجئے۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خدایا دوس کو ہدایت دے اور ان کو بھیج۔ اس کے بعد سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

عمرؓو بن عبسہ کا اسلام

عمرؓو بن عبسہ سلمی بھی انہی بزرگوں میں ہیں جنھوں نے لوگوں کی زبانی یہ سُن کر کہ مکہ میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جو بہت سی باتیں بتاتا ہے، مشتاقانہ مکہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت قریش کے مظالم کی بناء پر چھپے رہتے تھے، عمرؓو بن عبسہ کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کی کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا "میں پیغمبر ہوں"۔ انھوں نے کہا "پیغمبر کس کو کہتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا ہے"۔ انھوں نے پھر پوچھا "کیا پیغام دے کر بھیجا ہے؟" ارشاد فرمایا "مجھے خدا نے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بُت توڑ دیئے جائیں، خدا کو ایک مانا جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے"۔ عمرو نے پوچھا "اس مذہب کے کتنے پیرو ہیں؟" آپ نے فرمایا "ایک آزاد (ابوبکرؓ) اور ایک غلام (بلالؓ)"۔ عمرو نے کہا "میں بھی آپ کی پیروی کرتا ہوں"۔ ارشاد ہوا کہ "ابھی تو یہ ممکن نہیں، تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں اور لوگوں کا کیا حال ہے، میری کامیابی کا جب حال سنو تو میرے پاس آجانا"، چنانچہ عمرو واپس گئے اور ہجرت کے بعد جب لوگوں کی زبانی آپ کی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو حاضر خدمت ہوئے۔

ضماد بن ثعلبہ کا اسلام

ضمادؓ بن ثعلبہ قبیلۂ ازدشنوء کے رئیس اور آپ کے زمانہ جاہلیت کے دوست تھے، وہ مکہ آئے تو سُنا کہ محمد کو جنون ہو گیا ہے، وہ جھاڑ پھونک بھی کرتے تھے وہ آپ کے پاس آئے کہ لاؤ میں تمہارا علاج کر دوں۔ آپ نے فرمایا: الحمد للہ نحمدہٗ ونستعینہٗ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ ان فقروں نے ضماد پر غیر معمولی اثر کیا، عرض کی دوبارہ ارشاد فرمائیے۔ آپ نے پھر اعادہ فرمایا، ضماد نے پھر تیسری بار پڑھوایا۔ اب وہ بالکل مسحور تھے۔ بولے کہ میں نے کاہنوں کی باتیں، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سُنے ہیں لیکن ایسا

---

[1] زرقانی۔ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان سے یہ مفہوم ہوتا ہے۔ [3] صحیح بخاری باب قصۂ دوس۔ [4] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوۃ فیہا۔ [5] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ۔

کلام میں نے نہیں سنا، یہ تو دریا کی تہ تک میں بھی اُتر کر جائے گا، لائیے ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں، آپؐ نے اُن سے بیعت لی۔

قبیلۂ ازد کا اسلام

پھر فرمایا، اپنے پورے قبیلہ کی طرف سے بھی بیعت کر لو، چنانچہ انھوں نے پورے قبیلہ کی طرف سے بیعت کر لی اور وہ ان کی دعوت سے مسلمان ہو گیا۔ ایک دفعہ ایک لڑائی میں مسلمان سپاہیوں کا اُدھر سے گزر ہوا تو افسر نے پوچھا کہ کسی نے اس قبیلہ کی کوئی چیز لی ہے۔ ایک سپاہی نے کہا ایک لوٹا میرے پاس ہے اس نے حکم دیا کہ واپس کر دو۔

حضرت ابوذرؓ کا اسلام

حضرت ابوذرؓ کا واقعہ اس موقع پر خاص طرح پر ذکر کے قابل ہے۔ غفار کا قبیلہ جو قریش کی شامی تجارت کے راستہ میں آباد تھا جب وہاں یہ چرچا پھیلا تو حضرت ابوذرؓ جو بُت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے، انھوں نے اپنے بھائی اُنیس سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم اور تلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور جو کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔ حضرت ابوذرؓ کو اس مختصر جواب سے تسکین نہیں ہوئی، خود گئے، زادِ سفر کے لئے مشک میں پانی اور کچھ کھانے کو لے لیا، مکہ میں آئے تو ڈر کے مارے کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پوچھ نہیں سکتے تھے۔ حرم میں حضرت علیؓ سے ملاقات ہو گئی، انھوں نے گھر پر لا کر مہمان رکھا لیکن تین دن تک اُن سے بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر خود حضرت علیؓ نے پوچھا کہ "یہاں آنے کی کیا غرض ہے؟" انھوں نے ڈرتے ڈرتے بتایا لیکن پھر قول و اقرار لے لیا کہ کسی پر راز ظاہر نہ ہونے پائے۔ حضرت علیؓ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آپؐ نے اسلام کی تلقین کی اور فرمایا کہ اس وقت گھر واپس جاؤ، پھر میں جو کچھ کہلا بھیجوں گا اس کی تعمیل کرنا، لیکن ان کو اسلام کا جوش تھا عرض کی کہ میں تو اسلام کا اعلان کر کے رہوں گا۔ غرض حرم میں آئے اور زور سے پکارے کہ اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رسول الله۔ اس آواز کا سننا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ان کو مارنا شروع کیا حضرت عباسؓ نے آکر بچایا اور لوگوں سے کہا، تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہاری تجارت کا راستہ غفار کی آبادی سے ہو کر گزرتا ہے اور یہ اسی قبیلہ کے آدمی ہیں۔ اس وقت لوگوں نے چھوڑ دیا، لیکن دوسرے دن حضرت ابوذرؓ نے حرم میں جا کر پھر اسی طریقہ سے اسلام کا اعلان کیا اور نتیجہ بھی وہی ہوا جو کل ہو چکا تھا۔ آج بھی اتفاق سے حضرت عباسؓ آ گئے اور انھوں نے جان بچائی۔[1]

قبیلۂ غفار کا اسلام

حضرت ابوذرؓ مکہ سے جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی تو آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا، بقیہ آدمیوں نے کہا کہ ہم اس وقت اسلام کا اظہار کریں گے

---

[1] یہ روایت تمام تر صحیح بخاری سے ماخوذ ہے، صحیح مسلم میں یہ واقعہ جس طرح منقول ہے اس میں بہت سی باتیں اس سے زائد اور مختلف ہیں، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں تطبیق مشکل ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آجائیں چنانچہ جب آپ مدینہ میں تشریف لائے تو باقی آبادی بھی مسلمان ہو گئی[1]

قبیلۂ اسلم کا اسلام

غفار سے قریب اسلم کا قبیلہ آباد تھا اور دونوں قبیلوں میں قدیم تعلقات تھے۔ غفار کے اثر سے انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ (حالانکہ یہ دونوں قبیلے اسلام سے پہلے چوری میں بدنام تھے اور ان کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا دشمن ہے)

اوس و خزرج کا اسلام

موسمِ حج میں عرب کے اکثر قبائل کا اجتماع ہو جاتا تھا۔ آپ اس موقع پر ایک ایک قبیلے کے قیام گاہ پر جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے، چنانچہ مدینہ کے قبائل اوس و خزرج کی معتدبہ جماعت نے اسی موقع پر اسلام قبول کیا۔

قبائلِ مدینہ میں اشاعتِ اسلام

اس کے بعد جب حضرت مصعبؓ بن عمیر داعیِ اسلام بنا کر مدینہ منورہ بھیجے گئے تو ان کے فیضِ تلقین سے چند ہی مہینوں میں دو گھرانوں کے سوا بقیہ تمام گھرانے مسلمان ہو گئے۔ ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ تشریف لائے تو آس پاس کے قبائل میں جیسا کہ اوپر گزرا غفار و اسلم نے اسلام قبول کر لیا۔

بدر کے بعض قریشیوں کا اسلام

کچھ ہی دنوں کے بعد بدر کا معرکہ پیش آیا جس میں قریش کو شکست ہوئی اور ستر اشخاص مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہوئے۔ ان قیدیوں کی رہائی کے لئے قریش نے مدینہ میں آمد و رفت شروع کی۔ اس تقریب سے لوگوں کو مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اس اثر سے متعدد اشخاص مسلمان ہو گئے۔

ان میں بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اتفاقیہ ان کے کانوں میں قرآن مجید کی آواز پڑ گئی اور باوجود سخت عداوت کے ان کا دل پتھر سے موم بن گیا۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے کے لئے آئے تھے اور قیدیوں کے ساتھ اسیر تھے۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیتیں پڑھ رہے تھے۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ
أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَا
يُوقِنُونَ (طور، ۲)

کیا یہ یوں ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے یا ان لوگوں نے خود
اپنے آپ کو پیدا کیا، یا ان لوگوں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا
بلکہ یہ بات ہے کہ ان کو یقین نہیں ہے۔

جبیر بن مطعم کا اسلام

جبیر بن مطعم نے یہ آیتیں سن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا۔ صحیح بخاری سورۂ طور میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

(مکہ میں روم و فارس کی جنگ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ ٹھیک فتح بدر کے موقع پر پوری اتری اور قرآن مجید کی پیشین گوئی کے مطابق سات برس کے بعد رومیوں نے فارس پر فتحِ کُلی پائی۔ اس عظیم الشان معجزہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک خلقِ کثیر نے اسلام کی صداقت کا اقرار کیا)

---

[1] صحیح مسلم اسلام ابی ذر، [2] صحیح بخاری ذکر اسلم و غفار، [3] بحوالہ سابق۔

پیشین گوئی روم کا اثر

غرض اس طرح آپ ہی آپ لیکن نہایت آہستگی اور تدریج کے ساتھ اسلام پھیلتا جاتا تھا۔ ۵ھ میں قریش، کنانہ، غطفان، اسد اور دیگر قبائل نے متحد ہو کر مدینہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی۔ اس معرکہ کا نام احزاب ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ اس شکست نے قریش کا عالمگیر اثر کسی قدر کم کیا اور وہ قبائل جو قبولِ اسلام کے لئے آمادہ تھے لیکن قریش کے ڈر سے ان کو اظہارِ اسلام کی ہمت نہیں ہوتی تھی، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفود بھیجنے شروع کئے۔

قبیلہ مزینہ کا اسلام

سب سے پہلی جو سفارت آئی وہ قبیلہ مزینہ کی تھی جس میں چار سو آدمی شریک تھے انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اگر ارشاد ہو تو ہجرت کر کے مدینہ میں آ جائیں، لیکن آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم جہاں رہو، مہاجر ہو[1]۔

قبیلہ اشجع کا اسلام

اسی زمانہ میں قبیلہ اشجع کے سفراء جن کی تعداد سو تھی، مدینہ میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ صلح کا معاہدہ ہو جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔ اس وقت تک یہ لوگ کافر رہے۔ لیکن جب صلح ہو چکی تو انھوں نے خود بخود اسلام قبول کر لیا۔

قبیلہ جہینہ کا اسلام

جہینہ بھی انہی قبائل کے آس پاس آباد تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اسلام کی دعوت دی اور وہ فوراً ایک ہزار کی جمعیت لے کر مدینہ آئے اور مسلمان ہو گئے اور اس کے بعد وہ اکثر غزوات میں مسلمانوں کے شریکِ حال رہے۔ غفار، اسلم، مزینہ، اشجع اور جہینہ کی یہی اطاعت اور سابقیتِ اسلام تھی جس کی بنا پر آپ نے اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

صلح حدیبیہ کا اثر

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں جیسا کہ ہم حدیبیہ کے ذکر میں لکھ آئے ہیں، کفار اور مسلمان نہایت آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے اور اس لئے منکروں کو خلوت و جلوت میں مسلمانوں کی تلقینات کے سننے کا موقع ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے پہلے باوجود غزوات اور محاربات کے جس قدر لوگ اسلام لائے تھے صرف دو برس میں یہ تعداد اس سے اضعافاً مضاعفہ بڑھ گئی۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے سال ادائے عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلے تو صرف ڈیڑھ ہزار شخص ساتھ تھے، اب دو برس کے بعد فتح مکہ

---

[1] جزء طبقات ابن سعد متعلق وفود جزء اول قسم ثانی صفحہ ۳۸ [2] جزء طبقات ابن سعد مذکور صفحہ ۴۷ [3] اصابہ تذکرہ بشیر بن عرفطہ۔

[4] صحیح بخاری ج اول ذکر غفار و اسلم و جہینہ۔ [5] طبری میں امام زہری کا قول ہے۔

فلما کانت الھدنۃ وضعت الحرب اوزارھا وامن
الناس کلھم بعضھم بعضا فالتقوا وتفاوضوا فی الحدیث
والمنازعۃ فلم یکلم احد بالاسلام یعقل شیئا الا دخل
فیہ فلقد دخل فی تینک السنتین فی الاسلام مثل
ما کان فی الاسلام واکثر (صفحہ ۱۵۵۰)

جب صلح ہو گئی اور جنگ موقوف ہو گئی، ایک دوسرے سے لوگ
بے خوف ہو گئے، باہم ملے جلے، باتیں چیتیں ہوئیں تو کوئی عقلمند ایسا نہیں
تھا جس سے اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے قبول نہ کر لیا ہو، چنانچہ
جتنے لوگ ابتدا سے اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں
میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔

کو چلے تو دس ہزار مسلمانوں کا لشکر جرار ساتھ تھا۔

صلح حدیبیہ کا اثر اگرچہ تمام عرب پر محیط نہ تھا کیونکہ اس معاہدہ میں صرف قریش اور کنانہ شریک تھے اس لئے جو لوگ براہ راست قریش کے زیر اثر یا اُن کے حلیف اور ہم عہد نہ تھے، وہ اب بھی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کرتے رہتے تھے اور اُن کے دفاع کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ کچھ فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں، تاہم جن موقعوں پر امن کا گمان ہوتا تھا وہاں داعیانِ اسلام بھیجے جانے لگے کہ لوگوں کو اسلام کی طرف بلائیں لیکن چونکہ حفاظت خود اختیاری کی غرض سے ان داعیوں کے ساتھ تھوڑی بہت جمعیت بھی ہوتی تھی اس لئے ارباب سیر ان تبلیغی جماعتوں کو بھی سرایا سے تعبیر کرتے ہیں۔

فتح مکہ کا اثر

تمام عرب تولیت کعبہ کی وجہ سے قریش کو مذہبی رہبر سمجھتا تھا اس لئے وہ انتظار کر رہے تھے کہ قریش کا کیا انجام ہوتا ہے، عمرؓو بن سلمہ ایک صحابی تھے جو مدینہ سے دور ایک گزرگاہ عام پر رہتے تھے، اُن کے یہ الفاظ صحیح بخاری میں منقول ہیں۔

كانت العرب تلوم باسلامهم الفتح فيقولون اتركوه وقومه فانه ان ظهر عليهم فهو نبي صادق فلما كانت وقعة اهل الفتح بادر كل قوم باسلامهم[1]۔

عرب قریش کے اسلام کا انتظار کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی قوم (قریش) پر چھوڑ دو، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر غالب آگئے تو بے شبہ وہ سچے پیغمبر ہیں، پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش دستی کی۔

ابن ہشام نے زیادہ صاف لکھا ہے۔

وانما كانت العرب تربص بالاسلام امر هذا الحي من قريش وامر رسول الله صلى الله عليه وسلم وذلك ان قريشا كانوا امام الناس وهاديهم اهل البيت والحرم وصريح ولد اسمعيل بن ابراهيم عليهما السلام وقادة العرب لا ينكرون ذلك وكانت قريش هي التي نصبت الحرب رسول الله صلى الله عليه وسلم وخلافه فلما افتتحت مكة ودانت له قريش ودخلها الاسلام عرفت العرب انه لا طاقة لهم بحرب رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عداوة فدخلوا في دين الله كما قال الله عز وجل ۔[2]

اور عرب اسلام کے باب میں صرف قریش کا انتظار کر رہے تھے اور وہ یوں کہ قریش تمام ملک کے سردار اور پیشوا اور کعبہ و حرم کے متولی اور حضرت اسماعیل کی خاص اولاد اور عرب کے قائد تھے اور صرف قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے جنگ برپا کی تھی تو جب مکہ فتح ہو گیا اور قریش نے سپر ڈال دی اور اسلام مکہ میں چھا گیا تو عرب کو یقین ہو گیا کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگ اور عداوت کی طاقت نہیں ہے تو وہ خدا کے دین میں داخل ہو گئے جیسا کہ اللہ عز وجل نے قرآن میں کہا ہے (یعنی اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ)

---

[1] صحیح بخاری فتح مکہ۔ [2] سیرت ابن ہشام ذکر واقعات ۹ھ و وفود۔

غرض اسلام کی سچائی اور سادگی اور عرب کی تیز فہمی اور ذہانت کے لحاظ سے اسلام کے پھیلنے میں جو دیر لگی، وہ زیادہ تر قومی اور خاندانی مخالفت کی وجہ سے تھی اب جبکہ باطل کا سنگِ راہ ہٹ گیا تو حق کے آگے بڑھنے میں دیر نہ تھی۔

فتح مکہ کے بعد اب دعوتِ اسلام کے لئے یہ خطرہ نہیں رہا کہ اس کے دعاۃ جہاں جائیں بے دریغ قتل کر دیئے جائیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام اطرافِ عرب میں دعاۃ بھیج کر لوگوں کو اسلام کے فضائل و محاسن بتا کر اُن کو اسلام کی ترغیب دلائیں، دعاۃ حسبِ ذیل طریقہ سے مقرر کئے گئے۔

۱. حفاظتِ خود اختیاری کی غرض سے کسی قدر فوج ساتھ کر دی جاتی تھی کہ ان کو کوئی شخص ضرر نہ پہنچانے پائے اور وہ آزادی سے تبلیغِ اسلام کر سکیں، حضرت خالدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن بھیجا تو فوج بھی ساتھ کر دی، لیکن تاکید تھی کہ بہ جبر پیش نہ آئیں۔ چنانچہ پورے چھ مہینے تک ان کی دعوتِ اسلام پر کسی نے توجہ نہیں کی اور وہ کچھ نہ کر سکے حضرت خالدؓ سپہ سالار اور فاتح تھے، واعظ اور صاحبِ ارشاد نہ تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب حضرت علیؓ کو بھیجا، انھوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعۃً ملک کا ملک مسلمان تھا۔

یہی وہ دعاۃ ہیں جن کو علامہ طبری نے ان لفظوں سے تعبیر کیا ہے۔

قد کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعث فیما حول مکۃ السرایا تدعوا الی اللہ عز وجل ولم یامرھم بقتال[1]	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں کچھ ٹکڑیاں بھیجی تھیں کہ لوگوں کو خدا کی طرف بلائیں لیکن ان کو لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

حضرت خالدؓ کو قبیلۂ بنی جذیمہ کے پاس بھی اسی طرح دعوتِ اسلام کے لئے بھیجا تھا لیکن جب انھوں نے کشت و خون کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رخ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا خدایا! میں خالد کے فعل سے بری ہوں، پھر حضرت علیؓ کو بھیجا، انھوں نے ایک ایک مقتول کا خون بہا ادا کیا، یہاں تک کہ کتوں کا بھی۔

(اشاعتِ اسلام کی غرض سے جو مسلح جماعت اطرافِ ملک میں بھیجی جاتی تھی اس میں کبھی کبھی آپ ایک ایک فرد کا امتحان لیتے تھے، ان میں جو صاحب سب سے زیادہ حافظِ قرآن ہوتے تھے ان کو اس کا امیر مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپ نے ایک بار اسی قسم کی فوج روانہ کرنا چاہی تو ایک ایک شخص سے قرآن پڑھوا کر سنا، ان لوگوں میں ایک کم سن نوجوان تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس آئے، پوچھا تمہیں کیا یاد ہے؟ انھوں نے کہا مجھ کو سورۂ بقرہ اور فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تو تم ہی اب سب کے امیر ہو (ترغیب و ترہیب ج ۱ صفحہ ۱۹۹ بروایت ترمذی)

(۲) جو ممالک زیرِ اثر آتے تھے اور وہاں زکوٰۃ اور جزیہ کے وصول کرنے کے لئے عمال بھیجے جاتے تھے وہ اکثر اس درجہ کے لوگ ہوتے تھے جن کا تقدس، زہد اور پاکیزگی مسلّم ہوتی تھی، اس کے ساتھ عالم اور واعظ بھی ہوتے تھے اور اس لئے وہ تحصیلِ مال کے ساتھ تبلیغِ اسلام کی خدمت بھی انجام دے سکتے تھے، ان میں سے بعضوں کے نام حسبِ ذیل ہیں،

---

[1] اس روایت میں اگرچہ یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ فوج اشاعتِ اسلام کے لئے بھیجی گئی تھی صرف یہ الفاظ ہیں، بعث بعثا وھو ذو عدد یعنی آپ نے ایک بہت بڑی جماعت بھیجی، تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اشاعتِ اسلام تھا کیونکہ اگر لڑائی مقصود ہوتی تو پھر حفظِ قرآن کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ آپ ہر ایک سے قرآن پڑھوا کر سنتے)

نام	مقام	کیفیت
مہاجرؓ بن ابی امیہ	صنعاء یمن	حضرت ام سلمہؓ (زوجۂ نبوی) کے بھائی تھے۔
زیادؓ بن لبید	حضرموت	یہ اُن اصحاب میں ہیں جو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔
خالدؓ بن سعید	صنعاء یمن	سابقین اولین اور مہاجرین حبش میں ہیں سب سے پہلے انہی نے کاغذات پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا
عدیؓ بن حاتم	قبیلۂ طے (یمن)	مشہور صحابی ہیں، حاتم طائی انہی کا باپ تھا۔
علاؓ بن حضرمی	بحرین	
حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ	زبید و عدن	ان کی دعوتِ اسلام سے قریباً تمام لوگ مسلمان ہو گئے، مشہور صاحب علم صحابی ہیں۔
حضرت معاذؓ بن جبل	جند	
جریرؓ بن عبداللہ بجلی	ذوالکلاع حمیری	جریر مشہور صحابی ہیں، ذوالکلاع حمیری یمن کے سلاطین کے خاندان سے تھے ایک موقع پر لاکھ آدمیوں نے ان کو سجدہ کیا تھا، جریرؓ کی دعوت پر یہ اسلام لاتے تو اس کی خوشی میں چار ہزار غلام آزاد کئے

(۳) بعض لوگ خاص اشاعتِ اسلام کی غرض سے بھیجے جاتے تھے، تفحص سے اس قسم کی دعاۃ کے نام حسبِ ذیل ہیں

نام	مقام دعوت	نام	مقام دعوت
علیؓ بن ابی طالب	قبیلۂ ہمدان و حِمیر و مذحج	خالدؓ بن ولید	اطرافِ مکہ
مغیرہؓ بن شعبہ	نجران	عمروؓ بن العاص	عمان
وبرؓ بن نخیس	ابنائے فارس	مہاجر بن ابو امیہ	بطرفِ حارث بن عبد کلال شہزادۂ یمن
محیصہؓ بن مسعود	فدک		
احنف	قبیلۂ سلیم (مسند ج ۵ ص ۲)[1]		

(۴) رؤسائے قبائل بارگاہِ نبوت میں آکر مسلمان ہو جاتے تھے اور کچھ روز یہاں قیام کر کے اپنے اپنے قبائل میں دعوتِ اسلام کی غرض سے واپس جاتے تھے۔ ان اشخاص کے نام یہ ہیں۔

نام	مقام	کیفیت
طفیل بن عمرو دوسی	قبیلۂ دوس	
عروہ بن مسعود	ثقیف	
عامر بن شہر	ہمدان	
ضمام بن ثعلبہ	بنو سعد	
منقذ بن حبان	بحرین	
ثمامہ بن اثال	اطرافِ نجد	

---

[1] اضافہ ذکر اسلام ابنائے یمن۔

ان مبلغین اور دعاۃ کے اثر سے اسلام ہر جگہ تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ فتح مکہ کے بعد جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، دعاۃ اطرافِ مکہ میں بھیج دیئے گئے تھے اور لوگ خوشی خوشی مسلمان ہوتے جاتے تھے۔ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی موقع کی طرف اشارہ کرتی ہیں،

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ	جب خدا کی فتح و نصرت آئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج
يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا	خدا کے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں۔

فتح مکہ کے تین مہینے کے بعد ذوالحجہ ۹ھ کے موسم حج میں اعلانِ براءۃ ہوا۔ اس واقعہ کے بعد بلا استثنا حجاز نے عام طور سے اسلام قبول کر لیا[۱]۔

حجاز سے باہر نبوت کے اکیس برس میں صرف قریش اور یہود کی مزاحمت سے اسلام آگے نہ بڑھ سکا اور خال خال مسلمان اِدھر اُدھر نظر آتے تھے۔ لیکن ان دیواروں کا ہٹنا تھا کہ صرف تین برس میں ۸، ۹، ۱۰ھ میں اسلام کا اثر ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک وسیع ہو گیا۔ یہ عرب کے وہ صوبے ہیں جہاں اسلام سے پہلے عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم تھیں اور اس وقت بھی وہ روم و فارس دنیا کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، تاہم اسلام بغیر تلوار کی رفاقت کے صلح و امن کے سایہ میں اپنی آواز بلند کرتا چلا گیا اور ہر گوشہ سے لبیک کی صدائیں خود بخود آنے لگیں۔

یمن ملک عرب کے تمام صوبوں میں یمن سب سے زیادہ زرخیز اور سیر حاصل ہے اور نہایت قدیم زمانے سے تمدن و تجارت کا مرکز ہے۔ سبا اور حمیر کی عظیم الشان حکومتیں یہیں قائم ہوئی تھیں۔ ولادتِ نبوی سے تقریباً پچاس برس پہلے ۵۲۵ء میں حبشی عیسائیوں نے یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ولادتِ نبوی کے چند سال بعد اہل ایران یہاں کے مالک بن گئے تھے۔ اُن کی طرف سے یہاں ایک گورنر ہوتا تھا جو یمن پر حکومت کرتا تھا۔ یمن میں اسلام کی تحریک کے لئے متعدد عوائق موجود تھے، مثلاً اختلافِ جنسیت کہ اہل یمن قحطانی تھے، داعی اسلام اسماعیلی، اہل یمن کو اپنے قدیم جاہ و جلال اور تمدن و حکومت پر ناز تھا اور تمام عرب بجا طور سے ان کی پیش روی کو تسلیم کرتا تھا اور تمام عرب میں وہی حکومت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ ملک میں جہاں کہیں باقاعدہ حکومت تھی وہ نسلاً اسی خاندان سے شمار ہوتی تھی، چنانچہ جب یمن سے قبیلہ کندہ کا وفد آیا ہے جو یمن کا ایک شاہی خاندان تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عرب فرمانروا سمجھ کر رئیس وفد نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ اور ہم ایک خاندان نہیں، آپ نے فرمایا، ہم نضر بن کنانہ کے خاندان سے ہیں، نہ اپنی ماں پر تہمت رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے باپ سے انکار کر سکتے ہیں[۲]۔

یمن میں اشاعتِ اسلام کا سب سے بڑا عائق یہ ہو سکتا تھا کہ وہ پولیٹیکل حیثیت سے ایرانیوں کے ماتحت تھے اور باشندے مذہباً علی العموم یہودی یا عیسائی تھے، لیکن قبول حق کے لئے کوئی چیز اُن میں سے مانع نہ آئی یمن میں اسلام کی دعوت ہجرت سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ یمن میں دوس ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ اس قبیلہ کا رئیس طفیل بن عمرو اتفاق سے مکہ آیا اور مسلمان ہو گیا۔ اسی زمانہ میں کندہ کا قبیلہ حج کے لئے مکہ آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ

---

[۱] طبری واقعات ۹ھ۔ [۲] ابن حنبل حدیث اشعث بن قیس و زاد المعاد جلد ۱ ص۳۲ مصر۔

وسلم نے اُن کو اسلام کی دعوت دی، لیکن انہوں نے انکار کیا[1]، ۷ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تشریف فرما تھے۔ دوس کا قبیلہ مسلمان ہو کر دار الاسلام میں منتقل ہوگیا، یمن کا ایک مشہور قبیلہ اشعر تھا، وہ بھی مہاجرین حبشہ کی معیت میں اسی زمانہ میں بلا تحریک خود بخود اسلام لایا اور آستانۂ نبوت پر حاضر ہوا، ابو ہریرہؓ، دوسی اور ابو موسیٰ اشعریؓ ان ہی قبائل کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

یمن میں ہمدان سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحب اثر خاندان تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۸ھ کے آخر میں) اُن کو دعوت اسلام دینے کے لئے حضرت خالدؓ کو بھیجا، خالدؓ چھ مہینے تک اُن کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن اُن لوگوں نے قبول نہیں کیا، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو بلا لیا اور حضرت علیؓ کو بھیجا، حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو جمع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا، حضرت علیؓ نے جب اس واقعہ کی اطلاع بارگاہ رسالت میں دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور سر اٹھا کر دو دفعہ فرمایا السلام علیٰ همدان[2]۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ہمدان نے جب اسلام کا غلغلہ سنا تو عامر بن شہر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا کہ یہ مذہب اگر تم کو پسند آئے تو ہم سب اس کے قبول کے لئے تیار ہیں اور اگر ناپسندیدہ ٹھہرے تب بھی ہم تمہارے ساتھ ہیں، عامر بن شہر جب دربار رسالت سے واپس آیا تو اس کا دل نور اسلام سے معمور تھا اور ساتھ ہی سارا قبیلہ بھی مسلمان تھا، ممکن ہے کہ یہ دونوں واقعے ہوں اور دونوں کی کوشش سے یہ کامیابی حاصل ہوئی ہو۔

یمن میں حضرت علیؓ سے لوگ مانوس ہو گئے تھے، ربیع الاول ۱۰ھ میں تین سو سواروں کی حفاظت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کو یمن کے قبیلہ مذحج میں تبلیغ اسلام کے لئے نامزد فرمایا اور ساتھ ہی یہ تاکید فرما دی کہ جب تک وہ حملہ آور نہ ہوں پیش دستی نہ کرنا، حضرت علیؓ جب مذحج کی سرزمین میں پہنچے تو مال گزاری وصول کرنے کے لئے اِدھر اُدھر لوگوں کو متعین کیا، اسی اثنا میں قبیلہ مذحج کی ایک جمعیت نظر آئی، حضرت علیؓ نے اُن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، لیکن اُدھر سے اس احسان کا جواب تیر اور پتھروں کی زبان سے ملا، یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے بھی اپنے ساتھیوں کی صف آرائی کی، مذحج اپنے بیس آدمی مقتول چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے مسلمانوں نے اُن کا تعاقب نہ کیا کہ اُن کا مقصود صرف مدافعت تھا، اس کے بعد رؤسائے قبیلہ خود حاضر ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور دوسروں کی طرف سے نیابۃً اسلام کا اعلان کیا[3]۔

---

[1] ابن ہشام ذکر عرض الاسلام علی القبائل، [2] زرقانی بہ سند صحیح از بیہقی (اصل واقعہ بخاری جزء مغازی میں موجود ہے، لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں اور نہ ان کے اسلام کا اس میں ذکر ہے) اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں ہیں لیکن وہ صحیح نہیں، چنانچہ خود مواہب لدنیہ نے تسلیم کیا ہے۔ ان روایتوں کا یہ مفہوم ہے کہ ہمدان کے لوگوں نے حضرت علیؓ کے ڈر سے اسلام قبول کر لیا لیکن یہ راویوں کا حسن ظن ہے واقعہ نہیں (ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ہمدان کو حکم دیا کہ وہ ثقیف سے ہمیشہ لڑا کریں اور ان پر غارت گری کیا کریں لیکن حافظ ابن قیم نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت بالکل غلط ہے، ہمدان یمن کا قبیلہ تھا اور ثقیف مکہ کے پاس طائف میں تھے، یہ حکم تو دو ہمسایہ قبیلوں کو دیا جا سکتا تھا، [3] حضرت علی کی مہم یمن کا واقعہ تمام حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے، لیکن یہ تفصیل ابن سعد جزء مغازی سے ماخوذ ہے۔

یمن میں فارس کے جو رؤسا قیام پذیر ہو گئے تھے، ان کو ابناء کہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں وبرؓ بن نخلیس کو ان کے پاس دعوت اسلام کے لئے بھیجا، وہ نعمان بن بزرج (ابزرگ) کے گھر ان کے مہمان ہوئے اور فیروز دیلمی، مرکبود، وہب ابن منبہ کے پاس دعوت اسلام کے خطوط بھیجے، سب نے اسلام قبول کیا، صنعاء میں سب سے پہلے جس نے قرآن مجید حفظ کیا وہ مرکبود کے صاحبزادے عطا۔ اور وہب بن منبہ تھے[1])

(عام یمن میں تبلیغ اسلام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذؓ بن جبل اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو نامزد فرمایا، دونوں صاحب یمن کے ایک ایک ضلع میں بھیجے گئے تھے۔ چلتے وقت آپ نے ان لوگوں کو جو باتیں تعلیم فرمائیں۔ وہ درحقیقت اسلامی تبلیغ کے اصول ہیں، آپ نے فرمایا، سہولت سے کام کرنا، سخت گیری نہ کرنا، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا، دونوں مل کر کام کرنا، تم کو ایسے لوگ ملیں گے جو پہلے سے کوئی مذہب رکھتے ہیں جب ان کے ہاں پہنچنا تو پہلے ان کو توحید اور رسالت کی دعوت دینا، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو کہنا کہ خدا نے تم پر روز و شب میں پانچ وقت کی نماز بھی فرض کی ہے، جب یہ بھی مان لیں تو ان کو سمجھانا کہ تم پر زکوٰۃ بھی واجب ہے تم میں جو امیر ہوں ان سے لے کر جو غریب ہیں ان کو دے دی جائے گی، دیکھو جب وہ زکوٰۃ دینا منظور کر لیں تو چن کر اچھی اچھی چیزیں نہ لے لینا، مظلوموں کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے پوچھا یا نبی اللہ! ہمارے ملک یمن میں جو اور شہد کی شراب بنتی ہے، کیا یہ بھی حرام ہے؟ آپ نے فرمایا ہر شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے[3])

نجران (یمن کے پاس ہی نجران کا ضلع ہے، نجران عرب میں عیسائیت کا خاص مرکز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہؓ بن شعبہ کو جو صلح حدیبیہ ۶ھ سے پہلے اسلام لا چکے تھے، دعوت اسلام کے لئے نجران بھیجا، عیسائیوں نے قرآن پر اعتراضات شروع کئے یہ جواب نہ دے سکے اور واپس چلے آئے[4]۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا ان کو خط لکھا جس میں تحریر تھا، اگر اسلام قبول نہ ہو تو اسلام کی سیاسی اطاعت قبول کرو اور جزیہ دو[5] اہل نجران نے راہبوں اور مذہبی پیشواؤں کی ایک جماعت کو دریافت حال کے لئے مدینہ بھیجا، اس وفد کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

نصاریٰ کے علاوہ نجران میں مشرکین کی بھی کچھ آبادی تھی، ان میں ایک قبیلہ بنو حارث ابن زیاد تھا جو مدان نام ایک بت کو پوجتا تھا اور اس لئے عبد المدان کے نام سے مشہور تھا، ربیع الآخر ۱۰ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالدؓ بن ولید کو وہاں دعوت اسلام کے لئے بھیجا، حضرت خالدؓ وہاں پہنچے تو سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا، حضرت خالدؓ نے یہاں تھوڑے دن قیام کیا اور قرآن اور احکام اسلام کی تعلیم دی[6]

اہل یمن کا بغیر کسی ترہیب و ترغیب کے خلوص دل سے قبول اسلام کوئی ایسا واقعہ نہ تھا جو خاص رحمت الٰہی کا مستوجب نہ ہو، جب اشعریوں کی آمد کی خبر ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ کل اہل یمن

---

[1] طبری ص ۱۷۶۳ [2] اضافہ نا بجا ہے [3] یہ پورا واقعہ بخاری جزء و غزوات میں مذکور ہے۔ ہم نے بخاری کی مختلف روایتوں کو یکجا کر لیا ہے [4] ترمذی تفسیر سورۂ مریم [5] زرقانی بحوالہ بیہقی۔ [6] زرقانی جلد ۳ ص ۱۰۱)

آتے ہیں جو رقیق القلب اور نرم دل ہیں[1]۔ جب ہمدان مسلمان ہوا تو آپ نے سجدۂ شکر ادا کیا اور ان کو سلامتی کی دعا دی[2]۔ حمیر اور تمیم کا وفد آیا تو آپ نے پہلے تمیم کی طرف خطاب کیا، تمیم بشارت قبول کرو۔ بنو تمیم نے کہا، یا رسول اللہ ہم نے بشارت تو قبول کر لی، کچھ عطا بھی فرمایئے۔ آپ نے منہ پھیر لیا کہ بشارت سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی؟ پھر اہل یمن کی طرف رخ کر کے فرمایا، اے اہل یمن! تمیم نے بشارت قبول نہ کی تم قبول کر لو۔ اہل یمن بے اختیار بول اٹھے اے خدا کے رسول! ہم نے قبول کیا۔ پھر آپ نے عام طور سے فرمایا۔ ایمان یمن کا ایمان ہے اور دانائی یمن کی دانائی ہے[3]۔

مبلغین یمن میں سے حضرت علیؓ اور ابو موسیٰؓ حجۃ الوداع کے موقع پر یمن سے واپس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا۔ ان مبلغین کے ساتھ یمن کے بہت سے نو مسلم بھی حج و زیارت کو آئے۔

بحرین میں اسلام ۸ھ

بحرین ایران کی حدود حکومت میں داخل تھا، عرب کے قبائل وادیوں میں آباد تھے جن میں مشہور اور با اثر خاندان عبد القیس، بکر بن وائل اور تمیم تھے، ان میں سے عبد القیس کے قبیلہ میں سے منقذ بن حبان تجارت کے لئے نکلے، راہ میں مدینہ پڑتا تھا وہاں ٹھہرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور سورۂ فاتحہ اور اقرأ سیکھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک فرمان عنایت کیا، وہ سفر سے واپس گئے تو چند روز تک کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا، لیکن ان کی بیوی نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو اپنے باپ منذر بن عائذ سے شکایت کی، انہوں نے منقذ سے دریافت کیا۔ بحث و مباحثہ کے بعد منذر بھی مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک لوگوں کو سنایا، سب نے اسلام قبول کر لیا[4]۔

صحیح بخاری (کتاب الجمعہ) میں روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ جس مسجد میں ادا کیا گیا وہ بحرین کی مسجد تھی جو جواثی میں واقع ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحرین میں ابتدائی زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہو چکی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں نے چودہ شخصوں کی ایک سفارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجی جس کے افسر منذر بن الحارث تھے۔ ان کا قافلہ کاشانۂ نبوت کے قریب آیا تو یہ لوگ اس قدر بے تاب ہوئے کہ سواریوں سے کود پڑے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چومے لیکن منذر کو پاس ادب ملحوظ تھا۔ انہوں نے قیام گاہ پر جا کر کپڑے بدلے، پھر خدمت میں حاضر ہو کر دست بوسی کی[5]۔

۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علاء حضرمیؓ کو تبلیغ اسلام کے لئے بحرین بھیجا۔ اس زمانہ میں یہاں ایران کی طرف سے منذر بن ساویٰ گورنر تھا اس نے اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ تمام عرب اور کچھ عجم جو

---

[1] بخاری قدوم الاشعریین و اہل الیمن، [2] زرقانی بحوالہ بیہقی، [3] بخاری کتاب بدء الخلق و قدوم الاشعریین، [4] زرقانی بحوالہ کرمانی قبیلہ عبد القیس کی ایک سفارت کا ذکر صحیح بخاری میں آتا ہے اور وہ اس زمانہ کے بعد کی ہے، بخاری کی روایت سے بھی اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ عبد القیس اس سفارت سے پہلے ایمان لا چکے تھے۔ اصابہ میں ابن شاہین سے جو روایت ہے وہ گو زرقانی کی روایت سے مختلف ہے اور رئیس سفارت کے نام میں اختلاف ہے تاہم اس قدر روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی سفارت ۸ھ سے پہلے کی ہے، [5] زرقانی بروایت بیہقی و مسند احمد،

یہاں مقیم تھے مسلمان ہو گئے[1]

بحرین کے علاقہ میں "ہجر" ایک مقام ہے یہاں ایران کی طرف سے سیبخت حاکم تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے نام بھی خط بھیجا اور اس نے بھی اسلام قبول کیا[2]

عمان میں اسلام ۸ھ

اس شہر پر قبیلۂ ازد کا قبضہ تھا اور عبید و جعفر یہاں کے رئیس تھے، ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو زید انصاریؓ کو جو حافظِ قرآن تھے اور عمروؓ بن العاص کو دعوتِ اسلام کا خط دے کر بھیجا دونوں رئیسوں نے اسلام قبول کیا اور وہاں کے تمام عرب اُن کی ترغیب سے اسلام لائے[3]

حدودِ شام میں اسلام ۹ھ

شام کے اطراف میں جو عرب آباد تھے اُن میں متعدد ریاستیں تھیں ان میں سے معان اور اس کے اضلاع فروۃ بن عمرو کے زیرِ حکومت تھے لیکن خود فروۃ رومی سلطنت کی طرف سے گویا گورنر تھے، انہوں نے اسلام سے واقفیت پیدا کی تو مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اظہارِ اسلام کے ساتھ ایک خچر ہدیہ کے طور پر بھیجا (عیسائی) رومیوں کو اُن کے اسلام کا حال معلوم ہوا تو ان کو گرفتار کر کے سُولی دے دی، اس وقت یہ شعر ان کی زبان پر تھا[4]

بلغ سراة المسلمین باننی　　سلم لربی اعظمی ومقامی

(مسلمان سرداروں کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میرا جسم اور میری عزت سب اپنے پروردگار کے نام پر نثار ہے)

(شام اور عرب کے درمیان عذرہ، بلیّ، جذام وغیرہ قبائل آباد تھے، قبیلۂ بلی میں حضرت عمروؓ بن العاص کا ننہال تھا اس لئے ایک جماعت کے ساتھ وہ ان اطراف میں بھیجے گئے، جب وہ جذام کے تالاب پر پہنچے تو اُن کو حملہ کا خوف ہوا، دربارِ نبوت میں اطلاع کی، وہاں سے حضرت ابو عبیدہؓ کی ماتحتی میں بغرضِ حفاظت کچھ فوج بھیج دی گئی، اسی کو اہلِ سیر کی اصطلاح میں غزوۂ ذات السلاسل کہتے ہیں)

*

---

[1] فتوح البلدان [2] ایضاً ذکر بحرین [3] ایضاً ذکر فتح عمان [4] ابن ہشام اسلام فروۃؓ ذکر وفود

وفودِ عرب

(جن لوگوں نے مبلغینِ اسلام کی دعوت قبول کر لینے کے بعد خود بارگاہِ نبوت میں جا کر اسلام کا اعلان کرنا چاہا، اربابِ سیر "وفود" کے عنوان سے اُن کا ذکر کرتے ہیں، اس قسم کے وفود کی تعداد بہت زیادہ ہے، ابنِ اسحاق نے صرف پندرہ وفود کا حال لکھا ہے، ابن سعد میں ستر وفود کا تذکرہ ہے، دمیاطی، مغلطائی، زین عراقی بھی یہی تعداد بیان کرتے ہیں، لیکن مصنف سیرتِ شامی نے زیادہ استقصاء کیا ہے اور ایک سو چار وفود کے حالات بہم پہنچائے ہیں، اگرچہ ان میں کہیں کہیں ضعیف روایتوں سے استناد کیا گیا ہے اور اکثر وفود کے نام مبہم ہیں، تاہم یہ مسلّم ہے کہ اصل تعداد ابنِ اسحاق کی روایت سے کہیں زیادہ ہے، حافظ ابن قیم اور قسطلانی نے نہایت تحقیق اور احتیاط کے ساتھ ان میں سے صرف ۳۴ وفود کی تفصیل کی ہے)

اصل یہ ہے کہ تمام عرب مکہ کے فیصلۂ اخیر کا انتظار کر رہا تھا، مکہ فتح ہو چکا تو یہ انتظار جاتا رہا، اب ہر قبیلہ نے چاہا کہ خود دارالاسلام میں جا کر کوئی فیصلہ کرے، اہلِ عرب کو یہ بات تو معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ اسلام کے مقابلہ میں سرکشی نہیں کر سکتے، لیکن خیبر وغیرہ کی نظیروں سے یہ بھی جانتے تھے کہ اسلام لانے پر وہ مجبور نہیں ہیں بلکہ جزیہ یا کسی اور طریقہ سے صلح کر کے ان کی سابق حالت قائم رہ سکتی ہے۔

فتح مکہ کے ساتھ ہی ہر طرف سے سفارتیں آنی شروع ہو گئیں اور بجز چند کے باقی جس قدر سفارتیں آئیں، انھوں نے بارگاہِ نبوت میں پہنچ کر وہ کچھ دیکھا کہ واپس آئے تو ایمان کی دولت سے مالا مال آئے۔

عرب کے سب سے طاقتور قبیلے جن کا اثر دور تک پھیلا ہوا تھا، بنو تمیم، بنو سعد، بنو حنیفہ، بنو اسد، کندہ، سلاطینِ حمیر، ہمدان، ازد اور طے تھے، ان تمام قبائل کی سفارتیں، دربارِ نبوت میں آئیں، ان میں سے بعض ملکی حیثیت رکھتی تھیں یعنی جن کا مقصد صرف یہ تھا کہ بحیثیت فاتح کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدہ کر لیں لیکن اکثر اس غرض سے آئیں کہ اسلام کی حقیقت سے مطلع ہو کر اس کے حلقہ میں آ جائیں، یہ وفود زیادہ تر فتح مکہ کے بعد ۸ھ، ۹ھ اور ۱۰ھ میں آئے، لیکن تسلسل بیان کے لئے اس سے پہلے کے چند وفود کا تذکرہ کرنا بھی موزوں ہوگا۔

مزینہ یہ ایک بڑا قبیلہ تھا جو مضر تک پہنچ کر قریش کے خاندان سے مل جاتا ہے، نعمانؓ بن مقرن مشہور صحابی جو فتح مکہ میں قبیلہ مزینہ کے علمبردار تھے اسی قبیلہ سے تھے، اصفہان انہی نے فتح کیا تھا، ۵ھ میں اس قبیلہ کے چار سو شخص قبیلہ کے سفیر بن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور اسلام لائے[1]، عراقی نے سیرۃ منظوم میں لکھا ہے

---

[1] اصابہ فی احوال الصحابہ، ترجمہ نعمان بن مقرن و ابن سعد جزء وفود صفحہ ۳۸)

اوّل وفد وفد المدینۃ   سنۃ خمس وفد امزینہ

سب سے پہلا وفد جو مدینہ میں آیا   وہ مزینہ کا قبیلہ تھا جو ۵ھ میں آیا

بنو تمیم بنو تمیم کے وفود بڑی شان و شوکت سے آئے، قبیلہ کے تمام بڑے بڑے رؤسا، مثلاً اقرع بن حابس زبرقان، عمرو بن الاہتم، نعیم بن یزید سب اس سفارت میں شامل تھے، عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کے حدود تک حملہ آور ہوا کرتا تھا، وہ بھی ساتھ تھا، یہ لوگ اگرچہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے، تاہم عربی فخر و غرور کا نشہ سر میں اب بھی باقی تھا، دربار نبوت یعنی مسجد نبوی میں پہنچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے تھے، آستانہ اقدس پر جاکر پکارے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو بولے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم اس لئے آئے ہیں کہ تم سے مفاخرہ کریں، آپ نے اجازت دی، عطارد ابن حاجب جو مشہور خطیب تھا اور جس نے نوشیرواں کے دربار سے حسن تقریر کے صلہ میں کمخواب کا خلعت حاصل کیا تھا، اٹھا اور اپنی قوم کے مفاخر پر ایک پرزور تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا،

"خدا کا شکر ہے جس کے الطاف کی بدولت ہم صاحب تاج و تخت خزانہ ہائے گراں بہا کے مالک اور مشرق میں تمام قوموں سے معزز تر ہیں، ہماری برابری آج کون کرسکتا ہے، ہماری ہمسری کا جس کو دعویٰ ہو وہ یہ خصائص اور اوصاف گنائے جو ہم نے گنائے ہیں"

عطارد خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو جواب دینے کا اشارہ کیا، انھوں نے جو تقریر کی اس کا ماحصل یہ تھا،

"اس کی تعریف جس نے زمین و آسمان بنائے اُس نے ہم کو بادشاہت دی اور اپنے بندوں میں سے بہترین شخص کو انتخاب کیا جو سب سے زیادہ شریف النسب، سب سے زیادہ راست گفتار، سب سے زیادہ شریف الاخلاق تھا، وہ تمام عالم کا انتخاب تھا اس لئے خدا نے اس پر کتاب نازل کی، ہم نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے مہاجرین اور اس کے بعد ہم (انصار) نے دعوت اسلام پر لبیک کہا، ہم لوگ انصار النبی اور وزرائے رسالت ہیں"

تقریریں ہو چکیں تو اشعار کی باری آئی، سفارت کی طرف سے تمیم کے مشہور شاعر زبرقان ابن بدر نے قصیدہ پڑھا،

نحن الکرام فلا حیّ یعادلنا   منا الملوک وفینا تنصب البیع

روایتوں میں آیا ہے کہ ایک شخص نے مدینہ میں آکر خطبہ دیا تو اس کی خوبی تقریر نے تمام حاضرین کو حیرت زدہ کردیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، ان من البیان لسحرا، یعنی بعض بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے، اصابہ فی احوال الصحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبرقان ہی کی تقریر پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے، غرض جب زبرقان تقریر کر چکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دربار رسالت کے شاعر یعنی حسانؓ بن ثابت کی طرف دیکھا، انھوں نے برجستہ کہا،

؎ اصابہ فی احوال الصحابہ، ہم شرفائے قوم ہیں کوئی قبیلہ ہمارا ہمسر نہیں ہو سکتا ہم میں تخت نشین ہیں اور ہم کلیساؤں کے بانی ہیں۔

ان الذوائب من فهر و اخوانهم قد بیّنوا سنة للناس یتّبعا
شرفائے قبیلۂ فہر و برادرانِ فہر نے لوگوں کو وہ راستہ بتادیا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں

ارکانِ سفارت میں اقرع بن حابس عرب کا مشہور حاکم تھا یعنی قومی مقدمات کا مرافعہ اس کے پاس جاتا تھا اور اُس کے فیصلوں پر لوگ گردن جھکا دیتے تھے۔ وہ اسلام لانے سے پہلے مجوسی تھا اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جب سفارت کے ساتھ دربارِ رسالت میں آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

ان حمدی لزین وان ذمی لشین۔ میں جس کی تعریف کر دوں وہ چمک جاتا ہے اور جس کو برا کر دوں اس کو داغ لگ جاتا ہے۔

نظم و نثر کی معرکہ آرائی ہو چکی تو سفارت نے اعتراف کیا کہ دربارِ رسالت کے خطیب اور شاعر دونوں ہمارے شاعر و خطیب سے افضل ہیں، پھر سب نے اسلام قبول کیا۔

بنو سعد بنو سعد نے ضمام بن ثعلبہ کو سفیر بنا کر بھیجا وہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آئے اور جس طریقہ سے سفارت ادا کی اس سے عرب کی اصلی ادائیگی اور آزادروی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں متعدد موقعوں پر اس کا ذکر ہے، کتاب العلم کی روایت حسب ذیل ہے۔

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے، ایک شخص ناقہ پر سوار آیا اور صحنِ مسجد میں آکر ناقہ سے اترا، پھر حاضرین سے پوچھا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کس کا نام ہے؟" لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "یہ گورے رنگ کے جو تکیہ لگائے بیٹھے ہیں" پاس آکر کہا "اے عبدالمطلب کے بیٹے!" آپ نے فرمایا "میں جواب دے چکا" بولا کہ "میں تم سے کچھ باتیں پوچھوں گا لیکن سختی سے پوچھوں گا اس پر ناراض نہ ہونا" ارشاد ہوا کہ "جو پوچھنا ہو پوچھو" بولا کہ اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو، کیا خدا نے تم کو تمام دنیا کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے؟" آپ نے فرمایا "ہاں!" پھر قسم دلا کر پوچھا کہ کیا تم کو خدا نے پنج وقتہ نماز کا حکم دیا ہے؟ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ، حج کی نسبت پوچھا اور آپ برابر ہاں فرماتے جاتے تھے۔ جب سب احکام سن لئے تو کہا کہ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے، میں جاتا ہوں اور جو تم نے بتایا ہے میں اس سے ایک ذرہ نہ زیادہ کروں گا نہ کم، وہ جا چکا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی"[1]

ضمام نے واپس جا کر اپنی قوم سے کہا کہ لات و عزیٰ کوئی چیز نہیں، لوگوں نے کہا کیا کہتے ہو؟ تم کو جنون یا جذام نہ ہو جائے۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم! وہ نہ کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، میں تو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا ہوں" اُن کی مختصر تقریر کا یہ اثر تھا کہ شام نہیں ہونے پائی تھی کہ قبیلہ کا قبیلہ زن و مرد و بچے سب مسلمان تھے[2]

اشعریین یمن یمن کا ایک نہایت معزز قبیلہ اشعریین کا تھا، ابو موسیٰ اشعریؓ اسی قبیلہ سے ہیں، ان لوگوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سنی تو ترپن شخصوں نے مدینہ کی ہجرت کا قصد کیا، اسی قافلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بھی تھے۔ یہ لوگ جہاز میں سوار ہو کر چلے، لیکن ہوائے مخالف نے جہاز کو حبش

---

[1] یہ روایت صحیح بخاری میں مختلف ابواب میں منقول ہے [2] ابن ہشام۔

میں پہنچا دیا۔ وہاں جعفر طیارؓ موجود تھے، وہ اپنے ساتھ لے کر عرب کو روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں خیبر فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہیں تشریف فرما تھے، چنانچہ یہیں لوگوں نے شرف باریابی حاصل کیا۔

یہ صحیح مسلم (فضائل اشعریین) کی روایت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعریوں کا وفد آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تمہارے یہاں یمن کے لوگ آتے ہیں جو نہایت رقیق القلب اور نرم دل ہیں

مسند احمد بن حنبل میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب اشاعرہ کا وفد آیا تو یہ لوگ جوش مسرت سے یہ رجز پڑھتے تھے

غداً نلقی الاحبۃ   محمداً و حزبہ
(کل ہم دوستوں سے ملیں گے   محمدؐ اور پیروان محمد سے)

(بارگاہ نبوت میں پہنچے تو عرض کی یا رسول اللہ! ہم اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنے مذہب کے کچھ احکام سیکھیں اور ابتدائے کائنات کے کچھ حالات پوچھیں، آپ نے فرمایا "پہلے خدا تھا اور کچھ نہ تھا اس کا تخت پانی پر تھا"[1]

دوس ۷ھ

دوس عرب کا ایک مشہور قبیلہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ اسی قبیلہ سے ہیں۔ اس قبیلہ کے مشہور شاعر اور رئیس طفیل بن عمرو تھے، وہ ہجرت سے پہلے مکہ گئے، قریش نے ان کو منع کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جائیں لیکن اتفاق سے ایک دفعہ یہ حرم میں گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ قرآن مجید سن کر متاثر ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ مجھ کو اسلام کی حقیقت سمجھائیں، آپ نے اسلام کی تبلیغ کی اور قرآن کی آیتیں سنائیں۔ وہ نہایت خلوص سے اسلام لائے، وطن جا کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ لیکن ان کے قبیلہ میں زنا کا بہت رواج تھا۔ لوگ سمجھے کہ اسلام کے بعد اس آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اس لئے لوگوں نے تامل کیا۔ طفیل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر یہ حقیقت بیان کی آپ نے دعا فرمائی کہ "خدایا! دوس کو ہدایت دے"، پھر طفیل سے ارشاد فرمایا کہ جا کر نرمی اور ملاطفت سے لوگوں کو اسلام کی دعوت دو۔ غرض دعائے نبوی کی برکت اور طفیل کی ترغیب اور ہدایت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا اور اسّی خاندان جن میں ابوہریرہؓ بھی تھے، ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔[2]

بنو حارث بن کعب ۹ھ

یہ نجران کا ایک نہایت معزز خاندان تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو ان کے پاس دعوت اسلام کے لئے بھیجا، یہ لوگ نہایت خلوص کے ساتھ اسلام لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مدینہ بلا بھیجا، چنانچہ قیس ابن الحصین و یزید بن عبدالمدان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے چونکہ اکثر معرکوں میں قبائل عرب پر غالب رہے تھے، آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے غلبہ کے اسباب کیا تھے؟ بولے ہم ہمیشہ متفق ہو کر لڑتے تھے اور کسی پر ظلم نہیں کرتے تھے، آپ نے قیس کو ان کا رئیس مقرر کیا۔[3]

---

[1] بخاری باب بدء الخلق۔ [2] اصابہ اور زاد المعاد اور ابن سعد بذکر وفود۔ [3] اصابہ و زاد المعاد۔

قبیلۂ طے ۹ھ

یمن میں طے نہایت نامور قبیلہ تھا، اس قبیلہ کے رؤسا زید الخیل و عدی ابن حاتم طائی تھے اور اُن کے حدودِ حکومت الگ تھے، زید زمانۂ جاہلیت کے مشہور شاعر، خطیب، خوش جمال فیاض، بہادر تھے، سنہ ۹ھ میں یہ چند معزز اشخاص کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی، انھوں نے مع اپنے ساتھیوں کے نہایت صدق سے اسلام قبول کیا، شہسواری کی وجہ سے یہ زید الخیل کے لقب سے مشہور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لقب کو زید الخیرؓ سے بدل دیا۔

عدی بن حاتم ۹ھ

عدی مشہور حاتم طائی کے بیٹے اور قبیلۂ طے کے رئیس اور مذہباً عیسائی تھے، سلاطینِ عرب کی طرح اُن کو بھی آمدنی کا چوتھا حصہ ملتا تھا، جس زمانہ میں اسلامی فوجیں یمن گئیں یہ بھاگ کر شام چلے گئے، اُن کی بہن گرفتار ہو کر مدینہ میں آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو بڑی عزت و حرمت سے رخصت کیا، وہ اپنے بھائی کے پاس چلی گئیں کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو، وہ پیغمبر ہوں یا بادشاہ ہر حال میں اُن کے پاس جانا مفید ہے، غرض عدی مدینہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، عدی نے مسجد میں جا کر سلام کیا، آپ نے جواب سلام کے بعد نام پوچھا، پھر ان کو لے کر گھر کی طرف چلے اسی اثنا میں ایک بڑھیا آگئی، اُس نے آپ کو روک لیا اور دیر تک آپ سے کسی کام کے متعلق باتیں کرتی رہی، عدی خود رئیس تھے، شام میں رومیوں کا دربار دیکھا تھا، ان کو حیرت ہوئی کہ شہنشاہِ عرب ایک بڑھیا کے ساتھ اس مساوات سے پیش آتا ہے، اُسی وقت ان کو خیال ہوا کہ یہ شخص بادشاہ نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے، چمڑے کا ایک گدا تھا، اس کو عدی کی طرف بڑھایا، یہ اصرار کے بعد اس پر بیٹھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیوں عدی! تم اپنی قوم سے مرباع لیتے تھے، لیکن یہ تو تمہارے مذہب (نصرانیت) میں جائز نہیں ہے[2]، پھر فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا ہے؟ بولے نہیں، پھر پوچھا کہ خدا سے کوئی بڑا ہے؟ بولے کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہودیوں پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے اور عیسائی گمراہ ہوگئے ہیں[3]۔

غرض عدی نے اسلام قبول کیا اور اس قدر ثابت قدم رہے کہ ردّہ کے زمانے میں بھی ان پر کچھ اثر نہیں پڑا باپ کی سخاوت کا اثر اُن پر بھی تھا، ایک دفعہ ایک شخص نے اُن سے سو روپے طلب کئے، بولے کہ تم حاتم کے بیٹے سے اس قدر حقیر رقم مانگتے ہو، بخدا ہرگز نہ دوں گا[4]۔

وفد ثقیف

(یاد ہوگا) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ چھوڑ کر روانہ ہونے لگے تو صحابہؓ نے عرض کی تھی کہ آپ اُن کے حق میں بددعا فرمائیں، آپ نے جن لفظوں میں دُعا فرمائی تھی یہ تھی۔

اللّٰھم اھد ثقیفا وائتِ بھم	اے خدا ثقیف کو ہدایت دے اور ان کو میرے پاس بھیج

(یہ دُعائے نبوی کا اعجاز تھا کہ وہ قبیلہ جو تلوار سے زیر نہ ہو سکا تھا، دفعۃً جلالِ نبوت نے اس کی گردن آستانۂ اسلام پر جھکا دی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا)

---

[1] اصابہ و زاد المعاد [2] ابن ہشام اسلام عدیؓ بن حاتم [3] مسند امام احمد حدیث عدی و ترمذی تفسیر فاتحہ

[4] اصابہ فی احوال الصحابہ ذکر عدی۔

طائف دو رئیسوں کے قبضہ میں تھا جن میں ایک عروہ بن مسعود تھے، جن کی نسبت کفارِ مکہ کہا کرتے تھے کہ کلام مکہ اترتا تو ان پر اترتا، عروہ اگرچہ اب تک اسلام نہیں لائے تھے لیکن مادۂ قابل رکھتے تھے، حدیبیہ کی صلح بھی انہی کی سفارت سے انجام پائی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب طائف سے واپس چلے تو خدا نے ان کو اسلام کی توفیق دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ نہیں پہنچنے پائے تھے کہ وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اسلام لاکر واپس گئے۔ واپس جاکر انہوں نے اسلام کا اظہار کیا اور لوگوں کو اسلام کی ترغیب دی۔ لوگوں نے ان کو بہت برا بھلا کہا، صبح کو جب اپنے بالاخانہ پر اذان دی تو ہر طرف سے تیروں کا مینہ برسا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ محاصرۂ طائف میں جو مسلمان شہید ہو چکے ہیں اُن ہی کے پہلو میں ہی دفن کئے جائیں۔

عروہ کا خون رائیگاں نہیں جا سکتا تھا، صخر بن عیلہ رئیسِ احمس یہ سُن کر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں کچھ سوار لے کر چل کھڑا ہوا تھا اتفاق سے اس وقت پہنچا جب آپ طائف چھوڑ کر مدینہ کی طرف مراجعت فرما چکے تھے۔ صخر نے عہد کیا کہ جب تک اہلِ طائف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ قبول کر لیں گے میں قلعہ کا محاصرہ نہ چھوڑوں گا، آخر اہلِ طائف نے اطاعت قبول کر لی۔ صخر نے خدمتِ نبوی میں اطلاع کی تو آپ نے مسجدِ نبوی میں تمام لوگوں کو جمع کیا اور احمس کے لئے دس بار دعا فرمائی[۱] چند روز کے بعد اہلِ طائف نے مشورہ کیا کہ تمام عرب اسلام لا چکا، اب ہم اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ غرض یہ رائے قرار پائی کہ چند سفیر مقرر کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجے جائیں۔

ان کی سفارت نے مدینہ کا رُخ کیا تو مسلمانوں کو اس قدر مسرت ہوئی کہ سب سے پہلے مغیرہؓ بن شعبہ دوڑے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جا کر خبر کریں، راہ میں حضرت ابوبکرؓ مل گئے۔ ان کو معلوم ہوا تو مغیرہ کو قسم دلائی کہ یہ خوشخبری مجھ کو پہنچانے دو، مغیرہ نے ان لوگوں کو تعلیم دی کہ دربارِ رسالت میں جانا تو اس طریقے سے سلام عرض کرنا، لیکن یہ لوگ اسی قدیم دستور کے موافق آداب بجالائے۔

عبد یالیل طائف کا مشہور رئیس امیر الوفد تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حالانکہ اب تک وہ کافر تھا، مسجدِ نبوی میں اتارا کہ مسلمانوں کی محویت و استغراق کو دیکھ کر متاثر ہوں، یہ لوگ صحنِ مسجد میں خیمہ نصب کرا کر ٹھہرائے گئے نماز اور خطبہ کے وقت یہ لوگ موجود رہتے تھے، گو خود شریک نہیں ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ خطبہ میں اپنا نام نہیں لیتے تھے، ان لوگوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے تو اپنی پیغمبری کا اقرار لیتے ہیں لیکن خطبہ میں خود اپنی پیغمبری کا اقرار نہیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا کہ "میں سب سے پہلے شہادت دیتا ہوں کہ میں فرستادۂ الٰہی ہوں"[۲]

جماعتِ سفراء میں عثمان بن ابی العاص سب سے کم عمر تھے، سفراء دربارِ نبوی میں آتے تو اُن کو بچہ سمجھ کر قیام گاہ میں چھوڑ آتے، عثمان گو کم سن تھے لیکن سب سے زیادہ تیز فہم اور رسائی تحقیق تھے ان کا معمول تھا کہ جب سفراء دن کو قیلولہ کرتے تو یہ چپکے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور قرآن مجید اور مسائلِ اسلام سیکھتے

---

[۱] ابوداؤد باب اقطاع الارضین، [۲] ابوداؤد باب ماجاء فی خبر الطائف۔

یہاں تک کہ اکثر ضروری مسائل سیکھ لیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے (نماز عشاء کے بعد اُن کے پاس تشریف لے جاتے اور کھڑے کھڑے اُن سے باتیں کرتے۔ زیادہ تر مکّہ میں قریش کے ہاتھ سے جو اذیتیں اٹھائی تھیں اُن کو بیان فرماتے۔ مدینہ میں جو لڑائیاں پیش آئیں اُن کا بھی تذکرہ فرماتے)[1] بالآخر ان لوگوں نے اسلام پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ شرطیں پیش کیں،

(۱) زنا ہمارے لیے جائز رکھا جائے۔ کیونکہ ہم میں سے اکثر مجرد رہتے ہیں اور اس لیے ان کو اس سے چارہ نہیں۔

(۲) ہماری قوم کا تمام کاروبار اور ذریعۂ معاش سود ہے اس لیے سود خواری جائز رکھی جائے۔

(۳) شراب سے نہ روکا جائے، ہمارے شہر میں کثرت سے انگور پیدا ہوتا ہے اور یہ ہماری بڑی تجارت ہے۔

لیکن یہ تینوں درخواستیں نامنظور ہوئیں۔ بالآخر ان لوگوں نے کہا اچھا ہم یہ شرطیں واپس لیتے ہیں لیکن ہمارے معبود (طائف کا سب سے بڑا بُت جس کا نام لات تھا) کی نسبت کیا ارشاد ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ توڑ دیا جائے گا۔ یہ سُن کر ان کو سخت حیرت ہوئی کہ کیا کوئی شخص اُن کے خدائے اعظم کو ہاتھ بھی لگا سکتا ہے۔ بولے کہ اگر ہمارے معبود کو معلوم ہو جائے کہ آپ کا یہ ارادہ ہے تو وہ تمام شہر کو تباہ کر دے گا، حضرت عمرؓ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولے کہ تم لوگ کس قدر جاہل ہو، منات صرف ایک پتھر ہے۔ ان لوگوں نے کہا عمر! ہم تمہارے پاس نہیں آئے۔ یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ ہم منات کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ آپ جو چاہیں کریں لیکن ہم کو اس جرأت سے معاف رکھا جائے۔ آپ نے یہ درخواست منظور کر لی[2]۔

ان لوگوں نے نماز، زکوٰۃ اور جہاد سے مستثنیٰ ہونے کی بھی درخواست کی۔ نماز سے معافی تو کسی حالت میں ممکن نہ تھی، وہ ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنے کی چیز ہے لیکن زکوٰۃ سال بھر کے بعد واجب ہوتی ہے اور جہاد فرض کفایہ ہے، ہر شخص پر واجب نہیں ہے، واجب بھی ہو تو اس کے خاص مواقع ہیں، روز کا کام نہیں، اس بناء پر اس وقت ان دونوں باتوں سے ان کو مجبور نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ جب وہ اسلام قبول کریں گے تو رفتہ رفتہ خود ان میں صلاحیت آجائے گی۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سُنا کہ جب یہ ایمان لاچکیں گے تو زکوٰۃ بھی دینے لگیں گے اور جہاد بھی کریں گے[3]۔ (چنانچہ دو ہی برس کے بعد حجۃ الوداع کا موقع آیا تو کوئی ثقفی ایسا نہ تھا جس نے اسلام نہ قبول کر لیا ہو[4])

سفارت جب واپس چلی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا کہ شرط کے موافق طائف کے صنم اعظم (لات) کو جا کر توڑ آئیں، مغیرہ نے طائف پہنچ کر بُت کدہ کو ڈھانا چاہا تو مستورات روتی ہوئی ننگے سر گھروں سے نکل آئیں اور یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں[5]۔

---

(۱) ابوداؤد باب تحزیب القرآن، (۲) زاد المعاد بحوالہ مغازی موسیٰ بن عقبہ (۳) ابوداؤد کتاب الخراج والامارہ باب ماجاء فی خبر الطائف

(۴) اصابہ ترجمہ جبیر بن حیہ ثقفی، (۵) تاریخ طبری۔

الا ابکین دفاع	لوگوں پر رو دو کہ پست ہمتوں نے اپنے
اسلمها الرضاع	بتوں کو دشمنوں کے سپرد کر دیا اور
لم یحسنوا المصاع	معرکہ آرائی نہ کر سکے۔

عربوں میں کثیر الازواجی کی عام عادت تھی، قبیلۂ ثقیف کے ایک نامور سردار غیلان ابن سلمہ کی دس بیویاں تھیں جب وہ مسلمان ہوا تو احکام اسلام کے مطابق چار کے سوا تمام بیویوں سے اُس کو مفارقت کرنی پڑی[1]۔

وفد نجران ۹ھ نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع کا نام ہے جہاں عیسائی عرب آباد تھے، یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا جس کو وہ کعبہ کہتے تھے اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے، اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے جن کا لقب سید اور عاقب تھا، عرب میں عیسائیوں کا کوئی مذہبی مرکز اس کا ہمسر نہ تھا، اعشیٰ اسی کی شان میں کہتا ہے۔

وکعبة نجران حتم علیک	حتی تناخی بابوابها
تزور یزید او عبد المسیح	وقیس هم خیر اربابها

یہ کعبہ تین سو کھالوں سے گنبد کی شکل میں بنایا گیا تھا، جو شخص اس کے حدود میں آ جاتا تھا وہ مامون ہو جاتا تھا اس کعبہ کے اوقاف کی آمدنی دو لاکھ سالانہ تھی[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوتِ اسلام کا خط لکھا تو اس کعبہ کے محافظ اور ائمہ مذہب ساٹھ آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو مسجد میں اتارا، تھوڑی دیر کے بعد نماز کا وقت آیا تو ان لوگوں نے نماز پڑھنی چاہی، صحابہؓ نے روکا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پڑھنے دو، چنانچہ ان لوگوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا کی، ابو حارثہ جو لارڈ بشپ تھا، نہایت محترم اور فاضل شخص تھا، قیصر روم نے اس کو یہ منصب عطا کیا تھا اور اس کے لئے گرجے اور معبد بنوائے تھے[3]۔

ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مسائل پوچھے اور آپ نے وحی کی رو سے اُنکا جواب دیا، اُن کے زمانۂ قیام میں سورۂ آل عمران کی ابتداء کی اسی آیتیں اُتریں۔ ان آیتوں میں اُن کے سوالات کا جواب تھا، جس آیت میں دعوتِ اسلام کی تشریح تھی وہ یہ ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔ (آل عمران)	کہہ دے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کو مان لیں جو ہم تم دونوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو خدا کا شریک نہ بنائیں اور ہم میں کوئی کسی کو خدا کے سوا رب نہ قرار دیں، پھر اگر یہ لوگ نہ مانیں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

---

[1] جامع ترمذی و ابو داؤد کتاب النکاح۔ [2] یہ تمام تفصیل معجم البلدان میں ہے۔ پہلا فقرہ فتح الباری سے ماخوذ ہے جہاں وفد نجران کا ذکر ہے۔ [3] زاد المعاد۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُن کو اسلام کی دعوت دی تو اُن لوگوں نے کہا کہ ہم تو پہلے سے مسلمان ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم صلیب پوجتے ہو، عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہو کیونکر مسلمان ہو سکتے ہو، جب یہ لوگ اس پر راضی نہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے مطابق ان سے کہہ دیا کہ اچھا مباہلہ کرو، یعنی ہم تم دونوں اپنے اہل و عیال کو لے کر آئیں اور دُعا کریں کہ جو شخص جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ ۔ (آل عمران)	تو جو شخص تجھ سے علم آئے پیچھے جھگڑا کرتا ہے اس سے کہہ دے کہ آؤ اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کو اور خود اپنے آپ کو بلائیں پھر مباہلہ کریں اور خدا سے دُعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ زہراؓ اور امام حسن و حسین علیہما السلام کو لے کر مباہلہ کے لئے نکلے تو خود اُن کی جماعت میں سے ایک شخص نے رائے دی کہ مباہلہ نہیں کرنا چاہئے، اگر یہ شخص واقعی پیغمبر ہے تو ہم لوگ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں گے۔ غرض ان لوگوں نے کچھ سالانہ خراج قبول کر کے صلح کر لی۔

بنو اسد ۹ھ

یہ وہ قبیلہ ہے جو لڑائیوں میں قریش کا دست و بازو تھا، طلیحہ بن خویلد جس نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا اسی قبیلہ سے تھا، ۹ھ میں یہ لوگ بھی اسلام لائے اور سفارت بھیجی لیکن اب تک اُن کے دماغ میں فخر کا نشہ باقی تھا، سفراء دربار رسالت میں آئے تو احسان کے لہجہ میں کہا کہ آپ نے ہمارے پاس کوئی مہم نہیں بھیجی، بلکہ ہم نے خود اسلام قبول کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (سورۂ حجرات)	یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ ہم اسلام لائے کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ خدا تم پر احسان رکھتا ہے کہ تم کو ایمان لانے کی ہدایت کی، اگر تم سچے ہو۔

بنو فزارہ ۹ھ

یہ نہایت سرکش اور زور آور قبیلہ تھا، عیینہ بن حصن اسی قبیلہ سے تھے، اسی قبیلہ نے رغبتاً ۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے، اپنا وفد بھیجا اور اسلام قبول کیا۔

کندہ ۱۰ھ

یہ حضر موت (یمن) کے اضلاع میں سے ایک شہر تھا، یہاں کندی خاندان کی سلطنت تھی، اس زمانہ میں اس خاندان کے حاکم اشعث بن قیس تھے، یہ ۱۰ھ میں اسی سواروں کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے حبرہ کی چادریں جن کے سنجاف حریر کے تھے کاندھوں پر ڈالے بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے، یہ پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دیکھ کر فرمایا کہ کیا تم اسلام نہیں لا چکے ہو؟ بولے ہاں! آپ نے فرمایا کہ پھر یہ حریر کیسا؟[1] ان لوگوں نے فوراً چادریں پھاڑ پھاڑ کر زمین پر ڈال دیں۔[2]

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اپنی بہن ام فروہ سے ان کی شادی کر دی تھی، نکاح ہو چکا تو فوراً اٹھ کر اونٹوں کے بازار میں پہنچے اور جو اونٹ سامنے آیا تلوار سے اس کی کوچیں اڑا دیں، تھوڑی دیر میں بیسیوں

---

[1] زرقانی [2] ابن ہشام وفد کندہ۔

زمین پر پڑے تھے، لوگوں کو حیرت ہوئی، انھوں نے کہا میں اپنی دارالریاست میں ہوتا تو اور ہی سرو سامان ہوتا یہ کہہ کر اونٹوں کے دام دے دیئے اور لوگوں سے کہا یہ آپ کی دعوت ہے[1]۔ یہ جنگِ قادسیہ اور یرموک میں شریک تھے اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔

عبد القیس

یہ قبیلہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بحرین کا باشندہ تھا، یہاں اسلام کا اثر بہت پہلے پہنچ چکا تھا سب سے پہلے اس قبیلہ کے تیرہ آدمی ؁ میں یا اس سے آگے پیچھے زمانہ میں خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! ہم خاندانِ ربیعہ سے ہیں، فرمایا مرحبا لا خزایا ولا ندامی۔ پھر ان لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمارا ملک (بحرین) بہت دور ہے اور بیچ میں کفارِ مضر کی آبادیاں ہیں، ہم اشہرِ حرم کے سوا اور مہینوں میں نہیں آ سکتے۔ چند ایسی باتیں تلقین فرمایئے جن پر ہمیشہ عمل کریں اور اپنے اہلِ وطن کو بھی ان کی تعلیم دیں، ارشاد ہوا کہ میں تم کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں، خدا کو ایک جانو، نماز پڑھو، روزہ رکھو اور خمس دو اور چار چیزوں سے منع کرتا ہوں، دبا، حنتم، نقیر، مزفت۔

دُبّا، حنتم، نقیر، مزفت، یہ عرب میں چار قسم کے برتن ہوتے تھے جن میں رکھ کر شراب بنائی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریف یہ جاری تھی کہ جس قبیلہ میں جو مخصوص عیوب ہوتے تھے، اُن کے پند و موعظت میں انہی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرماتے تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ حضورؐ نے ان ظروف کا کیوں مخصوص طور سے ذکر فرمایا، چنانچہ انھوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! نقیر کے متعلق آپ کو کیا معلوم ہے؟ ارشاد فرمایا، ہاں کھجور کی موٹی لکڑی کو اندر سے کھود کے تم اس میں پانی ڈال لیتے ہو جب اُبال کم ہو جاتا ہے تو اُس کو پی کر اپنے بھائیوں پر تلوار چلاتے ہو، اتفاق یہ کہ وفد میں ایک صاحب ایسے تھے جن پر یہی واقعہ گزرا تھا ان کی پیشانی پر تلوار کا داغ بھی تھا، اس کو وہ شرم سے چھپاتے تھے[3]۔

بعض روایتوں میں ہے کہ عبد القیس نے خود پوچھا کہ یا رسول اللہ ہم کو کیا پینا چاہیئے؟ اس کے جواب میں آپ نے ان چار چیزوں کا ذکر فرمایا۔

بنو عامر ؁

(بنو عامر کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلہ قیس بن عیلان کی شاخ تھا، بنو عامر میں اس وقت تین رئیس تھے۔ عامر بن طفیل، اربد بن قیس اور جبار بن سلمٰی، عامر اور اربد صرف حصولِ جاہ کے خواہاں تھے یہ عامر وہی شخص تھا جو اس سے پہلے متعدد فتنوں کا باعث ہو چکا تھا اور اس وقت بھی شر کی نیت سے آیا تھا، جبار اور قبیلہ کے عام لوگ خلوصِ طلب سے صداقت کے طالب تھے۔

عامر مدینہ پہنچ کر خاندانِ سلول کی ایک خاتون کا مہمان ہوا، جبار اور مشہور صحابی کعبؓ ابن مالک میں پہلے سے

---

[1] اصابہ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الایمان [3] صحیح مسلم باب الایمان [4] مسلم اور دیگر کتبِ صحاح میں عبد القیس کے اسی وفد کا ذکر ہے، ابن مندہ و دولابی وغیرہ نے اسی قبیلہ کے ایک اور وفد کا ذکر کیا ہے جس میں چالیس آدمی شریک تھے اس بنا پر علامہ قسطلانی نے اسی قبیلہ کے دو وفد قرار دیئے ہیں، پہلا تقریباً ؁ میں اور دوسرا ؁ میں، حافظ ابن حجر نے کتاب المغازی میں بعینہٖ یہی تحقیق کی ہے لیکن کتاب الایمان کی شرح میں دونوں روایتوں کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے [5] اضافہ۔

مراسم تھے، اس لئے وہ تیرہ آدمیوں کے ساتھ انہی کے گھر مہمان اُترے اور اسی تقریب سے کعبؓ ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ بنو عامر نے سلسلۂ کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کر کے کہا ”انت سیدنا“ حضور ہمارے آقا ہیں۔ آپ نے فرمایا ”السید اللہ“ آقا خدا ہے۔ انہوں نے پھر عرض کیا، حضورؐ ہم میں سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر فیاض ہیں۔ ارشاد ہوا۔ بات بولو تو اس کا لحاظ رہے کہ شیطان تم کو ہنکا نہ لے جائے یعنی یہ تکلف اور تملق بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے[1]۔

عامر بن طفیل نے کہا، محمدؐ! تین باتیں ہیں۔ اہل بادیہ پر تم حکومت کرو اور شہر میرے قبضہ میں ہوں۔ اگر یہ نہیں تو اپنے بعد مجھے اپنا جانشین بنا جاؤ۔ اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو میں غطفان کو لے کر چڑھ آؤں گا۔ عامر نے اربد کو یہ سمجھا دیا تھا کہ میں ادھر محمدؐ کو باتوں میں لگاؤں گا، اُدھر تم ان کا کام تمام کر دینا۔ اب عامر نے جو دیکھا تو اربد میں جنبش تک نہ تھی۔ نبوت کے غیر مرئی جاہ و جلال نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ دونوں اٹھ کر چلے آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خدایا ان کے شر سے بچانا“۔ عامر کو طاعون ہو گیا۔ عرب میں صاحب فراش ہونا شرم کی بات تھی۔ عامر نے کہا مجھے گھوڑے پر بٹھا دو۔ گھوڑے پر بٹھا دیا گیا اور اسی پر اُس نے دم توڑ دیا۔ جبار اور عام اشخاص ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر دار السلام سے واپس آئے[2]۔

حمیر وغیرہ کی سفارت

حمیر میں مستقل سلطنت نہیں رہی تھی۔ سلاطین حمیر کی اولاد نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لی تھیں اور برائے نام بادشاہ کہلاتے تھے۔ عربی میں ان کا لقب قیل تھا، لیکن خود نہیں آئے لیکن قاصد بھیجے کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔

اسی زمانہ میں بہرا، بنو بکا وغیرہ کی سفارتیں بھی آئیں۔

*

---

[1] مشکوٰۃ باب المفاخرہ بحوالہ ابو داؤد۔ [2] عام واقعات ابن اسحاق و زرقانی سے ماخوذ ہیں۔ عامر کی تقریر اور اس کی موت کا واقعہ صحیح بخاری میں مذکور ہے۔

تاسیس حکومتِ الٰہی

استخلاف فی الارض

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

تیرہ و تار راتوں کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے، گنگھور گھٹائیں جب چھنٹ جاتی ہیں تو خورشید تاباں ضیاگستری کرتا ہے۔ دنیا گنہگاریوں اور ظلم و ستم کی تاریکیوں سے گھری ہوئی تھی کہ دفعۃً صبح سعادت نے ظہور کیا اور حق و صداقت کا آفتاب پرتو افگن ہوا، عرب جس طرح ایک خدا کو پوجنے لگا تھا، اب وہ صرف ایک ہی حکومت کے ماتحت تھا۔ خدائے پاک نے وعدہ فرمایا تھا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	خدا نے تم میں سے ایمانداروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا ہے کہ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ	ان کو بہ تحقیق زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح کہ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي	گزشتہ امتوں کو اس نے اپنی خلافت عطا کی تھی اور ان کے اس مذہب
ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا	کو جس کو اس نے ان کے لیے پسند کیا تھا یقیناً قوت بخشے گا اور ان کی بے امنی
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا (نور)	کو امن سے بدل دے گا، مجھ کو پوجیں اور کسی کو شریک نہ بنائیں۔

حکومت الٰہی و استخلاف فی الارض نبوت کے ضروری لوازم نہیں، لیکن جب دعوت الٰہی سیاست ملکی کی دیواروں سے آ کر ٹکراتی ہے یا جب اصلاحات کا دامن ملک کی بدامنی و انتشار حال کے کانٹوں میں الجھ جاتا ہے تو پیغمبر ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے قالب میں آگے بڑھتا ہے اور قوم و ملک کو نمارود و فراعنہ کی غلامی سے آزادی دلاتا ہے، پیغمبروں میں عیسیٰؑ اور یحییٰؑ بھی گزرے ہیں۔ جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اور موسیٰؑ اور داؤدؑ و سلیمانؑ بھی جو قوموں اور ملکوں کی قسمت کے مالک تھے لیکن محمد رسول اللہؐ عیسیٰؑ و یحییٰؑ بھی تھے اور موسیٰؑ و داؤدؑ بھی۔ عرب کے خزانے دست تصرف میں تھے لیکن کاشانۂ نبوت میں نہ کوئی نرم بستر تھا نہ غذائے لطیف، نہ جسم مبارک پر خلعت شاہانہ تھا، نہ جیب و آستین میں درہم و دینار، عین اس وقت جب اس پر کسریٰ و قیصر کا دھوکا ہوتا تھا وہ گلیم پوش مکہ کا یتیم اور آسمان کا معصوم فرشتہ نظر آتا تھا۔

اسلام کی حکومت کی غرض و غایت جس کو خدا نے خود اپنے الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے یہ تھی۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ	مسلمان جن سے (بلا سبب) جنگ کی جاتی ہے، اب ان کو بھی جنگ
عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ	کی اجازت دی گئی کہ وہ مظلوم ہیں اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے

---

[1] یہ پورا باب اضافہ ہے۔ (س) [2] حضرت ابراہیمؑ اپنے قبیلہ کے شیخ تھے، چار سو غلاموں کی فوج ساتھ رہتی تھی، شام و اطراف بابل کے کئی بادشاہوں سے ان کو لڑنا پڑا اور خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی اولاد کو ارض مقدس کی حکومت عطا کرے گا (توراۃ سفر تکوین)

دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۚ وَلَوْلَا
دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ
وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ
وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ
لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى
الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا
بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ
عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔

(سورۃ الحج)

وہ جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے سوا اس کے اُن کا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار ہی ہمارا خدا ہے، اگر دنیا میں ایک قوم کو دوسری قوم سے بچایا نہ جائے تو بہت سی خانقاہیں کلیسے عبادت گاہیں مسجدیں جن میں اکثر خدا کا نام لیا جاتا ہے برباد کر دی جائیں جو خدا کی مدد کرتا ہے خدا اس کی مدد کرتا ہے خدا طاقتور اور غالب ہے مسلمان وہ ہیں جن کو اگر خدا زمین میں قوت عطا کرے تو عبادت الٰہی کریں، مستحقین کی مالی اعانت کریں (زکوٰۃ دیں) لوگوں کو نیکیوں کی تاکید کریں، برائیوں سے روکیں، انجام کار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ان آیتوں میں بالاجمال یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں غزوات کی ابتدا، کیوں اور کیونکر ہوئی؟ اسلام کی حکومت کے کیا اغراض و مقاصد تھے اور استخلاف فی الارض کے کیا فرائض ہیں، اور دنیا کی عام حکومتوں سے وہ کن امور میں ممتاز ہے؟ ان مباحث کا اصولی اور مفصل بیان کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گا، یہاں عرب کے نظم و نسق کے متعلق عام اور جزئی باتیں کرنی مقصود ہیں۔

صفحاتِ بالا سے معلوم ہو چکا ہے کہ اب تمام عرب میں امن و امان قائم ہے، سیاسی مشکلات کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ملک کے ہر گوشہ میں دعاۃِ اسلام پھیلے ہوتے ہیں، قبائل دور دراز صوبوں سے بارگاہِ نبوت کا رُخ کر رہے ہیں، فتح مکہ اسلام کی شہنشاہی کا پہلا دن تھا جو رمضان ۸ھ کا واقعہ ہے، اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل میں محصلینِ زکوٰۃ کا تقرر فرمایا، لیکن اصل خلافتِ الٰہی کے تمام اجزاء اواخر ۱۰ھ زمانہ حجۃ الوداع کے قریب مکمل پائے۔

یورپ کی ناآشنا نگاہ میں اگرچہ آپ کی زندگی کا یہ دور جدید ایشیائی شاہانہ زندگی کا ایک طرب انگیز منظر تھا لیکن آشنایانِ حقیقت کو شہنشاہِ عرب پھٹے پرانے کپڑوں میں مدینہ کی گلیوں کے اندر غلاموں اور مسکینوں کے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ تاج و تخت سے بے نیاز قصر و ایوان سے مستغنی، حاجب و دربان سے بے پروا، مال و زر سے خالی، خدم و حشم کے بغیر دلوں پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی حکومت میں نہ پولیس تھی نہ بڑے بڑے انتظامی دفاتر، نہ کثیر التعداد اربابِ مناصب، نہ وزرائے شوریٰ، نہ امرائے سیاست، نہ الگ الگ حکام و قضاۃ۔ وہ ایک ہی ذات تھی، جو ہر فرض و خدمت کی خود ذمہ دار تھی لیکن بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے اونٹ کے ایک بال کے برابر بھی زیادہ مستحق نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے عدل و انصاف کے آگے فاطمہؓ جگر گوشۂ نبوت اور عام مجرم برابر تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل بعثت کا مقصد دعوت مذہب، اصلاح اخلاق اور تزکیۂ نفوس تھا اس

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ القاعد [2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

کے علاوہ اور تمام فرائض محض ضمنی تھے، اس بنا پر انتظاماتِ ملکی آپؐ نے اسی حد تک قائم کئے جہاں تک ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید کے لئے عوائق پیش آتے تھے، تاہم یہ کام بھی کچھ اہم نہ تھا)

انتظام ملکی (عمر شریف اس وقت ساٹھ برس کی تھی لیکن اس عمر میں بھی اس حکومت کے تمام کام خود انجام دیتے تھے۔ ولاۃ اور عمال کا تقرر، مؤذنین اور ائمہ کا تعین، محصلین زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی، غیر قوموں سے مصالحت، مسلمان قبائل میں جائیدادوں کی تقسیم، فوجوں کی آراستگی، مقدمات کا فیصلہ، قبائل کی خانہ جنگیوں کا انسداد، وفود کے لئے تعینِ وظائف، اجرائے فرامین، نومسلموں کے انتظامات، مسائل شرعیہ میں افتاء، جرائم کے لئے اجرائے تعزیر، ملک کے بڑے بڑے سیاسی انتظامات، عہدہ داروں کی خبرگیری اور احتساب، دور کے صوبوں میں متعدد صحابہ گورنر اور والی بنا کر بھیج دیئے گئے تھے لیکن خود مدینہ اور اطراف مدینہ کے فرائض آپؐ خود انجام دیتے تھے۔

خلافتِ الٰہی کے ان فرائض و اعمال نے آپؐ کے دل و دماغ پر جو بارِ عظیم ڈالا، اس نے آپؐ کے نظامِ جسمانی کو چور چور کر دیا۔ عام روایتوں سے ثابت ہے کہ آپؐ آخر زندگی میں تہجد کی نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے جو ضعفِ جسمانی کا اقتضا تھا، لیکن یہ ضعفِ جسمانی خود کس چیز کا نتیجہ تھا، اس کا جواب حضرت عائشہؓ کی زبان سے سننا چاہیے جن سے بڑھ کر آپؐ کے اعمالِ زندگی کا کوئی ترجمان نہیں ہو سکتا۔

ان عبد الله بن شقیق قال سألت عائشة اكان يصلي قاعداً قالت حين حطمه الناس[1]۔

عبد اللہ بن شقیق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں، لیکن اس وقت جب لوگوں نے آپ کو چور چور کر دیا تھا۔

امیر العسکری (چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا کے امیر الجیش اگرچہ اکابر صحابہ ہوتے تھے لیکن جو بڑے معرکے پیش آتے تھے ان کی قیادت خود آپؐ بہ نفسِ نفیس فرماتے تھے۔ چنانچہ بدر، احد، خیبر، فتح مکہ، تبوک میں خود آپؐ ہی امیر العسکر تھے۔ اس کا مقصد صرف فوج کو لڑانا اور آخری فتح و ظفر حاصل کرنا نہ تھا بلکہ فوج کی عام اخلاقی اور روحانی نگرانی کرنا تھا، چنانچہ آپؐ نے مجاہدین اسلام کی جن جزئی سے جزئی بے اعتدالیوں پر گرفت فرمائی ہے وہ احادیث میں بہ تصریح مذکور ہیں اور اسلام کا قانونِ جنگ اسی دار و گیر کے ذریعہ سے وجود میں آیا ہے)

افتاء (آپؐ کے عہدِ مبارک میں اگرچہ متعدد صحابی بھی بطورِ خود فتویٰ دیتے تھے لیکن زیادہ تر آپؐ ہی اس فرض کو بھی ادا کرتے تھے۔ فتویٰ دینے کے لئے آپ نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں فرمایا تھا، بلکہ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، غرض جس وقت لوگ آپؐ سے احکامِ اسلام کے متعلق سوالات کرتے تھے آپؐ ان کا جواب دیتے تھے، چنانچہ امام بخاری نے کتاب العلم میں ان فتاویٰ کو اس قسم کے متعدد ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ خلافت کا یہی فرض تھا جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں نہایت ترقی دی اور اس کا ایک مستقل شعبہ قائم کر دیا)

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ۔ باب صلوٰۃ القاعد

فصل قضایا

(اگرچہ آپ کے عہدِ مبارک میں عہدۂ قضاۃ قائم ہو چکا تھا اور حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبل کو آپ نے خود یمن کا قاضی مقرر فرما کے بھیجا تھا، تاہم مدینہ اور اس کے حوالی و مضافات کے تمام مقدمات کا آپ خود فیصلہ فرماتے تھے اس کے لئے کسی قسم کی روک ٹوک اور پابندی نہ تھی، امام بخاری نے ایک خاص باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے۔

باب ما ذکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لہ بواب۔	یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر دربان نہ تھا۔

اس بنا پر گھر کے اندر بھی آپ اطمینان و سکون کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے تھے، عورتوں کے معاملات عموماً زنان خانہ ہی میں پیش ہوتے تھے۔ احادیث کی کتابوں میں آپ کے فیصلوں کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر ان کا استقصا کیا جائے تو ایک ضخیم جلد تیار ہو جائے، عموماً احادیث کی کتاب البیوع میں دیوانی کے مقدمات اور کتاب القصاص والدیات وغیرہ میں فوجداری کے مقدمات مذکور ہیں۔

توقیعات و فرامین

(یہ اس قدر اہم کام تھا کہ عہدِ مبارک میں اگرچہ اور صیغوں کا کوئی مستقل دفتر نہیں قائم ہوا تھا تاہم توقیعات و فرامین کے لئے اس کی ابتدائی شکل قائم ہو چکی تھی، چنانچہ اس خدمت پر حضرت زیدؓ بن ثابت اور آخر میں معاویہؓ مامور ہوئے، ان کے علاوہ اور دوسرے صحابہ بھی وقتاً فوقتاً یہ خدمت انجام دیتے تھے، آپ نے سلاطین و ملوک کو دعوتِ اسلام کے جو خطوط روانہ فرمائے، غیر قوموں کے ساتھ جو معاہدے کئے، مسلمان قبائل کو جو احکام بھیجے، عمال و محصلین کو جو تحریری فرامین عنایت کئے، فوج کا جو رجسٹر مرتب کرایا، بعض صحابہ کو جو حدیثیں لکھوائیں، وہ سب اسی سلسلہ میں داخل ہیں، زرقانی وغیرہ نے آپ کے احکام و فرامین تحریری کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے)

مہمان داری

(منصبِ نبوت کے بعد آپ کی ذاتی حیثیت تقریباً فنا ہو گئی تھی، اس لئے آپ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے ان کا تعلق بھی خلافتِ الٰہی یا نبوت ہی کے ساتھ ہوتا تھا اور آپ اسی حیثیت سے اُن کی مہمان داری فرماتے تھے، مہمانوں کی زیادہ تر تعداد قبولِ اسلام کے لئے آتی تھی جن کی مہمان داری کے لئے آپ نے ابتدائے نبوت ہی سے خاص طور پر حضرت بلالؓ کو مامور فرما دیا تھا، چنانچہ جب کوئی تنگدست مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ اس کو برہنہ تن دیکھتے تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے اور وہ قرض لے کر اُس کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتے، جب آپ کے پاس کہیں سے کچھ مال آتا تو اُس کے ذریعہ سے وہ قرض ادا کیا جاتا، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص آپ کو ذاتی طور پر ہدیہ دیتا تو وہ بھی اسی صیغہ میں صرف کیا جاتا[1]، کبھی کبھی اس غرض کے لئے آپ تمام صحابہ کو صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے اور جو رقم حاصل ہوتی وہ اُن مفلوک الحال مہاجرین کی اعانت میں صرف ہوتی، چنانچہ ایک بار مہاجرین کی ایک برہنہ پا و سر جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی، ہر شخص کے بدن پر صرف ایک چادر اور گلے میں ایک تلوار حمائل تھی۔ آپ نے ان کی پریشان حالی دیکھی، دیکھا تو چہرے کا رنگ

---

[1] ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین۔

بدل گیا۔ فوراً حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ میں تمام صحابہ کو ان لوگوں کی اعانت کی ترغیب دی، اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک انصاری اٹھے اور ایک توڑا جو اس قدر وزنی تھا کہ اُن سے بمشکل اٹھ سکتا تھا، لاکر آپ کے آگے ڈال دیا۔ اس سے تمام لوگوں میں اور بھی جوش پیدا ہوا اور تھوڑی دیر میں ان بے سروسامان مہاجرین کے آگے غلہ اور کپڑے کا ڈھیر لگ گیا۔[1]

فتح مکہ کے بعد تمام اطرافِ ملک سے بکثرت ملکی و مذہبی وفود آنے لگے، آپ بنفسِ نفیس اُن کی خاطر مدارات کرتے تھے اور اُن کے لئے حسبِ حاجت وظائف اور سفر کے مصارف ادا فرماتے تھے، قبائل پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا تھا، آپ اس کا اس قدر لحاظ فرماتے تھے کہ وفات کے وقت آپ نے جو آخری وصیتیں فرمائی تھیں، اُن میں ایک یہ بھی تھی۔

اجیزوا الوفد بنحو ماکنت اجیزھم۔[2]	جس طرح میں وفود کو عطیہ دیا کرتا تھا اسی طرح تم بھی دیا کرو۔

(وفود کے حالات آگے آتے ہیں)

عیادت مرضیٰ

(مریضوں کی عیادت اور ان کی تجہیز و تکفین میں بھی شریک ہونا اگرچہ ایک مذہبی فرض تھا اور مذہبی حیثیت سے اس کی ابتدا بھی ہوئی، چنانچہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو یہ عام دستور ہو گیا کہ دمِ نزعِ میت کے اعزہ آپ کو اطلاع دیتے، آپ ان کے پاس آکر اُن کے لئے دعائے مغفرت کرتے۔ لیکن بعض حیثیتوں سے اس کا تعلق خلافت کے ساتھ بھی ہو گیا تھا، کیونکہ بعض صحابہ اس حالت میں اپنی جائداد کو وقف یا صدقہ کر دینا چاہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر اُن کا صحیح طریقہ بتاتے تھے جن لوگوں پر قرض آتا تھا، آپ اُن کے جنازہ میں شریک نہیں ہوتے تھے اس لئے ان کے ورثا، یا دوسرے صحابہ کو مجبوراً یہ قرض ادا کرنا پڑتا تھا اور اس طرح بعض معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہو جاتا تھا، چنانچہ احادیث میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

احتساب

تمدنِ اسلام کے دورِ ترقی میں محکمۂ احتساب ایک مستقل محکمہ تھا جو نہایت وسیع پیمانہ پر تمام قوم کے اخلاق و عادات، بیع و شرا، اور معاملات داد و ستد کی نگرانی کرتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں یہ محکمہ قائم نہیں ہوا تھا بلکہ خود ہی آپ اس فرض کو ادا فرماتے تھے، ہر شخص کے جزئیات اخلاق اور فرائض مذہبی کے متعلق آپ وقتاً فوقتاً دار و گیر فرماتے رہتے تھے، تجارتی معاملات کی بھی نگرانی فرماتے تھے۔ عرب میں تجارتی معاملات کی حالت نہایت قابلِ اصلاح تھی اور مدینہ میں آنے کے ساتھ ہی آپ نے ان اصلاحات کو جاری کر دیا، لیکن تمام لوگوں سے اصلاحات پر عمل کرانا صیغۂ احتساب سے تعلق رکھتا تھا، چنانچہ نہایت سختی کے ساتھ ان معاملات کی نگرانی فرماتے تھے اور تمام لوگوں سے اُن پر عمل کراتے تھے اور جو لوگ باز نہیں آتے تھے اُن کو سزائیں دلاتے تھے، صحیح بخاری کتاب البیوع میں ہے۔

لقد رأیت الناس فی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتبایعون جزافا یعنی الطعام	حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دیکھا کہ جو لوگ تخمیناً غلہ خریدتے تھے ان کو اس بات

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۔ [2] صحیح بخاری جلد اول باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب [3] مسند ج ۳ ص ۹۶۔

یضربون ان یبیعوہ فی مکانہم حتی یؤدوہ الی رحالہم۔

پر سزا دی جاتی تھی کہ اپنے گھروں میں منتقل کرنے سے پہلے اس کو خود اسی جگہ بیچ ڈالیں جہاں اس کو خریدا تھا۔

کبھی کبھی تحقیق حال کے لئے آپؐ خود بازار تشریف لے جاتے، ایک بار آپؐ بازار میں گزرے تو غلہ کا ایک انبار نظر آیا۔ اس کے اندر ہاتھ ڈالا تو نمی محسوس ہوئی۔ دوکاندار سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، ارشاد ہوا کہ پھر اس کو اوپر کیوں نہیں کر لیا تاکہ ہر شخص کو نظر آئے۔ جو لوگ فریب دیتے ہیں وہ ہم میں سے نہیں ہیں[1]۔

فرائض احتساب میں آپؐ کا سب سے بڑا فرض عمال کا محاسبہ تھا، یعنی جب عمال زکوٰۃ اور صدقہ وصول کر کے آتے تھے تو آپؐ اس غرض سے ان کا جائزہ لیتے تھے کہ انھوں نے کوئی ناجائز طریقہ تو نہیں اختیار کیا ہے چنانچہ ایک بار آپؐ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے مامور فرمایا۔ وہ اپنی خدمت انجام دے کر واپس آئے اور آپؐ نے ان کا جائزہ لیا تو انھوں نے کہا یہ مال مسلمانوں کا ہے اور یہ مجھ کو ہدیۃً ملا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ گھر بیٹھے بیٹھے تم کو یہ ہدیہ کیوں نہیں ملا؟ اس کے بعد آپؐ نے ایک عام خطبہ دیا جس میں اس کی سخت ممانعت فرمائی۔

اصلاح بین الناس

اسلام تمام دنیا کے تفرقوں کو عموماً اور عرب کے اختلافات کو خصوصاً مٹانے کے لئے آیا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنا ایک ضروری فرض قرار دیا تھا اور جب آپؐ کو اس قسم کے منازعات کی خبر ہوتی تھی تو آپؐ اصلاح کو تمام مذہبی فرائض پر مقدم رکھتے تھے، چنانچہ ایک بار قبیلہ بنو عمرو بن عوف کے چند اشخاص کے درمیان نزاع پیدا ہوئی، آپؐ کو معلوم ہوا تو چند صحابہ کے ساتھ ان میں مصالحت کرانے کے لئے تشریف لے گئے، آپؐ کو اس معاملہ میں دیر ہوئی اور نماز کا وقت آ گیا۔ حضرت بلالؓ نے اذان دی لیکن اذان کے بعد بھی آپؐ تشریف نہیں لائے، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کو امام بنا کر نماز شروع کی، آپؐ اسی حالت میں تشریف لائے اور صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں جا کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ اگرچہ نماز میں ادھر اُدھر نہیں دیکھتے تھے لیکن جب لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کیں تو انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں، آپؐ نے اگرچہ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیں، لیکن آپؐ کی موجودگی میں انھوں نے امامت کرانا سوء ادب خیال کیا اس لئے پیچھے ہٹ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ کر ان کی جگہ کھڑے ہو گئے[2]۔

ایک بار اہل قبا کے درمیان نزاع قائم ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے باہم سنگ اندازی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ صحابہ کے ساتھ مصالحت کرانے کی غرض سے تشریف لے گئے[3]۔ (یہ دونوں واقعات کو امام بخاری نے الگ لکھے ہیں، لیکن شراح حدیث کی تحقیق میں یہ ایک ہی واقعہ کے دو حصے ہیں) بخاری کی دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ اتنی دور پیدل گئے تھے۔

ابن ابی حدرد پر حضرت کعبؓ بن مالک کا کچھ قرض تھا، انھوں نے مسجد میں تقاضا کیا، حدرد قرض کا ایک

---

[1] صحیح مسلم ج۱ ص۳۵ کتاب الایمان [2] بخاری ج۲ ص۱۰۶۵ کتاب الاحکام [3] بخاری جلد۱ ص[illegible] کتاب الصلح [4] بخاری کتاب الصلح۔

حصہ معاف کرانا چاہتے تھے، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوتے تھے۔ بات زیادہ بڑھی اور شور وغل ہوا، تو آپؐ گھر کے اندر سے نکل آئے اور کعبؓ کو پکارا، کعبؓ نے لبیک کہا تو آپؐ نے فرمایا کہ نصف معاف کر دو، وہ راضی ہو گئے تو آپؐ نے مدیون سے کہا کہ جاؤ اور بقیہ حصہ ادا کر دو۔

اس قسم کے سیکڑوں جزئی واقعات روزانہ پیش آیا کرتے تھے۔

مدینہ میں اور مدینہ سے باہر دیگر فرائض کی انجام دہی کے لئے اکابر صحابہ اور ارباب استعداد کو مختلف عہدوں پر نصب فرمایا، کتابت وحی، نامہ و پیام اور اجرائے احکام و فرامین کے لئے سب سے پہلی ضرورت عہدۂ انشاء اور کتابت کی تھی۔ اسلام سے پہلے عرب میں عام طور پر لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، لیکن اسلام عرب کے لئے رحمتوں کا جو خزانہ لایا تھا اس میں ایک شے یہ بھی تھی۔ اسیرانِ بدر میں نادار لوگوں کا فدیہ صرف یہ قرار دیا گیا کہ وہ مدینہ کے بچوں کو لکھنا سکھا دیں، حضرت زیدؓ بن ثابت نے جن کے متعلق کتابتِ وحی کی مقدس خدمت تھی، اسی طریقہ پر تعلیم پائی تھی۔ ابو داؤد کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحابِ صُفّہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا ایک جزو کتابت کی تعلیم بھی تھی۔

کُتّاب

عہدۂ قضا گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت سے نیابت تھی اس لئے مختلف اوقات میں بڑے بڑے صحابہ اس خدمت پر مامور کئے گئے جن میں شرحبیلؓ بن حسنہ کندی سب سے پہلے اس شرف سے ممتاز ہوئے، یہ نہایت قدیم الاسلام تھے، مکہ میں انہی نے سب سے پہلے کتابتِ وحی کا فرض انجام دیا، قریش میں سب سے پہلے کاتب عبد اللہؓ بن ابی سرح تھے، مدینہ میں اس کی اوّلیت کا شرف حضرت ابی بن کعب کو حاصل ہوا حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عامرؓ بن فہیرہ، حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت عبد اللہؓ بن ارقم، حضرت ثابت بن قیسؓ بن شماس، حضرت حنظلہؓ، ابن الربیع الاسدی، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت عبد اللہؓ بن رواحہ، حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص، حضرت علاؓ بن حضرمی، حضرت حذیفہؓ بن الیمان، حضرت معاویہؓ بن ابی سفیان، حضرت زیدؓ بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوئے۔ اگرچہ تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت ادا کرنی پڑتی تھی، چنانچہ صلح نامہ حدیبیہ حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، امراء اور سلاطین کے نام خطوط حضرت عامرؓ بن فہیرہ لکھتے تھے اور امرائے عمان کے نام آپؐ نے جو مکتوب بھیجا تھا وہ حضرت ابی بن کعبؓ کا لکھا تھا، قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہِ نبوت سے بھیجا گیا تھا وہ حضرت ثابتؓ بن قیس نے لکھا تھا، لیکن عام طور پر یہ خدمت حضرت زیدؓ بن ثابت کے متعلق تھی اور صحابہ کے گروہ میں انکا نام اسی حیثیت سے زیادہ نمایاں[1] ہے۔

حضرت زیدؓ بن ثابت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ان تمام بزرگوں پر ایک خاص امتیاز حاصل کیا کہ عبرانی زبان سیکھی، جس کی ضرورت یہ پیش آئی کہ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تر یہود سے تعلق رہتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی، اسی بنا پر آپؐ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے پندرہ دن میں اس میں مہارت حاصل کر لی۔

---

[1] ان بزرگوں کے نام اور تفصیلی حالات زرقانی جلد ۳ ص ۳۱۲ میں مذکور ہیں۔

حکام اور ولاۃ

فصل قضایا، اقامتِ عدل، بسطِ امن، رفعِ نزاع کے لئے متعدد ولاۃ حکام کی ضرورت تھی اس غرض سے آپؐ نے متعدد صحابہ کو مختلف مقامات کا حاکم ووالی مقرر فرما دیا، چنانچہ انکے ناموں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

باذانؓ بن ساسان	بہرام گور کے خاندان سے تھے اور سلاطین عجم میں سب سے پہلے مشرف باسلام ہوئے اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کا والی مقرر فرمایا۔
شہر بن باذانؓ	باذان بن ساسان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو صنعاء کا والی مقرر فرمایا۔
خالد بن سعید بن العاص	شہر بن باذان مارے گئے تو ان کے بعد آپؐ نے ان کو صنعاء میں عامل مقرر فرمایا۔
مہاجرؓ بن امیۃ المخزومی	آپؐ نے ان کو کندہ وصدف کا والی مقرر فرمایا تھا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہ ہوئے تھے کہ آپؐ نے انتقال فرمایا۔
زیاد بن لبید الانصاریؓ	حضر موت کے والی تھے
ابو موسیٰ اشعریؓ	زبید، عدن، زمعہ وغیرہ کے والی تھے۔
معاذ بن جبلؓ	والی جند۔
عمرو بن حزمؓ	والی نجران۔
یزید بن ابی سفیانؓ	والی تیماء۔
عتابؓ بن اسید	والی مکہ۔
علیؓ بن ابی طالب	متولی اخماس یمن۔
عمروؓ بن العاص	والی عمان۔
علاءؓ بن حضرمی	والی بحرین۔

ان ولاۃ یعنی گورنروں کا تقرر ملک کی وسعت اور ضروریات کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں عرب کے جو حصے اسلام کے زیرِ سایہ آئے اُن میں یمن سب سے زیادہ وسیع اور متمدن تھا اور مدت تک ایک باقاعدہ سلطنت کے زیرِ سایہ رہ چکا تھا۔ اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو پانچ حصوں میں منقسم فرمایا اور ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر فرمائے۔ خالدؓ بن سعید کو صنعاء پر، مہاجرؓ بن ابی امیہ کو کندہ پر، زیاد بن لبید کو حضر موت پر، معاذؓ بن جبل کو جند پر، ابو موسیٰ اشعریؓ کو زبید، زمعہ، عدن اور ساحل پر[1]۔

عموماً جب کسی مہاجر کو کہیں کا عامل مقرر فرماتے تھے تو اسی کے ساتھ ایک انصاری کا تقرر بھی فرماتے تھے[2]

---

[1] استیعاب تذکرۂ معاذ بن جبل [2] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۸۶۔

ملکی انتظام، فصلِ مقدمات اور تحصیلِ خراج وغیرہ کے علاوہ ان عمال کا سب سے مقدم فرض اشاعتِ اسلام اور سُنن و فرائض کی تعلیم تھی، اس لحاظ سے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ لوگ حاکمِ ملک اور والیٔ صوبہ ہونے کے ساتھ مبلغِ دین اور معلمِ اخلاق کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ استیعاب تذکرۂ معاذؓ بن جبل میں ہے۔

وبعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم قاضياً الى الجند من اليمن يعلم الناس القرآن وشرائع الاسلام ويقضي بينهم وجعل اليه قبض الصدقات من العمال الذين باليمن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کے ایک حصہ یعنی جند کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا کہ لوگوں کو قرآن اور شرائعِ اسلامی کی تعلیم دیں اور جو عمال یمن میں تھے ان کے صدقات کے جمع کرنے کی خدمت بھی اُن کے متعلق تھی۔

چنانچہ جب یہ لوگ روانہ ہوتے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان فرائض کی تعیین فرما دیتے تھے، معاذؓ بن جبل کو روانہ فرمایا تو یہ وصیت کی۔

انك تأتي قوما من اهل الكتاب فادعهم الى شهادة ان لا اله الا الله واني رسول الله فان هم اطاعوا لذالك فاعلمهم ان الله افترض عليهم خمس صلوات في كل يوم وليلة فان هم اطاعوا لذالك فاعلمهم ان الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنيائهم وترد الى فقرائهم فان هم اطاعوا لذالك فاياك وكرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه ليس بينها وبين الله حجاب۔

تم اہلِ کتاب کے پاس جاتے ہو پہلے ان کو کلمۂ توحید کی دعوت دو اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے رات اور دن میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اگر وہ اس کو بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو اُن کے امراء سے لے کر ان کے غرباء پر تقسیم کر دیا جائے گا، اگر وہ اس کو بھی تسلیم کرلیں تو ان کے بہترین مال سے احتراز کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ اس میں اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت تبحرِ علمی، وسعتِ نظر اور اجتہاد کی تھی اس بنا پر آپ ان لوگوں کے تبحرِ علمی اور طرزِ عمل کا امتحان لیتے تھے چنانچہ جب حضرت معاذؓ کو روانہ فرمایا تو پہلے ان کی اجتہادی قابلیت کے متعلق اطمینان فرما لیا، ترمذی میں ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لمعاذ بن جبل حين وجهه الى اليمن بم تقضي قال بما في كتاب الله قال فان لم تجد في كتاب الله قال بما في سنة رسول الله قال فان لم تجد في سنة رسول الله قال اجتهد برائي قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يحب رسول الله۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا کس چیز سے مقدمات کا فیصلہ کرو گے انہوں نے کہا قرآن مجید سے۔ آپ نے فرمایا اگر اس میں وہ فیصلہ تم کو نہ ملے انہوں نے کہا احادیث سے، پھر آپ نے فرمایا اگر احادیث میں بھی کچھ متعلق مقدمہ نہ ملے تو انہوں نے کہا میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اس پر آپ نے فرمایا اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول کے رسول کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اس کا رسول محبوب رکھتا ہے۔

لیکن اہلِ عرب کے دلوں کو مسخر کرنے کے لئے ان تمام چیزوں سے زیادہ رفق و ملاطفت نرمی اور خوش خوئی

کی ضرورت تھی جن کی آمیزش سیاست اور حکومت کے اقتدار کے ساتھ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گورنروں کو بار بار اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے۔ چنانچہ جب معاذؓ بن جبل کو ایک صحابی کے ساتھ یمن کی گورنری پر روانہ فرمایا تو پہلے دونوں کو عام طور سے وصیت فرمائی۔

یسرا ولا تعسرا وبشرا ولا تنفرا وتطاوعا ولا تختلفا (مسلم ج ۲ صفحہ ۹۲ کتاب الایمان)	آسانی پیدا کرنا، دشواری نہ پیدا کرنا، لوگوں کو بشارت دینا اور ان کو وحشت زدہ نہ کرنا، باہم اتفاق رکھنا اور اختلاف نہ کرنا۔

اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو معاذؓ بن جبل جب رکاب میں پاؤں ڈال چکے تو اُن سے خاص طور پر یہ الفاظ فرمائے۔

احسن خلقك للناس (ابن سعد تذکرہ معاذؓ بن جبل)	لوگوں کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ برتاؤ کرنا۔

اگر یہ اصول صحیح ہے کہ کوئی حکومت کتنی ہی رحم دل کیوں نہ ہو لیکن ابتداء میں جب وہ کسی ملک کو اپنے قبضۂ اقتدار میں لاتی ہے تو سرکش لوگوں کے مطیع کرنے کے لئے اس کو مجبوراً سختیاں کرنی پڑتی ہیں تو عرب سب سے زیادہ اس کا مستحق تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ریگستانِ عرب کا ایک ذرہ بھی ولاۃ کے مظالم کے سنگِ گراں سے نہ دبا، یہاں تک کہ اخیر زمانہ میں جب صحابہ عمالِ حکومت کے مظالم کو دیکھتے تھے تو اُن کو سخت استعجاب ہوتا تھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقینات کے ذریعہ سے ان کو روکتے تھے۔ چنانچہ ایک بار ہشام بن حکیم بن حزام نے دیکھا کہ شام کے کچھ نبطی دھوپ میں کھڑے کئے گئے ہیں، انہوں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ وصول کرنے کے لئے اُن لوگوں کے ساتھ یہ سختی کی جا رہی ہے، انہوں نے یہ سُن کر کہا۔

اشهد لسمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان الله يعذب الذين يعذبون الناس في الدنيا۔[1]	میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو سزا دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

محصلین زکوٰۃ وجزیہ

عرب کا خلوص اور جوشِ ایمان اگرچہ خود اُن کو صدقہ و زکوٰۃ کے ادا کرنے پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ اسلام لانے کے ساتھ ہی ہر قبیلہ اپنی قوم کا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خود پیش کرتا اور آپؐ کی دعا سے برکت اندوز ہوتا تھا لیکن ایک وسیع ملک اور ایک وسیع حکومت کیلئے یہ طریقہ کافی نہ تھا اس لئے ولاۃ کے علاوہ یکم محرم ۹ھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے ہر قبیلہ کے لئے الگ الگ محصلین مقرر فرمائے جو قبائل کا دورہ کر کے لوگوں سے زکوٰۃ اور خراج وصول کر کے آپؐ کی خدمتِ مبارک میں پیش کرتے تھے، عموماً خود رؤسائے قبائل اپنے اپنے قبیلوں کے محصل ہوتے تھے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عموماً ان کا تقرر وقتی ہوتا تھا۔

بہرحال آپؐ نے اس فرض کی انجام دہی کے لئے حسب ذیل اشخاص کو مختلف قبائل اور شہروں[2] میں متعین فرمایا۔

---

[1] صحیح مسلم باب الوعید الشدید لمن عذب الناس بغیر حق۔ [2] اس فہرست کے اکثر اقسام ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۱۱۵ میں مذکور ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور ابو عبیدہ بن جراح کا ذکر بخاری کتاب الصدقات اور بعض کا ابوداؤد کتاب الخراج میں ہے۔ بقیہ کے لئے طبری ذکر مصدقین وامرائے نبوی اور فتوح البلدان بلاذری دیکھو۔

نام	مقام تقرر	نام	مقام تقرر
عدی بن حاتم	طے و بنی اسد	ابوجہم بن حذیفہ	بنو لیث
صفوان بن صفوانؓ[1]	بنی عمرو	ایک ہذیلی	بنو ہذیم
مالک بن نویرہ	بنو حنظلہ	عمر فاروقؓ	شہر مدینہ
بریدہ بن حصیب الاسلمی	غفار و اسلم	ابوعبیدہ بن جراح	شہر نجران
عباد بن بشر الاشہلی	سلیم و مزینہ	عبداللہ بن رواحہ	شہر خیبر
رافع بن مکیث جہنی	جہینہ	زیاد بن لبید	حضر موت
زبرقان بن بدر	بنو سعد	ابوموسیٰ اشعری	صوبۂ یمن
قیس بن عاصم	”	خالدؓ	”
عمرو بن عاص	بنو فزارہ	ابان بن سعید	بحرین
ضحاک بن سفیان کلابی	بنو کلاب	محمیہ بن جزء الاسدی	تحصیل خمس
بسر بن سفیان کلابی	بنو کعب	عمرو بن سعید بن عاص	تیماء
عبداللہ بن اللتبیہ	بنو ذبیان	عیینہ بن حصن فزاری	بنو تمیم

ان محصلین کے تقرر میں آپؐ حسب ذیل امور کی پابندی فرماتے تھے۔

(۱) ان کو ایک فرمان عطا ہوتا تھا جس میں بتصریح بتایا جاتا تھا کہ کس قسم کے مال کی کتنی تعداد میں زکوٰۃ کی کیا مقدار ہے؟ چھانٹ کر مال لینے کی یا حق سے زیادہ لینے کی اجازت نہ تھی، عام حکم تھا کہ ایاک و کرائم اموالہم عمال نہایت شدت کے ساتھ اس فرمان پر عمل کرتے تھے اور اس سے تجاوز جائز نہیں رکھتے تھے، بعض لوگوں نے بخوشی حق سے زیادہ دینا چاہا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا، سوید بن غفلہ کا بیان ہے کہ ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا محصل آیا، میں جا کر اس کے پاس بیٹھا تو اس نے پہلے جانوروں کے ان اقسام کو بیان کیا جن کے لینے کی فرمان میں اجازت نہ تھی، چنانچہ اسی وقت ایک شخص ایک نہایت عمدہ کوہان دار اونٹنی لے کر حاضر ہوا، اور اس کی خدمت میں پیش کی لیکن اس نے انکار کر دیا، اسی طرح جب ایک شخص نے ایک محصل کو بچے والی بکری دی تو اس نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کی ممانعت کی گئی ہے۔[2]

(۲) عرب کے مال و دولت کی کل کائنات بکریوں کے ریوڑ اور اونٹوں کے گلے تک محدود تھی، جو جنگلوں میں بیابانوں میں، پہاڑوں کے [illegible]وں میں چھپتے رہتے تھے، لیکن بجائے اس کے کہ دنیوی حکومتوں کی طرح جابرانہ احکام کے ساتھ لوگ خ[illegible]ۃ کے جانور لا کر محصلین کے سامنے پیش کرتے، محصلوں کو خود ان دروں میں جا کر زکوٰۃ وصول کرنا پڑتی تھی، ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں پہاڑ کے ایک درہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ دو شخص اونٹ پر سوار ہو

---

[1] اصابہ باب صفوان [2] نسائی صفحہ ۳۰۹ [3] نسائی صفحہ ۲۹۳۔

گئے اور کہا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہیں، یہاں تمہاری بکریوں کا صدقہ وصول کرنے کے لئے آئے ہیں، میں نے ایک بچہ والی شیر دار بکری پیش کی، لیکن انہوں نے کہا کہ ہم کو اس کے لینے کا حکم نہیں، میں نے ایک دوسرا بچہ دیا تو انہوں نے اس کو اپنے اونٹ پر لاد لیا اور چلتے ہوئے۔[1]

(۳) اگرچہ صحابہؓ اپنے تقدس اور پاک باطنی کی بنا پر ہر قسم کے ناجائز مال لینے سے خود احتراز کرتے تھے، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو خیبر کے یہودیوں کے پاس بھیجا کہ وہاں کی زراعت کی نصف پیداوار حسب معاہدہ تقسیم کرکے لائیں تو انہوں نے ان کو رشوت دینا چاہی تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو؟[2] لیکن بایں ہمہ زہد و تقدس جب محصل اپنے دورہ سے واپس آتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کا محاسبہ فرماتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ نے ابن اللتبیہ کو صدقہ وصول کرنے کے لئے روانہ فرمایا جب وہ واپس ہوئے اور آپ نے ان کا محاسبہ کیا، تو انہوں نے کہا یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تم کو گھر بیٹھے بیٹھے ہدیہ کیوں نہیں ملا؟ اس پر بھی تسکین نہیں ہوئی تو ایک عام خطبہ دیا اور تمام لوگوں کو اس قسم کے مال لینے سے سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی۔[3]

(۴) چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان پر صدقہ و زکوٰۃ کا مال حرام کر دیا تھا اس لئے خاندان نبوت کا کوئی فرد صدقہ کا محصل مقرر نہیں ہوا، ایک بار عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث اور فضل ابن عباس نے کہ عم زاد بھائی اور بھتیجے تھے، آپ کی خدمت میں درخواست کی کہ اب ہمارا سن نکاح کے قابل ہو گیا ہے، تمام لوگوں کی طرح ہم کو بھی صدقہ کا عامل مقرر فرما دیجئے تاکہ اس کے معاوضہ سے کچھ مال جمع کر کے نکاح کے لئے سرمایہ مہیا کریں، لیکن آپ نے فرمایا کہ صدقہ آل محمدؐ کے لئے جائز نہیں ہے وہ لوگوں کا میل ہے۔[4]

(۵) عمال کا انتخاب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے اور جو لوگ اپنے آپ کو اس خدمت کے لئے خود پیش کرتے تھے ان کی درخواست نامنظور ہوتی تھی، چنانچہ ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ دو شخص آئے اور عامل بننے کی درخواست کی، آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ لوگ اس غرض سے آئے ہیں۔ آپ نے ان دونوں کی درخواست نامنظور کی اور فرمایا کہ جو لوگ خود خواہش کرتے ہیں ہم ان کو عامل مقرر نہیں کرتے، لیکن اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بلا درخواست یمن کا عامل مقرر کر کے روانہ فرمایا۔[5]

(۶) عمال کو صرف بقدر ضرورت معاوضہ ملتا تھا، آپ نے عام منادی فرما دی تھی کہ جو شخص ہماری مقررہ شرح سے زیادہ لے گا، وہ خیانت مالی ہے، مقدار ضرورت کی تصریح خود آپ نے فرما دی تھی۔[6]

من کان لنا عاملا فلیکتسب زوجة فان لم یکن	جو شخص ہمارا عامل ہو اس کو ایک بی بی کا خرچ لینا چاہئے اگر اس
له خادم فلیکتسب خادما فان لم یکن له مسکن	کے پاس نوکر نہ ہو تو نوکر کا، اگر مکان نہ ہو تو مکان کا لیکن اگر

---

[1] نسائی ص ۲۹۳ [2] فتوح البلدان ص ۳۳ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۳۰ [4] صحاح کتاب الصدقات [5] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۰۹۔

[6] ابوداؤد جلد ۲ باب ارزاق العمال میں دونوں حدیثیں شامل ہیں۔

فلیکتسب مسکناً ومن اتخذ غیر ذالک فہو غال۔ کوئی اس سے زیادہ لے گا تو وہ خائن ہوگا۔

آپؐ کے زمانہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس قسم کا معاوضہ ملا تھا۔ چنانچہ اُن کے عہدِ خلافت میں جب صحابہ نے زہد و تقدس کی بنا پر معاوضہ لینے سے انکار کیا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرزِ عمل سے استدلال کیا۔

قضاۃ ان مناصب کے علاوہ بعض اور عہدے بھی سادہ طور سے قائم ہو گئے تھے، مثلاً فصلِ مقدمات کا کام اگرچہ زیادہ تر آپؐ خود انجام دیتے تھے، لیکن کبھی کبھی آپ کے حکم سے حسبِ ذیل صحابہ نے بھی اس فرض کو انجام دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، ابن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، اگرچہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی باضابطہ طور پر پولیس کا محکمہ قائم نہیں ہوا اور اس کی ابتداء بنو امیہ کی سلطنت میں ہوئی[1]، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں بھی اس کا ابتدائی نمونہ قائم ہو چکا تھا، چنانچہ آپؐ کے عہدِ مبارک میں قیسؓ بن سعد اس خدمت کو انجام دیتے تھے اور اس غرض سے ہمیشہ آپؐ کے ساتھ رہتے تھے[2]۔

جلاد مجرموں کی گردن مارنے کی خدمت حضرت زبیرؓ، حضرت علیؓ، مقداد بن الاسودؓ، محمد بن مسلمہؓ، عاصم بن ثابتؓ ضحاک بن سفیان کلابیؓ کے سپرد تھی[3]۔

غیر قوموں سے معاہدہ عرب میں اب کفر و شرک کا بالکل وجود نہ تھا، کہیں کہیں صرف مجوس، نصاریٰ اور یہود کی آبادیاں تھیں، ان میں سے معتدبہ افراد نے گو نورِ ایمان سے قلوب کو روشن کر لیا تھا لیکن مجموعی حیثیت سے وہ اب تک تاریکی میں تھے۔ تاہم خلافتِ الٰہی کی ہمہ گیر قوت سے وہ سرتابی نہ کر سکے۔ حجاز کے یہودیوں کے سوا عرب کی تمام قوموں نے بخوشی اسلام کی اطاعت قبول کی، اس لئے اسلام نے بھی اُن کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کی حفاظت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اس کے مقابلہ میں جزیہ کی ایک خفیف رقم (یعنی ہر مستطیع عاقل بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ) ان پر مقرر کی، اس رقم کا نقد روپیہ کی صورت میں ادا ہونا ضروری نہ تھا بلکہ عموماً جہاں جس چیز کی پیداوار ہوتی تھی یا جو چیز بنتی تھی وہی چیز جزیہ قرار پائی[4]۔

غیر قوموں میں سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۷ھ میں خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیما کے یہودیوں سے مصالحت فرمائی اس وقت تک آیتِ جزیہ کا نزول نہیں ہوا تھا، اس بناء پر باہمی رضامندی سے جو شرائط قرار پا گئے تھے وہ آیتِ جزیہ کے نزول کے بعد بھی قائم رہے[5]۔ اصل شرط یہ تھی کہ وہ رعایا کی حیثیت سے کام کریں گے اور پیداوار کا نصف حصہ خود لیں گے اور نصف مالکوں کو ادا کریں گے[6]۔

۹ھ میں جزیہ کی آیت نازل ہوئی اس کے بعد تمام معاہدے اسی کی رُو سے قرار پاتے۔ نجران کے عیسائیوں نے مدینہ میں آکر مصالحت کی درخواست کی جس کو آپؐ نے منظور فرمایا۔ شرائطِ صلح یہ تھے کہ وہ مسلمانوں کو سالانہ دو ہزار کپڑے دیں گے اور اُن کو دو قسطوں میں یعنی آدھا ماہ صفر اور آدھا ماہ رجب میں ادا کریں گے۔ اگر یمن میں بھی کبھی بغاوت

---

[1] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۹۶ [2] بخاری کتاب الاحکام [3] زاد المعاد ابن قیم [4] ایضاً ج ۲ فصل جزیہ [5] زاد المعاد ابن قیم جلد اول۔

[6] بخاری و مسلم و ابو داؤد، ذکر خیبر و فتوح البلدان بلاذری ذکر فدک و وادی القریٰ و تیما۔

یا شورش ہوگی تو وہ عاریۃً[1] تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس تیس عدد ہر قسم کے ہتھیار دیں گے اور مسلمان انکی واپسی کے ضامن ہوں گے۔ اس کے معاوضہ میں جب تک وہ سودی لین دین یا بغاوت نہ کریں گے، نہ ان کے گرجے ڈھائے جائیں گے نہ اُن کے پادری نکالے جائیں گے، نہ اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ کیا جائے گا[2]۔

حدودِ شام میں بہت سے عیسائی اور یہودی گاؤں میں آباد تھے، رجب ۹ھ میں غزوہ تبوک کے موقع پر دومۃ الجندل، ایلہ، مقنا، جربا، اذرح، تبالہ اور جرش کے جو عیسائی اور یہودی زمیندار اسلام نہیں لائے بلکہ جزیہ دینا قبول کیا اُن میں سے ہر بالغ مرد پر ایک دینار سالانہ مقرر ہوا۔ اور مسلمان جب ادھر سے گزریں تو اُن کی ضیافت بھی ان پر لازمی قرار دی گئی[3]۔ ایک آسانی یہ بھی دی گئی کہ اگر نقد نہ ادا کرسکیں تو اسی کے برابر معافری کپڑے دیا کریں، بحرین کے مجوسیوں سے بھی جزیہ کی اسی شرحِ مقدار پر مصالحت کی گئی[4]۔

اصنافِ محاصل و مخارج

مختلف اغراض و مصالح کی بنا پر اسلام میں آمدنی کے صرف پانچ ذرائع تھے، غنیمت، فَے، زکوٰۃ، جزیہ، خراج۔ اول و دوم کے سوا بقیہ ذرائع آمدنی سالانہ تھے۔ غنیمت کا مال صرف فتوحات کے موقع پر آتا تھا، عرب میں قاعدہ تھا کہ رئیسِ فوج غنیمت کا چوتھا حصہ خود لیتا تھا جس کو اصطلاح میں مرباع کہتے تھے اور بقیہ جو جس کے ہاتھ لگ جاتا تھا لے لیتا تھا، تقسیم کا کوئی نظام نہ تھا۔ غزوۂ بدر کے بعد خدا نے غنیمت کو خود اپنی مِلک قرار دیا جس میں خمس یعنی پانچواں حصہ خدا اور رسول کے نام سے حکومتِ الٰہی کے مصالح و اغراض کے لئے مخصوص فرمایا۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (انفال)

اے پیغمبر! لوگ تجھ سے مالِ غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں کہہ دے کہ وہ خدا اور رسول کی مِلک ہے۔

خدا اور رسول کی ملکیت سے مقصود یہ ہے کہ وہ سپاہیوں کی شخصی ملکیت نہیں ہے بلکہ مصالح کی بنا پر حسبِ صوابدید خلافت جس طرح مناسب سمجھے اس کو صرف کرسکتا ہے۔ اسی طرح خمس کی نسبت ارشاد ہوا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال)

مسلمانو! جان لو کہ تم کو جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ خدا اور رسول، اہلِ قرابت اور یتیموں اور مسکینوں کا ہے۔

ایک دو استثنائی واقعہ کے سوا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت مخصوص مہاجرین کو یا مکہ کے نومسلموں کو عنایت فرمایا، ہمیشہ آپ کا یہ طرزِ عمل رہا کہ خمس کے بعد ایک ایک حبہ سپاہیوں پر برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے، سواروں کو تین حصے اور پاپیادہ کو ایک حصہ۔ بعض روایتوں میں ہے کہ سواروں کو صرف دو حصے ملتے تھے[5]۔ خمس کا بھی نمونۃً بہت کم حصہ ذاتی مصرف میں آتا تھا۔ آیتِ بالا میں جن اربابِ استحقاق کا ذکر ہے زیادہ تر انہی پر صرف کر دیا جاتا تھا۔

---

[1] ابو داؤد کتاب الخراج باب اخذ الجزیہ۔ [2] فتوح البلدان بلاذری۔ [3] ابو داؤد باب اخذ الجزیہ۔ [4] ابو داؤد باب اخذ الجزیہ من المجوس و تاریخ بلاذری ذکر بحرین۔ [5] ابو داؤد در حکم ارض خیبر بروایت مجمع۔

زکوٰۃ:۔ صرف مسلمانوں پر فرض تھی اور وہ چار مدوں سے وصول ہوتی تھی۔ نقد روپیہ، پھل اور پیداوار، مویشی (بجز گھوڑا) اسبابِ تجارت[1]۔ دو سو درہم چاندی، بیس مثقال سونے اور پانچ اونٹ سے کم پر زکوٰۃ نہ تھی پیداوار سے جو زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی، اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کی مقدار ۵ وسق (۳۰۰ صاع بہ تحقیق امام ترمذی) یا پانچ وسق سے زیادہ ہو، سونا اور چاندی کا چالیسواں حصہ وصول کیا جاتا تھا، مویشیوں کا نرخ زکوٰۃ بھی مختلف جنس کی مختلف تعداد پر مقرر تھا جو حدیث اور فقہ کی تمام کتابوں میں مفصل مذکور ہے، اراضی کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کی سیرابی صرف بارش یا بہتے پانی سے ہوتی تھی[2] اس قسم کی اراضی کی پیداوار میں دسواں حصہ (عشر) وصول ہوتا تھا، اور جس کو آبپاشی کے ذریعہ سے سیراب کیا جاتا تھا، اس میں نصف (عشر) یعنی بیسواں حصہ لیا جاتا تھا، سبزی پر کوئی زکوٰۃ نہ تھی[3]۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصرف تھے جن کی تفصیل خود قرآن مجید نے کر دی تھی۔ فقراء، مساکین، نو مسلم، غلام جن کو خرید کر آزاد کرانا ہے، مقروض، مسافر، محصلینِ زکوٰۃ کی تنخواہ، دیگر کارِ خیر۔ عموماً جہاں سے زکوٰۃ کی رقم وصول کی جاتی تھی، وہیں کے مستحقین پر صرف کر دی جاتی تھی، صحابہ اس حکم اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ ایک صحابی کو زیاد نے عامل بنا کر ایک مقام میں بھیجا جب وہ واپس آئے تو زیاد نے اُن سے رقم کا مطالبہ کیا، انھوں نے جواب میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے جس طرح ہم کرتے آئے تھے وہی ہم نے کیا[4]، معاذ بن جبل جب عامل بنا کر یمن بھیجے گئے تو زکوٰۃ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وصدقۃ تؤخذ من اغنیائھم وترد علیٰ فقرائھم

جزیہ غیر مسلم رعایا سے اُن کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا، اس کی مقدار متعین نہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں ہر مستطیع بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا، بچے اور عورتیں اس میں داخل نہ تھیں، ایلہ کے جزیہ کی مقدار ۳۰۰ دینار تھی، عہد نبوی میں جزیہ کی سب سے بڑی مقدار بحرین سے وصول ہوتی تھی۔

خراج غیر مسلم کاشت کاروں سے حق مالکانہ کے معاوضہ میں زمین کی پیداوار کا جو مخصوص حصہ باہمی مصالحت سے طے ہو گیا ہو اس کا نام خراج ہے، خیبر، فدک، وادی القریٰ، تیما، وغیرہ سے خراج ہی وصول ہوتا تھا، پھل یا پیداوار کے تیار ہونے کا وقت جب آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی کو بھیج دیتے تھے وہ باغوں اور کھیتوں کو دیکھ کر تخمینہ لگاتے تھے، رفعِ اشتباہ کے لئے تخمینہ میں سے ثلث کم کر دیا جاتا تھا، بقیہ پر حسب شرائط خراج وصول کیا جاتا، خیبر وغیرہ میں آدھی پیداوار پر صلح ہوئی تھی، جزیہ اور خراج کی رقم سپاہیوں کی تنخواہ اور جنگی مصارف میں صرف ہوتی تھی تمام صحابہ ضرورت کے وقت والنٹیر سپاہی تھے، جو کچھ وصول ہو کر آتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب کو اسی وقت تقسیم فرما دیتے تھے اوّل آپ اُن لوگوں کو عطا فرماتے تھے جو پہلے غلام رہ چکے تھے، ایک رجسٹر پر لوگوں کے نام لکھے ہوتے تھے اسی ترتیب سے نام پکارے جاتے تھے جو لوگ صاحب اہل و عیال ہوتے تھے ان کے دو حصے

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب العروض اذا کانت للتجارۃ [2] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۰۱ [3] ترمذی کتاب الزکوٰۃ [4] ایضاً [5] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ تحمل فی البلد [6] بلاذری [7] بحوالہ مذکور باب فی الخرص۔

اور مجرد لوگوں کو ایک حصہ ملتا تھا۔

جاگیریں اور افتادہ زمینوں کی آبادی

ملکِ عرب کا اکثر حصہ ریگستانی، پتھریلا، شور اور بنجر تھا جو سبز قطعات تھے ان پر بیرونی قومیں قابض تھیں، بقیہ افتادہ زمینیں تھیں مدینہ اور طائف میں البتہ کاشت کاری ہوتی تھی۔ بقیہ عام عرب تجارت یا لوٹ مار پر زندگی بسر کرتے تھے۔ عربوں کی غیر مامون زندگی کا راز یہی تھا کہ وہ مستقل پیشہ ور نہ تھے۔ اس بنا پر قیام امن کے لیے بھی ضروری تھا کہ زمین کا نئے سرے سے بندوبست کیا جائے۔ حجاز میں غیر قوموں کے انخلاء کے سبب سے یوں بھی بہت سی زمینیں خالی ہو گئی تھیں جن کا انتظام ضروری تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر صحابہ کو اس کی ترغیب دی۔

من احیا ارضا میتۃ فھی لہ من احاط حائطا جس شخص نے افتادہ زمینوں کو آباد کیا وہ اس کی ملک ہے
علی ارض فھی لہٗ۔ جس شخص نے کسی زمین کو گھیر لیا وہ اس کی ملک ہے۔

ترغیب عام کے ساتھ خاص خاص انتظامات بھی فرماتے۔ بنو نضیر اور قریظہ کے نخلستان اور کھیت خاص بارگاہِ نبوت کی ملک قرار پائے اور آپ نے اپنی طرف سے ان کو مہاجرین اور بعض انصار میں تقسیم فرما دیا۔ خیبر کی زمین کچھ خالصہ رہی اور بقیہ ان مہاجرین و انصار میں تقسیم فرما دی جو حدیبیہ میں شریک تھے لیکن عملاً یہودیوں کے ساتھ انکا بندوبست رہا۔ پیداوار کا نصف حصہ وہ خود لیتے تھے اور نصف مالکوں کو ادا کرتے تھے اور جو زمینیں آباد تھیں ان کو بعض شرائط پر اصل مالک کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ چنانچہ عک، ذوخیوان اور ایلہ، اذرح، نجران وغیرہ میں اسی طرح معاملات طے پائے۔ افتادہ زمینیں بھی صحابہ کو بطور جاگیر عطا فرمائیں۔ حضرت وائل کو حضرموت میں ایک قطعہ زمین عنایت فرمایا۔ بلالؓ بن حارث مزنی کو قابل زراعت زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا اور کانیں مرحمت فرمائیں۔ حضرت زبیرؓ کو مدینہ کے پاس اور حضرت عمرؓ کو خیبر میں جاگیریں عطا کیں۔ بنو رفاعہ کو دومۃ الجندل کے پاس زمین عنایت کی۔

یہ جاگیریں اس فیاضی اور وسعت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ ہر شخص حسب استطاعت اُن کا انتخاب اور اُن کے رقبہ کی تحدید کر سکتا تھا۔ ایک بار آپ نے حضرت زبیرؓ کو حکم دیا کہ جہاں تک ان کا گھوڑا دوڑ سکے وہ زمین ان کی جاگیر میں داخل ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا جب تک گھوڑا ایک خاص حد تک پہنچ کر رک گیا تو انھوں نے اپنا کوڑا پھینکا اور وہ جس نقطے پر گرا وہی ان کی جاگیر کا رقبہ قرار پایا۔ عرب کی خشک زمین میں سب سے زیادہ ضرورت چشمہ ہائے آب کی تھی، چنانچہ ایک بار جب آپ نے حکم دیا من سبق الی ما لم یسبقہ الیہ مسلم فھو لہ یعنی جو شخص ایسے چشمہ پر قبضہ کر لے جس پر کسی مسلمان نے قبضہ نہیں کیا ہے تو وہ اس کا ہے۔ تو تمام لوگوں نے دوڑ دوڑ کر اپنے اپنے چشموں کے حدود مقرر کر لئے۔

اس فیاضی کی اس قدر شہرت ہوئی کہ لوگوں نے دور دور سے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جاگیروں کی درخواست کرنا شروع کی۔ ابیض بن حمال یمن سے خدمتِ مبارک میں حاضر ہوئے اور ایک نمک کی کان کی درخواست

---

[1] ابو داؤد کتاب الخراج باب قسم الفئی۔

کی جس کو آپ نے منظور فرما لیا، لیکن ایک صحابی نے کہا کہ آپ نے ان کو جو کچھ جاگیر میں عطا فرمایا ہے، وہ پانی کا ایک بہت بڑا چشمہ ہے، چونکہ وہ ایک پبلک چیز تھی، اس بنا پر آپ نے اس کو واپس لے لیا۔

یہ تمام فیاضیاں صرف انہی چیزوں کے ساتھ مخصوص تھیں جن کا تعلق پبلک کے ساتھ نہیں تھا، لیکن جو چیزیں رفاہ عام کے کام آسکتی تھیں ان کو آپ نے اسی قدیم حالت پر چھوڑ دیا، عرب کا قدیم دستور تھا کہ اپنے مویشیوں کیلئے چراگاہیں متعین کر لیتے تھے جن کو حمیٰ کہتے تھے، عرب میں پیلو کا درخت اونٹوں کی عام غذا تھی اور اس کے متعلق کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی لیکن ابیض ابن حمال نے جب اس کو اپنے حمیٰ میں داخل کرنا چاہا تو آپ نے منع فرمایا، (لاحمی فی الاراک)۔ عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ مویشیوں کے چرانے کے لئے رؤسا اور ارباب اقتدار اپنے لئے چراگاہ مخصوص کر لیتے تھے اور وہاں کسی دوسرے کو نہیں آنے دیتے تھے، چونکہ اس سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اس لئے اس طریقہ کو بھی روک دیا۔

اسی طرح عرب میں ایک مقام دہنا ہے جس کے ایک طرف بکر بن وائل کا قبیلہ تھا اور دوسری طرف بنو تمیم رہتے تھے، حریث بن حسان نے بکر بن وائل کے لئے اس زمین کی درخواست کی، آپ نے فرمان لکھنے کا حکم دیا، اتفاق سے اس وقت ایک تمیمیہ موجود تھی، آپ نے اس کی طرف دیکھا، اس نے عرض کی، یا رسول اللہ! وہ اونٹوں اور بکریوں کی چراگاہ ہے اور اسی کے پاس بنو تمیم کی عورتیں اور بچے بھی رہتے ہیں، آپ نے فرمایا "بے چاری سچ کہتی ہے فرمان نہ لکھو" ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک چشمہ اور ایک چراگاہ سب کو کافی ہو سکتا ہے۔

*

---

[1] یہ تمام واقعات ابو داؤد کتاب الخراج کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں۔

مذہبی انتظامات

ملک میں امن قائم رکھنے کی غرض سے جو بعض ضروری انتظامات سرانجام پائے تھے اُن سے زیادہ ضروری مسلمانوں کے مذہبی امور کے انتظامات کا مسئلہ تھا۔ یہودیوں میں مذہبی فرائض کے ادا کرنے کے لئے ایک مخصوص خاندان مقرر تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور کو ان خدمات کی بجا آوری کا حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ عیسائیوں میں گو خاندان کی تخصیص نہ تھی لیکن ان میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس نے ان خدمات کو اپنا حق قرار دے لیا تھا۔ ہندوؤں میں غیر برہمن کسی مذہبی خدمت کا مستحق نہیں۔ دنیا کی دوسری قوموں کا بھی یہی حال تھا لیکن جو شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں قائم کی اس میں مخصوص اشخاص، مخصوص خاندان اور مخصوص طبقہ کی حاجت نہ تھی بلکہ ہر شخص جو اسلام کا کلمہ گو تھا اس رتبہ کا مستحق ہو سکتا تھا۔

دعاۃ اور مبلغین اسلام

ایک مشہور مغربی مؤرخ نے لکھا ہے کہ مدینہ میں آ کر اسلام نبوت کا منصب چھوڑ کر سلطنت بن گیا تھا اور اب اسلام کے معنی بجائے اس کے کہ خدا پر ایمان لایا جائے یہ رہ گئے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکومت تسلیم کر لی جائے[1]۔ اسلام کا مقصد وہ تھا جو خدا نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔

(وہ لوگ جن کو ہم زمین میں اگر طاقت دیں تو نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں)

اس بنا پر ہر مسلمان واعظ بھی ہوتا تھا اور محتسب بھی، داعیٔ مذہب بھی اور ماہر شریعت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ یا تو اسلام سے پہلے عرب میں اس قدر جہالت پائی جاتی تھی کہ اکثر شرفاء میں لکھنا پڑھنا عیب خیال کیا جاتا تھا یا ایک ایک گھر فقہ، حدیث اور تفسیر کا دار العلم بن گیا۔ تاہم چونکہ ہر شخص کو تفقہ و تدریس کا کافی وقت نہیں مل سکتا تھا اس لئے ضروری قرار دیا گیا کہ ہر جماعت اور ہر قبیلہ میں کچھ ایسے لوگ موجود رہیں جو تعلیم و ارشاد کا فرض انجام دے سکیں۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں حکم آیا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ
مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ
وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ
يَحْذَرُوْنَ (توبہ ۱۴)

اور سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینہ) نہیں آ سکتے اس لئے ہر قبیلہ سے ایک گروہ کو آنا چاہیئے تا کہ وہ شریعت (دین) میں تفقہ حاصل کریں اور تا کہ واپس جا کر اپنی قوم کو ڈرائیں شاید یہ لوگ بری باتوں سے بچیں۔

---

[1] دیکھو ولہاوسن صاحب کا آرٹیکل اسلام پر انسائیکلوپیڈیا۔

اُن کی تعلیم و تربیت

چونکہ مقصد یہ تھا کہ ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو نہ صرف شریعت کے اوامر و نواہی سے واقف ہو بلکہ شب و روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے سے تمام تر اسلامی رنگ میں ڈوب جائے، جس کی گفتار، کردار، بات چیت، نشست و برخاست، قول و عمل، ایک ایک چیز تعلیم نبوی کے پرتو سے منور ہو جائے تاکہ وہ تمام ملک کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بن سکے، اس لئے عرب کے ہر قبیلہ سے ایک جماعت آتی تھی اور آپؐ کی خدمت میں رہ کر تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتی تھی،

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے،

کان ینطلق من کل حی من العرب عصابۃ فیأتون النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیسألونہ عما یریدون من امر دینھم ویتفقھوا فی دینھم۔	عرب کے ہر قبیلہ کا ایک گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا اور آپؐ سے مذہبی امور دریافت کرتا تھا اور دین میں تفقہ حاصل کرتا تھا۔

داعیانِ اسلام جو اطرافِ عرب میں بھیجے جاتے تھے اُن کو ہدایت کی جاتی تھی کہ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وطن چھوڑ کر مدینہ میں آجائیں اور یہیں بود و باش اختیار کریں، اس کا نام ہجرت تھا، اس بناء پر بیعت کی دو قسمیں کر دی گئی تھیں، بیعتِ اعرابی اور بیعتِ ہجرت، بیعتِ اعرابی صرف ان بدوؤں کے لئے تھی جن کو کچھ دنوں مدینہ منورہ میں رکھ کر تعلیم دینا مقصود تھا، مختصر مشکل الآثار میں روایت ہے کہ عقبہ جہنی جب اسلام لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ بیعتِ اعرابی کرتے ہو یا بیعتِ ہجرت، اس کے بعد مصنف لکھتا ہے،

ان البیعۃ من المھاجر توجب الاقامۃ معہ (صلی اللہ علیہ وسلم) لیصرف فیما یصرفہ فیہ من امور الاسلام وبخلاف البیعۃ الاعرابیہ۔	ہجرت کی بیعت کرنے سے لازم ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قیام کرے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلامی امور میں لگائیں اور بیعتِ اعرابی میں یہ ضرور نہیں۔

اسی بناء پر عرب کے بہت سے خاندان اپنے گھروں سے ہجرت کر کے مدینہ میں چلے آتے تھے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ آئے تو اسی شخصوں کو لے کر آئے اور مدینہ میں آباد ہوئے، خلاصۃ الوفا سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں جہینہ وغیرہ قبائل کی الگ الگ مسجدیں تھیں، یہ وہی قبائل تھے جو ہجرت کر کے مدینہ آگئے تھے اور چونکہ مسجد نبوی سب کے لئے کافی نہ تھی اس لئے الگ الگ مسجدیں بن گئی تھیں،

تعلیم و ارشاد کے مختلف طریقے تھے،

ایک یہ کہ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہ کر عقائد اور فقہ کے ضروری مسائل سیکھ لیتے تھے اور اپنے قبائل میں واپس جاتے تھے اور اُن کو تعلیم دیتے تھے، مثلاً مالک بن الحویرث جب سفارت لے کر آئے تو بیس دن قیام کیا اور ضروری مسائل کی تعلیم حاصل کی، جب چلنے لگے تو آپؐ نے فرمایا،

ارجعوا الی اھلیکم فعلموھم ومروھم وصلوا کما رأیتمونی أصلی۔	اپنے خاندان میں واپس جاؤ، ان میں رہ کر ان کو اوامر شریعت کی تعلیم دو اور جس طرح مجھ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے

لہ تفسیر خازن سورۂ توبہ آیت وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ۔

(بخاری باب رحمۃ البہائم)　　　　اسی طرح نماز پڑھو۔

دوسرا مستقل طریقہ درس کا تھا یعنی لوگ مستقل طریقہ سے مدینہ میں رہتے تھے اور عقائد شریعت اور اخلاق کی تعلیم پاتے تھے، اُن کے لئے صفہ خاص درس گاہ تھی اور اس میں زیادہ تر وہ لوگ قیام کرتے تھے جو تمام دنیاوی تعلقات سے آزاد ہو کر شب و روز زہد و عبادت اور زیادہ تر خدمت علم میں مصروف رہتے تھے۔

مشکوٰۃ کتاب العلم میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے، اس وقت مسجد میں دو حلقے تھے، حلقۂ ذکر اور حلقۂ درس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ درس میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس وقت کی اصطلاح میں ان طالبان علم کو قرا کہتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہر جگہ یہی نام آتا ہے۔ مدینہ میں جو لوگ تعلیم و ارشاد کے لئے گئے تھے اور کفار نے ان کو دھوکے سے شہید کر دیا تھا وہ اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے اور کتب حدیث میں ان کا نام اسی لقب (قرا) کے ساتھ آیا ہے، ارباب سیر نے لکھا ہے کہ ان لوگوں میں سے جب کوئی شادی کر لیتا تھا تو اس جماعت سے نکل آتا تھا اور ان کے بجائے دوسرے لوگ داخل ہوتے تھے۔

اصحاب صفہ اگرچہ اس قدر مفلس و نادار تھے کہ کسی کے پاس ایک کپڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا جس کو گردن سے باندھ کر گھٹنوں تک چھوڑ دیتے تھے کہ چادر اور تہمد دونوں کا کام دیتا تھا، تاہم یہ لوگ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ جنگل میں جا کر لکڑیاں چن لاتے تھے اور ان کو بیچ کر آدھا خیرات کر دیتے تھے اور آدھا خوان طریقت میں تقسیم ہوتا تھا، اس بنا پر تعلیم اور درس کا وقت رات کو مقرر کیا گیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس درسگاہ کے معلمین میں حضرت عبادہؓ بن الصامت بھی تھے جو مشہور صاحب علم تھے اور جن کو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں تعلیم فقہ و قرآن کے لئے فلسطین بھیجا تھا، ابو داؤد میں حضرت عبادہؓ بن الصامت سے روایت ہے۔

علمت ناسا من اھل الصفۃ القراٰن والکتاب	میں نے اصحاب صفہ میں سے چند لوگوں کو قرآن مجید اور لکھنے کی تعلیم
فاھدی الی رجل منھم قوسا (ص۱۲۹ جلد دوم)	دی اس کے صلہ میں مجھ کو ایک شخص نے ایک کمان تحفہ میں دی۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادہؓ کو اس تحفہ کے قبول کرنے کی اجازت نہیں دی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ درس گاہ صفہ کے علاوہ اور بھی کوئی جگہ تھی، جہاں اصحاب صفہ رات کو تعلیم پاتے تھے، مسند امام ابن حنبل میں ہے۔

عن انسؓ کانوا سبعین فکانوا اذا جنھم اللیل انطلقوا الی	حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ اصحاب صفہ میں سے ستر شخص رات کو ایک معلم
معلم لھم بالمدینۃ فیدرسون اللیل حتی یصبحوا (ج۳ ص۱۳۷)	کے پاس جاتے تھے اور صبح تک درس میں مشغول رہتے تھے۔

عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا لیکن اسلام آیا تو تحریر و کتابت کا فن بھی گویا ساتھ لے کر آیا، سب سے بڑی ضرورت قرآن مجید کے ضبط و تدوین کی تھی، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی سے کتابت کی ترویج کی طرف توجہ فرمائی، جنگ بدر کے ذکر میں گزر چکا ہے کہ اسیران جنگ میں سے جو لوگ فدیہ نہیں ادا کر سکے انکو اس شرط پر رہا کیا گیا کہ مدینہ میں رہ کر لوگوں کو لکھنا سکھا دیں، ابو داؤد کی مذکورہ بالا حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب

۱؎ صحیح بخاری غزوۂ بیر معونہ۔

صفہ کو جو تعلیم دی جاتی تھی اُس میں لکھنا بھی داخل تھا، چنانچہ حضرت عبادہؓ قرآن مجید کے ساتھ لکھنے کی بھی تعلیم دیتے تھے۔[1]

مساجد کی تعمیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ ترقی وجاہ پرستی سے طبعاً نفور تھے اور اس لئے اینٹ اور مٹی پر صرف زر ناپسند فرماتے تھے، تاہم چونکہ اسلام کی تمام تحریکات کا مقصد صرف رفع ذکر اور تسبیح وتقدیس الٰہی تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ کو مسلمان ہونے کے ساتھ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت پیش آتی تھی، ایک سبب اس کا یہ بھی تھا کہ یہ مسجدیں صرف نماز ہی پڑھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں بلکہ درحقیقت یہ تمام اہل قریہ یا اہل محلہ کو دن رات میں پانچ بار ایک جگہ جمع کر کے ان کی اجتماعی اور اتحادی قوت کو روز بروز اور زیادہ ترقی دینے کا ذریعہ بھی بنتی تھیں، اس لئے آپؐ باجماعت نماز پڑھنے کی سخت تاکید فرماتے تھے، خود مدینہ کے اندر بہت سے قبائل آباد تھے، ہر قبیلہ کا الگ الگ محلہ تھا اور ہر محلہ میں ایک ایک مسجد تھی۔

ابوداؤد نے کتاب المراسیل میں بسند لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے اندر آپؐ کے زمانہ میں نو مسجدیں تھیں، جہاں الگ الگ جماعتیں ہوتی تھیں اُن کے نام یہ ہیں۔ مسجد بنی عمرو، مسجد بنی ساعدہ، مسجد بنی عبید، مسجد بنی سلمہ، مسجد بنی رایح، مسجد بنی زریق، مسجد غفار، مسجد اسلم، مسجد جہینہ۔ ان کے علاوہ متفرق روایات میں مختلف قبائل کی حسب ذیل مسجدوں کا اور پتہ لگتا ہے۔ مسجد بنی خدارہ، مسجد بنی امیہ (انصار کا ایک قبیلہ تھا) مسجد بنی بیاضہ، مسجد بنی الحبلی، مسجد بنی عصیہ، مسجد ابی فیصلی، مسجد بنی دینار، مسجد ابی ابن کعب، مسجد النابغہ، مسجد ابن عدی، مسجد حارث بن خزرج، مسجد بنی حطمہ، مسجد الفضیخ، مسجد بنی حارثہ، مسجد بنی ظفر، مسجد بنی عبدالاشہل، مسجد واقم، مسجد بنی معاویہ، مسجد بنی قریظہ، مسجد بنی وائل، مسجد الشجرۃ۔[2]

روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ اشاعتِ اسلام کے ساتھ مدینہ سے باہر عرب کے گوشہ گوشہ میں مسجدیں بنی جاتی تھیں جہاں دن میں پانچ بار خدا کا نام پکارا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوات میں معمول کر لیا تھا کہ رات بھر انتظار فرماتے تھے، صبح کو جہاں سے اذان کی آواز آتی وہاں حملہ نہ فرماتے، چنانچہ ایک سفر جہاد میں آپؐ کے کانوں میں ایک طرف سے اللہ اکبر کی آواز آئی تو آپؐ نے فرمایا "یہ تو فطری شہادت ہے" اس کے بعد آپؐ نے أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کی آواز سنی تو فرمایا "آگ سے نجات ہوگی"، صحابہ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ بکرے کے چرواہے کی آواز تھے۔[3] تمام مجاہدین اسلام کو بھی یہی حکم تھا، چنانچہ ایک بار آپؐ نے ایک سریہ کو روانہ کیا تو یہ وصیت فرمائی۔

اذا رأیتم مسجداً او سمعتم مؤذناً فلا تقتلوا احداً[4]	اگر کہیں مسجد دیکھو یا اذان کی آواز سنو تو وہاں کسی شخص کو قتل نہ کرنا۔

ان روایتوں سے ایک طرف تو عہدِ نبوت میں اشاعتِ اسلام کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف

---

[1] اصابہ تذکرہ باب المعوذتین [2] یہ تمام تفصیل عینی شرح بخاری جلد ۲ صفحہ ۴۰۹ سے ماخوذ ہے [3] صحیح مسلم جلد اول کتاب الاذان باب الامساک عن الاغارۃ علی قوم فی دار الکفر اذا سمع فیہم الاذان [4] ابوداؤد کتاب الجہاد فی دعاء المشرکین۔

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قبائل اسلام لائے تھے، انہوں نے الگ الگ مسجدیں تعمیر کرائی تھیں اور ان میں پنج وقتہ غلغلۂ تکبیر و اذان بلند ہوا کرتا تھا۔

اگرچہ اس وقت کی عام غربت اور سادگی کی وجہ سے جو مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں وہ ایک زمانہ ممتد تک قائم نہیں رہ سکتی تھیں، اس لئے ان باقیات صالحات کا بہت بڑا حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور ان کے ساتھ ان کا نام اور اُن کی تاریخ بھی مٹ گئی، تاہم جو مسجدیں مدتوں قائم رہیں ان کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا کوئی گوشہ ان مذہبی یادگاروں سے خالی نہ تھا۔[1]

عرب کے عام قبائل سے بحرین کا ایک قبیلہ عبد القیس اسلام لاچکا تھا، اس قبیلہ نے ایک مسجد تعمیر کی تھی چنانچہ اسلام میں مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلے جمعہ کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی، بخاری کتاب الجمعہ میں ہے

عن ابن عباسؓ انہ قال ان اول جمعۃ جمعت	حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کے بعد پہلا
بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	جمعہ قبیلۂ عبد القیس کی مسجد میں پڑھا گیا جو بحرین کے ایک گاؤں
فی مسجد عبد القیس بجواثی من البحرین۔	جواثی نامی میں واقع تھی۔

اہل طائف جب اسلام لائے تو آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ خاص اس جگہ مسجد تعمیر کرائیں جہاں اُن کا بُت نصب[2] تھا، حضرت طلق بن علیؓ سے روایت ہے کہ جب ہماری قوم کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کی کہ ہمارے ملک میں ایک گرجا ہے تو آپؐ نے اپنے وضو کا پانی عنایت فرمایا اور ہدایت کی کہ گرجے کو توڑ ڈالو اور وہاں یہ پانی چھڑک کر مسجد بنا لو، چنانچہ جب وہ لوگ واپس آئے تو حسب ارشاد مسجد تعمیر کرلی۔[3]

اس قسم کی مسجدیں اگرچہ عرب کے گوشہ گوشہ میں تعمیر ہوئی ہوں گی، لیکن عموماً احادیث کی کتابوں سے صرف اُن مسجدوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے جو مدینہ اور حوالی مدینہ میں تعمیر ہوئیں، صحیح مسلم میں ہے کہ حوالی مدینہ میں انصار کے جو گاؤں آباد تھے، عاشورہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اُن میں منادی کرادی کہ جو لوگ روزہ دار ہیں وہ اپنے روزے کو پورا کرلیں اور جو لوگ افطار کرچکے ہیں وہ بقیہ دن روزہ رکھیں، اس اعلان کے بعد صحابہ نے اس پر اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ خود روزے رکھتے تھے اور اپنے بچوں سے روزے رکھواتے تھے، یہاں تک کہ ان کو گھر سے باہر مسجد میں لے جاکر رکھتے تھے اور جب وہ کھانے کے لئے روتے تھے تو اُن کو ان کے بنے ہوئے کھلونوں سے بہلاتے تھے۔[4]

امام بخاری نے صحیح بخاری میں ایک مستقل باب باندھا ہے کہ "مساجد کو اشخاص کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے یا نہیں"، اور اس باب کے تحت میں جو حدیث لائے ہیں اس میں بہ تصریح مسجد بنی زریق کا نام لیا ہے۔ حضرت انسؓ بن مالک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ کر اپنے محلہ میں آتے تھے، یہاں لوگ مسجد میں

---

[1] نسائی کتاب المساجد جلد ۱ صفحہ ۱۱۸ [2] زاد المعاد جلد اول صفحہ ۲۸۹ بروایت ابو داؤد طیالسی [3] سنن نسائی کتاب المساجد صفحہ ۱۱۸

[4] صحیح مسلم کتاب الصیام باب من اکل فی عاشورا فلیکف بقیۃ یومہ۔

منتظر رہتے تھے، وہ آکر کہتے تھے کہ مسجد نبوی میں نماز ہو چکی تب لوگ یہاں نماز پڑھتے تھے[1]۔ ان روایتوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان قبائل کی مسجدیں الگ الگ تھیں، صحاح کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک جماعت ہوتے تھے اور پھر اپنے محلہ کی مسجد میں جاکر اپنی قوم کی امامت کرتے تھے، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل کا اسی پر عمل تھا، مدینہ میں جو قبائل آباد تھے ان کے علاوہ جو قبائل ہجرت کرکے آتے تھے وہ بھی اپنی مسجد تعمیر کر لیتے تھے۔ چنانچہ طبقات ابن سعد میں ہے۔

ولجهينة مسجد بالمدينة[2]	مدینہ میں جہینہ کی ایک مسجد ہے۔

قبائل کی ضروریات کے علاوہ مسجدوں کی تعمیر کا ایک بڑا سبب یہ ہوتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم راہ میں جہاں کہیں نماز پڑھتے تھے وہاں صحابہ تبرکاً مسجد تعمیر کر لیتے تھے، امام بخاری نے صحیح بخاری میں مستقل باب باندھا ہے جس کا عنوان یہ ہے۔ باب المساجد التی علی طریق المدینة والمواضع التی صلی فیها النبی صلی الله علیه وسلم، یعنی وہ مسجدیں جو مدینہ کے راستوں اور ان مقامات میں واقع ہیں جہاں آپ نے نماز پڑھی ہے اور اس کے تحت میں اس قسم کی متعدد مسجدوں کا نام لیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اُن کے حسب ذیل نام گنائے ہیں۔

مسجد قبا، مسجد الفضیح، مسجد بنی قریظہ، مشربہ ام ابراہیم، مسجد بنی ظفر یا مسجد البغلہ، مسجد بنی معاویہ، مسجد فتح، مسجد قبلتین، حافظ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں جو مسجدیں منقش پتھروں سے تعمیر ہوئی ہیں ان سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا فرمائی ہے، کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے جب ان مساجد کی تجدید کی تھی تو اہل مدینہ سے اس کی تحقیق کر لی تھی[3]۔

ائمہ نماز کا تقرر

مساجد کی تعمیر کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مختلف قبائل کے لئے الگ الگ امام مقرر کر دیئے جائیں، عموماً عادت شریف یہ جاری تھی کہ جو قبیلہ مسلمان ہو جاتا اس میں جو شخص سب سے زیادہ حافظ قرآن ہوتا وہی امام مقرر کر دیا جاتا اور اس شرف میں چھوٹے بڑے، غلام آقا سب برابر تھے آپ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ میں جو مہاجرین آچکے تھے اُن کے امام حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالم تھے، جرم کا قبیلہ جب اسلام لایا تو عمرو بن سلمہ جرمی اس وقت سات یا آٹھ برس کے کم سن بچے تھے لیکن چونکہ اپنے قبیلہ میں قرآن کے سب سے بڑے حافظ وہی تھے اس لئے وہی امام قرار پائے۔

امامت کے انتخاب کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصول مقرر فرما دیئے تھے۔

عن ابی مسعود الانصاریؓ قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یؤم القوم اقرأهم لکتاب الله فان کانوا فی القرأة سواء فاعلمهم بالسنة فان کانوا فی السنة سواء فاقدمهم هجرة فان کانوا	ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت کی امامت وہ کرے جو سب سے زیادہ کلام اللہ پڑھا ہو اگر اس میں سب برابر ہوں تو جو سنت سے سب سے زیادہ واقف ہو اگر اس میں بھی مساوات ہو تو جس نے سب سے پہلے ہجرت کی ہو

---

[1] مسند ابن حنبل ج۴ ص۱۲۲ [2] طبقات ابن سعد جزو رابع ص۵ [3] فتح الباری ج اول ص۴۶۴ [4] ایضاً

فی الهجرة سواء فاقدمهم سنًا (مسلم) اور اس میں بھی سب برابر ہوں تو جس کی عمر سب سے زیادہ ہو۔

جب کوئی ایسا قبیلہ خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تو آپ پوچھتے کہ تم میں سب سے زیادہ حافظ قرآن کون ہے؟[1] اگر کوئی ایسا شخص ہوتا تو لوگ اس کا نام لیتے اور آپ اس کو اس عہدہ پر خود ممتاز فرماتے، چنانچہ اہل طائف کے امام عثمانؓ بن ابی العاص اسی طرح مقرر ہوئے تھے اور سب مساوی الحیثیت ہوتے تو ارشاد ہوتا تم میں جو بڑا ہو وہ جماعت کی امامت کرے۔ مالکؓ بن حویرث جب اپنی قوم کی طرف سے بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا۔

مدینہ میں، مدینہ سے باہر اطراف میں عرب کے مختلف صوبوں میں جہاں جہاں مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں، ظاہر ہے کہ وہاں ہر جگہ الگ الگ امام مقرر ہوتے ہوں گے، جن قبائل میں عمال مقرر ہوئے تھے وہی ان کے امام بھی ہوتے تھے۔ بڑے بڑے مقامات میں یہ دونوں عہدے الگ الگ ہوتے تھے۔ عمان میں حضرت عمرو بن العاص عامل تھے اور ابوزید انصاریؓ امام، لیکن افسوس ہے کہ احادیث وسیر کی کتابوں میں نام بنام ان کی یکجا تفصیل مذکور نہیں، ضمنی واقعات میں جہاں تک اس کا سراغ لگ سکا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

نام	مقام تقرر	کیفیت
مصعبؓ بن عمیر	مدینہ منورہ	ہجرت نبویؐ سے پہلے انصار کی امامت کرتے تھے (ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ)
سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ		آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مہاجرین کے امام تھے (بخاری وابوداؤد)
ابن مکتومؓ	مدینہ منورہ	جب آپ مدینہ سے باہر غزوات میں تشریف فرما ہوتے تو اکثر صحابہ بھی ہمرکاب ہوتے لیکن چونکہ یہ آنکھوں سے معذور تھے اس لئے مدینہ ہی میں رہتے تھے اس سبب سے اس موقع پر انہی کو آپ امام مقرر فرما جاتے (ابوداؤد)
ابوبکر صدیقؓ	۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدم تشریف آوری پر مسجد نبویؐ میں امام ہوتے تھے (صحیح بخاری)
عتبان بن مالکؓ	بنو سالم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (ابوداؤد ونسائی)
معاذؓ بن جبل	بنو سلمہ	〃 〃 〃 〃 (بخاری وغیرہ)
ایک انصاریؓ	مسجد قبا	〃 〃 〃 〃 (بخاری)
عمروؓ بن سلمہ	بنو جرم	〃 〃 〃 〃 (ابوداؤد ونسائی)

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ [2] فتوح البلدان بلاذری۔

نام	مقام تقرر	کیفیت
اسیدؓ بن حضیر	بنو جرم	اپنے قبیلہ کے امام تھے (ابوداؤد)
انسؓ بن مالک یا کوئی	بنو نجار	〃 〃 〃 〃 (امام کا نام مشکوک ہے)
دوسرے صحابی	〃	〃 〃 〃 〃 (مسند جلد ۳ صفحہ ۲۳۲)
مالکؓ بن حویرث	〃	〃 〃 〃 〃 (ابوداؤد)
عتابؓ بن اسید	مکہ معظمہ	〃 〃 〃 〃 (نسائی)[2]
عثمانؓ بن ابی العاص	طائف	〃 〃 〃 〃 (ذکر وفد طائف)
ابو زیدؓ انصاری	عمان	〃 〃 〃 〃 (بلاذری ذکر عمان)

موذنین عام طور پر اذان کے لئے کوئی خاص شخص منتخب نہیں کیا جاتا تھا، تاہم چند مثالوں سے قیاس ہوتا ہے کہ بڑی بڑی مسجدوں میں یہ عہدہ الگ آپ نے قائم فرمایا تھا، چنانچہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں اس عہدے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صاحبوں کو ممتاز فرمایا تھا۔

نام	مقام	مسجد
بلالؓ بن رباح	مدینہ منورہ	موذن مسجد نبویؐ
عمروؓ بن ام مکتوم قرشی	〃	〃
سعد القرظؓ	عوالی مدینہ	موذن مسجد قبا
ابو محذورہؓ جمحی قرشی	مکہ مکرمہ	موذن مسجد حرام

✱

---

[1] کتب مذکورہ کی کتاب الصلوٰۃ سے یہ نام ملتقط ہیں۔ [2] نسائی صفحہ ۱۸۔

تاسیس و تکمیلِ شریعت

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا،

(آج ہم نے تمہارا مذہب کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور اسلام کو تمہارے لئے مذہب پسند کیا)

یہ تمام انتظام اور نظم و نسق اسلام کا حقیقی نصب العین نہ تھا، بلکہ جیسا کہ بتفصیل اوپر بیان کیا جا چکا ہے یہ اس لئے تھا کہ ملک میں امن و امان پیدا ہو اور ایک منظم اور باقاعدہ حکومت کا وجود ہو تاکہ مسلمان بے روک ٹوک اور بلا مزاحمت اپنے مذہبی فرائض انجام دے سکیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کسی نے اس آیت کے معنی پوچھے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ۔	ان کافروں سے جہاد کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور مذہب تمام تر خدا کے لئے ہو جائے۔

انہوں نے فرمایا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا جب اسلام کم تھا، آدمی اپنے مذہب کی بنا پر فتنہ میں مبتلا ہو جاتا تھا، لوگ اس کو قتل کر دیتے تھے، اب جب اسلام ترقی کر گیا تو کوئی فتنہ نہیں رہا۔

ہجرت سے آٹھ برس تک کا زمانہ تمام تر ان ہی فتنوں کی دار و گیر، مخالفوں کی شورشوں اور ہنگاموں کی مدافعت اور ملک میں امن و امان قائم کرنے میں گزرا، اسی لئے آٹھ برس کی وسیع مدت میں فرائض اسلام سے جو چیز ہر جگہ اور ہر موقع پر نمایاں نظر آتی ہے وہ صرف جہاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایک ایک غزوہ کی تفصیل سینکڑوں صفحات میں ہے، لیکن نماز، روزہ، زکوٰۃ کے متعلق دو دو، چار چار سطروں سے زیادہ واقعات نہیں ہیں وہ بھی اس طرح کہ جب کوئی سنہ ختم ہوتا ہے تو اس قدر لکھ دیتے ہیں کہ اسی سال فرض نماز کی رکعتیں دو سے چار ہو گئیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ خدا نخواستہ ارباب سیر و بحر فرائض کی اہمیت و عظمت پیش نظر نہیں رکھتے تھے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ غزوات کی مصروفیت اور ملک کی بدامنی کی وجہ سے اکثر فرائض دیر میں فرض ہوئے اور جو پہلے فرض ہو چکے تھے ان کی تکمیل بھی بتدریج اسی زمانہ میں ہوتی رہی جس کے لیل و نہار زیادہ تر مخالفین کے تیر باراں کے روکنے میں بسر ہو گئے۔

جن احکام کا تعلق قانون ملکی سے تھا وہ اس وجہ سے نازل نہ ہو سکے کہ اب تک اسلام کوئی حکمران طاقت نہ تھا، خالص مذہبی فرائض اور احکام بھی رفتہ رفتہ اسی زمانہ میں نازل ہوتے رہے اور بتدریج جیسے جیسے ان کے مناسب حالات پیدا ہوتے جاتے تھے وہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے۔ سب سے بڑا نکتہ احکام کے تدریجی نزول میں

---

[1] بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۷۰ تفسیر سورۂ انفال،

یہ تھا کہ ان سے مقصود محض عربوں کو ان کا بتا دینا مقصود نہیں تھا بلکہ عملاً ان کی زندگی کو ان پر کاربند بنا دینا تھا اس لئے نہایت آہستہ آہستہ بتدریج ترتیب کے ساتھ ان کو آگے بڑھایا گیا، اسی نکتہ کو حضرت عائشہؓ نے نہایت خوبی سے بیان فرمایا ہے کہ پہلے عذاب و ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں، جب دلوں میں استعداد اور رقت پیدا ہو گئی تو احکام نازل ہوئے، ورنہ اگر پہلے ہی دن یہ حکم ہوتا کہ شراب نہ پیو تو کون مانتا[۱]۔

الغرض ان مختلف اسباب کی بنا پر اسلام کے اکثر فرائض اور احکام اس وقت تکمیل کو پہنچے جب تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا، مکہ معظمہ کے قیام تک روزہ سرے سے فرض نہیں ہوا، مدینہ منورہ میں روزے فرض ہوئے لیکن زکوٰۃ کی فرضیت سات آٹھ سال کے بعد ہوئی، اس کی وجہ یہی تھی کہ رات دن کی معرکہ آرائیوں سے مالی حالت اس حد تک پہنچنے کہاں پائی تھی کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا موقع آتے۔ فتح مکہ سے پہلے مسلمان اس سرزمین مقدس پر قدم نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے اس وقت تک حج بھی فرض نہ ہوا، نماز روزانہ کا فرض ہے اور یہ فرض اسلام کے وجود کے ساتھ آیا لیکن اس کی تکمیل بتدریج ہجرت کے چھ سات برس کے بعد ہوئی، ۵ھ تک نماز میں بات چیت کرنا جائز تھا اور کوئی باہر کا آدمی سلام کرتا تو نمازی عین نماز میں جواب دیتے تھے، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ میں متعدد روایتیں[۲] مذکور ہیں۔

غرض فتح مکہ کے بعد جب کفر کا زور ٹوٹ گیا اور تمام ملک میں امن و امان قائم ہو گیا تو مذہبی احکام کی تفصیل اور نظام شریعت کی تکمیل کا موقع آیا، احکام بہت سے ایسے تھے جو سرے سے ابھی شروع نہیں ہوئے تھے مثلاً زکوٰۃ، حج، حرمت ربا وغیرہ بہت سے ایسے تھے کہ ابتدائی ارکان قائم ہو گئے تھے لیکن تکمیل نہیں ہوئی تھی[۳]۔

* * *

---

[۱] صحیح بخاری باب تالیف القرآن [۲] ابوداؤد باب رد السلام فی الصلوٰۃ [۳] اسلام کے بعض احکام کے نزول اور تدریجی تکمیل کی تاریخ جلد نمبر ۱ کے واقعات متفرقہ کے تحت میں بھی ضمناً گزر چکی ہے۔ ناظرین ایک دو جگہ احکام کی تاریخ اور سنین میں یہاں سے اختلاف پائیں گے اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ جلد اول میں عام مؤرخین اور ارباب سیر کی تقلید کی گئی ہے اور یہاں احادیث اور کتب شان نزول سے استقرار کر کے جو امر محقق نظر آیا ہے اس کی تفصیل کی گئی ہے اور اصل یہ ہے کہ احکام کے سنین اور تاریخیں کتب حدیث میں بالتصریح مذکور نہیں ہیں محدثین اور ارباب روایت کے قیاسات اور استنباطات ہیں اور اسی بنا پر باہم ان میں اختلافات ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ صحیح اور معتبر دلائل کی رہنمائی سے اس راستہ کو طے کریں والعصمۃ بید اللہ (س)

عقائد اور اسلام کے اصولِ اوّلین

اسلام کے فرائضِ اوّلین عقائد ہیں، یعنی توحید، رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر و نشر وغیرہ پر ایمان لانا[1]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اول وحی جو نازل ہوئی یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ اس میں خدا کی بڑائی کے سوا کسی مخصوص عقیدہ کی تعلیم نہ تھی، لیکن دوسری بار جو وحی نازل ہوئی وہ یہ تھی[2]

يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر-۱)	اے چادر اوڑھنے والے اٹھ، لوگوں کو ڈرا اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور بتوں کو چھوڑ دے۔

اس کے بعد مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں جس قدر آیتیں نازل ہوئیں وہ بیشتر عقائد کے متعلق تھیں، شرک اور بت پرستی کی برائی، خدا کی عظمت و جلال کا اظہار، قیامت کے ہولناک سماں اور جنت و دوزخ کا پر اثر بیان، رسالت کے خواص اور اس کی ضرورت کے دلائل مکہ میں تیرہ برس تک زیادہ تر یہی مطالب ادا ہوتے رہے غرض عقائد کے تمام اجزاء۔ اگرچہ آغازِ اسلام ہی میں لوگوں کو سنائے جا چکے تھے لیکن مکی آیتوں کے استقصاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک کا بیان الگ الگ ہوتا تھا۔ عقائد کا مسلسل بیان سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں ہے اور یہ دونوں سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں۔ مکی سورتوں میں زیادہ تر زور توحید، قیامت کے اعتقاد اور رسول کی صداقت پر صرف ہوا ہے لیکن مدینہ میں آکر اسلام کے تمام عقائد اور اصول اوّلین کی مجموعی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔

ایمان اور اسلام کے اصولِ اوّلین کے متعلق سورۂ بقرہ کی سب سے پہلی آیت یہ ہے۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔	جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں، نماز کھڑی کرتے ہیں، ہم نے جو روزی دی ہے اس سے خرچ کرتے ہیں اور جو ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اے محمد! تجھ پر اتاری گئیں اور تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اور ان کو آخرت پر بھی یقین ہے۔

وسطِ سورہ میں یہ اصول دوبارہ ادا ہوتے ہیں۔

لَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ۔	لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی خدا پر، روز قیامت پر، فرشتوں پر کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔

اس کے بعد نماز، روزہ، زکوٰۃ اور بعض اخلاقی احکام گنائے گئے ہیں، یہ آیتیں تحویل قبلہ کی آیت کے ساتھ ۲ھ میں نازل ہوئیں، اسی کی تفصیل سورہ کے آخر میں کی گئی ہے۔ یہ آیتیں ہجرت کے چند سال بعد غالباً نازل ہوئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی روایتوں سے ثابت ہے۔[3]

---

[1] فتاوی تا تم باب تیمم۔ [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مدثر۔ [3] بخاری باب تالیف القرآن۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۔

پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس کے رب کی طرف سے اترا اور تمام مسلمان خدا پر خدا کے فرشتوں پر اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء کی آیت یہ ہے جس میں بالتفصیل بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہو چکے ان کے کیا عقائد ہونے چاہئیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِي نَزَّلَ عَلٰى رَسُولِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيٓ أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيدًا ۔ (نساء ع ۲۰)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

احادیث کتاب الایمان میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں لوگوں نے آپؐ سے اسلام اور ایمان کے معنی دریافت کئے ہیں اور آپ نے سائل کی یا وقت کی مناسبت سے مختلف جوابات دیئے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لڑوں جب تک لوگ یہ گواہی نہ دیں کہ خدا ایک ہے، محمدؐ خدا کا پیغمبر ہے نمازیں پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔

ایک دفعہ کسی دیہات سے ایک مسلمان حاضر خدمت ہوا اور دریافت کیا کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے تین چیزیں بتائیں، "رات دن میں پانچ وقت کی نماز، رمضان کے روزے اور زکوٰۃ" عبدالقیس کے وفد نے ۵ھ میں حاضر ہو کر عرض کی ہم دشمنوں کی مزاحمت کے سبب سے ہمیشہ نہیں حاضر ہو سکتے اس لئے ایسے احکام بتا دیئے جائیں جو ان لوگوں کو بھی سنا دیئے جائیں جو شرف حضوری حاصل نہیں کر سکتے، آپ نے فرمایا۔

شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله وإقام الصلوٰة وإيتاء الزكوٰة وصيام رمضان وأن تعطوا من المغنم الخمس ۔

اس بات کی شہادت کہ خدا ایک ہے محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ دینا۔

ایک دفعہ آپؐ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، اس اثناء میں ایک شخص نے آ کر سوال کیا، ایمان کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ایمان یہ ہے کہ خدا پر، فرشتوں پر، خدا کی ملاقات پر، اس کے پیغمبروں پر، اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر یقین ہو، اس نے پوچھا اور اسلام کیا ہے؟ فرمایا اسلام یہ ہے کہ صرف خدا کو پوجو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اس نے پھر دریافت کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یہ اصول اسلام کا تقریباً کامل نقشہ ہے، غالباً یہ سوال و جواب فتح مکہ یعنی ۸ھ سے پہلے کا واقعہ ہے، کیونکہ اس میں حج کا ذکر نہیں ہے تاہم اس قدر اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ تکمیل عبادت کے لئے خضوع و خشوع کی قید بھی اضافہ کی جا سکے، اصول اسلام کا آخری اعلان یہ ہے۔

بنی الاسلام علی الخمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان۔

اسلام کی بنا پانچ باتوں پر ہے، اس بات کی گواہی کہ خدا کے سوا کوئی اور خدا نہیں محمدؐ اس کا پیغمبر ہے، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، رمضان کے روزے رکھنا۔

رفتہ رفتہ ایمان اور اسلام کے اصول کلیہ کی جب تکمیل ہو چکی تو اس کے جزئیات اور دیگر لوازم کی بھی تعلیم دی گئی آپؐ نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں جن میں ایک شاخ حیا ہے، ایک دفعہ فرمایا کہ بہترین اسلام یہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے۔ ایک اور صاحب کے جواب میں فرمایا کہ بہترین اسلام یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ اور کسی سے جان پہچان ہو یا نہ ہو مگر اس کو سلام کرو۔ یہ بھی فرمایا کہ اس وقت تک تم مومن نہیں جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔[1]

غرض اسلام کے تمام اصول و فروع کی تعلیم اسی طرح تدریج تکمیل کو پہنچی گئی اور آخری ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کے روز وہ ساعت آئی جب خدا نے فرمایا۔[2]

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔

آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

عبادات

اوپر حدیث گزر چکی ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی، ان میں سے توحید و رسالت کے علاوہ بقیہ چار چیزیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ عبادت میں داخل ہیں، اس میں سب سے اول شے نماز ہے، نماز کی صحت کے لئے متعدد شرطیں ہیں، سب سے اول اور ضروری شرط طہارت ہے۔

طہارت طہارت کے معنی یہ ہیں کہ جسم اور لباس ظاہری اور معنوی ہر قسم کی نجاستوں سے پاک ہو، طہارت کو اسلام میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے کرو کہ دوسری ہی دفعہ کی وحی سے جب احکام اور فرائض کا آغاز ہوا تو توحید کے بعد دوسرا حکم طہارت ہی کا دیا گیا۔

يَاۤ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ۔ (مدثر)

اے چادر اوڑھنے والے اٹھ اور ڈرا اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر اور اپنے کپڑے پاک کر اور ناپاکی کو چھوڑ دے۔

اگرچہ مفسرین نے عموماً کپڑے کی طہارت سے دل کی طہارت اور ناپاکی سے بت پرستی مراد لی ہے، تاہم اس سے ظاہری طہارت اور پاکیزگی کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔ نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے اس فرضیت کا ثبوت ابتدائے اسلام سے ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ و سیر اور بعض روایات حدیث میں ہے کہ وضو کا طریقہ آغاز وحی ہی میں حضرت جبرئیلؑ نے آپؐ کو سکھایا تھا۔[3] حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ ہجرت سے پہلے بھی وضو فرماتے تھے۔[4] لیکن قرآن میں وضو کا حکم باتفاق محدثین مدینہ

---

[1] یہ تمام حدیثیں صحیح بخاری کتاب الایمان میں ہیں۔ [2] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور۔ [3] ابن ہشام و فتح الباری بحوالہ مغازی ابن لہیعہ و امام احمد جلد ۴ صفحہ ۱۶۱ و ابن ماجہ۔ [4] فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۲۰۰ و طبرانی فی الاوسط۔

يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ عَلِمَ أَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ عَلِمَ أَنْ سَيَكُوْنُ
مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔

ہی رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے اس لئے جان لیا کہ تم اس کو گن نہیں سکتے تم پر اس نے مہربانی کی اب جتنا ہوسکے اتنا ہی قرآن نماز میں پڑھو، اس نے جان لیا کہ تم میں بیمار بھی ہوں گے مسافر بھی ہوں گے جو خدا کی روزی ڈھونڈنے کو سفر کریں گے اور لوگ خدا کی راہ میں سفر جہاد کریں گے پس اب جتنا ہوسکے اتنا ہی پڑھو۔

رات کی اس نفل نماز کا نام تہجد ہے، نماز نفل کے تہجد ہو جانے کے بعد فجر، مغرب اور عشاء تین وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ
اللَّيْلِ (ہود-۱۰)

دن کے دونوں ابتدائی اور انتہائی کناروں میں (یعنی فجر و مغرب) اور رات تھوڑی گزرنے کے بعد نماز پڑھا کرو۔

معراج میں جو نبوت کے پانچویں سال ہوئی، پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں[1] اور سورۂ اسراء میں جو معراج کے بیان پر مشتمل ہے، یہ آیت اتری۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ
قُرْاٰنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۔
وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ۔

نماز کے اوقات زوال آفتاب سے لے کر ظلمت شب تک ہیں (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور صبح کی نماز کہ صبح کی نماز میں سب جمع ہوتے ہیں اور رات کو تہجد، یہ تیرے لئے مزید ہے۔

لیکن رکعتیں دو ہی رہیں، مدینہ منورہ میں آکر جب نسبتۃً کسی قدر اطمینان ہوا تو اس فرض نے وسعت حاصل کی اور دو کے بجائے چار رکعتیں فرض ہوگئیں[2]۔

باایں ہمہ نماز میں خضوع و خشوع اور تمکین و وقار کے جو ارکان ضروری ہیں ان کے لئے جس اطمینان کی ضرورت تھی وہ مدت تک نصیب نہیں ہوا، اس لئے فوراً وہ ارکان اور آداب لازمی نہیں قرار دیئے بلکہ رفتہ رفتہ ان کی تکمیل کی گئی پہلے لوگ نماز میں آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے، بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ما بال اقوام یرفعون البصر الی السماء فی صلوٰتہم۔

یہ کیسے لوگ ہیں کہ نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا کرتے ہیں۔

ایک مدت تک یہ حالت تھی کہ نماز پڑھتے میں کوئی کام یاد آجاتا تو کسی سے کہہ دیتے یا کوئی سلام کرتا تو نماز ہی میں جواب دیتے۔ پاس پاس کے آدمی نماز میں باہم باتیں کیا کرتے۔ جب مہاجرین حبش سنہ ھ واپس آکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشغول تھے معمول کے موافق لوگوں نے سلام کیا لیکن جواب نہیں ملا۔ نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خدا نے اب حکم دیا ہے کہ نماز میں باتیں نہ کرو" اس وقت سے بات چیت کرنا یا سلام کا جواب دینا بالکل منع ہوگیا۔

---

[1] ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے نویں سال میں ہوئی تھی۔ [2] فتح الباری مصری جلد ۱ صفحہ ۵ [3] صحیح بخاری باب الہجرت [4] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ۔ [5] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ۔

معاویہ بن حکم کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، ایک صاحب کو چھینک آئی، میں نے یرحمک اللہ کہا، لوگوں نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا، میں نے کہا، آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں؟ لوگوں نے زانو پر ہاتھ مارے، اس وقت میں سمجھا کہ بات کرنے سے روکنا چاہتے ہیں، میں چپ ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے فارغ ہو کر (خلق احمدی ہے مجھ کو نہ سزا دی نہ ڈانٹا نہ برا کہا) صرف یہ فرمایا کہ نماز تسبیح و تکبیر اور قرأت کا نام ہے، اس میں بات چیت جائز نہیں۔[1]

تشہد کا جو طریقہ اب ہے پہلے نہ تھا، مختلف اشخاص کے نام لے کر کہتے تھے، السلام علی فلاں و فلاں، بالآخر التحیات کے خاص الفاظ سکھائے گئے، جو اب نماز میں معمول بہا ہیں۔[2]

حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹے بچوں کو نماز میں کندھے پر چڑھا لیتے، سجدہ میں جاتے وقت اتار دیتے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے تو پھر چڑھا لیتے۔ حضرت عائشہؓ باہر سے آتیں اور دروازہ کھٹکھٹاتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے ہوئے عین اسی حالت میں جا کر دروازہ کھول دیتے،[3] ان حدیثوں کی بنا پر بہت سے فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ سب افعال نماز نفل میں جائز ہیں، نفل کی تخصیص اس لئے کہ جن نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال کئے وہ فرض نہ تھیں بلکہ نفل تھیں لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں، ایک حدیث میں صاف موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امامہ بنت ابو العاص کو کاندھے پر چڑھائے مسجد میں آئے اور نماز ادا کی،[4] ہمارے نزدیک یہ تمام روایتیں اسی زمانہ کی ہیں جب کہ نماز میں بات چیت اور اس قسم کی حرکات ممنوع نہیں قرار پائے تھے، رفتہ رفتہ نماز تکمیل کی اس حد کو پہنچی کہ وہ تمام تر خضوع و خشوع و مراقبہ و محویت بن گئی۔

قرآن مجید میں آیت اتری قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔ یعنی فلاح پانے والے مسلمان وہ مسلمان ہیں جو خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، اور اس بنا پر نماز میں ادھر ادھر دیکھنا یا کوئی حرکت خضوع و خشوع کے خلاف کرنا منع ہو گیا۔ نماز کے تمام ارکان کا نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ ادا کرنا لازمی قرار پایا، یہاں تک کہ ایک شخص نے آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نماز ادا کی اور تمام ارکان ٹھہر ٹھہر کر اچھی طرح ادا نہیں کئے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی جا کر پھر پڑھو، اس نے دوبارہ اسی طرح ادا کی آپ نے پھر فرمایا کہ نماز نہیں ہوئی، تیسری دفعہ اس نے پوچھا کہ کیونکر پڑھوں؟ آپ نے رکوع، سجدہ، قیام سب کی نسبت ہدایت کی کہ نہایت اطمینان کے ساتھ ادا کئے جائیں، چنانچہ صحیح بخاری وغیرہ[5] میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

غرض یا تو یہ حالت تھی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے، اتفاقاً شام سے تجارت کا قافلہ آیا، بارہ آدمیوں کے سوا جس قدر لوگ نماز میں شریک تھے، اٹھ کر قافلہ کی طرف دوڑے اس پر یہ آیت اتری۔[6]

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ اور جب لوگ تجارت یا کھیل تماشہ دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [2] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب التشہد [3] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب العمل فی الصلوٰۃ [4] ایضاً [5] صحیح بخاری باب امر النبی صلی اللہ علیہ وسلم من لا یتم الصلوٰۃ بالاعادۃ [6] صحیح بخاری کتاب البیوع تفسیر آیت مذکور

تَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ
وَمِنَ التِّجَارَةِ (جمعہ-۲)

پر گرتے ہیں اور تجھ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں کہہ دے کہ جو کچھ خدا کے ہاں ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے۔

اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تعلیم سے یہ حالت ہوئی کہ (ایک انصاری نماز کی حالت میں تین دفعہ تیر کا زخم کھاتے ہیں لیکن نماز نہیں توڑتے کہ جو سورہ انھوں نے شروع کیا تھا اس کی لذت معنوی اس درد زخم سے زیادہ تھی، اس سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عمر فاروقؓ نماز میں زخم کھا کر گرتے اور تڑپتے ہیں، یہ قیامت خیز منظر سب کے سامنے ہے، لیکن ایک شخص مڑ کر نہیں دیکھتا، کیونکہ خشیت الٰہی اور محویت کا عالم جو دلوں پر طاری ہے وہ اور کسی طرف متوجہ ہونے نہیں دیتا۔

نماز عیدین اور جمعہ

مکہ میں چار شخصوں کا یکجا ہو کر نماز ادا کرنا ناممکن تھا، اس لئے جمعہ کی نماز فرض نہ تھی کیونکہ جمعہ کی پہلی شرط جماعت ہے، لیکن مدینہ منورہ میں انصار کی ایک بڑی جماعت اسلام لا چکی تھی اور کوئی شخص ادائے نماز میں خلل انداز نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل جو مسلمان مدینہ آ چکے تھے، اسعدؓ بن زرارہ کی تحریک سے بنی بیاضہ کے محلہ میں انھوں نے جمعہ کی سب سے پہلی نماز ادا کی[1] مصعبؓ بن عمیر امام تھے اور کل چالیس مسلمان نمازی تھے، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو پہلے قبا میں قیام فرمایا، یہاں سے روانگی کے لئے آپ نے قصداً جمعہ کا دن متعین فرمایا، بنی سالم کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت آ گیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں ادا فرمائی، یہ اواخر ربیع الاول ۱ھ کا واقعہ[2] ہے۔ مدینہ سے باہر عرب کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی یکجا تعداد سب سے زیادہ جواثی میں تھا جو بحرین میں واقع تھا، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلے نماز جمعہ یہیں قائم ہوئی[3] لیکن بظاہر نماز جمعہ کا اہتمام مسلمانوں میں پہلے اتنا نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہیے، ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھا رہے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اتفاقاً شام سے غلہ کے بیوپاری آ گئے سب لوگ اٹھ کر چلے گئے، جماعت میں صرف بارہ آدمی اور دوسری روایت کی رو سے چالیس آدمی رہ گئے[4]۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ
الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ
فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً
اَوْ لَهْوَا ِۨانْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا قُلْ مَا عِنْدَ

ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لئے پکارا جائے تو یاد الٰہی کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو علم ہو، جب نماز سے فراغت ہو جائے تو زمین میں چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو اور خدا کو اکثر یاد کیا کرو تاکہ فلاح پاؤ، جب لوگ تجارت اور کھیل تماشہ دیکھ پاتے ہیں تو ٹوٹ کر اس پر گرتے ہیں اور تجھ کو اے پیغمبر کھڑا چھوڑ دیتے ہیں، کہہ دے کہ جو

---

[1] ابوداؤد و ابن ماجہ و دارقطنی کتاب الجمعہ مصنف عبدالرزاق و احمد و ابن خزیمہ بحوالہ فتح الباری [2] طبری صفحہ ۱۳۵۶ [3] صحیح بخاری باب الجمعہ [4] دارقطنی کتاب الجمعہ۔

اللّٰہِ خَیْرٌ مِّنَ اللَّھْوِ وَمِنَ التِّجَارَۃِ وَاللّٰہُ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ (جمعہ)

جو خدا کے پاس ہے وہ تجارت اور کھیل تماشہ سے بہتر ہے اور خدا بہتر روزی دینے والا ہے۔

اس کے بعد یہ حالت ہوگئی کہ نماز کے سامنے تمام دنیا کے دولت کا خزانہ بھی اُن کے آگے ہیچ ہوگیا، خدا نے اُن کی مدح فرمائی۔

رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (نور-۱)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

عید کی نماز بھی مدینہ ہی میں آکر قائم ہوئی لیکن جس سال آپ تشریف لائے اس سال عید کی نماز نہیں ہوئی بلکہ ۲ھ میں مسنون[1] ہوئی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ عید کی نماز، روزہ رمضان کے تابع ہے اور رمضان کے روزے دوسرے سال فرض ہوئے۔

صلوٰۃ خوف نماز کسی حالت میں قضا نہیں کی جاسکتی۔ خوف کی حالت میں مثلاً جنگ میں یہ حکم ہے کہ تمام فوج کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں، پہلے ایک جماعت ہتھیاروں سے مسلح ہو کر امام کے پیچھے کھڑی ہو اور نماز قصر ادا کرے پھر بہ ترتیب یہ آگے بڑھے اور دوسری جماعت جو دشمن کے مقابلہ میں تھی وہ پیچھے ہٹے اور وہ بھی قصر نماز ادا کرے، امام اپنی جگہ پر قیام کرے۔ روایتوں میں ہے کہ ہر جماعت دو دو رکعت امام کے ساتھ ادا کرے یا ایک ایک رکعت امام کے ساتھ اور دوسری رکعت علیحدہ علیحدہ پڑھے۔ یا صرف ایک ہی رکعت اس حالت میں فرض ہے۔ ابوداؤد نے صلوٰۃ الخوف کی تمام صورتیں بروایت صحابہ الگ الگ لکھ دی ہیں، ہمارے نزدیک ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ جنگ کی حالت پر موقوف ہے، امام جس وقت جو مناسب سمجھے کرلے۔ اگر لڑائی پورے زور اور شدت پر ہو تو ہر سپاہی اپنی اپنی جگہ پر اشارات سے نماز ادا کرے گا، سورۂ نساء میں صلوٰۃ الخوف کی صورت بہ تفصیل مذکور ہے۔ صلوٰۃ الخوف کا حکم غزوہ ذات الرقاع ۵ھ میں نازل ہوا، اسی غزوہ کا نام بعض راویوں نے غزوہ نجد بتایا ہے، ابوداؤد میں ابوعباس زرقی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر مقام عسفان میں نازل ہوئی یعنی ۶ھ میں لیکن زیادہ تر رواۃ حدیث اور اہل سیر غزوہ ذات الرقاع کو اس حکم کا زمانہ سمجھتے ہیں۔[3]

روزہ اسلام سے پہلے قریش عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے (اُس دن خانہ کعبہ پر غلاف چڑھایا جاتا تھا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُس دن روزہ رکھتے تھے اور عجب نہیں کہ آپ کی تبعیت میں دوسرے صحابہ بھی روزے رکھتے ہوں، ۵ نبوی میں یعنی ہجرت سے آٹھ برس پہلے حضرت جعفرؓ نے حبش کے نجاشی کے سامنے اسلام پر جو تقریر کی تھی اس میں روزہ کا ذکر بھی موجود ہے، وہ غالباً اسی دن کا روزہ ہوگا) اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود بھی اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے وجہ پوچھی، لوگوں نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰؑ نے اسی روز فرعون کے ہاتھ سے نجات پائی تھی، آپ نے فرمایا، تو ہم کو موسیٰ کی تقلید کا زیادہ حق ہے۔ چنانچہ آپ نے (یہاں بھی) عاشورہ کا روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی رکھنے کا حکم دیا، پھر ۲ھ میں رمضان کے روزے

---

[1] طبری ص ۱۴۰۱ [2] ابوداؤد ج ۱ [3] دیکھو کتب احادیث صلوٰۃ الخوف اور طبری ج ۳ ص ۱۴۵۴ ابن سعد جزء ۲ ص ۴۳ [5] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۱ و معجم کبیر طبرانی)

فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ مستحب ہو گیا، یعنی جس کا جی چاہتا تھا رکھتا تھا اور جو نہیں چاہتا تھا نہیں رکھتا تھا لیکن آپ نے بنفسِ نفیس اس دن کا روزہ برابر رکھا۔ ۱۰ھ میں لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہود تو اس دن کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ فرمایا آئندہ سال ۱۰ کے بجائے ۹ کو روزہ رکھوں گا، لیکن افسوس کہ آپؐ نے اسی سال وفات پائی۔

یہود اس طرح روزہ رکھتے تھے کہ نمازِ عشاء کے بعد پھر نہیں کھاتے تھے اور اس کو حرام سمجھتے تھے، عورت کے ساتھ ہم بستری بھی منع تھی، ابتدائے اسلام میں مسلمان بھی اسی طریقہ کے موافق مامور ہوئے۔ اسلام کے تمام احکام میں سب سے مقدم یہ اصول ملحوظ رہتے تھے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ)	خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔
لا صرورة في الاسلام (ابو داؤد، احمد)	اسلام میں جوگی پن نہیں ہے۔

اسی بنا پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلٰى نِسَآئِكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ۔ ۲۳)	روزے کی راتوں میں تمہارے لئے عورتوں سے لطف اٹھانا حلال کر دیا گیا ہے، جب تک صبح کی سپید لکیر (رات کی) سیاہ لکیر سے الگ نہ ہو جائے تم کھاتے پیتے رہو۔

اہل عرب روزہ کے بہت کم خوگر تھے، اوّل اوّل روزہ اُن پر شاق ہوا، اس لئے نہایت تدریج کے ساتھ روزہ کی تکمیل کی گئی، اوّل اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو سال میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا، پھر روزے کی فرضیت نازل ہوئی تو یہ اختیار رہا کہ جو شخص چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے روزہ کے بدلے ایک غریب کو کھانا کھلا دے، رفتہ رفتہ جب لوگ روزے کے خوگر ہو چلے تو یہ آیت اتری۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔	جو رمضان کا مہینہ پائے وہ ضرور روزہ رکھے۔

اب بالیقین روزہ فرض ہو گیا اور فدیہ کی اجازت جاتی رہی، البتہ جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو اس کیلئے یہ حکم ہوا کہ اس وقت روزہ چھوڑ دے اور ان کے بدلے کسی اور وقت قضا کر دے۔ چونکہ اور تمام قوموں میں خصوصاً عیسائیوں میں رہبانیت بڑی فضیلت کی بات سمجھی جاتی تھی، اس لئے جو لوگ زیادہ خدا پرست تھے وہ روزے میں زیادہ سختی برداشت کرتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً اس سے روکتے رہتے تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے اور اس پر لوگوں نے سایہ کر رکھا ہے سبب پوچھا، معلوم ہوا کہ گرمی میں اس شخص نے روزہ رکھا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کچھ ثواب کی بات نہیں، بعض لوگوں نے صوم وصال رکھنا چاہا، یعنی رات دن روزہ رکھیں، بیچ میں افطار نہ کریں، آپؐ نے اس سے منع فرمایا۔

روزہ کا مقصد عام طور پر صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ثواب کی بات ہے اس

---

[۱] ابوداؤد کتاب الصوم [۲] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ابوداؤد کتاب الصوم میں بتفصیل مذکور ہیں [۳] ابوداؤد کتاب الصوم باب مبدأ فرض الصیام واسباب النزول سیوطی [۴] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب کیف الاذان [۵] صحیح بخاری کتاب الصوم۔

لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر طرح کی آسانیوں کا حکم دیا، سفر میں اور بیماری میں روزہ رکھنا فرض نہ تھا، راتوں کو صبح صادق تک کھانے پینے اور تمام اشغال کی اجازت تھی، سحر کھانے کی فضیلت بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ صبح کے قریب کھائی جائے تاکہ دن بھر قوت باقی رہے۔

روزہ کا مقصد صرف معاصی سے کفِ نفس تھا اور روزہ اس کا معین تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص روزہ میں جھوٹ فریب نہیں چھوڑتا، خدا کو اس کی فاقہ کشی کی کوئی حاجت نہیں۔

زکوٰۃ

خیرات اور زکوٰۃ کی ترغیب اور تحریص اسلام میں ابتداء ہی سے معمول بہ تھی، مکہ میں جو سورتیں اتریں ان میں زکوٰۃ کا لفظ تصریحاً مذکور ہے اور خیرات نہ دینے والے پر عتاب ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (ماعون)

تم نے اس شخص کو دیکھا جو قیامت کو جھٹلاتا ہے یہی شخص وہ ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی لوگوں کو ترغیب نہیں کرتا۔

مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں، ۲ھ میں عید کے دن صدقہ فطر دینا واجب قرار پایا، ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے، حدیثوں میں صحابہ کے فقر و تنگدستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں اسی زمانہ کے ہیں، اس بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیے ورنہ عذاب ہوگا، چنانچہ خاص آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (توبہ)

جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں خیرات نہیں کرتے۔

اس آیت کا بھی یہی مطلب ہے۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (بقرہ)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات دیں کہہ دو کہ جو کچھ مصارف ضروری سے بچ رہے۔

بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے، بے کار یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے، اس پر حکم ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ (بقرہ)

مسلمانو اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا اچھا حصہ خیرات کرو۔

مزید تاکید کے لئے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دے گا اس کو ثواب نہ ملے گا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ (آل عمران)

تم لوگ ثواب نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ چیز خیرات نہ کرو جو تم کو عزیز ہو۔

اب صدقہ اور خیرات کی طرف یہ عام رغبت پیدا ہوئی کہ جو لوگ نادار تھے وہ صرف اس لئے بازار میں جا کر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] طبری مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۲ [3] صحیح بخاری مقولہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔

مزدوری کرتے اور کندھوں پر بوجھ لاد کر لوگوں کے پاس پہنچاتے تھے کہ مزدوری ملے تو خیرات کریں[1]۔

بایں ہمہ ۸ھ تک زکوٰۃ فرض نہیں ہوئی، فتح مکہ کے بعد اس کی فرضیت ہوئی تو اس کے مصارف بیان کئے گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام ممالک مقبوضہ میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے محرم ۹ھ میں محصلین مقرر کئے[2]۔ زکوٰۃ کے مصارف حسب ذیل تھے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (توبہ)	زکوٰۃ ان مصارف کے لئے ہے فقراء و مساکین زکوٰۃ کے وصول کرنے والے، مؤلفۃ القلوب غلام جن کو آزاد کرانا ہے مقروض، مسافر اور خدا کی راہ میں یہ خدا کا فرض ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔

زکوٰۃ کی شرح نہایت تفصیل سے فرامین نبوی میں منقول ہے، فقہ میں کتاب الزکوٰۃ ان ہی فرامین سے ماخوذ ہے۔

حج

دنیا میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا پرستی کے لئے عبادت گاہ عام بنایا اور تمام دنیا کو وہاں آکر عبادت کرنے کی دعوت دی۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ (حج)	اور جب کہ ہم نے ابراہیم کے لئے کعبہ کی جگہ مقرر کردی کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ہمارے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع اور سجود کرنیوالوں کیلئے پاک و صاف رکھ اور حج کی منادی کردے تو لوگ ہر طرف سے دوڑے آئیں گے کچھ پیدل اور کچھ اونٹنیوں پر سوار تاکہ فائدہ اٹھائیں اور تاکہ ایام مقررہ میں خدا کا ذکر کریں۔

حضرت ابراہیم کی دعوت عام پر دنیا نے لبیک کہا اور ہر سال عرب کے دور دراز اطراف سے لوگ حج کو آتے تھے لیکن ایک طرف تو یہ افسوسناک انقلاب ہوا کہ جو گھر خالص توحید کے لئے تعمیر ہوا تھا وہ تین سو ساٹھ بتوں کا تماشا گاہ بن گیا، دوسری طرف اس گھر کی تولیت کا سب سے زیادہ جس کو حق تھا وہ یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوا اور پورے آٹھ برس تک ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ بالآخر ظہور حق کا وقت آیا، مکہ فتح ہوا اور جانشین ابراہیم اور ان کے متبعین کو موقع ملا کہ شعار ابراہیمی کو پھر زندہ کیا جائے چنانچہ ۹ھ میں حج فرض ہوا[3]، تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سال یہ فرض ادا نہیں کیا، عرب ننگے ہو کر طواف کعبہ کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بے حیائی کا منظر آنکھ سے دیکھنا گوارا نہیں فرما سکتے تھے، اس لئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ ایام حج میں روانہ کئے گئے کہ کعبہ میں جا کر منادی کردیں کہ آئندہ سے کوئی شخص عریاں ہو کر کعبہ کا طواف نہ کرنے پائے گا[4]۔

ایک اور وجہ یہ تھی کہ نسی کے قاعدہ سے حج کا مہینہ ہٹتے ہٹتے ذوقعدہ میں آگیا تھا، چنانچہ ۹ھ کا حج اسی مہینہ میں ادا ہوا تھا، لیکن حج کا اصلی مہینہ ذوالحجہ تھا، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سال کا انتظار

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ [2] طبری مطبوعہ یورپ جلد ۳ صفحہ ۱۷۲۲ (ابن سعد جزء مغازی صفحہ ۱۱۵) [3] زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۲۱۰ [4] صحیح مسلم کتاب الحج باب لا یحج البیت مشرک ولا یطوف بالبیت عریان۔

فرمایا اور اس وقت حج ادا کیا جب وہ اپنے اصلی مرکز پر آگیا۔[1]

حج کی اصلاحات

حج کی رسم اگرچہ کفار نے قائم کر رکھی تھی، لیکن اس کی صورت بالکل بدل دی تھی اور اس میں اس قدر بدعات اضافہ کر دیئے تھے کہ ثواب کے بجائے عذاب کا کام بن گیا تھا۔ سب سے مقدم یہ کہ حج اور تمام عبادات کا مقصد خدا کا ذکر اور توجہ الی اللہ ہے۔ لیکن اہل عرب حج میں جمع ہوتے تھے تو خدا کے بجائے اپنے باپ دادا کے مفاخر اور کارنامے بیان کرتے تھے، اسی بنا پر یہ آیت اتری۔

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ	پھر جب حج کے ارکان پورے کر لو تو خدا کا ذکر کرو جس طرح
اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا (بقرہ)	اپنے باپ دادا کا کرتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر۔

خاص اہل مدینہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ مناۃ جو بت تھا اس کا طواف کرتے تھے اور اس بنا پر جب کعبہ کا حج کرتے تھے تب بھی صفا و مروہ کا طواف نہیں کرتے تھے حالانکہ حج کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم کی یادگاریں قائم رکھی جائیں اور صفا و مروہ کا طواف اسی عہد کی یادگار ہے، اسی بنا پر یہ آیت اتری۔[2]

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ	صفا اور مروہ خدا کی یادگاریں ہیں اس لئے جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس
اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا (بقرہ-۱۹)	کو دونوں مقاموں کا بھی طواف کرنا چاہیے۔[3]

ایک طریقہ یہ رائج ہو گیا تھا کہ اکثر لوگ (آج کل کی طرح) جن کے پاس زادِ سفر نہیں ہوتا تھا یونہی چل کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں، ان لوگوں کو اکثر راہ میں گداگری اور دوستوں کی دست گیری کا محتاج ہونا پڑتا تھا اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی (بقرہ)	اور گھر سے زادِ سفر لے کر چلو، کیونکہ اچھا زادِ سفر تقویٰ ہے۔[4]

احرام حج میں سر کے بالوں کا منڈوانا یا ترشوانا منع ہے، لیکن اس میں اہل جاہلیت نے بہت سختی کر دی تھی، یہاں تک کہ بعض صاحبوں کے بالوں میں اس قدر جوئیں پڑ گئیں کہ بینائی جلتے رہنے کا خوف ہو گیا، تاہم وہ بال نہ ترشوا سکے۔ اسلام میں چونکہ سب سے مقدم یہ امر پیشِ نظر ہے کہ اس کی عبادات اور احکام تکلیف مالایطاق نہ بن جائیں اس لئے یہ حکم ہوا۔

فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ اَذًی مِّنْ رَّاْسِہٖ	تو جو شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ عارضہ ہو تو وہ (اگر بال منڈائے)
فَفِدْیَۃٌ مِّنْ صِیَامٍ اَوْ صَدَقَۃٍ اَوْ نُسُکٍ۔	تو فدیہ ادا کر دے یعنی روزہ یا خیرات یا قربانی۔

قربانی جو کرتے تھے، اُس کا خون لے کر کعبہ کے در و دیوار پر ملتے تھے اور اس کو ثواب سمجھتے تھے، اس پر

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ الفاظ فرمائے تھے۔ الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السموات والارض اثنا عشر شہرا منہا اربعۃ حرم ثلث متوالیات ذوالقعدۃ وذوالحجۃ والمحرم ورجب مضر الذی بین جمادی وشعبان۔ اس سے اسی طرف اشارہ تھا۔

[2] اسباب النزول للواحدی۔

[3] قرآن مجید میں جناح کا لفظ ہے اس کا عام ترجمہ "حرج" یا نقصان ہے، اس بنا پر ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کچھ حرج نہیں، لیکن لاجناح کا لفظ واجب اور مستحب کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

[4] بخاری کتاب الحج باب تزودوا فان خیر الزاد التقوی۔

یہ آیت نازل ہوئی[1]

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (حج)	خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہاری پرہیزگاری اس تک پہنچتی ہے۔

اس آیت میں صرف اس فعل سے نہیں روکا گیا بلکہ یہ بھی بتادیا گیا کہ قربانی کوئی مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ اصل چیز جس کو خدا قبول کرتا ہے وہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

رسوم حج میں ایک بڑی چیز جو قریش نے اصولِ اسلام کے خلاف قائم کردی تھی یہ تھی کہ وہ عرفات جو حج کا اصلی عبادت گاہ عام تھا نہیں جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہل حرم ہیں، ہم حدودِ حرم سے نہیں جاسکتے۔ یہ ہمارے خاندان کی توہین ہے، اس لئے وہ صرف مزدلفہ تک جاکر ٹھہر جاتے تھے۔ باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے تھے اور وہاں سے چل کر مزدلفہ اور منیٰ میں آتے تھے چونکہ اسلام کا اصول اصلی مساواتِ عام ہے اور عبادات میں سب یکساں ہیں اس لئے حکم آیا کہ

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْکُرُوْہُ کَمَا ھَدٰکُمْ وَاِنْ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (بقرہ)	پھر جب عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس خدا کا ذکر کرو جس طریقہ سے اس نے تم کو ہدایت کی ہے اور اس سے پہلے بے شک تم گمراہ تھے پھر وہیں سے چلو جہاں سے اور لوگ چلتے ہیں اور خدا سے معافی مانگو وہ غفور اور رحیم ہے۔

قربانی کے جانور کو چونکہ سمجھتے تھے کہ خدا پر چڑھا دیا گیا ہے اس لئے اس پر سوار نہیں ہوتے تھے اور پیدل چلنے کی تکلیف گوارا کرتے تھے۔ یہ رسم اسلام کے آنے تک قائم رہی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو سفرِ حج میں دیکھا کہ قربانی کے اونٹ کے ساتھ ہیں لیکن خود پیدل جارہے تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ "سوار ہو لو" بولے "یہ قربانی کے اونٹ ہیں"۔ آپ نے دوبارہ فرمایا، انہوں نے دوبارہ وہی عذر کیا، آپ نے زجر کے ساتھ حکم دیا کہ "بیٹھ لو"[2]

ایک قسم کا حج ایجاد کرلیا تھا جس کو حج مصمت کہتے تھے، یعنی جو شخص حج کرتا تھا وہ آغاز حج سے اخیر تک منہ سے کچھ بولتا نہ تھا، اسلام نے اس تکلیف مالایطاق سے منع کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے احمس کی ایک عورت کو جس کا نام زینب تھا، دیکھا کہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حج مصمت کی نیت کی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ یہ جائز نہیں، یہ زمانہ جاہلیت کی بات ہے[3]۔

سب سے بڑی بے حیائی کی بات یہ تھی کہ قریش (حمس) کے سوا عام عرب مرد و زن کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے حدودِ حرم میں آکر تمام لوگ اپنے اپنے کپڑے اتار ڈالتے تھے اور عاریۃً کسی قریش سے کپڑے مانگ لیتے تھے اگر نہ ملتے تو ننگے کعبہ کے گرد گھومتے تھے، عورتیں بھی اسی طرح ننگی طواف کرتی تھیں اور یہ شعر گاتی جاتی تھیں،

---

[1] تفسیر بیضاوی (یہ رسم یہودیوں سے آئی تھی) لاویین ۱-۷، تاریخ دوم ۲۹-۲۲ [2] صحیح بخاری جلد ۱ کتاب الحج ص ۲۲۶ [3] بخاری کتاب الحج [4] بخاری جلد ۱ ص ۵۲۱۔

الیوم یبدو بعضہ اَوْ کُلُّہٗ ۔ وما بدا منہ فلا احلہ
آج کچھ حصہ اس کا یا پورا کھلے گا اور جو کھلا ہے اس کو میں حلال نہیں کرتی

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰبَنِیْ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف) اے آدم کے بیٹو! مسجدوں میں کپڑے پہن لیا کرو۔

(اس بنا پر ۹ھ[1] میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو بھیجا، انہوں نے عین موسم حج میں اعلان کیا کہ آئندہ کوئی برہنہ حج نہ کرنے پائے گا)

معاملات

شریعت کی تکمیل میں جو تدریج ملحوظ رہی اس کے لحاظ سے وراثت، نکاح وطلاق، قصاص وتعزیرات (وغیرہ) کے احکام بعثت سے بہت بعد آئے، سبب یہ ہے کہ ان احکام کے اجراء کے لیے ایک نافذ الامر قوت کی ضرورت تھی جو اب تک اسلام کو حاصل نہیں ہوئی تھی، غزوۂ بدر کے بعد سے اسلام کی سیاسی طاقت کا نشو ونما شروع ہوا، ہجرت کے پہلے اور دوسرے سال میں جو احکام نازل ہوئے وہ تحویل قبلہ، فرضیت روزہ، زکوٰۃ فطر، نماز عید اور قربانی تھی تیسرے سال سے جب اسلام کے کاروبار زیادہ پھیلنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے توریث کا قانون قرآن مجید میں نازل ہوا۔

وراثت (مسلمان جب ابتداءً مدینہ آئے ہیں تو اُس وقت یہ حالت تھی کہ باپ مسلمان ہے تو بیٹا کافر ہے، ایک بھائی کافر ہے تو دوسرا بھائی مسلمان ہے، اس حالت میں اقرباء اور اعزہ کی وراثت کا قانون کیونکر نافذ ہوسکتا تھا؟ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخاۃ (برادری) قائم کردی جس کی رُو سے یہ قاعدہ مقرر ہوگیا کہ کوئی انصاری مرتا تو اس کی وراثت مہاجرین کو ملتی، عرب میں پہلے بھی دستور تھا کہ دو آدمی آپس میں عہد کرلیتے کہ ہم دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، ان میں سے جب کوئی مرتا تو دوسرا وارث ہوتا لیکن ۳ھ میں قرآن کی اس آیت نے اس قاعدہ کو منسوخ کردیا)[2]

اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُھُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ (انفال) قرابت مند ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔

اس کی رو سے مواخاۃ کی بنا پر وراثت موقوف ہوگئی اور خاندان اور ذوی الارحام میں وراثت محدود ہوگئی

(آیت توریث کے نزول سے پہلے قرآن نے وصیت کا قاعدہ جاری کیا تھا یعنی مرنے والا اپنے مال وجائیداد کی نسبت یہ وصیت کرجاتا کہ اس میں سے اتنا اس کو دیا جائے اور اتنا اس کو ملے، مرنے کے بعد اسی طریقے سے اس کی جائیداد تقسیم کردی جاتی، مرنے سے پہلے ہر مسلمان پر اس وصیت کا مکمل کرجانا فرض تھا۔

---

[1] یہ پورا واقعہ اور شان نزول نسائی کتاب مناسک الحج میں ہے، صحیح مسلم وصحیح بخاری اور تمام حدیث کی کتابوں میں باب مایطوف بالبیت عریاناً میں مذکور ہے۔

[2] یہ مفسرین کا بیان ہے لیکن صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ حکم حسب ذیل آیت کریمہ سے منسوخ ہوا۔ ولکلٍ جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاٰتوھم نصیبھم (النساء) دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت مذکورہ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (بقرہ)	مسلمانو تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وہ کچھ مال چھوڑنے والا ہو تو ماں باپ اور رشتہ داروں کیلئے بطریق مناسب وصیت کر جائے، متقی لوگوں پر یہ فرض ہے۔

جو لوگ حالتِ مسافرت میں جاتے اُن کے لئے گواہی اور شہادت کا قانون قرآن میں مقرر کیا گیا۔ گواہی کو چھپانا یا بدل دینا قانوناً جرم تھا، چنانچہ سورۂ بقرہ اور مائدہ میں اس کی پوری تفصیل ہے۔ غزوۂ بدر کے بعد مسلمانوں کی تعداد میں کافی ترقی ہوتی گئی، خاندان کے خاندان مسلمان ہو گئے، اس لئے وراثت کے مخصوص قانون کی ضرورت ہوئی۔ پھر وصیت کے قاعدہ میں بڑی دقت یہ تھی کہ ناگہانی موت کے موقع پر تقسیم جائیداد کا کوئی اصول جاری کرنا ممکن نہ تھا، مثلاً جہاد میں سینکڑوں مسلمان شریک ہوتے، اب کس کو معلوم ہے کس کو شہادت ہوگی اس حالت میں وصیت نہ کر جانے سے رشتہ داروں میں جس کا قابو چل جاتا وہ جائیداد پر قبضہ کر لیتا، چنانچہ غزوۂ احد میں یہی موقع پیش آیا، سعدؓ بن الربیع جو بہت دولت مند صحابی تھے اس جنگ میں شہید ہوئے، اُن کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں کہ سعد آپؐ کی خدمت میں شہید ہوئے، انھوں نے دو لڑکیاں چھوڑی ہیں لیکن سعد کے بھائی نے سعد کی ساری جائیداد پر قبضہ کر لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا فیصلہ کرے گا" پھر غالباً ۳ھ میں یہ آیت نازل ہوئی[1]، جس میں وراثت کے تمام احکام مذکور ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۔ الخ	خدا تم کو تمہاری اولاد کی نسبت حکم دیتا ہے کہ لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے (آخر تک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد کے بھائی کو بُلا کر فرمایا کہ سعد کے متروکہ میں سے دو تہائی ان کی بیٹیوں اور آٹھواں حصہ اُن کی بیوی کو دو، اس کے بعد جو بچ رہے وہ تمہارا حق ہے۔

اہلِ عرب عورتوں کو وراثت سے محروم رکھتے تھے کہ وراثت اس کا حق ہے جو تلوار چلاتے۔ دنیا کی اور اکثر قوموں میں بھی یہی دستور تھا، یہ پہلا دن ہے کہ اس صنفِ ضعیف کی دادرسی کی گئی۔

وصیت احکامِ وراثت کے بعد بھی وصیت کی اجازت باقی رہی، لیکن چونکہ اس سے مستحقینِ وراثت کی حق تلفی کا اندیشہ تھا اس لئے وصیت کی تحدید کی ضرورت تھی۔ ۱۰ھ میں حضرت سعدؓ عامر کے والد بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی عیادت کو گئے۔ انھوں نے عرض کی کہ میں مر رہا ہوں اور میرے صرف ایک ہی لڑکی ہے

---

[1] آیتِ میراث کی شانِ نزول میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں، اول یہ کہ حضرت جابرؓ ۸ھ میں بیمار پڑے تو آیت اتری، یہ روایت تمام صحاح ستہ میں ہے لیکن درحقیقت اس روایت میں راویوں سے کسی قدر مسامحت ہوئی ہے کیونکہ وراثت ۸ھ سے پہلے جاری ہو چکی تھی اور دوسری یہ کہ حضرت جابرؓ اس وقت تک لاولد تھے، اس لئے صحیح یہ ہے کہ حضرت جابرؓ کا واقعہ وراثت کی ایک خاص صورت لاولدیت یعنی کلالہ سے متعلق ہے جیسا کہ مسلم کی دوسری روایتوں میں (کتاب الفرائض) اس کی تصریح ہے۔ دوسرا شانِ نزول یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت حسانؓ کے بھائی عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد انکی بیوی ام کجہ کی فریاد پر یہ آیت اتری، یہ روایت طبری وغیرہ کی ہے جو گو ضعیف ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیعؓ کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں، تیسرا شانِ نزول یہی سعد بن ربیعؓ کا واقعہ ہے جو ابوداؤد، ترمذی، حاکم در مستدرک میں مذکور ہے۔

چاہتا ہوں کہ صرف دو تہائی مال خیرات کر دوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، انھوں نے کہا نصف، آپ نے اس کو بھی قبول نہیں کیا، انھوں نے کہا ایک تہائی، آپ نے فرمایا یہ بھی بہت ہے، وارثوں کو غنی چھوڑ کر جانا اس سے اچھا ہے کہ وہ بھیک مانگتے پھریں، تاہم یہ مقدار آپ نے جائز رکھی، اس وقت سے وصیت ایک ثلث سے زیادہ ممنوع ہو گئی۔

وقف وقف شریعت کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اسلام نے اس مسئلہ کو جس حد تک صاف کیا اس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں، اسی بنا پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلام طریقہ وقف کا موجد ہے۔ اسلام میں وقف کی تاریخ نہایت قدیم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے پہلے ہی سال مدینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد جس زمین میں رکھی تھی وہ دو یتیموں کی ملکیت تھی، آپ نے قیمت دینی چاہی لیکن انھوں نے کہا۔

لا واللہ لا نطلب ثمنہ الا الی اللہ۔ نہیں ہم خدا کی قسم قیمت نہ لیں گے، ہم اس کی قیمت خدا ہی سے لیں گے[۱]

یہ اسلام کا پہلا وقف تھا اور نہایت سادہ صورت میں تھا، چنانچہ امام بخاری اس حدیث کو وقف مشاع (مشترکہ جائیداد) کا وقف کے ثبوت میں لاتے ہیں، اس کے بعد ۳ھ یا ۴ھ میں جب یہ آیت نازل ہوئی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ تم نیکی اس وقت تک نہیں پا سکتے جب تک وہ خدا کی راہ میں نہ دے دو جو تم کو سب سے محبوب ہے۔

تو ابو طلحہ صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی یا رسول اللہ بیرحا مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، میں اس کو خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اس کا ثواب اور اجر خدا سے چاہتا ہوں۔ آپ جس مصرف میں چاہیں اس کو رکھیں، چنانچہ آپ کے مشورہ سے انھوں نے اس کا منافع اپنے اعزہ پر وقف کیا۔

اب تک وقف کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ صرف یہ تھے کہ وہ ذاتی تصرف سے نکال کر خدا کی ملکیت میں دیا گیا لیکن ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد اس کی حقیقت بالکل واضح کر دی گئی، خیبر میں حضرت عمرؓ کو ایک زمین ملی تھی، حضرت عمرؓ نے اس کو وقف کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا،

ان شئت حبست اصلہا وتصدق بہا۔ اگر چاہو اصل جائیداد باقی رکھو اور منافع صدقہ کرو۔

چنانچہ ان شرائط کے ساتھ وہ جائیداد وقف ہوئی[۳]

انہ لا یباع اصلہا ولا یوہب ولا یورث۔ اصل جائیداد نہ بیچی جائے نہ ہبہ کی جائے اور نہ وراثت میں بانٹی جائے۔

نکاح وطلاق نکاح کے متعلق جو اصلاحی احکام آئے ان کی تفصیلات اصلاحات کے عنوان کے نیچے آئے گی، یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں کئی قسم کے نکاح کے طریقے جاری تھے جن میں سے ایک کے سوا سب زنا کے مشابہ تھے۔ سب سے پہلے اسلام نے ان کو ناجائز ٹھہرایا۔ متعہ[۴] جو زمانۂ جاہلیت سے چلا آتا تھا، بار بار حرام اور حلال ہوتا رہا، یہاں تک کہ ۷ھ غزوۂ خیبر میں قطعاً حرام ہو گیا، اگرچہ اس پر بھی اس کی ضرورت پیش آئی کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں منبر پر کہا کہ میں متعہ کو حرام کرتا ہوں یعنی متعہ کی حرمت جو اچھی طرح اب بھی ملک میں شائع نہ ہو سکی میں آج اس کا اعلان کرتا ہوں۔

نکاح اور طلاق کے دیگر احکام مثلاً محرمات شرعی کا بیان، منہ بولے بیٹے کی بیوی کا حرام نہ ہونا، کثرت ازدواج

---

[۱] بخاری جلد ا کتاب الوصایا۔ [۲] ایک زمین کا نام ہے جو مدینہ میں واقع تھی۔ [۳] یہ تمام حدیثیں بخاری باب الوقف میں ہیں۔ [۴] محدود الوقت نکاح۔

کی تحدید، تعداد طلاق کی تعیین، زمانہ عدت کا بیان، مہر کا ضروری ہونا، ظہار یعنی ایک طریقہ طلاق جس میں اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دیتے تھے اور لعان یعنی شوہر کا اپنی بیوی کی عصمت پر شبہ کرنا اور باہم اپنی سچائی اور دوسرے کی دروغ گوئی کا دعویٰ کرنا، یہ تمام تفصیلیں اصلاحات کے تحت میں آئیں گی، یہاں صرف اس قدر بتا دینا کافی ہے کہ یہ تمام احکام قرآن مجید میں مذکور ہیں اور ان کے نزول کا زمانہ ۵ھ اور ۶ھ ہے۔

حدود و تعزیرات

دنیا کے مادی خزانہ میں انسان کی جان سے زیادہ کوئی قیمتی شے نہیں۔ حدود اور تعزیرات کے اکثر قوانین ہجرت کے چند برس بعد نازل ہوئے لیکن انسان کی جان کی حرمت کا حکم مکہ ہی میں اتر چکا تھا، معراج کے سلسلہ میں جو اخلاقی احکام بارگاہ الٰہی سے عطا ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا (بنی اسرائیل)

خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اس کو ناحق نہ مارو اور جو ناحق مارا جائے اس کے وارث کو ہم نے اختیار دیا ہے کہ وہ قصاص میں زیادتی نہ کرے، اس کی مدد کی جائے۔

عرب میں اسلام سے پہلے بھی قتل و قصاص کے کچھ قوانین موجود تھے، یہود جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، تورات کے حدود و تعزیرات کا مجموعہ ان کے پاس بھی موجود تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرب میں چونکہ منتظمانہ طاقت اور اخلاقی روح نہ تھی اس لئے وہ ان احکام کا نفاذ نہیں کر سکتے تھے، مدینہ پہنچنے کے ساتھ ہی یہود نے فصل مقدمات کے لئے بارگاہ نبوت کی طرف رجوع کیا، آپ ان کے مقدمات عموماً تورات کے احکام کے مطابق فیصل کر دیتے تھے۔

عرب میں ایک شخص کا قتل صدہا قبائل کی خانہ جنگی کا سلسلہ چھیڑ دیتا تھا اس لئے غزوۂ بدر کے بعد جب اسلام کے بازوؤں میں حاکمانہ زور آ چلا تھا، قصاص کا حکم نازل ہوا، یاد ہوگا کہ اطراف مدینہ میں بنو قریظہ اور بنو نضیر دو یہودی قبائل رہتے تھے۔ ان دونوں میں بنو نضیر معزز سمجھے جاتے تھے، اس لئے کوئی قرظی کسی نضیری کو مار ڈالتا تو اس کو بنو نضیر مار ڈالتے تھے اور اگر کسی نضیری کے ہاتھ سے کوئی قرظی قتل ہو جاتا تھا تو چھوہاروں کے سو وسق خون بہا دے دیتے۔ مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، لوگوں نے اس کا مرافعہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، اس پر سورۂ مائدہ کی چند آیتیں اتریں، ان میں سے ایک آیت یہ ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ

ہم نے ان کو توراۃ میں حکم دیا تھا کہ جان کے بدلے جان آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم۔

یہ حکم گو یہودیوں کے لئے تھا لیکن ایک اور آیت نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ۔[1]

مسلمانو! تم پر مقتولین میں مساوات اور برابری کا حکم دیا جاتا ہے۔

---

[1] اضافہ تا ختم باب حلال و حرام۔ ابوداؤد کتاب الدیات۔

اس حکم نے مساوات اور عدل کے پلے کو دنیا میں ہمیشہ کے لئے برابر کر دیا، یہودیوں میں خون بہا (دیت) کا قانون نہ تھا لیکن عرب میں یہ قانون تھا اور اسلام نے چند اصلاحات کے ساتھ اس کو باقی رکھا۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ (بقرہ)

اسکے بھائی (یعنی اولیائے مقتول) کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اس کی پابندی خوبی کیساتھ کرنا اور بطور احسن اسکو ادا کرنا چاہیئے

اب تک قتل عمد اور قتل شبہ (یعنی غلطی سے قتل) میں کوئی تفریق نہ تھی، سنہ ۶ھ میں ایک مسلمان غلطی سے ایک مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا اور ایک مسلمان انصاری کے ہاتھ سے ایک قریشی قتل ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے بھائی کو خون بہا دے کر راضی کر لیا، اس کے بعد وہ منافقانہ اسلام لایا اور غداری سے انصاری کو قتل کر کے قریش میں جا کر مل گیا، ان واقعات کی بنا پر قتل شبہ کے متعلق متعدد احکام نازل ہوئے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَى أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا۔

کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو مار ڈالے لیکن غلطی سے اگر کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کیا تو ایک مسلمان غلام آزاد اور خون بہا اس کے وارثوں کو ادا کرنا چاہیئے لیکن یہ کہ وہ معاف کریں تو خیر اگر مقتول خود مسلمان ہو اور وہ کسی دشمن قوم سے ہو تو صرف ایک غلام آزاد کر دو اور اگر ایسی قوم سے ہو جس سے تم نے معاہدہ کیا ہو تو خون بہا دینا اور ایک غلام آزاد کرنا چاہیئے۔ اگر قاتل کو یہ مقدور نہ ہو تو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں کہ خدا اس کی طرف رجوع ہو، خدا علم اور حکمت والا ہے اور جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا دوزخ ہے ہمیشہ اس میں رہے گا خدا اس پر اپنا غضب اور لعنت بھیجے گا اور اس کے لئے بڑا عذاب اس نے مہیا کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ قصاص و نسل کے متعلق یہ سب سے آخری حکم ہے، حفاظت جان کا اعلان فتح مکہ کے موقع پر ہوا، جب آپ نے ارشاد فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت کے تمام خون میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں اس کے بعد قتل خطا، مشابہ بہ قتل عمد کے خون بہا کی تحدید فرمائی۔ قتل خطا کا خون بہا اہل قریہ کے لئے ۴۰۰ دینار مقرر کیا۔

سنہ ۶ھ تک رہزنوں کے لئے کوئی حد مقرر نہ تھی، سنہ ۶ھ میں عکل و عرینہ کے قبیلے کے کچھ لوگ مدینہ آکر مسلمان ہوئے، یہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے باہر چراگاہ میں ان کو قیام کی اجازت دی، ایک موقع پر مسلمان چرواہوں کو طرح طرح سے عذاب دے کر بڑی بے رحمی سے مار ڈالا اور مویشی لوٹ کر لے گئے۔ وہ گرفتار ہو کر آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اسی طرح عذاب کے ساتھ قتل کا حکم دیا، گو یہ برابر کا انتقام تھا، تاہم اس میں کسی قدر بے رحمی تھی اس لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور ڈاکوؤں

---

۱ صحیح بخاری کتاب التفسیر آیۃ کتب علیکم القصاص ۲ ابو داؤد کتاب الدیات باب فی دیۃ الخطا شبہ العمد ۳ ابو داؤد دیات الاعضاء۔

کے لئے علیحدہ احکام نازل ہوتے تھے[1]

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (مائدہ)

ان لوگوں کی سزا جو خدا اور اس کے رسول سے لڑائی لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے قتل کئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے الگ کر دیئے جائیں یعنی قید ہوں یا جلاوطن کئے جائیں۔

جان کے بعد مال کا درجہ ہے، اسلام سے پہلے عرب میں چوروں کے لئے قطع ید کی سزا جاری تھی، اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے موقع پر قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت نے اس جرم کا ارتکاب کیا، چونکہ وہ ایک شریف خاندان سے تھی اس لئے مسلمانوں میں بڑا اضطراب پیدا ہوا، حضرت اسامہؓ بن زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت چہیتے تھے اُن سے سفارش کرائی گئی، آپ بہت برہم ہوتے اور لوگوں کو جمع کرکے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا یہی سبب ہوا کہ وہ نیچے طبقے کے لوگوں پر تو احکام جاری کرتے لیکن اوپر درجہ کے لوگ جب جرم کا ارتکاب کرتے تو ان سے درگزر کرتے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا، اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے بے چون وچرا اس حکم کی تعمیل کی۔[2]

عربوں میں زنا کی کوئی سزا مقرر نہ تھی، یہودیوں میں توراۃ کی رو سے زانی کی سزا "رجم" یعنی سنگسار کرنا مقرر تھی لیکن اخلاقی کمزوری کی بنا پر اس حکم کو جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ اطراف مدینہ میں جو یہود آباد تھے، رجم کے بجائے انھوں نے یہ سزا مقرر کی تھی کہ مجرم کے منہ میں کالک لگا کر کوچہ و بازار میں اس کی تشہیر کرتے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انھوں نے ایک مجرم کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ غالباً یہ ۴ھ کے اندر کا واقعہ ہے، آپ نے استفسار فرمایا کہ تمہاری شریعت میں اس جرم کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے اپنا رواج بتایا، آپ نے توراۃ منگوا کر اُن سے پڑھوایا، انھوں نے رجم کی آیت پر انگلی رکھ کر چھپا دی۔ آخر ایک مسلمان یہودی نے نکال کر وہ سنائی، آپ نے فرمایا "خداوندا یہ تیرا حکم ہے جس کو ان لوگوں نے مردہ کر دیا ہے، میں سب سے پہلا شخص ہوں جو تیرے اس حکم کو زندہ کروں گا" چنانچہ آپ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا اور وہ سنگسار کیا گیا۔[3]

۶ھ میں سورۂ نور نازل ہوئی جس میں زنا کی سزا سو دُرّے قرار دی گئی، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ رجم کی سزا بھی قرآن نے باقی رکھی تھی اس کی تلاوت منسوخ ہو گئی، بہرحال احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو دُرّے اور بیاہوں کے لئے رجم کا حکم ہے[4]، چنانچہ ۶ھ میں ایک مسلمان نے اس جرم کا ارتکاب کیا اور گو لوگوں کو اس کا علم نہ تھا لیکن دنیا کی سزا کو آخرت کے عذاب پر اس نے ترجیح دی۔ اور مجمع عام میں آکر بارگاہِ نبوت میں عرض پیرداز ہوا کہ یا رسول اللہ! میں گنہگار ہوں، مجھے پاک کیجئے۔ آپ نے تحقیق

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود باب المحاربۃ [2] صحیح بخاری غزوۃ الفتح [3] ابوداؤد باب فی رجم الیہودیین [4] صحیح بخاری رجم الحبلی [5] تمام کتب حدیث میں یہ مذکور ہے۔

فرمائی اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

شراب ۳ھ میں حرام ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شراب خوری کی کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی چالیس درے تک لوگوں کو اس جرم میں مارے گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اسی درے کر دیئے تھے۔

قذف یعنی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کی سزا ۵ھ میں نازل ہوئی۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا (نور)

جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں، پھر چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسی درے مارو اور پھر کبھی ان کی گواہی نہ قبول کرو۔

دنیا میں تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو۔ جن حدود اور تعزیرات کا اوپر ذکر ہوا وہ انہی تین چیزوں کے تحفظ کے لئے ہیں، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قوانین کے نزول کے بعد ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر حرم کے اندر ماہِ حرام کی تاریخوں میں فرمایا۔

"مسلمانو! ہر مسلمان کی جان، مال اور آبرو اسی طرح قابلِ حرمت ہے، جس طرح اس محترم شہر میں اس احاطہ حرم کے اندر یہ مقدس دن قابلِ حرمت ہے"۔

حلال وحرام

ماکولات میں حلال وحرام

عرب میں کھانے پینے میں کسی چیز کا پرہیز نہ تھا اور نہ کوئی شے حلال یا حرام تھی، مردار اور حشرات الارض تک کھاتے تھے۔ البتہ بعض بعض جانور جن کو بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے، ان کو ذبح کرنا گناہ سمجھتے تھے، بعض جانوروں میں یہ نذر مانتے تھے کہ مرد کھا سکتے ہیں عورتیں نہیں۔ اگر بچہ مردہ پیدا ہوا تو مرد وعورت دونوں کھا سکتے ہیں اور زندہ ہو تو صرف مرد کھائیں اسی قسم کے اور بعض بت پرستانہ رسوم تھے۔ سورۃ انعام میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، ان رسوم کا بتفصیل ذکر ہے۔ اسلام کے اکثر احکام گو مدینہ میں اترے لیکن ماکولات کی حلت وحرمت کے احکام مکہ ہی میں اترنے شروع ہو چکے تھے چنانچہ سورۃ انعام میں مشرکین کے ان رسوم کی تردید کے بعد حکم آیا۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّکَ

کہدے کہ مجھ پر جو وحی اتری ہے اس میں کسی کھانیوالے پر کوئی شے حرام نہیں ہے ہاں اگر حرام ہے تو مردار یا بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کیونکہ یہ چیزیں ناپاک ہیں یا وہ گناہ کا جانور جو غیر خدا کے نام پر چڑھایا جائے وہ بھی حرام ہے لیکن جو بھوک سے لاچار ہو کر نافرمانی اور گناہ کے ارادہ سے نہیں الخ

---

[1] ۷ھ کی تحدید کہیں بہ تفصیل مذکور نہیں ہے، یہ سنہ اس قیاس سے شارحین حدیث نے اختیار کیا ہے کہ اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مدینہ میں موجود تھے اور یہ ثابت ہے کہ وہ اسی سال بزمانہ فتح خیبر مدینہ میں آئے تھے (ابوداؤد اذا تتابع فی الخمر) واقعہ افک اسی سال ہوا تھا اور یہ اسی تعلق سے نازل ہوئی ہے اس لئے اس کے لئے ۵ھ کا زمانہ متعین کیا گیا۔

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ — سے کچھ کھالے تو تیرا پروردگار معاف کرنیوالا اور رحم والا ہے۔

مشرکین کو سب سے زیادہ تعجب اس پر ہوا کہ جو آپ سے مر جائے اس کو حرام کہتے ہیں اور جس کو خود اپنے ہاتھ سے ماریں اس کو حلال جانتے ہیں، حالانکہ دونوں میں کوئی فرق نہیں، اس پر یہ آیت اتری۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (انعام)

جو جانور خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو، وہ کھاؤ جو خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا وہ کیوں نہ کھاؤ خدا نے تم پر جو حرام کیا ہے اس کو تو وہ بیان ہی کر چکا۔

اس کے بعد مکہ معظمہ ہی میں سورۂ نحل کی آیت فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ الخ نازل ہوئی جس میں اسی حکم سابق کا اعادہ کیا گیا اور یہی چار چیزیں مُردار، خون، سور اور بتوں پر چڑھاوے حرام بیان کی گئیں۔ مدینہ طیبہ میں آکر پہلے سورۂ بقرہ میں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ۔ تیسری بار یہ محرمات اربعہ بیان کئے گئے۔ عرب میں حلال و حرام کی تمیز کم تھی۔ وحشت و جہالت کے علاوہ اس کا ایک سبب عام غربت اور افلاس تھی، اس لئے مسلمانوں کی مالی حالت جیسے جیسے درست ہوتی جاتی تھی حلال و حرام کی تفریق بڑھتی جاتی تھی، لوگ عموماً مردار اسی کو سمجھتے تھے جو بیمار ہو کر اپنی موت سے مر جائے، اس لئے اگر اور کسی سبب سے جانور مر جاتا تو اس کو حرام نہ سمجھتے، ہجرت کے چار پانچ سال کے بعد سورۂ مائدہ میں مردار (میتۃ) کی تفصیل بیان کی گئی، یعنی یہ کہ یا وہ گلا گھٹنے سے مرا ہو المنخنقة یا گردن ٹوٹنے سے مرا ہو والموقوذة یا اوپر سے گر کے مرا ہو والمتردية یا کسی جانور کا سینگ لگ کر مر گیا ہو والنطيحة یا کسی جانور نے اس کو پھاڑ ڈالا ہو وما اكل السبع صرف وہ جانور حلال ہے جس کو تم نے ذبح کیا۔ الا ما ذكيتم۔

۷ھ میں جب مسلمانوں کو خیبر کی فتوحات اور جاگیریں ہاتھ آئیں تو جانوروں میں بھی حلال و حرام کی تفریق کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ آج سے گدھا، درندہ جانور اور پنجہ دار پرند حرام ہیں، ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد طے کے قبیلے نے جو عیسائی تھا اسلام قبول کیا اور شام کے بعض عیسائی مسلمان ہوئے، یہ لوگ شکاری کتے پالتے تھے اور ان سے شکار کرتے تھے اسلام لانے پر ان کو معلوم ہوا کہ مردہ جانور حرام ہیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا حال عرض کیا اس پر یہ آیت اتری۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ۔

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لئے کیا حلال کیا گیا کہہ دے کہ تمام ستھری چیزیں۔

اس کے بعد یہ تفصیل ہے کہ شکاری جانور اگر سدھے ہوئے ہوں اور خدا کا نام لے کر چھوڑے جائیں تو ان کا شکار کیا ہوا کھانا حلال ہے۔[1]

شراب کی حرمت

مخالفین کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے اکثر احکام (مثلاً تعدد ازدواج وغیرہ) نفس پرستی کے مؤید تھے، اس لئے عرب کو اس کے قبول کرنے میں کوئی ایثار درکار نہ تھا، بلکہ اسلام وہ لاتا تھا جو وہ خود چاہتے تھے، اس بحث کی تحقیق آگے آئے گی۔ یہاں صرف تاریخی حیثیت سے

---

[1] حوالوں کے لئے ان آیتوں کے شان نزول تفسیروں میں دیکھو۔

شراب کی حرمت کا واقعہ ذکر کرنا مقصود ہے، عرب کو شراب سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہ تھی، تمام ملک اس مرض میں مبتلا تھا، عرب کی شاعری کا موضوعِ اعظم شراب ہے، مصلحت کے لحاظ سے اسلام کے تمام احکام بتدریج آئے ہیں، اس لئے شراب بھی بتدریج حرام کی گئی۔

مدینہ میں شراب خوری کا رواج کسی قدر زیادہ تھا، بڑے بڑے شرفاء اعلانیہ شراب پیتے تھے، عرب میں ایسے بھی نیک لوگ تھے، جنھوں نے شراب پینی چھوڑ دی تھی اور اس کو خلافِ اتقاء سمجھتے تھے، ابھی تک اسلام نے اُس کے متعلق کوئی اپنا فیصلہ نہ سنایا تھا، لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ شراب کے متعلق کیا حکم ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا۔

اَللّٰھُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شِفَاءً۔	اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے۔

اس پر یہ آیت اُتری۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ۔ ۲۶)	لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت پوچھتے ہیں کہہ دو کہ ان دو میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں، لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے رہے، ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف کی دعوت کی، جس میں شراب بھی تھی، کھانے کے بعد مغرب کا وقت آگیا اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھائی، لیکن نشہ کے خمار میں کچھ کا کچھ پڑھ گئے، حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی کہ خدا شراب کے بارے میں صاف صاف بیان کر دے، اس پر یہ آیت اُتری۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء)	نشہ کی حالت میں تم نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ جو تم کہو اس کو بھی سمجھ سکو۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نماز کا وقت آتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ایک منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں نہ شامل ہونے پائے، لیکن چونکہ عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے سوا باقی اوقات میں لوگ بے تکلف پیتے پلاتے تھے، حضرت عمرؓ نے پھر وہی دعا کی، اسی زمانہ میں کچھ لوگ شراب پی کر اس قدر بدمست ہوئے کہ آپس میں مار پیٹ تک نوبت[2] پہنچ گئی، اس پر یہ آیت اُتری[3]۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (مائدہ)	مسلمانو! بے شبہ شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو فلاح حاصل ہو شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں میں شراب اور جوئے کے ذریعہ سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو بولو، تم باز آتے ہو۔

---

[1] یہ پورا واقعہ ابوداؤد کتاب الاشربہ میں مذکور ہے۔ [2] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۴ ذکر سعد وقاصؓ۔ [3] ابوداؤد میں پوری آیتیں نہیں مذکور ہیں بلکہ چند الفاظ نقل کر کے پوری آیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

ان آیتوں کے نزول کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی، اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی گلی کوچوں میں منادی کرا دی کہ آج سے شراب حرام ہے لیکن بایں ہمہ شراب کی تجارت اور خرید و فروخت جاری تھی، ۸ھ میں یہ بھی حرام ہو گئی، آپؐ نے مسجد نبوی میں لوگوں کو جمع کر کے اسی وقت اعلان کیا[1] اس کے بعد اسی سال فتح مکہ کے زمانہ میں آپؐ نے علی الاعلان ان چیزوں کی تجارت کی ممانعت فرمائی، جن کا کھانا یا رکھنا ناجائز ہے، آپؐ نے فرمایا،

ان اللہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام[2]۔

خدا اور اس کے رسول نے شراب، مردہ، سور اور بتوں کی خرید و فروخت حرام کر دی،

غور کرو! شراب کی حرمت کس طرح اعلانِ عام کے ساتھ عمل میں آئی، بایں ہمہ ابھی تک یہ نہیں متعین ہوا کہ یہ کس سال کا واقعہ ہے؟ محدثین اور ارباب روایت اس امر میں نہایت مختلف الآراء ہیں[3]۔

حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب التفسیر سورۂ مائدہ باب لیس علی الذین آمنوا میں لکھتے ہیں۔

والذی یظہر ان تحریمہا کان عام الفتح سنۃ ثمان کما روی احمد من طریق عبد الرحمٰن بن وعلۃ قال سالت ابن عباس عن بیع الخمر فقال کان لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق من ثقیف او دوس فلقیہ یوم الفتح براویۃ خمر یہدیہا الیہ فقال یا فلان اما علمت ان اللہ حرمہا .الخ

اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت فتح مکہ کے زمانے ۸ھ میں ہوئی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے عبد الرحمٰن بن وعلہ کی سند سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ شراب کا بیچنا کیسا ہے تو انھوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک دوست تھے جو ثقیف یا دوس کے قبیلے سے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ میں ملے اور ایک مشک شراب تحفہ میں پیش کی، آپؐ نے فرمایا تم کو معلوم نہیں کہ خدا نے شراب کو حرام کر دیا ہے۔

ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور ان کا استدلال صحیح نہیں۔ اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوا تھا، یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت الربوا و صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اواخر سورۂ بقرہ کے نزول کے بعد جس میں حرمت ربوا کا حکم ہے یہ اعلان فرمایا یہ آیتیں ۸ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ [2] صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر والمیتۃ والاصنام۔ [3] سیرت النبی جلد اول میں حرمت شراب کی دو تاریخیں مختلف مقامات پر لکھی گئی ہیں، پہلا بیان عام ارباب سیر کا ہے دوسرا علامہ ابن حجر کی تحقیق ہے لیکن مصنفین سیرت النبی کی اصل تحقیق یہی بیان مذکور ہوئی ہے اور وہ اس باب میں عام محدثین کے ساتھ ہیں جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا "س"۔ [4] مصنف کا یہ قیاس بالکل درست ہے، جن صاحب کا یہ واقعہ ہے وہ قبیلۂ ثقیف یا دوس سے تھے ثقیف کا قبیلہ ۹ھ میں مسلمان ہوا اور دوس گو بہت پہلے اسلام لا چکے تھے لیکن وہ مدینہ سے بہت دور آباد تھے، اس کے علاوہ ایک اور نکتہ بھی ہے جس کی طرف ہمارے محدثین نے توجہ نہیں کی ہے وہ یہ ہے جیسا کہ ہم متن میں پہلے لکھ آئے ہیں کہ شراب کا پینا گو ۴ھ میں حرام ہو چکا تھا، لیکن شراب کی تجارت بند نہیں ہوئی تھی، چنانچہ یہ صاحب بھی مے فروش تھے۔ شراب کی خرید و فروخت ممانعت ربا، کی حرمت کے ساتھ عمل میں آئی اور ربا کی حرمت سب سے آخر میں نازل ہوئی یعنی ۸ھ میں شراب نوشی کی ممانعت مدینہ میں اسی وقت کر دی گئی، لیکن اس کا عام اعلان آپ نے فتح مکہ

حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی، بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دُور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی، علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ھ تک حلال رہتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوتی حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہو چکی تھی۔

سود خواری کی حرمت

سود خواری بھی ان اخلاق ذمیمہ میں سے ہے جو اہل عرب کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئے تھے، اس لئے نہایت تدریج کے ساتھ اس کی حرمت کے احکام بھی اترے، قریش عموماً تجارت پیشہ تھے ان میں جو امیر اور دولت مند سوداگر تھے وہ غریبوں اور کاشت کاروں کو بھی شرح سود پر روپیہ قرض دیتے اور جب تک قرض وصول نہ ہو جاتا، اصل سرمایہ کو ہر سال بڑھاتے جاتے تھے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس (اسلام سے پہلے) بہت بڑے سودی کاروبار کے مالک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی تاجروں کے سبب سے یہاں مختلف قسم کے سود کا رواج دیکھا سب سے پہلے آپ نے چاندی اور سونے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے زمانہ میں فرمایا جیسا کہ احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہے (دیکھو صحیح بخاری تفسیر آیت ربا و باب بیع المیتۃ والاصنام اور صحیح مسلم باب تحریم بیع الخمر) حافظ ابن حجر جو اس بات کے قائل ہیں کہ شراب کی حرمت ۸ھ میں نازل ہوئی وہ خود جلد اول ص ۱۹۱ میں قاضی عیاض کے جواب میں لکھتے ہیں، قلت ویحتمل ان یکون تحریم التجارۃ فیہا تاخر عن وقت تحریمہا واللہ اعلم۔ یعنی ممکن ہے کہ شراب پینے کی حرمت کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت نازل ہوئی ہو، صحیح مسلم میں ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے (باب تحریم بیع الخمر) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے اور اس کی خرید و فروخت کی ممانعت ایک ساتھ نازل ہوئی، لیکن اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور جابرؓ بن عبداللہ سے جو روایتیں ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں ابو سعید خدری یا ان کے بعد کے راویوں سے کسی قدر تسامح ہوا ہے، وھذا ہو الحق علاوہ ازیں حافظ ابن حجر نے امام احمد کی جس حدیث سے فتح مکہ میں شراب نوشی کی حرمت کے نزول پر استدلال کیا ہے، وہ حدیث صحیح مسلم (باب تحریم بیع الخمر) میں بھی ہے، لیکن اس میں فتح مکہ کی تعیین نہیں، سب سے بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ ہمارے مسلمان بھائی جو شراب پی کر جنگ احد میں شریک ہوئے اور اسی حالت میں مارے گئے ان کا کیا حال ہوگا؟ اس پر آیت لیس علی الذین امنوا نازل ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت کا واقعہ جنگ احد سے بالکل متصل تھا اور جنگ اُحد کا زمانہ یہی ہے۔ بخاری تفسیر آیت مذکور میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے۔

صبح ناس غداۃ احد الخمر فقتلوا من یومہم جمیعا شہداء وذالک من قبل تحریمہا۔	غزوہ اُحد کی صبح کو کچھ لوگوں نے شراب پی اور یہ سب اسی دن شہید ہوئے، یہ شراب کی حرمت سے پہلے ہوا۔

اس روایت کے ساتھ حضرت انسؓ کی اس روایت کو ملاؤ جو اس کے بعد ہی واقع ہے۔

فقال بعض القوم قتل قوم وھی فی بطونہم قال فانزل اللہ ولیس علی الذین اٰمنوا الخ	حرمت شراب کی آیت نازل ہوئی تو بعض لوگوں نے کہا کہ کچھ لوگ اس حال میں مارے گئے ہیں کہ شراب ان کے پیٹ میں تھی، اس پر یہ آیت اتری کہ مومنوں پر کچھ حرج نہیں۔ ش۔

۱؎ اضافہ تاخیر سود، موطا امام مالک باب الربوا تفسیر ابن جریر طبری آیت ربوا۔

کے ادھار خرید و فروخت کو سود قرار دیا۔ پھر دو گنے اور چوگنے سود لینے کی ممانعت آئی اور یہ آیت اتری۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً وَّاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (اٰل عمران)	مسلمانو! دگنا چوگنا سود نہ کھایا کرو اور خدا سے ڈرا کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

اس کے بعد آپ نے ہم جنس اشیاء کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ منع فرمایا ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں نے یہودی سوداگروں سے لین دین شروع کیا۔ اس وقت آپ نے اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے، سود کی حرمت کے متعلق تفصیلی احکام ۸ھ میں نازل ہوئے۔ آل عمران کے بعد سورۂ بقرہ میں سب سے پہلے یہ آیت اتری۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ۔	جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ اس طرح کھڑے ہوں گے جس طرح شیطان کسی کو چھو کر مخبوط بنا دیتا ہے، اسلئے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بیع اور سود کا معاملہ ایک ہی ہے خدا نے بیع کو تو حلال کیا اور سود کو حرام کر دیا پس جس کے پاس خدا کی طرف سے نصیحت کی بات پہنچی اور وہ باز آگیا تو اس کو وہی لینا چاہیئے جو پہلے دیا۔

لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ سود بھی ایک قسم کی تجارت ہے، جب تجارت جائز ہے تو سود کیوں حرام ہے؟ اس سوال کا جواب تو کتاب کی دوسری جلدوں میں آئے گا، یہاں صرف سود کی تاریخ حرمت سے بحث ہے۔ بہر حال اس آیت میں بھی سود کی قطعی حرمت کا فیصلہ نہ ہوا، آخر تھوڑے ہی وقفہ کے بعد غالباً ۹ھ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ)	مسلمانو! خدا سے ڈرو اور سود جو باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم سچے مومن ہو، اگر یہ نہ کرو تو خدا اور رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، اگر باز آجاؤ تو تم کو اپنے راس المال کا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

یہ آیت جب اتری تو آپ نے مسجد میں تمام مسلمانوں کو جمع کر کے یہ حکم سنایا۔ ۹ھ میں اہل نجران سے جو معاہدات صلح ہوئے ان میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سود نہ لیں گے[5]: ذی حجہ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کے نزول سے پہلے تمام ملک عرب میں جس قدر سودی معاملات تھے، آپ نے سب کو کالعدم قرار دیا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سود کی حرمت کا حکم اسلام کے سلسلۂ احکام کی سب سے آخری کڑی ہے[6]

*

---

[1] صحیح مسلم باب الصرف [2] صحاح کتاب البیوع [3] صحیح مسلم باب بیع القلادۃ فیہا خرز [4] صحیح بخاری و مسلم باب تحریم بیع الخمر [5] ابوداؤد باب اخذ الجزیہ [6] تفسیر آیت واتقوا یوما (بقرہ)

سال اخیر حجۃ الوداع اختتام فرض نبوت

ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ مطابق فروری سنہ ۶۳۲ء

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔

جب خدا کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہو چکا اور تو نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے دین میں فوج کی فوج داخل ہو رہے ہیں تو خدا کی حمد کی تسبیح پڑھ اور استغفار کر، خدا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ نصرت اور فتح کے مقابلہ میں شکر کی ہدایت ہونی چاہیے تھی، تسبیح اور استغفار کو فتح سے کیا مناسبت ہے؟ اس بنا پر ایک صحبت میں حضرت عمرؓ نے صحابہ سے اس آیت کے معنی پوچھے۔ لوگوں نے مختلف معنی بتائے۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عباسؓ کی طرف دیکھا، وہ کم سن تھے اور جواب دیتے جھجکتے تھے، حضرت عمرؓ نے ان کی ڈھارس بندھائی، تو انہوں نے کہا کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب وفات کا اعلان[1] ہے کہ استغفار موت کے لئے مخصوص ہے۔

اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ رحلت کا زمانہ قریب آگیا ہے، اس لئے اب ضرورت تھی کہ تمام دنیا کے سامنے شریعت اور اخلاق کے تمام اصول اساسی کا مجمع عام میں اعلان کر دیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے زمانہ سے اب تک فریضہ حج ادا نہیں فرمایا تھا، ایک مدت تک تو قریش سد راہ رہے، صلح حدیبیہ کے بعد موقع ملا لیکن مصالح اس کی مقتضی تھے کہ یہ فرض سب سے آخر میں ادا کیا جائے۔

بہر حال ذوقعدہ[3] میں اعلان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ارادہ سے مکہ تشریف لے جا رہے ہیں، یہ خبر دفعۃً پھیل گئی اور شرف ہمرکابی کے لئے تمام عرب امنڈ آیا (سنیچر کے دن) ذوقعدہ کی ۲۶ تاریخ کو آپ

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۃ اذا جاء۔ واحدی نے اسباب النزول میں لکھا ہے کہ یہ سورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو برس پہلے اتری لیکن ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۰ھ میں اور عین ایام تشریق میں اتری (یہ دوسری روایت اصل میں بیہقی کی ہے اور ابن حجر اور زرقانی نے تصریح کی ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے، اس لئے واحدی کی روایت صحیح ہے، سیوطی نے بھی اسباب النزول میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے یہی روایت نقل کی ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کے بعد ہی فوراً نازل ہوئی، تصریحات ائمہ و اشارات حدیث کے علاوہ خود اس سورہ کے طرز بیان نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہ فتح مکہ کے متصل ہی اتری ہے یعنی حجۃ الوداع سے تقریباً پونے دو برس پہلے، جن روایتوں میں وفات سے چند روز پہلے اس سورہ کا نازل ہونا بیان ہوا ہے وہ روایت دونوں حیثیتوں سے ضعیف ہیں۔

[2] سنن ابن ماجہ میں ہے (باب حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہ ہجرت سے پہلے آپ نے دو حج فرمائے، بعض حدیثوں میں جو یہ ہے کہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا (ترمذی باب کم حج النبی اور ابوداؤد وقت الاحرام) اس سے مقصود بعد ہجرت ہے۔

[3] ابوداؤد اور صحیح مسلم میں حجۃ الوداع کا واقعہ نہایت تفصیل سے مذکور ہے جس کا شان نزول یہ ہے کہ

نے غسل فرمایا اور چادر اور تہمد باندھی، نماز ظہر کے بعد مدینہ سے باہر نکلے اور تمام ازواج مطہراتؓ کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مدینہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ذو الحلیفہ ایک مقام ہے جو مدینہ کی میقات ہے۔ یہاں پہنچ کر شب بھر اقامت فرمائی، دوسرے دن دوبارہ غسل فرمایا، حضرت عائشہؓ نے اپنے ہاتھ سے آپؐ کے جسم مبارک پر عطر ملا، اس کے بعد آپؐ نے دو رکعت نماز ادا کی، پھر قصواء پر سوار ہو کر احرام باندھا اور بلند آواز سے یہ الفاظ کہے۔

لبیك اللّٰهم لبیك لا شریك	اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں، اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں
لك لبیك ان الحمد والنعمة لك والملك	ہم حاضر ہیں تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت
لك لا شریك لك۔	میں کوئی تیرا شریک نہیں۔

حضرت جابرؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں اُن کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی، آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی اور تمام دشت و جبل گونج اُٹھتے تھے۔

راہ مکہ میں آپؐ نے جن منازل میں نماز ادا کی تھی، وہاں برکت کے خیال سے لوگوں نے مسجدیں بنالی تھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مساجد میں نماز ادا کرتے جاتے تھے، سرف پہنچ کر غسل فرمایا، دوسرے روز اتوار کے روز ذو الحجہ کی چار تاریخ کو صبح کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ مدینہ سے مکہ تک کا یہ سفر نو دن میں طے ہوا خاندانِ ہاشم کے لڑکوں نے آمد آمد کی خبر سُنی تو خوشی سے باہر نکل آئے۔ آپؐ نے فرطِ محبت سے اونٹ پر کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیا، کعبہ نظر پڑا تو فرمایا کہ "اے خدا! اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے"۔ پھر کعبہ کا طواف کیا، طواف سے فارغ ہو کر مقامِ ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا اور یہ آیت پڑھی۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ	اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔

صفا پر پہنچے تو یہ آیت پڑھی۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۔	صفا اور مروہ خدا کی نشانیاں ہیں۔

(یہاں سے) کعبہ نظر آیا تو یہ الفاظ فرمائے۔

لا اله الا الله وحده لا شریك له له الملك	خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں اس کے لئے
وله الحمد یحیی ویمیت وهو علی كل شئ	سلطنت اور ملک اور حمد ہے مارتا اور جلاتا ہے اور وہ تمام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حضرت امام باقرؒ نے حضرت جابرؓ سے جب وہ نابینا ہو گئے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کا حال پوچھا حضرت جابرؓ نے آلِ رسول کی محبت سے امام باقرؒ کے گریبان کے تکمے کھولے اور اُن کے سینہ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہا بھتیجے! پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ پھر نہایت تفصیل سے حج نبویؐ کے تمام حالات بیان کئے۔ اوقات کی تعیین بھی بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں میں ہے اور امام نسائی نے کتاب المناسک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وقت و تاریخ کے لئے خاص باب باندھا ہے باب الوقت الذی خرج فیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لہ صحیح بخاری و مسلم ئہ غسل کا ذکر طبقات ابن سعد ذکر حجۃ الوداع میں ہے (ص ۱۲۴)؛ تہ کم و بیش ایک لاکھ مسلمان شریک حج تھے ئہ نسائی باب استقبال الحج)

قدیر لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔	چیزوں پر قادر ہے کوئی خدا نہیں مگر وہ اکیلا خدا، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور اکیلے تمام قبائل کو شکست دی،

صفا سے اُتر کر مروہ پر تشریف لائے، یہاں بھی دعا و تہلیل کی، اہل عرب ایام حج میں عمرہ ناجائز سمجھتے تھے صفا و مروہ کے طواف وسعی سے فارغ ہو کر آپ نے ان لوگوں کو جن کے ساتھ قربانی کے جانور نہیں تھے عمرہ تمام کرکے احرام اتارنے کا حکم دیا، بعض صحابہ نے گزشتہ رسوم مالوفہ کی بنا پر اس حکم کی بجاآوری میں معذرت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے ساتھ قربانی کے اونٹ نہ ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا، حضرت علیؓ کچھ پہلے یمن بھیجے گئے تھے اسی وقت وہ یمنی حاجیوں کا قافلہ لے کر مکہ میں وارد ہوئے، چونکہ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے اس لئے انھوں نے احرام نہیں اتارا، جمعرات کے روز آٹھویں تاریخ کو آپ نے تمام مسلمانوں کے ساتھ منیٰ میں قیام فرمایا دوسرے دن نویں ذی الحجہ کو جمعہ کے روز صبح کی نماز پڑھ کر منیٰ سے روانہ ہوئے۔

قریش کا معمول تھا کہ جب مکہ سے حج کے لئے نکلتے تھے تو عرفات کے بجائے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے جو حرم کے حدود میں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ قریش نے اگر حرم کے سوا کسی اور مقام میں مناسک حج ادا کئے تو ان کی شان یکتائی میں فرق آجائے گا، لیکن اسلام کو جو مساوات عام قائم کرنی تھی اس کے لحاظ سے یہ تخصیص روا نہیں رکھی جاسکتی تھی، اس لئے (خدا نے حکم دیا) ثُمَّ اَفِیضُوا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ، آپ بھی عام مسلمانوں کے ساتھ عرفات میں آئے (اور یہ اعلان کرا دیا)[1]

قفوا علی مشاعرکم فانکم علی ارث من ارث ابیکم ابراھیم۔	اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرے رہو کہ تم اپنے باپ ابراہیم کی وراثت پر ہو۔

یعنی عرفہ میں حاجیوں کا قیام حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے اور ان ہی نے اس مقام کو اس غرض خاص کے لئے متعین کیا ہے، عرفات میں ایک مقام نمرہ ہے، آپ نے ایک کمل کے خیمہ میں قیام فرمایا، دوپہر ڈھل گئی تو ناقہ پر (جس کا نام قصوا تھا) سوار ہو کر میدان میں آئے اور ناقہ کے اوپر ہی سے خطبہ پڑھا۔

آج پہلا دن تھا کہ اسلام اپنے جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوا اور جاہلیت کے تمام بے ہودہ مراسم کو مٹا دیا اس لئے آپ نے فرمایا۔

الا کل شیءٍ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوعٌ (صحیح مسلم و ابوداؤد)[2]	ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری باب الوقوف بعرفۃ، ابوداؤد موضع الوقوف بعرفۃ۔ [2] یہ اور اس کے بعد کے تمام عربی جملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے ٹکڑے ہیں (یہ جملے کسی حدیث میں یکجا نہیں ہوتے ہیں اس لئے ان کو مختلف ماخذوں سے جمع کرنا پڑا ہے) صحیح بخاری و صحیح مسلم (باب حجۃ النبی و باب الدیات) اور ابوداؤد (باب الاشہر الحرام و حجۃ النبی) وغیرہ میں یہ خطبہ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو امامہ باہلیؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوبکرہؓ و جریر بجلیؓ کی روایتوں سے مذکور ہے ان روایتوں میں بعض باتیں مشترک ہیں مثلاً ان دماءکم واموالکم حرام علیکم کحرمۃ الخ اور بعض جگہ الگ الگ ہیں۔ بخاری و مسلم کی کتابوں میں کچھ اور باتیں بھی

تکمیل انسانی کی منزل میں سب سے بڑا سنگِ راہ امتیازِ مراتب تھا، جو دنیا کی تمام قوموں نے تمام مذاہب نے تمام ممالک نے مختلف صورتوں میں قائم رکھا تھا، سلاطین سایۂ یزدانی تھے جن کے آگے کسی کو چون و چرا کی مجال نہ تھی، ائمہ مذاہب کے ساتھ کوئی شخص مسائل مذہبی میں گفتگو کا مجاز نہ تھا، شرفاء رذیلوں سے ایک بالاتر مخلوق تھی، غلام آقا کے ہمسر نہیں ہو سکتے تھے، آج یہ تمام فرقے، یہ تمام امتیازات، یہ تمام حد بندیاں دفعتاً ٹوٹ گئیں۔

ایها الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی (مسند احمد)	لوگو بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔
ان کل مسلم اخو المسلم وان المسلمین اخوۃ (مستدرک حاکم جلد ا صفحہ ۹۳ وطبری وابن اسحاق)	(ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور) اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔
ارقاءکم ارقاءکم اطعموهم مما تاکلون واکسوهم مما تلبسون (ابن سعد جلد)	تمہارے غلام تمہارے غلام، جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

عرب میں کسی خاندان کا کوئی شخص کسی کے ہاتھ سے قتل ہوتا تو اس کا انتقام لینا خاندانی فرض ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ سینکڑوں برس گزر جانے پر بھی یہ فرض باقی رہتا تھا اور اسی بنا پر لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا اور عرب کی زمین ہمیشہ خون سے رنگین رہتی تھی، آج سب سے قدیم رسم عرب کا سب سے مقدم مفخر خاندان کا پُر فخر مشغلہ برباد کر دیا جاتا ہے (اور اس کے لئے نبوت کا منادی سب سے پہلا اپنا نمونہ آپ پیش کرتا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ مذکور ہیں) اصل یہ ہے کہ یہ ایک طویل خطبہ تھا، ہر ایک شخص کو جو فقرہ یاد رہ گیا جس کی اس نے روایت کی اس بنا پر مختلف ماخذوں سے ان ٹکڑوں کو جمع کر لیا گیا ہے اور اس کے جا بجا حوالے دیئے گئے ہیں، خطبہ کے بعض ضمنی الفاظ مصنف نے چھوڑ دیئے ہیں، روایتوں میں ایک اور اختلاف ہے، حضرت جابرؓ اپنی روایت میں اور ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ خطبہ کا دن یوم عرفہ یعنی ۹ ذی الحجہ اور حضرت ابو بکرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ اور دوسری روایتوں میں یوم النحر یعنی ۱۰ ذی الحجہ بتاتے ہیں بعض بیانات ایام التشریق کے خطبہ کی ہیں، ابن اسحاق نے اس کو مسلسل خطبہ کے طور پر نقل کیا ہے، ابن ماجہ، ترمذی اور مسند احمد میں خطبہ حجۃ الوداع کے چند فقرے منقول ہیں جن میں یہ تصریح نہیں کہ کس تاریخ کے خطبہ میں آپؐ نے یہ فرمایا، بہر حال صحاح ستہ اور مسانید کی تمام روایات یکجا کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس حج میں تین دفعہ خطبہ دیا۔ ۹ ذی الحجہ یوم عرفہ کو، ۱۰ ذی الحجہ یوم النحر کو اور تیسرا خطبہ ایام تشریق میں ۱۱ یا ۱۲ ذی الحجہ کو، ان خطبوں میں اصولی طور پر بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض مختص المقام ہیں۔ یہ بہت ممکن ہے جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ چونکہ مجمع بہت بڑا تھا اور آپ جو پیغام اپنی امت کو پہنچانا چاہتے ہیں وہ نہایت اہم تھا اس لئے آپؐ نے اپنی تقریر کے بعض بعض فقرے مکرر اعادہ فرمائے ہیں۔ "س" ۔ امام احمد نے مسند میں ابو نضرۃ تابعی کے واسطے سے اور تابعی مذکور نے ایک صحابی سے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے سنا تھا یہ فقرہ نقل کیا (بحوالہ منتقی الاخبار ابن تیمیہ مع نیل الاوطار)

ودماء الجاهلية موضوعة وان اول دم اضع من دمائنا دم ابن ربيعة[1] ابن الحارث۔ (صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد بروایت جابر)	جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کا خون) ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا خون باطل کر دیتا ہوں۔

تمام عرب میں سودی کاروبار کا ایک جال پھیلا ہوا تھا جس سے غرباء کا ریشہ ریشہ جکڑا ہوا تھا اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنے قرض خواہوں کے غلام بن گئے تھے۔ آج وہ دن ہے کہ اس جال کا تار تار الگ ہوتا ہے، اس فرض کی تکمیل کے لئے بھی معلم حق سب سے پہلے اپنے خاندان کو پیش کرتا ہے۔

وربا الجاهلية موضوع واول ربا اضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب (صحیح مسلم و ابوداؤد)[2]	جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے اپنے خاندان کا سود (عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں)

آج تک عورتیں ایک جائیداد منقولہ تھیں جو قمار بازی میں داؤں پر چڑھا دی جا سکتی تھیں، آج پہلا دن ہے کہ یہ گروہ مظلوم یہ صنف لطیف، یہ جوہر نازک قدر دانی کا تاج پہنتا ہے۔

فاتقوا الله فی النساء (صحیح مسلم و ابوداؤد)[3]	عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔
ان لکم علی نسائکم حقا ولهن علیکم حقا (طبری ابن ہشام وغیرہما)	تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

عرب میں جان و مال کی کچھ قیمت نہ تھی جو شخص چاہتا تھا قتل کر دیتا تھا اور جس کا مال چاہتا تھا چھین لیتا تھا، آج امن و سلامتی کا بادشاہ تمام دنیا کو صلح کا پیغام سناتا ہے۔

ان دمائکم واموالکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا الی یوم تلقون ربکم[4]	تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔

اسلام سے پہلے بڑے بڑے مذاہب دنیا میں پیدا ہوئے لیکن ان کی بنیاد خود صاحب شریعت کے تحریری اصول پر نہ تھی، ان کو خدا کی طرف سے جو ہدایتیں ملی تھیں، بندوں کی ہوس پرستیوں نے ان کی حقیقت گم کر دی تھی، ابدی مذہب کا پیغمبر اپنی زندگی کے بعد ہدایات الٰہی کا مجموعہ خود اپنے ہاتھ سے اپنی امت کو سپرد کرتا ہے اور تاکید کرتا ہے۔

وانی قد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعده ان اعتصمتم به کتاب الله (صحاح)	میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو تم گمراہ نہ ہوگے وہ کیا چیز ہے؟ کتاب اللہ۔

---

[1] ربیعہ قریش کے خاندان سے تھے اور ان کے خون کا انتقام لینا میراث کے طور پر ایک فرض خاندانی چلا آتا تھا (ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے اور بعض روایتوں میں خود ان کے قتل کا ذکر ہے لیکن یہ صحیح نہیں، ربیعہ خلافت فاروقی تک زندہ رہے اور ۲۳ھ میں وفات پائی، صحیح یہ ہے کہ ربیعہ کا ایاس نام ایک بیٹا تھا وہ قبیلہ بنو سعد میں پرورش پا رہا تھا (ہذیل نے اس کو قتل کر ڈالا، دیکھو ابوداؤد و صحیح مسلم باب حجۃ النبی اور زرقانی جلد ۳ صفحہ [illegible]

[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباسؓ اسلام سے پہلے سود کا کاروبار کرتے تھے، بہت سے لوگوں کے ذمہ ان کا سود باقی تھا (دیکھو تفسیر آیت ربوٰ) [3] اس کے بعد آپ نے زن و شوہر کے فرائض کی تفصیل فرمائی۔

[4] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ۔

اس کے بعد آپؐ نے چند اصولی احکام کا اعلان فرمایا[۱]

ان اللہ عزوجل قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث۔	خدا نے ہر حق دار کو ازروئے وراثت، اس کا حق دے دیا اب کسی کو وراثت کے حق میں وصیت جائز نہیں۔
الولد للفراش وللعاھر الحجر وحسابھم علی اللہ۔	لڑکا اس کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا زنا کار کے لئے پتھر ہے اور ان کا حساب خدا کے ذمہ ہے۔
من ادعی الی غیر ابیہ و انتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ۔	جو لڑکا اس باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب سے ہونے کا دعویٰ کرے اور جو غلام اپنے مولیٰ کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے اس پر خدا کی لعنت ہے
الا لا یحل لامرأۃ ان تعطی من مال زوجھا شیئاً الا باذنہ الدین مقضی والعاریۃ مؤداۃ والمنحۃ مردودۃ والزعیم غارم۔	ہاں عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کچھ دینا جائز نہیں، قرض ادا کیا جائے، عاریت واپس کی جائے عطیہ لوٹایا جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔

یہ فرما کر آپؐ نے مجمع عام کی طرف خطاب کیا۔

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون (صحیح مسلم و ابوداؤد)	تم سے خدا کے ہاں میری نسبت پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟

صحابہ نے عرض کی ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا، آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا!

اَللّٰھُمَّ اشْھَد (صحیح مسلم و ابوداؤد)	اے خدا تو گواہ رہنا۔

عین اُس وقت جب آپؐ یہ فرض نبوت ادا کر رہے تھے یہ آیت اتری[۲]

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔	آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا۔

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شاہنشاہ عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرمانِ ربانی کا اعلان کر رہا تھا، اس کے تختِ شاہنشاہی کا مسند و بالین کجاوہ اور عرق گیر ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا[۳]

خطبہ سے فارغ ہو کر آپؐ نے حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا اور ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر ناقہ پر سوار ہو کر موقف تشریف لائے اور وہاں کھڑے ہو کر دیر تک قبلہ رو دعا میں مصروف رہے، جب آفتاب ڈوبنے لگا تو آپؐ نے وہاں سے چلنے کی تیاری کی، حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اونٹ پر پیچھے بٹھا لیا، آپؐ ناقہ کی زمام کھینچے

---

[۱] سنن ابن ماجہ باب الوصایا و مسند ابوداؤد طیالسی بروایت ابی امامۃ الباہلی، ابوداؤد کتاب الوصایا میں مختصراً ہے ابن سعد اور ابن اسحاق نے بھی اس کی بسند روایت کی ہے کہ یہ عرفہ کے خطبہ میں آپؐ نے فرمایا [۲] صحیح بخاری و صحیح مسلم و ابوداؤد وغیرہ، ابن سعد میں تصریح خاص ہے [۳] طبقات ابن سعد صفحہ ۱۳ [۴] کتاب الشمائل للترمذی و ابن ماجہ۔

ہوتے تھے، یہاں تک کہ اس کی گردن کجاوے میں آکر لگتی تھی، لوگوں کے ہجوم سے ایک اضطراب سا پیدا ہو گیا تھا، لوگوں کو دستِ راست سے اور بخاری میں ہے کہ کوڑے سے آپ اشارہ کرتے جاتے تھے کہ آہستہ آہستہ اور زبان مبارک سے ارشاد فرما رہے تھے۔

السکینۃ یا ایہا الناس السکینۃ یا ایہا الناس۔	لوگو! سکون کے ساتھ، لوگو! سکون کے ساتھ۔

اثنائے راہ میں ایک جگہ اُتر کر طہارت کی، اسامہؓ نے کہا یا رسول اللہ! نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، فرمایا نماز کا موقع آگے آتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ تمام قافلہ کے ساتھ مزدلفہ پہنچے، یہاں پہلے مغرب کی نماز پڑھی، اس کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے پڑاؤ پر جا کر سواریوں کو بٹھایا، ابھی سامان کھولنے بھی نہیں پائے تھے کہ فوراً ہی نمازِ عشا کی تکبیر ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ لیٹ گئے اور صبح تک آرام فرمایا، بیچ میں روزانہ دستور کے خلاف عبادت شبانہ کے لئے بیدار نہ ہوئے۔ محدثین نے لکھا ہے کہ یہی ایک شب ہے جس میں آپ نے نماز تہجد ادا نہیں فرمائی۔ صبح سویرے اٹھ کر باجماعت فجر کی نماز پڑھی۔ کفار قریش مزدلفہ سے اس وقت کوچ کرتے تھے، جب آفتاب پورا نکل آتا تھا اور آس پاس کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ چمکنے لگتی تھی۔ اس وقت باواز بلند کہتے تھے: "کوہ ثبیر! دھوپ سے چمک جا!" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کے ابطال کے لئے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے کوچ فرمایا۔ یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور سنیچر کا دن تھا۔

فضل بن عباسؓ آپ کے برادر عم زاد ناقہ پر ساتھ تھے، اہلِ حاجت داہنے بائیں حج کے مسائل دریافت کرنے کے لئے آ رہے تھے، آپ جواب دیتے تھے اور زور زور سے مناسکِ حج کی تعلیم دیتے چلتے تھے[1]۔ وادی محسر کے راستہ سے آپ جمرہ کے پاس آئے، ابن عباسؓ سے جو اس وقت کم سن تھے، فرمایا مجھے کنکریاں چن کر دو، آپ نے کنکریاں پھینکیں اور لوگوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا[2]:

ایاکم والغلو فی الدین فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین (ابن ماجہ ونسائی)	مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو، کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

اسی اثنا میں آپ یہ بھی فرماتے۔

لتاخذوا مناسککم فانی لا ادری لعلی لا احج بعد حجتی ھذہ (مسلم وابوداؤد)	حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر منیٰ کے میدان میں تشریف لائے، داہنے بائیں، آگے پیچھے، تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کا مجمع تھا، مہاجرین قبلہ کے داہنے، انصار بائیں اور بیچ میں عام مسلمانوں کی صفیں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ناقہ پر سوار تھے، حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں ناقہ کی مہار تھی، حضرت اسامہ بن زیدؓ پیچھے پیچھے کپڑا تان کر سایہ کئے ہوئے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر اس عظیم الشان مجمع کی طرف دیکھا تو فرائض نبوت کے ۲۳ سالہ نتائج نگاہوں کے سامنے تھے زمین سے آسمان تک قبول و اعترافِ حق کا نور ضو فشاں تھا۔ دیوانِ قضا میں انبیائے سابقینؑ کے فرائض تبلیغ کے

لہ بخاری ومسلم وابوداؤد، ٹہ صحیح بخاری وابوداؤد، سہ ابوداؤد، ٹہ نسائی۔

کارناموں پر ختم رسالت کی مہر ثبت ہو رہی تھی اور دنیا اپنی تخلیق کے لاکھوں برس کے بعد دین فطرت کی تکمیل کا مژدہ کائنات کے ذرہ ذرہ کی زبان سے سن رہی تھی، عین اسی عالم میں زبانِ حق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام و دہن میں زمزمہ پرداز ہوئی۔

اب ایک نئی شریعت ایک نئے نظام اور ایک نئے عالم کا آغاز تھا، اسی بنا پر ارشاد فرمایا۔

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ	ابتدا میں جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر
السموات والارض (بروایت ابو بکرہ)	پھرا کے آج پھر اسی نقطہ پر آگیا۔

ابراہیم خلیل کے طریق عبادت (حج) کا موسم اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ میں کسی قسم کی خونریزی جائز نہیں تھی، اس لئے عربوں کے خون آشام جذبات حیلۂ جنگ کے لئے اس کو کبھی گھٹا کبھی بڑھا دیتے تھے، آج وہ دن آیا کہ اس اجتماع عظیم کے اشہر حرم کی تعیین کردی جائے۔ آپ نے فرمایا۔

السنۃ اثنا عشر شھرا منھا اربعۃ حرم ثلاثۃ	سال کے بارہ مہینے ہیں جن میں چار مہینے قابل احترام ہیں تین تو
متوالیات ذوالقعدہ و ذوالحجۃ ومحرم ورجب	متواتر مہینے ہیں ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا رجب مضر کا
شھر مضر الذی بین جمادی وشعبان (بروایت ابو بکرہ)	مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔

دنیا میں عدل و انصاف اور جور و ستم کا محور صرف تین چیزیں ہیں، جان، مال اور آبرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے خطبہ میں گو اُن کے متعلق ارشاد فرما چکے تھے، لیکن عرب کے صدیوں کے زنگ دُور کرنے کے لئے مکرر تاکید کی ضرورت تھی، آج آپ نے اس کے لئے عجیب بلیغ انداز اختیار فرمایا۔

لوگوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ کچھ معلوم ہے آج کون سا دن ہے؟ لوگوں نے عرض کی کہ خدا اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے، آپ دیر تک خاموش رہے، لوگ سمجھے کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے، دیر تک سکوت کے بعد فرمایا، کیا آج قربانی کا دن نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں بے شک ہے، پھر ارشاد ہوا، یہ کونسا مہینہ ہے؟ لوگوں نے پھر اسی طریقہ سے جواب دیا۔ آپ نے پھر دیر تک سکوت کیا اور فرمایا، کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں بے شک ہے۔ پھر پوچھا۔ یہ کون سا شہر ہے؟ لوگوں نے بدستور جواب دیا۔ آپ نے اسی طرح دیر تک سکوت کے بعد فرمایا، کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا۔ ہاں بے شک ہے، جب سامعین کے دل

---

[1] حج کے ان مہینوں کے احترام اور بزرگی کا تخیل عرب میں نہایت قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا اور عرب کے تمام فرقے خواہ یہودی یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے پیرو ہوں سب برابر ان کی عزت کرتے تھے، ان مہینوں میں جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑا حرام جانتے تھے قدیم اشعار عرب میں ان کا بیان نہایت کثرت سے ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی عربوں کے اس عقیدہ کا ذکر ہے، سنہ ۵۴۱ء میں رومیوں کو شام اور فلسطین میں کوئی جنگی کارروائی کرنی تھی اور ساتھ ہی عربوں کے حملہ کا خوف لگا تھا، سپہ سالار روم جو عربوں کے اندرونی حالات سے واقف تھا اس نے جواب دیا کہ اس زمانہ میں عربوں سے کوئی خوف نہیں، کیونکہ عنقریب وہ دو مہینے آرہے ہیں جن میں اہل عرب عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں اور کسی قسم کا ہتھیار نہیں لگاتے۔ نتائج الافہام محمود پاشا فلکی ص ۲۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک سوسائٹی جرنل اپریل ۱۸۵۸ء ص ۲

میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو چکا کہ آج کا دن بھی، مہینہ بھی اور خود شہر بھی محترم ہے، یعنی اس دن اس مقام میں جنگ اور خون ریزی جائز نہیں، تب فرمایا۔

فان دماءکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام لحرمۃ یومکم ہذا فی شہرکم ہذا فی بلدکم ہذا (بروایت ابوبکرہ)

تو تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو تا قیامت، اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن، اس مہینہ میں اور اس شہر میں محترم ہے۔

قوموں کی بربادی ہمیشہ آپس کے جنگ وجدال اور باہمی خونریزیوں کا نتیجہ رہی ہے، وہ پیغمبر جو ایک لازوال قومیت کا بانی بن کر آیا تھا اس نے اپنے پیروؤں سے بآواز بلند کہا۔

الا لا ترجعوا بعدی ضلالا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم (بروایت ابوبکرہ)

ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو، تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بازپرس کرے گا۔

ظلم وستم کا ایک عالمگیر پہلو یہ تھا کہ اگر خاندان میں کسی ایک شخص سے کوئی گناہ سرزد ہوتا تو اس خاندان کا ہر شخص اس جرم کا قانونی مجرم سمجھا جاتا تھا اور اکثر اصلی مجرم کے روپوش یا فرار ہو جانے کی صورت میں بادشاہ کا اس خاندان میں سے جس پر قابو چلتا تھا اس کو سزا دیتا تھا، باپ کے جرم میں بیٹے کو سولی دی جاتی تھی اور بیٹے کے جرم کا خمیازہ باپ کو اٹھانا پڑتا تھا، یہ سخت ظالمانہ قانون تھا جو مدت سے دنیا میں حکمران تھا۔ اگرچہ قرآن مجید نے لا تزر وازرۃ وزر اخری کے وسیع قانون کی رو سے اس ظلم کی ہمیشہ کے لئے بیخ کنی کر دی تھی لیکن اس وقت جب دنیا کا آخری پیغمبر ایک نیا نظام سیاست ترتیب دے رہا تھا، اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا۔

الا لا یجنی جان الا علی نفسہ الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔

عرب کی بدامنی اور نظام ملک کی بے ترتیبی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ ہر شخص اپنی خداوندی کا آپ مدعی تھا، اور دوسرے کی ماتحتی اور فرمانبرداری کو اپنے لئے ننگ اور عار جانتا تھا۔ ارشاد ہوا۔

ان امر علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (صحیح مسلم)

اگر کوئی حبشی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

ریگستان عرب کا ذرہ ذرہ اس وقت اسلام کے نور سے منور ہو چکا تھا اور خانہ کعبہ ہمیشہ کے لئے ملت ابراہیم کا مرکز بن چکا تھا اور فتنہ پردازانہ قوتیں پامال ہو چکی تھیں، اس بنا پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

الا ان الشیطان قد ایس ان یعبد فی بلدکم ہذا ابدا ولکن ستکون لہ طاعۃ فیما تحتقرون من اعمالکم فسیرضی بہ (ابن ماجہ و ترمذی)

ہاں شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا کہ اب تمہارے اس شہر میں اس کی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے اور وہ اس پر خوش ہوگا۔

سب سے آخر میں آپ نے اسلام کے فرض اولین یاد دلائے۔

اعبدوا ربکم فصلوا خمسکم وصوموا شہرکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم۔

اپنے پروردگار کو پوجو، پانچوں وقت کی نماز پڑھو، مہینہ کے روزے رکھا کرو، اور میرے احکام کی اطاعت کرو، خدا کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(مسند احمد ج ۵ صفحہ ۲۵۱ و مستدرک حاکم ج ۱ صفحہ ۳۸۹، صفحہ ۴۷۳)

یہ فرما کر آپؐ نے مجمع کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا۔

الا ھل بلغت۔

کیوں میں نے پیغام خداوندی سنا دیا۔

سب بول اٹھے، ہاں: فرمایا،

اللّٰھم اشھد۔

اے خدا تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا،

فلیبلغ الشاھد الغائب۔

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں۔

خطبہ کے اختتام پر آپؐ نے تمام مسلمانوں کو الوداع کہا۔

اس کے بعد آپؐ قربان گاہ کی طرف تشریف لے گئے اور فرمایا کہ قربانی کے لئے منیٰ کی کچھ تخصیص نہیں ہے بلکہ منیٰ اور مکہ کی ایک ایک گلی میں قربانی ہو سکتی ہے۔ آپؐ کے ساتھ قربانی کے سو اونٹ تھے کچھ تو آپؐ نے خود اپنے ہاتھ سے ذبح کئے اور باقی حضرت علیؓ کے سپرد کر دیئے کہ وہ ذبح کریں اور حکم دیا کہ گوشت پوست جو کچھ ہو سب خیرات کر دیا جائے۔ یہاں تک کہ قصاب کی مزدوری بھی اس سے ادا نہ کی جائے بلکہ الگ سے دی جائے۔

قربانی سے فارغ ہو کر آپؐ نے معمر بن عبداللہ کو بلوایا اور سر کے بال منڈوائے اور فرط محبت سے کچھ بال خود اپنے دست مبارک سے ابوطلحہؓ انصاری اور ان کی بیوی ام سلیم اور بعض ان لوگوں کو جو پاس بیٹھے تھے عنایت فرمائے اور باقی ابوطلحہؓ نے اپنے ہاتھ سے تمام مسلمانوں میں ایک ایک دو دو کر کے تقسیم کر دیئے۔ اس کے بعد آپ مکہ معظمہ تشریف لائے، خانہ کعبہ کا طواف کیا، اس سے فارغ ہو کر چاہ زمزم کے پاس آئے۔

چاہ زمزم سے حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت خاندان عبدالمطلب سے متعلق تھی، چنانچہ اس وقت اس خاندان کے لوگ پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "یا بنی مطلب اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ مجھ کو ایسا کرتے دیکھ کر اور لوگ بھی تمہارے ہاتھ سے ڈول چھین کر خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پئیں گے تو میں خود اپنے ہاتھ سے پانی نکال کر پیتا"۔

حضرت عباسؓ نے ڈول میں پانی نکال کر پیش کیا، آپؐ نے قبلہ رخ ہو کر کھڑے کھڑے پانی پیا، پھر یہاں سے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطبہ بہت بڑا تھا، صحیح مسلم (حج) میں روایت ہے کہ قال قولاً کثیراً، آپؐ نے بہت سی باتیں فرمائیں۔ صحیح بخاری (حجۃ الوداع) میں ہے کہ آپؐ نے اس میں دجال کا ذکر بھی فرمایا تھا لیکن یہ تعیین نہیں کہ کس دن کے خطبہ میں یہ فرمایا۔ [2] صحیح بخاری باب الخطبہ ایام منیٰ، صحیح مسلم و ابوداؤد۔

منیٰ واپس تشریف لے گئے اور وہیں نماز ظہر ادا فرمائی[1]۔

بقیہ ایام التشریق یعنی ۱۲ ذی الحجہ تک آپ نے مستقل اقامت منیٰ ہی میں فرمائی۔ ہر روز زوال کے بعد رمی جمار کی غرض سے تشریف لے جاتے اور پھر واپس آجاتے۔ ابوداؤد (باب الخطبہ یمنیٰ) میں ایک حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ۱۲ ذی الحجہ کو بھی منیٰ میں ایک خطبہ دیا تھا جس کے الفاظ مختصراً وہی ہیں جو پہلے خطبہ میں گزر چکے ہیں۔ ۱۳ ذی الحجہ کو سہ شنبہ کے دن زوال کے بعد آپ نے یہاں سے نکل کر وادی محصب میں قیام کیا اور شب کو اسی مقام پر آرام فرمایا، پچھلے پہر اٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور خانہ کعبہ کا آخری طواف کرکے وہیں صبح کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد قافلہ اسی وقت اپنے اپنے مقام کو روانہ ہوگیا اور آپ نے مہاجرین وانصار کے ساتھ مدینہ کی طرف مراجعت فرمائی، راہ میں ایک مقام خم پڑا، جو جحفہ سے تین میل پر ہے، یہاں ایک تالاب ہے، عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اور اس لئے اس مقام کا نام عام روایتوں میں غدیر خم آتا ہے، آپ نے یہاں تمام صحابہ کو جمع کرکے ایک مختصر سا خطبہ دیا۔

اما بعد الا ایها الناس فانما انا بشر یوشك ان	حمد وثنا کے بعد اے لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ خدا کا فرشتہ جلد
یاتی رسول الله فاجیب وانا تارك فیكم الثقلین	آجائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی موت) میں تمہارے درمیان
اولهما كتاب الله فیه الهدی والنور فخذوا	دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور
كتاب الله واستمسكوا به واهل بیتی اذكركم	روشنی ہے خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور دوسری چیز میرے
الله فی اهل بیتی۔	اہلبیت ہیں میں اپنے اہلبیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔

آخری جملہ کو آپ نے تین دفعہ مکرر فرمایا، یہ صحیح مسلم (مناقب حضرت علیؓ) کی روایت ہے، نسائی، مسند امام احمد ترمذی، طبرانی، طبری، حاکم وغیرہ میں کچھ اور فقرے بھی ہیں جن میں حضرت علیؓ کی منقبت ظاہر کی گئی ہے، ان روایتوں میں ایک فقرہ اکثر مشترک ہے۔

من كنت مولاه فعلی مولاه اللهم	جس کو میں محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہونا چاہیے، الٰہی جو
وال من والاه وعاد من	علی سے محبت رکھے اس سے تو بھی محبت رکھ اور جو علی سے
عاداه۔	عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔

احادیث میں خاص یہ تصریح نہیں کہ ان الفاظ کے کہنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ بخاری میں ہے کہ اسی زمانے میں حضرت علیؓ یمن بھیجے گئے جہاں سے واپس آکر وہ حج میں شامل ہوئے تھے، یمن میں انھوں نے اپنے

---

[1] حضرت ابن عمرؓ کی حدیث بخاری ومسلم دونوں میں ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز حسب دستور اس دن منیٰ میں پڑھی، لیکن حضرت جابرؓ کی جو طویل حدیث قصہ حجۃ الوداع میں ہے، اس میں تعیین ہے کہ آپ نے مکہ میں نماز ظہر پڑھی، حضرت عائشہؓ کی ایک روایت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، اس بنا پر محدثین میں ان دونوں قولوں کی باہمی ترجیح اور وجوہ ترجیح میں اختلاف ہے، علامہ ابن حزم نے دوسری روایت کو ترجیح دی ہے اور علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں پہلے قول کو مرجح ثابت کیا ہے، فریقین کے موازنہ دلائل کے بعد ہم نے ابن قیم کا فیصلہ قبول کیا ہے۔

[2] (یہ اسی کا دوسرا نام ابطح اور خیف بنی کنانہ ہے)

اختیار سے ایک ایسا واقعہ کیا تھا جس کو اُن کے بعض ہمراہیوں نے پسند نہیں کیا، ان میں سے ایک صاحب نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے فرمایا "علی کو اس سے زیادہ کا حق تھا[1]" عجب نہیں کہ اس قسم کے شکوک رفع کرنے کے لئے اس موقع پر آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

مدینہ کے قریب پہنچ کر ذوالحلیفہ میں شب بسر کی۔ صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب نکلا اور دوسری طرف کوکبۂ نبوی مدینہ منورہ میں داخل ہوا۔ سوادِ مدینہ پر نظر پڑی تو یہ الفاظ فرمائے[2]۔

اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریك له له الملك وله الحمد وھو علیٰ كل شیٔ قدیر، آئبون تائبون عابدون وساجدون لربنا حامدون صدق اللہ وعدہٗ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔	خدا بزرگ و برتر ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں کوئی اس کا شریک نہیں، بس اسی کی سلطنت ہے اسی کے لئے مدح و ستائش ہے وہ ہر بات پر قادر ہے، لوٹتے آرہے ہیں توبہ کرتے ہوئے فرمانبردارانہ زمین پر پیشانی رکھ کر اپنے پروردگار کی مدح و ستائش میں مصروف ہو کر خدا نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی نصرت کی اور تمام قبائل پر تنہا شکست دی۔

*

---

[1] صحیح بخاری بعث علی الی الیمن والترمذی مناقب حضرت علیؓ

[2] حجۃ الوداع کے تمام تر واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد ونسائی سے لئے گئے ہیں۔ ہر واقعہ کے لئے ان کتابوں میں کتاب الحج کے مختلف ابواب دیکھو۔

وفات

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ (زمر)

ربیع الاول ۱۱ھ مطابق مئی ۶۳۲ء

روحِ قدسی کو عالمِ جسمانی میں اسی وقت تک رہنے کی ضرورت تھی کہ تکمیلِ شریعت اور تزکیۂ نفوس کا عظیم الشان کام درجۂ کمال تک پہنچ جائے۔ حجۃ الوداع میں یہ فرضِ اہم ادا ہو چکا، توحیدِ کامل اور مکارمِ اخلاق کے اصول عملاً قائم کر کے عرفات کے مجمعِ عام میں اعلان کر دیا گیا کہ۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔	آج کے دن میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔

سورۂ نصر کا نزول خاص خاص صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قربِ وفات کی اطلاع دے چکا تھا[1] اور آپ حکمِ ربانی فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (نصر) کے مطابق زیادہ تر اوقات تسبیح و تہلیل میں بسر فرماتے تھے۔ آپ عموماً ہر سال رمضان مبارک میں دس دن اعتکاف میں بیٹھتے تھے لیکن رمضان ۱۰ھ میں بیس دن اعتکاف میں بیٹھے، سال میں ایک دفعہ ماہِ رمضان میں آپ پورا قرآن ناموسِ اکبر کی زبانی سنتے تھے لیکن وفات کے سال دو دفعہ یہ شرف حاصل ہوا[2]۔ حجۃ الوداع کے موقع پر مناسکِ حج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ اعلان بھی فرمایا کہ مجھے امید نہیں کہ آئندہ سال تم سے مل سکوں۔ بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں، شاید میں اس کے بعد حج نہ کر سکوں[3]۔ غدیرِ خم کے خطبوں میں بھی اسی قسم کے الفاظ ادا ہوئے۔

غزوۂ احد کے بیان میں گزر چکا ہے کہ شہدائے احد کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی گئی تھی، تمام غزوات میں صرف غزوۂ احد ہی ایک ایسا غزوہ ہے جس میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ بے کسی کے ساتھ جان دی، اس لئے ان کی یاد آپ کے دل میں اس وقت بھی موجود تھی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر تمام مسلمانوں کو اپنے فیضِ دیدار سے مشرف فرمایا اور ان کو حسرت کے ساتھ الوداع کیا۔ شہدائے احد جو بَلْ هُمْ اَحْيَاءٌ کے مژدۂ جانفزا سے فیض یاب تھے، آٹھ برس کے بعد آخری دفعہ آپ نے ان کو بھی اپنی زیارت سے مشرف کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ان کی قبر پر تشریف لے گئے اور ان کے لئے دعائے خیر فرمائی اور اس رقت انگیز طریقہ سے ان کو الوداع کیا کہ جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ

---

[1] صحیح بخاری تفسیر اذا جاء نصر۔ اس قسم کی روایتیں طبری، ابن خزیمہ اور ابن مردویہ میں ہیں لیکن مختصراً صحیح بخاری تفسیر اذا جاء میں بھی مذکور ہیں۔ [2] صحیح بخاری باب الاعتکاف و باب جمع القرآن۔ [3] مسلم و ابوداؤد و نسائی کتاب الحج۔

کو وداع کرتا ہے[1]، اس کے بعد ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا: میں تم سے پہلے حوض پر جا رہا ہوں، اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک، مجھ کو تمام دنیا کے خزانوں کی کنجی دی گئی ہے، مجھے خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرو گے، لیکن اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اس کے لئے آپس میں کشت و خون نہ کرو، تو پھر اسی طرح ہلاک ہو جاؤ جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں، راوی کا بیان ہے کہ یہ آخری دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے ہوئے سنا۔

غزوات میں گزر چکا ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو حدود شام کے عربوں نے شہید کر ڈالا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس کا قصاص لینا چاہتے تھے، آغاز علالت سے ایک روز پہلے آپؐ نے اسامہ ابن زیدؓ کو مامور کیا کہ وہ فوج لے کر جائیں اور ان شریروں سے اپنے باپ کا انتقام لیں[2]۔ (۱۸ یا ۱۹) صفر ۱۱ھ میں آدھی رات کو آپؐ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز و صحیح مسلم باب اثبات الحوض۔ [2] واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی جانے کا حکم دیا تھا، لیکن یہ روایتیں بے سند ہیں، اس لئے علامہ ابن تیمیہ نے اس سے شدت کے ساتھ انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کے متعلق تو نہیں کہا جا سکتا لیکن حضرت ابوبکرؓ کو آپؐ نے ایام علالت میں امام نماز مقرر فرمایا اور یہ صحیح روایت سے ثابت ہے اس بنا پر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کو جانے کا حکم ہوا تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ بعد کو آپؐ نے مستثنیٰ کر لیا۔ [3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے مرض کے دن مدت علالت اور تاریخ وفات کی تعیین میں روایات مختلف ہیں، امر مختلف فیہ سے پہلے ان امور کو بتا دینا چاہیئے جن پر تمام روایات کا اتفاق ہے اور جن پر گویا محدثین اور ارباب سیر کا اجماع عام ہے اور وہ یہ ہیں (۱) سال وفات ۱۱ھ ہے (۲) مہینہ ربیع الاول کا تھا (۳) یکم سے ۱۲ تک کوئی تاریخ تھی (۴) دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات کتاب الجنائز) زیادہ تر روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کل ۱۳ دن بیمار رہے، اس بنا پر اگر یہ تحقیقی طور سے متعین ہو جائے کہ آپؐ نے کس تاریخ کو وفات پائی تو تاریخ آغاز مرض بھی متعین کی جا سکتی ہے، حضرت عائشہؓ . بروایت صحیح ۸ روز (ایک دوشنبہ سے دوسرے دوشنبہ تک) بیمار رہے اور جن میں وفات فرمائی اس لئے ایام علالت کی مدت ۸ روز یقینی ہے، عام روایات کی رو سے پانچ دن اور چاہئیں اور یہ قرائن سے بھی معلوم ہوتا ہے اس لئے ۱۳ دن مدت علالت صحیح ہے، علالت کے ۵ دن آپؐ نے دوسری ازواج کے حجروں میں بسر فرمائے، اس حساب سے علالت کا آغاز چہار شنبہ سے ہوتا ہے۔

تاریخ وفات کی تعیین میں راویوں کا اختلاف ہے کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی بابت کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی، ارباب سیر کے ہاں تین روایتیں ہیں یکم ربیع الاول، دوم ربیع الاول اور ۱۲ ربیع الاول، ان تینوں روایتوں میں باہم ترجیح دینے کے لئے اصول روایت و درایت دونوں سے کام لینا ہے اور روایت دوم ربیع الاول کی روایت ہشام بن محمد بن سائب کلبی اور ابو مخنف کے واسطے سے مروی ہے (طبری ص ۱۵-۱۸) اس روایت کو گو اکثر قدیم مورخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے، لیکن محدثین کے نزدیک یہ دونوں مشہور دروغ گو اور غیر معتبر ہیں، یہ روایت واقدی سے بھی ابن سعد و طبری نے نقل کی ہے (جزء وفات) لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے، البتہ بیہقی نے دلائل میں بسند صحیح سلیمان التیمی سے دوم ربیع الاول کی روایت نقل کی ہے (زرقانی بحوالہ ابن سید الناس، وفات) لیکن یکم ربیع الاول کی روایت ثقہ ترین ارباب سیر موسیٰ بن عقبہ سے اور مشہور محدث امام لیث مصری سے

جنت البقیع میں جو عام مسلمانوں کا قبرستان تھا تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپس تشریف لاتے تو مزاج ناساز ہوا۔ یہ حضرت میمونہؓ کی باری کا دن تھا اور روز چہار شنبہ تھا۔ پانچ دن تک آپ اس حالت میں بھی از راہ عدل وکرم باری باری ایک ایک بیوی کے حجرہ میں تشریف لے جاتے رہے، دوشنبہ کے دن مرض میں شدت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مروی ہے (فتح الباری وفات) امام سہیلی نے روض الانف میں اسی روایت کو اقرب الی الحق لکھا ہے (جلد دوم وفات) اور سب سے پہلے امام مذکور ہی نے درایۃً اس نکتہ کو دریافت کیا کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے کیونکہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں، روز وفات دوشنبہ کا دن تھا (صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ) اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا (صحاح قصہ حجۃ الوداع (صحیح بخاری تفسیر الیوم اکملت لکم دینکم) ذی الحجہ ۱۰ھ روز جمعہ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ تک حساب لگاؤ، ذی الحجہ، محرم، صفر ان تینوں مہینوں کو خواہ ۲۹، ۲۹ خواہ ۳۰، ۳۰ خواہ بعض ۳۰ کسی حالت اور کسی شکل سے ۱۲ ربیع الاول کو دوشنبہ کا دن نہیں پڑ سکتا اس لئے درایۃً بھی یہ تاریخ قطعاً غلط ہے۔ دوم ربیع الاول کو حساب سے اس وقت دوشنبہ پڑ سکتا ہے جب تینوں مہینے ۲۹ کے ہوں، جب دو پہلی صورتیں نہیں ہیں تو اب صرف تیسری صورت رہ گئی ہے جو کثیر الوقوع ہے یعنی یہ کہ دو مہینے ۲۹ کے اور ایک مہینہ تیس کا لیا جائے۔ اس حالت میں ۲۹ ربیع الاول کو دوشنبہ کا روز واقع ہوگا اور یہی ثقہ اشخاص کی روایت ہے۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ ہو تو اوائل ربیع الاول میں اس حساب سے دوشنبہ کس کس دن واقع ہو سکتا ہے۔

نمبر شمار	صورت مفروضہ	دوشنبہ	دوشنبہ	دوشنبہ
۱	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں۔	۶	۱۳	
۲	ذی الحجہ، محرم اور صفر سب ۳۰ دن کے ہوں۔	۲	۱۹	۱۶
۳	ذی الحجہ، ۲۹ محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۴	ذی الحجہ ۳۰ محرم ۲۹ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۵	ذی الحجہ ۲۹ محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۱	۸	۱۵
۶	ذی الحجہ، ۳۰ محرم ۲۹ اور صفر ۳۰ کا ہو۔	۷	۱۴	
۷	ذی الحجہ، ۳۰ محرم ۳۰ اور صفر ۲۹ کا ہو۔	۷	۱۴	
۸	ذی الحجہ، ۲۹ کا اور محرم وصفر ۳۰ کے ہوں۔	۷	۱۴	

ان مفروضہ تاریخوں میں سے ۶، ۷، ۸، ۱۳، ۱۹، ۱۴، ۱۵ خارج از بحث ہیں کہ علاوہ اور وجوہ کے ان کی تائید میں کوئی روایت نہیں، رہ گئیں یکم اور دوم تاریخیں، دوم تاریخ صرف ایک صورت میں پڑ سکتی ہے جو خلاف اصول ہے، یکم تاریخ تین صورتوں میں واقع ہو سکتی ہے اور تینوں کثیر الوقوع ہیں اور روایت ثقات ان کی تائید میں ہیں اس لئے وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے اس روایت میں فقط رویت ہلال کا اعتبار کیا گیا ہے جس پر اسلامی قمری مہینوں کی بنیاد ہے۔ اصول فلکی سے ممکن ہے کہ اس پر خدشات وارد ہو سکتے ہوں، کتب تفسیر میں آیت الیوم اکملت لکم دینکم، حضرت ابن عباسؓ سے

ل ابن سعد وعبدالرزاق بسند صحیح وصحیح مسلم باب الامامۃ

ہوئی تو ازواجِ مطہرات سے اجازت لی کہ حضرت عائشہؓ کے گھر قیام فرمائیں، خلقِ عظیم کی بنا پر اجازت بھی صاف اور اعلانیہ نہیں طلب کی بلکہ پوچھا کہ کل میں کس کے گھر رہوں گا، دوسرا دن (دوشنبہ) حضرت عائشہؓ کے یہاں قیام فرمانے کا تھا۔ ازواجِ مطہرات نے مرضی سمجھ کر عرض کی کہ آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں، ضعف اس قدر ہو گیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لائے۔

آمد و رفت کی قدرت جب تک رہی آپ مسجد میں نماز پڑھانے کی غرض سے تشریف لاتے رہے، سب سے آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ مغرب[1] کی نماز تھی، سر میں درد تھا، اس لئے سر میں رومال باندھ کر آپ تشریف لائے اور نماز ادا کی جس میں سورہ والمرسلات عرفاً قرأت فرمائی، عشاء کا وقت آیا تو دریافت فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کی کہ سب کو حضورؐ کا انتظار ہے، لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا، پھر اٹھنا چاہا کہ غش آ گیا،

افاقہ کے بعد پھر فرمایا کہ نماز ہو چکی؟ لوگوں نے پھر وہی پہلا جواب دیا، آپ نے پھر غسل فرمایا اور پھر جب اٹھنا چاہا تو غش آ گیا، افاقہ ہوا تو پھر دریافت فرمایا اور لوگوں نے وہی جواب دیا، تیسری دفعہ جسم مبارک پر پانی ڈالا پھر جب اٹھنے کا ارادہ کیا تو پھر غشی طاری ہو گئی، جب افاقہ ہوا تو ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں، حضرت عائشہؓ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مروی ہے کہ اس آیت کے یوم نزول (۹ ذی الحجہ ۱۰ھ) سے روز وفات تک کے ۸۱ دن ہیں (دیکھو ابن جریر، ابن کثیر و بغوی وغیرہ) ہمارے حساب سے ۹ ذی الحجہ ۱۰ھ سے لے کر ۱۲ ربیع الاول تک ۲۱+۲۹ اور ایک مہینہ، ملا کر جو ہماری مفروضہ صورت ہے پورے ۸۱ دن ہوتے ہیں۔ ابونعیم نے بھی دلائل میں بسند ۱۲ ربیع الاول تک تاریخ وفات نقل کی ہے، ص ۲۱۴ (ت)

[1] صحیح بخاری ذکر وفات، ابن سعد نے بروایات صحیحہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حضرت فاطمہ زہراؓ نے اجازت طلب کی تھی (دیکھو) یہ حدیث بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی اور نسائی باب القرأۃ میں مذکور ہے۔ آئندہ حضرت عائشہؓ کی روایت آئے گی جس میں مذکور ہو گا کہ آخری نماز مسجد میں ظہر کی آپ نے پڑھائی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ مغرب کا واقعہ اندرون حجرۂ نبوی کا واقعہ ہے جیسا کہ نسائی میں ہے (جلد ۲ صفحہ ۱۲۸) لیکن آگے چل کر حافظ موصوف کی نظر ترمذی کی روایت پر پڑی جس میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر نکل کر نماز پڑھائی، اس کی تاویل ان کو یہ کرنی پڑی کہ اس سے مقصود ہے کہ خواب گاہ سے باہر آ کر (جلد ۸ ص ۱۰۲)، لیکن ہمارے نزدیک یہ تاویل صحیح نہیں کہ اول تو حجرۂ نبوی میں اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی بڑی جماعت ہو سکے، دوسرے یہ کہ خواب گاہ کے علاوہ حجرۂ نبوی میں اور جگہ کہاں تھی، علاوہ ازیں احادیث میں صلی بنا کے یہی معنی ہر جگہ آتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے امام بن کر نماز پڑھائی، گھر کی نماز پر یہ لفظ صادق نہیں آتا، اس لئے صحیح یہ ہے کہ نماز مسجد نبوی میں پڑھی گئی جیسا کہ عام روایت کا اشارہ ہے۔ آخری نماز مغرب تھی یا ظہر، اس کی تطبیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسلسل امامت کا انقطاع مغرب کی نماز مذکور پر ہوا جیسا کہ آگے عشاء کی نماز کے ذکر میں آئے گا۔ ظہر کی نماز جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں آ کر ادا فرمائی وہ اتفاقی تھی، اصل میں امام پہلے سے حضرت ابوبکرؓ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آ کر بعد کو شریک ہو گئے تھے، یہ نماز مسجد میں آپ کی آخری نماز تھی، بعض صحابہؓ سے مذکور ہے کہ آخری نماز صبح کی تھی یہ درحقیقت ان کا اپنا واقعہ ہے یعنی آخری بار یہی موقع ملا، س۔

[2] صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت عائشہؓ یہ تخصیص ہے۔ (دیکھو کتاب الصلوٰۃ اور وفات)

معذرت کی کہ یا رسول اللہ! ابوبکر نہایت رقیق القلب ہیں، آپ کی جگہ ان سے کھڑا نہ ہوا جائے گا، آپ نے پھر بھی حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں، چنانچہ کئی دن تک حضرت ابوبکرؓ نے نماز پڑھائی۔

وفات سے چار دن پہلے (جمعرات) کو آپ نے فرمایا کہ دوات کاغذ لاؤ، میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے، بعض صحابہ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض کی شدت ہے (غلبہ الوجع) اور تمہارے پاس قرآن مجید موجود ہے جو ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہوا، بعض کہتے تھے کہ تعمیل ارشاد کی جائے، بعض کچھ اور کہتے تھے۔ اختلاف اور شور و غل زیادہ ہوا تو بعض نے کہا اھجر۔ استفھموہ، خود آپ سے دریافت کر لو، لوگ جب پوچھنے لگے تو آپ نے فرمایا، مجھے چھوڑ دو میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔

---

(۱) بخاری باب الامامۃ ج ۱ ص ۹۴) میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہیں پڑھائی اور حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی قائم مقامی کا آغاز شب جمعہ کی نماز عشاء سے کیا ہے (بخاری و مسلم کتاب الصلوٰۃ) اور اختتام دوشنبہ کی صبح کی نماز پر ہوا (بخاری باب رجع القہقری فی الصلوٰۃ ص ۱۰۰) کل یہ تین دن میں ۱۷ وقت کی نمازیں ہوئیں، ابن سعد نے واقدی سے بعینہٖ یہی روایتیں کی ہیں ایک میں ہے کہ ۳ دن امامت کی دوسری میں ہے کہ ۱۷ وقت کی۔ ص ۱۳۔

(۲) یہ روایت صحیح بخاری موقع وفات کی ہے، صحیح بخاری میں یہ حدیث مختلف ابواب میں مذکور ہے اور ہر جگہ الفاظ میں کچھ نہ کچھ اختلاف ہے صحیح مسلم کتاب الوصیۃ میں یہ روایتیں یکجا ہیں جن صحابی نے قلم دوات لانے میں گفتگو کی بخاری میں ان کا نام نہیں، لیکن حدیث کی اور کتابوں میں (مثلاً صحیح مسلم) بہ تصریح حضرت عمرؓ کا نام ہے، صحیح مسلم میں (راوی کے) یہ الفاظ ہیں،

قد غلب علیہ الوجع وعندکم القرآن حسبنا کتاب اللّٰہ۔	آپ کو مرض کی شدت ہے، ہمارے پاس قرآن موجود ہے خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔

(صحیح مسلم کی دوسری روایتوں کے یہ الفاظ ہیں۔

(۱) فقالوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یھجر۔	تو لوگوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیماری (ہجر) کی باتیں کرتے ہیں
(۲) فقالوا اھجر استفھموہ۔	(تو لوگوں نے کہا کیا آپ بیماری کی باتیں کرتے ہیں، آپ سے خود پوچھو تو)

اس بنا پر یہ روایت شیعہ و سنی کا بڑا معرکۃ الآرا میدان بن گئی ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے سنی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعی تکلیف تھی اور یہ معلوم تھا کہ شریعت کے متعلق کوئی نکتہ باقی نہیں رہا خود قرآن مجید میں الیوم اکملت لکم نازل ہو چکی تھی اس لئے حضرت عمرؓ نے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا، اگر کوئی ضروری حکم ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے روکنے سے کیونکر رک سکتے تھے، اس واقعہ کے بعد چار دن (آپ زندہ رہے) اس وقت کسی بعد کو لکھوا دیا ہوتا اور یہ کیونکر معلوم ہوا کہ آپ کیا لکھوانا چاہتے تھے، بخاری میں ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی بکر کو بلا کر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا فرمان لکھوانا چاہتے تھے، پھر آپ نے ضرورت نہیں سمجھا اور فرمایا کہ خود خدا اور اہل اسلام ابوبکر کے سوا کسی اور کو پسند نہ کریں گے، اس اختلاف کے بعد آپ نے لوگوں کو زبانی تین وصیتیں فرمائیں، جو ضروری بات آپ کاغذ پر لکھوانا چاہتے تھے ممکن ہے وہ یہی ہوں، یا اگر وہ اس کے علاوہ بھی ہوں تو آپ اس کو ان عام وصیتوں کے ساتھ زبانی بھی فرما سکتے تھے، اس کے بعد مجمع عام میں جو خطبہ دیا اس میں اس کا اظہار

(اس کے بعد آپ نے تین) وصیتیں فرمائیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی مشرک عرب میں رہنے نہ پائے دوسری یہ کہ سفراء کا اسی طرح احترام کیا جائے جس طرح آپ کے زمانہ میں دستور تھا تیسری وصیت راوی کو یاد نہیں رہی اسی دن ظہر کی نماز کے وقت آپ کی طبیعت کچھ سکون پذیر ہوئی، آپ نے حکم دیا کہ پانی کی سات مشکیں آپ پر ڈالی جائیں غسل فرما چکے تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ تھام کر مسجد میں لائے، جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، آہٹ پا کر حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹے، آپ نے اشارہ سے روکا اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی آپ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر اور لوگ ارکان ادا کرتے جاتے تھے۔

نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا، جو آپ کی زندگی کا سب سے آخری خطبہ تھا، آپ نے فرمایا۔

"خدا نے اپنے ایک بندہ کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا خدا کے پاس (آخرت) میں جو کچھ ہے اس کو قبول کرے، لیکن اس نے خدا ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں، یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے، لوگوں نے اُن کی طرف تعجب سے دیکھا کہ آپ تو ایک شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ یہ رونے کی کون سی بات ہے، لیکن رازدارِ نبوت سمجھ چکا تھا کہ وہ بندہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ نے اپنی تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا اور فرمایا سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے، مسجد کے رُخ کوئی دریچہ ابوبکر کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔ ہاں تم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے، دیکھو تم ایسا نہ کرنا میں منع کر جاتا ہوں"

زمانہ علالت میں انصار آپ کی عنایات اور مہربانیوں کو یاد کر کے روتے تھے، ایک دفعہ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا گزر ہوا، انہوں نے انصار کو روتے دیکھا تو وجہ دریافت کی، انہوں نے بیان کیا کہ حضورؐ کی صحبتیں یاد آتی ہیں، اُن میں سے ایک صاحب نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آج اس کی تلافی کا موقعہ تھا، اس لئے اس کے بعد آپ نے انصار کی نسبت لوگوں کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ یا ایہا الناس، میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فرما سکتے تھے "ص" مجھ کو احتیاط کرنی چاہیئے کہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے نکل کر علم کلام کے دائرہ میں نہ آجائے تاہم جو میری ذاتی تحقیق ہے، میں الفاروق میں لکھ چکا ہوں۔

[1] صحیح بخاری ذکر وفات و صحیح مسلم کتاب الوصیۃ۔ [2] روایتوں میں بالتصریح یہ مذکور نہیں ہے کہ یہ کس دن کے ظہر کا واقعہ ہے لیکن صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں حضرت جندبؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی شان میں جو الفاظ آپ نے فرمائے تھے جن کا بیان آگے آتا ہے، وہ وفات سے پانچ روز پیشتر فرمائے تھے اور چونکہ مرض الموت کا خطبہ اسی نماز ظہر کے بعد آپ نے فرمایا تھا، جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے اس لئے یہ وفات سے پانچ روز پہلے جمعرات کا واقعہ تھا، حافظ ابن حجر نے بھی فتح الباری میں یہی فیصلہ کیا ہے "ص"۔ [3] صحیح بخاری ومسلم مناقب ابی بکرؓ، اخیر ٹکڑا صحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور میں ہے۔

انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان بڑھتے جائیں گے لیکن انصار اس طرح کم ہو کر رہ جائیں گے جیسے کھانے میں نمک، وہ اپنی طرف سے اپنا فرض ادا کر چکے اب تمہیں ان کا فرض ادا کرنا ہے، وہ میرے جسم میں بمنزلہ معدہ کے ہیں جو تمہارے نفع و نقصان کا متولی ہو (یعنی جو خلیفہ ہو) اس کو چاہیے کہ ان میں جو نیکوکار ہوں ان کو قبول کرے اور جن سے خطا ہوتی ہے ان کو معاف کرے[1]۔

اوپر گزر چکا ہے کہ رومیوں کی طرف جس فوج کو بھیجنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز کیا تھا اس کی سرداری اسامہؓ بن زید کو تفویض فرمائی تھی۔ اس پر لوگوں نے (ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ وہ منافقین تھے) شکایت کی کہ بڑے بوڑھوں کے ہوتے نوجوان کو یہ منصب کیوں عطا ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلہ کی نسبت ارشاد فرمایا،

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ زید کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم! وہ اس منصب کا مستحق تھا اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھا اور اب اس کے بعد یہ سب سے زیادہ محبوب ہے[2]۔"

اسلام اور دیگر مذاہب میں ایک نہایت دقیق فرق یہ ہے کہ اسلام شریعت کے تمام احکام کا واضع اور حاکم براہ راست خدائے پاک کو قرار دیتا ہے۔ پیغمبر کا صرف اسی قدر فرض ہے کہ احکام الٰہی کو اپنے قول و عمل کے ذریعہ سے بندوں تک پہنچا دے، چونکہ دوسرے مذاہب میں یہ غلط فہمی شرک و کفر تک منجر ہو چکی تھی اور اس کے نتائج پیش نظر تھے اس لئے ارشاد فرمایا،

حرام و حلال کی نسبت میری طرف نہ کی جائے، میں نے وہی حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جو خدا نے حرام کی ہے۔

انسان کی جزا و سزا کی بنیاد خود اس کے ذاتی عمل پر ہے، آپ نے فرمایا،

"اے پیغمبرِ خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو، میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا[3]"

خطبہ سے فارغ ہو کر آپ حجرۂ عائشہ میں واپس تشریف لائے۔

آپ کو حضرت فاطمہ زہراؓ سے حد محبت تھی (اثنائے علالت میں) ان کو بلا بھیجا تشریف لائیں تو اُن سے کچھ کان میں باتیں کیں، وہ رونے لگیں، پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا پہلی دفعہ آپ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا، جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے

---

[1] صحیح بخاری مناقب انصار [2] صحیح بخاری بعث اسامہ و مناقب زید بن حارثہ [3] یہ اور اس کے اوپر کی حدیث مسند امام شافعی باب استقبال القبلہ کتاب الامام امام شافعی اور ابن سعد جزو الوفات میں بسند حسن مروی ہے، لیکن ان روایتوں میں مذکور ہے کہ صبح کی نماز کے بعد آپ نے یہ فرمایا، لیکن بخاری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز میں شرکت فرمائی تھی اور اس کے بعد خطبہ دیا تھا دوسری غلطی مسند اور ابن سعد کی روایتوں میں یہ ہے کہ وہ دوشنبہ کی صبح یعنی روز وفات واقعہ اس کو بیان کرتے ہیں، حالانکہ بروایت صحیح ثابت ہے کہ دوشنبہ کی صبح کو آپ نے صرف پردہ اٹھا کر جھانکا تھا اور نہ باہر تشریف لائے اور نہ نماز میں شرکت فرمائی۔ تمام)

پہلے تم ہی مجھ سے آکر ملوگی[1]، تو ہنسنے لگی۔

یہود و نصاریٰ نے انبیاء کے مزارات اور یادگاروں کی تعظیم میں جو افراط کی تھی وہ بُت پرستی کی حد تک پہنچ گئی تھی، اسلام کا فرضِ اولین بُت پرستی کی رگ و ریشہ کا استیصال کرنا تھا، اس لئے حالتِ مرض میں جو چیز سب سے زیادہ آپؐ کے پیشِ نظر تھی یہی تھی۔ اتفاق سے بعض ازواجِ مطہراتؓ نے جو حبشہ ہو آئی تھیں اسی حالت میں وہاں کے عیسائی معبدوں[2] کا اور اُن کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرجاتا ہے[3] تو اس کے مقبرہ کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور اس کا بُت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں، قیامت کے روز اللہ عز وجل کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے[4]۔ عین کرب کی شدت میں جب کہ چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے تھے اور کبھی گرمی سے گھبرا کر الٹ دیتے تھے حضرت عائشہؓ نے زبان مبارک سے یہ الفاظ سُنے۔

لعنۃ اللہ علی الیھود والنصارٰی اتخذوا قبور انبیائھم مساجد[5]۔	یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

اسی کرب اور بے چینی میں یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں، دریافت فرمایا کہ عائشہؓ وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ اُن کو خدا کی راہ میں خیرات کر دو[6]۔

(وفات سے ایک دن[7] پہلے اتوار کو) لوگوں نے دوا پلانی چاہی، چونکہ گوارا نہ تھی، آپؐ نے انکار فرمایا، اسی حالت میں غشی طاری ہو گئی، لوگوں نے منہ کھول کر دوا پلا دی، افاقہ کے بعد آپؐ کو احساس ہوا تو فرمایا کہ سب کو دوا پلائی جائے، معلوم ہوا جن لوگوں نے زبردستی دوا پلائی تھی ان میں حضرت عباسؓ شامل نہ تھے، اس لئے وہ اس حکم[8] سے مستثنیٰ رہے محدثین اس واقعہ کو لکھ کر لکھتے ہیں کہ یہ بشریت کا اقتضا تھا، یعنی جس طرح بیماروں میں نازک مزاجی آجاتی ہے، آپؐ نے بھی اسی طرح یہ حکم دیا تھا، لیکن ہمارے نزدیک تو یہ تنگ مزاجی نہیں بلکہ لطفِ طبع تھا۔

مرض میں اشتداد اور تخفیف ہوتی رہتی تھی، جس دن وفات ہوئی (یعنی دوشنبہ کے روز) بظاہر طبیعت کو سکون تھا، حجرۂ مبارک مسجد سے ملا ہوا تھا، آپؐ نے (صبح کے وقت) پردہ اٹھا کر دیکھا تو لوگ (فجر کی) نماز میں مشغول تھے، دیکھ کر مسرت سے ہنس پڑے، لوگوں نے آہٹ پا کر خیال کیا کہ آپ باہر آنا چاہتے ہیں، فرطِ مسرت سے تمام لوگ بے قابو ہو گئے اور قریب تھا کہ نمازیں ٹوٹ جائیں، حضرت ابو بکرؓ نے جو امام تھے چاہا کہ پیچھے ہٹ جائیں آپؐ نے اشارہ سے روکا اور حجرۂ شریف میں داخل ہو کر پردے ڈال دیئے[9] (صحیح مسلم میں ہے کہ اس قدر ضعف تھا کہ آپؐ پردے بھی اچھی طرح نہ ڈال سکے[10]) یہ سب سے آخری موقع تھا کہ صحابہؓ نے جمالِ اقدس کی زیارت کی حضرت

---

[1] صحیح بخاری ذکر وفات [2] کوئی رومی کیتھولک گرجا ہوگا جس میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور ولیوں اور شہیدوں کے مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں [3] جن کو عیسائی سینٹ کہتے ہیں [4] صحیح بخاری وصحیح مسلم باب النہی عن بناء المساجد علی القبور [5] صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم باب مذکور سابق [6] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۴۹ و ابن سعد جزء الوفات بروایت متعددہ [7] ابن سعد وفات [8] صحیح بخاری ذکر وفات وصحیح مسلم (التداوی باللدود)۔ [9] صحیح بخاری ذکر وفات وکتب صحاح کتاب الصلوٰۃ [10] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۷۔

انس بن مالک کہتے ہیں کہ آپ کے چہرہ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مصحف کا کوئی ورق ہے یعنی سپید ہو گیا تھا۔

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا آپ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ حضرت فاطمہ زہراؓ یہ دیکھ کر بولیں "واکرب اباہ" ہائے میرے باپ کی بے چینی! آپ نے فرمایا، تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ جب تندرست تھے تو فرمایا کرتے تھے کہ پیغمبروں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خواہ موت کو قبول کریں یا حیاتِ دنیا کو ترجیح دیں۔ اس حالت میں اکثر آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوتے رہے۔

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام کیا۔

اور کبھی یہ فرماتے۔

اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى۔ خداوندا! بڑے رفیق میں۔

وہ سمجھ گئیں کہ اب صرف رفاقتِ الٰہی مطلوب ہے۔

وفات سے ذرا پہلے حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن خدمتِ اقدس میں آئے۔ آپ حضرت عائشہؓ کے سینہ پر سر ٹیک کر لیٹے تھے، عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں مسواک تھی، مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا، حضرت عائشہؓ سمجھیں کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر دانتوں سے نرم کی اور خدمتِ اقدس میں پیش کی، آپ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی۔ آپ کی وفات کا وقت قریب آ رہا تھا، سہ پہر تھی، سینہ میں سانس کی گھرگھراہٹ محسوس ہوتی تھی، اتنے میں لبِ مبارک ہلے تو لوگوں نے یہ الفاظ سنے۔

اَلصَّلٰوةَ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ نماز اور غلام۔

پاس پانی کی لگن تھی، اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرہ پر ملتے، چادر کبھی منہ پر ڈال لیتے اور کبھی ہٹا دیتے تھے، اتنے میں ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کیا اور تین دفعہ فرمایا۔

بَلِ الرَّفِيْقُ الْاَعْلٰى۔ اب کوئی نہیں بلکہ وہ بڑا رفیق درکار ہے۔

یہی کہتے کہتے ہاتھ لٹک آئے، آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئیں اور روحِ پاک عالمِ قدس میں پہنچ گئی۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ صَلٰوةً كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔

لہ صحیح مسلم باب الصلوٰۃ، حضرت انسؓ بن مالک کی روایت میں جو صحیح مسلم (کتاب الصلوٰۃ ص ۱۶۷) میں ہے، بیان ہے کہ تین دن کے بعد آپ اس وقت صبح کی نماز کے وقت برآمد ہوئے تھے، لیکن جماعت میں شریک نہ ہو سکے اور واپس گئے، امام شافعی نے کتاب الام میں اور ابن سعد نے جزء الوفات میں ابن ابی سبرہ سے روایت کی ہے کہ آپ اس نماز میں شریکِ جماعت ہوئے لیکن یہ درحقیقت راوی کا سہو ہے، صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں بہ تصریح مذکور ہے کہ آپ شریکِ جماعت نہ ہو سکے اور واپس گئے، راوی کو گزشتہ نماز ظہر کا التباس ہوا، تین دن کے بعد سے مراد جمعرات کے روز جس دن آپ نے خطبہ دیا تھا اس کے بعد سے جمعہ، سنیچر اور اتوار کے دن ہیں۔ لہ ابن اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ دوپہر کو وفات ہوئی لیکن حضرت انسؓ بن مالک سے بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ آخر یوم یعنی دوشنبہ کے آخر وقت وفات پائی۔ حافظ ابن حجر نے دو روایتوں میں اسی طرح تطبیق دی ہے کہ دوپہر ڈھل چکی تھی اور سہ پہر کا وقت تھا [illegible]

لہ امام بخاری [illegible] مصر، سنن ابی ماجہ کتاب الوصایا اور ابن سعد جزء الوفات بسند صحیح۔

تجہیز و تکفین

تجہیز و تکفین کا کام دوسرے دن سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول کو شروع ہوا، اس تاخیر کے متعدد اسباب تھے (۱) عقیدت مندوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ حضورؐ نے اس دنیا کو الوداع کہا چنانچہ حضرت عمرؓ نے تلوار کھینچ لی کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی اس کا سر اڑا دوں گا۔

لیکن حضرت ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے تمام صحابہ کے سامنے خطبہ دیا کہ حضورؐ کا اس جہاں سے تشریف لے جانا یقینی تھا اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس ناگزیر واقعہ کا یقین آیا۔

(۲) اس کے بعد اتنا وقت نہیں رہا تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے تجہیز و تکفین سے فراغت ہو سکے۔

(۳) قبر کنی کا کام غسل و کفن کے بعد شروع ہوا، اس لئے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔

(۴) جس حجرہ میں آپؐ نے وفات پائی تھی وہیں لوگ علی الترتیب تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے اور نماز جنازہ ادا کرتے تھے اس لئے بھی بڑی دیر لگی اور سہ شنبہ کا دن گزر کر رات کو فراغت ملی[2]۔

تجہیز و تکفین کی خدمت خاص اعزہ و اقارب نے انجام دی، فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ نے پردہ کیا اور حضرت علیؓ نے غسل دیا حضرت عباسؓ بھی موقع پر موجود رہتے تھے اور بعض روایتوں میں ہے کہ ان ہی نے پردہ بھی کیا تھا چونکہ اس شرف میں ہر شخص شریک ہونا چاہتا تھا، اس لئے حضرت علیؓ نے اندر سے کواڑ بند کر لئے تھے۔ انصار نے دروازہ پر آواز دی کہ خدا کے لئے ہمارے حقوق کا بھی خیال رکھئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری میں ہمارا بھی حصہ ہے، حضرت ابوبکرؓ نے جیسا کہ واقدی کا بیان ہے، فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کسی کا حق نہیں ہے اس لئے اگر سب کو اجازت دی گئی تو کام رہ جائے گا، لیکن انصار کے اصرار پر، حضرت علیؓ نے اوس ابن خولی انصاری کو جو اصحاب بدر میں تھے اندر بلا لیا، وہ پانی کا گھڑا بھر بھر کر لاتے تھے حضرت علیؓ نے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا حضرت عباسؓ اور ان کے دونوں صاحبزادے قثم اور فضل جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے، اور اسامہ بن زیدؓ اوپر سے پانی ڈالتے تھے[3]۔

کفن کے لئے پہلے جو کپڑا انتخاب کیا گیا تھا، وہ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبداللہ کی یمن کی بنی ہوئی ایک چادر تھی لیکن بعد کو اتار لی گئی[4]، اور تین سحولی سفید کپڑے جو سحول کے بنے ہوئے تھے کفن میں دیئے گئے ان میں قمیص اور عمامہ نہ تھا۔

غسل و کفن کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ کو دفن کہاں کیا جائے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا نبی جس مقام پر وفات

---

[1] یہ تمام واقعات صحیح بخاری ذکر وفات کے مختلف ابواب میں مذکور ہیں [2] ابن سعد وغیرہ کی بعض روایتوں میں ہے کہ چہار شنبہ کو تدفین ہوئی۔ لیکن یہ تمام تر کذب اور جھوٹ ہے، خود ابن سعد میں صحیح روایتیں یہ ہیں کہ سہ شنبہ کو تدفین ہوئی، البتہ چہار شنبہ کی شام شروع ہو گئی تھی، ابن ماجہ کی روایت ہے (کتاب الجنائز) فلما فرغوا من جهازه يوم الثلثاء جب سہ شنبہ کے دن تجہیز و تکفین سے فراغت ہوئی [3] طبقات ابن سعد ص ۶۲، ۶۳، جزء ۱۰ الوفات طبری (مختصراً) ابو داؤد کتاب الجنائز میں بھی ان صاحبوں کے نام ہیں، نیز ابن ماجہ کتاب الجنائز، [4] صحیح مسلم ص ۲۰ کتاب الجنائز، [5] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد کتاب الجنائز۔

پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ نعش مبارک اٹھا کر اور بستر الٹ کر حجرۂ عائشہؓ میں اسی مقام پر قبر کھودنا تجویز ہوا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ کو کسی میدان میں اس لئے دفن نہیں کیا گیا کہ آخری لمحوں میں آپ کو یہ خیال تھا کہ لوگ فرطِ عقیدت سے میری قبر کو بھی عبادت گاہ نہ بنا لیں، میدان میں اس کی داروگیر مشکل تھی؛ اس لئے حجرہ کے اندر دفن کیا گیا)

مدینہ میں دو صاحب قبر کھودنے میں ماہر تھے، حضرت ابوعبیدہؓ جراح اور ابوطلحہؓ، حضرت ابوعبیدہؓ اہل مکہ کے دستور کے مطابق صندوقی قبر کھودتے تھے اور ابوطلحہؓ مدینہ کے رواج کے مطابق لحدی۔ لوگوں میں اختلاف پیش آیا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اختلاف مناسب نہیں، دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے جائیں، جو پہلے آجائے۔ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا۔ حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے۔ اتفاق یہ کہ حضرت ابوعبیدہؓ گھر پر موجود نہ تھے۔ ابوطلحہؓ آئے اور انہی نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو لحدی یعنی بغلی تھی۔ چونکہ زمین نم تھی اس لئے جس بستر پر آپ نے وفات پائی تھی وہ قبر میں بچھا دیا گیا۔

جنازہ تیار ہو گیا تو لوگ نماز کے لئے ٹوٹے (جنازہ حجرے کے اندر تھا، باری باری سے لوگ تھوڑے تھوڑے کر کے جاتے تھے) پہلے مردوں نے، پھر عورتوں نے اور پھر بچوں نے نماز پڑھائی لیکن کوئی امام نہ تھا۔ جسم مبارک کو حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ (اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف) نے قبر میں اتارا۔

*

---

[1] ابن سعد جزء الوفات بروایات صحیح و ابن ماجہ کتاب الجنائز ذکر وفات نبوی [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب الوفات [3] ابن ماجہ کتاب الجنائز [4] ابن سعد بروایت صحیح جزء الوفات [5] ابوداؤد کتاب الجنائز؛ ابن ماجہ اور ابن سعد میں اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے بجائے قثم بن عباس اور شقران (غلام خاص) کے نام ہیں، ارباب نظر جانتے ہیں کہ ان دو روایتوں میں ترجیح کس کو ہو سکتی ہے!

متروکات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائیداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے۔

لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔[1]

ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو چھوڑا عام مسلمانوں کا حق ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے وارث اشرفی بانٹ کر نہیں پائیں گے (یعنی نہ ہوگی نہ پائیں گے)، چنانچہ یاد ہوگا کہ وفات کے وقت چند دینار حضرت عائشہؓ کے پاس امانت تھے، آپ نے اسی وقت نکلوا کر خیرات کرا دیئے۔

عمروؓ بن حویرث سے جو ام المومنین جویریہؓ کے بھائی تھے، بخاری میں روایت ہے۔

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عند موتہ درھما ولا دینارا ولا عبدا ولا امۃ ولا شیئا الا بغلتہ البیضاء وسلاحہ وارضا جعلھا صدقۃ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا، نہ درہم، نہ دینار، نہ غلام، نہ لونڈی اور نہ کچھ اور صرف اپنا سفید خچر اور ہتھیار[2] اور کچھ زمین جو عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے۔

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے۔

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینارا ولا درھما ولا بعیرا ولا شاۃ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری۔

بہرحال متروکات میں اگر تھیں تو یہی تین چیزیں تھیں، کچھ زمین، سواری کے جانور اور ہتھیار۔

زمین حضرت عمروؓ بن حویرث نے جس زمین کا ذکر کیا ہے وہ مدینہ، خیبر اور فدک کے چند باغ تھے، مدینہ کی جائیداد سے بنونضیر کی جائیداد مراد ہے یا مخیریق نام ایک یہودی نے ۳ھ میں غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چند باغ وصیۃً ہبہ کئے تھے، وہ مراد ہیں، لیکن صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ باغ اسی وقت مستحقین کو تقسیم کر دیئے تھے[3]۔

فدک اور خیبر کی نسبت ابتداء ہی سے شیعہ اور اہل سنت میں اختلاف ہے، شیعہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی جائیداد تھی اور وراثت کے طور پر اہل بیت میں تقسیم ہونی چاہیئے تھی، اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ بطور ریاست اسلامی

---

[1] یہ فقرہ تمام حدیث کی کتابوں میں ہے، بخاری میں متعدد مقامات میں ہے، کتاب الوصایا، کتاب الفرائض، باب فرض الخمس [2] صحیح بخاری کتاب الوصایا [3] بخاری باب فرض الخمس میں ہے وصدقتہ بالمدینۃ یہ انہی باغوں کے متعلق ہے، تفصیل کیلئے فتح الباری ج۶ صفحہ ۱۴۰ دیکھو نیز صحیح بخاری میں کتاب المغازی ذکر خیبر

آپ کے قبضہ میں تھی اور ذاتی ہو بھی تو آپ نے خود فرما دیا تھا کہ ہمارا جو ترکہ ہو، وہ صدقہ ہے۔

اصل یہ ہے کہ یہ اختلاف خود صحابہ کے وقت میں پیدا ہو چکا تھا، حضرت عباسؓ (آپ کے چچا) حضرت فاطمہؓ (صاحبزادی) اور اکثر ازواج مطہرات مدعی تھیں کہ اس جائیداد کو بطور وراثت تقسیم ہونا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر اکابر صحابہ نے کہا کہ یہ وقف عام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی زندگی میں جس طرح اور جن مصارف میں ان کی آمدنی صرف کرتے تھے اس میں تغیر نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ حیات میں ان تینوں جائیدادوں کی آمدنی مختلف مدوں میں متعین کر دی تھی، بنو نضیر کی جائیداد کی آمدنی ناگہانی ضروریات کے لئے مخصوص تھی۔ فدک کی آمدنی مسافروں کے لئے وقف تھی، خیبر کی آمدنی کو آپ تین حصوں میں تقسیم فرماتے رہتے۔ دو حصے عام مسلمانوں کے لیتے تھے، ایک حصہ ازواج مطہرات کو سالانہ مصارف کے لئے ملتا تھا اس میں سے بھی جو بچ جاتا وہ غریب مہاجرین کی اعانت میں کام آتا۔ آخر میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے اصرار پر مدینہ کی جائیداد ان دونوں کی تولیت میں دے دی تھی لیکن حضرت علیؓ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، خیبر اور فدک حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک خلفاء کے ہاتھ میں رہے۔

جانور ارباب سیر نے آپ کے اسپ خاصہ اور مویشی اور دواب کی تفصیل اس طرح لکھی ہے جس سے ایک والی ملک کے اصطبل اور دواب خانہ کا دھوکا ہوتا ہے۔

طبری نے ان تمام جانوروں کے نام اور حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور اگر وہ قابل اعتبار ہوتے تو حقیقت میں نہایت دلچسپ تھے، لیکن اس کے متعلق طبری کی جس قدر روایتیں ہیں، سب بلا استثنا۔ واقدی سے ماخوذ ہیں۔ پچھلے مصنفین جن میں بڑے بڑے محدثین ہیں، مثلاً یعمری، مغلطائی، حافظ عراقی وغیرہ نے بھی یہ تفصیل لکھی ہے اور چونکہ یہ مصنفین اکثر سلسلہ سند نہیں لکھتے۔ اس لئے اکثر لوگ ان کے مستند ہونے کی بنا۔ پر اس واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں، لیکن جب تفتیش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی تمام روایتوں کا سلسلہ سند واقدی سے آگے نہیں بڑھتا۔

حضرت عائشہؓ کی روایت اوپر گزر چکی ہے۔

ما ترک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیناراً ولا درھما ولا بعیراً ولا شاۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑا، نہ درہم، نہ اونٹ نہ بکری۔

صحیح بخاری (کتاب الجہاد) میں عمرو بن حریث (ام المومنین جویریہ کے بھائی تھے) سے روایت ہے۔

ما ترک النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا بغلتہ البیضاء وسلاحہ وارضا ترکھا صدقۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں چھوڑا بجز اپنے سفید خچر اور ہتھیار اور ایک زمین کے جو وقف عام ہو گئی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفرائض [2] یہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مذکور ہے، دیکھو کتاب الفرائض [3] سنن ابی داؤد، باب صفایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم [4] حوالہ مذکورہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے باغ فدک سادات کو دے دیا تھا۔

ان روایتوں سے معلوم ہوگا کہ متروکاتِ خاصہ میں صرف ایک جانور تھا۔ ان صحیح اور مسلم روایات کے ہوتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسباب اور دواب کی اتنی بڑی فہرست جو طبری وغیرہ نے درج کی ہے، اور جو ایک تاجدارِ سلطنت کے شایانِ حال ہے کیونکر تسلیم کی جاسکتی ہے۔

احادیثِ صحیحہ کے استقراء سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عمروؓ بن حویرث کی مختصر فہرست سے زائد چیزیں بھی آپؐ کے قبضہ میں آئیں لیکن اس سے عمرو کی روایت پر اثر نہیں پڑ سکتا، کیونکہ عمرو صرف اس بات کے مدعی ہیں کہ وفات کے وقت یہی سرمایہ تھا، ممکن ہے کہ یہ چیزیں وفات سے پہلے آپؐ نے حسبِ عادت ہبہ یا خیرات کر دی ہوں، بہرحال (از روئے روایاتِ صحیحہ مختلف اوقات میں) حسبِ ذیل جانور آپؐ کے دائرہ ملک میں آئے۔

لحیف۔ ایک گھوڑا جو ابی بن عباس کے باغ میں بندھتا تھا۔ بخاری نے کتاب الجہاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عفیرہ۔ ایک گدھا تھا، حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اپنے ساتھ اس پر بٹھایا تھا (بخاری کتاب الجہاد)

عضباء و قصواء۔ نہایت تیز اونٹنی تھی، قصواء بھی اسی کا نام ہے (طبری صفحہ ۱۸۴۲) یہی ہے کہ اسی کو آپؐ نے ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ سے خریدا تھا اور اسی پر سوار ہو کر آپؐ نے ہجرت فرمائی تھی اور مدینہ پہنچ کر حضرت ابوایوبؓ کے مکان کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھی۱؎، حجۃ الوداع کا خطبہ بھی آپؐ نے اسی کی پشت پر دیا تھا۲؎ یہ ہر معرکہ میں بازی لے جاتی تھی، ایک دفعہ ایک بدو باہر سے آیا۔ اس کی سواری میں ایک اونٹ تھا جو ابھی جوان بھی نہیں ہوا تھا عضباء کا اس سے مقابلہ ہوا اور وہ آگے نکل گیا، صحابہ کو ملال ہوا۔ آپؐ نے فرمایا کہ، یہ خدا کا فرض ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اٹھائے تو اس کو پست کر دے (بخاری باب الجہاد)

تیسرہ۔ دُلدل جس کا ذکر اکثر روایتوں میں ہے اسی خچر کا نام ہے جس کا ذکر عمروؓ بن حویرث کی روایت میں ہے چنانچہ بخاری کے شارحین نے تصریح کی ہے۔ یہ خچر مقوقس مصری نے آپؐ کو تحفہ میں بھیجا تھا، صحیح بخاری میں ہے کہ ابن العلماء (رئیس ایلہ) نے بھی آپؐ کو ایک سفید خچر (غزوہ تبوک کے موقع پر۳؎) تحفۃً بھیجا تھا۔

غزوہ حنین میں جس سفید خچر پر آپؐ سوار تھے وہ فروہ بن نفاثہ جذامی نے ہدیۃً بھیجا تھا، اربابِ سیر نے اس خچر کو دُلدل سمجھا ہے، لیکن یہ غلط ہے۴؎، صحیح مسلم میں اس کی تصریح موجود ہے۵؎

اسلحہ اس زہد و قناعت کے ساتھ جہاد کی ضرورت سے گوشۂ خانۂ مبارک میں حسبِ ذیل سامان تھا۔ نو عدد تلواریں تھیں جن کے نام یہ ہیں، ماثور، عضب، ذوالفقار، قلعی، بتار، حتف، مخذم، قضیب۔

ماثور، والد ماجد سے میراث میں ملی تھی۔ ذوالفقار بدر میں ہاتھ آئی تھی۔ تلوار کا قبضہ چاندی کا تھا۔ فتح مکہ میں جو تلوار آپؐ کے ہاتھ میں تھی، اس کا قبضہ زریں تھا۔ سات زرہیں تھیں۔ ذات الفضول، ذات الوشاح، ذات الحواشی

۱؎ صحیح مسلم ذکر ہجرت ۲؎ صحیح مسلم و ابوداؤد ذکر حجۃ الوداع ۳؎ کتاب الجہاد بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۴؎ فتح الباری ذکر غزوہ حنین ج ۸ ص ۲۳ ۵؎ ایضاً غزوہ حنین

سعدیہ، فضہ، تبرا، خرنق، ذات الفضول وہی زرہ تھی جو تیس صاع پر ایک یہودی کے ہاں سال بھر کے لئے آپؐ نے رہن رکھی تھی۔ زرہیں سب لوہے کی تھیں، اگرچہ عرب میں چمڑے کی زرہیں بھی ہوتی تھیں۔

چھ کمانیں تھیں، زوراء، روحاء، صفرا، بیضاء، کتوم، شداد، کتوم وہ کمان تھی جو غزوہ احد میں ٹوٹ گئی تھی اور آپؐ نے قتادہ کو دے دی تھی، ایک ترکش تھا جس کو کافور کہتے تھے۔ چمڑے کی ایک پیٹی تھی جس میں چاندی کے تین حلقے تھے۔ لیکن ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ کسی حدیث سے مجھ کو یہ نہیں پتہ لگا کہ آپؐ نے کبھی پیٹی لگائی بھی تھی۔

ایک ڈھال تھی جس کا نام زلوق تھا، پانچ برچھیاں تھیں، لوہے کا ایک مغفر تھا جس کا نام موشح تھا ایک اور مغفر تھا جس کو سبوغ کہتے تھے۔ تین جبے تھے جن کو آپ لڑائی میں پہنتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک دیباج سبز کا تھا ایک سیاہ علم تھا جس کا نام عقاب تھا اور بھی زرد و سفید علم تھے۔

آثار متبرکہ

ان متروکات کے علاوہ بعض یادگاریں بھی تھیں جو لوگوں نے تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑی تھیں حجۃ الوداع[2] کے موقع پر آپؐ نے عقیدت مندوں کو موئے مبارک عطا فرمائے تھے جو زیادہ تر حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے ہاتھ آئے تھے[3] حضرت انسؓ بن مالک کے پاس بھی موئے مبارک تھے، ان کے پاس دو اور چیزیں تھیں، نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ جو چاندی کے تاروں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ ذوالفقار جو حضرت علیؓ کے پاس تھی ان کے بعد ان کے خاندان میں یادگار رہی۔ امام حسینؓ کی شہادت کے بعد وہ حضرت علی بن حسینؓ کے ہاتھ آئی بعض صحابہ نے آکر ان کی خدمت میں عرض کی کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ یادگار آپ سے نہ چھن جائے، اگر مجھے عنایت ہو تو یہ میری جان کے ساتھ رہے لیکن انھوں نے یہ ایثار گوارا نہ کیا۔

حضرت عائشہؓ کے پاس وہ کپڑے تھے جن میں آپؐ نے انتقال فرمایا تھا، استحقاق خلافت کی بنا پر خاتم مہر اور عصائے مبارک جن کا احادیث میں ذکر ہے، پہلے حضرت ابوبکرؓ، پھر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے قبضہ میں آئے۔ لیکن ان ہی کے عہد میں یہ دونوں چیزیں ضائع ہو گئیں، انگوٹھی تو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ سے ایک کنوئیں میں گر گئی اور عصائے مبارک کو جہجاہ غفاریؓ نے توڑ ڈالا۔ امام بخاری نے ان آثار مبارکہ کے ذکر کے لئے ایک خاص باب باندھا ہے۔

مسکن مبارک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کم سن تھے کہ والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اپنے دادا اور چچا کے گھروں میں پرورش پائی اور یہیں سن رشد کو پہنچے، پچیس سال کی عمر میں حضرت خدیجہؓ سے شادی کی، یہ تحقیقی طور پر نہیں معلوم کہ اس کے بعد آپؐ نے اپنے موروثی مکان میں اقامت فرمائی یا حضرت خدیجہؓ ہی کے گھر رہے لیکن آپؐ کے حصہ کا ایک پدری مکان مکہ میں موجود تھا جس پر عقیل نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور حضرت علیؓ کے حقیقی بھائی تھے اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے قبضہ کر لیا تھا، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب

---

[1] صحیح بخاری کتاب البیوع، کتاب الرہن [2] صحیح مسلم حجۃ الوداع [3] صحیح بخاری کتاب الطہارت [4] ان تمام آثار مذکورہ بالا کا ذکر صحیح بخاری کتاب الخمس میں ہے [5] خاتم کا ذکر کتاب الخمس کے علاوہ بخاری کی کتاب اللباس میں ہے۔ عصائے مبارک کا حال فتح الباری ج ۶ ص ۱۲۵ سے ماخوذ ہے۔ "س"۔

آپ مکہ تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ کیا اپنے دولت خانہ پر ٹھہریں گے؟ آپ نے فرمایا عقیل نے ہمارے لئے گھر کہاں چھوڑا؟[۱]

مدینہ منورہ میں تشریف آوری کے بعد چھ مہینے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے گھر قیام فرما رہے اس اثنا میں آپ تنہا تھے۔ اہل و عیال مکہ ہی میں تھے۔ جب آپ نے مسجد نبویؐ کی بنیاد ڈالی تو اسی کے اطراف میں چھوٹے چھوٹے حجرے تیار فرمائے اور اس وقت آپ نے آدمی بھیج کر مکہ سے اہل و عیال کو بلا لیا اور ان ہی حجروں میں اتارا۔[۲]

آخر ایام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں اور الگ الگ حجروں میں رہتی تھیں، جن میں نہ صحن تھا نہ دالان تھے، نہ ضرورت کے الگ الگ کمرے تھے۔ ہر حجرہ کی وسعت عموماً چھ سات ہاتھ سے زیادہ نہ تھی۔ دیواریں مٹی کی تھیں جو اس قدر کمزور تھیں کہ ان میں شگاف پڑ گیا تھا۔ ان سے اندر دھوپ آتی تھی۔ چھت کھجور کی شاخوں اور پتیوں سے چھائی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے بال کے کمبل لپیٹ دیئے جاتے تھے، بلندی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو ہاتھ سے چھو سکتا تھا۔ گھر کے دروازوں پر پردہ یا ایک پٹ کا کواڑ ہوتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ باری باری سے ایک ایک شب ایک ایک حجرہ میں بسر فرماتے تھے۔ دن کو عموماً اصحاب کی مجلس میں تشریف رکھتے جو گویا ان حجروں کا صحن یا گھر کی مردانہ نشست گاہ تھی۔[۳]

ان حجروں کے علاوہ ایک بالاخانہ بھی تھا جس کو احادیث میں "مشربہ" کہا گیا ہے۔ بسنہ ۹ھ میں جب آپ نے ایلاء کیا تھا اور نیز گھوڑے پر سے گر کر چوٹ کھائی تھی، تو ایک مہینہ اسی پر اقامت فرمائی تھی۔[۴] اس بالاخانہ پر سامان آرائش کیا تھا، ایک چٹائی کا بستر، چمڑے کا ایک تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی اور ادھر اُدھر چند کھالیں لٹکی ہوئی تھیں۔[۵]

کاشانۂ نبوت گو انوار الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ تک نہیں ہوتا تھا۔[۶] گھر کی دنیاوی اور ظاہری آرائش بھی پسند خاطر نہ تھی، ایک بار حضرت عائشہؓ نے دیواروں پر دھاری دار رنگین کپڑے منڈھے تو آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا ہم کو اینٹ اور پتھر کو لباس پہنانے کے لئے مال نہیں دیا گیا ہے۔[۷]

یہ حجرۂ مبارک آپ کی وفات کے بعد ازواج مطہراتؓ کے قبضہ میں رہے، ان میں جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو وہ حجرہ ان کے اعزہ کی ملکیت ہو جاتا جن سے حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حجروں کو خرید لیا تھا۔[۸]

حضرت عمرؓ کے عہد تک یہ تمام حجرے اپنے حال پر قائم رہے، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بعض حجرے توڑ کر مسجد نبویؐ میں داخل کر لئے گئے، تاہم ولید بن عبد الملک کے زمانہ تک بہت سے حجرے باقی تھے بسنہ ۸۸ھ میں جب حضرت عمر بن عبد العزیز مدینہ کے والی تھے، تمام حجرے بجز حجرۂ عائشہؓ کے کہ وہ مدفن نبویؐ ہے توڑ کر

---

(۱) بخاری فتح مکہ (۲) ابن سعد (۳) یہ پوری تفصیل ادب المفرد بخاری باب التطاول فی البنیان والبناء میں ہے (۴) ابو داؤد باب امامۃ القاعد (۵) صحیح بخاری صفحہ ۹۶۹ باب ما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتجوز من اللباس والبسط (۶) صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۳۳، باب التطوع خلف المرأۃ (۷) ابو داؤد ج ۲، کتاب اللباس باب فی الصور (۸) ابن سعد جزو نساء۔

مسجد نبوی میں ملا دیئے گئے، جس دن یہ حجرے ٹوٹے ہیں تمام مدینہ میں کہرام مچا ہوا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور یادگار مٹ گئی۔[1]

دایہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ترکہ والد سے ملا تھا اس میں ایک حبشیہ کنیز بھی تھیں جن کا نام ام ایمن تھا[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انا یا دایہ وہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک زندہ رہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اُن کو ماں کہہ کر پکارتے تھے اور جب اُن کو دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ اب یہی میرے خاندان کی یادگار رہ گئی ہیں، جب آپ نے حضرت خدیجہؓ سے عقد کیا تو اُن کو آزاد کر کے حضرت زیدؓ سے جو آپ کے متبنّی اور محبوب خاص اور حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے شادی کر دی، اسامہ انہی کے بطن سے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح کا واقعہ جو کتابوں میں منقول ہے کہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اونٹ مانگا، آپ نے فرمایا "میں اونٹ کا بچہ دوں گا" بولی کہ بچہ لے کر کیا کروں گی۔ آپ نے فرمایا کہ "جتنے اونٹ ہیں، اونٹ کے بچے ہی ہوتے ہیں، ان ہی کا واقعہ ہے۔

یہ اکثر غزوات میں شریک رہیں، جنگ اُحد میں سپاہیوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، جنگِ خیبر میں بھی شریک تھیں۔[3]

خدام خاص

صحابہ میں سے بعض عقیدت مند ایسے تھے جو دنیا کے سب کام کاج چھوڑ کر ہمہ وقت خدمتِ اقدس میں حاضر رہتے اور خاص خاص کام انجام دیتے اُن کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مشہور صحابی ہیں، فقہ حنفی کے بانی اول گویا وہی ہیں، امام ابو حنیفہؒ کی فقہ کا سلسلہ ان ہی کی روایات اور استنباطات پر منتہی ہوتا ہے، مکہ معظمہ میں قرآن مجید کی اشاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانے میں ان ہی نے کی، ستر سورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سن کر یاد کی تھیں۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار بھی تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں جاتے تو خواب گاہ، وضو اور مسواک کا اہتمام ان ہی کے متعلق ہوتا، جب آپ مجلس سے اٹھتے تو جوتیاں پہناتے، راہ میں آگے آگے عصا لے کر چلتے، جب آپ کہیں کسی مجلس میں جا کر بیٹھتے تو نعلین مبارک اتار کر رکھ لیتے، پھر اُٹھنے کے وقت سامنے لا کر رکھ دیتے۔ جلوت و خلوت میں ساتھ رہتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات کا نمونہ بن گئے تھے۔[4]

(۲) حضرت بلالؓ۔ دنیا اُن کو مؤذن کے لقب سے جانتی ہے، یہ حبشی نژاد غلام تھے، مکہ میں ایمان لائے

---

[1] ابن سعد ج۸، ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] صحیح مسلم باب رد المہاجرین الی الانصار منائحہم [3] یہ تمام حالات طبقات ابن سعد ج۸ من تذکرہ ام ایمن سے ماخوذ ہیں [4] پوری تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے (دیکھو بخاری باب مناقب عبداللہ بن مسعود میں بھی یہ مذکور ہے)

تھے اور جس جوش و خروش سے ایمان لائے تھے، اُس کا مختصر ذکر آغاز کتاب میں گزر چکا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اُن کو خرید کر آزاد کرا دیا تھا۔ اس وقت سے برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، آپؐ کا خانگی انتظام ان ہی کے سپرد تھا۔ بازار سے سودا سلف لانا، قرض دام لینا، پھر ادا کرنا، مہمانوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا، یہ تمام باتیں ان ہی سے متعلق تھیں[1]۔

(۳) حضرت انسؓ بن مالک بھی آپؐ کے خادم خاص تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو وہ نہایت کم سن تھے۔ اُن کی ماں خدمتِ اقدس میں ان کو لائیں اور عرض کی یا رسول اللہ! یہ میرا بیٹا ہے لائی ہوں کہ خدمت گزاری کرے[2]۔

حضرت انسؓ نے دس برس تک آپؐ کی خدمت کی۔ لوگوں کے پاس آنا جانا، چھوٹے چھوٹے کام کرنا، وضو کا پانی لانا، اُن کے فرائض تھے۔ چونکہ ابھی کم سن تھے، اُن کو کام کرنے نہیں آتے تھے۔ لیکن آپؐ نے کبھی اُن سے بازپرس نہ فرمائی[3]۔

*

---

[1] ابوداؤد ج۲ ص۲ باب قبول ہدایا المشرکین [2] صحیح مسلم فضائل انسؓ [3] ابوداؤد کتاب الادب۔

شمائل

شکل و لباس و طعام و مذاق طبیعت

حلیۂ اقدس آپ میانہ قد اور موزوں اندام تھے، رنگ سفید سرخ تھا، پیشانی چوڑی اور ابرو پیوستہ تھے، بینی مبارک درازی مائل تھی، چہرہ ہلکا یعنی بہت پُرگوشت نہ تھا۔ دہانہ کشادہ تھا، دندان مبارک بہت پیوستہ نہ تھے، گردن اونچی، سر بڑا اور سینہ کشادہ اور فراخ، سر کے بال نہ بہت پیچیدہ تھے، نہ بالکل سیدھے تھے، ریش مبارک گھنی تھی، چہرہ کتابی تھا، آنکھیں سیاہ و سُرگیں اور پلکیں بڑی بڑی تھیں، شانے پُرگوشت لو مونڈھوں کی ہڈیاں بڑی تھیں، سینہ مبارک میں ناف تک بالوں کی ہلکی تحریر تھی، شانوں اور کلائیوں پر بال تھے، ہتھیلیاں پُرگوشت اور چوڑی کلائیاں لمبی اور پاؤں کی ایڑیاں نازک اور ہلکی تھیں۔ پاؤں کے تلوے بیچ سے ذرا خالی تھے، نیچے سے پانی نکل جاتا تھا۔[1]

صحابہ پر آپ کے حسن و خوبروئی کا بہت اثر پڑتا تھا، حضرت عبد اللہؓ بن سلام جو پہلے یہودی تھے۔ پہلے پہل جب چہرۂ اقدس پر اُن کی نظر پڑی ہے تو بولے خدا کی قسم! یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں۔[2] جابرؓ بن سمرہ ایک صحابی ہیں، اُن سے کسی نے پوچھا آپ کا چہرہ تلوار سا چمکتا تھا، بولے "نہیں ماہ و خورشید کی طرح"[3] یہی صحابی روایت کرتے ہیں کہ ایک شب کو جب مطلق ابر نہ تھا اور چاند نکلا تھا، میں کبھی آپ کو دیکھتا اور کبھی چاند کو دیکھتا تھا، تو آپ مجھے چاند سے زیادہ خوبرو معلوم ہوتے تھے۔[4] حضرت براءؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے کسی جوڑے والے کو سُرخ دھاری کے لباس میں آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں دیکھا۔[5]

آپ کے پسینہ میں ایک طرح کی خوشبو تھی[6] چہرہ مبارک پر پسینہ کے قطرے موتی کی طرح[7] ڈھلکتے تھے۔ جسم مبارک کی جلد نہایت نرم تھی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ کا رنگ نہایت کھلتا تھا، آپ کا پسینہ موتی معلوم ہوتا تھا، میں نے دیبا اور حریر بھی آپ کی جلد سے زیادہ نرم نہیں دیکھے اور مشک و عنبر میں بھی آپ کے بدن سے زیادہ خوشبو نہ تھی۔[8]

عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کے سایہ نہ تھا، لیکن اس کی کوئی سند نہیں ہے۔

مُہرِ نبوت شانوں کے بیچ میں کبوتر کے انڈے کے برابر خاتم نبوت تھی۔ یہ بظاہر سُرخ ابھرا ہوا گوشت سا تھا۔ (صحیح مسلم اور شمائل ترمذی میں حضرت جابر بن سمرہ سے روایت ہے۔

---

[1] یہ حلیہ بہ تفصیل شمائل ترمذی و مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۱۶، ۱۱۷ میں اور مختصراً بخاری و مسلم باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ہے۔
[2] ترمذی ابواب الزہد ص ۴۰۶ [3] مشکوٰۃ باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم [4] مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ ترمذی و دارمی۔
[5] صحیح مسلم باب مذکور [6] ایضاً [7] بخاری واقعہ افک [8] مشکوٰۃ باب مذکور بحوالہ بخاری و مسلم۔

رأیت الخاتم بین کتفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدۃ حمراء مثل بیضۃ الحمامۃ.

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں شانوں کے بیچ میں خاتم کو دیکھا جو کبوتر کے انڈے کے برابر سرخ غدہ تھا۔

لیکن ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شانہ کے پاس چند مہاسوں کی مجموعی ترکیب سے ایک مستدیر شکل پیدا ہوگئی تھی، اسی کو مہر نبوت کہتے تھے[1]۔ تمام صحیح روایات کی تطبیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں شانوں کے درمیان ایک ذرا ابھرا ہوا گوشت کا حصہ تھا جس پر تل تھے اور بال اُگے ہوئے تھے۔

موئے مبارک

سر کے بال اکثر شانوں تک لٹکے رہتے تھے۔ فتح مکہ میں لوگوں نے دیکھا تو شانوں پر چار گیسو پڑے تھے، مشرکین عرب بالوں میں مانگ نکالتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ کفار کے مقابلہ میں اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے، ابتداء میں آپ بھی اہل کتاب کی طرح بال چھوٹے ہوتے رکھتے تھے، پھر مانگ نکالنے لگے، یہ شمائل ترمذی کی روایت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جب مشرکین کا وجود نہ رہا تو ان کی مشابہت کا احتمال بھی جاتا رہا، اخیر زمانہ میں مانگ نکالنے لگے۔

(بالوں میں اکثر تیل ڈالتے تھے، اور ایک دن بیچ کنگھی کرتے تھے، ریش مبارک میں گنتی کے چند بال سفید ہونے پائے تھے)

رفتار بہت تیز تھی، چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ڈھلوان زمین پر اتر رہے ہیں، ضعیف روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا یعنی زمین پر جسم اقدس کا سایہ نہیں پڑتا تھا، لیکن محدثین کے نزدیک یہ روایتیں صحت سے خالی اور ناقابل اعتبار ہیں۔

گفتگو اور خندہ و تبسم

گفتگو نہایت شیریں اور دلآویز تھی، بہت ٹھہر ٹھہر کر گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک فقرہ الگ ہوتا کہ سننے والوں کو یاد رہ جاتا، معمول تھا کہ ایک ایک بات کو تین تین دفعہ فرماتے جس بات پر زور دینا ہوتا بار بار اس کا اعادہ فرماتے، حالت گفتگو میں اکثر نگاہ آسمان کی طرف ہوتی تھی، آواز بلند تھی حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں قرآن پڑھتے تھے اور ہم لوگ گھروں میں پلنگوں پر لیٹے لیٹے سنتے تھے[2]۔

حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ایک صاحبزادے تھے جن کا نام ہند تھا اور وہ نہایت خوش تقریر تھے جس چیز کا بیان کرتے اس کی تصویر کھینچ دیتے، حضرت امام حسن علیہ السلام نے ان سے پوچھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کیونکر تقریر فرماتے تھے؟ انہوں نے کہا آپ ہمیشہ متفکر رہتے تھے، اکثر چپ رہتے اور بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا تھا، ہاتھ سے اشارہ کرتے تو پورا ہاتھ اٹھاتے، کسی بات پر تعجب کرتے

---

[1] صحیح مسلم (باب اثبات النبوۃ) مشہور ہے کہ پشت پر جو خاتم نبوت تھی اس میں گویا قدرتی طور پر کلمہ طیبہ تحریر تھا یہ بالکل بے سند بات ہے احادیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں، محدثین نے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے بعض روایتیں باطل اور بعض سخت ضعیف ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں لم یثبت منہا شئی. زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۱۹۳۔ البتہ کلمہ اس نقرئی خاتم میں منقوش تھا جو انگشت مبارک میں خطوط پر مہر کرنے کی غرض سے آپ پہنا کرتے تھے لوگوں نے غلطی سے اس کو خاتم نبوت کی طرف منسوب کر دیا ہے۔

[2] ابن ماجہ باب ما جاء فی القراءۃ فی صلوٰۃ اللیل۔

تو تفصیل کا رُخ پلٹ دیتے۔ تقریر میں کبھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے، بات کرتے کرتے جب کبھی مسرت کی کیفیت طاری ہوتی تو آنکھیں نیچی ہو جاتیں، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے اور یہی آپ کی ہنسی تھی۔ جریر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو دیکھا ہو اور مسکرا نہ دیا ہو۔ روایتوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی جب آپ کو زیادہ ہنسی آتی تو داڑھ کے دانت نواجذ نظر آنے لگتے، لیکن ابن القیم وغیرہ نے لکھا ہے کہ یہ طرز ادا کا مبالغہ ہے ورنہ کبھی آپ اس زور سے نہیں ہنسے کہ نواجذ نظر آئیں۔

لباس لباس کے متعلق کسی قسم کا التزام نہ تھا۔ عام لباس چادر، قمیص اور تہمد تھی، پاجامہ کبھی استعمال نہیں فرمایا لیکن امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کی ہے کہ آپ نے منیٰ کے بازار میں پاجامہ خریدا تھا۔ حافظ ابن قیم نے لکھا ہے کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا۔ موزوں کی عادت نہ تھی لیکن نجاشی نے جو سیاہ موزے بھیجے تھے، آپ نے استعمال فرمائے۔ بظاہر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرمی تھے۔ عمامہ کا شملہ کبھی دوش مبارک پر، کبھی دونوں شانوں کے بیچ میں پڑا رہتا تھا، کبھی تحت الحنک کے طور پر لپیٹ لیتے تھے عمامہ اکثر سیاہ رنگ کا ہوتا تھا، عمامہ کے نیچے سر سے لپٹی ہوئی ٹوپی ہوتی تھی۔ اونچی ٹوپی کبھی استعمال نہیں فرمائی (عمامہ کے نیچے ٹوپی کا التزام تھا، فرماتے تھے کہ ہم میں اور مشرکین میں یہی امتیاز ہے کہ ہم ٹوپیوں پر عمامہ باندھتے ہیں)

چادر لباس میں سب سے زیادہ یمن کی دھاری دار چادریں پسند تھیں، جن کو عربی میں حبرہ کہتے ہیں۔

عبا بعض اوقات شامی عبا استعمال کی ہے جس کی آستین اس قدر تنگ تھی کہ وضو کرنا چاہا تو چڑھ نہ سکی اور ہاتھ کو آستین سے نکالنا پڑا، نوشیروانی قبا بھی جس کی جیب اور آستینوں پر دیبا کی سنجاف تھی استعمال کی ہے۔

کمبل جب انتقال ہوا تو حضرت عائشہؓ نے کمبل جس میں پیوند لگے ہوئے تھے اور گاڑھے کی ایک تہمد نکال کر دکھائی کہ ان ہی کپڑوں میں آپ نے وفات پائی۔

حُلّہ حمراء روایتوں میں آیا ہے کہ آپ نے حُلّہ حمراء بھی استعمال کیا ہے، حمراء کے معنی سُرخ کے ہیں، اس لئے اکثر محدثین نے وہی عام معنی لئے ہیں، لیکن ابن القیم نے اصرار کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ سُرخ لباس آپ نے کبھی نہیں پہنا اور نہ مردوں کے لئے اس کو جائز رکھتے تھے، حُلّہ حمراء ایک قسم کی یمنی چادر تھی جس میں سُرخ دھاریاں بھی ہوتی تھیں، اس بنا پر اس کو حمراء کہتے تھے اور یہی کبھی کبھی استعمال کرتے تھے۔ عام محدثین کہتے ہیں کہ اس تخصیص کا کوئی ثبوت نہیں، زرقانی میں یہ بحث نہایت تفصیل سے مذکور ہے۔ مختلف روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے سیاہ، سُرخ، سبز، زعفرانی ہر رنگ کے کپڑے پہنے ہیں، لیکن سفید رنگ بہت مرغوب تھا، بعض اوقات اس قسم کی چادر بھی استعمال فرمائی ہے جس پر کجاوے کی شکل بنی ہوتی تھی، نعلین مبارک اس طرز کے تھے جس کو اس ملک میں چپل کہتے ہیں۔ یہ صرف ایک تلا ہوتا تھا جس میں تسمے لگے ہوتے تھے۔ بچھونا چمڑے کا گدا ہوتا تھا جس میں روئی کے بجائے کھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے۔ چارپائی بان کی بنی ہوتی تھی جس سے اکثر جسم پر بدھیاں پڑ جاتی تھیں۔

لہ شمائل ترمذی ۲ہ ابوداؤد کتاب اللباس ۳ہ صحیح بخاری باب اللباس ۴ہ ابوداؤد ج ۲ کتاب اللباس۔ مسند ابن حنبل ۱۲۰۔ ۵ ص ۴۳

۵ہ ابوداؤد ج ۲ کتاب اللباس لبس الصوف والشعر۔

انگوٹھی جب آپؐ نے نجاشی اور قیصر روم کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے عرض کی کہ سلاطین مُہر کے بغیر کوئی تحریر قبول نہیں کرتے، اس بنا پر چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس میں اوپر تلے تین سطروں میں محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا بعض صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ صرف مہر لگانے کے وقت اس کا استعمال فرماتے تھے اور داہنے ہاتھ کی انگلی میں پہنتے تھے۔

خود و زِرہ لڑائیوں میں زِرہ اور مغفر بھی پہنتے تھے، اُحد کے معرکہ میں جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں، تلوار کا قبضہ کبھی چاندی کا بھی ہوتا تھا۔

غذا اور طریقۂ طعام اگرچہ ایثار اور قناعت کی وجہ سے لذیذ اور پُرتکلف کھانے کبھی نصیب نہ ہوتے یہاں تک کہ (جیسا کہ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ میں ہے) تمام عمر آپؐ نے چپاتی کی صورت تک نہیں دیکھی تاہم بعض کھانے آپؐ کو نہایت مرغوب تھے۔

مرغوب کھانے سرکہ، شہد، حلوہ، روغن زیتون، کدو خصوصیت کے ساتھ پسند تھے، سالن میں کدو ہوتا تو پیالہ میں اس کی قاشیں انگلیوں سے ڈھونڈتے، ایک دفعہ ام ہانیؓ کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کچھ کھانے کو ہے؟ بولیں کہ سرکہ ہے، فرمایا کہ جس گھر میں سرکہ ہو اس کو نادار نہیں کہہ سکتے۔ عرب میں ایک کھانا ہوتا ہے جس کو حیس کہتے ہیں، یہ گھی میں پنیر اور کھجور ڈال کر پکایا جاتا ہے، آپؐ کو یہ بہت مرغوب تھا۔

ایک دفعہ حضرت امام حسن علیہ السلام اور عبد اللہ بن عباسؓ سلمیٰ کے پاس گئے اور کہا آج ہم کو وہ کھانا پکا کر کھلاؤ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مرغوب تھا، بولیں تم کو وہ کیا پسند آئے گا؟ لوگوں نے اصرار کیا تو انھوں نے جَو کا آٹا پیس کر ہانڈی میں چڑھا دیا، اوپر سے روغن زیتون اور زیرہ اور کالی مرچیں ڈالیں، پک گیا تو لوگوں کے سامنے رکھا کہ یہ آپؐ کی محبوب ترین غذا تھی۔

گوشت کے اقسام میں سے آپؐ نے دُنبہ، مرغ، بٹیر (حباری) اونٹ، بکری، بھیڑ، گورخر، خرگوش، مچھلی کا گوشت کھایا ہے، دست کا گوشت بہت پسند تھا، شمائل ترمذی میں حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ دست کا گوشت فی نفسہٖ آپؐ کو چنداں مرغوب نہ تھا، بات یہ تھی کہ کئی کئی دن تک گوشت نصیب نہیں ہوتا تھا، اس لئے جب کبھی مل جاتا تو آپؐ چاہتے تھے کہ جلد پک کر تیار ہو جائے، دست کا گوشت جلدی گل جاتا ہے اس لئے آپؐ اسی کی فرمائش کرتے لیکن متعدد روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یوں بھی آپؐ کو یہ گوشت پسند تھا۔

حضرت صفیہؓ کے نکاح میں جب آپؐ نے ولیمہ کا کھانا کھلایا تھا تو صرف کھجور اور ستّو تھا، تربوز کو کھجور کے ساتھ ملا کر کھاتے تھے، پتلی ککڑیاں پسند تھیں، ایک دفعہ معوذ بن عفرا کی صاحبزادی نے کھجور اور پتلی ککڑیاں خدمت میں پیش کیں، بعض اوقات روٹی کے ساتھ بھی کھجور تناول فرمائی ہے۔

پانی، دودھ، شربت ٹھنڈا پانی نہایت مرغوب تھا، دودھ کبھی خالص نوش فرماتے، کبھی اس میں پانی ملا دیتے کشمش، کھجور، انگور، پانی میں بھگو دیا جاتا، کچھ دیر کے بعد وہ پانی نوش جاں فرماتے، کھانے کے ظروف میں ایک لکڑی کا پیالہ تھا جو لوہے کے تاروں سے بندھا ہوا تھا، روایت میں اسی قدر ہے، قرینہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ ٹوٹ گیا ہوگا، اس لئے تاروں سے جوڑ دیا ہوگا۔

معمولات طعام

دسترخوان پر جو کھانا آتا اگر ناپسند ہوتا تو اس میں ہاتھ نہ ڈالتے لیکن اس کو برا نہ کہتے، جو سالن سامنے ہوتا اسی میں ہاتھ ڈالتے، اِدھر اُدھر ہاتھ نہ بڑھاتے اور اس سے اوروں کو بھی منع فرماتے کھانا کبھی مسند یا تکیہ پر ٹیک لگا کر نہ کھاتے اور اس کو ناپسند فرماتے، میز یا خوان پر کبھی نہیں کھایا خوان زمین سے کچھ اونچی میز ہوتی تھی، عجم اسی پر کھانا رکھ کر کھاتے تھے، چونکہ یہ بھی فخر اور امتیاز کی علامت تھی، یعنی امراء اور اہل جاہ کے لئے مخصوص تھی، اس لئے آپ نے اس پر کھانا پسند نہیں فرمایا۔ کھانا صرف انگلیوں سے کھاتے، گوشت کو کبھی کبھی چھری سے کاٹ کر بھی کھاتے، صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے[2]۔ ابو داؤد میں ایک حدیث ہے کہ گوشت چھری سے نہ کاٹو، کیونکہ یہ اہل عجم کا شعار ہے لیکن ابو داؤد نے خود اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ اس حدیث کے راوی ابو معشر نجیح ہیں، جن کی نسبت بخاری نے لکھا ہے کہ وہ منکر الحدیث ہیں اور ان ہی منکرات میں حدیث مذکور بھی ہے[3]۔

خوش لباسی

گو تکلف اور جاہ پسندی سے آپ کو نفرت تھی، لیکن کبھی کبھی آپ نہایت قیمتی اور خوشنما لباس بھی زیب تن فرماتے تھے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جب حروریہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجے گئے تو وہ یمن کے نہایت قیمتی کپڑے پہن کر گئے۔ حروریہ نے کہا کیوں ابن عباس یہ کیا لباس ہے؟ بولے کہ تم اس پر معترض ہو، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہتر سے بہتر کپڑوں میں دیکھا ہے[4]۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نہایت متقشف تھے، ایک دفعہ بازار سے ایک شامی حلہ مول لیا، گھر پر آکر دیکھا تو اس میں سرخ دھاریاں تھیں جا کر واپس کر آئے، کسی نے یہ واقعہ حضرت اسماءؓ (حضرت عائشہؓ کی بہن) سے کہا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ منگا کر لوگوں کو دکھایا جس کی جیبوں اور آستینوں اور دامن پر دیبا کی سنجاف تھی[5]۔ بعض امراء و سلاطین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیش قیمت کپڑے ہدیہ بھیجے، آپ نے قبول فرمایا اور کبھی زیب تن کئے۔

مرغوب رنگ

رنگوں میں زرد رنگ بہت پسند تھا، حدیثوں میں آیا ہے کہ کبھی کبھی آپ تمام کپڑے یہاں تک کہ عمامہ بھی اسی رنگ کا رنگوا کر پہنتے تھے[6]۔ سفید رنگ بھی بہت پسند تھا فرماتے تھے کہ یہ رنگ سب رنگوں میں اچھا ہے۔

نامرغوب رنگ

سرخ لباس ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ عبد اللہ بن عمروؓ سرخ کپڑے پہن کر آئے تو فرمایا یہ کیا لباس ہے؟ عبد اللہ نے جا کر آگ میں ڈال دیا، آپ نے سنا تو فرمایا کہ جلانے کی ضرورت نہ تھی کسی عورت کو دے دیا ہوتا[7]۔

عرب میں سرخ رنگ کی مٹی ہوتی ہے جس کو مغرہ کہتے ہیں اس سے کپڑے رنگا کرتے تھے۔ یہ رنگ آپ کو نہایت ناپسند تھا، ایک دفعہ حضرت زینبؓ اس سے کپڑے رنگ رہی تھیں، آپ گھر میں آئے اور دیکھا تو واپس چلے

---

[1] غذا کے متعلق زیادہ تر واقعات شمائل ترمذی اور زاد المعاد ابن قیم سے ماخوذ ہیں [2] کتاب الاطعمہ باب القطع بالسکین [3] قسطلانی شرح صحیح بخاری ج ۸ صفحہ [illegible] مصر [4] ابو داؤد کتاب اللباس باب لبس الصوف والشعر [5] ابو داؤد باب الرخصۃ فی العلم وخیط الحریر [6] ابو داؤد باب فی المصبوغ [7] ابو داؤد باب فی الحمرۃ

گئے۔ حضرت زینبؓ سمجھ گئیں، کپڑے دھو ڈالے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ تشریف لائے اور جب دیکھ لیا کہ اس رنگ کی کوئی چیز نہیں تب گھر میں قدم رکھا[1]۔

ایک دن ایک شخص سرخ پوشاک پہن کر آیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ایک دفعہ صحابہؓ نے سواری کے اونٹوں پر سرخ رنگ کی چادریں ڈال دی تھیں، آپ نے فرمایا میں یہ دیکھنا نہیں چاہتا کہ یہ رنگ تم پر چھا جائے۔ فوراً صحابہ نہایت تیزی سے دوڑے اور چادریں اتار کر پھینک دیں[2]۔

خوشبو کا استعمال

خوشبو آپ کو بہت پسند تھی، کوئی خوشبو کی چیز ہدیۃً بھیجتا تو کبھی رد نہ فرماتے۔ ایک خاص قسم کا خوشبو یا عطر ہوتا ہے جس کو سکہ کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ آپ کے استعمال میں رہتا تھا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ جس گلی کوچہ سے آپ نکل جاتے وہ معطر ہو جاتا۔ اکثر فرمایا کرتے مردوں کی خوشبو ایسی ہونی چاہیے کہ خوشبو پھیلے اور رنگ نظر نہ آئے اور عورتوں کی ایسی کہ خوشبو نہ پھیلے اور رنگ نظر آئے[3]۔

لطافت اور نفاست پسندی

مزاج میں لطافت تھی۔ ایک شخص کو میلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہوتا کہ کپڑے دھو لیا کرے[4]۔ ایک دفعہ ایک شخص خراب کپڑے پہنے ہوئے خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے پوچھا تم کو کچھ مقدور ہے؟ بولا ہاں۔ ارشاد ہوا کہ خدا نے نعمت دی ہے تو صورت سے بھی اس کا اظہار ہونا چاہیے[5]۔ عرب تہذیب و تمدن سے کم آشنا تھے، مسجد میں آتے تو عین نماز میں دیواروں پر یا سامنے زمین پر تھوک دیتے۔ آپ اس کو نہایت ناپسند فرماتے۔ دیواروں پر تھوک کے دھبوں کو خود چھڑی کی نوک سے کھرچ کر مٹاتے۔ ایک دفعہ تھوک کا دھبہ دیوار پر دیکھا تو اس قدر غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا۔ ایک انصاری عورت نے دھبہ کو مٹایا اور اس جگہ خوشبو لا کر ملی۔ آپ نہایت خوش ہوئے اور اس کی تحسین کی[6]۔

کبھی کبھی مجلس عالی میں خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جاتیں جن میں اگر اور کبھی کبھی کافور ہوتا[7]۔ ایک دفعہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ خضاب لگانا کیسا ہے؟ بولیں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن میں اس لئے ناپسند کرتی ہوں کہ میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حنا کی بو ناگوار تھی[8]۔

اکثر مشک اور عنبر کا استعمال فرماتے۔

ایک شخص کے بال پریشان دیکھے تو فرمایا کہ اس سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ بالوں کو درست کر لے[9]۔ ایک دفعہ اون کی چادر اوڑھی، پسینہ آیا تو اتار کر رکھ دی[10]۔ ایک دن لوگ مسجد نبویؐ میں آئے۔ چونکہ مسجد تنگ تھی اور کاروباری لوگ میلے کپڑوں میں چلے آتے تھے، پسینہ آیا تو تمام مساجد میں بو پھیل گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہا کر آتے تو اچھا ہوتا۔ اسی دن سے غسل جمعہ ایک حکم شرعی بن گیا[11]۔

مسجد نبویؐ میں جھاڑو دینے کا التزام تھا۔ ام محجن نام ایک عورت جھاڑو دیا کرتی تھی۔ ابن ماجہ میں روایت ہے

---

[1] ابوداؤد۔ [2] یہ تمام روایتیں ابوداؤد کتاب اللباس میں ہیں۔ [3] شمائل ترمذی۔ [4] ابوداؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی غسل الثوب۔ [5] ابوداؤد کتاب اللباس۔ [6] نسائی کتاب المساجد۔ [7] نسائی صفحہ ۲۴۲، مطبوعہ دہلی باب البخور۔ [8] نسائی صفحہ ۲۹۵ باب کراہیۃ ریح الحناء۔ [9] ابوداؤد کتاب اللباس۔ [10] ایضاً۔ [11] اس مضمون میں متعدد حدیثیں بخاری شریف (غسل جمعہ) میں باختلاف الفاظ و واقعات مذکور ہیں۔

کہ آپ نے حکم دیا کہ مساجد میں بچے اور مجنوں نہ جانے پائیں اور خرید و فروخت نہ ہونے پائے اور یہ بھی حکم دیا کہ مساجد میں جمعہ کے دن خوشبو کی انگیٹھیاں جلائی جائیں۔ اہل عرب بداوت کے اثر سے لطافت اور صفائی کا نام نہ جانتے تھے اس بنا پر اس خاص باب میں آپ کو نہایت اہتمام کرنا پڑا تھا۔

عرب کی عادت تھی اور آج بھی بدویوں میں عموماً پائی جاتی ہے کہ راستہ میں بول و براز کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نہایت ناپسند فرماتے اور اس سے منع کرتے تھے۔ احادیث میں کثرت سے روایتیں موجود ہیں کہ آپ نے ان لوگوں پر لعنت کی ہے جو راستہ میں یا درختوں کے سایہ میں بول و براز کرتے ہیں۔ امراء کا دستور ہے کہ کاہلی کی وجہ سے کسی برتن میں پیشاب کر لیا کرتے ہیں اس سے بھی منع فرماتے تھے۔[1]

عرب میں پیشاب کے بعد استنجا کرنے یا پیشاب سے کپڑوں کے بچانے کا مطلق دستور نہ تھا، آپ ایک دفعہ راہ میں جا رہے تھے، دو قبریں نظر آئیں، فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ اپنے کپڑوں کو پیشاب سے محفوظ نہیں رکھتا تھا۔[2]

ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، دیواروں پر جا بجا دھبے تھے، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی ٹہنی تھی، اس لئے کھرچ کھرچ کر تمام دھبے مٹائے۔ پھر لوگوں کی طرف خطاب کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا، کیا تم پسند کرتے ہو کہ کوئی شخص تمہارے سامنے آکر تمہارے منہ پر تھوک دے، جب کوئی شخص نماز پڑھتا ہے تو خدا اس کے سامنے اور فرشتہ اس کے داہنے جانب ہوتے ہیں، اس لئے انسان کو سامنے یا دائیں جانب تھوکنا نہیں چاہیے۔[3]

ایک صحابی نے عین نماز میں (جب کہ وہ امام نماز تھے) تھوک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیکھ رہے تھے فرمایا کہ یہ شخص اب نماز نہ پڑھائے، نماز کے بعد یہ صاحب خدمت اقدس میں آئے اور پوچھا کہ کیا آپ نے یہ حکم دیا؟ فرمایا کہ ہاں تم نے خدا اور پیغمبر کو اذیت دی۔[4]

بودار چیزوں مثلاً پیاز، لہسن اور مولی سے نفرت تھی، حکم تھا کہ یہ چیزیں کھا کر لوگ مسجد میں نہ آئیں، بخاری میں حدیث ہے کہ جو شخص پیاز، لہسن کھائے وہ ہمارے پاس نہ آئے اور ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے خطبہ میں کہا کہ تم لوگ پیاز لہسن کھا کر مسجد میں آتے ہو حالانکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ کوئی شخص یہ چیزیں کھا کر مسجد میں آتا تو آپ حکم دیتے کہ مسجد سے نکال کر بقیع میں پہنچا دیا جائے۔[5]

سواری کا شوق

گھوڑے کی سواری آپ کو نہایت مرغوب تھی (آپ فرمایا کرتے الخیل معقود فی نواصیہا الخیر[6]) گھوڑوں کے علاوہ گدھے، خچر، اونٹ پر آپ نے سواری فرمائی ہے، آپ کے خاص سواری کے گھوڑے کا نام لحیف تھا، گدھے کا نام عفیر اور خچر کا نام دُلدُل اور تیہ اور اونٹنیوں کا نام قصواء اور عضباء تھا)

اسپ دوانی

مدینہ سے باہر ایک میدان تھا جس کی سرحد حصباء سے ثنیۃ الوداع تک ۶ میل تھی یہاں گھوڑ دوڑ کی مشق کرائی جاتی تھی۔ گھوڑے جو مشق کے لئے تیار کرائے جاتے تھے ان کی تیاری کا یہ طریقہ تھا کہ

---

[1] ترغیب و ترہیب کتاب الطہارۃ [2] صحیح بخاری عذاب القبر [3] ترغیب و ترہیب [4] ایضاً باب البصاق فی المسجد [5] مسلم ونسائی وابن ماجہ [6] نسائی صفحہ ۵۹۰ باب حب الخیل۔

پہلے اُن کو خوب دانا گھاس کھلاتے تھے، جب وہ موٹے تازے ہو جاتے تو اُن کی غذا کم کرنی شروع کرتے اور گھر میں باندھ کر چار جامہ کستے، پسینہ آتا اور خشک ہوتا، روزانہ یہ عمل جاری رہتا، رفتہ رفتہ جس قدر گوشت چڑھ گیا تھا خشک ہو کر ہلکا پھلکا، چھریرا بدن نکل آتا، یہ مشق چالیس دن میں ختم ہوتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام سکب تھا، ایک دفعہ اس کو آپؐ نے بازی میں دوڑایا، اس نے بازی جیتی تو آپؐ کو خاص مسرت ہوئی۔[1]

گھوڑ دوڑ کا اہتمام حضرت علیؓ کے سپرد تھا، انہوں نے اپنی طرف سے سراقہ بن مالک کو یہ خدمت سپرد کی اور اس کے چند قاعدے مقرر کئے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔[2]

(۱) گھوڑوں کی صفیں قائم کی جائیں اور تین دفعہ پکار دیا جائے کہ جس کو لگام درست کرنی یا بچہ کو ساتھ رکھنا یا زین الگ کر دینی ہو الگ کر لے۔

(۲) جب کوئی آواز نہ دے تو تین دفعہ تکبیریں کہی جائیں، تیسری تکبیر پر گھوڑے میدان میں ڈال دیئے جائیں۔

(۳) گھوڑے کے کان آگے نکل جائیں تو سمجھ لیا جائے گا کہ وہ آگے نکل گیا۔

حضرت علیؓ خود میدان کے انتہائی سرے پر بیٹھ جاتے اور ایک خط کھینچ کر دو آدمیوں کو دونوں کناروں پر کھڑا کر دیتے۔ گھوڑے ان ہی دونوں کے درمیان سے ہو کر نکلتے۔

اونٹوں کی دوڑ بھی ہوتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص سواری کا ناقہ عضباء ہمیشہ بازی لے جاتا، ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر سوار آیا اور مسابقت میں عضباء سے آگے نکل گیا، تمام مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا پر حق ہے کہ دنیا کی جو چیز گردن اٹھائے اس کو نیچا دکھائے۔[3]

رنگوں میں صندلی، مشکی اور کمیت بہت پسند تھا۔[4] گھوڑوں کی دم کاٹنے سے منع فرمایا کہ مکھی ہانکنے کا مورچھل ہے۔[5]

*

---

[1] دارقطنی ج ۲ ص ۵۵۵ (کتاب السبق بین الخیل مسند احمد اور بیہقی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے) [2] یہ پوری تفصیل دارقطنی ص ۵۵۳، ۵۵۲ (کتاب السبق بین الخیل) میں ہے، لیکن محدثانہ حیثیت سے یہ روایت ضعیف ہے [3] صحیح بخاری و نسائی و دارقطنی و مسند احمد عن انس باب الدواب ہذا السبق [4] نسائی مطبوعہ نظامی ص ۱۷۶ (باب ما یستحب من شیۃ الخیل) [5] کتب سنن کتاب الادب۔

معمولات

(ترمذی نے شمائل میں حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوقات کے تین حصے کر دیئے تھے. ایک عبادت الٰہی کے لئے، دوسرا عام خلق کے لئے اور تیسرا اپنی ذات کے لئے.

صبح سے شام تک کے معمولات

معمول تھا کہ نماز فجر پڑھ کر جا نماز پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ آفتاب اچھی طرح نکل آتا اور یہی وقت دربار نبوت کا ہوتا. لوگ پاس آکر بیٹھتے[1] اور آپ ان کو مواعظ و نصائح تلقین فرماتے[2]،

اکثر صحابہ سے پوچھتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ کسی نے دیکھا ہوتا تو عرض کرتے. آپ اس کی تعبیر بیان[3] فرماتے، کبھی خود اپنا خواب بیان فرماتے[4]. اس کے بعد ہر قسم کی گفتگو ہوتی. لوگ جاہلیت کے قصے بیان کرتے اشعار پڑھتے، ہنسی خوشی کی باتیں کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف مسکرا دیتے[5]. اکثر اسی وقت مال غنیمت اور وظائف و خراج وغیرہ کی تقسیم فرماتے[6].

بعض روایتوں میں ہے کہ جب دن کچھ چڑھ جاتا تو چاشت کی کبھی چار کبھی آٹھ رکعت نماز ادا فرماتے. گھر جا کر گھر کے دھندے میں مشغول رہتے، پھٹے کپڑوں کو سیتے، جوتا ٹوٹ جاتا تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے، دودھ دوہتے[7].

نماز عصر پڑھ کر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے پاس جاتے اور ذرا ذرا دیر ٹھہرتے، پھر جس کی باری ہوتی وہیں رات بسر فرماتے، تمام ازواج مطہرات وہیں جمع ہو جاتیں. عشا تک صحبت[8] رہتی، پھر نماز عشاء کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے اور واپس آکر سو رہتے. ازواج رخصت ہو جاتیں. نماز عشاء کے بعد بات چیت کرنی ناپسند فرماتے[9].

خواب

عام معمول یہ تھا کہ آپ اول وقت نماز عشاء پڑھ کر آرام فرماتے تھے، سوتے وقت التزاماً قرآن مجید کی کوئی سورت (بنی اسرائیل، زمر، حدید، حشر، صف، تغابن، جمعہ) پڑھ کر سوتے. شمائل ترمذی میں ہے کہ آرام فرماتے وقت یہ الفاظ فرماتے.

اللّٰھم باسمك اموت واحییٰ	خدایا تیرا نام لے کر مرتا ہوں اور زندہ رہتا ہوں

جاگتے تو فرماتے.

الحمد للّٰہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور.	اس خدا کا شکر جس نے موت کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف حشر ہوگا.

---

[1] صحیح مسلم باب تبسم صلعم و ابوداؤد ص ۳۱۸ [2] جامع ترمذی [3] صحیح مسلم کتاب التعبیر [4] صحیح بخاری کتاب التعبیر [5] نسائی باب قعود الامام فی مصلاہ

[6] بخاری اور حدیث کی کتابوں میں متعدد جزئی واقعات مذکور ہیں [7] صحیح بخاری باب ما یکون الرجل فی مہنۃ و مسند حنبل و مسند عائشہؓ

[8] صحیح مسلم باب القسم بین الزوجات [9] بخاری صلوٰۃ العشاء.

آدھی رات یا پہر رات رہے جاگ اٹھتے، مسواک ہمیشہ سرہانے رہتی تھی، اٹھ کر پہلے مسواک فرماتے، پھر وضو کرتے، اور عبادت میں مشغول ہوتے، آپ کی سجدہ گاہ[1] آپ کے سرہانے ہوتی تھی، ہمیشہ داہنی کروٹ اور دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ کر سوتے لیکن جب کبھی سفر میں پچھلے پہر منزل پر اتر کر آرام فرماتے تو معمول تھا کہ دایاں ہاتھ اونچا کر کے چہرہ اس پر ٹیک کر سوتے کہ گہری نیند آ جائے۔ نیند میں کسی قدر خراٹے کی آواز آتی تھی۔

بچھونے میں کوئی التزام نہ تھا، کبھی معمولی بستر پر، کبھی کھال پر، کبھی چٹائی اور کبھی خالی زمین پر آرام فرماتے۔

عبادت شبانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خانگی معمولات اور اوراد سے حضرت عائشہؓ کے برابر کوئی واقف نہ تھا، اُن سے مروی ہے کہ جب سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں تو آپؐ نے اس قدر نمازیں پڑھیں کہ پاؤں پر ورم آ گیا، بارہ مہینے تک باقی آیتیں رُکی رہیں، سال بھر کے بعد جب بقیہ آیتیں اتریں تو قیام لیل جو اب تک فرض تھا نفل رہ گیا۔

شب کو آٹھ رکعت متصل پڑھتے جن میں صرف آٹھویں رکعت میں قعدہ کرتے پھر ایک اور رکعت پڑھتے اور اس میں بھی جلسہ کرتے، پھر دو رکعت اور ادا کرتے، اس طرح ۱۱ رکعتیں ہو جاتیں، لیکن جب عمر زیادہ ہو گئی اور جسم ذرا بھاری ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھتے جن کے بعد دو رکعتیں اور ادا کرتے، کبھی کبھی رات کو اتفاقاً نیند کا غلبہ ہوتا اور اس معمول میں فرق آتا تو دن میں ۱۲ رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔[2]

ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے ایک اور روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

"عشا کی نماز جماعت سے پڑھ کر گھر میں چلے آتے اور یہاں چار رکعتیں پڑھ کر خواب راحت فرماتے، وضو کا پانی اور مسواک سرہانے رکھ دی جاتی، سو کر اٹھتے پہلے مسواک فرماتے پھر وضو کرتے اور جائے نماز پر آ کر آٹھ رکعتیں ادا کرتے۔"[3]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں اپنی خالہ میمونہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں تھیں) کے یہاں خاص اس غرض سے رہا کہ دیکھوں آپؐ رات کو کس طرح نماز پڑھتے ہیں، زمین پر فرش بچھا ہوا تھا، آپؐ نے اس پر آرام فرمایا، میں سامنے پڑا سو رہا، قریباً رات ڈھلے آپ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ آل عمران کی اخیر دس آیتیں پڑھیں، پانی کی مشک لٹکی ہوئی تھی اس سے وضو کیا، پھر نماز شروع کی، میں بھی وضو کر کے بائیں پہلو میں کھڑا ہو گیا، آپؐ نے ہاتھ پکڑ کر داہنی جانب پھیر دیا، ۱۲ رکعتیں پڑھ کر آپ سو رہے، یہاں تک کہ سانس کی آواز آنے لگی، صبح ہوتے حضرت بلالؓ نے اذان دی، آپ اٹھے، فجر کی سنتیں ادا کیں، پھر مسجد میں تشریف لے گئے۔

معمولات نماز ابتدا میں آپ ہر نماز کے لئے نیا وضو کرتے تھے، لیکن جب یہ گراں گزرنے لگا تو صرف پنجوقتہ مسواک رہ گئی۔ فتح مکہ میں آپؐ نے سب سے پہلے ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھیں، تاہم عادتاً آپ اکثر نئے وضو کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے، وضو میں عام معمول یہ تھا کہ پہلے تین بار ہاتھ دھوتے، پھر کلی کرتے اور ناک میں پانی ڈالتے، اس کے بعد تین تین بار منہ ہاتھ دھوتے، سر کا مسح کر کے اور تین بار پاؤں کو دھوتے، بعض

---

[1] یعنی سجدہ کا مقام جہاں بحالت نماز آپ سجدہ کرتے تھے۔ [2] یہ پوری تفصیل زرقانی میں حدیث کی متعدد کتابوں کے حوالے سے مذکور ہے [3] سنن ابوداؤد باب صلوٰۃ اللیل [4] صحیح مسلم و مسند ج ۵ ص ۲۲۵ [5] مسلم ج ۱ ص ۱۰۸ باب آخر صفۃ الوضوء واکمال

اوقات کسی عضو کو تین بار اور کسی عضو کو دو بار اور کسی کو ایک بار دھوتے[1]۔

سنن و نوافل زیادہ تر گھر ہی میں ادا فرماتے۔ اذان صبح ہی کے ساتھ اٹھتے اور فجر کی دو رکعت سنت نہایت اختصار کے ساتھ ادا کرتے، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مجھے بعض اوقات یہ خیال ہوتا تھا کہ آپؐ نے سورۂ فاتحہ پڑھی یا نہیں[2]، لیکن فرض کی دو رکعتوں میں عموماً طویل سورتیں پڑھتے، حضرت عبداللہ بن سائب سے مروی ہے کہ ایک بار آپؐ نے مکہ میں نماز فجر میں سورۂ مومنین پڑھی، اسی طرح کبھی واللیل اذا عسعس اور کبھی سورۂ ق پڑھتے، صحابہؓ کا اندازہ ہے کہ آپؐ صبح کی نماز میں ساٹھ سے لے کر سو آیتوں تک پڑھتے تھے۔

ظہر و عصر میں اگرچہ بہ نسبت فجر کے تخفیف فرماتے تھے، تاہم ابتدائی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ اتنی بڑی سورہ پڑھتے کہ آدمی بقیع تک جاتا تھا اور وہاں اپنا کام کرتا تھا، پھر پلٹ کر گھر آتا تھا اور وضو کرتا تھا اور پہلی رکعت میں جا کر شامل ہو جاتا تھا۔ صحابہ نے اندازہ کیا تو معلوم ہوا کہ ظہر کی اول دو رکعتوں میں آپؐ اس قدر قیام فرماتے تھے جس میں الٓمٓ تنزیل السجدہ کے برابر سورہ پڑھی جا سکتی ہے، اخیر کی دو رکعتوں میں یہ مقدار نصف رہ جاتی تھی، عصر کی دونوں پہلی رکعتوں میں ظہر کی آخری رکعتوں کے برابر قیام فرماتے تھے اور اخیر کی دو رکعتوں میں پہلی رکعتوں کی نصف مقدار رہ جاتی تھی، حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے برابر اور دوسری رکعت میں پندرہ آیتوں کے یا اس کے نصف کے برابر اور عصر میں پندرہ آیتوں کے برابر پڑھا کرتے تھے، جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں کہ ظہر میں آپؐ سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھتے تھے۔

مغرب کی نماز میں والمرسلٰت اور سورۂ طور پڑھتے تھے۔

عشاء کی نماز میں والتّین والزّیتون اور اسی کے برابر کی سورتیں پڑھتے تھے، تہجد کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء، جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ اور دوسری رکعت میں اِذَا جَآءَکَ الْمُنٰفِقُوْنَ اور کبھی سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتاک حدیث الغاشیۃ۔ عیدین میں بھی دو یہی سورتیں یعنی سبح اسم ربک الاعلیٰ، اور ھل اتاک پڑھتے تھے، اتفاق سے اگر عید اور جمعہ ایک ساتھ پڑ جاتا تو دونوں نمازوں میں یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے تھے، جمعہ کے دن کی نماز صبح میں الٓمٓ تنزیل السجدہ اور ھل اتی علی الانسان حین من الدھر پڑھنے کا معمول تھا[3]۔

معمولات خطبہ تعلیم و ارشاد و ہدایت کے لئے آپؐ اکثر خطبہ دیا کرتے تھے، بالخصوص جمعہ کے لئے تو خطبہ لازمی تھا، جمعہ کے خطبات میں معمول یہ تھا کہ جب لوگ جمع ہو جاتے تو آپؐ نہایت سادگی کے ساتھ گھر سے نکلتے، مسجد میں داخل ہوتے اور لوگوں کو سلام کرتے، پھر منبر پر تشریف لے جاتے تو لوگوں کی طرف رخ کر کے سلام کرتے اور اذان کے بعد فوراً خطبہ شروع کر دیتے۔ پہلے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا تھا، لیکن جب منبر بن گیا تو

---

[1] مسلم ج۱ ص۱۰۱ باب آخر فی صفۃ الوضوء [2] مسلم ج۱ ص۲۰۲ باب رکعتی سنۃ الفجر والحث علیہا [3] مسلم ج۱ ص۱۸۵ باب القراءۃ فی الظہر والعصر وغیرہما [4] یہ تمام روایتیں صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجمعہ والعیدین میں مذکور ہیں۔

ہاتھ میں عصا لینا چھوڑ دیا۔ خطبہ ہمیشہ نہایت مختصر اور جامع ہوتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں عموماً سورۂ "ق" پڑھتے تھے[1]۔ اس میں قیامت اور حشر و نشر کا بہ تفصیل ذکر ہے۔

خطبہ ہمیشہ حمد خداوندی کے ساتھ شروع کرتے تھے، اگر اثنائے خطبہ میں کوئی کام پیش آجاتا تو منبر سے اُتر کر اس کو کر لیتے۔ پھر منبر پر جا کر خطبہ کو پورا فرماتے، ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، اسی حالت میں ایک آدمی نے آکر کہا یا رسول اللہ! میں مسافر آدمی ہوں، اپنے دین کی حقیقت سے ناواقف ہوں، اس کے متعلق پوچھنے آیا ہوں، آپ منبر سے اتر آئے۔ ایک کرسی رکھ دی گئی، اس پر بیٹھ گئے اور اس کو تعلیم و تلقین کی، پھر جا کر خطبہ کو پورا کیا[2]، ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے، امام حسین علیہ السلام سُرخ کپڑے پہنے ہوئے مسجد میں آگئے، چونکہ بچپن کی وجہ سے لڑکھڑاتے آتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو ضبط نہ ہوسکا۔ منبر سے اتر آئے اور گود میں اٹھا لیا اور یہ آیت پڑھی۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ[3]۔

خطبہ کی حالت میں لوگوں کو بیٹھنے اور نماز پڑھنے کا بھی حکم دیتے تھے، چنانچہ عین خطبہ کی حالت میں ایک شخص مسجد میں آیا۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے نماز پڑھی؟ اس نے کہا نہیں، آپ نے فرمایا، "اٹھو اور پڑھو"[4]

میدانِ جہاد میں جب خطبہ دیتے تھے تو کمان پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ ہاتھ میں تلوار لے کر کھڑے ہوتے تھے لیکن ابن قیم نے لکھا ہے کہ آپ نے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لی[5]۔ وعظ و ارشاد کے لئے عموماً ناغہ دے کر خطبہ دیا کرتے تھے تاکہ لوگ گھبرا نہ جائیں[6]۔

معمولاتِ سفر

حج، عمرہ اور زیادہ تر جہاد کی وجہ سے آپ کو اکثر سفر کی ضرورت پیش آیا کرتی تھی، سفر میں معمول یہ تھا کہ پہلے ازواجِ مطہرات میں قرعہ ڈالتے جس کے نام قرعہ پڑتا وہ ہم سفر ہوتیں[7]، جمعرات کے دن سفر کرنا پسند فرماتے تھے اور صبح کے تڑکے روانہ ہو جاتے تھے[8]، افواج کو بھی جب کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اسی وقت جب سواری سامنے آتی اور رکاب میں قدم مبارک رکھتے تو بسم اللہ کہتے اور جب زین پر سوار ہو جاتے تو تین بار تکبیر کہتے۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھتے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ وَاِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ[9]

پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارا فرماں بردار بنا دیا، حالانکہ ہم خود اس کو مطیع نہیں کر سکتے تھے اور ہم اپنے خدا کی طرف پلٹنے والے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم [2] ادب المفرد مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۳ باب الجلوس علی السریر [3] جامع ترمذی مناقب حسنینؓ [4] بخاری ج ۱ ص ۱۲۷ باب اذا رای الامام رجلا جاء وہو یخطب امرہ ان یصلی رکعتین [5] زاد المعاد ج ۱ اول ص ۱۲۱ فصل فی ہدیہ فی خطبہ [6] بخاری ج ۱ باب ما کان النبی یتخولہم بالموعظۃ [7] بخاری ج ۲ باب حدیث الافک کتاب المغازی [8] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای یوم یستحب السفر و باب فی الابتکار فی السفر [9] ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ سوار ہو جانے کے بعد تین تین بار تکبیر و تحمید کرتے پھر یہ دعا پڑھتے، سبحانک انی ظلمت نفسی فاغفر لی انہ لا یغفر الذنوب الا انت (ابوداؤد کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا رکب)

پھر یہ دعا کرتے۔

اللّٰھم انا نسئلك فی سفرنا ھذا البر والتقوی ومن العمل ما ترضی اللّٰھم ھون علینا سفرنا واطولنا بعدہ اللّٰھم انت الصاحب فی السفر والخلیفة فی الاھل اللّٰھم انی اعوذ بك من وعثاء السفر وکابة المنقلب وسوء المنظر فی الاھل والمال۔

خداوندا! اس سفر میں ہم تجھ سے نیکی، پرہیزگاری اور عمل پسندیدہ کی درخواست کرتے ہیں۔ خداوندا! ہمارے اس سفر کو آسان اور اس کی مسافت کو طے کر دے۔ خداوندا! سفر میں تو رفیق ہے، بال بچوں کے لئے تو ہمارا قائم مقام ہے خداوندا میں سفر اور واپسی کے آلام و مصائب اور گھربار کے مناظر قبیحہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

جب واپس ہوتے تو اس میں اس قدر اضافہ کر دیتے آئبون، تائبون، عابدون لربنا حامدون راستے میں جب کسی چوٹی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب اس سے نیچے اترتے تو ترنم ریز تسبیح ہوتے، صحابہ بھی آپ کے ہم آواز ہو کر تکبیر و تسبیح کا غلغلہ بلند کرتے، جب کسی منزل پر اترتے تو یہ دعا فرماتے۔[1]

یا ارض ربی و ربك اللّٰہ اعوذ باللّٰہ من شرك وشر ما فیك وشر ما خلق فیك وشر ما یدب علیك واعوذ بك من اسد و اسود ومن الحیة والعقرب ومن ساکنی البلد ومن والد وما ولد[2]۔

اے زمین! میرا خدا تیرا پروردگار خدا ہے، میں تیری برائی سے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تیرے اندر پیدا کی گئی ہے اور اس چیز کی برائی سے جو تجھ پر چلتی ہے پناہ مانگتا ہوں، خداوندا تجھ سے شیر، سانپ، بچھو اور اس گاؤں کے رہنے والوں اور آدمیوں سے پناہ مانگتا ہوں۔

جب کسی آبادی میں داخل ہونا چاہتے تو یہ دعا پڑھتے۔

اللّٰھم رب السمٰوٰت السبع وما اظللن و رب الارضین السبع وما اقللن و رب الشیاطین وما اضللن و رب الریاح وما ذرین اسألك خیر ھذہ القریة وخیر اھلھا و اعوذ بك من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا (ابوداؤد کتاب الجہاد، باب ما یقول الرجل اذا نزل المنزل)

خداوندا! اے ساتوں آسمان اور ان تمام چیزوں کے پروردگار جن پر وہ سایہ فگن ہیں اے ساتوں زمینوں اور ان تمام مخلوقات کے پروردگار جو ان پر موجود ہیں اے شیاطین اور ان تمام نفوس کے پروردگار جن کو وہ گمراہ کرتے ہیں اے ہوا اور ان تمام اشیا کے پروردگار جن کو وہ اڑاتی ہیں، میں تجھ سے اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی بھلائی کی درخواست کرتا ہوں اور اس گاؤں اور اس گاؤں کے رہنے والوں کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔

مدینہ پہنچتے تو پہلے مسجد میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرماتے۔[3] پھر مکان کے اندر تشریف لے جاتے۔ تمام لوگوں کو حکم تھا کہ سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر کے اندر نہ چلے جائیں تاکہ عورتیں اطمینان کے ساتھ سامان درست کر لیں۔[4]

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یقول الرجل اذا سافر۔ [2] زاد المعاد فصل فی ہدیہ فی السفر۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی اعطاء البشیر۔

[4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔

معمولاتِ جہاد جہاد میں معمول یہ تھا کہ جب فوج کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو امیر العسکر کو خاص طور پر پرہیزگاری اختیار کرنے اور اپنے رفقا کے ساتھ نیکی کرنے کی ہدایت فرماتے۔ پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے۔

اغزوا باسم اللہ فی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ اغزوا ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا۔	خدا کے نام پر خدا کی راہ میں کفار سے لڑو، خیانت اور بدعہدی نہ کرنا، مُردوں کے ناک کان نہ کاٹنا، بچوں کو قتل نہ کرنا۔

اس کے بعد شرائطِ جہاد کی تلقین کرتے۔[1]

جب فوج کو رخصت کرتے تو یہ الفاظ فرماتے۔

استودع اللہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم۔[2]	میں تمہارے فرض کو، امانت کو اور تمہارے اعمال کے نتائج کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔

جب خود شریکِ جہاد ہوتے اور حملہ کے مقام پر شب کو پہنچتے تو صبح کا انتظار کرتے، صبح ہو جاتی تو حملہ کرتے۔[3] اگر صبح کے وقت حملہ کرنے کا اتفاق نہ ہوتا تو دوپہر ڈھلے حملہ کرتے۔[4] جب کوئی مقام فتح ہو جاتا تو اقامتِ عدل و انصاف کے لئے وہاں تین دن تک قیام فرماتے۔[5] جب فتح و ظفر کی خبر آتی تو سجدۂ شکرانہ بجالاتے۔[6] جب میدانِ جہاد میں شریکِ کارزار ہوتے تو یہ دعا فرماتے۔

اللّٰھم انت عضدی ونصیری بک احول وبک اصول وبک اقاتل۔[7]	خداوندا تو میرا دست و بازو ہے تو میرا مددگار ہے تیرے سہارے پر میں مدافعت کرتا ہوں، حملہ کرتا ہوں اور لڑتا ہوں۔

معمولاتِ عیادت وغیرہ بیماروں کی عیادت و غمخواری آپ ضرور فرماتے تھے اور صحابہ کو ارشاد ہوتا تھا کہ عیادت بھی ایک مسلمان کا فرض ہے۔[8] ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں معمول شریف یہ تھا کہ جب کسی شخص کا موت کا وقت قریب آ جاتا تو صحابہ آپ کو اس کی اطلاع دیتے۔ آپ اس کے مرنے سے پہلے تشریف لاتے اس کے لئے دعائے مغفرت فرماتے اور اخیر دم تک اس کے پاس بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ دمِ واپسیں کے انتظار میں آپ کو اس قدر دیر ہو جاتی کہ آپ کو تکلیف ہونے لگتی۔ صحابہ نے تکلیف کا احساس کیا اور اب ان کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص مر جاتا تو آپ کو اس کی موت کی خبر دیتے۔ آپ اس کے مکان پر تشریف لے جاتے، اس کے لئے استغفار فرماتے، جنازہ کی نماز پڑھتے۔ اس کے بعد اگر مٹی دینا چاہتے تو ٹھہر جاتے ورنہ واپس چلے آتے، لیکن صحابہ کو آخر آپ

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ووصیتہ ایاہم باداب الغزو وغیرہا۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع۔

[3] بخاری کتاب المغازی ذکر غزوۂ خیبر۔ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی ای وقت یستحب اللقاء۔ [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الامام یقیم عند الظہور علی العدو بارضہم۔ [6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔ [7] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یدعی عند اللقاء۔

[8] صحیح بخاری باب وجوب عیادۃ المریض۔

کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ ہوئی۔ اس لئے خود جنازہ آپؐ کے مکان تک لانے لگے اور یہی عام معمول ہوگیا۔[1]

عیادت کے لئے جب کسی بیمار کے پاس تشریف لے جاتے تو اس کو تسکین دیتے، پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔[2] اس کی صحت کے لئے دُعا فرماتے[3] اور کہتے انشاء اللہ طہور، خدا نے چاہا تو خیریت ہے، کوئی بدفالی کے خوف سے کہتا تو ناپسند فرماتے۔ ایک بار ایک اعرابی مدینہ میں آکر بیمار پڑ گیا، آپؐ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور کلماتِ تسکین ادا فرمائے۔ اس نے کہا تم نے خیریت کہا شدید تپ ہے، جو قبر ہی میں لاکر چھوڑے گی۔ آپؐ نے فرمایا ہاں اب یہی سہی۔[4]

معمولاتِ ملاقات معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ کرتے، کوئی شخص اگر جھک کر آپؐ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپؐ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔[5]

جو شخص حاضر ہونا چاہتا، دروازے پر کھڑے ہو کر پہلے السلام علیکم کہتا، پھر پوچھتا کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (خود بھی آپؐ کسی سے ملنے جاتے تو اسی طرح اجازت مانگتے۔) کوئی شخص اس طریقہ کے خلاف کرتا تو آپؐ اس کو واپس کر دیتے، ایک دفعہ بنو عامر کا ایک شخص آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو کر پکارا کہ اندر آ سکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ جا کر ان کو اجازت طلبی کا طریقہ سکھا دو، یعنی پہلے سلام کر لے تب اجازت مانگے۔

ایک دفعہ صفوان بن امیہ نے جو قریش کے رئیس اعظم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے بھائی کلدہ کے ہاتھ دودھ، ہرن کا بچہ اور لکڑیاں بھیجیں، کلدہ یونہی بے اجازت چلے آئے، آپؐ نے فرمایا کہ واپس جاؤ اور سلام کر کے اندر آؤ۔[6]

ایک دفعہ حضرت جابرؓ زیارت کو آئے اور زیادہ دیر دروازہ پر دستک دی، آپؐ نے پوچھا کون ہے۔ بولے میں، آپؐ نے فرمایا "میں میں" یعنی یہ کیا طریقہ ہے، نام بتانا چاہیے۔

جب آپؐ خود کسی کے گھر پر جاتے تو دروازہ کے دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور السلام علیکم کہہ کر اذن طلب فرماتے (راوی کا بیان ہے کہ آپؐ عین دروازہ کے سامنے اس وجہ سے نہ کھڑے ہوتے کہ اس وقت تک دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا)

اگر صاحب خانہ اذن نہ دیتا تو پلٹ آتے، چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سعدؓ بن عبادہ کے گھر تشریف لائے اور باہر کھڑے ہو کر اذن طلبی کے لئے السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہا، سعدؓ نے اس طرح آہستہ سلام کا جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں سُنا، حضرت سعدؓ کے فرزند قیس بن سعدؓ نے کہا کہ آپ رسول اللہ

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۶۶ [2] صحیح بخاری باب وضع الید علی المریض [3] باب دعاء العائد للمریض [4] باب عیادۃ الاعراب

[5] ابوداؤد و ترمذی [6] یہ دونوں روایتیں ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۶ میں ہیں۔

کو اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ حضرت سعدؓ نے کہا چپ رہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سلام کریں گے جو ہمارے لئے برکت کا سبب ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ السلام علیکم کہا اور سعدؓ نے پھر اسی طرح جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر تیسری دفعہ اسی طریقہ سے اذن طلب کیا اور جب کوئی جواب نہ ملا تو آپؐ واپس چلے، حضرت سعدؓ نے آپ کو جاتے دیکھا تو دوڑ کر گئے اور عرض کی کہ میں آپؐ کا سلام سن رہا تھا لیکن آہستہ جواب دیتا تھا کہ آپ بار بار سلام فرمادیں[1])

(کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو ممتاز مقام پر بیٹھنے سے پرہیز فرماتے، ایک بار آپؐ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے مکان پر تشریف لے گئے، انھوں نے آپ کے بیٹھنے کے لئے چمڑے کا ایک گدا ڈال دیا، لیکن آپ زمین پر بیٹھ گئے اور گدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے درمیان آگیا[2])

معمولات عامہ

(تیمن یعنی داہنی طرف سے داہنے ہاتھ سے کام کرنا آپؐ کو محبوب تھا، جوتا پہلے داہنے پاؤں میں پہنتے، مسجد میں پہلے داہنا پاؤں رکھتے، مجلس میں کوئی چیز تقسیم فرماتے تو داہنی طرف سے، اسی طرح کسی کام کو شروع کرنا چاہتے تو پہلے بسم اللہ کہہ لیتے)

*

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] ادب المفرد ص ۲۱۹۔

مجالسِ نبوی ؐ

دربارِ نبوت شہنشاہِ کونینؐ کا دربار نقیب و چاؤش اور خیل و حشم کا دربار نہ تھا، دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے، تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص پیکرِ تصویر نظر آتا تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ اُن کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوتی ہیں، یعنی کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا۔ گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا۔ لیکن یہ امتیازِ مراتب نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا۔ سب سے پہلے آپؐ اہلِ حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کی معروضات سن کر ان کی حاجت براری فرماتے۔

تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے۔ خود بھی آپؐ مؤدب ہو کر بیٹھتے۔ جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا، کوئی شخص بولتا تو جب تک وہ چپ نہ ہو جاتے دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا۔ اہلِ حاجت عرض و معا میں ادب کی حد سے بڑھ جاتے تو آپؐ کمالِ حلم کے ساتھ برداشت فرماتے۔

آپؐ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے، جو بات ناپسند ہوتی اُس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے۔ کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپؐ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہے تو شکریہ قبول فرماتے۔ مجلس میں جس قسم کا ذکر چھڑ جاتا آپؐ بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ ہنسی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے، خود بھی مذاقیہ باتیں فرماتے، کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آجاتا، تو حسبِ مرتبہ اس کی تعظیم فرماتے اور فرماتے اکرموا کریم کل قوم۔ مزاج پرسی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے؟ یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک نہیں پہنچا سکتے" مجھ کو اُن کے حالات اور ضروریات کی خبر دو۔

ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آجاتا تھا تو سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا اور امراء جب دربار جاتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے رہتے۔ آپؐ نے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ جس کو یہ پسند آتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈنی چاہیئے۔[1] البتہ جوشِ محبت میں آپؐ کسی کسی کے لئے کھڑے ہو جاتے، چنانچہ حضرت فاطمہ زہراؓ جب کبھی آجاتیں تو اکثر کھڑے ہو جاتے اور فرطِ محبت سے اُن کی پیشانی چومتے۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے لئے بھی آپؐ نے اٹھ کر چادر بچھادی تھی، اسی طرح ایک دفعہ آپؐ کے رضاعی بھائی آئے تو اُن کے لئے بھی محبت سے کھڑے ہو گئے اور اُن کو اپنے سامنے بٹھایا۔[2]

ہر شخص کو اس کے رتبہ کے مناسب جگہ ملتی۔ کسی شخص کے دل میں یہ خیال نہیں آنے پاتا کہ دوسرا شخص اس

---

[1] ابو داؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل۔ [2] ابو داؤد کتاب الادب بر الوالدین۔

سے زیادہ عزت یاب ہے، جب کوئی شخص اچھی بات کہتا تو آپ تحسین فرماتے اور نامناسب گفتگو کرتا تو اس کو مطلع فرما دیتے[1]

ایک دفعہ دو شخص مجلس اقدس میں حاضر تھے۔ ان میں ایک معزز اور دوسرا کم رتبہ تھا، معزز صاحب کو چھینک آئی، لیکن انھوں نے اسلامی شعائر کے موافق الحمد للہ نہیں کہا، دوسرے صاحب کو بھی چھینک آئی، انھوں نے الحمد للہ کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب معمول یرحمک اللہ کہا، معزز صاحب نے شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ انھوں نے خدا کو یاد کیا تو میں نے بھی کیا، تم نے خدا کو بھلا دیا تو میں نے بھی تم کو بھلا دیا[2]

صحابہ کو اس بات کی سخت تاکید تھی کہ کسی کی شکایت یا عیوب آپ تک نہ پہنچائیں۔ آپ فرماتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو سب کی طرف سے صاف جاؤں[3]۔

مجالس ارشاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تلقین کا فیض اگرچہ سفر، حضر، جلوت، خلوت، نشست، برخاست، غرض ہر وقت جاری رہتا تھا، تاہم اس سے وہی لوگ مستفیض ہو سکتے تھے جو اتفاق سے موقع پر ہوتے تھے، اس بنا پر آپ نے تعلیم و ارشاد کے لیے بعض اوقات خاص کر دیئے تھے کہ لوگ پہلے سے مطلع رہیں اور جن کو استفادہ منظور ہو، وہ آسکیں۔

یہ صحبتیں عموماً مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھیں، مسجد نبوی میں ایک چھوٹا سا صحن تھا، کبھی آپ وہاں نشست فرماتے۔ ابتداءً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست کے لیے کوئی ممتاز جگہ نہ تھی، باہر سے اجنبی لوگ آتے تو آپ کے پہچاننے میں دقت ہوتی، صحابہ نے ایک چھوٹا سا مٹی کا چبوترہ بنا دیا، آپ اس پر تشریف رکھتے باقی دونوں طرف صحابہ حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتے تھے۔

آداب مجالس

ان مجالس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی، عموماً بدو اپنے اسی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے۔

خلق نبوی کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بن جاتا ہے، آپ پیغمبر خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں، صحابہ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمت اقدس میں حاضر ہیں۔ ایک شخص آتا ہے اور اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا، لوگوں سے پوچھتا ہے "محمد کون ہے؟" صحابہ بتاتے ہیں کہ یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، وہ کہتا ہے۔ اے ابن عبد المطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا خفا نہ ہونا، آپ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں[4]

بایں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب و وقار اور آداب نبوت کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ، اخلاق، مذہب اور تزکیہ نفوس تک محدود تھا، اس کے علاوہ اور باتیں منصب نبوت سے خارج تھیں، لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے، مثلاً یا رسول اللہ! میرے باپ کا نام کیا ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے، وہ کہاں ہے؟ آپ اس قسم کے سوالات

---

[1] یہ تمام تفصیل شمائل ترمذی کی دو مفصل روایتوں سے ماخوذ ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اخلاق کا ذکر ہے۔ [2] ادب المفرد امام بخاری۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب۔ [4] ایضاً ص ۲۰۳۔ [5] ابوداؤد باب القدر۔ [6] بخاری ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان۔

کو ناپسند فرماتے تھے۔

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کئے گئے تو آپ نے برہم ہو کر فرمایا کہ جو پوچھنا ہو پوچھو میں سب کا جواب دوں گا؛ حضرت عمرؓ نے آپ کے چہرہ کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا: رضیت[1] الخ۔

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا، ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا، بعض اوقات آپ گفتگو کرتے ہوتے، کوئی صحرانشین بدو جو آدابِ مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعۃً آجاتا، اور عین سلسلۂ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا، آپ سلسلۂ تقریر قائم رکھتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جواب دیتے ایک دفعہ آپ تقریر فرما رہے تھے۔ ایک بدو آیا اور آنے کے ساتھ اس نے پوچھا کہ قیامت کب آئے گی؛ آپ تقریر کرتے رہے، حاضرین سمجھے کہ آپ نے نہیں سنا۔ کسی نے کہا سنا لیکن آپ کو ناگوار ہوا۔ آپ گفتگو سے فارغ ہو چکے تو دریافت فرمایا کہ پوچھنے والا کہاں ہے؟ بدو نے کہا۔ میں یہ حاضر ہوں۔ آپ نے فرمایا جب لوگ امانت کو ضائع کرنے لگیں گے۔ بولا کہ امانت کیونکر ضائع ہو گی۔ فرمایا، جب نااہلوں کے ہاتھ میں کام آئے گا[2]۔

اوقاتِ مجلس اس قسم کی مجالس کے لئے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا، نمازِ فجر کے بعد آپ بیٹھ جاتے اور فیوضِ روحانی کا سرچشمہ جاری ہو جاتا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی، چنانچہ کعبؓ بن مالک پر جب غزوۂ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ انہی مجالس میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودیٔ مزاج کا پتہ لگاتے، خود ان کے الفاظ یہ ہیں۔

واتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاسلم علیہ وھو فی مجلسہ بعد الصلوٰۃ فاقول فی نفسی ھل حرک شفتیہ برد السلام ام لا[3]۔	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا سلام کرتا تھا اور آپ بعد نماز کے اپنی مجلس میں ہوتے تھے تو میں اپنے جی میں کہتا تھا کہ آپ نے جواب سلام میں اپنے لب ہلائے یا نہیں۔

صبح کی مجلسوں میں کبھی کبھی آپ وعظ فرماتے، ترمذی اور ابوداؤد میں عرباضؓ بن ساریہ سے روایت ہے؛

وعظنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یوماً بعد صلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منھا العیون ووجلت منھا القلوب[4]۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صبح کی نماز کے بعد ایک بلیغ وعظ کیا، جس سے آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔

نماز کے بعد جو مجلس منعقد ہوتی اس میں وعظ و نصیحت اور اس قسم کی جزئی باتوں پر گفتگو ہوتی تھی، لیکن ان اوقات کے علاوہ آپ خاص طور پر حقائق و معارف کے اظہار کے لئے مجالس منعقد فرماتے تھے، یہی مجالس ہیں جن کی نسبت احادیث میں یہ الفاظ آتے ہیں۔

---

[1] بخاری کتاب العلم۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۴۔ [3] بخاری جز ۱ صفحہ ۹۔۔ حدیث کعبؓ بن مالک۔ [4] ترمذی صفحہ ۴۴۲۔

کان یوماً بارزاً للناس[1] ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن عام طور پر لوگوں کیلئے باہر نکلے تھے

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا، اس لئے آپ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے اس بناء پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے اُن پر آپ نہایت ناراض ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ صحابہ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے، ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی وہیں بیٹھ گئے دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہیں ملا، اس لئے سب کے پیچھے بیٹھے۔ لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی، خدا نے بھی اس کو پناہ دی، ایک نے حیا کی، خدا بھی اس سے شرمایا۔ ایک نے خدا سے منہ پھیرا، خدا نے بھی اس سے منہ پھیر لیا[2]۔

پند و نصائح کتنے ہی موثر طریقہ سے بیان کئے جائیں، لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اُکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں، اس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دے کر منعقد فرماتے تھے بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یتخولنا بالموعظۃ فی الایام کراھۃ السآمۃ علینا۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو ناغہ دے کر نصیحت فرماتے تھے کہ ہم لوگ اکتا نہ جائیں۔

عورتوں کے لئے مخصوص مجالس

ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا، اس بناء پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لئے خاص دن مقرر فرمایا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ درخواست منظور کی اور اُن کے وعظ و ارشاد کے لئے ایک خاص دن مقرر ہو گیا[3]۔

اگرچہ مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی اور خاتونانِ حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے، تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلسِ عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرطِ حیاء سے آپ کو ناگوار ہوتا۔

اس قسم کے پردے کی بات مرد بھی مجمع عام میں پوچھتے تو آپ کو تکدر ہوتا۔ ایک دفعہ ایک انصاری نے (جن کا نام عاصم تھا) مجلس عام میں پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو غیر کے ساتھ دیکھ لے تو کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار ہوا اور آپ نے اُن کو ملامت کی[4]۔

طریقۂ ارشاد

کبھی کبھی آپ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے اس سے لوگوں کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے، لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا درخت ہو گا، لیکن میں کم سن تھا اس لئے جرأت نہ کر سکا بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضور بتائیں، آپ نے ارشاد فرمایا۔ کھجور، عبد اللہ بن عمرؓ کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرأت کر کے

---

[1] سنن ابن ماجہ ص۱۲ [2] بخاری ج ۱ ص ۱۶ کتاب العلم [3] بخاری کتاب العلم [4] ایضاً۔

اپنا خیال ظاہر کر دیا۔[۱]

ایک روز آپؐ مسجد میں تشریف لائے، صحابہؓ کے دو حلقے قائم تھے، ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دوسرے حلقہ میں علمی باتیں ہو رہی تھیں، آپؐ نے فرمایا دونوں عمل خیر کر رہے ہیں، لیکن خدا نے مجھ کو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے۔ یہ کہہ کر علمی حلقہ میں بیٹھ گئے۔[۲]

ان مجالس میں دقیق مباحث کو جن کی تہ تک عوام نہیں پہنچ سکتے ناپسند فرماتے تھے چنانچہ ایک روز صحابہؓ کی مجلس میں مسئلہ تقدیر پر گفتگو ہو رہی تھی آپؐ نے سنا تو حجرہ سے نکل آئے، آپؐ کا چہرہ اس قدر سرخ ہو گیا تھا گویا عارض مبارک پر کسی نے انار کے دانے نچوڑ دیئے ہیں، آپؐ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا تم اس لئے پیدا کئے گئے ہو، قرآن کو باہم ٹکرا رہے ہو، گزشتہ امتیں ان ہی باتوں سے برباد ہوئیں۔[۳]

ان مجالس کا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ جن مسائل میں باہم اختلاف کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح فیصلہ کر دیتے، مثلاً شہرت طلبی اور جاہ پرستی خلوص عمل کے منافی سمجھی جاتی ہے اور خود صحابہ کے زمانہ میں بھی سمجھی جاتی تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں دو شخصوں نے اس مسئلہ میں گفتگو کی۔

ایک نے کہا اگر ہم نے دشمن سے مقابلہ کیا اور ایک شخص نے فخریہ یہ کہہ کر نیزہ مارا کہ میرا وار لینا میں غفاری جوان ہوں تو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟ مخاطب نے جواب دیا میری رائے میں کچھ ثواب نہ ملے گا، تیسرے آدمی نے یہ گفتگو سن کر کہا میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں، اس پر دونوں میں اختلاف ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گفتگو سنی تو فرمایا، ثواب اور شہرت دونوں میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔[۴]

عام خیال یہ تھا کہ قوائے عملیہ کے بے کار کر دینے کا نام تقدیر ہے، تقدیر میں جو کچھ لکھا ہو گا اس کو کوئی عمل مٹا نہیں سکتا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں جو اتفاقاً منعقد ہو گئی تھی، اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ اعمال تو خود تقدیر ہیں، انسان کو خدا جیسے اعمال کی توفیق دیتا ہے وہی اس کا نوشتۂ تقدیر ہیں اس لئے توکل قوت عمل کے بیکار کر دینے کا نام نہیں، چنانچہ صحابہ ایک جنازہ میں شریک تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ جمع ہو گئے، آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس سے زمین کریدنے لگے، پھر فرمایا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کی جگہ جنت یا دوزخ میں نہ لکھی جا چکی ہو، ایک شخص نے کہا تو ہم اپنی تقدیر پر توکل کر کے عمل کیوں نہ چھوڑ دیں؟ جو شخص سعادت مند ہو گا وہ خود بخود سعادت مندوں میں داخل ہو جائے گا اور جو شخص بدبخت ہو گا وہ بدبختوں سے جا ملے گا، آپؐ نے فرمایا سعادت مند وہ لوگ ہیں جن کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور بدبخت وہ ہیں جن کے لئے شقاوت کے کام کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں۔[۵]

مجالس میں شگفتہ مزاجی

باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیۂ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے کان الطیر

---

[۱] سنن ابن ماجہ ص ۲۱ باب فضل العلماء [۲] سنن ابن ماجہ ص ۹ باب القدر [۳] ایضاً [۴] ابوداؤد ج ۲ صفحہ ۱۱۳۔

[۵] بخاری ج ۲ ص ۷۳۹ تفسیر وکذب بالحسنیٰ

نوک روکھے تھے تاہم بیجا تنگ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں، ایک دن آپؐ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی، خدا نے کہا کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے! اس نے کہا ہاں! لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے، چنانچہ اس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اگا، بڑھا اور کاٹنے کے قابل ہو گیا، ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہو گی جو زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں، آپؐ برجستہ ہنس پڑے[1]۔

ایک دفعہ ایک صاحب خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میں تباہ ہو گیا، ارشاد ہوا کیوں؟ بولے میں نے رمضان میں بیوی سے ہم بستری کی، آپؐ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کرو، بولے غریب ہوں، غلام کہاں سے لاؤں، ارشاد ہوا، دو مہینے کے روزے رکھو، بولے یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا، فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، بولے اتنا مقدور نہیں، اتفاق سے کہیں سے زنبیل بھر کر کھجوریں آ گئیں، آپؐ نے فرمایا تو غریبوں کو خیرات کر آؤ، عرض کی اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو پیغمبر بنایا، سارے مدینہ میں مجھ سے بڑھ کر کوئی غریب نہیں، آپؐ بے ساختہ ہنس پڑے اور فرمایا اچھا تم خود ہی کھا لو[2]۔

فیضِ صحبت ایک دفعہ حضرت ابوہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا ہیچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے[3]۔

ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا یا رسول اللہ! میں منافق ہو گیا ہوں، میں جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا ہوں اور آپؐ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں، لیکن بال بچوں میں آ کر سب بھول جاتا ہوں، ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے[4]۔

*

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۱۱۲۱ باب کلام الرب مع اہل الجنۃ [2] بخاری ص ۹۰۰ باب نفقۃ المعسر علی اہلہ [3] ترمذی شریف باب ما جاء فی صفۃ الجنۃ و نعیمہا۔ امام ترمذی کے نزدیک یہ حدیث قوی نہیں [4] ترمذی الخ ص ۱۰۰ [5] صحیح مسلم کتاب التوبہ۔

خطابتِ نبویؐ

خطابت اور تقریر نبوت کا نہایت ضروری عنصر ہے، اسی بنا پر جب خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس پیغمبر بنا کر بھیجا تو اُن کو یہ دُعا مانگنا پڑی۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۔	خداوندا! میری زبان کی گرہ کھول کر لوگ میری بات سمجھیں۔

لیکن سید الانبیاء کو خود بارگاہِ الٰہی سے یہ وصفِ کامل عطا کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا۔

انا افصح العرب۔	میں فصیح ترین عرب ہوں۔
بعثت بجوامع الکلم۔	میں کلماتِ جامعہ لے کر مبعوث ہوا ہوں۔

عرب میں اگرچہ ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت کا مدعی تھا تاہم تمام عرب میں دو قبیلے اس وصف میں نمایاں امتیاز رکھتے تھے، قریش اور بنو ہوازن، قریش خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ تھا اور بنو ہوازن کے قبیلہ میں آپؐ نے پرورش پائی تھی، اس لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

انا اعربکم انا من قریش ولسانی لسان بنی سعد بن بکرؓ۔	میں تم میں فصیح تر ہوں، قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے۔

طرزِ بیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سادہ طریقہ پر خطبہ دیتے تھے، آپؐ جب اپنے حجرے سے نکلتے تھے تو سلاطین کی طرح نہ آپؐ کے ساتھ چاؤش ہوتے تھے، نہ آپؐ خطباء کا لباس پہنتے تھے۔ ہاتھ میں صرف ایک عصا ہوتا تھا اور کبھی کبھی کمان پر ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ مسجد میں جب آپؐ خطبہ دیتے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدانِ جنگ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔ جمعہ اور عیدین کا خطبہ تو متعین تھا لیکن اس کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی، آپؐ فی البدیہہ خطبہ کے لئے تیار ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے زمین پر، منبر پر، اونٹ پر جس جگہ جیسا موقع پیش آیا خطبہ دیا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے اگرچہ آپؐ کو کبھی کبھی طویل خطبہ بھی دینا پڑتا تھا، تاہم آپؐ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے۔

عام نصائح اور پند کی باتیں گو آپؐ اخباری فقروں میں بیان فرماتے لیکن جب کلام کو خاص طور پر مؤثر بنانا ہوتا تھا تو خطبہ کو عموماً سوال کی صورت میں شروع فرماتے تھے، غزوۂ حنین میں آپؐ نے انصار کے سامنے جو خطبہ دیا وہ اول سے آخر تک سوال و جواب ہے، خطبہ حجۃ الوداع وغیرہ اور تمام خطبات میں جیسا کہ آگے آتا ہے یہ خصوصیت نمایاں ہے، جوشِ بیان کا یہ حال تھا کہ آنکھیں سُرخ اور آواز نہایت بلند ہو جاتی تھی، غصہ

۱؎ اضافۃ الفہم باب ۲؎ طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۷۱ ۳؎ بنو سعد قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ ہے ۴؎ ابو داؤد ج ۱ کتاب الصلوٰۃ ابواب الجمعۃ والخطبۃ علی قوس۔

بڑھ جاتا تھا، انگلیاں اٹھتی جاتی تھیں، گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ کسی فوج کو جنگ کے لئے ابھار رہے ہیں[1] جوشِ بیان میں جسدِ مبارک جھوم جھوم جاتا تھا، ہاتھوں کو حرکت دینے سے پٹھوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی، کبھی مٹھی بند کر لیتے تھے، کبھی کھول دیتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس قسم کی پُرجوش حالت کی نہایت صحیح تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر یقول یاخذ الجبار سمواتہ وارضہ بیدہ وقبض یدہ فجعل یقبضہا ویبسطہا قال ویتمائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن یمینہ وعن شمالہ حتی نظرت الی المنبر یتحرک من اسفل شیء منہ حتی انی لاقول اساقط ھو برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن ماجہ ذکر المبعث)[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر خطبہ دیتے سنا فرما رہے تھے کہ خداوندِ صاحبِ جبروت آسمان و زمین کو اپنے ہاتھ میں لے لے گا، یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے، آپ کا جسم مبارک کبھی دائیں کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا، یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو اس کا سب سے نچلا حصہ بھی اس قدر ہل رہا تھا کہ میں نے خیال کیا کہ آپ کو لے کر گر تو نہیں پڑے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات کی نوعیت

احادیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبات اور اُن کے جستہ جستہ فقرے بغیر کسی خاص ترکیب کے جمع کر دیئے گئے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیتیں تھیں اور اس کا اثر آپ کے طرزِ بیان پر پڑتا تھا۔ آپ داعیِ مذہب تھے، فاتح تھے، واعظ تھے، امیر الجیش تھے، قاضی تھے، پیغمبر تھے، اس اختلافِ حیثیت نے آپ کے خطابت اور زورِ بیان میں نہایت اختلاف پیدا کر دیا ہے اور بلاغت کا اقتضا بھی یہی ہے، آپ بحیثیت داعیِ مذہب ہونے کے جو خطبہ دیتے تھے اس میں نہایت زور اور جوش پیدا ہو جاتا تھا اور اس وقت آپ کی حیثیت بالکل ایک امیر الجیش کی ہوتی تھی، چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ وانذر عشیرتک الاقربین (اپنے اقربا کو ڈراؤ) تو آپ نے تمام قریش کو جمع کر کے ایک خطبہ دینا چاہا![3] ابولہب کی شقاوت نے اگرچہ اس خطبہ کو پورا نہیں ہونے دیا، تاہم آپ کی زبان سے اس واقعہ پر جو چند جملے نکل گئے اس سے آپ کے زورِ بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آپ نے صفا پر چڑھ کر پہلے پکارا۔ "یا صباحاہ"، یہ وہ لفظ ہے جو عرب میں اس وقت بولا جاتا ہے جب صبح کے وقت کوئی قبیلہ کسی پر دفعۃً غارت گری کے لئے ٹوٹ پڑتا ہے۔ تمام لوگ یہ لفظ سُن کر چونک اٹھے اور آپ کے گرد جمع ہو گئے، آپ نے فرمایا۔

ارأیتم ان اخبرتکم ان خیلا تخرج من سفح ھذا الجبل اکنتم مصدقیّ۔

بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکلا چاہتی ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے۔

سب نے جواب دیا، اب تک آپ کی نسبت ہم کو کسی قسم کی دروغ گوئی کا تجربہ نہیں ہوا، جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا۔

انی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید۔

میں تمہیں ایک ایسے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں جو تمہارے سامنے ہے۔

---

[1] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ ص ۳۱۹ ج ۱۔ [2] ابن ماجہ ذکر البعث [3] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۱۰۲۔

ابولہب نے نہایت استخفاف کے ساتھ کہا، کیا ہم سبھوں کو اسی لئے جمع کیا تھا، یہ کہہ کر چل کھڑا ہوا۔

غزوۂ حنین میں آپؐ نے تمام مال غنیمت مؤلفۃ القلوب کو دے دیا اور انصار بالکل محروم رہ گئے تو چند نوجوانوں کو یہ نہایت ناگوار ہوا اور انھوں نے کہا خدا پیغمبر کی مغفرت کرے، قریش کو دیتا ہے اور ہم کو چھوڑ دیتا ہے حالانکہ ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو تمام انصار کو ایک خیمہ میں جمع کر کے اصل حقیقت دریافت فرمائی۔ لوگوں نے کہا چند نوجوانوں نے یہ کہا ہے، لیکن ہم میں جو لوگ صاحب الرائے اور سردار ہیں، انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اب آپؐ نے اس موقع پر کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا۔

یامعشر الانصار الم اجدکم ضلالا فھداکم اللہ بی وکنتم متفرقین فالفکم اللہ بی وعالۃ فاغناکم اللہ بی۔	اے گروہ انصار! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم متفرق تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو مجتمع کر دیا، تم محتاج تھے، خدا نے میری وجہ سے تم کو غنی کر دیا۔

انصار ہر بات پر کہتے جاتے تھے "خدا اور اس کا رسول بہت امین ہے" آپؐ نے فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ اے محمدؐ! تم اس حالت میں آئے تھے کہ لوگ تمہاری تکذیب کرتے تھے، ہم نے تمہاری تصدیق کی، تمہارا کوئی مددگار نہ تھا، ہم نے تمہاری مدد کی، تم گھر سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے تم کو گھر دیا، تم محتاج تھے، ہم نے تمہاری غمخواری کی" اس کے بعد آپؐ نے اصل اعتراض کا جواب دیا۔

ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم فواللہ لما تنقلبون بہ خیر مما ینقلبون۔	کیا تم یہ نہیں پسند کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کے جائیں اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبر کو لے کر جاؤ، خدا کی قسم تم لوگ جو لیکر واپس جاتے ہو وہ اس سے بہتر ہے جو تمام لوگ لے کر جاتے ہیں۔

اس پر تمام انصار پکار اٹھے "رضینا" یعنی ہم سب راضی ہیں۔ اس خطبہ کے وجوہ بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو ایک مختصر سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔ فاتحانہ حیثیت سے آپؐ نے صرف فتح مکہ کے موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کے جستہ جستہ فقرے احادیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، مکہ عرب کے نزدیک نہایت مقدس شہر تھا، حرم ایک دارالامان تھا جس میں کبھی خونریزی نہیں ہو سکتی تھی۔ فتح مکہ میں سب سے پہلے اس کے دامن عظمت پر خون کا دھبہ لگایا گیا اور چونکہ مذہب کے ہاتھ سے لگایا گیا تھا اس لئے خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے اس کا یہ احترام نہ مٹ جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ہی دونوں پہلوؤں پر اپنی تقریر میں زور دینا تھا، چنانچہ آپؐ نے بہ ترتیب ان ہی کی طرف توجہ کی۔ سب سے پہلے آپؐ نے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔

ان اللہ حرم مکۃ یوم خلق السموٰت والارض فھی حرام بحرام اللہ الی یوم القیامۃ لم تحل لاحد قبلی ولا تحل لاحد بعدی ولم تحلل لی قط الا ساعۃ من الدھر لا ینفر صیدھا ولا یعضد شوکھا ولا یختلی	خدا نے جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا اسی دن مکہ کو حرام کر دیا پس وہ بحرمت خدا حرم ہے وہ میرے پہلے نہ کسی پر حلال ہوا اور نہ میرے بعد حلال ہوگا اور میرے لئے بھی بجز چند گھنٹوں کے ہرگز حلال نہیں ہوا، اسکے شکاروں کو بھگایا جا سکتا، نہ اسکا کانٹا کاٹا جا سکتا، نہ اسکی گھاس کاٹی جا

---

[1] بخاری جلد ۲ ص ۷۴۳ تفسیر سورہ تبت۔ [2] صحیح بخاری غزوۂ حنین۔

خلاها ولا تحل لقطتها الا لمنشد۔	سکتی نہ اس کی گمشدہ چیز حلال ہو سکتی ہے بجز اس شخص کے جو اس کو ڈھونڈ رہا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے مہتم بالشان خطبہ وہ ہے جو آپؐ نے حجۃ الوداع میں دیا تھا، یہ خطبہ صرف احکام کا ایک سادہ مجموعہ ہے جس کو قدرتاً خشک اور روکھا پھیکا ہونا چاہیئے، تاہم سلاست روانی اور شستگی الفاظ کے لحاظ سے یہ خطبہ بھی اور خطبوں سے کم نہیں، آپؐ نے حمد و نعت کے بعد اس خطبہ کی اہمیت اسی طرح ظاہر کی۔

ایها الناس اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی هذا فی موقفی هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا	لوگو! سنو! کیونکہ شاید میں اس سال کے بعد اس جگہ اس مہینہ میں اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں۔

سادہ سا جملہ یہ تھا کہ غالباً یہ میری عمر کا آخری سال ہے، لیکن اس تفصیل اور اس پیرایۂ بیان نے اس مفہوم کو اور بھی زوردار بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو، جان، مال سب مسلمانوں پر حرام ہے اس مطلب کو اس بلیغ طریقہ سے ادا کیا ہے۔

اتدرون ای یوم هذا قالوا الله ورسوله اعلم قال فان هذا یوم حرام اتدرون ای بلد هذا قالوا الله ورسوله اعلم قال بلد حرام قال اتدرون ای شهر هذا قالوا الله ورسوله اعلم قال شهر حرام	کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے، آپؐ نے فرمایا یہ یوم الحرام ہے، کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا شہر ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپؐ نے کہا بلد حرام ہے، کیا جانتے ہو کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ لوگوں نے کہا خدا اور رسول کو اس کا علم ہے آپ نے فرمایا شہر حرام ہے۔

اس طرح جب لوگوں کے دل میں اس دن اس مہینہ اور اس شہر کی حرمت کا خیال تازہ ہو گیا تو آپؐ نے اصل مقصود کو بیان کیا۔

ان الله حرم علیکم دماءکم واموالکم واعراضکم کحرمة یومکم هذا فی شهرکم هذا فی بلدکم هذا لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض	خدا نے تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو، تم پر اس مہینہ میں اس شہر میں، اس دن کی حرمت کی طرح حرام کیا، میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم میں ہر ایک دوسرے کی گردن مارے۔

آپؐ نے ان الفاظ میں مساوات کی تعلیم دی ہے۔

ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم من آدم وآدم من تراب ان اکرمکم عند الله اتقاکم۔	تمہارا خدا ایک، تمہارا باپ ایک، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی کے تھے خدا کے نزدیک تم میں شریف تر وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے،

عرب کا عام ذریعہ معاش غارت گری تھی، لیکن شہر حرام کے چار مہینے تک وہ لوگ بیکار نہیں رہ سکتے تھے اس لئے ان مہینوں کو ادل بدل کیا کرتے تھے جس کو نسئی کہتے تھے، قرآن مجید نے اس کی ممانعت کی

انما النسئ زیادة فی الکفر۔	نسئی کفر میں اضافہ کرتا ہے

آپؐ نے اپنے خطبہ میں اس کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا۔

ان الزمان قد استدار کهیئة یوم خلق الله السموات والارض۔	زمانہ پھر پھرا کے پھر اسی مرکز پر آگیا جیسا کہ اس دن تھا جب خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔

ان حیثیتوں کے علاوہ آپ کی حیثیت ایک معلم اور واعظ کی تھی، آپ نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں وہ اگرچہ نہایت سادہ ہیں، تاہم ان میں بھی مجموعی بلاغت کا اسلوب موجود ہے، ایک اخلاقی وعظ کے لئے پیچ دار ترکیب، شاندار الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کی ضرورت نہیں ہوتی، اس کو صرف سادہ الفاظ، واضح جملے اور مختصر ترکیبوں سے مطالب کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حیثیت سے جو خطبے دیئے ہیں وہ تمام تر اسی قسم کے ہیں۔ مدینہ آکر سب سے پہلا فقرہ جو زبان مبارک سے نکلا یہ تھا۔

يا ايها الناس. افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا	لوگو! اسلام پھیلاؤ، کھانا کھلایا کرو، نماز پڑھا کرو، جب لوگ سوتے
والناس نيام تدخلوا الجنة بسلام۔	ہیں، جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

مدینہ میں جو سب سے پہلا جمعہ آپ نے پڑھا ہے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حمد و ثنا کے بعد اس میں آپ نے یہ خطبہ دیا تھا۔

اما بعد ايها الناس فقدموا لانفسكم تعلمن والله	حمد و ثنا کے بعد، لوگو! اپنے لئے پہلے سے سامان کر لو، تم کو معلوم
ليصعقن احدكم ثم ليدعن غنمه ليس لها راع ثم ليقولن	ہو جائے گا کہ خدا کی قسم تم میں سے ایک جب اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے
له ربه ليس له ترجمان ولا حاجب يحجبه دونه الم	گا اور اپنی بکریوں (مال و دولت) کو چھوڑ جاوے گا جن کا کوئی نگہبان نہ ہو
ياتك رسولي فبلغك وآتيتك مالا وافضلت عليك	گا، پھر خدا اس کے لئے بیچ میں نہ کوئی ترجمان ہے نہ دربان ہے جو روک
فما قدمت لنفسك فلينظرن يمينا وشمالا فلا يرى	سکے گا، اس سے کہے گا کہ کیا تیرے پاس میرا فرستادہ نہیں آیا اور میرا پیغام نہیں
شيئا ثم لينظرن قدامه فلا يرى غير جهنم فمن	پہنچایا اور میں نے تم کو دولت نہیں دی اور حاجت سے زیادہ نہیں عطا کیا
استطاع ان يقي وجهه من النار ولو بشق من	تو تو نے اپنے لئے پہلے سے کیا سامان کیا، اس وقت وہ دہنے اور بائیں
تمرة فليفعل ومن لم يجد فبكلمة طيبة فانه	دیکھے گا تو اس کو کچھ نظر نہیں آئے گا، اپنے سامنے دیکھے گا تو جہنم کے سوا
تجزى الحسنة بعشر امثالها الى سبع مائة ضعف	اس کو کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، پس جس کو قدرت ہو وہ اپنے کو اس آگ
والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته۔	سے بچائے تو چاہئے کہ ایک کھجور ہی کے ٹکڑے سے کیوں نہ ہو، کسی کے پاس یہ

بھی نہ ہو تو ایک اچھی اور خوش اخلاقی کی بات ہی سے کیونکہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا بلکہ سات سو گنا دیا جائے گا، تم کو سلامتی اور خدا کی رحمت و برکت نازل ہو۔ (صحیح مسلم بروایت جریر)

اس کے بعد دوسری دفعہ آپ نے فرمایا۔

الحمد لله احمده واستعينه ونعوذ بالله من شرور	خدا کی حمد ہو، میں خدا کی حمد کرتا ہوں اور اسی سے مدد مانگتا ہوں، ہم اپنے نفس کی برائیوں
انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل	اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں، جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی
له ومن يضلل فلا هادي له واشهد ان لا اله الا	گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ ہدایت نہ دے اس کا کوئی رہنمائی کرنے والا نہیں ہے
الله وحده لا شريك له ان احسن الحديث كتاب	میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں، وہی تنہا ہے کوئی اس کا
الله قد افلح من زينه الله في قلبه وادخله	شریک نہیں، بہترین کلام خدا کی کتاب ہے، کامیاب ہو گیا وہ جس کے دل کو خدا نے
في الاسلام بعد الكفر فاختاره على ما سواه من	اس سے آراستہ کیا اور اس کو کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا، انسانوں کی باتوں کو

احادیث الناس انه احسن الحدیث وابلغه احبوا ما احب الله احبوا الله من کل قلوبکم ولا تملوا کلام الله وذکره ولا تقس عنه قلوبکم فاعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئا واتقوا حق تقاته وصدقوا الله صالح ما تقولون بافواهکم وتحابوا بروح الله بینکم ان الله یغضب ان ینکث عهده والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته۔

چھوڑ کر خدا کے کلام کو پسند کیا کیونکہ خدا کا کلام سب سے زیادہ بہتر اور سب سے زیادہ پُر اثر ہے، جس کو خدا دوست رکھتا ہے تم بھی دوست رکھو، خدا کو دل سے پیار کرو اور اسکے کلام اور ذکر سے کبھی نہ تھکو اور تمہارے دل اسکی طرف سے سخت نہ ہوں۔ پس خدا ہی کو پوجو، اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور اس سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور خدا سے سچی بات کہو اور آپس میں ایک دوسرے کو ذات الٰہی کے واسطے سے پیار کرو، خدا اس سے ناراض ہوتا ہے کہ کوئی اپنے عہد کو پورا نہ کرے تم پر خدا کی سلامتی اور رحمت اور برکت نازل ہو۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا جس میں صرف پانچ باتیں بیان کیں۔

ان الله لا ینام ولا ینبغی له ان ینام یخفض القسط ویرفعه الیه عمل اللیل قبل عمل النهار وعمل النهار قبل عمل اللیل حجابه النور (صحیح مسلم، رؤیۃ اللہ تعالیٰ)

ہاں خدا سوتا نہیں اور نہ سونا اس کی ذات کے شایان شان ہے وہی قسمت کو پست و بلند کرتا ہے، رات کے اعمال اسکو دن سے پہلے پہنچ جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات سے پہلے، خدا کا پردہ نور ہے۔

جمعہ کے خطبہ میں عموماً زہد و رقاق، حسن اخلاق، خوف قیامت، عذاب قبر، توحید و صفات الٰہی بیان کرتے تھے بیچ میں کوئی مہتم بالشان واقعہ پیش آ جاتا تھا تو اس کے متعلق ہدایت فرماتے تھے، اکثر ایسا بھی کرتے کہ خطبہ کے بجائے قرآن مجید کے انہی مضامین کی کوئی موثر سورت قٓ وغیرہ پڑھ دیا کرتے، یہ سورہ آپ جمعہ کے خطبہ میں اکثر و بیشتر پڑھا کرتے تھے، عید کے خطبہ میں ان مضامین کے علاوہ صدقہ پر خاص طور پر زور دیتے تھے، اتفاقی خطبے ضرورت کے موقع پر دیا کرتے تھے اور ان میں مقتضائے وقت کے مناسب مطالب بیان فرماتے تھے، ایک دفعہ آفتاب میں گہن لگا، اتفاق سے اسی دن آپ کے کمسن فرزند حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی تھی، مزعومات عرب کے مطابق لوگوں نے کہا کہ یہ گہن اسی لئے لگا ہے، آپ نے اس موقع پر حسب ذیل خطبہ دیا۔

اما بعد یا ایها الناس انما الشمس والقمر آیتان من آیات الله وانهما لا ینکسفان لموت احد من الناس،

حمد و ثنا کے بعد، لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی دو نشانیاں ہیں وہ کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتے۔

ما من شیء لم اکن رایته الا قد رأیت من مقامی هذا حتی الجنة والنار وانه قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور مثل فتنة الدجال فیؤتی احدکم فیقال ما علمك بهذا الرجل فاما المؤمن فیقول هو محمد هو رسول الله جاء بالبینات والهدی فاجبنا واطعنا واما المرتاب فیقول لا ادری سمعت الناس یقولون شیئاً فقلته انه عُرِضَ عَلَیَّ کُلُّ شَیْءٍ تُولِجُونَهُ فَعُرِضَتْ عَلَیَّ الْجَنَّةُ حتی لو تناولت منها قطفا اخذته فقصر یدی

جس چیز کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا اس کو یہیں دیکھ لیا یہاں تک کہ جنت و دوزخ کو بھی اور ہاں مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے، تم میں سے ہر ایک شخص کے پاس ایک آنے والا آئے گا اور پوچھے گا کہ اس شخص (یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت کیا جانتے ہو یقین والے کہیں گے کہ یہ محمد ہیں، یہ خدا کے رسول ہیں، جو نشانیاں اور ہدایتیں لے کر آئے تو ہم نے ان کو قبول کیا اور ان کی پیروی کی اور شک والے کہیں گے میں نہیں جانتا لوگوں کو جو کہتے سنا کہہ دیا، میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم داخل ہو گے، تا آنکہ اگر میں چاہتا تو

عنہ وعرضت علی النار فرأیت فیها امرأة تعذب فی هرة لها ربطتها فلم تطعمها ولم تدعها تاکل من خشاش الارض ورأیت ابا ثمامة عمرو بن مالک یجر قصبه فی النار وانهم کانوا یقولون ان الشمس والقمر لا یخسفان الا لموت عظیم وانهما آیتان من آیات الله یریکموهما فاذا خسفا فصلوا حتی تنجلی[1]۔

کا پھل توڑ لیتا لیکن میرے ہاتھ رک گئے، دوزخ میرے سامنے رونما کی گئی اس میں ایک عورت کو دیکھا جس کو صرف اس لئے سزا دی جا رہی تھی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا نہ اس کو خود کچھ کھانے کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین کی گری پڑی کوئی چیز کھاتے، میں نے دوزخ میں ابو ثمامہ عمرو بن مالک کو دیکھا، یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے حالانکہ وہ تو خدا کی دو نشانیاں ہیں، جب تم گہن دیکھو تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تاکہ وہ صاف ہو جائے۔

رد بدعت اور اعتصام بالسنۃ میں آپ کا یہ مختصر خطبہ بتغیر الفاظ حدیث کی اکثر کتابوں میں منقول ہے۔

انما هما اثنتان الکلام والهدی فاحسن الکلام کلام الله فاحسن الهدی هدی محمد الا وایاکم ومحدثات الامور فان شر الامور محدثاتها وکل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة الا لا یطولن علیکم الامد فیقسوا قلوبکم الا ان ما هو آت قریب وانما البعید ما لیس بآت الا انما الشقی من شقی فی بطن امه والسعید من وعظ بغیره الا ان قتال المؤمن کفر وسبابه فسوق ولا یحل لمسلم ان یهجر اخاه فوق ثلاث الا وایاکم والکذب

(ابن ماجہ باب اجتناب البدع)

صرف دو باتیں ہیں قول اور عمل طریقہ، تو عمدہ کلام خدا کا کلام ہے اور عمدہ طریقہ محمد کا طریقہ ہے، خبردار (مذہب میں) نئی باتوں سے بچو، نئی باتیں بدترین چیزیں ہیں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، تم کو درازی عمر کا خیال نہ پیدا ہو کہ تمہارے دل سخت ہو جائیں اور جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے دور وہ چیز ہے جو آنے والی نہیں ہے بعید ہے، بدبخت اپنی ماں کے پیٹ میں بدبخت ہوتا ہے، خوش نصیب وہ ہے جو غیر سے موعظت حاصل کرے، خبردار، مسلمان سے لڑنا کفر اور اس سے گالی گلوچ کرنا فسق ہے، مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے رنجیدہ رہے، ہاں خبردار جھوٹ سے پرہیز کرنا۔

اثر انگیزی خطبات نبوی تاثیر اور رقت انگیزی میں درحقیقت معجزۂ الٰہی تھے، پتھر سے پتھر دل بھی ان کو سن کر چند لمحوں میں موم ہو جاتے تھے، مکہ میں ایک دفعہ آپ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کرکے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ آپ کے ساتھ مسلمان تو مسلمان بڑے بڑے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ جاہلیت کے ایک دوست جو جھاڑ پھونک کرنا جانتے تھے، یہ سن کر کہ نعوذ باللہ آپ کو جنون ہے، بغرض علاج آئے، آپ نے ان کے سامنے مختصر سی تقریر کی، انہوں نے کہا محمد ذرا اس کو پھر تو دہرانا، غرض آپ نے کئی دفعہ تقریر دہرائی تو انہوں نے کہا، میں نے شاعروں کے قصیدے اور کاہنوں کے کلام سنے ہیں، لیکن یہ تو چیز ہی اور ہے[3]۔

ایک دفعہ ایک نو مسلم قبیلہ ہجرت کرکے مدینہ آیا، آپ نے ان کی امداد کی ضرورت سمجھی، مسجد نبوی میں تمام

---

[1] صحیح مسلم ابواب [illegible] [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ وقصر الخطبہ [3] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ وقصر الخطبہ۔

مسلمان جمع ہوئے تو آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں یعنی۔

یَا أَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔	اے لوگو! اس خدا سے ڈرو جس نے ایک ذات سے تم سب کو پیدا کیا۔

پھر سورۂ حشر کی یہ آیت تلاوت کی۔

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔

اس کے بعد فرمایا، درہم، کپڑا، غلہ، بلکہ چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی ہو، راہ خدا میں دو۔ مدینہ کے مسلمانوں کی مالی حالت جیسی تھی، وہ سیرت کے ہر صفحہ سے ظاہر ہے، لیکن بایں ہمہ آپ کی رقت انگیز اور مؤثر تقریر سے یہ عالم پیدا ہو گیا کہ ہر صحابی کے پاس جو کچھ تھا، اس نے سامنے رکھ دیا، بعضوں نے اپنے کپڑے اتار دیئے، کسی نے گھر کا غلہ لا کر دے دیا، ایک انصاری گئے اور گھر سے اشرفیوں کا ایک توڑا اٹھا لائے جو اس قدر بھاری تھا کہ بمشکل ان سے اٹھ سکتا تھا، راوی کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد آپ کے سامنے غلہ اور کپڑے کے دو بڑے بڑے ڈھیر لگ گئے اور خوشی سے آپ کا چہرہ کندن کی طرح دمکنے لگا۔[1]

سخت سے سخت اشتعال انگیز اوقات میں آپ کے چند فقرے معاملہ کو رفع دفع کر کے جوش محبت کا دریا بہا دیتے تھے، اوس و خزرج کی سالہا سال کی عداوتیں اسی اخلاق کی بدولت مبدل بہ محبت ہو گئیں، غزوۂ بدر سے پہلے ایک دفعہ سوار ہو کر نکلے اور منافقین یکجا بیٹھے ہوئے تھے، مسلمانوں نے تو ادب سے سلام کیا، لیکن منافقین نے ایک گستاخانہ فقرہ استعمال کیا، یہ چنگاری تھی جس نے خرمن میں آگ لگا دی، قریب تھا کہ جنگ و جدل برپا ہو جائے، لیکن آپ کے چند فقروں نے آگ پر پانی ڈال دیا،[2] غزوۂ مصطلق سے واپسی میں ایک واقعہ پر منافقین نے اشتعال پیدا کیا اور بہت جلد ممکن تھا کہ مہاجرین و انصار باہم دست و گریباں ہو جائیں کہ عین وقت پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی، آپ تشریف لائے تو اس طرح تقریر فرمائی کہ چند لمحوں میں مہاجرین و انصار پھر شیر و شکر تھے،[3] واقعۂ افک میں اوس و خزرج میں اس قدر اختلاف پیدا ہوا کہ خاص مسجد نبوی میں شاید تلواریں نیام سے نکل پڑتیں، آپ منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھا اور اثر یہ تھا کہ برادرانہ محبت کی لہریں پھر جاری ہو گئیں۔[4]

غزوۂ حنین میں جب مال غنیمت کی تقسیم پر انصار میں آزردگی پیدا ہو گئی تھی، اس وقت آپ نے جس بلیغانہ انداز میں تقریر فرمائی ہے اس کا مختصر سا ذکر اوپر گزر چکا ہے، اس تقریر کا کیا اثر ہوا؟ یہ ہوا کہ وہی انصار جو چند لمحے پہلے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے اس قدر روئے کہ ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور دل کا سارا غبار آب کوثر کے ان قطروں سے دفعۃً دھل گیا۔[5] فتح مکہ کے موقع پر انصار کی توقع کے خلاف جب آپ نے رؤسائے قریش کی جان بخشی فرمائی تو ان میں سے وہ لوگ جن کی آنکھوں میں خلق نبوی کا جلوہ نہ تھا معترض ہوئے کہ آخر آپ کو اپنے وطن و خاندان سے محبت

---

[1] صحیح مسلم باب الصدقات۔ [2] صحیح بخاری السلام علی جماعۃ فیہا المسلم والکافر۔ [3] صحیح بخاری تفسیر منافقین و ابن سعد غزوۂ مذکور۔
[4] صحیح بخاری قصۂ افک۔ [5] صحیح مسلم فتح مکہ۔

آہی گئی، آپ کو یہ معلوم ہوا تو تمام انصار کو جمع کر کے دریافت کیا کہ کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا ہے، عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا، وطن و خاندان کی پاسداری میرے پیشِ نظر نہ تھی، میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں، میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی اور تمہاری طرف، اب میرا جینا تمہارا جینا ہے اور میرا مرنا تمہارا مرنا ہے، یہ سن کر انصار پر رقت طاری ہو گئی اور رونے لگے، وعظ و نصیحت میں جو خطبات آپ ارشاد فرماتے تھے وہ بھی اسی قدر موثر ہوتے تھے ایک صحابی موقع کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

وعظنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یومًا بعد الصلوٰۃ الغداۃ موعظۃ بلیغۃ ذرفت منہا العیون وجلت منہا القلوب (ترمذی و ابوداؤد)	صبح کی نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن ایسا موثر وعظ کہا کہ آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور دل کانپ اٹھے۔

ایک اور مجلس وعظ کے تاثیر کی کیفیت حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ بیان کرتی ہیں۔

قام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خطیبًا فذکر فتنۃ القبر التی یفتتن بہا المرء فلما ذکر ذلک ضج المسلمون ضجۃ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں فتنۂ قبر کو بیان کیا جس میں انسان کی آزمائش کی جائیگی جب یہ بیان کیا تو مسلمان چیخ اٹھے۔

حضرت ابوہریرہؓ اور ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے والذی نفسی بیدہٖ قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، یہ الفاظ آپ نے تین دفعہ فرمائے اور پھر جھک گئے، لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ جو جہاں تھا وہیں سر جھکا کر رونے لگا، راوی کہتے ہیں کہ ہم کو بھی ہوش نہ رہا کہ آپ قسم کس بات پر کھا رہے ہیں۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ نے خطبہ دیا، یہ خطبہ اس قدر موثر تھا کہ میں نے ایسا خطبہ نہیں سنا، اثنائے تقریر میں آپ نے فرمایا "اے لوگو! جو میں جانتا ہوں اگر تم وہ جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ" اس فقرہ کا ادا ہونا تھا کہ لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ منہ پر کپڑے ڈال کر بے اختیار رونے لگے۔

*

سے صحیح مسلم [illegible] عذاب [illegible] صحیح بخاری تفسیر سورۃ مائدہ۔

عباداتِ نبویؐ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝

(اے محمدؐ! جب تجھے فرصت ملے عبادت کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب سے دل لگاؤ)

دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ایسا پیغمبر نہیں گزرا جس کے متعلق صحیح طور پر یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا طریقۂ عبادت کیا تھا اور اس کے کون کون سے اوقات اس کے لئے مخصوص تھے اور اس کی عبادتوں کی نوعیت کیا تھی؟ گزشتہ انبیاء میں حضرت نوحؑ بلکہ آدمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ تک جن کے حالات تورات میں مذکور ہیں، ان کی زندگی کا یہ باب صحائف بنی اسرائیل سے قطعاً مفقود ہے۔ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کہیں کہیں صرف اس قدر ملتا ہے کہ وہ کبھی کبھی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ لیکن جب کہ ان مذاہب کے پیرووں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ اس قدر بے اعتنائی برتی ہے کہ یہ ضروری امور بھی جن پر دین و شریعت کا دار و مدار ہے، وہ محفوظ نہیں رکھ سکے، پیروانِ اسلام کو یہ فخر ہے کہ انہوں نے اول سے آخر تک اپنے پیغمبر کے اوقاتِ عبادات، اس کے طریقے، اس کے انواع، اس کی کیفیات، غرض اس کے ایک ایک جزئیات کو محفوظ رکھا ہے۔

دعا اور نماز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور غارِ حرا میں جا کر ہفتوں قیام اور مراقبہ[2] کرتے تھے۔ نبوت کے ساتھ ساتھ آپ کو نماز کا طریقہ بھی بتایا گیا لیکن چونکہ کفار قریش کا ڈر تھا اس لئے چھپ کر نماز ادا کرتے تھے، نماز کا وقت جب آتا کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھ لیتے۔ ایک دفعہ آپ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے ابوطالب آنکلے۔ انہوں نے دیکھا تو پوچھا بھتیجے! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی[3]۔

چاشت کی نماز آپ سب کے سامنے حرم ہی میں ادا کرتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی[4]۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دن آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے اور رؤسائے قریش بیٹھے تمسخر اڑا رہے تھے، ابوجہل نے کہا، کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا اور محمد جب سجدہ میں جاتے تو وہ ان کی گردن پر ڈال دیتا[5]۔ چنانچہ اس تجویز کے مطابق یہ فرض عقبہ نے انجام دیا۔ نماز میں جب آپ جہر سے قرأت فرماتے تو کفار برا بھلا کہتے[6]۔ ایک دفعہ آپ حرم میں نماز ادا کر رہے تھے، بعض اشقیاء نے چاہا کہ آپ کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں[7]۔ ایک دفعہ ایک شقی نے گلے میں پھانسی ڈال دی[8]۔ لیکن بایں ہمہ مزاحمت لذت شناس یادِ الٰہی اپنے فرض سے باز نہیں آتا تھا۔

راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ نمازیں پڑھا کرتے تھے، اس عبادت شبانہ کے مختلف صحابہ سے مختلف روایتیں

---

[1] اضافہ ناظم [2] باب صحیح بخاری باب بدء الوحی [3] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۹۹ [4] ابن اثیر [5] صحیح بخاری باب الطہارۃ والصلوٰۃ [6] صحیح بخاری تفسیر سورۂ بنی اسرائیل [7] ابن ہشام ذکر قبل ہجرت [8] صحیح بخاری باب ما لقی النبی بمکہ۔

ہیں۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ آپؐ رات بھر نماز میں کھڑے رہے۔ ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ کچھ دیر سوتے پھر کچھ دیر اٹھ کر نماز میں مصروف ہوتے، پھر سو جاتے، پھر اٹھ بیٹھتے اور نماز ادا کرتے۔ غرض صبح تک یہی حالت قائم رہتی ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آدھی رات کے بعد آپؐ اٹھتے تھے اور تیرہ رکعتیں ادا کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ۹ رکعت کی ہے۔ محدثین نے ان سب میں تطبیق دی ہے کہ آپؐ ان طریقوں میں سے ہر ایک طریقے سے نماز ادا کرتے تھے، ہر راوی نے اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے[1] عام طور پر آخر میں آپؐ کا طرز عمل وہی تھا جو حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی زبانی عبادت شبانہ کے عنوان سے گزر چکا ہے۔

فرائض پنجگانہ کے علاوہ آپؐ کم از کم سنن و نوافل کی ۳۹ رکعتیں روزانہ معمولاً ادا کرتے تھے۔ دو صبح، چار چاشت چھ ظہر، چھ عصر، چار پہلے اور دو بعد نماز (حسب روایت حضرت عائشہؓ) دو مغرب، چھ عشاء، تیرہ عشاء، دو وتر۔ ان کے علاوہ صلوٰۃ الاوابین، سنت تحیت مسجد وغیرہ الگ تھیں۔ تمام سنن میں سب سے زیادہ صبح کی دو رکعتوں کے آپؐ سختی سے پابند تھے[2] کسی وقت کی سنت خلاف معمول اگر چھوٹ جاتی، تو اس کی قضا پڑھتے۔ حالانکہ اصل شریعت کی رو سے اس کی ضرورت عام امت کے لئے نہیں۔ ایسا واقعہ حضر میں صرف ایک ہی دفعہ پیش آیا ہے۔ ظہر و عصر کے درمیان ایک وفد خدمت اقدس میں باریاب ہوا جس کی وجہ سے آپؐ ظہر کے بعد کی دو رکعت نہ پڑھ سکے، نماز عصر کے بعد آپؐ نے بعض ازواج مطہرات کے حجروں میں جا کر دو رکعت نماز ادا کی، چونکہ یہ نماز بالکل خلاف معمول تھی، اس لئے ازواج مطہرات نے استفسار کیا۔ آپؐ نے واقعہ بیان فرمایا۔ عام امت کے لئے ایک نماز کی قضا ایک دفعہ کافی ہے لیکن آپؐ جس چیز کو شروع کرتے تھے، پھر اس کو ترک کرنا مناسب نہیں فرماتے تھے۔ اس لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے اس قضاء کو تمام عمر ادا کیا[3]

رمضان کا مہینہ آپؐ کی عبادتوں کے لئے سب سے زیادہ ذوق افزا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ فیاض تو تھے ہی لیکن جب رمضان کا مہینہ آتا اور جبرئیل قرآن سنانے آتے تو آپؐ کی فیاضی کی کوئی حد نہیں رہتی آپ کی فیاضی ہوا سے بھی آگے نکل جاتی[4] رمضان کے آخری عشرہ میں آپؐ اور زیادہ عبادت گزار ہو جاتے حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپؐ رات رات بھر بیدار رہتے تھے، ازواج سے بے تعلق ہو جاتے تھے، اہل بیت کو نماز کے لئے[5] جگاتے تھے، اس اخیر عشرہ میں آپؐ عموماً اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے، یعنی ہر وقت مسجد میں بیٹھ کر یاد الٰہی اور عبادت گزاری میں مصروف رہتے تھے[6]

قرآن مجید کی تلاوت روزانہ فرماتے تھے۔ ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت کا وقت نماز عشاء کے بعد[7] تھا۔ روزانہ سورتوں کی تعداد مقرر رہتی۔ اسی تعداد کے موافق آپؐ تلاوت کر لیا کرتے تھے۔ رمضان میں پورے قرآن کا دورہ کرتے تھے[8] پچھلی رات کو اٹھ کر کوئی موثر سورہ یا چند آیات تلاوت کرتے تھے حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں نے دیکھا کہ آپؐ پچھلے پہر بیدار ہوئے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے، رات کے

---

[1] اس بحث کو زرقانی نے شرح مواہب میں بتفصیل لکھا ہے۔ [2] صحیح بخاری، ابواب نوافل و سنن۔ [3] مسند احمد و ابوداؤد و صحیح مسلم الرکعتان بعد العصر۔

[4] صحیح بخاری کتاب الصوم۔ [5] ابوداؤد باب الصوم۔ [6] صحیح بخاری باب الاعتکاف۔ [7] ابوداؤد شہر رمضان۔ [8] صحیح بخاری جز اول۔

سناٹے میں تارے جھلملا رہے تھے، آپ نے نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور یہ آیتیں پڑھیں۔[1]

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۝ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۝ فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی بَعْضُکُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران ۲۰)

آسمان اور زمین کی پیدائش اور شب و روز کے انقلاب میں ان دانشمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور پہلو پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ نظام عالم بے نتیجہ نہیں پیدا کیا تو پاک ہے پس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، خدایا جسکو تو دوزخ میں داخل کرے اسکو تو نے رسوا کر دیا، گنہگاروں کا کوئی مددگار نہیں، خداوندا ہم نے ایک پکارنے والے کی آواز سنی جو پکار کر یہ کہ رہا تھا کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے، خداوندا تو ہمارے گناہ بخش دے، ہماری برائیوں پر پردہ ڈال اور نیکوں کے ساتھ دنیا سے اٹھا، خداوندا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ ہم کو عنایت کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کر، تو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، پروردگار نے پکار سن لی اور دعا قبول کر لی کہ میں کسی کام کرنے والے کا کام ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت تم ایک دوسرے سے ہو، جنہوں نے ہجرت کی یا اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے یا اور وہ لڑے میں اور مارے گئے ہیں ان سب کے گناہوں کو مٹا دوں گا اور انکو جنت میں جگہ دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اللہ کی طرف سے ان کو یہ جزا ملے گی اور اللہ ہی کے پاس اچھی چیز ہے۔

اسی موقع پر آپ یہ الفاظ بھی کہا کرتے تھے جو سرتاپا روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

اللّٰھم لک الحمد انت نور السموٰت والارض ولک الحمد انت قیام السموٰت والارض ولک الحمد انت رب السموٰت والارض ومن فیھن انت الحق ووعدک الحق وقولک الحق ولقاءک الحق والجنۃ حق والنار حق والساعۃ حق اللّٰھم لک اسلمت وبک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت والیک حاکمت فاغفرلی ما قدمت واخرت واسررت واعلنت انت الٰھی لا الٰہ الا انت۔

خداوندا تیری حمد ہو تو آسمان و زمین کا نور ہے، تیری حمد ہو تو آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پروردگار ہے، تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے تیری بات حق ہے، تجھ سے ملنا حق ہے جنت حق ہے دوزخ حق ہے قیامت حق ہے، خداوندا میں نے تیرے ہی آستانہ پر سر جھکایا ہے تجھی پر ایمان لایا ہوں، تجھی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، تیرے ہی نام پر جھگڑتا ہوں، تجھی سے فیصلہ چاہتا ہوں، تو میرا اگلا اور پچھلا، کھلا اور چھپا ہر ایک گناہ معاف کر، تو ہی میرا معبود ہے تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں (صحیح مسلم باب الدعا فی صلوٰۃ اللیل)۔

کبھی گھر کے لوگ جب سو جاتے، آپ چپ چاپ بستر سے اٹھتے اور دعا و مناجات الٰہی میں مصروف ہو جاتے

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم صلوٰۃ اللیل۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو آپؐ کو بستر پر نہ پایا، سمجھی کہ آپؐ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولا تو دیکھا کہ پیشانی اقدس خاک پر ہے اور آپؐ سربسجود دعا میں مصروف ہیں یہ دیکھ کر حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو اپنے شبہ پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا، سبحان اللہ! ہم کس خیال میں ہیں اور آپؐ کس عالم میں[1]، کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر آپؐ تن تنہا قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے اور دعا و زاری کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ کے پیچھے پیچھے حضرت عائشہؓ گئیں، تو دیکھا کہ آپؐ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور دعا مانگی[2]۔

دعا اور نماز کے بعد آپؐ سو جاتے، یہاں تک کہ خراٹے کی آواز سنائی دیتی کہ دفعۃً سپیدۂ صبح نمودار ہوتا، آپؐ بیدار ہوتے، صبح کی سنت ادا کر کے مسجد کو تشریف لے جاتے اور اس وقت یہ الفاظ زبان مبارک پر ہوتے۔

اللّٰھم اجعل فی قلبی نورًا و فی لسانی نورا واجعل فی سمعی نورًا واجعل فی بصری نورًا واجعل فی خلفی نورًا و من امامی نورًا واجعل من فوقی نورًا و تحتی نورًا و اعظم لی نورًا (صحیح مسلم باب الدعاء فی صلوٰۃ اللیل)	خدایا میرے دل میں نور پیدا کر اور میری زبان میں اور میری قوت سامعہ میں نور پیدا کر، آنکھوں میں نور پیدا کر اور میرے پیچھے اور میرے آگے نور پیدا کر دے اور میرے اوپر اور میرے نیچے نور پیدا کر اور مجھے نور عطا کر۔

ارکان نماز میں سب سے کم وقفہ رکوع کے بعد قیام میں ہوتا ہے، لیکن حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع کے بعد اتنی دیر کھڑے رہتے تھے کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ آپؐ سجدہ میں جانا بھول گئے[3]۔ جو چیز نماز کی حضوری میں خلل ڈالتی تھی اس سے احتراز فرماتے تھے۔ ایک دفعہ چادر اوڑھ کر نماز ادا فرمائی جس میں دونوں طرف حاشیے تھے، نماز میں اتفاق سے حاشیوں پر نظر پڑ گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ یہ لے جا کر فلاں شخص (ابوجہم) کو دے اور ان سے انبجانی[4] مانگ لاؤ، حاشیوں نے نماز کی حضوری میں خلل ڈالا[5]۔

ایک دفعہ دروازے پر منقش پردہ پڑا ہوا تھا، نماز میں اس پر نگاہ پڑی تو حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ اس کو ہٹا دو، اس کے نقش و نگار حضور قلب میں خلل انداز ہوئے[6]۔

روزہ

انبیاء اور داعیان مذہب نے تکمیل روحانیت کے لئے تقلیل غذا بلکہ ترک غذا (روزہ) کو اسباب ضروری میں شمار کیا ہے۔ ہندوستان کے ریاضت کش اور مرتاض داعیان مذہب تو اس راہ میں حدّ افراط سے بھی آگے نکل گئے ہیں لیکن داعی اسلام کا طرز عمل اس باب میں افراط و تفریط کے بیچ میں تھا، اسلام سے پہلے اہل عرب عاشورہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی معمولاً اس دن روزہ رکھتے تھے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں آپؐ متواتر کئی کئی مہینوں تک روزہ رکھتے تھے، لیکن مدینے آکر اس معمول میں فرق آگیا۔ مدینہ میں یہود بھی عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، آپؐ نے بھی رکھا، بلکہ تمام مسلمانوں کو اس دن روزہ رکھنے کی تاکید فرمائی، لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورہ کا روزہ نفل رہ گیا۔

رمضان کے علاوہ پورے مہینہ کا روزہ مدینہ میں آپؐ نے کبھی نہیں رکھا صرف ایک شعبان مستثنیٰ ہے۔

---

[1] سنن نسائی باب الغیرہ [2] ایضاً باب الاستغفار للمومنین [3] مسند ابن حنبل ج ۳ صفحہ ۱۴۲ [4] صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۵۴ کتاب الصلوٰۃ انبجانی ایک کپڑے کا نام ہے [5] صحیح بخاری کتاب اللباس والصلوٰۃ۔

اس میں قریب قریب پورے مہینہ بھر آپ روزہ سے رہتے، اس طرح سال میں دو مہینے شعبان اور رمضان تو پورے روزوں میں گزرتے تھے، سال کے بقیہ مہینوں میں یہ کیفیت رہتی تھی کہ روزہ رکھنے پر آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ کبھی روزہ نہ توڑیں گے، پھر روزہ توڑ دیتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی روزہ نہ رکھیں گے مہینہ کے نصف اول میں جن کو ایام بیض کہتے ہیں آپ اکثر روزوں سے رہتے تھے، مہینہ میں تین دن دو دو شنبہ اور ایک جمعرات کو معمولاً روزے رکھا کرتے تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ جمعہ کا روزہ بھی معمولات میں سے تھا، ان کے علاوہ محرم کے دس دن یکم سے عاشورہ تک اور شوال کے آغاز میں چھ دن، دوسری سے ساتویں تک آپ روزوں میں گزارتے تھے[1]۔

اتفاقی روزے ان کے علاوہ تھے، آپ کبھی گھر میں تشریف لا کر پوچھتے تھے کہ کچھ کھانے کو ہے؟ جواب ملتا کچھ نہیں، آپ فرماتے تو میں آج روزے سے ہوں[2]۔ کبھی کبھی آپ صوم وصال بھی رکھتے تھے یعنی متواتر کئی کئی دن تک ایک روزہ رکھتے تھے، بیچ میں مطلق افطار نہیں کرتے تھے یا برائے نام کچھ کھا لیتے تھے لیکن جب صحابہؓ نے اس میں آپ کی تقلید کرنی چاہی تو آپ نے منع فرمایا، بعض لوگوں نے اس ممانعت کو صرف اس معنی پر محمول کیا کہ آپ حکماً نہیں بلکہ شفقت سے منع فرماتے ہیں، اس لئے اس ممانعت کے باوجود آپ کے ساتھ انہوں نے بھی اس قسم کے روزے رکھنے شروع کئے، آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو دو دن متصل روزہ رکھا، تیسرے دن اتفاق سے چاند ہو گیا آپ نے فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے دن تک انتظار نہ کرتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو جاتا رہتا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر حضورؐ کیوں کئی کئی دن تک افطار نہیں کرتے؟ ارشاد ہوا، تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھ کو تو ایک کھلانے والا ہے جو کھلاتا ہے اور ایک پلانے والا ہے جو پلاتا ہے، بعض روایتوں میں یہ الفاظ اس طرح وارد ہوئے ہیں، "تم میں مجھ جیسا کون ہے، میں شب بسر کرتا ہوں تو میرا خدا مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے"[3]۔

عام مسلمانوں کے لئے آپ اس قسم کی مذہبی سختیوں کو ناپسند فرماتے تھے اور عام طور پر خود بھی ان چیزوں سے احتراز کرتے تھے، تفصیلی واقعات آگے آتے ہیں۔

زکوٰۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام سے پہلے بھی بہت کچھ خیرات اور مبرات کیا کرتے تھے جیسا کہ آغاز اسلام میں حضرت خدیجہؓ نے شہادت دی ہے[4]، اسلام کے بعد آپ کی یہ کیفیت تھی کہ کوئی چیز نقد اپنے پاس رہنے نہیں دیتے تھے جو کچھ آتا مستحقین میں تقسیم فرما دیتے، لیکن بایں ہمہ زکوٰۃ کا ادا کرنا آپ سے ثابت نہیں[5]، اس سے بعض فقہا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، لیکن اصل یہ ہے کہ زکوٰۃ کے دو مفہوم ہیں، ایک مطلق صدقہ وخیرات اور اس باب میں جو آپ کی کیفیت تھی وہ کس سے مخفی ہے؟ دوسرا یہ کہ چاندی سونے یا جانور وغیرہ کی مخصوص مقدار و تعداد پر جو حاجت اصلیہ سے زیادہ ہو اور سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، ایک خاص شرح رقم ادا کی جائے، یہ مصطلح زکوٰۃ کبھی آپ پر فرض ہی نہیں ہوئی، کاشانۂ نبوت میں کوئی قابل زکوٰۃ چیز سال بھر تک تو کیا کبھی

---

[1] روزہ کے متعلق یہ حدیثیں تمام کتب حدیث میں ہیں، اس وقت ابوداؤد اور صحیح مسلم کتاب الصوم پیش نظر ہیں۔ [2] ابوداؤد باب النیۃ فی الصیام [3] صوم وصال کی یہ حدیثیں صحیح مسلم سے لی گئی ہیں [4] صحیح بخاری بدء الوحی۔ [5] صحیح بخاری بدء الوحی

یہ بھی پسند خاطر نہ تھا کہ شب گزر جائے اور مال و دولت کا کوئی نشان گھر کے اندر رہ جائے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ خراج کی رقم اس قدر زیادہ آگئی کہ وہ شام تک ختم نہ ہو سکی آپ نے رات بھر مسجد میں آرام فرمایا اور کاشانۂ اقدس میں اس وقت تک قدم نہیں رکھا جب تک حضرت بلالؓ نے آکر یہ اطلاع نہ دی کہ یا رسول اللہ! خدا نے آپ کو سبکدوش کیا۔[۱]

حج اسلام سے پہلے آپ نے جس قدر حج کئے ان کی تعداد صحیح متعین نہیں کی جا سکتی۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ چونکہ قریش عموماً ہر سال حج کیا کرتے تھے اس لئے قرینۂ غالب یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر سال حج ادا کرتے ہوں گے۔ ترمذیؒ[۲] میں ہے کہ قیام مکہ کے زمانے میں آپ نے دو حج کئے تھے اور ابن ماجہ اور حاکم میں ہے کہ تین حج کئے تھے۔ لیکن یہ سب روایتیں مرسل ہیں[۳]۔ مدینہ کے زمانۂ قیام میں متفقہ[۴] ثابت ہے کہ صرف ایک حج سنہ۱۰ھ میں کیا، یہ وہی حجۃ الوداع ہے جس کا ذکر بہ تفصیل پہلے گزر چکا ہے۔

حج کے علاوہ آپ نے عمرے بھی ادا کئے ہیں، ہجرت کے بعد چار عمرے ثابت ہیں، ایک عمرہ ذیقعدہ کے مہینہ میں، ایک حدیبیہ کے سال، ایک غزوۂ حنین کے بعد اور چوتھا حجۃ الوداع کے ساتھ، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع والے عمرے کے سوا تمام عمرے آپ نے ذیقعدہ کے مہینہ میں ادا کئے۔ ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمرے کئے تھے؟ انہوں نے جواب دیا، چار عمرے۔ ان میں سے ایک ماہ رجب میں۔ حضرت عائشہؓ نے یہ سنا تو کہا خدا ابو عبد الرحمٰن (ابن عمر کی کنیت) پر رحم فرمائے۔ آپ نے کوئی عمرہ ایسا نہیں کیا جس میں وہ شریک نہ ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب میں کوئی عمرہ نہیں کیا۔[۵]

سال حدیبیہ میں سب سے پہلی دفعہ جب آپ عمرہ ادا کرنے کے لئے روانہ ہوئے تھے تو کفار قریش نے قدم قدم پر روکنے کی کوشش کی، صحابہ ان کی مدافعت میں آپ سے بچھڑ گئے لیکن آپ کو خانہ کعبہ کی زیارت کا یہ ذوق و شوق تھا کہ اپنے ہمراہیوں کا انتظار کئے بغیر بے خطر آپ سب سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ آخر جان نثاروں نے ابو قتادہ انصاریؓ کو بھیجا کہ وہ جا کر ہماری جانب سے سلام عرض کریں اور یہ درخواست کریں کہ آپ ذرا توقف فرمائیں، ہمیں یہ ڈر ہے کہ دشمن کہیں ہمارے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہو جائیں، آپ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔[۶]

دوام ذکر الٰہی قرآن مجید نے اہل ایمان کا یہ وصف خاص بیان کیا ہے۔

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ (آل عمران) جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے یاد کرتے ہیں ۔۔۔۔

لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (نور ۵) جن کو اشغال دنیوی خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

اور قرآن کا مبلغ ان اوصاف کا خود بہترین مظہر تھا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر لحظہ اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے[۷]۔ ربیعہؓ بن کعب اسلمی رات کو آپ کے آستانہ پر پہرہ دیتے تھے وہ بیان

---

[۱] ابو داؤد باب قبول ہدایا المشرکین [۲] باب کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۳] زرقانی ج ۸ صفحہ ۱۹۱ [۴] صحیح مسلم ابوداؤد حجۃ الوداع و ترمذی باب کم حج النبی صلی اللہ علیہ وسلم [۵] جامع ترمذی باب مذکور۔ بخاری و مسلم کتاب الحج [۶] صحیح بخاری صفحہ ۲۴۴ باب جزاء الصید [۷] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

کرتے ہیں کہ آپ کی تسبیح و تہلیل کی آواز سنتے سنتے میں تھک جاتا تھا اور مجھے نیند آجاتی تھی[1]۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، وضو کرتے، نئے کپڑے پہنتے، سوار ہوتے، سفر میں جاتے، واپس آتے، گھر میں داخل ہوتے، مسجد میں قدم رکھتے، غرض ہر حالت میں دل و جان ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، چنانچہ اسی بنا پر احادیث میں مختلف اوقات و حالات کے لیے کثرت سے ادعیہ ماثورہ منقول ہیں۔ اخیر زندگی میں جب سورۂ اذا جاء اتری جس میں تحمید و تسبیح کا حکم ہے تو امہات المومنین کا بیان ہے کہ ہر وقت اور ہر حالت میں زبان مبارک پر تسبیح و تہلیل جاری رہتی تھی[2]۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ اکثر یہ دُعا رب اغفرلی وتُب علی انک انت التواب الغفور۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پڑھا کرتے تھے، ہم نے گنا تو ایک ایک نشست میں سو سو دفعہ یہ الفاظ آپ کی زبان سے ادا ہوتے[3]۔ سفر اور کوچ کی بے اطمینانی میں بھی آپ یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہوتے تھے، سواری پر بیٹھے بیٹھے نفل ادا کرتے تھے اور اس کی پروا نہیں کرتے تھے کہ قبلہ کی طرف رُخ ہے یا نہیں۔ سواری کا جانور جدھر چل رہا ہوتا، آپ اُدھر کا منہ کئے نماز کی نیت کر لیتے کہ اَینما تولّوا فثمّ وجه الله۔ جدھر رُخ کرو اُدھر ہی خدا کا منہ ہے[4]۔

ذوق و شوق

آپ اصحابؓ کی محفل میں یا امہات المومنینؓ کے حجروں میں بات چیت میں مشغول ہوتے کہ دفعۃً اذان کی آواز آتی، آپ اٹھ کھڑے ہوتے[5]۔ رات کا ایک معتدبہ حصہ گو شب بیداری میں گزرتا تھا تاہم صبح کے وقت اُدھر مؤذن نے اللہ اکبر کہا، اُدھر آپ بستر سے اٹھ بیٹھے[6]۔ شب کے وقت جس ذوق شوق اور وجد کی حالت میں نماز پڑھتے، اس کا نقشہ حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے، کبھی پوری پوری رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہتے، سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نسا، (قرآن کی سب سے بڑی سورتیں ہیں) پڑھتے، جب کوئی خوف اور خشیت کی آیت آتی، خدا سے دعا مانگتے اور پناہ طلب کرتے، کوئی رحمت اور بشارت کی آیت آئی تو اس کے حصول کی دعا مانگتے[7]۔ قرأت اتنی زور سے فرماتے کہ دور تک آواز جاتی اور لوگ اپنے بستروں پر پڑے پڑے آپ کی آواز سنتے[8]۔ کبھی کبھی کوئی آیت آجاتی کہ آپ اس کے ذوق و شوق میں محو ہو جاتے، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ نے نماز میں یہ آیت پڑھی،

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔	اگر تو سزا دے تو تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کر دے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

تو یہ اثر ہوا کہ صبح تک آپ یہی آیت پڑھتے رہ گئے[9]۔

زید بن خالد جہنی ایک صحابی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ آج شب میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھوں گا (غالباً یہ کسی سفر کا واقعہ ہے)، نماز کا وقت آیا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ پہلے دو رکعتیں معمولی

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۰۵ [2] ابن سعد جزء الوفاۃ [3] ترمذی و ابن ماجہ و دارمی باب دعوات [4] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ [5] صحیح بخاری باب یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ ص ۸۰ [6] صحیح بخاری من انتظر الاقامۃ [7] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۲ [8] [illegible] [9] [illegible] صلاۃ اللیل فی الوتر۔

اوابین، پھر دو رکعتیں بہت ہی لمبی اور بڑی دیر تک پڑھیں۔ پھر دو دو رکعتیں کر کے آٹھ رکعتیں بتدریج چھوٹی پڑھیں اور سب کے آخر میں وتر ادا کی[1]۔ خبابؓ کی روایت ہے کہ ایک شب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو صبح تک مصروف رہے[2]۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک شب مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، آپ نے سورۂ بقرہ شروع کی (قرآن کی یہ سب سے بڑی سورہ ہے) میں سمجھا کہ آپ سو آیتوں تک پڑھیں گے لیکن آپ ان کو پڑھ کر اور آگے بڑھے، میں نے دل میں کہا شاید پوری سورہ آپ ایک ہی رکعت میں ختم کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ جب آپ نے اس سورہ کو ختم کیا تو میں نے خیال کیا کہ آپ رکوع کریں گے لیکن آپ نے فوراً ہی سورۂ آل عمران شروع کر دی یہ بھی ختم ہو چکی تو سورۂ نساء شروع کی (یہ تینوں سورتیں مل کر سوا پانچ پاروں کے قریب ہیں) بہت ٹھہر ٹھہر کر نہایت سکون اور اطمینان سے آپ قرأت کر رہے تھے اور ہر آیت کے مضمون کے مطابق بیچ بیچ میں تسبیح اور دعا کرتے جاتے تھے اس کے بعد آپ نے رکوع کیا، رکوع میں قیام ہی کے برابر توقف فرمایا، پھر کھڑے ہوئے اور اتنی ہی دیر تک کھڑے رہے، پھر سجدہ کیا اور سجدہ میں بھی اسی قدر تاخیر فرمائی[3]۔

میدان جنگ میں یاد الٰہی

عین اس وقت جب دونوں طرف سے فوجیں برسر پیکار ہوتیں، تیر و سنان اور تیغ و خنجر کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی ہوتیں اور ہر طرف سے شور دار و گیر برپا ہوتا آپ نہایت خضوع و خشوع و اطمینان قلب کے ساتھ دعا و زاری اور ذکر الٰہی میں مصروف ہوتے، سپاہی شجاعت کے فخر و غرور سے پیشانیوں پر بل ڈالے ہوئے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوتے لیکن خود سپہ سالار کی پیشانی زمین نیاز پر ہوتی، بدر، احد، خندق، خیبر، تبوک، تمام بڑے بڑے معرکوں میں آپ کی یہی کیفیت تھی۔

معرکہ ہائے جنگ میں سپہ سالاروں کو اپنے بہادر سپاہیوں کی قوت پر ناز ہوتا ہے لیکن اسلام کے قائد اعظم کو صرف خدائے ذوالجلال کی قوت پر ناز تھا، عالم اسباب کے لحاظ سے گو آپ نے اصول جنگ کے مطابق ہر میدان میں اپنی فوجیں مرتب کیں لیکن اصلی اعتماد اور بھروسہ اسباب کائنات سے ماوراء قادر مطلق کی ذات پر تھا۔ بدر میں دو صحابی حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ ہم کو کافروں نے اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم جنگ میں شرکت نہ کریں، ارشاد ہوتا ہے کہ ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے[4]۔ بدر کا میدان خون سے لالہ زار ہو رہا ہے اور خشوع و خضوع سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بارگاہ ایزدی میں عرض کر رہے ہیں، خدایا اپنا وعدۂ نصرت پورا کر، محویت اور بے خودی میں ردائے مبارک کندھے سے گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی، کبھی سجدے میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ خدایا! اگر آج یہ چند نفوس مٹ گئے تو پھر قیامت تک تو نہ پوجا جائے گا[5]، اسی اثنا میں حضرت علیؓ تین دفعہ میدان جنگ سے حاضر خدمت ہوتے ہیں اور ہر دفعہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے[6]۔

غزوۂ احد کے خاتمہ پر ابوسفیان مسرت سے ہبل کی جے پکارتا ہے لیکن آپ اس دل شکستگی کے عالم میں

---

[1] صحیح مسلم، موطا، ابوداؤد۔ [2] نسائی احیاء اللیل [3] صحیح مسلم ونسائی صلوٰۃ اللیل [4] صحیح مسلم باب الوفا بالعہد [5] صحیح مسلم بخاری بدر [6] سیرت ج ۱ صفحہ ۲۴۵۔

بھی حضرت عمرؓ کو حکم دیتے ہیں کہ تم بھی کہو۔

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم اللہ اعلیٰ واجلّ۔	خدا ہمارا آقا ہے تمہارا کوئی آقا نہیں، خدا بڑا اور بلند ہے۔

غزوۂ احزاب میں آپؐ خود اپنے دستِ مبارک سے خندق کھودنے میں مصروف تھے اور لبِ مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے۔

اللّٰھم لا خیر الا خیر الآخرۃ فبارک فی الانصار والمہاجرۃ۔	خدایا بھلائی صرف آخرت کی بھلائی ہے، انصار اور مہاجرین کو برکت عطا کر۔

دشمن اس شدت سے حملہ پر حملہ کر رہے تھے کہ کسی مسلمان کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکن نہ تھا اور یہ محاصرہ ۲۰ یا ۲۲ دن تک قائم رہا، لیکن اس مدت میں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چار وقت کی نمازیں قضا ہوئیں، ایک دن عصر کے وقت دشمنوں نے اس زور کا حملہ کیا کہ ایک لمحہ کے لئے بھی مہلت نہ مل سکی، آخر عصر کا وقت ختم ہو گیا، آپؐ کو سخت رنج ہوا، حملہ رکنے پر سب سے پہلے با جماعت نماز ادا کی[1]۔

غزوۂ خیبر میں جب آپؐ شہر کے قریب پہنچے تو زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے اللہ اکبر خربت خیبر۔ اللہ اکبر خیبر ویران ہو چکا، عمارتیں نظر آئیں تو صحابہ سے ارشاد کیا کہ ٹھہر جاؤ، پھر یہ دعا مانگی

اللّٰھم انا نسئلک خیر ھذہ القریۃ وخیر اھلھا وخیر ما فیھا ونعوذ بک من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا (ابن ہشام)	اے خدا ہم تجھ سے اس آبادی کی، اس آبادی والوں کی، اس آبادی کی چیزوں کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی برائیوں سے تیری پناہ کے طلب گار ہیں۔

حنین کے معرکہ میں بارہ ہزار فوج آپؐ کے ساتھ تھی، لیکن اوّل ہی حملہ میں اس کے پاؤں اکھڑ گئے، اس فوج کا سپہ سالار اگر ان ہی آدمیوں کے بھروسہ پر میدانِ جنگ میں اترتا تو شاید وہ سب سے پہلے بھاگ کر اپنی جان بچاتا لیکن آپؐ کو جس قوت پر اعتماد تھا، آپؐ اس کو اس تنہائی میں بھی اسی طرح ناصر و مددگار سمجھتے تھے جس طرح فوج و لشکر کے ساتھ میں اس وقت جب دس ہزار قدر انداز تیروں کا مینہ برساتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھتے چلے آتے تھے اور آپؐ کے پہلو میں چند جاں نثاروں کے سوا کوئی اور باقی نہیں رہا تھا، آپؐ سواری سے اتر آئے اور فرمایا میں خدا کا بندہ اور پیغمبر ہوں۔ پھر بارگاہِ الٰہی میں دستِ بدعا ہو کر نصرتِ موعودہ کی درخواست کی، دفعۃً ہوا کا رخ پلٹ گیا اور نسیم فتح علم اسلام کو لہرانے لگی[2] دس ہزار دشمن کے بے پناہ تیروں کو یکہ و تنہا مناجات و زاری کی سپر پر روکنے کی جرأت پیغمبروں کے سوا اور کس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔

اس موقع کا سب سے مؤثر منظر غزوۂ بنی مصطلق میں نظر آتا ہے، سامنے دشمن پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں اور غفلت کے منتظر ہیں کہ دفعۃً نماز کا وقت آ جاتا ہے اور آپؐ امام بن کر آگے کھڑے ہو جاتے ہیں، صحابہ کی ایک جماعت مقتدی ہو کر نماز میں مصروف ہو جاتی ہے اور دوسری دشمنوں کا سامنا روک لیتی ہے، صلح حدیبیہ کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک موقع پیش آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے پاس عسفان میں خیمہ زن تھے، قریش کے

---

[1] صحیح بخاری احد [2] صحیح بخاری و مسلم حنین۔

[redacted]

مشہور جنرل خالد بن ولید آس پاس کی پہاڑیوں میں دشمنوں کی فوج کا ایک دستہ لیے ہوئے موقع کی تاک میں تھے۔ قریش کی یہ رائے قرار پائی کہ مسلمان جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تو عین اس وقت ان پر بے خبری میں حملہ کیا جائے۔ خداوند کارساز کی بارگاہ میں قصرِ صلوٰۃ کی ایک عمدہ تقریب پیدا ہو گئی، چنانچہ قصر کی آیتیں نازل ہوئیں، عصر کا وقت آیا تو آپ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، دشمن اپنی فوج کا پرا لئے آپ کے سامنے تھے، صحابہ دو حصوں میں منقسم ہوئے، ایک حصہ نے آپ کے پیچھے آکر نماز کی صفیں قائم کر لیں اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابل کھڑا ہو گیا، پہلی جماعت فارغ ہو کر بتدریج دشمنوں کے مقابل آگئی اور دوسری ترتیب کے ساتھ پیچھے ہٹ کر آپ کے ساتھ نماز میں جا ملی، یہ تمام تبدیلیاں مقتدیوں کی صفوں میں ہو رہی تھیں، لیکن خود سپہ سالار خون آشام تلواروں کے سایہ میں تمام خطرات سے بے پرواہ عبادتِ الٰہی میں مصروف تھے۔[1]

ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ اس حکمِ الٰہی کی کہاں تک تعمیل ہوتی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا	مسلمانو! جب کسی گروہ سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور
وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (انفال)	بار بار خدا کا نام لیتے جاؤ تو تم کامیاب ہو گے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں جب کسی ٹیکرے پر چڑھتے تو تین بار اللہ اکبر کہتے۔[2]

خشیتِ الٰہی

آپ خاتم الانبیاء تھے، افضل رسل تھے، محبوب خاص تھے، تاہم خشیتِ الٰہی کا یہ اثر تھا کہ فرمایا کرتے کہ مجھ کو کچھ نہیں معلوم کہ میرے اوپر کیا گزرے گی؟ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے جب وفات پائی تو آپ تعزیت کو گئے، لاش دھری تھی، ایک عورت نے لاش کی طرف مخاطب ہو کر کہا "خدا گواہ ہے کہ خدا نے تجھ کو نوازا" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم کو کیونکر معلوم ہوا؟" بولیں خدا نے ان کو نہیں نوازا تو اور کس کو نوازے گا، ارشاد ہوا کہ ہاں مجھ کو بھی ان کی نسبت بھلائی کی توقع ہے، لیکن میں پیغمبر ہو کر بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔[3]

جب کبھی زور سے ہوا چلتی آپ سہم جاتے، کسی ضروری کام میں ہوتے اس کو چھوڑ کر قبلہ رخ ہو جاتے اور فرماتے خدایا تیری بھیجی ہوئی مصیبت سے پناہ مانگتا ہوں، جب مطلع صاف ہو جاتا یا پانی برس جاتا تو مسرور ہوتے اور خدا کا شکر ادا فرماتے، ایک دن اس قسم کا واقعہ پیش آیا تو حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کیوں مضطرب ہو جاتے ہیں، ارشاد ہوا عائشہؓ! مجھے کیا معلوم کہ قوم ہود کا واقعہ نہ پیش آئے، جس نے بادل دیکھ کر کہا کہ یہ ہمارے کھیتوں کو سیراب کرنے والا ہے، حالانکہ وہ عذابِ الٰہی تھا۔[4]

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کے بال پکنے لگے، فرمایا مجھے سورۂ ہود، واقعہ، والمرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا کر دیا۔[5] ان سورتوں میں قیامت وغیرہ کے واقعات مذکور ہیں، اُبیؓ بن کعب سے روایت ہے کہ جب دو ثلث شب گزر چکتی، بآواز یہ الفاظ ادا فرماتے، "لوگو! خدا کو یاد کرو، زلزلہ آ رہا ہے، اس کے پیچھے آنے والا آ رہا ہے، موت اپنے سامان کے ساتھ آ پہنچی، موت اپنے سامان کے ساتھ آ پہنچی۔"[6]

---

[1] ابوداؤد ج ۱ باب صلوٰۃ المسافرین [2] باب التکبیر عند الحرب [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] سنن ابن ماجہ باب ما یدعو بہ الرجل اذا رأی السحاب والمطر، یہ واقعہ بخاری و مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے، اخیر فقرہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے [5] شمائل ترمذی باب ما جاء فی شیبۃ [6] مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی باب البکاء والخوف

فرمایا کرتے تھے، لوگو! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے ہوتے تو تم کو ہنسی کم اور رونا زیادہ آتا[1]۔ ایک دفعہ آپؐ نے نہایت مؤثر طرز سے خطبہ میں فرمایا: اے معشر قریش! اپنی آپ خبر لو، میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا! اے بنی عبد المناف! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبد المطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا، اے صفیہ! رسول خدا کی پھوپھی! میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا! اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ میں تجھ کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ (صحیحین)

ایک دفعہ اعراب بادیہ کا مسجد نبوی میں اتنا ہجوم ہوا کہ آپؐ پسنے کے قریب ہو گئے، مہاجرین نے اٹھ کر لوگوں کو ہٹایا، آپؐ نکل کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں داخل ہو گئے اور تقاضائے بشری سے بددعا زبان سے نکل گئی فوراً قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھ خدا کی بارگاہ میں اٹھائے اور دعا کی، خدایا! میں ایک انسان ہوں، اگر تیرے کسی بندہ کو مجھ سے تکلیف پہنچے تو مجھے سزا نہ دینا[2]۔ گریہ و بکا (خشیت الٰہی) کی وجہ سے اکثر آپ پر رقت طاری ہوتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے، حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے جب آپؐ کے سامنے یہ آیت پڑھی فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے۔ اکثر نماز میں رقت طاری ہوتی اور آنسو جاری ہو جاتے۔ ایک دفعہ جب سورج گرہن پڑا تو نماز کسوف میں آپؐ ٹھنڈی سانسیں بھرتے اور فرماتے تھے خدا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو لوگوں پر میرے ہوتے عذاب نہیں نازل کرے گا[3]۔

عبد اللہ بن شخیر ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بار خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا، دیکھا کہ آپؐ نماز میں مشغول ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور روتے روتے اس قدر ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے[4]۔

ایک بار آپؐ ایک جنازہ میں شریک تھے، قبر کھودی جا رہی تھی، آپؐ قبر کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسوؤں سے زمین نم ہو گئی، پھر فرمایا بھائیو! اس دن کے لئے سامان کر رکھو[5]۔

ایک دفعہ کسی غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے راہ میں ایک پڑاؤ ملا کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم کون ہو؟ بولے ہم مسلمان ہیں۔ ایک عورت بیٹھی چولہا سلگا رہی تھی پاس ہی اس کا لڑکا تھا، آگ ذرا روشن ہو گئی اور بھڑک گئی تو وہ بچہ کو لے کر آپؐ کی خدمت میں آئی اور بولی، آپ رسول اللہؐ ہیں؟ ارشاد ہوا ہاں بے شک، پھر اس نے پوچھا کیا ایک ماں اپنے بچہ پر جس قدر مہربان ہے خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں ہے؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں بے شک! اس نے کہا تو ماں اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈالتی۔ آپؐ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا اس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکش اور متمرد ہے، خدا سے سرکشی کرتا ہے اور اس کو ایک نہیں کہتا[6]۔

ایک دفعہ آپؐ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا

---

[1] صحیحین [2] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۱۲۳ دونوں صفحوں پر [illegible] ابو داؤد
صلوٰۃ الکسوف [4] ترمذی و ابو داؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ [illegible]

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ۔

پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ان میں سے جس نے میری پیروی کی وہی میری جماعت میں ہے۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ والی دعا پڑھی۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف کردے تو تو غالب و دانا ہے۔

دونوں ہاتھ اٹھا کر اَللّٰهُمَّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ فرماتے جاتے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے[1]۔

محبتِ الٰہی

دنیا میں دو قسم کے پیغمبر آئے ہیں، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا اور اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ و حضرت موسیٰؑ دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے، مثلاً حضرت یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام لیکن یہ دونوں افراط و تفریط کے راستے تھے، پہلی راہ اخلاص و محبت کی منزل تک پہنچاتی اور دوسری عبودیت اور آداب و احترام کی منزل سے دور پھینک دیتی ہے، جیسا کہ عیسائی تعلیم اور موجودہ انجیل کی سیرت مسیحؑ میں ہر شخص کو نظر آسکتا ہے، لیکن اسلام دونوں جلووں کو یکساں نمایاں کرنا چاہتا ہے، یہی سبب ہے کہ حاملِ شریعتِ اسلامیہ کی ذاتِ مبارک میں یہ دونوں پہلو بیک دفعہ نظر آتے ہیں، قرآن مجید نے کمال ایمان کا یہ وصف بیان کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

جو ایمان لاتے ہیں ان کو سب سے زیادہ خدا پیارا ہے۔

صحیح روایتوں میں ہے کہ آپؐ راتوں کو اتنی دیر تک نماز میں کھڑے رہتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم آجاتا تھا، یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کی مغفرت تو خدا کر چکا ہے، آپؐ یہ زحمت کیوں اٹھاتے ہیں ارشاد ہوا کہ کیا میں عبد شکور نہ بنوں۔ اربابِ باطن کہتے ہیں کہ لوگ سمجھتے تھے کہ آپؐ کی عبادتیں خشیۃ الٰہی سے ہیں اور چونکہ آپؐ گناہوں سے پاک کر دیئے گئے تھے اس لئے آپؐ کو ریاضاتِ شاقہ کی ضرورت نہ تھی، آپؐ نے اپنے جواب میں اسی شبہ کو دفع فرمایا اور بتایا کہ ان کا مقتضا محبتِ الٰہی ہے خشیتِ الٰہی نہیں ہے، اسی لئے آپؐ فرمایا کرتے تھے۔

وجعلت لی قرۃ عینی فی الصلوٰۃ۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

راتوں کو سناٹے میں اٹھ کر آپؐ کبھی دعا و زاری میں مصروف ہوتے کبھی قبرستان کی طرف نکل جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ نصف شب کے سکوت میں خدا سمائے دنیا پر نزول فرماتا ہے[2]۔ عبادتِ شبانہ کا خاتمہ صبح کی دو رکعتوں پر ہوتا تھا، جن کی نسبت آپؐ کا ارشاد تھا کہ ان کے معاوضہ میں دنیا و مافیہا کی نعمتیں بھی میرے سامنے ہیچ رہیں گی[3]۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں کوئی عورت گرفتار ہو کر آئی، اس کا بچہ گم تھا، محبت کا یہ جوش تھا کہ کوئی بچہ مل جاتا تو وہ سینہ سے لگا لیتی اور اس کو دودھ پلاتی، آپؐ نے دیکھا تو حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے۔ لوگوں نے عرض کی ہرگز نہیں۔ فرمایا تو خدا کو اپنے بندوں سے اس سے

---

[1] صحیح مسلم باب بکاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم لامتہ۔ [2] صحیح بخاری [3] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ۔

زیادہ محبت ہے جتنی اس کو اپنے بچہ سے ہے[1]۔

اسی طرح ایک اور واقعہ اوپر گزر چکا ہے کہ آپ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر خدمت اقدس میں آئی اور عرض کی یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنے بچہ سے جس قدر محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا ہاں بے شک ہے۔ اس نے کہا کوئی ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں ڈالنا گوارا نہیں کرتی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا صرف اس بندہ کو عذاب دے گا جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے[2]۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صاحب ایک چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے لپیٹے ہوئے لائے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا اس کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا کہ کیا اپنے بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے[3]۔

آپ محبت الٰہی کے سامنے دنیا کی تمام محبتوں کو ہیچ سمجھتے تھے۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپ نے صحابہ کے مجمع میں ایک خطبہ دیا، اس میں فرمایا، میں خدا کے سامنے اس بات سے برأت کرتا ہوں کہ تم میں سے (یعنی انسانوں میں سے) کوئی میرا دوست ہو، کیونکہ خدا نے مجھے اپنا دوست بنا لیا، جس طرح ابراہیمؑ کو اس نے اپنا دوست بنا لیا تھا اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا[4]۔

وفات کے وقت زبان مبارک سے جو فقرہ بار بار ادا ہو رہا تھا یہ تھا۔

اَللّٰهُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔ خدایا صرف رفیق اعلیٰ مطلوب ہے۔

یہ الفاظ سن کر حضرت عائشہؓ نے کہا، اب آپ ہم لوگوں کو چھوڑ دیں گے[5]۔

اس رفاقت علوی کے راز سے جو کسی قدر آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی یہ تشریح کرتے ہیں،

”انبیاء علیہم السلام چوں از مقام دعوت فارغ میگردند و متوجہ عالم بقا می شوند و مصلحت رجوع الی الخلق تمام می شود بشوق تمام ندائے الرفیق الاعلیٰ برآوردہ بکلیت متوجہ حق جل شانہ میگردند در مراتب قرب سیر می نمایند[6]۔“

توکل علی اللہ

توکل کے یہ معنی ہیں کہ انسان کوششوں کے نتائج اور واقعات عالم کے فیصلہ کو خدا کے سپرد کر دے اسباب وعلل کے پردے اس کے سامنے سے اٹھ جائیں اور وہ براہ راست ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں نظر آئے، بظاہر اسباب وعلل گو ناموافق ہوں، مگر یہ غیر متزلزل یقین پیدا ہو کہ یہ ناموافق حالات ہمارے کام میں ذرہ بھر موثر نہیں ہو سکتے، بلکہ اصلی قوت و قدرت عالم اسباب سے ماوراء ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کا

---

[1] صحیح بخاری ص ۸۰ باب رحمۃ الولد [2] سنن ابن ماجہ باب ما یرجی من الرحمۃ [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ اللہ

[4] صحیح مسلم ص ۲۰۱ باب النہی عن بناء المساجد علی القبور [5] صحیح بخاری باب الوفات [6] مکتوبات امام ربانی، مجدد الف ثانی مکتوب ۲۷۲ جلد اول۔

استقلال عزم، جرأت و بے باکی یہ تمام باتیں اسی ایک اصل کی پرتو ہیں اسی کی بدولت مشکل اوقات میں بھی زمام صبر اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی، پرخطر سے پرخطر راستوں میں بھی جبن اور ضعف ہمت اس کے قلب میں راہ نہیں پاتا، شدید سے شدید حالات میں بھی اس کے دل پر مایوسی کا بادل نہیں چھاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح زندگی کا ایک ایک حرف پڑھ جاؤ، تم کو صاف نظر آئے گا کہ آسمان کے نیچے شدائد اور مصیبتوں کی کوئی ایسی صنف نہ ہوگی جو آپ کی راہ میں حائل نہ ہوئی ہو، لیکن آپ کا دل کبھی اضطراب و انتشار مایوسی و ناامیدی اور خوف و بیم سے آشنا نہ ہوا، مکہ کی تنہائیوں میں مصائب کے ہجوم میں دشمنوں کے نرغہ میں حنین و احد کے خونریز معرکوں میں ہر جگہ توکل و اعتماد علی اللہ کا ایک ہی جلوہ نظر آتا ہے، ابوطالب سمجھاتے ہیں کہ جان پدر اس کام سے ہاتھ اٹھاؤ، آپ فرماتے ہیں: "عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجیے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عرب ایک دن اس کے ساتھ ہوگا" ایک دوسرے کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ "خدا مجھے تنہا نہیں چھوڑے گا"[1] مکہ میں ایک مصیبت زدہ مایوس صحابی سے ارشاد ہوتا ہے: "خدا کی قسم! عنقریب وہ وقت آتا ہے جب یہ دین مرتبۂ کمال کو پہنچ جائے گا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہیں رہے گا"[2]

ایک دفعہ حرم میں بیٹھ کر کفار نے باہم مشورہ کیا کہ محمد اب جیسے ہی یہاں قدم رکھیں ان کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے حضرت فاطمہؓ ان کی یہ تقریر سن رہی تھیں وہ روتی ہوئی آپ کے پاس آئیں اور واقعہ عرض کیا، آپ نے ان کو تسکین دی اور وضو کے لئے پانی مانگا، وضو کر کے آپ بےخطر حرم کی سمت روانہ ہو گئے، جب خاص صحن حرم میں پہنچے اور کفار کی نظر آپ پر پڑی تو خود بخود ان کی نگاہیں جھک گئیں۔[3]

جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ شب ہجرت میں قریش کے بہادر خون آشام ارادوں کے ساتھ کاشانۂ اقدس کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، لیکن آپ نے نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنے عزیز قوت بازو علی مرتضیٰؓ کو اپنی جگہ بستر پر لٹا دیا، حالانکہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ قتل گاہ ہے، بستر خواب نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم تھا کہ ایک قادر کل ہستی ہے، جو تختۂ مقتل کو فرش گل بنا سکتی ہے ان کو لٹاتے ہوئے نہایت بے پروائی سے فرمایا کہ "تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا"[4]

گھر کے چاروں طرف دشمنان قریش محاصرہ کئے ہوئے تھے اور خیال ہو سکتا تھا کہ صبح امید کے انتظار میں مکہ کے برنا و پیر عجب نہیں کوچوں میں اور گلیوں میں مشتاق خبر پھر رہے ہوں، لیکن آپ نے اذن الٰہی کے اعتماد پر ان تمام ناموافق حالات کی موجودگی میں گھر سے باہر قدم نکالا، اس وقت سورہ یٰسین کی ابتدائی آیتیں زبان مبارک پر تھیں جن میں نبوت کی اور اپنے راہ راست پر ہونے کی تصدیق ہے، آخری آیت یہ تھی۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ
سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (یٰسین)

ہم نے ان کے آگے اور ان کے پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں ہم
نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

مکہ سے نکل کر آپ نے مع حضرت ابوبکرؓ کے غار ثور میں پناہ لی، قریش میں خون آشامی کے ساتھ اپنی ناکامی

---

[1] یہ دونوں واقعے ابن ہشام میں ہیں۔ [2] صحیح بخاری اواخر جزو اول۔ [3] مسند اول ج ۱ ص ۳۶۸۔ [4] ابن ہشام و طبری۔

کا غصہ بھی تھا اور اس لیے اس وقت ان کے انتقام کے جذبات میں غیر معمولی تلاطم ہوگا، وہ آپ کے تعاقب میں نشان قدم کو دیکھتے ہوئے ٹھیک اسی غار کے پاس پہنچ گئے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس پُر خطر حالت میں کسی کے حواس برجا رہ سکتے ہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! دشمن اس قدر قریب ہیں کہ اگر ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں گے تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔ لیکن آپ نے روحانیت کی پُر سکون آواز میں فرمایا، اُن دو کو کیا غم ہے جن کے ساتھ تیسرا خدا ہو، پھر جیسا کہ قرآن مجید میں ہے فرمایا۔

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ غم نہ کر، خدا ہمارے ساتھ ہے۔

سینۂ نبوت کے سوا اس روحانی سکون کا جلوہ اور کہاں نظر آسکتا ہے۔

قریش کے اس اعلان کے بعد کہ جو محمدؐ کو زندہ یا اُن کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سو اونٹ ملیں گے، سراقہ بن جعشم نے آپ کا تعاقب کیا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ وہ آپ کو پاسکتا تھا حضرت ابوبکرؓ بار بار گھبرا کر ادھر دیکھ رہے تھے، لیکن آپ نے ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ سراقہ کس ارادہ سے آرہا ہے، یہاں دل پر وہی سکینتِ ربانی طاری تھی اور لب ہائے مبارک تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مدینہ آکر آپ کی زندگی ہر قسم کے خطروں سے محفوظ ہوگئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ گو اسلام کو یہاں اعوان و انصار کی ایک معتدبہ تعداد مل گئی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان دشمنوں کا سامنا بھی تھا جو دشمنانِ مکہ سے زیادہ خطرناک تھے۔ مکہ میں قریش گو آپ کے دشمن تھے لیکن ان میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نسبی تعلقات تھے جو کبھی کبھی کسی کو غم خواری اور مواسات پر بھی مائل کر دیتے تھے لیکن مدینہ کے منافقین اور یہود کو مواسات اور ہمدردی کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی، علاوہ بریں یہود و منافقین مدینہ اور قریشِ مکہ میں باہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل و جلا وطنی کی سازشیں شروع ہوگئی تھیں۔ اس بنا پر صحابہ جاں نثاری کی بنا پر آپ راتوں کو پہرہ دیا کرتے تھے، اسی زمانہ میں ایک رات صحابہ آپ کے خیمہ کا پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ) اور اللہ لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

اور آپ نے اُسی وقت خیمہ سے باہر سر نکال کر صحابہؓ سے فرمایا،

یٰایھا الناس انصرفوا فقد عصمنی اللہ۔ لوگو واپس جاؤ میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے۔

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا، یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے دوپہر کا وقت تھا صحابہ درختوں کے سایہ میں ادھر اُدھر سو رہے تھے، آپ بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما تھے آپ کی تلوار ایک درخت سے لٹکی تھی کہ ناگاہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار اتار کر نیام سے باہر کی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہوشیار ہوگئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے بدو نے پوچھا اے محمدؐ! اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟ ایک پُر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"۔

ایک دفعہ ایک شخص گرفتار ہو کر پیش ہوا کہ یہ آپ پر حملہ کی گھات میں تھا، آپ نے فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ یہ

---

۱ صحیح بخاری ہجرت ۲ سیرت ج ۲ سلسلۂ غزوات ۳ جامع ترمذی تفسیر مائدہ ۴ صحیح بخاری کتاب الجہاد ۵ مسند ابن حنبل ج ۳ صفحہ ۴۲۔

مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا، یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ میری حفاظت کا ذمہ دار کوئی اور ہے۔ خیبر میں جس یہودیہ نے آپ کو زہر دیا تھا اس سے آپ نے دریافت کیا کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے جواب دیا کہ "آپ کے قتل کرنے کے لیے" آپ نے فرمایا کہ "خدا تم کو اس پر مسلط نہ کرتا"[1]

اُحد اور حنین کے معرکوں میں جب میدان جنگ تھوڑی دیر کے لئے جان نثاروں سے خالی ہو گیا تھا، آپ کا استقلال، توکل علی اللہ و سکینتِ روحانی کی معجزانہ مثال ہے، یہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی ایک رخی تصویر ہے اس مرقع کا دوسرا رُخ بھی کچھ اس سے کم مؤثر نہیں ہے، آپ پر فقر و غنا کے مختلف دور گزرے، کوئی دن ایسا آتا کہ مسجدِ نبوی کا صحن زر و مال سے معمور ہو جاتا اور پیہم متصل کئی کئی دن ایسے آتے کہ فاقہ سے شکم مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، حالانکہ بالکل ممکن تھا کہ آج کا سرمایہ کل کے مصارف کے لئے اٹھا رکھا جاتے لیکن تمام عمر آپ کا طرزِ عمل اس کے خلاف رہا، کبھی ایک دن کی آمدنی دوسرے دن کے لئے اٹھا کر نہیں رکھی گئی، ضروری اور بقدرِ کفالت اخراجات کے بعد جو کچھ بچ جاتا وہ شام تک اہلِ استحقاق پر صرف کر دیا جاتا تھا، ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یدخر لغد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کیلئے کوئی چیز اٹھا نہیں رکھتے تھے۔

اتفاق سے یا بھولے سے اگر کوئی چیز گھر میں رہ جاتی تو آپ کو سخت تکلیف[2] ہوتی تھی بلکہ آپ اس وقت تک گھر میں تشریف نہیں لے جاتے تھے جب تک یہ نہ معلوم ہو جاتا کہ اب وہاں خدا کی برکت کے سوا کچھ نہیں ہے[3] اس قسم کے متعدد واقعات جود و سخا کے عنوان میں مذکور ہیں۔

نزع کے وقت جب انسان ہر چیز کو فراموش کر دیتا ہے، آپ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں وہ پڑی ہوں گی، اس نازک موقع پر بھی یہ سہو آپ کو توکل علی اللہ کی شان کے خلاف نظر آیا، ارشاد ہوا کہ عائشہؓ! کیا محمدؐ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا، جاؤ پہلے ان کو خیرات کر دو۔[4]

صبر و شکر

رنج و غم کے متعاقب اور توام دور کس کی زندگی میں نہیں آتے لیکن انسان کے روحانی کمال کا جوہر یہ ہے کہ ایک طرف حصولِ مقصد اور کامیابی کے نشہ میں سرشار اور از خود رفتہ نہ ہو تو دوسری طرف مصائب و آلام کی تلخی کو خندہ جبینی اور کشادہ دلی کے ساتھ گوارا کر لے اور یقین رکھے کہ انسان کا فرض صرف عمل ہے کامیابی و ناکامیابی کا سررشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ ہے

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید-۳)

جتنی مصیبتیں زمین پر یا خود تم پر نازل ہوتی تھیں وہ ان کے وجود سے پہلے دیوانِ قضا میں لکھی گئی ہیں، یہ بات خدا کے لئے آسان ہے یہ اس لئے کیا گیا تاکہ تم ناکامی پر غم اور حصولِ مقصد پر فخر نہ کرو، خدا مغرور اور فخر کر کو دوست نہیں رکھتا۔

---

[1] صحیح مسلم باب السم۔ [2] صحیح بخاری باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاہم و مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۳۔ [3] ابوداؤد باب قبول ہدایا المشرکین۔

[4] مسند احمد و ابن سعد جزء الوفاۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں وہ بڑی سے بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں جو اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے کسی فرد کو حاصل ہو سکتی تھیں، تاہم آپ کے آئینۂ دل میں کبھی فخر و غرور نے اپنا عکس نہیں ڈالا۔ آپ نے فرمایا انا سید ولد آدم ولا فخر۔ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن مجھے اس پر فخر نہیں۔

عدی بن حاتم طائی نے جو مذہباً عیسائی تھے، آپ کے جو حالات سنے تھے ان کی بنا پر ان کو یہ شک تھا کہ آپ بادشاہ ہیں یا پیغمبر؟ جب وہ اپنے قبیلہ کا وفد لے کر حاضر خدمت ہوئے تو ٹھیک اسی وقت ایک مسکین سی عورت اپنی کسی غرض کے لئے بارگاہ اقدس میں آئی اور مجمع سے ذرا ہٹ کر کچھ سن لینے کی درخواست کی، آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس وقت تک گلی میں کھڑے رہے، جب تک وہ خود اپنی مرضی سے چلی نہیں گئی۔ عدی کہتے ہیں کہ آپ کی تواضع اور خاکساری کا یہ عالم دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ آپ پیغمبر ہیں بادشاہ نہیں[1]۔

مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہوئے دنیا کے ہر فاتح کا سر غرور و ناز سے بلند ہو جاتا ہے لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اس وقت بھی اپنا سر نیاز بارگاہ ایزدی میں جھکا کر شہروں کے اندر داخل ہوا۔ ابن اسحاق نے روایت کی ہے کہ فتح مکہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما انتھی الی ذی طویٰ وقف علی راحلته لیضع رأسه تواضعاً للہ حین رأی ما اکرمه اللہ من الفتح حتی ان عثنونه لیکاد یمس واسطة الرحل[2]۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ کو فتح کی عزت عطا کی ہے تو آپ نے اپنی سواری پر توقف کیا تاکہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکائیں پھر یہاں تک آپ جھکے کہ آپ کی ٹھڈی قریب تھی کہ کجاوہ کی لکڑی سے لگ جاتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے عبادت اور تسبیح و تہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا تو آپ کو بے گناہ اور معصوم بنا چکا، اب آپ کیوں یہ زحمت اٹھاتے ہیں۔ ارشاد ہوا۔

افلا اکون عبداً شکوراً[3]۔

کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

یعنی اگر یہ تعبد و تسبیح و تحمید پہلے اس مرتبہ کے حصول کے لئے تھی، تو اب اس مرتبہ کے حصول پر شکر گزاری اور احسان مندی کے اعتراف میں ہے۔ دنیا کے اعاظم رجال جن کو روحانیت کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا، اپنی ہر کامیابی کو اپنی قوت بازو، اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب و داب کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مقربین الٰہی کی اصطلاح میں یہ تخیل شرک و کفر کے ہم پایہ ہے، ان کو ہر کامیابی اور مسرت کے واقعہ کے اندر قادر کل کا دست غیر مرئی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے، حدیث میں ہے[4]۔

انه کان اذا جاءہ امر سرور او بشر به خر ساجداً شاکراً للہ تعالیٰ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی تھی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کیلئے آپ فوراً سجدہ میں گر پڑتے تھے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام صفحہ ۲۲۰۔ [2] سیرت ابن ہشام ذکر فتح مکہ۔ [3] صحیح بخاری قیام اللیل۔ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔

قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپؐ کو پہنچی تو آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا[۱]، اسی طرح ایک دفعہ اور کسی بات کی آپؐ کو خبر دی گئی تو آپؐ فوراً سجدۂ الٰہی بجا لائے[۲]۔ وحی کے ذریعہ سے جب آپؐ کو یہ معلوم ہوا کہ جو مجھ پر درود بھیجے گا اس پر خدا درود بھیجے گا تو اس رفیع منزلت پر آپؐ نے سجدۂ شکر ادا کیا[۳]۔

حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور جب مقام زوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر گئے اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک بارگاہِ الٰہی میں دعا کی، پھر سجدہ میں گئے اور دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے، پھر سر اٹھا کر بدستور دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے اور پھر دیر تک سجدہ میں رہے، پھر اٹھ کر تضرع کے ساتھ دعا شروع کی اور اس کے بعد جبین نیاز خاک پر رکھی، اس دعا و سجود سے فارغ ہو کر آپؐ نے صحابہ سے فرمایا میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لئے خدا سے دعا مانگی تھی جس کا ایک حصہ مقبول ہوا، میں شکر کے لئے سجدہ میں گرا، پھر مزید درخواست کی اس نے وہ بھی قبول کی میں سجدۂ شکر بجا لایا اور پھر دعا و زاری کی، اس نے اس کو بھی درجہ استجابت بخشا اور پھر میں سجدہ میں گر پڑا[۴]۔

سورۂ والضحیٰ میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اسی وصف کو نمایاں فرمایا ہے۔

وَالضُّحٰى وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (ضحیٰ ۱۰)	(اے پیغمبر) دن کے پہلے پہر کی قسم اور رات کی قسم جب وہ پردہ ڈال دے کہ تیرے پروردگار نے نہ تو تجھ کو چھوڑا اور نہ تجھ سے ناراض ہوا یقیناً تیری پچھلی زندگی پہلی سے بہتر ہے وہ تجھ کو وہ کچھ دے گا جس سے تو خوش ہو جائے گا کیا اس نے تجھ کو یتیم نہیں پایا تو اپنی پناہ میں لے لیا اور تجھ کو راہ حق کا جویاں پایا تو اس نے سیدھی راہ دکھا دی اور تجھ کو مفلس پایا تو غنی کر دیا ان نعمتوں کے شکریہ میں یتیم پر ظلم نہ کرنا اور سائل کو نہ جھڑکنا اور اپنے پروردگار کے احسان کو یاد کرتے رہنا۔

آپؐ کی سوانح زندگی کا حرف حرف شاہد ہے کہ آپؐ عمر بھر کیونکر اس ارشاد ربانی کی تعمیل کرتے رہے۔

صبر کا مفہوم بالکل شکر کے مخالف ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ دونوں متضاد اوصاف ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے اور آپؐ کو عملاً دونوں کے اظہار کا موقع ملا۔ حدیث شریف میں ہے ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ مصیبت کس پر آتی ہے؟ ارشاد ہوا کہ پیغمبر پر، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ لوگوں پر[۵]۔ واقعات بھی اس روایت کی تصدیق کرتے ہیں، آپؐ سرور انبیاء تھے، اس بنا پر دنیا کے شدائد اور مصائب کا بار اس مقدس گروہ میں سب سے زیادہ آپؐ کے دوش مبارک پر تھا، اسی لئے قرآن مجید میں بار بار آپؐ کو صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے۔

واصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل۔	(اے پیغمبر) جس طرح اولوا العزم پیغمبروں نے صبر کیا تم بھی صبر کرو۔

---

[۱] زاد المعاد بحوالہ بیہقی بسند علی شرط البخاری ج ۱ ص ۱۹۵ [۲] ایضاً [۳] مسند احمد عن عبد الرحمٰن بن عوف [۴] ابو داؤد کتاب السجود۔

[۵] سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء۔

آپ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے کہ والد نے انتقال کیا، عہدِ طفولیت ہی میں تھے کہ سر سے ماں کا سایہ اٹھ گیا، اس کے دو برس کے بعد دادا نے جن کی نگاہِ لطف زخمِ یتیمی کا مرہم تھا وفات پائی، نبوت کے بعد ابوطالب نے جو قریش کے ظلم و ستم کے سپر تھے، مفارقت کی، محرمِ اسرار ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ جو اس ہجومِ مصائب میں آپ کی تنہا مونس و غمخوار تھیں موت نے ان کو بھی اسی زمانہ میں آپ سے علیحدہ کر دیا، والدین اور بیوی کے بعد انسان کو سب سے زیادہ اولاد سے محبت ہوتی ہے جس کی مفارقت کا زخم تمام عمر مندمل نہیں ہوتا، آپ کی اولادِ ذکور حسبِ اختلافِ روایت کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ آٹھ تھی، لڑکیوں کی تعداد چار تھی، لیکن ایک حضرت فاطمہؓ کے سوا سب نے کم سنی یا جوانی میں آپ کی نگاہوں کے سامنے جان دی، ان واقعات پر اگرچہ کبھی کبھی آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں لیکن زبان و دل پر ہمیشہ سکینت کی مہر لگی رہی اور کبھی کوئی کلمہ زبانِ مبارک سے ایسا نہیں نکلا جس سے کارکنانِ قضا کی شکایت کا پہلو نکلتا ہو۔

آپ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے ۸ھ میں وفات پائی تو تجہیز و تکفین کے متعلق آپ نے خود بنفسِ نفیس ہدایات دیں، جنازہ قبر کے سامنے رکھا گیا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، لیکن زبانِ مبارک سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، حضرت زیدؓ (پروردۂ خاص) اور حضرت جعفرؓ (ابن عم) دونوں آپ کو بہت محبوب تھے، غزوۂ موتہ میں ان کی شہادت کی خبر آئی تو چشمِ مبارک اشک آلود ہو گئی، لیکن اسی اثنا میں حضرت جعفرؓ کے گھر سے نوحہ کی آواز آئی تو آپ نے منع کرا بھیجا، آپ کا ایک نواسہ جس سے آپ کو محبت تھی مبتلائے نزع ہوا تو صاحبزادی نے بلا بھیجا، لیکن آپ نے اس کے جواب میں سلام کے بعد یہ پیغام بھیجا۔

انا للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل	اللہ نے جو لے لیا وہ اسی کا تھا اور جو دیا وہ بھی اسی کا ہے اس کا
مسمی فلتصبر ولتحتسب۔	ہر کام وقت مقررہ پر ہوتا ہے صبر کرو اور اس سے خیر طلب کرو۔

صاحبزادی نے دوبارہ باصرار بلایا، آپ چند صحابہؓ کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، بچہ آپ کی گود میں رکھ دیا گیا وہ دم توڑ رہا تھا، آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، ایک صحابی نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیا ہے؟ فرمایا جذبۂ محبت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل میں رکھا ہے، خدا اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر رحم کرتا ہے۔

ایک بار آپ سعدؓ بن عبادہ کی عیادت کو تشریف لائے اور ان کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ انتقال کر گئے، صحابہؓ نے کہا نہیں یا رسول اللہ! آپ رو پڑے تو آپ کو روتے دیکھ کر صحابہ بھی رو پڑے، آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کو منع نہیں کرتا، لیکن زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس سے عذاب ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت جب آپ کی آنکھوں سے اشکِ محبت جاری ہوئے تو عبدالرحمنؓ بن عوف نے کہا یا رسول اللہ یہ کیا بات ہے؟ فرمایا یہ رحمت و شفقت ہے، حضرت عبدالرحمنؓ نے دوبارہ گزارش کی، ارشاد ہوا۔

ان العین تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا ما یرضی	آنکھ اشک ریز ہے دل غمگین ہے لیکن ہم وہی کہیں گے جو ہمارے
ربنا وانا بفراقک یا ابراہیم لمحزونون	رب کی مرضی ہو اے ابراہیم! ہم تیرے فراق میں بہت غمگین ہیں۔

---

[1] ان تمام واقعات کے لئے صحیح بخاری کتاب الجنائز دیکھو۔

بہرحال یہ واقعات آنی ہیں، یعنی اُن کا اثر ایک خاص وقت تک انسان پر رہتا ہے، پھر مٹ جاتا ہے لیکن مسلسل اور غیر منقطع مصائب و حوادث کو اس طرح برداشت کرنا کہ کبھی پیمانۂ صبر لبریز نہ ہونے پائے سخت مشکل ہے۔ ہجرت سے پہلے ۱۳ سال تک طائف اور مکہ کے اشقیائے دعوتِ حق کا جس تحقیر و استہزا، سب و شتم، تعذیب و ایذارسانی کے ساتھ جواب دیا، اس کے دہرانے کی حاجت نہیں۔ مدینہ منورہ میں آٹھ نو برس تک جن خونی معرکوں کا ہمیشہ سامنا رہا اور دشمنوں نے آپ کی جلاوطنی اور قتل و شکست کے جو جو منصوبے باندھے ان کے اعادہ کی بھی ضرورت نہیں، لیکن ان تمام تیروں کی بوچھاڑ صبر کے سوا آپ نے کس سپر پر روکی؟

اس سے بھی زیادہ مشکل ان واقعات پر صبر ہے جو خود اختیاری ہوں، فتوحات کی کثرت گو ہر دفعہ بیت المال کو معمور کر دیتی تھی لیکن دستِ کرم کو اسی وقت آرام ملتا جب سارا خزانہ اربابِ حاجت اور فقرا میں لٹ چکا ہوتا۔ چنانچہ اسی بنا پر آپ خود اور تمام اہل بیت کی زندگی اکثر فقر و فاقہ میں گزرتی تھی، جسمِ مبارک کے لئے ایک کے سوا کپڑے کا کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہوتا تھا، تاہم یہ تمام شدائد اس لئے گوارا تھے کہ صبر کی لذت الوانِ نعمت کی خوشگواری اور لباس ہائے فاخرہ کی مسرت سے کہیں زیادہ تھی۔

لیکن سب سے زیادہ حوصلہ شکن اور صبر آزما اُس تیر کا نشانہ ہے جو دشمنوں کے نہیں بلکہ دوستوں کے ہاتھ سے لگایا جائے۔ دو دفعہ ایسا ہوا کہ بعض جلد باز نوجوانوں نے آپ کے کسی فعل پر جو کسی مصلحت پر مبنی تھا، اعتراض کیا اس موقع پر بھی صبر کا رشتہ آپ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ غنائمِ حنین کے متعلق ایک دو انصاریوں نے اعتراض کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دوسروں کو کیوں دے دیا، حق تو ہمارا تھا، آپ کو اس کی خبر پہنچی تو فرمایا۔

رحمة الله على موسى قد اوذى اكثر من ذالك فصبر۔	موسیٰ پر خدا کی رحمت ہو، وہ اس سے بھی زیادہ (اپنے دوستوں کی طرف سے) ستائے گئے ہیں لیکن انہوں نے صبر کیا۔
(باب غزوۂ حنین)	

*

اخلاقِ نبوی

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ اقدس کا یہ وہ حصہ ہے جہاں آکر آپ کی زندگی تمام انبیاء کرام اور مصلحین عالم سے علانیہ ممتاز نظر آتی ہے۔ تاریخی ہستی کا ثبوت ایک طرف، اگر یہ سوال کیا جائے کہ ان اخلاقی وعظوں کا خود عملی نمونہ کیا تھا تو دنیا اس کے جواب سے عاجز رہ جائے گی۔ دنیا کے تمام مصلحین اخلاق میں گوتم بدھ اور مسیح کا درجہ سب سے بڑا ہے، لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ ہندوستان کا یہ مصلح اعظم (بودھ) عملاً کیا تھا؟ کوہِ زیتون کے ریحانہ اخلاق کا واعظ (مسیح) دنیا کو اخلاق کا بہترین درس دیتا تھا، لیکن اس کی زندگی کا ایک واقعہ بھی اس کے زریں مقولوں کی تائید میں ہم کو معلوم ہے؟ لیکن مکہ کا معلمِ اُمّی پکار کر کہتا تھا۔

لِمَا تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ (بقرہ)
جو نہیں کرتے وہ کہتے کیوں ہو۔

وہ خود اپنی تعلیم کا آپ نمونہ تھا۔ انسانوں کے مجمعِ عام میں وہ جو کچھ کہتا تھا گھر کے خلوت کدہ میں وہ اسی طرح نظر آتا تھا۔ اخلاق و عمل کا جو نکتہ وہ دوسروں کو سکھاتا تھا وہ خود اس کا عملی پیکر بن جاتا تھا۔ بیوی سے بڑھ کر انسان کے اخلاق کا اور کون راز داں ہو سکتا ہے، چند صاحبوں نے آکر حضرت عائشہؓ سے درخواست کی کہ حضرتؐ کے اخلاق بیان کیجئے، انہوں نے پوچھا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؛ ان خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان القرآن "آپؐ کا اخلاق سر تا سر قرآن تھا"[1]

موجودہ صحائفِ آسمانی اپنے داعیوں کے بہترین اقوال کا مجموعہ ہیں لیکن کیا ان کا ایک حرف بھی اپنے مبلغین کے عمل کا مدعی ہے۔ قرآن مجید لاکھوں مخالفین و اہلِ عناد کی بھیڑ میں اپنے داعیٔ حق کی نسبت گویا تھا۔

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔
اے محمدؐ! تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو۔

بے درد نکتہ چین آج تیرہ سو برس کے بعد آپؐ کو سنگ دل کہتے ہیں، لیکن اس وقت جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا قرآن خود دشمنوں کے مجمع میں آپؐ کی نسبت کیا شہادت دے رہا تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران)
خدا کی عنایت سے تم ان سے نرمی پیش آتے ہو، اگر تم کہیں کج خلق اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے آس پاس سے ہٹ جاتے۔

دوسری جگہ کہتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ)
تمہارے پاس تم میں سے خود ایک پیغمبر آیا، اس پر تمہاری تکلیف بہت شاق گزرتی ہے تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے، اہل ایمان پر نہایت نرم اور مہربان ہے۔

---

[1] ابوداؤد باب الصلوٰۃ فی اللیل۔

مسئلۂ اخلاق کی نسبت ایک بڑی غلطی یہ کی گئی ہے کہ صرف رحم و رافت اور تواضع و خاکساری کو پیغمبرانہ اخلاق کا مظہر قرار دے دیا گیا، حالانکہ اخلاق وہ چیز ہے جو زندگی کی ہر منزل میں اور واقعات کے ہر پہلو میں نمایاں ہوتی ہے، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ، صغیر و کبیر، مفلس و تونگر، صلح و جنگ، خلوت و جلوت، غرض ہر جگہ اور ہر ایک تک دائرہ اخلاق کی وسعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوانِ اخلاق پر اسی حیثیت سے نظر ڈالنی چاہیے۔

اخلاقِ نبوی کا جامع بیان

اس سے پہلے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق مبارکہ کے جزئی اور تفصیلی واقعات لکھے جائیں، ان صاحبوں کے بیانات زیر تحریر آتے ہیں جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سالہا سال اور مدت ہائے دراز بسر کی ہیں اور جو آپ کے اخلاق و عادات کے دفتر کے ایک ایک حرف سے واقف تھے، انسان کے حالات کا واقف کار بیوی سے بڑھ کر دنیا میں کون ہو سکتا ہے، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ جو نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد ۲۵ برس تک آپ کی خدمتِ زوجیت میں رہی تھیں، زمانہ آغازِ وحی میں آپ کو ان الفاظ میں تسلی دیتی تھیں "ہرگز نہیں! خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں[1]۔"

امہات المومنین میں حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر کسی نے آپ کے اوصاف تفصیل سے نہیں بیان کیے ہیں، فرماتی ہیں "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کسی کو برا بھلا کہنے کی نہ تھی، برائی کے بدلہ میں برائی نہیں کرتے تھے بلکہ درگزر کرتے تھے اور معاف فرما دیتے تھے[2]۔ آپ کو جب دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان ہوتی اس کو اختیار فرماتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو، ورنہ آپ اس سے بہت دور ہوتے۔ آپ نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، لیکن جو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتا خدا اس سے انتقام لیتا تھا[3] (یعنی خدا کی طرف سے بحیثیت احکامِ ربانی آپ اس پر حد جاری فرماتے تھے)، آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، آپ نے کبھی کسی غلام کو، لونڈی کو، کسی عورت کو، جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، آپ نے کسی کی کوئی درخواست رد نہیں فرمائی لیکن یہ کہ وہ ناجائز ہو[4]۔ آپ جب گھر کے اندر تشریف لاتے تو نہایت خنداں ہنستے اور مسکراتے ہوئے، دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، باتیں ٹھہر ٹھہر کر اس طرح فرماتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ لے[5]۔"

حضرت علیؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے اور آغازِ نبوت سے آخر تک کم از کم ۲۳ برس آپ کی خدمتِ اقدس میں رہے تھے، ایک دفعہ حضرت امام حسینؓ نے اُن سے آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت سوال کیا، فرمایا آپ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، بات بات پر شور نہیں کرتے تھے، کوئی برا کلمہ منہ سے کبھی نہیں نکالتے تھے، عیب جو اور تنگ گیر نہ تھے، کوئی ایسی بات ہوتی جو آپ

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔ [2] جامع ترمذی۔ [3] شمائل ترمذی۔ [4] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الادب۔ [5] یہ تفصیل مسلم اور ابوداؤد وغیرہ احادیث کی مختلف روایات میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔ [6] حاکم بہ سند متصل، اس کے بعض ٹکڑے صحیح مسلم میں بھی ہیں۔ [7] ابن سعد۔ [8] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد۔

کو ناپسند ہوتی تو اس سے اغماض فرماتے تھے، کوئی آپؐ سے اس کی امید رکھتا تو نہ اس کو مایوس کرتے تھے اور نہ منظوری ظاہر فرماتے تھے، یعنی صراحۃً انکار و تردید نہیں کرتے تھے بلکہ خاموش رہتے تھے اور مزاج شناس آپؐ کے تیور سے آپؐ کا مقصد سمجھ جاتے تھے۔ اپنے نفس سے تین چیزیں آپؐ نے بالکل دور کر دی تھیں، بحث و مباحثہ، ضرورت سے زیادہ بات کرنا اور جو بات مطلب کی نہ ہو اس میں پڑنا، دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے، کسی کو برا نہیں کہتے تھے، کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے، وہی باتیں کرتے تھے جن سے کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا تھا، جب آپؐ کلام کرتے صحابہؓ اس طرح خاموش ہو کر اور سر جھکا کر سنتے گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں، جب آپؐ چپ ہو جاتے تو پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے، کوئی دوسرا بات کرتا تو جب تک وہ بات ختم نہ کر لیتا چپ سنا کرتے۔ لوگ جن باتوں پر ہنستے آپؐ بھی مسکرا دیتے، جن پر لوگ تعجب کرتے آپؐ بھی کرتے۔ کوئی باہر کا آدمی اگر بے باکی سے گفتگو کرتا تو آپؐ تحمل فرماتے، دوسروں کے منہ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اگر کوئی آپؐ کے احسان و انعام کا شکریہ ادا کرتا تو قبول فرماتے۔ جب تک بولنے والا خود چپ نہ ہو جاتا آپؐ اس کی بات درمیان سے نہیں کاٹتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے۔ اگر کوئی دفعۃً آپؐ کو دیکھتا تو مرعوب ہو جاتا لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔[1]

ہند بن ابی ہالہ جو گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش پروردہ تھے، وہ بیان کرتے ہیں[2] کہ آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہ رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہارِ شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے اور اس کو برا بھلا نہ کہتے، کوئی اگر کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپؐ کو غصہ آ جاتا اور اس کی پوری حمایت کرتے، لیکن خود اپنے ذاتی معاملہ پر کبھی آپؐ کو غصہ نہیں آیا اور نہ کسی سے انتقام لیا۔[3]

مداومتِ عمل

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے، انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوقات صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرۃً اسی پر مجبور ہے۔ آفتاب صرف روشنی بخشتا ہے اس سے تاریکی کا صدور نہیں ہو سکتا، رات تاریکی ہی پھیلاتی ہے، وہ روشنی کی علت نہیں، درخت اپنے موسم ہی میں پھلتے ہیں اور پھول ایامِ بہار ہی میں پھولتے ہیں، حیوانات کا ایک ایک فرد اپنے نوعی افعال و اخلاق سے ایک سر مو تجاوز نہیں کر سکتا۔ لیکن انسان خدا کی طرف سے مختار پیدا ہوا ہے، وہ آفتاب بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی، اس کے جوہر کا درخت ہر موسم میں پھلتا ہے اور اس کے اخلاق کے پھول ایامِ بہار کے پابند نہیں، وہ حیوانات کی طرح کسی ایک ہی خاص قسم کے اعمال و اخلاق پر مجبور نہیں، اس کو اختیار دیا گیا ہے اور یہی اختیار اور اس کے مکلف اور ذمہ دار ہونے کا اثر ہے۔ لیکن اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لئے

---

[1] پوری تفصیل شمائل ترمذی بیان اخلاق میں ہے [2] یہ ٹکڑا شمائل ترمذی بیان حلیہ مبارک میں ہے [3] شمائل ترمذی۔

اخلاق حسنہ کا جو پہلو پسند کرے، اس کی شدت سے پابندی کرے، اور اس طرح دائمی اور غیر متبدل طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے۔ اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل اور پھول سے خوشبو کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اسی کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام کاموں میں اسی اصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپؐ نے شروع فرمایا اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہتے تھے۔ سُنّت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے۔ سنت وہ فعل ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا۔ اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپؐ کی استقامت حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں، آپؐ کے معمولات کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، جس سے یہ معلوم ہوا کہ آپؐ کے تمام اخلاق و اعمال کس قدر پختہ اور مستحکم تھے کہ کبھی تمام عمر ان میں ایک ذرہ فرق نہیں پیدا ہوا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عبادات و اعمال کے متعلق حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا کہ کیا آپؐ کسی خاص دن یہ کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا۔ لا کان عملہ دیمۃ۔ آپؐ کا عمل جھڑی ہوتا تھا، یعنی جس طرح بادل کی جھڑی برسنے پر آتی ہے تو نہیں رکتی، اسی طرح آپؐ کا حال تھا کہ جو بات ایک دفعہ آپؐ نے اختیار کر لی ہمیشہ اس کی پابندی کی، پھر فرمایا وایکم یستطیع ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستطیع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کر سکتے تھے وہ تم سے کون کر سکتا ہے[1]۔ دوسری روایت میں ہے۔

وکان اذا عمل عملاً اثبتہ[2]۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کام کرتے تھے تو اس پر مداومت فرماتے تھے

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ارشاد ہے۔

ان احب العمل الی اللہ ادومہ[3]۔ خدا کے نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جس پر سب سے زیادہ انسان مداومت کرے

آپؐ راتوں کو اٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی رات کی عبادت ترک نہیں کی۔ اگر کبھی مزاج اقدس ناساز یا سُست ہوا تو بیٹھ کر ادا کرتے تھے[4]۔

جریرؓ بن عبداللہ ایک صحابی ہیں، جن کو دیکھ کر آپؐ محبت سے مسکرا دیا کرتے تھے، ان کا بیان ہے کہ کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا ہوں اور آپؐ نے مسکرا نہ دیا ہو[5]۔

جس کام کے کرنے کا جو وقت آپؐ نے مقرر کر لیا تھا اس میں کبھی تخلف نہ ہوا، نماز اور تسبیح و تہلیل کے اوقات، نوافل کی تعداد، خواب اور بیداری کے مقررہ ساعات، ہر شخص سے ملنے جلنے کے طرز و انداز میں کبھی فرق نہ آیا، اب وہی مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق [2] ابوداؤد آخر کتاب الصلوۃ و صحیح بخاری کتاب الادب [3] ایضاً [4] ابوداؤد قیام اللیل

[5] صحیح مسلم مناقب جریرؓ بن عبداللہ۔

حسن خلق

(حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ وغیرہ جو مدتوں آپ کی خدمت میں رہے ہیں، ان سب کا متفقہ بیان ہے کہ آپؐ نہایت نرم مزاج، خوش اخلاق اور نیکو سیرت تھے، آپ کا چہرہ ہنستا تھا، وقار و متانت سے گفتگو فرماتے تھے، کسی کی خاطر شکنی نہیں کرتے تھے[1]،

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام و مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپؐ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے، جب تک وہ خود منہ نہ ہٹا لے، مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے، مجلس میں بیٹھتے تو آپؐ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ اکثر نوکر چاکر، لونڈی، غلام خدمتِ اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپؐ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے، جاڑوں کا دن اور صبح کا وقت ہوتا تاہم آپؐ کبھی انکار نہ فرماتے[2]۔

ایک دفعہ آپؐ سعدؓ بن عبادہ سے ملنے گئے، واپس آنے لگے تو انھوں نے اپنے صاحبزادہ قیسؓ کو ساتھ کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیسؓ سے کہا تم بھی میرے اونٹ پر سوار ہو لو، انھوں نے بے ادبی کے لحاظ سے تامل کیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یا سوار ہو لو یا گھر واپس جاؤ، وہ واپس چلے آئے[3]۔

ایک دفعہ نجاشی کے ہاں سے ایک سفارت آئی، آپؐ نے اس کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور خود بنفس نفیس مہمانداری کے تمام کام انجام دیئے، صحابہ نے عرض کی کہ ہم یہ خدمت انجام دیں گے۔ ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے میرے دوستوں کی خدمت گزاری کی ہے، اس لئے میں خود ان کی خدمت گزاری کرنا چاہتا ہوں[4]۔

عتبانؓ بن مالک جو اصحاب بدر میں سے تھے ان کی بینائی میں فرق آ گیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر درخواست کی کہ میں اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہوں لیکن جب بارش ہو جاتی ہے تو مسجد تک جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر آپؐ میرے گھر میں تشریف لا کر نماز پڑھ لیتے تو میں اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنا لیتا، دوسرے دن صبح کے وقت آپؐ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ان کے گھر گئے اور دروازہ پر ٹھہر کر اذن مانگا، اندر سے جواب آیا تو گھر میں تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا کہ کہاں نماز پڑھوں؟ جگہ بتا دی، آپؐ نے تکبیر کہہ کر دو رکعت نماز ادا کی، نماز کے بعد لوگوں نے کھانے کے لئے اصرار کیا، خزیرہ ایک کھانا ہوتا ہے، قیمہ پر آٹا چھڑک کر تیار کرتے ہیں، وہ سامنے آیا، محلہ کے تمام لوگ کھانے میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے کسی نے کہا مالک بن دخشن نظر نہیں آتے۔ ایک نے کہا وہ منافق ہے۔ ارشاد فرمایا یہ نہ کہو، وہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں۔ لوگوں نے کہا، ہاں! ان کا میلان منافقین کی طرف ہے۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص خدا کی مرضی کے لئے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس پر آگ کو حرام کر دیتا ہے[5]۔

---

[1] ابوداؤد و ترمذی [2] صحیح مسلم باب فی قرب النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الناس [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب [4] شرح شفائے قاضی عیاض بحوالہ دلائل بیہقی جلد اخلاق [5] بخاری ج ۱ ص ۶۰ کتاب الصلوٰۃ۔

ابتدائے ہجرت میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام مہاجرین انصار کے گھر میں مہمان رہتے تھے، دس دس آدمیوں کی ایک ایک جماعت ایک ایک گھر میں مہمان اتاری گئی تھی، مقدادؓ بن الاسود کہتے ہیں کہ میں اس جماعت میں تھا جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شامل تھے، گھر میں چند بکریاں تھیں جن کے دودھ پر گزارا تھا، دودھ دُوھ چکتا تو سب لوگ اپنے اپنے حصہ کا پی لیتے اور آپؐ کے لئے پیالہ میں چھوڑ دیتے۔ ایک شب کا واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری میں تاخیر ہوئی، لوگ دودھ پی پی کر سو رہے۔ آپؐ نے آکر دیکھا تو پیالہ خالی پایا، خاموش ہو رہے، پھر فرمایا، خدایا جو آج کھلا دے اس کو تو بھی کھلا دینا۔ حضرت مقدادؓ چھری لے کر کھڑے ہوئے کہ بکری کو ذبح کر کے گوشت پکائیں۔ آپؐ نے روکا اور بکری کو دوبارہ دودھ کر جو کچھ نکلا اسی کو پی کر سو رہے اور کسی کو اس فعل پر ملامت نہ کی[1]

ابو شعیبؓ ایک انصاری تھے، ان کا غلام بازار میں گوشت کی دوکان رکھتا تھا۔ ایک دن وہ خدمت اقدس میں آئے۔ آپؐ صحابہ کے حلقہ میں تشریف فرما تھے اور چہرہ سے بھوک کا اثر پیدا تھا۔ ابو شعیبؓ نے جا کر غلام سے کہا کہ پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کرو۔ کھانا تیار ہو چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ صحابہ کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں، کُل پانچ آدمی تھے، راہ میں ایک اور شخص ساتھ ہو لیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شعیبؓ سے کہا یہ شخص بے کہے ساتھ ہو لیا ہے، تم اجازت دو تو یہ بھی ساتھ آئے ورنہ رخصت کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا آپؐ ان کو بھی ساتھ لائیں[2]

عقبہؓ بن عامر ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہاڑ کے درّہ میں اونٹ پر سوار جا رہے تھے، یہ بھی ساتھ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کہا کہ آؤ سوار ہو لو۔ اس کو گستاخی سمجھا کہ رسول اللہؐ کو پیادہ بنا کر خود سوار ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ کہا۔ اب انکار کرنا امتثال امر کے خلاف تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتر پڑے اور یہ سوار ہوئے[3]

مجالس صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے۔ حضرت زینبؓ سے جب نکاح ہوا اور دعوتِ ولیمہ کی تو کچھ لوگ کھانا کھا کر وہیں بیٹھے رہے، اس وقت پردہ کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور حضرت زینبؓ بھی مجلس میں شریک تھیں، آپؐ چاہتے تھے کہ لوگ اٹھ جائیں، لیکن زبان سے کچھ نہیں فرماتے تھے لوگوں نے کچھ خیال نہ کیا، آپؐ اٹھ کر حضرت عائشہؓ کے حجرہ تک گئے۔ واپس آئے تو اسی طرح مجمع موجود تھا، پھر واپس چلے گئے اور دوبارہ تشریف لائے۔ پردہ کی آیت اسی موقع پر اتری[4]

غزوۂ حنین سے واپس آ رہے تھے کہ راہ میں نماز کا وقت آ گیا، حسب دستور ٹھہر گئے، مؤذن نے اذان دی، ابو محذورہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے، چند دوستوں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے، اذان سن کر سب نے چلا چلا کر استہزاء کے طور پر اذان کی نقل اتارنی شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بلوا کر ایک ایک سے اذان کہلوائی، ابو محذورہ خوش لحن تھے ان کی آواز پسند آئی، سامنے بٹھا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کیلئے

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲ [2] بخاری ص ۸۱۰ [3] نسائی ص ۸۰۳ [4] بخاری ص ۹۱۲ باب آیۃ الحجاب۔

دعا کی، پھر ان کو اذان سکھلا کر ارشاد فرمایا کہ جاؤ اسی طرح حرم میں اذان دیا کرنا[1]۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گئے، آپ نے پوچھا ڈھیلے کیوں چلاتے ہو؟ میں نے کہا کھجوروں کے لئے، ارشاد فرمایا زمین پر ٹپکی ہوئی کھجوریں کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو، یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی[2]۔

عباد بن شرحبیل مدینہ میں ایک صاحب تھے۔ ایک دفعہ قحط پڑا اور بھوک کی حالت میں ایک باغ میں گھس گئے اور خوشے توڑ کر کچھ کھائے، کچھ دامن میں رکھ لئے، باغ کے مالک کو معلوم ہوا تو اس نے آکر ان کو مارا اور کپڑے اتروا لئے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر آئے۔ مدعا علیہ بھی ساتھ تھا۔ آپ نے اس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ جاہل تھا اس کو تعلیم دینا تھا، یہ بھوکا تھا اس کو کھانا کھلانا تھا۔ یہ کہہ کر کپڑے واپس دلوائے اور ساٹھ صاع غلہ اپنے پاس سے عنایت فرمایا[3]۔

یہود کا دستور تھا کہ عورتوں کو جب ایام آتے تو ان کو گھروں سے نکال دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تشریف لائے تو انصار نے آپ سے اس کے متعلق سوال کیا، اس پر یہ آیت اتری کہ اس حالت میں مقاربت ناجائز ہے، اس بناء پر آپ نے حکم دیا کہ مقاربت کے سوا کوئی چیز منع نہیں۔ یہودیوں نے آپ کا حکم سنا تو بولے کہ یہ شخص بات بات میں ہماری مخالفت کرتا ہے، صحابہؓ آپ کی خدمت میں آئے کہ یہود جب یہ کہتے ہیں تو ہم مقاربت بھی کیوں نہ کریں، رخسارۂ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا، دونوں صاحب چلے گئے۔ آپ نے ان کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں بھیجیں، اس وقت ان کو تسکین ہوئی کہ آپ ناراض نہ تھے[4]۔

کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے، ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے کچھ نہ فرمایا، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں[5]۔

ایک دفعہ ایک شخص نے باریابی کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا اچھا آنے دو، وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے لیکن جب وہ خدمتِ مبارک میں حاضر ہوا تو نہایت نرمی کے ساتھ اس سے گفتگو فرمائی، حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا اور آپ سے دریافت فرمایا کہ آپ تو اس کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، پھر اس رفق و ملاطفت کے ساتھ کلام کیا۔ آپ نے فرمایا خدا کے نزدیک سب سے برا وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کی وجہ سے لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیں[6]۔ یہود جس درجہ شقی اور دشمنِ اسلام تھے، اس کا اندازہ گزشتہ واقعات سے ہو چکا ہوگا باایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سنگدلوں کے ساتھ ہمیشہ نرمی اور لطف کا برتاؤ کرتے اور ان سے داد و ستد رکھتے، سخت سے سخت غصہ کی حالت میں صرف اس قدر فرماتے کہ اس کی پیشانی خاک آلود ہو[7]۔

---

[1] دار قطنی مطبوعہ دہلی ج ۱ ص ۸۶ کتاب الصلوٰۃ [2] ابو داؤد کتاب الجہاد [3] ایضاً [4] ابو داؤد مواکلۃ الحائض [5] ابو داؤد ج ۲ کتاب الادب

[6] صحیح بخاری و ابو داؤد ج ۲ کتاب الادب باب حسن العشرۃ و باب الرجل [7] ادب المفرد امام بخاری۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کہتے ہیں کہ مدینہ میں ایک یہودی رہتا تھا جس سے میں قرض لیا کرتا تھا۔ ایک سال اتفاق سے کھجوریں نہیں پھلیں اور قرضہ ادا نہ ہو سکا، اس پر پورا سال گذر گیا، بہار آئی تو یہودی نے تقاضا شروع کیا، اب کے بھی پھل کم آئے، میں نے آئندہ فصل کی مہلت مانگی، اس نے انکار کیا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر تمام واقعات بیان کئے۔ آپؐ چند صحابہ کے ساتھ خود یہودی کے گھر تشریف لے گئے اور سمجھایا کہ مہلت دے دو، اس نے کہا ابوالقاسم! میں کبھی مہلت نہ دوں گا۔ آپؐ نخلستان میں تشریف لے گئے اور ایک چکر لگا کر پھر یہودی کے پاس آئے اور اس سے گفتگو کی، لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ بالآخر آپؐ نے مجھے فرمایا کہ چبوترہ پر (جو مسقف تھا) فرش بچھادو، اس پر آرام فرمایا اور سو گئے، سو کر اٹھے تو پھر یہودی سے خواہش ظاہر کی کہ مہلت دے دو، اس شقی نے اب بھی نہ مانا، آپ درختوں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہو گئے اور جابرؓ سے کہا کہ کھجوریں توڑنی شروع کر دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے اتنی کھجوریں نکلیں کہ یہودی کا قرض ادا کر کے بچ رہیں[1]۔

مجلس نبوی میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے اُن کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی، ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لئے آپ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے، ایک دفعہ مقام جعرانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور اپنے ہاتھوں سے لوگوں کو گوشت تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک عورت آئی اور آپؐ کے پاس چلی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو اس کی نہایت تعظیم کی، اپنی چادر مبارک اس کے لئے بچھا دی۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون عورت تھی؟ تو لوگوں نے کہا یہ حضورؐ کی رضاعی ماں تھیں[2]۔

اسی طرح ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ آپؐ کے رضاعی والد آئے، آپؐ نے ان کے لئے چادر کا ایک گوشہ بچھا دیا، پھر رضاعی ماں آئیں، آپؐ نے دوسرا گوشہ بچھا دیا، آخر میں رضاعی بھائی آئے تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھا لیا[3]۔

حضرت ابوذرؓ مشہور صحابی ہیں، ایک دفعہ ان کو بلا بھیجا تو وہ گھر میں نہیں ملے، تھوڑی دیر کے بعد حاضر خدمت ہوئے تو آپؐ لیٹے ہوئے تھے، ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سینہ سے لگا لیا[4]۔ حضرت جعفرؓ جب حبشہ سے واپس آئے تو ان کو گلے لگا لیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا[5]۔ سلام میں پیش دستی فرماتے، راستہ میں جب چلتے تو مرد، عورتیں، بچے جو سامنے آتے ان کو سلام کرتے[6]، ایک دفعہ آپؐ راستہ سے گزر رہے تھے، ایک مقام پر مسلمان اور منافق و کافر یکجا بیٹھے ملے آپؐ نے سب کو سلام کیا[7]۔

کسی کی کوئی بات بُری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ صیغہ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے، یہ طریقہ ابہام اس لئے فرماتے

---

[1] بخاری ص ۳۲۱ باب الرطب والتمر [2] ابوداؤد کتاب الادب [3] ایضاً بر الوالدین [4] ابوداؤد کتاب الادب باب المعانقہ [5] کتاب سابق [6] بخاری و ابوداؤد باب السلام [7] بخاری باب السلام علی جماعۃ فیہا الکافر

تھے کہ شخص مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آجائے۔

حسن معاملہ

اگرچہ غایت فیاضی کی وجہ سے اکثر مقروض رہتے تھے، یہاں تک کہ وفات کے وقت بھی آپؐ کی زرہ من بھر غلہ پر ایک یہودی کے ہاں گروی تھی۔ لیکن ہر حال میں حسنِ معاملت کا سخت اہتمام تھا۔ مدینہ میں دولت مند عموماً یہودی تھے اور اکثر ان ہی سے آپؐ قرض لیا کرتے۔ یہودی عموماً دنی الطبع اور سخت گیر ہوتے تھے، آپؐ ان کی ہر قسم کی بدمزاجیاں برداشت فرماتے تھے۔

نبوت سے پہلے جن لوگوں سے آپؐ کے تاجرانہ تعلقات تھے، انہوں نے ہمیشہ آپؐ کی دیانت اور حسنِ معاملہ کا اعتراف کیا ہے، اسی لئے قریش نے متفقاً آپؐ کو امین کا خطاب دیا تھا۔ نبوت کے بعد بھی گو قریش بغض وکینہ کے جوش سے لبریز تھے تاہم ان کی دولت کے لئے مامون مقام آپؐ ہی کا کاشانہ تھا۔ عرب میں سائبؓ نام ایک تاجر تھے، وہ مسلمان ہو کر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، لوگوں نے مدحیہ الفاظ میں آپؐ سے ان کا تعارف کرایا آپؐ نے فرمایا: میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں: سائبؓ نے کہا، میرے ماں باپ فدا، آپؐ میرے ساجھی تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔[1]

ایک دفعہ ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں، چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا، آپؐ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کر دیں اور انصاری نے کھجوریں دیں لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں، اس شخص نے لینے سے انکار کیا، انصاری نے کہا تم رسول اللہؐ کی عطا کردہ کھجور کے لینے سے انکار کرتے ہو؟ بولا ہاں رسول اللہ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جاسکتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملے سُنے تو آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے۔[2]

ایک دن ایک بدو آیا جس کا کچھ قرضہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً وحشی مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا کہ تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیئے کیونکہ اس کا حق ہے (قرض خواہ کو بولنے کا حق ہے) اس کے بعد صحابہ کو اس کا قرض ادا کر دینے کا حکم صادر فرمایا اور زیادہ دلوایا۔[3]

ایک غزوہ میں حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ ہمرکاب تھے، ان کی سواری میں جو اونٹ تھا وہ سست تھا اور تھک جانے کی وجہ سے اور بھی سست ہو گیا تھا، آپؐ نے اونٹ اُن سے خرید لیا اور دام کے ساتھ اونٹ بھی اُن کو دے دیا کہ دونوں تمہارے ہیں۔[4]

یہی واقعہ ایک روایت میں اس طرح پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا تمہارے پاس کوئی لکڑی ہو تو دو، انہوں نے دی۔ آپؐ نے اس سے اونٹ کو مارا تو وہ اس قدر تیز دوڑنے لگا کہ سب سے آگے نکل گیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے چار دینار پر اونٹ اس شرط پر خرید لیا کہ مدینہ تک اُن کا سواری

---

[1] ابو داؤد ج ۲ ص ۳۱۹ [2] ترغیب وترہیب بحوالہ مسند احمد ج ۲ ص ۳ مطبوعہ مصر [3] ابن ماجہ باب لصاحب الحق سلطان [4] بخاری ص ۲۸۱ باب شری الدواب۔

کا حق ہے، مدینہ پہنچ کر جابرؓ بن عبداللہ نے قیمت طلب کی، آپ نے بلالؓ سے فرمایا کہ ان کو قیمت چار دینار دو اس سے کچھ اور زیادہ بھی دو، چنانچہ حضرت بلالؓ نے چار دینار پر ایک قیراط سونا اور زیادہ دیا۔[1]

معمول تھا کہ کوئی جنازہ لایا جاتا تو پہلے فرماتے کہ میت پر کچھ قرض تو نہیں ہے اگر معلوم ہوتا کہ مقروض تھا تو صحابہ سے فرماتے کہ جنازہ کی نماز پڑھا دو، خود شریک نہ ہوتے۔[2]

ایک دفعہ کسی سے اونٹ قرض لیا، جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا اور فرمایا سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو قرض کو خوش معاملگی سے ادا کرتے ہیں۔[3]

ایک دفعہ کسی شخص سے ایک پیالہ مستعار لیا، سوء اتفاق سے وہ گم گیا تو اس کا تاوان ادا فرمایا۔[4]

عموماً فرمایا کرتے تھے کہ میں تین دن سے زیادہ اپنے پاس ایک دینار بھی رکھنا پسند نہیں کرتا بجز اس دینار کے جن کو قرض ادا کرنے کے انتظار میں اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہوں۔[5]

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بددیانتی، لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بددیانتی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپ نے فرمایا اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپ نے ایک انصاری کے ہاں اس کو بھجوایا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم و عفو اور حسن معاملت سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا محمدؐ! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری پوری دی اور اچھی دی۔[6]

ایک دفعہ مدینہ منورہ کے باہر ایک مختصر سا قافلہ آ کر فروکش ہوا، ایک سرخ رنگ کا اونٹ اس کے ساتھ تھا اتفاقاً ادھر سے آپ کا گزر ہوا، آپ نے اونٹ کی قیمت پوچھی، لوگوں نے قیمت بتائی، بے مول تول کئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی قیمت منظور کر لی، اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے، بعد کو لوگوں کو خیال آیا کہ بے جان پہچان ہم نے جانور کیوں حوالہ کر دیا اور اس حماقت پر اب پورے قافلہ کو ندامت تھی۔ قافلہ کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی، اس نے کہا مطمئن رہو ہم نے کسی شخص کا چہرہ ایسا روشن نہیں دیکھا۔ یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو آپ نے ان کے لئے کھانا اور قیمت بھر کھجوریں بھجوا دیں۔[7]

غزوہ حنین میں آپ کو کچھ اسلحہ کی ضرورت تھی، صفوان اس وقت تک کافر تھے، ان کے پاس بہت سی زرہیں تھیں، آپ نے ان سے کچھ زرہیں طلب کیں، انہوں نے کہا محمدؐ! کیا کچھ غصب کا ارادہ ہے، فرمایا نہیں میں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الوکالۃ [2] صحیح بخاری ص ۳۰۹ کتاب النفقات [3] ترمذی باب استقراض البعیر ص ۱۲۳ [4] ترمذی ابواب الکلام ص ۲۲ [5] بخاری ج ۱ ص ۳۲۱ کتاب الاستقراض [6] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۹۳ [7] دارقطنی جلد ثانی ص ۳۰۲ کتاب البیوع۔

عاریۃ مانگتا ہوں، اگر ان میں سے کوئی تلف ہوئی تو میں تاوان دوں گا چنانچہ انہوں نے چالیس زرہیں مسلمانوں کو عاریۃ دیں۔ حنین سے واپسی کے بعد جب اسلحہ اور دیگر سامان کا جائزہ لیا گیا تو کچھ زرہیں کم نکلیں، آپ نے صفوان سے کہا تمہاری چند زرہیں کم ہیں ان کا معاوضہ لے لو، صفوان نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے دل کی حالت پہلے جیسی نہیں[1] یعنی مسلمان ہو گیا۔ اب معاوضہ کی حاجت نہیں۔

عدل و انصاف

کوئی شخص گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائے تو اس کے لئے عدل و انصاف سے کام لینا نہایت آسان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے سینکڑوں قبائل سے کام پڑتا تھا، یہ آپس میں ایک ایک کے دشمن تھے، ایک کے موافق فیصلہ کیا جاتا تو دوسرا دشمن بن جاتا۔ اسلام کی اشاعت کی غرض سے ہمیشہ آنحضرتؐ کو تالیف قلوب سے کام لینا پڑتا، ان سب مشکلات کے باوجود انصاف کا پلہ کبھی کسی طرف جھکنے نہ پاتا۔

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا جس نے گردن تسلیم خم نہیں کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا محاصرہ کیا لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ صخر ایک رئیس تھے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو خود جا کر طائف کی حصار بندی کی اور اہل شہر کو اس قدر دبایا کہ وہ بالآخر مصالحت پر راضی ہو گئے۔ صخر نے بارگاہ نبوت میں اطلاع کی، مغیرہ بن شعبہ ثقفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے۔ آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچا دو، اس کے بعد بنو سلیم آئے کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام لائے، ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلا دیں۔ آپ نے صخر کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے اس لئے ان کو ان کا چشمہ دے دو۔ صخر کو منظور کرنا پڑا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے صخر نے دونوں حکم منظور کئے تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پر شرم سے سرخی آگئی کہ صخر کو دونوں معاملوں میں شکست ہوئی اور فتح طائف کا ان کو کوئی صلہ نہ ملا۔[2]

ایک دفعہ ایک عورت نے جو خاندان مخزوم سے تھی چوری کی، قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ سزا سے بچ جائے اور معاملہ دب جائے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ رسول اللہؐ کے محبوب خاص تھے، لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ سفارش کیجئے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی، آپ نے غضب آلود ہو کر فرمایا کہ بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غرباء پر حد جاری کرتے تھے، امراء سے درگزر کرتے تھے۔[3]

خیبر کے یہودیوں سے جب صلح ہو کر وہاں کی زمین مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو عبداللہؓ بن سہل ایک دفعہ کھجوروں کی بٹائی کے لئے گئے، محیصہ ان کے چچیرے بھائی ساتھ تھے، عبداللہ گلی میں جا رہے تھے کہ کسی نے ان کو قتل کر کے لاش ایک گڑھے میں ڈال دی۔ محیصہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر استغاثہ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا، بولے میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا آپؐ نے فرمایا، تو یہود سے حلف لیا جائے، بولے حضرت! یہودیوں کی قسم کا اعتبار کیا، یہ سو دفعہ جھوٹی قسم

---

[1] ابوداؤد باب تضمین العاریۃ [2] ابوداؤد ص ۸۱ ج ۲ [3] صحیح بخاری کتاب الحدود

کھالیں گے۔

خیبر میں یہود کے سوا اور کوئی قوم آباد نہ تھی۔ یہ یقینی تھا کہ یہودیوں ہی نے عبداللہ بن سہل کو قتل کیا ہے تاہم چونکہ کوئی عینی شہادت موجود نہ تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تعرض نہیں فرمایا اور خون بہا کے سو اونٹ بیت المال سے دلوائے[1]۔

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے اور مدینہ کو روانہ ہوتے، شہر کے قریب پہنچ کر مقام کیا۔ زنانی سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوتے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوتے آئے اور سلام علیک کی۔ ہم نے سلام کا جواب دیا۔ ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا اس کی قیمت پوچھی، ہم نے جواب دیا اتنی کھجوریں، انھوں نے کچھ مول تول نہیں کیا اور وہی قیمت منظور کرلی پھر اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف بڑھے، نظروں سے اوجھل ہوگئے تو سب کو خیال آیا کہ دام رہ گئے، ہم لوگ ان کو پہچانتے نہیں۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا، محمل نشین خاتون نے کہا مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ اس قدر چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا، یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا، رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ نے تمہارے لئے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں، دوسرے دن صبح کو ہم لوگ مدینہ میں آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا، یارسول اللہ! یہ لوگ بنو ثعلبہ کے قبیلے کے ہیں اور اُن کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اس کے بدلہ میں اُن کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے۔ آپ نے فرمایا۔ باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جاسکتا[2]۔

سرقؓ ایک صحابی تھے۔ انھوں نے ایک بدوی سے ایک اونٹ مول لیا لیکن قیمت نہ ادا ہوسکی۔ بدو ان کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور واقعہ بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قیمت ادا کر دو، انھوں نے ناداری کا عذر کیا، آپ نے بدو سے کہا کہ بازار لے جا کر ان کو فروخت کرلو۔ بدو ان کو بازار میں لے گیا، ایک صاحب نے دام دے کر بدو سے خرید لیا اور آزاد کر دیا[3]۔

ابو حدرد اسلمیؓ ایک صحابی تھے جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا اور ان کے پاس بدن پر جو کپڑے تھے ان کے سوا کچھ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی مہم کا ارادہ کر رہے تھے، ابو حدردؓ نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا اور ان کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا، آپ نے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کر دو۔ انھوں نے عذر کیا، آپ نے پھر فرمایا۔ انھوں نے پھر وہی جواب دیا۔ اور عرض کی کہ یارسول اللہ غزوہ خیبر قریب ہے۔ شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اس کو ادا کر دوں۔ آپ نے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کر دو، آخر اپنا تہبند اس یہودی کو قرض میں نذر کیا اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا[4]۔

---

[1] یہ واقعہ بخاری ونسائی وغیرہ میں (باب القسامۃ) میں باختلاف روایات مذکور ہے [2] دارقطنی ج ۲ ص ۲۰۷، ۲۰۸۔

[3] ایضاً ص ۲۱۴ [4] مسند احمد ج ۳ ص ۴۲۳؛ معجم صغیر طبرانی معجم عبدان۔

اس عدل و انصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف یہود بھی جو آپ کے شدید ترین دشمن تھے اپنے مقدمات آپ ہی کی بارگاہِ عدالت میں لاتے تھے اور ان کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا مصرح ذکر ہے، اسلام سے پہلے یہودیان بنو نضیر و قریظہ میں عزت و شرافت کی عجیب و غریب حد قائم تھی، کوئی قریظی اگر کسی نضیر کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا، لیکن اگر کوئی قریظی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بارِ شتر چھوہارا تھی، اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریظہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپ نے فوراً توراۃ کے مطابق النفس بالنفس کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص جاری کر دیا۔

عدل و انصاف کا سب سے نازک پہلو یہ ہے کہ خود اپنے مقابلہ میں بھی حق کا رشتہ چھوٹنے نہ پاتے، ایک بار آپ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، لوگوں کا گرد و پیش ہجوم تھا، ایک شخص آ کر منہ کے بل آپ پر لد گیا، دستِ مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی، آپ نے اس سے اس کا ٹھوکا دیا، اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آگئی، فرمایا مجھ سے انتقام لے لو، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا، مرض الموت میں آپ نے مجمع عام میں اعلان کیا، اگر میرے ذمہ کسی کا قرض آتا ہو، اگر میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان و مال و آبرو حاضر ہے، اسی دنیا میں وہ انتقام لے لے، مجمع میں سناٹا تھا، صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعوے کیا جو دلوا دیے گئے۔

جود وسخا جود وسخا آپ کی فطرت تھی، ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور خصوصاً رمضان کے مہینہ میں آپ اور زیادہ سخاوت کرتے تھے، تمام عمر کسی کے سوال پر "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا۔

انما انا قاسم و خازن و اللہ یعطی (بخاری)

میں تو صرف دینے بانٹنے والا اور خازن ہوں اور دیتا اللہ ہے۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمتِ اقدس میں آیا اور دیکھا کہ دُور تک آپ کی بکریوں کا ریوڑ پھیلا ہوا ہے اُس نے آپ سے درخواست کی اور آپ نے سب کی سب دے دیں، اس نے اپنے قبیلہ میں جا کر کہا کہ اسلام قبول کر لو، محمدؐ ایسے فیاض ہیں کہ مفلس ہو جانے کی پروا نہیں کرتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ مانگا، آپ نے فرمایا، اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، تم میرے ساتھ آؤ، حضرت عمرؓ بھی ساتھ تھے، عرض کی کہ آپ کے پاس کچھ موجود نہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہے؟ ایک اور صاحب حاضر تھے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ دیتے جائیں اور عرش والے خدا سے نہ ڈریئے، وہ آپ کو محتاج نہ کرے گا، آپ فرطِ بشاشت سے مسکرا دیئے۔

عام فیاضی کا یہ حال تھا کہ جو شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اگر آپ کے پاس کچھ سرمایہ موجود ہوتا تو اس کو کچھ نہ کچھ ضرور عطا فرماتے ورنہ وعدہ فرماتے، اس معمول کی بنا پر لوگ اس قدر دلیر ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ عین اقامتِ نماز کے وقت ایک بدو آیا، آپ کا دامن پکڑ کر کہا کہ میری ایک معمولی سی حاجت باقی رہ گئی ہے

لہ ابوداؤد باب تضمین العاریۃ جلد ثانی ٹہ ابوداؤد کتاب الدیات سے ابوداؤد باب القود بغیر حدید ٹہ ابن اسحاق بروایت ابن ہشام ھے صحیح بخاری باب بدء الوحی لہ صحیح بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق ٹہ صحیح بخاری باب قرض النفس ٹہ صحیح مسلم ۲۰ صفحہ ۲۹ ف ادب المفرد امام بخاری۔

خوف ہے کہ میں اس کو بھول نہ جاؤں اس کو پورا کر دیجئے، چنانچہ آپؐ اس کے ساتھ تشریف لے گئے اور حاجت براری کر کے آئے تو نماز پڑھی[1]۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک شخص سے ایک چیز خریدتے، قیمت چکا دینے کے بعد پھر وہ چیز اس کو بطور عطیہ کے عنایت فرماتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خریدا اور پھر اسی وقت اس کو عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیا، حضرت جابرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا ایک واقعہ مذکور[2] ہے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرما لیتے۔ کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ ہمراہ تھے۔ آپؐ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی اور کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا، وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمایا جو لوگ موجود نہ تھے، ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا[3]۔ جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتی جب تک صرف نہ ہو جاتی آپ کو چین نہ آتا، بے قراری سی رہتی، ام المومنین ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! خیر ہے؟ فرمایا کل جو سات دینار آئے تھے، شام ہو گئی اور وہ بستر پر پڑے رہ گئے[4]۔

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک راستہ سے گزر رہے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابوذر! اگر اُحد کا پہاڑ میرے لئے سونا ہو جاتے تو میں کبھی پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جاتے لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کیلئے چھوڑ دوں[5]۔

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے، رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کر کے خدمت نبویؐ میں بھیجا، حضرت بلالؓ نے بازار میں غلہ فروخت کر کے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اطلاع کی، آپ نے پوچھا کچھ بچ تو نہیں رہا، بولے ہاں کچھ بچ بھی رہا، فرمایا کہ جب تک کچھ باقی رہے گا میں نہیں جا سکتا حضرت بلالؓ نے کہا میں کیا کروں کوئی سائل نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں رات بسر کی۔ دوسرے دن حضرت بلالؓ نے آکر کہا یا رسول اللہ! خدا نے آپؐ کو سبکدوش کر دیا یعنی جو کچھ تھا، وہ بھی تقسیم کر دیا گیا۔ آپؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے[6]۔

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلافِ معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے لوگوں کو تعجب ہوا، آپؐ نے فرمایا مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اس لئے جا کر اس کو خیرات کر دینے کو کہہ آیا[7]۔

غزوۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو خیرات فرما کر واپس آ رہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر ملی کہ ادھر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۴ [2] ایضاً ص ۲۹۳ [3] صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۹۹ [4] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۹۳ [5] صحیح بخاری کتاب الاستقراض ص ۳۲۱ [6] ابوداؤد باب ہدایا المشرکین [7] صحیح بخاری یفکر الرجل الشئ فی الصلوٰۃ۔

گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپ اژدحام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسم اطہر سے چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی۔ فیاض عالم نے کہا میری چادر دے دو، خدا کی قسم اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تم کو دے دیتا اور پھر مجھ کو بخیل نہ پاتے، نہ دروغ گو، نہ نامرد۔[1]

لوگوں کو عام حکم تھا کہ جو مسلمان مر جائے اور اپنے ذمہ قرض چھوڑ جائے تو مجھے اطلاع دو، میں اس کو ادا کر دوں گا اور جو ترکہ چھوڑ جائے وہ وارثوں کا حق ہے۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ ایک دفعہ آپ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ ایک بدو آیا اور آپ کا چادر کا گوشہ زور سے کھینچ کر بولا، محمد یہ مال نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے، ایک بار شتر دے؛ آپ نے اس کے اونٹ کو جو اور کھجوروں سے لدوا دیا۔[2]

ایک دفعہ بحرین سے خراج آیا اور اس قدر کثیر رقم تھی کہ اس سے پہلے کبھی دار الاسلام میں نہیں آئی تھی آپ نے حکم دیا کہ اس کو صحن مسجد میں ڈلوا دو۔ اس کے بعد جب آپ مسجد میں تشریف لائے تو اس پر مڑ کر بھی نظر نہ ڈالی نماز سے فارغ ہو کر آپ نے اس کی تقسیم شروع کی جو سامنے آتا اس کو دیتے چلے جاتے۔ حضرت عباسؓ کو جو غزوہ بدر کے بعد دولت مند نہیں رہے تھے، اتنا دیا کہ اٹھا کر چل نہیں سکتے تھے۔ اسی طرح اور لوگوں کو بھی عنایت فرماتے جاتے تھے، جب کچھ نہ رہا تو کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔[3]

اسلام میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی آزاد شدہ غلام مر جائے تو اس کا ترکہ اس کے آقا کو ملتا ہے۔ ایک دفعہ آپ کا اسی قسم کا غلام مر گیا۔ لوگ اس کا متروکہ سامان اٹھا کر آپ کے پاس لائے، آپ نے دریافت فرمایا کہ کوئی اس کا یہاں ہم وطن ہے؟ لوگوں نے کہا ہاں ہے۔ آپ نے فرمایا یہ تمام چیزیں اسی کے حوالہ کر دو۔[4]

ایک دفعہ چند انصار نے آپ سے کچھ مانگا، آپ نے دے دیا، پھر مانگا پھر دیا، پھر جب تک رہا آپ دیتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس کچھ نہیں رہا۔ لیکن وہ باوجود اس کے حاضر ہوئے اور درخواست کی۔ فرمایا میرے پاس جو کچھ ہو میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا۔[5]

ایثار آپ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپ کو بے انتہا محبت تھی اور ان میں حضرت فاطمہ زہراؓ اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم حضرت فاطمہؓ کی عسرت اور تنگدستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں، چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں اور مشک کے اثر سے سینہ پر نیل پڑ گئے تھے، ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں خود تو پاس حیا سے عرض حال نہ کر سکیں، جناب امیرؓ نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا۔ اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں

---

[1] صحیح بخاری باب الشجاعۃ فی الحرب [2] صحیح بخاری [3] ابوداؤد کتاب الادب [4] صحیح بخاری ج ۲ باب القسر [5] مسند ابن حنبل ج ۲ صفحہ ۱۵۱ [6] صحیح بخاری صفحہ ۱۹۸ کتاب الصدقات۔

ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔[1] ایک روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی صاحبزادیاں اور حضرت زہراؓ خدمت اقدس میں گئیں اور اپنے افلاس و تنگدستی کی شکایت کرکے عرض کی کہ اب کی غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک دو ہم کو مل جائیں، آپ نے فرمایا، بدر کے یتیم تم سے پہلے درخواست کر چکے۔[2]

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے کسی امر کی درخواست کی۔ فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں۔[3]

ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر لاکر پیش کی، آپ کو ضرورت تھی آپ نے لے لی۔ ایک صاحب حاضر خدمت ہوئے، انہوں نے کہا کیا اچھی چادر ہے! آپ نے اتار کر ان کو دے دی، جب اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں نے ان کو ملامت کی کہ تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چادر کی ضرورت تھی، یہ بھی جانتے ہو کہ آنحضرتؐ کسی کا سوال رد نہیں کرتے، انہوں نے کہا ہاں! لیکن میں نے تو برکت کے لئے لی ہے کہ مجھ کو اسی چادر کا کفن دیا جائے۔[4]

زہد و قناعت کے عنوان سے جو واقعات لکھے گئے ہیں، ان سے ظاہر ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس عسرت اور تنگدستی میں بسر فرماتے تھے، سنہ۷ھ کے بعد فتوحات کو جو وسعت حاصل ہوئی ہے، عرب میں باغات سب سے بہتر جائیداد تھی، سنہ۴ھ میں یہودیان بنو نضیر میں سے مخیریق نامی ایک شخص نے اپنے سات باغ مشیب، صافقہ، دلال، حسنیٰ، برقہ، اعواف، مشربہ ام ابراہیم مرتے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کر دیئے۔[5] آپ نے سب کو خیرات کر دیا، یعنی وہ خدا کی راہ میں وقف تھے۔ ان میں جو کچھ پیدا ہوتا تھا وہ غرباء اور مساکین کو دیدیا جاتا تھا۔[6]

ایک صحابی نے شادی کی، سامان ولیمہ کے لئے گھر میں کچھ نہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ عائشہؓ کے پاس جاؤ اور آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ، وہ گئے اور جاکر لے آئے۔ حالانکہ کاشانۂ نبوت میں اس ذخیرہ کے سوا شام کے کھانے کو کچھ نہ تھا۔[7] ایک دفعہ ایک غفاری آکر مہمان ہوا، رات کو کھانے کے لئے صرف بکری کا دودھ تھا، وہ آپ نے اس کی نذر کر دیا، یہ تمام رات خانۂ نبوت میں فاقہ سے گزری، حالانکہ اس سے پہلی شب میں بھی یہاں فاقہ ہی تھا۔[8]

مہمان نوازی عرب میں مختلف اطراف اور صوبوں سے جوق در جوق لوگ بارگاہ نبوی میں آتے تھے۔[9] رملہ ایک صحابیہ تھیں، ان کا گھر دار الضیوف تھا، یہیں لوگ مہمان اترتے تھے۔ ام شریکؓ جو ایک دولتمند اور فیاض انصاریہ تھیں، ان کا گھر بھی گویا ایک مہمان خانہ تھا،[10] مخصوص لوگ مسجد نبوی میں اتارے جاتے تھے چنانچہ وفد ثقیف یہیں اترا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بہ نفس نفیس ان مہمانوں کی خاطر داری اور تواضع فرماتے تھے یوں بھی جو لوگ حاضر ہوتے تھے، بغیر کچھ کھائے پیئے واپس نہ آتے تھے۔[11]

---

[1] یہ روایت کتب احادیث (سنن ابو داؤد) وغیرہ میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہؓ کو ایک دعا بتادی کہ یہ لونڈی سے بڑھ کر ہے [2] ابو داؤد ج ۲ ص ۳۳ [3] مسند احمد ج ۱ ص ۱۰۶ [4] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء، و باب من استعد الکفن [5] فتح الباری شرح کتاب الفرائض [6] اصابہ تذکرہ مخیریق [7] مسند احمد ج ۴ ص ۵۸ [8] ایضاً ج ۶ ص ۲۱ [9] زرقانی ذکر وفود [10] مسلم ج ۲ ص ۵۱۹ [11] شمائل ترمذی۔

فیاضی میں کافر و مسلمان کا امتیاز نہ تھا، مشرک و کافر سب آپؐ کے مہمان ہوتے اور آپ یکساں انکی مہمان نوازی کرتے، جب اہل حبشہ کا وفد آیا تو آپؐ نے خود اپنے ہاں ان کو مہمان اتارا اور خود بہ نفس نفیس اُن کی خدمت[۱] کی، ایک دفعہ کافر مہمان ہوا، آپؐ نے ایک بکری کا دودھ اسے پلایا، وہ سارے کا سارا پی گیا، آپؐ نے دوسری بکری منگوائی، وہ بھی کافی نہ ہوئی، غرض سات بکریوں تک نوبت آئی جب تک وہ سیر نہ ہوا، آپؐ پلاتے گئے[۲]۔ کبھی ایسا ہوتا کہ مہمان آجاتے اور گھر میں جو کچھ موجود ہوتا وہ ان کی نذر ہو جاتا اور تمام اہل و عیال فاقہ کرتے[۳]۔ آپؐ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے مہمانوں کی خبر گیری کرتے تھے[۴]۔

صحابہ میں سب سے مفلس اور نادار گروہ اصحابِ صفہ کا تھا، وہ مسلمانوں کے مہمان عام تھے، لیکن ان کو زیادہ تر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہونے کا شرف حاصل ہوتا، ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس دو آدمی کا کھانا ہو وہ ان میں سے تین آدمی کو اور جن کے پاس چار آدمی کا کھانا ہو وہ اُن میں سے پانچ آدمی کو ساتھ لے جائے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ تین آدمیوں کو ساتھ لائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس آدمیوں کو ہمراہ لے گئے[۵]۔

اصحابِ صفہ میں حضرت ابوہریرہؓ اپنے فقر و فاقہ کی داستان نہایت دردانگیز طریقہ سے بیان کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز شدتِ گرسنگی کی حالت میں گزرگاہِ عام پر بیٹھ گیا، حضرت ابوبکرؓ راستے سے گزرے تو میں نے بطور حسن طلب کے اُن سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن وہ گزر گئے اور میری حالت کی طرف توجہ نہ کی، حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا اور وہی نتیجہ ہوا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا تو آپؐ مجھ کو دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا کہ میرے ساتھ ساتھ آؤ۔ آپؐ گھر میں پہنچے تو دودھ کا ایک پیالہ نظر آیا، آپؐ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ کسی نے ہدیۃً بھیجا ہے، آپؐ نے مجھ سے کہا کہ اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ، میں ان کو بلا لایا تو آپؐ نے مجھ کو دودھ کا پیالہ دیا[۶] کہ سب کو تقسیم کردو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ایک پیالہ اس قدر بھاری تھا کہ اس کو چار آدمی اٹھا سکتے تھے، جب دوپہر ہوتی تو وہ پیالہ آتا اور اصحابِ صفہ اس کے گرد بیٹھ جاتے، یہاں تک کہ جب زیادہ مجمع ہو جاتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اوکڑوں بیٹھنا پڑتا کہ لوگوں کے لئے جگہ نکل آئے[۷]۔

مقدادؓ کا بیان ہے کہ میں اور میرے دو رفیق اس قدر تنگ دست تھے کہ بھوک سے بینائی جاتی رہی، ہم لوگوں نے اپنے تکفل کی درخواست کی لیکن کسی نے منظور نہیں کیا، آخر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ دولت خانہ پر لوا گئے اور تین بکریوں کو دکھا کر فرمایا کہ ان کا دودھ دوہا کرو، چنانچہ ہم میں ہر شخص دودھ دوھ کر اپنا اپنا حصہ پی لیا کرتا تھا[۸]۔

ایک دن اصحابِ صفہ کو لے کر حضرت عائشہؓ کے گھر پہنچے اور فرمایا کھانے کو جو کچھ ہو لاؤ، چونی کا پکا ہوا کھانا سامنے لاکر رکھا گیا، آپؐ نے کھانے کی کوئی اور چیز طلب کی تو چھوہارے کا حریرہ پیش ہوا، اس کے بعد بڑے

---

[۱] شفائے قاضی عیاض لبنہ متصل [۲] صحیح مسلم باب المومن یاکل فی معی [۳] مسند ابن حنبل ج ۶، صفحہ ۲۹۴ [۴] ابوداؤد کتاب الادب

[۵] صحیح مسلم ج ۲ [۶] ترمذی صفحہ ۲۹۹ [۷] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [۸] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۱۹۰۔

پیالہ میں دودھ حاضر کیا گیا اور یہی سامانِ مہمانی کی آخری قسط تھی۔[1]

گداگری اور سوال سے نفرت

باوجود اس کے کہ آپ کا ابرِ کرم ہر وقت برستا رہتا تھا، تاہم کسی کا بے ضرورتِ شدید سوال کرنا آپ کو سخت گراں ہوتا تھا۔ ارشاد فرماتے کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لاد لائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے۔[2]

ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا۔ آپ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ بولے کہ بس ایک بچھونا ہے، جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا ہوں اور کچھ بچھا لیتا ہوں اور ایک پانی کا پیالہ ہے۔ آپ نے دونوں چیزیں منگوائیں، پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے دو درہم لگائے۔ آپ نے فرمایا۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیئے۔ آپ نے دونوں چیزیں دے دیں اور درہم انصاری کو دیئے کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ اور دوسرے سے رسی خریدو اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو؟ پندرہ دن کے بعد وہ خدمتِ اقدس میں آئے تو دس درہم اُن کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ اس سے کچھ کپڑا خریدا، کچھ کا غلہ مول لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے۔[3]

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپ نے عنایت فرمایا، پھر جب تک کچھ رہا، آپ نے ان کی درخواست رد نہیں فرمائی۔ جب کچھ نہیں رہا تو آپ نے فرمایا میرے پاس جب تک کچھ رہے گا میں تم سے بچا کر اس کو نہیں رکھوں گا، لیکن جو شخص اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اس کو سوال اور گداگری کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو خدا سے غنیٰ کا طالب ہوتا ہے وہ اس کو غنیٰ مرحمت فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور صبر سے کوئی بہتر اور وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی ہے۔[4]

حکیمؓ بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ انہوں نے آپؐ سے کچھ طلب کیا، آپؐ نے عنایت فرمایا، کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپؐ نے پھر ان کو دیا، تیسری دفعہ پھر سوال کیا، پھر کچھ مرحمت کیا، اس کے بعد فرمایا اے حکیم! یہ دولت سبز و شیریں ہے، جو استغنا کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے اس کو برکت ملتی ہے اور جو حرص و طمع کے ساتھ اس کو حاصل کرتا ہے وہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے۔ حکیمؓ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک وہ زندہ رہے کبھی کسی سے معمولی چیز بھی نہیں مانگی۔[5]

حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آ کر شامل ہو گئے۔ آپؐ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں کے درست معلوم ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔[6]

قبیصہ نام ایک صاحب تھے وہ مقروض ہو گئے تھے، آپؐ کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپؐ نے

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] صحیح بخاری کتاب الصدقات صفحہ ۱۹۱ [3] ابوداؤد و ترمذی صدقات [4] کتاب الصدقات [5] صحیح بخاری کتاب الصدقات [6] ابوداؤد کتاب الزکاۃ۔

وعدہ کیا اس کے بعد ارشاد فرمایا، اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے۔ ایک اس شخص کو جو قرض سے زیادہ زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے، لیکن جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رُک جانا چاہیے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آگئی جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اس وقت تک مانگنا جائز ہے جب تک اس کی حالت کسی قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے اس شخص کو جو مبتلائے فاقہ ہو اور محلہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اس کو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔[1]

صدقہ سے پرہیز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اور اپنے خاندان کے لئے صدقہ و زکوٰۃ لینے کو سخت موجب ننگ و عار سمجھتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر میں آتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجور پاتا ہوں جی میں آتا ہے کہ اٹھا کر منہ میں ڈال لوں، پھر خیال ہوتا ہے کہ کہیں صدقہ کی کھجور نہ ہو، اس لئے ڈال دیتا ہوں۔[2]

ایک دفعہ راستہ میں ایک کھجور ہاتھ آگئی، فرمایا اگر صدقہ کا شبہ نہ ہوتا تو میں اس کو کھا جاتا۔ ایک بار امام حسن علیہ السلام نے صدقہ کی کھجوروں میں سے منہ میں ایک کھجور ڈال لی، آپ نے ڈانٹ کر کہا، کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا، پھر منہ سے اگلوا دیا۔

آپ کے سامنے جب کوئی شخص کوئی چیز لے کر آتا تو دریافت فرماتے کہ ہدیہ ہے یا صدقہ؟ اگر ہدیہ ہوتا قبول فرماتے اور اگر یہ کہتا کہ صدقہ تو آپ ہاتھ روک لیتے اور دوسرے صاحبوں کو عنایت فرما دیتے۔

ہدایا اور تحفے قبول کرنا

دوست و احباب کے ہدایا اور تحفے آپ قبول فرماتے تھے بلکہ آپ نے اس کو ازدیادِ محبت کا بہترین ذریعہ فرمایا ہے۔

تھادوا تحابوا (حدیث)
باہم ایک دوسرے کو ہدیہ بھیجو تو باہم محبت ہوگی۔

اسی لئے صحابہ عموماً کچھ نہ کچھ روز آپ کے گھر بھیجا کرتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اس دن بھیجتے تھے، جس دن آپ حجرۂ عائشہؓ میں قیام فرماتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ کوئی چیز آپ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ دریافت فرماتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر ہدیہ ہوتا تو قبول فرماتے ورنہ احتراز کرتے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے ایک چادر خدمت اقدس میں پیش کی، آپ نے لے لی، اسی وقت ایک صاحب نے مانگ لی، آپ نے ان کو عنایت فرما دی۔[6]

آس پاس کے ملوک و سلاطین بھی آپ کو تحفے بھیجا کرتے تھے۔ حدودِ شام کے ایک رئیس نے ایک سفید خچر تحفہ دیا تھا، عزیزِ مصر نے ایک خچر مصر سے بھیجا تھا، ایک امیر نے آپ کو موزے بھیجے تھے، ایک دفعہ قیصرِ روم نے آپ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی، جس میں دیبا کی سنجاف لگی ہوئی تھی، آپ نے ذرا دیر کے لئے پہن لی، پھر اتار کر حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی) کے پاس بھیج دی، وہ پہن کر خدمت اقدس میں آئے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اس لئے نہیں بھیجی کہ تم خود پہنو، عرض کی، پھر کیا کروں؟ ارشاد فرمایا کہ اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دو، حضرت جعفرؓ ایک مدت

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ [2] بخاری ج ۱ ص ۳۲۲ کتاب اللقطہ [3] بخاری ج ۱ ص ۳۲۲ کتاب اللقطہ [4] بخاری جلد ۱ ص ۱۰۶ کتاب الصدقات
[5] بخاری مناقب عائشہؓ [6] صحیح بخاری کتاب الصدقہ [7] صحیح بخاری کتاب الجنائز

یعنی فتح خیبر تک حبش میں رہے تھے اور نجاشی نے ان ہی سے اسلام کی تعلیم پائی تھی۔

ہدایا اور تحفے دینا

جن لوگوں کے ہدایا اور تحفے قبول فرماتے تھے، ان کو اُن کا صلہ بھی ضرور عطا فرماتے تھے حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔

کان یقبل الھدیۃ ویثیب علیھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اسکا معاوضہ دیتے تھے[1]

یمن کا مشہور بادشاہ ذی یزن جس نے حبشی حکومت مٹا کر ایران کے زیر اثر عربی حکومت قائم کی تھی اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قیمتی حلہ بھیجا جس کو اس نے ۳۳ اونٹوں کے بدلہ میں خریدا تھا آپ نے قبول فرمایا اور پھر اس کو ایک حلہ ہدیۃً بھیجا جو ۲۰ سے کچھ زیادہ اونٹ دے کر خریدا گیا تھا۔

ایک دفعہ قبیلہ بنی فزارہ کے ایک شخص نے آپ کی خدمت میں ہدیۃً ایک اونٹنی پیش کی، آپ نے اس کا صلہ دیا تو وہ سخت ناراض ہوا آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطاب عام کیا اور فرمایا کہ تم لوگ مجھے ہدیہ دیتے ہو اور میں بقدرِ استطاعت اس کا صلہ دیتا ہوں تو ناراض ہوتے ہو۔ آئندہ قریش، انصار، ثقیف اور دوس کے سوا کسی قبیلہ کا ہدیہ قبول نہ کروں گا[2]۔

حضرت ایوب انصاریؓ جن کے مکان میں آپ چھ مہینہ تک فروکش رہے تھے، آپ اکثر ان کو بچا ہوا کھانا بھیجا کرتے تھے، ہمسایوں اور پڑوسیوں کے گھروں میں بھی تحفے بھیجتے تھے، اصحاب صُفہ اکثر آپ کے تحفوں سے مشرف ہوا کرتے تھے[3]۔

عدم قبول احسان

کبھی کسی کا احسان گوارا نہ فرماتے حضرت ابوبکرؓ سے بڑھ کر جاں نثار کون ہو سکتا تھا تاہم ہجرت کے وقت جب انھوں نے سواری کے لئے ناقہ پیش کیا تو آپ نے قیمت ادا کی[4]۔ مدینہ میں مسجد کے لئے جو زمین درکار تھی مالکانِ زمین نے مفت نذر کرنا چاہی لیکن آپ نے قیمت دے کر لی۔ ایک دفعہ عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ہم سفر تھے۔ عبداللہ بن عمر کی سواری کا اونٹ سرکش تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ سے آگے نکل نکل جاتا تھا، عبداللہ بن عمرؓ روکتے تھے لیکن وہ قابو نہ آتا تھا حضرت عمرؓ بار بار عبداللہ بن عمر کو ڈانٹتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے کہا، یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو انھوں نے کہا نذر ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں دام لو، انھوں نے دوبارہ عرض کی کہ یوں ہی حاضر ہے۔ آپ نے انکار کیا۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے دام لینے منظور کئے۔ آپ نے خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دے دیا کہ اب یہ تمہارا ہے[5]۔

عدم تشدد

حضرت معاذؓ بن جبل جو اکابر صحابہ میں سے تھے، ایک محلہ میں امامت کرتے اور نماز فجر میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے تھے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ وہ اس قدر لمبی نماز پڑھتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے قاصر رہتا ہوں۔ ابو مسعود انصاریؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اس قدر غضب ناک نہیں دیکھا جس قدر اس موقع پر دیکھا۔ آپ نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز صفحہ ۲۰۳ [2] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۸۱ [3] مسلم کتاب الاشربہ [4] بخاری صفحہ ۵۵۳ [5] ایضاً صفحہ ۲۸۴

[6] بخاری کتاب الصلوٰۃ و باب ہل یقضی الحاکم وہو غضبان ص ۱۰۶۰

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو لوگوں کو متنفر کر دیتے ہیں جو شخص تم میں سے نماز پڑھائے مختصر پڑھائے کیونکہ نماز میں بوڑھے، کمزور، کام والے سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔[1]

حدود قصاص میں نہایت احتیاط فرماتے اور جہاں تک ممکن ہوتا درگزر کرنا چاہتے، ماعز اسلمی ایک صاحب تھے جو زنا میں مبتلا ہوگئے، لیکن فوراً مسجد میں آئے اور کہا یا رسول اللہ میں نے بدکاری کی، آپ نے منہ پھیر لیا، وہ دوسری سمت آئے۔ آپ نے اور طرف منہ پھیر لیا، آپ بار بار منہ پھیر لیتے اور وہ بار بار سامنے آکر زنا کا اقرار کرتے، بالآخر آپ نے فرمایا کہ تم کو جنون تو نہیں ہے؟ بولے نہیں۔ پھر پوچھا، تمہاری شادی ہو چکی ہے، بولے ہاں آپ نے فرمایا کہ تم نے صرف ہاتھ لگایا ہوگا، بولے نہیں بلکہ مجامعت کی، آخر مجبور ہو کر آپ نے حکم سنا دیا کہ سنگسار کئے جائیں۔[2]

ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ مجھ سے گناہ سرزد ہوا، آپ حد (سزا) کا حکم دیں۔ آپ چپ رہے اور نماز کا وقت آگیا، نماز کے بعد انہوں نے پھر آکر وہی درخواست کی، آپ نے فرمایا کیا تم نے نماز نہیں پڑھی، بولے ہاں پڑھ لی، ارشاد فرمایا تو خدا نے تمہارا گناہ معاف کر دیا۔[3]

ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی اور اظہار کیا کہ میں نے بدکاری کی، آپ نے فرمایا، واپس جاؤ، دوسرے دن پھر آئی اور بولی کہ کیا آپ مجھ کو ماعز کی طرح چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم! مجھ کو حمل رہ گیا ہے، پھر فرمایا، واپس جاؤ، وہ چلی گئی، تیسرے دن پھر واپس آئی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے تک انتظار کرو، جب بچہ پیدا ہوا تو بچہ کو گود میں لئے ہوئے آئی (یعنی اب زنا کی سزا دینے میں کیا تامل ہے؟) آپ نے فرمایا کہ دودھ چھٹنے کی مدت تک انتظار کرو، جب دودھ چھوٹ جائے تب آنا، جب رضاعت کا زمانہ گزر گیا تو پھر حاضر ہوئی، اب آپ نے مجبور ہو کر سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے اس پر پتھر برسانے شروع کئے۔ ایک صاحب کا پتھر اس کے چہرہ پر لگا اور خون کی چھینٹیں اڑ کر ان کے چہرہ پر آئیں، انہوں نے اس کو گالی دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زبان روکو، خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ جبر محصول لینے والا بھی اگر یہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا،[4] ایک دن ایک صاحب نے عرض کی کہ ہم لوگ یہودیوں اور عیسائیوں کے ملک میں رہتے ہیں کیا ان کے برتنوں میں کھانا کھا لیا کریں؟ فرمایا اور برتن ہاتھ آئیں تو ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ، ورنہ ان کو دھو کر کھا سکتے ہو۔[5]

ایک بار ایک صحابی نے ماہ رمضان تک کے لئے اپنی بی بی سے ظہار کر لیا، لیکن ابھی یہ مدت گزرنے نہ پائی تھی کہ اس سے مقاربت کر لی، پھر لوگوں کو اس واقعہ کی خبر کی اور کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے انکار کر دیا، انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا، آپ نے پہلے تو تعجب ظاہر کیا، پھر ایک غلام کے آزاد کرنے کا حکم دیا، انہوں نے ناداری کا عذر کیا تو آپ نے متصل دو ماہ تک روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ انہوں نے کہا یہ سب تو رمضان ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب آپ نے ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرنے کو فرمایا، انہوں نے کہا ہم تو خود فاقہ کرتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ صدقہ کے عامل کے پاس جاؤ وہ تمہیں ایک وسق کھجور دے گا اس میں سے ساٹھ مسکینوں کو دے دینا اور جو بچے وہ اپنے اہل و عیال پر صرف کرنا

---

[1] یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں ہے موقع کیجیے صفحہ ۱۰۰۹ [2] دیکھنا چاہیے [3] بخاری صفحہ ۱۰۱۳ [4] ابوداؤد کتاب الحدود [5] بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۱۲۔

وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ تم لوگ متشدد اور بدتدبیر تھے، لیکن مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حسن رائے اور آسانی نظر آئی[1]۔

ایک بار ایک اور صحابی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں برباد ہو گیا، روزہ میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا۔ آپؐ نے فرمایا، ایک غلام آزاد کر سکتے ہو؟ کہا نہیں۔ فرمایا دو مہینے تک متصل روزہ رکھ سکتے ہو؟ کہا نہیں۔ فرمایا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلا سکتے ہو؟ کہا اس کی بھی قدرت نہیں، آنحضرتؐ نے تامل فرمایا کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ایک شخص نے کھجوروں کی ایک ٹوکری ہدیۃً پیش کی، آپؐ نے فرمایا سائل کہاں گیا سائل نے کہا یا رسول اللہ! میں یہ ہوں، فرمایا ان کھجوروں کو لے جاؤ اور کسی غریب کو خیرات دے دو۔ سائل نے عرض کی یا رسول اللہ! مدینہ میں مجھ سے زیادہ غریب کون ہوگا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور فرمایا جاؤ گھر ہی والوں کو کھلا دو[2]۔

تقشف ناپسند تھا

رہبانیت اور تقشف کو ناپسند فرماتے تھے، صحابہ میں سے بعض بزرگ میلانِ طبعی یا عیسائی راہبوں کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو باز رکھا بعض صحابہ ناداری کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبطِ نفس پر بھی قادر نہ تھے، انہوں نے قطع اعضا کرنا چاہا، آپؐ نے سخت ناراضی ظاہر کی، قدامہؓ بن مظعون ایک اور صحابی آئے کہ ہم میں سے ایک نے ترکِ حیوانات اور دوسرے نے ترکِ نکاح کا عزم کر لیا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ "میں تو دونوں سے متمتع ہوتا ہوں" آپؐ کی مرضی پا کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ عرب میں صوم وصال کا طریقہ مدت سے جاری تھا یعنی کئی کئی دن متصل روزے رکھتے تھے، صحابہ نے بھی اس کا ارادہ کیا لیکن آپؐ نے سختی سے روکا، حضرت عبد اللہؓ بن عمرو نہایت مرتاض زاہد تھے، انہوں نے عہد کر لیا تھا کہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو بلا بھیجا اور پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے۔ عرض کی، ہاں! فرمایا تم پر تمہارے جسم کا حق ہے آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں۔ عبد اللہ بن عمروؓ نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ طاقت ہے۔ فرمایا کہ اچھا تیسرے دن، بولے میں اس سے بھی زیادہ طاقت رکھتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ ایک دن بیچ دے کر کہ یہی داؤد کا روزہ تھا اور یہی افضل الصیام ہے۔ انہوں نے عرض کی کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ قدرت ہے۔ ارشاد ہوا "بس اس سے زیادہ بہتر نہیں[3]"۔

ایک روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن عمروؓ کی روزہ داری کا چرچا ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے استقبال کیا اور چمڑے کا گدا بچھا دیا، آپؐ زمین پر بیٹھ گئے اور ان سے کہا کہ تم کو مہینہ میں تین روزے بس نہیں کرتے؟ عرض کی نہیں، فرمایا پانچ، بولے نہیں۔ غرض آپؐ بار بار تعداد بڑھاتے جاتے اور وہ اس پر راضی نہ ہوتے۔ بالآخر آپؐ نے فرمایا کہ اخیر حد یہ ہے کہ ایک دن افطار کرو اور ایک دن روزہ رکھو[4]۔

ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میں جوان آدمی ہوں اور اتنا مقدور نہیں کہ نکاح

---

[1] ابو داؤد ج ۲ ص ۲۲ [2] بخاری ص ۲۶۰ باب اذا جامع فی رمضان [3] صحیح بخاری کتاب الصوم [4] بخاری کتاب النکاح۔

کروں نہ اپنے نفس پر اطمینان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، حضرت ابوہریرہؓ نے پھر ان ہی الفاظ کا اعادہ کیا، آپ چپ رہے، سہ بارہ کہا تو آپ نے فرمایا کہ خدا کا حکم ٹل نہیں سکتا۔[۱]

قبیلہ باہلہ کے ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واپس گئے، سال بھر کے بعد آنے کا اتفاق ہوا، لیکن اتنے ہی زمانہ میں ان کی شکل و صورت اس قدر بدل گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو نہ پہچان سکے، انہوں نے اپنا نام بتایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب سے پوچھا کہ تم تو نہایت خوش جمال تھے، تمہاری صورت کیوں بگڑ گئی؟ انہوں نے کہا جب سے آپ سے رخصت ہوا متصل روزے رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا، رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک دن کا روزہ کافی ہے، انہوں نے کہا اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں، آپ نے ایک دن کا اور اضافہ کر دیا، انہوں نے اور اضافہ کی درخواست کی آپ نے تین کر دیئے، ان کو اس سے بھی تسکین نہ ہوئی تو آپ نے اشہر حرام کے روزوں کا حکم دیا۔[۲] ایک دن چند صحابہ خاص اس غرض سے ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے حالات دریافت کریں، وہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات دن عبادت کے سوا کچھ نہ کرتے ہوں گے حالات سنے تو ان کے معیار کے موافق نہ تھے، بولے کہ بھلا ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت؟ ان کے اگلے پچھلے گناہ سب خدا نے معاف کر دیئے ہیں، پھر ایک صاحب نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزہ رکھوں گا، ایک اور صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے، فرمایا کہ خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو شخص میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میرے گروہ سے خارج ہے۔[۳]

کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گزر ہوا جس میں پانی تھا اور آس پاس کچھ بوٹیاں تھیں، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار مل گیا ہے جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ نشین ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ نے فرمایا، میں یہودیت یا نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا، میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔[۴]

عیب جوئی اور مداحی کی ناپسندیدگی

مداحی اور تعریف کو بھی دل سے ناپسند فرماتے تھے، ایک دفعہ مجلس اقدس میں ایک شخص کا مذکور نکلا، حاضرین میں سے ایک شخص نے ان کی بہت تعریف کی، آپ نے فرمایا تم نے اپنے دوست کی گردن کاٹی۔ یہ الفاظ چند بار فرمائے۔ پھر ارشاد کیا کہ تم کو اگر کسی کی خواہی نخواہی مدح کرنی ہو تو یوں کہو کہ میرا ایسا خیال ہے۔[۵] ایک دفعہ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا، حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے، انہوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منہ میں جھونک دی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ مداحوں کے منہ میں خاک بھر دیں۔[۶] ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف لائے، ایک

---

[۱] بخاری کتاب النکاح [۲] ابوداؤد ج ۱ ص ۲۴۳ [۳] صحیح بخاری کتاب النکاح [۴] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۶۶ [۵] [illegible] [۶] الادب المفرد ص ۹۶ [۷] ایضاً ص [illegible]

شخص نماز پڑھ رہا تھا، محجن ثقفیؓ سے پوچھا یہ کون ہے؟ محجنؓ نے ان کا نام بتایا اور بہت تعریف کی، ارشاد فرمایا کہ دیکھو یہ سن نہ پائے ورنہ تباہ ہو جائے گا، یعنی دل میں غرور پیدا ہوگا جو موجب ہلاکت ہوگا۔[1]

ایک دفعہ اسود بن سریع جو شاعر تھے، خدمتِ عالی میں آئے اور عرض کی کہ میں نے خدا کی حمد و ثنا اور حضورؐ کی مدح میں کچھ اشعار کہے ہیں، فرمایا کہ ہاں خدا کو حمد پسند ہے، اسود نے اشعار پڑھنے شروع کئے، اسی اثنا میں کوئی صاحب باہر سے آگئے، آپؐ نے اسود کو روک دیا، وہ کچھ دیر باتیں کر کے چلے گئے، پھر اسود نے پڑھنے شروع کئے، وہ صاحب پھر آگئے، آپؐ نے اسود کو روک دیا، دو تین دفعہ یہی اتفاق ہوا، اسود نے عرض کی کہ یہ کون صاحب ہیں جن کیلئے آپؐ مجھ کو بار بار روک دیتے ہیں، فرمایا کہ یہ وہ شخص ہے جو فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔[2]

اس موقع پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان کے اشعار سنتے تھے اور فرماتے تھے اللّٰھم ایدہ بروح القدس حالانکہ یہ اشعار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہوتے تھے[3] لیکن واقعہ یہ ہے کہ حسانؓ کے اشعار کفار کے مطاعن کا جواب تھے، عرب میں شعرا کو یہ رتبہ حاصل تھا کہ زورِ کلام سے جس شخص کو چاہتے ذلیل اور جس کو چاہتے معزز کر دیتے، ابن الزبعری اور کعب اشرف وغیرہ نے اس طریقہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، حسانؓ کی مداحی ان کا ردِ عمل تھا۔

سادگی اور بے تکلفی

معمول تھا کہ مجلس سے اٹھ کر گھر میں تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی ننگے پاؤں چلے جاتے اور جوتی وہیں چھوڑ جاتے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ پھر واپس تشریف لائیں گے روزانہ کنگھا کرنا ناپسند فرماتے، ارشاد تھا کہ ایک دن بیچ دے کر کنگھا کرنا چاہیئے۔

کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے کسی چیز میں تکلف نہ تھا، کھانے میں جو سامنے آتا تناول فرماتے پہننے کو موٹا جھوٹا جو مل جاتا پہن لیتے، زمین پر، چٹائی پر، فرش پر جہاں جگہ ملتی بیٹھ جاتے[4] آپ کے لئے آٹے کی بھوسی کبھی صاف نہیں کی جاتی تھی[5] کرتہ کا تکمہ اکثر کھلا رکھتے تھے، لباس میں نمائش کو ناپسند فرماتے تھے، سامانِ آرائش سے طبعًا نفور تھے، غرض ہر چیز میں سادگی اور بے تکلفی پسند خاطر تھی۔[6]

امارت پسندی سے اجتناب

اسلام رہبانیت اور جوگی پن کا سخت مخالف ہے لا رھبانیۃ فی الاسلام اسی بنا پر آپ ہر قسم کے جائز حظوظ دنیوی سے متمتع ہونا جائز رکھتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی ان چیزوں سے تمتع اٹھاتے تھے تاہم ناز و نعمت، تکلف و عیش پرستی کو ناپسند فرماتے، اور اوروں کو بھی اس سے روکتے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا پکوا کر گھر بھیج دیا حضرت فاطمہ زہراؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلعم بھی تشریف لاتے اور ہمارے ساتھ کھاتے تو خوب ہوتا حضرت علیؓ گئے اور آپؐ سے جا کر عرض کی، آپؐ تشریف لائے لیکن دروازہ پر پہنچے تو یہ دیکھ کر کہ گھر میں دیواروں پر پردے لٹکے ہوتے ہیں واپس چلے گئے، حضرت علیؓ نے واپسی کی

---

[1] ادب المفرد ص ۶ [2] ادب المفرد ص ۷ [3] ابوداؤد ج ۲ ص ۳۱۹ [4] دیکھو شمائل [5] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ ص ۹۱۲

[6] صحاح کی کتاب اللباس میں متعدد واقعات ہیں۔

وجہ دریافت کی تو فرمایا پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو۔ فرمایا کہ گھر میں ایک بستر اپنے لئے، ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے[1]۔

ایک دفعہ کسی غزوہ میں تشریف لے گئے، حضرت عائشہؓ رہ گئیں۔ لڑائی سے واپس تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ کے پاس آئے تو دیکھا کہ گھر میں چھت گیر لگی ہوئی ہے، اسی وقت پھاڑ ڈالی اور فرمایا کہ خدا نے ہم کو دولت اس لئے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے پہنائے جائیں[2]۔ ایک انصاری نے ایک مکان بنوایا جس کا گنبد بہت بلند تھا، آپ نے دیکھا تو پوچھا کس نے بنایا ہے؟ لوگوں نے نام بتایا، آپ چپ ہو رہے، جب وہ حسب معمول خدمت میں آئے اور سلام کیا تو آپ نے منہ پھیر لیا، انھوں نے پھر سلام کیا، آپ نے پھر منہ پھیر لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ناراضی کی کیا وجہ ہے، جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا، ایک دن آپ بازار میں نکلے تو گنبد نظر نہ آیا، معلوم ہوا کہ انصاری نے اس کو ڈھا دیا، ارشاد فرمایا کہ ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لئے وبال ہے[3]۔

ایک دفعہ کسی نے کمخواب کی قبا بھیجی، آپ نے پہن لی، پھر خیال آیا اور اتار کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دی، حضرت عمرؓ روتے ہوئے آئے اور عرض کی کہ آپ نے جو چیز ناپسند کی وہ مجھ کو عنایت ہوتی ہے۔ ارشاد ہوا کہ میں نے استعمال کے لئے نہیں بلکہ فروخت کے لئے بھیجی، چنانچہ حضرت عمرؓ نے فروخت کیا تو دو ہزار درہم پر اٹھی[4]۔

ایک دفعہ کسی نے ایک مخطط جوڑا بھیجا، آپ نے حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا، وہ پہن کر خدمتِ اقدس میں آئے، آپ کے چہرہ پر غضب کے آثار پیدا ہوئے اور فرمایا کہ میں نے اس لئے بھیجا تھا کہ پھاڑ کر زنانی چادریں بنائی جائیں[5]۔

مہر کرنے کی غرض سے جب آپ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی، آپ کی تقلید میں صحابہ نے بھی زریں انگوٹھیاں بنوائیں۔ آپ منبر پر چڑھے اور انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور فرمایا کہ اب نہ پہنوں گا، صحابہ نے بھی اسی وقت اتار کر پھینک دیں[6]۔

(جس طرح آپ خود سادگی پسند فرماتے تھے، اسی طرح آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کے اہل و عیال بھی سادہ زندگی بسر کریں اور تکلف و تنعم سے پاک رہیں، عورتوں کو شریعت میں سونے کے زیور کا استعمال مباح ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت کرام کے لئے اس بات کو بھی خلاف اولیٰ تصور فرماتے تھے)

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو یہ ناگوار نہ ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے[7]۔

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن (مسکتہ) دیکھے، فرمایا کہ اگر اس کو اتار کر درس کے کنگن کو زعفران سے رنگ کر پہن لیتیں تو بہتر ہوتا[8]۔

ایک دفعہ نجاشی نے کچھ زیورات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیۃً بھیجے، ان میں ایک انگوٹھی تھی جس میں حبشی پتھر کا نگینہ جڑا تھا، آپ کے چہرہ پر کراہت کے آثار ظاہر ہوتے تھے اور لکڑی سے اس کو

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۷۱ [2] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۱ کتاب اللباس [3] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۱ [4] ایضاً ص ۲۰۲ [5] ایضاً کتاب اللباس، [6] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۰۶ کتاب اللباس [7] ابوداؤد کتاب الخاتم [8] نسائی ج ۲ ص ۲۴۳ [9] ایضاً۔

چھوتے تھے، ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔[1]

ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ ہدیۃً بھیجا، آپؐ نے پہن لیا اور اس کو پہن کر نماز ادا فرمائی، نماز سے فارغ ہو کر نہایت کراہت اور نفرت کے ساتھ نوچ کر اتار ڈالا پھر فرمایا "پرہیزگاروں کے لئے یہ کپڑے مناسب نہیں۔"

تواضع اور خاکساری کی راہ سے اکثر معمولی کپڑے استعمال فرماتے تھے، حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ جمعہ و عیدین میں یا سفراء کے ورود کے موقع پر آپؐ شان و تجمل کے کپڑے زیب تن فرمائیں، اتفاق سے ایک بار راستہ میں ایک ریشمی کپڑا (حلہ سیرا) بک رہا تھا حضرت عمرؓ نے موقع پا کر عرض کیا "یا رسول اللہ! یہ کپڑا حضور خرید لیں اور جمعہ میں اور سفراء کی آمد کے موقع پر ملبوس فرمائیں"۔ ارشاد فرمایا کہ "یہ وہ پہنے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔ اکثر موٹے جھوٹے اور بعض کے بال کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے اور انہی کپڑوں میں وفات پائی۔[2]

بستر کمبل کا تھا، کبھی چمڑے کا جس میں کھجور کی کھال بھری ہوتی تھی کبھی معمولی کپڑے کا جو دو تہہ کر دیا جاتا تھا، حضرت حفصہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک شب کو میں نے بستر مبارک چار تہہ کر کے بچھایا کہ ذرا نرم ہو جائے۔ صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری ظاہر فرمائی۔[3]

۹ھ میں جب کہ یمن سے شام تک صرف اسلامی حکومت تھی، فرمانروائے اسلام کے گھر میں صرف ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ[4] تھا، حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب آپؐ نے وفات پائی تو تھوڑے سے جَو کے سوا گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا، صحابہ سے فرمایا کرتے تھے[5] کہ دنیا میں انسان کے لئے اتنا کافی ہے، جتنا ایک مسافر کو زادِ راہ کے لئے[6]۔ ایک دفعہ ایک بوریئے پر آرام فرما رہے تھے، اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ! کیا ہم لوگ کوئی گدا بنوا کر حاضر کریں، ارشاد ہوا کہ مجھ کو دنیا سے کیا تعلق، مجھ کو دنیا سے اس قدر تعلق ہے جس قدر اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لئے راہ میں کسی درخت کے سایہ میں بیٹھ جاتا ہے پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔[7]

ایلاء کے زمانہ میں حضرت عمرؓ جب مشربہ میں جو اسباب کی کوٹھڑی تھی حاضر ہوئے تو ان کو نظر آیا کہ سرور عالمؐ کے بیت قدس میں دنیاوی ساز و سامان کی کیا کیفیت ہے! جسم مبارک پر صرف ایک تہبند ہے ایک کھری چارپائی بچھی ہے، سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے۔ ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں ایک کونے میں پائے مبارک کے پاس کسی جانور کی کھال پڑی ہے، کچھ مشکیزہ کی کھالیں سر کے پاس کھونٹی پر لٹک رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کا سبب دریافت فرمایا، عرض کی یا رسول اللہ! میں کیوں نہ روؤں، چارپائی کے بان سے جسم اقدس میں بدھیاں پڑ گئی ہیں، یہ آپؐ کے اسباب کی کوٹھڑی ہے، اس میں جو سامان ہے وہ نظر آ رہا ہے۔ قیصر و کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپؐ خدا کے پیغمبر اور برگزیدہ ہو کر آپؐ کے سامان خانہ کی یہ کیفیت ہو۔ ارشاد ہوا،

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۱۱۹ [2] اوپر کی تمام روایتیں صحیح بخاری کتاب اللباس سے ماخوذ ہیں [3] شمائل ترمذی [4] صحیح بخاری کتاب اللباس [5] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۱۰۹ [6] ابن ماجہ کتاب الزہد [7] جامع ترمذی کتاب الزہد

اے ابن خطاب! تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔[1]

مساوات

آپ کی نظر میں امیر و غریب، صغیر و کبیر، آقا و غلام سب برابر تھے، سلمانؓ و صہیبؓ و بلالؓ کہ سب کے سب غلام رہ چکے تھے، آپ کی بارگاہ میں رؤسائے قریش سے کم رتبہ نہ تھا، ایک دفعہ حضرت سلمانؓ و بلالؓ ایک موقع پر جمع تھے، اتفاق سے ابوسفیان نکلے، ان لوگوں نے کہا ابھی تلوار نے اس دشمن خدا کی گردن پر پورا قبضہ نہیں پایا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان لوگوں سے کہا، سرداران قریش کی شان میں یہ الفاظ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کہیں تم نے ان لوگوں کو ناراض تو نہیں کیا۔ ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فوراً جا کر ان بزرگوں سے کہا بھائیو! آپ لوگ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوئے؟ ان لوگوں نے کہا نہیں، خدا تم کو معاف کرے۔[2] قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ اسامہ بن زیدؓ جن سے آنحضرتؐ نہایت محبت رکھتے تھے، لوگوں نے ان کو شفیع بنا کر خدمت نبوی میں بھیجا۔ آپ نے فرمایا۔ اسامہ! کیا تم حدودِ خداوندی میں سفارش کرتے ہو۔ پھر آپ نے لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا، تم سے پہلے کی امتیں اسی لئے برباد ہو گئیں کہ جب معزز آدمی کوئی جرم کرتا تو تسامح کرتے اور معمولی آدمی مجرم ہوتے تو سزا پاتے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ سرقہ کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔[3]

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ آپ کے چچا حضرت عباس بھی گرفتار ہو کر آئے تھے، قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر رہا کیا جاتا تھا۔ بعض نیک دل انصار نے اس بنا پر کہ وہ آپ سے قرابت قریبہ رکھتے تھے، عرض کی کہ یارسول اللہ! اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباس) کا زرِ فدیہ معاف کر دیں، آپ نے فرمایا نہیں، ایک درہم بھی معاف نہ کرو۔[4] مجلس میں جو چیزیں آتیں ہمیشہ داہنی طرف سے اس کی تقسیم شروع فرماتے اور ہمیشہ اس میں امیر و غریب، صغیر و کبیر سب کی مساوات کا لحاظ ہوتا۔

ایک دفعہ خدمتِ اقدس میں صحابہ کا مجمع تھا، اتفاق سے داہنی طرف حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیٹھے ہوئے تھے جو بہت کم سن تھے۔ بائیں جانب بڑے بڑے معمر صحابہ تھے کہیں سے دودھ آیا، آپ نے نوش فرما کر عبداللہ بن عباسؓ سے کہا تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔ انہوں نے عرض کی، اس عطیہ میں میں ایثار نہیں کر سکتا۔ چونکہ وہ داہنی جانب تھے اور ترتیبِ مجلس کی رو سے انہی کا حق تھا، آپ نے انہی کو ترجیح دی۔[5] حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میرے مکان پر تشریف لائے اور پینے کا پانی مانگا۔ میں نے بکری کا دودھ پیش کیا۔ مجلس کی ترتیب یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب، حضرت عمرؓ سامنے اور ایک بدو داہنی جانب تھا، آپ نے پی لیا تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی طرف اشارہ کیا یعنی بقیہ ان کو عنایت ہو۔ آپ نے فرمایا پہلے داہنی طرف والے کا حق ہے، یہ کہہ کر بچا ہوا دودھ بدو کو عنایت فرمایا۔[6]

قریش اپنے فخر و امتیاز کے لئے مزدلفہ میں قیام کرتے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تفریق کو

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطلاق باب تخییر الازواج [2] صحیح مسلم فضائل سلمانؓ و صہیبؓ [3] بخاری و مسلم و ابوداؤد کتاب الحدود [4] صحیح بخاری باب فداء المشرکین [5] صحیح بخاری صفحہ ۸۸ [6] بخاری صفحہ ۳۵۰۔

کبھی پسند نہ فرمایا۔ بعثت[1] سے پہلے اور بعثت کے[2] بعد بھی ہمیشہ عام لوگوں کے ساتھ مقام کرتے تھے، علاوہ بریں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہاں خاص طور سے کوئی عمدہ جگہ دیکھ کر آپ کے لئے مخصوص کر دی جائے اور وہاں سایہ کیلئے کوئی چھپر ڈال دیا جائے۔ صحابہ نے یہ تجویز پیش کی تو فرمایا جو پہلے پہنچ جائے اس کا مقام ہے[3]۔

صحابہ جب سب مل کر کوئی کام کرتے تو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے، مدینہ میں آکر سب سے پہلا کام مسجد نبویؐ کی تعمیر تھی، اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ کی طرح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفس نفیس شریک تھے، خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ عرض کرتے تھے، ہماری جانیں قربان آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آتے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ مدینہ کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے، آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے، یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہہ جم گئی تھی[5]۔

ایک سفر میں کھانا تیار نہ تھا، تمام صحابہ نے مل کر کھانا پکانے کا سامان کیا۔ لوگوں نے ایک ایک کام بانٹ لیا، جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمہ لیا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ کام ہم خدام کر لیں گے۔ فرمایا ہاں یہ سچ ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے کو ممتاز کر دوں۔ خدا اس بندہ کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے[6]۔

غزوۂ بدر میں سواریوں کا انتظام بہت کم تھا، تین تین آدمیوں کے بیچ میں ایک ایک اونٹ تھا، لوگ باری باری سے چڑھتے اترتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو آدمیوں کے ساتھ شریک تھے، ہمراہ جان نثارانہ اپنی باری پیش کرتے اور عرض کرتے کہ یا رسول اللہ! آپ سوار رہیں، حضور کے بدلہ میں ہم پیادہ چلیں گے۔ ارشاد ہوتا کہ نہ تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا چل سکتے ہو اور نہ میں تم سے کم ثواب کا محتاج ہوں[7]۔

تواضع گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، گدھے کی سواری سے آپ کو عار نہ تھا، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا[9]۔ ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لاتے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا کہ اہل عجم کی طرح تعظیم کے لئے نہ اٹھو[10]۔ غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے، مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بناء پر کوئی آپ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے[11]۔

ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا، لیکن نبوت کا رعب اس قدر طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ

---

[1] ابوداؤد کتاب المناسک [2] ایضاً [3] مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۱۰۱ [4] صحیح بخاری باب الہجرۃ وبناء المسجد [5] صحیح بخاری باب غزوۂ احزاب [6] زرقانی ج ۴ ص ۳۰۶ بحوالہ سیرت محب طبری، یہ روایت کسی اور کتاب میں نہیں ہے [7] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۴۱۱ و ۴۲۲ [8] مسند ابوداؤد طیالسی [9] شمائل ترمذی [10] ابوداؤد ابن ماجہ [11] شمائل ترمذی۔

نہیں میں بادشاہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی[1]۔

تواضع اور خاکساری کی راہ سے آپ اکڑوں بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "میں بندہ اور بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں ہی کی طرح بیٹھتا ہوں" ایک دفعہ کھانے کے موقع پر جگہ تنگ تھی اور لوگ زیادہ آگئے، آپ اکڑوں بیٹھ گئے کہ جگہ نکل آئے، ایک بدو بھی مجلس میں شریک تھا، اس نے کہا محمدؐ! یہ کیا طرزِ نشست ہے؟ آپ نے فرمایا خدا نے مجھے خاکسار بندہ بنایا ہے، جبار اور سرکش نہیں بنایا ہے[2]۔

تواضع کی انتہا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق جائز تعظیمی الفاظ بھی نہیں پسند فرماتے تھے۔ ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ سے آپ کو خطاب کیا، اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور ہم میں سب سے بہتر کے فرزند! آپ نے فرمایا، لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں بگاڑ نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا، میں پسند نہیں کرتا کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ[3]۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کو یا خیر البریۃ (یعنی اے بہترین خلق) کہہ کر مخاطب کیا، آپ نے فرمایا وہ ابراہیمؑ تھے[4]۔

عبداللہ بن شخیر کا بیان ہے کہ بنی عامر کی سفارت کے ساتھ جب ہم لوگ خدمتِ اقدس میں آئے تو عرض کی کہ حضور! ہمارے آقا سید ہیں، ارشاد فرمایا کہ "آقا خدا ہے" پھر ہم لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم میں سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں۔ ارشاد ہوا کہ بات کہو تو دیکھ لو کہ شیطان تو تم کو نہیں چلا رہا ہے[5]۔

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی جس کے دماغ میں کچھ فتور تھا، آپ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ محمدؐ! مجھ کو تم سے کچھ کام ہے، فرمایا جہاں کہو چل سکتا ہوں، وہ آپ کو ایک کوچہ میں لے گئی اور وہیں بیٹھ گئی، آپ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور جو کام تھا انجام دے دیا[6]۔ مخرمہؓ ایک صحابی تھے، ایک دفعہ انہوں نے اپنے بیٹے مسور سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہیں سے چادریں آئی ہیں اور وہ تقسیم فرما رہے ہیں، آؤ ہم بھی چلیں، آئے تو آپ زنانہ میں تشریف لا چکے تھے، کہا آواز دو، انہوں نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آواز دوں، مخرمہ نے کہا بیٹے! محمدؐ جبار نہیں ہیں، ان کی جرأت دلانے سے مسور نے آواز دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً نکل آئے اور ان کو دیا کی قبا عنایت کی جس کی گھنڈیاں زریں تھیں[7]۔ ایک دفعہ ایک انصاری نے ایک یہودی کو یہ کہتے سنا کہ اس خدا کی قسم! جس نے موسیٰؑ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، یہ سمجھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض ہے غصہ میں آکر اس کے منہ پر تھپیڑ کھینچ مارا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فریادی آیا، آپ نے انصاری کو بلا بھیجا اور واقعہ کی تحقیق کے بعد فرمایا کہ مجھ کو انبیاء پر فضیلت نہ دو[8]۔

(انسان کے غرور و ترفع کا اصل موقع وہ ہوتا ہے جب وہ اپنے چپ و راست جلو میں ہزاروں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے جو اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کو تیار ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب وہ فاتح

---

[1] مستدرک ج ۳ ص ۴۸ مع شرح الشیخین واقعہ فتح مکہ [2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [3] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۵۳ [4] صحیح بخاری باب فضائل ابراہیم [5] ابوداؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح [6] ایضاً [7] بخاری ص [illegible] [8] بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر موسیٰ۔

ایک جرار و پرجوش لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع و خاکساری کا منظر اس وقت اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو تواضع سے سر مبارک کو اس قدر جھکا دیا کہ کجاوہ سے آکر مل گیا[1]۔ غزوۂ خیبر میں جب آپ کا داخلہ ہوا تو آپ ایک گدھے پر سوار تھے جس میں لگام کی جگہ کھجور کی چھال بندھی تھی[2]۔ حجۃ الوداع میں جس کجاوہ پر آپ سوار تھے، سن چکے ہو کہ اس کی قیمت کیا تھی[3]،

تعظیم اور مدح مفرط سے روکتے تھے

اس نکتہ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کی مثال پیش نظر تھی، فرمایا کرتے تھے کہ میری اس قدر مبالغہ آمیز مدح نہ کیا کرو جس قدر نصاریٰ ابن مریم کی کرتے ہیں، میں تو خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں[4]، قیس بن سعدؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حیرہ گیا، وہاں لوگوں کو دیکھا کہ رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو اس کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور عرض کی کہ آپ کو سجدہ کیا جائے کہ آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں، آپ نے فرمایا کہ تم میری قبر پر گزرو گے تو سجدہ کرو گے؟ کہا نہیں، تو فرمایا، جیتے جی بھی سجدہ نہیں کرنا چاہیئے[5]۔

معوذ بن عفراء کی صاحبزادی (ربیع) کی جب شادی ہوئی تو آپ ان کے گھر تشریف لے گئے اور دلہن کے لیے جو فرش بچھایا گیا تھا اس پر بیٹھ گئے، گھر کی لڑکیاں آس پاس جمع ہو گئیں اور دف بجا بجا کر شہدائے بدر کا مرثیہ گانے لگیں، گاتے گاتے ایک نے یہ مصرعہ گایا۔

فینا نبیٌّ یعلم ما فی غد — ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی باتیں جانتا ہے۔

فرمایا یہ چھوڑ دو اور وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں[6]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس درد و صدمہ سے کم از کم اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہو جائے گا، لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہو سکتا تھا، لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ ہے آنحضرتؐ نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیات قدرت میں ہے کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا[7]۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وضو کر رہے تھے، وضو کا پانی جو دست مبارک سے گرتا، فدائی برکت کے خیال سے اس کو چلو میں لے کر بدن میں مل لیتے، آپ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کر رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں۔ فرمایا، اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ جب باتیں کرے سچ بولے، جب امین بنایا جائے ادائے امانت

---

[1] شرح شفاء قاضی عیاض و سیرت ابن ہشام۔ [2] مستدرک حاکم ج ۴ صفحہ ۳۱۰ [3] مشکوٰۃ، اخلاق النبی بحوالہ حاکم و ابن ماجہ و بیہقی [4] صحیح بخاری ج ۱ صفحہ ۴۹۰ کتاب الانبیاء

[5] ابوداؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ [6] صحیح مسلم باب ضرب الدف فی النکاح [7] صحیح بخاری و مسلم باب صلوٰۃ الکسوف۔

کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو ہمسائیگی کو اچھی طرح نباہے[1]۔

ایک صاحب بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا، جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں۔ ارشاد ہوا۔ تم نے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا کہو کہ جو خدا تنہا چاہے[2]۔

شرم وحیاء

(صحاح میں ہے کہ آپ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے اور شرم وحیاء کا اثر آپ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی، بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گزر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لب مبارک خندہ و قہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے) بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہ متنبہ ہو جاتے۔

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیاء کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی، حرم کعبہ کا طواف ننگے ہو کر کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کر لیا کرو، عرب میں حمام نہ تھے لیکن شام و عراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے وہاں کثرت سے حمام تھے اس بنا پر آپ نے فرمایا کہ جب عجم فتح کرو گے تو وہاں حمام ملیں گے، ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔

ایک دفعہ کچھ عورتیں حضرت ام سلمہؓ کے پاس آئیں، انھوں نے وطن پوچھا، بولیں حمص (شام کا ایک شہر ہے) حضرت ام سلمہؓ نے کہا تم ہی وہ عورتیں ہو جو حمام میں نہاتی ہیں؟ بولیں کیا حمام کوئی بری چیز ہے؟ فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو عورت اپنے گھر کے سوا کسی گھر میں کپڑے اتارتی ہے خدا اس کی پردہ دری کرتا ہے[3]۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمام میں نہانے کو مطلقاً منع کر دیا تھا، پھر مردوں کو پردوں کی قید کے ساتھ اجازت دی لیکن عورتوں کے لئے وہی حکم قائم رہا، عرب میں جائے ضرور نہ تھے[4]۔ لوگ میدانوں میں رفع حاجت کے لئے جایا کرتے تھے لیکن پردہ نہیں کرتے تھے بلکہ آمنے سامنے بیٹھ جایا کرتے اور ہر قسم کی بات چیت کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت کی اور فرمایا کہ خدا اس سے ناراض ہوتا ہے[5]۔

معمول تھا کہ رفع حاجت کے لئے اس قدر دور نکل جاتے کہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام تھا، حدودِ حرم سے باہر چلے جاتے جس کا فاصلہ مکہ معظمہ سے کم از کم تین میل تھا[6]۔

اپنے ہاتھ سے کام کرنا

اگرچہ تمام صحابہ آپ کے جاں نثار خادموں میں داخل تھے، بایں ہمہ آپ خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو پسند کرتے تھے، حضرت عائشہؓ، ابوسعید خدریؓ اور امام حسنؓ سے روایت ہے کہ کان یخدم نفسہ یعنی آپ اپنے کام خود اپنے دست مبارک سے انجام دیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ آپ گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ جواب دیا کہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتے تھے

---

[1] مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی [2] ادب المفرد امام بخاری [3] مسند [4] یہ تمام روایتیں ترغیب و ترہیب میں کتب حدیث کے حوالے سے منقول ہیں [5] صحیح بخاری حدیث افک [6] ابوداؤد و ابن ماجہ [7] شرح شفائے قاضی عیاض ج ۲ ص ۱۹۱۔

کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے خود پیوند لگاتے تھے، گھر میں خود جھاڑو دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے، بازار سے سودا خرید لاتے تھے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے تھے، ڈول میں ٹانکے لگا دیتے تھے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ دیتے تھے، اس کو چارہ دیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے تھے۔[1]

حضرت انسؓ بن مالک ایک دفعہ خدمت مبارک میں حاضر ہوئے تو دیکھا، آپ خود اپنے ہاتھ سے ایک اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے تھے، ان سے دوسری روایت ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ صدقہ کے اونٹوں کو داغ رہے ہیں، تیسری روایت میں وہ کہتے ہیں کہ آپ بکریوں کو داغ لگا رہے تھے۔[2]

ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں تشریف لے گئے، دیکھا تو مسجد میں کسی نے ناک صاف کی ہے، آپ نے خود دست مبارک سے ایک کنکری لے کر اس کو کھرچ ڈالا اور آئندہ لوگوں کو اس فعل سے منع فرمایا۔[3]

آپ جب بچے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی تو اس وقت بھی پتھر اٹھا اٹھا کر معماروں کے پاس لاتے تھے۔[4] مسجد قبا اور مسجد نبویؐ کی تعمیر اور خندق کے کھودنے میں جس طرح عام مزدوروں کے ساتھ مل کر آپ نے کام کیا، خود دست مبارک سے جس طرح پتھر اٹھا اٹھا کر دیا اور جس طرح زمین کھودی اس کی تفصیل جلد اول کے واقعات میں گزر چکی ہے۔ ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کے لئے آپس میں کام بانٹ لئے۔ آپ نے فرمایا: جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا، صحابہ نے تامل کیا تو فرمایا: میں امتیاز پسند نہیں کرتا۔[5] ایک اور سفر میں آپ کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ آپ نے خود اس کو درست کرنا چاہا، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! لایئے میں ٹانک دوں، فرمایا یہ تشخص پسندی ہے جو مجھے محبوب نہیں۔[6] دو صحابی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ خود اپنے دست مبارک سے مکان کی مرمت کر رہے ہیں، ہم لوگ بھی اس کام میں شریک ہو گئے، جب کام ختم ہو گیا تو آپ نے ہمارے لئے دعائے خیر فرمائی۔[7]

دوسروں کے کام کر دینا

خبابؓ بن ارت ایک صحابی تھے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی غزوہ پر بھیجا، خبابؓ کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوہنا نہیں آتا تھا، اس بنا پر آپ ہر روز ان کے گھر جاتے اور دودھ دوہ دیا کرتے۔ حبش سے جو مہمان آتے تھے صحابہ نے چاہا کہ وہ ان کی خدمت گزاری کریں، لیکن آپ نے ان کو روک دیا اور فرمایا کہ انہوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے اس لئے میں خود ان کی خدمت گزاری کا فرض انجام دوں گا۔ کفار ثقیف جنہوں نے طائف میں آپ کے پائے مبارک کو زخمی کر دیا تھا، ۹ھ میں وفد لے کر آئے تو آپ نے ان کو مسجد نبویؐ میں اتارا اور بہ نفس نفیس ان کی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، اور باب ما یکون الرجل فی مہنۃ اہلہ میں مجمل ہے، قاضی عیاض نے شفا میں متعدد حدیثوں سے لے کر اور ٹکڑے بھی جمع کر دیئے ہیں، زرقانی نے ج ۴ ص ۳۰۲ میں مسند احمد و ابن سعد سے یہ روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [2] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم میں ہیں، پہلی روایت کتاب الادب میں اور دوسری اور تیسری باب جواز وسم الحیوان میں ہے۔ [3] سنن نسائی کتاب المساجد۔ [4] صحیح بخاری باب الجاہلیۃ۔ [5] زرقانی ج ۴ ص ۳۰۲ بحوالہ سیرت محب طبری۔ [6] ایضاً بحوالہ کتاب شمائل النقل الشریف لابی الیمن ابن عساکر۔ [7] مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۴۰۹۔

سمائی کے فرائض ادا کیے۔

مدینہ کی لونڈیاں آپ کی خدمت میں آتیں اور کہتیں، یا رسول اللہ میرا یہ کام ہے، آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کا کام کر دیتے۔ مدینہ میں ایک پاگل لونڈی تھی، وہ ایک دن حاضر ہوئی اور آپ کا دست مبارک پکڑ لیا، آپ نے فرمایا، اے عورت! مدینہ کی جس گلی میں تو چاہے بیٹھ، میں تیرا کام کر دوں گا۔ چنانچہ آپ اس کے ساتھ مدینہ کی ایک گلی میں جا کر بیٹھے اور اس کی ضرورت پوری کی۔ عبد اللہ بن ابی اوفیٰ ایک صحابی ہیں، وہ فرماتے ہیں۔

ولا یأنف ان یمشی مع الارملۃ والمسکین فیقضی لہ الحاجۃ (نسائی و دارمی)	بیوہ اور مسکین کے ساتھ چل کر ان کا کام کر دینے میں آپ کو عار نہ تھا۔

ایک دفعہ آپ نماز کے لئے کھڑے ہو چکے تھے کہ ایک بدو آیا اور آپ کا دامن پکڑ کر بولا، میرا ذرا سا کام رہ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں، پہلے اس کو کر دو، آپ اس کے ساتھ فوراً مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام انجام دے کر نماز ادا کی۔[2]

عزم و استقلال خدا نے قرآن مجید میں اولوا العزم من الرسل کہہ کر انبیائے کبار کی مدح فرمائی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الرسل تھے اس لئے خصوصیت کے ساتھ خدا نے یہ وصف آپ کی ذات میں ودیعت کیا تھا۔ ابتدا سے انتہا تک اسلام کا ایک ایک کارنامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و استقلال کا مظہر اتم ہے، عرب کے کفرستان میں ایک شخص تنہا کھڑا ہوتا ہے بے یار و مددگار دعوتِ حق کی صدائیں بلند کرتا ہے۔ ریگستان کا ذرہ ذرہ اس کی مخالفت میں پہاڑ بن کر سامنے آتا ہے، لیکن وقارِ نبوت اور عزم ربانی سے ٹھوکر کھا کر پیچھے ہٹ جاتا ہے اور مخالفتوں کی تمام قوت اس کے سامنے چور چور ہو جاتی ہے۔

تیرہ برس کی متواتر ناکامیوں کے بعد بھی ذاتِ اقدس حزن و یاس سے آشنا نہیں ہوتی اور بالآخر وہ دن آتا ہے جب ایک تنہا انسان ایک لاکھ جاں نثاروں کو چھوڑ کر دنیائے فانی کو الوداع کہتا ہے، ہجرت سے قبل ایک دفعہ صحابہ نے کفار کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر خدمت مبارک میں عرض کی کہ آپ ہمارے لئے کیوں دعا نہیں فرماتے آپ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان کو آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، ان کے بدن پر لوہے کی کنگھیاں چلائی جاتی تھیں جس سے گوشت پوست علیحدہ ہو جاتا تھا لیکن یہ آزمائشیں بھی ان کو مذہب سے برگشتہ نہیں کر سکتی تھیں، خدا کی قسم؛ دین اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ کر رہے گا، یہاں تک کہ صنعاء سے حضر موت تک ایک سوار اس طرح بے خطر چلا آئے گا کہ اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔[3]

مکہ میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انھوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی، ان میں سے ہر چیز بہادر سے بہادر انسان کے قدم کو ڈگمگانے کے لئے کافی تھی، لیکن آپ نے ذلت کے ساتھ ان کی درخواست کو ٹھکرا دیا اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہم

---

[1] مسلم اور ابوداؤد اخلاق و آداب [2] ابوداؤد کتاب الادب و بخاری کتاب صلوٰۃ مختصراً [3] صحیح بخاری ج ۱ باب مالقی النبی۔

دمساز یعنی ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا تو یہ غور و فکر کا آخری لمحہ اور عزم و استقلال کا آخری امتحان تھا، اس وقت آپ نے جواب میں جو فقرے فرمائے عالم کائنات میں ثبات و پامردی کے اظہار کا سب سے آخری طریقۂ تعبیر ہے۔ آپ نے فرمایا چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند رکھ دیں تب بھی اپنے اعلانِ حق سے باز نہ آؤں گا۔ (ابن ہشام)

غزوۂ بدر میں جب تین سو بے سروسامان مسلم، ایک ہزار ساز و سامان فوج سے معرکہ آرا تھے، کفارِ قریش اپنے زور و کثرت سے بپھرے آئے تھے، اس وقت مسلمان سمٹ سمٹ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں آجاتے تھے اور بایں ہمہ نبوت کا کوہ وقار اپنی جگہ پر قائم تھا[1]۔

غزوۂ اُحد میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا تو سب نے حملہ کی رائے دی لیکن جب آپ زرہ پہن کر تیار ہو گئے تو صحابہ نے رک جانے کا مشورہ دیا، آپ نے فرمایا "پیغمبر زرہ پہن کر اتار نہیں سکتا[2]" غزوۂ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کے قدر اندازوں نے متصل تیروں کی بوچھاڑ کی تو اکثر صحابہ کے قدم اکھڑ گئے، لیکن آپ نہایت سکون و اطمینان سے چند جان نثاروں کے ساتھ میدان میں جمے رہے، اس وقت زبانِ مبارک پر یہ رجز جاری تھا،

انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب[3]۔ میں پیغمبر صادق ہوں، میں فرزند عبدالمطلب ہوں۔

ایک بار آپ کسی غزوہ میں درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے، ایک کافر آیا اور اسی حالت خواب میں تلوار کھینچ کر بولا، محمدؐ! اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، "خدا" اس عزم و استقلال اور جرأت صادقہ نے اس کو اس قدر مرعوب کر دیا کہ فوراً اس نے تلوار میان میں کر لی اور پاس بیٹھ گیا[4]۔

شجاعت یہ وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے، عزم استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، پر دلی، یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سیکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آئے لیکن کبھی پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی، غزوۂ بدر میں گھمسان کی لڑائی میں ۳۰۰ نہتے مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکزِ نبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے، حضرت علیؓ جن کے دست و بازو نے بڑے بڑے سرکش کے سر کاٹے کہتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی، آپ سب سے زیادہ شجاع تھے مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا[5]۔

غزوۂ حنین میں ہوازن کے بے پناہ تیروں کی بارش ہوئی تو مسلمانوں کی کثیر التعداد فوج دفعۃً میدان سے ہٹ گئی، لیکن آپ مع چند جاں نثاروں کے بدستور میدان میں کھڑے رہے، اس وقت بار بار آپ اپنے خچر کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ جانے کا قصد فرما رہے تھے لیکن جان نثار مانع آتے تھے، اب دشمنوں کی تمام فوج کا نشانہ صرف آپ کی ذات تھی، بایں ہمہ پائے اقدس میں لغزش نہیں ہوئی، حضرت براءؓ جو اس معرکہ میں شریک تھے کسی نے

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶ [2] بخاری ج ۲ ص ۱۰۹۱ باب قول اللہ و امرہم شوری بینہم [3] صحیح بخاری حنین [4] بخاری ج ۲ ص ۵۹۳ غزوۂ ذات الرقاع۔ [5] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۲۶۔

اُن سے پوچھا کہ کیا حنین میں تم بھاگ کھڑے ہوئے تھے؟ جواب دیا ہاں یہ سچ ہے، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضرتؐ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے تھے۔ خدا کی قسم! جب لڑائی پورے زور پر ہوتی تھی تو ہم لوگ آپؐ ہی کے پہلو میں آکر پناہ لیتے تھے، ہم میں، سب سے بڑا بہادر وہ شمار ہوتا تھا جو آپؐ کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا[1]۔

حضرت انسؓ بن مالک کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک دفعہ مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آگئے، لوگ مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے، لیکن سب سے پہلے جو آگے بڑھ کر نکلا وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جلدی میں آپؐ نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ گھوڑے پر زین کسی جائے، گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہو کر آپؐ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آئے اور واپس آکر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرہ کی بات نہیں[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کو اپنے دستِ خاص سے قتل نہیں کیا، ابی بن خلف آپؐ کا سخت دشمن تھا، بدر میں فدیہ دے کر رہا ہوا تو ساتھ ساتھ یہ کہتا گیا "میرے پاس ایک گھوڑا ہے جس کو میں ہر روز جوار کھلاتا ہوں، اسی پر چڑھ کر محمدؐ کو قتل کروں گا"۔ اُحد میں اسی گھوڑے کو اڑاتا اور صفوں کو چیرتا ہوا آپؐ کے پاس پہنچ گیا، مسلمانوں نے چاہا کہ اس کو بیچ میں روک لیں، آپؐ نے منع فرمایا اور ایک مسلمان کے ہاتھ سے نیزہ لے کر آپؐ اس کی طرف بڑھے اور آہستہ سے اس کی گردن میں انی چبھو دی، وہ چنگھاڑ مار کر بھاگا، لوگوں نے کہا یہ تو کوئی بڑا زخم نہیں تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ اس نے کہا ہاں سچ ہے، لیکن یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے[3]۔

راست گفتاری

راست گفتاری پیغمبر کی ایک ضروری صفت ہے اور اس کا وجود ان کی ذات سے کبھی منفک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے عنوان میں اس کے جزئیات کی تفصیل کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس موقع پر ہم صرف اُن شہادتوں کو قلمبند کرنا چاہتے ہیں جو دشمنوں کے اعتراف سے ہاتھ آسکی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار میں جو لوگ آپؐ سے واقف تھے انہوں نے آپؐ کو کاذب اور دروغ گو یقین نہیں کیا بلکہ یہ سمجھا کہ نعوذ باللہ آپؐ کے حواس درست نہیں یا آپؐ کی عقل نہیں بجا رہی ہے یا یہ کہ ان میں اب شاعرانہ تخیل پرستی آگئی ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے آپؐ کو مجنون کہا، مسحور کہا، شاعر کہا، لیکن کاذب نہیں کہا۔

ایک روز قریش کے بڑے بڑے رؤسا۔ جلسہ جمائے بیٹھے تھے اور آپؐ کا ذکر ہو رہا تھا۔ نضر بن حارث نے جو قریش میں سب سے زیادہ جہاندیدہ تھا، کہا اے قریش! تم پر جو مصیبت آئی ہے، اب تک تم اس کی کوئی تدبیر نہ نکال سکے۔ محمدؐ تمہارے سامنے بچہ سے جوان ہوا، وہ تم میں سب سے زیادہ پسندیدہ، صادق القول اور امین تھا اب جب اس کے بالوں میں سپیدی آچلی اور تمہارے سامنے یہ باتیں پیش کیں تو کہتے ہو کہ وہ ساحر ہے، کاہن ہے شاعر ہے، مجنون ہے، خدا کی قسم! میں نے ان کی باتیں سُنی ہیں، محمدؐ میں یہ کوئی بات نہیں، تم پر یہ کوئی مصیبت ہی نئی آئی ہے[4]۔ ابوجہل کہا کرتا تھا "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا، البتہ جو کچھ کہتے ہو اس کو صحیح نہیں سمجھتا"۔ قرآن مجید کی

---

[1] صحیح مسلم غزوہ حنین [2] صحیح بخاری کے متفرق ابواب میں یہ حدیث ہے، مثلاً باب الشجاعت فی الحرب و باب لما فزعوا باللیل [3] شفاء قاضی عیاض ج ۲ ص ۴۲ بحوالہ بیہقی بسند صحیح و مصنف عبدالرزاق و ابن سعد و واقدی۔ [4] ابن ہشام۔

یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی ہے[1]۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ - (انعام-۴)	ہم جانتے ہیں کہ اے پیغمبر ان کافروں کی باتیں تم کو غمگین کرتی ہیں کیونکہ وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے، البتہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش گاہِ الٰہی سے حکم ہوا کہ اپنے اہل خاندان کو اسلام کی دعوت دو تو آپ نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکارا یا معشر قریش! جب سب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟ سب نے کہا ہاں! کیونکہ ہم نے تم کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا[2]۔

قیصر روم نے دربار میں ابوسفیان سے پوچھا کہ تمہارے ہاں جو مدعی پیدا ہوا ہے اس دعویٰ سے پہلے کبھی تم نے اس کو دروغ گو بھی پایا، ابوسفیان نے کہا نہیں، آخر میں قیصر نے جو تقریر کی اس میں کہا میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک وہ کبھی کذب کا بھی مرتکب ہوا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر وہ خدا پر افترا باندھتا تو وہ آدمیوں پر افترا باندھنے سے کب باز رہتا[3]۔

ایفائے عہد

ایفائے عہد آپ کی ایک ایسی عام خصوصیت تھی کہ دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، چنانچہ قیصر نے اپنے دربار میں آپ کے متعلق ابوسفیان سے جو سوالات کئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ کیا کبھی محمدؐ نے بدعہدی بھی کی ہے؟ ابوسفیان کو مجبوراً یہ جواب دینا پڑا کہ نہیں[4]۔ وحشی، جنہوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا، اسلام کے ڈر سے شہر بہ شہر پھرا کرتے تھے، اہل طائف نے مدینہ بھیجنے کے لئے جو وفد مرتب کیا اس میں ان کا نام بھی تھا لیکن ان کو ڈر تھا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے، لیکن خود دشمنوں نے ان کو یقین دلایا کہ تم بے خوف و خطر جاؤ، محمد سفراء کو قتل نہیں کرتے، چنانچہ وہ اس اعتماد پر دربارِ نبوت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے[5]۔ صفوان بن امیہ (قبل اسلام) شدید ترین دشمنوں میں تھے، جب مکہ فتح ہوا تو وہ بھاگ کر یمن کے ارادہ سے جدہ چلے گئے، عمیر بن وہب نے حاضرِ خدمت ہو کر واقعہ عرض کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ مبارک عنایت کیا اور فرمایا کہ یہ صفوان کی امان کی نشانی ہے، عمیر عمامۂ مبارک لے کر صفوان کے پاس پہنچے اور کہا تم کو بھاگنے کی ضرورت نہیں تم کو امان ہے، جب خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کی کہ کیا آپ نے مجھے امان دی ہے؟ ارشاد ہوا کہ ہاں یہ سچ ہے[6]۔

ابورافع ایک غلام تھے، حالاتِ کفر میں قریش کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ منورہ آئے، روئے اقدس پر نظر پڑی تو بے اختیار اسلام کی صداقت ان کے دل میں جاگزیں ہو گئی، عرض کی یارسول اللہ! اب میں کبھی کافروں کے پاس لوٹ کر نہ جاؤں گا، ارشاد ہوا، نہ میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں تم اس وقت واپس جاؤ، اگر وہاں پہنچ کر بھی تمہارے دل کی یہی کیفیت باقی رہے تو آجانا، چنانچہ وہ اس وقت

---

[1] جامع ترمذی تفسیر انعام [2] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت [3] صحیح بخاری باب بدء الوحی [4] ایضاً [5] صحیح بخاری غزوۂ احد [6] ابن ہشام۔

واپس گئے، پھر اسلام لائے[1]

صلح حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا وہ اہل مکہ کے مطالبہ پر واپس کر دیا جائے گا، عین اس وقت جب معاہدہ کی شرطیں زیر تحریر تھیں، ابوجندلؓ پابزنجیر اہل مکہ کی قید سے بھاگ کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریادی ہوئے، تمام مسلمان اس دردانگیز منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باطمینان تمام ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: "اے ابوجندل صبر کرو، ہم بدعہدی نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ عنقریب تمہارے لئے کوئی راستہ نکالے گا"[2]

نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ عبداللہ بن ابی الحمساء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ معاملہ کیا اور آپ کو بٹھا کر چلے گئے کہ آ کر حساب کر دیتا ہوں، اتفاق سے ان کو خیال نہ رہا، تین دن کے بعد آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ تشریف رکھتے تھے، ان کو دیکھ کر فرمایا، "میں تین دن سے یہاں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں"[3]

غزوہ بدر میں کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث سے بھی کم تھی، ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدرتی خواہش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جس قدر آدمی بڑھ سکیں بہتر ہے، لیکن آپ اس وقت بھی ہمہ تن وفا تھے، حذیفہؓ بن الیمان اور ابوحسیلؓ دو صحابی مکہ سے آ رہے تھے، راہ میں کفار نے ان کو روکا کہ محمدؐ کے پاس جا رہے ہو، انہوں نے انکار کیا، آخر اس شرط پر ان کو رہائی ملی کہ وہ جنگ میں آپ کا ساتھ نہ دیں گے، یہ دونوں صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو صورت حال عرض کی، فرمایا تم دونوں واپس جاؤ، ہم ہر حال میں وعدہ وفا کریں گے، ہم کو صرف خدا کی مدد درکار ہے[4]

زہد و قناعت

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے، پیغمبر تھے، مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ تمام عرب کے زیر نگین ہو جانے پر بھی فاقہ کش رہے، صحیح بخاری باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں تیس صاع جو پر گروی تھی، جن کپڑوں میں آپ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدود شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آ چکا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ آپ کی مہمات فرائض میں رہبانیت کا قلع قمع کرنا بھی تھا جس کی نسبت خدا نے نصاریٰ کو ملامت کی تھی کہ رہبانیۃ ابتدعوھا اس بنا پر آپ نے کبھی کبھی اچھے کھانے اور اچھے کپڑے بھی استعمال کئے ہیں لیکن اصلی میلان طبع زخارف دنیوی سے اجتناب تھا، فرمایا کرتے، فرزند آدم کو ان چند چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں، رہنے کے لئے گھر، ستر پوشی کے لئے ایک کپڑا اور شکم سیری کے لئے روکھی سوکھی روٹی اور پانی[5] حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں لا یطوی له ثوب کبھی آپ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا، یعنی صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کر کے رکھا جا سکتا۔

---

[1] ابوداؤد باب الوفاء بالعہد [2] صحیح بخاری کتاب الشروط، آخری فقرے ابن ہشام میں ہیں [3] ابوداؤد کتاب الادب [4] صحیح مسلم باب الوفاء بالعہد ج ۲ ص ۱۰۹ [5] جامع ترمذی ابواب الزہد

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ گھر کی دیوار کی مرمت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ کسی طرف سے آ نکلے۔ پوچھا کیا شغل ہے؟ عبداللہ بن عمروؓ نے عرض کی، دیوار کی مرمت کر رہا ہوں، ارشاد ہوا کہ اتنی مہلت کہاں؟ [1]

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپ اور سارا گھر بھوکا سو رہتا تھا۔

کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویا ھو و اھلہ لا یجدون عشاءً [2]	آپ اور آپ کے اہل وعیال متصل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن زبیرؓ نے پوچھا کہ آخر گزارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور، البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تو پی لیتے تھے۔ [3] آپ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی۔ [4] میدہ جس کو عرب میں حواری اور نقی کہتے ہیں کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آنحضرتؐ کے زمانہ میں چھلنیاں نہ تھیں، بولے نہیں، لوگوں نے پھر پوچھا کہ آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے، بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے جو رہ جاتا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے۔ [5] حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ [6]

فدک اور خیبر وغیرہ کے ذکر میں محدثین اور ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آپؐ ان کی آمدنی سے سال بھر کا خرچ لے لیا کرتے تھے، یہ واقعہ بظاہر روایاتِ مذکورہ بالا کے مخالف معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت دونوں صحیح ہیں، بے شبہ آپؐ بقدر نفقہ آمدنی میں سے لے لیتے، باقی فقراء اور اہل حاجت کو دے دیتے تھے، لیکن آپ اپنے لئے جو رکھ لیتے تھے وہ بھی اہل حاجت کے نذر ہو جاتا تھا، احادیث میں آپؐ کی فاقہ کشی اور تنگ دستی کے واقعات نہایت کثرت سے موجود ہیں، چند روایتیں اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمتِ اقدس میں حاضر [illegible] کہ سخت بھوکا ہوں، آپ نے ازواج مطہراتؓ میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیج دو۔ جواب آیا کہ گھر میں [illegible] کے سوا کچھ نہیں، آپ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا، وہاں سے بھی یہی جواب آیا، مختصر یہ کہ آٹھ نو گھروں میں [illegible] کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ [7]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمتِ [illegible] حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے، سبب پوچھا تو حاضرین میں سے ایک صاحب [illegible] کہ بھوک کی وجہ سے۔ [8]

حضرت ابوطلحہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ مسجد میں زمین پر لیٹے ہوتے ہیں اور بھوک کی وجہ سے بار بار کروٹیں بدلتے ہیں۔ [9]

ایک دفعہ صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ پتھر بندھے تھے، آپؐ نے شکم کھولا تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے۔ [10]

---

[1] ابن ماجہ کتاب اللباس۔ [2] جامع ترمذی معیشۃ النبیؐ [3] صحیح بخاری کتاب الرقاق [4] ایضاً [5] شمائل [6] ایضاً [7] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۴۱۹ مطبوعہ مصر و صحیح بخاری صفحہ ۵۲۵ [8] صحیح مسلم صفحہ ۱۹۳؛ [9] ایضاً [10] ایضاً

اکثر بھوک کی وجہ سے آواز اس قدر کمزور ہو جاتی تھی کہ صحابہ آپ کی حالت سمجھ جاتے تھے، ایک دن ابوطلحہؓ گھر میں آئے اور بیوی سے کہا کہ کچھ کھانے کو ہے، میں نے ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ان کی آواز کمزور ہو گئی ہے[1]۔

ایک دن بھوک میں ٹھیک دوپہر کے وقت گھر سے نکلے، راہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں ملے یہ دونوں صاحب بھی بھوک سے بے تاب تھے، آپ سب کو لے کر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر آئے ان کا معمول تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دودھ مہیا رکھتے تھے، آج آپ کے آنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے بچوں کو کھلا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر پہنچے تو وہ نخلستان میں چلے گئے تھے، ان کی بیوی کو خبر ہوئی تو باہر نکل آئیں اور عرض کی حضورؐ کا آنا مبارک، آپ نے پوچھا ابوایوب کہاں ہیں؟ نخلستان پاس ہی تھا، وہ آواز سن کر دوڑے آئے اور مرحبا کہہ کر عرض کی، یہ حضورؐ کے آنے کا وقت نہیں، آپ نے حالت بیان کی، وہ نخلستان میں جا کر کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ لائے اور کہا میں گوشت تیار کراتا ہوں، ایک بکری ذبح کی، آدھے کا سالن، آدھے کے کباب تیار کرائے، کھانا سامنے لا کر رکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا کہ فاطمہؓ کو بھجوا دو، کئی دن سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا ہے، پھر خود صحابہ کے ساتھ مل کر کھانا نوش فرمایا، متعدد قسم کے کھانے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا کہ خدا نے جو کہا ہے کہ قیامت میں نعیم سے سوال ہوگا وہ یہی چیزیں ہیں[2]۔

اکثر ایسا ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صبح کو ازواجِ مطہراتؓ کے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ آج کچھ کھانے کو ہے؟ عرض کرتی نہیں، آپ فرماتے کہ اچھا میں نے روزہ رکھ لیا[3]۔

عفو و حلم

ارباب سیر نے تصریح کی ہے کہ تمام واقعات شاہد ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، صحیحین میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا، بجز اس صورت کے اس نے احکامِ الٰہی کی تفضیح کی ہو[4]۔

جنگِ احد کی شکست سے زیادہ رؤسائے طائف کے تحقیر آمیز برتاؤ کی یاد خاطرِ اقدس پر گراں تھی[5]، تاہم دس برس کے بعد غزوۂ طائف میں جب ایک منجنیق سے مسلمانوں پر پتھر برساتے تھے تو دوسری طرف ایک سراپائے حلم و عفو انسان (خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) یہ دعا مانگ رہا تھا کہ خدایا انہیں سمجھ عطا کر اور ان کو آستانۂ اسلام پر جھکا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ۹ھ میں جب ان کے وفد نے مدینہ کا رخ کیا تو آپ نے ان کو صحنِ مسجد میں مہمان اتارا اور عزت اور حرمت کے ساتھ ان سے پیش آئے[6]۔

قریش نے آپؐ کو گالیاں دیں، مارنے کی دھمکی دی، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسمِ اقدس پر نجاستیں ڈالیں گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا، آپ کی شان میں گستاخیاں کیں، نعوذ باللہ کبھی جادوگر، کبھی پاگل، کبھی شاعر کہا، لیکن

---

[1] صحیح مسلم صفحہ ۱۹۱ [2] ترغیب و ترہیب ج ۲ ص ۲۲۰ یہ واقعہ صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۰ میں بھی جزئی اختلافات کے ساتھ موجود ہے۔ [3] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۴۹ [4] صحیح بخاری ج ۴ ص ۱۰۹ کتاب الادب [5] صحیح بخاری بدء الخلق [6] ابوداؤد ذکر طائف و مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۱۸

آپ نے کبھی ان باتوں پر برہمی ظاہر نہیں فرمائی، غریب سے غریب آدمی بھی جب کسی مجمع میں جھٹلایا جاتا ہے تو وہ غصہ سے کانپ اٹھتا ہے، ایک صاحب جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذی المجاز کے بازار میں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے دیکھا تھا بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ فرمارہے تھے کہ لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے پیچھے پیچھے ابوجہل تھا، وہ آپ پر خاک اڑا اڑا کر کہہ رہا تھا، لوگو اس شخص کی باتیں تم کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر دیں، یہ یہ چاہتا ہے کہ تم اپنے دیوتاؤں لات و عزیٰ کو چھوڑ دو، راوی کہتا ہے کہ آپ اس حالت میں اس کی طرف مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے (مسند احمد جلد ۴ ص ۶۳)

سب سے بڑھ کر طیش اور غضب کا موقع افک کا واقعہ تھا جبکہ منافقین نے حضرت عائشہؓ صدیقہ کو نعوذ باللہ تہمت لگائی تھی، حضرت عائشہؓ آپ کی محبوب ترین ازواج اور ابوبکرؓ جیسے یار غار اور افضل الصحابہ کی صاحبزادی تھیں، شہر منافقوں سے بھرا پڑا تھا جنھوں نے دم بھر میں اس خبر کو اس طرح پھیلا دیا کہ سارا مدینہ گونج اٹھا دشمنوں کی شماتت، ناموس کی بدنامی، محبوب کی تفضیح، یہ باتیں انسانی صبر و تحمل کے پیمانہ میں نہیں سما سکتیں، تاہم رحمت عالم نے ان سب باتوں کے ساتھ کیا کیا؟ تہمت کا تمام تر بانی رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھا اور آپ کو اس کا بخوبی علم تھا، بایں ہمہ آپ نے صرف اس قدر کیا کہ مجمع عام میں منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا مسلمانو! جو شخص میرے ناموس کے متعلق مجھ کو ستاتا ہے اس سے میری داد کون لے سکتا ہے؟ حضرت سعدؓ بن معاذ غصہ سے بے تاب ہو گئے اور اٹھ کر کہا میں اس خدمت کے لئے حاضر ہوں، آپ نام بتائیں تو اس کا سر اڑا دوں، سعدؓ بن عبادہ نے جو عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے مخالفت کی اور اس پر دونوں طرف سے حمایتی کھڑے ہو گئے، قریب تھا کہ تلواریں کھنچ جائیں، آپ نے دونوں کو ٹھنڈا کیا، واقعہ کی تکذیب خود خدا نے کر دی اور تہمت لگانے والوں کو شرعی سزا دی گئی، تاہم عبداللہ بن ابی اس بنا پر چھوڑ دیا گیا کہ اس کو تہمت لگانے کا اقرار نہ تھا اور ثبوت کے لئے شرعی شہادت موجود نہ تھی، تہمت لگانے والوں میں جن کو سزا دی گئی ایک صاحب مسطح بن اثاثہ تھے، ان کی معاش کے کفیل حضرت ابوبکرؓ تھے، تہمت لگانے کے جرم میں حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بند کر دیا، اس پر یہ آیت اتری۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا
أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ
لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (نور)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضیلت اور ذی مقدور ہیں ان
کو یہ قسم نہیں کھانا چاہیئے کہ قرابتداروں اور مسکینوں اور
مجاہدوں سے سلوک نہ کریں گے تم کو عفو اور درگزر سے کام لینا
چاہیئے کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو بخش دے، خدا غفور رحیم ہے۔

اور حضرت ابوبکرؓ نے ان کا روزینہ بدستور جاری کر دیا۔

تہمت لگانے والوں میں (جیسا کہ صحیح ترمذی کتاب التفسیر سورۂ نور میں تصریح ہے) حضرت حسانؓ بھی تھے حضرت عائشہؓ کو ان سے جو رنج تھا وہ عفو کی حد سے متجاوز تھا، لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ جب عروہ بن زبیرؓ نے حضرت عائشہؓ کے سامنے حضرت حسانؓ کو برا کہنا شروع کیا تو حضرت عائشہؓ نے روک

دیا کہ یہ حسانؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کفار کو جواب دیتے تھے[1]۔

مدینہ کے منافق یہودیوں میں سے لبید بن اعصم نے آپ پر سحر کیا، تاہم آپ نے کچھ تعارض نہ فرمایا (حضرت عائشہؓ نے مزید تحقیق کی تحریک کی تو فرمایا، میں لوگوں میں شورش نہیں پیدا کرنا چاہتا[2])

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعادِ ادا میں ابھی کچھ دن باقی تھے، تقاضے کو آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت سست کہہ کر کہا، عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یونہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو، حضرت عمرؓ غصہ سے بے تاب ہوگئے، اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا او دشمنِ خدا تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آنحضرتؐ نے مسکرا کر فرمایا، عمر! تم سے کچھ اور امید تھی اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرے اور مجھ سے یہ کہنا چاہیے کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں۔ یہ فرما کر حضرت عمرؓ کو ارشاد فرمایا کہ قرضہ ادا کر کے بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو[3]۔

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں[4]۔

ایک دفعہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک عورت قبر کے پاس بیٹھی رو رہی تھی، آپ رک گئے اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا، صبر کرو۔ وہ آپ کو پہچانتی نہ تھی (گستاخی کے ساتھ بولی) ہٹو تم کیا جان سکتے ہو کہ مجھ پر کیا کیفیت ہے؟ آپ چلے آئے، لوگوں نے عورت سے کہا تو نے نہیں پہچانا، وہ رسول اللہ تھے، دوڑی ہوئی آئی اور کہا میں حضور کو پہچانتی نہ تھی، ارشاد فرمایا، صبر وہی معتبر ہے جو عین مصیبت کے وقت کیا جائے[5]۔

ایک دفعہ حضرت سعد بن عبادہؓ بیمار ہوئے، آپ عیادت کو سواری پر تشریف لے گئے راہ میں ایک جلسہ تھا، آپ ٹھہر گئے، عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا، وہ بھی جلسہ میں موجود تھا، آپ کی سواری کی گرد اڑی تو اس نے چادر ناک پر رکھ لی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا دیکھو گرد نہ اڑاؤ، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب پہنچے تو اس نے کہا محمدؐ اپنا گدھا ہٹاؤ، تمہارے گدھے کی بدبو نے میرا دماغ پریشان کر دیا، آنحضرتؐ نے سلام کیا، پھر سواری سے اترے اور اسلام کی دعوت دی، عبداللہ ابن ابی نے کہا، ہمارے گھر آکر ہم کو نہ ستاؤ جو شخص خود تمہارے پاس آئے اس کو تعلیم دو، عبداللہ بن رواحہؓ جو مشہور شاعر تھے، انہوں نے کہا، آپ ضرور تشریف لائیے، بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ قریب تھا تلواریں نکل آئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریق کو

---

[1] صحیح بخاری قصہ افک [2] صحیح بخاری صفحہ ۹۱ [3] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفا از شہاب خفاجی) [4] جامع ترمذی کتاب البیوع [5] بخاری کتاب الجنائز۔

سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کیا۔ جلسہ سے اٹھ کر آپ سعدؓ بن عبادہ کے پاس آئے اور ان سے کہا، تم نے عبداللہ کی باتیں سنیں، سعدؓ بن عبادہ نے عرض کی کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں، یہ وہ شخص ہے کہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے اہل مدینہ نے اس کے لئے ریاست کا تاج تیار کر لیا تھا۔[1]

غزوۂ حنین میں آپ نے مالِ غنیمت تقسیم فرمایا تو ایک انصاری نے کہا، یہ تقسیم خدا کی رضامندی کے لئے نہیں ہے۔ آپ نے سنا تو فرمایا، خدا موسیٰؑ پر رحم کرے ان کو لوگوں نے اس سے بھی زیادہ ستایا تھا۔[2]

ایک دفعہ ایک بدو خدمتِ اقدس میں آیا، آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، اس کو پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی، آدابِ مسجد سے واقف نہ تھا، وہیں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگا، لوگ ہر طرف سے دوڑ پڑے کہ اس کو سزا دیں، آپ نے فرمایا، جانے دو اور پانی کا ایک ڈول لا کر بہا دو، خدا نے تم لوگوں کو دشواری کے لئے نہیں بلکہ آسانی کے لئے بھیجا ہے۔[3]

حضرت انسؓ جو خادمِ خاص تھے ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کسی کام کیلئے بھیجنا چاہا، میں نے کہا نہ جاؤں گا، آپ چپ رہ گئے میں یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔ دفعتہً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے آکر میری گردن پکڑ لی، میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ ہنس رہے ہیں، پھر پیار سے فرمایا "انس! جس کام کے لئے کہا تھا، اب تو جاؤ" میں نے عرض کی اچھا جاتا ہوں، انسؓ نے اسی واقعہ کے ساتھ بیان کیا کہ میں نے سات برس آپ کی ملازمت کی کبھی یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا یا یہ کیوں نہیں کیا۔[4]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ کی عادت تھی کہ ہم لوگوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرتے جب اٹھ کر گھر میں جاتے تو ہم لوگ بھی چلے جاتے، ایک دن حسبِ معمول مسجد سے نکلے، ایک بدو آیا اور اس نے آپ کی چادر اس زور سے پکڑ کر کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہو گئی، آپ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، بولا کہ میرے اونٹوں کو غلہ سے لاد دے، تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے نہ تیرے باپ کا ہے۔ آپ نے فرمایا پہلے میری گردن کا بدلہ دو، تب غلہ دیا جائے گا، وہ بار بار کہتا تھا کہ خدا کی قسم! میں ہرگز بدلہ نہ دوں گا۔ آپ نے اس کے اونٹوں پر جو اور کھجوریں لدوا دیں[5] اور کچھ تعرض نہ فرمایا۔

(قریش نعوذ باللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے تھے، برا بھلا کہتے تھے۔ ضد سے آپ کو محمد (تعریف کیا گیا) نہیں کہتے تھے بلکہ مذمم (مذمت کیا گیا) کہتے تھے، لیکن آپ اس کے جواب میں اپنے دوستوں کو خطاب کر کے صرف اسی قدر فرمایا کرتے کہ تم کو تعجب نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ قریش کی گالیوں کو مجھ سے کیونکر پھیرتا ہے وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور مذمم پر لعنت بھیجتے ہیں اور میں محمد ہوں۔[6]

جس زمانہ میں آپ فتح مکہ کے لئے تیاریاں کر رہے تھے، اس بات کی خاص احتیاط فرما رہے تھے کہ قریش کو ہمارے ارادوں کی خبر نہ ہو، حاطب بن بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے چاہا کہ قریش کو اس کی اطلاع

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۴۲ [2] ایضاً غزوۂ حنین ص ۶۲۰ [3] ایضاً ص ۳۵ [4] صحیح مسلم وابوداؤد کتاب الادب [5] ابوداؤد کتاب الادب یہی واقعہ حضرت انسؓ سے بخاری ومسلم میں مروی ہے بتغیر یسیر [6] مشکوٰۃ باب اسماء النبیؐ۔

کردیں، چنانچہ ایک خط لکھ کر انہوں نے چپکے سے ایک عورت کی معرفت مکہ روانہ کیا، آپ کو اس کی خبر ہو گئی، حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ اسی وقت بھیجے گئے جو قاصد کو مع خط کے گرفتار کر لائے، حاطب کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کیا اور معذرت چاہی، یہ موقع تھا کہ ہر سیاست داں مجرم کی سزا کا فتویٰ دیتا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے ان کو معاف فرمایا کہ وہ شرکائے بدر میں تھے، عورت جو اس جرم میں شریک تھی اس سے بھی کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا[1]۔ حالانکہ یہ خط اگر دشمنوں تک پہنچ جاتا تو مسلمانوں کو سخت خطرات کا سامنا ہو جاتا۔

فرات بن حیان ایک شخص تھا، ابوسفیان کی طرف سے مسلمانوں کی جاسوسی پر مامور تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہا کرتا تھا، ایک دفعہ وہ پکڑا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قتل کا حکم دیا، لوگ اس کو پکڑ کر لے چلے، جب انصار کے ایک محلہ میں پہنچا تو بولا کہ میں مسلمان ہوں، ایک انصاری نے آکر اطلاع دی کہ وہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں، آپ نے فرمایا کہ تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ایمان کا حال ہم انہی پر چھوڑتے ہیں ان میں سے ایک فرات بن حیان تھے[2]، مورخین نے لکھا ہے کہ وہ بعد کو صدق دل سے مسلمان ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمامہ میں ایک زمین عنایت فرمائی جس کی آمدنی ۴۰۰۰ تھی[3]

دشمنوں سے عفو و درگزر اور حسن سلوک

انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کمیاب، نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفو و درگزر ہے، لیکن حامل وحی و نبوت کی ذات اقدس میں یہ جنس فراواں تھی، دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے، لیکن اخلاق کے دائرۂ شریعت میں آکر یہ فرضیت مکروہ تحریمی بن جاتی ہے تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ نے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔

دشمنوں سے انتقام کا سب سے بڑا موقع فتح حرم کا دن تھا جب کہ وہ کینہ خواہ سامنے آئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے اور جن کے دست ستم سے آپ نے طرح طرح کی اذیتیں اٹھائی تھیں لیکن ان سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء   تم پر کوئی ملامت نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

وحشی جو اسلام کے قوت بازو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کا قاتل تھا، مکہ میں رہتا تھا، جب مکہ میں اسلام کی قوت نے ظہور کیا وہ بھاگ کر طائف آیا، طائف نے بھی آخر سر اطاعت خم کیا، اور وحشی کے لئے یہ بھی مامن نہ رہا، لیکن اس نے سنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفراء سے کبھی سختی کے ساتھ پیش نہیں آتے، ناچار خود رحمت عالم کے دامن میں پناہ لی اور اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس قدر فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے[4]۔

---

[1] صحیح بخاری فتح مکہ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجاسوس الذمی، یہ حدیث سفیان ثوریؒ کے واسطہ سے دو طریقوں سے مروی ہے ایک میں ابوہمام الدلال ہے اور یہی ابوداؤد کا طریق ہے، یہ طریق ضعیف ہے، دوسرا طریق بشر بن سری البصری کے ذریعہ ہے جو صحیح ہے امام احمد نے بھی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے [3] اصابہ ترجمہ فرات مذکور [4] صحیح بخاری قتل حمزہ۔

ہند ابوسفیان کی بیوی جس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کیا اور دل وجگر کے ٹکڑے کئے، فتح مکہ کے دن نقاب پوش آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہچان نہ سکیں اور بے خبری میں بیعت اسلام کرکے سند امان حاصل کرے پھر اس موقع پر بھی گستاخی سے باز نہ آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہند کو پہچان لیا لیکن اس واقعہ کا ذکر تک نہ فرمایا، ہند اس کرشمۂ اعجاز سے متاثر ہو کر بے اختیار بول اٹھی۔ یا رسول اللہ! آپ کے خیمہ سے مبغوض تر خیمہ میری نگاہ میں نہ تھا لیکن آج آپ کے خیمہ سے کوئی محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں[1]۔

عکرمہ، دشمن اسلام ابوجہل کے فرزند تھے اور اسلام سے پہلے باپ کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمن تھے، فتح مکہ کے وقت بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھی، وہ یمن گئیں اور عکرمہ کو تسکین دی اور ان کو مسلمان کیا اور خدمت اقدس میں لے کر حاضر ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرط مسرت سے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس تیزی سے ان کی طرف بڑھے کہ جسم مبارک پر چادر تک نہ تھی[2] اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

مرحبا یا الراکب المہاجر[3]۔ اے ہجرت کرنے والے سوار تمہارا آنا مبارک ہو۔

صفوان بن امیہ قریش کے رؤسائے کفر میں سے اور اسلام کے شدید ترین دشمن تھے، ان ہی نے عمیر بن وہب کو انعام کے وعدہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل پر مامور کیا تھا۔ جب مکہ فتح ہوا تو اسلام کے ڈر سے جدہ بھاگ گئے اور قصد کیا کہ سمندر کے راستہ سے یمن چلے جائیں، عمیر بن وہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! صفوان ابن امیہ اپنے قبیلہ کے رئیس ہیں وہ ڈر سے بھاگ گئے ہیں کہ اپنے کو سمندر میں ڈال دیں، ارشاد ہوا کہ اس کو امان ہے، مکرر عرض کی یا رسول اللہ! امان کی کوئی نشانی مرحمت فرمایئے جس کو دیکھ کر ان کو میرا اعتبار آئے۔ آپ نے عمامہ مبارک ان کو عنایت فرمایا جس کو لے کر وہ صفوان کے پاس پہنچے صفوان نے کہا مجھے وہاں جانے میں اپنی جان کا ڈر ہے، عمیر نے جواب دیا، صفوان! ابھی تمہیں محمدؐ کے حلم وعفو کا حال معلوم نہیں، یہ سن کر وہ عمیر کے ساتھ دربار نبویؐ میں حاضر ہوئے اور سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ عمیر کہتے ہیں کہ تم نے مجھے امان دیا ہے؟ فرمایا سچ ہے، صفوان نے کہا تو مجھے دو مہینے کی مہلت دو۔ ارشاد ہوا کہ دو نہیں تم کو چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے، اس کے بعد وہ اپنی خوشی سے مسلمان ہو گئے، یہ واقعہ بہ تفصیل ابن ہشام میں مذکور ہے۔

ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جس کے ہاتھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینبؓ کو سخت تکلیف پہنچی تھی، حضرت زینبؓ حاملہ تھیں اور مکہ سے مدینہ ہجرت کر رہی تھیں، کفار نے مزاحمت کی، ہبار بن الاسود نے جان بوجھ کر ان کو اونٹ سے گرا دیا جس سے ان کو سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا، اس کے علاوہ اور بھی بعض جرائم کا وہ مرتکب ہوا تھا اور اسی بنا پر فتح مکہ کے وقت ہبار اشتہاریان قتل میں داخل تھا، چاہا کہ بھاگ کر ایران چلا جائے کہ داعی ہدایت نے خود آستانۂ نبوت کی طرف جھکا دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے حضورؐ کے احسانات اور حلم وعفو یاد آئے، میری نسبت

---

[1] صحیح بخاری ذکر ہند [2] موطا امام مالک کتاب النکاح [3] مشکوٰۃ کتاب الادب بحوالہ ترمذی۔

آپ کو جو خبریں پہنچی تھیں وہ صحیح تھیں، مجھے اپنی جہالت اور قصور کا اعتراف ہے، اب اسلام سے مشرف ہونے آیا ہوں، ادھر باب رحمت وا تھا اور دوست و دشمن کی تمیز یکسر مفقود تھی[1]

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزوات نبویؐ کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لیکر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان میں سے اکثر میں ان کا ہاتھ تھا لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور حضرت عباسؓ ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپؐ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمرؓ نے گزشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا، لیکن آپؐ نے منع فرمایا، اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن وامان کا حرم بنادیا، فرمایا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس کا قصور معاف ہوگا[2]۔ کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنو حنیفہ کا قبیلہ تھا جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا۔ ثمامہ ابن آثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لے آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپؐ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا اے محمدؐ! اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو ایک خونی کو کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو تم مانگو میں دوں گا، یہ سن کر آپؐ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی۔ تیسرے دن بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپؐ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو اور آزاد کر دو، ثمامہ پر اس خلاف توقع لطف وعنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آکر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا اور عرض کی یا رسول اللہ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپؐ سے زیادہ مبغوض نہ تھا اور اب آپؐ سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپؐ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں برا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپؐ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا اور اب وہی پسندیدہ ہے،

قریش کی ستم گری وجفا گری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپؐ کو اور آپ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ اندر پہنچ نہیں سکتا تھا بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے درد ان کی آوازیں سن کر ہنستے اور خوش ہوتے تھے، لیکن معلوم ہے کہ رحمت عالمؐ نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا یمامہ کے رئیس بھی ثمامہ بن آثال تھے، مسلمان ہو کر جب یہ مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر ان کو طعنہ دیا، انہوں نے غصہ سے کہا کہ خدا کی قسم! اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ نہیں ملے گا اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر گھبرا کر قریش نے اس آستانہ کی طرف رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی

---

[1] ابن اسحاق واصابہ ذکر ہبار [2] صحیح بخاری وصحیح مسلم فتح مکہ مع فتح الباری۔

محروم نہیں گیا، حضورؐ کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھا لو، پھر حسب دستور غلہ جانے لگا۔[1]

کفار اور مشرکین کے ساتھ برتاؤ

کفار کے ساتھ آپؐ کے حسن سلوک کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، مورخین یورپ مدعی ہیں کہ یہ اس وقت تک کے واقعات ہیں جب تک اسلام ضعیف تھا اور مجاملت اور لطف و آشتی کے سوا چارہ نہ تھا، اس لئے ہم اس عنوان کے نیچے صرف وہ واقعات نقل کریں گے جو اس زمانہ کے ہیں جب کہ مخالفین کی قوتیں پامال ہو چکی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔

ابو بصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے، مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر مہمان رہے رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے، لیکن آپؐ نے کچھ نہ فرمایا، رات بھر تمام اہل بیت نبویؐ بھوکا رہا،[2] اسی طرح ایک اور واقعہ حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں، شب کو ایک کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان ہوا، آپؐ نے ایک بکری کا دودھ اس کے سامنے پیش کیا وہ پی گیا، پھر دوسری بکری دوہی گئی، وہ دودھ بھی بے تامل پی گیا پھر تیسری، پھر چوتھی، یہاں تک کہ سات بکریاں دوہی گئیں اور وہ دودھ سب پیتا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تنغض ظاہر نہ فرمایا، شاید اسی حسن اخلاق کا اثر تھا کہ وہ صبح کو مسلمان تھا اور صرف ایک بکری کے دودھ پر قانع ہو گیا۔[3]

حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ان کی ماں جو مشرکہ تھیں، اعانت خواہ مدینہ حضرت اسماءؓ کے پاس آئیں، ان کو خیال ہوا کہ اہل شرک کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر دریافت کیا، آپؐ نے فرمایا اُن کے ساتھ نیکی کرو،[4] حضرت ابو ہریرہؓ کی ماں کافرہ تھیں اور بیٹے کے ساتھ مدینہ میں رہتی تھیں، جہالت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتی تھیں، ابو ہریرہؓ نے خدمت اقدس میں عرض کی آپؐ نے بجائے غیظ و غضب کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا تمام کاروبار حضرت بلالؓ کے سپرد تھا، روپیہ پیسہ جو کچھ آتا تھا ان کے پاس رہتا، ناداری کی حالت میں وہ بازار سے سودا سلف قرض لاتے اور جب کہیں سے کوئی رقم آ جاتی تو اس سے ادا کیا کرتے، ایک دفعہ بازار جا رہے تھے، ایک مشرک نے دیکھا، ان سے کہا تم قرض لیتے ہو تو مجھ سے لیا کرو، انہوں نے قبول کیا، ایک دن اذان دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو وہ مشرک چند سوداگروں کے ساتھ آیا اور ان سے کہا، او حبشی! انہوں نے اس بدتہذیبی کے جواب میں لبیک کہا، بولا کچھ خبر ہے، وعدہ کے صرف چار دن رہ گئے ہیں، تم نے اس مدت میں قرضہ ادا نہ کیا تو تم سے بکریاں چروا کے چھوڑ دوں گا، یہ عشاء پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور سارا حال بیان کر کے کہا کہ خزانہ میں کچھ نہیں ہے، کل وہ مشرک آ کر مجھ کو فضیحت کرے گا، اس لئے مجھ کو اجازت ہو کہ میں کہیں نکل جاؤں، پھر جب قرضہ ادا کرنے کا سامان ہو جائے گا تو واپس آ جاؤں گا، غرض رات کو جا کر سو رہے اور سامان سفر یعنی تھیلا، جوتی، ڈھال سر کے نیچے

---

[1] ثمامہ کا پورا واقعہ صحیح بخاری میں ص ۶۲۷ باب وفد بنی حنیفہ میں ہے، آخری ٹکڑا ابن ہشام میں مذکور ہے [2] مسند ابن حنبل ج ۶ صفحہ ۳۹۷

[3] جامع ترمذی باب ان المومن یاکل فی معی واحد [4] صحیح بخاری باب صلۃ الوالد المشرک [5] صحیح مسلم۔

رکھ لی، صبح اٹھ کر سفر کا سامان کر رہے تھے کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد فرمایا ہے، یہ گئے تو دیکھا کہ چار اونٹ غلّہ سے لدے ہوئے دروازہ پر کھڑے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مبارک ہو یہ اونٹ رئیس فدک نے بھیجے ہیں، انہوں نے بازار میں جا کر سب چیزیں فروخت کیں اور مشرک کا قرضہ ادا کر کے مسجدِ نبوی میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ سارا قرضہ ادا ہو گیا۔لہ

یہ واقعہ فدک کی فتح کے بعد کا ہے جو ہجرت کا ساتواں سال ہے۔ حضرت بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب خاص اور گھر کے منتظم تھے، ایک مشرک ان کو حبشی کہہ کر پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھ سے بکریاں چروا کے چھوڑوں گا، حضرت بلالؓ اس کی تنگ گیری کے ڈر سے بھاگ جانے کا ارادہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ باتیں سنتے ہیں، لیکن مشرک کی نسبت ایک لفظ نہیں فرماتے، نہ بلالؓ کی حمایت اور دلدہی کی تدبیر کرتے، اتفاق سے غلّہ آجاتا ہے اور مشرک کا قرضہ ادا کیا جاتا ہے اور اس کی بدزبانی اور سخت گیری سے درگذر کیا جاتا ہے، یہ حلم، یہ عفو، یہ تحمل رحمتِ عالم کے سوا کس سے ہو سکتا ہے؟

سب سے مشکل معاملہ منافقین کا تھا، یہ کفار کا ایک گروہ تھا جس کا رئیس عبد اللہ بن ابی تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں مدینہ میں تشریف لائے، اس سے کچھ پہلے تمام شہر نے اس پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ مدینہ کا فرماں روا بنا دیا جائے، جنگِ بدر کے بعد اس نے اسلام کا اعلان کیا، لیکن دل سے کافر تھا، اس کے پیرو بھی اسی قسم کا منافقانہ اسلام لائے اور منافقین کی ایک مستقل جماعت قائم ہو گئی، یہ لوگ در پردہ اسلام کے خلاف ہر قسم کی تدبیریں کرتے تھے، قریش اور دیگر مخالف قبائل سے سازش رکھتے، ان کو مسلمانوں کے مخفی رازوں کی خبر دیتے رہتے، بایں ہمہ بظاہر اسلام کے مراسم ادا کرتے، جمعہ جماعت میں شریک ہوتے اور لڑائیوں میں ساتھ جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حالات اور ایک ایک کے نام و نشان سے واقف تھے، لیکن چونکہ شریعت اور قانون کے احکام دلوں کے اسرار سے نہیں بلکہ ظاہری اعمال سے متعلق ہیں، اس لئے آپ اُن پر کفر کے احکام جاری نہیں فرماتے تھے، یہاں تک تو شریعت اور قانون کا معاملہ تھا، لیکن فیاض دلی اور عفو و حلم کے اقتضا سے آپؐ ان سے ہمیشہ حسنِ اخلاق کا بھی برتاؤ کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مارا، انصاری نے کہا یا للانصار (یعنی انصار کی دہائی) مہاجر نے بھی مہاجر کی دہائی دی، قریب تھا کہ دونوں میں تلوار چل جاتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ کیا جاہلیت کی باتیں ہیں، دونوں رُک گئے، عبد اللہ بن ابی نے سُنا تو کہا، مدینہ چل کر ذلیل مسلمانوں کو نکال دوں گا، ساتھیوں سے کہا آسان بات یہ ہے کہ تم لوگ مہاجرین کی خبر گیری سے ہاتھ اٹھا لو، یہ خود تباہ ہو جائیں گے چنانچہ قرآن مجید میں یہ واقعہ مذکور ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ
رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا (منافقون)

یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پیغمبر کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو
تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔

لہ ابوداؤد جلد ۲ باب قبول ہدایا المشرکین۔

یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل (منافقون)	کہتے ہیں کہ جب ہم مدینہ کو واپس چلیں گے تو معزز لوگ کمینوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ابی کو بلا بھیجا کہ تم نے یہ الفاظ کہے تھے، اس نے صاف انکار کیا حضرت عمرؓ موجود تھے، بولے یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا لوگ چرچا کریں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں[1]۔ جنگ اُحد میں عبد اللہ بن ابی عین لڑائی کے پیش آنے کے وقت تین سو آدمیوں کے ساتھ واپس چلا آیا، جس سے مسلمانوں کی قوت کو سخت صدمہ پہنچا تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درگزر فرمایا، اور وہ جب مرا تو اس احسان کے معاوضہ میں کہ حضرت عباسؓ کو اس نے اپنا کرتا دیا تھا مسلمانوں کی ناراضی کے باوجود آپ نے اپنا قمیص مبارک اس کو پہنا کر دفن کیا[2]۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ برتاؤ

خلق عظیم میں کافر و مسلم، دوست و دشمن، عزیز و بیگانہ کی تمیز نہ تھی، ابر رحمت دشت و چمن پر یکساں برستا تھا، یہود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس شدت کی عداوت تھی اس کی شہادت غزوۂ خیبر تک کے ایک ایک واقعہ سے ملتی ہے، لیکن آپ کا طرز عمل مدت تک یہ رہا کہ جن امور کی نسبت مستقل حکم نازل نہ ہوتا، آپ ان میں ان ہی کی تقلید فرماتے[3]۔

ایک دفعہ ایک یہودی نے بر سر بازار کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی، ایک صحابی یہ کھڑے سن رہے تھے، ان سے رہا نہ گیا، انہوں نے پوچھا کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی؟ اس نے کہا ہاں، انہوں نے غصہ میں ایک تھپڑ اس کے مار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل اور اخلاق پر دشمنوں کو بھی اس درجہ اعتبار تھا کہ وہ یہودی سیدھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا، آپ نے اُن صحابی پر برہمی ظاہر فرمائی[4]۔

ایک یہودی کا لڑکا بیمار ہوا تو آپ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، گویا باپ کی رضامندی دریافت کی، اس نے کہا کہ آپ جو فرماتے ہیں اس کو بجا لاؤ، چنانچہ اس نے کلمہ پڑھا[5]، ایک دفعہ سر راہ ایک یہودی کا جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہو گئے[6]۔

ایک دفعہ چند یہودی آپ کی خدمت میں آئے اور شرارت سے اسلام علیکم کے بجائے السام علیکم (تم پر موت) کہا، حضرت عائشہؓ نے غصہ میں آ کر ان کو بھی سخت جواب دیا، لیکن آپ نے روکا اور فرمایا، عائشہ! بد زبان نہ ہو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے[7]۔

یہودیوں کے ساتھ داد و ستد کرتے تھے، ان کے سخت و ناجائز تقاضوں اور درشت کلمات کو برداشت کرتے تھے، یہودیوں اور مسلمانوں میں اگر معاملات میں اختلاف پیش آتا تو مسلمانوں کی بلاوجہ جنبہ داری نہ فرماتے اس قسم کی متعدد مثالیں دوسرے عنوانات میں مذکور ہیں۔ ایک دفعہ ایک یہودی نے آ کر شکایت کی کہ محمد! دیکھو ایک

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورہ منافقون [2] بخاری میں یہ واقعہ متعدد روایتوں اور متعدد طریقوں سے منقول ہے [3] صحیح بخاری [4] ایضاً [5] صحیح بخاری کتاب الجنائز [6] ایضاً [7] صحیح مسلم کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۲۳۹ مصر

مسلمان نے مجھ کو تھپڑ مارا ہے۔ آپؐ نے اس مسلمان کو اسی وقت بلوا کر زجر فرمایا نصاریٰ کا وفد جب نجران سے مدینہ حاضر ہوا تو آپؐ نے اس کی مہمانداری کی، مسجد نبویؐ میں ان کو جگہ دی، بلکہ ان کو اپنے طریق پر مسجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت دے دی اور جب عام مسلمانوں نے ان کو اس کام سے روکنا چاہا تو آپؐ نے منع فرمایا[1]۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانے پینے، نکاح و معاشرت کی اجازت تھی اور ان کے لئے مخصوص امتیازی احکام شریعتِ اسلامیہ میں جاری فرمائے۔

غریبوں کے ساتھ محبت وشفقت

مسلمانوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی، دولت مند بھی اور فاقہ کش بھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا بلکہ غربا کے ساتھ آپؐ اس طرح پیش آتے تھے کہ دنیاوی دولت کی محرومی ان کے دلوں کو صدمہ نہیں پہنچاتی تھی، ایک دفعہ تقاضائے بشریت سے آپؐ کا ایک فعل اس کے خلاف ہوا تو بارگاہِ واحدیت سے اس پر بازپرس ہوئی، مکہ کا واقعہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند اکابرِ قریش بیٹھے تھے اور آپؐ ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے کہ اتفاق سے عبد اللہ بن ام مکتوم جو آنکھوں سے معذور اور غریب تھے، ادھر آنکلے اور وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر آپؐ سے باتیں کرنے لگے، رؤسائے قریش چونکہ سخت متکبر اور مغرور تھے، ان کو یہ برابری ناگوار گزری، آپؐ نے ابن ام مکتوم کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اس امید پر ان ہی سے باتیں کرتے رہے کہ شاید اشقیا اسلام کی سعادت کو قبول کر لیں اور ان کے دل حق کی لذت سے آشنا ہوں، لیکن خدا کو یہ امتیاز پسند نہ آیا اور یہ آیت اتری[2]۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ۔

(عبس)

پیغمبر نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا کہ اس کے پاس اندھا آیا اے پیغمبر، تجھے کیا خبر کہ تیری باتوں سے وہ پاک ہو جاتا یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی لیکن جو بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تیرا کیا نقصان ہے اگر وہ پاک و صاف نہ بنے اور جو تیرے پاس دوڑا آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تو اس سے بے اعتنائی کرتا ہے نہیں ہرگز نہیں یہ نصیحت عام ہے جو چاہے اس کو قبول کرے۔

یہی غربا اور مفلس اسلام کے سب سے پہلے جان نثار بنے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لے کر حرم میں نماز پڑھنے جاتے تھے تو رؤسائے قریش ان کی ظاہری بد حیثیتی کو دیکھ کر استہزاء کرتے تھے۔

اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْ بَیْنِنَا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم لوگوں کو چھوڑ کر احسان کیا ہے

لیکن آپؐ ان کے اس استہزاء کو خوشی سے برداشت کرتے تھے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے مزاج میں کسی قدر تعلی تھی اور وہ اپنے آپ کو غریبوں سے بالاتر سمجھتے تھے، آپؐ نے ان کی طرف خطاب کر کے فرمایا، تم کو جو نصرت اور روزی میسر آتی ہے وہ ان ہی غریبوں کی بدولت آتی ہے[3]۔ اسامہ بن زیدؓ سے فرمایا، میں نے درِ جنت پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ زیادہ تر غریب مفلس ہی لوگ اس میں داخل ہیں[4]۔

---

[1] زاد المعاد [2] ترمذی تفسیر سورۂ عبس [3] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء، بروایت صحیح مسلم [4] حوالہ مذکور بروایت بخاری و مسلم۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں مسجد نبویؐ میں بیٹھا تھا اور غریب مہاجر لوگ حلقہ باندھے ایک طرف بیٹھے تھے، اس اثنا میں آپؐ تشریف لے آئے اور انہی کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے، یہ دیکھ کر میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا، آپ نے فرمایا، فقرائے مہاجرین کو بشارت ہو کہ وہ دولتمندوں سے چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ یہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے اور مجھے حسرت ہوئی کہ کاش میں بھی ان ہی میں ہوتا۔[1]

ایک دفعہ آپؐ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، اس اثنا میں ایک شخص سامنے سے گزرا، آپؐ نے اپنے پہلو کے ایک آدمی سے دریافت فرمایا کہ اس کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ امراء کے طبقہ میں سے ایک صاحب ہیں۔ خدا کی قسم! یہ اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو کیا جائے اور اگر کسی کی سفارش کرے تو قبول کی جائے۔ یہ سن کر آپؐ خاموش ہو گئے، کچھ دیر کے بعد ایک اور صاحب اسی راہ سے گزرے آپؐ نے پھر اس سے استفسار فرمایا کہ اس کی نسبت کیا کہتے ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ! یہ فقرائے مہاجرین میں سے ہے اور اس لائق ہے کہ اگر رشتہ چاہے تو واپس کر دیا جائے اور سفارش کرے تو رد کر دی جائے اگر کچھ کہنا چاہے تو نہ سنا جائے۔ ارشاد ہوا کہ تمام روئے زمین میں اگر اس امیر جیسے آدمی ہوں تو اس سے یہ ایک غریب بہتر ہے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دعا میں فرمایا کرتے تھے، خداوندا مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر کر، حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں؟ فرمایا۔ اس لئے کہ یہ دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ پھر فرمایا اے عائشہؓ! کسی مسکین کو اپنے دروازہ سے نامراد نہ پھیرو، گو چھوہارے کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اے عائشہؓ! غریبوں سے محبت رکھو اور ان کو اپنے سے نزدیک کرو تو خدا بھی تم کو اپنے سے نزدیک کرے گا۔[3]

ایک دفعہ چند غریب مسلمانوں نے آ کر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! امراء ہم سے درجہ اخروی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں، نماز، روزہ جس طرح ہم کرتے ہیں، وہ بھی کرتے ہیں، لیکن صدقات وخیرات سے جو نیکیاں ان کو ملتی ہیں ان سے ہم محروم ہیں، آپ نے فرمایا کیا میں تم کو وہ بات نہ بتاؤں جس سے تم اگلوں کے برابر ہو جاؤ اور پچھلوں سے بڑھ جاؤ اور پھر کوئی تمہاری برابری نہ کر سکے؟ عرض کی ہاں یا رسول اللہ! بتائیے، ارشاد ہوا۔ ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ دفعہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ کچھ دن کے بعد یہ وفد پھر حاضرِ خدمت ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ہمارے دولت مند بھائیوں نے بھی یہ وظیفہ سن لیا اور پڑھنا شروع کر دیا، فرمایا ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء یعنی یہ خدا کی دین ہے جس کو چاہے دے۔ مسلمانوں سے جو زکوٰۃ وصول ہوتی تھی اس کی نسبت عام حکم تھا کہ۔

---

[1] حوالہ مذکور بروایت دارمی [2] حوالہ مذکور بروایت صحیح بخاری و صحیح مسلم [3] مشکوٰۃ باب فضل الفقراء بروایت ترمذی و بیہقی و ابن ماجہ

[4] صحیح بخاری و مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ۔

تؤخذ من امرائهم وترد علی فقرائهم۔
ہر قبیلے کے یا ہر شہر کے امراء سے لیکر وہیں کے غرباء میں تقسیم کر دی جائے،
صحابہ اس کی شدت سے پابندی کرتے تھے اور ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ نہیں بھیجتے تھے۔[1]

مساوات کے بیان میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے کسی بات پر حضرت سلمانؓ و بلالؓ کو جن کا شمار فقرائے مہاجرین میں ہے ڈانٹا، آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا کہ تم نے ان لوگوں کو آزردہ تو نہیں کیا؟ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ ان لوگوں کے پاس آئے اور معافی مانگی اور ان لوگوں نے معاف کیا۔

عوالی میں ایک عورت رہتی تھی وہ بیمار پڑی، اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی، خیال تھا کہ وہ آج کسی وقت مر جائے گی، آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ وہ مر جائے تو میں جنازہ کی نماز خود پڑھاؤں گا، اس کے بعد دفن کی جائے، اتفاق سے اس نے کچھ رات گئے انتقال کیا، اس کا جنازہ جب تیار ہو کر لایا گیا تو آپؐ آرام فرما رہے تھے صحابہ نے اس وقت آپؐ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھی اور رات ہی کو دفن کر دیا، صبح کو آپؐ نے دریافت فرمایا تو لوگوں نے واقعہ عرض کیا، آپؐ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور صحابہ کو ساتھ لے کر دوبارہ اس کی قبر پر جا کر نمازِ جنازہ ادا کی۔[2]

حضرت جریرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن پہلے پہر ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک پورا قبیلہ مسافروار حاضرِ خدمت ہوا، ان کی ظاہری حالت اس درجہ خراب تھی کہ کسی کے بدن پر کوئی کپڑا ثابت نہ تھا، برہنہ تن، برہنہ پا، کھالیں بدن سے بندھی ہوئی، تلواریں گلوں میں پڑی ہوئی، ان کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ بیحد متاثر ہوئے، چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا، اضطراب میں آپؐ اندر گئے باہر آئے، پھر حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا، نماز کے بعد آپؐ نے خطبہ دیا اور تمام مسلمانوں کو ان کی امداد و اعانت کے لئے آمادہ کیا۔[3]

دشمنانِ جان سے عفو و درگزر

جانی دشمنوں اور قاتلانہ حملہ آوروں سے عفو و درگزر کا واقعہ پیغمبروں کے صحیفہ اخلاق کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے، جس شب کو آپؐ نے ہجرت فرمائی ہے کفارِ قریش کے نزدیک یہ طے شدہ تھا کہ صبح کو محمدؐ کا سر قلم کر دیا جائے، اس لئے دشمنوں کا ایک دستہ رات بھر خانۂ نبوی کا محاصرہ کئے کھڑا رہا، اگرچہ اس وقت دشمنوں سے انتقام لینے کی آپؐ میں ظاہری قوت نہ تھی لیکن ایک وقت آیا جب ان میں سے ایک ایک کی گردن اسلام کی تلوار کے نیچے تھی اور اس کی جان صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم و کرم پر موقوف تھی لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی شخص اس جرم میں کبھی مقتول نہیں ہوا۔

ہجرت کے دن قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کی قیمت مقرر کی تھی اور اعلان کیا تھا کہ جو محمدؐ کا سر لائے گا یا زندہ گرفتار کرے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے، سراقہ بن جعشم پہلے شخص تھے جو اس نیت سے اپنے صبا رفتار گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے آپؐ کے قریب پہنچے، آخر دو تین دفعہ کرشمۂ اعجاز دیکھ کر اپنی نیتِ بد سے توبہ کی اور خواہش کی کہ مجھ کو سندِ امان لکھ دی جائے، چنانچہ سندِ امان لکھ کر ان کو دی گئی اس

---

[1] ابوداؤد زکوٰۃ [2] یہ واقعہ بخاری وغیرہ میں بھی ہے لیکن سنن نسائی کتاب الجنائز باب الصلوٰۃ فی اللیل سے لیا گیا ہے [3] صحیح مسلم صدقات [4] صحیح بخاری باب الہجرۃ۔

کے آٹھ برس کے بعد فتح مکہ کے موقع پر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے اور اس جرم کے متعلق ایک حرف سوال بھی درمیان میں نہیں آیا[۱]۔

عمیر بن وہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا، مقتولین بدر کے انتقام کے لئے جب سارا قریش بے تاب تھا تو صفوان بن امیہ نے اس کو بیش قرار انعام کے وعدہ پر مدینہ بھیجا تھا کہ وہ چپکے سے جا کر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کر دے، عمیر اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آیا، لیکن وہاں پہنچنے کے ساتھ اس کے تیور دیکھ کر لوگوں نے پہچان لیا، حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ سختی کرنی چاہی، لیکن آپ نے اس سے منع فرمایا اور اپنے قریب بٹھا کر اس سے باتیں کیں اور اصلی راز ظاہر کر دیا، یہ سن کر وہ سناٹے میں آ گیا، لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، یہ دیکھ کر وہ اسلام لایا اور مکہ میں جا کر دعوت اسلام پھیلائی۔ یہ واقعہ سنہ ۲ھ کا ہے[۲]۔ ایک دفعہ آپ ایک غزوہ سے واپس آ رہے تھے، راہ میں ایک میدان آیا، دھوپ تیز تھی، لوگوں نے درختوں کے نیچے بستر لگا دیئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک درخت کے نیچے آرام فرمایا، تلوار درخت کی شاخ سے لٹکا دی، کفار موقع کے منتظر رہتے تھے، لوگوں کو غافل دیکھ کر ناگاہ ایک طرف سے ایک بدو نے آ کے بے خبری میں تلوار اتار لی، دفعۃً آپ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص سرہانے کھڑا ہے اور ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، آپ کو بیدار دیکھ کر بولا، کیوں محمدؐ! اب بتاؤ تم کو اس وقت مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا، ”اللہ“ یہ پر اثر آواز سن کر اس نے تلوار نیام میں کر لی، اتنے میں صحابہ آ گئے، آپ نے ان سے واقعہ دہرایا اور بدو سے کسی قسم کا تعرض نہیں فرمایا[۳]۔ ایک دفعہ ایک اور شخص نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا، صحابہ اس کو گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لائے، وہ آپ کو دیکھ کر ڈر گیا، آپ نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا، ڈرو نہیں، اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے بھی تو نہیں کر سکتے تھے[۴]۔

صلح حدیبیہ کے زمانہ میں ایک دفعہ اسی آدمیوں کا ایک دستہ منہ اندھیرے جبل تنعیم سے اتر کر آیا اور چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا، اتفاق سے وہ لوگ گرفتار ہو گئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چھوڑ دیا اور کچھ تعرض نہیں کیا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے[۵]۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ (فتح) اسی خدا نے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک لئے

خیبر میں ایک یہودیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں زہر دیا، آپ نے کھانا کھایا تو زہر کا اثر محسوس کیا، آپ نے یہودیوں کو بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے اقرار کیا، لیکن آپ نے کسی سے کچھ تعرض نہیں فرمایا لیکن اسی زہر کے اثر سے جب ایک صحابی نے انتقال کیا تو آپ نے صرف اس یہودیہ کو قصاص کی سزا دی، حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کا اثر مرتے دم تک محسوس ہوتا رہتا تھا[۶]۔

---

[۱] سراقہ بن مالک بن جعشم مدلجی کا حال استیعاب واصابہ وغیرہ میں دیکھو۔ [۲] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر۔ [۳] صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۴۰۵۔ [۴] ابن حنبل ج ۳ ص ۴۷۱۔ [۵] جامع ترمذی تفسیر فتح۔ [۶] بخاری وفات النبی۔

دشمنوں کے حق میں دعائے خیر

دشمنوں کے حق میں بددعا کرنا انسان کی فطری عادت ہے لیکن پیغمبروں کا مرتبہ عام انسانی سطح سے بدرجہا بلند ہوتا ہے، جو لوگ ان کو گالیاں دیتے ہیں وہ ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور جو اُن کے تشنۂ خون ہوتے ہیں وہ ان کو پیار کرتے ہیں، ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں پر اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پیہم مظالم ہو رہے تھے، اس داستان کے دہرانے کے لئے بھی سنگ دلی درکار ہے، اسی زمانہ میں خبابؓ بن ارت ایک صحابی نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! دشمنوں کے حق میں بددعا فرمایئے، یہ سن کر چہرۂ مبارک سُرخ ہوگیا[1]، ایک دفعہ چند صاحبوں نے مل کر اسی قسم کی بات کہی تو فرمایا: میں دنیا کے لئے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں[2]۔

وہ قریش جنہوں نے تین برس تک آپؐ کو محصور رکھا اور جو آپؐ کے پاس غلہ کے ایک دانہ کے پہنچنے کے روادار نہ تھے، ان کی شرارتوں کی پاداش میں دعائے نبویؐ کی استجابت نے ابرِ رحمت کا سایہ اُن کے سر سے اٹھا لیا اور مکہ میں اس قدر قحط پڑا کہ لوگ ہڈی اور مردار کھانے لگے۔ ابوسفیان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ محمدؐ! تمہاری قوم ہلاک ہو رہی ہے، خدا سے دعا کرو کہ یہ مصیبت دور ہو۔ آپؐ نے بلا عذر فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خدا نے اس مصیبت سے ان کو نجات دی[3]۔

جنگِ اُحد میں دشمنوں نے آپؐ پر پتھر پھینکے، تیر برسائے، تلواریں چلائیں، دندانِ مبارک کو شہید کیا، جبینِ اقدس کو خون آلود کیا، لیکن ان حملوں کا وار آپؐ نے جس سپر پر روکا وہ صرف یہ دعا تھی[4]۔

اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ خدایا ان کو معاف کر کہ یہ نادان ہیں۔

وہ طائف جس نے دعوتِ اسلام کا جواب استہزاء اور تمسخر سے دیا تھا، وہ طائف جس نے داعیِ اسلام کو اپنی پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا، وہ طائف جس نے پائے مبارک کو لہولہان کیا تھا ان کی نسبت فرشتۂ غیب پوچھتا ہے کہ حکم ہو تو ان پر پہاڑ الٹ دیا جائے، جواب ملتا ہے کہ شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو۔ دس بارہ برس کے بعد یہی طائف اسلام کی دعوت کا جواب تیر و تفنگ، و منجنیق سے دیتا ہے، جاں نثاروں کی لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں، اصحاب عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ان کے حق میں بددعا کیجئے۔ آپؐ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ ان کے حق میں بددعا فرمائیں گے، لیکن زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلتے ہیں، خداوندا! ثقیف (اہل طائف) کو اسلام نصیب کر اور دوستانہ ان کو مدینہ لا۔ وہ تیر جو میدانِ جنگ میں نشانہ پر نہیں لگے تھے، وہ مدینہ کے صحنِ مسجد میں زبانِ مبارک سے نکل کر ٹھیک اپنے ہدف پر پہنچے، یعنی وہ مدینہ آکر خاص مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر جہاں وہ مہمان ٹھہرائے گئے تھے، مسلمان ہوگئے[5]۔

دوس کا قبیلہ یمن میں رہتا تھا، طفیلؓ بن عمرو دوسی اسی قبیلہ کے رئیس تھے، وہ قدیم الاسلام تھے، مدت تک وہ اپنے قبیلہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، لیکن وہ اپنے کفر پر اصرار رہا، ناچار وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے

---

[1] صحیح بخاری مبعث النبیؐ [2] مشکوٰۃ اخلاق النبیؐ بحوالہ صحیح مسلم [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان ج ۲ [4] صحیح بخاری [5] ابن سعد غزوۂ طائف۔

اور قبیلے کی حالت عرض کر کے گذارش کی کہ ان کے حق میں بد دعا فرمائیے، لوگوں نے یہ سنا تو کہا کہ اب دوس کی بربادی میں کوئی شک نہیں رہا، لیکن رحمتِ عالمؐ نے جن الفاظ میں دعا فرمائی وہ یہ تھے:[1]

اللھم اھد دوسا وأت بھم۔ خداوندا دوس کو ہدایت کر اور ان کو لا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی ماں مشرکہ تھیں، اپنی ماں کو وہ جس قدر اسلام کی تبلیغ کرتے تھے وہ ابا کرتی تھیں، ایک دن انہوں نے اسلام کی دعوت دی تو ان کی ماں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی، حضرت ابوہریرہؓ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ رونے لگے اور اسی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا، آپؐ نے دعا کی، الٰہی! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت نصیب کر، وہ خوش خوش گھر واپس آئے تو دیکھا کواڑ بند ہیں اور ماں نہا رہی ہیں، غسل سے فارغ ہو کر کواڑ کھولے اور کلمہ پڑھا۔[2]

عبد اللہ بن ابی بن سلول وہ شخص تھا جو عمر بھر منافق رہا اور کوئی موقع اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشوں اور اعلانیہ استخفاف و اہانت کا ہاتھ سے جانے نہ دیا، کفار قریش کے ساتھ اس کی خفیہ خط و کتابت تھی، غزوۂ اُحد میں عین موقع پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مسلمانوں کی فوج سے الگ ہو گیا، واقعہ افک میں حضرت عائشہؓ پر الزام لگانے والوں میں وہ سب سے آگے تھا، بایں ہمہ اس کی فردِ جرم کو رحمتِ عالم کا عفو ہمیشہ دھوتا رہا، وہ مرا تو آپؐ نے اس کی مغفرت کی نماز پڑھی، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا یا رسول اللہ! آپؐ اس کے جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں حالانکہ اس نے یہ کہا اور یہ کہا، یہ سن کر آپؐ متبسم ہوئے اور فرمایا، ہٹو اے عمر! جب زیادہ اصرار کیا تو فرمایا، اگر مجھے اختیار دیا جاتا کہ اگر ستر دفعہ میں نماز پڑھوں گا اس کی بخشش ہو سکتی ہے تو اس سے بھی زیادہ پڑھتا۔[3]

بچوں پر شفقت

بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے، معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے، راستہ میں بچے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے۔[4]

ایک دن خالدؓ بن سعید خدمتِ اقدس میں آئے، ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی اور سرخ رنگ کا کرتہ بدن پر تھا، آپؐ نے فرمایا سنہ، حبشی زبان میں حسنہ کو سنہ کہتے ہیں، چونکہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی، اس لئے آپؐ نے اس کی مناسبت سے حبشی تلفظ میں حسنہ کے بجائے سنہ کہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر جو مہر نبوت تھی ابھری ہوئی تھی، بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ غیر معمولی چیز نظر آئے تو اس سے کھیلنے لگتے ہیں، وہ بھی مہر نبوت سے کھیلنے لگیں، خالدؓ نے ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ کھیلنے دو۔[5]

ایک دفعہ آپؐ کے پاس کہیں سے کپڑے آئے جن میں ایک سیاہ چادر بھی تھی جس میں دونوں طرف آنچل تھے، آپؐ نے حاضرین سے کہا یہ چادر کس کو دوں؟ لوگ چپ رہے، آپؐ نے فرمایا ام خالد کو لاؤ،[6] وہ آئیں تو آپؐ نے ان کو

---

[1] صحیح مسلم مناقب دوس [2] صحیح مسلم فضائل ابی ہریرہؓ [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز [4] ابوداؤد کتاب الادب [5] بخاری، ج۲ ص ۸۸۶

[6] اصابہ میں ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی تھیں کہ لوگ ان کو گود میں اٹھا کر لائے (اصابہ ترجمہ ام خالدؓ)

پہنایا اور دو دفعہ فرمایا "پہننا اور پرانی کرنا" چادر میں جو بوٹے تھے، آپ ان کو دکھا دکھا کر فرماتے تھے، ام خالد دیکھنا یہ سُنا ہے یہ سُنا ہے[1]۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ام خالد حبش میں پیدا ہوئی تھی اور کئی مہینے تک وہیں رہی تھیں، اس لئے ان سے حبشی زبان میں خطاب کیا۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ بچپن میں انصار کے نخلستان میں چلا جاتا اور ڈھیلوں سے مار کر کھجوریں گراتا، لوگ مجھ کو خدمتِ اقدس میں لے گئے، آپ نے کہا ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟ میں نے کہا کھجوریں کھانے کے لئے، ارشاد فرمایا کہ کھجوریں جو زمین پر ٹپکتی ہیں ان کو اٹھا کر کھا لیا کرو، ڈھیلے نہ مارو۔ یہ کہہ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی[2]۔

ماں بچے کی محبت کے واقعات سے آپ پر سخت اثر ہوتا تھا، ایک دفعہ ایک نہایت غریب عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی، دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی ساتھ تھیں، اس وقت حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ نہ تھا، ایک کھجور زمین پر پڑی ہوئی تھی، وہی اٹھا کر دے دی، عورت نے کھجور کے دو ٹکڑے کئے اور دونوں میں برابر تقسیم کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا، ارشاد فرمایا خدا جس کو اولاد کی محبت میں ڈالے اور وہ ان کا حق بجا لائے وہ دوزخ سے محفوظ رہے گا[3]۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ ہوتا ہے کہ دیر میں ختم کروں گا کہ دفعۃً صف سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی ہے اور مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں کو تکلیف ہوتی ہوگی[4]۔

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچوں تک محدود نہ تھی، بلکہ مشرکین کے بچوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے، ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچے جھپٹ میں آکر مارے گئے، آپ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے، ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ! وہ مشرکین کے بچے تھے، آپ نے فرمایا، مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے[5]۔

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمتِ اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے[6]۔ بچوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے، ایک دفعہ آپ اسی طرح بچوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا، تم لوگ بچوں کو پیار کرتے ہو میرے دس بچے ہیں، مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا، آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اگر تمہارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں[7]۔

جابرؓ بن سمرہ صحابی تھے، وہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر آپ اپنے گھر کی طرف چلے، میں بھی ساتھ ہو لیا کہ ادھر سے چند اور لڑکے نکل آئے، آپ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا[8]۔

ہجرت کے موقع پر جب مدینہ میں آپ کا داخلہ ہو رہا تھا، انصار کی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے دروازوں سے نکل نکل کر گیت گا رہی تھیں جب آپ کا ادھر گزر ہوا، فرمایا، اے لڑکیو! تم مجھے پیار کرتی ہو؟ سب نے کہا، ہاں

---

[1] بخاری کتاب اللباس سنہ حبشی میں حسن کو کہتے ہیں [2] ابو داؤد کتاب الجہاد [3] صحیح بخاری صفحہ [illegible] [4] بخاری کتاب الصلوٰۃ [5] مسند ابن حنبل ج ۳ صفحہ [illegible]
[6] معجم صغیر طبرانی باب المیم معجم محمد [7] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب [8] صحیح مسلم باب طیب رائحۃ النبیؐ۔

یارسول اللہ! فرمایا، میں بھی تمہیں پیار کرتا ہوں[1]۔

حضرت عائشہؓ کم سنی میں بیاہ کر آئی تھیں، محلہ کی لڑکیوں کے ساتھ وہ کھیلا کرتی تھیں، آپؐ جب گھر میں تشریف لاتے تو لڑکیاں آپؐ کا لحاظ کر کے اِدھر اُدھر چھپ جاتیں، آپؐ انھیں تسکین دیتے اور کھیلنے کو کہتے[2]۔

غلاموں پر شفقت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غلاموں پر خصوصیت کے ساتھ شفقت فرماتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں جو خود کھاتے ہو، وہ ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہ ان کو پہناؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت میں جو غلام آتے ان کو ہمیشہ آپؐ آزاد فرما دیتے تھے، لیکن وہ حضورؐ کے احسان و کرم کی زنجیر سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ماں باپ، قبیلہ، رشتہ کو چھوڑ کر عمر بھر آپؐ کی غلامی کو شرف جانتے تھے، زید بن حارثہ غلام تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آزاد کر دیا، ان کے باپ ان کو لینے آئے، لیکن وہ آستانۂ رحمت پر باپ کے ظلِ عاطفت کو ترجیح نہ دے سکے اور اپنے جانے سے قطعاً انکار کر دیا، زیدؓ کے بیٹے اسامہؓ سے آپؐ اس قدر محبت کرتے تھے کہ آپؐ فرمایا کرتے تھے۔ اگر اسامہ بیٹی ہوتی تو میں اس کو زیور پہناتا، خود اپنے دستِ مبارک سے ان کی ناک صاف کرتے تھے۔

غلاموں کو لفظ "غلام" کا سن کر اپنی نظر میں اپنی آپ ذلت محسوس ہوتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ تکلیف بھی گوارا نہ تھی۔ فرمایا کوئی "میرا غلام" "میری لونڈی" نہ کہے "میرا بچہ" یا "میری بچی" کہے اور غلام بھی اپنے آقا کو خداوند نہ کہیں، خداوند خدا ہے، آقا کہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غلاموں پر شفقت اتنی ملحوظ تھی کہ مرض الموت میں سب سے آخری یہ وصیت فرمائی کہ غلاموں کے معاملہ میں خدا سے ڈرا کرنا۔

حضرت ابوذرؓ بہت قدیم الاسلام صحابی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی راست گوئی کی مدح فرماتے تھے، ایک دفعہ انہوں نے ایک عجمی آزاد غلام کو بُرا بھلا کہا، غلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر شکایت کی آپؐ نے ابوذرؓ کو زجر فرمایا کہ تم میں اب تک جہالت باقی ہے، یہ غلام تمہارے بھائی ہیں، خدا نے تم کو ان پر فضیلت عطا کی ہے، اگر وہ تمہارے مزاج کے موافق نہ ہوں تو ان کو فروخت کر ڈالو، خدا کی مخلوق کو ستایا نہ کرو، جو خود کھاؤ وہ ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ، ان کو اتنا کام نہ دو جو وہ نہ کر سکیں اور اتنا کام دو تو خود بھی ان کی اعانت کرو[3]۔

ایک دفعہ ابو مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی، ابو مسعود! تم کو جس قدر اس غلام پر اختیار ہے، خدا کو اس سے زیادہ تم پر اختیار ہے۔ ابو مسعودؓ نے مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، عرض کی یارسول اللہ! میں نے لوجہ اللہ اس غلام کو آزاد کیا، فرمایا اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتشِ دوزخ تم کو چھو لیتی۔

ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، عرض کی یارسول اللہ! میں غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ خاموش رہے، اس نے پھر عرض کی، آپؐ نے پھر خاموشی اختیار کی، اس نے تیسری بار عرض کی، آپؐ نے فرمایا ہر روز ستر بار معاف کیا کرو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک خاندان میں سات آدمی تھے اور سات آدمیوں کے بیچ میں ایک

---

[1] سیرت ۲ اول ہجرت [2] ابوداؤد کتاب الادب باب اللعب [3] بخاری باب المعاصی من امر الجاہلیہ و ابوداؤد کتاب الادب۔

ہی لونڈی تھی، ایک دفعہ ان میں سے ایک نے اس لونڈی کو تھپڑ مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو، لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم سات آدمیوں کے بیچ میں یہی ایک خادم ہے، آپ نے فرمایا، اچھا اس وقت تک خدمت گزاری کرے، جب تک تم اس سے بے نیاز نہ ہو جاؤ جب حاجت نہ رہے تو وہ آزاد ہے[1]۔

ایک صاحب کے پاس دو غلام تھے جن کے وہ بہت شاکی تھے، وہ ان کو مارتے تھے، برا بھلا کہتے تھے، لیکن وہ دونوں باز نہ آتے تھے، انہوں نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا۔ آپ نے فرمایا، تمہاری سزا اگر ان کے قصور کے برابر ہوگی تو خیر ورنہ سزا کی جو مقدار زائد ہوگی اس کے برابر تمہیں بھی خدا سزا دے گا۔ یہ سن کر وہ بے قرار ہو گئے اور گریہ وزاری شروع کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ شخص قرآن نہیں پڑھتا و نضع الموازین القسط (یہ سن کر انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ بہتر ہے کہ میں ان کو اپنے سے جدا کر دوں، آپ گواہ رہیں کہ اب وہ آزاد ہیں[2]۔ غلاموں کا لوگ بیاہ کر دیتے تھے اور پھر جب چاہتے تھے جبراً ان میں تفریق کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص نے اپنی لونڈی سے اپنے غلام کا عقد کر دیا اور پھر دونوں میں علیحدگی کرنی چاہی، غلام نے خدمت نبوی میں آکر شکایت کی، آپ نے منبر پر خطبہ دیا کہ لوگ کیوں غلاموں کا نکاح کر کے پھر تفریق کرانا چاہتے ہیں، نکاح وطلاق کا حق صرف شوہر کو ہے[3]۔

اسی رحم و شفقت کا اثر تھا کہ اکثر کافروں کے غلام بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ انہیں آزاد فرما دیتے تھے[4]۔ مال غنیمت جب تقسیم ہوتا تو آپ اس میں سے غلاموں کو بھی حصہ دیتے تھے[5]۔ جو غلام نئے آزاد ہوتے تھے، چونکہ ان کے پاس کوئی مال سرمایہ نہیں ہوتا تھا اس لئے جو آمدنی وصول ہوتی تھی، اس میں سب سے پہلے آپ انہی کو عنایت فرماتے تھے۔

مستورات کے ساتھ برتاؤ

دنیا میں یہ صنف ضعیف (عورتیں) چونکہ ہمیشہ ذلیل رہی ہیں، اس لئے کسی نامور شخص کے حالات میں یہ پہلو کبھی پیش نظر نہیں رہا کہ اس مظلوم گروہ کے ساتھ اس کا طریق معاشرت کیا تھا، اسلام دنیا کا سب سے پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کی حق رسی کی اور عزت و منزلت کے دربار میں ان کو مردوں کے برابر جگہ دی، اس لئے شارع اسلام کے واقعات زندگی میں ہم کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مستورات کے ساتھ اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔

صحیح بخاری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلاء (ازواج مطہرات ؓ سے چند روز علیحدگی) کی جو روایت مذکور ہے اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ناقابل التفات سمجھتے تھے، مدینہ میں نسبتاً عورتوں کی قدر تھی، لیکن نہ اس قدر جس کی وہ مستحق تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اپنے ارشاد و احکام سے اُن کے حقوق قائم کئے، آپ کے برتاؤ نے اور زیادہ اس کو قوی اور نمایاں کر دیا۔ ازواج مطہرات کے

---

[1] یہ تمام واقعات ابوداؤد کتاب الادب باب حق المملوک میں مذکور ہیں۔ [2] مسند ابن حنبل ج ۲، صفحہ [illegible] [3] سنن ابن ماجہ کتاب الطلاق۔ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد و مسند ابن حنبل ج ۱ صفحہ ۲۲۳ [5] ابوداؤد باب قسمۃ الفئی۔

واقعات مستقلاً مذکور ہیں، یہاں ہم عام واقعات لکھتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں چونکہ ہر وقت مردوں کا ہجوم رہتا تھا، عورتوں کو وعظ و پند سننے اور مسائل دریافت کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مستورات نے آکر درخواست کی کہ مردوں سے ہم عہدہ برآ نہیں ہوسکتے، اس لئے ہمارے لئے ایک دن خاص مقرر کردیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے دربار کا ایک خاص دن مقرر ہوگیا۔[1]

جن لوگوں نے آغاز اسلام میں حبش کو ہجرت کی تھی ان میں اسماء بنت عمیس بھی تھیں، خیبر کی فتح کے زمانہ میں مہاجرین حبش مدینہ میں آئے تو وہ بھی آئیں، ایک دن وہ حضرت حفصہؓ سے ملنے گئیں، اتفاق یہ کہ اس وقت حضرت عمرؓ بھی موجود تھے، ان کو دیکھ کر پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت حفصہؓ نے نام بتایا حضرت عمرؓ نے کہا، ہاں وہ حبش والی و سمندر والی۔ اسماءؓ بنت عمیس نے کہا ہاں! وہی۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں نے تم سے پہلے ہجرت کی اور اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ حق ہے۔ اسماءؓ کو سخت غصہ آیا، بولیں ہرگز نہیں، تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، وہ بھوکوں کو کھلاتے تھے، ہمارا یہ حال تھا کہ گھر سے دور بیگانے حبشیوں میں رہتے تھے لوگ ہم کو ستاتے تھے اور ہر وقت جان کا ڈر لگا رہتا تھا، یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگئے۔ اسماءؓ نے کہا یا رسول اللہ عمرؓ نے یہ یہ کہا، آپؐ نے فرمایا تم نے کیا جواب دیا، انہوں نے ماجرا سنایا، آپؐ نے فرمایا، عمر کا حق مجھ پر تم سے زیادہ نہیں، عمر اور اس کے ساتھیوں نے صرف ایک ہجرت کی اور تم لوگوں نے دو ہجرتیں کیں۔[2]

اس واقعہ کا چرچا پھیلا تو مہاجرین حبش جوق در جوق اسماءؓ کے پاس آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ان سے بار بار دہرا کر سنتے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ مہاجرین حبش کے لئے دنیا میں کوئی چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے زیادہ مسرت انگیز نہ تھی۔[3]

حضرت انسؓ بن مالک جو خادم خاص تھے ان کی خالہ کا نام ام حرام تھا (جو رضاعت کے رشتہ سے آپؐ کی بھی خالہ تھیں) معمول تھا جب آپؐ قبا تشریف لے جاتے تو اُن کے پاس ضرور جاتے، وہ اکثر کھانا لا کر پیش کرتیں اور آپؐ نوش فرماتے، آپؐ سو جاتے تو بالوں میں سے جوئیں نکالتیں۔[4]

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ سے آپؐ کو نہایت محبت تھی، آپؐ اکثر ان کے گھر تشریف لے جاتے، وہ بچھونا بچھا دیتیں، آپؐ آرام فرماتے، جب سو کر اٹھتے تو وہ آپؐ کا پسینہ ایک شیشی میں جمع کر لیتیں، مرتے وقت وصیت کی کہ کفن میں حنوط ملایا جائے تو عرق مبارک کے ساتھ ملایا جائے۔

ایک دفعہ حضرت انسؓ کی والدہ ملیکہ نے آپؐ کی دعوت کی کھانا خود تیار کیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا نوش فرما کر فرمایا، آؤ میں تمہیں نماز پڑھاؤں، گھر میں صرف ایک چٹائی تھی اور وہ بھی پرانی ہو کر سیاہ ہوگئی تھی حضرت انسؓ نے پہلے اس کو پانی سے دھویا اور پھر نماز کے لئے بچھایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت کی، حضرت انسؓ اور

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم باب ہل یجعل للنساء یوما علی حدة۔ [2] صحیح بخاری غزوہ خیبر۔ [3] بخاری کتاب الجہاد ص ۳۹۱ [4] بخاری کتاب الاستیذان۔

ان کی دادی اور یتیم (غلام) صف باندھ کر کھڑے ہوئے، آپؐ نے دو رکعت نماز ادا کی اور واپس آئے۔[1]

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی (اسماءؓ) جو حضرت عائشہؓ کی علاتی بہن تھیں، حضرت زبیرؓ سے بیاہی تھیں، مدینہ میں آئیں تو اس وقت حضرت زبیرؓ کی یہ حالت تھی کہ ایک گھوڑے کے سوا اور کچھ نہ تھا، حضرت اسماءؓ خود ہی گھوڑے کے لئے جنگل سے گھاس لاتیں اور کھانا پکاتیں، حضرت زبیرؓ کو جو زمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی اور جو مدینہ سے دو میل پر تھی، وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں سر پر لاد کر لاتیں، ایک دن وہ گٹھلیاں لئے ہوئے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا آپؐ اس وقت اونٹ پر سوار تھے، اونٹ کو بٹھا دیا کہ وہ سوار ہولیں، حضرت اسماءؓ شرمائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ وہ حجاب کرتی ہیں کچھ نہیں فرمایا اور ان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے، حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے ایک خادم بھیجا جو گھوڑے کی خدمت کرتا تھا مجھ کو اس قدر غنیمت معلوم ہوا گویا میں غلامی سے آزاد ہوگئی۔[2]

ایک بار قرابت کی بہت سی بیبیاں بیٹھی ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی تھیں، حضرت عمرؓ آئے تو سب اٹھ کر چل دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے، حضرت عمرؓ نے کہا خدا آپؐ کو خنداں رکھے کیوں ہنسے، فرمایا ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ وہ تمہاری آواز سنتے ہی سب آڑ میں چھپ گئیں، حضرت عمرؓ نے ان کی طرف مخاطب ہو کر کہا، اے اپنی جان کی دشمنو! مجھ سے ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں، سب نے کہا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سخت مزاج ہو۔[3]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں آپؐ منہ ڈھانک کر سوئے ہوئے تھے، عید کا دن تھا، چھوکریاں گا بجا رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ آئے تو ان کو ڈانٹا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ان کو گانے دو، ان کی عید کا دن ہے۔[4]

عورتیں نہایت دلیری کے ساتھ آپؐ سے بے محابا مسائل دریافت کرتی تھیں اور صحابہ کو ان کی اس جرأت پر حیرت ہوتی تھی، لیکن آپؐ کسی قسم کی ناگواری نہیں ظاہر فرماتے تھے، چونکہ عورتیں عموماً نازک طبع اور ضعیف القلب ہوتی ہیں، ان کی خاطر داری کا نہایت خیال رکھتے تھے، انجشہ نام ایک حبشی غلام حدی خواں تھے یعنی اونٹ کے آگے حدی پڑھتے جاتے تھے، ایک دفعہ سفر میں ازواج مطہرات ساتھ تھیں، انجشہ حدی پڑھتے جاتے تھے، اونٹ زیادہ تیز چلنے لگے تو آپؐ نے فرمایا، انجشہ! دیکھنا شیشے (عورتیں) ٹوٹنے نہ پائیں،

حیوانات پر رحم

حیوانات پر نہایت رحم فرماتے تھے، ان بے زبانوں پر جو ظلم مدت سے عرب میں چلے آتے تھے موقوف کرا دیئے، اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکانے کا عام دستور تھا اس کو روک دیا، زندہ جانور کے بدن سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیتے تھے اور اس کو پکا کر کھاتے تھے، اس کو منع کر دیا، جانور کی دم اور ایال کاٹنے سے بھی منع کیا اور فرمایا کہ دم ان کا مورچھل ہے اور ایال ان کا لحاف ہے، جانوروں کو دیر تک ساز میں باندھ کر کھڑا رکھنے کی بھی ممانعت کی اور فرمایا کہ جانوروں کی پیٹھوں کو اپنی نشست گاہ اور کرسی نہ بناؤ، اسی طرح جانوروں کو باہم لڑانا بھی ناجائز بتایا۔ ایک بے رحمی کا دستور یہ تھا کہ کسی جانور کو باندھ کر اس کا نشانہ بناتے تھے اور مشق تیر اندازی کرتے

---

[1] بخاری باب الصلوٰۃ علی الحصیر، [2] بخاری صفحہ ۷۸۶، کتاب النکاح، [3] صحیح بخاری مناقب عمر بن خطاب، [4] مسلم کتاب العیدین، [5] صحیح مسلم باب اللباس والزینۃ۔

تھے، اس سنگ دلی کی بھی قطعاً ممانعت کر دی۔

ایک دفعہ ایک گدھا راہ میں نظر پڑا جس کا چہرہ داغا گیا تھا، فرمایا کہ جس نے اس کا چہرہ داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے، علامت یا بعض دیگر ضرورتوں کی وجہ سے اونٹوں اور بکریوں کو داغنا پڑتا تھا، ایسی حالت میں آپ ان اعضاء کو داغتے جو زیادہ نازک نہیں ہوتے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ بکریوں کے ریوڑ میں گیا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکریوں کے کان داغ رہے ہیں[1]۔

ایک بار آپؐ کسی سفر میں جا رہے تھے لوگوں نے مقام پر منزل کیا، وہاں ایک پرندہ نے انڈہ دیا ہوا تھا ایک شخص نے وہ انڈہ اٹھا لیا، چڑیا بے قرار ہو کر پر مار رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ اس کا انڈہ چھین کر کس نے اس کو اذیت پہنچائی؟ ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ! مجھ سے یہ حرکت ہوئی ہے، آپؐ نے فرمایا اسے وہیں رکھ دو[2]۔

ایک صحابی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، ان کے ہاتھوں میں چادر سے چھپے ہوئے کسی پرندہ کے بچے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا تو عرض کی کہ ایک جھاڑی سے آواز آرہی تھی، جا کر دیکھا تو یہ بچے تھے۔ میں نے ان کو نکال لیا، پرندہ نے یعنی ان کی ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، آپؐ نے فرمایا، جاؤ ان بچوں کو وہیں پھر رکھ آؤ[3]۔

ایک بار راستہ میں ایک اونٹ نظر سے گزرا جس کے پیٹ اور پیٹھ شدتِ گرسنگی سے ایک ہو گئے تھے، فرمایا ان بے زبانوں کے متعلق خدا سے ڈرو[4]۔ ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں آپؐ تشریف لے گئے، ایک گرسنہ اونٹ نظر پڑا، آپؐ کو دیکھ کر بلبلایا، آپؐ نے شفقت سے اس پر ہاتھ پھیرا، پھر لوگوں سے اس کے مالک کا نام پوچھا، معلوم ہوا کہ ایک انصاری کا ہے ان سے آپؐ نے فرمایا کہ اس جانور کے معاملہ میں تم خدا سے نہیں ڈرتے[5]۔

رحمت و محبت عام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر آئی تھی، حضرت مسیح نے کہا تھا کہ "میں امن کا شہزادہ ہوں" لیکن شہزادۂ امن کی اخلاقی حکومت کا ایک کارنامہ بھی اس کے ثبوت میں محفوظ نہیں، لیکن امن کے شہنشاہ کو خداوند ازل ہی نے خطاب کیا۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔ محمدؐ! ہم نے تم کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلم و عفو، مسامحت و درگزر کے سینکڑوں واقعات پڑھ چکے، نظر آیا ہوگا کہ اس خزانۂ رحمت میں دوست و دشمن، کافر و مسلم، بوڑھے بچے، عورت، مرد، آقا و غلام، انسان و حیوان ہر ایک صنفِ ہستی برابر کی حصہ دار تھی، ایک صاحب نے آپؐ سے کسی پر بددعا کرنے کی درخواست کی تو غضب آلود ہو کر فرمایا میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں آیا ہوں[6]، رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، آپؐ نے دنیا کو پیغام دیا[7]۔

لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا ایک دوسرے پر بغض و حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو

---

[1] یہ حدیثیں ترمذی و ابوداؤد وغیرہ میں مذکور ہیں [2] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ البہائم [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد باب رحمۃ الخلق [4] ابوداؤد کتاب الجہاد [5] ایضاً [6] زرقانی ج ۶ ص ۲۸۹ [7] صحیح بخاری باب الہجرۃ ص ۸۹۱۔

وکونوا عباد الله اخوانا۔	اور اے خدا کے بندو سب آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

ایک اور حدیث میں حکم فرمایا۔

احب للناس ما تحب لنفسك تكن مسلما[1]	لوگوں کیلئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلم ہو گے۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

لا يؤمن احدكم حتى يحب للناس ما يحب لنفسه وحتى يحب المرء لا يحبه الا لله عز و جل۔ (مسند احمد ج ۳ صفحہ ۲۷۲)	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ سب لوگوں کیلئے وہی محبوب نہ رکھے جو اپنے لئے رکھتا ہے جب تک وہ دوسرے کو بے غرض صرف خدا کے لئے پیار نہ کرے۔

ایک شخص نے مسجد نبویؐ میں آ کر دعا کی خدایا! مجھ کو اور محمدؐ کو مغفرت عطا کر۔ آپؐ نے فرمایا۔ خدا کی رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک اعرابی مسجدِ نبویؐ میں آیا اور آپؐ کے پیچھے نماز پڑھی، نماز پڑھ کر اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور بولا خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی اور کو شریک نہ کر آپؐ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا۔ بتاؤ یہ زیادہ راہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ۔ یعنی آپؐ نے اس قسم کی دعا کرنا ناپسند فرمایا۔

رقیق القلبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ مالک بن حویرث ایک وفد کے رکن بن کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تھے ان کو بیس دن تک مجلسِ نبویؐ میں شرکت کا موقع ملا تھا وہ فرماتے تھے۔

کان رسول الله صلى الله عليه وسلم رحيما رقيقا[4]	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحیم المزاج اور رقیق القلب تھے۔

حضرت زینبؓ کا بچہ مرنے لگا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا بھیجا اور قسم دلائی کہ ضرور تشریف لائیے مجبوراً آپؐ تشریف لے گئے حضرت سعدؓ بن عبادہ، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، زیدؓ بن ثابت بھی ساتھ تھے، بچہ کو لوگ ہاتھ میں لے کر سامنے لائے وہ دم توڑ رہا تھا بے اختیار آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ کو تعجب ہوا کہ یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا، خدا ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے جو اوروں پر رحم کرتے ہیں[5]۔ غزوہ اُحد کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو گھر گھر شہیدوں کا ماتم برپا تھا مستورات اپنے اپنے شہیدوں پر نوحہ کر رہی تھیں، یہ دیکھ کر آپؐ کا دل بھر آیا اور فرمایا حمزہ رضی رسول اللہ، کا کوئی نوحہ خواں نہیں[6]۔

ایک بار ایک صحابی جاہلیت کا اپنا ایک قصہ بیان کر رہے تھے کہ میری ایک چھوٹی لڑکی تھی، عرب میں لڑکیوں کے مار ڈالنے کا کہیں کہیں دستور تھا، میں نے بھی اپنی لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکار رہی تھی اور میں اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈال رہا تھا، اس بے دردی کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس قصہ کو پھر دہراؤ۔ ان صحابی نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا۔ آپؐ

---

[1] جامع ترمذی باب الزہد بسند غریب [2] صحیح بخاری کتاب الادب [3] ابو داؤد کتاب الادب۔ شاید یہ دونوں واقعے ایک ہوں [4] بخاری صفحہ ۸۸۵ باب رحمت الناس [5] صحیح بخاری باب المرضیٰ صفحہ ۸۴۲ [6] سیرت ج اول اُحد۔

بے اختیار روئے، یہاں تک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہو گئے۔[1]

حضرت عباسؓ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر باندھ دیئے تھے، اور وہ درد سے کراہ رہے تھے، ان کے کراہنے کی آواز گوش مبارک میں بار بار پہنچ رہی تھی، لیکن اس خیال سے ان کے ہاتھ نہیں کھولتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے عزیز کے ساتھ غیر مساویانہ رحمدلی ہے، تاہم نیند نہیں آتی تھی، آپ بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہے تھے، لوگوں نے بے قراری کا سبب سمجھ کر گرہیں ڈھیلی کر دیں، حضرت عباسؓ کی کرب اور بے چینی رفع ہوئی تو آپ نے استراحت فرمایا۔

مصعبؓ بن عمیر ایک صحابی تھے، جو اسلام سے پہلے بہت نازو نعمت میں پلے تھے، ان کے والدین بیش قیمت سے بیش قیمت لباس ان کو پہناتے تھے، خدا نے ان کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی اور وہ مسلمان ہو گئے، یہ دیکھ کر کہ لڑکے نے اپنے آبائی مذہب کو ترک کر دیا ہے، والدین کی محبت دفعۃً عداوت سے بدل گئی، ایک دفعہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں اس حال میں آئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا، اس پر پیوند سے ایک کپڑا سالم نہ تھا، یہ پُر اثر منظر دیکھ کر آپ آبدیدہ ہو گئے۔[2]

عیادت وتعزیت وغمخواری

بیماروں کی عیادت میں دوست و دشمن، مومن و کافر کسی کی تخصیص نہ تھی (سنن نسائی باب التکبیر علی الجنازہ میں ہے کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احسن شئی عیادۃ المریض) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار کی عیادت کا بہت اچھی طرح خیال رکھا کرتے تھے، (بخاری و ابوداؤد وغیرہ) میں روایت ہے کہ ایک یہودی غلام مرض الموت میں بیمار ہوا تو آپ عیادت کو تشریف لے گئے۔[3]

عبداللہؓ بن ثابت جب بیمار ہوئے تو آپ عیادت کو گئے تو ان پر غشی طاری تھی، آواز دی وہ خبر نہ ہوئے فرمایا افسوس ابو الربیع تم پر ہمارا زور اب نہیں چلتا، یہ سن کر عورتیں بے اختیار چیخ اٹھیں اور رونے لگیں، لوگوں نے روکا، آپ نے ارشاد فرمایا، اس وقت رونے دو، مرنے کے بعد البتہ رونا نہیں چاہیئے، عبداللہؓ بن ثابت کی لڑکی نے کہا، مجھ کو ان کی شہادت کی امید تھی، کیونکہ جہاد کے سب سامان تیار کر لیے تھے، آپ نے فرمایا، ان کو نیت کا ثواب مل چکا۔[4]

حضرت جابرؓ بیمار ہوئے تو اگرچہ ان کا گھر فاصلہ پر تھا، پیادہ پا ان کی عیادت کو جایا کرتے تھے،[5] ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے تو آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر پیدل ان کی عیادت کو گئے، ان پر غشی طاری تھی، پانی منگوا کر وضو کیا اور بچے ہوئے پانی کو ان کے منہ پر چھڑکا، جابرؓ ہوش میں آگئے اور عرض کی یا رسول اللہ! اپنا ترکہ کس کو دوں اس پر یہ آیت اتری یُوْصِیْکُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ۔[6]

ایک صاحب بیمار ہوئے، آپ چند دفعہ ان کی عیادت کو گئے، جب انھوں نے انتقال کیا تو لوگوں نے اس خیال سے کہ اندھیری رات ہے آپ کو تکلیف ہو گی، خبر نہ کی اور دفن کر دیا، صبح کو معلوم ہوا تو آپ نے شکایت

---

[1] دارمی ص ۱۰ [2] ترغیب وترہیب ج ۲ ص ۲۴۳ بحوالہ ترمذی و مسند ابو یعلیٰ [3] صحیح بخاری باب عیادۃ المشرک [4] ابوداؤد باب [illegible]

[5] ایضاً [6] صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۵ تفسیر آیت مذکور

کی اور قبر پر جاکر نماز جنازہ پڑھی[1]۔

عبد اللہؓ بن عمرو نے غزوہ احد میں شہادت پائی تھی اور کافروں نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے تھے، ان کی لاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھی گئی اور اس پر چادر ڈال دی گئی، ان کے صاحبزادے (جابرؓ) آئے اور جوشِ محبت میں چاہا کہ کپڑا اٹھا کر دیکھیں، حاضرین نے روکا، انھوں نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا، لوگوں نے پھر روک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دردِ پدری کے خیال سے حکم دیا کہ چادر اٹھا دی جائے، چادر کا اٹھانا تھا کہ عبد اللہ کی بہن بے اختیار چلا اٹھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رونے کی بات نہیں، فرشتے ان کو اپنے پروں کے سایہ میں لے گئے[2]۔

ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن عبادہ بیمار ہوئے، آپؐ عیادت کو تشریف لے گئے، ان کو دیکھ کر آپؐ پر رقت طاری ہوئی اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، آپؐ کو روتا دیکھ کر سب رو پڑے[3]۔

ایک حبشی مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا، مر گیا تو لوگوں نے آپؐ کو خبر نہ کی، ایک دن آپؐ نے ان کا حال دریافت فرمایا، لوگوں نے کہا وہ انتقال کر گیا، ارشاد فرمایا کہ تم نے مجھ کو خبر نہ کی، لوگوں نے اس کی تحقیر کی (یعنی وہ اس قابل نہ تھا کہ آپؐ کو اس کے مرنے کی خبر کی جاتی) آپؐ نے لوگوں سے اس کی قبر دریافت کی اور جاکر جنازہ کی نماز پڑھی[4]۔

جنازہ جاتا تو آپؐ کھڑے ہو جاتے، بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جنازہ جاتا ہو تو اس کے ساتھ جاؤ ورنہ کم از کم کھڑے ہو جاؤ اور اس وقت تک کھڑے رہو کہ سامنے سے نکل جاتے[5]۔ اگرچہ آپؐ نہایت رقیق القلب اور متاثر الطبع تھے، خصوصاً اعزہ کی وفات کا آپؐ کو سخت صدمہ ہوتا تھا تاہم نوحہ اور ماتم کو نہایت ناپسند فرماتے تھے، حضرت جعفرؓ (حضرت علیؓ کے بھائی تھے) سے آپؐ کو نہایت محبت تھی، جب ان کی شہادت کی خبر آئی تو آپؐ مجلس ماتم میں بیٹھے، اسی حالت میں کسی نے آکر کہا کہ جعفرؓ کی عورتیں رو رہی ہیں، آپؐ نے فرمایا جاکر منع کر دو، وہ گئے اور واپس آکر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آئیں، آپؐ نے دوبارہ منع کرا بھیجا، پھر بھی وہ باز نہ آئیں سہ بارہ منع کرنے پر بھی جب وہ باز نہ آئیں تو فرمایا کہ جاکر ان کے منہ میں خاک ڈال دو[7]۔

لطفِ طبع

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے، ایک دفعہ حضرت انسؓ کو پکارا تو فرمایا "او دو کان والے"[8]، اس میں یہ نکتہ بھی تھا کہ حضرت انسؓ نہایت اطاعت شعار تھے اور ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے، حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کا نام ابو عمیر تھا، وہ کم سن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا، اتفاق سے وہ مر گیا، ابو عمیر کو بہت رنج ہوا، آپؐ نے ان کو غمزدہ دیکھا تو فرمایا یا ابا عمیر ما فعل النغیر[9] یعنی ابو عمیر! تمہارے ممولے نے کیا کیا۔

ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو، ارشاد ہوا کہ میں تم کو اونٹنی

---

[1] بخاری کتاب الجنائز [2] بخاری جنائز ص ۱۷۳ [3] ایضاً ص ۱۷۵ [4] بخاری باب الصلوٰۃ علی القبر میں ابوہریرہؓ کی روایت کے راوی نے شک کیا کہ یہ مرد تھا یا عورت، لیکن دوسری روایتوں میں اس کا عورت ہونا بہ تحقیق ذکر ہے ام محجن اس کا نام تھا [5] بخاری ص ۱۷۵ کتاب الجنائز [6] بخاری ص ۱۷۵ ج اول کتاب الجنائز [7] بخاری کتاب الجنائز باب الجلس عند المصیبۃ [8] شمائل ترمذی [9] صحیح بخاری۔

کا بچہ دوں گا، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ آپ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو۔

ایک بڑھیا خدمت اقدس میں آئی کہ حضورؐ! میرے لئے دعا فرمائیں کہ مجھ کو بہشت نصیب ہو، آپ نے فرمایا، بڑھیاں بہشت میں نہ جائیں گی۔ اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ بڑھیاں جنت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی[1]۔

ایک بدوی صحابی تھے جن کا نام زاہرؓ تھا، وہ دیہات کی چیزیں آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے ایک دفعہ وہ شہر میں آئے اگاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے، اتفاقاً آپ ادھر سے گزرے، زاہرؓ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا، انہوں نے کہا کون ہے چھوڑ دو، مڑ کر دیکھا تو سرور عالم تھے، اپنی پیٹھ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ سے لپٹا دی، آپ نے فرمایا کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟ بولے کہ یا رسول اللہ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا۔ آپ نے فرمایا، لیکن خدا کے نزدیک تمہارے دام زیادہ ہیں[2]۔

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے، فرمایا شہد پلاؤ، وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے، آپ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی، سہ بارہ آئے، پھر وہی جواب ملا، چوتھی بار آئے تو فرمایا کہ خدا سچا ہے (کہ شہد میں شفا ہے) لیکن تمہارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جا کر شہد پلاؤ۔ اب کی بار پلایا تو شفا ہو گئی[3]۔ معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا تنقیہ ہو گیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت

اولاد سے نہایت محبت تھی، معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریاب خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے، اسی اثنا میں حضرت فاطمہؓ نے دونوں صاحبزادوں (حسنین علیہما السلام) کے لئے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو خلاف معمول حضرت فاطمہؓ کے گھر نہیں گئے وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اتار لئے، صاحبزادے روتے ہوئے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، آپ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیئے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔

حضرت فاطمہؓ جب آپ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔

ابو قتادہؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ مسجد نبویؐ میں حاضر تھے کہ دفعۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امامہؓ (آنحضرتؐ کی نواسی تھیں) کو کندھے پر چڑھائے ہوئے تشریف لائے اور اسی حالت میں نماز پڑھائی، جب رکوع میں جاتے تو

---

[1] شمائل ترمذی [2] شمائل ترمذی [3] صحیح بخاری صفحہ ۸۴۳ باب الدوا بالعسل۔

ان کو اتار دیتے، پھر کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے، اسی طرح پوری نماز ادا کی۔[1]

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جس قدر آپؐ کرتے تھے، آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ عوالی میں پرورش پاتے تھے جو مدینہ سے تین چار میل ہے ان کے دیکھنے کے لیے مدینہ سے پیادہ پا جاتے، گھر میں دھواں ہوتا رہتا تھا، گھر میں جاتے بچہ کو انا کے ہاتھ سے لے لیتے اور منہ چومتے، پھر مدینہ کو واپس آتے۔[2]

ایک دفعہ اقرع بن حابس عرب کے ایک رئیس خدمتِ اقدس میں آئے، آپؐ حضرت امام حسینؓ کا منہ چوم رہے تھے، عرض کی کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے کبھی کسی کو بوسہ نہیں دیا، ارشاد فرمایا کہ جو اوروں پر رحم نہیں کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا (یعنی خدا اس پر رحم نہیں کرتا)

حسنین رضی اللہ عنہما سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ میرے گلدستے ہیں، حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا، وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپؐ ان کو چومتے اور سینہ سے لپٹاتے۔

ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے، اتفاق سے حسنین رضی اللہ عنہما سرخ کپڑے پہنے ہوئے آئے کم سنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے، آپؐ ضبط نہ کر سکے، منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا، پھر فرمایا خدا نے سچ کہا ہے اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ فرمایا کرتے تھے حسینؓ میرا ہے اور میں حسینؓ کا ہوں، خدا اس سے محبت رکھے جو حسین سے محبت رکھتا ہے۔

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ دوشِ مبارک پر سوار تھے، کسی نے کہا کیا سواری ہاتھ آئی ہے، آپؐ نے فرمایا سوار بھی کیسا ہے؟

ایک دفعہ امام حسنؓ یا امام حسینؓ (راوی کو بتعیین یاد نہیں رہا) آپؐ کے قدم پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپؐ نے فرمایا اوپر چڑھ آؤ، انھوں نے آپؐ کے سینہ پر قدم رکھ دیئے، آپؐ نے منہ چوم کر فرمایا، اے خدا! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی رکھ۔[3]

ایک دفعہ آپؐ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین رضی اللہ عنہ راہ میں کھیل رہے تھے، آپؐ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیئے، وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے، بالآخر آپؐ نے ان کو پکڑ لیا، ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا، حسین میرا ہے اور میں اس کا[4]

اکثر امام حسین رضی اللہ عنہ کو گود میں لیتے اور ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

آپؐ کے داماد حضرت زینبؓ کے شوہر جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا،

---

[1] نسائی ص ۱۲۰ باب ادخال الصبیان فی المساجد، صحیح بخاری میں بھی یہ حدیث مذکور ہے [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۱ [3] یہ تمام روایتیں شمائل ترمذی میں مذکور ہیں، اخیر حدیث کے ایک راوی کی نسبت ترمذی نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم نے اس کو ضعیف الحافظ کہا ہے [4] الادب المفرد بخاری ص ۸۱ [5] ایضاً ص ۳۲۔

حضرت زینبؓ نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا، یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینبؓ کے جہیز میں حضرت خدیجہؓ نے ان کو دیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے، پھر صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو ہار زینبؓ کو بھیج دوں، سب نے بسر و چشم منظور کیا۔

حضرت زینبؓ کی کم سن صاحبزادی کا نام امامہ تھا، ان سے آپؐ کو بہت محبت تھی، آپؐ نماز پڑھتے ہوتے بھی اُن کو ساتھ رکھتے، جب آپؐ نماز پڑھتے تو وہ دوش مبارک پر سوار ہو جاتیں، رکوع کے وقت آپؐ ان کو کاندھے سے اتار دیتے تھے، پھر کھڑے ہوتے تو وہ پھر سوار ہو جاتیں، روایتوں کے الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کو کاندھوں پر بٹھا لیتے اور اتار دیتے تھے لیکن ابن القیم نے لکھا ہے کہ یہ عمل کثیر ہے وہ خود سوار ہو جاتی ہوں گی اور منع نہ فرماتے ہوں گے۔

آپؐ کی ایک نواسی حالت نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بُلا بھیجا، آپؐ تشریف لے گئے تو لڑکی اسی حالت میں آغوش مبارک میں رکھ دی گئی، آپؐ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت سعدؓ نے کہا یارسول اللہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں! آپؐ نے فرمایا یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے

حضرت ابراہیمؑ کی وفات میں بھی آپؐ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا تھا، آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمزدہ ہو رہا ہے، لیکن منہ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے، لیکن یہ محبت صرف اپنے ہی آل و اولاد کے ساتھ مخصوص نہ تھی، بلکہ عموماً بچوں سے آپؐ کو اُنس تھا۔

*

لہ بخاری، [illegible] ثانی صفحہ ۸۴۴ ۔ بخاری کتاب [illegible] ۸۴

ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ معاشرت

حضرت خدیجہؓ

سلسلۂ نسب یہ ہے، خدیجہؓ بنت خویلد بن اسعد بن عبدالعزیٰ بن قصی، قصی پر پہنچ کر ان کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے مل جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں، ان کی والدہ فاطمہ بنت زاہدہ تھیں، ان کے والد اپنے قبیلہ میں ممتاز تھے، مکہ میں آکر سکونت اختیار کی، اور بنو عبدالدار کے حلیف بنے، عامر بن لوی کے خاندان میں فاطمہ بنت زائدہ سے نکاح کیا، ان کے بطن سے حضرت خدیجہؓ پیدا ہوئیں، ان کی پہلی شادی ابوہالہ بن زرارہ تیمی سے ہوئی، ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام ہندؓ تھا اور دوسرے کا حارث۔ ابوہالہ کے انتقال کے بعد عتیق بن عابد مخزومی کے عقدِ نکاح میں آئیں ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ہند تھا، اسی بنا پر حضرت خدیجہؓ ام ہند کے نام سے پکاری جاتی تھیں، ہند نے اول اسلام قبول کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مفصل حلیہ ان ہی کی روایت سے منقول ہے، نہایت فصیح و بلیغ تھے، حضرت علیؓ کے ساتھ جنگِ جمل میں شریک تھے اور شہید ہوگئے تھے۔[1]

عتیق کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں جس کے مفصل حالات گزر چکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ اولادیں ہوئیں، دو صاحبزادے کہ دونوں بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں حضرت فاطمہ زہراؓ، حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ۔ ان سب کے حالات آگے آئیں گے، حضرت خدیجہؓ کی ایک بہن ہالہ تھیں وہ اسلام لائیں اور حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت خدیجہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقدِ نکاح میں آئیں تو ان کی عمر چالیس برس کی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پچیس سال کے تھے، نکاح کے بعد وہ پچیس برس تک زندہ رہیں ان کی زندگی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری شادی نہیں کی، حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ کا معمول تھا کہ جب کبھی گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپؐ ڈھونڈ ڈھونڈ کر حضرت خدیجہؓ کی ہم نشین عورتوں کے پاس گوشت بھجواتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھ کو جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ایک دفعہ میں نے اس پر آپؐ کو رنجیدہ کیا، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو ان کی محبت دی ہے۔[2]

ایک دفعہ ان کے انتقال کے بعد ان کی بہن ہالہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئیں اور استیذان کے قاعدہ سے اندر آنے کی اجازت مانگی، ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے ملتی تھی، آپؐ کے کانوں میں آواز پڑی تو حضرت

---

[1] طبقات ابن سعد ذکر خدیجہ کتاب النساء۔ [2] طبقات ابن سعد ج ۸ اصابہ ذکر ہند ج ۳ صحیح مسلم فضائل خدیجہؓ۔

خدیجہؓ یاد آگئیں اور آپ بے جھجک اٹھے اور فرمایا کہ "ہالہ ہوں گی" حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں ان کو رشک ہوا، بولیں کہ آپ ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں جو مر چکیں اور خدا نے ان سے اچھی بیویاں دیں، صحیح بخاری میں یہ روایت یہیں تک ہے لیکن استیعاب میں ہے کہ جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز نہیں، جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے تصدیق کی، جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں، جب میرا کوئی معین نہ تھا تو انہوں نے میری مدد کی

حضرت سودہؓ بنت زمعہ

ازواجِ مطہراتؓ میں یہ فضیلت صرف حضرت سودہؓ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں[1]، وہ ابتدائے نبوت میں مشرف باسلام ہو چکی تھیں، اس بنا پر ان کو قدیم الاسلام ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، ان کی شادی پہلے سکرانؓ بن عمرو سے ہوئی تھی، حضرت سودہؓ انہی کے ساتھ اسلام لائیں اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت (ہجرتِ ثانیہ) کی، حبشہ سے مکہ کو واپس آئیں، سکران نے کچھ دن کے بعد وفات پائی اور ایک لڑکا یادگار چھوڑا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، انہوں نے جنگ جلولاء میں شہادت حاصل کی۔

حضرت خدیجہؓ کے انتقال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت پریشان و غمگین تھے، یہ حالت دیکھ کر خولہ بنت حکیم نے عرض کی کہ آپ کو ایک مونس و رفیق کی ضرورت ہے، آپ نے فرمایا ہاں، گھر بار، بال بچوں کا انتظام سب خدیجہؓ کے متعلق تھا، آپ کے ایما سے وہ حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقہ پر سلام کیا، انعم صباحاً، پھر نکاح کا پیغام سنایا، انہوں نے کہا ہاں محمدؐ شریف کفو ہیں، لیکن سودہ سے بھی تو دریافت کرو، غرض سب مراتب طے ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے گئے اور سودہؓ کے والد نے نکاح پڑھایا، چار سو درہم مہر قرار پایا، نکاح کے بعد عبداللہ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) جو اس وقت کافر تھے آئے، ان کو یہ حال معلوم ہوا تو سر پہ خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا، چنانچہ اسلام لانے کے بعد اپنی اس حماقت پر ہمیشہ ان کو افسوس آتا تھا، حضرت عائشہؓ اور سودہؓ کا خطبہ اور نکاح چونکہ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا، اس لئے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدم حاصل ہے، ابن اسحاق کی روایت ہے کہ سودہؓ کو تقدم ہے، عبداللہ بن محمد بن عقیل کا قول ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بعد نکاح میں آئیں۔

شکل و شباہت حضرت سودہؓ بلند بالا اور فربہ اندام تھیں اور اس وجہ سے تیزی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتی تھیں، حجۃ الوداع میں جب مزدلفہ سے روانہ ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی بنا پر سب سے پہلے چلنے کی اجازت مانگی کہ ان کو بھیڑ بھاڑ میں چلنے سے تکلیف ہو گی۔

آیتِ حجاب سے پہلے عرب کے قدیم طرز پر ازواجِ مطہراتؓ قضائے حاجت کے لئے صحرا کو جایا کرتی تھیں، حضرت عمرؓ کو یہ ناگوار ہوتا تھا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پردہ کی تحریک کرتے رہتے تھے، لیکن ابھی استدعا قبول نہیں ہوئی تھی کہ حضرت سودہؓ رات کے وقت قضائے حاجت کے لئے نکلیں، چونکہ ان کا قد نمایا

---

[1] طبقات ابن سعد میں ہے کہ رمضان سنہ ۱۰ھ میں ان کا نکاح ہوا، زرقانی نے سنہ ۸ھ بھی لکھا ہے، یہ اختلاف اس بنا پر ہے کہ خود حضرت خدیجہؓ کے وفات کے سنہ میں اختلاف ہے۔

تھا، حضرت عمرؓ نے کہا، سودہؓ! تم کو ہم نے پہچان لیا، اسی واقعہ کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔[1]

اخلاق وعادات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات میں سخاوت وفیاضی ایک نمایاں وصف تھا، اس بنا پر صحابہ میں جس کو آپؐ سے جس قدر تقرب حاصل تھا اسی قدر اس پر اس وصف خاص کا زیادہ اثر پڑتا تھا، ازواج مطہرات کو آپؐ کے اخلاق وعادات وفیض صحبت سے متمتع ہونے کا سب سے زیادہ موقع حاصل تھا، اس لئے یہ وصف ان میں عموماً نظر آتا ہے، حضرت سودہؓ اس وصف میں باستثنائے حضرت عائشہؓ سب سے ممتاز تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی، لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ بولا درہم، بولیں کھجور کی تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اسی وقت سب کو تقسیم کر دیا، اطاعت اور فرمانبرداری بھی ان کا خاص وصف ہے، اور اس وصف میں وہ تمام ازواج مطہرات سے ممتاز تھیں۔

روایت حدیث ان کے ذریعہ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے بخاری میں صرف ایک ہے، صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ نے ان سے روایت کی ہے۔

وفات حضرت سودہؓ کے سنہ وفات میں اختلاف ہے، واقدی کے نزدیک انہوں نے امیر معاویہؓ کے زمانہ خلافت ۵۴ھ میں وفات پائی، حافظ ابن حجر ان کا سال وفات ۵۵ھ قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے تاریخ میں بسند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا۔ ذہبی نے تاریخ کبیر میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے آخری زمانہ میں وفات کی، حضرت عمرؓ نے ۲۳ھ میں وفات پائی ہے اس لئے ان کا زمانہ وفات ۲۲ھ ہوگا، انہیں میں سے کہی روایت سب سے زیادہ صحیح ہے۔[2]

حضرت عائشہؓ[3]

عائشہؓ نام تھا، اگرچہ اُن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، تاہم اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ کے تعلق سے ام عبداللہ کنیت کرتی تھیں، ماں کا نام زینب اور ام رومان کنیت تھی، بعثت کے چار برس بعد پیدا ہوئیں، ۱۰ نبوی میں آنحضرتؐ کے ساتھ نکاح ہوا، اس وقت شش سالہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جبیر بن مطعم کے صاحبزادے سے منسوب تھیں، حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد خولہ بنت حکیم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کی تحریک کی، آپؐ نے رضامندی

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۷۰۶، آیت حجاب کے شان نزول میں سخت اختلاف ہے، ایک روایت تو یہی ہے، دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپؐ کے یہاں نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں کاش آپ ان کو پردے کا حکم دیتے، ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے حضرت عائشہؓ بھی شریک طعام تھیں، ایک آدمی کا ہاتھ حضرت عائشہؓ سے چھو گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناگوار گزرا اسی پر آیت حجاب اتری، عام طور سے مشہور ہے کہ حضرت زینبؓ کے دعوت ولیمہ میں آیت حجاب نازل ہوئی چنانچہ صحاح میں یہ واقعہ بتفصیل موجود ہے، حافظ ابن حجر نے ان روایتوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ آیت حجاب کے نزول کے متعدد اسباب تھے جن میں آخری سبب حضرت زینبؓ کا واقعہ تھا اور وہی آیت کا شان نزول ہے کیونکہ روایت میں واقعہ کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں (فتح الباری ج ۸ ص ۴۱۹)

[2] زرقانی ج ۳ ص ۲۶۲ میں بتفصیل مذکور ہے، طبقات ابن سعد میں صرف پہلی روایت نقل کی ہے۔

[3] حضرت عائشہؓ کے حالات اور خصوصاً انکے علمی کمالات کیلئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے یہاں صرف ضروری سوانح زندگی لکھ دیئے گئے ہیں،

[4] حضرت مصنف نے اپنا یہ وعدہ پورا کر کے سیرت عائشہؓ کے نام سے یہ کتاب لکھ دی ہے جو سلسلہ مطبوعات دار المصنفین سے ملتی ہے۔

ظاہر کی، خولہ نے ام رومان سے کہا، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے مذکور کیا، بولے کہ جبیر بن مطعم سے وعدہ کر چکا ہوں اور میں نے کبھی وعدہ خلافی نہیں کی، لیکن مطعم نے خود اس بنا پر انکار کر دیا کہ اگر حضرت عائشہؓ ان کے گھر آ گئیں تو گھر میں اسلام کا قدم آ جائے گا، بہر حال حضرت ابوبکرؓ نے خولہ کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقد کر دیا، چار سو درہم مہر قرار پایا لیکن مسلم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ازواج مطہراتؓ کا مہر پانچسو درہم ہوتا تھا۔

نکاح کے بعد مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام تین سال تک رہا، ۱۳ نبوی میں آپ نے ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ ساتھ تھے، اہل و عیال کو مکہ چھوڑ آئے تھے، جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقط کو بھیجا کہ ام رومان، اسماء، اور عائشہ کو لے آئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زید بن حارثہؓ اور ابو رافع کو حضرت فاطمہؓ ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ وغیرہ کے لانے کے لئے روانہ فرمایا، مدینہ میں آ کر حضرت عائشہؓ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں، اشتداد مرض سے سر کے بال تک جھڑ گئے، صحت ہوئی تو ام رومان کو رسم عروسی ادا کرنے کا خیال آیا، اس وقت حضرت عائشہؓ کی عمر ۹ سال کی تھی، سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھیں کہ ام رومان نے حضرت عائشہؓ کو آواز دی، ان کو اس واقعہ کی خبر تک نہ تھی، ماں کے پاس آئیں، انہوں نے منہ دھویا بال درست کئے، گھر میں لے گئیں، انصار کی عورتیں انتظار میں تھیں، یہ گھر میں داخل ہو گئیں تو سب نے مبارک باد دی، چاشت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور رسم عروسی ادا ہوئی، شوال میں نکاح ہوا تھا اور شوال ہی میں یہ رسم بھی ادا کی گئی، زمانہ قدیم میں اس مہینہ میں طاعون آیا تھا، اس بنا پر اہل عرب اس مہینہ کو اس تقریب کے لئے مکروہ خیال کرتے تھے، اس خیال کے مٹانے کے لئے غالباً یہ مہینہ انتخاب کیا گیا تھا۔

وفات

حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو برس تک زندگی بسر کی، نو سال کی عمر میں وہ آپؐ کے پاس آئیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو ان کی عمر ۱۸ سال کی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عائشہؓ تقریباً ۴۸ سال تک زندہ رہیں، ۵۸ھ میں وفات پائی، اس وقت ان کی عمر ۶۶ سال کی تھی، وصیت کے مطابق جنۃ البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں، قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمن، عبداللہ بن ابی عتیق، عروہ بن زبیرؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے قبر میں اتارا، اس وقت حضرت ابوہریرہؓ مروان بن الحکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، اس لئے انہوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ سے بہت محبت تھی، اسی محبت سے آپؐ نے مرض الموت میں تمام ازواج مطہرات سے اجازت لی اور اپنی زندگی کے آخری دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں بسر کئے، اس محبت کا اظہار جن طریقوں سے ہوتا تھا ان کے متعلق احادیث و سیر میں نہایت کثرت سے واقعات درج ہیں۔

علمی زندگی

حضرت عائشہؓ کی علمی زندگی بھی نمایاں حیثیت رکھتی ہے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتوی دیتی تھیں، اکابر صحابہ پر انہوں نے دقیق اعتراضات کئے ہیں جن کو علامہ سیوطیؒ نے ایک رسالہ[1] میں جمع کر دیا ہے ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۱۷۴ حدیثوں پر شیخین نے اتفاق کیا ہے، بخاری نے منفرداً ان سے ۵۴ حدیثیں روایت کی ہیں، ۶۸ حدیثوں میں امام مسلم منفرد ہیں، بعض لوگوں کا قول ہے کہ احکام شرعیہ میں سے ایک چوتھائی ان سے منقول ہے۔ ترمذی میں ہے کہ صحابہ کے سامنے جب کوئی مشکل سوال آ جاتا تھا تو اس کو حضرت عائشہؓ ہی حل کرتی تھیں الخ

---

[1] یہ رسالہ بھی سیرت عائشہؓ کے آخر میں ملحق ہے۔ ۱۲

کے شاگردوں کا بیان ہے کہ ہم نے ان سے زیادہ خوش تقریر نہیں دیکھا، تفسیر، حدیث، اسرار شریعت، خطابت اور ادب و انساب میں انکو کمال تھا، شعراء کے بڑے بڑے قصیدے ان کو زبانی یاد تھے، حاکم نے مستدرک میں اور ابن سعد نے طبقات میں بہ تفصیل ان واقعات کو لکھا ہے اور مسند ابن حنبل وغیرہ میں بھی جستہ جستہ ان کے فضل و کمال کے دلائل و شواہد ملتے ہیں۔

حضرت حفصہؓ

حضرت حفصہؓ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں، ماں کا نام زینب بنت مظعون تھا۔ بعثت سے پانچ برس پہلے عین اس سال جب قریش خانہ کعبہ کو تعمیر کر رہے تھے پیدا ہوئیں، ان کی شادی خنیسؓ بن حذافہ سے ہوئی اور انہی کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی، خنیسؓ نے غزوۂ بدر میں زخم کھائے اور واپس آکر انہی زخموں کی وجہ سے شہادت پائی خنیسؓ نے اپنی یادگار میں حضرت حفصہؓ کے بطن سے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ حضرت حفصہؓ کے بیوہ ہو جانے کے بعد حضرت عمرؓ کو ان کے نکاح کی فکر ہوئی، سوء اتفاق سے اسی زمانہ میں حضرت رقیہ کا انتقال ہو چکا تھا اس بنا پر سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے ان کے نکاح کی خواہش حضرت عثمانؓ سے کی، انہوں نے کہا میں اس معاملہ میں غور کروں گا، حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے ذکر کیا، انہوں نے خاموشی اختیار کی، حضرت عمرؓ کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا، اس کے بعد خود جناب رسالت پناہؐ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کی، نکاح ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کے نکاح کی درخواست کی اور میں خاموش رہا تو تم کو ناگوار گزرا لیکن میں نے اسی بنا پر کچھ جواب نہیں دیا کہ رسول اللہؐ نے انکا ذکر کیا تھا اور میں آپ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر رسول اللہؐ نے ان سے نکاح نہ کر لیا ہوتا تو میں اس کے لئے آمادہ تھا۔ حضرت حفصہؓ آخر حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں اس لئے مزاج میں ذرا تیزی تھی۔ صحیح بخاری میں واقعۂ ایلا کے متعلق خود حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے، میں ایک دن کسی معاملہ میں غور کر رہا تھا، اتفاق سے میری بی بی نے مجھ کو مشورہ دیا میں نے کہا تم کو ان معاملات میں کیا دخل ہے؟ بولیں کہ تم میری بات پسند نہیں کرتے، حالانکہ تمہاری بیٹی رسول اللہ کو برابر کا جواب دیتی ہیں، میں اٹھا اور حفصہؓ کے پاس آیا، میں نے کہا بیٹی! تم رسول اللہ کو جواب دیتی ہو، یہاں تک کہ آپ دن بھر رنجیدہ رہتے ہیں، بولیں ہاں ہم ایسا کرتے ہیں، میں نے کہا خبردار! میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں، تم اس کے گھمنڈ میں نہ آجانا جس کے حسن نے رسول اللہ کو فریفتہ کر لیا ہے (یعنی عائشہؓ)۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا مجھ کو حفصہؓ نے کہا ہے کہ تم یہودی کی بیٹی ہو، آپؐ نے فرمایا، تم نبی کی بیٹی ہو، تمہارا چچا پیغمبر ہے اور پیغمبر کے نکاح میں ہو، حفصہؓ تم پر کس بات میں فخر کر سکتی ہے۔

طبقات ج ۸ ص ۵۶ عام طور پر یہی مشہور ہے لیکن اصابہ میں ہے کہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے رقیہ کے انتقال کے بعد حضرت عثمانؓ سے ان کے نکاح کی خواہش کی تھی اور یہ مسلم ہے کہ حضرت رقیہؓ کا انتقال غزوۂ بدر کے بعد ہوا اور اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ شریک غزوۂ بدر نہ ہو سکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خنیسؓ نے غزوۂ بدر کے بعد وفات پائی، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمانؓ مغموم بیٹھے تھے حضرت عمرؓ ادھر سے گزرے اور پوچھا حفصہؓ سے نکاح کرتے ہو؟ اس کی عدت گزر گئی، اگر خنیسؓ نے احد میں شہادت پائی ہوتی تو ان کی عدت کا زمانہ ۳ھ ہی تھا اور نکاح ۳ھ میں ہوا (فتح الباری ج ۹ ص ۱۵۱) طبری ج ۳ ص ۱۷۷۱ بخاری ج ۲ ص ۷۶۱ صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۳۰ ترمذی ص ۶۳۸ کتاب المناقب۔

ایک بار حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے حضرت صفیہؓ سے کہا کہ ہم رسول اللہ کے نزدیک تم سے زیادہ معزز ہیں، ہم آپ کی بیوی بھی ہیں اور چچا زاد بہن بھی، حضرت صفیہؓ کو ناگوار گزرا، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ تم مجھ سے زیادہ کیونکر معزز ہو سکتی ہو، میرے شوہر محمدؐ میرے باپ ہارونؑ اور میرے چچا موسیٰؑ ہیں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیٹی تھیں جو تقرب نبوی میں دوش بدوش تھے اس بنا پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دیگر ازواج کے مقابلہ میں باہم ایک تھیں لیکن کبھی کبھی خود بھی باہم رشک و رقابت کا اظہار ہو جایا کرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضرتؐ کے ساتھ سفر میں تھیں رسول اللہ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے، ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آج رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمہارے اونٹ پر سوار ہوں تاکہ مختلف مناظر دیکھنے میں آئیں حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے پاس آئے جس پر حفصہؓ سوار تھیں جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس ہے جس میں سانپ بچھو رہتے ہیں) کے درمیان لٹکا کر کہنے لگیں، خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس جائے۔

وفات

حضرت حفصہؓ نے شعبان ۴۵ھ میں جو امیر معاویہؓ کی خلافت کا زمانہ تھا وفات پائی، وفات سے پیشتر اپنے بھائی عبداللہ بن عمرؓ سے اس وصیت کی تجدید کی جو حضرت عمرؓ نے ان کو کی تھی، کچھ جائیداد بھی وقف کی اور کچھ مال صدقہ میں دیا، مروان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا، نماز جنازہ پڑھائی اور بنی حزم کے گھر سے مغیرہ بن شعبہ کے گھر تک جنازہ کو کاندھا دیا، یہاں سے قبر تک حضرت ابوہریرہؓ جنازہ کو لے گئے، ان کے بھائی عبداللہ عاصم، سالم، عبداللہ، حمزہ، عبداللہ بن عمرؓ کے لڑکوں نے قبر میں اتارا۔

حضرت زینب امّ المساکینؓ

زینب نام تھا چونکہ فقراء و مساکین کو نہایت فیاضی کے ساتھ کھانا کھلاتی تھیں اس لئے ام المساکینؓ کی کنیت کے ساتھ مشہور ہو گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عبداللہؓ بن جحش کے نکاح میں تھیں، عبداللہ بن جحش نے جنگ احد ۳ھ میں شہادت پائی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سال ان سے نکاح کر لیا، نکاح کے بعد آنحضرتؐ کے پاس صرف دو تین

---

[1] اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ازواج مطہراتؓ میں اس قسم کی روایتیں صرف صفیہؓ و حضرت عائشہؓ کے متعلق مذکور ہیں، اس کے اسباب کی تلاش کرنی چاہیئے، حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے ساتھ منافقین کو جو عداوت تھی وہ قابل لحاظ ہے۔

[2] حضرت حفصہؓ کے بھی سن وفات میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ انہوں نے جمادی الاول ۴۱ھ میں وفات پائی اس وقت ان کا سن ۵۹ سال کا تھا لیکن اگر سن وفات ۴۵ھ قرار دیا جائے تو ان کی عمر ۶۳ سال کی ہو گی، ایک روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں انتقال کیا، یہ روایت اس بنا پر کی گئی کہ وہب نے ابن مالک سے روایت کی کہ جس سال افریقہ فتح ہوا حفصہؓ نے اسی سال وفات پائی اور افریقہ حضرت عثمانؓ کی خلافت میں ۲۷ھ میں فتح ہوا لیکن یہ سخت غلطی ہے، افریقہ دو مرتبہ فتح ہوا ہے اس دوسری فتح کا فخر حضرت معاویہ بن خدیج کو حاصل ہے، اور یہ فتح ۴۵ھ میں ہوئی، وہب بن مالک نے حفصہؓ کا سال وفات اسی فتح کے سنہ کو قرار دیا ہے۔

مہینے رہنے پائی تھیں کہ ان کا انتقال ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کے بعد صرف یہی ایک بی بی تھیں جنھوں نے وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں، وفات کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال کی تھی۔

حضرت اُمِّ سلمہؓ

ہند نام، ام سلمہ کنیت تھی، باپ کا نام سہیل اور ماں کا عاتکہ تھا، پہلے عبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں جو زیادہ تر ابوسلمہ کے نام سے مشہور ہیں اور جو اُن کے چچازاد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے، اپنے شوہر ہی کے ساتھ اسلام لائیں اور ان ہی کے ساتھ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، چنانچہ سلمہ ان کے بیٹے حبشہ ہی میں پیدا ہوئے، حبشہ سے مکہ میں آئیں اور یہاں سے مدینہ کو ہجرت کی، ہجرت میں ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی کہ اہل سیر کے نزدیک وہ پہلی عورت ہیں جو ہجرت کر کے مدینہ میں آئیں، ان کے پہلے شوہر ابوسلمہؓ بڑے شاہسوار تھے، مشہور غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے، غزوہ احد میں چند زخم کھائے جن کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکے اور جمادی الثانی ۴ھ میں وفات پائی، ان کے جنازہ کی نماز نہایت اہتمام سے پڑھی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ تکبیریں کہیں، لوگوں نے نماز کے بعد پوچھا یا رسول اللہ! آپ کو سہو تو نہیں ہوا، فرمایا یہ ہزار تکبیر کے مستحق تھے، ابوسلمہؓ کی وفات کے وقت ام سلمہؓ حاملہ تھیں، وضع حمل کے بعد جب عدت گزر گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کرنا چاہا تو انھوں نے چند عذر پیش کئے۔

(۱) میں سخت غیور عورت ہوں (۲) صاحب عیال ہوں (۳) میرا سن زیادہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب زحمتوں کو گوارا کیا۔

وفات اہل سیر متفق اللفظ ہیں کہ ازواج مطہراتؓ میں سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی، لیکن انکے سنہ وفات میں نہایت اختلاف ہے، واقدی نے ۵۹ھ بتایا ہے، ابراہیم حربی کے نزدیک ۶۲ھ ہے اور تقریب میں اسی کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ۵۸ھ میں وفات پائی، بعض روایتوں میں ہے کہ ۶۱ھ میں جب امام حسینؓ کی شہادت کی خبر آئی اس وقت ان کا انتقال ہوا ہے، ابن عبداللہؓ نے اس روایت کی تصحیح کی ہے۔

اس اختلاف روایت کی حالت میں سنہ وفات کی تعیین مشکل ہے تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ واقعہ حرہ تک زندہ تھیں، مسلم میں ہے کہ حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عبداللہ بن صفوان ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس لشکر کا حال پوچھا جو زمین میں دھنس جائے گا، یہ سوال اس وقت کیا گیا تھا جب یزید نے مسلم بن عقبہ کو لشکرِ شام کے ساتھ مدینہ کی طرف بھیجا تھا اور واقعہ حرہ پیش آیا تھا، واقعہ حرہ ۶۳ھ میں پیش آیا ہے، اس لئے اس سے پہلے ان کی وفات کی تمام روایتیں صحیح نہیں، ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کی وصیت کی بنا پر سعید بن زید نے نماز جنازہ پڑھائی، لیکن اس روایت کی صحت میں کلام ہے، سعید بن زید نے باختلافِ روایت ۵۰ھ یا ۵۲ھ یا ۵۱ھ میں انتقال کیا ہے اور یہ یقینی طور پر ثابت ہے کہ اس وقت ام سلمہؓ زندہ تھیں، واقدی نے لکھا ہے کہ ابوہریرہؓ نے ان کا جنازہ پڑھایا، اگر ان کی وفات کے وقت سعید بن زید زندہ ہوتے تو حضرت ابوہریرہؓ خلاف وصیت کیونکر نماز جنازہ پڑھ سکتے تھے، بہر حال ازواجِ مطہرات میں

سب کے بعد حضرت ام سلمہؓ نے وفات پائی اور وفات کے وقت ان کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔

فضل وکمال ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد فضل وکمال میں انہی کا درجہ ہے ابن سعد نے طبقات میں اس کی تصریح کی ہے، روایت حدیث اور نقل احکام میں حضرت عائشہؓ کے سوا اور تمام بیبیوں پر ان کو فضیلت حاصل ہے، صلح حدیبیہ میں جب صحابہ کو مکہ سے باہر حلق اور قربانی میں تامل تھا تو حضرت ام سلمہؓ ہی کی تدبیر سے یہ مشکل حل ہوئی اور ان کی یہ دانشمندی اور عقل وذہانت کی سب سے بہتر مثال ہے، یہ واقعہ صحیح بخاری میں بتفصیل موجود ہے۔

حضرت زینبؓ

ازواج مطہرات میں جو بیبیاں حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھیں ان میں حضرت زینبؓ بھی تھیں، خود حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کانت تسامینی یعنی وہ میرا مقابلہ کرتی تھیں اور ان کو اس کا حق بھی تھا نسبی حیثیت سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جمال میں بھی ممتاز تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے نہایت محبت تھی، زہد وتورع میں یہ حال تھا کہ جب حضرت عائشہؓ پر اتہام لگایا گیا اور اس اتہام میں خود حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ شریک تھیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حضرت عائشہؓ کی اخلاقی حالت دریافت کی تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہ دیا۔

ما علمت الا خیرا۔ مجھ کو حضرت عائشہؓ کی بھلائی کے سوا کسی چیز کا علم نہیں۔

حضرت عائشہؓ کو ان کے اس صدق واقرار حق کا خود اعتراف کرنا پڑا۔

عبادت میں نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ مشغول رہتی تھیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عقد میں لانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ میں بغیر استخارہ کے کوئی رائے قائم نہیں کرتی، ایک دفعہ آپؐ مہاجرین پر کچھ مال تقسیم کر رہے تھے حضرت زینبؓ اس معاملہ میں کچھ بول اٹھیں، حضرت عمرؓ نے ڈانٹا، آپؐ نے فرمایا ان سے درگزر کرو، یہ اواہ ہیں (یعنی خاشع ومتضرع ہیں)، نہایت قانع اور فیاض طبع تھیں، خود اپنے دست وبازو سے معاش پیدا کرتی تھیں اور اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتی تھیں، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ان کا سالانہ نفقہ بھیجا، انہوں نے اس پر ایک کپڑا ڈال دیا اور برزہ بنت رافع کو حکم دیا کہ میرے خاندانی رشتہ داروں اور یتیموں کو تقسیم کر دو، برزہ نے کہا آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے انہوں نے کہا کہ کپڑے کے نیچے جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے، دیکھا تو پچاس درہم نکلے جب تمام مال تقسیم ہو چکا تو دعا کی کہ خدایا اس سال کے بعد میں عمرؓ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں، یہ دعا مقبول ہوئی اور اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔

وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے فرمایا تھا۔

اسرعکن لحاقا بی اطولکن یدا۔ تم میں مجھ سے جلد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہو گا۔

یہ استعارۃً فیاضی کی طرف اشارہ تھا لیکن ازواج مطہراتؓ اس کو حقیقت سمجھیں، چنانچہ باہم اپنے ہاتھوں کو ناپا کرتی تھیں، حضرت زینبؓ اپنی فیاضی کی بنا پر اس پیشین گوئی کا مصداق ثابت ہوئیں اور ازواج مطہراتؓ میں سب سے پہلے انتقال کیا، کفن کا خود سامان کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک صدقہ کر دینا

چنانچہ یہ وصیت پوری کی گئی، حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا کہ کون قبر میں داخل ہوگا؟ انہوں نے کہا وہ شخص جو ان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا، چنانچہ اسامہؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے ان کو قبر میں اتارا، ۲۰ھ میں انتقال کیا اور ۵۳ برس کی عمر پائی، واقدی نے لکھا ہے کہ آنحضرتؐ سے جس وقت ان کا نکاح ہوا، اس وقت ۳۵ سال کی تھیں۔

حضرت جویریہؓ

حضرت جویریہؓ حارث بن ضرار کی بیٹی تھیں جو قبیلہ بنی مصطلق کا سردار تھا، مسافع بن صفوان سے شادی ہوئی تھی جو غزوہ مریسیع میں قتل ہوا، اس لڑائی میں کثرت سے لونڈی غلام مسلمانوں کے ہاتھ آئے، انہی لونڈیوں میں حضرت جویریہؓ بھی تھیں، جب مال غنیمت کی تقسیم ہوئی تو وہ ثابت بن قیس بن شماسؓ انصاری کے حصہ میں آئیں۔

اسلام میں اگر آقا راضی ہو تو لونڈی غلام کچھ رقم ادا کر کے آزاد ہو سکتے ہیں، اس طریقہ کو فقہا کی اصطلاح میں کتابت کہتے ہیں، اسی اصول کے موافق حضرت جویریہؓ مکاتبہ بن گئیں، ان کو شرط کے موافق ۹ اوقیہ سونا ادا کرنا تھا لیکن رقم ان کی استطاعت سے بہت زیادہ تھی، وہ رسول اللہ کے پاس آئیں اور کہا یا رسول اللہ! میں مسلمان کلمہ گو عورت اور جویریہ حارث کی بیٹی ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے مجھ پر جو مصیبتیں آئیں وہ آپؐ سے مخفی نہیں، میں ثابت بن قیس کے حصہ میں آئی اور ۹ اوقیہ سونے پر ان سے عہد کتابت کیا، یہ رقم میرے امکان میں نہ تھی لیکن میں نے آپؐ کے بھروسہ پر اس کو منظور کر لیا اور اب آپؐ سے اس کا سوال کرنے کے لئے آئی ہوں، آپؐ نے فرمایا تو کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں؟ انہوں نے کہا وہ کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا میں یہ رقم ادا کر دیتا ہوں اور تم سے نکاح کر لیتا ہوں، وہ راضی ہو گئیں، آپؐ نے ثابت بن قیس کو بلایا، وہ بھی راضی ہو گئے، آپؐ نے رقم ادا کی اور ان کو آزاد کر کے نکاح کر لیا، یہ چرچا پھیلا تو لوگوں نے قبیلہ بنی مصطلق کے تمام لونڈی غلام کو اس بنا پر آزاد کر دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے رشتہ مصاہرت قائم کر لیا، آزاد شدہ غلاموں کی تعداد ایک روایت میں سات سو بتائی گئی ہے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جویریہؓ کی برکت سے سینکڑوں گھرانے آزاد کر دیئے گئے، بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود حضرت جویریہؓ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی اور آپ نے تمام قیدیوں کو ان پر ہبہ کر دیا تھا، حضرت جویریہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں، اس وقت ان کا سن ۶۵ برس کا تھا

حضرت اُم حبیبہؓ

رملہ نام اور ام حبیبہ کنیت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئیں اور عبیداللہ بن جحش سے عقد ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو دونوں مشرف باسلام ہوئے اور حبشہ کی طرف ہجرت ثانیہ کی، ایک روایت ہے کہ ان کی بیٹی حبیبہ جن کی کنیت کے ساتھ وہ مشہور ہیں، حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، حبشہ میں جا کر عبیداللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کر لی لیکن ام حبیبہؓ اسلام پر قائم رہیں، اختلاف مذہب کی بنا پر عبیداللہ ابن

حبش نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی، اور اب وہ وقت آگیا کہ ان کو اسلام اور ہجرت کی فضیلت کے ساتھ ام المومنین بننے کا شرف بھی حاصل ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیۃ الضمری کو نجاشی کی خدمت میں بغرض نکاح بھیجا، جب وہ نجاشی کے پاس پہنچے تو نجاشی نے ام حبیبہؓ کو اپنی لونڈی ابرہہ کے ذریعہ سے پیغام دیا کہ آنحضرتؐ نے مجھ کو تمہارے نکاح کے لئے لکھا ہے، انہوں نے خالد بن سعید اموی کو وکیل مقرر کیا اور اس مژدہ کے صلہ میں ابرہہ کو چاندی کے دو کنگن اور انگوٹھیاں دیں، جب شام ہوئی تو نجاشی نے جعفر بن ابی طالب اور وہاں کے مسلمانوں کو جمع کرکے خود نکاح پڑھایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چار سو مہر ادا کیا[1]

تمام لوگوں کے سامنے خالد بن سعید کو یہ رقم دی گئی، لوگوں نے بعد نکاح اٹھنا چاہا لیکن نجاشی نے کہا دعوت ولیمہ تمام پیغمبروں کی سنت ہے، ابھی بیٹھنا چاہیئے، چنانچہ کھانا آیا، لوگ دعوت کھا کے رخصت ہوئے، جب مہر کی رقم ام حبیبہؓ کو ملی تو انہوں نے پچاس دینار ابرہہ کو دیئے لیکن اس نے اس رقم کو اس کنگن کے ساتھ جو پہلے دیئے گئے تھے، یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ بادشاہ نے مجھ کو منع کر دیا ہے، دوسرے دن ان کی خدمت میں عود، زعفران، عنبر وغیرہ لے کر آئی جن کو وہ اپنے ساتھ رسول اللہ کی خدمت میں لائیں، جب نکاح کے تمام رسومات ادا ہو گئے تو نجاشی نے ان کو شرجیلؓ بن حسنہ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔

ام حبیبہؓ نے ۴۴ھ میں وفات[2] پائی اور مدینہ میں دفن ہوئیں۔

حضرت میمونہؓ

میمونہ نام، باپ کا نام حارث اور ماں کا نام ہند تھا، پہلے مسعود بن عمرو بن عمیر الثقفی کے نکاح میں تھیں مسعود نے طلاق دے دی تو ابورہم بن عبد العزیٰ نے نکاح کرلیا، ابورہم کے انتقال کے بعد رسول اللہ کے نکاح میں آئیں، نکاح کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہبہ کیا، دوسری روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے اپنے غلام ابورافع کو اوس بن خولی کے ساتھ وکیل بنا کر بھیجا اور انہوں نے ایجاب و قبول کیا، لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت عباسؓ نے اس نکاح کی تحریک کی اور انہی نے نکاح پڑھایا۔

وفات یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ مقام سرف میں ان کا نکاح ہوا تھا اور سرف ہی میں انہوں نے انتقال بھی کیا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور قبر میں اتارا، صحاح میں ہے کہ جب ان کا جنازہ

---

[1] سال نکاح میں اختلاف ہے مشہور یہ ہے کہ ۶ھ میں نکاح ہوا لیکن بعض روایتوں میں ۷ھ بھی بیان کیا گیا ہے ممکن ہے کہ آنحضرت نے عمرو بن امیہ الضمری کو بغرض نکاح بھیجا ہو اور ۷ھ میں نکاح پڑھایا گیا ہو، اس میں بھی اختلاف ہے کہ نکاح کہاں ہوا اور کس نے پڑھایا لیکن صحیح یہ ہے کہ حبشہ میں نکاح ہوا اور نجاشی نے نکاح پڑھایا، مہر صحیح روایت یہی ہے لیکن اور بھی مختلف تعداد بیان کی گئی ہے بعض روایتوں میں نو سو دینار ہے بعضوں کے نزدیک چار ہزار دینار ہے ابو داؤد میں دینار کے بجائے چار ہزار درہم ہے زہری کی روایت میں چالیس اوقیہ کی تعداد کا ذکر ہے اس لئے اگر چاندی ہوگی تو اس کے سولہ سو درہم ہوتے ہیں۔

[2] بعضوں نے سال وفات ۴۲ھ لکھا ہے، ابن ابی خیثمہ کے نزدیک ان کا سال وفات ۵۹ھ ہے بعض لوگوں نے ۵۰ھ اور بعضوں نے ۵۵ھ بیان کیا ہے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دمشق میں مدفون ہوئیں۔

اٹھایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا یہ رسول اللہ کی بی بی ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو، با ادب آہستہ لے چلو، سال وفات کے متعلق اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے سنہ ۵۱ھ میں وفات پائی۔

حضرت صفیہؓ

صفیہ اصل نام نہ تھا، زرقانی نے لکھا ہے کہ عرب میں مال غنیمت کا جو بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لئے مخصوص ہو جاتا تھا اس کو صفیہ کہتے تھے، چونکہ جنگ خیبر میں اسی طریقہ کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تھیں اس لئے صفیہ کے نام سے مشہور ہو گئیں ورنہ اصل نام زینبؓ تھا، باپ کا نام حیی بن اخطب اور ماں کا نام ضرہ تھا، حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کی جانب سے سیادت حاصل تھی، باپ قبیلہ بنو النضیر کا سردار اور ماں قریظہ کے رئیس کی بیٹی تھیں، حضرت صفیہؓ کی شادی پہلے سلام بن مشکم القرظی سے ہوئی تھی، ابن مشکم نے طلاق دی تو کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں، کنانہ جنگ خیبر میں مقتول ہوا، حضرت صفیہؓ کے باپ اور بھائی بھی کام آئے اور خود بھی گرفتار ہوئیں، جب خیبر کے تمام قیدی جمع کئے گئے تو دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لونڈی کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتخاب کرنے کی اجازت دی، انہوں نے حضرت صفیہ کو منتخب کیا، لیکن ایک صحابی نے آپؐ کی خدمت میں آکر عرض کی کہ آپؐ نے رئیسہ بنو نضیر و قریظہ کو دحیہ کو دے دیا، وہ تو صرف آپؐ کے قابل ہے، آپؐ نے حکم دیا کہ دحیہؓ اس عورت کے ساتھ حاضر ہوں، وہ صفیہؓ کو لے کر آئے تو آپؐ نے ان کو دوسری لونڈی عنایت فرمائی اور صفیہؓ کو آزاد کر کے نکاح کر لیا، خیبر سے روانہ ہوئے تو مقام صہبا میں رسم عروسی ادا کی اور جو کچھ سامان لوگوں کے پاس تھا اس کو جمع کر کے دعوت ولیمہ فرمائی، وہاں سے روانہ ہوتے تو آپؐ نے ان کو خود اپنے اونٹ پر سوار کر لیا اور اپنے عبا سے ان پر پردہ کیا، یہ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ وہ ازواج مطہراتؓ میں داخل ہو گئیں۔

حضرت صفیہؓ کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی اور ہر موقع پر ان کی دلجوئی فرماتے تھے، ایک بار آپؐ سفر میں تھے، ازواج مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں، حضرت صفیہؓ کا اونٹ سوء اتفاق سے بیمار ہو گیا، حضرت زینبؓ کے پاس ضرورت سے زیادہ اونٹ تھے، آپؐ نے ان سے کہا کہ ایک اونٹ صفیہؓ کو دے دو، انہوں نے کہا کہ کیا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ دوں؟ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اس قدر ناراض ہوئے کہ دو مہینے تک ان کے پاس نہ گئے، ایک بار آپؐ حضرت صفیہؓ کے پاس تشریف لے گئے، دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں، آپؐ نے رونے کی وجہ پوچھی، انہوں نے کہا کہ عائشہؓ اور زینبؓ کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج میں افضل ہیں، ہم آپؐ کی زوجہ ہونے کے ساتھ آپؐ کی چچازاد بہن بھی ہیں، آپؐ نے فرمایا تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ ہارونؑ میرے باپ، موسیٰؑ میرے چچا اور محمدؐ میرے شوہر ہیں، اس لئے تم لوگ کیونکر مجھ سے افضل ہو سکتی ہو؟

حضرت صفیہؓ نے ۵۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

*

اولاد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ کے چھ اولادیں تھیں۔ قاسمؓ، ابراہیمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، فاطمہؓ۔ ان تمام لڑکیوں نے اسلام کا زمانہ پایا اور ہجرت سے شرف اندوز ہوئیں، لیکن ابن اسحاق نے دو صاحبزادوں کا نام اور لیا ہے، طاہر، طیب، اس بنا پر اولاد مذکور کی تعداد لڑکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ اس بارہ میں تمام اقوال کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بارہ اولادیں تھیں جن میں آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، لڑکیوں کی تعداد میں کسی قسم کا اختلاف نہیں البتہ صاحبزادوں کی تعداد میں سخت اختلاف ہے، مجموعی تعداد آٹھ تک پہنچتی ہے، جن میں قاسم اور ابراہیم پر تمام راویوں کا اتفاق ہے، حضرت ابراہیمؓ ماریہ قبطیہؓ سے اور بقیہ حضرت خدیجہؓ سے تھیں[1]۔

حضرت قاسمؓ

آپؐ کی اولاد میں سب سے پہلے حضرت قاسم پیدا ہوئے اور غالباً نبوت سے گیارہ برس پہلے پیدا ہوئے ہوں گے۔ مجاہد کے نزدیک یہ صرف سات دن زندہ رہے، ابن سعدؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے، ابن فارس نے لکھا ہے کہ فن تمیز کو پہنچ گئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں جس طرح یہ سب سے پہلے پیدا ہوئے تھے اسی طرح سب سے پہلے انتقال بھی کیا، عام روایت یہ ہے کہ قبل بعثت وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابو القاسم انہی کے انتساب سے ہے، آپؐ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے، صحابہ بھی جب آپؐ کا محبت سے نام لیتے تو ابو القاسم ہی کہتے، ایک دن آپؐ بازار سے گزر رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے یا ابا القاسم کہہ کر آواز دی، آپؐ نے مڑ کر دیکھا تو اس نے کہا یا رسول اللہ میں اسی نام کے ایک اور شخص کو پکار رہا ہوں، رفع اشتباہ کے لئے پھر آپؐ نے منع فرمایا کہ کوئی یہ کنیت نہ رکھے۔

حضرت زینبؓ

اہل سیر کا اتفاق ہے کہ لڑکیوں میں سب سے بڑی تھیں، زبیر بن بکار کا قول ہے کہ حضرت قاسمؓ کے بعد پیدا ہوئیں، لیکن ابن کلبی کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلی اولاد حضرت زینبؓ ہی ہیں، بعثت سے دس برس پہلے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۰ سال کی تھی پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی تو اہل و عیال مکہ میں رہ گئے تھے، حضرت زینبؓ کی شادی ان کے خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع بن لقیط سے ہوئی، غزوہ بدر میں ابو العاص گرفتار ہو گئے، جب یہ رہا کئے گئے تو ان سے وعدہ لیا گیا کہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو بھیج دیں گے، ابو العاص نے مکہ جا کر اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ ان کو مدینہ کی طرف روانہ کیا، چونکہ کفار کے تعرض کا خوف تھا کنانہ نے ہتھیار ساتھ لے لئے تھے، مقام ذی طویٰ میں پہنچے تو کفار قریش کے چند آدمیوں نے آ کر

---

[1] زرقانی ۳، ۲۳

کیا، ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو نیزے سے زمین پر گرا دیا، وہ حاملہ تھیں، حمل ساقط ہوگیا، کنانہ نے ترکش سے تیر نکالے اور کہا کہ اب اگر کوئی قریب آیا تو ان تیروں کا نشانہ ہوگا، لوگ ہٹ گئے تو ابوسفیان سردارانِ قریش کے ساتھ آیا اور کہا، تیر روک لو ہم کو کچھ گفتگو کرنی ہے، انہوں نے تیر ترکش میں ڈال دیئے، ابوسفیان نے کہا محمدؐ کے ہاتھ سے جو مصیبتیں پہنچی ہیں تم کو معلوم ہیں، اب اگر تم علانیہ ان کی لڑکی کو ہمارے قبضہ سے نکال لے گئے تو لوگ کہیں گے کہ ہماری کمزوری ہے، ہم کو زینبؓ کے روکنے کی ضرورت نہیں، جب شور و ہنگامہ کم ہو جائے اس وقت چوری چھپے لے جانا، کنانہ نے یہ رائے تسلیم کی اور چند روز کے بعد ان کو رات کے وقت لے کر روانہ ہوئے، زیدؓ بن حارثہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے بھیج دیا تھا وہ بطن یاجج میں تھے، کنانہ نے زینبؓ کو ان کے حوالہ کیا وہ ان کو لے کر روانہ ہوگئے۔

حضرت زینبؓ مدینہ میں آئیں اپنے شوہر ابوالعاص کو حالتِ شرک میں چھوڑا، ابوالعاص دوبارہ ایک سریہ میں گرفتار ہوئے، اس وقت بھی حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی، مکہ جا کر انہوں نے لوگوں کی امانتیں حوالہ کیں اور اسلام لائے، اسلام لانے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آئے، حضرت زینبؓ نے ان کو حالتِ شرک میں چھوڑا تھا، اس لئے دونوں میں باہم تفریق ہوگئی تھی، وہ مدینہ آئے تو حضرت زینبؓ دوبارہ ان کے نکاح میں آئیں، ترمذی وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی جدید نکاح نہیں ہوا، لیکن دوسری روایت میں جدید نکاح کی تصریح ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ اگرچہ اسناد کے لحاظ سے دوسری روایت پر ترجیح ہے لیکن فقہا نے دوسری روایت پر عمل کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ تاویل کی ہے کہ نکاح جدید کے مہر اور شرائط وغیرہ میں کسی قسم کا تغیر نہ ہوا ہوگا، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کو نکاح اول سے تعبیر کیا ورنہ بعد تفریق نکاح ثانی ضروری ہے۔

ابوالعاص نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شریفانہ تعلقات کی تعریف کی، نکاح جدید کے بعد حضرت زینبؓ بہت کم زندہ رہیں، ۶ھ یا ۷ھ (باختلاف روایت) ابوالعاص اسلام لائے تھے اور اس لئے ۸ھ میں حضرت زینبؓ نے انتقال کیا، ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ بنت زمعہ اور ام سلمہؓ نے غسل دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی، ابوالعاصؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر میں اتارا، حضرت زینبؓ نے دو اولاد چھوڑی، امامہ اور علی، علی کی نسبت ایک روایت ہے کہ بچپن میں وفات پائی لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے، ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکہ میں شہادت پائی۔

امامہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، آپؐ ان کو اوقاتِ نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے، صحاح میں ہے کہ آپؐ ان کو کاندھے پر رکھ کر نماز پڑھتے تھے، جب رکوع میں جاتے تو دوش مبارک سے اتار دیتے جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو پھر سوار کرا لیتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مرتبہ کسی نے کچھ چیزیں

---

[1] اصابہ میں ہے کہ ابوالعاص قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ جمادی الاول ۶ھ میں روانہ ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید ابن حارثہ کو ۱۷۰ سواروں کے ساتھ بھیجا، مقام عیص میں قافلہ ملا، کچھ لوگ گرفتار کئے گئے اور اسباب لوٹ میں آیا ان ہی میں ابوالعاص تھے، ابوالعاص آئے تو حضرت زینبؓ نے ان کو پناہ دی اور ان کی سفارش سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مال واپس کر دیا۔

ہدیے میں بھیجیں، جن میں ایک زریں ہار بھی تھا، امامہ ایک گوشہ میں کھیل رہی تھیں، آپ نے فرمایا، میں اس کو اپنی محبوب ترین اہل کو دوں گا، ازواج نے سمجھا کہ یہ شرف حضرت عائشہؓ کو حاصل ہوگا، لیکن آپ نے امامہ کو بلا کر وہ ہار خود ان کے گلے میں ڈال دیا، ابوالعاصؓ نے حضرت زبیرؓ بن عوام کو امامہ کے نکاح کی وصیت کی تھی، حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو انھوں نے حضرت علیؓ سے ان کا نکاح کر دیا، حضرت علیؓ نے شہادت پائی تو مغیرہ کو وصیت کر گئے کہ امامہ سے نکاح کر لیں، مغیرہ نے نکاح کیا اور ان سے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام یحیٰی تھا، لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ امامہ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی، امامہ نے مغیرہ کے یہاں وفات پائی۔

حضرت رقیہؓ

جرجانی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، لیکن مشہور روایت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے بعد سنہ ۳۳ قبل نبوت میں پیدا ہوئیں، پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ شادی قبل نبوت ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی ام کلثومؓ کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوئی تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوت اسلام کا اظہار کیا، ابولہب نے بیٹوں کو جمع کر کے کہا اگر تم محمدؐ کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرتے تو تمہارے ساتھ میرا سونا بیٹھنا حرام ہے، دونوں فرزندوں نے باپ کے حکم کی تعمیل کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی۔

دولابی نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کا نکاح زمانہ جاہلیت میں ہوا، لیکن خود ایک روایت حضرت عثمانؓ سے مروی ہے جس میں زمانۂ اسلام کی تصریح ہے۔ نکاح کے بعد حضرت عثمانؓ نے حبش کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ بھی ساتھ گئیں، مدت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا، ایک عورت نے آکر خبر دی کہ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور فرمایا کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے بی بی کو لے کر ہجرت کی ہے۔

حبش میں حضرت رقیہؓ کے ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ تھا، لیکن صرف ۶ سال زندہ رہا، حضرت عثمانؓ حبش سے مکہ کو واپس آئے اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، حضرت رقیہؓ مدینہ میں آکر بیمار ہوئیں، یہ غزوۂ بدر کا زمانہ تھا حضرت عثمانؓ ان کی تیمارداری کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہو سکے، عین اسی دن جس روز زیدؓ بن حارثہ نے مدینہ آکر فتح کا مژدہ سنایا وفات پائی، غزوۂ بدر کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

حضرت اُمِّ کلثومؓ

کنیت ہی کے نام سے مشہور ہیں، سنہ ۳ھ میں جو غزوۂ بدر کا سال تھا جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت ام کلثومؓ کے ساتھ نکاح کر لیا، بخاری میں ہے کہ جب حضرت حفصہؓ بیوہ

ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا، حضرت عثمانؓ نے تامل کیا، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا میں تم کو عثمانؓ سے بہتر شخص کا پتہ دیتا ہوں اور عثمانؓ کے لئے تم سے بہتر شخص ڈھونڈتا ہوں، تم اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو اور میں اپنی لڑکی کی شادی عثمانؓ سے کر دیتا ہوں۔ بہرحال نکاح ہوا اور نکاح کے بعد حضرت ام کلثومؓ چھ برس تک حضرت عثمانؓ کے ساتھ رہیں، شعبان ۹ھ میں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھائی، اور حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اتارا۔

حضرت فاطمہ زہراؓ

فاطمہ نام، زہرا لقب، سن ولادت میں اختلاف ہے، ایک روایت ہے کہ سنہ ۱ بعثت میں پیدا ہوئیں، ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد قبل نبوت پیدا ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چالیس سال کی عمر میں ہوئی تھی، اس بنا پر بعضوں نے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے کہ سنہ ۱ بعثت کے آغاز میں حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئی ہوں گی اور چونکہ دونوں کی مدت میں بہت فاصلہ ہے اس لئے یہ اختلاف روایت ہو گیا ہوگا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ بعثت سے پانچ برس پہلے جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہو رہی تھی، پیدا ہوئیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت سے تقریباً ایک سال پیشتر پیدا ہوئیں،

حضرت فاطمہؓ، اگر ان کا سال ولادت سنہ ۱ بعثت صحیح تسلیم کر لیا جائے، جب پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کی ہوئی تو ۲ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے ساتھ نکاح کر دیا، اس وقت حضرت علیؓ کا سن ۲۱ برس پانچ مہینے کا[۱] تھا، حضرت فاطمہؓ سے عقد کی درخواست سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے کی تھی، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ جواب نہیں دیا، حضرت علیؓ نے خواہش کی تو فرمایا، تمہارے پاس مہر ادا کرنے کو کچھ ہے؟ بولے ایک گھوڑا اور زرہ کے سوا کچھ نہیں، آپ نے فرمایا گھوڑا تو لڑائی کے لئے ضروری ہے، زرہ فروخت کر ڈالو، حضرت عثمانؓ نے ۴۸۰ درہم پر خریدی اور حضرت علیؓ نے قیمت لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈال دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں، عقد ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہیز میں ایک پلنگ اور ایک بستر دیا، اصابہ میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشک بھی دی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہی دو چیزیں عمر بھر ان کی رفیق رہیں۔

نکاح کے بعد رسم عروسی کا وقت آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ایک مکان لے لیں، چنانچہ حارث بن النعمان کا مکان ملا اور حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے ساتھ اس میں قیام کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے، چنانچہ جب حضرت

---

[۱] حضرت علیؓ کے متعلق ایک روایت ہے کہ آٹھ برس کی عمر میں اسلام لائے، اس کی تعیین اس روایت کی بنا پہ ہے لیکن قول راجح یہ ہے کہ وہ دس سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے، اس روایت کی رو سے ان کا سن ۲۴ سال ڈیڑھ مہینہ کا تھا۔

علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں کبھی کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں میں صلح کرا دیتے تھے، ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ آپ گھر میں تشریف لے گئے اور صفائی کرا دی، گھر سے مسرور نکلے لوگوں نے پوچھا آپ گھر میں گئے تھے تو اور حالت تھی، اب آپ اس قدر خوش کیوں ہیں؟ فرمایا، میں نے ان دو شخصوں میں مصالحت کرا دی جو مجھ کو محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ان پر کچھ سختی کی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر چلیں پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آئے، حضرت فاطمہؓ نے شکایت کی، آپ نے فرمایا بیٹی! تم کو خود سمجھنا چاہیے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے، حضرت علیؓ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا، اب میں تمہارے خلاف مزاج کوئی بات نہ کروں گا۔

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے، آپ نے مسجد میں خطبہ دیا، اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی۔ فرمایا، میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جس سے اس کو دکھ پہنچے گا مجھے بھی اذیت ہوگی۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے۔ اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہیں کیا[1]۔

حضرت فاطمہؓ کے پانچ اولادیں ہوئیں، حسنؓ، حسینؓ، محسنؓ، ام کلثومؓ، زینبؓ، محسنؓ نے بچپن ہی میں انتقال کیا حضرت زینبؓ، امام حسنؓ، امام حسینؓ اور ام کلثومؓ اہم واقعات کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں مشہور ہیں۔

حضرت فاطمہؓ نے رمضان سلاھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے چھ ماہ بعد وفات پائی اس وقت ان کا سن ۲۹ سال تھا۔ سن کی تعیین میں سخت اختلاف ہے، بعضوں نے ۲۴ سال، بعضوں نے ۲۵ سال اور بعضوں نے ۳۰ سال بتایا ہے لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اگر سلکہ کو سال ولادت قرار دیا جائے تو اس وقت ان کا یہ سن نہیں ہو سکتا تھا، البتہ اگر ۲۴ سال کی عمر تسلیم کی جائے تو اس سن کو سال ولادت قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ روایت صحیح مان لی جائے کہ وہ پانچ برس قبل نبوت میں پیدا ہوئیں تو اس وقت ان کا سن ۲۹ سال کا ہو سکتا ہے۔

حضرت ابراہیمؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری اولاد ہیں۔ ذی الحجہ ۸ھ بمقام عالیہ جہاں ماریہ قبطیہؓ رہتی تھیں پیدا ہوئے، اسی بنا پر لوگ عالیہ کو مشربۂ ابراہیم بھی کہنے لگے۔ ابو رافع کی بی بی سلمیٰ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کی پھوپھی صفیہ کی لونڈی تھیں، دایہ گیری کی خدمت انجام دی، ابو رافع نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

---

[1] صحیح بخاری ذکر اصہار النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس میں بھی اختلاف ہے بعضوں نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف تین دن زندہ رہیں بعضوں نے چار مہینے بتایا ہے بعضوں کے نزدیک دو مہینے کے بعد انتقال ہوا، کسی نے ایک مہینہ کسی نے تین مہینے بعد اور بعضوں نے تین مہینے پانچ دن بعد لکھا ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے چھ مہینے والی روایت مذکور ہے۔

ان کی ولادت کا مژدہ سنایا تو آپؐ نے اس کے صلہ میں ایک غلام عطا فرمایا، ساتویں دن عقیقہ ہوا، آپؐ نے بال کے برابر چاندی خیرات کی اور حضرت ابراہیمؑ کے نام پر نام رکھا، دودھ پلانے کے لئے تمام انصار نے خواہش کی لیکن آپؐ نے ان کو ام بردہ خولہ بنت زید الانصاری کے حوالہ کیا اور اس کے معاوضہ میں کھجور کے چند درخت دیئے، بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے یہ خدمت ام سیف کے متعلق کی، قاضی عیاض نے لکھا ہے کہ ام سیف اور ام بردہ ایک ہی ہیں، یہ تاویل کچھ مستبعد نہیں، لیکن ان کے شوہر کا نام براء بن اوس بتایا جاتا ہے اور وہ ابو سیف کی کنیت کے ساتھ مشہور نہیں، ام سیف عوالی مدینہ میں رہتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرط محبت سے وہاں جاتے، حضرت ابراہیمؑ کو گود میں لیتے اور چومتے، ام سیف کے شوہر لوہار تھے، اس لئے گھر دھوئیں سے بھرا رہتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود نظافت طبع گوارا فرماتے۔

ابراہیمؑ نے ام سیف ہی کے یہاں انتقال کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے ساتھ تشریف لائے، نزع کی حالت تھی، گود میں اٹھا لیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے کہا، یا رسول اللہ! آپؐ کی یہ حالت ہے، آپؐ نے فرمایا، یہ رحمت ہے۔

عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مر جاتا ہے تو چاند میں گہن لگ جاتا ہے، اتفاق سے جس روز حضرت ابراہیمؑ نے وفات پائی، سورج میں گہن لگ گیا تھا، عام طور پر مشہور ہوگیا کہ یہ ان کی موت کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا، چاند اور سورج خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کی موت سے ان میں گہن نہیں لگتا۔

چھوٹی سی چارپائی پر جنازہ اٹھایا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی، عثمانؓ بن مظعون کی قبر کے متصل دفن ہوئے، قبر میں فضل بن عباسؓ اور اسامہؓ نے اتارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر کے کنارے کھڑے تھے، قبر پر پانی چھڑکا گیا اور اس پر ایک امتیازی علامت قائم کی گئی۔

ابوداؤد اور بیہقی کی روایت کے موافق دو مہینے دس دن کی عمر پائی، ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے تھے اس روایت کی بنا پر ۹ھ میں انتقال ہوا، واقدی کے نزدیک ماہ ربیع الاول ۱۰ھ میں وفات کی، اس لحاظ سے تقریباً پندرہ مہینے زندہ رہے، بعض روایتوں میں ہے کہ سولہ مہینے آٹھ دن کی عمر پائی، بعض لوگوں نے مدت حیات ایک برس دس ماہ چھ دن لکھی ہے لیکن صحاح میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ابراہیمؑ ۱۶ یا ۱۸ مہینے تک زندہ رہے۔

*

ازواج مطہرات کے ساتھ معاشرت

ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد نو تک پہنچی تھی، ان میں عام اصولِ فطرت کے موافق ہر مزاج اور ہر طبیعت کی عورتیں تھیں باہم رشک اور منافست بھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہمیشہ فقر و فاقہ سے بسر کرتے تھے، ان کی خورد و پوشش کا انتظام بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے ان کو شکایت کا موقع ملتا تھا، ان تمام حالات کیساتھ آپ کی جبینِ خلق پر کبھی شکن نہیں پڑتی تھی، حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کو بے انتہا محبت تھی، جب وہ عقدِ نکاح میں آئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ریعانِ شباب اور ان کا بڑھاپا تھا، تاہم آپ نے ان کی وفات تک کو کوئی شادی نہیں کی، وفات کے بعد بھی جب کبھی ان کا ذکر آجاتا تو جوشِ محبت سے بے تاب ہو جاتے تھے (تفصیل اوپر گزر چکی ہے)۔

حضرت خدیجہؓ کے بعد حضرت عائشہؓ ازواجِ مطہرات میں سب سے محبوب تر تھیں لیکن محبت کے اسباب وہ نہ تھے جو عام انسانوں میں پائے جاتے ہیں، حسن صورت میں حضرت صفیہؓ ان سے بڑھ کر تھیں اور کم سن بھی تھیں دیگر ظاہری محاسن میں بھی دیگر ازواج ان سے کم نہ تھیں، لیکن حضرت عائشہؓ کی قابلیت، ذہانت، قوتِ اجتہاد، دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات ایسے اوصاف تھے جو اُن کی ترجیح کا اصلی سبب تھے۔

ایک دفعہ چند ازواجِ مطہراتؓ نے حضرت فاطمہ زہراؓ کو سفیر بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جنابِ سیدہؓ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں، دستور کے موافق پہلے اذن طلب کیا، اجازت ملی تو سامنے آئیں اور عرض کی کہ ازواجِ مطہرات نے مجھ کو وکیل بنا کر بھیجا ہے کہ آپ ابوبکرؓ کی بیٹی کو ہم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، جانِ پدر! کیا تم اس کو نہیں چاہتیں جس کو میں چاہتا ہوں۔ جنابِ سیدہؓ کے لئے اتنا کافی تھا، واپس جا کر ازواجِ مطہرات سے کہا میں اس معاملہ میں دخل نہ دوں گی۔

اب اس خدمت (سفارت) کے لئے حضرت زینبؓ انتخاب کی گئیں، کیونکہ ازواج میں سے حضرت زینبؓ کو خصوصیت کے ساتھ حضرت عائشہؓ کی ہمسری کا دعویٰ تھا اس لئے وہی اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں تھیں، انہوں نے یہ پیغام بڑی دلیری سے ادا کیا اور بڑے زور کیساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ چپ سُن رہی تھیں اور رسول اللہ کے چہرہ کی طرف دیکھتی جاتی تھیں، حضرت زینبؓ جب تقریر کر چکیں تو مرضی پا کر کھڑی ہو گئیں اور اس زور شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں، آنحضرتؐ نے فرمایا، کیوں نہ ہو ابوبکر کی بیٹی ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ شادی کرنے کے لئے عورت کا انتخاب چار اوصاف کی بنا پر ہو سکتا ہے، مال، نسب، حسن، دینداری، سو تم دیندار عورت[2] تلاش کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر کام میں سب سے

---

[1] یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بخاری اور دیگر احادیث کی کتابوں میں ہے، الفاظ روایت سے بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق نے طرفین نکتہ چینی اور ایک دوسرے کی کسرِ شان کی تھی، جیسا کہ عام طور پر سوکنیں باہم خانگی جھگڑوں میں کرتی ہیں لیکن یہ کم نظری ہے حضرت عائشہؓ نے اپنی ترجیح کی وہ مسکت دلیلیں بیان کی ہوں گی جس کا جواب سکوت کے سوا کچھ نہ ہو سکتا ہوگا۔ ۲ کتاب النکاح بخاری شریف۔

مقدم جو چیز پیشِ نظر ہوتی تھی وہ دین ہوتا تھا اس لئے ازواج میں بھی وہی زیادہ منظورِ نظر ہوتی تھیں جن سے دین کی خدمت زیادہ ادا ہو سکتی تھی۔ ازواجِ مطہراتؓ کو باریابی کا زیادہ موقع ملتا تھا، وہ خلوت و جلوت کی شریکِ صحبت تھیں، اس لئے مذہبی احکام و مسائل کے علم و اطلاع کا بھی ان کو سب سے زیادہ موقع مل سکتا تھا لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت تھی کہ مسائل کے سمجھنے اور نکاتِ شریعت کی تہ تک پہنچنے کی قابلیت جس قدر زیادہ ہوتی اسی قدر زیادہ تمتع اٹھا سکتا تھا، حضرت عائشہؓ مجتہدانہ دل و دماغ رکھتی تھیں اس لئے قربِ صحبت سے اس قدر فائدہ اٹھا سکیں کہ بڑے بڑے نازک اور دقیق مسائل میں وہ اکابر صحابہ سے مخالفت کرتی تھیں اور انصاف بالائے طاعت است، اکثر مسئلوں میں ان کی فہم و دقتِ نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے، چنانچہ اس کی کسی قدر تفصیل حضرت عائشہؓ کے حالات میں گزر چکی ہے۔

معمول تھا کہ ہر روز آپؐ تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں جو پاس پاس تھے، تشریف لے جاتے ایک ایک کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتے، جب ان کا گھر آجاتا جن کی باری ہوتی تو شب کو وہیں قیام فرماتے یہ ابوداؤد کی روایت ہے، زرقانی نے حضرت ام سلمہؓ کے حال میں لکھا ہے کہ عصر کا وقت ہوتا تھا اور ابتدا حضرت ام سلمہؓ سے ہوتی تھی، بعض روایتوں میں ہے کہ جن کی باری ہوتی تھی انہی کے گھر پر تمام ازواجِ مطہرات آجاتی تھیں اور دیر تک صحبت رہتی تھی، پھر رات گئے سب رخصت ہو جاتی تھیں، اس سے ظاہر ہوگا کہ گو ازواج میں کبھی کبھی منافست کا اظہار ہوتا تھا لیکن دل صاف تھے اور باہم مل کر لطفِ صحبت اٹھاتی تھیں آنحضرتؐ کے شرفِ صحبت نے جس طرح ان آئینوں کو جلا دی تھی اس کا اندازہ افک کے واقعہ سے ہو سکتا ہے جس میں جناب عائشہؓ کو منافقین نے متہم کیا تھا، اس سے بڑھ کر حریفوں کے لئے انتقام کا کیا موقع مل سکتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ غیر متعلق لوگ تہمت لگانے میں آلودہ ہو گئے تھے تاہم ازواجِ مطہرات کا دامن صاف رہا، حضرت عائشہؓ کی بڑی حریف حضرت زینبؓ تھیں لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے استفسار فرمایا تو انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا کہ حاشا یہ محض تہمت ہے، حضرت عائشہؓ جب واقعۂ افک کا ذکر کرتی تھیں تو ہمیشہ حضرت زینبؓ کی پاک باطنی کی شکر گزاری ظاہر کرتی تھیں، چنانچہ بخاری کی متعدد روایتوں میں تفصیلاً مذکور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح ازواجِ مطہرات کی خاطر داری فرماتے اور ان کی نازک مزاجیاں برداشت کرتے تھے اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہوگا۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات سفر میں تھیں، ساربان اونٹ کو تیز ہانکنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا، دیکھنا یہ آبگینے (شیشے) ہیں۔

حضرت صفیہؓ کھانا نہایت عمدہ پکاتی تھیں، ایک دن انہوں نے کھانا پکا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا، آپؐ اس وقت حضرت عائشہؓ کے گھر میں تشریف رکھتے تھے، حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر زمین پر دے مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالے کے ٹکڑے چن چن کر یکجا کئے اور ان کو جوڑا پھر

دوسرا پیالہ منگوا کر واپس کیا۔[1]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے برہم ہو کر بلند آواز سے باتیں کر رہی تھیں، اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ آ گئے اور حضرت عائشہؓ کو پکڑ کر تھپڑ مارنا چاہا کہ تو رسول اللہ سے چلا کر بولتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیچ میں آ گئے اور حضرت عائشہؓ کے آڑے آ گئے، حضرت ابوبکرؓ غصہ میں بھرے ہوئے باہر چلے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کہا کیوں؟ کس طرح تم کو بچا لیا۔ چند روز کے بعد حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو وہ حالت بدل چکی تھی، بولے کہ مجھ کو بھی صلح میں شریک کیجئے جیسا کہ اس موقع پر میں نے جنگ میں شرکت کی تھی، آپ نے فرمایا ہاں اور ہاں۔[2]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تو مجھ سے جب ناراض ہوتی ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں، بولیں کیونکر؟ ارشاد ہوا جب تو خوش رہتی ہے اور کسی بات پر قسم کھاتی ہوتی ہے تو یوں قسم کھاتی ہے محمدؐ کے خدا کی قسم! اور جب ناراض ہو جاتی ہے تو کہتی ہے، ابراہیمؑ کے خدا کی قسم! حضرت عائشہؓ نے کہا ہاں یا رسولؐ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں۔[3]

حضرت عائشہؓ شادی کے وقت بہت کم سن تھیں اور لڑکیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتفاقاً آ جاتے تو لڑکیاں بھاگ جاتیں، آپؐ ان کو بلا کر حضرت عائشہؓ کے پاس بھیج دیا کرتے۔[4]

حبشی ایک چھوٹا سا نیزہ رکھتے ہیں جس کو حراب کہتے ہیں اور جس طرح ہمارے ملک میں پٹہ ہلاتے ہیں حبشی اس سے کھیلتے ہیں، ایک دفعہ عید کے دن حبشی یہ تماشا دکھا رہے تھے، حضرت عائشہؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے کھڑے ہو گئے، حضرت عائشہؓ دوش مبارک پر رخسارے رکھ کر تماشہ دیکھنے لگیں اور دیر تک دیکھتی رہیں، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کیوں ابھی تک تم سیر نہیں ہوئیں، بولیں نہیں، آپ چپ رہے، یہاں تک کہ خود تھک کر ہٹ گئیں۔[5]

ایک دفعہ حضرت عائشہؓ گڑیوں سے کھیل رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے تشریف لائے، گڑیوں میں ایک گھوڑا بھی تھا جس کے پر بھی تھے، آپ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ بولیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں کے پر بھی تھے، آپ نے تبسم فرمایا۔[6] عوام میں مشہور ہے کہ پہلے گھوڑوں کے پر ہوتے تھے، حضرت سلیمانؑ نے اس بنا پر کہ گھوڑ سواری کی سیر میں ان کی نماز قضا ہو گئی تھی، پر کٹوا دیئے، اس وقت سے پر جاتے رہے لیکن نشان اب بھی باقی ہے حضرت عائشہؓ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایک دفعہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آؤ تیز قدمی میں مقابلہ کریں، حضرت عائشہؓ اس وقت ہلکی پھلکی تھیں، آگے نکل گئیں، جب سن زیادہ ہوا اور پُر اندام ہو گئیں تو پھر مسابقت کی نوبت آئی، اب کے وہ پیچھے رہ گئیں، آپ نے فرمایا یہ اس دن کا جواب ہے۔[7]

---

[1] بخاری میں یہ روایت کتاب النکاح کے ذیل میں ہے لیکن ازواج کے نام نہیں، نسائی میں نام کی تصریح ہے لیکن روایت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی المزاح۔ [3] صحیح مسلم۔ [4] ایضاً۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب۔ [6] ابوداؤد۔

ازواج مطہرات اور اہل و عیال کی سادہ زندگی

انسان بذاتِ خود فاقہ کشی کر سکتا ہے سخت سے سخت تکلیفیں اٹھا سکتا ہے، زخارفِ دنیوی کو کلیۃً چھوڑ سکتا ہے لیکن وہ اپنے اعزہ و اقربا بالخصوص عزیز ترین اولاد کو اس قسم کی سادہ اور متقشفانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے راہبانہ زندگی بسر کی ہے، انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اہل و عیال کے جھگڑوں سے الگ رکھا ہے، دنیا کی مذہبی تاریخ میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کلیہ کی ایک مستثنیٰ مثال ہے آپ کے و بیبیاں تھیں جن میں بعض ناز و نعمت میں پلی تھیں، اکثر معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں، اس لئے ان کا قدرتی میلان غذا ہائے لطیف اور لباس ہائے فاخرہ کی طرف ہو سکتا تھا متعدد صغیر السن بچے تھے جن کو کھانے پہننے کی ہر خوشگوار اور خوشنما چیز اپنی طرف مائل کر سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ اوپر کے واقعات سے معلوم ہوا ہو گا، اعزہ اولاد ازواج مطہرات کے ساتھ سخت محبت تھی، آپ نے رہبانیت کا بھی قلع قمع کر دیا تھا اور فتوحات کی کثرت مدینہ میں مال و زر کے خزانے لٹا رہی تھی لیکن بایں ہمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کی طرح اُن کو بھی زخارفِ دنیوی کا خوگر نہیں بنایا، بلکہ ہر موقع پر روک ٹوک کی، اس بنا پر آپ کے تمام خاندان کی زندگی آپ کے اسوۂ حسنہ کا اعلیٰ ترین مظہر بن گئی۔

حضرت فاطمہؓ آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں، لیکن انہوں نے آپ کی محبت سے کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا ان کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ اس قدر چکی پیستی تھیں کہ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر گٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چکٹ ہو جاتے تھے، چولہے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہو جاتے تھے لیکن بایں ہمہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار گھر کے کاروبار کیلئے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقراء و یتامیٰ کا حق ہے[1]

ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کے پاس آئے، دیکھا کہ انہوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے[2]۔

صرف یہی نہیں کہ خود عام طریقہ اظہار محبت کے خلاف ان کو آرائش و زیب و زینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے بلکہ اس قسم کی جو چیزیں ان کو دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں، ان کو بھی ناپسند فرماتے تھے، چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ان کو سونے کا ایک ہار دیا، آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا کیوں فاطمہؓ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے، چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے اس کو فوراً بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا[3]۔

ایک دفعہ آپ کسی غزوہ سے تشریف لائے، حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم کے گھر کے دروازوں پر پردہ لگایا اور امام حسن و امام حسین علیہما السلام کو چاندی کے کنگن پہنائے، آپ حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے یہاں آئے تو اس دنیوی ساز و سامان کو دیکھ کر واپس گئے، حضرت فاطمہؓ کو آپ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردہ چاک کر دیا اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے، بچے آپ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے، آپ نے فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ

---

[1] ابوداؤد [2] ایضاً [3] نسائی کتاب الزینۃ۔

وہ ان زخارفِ دنیا سے آلودہ ہوں، اس کے بدلے فاطمہ کے لئے ایک عصیب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ[1]، ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپؐ کو جو محبت تھی اس کا اظہار کبھی دنیا دارانہ طریقہ سے نہیں ہوتا تھا چنانچہ ازواجِ مطہرات نے جب اچھے کھانے اور اچھے لباس کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے ان سے ایلا کر لیا، تمام ازواج میں آپؐ کو حضرت عائشہؓ سب سے زیادہ محبوب تھیں، لیکن یہ محبت رنگین لباسوں اور سنہرے زیوروں کی صورت میں کبھی نہیں ظاہر ہوئی، تمام بیبیوں کا جو لباس تھا وہی حضرت عائشہؓ کا تھا چنانچہ وہ خود فرماتی ہیں،

ما کانت لاحدانا الا ثوب واحد (بخاری ج ا ص ۵۴) ہم تمام بیبیوں کے پاس صرف ایک ایک جوڑا کپڑا تھا۔

اگر کبھی اس کے خلاف ان کے بدن پر دنیوی آرائش کے سر و سامان نظر آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منع فرماتے، ایک مرتبہ انہوں نے سونے کے کنگن (مسکہ) پہنے آپؐ نے فرمایا، اگر ورس کے کنگن زعفران سے رنگ کر پہنتیں تو بہتر ہوتا (تمام اہل وعیال و خانوادۂ نبوت کو ممانعت تھی کہ وہ پُرتکلف و ریشمی لباس اور سونے کے زیور استعمال نہ کریں، آپؐ اُن سے فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم کو اس کی تمنا ہے کہ یہ چیزیں جنت میں ملیں تو دنیا میں اُن کے پہننے سے پرہیز کرو،)

انتظامِ خانگی

اگرچہ ازواجِ مطہراتؓ کی تعداد ایک زمانہ میں ۹ تک پہنچ گئی تھی اور اس وجہ سے خانہ داری کے بہت سے بکھیڑے تھے تاہم آپؐ کو خود بہ نفسِ نفیس ان چیزوں سے سروکار نہ تھا، اپنی ذات کی نسبت تو التزام تھا کہ جو کچھ آتا دن کے دن صرف ہو جاتا، یہاں تک کہ اگر دے دلا کر کچھ باقی رہ جاتا تو آپؐ اس وقت تک گھر میں نہ جاتے جب تک وہ بھی کارِ خیر میں صرف نہ ہو جاتا، لیکن ازواجِ مطہراتؓ اور مہمانوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام حضرت بلالؓ کے متعلق تھا، ابوداؤد میں عبد اللہ ہوزنی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ کے خانگی انتظام کا کیا حال تھا؟ انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام کاروبار میرے سپرد تھا اور آغاز سے اخیر زمانہ وفات تک میرے ہاتھ میں تھا، معمول تھا کہ جب کوئی نادار مسلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھ کو ارشاد ہوتا، میں جا کر کہیں سے قرض لاتا اور اس کے کھانے کپڑے کا انتظام کر دیتا[2]۔

اہل وعیال کے مصارف کا انتظام

ازواجِ مطہراتؓ کے لئے یہ انتظام تھا کہ بنو نضیر کے نخلستان میں ان کا حصہ مقرر کر دیا گیا تھا، وہ فروخت کر دیا جاتا جو سال بھر کے مصارف کے لئے کافی ہوتا[3]، خیبر فتح ہوا تو ازواج کے لئے فی کس ۸۰ وسق کھجور اور ۲۰ وسق جو سالانہ مقرر ہو گیا، وسق ۹۰ صاع کا ہوتا ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بعض ازواج نے جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں پیداوار کے بدلے زمین لے لی[4]۔

---

[1] نسائی کتاب الزینۃ [2] جلد دوم باب فی الامام یقبل ہدایا المشرکین [3] بخاری ص ۸۰۶ [4] بخاری کتاب المزارعۃ جلد اول ص ۳۱۳۔

*

تم المجلد الثانی من السیرۃ النبویۃ علی صاحبہا الصلوۃ و التحیۃ

اعانہ [illegible] وسعی فی تنقیحہ [illegible] محمد الدین [illegible] الصوالحی [illegible] دار العلوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دلائل و معجزات

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ (مائدہ)

اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا کیے۔

روحانی نوامیس کا وجود

سیرت نبوی کا یہ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق اس عالم سے ہے جو ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی قوانین کے حدود سے باہر ہے، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے، مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے، فصل و موسم ہے۔

؎ آسمانہاست در ولایت جاں
کار فرمائے آسمان جہاں

نبوت کے فطری و روحانی آثار

جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے اور آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے تو موسم بدلتا ہے اور بہار نبوت[1] رونق افزا ہوتی ہے۔

اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا کی رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوت و رسالت کے خاص خاص اصول و قواعد ہیں جن میں تغیر راہ نہیں پاتا، انبیاء و رسل اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل نے ہمارے علم و دانش

---

[1] خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باوجود سے پہلے انبیاء کا سلسلہ جاری رہا، حضورؐ کی آمد کے بعد جانشینان نبوت محمدی یعنی مجددین امت اس فرض کو انجام دیتے ہیں، یہ مجددین ملت رسولؐ کے متبع کامل ہوتے ہیں اور منصب نبوت سے عاری ہوتے ہیں اسی لئے ان کے انکار سے کفر نہیں لازم آتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف ملکوں میں یا ایک ہی ملک کے مختلف حصوں میں یا مختلف علوم میں مختلف مجددین ملت ہوں، ان کی پہچان کا سب سے بڑا معیار عقائد و اعمال، اخلاق اور طرق دعوت میں رسول اکرمؐ کا اتباع کامل ہے، ان کا کام یہ ہے کہ وقت کے اوہام و رسوم و اعمال کو جو باہر سے آ کر دین میں شامل ہو گئے ہوں دور کریں اور امور دین میں جو امور مٹ گئے ہوں ان کو دوبارہ جاری کریں۔

سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

نبوت کے روحانی نوامیس انسانی قوانین پر حکمران ہیں

جس طرح ہمارا نفس اور ہماری روح یا ہمارے جسم کی پر اسرار مخفی قوت ہمارے کالبد خاکی پر حکمران ہے اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارے پر حرکت کرتے ہیں، اسی طرح نبوت کی روح اعظم اذن الٰہی سے سارے عالم جسمانی پر حکمراں ہو جاتی ہے اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں، اس لئے وہ چشم زدن میں فرش زمین سے عرش بریں تک عروج کر جاتی ہے، سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے، چاند اس کے اشارہ سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھوں کی رچی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں، اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں، اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکم الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں، وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فعل ہوتا ہے اور اسی کی مشیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں۔

نبوت کے روحانی نوامیس کے اسباب و علل سے ہم اسی طرح لاعلم ہیں جس طرح جسمانی قوانین کے

لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں، پھول سرخ کیوں ہوتے ہیں؟ ستارے چمکتے کیوں ہیں؟ شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے؟ چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں؟ تخم اور درخت اغذا، خون، گوشت کیونکر بن جاتا ہے، اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیونکر ہوتا ہے اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال و اعمال بحکم الٰہی کیونکر صادر ہوتے ہیں؟ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں، چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پراسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات و کیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات و سوانح غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے تھے جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ وہ، وہ کچھ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ، وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جان سکتے اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سکندر اور نپولین کی فتوحات اور بدھ اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے۔ جودت سے ہندوستان کی روحانی داستان کا ایک ایک حرف، اسرائیلی نبیوں کے صحیفوں کا ایک ایک باب اور عیسائیوں کی انجیل کا ایک ایک صفحہ اس تاریخ کی مثالیں اور نظیریں ہیں۔

انبیاء کا اصلی معجزہ خود ان کا سراپا وجود ہے

گو پیغمبر کا اصلی معجزہ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی کھلی نشانی خود اس کا سراپا وجود ہوتا ہے، دیکھنے والوں کے لئے اس کی چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لئے اس کے لب و لہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لئے اس کے پیام و دعوت میں اعجاز ہوتا ہے، لیکن جو لوگ احساس حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی

اور محسوس نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں، جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں۔

انبیاء کے کامل پیرو اُن سے معجزہ نہیں مانگتے تھے

لیکن انبیاء کے متبعین میں سے سابقین اولین اور صدیقین و صالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت عیسیٰ کے حواریوں نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر نہیں تسلیم کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا، حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں بلکہ یہ جان کر کہ آپ غریبوں کے دست و بازو ہیں قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں[1]، حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ اور دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا، ان کے لئے آپ کا سراپا وجود و نفس دعوت حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا، انہوں نے اسی کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی۔

معاندین معجزوں کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے

مگر نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب جو آتش خلیل، طوفان نیل، قحط مکہ اور انشقاق قمر کے معجزوں کے طالب تھے پھر بھی ایمان کی دولت عظمیٰ سے محروم رہے، لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے جس کی بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ چھائیاں پڑی ہوتی ہیں، جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی گرم کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو چمک اٹھتے ہیں اور آمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (طٰہٰ-۳) پکار اٹھتے ہیں۔

معجزوں سے کن کو فائدہ پہنچتا ہے؟

فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو موسیٰؑ و ہارونؑ کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح روم[2] کی پیشین گوئی پوری ہوئی تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشم باطن کھل گئی اور حقیقت کا پیکر ان کے سامنے جلوہ نما ہو گیا، یہی طبقہ ہے جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدر استعداد حصہ پہنچتا ہے، اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ مؤیدات یعنی تائید حق کے لئے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے، مومنین صادقین کو مشکلات کے الم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دی جاتی ہے اور رسوخ ایمان اور ثبات قدم مرحمت ہوتا ہے ان کی بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات کی جاتی ہے اور اس سے ان کی دولت ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

ان واقعات کا اصطلاحی نام

حضرات انبیائے کرامؑ سے جو یہ مافوق العادۃ کیفیات اور اعمال صادر ہوتے ہیں، ان کے لئے عام طور پر "معجزہ" کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن یہ اصطلاح کئی حیثیتوں سے غلط ہے، اول تو اس لئے کہ قرآن مجید اور احادیث میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ آیت (نشانی)، اور برہان (دلیل)، کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہیں، قدیم محدثین[3] نے ان کی جگہ دلائل و علامات کے الفاظ استعمال کئے ہیں جو الفاظ قرآنی کے ہم معنی ہیں، دوسرے یہ کہ عام استعمال

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔ [2] جامع ترمذی تفسیر سورۂ روم۔ [3] جیسے دلائل النبوۃ ابی نعیم اصبہانی متوفی [illegible] اور دلائل النبوۃ [illegible] اعلام النبوۃ [illegible] متوفی ۴۵۰ھ وغیرہ۔ [illegible]

کی بنا پر معجزہ کے اندر کچھ خاص لوازم ذہنی پیدا ہو گئے ہیں، جو حقیقت میں صحیح نہیں ہیں، مثلاً اس لفظ سے عوام میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خود پیغمبر کا فعل ہوتا ہے جس کا صدور خاص اس کے اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے اور نیز یہ کہ اس لفظ کے سبب سے اس کا معجزہ ہونا گویا اس کی حقیقت میں داخل ہو گیا ہے، حالانکہ یہ دونوں خیال غلط ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ معجزہ پر عقلی حیثیت سے جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، ان کا ایک بڑا حصہ خود لفظ معجزہ کے غلط استعمال سے پیدا ہو گیا ہے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو ایک ایسا جامع لفظ درکار ہے جس میں نبوت کے تمام خواص کیفیات، مشاہدات اور اعمال خارقِ عادت اور غیر خارقِ عادت سب داخل ہیں، لیکن معجزہ کا لفظ اتنا وسیع نہیں، آئندہ جہاں از روئے قرآن معجزہ کی حقیقت پر بحث آئے گی، وہاں اس کے متعلق یہ تفصیل کی جائے گی جس سے معلوم ہو گا کہ قرآن پاک کی اصطلاح کس قدر صحیح اور موزوں ہے، ان وجوہ کی بنا پر صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اس کتاب میں صرف قرآن کی اصطلاح آیت، برہان اور محدثین کی اصطلاح علامات و دلائل کو اختیار کریں تاکہ ہمارا مفہوم زیادہ صحیح طریقہ سے اور زیادہ وسیع طور سے ادا ہو سکے، لیکن چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل گیا ہے اس لئے اس کو یک قلم ترک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دلائل و براہین و آیات کا تعلق انبیاء کی سیرتوں سے

قرآن مجید اور دیگر صحفِ آسمانی میں انبیائے سابقین علیہم السلام کے جو قصص اور واقعات مذکور ہیں ان میں ان کے روحانی حالات و کیفیات یعنی دلائل و براہین اور آیات کا ذکر نہایت مؤثر اور حیرت انگیز طریقہ سے کیا گیا ہے، سیر ملکوت، مکالمہ الٰہی، رویت ملائکہ، رویائے صادقہ، استجابت دعا، طوفان نوح، آتش خلیل، عصائے موسیٰؑ، نفس عیسیٰؑ اور اس قسم کے اور بھی بہت سے کیفیات و حالات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور ان کے ساتھ ان کے عواقب و نتائج بھی نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے ہر زمانہ میں ان چیزوں کو خاص تعلق رہا ہے اور اس وجہ سے وہ ان کے واقعاتِ زندگی کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی زندگی اگرچہ گوناگوں واقعات کا مجموعہ ہوتی ہے لیکن نتائج کے لحاظ سے ان تمام واقعات کا مرکز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس خاکدان کو اخلاق ذمیمہ کے خس و خاشاک سے پاک کر کے محاسنِ اخلاق کے گل و ریحان سے آراستہ کیا جائے تاکہ برکات آسمانی کا دامن کانٹوں سے الجھنے نہ پائے، اس مقدس فرض کے ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں اور مادی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست و بازو سے زیادہ ان کے روحانی دست و بازو کام کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے اور ان کے ذکر سے گویا انبیاء علیہم السلام کے تمام حالات زندگی کو سلسلۂ علل و اسباب سے مربوط کر دیا ہے۔

دلائل و آیات کا تعلق سیرت محمدی ﷺ سے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعات

زندگی کا خلاصہ، ان کی تعلیمات کا عطر اور ان کے حالات و مشاہدات کا برزخ ہے، آپ ایک عالمگیر اور ابدی مذہب لے کر مبعوث ہوتے تھے، اس لئے آپ نے ایک ہی خطاب کے ساتھ ان تمام لوگوں کو مخاطب فرمایا جن کو طوفانِ نوح دفعۃً بہالے گیا تھا جن کو دریائے قلزم کی موجیں نگل چکی تھیں جن کو نفسِ عیسیٰ نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا اور ان سب سے بڑھ کر آپ کا مخاطب ایک گروہ اور بھی تھا جو ان چیزوں کو صرف عجائب پرستی کی نگاہ سے نہیں بلکہ ژرف نگاہی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس بنا پر جس چشمۂ فیض نے اسباطِ موسیٰؑ کو سیراب کیا تھا وہ ان تشنہ کامانِ روحانیت سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا، چنانچہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا جو علی قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لئے ضروری تھے، آپ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے، آپ کی شریعت معجزہ تھی، آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لئے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی، کبھی ماکذب الفؤاد کے نور سے قلبِ مبارک کو منور کیا اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزولِ رحمتِ الٰہی کے لئے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادیٔ حق کے پیاسوں کے لئے زمین کی تہہ سے پانی کے چشمے نکالے، کبھی سنگِ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہائے بشارت سنائے، اور آئندہ دنیا کے واقعاتِ غیب بتا کر رہروانِ عالم کو منزلِ حقیقت کے نشان دکھائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی کا سب سے بڑا جزو غزوات و محاربات ہیں اور ان ہنگامہ خیز واقعات کے تاریخی علل و اسباب اور ان کے نتائج کا ذکر کتاب کے ایک حصہ میں بتصریح گزر چکا ہے لیکن جہاد کے میدان میں آپ کو جو فتوحاتِ عظیم حاصل ہوئیں ان میں انسانوں کے لشکر اور سپاہیوں کے تیغ و خنجر سے زیادہ فرشتوں کے پرے، دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے اور روئے انور نے، نگاہِ کیمیا اثر نے، تقریرِ دلپذیر نے، اخلاقِ اعجاز نما نے، آیات و دلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے، غرض آپ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر منظر میں یہ دلائل یہ براہین یہ آیات یہ معجزات، اسباب ظاہری کے پہلو بہ پہلو اسباب حقیقی بن کر رونما ہوتے رہے ہیں۔

دلائل و معجزات اور عقلیت

ان دلائل و معجزات کے الفاظ کو سننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے دلوں میں یہ سوال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہیں؟ کیا عقلِ مجردہ ان کے وقوع کو باور بھی کرتی ہے؟ دنیا میں عقل و نقل اور فلسفہ و مذہب کا جب سے وجود ہے، ان مباحث پر معرکہ آرا بحثیں ہوتی چلی آئی ہیں، لیکن فلسفہ قدیمہ ہو یا جدیدہ، فلسفہ یونان ہو یا فلسفہ اسلام، مشرق کا فلسفہ ہو یا مغرب کا، ان سب کا حاصل بحث یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ فریق ان کو ممکن بلکہ واقع سمجھتے ہیں تو [illegible] ان کو محال قطعی تصور کرتے ہیں، عقل و فہم [illegible] ہر آنے والی دنیا [illegible]

قائل ہیں، وہ خود اپنے کج بحث دل اور بدگمان قلب کی تسلی و طمانیت اور رفع شک کے لئے اپنے اپنے فہم و ادراک کے موافق مختلف نظریئے قائم کرتے ہیں، تاکہ وہ اپنی راز جو طبیعت کی تشنہ لبی کو تسکین دے سکیں، ان تمام نظریات کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ ان عقل و حواس سے مافوق حقائق کو اپنے دریافت کردہ معلوم و محسوس قواعد کے مطابق بنا سکیں، لیکن کیا یہ ممکن ہے کیا محسوس، وغیر محسوس یا جسمانی و روحانی دنیا، دونوں ایک ہی نظام پر چل رہی ہے کہ ایک عالم کے قیاس تمثیلی و استقرائی سے ہم دوسرے عالم کے ثبوت پر شہادتوں کا انبار لگانا چاہتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ جو جانا نہیں جاسکتا اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں اور جو سمجھا نہیں جاسکتا اس کو سمجھنا چاہتے ہیں، جب ہماری عقل و فہم کی لنگ پائی محسوسات کے میدان میں صاف نظر آتی ہے تو ماورائے محسوسات میں ان کی تگاپو کہاں تک منزل مقصود کے قریب کر سکتی ہے۔

آنانکہ وصف حسن تو تقریر می کنند
خواب نہ دیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

بہرحال اب تک انسان نے اس خواب نادیدہ کی جو کچھ تعبیر کی ہے وہ قرن کے اوراق میں پھیلائی گئی ہے اور سلسلہ بحث میں سب سے پہلے فلسفہ قدیمہ کے نظریات کی تشریح کی گئی ہے اور اس کے بعد فلسفہ جدیدہ ان عقدوں کی گرہ کشائی جہاں تک کر سکتا ہے اس کی تفصیل ہے اور آخر میں خود قرآن مجید نے ہمیں اس باب میں جو کچھ تلقین کی ہے اس کو بیان کیا جائے گا۔

*

دلائل و معجزات اور فلسفہ قدیم و علم کلام

اسلام میں عقائد کی سطح جب تک صاف اور ہموار رہی، دلائل اور معجزات کے متعلق عقلی مباحث نہ پیدا ہوئے تھے نہ پیدا ہو سکتے تھے، لیکن دوسری صدی میں جب یونانی علوم کے تراجم مسلمانوں میں پھیلے تو وہ ہمارے علم کلام کے ضروری اجزا بن گئے اور ان کو اس درجہ اہمیت ہو گئی کہ اب ان سے قطع نظر کر لینے کے بعد گویا موضوع زیر بحث کے لئے تشنہ رہ جاتا ہے۔

اہل یونان کسی شریعت الٰہی سے مشرف نہ تھے اس لئے وہ نبوت، خواص نبوت، نبی، الہام اور معجزہ وغیرہ سے واقف نہ تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص فلسفہ میں ان مباحث کا وجود نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن رشد نے تہافۃ التہافۃ میں اس کی خاص تصریح کی ہے اور علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اپنی تصنیفات میں اس کو جابجا لکھا ہے۔ مسلمانوں میں سب سے پہلا فلسفی یعقوب کندی ہے، لیکن چند مختصر رسائل کے سوا اس کی تمام تصنیفات ناپید ہیں، کندی کے بعد فارابی کا زمانہ ہے اور اسی نے سب سے پہلے ان مسائل کے متعلق اپنے خاص نظریے قائم کئے، چنانچہ اس نے اپنے رسالہ فصوص الحکم[1] میں نبوت اور خواص نبوت کے متعلق بہ ترتیب حسب ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں۔

فقرہ ۲۸:۔ صاحب نبوت کی روح میں ایک قوت قدسیہ ہوتی ہے جس طرح تمہاری روح عالم اصغر کیا یعنی اپنے جسم میں تصرف کرتی ہے اور تمہارا جسم تمہاری روح کا تابع و فرماں بردار رہتا ہے، اسی طرح وہ روح قدسی عالم اکبر میں یعنی تمام جسمانیات میں تصرف کرتی ہے اور تمام عالم جسمانی اس کا فرماں بردار و تابع رہتا ہے، اور اسی بنا پر اس سے خارق فطرت معجزات صادر ہوتے ہیں، اور چونکہ اس کا آئینہ باطنی صاف اور زنگ و غبار سے پاک ہوتا ہے اس لئے لوح محفوظ یعنی اس کتاب میں جو کبھی غلط نہیں ہو سکتی اور ملائکہ کی ذاتوں میں جو کچھ ہے اس کا عکس اس کے آئینہ پر پڑتا ہے اور وہ قدرت قدسیہ یا روح قدسی اس کو مخلوقات تک پہنچاتی ہے۔

فقرہ ۲۹:۔ ملائکہ ان صور علمیہ کا نام ہے جو بذاتہا قائم ہیں، اس طرح نہیں جس طرح لوح کے نقوش یا ذہن میں معلومات ہوتے ہیں بلکہ خود معانی قائم بالذات ہیں اور وہ امر الٰہی سے فیض حاصل کرتے ہیں، عام روح بشری تو حواس ظاہری کے تعطل یعنی خواب میں اس امر الٰہی سے لگاؤ پیدا کرتی ہے لیکن روح نبوی بیداری میں اس سے تعلق طلب کرتی ہے۔

فقرہ ۳۰:۔ عام روح بشری کا حال یہ ہے کہ جب اس کے حواس ظاہری مشغول ہوتے ہیں تو حواس باطنی معطل ہو جاتے ہیں اور جب حواس باطنی کام لیتے ہیں تو حواس ظاہری بیکار ہو جاتے ہیں مگر ارواح قدسیہ کا یہ حال ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان کے حواس ظاہری کی مصروفیت ان کے حواس باطن کو اور ان کے حواس باطن کی مشغولیت ان کے حواس ظاہری کو معطل نہیں ہونے دیتی، اور دونوں ایک دوسرے کے فرائض میں مخل نہیں ہوتے بلکہ ان کی تاثیر کا عمل ان کے اجسام سے متعدی ہو کر دوسرے اجسام تک پہنچتا ہے اور وہ انسانی تعلیم سے نہیں، بلکہ ارواح و ملائکہ کے ذریعہ سے علم کی تلقی کرتے ہیں۔

---

[1] فصوص الحکم یورپ اور مصر دونوں میں چھپ گئی ہے، اس وقت میرے پیش نظر لیڈن ڈیٹریسی کا نسخہ مطبوعہ ۱۸۹۰ء ہے۔

فقرہ ۱۴: عام روحوں کی درماندگی یہاں تک ہے کہ نہ صرف یہ کہ حواس ظاہری کی مصروفیت حواس باطنی کو اور حواس باطنی کی مصروفیت حواس ظاہری کو اپنے فرائض سے باز رکھتی ہے، بلکہ خود ان کے ایک حس کی مشغولیت دوسرے حس کو بیکار کر دیتی ہے، ہم جس وقت غور سے سنتے ہیں دیکھتے نہیں، جب دیکھنے میں مستغرق ہوتے ہیں تو سنتے نہیں، خوف کا احساس ہو تو اشتہا نہیں پیدا ہو سکتی، اشتہا ہو تو غصہ نہیں پیدا ہو سکتا، جب ہم فکر کرتے ہیں تو ذکر سے غفلت ہو جاتی ہے اور جب ذکر کرتے ہیں تو تفکر سے خالی ہو جاتے ہیں، لیکن ارواح قدسیہ کی یہ حالت نہیں ہوتی، ان کے تمام ظاہری و باطنی حواس ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور ان کا ایک حاسہ دوسرے حاسہ کا عائق و مانع نہیں ہوتا۔

فارابی کے یہی چند لفظ ہیں جو ابن سینا اور ابن مسکویہ تک پہنچتے پہنچتے ایک داستان بن گئے ہیں اور اب چھوٹی اور بڑی تمام اسلامی فلسفیانہ تصنیفات میں باب النبوۃ کے نام سے یہ مسائل شامل ہیں، یہاں تک کہ امام غزالی و رازی کی تصنیفات سے ان ہی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ صوفیہ کے لسان القوم مولانا روم کے ساز نغمہ سے بھی یہی آواز نکلتی ہے۔ فلسفہ و عقل کی راہ سے جو حکمائے اسلام منزل حقیقت کے جویاں ہیں ان کے نزدیک نبی وہ ہے جس میں یہ تین باتیں جمع ہوں۔

۱۔ اول یہ کہ اس کو امور غیب پر اطلاع ہو۔
۲۔ دوسرے یہ کہ ملائکہ اس کو نظر آئیں اور وہ اس سے کلام کریں۔
۳۔ تیسرے یہ کہ اس سے خوارق عادت ظاہر ہوں۔

ان تینوں دعووں کے امکان پر ان کے دلائل بہ ترتیب یہ ہیں۔

اطلاع غیب

یہ عالم کائنات ایک باترتیب اور مسلسل نظام فطرت پر قائم ہے جس کا ہر درجہ دوسرے درجہ سے بلند ہے، پہلے جمادات ہیں جن میں نہ حرکت ہے نہ نمو، نہ احساس ہے نہ ارادہ، نہ نطق ہے نہ ادراک کلیات کی قوت، اس کے بعد نباتات کا درجہ ہے جن میں حرکت اور نمو تو ہے لیکن وہ دوسرے صفات سے محروم ہیں، اس کے بعد حیوانات آتے ہیں جن میں حرکت اور نمو کے ساتھ ارادہ و احساس بھی ہے، سب سے آخر انسان کا مرتبہ ہے جس میں ان تمام خصوصیات کے ساتھ نطق اور ادراک کلیات کی قوت بھی ہے، کائنات کے ان چاروں طبقوں میں بھی یکسانی نہیں ہے، بلکہ ان میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ایک ترقی محسوس ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کا پست تر نقطہ اپنے پچھلے سے بلند تر اور پچھلا اگلے سے جا کر مل جاتا ہے، لیکن کیا اس ترقی کی انتہا یہیں پر جا کر ختم ہو جاتی ہے؟ نہیں! ابھی نطق و ادراک اور احساس و تمیز کا مرتبہ کمال کو نہیں پہنچا ہے، انسانوں میں وحشی اور غیر متمدن قبائل سے شروع کرو تو ان سے ترقی یافتہ دہقانی اور گنوار ہیں، ان سے اعلیٰ شہری اور متمدن ہیں اور ان سے زیادہ بلند تر علماء اور عقلائے روزگار ہیں جو فکر و نظر اور قیاس و استدلال سے مجہول کو معلوم کرتے ہیں، لیکن انسانوں کی بلند ترصنف وہ ہے جس کی عقل و دانش کے سامنے نظریات بھی بدیہیات ہیں، جن کی روح قدسی اپنے تمام معلومات کو تجربہ [illegible] ذریعہ سے نہیں بلکہ براہ راست عالم ملکوت سے حاصل کرتی ہے، جن کے حواس کی طاقت عام انسانوں سے اس قدر تیز اور قوی ہے کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے ہیں جو عام انسان نہیں دیکھ

سکتے ہیں، وہ وہ کچھ سنتے ہیں جو عام انسان نہیں سن سکتے، یہ قوت کمالیہ اور یہ روح قدسیہ جن صنفِ انسانی میں پائی جاتی ہے وہی انبیاء ہیں۔

رویت ملائکہ

انسان کے اندر احساس کا منبع روح ہے، اور اس کے آلات و ذرائع اس کے باطنی اور ظاہری حواس ہیں، اگر اس سطح زمین پر کوئی ایسا انسان ہو جو ان تمام آلات سے مبرا ہو، تو وہ کسی شے کا احساس کر سکتا ہے اور نہ کسی چیز کا علم حاصل کر سکتا ہے، لیکن جیسے علم و احساس کے ان آلات میں ترقی اور تیزی آجاتی ہے اسی کے علم و احساس میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک خاص نقطہ پر آکر وہ رک جاتے ہیں اور مادیات و محسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتے، لیکن خواب کی حالت میں روح کو مادیت اور محسوسات کی زنجیروں سے جب آزادی ملتی ہے تو غیر مادی چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ روح انسانی کے علائق جس قدر مادیات سے پاک ہونگے اسی قدر اس کے علم و احساس کے قویٰ میں ترقی ہوگی اور جس قدر اس عالم مادی سے اس کو افتراق ہوگا اسی قدر عالم غیب کے ساتھ اس کا اتصال بڑھتا جائے گا، اس بنا پر اگر کسی روح میں اس قدر استعداد اور صلاحیت عطا ہوئی ہو کہ وہ عالم بیداری میں بھی ان مادی تعلقات کو منقطع کر سکتی ہو تو جو کچھ عام روحوں کو خواب میں نظر آتا ہے اس سے بہت بڑھ کر اس کو بیداری میں محسوس و مشاہد ہو سکتا ہے، وہ غیب کی آوازوں کو سن سکتی ہے، فرشتوں کو دیکھ سکتی ہے، ان سے باتیں کر سکتی ہے اور ان کے ذریعہ سے علم و معرفت کا فیض حاصل کر سکتی ہے۔

خوارق عادت

دنیا کے مادی حوادث جس طرح مادی اسباب و علل کے نتائج ہیں اسی طرح وہ نفسیاتی اسباب کے نتائج بھی ہوتے ہیں، نفس کے اندر مختلف قسم کے جذبات اور حرکات پیدا ہوتے ہیں اور ان سے ہمارا مادی جسم متاثر ہوتا ہے، درخت یا دیوار پر چڑھنے والے کو اکثر یہ پیش آتا ہے کہ جہاں اس کے دل میں خوف پیدا ہوا اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ کانپ جاتا ہے اور گر پڑتا ہے، کبھی خوف سے انسان بے ہوش ہو جاتا ہے، بیمار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے، شرمندگی اور خجالت سے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے، غیظ و غضب میں چہرہ تمتما اٹھتا ہے، یہ کمزور نفوس کا حال ہے اس سے زیادہ قوی نفوس اپنے اثرات سے دوسروں کو متاثر کر لیتے ہیں اور اپنی قہر و محبت کی نگاہ سے دوسروں کو اپنا معمول بنا لیتے ہیں، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصحاب نفوس قدسیہ اور ارباب قوت کمالیہ اس مادی دنیا میں بہت کچھ تصرف کر سکتے ہیں[1]۔

اکثر متکلمین اسلام نے پہلی اور دوسری شقوں کو ایک میں داخل کر دیا ہے اور ہیں بھی وہ درحقیقت ایک، یعنی امور غیب کی اطلاع، ملائکہ اور روحانیت کا مشاہدہ، رویت اور ان سے تخاطب، یہ تمام تر وحی و مشاہدہ روحانیت کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں اور تیسری چیز کا نام ان کی زبان میں معجزہ ہے، ہم ان دونوں پر الگ الگ بحث کرتے ہیں۔

*

---

[1] ابن سینا نے اشارات میں تفصیل سے اور نجات میں اختصار کے ساتھ ان نظریات کو بیان کیا ہے، امام رازی نے مباحث مشرقیہ میں اور ابن مسکویہ نے فوز الاصغر میں ان کو لکھا ہے، دیگر فلسفیانہ تصانیف میں بھی کم و بیش یہی ہے۔

وحی و مشاہدہ

ہمارے حکمائے متکلمین اور صوفیہ نے وحی و الہام اور مشاہدۂ روحانیات کی تشریح میں متعدد نظریے قائم کیے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) الہامِ فطری اور الہامِ نوعی:- دنیا میں جتنی چیزیں پردۂ عدم سے منصۂ وجود پر آتی ہیں، وہ اپنے اپنے وجود کے ساتھ مختلف قسم کے خواص اور فطری علم اپنے ساتھ لاتی ہیں، گلاب کا پھول سرخ اور چنبیلی سفید کیوں ہوتی ہے؟ گنّا میٹھا اور اندرائن کڑوا کیوں ہوتا ہے؟ ایک ہی زمین اور ایک ہی آب و ہوا میں مختلف پودے اُگتے ہیں مگر ہر ایک کا رنگ، مزہ اور بُو مختلف کیوں ہوتی ہے؟ ان کے خواص اور کیفیات میں کیوں اس درجہ اختلاف ہوتا ہے؟ پرندہ کا بچہ انڈے کے چھلکے سے باہر آنے کے ساتھ زمین سے دانہ چگنے لگتا ہے، بط کا بچہ پانی میں تیرنے لگتا ہے، حیوانات کے بچے ماؤں کے تھن میں منہ لگا دیتے ہیں، چوہے کے بچے نے گو کبھی بلی نہ دیکھی ہو اور بلی کے بچے نے کبھی چوہا نہ دیکھا ہو، مگر عمر میں پہلی دفعہ جب ان کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے تو ہر ایک سے اس کے فطری حرکات سرزد ہونے لگتے ہیں، ہر حیوان اپنے نفع و ضرر کو سمجھتا ہے، وہ مہلکات سے بھاگتا اور منافع کی طرف لپکتا ہے، یہ تعلیم اُن کو کس نے دی؟ شیر، لومڑی، کتا، بلی ہر ایک کے بچے سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اُن کے نوعی خصوصیات ہیں، ان اعمال کا معلم کون ہے؟ کوے بلبلوں کے جھنڈ میں اور بلبلیں کوؤں کے غول میں نہیں بیٹھتیں، یہ ہم جنسی کا علم اُن میں کہاں سے آیا؟ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں عظیم الشان اور حیرت انگیز جماعت بندی اور ذخیرہ اندوزی کی قابلیت کیونکر پیدا ہوئی، ان سب باتوں کا جواب یہ ہے کہ معلمِ فطرت نے عطیۂ وجود کے ساتھ ساتھ یہ طبعی خصوصیات اور الہامات بھی ان میں ودیعت کر دیئے ہیں۔

یہ تو انواع کا حال ہے ہر نوع کے تحت میں اصناف ہیں جس طرح ہر نوع کی خصوصیتیں اور قابلیتیں الگ الگ ہیں، اسی طرح ہر صنف کی خصوصیات اور استعدادات بھی الگ ہیں، ایک کبوتر کی کتنی قسمیں ہیں، ایک آم میں کس قدر اقسام ہیں، ایک نوعِ انسان میں کس قدر طبقات ہیں، ان میں سے ہر ایک صنف، قسم اور طبقہ اپنی مشترک نوعی خصوصیات کے ساتھ کچھ مستقل الگ صنفی اوصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو دوسرے اصناف میں نہیں پائے جاتے، افریقہ کے ایک وحشی انسان سے لے کر یورپ کے متمدن شہری تک، ایک ناخواندہ جاہل سے لے کر ایک فلسفی اور حکیم تک کس قدر مختلف انسانی طبقات ہیں، ہر طبقہ اپنے اندر متعدد مختلف خصوصیات اور ادراکات رکھتا ہے، اسی طرح ممکن ہے کہ معلمِ ازل انسانوں کے ایک اور صنف (انبیاء) کو علوم و معارف اور حقائق و اسرار کے وہ الہامات عطا کر دے جن سے دیگر صنفِ انسانی محروم اور ناآشنا ہیں۔

دنیا میں جس قدر علوم و فنون، صنائع و حرف، ایجاد و اختراعات پیدا ہو چکے ہیں، ان کا کوئی نہ کوئی بانی موجد اور مخترع ہوگا، پارچہ بافی اور خیاطی سے لے کر ریاضیات و مکینکس تک جس قدر صنائع و ایجادات اور علوم و معارف میں

وہ کسی نہ کسی ایک شخص کے ذہن کا نتیجہ ہیں، اسی بانی اور مخترعِ اول کے ذہن میں اس مسئلۂ خاص یا ایجادِ خاص کا خطور کیونکر ہو گیا؟ اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسرے سے سیکھے بغیر اس کے نفس میں مسئلۂ خاص اور اس ایجادِ خاص کے متعلق ایک خاص قسم کی سوجھ بوجھ یا فہم پیدا ہو گئی اور اس کے ذہن میں کہیں سے ایسی حقیقت بے پردہ مشہود ہو گئی جو دوسروں کے لئے تمام تر مستور تھی، یہی الہام ہے، اب جس شخص کو فلسفیانہ الہامات ہوتے ہیں وہ فلسفی ہے جس کو شاعرانہ ہوتے ہیں وہ شاعر ہے، جن کو آلات اور مشینوں کا الہام ہوتا ہے وہ آلات ساز اور انجینئر ہے اور جس نفسِ قدسی میں اسرارِ الٰہیہ، نوامیسِ ملکوتیہ، عقائدِ حقہ، اعمالِ صالحہ، قوانینِ عادلہ کا الہام ہو وہ پیغمبر ہے اور اس کے اس الہام کو وحی کہتے ہیں۔

(۲) **انقطاعِ حواس عن المادیات**:۔ انسان کے تمام محسوسات اور مدرکات براہِ راست یا بالواسطہ اس کے حواسِ خمسہ یعنی سامعہ، باصرہ، شامہ، ذائقہ اور لامسہ سے ماخوذ ہیں جن کے کام بترتیب سننا، دیکھنا، سونگھنا چکھنا اور ٹٹولنا ہیں، اسی طرح انسان میں پانچ قوائے دماغی بھی ہیں جن کے نام حسِ مشترک، خیال، واہمہ، حافظہ اور متخیلہ ہیں، ان قوائے خمسہ کے متفرق کام ہیں، حسِ مشترک تو آلاتِ حواس کا خزانہ یا لیٹر بکس ہے، انسان کو اپنے پانچوں حواس کے ذریعہ سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ سیدھا حسِ مشترک میں جا کر منطبع ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے منتقل ہو کر خیال میں جمع ہو جاتا ہے اور وہاں محفوظ رہتا ہے، واہمہ وہ قوت ہے جو اپنے اس گزشتہ محفوظ خزانۂ مدرکات کا بار بار جائزہ لیتی رہتی ہے اور اس پر احکام جاری کرتی رہتی ہے، مثلاً دوسرے ہم نے ایک زرد سیال شے دیکھی پہلے سے ہمارے خیال میں شہد کی صورت محفوظ ہے، اس زرد سیال شے کو دیکھتے ہی ہم نے کہہ دیا کہ یہ شہد ہے اور میٹھا ہوتا ہے، یہ واہمہ کا کام ہے، حافظہ میں قوتِ واہمہ کے مخزونات جمع رہتے ہیں اور متخیلہ جس کا دوسرا نام مفکرہ بھی ہے، اس قوتِ دماغی کو کہتے ہیں جو مدرکاتِ خیال کی ترکیب و تحلیل کرتی رہتی ہے اور نئی نئی شکلیں اور عجیب عجیب صورتیں سینما تصویروں کے تماشہ کی طرح ہمارے ذہن کے سامنے لاتی رہتی ہے، کبھی دو سر کا انسان بنا کر کھڑا کر دیتی ہے، کبھی بے سر کا چلتا پھرتا انسان مشاہدہ کراتی ہے، کبھی پرستان کی سیر کراتی ہے اور کبھی عالمِ قدس میں جانے کے لئے پر تولتی ہے، ذہن کو ہزاروں لاکھوں میل کی مسافت دم کے دم میں لے کر اڑ جاتی ہے، آنکھیں بند کرتے ہی ہماری دوسری آنکھوں کے سامنے جو ہنگامۂ فکر و خیال برپا ہو جاتا ہے وہ اسی کا کام ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ ہماری قوتِ مفکرہ صرف آرام و سکون کے لمحوں میں کیوں یہ تماشے دکھاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ جاگتے ہوئے حسِ مشترک کی تختی ظاہری آلاتِ حواس کے بھیجے ہوئے محسوسات کی تحصیل و حصول میں مصروف رہتی ہے، اس لئے جب تک ہماری نیند یا غفلت یا کسی اور سبب سے آلاتِ حواس میں تعطل نہیں ہوتا ہمارے قوائے دماغی میں آرام و سکون نہیں پیدا ہو سکتا، خواب کی حالت میں جب یہ حواس تھوڑی دیر کے لئے اپنا کام موقوف کر دیتے ہیں، اس وقت ہمارے پر اسرار قوائے ذہنی عالمِ بالا کی سیر کرنے لگتے ہیں اور وہاں کے مشاہدات و مسموعات حسِ مشترک میں آ کر ہماری قوتِ مفکرہ کو حرکت دیتے ہیں، اور ہم عجیب عجیب چیزیں دیکھنے اور عجیب عجیب آوازیں سننے لگتے ہیں، اب اگر کسی کی روح میں اتنی قوت ہو کہ حالتِ بیداری میں بھی اپنے ظاہری آلات کو معطل کر کے

عالم بالا سے اپنا سلسلۂ تعلق قائم کر سکے تو اس کو سب کچھ اسی عالم بیداری میں نظر آسکتا ہے۔

(۳) قوت نبوت:- تیسرا نظریہ یہ ہے کہ حواس انسانی صرف پانچ کے اندر محدود نہیں ہیں، چنانچہ شیخ الاشراق نے حکمۃ الاشراق میں اس پر دلائل قائم کئے ہیں، بعض جمادات میں نباتاتی اوصاف ملتے ہیں، بعض نباتات ایسے دریافت ہوئے ہیں جن میں قوت حس ہے جس سے دیگر نباتات عام طور سے محروم ہیں، حیوانات کے مختلف انواع میں بعض ایسے قویٰ کا پتہ چلتا ہے جو دیگر حیوانات میں نہیں، شہد کی مکھیوں میں ایک ایسی عجیب و غریب قوت ہے جس سے ان کو کسی طرح بند کر کے لے جایئے اور کہیں جاکر چھوڑ دیجئے وہ اپنے چھتہ کا راستہ پالیتی ہیں، مکڑیوں کی اقلیدسی اشکال بھی کسی نہ کسی قوت کا نتیجہ ہیں خواہ اس کا نام جبلت یا فطرت ہی کیوں نہ رکھو، اسی طرح ممکن ہے کہ انبیاء میں احساس و ادراک کا وہ خاص قوت ہو جس سے اور اصناف انسانی محروم ہیں، وہ اپنی اس قوت قدسیہ کے ذریعہ سے ان چیزوں کا احساس و ادراک کر لیتے ہیں جن کو عام قوائے انسانی نہیں کر سکتے، مولانا رومی نے مثنوی میں اس خیال کو جابجا ظاہر کیا ہے۔

پنج حسے ہست جز ایں پنج حس　　　آں چو زر سرخ و ایں حسہا چو مس

ان پانچ جسمانی حواسوں کے علاوہ پانچ اور روحانی حواس بھی ہیں وہ سونا ہیں اور یہ تانبا ہیں۔

حس ابداں قوت ظلمت خورد　　　حس جاں از آفتابے می چرد

جسمانی حواس تاریکی سے قوت اخذ کرتے ہیں تو روحانی حواس آفتاب سے۔

ہر کہ از حس خدا دید آیتے　　　در بر حق داشت بہتر طاعتے

جس نے اس خدائی احساس کی کوئی نشانی دیکھ لی ہے وہ خدا کے سامنے زیادہ مطیع ہے۔

گر بدیدے حس حیواں شاہ را　　　پس بدیدے گاو و خر اللہ را

اگر حیوان اپنے احساس سے بادشاہ کا مرتبہ پہچان سکتے تو بیل اور گدھے بھی خدا کو دیکھ لیتے۔

گر نبودے حس دیگر مر ترا　　　جز حس حیواں ز بیروں ہوا

اگر احساس حیوانی کے علاوہ تم کو اور دوسرے قوائے احساس نہ ملے ہوتے!

پس بنی آدم مکرم کے بدے　　　کے بحس مشترک محرم شدے

تو بنی آدم کا درجہ اتنا بڑھایا کیوں جاتا اور صرف حس مشترک کی بنا پر وہ محرم راز کیونکر ہو سکتا۔

فلسفی گو ہر ز معقولات دوں　　　عقل از دہلیز می ماند بروں

فلسفی لغو معقولات کی باتیں کرتا ہے تو عقل دہلیز کے باہر رہ جاتی ہے۔

فلسفی منکر شود در فکر و ظن　　　گو برو سر را براں دیوار زن

فلسفی جو صرف اپنی فکر و گمان کے باعث ان حقائق کا انکار کرتا ہے اس کو کہنا چاہئے کہ اپنا سر دیوار پر دے مارے۔

نطق آب و نطق باد و نطق گل　　　ہست محسوس حواس اہل دل

پانی، ہوا، مٹی، ان سب کا نطق اہل دل کے حواس کو محسوس ہوتا ہے۔

فلسفی کو منکر حنانہ است
از حواس انبیاء بیگانہ است

فلسفی جو ستون نبوی ؐ کے گریہ کا منکر ہے اس کا سبب یہ ہے کہ انبیاء کے حواس سے واقف نہیں ہے۔

(۴) حواس کی غیر محدود وسعت:۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حواس پانچ ہی ہیں اور ان کے علاوہ کوئی حاسہ کسی انسان میں موجود نہیں ہے تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ ان حاسوں کی وسعتِ احساس، ان کے حدود کے اندر محدود ہے اور چند اشخاص کو جو چیز دکھائی یا جو آواز سنائی دیتی ہے وہ اس لئے غلط ہے کہ عام انسان اس کو دیکھ سن نہیں سکتے یا جو چیز ہم کو اس وقت دکھائی یا سنائی نہیں دیتی وہ آئندہ بھی ہم کو دکھائی یا سنائی نہیں دے گی۔ بالکل ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو دیکھ یا سن نہ سکے، دوسرا انسان اس کو دیکھ اور سن لے، کور نظر پاس کی چیز بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن تیز نظر میلوں کی خبر لیتے ہیں، بعض انسانوں اور حیوانوں میں بعض قوائے احساس اوروں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں، چیونٹی میں قوتِ شامہ، چیل اور کبوتر میں قوت باصرہ، سانپ میں قوت لامسہ، کتوں اور گھوڑوں میں قوتِ سامعہ معمولی سطح حواس سے بہت زیادہ بلند ہوتی ہے، خود انسان کے حواس کے درجے کس قدر متفاوت اور مختلف ہیں، ایک انسان دور سے آواز سنتا ہے، دور کی چیز اس کو نظر آتی ہے، دور کی نہایت نازک خوشبو محسوس کر لیتا ہے لیکن کمزور حواس کے انسان ان کا مطلق احساس نہیں کر سکتے، لیکن کسی طریقہ سے اگر ان کے حواس کی قوت اور تیزی میں اضافہ ہو سکے تو وہ بھی اسی طرح دیکھ سکتے، سن سکتے اور سونگھ سکتے ہیں۔

مقدمۂ بالا سے معلوم ہوا کہ ایک کم نظر انسان یا گراں گوش آدمی جس قدر دیکھتا یا سنتا ہے اگر اس کی قوت بصارت وسماعت کو کسی تدبیر سے ترقی دی جائے تو وہ حیرت انگیز طریقہ سے ترقی کر سکتی ہے اور پھر جس قدر اس کے حواس میں ترقی ہوتی جائے گی، اس کے احساسات میں اضافہ اور محسوسات میں وسعت آتی جائے گی، ہمارے ہاتھ میں پانی کا ایک گلاس ہے ہم اس کو پینا چاہتے ہیں، اس میں گرد و غبار کا ایک ذرہ بھی ہم کو نظر نہیں آتا، لیکن ہم خوردبین لگا کر دیکھیں تو قطرہ قطرہ میں ہم کو کیڑوں کی بستی کی بستی نظر آئے گی، خالی آنکھ سے ہم کو صرف آفتاب، ماہتاب اور کچھ چھوٹے بڑے روشن ستارے دکھائی دیتے ہیں، یہاں تک کہ بطلیموس کو ثوابت کی حرکت تک محسوس نہیں ہوئی اور اس وقت تک صرف تین سو ستارے دریافت ہو سکے اور جب ایک سے ایک طاقتور دوربینیں نکل رہی ہیں تو ہر نئی دوربین کی ایجاد کے بعد پہلے سے زیادہ ہماری آنکھیں روشن ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ صرف ساتویں درجہ کے ستارے تیرہ ہزار اور آٹھویں درجہ کے چالیس ہزار اور نویں درجہ کے ایک لاکھ بیس ہزار ہم کو اس فضائے آسمانی پر تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ہرشل کی دوربین سے کل چھوٹے بڑے دو کروڑ ستاروں کی فوج ہم کو دکھائی دینے لگی ہے۔

یہی حال سماعت کا ہے، پہلے ہماری آواز زیادہ سے زیادہ ایک میل جا سکتی ہوگی، ٹیلیفون کی پہلی ایجاد نے اس کو بڑھایا اور وہ چار قدم کے بعد شہر کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر دوسرے گوشہ کے لوگوں سے باتیں کرنے لگے، چند سالوں میں یہاں تک ترقی ہو گئی کہ سوئٹزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر ہم بولتے ہیں اور فرانس میں لوگ اس کو سنتے ہیں، لکھنؤ سے الہ آباد دم کے دم میں آپ کی آواز پہنچتی ہے اور اب ہندوستان سے ہزاروں میل دور لندن میں آپ کی آواز پہنچتی ہے۔[1]

---

[1] اب آلہ جدید [illegible] کے ذریعہ [illegible] اپنے کمال کو پہنچ رہی ہے (ناشر)

ان روزمرہ کی مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حواس کے فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کے دائرے کی تحدید نہیں کی جا سکتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ صنفِ انسانی کے حواس اس قدر تیز، سریع اور قوی ہوں کہ ان کو وہ کچھ نظر آئے جو ہم کو نظر نہیں آتا اور وہ کچھ سنائی دے، جو ہم کو سنائی نہیں دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی صف کے اندر فرماتے ہیں کہ مجھ کو اسی مقام سے دوزخ اور جنت نظر آئی۔ حضرت یعقوب کو کنعان کی وادی میں، بیٹھ کر مصر سے حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو معلوم ہوتی ہے۔ مولانا رومیؒ اسی خیال کو ان اشعار میں ظاہر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس حالت میں ایک حس کی تیزی دوسرے حواس کو بھی تیز کر دیتی ہے۔

پنج حس با یک دگر پیوستہ اند　　زانکہ ایں ہر پنج ز اصلے رستہ اند

حواس خمسہ باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، کیونکہ یہ پانچوں حواس ایک ہی اصل سے نکل کر آئے ہیں۔

قوتِ یک قوتِ باقی شود　　ما بقی را ہر یکے ساقی شود

ایک حاسہ کی قوت بقیہ حواس کی قوت بن جاتی ہے۔

دیدن دیدہ فزاید عشق را　　عشق اندر دل فزاید صدق را

دیدارِ چشم عشق کو ترقی دیتا ہے اور عشق دل میں سچائی پیدا کرتا ہے۔

صدق بیداری ہر حس می شود　　حسہا را ذوق مونس می شود

سچائی ہر حاسہ کی بیداری کا سبب ہو جاتی ہے اور احساس کو ذوق و وجدان سے مدد ملنے لگتی ہے۔

(۵) عالم مثال۔ حکمائے اسلام میں، جن کے سینے علم و حکمت کے ساتھ نورِ معرفت سے بھی منور ہیں، انہوں نے طرزِ استدلال سے نہیں بلکہ ذوق و عرفان سے، ایک اور راستہ اختیار کیا ہے۔ حکما میں دو گروہ ہیں۔ ایک وحدیہ اور دوسرا ثنویہ۔ وحدیہ وہ ہیں، جو ایک ہی عالم کے قائل ہیں، یعنی ان کے نزدیک مبدءِ عالم صرف ایک ہی ہے۔ ان کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جو مبدءِ عالم صرف مادہ کو مانتی ہے اور مادہ کے علاوہ کسی اور چیز کو تسلیم نہیں کرتی یہاں تک کہ عقل و حیات اور قوائے ذہنیہ تک اس کے نزدیک تمام تر مادہ کی نیرنگیاں ہیں، ان کو مادیئین اور طبعیئین کہتے ہیں اور دوسری جماعت مادہ سے یکسر منکر ہے، وہ صرف نفس و روح کو تسلیم کرتی ہے اور اس عالم محسوس کو وہم و تصور سے زیادہ رتبہ نہیں دیتی، اس کے نزدیک عالم اور عالم میں جو کچھ ہے وہ نفس و روح کے مظاہر ہیں، ان کو روحانیئین کہتے ہیں۔

ثنویہ۔ دو مبدءِ عالم تسلیم کرتے ہیں، یعنی مادہ اور روح اور عالم کو ان دونوں کا جلوہ گاہ تسلیم کرتے ہیں، ہم نے اوپر کی سطروں میں جن ارباب معرفت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تین عالم تسلیم کرتے ہیں، ایک تو یہ عالم اجساد یا عالم شہادت جس کو ہم مادہ اور مادیات کہتے ہیں، دوسرا عالم ارواح یا عالم غیب جو مادی اور مادیات سے منزہ اور بالاتر ہے اور تیسرا عالم مثال یا عالم برزخ، یہ وہ عالم ہے جہاں عالم اجساد اور عالم ارواح، عالم شہادت اور عالم غیب دونوں کے اوصاف اور قوانین ممتزج ہو جاتے ہیں، عالم اجساد کی چیزیں یہاں آ کر پیکر مادی سے پاک ہو کر لطیف آتی ہیں اور غیر مادی معانی اور حقائق اور عالم ارواح کی مخلوقات، یہاں متشکل اور متجسد ہو کر نظر آتی ہیں، امام ربانی

مکتوبات میں لکھتے ہیں۔

اے برادر، عالم ممکنات را سہ قسم قرار دادہ اند، عالم ارواح و عالم مثال و عالم اجساد۔ عالم مثال را برزخ گفتہ اند درمیان عالم ارواح و عالم اجساد و نیز گفتہ اند کہ عالم در رنگ مرآۃ است مر معانی و حقائق ایں ہر دو عالم را کہ معانی و حقائق اجساد و ارواح در عالم مثال بصور لطیفہ ظہور می نماید چہ در آنجا مناسب ہر معنی و حقیقتی صورت و ہیئت دیگر است و آں عالم فی حد ذاتہ متضمن صور و ہیئات و اشکال نیست صور و اشکال در وے از عوالم دیگر منعکس گشتہ ظہور یافتہ است در رنگ مرآت کہ فی حد ذاتہا متضمن ہیچ صورت نیست، اگر در وے صورت کائن است از خارج آمدہ است۔

(جلد سوم مکتوب سی ویکم)

عالم ممکنات کی تین قسمیں قرار دی ہیں، عالم ارواح، عالم مثال اور عالم اجسام۔ عالم مثال کو عالم ارواح اور عالم اجسام کے بیچ میں کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ عالم مثال، عالم ارواح اور عالم اجسام کے معانی و حقائق کے لئے آئینہ کے مانند ہے کہ اس عالم مثال میں اجسام و ارواح کے معانی و حقائق لطیف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ اس عالم مثال میں ہر معنی و حقیقت کی ایک خاص مناسب شکل ہے، اس عالم مثال میں بذات خود کوئی صورت و شکل و ہیئت نہیں ہے، یہ صور و اشکال دوسرے عالموں سے آکر یہاں عکس انداز ہوتی ہیں جس طرح خود آئینہ میں کوئی صورت نہیں ہوتی بلکہ جو صور و اشکال اس میں نمودار ابھرتی ہیں وہ خارج سے آکر اس میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان بزرگوں کا عالم مثال وہی افلاطون کا عالم مثل ہے لیکن افلاطون فرقہ وحدیہ سے تھا یعنی عالم کا مبدأ صرف ایک تسلیم کرتا تھا، اس نے اس کے نظریہ کا منشا صرف یہ ہے کہ اس عالم محسوس میں ہر شے فرداً فرداً جزئی اور متشخص ہو کر آتی ہے، نفس کلی اور مطلق نوع وجود خارج میں نہیں، مثلاً ہم کہتے ہیں انسان ہنستا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، کتا بھونکتا ہے، تو یہ کسی خاص انسان، خاص گھوڑے یا خاص کتے کی نسبت حکم نہیں ہے، بلکہ انسان، گھوڑے اور کتے کی نوع پر حکم لگایا گیا ہے، لیکن کلی انسان، مطلق گھوڑا اور مطلق کتے کا وجود تو اس عالم محسوس میں نہیں مگر کہیں نہ کہیں تو اس کا وجود ہونا چاہیئے، پھر کہاں ہے؟ عام جواب یہ ہے کہ ذہن میں، مگر ذہن جو ہمارے محدود، مختصر دماغ کا دوسرا نام ہے کوئی ایسا ظرف نہیں جس کے اندر یہ ساری دنیا سما سکے۔ اس لئے ایک اور عالم ہے جس میں کلیات اور انواع بستے ہیں اس عالم محسوس میں جتنی چیزیں ہیں وہ کسی کسی نوع کے تحت میں ہیں، یہ انواع عالم مثل میں ہیں اور ان کے عکس اور سائے جن کا نام افراد اور جزئیات ہے، وہ اس عالم محسوس میں ہیں، حقیقی وجود ان ہی انواع یا مثل کا ہے وہ گویا قدرت کے سانچے ہیں اور ان ہی سے ڈھل ڈھل کر اس عالم محسوس میں افراد اور جزئیات نمودار ہوتے ہیں، مگر ان افراد اور جزئیات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے، وہ صرف اپنی نوع کے آثار اور ظلال (سایہ) ہیں، پھر ان میں سے ہر نوع کی مستقل روح نوعی ہے جو اس نوع کا خدا ہے، اسی کا نام ان کی اصطلاح میں رب النوع ہے۔

یہ ہے مثل افلاطون کی حقیقت، عالم مثال کی حقیقت اس سے بالکل الگ ہے، اس عالم کے قائل جیسا ابھی امام ربانی کے مکتوب کے حوالہ سے گزر چکا تین عالم کے قائل ہیں، عالم جسمانی، عالم روحانی اور عالم مثالی۔ عالم مثال جسم و روح کے احکام کا جامع ہے، اس میں روحانی اشیاء متجسم اور جسمانی چیزیں کسی اور مناسب شکل میں متشکل

ہو کر نظر آتی ہیں اور وہ معانی و حقائق جن میں جسم و جان نہیں، مثلاً حیات، موت، علم، عقل، جسمانی رنگ و روپ میں وہاں نمایاں ہوتی ہیں، ارواح فرشتے، جبریل جو جسم سے پاک ہیں اس عالم میں متجسم معلوم ہوتے ہیں، اس کی مثال بالکل خواب کی سی ہے کہ اس میں کبھی روحانیت متجسم ہو کر اور کبھی جسمانیات کسی اور شکل میں نمودار ہو کر جلوہ گر ہوتے ہیں اور اہل معرفت ان کو دیکھ کر ان کی مناسب تعبیر کرتے ہیں، مثلاً کبھی خواب میں علم دریا کی صورت میں، غیظ و غضب آگ کی شکل میں، شجاعت شیر کی ہیئت میں نظر آتی ہے، اسی طرح عالم مثال میں بھی معانی و حقائق اور روحانیات و مجردات کسی مناسب جسمانی شکل و صورت میں دکھائی دیتے ہیں اور ان کو دیکھ کر اہل بصیرت ان رموز و کنایات کی حقیقت کو پا لیتے ہیں، خود عالم مثال میں کوئی آبادی نہیں، وہ صرف ایک آئینہ خانہ ہے جس میں عالم بالا یا عالم زیریں سے جو شکل بھی اس کے سامنے آتی ہے، اہل بصیرت کو نظر آجاتی ہے۔

علمائے اسلام میں سب سے پہلے یہ خیال امام غزالی کے ہاں ملتا ہے لیکن اس کو انہوں نے عالم کے لفظ سے نہیں بلکہ وجود کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، کسی شے کے وجود کا ثبوت ہمارے پاس اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اس کا احساس یا تعقل کرتے ہیں، ہماری معلومات و محسوسات ذہن میں موجود ہیں اور ان کا یہ وجود بھی اسی طرح ناقابل انکار ہے جس طرح عام اشیاء کا یہ خارجی وجود، لیکن نہ ہم ان کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ چکھ سکتے ہیں، نہ سونگھ سکتے ہیں، نہ ٹٹول سکتے ہیں، اس بنا پر امام صاحب کے نزدیک وجود کی تین قسمیں ہیں وجود ذہنی، وجود عقلی اور وجود خیالی۔ اس آخری قسم کی انہوں نے حسب ذیل تفصیل کی ہے۔

"اور وہ یہ ہے کہ زبان حال تمثیلی رنگ میں محسوس اور مشاہد بن کر سامنے آتے اور یہ خاص انبیاء اور پیغمبروں کی نشانی ہے، اس کی مثال خواب کی ہے، جس طرح خواب میں زبان حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی تمثیلی رنگ میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں سنتے ہیں۔ مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے یا کوئی مُردہ اس کو کچھ دے رہا ہے یا اس کا ہاتھ پکڑ رہا ہے یا اس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اس کی انگلی آفتاب، سورج یا چاند گہن ہو گئی یا اس کا ناخن شیر ہو گیا ہے یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں ان سے خطاب کرتی ہیں، ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں، وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے، خواب دیکھنے والوں کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ جاگ جاتا ہے اور خواب و بیداری کی دونوں حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے۔

جن لوگوں کو ولایت تامہ حاصل ہو جاتی ہے ان کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے، اس کی ولایت اپنے فیض کی شعاعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحب ولایت کو نظر آتا ہے اور وہی سنتے ہیں جو صاحب ولایت کو سنائی دیتا ہے۔" (مضنون بہ علی غیر اہلہ صفحہ ۱۹، مصر)

احیاء العلوم باب عذاب القبر میں بھی امام صاحب نے اس کی تشریح کی ہے، امام خطابی (مشہور امام الحدیث) نے معالم السنن میں اس کو [illegible] کے لفظ سے تعبیر کیا ہے [illegible] حافظ ابن حجر نے

شرح بخاری میں ان کی رائے نقل کی ہے، شریک بن عبداللہ کی روایت جس میں معراج میں خدا کے قرب کی تصریح ہے اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لم یبلغہ ھذا من الحدیث الا ھذا القدر مقطوعا عن غیرہ ولم یعتبرہ باول القصۃ وآخرھا اشتبہ علیہ وجھہ ومعناہ وکان قصاراہ اما رد الحدیث من اصلہ واما الوقوع فی التشبیہ وھما خطتان مرغوب عنھما واما من اعتبر اول الحدیث بآخرہ فانہ یزول عنہ الاشکال فانہ مصرح فیھما بانہ کان رؤیا لقولہ فی اولہ وھو نائم وفی آخرہ استیقظ وبعض الرؤیا مثل یضرب لیتأول علی الوجہ الذی یجب ان یصرف الیہ معنی التعبیر فی مثلہ وبعض الرؤیا لا یحتاج الی ذلک بل یاتی کالمشاھدۃ۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۰۲)

پس جس شخص کو اس حدیث کا اتنا ہی ٹکڑا (کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے قریب ہوا) حدیث کے دوسرے ٹکڑوں سے الگ ہو کر پہنچا اور اس نے آغاز روایت اور آخر روایت کو باہم ملا کر نہ دیکھا تو اس حدیث کا مطلب اس پر مشتبہ ہو جائے گا اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ یا وہ اصل حدیث سے انکار کر بیٹھے اور یا یہ کہ وہ خدا کی تجسیم کا قائل ہو جائے اور یہ دونوں باتیں ناپسندیدہ ہیں لیکن جو شخص اول و آخر حدیث کو ملا کر دیکھے گا تو اس سے اشکال رفع ہو جائے گا کیونکہ حدیث کے شروع میں اور آخر میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا کیونکہ شروع میں ہے کہ آپ سو رہے تھے کہ آپ نے دیکھا اور آخر میں ہے کہ اس کے بعد آپ بیدار ہوئے، بعض خواب بہ رنگ تمثیل ہوتے ہیں جن کی تعبیر اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح اس قسم کے خوابوں کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض خواب تعبیر کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدہ کی طرح ہوتے ہیں۔

امام صاحب کے بعد شیخ الاشراق نے اس کا عالم نام رکھا اور اس کی کچھ کیفیت بیان کی، مگر انہوں نے عالم مثال اور مثل افلاطونیہ کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی اپنی بعض تصنیفات میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ خواجہ حافظ کے ہاں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ؎

عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است

حضرات نقشبندیہ میں نہیں معلوم یہ خیال کب سے قائم ہے، بہرحال امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے زمانہ کے بہت پہلے سے یہ خیال ان میں پایا جاتا ہے کیونکہ امام ربانی کی تحریروں میں متعدد مقام پر اس کا ذکر ہے ان کے بعد تو حضرات مجددیہ کی تصنیفات میں اس عالم کی نیرنگی اور بوقلمونی پر نہایت پُر اسرار مباحث ہیں، علمائے متکلمین میں جس کو سب سے پہلے اس نظریہ کو علم کلام میں استعمال کرنے کا خیال پیدا ہوا وہ مجدد الف ثانیؒ کے ایک مرید ملا بدر الدین ہیں، چنانچہ وہ ایک خط میں مجدد صاحب کو لکھتے ہیں۔

پس عذاب قبر در عالم مثال خواہد بود در رنگ آنکہ در خواب در عالم مثال نمایند و نوشتہ بودند کہ ایں سخن شاخہائے بسیار دارد و اگر قبول نمایند فروغ بسیار بریں سخن متفرع خواہد ساخت

(مکتوب سی ویم جلد سوم)

پس عذاب قبر بھی عالم مثال میں ہوگا اسی طرح جس طرح کہ خواب میں مثالی رنگ میں ڈر اور تکلیف محسوس ہوتی ہے اور یہ بھی حضور نے لکھا کہ اس مسئلہ سے بہت سی شاخیں نکل سکتی ہیں اور اگر آپ قبول فرمائیں تو اس سے بہت سے فروع پیدا ہو سکیں گے۔

یہی چند منتشر خیالات تھے جن کو شاہ ولی اللہ صاحب نے ایک عالم بنا دیا چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں عالم مثال

کا ایک باب باندھا ہے اور اس کے تمام اصول و فروع بیان کئے ہیں۔ ہم اسی موقع پر شاہ صاحب کے اس باب کا پورا ترجمہ درج کرتے ہیں۔

جاننا چاہیئے کہ بہت سی حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم موجودات میں ایک ایسا عالم بھی ہے جو غیر مادی ہے اور جس میں معانی (اعراض و حقائق)، ان اجسام کی صورت میں متشکل ہوتے ہیں جو اوصاف کے لحاظ سے ان کے مناسب ہیں، پہلے اس عالم میں اشیاء کا ایک گونہ وجود ہو لیتا ہے، تب دنیا میں ان کا وجود ہوتا ہے اور یہ دنیاوی وجود ایک اعتبار سے بالکل اسی عالم مثال کے وجود کے مطابق ہوتا ہے۔

اکثر وہ اشیاء جو عوام کے نزدیک جسم نہیں رکھتیں، اس عالم میں منتقل ہوتی اور اترتی ہیں اور عام لوگ ان کو نہیں دیکھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب خدا نے رحم کو پیدا کیا تو وہ کھڑی ہو کر بولی کہ یہ اس شخص کا مقام ہے جو قطع رحم سے پناہ مانگ کر تیرے پاس پناہ ڈھونڈتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ بقرہ و آل عمران قیامت میں یا سائبان یا صف بستہ پرندوں کی شکل میں آئیں گی اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت کریں گی جنہوں نے ان کی تلاوت کی ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں اعمال حاضر ہوں گے تو پہلے نماز آئے گی پھر خیرات، پھر روزہ۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نیکی اور بدی دو مخلوق ہیں جو قیامت میں لوگوں کے سامنے کھڑی کی جائیں گی، نیکی نیکی والوں کو بشارت دے گی اور بدی بدی والوں سے کہے گی کہ دور ہو، لیکن وہ لوگ اس سے چمٹے ہی رہیں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں اور جتنے دن ہیں وہ معمولی صورت میں حاضر ہوں گے لیکن جمعہ کا دن چمکتا دمکتا ہوا آئے گا۔ اور آنحضرت نے فرمایا ہے کہ قیامت میں دنیا ایک بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی جس کے بال کھچڑی، دانت نیلے اور صورت بدنما ہو گی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میں دیکھتا ہوں، کیا تم بھی دیکھتے ہو؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ فتنے تمہارے گھروں پر اس طرح برس رہے ہیں جس طرح بادل سے قطرے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی حدیث میں فرمایا کہ دفعۃً چار نہریں نظر آئیں دو نہریں اندر تھیں اور دو باہر، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ کیا ہے؟ بولے اندر کی نہریں تو جنت کی ہیں اور باہر کی نیل اور فرات ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسوف کی نماز میں فرمایا کہ بہشت اور دوزخ میرے سامنے متمثل کر کے لائی گئیں اور ایک روایت میں ہے کہ میرے اور قبلہ کی دیواروں کے بیچ میں بہشت اور دوزخ مجسم ہو کر آئیں، میں نے ہاتھ پھیلایا کہ بہشت سے ایک انگور کا خوشہ توڑ لوں، لیکن دوزخ کی گرمی کی لپیٹ سے رک گیا اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاجیوں کے چور کو اور ایک عورت کو دوزخ میں دیکھا جس نے ایک بلی کو باندھ کر رکھا تھا اور ایک فاحشہ عورت کو بہشت میں دیکھا جس نے ایک کتے کو پانی پلایا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ بہشت اور دوزخ کی وسعت جو ہم لوگوں کے خیال میں ہے وہ اس قدر مسافت (یعنی حجرہ کی چار دیواری) میں نہیں سما سکتی۔ اور حدیث میں ہے کہ بہشت کو مکروہات نے اور دوزخ کو شہوات نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

پھر جبرئیل کو خدا نے حکم دیا کہ دونوں کو دیکھیں اور حدیث میں ہے کہ بلا جب نازل ہوتی ہے تو دعا اس سے کشتی لڑتی ہے اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ خدا نے عقل کو پیدا کیا اور اس سے کہا کہ آگے آ، تو وہ آگے آئی پھر کہا کہ پیچھے ہٹ تو پیچھے ہٹ گئی، اور حدیث میں ہے کہ یہ دونوں کتابیں پروردگار عالم کی طرف سے ہیں الخ اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی، پھر دوزخ اور جنت کے درمیان ذبح کر دی جائے گی۔ اور خدا نے فرمایا کہ

ہم نے اپنی روح مریم کے پاس بھیجی تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن کر آئی، اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جبرئیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آتے تھے اور آپ سے باتیں کرتے تھے اور کوئی ان کو نہیں دیکھتا تھا، اور حدیث میں ہے کہ قبر ہفتاد در ہفتاد گز چوڑی ہو جاتی ہے یا اس قدر سمٹ آتی ہے کہ مردہ کی پسلیاں بھرکس ہو جاتی ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ فرشتے قبر میں آتے ہیں اور مردہ سے سوال کرتے ہیں اور مردہ کا عمل مجسم ہو کر اس کے سامنے آتا ہے اور نزع کی حالت میں فرشتے حریر یا گزی کا کپڑا لے کر آتے ہیں اور فرشتے مردہ کو لوہے کے گرز سے مارتے ہیں، مردہ شور کرتا ہے اور اس کے شور کی آواز مشرق سے مغرب تک کی چیزیں سنتی ہیں اور حدیث میں ہے کہ قبر میں کافر کے اوپر ننانوے اژدہے مسلط ہوتے ہیں جو اس کو کاٹتے ہیں تا قیامت۔ اور حدیث میں ہے کہ جب مردہ قبر میں آتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے وہ اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھہرو نماز پڑھ لوں اور حدیث میں اکثر جگہ آیا ہے کہ قیامت میں خدا بہت سی مختلف صورتوں میں لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پاس اس حالت میں جائیں گے کہ خدا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوگا اور یہ کہ خدا انسانوں سے بالمشافہ بات چیت کرے گا اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

ان حدیثوں کو جو شخص دیکھے گا تین باتوں میں سے ایک نہ ایک بات اس کو ماننی پڑے گی، یا تو ظاہری معنی مراد لے اور اس صورت میں اس کو ایک ایسے عالم کا قائل ہونا پڑے گا جس کی کیفیت ہم بیان کر چکے ہیں (یعنی عالم مثال) اور یہ صورت وہ ہے جو اہل حدیث کے قاعدے کے مطابق ہے، چنانچہ سیوطی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود میری بھی یہی رائے ہے اور یہی مذہب ہے، یا اس بات کا قائل ہو کہ دیکھنے والے کے حاسہ میں واقعات کی یہی شکل ہوگی اور اس کی نظر میں وہ اسی طرح جلوہ گر ہوں گے، گو اس کے حاسہ کے باہر اس کا وجود نہ ہو، قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ آسمان اس دن صاف دھواں بن کر آئے گا۔ اس کے معنی حضرت عبداللہ بن مسعود نے اسی کے قریب قریب بتائے ہیں یعنی یہ کہ لوگوں پر قحط پڑا تھا تو جب کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو اس کو بھوک کی وجہ سے آسمان دھواں سا معلوم ہوتا تھا ابن ماجشون (مشہور محدث تھے) سے مروی ہے کہ جن حدیثوں میں خدا کے اترنے اور مرئی ہونے کا ذکر ہے، ان کے معنی یہ ہیں کہ خدا مخلوقات کی نظر میں ایسا تغیر پیدا کر دے گا کہ وہ خدا کو ایسی حالت میں دیکھیں گے کہ وہ اتر رہا ہے اور جلوہ دکھا رہا ہے اور اپنے بندوں سے گفتگو اور خطاب کر رہا ہے، حالانکہ خدا کی جو شان ہے اس میں نہ تغیر ہوگا نہ تنقل ہوگا اور یہ اس لئے ہوگا کہ لوگ جان لیں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ یہ سب باتیں بطور تمثیل کے بیان کی گئی ہیں جن سے مقصود کچھ اور ہے، لیکن جو شخص صرف اسی احتمال پر بس کرتا ہے، میں اس کو اہل حق میں شمار نہیں کرتا امام غزالیؒ نے عذاب قبر کے بیان میں ان تینوں مقامات کو بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ان تمام واقعات کے ظاہری معنی صحیح ہیں اور ان کے اندر دقیق اسرار مخفی ہیں، لیکن ارباب بصیرت کے نزدیک یہ اسرار فاش اور کھلے ہیں تو جن لوگوں پر یہ اسرار فاش نہ ہوں ان کو ان کے ظاہری معنوں کا انکار مناسب نہیں ہے کہ ایمان کا آخری درجہ تسلیم اور اقرار ہے۔"

اس کے بعد دوسرے متفرق ابواب میں وحی، معراج، رویت ملائکہ، ملاقات انبیاء، براق، سدرۃ المنتہیٰ وغیرہ سب کی تشریح اسی عالم میں کی ہے۔ ہم نے آگے چل کر ایک باب عالم رویا کا قائم کیا ہے، اس میں دکھایا ہے کہ

اس اصول کی صحت پر آیات واحادیث سے استناد ہو سکتا ہے۔

ان تمام نظریات پر ایک نظر ڈال لینے کے بعد یہ بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ ان کا درجہ دلائل وبراہین کا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں ان میں سے ہر نظریہ کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ بظاہر ان چیزوں کے تسلیم کرنے میں عقل کو جو استحالہ یا کم از کم استبعاد نظر آتا ہے وہ کم یا دور ہو جائے، اس لئے ہر گروہ نے اپنے اپنے ذوق اور طریق فکر کے مطابق اپنے تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ سے ایک ایسا تمثیلی نظریہ قائم کیا ہے جس پر قیاس کرکے وہ باتیں جو تجربہ ومشاہدہ سے ماوراء ہیں، ان کا کچھ دھندلا سا خاکہ ذہن انسانی میں قائم ہو جائے کہ وہ ان کے انکار واستبعاد کی جرأت نہ کر سکے اور قلبِ بدگمان اور عقلِ نارسا کسی قدر تسلی پا سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ شاہد سے غائب پر، محسوسات سے غیر محسوسات پر، تجربیات سے ناممکن التجربہ حقائق پر، جسمانی قوانینِ فطرت سے روحانی خصائص پر استشہاد کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ؏

کہ کس نہ کشود ونہ کشاید بہ حکمت ایں معمارا

*

معجزات

ہمارے متکلمین کے نزدیک معجزہ وہ امر ہے جس کو اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کے دعویٰ کی صداقت کے لئے دنیا پر ظاہر کرتا ہے، اس کے لئے چند شرائط ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ خارق عادت ہو تو گویا معجزہ کی عام تعریف یہ سمجھنی چاہیئے کہ معجزہ اس خارق عادت چیز کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے پیغمبر کی تصدیق کے لئے صادر ہو۔ اب معجزہ کے ثبوت میں اصل اشکال جو پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ عالم کائنات ایک نظام خاص پر قائم ہے، ہر شے کی ایک علت اور ہر حادثہ کا ایک سبب ہے، علت اور سبب کے بغیر کوئی شے پیدا نہیں ہوتی، علت و معلول کا جو سلسلہ اشیاء میں نظر آتا ہے ان میں باہم اس قدر لزوم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے منفک نہیں ہو سکتے، ہر شے میں ایک خاصیت ہے جو اس سے الگ نہیں ہو سکتی اور نیز جس شے میں جس چیز کی خاصیت نہیں ہے اس کا اس سے صدور بھی نہیں ہو سکتا۔ آگ جلاتی ہے، سمندر بہتا ہے، درخت ساکن ہے، پتھر چلتا نہیں، سورج میں نور ہے، کنکر بولتے نہیں، سنکھیا زہر قاتل ہے، انسان مر کر پھر جیتا نہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آگ نے جلایا نہیں، سمندر دفعۃً تھم گیا، درخت چلنے لگا، پتھر حرکت کرنے لگا، آفتاب میں سیاہی آگئی، زہر کھا کر آدمی مرا نہیں اور انسان مر کر ایک اشارہ سے پھر جی اٹھا تو درحقیقت وہ اس پورے نظام فطرت کو جس پر دنیا قائم ہے درہم برہم کرنا چاہتا ہے، علل و اسباب کے تار و پود کو بکھیر دینا چاہتا ہے اور اشیاء کے ان طبائع اور خواص کے اعلانیہ انکار پر آمادہ ہے جو بارہا کے تجربہ سے ثابت ہو چکے ہیں اور جن میں کبھی تخلف نہیں ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ نظام فطرت، یہ سلسلہ علل و اسباب، یہ طبائع اور خواص اس درجہ ناقابل تنسیخ ہیں کہ ان میں کسی قسم کی تغیر و تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ اور حکماء کے ایک گروہ کے نزدیک یہ نظام، یہ سلسلہ یہ اصول ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہیں، حکمائے اسلام کا گروہ (مثلاً فارابی، ابن سینا، ابن مسکویہ وغیرہ) اس بات کا قائل ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ اس نظام فطرت اور سلسلۂ علل و اسباب میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے اور نہ دنیا میں کوئی شے بغیر علت مادیہ اور سبب طبعی کے پیدا ہو سکتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ معجزات اس نظام و سلسلہ سے الگ ہیں، اور وہ فطرت کی قانون شکنی کرتے ہیں، بلکہ وہ بھی علل و اسباب طبعی کے نتائج ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہ ہم ان علل و اسباب کے احاطہ سے اب تک قاصر ہیں اور وہ اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں، ممکن ہے کہ تحقیقات انسانی کا دائرہ کبھی اتنا وسیع ہو جائے کہ ان کے علل و اسباب ہمارے فہم میں آجائیں۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ ہم کو یہ تسلیم ہے کہ عالم میں ایک خاص نظام فطرت، موجودات میں سلسلۂ علل و معلولات اور اشیاء میں طبائع و خواص ہیں، لیکن ہم ان کی اس درجہ ہمہ گیری کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کسی حال میں اور کسی طریق سے شکست نہیں ہو سکتے۔ آج تک ہمارا علم یہ ہے کہ نباتات بیج سے، پرندے انڈے سے اور حیوانات نطفے سے پیدا ہوتے ہیں، مگر ممکن ہے کہ کل وہ ان کے بیچ کے وسائط اور ذرائع کے بغیر دفعۃً پیدا ہو جائیں۔ غرض یہ کہ خرق فطرت کلیۃً محال ہے۔ اشاعرہ اپنا عقیدہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نہ تو

عالم میں حقیقتاً قوانینِ فطرت ہیں اور نہ خود اشیاء کے اندر خواص ہیں بلکہ ہر شے سے جو فعل سرزد ہوتا ہے اس کو درحقیقت اللہ تعالیٰ اسی وقت اس میں پیدا کر دیتا ہے، اشاعرہ[1] کے اس عقیدہ کا نہ صرف مدعیانِ عقل نے بلکہ اربابِ ظواہر تک نے مضحکہ اڑایا ہے، لیکن درحقیقت یہ خیال ایسا نہیں ہے کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

فلاسفہ اور حکماء کی وہ جماعت قوانینِ فطرت کے ناقابلِ شکست ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور اس بناء پر معجزات وخوارق سے قطعی انکار کرتی ہے، امام رازی نے لکھا ہے[2] کہ گو خود ان فلاسفہ کا اصل عقیدہ یہی ہے کہ وہ متعدد ایسے اصول تسلیم کرتے ہیں جن کی بناء پر خوارقِ فطرت کا تسلیم کرنا ان کے لئے لازم ہو جاتا ہے مثلاً۔

۱۔ وہ تولدِ ذاتی کے قائل ہیں یعنی کہ یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظامِ خاص کے ساتھ ہوتی ہے ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدتِ حمل کے اندر وہ شکمِ مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں، ایک متعین زمانہ کے بعد وضعِ حمل ہوتا ہے، پھر شیرخوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ایک تنومند قوی ہیکل، ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہ دفعۃً ان بیچ کے منازل کو طے کئے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں، یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لے کر اس عالمِ شباب کے عہد تک اس مجموعۂ عناصر کو جو سالہاسال سے صرف کرنے پڑے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کیلئے ایک خاص قسم کے اعتدالِ ترکیب کی ضرورت تھی، جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا، حیات پیدا ہو گئی، اس بناء پر اگر کسی مجموعۂ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جائے جس میں حیاتِ انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ، حمل، خون، گوشت، وضعِ حمل، شیرخوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائطِ طبعی کے، اچھا خاصا ایک نوجوان مٹی کے تپلے سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جاندار اور ذی روح بن جاتے ہیں، اسی کا نام "تولدِ ذاتی" ہے۔

اسی تفصیل کی بناء پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ذی روح کی پیدائش کے لئے دنیا میں جو سلسلۂ اسباب عادۃً جاری ہے اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو پھر عصا سانپ بھی ہو سکتا ہے، مردے زندہ بھی ہو سکتے ہیں، پہاڑ سونا بھی ہو سکتا ہے، ایک عصا کے سانپ بن جانے کی فطری صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہو جاتا ہے وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے تولدِ ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

۲۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں جو کچھ حوادث ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے مادہ (ہیولیٰ) ہی کے تغیرات

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین میں اور ابن حزم ظاہری نے فصل فی الملل والنحل میں اس کی پرزور تردید کی ہے، اور دور کے جدید علم کلام کے بانیوں نے بھی اس کا کچھ کم مذاق نہیں اڑایا ہے، استاد مرحوم نے تو تقریباً اپنی ہر کلامی تصنیف میں اشاعرہ کے اس خیال کو "حماقت" سے تعبیر کیا ہے۔

[2] مطالب عالیہ بحث معجزات نسخۂ قلمی موجودہ دار المصنفین وتفسیر کبیر سورۂ اعراف۔

کے نام ہیں، مادہ (ہیولیٰ) اس تمام عالم عنصری کا ایک ہی ہے اس بنا پر عالم میں انواع اشکال اور خواص کے یہ لاکھوں اور کروڑوں تنوعات اور اختلافات جو ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا سبب مؤثر اگر بالفرض خود مادہ ہی ہوتا تو ضروری تھا کہ تمام دنیا میں ایک ہی شکل اور ایک ہی خاصیت ہوتی۔ تو تم کہو گے کہ یہ اختلاف و تنوع مادہ کے اختلاف استعداد سے پیدا ہوا، لیکن استعداد تو تأثر اور انفعال کا نام ہے، علت فاعلہ اور سبب مؤثر کیا ہے؟ فلاسفہ کہتے ہیں کہ اجرام فلکیہ کی گردش اور رفتار ہے، مگر اس کے ساتھ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اجرام فلکی کی اس گردش و رفتار اور اختلاف اشکال کی نہ کوئی حد و نہایت ہے اور نہ کسی قانون فطری کے ماتحت ہیں اور نہ ان کا علم ہم کو ہو سکتا ہے، تو اس اصول کے صحیح باور کر لینے پر عجائب قدرت اور خوارق فطرت کی وہ کون سی مثال ہے جس کے محال ہونے کا وہ دعوے کر سکتے ہیں۔

۲۔ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یا تو وہ کسی سبب مؤثر کی بنا پر ہوتا ہے یا بلا سبب مؤثر کے ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں خرق عادت کو تسلیم کرنا پڑے گا، اگر یہ کہئے کہ یہ حوادث بلا سبب مؤثر کے وجود پذیر ہوتے ہیں تو گویا آپ نے خود خرق عادت کو تسلیم کر لیا۔ پھر دنیا میں کوئی عجیب سی عجیب اور مستبعد سے مستبعد بات بھی ناممکن نہیں رہتی۔ اور اگر یہ کہئے کہ یہ سبب مؤثر کے نتائج ہیں تو دو حال سے خالی نہیں، یا یہ سبب مؤثر صاحب اختیار و ارادہ ہے، اور یہ تمام حوادث و تاثیرات اس کے ارادہ اور اختیارات سے صادر ہوتے ہیں یا وہ بے اختیار اور مسلوب الارادہ ہے اور یہ حوادث و تاثیرات اس سے اسی طرح بے ارادہ اور اضطرارانہ طبعی طور سے سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے گرمی، برف سے ٹھنڈک، پہلی صورت میں معجزات اور خوارق کے صدور میں کوئی استحالہ نہیں، کیونکہ اس مدبر و مؤثر کا جب جیسا ارادہ ہو وہ شے اسی طرح واقع ہوگی، کوئی اس کا مانع نہیں اور دوسری صورت میں ظاہر ہے کہ یہ تمام تاثیرات اس بے ارادہ مؤثر عالم سے زمانہ قدیم سے ایک ہی طور پر سرزد ہوتی چلی آتی ہیں جیسے آفتاب سے روشنی ایسی حالت میں ایک عام واحد قدیم و ازلی سبب و مؤثر سے یہ ہر نئے آن اور نئے لمحہ میں نئی نئی اور مختلف شکل و صورت اور خواص کی اشیا۔ کیونکر ظہور پذیر ہوتی ہیں؟ آپ کہیں گے کہ علت تو بے شک واحد قدیم ہے مگر علت کے وجود کے ساتھ معلول میں بھی تو استعداد اور قبولیت کا مادہ پیدا ہونا چاہیے۔ مادہ میں یہ استعداد و صلاحیت گردش فلکی کے مختلف اشکال کا نتیجہ ہے لیکن ابھی یہ کہا جا چکا ہے کہ آپ کے نزدیک اشکال فلکی کی نہ تو کوئی حد و پایاں ہے اور نہ وہ کسی خاص قاعدہ اور اصول کے اندر محدود ہیں، اس بنا پر حوادث عالم کے اختلاف اور نیرنگی کا باعث اگر گردش فلکی کا اختلاف اور نیرنگی ہے تو ایسی صورت میں یہ کیوں نہیں ممکن ہے کہ جو چیز آپ کو بظاہر خلاف فطرت اور خلاف عادت معلوم ہوتی ہے وہ کسی خاص شکل فلکی کا نتیجہ ہو۔

گزشتہ تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے معجزات کے امکان پر حسب ذیل دلائل قائم کئے ہیں۔

۱۔ تاثیرات فلکیہ:۔ معجزات کے انکار کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کے حل کرنے کے لئے کوئی مادی علت ہمارے پیش نظر نہیں ہے اور ہم تمام معمولات کی تشریح مادی اور طبعی علل و اسباب سے کرنا چاہتے ہیں، لیکن حکماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ گردش افلاک اور گردش نجوم کا اس دنیا کے حوادث پر بہت اثر پڑتا ہے اور قوائے فلکی اس

عالم کے واقعات میں موثر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں اگر کسی بظاہر عجیب وغریب شے کی تعلیل ہم مادی وطبعی علل واسباب سے نہیں کر سکتے تو یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ اس کے اسباب فلکی وسماوی ہوں۔

۲۔ علل خفیہ:- یہ ہم کو تسلیم ہے کہ تمام حوادث کسی نہ کسی سبب طبعی کی بنا پر ہوتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سبب طبعی ہمارے علم وفہم میں آجائے، دنیا میں بیسیوں اسرار قدرت ہیں جن کی اب تک تحلیل نہیں ہو سکی ہے اس بنا پر ممکن ہے کہ معجزات بھی اسباب طبعی کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن ان کے اسباب وعلل اب تک ہماری نگاہوں سے مخفی ہوں، مثلاً یہ کہ انبیاءؑ نے چالیس دن تک ایک ساتھ روزہ رکھا اور اس مدت میں ایک دانہ بھی انہوں نے نہیں کھایا، لیکن بایں ہمہ ان کی قوت جسمانی میں کوئی فرق نہیں آیا، یہ بظاہر عجیب بات ہے مگر سبب طبعی سے الگ نہیں ہے۔ ہم کو کیوں بھوک لگتی ہے؟ اس لئے کہ ہمارے قوائے معدہ غذا کو ہضم کر لینے کے بعد اس کے خون کو جسم کے مختلف حصوں میں پہنچا دیتے ہیں تو ان کے لئے پھر کوئی کام باقی نہیں رہتا اور ان کو کام کی تلاش ہوتی ہے لیکن ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ بیماری کے سبب یا خوف طاری ہو جانے کے باعث سے یا کسی غم کے سبب سے جسم پر یہ اثر پڑتا ہے کہ کئی کئی روز تک معدہ کے قوئی معطل ہو جاتے ہیں اور وہ اپنا کام انجام نہیں دیتے، اس لئے اس کو بھوک بھی نہیں لگتی، اس بنا پر اگر یہی حالت کسی نفس کی اس بنا پر ہو جائے کہ اس کو روحانیات کے ساتھ شدت انہماک اور جسمانیات سے قطع علائق ہو گیا ہے تو اس کے قوائے جسمانی بھی معطل ہو سکتے ہیں اور وہ مدت تک فاقہ کر سکتا ہے، اسی طرح دوسرے معجزات کی تشریح بھی کی جا سکتی ہے۔

(۳) قوت کمالیہ:- اس عالم میں جس قدر انسان ہیں، ان کے نفسانی خصوصیات کو اگر غور سے دیکھا جائے تو عجیب وغریب اختلافات نظر آتے ہیں، ایک بلید الفہم اور کودن ہے تو دوسرا زیرک اور ذی فہم ہے، ایک کو بولنے کا شوق ہے تو دوسرے کو سننے کا، ایک علم کا عاشق ہے تو دوسرا اس کا دشمن، ایک کے علوئے ہمت اور بلند حوصلگی کے سیلاب کے سامنے مشکلات کے بڑے بڑے پہاڑ بھی خس وخاشاک ہیں، دوسرا اتنا پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہے کہ وہ تنکے کو بھی پہاڑ جانتا ہے، ایک اس قدر قوی الحافظہ ہے کہ معمولی سی بات بھی اس کے ذہن کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتی، دوسرے کو موٹی موٹی بات بھی یاد نہیں رہتی، پھر علم وفن کے عشاق میں بھی کسی کو ادبیات سے لگاؤ ہے کسی کو عقلیات کا چسکا ہے، کسی کو منقولات میں مزہ ملتا ہے، قوت شہوانیہ کے لحاظ سے دیکھو تو کسی کو سواری کا شوقین پاؤ گے کسی کو لباس وپوشاک اور وضع وقطع کا کسی کو کھانے پینے کا، ایک کو صرف دولت جمع کرنے میں مزہ ملتا ہے تو دوسرے کو اس کے اڑانے میں لطف حاصل ہوتا ہے کوئی طبعاً حلیم ہے تو دوسرا سرتاپا غضب کا شعلہ، ایک خلقی طور سے قانع ہے تو دوسرا حریص اور طماع، کوئی بد زبان ہے مگر بدکردار نہیں، دوسرا بظاہر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہے مگر بباطن نہایت بداطوار اور خفیف الحرکت ہے، ان میں سے ہر وصف وخاصیت کے بھی سینکڑوں مدارج اور مراتب ہیں، الغرض صفات وخواص نفسانی کے مظاہر اس قدر گوناگوں اور بوقلموں ہیں کہ وہ حد وتحدید میں بھی نہیں آسکتے، غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک انسان کے نفس میں جو خصوصیات ہیں ان کے مطابق جو اعمال وآثار اس سے صادر ہوتے ہیں ان پر اس کو مطلق تعجب نہیں آتا، لیکن دوسرے اعمال وآثار جن کے خصائص اس کے نفس میں نہیں

ہیں، ان پر اس کو سخت تعجب آتا ہے بلکہ اگر ان اشخاص کو اس نے خود دیکھا نہ ہو تو اس کو ان خصائص کا یقین مشکل سے آئے گا، ایک بخیل کے نزدیک بذل و کرم کی راہ میں تمام گھر بار لٹا دینا ایک مافوق البشریت کارنامہ ہے، ایک دنیادار جاہ پسند اور حریص آدمی کو ایک زاہد قانع اور متواضع آدمی کو دیکھ کر تعجب آتا ہے، معمولی حافظہ والوں سے کوئی کہے کہ امام بخاری کو ۶ لاکھ حدیثیں یاد تھیں اور اندلس کے ایک نابینا ادیب کو اغانی کی ۲۰ جلدیں نوک زبان تھیں تو اس کو یقین نہیں آئے گا، تیمور، بابر، ہنیبال اور نپولین کی قوت عزم و ارادہ کے قصے کمزور اور ضعیف الارادہ کے آدمیوں کو معجزہ معلوم ہوں گے۔ ایک کمزور ارادہ کا آدمی خود اپنی اولاد و اعزہ و خدام کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتا لیکن غیر معمولی عزم و ارادہ کے لوگ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں پر اس طرح استیلا حاصل کر لیتے ہیں کہ وہ اس کے ہاتھ میں پیکر بے جان بن جاتے ہیں، یہی حال دوسرے خصائص کے اختلاف کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تمام نفوس انسانی کے اتحاد ماہیت کے باوجود یہ اختلافات کہاں سے آئے؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ہر نفس کی جوہریت دوسرے سے مختلف ہے، اس لئے ایک سے جو خصوصیات اور افعال صادر ہوتے ہیں، وہ دوسرے سے نہیں ہوتے یا یہ کہ ہر جسم کی ترکیب عنصری میں اختلاف مزاج ہے جس کے سبب سے ایک کی خصوصیات دوسرے سے نہیں ملتیں، بہر حال ان دو میں سے جو پہلو بھی اختیار کیجئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ممکن ہے بعض ایسے نفوس بھی ہوں جن کی روحانی یا جسمانی قوت میں کوئی خاص ایسی بات ہو جس کی بنا پر ان سے عجیب و غریب اعمال اور تصرفات صادر ہوتے ہیں، جن کا صدور عام انسانوں کی روحانی و جسمانی قوت سے باہر ہے اور اس لئے وہ ان کو مستبعد اور ناقابل فہم نظر آتے ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک بلید کو ایک ذہین کے افعال پر، ایک ضعیف الحافظہ کو ایک قوی الحافظہ کی قوت پر، ایک طماع و حریص کو ایک قانع و زاہد کے حالات پر، ایک کمزور اور ضعیف الارادہ کو قوی الارادہ اور مستحکم العزم پر تعجب آتا ہے، لیکن چونکہ وہ نفوس جن میں معجزات کی یہ قوت ہے، نادر الوجود ہیں، اس لئے عموماً ان کے خصائص اور آثار پر تعجب اور استبعاد بھی معمول سے زیادہ ہوتا ہے۔

۴۔ **قوت نفسیہ:۔** ہر انسان اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو جس طرح چاہتا ہے حرکت دیتا ہے، گویا ایک قوت ہے جو اس کے تمام قالب جسمانی پر مسلط ہے اور یہ جسم اس کے امر و ارادہ کے ماتحت اس کے حکم کو اس طرح بجا لاتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا، یہ تصرف اور عمل ہر نفس انسانی اپنے جسم کے اندر کرتا ہے اور یہ معمولی اور ادنیٰ نفوس کی قوت کی نیرنگی ہے، لیکن جو نفوس ان سے زیادہ طاقتور ہیں وہ اپنے جسم کے باہر دوسرے نفوس اور اجسام کو بھی اپنا مطیع فرمان کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے جن کو کمال کا معجزانہ حصہ ملا ہے، ان کے لئے یہ سارا مادی عالم مثل جسم کے ہوتا ہے اور وہ اسی طرح اس عظیم الشان جسم میں تصرف کرنے لگتے ہیں جس طرح معمولی انسان اپنے جسم میں کرتے ہیں۔

۵۔ **تاثیرات نفسانیہ:۔** یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ نفس انسانی میں جو جذباتی تغیرات پیدا ہوتے ہیں وہ اس کے جسم مادی کو متاثر کر دیتے ہیں، رات کوئی چیز دیکھی اور اس کا ہیبت ناک تصور کیا اور گھبرا کر چیخ اٹھا یا بے ہوش ہو کر گر پڑا، کسی درخت کی پتلی شاخ پر چڑھتے یا چھت کے منڈیر یا پتلے تختہ کے پل پر سے گزرتے ہوئے خوف طاری

ہوا، ہاتھ پاؤں میں لغزش ہوئی اور آدمی گر پڑا، غصہ سے آدمی کا چہرہ سرخ اور خجالت و شرمندگی سے زرد پڑ جاتا ہے، آدمی نے کسی ناگوار واقعہ کا تخیل کیا غصہ آ گیا، غصہ سے بدن میں گرمی پیدا ہو گئی اور گرمی سے پسینہ آ گیا، محض وہم سے آدمی ڈر جاتا ہے بلکہ بیمار پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی مر جاتا ہے۔ ان تمام واقعات میں دیکھو کہ نفسانی اثرات مادی جسم کو متاثر کر دیتے ہیں، یہ تو کمزور نفوس کا حال ہے لیکن جو لوگ کہ ارباب نفوس قدسیہ ہیں، وہ اپنے نفسانی اثرات سے دوسرے اجسام کو متاثر کر سکتے ہیں اور ان میں عجیب عجیب تغیرات اور تصرفات کر سکتے ہیں، یہ آخری دلیلیں بعینہٖ وہی ہیں جو آج ہپنوٹزم (تنویم مقناطیسی) اور مسمرازم کے نام سے لوگ پیش کرتے ہیں۔

معتزلہ اور اشاعرہ دونوں فطرت نبوی اور خرق عادات کو تسلیم کرتے ہیں، جہاں تک ہم ان کی عبارتوں سے سمجھ سکتے ہیں، اس نتیجہ میں دونوں کا اختلاف نہیں ہے بلکہ جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اصل نظریہ میں ہے، معتزلہ یہ سمجھتے ہیں کہ خاصیت و اثر، علیت و معلولیت و سببیت نفس اشیاء میں ہے، یعنی خود اشیاء کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی بات ہے جو ایک علت و سبب اور دوسرے کو معلول و مسبب بناتی ہے، آگ کی طبیعت میں جلانا اور برف کی طبیعت میں ٹھنڈک پیدا کرنا ازل سے اللہ تعالیٰ نے رکھ دیا ہے، اسی کا نام طبیعت ہے جس سے اس خاصیت کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے معتزلہ سمجھتے ہیں کہ آگ سے سوزش اور برف سے ٹھنڈک کا جو صدور ہوتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ نفس آگ یا برف کی طبیعت میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے آگ میں سوزش اور برف میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور جب کوئی معجزۂ نبوی ظاہر ہوتا ہے تو یہ طبیعت یا اس کی خاصیت تھوڑی دیر کے لئے بدل دی جاتی ہے یا روک لی جاتی ہے۔

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ خود اشیاء کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک علت و سبب اور دوسرا معلول و مسبب ہو، نفس آگ میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کو ہم گرمی کا سبب قرار دیں اور نہ برف کے اندر ٹھنڈک طبیعت کے طور پر موجود ہے بلکہ مختلف اشیاء کے متعلق ہم کو جو مختلف احساسات ہوتے ہیں، مثلاً کسی سے گرمی، کسی سے سردی، کسی سے سختی، کسی سے نرمی، کسی سے جلن، کسی سے ٹھنڈک کا، یہ ہمارے ذاتی احساسات ہیں جن کو ہم حسب ارادہ الٰہی اشیاء میں محسوس کرتے ہیں، ہماری عادت یہ ہو گئی ہے کہ ہم ایک شے کے بعد دوسری شے کو ہوتے ہوتے جب دیکھتے ہیں تو ہم ایک کو علت اور دوسری کو معلول سمجھنے لگتے ہیں، ورنہ حقیقت میں علت و معلول میں لزوم کا کوئی طبعی تعلق نہیں۔ اگر ارادۂ الٰہی بدل جائے تو ہم آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی محسوس کرنے لگیں، نفس آگ اور برف کی طبیعت میں کوئی ایسی شے نہیں جو اس تغیر کو محال قرار دے اور اس لئے حسب ارادۂ الٰہی معجزات کا صدور ہوا کرتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا اصل بانی جہم ہے جس کے انتساب سے فرقۂ جہمیہ قائم ہوا تھا، اس کے بعد ابوالحسن الاشعری نے اس کی پیروی کی، علامہ موصوف نے مسئلہ مذکور کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

لکن من لا یثبت الاسباب والعلل من اھل الکلام — لیکن متکلمین میں جو لوگ اسباب و علل کے منکر ہیں جیسے جہم اور اس مسلک

کالجمهور موافقیه فی ذلك مثل ابی الحسن الاشعری واتباعه یجعلون المعلوم اقتران احد الامرین بالآخر لمحض مشیئة القادر المرید من غیر ان یکون احدهما سببًا للآخر ولا مولدًا له۔

واما جمهور العقلاء من المسلمین وغیر المسلمین اهل السنة من اهل الکلام والفقه والحدیث والتصوف وغیر اهل السنة من المعتزلة وغیرهم فیثبتون الاسباب ویقولون کما یعلم اقتران احدهما بالآخر یعلمون ان فی النار قوۃ تقتضی الحرارۃ وفی الماء قوۃ تقتضی البرودۃ وفی العین قوۃ تقتضی الابصار وفی اللسان قوۃ تقتضی الذوق ویثبتون الطبیعة التی تسمی الغریزۃ والبخرۃ والخلق والعادۃ ونحو ذلك من الاسماء۔

میں جمہور کے جو موافق ہیں جیسے ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو، یہ مانتے ہیں کہ ہم کو صرف یہ معلوم ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ایک لگاؤ اور علاقہ ہے اور یہ لگاؤ اور علاقہ صرف اس قادر ذی ارادہ کی مشیت سے ہے، نہ اس لئے کہ ایک دوسرے کا سبب ہو یا ایک دوسرے کو پیدا کرتا ہو۔ جمہور اشاعرہ کے علاوہ وہ تمام عقلا یا مسلمان یا غیر مسلمان، مسلمانوں میں اہل سنت ہوں، خواہ وہ متکلم ہوں، اہل فقہ ہوں، اہل حدیث ہوں، اہل تصوف ہوں اور غیر اہل سنت میں معتزلہ ہوں یا کوئی اور فرقہ ہو، یہ سب لوگ اسباب کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کو یہ معلوم ہے کہ ایک کا دوسرے سے لگاؤ اور علاقہ ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ آگ میں ایک قوت ہے جو گرمی کو چاہتی ہے اور پانی میں ایک قوت ہے جو ٹھنڈک کو مقتضی ہے اور اسی طرح آنکھ میں ایک قوت ہے جو رویت کا باعث ہے اور زبان میں ایک قوت ہے جو مزہ پیدا کرتی ہے، یہ لوگ طبیعت کو ثابت کرتے ہیں جس کا دوسرا نام فطرت، خلقت، عادت وغیرہ ہے۔

اوپر خرق عادت کے امکان اور عدم امکان کے متعلق چار مذہب ہم نے نقل کئے ہیں، یہی مذاہب آج بھی فلسفہ کی مملکت میں قائم ہیں، لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس باب میں صرف دو ہی مذہب ہو سکتے ہیں، ایک ان لوگوں کا جو کسی نہ کسی طرح سے باری تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اور دوسرا ان لوگوں کا جو اس کے یکسر منکر ہیں دوسرا گروہ حکمائے طبیعین کا یا مادہ پرستوں کا ہے جن کے نزدیک عالم مادی کے باہر کچھ نہیں ہے اور تمام کائنات ذرات مادہ کے باہمی تاثیر و تاثر کی جلوہ انگیزیاں ہیں اور سلسلۂ علل و معلول اور اسباب و مسببات اور آثار و خواص کے مظاہر اور نتائج ہیں، ظاہر ہے کہ اس عقیدہ کی جماعت معجزہ اور خرق عادت پر کیونکر ایمان لا سکتی ہے، جو لوگ ان کے سامنے فلسفیانہ حیثیت سے براہ راست معجزہ اور خرق عادت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ ایک بے سود کوشش کرتے ہیں اور عقلی حیثیت سے خرق عادت کا ثبوت بھی بہم پہنچ گیا ہے تو جب وہ اس بنیاد کو جس پر نبوت اور شریعت کی عمارت قائم ہے یعنی ایک برتر خالق قوت کا وجود تسلیم نہیں کرتے تو اس خرق عادت کے ثبوت سے ارباب مذاہب اور پیروان شرائع کی کیا مقصد برآری ہو سکتی ہے؟

اشاعرہ نے اثبات مدعا کا طریقہ اختیار کرنا چاہا کہ پہلے معجزہ اور عادت کا امکان اور وقوع ثابت کیا جائے اور اس معجزہ اور خرق عادت سے نبوت پر استدلال کیا جائے، نبوت کے ثبوت سے ایک قادر مطلق کا ثبوت ہاتھ آئے گا اور پھر اس کے احکام شریعت کا ثبوت بہم پہنچے گا، اس طریقۂ استدلال کو اختیار کرنا درحقیقت الٹی گنگا بہانا ہے ع : ایں رہ کہ تو می روی بترکستان است،

صحیح راستہ ان کے مقابلہ میں یہ ہے کہ پہلے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا جائے، اس کے بعد نبوت،

شریعت، خرقِ عادت، معجزہ سب کچھ ثابت ہو جائے گا، جب تک اس چٹان پر بنیاد قائم نہ ہوگی، عمارت مستحکم نہیں ہو سکتی۔

اسبابِ خفیہ کی توجیہ بیکار ہے

دوسرا فرقہ باری تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے اور معجزہ کو تسلیم کرتا ہے خواہ وہ اس کے وقوع کے کچھ ہی اسباب بیان کرے، وہ درحقیقت خرقِ عادت کو بھی تسلیم کرتا ہے یا اس کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور اس سے اس کو کوئی چارہ نہیں کہ حکمائے اسلام فارابی اور ابن سینا وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ معجزہ اسبابِ خفیہ کی بنا پر صادر ہوتا ہے اور اس کے اندرونی طبعی علل و اسباب ہوتے ہیں، اس لئے خرقِ عادت لازم نہیں آتا اور معمولی نظامِ عالم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

حضرت موسیٰؑ مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر چلے تو راستہ میں بحرِ قلزم (ریڈ سی) حائل تھا، حکم ہوا کہ اپنی لکڑی سے دریا کو مارو، دفعۃً دریا خشک ہو گیا اور راستہ پیدا ہو گیا، حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر اتر گئے، لیکن جب فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ دریا میں قدم رکھا تو دریا پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا اور وہ اپنے لشکر کے ساتھ ڈوب کر مر گیا، وہ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ دریا میں مدوجزر تھا، جب حضرت موسیٰؑ پہنچے تو جزر تھا اور دریا پایاب ہو گیا تھا اور جس وقت فرعون دریا میں داخل ہوا تو مد شروع ہو گیا اور ڈوب گیا، ہم ان اعتراضات کو جو نقلی حیثیت سے اس توجیہ پر وارد ہوتے ہیں کہ توراۃ اور قرآن مجید نے اس معجزہ کی جس طرح تشریح کی ہے اس کی یہ صحیح نقل نہیں ہے، نظر انداز کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰؑ پہنچے تو جزر تھا اور جب فرعون آیا تو مد ہو گیا، آیا یہ اتفاقی امر تھا اور ممکن تھا کہ اس کے برعکس ہوتا، یعنی فرعون بچ جاتا اور حضرت موسیٰؑ ڈوب جاتے، اور یا یہ کہ حضرت موسیٰؑ کے لئے جزر اور فرعون کے لئے مد خاص طور سے پیدا کیا گیا تھا یا ایسے اسباب بہم پہنچائے گئے کہ حضرت موسیٰؑ جزر کے وقت پہنچیں اور فرعون مد کے وقت پہنچے اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ وہ اس خطرناک دریا میں بے سمجھے بوجھے قدم رکھے، پہلی صورت میں تو معجزہ کیا نبوت کی بھی تشکیک لازم آتی ہے اور دوسری صورت میں خرقِ عادت کی تسلیم سے چارہ نہیں اور خرقِ عادت کے تسلیم کر لینے کے بعد خدا کی قدرتِ مطلقہ پر بھی ایمان لانا ہو گا۔

حکمائے اسلام کی غلطی کا سبب

اصل یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے ارسطو کی تقلید کی ہے اور مسئلہ علت میں تمام تر مشائیہ کے نظریہ کو قبول کر لیا ہے کہ ذاتِ واجب الوجود علتِ اولیٰ یا عقلِ اوّل کی علتِ تامہ ہے اور علتِ تامہ سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا اور اضطراراً اس سے پیدا ہو جاتا ہے، اس میں اس کے ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا، اس کی صحیح مثال آفتاب اور روشنی کی ہے کہ آفتاب کی روشنی علتِ تامہ ہے جب آفتاب نکلے گا روشنی کا ظہور ہو گا، خواہ وہ موانع کی وجہ سے نظر نہ آئے اور آفتاب سے اس روشنی کا صدور آفتاب کے قصد اور ارادہ سے نہیں ہے بلکہ اس سے مجبوراً اور اضطراراً یہ روشنی پیدا ہو رہی ہے، عقلِ اول کے پیدا ہونے کے بعد عالمِ کائنات کا تمام کارخانہ باہمی سلسلۂ علل و معلول سے خود بخود پیدا ہونے لگا اور تمام عالم ایک ایسے نظام میں بند ہو گیا کہ اب خالقِ اوّل کو اس میں دست اندازی کی مطلق قدرت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مذہب کا پیرو سلسلۂ علل و معلول کو نہیں توڑ سکتا اور اس لئے وہ خرقِ عادت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا، لیکن تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایسے

واقعات پیش آتے ہیں جن کی توجیہ ظاہری سلسلۂ علل و معلول سے نہیں ہو سکتی اور نہ ان کے وقوع سے کوئی انکار کر سکتا ہے، اس لئے ایک طرف اس کو لامحالہ ان واقعات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف چونکہ وہ خدا کو مضطر و مجبور مان چکا ہے، اس لئے براہِ راست ان واقعات کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتا اور چونکہ بلا سبب اور بے علت کے کوئی شے ہو نہیں سکتی، اس بنا پر اسباب و عللِ خفیہ کے سایہ کے سوا اس کو اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی مگر آپ نے اوپر دیکھ لیا کہ یہ سوچ بھی محفوظ نہیں اور خدا کو قادرِ مطلق مانے بغیر چارہ نہیں۔

اشاعرہ اور معتزلہ میں نتیجہ کا اختلاف نہیں

اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان جو اختلاف ہے وہ صرف نظریہ کا فرق ہے، اس سے نفسِ خرقِ عادت اور معجزہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ امر کہ اشیاء کے طبائع میں فی نفسہٖ خواص اور آثار ودیعت ہیں یا اللہ تعالیٰ ہر وقت ان کو پیدا کر دیتا ہے ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے کسی پہلو کے اثبات اور دوسرے کی نفی پر کوئی دلیل نہیں قائم کی جا سکتی اور معجزہ کے سلسلہ میں ہم کو اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اس کا کوئی پہلو بھی صحیح ہو، بہرحال دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اشیاء کی عادتِ جاریہ کو اللہ تعالیٰ توڑ دیتا اور بدل دیتا ہے۔

خرقِ عادت سے انکار کا اصلی سبب سلسلۂ اسباب و علل پر یقین ہے

الغرض معجزہ یعنی خرقِ عادت سے صرف اس فریق کو انکار ہے جو یا خدا کا قطعاً منکر ہے یا یہ کہ وہ خدا کو قادر و ذی ارادہ نہیں مانتا اور ناقابلِ شکست سلسلۂ علل و معلول کے گورکھ دھندے پر یقینِ کامل رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام نظمِ کائنات باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے، غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اپنے اس عقیدۂ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتوں کو بھی بلا دلیل تسلیم کئے بیٹھے ہیں اور اس لئے خرقِ عادت کے قبول کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی۔

سلسلۂ اسباب و علل پر علمِ انسانی کو احتوا نہیں

(۱) گویا انہوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لئے ہیں وہ نظامِ کائنات کے چلانے کے لئے کافی ہیں، اس کے لئے کسی اور کے دست اندازی کی ضرورت نہیں۔

(۲) کائنات کے چہرۂ اسرار کو انہوں نے تمام تر بے نقاب کر لیا ہے اور ہر شے کی علت اور خاصیت انھوں نے دریافت کر لی ہے۔

حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلہ میں بہت کم حیثیت ہیں، اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں ذرہ نام ایک آبادی کے چوتھائی خشک حصے کے بعض اجزائے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکی ہے

---

[1] حکمائے اسلام میں مسئلہ خرقِ عادت کا سب سے بڑا منکر بو علی سینا اشارات میں لکھتا ہے:

ولكنها تجارب لما ثبتت طلب اسبابها توانى لو	لیکن یہ تجربے ہیں جب وہ ثبوت کو پہنچ گئے تو ان کے اسباب کی تلاش
اتفقت جزئيات هذا الباب فيما شاهدناه وفيما حكى	ہوئی اور اگر اس قسم کے جزئیات کا تتبع کریں جو ہم نے خود مشاہدہ کیا یا
عمن صدقنا ولطال الكلام.	ان کے لوگوں سے جن کو ہم معتبر سمجھتے ہیں سنا ہے تو بہت طول ہو جائیگا

اس مبلغِ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا، جن چیزوں تک ان کی رسائی ہوتی بھی ہے، ان کے متعلق جو کچھ انہیں معلوم ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ یہ چیز اس طرح چل رہی ہے، لیکن یہ حقیقت کہ وہ کیوں چل رہی ہے اور اگر اس کے خلاف چلے تو کیا استحالہ لازم آئے گا، ایک معمہ ہے اور ہمیشہ معمہ رہے گا، اجرامِ فلکیہ اور طبقاتِ ارضیہ کو چھوڑ دو کہ وہ دور ہیں، تم یہ کہتے ہو کہ بجلی میں یہ قوت ہے، سنکھیا میں یہ اثر ہے، مقناطیس کا یہ خاصہ ہے، لیکن یہ بھی معلوم ہے کہ کیوں ایسا ہے؟ اور نزدیک آؤ اپنے جسم کی دنیا کو دیکھو تم صرف یہ جانتے ہو کہ سانس کی آمد و رفت ہمارے پھیپھڑوں کی حرکت سے ہے، نبض کی رفتار، قلب کی قبض و بسط کی ڈوری سے وابستہ ہے، تمہارا نفس یا ذہن لمحوں میں ہزاروں میل کی خبر لیتا ہے اور خدا جانے عجائباتِ نفسانی کے کیا کیا تماشے دکھاتا ہے، لیکن کوئی یہ حل کر سکا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دل کو کس نے مضطرب بنا رکھا ہے، پھیپھڑوں کی دھونکنی کس طرح روز و شب مصروفِ عمل ہے، دماغ کے ذہنی افعال کیونکر سر انجام پاتے ہیں، جب اتنے قریب کی چیز تمہارے فلسفہ علل و اسباب کے دائرہ سے باہر ہے تو دور دراز کی اشیاء کی نسبت تمہارا دعویٰ علم کس قدر تمسخر انگیز ہے، حکما یعنی سائنٹسٹ اعلانیہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ صرف "کیسے" کا جواب دے سکتے ہیں، "کیوں" کا جواب ان کے موضوعِ بحث سے خارج ہے، فلاسفہ کا یہ حال ہے کہ وہ فلسفی بھی ایک نظامِ خیال پر متفق نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے الرد علی المنطقیین میں لکھا ہے

"فلاسفہ کوئی ایک متحد الخیال جماعت نہیں جس کا علمِ الٰہیات و طبیعیات وغیرہ میں کوئی ایک مذہب ہو بلکہ وہ مختلف الخیال فرقے ہیں اور ان کے اندر آراء اور خیالات کا اتنا اختلاف ہے کہ اس کا احاطہ بھی مشکل ہے ان کے باہمی اختلافات تو اس سے بھی زیادہ ہیں جس قدر کسی ایک آسمانی مذہب کے مختلف فرقوں کے اندر ہیں۔"

اس اختلافِ رائے اور اس خیال کی بناء پر کسی فلسفی کا یہ دعویٰ کہ مذہب کا فلاں مسئلہ فلسفہ کے خلاف ہے اس لئے ناقابلِ قبول ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ یہ مسئلہ ہماری رائے یا ہماری جماعت کی رائے کے خلاف ہے اس لئے ناقابلِ تسلیم ہے تو یہ مذہب ہی پر کیا موقوف ہے، ہر نظامِ فلسفہ کا قائل دوسرے نظامِ فلسفہ کے بطلان پر اسی قدر و قوت سے اس استدلال کو کام میں لا سکتا ہے، غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ فلسفہ کے جس قدر فرقے (اسکول) اور نظامات (سسٹم) ہیں، درحقیقت وہ اسرارِ کائنات کے متعلق ایک مرتب خیال کی کڑیاں ہیں، ان مرتب خیال کی کڑیوں کو مان کر جس کے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے، وہ ان کا فلسفہ ہے اسی طرح مذہب بھی اپنا ایک نظامِ خیال رکھتا ہے، اور جو لوگ اس نظامِ خیال پر یقین رکھتے ہیں، ان کی اس سے تشفی ہو جاتی ہے، ایسی حالت میں اگر معجزہ کا امکان یا وقوع کسی نظامِ خیال کے خلاف ہے، تو نفسِ یہ اختلاف اس کے ابطال کی دلیل نہیں ہو سکتا اور نہ یہ لازم آئے گا کہ ہر فلسفیانہ مسئلہ اس لئے باطل ہے کہ دوسرے نظامِ فلسفہ کے وہ خلاف ہے۔

نظامِ عالم کے چلانے کے لئے علل و اسباب کے کافی ہونے کے فلسفہ پر یقین رکھنے کے لئے سب سے پہلی بحث آغازِ آفرینش کی آتی ہے، آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ شے اس سبب سے پیدا ہوئی اور اس شے کی پیدائش کا سبب یہ ہے لیکن کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ مادہ کہاں سے آیا؟ اور اس کے حدوث کا سبب کیا ہوا؟ عناصر کیونکر اور کیوں وجود میں آئے یہ نوع بنوع چیزیں کیونکر بن گئیں؟ ہمارے جواب میں ان نظریات کا ذکر نہ کیجئے جن کا نام اصولِ ارتقاء اور انتخاب

طبعی وغیرہ ہے کہ ان کی علمی حیثیت مفروضات اور وہمیات سے زیادہ نہیں اور ان کی اخیر سرحد بالآخر لاعلمی اور جہالت پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، مادہ کی ابتدائی بنیاد چاہے اربع عناصر کو بتایئے یا جواہر فردہ کو یا سالمات کو یا ایتھر کو یا برقی پاروں کو جن کو بھی بتاؤ، لیکن ان کے حدوث کی علت نہیں بتائی جا سکتی اور نہ بتا سکتے ہیں کہ بالآخر وہ کہاں سے آئے؟ اب تو حیوانات نطفہ سے، پرندے انڈے سے اور درخت گٹھلی سے پیدا ہوتے ہیں اور بغیر ان کے ان کا پیدا ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی بتا سکتا ہے کہ دنیا کا پہلا حیوان، پہلا پرندہ اور پہلا درخت بغیر کسی نطفہ، کسی انڈے اور کسی گٹھلی کے پیدا ہوا یا نہیں؟ اگر ہاں کہتے ہیں تو آپ نے اپنے دعویٰ کے خلاف ایک شہادت قبول کر لی اور اگر انکار کرتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پہلا نطفہ، پہلا انڈہ اور پہلی گٹھلی، انسان، پرندہ اور درخت کے بغیر پیدا ہوئی، غرض اس گتھی کو آپ اپنے ناخن حکمت سے کسی طرح سلجھا نہیں سکتے اور ناچار آپ کو سلسلۂ علل و اسباب کے مذہب سے برگشتہ ہونا پڑے گا۔

حقیقی علت خدا کی قدرت اور ارادہ ہے

جہاں آپ اپنے سلسلۂ اسباب و علل کو چند قدم بڑھا سکتے ہیں وہاں بھی بالآخر سپر افگن ہونے سے چارہ نہیں، پانی بادل سے برسا، بادل بخارات سے بنے، بخارات پانی سے اٹھے جو سورج کی تپش سے گرم ہو کر یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں، غرض پانی بخارات سے پیدا ہوا اور بخارات پانی سے پیدا ہوئے، اس دور کے عقدۂ لاینحل کو آپ حل کر سکتے ہیں یہ ناممکن ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایک قادر و ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجئے جس کی مشیت اور ارادہ سے سارا کارخانہ چل رہا ہے، اسباب و علل صرف اس کی مشیت و ارادہ کے مظاہر ہیں اور اپنی عادت کے مطابق ایک طریق خاص پر اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اس کا پابند نہیں ہے، صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لئے عادت کے خلاف کوئی بات ظہور پذیر کر دی، علت و معلولیت کا تعلق جو بظاہر نظر آتا ہے ہم نے اس کی عادت جاریہ کی یک رنگی اور یکسانی سے اس کو سمجھ لیا ہے کہ اگر اس کی عادت جاریہ یہ یک رنگی اور یکسانی اختیار نہ کرتی تو مخلوقات اپنے منافع کے حصول اور مضرتوں کے دفع کے لئے پہلے سے کوئی تیاری نہ کر سکتیں۔

مولانا روم اور اسباب و علل اور معجزہ کی حقیقت

عارف روم نے اسی حقیقت کو ان اشعار میں ادا کیا ہے۔

سنتے بنہاد و اسباب و طرق　　طالبان را زیر ایں ازرق تتق
اللہ تعالیٰ نے آسمان کے ان نیلے پردوں کے نیچے کام کرنے والوں کیلئے علل اسباب اور عادات مقرر کر دیئے ہیں

بیشتر احوال بر سنت رود　　گاہ قدرت خارق سنت شود
دنیا کے زیادہ تر واقعات ان ہی عادات جاریہ کے مطابق ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی قدرت الٰہی اس عادت کو توڑ بھی دیتی ہے

سنت و عادت نہادہ بامزہ　　باز کردہ خرق عادت معجزہ
طرق و عادات یعنی اسباب و علل کو اس نے خوش آئند بنایا ہے لیکن پھر معجزہ سے خرق عادت بھی کر دیتا ہے۔

اے گرفتار سبب بیروں مپر   لیک عزلِ آں مسبب ظن مبر

اے وہ جو اسباب و علل کی زنجیر میں گرفتار ہے حد سے زیادہ نہ اڑ اور یہ خیال نہ کر کہ ان اسباب و علل کے بنا بیٹھنے سے وہ تمام العلل اور مسبب الاسباب بیکار ہو گیا

ہر چہ خواہد آں مسبب آورد   قدرتِ مطلق سببہا بر درد

وہ حقیقی مسبب الاسباب جو چاہے کر لے اور اس کی قدرت علی الاطلاق اسباب کو توڑ دے۔

لیک اغلب بر سبب راند نفاذ   تا بداند طالبے جستن مراد

لیکن بیشتر اسباب ہی کے مطابق دنیا کو چلاتا ہے تاکہ کام کرنے والوں کو اپنے حصول مقصد کا راستہ معلوم ہو۔

چوں سبب نبود چہ رہ جوید مرید   پس سبب در راہ می آید پدید

اگر اسباب معلوم نہ ہوں تو کام کرنے والوں کو راہ کیونکر ملے یہی اسباب تو نشانات بن کر نمودار ہوتے ہیں

ایں سببہا بر نظرہا پردہ است   کہ نہ ہر دیدار صنعش را سزا است

یہ ظاہری اسباب نگاہوں کے پردے ہیں کیونکہ ہر آنکھ اس کی صنعت کو نہیں دیکھ سکتی۔

دیدہ باید سبب سوراخ کن   تا حجب را بر کند از بیخ و بن

اس کے لئے ایسی آنکھ چاہیے جو اسباب پردہ چاک کر دے تاکہ حجابات اٹھ جائیں۔

از مسبب می رسد ہر خیر و شر   نیست اسباب و وسائط را اثر

درحقیقت ہر نیک و بد اسی اصلی مسبب الاسباب کے یہاں سے پہنچتا ہے اور بیچ میں ان درمیانی اسباب و وسائط کو دخل نہیں

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند   با من و مردہ با حق زندہ اند

ہوا، مٹی، پانی اور آگ سب خدا کے محکوم ہیں، یہ ہمارے تمہارے سامنے تو بے جان مگر خدا کے سامنے جاندار ہیں

سنگ بر آہن زنی بیروں جہد   ہم بہ امر حق قدم بیروں نہد

جب پتھر لوہے پر مارو تو اس سے آگ نکلتی ہے یہ خدا ہی کے حکم سے اپنا قدم باہر نکالتی ہے۔

آہن و سنگ از ستم بر ہم مزن   کایں دو می زایند ہمچو مرد و زن

لوہے اور پتھر کو بے فائدہ ایک دوسرے پر مت مارو کہ یہ دونوں نر و مادہ ہیں جو آگ کا بچہ پیدا کرتے ہیں۔

سنگ و آہن خود سبب آمد ولیک   تو بہ بالا تر نگر اے مرد نیک

پتھر اور لوہا گو یہ دونوں آگ کا سبب ہیں، لیکن ذرا اس سے آگے بڑھ کر غور کرو۔

کایں سبب را آں سبب آورد پیش   بے سبب کے شد سبب ہرگز بخویش

کہ اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب (خدا) نے آگے کر دیا یہ ظاہری سبب خود بخود بلا سبب کب پیدا ہوا ہے۔

آں سبب را آں سبب عامل کند   باز گاہے بے بر و عاطل کند

اس ظاہری سبب کو اس حقیقی سبب نے دنیا میں مؤثر اور عامل بنا دیا ہے جب چاہے وہ اس کو بے اثر اور بیکار قرار دے سکتا ہے۔

واں سببہا کانبیاء را رہبر است   آں سبب ہا زیں سبب ہا برتر است

اسباب کہ انبیاء کے کاموں میں پیش پیش ہوتے ہیں وہ ان ظاہری دنیاوی اسباب سے بلند تر اور برتر ہیں۔

ایں سبب را محرم آمد عقل ما   واں سبب ہا راست محرم انبیاء

ان ظاہری علل و اسباب کی محرم تو ہماری انسانی عقلیں ہیں لیکن ان حقیقی اسباب کے محرم انبیاء علیہم السلام ہیں۔

چونکہ ظاہر بین انسان ان اسباب و علل کو دیکھ کر اصل علۃ العلل اور مسبب الاسباب کو بھول جاتے ہیں اور وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اس غفلت کے پردے کو چاک کر دیتے ہیں اور ظاہری علل و اسباب ان کے لئے بیکار کر دیئے جاتے ہیں۔

ہست بر اسباب، اسباب دگر   در سبب منگر دراں افگن نظر

ان ظاہری اسباب کے اوپر حقیقی اسباب بھی کار فرما ہیں، ان ظاہری اسباب کو نہ دیکھو حقیقی اسباب پر غور کرو۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند   معجزاتِ خویش بر کیواں زدند

انبیاء قطع اسباب کے درپے ہیں اور اپنے معجزات کا جھنڈا انہوں نے مریخ میں گاڑ دیا ہے۔

بے سبب مر بحر را بشگافتند   بے زراعت چاش گندم یافتند

بغیر کسی سبب ظاہری کے انہوں نے سمندر کو شق کر دیا اور کھیتی کے بغیر گیہوں کا خوشہ حاصل کیا۔

جملہ قرآں ہست در قطعِ سبب   عزِ درویش و ہلاکِ بولہب

تمام قرآن قطع اسباب کے بیان سے بھرا ہوا ہے آنحضرت ﷺ کا غلبہ اور ابولہب کی بربادی بھی اسی طرح ہوئی۔

مرغ بابیلے دو سہ سنگ افگند   لشکرِ زفتِ حبش را بشکند

پرندے کنکریاں پھینکتے ہیں اور حبش کے سیاہ لشکر کو شکست دیتے ہیں۔

پیل را سوراخ سوراخ افگند   سنگ مرغ کو بیالہ بر زند

یہ کنکریاں جو اوپر سے آتی ہیں ہاتھیوں کے بدن میں چھید کر کے ڈال دیتی ہیں۔

ہم چنیں ز آغاز قرآں تا تمام   رفض اسباب است و علت والسلام

اسی طرح شروع سے لے کر آخر تک قرآن اسباب و علل کے موثر حقیقی ہونے کا منکر ہے۔

علت و خاصیت اور اس کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل علت، خاصیت اور اثر کی تحقیق پر مبنی ہے، اشیاء میں جو خواص اور آثار ہیں ان کا علم ہم کو کیونکر ہوتا ہے؟ محض تکرار احساس سے جس کا دوسرا نام تجربہ ہے۔

جب ہم آگ کے پاس جاتے ہیں تو گرمی اور سوزش کا احساس کرتے ہیں اور پھر جب، جب ہم آگ کے پاس گئے تو ہم کو اسی قسم کا احساس ہوتا رہا، اس سے ہم میں یہ یقین پیدا ہوا کہ آگ کا خاصہ اور اثر گرمی اور سوزش ہے، فرض کرو کہ اگر تکرار احساس سے یہی تجربہ ہم کو برف سے حاصل ہو جاتے تو یقیناً ہم کہہ دیں گے کہ برف کی خاصیت سوزش اور گرمی ہے، برف اور آگ دونوں آپ کے سامنے ہیں، دونوں کو اچھی طرح غور سے دیکھئے، کیا ان کی ذات میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جس کی بنا پر احساس بلکہ تکرار احساس سے قبل آپ یہ فیصلہ کر دیں کہ ایک میں گرمی اور دوسرے میں ٹھنڈک کا ہونا ضروری ہے، آپ کے ہاتھ میں کوئی شخص کافور اور سنکھیا دونوں کی تھوڑی تھوڑی مقدار لا کر رکھ دیتا ہے اس

سے پہلے آپ ان چیزوں سے واقف نہ تھے، اب آپ دونوں کو غور سے دیکھئے اور خوب الٹ پلٹ کر دیکھئے، سونگھ کر، چکھ کر، چھو کر کس طرح آپ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کے خواص و آثار کیا ہیں؟ یہ فیصلہ ناممکن ہے جب تک ان کا بار بار تجربہ نہ کیا جائے اور ہر بار کے عمل سے ایک ہی نتیجہ ظاہر نہ ہو، اس سے ثابت ہوا کہ اشیاء کے خواص و آثار کا علم صرف یکسانیٔ عمل اور تجربہ پر موقوف ہے۔

عمل کی اسی یکسانی اور تجربہ کی بناء پر ہم علل و معلولات اور اسباب و مسببات کا مسئلہ قائم کرتے ہیں اور اسی کی بنا پر مدعیانِ عقل و دانش وہ صنم کدہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے پرستاروں کے نام نیچری، میٹریلسٹ، مادہ پرست، فطرت پرست اور طبیعی ہیں، وہ جب ایک شے سے ایک ہی عمل اور اثر کا بار بار تجربہ کرتے ہیں تو یقین کر لیتے ہیں کہ اس شے سے اس خاصیت و اثر کا انفکاک قطعاً محال ہے اور جب ایک شے کے بعد فوراً دوسری چیز پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور بار بار دیکھتے ہیں اور کبھی اس میں تخلف نہیں پاتے تو یہ یقین کامل کر لیتے ہیں کہ دوسری شے معلول و مسبب اور پہلی شے علت و سبب ہے اور یہ کلیہ قائم کر لیتے ہیں کہ گرمی و سوزش کا سبب آگ ہے، ٹھنڈک اور برودت کا سبب برف ہے، موت کا سبب سنکھیا ہے یا یوں کہیئے کہ آگ کا خاصہ جلانا، برف کا خاصہ ٹھنڈا کرنا، سنکھیا کا خاصہ انسان کی زندگی کو ختم کر دینا ہے، معجزہ کے امکان سے چونکہ ان کے خیال کے مطابق ان آثار و خواص کا انکار یا علل و اسباب کا ابطال لازم آتا ہے، یعنی یہ ماننا پڑتا ہے کہ آگ ہو اور جلائے نہیں، سمندر ہو اور غرق نہ کرے، اسلئے وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ معجزہ قطعاً محال ہے۔

اسباب و علل محض عادی ہیں

لیکن ابھی ثابت ہو چکا کہ ہم جن کو آثار و خواص یا اسباب و علل کہتے ہیں محض اس تجربہ پر ان کی بنیاد ہے کہ ہم نے ہمیشہ اس شے کو ہوتے دیکھا ہے اور اس سے یہ توقع یا زیادہ سے زیادہ ظن غالب یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئندہ بھی جب یہ شے پیدا ہوگی تو اس کے بعد دوسری شے پیدا ہو جائے گی لیکن اس سے یہ یقین کس طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا اور ہمارے علاوہ شروع سے آج تک اور جن جن لوگوں نے اس کو دیکھا ہے، ان کے مشاہدہ کا بھی یہی نتیجہ نکلا کیا ہے، اور آئندہ بھی اُن کے مشاہدہ کا یہی نتیجہ نکلا کرے گا۔ آج تک آگ کے متعلق اور جن آگوں کے متعلق آپ کا جو تجربہ ہے اس پر آپ یقین کر سکتے ہیں، لیکن محیط جن کی ہر آگ کے متعلق جو آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے اور نہ آ سکتی ہے یہ کیونکر یقین پیدا کر لیتے ہیں کہ ان سب کا اثر جلانا ہی ہے اور نیز یہ اعتماد کس مقدمۂ یقین پر قائم کر لیتے ہیں کہ آئندہ تا قیامت آگ کا عمل و اثر ہمیشہ جلانا ہی رہے گا اور جب آپ کے اس یقین و اعتماد کے لئے کوئی دلیل قائم نہیں ہے تو چند آگوں کو دیکھ کر آپ اس قضیۂ کلیہ پر کیونکر ناقابلِ شکست یقین کی مہر لگا دیتے ہیں کہ دنیا کی ہر آگ جلاتی ہے اور ہمیشہ جلاتی رہے گی۔

اسباب عادیہ کا علم صرف تجربہ سے ہوتا ہے

غرض خواص و آثار اور اسباب و علل کی نسبت علم انسانی کا جہاں تک احاطہ ہے وہ صرف یکسانیٔ عمل اور تجربہ کا نتیجہ ہے ہم ایک شے کے بعد دوسری شے کو ہوتے ہوتے دیکھتے آتے ہیں، اس لئے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی ایسا

ہی ہوگا، اس کی مثال یہ ہے کہ ہم ایک شخص کو آغاز عمر سے دیکھتے ہیں کہ وہ فلاں وقت سوتا ہے، فلاں وقت جاگتا ہے، مسجد میں فلاں دروازہ سے داخل ہوتا ہے، کبھی کسی سے انتقام نہیں لیتا ہے، سالہا سال کے مشاہدہ اور تجربے کے بعد ہم اس کے متعلق بطریق ظن غالب خیال قائم کر لیتے ہیں کہ اس وقت اتنے بجے ہیں اس لئے وہ اٹھا ہوگا، اتنے بج کر اتنے منٹ ہوئے ہیں اس لئے وہ سو گیا ہوگا، آج جب وہ نماز کے لئے جائے گا تو فلاں دروازہ سے داخل ہوگا، اسی کا نام عادت ہے، اگر کبھی کوئی اس حماقت میں بھی مبتلا ہوگا کہ سالہا سال کے تجربہ کے بعد وہ یقینی دعویٰ کر بیٹھے کہ آج اس وقت اس کا سویا رہنا محال قطعی ہے، اس وقت اس کا جاگنا لازماً ضروری ہے اور فلاں دروازہ سے اس کا داخل عقلاً لازم ہے۔

اسباب وعلل کا علم بدلتا رہتا ہے

اسی طریق پر اشیاء اور موجودات عالم سے عادۃً جو مختلف آثار ونتائج کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم ان اشیاء اور موجودات سے ان آثار ونتائج کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور عادۃً ایسا سمجھتے ہیں کہ آئندہ بھی ان سے یہی آثار وخواص صادر ہوں گے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمثیل صحیح نہیں ہے انسان ایک صاحب ارادہ ہستی ہے اس لئے اس کے افعال اس کے ارادہ کے ماتحت ہیں جن کو وہ جب چاہے بدل سکتا ہے، دیگر غیر ذی روح اشیاء کے افعال ارادی نہیں ہیں بلکہ طبعی ہیں، اس لئے ان میں تغیر نہیں ہو سکتا، لیکن یہ درحقیقت ایک قسم کا مغالطہ ہے، آپ کے حرکات وافعال آپ کے اعضاء سے صادر ہوتے ہیں جو بے ارادہ ہیں اور ارادہ آپ کے نفس یا روح یا ذہن کا فعل ہے جس طرح آپ کی روح یا نفس یا ذہن کی قوت ارادہ آپ کے جامد اور بے جان مضغۂ گوشت اعضاء سے اپنی حسب خواہش مختلف حرکات وافعال صادر کراتی ہے، اسی طرح روح اعظم کی قوت ارادہ اس بے جان عالم کائنات سے اپنی خواہش کے مطابق مختلف افعال اور حرکات صادر کراتی رہتی ہے اور چونکہ عموماً وہ اس کو ایک ہی نہج پر چلاتی رہتی ہے اس لئے ہم کو اسباب عادیہ کا علم کسی قدر عطا ہو گیا ہے۔

اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ذہن کے اندر آگ اور گرمی، برف اور ٹھنڈک کے درمیان ایک تلازم پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ آگ سے گرمی اور برف سے ٹھنڈک کا انفکاک نہیں ہو سکتا حالانکہ اگر آگ اور برف کے متعلق ہمارا آئندہ تجربہ بدل جائے تو یقیناً یہ تلازم کا خیال بھی بدل جائے گا۔ مثلاً جس عہد قدیم میں گردش آسمانی اور دور نجوم، حادثات کے اسباب وعلل یقینی کئے جاتے تھے اور ستاروں کی مختلف چالوں اور ان کی خاص خاص اشکال سے حوادث عالم کی توجیہ کی جاتی تھی، اس وقت ستاروں کی ایک خاص شکل کے ظہور یا کسی خاص ستارہ کے طلوع اور اس کے آثار ونتائج کے درمیان ایک خاص تلازم سمجھا جاتا ہوگا اور اس یقین کو کہ یہ دونوں باہم علت ومعلول ہیں ناقابل انکار سمجھا جاتا ہوگا، لیکن آج ایسا نہیں ہے۔

قدیم وجدید فن طب میں اب آسمان وزمین کا اختلاف ہے، دواؤں کے خواص واثرات اور امراض کے علل واسباب میں عظیم الشان تبدیلی ہو گئی ہے مگر قدیم اطباء یا اب بھی قدیم طب کے واقف کاروں اور قدر شناسوں کے نزدیک ان کے تجربے اور یکسانی عمل کی بنا پر جن دواؤں کے جو اثرات اور جن امراض کے جو علل واسباب ہیں وہ ان کے

یقینیات میں داخل تھے اور ہیں، لیکن ممالک یورپ میں جہاں کوئی اس طب کا نام بھی نہیں جانتا اور اس کے تجارب وتحقیقات کا مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے، ہمارے اطباء کے یقین کردہ آثار وخواص اور اسباب وعلل کو وہاں اوہام سے زیادہ رتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

خود اوہام کیا چیز ہیں؟ جاہل طبقوں اور وحشی قوموں میں بہت سے ایسے یقینیات ہیں جن کو آپ اوہام سے تعبیر کرتے ہیں، مگر ان میں یہ اوہام کیونکر پیدا ہوئے؟ اسی تکرار تجربہ سے انہوں نے کئی دفعہ دیکھا کہ جب صبح کو فلاں پرندہ بولا یا اڑا تو فلاں بات ہوگئی، چند بار کے دیکھنے سے ان کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اس کا یہ اثر ہے، حالانکہ معلوم ہے کہ اس پرندہ کے بولنے یا اڑنے اور اس بات کے ہونے کے درمیان کسی قسم کا تلازم نہیں ہے تاہم چونکہ ان کا یقین ان کے تجربہ پر مبنی ہے، اس لئے اس کے خلاف باور کرنا ان کے لئے اتنا ہی محال ہے، جتنا کہ آگ اور گرمی وسوزش کے درمیان تلازم اور ان دونوں کے درمیان علت ومعلول پر عقیدہ رکھنے والوں کے لئے یہ تخیل کہ آگ موجود ہو اور اس سے گرمی وسوزش کا اثر ظاہر نہ ہو، جن ملکوں میں خچر نہیں ہوتے وہاں کے باشندے اپنے تجربہ کی بنا پر اس مسئلہ پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ دو مختلف النوع جانوروں میں باہم توالد وتناسل نہیں ہو سکتا اور اگر اس کے خلاف ان کو یقین دلانا چاہیں کہ گھوڑے اور گدھے مل کر باہم اس فرض کو انجام دیتے ہیں اور اس سے خچر نام ایک تیسری نوع تیار ہوتی ہے تو اس کے تسلیم کرنے میں ان کو کسی قدر تامل ہوگا، لیکن کیا ان کا تامل ہندوستان ومصر میں مطابق واقعہ سمجھا جائے گا جہاں ہزاروں دفعہ یہ مشاہدہ ہو چکا ہے۔

اسباب وعلل کا علم تجربہ سے ہوتا ہے

الغرض ہم جن کو اصول فطرت، نوامیس قدرت اور لاز آف نیچر کہتے ہیں وہ صرف روزمرہ کے مشاہدات عادیہ کے نام ہیں، ہم دیکھتے آئے ہیں کہ درخت کس طرح اگتے ہیں، جاندار موجودات کس طرح پیدا ہوتے ہیں، آفتاب کس طرح طلوع ہوتا ہے؟ پانی کس طرح برستا ہے، ان کو دیکھتے دیکھتے ہم اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ ہم ان کا اسی طرح ہونا ضروری اور اس کے خلاف ہونا محال قطعی سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے، کچھ دنوں کے بعد وہ پھوٹتا ہے اس میں کونپلیں نکل آتی ہیں، پھر وہ پودے کی شکل اختیار کرتا ہے شاخیں نکلتی ہیں اور بڑھ کر درخت ہو جاتا ہے، ایک قطرہ آب خون اور خون سے گوشت بن جاتا ہے، اس میں رگیں پٹھے اور ہڈیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دل ودماغ اور جگر وگردہ اپنی اپنی جگہ پر بن جاتے ہیں، پھر کہیں سے اس میں روح آجاتی ہے، پھر اس آئینہ میں احساس وعقل جلوہ آرا ہوتی ہے، ایک مدت متعینہ کے بعد وہ پیدا ہوتا ہے جوان ہوتا ہے، اس طرز پیدائش کو دیکھتے دیکھتے حیرت زائی اور استعجاب اور استبعاد کی روح ہم سے بالکل فنا ہو گئی ہے اور ہم کبھی ایک لحظہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے کہ ایک جاندار وذی عقل انسان کی صورت میں کیونکر بدل گیا لیکن جب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک بے جان لکڑی جاندار سانپ بن گئی اور عیسیٰ نام ایک بچہ بن باپ کے پیدا ہو گیا تو ہماری محدود عقل وتجربہ کا تیر فوراً انکار سے چلنے لگتا ہے، یہ کیوں؟ اس لئے کہ کبھی ہم نے ایسا ہوتے دیکھا نہیں آفتاب روز پورب سے طلوع ہوتا ہے اور پچھم میں جا کر غروب ہو جاتا ہے ہم کو اس پر مطلق تعجب نہیں ہوتا اور نہ متحیر

معلوم ہوتا ہے اور جب یہ سنتے ہیں کہ قیامت کے دن آفتاب پورب کے بجائے پچھم سے نکلے گا تو ہم اس کو خلافِ عقل کہتے ہیں، کیا پورب سے اس کا نکلنا عقل کے موافق تھا، اور تم آفتاب کو اگر پورب سے نکلتے نہ دیکھتے تو خود تو عقلاً یہ فیصلہ کر لیتے کہ اس کو پورب ہی سے نکلنا چاہیئے اور مغرب ہی میں ڈوبنا چاہیئے، عموماً انسان کے ایک سر، دو آنکھیں، دو کان، دو ہاتھ اور دو پاؤں اور ہر ہاتھ پاؤں میں پانچ پانچ انگلیاں ہوتی ہیں، لیکن تاریخ طبعی انسانی کی کوئی کتاب پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ قدرت کے مستثنیات کی بھی کوئی انتہا نہیں اور سینکڑوں ہزاروں بچے اس کے خلاف پیدا ہوتے ہیں، اب جس طرح آپ اس پر اعتراض نہیں کرتے کہ انسان کے دو ہی ہاتھ اور دو ہی پاؤں کیوں ہوتے ہیں، اس پر بھی اعتراض نہیں کر سکتے کہ اس بچہ کے چار ہاتھ اور چار پاؤں کیوں ہیں اور جس طرح آپ کو اس بات پر حیرت نہیں ہوتی کہ آدمی جی کر مر کیوں جاتا ہے، ایسے ہی اس پر حیرت نہ کیجیے کہ مر کر جی کیونکر جاتا ہے، ان دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک واقعہ کو آپ نے بار بار دیکھا ہے اور دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا لیکن کسی چیز کا دیکھنا اور نہ دیکھنا کسی چیز کے فی نفسہٖ محال یا ممکن ہونے پر دلیل نہیں ہو سکتی۔

حاصل یہ ہے کہ ہم کو معجزات کے متعلق جو استبعاد نظر آتا ہے، اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے گزشتہ مشاہدات و تجربات کے خلاف ہوتا ہے لیکن اس کا فیصلہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ اس کے گزشتہ مشاہدات اور تجربات میں غلطی کا ہونا یا اس میں انقلاب ہو جانا کچھ محال نہیں، طبیعیات جدیدہ نے طبیعیات قدیمہ کی تحقیقات کی دیوار ڈھا دی، حکمائے جدیدہ نے حکمائے قدیم کے سینکڑوں تجربات باطل کر دیئے، ہیئتِ قدیم اور ہیئتِ جدید میں آسمان اور زمین کا اختلاف پیدا ہو گیا، اختراعاتِ جدیدہ نے سینکڑوں اور ہزاروں قدیم مستبعدات اور ممتنعات کو ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا، جب ہمارے گزشتہ تجربات اور تحقیقات کا یہ حال ہے تو انسانی تحقیقات و تجربات کی آئندہ صحت کی کون ضمانت کر سکتا ہے؟ فلسفۂ یونان پڑھ کر ہم یقین کرتے تھے کہ زمین ساکن اور آفتاب متحرک ہے، اب روزِ روشن کی طرح یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ آفتاب ساکن اور زمین متحرک ہے، اس لیے اگر کسی پیغمبر کی زبان سے اس وقت یہ خیال ادا ہوتا کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہے تو حکمت قدیمہ کی درسگاہ میں یہ خیال شاید جاہلانہ اور مضحکہ خیز سمجھا جاتا، پھر حکمت جدیدہ کے دانایانِ روزگار کو آج مذہب کی جو چیز مضحکہ انگیز نظر آتی ہے کیا معلوم کہ کل خود ان کی تحقیقات حکمتِ مستقبل کے مدرسہ میں قابلِ مضحکہ نہ ٹھہرے گی۔

الغرض صفحات بالا سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ بنی نوع انسان کے اصل سرمایۂ علم علل و معلول میں جو کچھ ہے وہ صرف ان کے تجربہ کی کمائی ہے اور اسی کی بنا پر استدلال تمثیلی کے طور پر وہ ایک چیز کو چند بار دیکھ کر اپنے ذہن میں ایک حکم کلی پیدا کر لیتے ہیں، مثلاً ایک سیب کو دیکھا، اس کی خوشبو کو سونگھا، اس کے مزہ کو چکھا، اب دوسرا سیب ہمارے سامنے آتا ہے، اس کی شکل و صورت اور رنگ کو دیکھ کر اس کی خوشبو کو سونگھ کر ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ بھی سیب ہے اور اس کا مزہ ایسا ہوتا ہے اور پھر چند سیبوں کو دیکھ کر یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ ہر سیب ایسا ہوتا ہے اور اس کا یہ خاصہ اور اثر ہوتا ہے، اسی طرح ہم نے برف کو دیکھا، اس کی شکل و صورت، رنگ و مزہ اور ٹھنڈک کو محسوس کیا اور پھر کئی دفعہ اس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہم نے ہر دفعہ برف کی شکل دیکھ کر یہ حکم دیا کہ یہ بھی برف ہے، اور ہر برف

ٹھنڈا ہوتا ہے، یہی حال اس قضیہ کا ہے کہ تیز آگ جلاتی ہے، اب غور کیجئے کہ آپ کے یہ قضایا جو محض استدلال تمثیلی کی بنیاد پر قائم ہیں، عقلاً کیونکر ناقابل شکست یقین بننے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ آپ عادۃً اپنی عمل اور کاروبارِ دنیا کے لئے ان پر یقین کر کے جلب منافع اور دفع مضار میں ان سے کام لیں اور یہی سنت عادیہ کی حقیقت ومصلحت ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کا بیان کہ اسباب وعلل تجربی ہیں

ہم نے جس پیرایہ پر مسئلہ علیت کی تشریح کی ہے یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے، علامہ ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین میں جا بجا اس خیال کو ظاہر کیا ہے، چنانچہ ہم یہاں اس کی تلخیص اس لئے درج کرنا چاہتے ہیں کہ مسئلہ پوری وضاحت کے ساتھ ناظرین کے سامنے آجائے۔

"کھانے کے بعد آسودگی، پینے کے بعد سیری، بدیہی تجربات میں ہے، اسی طرح لذت وغیرہ کا احساس ہے کہ جب انسان اس کا احساس کرتا ہے تو اس کے بعد فوراً ایک اثر پاتا ہے، پھر جب بار بار اس شے کے احساس کے بعد وہی اثر پاتا ہے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہی شے اس اثر کا سبب ہے، اسی کا نام تجربیات ہے، قضایائے کلیہ کی اصل یہی تجربیات ہیں، تفصیل یہ ہے کہ مثلاً جب ایک شخص کسی دوا کو استعمال کرتا ہے اور یہ پاتا ہے کہ اس سے فلاں مرض دور ہو گیا یا فلاں قسم کا نقصان ہو گیا تو مرض کا اس سے پیدا ہو جانا یا زائل ہو جانا تجربہ ہے، یہی حال دیگر آلام ولذات کا ہے جو مشمومات، مسموعات، مرئیات اور ملموسات سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جب اس کو سونگھتا یا دیکھتا ہے یا سنتا یا چکھتا یا چھوتا ہے پھر نفس میں جو لذت کا احساس ہوتا ہے، وہ وجدانیات میں سے ہے جن کو حواس باطن سے دریافت کرتا ہے اس نفس میں جو اعتقاد کلی قائم ہو جاتا ہے تو اس جنس کے ہر فرد سے لذت حاصل ہوتی ہے اور اس جنس کے ہر فرد سے الم حاصل ہوتا ہے وہ من قبیل تجربیات ہے کیونکہ حواس ظاہرہ و باطنہ سے شے کلی کا احساس نہیں ہو سکتا حکم کلی کا جو اعتقاد نفس میں قائم ہو جاتا ہے وہ حس اور عقل کے مجموعہ سے ہوتا ہے اور اسی کا نام تجربیات ہے، مثلاً یہ اعتقاد کہ کھانے اور پینے کی چیزوں سے آسودگی اور سیری پیدا ہوتی ہے اور زہر قاتل کے استعمال سے آدمی مر جاتا ہے اور بیماری پیدا کرنے والے اسباب سے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے اور اس بیماری کا فلاں اسباب وذرائع سے استیصال ہو جاتا ہے، یہ کل کے کل قضایائے تجربیہ ہیں، کیونکہ حس تو صرف جزئی اور شخصی چیزوں کا احساس کرتا ہے، لیکن جب ایک شے سے ایک ہی احساس بار بار ہوتا ہے تو عقل ادراک کرتی ہے کہ اس مشترک امر کی وجہ سے جو ان تمام افراد میں تجاربات پیدا ہوئی اور یہ چیز فلاں قسم کی لذت پیدا کرتی ہے اور اس شے سے فلاں قسم کی تکلیف پیدا ہوتی ہے یہی حال حدسیات کا ہے کہ ان کی جزئیات کا علم احساس سے ہوتا ہے لیکن تکرار سے عقل قدر مشترک کا اندازہ لگا لیتی ہے، مثلاً جب چاند کی روشنی کا اختلاف آفتاب کے مقابلہ کے اختلاف سے دیکھتے ہیں تو گمان کر لیتے ہیں کہ چاند کی روشنی آفتاب سے حاصل ہوتی ہے یا یہ دیکھتے ہیں کہ ثوابت کی حرکت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا اور وہ سب ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا فلک ایک ہے، اسی طرح جب سبع سیارہ کے اختلاف حرکات کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہر سیارہ کا فلک دوسرے سے مختلف ہے۔"

قیاس کی بحث میں علامۂ ممدوحؒ کہتے ہیں۔

"فلاسفہ نے یقینیات کو صرف چند قضایا میں محدود کر دیا ہے جن میں سے ایک حسیات ہیں، حالانکہ یہ معلوم ہے کہ حس سے ہرگز کسی عام اور کلی شے کا ادراک نہیں ہو سکتا، اس لئے فقط حسیات سے کوئی قضیہ کلیہ عامہ نہیں بن سکتا جو برہان یقینی کا کوئی جزو بن سکے، مثلاً اہل منطق کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، حالانکہ اس قضیہ کی عمومیت اور کلیت کا علم تجربہ اور عادت سے ہوا ہے، جو قیاس تمثیل کی ایک قسم ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس کا علم اس طرح ہوا کہ آگ میں جلانے والی قوت موجود ہوتی ہے تو یہ علم بھی کہ ہر آگ میں یہ قوت موجود ہوتی ہے ایک حکم کلی ہے جو احساس سے نہیں ثابت ہو سکتا اور اگر یہ کہا جائے کہ ضروری ہے کہ آگ کی صورت نوعیہ میں یہ قوت موجود ہو اور جس میں یہ قوت موجود نہ ہوگی وہ آگ نہ ہوگی تو یہ دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو مفید یقین نہیں کیونکہ یہ قضیہ کہ جس شے میں یہ قوت ہوتی ہے وہ جلاتی ہے، اس میں تمثیل شمول، عادت اور استقرائے ناقص کو دخل ہے اور یہ معلوم ہے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آگ ہر شے کو جو اس کے اندر پڑتی ہے جلا دیتی ہے، وہ غلطی کرتا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس شے میں جلنے کی قابلیت ہو ورنہ وہ ہر شے کو نہیں جلا سکتی جس طرح پتھر اور یاقوت کو نہیں جلا سکتی یا ان اجسام کو نہیں جلا سکتی جن پر مانع آتش دوائیں لگا دی گئی ہوں، خرق عادت کی بحث کا مقام دوسرا ہے، بہرحال قضایائے حسیہ میں کوئی کلیہ ایسا نہیں ہے جس کا نقض نہ ہو سکے اور درحقیقت قضیہ کلیہ حسیہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ قضیہ حسیہ مثلاً یہ آگ جلاتی ہے، اس میں حس صرف ایک خاص چیز کا ادراک کرتی ہے، حکم کلی جو عقل لگا دیتی ہے تو فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ نفس ان خاص افراد اور مشاہدوں کے دیکھنے کے بعد اپنے میں یہ استعداد پیدا کر لیتا ہے کہ اس کے اندر یہ الہام پیدا ہو جائے کہ ہر آگ جلاتی ہے اور یہی حکم کلی ہے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بھی قیاس تمثیلی ہی ہے اور اس کی کلیت اور عمومیت پر اس وقت تک وثوق نہیں کیا جا سکتا، جب تک یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حکم تمام افراد میں مشترک ہے اور یہ اسی وقت تک ممکن ہے جب تمام افراد کا تجربہ کر لیا جائے پھر بھی قضایائے عادیہ میں سے کوئی قضیہ ایسا نہیں ہے جس کا ٹوٹنا باتفاق عقلاء جائز نہ ہو، بلکہ فلاسفہ تک خرق عادت کو جائز سمجھتے ہیں مگر وہ اس کے لئے فلکی طبعی اور نفسیاتی اسباب بیان کرتے ہیں اور ان ہی تینوں اسباب کی طرف خرق عادت کو منسوب کرتے ہیں اور اسی سے انبیاء کے معجزات، اولیاء کی کرامات اور سحر وغیرہ کو ثابت کرتے ہیں۔"

اسی قیاس کے بحث کے آغاز میں علامہ ممدوحؒ لکھتے ہیں۔

"اور یہی حال تجربیات کا ہے، لوگوں نے عموماً تجربہ کیا ہے کہ پانی پینے سے سیری ہوتی ہے اور گلا کٹ جانے سے آدمی مر جاتا ہے اور ضرب شدید سے تکلیف ہوتی ہے، ان تمام قضیوں کا علم محض تجربہ کی بنا پر ہے، کیونکہ حس نے ایک خاص سیری کا ادراک کیا ہے اور گلا کٹنے سے ایک خاص شخص کو مرتے دیکھا ہے اور مارنے سے تکلیف ایک خاص شخص نے محسوس کی ہے، اب یہ حکم کہ جو شخص ایسا کرے گا یہ خاص اثر پیدا ہوگا تو یہ قضیہ کلیہ حس سے نہیں معلوم ہوگا بلکہ اس کے ساتھ حکم عقلی کا لگاؤ بھی ہے، تجربہ سے جو اثر معین کسی شے معین میں معلوم ہوتا ہے اس کی نسبت یہ دیکھنا ہے کہ اس شے معین میں اور اس کے اثر معین میں ایک خاص تلازم ہے اور اس سے عادت مستمرہ

کا علم ہوتا ہے، خصوصاً جب ان دونوں کے درمیان کسی مناسبت کا بھی شعور ہو جائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ جہاں وہ شے بھی پائی جاتی ہے وہاں یہ اثر بھی پایا جاتا ہے اور جہاں وہ اثر پایا جاتا ہے وہاں وہ شے بھی پائی جاتی ہے اور نیز یہ کہ جہاں وہ شے نہیں پائی جاتی وہ اثر بھی نہیں پایا جاتا اور جہاں وہ اثر نہیں پایا جاتا وہاں وہ شے بھی نہیں پائی جاتی، اب جس قدر اس لزوم میں ظنیت پائی جائے گی اسی قدر علیت کا اعتقاد بھی ظنی ہوگا اور جس قدر اس لزوم میں قطعیت ہوگی اسی قدر لزوم کے اعتقاد میں قطعیت ہوگی اور یہی قضایائے عادیہ ہیں جیسے طب کے تجربیات وغیرہ یا یہ علم کہ روٹی کھانے سے آسودگی اور پانی پینے سے سیری ہوتی ہے اور کپڑے پہننے سے بدن میں گرمی اور برہنگی سے بدن میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے ...... پس تجربیات سے علم حاصل ہونے کا سبب ایک شے کا دوسری شے کے بعد ہونے سے اور تکرار اثر سے پیدا ہوتا ہے۔"

تجربیات کی بنا شہادت اور روایت اور تاریخ پر ہے

غرض ان مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ اشیاء کے خواص اور موجودات کے اسباب کا علم ہم کو محض تجربہ سے حاصل ہوا ہے، اب یہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ کیا تجربی یقین کے پیدا ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اس یقین کرنے والے نے اس کا تجربہ کیا ہو، ہم دنیا میں ہزاروں تجربی مسائل پر یقین رکھتے ہیں مگر ان میں سے بہت کم ہمارے ذاتی تجربہ میں آئے ہیں، طبیعیات، کیمیائیات، طبیات، فلکیات، ارضیات کی ہزاروں باتیں ہیں جن پر ہم یقین رکھتے ہیں مگر ہمارے ذاتی تجربہ میں بہت کم آئی ہیں، اگر آپ یہ کہیں کہ گو وہ ہمارے ذاتی تجربہ میں نہیں آئی ہیں لیکن ان علوم کے ماہرین نے ان کا تجربہ کیا ہے اور ہم کو ان کی شہادت کا اس لئے یقین ہے کہ وہ اپنے اپنے علوم میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اپنے ذاتی تجربوں کو انہوں نے اپنی تصنیفات میں لکھ دیا ہے تو گویا آپ نے قبول کر لیا کہ دوسروں کے تجربیات بھی مفید یقین ہیں بشرطیکہ خود ان تجربہ کرنے والے علماء پر ان کو وثوق ہو اور ان کے تجربیات صحیح و مستند شہادتوں اور واسطوں سے آپ تک پہنچیں۔

دنیا کے واقعات کا سب سے بڑا دفتر تاریخ ہے جو عہد ماضی کی ظلمت میں ہمارے لئے چراغ راہ ہے اور اس چراغ میں تیل کون برابر ڈالتا جاتا ہے کہ یہ بجھتا نہیں، وہ راویان اخبار اور ناقلان حکایات ہیں جو ایک عہد سے دوسرے عہد تک اس کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں، اگر یہ سلسلہ روایت کہیں منقطع ہو جائے تو عہد ماضی کی دنیا بھی عالم مستقبل کی طرح تیرہ و تار ہو جائے، لیکن تاریخ کی ہر شہادت آسانی کے ساتھ قبول نہیں کر لی جاتی بلکہ اس کے لئے چشم دید گواہوں کا وجود، ان کی صداقت اور راست شعاری اور پھر اس کے بعد بیچ کے واسطوں کی سچائی اور راست گفتاری اور علیٰ ہذا درجہ بدرجہ ثبوت کی بھی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ شرائط پورے ہو جائیں تو روایات منقولہ کی صداقت میں کسی کو شک نہ ہونا چاہیے۔

فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں

حقیقت میں فلسفہ اور سائنس بھی ایک قسم کی تاریخ ہیں، فلسفہ تو اشخاص یا جماعتوں کے مختلف خیالات کی اور سائنس کائنات فطرت کے تجربی انکشافات کی تاریخ ہے۔ فلسفہ کی درسگاہ کا ہر پروفیسر نہایت وثوق سے یہ کہتا ہے کہ اس مسئلہ میں

یونان، اسلام اور یورپ کے فلاں فلاں اساطین فلسفہ کی یہ رائیں ہیں، کیا اس وثوق کی بنیاد صرف شہادت تاریخی پر نہیں ہے؟ آغازِ آفرینش سے لے کر اس وقت تک دنیائے انسانی نے علم و اکتشاف، تجربہ و دانش کا جو سرمایہ جمع کیا ہے کیا وہ بجز شہادتِ تاریخی کے کسی اور طریقہ سے حاصل ہوا یا ہو سکتا ہے، یا آئندہ ہوگا، آپ یقین رکھتے ہیں کہ جسم بہتر بسیط عنصروں سے مرکب ہے، ہائیڈروجن اور آکسیجن پانی کے دو جزو ہیں، سنکھیا کے استعمال سے آدمی مر جاتا ہے، مگر ان میں سے ایک بات بھی آپ کے تجربہ میں نہیں آئی ہے، البتہ چونکہ صحیح اور مستند ذریعوں سے آپ تک یہ تحقیقات پہنچی ہیں اس لئے آپ ان کو باور کرتے ہیں، لندن اور پیرس کو آپ نے خود نہیں دیکھا، لیکن با ایں ہمہ آپ کو ان شہروں کے وجود میں شک نہیں، مگر کوہ قاف کے پرستان کے وجود پر آپ کو یقین نہیں، اس لئے کہ پہلے دو شہروں کے وجود کی خبر آپ نے بکثرت لوگوں سے اور ایسے ثقہ اور مستند لوگوں سے سنی ہے کہ آپ اس میں شک نہیں کر سکتے، لیکن کوہ قاف کے پرستان کے عینی شاہدوں تک آپ کا سلسلۂ روایت صحیح اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچا ہے، اس لئے آپ کو اس کے وجود میں بہت حد تک شک ہے، اسی طرح ہیئت و فلکیات کے اکثر مسائل مثلاً ستاروں کی چالیں، خاص ستاروں کا طلوع و غروب وغیرہ کسی نہ کسی ہیئت دان اور فلکی کا مشاہدہ ہے، ان جیسے سینکڑوں کے مشاہدات یکجا ہو کر آپ کے سامنے ہیئت و فلکیات کا ناقابل انکار دفتر بن کر آتا ہے، مگر غور کیجئے کہ اس دفترِ بے پایاں کا ہر ایک مشاہدہ بجز تاریخی روایت و شہادت کے کسی اور طریقہ سے پہنچا ہے یا پہنچ سکتا ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے، برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے، آفتاب روشن ہے، پتھر سخت ہے، کھانے سے سیری ہوتی ہے، چوٹ سے تکلیف ہوتی ہے، غرض تمام قضایاتِ تجربیہ جن پر علوم و فنون کی بنیاد قائم ہے اور جن کی عمومیت و کلیت کا آپ کو یقین یا ظن غالب ہے، ان کی اس کلیت اور عمومیت کا یقین یا غلبۂ ظن صرف آپ ہی کی ذاتی تجربہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر قضیہ کی عمومیت اور کلیت کے بنانے میں آپ کے سوا اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں اور بیسیوں نسلوں کے مشاہدات کو دخل ہے اور یہ مشاہدات آپ تک تحریری یا زبانی تاریخی شہادتوں کے ذریعے سے پہنچے ہیں تب جا کر وہ انسانی مسلمات میں داخل ہوئے ہیں۔

تاریخی شہادتوں کے شرائط استشہاد

لیکن کسی تاریخی شہادت کے مستند ہونے پر آپ کچھ قیود بھی عائد کرتے ہیں مثلاً یہ کہ خبر راوی چشم دید گواہ ہو، یعنی یہ کہ وہ واقعہ کے وقت مقام واقعہ پر حاضر ہو اور خود اس کا بلاواسطہ ذاتی علم حاصل کیا ہو، وہ راست گفتار ہو، اس کا حافظہ صحیح اور درست ہو، فریبی اور جھوٹا نہ ہو، اسی طرح آغاز سلسلۂ روایت سے لے کر آخر تک بیچ کا ہر راوی بھی انہی صفات سے متصف ہو، جہاں تک ان صفات میں ترقی ہوگی، واقعہ کے متعلق آپ کے علم و اذعان میں بھی ترقی ہوگی اور جہاں تک ان میں کمی ہوگی، آپ کے علم و اذعان میں بھی کمی ہوگی۔

مسلمانوں کا علم روایت

اب مسلمانوں کے علم اخبار یا علم نقل و روایت یعنی اصولِ حدیث پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ بعینہ یہی اصول انہوں نے ہر روایتی شہادت کے قبول کرنے کے لیے مقرر کیا ہے، سلسلۂ روایت کے ان اوصاف میں جس قدر بھی نقص ہوگا، اس جزو واقعہ کے علم و اذعان میں بھی اسی قدر نقص

ان کے نزدیک پیدا ہوگا۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی طرف جس قدر بھی صحیح و مستند معجزات منسوب ہیں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی صداقت کو اس اصول پر پرکھ نہ لیا گیا ہو، ہیوم نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "فہم انسانی" میں جہاں معجزات پر بحث کی ہے، انجیل کے بیان کردہ معجزات کی نسبت وہ اس لئے بے اعتباری ظاہر کرتا ہے کہ مصنفین انجیل جو ان واقعات کے راوی اول ہیں ان میں سے کوئی واقعہ کا چشم دید گواہ نہیں ہے، لیکن ہیوم کو اگر اسلامی طرز روایت و اصول حدیث کی احتیاطوں سے آگاہی ہوتی تو پیغمبر اسلام کے معجزات کی نسبت اس بے اعتباری کا اس کو موقع نہ ملتا۔

صحیح معجزات نبوی کے پہلے رواۃ یعنی وہ صحابہ کرام جو واقعات کے چشم دید گواہ ہیں، صدق مقال اور راست گفتاری پر ان کی زندگی کا ایک ایک حرف گواہ ہے اور ان کی عقل، رزانت اور متانت رائے پر ان کے کارنامے شاہد عدل ہیں، بیچ کے رواۃ وہ محدثین عظام ہیں جن کی سچائی، راستی اور حفظ و فہم پر اسمائے رجال کے اوراق کی مہریں ثبت ہیں، پیغمبر اسلام علیہ السلام نے علی رؤس الاشہاد کہا اور بار بار کہا کہ جو شخص میری طرف کسی جھوٹی بات کی نسبت کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، صحابہ کا یہ حال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کسی خبر کو بیان کرتے ہوئے کانپ جاتے تھے بیچ کے ثقہ اور مستند رواۃ بھی انتہائی انسانی احتیاط سے کام لیتے تھے، اس پر بھی ان کی تمام روایات کا درجہ یکساں نہیں ہے۔

اگر روایت کے ہر دور میں راویوں کی تعداد کثیر شریک ہو تو اس کو خبر متواتر کہتے ہیں اور اگر ہر دور میں گو تعداد کثیر نہ ہو لیکن دو یا دو سے زیادہ ہوں تو وہ مستفیض اور مشہور ہے اور اگر کسی دور میں ایک ہی راوی رہ گیا ہو تو اس خبر کو خبر احاد کہتے ہیں، معجزات نبوی مختلف طرق سے مروی ہیں، اور اسی کے اعتبار سے ان کی صحت بیان کا درجہ ہے، یہ سچ ہے کہ بعد کے لوگوں نے آپ کی طرف بہت سے ایسے معجزات منسوب کر دیئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں لیکن ہمارے محدثین نے نہایت جانفشانی اور دیانتداری سے ان روایات کو معیار پر پرکھ پرکھ کر الگ کر دیا ہے اور اس کتاب کی جلد اول کے مقدمہ میں تمام و کمال بحث موجود ہے۔ معجزات کے ثبوت پر یہ طرز استدلال گو عجیب ہے لیکن غلط نہیں، دنیا میں ہر واقعہ کے ثبوت کا یہی طریقہ ہے اور وہی اس باب میں بھی کار آمد ہے، یہ کیسی زبردستی ہے کہ جس طرز استدلال پر دنیائے یقین کا عملی کاروبار چل رہا ہے، اس کو اگر مذہب استعمال کرے تو مدعیان عقل کی جبین متانت پر بل پڑ جاتے ہیں۔

نادیدہ واقعات پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف روایات کی شہادت ہے

دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے اس کے علم کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس واقعہ کے وقت موجود ہوگا یا موجود نہ ہوگا، پہلی صورت میں اس کا علم اس کے احساس و مشاہدہ پر موقوف ہے اور وہ روایت کے تمام جھگڑوں سے بے نیاز ہے جیسے کہ ان صحابہ کا اس معجزہ کے متعلق علم جو ان کے سامنے ظاہر ہوا، اور دوسری صورت میں اس واقعہ کا علم صرف روایت سے ہو سکتا ہے اور اس کے سوا کوئی ذریعہ علم اس کے لئے دنیا میں موجود نہیں ہے، آپ کا فرض صرف اس قدر ہے کہ روایت کی اچھی طرح تنقید کر لیجئے اور جس طرح

دنیا کے دوسرے عملی کاروبار میں واقعات پر یقین کرنے کے ذرائع استعمال میں ہیں، اس باب میں بھی ان ہی کو استعمال کیجئے، عقلی احتمالات اور ذہنی شبہات کی کوئی حد نہیں ہے، مگر کبھی روزمرہ کے معاملات میں وہ آپ کے یقین کے سدِّ راہ نہیں ہوتے۔

خبرِ احاد پر بھی عملاً یقین ہوتا ہے

متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبرِ احاد تک پر آپ روزانہ یقین کرتے ہیں، خطوط، تار، اخبارات آج کل کی زندگی کا جز ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر آپ کو کامل وثوق ہے، رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات و ایجادات و طبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کر لیتے ہیں، آج تمام تجارت کا دارومدار انہی تاروں پر ہے، اس میں شدید مالی خطرات کا موقع ہے مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبرِ احاد کو یقین کر لیتا ہے اور اپنی تمام دولت اس کے نذر کر دیتا ہے اور کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کسی نے غلط کہا ہو، ممکن ہے غلط لکھ گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو۔ یہ تمام احتمالات عقلی قائم ہو سکتے ہیں مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔

ہم شفاخانوں میں جاتے ہیں اور عطاروں اور کمپونڈروں سے دوائیں لے کر باطمینان تمام ان کو استعمال کرتے ہیں، حالانکہ معلوم ہے کہ ان شفاخانوں میں اکسیر اور سنکھیا دونوں کی بوتلیں پہلو بہ پہلو رکھی ہیں، ممکن ہے کہ تنہا دوا بنانے والے کی یہ اطلاع کہ یہ دوا تمہارے نسخہ کے مطابق ہے غلط ہو اور اس بنا پر اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے مگر کبھی یہ خدشہ ہمارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتا اور ہم بخوشی اپنی جان کو خبرِ احاد کے یقین کی نذر کر دیتے ہیں، پھر معجزات اور مذہب ہی کے باب میں شہادت کے مسئلہ پر تمام عقلی احتمالات اور شکوک کا ازالہ ضروری کیوں تصور کیا جاتا ہے۔

واقعات پر یقین کیلئے اصلی بنیاد امکان اور عدم امکان کی بحث نہیں بلکہ روایت کے ثبوت اور عدم ثبوت کی ہے

آج کل مغربی علم تاریخ اور فن روایت کا بڑا کارنامہ یہ اصول سمجھا جاتا ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو سب سے پہلے اس پر غور کرو کہ کیا وہ ممکن بھی ہے؟ اور جب یہ طے ہو جائے تو روایت کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرنا چاہیئے، لیکن یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے تمام واقعی علوم، ہمارے تجربہ اور روایات ہی پر مبنی ہیں، اس لئے کسی شے کے ممکن اور ناممکن ہونے کا فیصلہ محض مشاہدہ کی تحقیق پر ہی مبنی ہے، اس لئے علم تاریخ اور فن روایت کی بنیاد اس کے امکان اور عدم امکان کی بحث پر قائم نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہمارے علمائے اصول نے بتایا ہے صرف اس پر قائم ہے کہ آیا یہ واقعہ روایۃً صحیح بھی ہے یا نہیں؟

جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہیئے

ہم کو اس اصول کی صحت سے انکار نہیں ہے کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت بھی ہونی چاہیئے لیکن درجہ، نام کمیت اشخاص سے زیادہ کیفیت اشخاص کا ہے، ایک واقعہ کو چند آدمی بیان کرتے ہیں مگر انکی راست گفتاری معرضِ بحث میں ہے لیکن ایک ایسا شخص اس کے خلاف اپنی روایت بیان کرتا ہے جس کی صداقت مسلم ہے جس کی راست گفتاری کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے، جس کی سمجھ، حافظہ اور وثوق کا ہم کو علم ہے اور جس کی دوسری اخلاقی صفات کا

کا روایت پر اثر پڑتا ہے، نہایت بلند ہیں تو ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیثیت سے دوسری شہادت پہلی شہادت سے زیادہ قابلِ قبول ہے، راویوں کی ان صفات کی واقفیت کا روایاتِ اسلامیہ کے سوا دنیا میں کسی اور قوم و مذہب کی روایات کے متعلق کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے دنیا کے اور مذاہب اور قوموں کی روایات کے مقابلہ میں اسلامی روایات کی ایک خاص اہمیت ہے۔

معجزات دراصل تجربیات کے خلاف نہیں ہوتے

اس موقع پر ایک اور مسئلہ کو بھی صاف کرنا ہے، عام طور سے معجزات کی شہادت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ معجزہ کی شہادت سینکڑوں، ہزاروں شہادتوں کے خلاف ہوتی ہے اس لئے وہ ناقابلِ یقین ہے، یہ حقیقت میں ایک قسم کا مغالطہ ہے، ہزاروں لاکھوں شہادتیں اس بات کی بے شک ہیں کہ آگ نے فلاں فلاں موقع پر جلایا، اب جو شخص ایک معجزہ کو بیان کرتا ہے کہ فلاں موقع پر آگ نے نہیں جلایا تو یہ شہادت ان ہزاروں لاکھوں شہادتوں کے خلاف نہیں ہے، بلکہ ان سے الگ ایک واقعہ ہے، اس روایت سے ان لاکھوں ہزاروں شہادتوں کی مخالفت اور انکار اس وقت لازم آتا کہ جن موقعوں کے متعلق یہ کثیر التعداد شہادتیں اپنا مشاہدہ بیان کرتی ہیں، ان کی تکذیب و تغلیط کی جاتی، دو شہادتوں کی باہمی ترجیح کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب دونوں ایک ہی خاص واقعہ کو مختلف حیثیتوں سے بیان کریں اور یہاں یہ صورت نہیں ہے، جن آگوں کے جلانے کے متعلق سینکڑوں شہادتیں موجود ہیں، معجزہ کا راوی ان کی تغلیط و تکذیب نہیں کرتا بلکہ ایک خاص آگ کی نسبت اپنا مشاہدہ بیان کرتا ہے، جن کے متعلق ان کو نفیاً یا اثباتاً کوئی علم نہیں، مثلاً ایک طرف ایک شخص کی تنہا یہ شہادت ہوتی جو پیغمبر علیہ السلام کے ہاتھوں سے پانی کا چشمہ ابلنے لگا، دوسری طرف سینکڑوں ہزاروں آدمیوں کی یہ شہادت ہوتی کہ نہیں ایسا واقعہ نہیں ہوا، تو بے شک اس موقع پر دوسری شہادت کو پہلی شہادت پر ترجیح دی جا سکتی اور تمام مسلمان اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر کسی معجزۂ نبوی کے متعلق اس قسم کی مخالف شہادت موجود ہو تو وہ اس معجزہ کو صحیح معجزاتِ نبویؐ کی فہرست سے خارج کر دیں گے۔

معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں

الغرض معجزہ کی شہادت کے متعلق اصل بحث یہ نہیں کہ وہ ممکن ہے یا ناممکن بلکہ اصل بحث یہ ہے کہ یہ شہادت کس درجہ کی ہے؟ اور اس کے رواۃ کی صحیح البیانی کا کیا پایہ ہے؟ اس کے لئے صحابہ کرام اور تابعین عظام کی راستی، دیانت، صدق مقال اور ان کی اخلاقی زندگی کے دیگر پہلوؤں کے مطالعہ کی حاجت ہے اور یہی شے ہے جو معجزات کی شہادت کو قوی تر یا کمزور بنا سکتی ہے اور یہی ہمارے محدثین اور اہل اصول کا قانونِ شہادت ہے اور اسی طریق سے اہل سنت والجماعت معجزہ کو ثابت کرتے ہیں، علامہ ابو منصور عبد القاہر بغدادی اشعری کتاب الفرق میں اہل سنت کا مسلک لکھتے ہیں۔

وبهذا النوع من الاخبار المستفيضة علمنا معجزة نبينا صلی الله عليه وسلم فی انشقاق القمر وتسبيح الحصا فی يده وحنين الجذع اليه لما فارقه واشباعه الخلق الكثير من الطعام اليسير ونحو ذالك من معجزاته (ص ۳۱۳ مصر)

اسی خبرِ مشہور کے ذریعہ سے ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو جانا، مثلاً شق قمر، دستِ مبارک میں کنکریوں کا تسبیح پڑھنا، شاخِ خرما کا گریہ و بکا کرنا اور تھوڑے کھانے سے بہت سے لوگوں کو سیر کر دینا وغیرہ۔

خلاصۂ مباحث

گزشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل سطروں میں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) معجزہ خرقِ عادت اور قاعدۂ علت و معلول کی اتفاقی شکست کا نام ہے جس کو اللہ تعالےٰ اپنے کسی پیغمبر کی سچائی کی نشانی کے طور پر لوگوں میں ظاہر کرتا ہے۔

(۲) خرقِ عادت اور قاعدۂ علت و معلول کی شکست ممکن بلکہ واقع ہے۔

(۳) کیونکہ عادات طبعی اور سلسلۂ علل و معلول کا علم ہم کو تجربہ سے ہوا ہے۔

(۴) اور تجربہ سے جو علم حاصل ہو اس کی کلیت اور عمومیتِ عقلی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، اس لئے اس سے معجزہ کے محال ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) تجربہ کی بنیاد ذاتی مشاہدہ یا دوسرے مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر ہے۔

(۶) اس لئے معجزہ کا ثبوت ذاتی مشاہدہ کرنے والوں کی شہادت پر مبنی ہے۔

(۷) اسلامی روایات اور صحیح معجزاتِ نبوی کی شہادت اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخی روایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس سے معجزات اور خوارق عادات کا قوی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

یقین معجزات کے اصول نفسی

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا خطاب فلسفہ اور منطق سے تھا، لیکن ظاہر ہے کہ عملی دنیا کا کاروبار ارسطو کے بنائے ہوئے اصول و قواعد پر نہیں چل رہا ہے بلکہ خالقِ فطرت اپنے وضع کردہ اصول و قواعد پر اس کو چلا رہا ہے، واقعات کسی حد تک تعجب، تحیّر اور دور از عقل ہوں تاہم انسانوں کی بڑی تعداد دلیل و برہانِ منطق کے بغیر صدقِ دل سے ان پر یقین رکھتی ہے، کسی واقعہ پر یقین رکھ سکنے کے لیے اس کا فہم انسانی میں آجانا اور عقل و استدلال کی میزان میں اس کا پورا اتر جانا ضروری نہیں ہے، ایک طبیعی فلسفی سے لے کر عامی تک مادہ کے وجود پر یقین رکھتا ہے، حالانکہ استدلال سے اس کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا، یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک واقعہ کی جب روایت کی جاتی ہے تو کچھ لوگ بے دلیل اس کو فوراً تسلیم کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ استدلال اور برہان کے باوجود اس کے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے، اگر استدلال کی قوت سے وہ خاموش بھی ہو جائیں تو ان کے دل کو تسلی نہیں ہوتی، جو اشخاص کسی جماعت یا ملک کے اندر کام کرتے ہیں ان کی سچائی اور خلوص و ایثار کے متعلق سب لوگوں کی رائے برابر نہیں ہوتی، ایک جماعت جس زور و قوت سے ان کے صدق و اخلاص پر ایمان رکھتی ہے، دوسری جماعت اسی زور و قوت کے ساتھ ان کو خائن اور ریاکار جانتی ہے، حالانکہ دونوں کے سامنے اُن کے اعمال کا ایک ہی نقشہ پیش رہتا ہے، مگر نتائج مختلف ہوتے ہیں اور دونوں میں سے کوئی اپنے دعویٰ پر کھلے دلائل نہیں رکھتا، اس لئے ایمان و کفر اور یقین و شک کے وجوہ منطقی طرز استدلال سے نہیں بلکہ زیادہ تر نفسیاتی اصول و قواعد سے ماخوذ ہیں۔

امام غزالی اور یقین اور اذعان کی صورتیں

امام غزالیؒ نے الجام العوام[1] میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے کہ واقعات کا اذعان اور یقین ہمارے اندر کیونکر پیدا ہوتا ہے

---

[1] الجام العوام عن علم الکلام صہ ۲۹ مصر۔

وہ کہتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو علم کلام کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو خدا نے اپنی توحید و صفات وغیرہ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے اور یہ باتیں بدیہی نہیں کہ ان کے لئے دلائل کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح ہم کو پیغمبر کی تصدیق کی ضرورت ہے اور یہ تصدیق مسئلہ معجزات پر غور و فکر کئے اور معجزہ کی حقیقت اور شرائط کے جانے بغیر ممکن ہی نہیں اس بنا پر علم کلام کی اشد ضرورت ہے، تو امام صاحب اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ عام مخلوق کو صرف ان چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے اور ایمان اس یقین جازم کا نام ہے جس میں تردد اور شک نہ ہو اور اس میں خطا اور غلطی کا خیال اس کو نہ ہو، اس یقین جازم کے چھ درجے ہیں جو چھ مختلف طریقوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۱) پہلا درجہ اس یقین کا ہے جو ایسے دلائل سے حاصل ہو، جن میں برہان کے تمام منطقیانہ شرائط ایک ایک کر کے پائے جائیں اور ان دلائل کے مقدمات کا ایک ایک حرف اچھی طرح جانچ لیا گیا ہو، یہاں تک کہ کسی میں شک و شبہ اور غلطی و التباس کا احتمال نہ رہا ہو، اس اصول کے مطابق تو بہت کم لوگ ایسے ہو سکتے ہیں جن کو یقین کا یہ مرتبہ نصیب ہو سکے، بلکہ ہر زمانہ میں ایک دو آدمی سے زیادہ اس معیار پر پورے نہیں اتر سکتے، اگر نجات صرف اسی یقین پر منحصر ہو تو نجات پانے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی، بلکہ انسانوں کے لئے دنیا کے واقعات پر یقین کرنے کی بہت کم گنجائش نکل سکے گی اور شاید ریاضیات کے علاوہ کہیں اور اس صورت یقین کا پیدا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان مسلمات سے یقین حاصل ہو جن کو عام طور سے لوگ مانتے ہیں اور ارباب عقل کے حلقوں میں وہ مقبول و مشہور ہیں، جن میں شک کا اظہار کرنا لوگ معیوب سمجھتے ہیں اور نفوس انسانی ان کے انکار سے ابا کرتے ہیں، ان مقدمات سے استدلال بعض لوگوں میں ایسا یقین جازم پیدا کرتا ہے کہ اس میں کسی قسم کا تزلزل راہ نہیں پا سکتا۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ ان خطابیات کے ذریعہ سے یقین پیدا کیا جاتے جن کو لوگ عام بول چال اور عملی کاروبار میں استعمال کیا کرتے ہیں اور عادۃً ان کو صحیح سمجھتے ہیں، اگر طبع انسانی میں خاص طور سے اس مسئلہ کی طرف غیر معمولی انکار یا شدید تعصب نہ ہو اور سامع میں تشکیک، مناظرہ اور خواہ مخواہ کرید اور بحث کی عادت نہ ہو اور اس کی ظرف فطرت صالح، سادہ اور صاف ہو تو اس طریقہ سے اکثر افراد انسانی کو یقین کی دولت ہاتھ آسکتی ہے اور اسی لئے قرآن مجید نے اس طرز استدلال سے اکثر کام لیا ہے۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ جس شخص کی دیانت اور ایمانداری پر یقین ہو اور اس پر کامل اعتقاد ہو، بکثرت لوگ اس کے مداح ہوں یا تم خود اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کی ہر بات کو صحیح باور کرتے ہو تو اس کا کہنا تمہارے اندر یقین پیدا کر دیتا ہے جیسے اپنے بزرگوں اور استادوں اور مرشدوں کے بیان کا لوگ حرف بحرف یقین کر لیتے ہیں، ایک بڑا شخص کسی کی موت کی خبر دیتا ہے تو ہر شخص اس کو باور کر لیتا ہے، اسی طرح اگر کسی شخص کو کسی کی سچائی اور پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کا یقین ہو جائے تو وہ بلا پس و پیش اس کی ہر بات کو صحیح تسلیم کر لے گا، چنانچہ حضرت صدیقؓ اور اکابر صحابہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو حسن اعتقاد تھا وہ اسی قسم کا تھا اس لئے آپ جو کچھ فرماتے تھے ان کو اس کے باور کرنے میں کسی دلیل و برہان کی حاجت نہ تھی۔

(۵) حصولِ یقین کا پانچواں طریقہ یہ ہے کہ روایت کی صورتِ حال کی ایسے دوسرے قرائن سے تصدیق ہو جن سے گو ایک مناظرہ پسند اور حجت طلب شخص کی تشفی نہ ہو، مگر عام اشخاص کی ان سے تسلی ہو جاتی ہے مثلاً اگر شہر میں یہ عام خبر پھیلی ہوئی تھی کہ امیرِ شہر بیمار ہے، اسی اثنا میں قلعہ سے گریہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں اور ایک شاہی غلام نے آکر روایت کی کہ امیر نے وفات پائی تو اس روایت کے تسلیم کر لینے میں عام لوگوں کو کوئی جائے انکار نہیں رہتی، گو اس کی صحت کی راہ میں آپ بیسیوں عقلی احتمالات پیدا کرتے رہیں، (یہی سبب ہے کہ کتنے اعرابی تھے جنھوں نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا یا آپ کی دلآویز اور پر اثر باتیں سنیں یا آپ کے اخلاقِ کریمانہ کو مشاہدہ کیا اور بے دلیل و برہان آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے (کیونکہ انھوں نے پہلے آپ کی نبوت کا چرچا تو سنا تھا لیکن اس دعوی کی صداقت نے ان کے دل میں پوری طرح گھر نہیں کیا تھا مگر جب اتفاق سے آپ کے دیدار کا ان کو موقع ملا تو قرائنِ حال اور آثارِ قیافہ کے ذریعہ سے نیک و بد اور اچھے برے کی تمیز کا جو ایک خاص جوہر انسان میں ودیعت ہے اس نے فیصلہ کر دیا کہ یہ دعوی صحیح ہے یا غلط)

(۶) چھٹا طریقہ یہ ہے کہ جو روایت بیان کی جائے، اگر وہ سامع کے مزاج، اخلاق اور خواہش کے مطابق اور مناسب ہو تو اس کے صحیح تسلیم کر لینے میں اس کو کبھی پس و پیش نہ ہوگا، اس حصولِ یقین میں نہ تو حسنِ اعتقاد کی ضرورت ہے اور نہ قرائن و آثار کی تائید کی، یہ فطری اور طبعی مناسبت خود حصولِ یقین کے لئے کافی ہے (یہی سبب ہے کہ سابقینِ اسلام میں وہی صحابہ داخل ہیں جو فطرۃً نیک اور طبعاً راستی پسند اور جویائے حق تھے)

ان ہی مختلف طریقوں سے لوگ یقین اور اذعان کا جذبہ اپنے اندر پیدا کرتے ہیں اور یہی طریقے غیبیات اور معجزات پر بھی یقین کرنے کے ہیں۔

معجزہ اور سحر کا فرق

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں سحر، طلسم، نیرنگ، شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جاسکتی ہیں، سحر و طلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنی مسمریزم اور ہپنوٹزم کے سمجھ لئے جائیں۔ ایسی صورت میں ایک پیغمبر اور ساحر و شعبدہ باز اور مسمریزر کے درمیان کیا فرق ہوگا؟ یہ سوال ہے جس پر علمِ کلام میں بڑی بڑی بحثیں ہیں، معتزلہ اور اربابِ ظواہر میں علامہ ابن حزم کا یہ دعوی ہے کہ معجزہ کے علاوہ سحر و طلسم و شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریبِ نظر ہیں لیکن معجزہ سے قلبِ حقیقت اور تبدیلِ خاصیت ہو جاتی ہے۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے جو عظیم الشان عجائب سرزد ہوتے ہیں، مثلاً سمندر کا خشک ہونا، چاند کا شق ہو جانا وغیرہ، یہ چیزیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتیں، حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحبِ معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جوابات سے اشکال کی اصل گرہ نہیں کھلتی، ایک شخص اپنے دعوی کے ثبوت میں بظاہر ایک خارقِ عادت کرشمہ پیش کرتا ہے، اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکا اور نظر بندی ہے یا رمزِ الٰہی ہے یا معمولی کام ہے یا عظیم الشان کارنامہ ہے نہایت مشکل ہے، کیونکہ ان اشیاء کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز نمایاں نہ

نہیں ہو سکتا، نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف جاری یا شر میں، یا یہ کہ ضروری ہے کہ یہ خوارق عادت محل خیر میں صرف ہوں یا محل شر میں، اس کے علاوہ کوئی تیسری نہیں ہو سکتی، بہت کچھ قابل بحث ہے۔ ایک مسمریزر اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج کرتا ہے، یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے تو کیا آپ اس کو معجزہ کہہ دیں گے؟

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات امور میں دو عظیم الشان فرق ہیں، ایک یہ کہ معجزہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائب امور اسباب طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعدائے دعوت الٰہی کی ہلاکت یا مبلغ رسالت کی تائید اور مومنین صادقین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے، محض کھیل تماشہ، شعبدہ بازی اور بازی گری اس کا مقصد نہیں ہوتی اور اب سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حد فاصل بن جاتی ہے یہ ہے کہ ساحر و بازی گر و شعبدہ باز صرف تماشہ، کرتب اور عجائبات دکھاتے ہیں اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی، ارادوں کی بے گناہی، دلوں کی طہارت اور صفائی، شریعت الٰہی کی تبلیغ، قلوب کے تزکیہ اور سیہ کاریوں کے قلع و قمع کے نہ وہ مدعی ہوتے ہیں اور نہ یہ خواص اور کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی معصوم زندگی، پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص و کیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں، قدم قدم پر خدا ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے، ان کی صدائے حق، جماعتوں، قوموں، اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ ان کی سچائی، راستی اور صداقت پر ان کے سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار، اور صدق و صفا کی مہر لگاتے ہیں، ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مومن، بدکار کو عفیف، بے باک کو متقی، بخیل کو فیاض، سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا، وہ لوہے کو زر خالص کی صورت میں بدل سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا۔

یہ ظاہری اشتباہ اور التباس صرف نبی اور ساحر و متنبی (جھوٹے پیغمبر) ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ اور ملی جلی ہوتی ہے، صبر اور بے حمیتی، توکل اور کاہلی، بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف، حق گوئی اور گستاخی، شجاعت اور تہور، ان کے ڈانڈے باہم اس قدر ملے ہوئے ہیں کہ انسان کی قوت ممیزہ کبھی کبھی دھوکہ کھا جاتی ہے، لیکن اہل نظر ان دونوں حقیقتوں کے ظاہری تشابہ سے فریب میں نہیں آتے۔ ان دونوں کی ظاہری شکل و صورت گو ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت اور متمائز ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حدود اور فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں، جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری حیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لئے گو دونوں ایک ہوں مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ، پاکیزگی کا فرشتہ، شریعت کا حامل، گنہگاریوں کا طبیب اور قلوب کا معالج ہوتا ہے اور دوسرا محض تماشہ گر یا شعبدہ باز یا مصنوعی حیلہ گر اور نقال۔

ایک عطائی اور طبیب حاذق، ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جنرل، ایک حرف شناس اور ماہر علوم، ایک

مکار اور زاہد، ایک مصنوعی اور حقیقی صوفی کے درمیان شاید کبھی عوام فرق نہ کر سکیں، مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات و قرائن باہم ملائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے، مولانائے روم نے اس فرقِ مراتب کو مثنوی میں نہایت عمدہ تشبیہات کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے، فرماتے ہیں۔

صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں   فرقِ شاں ہفتاد سالہ راہ بیں

اس طرح کی لاکھوں ہم شکل چیزیں ہیں، لیکن ان میں کوسوں کا فاصلہ ہے۔

ہر دو صورت گر بہم ماند رواست   آبِ تلخ و آبِ شیریں را صفاست

دونوں کی صورتیں اگر باہم مشابہ ہوں تو کچھ حرج نہیں، میٹھا اور تلخ پانی دونوں کا رنگ ایک ہی طرح صاف ہوتا ہے۔

ہر دو یک گل خوردہ زنبور و نحل   لیک شد زاں نیش وزیں دیگر عسل

بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہیں، لیکن ایک سے زہر اور اس سے شہد پیدا ہوتا ہے۔

ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب   زیں یکے سرگیں شد وزاں مشکِ ناب

دونوں قسم کے ہرن ایک ہی گھاس کھاتے اور ایک ہی پانی پیتے ہیں، مگر اس سے مینگنی اور اس سے مشک پیدا ہوتا ہے

ہر دو نے خوردند از یک آب خور   ایں یکے خالی و آں پُر از شکر

دونوں قسم کی نے ایک پانی سے پرورش پاتی ہیں لیکن ایک مزہ سے خالی اور دوسرے سے شکر پیدا ہوتی ہے۔

ایں خورد زاید ہمہ بخل و حسد   واں خورد آید ہمہ نورِ احد

ایک آدمی غذا کھاتا ہے تو اس سے بخل و حسد پیدا ہوتا ہے اور دوسرا وہی غذا کھاتا ہے تو اس سے خدائی نور پیدا ہوتا ہے

ایں زمیں پاک ست واں شورست و بد   ایں فرشتہ پاک و آں دیو است و دد

یہ زمین سیر حاصل ہے اور وہ بری اور بنجر ہے، یہ مقدس فرشتہ ہے اور وہ شیطان اور جانور۔

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں در میاں   در میانشاں برزخ لا یبغیان

شیریں اور تلخ سمندر ملے ہوتے ہیں مگر ان کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے جس سے تجاوز نہیں کر سکتے۔

زرِ قلب و زرِ نیکو در عیار   بے محک ہرگز ندانی ز اعتبار

کھوٹے اور کھرے سونے کی تمیز کسوٹی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

صالح و طالح بہ صورت مشتبہ   دیدہ بکشا کہ گردی منتبہ

نیک اور بدکار کی صورتیں ملتی جلتی ہیں، آنکھیں کھولو تو تمیز ہو سکے گی۔

بحر را نیمش شیریں چوں شکر   طعم شیریں، رنگ روشن چوں قمر

دریا کا آدھا حصہ شکر کی طرح شیریں ہے مزا میٹھا اور رنگ چاند کی طرح سپید ہے۔

نیم دیگر تلخ ہم چوں زہرِ مار   طعم تلخ و رنگ مظلم قیر وار

دوسرا نصف حصہ سانپ کے زہر کی طرح ہے مزہ کڑوا اور رنگ تارکول کی طرح سیاہ ہے۔

اے بسا شیریں کہ چوں شکر بود　　لیک زہر اندر شکر مضمر بود

بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو شکر کی طرح میٹھی ہیں، لیکن ان کے باطن میں زہر چھپا ہوا ہے۔

جز کہ صاحب ذوق شناسد بیاب　　او شناسد آب خوش از شور آب

صاحبِ ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری۔

جز کہ صاحب ذوق بشناسد طعوم　　شہد را ناخوردہ کے دانی ز موم

صاحبِ ذوق کے سوا مزہ کی تمیز اور کون کر سکتا ہے جب تک شہد کو نہ کھاؤ موم اور شہد میں کیونکر تمیز کر سکتے ہیں۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس؛　　ہر دو را بر مکر پندارد اساس

اس نے سحر کو معجزہ پر قیاس کیا اور سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے۔

زرِ قلب و زرِ نیکو در عیار؛　　بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار

تم کھوٹے اور کھرے سونے کو کسوٹی کے بغیر تمیز نہیں کر سکتے۔

ہر کرا در جان خدا بنہد محک　　ہر یقین را باز داند او ز شک

خدا نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہے وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے۔

چوں شود از رنج و علت دل سلیم　　طعمِ صدق و کذب را باشد علیم؛

جب آدمی کے دل میں بیماری نہیں ہوتی تو وہ صدق اور کذب کے مزے کو پہچانتا ہے۔

اب صرف یہ شبہ رہ جاتا ہے کہ جو قوت حیرت زا خوارق کی قدرت رکھتی ہے اس کا رُخ بھی نہایت آسانی کے ساتھ بدلا جا سکتا ہے، یعنی ساحر بے تکلف اپنی ساحرانہ قوت کو دنیا کے تزکیۂ اخلاق و اصلاحِ عالم میں صَرف کر سکتا ہے، اور اس سے کوئی محالِ عقلی لازم نہیں آتا، لیکن امکانِ عقلی اور امکانِ واقعی دو مختلف چیزیں ہیں، یہ عقلاً ممکن ہے کہ ہر شخص بادشاہ ہو سکتا ہے، عالمِ عصر ہو سکتا ہے، کشور کشا ہو سکتا ہے مگر واقعاً اور عملاً یہ قدرت ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی۔

اس لئے ساحر محض ایک تماشا گر ہوتا ہے، اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس قوت سے تزکیۂ نفوس، تطہیرِ اخلاق اور اصلاحِ عالم کا کام لے سکے، یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ساحر اور شعبدہ گر نے اصلاحِ عالم کا فرض ادا نہیں کیا، لیکن پیغمبر اپنے معجزانہ کارناموں سے دنیا کو الٹ دیتا ہے، بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل و ریحان سے اس خاکدانِ عالم کو سجا دیتا ہے۔

معجزہ دلیلِ نبوت ہو سکتا ہے یا نہیں

اسی تقریر سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہے یا نہیں؟ اشاعرہ کا جواب اثبات میں اور معتزلہ کا نفی میں ہے، اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیرکن بحث ابن رشد نے "کشف الادلہ" میں کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا، کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ مثلاً جب ایک شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ

وہ خدا کی طرف سے قوم کے عقائد و اعمال اور اخلاق کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوا ہے لیکن جب اس سے اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے دلیل طلب کی جاتی ہے تو وہ خشک چشمے کو پانی سے لبریز کرتا ہے، چاند کو ٹکڑے کر دیتا ہے، لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہے، یہ تمام واقعات اگرچہ نہایت عجیب و غریب ہیں لیکن ان دلائل کو دعویٰ کے ساتھ کیا مناسبت ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا ماہر ہے اور اس کے ثبوت میں انسان کو جانور اور جانور کو انسان بنا دیتا ہے تو اس واقعہ سے اس کے فلسفہ اور ریاضی کا کمال کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے؟ اشاعرہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اسی کمال کے اظہار کے لئے معجزہ طلب کیا جاتا ہے اور انبیاء کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جاتا ہے، اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات اور ان دونوں کو اجزائے نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے، اخبار بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے، ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ خرقِ عادت کا نام ہے، اس میں کوئی نزاع نہیں کہ اشیاء اور حقائق کے خصائص اور علل، خدا کے امر و حکم سے ہیں، اب جو شخص ان خصائص و علل کو اپنے معجزہ سے توڑ دیتا ہے، وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے ان اسباب و علل کو بنایا ہے وہی اس کو توڑ سکتی ہے اور یہ شکست و خرق چونکہ اس کے واسطہ سے ظاہر ہوا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسی کا فرستادہ ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا ہے، رعایا پوچھتی ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم بادشاہی قاصد ہو؟ وہ اس کے جواب میں بادشاہ کی انگوٹھی اور مہر پیش کرتا ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعوائے پیامبری کو مہر اور انگوٹھی سے براہ راست کوئی مناسبت نہیں، لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ مہر اور انگوٹھی بادشاہی کی نشانی ہے جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نشانی دے کر بھیجا گیا ہے۔

علم کلام کی کتابوں میں ایک عام مثال یہ دی جاتی ہے کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی دربار اور جلوس کے رسوم و آداب خاص ہوتے ہیں، بادشاہ دربار میں معمولی فرش پر نہیں بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے، جلوس میں وہ پا پیادہ نہیں بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے، ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمع عام میں آتا ہے، یہ مجمع اس کو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، قاصد بادشاہ سے کہتا ہے کہ اے بادشاہ! اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو رسم و عادت کے خلاف تو فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل، بادشاہ اس کے مطابق دربار میں فرش پر جلوس کرتا ہے اور پیادہ پا چلتا ہے، بادشاہ کا یہ عمل یقیناً اس بات کی تصدیق ہوگی کہ وہ شاہی قاصد ہے، اسی طرح دنیا کے اسباب و علل، اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کے رسوم و عادات ہیں، پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے، کفار اس کے قاصد الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتا ہے اے خدا! اگر میں حقیقتاً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنے رسوم و عادات کے خلاف معجزہ اور خرقِ عادت دکھا، وہ دکھاتا ہے، یہ اس بات کی دلیل

ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے،

لیکن معجزہ اگر دلیل نبوت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کا استدلال ہے، ظاہر ہے کہ اس کو برہان یقینی نہیں کہا جاسکتا تاہم دلیل کا انحصار صرف برہانیت میں نہیں ہے بلکہ اس کی اور بھی متعدد قسمیں ہیں اور معجزہ ان مقدمات میں داخل ہوسکتا ہے، ابن رشد نے کشف الادلہ میں معجزہ کو خطابیات میں داخل کیا ہے، یعنی معجزہ اگرچہ نبوت پر بالذات یقینی طور پر دلالت نہیں کرتا، تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلۂ کائنات میں عجیب وغریب تصرف کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہر شخص اس کے کمال روحانی کا اعتراف کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور اپنے دعویٰ میں صادق ہوگا، ان دونوں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاح روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں تاہم عوام کی دلفریبی کے لئے یہ کافی ہے، لیکن اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلمات خصم سے استدلال کیا جاتا ہے اور تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاس جدل کہنا زیادہ موزوں ہوگا، زمانہ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ہوتے ہیں، ان میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے اور وہی پیغمبر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، اس بنا پر جب کوئی پیغمبر کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو اس موروثی اور مسلم عقیدہ کی بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے، یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لئے دلیل وحجت نہیں ہوسکتا، تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اور ان ہی کے طلب واصرار سے اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے، ان کو اس کے ذریعہ سے ساکت کیا جاسکتا ہے اور وہ انہی کے لئے دلیل ہوسکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان اس بحث میں خلط مبحث ہوگیا ہے، اشاعرہ کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیل نبوت ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے اور معتزلہ کا اعتراض اسی وقت درست ہوسکتا ہے جب اشاعرہ اس کو منطقی دلیل کہیں، دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورہ میں نہیں بلکہ عام اور لغوی معنی (نشان) میں استعمال ہوا ہے، اس بنا پر جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ انواع دلیل کی کس قسم میں داخل ہے، بے سود ہے، چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے، شرح مواقف بحث معجزات میں ہے۔

وهذه الدلالة ليست دلالة عقلية محضة كدلالة الفعل على وجود الفاعل ودلالة احكامه واتقانه على كونه عالما بما صدر عنه فان الادلة العقلية ترتبط لنفسها بمدلولاتها ولا يجوز تقديرها غير دالة عليها وليست المعجزة كذلك بل هي دلالة عادية كما اشار اليه بقوله وهي عندنا اي الاشاعرة اجراء الله عادته بخلق العلم

معجزہ کی دلالت نبوت پر محض دلالت عقلی نہیں ہے جیسے فعل کی دلالت وجود فاعل پر یا فعل کے استحکام ونظم کی دلالت فاعل کے علم پر عقلی ہے کیونکہ دلائل عقل اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول پر دال نہ ہوں اور معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت، دلالت عادیہ ہے جیسا کہ صاحب مواقف نے اپنے ان لفظوں میں کہا ہے کہ یہ دلالت ہمارے (اشاعرہ کے نزدیک) اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو

بالصدق عقیبہ ای عقیب ظہور المعجزات۔ صاحب معجزہ کی سچائی کا علم وہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

آج کل کے محاورۂ علمی میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ معجزہ کی دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی (سایئکالوجیکل) دلیل ہے، عادتِ انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت و کبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں، جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارقِ عادت اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

آج گو نبوت نہیں مگر ولایت ہے۔ آج بھی جس شخص کی نسبت باخدا اور ولی کامل ہونے کا خیال لوگوں میں ہوتا ہے تو فوراً یہ سوال ہوتا ہے کہ ان سے کچھ کرامتیں بھی صادر ہوتی ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ملا اور خود ذاتی مشاہدہ بھی ہوا تو اس شخص کی نسبت حسن اعتقاد بڑھ جاتا ہے یہ عام تقاضائے انسانی ہے، اس میں مومن و کافر عقل مند و بیوقوف اور زنگی و فرنگی کی کوئی تخصیص نہیں، لیکن جو طبیعتیں فطرتاً اثر پذیر نہیں بلکہ معاند، متعصب اور کور باطن ہیں ان کے لئے یہ خوارق و معجزات قطعاً بے سود ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا عناد، تعصب اور کور باطنی حسن ظن کے بجائے ہمیشہ سوءِ ظن کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور وہ بڑے سے بڑے معجزہ کو دیکھ کر بھی یہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ سحر و جادو اور طلسم و نیرنگ ہے، اس لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ مدعیٔ نبوت کے اخلاق، خلوص، پاکیزگی و طہارت کا امتحان کیا جائے جب اس میں یہ باتیں ثابت ہو جائیں گی عادۃً ناممکن ہے کہ وہ کاذب اور جھوٹا ہو، امام غزالیؒ نے منقذ میں، امام رازی نے مطالب عالیہ میں اور عارف رومؒ نے مثنوی میں نہایت تفصیل سے اس بحث کو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ نبوت کی اصل دلیل معجزہ نہیں بلکہ تعلیم و ارشاد اور قوت علم و عمل کا کمال ہے۔

امام غزالی کی تقریر

نبوت کے کچھ آثار و خواص ہیں، اگر کسی شخص کی نسبت یہ شبہ ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں ؟ تو اس کا علم صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہو سکتا ہے، یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدہ سے حاصل ہو جیسی صحابہ کو تھی یا خبر متواتر سے اور سن کر ہو جیسی اب عام لوگوں کی ہے، نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی جس میں ہوتی ہے وہی آمادۂ تصدیق ہوتا ہے مثلاً اگر تم کو طب اور فقہ سے کچھ واقفیت ہے اور ان کا ذوق رکھتے ہو تو جو شخص فقیہ یا طبیب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کے احوال کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر فوراً یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ یہ طبیب یا فقیہ ہے یا نہیں، اور اسی طرح تم امام شافعیؒ کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کر سکتے ہو، گو آج امام شافعیؒ اور جالینوس کا وجود نہیں مگر ان کے سوانح اور تصنیفات پڑھ کر اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ امام شافعیؒ فقیہ کامل اور جالینوس طبیب حاذق تھے یا نہیں، اسی طرح گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان نہیں مگر آپؐ کی سیرت مبارکہ، آپؐ کی شریعت، آپؐ کی تعلیمات، آپؐ کے ارشادات موجود ہیں جن سے آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہر شخص کر سکتا ہے، اسی معیار سے کسی مدعیٔ نبوت کے دعویٰ پر یقین کرنا چاہیے، لاٹھی کے سانپ اور قمر کے شق ہونے سے نہیں، کیونکہ اگر ان خوارق پر نظر ڈالو اور دوسرے بے شمار قرائن اور شہادتوں کو ان کے ساتھ نہ ملاؤ تو ممکن ہے کہ یہ خطرہ پیدا ہو کہ یہ جادوگری

اور نظر بندی ہے[1]۔

امام رازی کی تقریر

امام رازی نے مطالب عالیہ میں نبوت اور متعلقات نبوت کی بحث سب سے زیادہ استیفا[2] سے لکھی ہے ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ نبوت تسلیم کرتے ہیں ان میں دو جماعتیں ہیں ایک کا مذہب یہ ہے کہ نبوت کی دلیل معجزہ ہے، یہ جمہور اہل مذاہب کا مسلک ہے، دوسرا مذہب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم کو خود غور کرنا چاہیئے کہ صداقت و راستی کیا ہے، اس کے بعد ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں جو نبوت کے دعویٰ کے ساتھ لوگوں کو دین حق کی دعوت دیتا ہے، اس کی دعوت مؤثر ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو باطل پرستی سے ہٹا کر حق پرستی کی طرف لا رہا ہے تو ہم یقین کر لیں گے کہ یہ سچا پیغمبر ہے، یہ مذہب عقل سے قریب تر ہے اور اس راہ میں شکوک و شبہات کم ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسانیت کا کمال، قوت علمی و عملی کی تصحیح تکمیل اور تزکیہ ہے، اس قوت کے لحاظ سے انسان کے تین طبقے ہیں، ایک وہ جو اس میں ناقص ہے یا عام انسان ہیں، دوسرا وہ جو خود کامل ہے مگر دوسروں کو کامل نہیں بنا سکتا، یہ خواص اور صلحاء کا درجہ ہے، تیسرا وہ جو خود کامل ہے، مگر دوسروں کو بھی کامل کر دیتا ہے، یہ انبیاء ہیں، اس کمال و نقص کے ہزاروں متفاوت درجے اور مرتبے ہیں اور انہی کے لحاظ سے ان کی قوت و مرتبہ کا اندازہ ہوگا، ان کی قوت علمی کے سامنے تمام مقدمات بدیہی ہوتے ہیں اور معارف الٰہی پر ان کو عبور ہوتا ہے اور ان کی قوت عملی اس عالم جسمانی میں تصرفات کرتی ہے اور یہی معجزات کا مقصد ہے، اس قوت علمی و عملی کے کمال کے ساتھ یہ نظر آتا ہے کہ وہ ان دونوں کو جو ان لوگوں میں پست اور ناقص ہیں اپنے فیض صحبت اور فیض تعلیم سے کامل کر دیتے ہیں اور امراض قلبی کا وہ علاج کرتے ہیں تو یہی ان کی نبوت کی دلیل ہے

امام رازی نے اس تفصیل کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ اثبات نبوت کا یہی طریقہ قرآن مجید نے اختیار کیا ہے اور چند سورتوں کی تفسیر لکھ کر دکھایا ہے کہ ان میں نبوت کے یہی آثار و خصائص بیان ہوئے ہیں[3]۔

مولانا روم کے حقائق

مولانا روم نے اس بحث کو عمدہ تشبیہات اور تمثیلات سے اس درجہ قریب الفہم بنا دیا ہے کہ تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں، اس سے پہلے مولانا کے وہ اشعار لکھے جا چکے ہیں جن میں یہ دکھایا ہے کہ نبوت کی تصدیق کے لئے سب سے پہلی چیز حسن ذوق ہے، آب شیریں اور آب شور، صورت و شکل اور رنگ و بو دونوں میں ایک ہوتے ہیں، مگر صرف صاحب ذوق ان دونوں کا فرق محسوس کر سکتا ہے اسی طرح نبی اور متنبی گو ظاہری شکل و صورت اور دعوائے نبوت میں یکساں نظر آتے ہیں مگر صاحب ذوق ان دونوں کے آثار و خصائص سے فوراً تمیز کر لیتا ہے۔

جز کہ صاحب ذوق بشناسد بیاب	غور کرو؛ صاحب ذوق کے سوا اور کون پہچان سکتا ہے؟
او شناسد آب خوش از شور آب	وہی تمیز کر سکتا ہے کہ یہ پانی میٹھا ہے اور یہ کھاری ہے۔

---

[1] المنقذ من الضلال ص ۳۵، [2]، [3] مصر، مطالب عالیہ کا پیش نظر نسخہ ناقص ہے، رغب پاشا نے اپنے سفینہ میں یہ تمام کمال نقل کی ہے اور مولانا شبلی نے الکلام کے ضمیمہ میں اس کو شائع کر دیا ہے، دیکھو سفینہ راغب پاشا مطبوعہ مصر ص ۲۔

جز کہ صاحب ذوق نشناسد طعوم	صاحبِ ذوق کے سوا مزے کی تمیز اور کون کر سکتا ہے؟
شہد را نا خوردہ کے دانی زموم	اگر شہد نہ کھایا ہو تو موم اور شہد میں تمیز کیوں کر کر سکتے ہو۔
سحر را با معجزہ کردہ قیاس	اس نے سحر کو معجزے پر قیاس کیا اور یہ سمجھا کہ ان
ہر دو را بر مکر پندارد اساس	دونوں کی بنیاد فریب پر ہے۔
زرِّ قلب و زرِّ نیکو در عیار	تم کھرے اور کھوٹے سونے کا فرق کسوٹی پر پرکھے
بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار	بغیر نہیں کر سکتے۔
ہر کرا در جاں خدا بنہد محک	خدا نے جس کی روح میں یہ کسوٹی رکھی ہے،
ہر یقیں را باز داند او ز شک	وہی یقین اور شک میں تمیز کر سکتا ہے۔
چوں شود از رنج و علت دل سلیم	جب آدمی کا دل بیماری سے پاک ہو،
طعم صدق و کذب را باشد علیم	تو وہ صدق و کذب کے مزہ کو پہچان لے گا۔

دوسری چیز طلب ہے جب تک دل میں کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی، اس کی طرف التفات نہیں ہوتا جس کا دل صداقت و راستی کا بھوکا نہیں وہ غذائے روحانی کا طالب نہیں اور جب دل میں طلب اور روح میں بے قراری پیدا ہو جاتی ہے اس وقت وہ دلیل و برہان کے لفظی مباحث سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ کسی کو اگر پیاس ہو اور وہ تم سے پانی طلب کرے اور تم پانی کے گلاس کی طرف اشارہ کرو کہ یہ پانی ہے تو کیا وہ تمہارے اس دعویٰ پر دلیل مانگے گا کہ پہلے یہ ثابت کرو کہ یہ پانی ہے؟ نہیں، بلکہ وہ بلا دلیل نہایت شوق سے اپنا ہاتھ بڑھائے گا اور پانی پینے لگے گا۔

تشنہ را چوں بگوئی زود شتاب	جب کسی پیاسے کو کہو کہ جلد جاؤ،
در قدح آب است بستاں زود آب	دیکھو وہ پیالہ میں پانی ہے،
ہیچ گوید تشنہ کیں دعویٰ است رو	کیا کوئی اس وقت پیاسا یہ کہتا ہے کہ
از برم اے مدعی مہجور شو	یہ فقط تمہارا دعویٰ ہے چلو ہٹو۔
یا گواہ و حجتی بنما کہ ایں	یا کیا وہ یہ کہتا ہے کہ پہلے اس دعویٰ کی دلیل لاؤ
جنس آب است و ازاں ماء معین	کہ یہ پانی ہے۔
یا بہ طفل شیر مادر بانگ زد	یا جب شیر خوار بچہ کو اس کی ماں بلا کر کہتی ہے کہ اے
کہ بیا من مادرم ہاں اے ولد	بچہ! میں تیری ماں ہوں،
طفل گوید مادرا حجت بیار	تو بچہ یہ کہتا ہے اپنی ماں ہونے پر دلیل پیش کرو تب
تاکہ با شیرت بہ گیرم من قرار	میں تمہارا دودھ پیوں گا۔
در دلِ ہر امتی کز حق مزہ است	جس کے دل میں حق کا مزہ ہوتا ہے اس کے لیے خود پیغمبر
روے و آوازِ پیغمبر معجزہ است	کا چہرہ اور پیغمبر کی آواز معجزہ ہوتی ہے۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند	جب پیغمبر باہر سے آواز بلند کرتا ہے تو
جانِ امت در دروں سجدہ کند	امت کی روح اندر ہی اندر سجدہ کرتی ہے
زانکہ جنس بانگ او اندر جہاں	سبب یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں اس کی آواز کی سی کوئی آواز
از کسے نشنیدہ باشد گوشِ جاں	روح کے کانوں نے اس سے پہلے نہیں سنی تھی۔

تیسری چیز اتحادِ جنسیت ہے، معجزات کا مقصد عموماً معارض کو لاجواب اور خاموش کرنا ہوتا ہے، لاجواب و خاموش کر کے تم خصم کو زیر کر سکتے ہو مگر اس کے دل میں تشفی نہیں پیدا کر سکتے، صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچائی اور راستی کا عنصر ہے وہ خود اپنی ہم جنس شے کے طلب گار اور خریدار ہوتے ہیں۔

موجبِ ایماں نباشد معجزات	درحقیقت معجزات ایمان کا باعث نہیں ہوتے بلکہ اتحادِ جنسیت
بوئے جنسیت کند جذبِ صفات	کی بُو اس کے صفات کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔
معجزات از بہر قہرِ دشمن است	معجزات تو مخالف کو دبانے کے لئے ہوتے ہیں اور
بوئے جنسیت سوئے دل بردن است	اتحادِ جنسیت کی بو دل کو متاثر کرنے کے لئے ہے۔
قہر گردد دشمن اما دوست نے	دبا کر تم دشمن کو زیر کر سکتے ہو مگر دوست نہیں بنا سکتے جس کو
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے	زبردستی گردن باندھ کر زیر کرو وہ دوست کیونکر ہو سکتا ہے۔

معجزات کا صدور اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ معاندین یہ سمجھ کر کہ پیغمبر کاذب ہے اس سے کسی خرقِ عادت کا مطالبہ کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ اس کو پیش نہیں کر سکتا اور اس طریقہ سے لوگوں میں اس کی رسوائی ہوگی اور اس کے دعویٰ کی تکذیب ہو جائے گی لیکن اللہ تعالیٰ اس خرقِ عادت کو ظاہر کر دیتا ہے اور اس سے پیغمبر کی رسوائی اور فضیحت کے بجائے اس کی صداقت اور راست بازی اور عالم آشکارا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر معجزہ اس کے صدق پر ایک نشانی اور آیت بن جاتی ہے، فرعون نے جادوگروں کو جمع کر کے چاہا کہ حضرت موسیٰؑ کو رسوا کرے مگر یہی واقعہ حضرت موسیٰؑ کی کامیابی اور فرعون کی ناکامی کا سبب بن گیا اور سینکڑوں جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کر دی، اس بنا پر معاندین کا وجود اعلانِ نبوت کی بلند آہنگی اور شہرت کے لئے ضروری ہے:

منکراں را قصدِ اذلالِ ثقات	مخالفوں کا یہ ارادہ کہ طلب معجزہ سے نیکو کاروں کو لغزش میں ڈالے
ذل شدہ عزّ و ظہورِ معجزات	دیں ان کی ذلت اور معجزات کے غلبہ پر عزت کا باعث ہوگا۔
قصد شانِ زاں کارِ ذل ایں بدہ	ان کا ارادہ اس طلب معجزہ سے پیغمبر کی ذلت تھی لیکن یہی تذلیل
عین ذل اعزِ رسولاں آمدہ	کا ارادہ پیغمبروں کی عزت کا باعث ہو جاتا ہے۔
گر نہ انکار آمدے از ہر بدے	اگر کوئی بدکار پیغمبر کا انکار نہ کرتا
معجزہ برہاں چرا نازل شدے	تو معجزہ برہان بن کر کیوں نازل ہوتا۔
خصم منکر تا نہ شد مصداق خواہ	جب تک فریق دوم دعویٰ سے منکر اور خواہانِ تصدیق نہ
کے کند قاضی تقاضائے گواہ	ہو قاضی گواہ و شاہد کب طلب کرتا ہے؟

معجزہ ہمچو گواہ آمد زکی!	اسی طرح اے عقلمند! معجزہ بھی پیغمبر کا گواہ ہے
بہرِ صدقِ مدعی در پیشگی	جو مدعی کی تصدیق کے لئے سامنے آیا ہے۔
طعنہ چوں می آمد از ہر ناشناخت	جب کوئی ناشناس طعنہ کرتا تھا
معجزہ می داد حق و بنواخت	تو پیغمبر کو معجزہ دے کر نوازش فرماتا تھا۔
مکر آں فرعون سی صد تو شدہ	فرعون موسیٰؑ کے مقابلہ میں سیکڑوں چالیں چلا مگر ان میں سے
جملہ ذلّ او و قمع او شدہ	ہر ایک خود اس کی ذلت اور بیخ کنی کا باعث ہوئی۔
ساحراں آوردہ حاضر نیک و بد	اس نے اچھے بُرے ہر قسم کے جادوگر جمع کئے
تاکہ جرح معجزہ موسیٰ کنند	تاکہ موسیٰؑ کے معجزہ کو باطل کر دے۔
تا عصا را باطل و رسوا کنند	اور عصائے موسیٰؑ کی قوت کو باطل و رسوا کرے
اعتبار او ز دلہا بر کنند	اور لوگوں کے دلوں سے اس کے اعتبار کو کھو دے۔
عین آں مکر آیتِ موسیٰ شدہ	لیکن عین یہی سازش موسیٰؑ کی صداقت کی نشانی ہوگئی
اعتبارِ آں عصا بالا شدہ	اور اس سے اس عصا کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی۔

معجزہ سے مقصود اگر معاندین کو خاموش اور رسوا کرنے کے علاوہ ان کے دلوں کو متاثر کرنا ہوتا تو اس کے لئے اس کی ضرورت نہ تھی کہ عصا کو سانپ بنایا جائے اور قمر کو دو ٹکڑے کر دیا جائے اور اس کے ذریعے قلوب کو متاثر کیا جائے، ان جمادات و نباتات پر تصرف کرکے قلوب میں تصرف کرنے سے زیادہ صاف اور سیدھا راستہ یہ تھا کہ براہِ راست خود دلوں میں تصرف کیا جائے کہ وہ صدائے نبوت کے سننے کے ساتھ لبیک پکار اٹھیں معاندین کا معجزہ طلب فرقہ جو انبیاء سے جمادات و نباتات پر ان کے اثرات کا طالب ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قبول ایمان پر آمادگی ظاہر کرتا ہے، خود اُن کی یہ طلب ان کے ضمیر کی پستی اور قلب کی سیاہی کی دلیل ہے جن کے آئینۂ دل پاک و صاف ہوتے ہیں، وہ بلا واسطہ جمادات و نباتات پیغمبر سے براہِ راست خود اس اثر کو قبول کرتے ہیں، اس کے علاوہ معجزہ سے ہر شخص کو ہدایت نہیں ملتی، اس کے لئے بھی استعداد کی ضرورت ہے، دریا کی طراوت اور اس کے روح افزا ہونے میں شک نہیں، لیکن اس میں خشکی کے پرند زندہ نہیں رہ سکتے۔

معجزہ کاں بر جمادات اثر   یا عصا یا بحر یا شق القمر

معجزہ جو بے جان چیزوں پر اثر و تصرف کرتا ہے مثلاً عصا کا سانپ ہو جانا، سمندر کا پھٹ جانا، چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔

گر اثر بر جاں زند بے واسطہ   متصل گردد بہ پنہاں رابطہ

اگر وہ معجزہ براہ راست روح کو متاثر کرے تو اندر اندر روح سے اس کا رابطہ پیدا ہو۔

بر جمادات آں اثر عاریہ است   آں پئے رُوحِ خوش متواریہ است

لیکن غیر ذی روح چیزوں پر اس کا اثر عاریۃً ہے اور روح کے لئے پوشیدہ ہے۔

تا ازاں جامد اثر گیرد ضمیر   جنبد اناں سبے ہیولائے خمیر

مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس غیر ذی روح شے کی اثر پذیری کو دیکھ کر روحِ انسانی اثر پذیر ہو۔

بر زند از جانِ کامل معجزات   بر ضمیرِ جانِ طالب چوں حیات

لیکن معجزہ روحِ کامل کو خود بے واسطہ اور براہ راست متاثر کرتا ہے اور طالب کے لئے زندگی ہوتا ہے۔

معجزہ بحر است و ناقص مرغِ خاک   مرغِ خاکی رفت در یم شد ہلاک

معجزہ کی مثال دریا کی ہے اور ناقص کی خشکی کی پرندہ کی، خشکی کا پرندہ دریا میں جائے گا تو ڈوب جائے گا۔

مرغِ آبی در وے ایمن از ہلاک   ماہیاں را مرگ بے دریاست خاک

لیکن آبی پرندہ اس میں جائے تو موت سے بے پرواہے گا بلکہ مچھلیوں کے لئے تو دریا کے بغیر خشکی موت ہے۔

الغرض ناقصین اور معاندین کے لئے جس طرح صدقِ نبوت کے دوسرے دلائل بے کار ہوتے ہیں معجزہ کی شہادت بھی بیکار ہوتی ہے، معجزہ طلب فرقہ شاذ و نادر ہی دولتِ ایمان پاتا ہے لیکن وہ ہستیاں جو براہ راست پیغمبر کے وجود سے اثر پذیر ہوتی ہیں، ان کو قبولِ اثر کے لئے معجزہ کے واسطہ کی حاجت نہیں، ابوجہل معجزہ جمادات دیکھ کر بھی کافر ہی رہا اور ابوبکرؓ معجزہ دل سے صدیق اکبر ہوئے۔

معجزہ خواست بوجہلِ لعین   معجزات از مصطفیٰؐ شاہِ مبین

ابوجہل نے عناد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ طلب کیا۔

معجزہ جست از نبی ابوجہل سگ   دید و نفزودش ازاں الا کہ شک

لیکن یہ معجزہ دیکھ کر بھی شک کے سوا اس کو یقین نہ پیدا ہوا۔

لیک آں صدیقِ حق معجز نخواست   گفت ایں رو خود نہ گوید غیر راست

لیکن ابوبکر صدیقؓ نے معجزہ طلب نہ کیا، انہوں نے کہا کہ یہ چہرہ نبوی سچ کے سوا جھوٹ کہہ ہی نہیں سکتا۔

صحابہ کو کیونکر رسالت کا یقین آیا

اب یہاں پہنچ کر مفروضات اور نظریات کو جانے دیجئے، واقعات کو لیجئے، آنحضرتؐ نے جب آوازۂ نبوت بلند کیا تو اس آواز کی تائید کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا، عرب کا ذرہ ذرہ اس صدائے حق کا دشمن تھا، آپ پشت ہا پشت کے خوگردہ عادات کے ترک کی دعوت دیتے تھے، موروثی مذہب جو لوگوں کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھا آپ انکی مذمت کرتے تھے، جن بتوں اور دیوتاؤں کے رعب و ہیبت سے وہ کانپتے تھے آپ ان کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے، سرقہ، ڈاکہ، لوٹ مار، قتل، خونریزی، کینہ، عداوت، سود، قمار، زنا، شراب، غرض وہ تمام افعال جو عرب کے خصائص بن گئے تھے، آپ ان کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے، علاوہ بریں آپ کے دست مبارک میں کوئی ظاہری مادی طاقت نہ تھی، دولت و خزانہ نہ تھا، اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لئے بجز مصائب و بلا کے آپ کے پاس کوئی ظاہری قابلِ معاوضہ چیز نہ تھی، ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام کا نام لینے کے ساتھ وہ اپنے گھر سے بیگانہ، اپنی جائیداد سے محروم اپنے خاندان سے ناآشنا، اپنے وطن سے مہجور اور اکابر شہر اور رؤسائے قریش میں رسوا و بدنام اور ہر قسم کی مصیبتوں کا ہدف اور نشانہ بن جائیگا، غریب مسلمانوں کیساتھ جو کچھ بے رحمیاں اور سفاکیاں کی جا رہی تھیں وہ سب کے سامنے تھیں، ہاں ہر ایک خلقت تھی کہ آستانہ

محمدی کی تلاش میں چلی آتی تھی، عرب کے دور دور کے قبائل سے لوگ چھپ چھپ کر پہنچتے تھے اور بیعت کر کے واپس جاتے تھے اور آخر وہ بھی جو سالہا سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن رہے تھے، اسلام کے شدید مخالف اور بدر و احد اور جنگ خندق کے بانی تھے، وہ بھی ایک روز سر اطاعت جھکانے پر مجبور ہوئے۔

آخر اس کے کیا اسباب تھے؟ اور کیونکر ان کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صداقت کا یقین آیا۔ عیسائیوں کی طرح یہ کہنا آسان ہے کہ محمدؐ نے لڑ کر لوگوں کو مطیع بنا لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ہزاروں جان نثار لڑنے والے کہاں سے اور کیونکر پیدا ہوئے، ان کو کس نے لڑ کر مطیع بنایا، اب اگر اسلام لانے والوں کے اسباب پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سب کے اسلام لانے کا ایک ہی سبب نہ تھا، سینکڑوں ہزاروں آدمی ایک متحد نتیجہ کا یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے یقین کے اسباب وعلل کی تلاش کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کے یقین کے اسباب وعلل اور اذعان کے طرق اور ذریعے مختلف ہیں، ہزاروں صحابہؓ نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی، آپ کی رسالت پر ایمان لائے، آپ کی صداقت پر یقین کیا، مگر یہ تصدیق، یہ ایمان اور یہ یقین کسی ایک سبب کا نتیجہ نہ تھا، اس سے معلوم ہوا کہ صرف معجزہ ہی نبوت کی دلیل نہیں ہے بلکہ ہر طبیعتِ صالح اور قلبِ سلیم کے لئے پیغمبر کی صداقت کی مختلف دلیلیں مؤثر اور کارگر ہوتی ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ صرف دعوائے نبوت کو سن کر ایمان لے آئے، محض دعویٰ کی صداقت نے ان کو ہر دلیل و برہان سے بے نیاز کر دیا، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبیدہؓ بن جراح یہ دیکھ کر اسلام لے آئے کہ ابوبکرؓ سا دانشمند اس صداقت سے متاثر ہے، خدیجہؓ ایمان لائیں، مگر یہ کہہ کر کہ آپ جیسے اخلاق گراں مایہ کا انسان جو غریبوں کا مولیٰ، مقروضوں کا ماویٰ اور مسافروں کا ملجا ہے، کبھی شیطان کے پنجہ میں نہیں گرفتار ہو سکتا، حضرت انیسؓ غفاریؓ اور حضرت عمرو بن عبسہ سلمیؓ یہ دیکھ کر اسلام لائے کہ آپ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی، حضرت جبیرؓ بن مطعم، نجاشی شاہ حبشؓ وغیرہ سینکڑوں اشخاص کلام ربانی سن کر حلقہ بگوش ہوگئے، حضرت ضماد بن ثعلبہ ازدی نے نفس کلمۂ طیبہ سننے کے ساتھ نعرۂ حق بلند کر دیا، حضرت عبداللہؓ بن سلام چہرۂ انور کو دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں، حضرت ضمامؓ بن ثعلبہ رئیس بنی سعد اس طرح اسلام لائے کہ انہوں نے بے تکلفی کے ساتھ دربار نبوی میں آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم دلائی کہ تم کو سچ سچ خدا نے بھیجا ہے اور جب آپ نے قسم کھائی تو وہ مسلمان ہوگئے۔

اوس و خزرج کے بہت سے لوگ اپنے یہودی ہمسایوں سے سُنا کرتے تھے کہ ایک نبی آخر الزمان کا ظہور ہونے والا ہے، جب انہوں نے آپ کی تقریر سنی تو پہچان لیا کہ یہ وہی پیغمبر ہیں، فتح مکہ کے بعد سینکڑوں قبائل اسلام لانے پر اس لئے مجبور ہوئے کہ خانۂ خلیل کسی جھوٹے پیغمبر کے قبضہ میں نہیں جا سکتا، ایک پورا قبیلہ صرف آپؐ کی فیاضی سے متاثر ہو کر کلمہ لا الٰہ الا اللہ پکار اٹھا، متعدد شعرائے عرب اور اصحاب علم صرف قرآن مجید کے اثر کو دیکھ کر دل کو قابو میں نہ رکھ سکے، متعدد قریشی جانباز جو معرکۂ بدر سے مرعوب نہیں ہوئے تھے، مسلمانوں کے آداب و اخلاق کو دیکھ کر اسلام لے آئے، صلح حدیبیہ کے بعد ہزاروں مکہ کے آدمیوں کو جب مسلمانوں سے بے تکلف میل جول

کا موقع ملا تو وہ اسلام کی صداقت کے اعتراف پر مجبور ہوگئے، ابوسفیان جس کو نہ تو معجزات اور خوارقِ عادات متاثر کر سکے اور نہ بدر و خندق کی تلواریں اس کو مرعوب کر سکیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتۂ دامادی اس کے سخت دل کو نرم کر سکا، وہ اس نظارہ کو دیکھ کر اپنے ضمیر کے اعتراف کو نہ روک سکا کہ قیصر روم اپنے تختِ جلال پر بیٹھ کر مکہ کے بوریا نشین پیغمبر کے پاؤں دھونے کی آرزو رکھتا ہے۔ ثمامہ بن اثال، ہند زوجۂ ابوسفیان، ہبار بن الاسود، وحشی قاتلِ حمزہؓ یہ دیکھ کر مسلمان ہوگیا کہ آپؐ دشمنوں کے ساتھ بھی کس محبت سے پیش آئے، قیصر روم صرف آپ کے چند دعاوی اور اسلام کے چند مناقب سن کر اظہارِ حق پر مائل ہوگیا، حضرت عدی بن حاتم قبیلۂ طے کے عیسائی رئیس تھے، وہ آپؐ کو بادشاہ سمجھ کر مدینہ آئے، مگر یہاں انھوں نے دیکھا کہ مکہ کی ایک لونڈی آتی ہے اور آپ اس کی حاجت روائی کو کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ دیکھ کر ان کا دل اندر سے پکار اٹھا کہ آپ بادشاہ نہیں پیغمبر ہیں۔

ایسے لوگ بھی تھے جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلہ میں مادی معجزات سے متاثر ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتے تھے، قریش کے بہت سے لوگ فتح روم کی پیشین گوئی کو پوری ہوتے دیکھ کر اسلام لے آئے۔ ایک سفر میں ایک قبیلہ کی عورت آپ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھ کر اپنے قبیلہ میں جا کر کہتی ہے کہ آج میں نے عرب کے سب سے بڑے جادوگر کو دیکھا اور اسی استعجاب نے پورے قبیلہ کو مسلمان کر دیا، متعدد یہودی اس لئے مسلمان ہوگئے کہ گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی جو نشانیاں بتائی گئی تھیں، وہ حرف بحرف آپ میں صحیح نظر آتی تھیں، متعدد یہودی علماء نے آکر آپؐ کا امتحان لیا اور جب آپؐ نے از روئے وحی ان کے جوابات صحیح دیئے تو وہ آپؐ کی نبوت پر ایمان لائے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس وقت آپ کو سچا رسول تسلیم کروں گا جب یہ خرمے کا خوشہ آپ کے پاس آکر آپ کی رسالت کی شہادت دے، اور جب یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مسلمان ہوگیا[1]۔ ایک سفر میں ایک اعرابی نظر آیا، آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا، آپ کی صداقت کی شہادت کون دیتا ہے، آپؐ نے فرمایا "سامنے کا درخت"، اور یہ کہہ کر آپؐ نے اس درخت کو بلایا، وہ اپنی جگہ سے اکھڑ کر آپؐ کے پاس کھڑا ہوگیا اور تین بار اس کے اندر سے کلمۂ توحید کی آواز آئی، یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہوگیا[2]۔ سراقہ بن مالک جو ہجرت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتے آرہے تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ آپؐ کی دعا سے تین دفعہ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تو ان کو یقین ہوگیا کہ اسلام کے اقبال کا ستارہ نقطۂ عروج پر پہنچ کر رہے گا، چنانچہ خطِ امان حاصل کیا اور بعد کو مسلمان ہوگئے[3]۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند — جانِ امت در دروں سجدہ کند
برزند از جانِ کاملِ معجزات — بر ضمیرِ جانِ طالب چوں حیات

*

---

[1] جامع ترمذی معجزات ص۶۰۳ [2] مسند دارمی باب ما اکرم اللہ نبیہ من ایمان الشجر [3] صحیح بخاری جلد اول ہجرت۔

دلائل و معجزات اور عقلیات جدیدہ

نوشتہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق استاد فلسفہ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔

وَمَا تُغْنِي الْاٰيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۔

جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے لئے آیات و نذر بیکار ہیں۔

لیکن

در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است روے و آواز پیمبر معجزہ است (عارف روم)

متکلمین و حکمائے اسلام نے عقلی حیثیت سے معجزہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ گزشتہ مباحث میں نظر سے گزر چکا ہے۔ سیرت کے اس حصہ کو اصلاً معجزات نبوی کی نقلی اور روایاتی تحقیق سے تعلق تھا، تاہم ضمناً قدیم کلامی مباحث بھی ایک حد تک آگئے ہیں۔ ذیل میں اس موضوع پر صرف عقلائے مغرب کی ترجمانی کرنی ہے اور جدید تحقیقات و خیالات کی روشنی میں جو نتائج نکلتے ہیں ان کو پیش کرنا ہے۔ آغازِ کتاب میں نبوت اور معجزہ کے مفہوم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا ہے، سب سے پہلے اس پر ایک نظر اور ڈال لو۔

مفہوم نبوت

جس طرح رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی کا آنا قانونِ قدرت ہے اسی طرح یہ بھی ایک سنتِ الٰہی ہے کہ جب عالمِ انسانیت پر ضلالت و گمراہی کی تاریکی چھا جاتی ہے تو اس کے مطلع سے ہدایت و رہنمائی کا نور طلوع کرتا ہے اور اگرچہ جس طرح ظلمتِ شب میں چھوٹے بڑے ستارے اپنی جھلملاہٹ سے کچھ نہ کچھ روشنی پیدا کرتے رہتے ہیں، اسی طرح عام مصلحین و مجددین کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی حد تک ضلالت انسانی کی سیاہی کو کم کرتا رہتا ہے تاہم آفتاب کی ضیا پاشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے اس کے سامنے ستاروں کی جھلملاہٹ بالکل ماند پڑ جاتی ہے اور کرۂ ارض دفعۃً بقعۂ نور بن جاتا ہے۔

سلسلۂ مصلحین کے اسی آفتابِ ہدایت کا نام ادیان و شرائع کی اصطلاح میں نبی، پیغمبر یا رسول ہے، عام مصلحین کے ہاتھ میں صرف انسانی عقل و بصیرت کی مشعل ہوتی ہے لیکن مشکوۃ نبوت سے جو نورِ ہدایت اُبلتا ہے اس کا سرچشمہ وہ "نور السموات والارض" ہوتا ہے جس سے عام مادی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں، پیغمبر وہ کچھ دیکھتا ہے جو ہم نہیں دیکھتے، وہ کچھ سنتا ہے جو ہم نہیں سنتے، اس کے احوال و کوائف سے ہم ناآشنا اور اس کے عقل و حواس سے بیگانہ ہوتے ہیں، مختصراً یوں سمجھو کہ پیمبرانہ خصائص کی اصلی روح عالم ناسوت سے ماوراء کسی عالمِ غیب کے ساتھ تعلق و ربط ہے۔ انسان اسی عالم اسرار و غیوب کو اپنی محدود تعبیر میں عالمِ قدس، عالمِ روح، عالمِ مثال وغیرہ سے موسوم کرتا ہے۔

مفہوم معجزہ

حاملِ رسالت اپنے ابنائے جنس کو جو دعوت دیتا ہے اور دنیا کو جو پیام پہنچاتا ہے، اس کی سچائی کی واضح ترین دلیل یا آیت، اگرچہ خود یہ پیام اور اس کے حامل کا مجسم وجود ہوتا ہے تاہم بہ اقتضائے

یعنی تبلیغی یا بہ لحاظ اتمام حجت اس داعیِ حق کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں اور ان کی توجیہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو درماندہ پاتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ پر آگ سرد ہو گئی، حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن گیا، حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چشم زدن میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ و سدرۃ المنتہیٰ تک کی سیر کر لی، ان واقعات کی توجیہ سے چونکہ عقل انسانی عاجز ہے، اس لئے ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے، عالم غیب کے ساتھ اس کے روابط کی نشانی و آیت یا تائید غیبی کا کام دیتے ہیں، قرآن مجید کی زبان میں اس قسم کے واقعات کا نام بینات، براہین یا زیادہ تر آیات (یا آیات بینات) ہے، محدثین ان کو "دلائل نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں اور حکماء و متکلمین کی اصطلاح میں ان ہی کو معجزات کہا جاتا ہے۔

ترتیب مباحث معجزات کی جو نوعیت ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلی بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیا ان کا وقوع ممکن بھی ہے یا نہیں؟ قدماء نے عللِ مخفیہ وغیرہ سے توجیہ معجزات کی جو کوششیں کی ہیں ان کا مدعا حقیقۃً امکان ہی کو ثابت کرنا ہے، مگر حکمت و فلسفہ کے دورِ جدید میں امکان کے ساتھ ایک دوسری زیادہ اہم بحث شہادت کی پیدا ہو گئی ہے، نفسِ امکان سے تو اب شاید ہی کسی حکیم یا فلسفی کا انکار ہو، البتہ یہ امکان اس قدر بعید الوقوع معلوم ہوتا ہے کہ یقینِ وقوع کے لئے عام واقعاتِ تاریخی کے درجہ کی شہادت کافی نہیں خیال کی جاتی۔

لیکن چونکہ امکان اور شہادت دونوں کی بحث کا اصلی مرجع معجزانہ واقعات کا قابلِ یقین و اذعان ہونا یا نہ ہونا ہے، اس لئے امکان و شہادت دونوں سے زیادہ اہم سوال خود یقین کی ماہیت و اسباب کا ہے، تعجب ہوتا ہے کہ اس طرف بحث معجزات کے ضمن میں متقدمین و متاخرین میں سے جہاں تک علم ہے کسی کا بھی ذہن نہیں گیا، صفحاتِ ذیل میں نہ صرف اس اہم سوال کا مستقلاً جواب دیا گیا ہے، بلکہ دراصل یہی جواب معجزہ کے متعلق تمام مباحث کا مقطع اور خاتمۂ سخن ہے۔

بہر کیف اس فکر کی بناء پر ترتیبِ مباحث یہ ہو گی۔

(۱) امکانِ معجزات (۲) شہادتِ معجزات (۳) استبعادِ معجزات
(۴) یقینِ معجزات (۵) غایتِ معجزات۔

امکانِ معجزات

یوں تو یورپ میں معجزات پر بیسیوں مستقل کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ اس بحث پر ہیوم[ل] نے جو چند اوراق لکھے تھے، وہ سارے طومار پر بھاری ہیں، اور گو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اس موضوع پر یہ سب سے پہلی تحریر نہ تھی، تاہم وقوعِ معجزات کے خلاف جو آخری حربہ استعمال کیا جا سکتا ہے وہ بھی یہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان اوراق پر کم و بیش دو صدیاں گزر جانے پر بھی موافق و مخالف دونوں کے قلم کی روشنائی ان ہی نقوش کے مٹانے

[ل] Human understanding "فہم انسانی" باب بحث معجزات

یا اجاگر کرنے میں صرف ہوتی رہی ہے۔

ہیوم کا استدلال

ہیوم کے استدلال کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) انسان کے علم ویقین کا مدار تمام تر تجربہ پر ہے، جس طرح آدمی تجربہ سے یہ جانتا ہے کہ آگ لکڑی کو جلاتی اور پانی سے بجھ جاتی ہے، اسی طرح تجربہ ہی کی بنا پر وہ اس کا بھی یقین رکھتا ہے کہ جب تک دروغ بیانی کا کوئی خاص سبب نہ ہو لوگ علی العموم سچ بولتے ہیں، یعنی جس چیز کی روایت یا تصدیق کرتے ہیں وہ عام طور پر تحقیق کے بعد صحیح ثابت ہوتی ہے۔

(۲) جس نسبت سے کسی امر کے متعلق گزشتہ تجربات کی شہادت قوی یا ضعیف ہوتی ہے، اسی نسبت سے ہمارے دل میں اذعان، شک یا انکار کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہونی چاہیئے۔

فرض کرو کہ تمہارے محلہ میں ساٹھ ستر برس کی عمر کا ایک بوڑھا فقیر رہتا ہے جس کو تم بچپن سے دیکھتے ہو کہ چیتھڑے لپیٹے ہوئے بھیک مانگ کر زندگی بسر کرتا ہے، پیری وفاقہ کشی سے ہڈیوں کا صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے کل تک تم نے اس کو اسی حال میں دیکھا تھا، آج تمہارا ایک پڑوسی آ کر کہتا ہے کہ وہ بیچارا بڈھا فقیر رات کو مر گیا، تم کو اس بیان کے باور کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، لیکن یہی پڑوسی اگر یہ بیان کرے کہ میں نے اس فقیر کو نہایت قیمتی لباس میں اعلیٰ درجہ کی موٹر پر سوار وائٹ وے کی دوکان پر کچھ چیزیں خریدتے دیکھا تو تم کو سخت اچنبھا ہوگا اور اگر پڑوسی کی صداقت کا غیر معمولی طور پر تم کو اعتبار نہیں ہے یا اور بہت سے معتبر لوگ اس کی تصدیق نہیں کرتے تو اس بیان کے قبول کرنے میں تم بہت زیادہ پس وپیش کرو گے۔ تیسری صورت یہ فرض کرو کہ اس پڑوسی نے یہ بیان کیا کہ میں نے اس پیر فرتوت، پوست واستخوان فقیر کو آج دیکھا کہ بیس پچیس برس کا جوان رعنا ہے، اب تم اپنے پڑوسی کو یا تو محض لائی سمجھو گے یا یہ خیال کرو گے کہ اس کو کچھ نہ کچھ دھوکا ہوا ہے، لیکن اس بیان کی واقعیت کا اذعان ہرگز تمہارے دل میں نہ پیدا ہوگا، کیوں؟

صرف اس لئے کہ اس قسم کی مثال انسان کے گزشتہ تجربات میں ایک بھی نہیں ملتی، اسی بنا پر اس کو خلاف فطرت یا خارق عادت قرار دیا جاتا ہے جس کو تسلیم کرنے کے بجائے یہ سمجھ لینا کہیں زیادہ قرین قیاس ہے کہ راوی کو کوئی دھوکہ ہوا یا وہ دانستہ جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ سچے سے سچے آدمی کا جھوٹ بول دینا یا عاقل سے عاقل انسان کا دھوکہ کھا جانا، بجائے خود ایک نادر الوقوع شے سہی، تاہم عدیم الوقوع نہیں ہے اور خرق عادت کے مقابل میں اس کا وقوع بہت زیادہ ممکن وقابل قبول ہے۔

(۳) معجزہ اسی صنف کے عدیم الوقوع یا قانون فطرت کے خارق واقعہ سے عبارت ہوتا ہے ورنہ پھر وہ معجزہ نہیں رہتا، اس لئے کہ اگر یہ محض نادر الوقوع شے کا نام ہو جس طرح کہ کسی آخری درجہ کے مدقوق کا صحت یاب ہو جانا یا ایک مفلس کا رات بھر میں دولت مند ہو جانا تو یہ ایسے واقعات ہیں جن کی توجیہ کے لئے عام انسانی زندگی ہی میں کچھ نہ کچھ تجربات ملتے ہیں، مثلاً مفلس کے گھر میں کوئی دفینہ نکل آسکتا ہے بخلاف اس کے معجزہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیل وتوجیہ عام تجربات کی دسترس سے باہر ہو، اس لئے معجزہ گویا بذات خود آپ

اپنی تردید ہے۔

اس استدلال کو خود ہیوم کے الفاظ میں بھی سن لینا چاہیے۔

"معجزہ نام ہے قوانینِ فطرت کے خرق کا اور چونکہ یہ قوانین مستحکم اور اٹل تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں اس لیے معجزہ خود اپنے خلاف اتنا زبردست ثبوت ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی تجربی ثبوت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا، یہی وجہ ہے کہ ہم ان باتوں پر قطعی یقین رکھتے ہیں کہ تمام انسان فانی ہیں، سیسہ آپ ہی آپ ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا، آگ لکڑی کو جلاتی اور پانی سے بجھ جاتی ہے، صرف یہی کہ یہ امور قوانینِ فطرت کے مطابق ثابت ہو چکے ہیں اور اب ان کا توڑنا بغیر قوانینِ فطرت کے توڑے، یا بہ الفاظ دیگر یوں کہو کہ بلا معجزہ کے ناممکن ہے، جو چیز عام قانونِ فطرت کے اندر واقع ہوتی ہے وہ کبھی معجزہ نہیں خیال کی جاتی مثلاً یہ کوئی معجزہ نہ ہوگا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں تندرست ہوتا ہے اچانک مر جائے کیونکہ اس قسم کی موت گو نسبتاً قلیل الوقوع سہی لیکن پھر بھی بارہا مشاہدہ میں آ چکی ہے، البتہ یہ معجزہ ہوگا کہ کوئی مردہ زندہ ہو جائے، کیونکہ ایسی کبھی کسی ملک میں نہیں دیکھا گیا ہے۔ لہذا جس واقعہ کو معجزہ کہا جاتا ہے اس کے خلاف تجربہ کا مستمر و متواتر ہو جانا ضروری ہے ورنہ پھر یہ معجزہ کے نام سے نہ موسوم ہوگا اور چونکہ کسی شے کا متواتر تجربہ خود ایک قطعی ثبوت ہے تو گویا معجزہ کی نفس حقیقت و ماہیت ہی میں اس کے وجود کے خلاف ایک قطعی و براہِ راست ثبوت موجود ہے اور ایسا ثبوت جو نہ اس وقت تک معجزہ کو ثابت ہونے دے سکتا ہے، اور نہ خود باطل کیا جا سکتا ہے جب تک اس کے خلاف اس سے بڑھ کر ثبوت نہ پیدا کیا جائے۔

لہذا صریح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ایک کلی اصول کی حیثیت رکھتا ہے کہ کوئی تصدیق و شہادت معجزہ کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ یہ ایسی نہ ہو جس کی تکذیب خود اس معجزہ سے بڑھ کر معجزہ ہو جس کو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے اور اس صورت میں بھی دلائل میں باہم تصادم ہوگا جو دلیل جتنی زیادہ قوی ہوگی، اپنی زائد قوت کے مناسب یقین پیدا کرے گی، فرض کرو کہ ایک شخص آکر مجھ سے کہتا ہے کہ اس نے ایک مردہ کو دیکھا کہ زندہ ہو گیا تو میں ذرا سوچنے لگتا ہوں کہ آیا یہ زیادہ ممکن ہے کہ یہ شخص دھوکہ دینا چاہتا ہو یا خود دھوکہ کھا گیا ہو، یا یہ اغلب ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے صحیح ہو، میں ان دونوں معجزوں میں موازنہ کرتا ہوں اور جدھر کا پلہ زیادہ جھکتا معلوم ہوتا ہے اس کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہوں اور ہمیشہ اسی احتمال کو رد کرنا پڑتا ہے جس میں معجزہ پن زیادہ نظر آتا ہے، البتہ اگر روایت کی تکذیب واقعہ روایت سے بڑھ کر معجزہ ہو تو اس صورت میں بے شک مجھ کو روایت کے یقین پر مجبور ہو جانا پڑے گا لیکن اس کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔" (فہم انسانی، باب معجزات)

غرض ہیوم کے استدلال اور اس کی تعریفِ معجزہ کی رو سے اگر ایک طرف ہم اپنی میزانِ عقل میں کسی خارقِ عادت واقعہ کی شہادت و روایت کو رکھیں اور دوسری طرف اس کے خلاف دنیا کے ہزارہا سال کے مستمر و متواتر تجربہ کو

تو ظاہر ہے کہ یہ شہادت چاہے کتنی ہی معتبر و وقیع کیوں نہ ہوتا ہم اس متواتر تجربہ کے ہم وزن کسی حال میں نہیں ٹھہر سکتی، لہٰذا انسانی شہادت کی کوئی کمیت و کیفیت بھی معجزہ کے یقین و اثبات کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

حضرت موسیٰ کا ایک معجزہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی جان کے دشمن اور اپنے سب سے بڑے منکر فرعون کے گھر میں پرورش پائی، ہیوم سے بڑھ کر معجزہ کا کون دشمن و منکر ہوگا، لیکن اس انکار کو جب اس کے پورے فلسفہ کی روشنی میں دیکھو تو نظر آتا ہے کہ قبول معجزات کی راہ میں عقل کی خود فریبی کا جو سب سے زبردست طلسم حائل تھا اس کو ہیوم ہی نے توڑا اور ہمیشہ کے لئے برباد کر دیا ہے جس کے بعد راستہ کے صرف چند کانٹوں کا ہٹانا باقی رہ جاتا ہے، چراغ کے تلے اندھیرا، آدمی بارہا اپنے ہاتھ کی مشعل سے دوسروں کو راستہ دکھلاتا ہے اور خود نہیں دیکھ سکتا۔

انسان کے ذہن میں جس قدر یہ اعتقاد راسخ ہے، شاید ہی کوئی اور ہو کہ کائنات کا ذرہ ذرہ مادی علل و اسباب اور قویٰ و خواص کی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے، چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اپنے ظہور کے لئے ایک اٹل اور غیر متغیر علت رکھتا ہے، ہر شے اپنے اندر کوئی نہ کوئی ایسی قوت یا خاصہ رکھتی ہے جس سے اس وقت تک اس کا انفکاک ناممکن ہے جب تک یہ خود اپنی ذات و حقیقت سے منفک نہ ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ میرا قلم میز کی ایک جانب سے دوسری جانب کو چلا گیا ہو، بے اس کے کہ کسی ہاتھ یا کسی اور مادی شے نے اس کو حرکت دی ہو، اس کاغذ پر جو نقوش تم کو نظر آ رہے ہیں ضرور ہے کہ ان کو کسی نہ کسی قلم نے کھینچا ہے اسی طرح یہ نہیں ہو سکتا کہ انار کے درخت سے آم کا پھل یا آم کے درخت سے انار کا پھل پیدا ہو، آم کے درخت سے ہمیشہ آم اور انار کے درخت سے ہمیشہ انار ہی پیدا ہوگا۔

غور کرو جب تم سے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ نہ جلا سکی تو تم کو اس کے باور کرنے میں کیوں پس و پیش ہوتا ہے، اسی لئے کہ آگ جب تک آگ ہے جلانے کا خاصہ اس سے منفک نہیں ہو سکتا، اس کو ابراہیمؑ اور نمرود کی تمیز نہیں، اژدہا ایک جاندار مخلوق ہے جو تولید مثل کے قاعدے سے اپنی ہی جیسی جاندار مخلوق سے وجود میں آتا ہے اس لئے یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا کیونکر اژدہا بن گیا، انسان کا بچہ اپنے والدین کے بندھے ہوئے اور مشترک عمل توالد و تناسل کا نتیجہ ہوتا ہے، پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے دس قدم کی مسافت طے کرنے کے لئے بھی آدمی اپنے پاؤں یا کسی اور مادی وسیلہ کی احتیاج ہوتی ہے اور جس قدر مسافت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر اس کو قطع کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے، لہٰذا یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ پیغمبر اسلامؐ نے لامعمولی وسائل مادی کے استعمال کے طرفۃ العین میں "مسجد حرام" سے "مسجد اقصیٰ" اور "سدرۃ المنتہیٰ" تک کی سیر کر لی، زمین و آسمان کی آیات کا مشاہدہ کیا اور تمام انبیائے سابقین سے گفتگو فرمائی، پھر یہ تمام مراحل اتنے وقفہ میں کیونکر طے ہو گئے ہیں کہ واپسی پر کواڑ کی زنجیر ہل رہی ہو اور بستر کی گرمی ہنوز قائم ہو۔

سلسلۂ علل و اسباب اور اشیاء کے افعال و خواص ہی کے اصول و قوانین کو نام حکماء و فلاسفہ کی اصطلاح میں قوانین فطرت ہے جن کا خرق محال خیال کیا جاتا ہے، مثلاً کشش ثقل ایک قانون فطرت ہے جس کا یہ اقتضا ہے کہ جب تم ڈھیلے کو اوپر پھینکو گے تو وہ لوٹ کر ہمیشہ نیچے آ جائے گا، فضا میں اس کا معلق رہنا ناممکن ہے، ہائیڈروجن اور

آکسیجن دو عناصر کے ایک خاص مقدار میں ملنے کا خاصہ یہ ہے کہ پانی بن جاتا ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔

قوانینِ فطرت کی حقیقت

اب دیکھو کہ جن چیزوں کو تم قوانینِ فطرت کا لقب دیتے ہو اور جو بظاہر اس قدر قطعی اور اٹل نظر آتے ہیں، واقعات کی کسوٹی پر ان کی کیا بساط ٹھہرتی ہے؟

اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ نمک نمکین اور شکر میٹھی کیوں ہوتی ہے؟ تو یہ سوال تم کو ایسا ہی مہمل و مضحک معلوم ہو گا جیسے کوئی یہ سوال کرے کہ جزء کل سے چھوٹا کیوں ہوتا ہے؟ جزء کی حقیقت ہی یہ ہے کہ کل سے چھوٹا ہو، اسی طرح لوگ سمجھتے ہیں کہ نمکینی اور مٹھاس نمک اور شکر کی حقیقت میں داخل ہیں، لیکن سوچو کہ کیا نمک کی نفسِ ذات میں تم کو کوئی ایسی شے نظر آتی ہے جس کی بنا پر بلا اس کو چکھے ہوئے تم یہ حکم لگا سکو کہ اس کا مزہ بالضرورت شکر کے مزہ سے مختلف ہونا چاہیے، صرف دونوں کے چکھنے اور تجربہ کی بنا پر نمک کو نمکین اور شکر کو شیریں یقین کیا جاتا ہے، سنکھیا زہر ہے جس کے کھانے سے آدمی مر جاتا ہے، سنکھیا کا ایک ٹکڑا لے کر اس کو خوب الٹ پلٹ کر دیکھو، اس کی ذات یا حقیقت میں کہیں کوئی ایسی شے محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے تم بلا تجربہ اس کو موت کی علت قرار دے سکو؟ جس شخص نے سنکھیا کبھی نہیں دیکھی یا اس کے اثر سے ناواقف ہے اس کو تم بآسانی کھلا سکتے ہو، کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس کو خود سنکھیا کے اندر کوئی ایسی شے نہیں نظر آتی جس سے بلا سابق تجربہ کے وہ اس کے زہرِ قاتل یا علتِ موت ہونے کا علم و یقین حاصل کر سکے بیسویں صدی کے سائنسدان کے لئے یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ پانی دو مختلف اجزا یا عناصر سے مرکب ہے لیکن جب تک اس حقیقت کا تجربہ نہیں ہوا تھا، ڈھائی ہزار سال تک حکما اور عقلائے عالم پانی کو ایک مفرد و بسیط عنصر یقین کرتے رہے، حالانکہ پانی کی جو صورت و شکل کاونڈش[1] کے سامنے تھی وہی طالیس ملطی[2] کے سامنے بھی تھی، سنکھیا اور شکر کے بجائے اگر ہم کو سمیت اور شیرینی کا تجربہ پتھر کی کنکریوں میں ہوتا تو ہم ان کو اسی طرح مہلک (ہلاکت کی علت) و شیریں یقین کرتے جس طرح آپ سنکھیا اور شکر کو کرتے ہیں۔

جان اسٹورٹ مل نے اپنی مشہور کتاب "نظامِ منطق"[3] میں اس کی نہایت عمدہ مثال دی ہے کہ:

> "آج سے پچاس سال پہلے وسطِ افریقہ کے باشندوں کے نزدیک غالباً کوئی واقعہ اس سے زیادہ تجربہ کی قطعیت و یکسانی پر مبنی نہ تھا، جتنا یہ کہ تمام انسان کالے ہوتے ہیں، اسی طرح کچھ زیادہ دن نہیں گزرے کہ اہلِ یورپ اس کو فطرت کی یکسانی کی ایک بالکل قطعی و غیر مشتبہ مثال سمجھتے ہیں کہ تمام ہنس سفید ہوتے ہیں، مزید تجربہ کے بعد افریقہ و یورپ والوں دونوں کو یہ معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھے، لیکن اس تجربہ کے لئے ان کو پانچ ہزار برس انتظار کرنا پڑا اور اس طویل مدت میں انسانی آبادی کے دو برِ اعظم فطرت کی ایک ایسی یکسانی پر یقین کرتے رہے جس کا حقیقۃً کوئی وجود نہ تھا۔

کائنات فطرت کی وسعتِ بیکراں کو دیکھتے ہوئے آج بھی نوعِ انسان کے تجربہ پر مبنی قوانینِ فطرت کی بساط اس[4] سے زیادہ نہیں ہے جتنی کہ اس تجربہ کی تھی کہ تمام انسان کالے ہوتے ہیں اور تمام ہنس سفید۔ انیسویں صدی کے ایک

---

[1] جس نے پانی کو بسیط عنصر کی بجائے آکسیجن و ہائیڈروجن سے مرکب ثابت کیا۔ [2] یونان کا پہلا فلسفی جو پانی کو مبدءِ عالم جانتا تھا۔ [3] سسٹم آف لاجک کتاب سوم باب فصل دوم۔ [4] وسط افریقہ کے آدمی کالے اور یورپ کے ہنس سفید ہوتے ہیں۔

مشہور فلسفی ڈاکٹر وارڈ نے اسی حقیقت کو ایک مفروض مثال کے پیرایہ میں اس طرح بیان کیا کہ فرض کرو کہ

"افریقہ کے کسی صحرا میں ایک نہایت عظیم الشان سلسلۂ عمارت ہے جو چاروں طرف ایک چار دیواری سے گھرا ہوا ہے، اس کے اندر ایک خاص ذی عقل مخلوق آباد ہے جو اس احاطہ سے باہر نہیں جاسکتی، یہ عمارت ایک ہزار سے زائد کمروں پر مشتمل ہے جو سب مقفل ہیں اور کنجیوں کا پتہ نہیں کہ کہاں ہیں، بڑی محنت و جستجو کے بعد کل پچیس کنجیاں ملتی ہیں جن سے ادھر ادھر کے پچیس کمرے کھل جاتے ہیں جو سب ہم شکل ہیں، لہٰذا کیا اس بنا پر اس احاطہ کے اندر رہنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیں کہ بقیہ ۹۷۵ کمرے بھی اسی شکل کے ہیں؟"[1]

قوانین فطرت یا خواصِ اشیاء و علاقۂ تعلیل (علت و معلول) کی مذکورہ بالا حقیقت اگرچہ اب حکمت (سائنس) و فلسفہ دونوں کے مسلّمات میں داخل ہے، لیکن اس حقیقت کو سب سے پہلے جس شخص نے اجاگر کیا، وہ معجزات کا منکر ہیوم ہی تھا، اس لئے خود اسی کی زبان سے سنو کہ جس چیز کو وہ خرقِ عادت کہہ کر ناممکن قرار دیتا ہے، اس کے عدم امکان کا کیا وزن ہے؟

"جب ہم اپنے آس پاس کی خارجی چیزوں پر نظر کرتے ہیں اور مختلف علتوں کے افعال کو غور سے دیکھتے ہیں تو ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس کے اندر کسی قوت یا لزوم کا پتہ چلتا ہو، نہ ان کی کوئی ایسی صفت نظر آتی ہے جو معلول کو اس طرح علت سے جکڑے ہوتے ہو کہ ایک کو دوسرے سے مستنبط کرنے میں خطا کا امکان نہ ہو، ہم کو جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ایک واقعہ کا ظہور دوسرے کے بعد ہوتا ہے، بلیرڈ کے ایک گیند میں ضرب لگانے سے دوسرے میں حرکت ظاہر ہوتی ہے بس حواس ظاہری سے جو کچھ نظر آتا ہے اس کی بساط اسی قدر ہے، اشیاء میں اس تقدم و تاخر یا تبعیت کے پائے جانے سے ذہن کو نفس تبعیت کے علاوہ کوئی اور احساس یا ارتسام باطنی نہیں حاصل ہوتا، کسی شے کو پہلی دفعہ دیکھنے سے ہم کبھی قیاس نہیں کر سکتے کہ اس سے کیا معلول یا نتیجہ ظاہر ہوگا، حالانکہ اگر علت کے اندر کسی قوت یا اثر کا پتہ محض ذہن دوڑانے سے چل سکتا تو بلا کسی سابق تجربہ کے ہم اس نتیجہ و معلول کی پیشین گوئی کر دیتے اور پہلی ہی نظر میں قطعی حکم لگا دیتے۔"[2]

حقیقت امر یہ ہے کہ کائنات مادی کا ایک ذرہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے صفات محسوسہ کی بنا پر ہم اس کے اندر کسی قوت کا سراغ لگا سکیں یا قیاس سے بتلا سکیں کہ اس سے کوئی اور شے دوسری ایسی وجود پذیر ہو سکتی ہے جس کو معلول کا لقب دیا جاتا ہے، صلابت، امتداد، حرکت، یہ چیزیں بجائے خود مستقل صفات اور ایسے واقعہ کا نشان نہیں دیتیں جس کو ان کا نتیجہ کہا جا سکے، موجودات عالم میں ہر آن تغیر و تبدل جاری ہے، ایک چیز دوسری چیز کے بعد برابر آتی جاتی رہتی ہے لیکن وہ قوت و طاقت جو اس ساری مشین کو چلاتی رہتی ہے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے اور اجسام کی کسی محسوس صفت میں

---

[1] مل کی منطق کتاب سوم، باب ۲۱ فصل ۴ حاشیہ [2] فہم انسانی باب ۷، فصل ۱۔

اپنا کوئی نشان نہیں رکھتی، ہم یہ واقعہ جانتے ہیں کہ آگ کے شعلہ میں گرمی پائی جاتی ہے لیکن ان دونوں (گرمی و شعلہ) میں کیا لزوم ہے، اس کے قیاس سے ہمارا تخیل قطعاً عاجز ہے۔"

اسی سلسلہ میں چند صفحات بعد کی ایک اور طویل عبارت[1] کا یہاں اقتباس مناسب ہے، جس سے آگے چل کر کام پڑے گا۔

"عام طور پر لوگوں کو فطرت کے پیش پا افتادہ اور مانوس واقعات وافعال کی توجیہ میں کوئی دشواری نہیں نظر آتی (مثلاً بھاری چیزوں کا نیچے آجانا، درختوں کی بالیدگی، حیوانات میں توالد و تناسل یا غذا سے جسم کی پرورش وغیرہ کے واقعات)، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان صورتوں میں ان کو علت کی بذاتِ خود اس قوت کا علم واحساس ہے جس کی بنا پر یہ اپنے معلول کو مستلزم ہے اور اس لئے ظہورِ معلول میں خطا کا امکان نہیں، بات یہ ہے کہ تجربہ یا عادت دراز کی وجہ سے ان کے ذہن میں ایک ایسا میلان ورجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ علت کے سامنے آتے ہی اس نتیجہ کا یقین ہو جاتا ہے جو معمولاً اس کے ساتھ پایا گیا ہے اور یہ مشکل سے ممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ظاہر ہو سکتا تھا، صرف اس صورت میں جبکہ غیر معمولی واقعات وحوادث ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً زلزلہ، وبا، یا کوئی اور عجیب وغریب بات، تو البتہ ان کی صحیح علت کا پتہ نہیں لگتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی توجیہ وتشریح کیسے کی جائے، اس مشکل میں پڑ کر لوگ علی العموم کسی ان دیکھی صاحبِ عقل وارادہ ذات کے قائل ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ ناقابل توجیہ ناگہانی واقعات اسی ذات کے پیدا کردہ ہیں، لیکن فلاسفہ کی باریک بین نگاہ کو نظر آتا ہے کہ روزمرہ کے معمولی واقعات کی پیدا کرنے والی قوت بھی اسی طرح نامعلوم ناقابل توجیہ ہے جس طرح کہ انتہائی سے انتہائی غیر معمولی واقعات کی، چنانچہ بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ بلا استثناء تمام واقعات عالم کا مبدا اسی ذات کو قرار دیں جس کی طرف عوام صرف معجزات اور فوق الفطرت واقعات وحوادث کے ظہور کو منسوب کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہر معلول کی واقعی وبراہِ راست علت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہی برابر کا ارادہ ہوتا ہے، بلیرڈ کا ایک گیند جب دوسرے گیند سے ٹکراتا ہے تو خود خدا اپنے ارادۂ خاص سے اس کو متحرک کر دیتا ہے اور یہ ارادہ ان عام قوانین کے مطابق ہوتا ہے جو اس نے اپنی مشیت سے کائنات پر حکم فرمائی کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔"

جب یہ مسلّم ہو چکا کہ قوانین فطرت کی بنیاد تمام تر تجربہ پر ہے اور تجربہ کے ناقابل خطا ہونے کا کبھی کسی حالت میں بھی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تو پھر ظاہر ہے کہ کسی شے کو خلافِ فطرت یا خارق عادت کہہ کر اس کو غلط یا ناممکن کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے، چنانچہ خود ہیوم کا اپنے اسی اصول پر دعویٰ ہے کہ جس شے کا تصور ممکن ہے وہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہو سکتی اور جو شے مستلزم تناقض نہ ہو اس کو کسی حجت وبرہان یا عقلی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا۔"[2]

---

[1] فہم انسانی باب ۷ فصل ۱ [2] فہم انسانی باب ۴۔

پروفیسر ہکسلے جو فلسفی سے زیادہ حکیم (سائنٹسٹ) ہے اور جس کی جگہ حکماء کی صف اول میں ہے، اس نے ہیوم کے اس قول کو اپنی تحریروں میں جا بجا نقل کر کے اس کی نہایت شدت سے تائید کی ہے۔ خود ہیوم کے نظریۂ معجزات پر بحث کرتے ہوئے پہلے تو معجزہ کے متعلق اس کی اس تعریف کی تغلیط کی ہے کہ "وہ نام ہے، قوانین فطرت کے خرق کا" اور بتایا ہے کہ "معجزات کے معنی زیادہ سے زیادہ انتہائی حیرت انگیز واقعات[1] کے ہو سکتے ہیں" پھر اسی ضمن میں ہیوم کے مذکورۂ بالا قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ:۔

"لیکن معجزہ کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی تناقض کو مستلزم نہیں ہے اِلہٰذا خود ہیوم ہی کے دعوے کے مطابق معجزہ کو کسی برہانی دلیل سے غلط نہیں ثابت کیا جا سکتا، بایں ہمہ ہیوم خود اپنے ہی اصول کے خلاف اور بالکل متناقض ایک دوسری جگہ لکھتا ہے کہ مردہ کا زندہ ہو جانا معجزہ ہے کیونکہ ایسا پہلے کبھی کسی زمانہ اور کسی ملک میں نہیں ہوا ہے۔"

اس ارتکاب تناقض کی تشریح کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے طنزاً لکھا ہے کہ اگر ہیوم کے استدلال کی مہملیت کو برہنہ کر کے دیکھا جائے تو معنی یہ ہوں گے، کہ جو چیز پہلے کبھی نہیں واقع ہوئی وہ آئندہ بغیر قوانین فطرت کے خرق کے نہیں واقع ہو سکتی"۔

ہکسلے کا ایک نہایت دلچسپ مضمون "ممکنات و ناممکنات" ہے اس میں بھی ہیوم اس کے پیش نظر ہے اور اپنی حکیمانہ ذمہ داری کے پورے احساس و شعور کے ساتھ لکھتا ہے کہ[2]:۔

"صحیح معنی میں بجز تناقض کے اور کسی بھی ایسی چیز سے میں واقف نہیں ہوں جس کو ناممکن کہنا حق بجانب ہو، منطقی ناممکنات کا وجود ہے لیکن طبعی ناممکنات کا قطعاً کوئی وجود نہیں "مربع مدور" ماضی موجود، دو متوازی خطوط کا تقاطع: یہ چیزیں ناممکنات سے ہیں اس لئے کہ مدور موجود یا حاضر اور تقاطع کا تصور ہی "مربع" ماضی اور متوازی کے تصور کے متناقض ہے، لیکن پانی پر چلنا یا پانی کو شراب بنا دینا، بچہ کا بے باپ کے پیدا ہونا، مردہ کو زندہ کر دینا یہ چیزیں مفہوم بالا کی رو سے ناممکنات سے نہیں ہیں، ہاں اگر ہم یہ دعویٰ کر سکتے کہ فطرت اشیاء کے متعلق ہمارے علم نے تمام ممکنات کا کامل احاطہ کر لیا ہے تو شاید یہ کہنا بجا ہوتا کہ آدمی کے صفات چونکہ پانی پر چلنے یا ہوا میں اڑنے کے متناقض ہیں اس لئے یہ افعال اس کے لئے ناممکن ہیں، لیکن یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ علم فطرت کی انتہا تک پہنچنا کیسا ابھی تک ہم اس کی ابتداء اور ابجد سے آگے نہیں بڑھے ہیں، بلکہ ہماری قوتیں اس قدر محدود ہیں کہ کبھی بھی ہم ممکنات فطرت کی حد بندی نہیں کر سکتے، جو کچھ واقع ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے اس کا ہم کو علم ہے باقی جو کچھ واقع ہونے والا ہے اس کی نسبت ہم صرف ایک توقع قائم کر سکتے ہیں جس کی بنیاد کم و بیش گذشتہ تجربہ کے صحیح سمجھنے پر ہے جس سے ہم کو خیال ہوتا ہے کہ مستقبل ماضی کے مماثل ہوگا۔"

---

[1] ہکسلے کی کتاب ہیوم باب ۷ (متعلق معجزات) ۔ انگریزی میں معجزہ کے لئے جو لفظ مستعمل ہے (مرکیل) اس کے لغوی معنی بھی "حیرت انگیز" کے ہیں۔ [2] ۸۰،۱۹۷۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ دن پہلے بعض گوشوں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ کائنات کا ہر ذرہ قانون کا پابند ہے، اور وہم و بے عقلی انسان کی بدترین دشمن ہے اور عقل و حکمت بہترین دوست، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ جہاں کہیں عقیدۂ معجزات کا پتہ چلے اس پر حملہ کریں[1]۔

لیکن یہ باتیں قریباً چوتھائی صدی قبل کی ہیں[2]۔ ۱۹۲۰ء کے بعد کوانٹم نظریہ کی بدولت سائنس میں جو بھونچال آیا ہے اس نے سائنس کی دنیا میں بھی اب ایسے بے باکانہ و مدعیانہ نعروں کی گنجائش نہیں چھوڑی، فلسفہ میں تو علت و معلول کے لزوم و وجوب کی بنیادوں کو ہیوم کیا، ہیوم سے صدیوں پہلے امام ابوالحسن اشعری ہی نے کھوکھلا کر دیا تھا البتہ سائنس کی بنیاد ہی فطرت کی یکسانی یا علیت کے اٹل قانون پر رکھی اور رکھی جاتی تھی، اس ستم ظریفی کو کیا کہیے، کہ خود سائنسی تجربات و اختبارات ہی کی راہ سے یہ اٹل قانون نہ صرف مجروح و متزلزل ہو گیا ہے بلکہ سر آرتھر ایڈنگٹن جیسے اکابر سائنس کے نزدیک اس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دینا پڑا ہے، چند سال قبل دنیا کے سائنس کے تازہ ترین معلومات و خیالات پر "ماڈرن بلیف" کے نام سے رسائل کا ایک سلسلہ شائع ہوا تھا اس کے جستہ جستہ یہ اقتباسات پڑھو۔

> "کوانٹم نظریہ نے بڑا زبردست انقلاب برپا کر دیا ہے کہ مادی دنیا میں اب تک علل و معلول کے قانون کی فرمانروائی کو اٹل تصور کیا جاتا تھا، سارے طبعی واقعات و حوادث بالکلیہ جبری یا وجوبی قوانین کے تابع یقین کئے جاتے تھے، سلسلۂ علل و معلولات میں کہیں کوئی خلل و رخنہ نہ تھا مگر ۱۹۲۷ء میں اس خیال و یقین کو سخت دھکا لگا اور ماہرین طبعیات نے دیکھا کہ علیت کے وجوب و کلیت کو مادی دنیا سے رخصت کرنا پڑا اور سارے قرائن اسی کے نظر آتے ہیں کہ وجوبی و قطعی علیت کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔
>
> ابھی بالکل حال تک قانون علیت کو سائنسی تحقیقات کا بالاتفاق بنیادی اصول قرار دیا جاتا تھا لیکن اب اسی اصول کو ترک کر دینے کا سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا کارخانۂ فطرت میں ہر واقعہ لزوماً کسی ایسے دوسرے واقعہ ہی سے پیدا ہوتا ہے جس کو علت کہا جاتا ہے؟ یا اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حوادث فطرت کی تہہ میں کوئی ایسی شے کارفرما ہے جس کو اختیار یا آزادی ارادہ کہا جاتا ہے۔ ماحصل یہ کہ اس وقت تک طبعی مظاہر کی تحلیل کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہم کو کہیں بھی وجوبی یا جبری قانون کی موجودگی کی شہادت نہیں ملتی۔" (بحوالہ جرنل آف فلاسفی بابۃ ۱۹۳۲ء)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ قوانین فطرت کا سرے سے کوئی وجود نہیں بلکہ ان کی حیثیت اعداد و شمار کے لئے قوانین کی رہ جاتی ہے، زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں کوئی ایسا قانون نہیں جانتی ہیں کہ فلاں شخص چالیس سال کی عمر میں مر جائے گا لیکن اتنا جانتی ہیں کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد آدمی چالیس کے سن میں مر جائیں گے یعنی افراد کا حال ناقابل پیش بینی ہونے کے باوجود جماعت کی نسبت پیش بینی ممکن ہے، پس قوانین فطرت صرف اک

---

[1] عجائبات حیات (WONDER OF LIFE) از ہیکل باب ۳ معجزات [2] معجزات پر سیرت کا یہ حصہ آج (۱۹۴۵ء) سے ۲۴ سال قبل لکھا گیا تھا۔

معنی میں موجود ہیں اور سائنسی پیش گوئی یا پیش بینی ہو سکتی ہے۔

بالفاظ دیگر قانونِ فطرت کی نوعیت دراصل قانونِ عادت کی ہے یعنی کسی خاص فرد کے بارے میں وجوباً پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ وہ فلاں عمر میں مر جائے گا، البتہ عادۃً یہ معلوم ہے کہ کسی بڑی جماعت میں اتنے فیصد چالیس سال کی عمر میں مر جائیں گے۔ مذہب کی زبان میں اسی قانونِ عادت کو عادۃ اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی بنا پر بھی عملِ فطرت کی یکسانی یا قوانینِ فطرت کے نفسِ وجود کا انکار نہیں لازم آتا۔ البتہ ان قوانین کا منشا یہ ہے بہرے بے علم و اختیار مادہ کا اٹل وجوب و لزوم سے نہیں، بلکہ ایک علم و اختیار والی ذات (اللہ تعالیٰ) کی عادتِ جاریہ سے ہے جو کسی حکمت و مشیت کے تحت کبھی کبھی اس عادتِ جاریہ کے خلاف بھی کر سکتی اور کرتی ہے یہی معجزہ ہے اور بقول مشہور سائنسدان ڈاکٹر کارپنٹر کے کہ قائل مذہب سائنسدان کو اس کے ماننے میں کوئی عقلی دشواری نہیں پیش آسکتی کہ خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف بھی کر سکتا ہے۔ ہم کو معجزات کے خلاف اگر سائنس کے کسی ایسے فتویٰ کا علم نہیں جو معتبر شہادت کی موجودگی میں ان کے قبول سے مانع ہو۔

جب کارپنٹر کے زمانہ ہی میں سائنس کا کوئی ایسا فتویٰ معلوم نہ تھا تو اب کوانٹم نظریہ کے بعد جب کہ کلام فلسفہ کے نرے قیاسات سے گزر کر خود سائنس کی دنیا میں اور سائنس ہی کی راہ سے فطرت یا طبیعت کے نام نہاد اٹل قوانین کا وجود اتنا مشتبہ ہو گیا ہے کہ مادی دنیا سے بظاہر ان کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنا پڑ رہا ہے تو اب بھی سائنس کا یا قوانینِ فطرت کے خرق کا نام لے کر کسی معجزہ کا انکار کس منہ سے کیا جاسکتا ہے! لہٰذا بقول کارپنٹر ہی کے اصل سوال صرف یہ ہے کہ آیا اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے یا نہیں جس سے معلوم ہو کہ خالقِ فطرت کبھی کبھی خلافِ فطرت بھی کر دیا کرتا ہے۔

یہ صرف ممکن ہی نہیں ہے کہ خالقِ فطرت اگر چاہے تو کبھی کبھی قوانینِ فطرت کے خلاف کر سکتا ہے یعنی معمولی سلسلۂ علل و اسباب و معلولات کو توڑ سکتا ہے بلکہ ایک اور نامور عالمِ طبیعیات پروفیسر ڈالبیئر کا اعتراف ہے کہ اس امر کی ہمارے پاس خاصی شہادت موجود ہے جس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بعض طبعی حوادث اس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کے تمام معمولی علل و اسباب غائب ہوتے ہیں، اجسام حرکت کرتے ہیں، درآں حالیکہ نہ کوئی شخص ان کو چھو رہا ہے اور نہ برقی یا مقناطیسی عوامل کا پتہ ہے، اس کی بھی شہادت موجود ہے کہ ایک نفس کا خیال دوسرے نفس میں بلا کسی وساطت کے پہنچ جاسکتا ہے اور جس قسم کے واقعات کو معجزہ سمجھا جاتا تھا ان کا وقوع اب غیر اغلب نہیں رہا ہے۔

ہکسلے کو اگرچہ اس بارے میں ہیوم سے شدید اختلاف ہے کہ معجزہ نام قوانینِ فطرت کے خرق کا ہے، لیکن تصریحاتِ بالا سے قانونِ فطرت کی جو حقیقت ثابت ہوتی ہے اس کو اگر وضاحت کے ساتھ سامنے رکھا جائے تو

لہ پورا نام AT LINE OF MODERN BELIEF ہے، مرتبہ جے ڈبلیو ان سولیوان (SULLIVAN) اور ڈاکٹر گریرسن (GRIERSON)، حصہ چہارم باب ۳ صفحہ ۲۰۔ ٹہ دیکھو فرانک بیلارڈ کی (THE MIRACLE OF UNBELIEF) تہ ایضاً ؂ دیکھو اس کی کتاب MATTER ETHER MOTION (مادہ، ایتھر، حرکت)

ہمارے نزدیک معجزہ کی یہ تعریف چنداں قابل اعتراض نہیں رہ جاتی۔

(۱) قوانین فطرت عبارت ہیں قوانین عادت سے۔

(۲) جو ہم کو بذات خود اشیاء کے اندر نہیں معلوم بلکہ ان کی بنیاد تمام تر گزشتہ تجربہ پر ہوتی ہے جس کے خلاف ہونا ہمیشہ ممکن ہے اور کسی اصلی استحالہ کو مستلزم نہیں۔

(۳) لہذا قوانین فطرت کے خلاف ہونا (یعنی ان کا خرق)، بذات خود ممکن، عقلاً جائز، بالفاظ دیگر یہ کہ معجزہ عقلاً بالکل جائز و ممکن ہے۔

شہادتِ معجزات

امکان وقوع کے لئے کافی نہیں لیکن کسی امر کا صرف عقلاً جائز و ممکن ہونا اس کے وقوع کی دلیل نہیں یہ عقلاً بالکل جائز و ممکن تھا کہ اکبر ہندوستان کے ساتھ انگلستان کا بھی بادشاہ ہوتا، مگر واقعاً ایسا نہیں، کسی شے کے وقوع کو قبول کرلے کے لئے دو صورتیں ہیں (۱) غیر مشتبہ مشاہدہ یا (۲) تشفی بخش شہادت، غیر مشتبہ مشاہدہ کی صورت میں کوئی شے بحث طلب نہیں رہ جاتی، مثلاً،

> "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سفر میں حضرت جابرؓ سے وضو کا پانی طلب فرمایا، انہوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈا پانی نہیں ملا، انصار میں ایک شخص تھے جو خاص طور پر آپ کے لئے پانی ٹھنڈا کرکے رکھتے تھے، حضرت جابرؓ نے آپ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی آپ نے ان کو ان انصاری کے پاس بھیجا لیکن ان کے پاس بھی اس قدر کم پانی نکلا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ ہی میں جذب ہو کر رہ جاتا، حضرت جابرؓ نے آنحضرت کو اس کی خبر دی تو آپ نے اس برتن کو منگا بھیجا اور ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا اور اس کو ہاتھ سے دبا دیا پھر حضرت جابرؓ کو برتن دیا اور طشت طلب فرمایا، آپ نے ہاتھ کی انگلیاں پھیلائیں اور اس طشت کے اندر رکھ کر حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کہہ کر آپ کے ہاتھ پر پانی گرائیں حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا، پہلے آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی ابلا، پھر تمام طشت بھر گیا، یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہوگئے، اس کے بعد آپ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا۔"[1]

اب اگر حضرت جابرؓ نے اس واقعہ کو بچشم خود مشاہدہ کیا اور ان کو اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ نہیں تھا تو ظاہر ہے کہ ان کو اس کے یقین و قبول میں کیا تامل ہوسکتا تھا، البتہ ہمارے لئے اس کے باور کرنے میں یہ بحث پیدا ہوسکتی ہے کہ یہ واقعہ فی نفسہ ممکن ہے یا ناممکن اور حضرت جابرؓ کی شہادت کہاں تک قابل اعتبار ہوسکتی ہے، لہذا امکان معجزات کا مرحلہ طے ہوچکنے کے بعد دوسری بحث شہادت معجزات کی پیدا ہوتی ہے۔

ہیوم کا فتویٰ ہیوم کا روایات معجزہ کے متعلق اگرچہ آخری فتویٰ یہی ہے کہ اس کے اثبات کے لئے انسانی شہادت

---

[1] دیکھو کتاب ہذا بیان عام معجزات۔

کی کوئی کمیت و کیفیت نہیں کافی ہو سکتی، تاہم نفس خارق فطرت واقعات کے لئے اس کے نزدیک بھی انسانی شہادت کا ایک درجہ ایسا موجود ہے جس کی بنا پر ان کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

"فرض کرو کہ تمام زبانوں کے تمام مصنفین اس پر متفق ہوں کہ یکم جنوری سنہ ۱۶۰۰ء سے لے کر آٹھ دن تک برابر تمام روئے زمین پر تاریکی چھائی رہی، یہ بھی فرض کرو کہ اس خارق عادت واقعہ کی روایت آج تک لوگوں کی زبان پر ہے اور دوسرے ممالک سے جو سیاح آتے ہیں وہ بے کم و کاست اور بلا شائبہ تناقض وہاں کے لوگوں کی یہی روایت بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانہ کے حکماء کا کام شک کے بجائے اس واقعہ کا یقین کر کے اس کی توجیہ اور اس کے علل و اسباب کی جستجو ہوگی، کائنات فطرت میں زوال و انحطاط، فنا و فساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثہ سے اس کی تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابل قبول ہوگی، بشرطیکہ یہ نہایت وسیع، متواتر اور متفق علیہ ہو۔"[1]

ہیوم کا تعصب

اب اگر یہی واقعہ کسی نبی کی طرف منسوب کر کے معجزہ قرار دیا جائے تو ہیوم کے نزدیک اس پر یقین کرنے کے لئے کوئی انسانی شہادت قابل قبول نہ ہوگی کیوں؟ اس لئے کہ اس قسم کی شہادت خود اپنی تکذیب ہے، حتیٰ کہ جس معجزہ کی بنا کسی انسانی شہادت پر ہو وہ حجت و استدلال کے بجائے محض تمسخر انگیز چیز ہے، مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک و خرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں، لہٰذا مذہب کی طرف نفس انتساب ہی معجزہ کے حیلہ و فریب ہونے کا پورا ثبوت ہے۔ مذہب جیسی مقدس شے کی تائید میں لوگ بے ضرر کذب و افترا سے باک نہیں کرتے، پیمبر (معاذ اللہ) عزت پیمبری کے شوق میں ہر طرح کے خطرات کو گوارا کر سکتا اور مکر و احتیال پر آمادہ ہو سکتا ہے، انسان زود اعتقاد اور بالطبع عجائب پسند ہے، معجزات کا قبول عام اور بہ آسانی شائع و ذائع ہو جانا خود اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ انسان میں عجائب پرستی کا کیسا شدید میلان ہے اور اس لئے عجائب پرستی کے تمام بیانات کو بجا طور پر اشتباہ کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے، پھر معجزات اور فوق العادت باتوں کے خلاف ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد زیادہ تر جاہل اور وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔ ایک عقلمند آدمی پرانے زمانہ کی حیرت ناک تاریخوں کو پڑھ کر پکار اٹھتا ہے کہ عجب بات ہے کہ اس قسم کے خارق عادت واقعات ہمارے زمانہ میں نہیں ظاہر ہوتے۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر دعویٰ ہے کہ مذہب کے نام سے جتنے معجزات بیان کئے جاتے ہیں وہ سب کے سب محض خرافات اور انسان کی اوہام پرست فطرت کا ڈھکوسلا ہے۔[2]

بلاشبہ شہادت کی جرح و تعدیل اور تحقیق و تنقیح کے وقت یہ تمام امور قابل لحاظ ہیں لیکن کیا ان میں سے کوئی ایک شے بھی ایسی ہے جس کی بنا پر محض معجزہ یا مذہب کے نام آتے ہی ہیوم کا یہ ایسا ناقابل حمایت اور صریح تعصب تھا جس کے لئے صدائے تائید حکمت و فلسفہ کے سنجیدہ حلقوں سے نہیں اٹھ سکتی تھی اور اگر کسی معجزہ کی تصدیق میں تشفی شہادت موجود ہو تو اس کے قبول سے محض معجزہ ہونے کی بنا پر کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا مثلاً ایک سفر میں:

"صحابہ بھوک سے اس قدر بے تاب ہوئے کہ اونٹنیاں ذبح کرنا چاہیں، لیکن آپ نے تمام لوگوں کے

---

[1] فہم انسانی باب ۱۰۔ [2] یہ تمام قریب قریب ہیوم ہی کے الفاظ ہیں جو ہم کو اس کے مضمون "معجزات" میں جا بجا ملیں گے۔

زاد راہ کے جمع کرنے کا حکم دیا، ایک چادر بچھائی گئی اور اس پر تمام زاد راہ ڈھیر کیا گیا، اس تمام سامان کی مجموعی تعداد نے صرف اس قدر زمین کا احاطہ کیا جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی اور اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی، لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے۔

کافی شہادت

اب اس روایت میں اگر ان امور کی کافی شہادت مل جائے کہ (۱) تمام زاد راہ صرف ایک بکری کے بیٹھنے بھر کی جگہ میں آ گیا تھا (۲) اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی (۳) سب لوگوں نے پیٹ بھر کر کھا لیا (۴) اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیے تو ہکسلے جیسے حکیم و فلسفی تک کو اس روایت کے تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

چنانچہ اسی نوعیت کا ایک معجزہ حضرت مسیحؑ کا انجیل میں مذکور ہے کہ پانچ روٹیوں اور مچھلیوں سے پانچ ہزار آدمیوں کا پیٹ بھر گیا اور پھر بھی اتنے ٹکڑے بچ رہے جن کو جمع کرنے سے بارہ ٹوکریاں بھر گئیں۔ لیکن اس معجزہ کے باور کرنے میں روایۃً و درایۃً جو دشواریاں نظر آتی ہیں ان کو پوری طرح واضح کرنے کے بعد ہکسلے نے لکھا ہے۔

”اگر یہ ثابت ہو جائے کہ (۱) کھانا شروع کرتے وقت روٹیوں اور مچھلیوں کا وزن کیا تھا (۲) پانچ ہزار آدمیوں میں یہ تقسیم کی گئیں، بلا اس کے کہ ان کی کمیت یا کیفیت میں کوئی اضافہ ہوا ہو (۳) تمام آدمی واقعاً پوری طرح آسودہ ہو گئے (۴) اس کے بعد ٹوکریوں میں جو ٹکڑے جمع کئے گئے ان کا وزن کیا تھا، تو پھر ممکنات و ناممکنات کے بارہ میں میرے موجودہ خیالات کچھ ہی ہوں، لیکن مذکورہ بالا چار چیزوں کی تشفی بخش شہادت کے بعد مجھ کو ماننا پڑے گا کہ پچھلے خیالات غلط تھے اور اس معجزہ کو ممکنات فطرت کی ایک نئی اور خلاف توقع مثال سمجھوں گا۔“

غرض معجزہ نہ صرف فی نفسہ ایک ممکن الوقوع شے ہے بلکہ تشفی بخش شہادت کی بنا پر اس کے وقوع کا یقین بھی کیا جا سکتا ہے، اس کے بعد یہ بحث رہ جاتی ہے کہ آیا مذہبی یا تاریخی کتابوں میں جو معجزات مذکور ہیں ان کے یقین کرنے کے لئے تشفی بخش شہادت موجود ہے۔

اس سوال کا جواب ہیوم کو نفی میں دینا ہی چاہیے تھا لیکن یہاں پہنچ کر ہکسلے بھی سپر انگندہ ہو جاتا ہے اور ہیوم کے جواب سے لفظاً و معنًی کامل طور پر اتفاق کر لیتا ہے۔

”یہ سچ ہے کہ معجزات کے ناممکن ہونے کا دعویٰ نہیں ثابت کیا جا سکتا، لیکن مجھ کو کوئی ایسی شے قطعاً نہیں معلوم جس کی بنا پر میں ہیوم کے اس وزنی فتویٰ میں کہ ”ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے سارے دفتر میں ایک بھی ایسا معجزہ نہیں ملتا جس کی تصدیق و تائید میں ایسے فہمیدہ، باہوش اور تعلیم یافتہ لوگوں کی کافی تعداد موجود ہو جن کے خود فریب و مغالطہ میں پڑنے کا ہم کو اندیشہ نہ ہو، جن کی راست بازی اس درجہ غیر مشتبہ ہو کہ کسی مصلحت کی بنا پر دوسروں کو فریب دہی کا ان پر گمان نہ ہو سکے، جو لوگوں کی نگاہ میں ایسی عزت و شہرت رکھتے ہوں کہ اگر ان کا جھوٹ کھل جائے تو ساری عزت خاک میں مل جائے، ساتھ ہی جن واقعات کی وہ روایت یا تصدیق کر رہے ہیں، وہ ایسے علی الاعلان طریقے سے اور ایسے مشہور مقام

لہ دیکھو کتاب ہذا بیان عدم معجزات لہ یوحنا باب ۶ آیات ۵-۱۴ لہ مقالات ہکسلے ج ۵ صفحہ ۲۰۳ لہ ایضاً صفحہ ۲۰۴۔

پر واقع ہوتے ہوں کہ ان کی نسبت دروغ بیانی چھپ ہی نہ سکے، حالانکہ انسانی شہادت کو قطعی بنانے کے لئے یہ تمام باتیں ضروری ہیں۔"

ہیوم نے کتنے کو تو کہہ دیا کہ قبول معجزات کے لئے جس درجہ کی شہادت درکار ہے اس کا تاریخ کے دفتر میں کہیں پتہ نہیں، لیکن معجزات کے عدم قبول کی کیا واقعاً یہی وجہ ہے؟ اور کیا اس نے اپنے اس دعویٰ کی چند ہی صفحات آگے بڑھ کر خود تردید نہیں کر دی ہے؟ فرانس میں کوئی مشہور درگاہ ہے جس کے تقدس پر (بقول ہیوم) لوگ مدتوں فریفتہ رہے ہیں۔

"بہروں کو سماعت، اندھوں کو بصارت مل جانا اور بیماروں کا اچھا ہو جانا، اس مقدس درگاہ کی معمولی کرامتیں تھیں، جن کا ہر گلی کوچے میں چرچا رہتا تھا، لیکن سب سے حیرت انگیز اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی کرامتیں ایسے اشخاص کو حکم یا ثالث بنا کر ان کے روبرو ثابت کر دکھائی گئی تھیں جن کی دیانت پر حرف رکھنا ناممکن ہے، پھر ان پر ایسے گواہوں کی مہر تصدیق ثبت ہے جن کی شہرت و سند مسلم ہے جس زمانہ میں ان کرامتوں کا ظہور ہوا وہ علم کا زمانہ ہے اور جگہ بھی ایسی جو دنیا کا مشہور ترین خطہ ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ کرامتیں چھاپ چھاپ کر ہر جگہ شائع کی گئیں، بایں ہمہ یسوعی فرقہ تک کو ان کی تکذیب یا پردہ دری کی مجال نہ ہوئی، حالانکہ یہ لوگ خود اہل علم تھے، مجسٹریٹ ان کی حمایت پر تھا اور ان خیالات کے جانی دشمن تھے، جن کی تائید میں یہ معجزات پیش کئے جاتے تھے، اب یہ بتاؤ کہ کسی امر کی توثیق و تنقیح کے لئے اتنی تعداد میں موافق حالات ہم کو کہاں میسر آسکتے ہیں اور ان دل بادل شہادتوں کے خلاف ہمارے پاس بجز اس کے اور کیا دلیل ہے کہ یہ واقعات بذات خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارق فطرت ہیں اور معقول پسند آدمیوں کی نگاہ میں ان کی تردید کے لئے بس یہی ایک دلیل کافی ہے۔"[1] اللہم احفظنا من شرور انفسنا

ہیوم کا صریح تناقض

ایک ہی مضمون کے اندر ایسے زبردست فلسفی کی ایسی صریح تناقض بیانی جس قدر حیرت افزا ہے اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان کا یقین ہمیشہ اس کی منطق کا ساتھ نہیں دیتا، جبریہ اس کے قائل ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے اور اس دعویٰ پر انہوں نے اٹل سے اٹل دلائل قائم کر دیئے ہیں، تاہم دیکھو کہ ۲۴ گھنٹے کی زندگی میں وہ خود کتنے لمحے ان دلائل کی بنا پر اپنے کو مجبور محض یقین کرتے ہیں، ہیوم کے دلائل فلسفہ نے بے شک یہ ثابت کر دیا کہ معجزہ فی نفسہ ناممکن نہیں لیکن پھر بھی دل سے یہ کھٹک نہیں نکلی کہ واقعات معجزات، بذات خود ناممکن اور سراسر خارق عادت ہیں، اور ان کی تردید کے لئے بس یہی ایک دلیل کافی ہے، فرانس کی درگاہ کے متعلق جو کرامتیں مشہور ہیں ان کی توثیق و تصدیق کے لئے اسی درجہ کی شہادت اس کو مل گئی جس کا چند صفحے پہلے اس کے نزدیک سارے تاریخ کے دفتر میں وجود نہ تھا لیکن پھر بھی ان کرامتوں سے قطعی انکار ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ معجزات کا یقین کرانے کے لئے کسی معجزہ یا کرامت کی تائید میں صرف ممکن سے ممکن انسانی شہادت کا مہیا کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ پہلے اس کے عدم امکان کا وسوسہ پوری طرح ذہن سے نکالنا چاہیئے اور پھر خود یقین کی ماہیت

---

[1] فہم انسانی باب ۱۰، قابل توجہ فقرات کو زیر خط میں مؤلف نے کیا ہے۔

واسباب پر بحث کرنی چاہیے۔

انتہائی استبعاد

اوپر اگرچہ ہم نے ہیوم کی اس تعریف میں چنداں مضائقہ نہیں خیال کیا تھا کہ معجزات نام ہے خارقِ فطرت واقعات کا، لیکن تم نے اقتباس بالا کے آخری زیرِ خط جملہ میں دیکھ لیا کہ "خارق" کا لفظ کس قدر گمراہ کن ہے، خود ہیوم ہی کے فلسفہ کی رو سے معجزات کا بالذات ممکن ہونا قطعی طور پر محقق ہو چکا ہے، پھر بھی اس کی زبانِ قلم اس لغزش سے اپنے کو نہیں بچا سکی کہ واقعات (معجزات) بذاتِ خود قطعاً ناممکن اور سراسر خارقِ فطرت ہیں، اصل یہ ہے کہ نفسی اتفاقات کی بنا پر ہمارے ذہن میں یہ غلط خیال بے طرح جاگزین ہو چکا ہے کہ فطرت یا قانونِ فطرت ایک اٹل اور ناممکن التغیر شے ہے، اس لئے کسی واقعہ کو خارقِ فطرت کہتے ہی اس کے ناممکن ہونے کا تصور ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔

لہذا جب یہ محقق طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ خود معجزہ کی ذات میں عدمِ امکان داخل نہیں ہے بلکہ تشفی بخش شہادت کی موجودگی میں اس کا یقین کیا جا سکتا ہے تو اس کو خارقِ فطرت کی گمراہ کن تعبیر کے بجائے ہیوم کے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ انتہائی حیرت انگیز واقعہ کہا جا سکتا ہے، لیکن انتہائی حیرت انگیز سے بھی مناسب تر تعبیر انتہائی مستبعد کی ہوگی۔

استبعادِ معجزات

فطرت کی یکسانی

ایک عام خیال جو اس حیرت انگیزی میں اضافہ کرتا ہے، یہ ہے کہ کارخانۂ فطرت کے تمام تجربے ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں ہی نتائج پیدا کرتے ہیں، حکما جب تک فطرت کی ایک رنگی پر زور دیتے ہیں تو اس مغالطہ میں مبتلا نظر آتے ہیں حتی کہ مل کو اپنی "منطق"[1] میں اس خیال کی تردید کرنی پڑی کہ فطرت کی کارفرمائی ہمیشہ یکسانی پر مبنی ہوتی ہے، ہم خود غور کریں تو کچھ نہ کچھ مثالیں ایسی سامنے آتی رہتی ہیں جن سے یہ مغالطہ دور ہونا چاہیے، ابھی آج ہی اخبار پڑھتے وقت اس قسم کے دو واقعے نظر پڑے[2]۔

عورتوں کے علی العموم بیک وقت ایک لڑکا ہوتا ہے یا کبھی کبھی دو، لیکن حال میں میکسکو (امریکہ) میں ایک عورت کے ایک ساتھ آٹھ لڑکے پیدا ہوئے، ایک دوست سے اس واقعہ کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا، کچھ عرصہ ہوا کہ برما میں ایک عورت کے چھ لڑکے جننے کی خبر شائع ہوئی تھی، طبی دنیا کا عام تجربہ ہے کہ جب خون کی حرارت ۱۰۷ یا ۱۰۸ درجے پہنچ جاتی ہے تو آدمی نہیں بچتا، لیکن برشل میں انفلوئنزا کی مریض ایک لڑکی کا بخار ۱۱۴ درجہ تک پہنچ گیا، پھر بھی وہ اچھی ہو گئی اور زندہ ہے، خود حیرت زدہ ڈاکٹر کی شہادت ہے کہ:

> "جب وہ پہلی دفعہ اس لڑکی کو دیکھنے کے لئے بلایا گیا تو اس کی حرارت ۱۱۲ نکلی، خیال ہوا کہ تھرمامیٹر میں کچھ نقص ہے، دوسرا تھرمامیٹر منگا کر لگایا تو پھر وہی ۱۱۲، ڈاکٹر کو اب بھی یقین نہ آیا، اس نے دو تھرمامیٹر اور منگائے، بالآخر یقین کرنا پڑا، کچھ علاج سے بخار اپنی معتدل حالت پر آ گیا لیکن رات کو پھر بڑھ گیا اور

---

[1] نظامِ منطق کتاب ۳ باب ۳۔

[2] یہ دونوں واقعے آج ۲۰ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کے لیڈر میں مذکور ہیں۔

دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر نے دیکھا تو ۱۰۳ تھا، حیرت کی انتہا نہ رہی، بہرحال علاج سے فائدہ ہوا اور اب مریضہ خاصی رو بصحت ہے۔"

ٹریگن متی (ٹرگنامیٹری)، یا مساحۃ المثلثات وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کالجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے، ۱۰، ۱۱ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ اسکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں، ان کی ریاضی دانی بس حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و محنتی اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳، ۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر پاتے ہیں،

لیکن گزشتہ سال اکتوبر میں (۱۶ کا تار، لیڈر) راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدراسی لڑکے کا معجزۂ ریاضیات (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی علم کی مدد کے اعلیٰ الجبرا، ٹریگن متی، تحلیلی اقلیدس (جامیٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہے۔

ولادت مسیح (بے باپ کے) یا احیائے موتیٰ سے بڑھ کر کس شے میں انتہائی استبعاد یا اعجاز ہو سکتا ہے لیکن سائنس کی تحقیقات نے (جس کے نزدیک انسان کی حقیقت حیوان عالم سے زیادہ نہیں) حیوانات ہی کے اندر اس کے نظائر بھی تلاش کر لیے، چنانچہ ہکسلے جیسے سائنس دان نے معجزات ہی کے ضمن میں لکھا ہے:

> "(مریم) کے کنوارپن میں مسیح کا پیدا ہونا تو یہ نہ صرف ممکن التصور شے ہے بلکہ علم الحیات کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض اصناف حیوانات میں یہ روزانہ کا واقعہ ہے، یہی حال احیائے موتیٰ کا ہے بعض جانور مر کر مومیات کی طرح بالکل خشک ہو جاتے ہیں اور مدت تک اسی حالت میں رہتے ہیں لیکن جب ان کو مناسب حالات میں رکھ دیا جاتا ہے تو پھر جان آ جاتی ہے۔"

ایجادات سائنس

یہ تو سائنس کا علمی و تحقیقاتی پہلو تھا، ایجادی و اختراعی پہلو نے بھی اس سے کم انتہائی حیرت انگیز اعجاز نمائیاں نہیں کی ہیں، لاسلکی ذریعہ پیغام رسانی کی ایجاد سے پہلے یہ کس قدر مستبعد بلکہ ایک حد تک ناقابل تصور بات تھی کہ آپ بمبئی میں بیٹھے ہیں اور آپ کا دوست لندن میں، درمیان میں ہزاروں میل سمندر کی پہنائی حائل ہے، تار وغیرہ کوئی محسوس شے آپ دونوں کے مابین رابطہ نہیں، پھر بھی چشم زدن میں آپ اس کو اپنا پیام پہنچا دے سکتے ہیں، ایک منٹ میں ۶۰ سیکنڈ ہوتے ہیں، ایک سیکنڈ کے بھی ۱۶ حصے کیجئے اور اس سولہویں حصہ میں یہ پیام ۱۲ ہزار میل سے زائد کی مسافت طے کر سکتا ہے۔

حیرت پر حیرت یہ ہے کہ آپ صرف پیام ہی نہیں پہنچا سکتے ہیں، بلکہ حال ہی میں ایک فرانسیسی سائنسدان نے اس معجزہ کا دعویٰ کیا ہے کہ بمبئی میں اپنے میز پر بیٹھے بیٹھے آپ اسی لاسلکی کے ذریعہ سے لندن، پیرس یا نیویارک میں چک پر اپنے دستخط ثبت کر سکتے ہیں، قریب قریب (یعنی سینکڑوں میل) کے مقامات پر اس کے کامیاب تجربات ہو بھی چکے ہیں۔

؎ مقالات جلد ۲ ص ۱۹۹ ؎ معارف ؎ انڈین ریویو بابت جنوری ۱۹۱۲ء ص ۱

تنویم طبیعیات کے ان کرشموں کو دیکھ چکنے کے بعد اب ذرا نفسیات کے اس شعبہ کی تحقیقات کو سامنے لایئے جس کا نام ہپناٹزم ہے، عربی میں اس کو تنویم مقناطیسی کہتے ہیں لیکن ہم صرف تنویم یا عمل تنویم سے تعبیر کرینگے اس عمل کی کرامات ہمارے زمانہ کے ایک نہایت ہی بلند پایہ محقق نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کے الفاظ میں یہ ہے۔

"عامل تنویم اپنے معمول سے جو کچھ بھی کہتا ہے اس کو وہ یقین کر لیتا ہے اور جس چیز کا حکم کرتا ہے اس کو بجا لاتا ہے حتی کہ جو چیزیں معمولی حالت میں آدمی کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی عامل کے حکم سے واقع ہو سکتی ہیں، مثلاً چھینک، چہرے کا سرخ یا زرد پڑ جانا، حرارت خون کا کم یا زیادہ ہو جانا، حرکت قلب میں تیزی یا سستی پیدا ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

تم معمول کو یقین دلا سکتے ہو کہ وہ یخ ہوا جا رہا یا آگ میں جلا جا رہا ہے، تم اس کو آلو کھلاؤ لیکن یہ یقین دلا سکتے ہو کہ شفتالو کھا رہا ہے، تم اس کو سرکہ پلا کر یقین دلا سکتے ہو کہ شراب پی رہا ہے، نوساد میں اس کو کالونی کی بو محسوس ہو سکتی ہے، کرسی اس کو شیر نظر آ سکتی ہے، جھاڑو اس کیلئے خوبصورت عورت بن جا سکتی ہے، راستہ کا شور اس کو موسیقی معلوم ہو سکتا ہے جوان آدمی اپنے کو بچہ یا نپولین اعظم سمجھنے لگ سکتا ہے، سر یا دانتوں کا درد دور کر دیا جا سکتا ہے، وجع مفاصل وغیرہ کے مریض کو اچھا کیا جا سکتا ہے، بھوک فنا کر دی جا سکتی ہے یہاں تک کہ ایک شخص نے ۱۴ دن تک کھانا نہیں کھایا جس چیز سے تم چاہو اسی چیز سے معمول بہرا یا اندھا ہو جا سکتا ہے مثلاً فلاں لفظ وہ نہ سُنے اگر اس کے سامنے پیچھو نہ سُنے گا یا فلاں آدمی کو وہ نہ دیکھے، اس کے سامنے کھڑا کر دو، وہ نہ دیکھ سکے گا۔"[1]

اس عمل کے وقت معمول پر ایک نیند کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اسی لئے اس کا نام تنویم ہے لیکن عمل کا اثر اس کیفیت کے بعد بھی قائم رہ سکتا ہے، مثلاً جس مرض کے لئے تم عمل کرو وہ ہمیشہ کے لئے دور ہو سکتا ہے یا فرض کرو کہ معمول سے تم یہ کہہ دو کہ آئندہ سال جنوری کی ۲۰ تاریخ کو صبح ۹ بجے اپنے پلنگ کے پاس ایک شیر کھڑا دیکھوگے، سال بھر کے بعد ٹھیک اسی وقت پلنگ کے پاس معمول کو شیر دکھائی دے گا۔

گو عمل تنویم کے تجربات زیادہ تر نیند کی کیفیت طاری کرنے کے بعد ہی کئے جاتے ہیں لیکن اس کیفیت کا نمایاں طور پر طاری ہونا کامیابی عمل کے لازمی شرائط میں نہیں ہے، بلکہ ڈاکٹر مول کا خیال تو یہ ہے کہ ایسے معمول نسبۃً کم ہوتے ہیں، جن پر کیفیت نوم طاری ہوتی ہو، ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس عمل کا اثر افراد ہی تک محدود نہیں بلکہ جماعتوں اور مجمعوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔[2]

ڈاکٹر البرٹ مول کا ابھی نام لیا جا چکا ہے، اس جرمن فاضل کی کتاب ہپناٹزم اپنے موضوع پر سب سے بہتر نہایت محققانہ اور مستند خیال کی جاتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ بہت سے معجزات کی توجیہ نہایت آسانی کے ساتھ تنویم مقناطیسی سے کی جا سکتی ہے، معجزات ہی پر کیا موقوف ہے، سحر و عملیات

---

[1] دیکھو پروفیسر موصوف کی کتاب پرنسپلس آف سائیکولوجی (اصول نفسیات) جلد دوم باب ۲۷۔ [2] ڈاکٹر مول کی کتاب ہپناٹزم ص ۴۹۲ مطبوعہ ۱۹۰۹ء۔

تک کے صد ہا عجائب کی گرہ کھل جاتی ہے اور جن واقعات پر عقلا نے اوہام و اباطیل کی مہر ثبت کر دی تھی وہ قوانین مادی کی طرح قوانین نفسی کے حقائق بن گئے ہیں۔

معجزات شفا

بہت سے معجزات و کرامات کا تعلق امراض کی ایسی شفا سے ہے جو طب کے مادی وسائل علاج پر مبنی نہیں اور اس کے لئے مدعیان عقل کے ہاں اس کا نام "توہم پرستی" تھا لیکن آج تنویمی تحقیقات نے ایک نیا اور نہایت کامیاب اصول علاج منکشف کر دیا ہے جو عام مادی وسائل اور استعمال ادویہ سے قطعاً مستغنی ہے اور اس بلا دوا کے علاج سے بہرے شنوا ہو جاتے ہیں، پھیپھڑے اور سل کے امراض میں شفا حاصل ہوتی ہے، آنکھوں کی بیماریاں جاتی رہتی ہیں، وجع مفاصل دور ہو جاتا ہے، زخم بھر آتے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی انجیل کی روایات مسیحائی کو محض خوش اعتقادی یا اکاذیب کا طومار کہنا خود اپنے جہل مرکب کی گواہی نہ ہوگی

فرانس کی جس مشہور درگاہ کی کرامات شفا کا اوپر ذکر گزرا ہے، ہیوم نے معتبر سے معتبر شہادت کے باوجود ان کو قطعاً ناممکن قرار دیا تھا، لیکن ڈاکٹر مول بلا کسی مطالبۂ شہادت کے قدیم مصری اور یونانی مندروں کی کرامات شفا کو تنویم ہی کا معجزہ نما نفسی اثر سمجھتا ہے[1]۔ غرض جو چیز ہیوم کے نزدیک قطعاً ناممکن تھی، مول کے نزدیک اب اس میں اتنا استبعاد بھی باقی نہیں کہ کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کرے۔

جان اسٹورٹ مل نے معجزہ کی تعریف یہ کی تھی کہ وہ عبارت ہے ایسے واقعہ سے جس کے پہلے وہ لوازم و شرائط نہ پائے جاتے ہوں جو دوبارہ اس کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہوتے ہیں لیکن آج ہمارے سامنے وہ لوازم و شرائط موجود ہیں جن کی بنا پر عصا اسی طرح اژدہا بن جاتا ہے جس طرح کرسی شیر نظر آ سکتی ہے، اگر تم کہو گے تو پھر اس صورت میں حضرت موسیٰؑ کا اعجاز کیا رہا؟ اس کا جواب آئے گا، سر دست تم صرف اتنا سمجھ لو کہ عصا کا اژدہا بن جانا اتنا مستبعد واقعہ نہیں ہے جس پر یقین کے لئے نفس نوعیت واقعہ کی بنا پر کسی غیر معمولی شہادت کی احتیاج ہو۔

عام تجربات

تنویمی تجربات کے علاوہ یوں بھی کچھ نہ کچھ ایسے پُر اسرار واقعات مشاہدہ و مسموع ہوتے رہتے ہیں جن کی توجیہ عام قوانین فطرت سے نہیں ہوتی اور جو بہت سے معجزات کے متعلق ہماری حیرت و استبعاد میں کمی پیدا کرتے رہتے ہیں، ہمارے صوبہ کے مشہور انگریزی اخبار لیڈر نے پچھلے سال اپریل میں بردوان کا ایک عجیب و غریب واقعہ چھاپا تھا جو نامہ نگار کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

> "بردوان میں ایک عجیب پُر اسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کر دی ہے، لالہ کندن لعل کپور ایک کھتری زمیندار ۱۱ ماہ حال کو ۶ بجے شام کے وقت مرا، متوفی چونکہ سوریہ بنسی کھتری تھا اس لئے جب تک دوسرے دن صبح آفتاب نہ نکل لیا اس کی لاش جلائی نہیں گئی، جلانے سے پہلے اس کے لڑکے (نند لال) نے ایک خالی کمرہ میں جہاں کوئی اور نہ تھا لاش کا فوٹو لیا، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں، ان تصویروں کی

---

[1] ڈاکٹر مول کی کتاب ہپناٹزم ص ۳۵۵ سنہ ۱۹۰۹ء [2] ہپناٹزم ص ۳۵۶۔

سے دو کو تو خاندان کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکی کی ہیں، جن کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں، باقی تین تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہ جا سکیں"

"ٹائمس آف سیلون" میں ایک انگریز پلانٹر (چائے کا کاشتکار) نے اپنے قلیوں کی قربانی اور پوجا کے کچھ مشاہدات لکھے تھے جو اس کو عجیب معلوم ہوتے تھے، ان میں یہ بھی تھا[1]

"ایک شخص آگ کی سوراخ دار چٹی، ہتھیلی پر رکھ کر مندر کے گرد رقص و طواف کرتا تھا، اس نے مجھ کو یقین دلایا کہ یہ چٹی اس کو بالکل گرم نہیں محسوس ہوتی تھی، حالانکہ جب میں نے تجربۃً چٹی کے اسی حصہ کو جو اس شخص کی ہتھیلی پر تھی چھوا تو میری انگلی جل گئی، ان کا بڑا پجاری کم و بیش ایک منٹ تک آگ میں ہاتھ ڈالے رہا اور کوئی اثر نہ ہوا، اسی طرح اور بھی کئی قلیوں نے نہایت غیر معمولی حرکتیں کیں"

ان چشم دید عجائب کو لکھ کر پلانٹر نے ناظرین اخبار سے درخواست کی ہے کہ اگر کسی اور صاحب نے اس قسم کے واقعات دیکھے ہوں تو براہ مہربانی اطلاع دیں یا اگر ان کی کوئی توجیہ، تشریح ہو سکتی ہو تو کریں، اس پر خود ٹائمس نے لکھا ہے کہ سیلون اور ہندوستان دونوں جگہ مذہبی رسوم کے مواقع پر اس قسم کے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً کولمبو میں محرم کے موقع پر لوگ آگ میں چلتے ہیں، ہم کو نہیں معلوم کہ ایسے واقعات کی اب تک علمی توجیہ ہو سکی ہے، ایک نظریہ یہ ہے کہ لوگ اپنے آپ پر عمل تنویم کر لیتے ہیں[2]

بہر حال توجیہ ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن اڈیٹر ٹائمس نے پلانٹر کے بیان کی تکذیب نہیں کی، نہ کسی مزید شہادت کا مطالبہ کیا، کیوں؟ اس لئے کہ اس طرح کے واقعات اور بھی وقتاً فوقتاً پیش آتے رہتے ہیں جن کو سامنے رکھنے کے بعد پلانٹر کا بیان اتنا مستبعد نہیں رہتا کہ نفس نوعیتِ واقعات ہی کی بنا پر ان کی تغلیط و تردید کر دی جائے یا کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ کیا جائے، پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس واقعہ کو غلط سمجھو کہ حضرت ابراہیمؑ کو آگ نہ جلا سکی، زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی بنا پر تم ان کی نبوت کا اقرار نہ کرو، لیکن نفس واقعہ سے انکار کا کیا حق حاصل ہے!

رویائے صادقہ

رویا یا خواب کی تشفی بخش عقدہ کشائی سے حکمت و فلسفہ کا ناخن اب تک عاجز ہے مختلف اصنافِ خواب کی توجیہ کے لئے جو جو نظریات فرض کئے گئے ہیں وہ خود ایک خواب پریشاں معلوم ہوتے ہیں لیکن قدرت اپنی عجائب آفرینیوں کے لئے انسانی توجیہات کا انتظار نہیں کرتی۔

تم کسی معمر آدمی سے دریافت کرو، اس کو اپنی زندگی کے بہت سے ایسے خواب یاد ہوں گے جو واقعات مستقبل کی تمثیلی یا صریحی پیش بینی تھے، میرے ایک فلسفی دوست کو اپنے خوابوں کی صحت کا اس قدر تجربہ ہے کہ جب کسی شخص سے خواب میں اُن سے بے لطفی ہو جاتی ہے تو بیداری میں اس کے نتیجہ کے لئے وہ تیار رہتے ہیں اور اکثر کچھ نہ کچھ بد مزگی کی نوبت آ ہی جاتی ہے، مجھ کو اپنے خواب بہت ہی کم یاد رہتے ہیں لیکن جو جس قدر زیادہ وضاحت کے ساتھ یاد رہتا ہے، اسی قدر زیادہ صحیح نکلتا ہے، ۱۹۲۰ء کے روزنامچہ میں (۱۵) اپریل

---

[1] لیڈر نے ٹائمس آف سیلون کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ [2] تنویم مقناطیسی کی تحقیقات کی رو سے آدمی خود اپنے اوپر بھی عمل کر سکتا ہے۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

> "آج دوپہر کو سویا تو کیا خواب دیکھتا ہوں کہ "ح" کا خط آیا ہے جس میں "س" کا بھی ایک خط ملفوف ہے، اٹھنے کے بعد ڈاک آئی تو یہ خواب بالکل واقعہ تھا، انتہا یہ کہ خطوں کا جو مضمون خواب میں دیکھا تھا وہی قریب قریب بیداری میں بھی پایا، حالانکہ مجھ کو "ح" کے خط کا کوئی انتظار نہ تھا اور "س" کا خط تو حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا۔"

پروفیسر ہلپرکٹ امیریکا کے آثار قدیمہ کا ایک مشہور ماہر ہے، اس نے دو بابلی کتبات کے متعلق ایک اشکال کو جو بیداری میں حل نہیں ہو سکا تھا خواب میں حل کیا اور وہ بھی اس طرح کہ بابل کے ایک پرانے کاہن نے خواب میں آکر اس کی رہنمائی کی۔[1]

جب عام لوگوں کے یہ تجربات ہیں، تو پھر اس میں کیا استعجاب و استبعاد رہ جاتا ہے کہ بعض نفوس قدسیہ (انبیاء) کے تمام خواب رویائے صادقہ یا ایک طرح کا وحی و الہام ہوتے ہیں، رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتداء رویائے صادقہ (صالحہ) سے ہوئی تھی، اخبار بالغیب کی گرہ بھی بڑی حد تک رویائے صادقہ سے کھل جاتی ہے۔

حقیقی اسرار نبوت

اسرار نبوت میں سب سے زیادہ پُراسرار مقام وہ ہے جہاں ابراہیمؑ کو خدا خود ندا دیتا ہے ﴿وَنَادَيْنَاهُ أَنْ يَا إِبْرَاهِيمُ﴾ جہاں سے موسیٰؑ کو ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ کی بنا پر کلیم اللہ کا شرف عطا ہوتا ہے اور جہاں محمدؐ اور خدا میں قَابَ قَوْسَيْنِ یا اس سے بھی کم کی دوری رہ جاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں منطق و استدلال کا حجاب اکبر اٹھ جاتا ہے اور ظنی علم کی جگہ کشف و مشاہدہ کا حق الیقین حاصل ہو جاتا ہے، ابراہیمؑ کو کس نے ندا دی؟ موسیٰؑ نے طور پر کس سے کلام کیا اور لن ترانی کے باوجود کیا دیکھا؟ وہ کون سی ہستی تھی جس میں اور محمدؐ میں صرف قاب قوسین کی دوری تھی؟ اور "أَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ" کا ماجرا کیونکر پورا ہوا؟ ان سوالات کا جواب جامۂ تحریر میں رہ کر نہ دیا جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

حقیقی آیات نبوت کی عام مثالیں

عام معجزات کی نوعیت سے ہے، چونکہ اس کی مثالیں جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، معمولی واقعات زندگی میں بھی ملتی رہتی ہیں، لہٰذا اسی نسبت سے ان کے استبعاد میں بھی بہت کچھ کمی ہو جاتی ہے، لیکن "وادی ایمن" اور "سدرۃ المنتہیٰ" کی واردات جو اصلی معجزات اور مقام نبوت کی حقیقی "آیات کبریٰ" ہیں، ان کی بظاہر کوئی مثال اس عالم ناسوت میں نہیں نظر آتی، جس سے عام انسانوں کو ان کی فہم میں مدد ملے، بے شک لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَىٰ کا رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا، اور یہ سچ ہے کہ آفتاب کی عالم افروزی کا اندازہ ستاروں کی چمک سے نہیں ہو سکتا، تاہم بہ قدر استعداد تجلی طور کا ہلکا سا پرتو ذرات پر کبھی کبھی پڑ ہی جاتا ہے اور چشم بینا کی ہدایت کے لئے اتنا ہی بس ہے، انبیائے مرسلین کے بعد اولیائے مقربین کے ہاں ان تجلیات کی کافی شہادتیں ملتی ہیں، لیکن عام انسانی سطح سے چونکہ یہ درجہ بھی بہت بلند ہے، اس لئے اور نیچے اتر کر ہم کو اپنی سطح کی کچھ مثالیں تلاش کرنی چاہئیں۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون "ڈریم" "رویا" [illegible]

پروفیسر ولیم جیمس جو ہمارے زمانہ کا سب سے نامور محقق نفسیات اور جس کا شمار اکابر فلاسفہ میں ہے، اس نے لوگوں کے ذاتی واردات مذہب، یا مذہبی تجربہ و شعور کے مختلف اصناف پر ۵۰۰ صفحات سے زائد کی ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بلا قید مشرق و مغرب انبیاء و اولیاء، عوام و خواص، علماء، حکماء، سب کے تجربات مذہبی کی آپ بیتی واردات کو یکجا کیا، اسی ذخیرہ میں سے ہم صرف عام انسانی سطح کے چند واقعات کا بہ ترتیب ذیل انتخاب کرتے ہیں، سب سے پہلے جیمس نے اپنے ایک بے تکلف اور نہایت ہی ذہین و زیرک دوست کے متعدد تجربات لکھے ہیں، اس دوست کو کبھی کبھی رات کے وقت جب کہ یہ کتب بینی میں مشغول ہے یا خالی بیٹھا ہے، ایسا معلوم ہوا کہ کمرے کے اندر کوئی موجود ہے، پلنگ کے پاس ہے، اپنی گود میں اس کو دبا رہا ہے، اگو وہ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے یا کیا ہے تاہم نفس اس کی موجودگی کا اس سے کہیں زیادہ اس کو یقین ہے جتنا کہ دن کی روشنی میں کسی ذی روح کی موجودگی کا ہو سکتا ہے، وہ اس کو کسی متشخص ذات یا انسان کی طرح نہیں دیکھ رہا ہے، پھر بھی اپنے تمام محسوسات سے زیادہ اس کے حقیقی و واقعی ہونے کا اذعان ہے۔

"اس کی موجودگی میں نہ کوئی ابہام و التباس ہے، نہ یہ شعر یا موسیقی کے وجد و کیف کا سا پیدا کردہ کوئی جذبہ ہے، بلکہ یہ ایک قوی شخصیت کی نہایت قریب موجودگی کا قطعی علم و یقین ہے اور اس کے چلے جانے کے بعد میرے حافظہ میں اس کی یاد ایک حقیقت کی طرح تازہ ہے، ہر چیز جو میں دیکھتا یا سنتا ہوں خواب ہو سکتی ہے، لیکن یہ واقعہ خواب نہ تھا" (صفحہ ۹۰، ۹۱)

یہ دوست کوئی وہم پرست نہیں ہے بلکہ جیمس کو اس بات پر حیرت ہے کہ وہ ان تجربات کو مذہبی رنگ میں کیوں نہیں تعبیر کرتا، اس کے بعد ایک اور شخص کا بیان ہے۔

"میری آنکھ بہت رات رہے کھل گئی، ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے جان بوجھ کر جگا دیا اور پہلے میں یہی سمجھا کہ کوئی شخص اندر گھس آیا ہے، میں نے پھر سونے کے لئے کروٹ بدل لی فوراً ہی محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی موجود ہے اور یہ کچھ عجیب احساس تھا، کسی عام ذی حیات شخص کی موجودگی کا نہیں بلکہ ایک روحانی وجود کا احساس تھا، ممکن ہے کہ تم کو اس پر ہنسی معلوم ہوتی ہو، لیکن میں وہ بیان کرتا ہوں جو مجھ پر گزری، بجز اس کے کہ میں ایک روحانی وجود سے اس کو تعبیر کروں اور کوئی بہتر صورت مجھ کو اپنے احساس کے ادا کرنے کی نہیں ملتی، ساتھ ہی مجھ کو ایک یہ دہشت بھی محسوس ہوئی کہ کوئی عجیب و خوفناک واقعہ ظاہر ہوا چاہتا ہے" (ص ۶۱)

ایک سائنس دان کے اعترافات سنو!

"بیس اور تیس سال کی عمر کے مابین میں بتدریج لاادری اور لامذہب ہوگیا تھا تاہم اس غیر متعین شعور سے میں کبھی خالی نہیں رہا جس کا نام ہربرٹ اسپنسر نے حقیقۃ مطلقہ رکھا ہے، لیکن اسپنسر کی طرح

۱؎ کتاب کا نام THE VIRERTIES OF RELGISUS EXPRERIENCE تجربہ مذہبی کے اصناف ہے، پروفیسر موصوف کا انتقال اگست ۱۹۱۰ء میں ہوا ہے۔

یہ حقیقت میرے لئے محض ناممکن الفہم تھی کیونکہ میں نے طفلانہ طریقہ سے خدا سے دعائیں مانگنی چھوڑ دیا تھا اور مذہبی رسم کے مطابق کبھی نماز نہیں پڑھی اور دست بدعا ہوا تاہم میرا زیادہ حال کا تجربہ بتلاتا ہے کہ عملاً اس ذات کے ساتھ مجھ کو وہی تعلق رہا ہے جو دعا اور نماز کا ہوتا ہے، جب مجھے کوئی مصیبت پڑی خواہ وہ خانگی ہو یا کاروباری، یا جب میں کسی معاملہ کے متعلق پریشان و متردد ہوا اور میرا دل بیٹھنے لگا تو اعتراف کرتا ہوں کہ استعانت کے لئے میں اسی تعلق کی طرف بھاگا جو اس ذات کے ساتھ مجھ کو حاصل تھا، اس نے ہمیشہ میری نصرت کی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تائید غیبی نے مجھ کو بے انتہا قوی کر دیا ہے، میں پاتا ہوں کہ اس کے ساتھ میرا تعلق دراصل شخصی تھا کیونکہ ادھر چند سال سے اس سے استعانت کی قوت نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے، جس سے مجھ کو ایک صریح فقدان کا شعور ہے اور اقرار ہے کہ میں اپنی زندگی میں ایک بڑی قوت و نصرت سے محروم ہو گیا ہوں، جس ذات کو میں اللہ سے تعبیر کر رہا ہوں، وہ اسپنسر کی نامعلوم حقیقت نہ تھی بلکہ یہ میرا خدا تھا جس کی تائید پر مجھ کو بھروسہ تھا لیکن جس کو نہیں معلوم میں نے کس طرح گم کر دیا۔" (ص ۱۰۰۔ ۱۰۱)

سوئٹزرلینڈ کے ایک شخص کی آپ بیتی یہ ہے:۔

"میں پوری طرح صحیح و تندرست تھا کسی قسم کی تھکن، بھوک یا پیاس قطعاً نہ تھی، طبیعت بالکل ہلکی اور شگفتہ تھی گھر سے جو خبر ملی تھی اچھی تھی، خوش دور و نزدیک کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ تھی، ہوشیار رہنما ہم لوگوں کے ساتھ تھا، راستہ میں بھٹکنے کا بھی مطلقاً اندیشہ نہ تھا، مختصر طور پر اپنی اس حالت کو یوں ادا کر سکتا ہوں کہ میرا دل و دماغ اس وقت کامل توازن کی حالت میں تھا کہ یکایک مجھ کو اپنے اندر ایک طرح کا ارتفاع محسوس ہوا اور یہ معلوم ہوا کہ خدا موجود ہو گیا اس کی رحمت و قوت میرے سارے وجود میں نفوذ کر رہی ہے، یہ کیفیت اس درجہ شدید تھی کہ ساتھیوں سے بمشکل اتنا کہہ سکا کہ آگے کو میرا انتظار نہ کرو، اس کے بعد میں کھڑے ہونے کی تاب نہ تھی ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے کا دریا امڈ آیا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک حقیر اور میرے جیسے گناہگار مخلوق پر اتنا بڑا رحم و فضل فرمایا کہ زندگی ہی میں اپنے کو پہچنوا کر اپنی ربوبیت کا کرشمہ دکھایا، میں نے اس سے نہایت الحاح کے ساتھ دعا کی کہ میری زندگی تمام تر اس کی رضا جوئی میں بسر ہو، جواب ملا کہ تو روز مرہ عاجزی و مسکنت کے ساتھ میری رضا پر چلنے کی کوشش کر اور اس کا فیصلہ مجھ قادر مطلق پر چھوڑ دے کہ اس سے بھی زیادہ حضور کے ساتھ تو مشاہدہ حق کے قابل ہوا ہے یا نہیں، بہرحال میرا احساس اس حد گہرا اور وسیع تھا کہ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا موسیٰ نے کوہ طور پر کچھ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا تھا، اس قدر بیان کر دینا اور مناسب ہوگا کہ اس عالم وجد میں خدا کسی شکل و صورت اور رنگ و روپ سے متصف نہ تھا، نہ میں اس کی موجودگی کی کوئی خاص جگہ محسوس کر رہا تھا۔" (ص ۶۷۔ ۶۸)

۱؎ اس حالت کو سامنے رکھ کر ذرا ان آیات کو پڑھئے، ایاک نستعین، ففروا الی اللہ، وما النصر الا من عند اللہ

جیمس نے تو اس قسم کے تجربات کا ایک انبار لگا دیا ہے، لیکن ہم ایک طویل بیان کے دو جملوں کے اقتباس پر بس کرتے ہیں، قیاس اور اخذ نتائج کے لئے امید ہے کہ یہی تین چار مثالیں کافی ہوں گی۔ امراض دماغی کے ایک ماہر ڈاکٹر نے خود اپنا تجربہ لکھا ہے۔

> "اس کے بعد مجھ پر ایک نہایت فرحت و انبساط کی کیفیت طاری ہوئی جس کے ساتھ ہی ایک ایسی اشراقی یا انشراحی حالت پیدا ہوئی جس کا بیان ناممکن ہے، اس حالت میں دوسری چیزوں کے ساتھ اس بات کا بھی مجھ کو صرف یقین نہیں بلکہ عینی مشاہدہ ہوا کہ کائنات بے جان مادہ سے نہیں بنی ہے بلکہ ایک ذی حیات وجود ہے، مجھ کو خود اپنے اندر ایک ابدی حیات کا احساس ہوا، یہ کیفیت صرف چند سکینڈ تک رہی لیکن اس کی یاد اور حقیقت کا احساس آج چوتھائی صدی گزر جانے پر بھی اسی طرح تازہ ہے۔" (ص ۳۹۹)

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر اب یہ حدیث پڑھو:

> "ایک دفعہ صبح کی نماز کے لئے آپ دیر سے برآمد ہوئے، نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ ٹھہر جائیں، پھر فرمایا کہ آج شب کو میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی کہ میرے لئے مقدر تھیں، تو نماز ہی میں کچھ اونگھ سا گیا (نعست) اس حالت میں، میں نے دیکھا کہ جلال الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہوا خطاب ہوا، اے محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی نہیں، اے میرے رب! میں نہیں جانتا، اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں، سوال ہوا یا محمدؐ! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی، ہاں میرے رب" ...... الخ[1]

اس میں کلام نہیں کہ مکالمۂ طور اور ماجرائے اسراء (معراج) کا مقام مذکورۂ بالا مثالوں سے اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ انبیاء کا مقام انسانوں سے بلند ہونا چاہیئے، "تاہم عالمے ہست کہ ایں عالم ازاں تمثالے است" ان مثالوں سے ایک ذرا ایک حد تک اس مقام برتر کا دھندلا سا تصور پیدا کیا جا سکتا ہے اور ہمارے مدعا کے لئے اسی قدر کافی ہے۔

مقدمات ثلثہ یقینِ معجزات کے لئے ہماری منطقِ استدلال کے تین مقدمات تھے جن میں سے دو کو تو ہیوم اور ہکسلے نے بترتیب پورا کر دیا تھا، تیسرا مختلف اصنافِ استبعاد کے شواہد سے پورا ہو جاتا ہے ان مقدماتِ ثلثہ کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) معجزات بذاتِ خود کوئی ناقابلِ تصور یا ناممکن الوقوع شئے نہیں ہیں (ہیوم)

(۲) زیادہ سے زیادہ ان کو "انتہائی حیرت انگیز" یا "انتہائی مستبعد" واقعات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اس لئے (الف) انسانی شہادت کی بنا پر ان کو قبول کیا جا سکتا ہے (ب) البتہ "انتہائی حیرت انگیزی" واستبعاد کی وجہ سے بظاہر ان کو قبول کرنے کے لئے جو شہادت مطلوب ہے اس کو بھی ہر لحاظ سے انتہائی حد تک قابل اعتبار

---

[1] پوری حدیث کے لئے دیکھو آگے ذکر مشاہدات۔

ہونا چاہیئے (انگیلی)

(۲) لیکن معجزات میں جس قسم کا استبعاد یا حیرت انگیزی پائی جاتی ہے، اس کے شواہد چونکہ عام انسانوں کے مادی، نفسی یا روحانی تجربات میں بھی ملتے رہتے ہیں جن کے قبول و یقین کے لئے لوگ کوئی غیر معمولی شہادت طلب نہیں کرتے۔

لہذا یقین معجزات کے لئے بھی کسی غیر معمولی شہادت کی ضرورت نہیں۔

اصلی بحث یقین کی ہے

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ناقص منطق سے اگر کوئی شخص گمراہ ہو گیا تھا تو کیا وہ اس منطق کا صرف تیسرا مقدمہ پورا کر دینے سے راہ راست پر آجائے گا اور کیا اب صفحات بالا کے پڑھ لینے سے معجزہ کا کوئی منکر نہ رہ جائے گا؟ مجھ کو تو اندیشہ ہے کہ بعض یہ سیاہ نقوش ایک منکر کو بھی مومن نہ بنا سکیں گے، آپ کہیں گے کہ شاید استدلال ہی بودا ہے، لیکن کیا دنیا کا کوئی قوی سے قوی استدلال بھی نفس اپنی قوت استدلال کی بنا پر کسی کو معجزات کا یقین دلا سکتا ہے؟ ارسطو، مل اور ہیگل جو منطق کے اقانیم ثلثہ ہیں، کیا یہ سب کے مل کر بھی کوئی ایسی منطق یا عقلی استدلال پیدا کر سکتے تھے جو بذاتہ ہر عام و خاص کو معجزات کا یقین دلا دیتا؟

ان سوالات کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر معجزات کے متعلق خالی امکان و وقوع اور شہادت وقوع کی بحث چنداں اہم نہیں رہ جاتی، بلکہ اصلی بحث یقین کی ماہیت اور اس کے علل و اسباب کی ہے۔

یقین معجزات

یقین کی ماہیت

یقین کی فلسفیانہ ماہیت پر کوئی مفصل و مستقل بحث چھیڑنا مقصود نہیں ہے نہ یہاں چنداں اس کی ضرورت ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ نفس تصور اور اس کے یقین میں کیا فرق ہے؟

یہاں ہمارے مقصد کے لئے صرف اتنا جان لینا چاہیئے کہ ریاضی کے تصورات مجردہ کی طرح امور واقعیہ (واقعات) کے متعلق ہمارا یقین ناقابل تغیر یا اطلاقی نوعیت کا نہیں ہوتا، بلکہ لذت، والم، حیرت، واستعجاب، رنج و غم،

---

۱ ارسطو، درمل، علی الترتیب قیاسی و استقرائی منطق کے امام ہیں جن کا تعلق اضافی حقائق و علوم سے ہے لیکن ہیگل (جرمنی) نے منطق کے زمین و آسمان ہی بدل دیئے یعنی منطق کو مابعد الطبیعات بنا کر اس کے ذریعہ "حقیقۃ مطلقہ" کا سراغ لگانا چاہا ہے۔

۲ معجزات کا تعلق چونکہ تاریخ اور روایت کے واقعات سے ہے نہ کہ ریاضی کی مجردات سے، اس لئے ہم مجردات ریاضیہ کے علم و یقین کی جو نوعیت ہے اس کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے ورنہ دراصل یہ یقین بھی کسی ایسی اطلاقی اور ازلی یا ناقابل تغیر بنیاد پر نہیں قائم ہے جس کا انکار ہو سکے بلکہ جیسے منطقی و فلسفی کا تو یہ دعویٰ ہے کہ ریاضیات کی مفروضہ قطعیت محض ایک وہم و فریب ہے جس طرح براق کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے آدھے گھوڑے اور آدھے انسان کا، یہ نہیں لازم آتا کہ براق کا وجود یقینی اور واقعی ہے اسی طرح دائرہ کی اس تعریف سے کہ وہ نام ہے ایسی شکل کا جس کے نصف قطر تمام برابر ہیں، یہ نہیں لازم آتا کہ واقعتاً ایسا کوئی دائرہ موجود بھی ہے، انتہا یہ کہ مل کے نزدیک اس میں بھی کوئی تناقض نہیں کہ دو اور تین مل کر چھ ہو سکتے ہیں۔

محبت ونفرت، ارادہ وخواہش وغیرہ دیگر کیفیات نفسی کی طرح محض ایک اضافی وتغیر پذیر ذہنی کیفیت کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح کسی واقعہ سے ہر شخص کے نفس میں کیفیات بالا کا پیدا ہونا یا یکساں طور پر پیدا ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح ہر آدمی کے دل میں اس واقعہ کا یقین یا ایک ہی معنی میں یقین پیدا ہونا بھی لازمی نہیں۔ تاریخ کی بعض کتابوں میں ایک روایت مذکور ہے کہ اسکندریہ کا کتب خانہ حضرت عمرؓ کے حکم سے اس بے دردی کے ساتھ جلایا گیا کہ چھ مہینے تک مصر کے حماموں کا ایندھن بنا رہا۔ علم کا فدائی اور حکمت وفلسفہ کا عاشق اس روایت کو پڑھ کر کف افسوس ملنے لگتا ہے اور اس کے دل میں نفرت وغصہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بخلاف اس کے یہی روایت کو اگر ایک سپاہی پڑھتا ہے تو نہ وہ اپنے اندر کوئی نفرت وغصہ پاتا ہے اور نہ اتنا افسوس کرتا ہے، اس کے نزدیک قلعہ انتورپ کی بربادی کتب خانہ اسکندریہ سے کہیں زیادہ ماتم انگیز ہے لیکن یہی روایت اگر کسی صوفی عارف کی نظر سے گزرے تو رنج وغصہ کی جگہ اس کو انتہائی مسرت ہو سکتی ہے کہ حجاب اکبر کا یہ دفتر بے معنی اسی سلوک کا مستحق تھا، صد کتاب وصد ورق در نار کن۔

تم نے دیکھا کہ ایک ہی چیز سے مختلف اشخاص پر مختلف بلکہ متضاد جذبات طاری ہوتے، جذبات کی طرح یقین وعدم یقین کے بھی متضاد اثرات طاری ہوتے ہیں۔ جن اہل یورپ کے دل میں مسلمانوں کی وحشت وجہالت کا تعصب راسخ تھا، جن کی طبیعت تنقیص اسلام کی ہر شہادت کو قبول کرنے پر حریص تھی، انہوں نے نہ صرف شہادت کی تحقیق وتفتیش کے بغیر اس خبر کا یقین کر لیا بلکہ اس کی روایتی ودرایتی تضعیف کے بعد بھی ان کا یقین قائم رہا، لیکن انہی اہل یورپ میں جو گروہ اس درجہ اسلام کے ساتھ عداوت نہیں رکھتا تھا کہ اس کے جذبہ انصاف پسندی کو تعصب نے مغلوب کر لیا ہو، اس کو تحقیق کے بعد یہ روایت سرے سے بے اصل ومضحکہ خیز نظر آئی، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مسلمان مورخ جو کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کو دامن اسلام پر وحشت وجہالت کا ایک بدنما داغ سمجھتا تھا اور کسی طرح اس کا محبت اسلام سے لبریز دل اس کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا، اس کی تحقیقات نے اس روایت کو نہ صرف دشمنوں کا صریح افتراء وبہتان قرار دیا بلکہ الٹے خود ان ہی افتراء پرداز دشمنوں کو اصلی مجرم ثابت کر دکھایا۔

؎ الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

نظریات حکمت کا یقین

یقین کی یہ جذباتی واضافی حیثیت صرف واقعات، تاریخ وروایت ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ فلسفہ وحکمت (سائنس) کے نظریات ونظامات کا یقین بھی یہی حیثیت رکھتا ہے، پروفیسر جیمس نے "ارادہ یقین" اور "جذبہ عقل پرستی"[1] کے عنوان سے دو نہایت دلچسپ مضمون لکھے ہیں، ان میں اس نے دکھایا ہے کہ ہمارا یقین کس قدر خواہش وارادہ یا جذبات کی اضافی کیفیت کا پابند ہے اور سائنس وفلسفہ کی بنیاد جس عقل پرستی پر ہے وہ بھی دراصل مذہب پرستی یا عجائب پرستی کی نوعیت کا محض ایک جذبہ ہے۔

یکسانی کا جذبہ

ایک فلسفی یا حکیم فلسفیانہ یا حکیمانہ تفکر وتفحص میں کیوں اپنا سر کھپاتا ہے؟ زیادہ تر اس خواہش کی بنا پر کہ عالم میں جو ایک تشتت وپریشانی، کثرت وپراگندگی نظر آتی ہے، کوئی ایسا اصول یا قانون دریافت

---

[1] جیمس کا مضمون جذبہ عقلیت SENTIMENT OF RATIONALITY

ہوجاتے جو اس کثرت و پراگندگی کو وحدت و یکسانی کے رشتہ سے مربوط و مسلسل کردے۔ اس قانون و اصول کے عقلی یا صحیح ہونے کا کیا معیار ہے؟ صرف یہی کہ اس کے قبول و باور کرنے سے ہمارے دماغ کی حیرانی و پریشانی رفع ہوجاتی ہے اور کارخانۂ فطرت میں یکسانی و ہمواری کی موجودگی کا ایک خوشگوار و لذیذ احساس یا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ لذت کہ پراگندہ واقعات دراصل کسی ایک ہی مخفی واقعہ کے مظاہر ہیں، اسی طرح کی لذت ہے جو کسی شخص کو پراگندہ آوازوں کے ایک نغمہ یا راگ میں منضبط کردینے سے حاصل ہوتی ہے، کون شخص اس امر کی دلچسپی کو نہ محسوس کرے گا کہ سیب کو زمین کے ساتھ وہی تعلق ہے جو چاند کو اس کے ساتھ ہے، غبارہ اسی قانون کے ماتحت اوپر چڑھتا ہے جس کے تحت پتھر نیچے گرتا ہے، اس یقین میں کس کے لئے لذت نہ ہوگی کہ پہاڑ پر چڑھنے یا درخت کے کاٹنے میں جس طاقت سے ہم کام لیتے ہیں وہ وہی ہے جو آفتاب کی ان کرنوں میں پائی جاتی ہے جو اس غذا کو بناتی ہیں جس کا صبح ہم نے ناشتہ کیا ہے۔

نظم و یکسانی کی لذت کے لئے انسان کی فطرت جس درجہ حریص ہے اسی کو ملحوظ رکھ کر ہمارے زمانہ کے ایک زبردست معلم فلسفہ پروفیسر جیمس نے تنبیہ کی ہے کہ جہاں کہیں بھی ہم کو کسی قانون فطرت کی وحدت و یکسانی کا یقین محسوس ہو، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس احساس وحدت کا بڑا حصہ اصل فطرت کی واقعی وحدت کے بجائے اس ناقابل استیصال جذبہ پر مبنی ہوسکتا ہے[1] جو وحدت و نظم کی پسندیدگی کے لئے خود ہمارے نفوس کے اندر موجود ہے۔ یہی تعصب تھا جس کی بنا پر ایک بڑے سائنسدان نے جیمس سے کہا کہ کلام نفسی کا دعویٰ اگر صحیح بھی ہو تو بھی تمام اہل سائنس کو اس کے دبانے اور چھپانے پر ایکا کرلینا چاہیے، کیونکہ اس سے فطرت کی یکسانی اور نیز بہت سی ایسی چیزوں کی تکذیب ہوتی ہے جن کے مانے بغیر سائنسدان اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ اسی قول کو نقل کرکے جیمس نے لکھا ہے کہ اگر یہی سائنس دان حضرات کلام نفسی کو سائنس کے حق میں مفید مطلب پاتے تو اس سے اغماض کے بجائے نہ صرف اس کی شہادت کی تحقیق پر آمادہ ہوجاتے بلکہ یہی شہادت یقین کے لئے کافی ہوتی۔[2] اب تم ہی فیصلہ کرو کہ کیا عقل پرست سائنس کے تعصبات اوہام پرست مذہب کے تعصبات سے کچھ بھی کم یا مختلف ہیں؟ اور کیا اہل سائنس کا انکار معجزات وحدت و یکسانی کے مذکورۂ بالا تعصب کا نتیجہ نہیں ہے؟

نظریاتِ فلسفہ کا یقین

خیر اہل سائنس یا حکماء کو تو خود ہی بڑی حد تک اس امر کا اعتراف ہے کہ سائنس کے نظریات، دلوں میں زیادہ تر اضافی اور مفروضی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن فلاسفہ یا متالہین جو حقائق عالیہ اور صداقت مطلقہ کے چہرہ سے پردہ اٹھانے کا دعویٰ رکھتے ہیں، ان کے اصول و نظریات پر تو انسانی جذبات یا ذاتی میلانات کا سایہ تک نہ پڑنا چاہیے تھا، مگر یہ کس قدر حسرت انگیز منظر ہے کہ سب سے زیادہ فلسفہ ہی کے مذاہب و نظامات شخصی جذبات و خواہشات کا عکس نظر آتے ہیں، اور یہ سچ ہے کہ جتنے فلاسفۂ

---

[1] دیکھو اصول نفسیات جلد دوم صفحہ ۳۱۶۔ THE RELIGIOUS ASPECT OF PHILOSOPHY فلسفہ کا مذہبی پہلو، مصنفہ پروفیسر رواکس۔

[2] ارادۂ یقین صفحہ ۱۰ طبع جدید ۱۹۱۱ء

ہی مذاہب، حتیٰ کہ ایک عام و دلچسپ تقسیم کی رو سے فلاسفہ کی دو قسمیں برقرار پائی ہیں کہ رونے والے (بکائیہ) اور ہنسنے والے (ضحکیہ)، فلاسفہ جن کو زیادہ سنجیدہ اصطلاح میں علی الترتیب شریہ اور خیریہ[1] کہا جاتا ہے یا اس کو "یاسیہ" اور "رجائیہ" بھی کہہ سکتے ہو، اگر نفسیاتی تحلیل کی جائے تو اس اختلاف کا بانی رونے اور ہنسنے، یاس و رجاء، امید و بیم وغیرہ کے ذاتی جذبات و احوال ہی ثابت ہوں گے۔

دور جدید کا ایک زبردست فلسفی شوپنہار جس کا شمار فلسفہ کے اکابر ائمہ میں ہے اور جو فلاسفہ کی رونی جماعت کا ایک نامور فرد ہے، اس کا سارا فلسفہ ہی یہ ہے کہ "صداقت مطلقہ" صرف ارادہ یا خواہش ہے نہ کہ عقل یا فکر، اور یہ ارادہ چونکہ "بے عقل" ہے اس لئے اس کی کوئی غایت نہیں، دنیا میں کوئی فلاح و سعادت نہیں بلکہ یہ تمام تر بے مقصد ارادہ کا ایک کھلونا یا تماشہ ہے، خارجی عالم اسی بے عقل و بے مقصد ارادہ کی محض ایک تصویر ہے۔

گو یہ عقل کی سب سے اونچی سطح پر بسنے والے ان فلاسفہ کے باہمی اختلافات بلکہ تضاد آراء کا یہ عالم ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، کوئی کہتا ہے کہ دنیا تمام تر عقل پر مبنی ہے کوئی مدعی ہے کہ اس کا وجود سراپا بے عقلی ہے کوئی شخصی خدا کا یقین رکھتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ شخصی خدا ناقابل تصور ہے، کسی کو ذہن سے باہر خارجی دنیا کا اذعان ہے کوئی ثابت کرتا ہے کہ خارجی دنیا کا وجود محض وہم و فریب ہے کسی کی زبان پر ہے کہ ایک مستقل و قائم بالذات روح ہے، کوئی پکارتا ہے کہ نفس کے تغیر پذیر احوال کے سوا کچھ نہیں ہے کسی کا دعویٰ ہے کہ سلسلہ علل لامتناہی ہے، کوئی مانتا ہے کہ نہیں، ایک علۃ العلل ہے، کوئی انسان کو مجبور محض پاتا ہے اور کوئی مختار، کوئی جسد و عالم کی وحدت کا قائل ہے اور کوئی کثرت کا، بظاہر محال سے محال بات بھی تم کو ایسی ملے گی جس کا ادعا کرنے والا عاقل سے عاقل فلسفی نہ ملتا ہو۔

عقل انسانی کی ان ہی حیرانیوں کو دیکھ کر آدمی پکار اٹھتا ہے کہ کسی چیز کو حق کہنے کے صرف یہ معنی ہیں کہ جب تم اس کو حق یقین کرو تو حق ہے ورنہ نہیں، اور خصوصاً موجودہ زمانہ میں تو اس سرعت و کثرت کے ساتھ نظریات ابل پڑے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے زیادہ واقعی خیال کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے، اس قدر مختلف مہندسات اس قدر مختلف منطقیں، اس قدر مختلف طبیعیاتی و کیمیاوی مفروضات پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم سے صحیح اصول کی نسبت بھی گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعیت کا پرتو ہونے کے بجائے محض انسانی ذہن کی ایجاد ہے[2]۔

مشاہدات کا یقین تم سمجھتے ہو گے کہ عقلی یقین کی یہ اضافی یا ذہنی نوعیت زیادہ سے زیادہ اصول و نظریات تک محدود ہوگی، باقی مشاہدات و محسوسات جو ان اصول و نظریات کا آخری مرجع ہیں تو وہ بہرحال کوئی اضافی شے نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے متعلق زید و عمرو کی نوعیت یقین میں کوئی تفاوت ناممکن ہے لیکن تمہارا یہ "ناممکن" نہ صرف "ممکن" بلکہ واقعہ ہے۔

دن رات کے ان معمولی تجربات کا تو ذکر ہی کیا، ایک چیز جو ایک آدمی کو خوبصورت معلوم ہوتی ہے دوسرے

---

[1] انگریزی زبان میں علی الترتیب [illegible]

[2] [illegible] THEORIES OF KNOWLEDGE (نظریات علم) از پروفیسر واکر صفحہ ۲۳ بحوالہ THE MEANING OF TRUTH (معنی صداقت) [illegible]

کو بدصورت نظر آتی ہے، ایک کو خوش مزہ محسوس ہوتی ہے، دوسرے کو بدمزہ۔ آلات حس و مشاہدہ کی ساری دنیا عبارت ہے رنگ و بو، آواز و مزہ، سردی و گرمی، شکل و صورت، طول و عرض، امتداد، پستی و بلندی، دوری و نزدیکی سے۔ لیکن کیا ان میں سے ایک شے کے متعلق بھی عامی، حکیم اور فلسفی سب کا یقین یکساں نوعیت رکھتا ہے۔ عامی آدمی اپنے حواس کی مذکورۂ بالا ساری دنیا کو ٹھوس خارجی حقائق یقین کرتا ہے لیکن حکیم یا سائنسداں کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کا بھی خارج میں کوئی وجود نہیں اور آج کل کے سائنسدان تو بار بار اس حقیقت کو دہراتے رہتے ہیں کہ اشیاء دراصل وہ یا ویسی نہیں جیسی کہ ہمارے حواس کو محسوس ہوتی ہیں اور اوڈرن بلیف جی ہے، ذہن یا احساس سے باہر نہ کوئی رنگ ہے نہ بو، نہ کوئی آواز ہے نہ مزہ، لیکن علمت کو چونکہ اپنی تحقیقات میں قدم قدم پر مادہ و قوت کے الفاظ دہرانا پڑتے ہیں، اس لئے خالص حکیم کے دل میں مادہ پرستی کا ایک ایسا جذبہ و میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ باوجود اس اقرار کے کہ مادہ کسی نامعلوم شے کا نام ہے پھر بھی کسی نہ کسی معنوم میں اس کے وجود خارجی کے یقین پر اپنے کو مجبور پاتا ہے، بخلاف اس کے فلسفہ یا مابعد الطبیعیات کا عالم چونکہ حکیمانہ تعصبات سے بالاتر ہے لہٰذا بے جھجک سرے سے وجود مادہ ہی کا انکار کر دیتا ہے، اس کے نزدیک بس جو کچھ وجود ہے وہ ذہن یا نفس کا۔ مگر یقین کی گردن دلائل سے کب جھکتی ہے، ممکن ہے کہ چند لمحات کے لئے حکیم یا فلسفی عالم رنگ و بو یا مادہ کے وجود فی الخارج کے خلاف یقین پر قائم رہ سکتا ہو لیکن بالآخر اس کو جبلت کی حکومت قاہرہ اسی نقطہ پر واپس لاتی ہے جہاں سے غور و فکر نے اس کو منحرف کیا تھا اور شب و روز کی زندگی میں وہ عالم رنگ و بو کے وجود خارجی پر اسی طرح اذعان رکھتا ہے جس طرح ایک عامی آدمی۔

غرض یقین اپنی ماہیت کی رو سے تمام تر صرف ایک نفسی میلان ہے، جو نہ علم کا پابند ہے نہ جہل کا جس کا انحصار نہ عقل پر ہے نہ بے عقلی پر، جو نہ سچ پر موقوف ہے نہ جھوٹ پر، وہ فلسفہ، حکمت، علم و عقل سب چیزوں سے پیدا ہو سکتا ہے اور کسی سے بھی نہیں پیدا ہو سکتا اور جب پیدا ہونا چاہتا ہے تو کلیفورڈ کے اس مشورہ کا منہ نہیں دیکھتا کہ "جھوٹ پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ ہمیشہ یقین کے بغیر رہو"۔

کیا عجیب بات ہے کہ یقین کی اس ماہیت پر بھی کہ وہ دلائل کا کوئی منطقی نتیجہ نہیں بلکہ محض ایک ذہنی میلان ہے خود اسی شخص کی نکتہ رس نظر پڑی تھی جو یقین معجزات کا سب سے بڑا مخالف ہے، چنانچہ "ارسٹاٹیلین سوسائٹی"[1] کے ایک ممبر براڈ نامی نے ۳۰، ۴۰ سال ہوئے، ہیوم کے نظریہ معجزات پر ایک مضمون کے ضمن میں خود ہیوم کے اصول کی بنا پر لکھا ہے کہ:

> "ہیوم کو یقین معجزہ سے اس لئے انکار ہے کہ معجزہ گزشتہ مستمر تجربہ کے منافی ہوتا ہے مثلاً گزشتہ تجربہ یہ ہے کہ الف کے بعد ہمیشہ ب ظاہر ہوتا رہا ہے جس سے ہمارے اندر ایک قوی یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ آئندہ بھی ب ہمیشہ الف کے تابع ہوگا، ایک مذہبی آدمی معجزہ پر اس لئے یقین کرتا ہے کہ اس کے اندر عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے یقین کا ایک فطری میلان موجود ہے جن سے مذہب

---

[1] دیکھو ارسٹاٹیلین سوسائٹی (انگلستان) رسالہ جدید، لندن، جلد ۱۰، بابت ۱۰-۱۹۰۹ء ص ۹۰۔

کی تائید ہوتی ہو، دونوں صورتوں میں یقین کا نفسیاتی سبب ظاہر ہے، ہیوم کا عدم یقین اس کے اس فطری میلان پر مبنی ہے کہ جو کچھ پہلے ہوا ہے وہی آئندہ بھی ہوگا اور مذہبی آدمی کا یقین اس کی عجائب پرستی اور ایسی چیزوں کے قبول کرنے کے فطری میلان پر مبنی ہے جن سے مذہب کی تائید ہوتی ہو لیکن خود ہیوم کو تسلیم ہے کہ گذشتہ مستمر تجربہ سے آئندہ پر حکم لگانے کا ہم کو کوئی منطقی حق حاصل نہیں ہے، لہٰذا مذہبی آدمی کا یقین معجزات پر اور ہیوم کا یقین قوانین فطرت پر، جس کا نتیجہ معجزات کا عدم یقین ہے، منطق کی نگاہ میں دونوں بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں، دونوں صورتوں میں یقین نفسیاتی علت پر مبنی ہے، اور کسی صورت میں بھی کوئی منطقی علت ہیوم نہیں پیش کر سکتا؛

جب یہ معلوم ہو چکا کہ یقین کی ماہیت صرف ایک طرح کا غیر منطقی میلان نفسی ہے تو اس کے اسباب کی جستجو منطق و فلسفہ کے دلائل میں بے سود ہے، منطقی یا فلسفیانہ دلائل زیادہ سے زیادہ میلان یقین کی تقویت و تضعیف کا کام دے سکتے ہیں، لیکن خود اس میلان کی تخلیق ان کے بس سے باہر ہے، یہ میلان بذات خود ایک نفسی حقیقت ہے، لہٰذا اس کے اسباب تخلیق کا سراغ نفسیات (علم النفس) ہی کے اوراق میں مل سکتا ہے، کم و بیش تمام علمائے نفسیات نے یقین کی ماہیت و اسباب پر بحث کی ہے لیکن ہمارے لئے یہاں علم النفس کے عام تفصیلی طرز بحث سے ہٹ کر کسی قدر مختلف اور مختصر راہ زیادہ مناسب ہوگی،

نفسیات یقین

البتہ بنیاد بحث کے لئے استناداً کسی معتبر شہادت کا سامنے رکھنا ضروری ہے، جس کے لئے عہد حاضر میں امریکہ کے سب سے بڑے استاد نفسیات پروفیسر ولیم جیمس کا نام مستند ترین ضمانت ہو سکتا ہے، اس لئے پہلے ہم پروفیسر موصوف کی کتاب اصول نفسیات کے باب احساس حقیقت (جلد دوم) سے اسباب یقین کے متعلق چند اصولی باتیں بلفظہ نقل کرتے ہیں:

(۱) "معالجات و تدابیر شفا طلبی کے بارے میں انسان کی زود اعتقادی اسی قسم کے نفسی اسباب یعنی جذباتی احوال پر مبنی ہے، حتیٰ کہ جب کوئی محبوب دوست یا شخص خطرناک بیماری یا تکلیف میں مبتلا ہو تو ناگوار سے ناگوار نسخے بھی زود اعتقادی کی راہ میں نہیں حائل ہو سکتے، بخصوص عورتوں کے لئے جس نسخے میں کچھ بھی امید شفا ہو اس کے کرنے سے تسلی حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جو علاج بھی ایسی حالت میں تجویز کیا جائے وہ آتش گیر مادہ کے لئے چنگاری کا کام دیتا ہے۔ طبیعت فوراً اس پر عمل کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے، آدمی اس علاج کا سامان کرتا ہے اور کم از کم ایک دن کیلئے اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ خطرہ جاتا رہا ہے، لہٰذا معلوم ہوا کہ یقین آفرینی کے بڑے اسباب امید و بیم وغیرہ کے جذبات ہیں جن کے احاطۂ اقتدار میں ماضی، مستقبل اور حال تینوں داخل ہیں۔" (ص ۳۰۰، ۳)

اس کے بعد دوسرے ہی صفحہ پر ہے کہ:

(۲) "سب سے زیادہ یقین آفرین وہ نظریہ ہوتا ہے جو ہمارے محسوسات کی تشفی بخش توجیہ کے علاوہ ایسی چیزیں ہمارے سامنے پیش کرتا ہو جو سب سے زیادہ دلچسپ ہوں اور جو ہمارے حاسۂ

جمال پرستی اور جذباتی و عملی ضروریات کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہوں۔

لیکن ہم کو یہاں نفسیاتِ یقین کے متعلق اصل میں جس مختصر اقتباس کی شرح کرنی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

(۲) ارادہ (خواہش) اور یقین (جس کے معنی نفس اور اشیاء کے مابین ایک خاص تعلق کے ہیں) ایک ہی نفسیاتی واقعہ کے دو نام ہیں۔ (ص ۲۷)

خواہش یقین

ارادہ اور یقین کے ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے یقین کے لئے لازمی ہے کہ پہلے دل میں اس کے یقین کا ارادہ یا خواہش پیدا ہو، یقین ایک قسم کی تشفی ہے، جب تک اس کے لئے طلب و تشنگی نہ موجود ہو یہ نہیں حاصل ہوتا۔ پانی پینے اور اس سے سیراب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے پیاس لگے، لیکن اکثر پیاس لگنا ہی پانی پی لینے کے لئے کافی نہیں ہوتا بلکہ شرط یہ ہے کہ اس کے پینے سے کوئی روکنے والا خیال موجود نہ ہو، مثلاً پانی کا دشمن کے ہاتھ سے ملنا، اس کی ناپاکی کا شبہ یا کسی بیماری کے سبب سے اس کے مضر ہونے کا اندیشہ، اسی طرح نفس پیاس کے علاوہ کبھی کبھی ترغیبات کی موجودگی بھی پانی پینے پر آمادہ کر دیتی ہے، مثلاً گرمی کے موسم میں کسی دوست کے یہاں صفائی و نفاست کے ساتھ کوری کوری صراحیوں میں ٹھنڈا پانی رکھا ہو اور ان کے آس پاس لکھنؤ کے نازک کاغذی آبخورے چنے ہوں تو بے پیاس کے بھی پیاس لگ آتی ہے۔

موانع و مؤیداتِ یقین

یقین کی صورت میں ہم ان دونوں چیزوں کو علی الترتیب خواہش یقین کے موانع اور مؤیدات سے تعبیر کریں گے، جب کوئی چیز یقین و اذعان کے لئے پیش کی جاتی ہے تو خواہش اور اس کے موانع و مؤیدات میں باہم ایک نفسی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور یقین یا عدم یقین کا فیصلہ اس معرکہ آرائی کے آخری نتیجہ پر منحصر ہوتا ہے، اگر خواہش یقین زیادہ قوی ہے، تو وہ بلا مؤیدات کی امداد کے موانع پر غالب آ جاتی ہے، اگر موانع زیادہ قوی ہیں تو وہ خواہش کو مغلوب کر دیتے ہیں، اگر موانع سرے سے نہیں موجود ہیں تو تنہا خواہش کافی ہو سکتی ہے، یا اگر موانع بہت ہی معمولی درجہ کے ہیں تو ضعیف سے ضعیف خواہش بھی اپنے مؤیدات کی مدد سے ان کو زیر کر لے گی، عقلی یا منطقی دلائل کو زیادہ سے زیادہ انہی موانع و مؤیدات کی صف میں جگہ مل سکتی ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ اس معرکہ کے تینوں (خواہش، موانع اور مؤیدات) لڑنے والوں کا اصل عنصر جذبات ہی ہوتے ہیں۔

اب اوپر اقتباس اول میں جیمس نے جو مثال دی ہے اسی کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ یقین کے پیدا کرنے میں خواہش و ارادہ کو کیا دخل ہے، اور مؤیدات و موانع کا اس پر کیا اثر پڑتا ہے؟

فرض کرو کہ زید کے گھر میں ایک شخص مہینوں سے مریض پڑا ہے، طبی علاج کوئی کارگر نہیں ہوتا، ایک دوست آ کر کہتا ہے کہ شہر میں ایک متقی پرہیزگار بے طمع بزرگ ہیں جن کی دعا سے بہتوں کو فائدہ ہوا ہے، تم بھی ان کی طرف کیوں نہ رجوع کرو۔ ظاہر ہے کہ زید کے دل میں اس مریض کے لئے شفا طلبی کی خواہش موجود ہے، اب اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی (مانع) نہیں ہے تو بے تکلف دوست کے مشورہ پر عمل کے لئے آمادہ ہو جائے گا اور طبیعت میں کم از کم کچھ دیر کے لئے شفا کی ایک امید بندھ جائے گی جس کا نام میلانِ یقین ہے، اب بزرگ

موصوف کے پاس پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ اہلِ حاجت کا میلہ لگا ہوا ہے، پھر ان کے اتقا اور بے لوثی کی کچھ مثالیں آنکھ کے سامنے آتی ہیں لازماً ان چیزوں سے زید کے میلانِ یقین کی اور تائید و تقویت ہوتی ہے لیکن اگر اس کو بزرگوں سے بدعقیدگی ہے وہ نہایت سخت ملحد و مادہ پرست ہے تو ایسی حالت میں وہ دوست کے مشورہ پر عمل کرنے کی جگہ الٹے اس سے طرح طرح کی بحثیں کرنے پر آمادہ ہو جائے گا، دعا کے اثر کو قانونِ فطرت کے منافی بتائے گا، اس کی شہادت پر جرح کرے گا، جو لوگ ان بزرگ کے پاس حاجت لے کر جاتے ہیں ان کو اوہام پرست کہے گا اور اپنے اندر کوئی میلانِ یقین نہ محسوس کرے گا۔

البتہ اگر یہی مادہ پرست و بدعقیدہ زید ایک دولت مند آدمی ہے، مریض خود اس کا اکلوتا، نوجوان ہونہار لڑکا ہے، جو اس کی دولت کا تنہا وارث اور خاندان کا ایک ہی چراغ ہے، جس مرض میں اپنے بوڑھے باپ کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا یہ مرکز مبتلا ہے وہ نہایت خطرناک ہے، ڈاکٹر اور اطباء علاج کرتے کرتے تھک گئے اور جواب دے چکے ہیں، ان حالات میں زید کی خواہشِ شفاطلبی جس درجہ قوی ہوگی، معلوم ہے ان ہی مواقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ مصیبت میں خدا یاد آتا ہے، اب زید کی ساری بدعقیدگی دھری رہ جائے گی، دوست کا مشورہ اس کی مایوسیوں میں امید کی ایک جھلک ثابت ہوگا، اس کی انتہائی طلب و تشنگی، الحاد و مادہ پرستی کے تمام دلائل و موانع پر غالب آئے گی اور وہ بلا بحث و حجت دوست کے ساتھ ہو جائے گا اور جتنی ہی زیادہ اس کی خواہش قوی ہوگی اتنی ہی زیادہ امید و یقین کے ساتھ یہ ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوگا، لیکن اگر زید کے الحاد و بدعقیدگی کا جذبہ اتنا زبردست ہے کہ وہ اس کی قوی سے قوی خواہشِ شفاطلبی کو بھی زیر کر سکتا ہے تو بڑے سے بڑے بزرگ کی بزرگی بھی بے کار ثابت ہوگی اور دوست کی جانب سے دعا کی شفابخشی کے دلائل و شواہد کا اگر انبار بھی لگا دیا جائے تو رائیگاں جائے گا، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ میں غالباً اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، ایمان و یقین کا حاسہ قلب ہے، اگر وہ مختوم ہے تو پھر عقلِ انسانی کی کوئی منطق اس مختومیت کا ازالہ نہیں کر سکتی۔

ساحروں کے دل میں ذوقِ ایمان کی کچھ نہ کچھ تشنگی موجود تھی، حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھ کر بے اختیار سربسجود ہو گئے اور پکار اٹھے اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى لیکن کیا فرعون کے معاند و مختوم قلب پر بھی کوئی معجزہ اثر کر سکا؟ انبیائے کرام خصوصاً سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تمہارے سامنے ہے، سیرت النبی میں ابتدائی قبولِ اسلام کے صفحات پڑھو، ہر سطر ذوقِ ایمان و طلبِ یقین کے مذکورۂ بالا نفسی حقائق سے معمور ملے گی۔

نفسیاتِ یقین کی شہادت واقعاتِ سیرت سے

حضرت ابوذر غفاریؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ وہ بت پرستی سے متنفر ہو چکے تھے اور حق کی تلاش میں تھے، انہوں نے اپنے بھائی انیس سے کہا کہ تم مکہ جاؤ اور دیکھو کہ یہ شخص (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم و تلقین کیا ہے؟ انیس مکہ آئے اور واپس جا کر بیان کیا کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اور

کلام پیش کرتا ہے وہ شاعری سے الگ ہے۔ ان مؤیداتِ یقین کے بعد حضرت ابوذرؓ خود مکہ گئے اور گو اس وقت مکہ کی سرزمین پر اعلانِ اسلام کے لیے نہایت خطرناک مواقع موجود تھے، تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے بعد ذوقِ ایمان کی تشفی نے اتنا جوش پیدا کر دیا کہ عین حرم کے اندر حضرت ابوذرؓ نے نہایت بلند آہنگی سے اعلان کر کے کہا کہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔ اس اعلان کی بدولت جان بچنی مشکل ہوگئی۔[1]

حضرت حمزہؓ کو آپ سے خاص محبت تھی، آپ سے صرف دو تین برس بڑے تھے اور ساتھ کھیلے تھے، وہ گو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن آپ کی ہر ادا کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے، دل میں نورِ حق موجود تھا، آخر ان بے رحمانہ ایذاؤں نے جو دشمنانِ اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے تھے، اظہارِ اسلام پر بے تاب کر دیا، اظہار تو کر دیا لیکن گھر پر آئے تو متردد تھے کہ آبائی دین کو دفعۃً کیونکر چھوڑ دوں، تمام دن سوچتے رہے، آخر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ دینِ حق یہی ہے۔ موانع یقیناً موجود تھے لیکن دینِ حق کے قبول اور اس کے داعی کی حمایت کا جذبہ ان موانع سے قوی تر تھا۔

قیصرِ روم کے پاس جس وقت داعیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک پہنچا اور قیصر و ابوسفیان میں باہم جو گفتگو ہوئی اس کے بعد گو قیصر کے ضمیر میں ایمان و اذعان کی روشنی پیدا ہوئی اور اس نے کہا کہ مجھ کو یہ تو ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے، لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا، لیکن قیصر نے ابوسفیان سے جو گفتگو کی تھی اس سے بطارقہ اور اہلِ دربار سخت برہم ہو چکے تھے، نامہ مبارک پڑھے جانے کے بعد اور بھی برہم ہوئے، یہ حالت دیکھ کر قیصر نے اہلِ عرب کو دربار سے اٹھا دیا اور گو اس کے دل میں نورِ ایمان آ چکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی، تخت و تاج کی حرص دولتِ ایمان کی ترغیب سے قوی تر ثابت ہوئی۔

خسرو پرویز کے تاریک دل میں قیصرِ روم کے برابر بھی ایمان کی روشنی نہ تھی، اس پر طرہ یہ ہوا کہ عجم کا طریقہ یہ تھا کہ سلاطین کو جو خطوط لکھتے تھے ان میں عنوان پر پہلے بادشاہ کا نام ہوتا تھا، بخلاف اس کے نامہ مبارک پر پہلے خدا کا نام اور پھر عرب کے دستور کے موافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا، خسرو نے اس کو اپنی تحقیر سمجھا اور بولا کہ میرا غلام ہو کر مجھ کو یوں لکھتا ہے، پھر نامہ مبارک چاک کر ڈالا، لیکن چند روز کے بعد خود سلطنتِ عجم کے پرزے اڑ گئے۔

اسی قسم کے واقعات کی بنا پر مصنف سیرت نے اوائل دعوت میں اسلام لانے والوں اور اس کے مخالفین کے جو مشترک خصائص گنائے ہیں ان سے بھی تمام تر یقین کے انہی اصول و اسباب کی تائید ہوتی ہے جو اوپر بیان ہوئے ہیں، تفصیل کے لیے خود سیرت (جلد اول) کی طرف رجوع کرنا چاہیے، یہاں اختصار کے ساتھ صرف

---

[1] یہ پورا واقعہ پڑھنے کے لائق ہے، دیکھو سیرت النبی جلد دوم۔ [2] سیرت النبی جلد اول۔ [3] ایضاً، پورا مکالمہ پڑھو۔

[4] سیرت النبی جلد اول۔

ضروری خلاصہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

اسلام لانے والوں کے خصائص مشترک

(۱) اکثر وہ لوگ اسلام لائے جو پہلے سے تلاش حق میں سرگرداں اور فطرۃً نیک طبع وپاکیزہ اخلاق تھے، حضرت ابوبکرؓ، حضرت صہیبؓ اور حضرت ابوذرؓ وغیرہ کا شمار ان ہی طالبان حق میں ہے (خواہش یقین)

(۲) بعض صحابہ ایسے تھے جو احناف کے تربیت یافتہ تھے، یعنی وہ لوگ جو زمانۂ اسلام سے پہلے بت پرستی ترک کرچکے تھے اور اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کا پیرو کہتے تھے (موانع یقین کی کمی)

(۳) یہ امر سب میں مشترک تھا کہ یہ لوگ قریش کے مناصب نظم میں سے کوئی منصب نہیں رکھتے تھے بلکہ اکثر ایسے تھے مثلاً عمارؓ، خبابؓ، ابوفکیہہؓ، صہیبؓ وغیرہ جن کو دولت وجاہ کے صحن بارگاہ میں بھی راہ نہیں مل سکتی تھی (موانع کی کمی)

قریش سے بڑھ کر اسلام کا کون دشمن ہوگا، لیکن ان کی دشمنی کے کیا اسباب تھے؟

(۱) مکہ کی جو عزت تھی کعبہ کی وجہ سے تھی، قریش ہمسایگان خدا بلکہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے، جس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ کعبہ کے مجاور و کلید بردار تھے، عرب ایک مدت سے بت پرستی میں مبتلا تھا، خلیل بت شکن کی یادگار (کعبہ) تین سو ساٹھ معبودوں سے معمور تھی۔

اسلام کا اصلی فرض اس طلسم کو برباد کر دینا تھا، لیکن اس کے ساتھ قریش کی عظمت واقتدار اور رعب واثر کا بھی خاتمہ تھا، اس لئے قریش نے شدت سے مخالفت کی اور ان میں جن لوگوں کو جس قدر زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا، اسی قدر وہ مخالفت میں سرگرم تھے۔

(۲) قریش کو عیسائیوں سے بالطبع نفرت تھی، لیکن اسلام اور عیسائیت میں بہت سی باتیں مشترک تھیں سب سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں اسلام کا قبلہ بیت المقدس تھا، ان اسباب سے قریش کو خیال ہوا کہ آنحضرت عیسائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) ایک بڑا سبب قبائل کی خاندانی رقابت تھی، قریش میں دو قبیلے نہایت ممتاز اور حریف یکدگر تھے، بنوہاشم اور بنوامیہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خاندان بنوامیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتے تھے، اس لئے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔

(۴) ایک اور بڑا سبب یہ تھا کہ قریش میں سخت بداخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بداخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب نے حرم محترم کا غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس بن شریق نمام وکذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف بت پرستی کی برائیاں بیان فرماتے تھے، دوسری طرف ان بداخلاقیوں پر سخت دار و گیر کرتے تھے جس سے ان کی عظمت واقتدار کی شہنشاہی متزلزل ہوتی جاتی تھی، قرآن مجید میں پیہم علانیہ ان بدکاروں کی شان میں آیتیں نازل ہوتی تھیں۔

غرض اولاً تو ان قریش میں ایمان و یقین کی خواہش کا کوئی نشان نہیں ملتا، ثانیاً اگر بعض خواہش کچھ

موجود بھی ہوتی تو مذکورہ بالا موانع اس قدر زبردست تھے کہ جب تک یہ نہ ہٹا دیئے جاتے، اس خواہش کا ظہور ناممکن تھا۔

یقین کے متعلق اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ٹھہرتا ہے۔

(۱) بذات خود یقین، عام انسانی جذبات واحساسات ہی کی طرح کا ایک نفسی میلان یا ذہنی کیفیت ہے، فلسفہ وحکمت، بلکہ ریاضیات تک کے منطقی دلائل سے جو یقین پیدا ہوتا ہے، اس کی ماہیت بھی اسی نفسی میلان سے زیادہ میلان نہیں ہے۔

(۲) یقین کی بنیاد عقلی ونقلی تمام چیزوں میں یقین کی نفسی خواہش اور پھر اس خواہش کے موانع وموئدات کا وزن ہے۔

(۳) ان بنیادی اسباب یقین کی تعبیر تمام تر ان جذبات ومعتقدات اور مزعومات ومفروضات (علوم عقلیہ) سے ہوتی ہے جو کسی شے کے قبول ویقین کو پیش کرنے سے پہلے افراد یا جماعت کے نفس میں جاگزین ہو چکے ہیں۔

لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ معجزات کے یقین وقبول کے لئے کس قسم کے معتقدات کی نفس میں پہلے سے موجودگی لازمی ہے۔

غایت معجزات

معجزہ منطقی دلیل نہیں

اوپر آغاز کلام میں معجزہ کا جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ معجزہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، البتہ جو شخص مذہب کا قائل ہے، غیب پر ایمان رکھتا ہے اور اس سنت الٰہی کا معتقد ہے کہ بندوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے خدا ان ہی کے اندر سے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو اپنے پیام کے ساتھ بھیجتا رہا ہے، اس کے سامنے جب کسی مقدس انسان کی طرف سے اس پیام کے حامل یا نبی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ داعی الی اللہ اپنے ظاہری وباطنی کمالات اخلاقیہ واوصاف حمیدہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے برتر نظر آتا ہے تو اس شخص کے دل میں ایمان کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے، اب اگر اس پیغمبر سے کوئی معجزہ نما واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا اس کی طرف کسی معجزہ کا انتساب کیا جاتا ہے تو وہ اس کی صداقت کی ایک آیت یا نشانی کا کام دیتا ہے جس سے ذوق ایمان کی تقویت ہوتی ہے اور اس طرح ایمان کے تشنہ کام نفوس کے لئے ایک معنی کر کے معجزہ براہ راست خود نبوت کی نہیں، البتہ مدعی نبوت کی صداقت کی ایک نفسی دلیل بن جاتا ہے۔

معجزہ کی اصل غایت

اس دلیل یا آیت کی جو غرض وغایت ہو سکتی ہے اس کی نفسی حقیقت کو یوں سمجھو کہ مذہب کی بنیاد تمام تر اسرار وغیوب پر ہے، سب سے بڑا سر یا غیب بلکہ غیب الغیب خود خدا کا وجود اور اس کی ذات ہے، حشر ونشر، جن وملک، وحی والہام تمام چیزیں ایک عالم غیب ہیں، نبوت نام ہے اسی

عالمِ غیب کے ساتھ ربط و علائق کا۔ معجزہ میں بھی چونکہ ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے، یعنی وہ عالمِ ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا ہے، اس لئے جو شخص غیب پر ایمان رکھتا ہے اس کا نفس قدرتاً اسی یقین کی جانب مائل ہو جاتا ہے کہ جس برگزیدہ انسان سے معجزہ ظاہر ہوا ہے وہ عالمِ غیب سے خاص تعلق رکھتا ہے لیکن اگر کوئی شخص سرے سے ایمان نہیں رکھتا یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے معجزہ تصدیقِ نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے اور نہ آیت، کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی بات ہے کہ پہلے آدمی کا نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے اور وہ ہدایت خلق کے لئے انبیاء کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے، جو آدمی نقطہ، خط یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس ہی کا قائل نہیں اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو، جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لئے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازم ہے، اسی طرح تفصیلاتِ مذہب پر یقین کرنے کے لئے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے۔

مل نے ہیوم کے انکارِ معجزات کی تنقیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جو شخص کسی فوق الفطرت ہستی اور انسانی معاملات میں اس کی مداخلت کا پہلے ہی سے قائل نہیں ہے اس کے سامنے اگر کسی انسان کی نسبت فوق الفطرت یا خارق عادت باتوں کی روایت کی جاتی ہے تو وہ ان کو معجزہ نہ مانے گا، معجزات سے خود خدا کا وجود نہیں ثابت کیا جا سکتا اس لئے اگر خدا کا اعتقاد پہلے ہی سے نہ موجود ہو تو کسی فوق الفطرت ہستی کی مداخلت کے علاوہ معجزنما واقعات کی اور بھی توجیہات ممکن ہیں، یہاں تک تو ہیوم کی دلیل بامعنی کہی جا سکتی ہے لیکن اگر ایک ایسی ذات کا وجود قطعی یا غالب طور پر بھی مان لیا جائے جو موجودہ نظامِ فطرت کی خالق ہے اور اس لئے اس میں تغیر و ترمیم بھی کر سکتی ہے تو ہیوم کی دلیل بے معنی ہو جاتی ہے، جب تم نے خدا کو مان لیا تو پھر جس شے کو اس کے ارادہ نے پیدا کیا تھا اس پر اس ارادہ کا براہ راست عمل و اثر خواہ مخواہ کا فرض نہیں رہتا بلکہ ایک سنجیدہ امکان بن جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں سوال کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور خدا کی مداخلت یا عدم مداخلت کا فیصلہ اس بحث پر منحصر ہوتا ہے کہ کائناتِ فطرت میں اس کی سنتِ عمل کیا رہی ہے یا عقلاً کیا رہنا چاہیے"[1]

غرض معجزہ کو معجزہ سمجھ کر اس کے یقین و قبول کی اولین شرط یہ ہے کہ آدمی پہلے غیب (خدا و مذہب) پر ایمان رکھتا ہو، اس کے بعد دیکھو کہ معجزہ کی مذکورہ بالا غایت اور اس پر یقین کی اولین شرط کو پیش نظر رکھ کر وقوعِ معجزہ

---

[1] دیکھو THREE ESSAYS ON RELIGION (مذہب پر تین مضامین) مطبوعہ ریشنلسٹ پریس ۱۹۰۹ء نیز نظام منطق کتاب سوم باب ۲۵ فصل ۲، اسی میں مل نے ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے وہ یہ کہ خدا کو مان لینے کے بعد معجزہ کو قانونِ فطرت کا سرے سے خارق ہی نہیں کہا جا سکتا، پتھر کو اوپر پھینکو اور کوئی شے بیچ میں مانع یا عائق نہ ہو تو اس صورت میں اس کا زمین پر لوٹ کر نہ گرنا یا ہوا میں معلق رہنا بے شک خلافِ فطرت ہو گا لیکن اگر اس کو بیچ میں کوئی روک لے تو زمین پر نہ گرنا خارق عادت نہ ہو گا کیونکہ مانع موجود ہے، معجزہ کی صورت میں جو ارادۂ خداوندی معمولی سلسلۂ علل و اسباب کا خالق ہے وہی اس کے عمل سے مانع ہو جاتا ہے لہٰذا معجزہ نہ خلافِ فطرت ہے اور نہ بلا علت، کیونکہ عملِ علت کی شرط تو یہ ہے کہ کوئی مانع نہ موجود ہو اور یہاں مانع موجود ہے۔

کی مختلف صورتیں یا توجیہات کیا ہو سکتی ہیں؟ جزئی شقوق یا فروعی احتمالات سے قطع نظر کرکے جن سے قدیم و جدید علم کلام کا دفتر پر ہے، اصولی طور پر صرف وہی دو صورتیں نکلتی ہیں جن کی جانب مل نے اقتباس بالا میں اشارہ کیا ہے۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خدا نے کارخانۂ عالم چلانے کے لئے کچھ اصول و قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن کے مطابق اس کل کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر کام کرتا رہتا ہے اور ارادۂ الٰہی اپنی اس سنت جاریہ میں کبھی کسی حالت میں کوئی تغیر و تبدیل نہیں کرتا، بقول اسپنوزا کے کہ خدا کی خدائی اور اس کی حقیقی عظمت و حکمت کا اظہار اسی سے ہوتا ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر نظام کا پابند ہو، قدرت خداوندی کے معنی یہی ہیں کہ کارخانۂ فطرت اپنے ازلی یا اٹل قوانین کا تابع ہے[1]۔

اس احتمال کی رُو سے معجزہ کا وقوع بھی ان ہی ازلی قوانین کی کسی نہ کسی ایسی کارفرمائی کے ماتحت ہونا چاہئے جس کا کم از کم ظہور معجزہ کے وقت عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا اور اس لئے معجزہ جو دراصل محض ایک فطری واقعہ ہوتا ہے، بظاہر لوگوں کو معجزہ نظر آتا ہے، مثلاً جس وقت تک عمل تنویم کے نفسی قوانین فطرت کا انکشاف نہیں ہوا تھا عصائے موسیٰ کا اژدہا بن جانا معجزہ تھا لیکن آج اس نفسی قانون کے جاننے والوں کے لئے کرسی کا شیر بن جانا فطری واقعہ ہے اور عصائے موسیٰ کے اژدہا نظر آنے کی بھی اس سے توجیہ کی جا سکتی ہے۔

لیکن اس توجیہ سے یہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں یہ واقعہ معجزہ نہ تھا اس لئے کہ اس زمانہ تک معجزہ کی وہ غایت جس کا ابھی اوپر ذکر آچکا ہے، اس واقعہ سے پوری طرح حاصل تھی یعنی اس میں ایک طرح کا غیب پایا جاتا تھا اور اس کا وقوع عالم ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا تھا لہٰذا اس سے نبی کی تصدیق کا جو عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے، نفس میں میلان پیدا ہو سکتا تھا جیسا کہ ساحروں کے نفس میں پیدا ہوا، انہوں نے حضرت موسیٰؑ کے نبی ہونے کی تصدیق کی۔

البتہ آج یہ واقعہ البرٹ مول یا ولیم جیمس کے سامنے بیان کیا جائے تو وہ اس کو بجائے معجزہ کے صرف ایک فطری واقعہ سمجھنے کا حق رکھتے ہیں، اس لئے اب اگر کوئی نبی یا ولی اپنی نبوت یا ولایت کی تصدیق کا میلان کسی معجزہ یا کرامت کے ذریعہ سے مول اور جیمس وغیرہ کے دل میں پیدا کرنا چاہے تو کوئی ایسی نشانی ظاہر کرنا ہوگی جس کی توجیہ سے ان کا موجودہ علم اسی طرح عاجز ہو جس طرح کہ انبیائے سابقین کے زمانہ میں ان کے معجزات کی توجیہ سے اس وقت کا علم عاجز تھا یا بعض کی توجیہ سے اب بھی عاجز ہے، مثلاً شق قمر، لیکن اصل یہ ہے کہ عمل تنویم کے تجربات میں اگر تھوڑی سی قیاسی وسعت اور پیدا کر لی جائے تو شق قمر وغیرہ تقریباً ہر قسم کے خوارق کی توجیہ ہو سکتی ہے کیونکہ اس عمل کا دارومدار تمام تر عامل کی قوت اثر آفرینی اور معمول کی اثر پذیری پر ہے، یہ نفسی تاثیر و تاثر کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے جس کی ادنیٰ مثالیں ہم کو روزانہ کی معمولی زندگی میں ملتی رہتی ہیں، ہماری زبان کی ایک عامیانہ مثل ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، جس کے یہی معنی ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے اوضاع و اطوار سے

---

[1] اسپنوزا جدید فلسفہ کا ایک نامور امام ہے دیکھو اس کا مجموعہ تصنیفات SPINOSA'S WORK جلد اول باب ۶ بحث معجزات۔

اثر پذیر ہوتا ہے، نیک صحبت کے فوائد اور بری صحبت کے مضار کا بھید بھی انہی میں تاثر ہے، جس قدر کسی شخص کی قوت ارادی یا قوتِ تاثیر زبردست ہوتی ہے اسی قدر زیادہ وہ دوسروں پر اثر ڈال سکتا ہے، دنیا کے اکابر رجال کی کامیابی کا ایک بڑا راز یہی قوت رہی ہے، ان کے عزم کا لوگوں پر جو اثر پڑتا ہے وہ دوسروں کے دلائل و براہین کا نہیں پڑتا، آج بھی بہترین زندہ مثال گاندھی جی ہیں، انہوں نے جس درجہ کے افراد و اعیانِ ملک سے حکم منوا لیا ہے اور اپنی سیدھی سادی گفتگو اور تحریروں سے جس طرح اس کی خوبیوں کا یقین ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے دل میں پیدا کر دیا ہے، وہ بڑی حد تک اسی قوت کا کرشمہ ہے، ورنہ ملک میں ان سے زبردست خطیب انشاپرداز اور منطقی سیکڑوں مل جائیں گے، لیکن اثر آفرینی کا یہ جوہر جو کسی کی تقریر، کسی کی تحریر اور کسی کے دلائل میں نہیں ملتا۔ غرض اثر آفرینی کی یہی قوت ہے جس کو عامل تنویم مشق سے بڑھا کر حق کو شیر اور جھاڑو کو حسین عورت بنا دے سکتا ہے۔

ان واقعات کی بنا پر ہم کو یقیناً اپنے قیاس میں اتنی توسیع کا حق حاصل ہے کہ ماہرین تنویم یا عام اکابر رجال و مصلحین کی قوتِ اثر آفرینی کے مقابلہ میں انبیائے کرام کی وہبی روحانی قوتِ تاثیر و نفوذ کا مرتبہ کہیں زیادہ اصلی و رفیع ہوتا ہے اور اسی لئے وہ ان سے بھی بدرجہا زیادہ عجیب تر و محیر العقول امور کا یقین لوگوں کے دل میں پیدا کر دے سکتے ہیں، عامل تنویم اثر آفرینی کے لئے کچھ نہ کچھ ظاہری حرکات و سکنات یا الفاظ و خطاب کا محتاج ہوتا ہے اور اس کا زیادہ تر اثر افراد تک محدود رہتا ہے لیکن نبی کی اصلی اور روحانی قوتِ تاثیر کے لئے صرف باطنی ارادہ کافی ہو سکتا ہے، اور اس کا اثر افراد سے بڑھ کر جماعت تک کو محیط ہو سکتا ہے۔

البتہ یہاں ایک وسوسہ دل میں پیدا ہوگا جس کا دور کر لینا ضروری ہے وہ یہ کہ معجزہ کی اس توجیہ کو قبول کرنے سے نتیجہ یہ ہوا، گویا اس کی حقیقت ایک طرح کے سحر، نظربندی یا فریبِ حواس سے زیادہ نہیں ہے، یعنی جس شخص کو کوئی معجزہ نظر آتا ہے، اس کا وجود خود اس شخص کی نظر، حواس یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ذہن سے باہر کسی خارجی و حقیقی شے کی صورت میں نہیں ہوتا۔

بعض وسوسوں کا جواب

اوپر معجزہ کی جو غایت معلوم ہو چکی ہے اس کے لحاظ سے اس وسوسہ کا صاف جواب تو یہ ہوگا کہ وہ غایت ہر نوع حاصل ہے، معجزہ فی نفسہ چاہے کوئی خارجی شے ہو یا محض ذہنی، اصلی غرض صرف اتنی ہے کہ جس فرد یا جماعت کے سامنے کوئی معجزہ پیش کیا جائے اس کے علم کے لحاظ سے وہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ غیب رکھتا ہو، ہاں بظاہر اس سے بھی ایک اور قوی تر اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں پیغمبر اور عامل تنویم یا ساحر میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ اس اشکال کا حل بھی ضمناً اوپر ہی گزر چکا ہے معجزہ بجائے خود نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، بلکہ جس شخص میں ظاہری و باطنی کمالات یعنی اصلی جمالِ معنی نبوت و اوصاف حمیدہ عام انسانوں کے مقابلہ میں فوق العادۃ حد تک مجتمع ہوتے ہیں، اس کے حق میں معجزہ محض تائید

۱؎ انگریزی میں اس اثر آفرینی کے لئے (SUGGESTION) کی اصطلاح ہے جس کی پوری حقیقت کو تجربات اور مثالوں سے سمجھنے کیلئے انگریزی داں حضرات ڈاکٹر سڈس کی دلچسپ کتاب "نفسیات اثر آفرینی" (THE PSYCHOLOGY OF SUGGESTION) کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

مزید کا کام دے سکتا ہے اور جس شخص پر نبوت کے باطنی خصائص و کمالات روحانی موثر نہ ہوں وہ بلا شبہ نبی کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک بڑا ساحر قرار دے گا جیسا کہ منکرین نے ہمیشہ کہا ہے کہ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ۔ إِنَّ هٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ۔ قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ۔ وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُسْتَمِرٌّ۔

لیکن اس وسوسہ کا کہ توجیہ بالا کی بنا پر معجزہ کی حقیقت کسی خارجی و واقعی وجود کی جگہ محض ایک ذہنی یا خیالی وہم کی رہ جاتی ہے، تحقیقی جواب دراصل مابعد الطبیعیات سے متعلق ہے جو تمام عقلی موشگافیوں کی آخری عدالت مرافعہ ہے، مگر اس عدالت کا آخری فیصلہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ حقیقی یا واقعی وجود صرف خارجی چیزوں کا ہے، بلکہ اس کے نزدیک تو یہی امر سرے سے مشتبہ ہے کہ خود خارج کا کوئی وجود ہے اور اساطین فلسفہ کی ایک بڑی جماعت (تصوریہ) کا مسلک یہ ہے کہ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔ حقیقی وجود صرف روح، ذہن یا نفس کا ہے، باقی دریا، پہاڑ، چاند، سورج، زمین و آسمان جو کچھ دیکھتے ہو یہ سب تمہارے ذہن ہی کے اندر ہیں، مادہ اور عالم مادی محض ایک "وہم و گمان" ہے۔ اس جماعت نے عالم خارجی کی ایک توجیہ یہ کی ہے کہ جن چیزوں کو ہم موجودات خارجی سمجھتے ہیں وہ صرف ذہن کے تصورات ہیں جو خدا ہمارے اندر پیدا کر دیتا ہے۔ اسی راز کی طرف اکبر مرحوم نے باتوں باتوں میں اس طرح اشارہ کیا ہے کہ جو کچھ ہے سب خدا کا وہم و گماں ہمارا۔ لہٰذا جس ذات یا قوت نے سارے ذہن میں "عصائے" موسوی اور ثابت و مسلم قمر کا تصور پیدا کیا تھا، اسی نے اگر تھوڑی دیر کے لیے عصا کی جگہ اژدہا اور قمر مسلم کی جگہ شق قمر کا تصور پیدا کر دیا تو دونوں کے وجود کی حقیقت و نوعیت میں کیا فرق پڑا؟

سائنس جس کا جذبۂ مادہ پرستی دلائل سے لاجواب اور خود مادہ کو غیر مادی و غیر جوہری کہنے کے باوجود مادیات کے وجود خارجی سے یک قلم دست برداری پر راضی نہیں اور اس تار عنکبوت میں کسی نہ کسی طرح الجھا رہنا ہی پسند کرتا ہے

---

[1] متکلمین اسلام کے ہاں سحر و معجزہ کی بحث ایک مستقل مسئلہ ہے لیکن ان میں بھی اہل تحقیق کا مسلک یہی ہے کہ دونوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ہے بعضوں کے نزدیک تو محض استعمال کا فرق ہے یعنی انبیا اور اولیا اپنے نفس کی قوت معجزنمائی کو مقاصد خیر کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ساحر مقاصد شر کے لئے (رسالۃ الراغب ص ۱۱) مولانا حمید الدین فراہی جن سے بڑھ کر موجودہ دنیائے اسلام میں شاید ہی کسی کو فہم قرآنی کی سعادت حاصل ہو وہ بھی لا یفلح الساحرون سے یہی نتیجہ اخذ فرماتے ہیں کہ معجزہ اور سحر میں صرف یہ فرق ہے کہ ساحر فلاح یاب نہیں ہوتا یعنی وہ اپنی قوت سحر کو خود اپنے یا دوسروں کے لئے فلاح و خیر کے اغراض میں استعمال نہیں کرتا بلکہ علی العموم جادوگروں کی اخلاقی حالت نہایت پست ہوتی ہے لیکن "لا یفلح الساحر حیث اتی" کی نص قرآنی کا زیادہ صاف و صحیح مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساحر کا سحر جب نبی اور اس کے معجزہ کے مقابلہ میں آتا ہے تو وہ مغلوب و ناکام رہتا ہے جیسا کہ عصائے موسیٰ کے مقابلہ میں ظاہر ہوا اس سے سحر و معجزہ میں جب کہ دونوں میں مقابلہ ہو ظاہری فرق و تمیز کا بھی ایک یقینی معیار ہاتھ آ جاتا ہے، باقی دونوں کی باطنی حقیقت میں کیا فرق ہے، یہ تو فن سحر کا عالم ہی جان سکتا ہے جیسا کہ تمام فنی حقائق میں معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ کے مقابل ساحروں نے فرق جان لیا تھا۔ مابعد الطبیعیات کے اس نازک مسئلہ کی توضیح کی گنجائش یہاں نہیں نکالی جا سکتی، البتہ دور جدید میں تصوریت کے بانی اول برکلے کا فلسفہ اردو میں منتقل ہو چکا ہے جو لوگ فلسفہ کا ذوق رکھتے ہیں وہ تو اس کی اصل کتاب "مکالمات" ہی کا مطالعہ کر سکتے ہیں، عام لوگ شاید فلسفہ برکلے سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے (مطبوعہ دار المصنفین)

وہ بھی کم از کم محسوسات کی نسبت تو یہ ماننے پر مجبور ہی ہے کہ رنگ و بو، آواز و مزہ، سردی و گرمی وغیرہ کا وجود صرف ایک ذہنی احساس یا تصور ہے جس کو مادہ نامی کوئی "نامعلوم شے" ہمارے ذہن میں خلق کر دیتی ہے اور جس کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں، جب رنگ اور آواز جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں، اس کے حقیقی و واقعی وجود کے صرف اتنے ہی معنی ہیں کہ ہم اس کا احساس و تصور رکھتے ہیں، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ معجزات کے وجود کو ہم اس سے زیادہ حقیقی و واقعی ثابت کرنے کی کوشش کریں۔

ایک اور اعتراض

یہ تو وہ شبہات تھے جو معجزہ اور سحر و تنویم کی یکسانی یا معجزات کے محض ذہنی وجود کی بنا پر پیدا ہوتے تھے، لیکن ایک اور اعتراض معجزہ کی تمام ان توجیہات پر وارد ہوتا ہے جن کی رو سے یہ فطرت کے معمولی غیر متغیر قوانین اور علل و اسباب (چاہے وہ نفسی ہوں یا طبعی و مادی) ہی کے کسی نہ کسی ایسے مخفی عمل کا معلول کیا جاتا ہے، جس کا ظہور معجزہ کے وقت تک عام لوگوں کو علم نہیں ہوتا، یہ ایک اعتراض معجزہ کے اضافی ہونے کا ہے۔ فرض کرو کہ شق قمر کی علت خواہ تنویم کی طرح کوئی نفسی قانون ہو یا کیمیاوی جذب و انفصال کی طرح جو چاند کے مختلف اجزا کو باہم ملحق کئے ہوئے ہے، کوئی ایسا مادی قانون دفع و افتراق ہو جس نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے ہوں، ان دونوں صورتوں میں شق قمر صرف اسی وقت تک معجزہ ہے جب تک کہ اس کے نفسی یا مادی قوانین و علل کا انکشاف نہیں ہوتا، اسکی پیام رسانی کے انکشاف سے پہلے اگر کوئی شخص ہندوستان میں بیٹھ کر ایک سکنڈ میں امریکہ کا کوئی واقعہ معلوم کر لیتا تو یہ کسی معجزہ سے کم نہ ہوتا، لیکن اب معمولی بات ہے۔

بے شبہ اس معنی کر کے معجزہ یقیناً اضافی شے ہے اور ہمیشہ رہے گا، کوئی معجزہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جو اس احتمال اضافیت سے خالی ہو کیونکہ انسان کا علم ہی تمام تر اضافی ہے اگر اس کا علم قطعی و مختتم طور پر تمام قوانین فطرت کا احاطہ کر سکتا تو البتہ کسی حد تک معجزہ کی نسبت یہ مطالبہ بجا ہو سکتا تھا کہ ابدالآباد تک کسی قانون فطرت سے اس کی توجیہ نہ ہونی چاہیئے، لیکن جب ہمارا علم ہی اضافی ہے تو کوئی معجزہ احتمال اضافیت سے کیسے خالی ہو سکتا ہے؟ ایک مدعی نبوت یہ اعجاز دکھلا سکتا ہے کہ ایک ہفتہ تک آفتاب غروب نہ ہو لیکن اس کا قطعی یقین کیسے دلایا جا سکتا ہے کہ آگے چل کر علم ہیئت کے انکشافات سے اس اعجاز کی توجیہ نہ ہو سکے گی؟ لہذا جو شے آج معجزہ ہے بالفرض کل وہ طبعی واقعہ ثابت ہو جائے تو بھی اس سے آج اس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا اور معجزہ کی غرض و غایت کو پورا کرنے کے لئے اسی قدر کافی ہے (دیکھو ص ۱۷۳)۔

۲۔ دوسری صورت

یہ ہے کہ عام طور پر تو کارخانۂ کائنات ایک مقررہ سنت یا بندھے ہوئے قوانین ہی کے ماتحت چلتا رہتا ہے، لیکن کبھی کبھی خدا اپنے مرسلین و مقربین کی تائید غیبی کے لئے اس سنت جاریہ میں مداخلت اور تغیر و تبدل کو بھی جائز رکھتا ہے، خواہ یہ تغیر و تبدل فطرت میں کسی نئے حذف و اضافہ کی وساطت سے ہو، یا اس کا منشا براہ راست ارادۂ الٰہی ہو اور جس طرح اسپنوزا کے نزدیک، خدا کی خدائی اس میں نظر آتی ہے کہ عالم ایک بندھے ہوئے غیر متغیر نظام کا پابند ہو اسی طرح بہت سے فلاسفہ اپنی عقل کو اس پر مجبور پاتے ہیں کہ ہر معلول کی براہ راست علت فطرت کی کوئی قوت نہیں بلکہ ایک ہستی برتر کا ارادہ ہے۔ ان

فلاسفہ کے نزدیک وقوعِ معجزہ کے لئے بھی ارادۂ الٰہی کی براہِ راست مداخلت ہی والا احتمال زیادہ قابلِ قبول ہوگا۔

اس صورت کے مختلف احتمالات

صورتِ مداخلت کے ان احتمالاتِ ثلٰثہ میں اگرچہ کوئی قطعی تفریق ہر جگہ نہیں کی جاسکتی، تاہم جو موٹا سا فرق کیا جاسکتا ہے اس کو ان مثالوں سے سمجھ لینا چاہیئے۔

(۱) عام قانونِ فطرت یہ ہے کہ انسان کا بچہ بلا اتصالِ جنسی نہیں پیدا ہوتا لیکن اس اتصالِ جنسی سے جو مادۂ تولید رحمِ مادر میں داخل ہوتا ہے، اس کو اگر خدا خود رحم کے اندر ہی پیدا کردے جس طرح کہ اور بہت سی رطوبات جسم میں پیدا ہوتی رہتی ہیں تو بلا اتصالِ جنسی لڑکا پیدا ہوسکتا ہے اور مداخلتِ خداوندی کی یہ صورت فطرت میں ایک نئے عارضی اضافہ کی وساطت پر مبنی ہوگی، ممکن ہے کہ ولادتِ مسیح میں خدا نے اپنی مداخلت کی اسی صورت سے کام لیا ہو۔

(۲) اسی طرح اضافہ کے بجائے حذف کی مثال یہ ہوسکتی ہے کہ چاند کے مختلف اجزا جس کیمیاوی جذب و اتصال کی قوت سے آپس میں پیوستہ ہیں، ان میں سے صرف اس حصۂ قوت کو جو چاند کے نصفین میں موجبِ اتصال ہے تھوڑی دیر کے لئے خدا حذف یا سلب کرلے جس سے شقِ قمر کا معجزہ ظاہر ہوسکتا ہے۔

(۳) تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی مادی واسطہ کا حذف و اضافہ کئے بغیر براہِ راست خدا نے صرف ارادۂ "کن فیکون" سے قمر کو شق اور مسیح کو پیدا کردیا ہو۔

یہی آخری صورت عمیق النظر فلاسفہ و متکلمین اور اہلِ حق کا مذہب ہے، بلکہ تنویمی احتمال کی تو خود کلامِ مجید کی رو سے گنجائش نہیں، اس لئے کہ تنویم کا عمل اس کے عامل کے علم و ارادہ کے تحت ہوتا ہے اور معجزات میں انبیاء علیہم السلام کے علم و ارادہ کو قطعاً دخل نہیں ہوتا، اسی لئے وہ فرمائش و تحدی پر کسی آیت یا معجزہ کو خود پیش کر سکنے سے عجز کا صاف اعتراف اور اس امر کا غیر مشکوک اعلان کرتے ہیں کہ آیات تو صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں (انما الآیات عند اللہ، انما الآیات عند ربی) اور اگر رسول ان کو پیش کرتا یا کرسکتا ہے تو صرف اللہ ہی کے براہِ راست حکم و اذن سے، خود کسی رسول میں ہرگز اس کی طاقت نہیں کہ اللہ کی مرضی و مشیت کے بغیر کوئی آیت یا معجزہ پیش کرسکے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ اَنْ يَّاْتِیَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

اگر عاملِ تنویم کی طرح انبیاء علیہم السلام اپنے ہی علم و ارادہ سے معجزات ظاہر کرتے ہوتے تو حضرت موسیٰؑ اپنے عصا کو سانپ کی صورت میں ظاہر فرما کر خود اسی سے کیوں ڈرتے اور پھر اس کے عصا بنا دینے کو اللہ تعالیٰ براہِ راست اپنی طرف کیوں منسوب فرماتا کہ ڈرو نہیں ہم اس کو پھر ابھی چھڑی ہی بنا دیں گے۔ لا تخف سنعیدھا سیرتھا الاولیٰ۔

باقی اور جتنے احتمالات اوپر بیان ہوئے وہ بھی بس احتمالات و تاویلات ہی کے درجہ میں ہیں لیکن تاویل خواہ بعید ہی ہو تکذیب کے مقابلہ میں اہون ہے، لہٰذا یہ درحقیقت ایسے طفل مزاج عقل پرستوں پر

اتمامِ حجت اور انکار و تکذیب کی راہ سے ان کو بچانے کے لئے ہیں، مگر بچوں کی طرح مٹھائی "عقل" کا نام لئے بغیر کسی اعلیٰ حقیقت کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے اور جن کی عقل، عقل کے نام سے اتنی مرعوب ہے کہ خود عقل کی نارسائی تک بھی رسائی نہیں پاسکے ہیں۔

اصل بحث و توجہ کی بات ایک ہی ہے کہ سارے کارخانۂ فطرت کی اساس و بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مبدء ہے یا اندر باہر انفس و آفاق میں جو کچھ بھی ہے اور ہوتا ہے تمام تر بالذات و براہِ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیت و قدرت کا ظہور ہے۔ فلسفہ اور فلسفیانہ عقل کے لئے ایک طرف تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے یا ہو رہا ہے، وہ ایک ہی ہستی کی جلوہ فرمائی و کار فرمائی کے مظاہر ہیں اور فلسفۂ تصوریت کی رُو سے (جس کا جدید فلسفہ میں خصوصاً دور دورہ رہا ہے) یہ ہستی اسی نوعیت کی ہے جس کو ہم شاعر بالذات، نفس و روح یا انا و ایغو سے تعبیر کرتے ہیں۔ باقی مادہ و طبیعت یا مادی و طبیعی عوامل و قوانین کی ساری تعبیرات و اصطلاحات دفتر بے معنی ہیں۔ ؎

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا
ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

نئی بات جو سائنس اور سائنس دانوں کے نام سے مرعوب ذہنوں اور عقلوں کے لئے خصوصاً لائق توجہ ہے یہ ہے کہ مادہ کی بظاہر جس ٹھوس چٹان پر مادیت یا طبیعی عوامل و قوانین کی پوری عمارت کھڑی تھی وہ خود نئی طبیعیات ہی میں برف کی طرح پگھل رہی ہے، اب ازلی و غیر فانی مادہ اور ٹھوس سالمات پرانا افسانہ ہو چکے ہیں قائم بالذات جوہر کی حیثیت سے مادہ کو اب کوئی اساسی حقیقت نہیں تسلیم کیا جاتا، وہ اب محض برقی توانائی یا برقیات میں گم ہو کر رہ گیا ہے، لیکن خود برق یا برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے، کوئی نہیں جانتا، یہی نہیں بلکہ مادہ کو کسی معنی میں بھی موجود جاننے کے لئے عام انسانی ذہن و دماغ کے لئے کم از کم اتنا سہارا ناگزیر تھا کہ وہ کسی جگہ (یا مکان میں) موجود ہے، لیکن نظریۂ اضافیت نے اس آخری سہارے کو بھی چھین لیا۔

> "مادہ جو ہماری عام عقل و فہم کے لئے ایک موجود فی المکان اور قائم فی الزمان جوہر تھا اور کائنات نام تھا مادہ کے ڈھیروں ڈلوں یا ایسے مادی جوہروں کا جو خاص خاص قوانین کے مطابق زمان و مکان میں ادھر سے اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ اب جو بڑا انقلاب سائنس کے نقطۂ نظر سے برپا ہوا ہے وہ صحیح معنی میں اسی واقعہ کا نتیجہ ہے کہ مادہ اور زمان و مکان سرے سے تین جداگانہ حقائق ہی نہیں قرار دیئے جاتے"[1]

ایک عامی آدمی عریاں الفاظ میں اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہے کہ مادہ نہ کسی جگہ ہے نہ کسی وقت میں یعنی نہ کسی زمان میں، تو پھر ہے کے کیا معنی؟ اضافیت کے اس شاہکار کو پوری طرح سمجھنا سمجھانا تو اعلیٰ ریاضیات کے ماہرین ہی کا کام ہے، ہم عامیوں کو سچ پوچھئے تو ایسے مادہ کی نسبت جو زمان و مکان سے الگ یا مستقل بالذات ہو کر کسی جگہ اور وقت میں یا زمان و مکان کے مظروف کی حیثیت سے نہ پایا جاتا ہو بے ساختہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ

---

[1] فلسفۂ مذہب مقدمہ صفحہ ۱۵۱۔

ریاضیات نے تحلیل کرتے کرتے ہماری خارجی (یا مادی) دنیا کو قریباً عدم تک پہنچا دیا ہے[1]۔ اور یہ تو بہر حال واضح ہوگیا ہے کہ کائنات کو کوئی مشین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ پرانی مادیت دیوالیہ ہو چکی ہے یعنی وہ مادیت جو کائنات، زندگی اور ذہن سب کا محض ایک مادی تصور رکھتی تھی[2]۔ اسی طرح سائنس و ریاضی کے جھروکوں سے بھی فلسفیانہ تصوریت ہی جھانکنے لگی ہے حتیٰ کہ:۔

”سائنس دانوں کو طبعی کائنات میں کسی اساسی خارجی یا معروضی حقیقت کی جستجو میں معلوم ہوا ہے کہ کوئی خارجی حقیقت اگر سرے سے ہو بھی، تو وہ کوئی ایسی نہایت ہی عجیب و غریب شے ہوگی جو کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آتی تھی۔ ایڈنگٹن نے نظریۂ اضافیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو طبعیات کی بلند و برتر جدید ترقی کوانٹم تھیوری تک پہنچ کر ہم نے خارجی حقیقت کی جستجو کے مقصد کو ترک کر دیا ہے اور طبعی کائنات کی ایسے عناصر میں تحلیل کرنا پڑی ہے جو صراحتہً ذہنی (SUBJECTIVE) ہیں۔ اگر خارجی دنیا کو جاننے میں ہمارے لئے خود اپنے ذہنی عنصر کو جدا کرنا مشکل ہے تو خود داں (SELF KNOWING) شعور کے مسئلہ میں جہاں ذہن و عالم (یعنی جاننے والا اور جانا گیا) حقیقتہً ایک ہو جاتے ہیں اس کو جدا یا ممتاز کرنا کہیں زیادہ مشکل ہوگا[3]۔“

غرض فلسفہ کے بعد سائنس میں بھی ہوا کا رُخ جس طرح تصوریت یعنی اس خیال کی طرف جا رہا ہے کہ ساری کائنات اور اس کی نیرنگیاں بے شعور مادہ کی میکانکی کارستانیاں نہیں بلکہ ذہن و شعور کی کارفرمائیاں ہیں، تو تمام سائنسدان نہ سہی لیکن سائنسدان فلسفی کی حیثیت سے سر جیمس جینس، ماکس پلانک، شروڈنگر، آئنسٹائن وغیرہ جیسے رجال سائنس کا تصوریت کی جانب رجحان بڑھتا جا رہا ہے اور کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں، جیسا کہ سر جیمس جینس کا صاف اعتراف ہے کہ میرا رجحان تصوریہ کے اسی نظریہ کی طرف ہے کہ اساسی و بنیادی حقیقت شعور ہے اور مادی کائنات اس سے ماخوذ ہے (ماڈرن بلیف ص ۵۲۰)

مذاہب کا وجود اسی ذی شعور و ذی علم اساسی سرچشمۂ کائنات کے سوا کیا ہے اور جب ساری کائنات ہی کسی نہ کسی طرح اس کے علم و شعور سے ماخوذ یا اس کی مخلوق ہے تو معجزات کے مادی یا میکانکی عوامل و قوانین کی جستجو خود عقل کی رو سے کون سی عقلمندی کا کارنامہ ہے۔ عقل و دانش کی بات تو بس وہی اکبر الہ آبادی کی ہے۔ ؎

تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

یقینِ معجزہ کے شرائط

غرض یقینِ معجزہ کی اولین شرط خدا اور غیب کا یقین ہے اس کے بعد اپنے اپنے علم و مذاق کے مطابق توجیہ معجزات کی جس طرح یہ ”پہلی صورت“ ممکن ہے کہ وہ عام قوانین فطرت (خواہ نفسی یا مادی)، ہی کے کسی مخفی عمل کا نتیجہ ہوں، اسی طرح مداخلت کی (خواہ براہ راست ہو یا بواسطہ حذف و اضافہ) ”دوسری صورت“ بھی قابل قبول ہے[4]۔ انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹانلے جیونس نے ایک

---

[1] ماڈرن بلیف مقدمہ صفحہ ۱۴۳ [2] ماڈرن بلیف مقدمہ صفحہ ۱۴۳ [3] ماڈرن بلیف مقدمہ ص ۸ [4] ان مباحث کی کامل تشفی انشاء اللہ فلسفہ اسلام کے ذیل میں بشرط صحت و حیات ملے گی۔

نہایت ضخیم کتاب اصول سائنس[1] کے نام سے لکھی ہے جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے۔

اوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گزری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے، جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے، اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے ہمارے لئے ناقابل تصور کہے جا سکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں ہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے۔"

مگر جو شخص اس خالق کائنات قوت ہی کا قطعاً منکر ہو جو سرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو اور جو ارنسٹ ہیکل (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست) کی طرح خود خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ کو معجزات (یعنی اوہام و خرافات) قرار دیتا ہو، اور جس کے نزدیک "معجزات کا یقین جہالت و بربریت کی آخری نشانی ہو، جس کا فنا کر دینا ہی علم و تمدن کی فتح ہوگی"[2] تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں کہ وہ کسی غیبی قوت کا آفریدہ ہے، یا جس شخص سے وہ ظاہر ہوا ہے، اس کے عالم غیب کے ساتھ رابطہ و تعلق (نبوت) کی آیت یا نشانی ہے؟

یقین کی اوپر جو حقیقت بیان کی گئی ہے، اس کے لحاظ سے معجزہ پر بہ حیثیت آیت نبوت کے یقین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ غیب پر ایمان ہو جس کے بغیر یقین معجزہ کی خواہش کا پیدا ہونا ناممکن ہے، پھر بھی جس شخص کی نسبت کوئی معجزہ بیان کیا جاتا ہو یا جس سے یہ ظاہر ہوا ہو اس کی زندگی اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی تفسیر اور ظاہری و باطنی کمالات کا بجائے خود ایک معجزہ ہو، یہ چیزیں خواہش یقین کے لئے مؤیدات کا کام دیں گی، اور سب سے آخری لیکن سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ فرعون و ابوجہل کی طرح دل میں خصومت و عناد، خود سری و خود بینی، ذاتی اغراض یا ہوا و ہوس کے موانع یقین نہ موجود ہوں، جس طرح ان شرائط کی عدم موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات پر آمادہ نہیں کر سکتی، بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات سے باز نہیں رکھ سکتی۔

میرے ایک دوست جن کا شمار کم از کم مسلمانوں میں تعلیم جدید کے مستثنیٰ افراد میں سے ہے، آج سے چند برس پہلے مغربی عقل و حکمت کے شدید پرستار تھے اور وجود خدا کا ان سے اقرار کرانا اس لئے ناممکن تھا کہ وہ مل کی منطق اور ہکسلے و ہیگل کی تحقیقات سے نہیں ثابت ہوا تھا، قرآن میں ان کے نزدیک علم النفس کے بیسیوں دقائق مرعی تھے اور اس کا پیش کرنے والا پیغمبر اسلام (علیہ السلام)، سکندر، سیزر، سقراط و نپولین وغیرہ قائدین عظام و مصلحین عالم کی صف اول میں اپنی جگہ رکھتا تھا۔ تاہم اگر آیات قرآنی کو بحیثیت کلام الٰہی ان کے سامنے تلاوت کیا جاتا یا پیغمبر اسلام علیہ السلام کی مکارم اخلاق سے معمور زندگی کو آپ کی پیغمبری کے ثبوت میں بیان کیا جاتا تو وہ "جواب جاہلاں" کی باتمکین خاموشی یا زیادہ سے زیادہ ایک خندۂ تحقیر کی سزاوار تھی، ظاہر ہے کہ بد عقیدگی

---

[1] THE PRINDEPLE OF SCIENCE (حاشیہ) طبع آخر ۱۹۱۳ء ص ۷۶۶۔ [2] دیکھو ہیکل کی کتاب WONDERS OF LIFE (عجائبات حیات) باب ۳ معجزات۔

کہ اس عالم میں روایاتِ معجزہ کی حقیقت اس سے زیادہ کیا ٹھہر سکتی ہے کہ وہ محض اپنے رواۃ کی خوش اعتقادیوں یا جاہلانہ عجائب پرستیوں کا مجموعہ ہیں، لیکن ادھر ان کی اس درجہ حیرت انگیز کایا پلٹ ہوئی ہے کہ عقلیاتِ مغرب کا سارا طومار ان کے نزدیک "صد کتاب و صد ورق در نار کن" سے زیادہ مستحق نہیں ہے، قرآن کریم دقائقِ نفسیہ کی جگہ "حقائقِ الٰہیہ" کا منبع بن گیا ہے، "سیرتِ نبویہ" کا ایک ایک حرف نبوت پر شاہدِ عدل ہے جو زبان جیمس اور اونٹ کی نفسیاتی تحقیقات سے رطب اللسان رہتی تھی اس کو اشتیاقی لذت اب صرف بزرگانِ دین کے مناقب، کشف و کرامات اور مسائلِ تصوف کے ذکر میں ملتی ہے، حتیٰ کہ دورِ اول کے ناصح احباب کو اب خود ان پر "خوش اعتقادی" کا گمان ہونے لگا ہے۔

اس قلبِ ماہیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انبیائے عظام علیہم السلام کا ذکر ہی کیا، ملک کی موجودہ تحریک "ترک موالات" کے بانی کی ذرا غیر معمولی اخلاق سے آراستہ زندگی بھی ان کو روحانی کمالات ہی کا پرتو نظر آتا ہے انتہا یہ کہ ان کی طرف جو طرح طرح کی کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں[1]۔ ان میں ایک مشہور واقعہ بعض درختوں سے روئی جیسی ایک چیز کا نکلنا تھا، میرے یہ دوست بھی اس کو تائیدِ غیبی کی ایک نشانی سمجھنے میں شریک تھے میں نے کہا کہ کچھ لوگ اس روئی کو کسی کیڑے کی رطوبت بتلاتے ہیں۔ کہا، اس سے کیا ہوتا ہے خدا نے اسی وساطت سے تائید کی ہوگی۔

شرائطِ یقین و غایتِ معجزات کے مقدماتِ بالا کو سامنے رکھ کر اب ذرا ریگستانِ عرب کے اس اُمی انسان کی زندگی، دعوت اور تعلیمات پر ایک سرسری نظر کرو جس نے ساڑھے تیرہ صدی ادھر کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا۔ اس قدسی صفات انسان کی امانت و دیانت نے ہم وطنوں کی طرف سے اس کے لئے امین کا لقب حاصل کیا تھا، اس کی راست گوئی، دوست و دشمن سب کو یکساں تسلیم تھی، حضرت خدیجہؓ جن کو پچیس برس تک آپ کی زوجیت کا شرف حاصل رہا، وہ ایک موقع پر آپ کو تسلی دیتی ہیں کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم! خدا آپ کو کبھی غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں، مقروضوں کا بار اٹھاتے ہیں، غریبوں کی اعانت کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، حق کی حمایت کرتے ہیں، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔

اس اپنے پرائے کے غمخوار کی دعوت صرف یہ تھی کہ لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو تو نجات پاؤ گے۔ اس دعوت سے باز رکھنے میں رؤسائے قریش جب ہر قسم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انہوں نے آپ کے سامنے حکومت کا تخت، زر و جواہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی اور بالآخر وہ وقت آیا جب آخری ہمدم و دمساز یعنی ابوطالب نے بھی ساتھ چھوڑنا چاہا، جس کا جواب اولو العزم من الرسول کی زبان سے فقط یہ ملا کہ چچا جان اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں، تب بھی اپنے اعلانِ حق سے باز نہ آؤں گا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی حق کامیاب ہوا، لیکن کیا اس کامیابی سے داعیٔ حق صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کوئی فائدہ حاصل کیا؟

مسجد نبویؐ کے صحن میں آپ کے سامنے مالِ غنیمت کے انبار لگ جاتے تھے، مگر خود اس انبار کو تقسیم

---

[1] یہ تحریر گزشتہ تحریک ترک موالات کے شباب کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، اس وقت طرح طرح کی یہ کرامتیں ملک میں پھیلی تھیں۔

کرنے والے شاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی یہ تھی کہ آپ کھال کی چٹائی یا خالی زمین پر آرام فرماتے تھے کاشانۂ نبوت گو انوارِ الٰہی کا مظہر تھا، تاہم اس میں رات کو چراغ نہیں جلتا تھا، کئی کئی دن تک فاقہ سے شکمِ مبارک پر دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے، گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند خود لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوھ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھتے، اس کو چارہ دیتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے، حضرت فاطمہؓ آپ کی محبوب ترین اولاد تھیں، جن کی عام خانگی زندگی یہ تھی کہ چکی پیسنے سے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، بار بار مشک میں پانی بھرنے سے سینہ پر گٹے پڑ گئے تھے، گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہو جاتے تھے، لیکن باایں ہمہ جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لئے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو آپ نے صاف انکار کر دیا کہ یہ فقر۔۔ اور یتامیٰ کا حق ہے۔

اتنا ہی نہیں کہ آپ دنیاوی عیش و آرام سے دست بردار تھے، بلکہ دشمنانِ دین طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے تھے، گالیاں دیتے تھے، مگر رحمۃ للعالمین کا ہاتھ اُن کے حق میں بھی ہمیشہ صرف دعا ہی کے لئے اٹھتا تھا اور ان کے ساتھ نیکی ہی کا حکم فرماتے تھے، راہ میں کانٹے بچھا دیتے تھے، نماز پڑھتے میں جسم مبارک پر نجاست ڈالتے تھے، ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، عقبہ بن معیط نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، یہ سب کچھ تھا، لیکن دعوتِ حق، نوعِ انسان کی ہدایت اور فلاح و بہبود کی تعلیمات کا کام بلا شائبۂ تزلزل جاری تھا، کیوں؟ اس لئے کہ آپ کو اپنے فرستادۂ خدا ہونے کا اذعان ہر وقت اس کی نصرت و معیت پر اعتماد اور بالآخر باطل کے زہوق اور حق کے غلبہ کا اسی طرح یقین تھا جس طرح تم کو رات کی تاریکی کے بعد طلوع صبح کا یقین ہوتا ہے، کفار کی دشمنی اور ایذا رسانی سے تنگ آکر ابو طالب سمجھاتے ہیں کہ جان پدر! اس کام سے ہاتھ اٹھا لو، آپ فرماتے ہیں کہ عم محترم! میری تنہائی کا خیال نہ کیجئے، حق زیادہ دیر تک تنہا نہیں رہے گا، عرب ایک دن اس کے ساتھ ہو گا، کفار قریش! بدنیتی (قتل) کے ساتھ آپ کے تعاقب میں نکلے ہیں، غار ثور جس میں آپ مخفی ہیں، اس کے قریب پہنچ گئے ہیں کہ رفیقہ فی الغار (حضرت ابو بکرؓ) نے گھبرا کر عرض کی کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) دشمن اس قدر قریب ہیں کہ ذرا نیچے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھیں تو ہم پر نظر پڑ جائے گی۔ آپ نے فرمایا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ غم نہ کرو، خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ایک موقع پر آپ کسی درخت کے نیچے تنہا استراحت فرما رہے تھے کہ ایک بدو جو شاید اسی موقع کی تاک میں تھا چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار درخت سے اتار کر نیام سے باہر کھینچ لی اور آپ کے سامنے آیا کہ دفعۃً آپ ہوشیار ہو گئے، دیکھا کہ ایک بدو تیغ بکف کھڑا ہے جس نے پوچھا کہ اے محمدؐ! اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟ ایک پُر اطمینان صدا آئی کہ "اللہ"!

کیا تشنگانِ ایمان کے لئے خود یہ صدا معجزہ نہیں ہے؟ اور کیا جن لبوں سے یہ صدا نکلی تھی ان کو کوئی دیکھنے والا کاذب تصور کر سکتا تھا، اسی کا اثر تھا کہ حضرت عبد اللہ بن سلام پکار اٹھے کہ لیس ھذا بوجہ

کذاب (یہ جھوٹے کا منہ نہیں ہے)

یہ سمندر کے صرف چند قطرے تھے اور اگرچہ انسان کا ناقص قلم پیغمبر کی سیرت کے تمام خط و خال کا کامل طور پر نمایاں نہیں کر سکتا، تاہم سیرۃ النبی کے گزشتہ دو حصوں (جن سے یہ چند منتشر قطرات ماخوذ ہیں) انسانی ہاتھ سے جو ناتمام مرقع کھنچ سکا ہے، اسی سے تم بڑی حد تک اندازہ کر سکتے ہو کہ کسی پیکر بشری کے اندر اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی اس جامعیت کبریٰ کا ظہور، بجائے خود اتنا بڑا اعجاز ہے جس سے بڑھ کر کوئی معجزہ نہ طلب کیا جا سکتا ہے اور نہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

ایسی اعجاز مجسم، جامع ہستی کے متعلق جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کش بھی ہو اور گدائے بینوا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سجدہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی جس کی زبان ہمہ وقت ذکر الٰہی اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جس کے پاؤں رات رات بھر نماز میں کھڑے رہنے سے آماس کر آتے ہوں، اگر کوئی ایسا واقعہ بیان کیا جائے جو خدا کی طرف سے تائید غیبی کی نشانی یا آیت معلوم ہو تو اس شخص کو اس کے یقین و قبول میں کیا تامل ہو سکتا ہے جو خدا اور غیب پر ایمان رکھتا ہے، لیکن جو شخص ہیگل کی طرح خدا اور غیب ہی کا منکر ہو یا فرعون کی طرح خود اپنے کو خدا کہتا ہو (انا ربکم الاعلیٰ) یا جس کے قلب کو ابوجہل و ابولہب کی طرح کفر و عناد کی تاریکی نے سیاہ کر رکھا ہو اس کے سامنے بڑے سے بڑا معجزہ پیش کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ یہ جواب مل سکتا ہے کہ "سحر مستمر"۔

یہی راز تھا کہ سیرت نبویہ کے سارے دفتر میں بمشکل ایک آدھ ایسا واقعہ ملتا ہے کہ معجزات کی بنا پر لوگوں نے رسالت کی تصدیق کی ہو، بلکہ عہد رسالت کے ہزاروں ایمان لانے والے وہی ہیں جن کے دل میں ایمان کا مزہ تھا اور جن کے لئے "روئے و آواز پیغمبر" ہی اصل معجزہ تھا۔ گو آج ظاہری روئے و آواز ہم سے مستور ہے، لیکن معنوی آدمی قرآن اور حقیقی "روئے پیغمبر" سیرت طیبہ ابد الآباد تک ذوق ایمان رکھنے والوں کے لئے معجزہ نمائی کرتی رہے گی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لُبِّ لُباب

گزشتہ مباحث کا لُبِّ لباب یہ ہے۔

(۱) معجزہ نام ہے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے جامع انسان کے تعلق سے کسی ایسے واقعے کے ظہور کا جس کی کم از کم بوقت ظہور عام علل و اسباب سے توجیہ نہ ہو سکے۔

(۲) ایسے واقعات بذات خود عقلاً ناممکن نہیں، ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ انتہائی حیرت انگیز یا مستبعد واقعات کی ہوتی ہے، اس لئے بظاہر ان کو قبول کرنے کے لئے بھی نہایت غیر معمولی شہادت کی ضرورت نظر آتی ہے۔

(۳) لیکن دراصل یہ استبعاد ایسا نہیں ہوتا جس کی کافی مثالیں عام زندگی میں بھی نہ ملتی ہوں اور جن کے

قبول کے لئے کسی غیر معمولی شہادت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، لہذا یقین معجزات کے لئے بھی معمولی درجہ کی قابلِ اعتماد شہادت کافی ہو سکتی ہے۔

(۴) مگر یقین صرف شہادت وغیرہ خارجی چیزوں سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا دارومدار زیادہ تر یقین کی خواہش اور اس کے موافق و مؤیدات پر ہے جس کا تعلق بڑی حد تک خود یقین کرنے والے کے گزشتہ معتقدات اور مزعومات سے ہوتا ہے۔

(۵) یقینِ معجزات کی خواہش کا پیدا ہونا موقوف ہے "ایمان بالغیب پر"

(۶) اگر غیب پر ایمان ہے اور فرعون و ابوجہل کی طرح عناد و تعصب کے موانع موجود نہیں ہیں، ساتھ ہی انبیاء کی نبوت کی زندگی اپنے احوال و اخلاق کے لحاظ سے بجائے خود اس کی نبوت کی مؤید ہے تو معجزہ (بمعنی خارق عادت) کا کیا ذکر ہے، خود پیمبر کی آواز و اصوات ہی معجزہ ہے۔

در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است
روئے و آواز پیمبر معجزہ است

* * *

آیات ودلائل اور قرآن مجید

انبیا اور آیات ودلائل

گزشتہ صفحات میں جو کچھ پھیلایا گیا ہے، وہ انسانی افکار و خیالات کی جہاں تک دسترس ہے اس کی تشریح ہے لیکن مسلمانوں کے نزدیک ہدایت و ارشاد کا اصلی سرچشمہ قرآن مجید ہے، اس لئے آیات ودلائل کی نسبت اخیر فیصلہ اسی کی عدالت میں ہونا چاہیئے۔ قرآن مجید میں اکثر انبیاء کے سوانح وحالات کے ضمن میں ان آیات اور معجزات کا بھی بیان ہے جو ان کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات اور دلائل انبیاء کے سوانح کا ضروری جز ہیں، خصوصاً حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے معجزات سب سے زیادہ تفصیل اور تکرار کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئے ہیں کہ نزول قرآن کے وقت ان ہی دونوں انبیاء کی امتیں عرب میں موجود تھیں اور ان ہی کے سامنے اسلام اپنے دعووں کو پیش کر رہا تھا۔

قرآن مجید میں جن انبیاء کا تذکرہ ہے ان میں سے کم وبیش حسب ذیل انبیاء کے آیات ودلائل بیان ہوئے ہیں، حضرت نوح، حضرت لوط، حضرت صالح، حضرت ہود، حضرت شعیب، حضرت زکریا، حضرت یونس، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ بعض ایسے انبیاء بھی ہیں جن کے آیات ودلائل کے ذکر سے قرآن خاموش ہے، مثلاً حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل، ذوالکفل الیسع وغیرہ۔ لیکن اس خاموشی سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کو کسی قسم کی نشانی اور دلیل نہیں عطا ہوئی تھی۔ صحیح بخاری[1] اور صحیح مسلم[2] میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

مامن الانبیاء نبی الا أعطی من الاٰیات ما مثلہ اٰمن أو اٰمن علیہ البشر۔	ہر نبی کو کچھ ایسی باتیں دی گئیں جن کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے۔

البتہ انبیائے کرام کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی آیات ودلائل ان ہی انبیا کو مرحمت ہوئے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا اور ضرورت بھی ان ہی کو تھی کہ ان کے عناد و انکار کا وہ ان کے ذریعہ سے جواب دے سکتے، باقی وہ انبیاء جو اپنی جماعتوں میں صرف تجدید و اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے، ان کو اس قسم کے دلائل کی حاجت نہ تھی کہ ان کی جماعتوں نے ان کی دعوت کے مقابلے میں عناد و انکار کا اظہار نہیں کیا تھا۔

قرآن مجید اور اصطلاح آیات ودلائل

قرآن مجید نے انبیا کے ان معجزات کو عموماً آیت[3] یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] کتاب الاعتصام باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت بجوامع الکلم۔ [2] کتاب الایمان باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم الی جمیع الناس ونسخ الملل بملتہ

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی (قصص ۴)	جب موسیٰ ان کے پاس ہماری آیات لے کر گئے تو انہوں نے کہا کہ یہ تو صرف مصنوعی جادو ہے
فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ (اعراف ۱۶)	تو ہم نے فرعون کی قوم پر طوفان، ٹڈی، جوں، مینڈک اور خون کی کھلی ہوئی آیتیں بھیجیں،

فرعون حضرت موسیٰؑ سے کہتا ہے۔

اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰیَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ فَاَلْقٰی عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ (اعراف ۱۳)	اگر تم کوئی آیت لے کر آئے ہو تو اب لاؤ اگر تم سچے ہو! موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ دفعۃً سانپ بن گئی۔

کفار معجزہ طلب کرتے ہیں تو اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (انعام-۱۳)	آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔
اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (عنکبوت ۵)	آیتیں تو خدا ہی کے پاس ہیں۔

کفار کہتے ہیں۔

فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ (انبیاء-۱)	چاہیے کہ وہ ہمارے پاس کوئی آیت لائیں جیسے پہلے پیغمبر بھیجے گئے

حضرت صالحؑ اپنے معجزہ کی نسبت کہتے ہیں۔

وَیٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً (هود-۶)	اور اے لوگو! یہ خدا کی اونٹنی آیت ہے۔

لفظ آیت اور معجزہ کی حقیقت

آیت کے معنی "نشانی" اور "علامت" کے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے اور پہچانتے ہو؟ صرف آیات و علامات سے، کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر، ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے، یہ انسان ہے، یہ درخت ہے، یہ سیب ہے، یہ انگور ہے، لیکن ہم کیونکر جانتے ہیں؟ اس طرح کہ ان چیزوں کی جو مخصوص نشانیاں ہیں وہ الگ الگ ہمارے ذہن میں محفوظ ہوگئی ہیں اور اب ان ہی کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے، ہم پہچانتے ہیں کہ یہ زید ہے، یہ عمر ہے، یہ میرا عزیز ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میرا گھوڑا ہے، مگر یہ تمام شناختیں آیات و علامات ہی کی مدد سے ہیں اگر دنیا میں ہر شے کی مخصوص آیات و علامات مٹا دی جائیں تو ہم یقیناً کسی چیز کو نہ شناخت کر سکتے، نہ جان سکتے، نہ پہچان سکتے ہیں۔

یہی آیات و علامات کی جان پہچان اور شناخت ہے جو حیوان و انسان اور عقلمند و بے وقوف میں فرق پیدا کرتی ہے جس میں ان آیات و علامات کی شناخت، تمیز اور یاد کی قوت جس قدر زیادہ ہوگی، اسی قدر اس کی عقل و دانائی کا کمال زیادہ ہوگا۔ ہماری منطق کا تمام تر استدلال بجز آیات و علامات کے اور کیا ہے، ہم اپنے جس دعویٰ پر جو دلیل قائم کرنا چاہتے ہیں وہ ان ہی آیات و علامات کی مدد سے کرتے ہیں، بلکہ ہمارے تمام تجربے اور مشاہدے بلکہ طبعیات، کیمیائیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ اور جس قدر

علوم بھی ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں، جن سے ہم براہ راست جزئیات کا علم حاصل کرتے ہیں اور پھر ہم ان سے کلیات تیار کر لیتے ہیں۔

غرض ہمارا تمام تر فن استدلال دراصل ان ہی آیات و علامات پر موقوف ہے۔ اگر اشیا کی علامات و آیات محو کر دی جائیں تو ہم نہ کسی چیز کو پہچان سکیں گے اور نہ کسی دعویٰ پر کوئی دلیل قائم کر سکیں گے، ہم علت سے معلول پر اور معلول سے علت پر استدلال کرتے ہیں، مگر ان ہی آثار و علامات کے ذریعہ سے ہم کو تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ شے جب پیدا ہوتی ہے تو اس کے ساتھ یہ آثار و آیات ظاہر ہوتے ہیں، اب کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ یہ شے پیدا ہو گئی ہے، اس لئے اس کا فلاں نشان اور اثر بھی ضرور پیدا ہوا، یہ علت سے معلول پر استدلال ہے اور کبھی ہم اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ فلاں نشان اور علامت ظاہر ہے اس لئے وہ شے بھی ہے، یہ معلول سے علت پر استدلال ہے، کبھی ہم آگ کے وجود سے حرارت کے وجود پر اور کبھی حرارت کے وجود سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔

ہم کسی غیر آباد مکان میں پہنچ جاتے ہیں، وہاں ہم کو ایک شاندار عمارت نظر آتی ہے اگرچہ ہم نے اس عمارت کے بنانے والوں کو نہیں دیکھا ہے، مگر اس عمارت کو دیکھ کر ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کسی معمار کی صنعت ہے، ایک جنگل میں ایک جھونپڑے کے اندر ایک تنہا زخمی پڑا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے زخم صاف ہیں مرہم پٹی ٹھیک ہے، اس کے آرام و آسائش کے تمام سامان قرینہ سے رکھے ہوتے ہیں، ہم نے گو اس کے تیماردار کو نہیں دیکھا، مگر آس پاس کے علامات و آثار بتاتے ہیں کہ اس بیمار کا کوئی تیماردار ہے اور وہ نہایت رحم و مہربانی سے اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے، ایک شخص آ کر کہتا ہے "میں طبیب ہوں"، اس کے پاس جو مریض آتے ہیں وہ اس کے نسخہ سے شفا بھی پاتے ہیں، اب گو ہم نے اس کو طب کی تحصیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا مگر اس کے آثار و علامات کو دیکھ کر اس کے دعوے کی تصدیق کر سکتے ہیں، یہی ہمارا فن استدلال ہے اور اسی پر ہمارے تمام حصول علوم کی بنیاد ہے۔

آیات اللہ

قرآن مجید میں آیت کا لفظ اس معنی میں اس کثرت سے آیا ہے کہ ہم یہاں ان کا استقصا بھی نہیں کر سکتے صرف متفرق سورتوں سے چند آیات یہاں نقل کرتے ہیں جن سے مفہوم کی تشریح ہو جائے گی۔

إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَفِيْ
خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ وَ
اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ
مِنْ رِّزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ
الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا
عَلَيْكَ بِالْحَقِّ فَبِأَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ
يُؤْمِنُوْنَ (جاثیہ ۱)

آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور
تمہاری پیدائش میں اور زمین میں جو چوپائے چلتے ہیں ان میں ان
کے لئے جو یقین کرتے ہیں نشانیاں ہیں، اور رات دن کے الٹ
پھیر اور آسمان سے جو خدا روزی برساتا ہے اور جس سے زمین
کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور ہواؤں کے پھیرنے میں عقل والوں
کیلئے نشانیاں ہیں، یہ آیتیں ہیں جن کو ہم سچائی کیساتھ پڑھ کر تم کو سناتے
ہیں تو پھر خدا اور اس کی نشانیوں کے بعد وہ کس چیز پہ ایمان لائیں گے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (البقرہ-۲۰)

بے شک آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے الٹ پھیر اور ان کشتیوں میں جو دریا کے اندر انسانوں کو فائدہ پہنچانے والے سامان لیکر چلتی ہیں اور خدا جو آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور زمین میں جو چوپائے اس نے پھیلا رکھے ہیں اور ہواؤں کو مختلف سمتوں میں چلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے بیچ میں مسخر ہیں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَجَنّٰتٍ مِنْ أَعْنَابٍ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ انْظُرُوا إِلَىٰ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ إِنَّ فِي ذٰلِكُمْ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (انعام-۱۲)

اور وہی خدا ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی نشو و نما کو ظاہر کیا پھر اس سے سبزے پیدا کئے جس سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں اور کھجور جس کے خوشے نیچے لٹکے ہوتے ہیں اور انگوروں کے باغوں کو اور زیتون اور انار کو اس نے پیدا کیا جو باہم ملتے جلتے ہوتے ہیں اور ان میل بھی ہوتے ہیں، ان کے پھلنے اور پکنے کو دیکھو ان چیزوں میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ (یونس-۷)

اس نے تمہارے لئے رات بنائی کہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو [illegible] روشن بنایا اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں نشانیاں ہیں۔

وَمِنْ آيٰتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝ وَمِنْ آيٰتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِلْعٰلِمِينَ ۝ وَمِنْ آيٰتِهِ مَنَامُكُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُمْ مِنْ فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ۝ وَمِنْ آيٰتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْ آيٰتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ۔

(روم-۳)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے خود تمہاری ہی جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم کو ان کے پاس سکون اور قرار حاصل ہو اور تم دونوں کے لئے لطف و محبت پیدا کر دیا، اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے زمین و آسمان کی پیدائش اور تمہاری زبانوں کا اور رنگوں کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ہے، اس میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں رات اور دن کو تمہاری نیند ہے اور تمہارا اس کی مہربانی (روزی) کی تلاش کرنا ہے اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس میں (عذاب) کا خوف اور (رحمت کی) امید دونوں ہیں اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اسی کے حکم سے قائم ہیں۔

وَمِنْ آيٰتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (فصلت-۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن، سورج اور چاند ہیں۔

یہ آیات اللہ یعنی خدا کی نشانیاں، خدا کے وجود اور اس کے صفات کمالیہ کی علامات ہیں جس طرح ویرانہ کی عمارت معمار کے وجود کو، اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم دلی کے صفات کو ظاہر کرتا ہے، اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے، ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہے اور زمین کے اندر و باہر ابر، بارش، دن رات، چاند سورج، درخت، میوے، پھل غلہ کے اقسام وغیرہ، زمین کے جانداروں کی زندگی کے سامان آرام و آسائش اس خالق و صانع کے رحم و کرم، عطا و بخشش اور دیگر اوصاف کمال کو نمایاں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خالق کو اپنے تمام مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق اور اعتنا ہے، کفر ان ہی کے دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ (ہود ۵)	اور یہ عاد کا قبیلہ ہے جس نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا
أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ (کہف ۱۲)	یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کا انکار کیا۔
وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ (یونس ۱۰)	اور ان لوگوں میں نہ ہو جنہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔
فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ (انعام ۲۰)	اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا

جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندہ اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی خاص بندہ سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا رہتا ہے۔

(۱) انبیا قوموں کے تاریک ترین زمانوں میں نور الٰہی کا مشعل ہاتھ میں لے کر تنہا مجمعوں کے اندر آتے ہیں، لوگ اس نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور تیغ و خنجر سے مشعل کے تھامنے والے دست و بازو کو زخمی کرنا چاہتے ہیں مگر وہ شمع الٰہی بجھنے کے بجائے رفتہ رفتہ اپنے دائرہ نورانی کو وسیع کرتی جاتی ہے اور بالآخر سطح ارض کے کناروں تک پہنچ جاتی ہے۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ	وہ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے خدا کے نور کو بجھا دیں اور خدا اپنے نور
مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ	کو پورا روشن کرنے والا ہے گو کافر اس سے خوش نہ ہوں اسی نے اپنے
رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ	رسول کو ہدایت اور سچائی کا مذہب دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو
كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (صف ۱)	ہر مذہب پر غالب کر دے، گو مشرک اس سے ناراض ہوں۔

(۲) باوجود تمام معاندانہ کوششوں اور مخالفانہ جد و جہد کے اس نور الٰہی کا پھیلتا جانا خود اس بات کی شہادت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے، اور اس مشعل گیر دست و بازو میں خدا کی غیر مرئی قوت کام کر رہی ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (انفال ۲)	اور تم نے وہ مٹھی بھر کنکریاں نہیں پھینکیں بلکہ خدا نے پھینکیں۔

قدم قدم پر تائیدات الٰہی اس کے ساتھ دیتی ہیں۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ	ہم نے اس نصیحت کو اتارا ہے اور بے شک ہم ہی اس

لَحٰافِظُوْنَ (حجر۔۱) — کی حفاظت کرنے والے۔

(۲) پیغمبر کے صحیفۂ زندگی کا صفحہ صفحہ ہر قسم کے اخلاقی داغ سے پاک ہوتا ہے، اس کی سچائی اور راست بازی عالم آشکارا اور دوست و دشمن سب کے نزدیک بے عیب ہوتی ہے، حضرت صالحؑ کی نسبت کافروں نے گواہی دی۔

یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ ھٰذَآ (ہود۔۶) — اے صالح پہلے تم سے بڑی بڑی امیدیں تھیں

حضرت شعیب کی مخالفت کے باوجود ان کو اقرار کرنا پڑا کہ وہ بڑے عبادت گزار ہیں۔

یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (ہود۔۸) — اے شعیب! کیا یہ تمہاری عبادت گزاری تم کو کہتی ہے کہ اس کو چھوڑ دیں جس کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی شہادت میں خود اپنی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس۔۲) — میں نے تمہارے درمیان مدت تک عمر گزاری ہے کیا تم سمجھتے ہو۔

(۴) سب سے آخر یہ کہ تبلیغ و دعوت میں دینِ الٰہی کی نصرت اور اشاعت میں مخالفین کی شکست اور ہزیمت میں صلحاء کو مزید ایمان اور تسکین کے حصول میں عجیب و غریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں، جن کو عرفِ عام میں معجزات کہتے ہیں۔

غرض یہی وہ مہر ہیں جو خالقِ فطرت اور داعی حق کے درمیان رابطۂ خاص اور علاقۂ مخصوص کو نمایاں کرتے ہیں اور جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادۂ الٰہی ہے۔

آیات و دلائل کی دو قسمیں ظاہری اور باطنی

تفصیلِ بالا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آیات اور نشانات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی، ظاہری اور مادی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں، مثلاً مردہ کا زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ ابلنا، بیمار کو اچھا کرنا وغیرہ، باطنی اور روحانی آیات و دلائل مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیرِ تعلیم، ہدایت، ارشاد، فلاح اور تائید ہے، اہلِ نظر اور حقیقت شناسوں کے لئے یہی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں، باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لئے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

نبوت کی باطنی نشانیاں واقعات کی روشنی میں

ہم نے نبوت کی ظاہری اور باطنی دو نشانیاں قرار دی ہیں اور باطنی نشانیوں کو ظاہری علامات پر ترجیح دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں، آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ قرآن مجید بھی انہی کو نبوت کی اصلی علامات قرار دیتا ہے، یہاں واقعات کی روشنی میں یہ واضح کرنا ہے کہ عہدِ نبوی میں بھی جو لوگ اہلِ نظر تھے وہ انہی علامات کی تلاش کرتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کو بھی چھوڑ دو جنہوں نے بالآخر نبوت کی تصدیق کی، اس عہد کے ان یہودیوں اور عیسائیوں کو دیکھو جنہوں نے گو کسی سبب سے علی الاعلان اس کی تصدیق کی جرأت

نہیں کی، مگر وہ اندرونی طور سے متاثر ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل سے بڑھ کر عرب میں علامات النبی کا رازداں کوئی اور نہ تھا، سینکڑوں یہودی متکلمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، امتحانات لیے، تجربات کیے، مگر ان کا امتحان و تجربہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ وہ آپ کے اخلاق کی آزمائش کرتے تھے، صحف انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے تھے، آپ کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے تھے، ان میں سے کسی نے آکر آپ سے خارق عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ تماشے بظاہر اور لوگ بھی دکھا سکتے ہیں اور یہ خوارق نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں، آنے والے نبی کی بشارتیں اور صفتیں توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحب خوارق ہونا اور ظاہری معجزات دکھانا ان کی صفت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ توراۃ میں اس کے اوصاف یہ بتائے گئے تھے کہ وہ فاران سے طلوع ہوگا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی، وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگی مرد کے مانند ہلاک کرے گا، وہ عبادت گزار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، مختون قوم (عرب) میں پیدا ہوگا، انجیل نے بتایا تھا کہ وہ تسلی کی روح ہوگا، وہ مسیح کی ناتکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا، خدا کی زبان اس کے منہ میں ہوگی۔

سینکڑوں یہود و نصاریٰ آپ کی خدمت میں آتے اور انہوں نے آپ کی نبوت کا امتحان لیا، مگر امتحان کے پرچہ میں مادی معجزات کا سوال شامل نہ تھا، بلکہ عام علمی اور مذہبی باتوں کی نسبت استفسار تھا، قرآن مجید نے ان کے دو سوالوں کو دہرایا یَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ (کہف) اور یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ، پہلے سوال میں ذی القرنین کا قصہ پوچھا گیا ہے اور دوسرے سوال میں "روح" کی حقیقت دریافت کی گئی ہے، ان کے علاوہ قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعدد اعتراضات اور سوالات مذکور ہیں، مگر ان میں سے ایک میں بھی یہ نہیں کہ تم اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں کوئی خارق عادت تماشا دکھاؤ، بلکہ وہی سوالات کرتے تھے جن کو پیغمبر کے علم و عمل یا تعلیم و تزکیہ سے تعلق تھا، آگے چل کر ایک خاص باب میں ہم نے یہودیوں کے امتحانی سوالات جمع کر دیئے ہیں ان کو پڑھ کر تم بہتر فیصلہ کر سکتے ہو، قرآن مجید میں ان کا ایک سوال بے شبہ ایسا مذکور ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی مادی معجزہ کی خواہش رکھتے تھے اور وہ یہ ہے۔

یَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (نساء۔ ۲۰)
اہل کتاب تجھ سے فرمائش کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کتاب اتارے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی معجزہ طلبی نہ تھی بلکہ چونکہ توراۃ کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ اس کی چند لوحیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے لکھ کر حضرت موسیٰ کو دی تھیں اس لیے وہ اسی تخیل کے مطابق قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے لیے اس کے نزول کو بھی اسی طرح چاہتے تھے۔ اب اس عہد کے عیسائیوں کو لو قیصر روم کے دربار میں جب قاصد نبوی پہنچا تو ابوسفیان کو جو اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے، بلوا کر قیصر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوالات کیے، وہ حسب ذیل ہیں۔

قیصر:	مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟	ابو سفیان:	شریف ہے۔
”	اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟	”	نہیں۔
”	اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟	”	نہیں۔
”	جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟	”	کمزور لوگ ہیں۔
”	اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟	”	بڑھتے جاتے ہیں۔
”	کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا بھی تجربہ ہے؟	”	نہیں۔
”	وہ کبھی عہد و قرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟	”	ابھی تک تو نہیں لیکن اب جو معاہدہ ہوا ہے دیکھیں وہ اس پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟
”	تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟	ابو سفیان:	ہاں۔
”	نتیجہ جنگ کیا رہا؟	”	کبھی ہم غالب رہے کبھی وہ۔
”	وہ کیا سکھاتا ہے؟	”	کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ تم نے اس کو شریف النسب بتایا، پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے پیدا ہوتے ہیں، تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے، تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے، پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے، سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے، تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا، پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے، تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو وہ یقیناً پیغمبر ہے۔

باوجود طول کلام کے ہم نے یہ تمام سوالات و جوابات نقل کر دیئے ہیں، غور کرو یہ تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار و علامات سے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک سوال بھی ایسا نہیں ہے جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ مدعی نبوت کوئی معجزہ بھی پیش کرتا ہے؛ حالانکہ اگر نبوت کی حقیقی علامت خوارق عادت ہوتے تو سب سے پہلے عیسائی قیصر کو یہی سوال پوچھنا چاہیئے تھا۔

حضرت جعفرؓ نجاشی کے دربار میں اسلام پر تقریر کرتے ہیں تو فرماتے ہیں ایھا الملک ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بُت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت اور صدق و دیانت

سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو تکلیف نہ دیں، ضعیف عورتوں پہ بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ ہم ان پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔[1]

نجران کے عیسائی علماء جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو انہوں نے قرآن کی آیتیں سنیں، مسلمانوں کی روحانی کیفیتوں کا مشاہدہ کیا، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت اسلام کا فیصلہ دریافت کیا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے حکم کے مطابق ان سے مباہلہ کرنا چاہا، مگر انہوں نے منظور نہیں کیا، اور آپس میں کہا کہ اگر یہ واقعی پیغمبر ہے تو ہم تباہ ہو جائیں گے، بالآخر سالانہ خراج پر صلح کر لی، دیکھو انہوں نے اسلام کی تعلیمات کا ہر طرح امتحان کیا، لیکن دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے ظاہری نشان نہیں مانگا۔

اب خاص عرب کے حقیقت شناس افراد کا مطالعہ کرو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ان میں سے ہزاروں اشخاص نے تصدیق کی، جن کے فضل و کمال، عقل و ہوش اور فہم و تدبر کے ان کے حالات و واقعات گواہ ہیں، مگر ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو باطنی علامات کے دیکھ لینے کے بعد ظاہری نشانوں کا طلب گار ہوا ہو، مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ اسلام لائیں، چنانچہ آغاز وحی ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ سے اپنے مشاہدات روحانی کا تذکرہ فرمایا تو وہ ایمان لے آئیں، مگر کس اثر سے؟ اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب آپ نے بتقاضائے بشریت ان سے اپنے خوف جان کا تذکرہ کیا تو انہوں نے جواب دیا۔

واللہ ما یخزیک اللہ ابداً انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق (بخاری بدء الوحی)	خدا کی قسم، خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحم کرتے ہیں اور قرضداروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حق کی مصیبتوں پر لوگوں کی اعانت کرتے ہیں

حضرت ابوذرؓ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے بھائی سے کہا کہ ذرا اس شخص کے پاس جا کر دیکھو جو دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس آسمان سے خبر آتی ہے، وہ مکہ آئے اور تحقیق حال کر کے واپس گئے اور حضرت ابوذرؓ سے جا کر کہا۔

رأیتہ یامر بمکارم الاخلاق وکلاماً ما ہو بالشعر (مسلم مناقب ابی ذر)	میں نے اس کو دیکھا وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے اور ایک کلام پیش کرتا ہے جو شعر نہیں۔

اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے حقیقت حال کی تشریح ہوتی ہے اور جن کی تفصیل سے سیرۃ نبویؐ کی گزشتہ جلدیں بھری پڑی ہیں۔

قرآن مجید اور نبوت کی باطنی علامات

یہ تمام بیانات درحقیقت قرآن مجید کی ان آیتوں کی تشریح ہیں جن میں نبوت کی حقیقت اور اس کے اصلی آثار و علامات بتائے گئے ہیں۔

---

[1] مسند ابن حنبل جلد اول صفحہ ۲۰۲۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (مائدہ۔ ۳)

اے یہود و نصاریٰ! تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا جو تمہاری کتاب کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے، اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور قرآن آچکا، خدا اس کے ذریعہ سے انکو جو اس کی خوشنودی کے پیرو ہیں، سلامتی کے راستے دکھاتا ہے، اور انکو اپنے حکم سے وہ اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھا راستہ بتاتا ہے۔

رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ۔ ۱)

خود امیوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انکو خدا کی آیتیں سناتا ہے انکو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے۔

رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (آل عمران۔ ۱۷)

خود امیوں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو خدا کی آیتیں سناتا ہے ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی انکو تعلیم دیتا ہے۔

الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف۔ ۱۹)

اس امی فرستادۂ الٰہی اور پیغامبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ ان کو اچھے کام کا حکم دیتا ہے اور بُرے کام سے روکتا ہے اور پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور رسم و رواج کے جو بوجھ اور بیڑیاں ان پر پڑی ہوئی تھیں وہ ان سے دور کرتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (احزاب۔ ۶)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو (اپنا) گواہ، اور نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

الغرض بعثت کے اصلی آثار و علامات یہ ہیں کہ وہ آیاتِ الٰہی تلاوت کرتا ہے، زنگ آلود نفوس اور سیاہ قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے، وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے، وہ قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان کے پاؤں کی بیڑیوں کو کاٹ ڈالتا ہے وہ خدا کا گواہ بن کر اس دنیا میں آتا ہے۔ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دیتا ہے نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے، بدکاروں کو عذابِ الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدہ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے، قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں، اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ

اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا خود ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہوگئے، ہم نے تو نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں کھول کر رکھ دیں۔

بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (بقرہ۔ ۱۴)

محمد! ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور جن کو اب بھی یہ نشانیاں باور نہ آئیں، ان دوزخیوں کی تجھ سے بازپرس نہ ہوگی۔

کفار پیغمبر کی صداقت کی نشانی پوچھتے ہیں، اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی روشنی تو اس کا سرتاپا وجود ہے اور اہل یقین کے لئے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں، اس کی بعثت نیکوکاروں کو خوشخبری سنانا اور بدکاروں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا اور اس سے انقلاب انسانی اور نتائج روحانی کا ظہور یہ خود اس کی صداقت کی کھلی نشانیاں ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (عنکبوت ۔ ۵)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ تجھ پر ہم نے کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

یعنی خود یہ دعوت الٰہی اور پیغام ربانی آیت و نشانی ہے اور اہل بصیرت کے لئے یہی معجزہ ہے۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (شعراء۔ ۱۰)

کیا ان کافروں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے عالم لوگ اس کو جانتے ہیں۔

یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ ہے کہ ایک اُمّی ہو کر وہ ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کرتا ہے جس کی صداقت کو علمائے بنی اسرائیل جانتے اور سمجھتے ہیں، کیا یہ معجزہ ہمارے قریش کی تسلی کے لئے کافی نہیں ہے کہ بڑے بڑے علما اس کی سچائی کے دل سے معترف ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ (طٰہٰ۔ ۸)

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا، کیا اگلی کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی اور اگر ہم ان کو اس سے پہلے ہلاک کر دیتے تو یہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار کیوں تو نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔

یعنی گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کے جو صفات اور نشانیاں مذکور تھیں، پیغمبر اسلام کا ان کا مصداق کامل ہونا ہی سب سے بڑی نشانی ہے۔ یا اس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ کفار بار بار یہی کہتے ہیں کہ معجزہ دکھاؤ، معجزے تو انہیں دکھائے جا چکے، کیا یہ نہیں معلوم کہ گزشتہ قومیں معجزات دیکھ کر بھی جب ایمان نہ لائیں تو ان کا کیا حشر ہوا۔ کفار کا سوال تھا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (رعد۔ ۱)

کہ اس پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری

اس کے جواب میں خدا نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد-۱) اے محمدؐ! تو صرف ڈرسنانے والا ہے اور ہر قوم میں ایک ہادی گزرا ہے

مقصود یہ ہے کہ نبوت کی حقیقت معجزہ نہیں بلکہ انذار اور ہدایت ہے۔

ظاہری آیات اور نشانات

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انبیاء ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتے ہیں، تمام انبیائے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے سوانح وواقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار ودلائل کو بھی بتفصیل بیان کیا ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں یہی سبب ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن مجید نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب میں آپ کی طرف سے یہ الفاظ کہے۔

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل) میں تو صرف ایک انسان پیغمبر ہوں۔

ظاہری نشانات صرف معاندین طلب کرتے ہیں

لیکن نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار وعلامات یعنی خارق عادت معجزات صرف وہ فرقہ طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور جو تعصب وعناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا چنانچہ انبیائے کرام پر ایمان لانے والوں کے حالات پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ معجزات کی طلب نیکوکاروں نے نہیں کی حضرت موسیٰؑ کو معجزہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں نہیں بلکہ فرعون کے مقابلہ میں دیا گیا حضرت عیسیٰؑ سے ان کے حواریوں نے نہیں بلکہ یہودیوں نے معجزہ طلب کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوبکرؓ وعمرؓ نے نہیں بلکہ ابوجہل وابولہب نے معجزہ مانگا یہی حال دوسرے انبیاء کا بھی ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کی پوری تصریح کی ہے اور طلب معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ۔ (بقرہ-۱۴)	اور جن کو (کتاب الٰہی کا) علم نہیں (یعنی کفار قریش) کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔
وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ (انعام-۴)	اور کفار نے کہا کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ (رعد-۱)	اور کفار کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔
وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (طٰہٰ-۸)	اور کفار نے کہا کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا۔

دیکھو کہ ہر آیت میں کفار ہی کا معجزہ طلب کرنا ظاہر کیا گیا ہے۔

کفار کا یہ معجزہ طلب کرنا نفی معجزہ کی دلیل نہیں

کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے، بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار معجزہ کے لئے اصرار کیوں کرتے؟ لیکن یہ استدلال سرتاپا غلط ہے، ان کو نفس معجزہ مانگنے پر بھی بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے

پر تنبیہ کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں، چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے اور انہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان خوارق سے انہیں تسلی نہ ہوگی، ان کو چاہیئے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادتمند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۔
(بقرہ-۱۴)

اور جو نہیں جانتے وہ کہتے ہیں کہ کیوں خدا ہم سے خود باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی نہیں آتی ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا دونوں کے دل ایک سے ہو گئے ہیں ہم نے نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو یقین کرتے ہیں کھول کر رکھ دی ہیں اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور جن کو یہ نشانیاں باور نہ آئیں ان دوزخیوں کا تم سے باز پرس نہ ہوگی۔

اس آیت کریمہ میں صاف موجود ہے کہ ہم نشانیاں کھول کر بتا چکے ہیں لیکن ان نشانیوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اہل الیقین ہیں اور جو برابر شک کرتے ہیں ان کا علاج صرف دوزخ ہے۔ دوسری آیت میں ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۔ وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ (طہ-۸)

اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا، کیا ان کے پاس گزشتہ کتابوں کی گواہی نہیں پہنچی؟ اگر ہم اس سے پہلے کسی عذاب سے ان کو ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! کیوں ہمارے پاس کوئی رسول تو نے نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی پیروی کرتے۔

اس آیت میں بھی معجزات ظاہر ہونے کے بعد مزید معجزات کی طلب پر گزشتہ قوموں کے واقعات کی طرف جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں، متوجہ کیا گیا ہے، کہ دیکھ لو دنیا میں ان کا کیا حشر ہوا، جنہوں نے معجزوں کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں قبول کیا۔

معجزات تو بہرحال کسی نہ کسی آنی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں، اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر پیغمبر معجزہ ہی دکھاتا رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو اور پیغمبر کی زندگی صرف ایک تماشہ گر کی حیثیت اختیار کر لے، اس لئے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی، کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں میں صرف کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں، کیا یہ ان کو بس نہیں کرتا کہ ہم نے

يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (عنکبوت ۔۵) تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

معاندین کو معجزہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی

نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر شے کے اندر شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے، جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسن عمل، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ پیغمبروں سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور چونکہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا اس لئے وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی اور خود اسی کے ہاتھوں سے اس کے دعووں کے تار و پود بکھر جائیں گے۔ لیکن قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادت بھی پیش کر دیتی ہے تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خارق عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں، بلکہ یہ شیطانی عمل اور سحر و جادو کی قوت سے پیدا ہوا ہے اور چونکہ بظاہر معجزہ اور سحر و شعبدہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اس لئے ان کے بدگمان قلب کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو متعدد معجزے دکھلائے، مگر ہر ایک کے جواب میں انہیں یہی سننا پڑا کہ تم جادوگر ہو۔

هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (نمل ۔۱) یہ تو کھلا جادو ہے۔

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (طہ ۔۳) یہ موسیٰ اور ہارون یقیناً جادوگر ہیں۔

حضرت موسیٰ کے معجزۂ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے اور حضرت موسیٰؑ کی پیغمبری پر ایمان لے آئے مگر فرعون یہی کہتا رہا۔

اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ (طہ ۔۳) یہ موسیٰ تم سب کا بڑا جادوگر ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔

توراۃ میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کو جب کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو ہر معجزہ کے بعد فرعون کے دل کی سختی علیٰ حالہ باقی رہ جاتی تھی چنانچہ توراۃ میں تقریباً ہر معجزہ کے بعد مذکور ہے "لیکن فرعون کا دل سخت رہا اور اس نے ان کی نہ سنی"[1] انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے سب سے زیادہ معجزات دکھلائے لیکن خود انجیل میں مذکور ہے کہ تقریباً ہر معجزہ کے بعد حاضرین کی دو جماعتیں ہو جاتی تھیں، ایک تو ان کی معتقد ہو جاتی تھی اور یقین کرتی تھی کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور دوسری کہتی تھی کہ یسوع کے ساتھ شیطان رہتا ہے تب یہودیوں کے بیچ ان باتوں کے سبب اختلاف ہوا اور بہتوں نے ان میں سے کہا، اس کے ساتھ ایک

---

[1] توراۃ کتاب الخروج۔

دیوتا رہتا ہے اور وہ مجنون ہے[1]۔ تم اس کی سنتے کیوں ہو، اوروں نے کہا، یہ باتیں اس کی ہیں جس میں دیو ہے کیا دیو اندھے کی آنکھیں کھول سکتا ہے[2]۔ ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ نے ایک گونگے کو اچھا کیا، لوگ حیرت زدہ ہو گئے، لیکن فریسی یہودیوں نے کہا، یہ دیوؤں کے سردار کی مدد سے دیوؤں کو نکالتا ہے[3]۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے معاندین کے جواب میں کہا، تم کہتے ہو کہ میں دیوتاؤں کو بعل زبول (ایک دیوتا کا نام) کی مدد سے نکالتا ہوں[4]، حضرت عیسیٰؑ نے متعدد دفعہ لوگوں سے کہا، تم معجزات دیکھتے ہو مگر ایمان نہیں لاتے[5]۔

یسوع نے (عیسیٰ) نے یہ باتیں کہیں اور اپنے تئیں ان سے (فریسی یہودیوں سے) چھپایا، اگرچہ اس نے ان کے روبرو اتنے معجزے دکھلائے پر وہ اس پر ایمان نہ لائے، تب ان شہروں کو جن میں اس کے بہت سے معجزے ظاہر ہوئے ملامت کرنے لگا کیونکہ انہوں نے توبہ نہ کی تھی[6]۔

کفار قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے طالب ہوتے تھے، مگر جب معجزے دیکھتے تھے تو کاہن اور جادوگر کہنے لگتے تھے۔ عرب میں پیشین گوئی کاہن کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کو دیکھ کر معاندین نے آپ کو کاہن کا خطاب دیا تھا، اس لئے قرآن مجید نے کہا،

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ (طور-۱)	اے پیغمبر! تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے۔
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (حاقہ-۲)	اور یہ کسی کاہن کی بات نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور خوارق کو وہ دیکھتے تھے تو ان کو جادو کا اثر سمجھتے تھے۔

ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ (مدثر-۱)	پھر پیٹھ پھیر کر چلا اور غرور کیا اور کہا کہ یہ تو جادو ہے جو اگلے وقتوں سے چلا آتا ہے۔

کفار ایک دوسرے کو منع کیا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ جایا کرو، کیونکہ وہ جادو کیا کرتے ہیں،

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیا-۱)	یہ محمد تو تمہاری ہی طرح آدمی ہیں، کیا تم جادو کے پاس آتے ہو اور تم دیکھ رہے ہو۔
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف-۱)	حق کے منکرین کے پاس جب حق آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معجزہ شق القمر دکھایا تو کفار نے اس کو بھی جادو کہا۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ (قمر-۱)	نزدیک آ گئی قیامت اور چاند پھٹ گیا اور اگر وہ کوئی بھی نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

---

[1] یوحنا کی انجیل باب ۱۰-۱۹ [2] متی کی انجیل باب ۹-۳۴ [3] لوقا کی انجیل ۱۱-۱۸ [4] یوحنا کی انجیل ۱۲-۳۷ [5] متی کی انجیل ۱۱-۲۰ [6] متی کی انجیل ۱۱-۲۱ [7] مسلم مناقب ابی ذر۔

دوسرے معجزات کو دیکھ کر وہ یہی کہتے رہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو جادوگر ہے۔

مَا كَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ قَالَ الْكَافِرُونَ إِنَّ هَٰذَا لَسَاحِرٌ مُّبِينٌ (یونس-۱)

کیا لوگوں کو اس پر تعجب ہے کہ ہم نے ان میں سے ایک پر وحی اتاری کہ لوگوں کو ڈرا اور ان کو جو ایمان لائے بشارت دے کہ ان کے پروردگار کی بارگاہ میں اس کی بڑی پایگاہ ہے، کافر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

معاندین کو معجزہ سے بھی ایمان کی دولت نہیں ملتی

چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور یقین کی سعادت سے وہ محروم ہوتے ہیں اس لئے بڑی سے بڑی نشانی بھی شک و شبہ کے گرداب سے ان کو باہر نہیں نکال سکتی، وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں، کبھی فریب اور قوت شیطانی کا ان کو دھوکہ ہوتا ہے اس لئے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حجت کے لئے ایک دفعہ معجزہ ان کو دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا، پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کو تسلی نہ ہوگی، چنانچہ سورۂ انعام کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراتب کو بیان کر دیا ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ۔ (انعام-۱)

اور خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ان کے پاس نہیں آتی لیکن یہ کہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ (انعام-۱)

اے پیغمبر! اگر ہم تجھ پر ایسی کتاب بھی آسمان سے اتار دیں جو کاغذ میں لکھی ہو کہ وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے چھوئیں تو وہ جو کافر ہیں کہیں گے کہ یہ فقط ایک ساحرانہ تماشا ہے۔

وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (انعام-۳)

اور اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو وہ ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ وہ جب تیرے پاس آتے ہیں تو وہ تجھ سے جھگڑا کرتے ہیں اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو صرف اگلوں کی کہانیاں ہیں۔

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ۞ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ۔

(انعام-۱)

اور کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا کہ دے کہ اگر فرشتہ اتارا جاتا تو ان کو پھر مہلت نہ دی جاسکتی اور بات پوری ہوجاتی، اگر ہم رسول کا ساتھی کسی فرشتہ کو بناتے تو اس کو بھی انسان ہی کی صورت میں بناتے تو پھر وہی شبے ان کے دلوں میں ہم پیدا کرتے جو اب یہ کر رہے ہیں۔

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ

اور اگر ہم ان کے پاس آسمان سے فرشتے بھی اتار کر بھیجیں اور مردے بھی ان سے باتیں کریں اور ہر چیز ان کے سامنے لا کر کردیں تو وہ ایمان نہ لائیں گے، لیکن یہ کہ خدا کی مشیت ہو،

وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ (انعام - ۴)

لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرط شفقت سے یہ خیال بار بار آتا تھا کہ یہ روسائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ رہنے پائیں، خدا نے فرمایا کہ ان کو حقیقت میں براہ راست نبوت سے انکار نہیں بلکہ ان کو نبوت سے اس لئے انکار ہے کہ ان کو اولاً نفس خدا پر یقین نہیں، یہ بظاہر نبوت کی نشانیوں کو طلب کرتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو خدا کی نشانیاں بھی تسلیم نہیں، ایسے لوگوں کی قسمت میں ایمان کی سعادت نہیں، ان کے لئے معجزے بیکار ہیں یہ سعادت ان ہی کو ملتی ہے جو حق کے طالب ہیں اور حق باتوں کو سنتے ہیں۔

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَإِنَّهُمْ
لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ
وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا
عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَأُوْذُوْا حَتّٰى أَتٰهُمْ
نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ
مِنْ نَّبَإِى الْمُرْسَلِيْنَ وَإِنْ
كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ
تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ
فَتَأْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى
الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ. إِنَّمَا
يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ
اللّٰهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ، وَقَالُوْا
لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ
إِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰى أَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً
وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ.

(انعام - ۴)

ہم جانتے ہیں کہ ان کافروں کی باتیں تجھ کو غمگین کرتی ہیں لیکن تجھ کو غمگین نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے ہیں بلکہ دراصل ان ظالموں کو خدا کی نشانیوں سے انکار ہے، تجھ سے پہلے انبیاء بھی جھٹلائے گئے تو انہوں نے اپنی تکذیب پر صبر کیا اور انکو بھی ایذا پہنچائی گئی یہاں تک کہ ان کے پاس خدا کی نصرت آئی خدا کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، گزشتہ پیغمبروں کے واقعات تجھ کو معلوم ہو چکے ہیں اور اگر ان کافروں کی روگردانی تجھ پر گراں ہو تو اگر تجھ میں طاقت ہو تو زمین میں کوئی سرنگ یا آسمان میں کوئی سیڑھی ڈھونڈ کر ان کو کوئی نشانی لا کر دے (ان نشانیوں سے ان پر کوئی اثر نہ ہوگا) اگر خدا چاہتا تو ان کو راہ ہدایت پر متفق کر دیتا تو غمگین ہو کر جاہلوں میں سے نہ بن، دعوت الٰہی کو وہی قبول کرتے ہیں جو آواز پر کان دھرتے ہیں (اور یہ کافر دل کے مردے ہیں) ان کو خدا ہی اٹھائے گا، پھر اسی کی طرف لائے جائیں گے، یہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی کہہ دے کہ خدا نشانی لانے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نادان ہیں۔

لیکن معجزہ دیکھنے پر بھی اُن کے قلوب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا کیونکہ اس شک و شبہ کا منشا عناد ہے حق طلبی نہیں، اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلی ہی دفعہ دیکھ کر وہ ایمان لے آتے۔

وَأَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ
اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ
وَمَا يُشْعِرُكُمْ أَنَّهَا إِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ
وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ

اور یہ کافر خدا کی بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی ان کے پاس آجائے گی تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں اور تمہیں کس نے بتایا کہ یہ نشانیاں دیکھ کر ایمان لائیں گے، یہ ایمان نہیں لائیں گے (نشانی کے بعد ہم انکے

يُؤْمِنُوا بِهٖ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَا اِلَيْهِمُ
الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا
عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا
اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
يَجْهَلُوْنَ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا
شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا

(انعام۔ ۱۳)

دلوں کو حصول یقین سے اور ان کی آنکھوں کو اپنے دیکھنے پر اعتبار کر لینے سے، پھیر دیتے ہیں، جس طرح کہ پہلے اس پر ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی اسی سرکشی کی حالت میں چھوڑ دیں گے کہ بھٹکتے رہیں، اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھی اتار کر بھیجیں اور مردے بھی اٹھ کر ان سے باتیں کریں اور ہر چیز ہم ان کے سامنے بھی کر دیں تو وہ ایمان لانے والے نہیں مگر جو چاہے اللہ لیکن ان میں اکثر نادان ہیں اور ہم نے اسی طرح ہر نبی کا معاند انسانوں اور جنوں سے بنایا ہے جو ایک دوسرے کو دھوکے کی ملمع باتیں سکھایا کرتے ہیں (اسی عناد کے باعث وہ نشانیوں کو نہیں مانتے)

اگر رفع حجت کے لیے ان کو معجزہ دکھایا بھی جاتا ہے تو حیلہ جوئی کر کے کہتے ہیں کہ گزشتہ انبیاء کو جیسے معجزے دیے جب تک وہی معجزے ہم کو نہ دیے جائیں ہم ایمان نہ لائیں گے۔

فَلْيَأْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۔

(انبیاء۔ ۱)

چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائے جیسے پہلے لوگ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے۔

لیکن فرض کرو کہ وہی معجزات دکھائے بھی جائیں تو ان کی حیلہ جو طبیعت ان سے کب تسلی پائے گی، وہ فوراً یہ کہہ دیں گے جیسا کہ انہوں نے بارہا کہا ہے کہ یہ محض ساحرانہ کرشمہ ہے اور ہماری آنکھوں کو مسحور کر دیا گیا ہے۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ
لَمَجْنُوْنٌ ۔ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا
لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ
الْاَوَّلِيْنَ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۔
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ وَلَوْ
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۔
لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ
مَّسْحُوْرُوْنَ ۔

(حجر۔ ۱)

اور کافر کہتے ہیں کہ اے وہ جس پر نصیحت اتری ہے تجھ پر کوئی جن سوار ہے، یوں تو فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے آتا اگر تو سچا ہے (خدا کہتا ہے) ہم فرشتوں کو دنیا میں حق کے ساتھ اتارتے ہیں اگر فرشتے اتار دیے جائیں تو پھر ان کافروں کو مہلت نہ دی جائے گی اس نصیحت کو ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں، ہم نے تجھ سے پہلی قوموں میں بھی پیغمبر بھیجے اور ان میں سے کسی کے پاس کوئی پیغمبر نہ گیا لیکن انہوں نے اس سے تمسخر کیا، اسی طرح ہم گنہگاروں کے دلوں میں بٹھا دیتے ہیں، وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے، یہ اگلوں سے رسم چلی آتی ہے اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیں اور وہ اس میں چڑھ بھی جائیں تو بھی کہتے رہیں گے کہ ہماری آنکھوں کو متوالا بنا دیا گیا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ ان معاندین کے شکوک و شبہات کا ابر تو بادل معجزات اور آیات کی روشنی سے بھی نہیں چھٹتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پہلے پہل اسلام کی دعوت ان کے سامنے پیش کی تو آپ کو انہوں نے مجنون کا

خطاب دیا، قرآن مجید نے ان کی تردید کی۔

مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (ن)

تو اپنے پروردگار کی عنایت سے مجنون نہیں۔

اس کے بعد آپ نے ان کے سامنے معجزات اور آیات پیش کیے کہ کہیں مجنوں سے بھی یہ افعال صادر ہو سکتے ہیں؟ تو انہوں نے آپ کو مجنون کے ساتھ "کاہن" اور "جادوگر" کہا۔

فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (طور)

تو اپنے پروردگار کی عنایت سے نہ تو کاہن ہے اور نہ مجنون

قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس ۱)

کافروں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادوگر ہے۔

آپ نے ان کے اس الزام کے جواب میں اپنی تعلیمات و تلقینات کو پیش فرمایا کہ کاہن و جادوگر علم و حکمت کا ذخیرہ نہیں رکھتے لیکن پُرعناد قلوب کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی اور کہا کہ علم و حکمت کے اسرار انہیں کوئی سکھاتا ہے۔

وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ (دخان ۱)

اور ان معاندوں نے کہا کہ یہ سکھایا ہوا مجنون ہے۔

الغرض انسانوں کے افہام و تفہیم اور ہدایت و رہنمائی کے جو اسلوب اور طریق ہو سکتے تھے وہ سب ان کے سامنے پیش کیے گئے مگر انہیں شک و شبہ کی کشمکش سے نجات نہ ملی۔

باایں ہمہ انبیاء، معاندین کو معجزات دکھاتے ہیں اور وہ اعراض کرتے ہیں

معاندین کی اس پیہم طلب اور اصرار سے خیال ہو سکتا ہے کہ اگر ان کو کوئی معجزہ دکھایا جائے تو وہ شاید ایمان لے آئیں، لیکن تمام انبیاء کی سیرتیں شہادت دیتی ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، انہوں نے معجزات دیکھے، پھر بھی اپنے انکار و اعراض پر نہایت استقلال کے ساتھ قائم رہے، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا لیکن اس کا انکار ایمان سے متبدل نہ ہوا جیسا کہ توراۃ اور قرآن دونوں میں بہ تکرار بیان ہوا ہے، قرآن مجید میں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ۔
وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ
اُخْتِهَا وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ. وَقَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ.
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ.
(زخرف ۵)

جب موسیٰ ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آیا تو وہ ہنستے ہیں اور ہم انہیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں لیکن یہ کہ وہ پہلی نشانی سے زیادہ بڑی ہوتی ہے اور ہم نے ان کو بڑے عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ رجوع کریں اور انہوں نے موسیٰ سے کہا اے جادوگر! اپنے خدا سے ہمارے لئے دعا کر جیسا کہ اس نے تجھ سے تیری دعاؤں کے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے (کہ وہ ہم سے یہ عذاب دور کر دے) ہم راہ راست کو قبول کئے لیتے ہیں پس جب ہم نے ان سے عذاب ہٹا دیا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں۔

اس موقع پر ایک نکتہ خاص خیال کے لائق ہے، یہ حکایت حضرت موسیٰؑ کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے جو زمانۂ ماضی کا ایک واقعہ تھا جس کو تمام تر صیغۂ ماضی سے ادا ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے صیغۂ مضارع کا استعمال کیا ہے جو واقعۂ حال و استقبال کے بیان کرنے کے لئے مقرر ہے۔

(۱) جب موسیٰ ہماری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس آئے تو وہ ہنستے ہیں۔

(۲) اور ہم انہیں کوئی نشانی نہیں دکھاتے ہیں، لیکن وہ پہلی نشانی سے بڑی ہوتی ہے۔

(۳) پہلے انہوں نے وعدہ کیا کہ اگر موسیٰ کی دعا قبول ہوگئی تو ہم ایمان لے آئیں گے، لیکن جب دعا قبول ہوکر اس کا اثر ہوا تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے ہیں۔

اس موقع پر صیغہ مضارع کے استعمال سے یہ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ گو یہ واقعہ خاص فرعون کے ساتھ پیش آیا مگر یہ مخصوص حضرت موسیٰ ہی کے فرعون کے ساتھ نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ جب ان کے پیغمبر خدا کے احکام اور نشانیاں لے کر ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ صدائے خندۂ تحقیر بلند کرتے ہیں، لیکن خدا ان کو نشانیوں پر نشانیاں دکھاتا جاتا ہے، تاہم ان سے ان کی تسکین نہیں ہوتی اور دوسری کوئی نشانی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ نشانی ہم کو دکھادی گئی تو ہم یقیناً ایمان لے آئیں گے، لیکن جب وہ نشانی بھی ان کو دکھادی جاتی ہے تو ان کو اس سے بھی تسکین نہیں ہوتی اور وہ آخر تک ایمان کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔

حضرت صالحؑ کی امت نے حضرت صالح سے ایک نشانی طلب کی، انہوں نے کہا یہ اونٹنی تمہاری نشانی ہے جو ایک دن میں ان کے چشمہ یا کنوئیں کا تمام پانی پی جاتی تھی اور دوسرے دن ان کے جانوروں کو پانی ملتا تھا، لیکن اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام چشمہ یا کنوئیں کا پانی پی جاتی ہے، انہیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پاداش میں وہ ہلاک کر دیئے گئے۔ سورۂ شعراء میں ہے۔

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ. قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّ
لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ. وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. فَعَقَرُوْهَا
فَأَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ. فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ
إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ (شعراء - ۸)

اے صالح! تم ہماری ہی طرح آدمی ہو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ، صالح نے کہا یہ اونٹنی ہے اس کے لئے پانی پینے کی ایک باری ہے اور تمہارے لئے ایک مقرر دن کا پانی پینا ہے، اور اس کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم کو آئے گا، تو انہوں نے اس کی کونچ کاٹ ڈالی پھر نادم ہوئے تو عذاب نے انہیں آگھیرا، اس واقعہ میں بڑی نشانی ہے، صالح کی قوم کے لوگ اکثر مومن نہ تھے۔

عہد نبویؐ کے فرعونوں اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں مگر انہیں عناد کی کورباطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی، چنانچہ کفار قریش کے حال میں قرآن مجید کا بیان ہے۔

وَمَا تَأْتِيْهِمْ مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ
إِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ. فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ
لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيْهِمْ أَنْبٰٓؤُا مَا
كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (انعام - ۱)

ان کے پاس خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی لیکن وہ اس سے اعراض کرتے ہیں حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کو جھٹلایا تو عنقریب جس چیز کا مذاق اڑاتے ہیں اس کی حقیقت ان کو معلوم ہوگی۔

ایک موقع پر قرآن مجید نے اسی واقعہ کو بیان کیا ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق نبوت کی کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو معاندین قریش کہتے ہیں کہ ان نشانیوں سے ہم کو تسکین نہ ہوگی جب تک گذشتہ پیغمبروں کی طرح خود ہم کو بھی وہی نشانیاں نہ دی جائیں، یعنی نبوت کے تمام آثار و کیفیات خود ہم پر طاری نہ ہوں تاکہ ہم کو دھوکا اور فریب کا شبہ نہ رہے، خدا نے کہا کہ یہ نبوت ہر ایک کا حصہ نہیں،

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰی نُؤْتٰی مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ رُسُلُ اللّٰهِ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام - ۱۵)	اور جب ان (کفار قریش) کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس وقت تک نہ مانیں گے جب تک ہم کو بھی وہ کچھ نہ دیا جائے جو خدا کے پیغمبروں کو دیا گیا ہے، خدا بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغامبری کا منصب کس کو عطا کرے

اسلئے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد بالآخر معاندین پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہر طلب معجزہ کے لئے ان کے پیہم اصرار الحاح اور طلب کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی اور صرف عذاب الٰہی کی آخری نشانی انکے لئے باقی رہ جاتی ہے، انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ نے تمام انبیاء سے زیادہ معجزات اور نشانیاں دکھائیں، تاہم فریسی یہودیوں کو معجزہ کی تشنگی باقی رہ گئی اور ہر ملاقات میں انھوں نے معجزہ کی نئی فرمائش کی،

"تب فریسی نکلے اور اس سے (حضرت عیسیٰ سے) حجت کر کے اس سے امتحان کے لئے کوئی آسمان سے نشان چاہا" (مرقس ۸-۱۱)

حضرت عیسیٰ نے آہ سرد بھر کر فرمایا،

"اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں، میں تم سے کہتا ہوں کہ زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا" (مرقس ۸-۱۲)

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ نے ایک گونگے کو اچھا کیا، بعضوں نے کہا کہ

"یہ بعل زبول دیوتا کی مدد سے ایسے عجیب کام کرتا ہے، اور اوروں نے آزمائش کے لئے اس سے ایک آسمانی نشان مانگا" (لوقا ۱۱-۱۶)

حضرت عیسیٰ نے ان کے جواب میں فرمایا،

"اس زمانہ کے لوگ برے ہیں، وہ نشان ڈھونڈتے ہیں، پر کوئی نشان ان کو نہ دیا جائے گا، مگر یونس نبی کا نشان" (لوقا ۱۱-۲۹)

اللہ تعالیٰ نے معاندین قریش کے جواب میں قرآن مجید میں اسی نکتہ کا اظہار فرمایا،

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ (بنی اسرائیل - ۶)	اور ہم کو نشانیوں کے بھیجنے سے صرف اس امر نے باز رکھا کہ پہلوں نے ان کو جھٹلایا،

قرآن مجید میں چار پانچ مقام پر مذکور ہے کہ عہد محمدی کے معاندین نے کہا،

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (رعد ۴) — محمد پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی،

اس کے جواب میں ان کو نبوت کی اصل حقیقت، انذار، تبشیر اور ہدایت کیطرف متوجہ کیا گیا اور خرق عادت کی کسی مزید نشانی کے دکھانے سے تغافل اور احتراز برتا گیا، عیسائی معترضین قرآن مجید کی ان آیتوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزہ دکھانے سے اس لئے انکار کیا کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی معجزہ نہیں ملا تھا، اگر ان آیتوں سے یہ استنباط صحیح ہے تو انجیل کی جو آیتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں ان کا مطلب کیا ہوگا؟ کیا حضرت عیسیٰ کا فریسیوں کو معجزہ دکھانے سے انکار کرنا بھی یہی نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ نعوذ باللہ ان کو کوئی معجزہ خدا کی طرف سے نہیں ملا تھا۔

معجزہ کے انکار یا تاخیر کے اسباب

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات روحانی کو بھی ایک نظام اور اصول کے تحت رکھا ہے اس بنا پر ہم کو ضرورت ہے کہ ان مصالح اور اسباب کا پتہ لگائیں جن کی بنا پر باوجود قدرت اور شدت ضرورت کے معجزات سے کلیۃً انکار کیا گیا ہے یا ان کے ظہور میں تاخیر ہوتی ہے، قرآن مجید کے امعان مطالعہ سے ان اسباب کو ذیل کی صورتوں میں محدود کیا جاسکتا ہے۔

(۱) معجزات کے ذریعہ سے جو لوگ ایمان لاتے ہیں انکا ایمان محض جبری، تقلیدی اور بالواسطہ ہوتا ہے، وہ لوگ اپنے دل میں انبیاء کے محاسن تعلیم کا کوئی خاص ذوق نہیں پاتے، صرف معجزات کی قوت اور اعجوبگی ان کو متحیر اور مبہوت کر دیتی ہیں، حالانکہ انبیاء کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو شریعت کے رمز شناس اور اس کے اسرار و حکم سے ذوق آشنا ہوں، یہی حالت ہے جس کو قرآن مجید نے "شرح صدر" اور انشراح قلب سے تعبیر کیا ہے۔

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (انعام ۱۵) — جس کو خدا ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو قبول اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔

اس قسم کے لوگوں کے لئے معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی، ان کے لئے آفتاب و ماہتاب، آسمان و زمین، دن اور رات غرض دنیا کا ایک ایک ذرہ معجزہ ہوتا ہے اور خدا کے وجود، خدا کی وحدانیت اور پیغمبر کی نبوت پر بلاواسطہ دلالت کرتا ہے، ان کے لئے صرف تفکر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے، یہی گروہ ہے جس پر زیادہ سے زیادہ انبیاء کی نگاہ انتخاب پڑتی ہے اور وہ ان کو صرف تفکر و اعتبار کی ترغیب دیتے ہیں، اس گروہ کے بالمقابل ایک کور باطن فرقہ اور بھی ہوتا ہے، جس پر نظام فطرت کے دوسرے شواہد و آیات کی طرح معجزات کا بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا، انبیاء کو ابتدائے بعثت میں ان ہی دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ فطرۃً ایک معجزات سے بے نیاز ہوتا ہے اور دوسرے پر معجزات کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لئے ان دونوں گروہوں کے لئے معجزات بے کار ہوتے ہیں اور اس بنا پر انبیاء ان کے پیش کرنے سے انکار کرتے ہیں، اسی نکتہ کو خداوند تعالیٰ نے ان آیتوں میں بیان کیا ہے۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — کہہ کہ دیکھو زمین و آسمان میں کس قدر نشانیاں ہیں اور نشانیاں

وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ — اور ڈراوے تو اس قوم کے لئے کچھ بھی مفید نہیں جو ایمان

لَا یُؤْمِنُوْنَ (یونس-۱۰)

نہیں لانا چاہتی۔

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ (رعد-۳)

اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہیں اترتا، کہہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو ہدایت کرتا ہے۔

(۲) بعض دفعہ معاندین ایسی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں جن کے بار کے متحمل قوت انسانی کے دوش و بازو نہیں ہو سکتے، خدا کا خود انسانوں کے سامنے آنا، خدا کا خود ہر انسان سے باتیں کرنا، فرشتوں کا نظر آنا، آسمان سے کوئی مجسم کتاب اتارنا، بازی گر کی طرح پیغمبر کا آسمان پر چڑھنا، کفار کی طرف سے جب اس قسم کے معجزات طلب کئے جاتے ہیں، تو انبیاء کو ہمیشہ انکار کرنا پڑتا ہے اور اس انکار کا منشا خود منکرین کی فطرت ہے۔

یَسْـَٔلُکَ اَهْلُ الْکِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ کِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓی اَکْبَرَ مِنْ ذٰلِکَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ (نساء-۲۲)

تم سے یہود کہتے ہیں کہ ان کے اوپر آسمان سے ایک کتاب اتار دو لیکن ان لوگوں نے تو موسیٰ سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا یعنی ان لوگوں نے کہا تھا کہ ہم کو خدا کو کھلم کھلا دکھلا دو، اس ظلم کا جو انہوں نے اپنے اوپر کیا یہ نتیجہ ہوا کہ بجلی کے کڑکے نے ان کو دبا لیا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَةٌ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (بقرہ-۱۴)

اور جن لوگوں کو علم نہیں وہ کہتے ہیں کیوں خدا ہم سے باتیں نہیں کرتا یا کوئی نشانی ہمارے پاس نہیں لاتا، اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کہا، دونوں کے دل ایک سے ہیں۔

لَوْمَا تَاْتِیْنَا بِالْمَلٰٓئِکَةِ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا کَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِیْنَ (حجرات-۱)

کیوں نہیں فرشتوں کو ہمارے پاس لے آتے اگر تم سچے ہو (خدا کہتا ہے) ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے لیکن حق کے ساتھ، اگر وہ ان کافروں کے سامنے اتریں تو پھر ان کو مہلت نہ دی جا سکے گی۔

(۳) مادیت کی ترقی کے زمانہ میں تمام فضائل و محاسن کا مرکز صرف دولت، جائیداد، مال و اسباب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اخلاق و عادات، تمدن و معاشرت، رسم و رواج غرض تمام چیزوں میں امراء کی تقلید کرتے ہیں لیکن انبیاء ہمیشہ اپنی معاشرت، اپنی وضع اپنے لباس غرض اپنی ایک ایک ادا سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ فضائل کا منبع صرف روح ہے اور زخارف دنیوی سے ان کو کوئی تعلق نہیں۔

اسی بنا پر جب منکرین انبیاء سے اس قسم کے معجزات طلب کرتے ہیں جو امراء کے ساتھ مخصوص ہیں تو انبیاء کو عموماً ان کا انکار کرنا پڑتا ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَکٌ فَیَکُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْهِ کَنْزٌ اَوْ تَکُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْکُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ

اور ان لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر کیوں کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں اس پر ایک فرشتہ نہیں اترتا جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈراتے یا اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتر آتا یا اس کے پاس کوئی باغ کیوں نہیں ہے جس سے وہ کھاتے اور

اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ، (فرقان-۱)

ظالموں نے کہا تم صرف ایک ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

(۴) آیت بالا سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کفار کا عام خیال یہ تھا کہ خدا کی طرف سے جو قاصد بن کر آئے اس کو مرتبہ بشریت سے بالاتر ہونا چاہیئے اور اس کو بے انتہا خدائی قدرتیں حاصل ہونی چاہئیں، اس بنا پر جب اس قسم کے معجزے طلب کئے جاتے ہیں جن سے اس ظن فاسد کی تائید ہوتی ہے تو انبیاء ان سے انکار کرتے ہیں،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (انعام-۵)

کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میں نے یہ کہا کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف وحی کا اتباع کرتا ہوں۔

(۵) تحدی کے معجزات یعنی وہ معجزات جو کفار کے مطالبہ پر صادر ہوتے ہیں، ان کی تاخیر کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ایسے معجزات پر ایمان نہ لانے کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے اور منکرین کا گروہ ہلاک کر دیا جاتا ہے، چنانچہ اس کی مثالیں قوم نوح، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش تک کی تمام تاریخیں پیش کرتی ہیں اور قرآن مجید نے اس کو بتصریح بیان کر دیا ہے، حضرت صالح کی امت نے ان سے نشانی طلب کی، خدا نے کہا، نشانی تمہیں دکھائی جائے گی، لیکن اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ، (بنی اسرائیل-۶)

اور ہم نے نشانیاں بھیجنا اس لئے موقوف کیا کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی کی نشانی دی سمجھانے کو اور پھر اس کا حق نہ مانا اور نشانیاں جو ہم بھیجتے ہیں تو ڈرانے کو۔

لیکن جس طرح افراد کی موت وحیات کا ایک زمانہ ہے اسی طرح قوموں کی ہلاکت و بربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے،

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (اعراف ویونس)

ہر قوم کا ایک زمانہ مقرر ہے،

اس لئے اس قسم کے معجزات کے ظہور میں اس مدت معینہ تک کے لئے تاخیر کی جاتی ہے اور پیغمبر اور معاندین دونوں اس کے منتظر رہتے ہیں،

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس-۲)

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پر خدا کی طرف سے کوئی نشان نہیں اترتا، کہہ کہ غیب صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے تم لوگ اس کے ظہور کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔

یہی سبب ہے کہ جن انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا مظہر اتم بنایا، ان کے ہاتھوں سے تحدی اور مطالبہ کے معجزوں کے صدور میں تاخیر برتی جاتی تھی، حضرت عیسیٰ کے متعلق انجیل کی آیتیں گزر چکی ہیں کہ یوں تو ان سے بیسیوں

معجزے سرزد ہوتے تھے، مگر تحدی اور مطالبہ کے معجزہ سے انہوں نے بالعموم انکار کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو تباہ و برباد دیکھنا نہیں چاہتے تھے، یہاں تک کہ حواریین نے جب زیادت ایمان اور ترقی ایمان کے لئے معجزہ کی فرمائش کی تو خدا نے جواب دیا،

إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ يَكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِينَ (مائدہ-۱۵)	میں یہ آسمانی خوان تم پر اتار سکتا ہوں لیکن اس کے بعد اگر تم میں سے کسی نے انکار کیا تو میں اس کو ایسا سخت عذاب دوں گا کہ دنیا میں کسی کو نہ دیا ہوگا۔

غرض کائنات روحانی کا یہی اصول پیش نظر تھا جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مطالب کی پرواہ نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ جانتے تھے کہ ان کے مطالبہ اور تحدی کے مطابق معجزہ آنے کے بعد ان کو پھر فرصت نہ دی جاسکے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے، چنانچہ معاندین قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ طلب کرتے تھے کہ فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لے آؤ، خدا نے کہا کہ اگر وہ سامنے آئیں بھی تو انسانوں کی صورت میں آئیں گے اور تم کو پھر وہی شبہ رہ جائے گا، علاوہ ازیں قانون الٰہی میں یہ آخری حجت ہے، اگر فرشتے اتر آتے اور اس سے بھی تمہاری تسلی نہ ہوتی تو پھر تم کو اس مطالبہ کے معجزہ کے بعد مہلت نہ مل سکے گی اور تم ہلاک و برباد کر دیئے جاؤ گے،

لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوٓا إِذًا مُّنْظَرِينَ (حجر-۱)	کیوں تم فرشتوں کو ہمارے پاس نہیں لے آتے اگر تم سچے ہو، خدا کہتا ہے فرشتوں کو حق کے ساتھ اتارتے ہیں اگر وہ اتریں تو پھر تم کو اس وقت مہلت نہ دی جاسکے گی۔

(۶) معاندین عموماً پیغمبروں کو جھوٹا جان کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس آخری معجزۂ عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو وہ آخر کب آئے گا اور وہ جلد کیوں نہیں آتا؟ چونکہ اپنی نافہمی سے ان کو یقین ہوتا ہے کہ یہ معجزانہ عذاب ظاہر نہ ہوگا اس لئے وہ اس کا مطالبہ بار بار کرتے ہیں، تاکہ لوگوں میں پیغمبر کی سبکی ہو اور ہماری طرح اور لوگ بھی اس کو کاذب تسلیم کریں، چنانچہ قرآن مجید میں بار بار ہر قرن کے کافروں کے اس مقولہ کو دہرایا گیا ہے اور اس کا جواب دیا گیا ہے، حضرت شعیبؑ کی امت نے کہا،

وَإِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِينَ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِينَ (شعراء-۱۰)	اور ہمارے خیال میں تم جھوٹے ہو اگر سچے ہو تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرادو۔

لیکن اس کے لئے خدا کے ہاں ایک قانون مقرر ہے،

لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ إِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ. قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَتٰىكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتًا أَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنْتُمْ بِهٖ آلْـٰٔنَ	ہر قوم کا ایک وقت مقرر ہے تو جب اس کا مقرر وقت آجاتا ہے تو پھر نہ ایک گھڑی وہ دیر کرسکتے ہیں اور نہ جلدی، کہدے اے پیغمبر! بھلا دیکھو تو اگر خدا کا عذاب راتوں رات یا دن کو آپہنچے تو یہ گنہگار جلدی کرکے کیا کرلیں گے، کیا جب آنے

وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔

(یونس-۵)

والا واقعہ آجائے گا تب تم ایمان لاؤ گے، اب ایمان لائے ہو حالانکہ تم تو اسی کی جلدی کر رہے تھے۔

عقیدہ و معجزات کی اصلاح

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں، وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں، اسلام دنیا میں دین الٰہی کی تکمیل اور گزشتہ مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لئے آیا تھا۔ ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دیئے تھے، جن انبیاء اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر ہوئے۔ ان میں الوہیت اور خدائی کا عنصر تسلیم کیا گیا اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصل حقیقت جس پر دین الٰہی کی بنیاد ہے متزلزل ہو گئی اس لئے قرآن مجید نے نہایت وضاحت، نہایت صفائی اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید اور نبوت کی اصل حقیقت اس استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم کر دی کہ آئندہ فساد اور سوء عقیدہ کے سیل و طوفان سے اس کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہا۔

(۱) سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج امور ہیں، نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبۂ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے، اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصل حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا
اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ
قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ اِنَّآ
اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا
تُسْــَٔـلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ

(بقرہ-۱۴)

اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں خدا خود ہم سے کیوں باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہو گئے ہم نے تو نشانیاں ان لوگوں کے لئے کھول دی ہیں جو یقین کرتے ہیں اے محمد! ہم نے تجھ کو سچائی دیکر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور گنہگاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اگر ان کو اب بھی یہ نشانیاں نظر نہ آئیں، تو ان دوزخیوں کا حال تجھ سے نہ پوچھا جائے گا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ
مُّبِيْنٌ ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ
الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (عنکبوت-۵۰)

اور،، کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اترتی ہیں کہہ دے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ
اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ
قَوْمٍ هَادٍ (رعد-۱)

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان اس کے پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اتارا جاتا، اے محمد! تو تو ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کا ایک ہدایت کرنے والا ہوتا ہے۔

(۱) قرآن مجید نے نہایت وضاحت اور تکرار کے ساتھ اس حقیقت کا اعادہ کیا ہے کہ ہمارا پیغمبر بشر اور خالص بشر ہے اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے اور اس لئے وہ اپنی طرف سے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ ۔
(کہف ۔۱۰ ۔ حم السجدہ ۔۱)

میں بھی تمہاری طرح ایک آدمی ہوں (البتہ) مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

کفار قریش کا خیال تھا کہ پیغمبر کے ساتھ فرشتوں کا پرا ہونا چاہیئے، کبھی کبھی خود خدا اس کے سامنے آکر نمایاں ہو، اس کے لئے سونے چاندی کا محل ہو، عجیب وغریب اقسام کے باغ اس کے قبضہ میں ہوں، ہمارے سامنے وہ آسمان پر چڑھے اور وہاں سے ہمارے لئے کتاب اتار لائے۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۔ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۚ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۔ (بنی اسرائیل ۱۰)

اور کافروں نے کہا ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے قبضہ میں کھجور اور انگور کا ایک باغ نہ ہو اور پھر تم اس کے بیچ میں نہریں نہ بہا دو یا جیسا کہا کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو یا خدا اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لئے سونے کا ایک گھر ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور وہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا یقین اس وقت تک ہم کو نہ آئے گا جب تک وہاں سے کوئی ایسی کتاب نہ اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ سکیں۔

ان سب کے جواب میں قرآن مجید آپ کو سکھاتا ہے۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا
(بنی اسرائیل ۱۰)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں کون ہوں، ایک آدمی پیغمبر۔

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ
(انعام ۵)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دے کہ میں یہ تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف الہام کیا جاتا ہے۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۚ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۚ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۔
(اعراف ۲۲)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دے خود میرا نفع اور نقصان بھی میرے قبضہ اختیار میں نہیں لیکن جو چاہے خدا، اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو اپنا بہت سا فائدہ کر لیتا اور مجھ کو کوئی گزند نہ پہنچتا، میں تو صرف ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

غور کرو کہ زمین سے باغ کا اگا دینا یا سونے کا محل کھڑا کر دینا یا چشمہ بہا دینا یا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب لا

دینا نہ خدا کی قدرت سے باہر تھا اور نہ اس رسول کے ان معجزات سے مافوق مطالبہ تھا جس کے ہاتھ سے پتھر بسر چکے تھے، جس کے اشارے سے درخت چل چکے تھے یا جو معراج میں ساتوں آسمانوں کی منزلیں طے کر چکا تھا لیکن چونکہ اگر ان کے مطالبہ پر یہ امور واقع ہو جاتے تو وہ اگر بدعقیدگی کو راہ دیتے تو وہ آپ کو جادوگر کہہ دیتے اور اگر خوش عقیدگی کا اظہار کرتے تو آپ کو نعوذ باللہ مافوق بشر تسلیم کر لیتے اور یہ دونوں باتیں اصول اسلام کے منافی ہیں اس لئے سرے سے ان کے اس جاہلانہ مطالبہ کو رد کر دیا گیا کہ چند لوگوں کے ایمان و عدم ایمان کی خاطر نفس پیغام و دعوت کی اصول کی بیخ کنی نہیں کی جا سکتی۔

(۲) عام لوگوں میں انبیاء کی نسبت یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالم کائنات کے تصرف پر قادر ہیں، چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کو جس طرح سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضۂ قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی، قرآن مجید نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں، بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (انعام۔۱۳)	کہہ دے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں،
قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ (عنکبوت۔۵)	کہہ دے اے پیغمبر! کہ نشانیاں تو خدا ہی کے پاس ہیں،
قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً (انعام۔۴)	کہہ دے اے پیغمبر! کہ خدا کو قدرت ہے کہ وہ نشان اتارے۔

سب سے زیادہ صاف اور صریح آیت یہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (رعد۔۶)	کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی نشانی لائے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجہ میں بیان ہوئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰؑ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کر دی گئی تھی، اس لئے وہ خاص اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے، قرآن مجید اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتا، اس نے حضرت عیسیٰؑ کے تمام معجزات کو بیان کر دیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس عقیدۂ باطل کو بھی رد کرتا گیا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا، حضرت عیسیٰؑ کے اختیار سے نہیں، چنانچہ خود حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن کہتا ہے۔

اِنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ	میں تمہارے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں کہ میں مٹی سے پرندہ کی صورت کا جانور بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جاتا ہے

وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (آل عمران۔ ۵)	اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور مردہ کو زندہ کرتا ہوں خدا کے حکم سے ۔

دوسرے موقع پر حضرت عیسیٰ پر اپنے احسانات جتاتے ہوئے خدا نے فرمایا۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ (مائدہ۔ ۱۵)	اور یاد کر جب تو مٹی سے پرندہ کی طرح صورت میرے حکم سے بناتا تھا پھر اس میں پھونک مارتا تھا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جاتا تھا اور تو اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتا تھا اور جب مردے کو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا۔

یہ قرآن مجید کے اسی اظہار حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہ ہوئیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور تمام دنیا کے مذاہب میں توحید کامل کی علمبرداری صرف اسلام کے دست و بازو کو سپرد ہوئی۔

مسئلہ اسباب وعلل میں افراط وتفریط

عقیدۂ معجزات کے اصلاحات ہی کے تحت میں مسئلہ اسباب وعلل سے بھی تعرض کرنا ہے جس نے دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی دو فرقے پیدا کر دیئے ہیں، ایک فرقہ وہ ہے جو دنیا میں صرف اسباب وعلل کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہے اور ان تعلقات کو ناقابل نسخ وتغیر مانتا ہے، اس کے نزدیک اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ان ہی مادی علل واسباب کے ماتحت ہوتا ہے اور ان میں کسی قسم کا رد و بدل اور نسخ وتغیر نہیں ہوتا اور اس لئے وہ خرق عادت کو ممتنع اور محال یقین کرتا ہے کیونکہ یہ اسباب وعلل اور عالم کا یہ نظام کارسنۃ الٰہی ہے اور سنن الٰہی میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، جیسا کہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے ثابت ہوتا ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (احزاب۔ ۸)	تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے۔
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (ملٰئکہ۔ ۵)	تم خدا کی سنت (طریقہ) میں ہرگز تغیر نہ پاؤ گے۔
لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم۔ ۴)	اللہ کے بنائے کو بدلنا نہیں۔

دوسرا فریق اللہ تعالیٰ کو نظام خاص، قوانین فطرت اور اسباب وعلل کا پابند ٹھہرانا اس کی شان قدرت کے منافی سمجھتا ہے اور وہ ان بیچ کے وسائط کے بغیر اس کو فرمانروائے مطلق یقین کرتا ہے، یہ فریق اپنے دعویٰ پر حسب ذیل دلیلیں پیش کرتا ہے۔

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (بروج)	وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (آل عمران۔ ۴)	اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے
وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (ابراہیم۔ ۴)	اور خدا جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (حج۔ ۲)	بے شک خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (بقرہ۔ ۳۳)	لیکن خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (مائدہ ۔۱)	بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (حج ۔۲)	بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

ان آیات کے علاوہ حسب ذیل آیت قرآن مجید میں کم و بیش تغیر کے ساتھ آٹھ مقامات پر مذکور ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ	اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر شے کی علت صرف خدا کی قدرت، مشیت اور ارادہ ہے اور اس لئے ہر قسم کے خرق عادت ممکن ہیں۔

قرآن مجید اسباب و مصالح کا قائل ہے

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں فریق افراط و تفریط کے دو کناروں پر ہیں اور انہوں نے قرآن مجید کی تمام آیتوں پر غور و تدبر کی نظر نہیں ڈالی ہے، یہی سبب ہے کہ انہوں نے اشیاء کے خواص و طبائع اور عقلی مصالح و حکم کا انکار کیا ہے، حالانکہ ان آیات بالا کی بنا پر یہ دعویٰ کرنا کہ قرآن اسباب و علل اور مصالح و حکم کا منکر ہے، کتاب الٰہی سے اپنی جہالت کا ثبوت پیش کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے صفات کمالیہ اور اس کے حکیم ہونے کی نفی کرنا ہے، قرآن مجید نے جابجا مخلوقات الٰہی میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، اگر یہ صحیفۂ قدرت اسباب و مصالح سے خالی ہوتا تو یہ دعوت بے سود تھی، قرآن ان عجائب قدرت کو آیات اللہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے اسرار و حکم پر غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے اور اسی دلیل سے وہ خدا کی قادر و حکیم ہستی کے وجود پر استدلال کرتا ہے، اگر یہ چیزیں اسباب و مصالح سے خالی ہوتیں تو ان میں غور و فکر کرنا بے کار ہوتا، قرآن نے آسمان و زمین، چاند، سورج، ہوا، بادل، پھول، پھل، جسم و جان، ان میں سے ہر شے کو اللہ کی وسیع قدرت اور دقیق مصلحت کا اعلان عام قرار دیا ہے اور انسان کو بار بار ادھر متوجہ کیا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ، الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران ۔۲۰)	آسمان اور زمین کے بنانے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور جو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا ہے۔

خدا نے ان لوگوں کو جو اشیاء کی پیدائش کو خالی از مصلحت جانتے ہیں، زجر فرمایا ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (مومنون ۔۶)	کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس نہیں لوٹائے جاؤ گے۔
وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (دخان ۔۲) وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ	اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے درمیان ہے ان کو محض کھیل کے لئے نہیں بنایا اور اسی خدا نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم نے اس سے ہر شے کی روئیدگی پیدا کی پھر ہم

خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا، وَمِنَ النَّخْلِ
مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ
اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ

(انعام ۔ ۱۲)

نے اس سے ہری کھیتی نکالی اور اس سے تو بر تو دانے پیدا کیے اور چھوہاروں کے درخت سے اس کے گپھوں سے لٹکے ہوئے خوشے اور انگور اور زیتون اور سیب کے باغ جن کے میوے ایک ہی قسم کے اور مختلف اقسام کے بھی پیدا کیے جب وہ پھلتا ہے تو اس کے پھل اور اس کے پکنے کو دیکھو۔

اگر ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ مصالح و احکام کے آثار پوشیدہ نہ رکھتا تو ان میں نظر و فکر کیوں دیتا، متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مخلوق الٰہی کے "منافع" کی خاص تصریح فرمائی ہے،

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ ۠ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ
وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۠ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى
بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ
اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۠ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ
وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ۠ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا
جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۠ هُوَ الَّذِيْٓ
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ
شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۠ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ
وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۠ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ
وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ
مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۠ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ
فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ۠
وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ
لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا

اور خدا نے جانوروں کو پیدا کیا ان کے اون میں خوشگوار گرمی اور بہت سے فائدے ہیں ان میں سے بعض جانور تمہاری خوراک ہیں اور تم کو ان سے رونق ہے جب شام کو ان کو پھیر لاتے ہو اور جب چراتے ہو اور وہ تمہارے مال و اسباب کو اس شہر تک اٹھا لے چلتے ہیں جہاں تم بغیر سخت تکلیف کے نہیں لے جا سکتے تھے بے شک تمہارا رب شفقت والا مہربان ہے اور گھوڑے خچر اور گدھے بنائے کہ تم ان پر سوار ہو اور رونق ہو اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے، خدا ہی پر ہے سیدھی راہ اور اس سے ہٹنے والے بھی، اسی نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا کچھ اس میں سے پینے کے کام آتا ہے اور کچھ سے درخت اگتے ہیں جن میں تم اپنے جانور چراتے ہو اس پانی سے خدا تمہارے لئے کھیتی اگاتا ہے اور زیتون، چھوارے، انگور اور ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بڑی نشانی ہے اور اسی خدا نے رات اور دن اور سورج اور چاند تمہارے کام میں لگائے اور تارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں، اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور جو بکھرا ہے تمہارے لئے زمین میں کئی رنگ کے غلے اور دانے، اس میں ان کے لئے جو سوچتے ہیں نشانی ہے اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے وہ موتی اور مونگا نکالو جس کو زینت کا سامان بنا کر پہنتے ہو اور تم دیکھو کشتیاں اس دریا کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں اور اس واسطے کہ تلاش کرو

مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (نحل - ۲)

اس کی روزی کو اور شاید احسان مانو۔

غور کرو اگر ان چیزوں میں مصالح و حکم نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ ہم انسانوں کو ان چیزوں کی پیدائش پر شکر کا حکم کیوں دیتا! بعض اشیاء کے مصالح اور اسباب کو خود قرآن مجید نے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پہاڑوں کی مصلحت یہ ظاہر کی ہے۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ (نحل - ۲)

اور اس نے زمین میں بڑے بڑے پہاڑوں کے گر ڈال دیئے ہیں کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔

ستاروں کی پیدائش کی یہ غرض بتائی۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (نحل - ۲)

اور ستاروں سے لوگ راہ پاتے ہیں۔

رات کی پیدائش کی یہ مصلحت بتائی۔

جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ (یونس - ۷)

اور اسی نے رات بنائی کہ تم سکون حاصل کرو۔

چاند کے گھٹنے بڑھنے کی غایت یہ ظاہر کی۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ (بقرہ - ۲۴)

لوگ تجھ سے چاند کی نسبت دریافت کرتے ہیں کہہ دے کہ وہ لوگوں کے لئے وقت اور زمانہ کا معیار ہیں۔

سایہ، آفتاب، رات، دن، ہوا اور پانی کے مصالح یہ تعلیم کئے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا۔ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا۔ وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا (فرقان - ۵)

کیا تو نے نہ دیکھا کہ تیرے رب نے سایہ کو کس طرح پھیلا رکھا ہے اور اگر وہ چاہتا تو ایک ہی جگہ ٹھہرا رہتا، پھر سورج کو سایہ کا رہنما بنایا، پھر اس سایہ کو ہم اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں، اسی خدا نے رات کو تمہارا اوڑھنا اور نیند کو آرام اور دن تمہارے جد و جہد کے لئے بنایا، اسی خدا نے اپنے ابر رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو خوشخبری سنانے والا بنایا اور ہم نے آسمان سے ستھرا اور نکھرا پانی اتارا کہ اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیں اور چوپایوں اور بہت سے انسانوں کو اس سے سیراب کریں۔

قرآن مجید نے اشیاء کے علل و اسباب ہونے کا بھی صاف اقرار کیا ہے مثلاً جا بجا بارش کو کھیتی اور پھل پھول کے پیدا ہونے کا سبب بتایا ہے۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (بقرہ - ۳)

اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے تمہاری روزی کے لئے پھل نکالے۔

تمام ذی روح چیزیں پانی سے زندہ ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (نور-۶)

اور خدا نے ہر چلنے والے کو پانی سے پیدا کیا،

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (انبیاء-۳)

اور ہم نے ہر زندہ شے کو پانی سے بنایا،

ہر قسم کے نباتات پانی سے اگتے ہیں،

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ (انعام-۱۲)

اسی نے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے ہر چیز کی روئیدگی ظاہر کی،

بادِ صرصر اور آندھی ہلاکت اور بربادی کا ذریعہ ہے،

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْٓ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ (حم السجدہ-۲)

ہم نے عاد کی قوم پر بادِ صرصر بھیجا منحوس دنوں میں تاکہ ہم ان کو رسوائی کا عذاب چکھائیں۔

رِیْحٌ فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا (احقاف-۳)

ایسی آندھی جس میں دردناک عذاب تھا جو خدا کے حکم سے ہر شے کو برباد کر دیتی ہے۔

اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ (الذاریات-۲)

یاد کرو جب ہم نے فائدہ نہ پہنچانے والی آندھی ان پر بھیجی جو جس شے پر گزرتی تھی اس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی،

آگ جلاتی ہے،

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (مومنین)

آگ ان کے چہروں کو جھلسا دیتی ہے

آگ لکڑی سے پیدا ہوتی ہے

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا (یٰس-۵)

جس نے ہرے درختوں سے آگ کو پیدا کیا،

قرآن مجید اشیاء کے طبعی خواص کا بھی منکر نہیں، شراب میں خواص ہیں،

قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ-۲۷)

کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے اور ان میں لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے

اون میں گرمی کی خاصیت ہے،

فِیْهَا دِفْءٌ (نحل)

جانوروں کے اون میں خوشگوار گرمی ہے۔

پانی میں پیاس بجھانے اور درخت اگانے کی خاصیت ہے،

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ (نحل۔۔)

وہی خدا آسمان سے پانی برساتا ہے، اس سے پینا ہے اور اس سے درخت ہیں،

شہد میں صحت بخشنے اور بیماری دور کرنے کی خاصیت ہے،

یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ (نحل۔۔)

شہد کی مکھیوں کے پیٹ میں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کیلئے شفا ہے۔

لیکن علت حقیقی قدرت و مشیت ہے غرض ان آیات کریمہ سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید

اسباب وعلل مصالح وحکم اور طبائع وخواص کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اس جماعت کا ساتھ نہیں دیتا جو ان چیزوں کا انکار کرتی ہے، اور یہ جانتی ہے کہ ان چیزوں کے تسلیم کرنے سے قدرت ومشیت الٰہی کے عقیدہ کا ابطال لازم آتا ہے حالانکہ یہ تو اس وقت لازم آتا ہے جب ان اسباب علل اور طبائع وخواص کو خدا سے مستقل اور مستغنی تسلیم کیا جائے اور قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اشیاء اسباب وعلل سے پیدا ہوتی ہیں اور ان میں طبائع و خواص ہیں، لیکن یہ اسباب وعلل اور طبائع وخواص خود خلاقِ عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں اور وہ ان ہی پر عموماً کاربند ہوتا ہے، لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کر سکتا ہو اور کبھی اپنے خاص حکم وارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کر سکتا ہو کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے اور خدا کی قدرت اور عظمت میں فرق آجاتا ہے، اسی لئے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے کہ اسباب و علل کے ساتھ ساتھ خدا کی مشیت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے تاکہ انسانوں میں خدا کی معذوری، مجبوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو اور نہ اس کی مشیت وارادہ پر خود اس کی مشیت وارادہ کے سوا خارجی پابندیاں عائد ہوں، چنانچہ وہ تمام آیتیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے متعلق اوپر دوسرے فریق کی طرف سے پیش کی گئی ہیں وہ اسی موقع کی ہیں اور جن سے یہی تعلیم مقصود ہے۔

ہم نے اوپر اسباب وعلل اور طبائع وخواص کے ثبوت میں جس قدر آیتیں لکھی ہیں، غور کرو ان سب میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ ان مسببات کے اسباب وعلل اور اشیاء کے طبائع و خواص خود اس نے اپنی مشیت وارادہ اور اپنے حکم وامر سے بنائے ہیں اور ہر جگہ اس کی توضیح کر دی ہے تاکہ ظاہر بیں انسان ان ظاہری علل واسباب اور طبائع وخواص کو دیکھ کر اشیاء کی علت تخلیق کا انکار کر کے مبتلائے الحاد یا اسباب وخواص کو مستقل شریک تاثیر مان کر گرفتار شرک نہ ہو جاتے، یہ انبیاء کی تعلیم کا خاص طریقہ ہے اور قرآن نے اس نکتہ کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ انبیائے کرام اور بزرگانِ خاص کو بھی عادت جاریہ اور ظاہری علل واسباب کے خلاف باور کرنے میں جب استعجاب اور استبعاد ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ کیا ہے اور ان کے اس استعجاب اور استبعاد کو اپنی قدرت اور مشیت کو یاد دلا کر رفع کیا ہے، حضرت سارہؓ کو پیرانہ سالی میں جب حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو توراۃ اور قرآن دونوں میں ہے کہ ان کو اس پر سخت تعجب ہوا، انہوں نے کہا۔

يَاوَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ (ہود)	اے خرابی! کیا میں جنوں گی اور میں بڑھیا ہوں اور میرا یہ خاوند بڑھا ہے، یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے

فرشتوں نے جواب میں کہا۔

أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ (ہود)	(اے سارہ) کیا تم خدا کے کام سے تعجب کرتی ہو۔

اس قدر تنبیہ ان کے ایمان کے لئے کافی تھی۔

حضرت زکریا بوڑھے ہو گئے تھے اور ان کی بیوی بانجھ تھیں، حضرت زکریا کو اپنی اور اپنی بیوی کی حالت کا قطعی علم تھا لیکن وہ اپنی اور اپنی بیوی کی ظاہری عدم استعداد اور اسباب وعلل کے نہ موجود ہونے کی صورت میں بھی

خدا کی قدرت اور مشیت کے مؤثر حقیقی ہونے پر یقین کامل رکھتے تھے، چنانچہ اسی حالت میں انہوں نے ایک وارث کی دعا مانگی، مگر جب ان کو اجابت دعا کی بشارت دی گئی تو تقاضائے بشریت سے کہ انسان ظاہری اسباب وعلل کے دیکھنے کا عادی ہے اس کمال ایمان کے باوجود ان کو یہ واقعہ مستبعد معلوم ہوا اور انہوں نے عرض کی۔

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا	اے میرے رب! کہاں سے میرے لڑکا ہوگا میری بیوی بانجھ ہے
وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (مریم ۔۱)	اور میں بوڑھا ہوگیا ہوں یہاں تک کہ بڑھاپے سے اکڑ گیا ہوں۔

خدا نے اس کے جواب میں صرف اسی قدر فرمایا۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ	کہا یوں ہی ہے تیرے رب نے کہا یہ مجھ پر آسان ہے، اور کیا تجھ
خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (مریم ۔۱)	کو یاد نہیں کہ میں نے تجھ کو پیدا کیا اور تو کچھ نہ تھا۔

حضرت مریم کو جب حضرت عیسیٰؑ کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے بھی ظاہری علل واسباب کے خلاف ہونے پر حیرت ظاہر کی۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ	مریم نے کہا میرے لڑکا کہاں سے ہوگا، مجھ کو کسی آدمی نے
وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (مریم ۔۲)	چھوا بھی نہیں اور نہ میں کبھی بدکار تھی۔

فرشتہ نے جواب میں کہا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ	بولا یوں ہی ہے تیرے رب نے کہا وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو
وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا (مریم ۔۲)	لوگوں کے لئے نشانی بنانا چاہتے ہیں اور اپنی طرف سے رحمت۔

قرآن میں سنت اللہ کا مفہوم

وہ فریق جو خرقِ عادت اور خلاف اسباب وعلل کے محال ہونے پر قرآن مجید کی ان آیتوں سے استدلال کرتا ہے جن میں سنت الٰہی کے عدم تبدیل کا ذکر ہے، درحقیقت دانستہ یا نادانستہ مفہوم قرآن کی تحریف کا مجرم ہے، قرآن مجید میں "سنت الٰہی" کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے، گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند و موعظت ان کے لیے مؤثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے اور وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گھڑگھڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں، یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے اسی مفہوم میں آیا ہے۔ چنانچہ وہ تمام آیتیں ذیل میں لکھ دی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کو شک و شبہ نہ رہے، قریش داعی حق کو شہر مکہ سے نکالنے کی تیاری کرتے ہیں اور اس دعوت کو قبول کرنے سے علانیہ انکار کر دیتے ہیں، تو خدا فرماتا ہے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ	اور وہ (کفار قریش) تو تجھ کو اس شہر سے لگے تھے گھبرانے تاکہ

مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ سُنَّةَ
مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ
لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا (بنی اسرائیل ۔ ۸)

وہ تجھ کو یہاں سے نکال دیں لیکن اگر ایسا ہو تو وہ تیرے بعد کم ٹھہریں گے، یہ دستور پڑا ہوا ہے ان رسولوں کا جن کو ہم نے تجھ سے پہلے بھیجا اور تو اللہ کے دستور کو ٹلتے نہ پائے گا۔

مدینہ کے منافقین اپنی شرارت سے باز نہیں آتے، خدا فرماتا ہے۔

اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۔ سُنَّةَ اللّٰهِ
فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ
تَبْدِيْلًا (احزاب ۔ ۸)

وہ جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے، دستور پڑا ہوا ہے اللہ کا ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے اور تو اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پائے گا۔

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لیے سورۂ فاطر کی حسب ذیل آیت سے بڑھ کر اور کون آیت ہو سکتی ہے۔

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ
اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۔ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا
فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ (فاطر ۔ ۵)

اور بدی کا داؤ پیچ خود داؤ پیچ کرنے والوں کو الٹ جاتا ہے تو کیا اب یہ کافر پہلی قوموں کے دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں تو تم اللہ کے دستور کو ہرگز نہ بدلتے پاؤ گے اور نہ کبھی اللہ کے دستور کو ٹلتے پاؤ گے، کیا وہ زمین میں پھرے نہیں ہیں کہ دیکھتے کہ اس سے پہلی قوموں کا کیا انجام ہوا۔

حدیبیہ کے موقع پر کفار قریش کو تنبیہ اور مسلمانوں کو تسکین دی جاتی ہے۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا
يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح ۔ ۳)

اور اگر یہ کافر تم سے لڑتے تو پیٹھ پھیر دیتے پھر وہ کوئی حامی نہ پاتے اور نہ مددگار، اللہ کا دستور یہ پہلے سے چلا آتا ہے اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے۔

اب ان آیتوں کے پڑھ لینے کے بعد بھی سنۃ اللہ کے مفہوم کے سمجھنے میں کس کو غلطی ہو سکتی ہے؟

قرآن میں فطرۃ اللہ کا مفہوم

قرآن مجید کی ایک اور آیت ہے جس کو یہ فریق اپنے ثبوت میں پیش کرتا رہتا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا
تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم ۔ ۴)

خدا کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا، خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں۔

اس موقع پر اس آیت کو پیش کرنا قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے، قرآن مجید کی اصطلاح میں فطرۃ اللہ سے مقصود توحید ہے جس کو وہ دین فطری سے تعبیر کرتا ہے، چنانچہ اوپر کی پوری آیت اگر پیش نظر ہو تو یہ مفہوم خود بخود آئینہ ہو جاتا ہے، خدا فرماتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ
فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ
ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ

سو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت خاص پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے

لَا يَعْلَمُوْنَ (روم ۴) لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

قرآن مجید کی اس اصطلاح کی تفسیر ایک صحیح حدیث سے پوری ہو جاتی ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من مولود الا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ کما تنتج البہیمۃ بہیمۃ جمعاء ہل تحسون فیہا من جدعاء ثم یقول فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ الخ

(بخاری تفسیر سورۃ روم)

کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت پر پیدا نہیں ہوتا، لیکن ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور صحیح و سالم بچہ پیدا کرتا ہے کیا تم نے دیکھا کہ کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: "خدا کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ..." آخر آیت تک۔

معجزہ کا سبب صرف ارادہ الٰہی ہے

الغرض اس تمام تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نہ تو اسباب عادیہ کا منکر ہے اور نہ عالم کے نظام کار کو علل و مصالح سے خالی تسلیم کرتا ہے لیکن وہ ان تمام اسباب و علل سے مافوق ایک اور قادر اور ذی ارادہ ہستی کو فرمانروائے کل یقین کرتا ہے جس کی مشیت اور ارادہ کی قوت سے کائنات کی یہ مشین چل رہی ہے۔ معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اس کی مشیت اور ارادہ ہے، کبھی یہ مشیت اور ارادہ عادات جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے، مثلاً قوم نوحؑ کے لئے طوفان آنا، قوم ہودؑ کے لئے کوہ آتش فشاں کا پھوٹنا یا زلزلہ آنا، حضرت ایوبؑ کا چشمہ کے پانی سے صحیح و تندرست ہو جانا، قوم صالحؑ کے لئے آندھی آنا، مکہ میں قحط عظیم کا رونما ہونا، غزوۂ خندق میں آندھی چلنا، یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں، لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکوکاروں کی نجات اور گنہگاروں کی ہلاکت ہوئی محض بخت و اتفاق نہیں بلکہ ارادہ و مشیت الٰہی نے خاص ان قوموں کے لئے بطور نشانی کے ان کو پیدا کیا اور کبھی یہ مشیت الٰہی عادت جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں، بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے، مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا جاری ہونا، مردہ کا جی اٹھنا، چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا، پتھر سے چشمہ کا ابلنا، درختوں کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا، بے جان چیزوں میں آواز پیدا ہونا کہ ان چیزوں کی تشریح موجودہ علم اسباب و علل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی اور نہ ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے، اس لئے ان کی علت خدا کی مشیت اور ارادہ کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی، اسی لئے انبیاء نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ صرف خدا کی قدرت، مشیت اور اذن سے ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ظاہری علل و اسباب کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیونکر بن سکتے ہیں، کفار ان کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے اس لئے خدائی نشان ہونے کا ثبوت کیونکر بہم پہنچ سکتا ہے؟

معجزہ کی باعتبار خرق عادت کے چار قسمیں

اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ معجزات اور نشانیاں کسی نہ کسی حیثیت سے خارق عادت ہوں، چنانچہ:

(۱) کبھی نفس واقعہ خارق عادت ہوتا ہے، مثلاً عصا کا سانپ بن جانا، چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا، انگلیوں سے چشمہ کا ابلنا، مردہ کا زندہ کرنا وغیرہ۔

(۲) کبھی یہ ہوتا ہے کہ نفس واقعہ خلافِ عادت نہیں ہوتا، مگر اس کا اس وقتِ خاص پر رونما ہونا خرقِ عادت بن جاتا ہے، مثلاً طوفان آجانا، آندھی آنا، زلزلہ آنا، کفار کا باوجود کثرتِ تعداد سے بے یار و مددگار اہل حق سے خوف کھانا وغیرہ۔ تمام تائیدات الٰہی اسی قسم میں داخل ہیں،

(۳) ایک صورت یہ ہے کہ نفس واقعہ اور اس کے ظہور کا وقت خاص تو عاداتِ جاریہ کے خلاف نہیں ہوتا مگر اس کا طریقہ ظہور خلافِ عادت ہوتا ہے، مثلاً انبیاء کی دعاؤں سے پانی کا برسنا، بیمار کا اچھا ہونا، آفتوں کا ٹل جانا کہ نہ تو پانی کا برسنا یا بیمار کا اچھا ہو جانا یا کسی آئی ہوئی آفت کا ٹل جانا، خلافِ عادت ہے، اور نہ اسکے ظہور کا کوئی خاص وقت ہے، لیکن جس طریقہ سے اور جن اسباب و علل سے یہ معجزات ظاہر ہوتے وہ خارق عادت ہیں، استجابتِ دعا اسی قسم میں داخل ہے۔

(۴) کبھی نہ تو واقعہ خارق عادت ہوتا ہے اور نہ اس کا طریقہ ظہور خارق عادت ہوتا ہے، بلکہ اس کا قبل از وقت علم، خارقِ عادت ہوتا ہے مثلاً انبیاء کی پیشین گوئیاں، ایک دفعہ زور سے آندھی چلی، آنحضرتؐ مدینہ سے باہر تھے آپؐ نے فرمایا کہ یہ آندھی ایک منافق کی موت کے لئے چلی ہے، چنانچہ جب لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مدینہ میں ایک منافق اس آندھی سے مرگیا، اس معجزہ میں نہ تو آندھی کا چلنا خرقِ عادت ہے، نہ آدمی کا آندھی کے صدمہ سے مرجانا خلافِ اسباب ہے بلکہ واقعہ کا قبل از وقت علم خرقِ عادت ہے۔

اہل ایمان پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

انبیاء کی زندگی علم و عمل دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ان کے تمام ارشادات و تعلیمات سے صرف ان ہی دونوں کی ترقی اور تکمیل مقصود ہوتی ہے اس لحاظ سے انبیاء کے بعض معجزات کا اثر صرف علم و یقین پر پڑتا ہے۔ ان سے کوئی عملی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، ہاتھ کا چمک اٹھنا، عصا کا سانپ بن جانا، چاند کا شق ہو جانا، اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے نے انکار کیا، لیکن انبیاء کے بہت سے معجزات ایسے ہوتے ہیں جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنو اسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا، لیکن اس کے ذریعہ سے پانی کا جو چشمہ ابلا وہ ان کیلئے حیات بخش ثابت ہوا، پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ان سے علم و یقین کو ترقی ہوتی ہے اور دوسری قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصر الٰہی کہا ہے، پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں لیکن تائید اور نصر الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔

آغازِ نبوت میں چونکہ انبیاء صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں اور کفار کی طرف سے ان ہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے اور ان ہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے اس لئے اول اول انبیاء سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے جن کا اثر صرف علم و یقین پر پڑ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اسی قسم کے دو

معجزے دے کر فرعون کے پاس بھیجا اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار قریش کو معجزہ شق القمر دکھایا، لیکن اس کے بعد انبیاء کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو عموماً مفلوک الحال خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے، یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن، خلوص نیت اور شدت ایمان کی بنا پر کسی معجزہ کا خواستگار نہیں ہوتا، تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے اور ہر موقع پر اسکی حفاظت وحمایت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تائیدات الٰہیہ کا ظہور اکثر بغیر طلب و سوال کے ہوتا ہے، مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کا سوال نہیں کیا، لیکن آپ سے اکثر معجزات کا ظہور ان ہی کے درمیان ہوا، بالخصوص غزوات میں اکثر تائید الٰہی نے مسلمانوں کی مدد کی ہے، غزوہ بدر و حنین میں فرشتوں کا آسمان سے نازل ہونا، تھوڑے سے زادِ راہ کا تمام فوج کے لئے کافی ہونا، آپ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، اور اس قسم کے بہت سے معجزات غزوات ہی کے زمانہ میں آپ سے ظہور پذیر ہوئے اور ان سے تمام مسلمانوں نے ایسی حالت میں فائدہ اٹھایا جبکہ تمام دنیوی اسباب و وسائل منقطع ہو چکے تھے۔

اسی کا نام قرآن مجید کی زبان میں نصر (مدد) اور تائید ہے اور یہ ہر نبی کو آخر وقت میں عطا کی جاتی ہے، اور عین اس وقت جب بظاہر اسباب مایوسیوں کے تمام مناظر پیش ہوتے ہیں اور تائیدِ حق کا بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا، دفعۃً نصرت الٰہی توقع کے خلاف گرد و پیش کے واقعات کے خلاف بجلی کی طرح ناامیدیوں کے بادل سے چمک اٹھتی ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (بقرہ-۲۶)

کیا تم کو خیال ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر وہ حالت گزری نہیں جو تم سے پہلوں پر گزری، ان پر مصیبت اور تکلیف آئی اور اسقدر جھڑ جھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھ مسلمان گھبرا کر کہہ اٹھے کہ خدا کی نصرت کہاں ہے، ہاں خدا کی نصرت نزدیک ہے۔

حَتّٰٓى إِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (یوسف-۱۲)

یہاں تک کہ جب ناامید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے نصرت کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا کہ ہماری نصرت آ گئی، پھر ہم نے جن کو چاہا وہ بچا دیے گئے اور پھری نہیں جاتی ہماری آفت گنہگار قوم سے۔

خدا کا یہ قطعی وعدہ ہے کہ وہ حق پرستوں کو ہمیشہ آخر کار نصرت عطا کرے گا۔

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (روم)

اور ایمان والوں کی مدد ہم پر فرض ہے۔

یہ نصرت مسلمانوں کو ہر قدم پر تسلی کا پیغام سناتی تھی، بدر ہو کہ احد، خندق ہو کہ حنین ہر جگہ وہی انکی دستگیر تھی۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ (توبہ ۳)

خدا نے بہت سے موقعوں پر تمہاری نصرت کی۔

لیکن سب سے بڑی نصرت بدر کی تھی، جب تین سو بے برگ و ساز نہتوں نے قریش کی ایک ہزار مسلح فوج کو کامل شکست دے دی۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ

اور خدا نے یقیناً بدر میں تمہاری مدد کی جب تمہارے پاس

اَذِلَّۃٌ (آل عمران ۔ ۱۳)	کوئی قوت نہ تھی،

لیکن عام معجزات اور نصرت الٰہی میں یہ فرق ہے کہ جو معجزات بطور حجت اور برہان کے پیش کئے جاتے ہیں وہ صرف انبیاء کی روحانی طاقت کا فیض ہوتے ہیں، یعنی ان کا یہ فیض سبب ہوتا ہے ارادۂ الٰہی کے ظہور کا، لیکن نصرت الٰہی میں پیغمبر کی روحانی طاقت کے ساتھ مومنین کے کمال ایمان، شدت یقین، تزکیۂ نفس اور استعداد قلب کی شرکت بھی ضروری ہوتی ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت نے جب سخت فاقہ کی حالت میں نزول مائدہ (خوان آسمانی) کی درخواست کی تو انہوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی،

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ	یاد کرو جب حواریوں نے کہا، اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا آپ
رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ	کا پروردگار ہم پر آسمان سے ایک خوان اتار سکتا ہے عیسیٰ نے
اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ ۔ ۱۵)	کہا، خدا سے تقویٰ کرو، اگر تم کو یقین ہے،

میدان جنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو نزول ملائکہ کی بشارت سناتے ہیں تو ساتھ ساتھ صبر اور تقویٰ کی بھی تعلیم دیتے ہیں،

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ	یاد کر اے پیغمبر! جب تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کہ کیا تم کو یہ کافی
بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا	نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے اتار کر تم کو مدد دے، (ضرور کافی ہے)
وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ	ہاں اگر تم مستقل رہو اور تقویٰ کرو اور وہ فوراً آجائیں تو خدا پانچ ہزار
بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (آل عمران ۱۳)	سوار فرشتوں کے ذریعہ سے تمہاری مدد کرے گا،

یہی وہ معجزات تھے جن کی نسبت صحابہ کرامؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ان کو برکت سمجھا کرتے تھے،

کفار کیلئے نتائج کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں

جس طرح مومنین پر اثر کے لحاظ سے معجزات کی دو قسمیں ہیں، اسی طرح کفار پر نتائج کی حیثیت سے بھی ان کی دو قسمیں ہیں، آیت ہدایت اور آیت ہلاک، انبیاءؑ کفار کو پہلے ہدایت کی نشانیاں دکھاتے ہیں اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں، کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں، وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب مادۂ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیت ہلاک آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب، لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے اور سطح خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عنایت ہوئے تھے مگر وہ اس لئے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے، جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیت ہلاک عنایت ہوئی اور رود قلزم کی لہریں فرعون کو اس کے سارے ساز و سامان اور امرائے دربار کے ساتھ ہمیشہ کے لئے نگل گئیں، حضرت نوحؑ کو آیت طوفان، حضرت صالحؑ کو آیت ناقہ، حضرت لوطؑ کو بربادی سدوم کی نشانی، حضرت شعیبؑ کو آیت صاعقہ بجر، حضرت عیسیٰؑ کو آیت رفع اور آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کو معجزہ بَطْشَۃُ الْکُبْرٰی (بڑی پکڑ) جو دیا گیا تھا وہ اسی دوسری قسم میں داخل تھا، ان میں سے ہر معجزہ اور نشانی کے ظہور کے بعد یا خود اسی معجزہ اور نشانی کے ذریعہ سے معاندین کی ہلاکت استیصال اور بربادی ہوتی اور اسی کو قرآن مجید نے سُنَّۃُ اللّٰہِ (خدا کا دستور) اور سُنَّۃُ الاوّلین (پہلوں کا دستور) کہا ہے کہ ہر پیغمبر کی قوم میں یہ اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ فَھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِیْنَ (فاطر)	اور بری کا داؤ پیچ کرنے والوں پر الٹ جاتا ہے تو کیا اب یہ کافر اگلی قوموں کے دستور ہی کی راہ دیکھتے ہیں۔
اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا، سُنَّۃَ اللّٰہِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (احزاب-۸)	یہ جہاں پائے گئے اور پکڑے گئے اور مارے گئے یہ اللہ کا دستور پڑا ہوا ہے اگلی قوموں میں۔

اس معجزۂ عذاب کے ظاہر ہونے میں عموماً ایک وقت معین تک تاخیر کی جاتی ہے جس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) یہ معجزۂ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیاتِ ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزاء اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین اور کافرین ایک دوسرے سے چھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی، حضرت نوحؑ نے ایک طویل زمانہ تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد ناامید ہو کر انہوں نے آخری معجزہ کی دعا مانگی۔

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ دَیَّارًا، اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا۔ (نوح-۲)	اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو ان کو چھوڑے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور وہ جنیں گے لیکن فاجر اور کافر۔

اس کے بعد طوفان آیا اور قوم نوحؑ کو بہا لے گیا، اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون سے پوری مایوسی ہو گئی تو انہوں نے دعا کی۔

رَبَّنَآ اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ۔ (یونس-۹)	اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور دولت عطا کی ہے اے ہمارے رب (وہ اس سے یہ کام لیتے ہیں کہ وہ) لوگوں کو تیرے راستہ سے گمراہ کرتے ہیں خداوندا ان کی دولت کو سمیٹ لے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے جب تک وہ تیرے دردناک عذاب کا مزہ نہ دیکھیں گے ایمان نہ لائیں گے۔

اس موقع پر اسی قسم کی دعائیں دیگر انبیاء نے بھی کی ہیں۔

(۲) اس منزل پر پہنچ کر پیغمبر کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے، حضرت نوحؑ کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے (اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ عنکبوت (میں خدا کی طرف ہجرت کرتا ہوں) حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے

ہی حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت صالحؑ سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہولیتی اور مومن و کافر الگ نہیں ہو جاتے، معجزۂ عذاب نہیں بھیجا جاتا، حضرت نوحؑ جب تک کشتی پر سوار ہو کر علیحدہ نہ ہولیے طوفان نہ آیا، حضرت ابراہیمؑ جب تک کلدانیوں کے ملک (عراق) سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے ان پر عذاب نہ آیا، اسی طرح حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر جب تک الگ نہ ہو گئے، ہلاکت کا عذاب نہیں آیا اور جب انہوں نے ہجرت کر لی تو یہ معجزۂ عذاب مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوا اور مومنین کی نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوئی۔

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں ان واقعات کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستور اور قانون فرمایا ہے جس میں تغیر اور تبدل ناممکن ہے، جیسا کہ اس سے پہلے قرآن مجید میں سنۃ اللہ کے مفہوم کے ضمن میں آیات قرآنی کے حوالہ سے اس کی پوری تفصیل گزر چکی ہے، سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ اس اصول کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ
قَبْلِهِمْ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ
ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا
نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (یونس - ۱۰)

کیا یہ کافر گزشتہ قوموں کی طرح واقعہ ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں
کہہ دے کہ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں
پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور ایسے ہی ایمان لانے
والوں کو ہم پر فرض ہے، ہم نجات دیں گے ایمان والوں کو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزۂ ہدایت

ہدایت کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو معجزات اور نشانیاں صادر ہوتی رہتی تھیں، ان کا بڑا حصہ غیر معمولی قوت تاثیر، استجابت دعا اور تائید و نصرت اور پیشین گوئی کا تھا، اسی غیر معمولی قوت تاثیر کا نتیجہ تھا کہ قریش لوگوں کو آپؐ کے پاس جانے سے روکتے تھے، سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد واقعات مذکور ہیں، قرآن مجید کی یہ آیت کفار کے اس باطنی اعتراف کا آئینہ ہے۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ
تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ)

اس قرآن کو نہ سنو، اور اس میں شور و غل کرو
شاید تم غالب آؤ۔

قرآن کے اثر کا ان پر یہ رعب چھایا ہوا تھا کہ وہ لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہ دیکھتے تھے کہ وہ شور و غل اور ہنگامہ کر کے لوگوں کو سننے نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی استجابت دعا کا بھی کفار کو بدرجہ اتم یقین تھا، ایک دفعہ صحن حرم میں جب ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز میں خلل انداز ہوئے اور آپؐ نے ان پر بددعا کی تو بخاری و مسلم میں یہ تصریح ہے کہ وہ اس کو سن کر کانپ اٹھے، ایک دفعہ جب مکہ میں قحط عظیم پڑا تو ابوسفیان نے آپؐ کے پاس آکر کہا کہ محمدؐ تمہاری قوم ہلاک ہو گئی، خدا سے دعا کرو کہ وہ اس بلا کو

---

[1] صحیح بخاری آخر کتاب الوضوء، و مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔

ان سے دور کر دے،[1] چنانچہ آپؐ نے دعا کی اور وہ بلا دور ہوئی، اسی طرح آپؐ کی پیشین گوئی کی صداقت کا بھی ان کو دل سے اعتراف تھا، یاد ہو گا کہ غزوۂ بدر سے پہلے جب امیہ کو حضرت سعد انصاریؓ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مارے جانے کی پیشین گوئی کی ہے تو وہ گھبرا اٹھا اور اس کی بیوی پر یہ اثر ہوا کہ اس نے غزوۂ بدر کے موقع پر اپنے شوہر کا دامن تھام لیا کہ محمدؐ کی یہ پیشین گوئی تمہیں یاد نہیں،[2] فتح روم کی مشہور پیشین گوئی جس دن پوری ہوئی بہت سے لوگ اس نشانِ صداقت سے ہدایت پا کر مسلمان ہو گئے۔[3]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و نصرت کے عجائبات بھی قریش کی نظروں سے گزر چکے تھے وہ بار بار آپؐ پر حملے کی تیاریاں کرتے تھے اور ناکام رہتے تھے، ایک دفعہ ابوجہل نے یہ ناپاک ارادہ کیا اور اس نیت سے آگے بڑھا تو فوراً ڈر کر پیچھے ہٹ گیا، ساتھیوں نے واقعہ پوچھا تو بتایا کہ مجھے نظر آیا کہ میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی خندق ہے اور چند پردار ہستیاں کھڑی ہیں۔[4]

الغرض ہدایت کے متعدد نشانات تھے جو مکہ میں کفار کو اس غرض سے دکھلائے گئے تھے کہ ان کو دیکھ کر ان کے قلوب میں قبولِ حق کی صلاحیت پیدا ہو۔

شق قمر آخری نشانِ ہدایت تھا

ہدایت کی ان نشانیوں میں کفارِ مکہ کے لئے سب سے آخری اور فیصلہ کن نشان شق قمر تھا جس کے بعد آیاتِ ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا، احادیث میں ہے کہ کفارِ مکہ آپؐ سے معجزہ کے طالب تھے تو آپؐ نے ان کو شق قمر کا معجزہ دکھایا، چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، لیکن معاندین کو اس عظیم الشان اور واضح تر معجزہ سے بھی ہدایت نہ ملی، بعضوں نے کہا محمدؐ نے جادو کیا ہے کسی نے کہا ایسی عجیب عجیب باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ قرآن مجید نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے،

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ (قمر-۱)	قیامت کا وقت قریب آگیا اور چاند شق ہو گیا اور اگر یہ کافر کوئی نشانی دیکھیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

اب خداوند ذوالجلال کے رحم و کرم نے دوسری شان اختیار کی، یعنی اس کے قہر و غضب نے ان غیر صلاحیت پذیر ہستیوں سے سطحِ ارضی کو پاک کر دینے کا تہیہ کر لیا اور وہ سنتِ الٰہی جو تمام گذشتہ امتوں کے ساتھ جاری رہی تھی

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان۔ [2] صحیح بخاری اول کتاب المغازی۔ [3] ترمذی تفسیر سورۂ روم۔ [4] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وما کان اللہ لیعذبہم۔ [5] ہم نے قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصول الٰہی کے مطابق اولاً ایسا سمجھا تھا کہ شق قمر کا معجزہ ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا ہو گا، لیکن سیر و مغازی اور کتبِ احادیث کا مطبوعہ ذخیرہ اس دعویٰ کے ثبوت اور انکار دونوں سے خاموش تھا، اسی اثنا میں حاکم کی مستدرک کی دوسری جلد حیدرآباد سے چھپ کر پہنچی، اس میں سورۂ قمر کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں یہ تصریح ملی کہ یہ نشان قبل مخرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی ہجرت سے پہلے ظاہر ہوا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا ہے، حاکم کی یہ روایت بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے اور حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک میں اس کی تصحیح کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مصنف عبدالرزاق میں بھی موجود ہے (مستدرک ج ۲ ص ۴۷۲ حیدرآباد)

یعنی یہ کہ معجزوں کے دیکھنے کے بعد ایمان نہ لانے پر کفار کی ہلاکت اور بربادی فرضِ محتم ہو جاتی ہے وہ قریش کے حق میں بھی جاری ہوتی۔ گزشتہ دستورِ الٰہی کی تفصیل کے مطابق اس ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کے لئے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

(۱) مومنین کی جماعت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر مکہ سے ہجرت۔

(۲) ہجرت سے پہلے ہدایت کی کسی آخری کھلی نشانی کا ظاہر ہونا۔

چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا نشان ظاہر ہوا اور اس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا۔ اسلام نہ لائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور ہلاکت کے عذاب کے نازل ہونے کا وقت قریب آگیا صحابہؓ میں اسرار نبوت کے جو محرم تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے مستدرک حاکم ج۲ ص۷ اور مسند ابن حنبل (جلد ۱ صفحہ ۲۱۶) میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا انا للہ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا، اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے۔ چنانچہ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ والی قتال کی آیت نازل ہوئی[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور معجزۂ ہلاکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو تقریباً تیرہ برس تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیات ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھلائے، بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر وہ وقت آیا جو پہلے اپنے پیغمبروں کے سامنے . . . .

دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالح جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی مطلق صلاحیت نہیں رکھتے تھے[2] یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہیں رکھتے تھے اور اس لئے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارضِ حرم کو پاک کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے، لیکن وہاں بھی کوئی حق کا سننے والا نہ تھا، بازار اور راستہ میں شریروں نے آپ کو پتھر مارے، یہاں تک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے، آپ مکہ واپس آرہے تھے کہ فرشتۂ جبال نے آپ کو ندا دی کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے، رحمتِ عالم اب بھی مایوس نہ ہوئے اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ ابھی وہ معجزۂ ہلاکت ظاہر نہ ہو، شاید کہ ان کی نسل سے کوئی توحید کا پرستار پیدا ہو۔ صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اُحد کے علاوہ آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون تھا؟ آپ نے فرمایا، وہ دن جب میں نے طائف کے سردار عبد یالیل کے سامنے اپنے کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا، میں مغموم واپس آرہا تھا کہ فرشتۂ جبال نظر آیا اور اس کے بعد آپ نے کفار کی ہلاکت کے لئے فرشتہ جبال کی اجازت طلبی اور اپنا جواب بیان کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دن کو ایام مصائب کی تاریخ

---

[1] نسائی کتاب الجہاد اور ترمذی تفسیر آیت بالا میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ [2] مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین و بخاری کتاب بدء الخلق۔

میں سب سے زیادہ سخت فرماتے ہیں، بظاہر ایسا سمجھا جاتا ہے کہ آپ نے طائف کی تکلیف کو سخت ترین دن فرمایا لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، اس سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت کی گھڑیاں آپ پر آئی ہیں بلکہ اس لحاظ سے آپ اس کو سخت ترین دن قرار دیتے تھے کہ یہ قریش کی فرصت اور مہلت کی اخیر گھڑی تھی اور اب معجزۂ ہلاک ان کے سر پر تھا اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا صدمہ تھا، تاہم قریش کو اب آخری عذاب کی اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ نادان استہزا کرتے تھے، جیسا کہ دوسری قومیں بھی اپنے اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی کرتی آئی ہیں، کفار قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر کہتے تھے، جس عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا، اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت کی یہ آخری نشانی بھی دکھا دو۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس - ۲)	اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس پر خدا کی طرف سے کوئی نشان کیوں نہیں اترتا، اے پیغمبر! کہہ دے کہ غیب کی بات خدا کے پاس ہے تم اس کے ظہور کا انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

کبھی آکر کہتے،

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (بنی اسرائیل)	یا جیسا تم کہا کرتے ہو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دو یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔
لَوْمَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (حجر - ۱)	اگر تم سچے ہو تو کیوں نہیں ہمارے پاس فرشتوں کو لے آتے ہو؟

خدا نے جواب میں کہا،

وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ (حجر)	جب فرشتے آجائیں گے تو پھر انہیں مہلت نہ دی جائے گی

کفار قریش کو معجزۂ عذاب کے دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشین گوئی سراسر جھوٹ ہے، خدا نے کہا جب تک پیغمبر کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں یعنی تمام افراد صالح الگ نہ ہو جائیں گے عذاب نہیں آنے کا،

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ (رعد - ۱)	اور کفار جلدی چاہتے ہیں تجھ سے بھلائی سے پہلے برائی حالانکہ ان سے پہلے گزشتہ قوموں میں اس قسم کے واقعات گزر چکے ہیں اور تیرا رب لوگوں کی گنہگاری کے باوجود ان کو معاف کرتا ہے اور تیرا رب بڑے عذاب والا بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے معجزہ کو ذکر کر کے کہتا ہے،

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۔ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۔ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۔ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۔ ثُمَّ جَآءَهُمْ	وہ نہ مانیں گے اس کو جب تک دکھ کا عذاب نہ دیکھ لیں گے پھر یہ عذاب اچانک ان پر اس طرح آجائے گا کہ ان کو خبر نہیں ہونے پائے گی تو اس وقت کہیں گے کہ ہم کو مہلت بھی کچھ مل سکتی ہے، کیا یہ کفار ہمارا عذاب جلد مانگتے ہیں بھلا دیکھ تو اگر ہم نے ان

مَا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ. مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ. وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ.

(شعراء ۔ ۱۱)

کو چند سال فائدہ اٹھانے کا موقع دے بھی دیا پھر ان پر وہ عذاب آگیا جس کا وعدہ تھا تو کیا ان کی یہ دولت ان کے کچھ کام آئے گی، ہم نے کسی آبادی کو ہلاک نہیں کیا لیکن اس کو ڈر سنانے والے پہلے موجود تھے۔

یعنی اس اصول کی بنا پر کہ قوموں کی ہلاکت سے پہلے ان کے اندر ایک ڈر سنانے والا مامور ہوا کرتا ہے قریش میں بھی ایک ڈر سنانے والا آیا، اگر وہ اس کی نہ سنیں گے تو پچھلی قوموں کی طرح وہ بھی نیست و نابود ہو جائیں گے۔ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ قریش کو مختلف قوموں کے حالات سنا کر کہتا ہے۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ. اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ. وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ. وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ. قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ.

(حج ۔ ۷)

تو کتنی بستیاں ہم نے برباد کیں اور وہ گنہگار تھیں اور اب وہ اپنی چھتوں پر ڈھی پڑی ہیں اور کتنے کنوئیں بے کار پڑے ہیں اور کتنے اونچے اونچے محل خراب اور ویران ہیں، کیا یہ کافر زمین میں چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ ان کے پاس دل ہوتے جن سے سمجھتے یا کان ہوتے جن سے سنتے، کیونکہ آنکھیں کچھ اندھی نہیں ہوتی ہیں جب کہ ان کو یہ عبرت ناک مناظر سوجھائی نہ دیتے ہوں مگر وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں اور یہ کافر تجھ سے جلدی مانگتے ہیں عذاب اور اللہ ہرگز اپنا وعدہ نہ ٹالے گا اور تیرے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے ہزار برس کے برابر ہے اور کتنی بستیاں ہیں کہ میں نے ان کو ڈھیل دی اور وہ گنہگار تھیں پھر ان کو پکڑا اور میری طرف پھر آنا ہے کہہ دے اے لوگو! میں تو صاف صاف تم کو ڈر سنانے والا ہوں۔

قرآن نے رؤسائے قریش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا،

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (فاطر ۔ ۵)

کیا وہ پہلی قوموں کے دستور کا انتظار کر رہے ہیں۔

چنانچہ گزشتہ قوموں کے قانون کے پورے ہونے کے دن آگئے، یعنی رسول اور مومنین کو گنہگار قوم کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت ملی، کیونکہ جیسا پہلے گزر چکا ہے، جب تک رسول اپنی قوم سے ہجرت نہیں کرتا، عذاب و ہلاکت کا نشان ظاہر نہیں ہوتا، چنانچہ کفار قریش کو جو اس نشان کے دیکھنے کے لئے بے تاب تھے پہلے ہی یہ جتا دیا گیا تھا،

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا. سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ

اور اگر وہ اس زمین سے تجھ کو گھبرانے لگے ہیں، تاکہ یہاں سے تجھ کو نکال دیں تو یاد رہے کہ تیرے چلے جانے کے بعد وہ بہت کم ٹھہر سکیں گے تجھ سے پہلے جو رسول گزرے ہیں ان کی یہ

لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا (بنی اسرائیل ۸)	سنت ہے اور خدا کی سنت کو تم مٹتا نہ پاؤ گے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے، رؤسائے قریش اِدھر اُدھر بیٹھے ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے، ابوجہل نے کہا کہ کون مذبح جا کر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو اس موقع پر موجود تھے، کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کر سکتا، اسی اثنا میں ایک شخص نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپ نے سر اٹھایا، یہ پہلا موقع ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوتے ہیں اور یہ اِس لئے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف پہنچی بلکہ اس لئے کہ وہ نماز (یعنی مشاہدۂ جمالِ الٰہی) میں جو اس دنیا میں آپ کی محبوب ترین چیز تھی خلل انداز ہوئے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ۔ (علق)	کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندۂ الٰہی کو نماز سے روکتا ہے۔

یہ رؤسائے قریش کی مہلت کا اخیر لمحہ تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بددعا کی اور اس آخری معجزۂ ہلاک کی درخواست کی، مگر پھر بھی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت دیکھیے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی طرح پوری قوم کی تباہی و بربادی کی دعا نہیں کی بلکہ صرف قریش کے رئیسوں کے حق میں بددعا کی اور ان میں سے بھی صرف سات رئیسوں کے نام لے اور فرمایا خداوندا! قریش کے سرداروں کو لے، خداوندا! ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ بن معیط، امیہ بن خلف، ولید بن عتبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ۔ یہ بددعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے[1]۔

اب سنتِ الٰہی کے مطابق صریح کے ساتھ ہجرت کی دعا آپ کو بتائی گئی[2]۔

رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا (بنی اسرائیل ۹)	خداوندا! مجھ کو خوبی سے کہیں پہنچا اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس سے مجھے ایک مدد کرنے والی طاقت عطا کر۔

یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل ۹)	حق آگیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کو ہے۔

انبیاء کی سنت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین کے ساتھ ہجرت فرمائی اور جس

---

[1] بخاری اور مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔ [2] ترمذی تفسیر آیت مذکورہ (بنی اسرائیل) اور مستدرک حاکم (باب الہجرۃ) میں تصریح ہے کہ یہ دعائے ہجرت ہے۔

دن کا انتظار تھا وہ آگیا، قرآن نے کہا کہ رؤسائے قریش پر آیت عذاب کے نازل ہونے کے لئے ہجرت کا انتظار تھا وہ ہو چکی اور اب کوئی مزید انتظار نہیں۔

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ
أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ
الْمَاكِرِينَ. وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ
سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا إِنْ هٰذَا إِلَّا
أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ. وَإِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ
هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا
حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ.
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا
كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝
وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ
إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ.

(انفال ۔ ۴)

اور جب (اے پیغمبر!) منکرین داؤ کر رہے تھے تیری جان لینے کا کہ وہ تجھ کو قید کر دیں یا مار ڈالیں یا جلاوطن کر دیں وہ داؤ کر رہے ہیں اور خدا بھی داؤ کرتا ہے اور خدا داؤ کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے اور جب ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کو، تو کہتے ہیں ہاں ہم نے سنا، اگر چاہیں تو ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں یہ تو فقط اگلوں کی کہانیاں ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ اے خدا! اگر یہ قرآن حق ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش کر یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر لا، اور خدا ان پر ہجرت سے پہلے کیونکر عذاب کرتا جب کہ تو ان میں تھا اور خدا ان پر عذاب کرنے والا نہیں ہے در آں حالیکہ وہ مغفرت چاہتے ہوں، اور خدا ان پر عذاب کیوں نازل نہ کرے گا جب وہ مسجد حرام سے روکتے ہیں، حالانکہ وہ اس کی تولیت کے مستحق نہیں۔ اس کے مستحق صرف پرہیزگار ہیں۔

غزوۂ بدر معجزۂ ہلاک تھا

جس طرح دوسری قوموں کے لئے مختلف معجزات عذاب آئے، اسی طرح جس قوم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس کے لئے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا، ہجرت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا، آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا بعض رؤسائے قریش نے خدمت نبوی میں آکر کہا کہ محمد! تم رحمت و شفقت اور صلۂ رحم کی دعوت دیتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی، مگر پھر قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہو گیا تو ان کے لئے معجزۂ عذاب کے سوا کوئی اور طریقہ علاج باقی نہ رہا، چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ (بڑی پکڑ) ان کے لئے ہلاکت کی نشانی قرار پائی، قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلان عام سنا دیا جس میں پہلے اس قحط کی، پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی تھی۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ.
يَغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ. رَبَّنَا اكْشِفْ
عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ. أَنَّىٰ لَهُمُ
الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ.

اس دن کی راہ دیکھ جب آسمان صاف دھواں کر دے جو لوگوں کو گھیر لے اس وقت کہا جائے گا یہ ہے دکھ کی مار، تب گڑگڑائیں گے کہ خداوندا ہم سے یہ عذاب دور کر دے ہم ایمان لاتے ہیں کہاں ہے ان کے لئے سمجھنا حالانکہ ان کے

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۝ إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ.

(دخان - ۱)

پاس کھول کر سنانے والا رسول آچکا تو اس سے پیٹھ پھیری، اور کہا کہ سکھایا ہوا دیوانہ ہے، اچھا ہم تھوڑے دنوں کے لئے عذاب دور کر دیتے ہیں تم پھر وہی کرنے والے ہو، انتظار کرو اس دن کا جب ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے ہم بدلہ لینے والے ہیں اور ان سے پہلے ہم فرعون کی قوم کو آزما چکے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں پورے واقعہ کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اور آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ بطشِ اکبر ان رؤسائے قریش کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لئے غرقِ بحر کی حیثیت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بیان کیا ہے کہ آیتیں قریش کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ قریش نے جب نافرمانی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا سے دعا کی کہ اے خدا! ان پر حضرت یوسفؑ کے سات برس والے قحط کی طرح قحط نازل کر، چنانچہ مکہ میں سخت قحط پڑا، یہاں تک کہ بھوک سے آسمان اور قریش کی آنکھوں کے درمیان دھواں سا نظر آتا تھا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آکر دعا کی درخواست کی، چنانچہ آپ نے دعا کی اور بارش ہوئی، خدا نے کہا کہ وہ پھر اپنی پہلی حالت پر آجائیں گے یعنی ایمان قبول نہ کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے بطشۃ الکبریٰ (بڑی پکڑ) کا دن مقرر فرمایا یعنی بدر۔[1]

یاد ہوگا کہ صحنِ حرم میں رؤسائے قریش جو نماز میں خلل انداز ہوئے تھے، آپ نے ان کا نام لے کر ہر ایک کے حق میں بددعا کی تھی، اس سے پہلے کہ غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آئے، ہجرت کے بعد ہی آپ نے ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا، بدر سے پہلے حضرت سعد انصاریؓ عمرہ کو گئے تھے، ابوجہل نے ان کو روکا، امیہ نے بیچ میں دخل دینا چاہا، حضرت سعدؓ نے کہا، امیہ تم دخل نہ دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ان کے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے۔ یہ سن کر امیہ ڈر گیا، چنانچہ جب بدر کا موقع پیش آیا تو اس نے جانے میں پس و پیش کیا، لوگوں کے طعن سے اس نے جانا چاہا تو اس کی بیوی نے دامن تھام لیا اور کہا کیا تم کو اپنے یثربی دوست کی بات یاد نہیں۔[2]

جب غزوۂ بدر کے لئے آپ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ پہلی جلد میں تفصیل گزر چکی ہے مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں، ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گزر کر مکہ کو جاتا تھا دوسرا رؤسائے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لئے نکلا تھا، خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی، عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا، لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا نہیں بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہِ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا، رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پہنچے ہیں تو انہیں یہ فکر ہوئی ہے کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پتہ لگایا جائے، چنانچہ مسلمان مخبر ادھر اُدھر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے۔ اس نے جواب دیا کہ قریش کے قافلہ کا تو مجھے علم

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان
[2] صحیح بخاری کتاب المغازی

نہیں، البتہ ان کا لشکر ادھر پڑا ہے، یہ سن کر مسلمانوں نے اس کو مارا کہ یہ ہم سے صحیح حال چھپاتا ہے، مار کھانے پر اس نے کہا، اچھا ٹھہرو قافلہ کا حال بتاتا ہوں، جب لوگ اس کو چھوڑ دیتے تو وہ پھر یہی کہتا کہ مجھ کو قافلہ کی خبر نہیں، البتہ یہ جانتا ہوں کہ ادھر قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے، اس سے فراغت ہوئی تو فرمایا، جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ کہتا ہے تو تم مارتے ہو، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے، یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہ عتبہ کا ہے، یہ اُبیّ کا ہے وغیرہ، راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا، ایک سر مو وہاں سے اس نے تجاوز نہیں کیا، جنگ میں وہ وہیں مرا پڑا ملا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو صحن حرم کی بد دعا کے دن موجود تھا، وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بد دعا کی تھی کل کے کل بدر کے میدان میں ڈھیر ہو گئے[1]۔ اور "بطشۃ الکبریٰ" کے انتقام کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

سورۂ انفال جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ یہی[2] فیصلہ کا دن تھا جس کا مدت سے انتظار تھا۔

وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (انفال)	اور خدا یہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنی باتوں سے مستحکم کر دے اور کافروں کا پیچھا کاٹ دے تاکہ حق کو حق اور باطل کو باطل کر دے اگرچہ گنہگار اس کو پسند نہ کریں۔

وسط سورہ میں فرمایا۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ (انفال۔۷)	یہ ویسا ہی ہوا جیسا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے کا کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے گناہوں کے سبب سے ان کو ہلاک کر دیا۔

یہ فیصلہ کا دن تھا۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (انفال۔۵)	اور جو ہم نے اپنے بندہ پر فیصلہ کے دن اتارا جس دن دونوں لشکر آمنے سامنے بھڑے۔

اور یہ سب اسی لئے ہوا کہ:-

لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا (انفال۔۵)	تاکہ خدا اس کام کو پورا کر دے جو پہلے مقرر کیا جا چکا تھا۔

نکتہ:- بدر کے میدان میں جب تین سو بے سروسامان مسلمان ایک ہزار لوہے میں غرق فوج سے مقابل تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی قسم کی بد دعا مانگی، جیسی حضرت نوحؑ نے طوفان سے اور حضرت موسیٰؑ نے غرق سے پہلے اپنی اپنی قوم کے لئے مانگی تھی، حضرت نوحؑ نے کہا "خداوندا! اب زمین پر کوئی کافر بسنے والا نہ چھوڑ کہ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی اور نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا"

---

[1] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری و مسلم میں موجود ہیں۔

حضرت موسیٰ نے کہا "خداوندا! ان کے دل سخت کر دے کہ جب تک عذاب نہ دیکھ لیں گے ایمان نہ لائیں گے" لیکن اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ "خداوندا! اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو پھر کوئی تیرا نام لینے والا نہ رہے گا۔"

غرض نوح اور حضرت موسیٰؑ نے براہ راست اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی لیکن رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اب بھی دعا مانگی تو صرف اہل توحید کی فتح و نصرت کی، دشمنوں کی تباہی و بربادی کی نہیں۔

حاکم نے مستدرک (جلد ۳ صفحہ ۲۱) میں بروایت صحیح نقل کیا ہے کہ بدر کے قیدی جب گرفتار ہو کر آئے اور آپ نے ان کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا اور مختلف صاحبوں نے مختلف رائیں پیش کیں تو آپ نے فرمایا، یہ کفار قریش اپنے ان ہی بھائیوں کی طرح ہیں جو ان سے پہلے تھے (یعنی گزشتہ انبیاء کی امتوں میں) نوحؑ نے دعا کی کہ "خداوندا! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی آباد گھرانا باقی نہ رکھ" موسیٰ نے کہا "ہمارے پروردگار! ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔" ابراہیم نے فرمایا "جس نے میری پیروی کی وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو خدا غفور رحیم ہے۔" عیسیٰؑ نے کہا "الٰہی اگر تو ان (نافرمانوں) پر عذاب بھیجے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو غالب اور دانا ہے۔" اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم لوگ وہ قوم ہو جس میں فریب اور دغا سے قتل کر دینے کا رواج ہے تو تم میں سے کوئی زر فدیہ یا اپنا سر دیئے بغیر لوٹ کر نہ جا سکے گا۔

اس روایت سے ہمارے اصول مذکور کی حرف بحرف تائید ہوتی ہے یعنی یہ کہ

(۱) بدر قریش کے لئے ایسا ہی عذاب ہلاکت کا دن تھا جیسا گزشتہ قوموں پر ہلاکت کے دن آیا کئے ہیں۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر دو قسم کے انبیاء کے نام اور ان کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے، ایک وہ جنہوں نے سخت گیری کا پہلو اختیار کیا، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ نے۔ دوسرے وہ جنہوں نے نرمی کا اظہار کیا، مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں میں سے بیچ کی راہ اختیار کی۔

سحر اور معجزہ کا فرق اور ساحر اور پیغمبر میں امتیاز

گزشتہ صفحات میں انبیاء کے جو خصائص و امتیازات اور علامات و آثار بتائے گئے ہیں ان سے خود سحر و معجزہ کا فرق اور ساحر و پیغمبر کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے، سحر و شعبدہ صرف دل لگی کے آنی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد، تعمیر اور تخریب، ترقی اور تنزل کے اسباب و سامان ہوتے ہیں، ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے متحیر کر دے لیکن پیغمبر کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح، قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، پیغمبر، بشیر، نذیر، مزکی، ہادی، سراج منیر اور شاہد عالم ہوتا ہے، ساحر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشا گری کے سوا کوئی اور ممتاز بات اس کے اندر نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں سحر کے متعلق جس قدر بیانات ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا،

اور تخیل اور نظربندی سے زیادہ اس کو وقعت نہیں دیتا، ہاروت و ماروت کے قصہ میں سحر کے زور و قوت کا منتہا یہ بیان کیا ہے۔

مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (بقرہ ۱۲۰)

سحر کا وہ فن سیکھتے ہیں جس سے خاوند اور اس کی بیوی میں تفریق کر دیتے ہیں اور یہ کسی کو حکم الٰہی کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے اور یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو انکو نقصان پہنچاتی ہے اور نفع نہیں پہنچاتی۔

غرض سحر و جادو کوئی مؤثر حقیقی شے نہیں، سورۂ طٰہٰ میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خیال سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں۔

حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ (طٰہٰ۔ ۳)

پھر ناگاہ مصر کے جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں انکے جادو کے اثر سے موسیٰ کے خیال میں معلوم ہونے لگیں کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔

حکم ہوا کہ موسیٰ تم بھی اپنا عصائے اعجاز ڈال دو، نتیجہ یہ ہوا کہ حق نے باطل پر فتح پائی۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سِحْرٍ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ۔ (طٰہٰ۔ ۳)

ہم نے کہا موسیٰ ڈرو نہیں تم ہی سربلند ہوگے تمہارے داہنے ہاتھ میں جو ہے تم اس کو ڈال دو، وہ ان کی صنعت کاری کو نگل جائے گا بیشک جادوگروں نے جو صنعت کی تھی وہ جادو کا فریب تھا اور جادوگر جدھر سے بھی آئے وہ فلاح نہیں پا سکتا۔

ساحر اور نبی میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق و امتیاز بتایا وہ یہی ہے کہ نبی فلاح پاتا ہے اور جادوگر فلاح نہیں پاتا نبی کے تمام اعمال، مساعی، جدوجہد اور معجزات کا مرکز و محور فلاح اور خیر ہوتا ہے اور جادوگر کا مقصد صرف فریب دھوکا اور شر ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ایک اور آیت میں اسی مفہوم کو دہرایا گیا ہے، حضرت موسیٰؑ مصر کے جادوگروں سے کہتے ہیں۔

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ (یونس۔ ۸)

جو تم لائے ہو وہ جادو ہے اللہ اس کو باطل کردے گا بے شک اللہ شریروں کے کام کو نہیں سنوارتا۔

یعنی سحر و جادو کا ایک آنی تماشا ہوتا ہے اور اعجاز کا اثر دائمی ہوتا ہے اور اس کے نتائج دنیا میں نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے اعجاز کو دیکھ کر کہا کہ "یہ سب جادو کے کرشمے ہیں" حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔

أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ (یونس۔ ۸)

کیا یہ جادو ہے اور جادو کرنے والے تو فلاح نہیں پاتے۔

غرض "فلاح" اور "عدم فلاح" سحر اور اعجاز کے درمیان سب سے بڑا فرق ہے۔

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہتے تھے کہ یہ شیطان کی قوت سے یہ کلام پیش کرتے ہیں اور ان کے کلام کا سرچشمہ شیطان کی تعلیم ہے، خدا نے اس کے جواب میں کہا کہ اس حقیقت کا امتیاز کہ اس کا منبع اور سرچشمہ خیر ہے یا شر اور یہ شیطان کی قوت کا نتیجہ ہے یا ملکوتی طاقت اس کا مظہر ہے نہایت آسان ہے اور خود مدعی کی زندگی

اور اس کے اخلاق و اعمال اس کے شاہدِ عدل ہیں، حضرت عیسیٰ کے قول کے مطابق کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ان دونوں قوتوں کے درمیان تفریق کچھ زیادہ مشکل نہیں، خدا نے کہا ہم بتائیں شیطان کس پر اترتے ہیں،

عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُهُمْ کٰذِبُوْنَ (شعراء - ۱۱)

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر لا ڈالتے ہیں وہ سنی بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

یعنی نبی اور متنبی کا فرق خود اس کی اخلاقی زندگی ہے، علاوہ ازیں افترا پرداز اور شریر کے کام کو مستقل اور دائمی زندگی عطا نہیں ہوتی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (نحل - ۱۵)

جو لوگ کہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے چند روزہ کامیابی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

معجزات اور نشانات سے کن لوگوں کو ہدایت ملتی ہے

معجزات، دلائل، آیات اور آثار سے ہدایت کن لوگوں کو عطا ہوتی ہے؟ قرآن مجید نے ان کے اوصاف و شرائط بیان کئے ہیں۔

(۱) سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کو خدا پر ایمان ہو، اگر اس کو پہلے سے خدا پر ایمان نہیں تو اس کو معجزہ سے ہدایت نہیں مل سکتی، اس کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ پہلے کائنات کے اسرار و عجائب کو دیکھ کر ایک قادرِ مطلق ہستی کے وجود پر یقین کرلے، اس کے بعد معجزات اور نشانیوں کے ذریعہ سے اس کو نبوت کے باب میں ہدایت نصیب ہوگی،

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (یونس - ۱۰)

کہہ، اے پیغمبر! کہ غور سے دیکھو کیا کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور کچھ کام نہیں آتیں نشانیاں اور ڈرانے والے ان لوگوں کے جو ایمان نہیں رکھتے۔

(۲) دوسری چیز جو آیات اور نشانیوں سے عبرت پذیر نہیں ہونے دیتی وہ خودی اور تکبر ہے، معاندین چونکہ عموماً دولت مند، رؤسا اور مدعیانِ عقل و خرد ہوتے ہیں اس لئے ان کا جذبۂ انانیت اور ترفع ان کو داعیانِ حق کے علم کے نیچے کھڑے ہونے سے باز رکھتا ہے، اس بنا پر آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس جذبہ سے پاک ہوں، معاندین نے ہمیشہ انبیا کو کہا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ یہ پیغمبر تو ہماری طرح ایک آدمی ہے، کیا ہم اس کی پیروی قبول کرلیں، مصر کے بادشاہ اور سرداروں نے اسی جذبہ کی بنا پر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور ان کو گوناگوں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ہدایت نہیں ملی،

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ

پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی ہارون کو نشانیاں اور کھلی قوت دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو انہوں نے غرور کیا اور وہ مغرور لوگ تھے تو انہوں نے

مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ۔
(مومنون-۳)

کہا کیا ہم اپنی ہی طرح کے آدمیوں پر ایمان لائیں دراں حالیکہ ان کی قوم ہماری رعایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے منکروں اور خود پسندوں کی نسبت اپنا یہ فیصلہ سنا دیا

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي
الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا
يُؤْمِنُوْا بِهَا۔ (اعراف-۱۷)

ہم ان لوگوں کو اپنی نشانیوں کے سمجھنے سے پھیر دیں گے جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اور اگر وہ تمام نشانیوں کو دیکھ بھی لیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے۔

قریش کے معاندین جو اپنی قوم کے رؤسا، اکابر اور اہلِ دولت تھے وہ بھی ان نشانیوں سے اسی لئے ہدایت نہ پاسکے کہ ان کو ایک غریب و مفلس اور بے یار و مددگار انسان کی پیروی گوارا نہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر نبوت ہوتی بھی تو مکہ کے طائف کے کسی بڑے آدمی کو ملتی۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ
الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف-۳)

اور انہوں نے کہا یہ قرآن طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا

سب سے آخری چیز جو ان آیات اور نشانیوں سے ہدایت پانے کی صلاحیت اور استعداد پیدا کرتی ہے وہ دل کا قبولِ حق کی طرف میلان ہے، بڑے سے بڑے خوارق اور عجیب سے عجیب معجزات ان لوگوں کے نزدیک سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جن کے دل انابت اور رجوع الی الحق کی استعداد سے خالی ہیں۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ
مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَ
يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ (رعد-۴)

اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری، کہہ دے کہ خدا جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اسی کو اپنی طرف راہ دکھاتا ہے جو خدا کی طرف اپنے کو رجوع کرتا ہے۔

اگر قبولیت اور اصلاح کی یہ استعداد نہ ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی باطل پرستی سے زیادہ نہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گمراہی کے شقاوت کی مہر لگی ہوئی ہے، مشرک جو کسی مذہب حق کو نہیں مانتے اور علم سے بے بہرہ ہیں ان کا یہی حال ہے۔

وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى
قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (روم-۶)

اور اے پیغمبر! اگر تو ان کے پاس کوئی نشانی لائے تو وہ جو منکر ہیں کہیں گے کہ تم فریبی ہو، اسی طرح اللہ ان لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے جو علم نہیں رکھتے۔

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے طلب ثبوت میں یہ کہتے ہیں کہ اس وقت تک ہم ان کو پیغمبر حق تسلیم نہ کریں گے، جب تک اسی قسم کے معجزے وہ نہ دکھائیں جیسے ان پیغمبروں نے لوگوں کو دکھائے تھے، قرآن کہتا ہے کہ فرض کرو کہ صرف ان ہی جیسے معجزوں سے پیغمبری کی سچائی تسلیم کی جا سکتی ہے تو ان پیغمبروں نے تو وہی معجزے دکھائے تھے، پھر ان کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے کل منکرین کیوں ایمان نہ لے آئے اور آخر تک وہ ان کو جادوگر ہی کیوں سمجھتے رہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِیَ
مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی اَوَلَمْ یَکْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِیَ
مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا
وَقَالُوْٓا اِنَّا بِکُلٍّ کٰفِرُوْنَ

(قصص - ۵)

تو جب ہماری طرف سے سچائی ان کے پاس آئی تو انھوں نے کہا کیوں نہیں (محمد) کو ویسی ہی چیز دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی کیا موسیٰ کو جو چیز دی گئی تھی اس کا انکار منکرین پہلے نہیں کر چکے انھوں نے کہا کہ یہ جادوگر ہیں جو باہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں ہم ان سب کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

صداقت کی نشانی صرف ہدایت ہے

قرآن مجید نے اس کے بعد ہی کہا کہ صداقت کی نشانی صرف ہدایت اور رہنمائی ہے کہ مدعی جو پیغام اور جو احکام پیش کرتا ہے وہ انسانوں کو فلاح نجات اور رشد کی طرف لے جاتے ہیں اور جو اُن سے انکار کرتے ہیں وہ ظالم اور خودسر ہیں، ان کو ہدایت کی سعادت نہیں ملتی۔

قُلْ فَاْتُوْا بِکِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰی
مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ
فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا
یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ
اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ ۚ اِنَّ
اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔

(قصص - ۵)

کہہ دے اے پیغمبر! کہ اگر توراۃ اور قرآن دونوں کتابیں جھوٹی ہیں اور تم سچے ہو تو ہدایت میں ان سے بڑھ کر کوئی کتاب الٰہی لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں، تو اگر وہ تیرے اعلان کے مطابق نہ کر دکھائیں تو جان لے کہ یہ صرف اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو ہدایت الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرتا ہے اللہ خودسر لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

*

آیات ودلائل نبوی کی تفصیل

"معجزہ" کے ہر پہلو پر کلی حیثیت سے بحث کرنے کے بعد اب موقع آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مافوق فہم بشری سوانح وواقعات کی تفصیل کی جائے، یہ سوانح وواقعات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو حقیقت میں لوازم نبوت ہیں اور کم وبیش ہر پیغمبر کو وہ ایک ہی طرح پیش آئے ہیں، ہم نے ان کا نام خصائص النبوۃ رکھا ہے، دوسری قسم میں وہ جزئی واقعات داخل ہیں جو ہر پیغمبر سے اس کے حالاتِ زمانہ کے مطابق مختلف صورتوں میں صادر ہوئے ہیں اور جن کو اصطلاحِ عام میں معجزات کہتے ہیں۔

ہم نے ان معجزات کو ان کے استناد اور ماخذ کی حیثیت سے تین مختلف ابواب میں منقسم کر دیا ہے، پہلے میں وہ معجزانہ واقعات ہیں جو بنص صریح یا اشارۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں، دوسرا باب ان معجزات کا قرار دیا ہے جو صحیح اور مستند روایات سے ثابت ہیں، اور تیسرے باب میں ان معجزات پر بحث کی ہے جن کو گو بعض محدثین اور اربابِ سیر نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، مگر محدثانہ اصول کی بنا پر وہ تمام تر کمزور اور غیر مستند ہیں، اس کے بعد کتبِ سابقہ کی وہ پیشین گوئیاں درج ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں، اور سب سے آخر میں خصائص محمدی کا باب ہے، اس تفصیل کے مطابق آئندہ اوراق کی ترتیب حسبِ ذیل صورت ہوگی۔

(۱) خصائص النبوۃ۔
(۲) وہ آیات ودلائل جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔
(۳) صحیح اور مستند روایتوں سے جو آیات ودلائل ثابت ہیں۔
(۴) غیر مستند روایتیں اور ان پر تنقید۔
(۵) کتب سابقہ کی بشارتیں۔
(۶) خصائص محمدی۔

*

خصائص النبوۃ

دنیا میں ہر جنس اور ہر نوع کی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن سے وہ اپنے غیر سے ممتاز ہوتی ہے۔ وہ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے اس جنس اور نوع کی کوئی فرد خالی نہیں ہوتی، اسی طرح نبوت کی بھی کچھ نہ کچھ خصوصیتیں ہیں جو اس کے لئے بمنزلۂ لوازم حقیقت کے ہیں، چنانچہ دنیا میں جس قدر پیغمبر کسی نہ کسی قوم اور کسی نہ کسی زمانہ میں آئے ہیں وہ ان خصوصیات سے ہمیشہ ممتاز ہوتے رہے ہیں، مثلاً یہ کہ خدا نے کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے کلام و ارشاد سے مفتخر اور اپنے احکام سے مطلع فرمایا ہے، ان کے ادراک و احساس کی قوتوں کو اس قدر بلند کیا کہ عام انسانوں کو جو چیزیں نظر نہیں آتیں ان کو نظر آتی ہیں، عامۂ بشر جن آوازوں کو نہیں سن سکتے وہ ان کو سنائی دی ہیں، ملائکۂ الٰہی خدا کے قاصد بن کر ان کے پاس آتے رہے ہیں، صداقت کے لحاظ سے ان کے خواب اور بیداری کا ایک ہی عالم رہا ہے، کیونکہ گو ان کی آنکھیں سوتی ہیں[1] لیکن ان کے دل نہیں سوتے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے کوئی نہ کوئی نشانی بھی عطا فرمائی ہے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ افضل الرسل، خاتم النبیین تھے، اس لئے ان خصوصیات میں سے ہر خصوصیت کا وافر حصہ آپ کو عنایت ہوا تھا، اسی لئے مکالمۂ الٰہی، نزول ملائکہ، مشاہدۂ خواب و بیداری وغیرہ خصائص نبوت کے واقعات آپ کی سیرت میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں سے بیشتر اور کامل تر نظر آتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں ان کے اشارات اور احادیث صحیحہ میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں، مختلف انبیاء میں ان خصائص کا کم و بیش ہونا بھی قرآن مجید کا فیصلہ ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ	ان پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت بخشی ہے
مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا	ان میں سے بعض سے خدا نے باتیں کیں بعضوں کے رتبے
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	بلند کئے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے کھلی نشانیاں دیں
الْقُدُسِ ؕ (بقرہ - ۳۳)	اور روح القدس کے ذریعہ سے اس کی تائید کی

دیکھئے کہ مکالمۂ الٰہی، رفع درجات، اعطائے نشان، تائید بروح القدس، یہ چاروں باتیں ایسی ہیں جن سے خدا کا کوئی فرستادہ محروم نہ تھا، تاہم چونکہ ان میں سے ہر چیز تمام پیغمبروں میں یکساں نہ تھی بلکہ بعض کو ان میں سے کسی چیز کا حصہ وافر دیا گیا تھا اور بعض کو کوئی دوسری چیز زیادہ ملی تھی، اس لئے ہر پیغمبر کی طرف اس خاص چیز کی نسبت مخصوص طور سے کی گئی ہے، جس کا ان کی قسمت میں بڑا حصہ آیا تھا، اس سے یہ مقصود نہیں کہ نبوت کے ان خصائص سے کوئی پیغمبر محروم بھی تھا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المناقب باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و کتاب التوحید باب وکلم اللہ موسیٰ تکلیما۔

[2] صحیح بخاری باب الاعتصام۔ [3] کما قیل حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری، آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔

ان خصائص میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ زور وحی اور نزولِ ملائکہ پر دیا ہے، ہر جگہ رسول اور نبی کی گویا تعریف ہی یہی کی ہے کہ ایک انسان جس کو خدا نے اپنی پیغمبری کے لئے منتخب کیا ہو، اور اس پر اپنی وحی نازل کی ہو۔

چنانچہ سورۂ نحل اور سورۂ انبیاء میں تمام پیغمبروں کا مشترک وصف یہ بتایا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (یوسف ۱۲)	اور ہم نے اپنا قاصد بنا کر تم سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں بھیجا لیکن وہ انسان تھے جن کی طرف ہم نے اپنی وحی بھیجی۔

نزولِ ملائکہ کی نسبت بھی خدا نے یہ فرمایا کہ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو اس لئے اتارتا ہے کہ وہ اس کی بات کو ان تک پہنچا دیں۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (نحل ۱)	خدا اپنی بات کی روح دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو نازل کرتا ہے۔

ان کے علاوہ رویت و مشاہدۂ غیب اور سیرِ ملکوت کے احوال و مشاہد کا بھی اکثر انبیاء علیہم السلام کے سوانح زندگی میں ان کے درجوں اور رتبوں کے مطابق پیش آنا، اسفار و کتب الٰہی سے ثابت ہے جیسا کہ آئندہ اوراق کے مطالعہ سے ناظرین پر روشن ہوگا۔

*

مکالمۂ الٰہی

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ (شوریٰ)

پیغمبروں کی خصوصیات میں سے سب سے بڑی خصوصیت مکالمۂ الٰہی ہے، قرآن مجید میں بار بار پیغمبروں کے ساتھ مخاطبۂ ربانی اور مکالمۂ الٰہی کی تصریح ہے اور مجموعۂ توراۃ میں ہر پیغمبر کے متعلق اس کی شہادتیں موجود ہیں، خدا انبیاء سے کلام کیونکر کرتا ہے؟ قرآن مجید میں ایک آیت میں اس کی حسب ذیل تصریح ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ	اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے رو برو کلام کرے لیکن
وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا	وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے تو
يَشَاءُ إِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيمٌ (شوریٰ - ۵)	اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں مکالمۂ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں، کلام بالوحی، کلام پس پردہ اور کلام بذریعہ قاصد (فرشتہ) ان ہر سہ اقسام میں سے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی طریقۂ کلام سے مشرف کیا گیا ہے، بعض پیغمبروں کو خصوصیت کے ساتھ کلام پس پردہ کے شرف سے ممتاز کیا گیا ہے، اسی لئے ان کے فضائل میں تکلم الٰہی کی فضیلت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے، مثلاً حضرت موسیٰؑ کہ ان کی شان میں

وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا (نساء)	خدا نے موسیٰ سے باتیں کیں۔

کی تصریح ہے، ان کو وادیٔ سینا کے ایک درخت سے خدا کی آواز سنائی دی، سورۂ بقرہ میں اس خاص طریقۂ کلام کے دائرہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے، چنانچہ پیغمبروں کے وصف میں خدا نے فرمایا۔

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ (بقرہ)	ان پیغمبروں میں سے بعض سے خدا نے باتیں کیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ تصریح نہیں کہ کن پیغمبروں کو خدا تعالیٰ نے اس مخصوص طریقۂ کلام سے مشرف کیا، اس لئے اس شرفِ خاص میں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ دوسرے انبیاء بھی شریک ہو سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکالمۂ الٰہی کے تینوں مذکورہ طریقوں سے خدا کی ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا ہے، بلکہ واقعہ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے جہاں حبیب و محبوب کے درمیان قاصد و پیامبر سرے سے بیگانہ تھے، جہاں زمان و مکان اور جلوہ و نگاہ کی شرکت بھی مخل تنہائی تھی، جہاں نہ کوہِ سینا تھا نہ برقِ طور دشتِ ایمن تھا نہ نخلِ وادی، صوت سرمدی سامعہ نواز تھی اور حقیقتِ محمدیؐ گوشِ سامع فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ (نجم) پھر اس نے اپنے بندہ سے چپ چاپ باتیں کیں، جو باتیں کیں۔

*

وحی

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى

گو مکالمہ الٰہی کی متعدد صورتیں ہیں جن میں سے ایک وحی بھی ہے، لیکن اصطلاح کے محاورہ میں وحی کا مفہوم اس قدر وسیع کر دیا گیا ہے کہ مکالمہ الٰہی کی تمام صورتیں اس کے تحت میں داخل ہو گئی ہیں، وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں۔

الوحی الاشارة والکتابة والرسالة والالهام والکلام الخفی وکل ما القیته الی غیرك (لسان العرب)
وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو۔

لکھنا۔ عجاج کا شعر ہے۔

حتی نحاهم جدنا والناحی
لقدر کان وحاه الواحی

خط اور کتابت۔ لبید کہتے ہیں۔

فمدافع الریان عری رسمها خلقا کما ضمن الوحی سلامها

"توریان پہاڑ کے نالوں کے آثار پرانے ہو کر ایسے دھندلے ہو گئے جیسے پتھر میں لکھی ہوئی عبارت۔"

حکم دینا، عجاج کہتا ہے۔

وحی لها القرار فاستقرت وشدها بالراسیات الثبت
زمین کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئی اور اسے جمے ہوئے پہاڑوں سے جکڑ دیا

چھپا کر بات کرنا، ابوذویب کا شعر ہے۔

فقال لها وقد اوحت الیه الا لله امك ما تعیف

اس مرد نے کہا جب عورت نے اس سے پوشیدہ طریقہ پر گفتگو کی کہ تیری ماں کا کیا کہنا کہ وہ کیا فال بد لیتی ہے۔

اشارہ کرنا۔ یوحی الیها بانقاض ونقنقة
وہ مرغ اس مرغی کی طرف کڑکڑا کے اشارہ کرتا ہے

آواز۔ ابوزبید مرتجز الجوف بوحی اعجم
گھوڑے کے پیٹ سے نہ سمجھنے والی آواز آتی ہے۔

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے کہ وحیت الیه بالکلام واوحیت الیه هو ان تکلمه بکلام تخفیه من غیره یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔ ابو اسحاق لغوی کہتا ہے۔ واصل الوحی

فی اللغۃ کلھا اعلام فی خفاء. وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں پر چھپا کر اطلاع دینے کے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے

(۱) فطری حکم،

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ (نحل)	تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو وحی کیا
بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (زلزال)	اس لئے کہ تیرے پروردگار نے زمین کو وحی کیا۔

عجاج کے اس شعر میں بھی یہی معنی ہیں،

وحی لہا القرار فاستقرت　　وشدھا بالراسیات الثبت

خدا نے زمین کو ساکن رہنے کی وحی کی تو وہ ساکن ہے اور اس کو مضبوط پہاڑوں سے باندھ دیا ہے۔

(۲) دل میں بات ڈال دینا،

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (مائدہ)	اور جب میں نے حواریوں کو وحی کیا کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔
وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ (قصص ۱)	اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کیا کہ اس بچہ کو دودھ پلاؤ۔

(۳) چپکے بات کرنا،

يُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ (انعام)	یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی بات وحی کرتے ہیں،
وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِهِمْ (انعام)	اور یہ شیطان لوگ اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں

وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو مفہوم سمجھا دینا: یا اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر پوشیدہ ہوں کہ دوسرے ان کو نہ سن سکیں، اس لئے اشارہ کرنا، لکھنا، دل میں ڈال دینا، حکم فطری، خط و کتابت اور جانوروں کا اپنے حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا سب اس کے معنوں میں داخل ہیں، بہرحال اس تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وحی کا لفظ جس مذہبی معنی میں مستعمل ہے وہ درحقیقت لغوی معنی کے بہت قریب ہے، چنانچہ خود شعرائے جاہلیت نے اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمۂ الٰہی اور وحی کا آغاز رویا اور خواب سے ہوا، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

اول ما بدئ بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم فکان لایری رؤیا الاجاءت مثل فلق الصبح۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وحی کا آغاز اچھے خواب سے ہوا، آپ جو خواب دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا تھا،

صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپ پر وحی کیونکر آتی ہے؟ آپ نے فرمایا،

احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس	کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح میرے پاس آتی ہے اور مجھ پر زیادہ

وهو اشده علی فیفصم عنی وقد وعیت عنه ما قال۔ واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی ما یقول۔	سخت ہوتی ہے اور پھر یہ حالت دور ہو جاتی ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں اور کبھی وہ فرشتہ جبریل میرے لئے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو وہ کہتا ہے اس کو میں محفوظ کر لیتا ہوں۔

صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آواز کا ہونا۔ اس کی تشریح متکلمین اور ارباب باطن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے، لیکن ہم اس کا صاف اور صریح مطلب وہ سمجھتے ہیں جو عوام ہاتف غیب یا منادی غیب کے لفظ سے سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ آواز سنائی دے، لیکن کوئی صورت نظر نہ آئے۔ بانگ جرس کے ساتھ اس کی تشبیہ محض اس بات میں ہے کہ جس طرح دور سے جرس کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کے متعینہ اشاروں سے انسان کچھ سمجھ جاتا ہے، حالانکہ جرس یا اس کے بجانے والے کی شکل آنکھوں سے اوجھل یا بہت دور ہوتی ہے اسی طرح پیغمبر کبھی دور سے منادی غیب کی آواز سنتا ہے، لیکن کوئی مجسم شکل اس کے سامنے نہیں ہوتی، اسی کے بالمقابل آپ نے وحی کی دوسری صورت یہ بیان فرمائی کہ بولنے والا فرشتہ مجسم ہو کر سامنے آتا ہے اور وہ باتیں کرتا ہے

حدیثوں میں طریقہ وحی کی اور صورت بھی آتی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا۔

ان روح القدس نفث فی روعی۔	روح القدس نے میرے دل میں پھونکا

اور کہیں یہ صیغہ مجہول کے ساتھ آیا ہے۔

نفث فی روعی۔	میرے دل میں پھونکا گیا۔

حافظ ابن قیم نے ان ہی حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر وحی کی حسب ذیل قسمیں قرار دی ہیں۔

(۱) رویائے صادقہ۔ سچ خواب دیکھنا۔

(۲) نفث فی الروع یا القاء فی القلب۔ دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا۔

(۳) صلصلۃ الجرس۔ گھنٹہ کی طرح آواز آنا۔

(۴) تمثل۔ فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا۔

(۵) فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا۔

(۶) وہ طریق مکالمہ جو معراج میں پیش آیا۔

(۷) بلا واسطہ مکالمہ

صحیح بخاری بدء الوحی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تیسری صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، اور پھر وہ شدت جاتی رہتی ہے، آپ پر وحی آتی تھی تو آپ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وحی اترنے کی حالت میں، میں نے آپ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبین مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی۔ ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وحی کی حالت میں آپ پر شدت کی

۱؎ بخاری بدء الوحی۔

جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ہوتی اور وحی کے بوجھ سے جاڑوں میں آپ کی پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگتے[1]۔ صحابہ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا سواری کے اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے[2]۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ پر وحی آئی اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا، مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے ٹوٹ جائے گا[3]۔ یعلیٰؓ بن امیہ ایک صحابی تھے، ان کو بڑا شوق تھا کہ ایک دفعہ نزول وحی کے عالم میں وہ آپؐ کی زیارت کرتے۔ اتفاق سے حج کے سفر میں ان کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپؐ کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے اور آپؐ خراٹے لے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں یہ حالت رفع ہو گئی[4]۔ عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو بے چینی ہوتی، چہرے کا رنگ بدل جاتا، آپؐ سر جھکا لیتے، صحابہؓ جو آپ کے ساتھ بیٹھے ہوتے وہ بھی سر نیچے کر لیتے، وحی کے بعد آپؐ سر اٹھاتے تھے[5]۔

فرشتہ کی زبانی سب سے پہلی وحی غار حرا میں آئی۔ اس وقت عمر شریف چالیس برس کی تھی اور اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کی ابتدائی آیتیں اس مکتب کا اولین درس تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وحی کا سلسلہ رکا رہا، آپؐ کو سخت صدمہ ہوا۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۔ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی (والضحیٰ)

قسم ہے دن کی جبکہ وہ پوری روشنی پر ہو اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ سنسان ہو جائے کہ تیرے پروردگار نے نہ تجھ کو چھوڑا ہے اور نہ تجھ سے رنجیدہ ہوا

لیکن صحیح بخاری تفسیر سورۂ والضحیٰ اور باب کیف نزول الوحی میں ہے کہ اس سورہ کا شان نزول یہ ہے کہ ایک دفعہ آپؐ بیمار تھے، چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادت الٰہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت نے طعن سے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا کیونکہ وہ دو تین روز سے تیرے پاس نہیں آیا ہے۔" اس پر یہ سورہ نازل ہوئی۔ اسی موقع پر دوسری روایت ہے کہ اس عورت نے کہا میں دیکھتی ہوں کہ تمہارے رفیق نے تم سے ملنے میں تاخیر کی ہے۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس کے بعد کسی اور زمانہ میں نازل ہوا ہے۔

تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی یعنی سلسلۂ وحی کے رک جانے (فترۃ) کے بعد سب سے پہلے سورۂ[6] مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ آپؐ حرا سے واپس آ رہے تھے کہ راہ میں ایک آواز سنائی دی، آپؐ نے ادھر ادھر دیکھا کچھ نظر نہ آیا، اوپر دیکھا تو وہی فرشتہ نظر آیا۔ آپؐ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تو کہا مجھے کمبل اوڑھاؤ اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ

اے گلیم پوش! اٹھ اور لوگوں کو خدا سے ڈرا، اپنے رب

---

[1] بخاری واقعہ افک [2] مسند ابن حنبل بسند عائشہؓ و مستدرک حاکم تفسیر سورۂ مزمل [3] صحیح بخاری و جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء [4] صحیح بخاری کتاب الحج و باب کیف نزول الوحی [5] صحیح مسلم باب وحی النبی صلی اللہ علیہ وسلم [6] اس کے برخلاف صرف حضرت جابرؓ کی حدیث ہے (بخاری باب بدء الوحی و باب کیف نزول الوحی) کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ سب سے پہلی وحی میں سورۂ مدثر کی یہ آیتیں نازل ہوئیں مگر اجماع عام یہ ہے کہ یہ حضرت جابرؓ کا وہم ہے وہ آیتیں فترۃ وحی کے بعد سب سے پہلے اتریں۔

فَكَبِّرْ (سورۂ مدثر)[1]	کی کبریائی بیان کر۔

اس کے بعد مسلسل وحی نازل ہونی شروع ہوگئی اور اس کا تار اس وقت تک نہ ٹوٹا جب تک حیات طیبہ کا ظاہری سلسلہ منقطع نہ ہوگیا، یعنی چالیس برس کے سن سے لے کر تریسٹھ سال کے سن تک کل ۲۳ برس نزول وحی کے ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر عمر میں وحی کی کثرت ہوگئی تھی۔[2] محدثین نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تھی، اطراف ملک سے وفود کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے اس لئے عطیۂ الٰہی کی ترقی بھی اس کے ساتھ ضروری تھی۔

صحابۂ کرام وفات نبویؐ کے بعد جب ان ایام سعادت کو یاد کرتے تھے، جب مدینہ کی گلیاں روح الامین کی گزرگاہ اور مدینہ کے در و دیوار وحی کے مطلع انوار تھے تو ان کی آنکھیں اشک آلود ہوجاتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ایک بوڑھی صحابیہ تھیں ان کی ملاقات کو تشریف لے جاتے تھے، آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ ان کے گھر تشریف لے گئے، دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں سبب دریافت کیا تو کہا آہ! کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے اور وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، یہ سن کر ان صاحبوں کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے۔[3]

قرآن مجید نے وحی کی حقیقت کو اس قدر بلند کیا ہے کہ وہ نبوت کی مرادف ہوگئی ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب میں نبوت کی حقیقت یا تو سرا سر مفقود ہے اور یا یہ کہ اس کو انسانیت و بشریت کے ہر لوث سے اس قدر منزہ سمجھا ہے کہ اس کو الوہیت کا ہم رتبہ قرار دے دیا ہے، لیکن قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ اس اعلان کی تاکید کی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف و فصلت)	کہہ دو کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں (فرق یہ ہے) کہ میرے پاس وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ خدا کی طرف سے لوگوں کو سناتے تھے، وہ چیز آپؐ کے نفس و ارادہ سے نہیں اٹھتی تھی بلکہ خدا کی طرف سے ان کے اندر آتی تھی۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (نجم)	وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس کو بھیجی جاتی ہے۔

البتہ اس کا مورد اور مہبط آپؐ کا پاک اور منزہ قلب تھا۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ۔۱۲)	اسی نے اس کو تمہارے قلب پر خدا کے حکم سے اتارا ہے۔
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ (شعراء)	روح الامین نے اس کو تیرے قلب پر اتارا ہے۔

اور یہی مجموعۂ وحی آپؐ کی نبوت کا بڑا معجزہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا لیکن اس کو ایسی چیز دی گئی جس کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے لیکن مجھے جو چیز دی گئی وہ وحی ہے جو مجھ پر اتاری گئی ہے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی و تفسیر سورۂ مدثر۔ [2] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی [3] صحیح مسلم فضائل حضرت ام ایمنؓ [4] صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

سرمایۂ وحی کی جو دولت اسلام کو ہاتھ آئی وہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں میں اب تک محفوظ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گنج گرانمایہ حدیث صحیح کے اوراق میں مخزون ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اتنا ہی اور[1]" یعنی وہ احکام و مواعظ جن کو جاں نثاروں نے حرز جان بنا کر رکھا اور دوسروں کو سپرد کیا۔ یعلیٰؓ بن امیہ صحابی حجۃ الوداع کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جعرانہ میں آپؐ تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا، یا رسول اللہؐ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑوں میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی جب وہ کیفیت زائل ہوئی تو آپؐ نے دریافت کیا کہ وہ آدمی کہاں گیا؟ لوگ اس کو سامنے لائے۔ آپ نے فرمایا: "جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو اتار ڈالو، پھر حسب معمول عمرہ ادا کرو[2]۔"

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا، روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک مر نہیں سکتا جب تک وہ اپنی روزی پوری نہ کرے، تو لوگو خدا سے ڈرو اور روزی کی تلاش میں صحیح طریقہ کو کام میں لاؤ، رزق میں تاخیر تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ گناہ کے ذریعوں سے روزی کو تلاش کرو، کیونکہ جو خدا کے پاس ہے وہ اس کی بندگی ہی سے مل سکتا ہے[3]۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھ سے جبرائیل نے کہا کہ آپ کی امت میں جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہیں کیا تو وہ جنت میں داخل ہوگا[4]۔

اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں بتصریح ہے کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے یا خدا نے مجھ سے یہ کہا ہے لیکن وہ قرآن مجید کے اجزاء نہیں ہیں، اسی لئے فقہاء نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں، وحی متلو یعنی وہ وحی جو تلاوت کی جاتی ہے یعنی قرآن، اور وحی غیر متلو جو تلاوت نہیں کی جاتی۔ مثلاً وہ احکام و نصائح جو بروایت صحیح احادیث میں مذکور ہیں، پہلی وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے ثابت ہے اور وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے۔ دوسری قسم تواتر سے بہت کم مروی ہے اور وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے خدا کا ارشاد ہے۔

★

---

[1] ابوداؤد کتاب السنۃ [2] باب نزول القرآن [3] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۴ تیسیر [4] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب بدء الخلق۔

نزولِ ملائکہ

اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (حج)

لفظ ملائکہ کا واحد مَلاکٌ ہے جو عربی کے قاعدہ سے مَلَکٌ ہوگیا ہے، یہ الوکۃ سے مشتق ہے، جس کے معنی پیغام کے ہیں، اس لئے ملائکہ کے معنی پیغام رساں اور قاصد کے ہیں۔

ملائکہ الٰہی خالق اور مخلوق کے درمیان قاصد ہیں، قرآن مجید نے متعدد مقامات پر ان کو رُسل اور رسل اللہ یعنی قاصدانِ الٰہی کہا ہے۔

اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ مِنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (حج-۱۰) خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغامبر منتخب کرتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ خدا کے حکم سے عالم کی مشین کے پُرزوں کو ہلاتے اور چلاتے ہیں اور اسی لئے خدا نے ان کو مُدبّراتِ امر کے نام سے بھی یاد کیا ہے (سورہ والنازعات) ان کی مخصوص صفت یہ ہے کہ خدا کے سراپا مطیع ہیں اور اس کے کسی امر یا اشارہ سے کبھی روگردانی نہیں کرتے۔

عَلَیۡہَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰہَ مَاۤ اَمَرَہُمۡ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ۔ (تحریم-۱)

اس پر سخت اور مضبوط فرشتے ہیں، اللہ ان کو جو حکم دیتا ہے وہ اس سے روگردانی نہیں کرتے اور وہ وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی تمام سیرتیں فرشتوں کی آمد، ان کی بشارت اور نصرت سے معمور ہیں، توراۃ اور انجیل قرآن، ہر کتاب الٰہی ان کے کارناموں کی شاہد ہے، حضرت آدمؑ کی بارگاہ میں انہوں نے سجدہ کیا، حضرت ابراہیمؑ کے مہمان خانہ میں یہ بھیجے گئے، حضرت لوطؑ کی حفاظت اور ان کی قوم کی بربادی پر یہ مامور ہوئے، حضرت ہاجرہؑ کو بیابان میں یہ نظر آئے، حضرت یعقوبؑ کے خیمہ میں ان کا دنگل ہوا، حضرت ایوبؑ کے مناظرۂ جبر و اختیار میں حکم یہ قرار پائے، حضرت زکریاؑ اور مریمؑ کو بشارت انہوں نے دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں بھی یہ مختلف فرائض پر مامور ہوئے، یہ آپ کی خدمت میں احکامِ الٰہی کے قاصد تھے، دشمنوں سے وجودِ اقدس کی محافظت اُن کے سپرد تھی، کمزور اور ناتواں مسلمانوں کی دستگیری اُن کا فرض تھا، ملائکہ کے سرخیل جبریلؑ ہیں اور وہی خدا اور پیغمبروں کے درمیان سفارت پر مامور ہیں، اور یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھی آکر سفارت کا فرض انجام دیتے تھے اور خدا کا پیغام پہنچاتے تھے۔

نزولِ جبریلؑ جبریلؑ عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی مردِ خدا کے ہیں، لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس فرشتہ کا نام ہے جو خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے، توراۃ اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے مستعمل ہوا ہے چنانچہ دانیال (۸-۱۶-۹-۲۱) میں اس کی پیامبری کا بیان ہے اسی طرح انجیل (لوقا ۱-۱۹-۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریاؑ کے پاس حضرت یحییٰؑ کی بشارت اور

حضرت مریمؑ کے پاس حضرت عیسیٰؑ کی بشارت لے کر آیا تھا۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خدا کے درمیان وحی کا ایلچی تھا وہ یہی جبریلؑ تھا۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ-۱۲)	جو جبریل کا دشمن ہو وہ ہو، کیونکہ اے پیغمبر! اس نے خدا کے حکم سے تیرے دل پر اس کو نازل کیا ہے۔

اور کہیں اس کو الروح الامین (امانت دار روح) سے تعبیر کیا ہے۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ؛ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (شعراء-۱۱)	امانت دار روح اس کو لے کر تیرے دل پر اتری تاکہ تو لوگوں کو خدا کے خوف سے ڈرانے والوں میں ہو۔

سورۂ نحل میں اس کو روح القدس (پاکی کی روح) کہا گیا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (نحل-۱۴)	کہہ دے کہ اس کو روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے سچائی کے ساتھ اتارا ہے

رسول (فرستادہ) کا لفظ بھی اس کی شان میں استعمال کیا گیا ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (الحاقہ)	یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے۔

سورۂ تکویر میں اس "رسول" کے متعدد صفات کا بھی ذکر ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (تکویر)	یہ تو ایک بزرگ فرستادہ کی بات ہے جو قوت والا ہے اور تخت والے خدا کے حضور میں اس کا اعتبار ہے اس کی سب اطاعت کرتے ہیں اور وہ امانت والا ہے۔

سورۂ نجم میں اس کے کچھ اور صفات بھی مذکور ہیں۔

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى (نجم)	اس پیغمبر کو بڑی قوتوں والے اور بڑی طاقت والے نے تعلیم دی۔

آغاز وحی کے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کے لئے "الملک" کا لفظ فرمایا ہے اور ورقہ نے اس کو ناموس کے لفظ سے ادا کیا ہے۔ ملک کی اصل جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے، ملاک جو الوک سے نکلا ہے اور جس کے معنی پیغام کے ہیں، اس لئے ملک کے معنی پیامبر کے ہوئے اور لفظ ناموس کے معنی محرم اسرار اور راز داں کے ہیں۔ بہرحال یہ تمام مختلف الفاظ اور عنوانات ایک ہی مفہوم و معنی کو ادا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جبریل کا نام تین مقام پر آیا ہے، دو جگہ سورۂ بقرہ میں اور ایک جگہ سورۂ تحریم میں، لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ وحی محمدی کے پیامبر اور قرآن کے حامل ہیں، صرف ایک ہی موقع پر قرآن مجید نے اس نام سے ان کو یاد کیا ہے اور وہ اس آیت میں۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ-۱۲)	جو جبریل کا دشمن ہو وہ ہو کیونکہ اس نے تو تیرے قلب پر خدا کے حکم سے اس کو اتارا ہے۔

دوسری آیتوں میں قرآن مجید نے حامل قرآن فرشتہ کی تعبیر (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) روح الامین روح القدس اور رسول کریم کے الفاظ سے کی ہے۔ لیکن احادیث اور روایات میں ان الفاظ کے بجائے جبریل ہی کا لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے۔

ایک پیامبر کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جبریلؑ کی سب سے پہلی آمد اس وقت ہوئی ہے جب آپ غار حرا میں معتکف تھے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ واقعہ ان الفاظ میں ادا ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کا آغاز خواب میں رویائے صالحہ سے ہوا۔ آپ جو رویا دیکھتے تھے وہ سپیدۂ سحر کی طرح سچا ہوکر، نمودار ہوتا تھا۔ پھر طبیعت مبارک میں تخلیہ پسندیدہ کیا گیا۔ غار حرا میں جاکر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے جاتے تھے، جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھر واپس آتے اور پھر نیا سامان لے کر غار میں چلے جاتے یہاں تک کہ حق آپ کے سامنے آگیا اور وہ فرشتہ آپ کے سامنے آگیا اور اس نے کہا "پڑھ"۔ آپ نے فرمایا "میں پڑھا نہیں ہوں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا۔ پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھ، میں نے پھر وہی جواب دیا، اس نے مجھے اتنا دبایا کہ وہ تھک گیا اور چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھ، میں نے پھر کہا کہ میں پڑھا نہیں ہوں، اس نے تیسری دفعہ دبایا اور چھوڑ دیا اور کہا،

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ خَلَقَ
الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ،

(علق)

اپنے پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے انسان کو جمے
ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا
بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے سکھایا اور انسان کو وہ
کچھ تعلیم کی جو نہیں جانتا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ واپس گھر آئے، قلب مبارک پر لرزہ تھا، حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے اور فرمایا "مجھے کمبل اوڑھاؤ، مجھے کمبل اوڑھاؤ"۔ لوگوں نے آپ کو کمبل اوڑھایا، جب آپ کو سکون ہوا تو حضرت خدیجہؓ سے تمام ماجرا بیان کر کے فرمایا کہ "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے"۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز آپ کی جان کو خطرہ نہیں، خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ قرابت داروں کا حق ادا کرتے ہیں، لوگوں کے بوجھ کو آپ خود اٹھاتے ہیں۔ فقیروں اور مسکینوں کی مدد کرتے ہیں، مسافروں کی مہمان نوازی کرتے ہیں، انصاف کی خاطر آپ لوگوں کی مصیبتوں میں کام آتے ہیں، پھر آپ کو لے کر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے اور عبرانی یا عربی لکھنا جانتے تھے (شاید توراۃ سے مراد ہو) اور انجیل کو عبرانی یا عربی میں لکھتے[1] تھے اور بہت بڈھے تھے اور آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ "اے ابن عم! اپنے بھتیجے کا ماجرا سنیئے"۔ ورقہ نے کہا: "اے میرے بھتیجے بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟" آنحضرت

---

[1] دو روایتیں ہیں، ایک میں ہے کہ عبرانی میں لکھتے تھے اور دوسری روایت میں ہے کہ عربی میں لکھتے تھے۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (محرم اسرار) ہے جو موسیٰ پر اتارا گیا تھا، اے کاش کہ میں اس وقت جوان ہوتا، اے کاش کہ میں اس وقت زندہ ہوتا جب کہ تمہاری قوم تم کو نکال دے گی"۔ آپ نے پوچھا "کیا میری قوم مجھ کو نکال دے گی؟" اس نے جواب دیا "ہاں جو کچھ تم لے کر آئے ہو اس کو لے کر کوئی آدمی نہیں آیا، جس سے لوگوں نے دشمنی نہ کی ہو، اور اگر اس زمانہ تک میں زندہ رہا تو تمہاری ہر طرح مدد کروں گا"۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ورقہ نے وفات[1] پائی۔

اس کے بعد جبریلؑ کی آمد رکی رہی اور آپ بدستور غارِ حرا میں جاتے رہے، اسی اثناء میں ایک دن آپ غارِ حرا سے نکل کر اور پہاڑی سے نیچے اتر کر جب میدان میں پہنچے تو غیب سے ایک آواز آئی۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے آگے پیچھے، داہنے بائیں دیکھا، پھر نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو پہلے غارِ حرا میں نظر آیا تھا۔ آسمان اور زمین کے بیچ میں تخت پر بیٹھا ہے۔ میں مرعوب ہو کر گھر واپس آیا۔ اس کے بعد حضرت جبریلؑ کی پے درپے آمد شروع ہوئی۔

جبریل جب وحی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تو آپ جلد جلد اپنی زبان سے انکے الفاظ کو ادا کرنے لگتے اس پر حکم ہوا[2]:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامہ-۱)	وحی کے الفاظ کے ساتھ اپنی زبان کو عجلت طلبی کے لئے جنبش نہ دو اس کی حفاظت اور قرأت کا فرض ہمارا ہے۔

اس کے بعد جب جبریلؑ نازل ہوتے تو آپ خاموشی سے سنتے اور ان کے چلے جانے کے بعد آپ اس کو پڑھتے۔ بارگاہِ نبویؐ میں جبریل کے آنے کا کوئی وقت متعین نہ تھا، صبح و شام، روز و شب، صلح و جنگ ہر وقت فیضانِ الٰہی کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ نصف شب کو سوتے سے کہ اٹھ کر بقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے۔ صبح کو آپ نے فرمایا رات جبریلؑ نے مجھے پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع جا کر لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگوں[3]۔ غزوۂ بدر میں آپ نے فرمایا کہ دیکھو یہ جبریل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں[4]۔ غزوۂ خندق سے جب مسلمانوں کی فوج لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبریل نے سامنے آکر کہا کہ آپ نے ہتھیار کھول دیئے۔ حالانکہ ہم اب تک مسلح ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا صلہ دینا ہے[5]۔ بایں ہمہ سب سے زیادہ جبریلؑ کی آمد آپ کے پاس ماہِ رمضان میں ہوتی تھی، جس میں وہ ہر روز آکر آپ سے قرآن مجید سنتے تھے اور خود آپ کو سناتے تھے[6]۔

جبریل اس وقت بھی آتے تھے جب آپ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوتے تھے، لیکن جو کچھ آپ دیکھتے اور

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی و کتاب التفسیر و تفسیر سورۂ مدثر میں یہ پورا واقعہ منفصل مذکور ہے۔ میں نے ان تینوں روایتوں کو تسلسل کے لئے یکجا کر دیا ہے چونکہ استاذ مرحوم نے جلد اول میں ان تفصیلات کو نظر انداز کر دیا تھا اس لئے یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت ہوئی [2] صحیح بخاری باب بدء الوحی [3] نسائی باب الاستغفار للمومنین [4] صحیح بخاری غزوۂ بدر [5] صحیح بخاری غزوۂ خندق

[6] صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

سنتے تھے وہ عموماً اوروں کو دکھائی اور سنائی نہیں دیتا تھا، ایک دفعہ آپ حضرت عائشہؓ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا: اے عائشہؓ! جبریلؑ تم پر سلام بھیجتے ہیں۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی[1] توراۃ میں انبیائے بنی اسرائیل کے قصوں میں اس فرشتۂ غیب کے تجسم اور تشکل کے بکثرت واقعات مذکور ہیں۔ انجیل میں ہے کہ روح القدس کبوتر کی شکل میں حضرت عیسیٰؑ پر اتری۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آکر آپ کے پاس بیٹھا اور سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "ایمان یہ ہے کہ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، خدا سے ملنے پر اور اس کے پیغمبروں پر اور قبر سے پھر جی اٹھنے پر تم یقین رکھو۔" اس نے پھر پوچھا کہ "اسلام کیا ہے؟" جواب دیا: "یہ کہ تم خدا کی اطاعت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور نماز پڑھو، زکوٰۃ مفروضہ دو، روزے رکھو۔" اسی نے کہا "اور احسان کیا ہے؟" ارشاد ہوا: "احسان یہ ہے کہ تم خدا کو اس طرح پوجو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔" اس نے پھر سوال کیا کہ "قیامت کب آئے گی؟" آپ نے فرمایا "مجیب اس باب میں سائل سے زیادہ واقف نہیں۔ البتہ میں تمھیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں، جب لونڈی اپنے آقا کو جنے اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں، قیامت کا علم ان پانچوں باتوں میں سے ہے جن کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی،

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ۔ قیامت کا علم خدا ہی کو ہے۔

وہ شخص اس کے بعد اٹھ کر چلا تو آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ذرا اس کو واپس بلا لو، لوگوں نے ادھر ادھر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ "یہ جبریل تھے جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔"[2]

صحابہ میں دحیہؓ نام ایک صحابی بہت حسین تھے، جبریل اکثر ان ہی کی صورت میں مجسم ہو کر آیا کرتے اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آجاتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ دحیہؓ آپ کے سامنے بیٹھے آپ سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ بھی شک نہ ہوا کہ یہ دحیہ نہیں ہیں۔ اتنے میں مسجد نبوی میں میں نے آپ کے خطبہ کی آواز سنی کہ آپ فرما رہے تھے کہ ابھی میرے پاس جبریل آئے تھے۔ ام سلمہؓ کہتی ہیں، تب میں سمجھی کہ وہ اصل میں دحیہؓ نہیں بلکہ جبریل امین تھے۔[3]

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ جبریل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اصلی شکل میں دو دفعہ ملاحظہ فرمایا، ایک دفعہ تو معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور دوسری دفعہ ایک اور مقام پر وہ آسمان کے کناروں میں نظر آئے۔ سورۂ نجم کی یہ آیتیں اسی کے متعلق ہیں۔

عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی۔ ذُوْمِرَّۃٍ فَاسْتَوٰی۔	بڑی قوتوں والے، طاقتور نے اس کو سکھایا، پھر وہ برابر ہوا
وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی۔ فَکَانَ	اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ تھا، پھر قریب ہوا، پھر
قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی۔ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ	لٹک آیا تو دو کمانوں کے بقدر تھا یا اس سے بھی قریب تر، تو

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی [2] صحیح بخاری باب الایمان [3] صحیح بخاری کیف نزول الوحی [4] صحیح بخاری تفسیر سورہ والنجم وصحیح مسلم معراج

اَوْحٰی۔ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی، اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی (نجم-۱)

خدا نے اپنے بندہ پر وحی کی جو کرنی کی، دل نے جھوٹ نہیں بولا جو دیکھا، کیا تم لوگ اس سے اس کے مشاہدہ پر جھگڑتے ہو، حالانکہ اس نے اس کو دوسری دفعہ اترتے دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔

سورۂ تکویر کی حسب ذیل آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار آپ کو مجنون اسی لیے کہتے تھے کہ آپ اس غیر مشاہد ہستی کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتے تھے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ، مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ، (تکویر)

یہ ایک بزرگ پیغام رساں کی بات ہے، قوت والا، جو عرش والے خدا کے پاس معتبر ہے وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے وہ امانت دار ہے، تمہارا ساتھی (یعنی پیغمبر) مجنون نہیں ہے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارہ میں دیکھا۔

وہ ذوق و شوق جو حضورؐ کو اس قاصد الٰہی کی آمد کے ساتھ تھا وہ اس آرزو کی شکل میں ظاہر ہوا کہ آپ نے جبریل سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آیا کرتے، جواب ملا۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّکَ لَهٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ، وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا (مریم-۴)

ہم تو تیرے پروردگار کے حکم اور اجازت سے اترتے ہیں، ہمارے آگے اور پیچھے اور درمیان سب کا علم اسی کو ہے اور تیرا رب بھول چوک سے پاک ہے۔

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ شب کو میں نکلا تو دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چاندنی میں ٹہل رہے ہیں، میں سمجھا کہ شاید آپ اس وقت تنہائی چاہتے ہیں اور کسی کا یہاں ہونا پسند نہ فرمائیں گے، چنانچہ اسی خیال سے میں سایہ میں ہوگیا، لیکن آپ کی نگاہ پڑ گئی، پوچھا کون ہے؟ عرض کیا، آپ پر قربان، میں ہوں ابوذر! آپ نے ساتھ لے لیا اور تھوڑی دیر تک ٹہلتے رہے، پھر فرمایا: "جو آج دولت مند ہیں وہ کل قیامت میں غریب ہوں گے لیکن وہ شخص کہ جس کو خدا نے جو دولت دی ہو وہ اس کو داہنے بائیں آگے پیچھے چھڑک دے اور اس میں نیکی کے کام کرے۔" ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں تھوڑی دیر تک ساتھ ٹہلتا رہا، اس کے بعد ایک خاص جگہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرے رہو، اور یہ کہہ کر آپ پہاڑ کی طرف گئے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے، میں نے دور سے آواز سنی تو میں ڈرا لیکن چونکہ آپ نے حکم دیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے نہ ٹلوں اس لئے ٹھہرا رہا، تھوڑی دیر کے بعد آپ سامنے سے آتے نظر آئے اور زبان مبارک سے یہ فرما رہے تھے کہ "اگرچہ چوری کرے اور زنا کرے"، میں نے کہا یا رسول اللہ! آپ پر قربان ہوں، آپ پہاڑی کی اوٹ میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟ فرمایا کیا تم نے آواز سنی؟ عرض کی ہاں: فرمایا جبریل تھے، پہاڑی کے بیچ میں مجھے نظر آئے اور کہا کہ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہ بنایا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نے کہا یا جبریل: کیا اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو، جواب دیا "ہاں"؛ میں نے پھر کہا، اگرچہ زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو، وہی جواب

دیا کہ ہاں! میں نے پھر کہا کہ اس نے زنا یا چوری ہی کیوں نہ کی ہو؟ تیسری دفعہ بھی جواب وہی تھا[1]

فرشتہ میکائیل کا نزول

جبریل کے علاوہ دوسرے ملائکہ کا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آنا ثابت ہے۔ قرآن مجید میں جبریل کے علاوہ ایک دو اور فرشتوں کے بھی نام آئے ہیں، جن میں سے ایک میکائیل ہیں، یہودیوں نے قرآن کے ماننے سے اس لئے اپنا انکار ظاہر کیا تھا کہ یہ جبریلؑ کی وساطت سے نازل ہوتا ہے، خدا نے اس کے جواب میں کہا۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ
جِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ
لِّلْكٰفِرِيْنَ (بقرہ-۱۲)

جو خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریلؑ اور میکائیلؑ کا دشمن ہو تو خدا ان کافروں کا دشمن ہے۔

یہودیوں کے اعتقاد میں یہ عرش الٰہی کے چار مخصوص فرشتوں میں سے ایک کا نام تھا، یہ خاص طور پر اسرائیل اور اس کے خاندان کا محافظ سمجھا جاتا تھا اور لڑائیوں میں اس کی مدد کیا کرتا تھا (دانیال ۱۰-۱۲-۲۱) عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق یہی فرشتہ تھا جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہمکلام ہوا تھا (اعمال ۷-۳۸)

میکائیل بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوتے ہیں، معراج کے موقع پر جو دو فرشتے آئے تھے وہ جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے، اسی طرح غزوہ احد میں جو دو فرشتے دشمنوں سے آپؐ کی حفاظت کرتے تھے وہ بھی جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے جبریلؑ اور میکائیلؑ تھے، بعض روایتوں میں ہے کہ نبوت کے ابتدائی تین سالوں میں میکائیلؑ ہی آپؐ کے ساتھ تھے۔

عام ملائکہ کا نزول

جبریلؑ اور میکائیلؑ کے ناموں کی تخصیص کے علاوہ دوسرے عام فرشتوں کا بلا تعین نام آپؐ کی خدمت میں آنا بھی صحیح روایتوں سے ثابت ہے اور ان ہی کی روحانی تائیدات کا اثر تھا کہ آپؐ کا دل ہر وقت سکینت الٰہی سے معمور رہتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک پر جب نبوت کا بار گراں رکھا گیا تو یقیناً آپؐ کو نظر آتا ہوگا کہ ایک طرف بظاہر ایک بے دست و پا انسان ہے جس کے قبضہ میں نہ سونے چاندی کے خزانے ہیں اور نہ اس کے علم کے نیچے خود اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا سپاہی ہے، اور دوسری طرف ایک دنیا ہے جس کے ہاتھوں میں دنیاوی دولت کے خزانے ابل رہے ہیں اور جس کے پرچم کے زیر سایہ ہزاروں اور لاکھوں کا ٹڈی دل ہر وقت حق کے مٹانے کو آمادہ پیکار ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب فرشتوں کو حکم پہنچا کہ میرے پیغمبر کو اپنی بشارتوں اور خوشخبریوں سے مطمئن کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (احزاب-۷)

بے شک خدا اور اس کے فرشتے اس پیغمبر پر رحمت بھیجتے ہیں اے مسلمانو! تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو۔

رئیس قریش اپنی قوت و طاقت پر نازاں ہو کر اعلان کرتا ہے کہ دنیائے قریش ہمارے ساتھ ہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق۔

پیغمبر کی طرف سے خود امداد فرماتا ہے۔

فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ۔ (علق) — وہ اپنی مجلس کے لوگوں کو بلائے ہم بھی اپنے فرشتوں کو آواز دیں گے۔

اس وقت جب منافقین آپ کی بزم خاص میں نفاق ڈالنا اور گھر میں خانہ جنگی کے سامان بہم پہنچانا چاہتے ہیں، بعض ازواج سے آپ آزردہ ہیں تو ارشاد ہوتا ہے۔

فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلٰئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيرٌ (تحریم۔۱) — تو خدا پیغمبر کا والی و ناصر ہے اور جبریل اور نیک مسلمان اور اس کے بعد فرشتے اس کے مددگار ہیں۔

ایک بار ابوجہل نے کفار سے پوچھا کہ کیا محمدؐ کبھی تمہارے سامنے سربسجود ہوتے ہیں، سبھوں نے کہا "ہاں"! اس نے کہا، لات و عزیٰ کی قسم! اگر میں ان کو سجدہ کرتے دیکھوں گا تو ان کی گردن توڑ ڈالوں گا اور ان کی پیشانی کو زمین میں رگڑ دوں گا، چنانچہ ایک دفعہ جب آپؐ مصروف نماز تھے وہ اسی نیت سے آپؐ کی طرف بڑھا لیکن فوراً سہم کر پیچھے ہٹ گیا، کفار نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی ایک خندق اور بہت سے پَر (یعنی فرشتوں کے) حائل ہو گئے، آپؐ نے فرمایا "اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کی تکا بوٹی کر دیتے"۔

قرآن مجید میں اس آیت میں،

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهٰى عَبْدًا إِذَا صَلّٰى (علق) — تم نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز سے منع کرتا ہے۔

اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے[1]۔

سفر طائف سے جب آپؐ ناکام واپس آرہے تھے تو حسب اقتضائے بشری آپؐ شکستہ دل تھے جب آپ قرن الثعالب میں پہنچے اور سر اٹھایا تو دیکھا کہ ابر کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے، اس میں آپؐ کو ایک فرشتہ نظر آیا جس نے پکار کر کہا یا محمدؐ! میں پہاڑوں پر متوکل (ملک الجبال) ہوں، آپؐ کے پروردگار نے آپؐ کی اور آپ کی قوم کی گفتگو سنی، مجھے بھیجا ہے کہ اگر آپؐ حکم دیں تو میں پہاڑوں کے نیچے ان کو کچل ڈالوں، فرمایا "شاید ان کی نسل سے کوئی خدا کا پرستار پیدا ہو"[2]۔

اسلام کی تاریخ میں ابتلاء و امتحان کا سب سے زیادہ سخت اور سب سے پہلا موقع غزوۂ بدر میں پیش آیا، مسلمانوں کی تعداد تین سو انیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن اس شرذمۂ قلیلہ کے مقابلہ کے لئے کفار کا ٹڈی دل امڈا ہوا چلا آتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس منظر کو دیکھا تو قبلہ رو ہو کر درگاہ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، دفعۃً ایک ہزار فرشتوں کی روحانی فوج مسلمانوں کی صف جنگ میں آکر کھڑی ہو گئی، قرآن مجید میں ہے،

---

[1] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وکان اللہ لیعذبہم۔ [2] صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ و صحیح مسلم غزوۂ احد۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِينَ۔
(انفال-۱)

جب تم خدا سے فریاد کر رہے تھے تو خدا نے تمہاری فریاد کو سنا اور کہا کہ میں ایک ہزار ہمرکاب سواروں سے تمہاری مدد کرتا ہوں۔

اس فوج نے جس طرح مسلمانوں کی مدد کی، اس کی کیفیت حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس طرح بیان کی ہے کہ ایک مسلمان ایک کافر کا تعاقب کر رہا تھا کہ اس نے کافر کے اوپر سے کوڑے کی آواز سنی اور سوار کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آگے بڑھ اے حیزوم، یہ کہنا تھا کہ کافر چت زمین پر گر پڑا، مسلمانوں نے آگے بڑھ کر دیکھا تو اس کی ناک میں سوراخ ہو گیا تھا جس میں نکیل لگی ہوئی تھی اور تمام چہرہ پھٹ گیا تھا اور اس میں نیلی دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ ان صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس واقعہ کو بیان کیا۔ آپ نے فرمایا سچ کہتے ہو یہ تیسرے آسمان کی مدد تھی[1]۔

غزوہ احد میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی، مسلمانوں کو یہ دیکھ کر اضطراب ہوا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ اپنی قلت تعداد اور بے سروسامانی پر نہ جاؤ، خدا اپنے ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، خدا نے کہا کہ ہاں بے شک اگر مسلمان جرأت و ہمت اور صبر سے کام لیں گے تو میں پانچ ہزار فرشتوں کی فوج ان کی مدد کو اتاروں گا، سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو بتفصیل بیان کیا ہے۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِينَ بَلٰٓى إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِينَ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران ۱۳)

اے پیغمبر! جب تم مسلمانوں سے کہتے تھے کہ کیا تم کو بس نہیں کرتا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا ہاں بے شک اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کرو اور تمہارے دشمن بڑے زوروں سے بڑھ کر آئیں تو وہ پانچ ہزار بہادر فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا، خدا نے اس وعدہ کو تمہارے لئے ایک خوشخبری بنایا اور تاکہ تمہارے دلوں میں طمانیت پیدا ہو ورنہ تو خدا ہی کے پاس سے آتی ہے۔

لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہاتھ سے صبر کا سررشتہ چھوٹ گیا اس لئے خدا کے وعدۂ نصرت سے وہ محروم رہ گئے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ اقدس کی حفاظت کے لئے دو فرشتے ساتھ تھے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں۔

"میں نے غزوۂ احد میں دو سفید پوش آدمیوں کو دیکھا جو آپ کی طرف سے سخت جانبازی کے ساتھ لڑ رہے تھے اور میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا، نہ اس کے بعد دیکھا[2]۔"

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ کتاب الجہاد، باب امداد الملائکہ۔

[2] صحیح بخاری ج ۲ باب غزوۂ احد ص ۵۸۰۔

صحیح مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ دونوں فرشتے جبریلؑ و میکائیلؑ تھے[1]

غزوۂ اُحد کے بعد غزوۂ خندق پیش آیا، اس غزوہ میں بھی مسلمانوں کی بے چارگی اور بے سروسامانی کا وہی عالم تھا، اسلامی فوج کی رسد کی یہ کیفیت تھی کہ خود مقدس سپہ سالار اپنے سپاہیوں کے ساتھ کئی وقت کا بھوکا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ روحانی فوج نازل کی جو بھوک اور پیاس سے بے نیاز ہے، سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اپنا احسان جتاتا ہے۔

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ	اے ایمان والو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب لشکر نے
اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْہِمْ رِیْحًا وَّ	تم کو آکر گھیر لیا تو ہم نے اُن پر بھی ہوا بھیجی اور فوج کو بھیجا
جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْہَا وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	جس کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں
بَصِیْرًا (احزاب ۲)	کو دیکھ رہا تھا۔

حضرت ابوذرؓ سے جو قدیم الاسلام صحابی تھے، روایت ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو پہلے پہل کیونکر معلوم ہوا کہ آپ پیغمبر ہیں، فرمایا: میں ایک دفعہ جا رہا تھا کہ آسمان سے دو فرشتے اُترے، ایک آسمان کی طرف گیا اور ایک زمین پر آیا، ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ کیا یہ وہی ہے؟ دوسرے نے کہا، ہاں یہ وہی ہے، پھر اس نے کہا ان کو ایک آدمی سے تولو، تولا تو میرا پلّہ بھاری رہا، پھر دس سے، پھر سو سے، پھر ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں تولا گیا، تب بھی میرا ہی پلّہ بھاری رہا، دوسرے فرشتے نے کہا کہ اگر ان کی تمام امت کو بھی ایک پلّہ میں رکھو اور ان کو دوسرے میں تب بھی ان ہی کا پلّہ جھکا دے گا۔

یہ حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بشری کی تمثیل تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مکہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شب عشاء کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میرا ہاتھ پکڑ کر مکہ کے باہر میدان میں لے گئے، اور ایک جگہ خط کھینچ کر فرمایا کہ یہاں ٹھہرو اور اگر تم کو کچھ لوگ نظر آئیں تو ان سے بولنا نہیں، وہ بھی تم سے نہیں بولیں گے، یہ کہہ کر آپ ایک طرف تشریف لے گئے، اس اثناء میں مجھے وہ لوگ نظر آئے جو زطی قوم کی طرح معلوم ہوتے تھے نہ وہ برہنہ تھے اور نہ ان کے کپڑے نظر آتے تھے، وہ میری طرف آکر پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے جاتے تھے اور خط سے آگے نہیں بڑھتے تھے، آدھی رات کے بعد آپ واپس تشریف لائے اور فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ آج شب میں سویا نہیں، یہ کہہ کر میرے زانو پر سر رکھ کر سو گئے اتنے میں کچھ لوگ اُجلے اُجلے کپڑے پہنے جن کے حسن و جمال کا حال خدا ہی جانے کہ کیا تھا پاس آکر بیٹھ گئے، کچھ آپ کے سرہانے بیٹھے اور کچھ آپ کے پاؤں کے پاس آکر بیٹھے، دونوں نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ کتاب الفضائل باب فضائل جبریل و میکائیل [2] یہ حدیث سنن دارمی باب کیف کان اول شان النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے، اس کا سلسلہ سند یہ ہے۔ اخبرنا عبد اللہ بن عمران حدثنا ابو داؤد حدثنا جعفر بن عثمان القرشی عن عثمان بن عروۃ بن الزبیر عن ابیہ عن ابی ذر الغفاری، تیسرے راوی جعفر بن عثمان القرشی کا صحیح نام جعفر بن عبد اللہ بن عثمان القرشی ہے اور جو محدثین میں معتبر نہیں۔

کی ایک تمثیل بیان کی اور کہا کہ یہ وہ پیغمبر ہے جس کی آنکھیں گویا سوتی ہیں، مگر دل ہوشیار رہتا ہے، اس کے بعد وہ چلے گئے۔ آپ بیدار ہوئے تو فرمایا ان لوگوں نے جو باتیں کہیں وہ میں نے سنیں، تم جانتے ہو کہ یہ کون تھے؟ عرض کی خدا اور خدا کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا یہ فرشتے تھے، ان کی تمثیل کی تفسیر یہ ہے[1]۔

حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ نماز عشا۔ پڑھ کر آپ چلے تو میں آپ کے پیچھے ہو لیا، فرمایا کون؟ حذیفہ! عرض کی جی ہاں، فرمایا۔ آج وہ فرشتہ مجھ پر اترا جو آج تک زمین پر نہیں اترا تھا، اس نے خدا سے اذن مانگا کہ وہ میرے پاس آکر مجھے یہ بشارت سنائے کہ فاطمہؓ جنتی بیبیوں کی اور حسنؓ اور حسینؓ جنتی جوانوں کے سردار ہیں[2]۔

*

---

[1] ترمذی ابواب الامثال، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب صحیح کہا ہے۔ [2] ترمذی مناقب حسنین، حدیث حسن غریب۔

عالمِ رؤیا

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ (فتح)

رؤیا، اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے، علمائے نفس کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت اور ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں، جب وہ سو جاتا ہے اور اس کے ظاہری حواس بے کار ہو جاتے ہیں، اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے، مگر چونکہ عموماً انسان عمیق اور پرسکون نیند سوتا ہے، اس لئے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالتِ خواب کا احساس نہیں ہوتا، لیکن کبھی کبھی جب اس کی نیند مستغرق اور گہری نہیں ہوتی تو اس کو اپنی گزشتہ سیر دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔

یہ تو فلسفۂ قدیمہ کا فرسودہ خیال تھا، اب جدید عہدِ ترقی میں سائیکالوجی اور نفسیات کے علماء کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالمِ بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات اور ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں، عالمِ خواب میں جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت اُن سے اُٹھ جاتی ہے، اُن کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں، بہرحال یہ شاید اس رؤیا کی توجیہ ہو گی جن کو "خواب پریشان" یا "اوہام دماغی" کہنا زیادہ موزوں ہے۔

عرفائے روح اس خواب پریشان یا اوہام دماغی کے منکر نہیں ہیں لیکن رؤیا کی حقیقت ان کے نزدیک کچھ اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح سے عبارت ہے، روح جب تک جسم کے اندر ہے اس کی جلوہ نمائی کے دو رُخ ہیں، جسمانی و روحانی، اپنے جسمانی دروازہ سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادہ کی سطح پر رنگارنگ کے نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں، یہ اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں، لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے، جہاں سے وہ روحانیت کے عالم کی سیر کر سکتی ہے، جس قدر اس کا تعلق، اُنس اور دل بستگی، شیفتگی اور مشغولیت عالمِ جسم سے زیادہ ہوگی اسی قدر دوسرے عالم کی طرف سے فراموشی، غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہوگی۔ حالتِ خواب میں روح کی ظاہری جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہیں اس لئے اس کو دوسری کھڑکی کی طرف جھانکنے کی فرصت مل جاتی ہے اور پھر روح کو جس قدر علائقِ خارجی سے بیگانگی زیادہ ہوتی ہے، شہرستانِ ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے تمثیلی مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے جو روحیں کہ اس عالم جسمانی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار و مقید نہیں، ان کے لئے عالمِ بیداری بھی اقلیمِ روح کی گلگشت سے مانع نہیں، اسی کا نام مشاہدہ اور مکاشفہ ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے مقدس قالبوں میں جو ارواح طیبات ہیں وہ عالم ظاہری کی گرفتاریوں کے بعد بھی جس حد تک آزاد اور بے تعلق رہتی ہیں، وہ عام حدِ انسانی سے بہت آگے اور بہت بلند ہے، اسی لئے عالم مشاہدہ اور عالم رؤیا دونوں میں حقائق و اسرار کی تجلیاں ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں، بیداری تو بیداری، وہ سوتے بھی ہیں تو بیدار رہتے ہیں، ان کے جسم سوتے ہیں لیکن ان کی روحیں ہمیشہ جاگتی رہتی ہیں۔

تنام اعینهم ولا تنام قلوبهم۔ (بخاری باب الانبیاء)

پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن ان کے دل ہمیشہ بیدار رہتے ہیں۔

غافل انسان ادھر التفات نہیں کرتا، ورنہ درحقیقت نیند اور خواب کا معاملہ ایک سرِّ ملکوتی اور رازِ الٰہی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ۔ (روم ۔ ۳)

خدا کی نشانیوں میں سے (اے انسانو) راتوں میں اور دنوں میں تمہاری نیند ہے اور پھر بیدار ہو کر اپنے کاروبار میں تمہارا مصروف ہونا اور اس کی دولت کو تلاش کرنا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں بڑی بصیرتیں ہیں۔

موت اور نیند دونوں کم و بیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں، فرق اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم سے روح کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے اور نیند میں عارضی، موت میں تمام تعلقاتِ ظاہری کے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور نیند میں کچھ نہ کچھ گرہیں باقی رہ جاتی ہیں، قرآن مجید نے اسی روزانہ پیش آنے والے حیرت انگیز واقعۂ قدرت کی طرف ہم کو اس آیت میں متوجہ کیا ہے۔

اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (زمر ۔ ۵)

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا ان کو نیند میں ان کی معروفیت دنیاوی کا وقت پورا کر دیتا ہے پھر جن پر موت کا فرمان جاری ہو چکا ہے ان کو اپنے پاس روک لیتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت مقررہ تک کیلئے چھوڑ دیتا ہے اس میں سوچنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

حضرت امام ربانیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"توفی نوم ازاں قبیل است کہ شخصے از وطنِ مالوفِ خود بہ شوق و رغبت از برائے سیر و تماشا بیرون آید تا فرح و سرور حاصل کند و خرم و شاداں بہ وطن خود باز رجوع نماید و سیرگاہ او عالم مثال است کہ متضمن عجائب ملک و ملکوت است۔" (مکتوب سی و یکم۔ جلد سوم)

عربی زبان میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں ایک حُلم جس کی جمع احلام آتی ہے، اس کے معنی خواب و خیال کے ہیں یعنی محض وہم و تخیل۔ دوسرا رؤیا، یہ اس خواب کو کہتے ہیں جس میں حقیقت بینی اور فرض شناسی ہو، ان دونوں لفظوں میں ایک اور فرق یہ ہے کہ پہلے میں وسوسۂ شیطانی کا دخل ہوتا ہے اور دوسرا اس سے پاک ہے، فرق سورۂ یوسف

کی ان آیتوں میں صاف نظر آئے گا، عزیز مصر نے خواب دیکھا ہے، اپنے درباریوں سے اس کی تعبیر پوچھتا ہے، اہل دربار کہتے ہیں کہ یہ محض خواب وخیال اور وہم ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ (سورہ یوسف۔ ۶)	اے درباریو! میرے اس خواب کے بارہ میں مجھے رائے دو، اگر خواب کی تم تعبیر بیان کر سکتے ہو، انہوں نے کہا یہ تو محض اوہام وخیالات کا مجموعہ ہے، ان اوہام اور خیالات کی تعبیر سے ہم واقف نہیں۔

گو عالم رؤیا کا نظارہ ہر اس ہستی کو کبھی کبھی پیش آتا ہے جو روح سے وابستہ ہے اور جس میں کالے گورے، مومن وکافر، شقی وسعید اور نیک وبد کی کوئی تمیز نہیں، لیکن جس طرح ایک نہایت نازک اور باریک یا کسی دور سے آنے والی چیز کو بہت سی آنکھیں دیکھ سکتی اور دیکھتی ہیں، لیکن ان میں حقیقت اور صحت کے قریب اسی کی رؤیت ہوتی ہے جس کی بینائی تیز، آلات باصرہ صحیح اور فہم واستنباط کی قوت لطیف ہوتی ہے، اسی طرح عالم رؤیا کے مشاہدات کی تحقیق اور صحیح رؤیت بھی ان ہی کے لئے ہے جن کی روح ودل کی بینائی تیز اور بصیرت کی آنکھیں روشن اور ادراک وعرفان کے حواس لطیف ہوں اور جن کے نفس کے آئینہ میں صلاح وتقویٰ کا صیقل زیادہ ہو۔

وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (اسرائیل)	اور جو یہاں اندھے ہیں اور وہ وہاں بھی اندھے ہوں گے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَیُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (بقرہ)	خدا سے تقویٰ کرو، اور وہ تم کو علم بخشتا ہے اور خدا کو ہر چیز کا علم ہے۔

اسی لئے دنیا کے تمام مذاہب نے رؤیا کو خاص اہمیت دی ہے، اسلام اور شارع اسلام نے جس طرح دین کے اور شعبوں کی تکمیل کی ہے، اس حقیقت کو بھی نہایت واضح اور روشن کر دیا ہے، قرآن مجید کی آیت ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (یونس۔ ۷)	جو ایمان لائے اور وہ متقی ہیں ان کے لئے اس دنیا میں بشارت ہے اور آخرت میں بھی، خدا کی باتوں میں تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔

جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اس دنیا میں بشارت کیا ہے، فرمایا کہ وہ رؤیائے صالحہ ہے جو ایک مرد مسلم دیکھتا ہے[1]، آپ نے فرمایا کہ نبوت اور رسالت ختم ہو گئی، لیکن صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور وہ مبشرات (خوشخبریاں) ہیں، لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا مسلم کی رؤیائے صالحہ، یہ نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزو ہے[2]۔ بخاری، مسلم اور ترمذی کی متعدد روایتوں میں مختلف صحابیوں سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مومن کی رؤیائے صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اس سے زیادہ رؤیا کی اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نبوت کا ایک حصہ ہے، لیکن یہ بھی سمجھ لو کہ وہ کون سی رؤیا ہے؟ ابھی ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ عربی میں خواب کے لئے دو لفظ ہیں، حلم (خواب پریشان)

---

[1] صحیح ترمذی کتاب الرؤیا۔ [2] صحیح ترمذی کتاب الرؤیا۔

یا خیالاتِ نفسانی)، اور رویا۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

الرؤیا من اللہ و الحلم من الشیطان۔ رویا خدا کی طرف سے اور حلم شیطان کی طرف سے ہے۔

آغازِ مضمون میں علمائے نفس اور عرفائے روح کی تشریحات کی تفصیل ہو چکی ہے۔ ذیل کی حدیث سے یہ حقیقت بہت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ اصدقکم رؤیا اصدقکم حدیثا[2]۔ تم میں سے سب سے سچا خواب دیکھنے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ سچ بولتا ہے۔ بحقیقت یہ انسان کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہے، اس کی زبان سچ بولے گی، اس کی روح بھی یقیناً سچ دیکھے گی، علمائے نفسیات حدیث کے اس ایک فقرہ کی گرہ کشائی پورے ایک باب میں کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خواب تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک رویائے صالحہ، یہ خدا کی طرف سے خوشخبری ہوتی ہے۔ دوسرا غم پیدا کرنے والا خواب، یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، تیسرا وہ خواب ہوتا ہے جو انسان کی اپنے دل کی باتیں اور خیالات ہوتے ہیں[3]۔ اس تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے نفس اور عرفائے روح جس خواب اور رویا کی تشریح کرتے ہیں وہ اپنی اپنی حقیقت کی رو سے بالکل الگ ہیں، اس عالمِ رویا کے تحت میں جس قسم سے بحث ہے وہ صرف پہلی قسم ہے۔

عام انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی رویا میں وہی نسبت ہے جو ان دونوں کی ذات میں ہے، جب عام انسانوں کی آنکھیں سوتی ہیں تو کم و بیش ان کے دل بھی سوتے رہتے ہیں، لیکن انبیائے کرام کی آنکھیں جب سوتی ہیں تو بھی اُن کے دل بیدار رہتے ہیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ نے بڑی دیر تک تہجد کی نماز پڑھی لیکن ابھی وتر نہیں پڑھے تھے کہ لیٹ گئے، حضرت عائشہؓ نے کہا، یا رسول اللہ! آپ بے وتر پڑھے سوتے ہیں، فرمایا، اے عائشہؓ! میری آنکھیں سوتی ہیں، لیکن میرا دل نہیں سوتا، معراج کے ذکر میں ہے کہ آپؐ اس حالت میں تھے کہ آپؐ کی آنکھیں سوتی تھیں لیکن دل بیدار تھا اور انبیاء کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں تو سوتی ہیں لیکن ان کے دل بیدار رہتے ہیں[4]۔

ان ہی حدیثوں کو پیشِ نظر رکھ کر جمہور علمائے اسلام کا یہ فیصلہ ہے کہ انبیاء کرام کی رویا بھی اسی قدر قطعی اور یقینی ہے، جس قدر آپؐ کے عام احکامِ وحی اور مخاطباتِ الٰہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خواب اپنے بھولے بیٹے کی قربانی کے متعلق دیکھا، اس کے حکمِ الٰہی ہونے میں انہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہوا اور انہوں نے اس کی تعمیل ویسی ہی ضروری سمجھی جیسی اس حکم کی جو عالمِ بیداری میں انہیں خدا کی طرف سے ملتا، دوسرے پیغمبروں کے حالات میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ان کو اپنی رویا کی صحت و صداقت اور واجب العمل ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ تھا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح مبارک میں یہ احوال بکثرت پیش آتے ہیں اور اس عالم میں جو احکام اور علوم آپ کو دیئے گئے ہیں، وہ بھی اسی طرح قطعی ہیں جس طرح وہ احکام اور علوم جو وحی کے دوسرے طریقوں سے آپ کو مرحمت ہوئے، چنانچہ ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی [2] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الرویا [3] صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل [4] صحیح مسلم و بخاری باب الاسراء۔

رُؤیا الانبیاء وحیٌ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے[1]

اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ بعض علمائے اسلام اور اصحاب کشف و عرفان عالم غیب اور عالم ملکوت اور عالم شہادت اور عالم جسمانیات کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جس کا نام انھوں نے عالم برزخ (درمیانی مقام) اور عالم مثال رکھا ہے، چنانچہ علماء میں امام خطابی، امام غزالی، علامہ سیوطی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور صوفیہ میں حضرت امام ربانی اور تمام حضرات مجددیہ اس عالم کے قائل ہیں، شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کا ایک خاص باب باندھا ہے، جس میں متعدد احادیث سے اور علامہ سیوطی اور امام غزالی کی تحریروں سے اس عالم کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، عالم مثال ان کے نزدیک گویا ایک صاف پانی کی غیر محدود نہر یا شیشہ ہے جس میں عالم شہادت کی وہ چیزیں جو جاندار یا مجسم نہیں ہیں مثلاً صفات انسانی نیکی و بدی، ایمان و علم وغیرہ وہاں اپنی مناسب اور موزوں شکلوں میں جاندار اور مجسم ہو کر نظر آتی ہیں، نیکی ایک حسین و جمیل کی شکل میں، بدی ایک کریہ المنظر صورت میں، ایمان آفتاب بن کر، علم دریا کے رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی طرح عالم غیب کی چیزیں، جنت، دوزخ، ملائکہ وغیرہ اسی نہر و آئینہ میں منعکس ہو کر اس عالم شہادت کے لوگوں کو نظر آتی ہیں اور جس طرح تصویر کی شبیہ اور نہر و آئینہ کے عکس میں اور اصل جسمانی شکلوں میں کامل مشابہت اور مماثلت ہوتی ہے، اسی طرح عالم غیب کی اشیاء اور عالم مثال کی شبیہوں اور تصویروں میں پوری مماثلت اور مشابہت پائی جاتی ہے۔

بہرحال اس عالم کا مستقل وجود ہو یا نہ ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں ایسے واقعات، حالات، مشاہدات اور کیفیات مذکور ہیں جن کی تشریح اس عالم میں بخوبی کی جا سکتی ہے، انجیل اور قرآن مجید دونوں میں ہے کہ جبریلؑ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت لے کر آئے۔

فتمثّل لھا بشرًا سویًّا (مریم)	مریم کے سامنے ایک پورے انسان کی مثال بن کر آئے۔

احادیث میں ہے کہ ایک دفعہ نماز کی حالت میں آپ کے سامنے جنت اور دوزخ کی صورتیں جلوہ گر کی گئیں، اس موقع پر مختلف صحابیوں نے اس مفہوم کو حسب ذیل مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، فرمایا۔

انہ صُوِّرت لی الجنۃُ والنارُ حتی رأیتُھما دون الحائط۔ (بخاری باب التعوذ من الفتن)	میرے لئے جنت اور دوزخ مصور کی گئی یا میرے سامنے جنت اور دوزخ کی صورت پیش کی گئی یہاں تک کہ میں نے ان کو اس دیوار کے پاس دیکھا۔
لقد رأیت الآن منذ صلیت بکم الصلوٰۃ الجنۃ والنار ممثلتین فی قبلۃ ھذا الجدار (بخاری باب رفع البصر فی الصلوٰۃ)	میں نے ابھی جب تم کو نماز پڑھا رہا تھا جنت اور دوزخ کو اس دیوار کے رُخ میں متمثل دیکھا یا میرے سامنے جنت اور دوزخ کی مثال پیش کی گئی۔

---

[1] ترمذی مناقب عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔

انی رأیت الجنة اریت النار (بخاری باب الکسوف)	میں نے جنت کو دیکھا اور دوزخ بھی مجھے دکھائی گئی،
عرضت علی الجنة وعرضت علی النار۔ (مسلم باب الکسوف)	مجھ پر دوزخ اور جنت پیش کی گئی۔
لقد جیئ بالنار ثم جیئ بالجنة (مسلم باب الکسوف)	میرے پاس جنت اور دوزخ لائی گئی۔
اطلعت فی الجنة واطلعت فی النار۔ (بخاری باب صفة الجنة)	میں جنت اور دوزخ میں جھانکا۔

ایک ہی مفہوم کو مختلف راویوں نے ان مختلف الفاظ میں ادا کیا ہے، لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ الفاظ کی احتیاط میں جس قدر امام بخاری کے ہاں ہے کسی اور کے ہاں نہیں، اس لئے امام بخاری کے الفاظ تصویر اور تمثیل یا صورت اور امثال یا امام مسلم کے الفاظ لایا جانا اور پیش کیا جانا پر زور تامل درکار ہے، حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زبان اس درجہ ادائے مطلب میں قاصر ہے کہ وہ اپنے الفاظ سے عالم محسوس کی کیفیتوں کی بھی پردہ دری نہیں کر سکتی پھر اس سے یہ توقع کس قدر بے جا ہے کہ غیر محسوس عالم کی کیفیتوں کو وہ کبھی الفاظ کا جامہ پہنا سکتی ہیں، جو ہم کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ صحیح، مستند اور محفوظ ذریعہ سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ دوسروں تک پہنچا دیں، وحی نبوی کا آغاز رویائے صالحہ سے ہوا، آپ کو چیزیں رویا میں دکھائی جاتی تھیں اور وہ سپیدۂ صبح کی طرح ٹھیک ٹھیک پوری اترتی تھیں۔[1]

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد صحابہ کی طرف منہ کر کے آپ جائے نماز پر بیٹھے رہتے اور ان سے دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ لوگ بیان کرتے، اگر وہ رویائے صالحہ ہوتی تو آپ اس کی تعبیر کرتے، اگر وہ خواب وخیال ہوتا تو کہہ دیتے کہ یہ محض خواب وخیال ہے، اسی اثنا میں اس شب میں اگر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی رویا دکھائی گئی ہوتی تو آپ اس کو سناتے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس قدر رویا احادیث میں مذکور ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ ہیں جو تمثیلی رنگ میں دکھائی گئی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعبیر وتشریح خود اپنی زبان مبارک سے کر دی ہے، دوسری وہ رویا ہیں جو بعینہ واقعہ اور حقیقت ہیں اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بیان کرتے وقت ان کی تاویل وتشریح نہیں کی، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس میں بعض اوقات دنیا کے متعلق پیش گوئی اور اخبار غیب ہے، دوسری وہ جس میں احوال آخرت اور اسرار غیب کا اظہار ہے، ذیل میں ہم ہر قسم کے واقعات کو الگ الگ عنوانوں کے تحت میں بیان کرتے ہیں۔

رویائے تمثیلی

ابھی آپ مکہ معظمہ ہی میں تھے، اسلام پر سختی اور مصیبت کے دن تھے، صدائے حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد کم تھی کہ آپ کو عالم رویا میں دکھایا گیا کہ آپ اپنی جماعت کے ساتھ عقبہ بن رافع کے گھر میں ہیں اور ابن طاب کی تر وتازہ کھجوریں لا کر آپ کو اور آپ کے رفقاء کو دی گئی ہیں، آپ نے اس کی تعبیر یہ

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی کتاب التعبیر وغیرہ وصحیح مسلم بدء الوحی۔ [2] ایضاً۔

کہ دنیا میں مسلمانوں کو ترقی اور آخرت میں عاقبت بخیر ہوگی اور ان کا مذہب پھیلے اور پھولے گا[1]۔

ابھی آپؐ نے ہجرت نہیں کی تھی لیکن ہجرت کا زمانہ قریب تھا کہ آپؐ کو ہجرت اور ہجرت کے بعد کے تمام اہم واقعات رویا میں دکھائے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ میری ہجرت کی سرزمین چھواروں کا نخلستان ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہ یمامہ یا ہجر کا شہر ہوگا، لیکن وہ شہر یثرب نکلا۔ اسی خواب میں نظر آیا کہ میرے ہاتھ میں تلوار ہے، میں نے اس کو ہلایا تو وہ ٹوٹ گئی۔ یہ احد کی شکست کی طرف اشارہ تھا۔ پھر میں نے اس کو ہلایا تو وہ ایک نہایت عمدہ تلوار ہو گئی۔ یہ اس واقعہ کی تمثیل تھی کہ احد کے بعد اللہ تعالیٰ فتح و کامیابی اور مسلمانوں کا اجتماع نصیب کرے گا۔ میں نے اسی خواب میں گائے کو ذبح ہوتے دیکھا۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو احد میں شہید ہوتے۔ اس کے بعد بھلائی دیکھی۔ یہ وہ بھلائی ہے جو اسلام کو نصیب ہوئی[2]۔

مسلمانوں نے جب مدینہ کو ہجرت کی ہے تو یہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی، وبا بھی پھیلی تھی، مہاجرین میں اضطراب سا تھا۔ آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ ایک کالی سیاہ عورت جس کے سر کے بال الجھے اور پریشان ہیں، وہ مدینہ سے نکل کر جحفہ کی طرف جا رہی ہے۔ اس کی تعبیر یہ ارشاد فرمائی کہ مدینہ کی وبا جحفہ میں منتقل کر دی گئی[3]۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مدینہ منورہ اس سے پاک ہو گیا۔

ایک دفعہ رویا میں آپؐ کو دکھایا گیا کہ آپؐ کے دونوں ہاتھوں میں سونے کا ایک ایک کنگن ہے۔ اس سے آپؐ کو تکلیف ہوئی۔ حکم ہوا کہ ان کو پھونک دو۔ آپؐ نے پھونکا تو دونوں کنگن ہاتھوں سے علیحدہ ہو کر اڑ گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ یہ نبوت کے دو جھوٹے مدعی ہیں (مسیلمہ اور اسود عنسی) جو میرے بعد پیدا ہوں گے[4]۔

آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے سامنے دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا۔ آپؐ نے اس کو اس قدر سیر ہو کر پیا کہ انگلیوں سے دودھ بہنے لگا۔ پیالہ کا بچا ہوا دودھ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو عطا فرمایا۔ آپؐ نے لوگوں سے جب یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اس کی تعبیر آپؐ نے کیا کی؟ فرمایا "علم[5]"۔ اسی طرح آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا: آج شب کو جب میں سویا تھا، میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے۔ ان میں سے کسی کے بدن پر کرتہ سینہ تک تھا، کسی کا اس سے نیچے تک۔ عمرؓ جب سامنے آئے تو ان کے جسم پر کرتہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے دامن زمین پر لوٹ رہے تھے۔ سننے والوں نے پوچھا یا رسول اللہ! آپؐ نے اس کی کیا تعبیر کی؟ فرمایا "دین[6]"۔

ایک شب میں آپؐ کو ذاتِ محمدیؐ پر ختم نبوت اور تکمیل دین کی تمثیل دکھائی گئی۔ آنکھیں خواب آلودہ تھیں لیکن قلب اقدس بیدار تھا۔ کچھ فرشتے اتر کر آپؐ کے پاس آ کر بیٹھے اور آپس میں ایک دوسرے سے بولے کہ اس پیغمبر کی کوئی تمثیل بیان کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آقا ہو۔ اس نے ایک محل تیار کیا اور

---

[1] صحیح مسلم کتاب الرؤیا و صحیح بخاری کتاب التعبیر۔ [2] صحیح مسلم کتاب الرؤیا۔ [3] صحیح بخاری و ابوداؤد کتاب الرؤیا۔ [4] صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الرؤیا والتعبیر۔ [5] صحیح بخاری کتاب التعبیر و مناقب عمرؓ و جامع ترمذی ابواب الرؤیا۔ [6] ایضاً۔

اس میں دسترخوان بچھایا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی، اب جس نے اس کی بات کو قبول کیا وہ آیا اور کھا پی کر سیر ہوا اور جو نہیں آیا اس نے اس کو سزا دی، بیدار ہو کر آپؐ نے عبداللہؓ ابن مسعود سے فرمایا کہ وہ آقا تو خدا ہے جنت اس کا محل ہے جس نے اس کی دعوت کو قبول کیا وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے انکار کیا اس کو اس نے عذاب دیا۱۔

ایک دفعہ آپؐ کو یہ دکھایا گیا کہ آپ ایک کنوئیں کے اندارے پر کھڑے ہیں، بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے دیکھا کہ میں حوض کوثر پر کھڑا ہوں، اور گرد لوگوں کا جماؤ ہے۔ آپ ڈول سے پانی کھینچ کھینچ کر ان کو پلا رہے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ابوبکرؓ آئے اور انہوں نے میرے ہاتھ سے ڈول لے کر مجھے سبکدوش کر دیا، اور پھر وہ پانی کھینچ کھینچ کر پلانے لگے، مگر خدا ان پر رحم کرے، ذرا کھینچنے میں کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد عمرؓ آئے تو ڈول بڑھ کر بڑا ہو گیا اور عمرؓ نے اس قوت اور تیزی سے پانی کھینچا کہ حوض کناروں کناروں تک پر ہو گیا اور لوگ پی کر سیراب ہو گئے۲ یہ خواب اتنا واضح تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعبیر کی ضرورت نہیں سمجھی، کون نہیں سمجھا کہ ڈول اور پانی کھینچنے سے مراد خلافت اور خدمتِ خلق کی بجا آوری ہے۔

حضرت عمرؓ ان چند سعید لوگوں میں ہیں جن کو اسی دنیا میں جنت کی بشارت دی جا چکی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رات میں نے دیکھا کہ میں جنت میں ہوں، سامنے ایک محل ہے، ایک عورت اس میں بیٹھی وضو کر رہی ہے، میں نے پوچھا یہ کس کا محل ہے؟ جواب دینے والے نے جواب دیا کہ یہ عمرؓ کا مسکن ہے، میں نے چاہا کہ اندر جاؤں، مگر عمرؓ کی غیرت یاد آئی تو الٹا پھر گیا، حضرت عمرؓ سن کر رو پڑے اور کہا یا رسول اللہ! میں آپ سے غیرت کرتا۳ ایک دفعہ آپ نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ اے بلالؓ! تم کون سا ایسا نیک عمل کرتے ہو کہ میں جب جنت میں گیا تو تمہارے جوتوں کے چاپ کی آواز سنی، عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب نیا وضو کرتا ہوں، دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں۴۔

ورقہ بن نوفل کا نام آغاز وحی کے ضمن میں ابھی گزر چکا ہے، یہ حضرت خدیجہؓ کے رشتہ دار تھے اور اسلام سے پہلے سچے عیسائی ہو گئے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ سے نزول جبرئیل کا حال سنا تو انہوں نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور کہا کہ اگر زندہ رہا تو اس وقت جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کرے گی، میں آپ کی پوری مدد کروں گا، حضرت خدیجہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ورقہ جنت میں گئے یا دوزخ میں، انہوں نے تو آپ کی تصدیق کی تھی، لیکن آپ کے ظہور سے پہلے مر گئے۔ فرمایا۔ مجھے وہ خواب میں دکھائے گئے کہ وہ سپید کپڑے پہنے ہیں، اگر وہ دوزخ میں ہوتے تو ان کے جسم پر یہ لباس نہ ہوتا۵۔

---

۱ جامع ترمذی ابواب الامثال ۲ صحیح بخاری ومسلم وترمذی کتاب التعبیر وکتاب الرؤیا مناقب عمرؓ ۳ صحیح بخاری ومسلم وترمذی کتاب التعبیر وکتاب الرؤیا مناقب عمرؓ ۴ بخاری ومسلم مناقب بلالؓ و ترمذی مناقب عمرؓ ۵ مشکوٰۃ کتاب الرؤیا بحوالہ ترمذی کتاب الرؤیا ومسند احمد۔

ایک شب کو جب آپؐ مصروف نماز تھے، جمال الٰہی بے نقاب ہو کر سامنے آگیا، صحیحین کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ صبح کی نماز کے لیے آپؐ دیر کو برآمد ہوئے۔ نماز کے بعد لوگوں کو اشارہ کیا کہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہیں۔ پھر فرمایا کہ آج شب کو جب میں نے اتنی رکعتیں پڑھیں جتنی میرے لئے مقدر تھیں تو نماز ہی کے اندر میں اونگھ گیا، میں نے دیکھا کہ جمال الٰہی بے پردہ میرے سامنے ہے، خطاب ہوا یا محمد! تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی نہیں، اے میرے رب میں نہیں جانتا؟ اس نے اپنا ہاتھ دونوں مونڈھوں کے بیچ میں میری پیٹھ پر رکھا، جس کی ٹھنڈک میرے سینہ تک پہنچ گئی اور آسمان و زمین کی تمام چیزیں نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گئیں سوال ہوا یا محمد تم جانتے ہو کہ فرشتگانِ خاص کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ عرض کی ہاں، اے میرے رب! ان اعمال کی نسبت گفتگو کر رہے ہیں جو گناہوں کو مٹا دیتے ہیں، پوچھا، وہ کیا ہیں؟ عرض کی، نماز باجماعت کی شرکت کے لئے قدم اٹھانا، نماز کے بعد مسجد میں ٹھہر جانا اور ناگواری کے باوجود اچھی طرح وضو کرنا، جو ایسا کرے گا اس کی زندگی اور موت دونوں بخیر ہوں گی، وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک ہوگا جیسا اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔ پھر سوال ہوا کہ یا محمد! درجات کیا ہیں؟ گزارش کی کھانا کھلانا، نرمی سے باتیں کرنا، جب دنیا سوتی ہو تو اٹھ کر نماز پڑھنا، پھر حکم ہوا کہ اے محمد! مجھ سے مانگو، میں نے عرض کی خداوندا! میں نیک کاموں کے کرنے اور برے کاموں سے بچنے اور غریبوں سے محبت کرنے کی توفیق چاہتا ہوں، میری مغفرت کر، مجھ پر رحم فرما، جب کسی قوم کو تو آزمانا چاہے مجھے بے آزمائے اٹھا لینا، میں تیری محبت کا اور تجھ سے جو محبت رکھے اس کی محبت کا اور جو عمل مجھ کو تیری محبت کے قریب کر دے اس کی محبت کا خواستگار ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں سے کہا کہ "یہ جو کچھ تھا حق تھا اور اس دعا کو پڑھا کرو"۔[1]

آثارِ قیامت کے بعض واقعات بھی اسی عالم میں آپؐ پر پیش کیے گئے، آپؐ نے صحابہ کے مجمع میں ایک دن فرمایا کہ رات مجھے ایک رؤیا دکھائی گئی، میں نے دیکھا کہ میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہا ہوں، اسی اثنا میں میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کا رنگ گندم گوں تھا، بہتر سے بہتر گندم گوں آدمی جو تم نے دیکھا ہو، اس کے گیسو پڑے ہوئے تھے، بہتر سے بہتر گیسو جو تم نے دیکھے ہوں، کنگھی سے بال درست کیے تھے اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ طواف کر رہا تھا، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ جواب ملا کہ مسیح بن مریم، جب ادھر دیکھنے کو مڑا تو ان کے پیچھے ایک اور آدمی نظر آیا، سرخ رنگ، موٹا بھدا، بالوں میں بہت گھونگر پڑے ہوئے، ایک آنکھ سے کانا، آنکھ ایسی معلوم ہوتی تھی گویا کہ ابھرا ہوا انگور ہے، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ معلوم ہوا دجال ہے۔[2]

---

[1] بروایت جامع ترمذی تفسیر سورۂ ص و مسند ابن حنبل، مسند معاذ، ج ۵ ص ۲۴۳، ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

[2] صحیح بخاری کتاب التعبیر و صحیح مسلم باب الاسراء۔

ام المومنین زینب بنت جحشؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ سونے سے جاگ اٹھے، چہرۂ مبارک سرخ تھا اور زبان پر یہ کلمات تھے لا الٰہ الا اللہ، افسوس ہے عرب پر برائی نزدیک آگئی، یاجوج ماجوج کی دیوار میں کچھ اتنا سوراخ ہوگیا[1]

حضرت جبریلؑ اور دوسرے فرشتے جس طرح آپؐ کے عالم مشاہدہ میں آتے تھے اسی طرح اس عالم میں حاضر ہوتے تھے، حضرت سمرہؓ بن جندب کہتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے فرمایا کہ آج شب کو میں نے خواب میں دو شخص دیکھے جو مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ دوزخ کی آگ کو جو جلاتا ہے وہ مالک داروغۂ دوزخ ہے، میں جبریلؑ ہوں اور یہ میکائیل ہیں[2]

نظارۂ جمال الٰہی کے بعد اس عالم کا سب سے بڑا مشاہدہ وہ تھا جس میں آپؐ کو دوزخ کے مہیب و ہولناک مناظر اور بہشت کی بعض دل کش اور مسرت افزا جلوہ آرائیاں دکھائی گئیں، حضرت سمرہؓ کہتے ہیں کہ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد آپؐ ہم لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے اور پھر دریافت فرماتے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے، بہر حال حسب معمول آج بھی آپؐ نے دریافت فرمایا، ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ آج شب کو مجھے رویا میں یہ نظر آیا کہ دو آنے والے میرے پاس آئے، انھوں نے مجھے اٹھایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک مقدس سرزمین میں لے گئے، میں نے دیکھا کہ ایک آدمی پڑا ہے دوسرا شخص ایک بڑا پتھر ہاتھ میں لئے اس کے پاس کھڑا ہے، وہ زور سے پتھر اس کے سر پر مارتا ہے جس سے اس کا سر چور چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے، وہ دوڑ کر پتھر اٹھاتا ہے تو اس کا سر پھر درست ہو جاتا ہے، وہ پھر آکر اسی طرح مارتا ہے اور سر کے پرخچے اڑ جاتے ہیں، میں نے پوچھا سبحان اللہ! یہ کیا ہے؟ میرے ساتھیوں نے کہا آگے چلو! آگے چلو! میں آگے چلا تو دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہے، دوسرے شخص کے ہاتھ میں ایک لوہے کا آنکڑا ہے، وہ ایک طرف اس کے منہ میں آنکڑا ڈال کر کھینچتا ہے تو باچھیں پھٹ کر گدی سے مل جاتی ہیں، پھر آنکھ میں، پھر نتھنے میں آنکڑا ڈال کر کھینچتا ہے اور چیر ڈالتا ہے، ادھر سے فرصت کر کے دوسری جانب جاتا ہے اور ادھر کے بھی جبڑے اور دانت اور نتھنے کو اسی آنکڑے سے پیچھے تک چیر ڈالتا ہے، اسی اثنا میں پہلی طرف سے سب زخم بھر آتے ہیں اور پھر آکر وہ ان کو چیرتا ہے تو دوسری طرف کے بھر جاتے ہیں، میں نے کہا کہ سبحان اللہ یہ کیا ہے؟ جواب ملا آگے چلو، آگے چلو، میں اور آگے بڑھا، دیکھا کہ ایک تنور ہے، اس میں آگ روشن ہے، کچھ مرد و عورت اس میں ننگے ڈالے گئے ہیں، جب نیچے سے آگ کا شعلہ اٹھتا ہے تو چیختے ہیں، چلاتے ہیں، تھوڑی دیر میں وہ آگ دب جاتی ہے اور پھر بلند ہوتی ہے اور پھر وہ چیختے ہیں اور چلاتے ہیں، میں نے کہا، سبحان اللہ! یہ کیا ہے؟ انھوں نے پھر آگے بڑھنے کو کہا، اب آگے بڑھے، تو دیکھا کہ ایک خون کی سرخ نہر ہے، اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفتن ومسلم باب اشراط الساعۃ۔ [2] بخاری بدء الخلق۔

اور کنارہ پر ایک شخص پتھر لئے کھڑا ہے، وہ آدمی چاہتا ہے کہ تیر کر کنارے لگ جائے، مگر جب وہ قریب آتا ہے وہ شخص پتھر اس زور سے تاک کر مارتا ہے کہ وہ اس کے منہ میں جا کر لگتا ہے اور حلق سے نیچے اتر جاتا ہے۔ وہ آدمی ہٹ کر پھر جہاں تھا وہیں پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ کنارے پر آنے کا قصد کرتا ہے کہ پھر اسی طرح پتھر آ کر اس پر پڑتا ہے، میں نے دریافت کیا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا آگے چلو، آگے چلو۔ میں آگے چلا تو ایک شخص نظر آیا، کریہہ منظر سے کریہہ منظر آدمی جو تم نے دیکھا ہو وہ اس سے بھی زیادہ کریہہ منظر تھا، آگ اس کے سامنے دہک رہی تھی اور اس کو وہ اور دہکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف پھر رہا تھا، میں نے اپنے ساتھیوں سے پھر پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انھوں نے آگے بڑھنے کو کہا، میں آگے بڑھا تو ایک ہرا بھرا گنجان باغ نظر آیا جس میں نو بہار کے رنگ برنگ پھول کھلے ہوئے تھے، باغ کے بیچ میں ایک نہایت ہی خوب صورت عمارت دکھائی دی کہ میں نے ویسی کبھی نہیں دیکھی تھی، اس میں بچے، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، ہر طرف آگے نظر آئے، آگے بڑھا تو ایک اور عمارت جو پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت تھی نظر آئی، اس میں بھی کچھ لوگ مختلف سن و سال کے دکھائی دیئے، ایک باغ میں ایک درخت کے پاس ایک دراز قد انسان دیکھا جس کا سر اتنا اونچا تھا کہ آسمان تک پہنچ گیا تھا اور مجھے نظر نہیں آتا تھا، اس انسان کے چاروں طرف اتنے بچے نظر آئے کہ میں نے اتنے نہیں دیکھے تھے، میں نے اپنے ہمراہیوں سے پھر سوال کیا، مگر انھوں نے اور آگے بڑھایا تو ایک بہت بڑے باغ کے قریب جس سے زیادہ بڑا اور زیادہ خوب صورت باغ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، پہنچا، اندر گیا تو ایک شہر نظر آیا جس کی چار دیواری ایک ایک سونے اور ایک ایک چاندی کی اینٹوں سے تعمیر ہوئی تھی، دروازہ کے پاس پہنچ کر دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا اور ہم اس کے اندر داخل ہوئے تو وہاں ہم کو ایسے لوگ نظر آئے جن کا آدھا دھڑ تو نہایت خوب صورت تھا اور آدھا دھڑ نہایت بدصورت، میرے ہمراہیوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اس نہر میں غوطے لگاؤ، ناگاہ ایک نہایت صاف شفاف نہر نظر پڑی، وہ گئے اور جا کر اس میں غوطے لگائے، غوطے لگا کر باہر آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور وہ نہایت خوب صورت ہو گئے۔ ساتھیوں نے کہا کہ یہ شہر جنت عدن ہے۔ اور آپ کی منزل وہ ہے، میری نگاہ اوپر اٹھی تو ایک محل سپید بادل کی طرح دکھائی دیا، میں نے کہا خدا تمہارا بھلا کرے مجھے وہاں جانے دو، انھوں نے جواب دیا کہ ابھی نہیں، مگر آپ وہاں یقیناً جائیں گے، پھر میں نے کہا آج رات کو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، بتاؤ یہ کیا تھیں؟ انھوں نے کہا اب ہم آپ کو سب بتا دیں گے، پہلا آدمی جس کا سر پتھر سے توڑا جا رہا تھا، وہ تھا جو قرآن پڑھ کر پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے اور فرض نماز سے غافل ہو کر سو جاتا ہے، وہ شخص جس کی آنکھ، ناک اور منہ چیرا جا رہا تھا وہ تھا جو جھوٹ بولتا ہے، تنور میں جو عورت مرد ننگے بدن نظر آئے وہ زناکار ہیں، خون کے دریا میں جو غوطے لگا رہا تھا اور پتھر نگل رہا تھا وہ سود خوار ہے کہ وہ لوگوں کا خون چوس کر حرام کھاتا

تھا کریہ منظر شخص جو آگ دہکا رہا تھا، دوزخ کا داروغہ مالک تھا، باغ میں جو دراز قد انسان اور اس کے چاروں طرف بچے نظر آتے تھے وہ ابراہیمؑ تھے اور یہ بچے وہ کم سن تھے جو دینِ فطرت پر مرے۔ یہاں پر حاضرینِ مسجد میں سے ایک مسلمان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک کر کہا۔ یا رسول اللہ! اور مشرکین کے بچے؟ فرمایا، اور وہ بھی (کیونکہ وہ ہوش میں آنے سے پہلے دینِ فطرت ہی پر مرے) پھر سلسلۂ گفتگو آگے فرمایا اور فرشتوں نے بتایا کہ پہلی عمارت جس میں ہر عمر کے لوگ تھے، عام اہلِ ایمان کا مسکن ہے دوسری عمارت جو اس سے بہتر تھی اور جس میں ہر سن و سال کے کچھ آدمی ملے وہ شہیدوں کا مقام ہے اور یہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، وہ تھے جنھوں نے نیک اعمال کے ساتھ بُرے اعمال بھی کیے ہیں، خدا نے اُن سے درگزر کیا۔[1]

*

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر و کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین

مشاہدات و مسموعات

عالم بیداری

أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (نجم)

پیغمبر جو کچھ دیکھتا ہے کیا اس پر تم اس سے جھگڑتے ہو۔

انبیاء علیہم السلام کے حواس یا عام اصناف انسانی کے حواس سے زیادہ لطیف ہوتے ہیں یا ہمارے حواس کے ماسوا اُن کے کچھ اور بھی حواس ہوتے ہیں، جن سے عام انسان اسی طرح بیگانہ ہیں جس طرح مادر زاد نابینا ایک تیز نگاہ نوجوان کی قوتِ بینائی اور لطفِ نظر سے ناآشنا ہے۔

مشاہدات نبوی، عام مادی واقعات نہیں جن کی روایت صحابہ کرام خود اپنے علم یا رویت یا سماعت سے کر سکتے، بلکہ وہ ان واقعات سے اسی قدر جان سکتے تھے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے کبھی کبھی ظاہر فرمایا، اس لئے روایاتِ حدیث میں مشاہدات نبوی کا احاطہ نہیں ہوسکتا ہے اور نہ عام امت کے عمل دین کے لئے ان کیفیات مافوق کا علم ضروری ہے، بہرحال الفاظ و عبارت کے حدود میں جہاں تک ممکن ہے ہم ان کے احاطہ کی کوشش کرتے ہیں۔

مشاہداتِ نبوی کی فہرست میں سب سے پہلی چیز روح القدس یا روح الامین یا جبریل نام فرشتہ کی رویت ہے جو سب سے پہلے غار حرا میں نظر آیا اور اس کے بعد کچھ زمانہ تک وہ آپ کی نگاہ سے اوجھل رہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی وجہ سے تکلیف رہی[1]، صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ مکہ میں آپؐ کے چند سال ایسے گزرے کہ آپ کو صرف غیب کی آوازیں سنائی اور روشنی دکھائی دیتی تھی اور کوئی چیز آپ کو نظر نہیں آتی تھی[2]۔ غالباً یہی فترۃ الوحی کا زمانہ ہے، یہ زمانہ ختم ہوگیا تو آپ نے ایک دن آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا تو آسمان و زمین کے بیچ میں ایک کرسی پر وہی فرشتہ بیٹھا ہوا نظر آیا[3]۔ مگر عموماً وہ کسی نہ کسی شکل میں نظر آتا، صحیح روایتوں میں ہے کہ جبریل صرف دو دفعہ اپنی اصلی صورت میں آپ کو نظر آئے، آپ نے اس وقت دیکھا کہ ان کے جسم میں چھ سو پر ہیں اور اُن کے دونوں بازوؤں نے اُفق کو گھیر لیا ہے[4]۔ جبریل کے علاوہ دوسرے فرشتگان الٰہی بھی بارگاہ نبوت میں آیا کرتے تھے جن کی تفصیل نزولِ ملائکہ کے عنوان میں گزر چکی۔

فرشتوں کے مقابل دوسری ہستی شیطان کی ہے یہ وہ قوتِ شر ہے جس سے کوئی انسان محفوظ نہیں رہ سکتا، سب سے پہلے اس سے حضرت آدمؑ کی آزمائش ہوئی اور خدا نے یہ نتیجہ ظاہر کیا کہ،

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب بدء الوحی [2] صحیح مسلم باب کم اقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ [3] صحیح مسلم بدء الوحی [4] صحیح بخاری بدء الخلق و تفسیر والنجم، صحیح مسلم باب الاسراء۔

لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ)
ہم نے آدم میں استقلال نہیں پایا۔

سفر ایوبؑ اور قرآن میں ہے کہ اس سے حضرت ایوبؑ کی بھی آزمائش ہوئی اور وہ اس امتحان میں پورے اترے، انجیل میں ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی شیطان سے آزمائے گئے اور انہوں نے کامیابی سے اس میدان کو سر کیا، حدیث صحیح میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے، پوچھنے والے نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا آپؐ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا، ہاں، لکنہ اسلم لیکن وہ مسلمان ہو گیا ہے یا مطیع ہو گیا ہے؟ ایک دفعہ کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ شیطان مجھے چھیڑنے لگا اور میری نماز توڑنے لگا تو خدا نے مجھے اس پر غلبہ عطا کیا۔[1]

جنت و دوزخ گو اور عالم کی چیزیں ہیں لیکن نگاہوں سے پردہ اٹھ جائے تو سامنے آجاتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک دفعہ سورج گرہن ہوا، آپؐ صحابہؓ کے ساتھ نماز کو کھڑے ہوئے اور بہت دیر تک قرأۃ، رکوع اور سجدہ میں مصروف رہے، اسی اثنا میں صحابہؓ نے دیکھا کہ آپؐ نے ایک بار ہاتھ آگے کو بڑھایا، پھر دیکھا کہ آپؐ کسی قدر پیچھے ہٹے، نماز کے بعد لوگوں نے دریافت کیا تو فرمایا کہ اس وقت میرے سامنے وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں جن کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، جنت اور دوزخ کی تمثیل اسی دیوار کے پاس دکھائی گئی میں نے بہشت کو دیکھا کہ انگور کے خوشے لٹک رہے ہیں، چاہا کہ توڑ لوں، اگر میں توڑ سکتا تو تم تا قیامت اس کو کھا سکتے، پھر میں نے دوزخ کو دیکھا جس سے زیادہ کوئی بھیانک چیز میں نے آج تک نہیں دیکھی، لیکن میں نے اس میں زیادہ تر عورتوں کو پایا، لوگوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیوں؟ فرمایا کہ اپنے خاوندوں کی ناشکری کے سبب، اگر ایک عورت پر تم عمر بھر احسان کرو اور صرف ایک دفعہ وہ تمہارے کسی فعل سے آزردہ ہو جائے تو وہ کہے گی کہ میں نے کبھی تمہارا اچھا برتاؤ نہیں دیکھا، میں نے اس دوزخ میں اس چور کو دیکھا جو حاجیوں کا اسباب چرایا کرتا تھا، میں نے اس میں ایک یہودی عورت کو دیکھا جس پر اس لئے عذاب ہو رہا تھا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ لیا تھا، اس کو نہ کچھ کھانے کو دیتی تھی اور نہ چھوڑتی تھی کہ وہ زمین پر گری پڑی چیزیں کھائے، آخر اسی بھوک سے اس نے جان دے دی۔[2]

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا، میں جنت میں جا نکلا تو دیکھا یہاں کے باشندوں میں بڑی تعداد ان کی ہے جو دنیا میں غریب تھے اور دوزخ میں جا کر دیکھا تو ان میں بڑی تعداد عورتوں کی پائی۔[3]

عمر کے اخیر سال میں آپؐ شہدائے احد کے مقبرے میں تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس آکر آپؐ نے ایک خطبہ دیا، اسی درمیان میں آپؐ نے فرمایا، میں اپنے حوض (کوثر) کو یہیں سے دیکھ رہا ہوں اور مجھ کو زمین کے خزانہ کی کنجیاں حوالہ کی گئیں، اے لوگو! مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم شرک کرنے لگو گے لیکن ڈرتا اس سے ہوں کہ اس دنیا کی دولت میں پڑ کر آپس میں رشک و حسد نہ کرنے لگو۔[4]

---

[1] صحیح بخاری بدء الخلق باب صفۃ ابلیس۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب رفع البصر و باب التعوذ من الفتن [3] صحیح بخاری باب صفۃ الجنۃ۔ [4] صحیح بخاری کتاب الجنائز (باب بخاری زہرۃ الدنیا)

منبر مبارک مسجد نبوی میں تھا اور اسی سے متصل ازواج مطہراتؓ کے حجرے بھی تھے جن میں سے ایک میں جسدِ اقدس سپردِ خاک ہے۔ آپ نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض پر رکھا ہے[1]۔

محدثین نے اس حقیقت کو مختلف تاویلوں سے ظاہر کرنا چاہا ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کی صحیح تشریح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مشاہدہ کرایا گیا۔

معمول تھا کہ تہجد کی نماز کے لیے جب آپؐ بیدار ہوتے تو امہات المومنین کو بھی جگا دیتے۔ ام المومنین ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ آپ ایک شب خواب سے بیدار ہوئے تو فرمایا سبحان اللہ! آج شب کو کیا کیا دولت کے خزانے اور کیا کیا فتنے نازل ہوئے ہیں، ان حجروں میں رہنے والیوں (ازواج مطہرات) کو کون جگائے؟ اے افسوس دنیا میں کتنی عورتیں سامان آرائش سے آراستہ ہیں مگر آخرت میں وہ ننگی ہوں گی[2] (کہ دنیا میں وہ جامۂ عمل سے برہنہ تھیں)

اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے، ایک ٹیلے پر چڑھے پھر فرمایا، اے لوگو! جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ تم دیکھ رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کی، نہیں یا رسول اللہ، فرمایا میں تمہارے گھروں کے درمیان فتنوں کو بارش کی طرح برستے دیکھ رہا ہوں[3]۔ (یہ غالباً حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد کے واقعات کا مشاہدہ تھا)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر حال میں اپنی امت کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے تمام کناروں کو میری نگاہوں کے سامنے کر دیا، میں نے ان کے مغرب و مشرق کو دیکھا، میری امت کی سلطنت ان تمام کناروں تک پہنچ جائے گی جو مجھے دکھائے گئے ہیں۔ مجھے سرخ و سپید (سونا چاندی) کے دونوں خزانے دیئے گئے ہیں، میں نے خدا کے حضور میں دعا کی کہ بار الٰہا! میری امت کو کسی عالمگیر قحط سے برباد نہ کرنا اور نہ ان پر ان کے سوا کسی غیر دشمن کو مسلط کرنا۔ حکم ہوا کہ میرے دربار میں فیصلہ کی تبدیلی نہیں ہوتی، میں نے تمہاری یہ دعا قبول کی، تو اب میری امت کو کوئی تباہ نہ کرے گا بلکہ وہ خود ایک دوسرے کو تباہ کریں گے[4]۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس مشاہدۂ اقدس کی تعبیر ہے۔

گذشتہ انبیائے کرام کی تمثیلیں اکثر آپؐ کو دکھائی گئی ہیں اور معراج اور عالم رؤیا کے علاوہ بیداری کے عالم میں بھی یہ مشاہدے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ سفر میں (غالباً سفر حج) جاتے ہوئے وادی ازرق سے گزرے، آپ نے دریافت فرمایا، یہ کون وادی ہے؟ لوگوں نے کہا یہ وادی ازرق ہے۔ فرمایا، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ موسیٰؑ گھاٹی سے اتر رہے ہیں اور ان کی زبان پر تلبیہ (صدائے لبیک) جاری ہے۔ اس کے بعد ہرشا کی گھاٹی آئی، فرمایا، یہ کون سی گھاٹی ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ ہرشا کی گھاٹی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحوض و باب فضل ما بین القبر والمنبر [2] صحیح بخاری کتاب التہجد [3] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب الفتن [4] صحیح مسلم باب الفتن۔

ہے۔ فرمایا گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ متی کے بیٹے یونس سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، اون کا جبہ پہنے ہیں، اونٹنی کی نکیل کھجور کی چھال کی ہے اور وہ لبیک اللّٰہم لبیک کہتے جارہے ہیں۔[1]

معراج کے واقعہ میں یاد ہوگا کہ جب کفار نے بیت المقدس کا نقشہ دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ دفعۃً اللہ تعالیٰ نے اس کو میری نگاہوں کے سامنے کردیا، وہ ایک ایک چیز کو پوچھتے جاتے تھے اور میں جواب دیتا جاتا تھا۔[2]

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن آپ قبرستان سے گزر رہے تھے، فرمایا کہ ان دو قبروں پر عذاب ہورہا ہے۔ یہ عذاب کسی گناہ کبیرہ کی پاداش میں نہیں ہے۔ ایک کو اس بات پر سزا دی جارہی ہے کہ وہ طہارت کے وقت پردہ نہیں کرتا تھا، یا یہ کہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ دوسرے کے عذاب کا سبب یہ ہے کہ وہ لوگوں کی چغلی کھایا کرتا تھا، اس کے بعد آپ نے ایک درخت کی سبز ٹہنی کو دو ٹکڑے کرکے دونوں پر کھڑا کردیا اور فرمایا کہ شاید ان کی تسبیح وتہلیل سے ان کی سزاؤں میں تخفیف ہو۔[3]

حضرت ابوایوب انصاریؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ آپ دوپہر کو گھر سے نکلے تو آپ کے کانوں میں ایک آواز آئی، فرمایا کہ یہ یہود پر ان کی قبروں میں عذاب ہورہا ہے۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔[4]

طبرانی میں ہے کہ آپ نے فرمایا، یہود کو ان کی قبروں میں جو عذاب دیئے جارہے ہیں، ان کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی ہیں۔[5]

ایک جہاد میں مسلمانوں کی طرف ایک آدمی مارا گیا تھا، لوگوں نے کہا وہ شہید ہوا، آپ نے فرمایا ہرگز نہیں، میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے کیونکہ اس نے مالِ غنیمت میں سے ایک عبا چرائی تھی، اس کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ وہ اعلان کردیں کہ جنت میں صرف اہل ایمان جائیں گے۔[6]

عمرو بن عامر خزاعی عرب میں پہلا شخص ہے جس نے جانوروں کو دیوتاؤں کے نام نذر کرنے کی بدعت پیدا کی۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے شعلے ایک دوسرے کو توڑ رہے ہیں اور اس میں عمرو بن عامر کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں گھسیٹ رہا ہے۔[7]

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ایک دفعہ بنی نجار کے نخلستان میں جا نکلے، آپ ایک خچر پر سوار تھے اور جاں نثار ساتھ ساتھ تھے کہ دفعۃً خچر اس زور سے بھڑکا کہ قریب تھا کہ آپ گر پڑیں، پاس پانچ چھ قبریں تھیں، دریافت فرمایا کہ ان قبروں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک نے کہا، ہاں یارسول اللہ میں جانتا ہوں۔ فرمایا، یہ لوگ کب مرے ہیں؟ عرض کیا کہ یہ لوگ شرک کی حالت میں مرے ہیں۔ فرمایا، ان لوگوں کی ان کی قبروں میں آزمائشیں ہورہی ہیں، اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ تم مُردوں سے ڈر کر ایک دوسرے کو دفن کرنے میں ڈرنے لگو گے تو میں خدا سے دعا کرتا کہ تم کو بھی عذابِ قبر کی وہ آواز سنائے جو میں سن رہا ہوں۔[8]

---

[1] صحیح مسلم باب الاسراء۔ [2] صحیح بخاری وصحیح مسلم باب الاسراء۔ [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ [4] کتاب الجنائز۔ [5] قسطلانی شرح حدیث مذکور۔ [6] جامع ترمذی باب ما جاء فی الغلول۔ [7] مسند ابن حنبل مسند جابر بن عبداللہ۔ [8] ایضاً۔

ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ کسی طرف کو تشریف لئے جا رہے تھے۔ اتنے میں ایک سخت بدبو پھیلی فرمایا جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے؟ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں[1]۔ حاکم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت بلالؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی طرف کو جا رہے تھے، آپ نے فرمایا اے بلال! جو میں سن رہا ہوں تم سن رہے ہو؟ عرض کی نہیں یا رسول اللہ! فرمایا کہ تم نہیں سنتے کہ مُردوں پر عذاب ہو رہا ہے[2]، مستدرک حاکم، کتاب الزہد امام احمد، بزار اور بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ حضرت زید بن ارقم بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ تھے، حضرت ابوبکرؓ نے پینے کی کوئی چیز مانگی تو لوگ شہد اور پانی لے آئے، حضرت ابوبکرؓ یہ دیکھ کر رونے لگے، لوگوں نے گریہ کا سبب دریافت کیا تو فرمایا، ایک دن میں خدمتِ نبوی میں حاضر تھا تو دیکھا کہ آپ ہاتھ سے کوئی چیز ہٹا رہے ہیں؛ اور مجھے کوئی چیز ہٹانے کی نظر نہیں آتی تھی تو میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کس چیز کو ہٹا رہے ہیں؟ فرمایا یہ دنیا ہے جو میرے سامنے متشکل ہو کر آئی ہے، میں نے اس سے کہا کہ میرے پاس سے چلی جا، تو اس نے کہا، اگر آپ مجھ سے بچ گئے تو آپ کے بعد کے لوگ مجھ سے نہیں بچ سکتے۔

*

---

[1] مسند ابن حنبل بمسند جابر بن عبد اللہ [2] مستدرک ج ۴ ص ۳۰۹، ذہبی نے لکھا ہے کہ بخاری وغیرہ نے اس کے ایک راوی (عبد الصمد) کو متروک کہا ہے

اسرا یا معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ

اسرا کے معنی رات کو چلانے یا لے جانے کے ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حیرت انگیز معجزانہ سفر رات کو ہوا تھا اس لئے اس کو اسرا کہتے ہیں، اور قرآن مجید نے اسی لفظ سے اس کو تعبیر کیا ہے سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا (پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندہ کو لے گیا)

معراج، عروج سے نکلا ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، چونکہ احادیث میں آپ سے لفظ عُرِجَ بِی مجھ کو اوپر چڑھایا گیا، مروی ہے، اس لئے اس کا نام معراج پڑا۔

انبیاء اور سیر ملکوت

انبیاء علیہم السلام کے روحانی حالات اور واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اولوالعزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ منصب رفیع حاصل ہوتا ہے اور اس وقت شرائط رویت کے تمام مادی پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیئے جاتے ہیں، اسباب سماعت کے دنیاوی قوانین ان کے لئے منسوخ کر دیئے جاتے ہیں، قیود زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ ان کے سامنے آتے ہیں اور وہ اس کے بعد نور کا حلۂ بہشتی پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض ربانی سے معمور اور غرق دریائے نور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوت گاہ قدس میں بار پا کر قاب قوسین (دو کمانوں کے فاصلہ) سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمانِ خاص لے کر اسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آجاتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کو جب نبوت عطا ہوتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، اور اسی طرح ہم ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین کی بادشاہی دکھاتے ہیں، یہ سیر ملکوت یعنی آسمان و زمین کی بادشاہی کا مشاہدہ کیا ہے؟ یہی اسراء اور معراج ہے۔

حضرت یعقوبؑ کے متعلق توراۃ میں مذکور ہے۔

> ”یعقوب بیر سبع سے نکلا اور حاران کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ایک مقام پر جا کر لیٹا کیونکہ سورج ڈوب گیا تھا اور اسی مقام سے کچھ پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ لئے اور وہیں سو رہا، وہاں خواب دیکھا کہ زمین سے آسمان تک ایک زینہ لگا ہوا ہے جس پر سے خدا کے فرشتے چڑھتے اور اترتے ہیں اور خدا اس پر کھڑا ہے اور اس نے کہا میں ہوں خداوند تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق کا خدا جس زمین پر تو سویا ہے وہ تجھ کو اور تیری نسل کو دوں گا۔“ (تکوین ۲۸)

حضرت موسیٰ کو طور پر جلوہ حق کا پرتو نظر آیا، وہی ان کی معراج ہے، دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے مشاہدات ربانی اور سیاحت روحانی کی تفصیل سے توراۃ کے صفحات معمور ہیں، عیسائیوں کے مجموعہ انجیل میں یوحنا رسول کا مکاشفہ بتفصیل مذکور ہے جس میں ان کو خواب کے اندر جنت سے روحانی مناظر دکھائے گئے ہیں اور قیامت کے واقعات تمثیلی رنگ میں ان کے سامنے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ پورا مکاشفہ جس کو ہم سفر نامہ ملکوت کہہ سکتے ہیں ۲۲ بابوں میں ختم ہوا ہے اور اُن میں آثار قیامت، جزاء وسزا اور جنت ودوزخ وغیرہ کے متعلق اکثر ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید کے بالکل مطابق ہیں اور ان کو تمام مسلمان پسند کرتے ہیں مجوس اپنے پیغمبر زردشت کے متعلق بھی معراج کا ایک طویل افسانہ سناتے ہیں جس میں زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات معراج کو نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پیروان بودھ بھی نخل حکمت کے سایہ میں بودھ کے مشاہدۂ ربانی کا ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔

بہرحال اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ سے یہ سیر ملکوت انبیا، مقربانِ الٰہی اور مدعیان قرب الٰہی کے سوانح کا جزو رہی ہے اور ہر ایک نے اپنے اپنے منصب اور رتبہ کے مطابق اس عالم کے مشاہدہ کا فیض حاصل کیا ہے۔ اسلام نے اس خزانہ کو یہاں تک عام کیا ہے کہ اہل ایمان کے لئے دن میں پانچ دفعہ اس دربار کے کسی نہ کسی گوشہ تک رسائی ممکن کر دی ہے کہ الصلوٰۃ معراج المومنین۔

معراجِ نبویؐ

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سرور انبیاء اور سید اولاد آدم تھے اس لئے اس سیر [illegible] اور بارگاہِ لامکان میں آپؐ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا جو اب تک دوسرے مقربان بارگاہ کی حد نظر سے باہر رہا تھا۔

معراجِ نبویؐ کا وقت و تاریخ اور تعداد وقوع

اس امر میں اختلاف ہے کہ معراج کب اور کس تاریخ واقع ہوئی، ایک دفعہ ہوئی یا مختلف اوقات میں، صحیح ومستند روایات کے مطابق اور جمہور علماء کی رائے کے موافق معراج صرف ایک دفعہ واقع ہوئی جو لوگ متعدد کے قائل ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں میں جزئیات معراج کے بیان میں اختلاف ہے اس لئے انہوں نے رفع اختلاف کے لئے متعدد دفعہ معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے[1] تاکہ ہر مختلف فیہ واقعہ ایک ایک جداگانہ معراج پر منطبق کیا جائے لیکن درحقیقت یہ ایک فرض محض ہے جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں مستند اور صحیح روایات ہمارے سامنے ہیں اور ان میں تعدد معراج کا اشارہ تک نہیں ہے، ایک ایسے اہم مافوق مشاہدۂ بشری اور طویل واقعہ کے متعلق جو اس وقت واقع ہوا جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، اور جس قدر تھی وہ بھی پراگندہ حال اور منتشر الخیال تھی اور ایک ایسے واقعہ کے متعلق جس کے رواۃ اکثر وہ لوگ ہیں جو اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے یا بہت چھوٹے تھے یا مدنی لوگ ہیں جن کو قبل ہجرت کے واقعات کی ذاتی اور بلاواسطہ واقفیت نہ تھی، اگر جزئیات میں معمولی اختلاف یا بعض واقعات کی ترتیب میں تقدم وتاخر واقع ہوا ہے تو ان کی تطبیق

---

[1] ابو سہیلی نے روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام میں اسی استدلال کی بنا پر تعدد کا میلان ظاہر کیا ہے، ج اول صفحہ ۲۴۰ مصر۔

کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں، خود ہمارے سامنے روزانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں، انکے جزئیات کی تفصیل اگر مختلف راویوں سے سُنیں یا مختلف اوقات میں ہم خود بیان کریں تو ترتیبِ واقعات اور دیگر جزئی امور میں بیسیوں اختلافات پیدا ہو جائیں گے، بایں ہمہ اصل معاملہ اور اس کے اہم اجزاء کے وقوع میں شک و شبہ نہ ہوگا۔

بعض اربابِ سیر نے دو دفعہ معراج کا ہونا ظاہر کیا ہے جن میں وہ ایک کو اسراء اور دوسرے کو معراج کہتے ہیں، قرآن میں اسراء اور احادیث میں معراج کا نام آیا ہے، انہوں نے اس کی ضرورت اس لئے بھی سمجھی ہے کہ قرآن مجید کے پندرہویں پارہ میں اسراء کا جو بیان ہے اس میں صرف مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر مذکور ہے اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جسم کے ساتھ حالتِ بیداری میں ہوا حالانکہ معراج میں تو آسمان تک کا سفر ہوا ہے اور عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں اور بعض روایتوں میں تصریح ہے کہ یہ خواب تھا، بہرحال یہ بھی استنباط اور قیاس سے آگے نہیں بڑھتا، قرآن مجید کے الفاظ خواب و بیداری دونوں کے متحمل ہیں، اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج ایک ہی دفعہ واقع ہوئی ہے۔

علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے کہ یہی جمہور محدثین، متکلمین اور فقہاء کی رائے ہے اور روایاتِ صحیحہ کا تواتر بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہیئے۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں تعددِ معراج کے قول کو بالکل لغو اور بے سند اور خلافِ سیاقِ احادیث ٹھہرایا ہے۔

معراج کے وقت اور زمانہ کی تعیین:۔ یہ دشواری پیش آتی ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جبکہ تاریخ اور سنہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی اور عرب میں عموماً اسلام سے پہلے کسی خاص سنہ کا رواج نہ تھا، تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا، خود قرآن مجید میں ہے اسرى بعبده ليلا (یعنی لے گیا اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو رات کے وقت) اور تمام روایات بھی اس پر متفق اللفظ ہیں، لیکن صحیح دن اور تاریخ کا پتہ لگانا نہایت مشکل ہے، محدثین کے ہاں کسی سے بھی بروایتِ صحیحہ اس کی تصریح موجود نہیں ہے، اربابِ سیر نے بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے کچھ روایتیں کی ہیں لیکن ان کی تصریحات مختلف ہیں، تاہم اتنی بات پر بلا اختلاف سب کا اتفاق ہے کہ یہ بعثت اور آغازِ وحی کے بعد اور ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جو مکہ معظمہ میں پیش آیا۔

مہینہ کی تعیین کے متعلق اربابِ سیر کے پانچ اقوال ہیں، کوئی ربیع الاول کہتا ہے، کسی نے ربیع الآخر کی روایت کی ہے، بعض رجب کی تعیین کرتے ہیں، بعض رمضان یا شوال کہتے ہیں، یہ آخری روایت سدی کی ہے جس کو ابن جریر طبری اور بیہقی نے نقل کیا ہے، اس کی روایت ہے کہ معراج ہجرت سے ۱۷ مہینے پیشتر واقع ہوئی، ہجرت اوائل ربیع الاول میں ہوئی ہے، اس بنا پر ۱۷ مہینے پیشتر آخر رمضان ہوگا

---

[1] شرح مواہب ج اول ۳۰۵ [2] صحیح بخاری اور کتب حدیث میں معراج کے بیان میں شریک نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ قبل آغاز وحی کے ہوا، اس کا مطلب محض فرشتوں کا آنا ہے نفس معراج نہیں، تفصیل آگے آئے گی۔

یا آغاز شوال، لیکن کون نہیں جانتا کہ سدی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے، واقدی سے ابن سعد نے دو روایتیں کی ہیں، ایک یہ کہ سنیچر کی شب تھی، ۱۷ تاریخ تھی، رمضان کا مہینہ تھا، ہجرت (ربیع الاول ۱ھ) سے ۱۸ مہینے پیشتر کا یہ واقعہ ہے، دوسری یہ ہے کہ یہ ہجرت سے ایک سال پہلے ۱۷ ربیع الاول کا واقعہ ہے۔ واقدی نے ان روایات میں کسی قدر تصریح کے ساتھ دن، تاریخ اور وقت بتا دیا ہے لیکن ہمارے علمائے رجال کی عدالت میں ان کی شہادت کوئی بڑی قدر و قیمت نہیں رکھتی، چنانچہ ان روایتوں میں بھی جس روایت میں وقت اور تاریخ کی جس قدر تفصیل زیادہ ہے اسی قدر وہ زیادہ نامعتبر ہے کیونکہ اس کی سند ناتمام ہے، دوسرے مہینوں کی روایتیں بھی اسی قسم کی ہیں، ابن قتیبہ دینوری (المتوفی ۲۷۶ھ) اور علامہ ابن عبدالبر (المتوفی ۴۶۳ھ) نے رجب کی تعیین کی ہے اور متاخرین میں امام رافعی اور امام نووی نے (روضہ میں) اسی کو تیقن کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور محدث عبدالغنی مقدسی نے بھی اسی مہینہ کو اختیار کیا ہے بلکہ ۲۷ تاریخ کی بھی تصریح کر دی ہے اور علامہ زرقانی نے لکھا ہے کہ لوگوں کا اسی پر عمل ہے اور بعضوں کی رائے ہے کہ یہی قوی ترین روایت ہے، کیونکہ اصول یہ ہے کہ جب کسی بات میں اسلاف کا اختلاف ہو اور کسی رائے کی ترجیح پر کوئی دلیل قائم نہ ہو تو بظن غالب وہ قول صحیح ہوگا جس پر عمل درآمد ہو اور جو لوگوں میں مقبول ہو، اس مسئلہ کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ متاخرین کے نقول قیاسیات، استنباطات اور مجادلات سے جو دس سے زیادہ مختلف اقوال پر مشتمل ہیں قطع نظر کر لیا جائے اور دیکھا جائے کہ قدیم راویوں کی اصل تصریحات کیا کیا ہیں اور کثرت روایت اور گمان صحت کا راجح پہلو کس کی جانب ہے، چنانچہ یہ تصریحات حسب ذیل ہیں۔

نام راوی	روایت	کیفیت سند
(۱) ابن سعد بواسطہ واقدی از حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص و ام سلمہ و عائشہ و ابن عباس و ام ہانی رضی اللہ عنہم	۱۷ ربیع الاول ہجرت سے ایک سال قبل۔	ابن سعد نے یہ روایت متعدد مسلسل طریقوں سے صحابہ سے نقل کیا ہے۔
(۲) موسیٰ بن عقبہ بواسطہ زہری۔	ہجرت سے ایک سال قبل	موسیٰ بن عقبہ کی سیرت معتبر ترین کتب سیرت ہے
(۳) زہری بواسطہ سعید ابن مسیب	〃	〃
(۴) عروہ بن زبیر از حضرت عائشہؓ	〃	〃
(۵) قتادہ	〃	یہ تابعی ہیں
(۶) مقاتل۔	〃	〃
(۷) ابن جریج	ہجرت سے ایک سال قبل	〃
(۸) ابراہیم بن اسحاق الحربی	۲۷ ربیع الآخر ہجرت سے ایک سال پہلے	〃

ابن سعد ج ۱ حصہ ۱ ص [illegible] یہ تمام تفصیل زرقانی ج ۱ ص ۳۵۵، ۳۵۸ میں مذکور ہے۔

(۹) مسلم بن قتیبہ	ہجرت سے ۱۸ ماہ پیشتر	یہ مورخ ہیں۔
(۱۰) عمرو بن شعیب از حضرت عمرو بن العاص	۱۷ ربیع الاول ہجرت سے ایک سال پہلے	
(۱۱) سدی۔	ہجرت سے ۱۷ یا ۱۶ مہینے پیشتر	سُدی پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔

متاخرین نے امام زہری کے انتساب سے دو اور مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ ایک ہجرت سے پانچ سال قبل اور دوسرا بعثت سے پانچ سال بعد، پہلے قول کے ناقل علامہ ابن حجر (فتح الباری جلد ۷ ص ۱۵۵ مصر) ہیں اور ان کا بیان ہے کہ قاضی عیاض، امام قرطبی اور امام نووی شارحین صحیح مسلم اسی کے مؤید ہیں، لیکن امام نووی کی شرح صحیح مسلم مطبوعہ ہندوستان (ص ۹۱) اور قسطلانی کی سیرت مواہب لدنیہ (مطبوعہ مصر مع زرقانی) میں دوسرا قول منقول ہے زرقانی نے (جلد اول فصل معراج) میں اس اختلاف پر حیرت ظاہر کی ہے، افسوس ہے کہ قلمی نسخے موجود نہیں، ہمارا خیال ہے کہ یہ اختلاف کتابت کی غلطی اور مسامحت سے پیدا ہوا ہے، اسی طرح اسد الغابہ ابن اثیر مطبوعہ مصر (ص ۲۰) میں سدی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ معراج ہجرت سے ۶ مہینے ستۃ اشہر پہلے ہوئی، یہ درحقیقت ۱۶ ہے "ستۃ اشہر" کے بجائے "ستۃ عشر شہرا" چاہیئے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے اس سے (تفسیر اسراء) نقل کیا ہے اور جو اس کی ۱۷ مہینے والی روایت کے قریب قریب ہے جو طبری و بیہقی میں ہے، چھٹی صدی میں علامہ ابن اثیر نے کسی قیاس یا استنباط تاریخی کی بنا پر ہجرت سے تین سال پہلے معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے، مگر جہاں تک ہم کو معلوم ہے کسی اور نے اس کا ساتھ نہیں دیا ہے اور نہ کہیں سیرت کی امہات کتب میں یہ تاریخ مذکور ہے، بجز اس قیاس کے کہ ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں واقعہ معراج کو ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات سے پہلے نقل کیا ہے اور یہ دونوں حادثے ہجرت سے تین سال پہلے پیش آئے تھے۔ اس سے اشارۃً یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ معراج ہجرت سے تین سال پہلے ہوئی۔

ہم نے متقدمین کی پوری روداد ناظرین کے سامنے رکھ دی ہے جس سے معلوم ہوا ہوگا کہ قدیم راویوں کا بڑا حصہ ایک سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرتا ہے، ایک دو بزرگ ۱۶ یا ۱۸ مہینے کی مدت اور بڑھاتے ہیں، متاخرین میں سے بعض اصحاب نے جو قیاس تاریخی سے تین سال یا پانچ سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرنا چاہا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نماز پنجگانہ کی فرضیت سے پہلے وفات پاچکی تھیں، نماز پنجگانہ بالاتفاق معراج میں فرض ہوئی۔ پھر بخاری ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی اور دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے کہ ہجرت

---

[1] یہ تمام روایات مختلف ماخذوں سے جمع کی گئی ہیں۔ اول ابن سعد میں ہے، دوم، چہارم، یازدہم تفسیر ابن کثیر (سورہ اسراء ص ۲) میں ہے۔ ہفتم تفسیر ابن جریر (۱۵۔ ۲) میں ہے، پنجم و ششم تفسیر ابی حیان (اسراء ص ۹) میں ہے، بقیہ اقوال اور روایات کے فتح الباری، منتقی، شروح شفائے عیاض، استیعاب ابن عبدالبر، اسد الغابہ ابن اثیر اور روض الانف (ذکر معراج) دیکھئے۔

سے پانچ سال پہلے انتقال کیا، ان مقدمات کو یکجا کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے (بقول ابن اثیر) یا پانچ سال پہلے (بقول قاضی عیاض وغیرہ) پیش آیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال اس وقت درست ہو سکتا تھا جب یہ ثابت ہوتا کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور حضرت خدیجہؓ کی وفات دونوں ایک ساتھ ہوئیں یا کم از کم یہ کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کے چند روز بعد پیش آیا، حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے معراج (فرضیت نماز پنجگانہ) سے پہلے وفات پائی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ایک مہینہ پہلے یا سال بھر پہلے یا چند سال پہلے، اس لئے ان قیاسات سے معراج کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔

بہر حال ابتدائی راویوں کی کثیر جماعت جن میں بعض نہایت معتبر اور ثقہ ہیں اسی طرف ہے کہ یہ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱؁ھ سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ امام بخاری نے جامع صحیح میں گو کوئی تاریخ نہیں بیان کی ہے۔ لیکن ترتیب میں وقائع قبل ہجرت کے سب سے آخر میں اور بیعت عقبہ اور ہجرت سے متصلاً پہلے واقعہ معراج کو جگہ دی ہے اور ابن سعد نے بھی سیرت میں واقعہ معراج کا یہی موقع ترتیب میں رکھا ہے، اس سے حدیث اور سیرت کے ان دو اماموں کا یہی منشا۔ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش، معراج کا زمانہ متعین کرتے ہیں، آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حائل نہ تھا بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔

مہینہ کی تعیین مشکل ہے جو لوگ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱؁ھ سے ایک سال پہلے کہتے ہیں، ان کے حساب سے اگر یہ ربیع الاول ادھر شامل کر لیا جائے تو اُدھر معراج کا ایک مہینہ ربیع الآخر پڑے گا اور اگر شامل نہ کیا جائے تو ربیع الاول رہے گا۔ اور اگر عام و مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کی جائے تو ہجرت سے ایک سال ۹ مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہوگا۔

معراج کی صحیح روایتیں

واقعہ معراج چونکہ نہایت اہم، ہماری مادی کائنات سے ماوراء اور قیاس، استنباط اور عقل انسانی کی سرحد سے بالاتر ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس باب میں صحیح و خالص روایتوں کی پیروی کی جائے، احادیث و سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو کثیر التعداد صحابیوں نے بیان کیا ہے۔ علامہ زرقانی نے ۴۵ صحابیوں کو نام بنام گنایا ہے اور حدیث و سیر و تفسیر کی جن جن کتابوں میں ان کی روایتیں مذکور ہیں، ان کی تصریح کی ہے۔ علامہ ابن کثیر نے تفسیر (بنی اسرائیل) میں ان میں سے اکثر روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، ان میں صحیح مرفوع، قوی، موقوف، مرسل، منکر سبھی قسم کی روایتیں ہیں۔ صحاح ستہ میں معراج کا واقعہ مستقلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ضمناً اور مختصراً یہ واقعات مختلف ابواب میں کہیں کہیں آ گئے ہیں۔ امام بخاری اور مسلم نے اس واقعہ کو حضرت ابوذرؓ، حضرت مالکؓ بن صعصعہ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سات اکابر صحابہ سے روایت کیا ہے، ان میں چار پچھلے صحابیوں نے صرف چند متفرق جزئیات بیان کئے ہیں۔

صحیحین میں واقعہ معراج کا مسلسل اور مفصل بیان حضرت ابوذرؓ حضرت مالکؓ بن صعصعہ اور حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے، حضرت انسؓ نے تین طرق سے روایت کی ہے، ایک طریقہ میں (صحیح مسلم باب الاسرا اور صحیح بخاری کتاب التوحید، اخیر راوی وہی ہیں، لیکن اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ انھوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، یا کسی صحابی نے ان سے بیان کیا، دوسرے طریقہ میں (صحیح بخاری باب ذکر الملائکہ و باب المعراج اور صحیح مسلم باب الاسرا) یہ تصریح ہے کہ انھوں نے حضرت مالک بن صعصعہ سے سنا اور تیسرے طریقہ (صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ و کتاب الانبیاء) میں یہ صراحت ہے کہ انھوں نے حضرت ابوذرؓ سے بھی سنا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ نے متعدد اکابر صحابہ سے معراج کا واقعہ سنا تھا اور اسی لئے ان کا بیان سب سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، تابعین میں سے متعدد بزرگوں نے حضرت انسؓ سے اس روایت کو صحیحین میں نقل کیا ہے مثلاً ثابت البنانی ابن شہاب زہری، قتادہ اور شریک بن عبداللہ بن ابی نمر، ان میں محفوظ تر بیان ثابت کا ہے، شریک کی روایت متعدد امور میں ثقات کی روایت کی مخالف ہے اور اسی لئے امام مسلم نے صحیح مسلم باب الاسرا، میں اس کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ ان کی روایت میں تقدم و تاخر اور زیادت و نقص ہے۔

حضرت مالک بن صعصعہ اور حضرت ابوذرؓ نے یہ تصریح کی ہے کہ انھوں نے معراج کے واقعہ کو لفظ بلفظ اور حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے، گو یہ دونوں ہی بزرگوار جلیل القدر صحابی ہیں لیکن حضرت ابوذرؓ میں ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ سابقین اسلام میں ہیں اور وقوع معراج سے پہلے ہی مکہ میں آکر اسلام لاچکے تھے، حضرت مالک بن صعصعہ انصاری ہیں، اس بنا پر معراج کی تمام روایتوں میں حضرت ابوذرؓ کی روایت کو ہم سب سے مقدم سمجھتے ہیں۔

معراج کا واقعہ الغرض جب اسلام کی سخت اور پرخطر زندگی کا باب ختم ہونے کو تھا اور ہجرت کے بعد سے اطمینان و سکون کے ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا تھا تو وہ شب مبارک آئی اور اس شب مبارک میں وہ ساعت ہمایوں آئی جو دیوان قضا میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیر ملکوت کے لئے مقرر تھی اور جس میں پیش گاہ ربانی سے احکام خاص کا اجراء اور نفاذ عمل میں آنے والا تھا، رضوان جنت کو حکم ہوا کہ آج مہمان سرائے غیب کو نئے ساز و برگ سے آراستہ کیا جائے کہ شاہد عالم آج یہاں مہمان بن کر آئے گا، روح الامین کو فرمان پہنچا کہ وہ سواری جو بجلی سے زیادہ تیز گام اور روشنی سے زیادہ سبک خرام ہے اور جو خطہ لاہوت کے مسافروں کے لئے مخصوص ہے، حرم ابراہیم الکعبہ میں لے کر حاضر ہو، کارکنان عناصر کو حکم ہوا کہ مملکت آب و خاک کے تمام مادی احکام و قوانین تھوڑی دیر کے لئے معطل کر دیئے جائیں اور زمان و مکان، سفر و اقامت، رویت و سماعت، تخاطب و کلام کی تمام طبعی پابندیاں اٹھا دی جائیں۔

صحیحین میں حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور جبریل علیہ السلام نازل ہوئے، انہوں نے پہلے آپؐ کا سینۂ مبارک چاک کیا، پھر اس کو آبِ زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان وحکمت سے بھر لائے اور ان کو سینۂ مبارک میں ڈال کر بند کر دیا، پھر آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر آسمان پر لے گئے، جب آپؐ آسمان پر پہنچے تو جبریل علیہ السلام نے آسمان کے داروغہ سے کہا کہ کھولو! اس نے کہا کہ کون؟ انہوں نے جواب دیا، جبریلؑ، اس نے پوچھا کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟ انہوں نے کہا: "ہاں میرے ساتھ محمدؐ ہیں"، اس نے سوال کیا، کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔

بہرحال آپؐ جب پہلے آسمان پر چڑھے تو آپؐ کو ایک شخص بیٹھا ہوا نظر آیا جس کے دائیں بائیں بہت سی پرچھائیں تھیں، جب وہ دائیں جانب دیکھتا تھا تو ہنستا تھا اور جب بائیں جانب نگاہ جاتی تھی تو روتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اس نے کہا، مرحبا اے نبی صالح اور اے فرزندِ صالح! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون ہیں؟ انہوں نے کہا، یہ آدم ہیں اور ان کے دائیں بائیں کی پرچھائیاں ان کی اولاد کی روحیں ہیں، دائیں جانب والے جنتی اور بائیں جانب والے دوزخی ہیں، اس لئے وہ دائیں جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو روتے ہیں، اس کے بعد آپؐ دوسرے آسمان پر پہنچے تو اسی قسم کا سوال وجواب ہوا اور ہر آسمان پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی، پہلے آسمان پر حضرت آدم اور چھٹے پر حضرت ابراہیم سے (حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے مجھ سے پیغمبروں کے منازل کی تعیین نہیں بیان کی) بہرحال حضرت جبریل علیہ السلام آپؐ کو ادریس علیہ السلام کے پاس سے لے کر گزرے، انہوں نے آپؐ کو دیکھ کر کہا، مرحبا اے نبی صالح اور برادرِ صالح! آپؐ نے نام پوچھا، حضرت جبریل نے نام بتایا، پھر یہی واقعہ حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے ساتھ پیش آیا، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ نے نبی صالح اور برادرِ صالح کہہ کر اور حضرت ابراہیمؑ نے نبی صالح اور فرزندِ صالح کہہ کر آپؐ کا خیر مقدم کیا، اس کے بعد حضرت جبریلؑ آپؐ کو اور اوپر لے گئے اور آپؐ اس مقام پر پہنچے جہاں قلمِ قدرت کے چلنے کی آواز آتی تھی، اس موقع پر خداوند تعالیٰ نے آپؐ کی امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عطیۂ ربانی کو لے کر حضرت موسیٰؑ کے پاس آئے تو انہوں نے پوچھا کہ خدا نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ پچاس وقت کی نماز، انہوں نے کہا کہ خدا کے پاس دوبارہ جائیے کہ آپؐ کی امت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گئے اور خدا نے ایک حصہ کم کر دیا، آپؐ واپس آئے تو حضرت موسیٰؑ نے کہا کہ دوبارہ خدا کے پاس جائیے، آپ کی امت اس کی بھی متحمل نہیں ہو گی، آپؐ گئے تو خدا نے ایک حصہ کی پھر تخفیف کر دی، حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ آپؐ کی امت میں اس کی بھی قوت نہیں، آپؐ پھر گئے تو خدا نے اس تعداد کو گھٹا کر پانچ وقت کر دیا اور ارشاد ہوا کہ گو نمازیں پانچ وقت کی ہوں گی لیکن ثواب ان ہی پچاس وقتوں کا ملے گا، کیونکہ میرے حکم میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تخفیف مزید کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر

خدا کے پاس مراجعت کا مشورہ دیا، لیکن آپؐ نے فرمایا کہ اب تو مجھے شرم آتی ہے، اس کے بعد آپؐ کو سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کرائی گئی جو ایسے مختلف رنگوں سے ڈھکا ہوا تھا جن کو آپؐ جان نہ سکے، پھر آپؐ کو حضرت جبریل علیہ السلام جنت میں لے گئے، وہاں آپؐ کو موتی کی عمارتیں نظر آئیں اور آپؐ نے دیکھا کہ اس کی مٹی مشک کی ہے[1]۔

کتبِ حدیث میں واقعۂ معراج کے متعلق یہ مقدم ترین اور معتبر ترین روایت ہے اس کے بعد حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت کا درجہ ہے۔ اس روایت میں بہت سی باتیں پہلی روایت سے زائد ہیں، حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں اس کی تصریح نہیں کہ آپؐ اس وقت بیدار تھے یا خواب میں تھے، اس میں یہ ہے کہ آپؐ خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھے۔ پہلی روایت میں ہے کہ آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے، اور اس میں ہے کہ آپؐ حطیم یا حجر[2] میں لیٹے ہوئے تھے کہ حضرت جبریلؑ آئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں براق کا ذکر نہیں، اور اس روایت میں ہے کہ آپؐ براق پر سوار ہو کر گئے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں منازلِ انبیاء نہیں بیان کئے گئے ہیں لیکن اس روایت میں نام بنام تصریح ہے، حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اوقاتِ نماز کی تعداد تین مرتبہ میں گھٹائی گئی[3]، لیکن اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس غرض سے خدا کے پاس پانچ بار گئے، ان دونوں روایتوں میں درحقیقت اجمال و تفصیل کا فرق ہے حضرت ابوذرؓ کی روایت مجمل ہے اور حضرت مالک بن صعصعہؓ کی روایت میں واقعات کی کسی قدر تفصیل ہے، تاہم یہ دوسری روایت بھی معراج کے تمام واقعات و سوانح کو محیط نہیں ہے۔ اب ذیل میں ہم صحیحین کی تمام روایتوں کو ملا کر معراج کے سوانح و مشاہدات کا ایک جامع بیان لکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے اصل کعبہ کے جو عمارت بنائی تھی وہ سیلاب سے کئی دفعہ گر چکی تھی، اور پھر بنی تھی، اسی طرح قریش کے زمانہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز پیغمبر نہیں ہوئے تھے، سیلاب سے گر گئی۔ قریش نے اس کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہا تو سرمایہ کی کمی کے باعث ایک طرف اندر کی تھوڑی سی زمین چھوڑ کر دیوار کے طول کو کم کر دیا، اس طرح کعبہ کی تھوڑی سی زمین چار دیواری سے باہر رہ گئی اور اب تک اسی طرح ہے اس زمین کا نام حجر اور حطیم ہے۔ قریش کے نوجوان اور رؤسا اکثر یہاں رات کو سویا کرتے تھے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کبھی کبھی یہاں آرام فرمایا کرتے تھے، نبوت سے پہلے بھی آپؐ کو حالت رویا میں فرشتے نظر آتے تھے۔

---

[1] بخاری جلد اول باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء [2] حطیم اور حجر ایک ہی مقام کے دو نام ہیں، یہ وہ مختصر سی جگہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے اصل تعمیر کردہ کعبہ میں سے قریش کے بناتے ہوئے کعبہ کی چار دیواری سے باہر رہ گئی ہے اور اندر داخل نہیں ہو سکی ہے [3] بخاری باب الانبیاء و باب المعراج [4] بخاری، کتاب التوحید و باب [illegible] ومسلم۔

جس شب کو معراج ہوئی آپؐ اسی مقام[1] پر استراحت فرما رہے تھے، بیداری اور خواب کی درمیانی حالت تھی، آپؐ نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے، ان کے ساتھ چند اور فرشتے بھی تھے۔ پہلے وہ آپؐ کو چاہِ زمزم کے پاس لے گئے اور وہاں آپؐ کے سینۂ مبارک کو چاک کیا اور قلبِ اطہر کو نکال کر آبِ زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان و حکمت سے معمور لایا گیا، جبریل نے اس طشت سے ایمان و حکمت کے خزانہ کو لے کر آپؐ کے سینہ میں رکھ کر اس کو برابر کر دیا۔

اس کے بعد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا سپید رنگ کا ایک لمبا جانور براق نامی لایا گیا جس کی تیز رفتاری کا یہ حال تھا کہ اس کا ہر قدم وہاں پڑتا تھا جہاں نگاہ کی آخری حد ہوتی تھی۔ آپؐ اس پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے اور براق کو اس قلابہ میں باندھ کر جس میں انبیاء اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے آپ نے مسجد اقصیٰ کے اندر قدم رکھا اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی، یہاں سے نکلے تو جبریل نے شراب اور دودھ کے دو پیالے آپؐ کے سامنے پیش کئے، آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، جبریل نے کہا آپؐ نے فطرت کو پسند کیا۔ اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپؐ کی اُمت گمراہ ہو جاتی۔ بعد ازیں جبریل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آسمان پر چڑھے، پہلا آسمان آیا تو جبریل نے دربان کو آواز دی، اس نے کہا کون ہے؟ جبریل نے اپنا نام بتایا، پوچھا کہ تمہارے ساتھ اور

---

[1] اس شب کو جس مقام پر آپؐ استراحت فرماتے تھے اور جہاں معراج کا واقعہ پیش آیا اس کی تعیین میں اختلاف بیان کیا جاتا ہے صحیحین میں حضرت مالکؓ اور حضرت انسؓ کی جو روایتیں ہیں ان میں بتصریح تمام یہ مذکور ہے کہ آپؐ مسجد حرام (کعبہ) میں تھے اور اسی کے ایک بیرونی گوشہ میں جس کا نام حجر اور حطیم ہے آپؐ سو رہے تھے، یہ تو صحیحین کا بیان ہے، بعض نیچے درجہ کی روایتوں میں ہے کہ ام ہانیؓ کا بیان ہے کہ آنحضرتؐ کو میرے ہی گھر میں معراج ہوئی۔ ام ہانی کا گھر شعب ابی طالب میں تھا۔ یہ روایت مشہور دروغ گو کلبی کی ہے، اس میں حد درجہ لغو، غریب و منکر باتیں مذکور ہیں، مسند ابو یعلیٰ میں ام ہانیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ عشاء کی نماز پڑھ کر ہم لوگوں کے ساتھ میرے ہی مکان میں سو رہے، شب کو میری آنکھ کھلی تو آپؐ کو نہ پایا، رؤسائے قریش کی دشمنی کے باعث دل میں عجیب عجیب بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں، نیند نہ آئی، صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ میں رؤسائے قریش سے کہنے جاتا ہوں، میں نے آپؐ کا دامن پکڑ لیا کہ خدا کے لئے ان سے یہ نہ کہئے وہ تکذیب کریں گے اور آپ کی جان پر حملہ کریں گے لیکن آپ نے نہ مانا اور دامن جھٹک کر چلے گئے۔ ان روایتوں میں علاوہ اور لغویات کے عشاء اور صبح کی نماز و جماعت کی تصریح کس قدر غلط ہے کہ نماز پنجگانہ تو عین شب معراج ہی فرض ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایتوں کا صحیحین کے مقابلہ میں کیا درجہ اور کیا اعتبار ہو سکتا ہے! اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کی شب آپؐ خانہ کعبہ میں تھے۔ البتہ بخاری و مسلم میں حضرت ابوذرؓ کی روایت یہ ہے کہ میں مکہ میں تھا کہ میرے گھر کی چھت کھلی اور جبریل آئے، ہمارے نزدیک اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ آپؐ آرام تو خانہ کعبہ ہی میں فرما رہے تھے لیکن مشاہدہ آپؐ کو یہ کرایا گیا کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور اس کی چھت کھلی اور حضرت جبریلؑ نازل ہوئے۔ مسند احمد میں بروایت انسؓ اور ترمذی اور ابن جریر طبری میں ہے کہ جب آپؐ نے براق پر سوار ہونے کا قصد کیا تو اس نے شوخی کی، جبریل نے کہا کیوں شوخی کرتے ہو؟ تجھ پر آج تک محمدؐ سے زیادہ خدا کے نزدیک برگزیدہ کوئی دوسرا سوار نہیں ہوا، یہ سن کر براق پسینہ پسینہ ہو گیا، ابن جریر کی روایت کی نسبت حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اس کے بعض الفاظ میں نکارت و غرابت ہے، ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ غریب ہے، غریب لا نعرفہ الا من حدیث

کون ہے؟ جواب دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر دریافت کیا، کیا وہ بلائے گئے ہیں؟ کہا ہاں، یہ سن کر فرشتہ نے دروازہ کھول دیا اور مرحبا خوش آمدید کہا اور کہا کہ اس خبر کو سن کر آسمان والے خوش ہوں گے، خدا اہل زمین کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا ہے جب تک وہ آسمان والوں کو اس کا علم نہ بخشے وہ جان نہیں سکتے" اب آپؐ پہلے آسمان میں داخل ہوئے تو ایک شخص نظر آیا جس کی داہنی اور بائیں طرف بہت سی پرچھائیں تھیں، جب وہ داہنی طرف دیکھتا تو ہنستا اور جب بائیں طرف دیکھتا تو رو دیتا تھا، وہ آپ کو دیکھ کر بولا مرحبا اے نبی صالح اے فرزند صالح۔ آپؐ نے جبریلؑ سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ جبریلؑ نے بتایا کہ یہ آپؐ کے باپ آدمؑ ہیں، ان کی داہنی اور بائیں طرف جو پرچھائیاں ہیں یہ ان کی اولادوں کی روحیں ہیں، داہنی طرف والے اہل جنت ہیں اور بائیں طرف والے دوزخی ہیں، اس لئے جب اُدھر دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور ادھر دیکھ کر آزردہ ہوتے ہیں، اسی آسمان میں آپؐ کو آمنے سامنے دو نہریں نظر آئیں۔ پوچھنے پر جبریلؑ نے بتایا کہ یہ نیل اور فرات کی سوتیں ہیں، چلتے پھرتے آپؐ کو ایک اور نہر نظر آئی جس پر لولو و زبرجد کا ایک محل تعمیر تھا اور اس کی زمین مشک اذفر کی تھی۔ جبریلؑ نے کہا یہ نہر کوثر ہے جس کو پروردگار نے مخصوص آپؐ کے لئے رکھا ہے،

اسی طرح ہر آسمان پر گزرتے گئے اور ہر آسمان کے دربان اور جبریلؑ سے اسی قسم کی گفتگو ہوتی گئی اور ہر ایک میں کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی، دوسرے میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ ملے جو دونوں خالہ زاد بھائی تھے ملاقات ہوئی، تیسرے میں حضرت یوسفؑ ملے جن کو حسن کا ایک حصہ عطا ہوا تھا، چوتھے میں حضرت ادریسؑ سے ملاقات ہوئی جن کی نسبت خدا نے قرآن میں فرمایا ہے وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ ہم نے اس کو ایک بلند مقام تک اٹھایا ہے، اور پانچویں میں حضرت ہارونؑ سے ملے اور ہر ایک نے۔ اے پیغمبر صالح اور برادر صالح کہہ کر خیر مقدم کیا، چھٹے میں حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا، مرحبا اے پیغمبر صالح اور اے برادر صالح! جب آپؐ آگے بڑھے تو حضرت موسیٰ رو پڑے، آواز آئی کہ اے موسیٰؑ! اس گریہ کا کیا سبب ہے؟ موسیٰؑ نے عرض کیا خداوندا! میرے بعد تو نے اس نوجوان کو مبعوث کیا ہے، اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ بہشت میں جائیں گے۔ ساتویں آسمان میں داخل ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ نے مرحبا اے پیغمبر صالح اور اے فرزند صالح! کہہ کر خیر مقدم کیا۔ جبریلؑ نے بتایا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ ہیں، حضرت ابراہیمؑ بیت معمور (آباد گھر) سے پیٹھ لگائے بیٹھے تھے جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، آپؐ کو جنت کی سیر کرائی گئی جس کے گنبد موتی کے تھے اور زمین مشک کی تھی[1]۔ اس مقام تک پہنچے جہاں قلم قدرت کے چلنے کی

---

[1] کتب روایت کی غیر محتاط کتابوں میں مثلاً ابن ابی حاتم (تفسیر) ابن جریر طبری (تفسیر بنی اسرائیل) بیہقی (دلائل النبوۃ) میں جنت و دوزخ کے بہت سے عجیب و غریب مناظر و مشاہدات اور پیغمبروں اور فرشتوں کی تعجب انگیز ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی تفصیل ہے، ان روایتوں کے ناقل ابو ہارون العبدی، ابو جعفر رازی اور خالد بن یزید ہیں، ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید تو مشہور دروغ گو ہیں، ابو جعفر رازی کو گو بعضوں نے ثقہ کہا ہے لیکن اکثروں کے نزدیک وہ ضعیف اور راوی منکرات ہیں اور ان کی تنہا روایت قبول نہیں کی جاتی، نیز ان روایتوں میں بہت سی لغو و منکر باتیں مذکور ہیں جن کو محدثین تسلیم نہیں کرتے۔ علاوہ ازیں یہ

آواز سنائی دیتی تھی۔ آگے بڑھ کر آپ سدرۃ المنتہیٰ (انتہا کی بیری) کا درخت تک پہنچے، اس درخت پر شانِ الٰہی (امرِ اللہ) کا پرتو تھا، جس نے آکر جب اس کو چھالیا تو اس کی ہیئت بدل گئی اور اس میں حسن کی وہ کیفیت پیدا ہوئی جس کو کوئی زبان بیان نہیں کر سکتی اور اس میں رنگ برنگ کے ایسے انوار کی تجلی نظر آئی جن کو الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں نیچے زمین پر اترتی ہیں اور زمین سے چڑھ کر اوپر وہاں جاتی ہیں، یہاں پہنچ کر حضرت جبریلؑ اپنی اصلی کمالی صورت میں آپ کے سامنے نمودار ہوئے، پھر شاہدِ مستور راز نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوت گاہ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوئے جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی، فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ۔

اس وقت آپ کو بارگاہِ الٰہی سے تین عطیے مرحمت ہوئے، سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں جن میں اسلام کے عقائد و ایمان کی تکمیل اور اُس کے دورِ مصائب کے خاتمہ کی بشارت ہے، رحمتِ خاص سے مژدہ سنایا کہ امتِ محمدیؐ میں سے ہر ایک جو شرک کا مرتکب نہ ہوا ہو، کرمِ مغفرت سے سرفراز ہوگا، اور ندا آئی امت پر پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی، آپ ان عطیوں کو لے کر واپس پھرے اور حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے دریافت کیا کہ بارگاہِ خاص سے کیا احکام عطا ہوئے، فرمایا، امت پر پچاس وقت کی نماز، موسیٰؑ نے کہا، میں نے بنی اسرائیل کا خوب تجربہ کیا ہے، آپ کی امت سے یہ بار نہ اٹھ سکے گا، آپ واپس جائیے اور عرض کیجئے، آپ نے مراجعت کی اور عرض پرداز ہوئے کہ بارِ الٰہا! میری امت نہایت کمزور اور اس کے قویٰ نہایت ضعیف ہیں، حکم ہوا کہ دس وقت کی نمازیں معاف ہوئیں، لوٹے تو حضرت موسیٰؑ نے پھر ٹوکا اور دوبارہ عرض کرنے کا مشورہ دیا، اس پر دس اور معاف ہوئیں، اسی طرح آپ چند بار حضرت موسیٰؑ کے مشورہ سے بارگاہِ الٰہی میں عرض پرداز ہوتے رہے، یہاں تک کہ شب و روز میں صرف پانچ وقت کی نمازیں رہ گئیں، حضرت موسیٰؑ نے پھر بھی مشورہ دیا کہ اب بھی مزید تخفیف کی درخواست کیجئے، فرمایا، اب مجھے اپنے پروردگار سے شرم آتی ہے، ندا آئی کہ اے محمدؐ! میرے حکم میں تبدیل نہیں ہوگی، نمازیں پانچ ہوں گی لیکن ہر نیکی کا بدلہ دہ گونہ بخشوں گا، یہ پانچ بھی پچاس ہوں گی، میں نے اپنے بندوں پر تخفیف کر دی اور اپنا فیصلہ نافذ کر دیا۔

اب آسمان سے اُتر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر تشریف لائے اور بیت المقدس میں داخل ہوئے دیکھا کہ یہاں انبیاء علیہم السلام کا مجمع ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ نماز میں مصروف ہیں، آپ نے ان میں سے چند پیغمبروں کی شکل و صورت بھی بیان کی، حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا کہ ان کا لمبا قد اور گندمی رنگ تھا اور الجھے ہوئے گھونگھر والے بال تھے اور شنوءہ کے قبیلہ کے آدمی معلوم ہوتے تھے، حضرت عیسیٰؑ کا قد میانہ اور رنگ سرخ سپید تھا، سر کے بال سیدھے اور لمبے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں، عروہؓ بن مسعود ثقفی (صحابی) سے ان کی صورت ملتی تھی، حضرت ابراہیمؑ کی صورت تمہارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مناظر و مشاہدات جیسا کہ صحیح بخاری (باب الرؤیا) میں ہے کہ معراج کے سوا ایک اور موقع پر آنحضرتؐ کو دکھائے گئے تھے، اس سے یہ معراج کے مشاہدات ہی نہیں۔

پیغمبر (خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی سی تھی، بہرحال اسی اثنا میں نماز (غالباً صبح کی نماز) کا وقت آگیا، سردار انبیاء علیہ السلام منصب امامت سے سرفراز ہوئے۔ نماز سے فراغت ہوئی تو ندا آئی کہ اے محمدؐ! دوزخ کا داروغہ حاضر ہے سلام کرو، آپ نے مڑ کر دیکھا تو داروغۂ دوزخ نے سلام کیا، بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ شب معراج میں دجال بھی آپ کو دکھایا گیا (باب بدء الخلق)

ان تمام منازل کے طے ہونے کے بعد آپ مسجد حرام (کعبہ) میں صبح کو بیدار ہوئے۔

کفار کی تکذیب

خانہ کعبہ کے آس پاس رؤسائے قریش کی نشست رہتی تھی، آپ بھی وہیں مقام حجر میں تشریف فرما تھے۔ صبح کو آپ نے ان سے اس واقعہ کو بیان کیا تو ان کو سخت اچنبھا ہوا جو زیادہ کورباطن تھے، انہوں نے آپ کو (نعوذ باللہ) جھٹلایا، بعضوں نے مختلف سوالات کئے، ان میں اکثر شام کے تاجر تھے اور انہوں نے بیت المقدس کو بارہا دیکھا تھا اور انہیں معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس نہیں گئے ہیں، اس لئے آخر میں خاتمہ دلائل کے طور پر سب نے کہا کہ اے محمدؐ! تم کہتے ہو کہ صرف ایک شب میں تم خانہ کعبہ سے بیت المقدس گئے اور واپس آئے۔ اگر یہ سچ ہے تو بتاؤ بیت المقدس کی کیا ہیئت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے ذہن میں عمارت کا صحیح نقشہ نہ تھا سخت بے قراری ہوئی کہ ناگاہ نظر کے سامنے پوری عمارت جلوہ گر کر دی گئی، وہ سوال کرتے جاتے تھے اور میں اس کو دیکھ کر جواب دیتا جاتا تھا۔

اتنا واقعہ تو صحیحین میں مذکور ہے لیکن واقدی، ابن اسحاق، ابن جریر طبری، ابن ابی حاتم، بیہقی اور حاکم میں جن کا مرتبہ کتب روایات میں بلند نہیں ہے، اس واقعہ پر لوگوں نے عجیب و غریب حاشیے لگائے ہیں، حضرت ام ہانی سے روایت ہے کہ صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر والوں سے شب کا واقعہ بیان کر کے باہر جانا چاہا کہ اور لوگوں سے بیان کریں تو میں نے دامن تھام لیا کہ اس کا قصد نہ کیجئے، کفار صریح جھٹلائیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ رات کو جب آپ کے اعزہ نے آپ کو بستر پر نہ پایا تو ان کو قریش کا خوف ہوا کہ انہوں نے آپ کو گزند نہ پہنچایا، اور پہاڑوں اور غاروں میں آپ کو ڈھونڈنے لگے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ معراج کی واپسی

---

[1] مسند احمد اور سیرت ابن اسحاق کی بعض روایتوں میں ہے کہ آسمان پر جانے سے پہلے ہی بیت المقدس میں انبیاء نے آپ کی اقتداء میں یہ نماز پڑھی تھی، صحیح بخاری میں اس کا ذکر نہیں، صحیح مسلم میں وقت کی تصریح نہیں مگر قرینہ سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واپسی کا واقعہ ہے، حافظ ابن کثیر نے اسی کو صحیح لکھا ہے (تفسیر سورۂ اسراء) اور ہم نے اسی کی تقلید کی ہے، ترمذی (تفسیر سورۂ اسراء) اور مسند ابن حنبل میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد اقصیٰ میں آتے جاتے سرے سے نماز ہی نہیں پڑھی، مگر صحیح مسلم کے مقابلہ میں اس کو کون تسلیم کرے گا۔

[2] معراج کے یہ تمام واقعات صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ، کتاب التوحید، کتاب الانبیاء، کتاب المعراج، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور باب بدء الخلق میں اور صحیح مسلم باب المعراج اور اس کے بعد کے متفرق ابواب متعلقہ معراج میں حرفاً حرفاً مذکور ہیں، ہم نے ان واقعات کے لکھنے میں صرف ترتیب و ترجمہ کا فرض ادا کیا ہے۔

ہیں قریش کے ایک تجارتی قافلہ سے آپ کی ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ کچھ واقعات پیش آئے، جب لوگوں نے جھٹلایا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا تمہارا قافلہ کل پرسوں تک آجائے گا اس سے پوچھ لینا، چنانچہ وہ آیا اور اس نے تصدیق کی۔ ان ہی روایتوں کا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ کچھ کفار دوڑے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے کہ آج محمدؐ کعبہ میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات کو وہ بیت المقدس گئے اور آئے، حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ کیا واقعی آپ یہ فرما رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا "ہاں" حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں تو آپ کو سچا جانتا ہوں اور اس پر ایمان لاتا ہوں، کفار نے کہا، تم کھلم کھلا ایسی خلاف عقل بات کیونکر صحیح سمجھتے ہو؟ جواب دیا، میں تو اس سے بھی زیادہ خلاف عقل بات پر یقین رکھتا ہوں، میں تو یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہر روز آپ کی خدمت میں آسمان سے فرشتے آتے ہیں، اسی دن سے حضرت ابوبکرؓ کا لقب صدیق ہو گیا۔

لیکن یہ تمام قصے سرتاپا لغو اور باطل ہیں، ابن اسحاق اور ابن سعد نے تو سرے سے ان واقعات کے اسناد ہی نہیں لکھے ہیں۔ ابن جریر طبری، بیہقی، ابن ابی حاتم، ابو یعلیٰ، ابن عساکر اور حاکم نے ان کی سندیں ذکر کی ہیں، ان کے رواۃ ابو جعفر رازی، ابو ہارون عبدی اور خالد بن یزید بن ابی مالک ہیں جن میں پہلے صاحب گو بجائے خود ثقہ ہیں، مگر بے سروپا حدیثوں کے بیان کرنے میں بے باک ہیں۔ بقیہ دو مشہور دروغ گو کاذب اور قصہ خواں ہیں۔ ان ہی لغو قطعوں کا اختتامی جزو یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے معراج کا واقعہ بیان کیا تو بہت سے مسلمانوں کے ایمان بھی متزلزل ہو گئے اور مرتد ہو گئے۔ فارتد کثیر ممن اسلم، یہ قصہ غالباً قرآن مجید کی اس آیت کی غلط توضیح میں گھڑا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (اسراء ۶۰)
ہم نے یہ دکھاوا جو تجھ کو دکھایا ہے، اس کو لوگوں کی آزمائش ہی کے لئے کیا ہے۔

ابن سعد اور واقدی نے اس قصہ کو یوں ہی بے سند بیان کیا ہے۔ طبری، ابن ابی حاتم اور بیہقی وغیرہ کے معتمد ارکان وہی اصحاب ثلثہ ہیں جن کے اوصاف گرامی ابھی اوپر گزر چکے ہیں، ابن جریر نے اس آیت کے تحت میں جو روایتیں درج کی ہیں، ان میں سے حسن، قتادہ اور ابن زید سے یہ واقعہ ارتداد مذکور ہے، لیکن ان کا سلسلہ ان سے آگے نہیں بڑھتا، اس واقعہ کے انکار کی سب سے پُرزور دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اس وقت تک مکہ میں جو اصحاب اسلام لائے تھے وہ گنے چنے لوگ تھے جو ہم کو نام بنام معلوم ہیں، ان میں سے کسی کی پیشانی پر ارتداد کا داغ نہیں۔ واقعہ کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کافروں میں بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اس سے پہلے آپ کے سخت مخالف نہ ہوں اور اگر آپ کو پیغمبر نہ جانتے ہوں مگر آپ کو مفتری اور کاذب بھی نہ کہتے ہوں، لیکن اس واقعہ معراج کے بعد سے انہوں نے بھی آپ کے ساتھ اس نیکی اور حسن ظن کے خیال کو اٹھا دیا ہو، قرآن مجید نے اس کو فتنۃ للناس لوگوں کے لئے آزمائش کہا ہے فتنۃ للمؤمنین یعنی مومنوں اور مسلمانوں کے لئے آزمائش نہیں کہا ہے اور اگر ان کے لئے بھی آزمائش ہو تو اس آیت سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس آزمائش میں پورے نہیں اترے۔

کیا آپ نے معراج میں خدا کو دیکھا

معراج کے مشاہدات شئون و صفات کی جلوہ انگیزی اور آیات اللہ کی نیرنگی تو آپ نے دیکھی، لیکن کیا ذات الٰہی بھی حجلۂ حجاب سے باہر آ کر مسئلۂ حقیقت بے پردہ ہوئی؟ یعنی دیدار الٰہی سے بھی آپ مشرف ہوئے؟ بعض روایتوں میں اس کا جواب اثبات میں ملتا ہے، صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے شریک بن عبداللہ نے معراج کی روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے،

حتی جاء سدرۃ المنتھی ودنا الجبار رب العزۃ فتدلی حتی کان منہ قاب قوسین او ادنیٰ (بخاری کتاب التوحید)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو عزت والا جبار (خدا) یہاں تک قریب ہوا اور جھک آیا کہ اس کے اور آپ کے درمیان دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔

محدثین نے شریک کی اس روایت کے اس حصہ پر سخت اعتراضات کئے ہیں اور سب سے پہلے امام مسلم نے اس کی نسبت بے احتیاطی کا الزام قائم کیا ہے، صحیح مسلم باب المعراج میں شریک کی اس سند کو اور کسی قدر متن کو لکھ کر تمام چھوڑ دیا ہے اور اس کے بعد لکھا ہے فقدم فیہ واخر وزاد ونقص، شریک نے اس روایت میں واقعات کو آگے پیچھے کر دیا ہے اور گھٹا بڑھا دیا ہے۔ امام خطابی نے لکھا ہے کہ صحیح بخاری میں کوئی حدیث ایسی نہیں جو بظاہر اس قدر قابل اعتراض ہو جس قدر یہ حدیث، اس کے بعد اس حدیث کی تاویل بیان کر کے لکھا ہے،

فانہ کثیر التفرد بمناکیر الالفاظ التی لا یتابعہ علیھا سائر الرواۃ۔	شریک ایسے منکر الفاظ خود تنہا بکثرت روایت کرتے ہیں جن کی تائید ان کے دیگر ہمدرس راوی نہیں کرتے۔

اور حضرت انسؓ سے واقعہ معراج کو اور بہت سے لوگوں نے نقل کیا ہے مگر شریک کے سوا کسی اور نے ان الفاظ کی روایت نہیں کی ہے، امام بیہقی نے بھی یہی کہا ہے اور یہی حافظ ابن کثیر کی بھی تحقیق ہے[1]، علامہ ابن حزم نے بھی اس کے متعلق قریب قریب یہی رائے ظاہر کی ہے، بعض علمائے رجال نے بھی شریک کی نسبت اچھی رائیں ظاہر نہیں کی ہیں۔ نسائی اور ابن جارود کا قول ہے کہ وہ قوی نہیں، یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں کہ اس سے حدیث نہ بیان کی جائے، البتہ ابن سعد اور ابوداؤد نے ان کے وثوق کی شہادت دی ہے۔ اس لئے محدثین کا فیصلہ ان کے حق میں یہ ہے کہ جب وہ تنہا کسی بات کو بیان کریں تو ان کی وہ بات شاذ اور منکر قرار دی جائے گی، چنانچہ اس روایت میں یہ فقرہ بھی اسی قسم کا ہے،

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا	محمد کو زبردست اور طاقتور نے تعلیم دی وہ آسمان کے بلند تر افق پر تھا، پھر قریب ہوا اور جھک آیا، یہاں تک کہ دو تیر کمان کے برابر یا اس سے بھی قریب تر ہو گیا، پھر اس کے بندے کی

---

[1] بیہقی اور ابن کثیر کا قول تفسیر ابن کثیر سورۂ اسراء میں ہے اور امام خطابی اور ابن حزم کے اقوال ابن حجر نے فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۰۳، ۴۰۴ مصر میں نقل کئے ہیں۔

اَوْحٰی مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی اَفَتُمٰرُوْنَهٗ
عَلٰی مَا یَرٰی وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی
عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی عِنْدَهَا جَنَّةُ
الْمَاْوٰی اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی وَلَقَدْ رَاٰی مِنْ
اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی۔

(والنجم-۱)

طرف جو کچھ وحی کرنا تھی کی، دل نے جو کچھ دیکھا غلط نہیں دیکھا
تو جو کچھ وہ دیکھتا ہے کیا تم لوگ اس سے اس کے متعلق آپس میں
لڑتے مرتے ہو، حالانکہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک جس کے پاس
جنت الماویٰ ہے اس نے دوسری مرتبہ یقیناً وہ جب سدرۃ
المنتہیٰ پر سے دیکھا جب کہ سدرہ کو چھالیا تھا جس نے چھالیا
تھا، نگاہ نہ بہکی نہ بڑھی اور اس نے اپنے پروردگار کی عظیم الشان
نشانیاں دیکھیں۔

یہی آیتیں ہیں جن کی بنا پر صحابہ میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے بعضوں کا خیال ہے کہ آپ کو خود خدا نظر آیا اور اکثر صحابہ کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا، ترمذی (تفسیر سورۂ نجم) میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس خود خدا کو دیکھا تھا۔ ترمذی ہی میں ہے کہ ایک مقام پر کعب احبار (نومسلم یہودی عالم) سے حضرت ابن عباسؓ کی ملاقات ہوئی، کعب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام اور اپنے دیدار کو موسیٰ اور محمد علیہما السلام میں تقسیم کر دی، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کو دو دفعہ شرف کلام حاصل ہوا، اور آپؐ دو دفعہ خدا کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ مسروق حضرت عائشہؓ کے ایک شاگرد نے یہ گفتگو ان سے جا کر نقل کی، وہ نہایت برہم ہوئیں، اور قرآن مجید کی آیتوں سے انہوں نے اس خیال کی تردید کی کہ خدا خود فرماتا ہے لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے اس آیت کو پیش کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں صحیح ہے مگر اس وقت جب خدا اپنے اصلی نور میں نمایاں ہو، آنحضرت نے خدا کو دو دفعہ دیکھا تھا۔[1]

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے خدا کو بھی دیکھا ہے؟ فرمایا وہ تو نور ہے، میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں[2] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا، میں نے صرف ایک نور دیکھا۔[2]

اکابر صحابہ میں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عائشہؓ کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو نہیں بلکہ جبریلؑ کو دیکھا تھا اور ان ہی نے آپ کی طرف وحی کی تھی، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریلؑ کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے، صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے تمام صحابہ میں حضرت عائشہؓ کو اس مسئلہ پر سخت اصرار تھا، صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ حضرت مسروقؒ نے حضرت عائشہؓ سے ایک بار پوچھا کہ مادر من! کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا کو دیکھا تھا، بولیں

---

[1] یہ تمام روایتیں ترمذی تفسیر سورۂ والنجم میں ہیں اور ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے [2] مسلم جلد اول ص ۹۹ باب الاسراء و ترمذی تفسیر سورۂ نجم۔

یہ سُن کر تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ تین باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق اگر کوئی شخص روایت کرے تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، جس نے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا، اس نے جھوٹ کہا، خدا خود کہتا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ	خدا کو نگاہیں نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے
وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (انعام-۱۳)	اور وہ لطیف وخبیر ہے۔

پھر فرماتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ	اور کسی آدمی میں یہ قوت نہیں کہ وہ خدا سے کلام کرے لیکن
مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (شوریٰ ۵)	یہ کہ بذریعہ وحی کے یا پردے کی آڑ سے۔

ان آیتوں کو پڑھ کر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو نہیں دیکھا، البتہ حضرت جبریلؑ کو ان کی اصل صورت میں دو بار دیکھا، امام نووی شارح صحیح مسلم نے لکھا ہے[1] کہ حضرت عائشہؓ کا یہ قول حجت نہیں ہو سکتا، کیونکہ انہوں نے قرآن مجید کی آیات سے صرف عقلی استدلال کیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی مرفوع روایت نہیں بیان کی کہ آپؐ نے خدا کو نہیں دیکھا تھا، لیکن خود صحیح مسلم میں جس کی شرح میں امام نووی نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے، اُسی مقام پر حضرت مسروقؓ سے یہ روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس تکیہ لگائے ہوئے بیٹھا تھا، انہوں نے کہا اے ابو عائشہ! تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی نے ایک کو بھی کہا تو اس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا۔ میں نے پوچھا وہ کیا باتیں ہیں؟ فرمایا جس شخص نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا تھا، اس نے خدا پر بڑی تہمت لگائی، میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا، یہ سُن کر سیدھا اُٹھ بیٹھا اور کہا کہ اے ام المومنین! جلدی نہ کیجیے، کیا خدا خود نہیں فرماتا۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (تکویر-۱)	اور اس نے اس کو افق المبین پر دیکھا۔
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (نجم-۱)	اور اس نے اس کو دوسری مرتبہ اترتے ہوئے دیکھا۔

بولیں، سب سے پہلے خود میں نے اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا، آپؐ نے فرمایا یہ جبریلؑ تھے۔ میں نے ان دو مرتبوں کے سوا اُن کو اصل صورت میں کبھی نہیں دیکھا۔[2] اس سے زیادہ مستند مرفوع روایت کیا ہو سکتی ہے؟ برخلاف اس کے حضرت ابن عباسؓ نے جن سے روایتیں ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا، کبھی اپنی روایت میں یہ تصریح نہیں کی ہے کہ انہوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کو سُنا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ صحابہ میں سے کوئی حضرت عائشہؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر کا مخالف نہیں ہے (تفسیر سورۃ اسراء)، بلکہ اصل یہ ہے کہ بقول ابن حجر حضرت ابن عباسؓ کے خیال کی تشریح میں بعض راویوں سے غلط فہمی ہوئی ہے، حضرت ابن عباسؓ کا یہ منشا نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ

---

[1] شرح صحیح مسلم نووی نولکشور ص ۹۷ [2] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۸۴ مصر، باب ذکر سدرۃ المنتہیٰ۔

علیہ وسلم نے ان ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھا بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کی آنکھوں سے جلوۂ ربانی کا مشاہدہ کیا، صحیح مسلم (متعلقات اسراء) اور جامع ترمذی (تفسیر والنجم) میں ان کے یہ الفاظ ہیں رأی بقلبه رأی بفؤاده، دل کی آنکھوں سے دیکھا، چشم قلب سے مشاہدہ کیا، مردویہ نے اس سے بھی زیادہ ان کے تصریحی الفاظ نقل کیے ہیں۔

لم یرہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعینیه انما رآہ بقلبه (فتح الباری ج ۸ ص ۴۹۳)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا بلکہ اپنے قلب سے دیکھا۔

اس تشریح کے بعد اس باب میں کوئی نزاع باقی نہیں رہ جاتی، رہی یہ بات کہ دل کا دیکھنا اور قلب کا مشاہدہ کیا ہے تو اس رمز کو وہی سمجھے جس کے دل میں نور بصیرت اور جس کے دل میں مشاہدہ کی طاقت ہو۔

معراج جسمانی تھی یا روحانی، خواب تھا یا بیداری

ہمارے متکلمین اور شراحِ حدیث نے اس باب میں بے سود مباحث کا ایک انبار لگا دیا ہے، فیصلہ کی صحیح صورت یہ ہے کہ متکلمانہ اعتراضات، فلسفیانہ خدشات اور عقلی محالات اور نیز عامیانہ ظواہر پرستی اور جمہور کے خیالات کی بے جا حمایت کے وسوسوں سے خالی الذہن ہو کر صحیح روایتوں کے اصل الفاظ پر غور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ سورۂ اسراء (معراج) کی اس آیت کی نسبت۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ أَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ (بنی اسرائیل)	ہم نے جو رویا (دکھاوا) تجھ کو دکھایا، اس کو ہم نے لوگوں کے لئے صرف آزمائش بنایا ہے۔

بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ یہ معراج کے متعلق ہے۔ رویا عربی زبان میں "دکھاوے" کو کہتے ہیں یعنی جو دیکھنے میں آئے، اور عام طور سے اس کے معنی "خواب" کے ہیں، اس لئے جو فریق معراج کو خواب بتاتا ہے وہ اس آیت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا ہے، لیکن صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت میں یہ ان کی تصریح ہے کہ اس آیت میں رویا کے معنی مشاہدہ چشم کے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ واقعہ معراج خواب نہ تھا بلکہ آنکھوں کا مشاہدہ تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ أَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ، قال هی رؤیا عین اریها رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لیلة اسری به الی بیت المقدس (بخاری باب الاسراء)	ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں کہ ہم نے جو رویا تجھ کو دکھایا اس کو نہیں بنایا لیکن لوگوں کے لئے آزمائش، کہتے ہیں کہ یہ آنکھ کا مشاہدہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا گیا جب آپ کو رات کے وقت بیت المقدس لے جایا گیا۔

اس پر یہ لغوی بحث چھڑ گئی کہ رویا لغت میں آنکھ کے "دیکھنے" کو نہیں کہتے، مگر ذرا غور کیجیے کہ حضرت ابن عباسؓ سے بڑھ کر لغت عرب کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، جب وہ رؤیائے عین کہتے ہیں تو کس کو انکار ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں راعی اور متنبی بعض عرب شعراء نے ظاہری آنکھ سے دیکھنے کو بھی "رویا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

راعی کہتا ہے ؎ فکبر للرؤیا وھش فؤادہ۔

متنبی کا مصرع ہے، ورؤیاک احلی فی العیون من الغمض۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند ابن حنبل اور حدیث کی دیگر معتبر کتابوں میں جن میں معراج کے مسلسل اور تفصیلی واقعات درج ہیں، ان سب کو ایک ساتھ پیش نظر رکھنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ صحیحین کی دو روایتوں کے سوا باقی روایتوں میں خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے، چنانچہ بخاری و مسلم اور مسند ابن حنبل میں حضرت ابوذرؓ کی جو صحیح ترین روایت ہے اور حضرت انسؓ کی وہ روایت جو ثابت البنانی کے ذریعہ سے ہے، خواب کے ذکر سے قطعاً خالی ہے، اس لئے حسب محاورۂ عام اس کو بیداری کے معنی میں سمجھنا قطعی ہے، لیکن حضرت انسؓ کی اس روایت میں جو شریک کے واسطے سے ہے، یہ مذکور ہے کہ یہ واقعہ آنکھوں کے خواب اور دل کی بیداری کی حالت میں پیش آیا، بخاری میں یہ حدیث کتاب التوحید اور باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم دو مقامات میں ہے اس کے الفاظ یہ ہیں،

سمعت انس بن مالک یقول لیلۃ اُسری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مسجد الکعبۃ انہ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحی الیہ وھو نائم فی المسجد الحرام فقال اولھم ایھم ھو فقال اوسطھم ھو خیرھم واخرھم خذوا خیرھم فکانت تلک اللیلۃ فلم یرھم حتی اتوا لیلۃ اخریٰ فیما یری قلبہ وتنام عینہ ولا ینام قلبہ وکذلک الانبیاء تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم۔ (کتاب التوحید)	انس بن مالک کو میں نے اس شب کا واقعہ جب آپ کو کعبہ کی مسجد سے لے جایا گیا (معراج) بیان کرتے ہوئے سنا کہ اس سے پہلے کہ آپ کی طرف وحی بھیجی جائے آپ کے پاس تین شخص آئے اور اس وقت مسجد حرام میں سوتے ہوتے تھے، پہلے نے کہا وہ کون ہے، بیچ والے نے کہا ان سونے والوں میں جو سب سے بہتر ہے اس کو لے لو، یہ رات ہو گئی، پھر آپ نے ان کو نہیں دیکھا، یہاں تک کہ ایک اور رات کو وہ آئے اس حالت میں کہ آپ کا دل دیکھتا تھا اور آپ کی آنکھ سوتی تھی لیکن آپ کا دل نہیں سوتا تھا اور اسی طرح پیغمبروں کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے،
سمعت انس بن مالک یحدثنا عن لیلۃ اُسری بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم من مسجد الکعبۃ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحی الیہ وھو نائم فی المسجد الحرام فقال اولھم ایھم ھو فقال اوسطھم ھو خیرھم وقال اخرھم خذوا اخیرھم فکانت تلک فلم یرھم حتی جاؤا لیلۃ اخری فیما یری قلبہ والنبی صلی اللہ علیہ وسلم نائمۃ عیناہ ولا ینام قلبہ وکذلک الانبیاء تنام اعینھم	انس بن مالکؓ ہم لوگوں سے آپ کی شب معراج کا قصہ بیان کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ آپ پر وحی آئے آپ مسجد حرام میں سو رہے تھے آپ کے پاس تین آدمی آئے، پہلے نے کہا وہ کون ہے؟ بیچ والے نے کہا وہ ان میں سب سے بہتر ہے، پچھلے نے کہا جو ان میں سب سے بہتر ہو اس کو لے لو، یہ تو ہو گیا، پھر آپ نے ان کو نہیں دیکھا یہاں تک کہ وہ ایک اور رات آئے، اس حالت میں کہ آپ کا دل دیکھتا تھا، اور آپ کی آنکھیں سوتی تھیں، لیکن آپ کا دل نہیں سوتا تھا، انبیاء کا یہی حال ہوتا ہے کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں اور انکے

---

[1] ان دونوں راتوں میں کم از کم بارہ برس کا فصل ہوگا، کیونکہ پہلی رات آغاز وحی سے پہلے کی تھی اور دوسری رات جو شب معراج تھی نبوت کے بارھویں سال تھی۔

ولا تنام قلوبهم فتولاه جبريل ثم عرج الى السماء (باب صفة النبي صلى الله عليه وسلم) دل نہیں سوتے، پھر جبریلؑ نے آپ کو اپنے اہتمام میں لیا پھر آپ کو لے کر آسمان پر چڑھے۔

بخاری نے اس باب میں اس حدیث کو یہیں تک لکھا ہے لیکن کتاب التوحید میں اس کے بعد معراج کے تمام واقعات بیان کر کے آخر میں حضرت انس کا یہ فقرہ روایت کیا ہے

فاستيقظ وهو في المسجد الحرام۔ پھر آپ بیدار ہوئے تو مسجد حرام میں تھے

صحیح مسلم میں یہ روایت نہایت مختصر ہے، سند کے بعد صرف اس قدر لکھ کر کہ آپ مسجد حرام میں سوتے تھے اس کو ختم کر دیا ہے، اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ شریک نے اس روایت میں واقعات کو گھٹا بڑھا اور آگے پیچھے کر دیا ہے، اسی لئے ائمہ نے جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے شفا میں اور امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے شریک کی اس روایت میں بہت سے اوہام ہیں اور اسی لئے ان کو انہوں نے رد کر دیا ہے، دوسری روایت صحیحین میں وہ ہے جس میں حضرت مالک بن صعصعہ انصاری خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے معراج کا واقعہ دہراتے ہوئے فرمایا۔

بینما انا عند البیت بین النائم والیقظان[1] میں کعبہ کے پاس خواب و بیداری کی درمیانی حالت میں تھا۔

صحیح بخاری باب المعراج اور مسند ابن حنبل میں مالک بن صعصعہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

بینما انا فی الحطیم مضطجعا۔ اس اثنا میں کہ میں خانہ کعبہ کے مقام حطیم میں لیٹا ہوا تھا۔

لیکن یہ شب معراج میں آغاز کی کیفیت کا بیان ہے کہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما رہے تھے، دلائل بیہقی میں ایک روایت ہے جس میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطہ سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عشا کے وقت خانہ کعبہ میں سو رہا تھا، ایک آنے والا (جبریل) آیا اور اس نے آکر مجھے جگایا، میں جگا۔ اس کے بعد واقعہ معراج کی تفصیل ہے، اس میں سونے کے بعد جگائے جانے کی گو تصریح ہے، لیکن اس کا دوسرا ہی راوی جھوٹا، دروغ گو اور ناقابل اعتبار ہے[2]، اور اس میں جو منکرات اور غرائب امور بیان کئے گئے ہیں وہ سرتا پا لغو ہیں، ابن اسحاق نے سیرت میں اور ابن جریر طبری نے تفسیر میں (سورۂ اسراء) حضرت حسن بصریؒ سے بھی اسی قسم کی روایت کی ہے کہ میں سو رہا تھا کہ جبریلؑ نے پاؤں سے ٹھوکر مار کر مجھے اٹھایا، لیکن اس کا سلسلہ حضرت حسن بصری سے آگے نہیں بڑھتا، سیرت ابن ہشام اور تفسیر ابن جریر طبری میں محمد بن اسحاق کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ سے دو روایتیں ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ یہ بزرگوار معراج کو روحانی اور رؤیائے صادقہ کہتے ہیں، یہ روایتیں مع سند کے حسب ذیل ہیں۔

عن محمد بن اسحاق قال حدثنی یعقوب بن عتبة محمد بن اسحاق سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ یعقوب بن

---

[1] صحیح بخاری ذکر الملائکہ و صحیح مسلم باب الاسراء۔ [2] حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر سورۂ اسراء (ص ۹) میں اس روایت کو نقل کیا ہے، اسی کے سلسلۂ سند میں دوسرا راوی وہی ابو ہارون العبدی ہے جس کو علمائے رجال نے بالاتفاق ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور کہا ہے (هو اكذب من فرعون) وہ فرعون سے بھی زیادہ جھوٹا ہے۔

بن المغیرة ان معاویة بن ابی سفیان کان اذا سئل عن مسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت رؤیا من اللہ صادقة۔

عتبہ بن مغیرہ نے بیان کیا کہ معاویہ بن سفیان سے جب معراج کا واقعہ پوچھا جاتا تو وہ کہتے کہ یہ خدا کی طرف سے ایک سچا خواب تھا۔

(ابن جریر تفسیر اسراء، سیرت ابن اسحاق ذکر معراج)

لیکن یہ روایت منقطع ہے، یعقوب نے حضرت معاویہؓ سے خود نہیں سنا ہے کیونکہ انہوں نے اُن کا زمانہ نہیں پایا ہے، دوسری روایت ہے۔

حدثنا ابن حمید، قال حدثنا سلمة عن محمد قال حدثنی بعض آل ابی بکر ان عائشة کانت تقول ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن اسری بروحه (حوالہ مذکور)

ابن حمید نے ہم سے بیان کیا، ان سے سلمہ نے، سلمہ سے محمد بن اسحاق نے، انہوں نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نہیں کھویا گیا بلکہ آپ کی روح شب کو لے جائی گئی۔

اس روایت کے سلسلہ میں بھی محمد بن اسحاق اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی خاندان ابوبکرؓ کے ایک شخص کا نام و نشان مذکور نہیں ہے، اس لئے یہ بھی پایۂ صحت سے فروتر ہے، تاہم ان روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج کو رویا یا روحانی کہنا قرن اول میں بعض لوگوں کا قول تھا، ابن اسحاق میں ہے کہ حضرت حسن بصری کے سامنے یہ بیان کیا جاتا تھا کہ یہ رویا تھا تو وہ اس کی تردید نہیں کرتے تھے، لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ معراج جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں تھی، قاضی عیاض نے شفا میں اور امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے۔

اختلف الناس فی الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقیل انما کان جمیع ذلک فی المنام والحق الذی علیه اکثر الناس ومعظم السلف وعامة المتاخرین من الفقهاء والمحدثین والمتکلمین انه اسری بجسده صلی اللہ علیه وسلم والآثار تدل علیه لمن طالعها وبحث عنها ولا یعدل عن ظاهرها الا بدلیل ولا استحالة فی حملها علیه فیحتاج الی تاویل (شرح مسلم باب الاسراء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج میں لوگوں کا اختلاف کہا گیا ہے کہ یہ سارا واقعہ خواب میں پیش آیا اور حق یہ ہے کہ جس پر اکثر لوگ، اور سلف صالحین کا بڑا حصہ اور عامہ متاخرین میں سے فقہاء، محدثین اور متکلمین سب متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جسم کے ساتھ معراج ہوئی اور جو شخص تمام آثار و احادیث کا غائر مطالعہ اور تحقیق کرے گا اس پر یہ حق واضح ہو جائے گا اور اس ظاہر سے بے دلیل انحراف نہیں کیا جائے گا اور نہ ظاہر پر ان کو محمول کرنے میں کوئی محال لازم آتا ہے جو تاویل کی حاجت ہو۔

مفسرین میں سے ابن جریر طبری سے لے کر امام رازی تک نے جمہور کے اس مسلک پر چار عقلی دلیلیں بھی قائم کی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید میں ہے سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ۔ پاک ہے وہ خدا جو شب معراج میں لے گیا اپنے بندہ (عبد) کو، اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اپنے "بندہ" کو لے گیا، بندہ یا عبد کا اطلاق جسم پر یا جسم و

روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے، تنہا روح کو عبد یا بندہ نہیں کہتے۔

(۲) واقعاتِ معراج میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ براق پر سوار ہوئے، دودھ کا پیالہ نوش فرمایا، سوار ہونا پینا یہ سب جسم کے خواص ہیں اس لئے یہ معراج جسمانی تھی۔

(۳) اگر واقعۂ معراج رویا اور خواب ہوتا تو کفار اس کی تکذیب کیوں کرتے؟ انسان تو خواب میں خدا جانے کیا کیا دیکھتا ہے، محال سے محال چیز بھی اُس کو عالمِ خواب میں واقعہ بن کر نظر آتی ہے۔

(۴) خدا نے قرآن مجید میں کہا ہے کہ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ کہ اس مشاہدۂ معراج کو ہم نے لوگوں کے لئے معیارِ آزمائش بنایا ہے۔ اگر یہ عام خواب ہوتا تو یہ آزمائشِ ایمان کیا چیز تھی اور اس پر ایمان لانا مشکل کیا تھا۔

معراج کے بحالتِ بیداری ہونے پر صحیح استدلال

میرے نزدیک معراج کے بحالتِ بیداری کے ثبوت کا صاف و صحیح طریقہ یہ ہے کہ کلام کا فطری قاعدہ یہ ہے کہ جب تک متکلم اپنے کلام میں یہ ظاہر نہ کر دے کہ یہ خواب تھا تو طبعاً یہی سمجھا جائے گا کہ وہ واقعہ بحالتِ بیداری پیش آیا، قرآن پاک کے ان الفاظ میں سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا (پاک ہے وہ جو اپنے بندہ کو ایک رات لے گیا) میں کسی خواب کی تصریح نہیں، اسی طرح حضرت ابوذرؓ کی صحیح ترین روایت میں بھی اس کی تصریح نہیں، اس لئے بے شبہ یہ بیداری ہی کا واقعہ سمجھا جائے گا اور یہی جمہور امت کا عقیدہ ہے اور وہ بھی بجسم۔ اسی طرح صحیح احادیث میں بھی خواب کی تصریح نہیں، اس لئے زبان کے محاورۂ عام کی بنا پر اس کو بیداری کا واقعہ سمجھا جائے گا۔

مدعیانِ رویا کا مقصود بھی رویا سے عام خواب نہیں

جو لوگ اس کو رویا کہتے ہیں اس سے ان کا مقصود بھی وہ عام خواب نہیں ہے جو ہر روز ہر شخص دیکھا کرتا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کے رویا کی حقیقت پر غور نہیں کیا ہے، وہ غلطی سے انبیاء کے رویاء کو بھی عام انسانی خواب سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل صرف لفظ کا اشتراک ہے ورنہ اس کی حقیقت بالکل جداگانہ ہے، یہ وہ رویا ہے جس میں گو آنکھیں بند ہوتی ہیں مگر دل بیدار ہوتا ہے، کیا یہی عام رویا کی حقیقت ہے؟ یہ وہ حالت ہے جو بظاہر خواب ہے مگر دراصل ہشیاری بلکہ مافوق ہشیاری ہے، عام خواب اور اس رویاء میں مشابہت صرف اس قدر ہے کہ اس عالمِ مادی اور کاروبارِ حواسِ ظاہری سے پہلے میں تغافل ہے تو دوسرے میں تعطل ہے، لیکن پہلے میں عالمِ روح اور کائناتِ ملکوت کو دخل نہیں اور دوسرے میں سراپا ہشیاری، بیداری، حقیقت بینی، ام سفری ناموس، سیرِ سماوات، لقائے ارواح، اور رویتِ حق سب کچھ ہے۔ اسی لئے جن لوگوں نے اس کو "منام" یا "رویا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے انہوں نے درحقیقت مجاز و استعارہ سے کام لیا ہے، ورنہ اصل مقصود یہی کیفیتِ روحانی اور یہی حالتِ ملکوتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے ظاہری حواس کے مادی قوانینِ طبعی کے رو سے جو چیزیں محال معلوم ہوتی ہیں، وہ

اس عالم میں محال نہیں ہیں۔

رویائے صادقہ کی تاویل

بہرحال جو لوگ اس کو رویائے صادقہ کہتے ہیں ان کو گو یہ مغالطہ بعض روایاتِ حدیث سے پیش آیا ہے جن کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اور جن میں سب سے مستند شریک کی روایت ہے جس کے الفاظ میں کمی بیشی پر اکثر محدثین نے اعتراض کیا ہے اور اسی سے انہوں نے اس کو رد کر دیا ہے، تاہم محدثین میں سے امام خطابی صاحب معالم السنن شریک کی اس روایت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واما من اثبت من اول الحديث ما نص به فانه يزول عنه الاشكال فانه مصرح فيه بانها كانت رؤيا لقوله في اوله وهو نائم وفي آخره استيقظ وبعض الرؤيا مثل يضرب ليتاول على الوجه الذي يجب ان يصرف اليه معنى التعبير في مثله وبعض الرؤيا لا يحتاج الى ذلك بل ياتي كالمشاهدة۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۰۱)

لیکن جو شخص اس حدیث کے ابتدائی الفاظ کو آخری الفاظ سے ملا کر دیکھے گا اس سے یہ اشکال اس لئے دور ہو جائے گا کہ ان میں یہ تصریح ہے کہ یہ رویا تھا کیونکہ اس روایت کے شروع میں ہے کہ آپ سو رہے تھے اور آخر میں ہے کہ آپ جاگ پڑے۔ بعض رویا تمثیلی رنگ کے ہوتے ہیں جن کی تاویل ضروری ہے کہ اسی طرح کی جائے جس طرح اس قسم کے خواب کی تعبیر کی جاتی ہے اور بعض رویا اس کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ وہ مشاہدۂ عینی کی طرح پیش آتے ہیں۔

رویا سے مقصود روحانی ہے

لیکن جو لوگ ان میں آشنائے راز ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ وہ ایک عام قسم کا خواب تھا جو ہر انسان تقریباً ہر شب کو دیکھتا ہے، بلکہ وہ اس کیفیت پر رویا کا اطلاق محض مجازی اور انسانی طریقہ ادا کے قصور کے باعث کرتے ہیں، انسان روح اور جسم سے مرکب ہے یہ روح جو جسم سے وابستہ ہے اس کا یہ تعلق محض عارضی ہے اور یہی عارضی تعلق عالمِ نور سے اس کے حجاب کا باعث ہے جس قدر اس تعلق کا رشتہ ڈھیلا ہوتا جائے گا اسی نسبت سے وہ حجاب اٹھتا جائے گا، انسان جب بیداری میں ہوتا ہے تو حواس ظاہری کی مصروفیت روح کو مشاہدۂ باطن سے باز رکھتی ہے، نیند کی حالت میں کسی قدر اس کو ظاہری مشغولیت سے آزادی ملتی ہے تو اس کو رنگا رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں، یہ حالت انسان کی باطنی اور روحانی قویٰ کی ترقی و تنزل پر موقوف ہے، ایک دن تو ہر انسان مر جاتا ہے یعنی اس کی روح کا تعلق اس کے جسم سے منقطع ہو جاتا ہے، لیکن انسانوں کی ایک صنف ایسی بھی ہے جس کا طائرِ روح خدا کے فضل و موہبت کے بازوؤں سے پر زور ہو کر اپنے قفسِ عنصری کو تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ کر عالمِ ملکوت کی سیر کرتا پھرتا ہے اور پھر اسی قفسِ عنصری کی طرف رجعت کر جاتا ہے، یہی حالت ہے جس کو وہ اپنی محدود زبان میں مجازاً رویائے صادقہ یا رویائے نبوت کہتے ہیں اور اسی عالم کو عالمِ رویا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ممکن ہے کہ اسی کو قرآن مجید کی آیت وما جعلنا الرؤيا التي اريناك میں رویا کہا گیا ہے، یہی وہ دنیا ہے جس میں آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار ہوتا ہے اور اسی کی طرف وحی کی حدیثوں میں اشارہ ہے، اور ابن ہشام حضرت عائشہؓ کی

طرف جو روایت منسوب ہے کہ:-

ما فقد جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن اُسری بروحہ۔

(یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج روح کے ذریعہ ہوئی)

کا یہی مطلب ہے، حافظ ابن قیم نے زاد المعاد[1] میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

فصل: وقد نقل ابن اسحاق عن عائشۃ ومعاویۃ انھما قالا انما کان الاسراء بروحہ ولم یفقد جسدہ ونُقل عن الحسن البصری نحو ذلک ولکن ینبغی ان یعلم الفرق بین ان یقال کان الاسراء مناماً وبین ان یقال کان بروحہ دون جسدہ وبینھما فرق عظیم وعائشۃ ومعاویۃ لم یقولا کان مناماً وانما قالا اسری بروحہ ولم یفقد جسدہ وفرق بین الامرین فان ما یراہ النائم قد یکون امثالاً مضروبۃ للمعلوم فی الصور المحسوسۃ فیری کانہ قد عرج بہ الی السماء او ذھب بہ الی مکۃ واقطار الارض وروحہ لم تصعد ولم تذھب وانما ملک الرؤیا ضرب لہ المثال والذین قالوا عرج برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طائفتان، طائفۃ قالت عرج بروحہ وبدنہ وطائفۃ قالت عرج بروحہ ولم یفقد بدنہ وھؤلاء لم یریدوا ان المعراج کان مناماً وانما ارادوا ان الروح ذاتھا اسری بھا وعرج بھا حقیقۃ وباشرت من جنس ما تباشر بعد المفارقۃ وکان حالھا فی ذلک کحالھا بعد المفارقۃ فی صعودھا الی السموٰت سماء حتی ینتھی بھا الی السماء السابعۃ فتقف بین یدی اللہ عز وجل فیأمر فیھا بما یشاء ثم تنزل الی الارض فالذی کان لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فصل: ابن اسحاق نے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ معراج میں آپ کی روح لے جائی گئی اور آپ کا جسم کھویا نہیں گیا (یعنی وہ اسی دنیا میں اپنی جگہ پر موجود تھا) اور حسن بصری سے بھی اسی قسم کی روایت ہے لیکن یہ جاننا چاہیے کہ یہ کہنا کہ معراج منام (خواب) تھا اور یہ کہنا کہ بذریعہ روح کے تھی جسم کے ساتھ نہ تھی، ان دونوں میں بڑا فرق ہے حضرت عائشہؓ اور معاویہؓ نے یہ نہیں کہا کہ وہ منام (خواب) تھا انہوں نے یہی کہا ہے کہ معراج میں آپ کی روح کو لے جایا گیا اور آپ کا جسم کھویا نہیں گیا۔ ان دونوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ سونے والا جو کچھ دیکھتا ہے کبھی محسوس صورتوں میں، جو کچھ معلوم ہے اس کی تمثیلیں اس کے سامنے کی جاتی ہیں، پس وہ دیکھتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھایا گیا یا مکہ اس کو لے جایا گیا اور زمین کے گوشوں میں اس کو پھرایا گیا، حالانکہ اس کی روح نہ چڑھی نہ گئی نہ پھری، صرف یہ ہوا کہ خواب کے فرشتے نے اس کے لئے ایک تمثیل اس کے سامنے کر دی اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر چڑھایا گیا ان میں دو فرقے ہیں ایک فرقہ کہتا ہے کہ آپ کو معراج روح و جسم دونوں کے ساتھ ہوئی اور دوسرا کہتا ہے کہ صرف روح کے ساتھ ہوئی اور جسم کھویا نہیں گیا (یعنی اس عالم سے) ان لوگوں کا یہ مقصد نہیں کہ وہ خواب تھا بلکہ یہ مقصد ہے کہ خود بذاتہ روح کو معراج ہوئی اور وہی درحقیقت اوپر چڑھائی گئی اور اس نے اسی طرح کیا جس طرح جسم سے مفارقت کے بعد کرتی ہے اور اس میں اس کی

---

[1] طبع اول صفحہ ۳۰۴ مصر

ليلة الاسراء اكمل مما يحصل للروح عند المفارقة ومعلوم ان هذا امر فوق ما يراه النائم لكن لما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم في مقام خرق العوائد حتى شق بطنه وهو حي لايتالم بذلك عرج بذات روحه المقدسة في غير اماتة ومن سواه لاينال بذات روحه الصعود الى السماء الا بعد الموت والمفارقة فالانبياء انما استقرت ارواحهم هناك بعد مفارقة الابدان وروح رسول الله صلى الله عليه وسلم صعدت الى هناك في حال الحياة ثم عادت وبعد وفاته استقرت في الرفيق الاعلى مع ارواح الانبياء ومع هذا فلها اشراف على البدن واشراق وتعلق به بحيث يرد السلام على من سلم عليه وبهذا التعلق رأى موسى قائما يصلي في قبره ورآه في السماء السادسة ومعلوم انه لم يعرج بموسى من قبره ثم رد اليه وانما ذلك مقام روحه واستقرارها وقبره مقام بدنه واستقراره الى يوم معاد الارواح الى اجسادها فرآه يصلي في قبره ورآه في السماء السادسة كما انه صلى الله عليه وسلم في ارفع مكان في الرفيق الاعلى مستقرا هناك وبدنه في ضريحه غير مفقود واذا سلم عليه المسلم رد الله عليه روحه حتى يرد عليه السلام ولم يفارق الملأ الاعلى ومن كثف ادراكه وغلظت طباعه من ادراك هذا فلينظر الى الشمس في علو محلها وتعلقها وتاثيرها في

کی حالت وہی تھی جو مفارقت جسم کے بعد آسمانوں پر ایک ایک آسمان کرکے چڑھنے میں ہوتی ہے یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر جاکر ٹھہر جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکر کھڑی ہو جاتی ہے پھر وہ جو چاہتا ہے اس کی نسبت حکم دیتا ہے پھر زمین پر واپس آجاتی ہے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں جو حاصل ہوا وہ اس سے بھی زیادہ کامل تھا جو روح کو مفارقت جسم کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ درجہ اس سے بڑا ہے جو سونے والے کو خواب میں نظر آتا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرق عادات کے مقام میں تھے یہاں تک کہ آپ کا سینہ چاک کیا گیا اور آپ زندہ تھے لیکن آپ کو تکلیف نہیں ہوئی اسی طرح خود روح مبارک بذاتہ اوپر چڑھ گئی بغیر اس کے کہ آپ پر موت طاری کی جائے آپ کے علاوہ کسی کی روح کو موت اور مفارقت تن کے بغیر یہ عروج نصیب نہ ہوا انبیاء کی روحیں جو یہاں ٹھہری تھیں وہ مفارقت جسم کے بعد ٹھہریں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک زندگی کی حالت میں وہاں گئی اور واپس آئی اور مفارقت کے بعد انبیاء کی روحوں کے ساتھ رفیق اعلیٰ میں جاکر ٹھہر گئی لیکن باوجود اس کے روح پاک کو اپنے جسم کے ساتھ ایک نوع کا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر آپ پر کوئی سلام بھیجے تو آپ سلام کا جواب دیتے ہیں، اسی تعلق سے آپ نے شب معراج میں دیکھا کہ موسیٰ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں، پھر آپ نے ان کو چھٹے آسمان پر دیکھا، حالانکہ معلوم ہے کہ موسیٰ کو اپنی قبر سے اٹھا کر نہیں لے جایا گیا تھا اور نہ پھر واپس کیا گیا تھا، اس کی گرہ یوں کھلتی ہے کہ وہاں آسمان پر جو موسیٰ کو آپ نے دیکھا تو وہ ان کی روح کا مقام و مستقر تھا اور قبر ان کے جسم کا، جہاں وہ قیامت میں روحوں کے لوٹنے کے وقت تک رہے گا۔ اس طرح آپ نے ان کو ان کی قبر میں نماز پڑھتے بھی دیکھا اور چھٹے آسمان پر بھی دیکھا جس طرح کہ بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس

الارض وحیاة النبات والحیوان بها هذا و
شان الارواح فوق هذا فلها شان وللابدان
شان وهذه النار تکون فی محلها وحرارتها
تؤثر فی الجسم البعید عنها مع ان الارتباط
والتعلق الذی بین الروح والبدن
اقوی واکمل من ذالك واتم فشان
الروح اعلی من ذالك والطف۔

سے بلند تر مقام یعنی رفیق اعلیٰ میں بھی قرار گیر ہیں اور جسم مبارک قبر شریف میں بھی موجود ہے جب سلام کرنے والا آپ پر سلام کرتا ہے تو اللہ آپ کی روح کو واپس کرتا ہے تا آنکہ آپ جواب دیتے ہیں حالانکہ مقام رفیق اعلیٰ سے آپ علیحدہ نہیں ہے جو شب معراج میں جو حاصل ہوا اس سے بھی زیادہ کامل تھا جو روح کو مفارقت جسم کے بعد حاصل ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ درجہ اس سے بڑا ہے جو سونے والے کو خواب میں نظر آتا ہے لیکن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرق عادات کے مقام میں تھے یہاں تک کہ آپ کا سینہ مبارک پاک کیا گیا اور آپ زندہ تھے لیکن آپ کو تکلیف نہیں ہوتی، اسی طرح خود روح مبارک بذاتہ اوپر ہے اور اس کی گرمی دور کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے، روح اور بدن کا باہمی تعلق تو اس سے بھی زیادہ قوی اور کامل ہے اس لئے کہ روح آگ سے زیادہ اعلیٰ اور لطیف ہے۔

فقل للعیون الرمد ایاك ان تری سنا الشمس فاستغشی ظلام اللیالیا

(گرد آلود آنکھوں سے کہہ دو کہ وہ آفتاب کی روشنی کو نہیں دیکھ سکتیں تو راتوں کی تاریکی کو اوڑھ لیں)

صوفیہ اور ارباب حال نے معراج کے واقعات کی تشریح اپنے مذاق اور رنگ میں کی ہے، علماء اسلام میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے جو صوفی اور صاحبِ حال ہے اور محدث اور متکلم بھی، یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی شاہ صاحب کے متعلق معلوم ہے کہ وہ دیگر اہل باطن کی طرح عالم برزخ اور عالم مثال زمام اور عالم جسد اور عالم روح کے درمیان ایک تیسرے عالم کے قائل ہیں جہاں جسم پر روح کے خواص طاری ہوتے ہیں اور روح اپنی خصوصیت اور مناسبت کے مطابق جسمانی شکل وصورت میں نمایاں ہوتی ہے، شاہ صاحب اس بات کے قائل ہیں کہ معراج بیداری میں اور جسم کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ عالم برزخ کی سیر تھی جہاں آپ کے جسم پر روحانی خواص طاری کئے گئے اور معانی و واقعات مختلف اشکال وصورت میں مشاہدہ کراتے گئے، چونکہ ایک بیگانہ کے لئے اس نادیدہ شہرستان کی ہو بہو تشریح اپنی زبان میں مشکل ہے اس لئے ہم اس ملک کے ایک سیاح کا بیان نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں معراج کی حقیقت ان الفاظ میں لکھتے ہیں۔

واسری به الی المسجد الاقصی ثم الی
سدرة المنتهی والی ما شاء الله وکل ذلك
لجسده صلی الله علیه وسلم فی الیقظة
ولکن ذلك فی موطن هو برزخ
بین المثال والشهادة جامع لاحکامها

آپ کو معراج میں مسجد اقصیٰ میں لے جایا گیا پھر سدرۃ المنتہیٰ اور جہاں خدا نے چاہا اور یہ تمام جسم مبارک کے لئے بیداری کی حالت میں ہوا لیکن اس مقام میں جو عالم مثال اور عالم ظاہر کے بیچ میں ہے اور جو دونوں عالموں کے احکام کا جامع ہے اس لئے جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوتے اور روح پر

فظهر على الجسد احكام الروح وتمثل الروح والمعاني الروحية اجسادا ولذلك بان لكل واقعة من تلك الوقائع تعبير وقد ظهر لحزقيل وموسى وغيرهما عليهم السلام نحو من تلك الوقائع وكذلك لاولياء الامة ليكون علو درجاتهم عند الله كما لهم في الرؤيا والله اعلم

معاملات روحانی جسم کی صورت میں نمایاں ہوئے اور اسی لئے ان واقعات میں سے ہر واقعہ کی ایک تعبیر ظاہر ہوئی اور اسی طرح کے واقعات حضرت حزقیل اور موسیٰ وغیرہ علیہم السلام کے لئے ظاہر ہوئے تھے جیسے اولیاء امت کے سامنے ظاہر ہوتے ہیں کہ خدا کے نزدیک ان کے درجہ کی بلندی مثل اس حالت کے ہوتی ہے جو رویا میں ان کو معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم)

اس کے بعد شاہ صاحب نے معراج کے مشاہدات میں سے ایک ایک کی تعبیر کی ہے، خود احادیث صحیحہ اور معتبر روایات میں جہاں یہ واقعہ مذکور ہے کہ آپ کے سامنے دودھ اور شراب کے دو پیالے پیش کئے گئے تو آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، اس پر فرشتہ نے کہا کہ آپ نے فطرت کو اختیار کیا، اگر شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی تمام امت گمراہ ہو جاتی، اس عالم تمثیل میں گویا فطرت کو دودھ اور ضلالت کو شراب کے رنگ میں مشاہدہ کرایا گیا۔

شاہ صاحب معراج کو عالم برزخ کا واقعہ بتا کر اسی طرح معراج کے تمام واقعات کی تشریح کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

اما شق الصدر وملؤه ايمانا فحقيقته غلبة انوار الملكية وانطفاء لهيب الطبيعة وخضوعها لما يفيض عليها من حظيرة القدس واما ركوبه على البراق فحقيقته استواء نفسه النطقية على نسمته التي هي لكمال الحيواني فاستوى راكبا على البراق كما غلبت احكام نفسه النطقية على البهيمية وتسلطت عليها واما اسراؤه الى المسجد الاقصى فلانه محل ظهور شعائر الله ومتعلق همم الملأ الاعلى ومطمح انظار الانبياء عليهم السلام فكانه كوة الى الملكوت واما ملاقاته مع الانبياء صلوات الله عليهم ومفاخرته معهم فحقيقتها اجتماعهم من حيث ارتباطهم بحظيرة القدس وظهور

لیکن سینہ کا چیرنا اور اس کا ایمان سے بھرنا تو اس کی حقیقت ملکیت کے انوار کا غلبہ اور طبیعت (بشری) کے شعلہ کا بجھنا اور طبیعت کی فرمانبرداری اس فیضان کے قبول کرنے کے لئے جو حظیرۃ القدس سے خدا اس پر فائض کرتا ہے لیکن آپ کا براق پر سوار ہونا تو اس کی حقیقت آپ کے نفس ناطقہ (بشری) کا اپنے اس روح حیوانی پر استیلاء حاصل کرنا ہے جو کمال حیوانی ہے تو آپ براق پر اسی طرح سوار ہو گئے جس طرح آپ کی روح بشری کے احکام آپ کی روح حیوانی پر غالب آگئے اور اس پر مسلط ہو گئے لیکن آپ کا رات کو مسجد اقصیٰ لے جانا تو وہ اس لئے کہ یہ مقام شعائر الٰہی کے ظہور کا مکان ہے اور ملا اعلیٰ کے ارادوں کا تعلق گاہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کی نگاہوں کا نظارہ گاہ ہے، گویا وہ اعلیٰ کی طرف ایک روشندان ہے جہاں سے روشنی چھن چھن کر اس روشن دان کے ذریعہ اس کرۂ انسانی پر فائض ہوتا ہے، لیکن آپ کی انبیاء علیہم السلام سے

وما اختص به من بينهم من وجوه الكمال واما رقيه الى السموات سماء بعد سماء فحقيقته الانسلاخ الى مستوى الرحمٰن منزلة بعد منزلة ومعرفة حال الملائكة الموكلة بها من لحق بهم من افاضل البشر والتدبير الذي اوحاه الله فيها والاختصام الذي يحصل في ملئها، واما بكاء موسىٰ فليس بحسد ولكنه مثال لفقد عموم الدعوة وبقاء كمال لم يحصل مما هو في وجهه واما سدرة المنتهىٰ فشجرة الكون وترتب بعضها على بعض وانجماعها في تدبير واحد كانجماع الشجرة في الغاذية والنامية ونحوهما ولم تتمثل حيوانا لان التدبير الجملي الاجمالي الشبيه بسياسة الكلي افراده وانما اشبه الاشياء به الشجرة دون الحيوان، فان الحيوان فيه قوى تفصيلية والارادة فيه اصرح من سنن الطبيعة واما الانهار في اصلها فرحمة نافضة في الملكوت حذو الشهادة وحياة ونماء فلذلك تعين هنالك بعض الامور النافعة في الشهادة كالنيل والفرات واما الانوار التي غشيتها فتدليات الهية وتدبيرات رحمانية تلمعت في الشهادة حيثما استعدت لها واما البيت المعمور

ملاقات اور مفاخرت (اور امامت) تو اس کی حقیقت کو ان کا اجتماع ہے بحیثیت اس کے کہ وہ سب ایک ہی رشتہ میں حظیرۃ القدس سے مربوط ہیں اور آپ کی ان حیثیاتِ کمال کا ظہور ہے جو ان تمام پیغمبروں میں آپ کی ذات سے مخصوص تھیں لیکن آپ کا آسمانوں پر ایک ایک آسمان کر کے چڑھنا (اور فرشتوں اور مختلف پیغمبروں سے ملاقات) تو اس کی حقیقت درجہ بدرجہ رحمت کی منزلوں سے کھینچ کر عرشِ الٰہی تک پہنچنا ہے اور ہر آسمان پر جو فرشتے متعین ہیں اور کامل انسانوں میں سے جو جہاں جس جس درجہ تک پہنچ کر ان کے ساتھ مل کر گیا ہے اُن کے حالات سے اور اس تدبیر سے جو ہر آسمان میں خدا نے وحی کی اور اس مباحثہ سے جو اُس آسمان کے فرشتوں کی جماعت میں ہوتا ہے آگاہی ہے لیکن حضرت موسیٰ کا رونا تو از راہِ حسد نہ تھا بلکہ وہ اس بات کی تمثیل تھی کہ ان کو دعوتِ عامہ نہیں ملی تھی اور اس کمال کی بقا ان کو عنایت نہیں ہوئی تھی جو عمومِ دعوت سے حاصل ہوتی ہے لیکن سدرۃ المنتہیٰ تو وہ وجود کا درخت ہے، اس کا ایک دوسرے پر مرتب ہونا اور پھر ایک ہی تدبیر میں مجتمع ہونا ہے جس طرح درخت اپنی شاخوں کے بے شمار افراد کے اختلاف کے باوجود اپنی قوتِ غاذیہ اور اپنی قوتِ نامیہ کی تدبیر میں متحد و مجتمع ہوتا ہے، سدرۃ المنتہیٰ حیوان کی شکل میں نمایاں نہیں ہوا اس لئے کہ اجمالی اور مجموعی تدبیر اس طرح ہے جس طرح کلی اپنے افراد کی سیاست (اجمالی) کرتی ہے اور اس تدبیرِ اجمالی کی بہترین تشبیہ درخت ہے نہ کہ حیوان کیونکہ حیوان میں تفصیلی قوتیں ہوتی ہیں اور خصوصاً اس میں ارادہ قوتِ طبعی سے زیادہ مصرح صورت میں ہوتا ہے، لیکن نہروں کی جڑوں اور سوتوں کا وہاں نظر آنا تو وہ رحمت و حیات و نشوونما کا منبع ہے جو عالمِ ملکوت میں اسی طرح جاری ہے جس طرح عالمِ ظاہر میں، اسی لئے وہاں

فحقیقته التجلی الالٰہی الذی یتوجه الیه سجدات البشر وتضرعاتها یتمثل بیتاً علی حذو ما عندهم من الکعبة وبیت المقدس ثم اتی باناء من لبن واناء من خمر فاختار اللبن، فقال جبرئیل هدیت للفطرة ولو اخذت الخمر لغوت امتك فکان هو صلی الله علیه وسلم جامع امة ومنشأ ظهورهم وکان اللبن اختیارهم الفطرة والخمر اختیارهم لذات الدنیا وامر بخمس صلوت بلسان التجوز ونها خمسون باعتبار الثواب ثم اوضح الله مراده تدریجاً لیعلم ان الحرج مدفوع وان النعمة کاملة وتمثل هذا المعنی مستنداً الی موسی علیه السلام فانه اکثر الانبیاء معالجة للامة ومعرفة بسیاستها۔

(باب الاسراء)

بھی بعض وہ پرفیض امور نظر آئے جو یہاں اس عالم میں ہیں جیسے دریائے نیل اور نہر فرات، لیکن وہ انوار جو اس درخت کو ڈھانکے تھے تو وہ تنزلات الٰہیہ اور تجلیات رحمانیہ ہیں جو اس عالم ظاہر میں وہاں چمکتی ہیں، جہاں بندوں اُن کے قبول کی استعداد ہوتی ہے، لیکن بیت معمور تو اس کی حقیقت وہ تجلی ہے، جس کی طرف انسانوں کے تمام سجدے اور بندگیاں متوجہ ہوتی ہیں وہ گھر کی صورت میں اس لئے نمایاں ہوا کہ وہ ان قبلوں کی طرح ہو جو انسانوں کے درمیان کعبہ اور بیت المقدس کی صورت میں ہیں پھر آپؐ کے سامنے ایک دودھ کا پیالہ اور ایک شراب کا پیالہ لایا گیا، آپؐ نے دودھ پسند فرمایا تو جبرئیل نے کہا کہ فطرت کی طرف آپ نے ہدایت پائی اگر آپ شراب پسند فرماتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ آپؐ کے پسند و قبول کی امت کی پسند و قبول کہنا اس لئے تھا کہ آپ اپنی امت کے جامع و مرکز اور اس کے ظہور کے منشا و مولد تھے اور دودھ کا پیالہ پسند کرنا فطرت کا پسند کرنا تھا اور شراب کو لینا دنیاوی لذتوں کو پسند کرنا تھا اور آپؐ کو بزبان مجاز پانچ وقتوں کی نمازوں کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ درحقیقت ثواب کے اعتبار سے پچاس وقت ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے مقصد کو ذکر پچاس وقتوں سے پانچ وقت مقصود ہیں، بدفعات اور بتدریج اس لئے ظاہر کیا تاکہ یہ معلوم ہو کر (۵۰ وقت کو پانچ کر دینے میں) تنگی دور کر دی گئی ہے اور نعمت پوری ہوئی ہے اور یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مکالمہ کی طرف منسوب ہو کر اس لئے ظاہر ہوئی کہ تمام پیغمبروں میں امت کا تجربہ اور امت کی سیاست کی آگاہی ان ہی کو سب سے زیادہ تھی۔

ہم نے ارباب حال اور محدثین کے یہ انکشافات، و حقائق اور جسم و روح کے یہ گوناگوں احوال و مناظر خود انہی کی زبانوں سے بتائے اور دکھائے ہیں ورنہ ہم خود اس باب میں سلف صالحین کا عقیدہ رکھتے ہیں جو ابن اسحاق کی عبارت میں حسب ذیل ہے،

وكان في مسراه وما ذكر منه بلاء وتمحيص وأمر من أمر الله في قدرته وسلطانه، فيه عبرة لأولي الألباب وهدى ورحمة وثبات لمن آمن بالله وصدّق وكان من أمر الله على يقين فأسرى به كيف شاء وكما شاء ليريه من آياته ما أراد حتى عاين ما عاين من أمره وسلطانه العظيم وقدرته التي يصنع بها ما يريد۔

(سیرت ابن ہشام باب الاسراء)

آپ کے اس سفرِ شبانہ اور جو کچھ اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے اس میں آزمائش اور کافر و مومن کی تمیز ہے اور خدا کی قدرت اور سلطنت میں سے کوئی الٰہی شان ہے اور اس میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے اور جو اللہ پر ایمان لایا اور تصدیق کی اور خدا کے کاموں پر یقین رکھا اس کے لئے اس میں ہدایت رحمت اور ثابت قدمی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو رات کے وقت لے گیا جس طرح چاہا اور جیسے چاہا تاکہ وہ اس کو اس کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے یہاں تک کہ آپ نے خدا کی شان اور اس کی عظیم اقتدار قوت کے مناظر دیکھے جو کچھ دیکھے اور اس قدرت کو دیکھا جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔

*

قرآن مجید اور معراج

معراج کے اسرار، اعلانات، احکام، بشارتیں اور انعامات

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معراج کا بیان سورۂ اسراء (جس کو سورۂ بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں) کی صرف ابتدائی تین چار آیتوں میں ہے، یعنی:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ	پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام
الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى الَّذِیْ بٰرَكْنَا	(کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا، جس
حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ	کے گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنے بندہ کو اپنی نشانیاں
(بنی اسرائیل ع-۱)	دکھائیں، وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

لیکن ہم نے اس سورہ کو شروع سے اخیر تک بار بار پڑھا اور ہر بار اس یقین کے ساتھ ختم کیا کہ یہ پوری سورہ معراج کے اسرار و حقائق، نتائج و عبر اور احکام و اعلانات سے معمور ہے، سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سورہ کے جلی عنوانات کیا ہیں۔

(۱) یہ اعلان کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی القبلتین (یعنی کعبہ اور بیت المقدس دونوں کے پیغمبر) ہیں۔

(۲) یہود جو اب تک بیت المقدس کے اصلی وارث اور اس کے نگہبان و کلید بردار بنائے گئے تھے ان کی تولیت اور نگہبانی کی مدت حسب وعدۂ الٰہی ختم کی جاتی ہے اور آل اسمٰعیل کو ہمیشہ کے لئے اسکی خدمت گزاری سپرد کی جاتی ہے۔

(۳) کفار قریش کو اعلان کہ تمہارے پند و موعظت کا عہد گزر گیا، فیصلۂ حق کے ثبوت کے لئے جس عذاب کو تم مانگتے تھے اب وہ آتا ہے کہ رسول اب ہجرت کرتے ہیں۔

(۴) رسولوں کی سنت کے مطابق اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا اذن دیا جائے گا، جس کے بعد نافرمان قوم پر عذاب آئے گا

(۵) معراج کے احکام شرائع۔

(۶) نماز پنجگانہ کی فرضیت۔

(۷) نبوت، قرآن، قیامت اور معجزات پر اعتراضات کے جوابات۔

(۸) حضرت موسیٰ کے حالات اور واقعات سے استشہاد۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی القبلتین ہونا

حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں کا کلید بردار بنایا

تھا اور اُن کو ارضِ مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا جس کے حدود خدا نے خواب میں حضرت ابراہیمؑ کو دکھائے تھے، لیکن اسی کے ساتھ توراۃ میں بار بار اعلان کر کے یہ بھی اُن کو سُنا دیا گیا تھا کہ اگر انھوں نے خدا کے احکام کی اطاعت اور پیغمبروں کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائے گا، حضرت ابراہیمؑ کو اسماعیلؑ و اسحاقؑ دو بیٹے عطا ہوئے تھے اور ارضِ مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی شام کا ملک حضرت اسحاقؑ کو اور عرب کا ملک حضرت اسماعیلؑ کو ملا تھا، شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا، حضرت اسحاقؑ کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے (اسرائیل حضرت اسحاقؑ کے بیٹے یعقوبؑ کا لقب تھا) بیت المقدس کی تولیت عطا ہوئی تھی اور بنو اسمٰعیل کو کعبہ کا متولی بنایا گیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں جس قدر پیغمبر پیدا ہوئے اُن میں سے بنو اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس اور اسماعیل کا کعبہ تھا، گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیاء عرب یا شام میں مبعوث ہوئے وہ ان دونوں قبلوں میں سے صرف ایک کے متولی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرق اوصاف و خصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا، اسی طرح حضرت اسحاقؑ و اسماعیلؑ دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذاتِ محمدیؐ ہی کو قرار دیا یعنی حضرت ابراہیمؑ کی وراثت جو صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آتی تھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پھر ایک جگہ جمع ہو گئی اور گویا وہ حقیقتِ ابراہیمیہ جو خاندانوں اور نسلوں میں منقسم ہو گئی تھی ذاتِ محمدیؐ میں پھر یکجا ہو گئی اور آپ کو دونوں قبلوں کی تولیت تفویض ہوئی اور نبی القبلتین کا منصب عطا ہوا، یہی نکتہ تھا جس کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا اور اسی لئے معراج میں آپ کو مسجد حرام (کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے جایا گیا اور مسجد اقصیٰ میں تمام انبیاء کی صف میں آپ کو امامت پر مامور کیا گیا تاکہ آج اس مقدس دربار میں اس کا اعلانِ عام ہو جائے کہ دونوں قبیلوں کی تولیت سرکارِ محمدیؐ کو عطا ہوتی ہے اور نبی قبلتین نامزد ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں سورۂ اسراء کی ابتداء اور واقعۂ معراج کا آغاز اسی حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۚ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ (بنی اسرائیل)	پاک ہے وہ خدا جو رات کے وقت اپنے بندہ کو مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل کی ہیں تاکہ ہم اپنے اس بندہ کو اپنی چند نشانیاں دکھائیں بیشک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

بنی اسرائیل کی مدتِ تولیت کا قیام

بنو اسرائیل کو ارضِ مقدس کی تولیت کا شرف بہت سی شرائط اور معاہدوں کے ساتھ عطا ہوا تھا اور یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جب وہ غیر معبودوں کی طرف جھکیں گے اور احکامِ الٰہی کی عدم پیروی کے ملزم ہوں گے، تو یہ منصب اُن سے چھین لیا جائے گا اور محکومی و غلامی کی زنجیر اُن کی گردنوں میں ڈال دی جائے گی، حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے عہد میں

اُن کو جو نیابت اور وراثت عطا کی گئی تھی عدم ایفائے عہد کی پاداش میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (بنوخذنذر) کے ہاتھوں اُن سے چھین لی گئی، ارضِ مقدس سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے، شہر اور شلیم کھنڈر کر دیا گیا، بیت المقدس کی ایک ایک اینٹ چور چور کر دی گئی اور توراۃ کے پرزے پرزے اڑا دیئے گئے۔

اس پُرغم سانحہ پر انبیائے بنی اسرائیل نے ماتم کیا، خدا کے سامنے دست تضرع دراز کیا، بنی اسرائیل کو توبہ و انابت کی دعوت دی تو پھر اُن کو معاف کیا گیا اور ایرانیوں کے عہد میں ارضِ مقدس کی دوبارہ تولیت سے وہ سرفراز ہوئے، لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہے، بتوں کو سجدے کئے، توراۃ کے احکام سے روگردانی کی تو ان پر یونانیوں اور رومیوں کو مسلط کیا گیا جنہوں نے بیت المقدس کو جلا کر خاکستر کر دیا، یہودیوں کا قتل عام کیا، قربان گاہ کے مقدس ظروف توڑ پھوڑ دیئے۔ اب اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوتی ہے اور بنو اسرائیل کو توبہ و انابت کا آخری موقع دیا جاتا ہے، اگر انہوں نے حق پسندی کو راہ دیا تو خدا ان پر رحم فرمائے گا ورنہ ہمیشہ کے لئے اس منصب سے وہ محروم کر دیئے جائیں گے۔

چنانچہ آیاتِ بالا کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى
لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ
وَكِيْلًا. ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ
اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا. وَقَضَيْنَآ
اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ
فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا
كَبِيْرًا. فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا
عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ
فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ. وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا
ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ
بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا.
وَاِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ
اَسَاْتُمْ فَلَهَا. فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ
لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ
كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا
تَتْبِيْرًا. عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ
يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت نامہ ٹھہرایا کہ ہمارے سوا وہ کسی کو کارساز نہ بنائیں۔ اے ان لوگوں کی اولاد! جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، دیکھو کہ اُن کا جنہوں نے اپنا کارساز دوسروں کو بنا لیا تھا کیا حشر ہوا؟ تم کو اس احسان کا شکر ادا کرنا چاہئے تھا کیونکہ تمہارا باپ نوح شکر گزار بندہ تھا اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے متعلق فیصلہ کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی زیادتیاں کرو گے جب ان میں سے پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے تم پر ایسے بندوں کو کھڑا کر دیا جو بڑے سخت گیر تھے وہ تمہارے شہروں کے اندر پھیل گئے اور خدا کا وعدہ پورا ہوا پھر ہم نے تمہارے دن پھیرے اور تم کو مال و اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد بہت بڑھا دی اور کہہ دیا کہ اگر تم نے اچھے کام کئے تو اپنے ہی لئے اور برے کام کئے تو اپنے لئے پھر جب اتنا ہے؛ دوسرے فساد کا وقت آیا تو پھر ہم نے اپنے دوسرے بندوں کو کھڑا کر دیا، کہ وہ تمہارے چہروں کو خراب کر دیں اور یہ بھی بیت المقدس میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح تمہارے پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر وہ قابو پائیں اس کو

عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا۔ (بنی اسرائیل - ۱)

توڑ پھوڑ ڈالیں (اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد) ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ویسا ہی کیا تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے اور حق کے منکروں کے لئے ہم نے جہنم کا احاطہ بنا رکھا ہے۔

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی تھی، وہاں بنی اسرائیل سے تعلقات نہ تھے، اسی لیے مکی سورتوں میں بنو اسرائیل کو عموماً مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ بنو اسرائیل کو مخاطب کیا جا رہا ہے، کیونکہ اب اسلام کے نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے اور آپ کو مدینہ کی طرف، ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے جہاں ان سے تعلقات کا آغاز ہو گا اور ازسرِنو خدا کے سامنے اپنی شرمساری کے اظہار کا موقع ملے گا اور خدا ان پر اپنی رحمت کا دروازہ کھولے گا لیکن اگر انہوں نے قبولِ حق سے انکار کیا تو ان کے لئے پھر وہی سزا ہے جو ان کو اس سے پہلے دو دفعہ مل چکی ہے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے عملاً اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا اور حق کو قبول نہیں کیا، حالانکہ خدا نے ان سے کہا،

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ ۵)

تم میرا عہد پورا کرو تو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔

اس لئے خدا نے ان پر رحمت کا دروازہ نہیں کھولا اور ان کو تیسری دفعہ بھی وہی سزا ملی اور وہ مدینہ، اطرافِ مدینہ باغات وغیرہ سے بے دخل کر دیئے گئے اور بیت المقدس کی تولیت مسلمانوں کے سپرد کی گئی۔

کفارِ مکہ کے نام آخری اعلان

آج کفارِ مکہ کے نام آخری اعلان ہے، ان کا مطالبہ تھا کہ اگر اسلام سچا اور ہمارا مذہب باطل ہے تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا؛ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر عذاب آئے، ان کو یہ سنتِ الٰہی بتائی گئی کہ قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں آتا جب تک اس میں مبلغِ الٰہی مبعوث نہیں ہو لیتا اور اس کو بالکل اس کی طرف سے مایوسی نہیں ہو جاتی، اس وقت قوم کا دولت مند اور مغرور طبقہ اس حق کی بیخ کنی کے لئے آگے بڑھتا ہے، بہت سے دوسرے لوگ جن کو ان کی قوت پر بھروسہ ہوتا ہے ان کا ساتھ دیتے ہیں، مومنوں کا طبقہ جو بظاہر کمزور و ضعیف ہوتا ہے اس حق کو قبول کر لیتا ہے، ایک دنیا کے نفعِ عاجل کا طالب ہے اور دوسرا آخرت کے نفعِ جاوید کو ترجیح دیتا ہے دنیا میں بظاہر دونوں کو برابر زندگی کی نعمتیں ملتی ہیں، مگر ایک دن آتا ہے جب رات اور دن کی روشنی الگ ہو جاتی ہے، دنیا میں کوئی ایک دوسرے کا ذمہ دار نہیں، مصلح اور ہادی اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں ایمان و کفر کے وہ ذمہ دار نہیں، اس دنیا میں ہر شخص اپنا آپ ضامن ہے، اسی انکار و کفر کی بدولت قریشِ مکہ بھی تولیتِ کعبہ سے معزول کئے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو فتحِ مکہ کی خوشخبری سنائی جاتی ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا۔ وَاَنَّ

یہ قرآن وہ راستہ بتاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھا ہے اور ان مومنوں کو جو نیک کام کرتے ہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑی مزدوری ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو آخرت پر

الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ
عَذَابًا أَلِيمًا ۝ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ
دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۚ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ۝
وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ
فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ
مُبْصِرَةً لِتَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا
عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ
فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ۝ وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ
طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ۝ اقْرَأْ
كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ
حَسِيبًا ۝ مَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا
يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ
عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ
وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ۝
وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا
مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا
الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۝ وَكَمْ
أَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُونِ مِنْ بَعْدِ نُوحٍ ۗ
وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا
بَصِيرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ
عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ
ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا
مَدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا
سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ
مَشْكُورًا ۝ كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ
عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝
انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ

ایمان نہیں ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کیا ہے انسان کبھی برائی (عذاب) کو بھی اسی طرح چاہتا ہے جس طرح بھلائی کو انسان بڑا ہی عجلت پسند واقع ہوا ہے ہم نے دن اور رات کو دو نشانیاں بنایا ہے نشان شب کو ہم مٹا دیتے ہیں اور نشان روز کو روشن کر دیتے ہیں کہ اس روشنی میں اپنے خدا کی مہربانی کو ڈھونڈو اور ماہ و سال کا شمار اور حساب جانو ہم نے ہر چیز کھول کر بیان کر دی اور ہر انسان کے نیک و بد کو اسی کی گردن میں ڈال دیا ہے قیامت کے دن ہم اس کے اعمال نامہ کو نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا اور اس وقت ہم اس سے کہیں گے کہ لو اپنا اعمال نامہ پڑھو آج تم ہی اپنا حساب آپ لے لو کہ جو ہدایت کو قبول کرتا ہے وہ خود اپنے لئے کرتا ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ اپنے لئے، کوئی ایک دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھاتا اور ہم اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ایک پیغمبر نہ بھیج لیں اور جب کسی آبادی کو ہلاک کرنا ہوتا ہے تو ہم وہاں کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس میں فسق و فجور کرتے ہیں (تو اس پر قانون الٰہی کے مطابق) سزا واجب ہو جاتی ہے تو ہم اس آبادی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور یاد کرو نوح کے بعد سے ہم کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں، تیرا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں کی خبر رکھتا ہے اور دیکھتا ہے جو اس دنیا کا نفع عاجل چاہتے ہیں تو ان میں سے جس کے لئے ہم چاہتے ہیں (اسی دنیا کا نفع) عاجل اس کو دے دیتے ہیں پھر دوزخ کو اس کا ٹھکانہ بناتے ہیں جس میں وہ ہر طرح بُرا حشر کر راندۂ درگاہ ہو کر داخل ہوگا اور جو آخرت کو چاہے گا اور آخرت کے لئے کوشش کرے گا اور وہ مومن ہوگا تو اس کی کوشش خدا کے یہاں مشکور ہوگی، ہم نیک و بد ہر ایک کو تیرے پروردگار کے عطیے دیتے ہیں، تیرے پروردگار کا عطیہ محدود نہیں ہے دیکھو! ہم نے کیوں کر دنیا میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے لیکن سب

وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا۔

(بنی اسرائیل ۲)

سے بڑا درجہ اور مرتبہ آخرت کا درجہ اور مرتبہ ہے۔

معراج کے احکام ووصایا یہود اور قریش دونوں کی معزولی کے بعد بیت المقدس اور خانۂ کعبہ دونوں کی تولیت کا منصب عطا کرنے کے لئے شہنشاہِ عالم اپنے بندۂ خاص کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے اور اس روحانی حکومت کے شرائط واحکام کا ایک نسخہ عطا کرتا ہے، جیسا کہ اس موقع پر حضرت موسیٰؑ اور دوسرے پیغمبروں کو عطا ہوا تھا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا۔ وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا۔ وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا۔ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ قَوْلًا مَيْسُورًا۔ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا۔ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا۔ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا۔ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا۔

خدا کے سوا کسی اور کو خدا نہ بنانا ورنہ تو بُرا ٹھہرے گا اور بے یار و مددگار رہ جائے گا اور تیرے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اگر ان میں ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کی بات میں اُف تک نہ کرنا اور ان کو نہ جھڑکنا ان سے ادب کے ساتھ بات کرنا اور ان کے سامنے نرم دلی سے اطاعت کا بازو جھکا دینا اور ان کے حق میں یہ دعا مانگنا کہ پروردگار میرے والدین پر اسی طرح رحم فرما جس طرح انہوں نے جب میں چھوٹا تھا مجھ پر رحم کیا تھا تمہارا پروردگار تمہارے دلوں کے راز سے خوب واقف ہے، اگر تم نیک ہو تو وہ توبہ کرنے والوں پر بخشش کرتا ہے اور قرابت دار کو اس کا حق ادا کر اور غریب ومسافر کا حق بھی دے اور فضول خرچی نہ کیا کر، فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے آقا کا بڑا ہی ناشکر گزار ہے، اگر اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تجھ کو توقع ہو ان مستحقین میں سے کسی سے تجھ کو منہ موڑنا پڑے تو ان کو نرمی سے سمجھا دے اور اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ لے کہ گویا گردن میں بندھا ہے اور نہ اتنا پھیلا ہی دے کہ ہر طرف سے تجھ کو لوگ ملامت کریں اور تو تہی دست ہو جائے تیرا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے کم کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال کا دانا و بینا ہے اور تم افلاس کے ڈر سے اپنے بچوں کو قتل نہ کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا قتل کرنا درحقیقت بڑا گناہ ہے

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

(بنی اسرائیل-۴)

اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے اور جس جان کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرنا اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو اس کے ولی وارث کو قصاص کا حق ہم نے دیا ہے تو چاہیے کہ وہ اس میں زیادتی نہ کرے کیونکہ اسی میں اس کی جیت ہے اور یتیم جب تک اپنی عقل و شعور (جوانی) کو نہ پہنچ جائے اس کے مال و جائیداد کے قریب بھی نہ جانا لیکن اس طریقہ سے جا سکتے ہو جو اُن کے حق میں بہتر ہو، عہد کو پورا کیا کرو کہ اُس کی باز پرس ہوگی اور جب ناپ کرو تو پورا ناپ کرو اور تول کرو تو سیدھی ترازو سے تول کر دو، یہ طریقہ اچھا ہے اور اس کا انجام بھی بہتر ہے اور جس بات کا تجھ کو علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ ہولے، کیونکہ کان، آنکھ، دل سب سے مواخذہ ہوگا اور زمین میں اکڑ اکڑ نہ چل کر تو اس چال سے نہ زمین کو چیر ڈالے گا اور نہ پہاڑوں کے برابر اونچا ہو جائے گا ان تمام باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، یہ تمام احکام دانشمندی کی ان باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں اور خدا کے ساتھ کوئی اور دوسرا خدا نہ بنائے ورنہ تو ملامتی اور راندۂ درگاہ ہو کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

ان احکام کی تفصیل کے بعد آخر میں خدا فرماتا ہے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ (بنی اسرائیل-۴)

یہ تمام باتیں دانشمندی کی اُن باتوں میں سے ہیں جو خدا نے تم پر وحی کی ہیں۔

معراج کے روحانی احوال کی تشریح کے ضمن میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے۔

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۔

پھر خدا نے اپنے بندہ کی طرف وحی کی جو کچھ کہ وحی کی۔

اس اجمال اور ابہام کے اندر جس قدر احکام و شرائع کا حصہ تھا، شاید وہ یہی ہیں جن کی اس مقام پر تفصیل کی گئی ہے۔

ان آیتوں میں جو احکام مذکور ہوئے وہ تعداد میں بارہ ہیں اور یہی احکام دوازدہ گانہ درحقیقت دنیا

کے تمام خیر و شر کی بنیاد و اساس ہیں، کوئی اخلاق کی تفصیل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے تاہم ان احکام دہ گانہ کے حلقہ سے باہر نہ نکل سکے گا، مختصر اور سادہ عبارت میں یہ احکام حسب ذیل ہیں۔

(۱) شرک نہ کرنا۔
(۲) ماں باپ کی عزت و اطاعت کر
(۳) حق والوں کا حق ادا کر۔
(۴) اسراف نہ کر اور افراط و تفریط کے بیچ میں اعتدال اور میانہ روی کی راہ چل۔
(۵) اپنی اولاد کو قتل نہ کر۔
(۶) زنا کے قریب نہ جانا۔
(۷) ناحق کسی کی جان نہ مارنا۔
(۸) یتیم سے بہتر سلوک کر۔
(۹) اپنا عہد پورا کر کہ تجھ سے اس کی پوچھ ہوگی، (۱۰) ناپ تول میں پیمانہ اور ترازو کو بھرپور رکھ۔
(۱۱) نامعلوم بات کی پیروی نہ کر۔
(۱۲) زمین پر مغرور نہ بن۔

یہ انہی احکام عشرہ کا نقش ثانی اور تکملہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور کی معراج میں عطا ہوئے تھے (توراۃ سفر استثناء ۵، ۶)

(۱) میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو۔
(۲) تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (یعنی جھوٹی قسم نہ کھا)
(۳) سبت کی دن کی یاد کر۔
(۴) اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے۔
(۵) تو خون مت کر۔
(۶) تو زنا نہ کر۔
(۷) تو چوری نہ کر۔
(۹) تو اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ۔
(۱۰) تو اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر۔

سورہ کے آخر میں حضرت موسیٰؑ کو جو یہ احکام عشرہ ملے تھے اُن کی طرف اشارہ آئے گا۔

ہجرت اور عذاب

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالم مادی میں کچھ طبعی و فطری قوانین مقرر کر دیئے ہیں جن میں عموماً تخلف نہیں ہوا کرتا، اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس نے کچھ اصول و قوانین بنا دیئے ہیں جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا، منجملہ ان اصول و قوانین کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو ہر طرح اس کو سمجھایا جاتا ہے، تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کیا جاتا ہے شریر قوم معجزات طلب کرتی ہے، بالآخر اس کے سامنے معجزے پیش کئے جاتے ہیں اور جب اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہوتا ہے، اور اس کے بعد اُس بدبخت قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے چنانچہ انبیائے کرام کی سیرتیں اس اصول کی بہترین تشریح ہیں، آج اسی قاعدہ کی تعمیل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے آپ کو معراج کی سب سے بڑی نشانی عطا کی گئی مگر اس کو بھی وہ جھٹلاتے ہیں۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا

دنیا میں نافرمانوں کی کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کر ڈالیں، اس پر سخت عذاب نہ نازل

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۔ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۔

کریں، یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے اور ہم کو فرمائشی معجزات کے بھیجنے سے سوا اس کے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اگلوں نے بھی ان نشانیوں کی فرمائش کی اور جب ہم نے اُن کو بھیجا تو انھوں نے جھٹلا دیا، ہم نے ثمود کو ناقہ کی سوجھانے والی نشانی دی تو انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم ان نشانیوں کو ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں یاد کرو اے پیغمبر! کہ یہ کفار تیری ایذا بلکہ قتل کے درپے ہیں لیکن ہم نے تجھ سے کہہ دیا کہ تیرا رب لوگوں سے تیری حفاظت کئے ہوئے ہے اور ہم نے (معراج کی جو) رویا تجھ کو دکھائی تو وہ لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور اسی طرح اس درخت کا ذکر جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے وہ بھی لوگوں کے لئے آزمائش ہے اور ہم ان کو آئندہ عذاب سے ڈراتے ہیں لیکن اس سے ان کی سرکشی میں اور ترقی ہوتی جاتی ہے،

(بنی اسرائیل - ۶۰)

اس لئے حضرت آدم اور شیطان کے قصہ سے اس واقعہ پر استدلال ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے،

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۤ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۔ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۔ وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۔ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۔

ہم نے جو تم پر وحی کے ذریعہ سے نازل کیا ہے قریب تھا کہ لوگ تم کو اس سے آزمائش میں ڈال دیں کہ اس وحی کے علاوہ تم کوئی اور وحی بنا کر ہماری طرف جھوٹ منسوب کر دو اور اس وقت وہ تم کو اپنا دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ جھک چلے تھے اگر تم ایسا کرتے تو ہم تم کو زندگی اور موت کے دوگونہ عذاب کا مزہ چکھا دیتے اور پھر تم کو میرے مقابلہ میں اپنے لئے کوئی مددگار بھی نہ ملتا اور وہ تم کو اس سرزمین (مکہ) سے قریب ہے کہ دل برداشتہ کر دیں تاکہ تم کو یہاں سے نکال دیں اگر ایسا ہوا تو پھر وہ تمہارے چلے جانے کے بعد اطمینان سے بہت کم رہ سکیں گے، تم سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے ہیں سب کے ساتھ یہی دستور رہا ہے اور تم ہمارے دستور میں ردوبدل نہ پاؤ گے،

(بنی اسرائیل - ۸۰)

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوگا کہ معراج ہجرت سے کچھ ہی پہلے کا واقعہ ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کی وہ نشانی تھی جس کے نہ تسلیم کرنے پر عذاب

الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

نماز پنجگانہ کی فرضیت

اوپر گزر چکا ہے کہ نماز پنجگانہ اسی معراج میں فرض ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا ۝ وَمِنَ اللَّیْلِ فَتَھَجَّدْ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (بنی اسرائیل - ٩)

آفتاب کے ڈھلنے کے وقت (ظہر، عصر، مغرب) سے لے کر رات کے اندھیرے (عشا) تک نمازیں پڑھا کر، اور صبح کی نماز میں حضور قلب خوب ہوتا ہے اور رات کے ایک حصہ میں تہجد پڑھ لیا کرو، تمہارے لئے نفل ہے، عجب نہیں کہ تمہارا پروردگار تم کو مقام محمود میں پہنچا دے۔

لفظ لدلوک الشمس (آفتاب کے ڈھلنے کے وقت) میں ظہر، عصر اور مغرب، نماز کے تین اوقات کی تعیین کی طرف لطیف اشارہ ہے، یہ معلوم ہے کہ دین محمدی ملت ابراہیمی کا نقش ثانی ہے، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں آفتاب پرستی اور ستارہ پرستی عام تھی اور جس کی رسم کہن دنیا میں آج بھی قائم ہے، اس مذہب میں آفتاب کی پرستش کے وہ اوقات تھے جن میں اس کی روشنی کا ظہور یا کمال ہوتا ہے اور اسی لئے طلوع سے لے کر نصف النہار تک اس کی پرستش کی جاتی ہے، امت ابراہیمی نے اس کے برخلاف اپنے لئے وہ اوقات متعین کئے جو آفتاب کے زوال کے ہیں، یعنی سورج ڈھلنے سے لے کر آفتاب کے غروب تک کہ یہ تمام اوقات اس کے انحطاط نور اور زوال کے ہیں، آفتاب کے انحطاط اور زوال کی تین منزلیں ہیں، ایک وہ جب سمت الراس (سر) سے وہ ڈھلتا ہے (یہ ظہر کا وقت ہے) اور دوسری منزل وہ ہے جب وہ برابر کی نگاہ سے نیچے اترتا ہے (یہ عصر کا وقت ہے) اور تیسری منزل وہ ہے جب وہ سمت افق سے نیچے گر جاتا ہے اور یہ مغرب کا وقت ہے، چوتھی نماز کا وقت رات کی تاریکی کا مقرر کیا ہے، جب آفتاب کے بقیہ وجود کی سرخ نشانی جس کو عرف عام میں شفق کہتے ہیں وہ بھی مٹ جاتی ہے اور صبح کی نماز ادبار النجوم یعنی ستاروں کی روشنی کے ماند ہونے کے بعد ہے، غرض آیات بالا میں پنجگانہ نماز کی فرضیت نہایت لطیف اور خوبی سے ادا کی گئی ہے (یہ نکتہ مخدومی مولانا حمید الدین صاحب مفسر نظام القرآن کا افادہ ہے)۔

ہجرت کی دعا

اس کے بعد ہجرت کے لئے دعا بتائی جاتی اور اس کے بعد فتح مکہ کی فوراً بشارت بھی سنائی جاتی ہے کہ نماز کے ساتھ فوراً قبلہ کا خیال آتا ہے جہاں اس وقت تین سو ساٹھ بت پوجے جا رہے تھے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا، قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ

اے پیغمبر! یہ دعا مانگو کہ خداوندا! مجھے اچھی جگہ پہنچائیو اور وہاں سے اچھی طرح نکالیو اور دشمنوں پر اپنی طرف سے فتح و نصرت دیجیو اور اے پیغمبر! اعلان کر دے کہ حق آگیا اور باطل

---

[1] صحیح بخاری و مستدرک حاکم کتاب الہجرۃ (صحیح ترمذی تفسیر سورۃ مذکور) و مسند احمد عن ابن عباس۔

الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (بنی اسرائیل۔ ۹) مٹ گیا، باطل کو مٹ ہی جانا تھا۔

یہ آخری الفاظ اسلام کے ایک نئے دور کی بشارت اور فتح مکہ کی نوید ہیں، اس سے فتح مکہ کے دن جب خلیل بت شکن کا گھر بتوں سے پاک کیا جا رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یہی آیت جاری تھی[1]۔

نبوت، قرآن، قیامت، معراج اور معجزات پر اعتراض

کفارِ مکہ کو ان مسائل پر جو معاندانہ اعتراضات تھے، اس موقع پر جب پیغمبر کی ہجرت اور ان کے لئے عذابِ الٰہی کا نزول کا وقت قریب آرہا ہے، اُن کے جوابات دیئے جارہے ہیں کہ اب بھی اُن کی تشفی ہوجائے تو یہ بلائے آسمانی جو پیغمبر کے ہجرت کرتے ہی ان پر نازل ہونا شروع ہوجائے گی وہ رک جائے۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ، وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا. قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا. وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ، قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا. وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا. إِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ، إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا. قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا. وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا. وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا. أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا. أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ

(اور کفارِ قریش اپنے مال اور دولت پر بھولے ہوئے ہیں) انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس پر انعام کرتے ہیں تو الٹا ہم سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرتا ہے اور جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو آس توڑ بیٹھتا ہے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دے کہ اپنے اپنے طور پر عمل کئے جاؤ، تمہارا پروردگار اُن کو خوب جانتا ہے جو زیادہ سیدھے راستہ پر ہیں۔ وہ تم سے روح امین[2] کی (جو قاصدِ وحی ہے) حقیقت دریافت کرتے ہیں کہہ دے کہ وہ میرے پروردگار کی ایک بات ہے اور تم کو علم نہیں دیا گیا ہے لیکن بہت تھوڑا۔ اسی وحی کے معجزۂ صداقت کے لئے یہ بات کیا کم ہے کہ باوجود اُمی ہونے کے وہ لفظ بہ لفظ تم کو یاد ہے اگر ہم چاہیں تو جو کچھ ہم نے تم پر وحی کی وہ سب تمہارے سینہ سے لے جائیں پھر تم کو اس کے لئے ہمارے مقابل کوئی حمایتی بھی نہ ملے لیکن یہ تیرے پروردگار کی رحمت ہے (کہ اس کا لفظ لفظ تم کو محفوظ ہے) بے شک اس کی تم پر بڑی مہربانی ہے۔ (ان شک کرنے والوں سے) کہہ دو کہ اگر تمام انس و جن بھی اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کی طرح کا کوئی اور کلام بنا لائیں تو یہ ناممکن ہے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی پشتی پر کیوں نہ ہوں، باوجودیکہ ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے سمجھنے کے لئے ہر قسم کی مثالیں طرح طرح سے بدل کر بیان کیں، مگر اکثر لوگ انکار کئے بدون

---

[1] صحیح بخاری باب فتح مکہ و تفسیر آیت مذکور۔
[2] یہاں مصنف نے روح سے روح امین یعنی جبریل مراد لیا ہے ورنہ عام تر تفاسیر اور روایات میں اس سے ارواح مراد ہے اور یہ سوال ہی کیا ہے جس کے متعلق یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ بخاری صفحہ [illegible] کتاب التفسیر

عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۔ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۔ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا ۔ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۔ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۔ قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ۔

(بنی اسرائیل ۔ ۱۰)

دے اور یہ کفار مکہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ نہ بہادو یا کھجوروں سے اور انگوروں کا ایک باغ تمہارے لئے ہو جائے اور تم اس میں نہریں بہادو یا یہ کہ جیسا تم کہتے ہو کہ ہم ایمان نہ لائیں گے تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑے گا تو ہم پر آسمان کے ٹکڑے گراؤ یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے کھڑا کردو یا یہ کہ تمہارے رہنے کے لئے ایک سونے کا گھر بن جائے یا آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کو بھی ہم اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک وہاں سے ہم پر کوئی ایسی کتاب اتار نہ لاؤ جس کو ہم پڑھیں، کہہ دے کہ سبحان اللہ! میں تو خدا کا ایک قاصد بندہ ہوں، ہدایت آجانے کے بعد لوگوں کو اس کے قبول سے بجز اس کے کوئی امر مانع نہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بشر کو اپنا قاصد بنایا ہے، کہہ دو کہ اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو ہی ان کے پاس قاصد بنا کر بھیجتے، کہہ دو کہ دلیلوں اور حجتوں کا وقت گزر گیا اب میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کے لئے خدا بس ہے، وہ اپنے بندوں کے حال کا دانا و بینا ہے جس کو وہ راستہ دکھائے وہی راہ راست پر ہے اور جن کو وہ گمراہ کرے تو اس کے سوا ان کا کوئی یار و مددگار نہیں پھر ہم انہیں قیامت کے دن اندھے منہ اندھے اور بہرے کر کے اٹھائیں گے کہ وہ اس دنیا میں حق کے دیکھنے اور سننے سے اندھے اور بہرے تھے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا، جب وہ بجھنے کو ہوگی تو ہم پھر اس کو بھڑکا دیں گے، یہ ہماری نشانیوں کے انکار کا بدلہ ہوگا اور وہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم مر کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر از سر نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے، کیا یہ ممکن ہے؟ کیا وہ نہیں سمجھے کہ وہ خدا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا وہ بے شک اس پر قادر ہے کہ وہ ان جیسے آدمی پھر پیدا کر دے اور اس نے

ان کے لئے ایک میعاد مقرر کر رکھی ہو جس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ ظالم انکار کئے بدون نہ رہے (اے پیغمبر!)
یہ کفار منکر حسد سے تم پر ایمان نہیں لائے کہ تم کو اور تمہارے خاندان کو یہ شرف کیوں عطا ہوا ہے) ان سے
کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کا خزانہ تمہارے قبضہ میں ہوتا تو بے شک تم اس کے خرچ ہو جانے کے ڈر سے
اس کو روکے رہتے اور سچ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل ہے۔

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمان پر تشریف لے جانے پر بھی یقین نہیں رکھتے ہیں یعنی واقعہ معراج کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اس واقعہ کو ہم اس وقت تک تسلیم نہیں کریں گے جب تک آپ ہمارے سامنے آسمان پر نہ چڑھ جائیں اور وہاں سے پورا قرآن مکمل لکھا ہوا لا کر ہمارے ہاتھ میں نہ دے دیں۔

حضرت موسیٰؑ کے واقعات اور حالات سے استشہاد

حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ زندگی میں متعدد حیثیتوں سے مماثلت ہے اور خود قرآن مجید نے اس مماثلت کو ظاہر کر دیا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (مزمل-۱)	(لوگو!) ہم نے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا اسی طرح تمہاری طرف بھی ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے۔

اسی سبب سے قرآن مجید میں بار بار حضرت موسیٰؑ کے قصہ کو دہرایا گیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے اندر زندگی بسر کی یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار کو ہر طرح سمجھایا مگر وہ ایمان نہ لائے اور بالآخر حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنا پڑی، اسی طرح صنادید قریش بھی آپ پر ایمان نہ لائے اور بالآخر آنحضرت نے صحابہؓ کو لے کر مکہ سے ہجرت فرمائی، جس طرح ہجرت سے کچھ پہلے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر خدا کی ہمکلامی نصیب ہوئی اور احکام عشرہ عطا ہوئے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے معراج ہوئی اور احکام دوازدگانہ عطا ہوئے، جس طرح حضرت موسیٰؑ کی ہجرت کے بعد فرعونیوں پر بحرِ احمر کی سطح پر عذاب نازل ہوا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد صنادید قریش پر بدر کے میدان میں عذاب آیا اور جس طرح اس کے بعد فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے، اسی طرح مکہ معظمہ کی حکومت بھی ہجرت کے بعد آپ کو عطا کی گئی۔

ان امور کو پیش نظر رکھ کر کفارِ قریش کو معلوم ہونا چاہئے کہ قانونِ الٰہی معراج کے بعد ہجرت کا حکم دے گا اور اس کے بعد ان پر عذاب الیم کا نزول ہو گا، چنانچہ سورۂ اسراء کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَىٰ مَسْحُورًا ۔ قَالَ لَقَدْ	اور ہم نے (کوہ طور پر) موسیٰ کو کھلے احکام دیئے (جس طرح محمد کو معراج میں عطا کئے) تو پوچھ لو بنی اسرائیل سے کہ جب موسیٰ بنی اسرائیل کے پاس آیا تو فرعون نے اس سے کہا کہ اے موسیٰ!

عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ
يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ۝ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ
مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ
جَمِيْعًا ۝ وَّقُلْنَا مِنْ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ
جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝

بنی اسرائیل۔ ۱۲)

میں سمجھتا ہوں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے (تمہاری عقل کھو دی ہے) موسیٰؑ نے کہا اے فرعون! تجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ان حکموں کو آسمان اور زمین کے مالک کے سوا کسی اور نے ان کو دانائی بنا کر نہیں اتارا ہے اور اے فرعون! میں سمجھتا ہوں کہ تم اب ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے۔ فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھیڑ دے تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو سب کو غرق کر دیا اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم ملک میں رہو جب قیامت کا وعدہ پورا ہوگا تو سب کو سمیٹ کر ہم اپنے حضور میں لائیں گے۔

ان آیتوں کے آغاز میں جن نو نشانیوں کے دیئے جانے کا حکم ہے بعض مفسرین نے اس سے حضرت موسیٰؑ کے نو معجزات مراد لئے ہیں، مگر بعض احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو وہ سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا) اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰؑ کو نو آیتیں کون سی دی گئیں؟ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں (کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زنا نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، چوری نہ کرو، جادو نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، سود نہ کھاؤ، کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدان جہاد سے نہ جاؤ (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود! یہ دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو[1] یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔

یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر میں ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے، ایک تفسیر بنی اسرائیل میں اور دوسرے باب ما جاء في قبلة اليد والرجل میں اور دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"۔

اس حدیث میں جن دس احکام کی تفصیل ہے اور موجودہ ترجمۂ توراۃ میں یہ احکام جن الفاظ میں مذکور ہیں ان میں کسی قدر فرق ہے۔ خصوصاً حدیث کا نواں حکم جس کے متعلق شعبہ راوی خود اقرار کرتے ہیں کہ اس کو یہ نویں بات اچھی طرح یاد نہیں، یہ نواں حکم دراصل ماں باپ کی اطاعت اور عزت ہے، باقی احکام وہی ہیں جو توراۃ میں مذکور ہیں، صرف طریقۂ ادا اور تعبیر کا فرق ہے، توراۃ کے موجودہ تراجم لفظی تو ہیں نہیں علاوہ ازیں اس حدیث کے ایک راوی عبد اللہ بن سلمہ کا حافظہ اچھا نہ تھا۔ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں اس کی تصریح کی ہے۔ بہرحال اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ان احکام عشرہ اور آنحضرت

---

[1] سبت کا حکم خاص یہود کے لئے تھا اس لئے شمار میں اس کو چھوڑ دیا گیا ہے جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوگا۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام دوازدگانہ میں ایک وجہ مماثلت ہے، اس لئے ان دونوں کے منکروں کا ایک ہی حال ہوگا۔

معراج کے انعامات

ان احکامات، بشارت اور نماز پنجگانہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اور خاص عطیے عنایت ہوئے، ایک یہ بشارت کہ امت محمدیہ میں سے جو شرک کا مرتکب نہ ہوگا، دامن مغفرت کے سایہ میں اس کو پناہ مل سکے گی، دوسرے سورۂ بقرہ کا اختتامی رکوع اسی بارگاہ میں فرمان خاص کے طور پر مرحمت ہوا، اس رکوع میں سب سے پہلی مرتبہ ایمان کی تکمیل کے اصول اور عفو و مغفرت کے سبق انسانوں کو سکھائے گئے ہیں، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پہلے عطیہ کی بشارت بھی درحقیقت انہی آیات میں مذکور ہے۔

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۔

(بقرہ - ۴۰)

پیغمبر اس پر ایمان لایا جو اس پر اترا اور تمام مسلمان بھی اس پر ایمان لائے، یہ سب کے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے اور کہتے ہیں کہ ہم خدا کے پیغمبروں میں یہ تفریق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے خدا کے احکام کو سنا اور ان کی اطاعت کی تو اے ہمارے پروردگار! ہم پر بخشش فرما اور تیری ہی طرف آخر لوٹ کر جانا ہے، خدا کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا جس نے اچھے کام کئے اور اپنے ہی لئے کئے اور برے کام کئے تو اس کا نقصان بھی وہی اٹھائیگا اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں تو اس کی بازپرس ہم سے نہ کر، اے ہمارے پروردگار! ہم پر اس طرح کا بوجھ نہ ڈال جس طرح ہم سے پہلوں پر تو نے ڈالا ہے، اے ہمارے پروردگار! اور اتنا بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہم سے نہ اٹھوا اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما، ہمارے قصوروں کو معاف کر اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا پروردگار ہے تو ان لوگوں کے مقابلہ میں جو تیرے منکر ہیں ہماری مدد فرما۔

معراج کا پُراسرار منظر

سورۂ اسراء کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے معراج کے روحانی مناظر کا بیان صرف دو لفظوں میں ختم کر دیا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم باب الاسراء اس روایت میں یہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں مرحمت ہوئیں، یہ تفصیل نہیں کہ وہ کس قدر آیتیں ہیں لیکن حدیث کی دوسری کتابوں میں جن خواتم سورۂ بقرہ کی فضیلت آئی ہے وہ یہی ہیں۔

لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا۔ (اسراء)

ہم نے اپنے بندہ کو یہ سیر اس لئے کرائی کہ ہم اپنی کچھ نشانیاں اس کو دکھائیں۔

یہ نشانیاں کیا تھیں؟ کیا اُن کی تفصیل کے لئے عاجز و درماندہ انسان کی زبان میں کچھ الفاظ ہیں؟ ہاں ہیں، مگر تمام ہماری فہم، ہمارا علم، ہمارا خیال، ہمارا قیاس، غرض جو کچھ ہمارے پاس ہے، اس کا دائرہ ہمارے محسوسات اور ہمارے تعقلات سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور ہمارے ذخیرۂ لغت میں صرف ان ہی کے لئے کچھ الفاظ ہیں۔ اس بنا پر وہ معانی جو نہ عام محسوساتِ انسانی کی حدود میں داخل ہیں اور نہ تعقل و تصور کے احاطہ کے اندر ہیں، وہ الفاظ و کلمات میں کیونکر سما سکتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے کمال قدرت سے ان کو حروف و کلمات کا جامہ پہنا بھی دے تو دماغِ انسانی ان کے فہم و تحمل کی قدرت کہاں سے لائے گا؟

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (اسراء)

اے انسانو! تم کو علم کا بہت تھوڑا سا حصہ عطا کیا گیا ہے۔

اسی لئے سورۂ والنجم میں جہاں ان اسرار کے چہرہ سے کچھ پردہ ہٹایا گیا ہے ایسی تفصیل ہے جو تمام تر اجمال ہے اور ایسی توضیح ہے جو سرتاپا ابہام ہے، دو دو لفظ کے فقرے ہیں، ضمیریں محذوف ہیں، فاعل کا ذکر ہے تو مفعول کا نہیں، مفعول بیان ہوا ہے تو فاعل نہیں، متعلقاتِ فعل کی تشریح نہیں، ضمائر کے مرجعوں کی تعیین نہیں کیوں؟ اس لئے کہ اس مقام کا مقتضا یہی ہے ع۔

عبارت از سخنداں ہم نہ گنجد

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔
عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى۔ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى۔
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى۔ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى۔ فَكَانَ قَابَ
قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى۔ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى۔
مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى
مَا يَرٰى۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى۔ عِنْدَ
سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى۔
اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى۔ مَا زَاغَ
الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى۔ لَقَدْ رَاٰى مِنْ
اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى۔

(سورۂ والنجم۔ ۱)

قسم ہے ستارہ کی جب وہ گرے کہ تمہارا رفیق (محمدؐ)، نہ تو بھٹکا ہے اور نہ بہکا ہے اور نہ وہ یہ باتیں اپنے دل سے بنا کر کہتا ہے بلکہ وہ تو وحی ہے جو اس کو بتایا جاتا ہے اس کو تو بڑی طاقتوں والا اور بڑی عقل والا تعلیم دیتا ہے وہ آسمان کے اونچے کنارے میں سیدھا ہو کر نمودار ہوا، پھر قریب آیا اور جھکا تو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا، اس سے بھی کم، پھر اس کے بندے سے جو باتیں کہیں، دل نے جو دیکھا اس نے جھوٹ بیان نہیں کیا اے لوگو کیا وہ جو دیکھتا ہے اس پر تم اس سے نزاع اور مناظرہ کرتے ہو، اس نے یقیناً دوبارہ اس کو اترتے دیکھا، انتہا کے درخت کے پاس جس کے قریب نیک بندوں کے رہنے کی جنت ہے جب بیری کے درخت پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا، نظر بہکی نہ اچٹی، اس نے یقیناً اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معراج کے روحانی مشاہدات و مناظر اور ملکوتی آیات و مظاہر کا قریش سے تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ راہِ حق سے دیدہ و دانستہ (غوایت)، یا نادانستہ (ضلالت) بھٹک گیا ہے یا اپنے

دل سے بنا کر یہ جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے۔ یہ انھوں نے کیوں کہا؟ اس لئے کہ روحانی جلووں کے دیکھنے کی ان کے پاس آنکھیں نہ تھیں، صوتِ سرمدی کے سننے کی ان کے کانوں میں طاقت نہ تھی، اسرارِ ملکوتی کے سمجھنے کے لئے ان کے سینوں میں دل نہ تھے۔ خدا نے کہا یہ جو کچھ تھا اور جو کچھ معلوم ہوا یہ بڑی طاقت و قدرت اور علم و عقل والی ہستی کی جلوہ انگیزیاں تھیں، وہ کبھی اتنا دور تھا کہ آسمان کے کناروں میں نظر آیا اور کبھی اتنا قریب کہ دو کمانوں کے فاصلہ سے بھی قریب تر تھا۔ کون جھکا؟ کون قریب آیا؟ کون دو کمانوں کے فاصلہ تک آکر رہ گیا؟ کیا خدا؟ نہیں! کیا جلوۂ خدا؟ شاید! کس نے باتیں کیں؟ معلوم نہیں! کیا باتیں کیں؟ بتائی نہیں! سدرۃ المنتہیٰ کیا ہے؟ انسانی فہم و ادراک کی سرحد کے اخیر پر ایک درخت[1]۔ کیا اس کو شئون و صفات الٰہی کی نیرنگی نے ڈھانک لیا[2]؟ کیا انسانی فہم و ادراک کی اخیر سرحد کا درخت صرف شئون و صفات کی نیرنگی کا مظہر ہے؟ کیا یہاں پہنچ کر کون و مکان اور وجوب و امکان کا عقدۂ مشکل حل ہو گیا؟ کیا دل بھی دیکھتا ہے؟ حضورؐ نے دل کی آنکھوں سے کیا دیکھا؟ دیدۂ چشم سے کیا نظر آیا؟ آپ کو اس سفر میں آیاتِ ربانی دکھائی گئیں، مگر یہ مشاہدۂ قلب تھا یا معائنۂ چشم؟ ع

راز ایں پردہ نہان است و نہان خواہد بود

*

---

[1] اکابر تابعین سے یہی روایت طبری نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کی ہے [2] بخاری شریف میں ہے فغشیها من امر اللّٰہ ما غشی۔ یعنی جلوۂ الٰہی اس پر چھا گیا۔

شرحِ صدر یا شقِ صدر

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ

کیا اے پیغمبر! ہم نے تیرے سینے کو کھول نہیں دیا؟

منجملہ نبوت کے اُن خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں، شقِ صدر یا شرحِ صدر بھی ہے چنانچہ یہ رتبۂ خاص پیش گاہِ الٰہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوا، شقِ صدر سے مراد یہ ہے کہ سینۂ مبارک کو چاک کر کے اس کو بشری آلودگیوں سے پاک اور ایمان و حکمت کے نور سے منور کیا گیا، بعض روایتیں ایسی بھی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ معراج سے پہلے بھی یہ کیفیت آپ پر گزری تھی، ان روایتوں میں بعض جزئیات کی تفصیل اور وقت کی تعیین میں اختلافات ہیں، چنانچہ تمام روایتوں کے جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپ پر اس کیفیت کا گزرنا ظاہر ہوتا ہے، ایک جب آپ چار پانچ سال کے تھے، اور حضرت حلیمہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے، دوسرے جب عمر شریف دس برس کی تھی، تیسرے جب آپ بیس برس کی عمر کو پہنچے، چوتھے جب حضرت جبرئیلؑ سب سے پہلی دفعہ وحی لے کر آئے، پانچویں معراج کے موقع پر۔

یہ مسئلہ کہ شقِ صدر واقع ہوا تمام صحیح روایتوں سے ثابت ہے اور اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، البتہ وقت کی تعیین اور بعض جزئیات کی تفصیل میں روایتیں مختلف ہیں۔ تیسری دفعہ کی روایت میں جس میں بیس برس کی عمر میں اس کیفیت کا گزرنا بیان کیا گیا ہے، محدثینؒ بلکہ خود اربابِ سِیَر کے نزدیک قطعاً غیر ثابت ہے، باقی چار موقعوں کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے جو ہر اختلافِ روایت کو ایک نیا واقعہ تسلیم کر کے مختلف روایتوں میں توفیق اور تطبیق کی کوشش کرتے ہیں تسلیم کیا ہے[1]، امام سہیلی روض الانف میں صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں، ایک دفعہ صغر سنی میں اور دوسری دفعہ معراج میں، اور اس کی مصلحت یہ بتائی ہے کہ صغر سنی میں اس لئے یہ ہوا کہ بچپن ہی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے زائد کے حصہ کو نکال دیا جائے، اور معراج کے وقت تو ظاہر ہے کہ اس لئے تاکہ حضور ربانی کے موقع پر حکم صلوٰۃ کا جو طہارت محض ہے تحمل کیا جائے اور ملائکہ الٰہی کی امامت نماز میں فرما سکیں (ص ۱۰۱ مصر) لیکن یہ بات ہر شخص کو کھٹک سکتی ہے کہ سینۂ مبارک کا آلودگیوں سے پاک و صاف ہو کر منور ہو جانا ایک ہی دفعہ میں ہو سکتا ہے اور وہ ایک دفعہ پاک و منور ہو کر پھر دوبارہ پاکی و طہارت کا محتاج نہیں ہو سکتا، اس بنا پر بعض محدثین جیسے قاضی عیاض وغیرہ اس کو ایک ہی دفعہ کا واقعہ سمجھتے ہیں اور وہ صغر سنی میں جب آپ حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پا رہے تھے اور معراج کے موقع پر شقِ صدر کے واقعہ کو راویوں کا سہو

---

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۴۰۹ مصر، شرح زرقانی بر مواہب ج ۱ ص ۱۵۰۔

جاتے ہیں۔ لیکن یہ پوشیدہ نہیں کہ واقعہ شقِ صدر کی روایت جن طریقوں کے ساتھ آتی ہے ان میں سب سے صحیح، سب سے مستند اور معتبر طریقہ وہی ہے جس میں اس کا شبِ معراج میں ہونا بیان ہوا ہے، اس لئے اس موقع پر راویوں کا سہو قرار دینا اور بچپن میں اس کا ہونا تسلیم کرنا اصولِ روایت سے صحیح نہیں۔

شقِ صدر کی ضعیف روایتیں

اصل یہ ہے کہ شقِ صدر کے وقت یا اوقات کی تعیین اور اس کا مکرر اور بار بار پیش آنا صرف مختلف روایات کے پیش کر دینے سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ حافظ ابن حجر نے کیا ہے، اور قسطلانی اور زرقانی نے اس کی تقلید کی ہے، بلکہ ضرورت ہے کہ ان روایات کے سلسلۂ سند پر بھی بحث اور راویوں کی قوت و ضعف پر بھی تنقید کی جائے، دس برس کے سن میں شقِ صدر والی روایت جس میں یہ تصریح ہے کہ سب سے پہلی دفعہ آپ پر نبوت کی علامت طاری ہوئی حسبِ ذیل ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے نبوت کا ابتدائی نشان پوچھتے ہیں، آپ فرماتے ہیں۔

میں دس برس کا تھا کہ میدان میں دو آدمی میرے سر پر آئے، ایک نے کہا یہ وہی ہیں، دوسرے نے کہا، ہاں: پھر دونوں نے پیٹھ کے بل مجھے پچھاڑا اور میرے پیٹ کو پھاڑا، ایک سونے کے طشت میں پانی لاتا رہا اور دوسرا پیٹ کو دھوتا رہا، پھر ایک نے کہا سینہ کو چاک کرو، تو ناگاہ دیکھتا ہوں کہ سینہ چاک ہے اور کچھ تکلیف نہیں معلوم ہوتی، پھر ایک نے کہا کہ دل کو چاک کرو، تو اس نے دل کو چاک کیا پھر اس نے کہا اس میں سے کینہ اور حسد نکال لو، تو اس میں سے جمے ہوئے خون کی طرح کی کوئی چیز نکالی پھر کہا اس میں مہربانی اور رحمت رکھ دو، تو اس نے چاندی کی طرح کی کوئی چیز رکھ دی، پھر اس نے چند گھنڈیاں جو اس کے پاس تھیں نکالیں اور وہ گھنڈیاں میرے سینہ میں لگا دیں، پھر میرے انگوٹھے کو کھونٹ کر مجھ سے کہا جاؤ، جب میں لوٹا تو اپنے میں وہ لے کر لوٹا جو لے کر نہیں آیا تھا، یعنی چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کے ساتھ نرمی۔

یہ روایت زوائد مسند احمد، ابن حبان، حاکم، ابن عساکر اور ابو نعیم میں ہے، لیکن ان تمام کتابوں میں مرکزی سلسلۂ سند ایک ہی ہے یعنی یہ کہ معاذ بن محمد اپنے باپ محمد بن معاذ اور وہ اپنے باپ معاذ ابن محمد سے اور وہ اپنے دادا ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں۔ محدث ابن المدینی نے اپنی کتاب العلل میں اس حدیث کے تحت میں لکھا ہے۔

حدیث مدنی واسنادہ مجہول کلہ ولا نعرف محمدًا

یہ مدنی حدیث ہے اس کی سند تمام تر مجہول ہے ہم لوگ محمد کو

۱؎ فتح الباری کتاب الصلوٰۃ باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء ج ۱ ص ۳۸۹ و کتاب التوحید ج ۱۳ ص ۴۰۰ باب ما جاء فی قولہ عز وجل و کلم اللہ موسیٰ تکلیما و روض الانف سہیلی ص ۱۱۵ مصر و زرقانی بر مواہب ج ۱ ص ۱۵۰، قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں، وقد خلط فیہ غیرہ لاسیما من روایۃ شریک عن ابی ذر فقد ذکر فی اولہ مجیء الملک لہ و شق صدرہ و غسلہ بماء زمزم و ہذا انما کان و ہو صبی قبل الوحی۔

(نسیم الریاض شرح شفا قاضی عیاض ج ۲ ص ۲۶۵)

ولا اباہ ولا جدہ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۱۹۴)	جانتے ہیں اور نہ اس کے باپ کو اور نہ اس کے دادا کو۔

حافظ ابونعیم نے دلائل میں جہاں یہ حدیث نقل کی ہے، صاف لکھ دیا ہے۔

وھذا الحدیث تفرد به معاذ ابن محمد او تفرد بذکر السن الذی شق فیه عن قلبه۔ (صفحہ ۱۰، حیدرآباد)	یہ حدیث صرف معاذ بن محمد نے نقل کی ہے اور وہی اس عمر کی تعیین کے بیان میں جس میں شق صدر ہوا منفرد ہیں (یعنی اس روایت کی کسی اور نے تائید نہیں کی ہے۔

بیس برس کے سن کی روایت بھی بعینہٖ ان ہی لوگوں سے تھوڑے تغیر کے ساتھ ان ہی الفاظ میں زوائد احمد، صحیح ابن حبان، حاکم، بیہقی اور مختارۂ ضیاء میں ہے (کنز العمال جلد ۶ ص ۹۶) لیکن اس سلسلۂ روایت کا حال آپ سن چکے ہیں کہ وہ معتبر نہیں۔

آغازِ وحی کے موقع پر شقِ صدر کی روایتیں، دلائل ابونعیم، دلائل بیہقی، مسند طیالسی اور مسند حارث میں ہیں، یہ روایتیں حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہیں، حضرت عائشہؓ کی آغازِ وحی والی حدیث بخاری، مسلم اور ابن حنبل وغیرہ تمام مستند کتابوں میں مذکور ہے اور اس باب میں یہی روایت سب سے زیادہ مفصل صحیح اور محفوظ ہے، لیکن ان کتابوں میں اس موقع پر شقِ صدر کا مطلق ذکر نہیں۔ اس سے اس واقعہ کی بے اعتباری ظاہر ہوتی ہے، علاوہ بریں ابونعیم، بیہقی، طیالسی اور حارث والی اس روایت کی مرکزی سند ابوعمران الجونی بن یزید بن بابنوس عن عائشہ ہے۔ یزید بن بابنوس مجہول ہے اور اس سے صرف ابوعمران الجونی ہی نے روایت کی ہے کسی اور نے اس کو نہیں لیا ہے، طیالسی میں (صفحہ ۲۱۵ حیدرآباد) اس روایت کی سند یہ ہے کہ حماد بن سلمہ ابوعمران جونی سے اور وہ ایک شخص سے اور وہ حضرت عائشہؓ سے راوی ہے۔ معلوم نہیں یہ نامعلوم شخص کون ہے؟ اور ابوعمران نے اس کا نام کیوں نہیں لیا ہے۔ ابونعیم میں (ص ۶۹ حیدرآباد) اس روایت کا جو سلسلۂ سند ہے اس میں یہ خالی جگہ یزید بن بابنوس کے نام سے پُر کی گئی ہے جس کا حال ابھی اوپر گزر چکا، علاوہ ازیں ابونعیم کی روایت میں اس کے نیچے داؤد بن المحبر ایک شخص آتا ہے جس کو اکثر محدثین ضعیف بلکہ دروغ گو تک کہتے ہیں، اسی کے ساتھ اس روایت کے اندر بعض ایسی لغو باتیں بھی ہیں جو اس کو صحت کے پایہ سے ساقط کرتی ہیں۔

ایک اور روایت حضرت ابوذرؓ سے ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا یارسول اللہ جب آپ کو نبی بنایا گیا تو آپ کو اپنی پیغمبری کا حال کیونکر معلوم ہوا؟ اور آپ نے کیونکر یقین کیا کہ آپ پیغمبر ہیں؟ فرمایا اے ابوذر! میں مکہ کی ترائی میں تھا کہ دو فرشتے میرے پاس آئے۔ ایک زمین پر آیا اور دوسرا آسمان پر تھا، ایک نے دوسرے سے کہا یہی وہ ہیں، پھر کہا ان کو تولو، پہلے ایک سے، پھر دس سے، پھر سو سے، پھر ہزار سے مجھ کو تولا، لیکن میرا پلہ بھاری رہا، تو کہا کہ یہ تمام امت سے بھاری ہیں، بعد ازیں میرا شکم چاک کیا، اس کے بعد شقِ صدر کے مختلف واقعات کا ذکر ہے، کہ ان فرشتوں نے پھر میرے شانے پر مہر کی۔

اس روایت میں گو وقت کی تعیین نہیں، مگر یہ ذکر ہے کہ یہ واقعہ مکہ کی ترائی میں پیش آیا، اس سے ظاہر

ہوتا ہے کہ یہ حضرت حلیمہؓ کے پاس بنو ہوازن میں قیام کے زمانہ سے بہت بعد کا واقعہ ہے، پھر اس میں یہ ہے کہ جب آپ کو نبی بنانا چاہا گیا، اور نبوت کی سب سے پہلی علامت کا سوال ہے اور امت کا ذکر ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ آغاز وحی کا واقعہ ہے، یہ روایت مسند دارمی (صفحہ ۹) اور دلائل ابونعیم (صفحہ ۱۷) میں ہے ان کے مشترک راوی بہ ترتیب ابوداؤد، جعفر بن عبداللہ بن عثمان القرشی، عثمان بن عروہ بن زبیر ہیں، جعفر بن عبداللہ کی نسبت محدث عقیلی نے تنقید کی ہے کہ اس میں "وہم" تھا، یعنی الفاظ کی صحیح یادداشت نہ تھی اور اضطراب تھا یعنی ایک ہی واقعہ اور سند کو کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح بیان کرتا تھا، پھر اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کی متابعت نہیں کی جاتی یعنی اس کے ہم شیخ اور ہم درس اس کی تائید نہیں کرتے۔ پھر بعینہٖ یہی واقعات شداد بن اوسؓ کی روایت سے ابونعیم، ابویعلیٰ اور ابن عساکر نے عتبہ بن عبد سلمی کی روایت سے دارمی اور ابن اسحاق نے (مرسلاً) بچپن کے شق صدر میں بیان کیا ہے جن سے ان کا باہم تعارض واضح ہے۔

اب رہ گئی وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے، یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمام تر خالی ہیں اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔

(۱) اس روایت کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ جہم بن ابی جہم، عبداللہ بن جعفر سے اور عبداللہ بن جعفر خود حلیمہ سعدیہ سے راوی ہیں، اس طریقہ سے یہ روایت ابن اسحاق اور دلائل ابی نعیم میں ہے، جہم بن ابی جہم مجہول ہے اور عبداللہ بن جعفر کی حلیمہ سعدیہ سے ملاقات ثابت نہیں اور ابن اسحاق جہم بن ابی جہم کا شک ظاہر کرتا ہے اس نے کہا کہ عبداللہ بن جعفر نے خود مجھ سے کہا یا ان سے سن کر کسی اور نے مجھ سے کہا۔ ابونعیم میں گو یہ شک مذکور نہیں ہے بلکہ اس میں تصریحاً عبداللہ بن جعفر کا نام لیا گیا ہے، مگر اس میں اس کے نیچے کے راوی مجروح ہیں۔

(۲) دوسرا طریقہ واقدی کا ہے، ابن سعد نے اس روایت کو اسی سلسلہ سے ذکر کیا ہے، جلد ۱ صفحہ ۷۰، مگر علاوہ اس کے کہ واقدی کا اعتبار نہیں اس کی تفصیل سند تک اس میں مذکور نہیں، اوپر کے راویوں کا نام مطلق نہیں بتایا گیا ہے۔

(۳) ابونعیم نے ایک اور سلسلہ سے اس کو بیان کیا ہے جو یہ ہے، عبدالصمد بن محمد السعدی اپنے باپ سے وہ اپنے باپ سے اور وہ ایک شخص سے جو حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی بکریاں چرایا کرتا تھا، بیان کرتے ہیں، یہ تمام تر مجہول لوگ ہیں۔

(۴) بیہقی اور ابن عساکر نے ایک اور سند سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے لیکن اس سند میں محمد بن زکریا الغلابی جھوٹا اور وضاع ہے، اس کا شمار قصہ گویوں میں ہے۔

---

[1] دیکھو میزان الاعتدال ذہبی اور تہذیب التہذیب ابن حجر۔

۵. ابن عساکر نے شداد بن اوس صحابی کے واسطہ سے ایک نہایت طویل داستان نقل کی ہے جس میں مذکور ہے کہ قبیلۂ بنی عامر کے ایک پیر مرد نے خدمتِ نبوی میں آکر آپ سے آپ کے ابتدائی حالات دریافت کئے، آپ نے پورا پورا حال بیان کیا، منجملہ اس کے ایک واقعہ اپنے بچپن کے شقِ صدر کا بیان کیا، لیکن خود ابن عساکر اس روایت کو غریب، یعنی ثقات کے بیان سے مختلف کہتے ہیں، اس کے سوا اس سلسلۂ سند کے بیچ میں ایک بے نام ونشان راوی ہے، اس سے اوپر ایک اور قابلِ اعتراض راوی اس میں ابو یحیٰی ہے جو شداد بن اوس صحابی سے اس قصہ کا سننا بیان کرتا ہے، امام بخاری نے تاریخ صغیر (ص ۱۳، الہ آباد) میں اس کی نسبت لکھا ہے فی حدیثہ نظر، اس کی حدیث بحث طلب ہے، ابو حاتم کہتے ہیں لیس حدیثہ بالقائم، یعنی اس کی حدیث ٹھیک نہیں (تہذیب التہذیب و میزان)

حضرت شداد بن اوسؓ سے مکحول شامی کے واسطہ سے ابو یعلیٰ اور ابن عساکر نے بعینہٖ اسی واقعہ کو ایک اور سلسلہ سے نقل کیا ہے جس میں گو کوئی مجہول راوی بیچ میں نہیں آیا ہے مگر اس میں یہ کمی ہے کہ مکحول اور شداد صحابی کے بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے یا چھوڑ دیا گیا ہے یعنی روایت منقطع ہے، کیونکہ مکحول نے حضرت شدادؓ کا زمانہ نہیں پایا ہے، مکحول تدلیس میں بدنام تھے یعنی ان کی عادت یہ تھی کہ بیچ میں اگر کوئی کمزور راوی آجاتا تو وہ اس کا نام چھپا دیتے تھے یا بیچ سے اس کو حذف کرکے اگلے سے سلسلہ جوڑ دیتے تھے، میرا خیال ہے کہ مکحول اور حضرت شدادؓ کے بیچ میں دراصل وہی ابو العجفاء تھا، مکحول نے یہ دیکھ کر کہ وہ مجروح ہے اس کو بیچ سے نکال دیا ہے اس لئے یہ سلسلہ بھی نامعتبر ہے۔

(۶) عتبہ بن عبد السلمیؓ ایک کمسن صحابی ہیں، ان سے ایک ہی سلسلۂ سند کے ذریعہ سے حاکمؒ، دارمیؒ، ابو یعلیٰ، ابن عساکر اور ابن حنبل نے واقعہ کی یوں روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ ایک دن میں اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چرانے گیا، کھانا ساتھ نہ تھا، میں نے اس کو ماں (دایہ) کے پاس کھانا لانے کے لئے بھیجا، وہ گیا تو دفعۃً کرگدھ کی طرح کے دو پرندے آئے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ یہی ہے، دوسرے نے کہا ہاں، پھر دونوں نے جھپٹ کر مجھے پکڑا اور زمین پر پچھاڑ کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے دو سیاہ جمے ہوئے خون کے قطرے نکالے اور برف اور ٹھنڈے پانی سے دھویا۔ یہ حاکم کے الفاظ ہیں، دارمی وغیرہ میں اس کے بعد اتنا زیادہ ہے کہ دھونے کے بعد ایک نے کہا کہ سکینت یعنی تسکین قلبی لاؤ، اس کو لاکر میرے سینہ میں چھڑک دیا، پھر دونوں چھوڑ کر مجھے چلے گئے، میں ڈرا اور اپنی ماں کے پاس گیا اور حال کہا۔ وہ ڈری کہ بچہ کی عقل ٹھیک نہیں رہی، اس نے کہا میں تم کو خدا کی پناہ میں دیتی ہوں اور پھر وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر میری والدہ کے پاس لائی، والدہ نے کہا تم نے یہ امانت پوری طرح ادا کی۔ دایہ نے میرا حال اور اپنا خوف بیان کیا لیکن والدہ نے واقعہ سن کر کوئی خوف یا تعجب نہیں کیا، فرمایا۔ جب یہ بچہ پیدا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک نور میرے بدن سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہوگئے، حاکم نے اس حدیث کو مسلم کی شرط کے مطابق کہا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ روایت کا پہلا مشترک راوی بقیہ بن ولید ہے جس کو گو بذاتِ خود بعضوں نے ثقہ کہا ہے، تاہم اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ سخت

بے احتیاط تھا۔ ابن مبارک کہتے ہیں وہ راست گو ہے، مگر وہ آگے پیچھے کے ہر شخص سے روایت لے لیا کرتا تھا۔ ابن عیینہ کہتے ہیں بقیہ سے احکام کی روایتیں نہ لیا کرو، ثواب (فضائل) کی روایتیں خیر لے لیا کرو۔ امام ابن حنبل اور امام یحییٰ کا قول ہے کہ اگر وہ مشہور لوگوں سے روایت کرے تو خیر، ورنہ مت کرو۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ اس کی حدیث لکھی جائے مگر وہ دلیل میں نہ پیش کی جائے۔ امام نسائی فرماتے ہیں جب وہ اخبرنا اور حدثنا کہے تو خیر اور جب عن عن بیان کرے تو نہ لو، یاد رہے کہ یہ روایت مذکورہ بہ طریق عن عن ہی ہے، ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی بعض روایتیں ثقہ اور معتبر راویوں کے خلاف ہیں۔ امام احمد بن حنبل ایک شخص سے فرماتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بقیہ مجہول الحال لوگوں سے سن کر حدیثیں نقل کرتا ہے، لیکن دیکھا تو وہ مشہور لوگوں سے بھی اسی قسم کی حدیثیں بیان کرتا ہے۔ تم نے جانا کہ وہ کہاں سے یہ روایتیں لاتا ہے؟ مخاطب نے جواب دیا۔ ہاں! تدلیس کے ذریعے (یعنی بیچ کے کمزور راوی کو حذف کر کے آگے کے معتبر راوی سے سلسلہ جوڑ دیا کرتا تھا) ابوعبداللہ حاکم کہتے ہیں کہ اوزاعی وغیرہ مشہور لوگوں سے وہ اپنی روایتیں کرتا ہے جو موضوعات کے مشابہ ہیں اور اس کی صورت یہ کرتا ہے کہ بیچ کے ضعیف راوی کو حذف کر دیتا ہے۔ خطیب کہتے ہیں کہ اس کی اکثر روایتیں منکر ہیں، اگرچہ وہ بذاتِ خود راست گو تھا۔ ابن القطان کا قول ہے کہ وہ ضعیف راویوں سے تدلیس کر کے بیان کرتا ہے اور اس کو وہ جائز سمجھتا ہے۔ یہ الزام اگر اس پر صحیح ہے تو اس کے معتبر ہونے میں خلل انداز ہے۔

حماد بن سلمہ کی روایت میں ان کا وہم

بچپن میں شقِ صدر کا سب سے صحیح اور محفوظ سلسلۂ سند وہ ہے جو حماد بن سلمہ ثابت بنانی سے، اور ثابت، انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ روایت صحیح مسلم، مسند احمد، ابن سعد اور دلائل ابونعیم میں ایک ہی سلسلۂ سند سے مذکور ہے۔ یعنی حضرت انسؓ سے ثابت البنانی اور ان سے حماد بن سلمہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریل آئے اور آپ کو پکڑ کر زمین پر لٹایا اور قلب مبارک کو چاک کیا اور اس کو نکال کر اس میں سے ذرا سا جما ہوا خون نکالا اور کہا کہ یہ شیطان کا اتنا حصہ تم میں تھا پھر اس کو سونے کے طشت میں آبِ زمزم سے دھویا، پھر شگاف کو جوڑ دیا، پھر اس کو اپنی جگہ پر رکھ دیا، لڑکے دوڑتے ہوئے آپؐ کی ماں (دایہ حلیمہ) کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ محمدؐ مار ڈالے گئے، لوگ آپؐ کے پاس پہنچے دیکھا تو چہرہ کا رنگ متغیر ہے۔ انسؓ کہتے ہیں کہ سینۂ مبارک میں زخم کے نشان یعنی ٹانکے مجھ کو نظر آتے تھے۔ مسند ابن حنبل میں بھی حدیث اسی سلسلۂ سند سے حضرت انسؓ سے مروی ہے اور اس میں آخر میں واحد متکلم کے بجائے جمع متکلم ہے یعنی یہ کہ مجھ کو نظر آتے تھے کی جگہ پر یہ ہے کہ ہم کو زخم کے ٹانکے نظر آتے تھے۔

اس سلسلۂ سند کے صحیح اور محفوظ ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحاح میں معراج اور شقِ صدر کی جس قدر روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ان کے دوسرے راوی تابعین میں حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے قتادہ، زہری، شریک اور ثابت بنانی چار شخص ہیں، ثابت بنانی سے دو آدمی ان واقعات کو نقل کرتے ہیں، سلیمان بن مغیرہ اور حماد بن سلمہ، حماد کے علاوہ اور جو طرق اوپر مذکور ہوئے ان سب

میں معراج کے واقعات کے آغاز میں شقِ صدر کا ذکر ہے، لیکن حماد نے اپنی روایت میں یوں کیا ہے کہ معراج کے سلسلہ میں وہ شقِ صدر کے ذکر کو ترک کر دیتے ہیں اور شقِ صدر کے واقعہ کو الگ اور مستقل بچپن کے زمانہ کی تخصیص کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حالانکہ نہ صرف حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے کوئی بلکہ حماد کے دوسرے ہم درس طلباء میں سے بھی کوئی ان کی تائید نہیں کرتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے معراج کی حدیث حماد کے واسطہ سے نقل نہیں کی ہے، حماد کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا۔ اسی سبب سے امام بخاری نے ان کی روایتیں نہیں لی ہیں، امام مسلم اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر کے خرابی حافظہ سے پہلے کی جو اُن کی روایتیں ہیں ان کو چن کر اپنی کتاب میں لائے ہیں، میرا میلان تحقیق یہ ہے کہ حماد کی یہ روایت اسی خرابی حافظہ کے زمانہ کی ہے کہ انہوں نے تمام معتبر راویوں کے خلاف شقِ صدر اور معراج کے مشترک واقعہ کو رد کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ امام مسلم بھی اپنی ترتیبِ بیان کے اشارات سے ایسا ہی کچھ بتانا چاہتے ہیں کہ معراج اور شقِ صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد سے غلطی ہوئی ہے، چنانچہ واقعاتِ معراج کے ذکر میں امام مسلم یہ کرتے ہیں کہ پہلے حضرت انسؓ سے ثابتؒ کے شاگرد حماد کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں جس میں معراج کے شقِ صدر کا ذکر نہیں، پھر حماد کے ساتھی اور ثابت کے شاگرد سلیمان بن مغیرہ کی روایت ہے جس میں شقِ صدر کے ساتھ معراج کا ذکر ہے اس کے بعد حماد کی وہ روایت ہے جس میں تنہا بچپن کے شقِ صدر کا تذکرہ ہے۔ بعد ازیں حضرت انسؓ کے دوسرے شاگردوں کی روایتیں ہیں جس میں شقِ صدر اور معراج کا ایک ساتھ واقع ہونا مذکور ہے۔

حماد کی اس روایت میں بعض ایسے معنوی وجوہ بھی ہیں جن کی تائید کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ کہ شقِ صدر کی یہ کیفیت کسی عمر میں بھی گزری ہو، مگر بہر حال اس کا تعلق روحانی عالم سے تھا، گزشتہ تمام مستند اور مجروح روایتوں میں حسد، بغض، حصہ شیطانی، سکینت، تسلی، رحمت، شفقت، ایمان اور حکمت وغیرہ جن امور کا سینۂ مبارک سے نکالنا یا اس میں رکھنا بیان ہوا ہے، ان میں سے کسی چیز کا تعلق جسمانیات سے نہیں، بایں ہمہ حماد حضرت انسؓ سے روایت کر کے کہتے ہیں کہ آپ کے سینہ پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھ کو (جیسا کہ مسلم میں ہے) یا ہم کو (جیسا کہ مسند احمد میں ہے) نظر آتے تھے۔ اگر یہ جسمانی واقعہ بھی تھا تو حضرت انسؓ کی دیگر مروی روایات میں سے جو حماد کے علاوہ دوسرے راویوں نے نقل کی ہیں، یہ مذکور نہیں علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل شمائل کا ایک ایک حرف جسم اطہر کے ایک ایک خط و خال کی کیفیت صحابہ نے بیان کی ہے، مگر کسی نے سینۂ مبارک کے ان نمایاں ٹانکوں کا نام تک نہیں لیا، ایسی حالت میں واقعہ کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہو سکتی ہے۔

دو دفعہ شقِ صدر ہو تو اس کی تاویل

اس تشریح اور تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حماد کی اس روایت کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق

بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینہ مبارک سے حصہ شیطانی جو ہر انسان کے اندر ہے اس کو نکالا گیا کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے، ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم و حکمت سے معمور کیا گیا، جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے۔

شق صدر کی صحیح کیفیت

شق صدر کی صحیح کیفیت حالت معراج کے سلسلہ میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور نسائی وغیرہ میں متعدد روایتوں اور طریقوں سے مذکور ہے کہ ایک شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے، آنکھیں سوتی تھیں مگر دل بیدار تھا کہ ناگاہ حضرت جبریلؑ چند فرشتوں کے ساتھ نظر آئے، آپ کو اٹھا کر وہ چاہ زمزم کے پاس لے گئے یا آب زمزم لے کر کوئی آپ کے پاس آیا سینہ مبارک کو چاک کیا، پھر آب زمزم سے دھویا، اس کے بعد سونے کا ایک طشت ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا لایا گیا، پھر اس طشت کے سرمایہ کو سینہ مبارک میں بھر کر شگاف کو برابر کر دیا گیا، اس کے بعد فرشتے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے[1]۔

شق صدر کی حقیقت

علمائے ظاہر بین اس واقعہ کے ظاہر الفاظ کے جو عام اور سیدھے سادے معنی سمجھے ہیں کہ واقعی سینہ مبارک چاک کیا گیا اور قلب اقدس کو اسی آب زمزم سے دھو کر ایمان اور حکمت سے بھر دیا گیا اس کو ہر مسلمان سمجھ سکتا ہے، لیکن صوفیائے حقیقت بین اور عرفائے رمز شناس ان الفاظ کے کچھ اور ہی معنی سمجھتے ہیں اور ان تمام غیر محتمل الالفاظ معنی کو تمثیل کے رنگ میں دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ عالم برزخ کے حقائق ہیں جہاں روحانی کیفیات جسمانی اشکال میں اسی طرح نظر آتے ہیں جس طرح حالت خواب میں تمثیلی واقعات جسمانی رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں اور جہاں معنی اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں،

چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

اما شق الصدر وملؤہ ایمانا فحقیقتہ غلبۃ انوار الملکیۃ وانطفاء لہب الطبیعۃ وخضوعہا لما یفیض علیہا من حظیرۃ القدس[2]۔	لیکن سینہ کا چاک کرنا اور اس کو ایمان سے بھرنا اس کی حقیقت انوار ملکیہ کا روح پر غالب ہو جانا اور طبیعت بشری کے شعلہ کا بجھ جانا اور عالم بالا سے جو فیضان ہو تو اس کے قبول کے لئے طبیعت کا آمادہ ہو جانا ہے۔

ان کے نزدیک معراج بھی اسی عالم کی چیز تھی، اس لئے شق صدر بھی اسی دنیا کا واقعہ ہوگا۔

ہمارے نزدیک صحیح اصطلاح شرح صدر ہے جیسا کہ صحیح مسلم باب الاسراء میں حضرت مالک بن صعصعہ کی روایت میں مذکور ہے فشرح صدری الی کذا وکذا "میرا سینہ یہاں سے یہاں تک کھولا گیا"، اور قرآن مجید کی اس سورہ میں جیسا کہ ترمذی میں ہے، اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (انشراح)	کیا ہم نے تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تجھ سے تیرے اس بوجھ کو ہٹا نہیں دیا جس نے تیری پیٹھ کو توڑ دیا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و نسائی ابواب معراج یا فرض الصلوۃ و مسند احمد بروایات انس وغیرہ۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ ۲۰۹۔

شرح کے لغوی معنی عربی میں "چیرنے پھاڑنے" کے ہیں، اسی سے طب کی اصطلاح "علم تشریح" اور "تشریح اجسام" نکلی ہے، چونکہ چیرنے اور پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہو جاتی ہے، اس لئے اس سے "تشریح امر" اور "تشریح کلام" "شرح بیان" اور "شرح کتاب" وغیرہ مجازی معنی پیدا ہوتے ہیں، اسی سے ایک اور محاورہ "شرح صدر" کا پیدا ہوا ہے جس کے معنی "سینہ کھول دینے" کے ہیں اور کلام عرب میں اس سے مقصود بات کا سمجھا دینا اور اس کی حقیقت کا واضح کر دینا ہوتا ہے، قرآن مجید اور احادیث میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے، حضرت موسیٰ کو جب فرعون کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی تو آپ نے دعا مانگی رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي (پروردگار! میرے سینہ کو کھول دے اور میرے کام کو آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

انبیاء علیہم السلام کا علم اور فہم، انسانی تعلیم وتعلم اور مادی حکمت ودانائی سے پاک ومبرا ہوتا ہے اور وہ اپنے اخذ نتائج اور اثبات دعویٰ کے لئے گذشتہ تجربات اور منطق کے استقراء وتمثیل اور ترتیب مقدمات کے ممنون نہیں ہوتے، بلکہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی القائے ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے اسی کا نام علم لدنی ہے۔ "لدن" کے معنی عربی زبان میں "پاس اور نزدیک" کے ہیں، چونکہ یہ علم ان کو کسب وتحصیل کے بغیر خدا کے پاس سے اور اس کے نزدیک سے عطا ہوتا ہے، اس لئے عرف عام میں علم لدنی کہلاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا (کہف)	ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

كَذَٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِ مَا قَدْ سَبَقَ وَقَدْ آتَيْنَاكَ مِنْ لَدُنَّا ذِكْرًا (طٰہٰ۔۵)	اسی طرح ہم تجھ سے گذشتہ زمانہ کی باتیں بیان کرتے ہیں اور ہم نے اپنی طرف سے تجھ کو علم (ذکر) بخشا ہے

حضرت یوسفؑ کے قصہ کے آغاز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ (یوسف۔۱)	ہم تجھ کو قرآن کی وحی بھیج کر ایک بہترین قصہ سناتے ہیں جس سے تو قطعاً اس سے پہلے بے خبر تھا۔

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ۔۵)	اور اسی طرح ہم نے اے محمد تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کو وحی کیا تو پہلے یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان سے واقف تھا لیکن ہم نے اس کو روشنی بنایا ہے جس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہم راستہ دکھا دیتے ہیں۔

دوسرے پیغمبروں کی نسبت بھی یہی ارشاد ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ سے کہتے ہیں۔

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ (مریم - ۳)

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔

حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کے متعلق ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا (نمل - ۲)

اور ہم نے داؤد و سلیمان کو علم بخشا۔

حضرت یوسفؑ کی نسبت ارشاد ہے

آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (یوسف - ۳)

ہم نے یوسف کو حکم اور علم عطا کیا۔

حضرت یوسفؑ کہتے ہیں،

ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي (یوسف ۴)

یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھائی ہیں۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (انبیاء - ۵)

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔

حضرت سلیمان اور چند دیگر انبیاء علیہم السلام کے ذکر کے بعد ہے۔

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (انبیاء)

ہم نے یہ بات سلیمان کو سمجھا دی اور ہم نے ان سب کو حکم اور علم عطا کیا۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کا یہ علم محض تعلیم الٰہی اور القائے ربانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور غور و فکر، تجربہ و امتحان تحصیل و اکتساب اور جمع معلومات اور ترتیب مقدمات کے بغیر ان کے علم کی باتیں ان کے سامنے آئینہ ہو کر آجاتی ہیں، صرف وہم و تمثیل کے لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ کبھی کبھی شعراء مصنفین، موجدین اور دیگر عقلاء کے ذہن میں بے غور و تامل ایک بات اس طرح خطور کر جاتی ہے کہ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا دماغ کا دروازہ یک بیک کھل گیا اور ایک چیز اندر داخل ہوگئی لیکن یہ شرح صدر کی نہایت معمولی مثال ہے۔ اس منصب خاص کے سینکڑوں مدارج ہیں جو انبیاء کو اولیاء کو اور دیگر مومنین کو اپنے اپنے رتبہ کے مطابق عطا ہوتے ہیں،

یعنی بلا حجت و برہان اسلام کی صداقت اس کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے، بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی خلافت کے زمانہ میں مشورہ دیا اور بہ اصرار کہا کہ قرآن مجید کو اوراق و مصاحف میں لکھوا دیجیے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے مخالفت کی کہ جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں نہیں کیا وہ ہم لوگ کیونکر کر سکتے ہیں، حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار اور حضرت ابوبکرؓ کو انکار رہا، مگر چند ہی روز میں یک بیک ان کی سمجھ میں بات آگئی، اس موقع پر انہوں نے فرمایا،

حتی شرح اللہ صدری لذلک (بخاری کتاب القرآن)

یہاں تک کہ خدا نے اس کام کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا۔

مفسر ابن جریر طبری نے متعدد صاحبوں سے روایت کی ہے کہ صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! شرح صدر کیونکر ہوتا ہے؟ فرمایا، قلب میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس سے سینہ کھل جاتا ہے، پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے؟ ارشاد ہوا، حیات جاوید کے گھر کا اشتیاق،

اور اس فریب کدۂ عالم سے دل برداشتگی اور موت سے پہلے موت کی تیاری۔[1] یہ تو حقیقت ہے اور اس حقیقت کی جسمانی تمثیل سینۂ مبارک کا چاک کیا جانا اور اس میں نور و حکمت کا بھرا جانا ہے۔

شرح صدر کے لئے مناسب موقع اور مصلحت

جن آیتوں میں دیگر انبیاء علیہم السلام کو عطیۂ علم کے دیئے جانے کا ذکر ہے ان میں اکثر علم کے ساتھ حکم کا لفظ بھی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ خالص شرعی ضرورتوں کے نظم و حکومت اور فیصلۂ احکام کے لئے بے غور و فکر کے بدیہی صحیح اور حاضر علم کی ضرورت ہے، چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا عنوان تھا جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی، اس لئے شرح صدر کے عطیہ کے لئے یہی مناسب موقع تھا۔ علاوہ ازیں معراج کے حقائق و مناظر جو نفوسِ نبویہ کے ادراکات کی آخری سرحد ہیں، ان کے احاطہ کے لئے بھی شرح صدر کی ضرورت تھی۔

*

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، جلد ۳۰ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مصر، حاکم فی المستدرک ج ۴ صفحہ ۳۱۱ بسند فیہ عدی بن الفضل۔

آیات و دلائل نبوی قرآن مجید میں

یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے سابقین کے معجزے جس تفصیل اور تکرار کے ساتھ بیان ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے اس تفصیل اور تکرار کے ساتھ اس میں مذکور نہیں۔ اس سے ایک طرف تو مخالفین اسلام نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی ذات پاک اس عطیۂ الٰہی سے محروم تھی، دوسری طرف اسلام کے عقل پرست فرقہ کو اس سے یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اسلام نے خوارق عادت کے ظہور سے انکار کیا ہے، کیونکہ جب اس کے نزدیک خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان سے خالی تھی تو گزشتہ انبیاء کے سوانح میں جو اعجاز نظر آتا ہے وہ بھی سمجھنے والوں کے لئے وہم کا قصور ہے۔

قرآن مجید میں آپ کے تمام معجزات کا تفصیلی ذکر کیوں نہیں ہے

لیکن واقعہ یہ ہے کہ دیگر انبیائے کرام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور آیات و دلائل میں جو یہ اختلاف منظر نمایاں ہے اس کے متعدد وجوہات اور اسباب ہیں جن پر ان کوتاہ بینوں کی نظر نہیں پڑی، اس لئے وہ مختلف قسم کے شکوک و شبہات میں گرفتار ہو گئے۔

(۱) اس اختلاف منظر کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جس نے قرآن مجید کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے یا گزشتہ صفحات میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے معجزہ کی جو حقیقت واضح کی گئی ہے اس کو سمجھا ہے، وہ تسلیم کرے گا کہ اسلام نے نبوت کی تصدیق کے باب میں ظاہری اور مادی معجزات کو وہ اہمیت نہیں دی ہے جو خصوصیت کے ساتھ عیسائی مذہب اور اس کے مقدس صحیفہ میں نظر آتی ہے بلکہ وہ انسانوں کو زیادہ تر غور و فکر، فہم و تدبر، سوچ اور سمجھ کی دعوت دیتا ہے اور نبوت کی اندرونی خصوصیات اور روحانی دلائل کو ایمان و تصدیق کی بنیاد قرار دیتا ہے، اس بنا پر اس کے لئے اپنے پیش کرنے والے کی سچائی کے ثبوت میں اس کے خوارق اور معجزات کو تفصیل اور تکرار کے ساتھ ہر جگہ پھیلانا اور دہرانا اس کے اصول کے خلاف تھا، چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام ان گمراہیوں سے پاک رہا جن کی تاریکیوں کے پردہ میں عیسوی مذہب کا نور چھپ کر رہ گیا۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کو جو نشانیاں ملی تھیں وہ چند محدود گنی ہوئی اور متعین شکل میں تھیں، اس لئے قرآن مجید کو جب کبھی ان پیغمبروں کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو خواہ مخواہ ان کے ان ہی چند حیرت انگیز واقعات کو بار بار دہرانا پڑتا ہے اور اس کی تفصیل اور تکرار سے کوتاہ بینوں کی نگاہوں میں ان پیغمبروں کی یہ نشانیاں ابھر کر نظر آتی ہیں۔ اس کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو نشانیاں عطا ہوئیں وہ اس قدر متنوع مختلف اور غیر محدود تھیں کہ ان کے تذکرے کے وقت ایک ہی نشانی کو بار بار پھیلانے اور دہرانے کی حاجت نہ تھی، اس لئے یہ دلائل محمدی قرآن مجید کے سینکڑوں صفحات کے مختلف گوشوں میں اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ دوسرے انبیاء کے معجزوں کی طرح وہ ابھار اور نمایاں ہو کر کم سوادوں کو نظر نہیں آتے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ گزشتہ مباحث میں یہ پوری تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر قسم کے معجزات، خوارق اور نشانیاں پیغمبر کی قوت اور اختیار سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ و مشیت سے ظہور پذیر ہوتی ہیں، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آیات و دلائل بھی ذاتِ محمدیؐ کی طرف منسوب ہو کر نہیں بلکہ قدرتِ الٰہی کی طرف منسوب ہو کر بیان ہوتے ہیں، اس لئے عام لوگوں کا خیال ان کو دلائلِ محمدیؐ سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

(۴) چوتھی وجہ یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی ان کا صحیفہ ہے جس میں اُن کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح، معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں، لیکن اسلام کے قبضہ میں دو چیزیں ہیں، ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام و مطالب ہیں، دوسرے حدیث و سنت، جس میں پیغمبر کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں اور وہ بجائے خود روایتی استناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے اس لئے خدا نے پیغمبر کے ان دلائل و معجزات کو عدمِ اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفہ میں جگہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اس کے لئے احادیث کے مستند ذخیرۂ روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا۔

قرآن مجید سے آپؐ کے صاحبِ معجزہ ہونے کی دلیل

غرض یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر بعض کم سواد اس دعویٰ کی جرأت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتیں آپ کو معجزات اور نشانیوں سے معرّا ظاہر کرتی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں غور کے قابل سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے آپ کے متعلق آپ کے زمانہ کے کافروں کے جو اقوال تردید کی غرض سے نقل کئے ہیں ان میں متعدد موقعوں پر آپ کو (نعوذ باللہ) کاہن اور ساحر کہا گیا ہے اور قرآن مجید پر سحر کا الزام لگایا ہے، عرب میں کاہن کا کام پیشین گوئی کرنا اور غیب کا حال بتانا تھا اور ساحر کی نسبت تو عام طور پر یہ معلوم ہے کہ وہ عوام کے نزدیک عجائب و خوارق کا پیکر ہوتا ہے، اب اگر آپ امورِ غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات اور خوارق کا صدور آپ سے نہیں ہوا کرتا تھا تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے! اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر حسب ذیل آیتوں پر غور کی ایک نگاہ ڈالئے۔

فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ ۔ (طور۔ ۲۰)	اے محمدؐ! تو اپنے پروردگار کے فضل سے کاہن نہیں ہے۔
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (حاقہ)	یہ قرآن کسی کاہن کا کلام نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے خدا کفارِ قریش کا حال بتاتا ہے۔

وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (صافات۔ ۱)	جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ کفار کو جو نشانیاں نظر آتی تھیں وہ ان کا ٹھٹھا اڑاتے تھے اور اُن

کو جادو کہتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کی خارق عادت نشانیاں ان کے مشاہدہ میں آتی تھیں اور دوسری آیتوں میں بھی سحر کی نسبت آپؐ کی طرف کفار کی زبان سے کی گئی ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۔ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف ۔ ۳)	اور جب ان کے پاس سچی بات آئی تو انہوں نے کہا یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو نہیں مانتے اور انہوں نے کہا کہ یہ قرآن مکہ و طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔
قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف ۔ ۱)	حق کے منکروں نے جب ان کے پاس حق آیا تو کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔
هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء)	یہ محمد تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہیں، کیا تم جان بوجھ کر جادو کے پاس آتے ہو۔
قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس ۔ ۱)	کافروں نے کہا کہ یہ (محمدؐ) تو کھلا جادوگر ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے آپؐ کی آمد کی جو بشارت دی تھی اس کے بعد ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (صف ۔ ۱)	پس جب وہ آنے والا پیغمبر کھلی آیتیں لے کر آیا تو کافروں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔

کفار کے ان اقوال سے ثابت ہے کہ آپؐ کی ذاتِ بابرکات سے کچھ تو مافوق العادت باتیں ظاہر ہوتی تھیں جن کی تعبیر کہانت اور جادوگری کے الفاظ سے کر کے وہ اپنے نادان دل کو تسلی دیتے تھے اور اسی سے آپؐ کے صاحب معجزہ ہونے کا ناقابلِ تردید ثبوت قرآن مجید سے ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آپؐ کے دلائل و معجزات مذکور ہیں

اس اجمالی ثبوت کے بعد ضرورت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان آیات و دلائل کے بکھرے ہوئے موتیوں کو جو قرآن مجید کے اوراق میں منتشر ہیں ایک خاص ترتیب کے رشتہ میں منسلک کر دیں کہ وہ نمایاں ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائیں۔ تنوع کے لحاظ سے یہ آیات و دلائل تین قسم کے ہیں، ایک تو کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کیلئے معجزانہ نشانیاں، دوسری مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیدات غیبی کا ظہور اور تیسری وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ '' لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا ہے، آئندہ اوراق میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔

*

معجزۂ قرآن

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (بنی اسرائیل-۱۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش گاہ الٰہی سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن مجید ہے۔ چنانچہ جب کفار نے معجزہ طلب کیا تو خدا نے فرمایا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ

(عنکبوت-۵)

اور انھوں نے کہا کہ پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں کیوں نہ اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کی قدرت میں ہیں میں تو صاف صاف خدا کے عذاب سے صرف ڈرانے والا ہوں کیا ان کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے اس پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات کے مقابلہ میں اپنی اسی وحی آسمانی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا، چنانچہ گویا اسی آیت پاک کی تفسیر میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من الآیات ما مثلہ اومن او امن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکثرھم تابعا یوم القیامۃ۔

(صحیح بخاری باب الاعتصام)

پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزات عنایت کیے، جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا وہ وحی (قرآن) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتارا، اس سے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیرووں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

اس حدیث سے متعدد نکتے حل ہوتے ہیں۔

(۱) ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا ہوا ہے۔

(۲) دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے، ہوئے اور ہو کر مٹ گئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے گا۔

(۳) چونکہ وہ معجزے وقتی اور عارضی تھے اس لئے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے اس لئے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور قیامت تک نئے نئے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا رہے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ربانی نشانیاں خدا کی طرف سے عنایت ہوئیں ان میں صرف یہی ایک معجزہ ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے تحدی کی ہے اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے اور پھر خود ہی اس کی

پیشین گوئی بھی کردی ہے کہ دنیا ہمیشہ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ رہے گی۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ (بنی اسرائیل-۱۰)	کہہ دے اے پیغمبر! اگر تمام جن وانس مل کر بھی چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنا لائیں تو نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد پر کیوں نہ ہوں۔

سورۂ ہود میں پورے قرآن کے بجائے صرف دس سورتوں کا جواب مانگا گیا ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (ہود-۲)	کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے جی سے بنالیا ہے تو کہہ دے کہ وہ ایسی بنائی ہوئی دس ہی سورتیں لے آئیں اور اپنی مدد کے لئے خدا کے سوا جس کو چاہیں بلالیں اگر وہ سچے ہیں۔

اس کے بعد کی آیتوں میں دس سورتوں سے گھٹا کر ایک ہی سورہ کا جواب لانے کی تحدید کی گئی ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ-۳)	اور اگر تم کو اس میں بھی کچھ شک ہو تو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے تو اس جیسی ایک ہی سورہ لاؤ اور خدا کے سوا اپنے تمام گواہوں کو بلاؤ اگر تم سچے ہو۔
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ (بقرہ-۳)	تو اگر تم ایسی سورہ بنا کر نہ لا سکو اور یقیناً نہ لا سکو گے تو اس آتش دوزخ سے بچو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر (جن کو تم پوجتے ہو) سب ہوں گے جو کافروں کے لئے تیار رکھی گئی ہے۔

اس کے ہم معنی دوسری آیت، سورۂ یونس میں ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس-۴)	کیا یہ کفار یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس قرآن کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے ان سے کہہ دے کہ اس جیسی ایک سورت تم بھی لاؤ اور خدا کے سوا اور جس کو چاہو مدد کے لئے بلا لو اگر تم سچے ہو۔

پھر سورۂ طور میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس جیسی ایک ہی بات پیش کرو۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (طور-۲)	کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو گھڑ لیا ہے بات یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اگر وہ سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات بھی پیش کریں۔

اس امر پر تو تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ اور وجہ اعجاز کیا ہے؟

(۱) بعض معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید کا نظم کلام (اسٹائل) معجزہ ہے یعنی اہل عرب کا کلام جس طرز اور اسلوب پر ہوا کرتا تھا، قرآن مجید نے ان کو چھوڑ کر ایک اور بدیع طرز اور عجیب اسلوب اختیار کیا جو عرب میں موجود نہ تھا، ان کے کلام کا تمام تر نمونہ شعر تھا، قرآن مجید نے نثر کا ایک اسلوب اختیار کیا، کاہنان عرب کا کلام بھی نثر ہوتا تھا، مگر اس میں تکلف اور آورد تھا، قرآن مجید نے نظم و نثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغائے

عرب کے تخیل میں نہ تھا، قرآن کے مطالع، مقاطع اور فواصل یعنی جس طرح قرآن کسی بیان کا آغاز اور اس کا خاتمہ کرتا ہے اور جس طرح ایک ایک آیت کو توڑتا جاتا ہے وہ حد اعجاز میں داخل ہے۔

(۲) معتزلہ سے جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کی حیثیت سے معجزہ قرار دیتے ہیں

(۳) نظام معتزلی اور ابن حزم ظاہری یہ اعتقاد رکھتے ہیں اور امام رازی بھی اس کو قریب الی الصواب کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام بلغائے عرب و عجم کی زبانیں اس کے مقابلہ میں گنگ کر دیں اور اس لئے وہ اس کا جواب نہیں لا سکتے۔

(۴) بعض متکلمین کے نزدیک وجہ اعجاز، قرآن مجید کا اظہار غیب اور پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہیں۔

(۵) بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دل کے چھپے ہوئے اسرار کو فاش کرتا تھا جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔

(۶) کسی نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ اور انسانوں کے کلام بلند و پست، کامل و ناقص، صحیح و غلط، غرض مختلف المراتب ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید شروع سے اخیر تک بلندی کمال اور صحت کے لحاظ سے ایک ہی نوعیت کا ہے۔

(۷) ایک دو آدمیوں کی یہ رائے ہے کہ معجزہ یہ ہے کہ ایک اُمّی کی زبان سے ایسا کلام بلاغت نظام نکلا ہے۔

(۸) قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ اس کی خارق عادت تاثیر اور قلوب انسانی کی تسخیر بھی قرار دی جا سکتی ہے۔

(۹) بعضوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اعجاز اس کے احکامات، تعلیمات اور ارشادات ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام اختلافات باہم متضاد نہیں ہیں جو ایک جگہ نہ مجتمع ہو سکیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ وجہ اعجاز صرف ایک ہی محدود ہو، قرآن مجید کے وجوہ اعجاز اس قدر کثیر ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا، جس شخص کو اپنے مذاق کے مطابق جو بات نمایاں نظر آتی ہے اسی کو اس نے وجہ اعجاز قرار دے لیا ہے، کوئی حسین اور خوبصورت چیز جب نقادانِ فن کی نگاہوں کے سامنے آتی ہے، تو کوئی اس کے رنگ و روغن کا مداح ہوتا ہے، کوئی اس کے اعتدال قامت کی تعریف کرتا ہے، کوئی اس کی وضع قطع کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے کوئی اس کی زیبائش و آرائش کی مدح کرتا ہے تو درحقیقت اس کی ذات ان تمام اوصاف کا مجموعہ ہوتی ہے اور ہر ناقد اپنی چشم اعتبار سے جو کچھ دیکھتا ہے اسی کو اس کے حسن کا معیار قرار دے لیتا ہے، حافظ و سعدی کے کلام کا معترف کون نہیں؟ لیکن لوگوں سے ان کے حسن و خوبی کی تفصیل پوچھو تو کوئی ایک بات نہیں کہے گا۔ کسی کے نزدیک ان کے کلام کا حسن یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں کے لئے بحریں نہایت مطربانہ اور موسیقیانہ اختیار کرتے ہیں، کوئی طریقہ ادا اور اسلوب تعبیر کی تعریف کرے گا۔ بعض ناقدین سخن الفاظ کی شیرینی اور ترکیب کی ندرت پیش

---

[1] الفصل فی الملل والنحل ابن حزم جلد سوم باب اعجاز القرآن [2] تفسیر کبیر جلد اول ص۳۳۵ تفسیر آیہ وان کنتم فی ریب [3] متکلمین کے یہ مذاہب شرح مواقف، اعجاز قرآن باقلانی، الاتقان سیوطی، فصل فی الملل والنحل ابن حزم میں مذکور ہیں [4] شاہ ولی اللہ صاحب نے فوز الکبیر میں اور مولانا شبلی نے اپنے مضمون اعجاز القرآن میں یہی مسلک اختیار کیا ہے

کریں گے، کوئی تشبیہ واستعارہ کی جدت پر زور دے گا، دوسرے اصحاب ان کی نازک خیالی کے معترف ہوں گے، بعضوں کے نزدیک ان کے معنی آفرینی، عمیق فلسفہ وحکمت اور دلپذیر موعظت ان کے کلام کا تمغائے کمال ہے

عباراتنا شتی وحسنک واحد   وکلٌّ الی ذاک الجمال یشیر

ہماری عبارتیں گو مختلف ہیں لیکن تیرا حسن ایک ہی ہے ہر شخص اپنی عبارت میں اسی ایک حسن کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

قرآن مجید کی ان آیتوں کا اگر استقصاء کیا جائے جن میں اس کے وجوہِ اعجاز کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے تو وہ ہم کو خود مختلف نظر آتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے وجوہِ اعجاز میں اس قدر متعدد اور کثیر الاطراف ہیں کہ ان میں کسی ایک میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے کہیں تو اپنی تعلیم وارشاد کی مدح کی ہے، کہیں اپنی تاثیر اور قوتِ جذب کی طرف اشارہ کیا ہے کہیں اپنی یکسانی اور عدمِ اختلاف کو اپنے خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی بتائی ہے، کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسنِ کلام کو ظاہر کیا ہے، کہیں ایک امی کی زبان کا پیغام ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے، ایک موقع پر اپنی ہدایت ورہنمائی کو مخصوص ترین وصف قرار دیا ہے، کہیں وہ خود کو نور، ھدیٰ، حکمۃ، بینۃ اور دیگر مختلف اوصاف معنوی کا پیکر کہتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم ان آیتوں کو بہ ترتیب لکھ دیتے ہیں۔

فصاحت وبلاغت

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (نحل ـ ۱۴)	جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ بھی زبان ہے جو عربی ہے اور اپنے معانے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔
بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ۔ (شعراء ـ ۱۱)	یہ قرآن ایک ایسی زبان میں ہے جو اپنے معانے دلی کو خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔
قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ (زمر)	قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں۔
قُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ (یٰس وحجر)	اپنے مدعا کو خوبی سے ظاہر کرنے والا قرآن۔

یکسانی اور عدمِ اختلاف

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا۔	کیا یہ کافر قرآن میں غور نہیں کرتے اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔

قوتِ تاثیر

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِیْهِ مُزْدَجَرٌ حِکْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر ـ ۱)	ان کو قرآن کے ذریعے سے اگلی امتوں کے اتنے حالات سنائے جا چکے ہیں جو ان کی تنبیہ کو کافی تھے، یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے لیکن ان کو ڈرانا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

کفار قرآن مجید کو سحر اور جادو کہتے تھے، یہ کیوں؟ اس کی اسی تاثیر اور قوتِ تسخیر کی بنا پر۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ	جب ان کافروں پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ

كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ (احقاف - ۱)

لوگ جو سچائی کے آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

کفار کہتے تھے کہ جب محمدؐ لوگوں کو قرآن پڑھ کر سنانے لگیں تو شور کر دو تاکہ لوگ سن کر متاثر نہ ہوں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ۔

کفار نے کہا کہ اس قرآن کو سنا نہ کرو اور اس کے پڑھتے وقت شور و غل کرو، شاید تم جیت جاؤ۔

تعلیم و ہدایت

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ (بقرہ)

یہی ہے وہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں ہے یہ پرہیزگاروں کے لئے سرتاپا ہدایت ہے۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (اسراء - ۱)

یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ صحیح اور سیدھی ہے

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ أَهْدٰى مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ (قصص - ۵)

کہ دے قرآن اور توراۃ سے بڑھ کر کوئی ہدایت والی کتاب لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتَابٌ مُّبِينٌ (مائدہ - ۳)

تمہارے پاس روشنی اور خدا کو ظاہر کرنے والی کتاب آچکی۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ اٰيَاتٍ بَيِّنَاتٍ (بقرہ)

ہم نے تیری طرف کھلی ہوئی آیتیں اتاریں۔

وَهٰذَا كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ مُبَارَكٌ فَاتَّبِعُوهُ وَاتَّقُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ أَنْ تَقُولُوا إِنَّمَا أُنْزِلَ الْكِتَابُ عَلٰى طَائِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغَافِلِينَ۔ أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ۔

(اسراء - ۹)

یہ مبارک کتاب ہم نے اتاری تو اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور یہ نہ کہو کہ ہم سے پہلے یہود و نصاریٰ دو قوموں پر کتاب اتاری گئی اور ہم ان کے پڑھنے سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان دونوں قوموں سے زیادہ راہ راست پر ہوتے تو لو یہ تمہارے رب کی طرف سے دلیل و ہدایت و رحمت آئی ہے اور قرآن سے ہم وہ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَّذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ۔ وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيَاتُهُ ءَأَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ اٰمَنُوا هُدًى وَّشِفَاءٌ (حم السجدہ - ۵)

یہ عزت والی کتاب ہے جس کے آس پاس بھی باطل نہیں آسکتا یہ حکمت اور تعریف والے خدا کی اتاری ہوئی ہے اے پیغمبر! تجھ سے وہی کہا جاتا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا، تیرا رب بخشش والا بھی ہے اور عذاب والا بھی ہے اگر ہم اس قرآن کو کی زبان کی کرتے تو وہ لوگ یہ کہتے کہ اس کے احکام کیوں نہیں کھول کر بیان کئے گئے ہم عرب ہیں اور کتاب عجمی، کہہ دے کہ یہ کتاب مومنوں کے لئے ہدایت اور شفا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًى
وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (یونس۔۶)

لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت آچکی اور وہ دلوں کے امراض کا علاج ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ

حکمت والا قرآن۔

وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ (ص)

نصیحت والا قرآن۔

قرآن کا جواب لانے کی قدرت نہیں،

لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ (اسراء)

جن وانس اس کا جواب نہیں لاسکتے۔

وَلَنْ تَفْعَلُوْا (بقرہ)

یہ کفار ہرگز اس کا جواب نہیں لاسکتے۔

ایک اُمی کی زبان سے ادا ہونا

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا
تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ۝
بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ
اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا
الظّٰلِمُوْنَ۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ
رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا
نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ
الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ
ذِكْرٰى لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (عنکبوت۔۵)

قرآن سے پہلے اے پیغمبر! نہ تو تو کچھ پڑھ کر سناتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اگر ایسا ہوتا تو البتہ یہ باطل پرست شک کر سکتے۔ بلکہ یہ کھلی آیتیں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم بخشا گیا ہے اور ہماری آیتوں سے صرف گنہگار ہی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیوں اس (پیغمبر) پر اس کے خدا کی طرف سے نشانیاں نہیں اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کے قبضہ میں ہیں، میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے، اس میں ایمان والوں کے لئے رحمت اور نصیحت ہے۔

حفظ وبقا کا وعدہ

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (نحل۔۱)

اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامہ۔۱)

ہم پر ہے اس قرآن کا جمع کرنا۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ
خَلْفِهٖ (فصلت)

اس قرآن کے پاس، آگے اور نہ پیچھے سے باطل آسکتا ہے۔

قوت دلائل

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (انعام)

یقیناً تمہارے پاس تمہارے خدا کی دلیل آچکی۔

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (انعام)

کہہ دے کہ خدا ہی کیلئے وہ دلیل ہے جو دلوں تک اتر جاتی ہے

هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ
لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۝ (اعراف۔۲۴)

یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں اور ہدایت اور رحمت ہے مومنوں کے لئے۔

قرآن مجید کی یہ آیتیں صرف چند حیثیتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں، اگر کوئی استقصا کرے تو متعدد وجوہ اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

الغرض مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزۂ کامل ہے، اس کے معجزۂ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گزرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے، تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گزر گیا، مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لئے بلند نہ ہوئی، اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیارِ اعجاز قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اُس وقت جب ایک اُمی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا، یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا، اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے مگر اس "صوت سرمدی" کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں، کفارِ عرب نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں، انہوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدانِ جنگ میں پرے جمائے، ان کے دولت مندوں نے اپنے خزانے کھول دیئے، ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستانِ عرب کو تنور بنا دیا، یہ سب کچھ کیا، مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق و صداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے اور جب وہ زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانے کے بعد کے لوگوں کے لئے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔

حسانؓ بن ثابت، عامرؓ بن اکوع، طفیل بن عمر، زید الخلیل، زبرقان، شماس، اسود بن سریع، کعب بن زہیر، عبد اللہؓ بن رواحہ وغیرہ عرب کے مشہور زبان آور شاعر تھے، مگر قرآن مجید کے سامنے ان سب نے سرِ نیاز خم کیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر تھے اور سبعہ معلقہ کی بزم مشاعرہ کے ایک رکن تھے، اسلام کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے چند اشعار کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں[2]۔

انیسؓ، قبیلۂ غفار کے شاعر تھے، انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے کلامِ ربانی کی کچھ آیتیں سن کر واپس گئے، ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیسا پایا، انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں، کاہن ہیں، ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے، یہ ان کی بولی نہیں، ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھ لیا ہے، وہ شاعر

---

[1] بخاری شریف [2] استیعاب ابن عبد البر ترجمہ لبید۔

بھی نہیں ہے، خدا کی قسم! محمدؐ سچے اور قریش جھوٹے ہیں[1]۔

ضماد ازدی ایک صاحب تھے جو جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، وہ یہ سن کر کہ محمدؐ (نعوذ باللہ) دیوانے ہوگئے ہیں، آپؐ کے علاج کے لئے آئے، آپؐ نے مختصر سی حمد اور کلمۂ شہادت پڑھا، وہ سن کر متحیر ہوگئے، تین دفعہ پڑھوا کر سنا، پھر کہا کہ خدا کی قسم! میں نے کاہنوں کی بولی اور جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں لیکن تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے، یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا[2]۔ جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل اور قریش کے دیگر اکابر جمع ہو کر مشورہ کرنے لگے کہ محمدؐ کی تحریک روز بروز زور پکڑتی جاتی ہے، کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا چاہیے جو جادو، کہانت اور شعر کہنا جانتا ہو، تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ کیا ہے؟ قریش کے سردار عتبہ بن ربیعہ نے کہا کہ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں، کہو تو میں جا کر دیکھوں، چنانچہ آستانۂ نبوی میں آکر اس نے صلح کے کچھ شرائط پیش کئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سورۂ فصلت پڑھنی شروع کی، کچھ ہی آیتیں پڑھی تھیں کہ اس نے آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ قرابت کا واسطہ بس کرو، واپس پھرا تو چند روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ابوجہل نے جا کر کہا، کیوں عتبہ! محمدؐ کے یہاں کھانا کھا کر پھسل گئے۔ عتبہ نے کہا، تم جانتے ہو کہ میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں، مجھ کو دولت کی طمع دامن گیر نہیں ہو سکتی، لیکن محمدؐ نے میرے جواب میں جو کلام پیش کیا وہ نہ شعر تھا، نہ کہانت تھی، نہ جادو، میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا، انہوں نے جو کلام پڑھا اس میں عذاب الٰہی کی دھمکی تھی، میں نے ان کو قرابت کا واسطہ دیا کہ چپ ہو جائیں، میں ڈرا کہ تم پر عذاب نہ آجائے، لوگوں نے کہا، محمدؐ نے اپنی زبان سے عتبہ پر جادو کر دیا[3]۔

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحب اثر تھا، وہ ایک دفعہ آپؐ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنائیے، آپؐ نے چند آیتیں پڑھیں، اس نے مکرر پڑھوا کر سنیں، آخر بے خود ہو کر بولا، خدا کی قسم! اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے، اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے، یہ کسی انسان کا کلام نہیں[4]۔

بنو ذہل بن شیبان کے سردار مفروق کے سامنے آپؐ نے چند آیتیں پڑھیں تو گو وہ مسلمان نہ ہوا مگر کلام الٰہی سے متاثر ہوا[5]۔

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جب سورۂ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر کہا، خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں[6]۔

---

[1] صحیح مسلم اسلام ابی ذر۔ [2] صحیح مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبہ۔ [3] کتاب التفسیر ابن مردویہ، مسند ابو یعلی و سیرت ابن اسحاق، اخیر فقرہ صرف سیرت ابن اسحاق میں ہے۔ [4] مصنف عبدالرزاق، مستدرک حاکم جلد ۲ ص ۵۰۶ میں یہ اور اوپر کا واقعہ دونوں مل جل گئے ہیں۔ [5] روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام جلد اول ص ۲۹۴ مطبوعہ مصر۔ [6] مسند احمد حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم ج ۲ صفحہ ۳۱۰۔

اس قسم کے اور بعض واقعات ابن اسحاق نے "سیرت" میں نقل کئے ہیں۔ پہلی جلدوں میں پڑھ چکے ہیں کہ لوگ کیونکر قرآن مجید کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا دل ایک سورہ کی چند آیتیں پڑھ کر اور سن کر پتھر سے موم ہو گیا[1]۔ حضرت جبیرؓ بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے[2][3][4]۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن مجید کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے[5]۔ طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانیؓ نے آپ کو والسماء والطارق پڑھتے سنا تو گو وہ اس وقت مسلمان نہ ہوئے، مگر پوری سورہ ان کے دل میں گھر کر گئی، یعنی یاد ہو گئی[6]۔

حبش سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت حاضر خدمت ہوئی۔ آپ نے ان کو قرآن مجید پڑھ کر سنایا ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے[7]۔ حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت ابو سلمہؓ، حضرت ارقمؓ بن ارقمؓ یہ تینوں اصحاب اسی کی کشش مقناطیسی سے کھنچ کر حلقہ اسلام میں آئے[8]، اور تو اور خود مہبط وحی اور حامل کلام ربانی کا کیا حال تھا؟ حضرت عبد اللہؓ بن مسعود نے ایک دفعہ قرأت شروع کی تو بے اختیار چشم مبارک سے آنسو جاری ہو گئے[9]۔ ایک اور موقع پر قرآن مجید کی چند آیتیں زبان مبارک سے ادا ہوئیں اور اس کے بعد آنسوؤں کا تار بندھ گیا[10]۔

کلام کی یہ شیرینی، یہ نمکینی، یہ تاثیر، یہ تسخیر جو دوست و دشمن، موافق و مخالف، شاہ و گدا، عالم و جاہل، پیغمبر و امت سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہے، اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ حکماء، فلاسفہ، علماء، اہل لغت، مفسرین، محدثین، فقہاء، صوفیاء، شعراء، متکلمین، غرض نوع انسانی کی وہ کون سی صنف ہے جس نے ایک امی کی زبان سے ادا ہونے والے پیغام کے عشق و محبت میں اپنا سرمایۂ حیات قربان نہیں کر دیا اور جن کو اس کلام کی تشریح و تفصیل اور تحقیق و توضیح کے خدمات کی لذت میں دنیا کی تمام نعمتیں ہیچ نظر آئیں، کیا یہ اعجاز نہیں؟

غور کیجئے کہ ایک امی محض جو امیوں کی ہی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہو کر اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اس کو کچھ نظر نہ آیا، علوم و فنون اور تمدن و تہذیب سے ایک عاری ملک، عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی، جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا، وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے آشنا نہ تھا اور گزشتہ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا، علماء اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اٹھائی، اصول قانون، مبادی

---

[1] ابن سعد جلد ۳ صفحہ ۱۹۱ حصہ اول و ابو یعلی و حاکم و بیہقی۔ [2] مسند ابن حنبل ج ۱ صفحہ ۸۰۔ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ طور۔ [4] مسند ابن حنبل ج ۱ صفحہ ۳۱۸۔ [5] استیعاب تذکرہ طفیل بن عمرو دوسی۔ [6] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵۔ [7] سیرت ابن ہشام۔ [8] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہؓ بن عبد الاسد۔ [9] صحیح بخاری تفسیر فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید۔ [10] صحیح مسلم باب بکائہ صلی اللہ علیہ وسلم امتہ۔

اخلاق، محاسن علم وعمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی، بلکہ مدرسۂ علم وحکمت کے سایۂ دیوار تک کبھی اس کا گذر نہیں ہوا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دورے پورے کرتا ہے کہ دفعۃً غارِ حرا کے ایک دہانے سے اجالا ہوتا ہے، علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا سرچشمہ اُبلتا ہے، ظاہری نوشت وخواند کے نقوش وحروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں، اس کے پرتوِ صحبت سے اُمی اور جاہل، علمائے دہر اور دانشورانِ روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں، اصول قانون، مبادی اخلاق اور محاسنِ علم وعمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزمِ فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے، کلامِ ربانی کے پردے میں علم وحکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں، اس سے زیادہ قرآن مجید کے معجز ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

توراۃ قانون وشریعت ہے لیکن اخلاق وموعظت نہیں۔ انجیل اخلاق وموعظت ہے لیکن قانون شریعت نہیں، زبور مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے، لیکن دیگر صفات سے خالی، مسیح کے صحیفے میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں، مگر استدلال اور فکر ونظر کی دعوت نہیں، صحفِ بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائقِ حکمت اور اسرارِ ایمان وعمل سے خالی ہیں، دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون وشریعت بھی ہے اور اخلاق وموعظت بھی، مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی۔ خطابت بھی ہے اور استدلال وفکر بھی، اظہارِ غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائقِ حکمت واسرارِ ایمان وعمل سے معمور بھی، اور ان سب کے ساتھ ہی اس وقت جب اور کتبِ الٰہی تحریف وتغییر اور تراجم وتعبیر سے اپنی اصل زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقاء اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک لفظ، ایک حرف، ایک نقطہ میں تغیر وتبدل نے راہ نہیں پائی وہ اپنی زندگیٔ جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش وحروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانہ کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور ان ہی الفاظ اور ان ہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دستِ قدرت نے اس کو ڈھالا تھا اور جبریل امین نے اس کو اتارا تھا اور محمد عربی نے اس کو اُمت کے ہاتھوں میں سونپا تھا، کیا یہ اعجاز نہیں؟

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ ساتھ اپنے الفاظ کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے اور اس کی فصاحت وبلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں بن سکتیں، کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں، چنانچہ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام وعبارت کے لحاظ سے معجز کہا ہے، چنانچہ اسی لئے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی (توراۃ) اور عیسوی (انجیل) نے ظہور کیا، مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہو گئی۔ توراۃ کی اصلی عبرانی زبان جو حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلی تھی وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہو گئی اور اس نے آرامی اور

سریانی زبان کا قالب اختیار کر لیا اور آخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیر نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا، انجیل کے متعلق ابھی تک یہی طے نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی؟ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں جو حضرت عیسےٰ فلسطین کے ملک میں بولتے تھے، ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور اس کے الفاظ کے من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ برخلاف اس کے دنیا میں "وحی محمدی" سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے، جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا، چنانچہ قرآن مجید کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا، اور وہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک ہے، اس لئے اس کے الفاظ، کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔[1]

* * *

---

[1] یہاں مسئلہ اعجاز القرآن پر بحث مقصود نہیں، یہ مباحث مفصل آئندہ کسی جلد میں آئیں گے، یہاں صرف سلسلہ معجزات میں اس کا محض تذکرہ مقصود تھا۔

اُمّیت

یعنی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک ہونا

اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ (اعراف)

یہ واقعہ محتاجِ بیان نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک تھے، قرآن مجید نے متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار کیا ہے، چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ ۔	یہ مسلمان وہ ہیں جو اَن پڑھ پیغمبر اور فرستادہ الٰہی کی پیروی کرتے ہیں۔

اسی سورہ میں پھر اس کے بعد ہی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ۔	تو لوگو! خدا پر اور اس کے اَن پڑھ پیغمبر اور فرستادہ پر ایمان لاؤ۔

سورۂ جمعہ میں نہ صرف آپ کے اُمّی بلکہ اغلب آبادی کی حالت کے لحاظ سے تمام قریش اور عرب کے اُمّی ہونے کا اظہار ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (جمعہ)	اسی خدا نے امّیوں کے درمیان ان ہی میں سے ایک پیغمبر بنا کر بھیجا۔

دوسری جگہ سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (عنکبوت - ۵)	اور قرآن کے نزول سے پہلے اے پیغمبر! تو تم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اس کو لکھ سکتے تھے اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک کر سکتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحت الٰہی کا ایک خاص منشا تھا، اسی لئے اس کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی	اور معترضین کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانیاں کیوں نہیں اتریں، کہہ دے کہ نشانیاں خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور میں تو صرف خدا سے ڈرانے والا ہوں، کیا ان معترضین کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر (جو امّی ہے) کتاب

عَلَيْهِمْ (عنکبوت - ۵)

اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں اس کا اظہار ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری زبان سے آج گزشتہ پیغمبروں، اگلی امتوں اور عہد ماضی کے واقعات ادا ہوتے ہیں ان واقعات اور حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے امکان میں ہیں، ایک یہ کہ وہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو، دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے، تیسرا یہ کہ اوروں سے سنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع کے ان ذرائع سے ناآشنا تھے، اول ذریعہ تو ظاہر ہے کہ مفقود تھا، قرآن مجید سے آدمؑ سے مولد نبویؐ تک کے تمام واقعات بیان کئے گئے ہیں آپ کی پیدائش سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے اور آپ کے پاس ان کے علم کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا، اسی لئے قرآن مجید نے متعدد مواقع مثلاً حضرت مریمؑ اور حضرت زکریاؑ کے قصہ میں کہا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا
كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ
يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ۔

(آل عمران - ۵)

یہ گزشتہ زمانہ کی خبروں میں سے ہے جس کو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں تو ان کے پاس اس وقت موجود نہ تھا جب وہ اپنا اپنا پانسہ ڈال رہے تھے کہ کون مریمؑ کی کفالت کرے گا اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى
مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ
وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَمَا
كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ
رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (قصص - ۵)

جب ہم نے موسیٰ کو اپنا فیصلہ دیا تو تو اس وقت مغربی گوشہ میں موجود نہ تھا بلکہ ہم نے صدیاں اس پر گزار دیں، قومیں پیدا کیں جن کی بڑی بڑی عمریں ہوئیں اور نہ تو اہل مدین میں قیام پذیر ہو کر آیات الٰہی ان کو پڑھ کر سناتا تھا، بلکہ ہم آئندہ تم کو بھیجنے والے تھے اور نہ تو اس وقت گوشۂ طور میں تھا جب ہم نے موسیٰؑ کو آواز دی، بلکہ (اس قصہ کا علم جو تجھ کو حاصل ہو رہا ہے) محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے۔

حضرت یوسفؑ کے قصہ میں فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ

(یوسف - ۱۱)

یہ اس گزشتہ زمانہ کا قصہ کا علم ہم تم کو اپنی وحی سے عطا کر رہے ہیں تو اس وقت ان میں موجود نہ تھا جب وہ باہم مشورہ سے بات کر رہے تھے۔

علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو قرآن مجید نے اس کی بھی نفی کی۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا
تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (عنکبوت - ۵)

نہ تو اس سے پہلے کوئی کتاب پڑھ کر سناتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے تو اس کو لکھ سکتا تھا۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔
(شوریٰ - ۵)

تجھ کو تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور ایمان کس کو کہتے ہیں۔

تیسری صورت یہ بھی کہ دوسروں سے سن کر یہ علم حاصل کیا جائے، سب کو معلوم ہے کہ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تمام تر مکہ معظمہ میں گزری، بجز اس کے کہ چند مہینے بصریٰ وغیرہ کے سفر تجارت میں گزرے ہوں اور خود مکہ معظمہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی، اسلئے یہ ذریعہ علم بھی ثابت نہیں چنانچہ قرآن مجید نے علی الاعلان کہا۔

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا۔ (ہود - ۴)

یہ گزشتہ زمانہ کی باتیں ہیں جن کی بذریعہ وحی ہم تجھ کو تعلیم کرتے ہیں، تو خود اور تیری قوم اس سے پہلے آگاہ نہ تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو زندگی مکہ معظمہ میں گزری اور سفر تجارت میں قریش کے شامی قافلوں کے ساتھ جو زمانہ بسر ہوا، اس کا ایک ایک واقعہ قریش کے سامنے تھا، جب آپ مکہ میں تھے تب بھی آپ قریش کے مجمع میں تھے اور جب کبھی مکہ سے باہر گئے تو بھی قریش ہی کے جھرمٹ میں رہے، اس لئے آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ان سے مخفی نہ تھا، اگر آپ نے کوئی ظاہری تعلیم پائی ہوتی تو شاعر و مجنون و ساحر کی طرح وہ اس الزام کا اظہار بھی کر سکتے تھے، مگر انہوں نے نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ محمد کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں، چنانچہ قرآن مجید نے بآواز بلند کہا۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (یونس - ۲)

اگر خدا کو منظور ہوتا تو میں تم کو نہ یہ قرآن پڑھ کر سناتا اور نہ خدا تم کو اس قرآن سے آگاہ کرتا، اس سے پہلے میں مدتوں تم میں رہ چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔

قرآن مجید نے ان تمام شکوک اور الزامات کو دہرایا ہے، ان کو یہ شک تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی دوسرے سے سن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید نے ان کے اس اعتراض کو نقل کیا اور اس کا جواب دیا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ۔ (نحل - ۱۴)

اور ہم کو بہ تحقیق معلوم ہے کہ یہ کفار کہتے ہیں کہ محمد کو کوئی آدمی سکھاتا ہے، اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔

سورۂ فرقان میں چند آدمیوں کی شرکت کا شبہ مذکور ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا۔ (فرقان - ۱)

اور کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن من گھڑت چیز ہے جس کو محمد نے گھڑ لیا ہے اور اس افترا پردازی میں چند دوسرے آدمی بھی شریک ہیں، وہ یقیناً غلط اور جھوٹ کہتے ہیں۔

یہ سب شبہات کیے گئے مگر کفار نے کبھی یہ شبہ نہیں ظاہر کیا کہ محمدؐ نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ آپؐ کی اُمیت پر ان کو یقین تھا۔

مدینہ آکر یہودیوں سے معاملہ پڑا، روایات میں بکثرت اس قسم کے واقعات مذکور ہیں کہ یہود آپؐ کے پاس آتے تھے اور آپؐ سے وہ سوالات کرتے تھے جو اُن کی کتابوں میں مذکور تھے اور کہتے تھے کہ اُن کے جواب پیغمبر ہی دے سکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے صحیح جوابات دیتے تھے اور وہ متحیر رہ جاتے تھے اس واقعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ یہود کو بھی یہ یقین تھا کہ محمد رسول اللہ اُمی محض ہیں اور ہماری کتابوں کو نہ انہوں نے پڑھا ہے اور نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ اس جرأت کے ساتھ وہ اپنی کتابوں کے سوالات اس شخص کے سامنے جس کی نسبت ان کو معلوم ہوتا کہ وہ ان کو پڑھ چکا ہے یا پڑھ سکتا ہے نہ پیش کرتے اور نہ اس کو حق و باطل کا معیار قرار دیتے۔

قریش کو جس شخص کی نسبت شبہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے اس کے متعلق امام طبری نے تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی شخصیت اور نام کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا جو اپنی زبان میں کتب مقدسہ کبھی کبھی پڑھا کرتا تھا اور آپؐ راستہ چلتے اس کے پاس کبھی کبھی کھڑے ہو جاتے تھے، اسی پر کفار نے کہا کہ محمدؐ کو یہی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اس غلام کی، اور جو کتابیں وہ پڑھا کرتا ہے ان کی زبان عربی نہیں اور نہ وہ عربی جانتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اور خود قرآن کی زبان فصیح عربی ہے، یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیر زبان کو سمجھیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں کلام کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپؐ کو آپؐ کے چچا ابوطالب اپنے ساتھ شام لیے جا رہے تھے، راستہ میں بحیرا نام ایک راہب نے آپؐ کو دیکھا اور آثار سے پہچان لیا کہ آپؐ ہی پیغمبر آخر الزمان ہیں، چنانچہ اس نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ ان کو مکہ واپس بھیج دو، ورنہ اگر یہود دیکھ لیں گے تو قتل کر ڈالیں گے، اگرچہ یہ واقعہ جیسا کہ سیرت نبویؐ جلد اول (شام کا سفر) میں بہ تفصیل لکھا جا چکا ہے، صحیح نہیں ہے، تاہم ہمارے عیسائی احباب اس ضعیف روایت پر اپنے شکوک و شبہات کی عظیم الشان عمارت قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو دنیا کے لیے اس سے بڑا معجزہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اور کیا چاہیے کہ ایک ابجد ناشناس طفل دوازدہ سالہ نے چند گھنٹوں میں حقائق و اسرار دین، اصول عقائد، نکات اخلاق، مہمات قانون اور ایک "شریعت عظمیٰ" کی تکمیل و تاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لیے، کیا ہمارے عیسائی دوست اس معجزہ کو تسلیم کرتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ زندگی پورے ۲۳ برس تک

قائم رہی، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی معلم سے فیض پاتے رہتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانہ تک یا بڑی مدت تک خلوت و جلوت میں آپ کے ساتھ رہتا کہ وقتِ ضرورت (نعوذ باللہ) آپؐ اس سے قرآن بنواتے، احکام و مواعظ سیکھتے، اسرار و نکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا، کیونکہ جو شخص خود مدعئ نبوت کو تعلیم دے رہا ہو وہ کیونکر اس کی نبوت کو تسلیم کر سکتا تھا، اور پھر اس شہرتِ عام، ذکرِ جمیل، رفعتِ مقام کو دیکھ کر جو مدعئ نبوت کو حاصل ہو رہی تھی وہ خود پردہ کے پیچھے گمنامی پسند کرتا اور صحابہ کرامؓ کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا، جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہ تھا اگر حقیقت میں آپ اس سے تعلیم حاصل کیا کرتے تو قریش جو آپؐ کی تکذیب، تذلیل اور آپ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا ہو رہے تھے ان کے لئے آسان تھا کہ اس غلام عجمی کو الگ کر دیتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعتاً درہم برہم ہو جاتا، علاوہ ازیں زیادہ سے زیادہ، اس کا وجود مکہ میں تھا، پھر مدینہ میں ۱۳ برس تک سینۂ نبوت سے فیضانِ الٰہی کا سرچشمہ کیونکر ابلتا رہا، قرآن مجید شریعتِ اسلام اور احکام کا بڑا حصہ یہیں وحی ہوا ہے، مکہ میں تو نسبتاً بہت کم سورتیں نازل ہوئی ہیں۔

جب مدینہ منورہ میں اسلام کا چرچا پھیلا تو یہود و نصاریٰ نے اسلام کو بدنام اور بے اثر کرنے کی ایک تدبیر یہ سوچی کہ لوگ جھوٹ موٹ آکر پہلے مسلمان اور پھر چند روز کے بعد ہی مرتد ہو جائیں تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بدنامی ہو اور لوگوں کو خیال ہو کہ اگر یہ مذہب سچا ہوتا تو اس کو قبول کر کے کوئی کیوں چھوڑ دیتا؟

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (آل عمران - ۸)	اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو اترا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس سے پھر جاؤ، شاید کہ وہ لوگ (مسلمان) بھی پھر جائیں۔

چنانچہ اسی سازش کے مطابق ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا اور سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ وحی کی خدمت اس کے سپرد کی، چند روز کے بعد وہ مرتد ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں نے محمدؐ کو جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہ[1] جانتے، خدا نے اپنی نشانی ظاہر کی اور موت نے بہت جلد اس کی افترا پردازی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ نبوت کا چشمہ اب بھی اسی طرح جوش زن ہے۔

صلح حدیبیہ کا ایک واقعہ یہ ہے کہ قریش اور مسلمانوں کے درمیان عہد نامہ مرتب ہو رہا تھا، حضرت علیؓ عہد نامہ لکھ رہے تھے، عہد نامہ کی عبارت یہ تھی کہ ”یہ وہ شرائط ہیں جن کو خدا کے رسول محمدؐ نے منظور کیا“ قریش نے کہا، اگر ہم آپ کو خدا کا رسول مانتے تو اس لڑائی کی نوبت ہی کیوں آتی، اس لفظ کو مٹا کر

---

[1] صحیح بخاری علامات النبوۃ فی الاسلام۔

اپنا اور اپنے باپ کا نام لکھئے، آپ نے حضرت علیؓ کو فرمایا کہ ان کی حسب خواہش ترمیم کر دو، حضرت علیؓ نے کہا مجھ سے یہ گستاخی نہیں ہو سکتی، آپ نے پوچھا وہ الفاظ کہاں ہیں، حضرت علیؓ نے انگلی رکھ کر بتایا تو آپؐ نے خود اپنے دست مبارک سے رسول اللہ کا لفظ مٹا دیا، اور محمد بن عبداللہ لکھ دیا، یہ واقعہ بخاری، مسلم، نسائی، مسند ابن حنبل، اور تمام کتب سیر میں مذکور ہے، اسی کے ساتھ بخاری میں یہ تصریح ہے کہ ولیس یحسن یکتب اور مسند احمد میں بروایت اسرائیل یہ الفاظ ہیں ولیس یحسن ان یکتب، یعنی آپ لکھنا نہیں جانتے تھے، لیکن باوجود اس کے تمام احادیث و سیر میں یہ ہے کہ آپؐ نے محمد بن عبداللہ کے الفاظ لکھ دیئے، روایت کے ظاہری معنی سے بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ آپ نے خود اپنے دست مبارک سے یہ الفاظ لکھے اور آپ نے شاید اخیر زمانہ میں لکھنا سیکھ لیا تھا، ابن ابی شیبہ نے مجاہد کے واسطہ سے یہ روایت کی ہے کہ آپ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک آپ کو لکھنا پڑھنا نہ آ گیا، اور ایک اور روایت ابو واسطہ یونس بن میسرہ عن ابی کبشۃ السلول عن سہل بن الحنظلیہ، نقل کی ہے کہ آپ نے حضرت امیر معاویہؓ سے ایک فرمان لکھوا کر اقرع اور عیینہ کو عنایت فرمایا، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہا کہ معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہے؟ آپ نے اس پر ایک نظر ڈال کر فرمایا، وہ ہی لکھا ہے جو میں نے حکم دیا ہے؟

اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور معجزہ ہوگا کہ انسانی تعلیم کے بغیر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ فن بھی اپنی بارگاہ سے عنایت کیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایتیں تمام تر موضوع یا نہایت ضعیف ہیں، اس لئے آپؐ کی امیت کے متعلق جو متواتر روایتیں ہیں ان سے ان کی تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ یہ ممکن ہے کہ امی سے امی آدمی۔ کے ہاں جب شب و روز لکھنے پڑھنے کا کام لگا رہے تو وہ کسی قدر حرف شناس ہو جائے، خصوصاً اپنے نام اور دستخط کو پہچان لینا اور ان کو لکیر کھینچ کر لکھ دینا تو معمولی بات ہے لیکن اصل یہ ہے کہ فاعل مجازی و حقیقی فرامین اور مراسلات لکھاتے ہیں، محاورۂ عام میں ان کو لکھنا ہی کہتے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ عالمگیر نے یہ فرمان لکھ کر دیا، شاہجہان نے جامع مسجد بنوائی، فلاں بادشاہ نے یہ قلعہ تعمیر کیا۔ حالانکہ لکھنے والے، بنانے والے اور تعمیر کرنے والے کاتب اور معمار تھے، مگر چونکہ ان سلاطین کے حکم سے اور ان ہی کی طرف سے وہ لکھا یا بنایا گیا، اس لئے بولنے والے خود سلاطین اور امراء کی طرف فعل کی نسبت کر دیتے ہیں، چنانچہ اسی محاورہ کے مطابق اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین عالم کے نام دعوت نامے بھیجے ہیں تو وہاں عام طور پر یہ الفاظ ہیں وکتب الی قیصر وکتب الی کسریٰ۔ آپؐ نے قیصر کو یہ خط لکھا، کسریٰ کو یہ لکھا، مگر سب کو معلوم ہے کہ آپ نے دست خاص سے یہ خطوط لکھ کر نہیں بھیجے مگر چونکہ آپ ہی نے لکھوائے تھے، اس لئے ان کی نسبت آپؐ ہی کی طرف کی گئی۔

روزمرہ کی بات ہے کہ ہندوستان کے ادنیٰ طبقے جو نوشت و خواند سے عاری ہیں وہ اپنے عرضہ

۱؎ صحیح بخاری باب عمرۃ القضاء۔

اور احباب کو خط لکھاتے ہیں، مگر کہنے والے اس کو یوں ہی کہتے ہیں کہ اس نے خط میں لکھا ہے کہ میں آنے والا ہوں، حالانکہ وہ خود لکھنے والا نہیں، اس نے دوسروں سے لکھایا ہے، مگر چونکہ لکھنے والے نے اپنا مدعا نہیں لکھا، بلکہ لکھانے والے کی زبان سے اس کا مدعا ظاہر کیا ہے، اس لئے اسی کی طرف فعل کی نسبت کردی گئی۔

قرآن پاک نے آپ کو بار بار اور برملا اُمّی کہا ہے، اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہیے، لیکن آپ اُمّی ہوکر، اُمّیوں میں پل کر کتبِ سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہوکر بھی سب کچھ جانتے تھے اور یہ آپ کا معجزہ تھا، کفار کو خطاب کرکے قرآن کہتا ہے کہ محمدؐ کی صداقت کی یہ دلیل کافی نہیں کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہوکر بھی وہ کچھ جانتا ہے جس کی علمائے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں۔

اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ (شعراء - ۱۱)	یہ باتیں گزشتہ پیغمبروں کی کتابوں میں ہیں، کیا ان کافروں کیلئے یہ نشانی نہیں کہ ان باتوں کو (جو ایک اُمّی کی زبان سے ادا ہورہی ہیں)، بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں۔

*

ذاتِ نبویؐ کی حفاظت

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ

انبیائے کرام جب دنیا میں تشریف لاتے ہیں تو وہ دنیا کی جہالت و ظلمت، جور و ستم، گناہ و معصیت کے خلاف اپنا جہاد شروع کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں انسان اُن کے دشمن بلکہ ان کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں، اس تنہائی و بے کسی کے عالم میں جس سے ہر مصلح کو آغازِ دعوت میں دو چار ہونا پڑتا ہے صرف اسی قادر و توانا کا ہاتھ ہوتا ہے جو اُن کی تسکین و نصرت کا سہارا ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ نمرود کے دربار میں اور حضرت موسیٰؑ فرعون کی بارگاہ میں، حضرت عیسیٰؑ رومیوں اور یہودیوں کی عدالت میں ایک ہی گناہ کے مجرم تھے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس پیغام کی بقا و قیام کا جس کے لئے وہ پیغمبر کو مبعوث کرتا ہے خود ذمہ دار ہوتا ہے، اس لئے اس بے کسی و بے چارگی کے عالم میں اس کی زندگی کا وہی محافظ و نگہبان بن جاتا ہے، وہ بے خوف و خطر اپنے فرائض کو انجام دے سکیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع ہی میں تسکین دے دی گئی تھی۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (طور۔ ۲)	اپنے رب کے حکم کے انتظار میں صبر کئے بیٹھ رہ کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا آغاز کیا تو مکہ کا بچہ بچہ آپ کا دشمن ہو گیا، آپ کو طرح طرح کے آزار پہنچائے گئے، آپؐ کے خلاف سینکڑوں منصوبے باندھے گئے، آپؐ کے قتل کی سازشیں ہوئیں، تلواریں زہر میں بجھا کر رکھی گئیں، سوتے میں آپؐ کے قتل کا ارادہ کیا گیا، میدانِ جنگ میں آپ پر نرغہ کیا گیا، کمین گاہوں سے آپ پر حملے کئے گئے، غفلت میں آپؐ کے سر پر پتھر گرانے کی تدبیر سوچی گئی، کھانے میں زہر دیا گیا، مگر ہر موقع پر یہ ظاہر ہوا کہ ؎

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است

اور قرآن مجید کا یہ اعلان صحیح ثابت ہوا۔

إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ۔ (اسرا۔ ۱)	تیرے پروردگار نے لوگوں کو گھیر رکھا ہے کہ تجھ پر دسترس نہ پائیں۔

یہ خود ایک مستقل معجزہ ہے کہ ان ہنگاموں، فتنوں اور سازشوں کے عالم میں خصوصاً عرب کے ملک میں جہاں اقتدارِ حکومت یا نظامِ امن کا نام و نشان تک نہ تھا، کیونکر آپؐ نے بحفاظت تمام اپنے فرض کو انجام تک پہنچایا۔

قریش کی مجلسیں اکثر خانہ کعبہ میں منعقد ہوا کرتی تھیں اور اکثر وہیں ان کی نشست و برخاست رہا کرتی تھی تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز اور طواف کے لئے بے خوف و خطر وہیں تشریف لے جایا کرتے اور برملا اُن کے دیوتاؤں اور بتوں کی برائیاں بیان کیا کرتے تھے، آخر قریش نے ایک دفعہ ارادہ کیا کہ نعوذ باللہ آپ کا خاتمہ کر دیں، یہ خبر آپ تک پہنچی ہے مگر اس سے آپ کے ارادہ میں کسی قسم کا وہن یا ضعف نہیں پیدا ہوتا۔ ایک دن قریش نے یہ طے کیا کہ آج محمد کی بوٹی بوٹی اڑا دی جائے، اتفاق سے کفار کی یہ تقریر حضرت فاطمہ سن لیتی ہیں وہ روتی ہوئی باپ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہیں، آپ تسلی دیتے ہیں اور وضو کر کے حرم کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں، دشمنوں کی نگاہیں آپ پر پڑتی ہیں تو وہی نگاہیں جو اب تک خون آشامی کے لئے تیار تھیں، دفعۃً سرنگوں ہو جاتی ہیں، حاکم میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے چند کنکریاں اٹھا کر ماریں جن کو یہ کنکریاں جا کر لگیں وہ بدر میں مارے گئے۔

ایک دفعہ ابوجہل نے ارادہ کیا کہ اگر اب وہ آپ کو سجدہ میں دیکھے گا تو آپ کی پیشانی کو رگڑ دے گا، جب وہ اس ارادہ سے آگے بڑھا تو جھجک کر پیچھے لوٹ گیا، لوگوں نے دریافت کیا تو اس نے کہا مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے اور محمدؐ کے درمیان آگ کی خندق حائل ہے اور چند پروردار ہستیاں کھڑی ہیں، آپ نے فرمایا اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے اڑا دیتے۔[2]

معلوم ہے کہ جس شب کو آپ نے ہجرت کا ارادہ کیا ہے، قریش کے تمام خاندان نے مل کر آپ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تھا، قریش کے بہادر رات بھر خانہ اقدس کا پہرہ دے رہے تھے، تاہم آپ ان کے سامنے سے نکلے، زبان مبارک پر یہ آیت پاک تھی،

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (یٰس)	اور ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دیں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا کہ وہ نہیں دیکھتے ہیں۔

پہرہ داروں کی آنکھوں پر قدرت نے مہر لگا دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے درمیان سے نکل کر چلے گئے، صبح ہوئی تو دشمن آپ کے تعاقب میں اس غار تک پہنچ گئے، جہاں آپ اور حضرت ابوبکرؓ جا کر چھپے تھے، وہ اس غار کے دہانہ تک پہنچ گئے اور اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو ان مقدس پناہ گزینوں پر ان کی نظر پڑ جاتی، مگر خدا نے ان کی عقل اور دور اندیشی کے نور کو بجھا دیا کہ نیچے جھک کر دیکھنے کا خیال تک ان کے دل میں نہیں آیا۔

کفار نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو محمدؐ کو گرفتار کر لائے یا ان کا سر کاٹ کر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام میں ملیں گے، یہ سن کر سراقہ بن جعشم اپنے اسپ راہوار پر سوار ہو کر آپ کے تعاقب میں روانہ ہوا، اور دمبدم اس

---

[1] مستدرک حاکم جلد اول صفحہ ۱۶۳، حیدرآباد، مسند ابن حنبل جلد اول صفحہ ۳۰۹ [2] صحیح مسلم باب قولہ تعالیٰ وما کان اللہ لیعذبہم۔

مختصر قافلہ کے قریب ہو رہا تھا حضرت ابوبکرؓ پر بتقاضائے بشری اضطراب طاری تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سکینت خاطر میں کوئی فرق نہ آیا، آپ نے دعا کی تین دفعہ اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس دھنس گئے، اس نے فال کے تیر نکال کے دیکھے تو ہر دفعہ نفی میں جواب آیا، بالآخر اس کو یقین ہوگیا کہ یہ کوئی اور ہی راز ہے اور ذات محمدی ہماری گرفت سے باہر ہے، اس نے اپنے ارادۂ فاسد سے توبہ کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خطِ امان لے کر واپس پھر گیا[1] اور بعد کو مسلمان ہوگیا۔

شروع شروع میں جب آپ مدینہ تشریف لائے تو صحابہ جان نثاری کی بنا پر راتوں کو آپ کے گرد پہرہ دیا کرتے تھے، ایک رات صحابہؓ آپ کے خیمہ کے گرد پہرہ دے رہے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ)[2] اور اللہ ان لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

آپ نے اسی وقت خیمہ سے باہر سر نکالا اور پہرہ والوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگو! واپس جاؤ، خدا نے میری حفاظت کا فرض خود اپنے ذمہ لے لیا ہے، یہ وعدۂ حفاظت ہزار ہا مشکلات اور خطرات کے باوجود بھی پورا ہوتا رہا، غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے، اور ذاتِ مبارک دشمنوں کے نرغہ میں تھی اور آپ پر تیغ و تیر و سنگ کی بارش ہو رہی تھی، لیکن دو سفید پوش فرشتے آپ کے پاس کھڑے ہوئے آپ کی حفاظت کا فرض انجام دے رہے تھے۔[3]

ایک دفعہ ایک شخص کو لوگ گرفتار کر لائے، اور عرض کی کہ یہ حضورؐ کے قتل کی گھات میں تھا، فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو کہ اگر یہ مجھ کو قتل کرنا چاہتا بھی تو نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سے خیبر میں جب ایک یہودیہ نے گوشت میں زہر ملا کر پیش کیا، تو آپ نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ فرمایا یہ گوشت نہ کھاؤ، کیونکہ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس میں زہر ملا ہے۔ یہودیہ کو بلا کر جب واقعہ کی تحقیق کی اور اس نے اپنی نیتِ فاسد کا اقرار کیا تو آپ نے فرمایا، کہ خدا تجھ کو اس پر قابو نہ دیتا۔[4]

*

---

[1] صحیح بخاری باب ہجرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] جامع ترمذی تفسیر سورۂ مائدہ۔

[3] صحیح بخاری غزوۂ احد و صحیح مسلم کتاب الفضائل [4] صحیح مسلم۔

لیلۃ الجن

جنوں کی انقلابِ آسمانی کی تلاش اور ان کا مشرف باسلام ہونا

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (سورۂ جن)

مخلوقاتِ الٰہی کی تعداد اور اصناف کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (مدثر)	اور تیرے رب کی فوجوں کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔

مخلوقاتِ الٰہی کی ایک صنف کا نام جن ہے، اہل لغت کہتے ہیں کہ عربی میں جن کا لفظ جنّ سے مشتق ہے جس کے معنی "چھپنے" اور "چھپانے" کے ہیں، چونکہ یہ مخلوق انسانوں کی آنکھوں سے عموماً مستور رہتی ہے اس لیے اس کو جن کہتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں یا اسی کے قریب قریب مختلف قوموں کی زبانوں میں پایا جاتا ہے، فرنچ میں جینی (GENEE) اور انگریزی میں (GENEI) اسی مفہوم میں ہے، جس میں عربی میں جنی (دیو، بھوت، پلیت) ہے، لاطینی میں جینیوس (GENIUS) اور جینی (GENII) وہ مفہوم رکھتا ہے جو ہمارے ہاں ہمزاد کا، اور روح نوعی کے معنی میں بھی یہ لفظ رومی اساطیر (میتھالوجی) میں مستعمل ہوا ہے، فارسی میں جان کے معنی مطلق روح کے ہیں، بہرحال دنیا کی قوموں میں یہ اعتقاد کسی نہ کسی حیثیت سے موجود رہا ہے کہ انسانوں کے سوا اس سطح ارضی پر ایک اور غیر مرئی مخلوق بھی موجود ہے، یورپ کے موجودہ دورِ الحاد میں ارواح سے نامہ و پیام اور ان کے عمل و تسخیر کے کارنامے بڑے بڑے فلسفیوں اور مادہ پرستوں کو آئینۂ حیرت بنائے ہوئے ہیں اور روز بروز ان کے انکار اور شک کی جرأت کم ہوتی چلی جاتی ہے، اسلام کے علاوہ دوسری مذہبی کتابوں میں بھی جن اور شیطان کے تذکرے موجود ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے معجزات جو موجودہ انجیل میں مذکور ہیں، ان کی بڑی تعداد انسانوں اور حیوانوں کو ان کے پنجۂ ظلم سے رہائی ہے، قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ان کی پیدائش انسانوں سے پہلے ہوئی ہے اور آگ سے بنائے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ	اور ہم نے آدمی کو کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا اور
وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (حجر ۳)	جنوں کو اس سے پہلے لو کی آگ سے پیدا کیا۔
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (رحمٰن ۱)	اور اس نے جنوں کو آگ کی لو سے پیدا کیا ہے

اسلام سے پہلے عرب میں جنات کا بڑا تسلط تھا، ان کی پوجا کی جاتی تھی، ان کی دہائی مانگی جاتی تھی اور بت خانوں میں جو عامل اور کاہن ہوتے تھے ان سے ان کی دوستی ہوتی تھی اور وہ ان کو غیب کی خبریں بتایا کرتے تھے بچوں کے سرہانے استرے رکھے جاتے تھے کہ ان سے جنات بھاگ جاتے ہیں، یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ

---

[1] صحیح مسلم باب التفسیر

ایک جن ہوتا ہے۔ یہ بھی خیال تھا کہ وہ صورتیں بدل بدل کر لوگوں میں پھرتے ہیں اور ان کو ستاتے ہیں، خدا کے کارخانہ قدرت میں بھی ان کے استیلا اور تصرف کو دخل تھا، وہ جنگلوں میں انسانوں کو مار ڈالتے تھے، راستوں سے ہٹا لے جاتے تھے، لوگوں کو بیمار ڈال دیتے تھے، ان کے ہوش و حواس کے خزانہ پر قبضہ کر لیتے تھے غرض جس طرح خدائی الوہیت میں عرب کے بہت سے دیوتا اور دیبیاں شریک تھیں، اسی طرح یہ جنات بھی شریک تھے۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ (انعام ۱۲)

اور ان مشرکوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا ہے۔

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صافات ۵)

اور ان مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتے قائم کر لیے ہیں۔

بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُؤْمِنُونَ (سبا)

(خدا ان کو قیامت میں کہے گا) بلکہ یہ لوگ جنوں کی پرستش کرتے تھے اور ان میں اکثر لوگ ان ہی کے معتقد تھے۔

اسلام آیا تو اس نے ان اعتقاداتِ باطلہ کے تار و پود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، اس نے دنیا میں صرف ایک ہی قوت کی تعلیم دی اور وہ خدا کی تھی، اس نے بتایا کہ جنات بھی اس کے حضور میں ویسے ہی عاجز اور درماندہ ہیں جیسے انسان۔ وہ بھی اسی طرح اس کی مخلوق ہیں جیسی اس کی دوسری مخلوقات، ان میں لوگ اسی طرح اچھے اور برے، کافر و مومن، سعید اور شقی ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں، وہ بھی توحید و رسالت اور احکام الٰہی کے ماننے کے ویسے ہی مکلف ہیں جیسے عام انسان۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (ذاریات ۳)

اور میں نے جن اور انس کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

قیامت میں دونوں سے سوال ہوگا۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنْذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا (انعام ۱۶)

اے جن اور انس (کی جماعت) کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر تمہارے پاس نہیں آئے اور وہ تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر نہیں سناتے تھے اور اس دن کے آنے سے نہیں ڈراتے تھے۔

قرآن کے تحدی کے جواب سے دونوں عاجز ہیں۔

قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ (اسرائیل)

کہہ دو کہ اگر انس و جن دونوں مل کر چاہیں کہ ایسا قرآن بنا لائیں تو ان کے لئے یہ ناممکن ہے۔

خدا کی قدرت اور طاقت کے سامنے دونوں لاچار اور درماندہ ہیں۔

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ (رحمٰن ۲۰)

اے جن و انس اگر آسمان و زمین کے حدود سے نکل کر باہر جا سکتے ہو تو نکل جاؤ لیکن خدا کی قدرت قاہرہ کے بغیر تم نکل نہیں سکتے ہو۔

کاہنوں اور عاملوں کو جو غیب کی بعض بعض باتیں معلوم ہو جاتی ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ اپنے اپنے ملأ اعلیٰ میں اس کا ذکر کرتا ہے، ملأ اعلیٰ والے اپنے نیچے کے

فرشتوں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس طرح درجہ بدرجہ ہر آسمان کے فرشتوں کو علم ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ آخری آسمان تک بات پہنچ جاتی ہے، جہاں سے نیچے دنیا کی حد شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ جنات و شیاطین سن گن لینے کے لئے ادھر ادھر چھپے رہتے ہیں، ایک دو لفظ انھوں نے سن لئے اور ان میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر کاہنوں اور عاملوں سے کہہ دیتے ہیں، وہ اس کو انسانوں میں مشتہر کرتے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان میں بے شمار ستاروں کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں کہ ایک تو ان سے آسمان کی زیبائش و آرائش ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ جنات اور شیاطین اپنی سرحد سے آگے بڑھ کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتے ہیں تو فوراً[1] ایک چمکتا ہوا تارا (شہاب ثاقب) ٹوٹ کر ان پر گرتا ہے، مختلف صورتوں میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۔ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ۔ (حجر۔۲)	اور ہم نے آسمان میں برج بنایا ہے اور ان ستاروں کو دیکھنے والوں کے لئے زینت و آرائش بنایا ہے اور ہر راندہ درگاہ شیطان سے اس کو محفوظ رکھا ہے لیکن اتنا ہے کہ وہ چوری چھپے کچھ سن لے تو ایک چمکتا ستارہ اس کا پیچھا کرتا ہے۔
اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (صافات۔۱)	ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کی آرائش سے مزین کیا ہے اور ان کو ہر سرکش شیطان کا نگہبان بنایا ہے وہ ملاء اعلیٰ کی باتیں نہیں سن سکتے وہ ہر طرف سے پھینک کر مارے جاتے ہیں اور ان کے لئے لازمی سزا ہے، اس طرح وہ فرشتوں کی باتیں نہیں سن سکتے، لیکن یہ کہ کوئی اچک کر سن لے تو ایک دہکتا ہوا ستارہ ان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔
وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (ملک۔۱)	ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کے چراغوں سے مزین کیا ہے اور ان کو شیطانوں کے لئے پھینک کر مارنے کی ایک چیز بنایا ہے۔
وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (فصلت۔۲)	اور ہم نے آسمان زیریں کو ستاروں کے چراغوں سے مزین کیا ہے اور ان کو نگہبان بنایا ہے، یہ غالب و دانا خدا کی تقدیر ہے۔

دنیا میں اس سلسلۂ نبوت کا جو آغاز آفرینش سے جاری تھا اور دین الٰہی کا ہزاروں منزلوں کے طے ہونے کے بعد تکمیل کی منزل میں پہنچ جانا اور نوع انسان کو خدا کی وہ آخری شریعت سپرد ہونا جس کے بعد خاکدانِ عالم کو وحی و نبوت کے کسی اور حامل کی ضرورت نہ ہوگی، ایک ایسا واقعہ تھا جس نے آب و خاک کے عالم میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اس نے سطح زمین کے ہزاروں پیغمبروں کے دین و ملت کو منسوخ کر دیا، ان کی آسمانی کتابوں کے احکام و رسوم کو بدل دیا، ملکوں کی شاہنشاہیاں ہل گئیں، قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ گئے، صومعہ و کلیسا ویران ہوگئے،

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حجر و تفسیر سورۂ نساء و بدء الخلق وغیرہ۔

اسی طرح مملکت فلکی اور آسمانی بادشاہی میں بھی انقلاب کا ظاہر ہونا ضرور تھا، آسمانی مخلوقات میں بھی ایک انقلاب پیدا ہوا، مگر اس کو وہی دیکھ سکے جو دیکھ سکتے تھے، انجیل میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے موقع پر بھی ایک نئے نورانی ستارہ کے ظہور کی خبر ہے جس کو دیکھ کر دوسرے ملک کے لوگ ان کی تلاش میں بیت لحم پہنچے اور ان کے دیدار سے مشرف ہوئے، مگر بنی اسرائیل کو آخر تک اس بینائی سے محرومی رہی۔

صحیحین میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے سرفراز ہوئے تو ستاروں کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہوا، جن اور شیاطین اب اوپر چڑھنے سے روک دیئے گئے، ٹوٹنے والے ستاروں کی بھرمار ہوگئی، کاہنوں اور عاملوں کی خبر رسانی کے ذرائع مسدود ہوگئے اور ان باطل پرستیوں کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا، اس آسمانی انقلاب نے جنوں اور شیطانوں کی محفلوں میں حیرت پیدا کر دی، سب نے کہا یقیناً روئے زمین پر کوئی اہم واقعہ رونما ہوا ہے، دنیا کی ہر سمت کو انہوں نے چھان ڈالا، اس پر چند سال گزر گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی تبلیغ کے لئے قبائل میں دورے کر رہے تھے اور اسی تقریب سے عکاظ کے میلہ میں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں رات کے وقت مقام نخلہ میں قیام ہوا، صبح کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کے ساتھ نماز میں مصروف تھے اور قرآن مجید کی آیتیں جہر کے ساتھ تلاوت فرما رہے تھے کہ اتفاق سے جنوں کی ایک جماعت کا جو تفتیش حال کے لئے تہامہ کی طرف آئی تھی، اس مقام پر گزر ہوا، اس نے جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو یکبار پکار اٹھی کہ یہی وہ نور حق ہے جو درخشاں ستاروں میں ہمیں نظر آتا ہے وہ لوٹ کر اپنی قوم میں گئی اور ان کو جا کر خاتم نبوت کے ظہور کی بشارت سنائی[1]۔

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا	اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دے کہ مجھ کو بذریعہ وحی خبر دی گئی ہے کہ
إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا	جنوں کی ایک جماعت نے قرآن کو سنا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے
بِهِ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا وَأَنَّهُ تَعَالَىٰ جَدُّ	عجیب و غریب کتاب الٰہی سنی جو ہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہے تو
رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا وَأَنَّهُ كَانَ	ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز خدا کا کسی کو شریک نہ
يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا وَأَنَّا ظَنَنَّا أَنْ لَّنْ	بنائیں گے خداوند تعالیٰ کی نہ تو کوئی بیوی ہے اور نہ لڑکا ہے
تَقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَأَنَّهُ	ہم میں سے کچھ بیوقوف خدا پر بہت دور از عقل الزام قائم کرتے
كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ	تھے ہم سمجھتے تھے کہ کوئی انسان یا جن خدا پر جھوٹ الزام نہیں قائم
الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا وَأَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا	کر سکتا، انسانوں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو بعض جنوں کی پناہ مانگا کرتے
ظَنَنْتُمْ أَنْ لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا وَأَنَّا لَمَسْنَا	تھے تو ان جنوں نے ان کو اور زیادہ گمراہ کر دیا، انسان بھی ہماری
السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَ	ہی طرح یہ سمجھتے تھے کہ اب خدا کوئی پیغمبر نہ بھیجے گا، ہم نے
شُهُبًا وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ	آسمان کو خوب ٹٹولا تو ہم نے پایا کہ وہ نگہبانوں سے اور ٹوٹتے

---

[1] یہ پوری تفصیل صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الجہر فی الصبح میں ہے اور امام بخاری نے مختلف ابواب میں اس واقعہ کو درج کیا ہے مثلاً تفسیر سورۂ جن و باب جہر بقراءۃ صلوٰۃ الفجر و مسند ابن حنبل روایت ابن عباس ج ۱ صفحہ ۲۵۰ و صحیح ترمذی تفسیر سورۂ جن۔

فَمَنْ يَسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًا ۙ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۙ وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۔ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۔ (جن ۱)

والے تاروں سے بھرا ہوا ہے، ہم پہلے اس آسمان کی بعض نشست گاہوں میں سننے کو بیٹھ جاتے تھے، اب جو کوئی سننے جاتا ہے تو اپنی تاک میں ٹوٹنے والے ستارہ کو پاتا ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ اس انقلاب سے زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا جا رہا ہے یا ان کا پروردگار ان کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، ہم میں اچھے بھی ہیں اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں، ہم جدا جدا راستوں پر تھے اور ہم سمجھتے تھے کہ ہم خدا کو اس زمین میں عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اس کے قبضہ سے نکل سکتے ہیں، اور اب جب ہم نے اس ہدایت کی بات کو سن لیا تو اب ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، تو جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آتا ہے تو پھر گھاٹے ٹوٹے کا اس کو ڈر نہیں رہتا، ہم میں کچھ اطاعت گزار ہیں کچھ گناہ گار، ہیں تو جو اطاعت گزار ہیں ان ہی نے حقیقت میں ہدایت کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہے اور جو گناہ گار ہیں وہ جہنم کے ایندھن ہیں۔

پھر سورۂ احقاف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۔ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔

(احقاف ۴)

ہم نے جب جنوں کی ایک جماعت کے رخ کو اے پیغمبر تیری طرف پھیر دیا کہ وہ قرآن کو سنیں تو جب وہ آئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے کہا چپ رہو، جب قرآن ختم ہو گیا تو وہ اپنی قوم کے پاس گئے کہ انہیں خبر کر دیں، انہوں نے جا کر کہا بھائیو! ہم نے ایک شریعت کی کتاب کو سنا جو موسیٰ کے بعد اتاری گئی ہے اور اس کے پہلے جو کتاب الٰہی آئی ہے اس کی تصدیق کرتی ہے اور سچائی اور سیدھی راہ دکھاتی ہے، اے بھائیو! خدا کے پکارنے والے کو قبول کرو اور اس پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہارے گناہوں کو معاف کرے اور دردناک عذاب سے تم کو پناہ دے۔

صحیح مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں نے دو دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام مجید پڑھتے سنا[1] اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ دونوں سورتیں الگ الگ واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہوں، پہلے واقعہ میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ شریک نہ تھے[2] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ کسی صحابی نے ان جنوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ایک درخت نے دی[3]، اور تفصیل کیفیت وحی

---

[1] صحیح مسلم باب الجہر بالقراءۃ فی الصبح۔ [2] صحیح بخاری و مسلم باب مذکور و مسند احمد جلد اول صفحہ ۴۵۶۔ [3] صحیح مسلم باب مذکور۔

آسمانی سے معلوم ہوئی، اسی واقعہ کو واقعہ لیلۃ الجن (جن کی رات) کہتے ہیں، لیکن یہ دونوں واقعے مکہ معظمہ ہی میں گزرے ہیں، صحیح مسلم[1]، ترمذی[2] اور مسند طیالسی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کے شاگرد خاص علقمہ نے پوچھا کہ آپ صاحبوں میں سے کوئی لیلۃ الجن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا؟ انھوں نے کہا نہیں لیکن ایک اور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ شب کو ہم لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا، میدانوں اور گھاٹیوں میں ہر جگہ ڈھونڈا، مگر آپ نہیں ملے، ہم لوگوں کو طرح طرح کے خیال آنے لگے کہ آپ کو کوئی اٹھا لے گیا یا دھوکے سے کسی نے قتل کر دیا، سخت اضطراب اور قلق میں ہم نے یہ رات بسر کی، صبح ہوئی تو دیکھا کہ آپ غار حرا کی طرف سے چلے آرہے ہیں، ہم سب نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم نے شب کو ہر جگہ آپ کو ڈھونڈا، مگر آپ کہیں نہیں ملے، ہم نے سخت اضطراب اور قلق میں رات بسر کی، فرمایا کہ "رات کو جنوں کا قاصد آیا تھا، میں اس کے ساتھ گیا تھا، میں نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا" اس کے بعد آپ ہم سب کو لے کر اس مقام پر تشریف لے گئے اور وہاں ان کے قیام اور آگ جلانے کے نشانات دکھائے اور فرمایا کہ انھوں نے مجھ سے زاد راہ کی خواہش کی، میں نے ان کے لئے دعا کی کہ وہ جس ہڈی اور گوبر پر گزریں ان کے لئے وہ کھانا ہو جائے[3]۔

مسند ابن حنبل کے زیادات میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی جنوں کی آمد کا ایک اور واقعہ مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رات کے وقت ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ یکایک آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی میرے ساتھ چلے لیکن وہ نہ چلے جس کے دل میں ذرا سا بھی کھوٹ ہو، ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں پانی کا لوٹا لے کر آپ کے ساتھ ہو لیا، آپ مجھے ساتھ لئے ہوئے مکہ کے آگے پہنچے، وہاں مجھ کو پرچھائیاں ایک جگہ اکٹھی نظر آئیں، آپ نے ایک خط کھینچ دیا اور فرمایا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہیں کھڑے رہو، یہ کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ گئے، میں نے دیکھا کہ وہ پرچھائیاں آپ کی طرف چلیں، آپ ان کے ساتھ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، جب فجر کا اجالا ہوا تو آپ میرے پاس آئے اور وضو کا پانی مانگا، میں نے دیکھا تو وہ پانی کے بجائے کھجور کا شربت (نبیذ) تھا، آپ نے فرمایا، اس میں کیا حرج ہے؟ کھجور بھی پاک ہے اور پانی بھی پاک ہے، یہ کہہ کر آپ نے اسی سے وضو کیا، اس کے بعد نماز کو کھڑے ہوئے تو ان میں سے دو آدمی پاس آکر کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہم بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھیں گے، چنانچہ وہ بھی میرے ساتھ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے، نماز سے فارغ ہو کر میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ کون لوگ تھے؟ فرمایا یہ شہر نصیبین کے جن تھے، اپنے کچھ معاملات میرے پاس فیصلہ کے لئے لائے تھے، انھوں نے مجھ سے توشہ مانگا تو میں نے دے دیا، عرض کی یا رسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ کوئی توشہ کا سامان تھا؟ فرمایا میں نے انھیں گوبر اور ہڈی کا توشہ دے دیا ہے، گوبر ان کے لئے جو اور ہڈی پر گوشت ہو جائے گی، اسی موقعہ پر آپ نے گوبر اور ہڈی سے استنجا منع فرمایا[4]۔

---

[1] صحیح مسلم باب مذکور۔ [2] ترمذی تفسیر سورۂ احقاف۔ [3] صحیح مسلم باب الجہر بقراءۃ الصبح، صحیح بخاری باب ذکر الجن فی البعث، صحیح بخاری و مسلم و ترمذی باب الاستنجاء۔ [4] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۴۵۸۔

زیادات مسند اور صحیح مسلم کی دونوں روایتیں کیا ایک ہی واقعہ کی دو تفصیلیں ہیں؟ مگر ان دونوں ہی روایتوں کے جزئیات میں اسی قدر فرق ہے کہ وہ یقیناً ایک نہیں ہو سکتیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زیاداتِ مسند کی روایت بالکل لغو اور بے سر و پا ہے، اس روایت کا سلسلہ سند یہ ہے عن ابی فزارۃ عن ابی زید مولیٰ عمرو بن الحریث المخزومی عن عبد اللہ بن مسعود، اس میں ابو زید مولی عمرو بن حریث ایک مجہول راوی ہے جس سے محدثین میں کوئی واقف نہیں، حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں۔

ابو زید مولی عمرو بن حریث لا یعرف عن ابن مسعود وعنہ ابو فزارۃ لا یصح حدیثہ ذکرہ البخاری فی الضعفاء ومتن حدیثہ ان نبی اللہ توضأ بالنبیذ وقال ابو احمد الحاکم رجل مجہول قلت مالہ سوی حدیث واحد۔

(میزان الاعتدال)

ابو زید غلام عمرو بن حریث اس کو کوئی جانتا نہیں، اس نے ابن مسعود سے روایت کی ہے اور اس سے ابو فزارہ نے، اس کی حدیث صحیح نہیں، بخاری نے ضعفا میں اس کو درج کیا ہے، اس کی حدیث کا متن یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ سے وضو کیا، ابو احمد حاکم کہتے ہیں کہ یہ مجہول الحال آدمی ہے میں کہتا ہوں کہ اس کی یہی ایک حدیث ہے۔

البتہ جامع ترمذی میں اسی قسم کا ایک واقعہ عبد اللہ بن مسعودؓ سے فرشتوں کی آمد اور دیدار کے متعلق بروایت صحیح مروی ہے۔

*

شقِ قمر

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (قمر-۱)

پیغمبر کی صداقت کی گواہی کائنات کا ذرہ ذرہ دیتا ہے، آسمان اور زمین، چاند اور سورج ہر چیز اس کی صداقت کا ثبوت بن جاتی ہے، انجیل (متی ۲-۲) میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور جب انہوں نے وفات پائی تو تین گھنٹے کے لئے تمام دنیا میں اندھیرا چھا گیا (متی ۲۷:۴۵) قریبِ قیامت کی ایک نشانی یہ بھی تھی کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے، یہ نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر پوری اتری اور قرآن نے کہا،

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ (قمر-۱)	قیامت نزدیک آگئی اور چاند شق ہو گیا، اگر کافر کوئی سا بھی نشان دیکھیں تو اس سے اعراض ہی کریں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو سدا سے ہوتا آیا ہے۔

بعض عقل پرست مسلمانوں نے قربِ قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ اس آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں شقِ قمر کا ثبوت نہیں ہوتا بلکہ یہ قیامت کے واقعہ کا ذکر ہے، لیکن اس حالت میں اوّل تو بے قرینہ ماضی (چاند پھٹ گیا) کو مستقبل (چاند پھٹ جائے گا) کے معنی میں لینا پڑے گا، دوسرے یہ کہ اگر قیامت کا واقعہ ہوتا تو اس کے بعد یہ کیوں ہوتا کہ "یہ کافر اگر کوئی سی نشانی بھی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور یہ کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے" قیامت سامنے آجانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو مستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیونکر تردید کی جاسکتی ہے۔

اس شقِ قمر کا واقعہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، مسند ابن حنبل، مسند طیالسی، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی اور دلائل ابو نعیم میں بہ تصریح تمام مذکور ہے کہ صحابہ میں سے حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیرؓ بن مطعم، علیؓ بن ابی طالب اور حذیفہؓ بن یمان وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے ان میں سب سے صحیح اور مستند تر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے جو صحیح بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں مروی ہے، وہ اس واقعہ کے وقت موقع پر موجود تھے اور اس معجزہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، چنانچہ ان کے الفاظ یہ ہیں،

انشق القمر ونحن مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمنیٰ فقال اشھدوا وذھبت فرقۃ نحو الجبل (بخاری و ترمذی و مسلم)	ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا آپ نے فرمایا گواہ رہو

صحیحین میں ان کی دوسری روایت یہ ہے،

انشق القمر علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرقتین فرقۃ فوق الجبل وفرقۃ دونہ فقال	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ایک ٹکڑا تو پہاڑ کے اوپر رہا اور دوسرا اس کے نیچے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشہدوا (صحیح بخاری ومسلم)	آپ نے فرمایا گواہ رہو۔

حضرت انسؓ بن مالک کی یہ روایت بخاری ومسلم دونوں میں ہے۔

ان اهل مكة سألوا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يريهم آية فاراهم القمر شقتين حتى رأوا حراء بينهما۔	اہل مکہ نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ ان کو کوئی معجزہ دکھائیں آپ نے ان کو چاند کے ٹکڑے دکھائے، ایک ٹکڑا حرا کے اس طرف تھا دوسرا اس طرف۔

صحیح مسلم میں ہے۔

ان اهل مكة سألوا النبى صلى الله عليه وسلم ان يريهم آية فاراهم انشقاق القمر فرقتين۔	اہل مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی تو آپؐ نے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کو دکھایا۔

جامع ترمذی میں انہی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

سأل اهل مكة النبى صلى الله عليه وسلم آية فانشق القمر بمكة فرقتين فنزلت۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔	اہل مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی طلب کی تو چاند مکہ میں دو ٹکڑے ہوگیا اس پر یہ آیت اتری۔ قیامت آگئی اور چاند پھٹ گیا۔

جامع ترمذی اور مسند ابن حنبل میں جبیرؓ بن مطعم کی جو روایت ہے اس میں ہے کہ اس معجزہ کو دیکھ کر کفار نے کہا کہ محمدؐ نے ہم پر جادو کر دیا ہے، دوسروں نے کہا کہ اگر ہم پر جادو کر دیا ہے تو تمام آدمیوں پر تو جادو نہیں کر سکتے، مسند ابوداؤد طیالسی اور بیہقی میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ محمدؐ تمام دنیا پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ مسافروں[1] کو اور مقامات سے آنے دو، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں؛ چنانچہ جب اِدھر اُدھر سے مسافر آئے اور ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا۔

بہرحال یہ معجزہ رات کے وقت مکہ میں بمقام منیٰ واقع ہوا۔

عقلی حیثیت سے یہ معجزہ زمانہ قدیم سے معرکۃ الآراء رہا ہے، علمائے متکلمین نے فلسفۂ قدیم کے اصول پر اس میں خوب خوب موشگافیاں کی ہیں، مثلاً فلاسفہ قدیم کا یہ اعتقاد تھا کہ اجرام فلکی میں خرق والتیام اور شکست وریخت محال ہے اس لئے شق قمر بھی ناممکن ہے، متکلمین نے ثابت کیا کہ اجرام فلکی میں خرق والتیام اور شکست وریخت ممکن ہے، مگر اب جدید طبیعیات وہیئت نے ہماری معلومات کے آسمان وزمین کو بدل دیا ہے۔ یہ مباحث بے سود وبیکار ہیں، اب تو ہر روز نئے نئے ستاروں کے شکست وریخت اور تصادم کے حادثے سُنے جارہے ہیں اور ہیئت جدید اور علم تکوین میں تو زمین، سورج اور ستاروں کے آغاز آفرینش کی داستان ہی اس باب سے شروع ہوئی ہے۔

اس سے دوسرے درجہ پر ایک اور قدیم اعتراض وجواب کتابوں میں لکھا چلا آتا ہے اور ہمارے نئے ناظرین نے اس کو نئے آب ورنگ سے شہرت دی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر یہ معجزہ درحقیقت واقع ہوتا تو یہ صرف

---

[1] مسند عبداللہ بن مسعود ص ۳۸۱ حیدرآباد دکن۔

اہل مکہ ہی کو نظر نہ آتا بلکہ اس کو تمام دنیا دیکھتی اور اس کی روایتیں مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جاتیں لیکن بجز مکہ کے اور ملکوں میں اس واقعہ کا چرچا نہیں ہوا اور تمام قدیم اہل نجوم اور ہیئت و تاریخ اس کی روایت سے خاموش ہیں۔

لوگوں نے اس شبہ کے یہ جوابات دیئے ہیں کہ اولاً ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ واقعہ دوسرے ملک کے لوگوں کو نظر نہیں آیا، تم اس کے ثبوت میں کہو گے کہ اگر نظر آتا تو اس ملک کے اہل تاریخ اس کا ذکر کرتے، حالانکہ کسی تاریخ میں اس کا ذکر نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ملک کا مشہور واقعہ جو دوسرے ملک کی معاصر تاریخوں میں مذکور نہ ہو، صرف اس کا یہ عدم ذکر کیا اس کے انکار کی سند ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہے تو ہندوؤں کی مہابھارت کا تم انکار کر سکتے ہو، حضرت مسیحؑ کے تمام معجزات بلکہ واقعات زندگی تک کا انکار کر سکتے ہو کہ شام و مصر کے معاصر رومی مورخوں نے ایسے عجیب وغریب واقعات کا ایک حرف بھی قلمبند نہیں کیا، اس کے برخلاف ابھی اوپر کی روایتوں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عرب وشام سے آنے والے مسافروں نے یہ بیان کیا کہ انہوں نے چاند کے دو ٹکڑے ہوتے دیکھا تھا۔

فلکی حیثیت سے جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اہل ہیئت جو اجرام فلکی کے ایک ایک واقعہ کو قلمبند کرتے آئے ہیں، انہوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ رات کے وقت ظاہر ہوا تھا اور اس وقت دنیا کا بڑا حصہ خواب راحت میں مصروف تھا، جو لوگ بیدار بھی ہوں گے، وہ اپنے دوسرے مشاغل میں مصروف ہوں گے اور جنہوں نے دیکھا بھی ہوگا ان میں کتنا بڑا حصہ ان کا ہوگا جو اپنے مشاہدات کو تحریری صورت میں لانے پر قادر نہ تھے یعنی ناخواندہ تھے اور اگر ان میں چند لکھے پڑھے ارباب ہیئت اور اصحاب تاریخ تھے تو ضروری نہیں کہ انہوں نے اپنے اس مشاہدہ کا تذکرہ بھی کیا ہو یا تذکرہ کیا تو ان کی یادداشت مثل دوسری سینکڑوں علمی یادداشتوں کے ضائع ہوگئی ہو، آغاز آفرینش سے اب تک اجرام فلکی میں لاکھوں انقلابات پیش آئے ہوں گے لیکن کیا وہ سب کے سب دنیا کے اوراق ہیئت میں درج ہیں؟ اور ان کا درج نہ ہونا ان کے عدم وقوع کی دلیل ہے مختلف مذاہب کی کتابوں میں اس قسم کے حوادث فلکی کا ذکر ہے لیکن علم ہیئت وفلک اس کے ذکر سے خاموش ہے، لیکن یہ خاموشی اس کے عدم وقوع پر شہادت ہے؟ خود تمہاری انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت ایک ستارۂ نبوت طلوع ہوا جس کو پورب کے لوگوں نے دیکھا اور پھر انجیل میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی گئی تو تمام دنیا دفعتہً تاریک ہوگئی، لیکن کیا ہیئت وافلاک کی کتابوں میں ان انقلابات سماوی کا تذکرہ موجود ہے۔

حوادث فلکی کے حدوث اور وقوع میں بڑی چیز یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ مطالع اور مغارب پر موقوف ہے اور ہر جگہ کے مطالع ومغارب دوسری جگہ سے نہایت مختلف ہیں، بالخصوص قمر کے مطالع میں تو اور بھی سخت اختلاف ہے، ایک جگہ چاند ڈوبتا ہے دوسری جگہ نکلتا ہے، ایک جگہ چاندنی ہے دوسری جگہ اندھیرا ہوتا ہے، ایک جگہ چاند کو گہن لگتا ہے اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو وہ نظر تک نہیں آتا، اس لئے اگر تمام دنیا نے اس معجزہ کو نہیں دیکھا تو یہ شق قمر کی نفی کی دلیل نہیں، چنانچہ دنیا کی مختلف باخبر قوموں نے اپنی اپنی کتابوں میں مختلف حوادث فلکی کا ذکر

کیا ہے، لیکن جس واقعہ کو ایک نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے اس کی معاصر قوموں کی کتابیں اس کی شہادت سے قطعاً خالی ہیں، لیکن کیا یہ خاموشی اس کے عدم وقوع کی سند ہو سکتی ہے، علاوہ اور وجوہ کے اس خاموشی اور اختلاف کی ایک وجہ یہی ہوتی ہے کہ تمام دنیا کا ایک مطلع نہیں ہے اس لئے ایک جگہ نظر آتی ہے، دوسری جگہ نہیں آتی، بعض متکلمین نے جن میں ایک شاہ ولی اللہ صاحب بھی ہیں، لکھا ہے اور امام غزالیؒ کا بھی ادھر ہی رجحان معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت چاند میں شگاف نہیں ہوا تھا بلکہ لوگوں کو ایسا نظر آیا، چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

ان اهل مکة سألوا النبی صلی الله علیه وسلم ان یریهم آیة فاراهم انشقاق القمر فرقتین (صحیح مسلم)	اہل مکہ نے آپ سے نشانی طلب کی تو آپؐ نے چاند دو ٹکڑے دکھایا۔

ہم ان پرپیچ راستوں سے گزر کر صرف ایک سیدھی سی بات کہہ دینا چاہتے ہیں کہ شق القمر اہل مکہ کی طلب پر ایک آیت الٰہی تھی، یعنی ان منکروں کو ان کی خواہش کے مطابق نبوت کی ایک نشانی دکھائی گئی تھی، احادیث میں یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، خواہ دراصل چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے وہ خود چاند میں بھی خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے، پھر چونکہ اللہ نے یہ نشانی اہل مکہ کے لئے ظاہر کی تھی اور ان ہی کے لئے یہ آیہ ثبوت تھی، اس لئے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور روایت کی حاجت نہ تھی، اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں، بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کے طبعی انقلابات میں سے کوئی انقلاب تھا، جیسا کہ اور سینکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں، (جیسا کہ فلکیات اور علم بدء الخلق (کسموگریفی اور نیچرل ہسٹری) میں مذکور ہیں) لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر میں تھے یا باہر قافلہ میں تھے صرف ان ہی کو نظر آیا تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا۔ واللہ الحمد۔

*

غلبۂ روم کی پیشین گوئی

الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَى الْاَرْضِ (روم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی الہامی زبان سے جن واقعات کی پیشین گوئی کی ہے، ان سب میں سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ صاف و صریح، سب سے زیادہ معرکۃ الآراء، روم کی پیشین گوئی ہے۔

عرب کے چپ و راست دونوں پہلوؤں میں روم و فارس کی پرزور حکومتیں قائم تھیں، اس وقت ایران کا تاجدار خسرو اور روم کا فرماں روا ہرقل تھا، ان دونوں سلطنتوں میں ایک مدت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا، بعثت نبوی کے پانچویں سال یعنی سنہ ۶۱۴ء میں ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ شروع ہوئی، گو ان دونوں قوموں میں کسی قوم نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا تھا تاہم رومی حضرت عیسیٰ کے پیرو اور اہل کتاب تھے اور ایرانیوں کے عقائد مشرکین مکہ کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے، اس بنا پر مسلمانوں کو رومی عیسائیوں کے ساتھ اور مشرکین مکہ کو ایرانیوں کے ساتھ ہمدردی تھی، اس لئے مسلمانوں اور کفار قریش دونوں کو جنگ کے نتیجہ کا شدت کے ساتھ انتظار تھا۔

ان دونوں سلطنتوں کے حدود دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر آکر ملتے تھے، رومی سلطنت مشرق میں ایشیائے کوچک، حدود عراق، شام، فلسطین اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی، ایرانیوں نے دو طرفہ حملہ کیا، ایک طرف تو وہ دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھے اور دوسری طرف ایشیائے کوچک کی جانب آذربائیجان سے آرمینیا ہو کر موجودہ اناطولیہ میں داخل ہو گئے اور دونوں طرف سے رومیوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے سمندر میں ان کو دھکیل دیا، شام کی سمت میں انہوں نے یکے بعد دیگرے اس ارض مقدس کا ایک ایک شہر رومیوں سے چھین لیا۔

سنہ ۶۱۴ء میں فلسطین اور اس کا مقدس شہر یروشلم صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی کے زیر سایہ آگیا، کنیسے مسمار کئے گئے، مذہبی شعائر کی توہین کی گئی، ۲۶ ہزار یہودیوں نے ایرانی فوج میں شامل ہو کر ۹۰ ہزار بے گناہ عیسائیوں کا قتل عام کیا، شہنشاہ ایران کے قصر اقامت کی تیس ہزار مقتول سروں سے آرائش کی گئی، ایرانی فتوحات کا سیلاب اس سے آگے بڑھ کر سنہ ۶۱۶ء میں پوری وادی نیل یعنی مملکت مصر پر محیط ہو گیا اور آخر سکندریہ کے ساحل پر جا کر تھما۔ دوسری طرف تمام ایشیائے کوچک کو زیر و زبر کرتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا کر کادر قسطنطنیہ کی دیواروں سے جا کر ٹکرایا، شہنشاہ روم کے دارالسلطنت کے سامنے ایران کے فاتح لشکر نے جا کر اپنے خیمے کھڑے کر دیئے اور اب رومیوں کے بجائے عراق و شام و فلسطین و مصر و ایشیائے کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو گئی، ہر جگہ آتش کدے تعمیر ہوئے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا، رومی سلطنت کی اس تباہی کو دیکھ کر رومی شہنشاہی کی وسیع مملکت میں بغاوتیں کھڑی ہو گئیں، افریقہ میں بھی شورش ہوئی، خود

قسطنطنیہ کے قریب یورپ میں مختلف قومیں قتل و غارت گری میں مصروف ہوگئیں، غرض اس وقت سلطنت روم کے پرزے پرزے اڑ گئے تھے۔

جنگ کا نتیجہ جب ایسا خلاف امید ظاہر ہوا تو مسلمانوں کو یقیناً رنج اور کفار کو مسرت حاصل ہوئی اور انھوں نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ جس طرح ہمارے بھائی غالب ہوتے ہیں، اسی طرح اگر تم ہم سے لڑتے تو ہم غالب ہوتے اس وقت رومیوں کی جو افسوس ناک حالت تھی وہ آپ سن چکے کہ وہ اپنے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ کھو چکے تھے، خزانہ خالی تھا، فوج منتشر تھی، ملک میں بغاوتیں پیدا تھیں، شہنشاہ روم ہرقل ہمہ تن عیاش، بے پرواہ، سست اور عقبات و اوہام تھا، ایرانیوں کا فاتح سپہ سالار قسطنطنیہ کے دروازہ پر پہنچ کر رومیوں کے سامنے حسب ذیل شرائط پیش کرتا ہے۔

رومی باج ادا کریں، ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار حریر کے تھان، ایک ہزار گھوڑے اور ایک ہزار باکرہ لڑکیاں ایرانیوں کے حوالہ کریں۔

رومیوں کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ وہ ان شرمناک شرائط کو قبول کرتے ہیں، اس پر بھی جب رومی قاصد شہنشاہ ایران کے دربار میں مصالحت کا پیغام لے کر جاتا ہے تو مغرور خسرو جواب دیتا ہے کہ مجھ کو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے اور اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک شہنشاہ روم اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر سورج دیوتا کے آگے سر نہ جھکائے گا۔

کارزار عالم کا نقشہ یہ تھا کہ معرکہ جنگ سے بہت دور ایک خشک اور بنجر زمین کی سنسان پہاڑی سے ایک شہزادۂ امن نمودار ہوا اور واقعات عالم کے بالکل خلاف سروش غیب سے نغمہ اقدس میں گویا ہوا۔

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ
مِنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ
لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ وَیَوْمَئِذٍ
یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ یَّشَآءُ
وَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا یُخْلِفُ
اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔ (روم)

رومی قریب تر زمین میں مغلوب ہوگئے، لیکن وہ چند سال میں مغلوب ہو جانے کے بعد پھر غالب ہوں گے خدا ہی کے ہاتھ میں پہلے اور پیچھے سب اختیار رہے اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کو چاہے مدد کرے وہ غالب رحم والا ہے، خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

یہ پیشین گوئی واقعات کے لحاظ سے اس قدر مستبعد اور ناقابل یقین تھی کہ کفار نے اس کے صحیح ہونے کی صورت میں کئی اونٹوں کے ہارنے کی مسلمانوں سے شرط لگائی، اب مسلمانوں اور کافروں کو بڑی شدت سے واقعات کے پہلو کا انتظار رہتا، آخر چند سال کے بعد دنیا نے خلاف امید پلٹا کھایا، مورخ گبن کے الفاظ میں شہنشاہ جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی، عیاشی اور اوہام کا غلام اور رعایا کے مصائب کا نامرد تماشائی تھا، جس طرح صبح و شام کا کہرا آفتاب نصف النہار کی روشنی سے پھٹ جاتا ہے، دفعۃً (۶۲۲ء میں) محلوں کا ارکاڈیوس میدان جنگ کا سیزر بن گیا اور روم اور ہرقل کی عزت نہایت شاندار

طریقہ سے بچالی گئی۱؎

جس وقت ہرقل اپنی بقیہ فوج لے کر قسطنطنیہ سے چلا ہے، لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ رومۃ الکبریٰ کے آخری لشکر کا منظر دنیا کے سامنے ہے۲؎ لیکن عرب کے نبی امی کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور عین اس وقت جب مسلمانوں نے بدر کے میدان میں قریش کو شکست دی، رومیوں نے ایرانیوں پر غلبہ حاصل کیا، مشرقی مفتوحات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر بحر دجلہ و فرات کے سواحل کی طرف دھکیل دیا۔

اس عظیم الشان پیشین گوئی کی صداقت کے اثر نے دنیا کو محو حیرت کر دیا، قریش کے بہت سے لوگ اس صداقت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۳؎۔ واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوال روم کا مشہور مصنف گبن اس حیرت ناک پیشین گوئی کی سچائی سے متحیر ہو کر کہتا ہے۔

> "مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دونوں کی ایک دوسرے کو تباہ کر دینے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا اور عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح و ظفر رومی علم پر سایہ فگن ہو گی، جس وقت پیشین گوئی کی گئی تھی، کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کی بارہ سال (۶۱۰ء سے ۶۲۲ء تک) کی حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ جلد بکھر جائے گا۴؎۔"

ہرقل کی طبیعت میں اس فوری انقلاب اور واقعات کی رو سے اس حیرت ناک تغیر اور اس کے اسباب کی تفصیل میں تاریخ روم کے مصنفین نے عجیب عجیب باتیں پیدا کی ہیں لیکن انھیں کیا معلوم کہ اس خونی معرکہ سے دور ایک پیغمبرانہ ہاتھ رومیوں کی مدد کے لیے دراز تھا اور وہی اس انقلاب اور تغیر کا سب سے بڑا روحانی سبب تھا۔

مستدرک۵؎ علی شرط الشیخین، اور جامع ترمذی۶؎ میں ہے کہ روم و فارس کی جب جنگ شروع ہوئی تو مشرکین ایرانیوں کے طرف دار تھے، کیونکہ وہ بھی بت پرست تھے اور مسلمان رومیوں کے طرف دار تھے کہ وہ اہل کتاب تھے اس وقت ایرانی روم کو دباتے جا رہے تھے، اس پر سورۂ روم کی پیشین گوئی نازل ہوئی، حضرت ابوبکرؓ نے چلا چلا کر تمام مشرکین کو یہ پیشین گوئی سنائی، مشرکین نے کہا کہ اس پیشین گوئی کے لئے کوئی سال مقرر کر دو، حضرت ابوبکرؓ نے پانچ سال کی شرط کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ بضع کا لفظ ۳ سے ۹ تک بولا جاتا ہے، اس لئے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیے تھی، چنانچہ اس تشریح کے مطابق نویں سال غزوۂ بدر کے موقع پر پیشین گوئی پوری ہوئی اور رومی غالب آ گئے۔

غزوۂ بدر ہجرت کے پہلے سال اور بعثت کے چودھویں سال پیش آیا، اس سے ۹ برس پہلے بعثت کا پانچواں

۱؎ تاریخ زوال روم مصنفہ گبن ج ۲ ص ۲ مطبوعہ ۱۹۱۹ء ۲؎ ایضاً ۳؎ ترمذی تفسیر سورۂ روم ۴؎ تاریخ زوال روم ج ۲ ص ۳ ص ۲۲ طبع مذکور ۵؎ جلد ۲ تفسیر سورۂ روم ۶؎ تفسیر سورۂ روم۔

سال ہوگا، اس بنا پر پیشین گوئی کا زمانہ ۸ بعثت اور اس کے پورے ہونے کا زمانہ ۱۴ بعثت یا ۱ھ ہے بعض لوگوں نے اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کا زمانہ صلح حدیبیہ کا سال یعنی ۶ھ بیان کیا ہے، یہ صحیح نہیں، شاید لوگوں کو اس سے دھوکہ ہوا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ قاصد نبوی جب اسلام کا دعوت نامہ لے کر قیصر کے پاس گیا تو وہ اس وقت فتح کا شکریہ ادا کرنے کے لئے شام آیا ہوا تھا، اور معلوم ہے کہ قاصد صلح حدیبیہ کے زمانہ میں روانہ ہوئے تھے، اس لئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ حصول فتح کی بھی یہی تاریخ ہے، مگر یہ مغالطہ ہے اور بالکل ظاہر ہے کہ یہ فتح ملکی کی تاریخ نہیں بلکہ فتح کے جشن کی تاریخ ہے، رومی تاریخ مطابقت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۶۱۰ء میں آپ کی بعثت ہوئی، ۶۱۰ء سے روم وفارس کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی، ۶۱۳ء میں اعلان جنگ ہوا، ۶۱۴ء سے رومیوں کی شکست کا آغاز ہوا اور ۶۲۲ء میں ان کی فتح تکمیل کو پہنچ گئی، اس ترتیب سے دیکھئے تو ظاہر ہوگا کہ اس پیشین گوئی کی خوبی یہ ہے کہ آغاز شکست سے آغاز فتح تک جوڑیئے جب بھی تو وہی نو برس ہوگئے ہیں اور اگر انجام شکست سے آغاز فتح تک جوڑیئے تو بھی وہی نو برس ہوں گے۔

اس فتح کی تکمیل کے بعد ہرقل پھر وہی سست وعیاش قیصر بن گیا جو پہلے تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دست قدرت نے صرف اس پیشین گوئی کے پورا کرنے کے لئے چند سال کے واسطے اس کے دل ودماغ کو بیدار اور دست وبازو کو ہشیار کر دیا تھا، پیشین گوئی کی تکمیل کے بعد پھر پہلے کی طرح تعیش اور کاہلی نے اس کو عیش وغفلت کے بستر پر تھپک تھپک کر سلا دیا۔

*

دیگر آیات و دلائل نبوی

قرآن مجید میں

طیرا ابابیل کی نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت عام الفیل میں ہوئی جس میں ابرہۃ الاشرم نے ہاتھیوں کی قطار کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کرنا چاہا تھا لیکن فضائے آسمانی کے ایک حقیر پرندہ نے کنکریوں کے ذریعہ سے اُن کو ہلاک کر دیا، یہ ایک عظیم الشان نشان تھا جس کا ظہور مسلمان اور عیسائی دونوں تسلیم کریں گے کہ مشرکین عرب کی تائید کے لئے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ابرہۃ الاشرم ایک عیسائی بادشاہ تھا جس کا مذہب بہرحال مشرکین سے بہتر تھا بلکہ یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا نشان تھا جن کی ذات پاک حقیقی طور پر خانہ کعبہ کی حفاظت کی کفیل تھی، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالےٰ نے اس معجزہ کے ذکر میں خاص طور پر آپ کی طرف روئے خطاب کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيْلِ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (فیل)	کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا، ان کی چھپی گھاتوں کو بے راہ نہیں کر دیا اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو ان کو پتھریلی کنکریوں سے مارتے تھے تو خدا نے ان کو کھائی ہوئی بھس کے مانند کر دیا۔

یہ سورہ واقعہ کے تقریباً ۴۰ برس بعد اتری تھی اور غالباً اس وقت متعدد اشخاص اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہوں گے اور ایسے تو ہزاروں ہوں گے جنھوں نے دیکھنے والوں سے براہ راست اور بلا واسطہ اس واقعہ کو سنا ہوگا، کفار جو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے درپے رہتے تھے، اگر اس صورت واقعہ کے بیان میں کچھ بھی غلطی یا جھوٹ شامل ہوتا تو وہ اس کی اعلانیہ تردید کر دیتے، مگر ایسا نہیں ہوا اس لئے اس کی سچائی میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

شہاب ثاقب کی کثرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت عطا ہوئی تو نظم آسمانی میں ایک خاص انقلاب پیدا ہوا، جنات جو پہلے آسمان کے قریب تک جا سکتے تھے ان کی آمد و رفت مسدود کر دی گئی اور ان پر ٹوٹنے والے تاروں کی بارش ہونے لگی، چنانچہ قرآن مجید میں خود جنات کی زبانی بیان ہے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (جن-۱)	ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو پایا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور ٹوٹنے والے تاروں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم پہلے سننے کو وہاں ٹھکانوں پر بیٹھتے تھے لیکن اب جو کوئی سنے تو تارے کو اپنی تاک میں پاتا ہے۔

شرح صدر

شرح صدر یعنی سینہ کا کھول دینا یا اس غرض سے چاک کر دینا کہ وہ انوار الٰہی سے معمور کیا جائے ایک دولت ربانی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی، ارشاد ہوا۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (شرح)

اے محمدؐ! کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا یا چاک نہیں کر دیا۔

احادیث میں گو شرح صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے مگر بہرحال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نور معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو، ہر صورت میں وہ ایک فہم سے بالاتر کیفیت تھی۔

مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزانہ طریق پر ایک شب میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک جو پر اسرار سفر کیا، قرآن نے ان الفاظ میں ان کی تصدیق کی ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (اسراء-۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو خانہ کعبہ سے بیت المقدس تک رات کے وقت ایک شب میں لے گیا۔

حالانکہ ان دونوں مقامات کے بیچ میں اس زمانہ میں مہینوں کا سفر تھا۔

قریش پر قحط سالی کا عذاب

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے پہلے بھی یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب قریش نے آپ کی مخالفت کی تو آپ نے ان کو بد دعا کی کہ خداوندا ان کو سات سال تک قحط میں مبتلا رکھ جس طرح تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں سات سال تک مسلسل قحط کو قائم رکھا تھا، چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے، یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ ان کو دھوئیں کی طرح نظر آتا تھا، یہ حالت دیکھ کر ابو سفیان آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے محمدؐ! تم خدا کی اطاعت اور صلہ رحم کا حکم دیتے ہو، حالانکہ خود تمہاری قوم تباہ ہو رہی ہے اس کے لیے خدا سے دعا کرو، آپ نے دعا فرمائی اور بارش آ گئی جس نے قحط کی مصیبت کو دور کر دیا، اس کے بعد پھر قریش نے حسب دستور آپ کی مخالفت شروع کی تو قیام مکہ ہی کے زمانے میں خدا نے آپ کی زبان سے یہ پیشین گوئی قریش کو سنائی کہ آئندہ اس کا انتقام ایک اور سخت گرفت سے لیا جائے گا، وہ گرفت بدر کی لڑائی تھی چنانچہ سورہ دخان کی ان آیتوں میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔[1]

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ يَغْشَى النَّاسَ هَٰذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ

اس دن کا انتظار کرو جب آسمان دھواں نمایاں کرے گا جو لوگوں پر چھا جائے گا یہ نہایت تکلیف دہ عذاب ہے، اے خداوندا یہ عذاب ہمارے اوپر سے ہٹا لے، ہم مسلمان ہیں اور کہاں ان کے لئے نصیحت پکڑنا، حالانکہ ان کے پاس ایک رسول کھلم کھلا آیا پھر ان لوگوں نے اس سے اعراض کیا اور کہا یہ سکھایا ہوا پاگل

---

[1] صحیح مسلم تفسیر سورۂ دخان۔

عَائِدُوْنَ. يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ.

(دخان ۔ ۱)

ہے ہم تھوڑی دیر کے لئے عذاب کو ہٹا لینے والے ہیں تم لوگ اسی قدیم حالت کی طرف عود کر جاؤ گے ہم اس روز انتقام لیں گے جو سب سے بڑی پکڑ کا دن ہو گا۔

متوقع ہجرت کی معجزانہ نشانیاں

کفار نے دار الندوہ میں چھپ کر آپ کے قتل وغیرہ کے مشورے کئے کوئی مسلمان ان میں شریک تھا اور نہ کسی طرح ہو سکتا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز کی خبر اللہ تعالیٰ نے دے دی، دن، تاریخ، وقت سب سے آگاہی ہو گئی اور پھر یہ کہ جس شب کو آپ نے ہجرت کی، سب کو معلوم ہے کہ اس رات کو آپ کے گھر کے چاروں طرف دشمنوں کا پہرہ تھا، تاہم آپ ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ان ہی کے درمیان سے گزر کر حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ شہر سے نکل گئے، آپ مکہ کے قریب ہی غار ثور میں جا کر چھپے، عرب آثار قدم سے اشخاص کے مقام و گزرگاہ کا پتہ لگانے میں نہایت مشاق تھے، صبح کو وہ آپ کا پتہ لگاتے ہوئے غار مذکور کے دہانہ تک پہنچ گئے، یہاں تک کہ اگر وہ ذرا جھک کر دیکھتے تو آپ ان کے سامنے تھے حضرت ابوبکرؓ اقتضائے بشری سے گھبرا اٹھے، مگر آپ نے تسلی دی کہ خدا ہمارے ساتھ ہے، چنانچہ ساتھ والے خدا نے یہ تدبیر کی کہ کافروں سے ان کی یہ سوجھ چھین لی کہ وہ جھک کر دیکھیں اور ان کے دل میں ایسی بات ڈال دی کہ وہ بے دیکھے واپس چلے گئے، سیر کی اکثر ضعیف روایتوں میں اور مسند ابن حنبل کی ایک روایت میں جو زیادہ کمزور نہیں ہے مذکور ہے کہ مکڑی نے غار کے منہ پر جالے تن دیئے تھے، کفار نے کہا کہ اگر کوئی اس غار میں جا کر چھپتا تو ظاہر ہے کہ یہ جالے ٹوٹ جاتے اور یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے، اس غار سے نکل کر اب آپ مدینہ کی راہ چلے تو قریش کے سوار آپ کے تعاقب میں نظر آئے، چنانچہ سراقہ اپنا گھوڑا دوڑاتا آپ کے قریب پہنچ گیا، دفعۃً گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، تین دفعہ یہی واقعہ پیش آیا، سراقہ اس اعجاز کو دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور خط امان لے کر واپس چلا گیا۔

واقعہ ہجرت کے ان معجزانہ واقعات کا تفصیلی بیان احادیث میں ہے، مگر قرآن مجید کا یہ اجمالی اعتراف ان کی تائیدی شہادت ہے۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ.

(انفال ۔ ۴)

اور یاد کر (اے پیغمبر) جب کفار تمہارے ساتھ داؤ کر رہے تھے تاکہ تم کو قید کریں یا قتل کریں یا گھر سے نکال دیں، وہ بھی داؤ کر رہے تھے اور خدا بھی داؤ کر رہا تھا اور خدا سب داؤ کرنے والوں میں سے بہتر داؤ کرنے والا ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ

اے لڑائی سے پیچھے رہنے والے لوگو! اگر تم اس پیغمبر کی مدد نہ کرو تو وہ تمہاری مدد سے بے نیاز ہے کہ خدا نے اس وقت اس کی مدد کی جب اس کو کافروں نے مکہ سے نکال دیا تھا وہ دو رفیقوں میں سے ایک تھا جب وہ دونوں غار میں تھے اپنے ساتھی سے کہتا تھا کہ گھبراؤ نہیں خدا ہمارے ساتھ ہے، پھر خدا نے اس پر اپنی

كَفَرُوا السُّفْلٰى ، وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

(توبہ - ۶)

تسکین نازل کی اور ان فوجوں سے اس کی مدد کی جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کی بات کو نیچا کیا اور خدا ہی کی بات اونچی رہتی ہے اور خدا غالب اور تدبیر والا ہے

خواب میں کفار کا کم دیکھنا

ہجرت کے بعد سب سے بڑا معرکہ غزوۂ بدر کا پیش آیا، جس میں ایک طرف تین سو تیرہ مسلمان تھے جو ہتھیاروں سے بھی پورے آراستہ نہ تھے۔ دوسری طرف ایک ہزار قریش کی لوہے میں غرق فوج تھی، دنیا قیاس کر سکتی ہے کہ اس جنگ کا خاتمہ کس کے حق میں ہوتا؟ لیکن چونکہ یہ اسلام کی ہمیشہ کے لیے موت وحیات کی ساعت تھی اس لئے کارساز قدرت نے اپنی عجیب وغریب نشانیوں سے حق کو فتح اور باطل کو شکست دی، چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ بدر سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معرکہ کا نقشہ عالم رویا میں دکھایا گیا تھا اور اس میں کفار کی تعداد بہت کم دکھائی گئی تھی جو ان کی ذلت اور شکست کی طرف اشارہ تھی، مسلمانوں نے جب یہ خواب سنا تو ان کی ہمت ہوئی، اگر عالم رویا میں کفار کی کثرت دکھائی جاتی تو مسلمانوں کے حوصلے پہلے ہی سے پست ہو جاتے، چنانچہ قرآن مجید نے اس کی تصریح کر دی۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا وَّلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ.

(انفال - ۵)

خدا کے احسان کو یاد کرو جب وہ تجھ کو تیرے خواب میں ان کافروں کو تھوڑا دکھا رہا تھا، اگر تم کو زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ہمت ہار دیتے اور لڑائی کے بارہ میں آپس میں اختلاف کرتے لیکن خدا نے بچا لیا، بے شک خدا سینوں کے راز جانتا ہے۔

مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھانا

اس معرکہ میں سن چکے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی، ایسی حالت میں مسلمانوں کا بزدل ہونا لازمی تھا، خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ تماشہ دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے معلوم ہونے لگے اُدھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے، مقصود یہ تھا کہ روسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ لے جانے پائیں، اس کی یہ تدبیر کی کہ مسلمان اپنی تعداد سے بھی کم ان کو نظر آنے لگے، اس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر حصول نتیجہ کے لئے نہ تو سرفروشانہ کوشش کی اور نہ بھاگنے کی کوئی ضرورت سمجھی اور یہی بات مسلمانوں کے حق میں مفید ہو گئی۔

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا.

(انفال - ۵)

خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم دشمنوں سے صف آرا ہوئے تو وہ تمہاری نگاہوں میں ان کو تھوڑا کر کے دکھاتا تھا اور تم کو ان کی آنکھوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا کہ اس کام کو جس کا ہونا مقرر ہے طے کر دے۔

پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دونا نظر آنا

پہلے تو خدا نے کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ کفار بے پرواہ ہو کر لڑ پڑیں، پھر جب دونوں فوجیں

گئے تھیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دونی نظر آنے لگی اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش نے ڈر کر ہمت ہار دی۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا، فِئَةٌ
تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَأُخْرَىٰ
كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ
وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ إِنَّ فِي
ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ۔

(آل عمران۔ ۲)

اے مسلمانو! تمہارے لئے ان دونوں فوجوں میں جو صف آرا ہوئیں جن میں ایک خدا کی راہ میں لڑ رہی تھی اور دوسری خدا کی منکر تھی یقیناً ایک نشانی تھی، کافروں کا لشکر آنکھوں دیکھتے اپنے مقابل فوج کو اپنے سے دونا دیکھ رہا تھا اور اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی مدد سے تائید کرتا ہے اس واقعہ میں ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں، بڑی عبرت ہے۔

فرشتوں کی آمد

یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیونکر گئی؟ کیا آسمان سے فرشتے اُتر آئے؟ خدا فرماتا ہے۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي
مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِينَ
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ
قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
إِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (انفال۔ ۱)

یاد کرو جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری سن لی کہ میں لگاتار ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا اور خدا نے یہ نہیں کیا، لیکن خوش کرنے کے لئے اور تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوں ورنہ فتح تو اللہ ہی کی طرف سے ہے اللہ غالب حکمت والا ہے۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ
فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ (انفال۔ ۲)

یاد کرو جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم مسلمانوں کے دل مضبوط کئے رہو، کافروں کے دلوں میں، میں عنقریب رعب ڈال دوں گا۔

میدانِ جنگ میں پانی برسانا

بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب تھی، اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سبب یہ پیدا کر دیا کہ عین اس وقت میدانِ جنگ میں موسلا دھار پانی برسایا جس نے اُدھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر اُن کے پاؤں جما دیئے اور اِدھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا ہوا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہوگیا، خدا خود فرماتا ہے۔

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ
بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ
عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ۔

(انفال۔ ۲)

اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب وہ آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تم کو اس پانی سے پاک کرے اور ناپاکی تم سے دور کرے اور تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور اس سے قدموں کو جمائے۔

لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا

معرکۂ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اڑ جاتی ہے مگر مایۂ تسکین عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز یہ تھا کہ بدر و اُحد کے کارزاروں میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری اور بے خوفی کے لئے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا، تاکہ کسی خوف و خطرہ کا خیال کئے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔ چنانچہ خدا احسان جتاتا ہے۔

وَاِذْ یُغَشِّیْکُمُ النُّعَاسَ اَمَنَۃً مِّنْہُ۔ (انفال ۔ ۲)

یاد کرو جب خدا اپنی طرف سے تمہاری بے خوفی کے لئے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغْشٰی طَآئِفَۃً مِّنْکُمْ وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ۔

پھر خدا نے غم کے بعد بے خوفی کے لئے تم پر نیند اتاری، جو ایک گروہ پر چھا رہی تھی اور دوسرا گروہ تھا جس کو اپنی جان کی فکر میں ڈالے تھی۔

آپ کا کنکری پھینکنا

یہ سب کچھ تھا لیکن عین اس دار و گیر کے معرکہ میں ایک مقدس اور پُر سکون دل اور سر بسجود پیشانی کے ساتھ ظاہری ہتھیاروں سے منزہ ہو کر دعاؤں میں مصروف تھا، اس نے سر اٹھایا، اس حیرت ناک منظر پر نگاہ ڈالی اور زمین سے ایک مٹھی کنکری اور خاک اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی، دفعۃً باطل کا طلسم چور چور تھا، قرآن گواہی دیتا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْہُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (انفال ۔ ۲)

تو تم نے (مسلمانو) ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ خود خدا نے ان کو قتل کیا اور اے پیغمبر تو نے نہیں پھینکا، جب تو نے پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا کہ مسلمانوں کو اس سے (فتح کی) اچھی نعمت عطا کرے خدا دعاؤں کا سننے والا اور بھیدوں کا جاننے والا ہے۔

کوئی رمی کے معنی تیر پھینکنے کے نہ لے کہ آپ نے اس موقع پر کیا، تمام عمر میں سخت سے سخت خطرہ میں بھی کبھی تیغ و تبر اور تیر و خنجر سے دست مبارک کو آلودہ نہیں کیا۔

غزوہ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ

پڑھ چکے ہیں کہ بدر کے معرکہ سے پہلے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا شام سے مکہ جا رہا تھا اور ادھر سے قریش کی فوج بڑے سر و سامان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کو نکلی تھی، مدینہ سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس صورت واقعہ سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک چیز تم کو ملے گی یا تو یہ قافلہ اور یا یہ قریش کی فوج شکست کھائے گی، اور تم کو غنیمت کا مال ملے گا، چنانچہ یہ صورت واقعہ بھی درست نکلی اور وعدہ بھی پورا ہوا۔

وَاِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ (انفال ۔ ۱)

اور یاد کرو جب تم سے اللہ وعدہ کر رہا تھا کہ ان دو گروہوں میں ایک تمہارا ہے

غزوہ احزاب کی خبر

غزوہ احزاب جس میں دفعۃً متحدہ عرب قبائل کا سیلاب مدینہ کے چاروں طرف امنڈ آیا تھا، واقعہ سے بہت پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم رؤیا میں اس کی اطلاع دی جاچکی تھی، اور آپ نے تمام مسلمانوں کو اس مصیبت کے آنے سے پیشتر باخبر کردیا تھا، چنانچہ جب یہ صورت حال نظروں کے سامنے آگئی تو اس نشان کے ظاہر ہونے سے مسلمانوں کے ایمان میں اور زیادہ پختگی آگئی اور ان کے دلوں میں آپ کی صداقت کا مزید یقین پیدا ہوگیا۔

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔ (احزاب۔۳)	اور جب مسلمانوں نے ان متحدہ حملہ آور قبائل کو دیکھا تو کہا کہ یہی وہ ہے جس کا وعدہ ہم سے خدا اور اس کے رسول نے کیا تھا اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس واقعہ نے ان کو ایمان اور اقرار میں اور زیادہ پختہ کردیا۔

غزوہ احزاب میں آندھی

اس غزوہ میں عرب کے مختلف قبائل نے مل کر مسلمانوں پر متحدہ حملہ کیا تھا اور چاروں طرف سے مدینہ کا محاصرہ کرلیا تھا اور ڈیرے خیمے ڈال کر اس بات پر جم گئے تھے کہ ہم اسی محاصرہ کی حالت میں مسلمانوں کو مدینہ میں گھیر کر ان کا خاتمہ کردیں گے، چنانچہ ۲۰ دن تک وہ محصور کئے پڑے رہے، آس پاس کے یہودی جو پہلے مسلمانوں سے عہد کرچکے تھے دشمنوں سے جا کر مل گئے اور اس قدر زور کا حملہ کیا کہ مسلمان فریضۂ نماز بھی وقت پر ادا نہیں کرسکتے تھے، مدینہ میں فاقہ ہونے لگا، منافقین اور کچے دل کے لوگ گھبرا کر ساتھ چھوڑنے لگے کہ عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے باہر اس زور کی آندھی چلائی کہ دشمنوں کے خیمے اکھڑ گئے، طنابیں ٹوٹ گئیں، ہانڈیاں الٹ گئیں اور ایسی سخت سردی پڑی کہ دشمن منتشر ہوکر رہ گئے اور ہمت ہار کر خود محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے، خدا نے مسلمانوں کو اپنا یہ احسان جتایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاۗءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (احزاب۔۲)	مسلمانو! اپنے اوپر خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب فوجوں نے تم پر حملہ کیا تو ہم نے ان پر ہوا اور ایسی فوجیں بھیجیں جن کو تم نے نہیں دیکھا اور جو تم کر رہے تھے خدا اس کو دیکھ رہا تھا۔

غزوہ حنین میں نصرت

فتح مکہ کے بعد غزوہ حنین پیش آیا، گو اس میں مسلمانوں کے ساتھ بڑی بھیڑ شامل تھی لیکن اس میں کچھ نوجوان تھے جو لڑائی کا تجربہ نہیں رکھتے تھے، کچھ مکہ کے نومسلم تھے جو ابھی صبر وضبط کے خوگر نہیں ہوئے تھے، فوج میں زرہ پوش بھی کم تھے اور مقابلہ قبیلہ ہوازن سے پڑا جو تیراندازی میں کمال رکھتے تھے، مسلمان جونہی آگے بڑھے، حریف نے ان کو تیروں پر رکھ لیا، پہلے ہی حملہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن مرکز نبوت اپنی جگہ پر تھا، آپ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا، انہوں نے مہاجرین وانصار کو آوازیں دیں، وہ پلٹے تو آپ سواری سے نیچے اترے اور زمین سے ایک مشت خاک اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکی دفعۃً جنگ کا نقشہ بدل گیا، ہوازن شکست کھا کر بھاگ نکلے، یہ واقعہ صحیح مسلم اور دیگر معتبر روایتوں سے مذکور ہے۔

اور قرآن کی اس صداقت کی گواہی دیتا ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ
اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا
وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ
وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى
رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ
تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (توبہ-۴)

خدا نے تمہاری نصرت بہت سے مقامات میں کی اور نیز حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم کو مغرور بنا دیا تھا تو یہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی پھر پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے، پھر اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول پر اور مومنوں پر نازل کی اور وہ فوجیں اتاریں جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کفر کرنے والوں کو پوری سزا دی۔

"نظر نہ آنے والی فوجوں" کے الفاظ سے قرآن مجید کے ہمیشہ فوق الفہم اور غیر مادی ذرائع و وسائل کی تعبیر کی ہے۔

غیب پر اطلاع غیب پر ذاتی علم تو خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، مگر وہ جس کو چاہے اپنی اس بخشش سے سرفراز بھی کر سکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں کے سامنے کبھی دور دراز مقامات کی خبریں، کبھی لوگوں کے دلوں کے حالات کبھی مخفی واقعات آئینہ کر دیئے جاتے تھے، مسلمان تو مسلمان، وہ بھی جو سچے دل سے آپ کی صداقت کے قائل نہ تھے اس سے ڈرتے رہتے تھے کہ وحی الٰہی جس کے متعلق انھیں تجربہ ہو چکا تھا کہ وہ واقعات غیبی کے پردہ در ہے، کہیں ان کے مخفی جرائم اور دل کے کھوٹوں کو برملا ظاہر نہ کر دے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ
سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔
(توبہ-۸)

منافقین اس سے ڈرتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی ایسی سورہ اترے جو ان کو ان باتوں سے آگاہ کر دے جو منافقوں کے دلوں میں ہیں۔

بنو نضیر کی سازش کی اطلاع ایک دفعہ ایک ضروری کام کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چند رفقائے خاص کے ساتھ بنو نضیر کے قلعہ میں تشریف لے گئے، یہود بنی نضیر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر اکابر اسلام کے خفیہ قتل کا اس کو بہترین موقع سمجھا، چنانچہ جس دیوار کے نیچے آپ کھڑے تھے اس کی چھت پر ایک شخص چڑھ گیا کہ اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ پر گرا دے کہ دب کر مر جائیں، اللہ تعالیٰ جو اپنے پیغمبر کی حفاظت کا کفیل تھا اس نے بروقت اطلاع دی اور آپ فوراً ان کے دام سے باہر نکل آئے اور ان کو ان کے اس ارادۂ فاسد کی اطلاع بھیج دی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ
اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَعَلَى اللّٰهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (مائدہ-۲)

اے مسلمانو! خدا کے اس احسان کو جو اس نے تم پر کیا یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے تم پر دست درازی کا قصد کیا تو خدا نے تم سے ان کے ہاتھوں کو روک دیا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور مسلمانوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

مہاجرین حبش کو بشارت قریش کے گوناگوں مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اپنے ملک و وطن کو

خیرباد کہہ کر حبش چلی گئی، اول تو غیر ملک اور مذہب میں ان مسلمانوں کا جانا ہی فکر و تردد کا باعث تھا اور معلوم نہ تھا کہ حبش کے عیسائی بادشاہ اور امراء نئے مذہب کے ان پیروؤں کے ساتھ کیونکر پیش آئیں گے؟ اس سے زیادہ فکر کی چیز یہ تھی کہ رؤسائے قریش کے تجارتی تعلقات کے باعث حبش کے امراء ان سے شناسا تھے اور باہم ان کے درمیان دیرینہ روابط تھے، اس کے بعد اس سے بھی زیادہ تردد انگیز یہ واقعہ ہوا کہ رؤسائے قریش نے اپنے گزشتہ تعلقات کی بنا پر نجاشی کے دربار میں تحفے تحائف دے کر اپنے سفراء اس غرض سے بھیجے تاکہ وہ ان بے وطن مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہنے کی اجازت نہ دے، یہ تمام اسباب ایسے تھے جن کی بنا پر مسلمانوں کو عموماً اور مہاجرین کو خصوصاً اپنے مستقبل کی نسبت سخت تشویش کا پیدا ہونا ضرور تھا، اس بنا پر سکینت الٰہی نے ان کو امن و امان کا پیام سنانا ضروری سمجھا چنانچہ اسی تشویش ناک اور تردد انگیز عہد میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل-۶)

اور جن لوگوں نے اللہ کی خاطر مظلومی کی حالت میں ہجرت کی ہم ان کو بالیقین دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور آخرت کا ثواب سب سے بڑا ہے۔

اگر ہجرت کا لفظ عام ہے اور اس دلیل سے کہ یہ سورہ قیام مکہ کے زمانہ کی ہے اور جن لوگوں نے اس عہد میں ہجرت کی تھی، ان کا ذکر ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص مہاجرین حبش کے لئے بشارت ہے، سب کو معلوم ہے کہ خدا کا یہ وعدہ کتنا سچا ہوا، نجاشی نے نہ صرف یہ کہ قریش کے سفراء کو خلاف توقع ناکام واپس کر دیا بلکہ مسلمانوں کو اس نے بڑی عزت سے جگہ دی اور خود اسلام کی طرف میلان ظاہر کیا، بعض مسلمان چودہ چودہ برس وہاں رہے اور اس اثناء میں کئی نجاشی سریر آرا ہوئے مگر کسی نے ان سے تعرض نہیں کیا۔

ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بے سروسامانی کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے، اس حالت کو دیکھ کر کسی شخص کے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بے خانماں قافلہ ایک دن مدینہ سے اس قدر طاقتور ہو کر نکلے گا کہ جن لوگوں نے ابتدائے نبوت سے آغاز ہجرت تک اس کی جان لینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، وہ اس کے ہاتھوں خود ہلاک و برباد ہو جائیں گے، لیکن قرآن مجید دوسری پیشین گوئی کر رہا تھا، چنانچہ ہجرت سے ایک سال پہلے مکہ معظمہ میں یہ آیت اتری۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل-۸)

اگر وہ تم کو سرزمین مکہ سے گھبرا چکے تاکہ تم کو اس سے نکال دیں تو وہ تمہارے بعد بہت کم مدت باقی رہیں گے۔

چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ایک ہی سال کے بعد غزوۂ بدر نے صنادید قریش کا خاتمہ کر دیا اور اہل عرب کی مخالفت کی جڑ کٹ گئی۔

مدینہ میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہوگا

عجب نہیں کہ مدینہ آ کر مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو گیا ہو کہ ان کی تمام تکلیفوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس وقت کوئی ایسا قرینہ بھی نہ تھا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ قریش انتقام کے جوش میں نیام سے تلواریں کھینچ لیں گے اور تمام عرب اس

ہم میں ان کا ہم آہنگ ہو جائے گا اور متصل آٹھ برس تک لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہے گا، جس میں مسلمانوں کو فاقہ، تنگ دستی، قتل و خونریزی ہر نوع کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑے گا، مگر عالم غیب کا پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی سے پہنچ چکا تھا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ (بقرہ - ۱۹)

اور ہم یقیناً تم کو کسی قدر خوف، فاقہ اور جانوں کی اور مال اور پھلوں کی کمی کی مصیبتوں سے آزمائیں گے۔

دینی اور دنیاوی شہنشاہی کا وعدہ

لیکن اس بے سروسامانی کے عالم میں اس بے خانماں گروہ کے ساتھ خداتعالیٰ نے ایک وعدہ اور بھی کیا اور ان کو خلافتِ ارض یعنی دینی و دنیاوی شہنشاہی کی بشارت دی، یہ بشارت واقعات موجودہ کے کس قدر خلاف تھی مگر چند ہی سال میں محال نے وقوع کی صورت اختیار کرلی۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (سورۂ نور - ۱)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین کا خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے تم سے پہلے کے لوگوں کو خلیفہ بنایا اور جو دین ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو مستحکم کردے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔

مسلمانوں کی حالت کے لحاظ سے یہ بشارت کس قدر عجیب و غریب تھی، مسلمانوں کا گروہ ایک مظلوم، بیکس اور ضعیف گروہ تھا، جس کو کفار نے طرح طرح کی اذیتیں دے کر خانماں برباد کردیا تھا اور اس نے مدینہ میں آکر خدا کے چند نیک بندوں کے سایہ میں پناہ لی تھی، یہاں آکر بھی اس کو اطمینان و راحت کی نیند نصیب نہ ہوئی کفار مکہ پہلے ہی سے جان کے دشمن تھے، یہاں آکر دشمنوں کی تعداد میں منافقین اور یہود کا اور بھی اضافہ ہوگیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہؓ کو ہمیشہ کفار کے حملہ کا خوف لگا رہتا تھا اور ذرا سے شور و غل پر مدینہ میں ہراسی پھیل جاتی تھی، یہاں تک کہ صحابہ ہمیشہ سوتے جاگتے مسلح رہتے تھے، چنانچہ اس مظلوم گروہ نے اس حالت سے تنگ آکر ایک دن کہا کہ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم کو اطمینان حاصل ہوگا اور خدا کے سوا کسی اور کا ڈر نہ ہوگا اس پر ان کو قرآن مجید نے خلافت ارض کی بشارت دی[1]۔ اور وہ پوری ہوئی اور اس گروہ نے دنیا پر اس طرح کامیاب حکومت کی کہ اس کے سامنے تمام متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر گیا، اس سے بڑھ کر اس پیشین گوئی کی صداقت کیا ہوسکتی ہے۔

قبائل عرب کی شکست ہوگی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو غزوات پیش آئے، اسلام کو جو غلبہ حاصل ہوا، کفار کو جو شکستیں ہوئیں، قرآن مجید نے ان کے متعلق پیشین گوئیاں کیں اور اس حالت میں کیں جب ظاہری اسباب کے لحاظ سے کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا، چنانچہ جب ہر طرف سے کفار کا ہجوم تھا اور اس ہجوم کو دیکھ کر ان کو یقین تھا کہ تمام عرب مل کر مسلمانوں کا خاتمہ کردے گا، خدا نے

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۴۱۰۔

یہ اعلان عام کر دیا کہ عنقریب خود مسلمان تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔

أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنْتَصِرٌ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔

(قمر-۳)

کیا وہ کفار کہتے ہیں کہ ہم سب ایک اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں، یہ جتھا عنقریب توڑ دیا جائے گا اور وہ پشت پھیر لیں گے۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (فتح-۳)

اور اگر کفار تم سے لڑیں گے تو ان کو بھاگنا پڑے گا پھر وہ کوئی حامی اور مددگار نہ پائیں گے۔

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ، وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ۔

(توبہ-۲)

تم ان سے لڑو، خدا ان کو تمہارے ہاتھ سے عذاب دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور تم کو ان پر فتح دے گا، اور مسلمانوں کے دل ٹھنڈے کرے گا اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا۔

اور یہ تمام پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں پوری ہوئیں، اسلام نے عرب کے تمام قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیا اور انھوں نے ہر موقع پر شکستیں کھائیں۔

قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے

مصیبت زدہ اور بے سروسامان مسلمانوں کی تسکین کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قریش کی تباہی و بربادی اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی کے متعدد وعدے کیے گئے تھے، جن میں سے بعض آپؐ کی زندگی میں اور بعض آپؐ کی وفات کے بعد پورے ہونے والے تھے۔

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُونَ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُونَ۔

(زخرف-۴)

پس اگر ہم تجھ کو اٹھا لیں تو بھی ان کافروں سے انتقام لیں گے اور اگر ہم تیری زندگی میں تجھ کو وہ دکھا دیں جس کی دھمکی ان کافروں کو ہم نے دی ہے تو ہم ان پر قدرت رکھتے ہیں۔

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ۔

(مومن-۸)

تو صبر کر خدا کا وعدہ یقیناً سچا ہے تو جس بات کی دھمکی ہم ان کافروں کو دیتے ہیں اس کو یا تیری زندگی میں دکھا دیں گے یا تجھ کو موت دیں گے تو وہ ہمارے پاس ہی لوٹائے جائیں گے۔

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ

اور اگر تیری ہی زندگی میں بعض وہ وعدے جو ہم نے ان سے کیے ہیں دکھا دیں یا تجھ کو موت دے دیں تو تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے کیا یہ کافر نہیں دیکھتے کہ ہم اسلامی فتوحات کے ذریعے

اَطْرَافِهَا وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ۔ (رعد - ۶)	سرزمین (عرب) کے حدود میں (کافروں کے قبضہ کو) کم کرتے جاتے ہیں، خدا ہی اپنا حکم چلاتا ہے، کوئی اس کے حکم کو رد و بدل نہیں کر سکتا۔

فتح کی پیشین گوئیاں

جو چیز مسلمانوں کے دل سے لگی ہوئی تھی وہ فتح مکہ تھی، یعنی جس شہر پر قبضہ جہاں سے وہ نہایت بے بسی اور بے کسی کے عالم میں نکلے تھے اور جس کے حدود میں ان کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی، وہ گو اب مدینہ کے دارالسلطنت میں تھے تاہم وطن کی یاد دلوں سے کم نہیں ہوتی تھی، ان کو فتح پر فتح ہوتی جاتی تھی، لیکن ان کے دل کی کلی اپنی شگفتگی کے لئے جس موسم بہار کا انتظار کر رہی تھی، وہ ہنوز نگاہوں سے دور تھا، مگر بشارت الٰہی ہر قدم پر ان کے لئے تسکین کا نیا پیام لا رہی تھی اور مژدۂ فتح سے ان کے دل شاد کرتی جاتی تھی، سورۂ قصص میں یہ آیت اتری۔

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (قصص - ۹)	جس نے تجھ پر قرآن فرض کیا ہے وہ تجھ کو ٹھکانے کی طرف پھر لوٹا کر لے جانے والا ہے۔

یعنی مکہ[1]، پھر سورۂ صف میں خدا نے مسلمانوں کو آخرت میں جنت کی بشارت دینے کے ساتھ اس دنیا میں بھی ایک بشارت دی۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (صف - ۲)	اور دوسری نعمت جس کو تم دل سے چاہتے ہو، وہ خدا کی طرف سے نصرت اور عنقریب فتح ہے اور مسلمانوں کو بشارت سنا دے۔

صلح حدیبیہ سے پہلے خواب میں آپ کو خانۂ کعبہ کا داخلہ دکھایا گیا۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ (فتح - ۳)	خدا نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دیا، تم لوگ یقیناً مسجد حرام میں اگر خدا نے چاہا تو بے خوف و خطر داخل ہو گے، بال منڈا کر یا ترشوا کر کسی سے نہ ڈرو گے۔

حدیبیہ سے واپس آپ آ رہے تھے کہ سورۂ فتح نازل ہوئی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (فتح - ۱)	ہم نے کھلی فتح تم کو دی۔

آپ نے اسی وقت حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ خوشخبری سنائی، اس کے دو برس کے بعد مکہ کی دولت مسلمانوں کو مل گئی۔

خیبر اور حنین کی فتح کی پیشین گوئی

۶ھ کی صلح حدیبیہ میں فتح مکہ کی پیشین گوئی کی جا چکی تھی جو ۸ھ میں پوری ہوئی لیکن حدیبیہ کی صلح میں مسلمانوں نے رسول کی اطاعت اور متابعت کا جو بہترین نمونہ پیش کیا تھا اور جس صبر اور تحمل سے صلح حدیبیہ کے شرائط کو مسلمانوں نے تسلیم کر لیا تھا اس کے معاوضہ میں اللہ تعالیٰ نے دوسری فتوحات عظیم کا وعدہ مسلمانوں سے کیا جن میں بے شمار مال غنیمت ان کو ہاتھ آنے والا تھا۔

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور۔

فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ
فَتْحًا قَرِيْبًا هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى
وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى
بِاللّٰهِ شَهِيْدًا (فتح ۔ ۴)

تو خدا نے وہ جانا جو تم نے نہیں جانا اور اس (فتح مکہ) سے پہلے ایک عنقریب فتح تمہارے لئے بنائی اور اسی نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور خدا گواہ کافی ہے۔

یہ خیبر کی فتح تھی جو صلح حدیبیہ کے ایک سال کے بعد اور فتح مکہ سے ایک سال پہلے حاصل ہوئی اور جس کے نتیجہ میں یہودیوں کی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور اسلام کو عرب کے تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہو گیا۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ
تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ
فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا
قَرِيْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا۔
(فتح ۔ ۳)

خدا مسلمانوں سے خوش ہو گیا، جب وہ درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے تو ان کے دلوں میں جو کچھ تھا (یعنی فتح کے لئے بے چینی) اس کو جان لیا تو اس نے ان پر تسکین نازل کی اور اس کے بدلہ میں سر دست ایک فتح ان کو دی اور بہت سا مال غنیمت جس پر وہ قبضہ کریں گے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا
فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ
النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (فتح ۔ ۳)

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن کو تم لو گے تو یہ ایک غنیمت تم کو جلد عطا کر دی اور لوگوں کی دست درازی کو تم سے روک دیا اور تاکہ مسلمانوں کے لئے ایک نشانی ہو۔

چنانچہ خیبر کی فتح میں مسلمانوں کو خیبر کی تمام سرسبز و شاداب زمینیں اور ہرے بھرے نخلستان مل گئے اور اس کے ایک سال بعد حنین کی فتح میں مال غنیمت کا بے شمار ذخیرہ (چھ ہزار اسیران جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی) مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

یہود کو اعلان عرب کے یہود اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں جان و مال سے دریغ نہیں کرتے تھے تاہم یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق بعض پیشین گوئیاں ایسی کیں کہ اگر وہ ہمت سے کام لیتے تو اس کا ابطال خود ان کے امکان میں تھا، مثلاً یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ خدا کے چہیتے ہیں اور جنت ان کے لئے مخصوص ہے، لیکن چونکہ جنت صرف مرنے کے بعد نصیب ہو سکتی ہے اور جن لوگوں کو اس کے ملنے کا یقین کامل ہو وہ اس کے لئے جان دینے سے دریغ نہیں کر سکتے اس لئے قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق کہا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ
خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (البقرہ ۔ ۱۱)

کہ اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے لئے مخصوص ہے تو اگر تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو لیکن وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز یہ آرزو نہ کریں گے، خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ (جمعہ - ۱)

کہہ اے یہود! اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ صرف تمہیں خدا کے دوست ہو تو اگر تم اس میں سچے ہو تو موت کی آرزو کرو، وہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے ہرگز اس کی آرزو نہ کریں گے خدا ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

لیکن باوجود اس کے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے تھے اور آرزوئے موت ان کے لئے ممکن تھی تاہم قرآن مجید کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور آج تک کسی یہودی نے لقائے الٰہی کی آرزو میں جان نہیں دی۔

یہود کی دائمی ناکامی

یہود سے دمبدم مقابلہ درپیش تھا اور پورے سات برس تک یہ مقابلہ درپیش رہا، یہود عرب میں بڑی طاقت رکھتے تھے، تمام مالی کاروبار ان کے قبضہ میں تھا، ان کے پاس بکثرت دولت تھی، عربوں سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں علانیہ فائق تھے، ہر طرح کے سامانِ جنگ رکھتے تھے اور فنِ جنگ سے بھی کماحقہ واقف تھے، مدینہ سے لے کر حدودِ شام تک ان کے تجارتی قلعوں کی مسلسل قطاریں تھیں اور ادھر مسلمانوں کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہ تھی، بایں ہمہ قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی زبانی یہ اعلانِ عام کر دیا۔

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ لَنْ يَضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ۔

اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لئے یہ بہتر ہوتا ان میں بعض ایماندار اور اکثر فاسق ہیں، وہ تم کو سوا تھوڑی تکلیف دینے کے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے لڑیں تو پشت پھیر دیں، پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ ان پر ذلت جہاں کہیں وہ ہوں چھینک ماری گئی ہے لیکن خدا کے کسی وسیلہ سے یا لوگوں کی سفارش سے کبھی کبھی اس ذلت سے بچ جائیں، خدا کا غضب لے کر وہ لوٹیں گے اور بیچارگی ان پر چھا جائے گی۔

اُس وقت سے آج تک ان کی ایشیا، افریقہ اور یورپ ہر جگہ کی تاریخ اس صداقت سے معمور پیشین گوئی کی حرف بحرف تصدیق ہے۔

روم کی قوت ٹوٹ جائے گی

سنہ ۸ھ کے بعد مسلمانوں کا مقابلہ عرب کے مشرکین اور یہود سے زیادہ سخت اور طاقت ور دشمن رومی عیسائیوں سے آپڑا، رومن امپائر کی وسعت، قوت سامان، نظام، فوج، خزانہ کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کی حالت پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ایک پرِ کاہ کا کوہ سے مقابلہ ہے، تاہم اسلام کے پیغمبر کی زبان سے اُسی وقت یقین و تسلی کے کلمات دنیا نے سُن لئے۔

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

وہی خدا ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (صف-۱)	بھیجا ہے تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے۔

دنیا کو اس پیشین گوئی کی تصدیق کے لئے صرف سال کا انتظار کرنا پڑا۔

خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں

لیکن قرآن مجید کی پیشین گوئیاں صرف انہی غزوات کے ساتھ مخصوص نہ تھیں جو عہد نبوت میں پیش آئے بلکہ اس کے بعد بھی خلفاء کے زمانہ میں جو عظیم الشان لڑائیاں واقع ہوئیں، ان کے متعلق قرآن مجید نے پہلے سے پیشین گوئی کر دی تھی اور وہ آئندہ زمانہ میں پوری ہوئیں۔ مسلمانوں کو ایرانیوں اور رومیوں سے جو جنگ کرنا پڑی وہ تاریخ اسلام کا ایک نمایاں واقعہ ہے لیکن قرآن مجید نے اس کے نتائج کا پہلے سے اعلان کر دیا تھا۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ	جہاد میں جان چرانے والے بدوؤں سے کہہ دو کہ تم کو ایک
اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ	سخت طاقتور قوم سے جنگ کرنے کے لئے بلایا جائے گا تم
اَوْ يُسْلِمُوْنَ (فتح-۲)	لوگ ان سے لڑوگے یا وہ مسلمان ہوں گے۔

چنانچہ یہ جنگ ہوئی اور وہی نتیجہ ہوا جس کو قرآن مجید نے دو صورتوں میں یعنی قتل اور اسلام میں محدود کر دیا تھا۔

وفاتِ نبوی کی پیشین گوئی

مکہ کی فتح کے بعد آپ کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا اور اس عام اصول کی بنا پر کہ انبیاء اپنی زندگی کا مقصد پورا کرنے کے بعد نہیں رہتے، وہ وقت آیا کہ آپ اپنی اصلی مرکز یعنی ملاء اعلیٰ سے جا ملیں، اس لئے خداوند تعالیٰ نے اس راز کو ایک مستقل پیشین گوئی کی صورت میں ظاہر کر دیا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ	جب خدا کی مدد اور فتح آگئی اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ خدا کے
يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ	دین میں جھنڈ کے جھنڈ داخل ہو رہے ہیں تو خدا کی تسبیح اور استغفار
رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (النصر)	کر، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

اس سورہ میں آپ کے وصال کی پیشین گوئی اگرچہ نہایت مبہم الفاظ میں کی گئی ہے لیکن اشارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مژدۂ فتح نہیں بلکہ مژدۂ وصال ہے، کیونکہ مژدۂ فتح کے ساتھ تسبیح و استغفار کو کوئی مناسبت نہیں بلکہ اس کے لئے شکر موزوں ہے، تسبیح و استغفار کا اصلی وقت وہ ہے جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے چنانچہ صحابہ میں جو لوگ نکتہ دانِ شریعت تھے وہ اس راز کو سمجھ گئے تھے۔[1]

*

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مذکور۔

آیات و دلائل نبویہ

بروایت صحیحہ

گزشتہ صفحات میں صرف وہی آیات و دلائل پیش کئے گئے ہیں جو صراحۃً قرآن مجید میں مذکور ہیں یا کم از کم ان کے اشارات قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں، لیکن ذیل میں ان آیات و دلائل کا استقصاء مقصود ہے جو صحیح اور مستند روایتوں سے حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں، اس قسم کے آیات و دلائل کا گو بڑا حصہ فرداً فرداً خبر احاد سے ثابت ہے مگر مجموعی حیثیت سے ان کا درجہ خبر مشہور تک پہنچ جاتا ہے، مثلاً تھوڑی سی مقدار کا بڑھ کر زیادہ ہو جانا، ہاتھ سے پانی کے چشمہ کا ابل پڑنا، امراض سے غیر معمولی طور پر شفایابی حاصل کرنا اور دعاؤں کا غیر معمولی طریق سے قبول ہو جانا ان میں سے ہر قسم کے معجزات کے جزئی جزئی واقعے گو صرف ایک ایک دو دو راویوں کی زبانی بیان ہوتے ہیں مگر ان میں سے ہر قسم کے معجزہ کے متعلق تو بر تو شہادتیں موجود ہیں جن کی بنا پر ان میں سے ہر قسم کے معجزات خبر متواتر نہیں تو خبر مشہور تک ضرور پہنچ جاتے ہیں۔

البتہ بعثت سے پہلے جو عجائبات آپ سے صادر ہوئے یا جو غیر معمولی سوانح آپ کو پیش آئے، ان کی صحت محدثانہ اصول سے بہت کم ثابت ہے لیکن اس کی وجہ اس عہد میں اس قسم کے واقعات کا کم ہونا یا غلط ہونا نہیں ہے بلکہ اس عہد کے واقعات کے راوی چونکہ عموماً ماں باپ اور خاندان کے بڑے بزرگ ہوا کرتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد بعثت کے بعد بلکہ مدینہ کی پرامن زندگی شروع ہونے کے بعد جب اسلام کے سلسلہ روایت کا صحیح طریقہ سے آغاز ہوا تو آپ کے خاندان کے بزرگوں میں سے جنھوں نے آپ کے بچپن اور نوجوانی کا عہد دیکھا تھا کوئی موجود نہ تھا، والدین پہلے ہی وفات پا چکے تھے، دادا کا بھی انتقال ہو چکا تھا، چچاؤں میں ابولہب آپ کا دشمن ہی تھا، ابوطالب آغاز اسلام ہی میں مر چکے تھے، حضرت حمزہؓ ہمسن تھے اور ۳ھ ہی میں شہادت پا چکے تھے، حضرت عباسؓ صرف دو برس بڑے تھے، اس بنا پر محدثانہ اصول تنقید کے معیار پر اس زمانہ کے واقعات کا سلسلہ روایت بہت کم صحیح اترتا ہے اور اس لئے وہ غیر مستند ٹھہرتے ہیں۔

بہرحال تمام صحیح معجزات کے استقصاء سے کچھ واقعات بعثت سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں، کچھ مکہ کی زندگی کے اور زیادہ تر مدینہ کے عہد کے جب اسلامی روایتوں کا سلسلہ راویوں کی کثرت کے باعث مستحکم ہو چکا تھا، ملتے ہیں، بعثت کے بعد جو معجزات ظاہر ہوئے ہیں وہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہیں، مثلاً بعض واقعات اجسام کائنات میں تصرف اور تاثیر کے ہیں، بعض تکثیر اشیاء کے ہیں، بعض استجابت دعا اور شفائے امراض وغیرہ کے ہیں، اس لئے ذیل میں ہر نوع کے معجزات کو ہم علیحدہ علیحدہ لکھتے ہیں۔

علامات نبوّت

قبل بعثت

ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ ممتاز افراد کے سوانح زندگی میں شروع ہی سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں، جو اُن کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں، جب یہ ان عام ممتاز افراد انسانی کا یہ حال ہے جو خاندانوں، قوموں اور ملکوں کے صرف ظاہری رہنما اور رہبر ہوتے ہیں تو اس حیثیت سے اُن برتر ہستیوں کی نسبت کیا شبہ ہو سکتا ہے جو قوموں کے روحانی پیشوا اور انسانیت کے حقیقی رہبر اور رہنما ہوتے ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سوانح زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں، کتب سیر و دلائل کے مصنفین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر بعثت تک کے ان تمام واقعات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے، مگر جیسا کہ پہلے گزر چکا محدثانہ اصول کی سخت گیری نے ہمارے لئے ان کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے، صحیح روایتوں سے اس عہد کے جو واقعات علامات نبوت کے تحت میں آسکتے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت آمنہ کا خواب متعدد صحابیوں سے روایت ہے کہ صحابہ نے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! اپنا حال بیان فرمائیے، فرمایا، میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں، میری ماں نے جب میں پیٹ میں تھا خواب دیکھا کہ ان کے بدن سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے، یہ خالد بن معدان تابعی کی روایت ہے، جو گو ابن سعد میں مرسل ہے، مگر مستدرک میں ہے کہ انہوں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، حضرت عرباض بن ساریہ کی روایت میں کچھ الفاظ زیادہ ہیں، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا کہ میں خدا کا بندہ اور خاتم انبیاء اس وقت سے ہوں کہ میرا باپ (آدم) آب و گل میں تھا، میں اس کی تفصیل بتاتا ہوں، میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا، عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی ماں آمنہ کا خواب ہوں، اور اسی طرح پیغمبروں کی مائیں خواب دیکھا کرتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے آپ کی ولادت کے وقت خواب دیکھا کہ ایک نور ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا
وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا
مُنِيرًا (احزاب - ۶)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور
ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے خدا کی طرف پکارنے والا اور
روشن چراغ بنا کر بھیجا۔

؎ ابن سعد جلد اول صفحہ ۹۶ و مستدرک حاکم ج ۲ صفحہ ۶۰۰ ؎ مسند ابن حنبل ج ۴ صفحہ ۱۲۷ و بیہقی و مستدرک و زرقانی شرح المواہب ج ۱ صفحہ ۹۰

؎ ابن سعد ج ۱ صفحہ ۹۶ ؎ مستدرک حاکم و صحیح جلد ۲ صفحہ ۶۱۸

ولادت نبوی کی پیشین گوئیاں یہود و نصاریٰ میں

احادیث سیر اور دلائل کی کتابوں میں تو بر تو ایسی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہور نبوی کے عہد میں یہود و نصاریٰ خاص طور سے آنے والے پیغمبر کے منتظر تھے اور اس کے جلد ظہور اور بعثت کی مختلف پیشین گوئیاں کر رہے تھے، ان روایتوں میں سے گو ہر روایت بجائے خود ضعیف ہے، مگر ان کی مجموعی حیثیت سے یہ قدر مشترک ضرور نکلتا ہے کہ یہ عہد ان لوگوں کے نزدیک آنے والے پیغمبر کے خاص انتظار کا تھا اور مدینہ کے لوگوں میں اور مکہ کے جویان حق اشخاص میں اس پیغمبر کے ظہور کا خاص ذکر اور چرچا تھا۔

بت خانوں سے غیبی آوازیں

اسی طرح ان کتابوں میں بکثرت روایتیں ایسی ہیں جن میں بیان ہے کہ آپؐ کی پیدائش کے بعد لوگوں نے بت خانوں کے اندر غیبی آوازیں سنیں کہ اب صنم خانوں کی بربادی کا زمانہ آگیا، پیغمبر صادق کی ولادت ظہور میں آچکی ہے۔ ان روایتوں کا اکثر حصہ سخت کمزور اور ناقابل اعتبار ہے، تاہم مجموعی شہادت سے اس قدر اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں اس قسم کا کوئی واقعہ ضرور ہوا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کے حوالہ سے اس قسم کی ایک روایت آگے آتی ہے۔

شق صدر

تمام ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کی بنا پر بچپن کے زمانہ میں جب آپؐ حضرت حلیمہؓ کے ہاں پرورش پا رہے تھے شق صدر کا واقعہ پیش آیا، ایک روایت میں ہے کہ بعض صحابہ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کو سب سے پہلا غیبی واقعہ کیا پیش آیا؟ اس کے جواب میں آپؐ نے دو فرشتوں کی آمد اور شق صدر کا واقعہ بیان کیا۔[1]

اس واقعہ کی سب سے مستند روایت وہ ہے جو حماد بن سلمہ اور ثابت البنانی کے واسطہ سے صحیح مسلم، مسند احمد اور ابن سعد وغیرہ میں ہے کہ آپؐ ایک روز بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے آپؐ کو پکڑ کر سینہ مبارک کو چاک کیا اور قلب اقدس سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر پھینک دیا اور کہا کہ یہی حصہ تجھ میں شیطان کا تھا، پھر سونے کے طشت میں زمزم کے پانی سے دھو کر برابر کر دیا۔ لڑکے بھاگے ہوئے حلیمہ کے پاس آئے کہ محمدؐ کو کسی نے مار ڈالا، حلیمہ آئیں تو دیکھا کہ آپؐ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے سینہ میں اس زخم کے ٹانکے کے نشان ہم کو نظر آتے تھے۔[2] مستدرک میں بھی اسی قسم کی ایک اور روایت خالد بن معدان سے عتبہ بن عبد السلمی کے واسطہ سے مذکور ہے (باب دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۶۱۶)

ارباب سیر اور بعض محدثین کی روایت کے مطابق میں نے اس واقعہ کو یہاں لکھ دیا ہے مگر اس باب میں میری جو ذاتی تحقیق ہے وہ اس سے پہلے "شرح صدر" کے حوالہ قلم کر چکا ہوں۔

مبارک قدم ہونا

روایتوں میں آپؐ کے مبارک قدم ہونے کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، مگر ان میں سے کوئی بطریق صحیح مروی نہیں، صرف ایک روایت صحیح طریقہ سے مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک صحابی اپنے

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۲ باب معجزات ابن سعد ج ۱ ص ۹۶ و مسند دارمی باب کیف کان اول شان النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مسند ابو یعلی و ابو نعیم و ابن عساکر و احمد طبرانی و ابن حبان۔ [2] صحیح مسلم باب الاسراء ابن سعد جز اول ص ۹۷ مسند ابن حنبل روایت حضرت انسؓ ج ۳ ص ۱۲۱

باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اسلام سے پہلے جاہلیت میں حج کرنے گئے تھے، تو انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص طواف میں مصروف ہے اور اس کی زبان پر شعر میں دعا ہے۔

رُدّ الی راکبی محمدا ۔ یارب رُدّ واصطنع عندی یدا

اے میرے پروردگار، میرے سوار محمدؐ کو واپس بھیج اور مجھ پر یہ ایک احسان کر۔

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ عبدالمطلب ہیں، ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا انھوں نے اپنے پوتے کو اس کے ڈھونڈنے کے لئے بھیجا ہے اور وہ اب تک لوٹ کر نہیں آیا ہے، ان کا یہ ہوتا ایسا ہے کہ انھوں نے جس کام کے لئے اس کو بھیجا ہے ان کو کامیابی ہی ہوئی ہے، کچھ دیر کے بعد آپ اونٹ لے کر واپس آتے نظر آئے، عبدالمطلب نے سینہ سے لگا لیا[1]

بے ستری میں آپ کا غش کھا کر گرنا

آپ بچہ تھے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر درپیش ہوئی، تمام شرفائے مکہ اس مقدس کام کے معمار اور مزدور بنے، بچے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، انہی بچوں کی صف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ بھی تھے، حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تہبند کھول کر گردن پر رکھ لو کہ پتھر کی رگڑ سے گردن پر خراش نہ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چچا کے حکم کی تعمیل کی، دفعۃً آپ غش کھا کر گر پڑے اور آنکھیں پھٹ کر آسمان سے لگ گئیں، جب ہوش آیا تو آپ کی زبان پر یہ لفظ تھے "میرا تہبند میرا تہبند" لوگوں نے تہبند کمر سے باندھ دیا، یہ صحیحین کی روایت ہے[2]، حاکم اور ابونعیم میں ہے کہ ابو طالب نے اس کے بعد واقعہ دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھے ایک سفید پوش مرد نظر آیا جس نے کہا کہ "ستر پوشی کر" بیہقی اور ابن سعد میں اور حاکم کی دوسری روایت میں ہے کہ ندا آئی کہ "محمدؐ اپنے ستر کو چھپا" ان روایتوں میں ہے کہ غیب کی یہ پہلی آواز تھی جو آپ کو سنائی دی۔

نیند طاری ہونا

حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بعثت سے پہلے صرف دو دفعہ میرے دل میں بُرا خیال آیا اور دونوں دفعہ خدا نے مجھے بچا لیا، ایک دفعہ رات کو میں نوجوان چرواہوں کے ساتھ مکہ سے باہر تھا، میرے دل میں آیا کہ شہر کے اندر جا کر لطف احباب اٹھاؤں، چلا تو سر راہ شادی کا ایک جلسہ نظر آیا، میں دیکھنے کھڑا ہو گیا تو خدا نے مجھ پر نیند طاری کر دی تو اس وقت تک میں نہ جاگا جب تک سورج کی کرنوں نے آکر میرے شانے نہ ہلائے، دوسری دفعہ جب خیال آیا تو پھر یہی واقعہ گزرا، اس کے بعد میں نے جاہلیت کا کوئی ارادہ نہ کیا یہاں تک کہ خدا نے مجھ کو نبوت سے مشرف کیا[3]

صدائے غیب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ بیٹھے تھے، سامنے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ صفحہ ۶۰۳ ذہبی نے حاکم کی اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے علاوہ ازیں تاریخ بخاری ابن سعد، ابو یعلیٰ، طبرانی، بیہقی، ابونعیم اور ابن مندہ میں یہ واقعہ مذکور ہے [2] صحیح بخاری ج اول کتاب المناقب باب بنیان الکعبہ، صحیح مسلم [3] مسند بزار، ابن جریر، ابن اسحاق، بزار، بیہقی، ابونعیم، ابن عساکر قال ابن حجر اسنادہ حسن متصل و رجالہ ثقات (خصائص کبری سیوطی ج اول صفحہ ۸۸ بحوالہ مستدرک حاکم ج ۴ صفحہ ۲۴۵ علی شرط مسلم)

خندق کھود رہے تھے، اتفاق سے ایک جگہ ایک بہت سخت چٹان نکل آئی، لوگوں نے ہر چند اس کو توڑنا چاہا، مگر وہ نہ ٹوٹی، کدالیاں اس پر پڑ پڑ کر اچٹ جاتی تھیں، آخر لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر صورت حال عرض کی، آپ اٹھ کر خود تشریف لائے اور کدال ہاتھ میں لے کر ایک ضرب لگائی تو وہ چٹان ریگ ہو کر چور چور ہو گئی۔[1]

درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں ایک طرف کو نکلا تو میں نے دیکھا کہ جو پہاڑ اور درخت بھی سامنے آ جاتا ہے اس سے السلام یا رسول اللہ کی آواز آتی ہے اور میں اس کو سن رہا تھا۔[2]

پہاڑ کا ہلنا

صحیح بخاری میں ہے ایک دن آپؐ اور آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ[3] اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ[4] بھی تھے، ایک پہاڑ پر چڑھے، پہاڑ جنبش کرنے لگا، آپؐ نے پہاڑ کو پائے مبارک سے ٹھوکر مار کر فرمایا، ٹھہر جا! کہ تیری پشت پر اس وقت پیغمبر ہے یا صدیق ہے یا شہید ہے۔

صحیح بخاری میں راوی کو شک ہے، یہ پہاڑ کوہ احد تھا یا کوہ حرا، مگر صحیح مسلم اور مسند احمد میں صرف کوہ حرا کا اور ابو یعلیٰ اور بیہقی میں صرف کوہ احد کا نام ہے، بہرحال اگر یہ کوہ احد تھا تو مدینہ کا یہ واقعہ ہے اور اگر کوہ حرا تھا تو مکہ کا ہے۔

آپؐ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا

فتح سے پہلے خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بتوں کا معبد تھا، جب مکہ فتح ہوا تو آپؐ کعبہ میں تشریف لے گئے، دست مبارک میں ایک چھڑی تھی اور زبان اقدس پر یہ آیت کریمہ جاری تھی۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل-۹)
حق آیا اور باطل مٹ گیا، باطل مٹنے ہی کے لیے آیا تھا۔

آپؐ چھڑی سے جس بت کی طرف اشارہ کرتے تھے وہ بے چھوئے دھم سے گر پڑتا تھا (فاکہی بتصحیح ابن حبان و بیہقی و طبرانی و ابونعیم)

یہ واقعہ کہ کعبہ کے چاروں طرف تین سو ساٹھ بت تھے اور آپؐ دست مبارک میں چھڑی لے کر ان بتوں کی طرف اشارہ کرتے جاتے اور آیت مذکور تلاوت کرتے جاتے تھے، صحیح بخاری و مسلم باب فتح مکہ میں موجود ہے مگر اس اشارہ سے بے چھوئے بتوں کا گر جانا گر جانا صحیحین میں مذکور نہیں، البتہ فاکہی میں بروایت عمرؓ اور طبرانی، ابن اسحاق اور ابونعیم میں بروایت ابن عباسؓ موجود ہے۔ فاکہی کی روایت کو ابن حبان نے صحیح کہا ہے، صحیح بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الفتح میں جو روایت ہے اس سے ضمناً اس کے خلاف یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپؐ نے ان لوگوں سے لکڑوا

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ خندق، و نسائی کتاب الجہاد، و بیہقی و ابونعیم و ابن سعد و ابن اسحاق و ابن جریر۔
[2] جامع ترمذی ذکر معجزات بروایت حسن۔
[3] صحیح بخاری مناقب ابی بکرؓ۔
[4] صحیح مسلم فضائل حضرت طلحہؓ و زبیرؓ، صحیحین کے علاوہ یہ واقعہ مسند ابن حنبل بروایت بریدہ اور ترمذی، نسائی اور دار قطنی بروایت حضرت عثمانؓ اور ابو یعلیٰ اور بیہقی میں بروایت سہل بن سعد مذکور ہے۔

کر پھینکوا دیا، اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

عن ابن عباس لما قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی ان یدخل البیت وفیہ الالہۃ فامر بہا فاخرجت۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ جب آپ مکہ آئے تو اس حالت میں کہ خانہ کعبہ کے اندر بت تھے آپ نے اس کے اندر جانے سے انکار کیا تو آپ نے ان کے باہر نکال دینے کا حکم دیا تو وہ باہر نکال دیئے گئے۔

اگر فاکہی، طبرانی، ابن اسحاق اور ابونعیم کی روایت بالا صحیح ہو تو اس میں اور بخاری کی اس روایت میں یہ تطبیق ممکن ہے کہ پہلے جن بتوں کا ذکر ہے وہ حول البیت یعنی خانہ کعبہ کے باہر چاروں طرف تھے، آپ ان کی طرف اشارہ کر کے آیت مذکور کو پڑھتے تھے اور وہ گر جاتے تھے اور خانہ کعبہ کے اندر جو بت تھے اپنے اندر جانے سے پہلے آپ نے ان کو نکلوا کر پھینکوا دینے کا حکم دیا تھا، اسی طرح بخاری و مسلم کی فتح مکہ والی روایت میں جن بتوں کو چھڑی سے کونچے دینے کا ذکر ہے وہ، وہ ہیں جو باہر تھے یعنی حول البیت اور جن کے نکلوانے کا ذکر بخاری کی دوسری روایت میں ہے وہ خانہ کعبہ کے اندر تھے۔

کھانوں سے تسبیح کی آواز

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ تم لوگ معجزوں کو خوف کی چیز سمجھتے ہو اور ہم لوگ ان کو برکت سمجھتے تھے، ہم کھانوں سے جب وہ کھائے جاتے تھے تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔[1]

زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا

ایک عیسائی نے اسلام قبول کیا اور سورۂ بقرہ و آل عمران پڑھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کتابت وحی کی خدمت کی، چند دنوں کے بعد وہ مرتد ہو کر بھاگ گیا اور عیسائی ہو گیا۔ اور مشہور کیا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانی دکھائی یعنی اس کو موت دے دی، اس کے دوستوں نے اسے دفن کیا تو صبح کے وقت لاش قبر کے باہر تھی اس کے دوستوں کو معلوم ہوا تو کہنے لگے کہ یہ محمدؐ اور اصحاب محمد کا کام ہے، چونکہ وہ ان سے علیحدہ ہو گیا اس لئے قبر کھود کر اس کو باہر پھینک دیا، اس خیال سے ان لوگوں نے اب کے خوب گہری قبر کھود کر اس میں اس کو دفن کیا، صبح کے وقت پھر مردہ قبر سے باہر تھا، اب ان کا یہ خیال پختہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ یہ مسلمانوں ہی کی حرکت ہے، پھر جس قدر وہ گہری قبر کھود سکتے تھے، کھود کر اس میں اس کو دفن کیا، صبح کو دیکھا تو پھر وہی منظر سامنے تھا، اب ان کو یقین ہوا کہ یہ آدمی کا کام نہیں، چنانچہ اس کو اسی طرح زمین پر چھوڑ دیا۔[2]

درختوں کا چلنا

ایک بار آپؐ سفر میں قضائے حاجت کے لئے نکلے، حضرت جابرؓ پانی لئے ہوئے ساتھ تھے آپؐ نے میدان میں ادھر ادھر دیکھا تو کوئی چیز آڑ کرنے کے لئے نہ ملی، میدان کے کنارے صرف دو درخت تھے، آپؐ ایک درخت کے پاس گئے اور اس کی ایک ڈالی کو پکڑ کر کہا کہ خدا کے حکم سے میری اطاعت کر، وہ فرماں بردار اونٹ کی طرح آپؐ کے ساتھ ہو لیا، پھر دوسرے درخت کے نزدیک تشریف لے گئے اور وہ بھی اسی طرح آپؐ کے ساتھ چل پڑا، پھر آپؐ نے دونوں کو ایک جگہ جمع کیا اور فرمایا کہ خدا کے حکم سے جڑ جاؤ، دونوں باہم مل گئے جب ان کی آڑ میں فراغت کر چکے تو پھر دونوں درخت الگ الگ اپنی جگہ پر آ گئے۔[3]

---

[1] صحیح بخاری باب علامات نبوت [2] بخاری باب علامات نبوت فی الاسلام [3] مسلم حدیث جابر طویل و احمد و دارمی و بیہقی باختلاف یسیر

اسی قسم کا واقعہ دوسرے سفروں میں بھی پیش آیا ہے، چنانچہ صحابہؓ نے اپنی عینی شہادت کی بنا پر اس کو بیان کیا ہے، حضرت اسامہ بن زیدؓ حجۃ الوداع میں اور حضرت یعلی بن مرہؓ نے کسی سفر میں اپنا مشاہدہ بیان کیا ہے۔

ایک اور واقعہ ہے کہ آپؐ ایک روز اہل مکہ کی ایذا رسانی سے نہایت غمگین بیٹھے ہوئے تھے، اسی حالت میں حضرت جبریلؑ آئے اور انہوں نے دریافت کیا تو حضرت جبریلؑ نے کہا یا خود آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی، (روایتیں مختلف ہیں) کہ مجھے ایک ایسی نشانی دکھا جو اس غم کو مجھ سے دور کر دے، حکم ہوا کہ میدان کے کنارے جو ایک درخت ہے آپؐ اس کو بلایئے، آپؐ نے بلایا تو وہ سامنے آکر کھڑا ہو گیا، پھر اس سے واپس جانے کو کہا تو وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا، آپؐ نے فرمایا "اب مجھ کو کوئی غم نہیں"۔

خوشۂ خرما کا چلنا

آپؐ کی خدمت میں ایک بدو آیا اور کہا کہ مجھے یہ کیونکر یقین ہو کہ آپؐ پیغمبر ہیں، آپؐ نے فرمایا اگر میں اس خوشۂ خرما کو بلا لوں تو تم میری نبوت کی شہادت دو گے؟ اس نے کہا ہاں! آپؐ نے خوشۂ خرما کو بلایا اور وہ درخت سے اتر کر آپؐ کے پاس آیا اور پھر آپؐ کے حکم سے واپس چلا گیا، بدو فوراً اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان لے آیا۔

درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا

آپؐ ایک سفر میں تھے کہ ایک بدو آتا ہوا نظر آیا، جب وہ آپؐ کے قریب آگیا تو آپؐ نے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ اس نے جواب دیا، مکان کا ارادہ ہے، پھر آپؐ نے فرمایا "تمہیں نیکی کی حاجت ہے"۔ اس نے کہا وہ نیکی کیا ہے؟ آپؐ نے کلمۂ توحید کی تلقین کی، اس نے کہا اس کی شہادت کون دیتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا "سامنے کا یہ درخت" چنانچہ یہ کہہ کر آپؐ نے وادی کے کنارے سے اس درخت کو بلایا، وہ دوڑتا ہوا آیا اور آپؐ کے سامنے کھڑا ہو گیا، آپؐ نے تین بار اس سے کلمۂ توحید پڑھایا اور اس نے پڑھا، پھر وہ اپنی جگہ پر واپس چلا گیا اور بدو یہ کہہ کر اپنے مکان کو روانہ ہوا کہ اگر میرے اہل و عیال نے بھی اسلام قبول کر لیا تو ان سب کو لے کر آؤں گا ورنہ تنہا آپؐ کے ساتھ قیام کروں گا۔

بے دودھ کی بکری نے دودھ دیا

عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نوخیز چھوکرا تھا، عقبہ بن معیط ایک قریشی کافر تھیں کی بکریاں مکہ میں چرایا کرتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔

۱؎ بزار و ابو یعلی و بیہقی و ابونعیم، حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں اس روایت کی تحسین کی ہے ۲؎ امام احمد بروایت یعلی بن مرہ و ابن شیبہ برجال ثقات ومسلم بروایت جابرؓ ۳؎ سنن ابن ماجہ باب الصبر علی البلاء و مسند احمد عن انس بن مالکؓ و ابن سعد و بزار و بیہقی عن عمر بن الخطاب ۴؎ ترمذی (معجزات نبویؐ) نے اس کو صحیح کہا ہے، امام بخاری نے تاریخ میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور ابو یعلی نے ابن عباسؓ سے اس کی روایت کی ہے ۵؎ مسند دارمی ۶؎ بسند صحیح، بزار و ابونعیم باختلاف یسیر، و ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۱۲ ۷؎ یہ روایت ابو داؤد طیالسی، مسند ابن حنبل، ابن سعد اور دلائل ابی نعیم میں ہے، طیالسی اور ابونعیم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جب مشرکین سے بھاگ گئے تھے تب یہ واقعہ پیش آیا یعنی ہجرت کے ایام میں، طیالسی کی اس روایت کا سلسلۂ سند ہر طرح سے محفوظ ہے، ابو داؤد، حماد بن سلمہ سے اور وہ عاصم ابن بہدلہ سے اور عاصم زر بن حبیش سے اور وہ خود عبداللہ بن مسعود سے اس کی روایت کرتے ہیں، یہ تمام صحابؓ ثقہ اور معتبر ہیں، باایں ہمہ اس واقعہ کو زمانۂ ہجرت میں قرار

آپ نے مجھ سے پوچھا لڑکے! تمہارے پاس دودھ ہے؟ ہم کو پلاؤ گے؟ میں نے کہا میں امین ہوں تم کو نہیں پلا سکتا، آپ نے پوچھا اچھا کوئی بکری کا بچہ ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا لے آؤ۔ حضرت ابوبکرؓ نے بچہ پکڑا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھن میں ہاتھ لگایا اور دعا کی، ابوبکرؓ ایک گہرا پتھر لے آئے اس میں دودھ دوہا گیا پہلے آپ نے خود پیا، پھر حضرت ابوبکرؓ نے پیا، اس کے بعد حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ پھر مجھے پلایا۔ دودھ پی کر آپ نے فرمایا اے تھن سمٹ جا، وہ سمٹ کر خشک ہو گیا، اس کے بعد میں آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی کہ اس عمدہ کلام یعنی قرآن مجید میں سے مجھے کچھ سکھا دیجئے، فرمایا تم سیکھنے والے لڑکے ہو، تو میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ستر سورتیں سیکھیں، جن میں کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہیں کر سکتا، ابن سعد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دینے سے متعدد خرابیاں نظر آتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت میں کسی صاحب سے سہو ہوئی ہے، اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہجرت کے وقت نوخیز لڑکے تھے اور ابھی تک قرآن مجید سے ناواقف تھے بلکہ مسلمان بھی نہ تھے حالانکہ وہ ہجرت سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے وہ پہلے مسلمان تھے اور ہجرت کے وقت وہ حبش میں تھے اور وہاں سے اس وقت لوٹے جب آنحضرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ جا چکے تھے جیسا کہ نماز میں سلام کرنے والی روایت ہے جو حدیث کی تمام کتابوں میں ہے سے ثابت ہوتا ہے اس لئے وہ اس وقت مکہ میں سرے سے موجود ہی نہ تھے، اس روایت کے ان الفاظ کے متعلق میں اپنے یہ شکوک لکھ چکا تھا کہ رجال اور سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا حال الٹ پلٹ کر پڑھا، سب نے ان کے حال میں اس روایت کو نقل کیا ہے مگر ان شبہات پر کسی کی نظر نہیں پڑی، اسی اثنا میں فتح الباری جلد ہجرت اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعینہ یہی اعتراضات حافظ ابن حجر کے ذہن میں بھی گذرے ہیں لیکن انہوں نے حسب دستور مختلف روایات کی تطبیق کے متعلق جو ان کا عام اصول ہے اس سے کام لے کر آگے بڑھ گئے ہیں یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ ہجرت کے علاوہ کسی اور زمانہ کا واقعہ ہو مگر مشکل یہ ہے کہ ہجرت کے علاوہ کوئی اور زمانہ ایسا نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مشرکین سے بھاگے ہوں لیکن الحمد للہ کہ اثنائے تحقیق میں مجھے مسند احمد بن حنبل (جلد ۱ صفحہ ۳۷۹) میں یہی روایت اسی قسم کی سند سے مل گئی ہے جس میں ان قابل اعتراض الفاظ کے بجائے مطلق یہ الفاظ ہیں کہ میں بکریاں چرا رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا گزر ہوا اس میں فرار اور ہجرت کا مطلق ذکر نہیں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہجرت سے بہت پہلے کا کوئی واقعہ ہے، پہلے الفاظ کے راوی عاصم سے ان کے شاگرد حماد بن سلمہ ہیں اور دوسرے الفاظ کے راوی ان ہی کے شاگرد ابوبکر عیاش ہیں، گو حافظہ کی خرابی اور اغلاط کی کثرت میں یہ دونوں برابر ہیں تاہم قرائن وجوہ ابوبکر بن عیاش کی تائید میں ہیں، پہلی روایت میں فرّ (بھاگے) کا لفظ ہے اور دوسری میں مرّ یعنی گزرے کا لفظ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ راویوں میں فرّ اور مرّ کے الفاظ میں باہم تشابہ ہو گیا ہے اور بعد کو پھر فرّ کی مناسبت سے من المشرکین بڑھ گیا ہے، ابن سعد نے بسند حسن (جلد اول صفحہ ۱۰۷) اس واقعہ کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے جس سے تمام مسئلہ صاف ہو جاتا ہے، حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں، میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا، میں گھر کی بکریاں چرا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کسی بکری میں دودھ ہے، میں نے عرض کیا نہیں، آپ نے ایک بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا فوراً دودھ اتر آیا!

تو میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں مانتا۔

کہ میرے اسلام لانے میں اسی معجزہ کو دخل ہے[1]۔

سست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا

ابو طلحہؓ صحابی کا گھوڑا نہایت سست رفتار اور مٹھا تھا، ایک دفعہ مدینہ میں شور و غل ہوا، آپ نے اسی گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگایا، وہ آپ کی سواری کی برکت سے اس قدر تیز رو ہو گیا کہ جب آپ واپس تشریف لائے تو فرمایا یہ تو دریا ہے، اس کے بعد کوئی گھوڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا[2]۔

اندھیرے میں روشنی ہونا

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ دو صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رات کو دیر تک حاضر رہے، جب واپس ہوتے تو رات بہت اندھیری تھی، مگر خدا کی قدرت کہ ان کے سامنے دو چراغوں کی طرح آگے آگے کوئی چیز روشن ہو گئی، جب دونوں الگ ہو کر اپنے اپنے گھر چلے تو ایک چراغ ایک کے ساتھ اور دوسرا دوسرے کے ساتھ ہو گیا، یہاں تک کہ دونوں گھر چلے گئے، یہ صحیح بخاری کی روایت[3] ہے، اس میں ان دونوں صحابیوں کے ناموں کی تصریح نہیں، لیکن حاکم، ابن سعد، بیہقی اور ابو نعیم میں حضرت انسؓ نے ان کے نام عبادؓ بن بشیر اور اُسیدؓ بن حضیر بتائے ہیں اور ان میں یہ اضافہ ہے کہ یہ روشنی اُن کی لکڑیوں کے سروں میں پیدا ہو گئی تھی، ابو نعیم کی ایک دوسری روایت میں جو حضرت انسؓ ہی سے مروی ہے، عبادؓ بن بشیر اور اسیدؓ بن حضیر کے بجائے حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ کے نام ہیں، روایت کی صحت کی صورت میں ممکن ہے کہ دوسرا واقعہ ہو، نیز حاکم، بیہقی اور ابو نعیم میں اسی قسم کا واقعہ ابو عبس ابن جبرؓ صحابی جو ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھا کرتے تھے، ان کو بھی ایک دفعہ پیش آنا بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ بخاری اور بیہقی میں ایک سفر میں اندھیری رات کو حمزۃ الاسلمیؓ کی انگلیوں کا روشن ہو جانا بھی مذکور ہے۔

جانور کا سجدہ کرنا

حدیث کی اکثر کتابوں میں چند الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ روایت مذکور ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری کا اونٹ باؤلا ہو گیا تھا یا بگڑ گیا تھا، لوگوں نے جا کر آپ کو خبر کی، آپ نے اس کے پاس جانا چاہا تو سب نے روکا کہ یا رسول اللہ! یہ آدمی کو کتے کی طرح کاٹ کھاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس کا خوف نہیں یہ کہہ کر آپ آگے بڑھے تو اونٹ نے آپ کے سامنے آکر اپنی گردن ڈال دی، آپ نے اس پر ہاتھ پھیرا اور اس کو پکڑ کر اس کے مالک کے حوالے کر دیا، پھر فرمایا، ہر مخلوق جانتی ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں لیکن گنہگار انسان اور نافرمان جن[4]۔ صحابہ نے یہ منظر دیکھ کر کہا یا رسول اللہ! جب جانور آپ کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو سب سے پہلے کرنا چاہیے، آپ نے فرمایا اگر انسان کا دوسرے انسان کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[5]۔

---

[1] ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۱۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد و باب الرکوب علی الدابۃ الصعبۃ، ۲۳ صفحہ ۴۔ [3] صحیح بخاری باب علامات نبوت۔ [4] دارمی۔

[5] امام احمد بن حنبل نے مسند میں متعدد صحابیوں کی سند سے یہ واقعہ نقل کیا ہے چنانچہ کتاب مذکور میں حضرت جابرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ اور حضرت عائشہؓ کی مسند دیکھو نیز سنن نسائی و ابن ابی شیبہ طبرانی و بیہقی اہل دلائل نے اس ایک واقعہ کو ذرا ذرا سے لفظی اختلاف کے باعث متعدد واقعات بنا دیا ہے (البدایۃ والنہایۃ ج ۶ ص ۱۳۹)۔

جانور کا آپؐ کے مرتبے کو پہچاننا

ایک دفعہ آپؐ ایک انصاری کے باغ میں گئے، ایک اونٹ کھڑا چلا رہا تھا، آپؐ کو دیکھ کر وہ بلبلانے لگا اور اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، آپؐ نے قریب جا کر اس کے سر اور کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہو گیا، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کا اونٹ ہے؟ لوگوں نے ایک انصاری کا نام بتایا، وہ بلوائے گئے تو آپؐ نے فرمایا تم ان جانوروں پر جن کو خدا نے تمہارا محکوم بنایا ہے، رحم کیا کرو، اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس کو تکلیف دیتے ہو۔[1]

حافظہ بڑھ جانا

تمام صحابہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایتیں سب سے زیادہ ہیں، حالانکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صرف تین چار برس رہے تھے، لوگوں کو آج بھی اس پر تعجب ہے اور خود ان کے زمانہ میں بھی تھا، لیکن حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ہمارے مہاجر بھائی تو بیوپار میں لگے رہتے تھے اور انصاری بھائی اپنے کھیتوں میں اور میرا آپؐ کی خدمت میں حاضری کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ایک دن خدمت میں حاضر تھا کہ زبان مبارک سے نکلا کہ جو دامن پھیلا کر اس وقت میری باتیں سینہ میں سمیٹ لے گا وہ پھر کبھی نہ بھولے گا، میں نے دامن پھیلایا، جب کلام مبارک ختم ہوا، سینہ میں سمیٹ لیا، اس وقت سے کوئی بات نہ بھولا۔[2]

صحیح بخاری میں یہی واقعہ ایک اور طرح سے بھی مذکور ہے چنانچہ وہ آگے آئے گا۔

*

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب الشفقة علی البہائم صفحہ ۳۴۳ ج ۲ و مسند احمد بسند عبداللہ بن جعفر و مسلم بسند مصری بن میمون البدایہ صفحہ ۲۰ ابونعیم وغیرہ میں اسی واقعہ میں؛ مستند باغین شامل ہیں۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم مناقب ابوہریرہؓ۔

شفائے امراض

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ،

پیغمبر دنیا میں درحقیقت بیمار دلوں کے روحانی طبیب بن کر آتے ہیں، مگر کبھی کبھی ارواح و قلوب کے معالجہ میں اُن کو جسمانی امراض و عوارض کا علاج بھی کرنا پڑتا ہے، تمام انبیاء میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی اس وصف میں سب سے ممتاز ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس قسم کے معجزات کا وافر حصہ ملا۔

حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہو جانا

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت سلمہؓ بن اکوع اور حضرت سہیلؓ بن سعد تین چشم دید گواہوں سے روایت ہے کہ غزوۂ خیبر میں جب آپؐ نے علم عطا فرمانے کے لیے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو طلب فرمایا تو معلوم ہوا کہ ان کی آنکھوں میں آشوب چشم ہے اور یہ آشوب جیسا کہ مسند ابن حنبل میں ہے ایسا سخت تھا کہ ایک صاحب (سلمہؓ بن اکوع) ان کا ہاتھ پکڑ کر لاتے تھے، آپؐ نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن مل دیا اور دم کر دیا، وہ اسی وقت اچھی ہو گئیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی درد تھا ہی نہیں[1]۔

ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہونا

حضرت عبداللہؓ بن عتیک قلعہ میں داخل ہو کر جب ابورافع یہودی کو قتل کر کے واپس آنے لگے تو کوٹھے کے زینہ سے گر پڑے جس سے ان کی ایک ٹانگ میں سخت چوٹ آئی پہلے پہل تو یہ چوٹ معلوم نہیں ہوئی، لیکن بعد کو یہ حالت ہوئی جیسا کہ ابن اسحاق میں ہے کہ ان کے ہمراہی اٹھا کر ان کو لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر واقعہ بیان کیا، آپؐ نے اس ٹانگ پر دست مبارک سے مسح کر دیا اور فوراً بالکل اچھی ہو گئی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ کبھی چوٹ لگی ہی نہ تھی[2]۔

تلوار کے زخم کا اچھا ہونا

غزوۂ خیبر میں حضرت سلمہؓ بن اکوع کی ٹانگ میں تلوار کا زخم لگ گیا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپؐ نے اس پر تین مرتبہ دم کر دیا، پھر انہیں کوئی شکایت محسوس نہیں ہوئی صرف نشان رہ گیا تھا[3]۔

غزوۂ حنین میں حضرت خالدؓ بن ولید کے پاؤں میں زخم تھے، جب لڑائی ختم ہو چکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا آپؐ حضرت خالدؓ کی فرودگاہ پوچھتے ہوئے اُن کے پاس آئے، دیکھا کہ کجاوہ سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں، آپؐ نے ان کے زخم پر ایک نگاہ ڈالی اور اس پر لعاب دہن ڈال دیا، زخم اچھا ہو گیا[4]۔

---

[1] صحیح بخاری باب غزوۂ خیبر و مناقب علی کتاب الجہاد و صحیح مسلم باب فضائل علی و مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۵۱، سہیل بن سعد اور سلمہ بن اکوع کی روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے اور حضرت سعدؓ کی روایت صرف مسلم میں ہے۔

[2] بخاری باب قتل ابی رافع میں یہ واقعہ دو طرح بیان ہوا ہے ان دونوں میں تطبیق کر دی گئی ہے۔

[3] صحیح بخاری باب غزوۂ خیبر و مسند ابن حنبل ج ۴ حدیث سلمہ بن اکوع۔

[4] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۸۸ عبدالرزاق و عبد بن حمید و ابن عساکر۔

اندھے کا اچھا ہونا

آپ کی خدمت میں ایک اندھا حاضر ہوا اور اپنی تکلیفیں بیان کیں، آپ نے فرمایا، اگر چاہو تو دعا کر دوں اور اگر چاہو تو صبر کرو اور یہ تمہارے لئے اچھا ہے، عرض کی دعا کیجئے، فرمایا، اچھی طرح وضو کر کے یہ دعا مانگو کہ خداوندا! اپنی رحمت والے پیغمبر کے وسیلہ سے میری حاجت پوری کر دے۔ ترمذی[1] اور حاکم[2] کی ایک روایت میں اسی قدر ہے مگر ابن حنبل[3] اور حاکم[4] کی دوسری روایت میں اس کے بعد ہے کہ اس نے ایسا کیا تو فوراً اچھا ہو گیا، حاکم[5] کی ایک اور روایت میں جو علیٰ شرط البخاری ہے یہ واقعہ ان الفاظ میں منقول ہے، حضرت عثمانؓ بن حنیف صحابی کہتے ہیں کہ ایک نابینا صحابی آپ کے پاس حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ یا رسول اللہ! میری خدمت کے لئے کوئی آدمی نہیں، مجھے سخت تکلیف ہے، فرمایا، وضو خانہ میں جا کر وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو اس کے بعد یہ دعا مانگو۔ عثمان بن حنیف کہتے ہیں کہ ابھی ہم مجلس سے الگ بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ کچھ زیادہ بات کرنے پائے تھے کہ وہ نابینا واپس آیا تو ایسا معلوم ہوا کہ اس کو نابینائی کی بیماری کبھی تھی ہی نہیں۔

حبیبؓ بن فدیک ایک اور نابینا صحابی کے اچھے ہونے کا واقعہ ابن ابی شیبہ، طبرانی، بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے[6] مگر چونکہ اس کے سلسلۂ سند میں مجہول الاسم اشخاص ہیں اس لئے اس کو قلم انداز کر دیا ہے۔

بلا دور ہونا

آپ ایک سفر میں جا رہے تھے، راستہ میں ایک عورت بچہ کو لئے ہوئے سامنے آئی اور کہا کہ یا رسول اللہ! اس کو دن میں کئی دفعہ کسی بلا کا دورہ ہوتا ہے، آپ نے بچہ کو اٹھا کر کجاوہ کے سامنے رکھا اور تین بار کہا کہ اے خدا کے دشمن نکل میں خدا کا رسول ہوں، پھر لڑکے کو اس عورت کے حوالے کر دیا، سفر سے پلٹے تو وہ عورت دو دنبے لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! میرا ہدیہ قبول فرمایئے، خدا کی قسم پھر بچے کے پاس وہ بلا نہ آئی، آپ نے ایک دنبہ قبول فرما لیا اور دوسرے کو واپس کر دیا۔[7]

گونگے کا بولنا

حجۃ الوداع میں آپ کی خدمت میں ایک عورت اپنے بچہ کو لے کر حاضر ہوئی اور عرض کی کہ یہ بولتا نہیں، آپ نے پانی منگایا، ہاتھ دھویا اور کلی کی اور فرمایا کہ یہ پانی اس کو پلا دو اور کچھ اس کے اوپر چھڑک دو، دوسرے سال وہ عورت آئی تو بیان کیا کہ لڑکا بالکل اچھا ہو گیا اور بولنے لگا۔[8]

مرض نسیان کا دور ہونا

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے آ کر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! قرآن یاد کرتا ہوں تو بھول جاتا ہوں، آپ نے فرمایا، اس طرح نماز پڑھ کر یہ دعا مانگو، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کیا اور فائدہ ہوا، اور جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ پہلے چار چار آیتیں یاد کرتا تھا اور اب چالیس چالیس

---

[1] ترمذی کتاب الدعوات [2] مستدرک ج ۱ ص ۵۱۹ [3] مسند ج ۴ ص ۱۳۸ [4] مستدرک ج ۱ ص ۵۲۶ [5] ایضاً [6] دلائل ابی نعیم ص ۱۶۶ و اصابہ تذکرہ حبیبؓ بن فدیک [7] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۱۷۱ میں دو مختلف راویوں سے حضرت یعلیٰ بن مرہ سے یہ واقعہ مذکور ہے، علاوہ ازیں ابن ابی شیبہ اور حاکم میں بھی یہ منقول ہے، دارمی ص ۱۲ میں یہ واقعہ حضرت جابرؓ سے جس سلسلۂ سند سے مذکور ہے وہ مستند نہیں، بزار، دارمی اور ابونعیم میں اسی قسم کا ایک اور واقعہ یعنی ایک جن کا ایک بچہ پر مسلط ہونا اور آپ کے اثر سے ایک کتے کے پلّے کی شکل میں نکل کر بھاگنا، حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے وہ بھی صحیح نہیں [8] سنن ابن ماجہ باب النشرۃ و ابونعیم ص ۱۶۵ و ابن ابی شیبہ۔

اُنہیں یاد کرلیتا ہوں، پہلے بات بھول جاتا تھا اور اب حرف حرف یاد رہتا ہے۔[1]

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کو آپ نے طائف کا عامل مقرر فرمایا، انہوں نے وہاں سے آکر بیان کیا کہ یارسول اللہ! مجھے یہ مرض پیدا ہوگیا ہے کہ نماز میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا پڑھتا ہوں؟ آپ نے پاس بلا کر اُن کے سینہ پر ہاتھ مارا اور منہ میں دم کیا، پھر یہ حالت بالکل زائل ہوگئی۔[2]

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ نے بھی ایک دفعہ حافظہ کی شکایت کی تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ دامن پھیلاؤ، انہوں نے پھیلایا، آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا، پھر فرمایا کہ اب اس کو سمیٹ لو، حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا، تب سے پھر میں کوئی بات نہ بھولتا۔[3]

بیمار کا تندرست ہونا

حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دفعہ سخت بیمار ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو فرمایا کہ یہ دعا سات مرتبہ پڑھو اور ہاتھ ملتے پھیرو، حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو خدا نے میری بیماری دور کر دی اور اب میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی یہ دعا بتایا کرتا ہوں۔[4]

ایک بار حضرت علیؓ اس قدر بیمار ہوئے کہ موت کی دعا کرنے لگے، آپ کا گزر ہوا تو ان کو اس پر تنبیہ کی اور دعا فرمائی، پھر ان کو اس مرض کی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔[5][6]

ایک جلے ہوئے بچہ کا اچھا ہونا

محمد بن حاطب ایک صحابی ہیں وہ جب بچے تھے تو اپنی ماں کی گود سے گر کر آگ میں گر پڑے اور کچھ جل گئے، ان کی ماں ان کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں، آپ نے اپنا لعاب دہن اُن پر ملا اور دُعا پڑھ کر دم کیا، طیالسی اور ابن حنبل میں اسی قدر ہے، مگر امام بخاری نے تاریخ میں بہ سند بیان کیا ہے کہ محمدؓ بن حاطب کی ماں کہتی تھیں کہ بچہ کو لے کر میں وہاں سے اٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ بچہ کا زخم چنگا ہوگیا۔[7]

جنون دور ہونا

ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یارسول اللہ! میرا بھائی بیمار ہے، دعا کیجئے، پوچھا کیا بیماری ہے؟ عرض کی اس پر جنون کا اثر ہے، فرمایا اس کو لے آؤ، وہ آیا تو آپ نے قرآن مجید کی متعدد سورتیں پڑھ کر جھاڑ دیا، وہ کھڑا ہوا تو اس پر جنون کا کوئی اثر نہ تھا۔[8]

*

---

[1] جامع ترمذی ابواب الدعوات و مستدرک حاکم ج ۱ ص ۳۱۲ ذہبی نے جرأت و سند کے باوجود اس روایت میں کلام کیا ہے۔ [2] سنن ابن ماجہ باب الفزع والارق۔ [3] صحیح بخاری باب علامات نبوت۔ [4] جامع ترمذی کتاب الطب۔ [5] جامع ترمذی ابواب الدعوات بروایت حسن و صحیح حاکم فی المستدرک۔ [6] مسند ج ۱ و طیالسی ص ۱۶۵ مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۵۹ تاریخ بخاری کی روایت ابن عبدالبر نے بہ سند استیعاب در ترجمہ محمد بن حاطب میں اور سیوطی نے خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۶۹ میں نقل کی ہے۔ [7] سنن ابن ماجہ باب الفزع والارق، اس روایت کے سلسلہ سند میں ابو جناب ایک راوی ہیں جن پر تدلیس کا الزام ہے مگر اس روایت میں تدلیس کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا ۱۲ اعظمی۔

استجابتِ دُعا

منجملہ دیگر علامتوں کے اللہ کی بارگاہ میں دعاؤں کا قبول ہونا بھی ایک بڑی علامت ہے جس سے نیک اور مقبول بندوں کی پہچان اور شناخت ہوتی ہے، انبیائے الٰہی سے بڑھ کر خدا کے نیک اور مقبول بندے اور کون ہو سکتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو شرف اجابت بخشتا ہے اور ان کی نداؤں کو جو دل کے اندر سے نکلتی ہیں سمع قبول سے سنتا ہے، حضرت آدمؑ نے ندامت کے ساتھ خدا کو پکارا تو اس نے اُن کو معاف کر دیا، حضرت نوحؑ نے طوفانی عذاب کی درخواست کی تو پوری ہوئی، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کے لئے نبوت اور برکت کی دعا کی تو قبول ہوئی، حضرت یونسؑ نے سمندر کی تہ میں سے خدا کو پکارا تو اس نے سُنا، حضرت زکریاؑ نے خانوادۂ نبوت کے لئے ایک وارث مانگا تو دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بارگاہِ الٰہی میں دعائیں مانگیں، حاجت کی منزلوں میں اُس کے آگے ہاتھ پھیلائے، تنہائیوں میں اس کی رفاقت چاہی، بے کسیوں میں اس کی نصرت مانگی، فقر و فاقہ میں اس سے خزانۂ غیب کی مدد طلب کی، حق کی اشاعت میں اس کی اعانت کی درخواست کی، نیک بندوں کے حق میں اپنے آپ کو اس کے سامنے شفیع بنایا، شریروں کے دفع شر کے لئے اس کی غیبی امداد کا سہارا ڈھونڈا اور ان میں سے ہر موقع پر آپ کے لئے قبول و اجابت کا دروازہ کھول دیا گیا۔

مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ جب کبھی کسی کے حق میں دُعا فرماتے تھے تو وہ نہ صرف اسی کے بلکہ اس کی اولاد در اولاد کے حق میں مستجاب ہوتی تھی۔[1] صحیح مسلم میں ہے کہ جب کسی کے متعلق آپؐ رحمہ اللہ یعنی خدا اس پر رحمت کرے فرماتے تھے تو صحابہ سمجھ جاتے تھے کہ اس کو شہادت نصیب ہوگی،[2] چنانچہ ایسا ہی ہوتا تھا یہاں تک کہ وہ بھی جو آپ کی دعوتِ حق کے سخت منکر تھے، اس امر کا دل سے یقین رکھتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں حیرت ناک تاثیر ہے، مکہ میں جب قحط پڑا تو ابوسفیان نے بھی بحالتِ کفر اسی آستانہ پر حاضر ہو کر دعائے رحمت کی درخواست کی۔[3] ابوجہل وغیرہ رؤسائے قریش کے حق میں جو آپ کی نماز میں خلل انداز ہوتے تھے، جب آپؐ نے بددُعا کی تو وہ خوف سے کانپ اٹھے،[4] یہ واقعات بتفصیل پہلے گزر چکے ہیں، اس لئے یہاں موضوعِ سخن کی تقریب سے اختصار پر اکتفا کی جاتی ہے۔

قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا

قریش نے جب اسلام کی سخت مخالفت کی، تو خدا نے ان پر قحط کا عذاب بھیجا اور وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہوئے، بالآخر سوا اس کے کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ اسی رحمتِ عالم کی بارگاہ کی طرف رجوع کریں، قریش کے بعض رئیسوں نے خدمت نبوی میں جا کر عرض کی کہ اے محمدؐ!

---

[1] مسند احمد بروایت حضرت حذیفہؓ [2] صحیح مسلم باب غزوہ خیبر [3] صحیح بخاری و صحیح مسلم تفسیر سورۂ دخان وغیرہ [4] صحیح بخاری آخر کتاب الوضوء و مسلم باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اذی المشرکین۔

تمہاری قوم برباد ہو گئی، خدا سے دعا کرو کہ وہ اس مصیبت سے اس کو نجات دے، رحمتِ عالمؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، دعا قبول ہوئی، خوب پانی برسا اور اہل مکہ کو قحط کے عذاب سے نجات ملی[1]۔

رؤسائے قریش کے حق میں بددعا

آپ ایک دفعہ صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے کہ بعض رؤسائے قریش نے عین حالتِ نماز میں آپ کی گردن مبارک پر نجاست ڈال دی، حضرت فاطمہؓ نے آکر جب یہ نجاست ہٹائی تو آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو نام بنام دعا مانگی کہ خداوندا! ان کو تو پکڑ۔ چنانچہ سب کے سب بدر کی لڑائی میں مارے گئے[2]۔

حضرت عمرؓ کا اسلام

ایک طرف قریش کے سربرآوردہ اصحاب، اسلام اور داعیِ اسلام کی عداوت اور دشمنی کی کوششوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف داعیِ اسلام ان کی ہدایت و رہنمائی کے پُرمحبت ولولوں سے معمور تھا، ابوجہل و عمرؓ یہ دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت اور مستقل تھے، اُن ہی کی ہدایت کا پُرشوق ارمان آپ کے قلب مبارک میں سب سے زیادہ تھا، جب تبلیغ و دعوت کے دوسرے حیلے ان پر کامیاب نہ ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سب سے کارگر حربہ کو ان کے مقابلہ میں استعمال کیا جس کے وار کی کوئی روک نہیں ہو سکتی تھی، آپ نے دعا فرمائی کہ خداوندا! ابوجہل یا عمرؓ میں جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو اس سے اسلام کو معزز کر[3]۔ ابن ماجہ اور حاکم میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا تھا، اس دعا کو ابھی چند روز بھی نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمرؓ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، کارسازِ قدرت نے اس دعا کے قبول و تاثیر کا سامان کیونکر پیدا کیا؟ روایتوں میں اس کی تفصیل میں کچھ اختلاف ہے، استاد مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ جس طرح لکھا ہے وہ حرف حرف الفاروق کی نقل ہے، اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے سن کر جو سورہ پڑھی اور جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے وہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ یعنی سورۂ حدید تھی، اس میں شک نہیں کہ بزار، طبرانی، بیہقی اور ابو نعیم میں یہ روایت بھی ہے لیکن صدر درجہ کمزور ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کا اسلام مکہ کا واقعہ ہے اور سورۂ حدید مدنی ہے، اس کو حضرت عمرؓ کیوں کر اس وقت پڑھ سکتے تھے، استاد مرحوم نے الفاروق میں واقعہ کتب رجال و تاریخ کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن حدیث و سیر کی صحیح روایتوں میں یہ واقعہ دو صورتوں سے مذکور ہوا ہے، ایک تو وہی مشہور صورت ہے کہ حضرت عمرؓ تلوار کمر سے لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادہ سے نکلے تھے کہ راہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہو گئی اُس نے حضرت عمرؓ کے ارادہ کا حال سُن کر کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمہاری بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل

---

[1] صحیح بخاری تفسیر سورۂ دخان و صلوٰۃ استسقاء۔ [2] صحیح بخاری غزوۂ بدر۔ [3] جامع ترمذی مناقب عمرؓ بروایت ابن عمرؓ حدیث حسن غریب، ترمذی کے اسی باب میں اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے، اس میں اس قدر اضافہ ہے کہ اس دعا کے دوسرے ہی دن حضرت عمرؓ مسلمان ہو گئے، مگر اس روایت میں ایک راوی قابل اعتراض ہے، ترمذی کے علاوہ یہ روایت ابن سعد میں تین مختلف سلسلوں میں بسند حسن مذکور ہے، ج ۳ حصہ اول صفحہ ۱۹۱، حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں ترجمۂ عمرؓ میں لکھا ہے کہ یہ روایت مسند ابو یعلیٰ و طبقات ابن جمیع وغیرہ میں بھی ہے۔ [4] خصائص سیوطی میں ہے کہ یہ روایت حاکم، طبرانی، ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں بھی ہے۔

ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ غصہ میں اپنی بہن کے گھر گئے اور مار پیٹ کی، بالآخر انہوں نے قرآن کی ایک سورہ بہن سے لے کر پڑھی، اور وہ سورۂ طٰہٰ تھی اور جب اس آیت پر پہنچے،

إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ)
میں ہوں خدا، کوئی خدا نہیں لیکن میں، تو مجھ کو پوجو اور میری یاد کے لئے نماز کھڑی کرو۔

تو یہ اثر ہوا کہ دل سے لا الٰہ الا اللہ پکار اٹھے اور در اقدس پر حاضری کی درخواست کی، یہ روایت بسند[1] ابن سعد، ابو یعلیٰ، دار قطنی، حاکم اور بیہقی میں حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے لیکن یہ حد درجہ کمزور ہے، یہ دو طریقوں سے مروی ہے اور ان دونوں میں ایسے رواۃ ہیں جو قبول کے لائق نہیں اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے،

دوسری روایت مسند[2] ابن حنبل میں خود حضرت عمرؓ سے ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شب میں آنحضرتؐ کے چھیڑنے کو نکلا، آپ بڑھ کر مسجد حرام میں داخل ہو گئے اور نماز شروع کر دی، اس وقت آپؐ نے سورۃ الحاقہ تلاوت فرمائی، میں کھڑا سنتا رہا اور قرآن کے نظم اور اسلوب سے حیرت میں تھا، دل میں کہا خدا کی قسم یہ شاعر ہے، جیسا قریش کہا کرتے ہیں، ابھی یہ خیال تھا ہی کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ
قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ (الحاقہ-۲)
یہ ایک بزرگ قاصد کا کلام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں تم بہت کم ایمان رکھتے ہو۔

میں نے کہا یہ تو کاہن ہے، میرے دل کی بات جان گیا کہ اس کے بعد ہی یہ آیت پڑھی۔

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ، تَنزِيلٌ
مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ (الحاقہ-۲)
یہ کاہن کا کلام بھی نہیں، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو، یہ تو جہانوں کے پروردگار کی طرف سے اترا ہے۔

---

[1] طبع اول میں ہم نے اس واقعہ کو لکھا تھا کہ "بسند صحیح" مذکور ہے مگر تحقیق سے یہ واقعہ اس مرتبہ "صحیح" کا نہیں ثابت ہوا؛ دار قطنی نے اس روایت کو منفرداً لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں (باب استماع القرآن)، ذہبی نے مستدرک حاکم (جلد ۴ صفحہ ۵۹) کے استدراک میں لکھا ہے کہ یہ روایت واہی اور منقطع ہے اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان بصری کے حال میں جو اس روایت کا ایک راوی ہے لکھا ہے، اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا پورا قصہ بیان کیا ہے وھی منکرۃ جداً، اور وہ نہایت ہی منکر ہے، کنز العمال (فضائل عمرؓ بن الخطاب) میں بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں کے مشترک راوی اسحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان اور اسحاق بن ابراہیم الحسنی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں اور یہ سب پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں لیکن بایں ہمہ کہ یہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے نہایت کمزور ہے تاہم اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان میں سے متعدد ٹکڑوں کی صحیح روایتوں سے تائید ملتی ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کا اپنی بہن اور بہنوئی کو ان کے مسلمان ہو جانے پر آزار دینا (بخاری اسلام سعید بن زید) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمرؓ کے اسلام کے لئے دعائے خیر کرنا (ترمذی و حاکم) اور متعدد طریقوں سے ایک واقعہ کا ذکر ہونا، گو وہ سب ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کچھ نہ کچھ اصلیت کا پتہ دیتا ہے، اس لئے ہم نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے۔

[2] جلد اول ص ۱۷، اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن ابتدائی راوی کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں اس لئے اس میں انقطاع ہے لیکن حضرت عمرؓ کے اسلام کے بارہ میں سب سے محفوظ روایت یہی ہے۔

آپ نے یہ سورہ آخر تک پڑھی اور اس کو سن کر اسلام میرے دل میں پوری طرح گھر کر گیا۔

ابن اسحاق نے ان دونوں روایتوں کو بہت کچھ گھٹا بڑھا کر بغیر کسی سند کے اپنی سیرت میں لکھا ہے اس لئے وہ اس باب میں سند کے قابل نہیں، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں یہ دونوں روایتیں لکھ کر چھوڑ دی ہیں اور یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ان دونوں واقعوں میں سے مرجح کون ہے؟ اور اگر دونوں قابل قبول ہیں تو ان کی ترتیب کیا ہے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اگر یہ دونوں واقعے صحیح ہیں تو ان کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے حضرت عمرؓ نے آپ کو نماز میں سورۂ الحاقہ پڑھتے سنا اور اس سے ان کو اسلام کی طرف میلان ہوا جیسا کہ ان کے اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوقع الاسلام فی قلبی کل موقع یعنی اسلام میرے دل میں پوری طرح بیٹھ گیا۔ تاہم چونکہ وہ طبعاً مستقل اور پختہ کار تھے اس لئے اپنے اسلام کا انہوں نے اعلان نہیں کیا بلکہ اس اثر کو وہ شاید رد کرتے رہے، لیکن اس کے بعد جب ان کی بہن کا واقعہ پیش آیا اور سورۂ طٰہٰ پر نظر پڑی تو پھر دل پر قابو نہ رہا اور جوش حق کا چشمہ ان کی زبان و دل سے بے اختیار ابل پڑا اور فوراً در اقدس پر حاضری کی درخواست پیش کی، حضرت انسؓ کی اس روایت میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اپنا یہ شوق ظاہر کیا، حضرت خبابؓ جو حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو سورۂ مذکور کی تعلیم دے رہے تھے اور حضرت عمرؓ کی آواز سن کر گھر میں چھپ گئے تھے[1] بے تامل نکل کر سامنے آ گئے، اور بشارت دی کہ اے عمر! تو یہ مژدہ کہ جمعرات کی رات کو تمہارے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا کی تھی شاید اس کے پورے ہونے کا دن آ گیا حضورؐ نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا! عمر بن خطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) سے اسلام کو عزت دے۔

غور کرو کہ یہ دعائے نبوی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی، نہ صرف یہ کہ حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا بلکہ ان کی ذات سے اسلام کو وہ عزت نصیب ہوئی کہ جس کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی دنیا کو اعتراف ہے عبداللہ بن مسعودؓ گواہی دیتے ہیں کہ: مَا زِلْنَا اَعِزَّةً مُنْذُ اَسْلَمَ عُمَرُ حضرت عمرؓ جب اسلام لائے ہم مسلمانوں کو عزت اور قوت حاصل ہو گئی[2]۔ اسلام کی اس عزت کو اگر چہ سوانح فاروقی کے کارناموں میں تلاش کرو تو دعائے نبوی کے قبول و اجابت کا پر حیرت سماں نگاہوں کے سامنے گزر جائے گا۔

سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں کا دھنس جانا

جب آپ ہجرت کی غرض سے مدینہ کو روانہ ہوئے تو کفار کے جاسوسوں میں سراقہ نے آپ کا پیچھا کیا اور آپ سے اس قدر قریب آ گیا کہ حضرت ابوبکرؓ گھبرا گئے بول اٹھے کہ "ہم آ لئے گئے" آپ نے ان کی دلدہی کی اور دعا فرمائی جس کے اثر سے اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے، سراقہ نے یہ حالت دیکھ کر کہا کہ تم دونوں نے مجھے بددعا دی، اب دعا کرو تو میں تمام لوگوں کو تمہارے تعاقب سے واپس لے جاؤں، آپ نے اس کے لئے دعا فرمائی اور اس نے اس مصیبت سے نجات پائی، وہاں سے واپس آیا تو تمام تعاقب کرنے والوں کو واپس لے گیا[3]۔

مدینہ کی آب و ہوا کے لئے دعا

مدینہ کی آب و ہوا اچھی نہ تھی، وبا کا بھی اثر تھا، اکثر مہاجرین یہاں آ کر بیمار پڑ گئے، اس حالت میں لوگوں کو بار بار اپنا

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب اسلام عمرؓ۔ [2] ایضاً [3] بخاری باب علامات نبوت۔

وطن مکہ یاد آنے لگا۔[1] یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ الٰہی مدینہ کو بھی ہمارے لئے ویسا ہی محبوب کر دے جیسا کہ ہم کو مکہ محبوب ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے، الٰہی ہمارے صاع اور مد میں برکت دے اور اس کو ہمارے لئے صحت بخش بنا دے اور یہاں کا بخار جحفہ میں منتقل کر دے۔[2] یہ دعا حرف بحرف قبول ہوئی، مہاجرین کو اس شہر سے جو محبت ہو گئی وہ ان کی زندگی کے واقعات سے ظاہر ہے، وہی ابوبکرؓ و بلالؓ جو چند روز پہلے یہاں سے گھبرا اٹھے تھے اس کے ایسے والہ و شیدا ہوئے کہ پھر مکہ کا نام بھی نہیں لیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں سے وبا کا دور ہونا خواب میں دکھایا گیا۔[3]

قحط کا دور ہونا اور پانی کا برسنا

ہجرت سے پہلے مکہ میں جب قحط پڑا تھا تو مسلمانوں نے نہیں کافروں نے جا کر آپ سے درخواست کی کہ دعا کیجئے، آپ نے دعا فرمائی تو پانی برسا۔[4] حضرت ابو طالب عم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید اسی منظر کو دیکھ کر آپ کی مدح میں یہ شعر کہا تھا۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه ثمال الیتامی عصمة للارامل

وہ گورے رنگ والا ہے اس کے چہرہ کے وسیلہ سے ابر باراں کی سیرابی مانگی جاتی ہے یتیموں کی جائے پناہ اور بیواؤں کا بچاؤ ہے

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آپ جب پانی برسنے کی دعا مانگتے تو میں آپ کے چہرہ مبارک کو تکتا رہتا اور ابو طالب کا یہ شعر یاد آتا، آپ دعا مانگ کر منبر سے اترنے بھی نہیں پاتے تھے کہ مدینہ کا ہر پرنالہ زور و شور سے بہنے لگتا۔[5] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے متعدد واقعے حضرت ابن عمرؓ کے سامنے گزرے تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں جب قحط پڑا تو حضرت عمرؓ نے دعا مانگی کہ خداوندا! ہم اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کو وسیلہ بنا کر تیرے سامنے پیش کرتے تھے تو تو ہم کو سیراب کرتا تھا۔[6]

ایک دفعہ مدینہ میں خشک سالی ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو لے کر نکلے اور کھڑے ہو کر بارگاہ الٰہی میں دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر دعا مانگی پھر قبلہ رخ ہو کر چادر الٹی اور دو رکعت نماز پڑھی، ابر آیا، پانی برسا اور لوگ سیراب ہوئے۔[7]

دعائے نبوی سے پانی برسنے کا سب سے حیرت انگیز لیکن مستند تر واقعہ حسب ذیل ہے جو متعدد طریقوں اور سلسلوں سے احادیث میں مذکور ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایک بار مدینہ اور اطراف مدینہ میں قحط پڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ اسی حالت میں ایک شخص نے کہا، یا رسول اللہ! مویشی ہلاک ہو گئے، لوگ بھوکوں مر گئے، خدا سے دعا فرمایئے کہ ہم کو سیراب کرے، آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے، یہ اثر ہوا کہ پہلے تو آسمان آئینہ کی طرح صاف تھا اور اب ایک آندھی چلی، بادل امنڈ آئے اور آسمان کا دہانہ کھل گیا، لوگ مسجد سے نکلے تو پانی میں بھیگتے ہوئے مکان تک پہنچے، ایک ہفتہ تک مسلسل پانی برستا رہا یہاں تک کہ لوگ گھبرا اٹھے اور

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح مسلم باب الترغیب فی سکنی المدینۃ و باب صیانۃ المدینۃ۔ [2] ایضاً۔ [3] صحیح بخاری کتاب الرؤیا و تعبیر۔ [4] صحیح بخاری باب الاستسقاء۔ [5] صحیح بخاری و ابن ماجہ ابواب الاستسقاء۔ [6] صحیح بخاری ابواب الاستسقاء۔

[7] بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ ابواب الاستسقاء۔

دوسرے جمعہ کو اسی آدمی نے یا کسی اور نے کہا یا رسول اللہ! مکانات گر گئے۔ دعا کیجئے کہ خدا پانی کو روک لے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور دعا فرمائی، بادل پھٹ گئے اور مدینہ تاج کی طرح چمک اٹھا[1]

ابن ماجہ باب الاستسقاء میں اس قسم کے دو واقعے اور لکھے ہیں، اگر وہ اس واقعہ سے الگ ہیں تو اس قسم کے دو واقعوں کا اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

حضرت انسؓ کے حق میں دعائے برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ ان کو چادر میں لپیٹ کر لائیں اور آپ کی خدمت میں بطور خادم کے پیش کیا اور ان کے لئے دعا کی درخواست کی، آپ نے ترقی مال و اولاد کی دعا دی، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ آج اسی دعا کی برکت سے میرے پاس بہ کثرت دولت ہے اور میرے لڑکوں اور پوتوں کی تعداد سو کے قریب پہنچ گئی ہے[3] اس دعا کا یہ اثر تھا کہ حضرت انس بن مالک کا باغ تھا جو سال میں دو بار پھل لاتا تھا اور اس میں ایک پھول کا درخت تھا، جس سے مشک کی بو آتی تھی[4]

حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعائے علم

ایک بار آپ قضائے حاجت کے لئے گئے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے پہلے ہی سے وضو کا پانی بھر کے رکھ دیا، آپ نے ان کو تفقہ فی الدین کی دعا دی[5]، چنانچہ ان کو یہ درجہ حاصل ہوا کہ انہوں نے "حبر الامۃ" کا خطاب پایا۔

حضرت ام حرامؓ کے حق میں دعائے شہادت

ایک روز آپ ام حرامؓ کے مکان پر تشریف لے گئے انہوں نے آپ کو کھانا کھلایا، اور سر سے جوئیں نکالنے لگیں، اسی حالت میں آپ کو نیند آ گئی، پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، تو ام حرامؓ نے ہنسی کی وجہ پوچھی، آپ نے فرمایا، میری امت میں سے مجاہدین کا ایک گروہ میرے سامنے پیش کیا گیا جو لغرض جہاد دریا میں اس طرح سوار ہو کر چلے گا جس طرح تخت پر بادشاہ، ام حرامؓ نے درخواست کی کہ خدا سے دعا فرمائیے کہ میں بھی انہی میں سے ہوں، چنانچہ آپ نے دعا فرمائی اور امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ان کو بحری جنگ کا شرف حاصل ہوا اور دریا سے نکل کر خشکی میں آئیں تو سواری سے گر کر درجہ شہادت حاصل کیا[6]

ایک نوجوان کی ہدایت کے لئے دعا

حضرت ابو امامہ باہلیؓ صحابی بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن اصحاب کے حلقہ میں تشریف فرما تھے، ایک نوجوان نے آ کر کہا کہ یا رسول اللہ مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ یہ سن کر چاروں طرف سے اس پر لوگوں نے ملامت شروع کی، آپ نے روکا، پھر اس نوجوان کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور دلدہی سے پوچھا کہ تم اس فعل کو اپنی ماں کے لئے پسند کرو گے؟ عرض کی آپ پر قربان نہیں یا رسول اللہ! فرمایا تو اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے نہیں پسند کریں گے، تو کیا تم اپنی بیٹی کے لئے یہ پسند کرو گے؟ عرض کی نہیں یا رسول اللہ! فرمایا تو اور لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے لئے اس کو پسند نہ کریں گے، تو کیا اپنی بہن کے لئے یہ پسند

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ و ابواب الاستسقاء۔ صحیح مسلم باب صلوٰۃ الاستسقاء۔ [2] طرق متعددہ۔ [3] مسلم فضائل انس بن مالکؓ [4] ترمذی مناقب انس [5] مسلم فضائل عبداللہ بن عباسؓ [6] بخاری کتاب الجہاد۔

کروگے؟ گزارش کی نہیں یا رسول اللہ! فرمایا تو اور لوگ بھی اپنی بہنوں کے لئے یہ پسند نہ کریں گے، پھر اسی طرح خالہ اور پھوپھی کے متعلق آپ نے پوچھا، اس نے وہی جواب دیا اور آپ بھی اسی طرح فرماتے گئے، اس کے بعد اس پر ہاتھ رکھ کر دعا کی کہ خداوندا! اس کے گناہوں کو بخش دے اور اس کے دل کو پاک اور اس کو عصمت عطا کر۔ ابو امامہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نوجوان کا یہ حال تھا کہ وہ کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتا تھا[1]۔

حضرت سعدؓ بن وقاص کی شفایابی کے لئے دعا

حضرت سعدؓ بن وقاص کہتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی میں مکہ گیا اور وہاں جا کر ایسا سخت بیمار ہوا کہ مرنے کے قریب ہو گیا، یہاں تک کہ وصیت کی تیاری کی، آپ عیادت کو تشریف لائے تو عرض کی یا رسول اللہ! میں اس سرزمین میں مرتا ہوں جس سے ہجرت کی تھی، آپ نے فرمایا نہیں ان شاء اللہ[2]، پھر تین دفعہ دعا کی کہ الٰہی سعد کو شفا دے، سعد کو شفا دے، سعد کو شفا دے[3]۔ چنانچہ ان کو شفا ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چودہ پندرہ برس تک زندہ رہے اور لشکر عراق کے امیر مقرر ہوئے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا

ان ہی حضرت سعدؓ بن وقاص کے حق میں آپ نے دعا فرمائی تھی کہ خداوندا! ان کو مستجاب الدعوات بنا[4]، چنانچہ اس کا یہ اثر تھا کہ وہ جس کو دعا دیتے تھے وہ یقیناً قبول ہو جاتی تھی، کوفہ کی امارت کے زمانہ میں بعض شریروں نے بارگاہ فاروقی میں ان کی غلط شکایت کی، حضرت عمرؓ نے تحقیق حال کے لئے آدمی بھیجا وہ ایک ایک مسجد میں جا کر لوگوں سے حضرت سعدؓ کے متعلق حالات دریافت کرتا پھرتا تھا، ایک محلہ کی مسجد میں ایک شخص نے جھوٹی گواہی دی کہ وہ نماز بھی ٹھیک نہیں پڑھاتے، یہ سن کر حضرت سعدؓ بے اختیار ہو گئے، فرمایا خداوندا! اگر یہ جھوٹا ہو تو اس کو آزمائش میں ڈال۔ اس شخص کا یہ حال ہو گیا تھا کہ بوڑھے ہو کر اس کی پلکیں لٹک آئی تھیں تاہم بازاروں میں چھوکریوں کو چھیڑتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ سعد کی بد دعا مجھے لگ گئی، احادیث و سیر میں ان کی قبولیت دعا کے اور بھی واقعات مذکور ہیں۔

حضرت عروہؓ کے حق میں دعائے برکت

ایک بار آپ نے حضرت عروہؓ کو ایک دینار دیا کہ اس کی ایک بکری خرید لائیں، انہوں نے اس سے دو بکریاں خرید لیں، ایک کو ایک دینار پہ فروخت کر ڈالا اور آپ کی خدمت میں دوسری بکری اور دینار کو پیش کیا، آپ نے ان کو خرید و فروخت کے معاملات میں برکت کی دعا کی اور اس کا یہ اثر ہوا کہ اگر وہ مٹی بھی خریدتے تھے تو اس میں نفع ہوتا تھا[6]۔

ابو امامہ باہلیؓ کے حق میں دعائے سلامتی

حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہیں فوج بھیج رہے تھے، میں نے حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے لئے دعا کیجئے کہ شہادت نصیب ہو۔ فرمایا خداوندا! ان کو سالم و غانم واپس لا، چنانچہ ہم صحیح و سلامت مال غنیمت لے کر واپس ہوئے

---

[1] مسند جلد ۵ صفحہ ۲۵۶ و مسند بیہقی و شعب الایمان بیہقی۔ [2] نسائی کتاب الوصیۃ۔ [3] صحیح مسلم کتاب الوصیۃ۔ [4] ترمذی مناقب سعد بن ابی وقاص۔

[5] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ۔ [6] بخاری باب علامات النبوۃ۔

پھر کہیں فوج جانے لگی، میں نے پھر وہی درخواست کی، آپؐ نے پھر وہی دعا دی اور پھر وہی ہوا، تیسری دفعہ پھر یہی موقع پیش آیا، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے دو دفعہ دعائے شہادت کے لئے درخواست پیش کی قبول نہ ہوئی، اب یہ تیسرا موقع ہے، آپؐ نے پھر وہی دعا دی اور وہی نتیجہ تھا۔[۱]

حضرت طلحہؓ کے حق میں برکت اولاد کی دعا حضرت ابوطلحہؓ کی بیوی نہایت ہوشمند اور اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر دل سے فدا تھیں، ایک دفعہ ان کا بچہ بیمار ہوا، حضرت ابوطلحہؓ گھر سے باہر ہی تھے کہ بچہ نے دم توڑ دیا، بیوی نے بچہ کو ایک گوشہ میں لٹا دیا، ابوطلحہؓ جب گھر واپس آئے تو بیوی سے دریافت کیا کہ بچہ کیسا ہے؟ نیک بخت نے جواب دیا کہ وہ آرام پا گیا، ابوطلحہؓ سمجھے کہ وہ اچھا ہے، دونوں میاں بیوی ایک ہی بستر پر سوتے، ابوطلحہؓ صبح کو اٹھے، غسل کر کے مسجد نبویؐ میں نماز پڑھنے کو جانے لگے تو بیوی نے اصل حقیقت ظاہر کی، ابوطلحہؓ نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب کا ماجرا سنایا تو فرمایا شاید کہ خدا نے آج شب کو برکت عطا کی ہو، چنانچہ اس شب کی برکت مقررہ مہینوں کے بعد پوری ہوئی[۲]، ایک انصاری کہتے ہیں کہ برکت کا یہ ثمر ہوا کہ میں نے ابوطلحہؓ کی نو اولادیں دیکھیں اور سب کی سب قرآن خواں تھیں[۳]۔

حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے حق میں دعائے ہدایت حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کافرہ تھیں، ابوہریرہؓ ان کو دعوتِ اسلام دیتے تھے لیکن وہ نہیں مانتی تھیں، ایک دن انہوں نے حسبِ دستور دعوتِ اسلام دی تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا بھلا کہا، حضرت ابوہریرہؓ کو سخت تکلیف ہوئی، وہ روتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس ناگوار واقعہ کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ میری والدہ کے لئے ہدایت کی دُعا فرمائیے، آپؐ نے دعا کی کہ خداوندا! ابوہریرہؓ کی ماں کو ہدایت نصیب کر، حضرت ابوہریرہؓ کو اس دعا کے قبول ہونے کا اس درجہ یقین تھا کہ وہ خوش خوش گھر واپس آئے دیکھا کہ دروازہ بند ہے، ماں نے پاؤں کی آہٹ سُنی تو کہا کہ دروازے پر ٹھہرے رہو، حضرت ابوہریرہؓ کو پانی گرنے کی آواز بھی محسوس ہوئی، جب وہ غسل کر کے کپڑے بدل چکیں تو دروازہ کھولا اور کلمۂ شہادت پڑھا، حضرت ابوہریرہؓ خوشی کے مارے الٹے پاؤں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے اور آپؐ کو مژدہ سنایا، آپؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور دونوں کو دعا دی[۴]۔

اونٹ کا تیز ہو جانا ایک غزوہ میں حضرت جابرؓ کی سواری کا اونٹ اس قدر تھک گیا یا بیمار ہو گیا کہ تقریباً چل نہیں سکتا تھا، آپؐ نے دیکھا تو دعا دی اور اب وہ اس قدر تیز ہو گیا کہ تمام اونٹوں کے آگے آگے رہتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر پھر دریافت فرمایا کہ اے جابر! اب کیا حال ہے؟ عرض کی آپؐ کی دعا کی برکت قبول ہوئی[۵]۔

بیمار کا اچھا ہونا آپؐ ایک صحابی کی عیادت کو تشریف لے گئے جو ضعف سے چُور ہو گئے تھے، آپؐ نے فرمایا کیا تم صحت کی حالت میں خدا سے کوئی دعا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں! میں خدا سے دعا کرتا تھا کہ مجھے آخرت میں

---

[۱] مسند احمد ج ۳ ص ۳۲۳ و ابو یعلیٰ و بیہقی۔ [۲] صحیح مسلم فضائل ابوطلحہؓ۔ [۳] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من لم یظہر الحزن عند المصیبۃ۔

[۴] صحیح مسلم فضائل ابوہریرہؓ۔ [۵] بخاری کتاب الجہاد۔

جو عذاب دینا ہے وہ دنیا ہی میں دے دے، آپ نے فرمایا سبحان اللہ! تم دنیا کے عذاب کے متحمل نہیں ہو سکتے تو تم نے یہ دعا کیوں نہیں کی۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ - ۲۵)
خداوندا ہم کو دنیا و آخرت دونوں میں بھلائی دے اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

اس کے بعد آپ نے درگاہ خداوندی میں دعا کی اور خدا نے ان کو شفا عطا فرمائی[۱]۔

سواری میں قوت آجانا حضرت جریرؓ ایک صحابی تھے جو گھوڑے کی پیٹھ پر جم کر نہیں بیٹھ سکتے تھے، ایک بار آپ نے ان کو ذی الخلصہ کے بت خانے کے ڈھانے کے لئے بھیجنا چاہا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گھوڑے پر جم کر نہ بیٹھنے کی شکایت کی، آپ نے ان کے سینہ پر ہاتھ مارا اور دعا دی کہ خداوندا! اس کو گھوڑے پر بیٹھنے کی قوت دے اور اس کو ہادی و مہدی بنا، چنانچہ وہ گئے اور اس میں آگ لگا کر آئے[۲]۔

ایک مغرور کا ہاتھ شل ہو جانا آپ کے سامنے ایک شخص نے بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کیا، آپ نے فرمایا داہنے ہاتھ سے کھاؤ، اس نے غرور سے کہا، میں اس سے کھا نہیں سکتا، چونکہ اس نے غرور سے کہا تھا، آپ نے فرمایا، خدا کرے ایسا ہی ہو، چنانچہ اس کے بعد ایسا ہوا کہ وہ داہنے ہاتھ کو اٹھا کر واقعی اپنے منہ تک نہیں لے جا سکتا تھا[۳]۔

قبیلۂ دوس کا مسلمان ہونا ایک بار حضرت طفیل دوسیؓ اپنے رفقاء کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! دوس کے قبیلہ نے دعوتِ اسلام کے قبول کرنے سے انکار کیا، آپ اس پر بددعا فرمایئے لیکن رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا وَّاْتِ بِھِمْ[۴]۔ خداوندا دوس کو ہدایت دے، اور ان کو لا۔

بالآخر یہ دعا قبول ہوئی اور پورا قبیلہ مسلمان ہو کر حاضر خدمت ہوا۔

رفع بے پردگی کے لئے دعا ایک حبشیہ عورت نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے صرع کا دورہ ہوتا ہے جس سے میں بے پردہ ہو جاتی ہوں، میرے لئے دعا فرمایئے، ارشاد ہوا اگر صبر کرنا چاہو تو تمہیں جنت نصیب ہوگی اور اگر کہو تو میں دعا کروں کہ خدا تم کو صحت دے، اس نے کہا میں صبر کرتی ہوں لیکن سترِ عورت کے لئے دعا فرمایئے۔ چنانچہ آپ نے اس کے لئے دعا کی[۵]۔

سلطنتِ کسریٰ کی تباہی پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام کے لئے جب کسریٰ کے پاس خط بھیجا تو اس نے خط کو چاک کر کے پھینک دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے اس کو بددعا دی کہ اس کے بھی پرزے پرزے ہو جائیں[۶]، چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اس کی سلطنت

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الدعوات باب کراہۃ الدعا بتعجیل العقوبۃ فی الدنیا [۲] صحیح مسلم فضائل جریر بن عبداللہ بجلی [۳] صحیح مسلم باب آداب الطعام والشراب واحکامہا [۴] صحیح بخاری قصہ دوس کتاب الجہاد و مسلم فضائل غفار و اسلم و دوس وغیرہا [۵] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ من المرض کتاب البر والصلۃ [۶] صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

کے پرنچے اڑ گئے۔

دعائے برکت کا اثر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فوج کو صبح تڑکے روانہ فرماتے تھے اور تمام امت کے لئے دعا کی تھی کہ خداوندا! میری امت کو صبح کے سویرے میں برکت دے، ایک تجارت پیشہ صحابی نے اس پر عمل کیا اور اپنا سامان تجارت عموماً صبح سویرے روانہ کرنا شروع کیا، چنانچہ اس دعا کی برکت ظاہر ہوئی اور وہ اتنے دولت مند ہو گئے کہ ان کو اپنی دولت کے رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی[1]

طول عمر کی دعا

ام قیسؓ ایک صحابیہ تھیں ان کا لڑکا مر گیا تو وہ اس قدر بدحواس ہو گئیں کہ غسل جنازہ دینے والے سے کہا کہ میرے بچے کو ٹھنڈے پانی سے غسل نہ دو، ورنہ مر جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو مسکرائے اور ان کو طول عمر کی دعا دی، چنانچہ انہوں نے تمام عورتوں سے زیادہ عمر پائی۔

ایک بچہ کی ہدایت کے لئے دعا

رافع بن سنان نے اسلام قبول کر لیا لیکن بی بی نے جس کی گود میں ایک لڑکی تھی اس سعادت ابدی سے انکار کیا، اب اختلاف مذہب کی بنا پر لڑکی کے بارے میں نزاع پیدا ہوئی، بارگاہ نبوت میں مقدمہ پیش ہوا، آپ نے دونوں کو الگ الگ بٹھایا اور کہا کہ لڑکی کو بلاتے جاؤ دونوں نے بلایا تو لڑکی ماں کی طرف بڑھی، آپ نے اس حالت کو دیکھ کر دعا فرمائی کہ خداوندا! اس کو ہدایت دے اس کا یہ اثر ہوا کہ لڑکی کا رخ فوراً باپ کی طرف پھر گیا، یہ ابوداؤد کی روایت ہے[2]

ابن سعد نے اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابوسلمہؓ صحابی کی نسبت لکھا ہے کہ وہ بچہ تھے ان کے دادا اور نانا میں سے ایک کافر اور ایک مسلمان تھا، دونوں نے بچہ کی تولیت کا دعویٰ کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا فیصلہ خود بچے کے اختیار پر رکھ دیا، پہلے تو بچہ اپنے کافر رشتہ دار کی طرف بڑھا، آپ نے فرمایا، خدا اس کو ہدایت دے۔ فوراً بچہ مسلمان عزیز کی طرف چلا گیا اور فیصلہ اسی کے حق میں رہا[3]

*

---

[1] ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ صفحہ ۱۶۳ باب ما یرجی من البرکت فی البکور (مسند احمد ج ۳ صفحہ ۴۳۲) عن صخر الغامدی [2] ابو داؤد صفحہ ۲۲۳ کتاب الطلاق باب اذا اسلم الابوان مع من یکون الولد [3] ابن ماجہ باب تخییر الصبی بین ابویہ میں بھی یہ روایت ہے۔

اشیاء میں اضافہ

مسلمانوں کی ابتدائی زندگی جس فقر و فاقہ میں گزری تھی، اس کا حال کتاب کے مختلف حصوں میں پڑھ چکے ہو، کئی کئی دن گزر جاتے تھے کہ ان کو کھانے کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی ایسی حالت میں اگر برکت الٰہی ان کو اپنا خاص مہمان نہ بنا لیتی تو ان کا کیا حشر ہوتا؟ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے تھوڑی سی روٹی اور مچھلی سے کئی سو آدمیوں کو شکم سیر کر دیا اور یہ اُن کا بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک اور فیض روحانی سے ایک دفعہ نہیں متعدد دفعہ اس قسم کے برکات ظاہر ہوئے۔

تھوڑے سے کھانے میں ستر آدمیوں کا سیر ہونا

ایک دن حضرت ابوطلحہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے محسوس کیا کہ آپ بھوک کی شدت سے ضعیف ہو رہے ہیں، گھر آئے اور بی بی ام سلیم سے کہا کہ مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ضعیف آواز سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھوکے ہیں، تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے، انھوں نے جو کی چند روٹیاں دوپٹے میں لپیٹ کر حضرت انسؓ کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجیں، وہ روٹیاں لے کر آئے تو آپ صحابہؓ کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے، حضرت انسؓ سامنے کھڑے ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ کیا ابوطلحہؓ نے تمہارے ہاتھ کھانا بھیجا ہے؟ انھوں نے کہا، ہاں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام صحابہؓ کے ساتھ اٹھے اور حضرت ابوطلحہؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ حضرت انسؓ نے ان کو خبر کی تو انھوں نے بی بی سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور ہمارے پاس کھانے کا کوئی سامان نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوطلحہؓ کے ساتھ آئے اور ام سلیمؓ سے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو لاؤ۔ انھوں نے وہی روٹیاں پیش کیں جو حضرت انسؓ کے ہاتھ بھیجی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اُن کو چُورا کیا گیا اور ام سلیمؓ نے گھی کا برتن انڈیل دیا جس نے سالن کا کام دیا، لیکن ان ہی روٹیوں میں یہ برکت ہوئی کہ آپ دس دس آدمیوں کو بُلا بُلا کے کھلاتے تھے اور وہ شکم سیر ہو ہو کے جاتے تھے، یہاں تک کہ ستر اسی آدمی آسودہ ہو گئے۔[1]

چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا

حضرت جابرؓ کے والد نے اپنے اوپر یہودیوں کا قرض چھوڑ کر وفات کی، قرضداروں نے تقاضا کیا تو حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ والد نے اپنے اوپر قرض چھوڑ کر انتقال کیا ہے اور بجز کھجوروں کے میرے پاس ادا کرنے کا کوئی سامان نہیں، صرف کھجوروں کی پیداوار سے کئی برس تک یہ قرض ادا نہیں ہو سکتا، آپ میرے ساتھ نخلستان میں تشریف لے چلئے تاکہ آپ کے ادب سے قرضدار مجھ پر سختی نہ کریں، آپ ان کے ساتھ تشریف لائے اور کھجوروں کا جو ڈھیر لگا ہوا تھا اس کے گرد چکر لگا کر دعا کی اور اسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اپنے اپنے قرض میں لیتے جاؤ، آپ کی دعا کی تاثیر سے ان ہی کھجوروں میں یہ برکت ہوئی کہ تمام قرض ادا ہو گیا اور جس قدر کھجوریں قرضداروں کو ادا کی گئی تھیں، اتنی ہی بچ رہیں۔[2]

---

[1] صحیح بخاری علامات النبوۃ [2] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ۔

کھانے میں حیرت انگیز برکت

چونکہ اصحاب صفہ بالکل محتاج تھے اور ان کی معاش کا کوئی سامان نہ تھا، اس لیے آپ نے ایک بار حکم دیا کہ جس کے پاس دو آدمیوں کے کھانے کا سامان ہو وہ اصحاب صفہ میں سے ایک کو اور جن کے پاس چار آدمیوں کی غذا ہو وہ دو کو اپنے ساتھ لے جائے اور کھانا کھلائے، چنانچہ اس اصول کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں دس اور حضرت ابوبکرؓ کے حصے میں تین آدمی آئے، یہ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے گھر میں آئے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے یہاں کھانا کھایا، اور آپ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، اس لیے کسی قدر رات گزر گئی، وہ گھر میں دیر سے آئے تو ان کی بیوی ام رومان نے کہا کہ مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں رہ گئے؟ انہوں نے کہا کیا تم نے ان کو کھانا نہیں کھلایا؟ وہ بولیں بغیر تمہارے ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا، حضرت ابوبکرؓ نہایت برہم ہوئے اور ان لوگوں کو کھانا کھلانا شروع کیا وہ لوگ جو لقمہ اٹھاتے تھے اس میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ لوگ شکم سیر ہو کر کھا چکے تو بچا ہوا کھانا پہلے سے بھی زیادہ نکلا۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس برکت کو دیکھ کر ام رومان کی طرف مسرت سے دیکھا اور غصہ میں اگرچہ کھانے کی قسم کھا چکے تھے لیکن قسم توڑنے کے لیے ایک لقمہ اس میں سے کھایا اور تمام کھانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیج دیا، وہ کھانا آپ کے گھر میں صبح تک رہا، دوسرے روز آپ کی خدمت میں بارہ آدمی آئے، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ کئی کئی آدمی خدا جانے کتنے تھے، آپ نے وہ کھانا ان کے پاس بھیج دیا اور وہ لوگ بھی سیر ہو گئے۔[۱]

گھی کی مقدار میں برکت

ام مالکؓ کا دستور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ ایک برتن میں گھی ہدیۃً بھیجا کرتی تھیں، جب ان کے بچے سالن مانگتے اور گھر میں نہ ہوتا تو وہ اس برتن کو جس میں آپ کی خدمت میں گھی بھیجتی تھیں، اٹھا لاتیں اور اس میں سے بقدر ضرورت گھی نکل آتا، ایک دن انہوں نے اس برتن کو نچوڑ لیا، پھر آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ نے فرمایا، اگر تم نے اس کو نچوڑ کر نہ لیا ہوتا تو ہمیشہ اس میں سے گھی نکلا کرتا۔[۲]

جَو کی مقدار میں برکت

ایک بار ایک شخص نے آپ سے غلہ مانگا، آپ نے تھوڑے سے جو دے دیئے، اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ وہ روز اپنے لئے، اپنی بی بی کے لئے، اپنے مہمان کے لئے اس میں سے صرف کرتا تھا اور اس میں کمی نہ ہوتی تھی، ایک دن اس نے اس کو تولا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا۔ اگر تم اس کو نہ تولتے تو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہتا۔[۳]

کھانے میں حیرت انگیز اضافہ

غزوۂ احزاب میں تمام مہاجرین اور انصار خندق کھود رہے تھے، حضرت جابرؓ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سخت بھوکے ہیں وہ اپنی بیوی کے پاس آئے اور پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے ایک صاع جو نکالا اور گھر میں ایک بکری تھی، حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کیا اور بی بی نے آٹا گوندھا، گوشت دیگچی میں چڑھایا گیا تو حضرت جابرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لینے کے

---

[۱] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [۲] صحیح مسلم باب معجزات النبی و مسند احمد عن جابرؓ [۳] ایضاً

لیتے چلے، بی بی نے کہا کہ دیکھو آپؐ کے ساتھ لوگوں کو لاکر مجھے رسوا نہ کرنا، حضرت جابرؓ آئے اور چپکے سے آپؐ کے کان میں کہا کہ ہم نے کھانے کا انتظام کیا ہے، آپؐ چند اصحاب کے ساتھ تشریف لے چلئے، لیکن آپؐ نے تمام اہل خندق کو پکارا کر آؤ جابرؓ نے دعوت عام کی ہے اور حضرت جابرؓ سے کہا کہ جب تک میں نہ آلوں چولہے سے دیگچی نہ اتاری جائے اور روٹی نہ پکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں کو لے کر روانہ ہوئے، حضرت جابرؓ گھر میں آئے تو بی بی نے برا بھلا کہنا شروع کیا، انھوں نے کہا میں کیا کروں، تم نے جو کہا تھا میں نے اس کی تعمیل کر دی، آپؐ آئے تو بی بی نے آپؐ کے سامنے آٹا پیش کیا، آپؐ نے اس میں اپنا لعاب دہن ملا دیا اور برکت کی دعا دی، اسی طرح دیگچی میں بھی لعاب دہن ڈالا اور دعائے برکت کی، اس کے بعد آپؐ نے روٹی پکانے اور سالن نکالنے کا حکم دیا، کم و بیش ایک ہزار آدمی تھے سب کھا کر واپس گئے لیکن گوشت اور آٹے میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔[1]

تھوڑی سی زادراہ میں غیر معمولی برکت

غزوۂ تبوک میں صحابہؓ کو بھوک کی اتنی تکلیف ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سواریوں تک کے ذبح کرنے کی اجازت دے دی، حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپؐ کے پاس آئے اور کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی، آپؐ بچا ہوا زادِ راہ سب سے طلب فرمائیں اور اس پر دعائے برکت کریں، ممکن ہے کہ خدا اس میں ان کا بھلا کر دے، آپؐ نے ایک چادر بچھوائی اور تمام فوج کا زادِ راہ جمع کرا دیا اور اس پر برکت کی دعا کی، پھر تمام لوگوں سے فرمایا کہ اپنے اپنے برتن بھر لیں، لوگوں نے تمام برتن بھر لئے اور خوب سیر ہو کر کھایا، یہاں تک کہ کھانے سے بچ گیا۔[2]

تھوڑی سی زادراہ میں عظیم برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے، صحابہ بھوک سے اس قدر بیتاب تھے کہ اونٹنیاں ذبح کرنی چاہیں، لیکن آپؐ نے تمام لوگوں کے زادِ راہ کے جمع کرنے کا حکم دیا، ایک چادر بچھائی گئی اور اس پر تمام زادِ راہ ڈھیر کیا گیا، اس تمام سامان کی مجموعی مقدار نے صرف اس قدر زمین کا احاطہ کیا جس پر ایک بکری بیٹھ سکتی تھی اور اشخاص کی تعداد چودہ سو تھی، لیکن تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھالیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لئے، کھانے کے بعد آپؐ نے پانی طلب فرمایا، ایک صاحب ایک برتن میں تھوڑا سا پانی لائے، آپؐ نے اس کو پیالہ میں انڈیل دیا اور ۱۴ سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا۔[3]

آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے، ۱۳۰ آدمیوں کی جماعت ساتھ تھی، آپؐ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کچھ کھانے کا سامان ہے؟ ایک شخص ایک صاع آٹا لایا اور وہ گوندھا گیا، پھر ایک کافر بکریاں چراتا ہوا آیا، آپؐ نے اس سے ایک بکری خرید فرمائی اور ذبح کرنے کے بعد کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا اور ہر شخص کو تقسیم کی، گوشت تیار ہوا تو دو پیالیوں میں بھرا گیا، اور سب کے سب کھا کر آسودہ ہو گئے اور بچ بھی گیا۔[4]

تھوڑے سے کھانے میں غیر معمولی برکت

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ نے ایک بار ایک قسم کا کھانا تیا

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۵۸۹ ذکر غزوہ خندق [2] صحیح مسلم ج اول ص ۴۳ مصر کتاب الایمان [3] مسلم ج ۲ ص ۷۵ مصر باب خلط ازواد اذا قلت

[4] بخاری ج ۲ ص ۸۱۲ کتاب الاطعمہ

کیا اور حضرت انسؓ کو بھیجا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا لائیں، وہ گئے تو آپؐ نے پوچھا کہ کیا میرے ساتھیوں کو بھی بلایا ہے؟ حضرت انسؓ نے گھر میں آکر پوچھا تو حضرت انسؓ نے آپؐ سے آکر کہا کہ وہ تو ذرا سی چیز ہے جس کو ام سلیمؓ نے تیار کیا ہے، آپ تشریف لائے اور وہ کھانا سامنے رکھا گیا تو فرمایا کہ دس دس آدمیوں کو لاؤ، اس طرح چالیس آدمی دس دس کر کے آئے اور شکم سیر ہو کر کھایا لیکن کھانے میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔[1]

قلیل تعداد میں کثیر برکت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کیا تو حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ نے تھوڑا سا حیس (ایک قسم کا کھانا ہوتا ہے) تیار کیا اور ایک طشت میں کر کے حضرت انسؓ کے ہاتھ آپ کی خدمت میں بھیجا، حضرت انسؓ کھانا لے کر آئے تو آپ نے بہت سے اصحاب کو مدعو کیا، تقریباً تین سو آدمی جمع ہو گئے، آپؐ نے حکم دیا کہ دس دس آدمی حلقہ باندھ کر بیٹھ جائیں اور اپنے سامنے سے کھانا شروع کریں، تمام لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے لیکن اس میں اس قدر برکت ہوئی کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ جس وقت میں نے طشت کو اٹھا کر رکھا اس وقت کھانا زیادہ تھا یا جب لوگوں کے سامنے رکھا گیا تھا۔[2]

ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت

سمرہ بن جندبؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ دس دس آدمی صبح سے شام تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پیالہ سے متصل کھاتے رہتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ اس میں اس قدر بڑھتی کیونکر ہوتی جاتی تھی؟ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ "وہاں" سے۔[3]

دودھ کے پیالہ میں برکت

ایک دن حضرت ابوہریرہؓ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر راستہ میں بیٹھ گئے حضرت ابوبکرؓ کا گزر ہوا تو ان سے قرآن مجید کی ایک آیت پوچھی لیکن اس کا مقصد اپنی حالت زار کی طرف توجہ دلانا تھا، وہ گزر گئے اور کچھ توجہ نہ کی، پھر حضرت عمرؓ گزرے، انہوں نے اسی غرض سے ان سے بھی ایک آیت پوچھی لیکن انہوں نے بھی بے التفاتی کی، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا اور آپؐ نے ان کے چہرے کو دیکھ کر اصل حقیقت معلوم کر لی اور ان کو پکارا، حضرت ابوہریرہؓ نے لبیک کہا اور ساتھ ہو لیے، آپؐ گھر میں داخل ہوئے تو دودھ کا پیالہ بھرا ہوا نظر آیا، پوچھنے سے معلوم ہوا کہ ہدیۃً آیا ہے، آپؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حکم دیا کہ اصحاب صفہ کو بلا لائیں، حضرت ابوہریرہؓ کو یہ ناگوار گزرا کہ اس دودھ کا سب سے زیادہ مستحق تو میں تھا، لیکن آپؐ کی تعمیل ارشاد سے چارہ نہ تھا، مجبوراً اصحاب صفہ کو بلا لے گئے اور سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، آپؐ کے حکم سے حضرت ابوہریرہؓ نے سب کو پلانا شروع کیا، جب سب کے سب سیراب ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ کو ہاتھ پر رکھا اور ابوہریرہؓ کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ اب صرف ہم اور تم باقی ہیں، آؤ بیٹھو اور پینا شروع کرو، آپؐ ان کو متصل پلاتے رہے یہاں تک کہ وہ خود بول اٹھے کہ اب گنجائش نہیں، اس کے بعد آپؐ نے خود پیالہ لیا اور جو کچھ بچ گیا تھا بسم اللہ کہہ کر پی گئے۔[4]

بکری کے دست میں برکت

ایک صحابیؓ نے آپؐ کے لئے گوشت پکایا چونکہ آپ کو بکری کا دست نہایت مرغوب

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۸۱۹ کتاب الاطعمہ [2] صحیح مسلم ج ۱ صفحہ ۵۵۸ مصر کتاب النکاح [3] ترمذی ص ۵۸۲ باب ما جاء فی آیات نبوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [4] بخاری ج ۲ ص ۹۵۶ کتاب الرقاق۔

تھا، انھوں نے آپ کو دونوں دست دیئے، جب آپ ان کو تناول فرما چکے تو پھر دست مانگا، انھوں نے کہا یارسول اللہ، بکری کے کتنے دست ہوتے ہیں؟ آپ نے فرمایا خدا کی قسم! اگر تم خاموش رہتے تو میں جس قدر دست مانگتا تم مجھے دیتے رہتے۔[1]

بکری کے تھنوں میں برکت

حضرت مقداد سے روایت ہے کہ میں اپنے دو رفیقوں کے ساتھ سخت عسرت اور فاقہ زدگی کی حالت میں آیا اور تمام صحابہ کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کیا لیکن کسی نے ہماری کفالت منظور نہیں کی، بالآخر ہم سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ہم کو گھر لے گئے، وہاں تین بکریاں بندھی ہوتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ ان کا دودھ دوہ کر پیا کرو، چنانچہ ہم سب دودھ دوہ کے اپنا حصہ پی لیتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ کا حصہ رکھ دیتے تھے، آپ رات کو آتے تو پہلے نرم آواز میں سلام کرتے، پھر مسجد میں آکر نماز پڑھتے، اس کے بعد اپنا حصہ دودھ پیتے، ایک دن جب کہ میں اپنے حصہ کا دودھ پی چکا تھا شیطان نے مجھ کو دھوکہ دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے یہاں سے آتے ہیں، وہ آپ کی خدمت میں تحائف پیش کرتے ہیں اور آپ ان کو تناول فرماتے ہیں، آپ کو اس ذرا سے دودھ کی ضرورت نہیں، میں اس کے دھوکہ میں آگیا اور تمام دودھ اٹھا کر پی گیا، جب میرے پیٹ میں گنجائش نہ رہی تو شیطان یہ کہہ کر پچھتایا ہوا کہ کم بخت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ پی گیا، جب آپ تشریف لائیں گے اور اپنے حصہ کو نہ پائیں گے تو تجھ کو بددعا دیں گے اور تیرا دین و دنیا سب برباد ہو جائے گا۔

چنانچہ اس ڈر سے میری آنکھوں کی نیند اڑ گئی، آپ تشریف لائے حسب معمول سلام کیا اور نماز پڑھی، اس کے بعد دودھ کو کھولا تو آپ کا حصہ غائب تھا، آپ نے آسمان کی طرف سر اٹھایا اور میں سمجھا کہ آپ اب مجھ پر بددعا فرمائیں گے اور میں ہلاک ہو جاؤں گا، لیکن آپ نے یہ دعا فرمائی "خداوندا! جس شخص نے مجھ کو کھلایا اس کو کھلا اور جس نے مجھے پلایا، اسے پلا۔" اب میں چادر لپیٹ کے اٹھا، ہاتھ میں چھری لی کہ ان بکریوں میں جو سب سے زیادہ فربہ ہو اس کو ذبح کروں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ان سب کے تھنوں میں دودھ بھرا ہوا ہے، اب میں نے ایک برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل و عیال کو یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ کبھی اس قدر دودھ ہو گا کہ اس میں دودھ جا سکیگا لیکن میں نے اس میں دودھ دوہا تو وہ بھر گیا اور اوپر جھاگ آ گئے تھے، میں نے دودھ کو آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم اپنا حصہ پی چکے، میں نے کہا آپ پی لیجئے، آپ نے پی کر مجھے دودھ عنایت فرمایا، چنانچہ جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سیر ہو گئے اور آپ کی دعا کی برکت میں میں شامل ہو گیا تو میں ہنستے ہنستے زمین پر گر پڑا اور آپ کی خدمت میں اول سے آخر تک تمام واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا

"یہ خداوند تعالیٰ کی رحمت ہے، تم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کیوں نہیں جگایا کہ وہ بھی پیتے۔"

میں نے کہا کہ جب میں نے آپ کے ساتھ پی لیا تو مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کسی اور نے پایا یا نہیں؟

ایک وسق جو کی برکت

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو کچھ وسق ایک جانماز جو کے سوا کچھ گھر میں نہ تھا تو میں نے اسی کو کھانا شروع کیا تو وہ ختم ہی ہونے پر نہیں آتا تھا تو

---

[1] شمائل ترمذی باب صفۃ ادام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۱۸۵ مصر باب اکرام الضیف۔

ہم نے اس کو تولا تو پھر وہ ختم ہو گیا یعنی اس کی وہ برکت جاتی رہی۔[1]

توشہ دان بھرا رہتا

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ مجھ پر اسلام میں تین مصیبتیں سب سے سخت پڑیں، پہلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، دوسری حضرت عثمانؓ کی شہادت، تیسری میرے توشہ دان کا جاتے رہنا، لوگوں نے پوچھا کیوں کیسا توشہ دان؟ انہوں نے کہا، آپ ایک غزوہ میں تھے، رسد ختم ہو گئی تھی آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ ابوہریرہؓ! کچھ تمہارے پاس ہے؟ میں نے عرض کی کہ کچھ کھجوریں ہیں، ارشاد ہوا وہ لے آؤ، میں لایا تو آپ نے ان کو دسترخوان پر پھیلا دیا، اکیس کھجوریں تھیں، آپ ایک ایک کھجور لے کر اور اس پر خدا کا نام پڑھ کر رکھتے جاتے تھے، پھر آپ نے سب کو ملا دیا اور حکم دیا کہ دس دس آدمی آکر شریک ہوں، چنانچہ اس طرح لوگ آتے گئے اور پوری فوج سیر ہو گئی اور کچھ کھجوریں بچ گئیں، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اس پر میرے لئے برکت کی دعا فرمائیے، آپ نے دعا کی، میں نے ان کو اپنے توشہ دان میں ڈال لیا، ان کی برکت یہ تھی کہ جب میں ہاتھ ڈالتا تھا اس میں سے کھجوریں نکل آتی تھیں اور ۵۰ وسق تو میں نے اس میں سے راہِ خدا میں خیرات کی، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ تک میں اسی سے کھاتا رہا، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے ہنگامہ میں جہاں اور چیزیں گئیں، توشہ دان بھی جاتا رہا۔[2]

تھوڑی کھجوروں میں برکت

حضرت دکینؓ اور نعمانؓ بن مقرن صحابی کہتے ہیں کہ ہم لوگ چار سو چودہ آدمی خدمتِ نبوی میں ایک ساتھ حاضر ہوئے اور ہم سب نے کھانے کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ ان کو کھانا کھلاؤ، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے پاس تو اسی قدر ہے جو بال بچوں کو کافی ہو، ارشاد ہوا، جاؤ ان کو کھلا دو، عرض کی جیسا حکم ہو تعمیل میں عذر نہیں، یہ کہہ کر حضرت عمرؓ ہم کو لے کر چلے اور ایک جگہ لا کر بٹھایا اور جو کچھ کھجوریں تھیں وہ سامنے لا کر رکھ دیں، اور ان میں یہ برکت نظر آئی کہ ہم سب سیر ہو گئے لیکن کھجوروں میں کمی نہیں آئی۔[3]

*

---

[1] صحیح بخاری و مسلم [2] مسند احمد، جامع ترمذی، ابن سعد، ابن حبان، بیہقی [3] مسند احمد عن دکین و ابوداؤد و ابن حبان و ابن سعد عن نعمان بن مقرن

پانی جاری ہونا

عرب کے خشک و ریگستانی ملک میں سب سے کم یاب جنس پانی کا ایک چشمہ ہے، دنیا کے فاتحوں اور کشور کشاؤں کے حملوں سے یہ ملک جن اسباب کی بنا پر ہمیشہ محفوظ رہا ہے ان میں سے ایک قوی سبب اس میں پانی کے وجود کی کمیابی بھی ہے، چنانچہ یونانیوں، رومیوں اور ایرانیوں کی ہمتیں اسی لئے اس صحرائے لق و دق میں آباد قبائل کے فتح سے قاصر رہیں، غور کرو کہ اسلام کا فاتحانہ لشکر بھی اگر نبوت کے برکات الٰہی کے یہ چشمے اس کے ساتھ نہ ہوتے تو اس مشکل کو وہ کبھی حل کر سکتا تھا!

انبیائے عالم میں صرف ایک حضرت موسیٰؑ کی ذات ہے جن کے لئے ایک دفعہ چٹان کی رگیں پانی کی سوتیں بنیں لیکن رسول عربؐ کے لئے مشکیزہ کا چمڑا، گوشت و پوست کی انگلیاں، خشک چشموں کے دہانے، سوکھے ہوئے کنوؤں کی سوتیں، دہان مبارک کی کلیاں متعدد دفعہ پانی کا خزانہ ثابت ہوئیں۔

مشکیزہ سے پانی ابلنا ایک دفعہ آپؐ سفر میں تھے، صبح کو آنکھ کھلی اور آپؐ نے نماز پڑھانی شروع کی تو ایک صحابی جماعت سے الگ ہو گئے، آپؐ نے شریک جماعت نہ ہونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جنابت کا عذر کیا چونکہ پانی نہ تھا اس لئے ان کو آپؐ نے تیمم کا حکم دیا، اس کے بعد آپؐ نے چند صحابہ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، وہ لوگ چلے تو ایک عورت ملی جو اونٹ پر دو مشکیزوں میں پانی لاد کر لئے جا رہی تھی، ان لوگوں نے اس سے چشمہ کا پتہ پوچھا تو اس نے کہا، اس جگہ پانی نہیں ہے، پھر ان لوگوں نے دریافت کیا کہ تمہارے قبیلہ اور چشمہ کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے؟ اس نے ایک دن اور ایک رات کی مسافت بتائی، وہ لوگ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے مشکیزوں کو چھو دیا، آپؐ کے دست مبارک کی برکت سے اس پانی کی مقدار میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ چالیس آدمیوں نے اس سے خوب سیراب ہو کر پانی پیا اور اپنے اپنے تمام مشکیزے اور برتن بھر لئے، اس کے بعد آپؐ نے کھجور اور روٹی کے ٹکڑے جمع کر کے اس عورت کو دیئے، وہ اپنے گھر آئی تو حیرت و استعجاب سے لبریز تھی، اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا کہ میں نے سب سے بڑے ساحر کو یا اس کے معتقدین کے خیال میں ایک پیغمبر کو دیکھا، آخر اسی خاتون کے اثر سے یہ پورا قبیلہ مع اس عورت کے مسلمان ہو گیا۔[1]

انگلیوں سے پانی جاری ہونا ایک دن آپؐ مقام زوراء میں تھے، عصر کا وقت آ گیا تو صحابہ نے پانی کی جستجو شروع کی، لیکن صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پانی ملا، جب آپؐ کی خدمت میں پانی کا برتن پیش کیا گیا تو آپؐ نے اس پر اپنا ہاتھ ڈال دیا اور انگلیوں سے پانی کا فوارہ چھوٹنے لگا، یہاں تک کہ تقریباً تین سو آدمیوں نے اس سے وضو کیا۔[2]

پانی کا بڑھ جانا آپؐ صحابہ کے ساتھ کسی سفر میں تھے، نماز کا وقت آیا تو صحابہ نے پانی تلاش کیا لیکن کہیں نہ ملا، ایک صحابی پیالہ میں تھوڑا سا پانی لائے، پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے وضو کیا پھر پیالے پر پنجے

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [2] صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی باب معجزات۔

انگلیاں پھیلا دیں، پانی کی مقدار میں اس قدر برکت ہوئی کہ تقریباً ستر آدمیوں کے وضو کے لئے کافی ہوا۔[1]

انگلیوں کی برکت

ایک بار نماز کا وقت آیا تو جن لوگوں کا گھر مسجد کے قریب تھا وہ گھر کے اندر وضو کرنے کے لئے چلے گئے لیکن بقیہ لوگ بے وضو رہ گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک برتن میں وضو کا پانی پیش کیا گیا، آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالنا چاہا تو اس کا دہانہ اس قدر تنگ نکلا کہ آپ کی ہتھیلیاں اس کے اندر نہ پھیل سکیں اس لئے آپ نے اپنی انگلیاں اس کے اندر ڈالیں اور وہ پانی تقریباً ۸۰ آدمیوں کے وضو کیلئے کافی ہوا۔[2]

انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا

صلح حدیبیہ کے دن صحابہ پیاس سے بے تاب ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صرف چمڑے کے ایک برتن میں پانی تھا، آپ نے اس سے وضو کرنا شروع کیا تو تمام صحابہ آپ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھے، آپ نے اس بے تابی کی وجہ پوچھی تو لوگوں نے کہا کہ ہماری ضروریات کے لئے صرف یہی پانی تھا، آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈال دیا اور آپ کی انگلیوں کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی جاری ہوا، چودہ پندرہ سو آدمی ساتھ تھے، سب نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہو کر پانی پیا۔[3]

کلی سے پانی بڑھ جانا

دوسری روایت ہے کہ صحابہ اس دن اس کنوئیں پر ٹھہرے جس کا نام حدیبیہ تھا اور اس کا تمام پانی اُلیچ لیا، یہاں تک کہ کنوئیں کے اندر ایک قطرہ پانی نہ رہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو کنوئیں کے کنارے بیٹھ گئے اور تھوڑا سا پانی منہ میں لے کر اس میں کلی کر دی، تھوڑی دیر میں پانی اس قدر اُبلا کہ تمام صحابہ اور صحابہ کے تمام اونٹ سیراب ہو گئے۔[4]

ہاتھ منہ دھونے کی برکت

غزوۂ تبوک کے سفر میں دو، دو وقت کی نمازیں ایک ساتھ پڑھتے جا رہے تھے ایک دن عشاء اور مغرب کی نماز ایک ساتھ ادا کی، پھر فرمایا کل تم لوگ دوپہر کے وقت تبوک کے پاس پہنچو گے لیکن جب تک میں نہ آؤں کوئی شخص اس کے پانی میں ہاتھ نہ لگائے، لوگ پہنچے تو نہر تسمہ کی طرح تنگ اور باریک نظر آئی، آپ کے حکم سے لوگوں نے پانی کو اُلیچنا شروع کیا، پانی ایک گڑھے میں جمع ہو گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں منہ ہاتھ دھوئے، پھر وہ پانی نہر میں ڈال دیا گیا تو وہ پانی سے اُبل گئی۔[5]

انگلیوں کی برکت

آپ نے ایک سفر میں حضرت جابرؓ سے وضو کا پانی طلب فرمایا، انہوں نے قافلہ میں بہت ڈھونڈا پانی نہیں ملا، انصار میں ایک شخص تھے جو خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پانی ٹھنڈا کر کے رکھتے تھے، حضرت جابرؓ نے آپ کی خدمت میں پانی نہ ملنے کی اطلاع کی تو آپ نے ان کو ان انصاری کے پاس بھیجا، لیکن ان کے پاس بھی اس قدر کم پانی نکلا کہ اگر انڈیلا جاتا تو برتن کے خشک حصہ میں جذب ہو کر رہ جاتا، حضرت جابرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی تو آپ نے اس برتن کو منگا بھیجا اور ہاتھ میں لے کر کچھ پڑھا اور اس کو طشت کے اندر رکھ کے حضرت جابرؓ کو حکم دیا کہ بسم اللہ کر کے ہاتھ پر پانی گرائیں، حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے پانی ڈالنا شروع کیا تو پہلے آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی امنڈا، پھر طشت بھر گیا، یہاں تک کہ سب لوگ پانی پی کر سیراب ہو گئے، اس کے بعد آپ نے اس کے اندر سے ہاتھ نکال لیا تو طشت بھرا کا بھرا رہ گیا۔[6]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم باب معجزات و مسند احمد عن انس ج ۳۔ [2] صحیح بخاری باب معجزات۔ [3] ایضاً۔ [4] ایضاً۔ [5] ایضاً۔ [6] مسلم باب حدیث جابر طویل۔

انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا

حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار عصر کا وقت آ گیا، صرف تھوڑا سا بچا ہوا پانی رہ گیا تھا، آپؐ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے اندر سے پانی جوش مارنے لگا، یہاں تک کہ ۱۴۰۰ آدمیوں نے اس سے وضو کیا اور سیراب ہو گئے۔[1]

تھوڑے پانی میں کثیر برکت

ایک بار آپؐ سفر میں تھے، صبح کے وقت قافلہ سے الگ ہو کر سو گئے اور چند اشخاص سے جو ساتھ تھے کہہ دیا کہ نماز کا خیال رکھنا، لیکن سب کے سب سو گئے اور سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو دن نکل چکا تھا، اب سب کے سب گھبرا کے اٹھے تو آپؐ نے کوچ کرنے کا حکم دیا، دن چڑھا تو آپؐ نے سواری سے اتر کر وضو کیا، تھوڑا سا پانی جو بچ رہا تھا اس کی نسبت ابو قتادہؓ سے فرمایا کہ اس کو محفوظ رکھنا، اس سے ایک عظیم الشان نشان ظاہر ہوگا، جب آفتاب خوب بلند ہو چکا تو آپؐ قافلہ سے جا ملے لوگوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! پیاس نے ہم کو مار ڈالا، آپ نے فرمایا تم لوگ تباہ نہیں ہو سکتے، یہ کہہ کر اپنے وضو کا بچا ہوا پانی ابو قتادہؓ سے طلب کر کے لوگوں کو پلانا شروع کیا اور تمام لوگ سیراب ہو گئے۔[2]

انگلیوں سے پانی اُبلنا

حبان بن بح الصدائی کا بیان ہے کہ میری قوم حالت کفر میں تھی، مجھے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے فوجی تیاریاں فرما رہے ہیں اور آپؐ کو اطلاع دی کہ میری قوم مسلمان ہے، پھر میں نے رات بھر آپ کے ساتھ سفر کیا، جب صبح ہوئی تو میں نے اذان دی، آپؐ نے پانی کا برتن مجھے عطا فرمایا، میں نے اس سے وضو کیا، پھر آپؐ نے اپنی انگلیاں اس میں ڈال دیں اور ان کے درمیان سے چشمہ کی طرح پانی ابلنے لگا، آپؐ نے حکم دیا کہ جو شخص چاہے اُس سے وضو کرے۔[3]

ایک اور واقعہ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ معجزات کو برکت سمجھا کرتے تھے، چنانچہ ایک بار ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے، پانی کی کمی کی شکایت ہوئی تو آپؐ نے بچے ہوئے پانی کو طلب فرمایا، وہ ایک برتن میں آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا اور آپ نے اس میں ہاتھ ڈال کر فرمایا کہ وضو کے مبارک پانی کی طرف دوڑو، خدا کی طرف سے برکت ہوگی۔ میں نے دیکھا تو آپؐ کی انگلیوں کے درمیان پانی اُبل رہا تھا۔[4]

یہ واقعات جو مختلف عنوانوں میں بیان کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ ان میں سے بعض ایک ہی قصہ کی متعدد حکایتیں ہوں، لیکن چونکہ ہر ایک کے ساتھ خصوصیت میں کچھ فرق و امتیاز محسوس ہوا اس لئے ان کو مستقل واقعات کی صورت دے دی گئی ہے۔

*

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۸۴۰ کتاب الاشربہ۔ [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب قضاء الصلوٰۃ الفائتۃ۔ [3] مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۱۶۹۔ [4] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام

اطلاعِ غیب

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (جن - ۲)

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار بے نقاب کیا ہے کہ "غیب کا علم خدا کے سوا کسی اور کو نہیں"، چنانچہ قرآن مجید میں اس معنی کی بکثرت آیتیں ہیں اور ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب کی صفت سے خدا کے سوا کسی اور کو متصف نہیں کیا جا سکتا۔

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (یونس)	کہہ دے (اے پیغمبر) کہ غیب تو خدا ہی کے لیے ہے۔
قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل)	کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ خدا کے سوا آسمان و زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

یعنی خدا کے سوا کسی مخلوق کو غیب کا ذاتی علم نہیں اور نہ غیب کی باتیں خدا نے آسمان و زمین میں کسی مخلوق کو بتائی ہیں، چنانچہ قیامت کے دن تمام انبیا کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (مائدہ - ۱۵)	جس دن خدا تمام پیغمبروں کو جمع کرے گا اور کہے گا کہ تم کو کیا جواب دیا گیا، وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں، غیب کی باتوں کا پورا جاننے والا تو ہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو اعلم الانبیا تھے، ان کو یہ اقرار کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام - ۵)	کہہ دے اے پیغمبر! کہ میں نہیں کہتا کہ خدا کے تمام خزانے میرے قبضہ میں ہیں اور یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں نہیں جانتا۔
قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف - ۲۳)	کہہ دے اے پیغمبر! کہ میں اپنے آپ کے لیے کسی نفع و ضرر پر قادر نہیں ہوں لیکن یہ کہ خدا جو چاہے، اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو بہت سے فائدے اٹھا لیتا اور مجھ کو کبھی مصیبت نہ پیش آتی، لیکن میں تو ایماندار قوم کو ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں۔

ان آیتوں نے صاف کھول دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ غیب کا ذاتی علم تھا اور نہ تمام غیب کی باتیں آپ کو بتائی گئی تھیں، البتہ خدا تعالیٰ نے اپنے علم میں سے جو کچھ چاہا اور پسند کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتاً فوقتاً اس سے مطلع فرماتا رہا، چنانچہ صاف ارشاد ہوا۔

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (بقرہ - ۳۴)	وہ (یعنی مخلوقات الٰہی) خدا کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا خدا چاہے۔

سورۂ جن میں فرمایا۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (جن-۲)

اللہ تعالیٰ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں فرمایا۔

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِن رُّسُلِهِ مَن يَشَاءُ (۱۸)

اور خدا غیب کی باتیں تم کو نہیں بتا سکتا لیکن وہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہتا ہے (اس کے لئے) چن لیتا ہے۔

امور غیب میں سے قیامت کے متعلق تصریح کر دی گئی ہے کہ اس کا علم کسی کو عطا نہیں ہوا ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي ۖ لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ۚ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً ۗ يَسْأَلُونَكَ كَأَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

(اعراف)

(اے پیغمبر!) لوگ تجھ سے قیامت کی نسبت پوچھتے ہیں کہ وہ کب لنگر انداز ہوگی؟ کہہ دے کہ اس کا علم تو صرف میرے پروردگار کو ہے، وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا، وہ وقت آسمان و زمین میں بڑا بھاری ہوگا، وہ دفعتہً آجائے گا، تجھ سے وہ قیامت کا حال اس طرح پوچھتے ہیں کہ گویا وہ تجھے معلوم ہے اور تو چھپاتا ہے کہہ دے کہ اس کا علم صرف خدا ہی کے پاس ہے لیکن اکثر آدمی نہیں سمجھتے۔

صحاح میں حضرت جبریلؑ کے ایک مسافر کی صورت میں آنے کی جو روایت ہے اور جس میں انہوں نے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات پوچھے ہیں اور آپ نے ان کے جوابات دیئے ہیں، اس کے آخر میں وہ پوچھتے ہیں کہ قیامت کب ہوگی؟ اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ما المسئول عنها بأعلم من السائل وساحدثك عن اشراطها (کتاب الایمان مسلم و بخاری)

جس سے پوچھتے ہو وہ پوچھنے والے سے اس باب میں زیادہ علم نہیں رکھتا، ہاں اس کی علامتیں بتاؤں گا۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ جو تم سے یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب کی باتیں جانتے تھے وہ جھوٹا ہے، قرآن نے صاف کہہ دیا ہے۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۔

کسی نفس کو یہ علم نہیں کہ کل وہ کیا کرے گا۔

ایک دفعہ چند لڑکیاں آپ کے سامنے بیٹھی کچھ گا رہی تھیں، گاتے گاتے ایک نے ان میں سے کہا۔

وفینا نبی یعلم ما فی غد

ہم میں سے ایک نبی ہے جو کل کی ہونے والی بات جانتا ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا[2] حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ غیب کی کنجی پانچ باتیں ہیں، اس کے بعد آپؐ نے یہ آیت پڑھی[3]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر قمر [2] صحیح بخاری کتاب النکاح [3] صحیح بخاری تفسیر لقمان

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ (لقمان-۴)

خدا ہی کے پاس اس آنے والی گھڑی کا علم ہے، وہی پانی برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا؟ اور نہ یہ کوئی جانتا ہے کہ کس سرزمین میں وہ مرے گا۔

یہی روایت بخاری کے دوسرے باب میں اس طرح ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، بجز خدا کے کوئی نہیں جانتا کہ حاملہ عورت کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی، اور نہ خدا کے سوا کوئی یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا اور نہ خدا کے علاوہ کسی کو اس کا علم ہے کہ پانی کب برسے گا اور نہ بجز خدا کے کسی کو اس کی خبر ہے کہ وہ کہاں مرے گا۔[1]

بہرحال ان مخصوص باتوں کے علاوہ جن کا علم صرف عالم الغیب کو ہے، اپنے غیب کی باتوں میں جن باتوں کو وہ مناسب سمجھتا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وقتاً فوقتاً ان کی اطلاع دیتا تھا، سورۂ ہود میں بعض انبیاء کے تذکرہ کے بعد خدا فرماتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ (ہود-۴)

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کر رہے ہیں، نہ تو ان کو جانتا ہے اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ۔ (تکویر-۱)

یعنی آپ کو امور غیب میں سے جس کی تعلیم دی جاتی ہے آپ اپنی امت کو اس کے بتانے میں بخل نہیں فرماتے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سورج کو گرہن لگا تھا، آپ نے صحابہ کے ساتھ نماز کسوف ادا فرمائی تھی اور نماز کے بعد ایک نہایت بلیغ و مؤثر خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا۔

یا امۃ محمد واللہ لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً ولبکیتم کثیراً (صحیح بخاری باب الصدقۃ فی الکسوف و تفسیر سورۂ مائدہ)

اے گروہ محمدؐ! خدا کی قسم، اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔

ایک دفعہ نماز کے بعد آپؐ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا۔

ھل ترون قبلتی ھٰھنا فواللہ ما یخفی علی خشوعکم ولا رکوعکم انی لاراکم من وراء ظھری۔ (بخاری)

تم دیکھتے ہو کہ میرا رخ ادھر ہے، لیکن خدا کی قسم مجھ سے نماز میں، تمہارا خشوع اور نہ تمہارا رکوع پوشیدہ رہتا ہے میں تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے دیکھتا ہوں۔

دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

انی لاراکم من ورائی کما اراکم۔ (بخاری باب عظۃ الامام الناس)

میں جس طرح تم کو دیکھ رہا ہوں اسی طرح میں تم کو پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

---

[1] صحیح بخاری کتب الرویا علی الغیب باب عالم الغیب۔

احادیث میں متعدد صحابہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپؐ خطبہ دے رہے تھے، بعض صاحبوں نے کچھ سوالات کئے جن کو آپؐ نے پسند نہیں کیا، آپؐ کو جوش آگیا، آپ نے فرمایا سلونی شئتم (جو چاہو مجھ سے دریافت کرلو) ایک شخص نے اٹھ کر کہا یا رسول اللہ! میرا باپ کون ہے؟ فرمایا "حذافہ"۔ دوسرے نے اٹھ کر کہا اور میرے باپ کا نام کیا ہے؟ فرمایا "سالم غلام شیبہ"۔ اور بار بار آپؐ فرماتے جاتے تھے، پوچھو مجھ سے پوچھو مجھ سے یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ آگے بڑھے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو اللہ اپنا پروردگار، محمدؐ اپنا رسول اور اسلام اپنا دین پسند ہے[1]۔

صحابہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن آپؐ نے صبح کی نماز پڑھ کر تقریر شروع کی، یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا، ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر عصر تک پھر تقریر کی، اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی، اس سے فارغ ہو کر غروب آفتاب تک پھر تقریر کا سلسلہ جاری رہا، اس طویل خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا یعنی آغاز آفرینش سے لے کر قیامت تک کے واقعات، پیدائش عالم، علامات قیامت، فتن، حشر و نشر سب کچھ سمجھایا، صحابہؓ کہا کرتے تھے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ بہت کچھ بھول گئے، بعضوں کو بہت کچھ یاد ہے، ان واقعات میں سے کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے تو ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی شخص کی صورت ذہن سے اتر جاتی ہے، پھر اس کو دیکھ کر یاد آجاتی ہے[2]۔

نجاشی شاہ حبش جس کے سایہ حکومت میں جا کر مسلمانوں نے پناہ لی تھی اور جس نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا تھا، جس دن اس نے حبش میں وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس سانحہ کی اطلاع دی، آپؐ نے فرمایا کہ آج تمہارے بھائی نجاشی نے وفات پائی اور اس کے بعد اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی[3]۔

۸ھ میں غزوۂ موتہ پیش آیا ہے تو آپؐ نے فوج کا علم زیدؓ بن حارثہ کو عنایت کیا اور فرمایا کہ جب زیدؓ شہید ہوں تو یہ امانت جعفرؓ کے سپرد کی جائے، جب وہ بھی جاں بحق ہوں تو عبداللہؓ بن رواحہ اس خدمت کو انجام دیں اور جب وہ بھی کام آجائیں تو مسلمان اپنے مشورہ سے جس کو چاہیں اپنا سردار بنائیں، یہ افسری اور سرداری کے متعلق ترتیبی بیان درحقیقت واقعہ کا اظہار تھا، میدان جنگ میں پہلے زیدؓ نے شہادت پائی، ان کی جانشینی جعفرؓ نے کی، وہ بھی جب علم نبوت پر قربان ہو چکے تو عبداللہؓ بن رواحہ نے پیش قدمی کی، جب وہ بھی نثار ہو گئے تو مسلمانوں نے خالدؓ بن ولید کو اپنا افسر بنایا، چونکہ اس جنگ میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ تھا، اس لئے مسلمانوں کو بڑا اضطراب تھا، عین اس وقت جب مدینہ سے کوسوں دور شام کی سرحد پر یہ خونی مناظر درپیش تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں منبر پر تشریف فرما تھے، دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور فرما رہے تھے علم کو زیدؓ نے لیا وہ شہید ہوئے، پھر جعفرؓ نے لیا وہ بھی جاں بحق ہوئے تو عبداللہؓ بن رواحہ نے لیا، انہوں نے بھی شہادت پائی تو خالدؓ بن ولید نے لیا اور ان کو فتح دی گئی[4]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب العلم باب الغضب فی الموعظۃ والتعلیم [2] صحیح مسلم باب اخبار النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یکون الی قیام الساعۃ [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز وصحیح مسلم [4] صحیح بخاری کتاب المغازی و باب علامات النبوۃ فی الاسلام و غزوۂ موتہ۔

ایک غزوہ میں ایک شخص نہایت جانبازانہ حملے کر رہا تھا، صحابہ نے دیکھا تو اس کی بڑی تعریف کی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ "یہ جہنمی ہے"۔ صحابہ کو اس پر بڑا تعجب ہوا اور ایک صحابی اس کے پیچھے ہو لیے، ایک موقع پر اس کو سخت زخم لگا اور اس نے بے صبری کی حالت میں خودکشی کر لی، وہ صحابی خدمت مبارک میں دوڑے ہوئے آئے اور کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ خدا کے رسول ہیں"۔ آپ نے فرمایا کہ کیا واقعہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ابھی حضورؐ نے ایک شخص کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ جہنمی ہے، لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تھا، میں اس کے پیچھے ہو لیا، میں نے دیکھا کہ ایک زخم کے صدمہ سے اس شخص نے خودکشی کر لی[1]۔

ایک غزوہ میں ایک شخص شریک تھا، وہ قتل ہوا، کسی نے آ کر خبر دی کہ یا رسول اللہ! فلاں شخص شہید ہو گیا، فرمایا کہ ناممکن ہے، شہادت اس کے لیے کہاں، میں نے اس کو دوزخ میں دیکھا ہے، کیونکہ مال غنیمت میں سے اس نے ایک عبا چرائی تھی[2]۔

مسلمانوں نے ۸ھ میں طائف کا محاصرہ کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو چکا تھا کہ طائف کی فتح اس محاصرہ سے مقدر نہیں، اس لئے ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کل ان شاء اللہ ہم محاصرہ کو چھوڑ کر کوچ کریں گے، لوگوں کو اتنی محنت و زحمت کے بعد حصول فتح کے بغیر واپسی شاق ہوئی اور انہوں نے کہا ہم فتح حاصل کئے بغیر چلے جائیں، آپ نے فرمایا اچھا کل پھر قسمت آزمائی کر لو، چنانچہ دوسرے دن مسلمان لڑے تو ان کو زیادہ نقصانات ہوئے، شام ہوئی تو آپ نے فرمایا: "کل ان شاء اللہ ہم محاصرہ چھوڑ کر چلے جائیں گے"، مسلمانوں کو اس سے تعجب ہوا اور آپ مسکرا دیئے، یہ گویا اس بات کا اظہار تھا کہ تمہیں میری طرح حقیقت حال کا علم نہ تھا[3]۔

عمیر بن وہب اسلام کا سخت دشمن تھا، وہ اور صفوان بن امیہ دونوں خانہ کعبہ میں بیٹھ کر بدر کے مقتولین پر ماتم کر رہے تھے، اور بالآخر ان دونوں میں پوشیدہ طور سے یہ سازش قرار پائی کہ عمیر مدینہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ سے قتل کر آئے اور اگر وہ مارا گیا تو صفوان اس کے تمام قرض اور گھر کے مصارف اور اولاد کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے گا، عمیر یہاں سے اٹھ کر گھر آیا اور تلوار کو زہر میں بجھا کر مدینہ کو چل کھڑا ہوا، مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے اس کو دیکھ لیا وہ اس کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ عمیر یہاں کس ارادہ سے آئے ہو؟ اس نے کہا اپنے بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں، فرمایا کیوں نہیں! کیا تم نے اور صفوان نے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش نہیں کی ہے؟ عمیر یہ راز کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا اور اس کو سخت تعجب ہوا اور بے اختیار بول اٹھا کہ محمد بے شک تم خدا کے پیغمبر ہو، خدا کی قسم! میرے اور صفوان کے سوا کسی تیسرے کو اس معاملہ کی خبر نہ تھی[4]۔

حضرت وابصہ بن معبدؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اس غرض سے حاضر خدمت ہوا کہ نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کروں، لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں، آپ نے فرمایا، وابصہ! میں تمہیں بتاؤں کہ تم کیا پوچھنے آئے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۴۰۶، باب العمل بالخواتیم۔ [2] جامع ترمذی باب ما جاء فی الغلول [3] صحیح بخاری و مسلم غزوۂ طائف [4] تاریخ طبری بروایت عروہ بن زبیر صفحہ ۱۳۵۳ طبع یورپ

ہو؟ عرض کی ارشاد ہو؟ فرمایا، تم نیکی اور گناہ کی حقیقت پوچھنے آئے ہو؟ عرض کی قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، آپ نے سچ فرمایا، ارشاد ہوا، نیکی وہ ہے جس کے کرنے کے خیال سے تمہارے دل میں انشراح اور خوشی پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے، اگرچہ لوگوں نے اس کے کرنے کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے دیا ہو۔[1]

ایک دفعہ ایک صحابیہ نے آپ کی دعوت کی، بکری ذبح کی اور آپ کو اور دیگر رفقاء کو کھانا کھانے کے لئے بلایا آپ تشریف لے گئے اور گوشت کا ایک لقمہ اٹھا کر ابھی چکھا ہی تھا کہ فرمایا یہ بکری اپنے مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے، صحابیہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آل معاذ اور ہمارے خاندان میں پوچھنے گچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ ہماری چیز بے تکلف لے لیتے ہیں اور ہم ان کی چیز۔[2] دوسری روایت میں ہے کہ اس نے جواب دیا کہ ہاں یا رسول اللہ! میں نے اپنی پڑوسن سے یہ بکری مانگی، اس نے اپنے شوہر سے پوچھے بغیر دے دی۔

غزوۂ خیبر میں ایک یہودیہ نے آپ کی دعوت کی، کھانے میں بکری کا گوشت تھا، آپ نے چند رفقاء کے ساتھ اس کو کھانا چاہا، ابھی پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ہاتھ روک لو، اس گوشت میں زہر ملایا گیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ خیبر کے تمام یہود کو جمع کیا جائے، جب وہ جمع ہوگئے تو آپ نے دریافت کیا کہ جو کچھ میں پوچھوں گا سچ سچ بتاؤ گے، انہوں نے ہاں کہا، آپ نے فرمایا تمہارے باپ کا کیا نام ہے، انہوں نے کچھ بتایا، آپ نے فرمایا تم جھوٹے ہو، تمہارے باپ کا یہ نام ہے، اس امتحان کے بعد آپ نے دریافت فرمایا، کیا تم نے بکری کے گوشت میں زہر ملایا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ کو کیونکر معلوم ہوا؟ فرمایا کہ بکری کے اس دست نے مجھ سے کہا ہے۔[3]

حضرت صہیبؓ بن سنان جو صہیب رومی کر کے مشہور ہیں، جس شب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، انہوں نے بھی ہجرت کرنی چاہی لیکن کفار نے ان کو روک دیا، وہ رات بھر کھڑے رہے اور بیٹھنے کا نام بھی نہیں لیا، کفار نے ان کی اس حالت کو دیکھ کر کہا کہ چلو اس کو تو پیٹ کے عارضہ نے خود ہی مجبور کر دیا ہے، یہ کہہ کر وہ چلے گئے، انہوں نے نگہبانوں سے اپنے کو آزاد پا کر مدینہ کا راستہ لیا، کافروں نے ان کو پکڑ لیا، آخر کچھ زر و نقد دے کر ان سے رہائی حاصل کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھنے کے ساتھ فرمایا اے ابو یحییٰ! تمہاری خرید و فروخت بڑے نفع کی رہی، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھ سے پہلے کوئی یہاں آیا نہیں جو اس راز کی آپ کو خبر کرتا، یہ یقیناً آپ کو بذریعہ وحی معلوم ہوا ہے۔[4]

حضرت حذیفہؓ کی والدہ محترمہ نے ایک دن اپنے بیٹے پر عتاب کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اتنے دن ہوگئے کیوں نہ گئے، انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ آج جا کر اپنی اور آپ کی مغفرت کی

---

[1] مسند ابن حنبل حدیث وابصۃ الاسدی و ابو یعلیٰ و بیہقی و ابو نعیم فی حلیۃ الاولیاء۔ ذکر وابصۃ بن معبد الجہنی و بزار۔ [2] سنن نسائی و حاکم فی المستدرک عن جابرؓ۔ [3] سنن ابی داؤد و کتاب الدیات و دارمی کلام الموتی و بیہقی۔ [4] مستدرک حاکم جلد ثالث صفحہ ۴۰۰ بروایت صحیح ذہبی نے بھی اس کی تصریح کی ہے ذکر ہجرۃ صہیبؓ۔

دعا کراؤں گا، چنانچہ وہ مغرب کی نماز میں جاکر حاضر ہوئے، عشاء کی نماز کے بعد جب آپ واپس ہوئے تو یہ بھی پیچھے چلے، آپ نے آواز پہچان کر فرمایا، کون؛ حذیفہ؛ خدا تمہاری اور تمہاری ماں کی مغفرت کرے[1]۔ گویا درخواست سے پہلے ہی حذیفہ کی درخواست سمع اقدس تک پہنچ چکی تھی۔

صحابہؓ کو آپ کی اس قوتِ اطلاع کا اس قدر یقین تھا کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہے صحابہ کو اپنے ایک ایک عمل کا خوف لگا رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ خدا آپ کو اس کی خبر کر دے، یہاں تک کہ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہم لوگ اپنی بیویوں سے بھی کھل کر ملتے ہوئے ڈرتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ ہماری نسبت قرآن میں کچھ نازل ہو جائے تو رسوائی ہو[2]۔ علاوہ ازیں منافقین کے تمام اندرونی حالات اور ناموں سے بھی آپ کو ایک ایک کر کے واقفیت تھی[3]۔

*

---

[1] جامع ترمذی مناقب حسنینؓ [2] صحیح بخاری مسند احمد ج ۲ ص ۶۲ [3] صحیح بخاری۔

اہل کتاب کے سوالات کے جواب دینا

یہ دوست دشمن اور موافق و مخالف سب کو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے نہ تھے یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں سے آپ کو تعلیمی واقفیت نہ تھی، تورات و انجیل اور علمائے یہود و نصاریٰ نے ان کی شرحوں میں یا اپنی دوسری مذہبی تصنیفات میں جو کچھ لکھا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ایک صفحہ بھی ملاحظہ نہیں فرمایا تھا اور یہی وہ چیزیں ہیں اس وقت یہود و نصاریٰ کے ایمان و عقائد کا جزو ہو گئی تھیں اور عوام میں ان ہی کتابوں کو مقبولیت حاصل تھی باایں ہمہ آپ کا ان کے سوالات کا صحیح جواب دینا آپ کی روحانی تعلیم کی کھلی شہادت ہے۔ مکہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کفار عرب کو عموماً آپ کے اس دعویٰ پر یقین نہیں آیا اس لئے انہوں نے معجزات طلب کئے اور جب وہ دکھائے گئے تو ان کو سحر اور جادو کہنے لگے، پھر ان کو خیال آیا کہ یثرب، خیبر اور شام میں جا کر یہودیوں سے ملیں اور ان سے پوچھ کر چند ایسے سوالات دریافت کریں جن کے جوابات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مانگے جائیں اور چونکہ وہ لکھے پڑھے نہیں ہیں اور مکہ میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو اُن کو ان کے جوابات بتا سکے گا، اس لئے وہ ان کے جوابات نہ دے سکیں گے اور اس طرح اس مدعی نبوت کی قلعی کھل جائے گی اور اس کا کذب سب پر واضح ہو جائے گا، اس خیال کی بناء پر وہ یہودیوں سے جا کر ملے، اُن سے آپ کے حالات بیان کئے اور آپ سے پوچھنے کے لئے ان سے چند سوالات مانگے، چنانچہ انہوں نے چند سوالات دیئے کہ یہ جا کر اس سے پوچھو، اگر وہ پیغمبر ہو گا تو ہرگز ان کا جواب نہ دے سکے گا۔

یہ تین تاریخی سوالات تھے، اصحاب کہف کا حال، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کی ملاقات کا واقعہ اور ذوالقرنین کا قصہ، اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں قصے وحی کے ذریعہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دیئے اور آپ نے ان کو پڑھ کر کفار کو سنایا، چنانچہ سورۂ کہف میں یہ تینوں قصے مذکور ہیں اور آخری قصہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ کفار کے سوال کے جواب میں ہے،

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُوا عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا (کہف۔ ۱۱)

اور کفار تجھ سے اے پیغمبر! ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں کہہ دے کہ میں اس کا تھوڑا ذکر تم کو سناتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے جو گویا یہودیوں ہی کا شہر تھا تو انہوں نے بھی مناسب سمجھا کہ اس مدعی نبوت کے دعوائے نبوت کا امتحان ان ہی کتابی سوالات سے لیا جائے، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ وہ ہماری کتابوں سے واقف نہیں، اس لئے وہ ان کے صحیح جوابات نہ دے سکے گا اور اگر اس نے یہ کہہ دیا کہ یہ سوالات یا جن کتابوں میں وہ سوالات مذکور ہیں، وہ غیر معتبر ہیں تو ان سوالوں، اور کتابوں کا اثر یہود میں اس قدر ہے کہ ان کی تکذیب سے خود محمدؐ کی جہالت اور کذب دعویٰ (نعوذ باللہ) کا پردہ فاش ہو جائے گا، لیکن اتنے بڑے مجمع میں سب لوگ بدنیت ہی نہ تھے بلکہ ان میں بعض لوگ نیک نیت بھی تھے اور وہ نیک نیتی سے یہ سمجھتے تھے کہ ہماری کتابوں میں جو مخفی اسرار لکھے ہوئے ہیں، ان کو پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ آئے تو عبد اللہ بن سلام مدینہ کے ایک مشہور یہودی عالم آپؐ سے ملنے آئے اور کہا کہ میں آپؐ سے تین سوال کروں گا جن کا جواب پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا، یہ بتائیے کہ قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟ اور اہل جنت کی پہلی غذا کیا ہوگی؟ اور بچہ کبھی ماں سے اور کبھی باپ سے مشابہ کیوں ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب تک لے جائے گی اور اہل جنت کی پہلی غذا مچھلی کا جگر ہے، اور ماں یا باپ سے بچہ کی مشابہت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جب باپ کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو بچہ باپ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب ماں کا نطفہ سبقت کرتا ہے تو ماں سے مشابہ ہوتا ہے، عبد اللہ بن سلام نے یہ جواب سن کر کہا کہ میں آپؐ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ثوبانؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک یہودی عالم خدمت والا میں حاضر ہوا اور کہا کہ اے محمدؐ! میں تم سے چند سوالات کروں گا تم جواب دو۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے جواب سے تم کو فائدہ ہوگا، اس نے کہا سنو! یہ بتاؤ کہ قیامت کے دن جس وقت آسمان اور زمین بدلے جائیں گے، لوگ کہاں ہوں گے؟ فرمایا پل کے پیچھے تاریکی میں، دوسرا سوال اس نے کیا کہ سب سے پہلے جنت میں جانے کی کس کو اجازت ملے گی؟ جواب دیا ان غریبوں کو جو راہ حق میں گھر سے بے گھر ہوئے ہیں، اس نے کہا اب میں تم سے وہ بات پوچھتا ہوں جس کا جواب روئے زمین پر صرف پیغمبر یا پیغمبر کے علاوہ ایک دو آدمی ہی دے سکتے ہیں، بتاؤ کہ بچہ کبھی لڑکی اور کبھی لڑکا کیوں ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا، مرد کا نطفہ سپید اور عورت کا زرد ہوتا ہے، جب یہ دونوں ملتے ہیں تو اگر مرد کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ خدا کے حکم سے لڑکا ہوتا ہے اور جب عورت کا نطفہ غالب ہوتا ہے تو وہ لڑکی ہوتی ہے، یہودی نے یہ جواب سن کر کہا کہ بے شک تم نبی ہو اور یہ کہہ کر چلا گیا، آپؐ نے فرمایا، یہ جوابات مجھ کو خدا نے القا کئے، مجھے پہلے سے معلوم نہ تھے۔

مسند ابو داؤد طیالسی میں ہے کہ ایک دفعہ چند یہودی خدمت اقدس میں آئے اور کہا کہ ہم آپؐ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں، جن کا جواب پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا، آپؐ نے فرمایا جو تم چاہو پوچھ سکتے ہو لیکن وعدہ کرو کہ اگر میں نے ایسے جوابات دیئے جن کو تم نے صحیح سمجھا تو کیا اسلام قبول کر لو گے؟ انہوں نے کہا ہاں ہم کو یہ شرط منظور ہے، آپؐ نے فرمایا اچھا پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ چار سوالوں کے جواب دیجئے پہلا یہ کہ حضرت یعقوبؑ نے توراۃ کے اترنے سے پہلے جو کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اس کا کیا واقعہ ہے؟ دوسرا یہ کہ ایک ہی نطفہ کبھی نر اور کبھی مادہ کیونکر ہو جاتا ہے؟ تیسرا یہ کہ توراۃ میں نبی امی کی کیا پہچان بتائی گئی ہے؟ اور چوتھا یہ کہ فرشتوں میں سے تمہارا دوست یا نگہبان کون ہے؟ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا، تم کو اس خدا کی قسم جس نے موسیٰ پر توراۃ نازل کی، تم یہ جانتے ہو کہ ایک دفعہ یعقوبؑ سخت بیمار تھے؟ انہوں نے نذر مانی کہ اگر میں اچھا ہو گیا تو کھانے اور پینے کی جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے وہ چھوڑ دوں گا، ان کو کھانے میں سب سے زیادہ اونٹ کا گوشت اور پینے میں اونٹ کا دودھ پسند تھا، چنانچہ صحت کے بعد انہوں نے اونٹ کا گوشت اور دودھ چھوڑ دیا۔

یہودیوں نے کہا خدایا سچ ہے، آپ نے فرمایا، خدایا گواہ رہو۔ پھر فرمایا میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ پر توراۃ نازل کی، تم کو یہ معلوم ہے کہ مرد کا نطفہ گاڑھا اور سپید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور زرد، ان میں جو جنس غالب ہوتی ہے وہ نطفہ بھی خدا کے حکم سے وہی ہو جاتا ہے اور اسی کے مشابہ ہو جاتا ہے، انہوں نے کہا خدایا درست ہے۔ آپ نے فرمایا، خدایا گواہ رہو۔ پھر فرمایا، میں تم کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰؑ پر توراۃ نازل کی، تم کو یہ معلوم ہے کہ اس نبی کی آنکھیں سوئیں گی اور دل نہیں سوئے گا؟ انہوں نے کہا خدایا ہاں، آپ نے فرمایا، خدایا گواہ رہ۔ یہودیوں نے کہا اچھا یہ بتایئے کہ فرشتوں میں آپ کا رفیق کون ہے؟ اس جواب کے معلوم کرنے کے بعد ہم آپ کے ساتھ ہو جائیں گے یا آپ سے الگ ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا میرا رفیق جبرئیل ہے اور دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں ہوا جس کا وہ رفیق نہ ہو، یہودیوں نے کہا، تو ہم پھر آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ ہمارا دشمن ہے۔

صحیح بخاری باب التفسیر (بنی اسرائیل) میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھیت میں جا رہا تھا کہ راہ میں چند یہودی ملے، انہوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ محمدؐ سے کچھ پوچھنا چاہیے، بعضوں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں، شاید وہ کوئی ایسا جواب دیں جو تم کو ناگوار ہو، بالآخر انہوں نے طے کیا کہ بہرحال کچھ پوچھنا چاہیے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ محمدؐ! بتاؤ روح کیا چیز ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ آپ پر وحی نازل ہو رہی ہے، جب وحی نازل ہو چکی تو آپ نے یہ آیت پڑھی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ	وہ پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے، اے پیغمبر، کہہ دے کہ روح میرے
وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل)	پروردگار کی ایک بات ہے اور تم کو علم کا بہت کم حصہ دیا گیا ہے۔

جامع ترمذی (تفسیر بنی اسرائیل) مستدرک حاکم، ج ۱ ص ۹ اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت صفوانؓ بن عسال مرادی روایت کرتے ہیں کہ دو یہودی راستہ میں جا رہے تھے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ پوچھیں، دوسرے نے کہا کہ اس کو پیغمبر نہ کہو تم کو وہ اپنی نسبت پیغمبر کہتے سنے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی، اس کے بعد وہ دونوں آپ کی خدمت میں آئے اور آکر پوچھا کہ موسیٰؑ کو جو نو احکام ملے تھے وہ کیا تھے؟ آپ نے فرمایا وہ یہ تھے کہ شرک ۱ نہ کرو، زنا ۲ نہ کرو، ناحق ۳ قتل نہ کرو، چوری ۴ نہ کرو، جادو ۵ نہ کرو، بے گناہ ۶ کی چغلی نہ کھاؤ، سود ۷ نہ کھاؤ، پاکدامن ۸ عورت پر بہتان نہ باندھو، اور میدان ۹ جنگ سے فرار نہ کرو (راوی کو اس نویں حکم میں شک ہے) پھر فرمایا اور تمہارے لئے اے یہود خاص حکم یہ ہے کہ سبت ۱۰ مناؤ۔ ان دونوں نے یہ جواب سن کر آپ کے دست و پائے مبارک کے بوسے دیئے اور کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ پیغمبر ہیں، آپ نے فرمایا تو پھر تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے، انہوں نے کہا داؤدؑ نے دعا کی تھی کہ اس کی نسل میں ہمیشہ پیغمبر ہوا کرے گا اور اگر ہم مسلمان ہو جائیں تو ہم ڈرتے ہیں کہ یہود ہم کو مار ڈالیں۔

*

اخبارِ غیب یا پیشین گوئی

فطرتِ بشری کے عجز اور بے چارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحرِ ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لیے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کی مدعی ہو اس کی آزمائش اور امتحان کے لیے اسی بحرِ بے کراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دے دے چنانچہ یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیل ہیں اور حجت قائمہ ہے، بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ ان کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی "پیشین گو" ہے، عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں میں "نبی" یا "نابی" جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے اس کے لغوی معنی مخبر اور پیشین گو کے ہیں اور نبوت کے معنی مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں، اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسی قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہانِ نادیدہ کا مخبر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کی یہ کیفیت تھی کہ تمام عرب کاہنوں کے جال میں گرفتار تھا، عرب کے تمام مشرکانہ معابد کاہنوں کے دار السلطنت تھے، جن میں بیٹھ کر وہ عرب کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے تھے، مشہور کاہنوں کے پاس لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے اور ان سے مستقبل اور غیب کی باتیں دریافت کرتے تھے، وہ ایک خاص قسم کی مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں ان کو غیب کی اور مستقبل کی باتیں بتاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے تو ان کے لیے ثبوت نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی ہو سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں پیشین گوئیاں کیں اور مستقبل کے واقعات اور باتوں کو رأی العین کی طرح پیش فرمایا اور وہ سب کی سب بے کم و کاست پوری اتریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پیشین گوئیوں کا صدور مختلف حالتوں میں ہوا اور آپ کو ان کی اطلاع مختلف صورتوں میں دی گئی، مثلاً کبھی قرآن مجید کی وحی کی صورت میں، کبھی عالمِ خواب میں اور کبھی زبانِ صداقت نشان کے عام الفاظ میں جس میں طریقۂ اطلاع کا اظہار نہیں ہے، قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے، خواب کی پیشین گوئیوں کا تذکرہ کچھ عالمِ رؤیا کے بیان میں آچکا ہے، باقی پیشین گوئیاں سطور ذیل میں تحریر ہیں۔

فتوحاتِ عظیمہ کی اطلاع اسلام کا آغاز جس اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں

یہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت کو الٹ دیں گے لیکن پیمبر صادق نے اسی وقت بشارت سنائی کہ مسلمانو! تم عنقریب قسطنطنیہ فتح کرو گے، مدائن تمہارے ہاتھوں میں آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے دست تصرف میں ہوں گے، مصر تمہاری حکومت میں داخل ہوگا، تم سے اور ترکوں سے جن کی چھوٹی آنکھیں اور چوڑے چہرے ہوں گے (ترکستانی و منغولی ترک) جنگ ہوگی۔ دنیا ان میں سے کس واقعہ کی تردید کر سکتی ہے!

یہ پیشین گوئیاں الگ الگ بھی کی گئی ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے اس وقت کی گئیں جب مسلمان مدینہ میں محصور ہو رہے تھے اور تمام عرب مدینہ کو گھیرنے کے لئے امنڈا چلا آرہا تھا اور مسلمان ہر آن اپنی موت کا نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر جب خندق کھودتے ہوئے ایک سخت پتھر حائل ہو گیا تھا اور صحابہ اس کے توڑنے سے عاجز ہو چکے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معجز نما ضرب خارا شگاف سے پتھر کے ٹکڑے کر دیئے تھے تو آپ نے تین ضربیں ماری تھیں اور ہر ضرب کے بعد ایک چنگاری سی اڑتی تھی اور آپ ہر بار نعرہ لگاتے تھے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔	اور تیرے پروردگار کی باتیں سچائی اور انصاف سے پوری ہوئیں اس کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا اور وہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔
(انعام-۱۴)	

بعض صحابہ نے حقیقت دریافت کی، فرمایا، جب میں نے پہلی ضرب ماری تو کسریٰ کے شہر اور ان کے اردگرد میرے سامنے کر دیئے گئے، یہاں تک کہ میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے ان کو دیکھا، حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ! دعا کیجئے کہ وہ فتح ہوں، آپ نے دعا فرمائی، پھر فرمایا، دوسری ضرب میں قیصر کے شہر اور اس کے آس پاس کے مقامات دیکھے، حاضرین نے پھر عرض کی یا رسول اللہ! ان کی فتح کی بھی دعا فرمائیے، آپ نے دعا کی، پھر ارشاد ہوا کہ تیسری ضرب میں حبشہ کے شہر اور گاؤں نگاہوں کے سامنے آئے، پھر فرمایا، حبشہ والے جب تم سے تعرض نہ کریں تم بھی تعرض نہ کرو اور ترکوں کو اس وقت تک چھوڑ دو جب تک وہ تمہیں چھوڑ دیں[2]۔

یہ پیشین گوئی تو تمثیلی شکل میں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلے اور صریح الفاظ میں بھی بشارت سنائی تھی، فرمایا تم لوگ جزیرۂ عرب میں لڑو گے اور خدا فتح دے گا، پھر فارس سے لڑو گے اور فتح ہوگی، پھر روم سے لڑو گے اور فتح ہوگی[3]۔

قیصر و کسریٰ کی بربادی کی خبر عین اس وقت جب کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں پورے جاہ و جلال سے دنیا پر حکمران تھیں اور بظاہر ان کی بربادی کا کوئی سامان نہ تھا کہ مکہ کے منادی حق نے یہ پیشین گوئی کی، اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده واذا هلك قيصر فلا قيصر بعده۔ جب کسریٰ ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا اور جب قیصر ہلاک ہوگا تو پھر دوسرا قیصر نہ ہوگا[4]۔

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام میں یہ حدیثیں ہیں۔ [2] سنن نسائی کتاب الجہاد [3] صحیح مسلم کتاب الفتن

[4] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ و صحیح مسلم وغیرہ۔

نہ صرف تاریخ بلکہ آج بھی دنیا کا مشاہدہ اس آواز کی صداقت سے معمور ہے، ایرانی مجوسیوں کی شہنشاہی کی شکست کے بعد کیا پھر کسی ایرانی مجوسی شہنشاہ کا تاج خسروی کسی نے دیکھا اور رومی شہنشاہی کی بربادی کے بعد رومی قوم کا وجود بھی اس سطح زمین پر کہیں نظر آیا؟

سازو سامان کی بشارت

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ میرے گھر تشریف لائے اور دریافت کیا کہ کیا قالین ہے، عرض کی ہمارے پاس قالین کہاں، ارشاد فرمایا کہ عنقریب تم قالینوں اور عمدہ فرشوں پر بیٹھو گے، حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ وہ دن آیا جب ہم قالینوں پر بیٹھے، اب میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ قالین ہٹا لے جاؤ، تو وہ کہتی ہے کہ یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی ہے[1]۔

امن وامان کی بشارت

عدی بن حاتم کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا کہ دو شخص آئے، ایک نے بھوک کی اور دوسرے نے رہزنی کی شکایت کی، آپؐ نے عدی کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا، کیوں عدی، تم نے حیرہ کو دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا، دیکھا تو نہیں، لیکن اس کو جانتا ہوں، آپؐ نے فرمایا اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک ہودج نشین عورت چل کر خانہ کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا، اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کا خزانہ فتح کر لیا گیا، اگر تم زندہ رہے تو دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونا چاندی لے کر نکلے گا کہ کسی کو خیرات دے لیکن دولت کی کثرت کا یہ عالم ہوگا کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا۔ عدیؓ کے دل میں یہ بات کھٹکی تھی کہ آخر قبیلہ طے کے وہ ڈاکو کیا ہو جائیں گے جنہوں نے تمام ملک میں آگ لگا رکھی ہے، لیکن خود عدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے دیکھ لیا کہ حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت تنہا چل کر آتی ہے اور خانہ کعبہ کا طواف کر کے واپس جاتی ہے اور اس کو خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوتا، ان کا بیان ہے کہ جن لوگوں نے کسریٰ کا خزانہ فتح کیا ان میں میں بھی تھا، صرف تیسری پیشین گوئی میرے سامنے پوری ہونے سے رہ گئی ہے جو لوگ زندہ رہیں گے وہ اس کو بھی پورا ہوتے ہوئے دیکھ لیں گے[2]۔ چنانچہ راویوں کا بیان ہے کہ بنوامیہ کی سلطنت کے زمانہ میں یہ واقعہ بھی بعینہٖ گزرا۔

ابو صفوان کے قتل کی خبر

ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو مدینہ منورہ کا دارالامان مل گیا اور اسلام روز بروز ترقی کرنے لگا تو یہ دیکھ کر قریش کے سردار مدینہ پر حملہ کی تدبیریں سوچنے لگے، اسی اثنا میں انصار کے ایک رئیس سعدؓ عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ معظمہ گئے اور ابو صفوان (امیہ) کے گھر جا کر مہمان ہوئے، ابو صفوان ایک دفعہ موقع پا کر ان کو طواف کرانے لایا، وہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوجہل نکل آیا، اس نے کہا تم مکہ آکر بے خوف وخطر کعبہ کا طواف کرتے ہو، حالانکہ تم نے بے دینوں (مسلمانوں) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے اور سمجھتے ہو کہ خدا ورسول کی تم نصرت کر رہے ہو، خدا کی قسم! اگر ابو صفوان کے ساتھ تم نہ ہوتے تو یہاں سے سلامت گھر نہ جا سکتے، حضرت سعدؓ نے ڈانٹ کر جواب دیا کہ اگر تم ہم کو طواف نہ کرنے دو گے تو ہم تمہارا قافلہ تجارت مدینہ کے راستہ سے گزرنے نہ دیں گے، ابو صفوان نے کہا کہ اے سعد!

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ [2] ایضاً

ان سے سخت لہجہ میں گفتگو نہ کرو، یہ اس وادی کے سردار ہیں۔

حضرت سعدؓ نے کہا اے صفوان! اپنی طرف داری رہنے دو، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تم عنقریب مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے جاؤ گے، ابوصفوان نے کہا کیا وہ یہاں آ کر مجھے ماریں گے، انھوں نے جواب دیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ یہ سن کر ابوصفوان کے بدن پر رعشہ پڑ گیا، وہ گو کافر تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ دہن رسالت سے آج تک کوئی غلط بات نہیں نکلی، چنانچہ اس کے بعد بدر کی لڑائی کا موقع پیش آیا تو اس کی بیوی نے جانے سے روکا اور سعدؓ کی پیشین گوئی یاد دلائی، ابوصفوان نے بھی ڈر کر اس فوج میں شرکت سے انکار کر دیا، لیکن ابوجہل اس کو سمجھا بجھا کر لے گیا، بالآخر اسی کارزار میں یہ پیشین گوئی پوری ہوئی[1]

نام بنام مقتولین بدر کی خبر

بدر کا معرکہ جب پیش آنے والا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر میدان میں گئے اور بتایا کہ یہ فلاں کافر کی قتل گاہ ہے، یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہاں قریش کا وہ بڑا سردار مارا جائے گا، یہ عجیب و غریب پیشین گوئی تھی۔ تین سو سالھے تین سو نیم مسلح بے سروسامان سپاہیوں کا افسر ایک ہزار سے زیادہ سپاہیوں کی غرق آہن باساز و سامان فوج کی شکست اور افسروں کے قتل و موت کا اعلان کر رہا تھا، صحابہ کہتے ہیں کہ ہر سردار قریش کے لئے آپ نے جو جگہ مقرر فرما دی تھی وہیں اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پائی گئی[2]

فاتح خیبر کی تعیین

خیبر میں یہودیوں کے متعدد مستحکم اور مضبوط قلعے تھے، ہر روز مسلمان افسر علم و فوج لے کر جاتے تھے اور زور آزمائی کرتے تھے اور شام کو ناکام واپس آتے تھے ایک دن آپؐ نے فرمایا کہ کل علم میں اس کے ہاتھ میں دوں گا جس کو خدا اور اس کا رسول پیار کرتا ہے اور اسی کے ہاتھ پر کل فتح ہوگی، اسلام کے صف میں ہر حوصلہ مند شمشیر زن نے کل کی توقع پر بے قراری میں رات بسر کی، کوکبۂ صبح جب طلوع ہوا تو حضرت علیؓ پردۂ غبار سے نمودار ہوئے، حضرت ممدوح کو آشوب چشم تھا اس لئے وہ ساتھ نہ آسکے تھے، آپؐ نے حضرت علیؓ کے ہاتھ میں علم دیا اور خیبر کا میدان اسی دن ان کے ہاتھوں سے سر ہوا[3]

حضرت فاطمہ زہراؓ کی وفات کی اطلاع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں ایک دفعہ حضرت فاطمہؓ کو اپنے پاس بلایا اور ان کے کان میں کوئی بات کہی کہ وہ رونے لگیں، تھوڑی دیر کے بعد ان سے ایک اور بات کہی کہ وہ ہنسنے لگیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھ کو دیکھ کر تعجب ہوا اور ان سے اس کا سبب دریافت کیا، انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہ کا راز ظاہر نہیں کر سکتی، جب آپؐ کی وفات ہو گئی تو حضرت عائشہؓ نے دوبارہ ان سے دریافت کیا، حضرت فاطمہؓ نے کہا ہاں اب میں بتا سکتی ہوں، حضورؐ نے پہلے مجھ سے یہ فرمایا کہ میں اسی بیماری میں انتقال کروں گا اور پھر

---

[1] صحیح بخاری آغاز کتاب المغازی۔ [2] صحیح مسلم غزوہ بدر۔ [3] صحیح بخاری فتح خیبر

فرمایا اے فاطمہؓ! میرے اہل بیت میں سب سے پہلے تم آکر مجھ سے ملوگی[1]، یہ دونوں باتیں صحیح ثابت ہوئیں آپؐ نے اسی مرض میں وفات پائی اور آپؐ کی وفات کے تقریباً چھ ہی مہینوں کے بعد حضرت فاطمہ زہراؓ بھی اس دنیا سے چل بسیں۔

خود اپنی وفات کی اطلاع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سال وفات پائی آپؐ نے اسی سال اس دنیا سے اپنی تشریف بری کا عام اعلان کر دیا تھا، حجۃ الوداع سے پہلے معاذؓ کو داعی اسلام بنا کر یمن بھیجا تھا، ان کو رخصت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا معاذؓ! اب اس کے بعد تم مجھ سے نہ مل سکو گے، واپس آؤ گے تو میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو گے، یہ سن کر وہ رونے لگے۔ حجۃ الوداع کے مجمع میں ہزاروں مسلمانوں کے روبرو آپؐ نے فرمایا، شاید کہ آئندہ سال تم مجھے نہ پاسکو گے۔ مرض الموت سے کچھ دن پیشتر فرمایا کہ خدا نے اپنے بندہ کو دنیا اور آخرت کی زندگی کا اختیار دیا تو اس نے آخرت کی زندگی پسند کی[3]۔

فتح یمن کی خبر

یمن ۸ھ میں فتح ہوا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فتح اور وہاں کے مسلمانوں کی دور دراز ملکوں میں ہجرت کی خبر پہلے ہی دے دی تھی، آپؐ نے فرمایا تھا، یمن فتح کیا جائے گا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اہل و عیال اور جو ان کا کہا مانیں گے ان کو لے کر آئیں گے، حالانکہ مدینہ ہی کا قیام ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ جانتے[4]۔ آخر یمن خود آپؐ کی زندگی ہی میں فتح ہوا اور وہاں سے لوگ نکل نکل کر ایک طرف مشرق میں خراسان اور ترکستان تک اور دوسری طرف مغرب میں افریقہ اور سپین تک پھیل گئے اور پھر ان تمام ملکوں میں یمنی اور حجازی قبائل کی باہمی خانہ جنگی کے باعث تباہی، تاریخ کے مشہور و معروف واقعات ہیں۔

فتح شام کی خبر

پھر فرمایا اور شام مفتوح ہوگا تو لوگ اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اور اپنے اہل و عیال اور ہمراہیوں کو لے کر آئیں گے اور مدینہ ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ جانتے[5]۔ امام احمد نے مسند میں روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا، عنقریب تم لوگ شام کی طرف ہجرت کرو گے تو وہ تمہارے لئے فتح کر دیا جائے گا[6]۔ معلوم ہے کہ شام فتح ہونے کے ساتھ وہ عربوں کا مسکن بن گیا اور آج بھی ان کی آبادی وہاں سب سے زیادہ ہے۔

فتح عراق کی خبر

پھر ارشاد ہوا کہ عراق مفتوح ہوگا اور لوگ وہاں بھی اپنی سواریوں کو ہنکاتے ہوئے اہل و عیال کو لے کر آئیں گے، حالانکہ مدینہ ان کے لئے بہتر تھا اگر وہ سمجھتے[7]۔ فتح عراق کی بعض اور روایتیں بھی ہیں۔

خوزستان اور کرمان کی فتوحات اور ترکوں سے جنگ

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت سے پہلے تم لوگ ایسے لوگوں سے لڑو گے جن

---

[1] صحیح مسلم باب الفضائل و صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۳۵ [3] صحیحین مناقب ابی بکرؓ [4] صحیح مسلم کتاب الحج و موطا امام مالک و عبدالرزاق و ابن خزیمہ و ابن حبان [5] بحوالہ سابق [6] مسند ابن حنبل بروایت معاذؓ [7] صحیح مسلم کتاب الحج و موطا امام مالک۔

کے جوتے بال کے ہوں گے[1]۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی جب تک تم خوز و کرمان کے عجمیوں سے نہ لڑو گے، جن کے چہرے سرخ، ناکیں چپٹی، آنکھیں چھوٹی ہوں گی، ان کے چہرے ہتھوڑوں سے پٹی ہوئی ڈھالوں کے مانند ہوں گے (یعنی چوڑے چپٹے) اور ان کے جوتے بال کے ہوں گے[2] اور روایتوں میں یہ الفاظ ہیں، اس وقت تک قیامت نہ آئے گی جب تک مسلمان ترکوں سے نہ لڑلیں جن کے چہرے چپٹے ہوں گے، جن کے لباس بال کے ہوں گے اور بال ہی کے موزے یا جوتے پہن کر وہ چلتے ہوں گے[3] یہ تمام پیشین گوئیاں پہلی ہی صدی کے آخر تک پوری ہو گئیں۔

فتح مصر کی بشارت اور ایک واقعہ کا حوالہ

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، تم عنقریب مصر فتح کرو گے جہاں کا قیراط مشہور ہے، جب اس کو فتح کرو تو وہاں کے باشندوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا کیونکہ تمہارے ان کے درمیان تعلق اور رشتہ ہے (حضرت ابراہیمؑ کی بیوی اور حضرت اسمٰعیلؑ کی ماں ہاجرہ مصر کی تھیں) اور جب تم دیکھنا کہ وہاں ایک اینٹ بھر جگہ کے لئے دو آدمی لڑتے ہوں تو وہاں سے نکل جانا، تو حضرت ابوذرؓ نے بعینہٖ ایسا ہی دیکھا اور وہ وہاں سے واپس چلے آئے[4]۔

غزوۂ ہند کی خبر

ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان یہ سن کر خوش ہوں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان قدسی بیان سے ہندوستان میں اسلام کے داخل اور غالب ہونے کی خوشخبری سنائی تھی، آپؐ نے فرمایا میری امت کے دو گروہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ آتش دوزخ سے بچائے گا، ایک وہ جو ہندوستان کے غزوہ میں شریک ہوگا، دوسری روایت میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے (مسلمانوں سے) ہندوستان کے غزوہ کا وعدہ فرمایا تھا تو اگر میں نے وہ زمانہ پایا تو اس کی راہ میں اپنی جان و مال قربان کر دوں گا تو اگر میں اس میں شہید ہوا تو بہترین شہید ٹھہروں گا اور اگر زندہ لوٹا تو میں آتش دوزخ سے آزاد ابوہریرہ ہوں گا[5]۔ یہ پیشین گوئیاں امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ کی سنن میں جو سلطان محمود کے حملہ ہندوستان (۳۹۲ھ) تقریباً سو برس پہلے لکھی گئی ہے۔

بحر روم کی لڑائیاں

بحر روم جس کو بحر اخضر اور بحر متوسط (مڈیٹرینین سی) بھی کہتے ہیں، یورپ اور ایشیا کی اور اب گویا اسلام اور عیسائیت کی حد فاصل ہے اور اس زمانہ میں یہ رومیوں کی بحری قوت کا جولانگاہ تھا، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خواب راحت سے مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے اور فرمایا اس وقت خواب میں میری امت کے کچھ لوگ تخت شاہی پر بادشاہوں کی طرح بیٹھے ہوئے دکھائے گئے، یہ بحر اخضر میں (جہاد کے لئے) اپنے جہاز ڈالیں گے[6]۔ یہ بشارت سب سے پہلے امیر معاویہؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور دیکھا گیا کہ دمشق کی سرزمین پر اسلام میں سب سے پہلے تخت شاہی بچھایا جاتا ہے اور دمشق کا شہزادہ یزید اپنی سپہ سالاری

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] ایضاً [3] ایضاً [4] صحیح مسلم باب الوصیۃ باہل مصر کتاب فضائل الصحابہ و مسند احمد ج ۵ ص ۱۷۳ عن ابی ذر، و مسند ابی عوانہ و ابن حبان [5] یہ دونوں روایتیں سنن نسائی کتاب الجہاد میں ہیں [6] صحیح بخاری باب کتاب الرویا النہار و مسلم باب الغزوۃ البحر کتاب الامارۃ و ابوداؤد کتاب الجہاد۔

میں مسلمانوں کا پہلا لشکر لے کر بحر اخضر میں جہازوں کے بیڑے ڈالتا ہے اور دریا کو عبور کر کے قسطنطنیہ کی چہار دیواری پر تلوار مارتا ہے۔

بیت المقدس کی فتح بیت المقدس اسلام کا دوسرا قبلہ ہے اور اس کی تولیت امت محمدیہ کا حق تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس تولیت کی بشارت دے دی تھی اور فرمادیا تھا کہ میری موت کے بعد یہ واقعہ پیش آئے گا، عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے چند واقعے گن رکھو (اول) میری موت، پھر بیت المقدس کی فتح[1]، اس کے بعد آپؐ نے چار اور باتیں بیان فرمائیں یہ بشارت حضرت عمرؓ کے عہد میں ۱۶ھ میں پوری ہوئی۔

فتح قسطنطنیہ کی بشارت فتح قسطنطنیہ کی متعدد بشارتیں ہیں، ایک دفعہ فرمایا کہ تم لوگ یقیناً آئندہ قیصر کے خزانوں پر متصرف ہو گئے[2]۔ اور فرمایا میری امت کی ایک جماعت بحیرہ اخضر (بحیرہ روم) جس کے ساحل پر قسطنطنیہ ہے، سوار ہوگی[3] مسلمانوں کی پہلی جماعت اسی قسطنطنیہ کی فتح کے لئے اس دریا میں سوار ہوئی، آثار قیامت کے سلسلہ میں فرمایا، یہ ہوگا، یہ ہوگا، پھر تم قسطنطنیہ فتح کر دو گے[4]۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا، تم لوگ بے شبہ قسطنطنیہ فتح کر دو گے تو اس کا حاکم (مسلمان) کتنا اچھا حاکم ہوگا اور وہ فتح کرنے والی فوج کیسی اچھی فوج ہو گی[5]۔ مسلمان خلفاء اور سلاطین میں سے ہر باہمت نے اس کو پورا کرنے کے لئے قسمت آزمائی کی مگر ازل سے یہ سعادت سلطان محمد فاتح کی قسمت میں آچکی تھی۔

فتح روم کا اشارہ جس طرح قسطنطنیہ مشرقی رومی سلطنت کا پایۂ تخت تھا، رومیہ (روم) مغربی رومی سلطنت کا دارالحکومت تھا اور جو اب اٹلی کا پایۂ تخت ہے، یہ مغربی عیسائیوں کا مقدس شہر ہے، گو صاف اور صریح الفاظ میں نہیں لیکن اشارہ پایا جاتا ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو اس کی فتح کی بشارت دی تھی، چنانچہ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اسپین اور مغرب کے مسلمانوں نے اس کے مناروں کے اوپر بھی اسلام کا علم ایک دفعہ بلند کر دیا تھا، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے کسی نے پوچھا کہ پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ؟ انھوں نے اپنی یادداشت کے کاغذوں کو دیکھ کر جواب دیا کہ ہم لوگ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد حاضر تھے کہ کسی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ پہلے قسطنطنیہ فتح ہوگا یا رومیہ؟ فرمایا نہیں پہلے ہرقل کا شہر فتح ہوگا[6]، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیہ کے متعلق جو زیادہ وضاحت نہیں فرمائی، اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ مسلمانوں کی حکومت کا وہاں فتح کے بعد قسمت الٰہی میں باقی رہنا منظور نہ تھا۔

فاتح عجم کا اشارہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی میں مکہ معظمہ گئے تھے، وہاں جا کر وہ اس قدر سخت بیمار پڑے کہ ان کو اپنی زندگی کی امید نہ رہی، آنحضرت

---

[1] صحیح بخاری باب الجزیہ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم [3] صحیح بخاری رکوب البحر و علامات النبوۃ و باب الرؤیا فی النہار
[4] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الفتن [5] مسند احمد عن ابی عبداللہ بن ابی بشر الخثعمی و حاکم و ابن ابی شیبہ [6] ایضاً عن ابی قبیل التابعی عن عبداللہ بن عمرو بن العاص ج ۲ ص [illegible] ابن ابی شیبہ۔

صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو ان کا اضطراب دیکھ کر ان کو تسلی دی اور ان کے حق میں دعا کی اور فرمایا کہ تم اگر خدا نے چاہا تو ابھی نہیں مرو گے، تم اگر خلوص سے کام کرو گے تو درجہ عظیم ملے گا، بہتیرے لوگوں کو تم سے فائدہ اور بہتوں کو تم سے نقصان پہنچے گا، یہ حضرت سعدؓ کے عجمی فتوحات کی بشارت تھی کہ حضرت سعدؓ نے سپہ سالار اسلام بن کر بڑا درجہ پایا اور چند سال میں کسریٰ کا تاج و تخت چھین لیا اور اس طرح مسلمانوں کو ان کی ذات سے فائدہ عظیم اور مجوسیوں کو نقصان عظیم پہنچا۔[1]

مرتدین کی اطلاع

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں عرب کے متعدد اطراف میں دعویداران کاذب پیدا ہو گئے اور بہت سے لوگ جو اسلام کا کلمہ پڑھ چکے تھے ان کے ساتھ ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کی پہلے ہی اطلاع دے دی تھی، فرمایا کہ حوض کوثر پر بہت سے لوگ آئیں گے، میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں، لیکن فرشتے ان کو دھکے دے کر نکال دیں گے اور کہیں گے کہ یا رسول اللہ! آپ کو معلوم نہیں کہ یہ آپ کے بعد بدل گئے تھے۔[2]

حضرت زینبؓ کی وفات کی اطلاع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہراتؓ کو اطلاع دی تھی کہ تم میں سب سے پہلے مجھ سے آکر وہ ملے گی جس کا ہاتھ سب سے لمبا ہو گا، ازواج مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس پیشین گوئی کے مطابق وہ اپنے اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ہم میں سے سب سے پہلے حضرت زینبؓ نے وفات پائی تو ہم سمجھے کہ ہاتھ کی لمبائی سے حضورؐ کا کیا مقصد تھا، ہاتھ کا لمبا ہونا عربی میں کشادہ دستی اور فیاضی سے کنایہ ہے، زینبؓ ہم سب سے زیادہ کشادہ دست تھیں۔[3]

ام ورقہ کو شہادت کی خوشخبری

ام ورقہؓ ایک صحابیہ تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدر کا ارادہ کیا تو انہوں نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھ کو بھی اس میں شرکت کی اجازت دیجئے، شاید کہ خدا مجھے شہادت نصیب کرے، فرمایا، تم اپنے گھر ہی میں رہو تمہیں شہادت نصیب ہو گی، چنانچہ وہ زندگی ہی میں اس پیشین گوئی کے مطابق شہیدہ کہلاتی تھیں، ان کے پاس ایک غلام اور ایک لونڈی تھی، حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان دونوں نے مل کر ایک رات ان کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس طرح اطلاع نبویؐ کے مطابق انہوں نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی۔[4]

خلفاء کی بشارت

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا، بنی اسرائیل کی سرداری اور نگہبانی انبیاء کرتے تھے، جب کوئی نبی مرتا تھا تو دوسرا نبی اس کا قائم مقام ہوتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے۔[5]

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و نسائی باب الوصایا۔ [2] صحیحین حدیث کوثر۔ [3] صحیح مسلم فضائل حضرت زینبؓ۔ [4] سنن ابی داؤد باب الامامۃ و ابن راہویہ۔ [5] صحیح مسلم کتاب الامارۃ۔

بارہ خلفاء

آپ کے بعد بارہ خلفاء کے ہونے کی بشارتیں حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں آئی ہیں صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں، اس وقت تک یہ اسلامی حکومت اچھی رہے گی، جب تک اس پر بارہ آدمی حکومت کریں گے۔ یہ حکومت اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک اس پر بارہ خلیفہ حکمران نہ ہولیں، بارہ خلیفوں تک اسلام معزز اور محفوظ رہے گا، میرے بعد قریش میں سے بارہ خلیفہ ہوں گے، پھر چھوٹے لوگ ہوں گے، ابوداؤد کتاب المہدی میں یہ الفاظ ہیں، یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، یہاں تک کہ اس میں بارہ خلیفہ گزر جائیں، ان[2] پر تمام امت مجتمع ہوگی، علمائے اہل سنت میں سے قاضی عیاض اس حدیث کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ تمام خلفاء میں سے بارہ وہ شخص مراد ہیں جن سے اسلام کی خدمت بن آئی اور وہ متقی تھے، حافظ ابن حجر ابوداؤد کے الفاظ کی بناپر خلفائے راشدین اور بنی امیہ میں سے ان بارہ خلفاء کو گناتے ہیں جن کی خلافت پر تمام امت کا اجتماع رہا یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، امیر معاویہؓ، یزید، عبدالملک، ولید، سلیمان، عمر بن عبدالعزیزؒ، یزید ثانی، ہشام۔ شیعہ فرقہ تو اس حدیث کی تشریح میں اپنے بارہ اماموں کو پیش کردے گا۔

خلافت راشدہ کی مدت

فرمایا، خلافت (یعنی خلافت راشدہ) میرے بعد تیس برس ہوگی، پھر بادشاہی ہوجائے گی[3] یہ تیس سال کی مدت حضرت علیؓ کی خلافت پر تمام ہوتی ہے۔

خلافت کی مدت	خلیفہ کا نام	خلافت کی مدت	خلیفہ کا نام
؁۱۱ھ تا ؁۱۳ھ	حضرت ابوبکرؓ	؁۲۳ھ تا ؁۳۵ھ	حضرت عثمانؓ
؁۱۳ھ تا ؁۲۳ھ	حضرت عمرؓ	؁۳۵ھ تا ؁۴۰ھ	حضرت علیؓ

شیخین کی خلافت کی پیشین گوئی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گو صریح اور صاف الفاظ میں اپنے جانشینوں کی تعیین نہیں فرمادی تھی مگر آپ کو یہ علم بخشا جاچکا تھا کہ حالات اس طرح رونما ہوں گے، ایک دفعہ آپ نے بیان فرمایا کہ میں سویا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک کنوئیں کی جگت پر دیکھا جس پر ڈول پڑا ہوا تھا، میں نے اس میں سے اتنے ڈول پانی نکالے جتنے خدا نے چاہے، پھر اس ڈول کو ابو قحافہ کے بیٹے ابوبکرؓ نے لیا، انہوں نے بھی اس سے ایک ڈول پانی کھینچا، مگر ان کے کھینچنے میں کسی قدر ضعف تھا، خدا ان کو معاف کرے، پھر یہ ڈول ایک بڑا سا ڈول بن گیا، تو خطاب کے بیٹے (عمرؓ) نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس طرح کھینچا کہ کسی طاقتور آدمی کو میں نے ان کے برابر کھینچتے نہیں دیکھا یہاں تک کہ حوض لبالب بھر گیا اور پینے والوں کا چاروں طرف سے ہجوم ہوگیا[4]

یہ خلافت صدیقی و فاروقی کی تمثیلی پیشین گوئی ہے جس کی آئندہ واقعات نے حرف حرف تصدیق کی۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الامارۃ [2] مقدمہ تاریخ الخلفاء سیوطی [3] جامع ترمذی کتاب الفتن، سنن ابی داؤد، حاکم، نسائی، بیہقی [4] صحیح بخاری کتاب المناقب کتاب الرؤیا، صحیح مسلم مناقب، آخری فقرے حتی ضرب الناس بعطن کا مرادی ترجمہ ہے لفظی نہیں، دیکھو فتح الباری ج ۱۲، ص ۳۶۴۔

مسلمانوں کو دولت کی کثرت اور فتنوں کے ظہور سے آگاہ کرنا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن فتنوں کا آغاز ہوا اور مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں پیش آئیں ان کا پورا پورا علم آپ کو عطا ہوا تھا اور اسی لئے آپ نے بار بار مسلمانوں کو اس سے متنبہ کر دیا تھا، ایک دفعہ آپ صحابہ کے ساتھ شہر سے باہر تھے، آپ نے ہمراہیوں سے پوچھا کہ مجھ کو جو نظر آرہا ہے وہ تم دیکھ رہے ہو؟ سب نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں پر بارش کی طرح فتنے برس رہے ہیں[1]، دوسری دفعہ فرمایا۔ خدا کی قسم! مجھ کو تم پر فقر و فاقہ کا خوف نہیں بلکہ دولت کا خوف ہے کہ جس طرح تم سے پہلوں پر دنیا پھیلا دی گئی تھی، تم پر بھی پھیلا دی جائے، تو تم اس میں آپس میں رشک و حسد کرنے لگو اور جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو غافل کر دیا تم کو بھی غافل کر دے[2]۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔ دیکھو میرے بعد ایک دوسرے کی گردن نہ مارنے لگنا۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا۔ ایک زمانہ آئے گا کہ تمہارے سامنے دن کو ایک کھانے کا پیالہ اور رات کو دوسرے کھانے کا پیالہ آئے گا اور کعبہ کے پردوں کی طرح (یعنی قیمتی اور عمدہ) تمہارے لباس ہوں گے، حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم اس حالت میں اچھے ہیں یا اس حالت میں اچھے رہیں گے؟ فرمایا نہیں تم اس حالت میں اچھے ہو کہ تم سب باہم ایک دوسرے سے محبت اور پیار کرتے ہو اور اس وقت تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹو گے[3]۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ مجلس میں رونق افروز تھے، فرمایا کہ میرے بعد اختلاف اور فتنہ ہو گا، لوگوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ تو اس وقت ہم کو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ امیر اور اس کے رفقاء کا ساتھ دینا[4]۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا، عنقریب میرے بعد کچھ فتنے پیدا ہوں گے جن میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے اور کھڑا ہونے والا چلنے والے سے اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہو گا[5]۔

حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد فتنوں کا ظہور ہو گا

خلافتِ راشدہ کے عہد میں جو فتنے برپا ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی اطلاع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی دے دی تھی اور آپ نے بعض صحابہ کو بتا دیا تھا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے پوچھا کہ حضورؐ نے فتنہ کی نسبت جو فرمایا تھا وہ کس کو زیادہ یاد ہے، حضرت حذیفہؓ نے کہا مجھے یاد ہے۔ انسان کو اہل و عیال اور دولت و مال میں جو فتنہ پیش آتا ہے وہ نماز، صدقہ، اچھی باتوں کے کہنے اور بری باتوں کے روکنے سے دور ہو جاتا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا میں اس کی نسبت نہیں پوچھتا۔ میں اس فتنہ کو پوچھتا ہوں جو سمندر کی موجوں کی طرح لہریں لے گا۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا اے امیر المومنین! اس فتنہ سے آپؓ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا کہ اس کے اور آپ کے درمیان ایک بند دروازہ ہے، دریافت فرمایا کہ کیا یہ دروازہ کھول دیا جائے گا یا توڑ دیا جائے گا، حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا توڑ دیا جائے گا، حضرت عمرؓ نے کہا تو یہ دروازہ کبھی بند نہ ہو سکے گا، حضرت حذیفہؓ نے کہا ہاں ایسا ہی ہے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفتن و حجۃ الوداع [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الفتن [3] مسند احمد حدیث علی [4] طبری و مستدرک و تر

[5] مستدرک حاکم جزء ۳ صفحہ ۹۹ ذہبی نے اس کو صحیح کہا ہے [6] صحیح بخاری کتاب الفتن۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے حضرت حذیفہؓ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ کو معلوم تھا کہ وہ دروازہ کون تھا؟ انھوں نے جواب دیا ہاں بے شک اُن کو اس کا اسی طرح علم تھا جس طرح اس بات کا علم ہے کہ آج کے بعد کل آئیگا۔ راوی کہتا ہے میں لحاظ سے نہ پوچھ سکا کہ وہ دروازہ کون تھا؟ اس لئے مسروق (تابعی) سے کہا کہ وہ حضرت حذیفہؓ سے اس کو دریافت کریں، مسروق نے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ دروازہ خود حضرت عمرؓ کا وجود تھا۔ یہ دروازہ جب سے ٹوٹا تو کس کو معلوم نہیں کہ اسلام پر فتنوں کا سیلاب امنڈ آیا۔

فتنے مشرق کی جانب سے اٹھیں گے

مستند اور معتبر حدیثوں میں پوری تصریح کے ساتھ بروایات کثیرہ مذکور[2] ہے کہ اسلام میں فتنوں کا آغاز مشرق کی طرف سے ہوگا، آپؐ نے انگلی سے اشارہ کرکے بار بار فرمایا کہ ادھر سے جدھر شیطان کی سینگیں یعنی سورج کی کرنیں نکلتی ہیں، یہ اشارہ عرب سے مشرق کی جانب تھا یعنی عراق کی طرف، دیکھو حضرت عمرؓ کا قاتل مجوسی تھا، حضرت عثمانؓ کے عہد کا فتنہ عراق ہی سے اٹھ کر مصر تک پھیلا۔ جنگِ جمل اسی سرزمین پر ہوئی، حضرت علیؓ یہیں شہید ہوئے، امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی جنگ صفین یہیں پیش آئی، خوارجِ اسلام کا پہلا گمراہ کن فرقہ یہیں سے نکلا، جبریہ اور قدریہ وغیرہ اسلام کے دیگر فرقوں کی یہ بدعتیں جنھوں نے اسلامی عقائد کی سادگی کو پارہ پارہ کردیا یہیں پیدا ہوئے، جگر گوشۂ رسول اور خانوادۂ نبوت کا قافلہ یہیں فرات کے کنارے لٹا، مختار نے ادعائے کاذب کا فتنہ یہیں پیدا کیا، شیعیت جس نے اسلام کو دو حصوں میں منقسم کیا یہیں کی پیداوار ہے، حجاج کی سفاکیاں اسی سرزمین پر ہوئیں، ترک و تاتار کی غارت گریوں کے نتائج جنھوں نے اسلام کی رہی سہی طاقت اور عرب و خلافت عربی کا تار تار الگ کردیا یہیں رونما ہوتے، حتی کہ اس جنگ عظیم میں بھی واحد اسلامی طاقت کے ساتھ غداری کے نتائج بھی اوّلاً یہیں، ظاہر ہوتے اور اس کے اثرات بعد کو اور اطراف میں بھی رونما ہوتے۔

حضرت عثمانؓ کو فتنہ کی اطلاع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے ایک باغ میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے حضرت ابوبکرؓ دروازہ کھلوا کر آئے تو آپؐ نے ان کو جنت کی بشارت دی، حضرت عمرؓ آئے اور آپؐ نے ان کو جنت کا مژدہ سنایا، اس کے بعد حضرت عثمانؓ آئے تو آپؐ نے ان کو جنت کی بشارت کے ساتھ فتنہ و امتحان سے دوچار ہونے کی بھی اطلاع دی، چنانچہ ان کو اپنے زمانۂ خلافت میں یہ فتنہ و امتحان پیش آیا اور شہادت نصیب[3] ہوئی، حدیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بھی روایتیں ہیں۔

حضرت عمرؓ اور عثمانؓ شہید ہوں گے

ایک دفعہ مکہ معظمہ میں کوہ ثبیر یا کوہ احد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، آپؐ کی رفاقت میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی تھے کہ دفعۃً پہاڑ کو جنبش ہوئی، آپؐ نے فرمایا، اے ثبیر! ٹھہر جا کہ تیری پشت پر ایک پیغمبر، ایک صدیق اور دو شہید ہیں، پیغمبر اور صدیق کو تو سب جانتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ بھی معلوم

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفتن [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الفتن وغیرہ [3] صحیح مسلم فضائل عثمان۔

ہو گیا کہ وہ دو شہید کون تھے۔[1]

حضرت علی مرتضیٰؓ کی مشکلات اور شہادت

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے فرمایا کہ تم سے میری امت میرے بعد بے وفائی کرے گی، حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اے علیؓ! خبردار کہ تم کو میرے بعد مصیبت پیش آئے گی، حضرت علیؓ نے استفسار کیا کہ کیا یہ مصیبت میری سلامتی دین کے ساتھ پیش آئے گی؟ فرمایا، ہاں تمہاری سلامتی دین کے ساتھ۔ حضرت علیؓ اور بعض صحابہ ایک سفر میں ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے آپ نے فرمایا میں بتاؤں کہ دو سب سے بدبخت انسان کون ہیں؟ لوگوں نے عرض کی کہ ہاں یا رسول اللہ بتائیے۔ ایک ثمود کا سرخ رنگ بدبخت جس نے ناقہ کو قتل کیا، دوسرا وہ جو اے علی تمہارے یہاں پر (گردن کی طرف اشارہ کیا) تلوار مارے گا۔[2]

جنگ جمل کی خبر

حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے درمیان جو اتفاقی لڑائی بصرہ میں پیش آگئی تھی اس کو جنگ جمل کہتے ہیں، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہراتؓ کے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا، تم میں سے کسی پر حوأب کے کتے بھونکیں گے (حوأب عراق میں ایک تالاب کا نام ہے) حضرت عائشہؓ جب اصحاب جمل کے ساتھ روانہ ہوئیں اور حوأب کے تالاب پر پہنچیں اور کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی یاد آئی۔[3]

حضرت علیؓ اور معاویہؓ کی جنگ

ایک بار آپ نے فرمایا کہ اس وقت تک قیامت نہ آئے گی، جب تک دو ایسے گروہ باہم جنگ آزما ہوں گے، جن میں سے ہر ایک کا دعویٰ ایک ہی ہوگا۔[4] علماء کا بیان ہے کہ یہ پیشین گوئی حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی لڑائیوں پر صادق آتی ہے۔[5]

حضرت عمارؓ شہید ہوں گے

آپ نے غزوۂ خندق میں حضرت عمارؓ کے سر پر دست شفقت پھیر کر فرمایا، افسوس تجھ کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔[6] یہ پیشین گوئی متعدد صحابہ سے منقول ہے، حضرت عمارؓ حضرت علیؓ کی معیت میں امیر معاویہؓ کے ساتھیوں کے ہاتھ سے جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

امام حسنؓ کی مصالحت

ایک دفعہ آپ حضرت امام حسنؓ کو لے کر گھر سے باہر نکلے اور ان کو گود میں لے کر منبر پر چڑھے پھر فرمایا کہ میرے اس فرزند کے ذریعہ سے خدا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان مصالحت کرا دے گا۔[7] چنانچہ یہ پیشین گوئی حضرت علیؓ کی شہادت کے چھ مہینے بعد پوری ہوئی اور طرفداران علیؓ اور حامیان معاویہؓ میں بعض شرائط پر صلح ہو گئی۔

---

[1] صحیح بخاری مناقب ابی بکرؓ و صحیح ترمذی مناقب عثمانؓ بروایت حسن و سنن نسائی و دارقطنی۔ [2] یہ تینوں روایتیں مستدرک حاکم کی ہیں، امام ذہبی نے پہلی روایت کو مطلق صحیح، دوسری کو بشرط بخاری و مسلم صحیح اور تیسری کو بشرط مسلم صحیح کہا ہے۔ ج ۳ صہ ۱۴۱ حیدرآباد۔ [3] مسند ابن حنبل ج ۶ صہ ۵۲، ۹۷۔ [4] صحیح مسلم فتن۔ [5] دیکھو شرح مسلم۔ [6] دیکھو شرح مسلم۔ [7] صحیح بخاری علامات النبوۃ فی الاسلام و صحیح مسلم و ترمذی باب المناقب و حاکم ترجمہ امام حسنؓ ج ۳۔

نوخیز حکمران قریش کے ہاتھوں اسلام کی تباہی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن مخصوص اصحاب کو اسلام کے مستقبل سے باخبر کر دیا تھا، ان میں ایک حضرت ابوہریرہؓ بھی تھے، وہ کہتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کی بربادی قریش کے چند نوخیزوں کے ہاتھ سے ہوگی، حضرت ابوہریرہؓ کہا کرتے تھے کہ اگر میں چاہوں تو سب کو نام بنام گنا دوں، یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح نکلی، حضرت عثمانؓ کے عہد کا سیاسی طوفان ان کی شہادت پھر جمل کی لڑائی، یہ سب چند نوخیز قریشی رئیس زادوں کے بے جا امنگوں کے نتائج تھے جیسا کہ عام تاریخوں میں مسطور ہے اور صحیح بخاری میں ہے کہ راوی کہتا ہے ہم نے شام جا کر بنی مروان کو دیکھا تو ان کو اسی طرح نوخیز نوجوان پایا۔[1]

یزید کی تخت نشینی کی بلا اسلام پر

امیر معاویہؓ نے ۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کے بجائے یزید تخت نشین ہوا اور یہی اسلام کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی ادبار ونکبت کی اولین شب ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے متعدد روایتیں ہیں، مسند احمد میں۔ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا کہ ۶۰ھ کے شروع ہونے سے اور لڑکوں کی حکومت سے پناہ مانگا کرو، اور دنیا ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ اس پر ایسے ایسے حکمران نہ ہولیں۔[2] حاکم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا عربوں پر افسوس اس مصیبت سے جو ۶۰ھ کے آغاز پر قریب آئے گی، امانت لوٹ کا مال اور صدقہ وخیرات جرمانہ اور تاوان سمجھا جانے لگا اور گواہی پہچان سے دی جانے لگی اور فیصلے ہوا وہوس سے ہوا کریں گے، بیہقی میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ مدینہ کے بازار میں یہ کہتے جاتے تھے کہ خداوندا میں ۶۰ھ اور لڑکوں کی حکومت کا زمانہ نہ پاؤں، خدا نے ان کی یہ دعا قبول کی اور ۵۹ھ میں انہوں نے وفات پائی۔

امام حسینؓ کی شہادت

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی متعدد پیشین گوئیاں حاکم، بیہقی، ابن راہویہ اور ابونعیم میں مذکور ہیں، مگر اصولاً ان روایات کا درجہ بلند نہیں،[3] تاہم اتنی بات مجملاً ثابت ہوتی ہے کہ آپؐ کو اس واقعہ کا علم ضرور عطا کیا گیا تھا اور آپؐ نے اہل بیت کو اس کے متعلق کوئی خاص اطلاع دی تھی، اس باب میں بہترین حدیث حاکم کی یہ روایت ہے جس کو اس نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ[4] کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تھی کہ میں نے یحییٰ (پیغمبر) کا بدلہ ستر ہزار سے لیا تھا اور میں تیرے نواسے کا بدلہ ستر اور ستر ہزار سے لوں گا، حافظ ذہبی نے اس روایت کو علیٰ شرط مسلم تسلیم کیا ہے[5] لیکن روایت خود اس کا اشارہ کرتی ہے کہ اس سے پہلے حضرت حسینؓ کی شہادت کی اطلاع دی جاچکی تھی، یہ اطلاع الٰہی حرف بحرف صحیح ہوئی، امام موصوف کی شہادت کے بعد مختار کے ہاتھوں قاتلین حسینؓ سے اسی قدر انتقام لیا گیا۔

خوارج کی اطلاع

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک آدمی آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف سے مال تقسیم فرمایئے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الفتن [2] اوائل کتاب الفتن [3] مسند احمد احادیث ابی ہریرہؓ [4] یہ روایتیں خصائص کبریٰ سیوطی ج ۲ ص ۱۲۶ کے حوالہ سے نقل کی گئی ہیں [5] مستدرک ج ۳ ص ۱۷۹۔

آپ نے فرمایا، میں نہ انصاف کروں گا تو کون کرے گا، اس کی گستاخی پر حضرت عمرؓ سخت برہم ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا جانے دو، اس کے ایسے رفقاء ہوں گے جن کے نماز روزے کے مقابل تم کو اپنے نماز روزے حقیر معلوم ہوں گے، وہ لوگ قرآن کی تلاوت کریں گے لیکن گلے کے نیچے نہ اترے گا، وہ مذہب کے دائرہ سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر نشانہ کے پار نکل جاتا ہے، اس گروہ کی علامت یہ ہے کہ ان میں ایک سیاہ فام شخص پیدا ہوگا جس کے دونوں بازوؤں میں عورت کے سینہ کی طرح گوشت لٹکتا ہوگا، حضرت ابوسعید خدریؓ کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے اس گروہ سے جنگ کی اور میں ان کے ساتھ موجود تھا، اس سیاہ فام کی تلاش کی گئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علامات بتائی تھیں وہ ان کے ساتھ متصف نکلا۔[1]

مختار اور حجاج کی اطلاع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قبیلہ ثقیف میں دو شخص پیدا ہوں گے جن میں ایک کذاب دوسرا مبیر یعنی ہلاک کرنے والا ہوگا، چنانچہ جب حجاج ثقفی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو پھانسی دی اور ان کی والدہ حضرت اسماءؓ کو بلایا تو انہوں نے جانے سے انکار کیا، بار بار کے انکار کے بعد حجاج خود ان کے پاس آیا، بہت سے سوال و جواب کے بعد انہوں نے کہا کہ قبیلہ ثقیف کے دو شخصوں کے متعلق آپ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی ان میں کذاب (مختار ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور مبیر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو، یہ سن کر حجاج چپ چاپ الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔[2]

حجاز میں ایک آگ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی، جب تک حجاز میں ایک ایسی آگ نہ نکلے جس کی روشنی بصریٰ کے اونٹوں کی گردنوں کو روشن نہ کر دے[3]

یہ روایت صحیح مسلم اور حاکم میں ہے، امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ آگ ہمارے زمانے میں ۶۵۴ھ میں مدینہ میں ظاہر ہوئی اور آگ اس قدر بڑی تھی کہ مدینہ کے مشرقی پہلو سے لے کر پہاڑ تک پھیلی تھی اس کا حال شام اور تمام شہروں میں بتواتر معلوم ہوا اور ہم سے اس شخص نے بیان کیا جو اس وقت مدینہ میں موجود تھا[4]، ابوشامہ ایک اور معاصر مصنف کا بیان ہے کہ ہمارے پاس مدینہ سے خطوط آئے جن میں لکھا تھا کہ چہار شنبہ کی رات کو جمادی الثانیہ کی تیسری تاریخ کو مدینہ میں ایک سخت دھماکا ہوا، پھر بڑا زلزلہ آیا جو ساعت بساعت بڑھتا رہا، یہاں تک کہ پانچویں کو بہت بڑی آگ پہاڑی میں قریظہ کے محلہ کے قریب نمودار ہوئی جس کو ہم مدینہ کے اندر اپنے گھروں سے اس طرح دیکھتے تھے کہ گویا وہ ہمارے قریب ہی ہے اور ترائیاں بہہ نکلیں اور ہم اس کو دیکھنے کو چڑھے تو دیکھا کہ پہاڑ آگ بن کر بہہ رہے ہیں اور ادھر ادھر شعلے بن کر جا رہے ہیں، آگ کے شعلے پہاڑ معلوم ہوتے تھے، محلوں کے برابر برابر چنگاریاں اڑ رہی ہیں، یہاں تک کہ یہ آگ مکہ معظمہ اور صحرا سے بھی نظر آتی تھی، لوگ گھبرا کر روضہ نبوی میں دعا و استغفار کے لئے جمع ہو گئے تھے، یہ حالت ایک مہینہ سے زیادہ رہی، علامہ ذہبی اس واقعہ

---

[1] بخاری ج ۱ صفحہ ۵۱۰ باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] مسلم کتاب الفضائل باب ذکر کذاب ثقیف و مبیرہا [3] کتاب الفتن [4] شرح مسلم نووی ج ۲ صفحہ ۳۹۴ نولکشور [5] تاریخ الخلفاء بحوالہ ابوشامہ واقعات ۶۵۴ھ

کے متعلق لکھتے ہیں کہ اسی سال (۶۵۴ھ) میں مدینہ میں آگ نکلی جو ان بڑی نشانیوں میں سے تھی جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی، اس آگ میں اس شدت اور روشنی کے باوجود گرمی نہ تھی اور چند روز رہی، اہل مدینہ کا خیال تھا کہ قیامت آگئی تو انہوں نے خدا کی بارگاہ میں توبہ و استغفار کیا۔ اس آگ کا حال بتواتر معلوم ہے، حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ متعدد لوگوں سے جو بصریٰ میں اس وقت موجود تھے، یہ شہادت منقول ہے کہ انہوں نے رات کو اس کی روشنی میں بصریٰ کے اونٹوں کی گردنیں دیکھیں[1][2]۔

ایک صدی یا ایک دور کے بعد انقلاب

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اخیر زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عشاء کے بعد حاضرین کو مخاطب کرکے فرمایا، آج اس شب میں، میں تم کو بتاؤں کہ اس سے سو برس بعد آج کے لوگوں میں سے کوئی بھی روئے زمین پر باقی نہ رہے گا راوی کہتا ہے کہ اس سے آپ کا مقصود ایک دَور (قرن) کا ختم ہو جانا تھا، حضرت جابرؓ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں کہ اپنی وفات سے ایک مہینہ پہلے آپؐ نے فرمایا کہ تم قیامت کی نسبت دریافت کرتے ہو، اس کا علم تو خدا کو ہے، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج روئے زمین پر کوئی سانس لینے والی جان نہیں جو سو برس بعد زندہ رہے گی[3]۔ اس سے مقصود صحابہؓ کے خیر و برکت کے دور کا اختتام تھا، ابوالطفیلؓ صحابی سب سے اخیر میں مرے ہیں، ان کا بیان تھا کہ اب میرے سوا کوئی باقی نہیں جس نے جمال محمدیؐ سے آنکھیں روشن کیں، یہ ابوالطفیلؓ[4] پوری صدی کے اختتام پر رحلت گزین ہوتے۔

چار دوروں کے بعد پورا انقلاب

متعدد راویوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ آپؐ نے علی الاعلان فرمایا کہ بہترین دور (قرن) وہ ہے جس میں، میں ہوں، پھر اس دور کے لوگ جو میرے بعد ہیں، پھر اس دور کے لوگ جو ان کے بعد ہیں، پھر اس دور کے لوگ جو ان کے بعد ہیں، پھر ایسے لوگ ہوں گے جو گواہی کے لئے بلائے نہیں جائیں گے خود جا کر گواہی دیں گے، خیانت کار ہوں گے امین نہ ہوں گے، نذر مانیں گے لیکن ایفا نہ کریں گے، پہلا دور عہد نبوی ہے، دوسرا دور صحابہؓ کا ہے، تیسرا تابعین کا، چوتھا تبع تابعینؒ کا، یہ چار عہد اسلام کے روحانی، دینی، اخلاقی، مناقب و مکارم کا اور صلحائے امت ائمہ دین اور علمائے خیر کے پے در پے ظہور اور وجود کا اور خالص مذہبی علوم کی نشوونما، ترتیب و تدوین اور نشر و اشاعت کا ہے، اس کے بعد ہی بدعات کا سیلاب امنڈ آتا ہے، علمائے سوء اور امرائے جور بیدار ہوتے ہیں، فرق باطلہ کا ظہور ہوتا ہے، فقہاء میں جمود آتا ہے، علماء میں ہوا و ہوس راہ پاتی ہے، مصر، فارس اور یونان کے فلسفیانہ خیالات مسلمانوں میں رائج ہوتے ہیں، اسلام کے اعتقادی و عملی قویٰ سست ہو جاتے ہیں اور تمام نظام ابتر ہو جاتا ہے۔

---

[1] مختصر تاریخ الاسلام ذہبی ج۲ ص۱۰ حیدرآباد۔ [2] تاریخ الخلفاء۔ واقعات ۶۵۴ھ۔ [3] یہ تمام حدیثیں صحیح مسلم باب فضل صحابہ میں ہیں اور پہلی روایت ابوداؤد کتاب الملاحم میں بھی مذکور ہے۔ [4] صحیح مسلم فضل صحابہ و مسند احمد حدیث بریدہؓ۔

مدعیان کاذب صحیح مسلم وغیرہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے تیس کاذب و دجال پیدا ہوں گے جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے۔[1] ایسے مدعیان کاذب کی تعداد اگر مسیلمہ کے وقت سے لے کر آج تک کی تاریخوں سے چُن کر الگ کی جائے تو قریب قریب تیس کے پہنچ جائے گی، ان میں سے دو جو ہندوستان اور ایران میں ابھی ابھی گزرے ہیں وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

منکرینِ حدیث ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا، میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے اکڑ کر شان سے بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا یا جس سے میں نے منع کیا، وہ اس سے بیان کیا جائے تو کہے کہ ہم نہیں جانتے جو ہم نے قرآن میں پایا اسی کو مانتے ہیں۔[2] بیہقی میں اس سے زیادہ صاف الفاظ ہیں، دورِ اول میں اگر یہ پیشین گوئی معتزلہ پر صادق آسکتی تھی تو اب آجکل حرف ہند کے ان اشخاص پر پوری طرح صادق آتی ہے جو خود کو اہل القرآن کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔

تجارت کی کثرت اور اس میں عورتوں کی شرکت قیامت کے آثار اور نشانیوں میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے خصوصیت کا سلام ہوگا اور تجارت کی کثرت ہوگی، یہاں تک کہ عورت بھی اپنے مرد کا ہاتھ اس میں بٹایا کرے گی۔[3] کیا اس موجودہ دورِ تمدن سے بڑھ کر اس پیشین گوئی کی صداقت کا کوئی اور زمانہ ہوگا، آج سے زیادہ کبھی تجارت کی گرم بازاری تھی اور عورتیں کبھی اس سے پہلے اس بے باکی سے مردوں کے دوش بدوش ہو کر اس پیشہ میں در آئی تھیں۔

اہل یورپ کی کثرت آپ نے صحابہ کے سامنے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ قیامت جب آئے گی تو روم سب سے زیادہ ہوں گے،[4] عربوں کے محاورہ میں روم سے مقصود اہل فرنگ یعنی اہل یورپ ہیں۔ آج اہل یورپ کی یہ کثرت ہے کہ اس وقت ان کے وجود سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں اور ان کی قوت و طاقت کا دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی، یہ پیشین گوئی آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کی گئی تھی اور آج اس کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے۔

سود کی کثرت پہلے وہی لوگ سود کھاتے تھے اور کھا سکتے تھے جو براہ راست اس کا کاروبار کرتے تھے لیکن آپ نے پیشین گوئی کی تھی کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو سود نہ کھائے گا اگر وہ براہ راست نہ کھائے گا تو اس کا غبار یا دھواں بھی اس تک ضرور پہنچے گا۔[5] کیا آج وہی زمانہ بعینہٖ نہیں ہے، آج کی تجارت اور سوداگری تمام تر سود پر مبنی ہے، یہاں تک کہ ہمارے ملک کی ہر چیز جو بازار سے خریدی جاتی ہے وہ بیسیوں سودی معاملوں سے گزر کر ہم تک پہنچتی ہے، تمام وہ لوگ جن کی معیشت سرکاری نوکری ہے اور اکثر غیر سرکاری نوکر بھی بنک کے جمع شدہ روپوں سے معاوضہ حاصل کرتے ہیں اور امراء اور اہل دولت بھی اپنا

---

[1] صحیح مسلم باب فتن و ابوداؤد و ترمذی کے علاوہ مسند احمد میں حضرت حذیفہؓ اور ابو یعلیٰ بزار اور طبرانی میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے اسی قسم کی روایت ہے۔ [2] سنن ابی داؤد باب لزوم السنۃ۔ [3] مسند احمد ج ۱ اول ص ۴۱۹ مصر و ادب المفرد امام بخاری باب تسلیم الخاصہ و مستدرک حاکم و بزار و طبرانی۔ [4] صحیح مسلم کتاب الفتن۔ [5] ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ باب الربوا، مسند احمد عن ابی ہریرہؓ۔

سرمایہ امانتی منافع سے وصول کرتے ہیں۔ غرض آج دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں کی جا سکتی ہے جو تمام تر سود سے پاک اور مبرا ہو اور یہ یورپ کے تمدن کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ عالمگیر اثر ہے، یہ عظیم الشان پیشین گوئی کتنی بڑی صداقت پر مبنی ہے اور جس کو کبھی کوئی انسان صرف قیاس سے اس بلند آہنگی کے ساتھ دنیا کو نہیں سنا سکتا ہے۔

یہودیوں سے جنگ

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی کہ مسلمانوں اور یہودیوں میں ایک عظیم الشان جنگ ہوگی، یہودی شکست کھا کر چٹانوں اور درختوں کے پیچھے چھپیں گے تو وہاں بھی ان کو پناہ نہ ملے گی اور ان میں سے آواز آئے گی کہ اے مسلمان دیکھ، یہ یہودی چھپا ہے۔ اس حدیث کو پڑھتے ہوئے پہلے دل میں خطرہ گزرتا تھا کہ الہٰی! یہودیوں میں نہ تو قوت ہے نہ کوئی ان کی سلطنت ہے، نہ مسلمانوں کے درمیان کہیں ان کی بڑی آبادی ہے، یہ لڑائی کیونکر پیش آئے گی؟ مگر پچھلی جنگ نے اپنے نتیجہ کے طور پر فلسطین میں جو صورت نمایاں کر دی ہے اور عہد نامۂ بالفور نے فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور صیہونی تحریک نے فلسطین کو خالص یہودی ملک بنانے اور بالآخر وہاں یہودی سلطنت قائم کرنے کا جو تہیہ کیا ہے اس نے مخبر صادق علیہ السلام کی پیشین گوئی کی صداقت کے منظر کو آنکھوں کے سامنے کر دیا ہے۔

حجاز کا انقطاع مصر، شام اور عراق سے

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، عراق نے اپنا نقرئی سکہ (درہم) اور غلہ کا پیمانہ (قفیز) روک دیا، شام نے اپنے غلہ کا پیمانہ (مد) اور اپنا طلائی سکہ (دینار) روک دیا اور مصر نے اپنے غلہ کا پیمانہ (اردب) اور اپنی اشرفی روک دی اور تم وہیں لوٹ گئے جہاں سے چلے تھے، حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ اس حدیث کے ارشاد نبوی ہونے پر ابوہریرہؓ کا گوشت اور خون گواہی دیتا ہے۔

اس حدیث میں درحقیقت دو پیشین گوئیاں ہیں ایک یہ کہ مسلمان ان ممالک کو فتح کریں گے اور حجاز کے تعلقات وہاں سے قائم ہوں گے اور اس خشک اور بنجر خطہ کی پرورش ان ہی ہمسایہ علاقوں سے ہوگی اور پھر وہ زمانہ آئے گا جب یہ علاقے الگ ہو جائیں گے اور حجاز پھر ویسا ہی ہو جائے گا جیسا اسلام سے پہلے یا اسلام کے آغاز میں تھا پہلی پیشین گوئی تو حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں پوری ہوئی اور اس وقت سے لے کر تیرہ سو برس تک برابر یہ حالت قائم رہی، حجاز کے لئے ہر قسم کا سامان ان ہی ممالک کی پیداوار سے آتا تھا، مصر و شام سے برابر غلہ قانوناً بھیجا جاتا تھا، سالانہ نذرانے تقسیم ہوتے تھے، بڑی بڑی جائیدادیں وقف تھیں، لیکن ہمارے خیال میں اس دوسری پیشین گوئی کا محل اس زمانہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ تیرہ سو برس کے اندر کبھی ایسا زمانہ پیش نہیں آیا جب حجاز، عراق و شام اور مصر سے دفعۃً منقطع ہو گیا ہو۔ آج حجاز کی وہی حالت نہیں جو اسلام سے پہلے یا آغاز اسلام میں تھی جب عراق پر ایرانی اور شام و مصر پر رومی حکمران تھے اور خود عرب کے صوبے پراگندہ اور بے نظام تھے اور ہر قطعہ پر ایک حاکم فرمانروا تھا۔ آج عراق و مصر و فلسطین و بحرین وغیرہ پر انگریز اور شام پر فرانسیسی حکمران ہیں، عرب کے تمام صوبے پراگندہ اور بے نظام ہیں اور ہر خطہ پر ایک مستقل فرمانروا ہے اور باہمی آتش جنگ و جدل برپا

؎ صحیح مسلم باب الفتن ؎ ایضاً

ہے، ایک کو دوسرے کی ماتحتی سے عار ہے، عراق کا غلہ اور نذرانہ بند ہے، شام کی موقوفہ جائیدادیں فرانسیسیوں نے ضبط کرلیں اور آپ نے گزشتہ سال سن لیا کہ مصر نے حجاز کے غلہ اور اشرفیوں کا وہ نذرانہ بند کردیا جو عہد فاروقی سے اب تک کبھی بند نہیں ہوا تھا۔

اہل یورپ سے شام میں جنگ

صحیح مسلم وغیرہ میں فتن اور آثار قیامت کے سلسلہ میں متعدد حدیثیں ایسی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے صاف و صریح الفاظ میں اپنی امت کو یہ اطلاع دی ہے کہ آخر زمانہ میں دجال کے ظہور اور نزول مسیح سے پہلے ملک شام میں مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان عظیم الشان خونی معرکے پیش آئیں گے، گو اس ملک میں ان دونوں کے درمیان صلیبی جنگوں نے اس قسم کے سینکڑوں خونی معرکے پیش کئے ہیں مگر جنگ عظیم نے شام کی جو صورت حال پیدا کردی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ تمام واقعات آنے والے خونی معرکوں کی تقریب و تمہید ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف تمام دنیا کی قومیں اٹھ کھڑی ہونگی

ابوداؤد[1] و بیہقی میں ہے کہ آپ نے فرمایا قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی (یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں گی) جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالہ پر گرتے ہیں، حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ اس لئے کہ اس زمانہ میں ہم مسلمانوں کی تعداد کم ہوجائے گی فرمایا نہیں، تمہاری تعداد ان دنوں بہت بڑی ہوگی لیکن تم ایسے ہوجاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس و خاشاک ہوتا ہے کہ (سیلاب ان کو بہاتے لئے جاتا ہے)، اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب دور کردے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا، کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا دنیا (فوائد دنیا) کی محبت اور موت سے کراہت۔ موجودہ دنیائے اسلام کے پیش نظر تاریخ میں کیا حرف حرف اس کی تصدیق نہیں ہے؟

*

---

[1] کتاب الملاحم۔

معجزاتِ نبویؐ کے متعلق غیر مستند روایات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے متعلق جو جھوٹی اور بے سروپا روایتیں مسلمانوں میں مشہور ہو گئی ہیں ضرورت نہ تھی کہ اس کتاب میں ان کو کسی حیثیت سے جگہ دی جائے، مگر چونکہ عام ناظرین کے دلوں میں ان کو اس کتاب میں نہ پاکر مختلف قسم کے شبہے پیدا ہوں گے، اس لئے صرف ان کی تسکین اور کشفِ حقیقت کی خاطر ان روایتوں سے بھی اس کتاب میں تعرض کرنا ضروری پڑا۔ یہ روایتیں زیادہ تر کتب دلائل میں ہیں یعنی ان کتابوں میں ہیں جن کو لوگوں نے عام حدیث کی کتابوں سے الگ کر کے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے ذکر و تفصیل میں لکھا ہے۔

یہی کتابیں ہیں جنھوں نے معجزات کی جھوٹی اور غیر مستند روایتوں کا ایک انبار لگا دیا ہے اور ان ہی سے میلاد و فضائل کی تمام کتابوں کا سرمایہ مہیا کیا گیا ہے، خوش اعتقادی اور عجائب پرستی نے ان غلط معجزات کو اس قدر شرفِ قبول بخشا کہ ان کے پردہ میں آپ کے تمام صحیح معجزات چھپ کر رہ گئے اور حق اور باطل کی تمیز مشکل ہو گئی، حالانکہ اس تمام ذخیرہ سے کتبِ صحاح اور خصوصاً بخاری و مسلم یکسر خالی ہیں، لیکن تیسری اور چوتھی صدی میں اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ اس درجہ بے احتیاطی کے ساتھ لکھی گئیں کہ محدثین ثقات نے ان کو بیشتر ناقابلِ اعتبار قرار دیا۔ کتبِ دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا، تاکہ خاتم المرسلینؐ کے فضائل و مناقب کے ابواب میں معتدبہ اضافہ ہو سکے، البتہ کچھ احتیاط پسند محدثین آئے مثلاً زرقانی وغیرہ، وہ ان روایات کے نقل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تردید اور تضعیف بھی کرتے گئے، لیکن جو چیز اس وسعت کے ساتھ پھیل گئی ہو جو اسلامی لٹریچر کا ایک جزو بن گئی ہو جو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہو، اس کے لئے صرف اس قدر کافی نہیں بلکہ وہ مزید تنقید کی محتاج ہے، خصوصاً اس لئے کہ ہمارے ملک میں میلاد کی مجلسوں میں جو بیانات پڑھے جاتے ہیں وہ تمام تر ان ہی بے بنیاد روایتوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

اس تنقید کے تین حصے ہو سکتے ہیں۔ اصولِ روایت کی بنا پر ان کتابوں کا اور محدثین میں ان کے مصنفوں کا درجہ کیا ہے؟ ان کتابوں میں جو غلط موضوع اور ضعیف معجزات مذکور ہیں ان کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ ان کتابوں کے خاص خاص مشہور اور زبان زد معجزات کی روایتی حیثیت کیا ہے؟

کتبِ دلائل اور اُن کے مصنفین کا درجہ

علمائے اسلام نے روایات کی تنقید اور اُن کے اصول کے منضبط کرنے میں جو کوششیں کی ہیں اور جو خدمات انجام دی ہیں ان کی پوری تفصیل کتاب کے مقدمہ میں گزر چکی ہے، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی ضمناً آ گئی ہے کہ ان روایات کی جانچ اور تنقید میں جن کا تعلق احکام فقہی سے ہے محدثین نے جو سختی اور شدت اختیار کی ہے، وہ مناقب

اور فضائل کے باب میں نہیں کی ہے، چنانچہ علم حدیث کے بڑے بڑے اماموں نے علانیہ اس کا اعتراف کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آیات قرآنی کے الگ الگ فضائل، نام بنام تمام خلفاء کے مناقب، مقامات اور شہروں کے محاسن، اعمال انسانی کے مبالغہ آمیز ثواب و عقاب کے بیانات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کاہنین عرب کی پیشین گوئیاں اور اشعار اور عجیب و غریب غیر صحیح فضائل معجزات اور برکات وغیرہ کا بے پایاں دفتر روایات میں موجود اور کتابوں میں مدون ہے۔

یہ روایات زیادہ تر تیسرے اور چوتھے درجہ کی کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں، تیسرے درجہ میں بقول شاہ ولی اللہ صاحبؒ یہ کتابیں ہیں[1]:

مسند ابو یعلی، مصنف عبد الرزاق، مصنف ابی بکر بن ابی شیبہ، مسند عبد بن حمید، مسند طیالسی، بیہقی، طحاوی اور طبرانی کی تصنیفات، ان میں سچی جھوٹی، اچھی بری، قوی ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پہلو بہ پہلو درج ہیں اور چوتھے درجہ میں وہ کتابیں ہیں جن کے مصنفین صدیوں کے بعد پیدا ہوئے، انہوں نے چاہا کہ اول اور دوم درجوں میں جو روایتیں داخل نہیں کی گئی تھیں ان کو ایک جگہ جمع کر دیں، یہ روایتیں ان لوگوں کی زبانوں پر تھیں جن کی روایتوں کو حدیث کے اماموں نے قلمبند کرنا پسند نہیں کیا تھا اور قصہ گو واعظین محض ان سے رونق محفل کا کام لیتے تھے، اسرائیلیات، اقوال حکماء، اشارات حدیث، قصص و حکایات اور روایات نامعتبر کو انہوں نے حدیث کا درجہ دے کر کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا، کتاب الضعفاء لابن حبان، کامل ابن عدی اور خطیب، ابونعیم، جوزقانی، ابن عساکر، ابن نجار اور دیلمی کی تصنیفات کا اسی طبقہ میں شمار ہے۔

اس تفصیل کے بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں، صرف اول اور دوم درجہ کی کتابوں پر یعنی صحاح ستہ پر محدثین کا اعتماد ہے اور ان ہی پر ان کا مدار ہے، تیسرے طبقہ کی کتابوں سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو فن کے ناقد اور جوہری ہیں، جن کو اسماء الرجال پر عبور اور علل حدیث سے واقفیت ہے، غرض جو صحیح اور غلط اور خطا و صواب میں کامل امتیاز رکھتے ہیں، چوتھے طبقہ کی کتابوں کو جمع اور تدوین کرنا اور ان کو کام میں لانا متاخرین کی ایک قسم کی بے فائدہ کی کاوش فکر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آیات و دلائل پر جو مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے کچھ تیسرے طبقہ میں اور بقیہ تمام تر چوتھے طبقہ کی کتابوں میں داخل ہیں، متاخرین نے عام طور سے یہ سرمایہ جن کتابوں سے حاصل کیا ہے وہ طبری، طبرانی، بیہقی، دیلمی، بزار اور ابونعیم اصفہانی کی تصنیفات ہیں، حافظ قسطلانی نے ان ہی روایات کو تمیز اور نقد کے بغیر مواہب لدنیہ میں داخل کیا اور ملا معین فراہی نے ان کو معارج النبوۃ میں فارسی زبان میں اس آب و رنگ سے بیان کیا کہ یہ روایتیں گھر گھر پھیل گئیں اور عوام نے اس شیفتگی اور وارفتگی کے ساتھ ان کو قبول کیا کہ اصلی اور صحیح معجزات اور آیات بھی اس پردہ میں چھپ کر رہ گئے۔

مواہب لدنیہ اور معارج النبوۃ وغیرہ کا سرمایہ جن کتابوں سے ماخوذ ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب طبقات کتب الحدیث۔

کتاب الطبقات لابن سعد، سیرت ابن اسحاق، دلائل النبوۃ ابن قتیبہ المتوفی ٢٧٦ھ، دلائل النبوۃ ابو اسحاق حربی المتوفی ٢٨٥ھ، شرف المصطفیٰ، ابو سعید عبد الرحمن بن حسن اصفہانی المتوفی ٤٠٧ھ، تاریخ و تفسیر ابو جعفر بن جریر طبری المتوفی ٣١٠ھ، مولد یحییٰ بن عائذ، دلائل النبوۃ جعفر ابن محمد مستغفری المتوفی ٤٣٢ھ، دلائل النبوۃ ابو القاسم اسماعیل اصفہانی المتوفی ٥٣٥ھ، تاریخ دمشق ابن عساکر المتوفی ٥٧١ھ، لیکن متاخرین میں ان روایات کا سب سے بڑا خزانہ یہ دو کتابیں ہیں، کتاب الدلائل ابو نعیم اصفہانی المتوفی ٤٣٠ھ اور کتاب الدلائل امام بیہقی المتوفی ٤٥٨ھ

ان بزرگوں کے بذات خود معتبر اور مستند ہونے میں کسی کو کم کلام ہے، جو کچھ کلام ہے وہ اس میں ہے کہ انہوں نے ہر قسم کے راویوں سے ہر قسم کی روایتیں نقد اور تمیز کے بغیر اخذ کیں اور ان کو کتابوں کے اوراق میں مدون کر دیا اور عام لوگوں نے ان مصنفین کی عظمت اور جلالت کو دیکھ کر ان روایتوں کو قبول کر لیا، حالانکہ ان میں نہ صرف ضعیف اور کمزور بلکہ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں اور ان کے سلسلہ روایت میں ایسے راوی آتے ہیں جن کو محدثین کے دربار میں صف نعال میں بھی جگہ نہیں مل سکتی، ان مصنفین نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ ہر قسم کا سلسلہ روایت لکھ دیا گیا ہے اور لوگ اس سلسلہ روایت کو دیکھ کر صحیح اور غلط، سچی اور جھوٹی روایت کا خود فیصلہ کر لیں گے، ان روایتوں کی تدوین میں ضروری احتیاطیں مدنظر رکھیں، یا یوں کہو کہ عشق نبویؐ نے فضائل و مناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا، حالانکہ خود اسی جذبہ عشق اور اسی ولولہ شوق نے ثقات محدثین اور علم حدیث کے اکابر کو روایتوں اور راویوں کے نقد اور بحث میں اس قدر سخت گیر بنا دیا تھا کہ وہ ایک لفظ بھی تحقیق اور کاوش کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے اور من کذب علی متعمدا کی وعید سے ہمیشہ ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے محدث ابن مندہ نے کتاب الدلائل کے مصنف حافظ ابو نعیم اصفہانی کی نسبت نہایت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں، علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں ان دونوں معاصرین کے درمیان محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

لا اعلم لهما ذنبا اکثر من روایتهما الموضوعات ساکتین عنها (ترجمہ ابو نعیم)

مجھے ان دونوں کا اس سے زیادہ کوئی گناہ معلوم نہیں کہ وہ موضوع روایتوں کو خاموشی کے ساتھ روایت کر جاتے ہیں،

لیکن ثقات محدثین کی بارگاہ میں یہ کوئی معمولی گناہ ہے؟ یہی ان کی خاموشی خدا انہیں معاف کرے آج ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی گمراہی کی بنیاد بن گئی ہے،

اس سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ہمارے علمائے رجال نے زیادہ تر ان راویوں کی بحث و تدقیق کی ہے جو پہلی تین صدیوں میں تھے اس لئے چوتھی اور پانچویں صدی کے رواۃ اور رجال کے نام و نشان ہماری موجودہ اسماء الرجال کی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، اگر تراجم و انساب میں ان کے کچھ حالات مل جاتے ہیں تو محدثانہ حیثیت سے اُن پر نقد و تبصرہ نہیں ملتا، اس لئے ان بزرگوں کے شیوخ اور راویوں میں مجہول الحال اشخاص کی بھی کمی نہیں، اس بنا پر ان کتابوں کی روایتوں کی تنقید کرنا نہایت مشکل ہے۔

اسلام میں میلاد کی مجلسوں کا رواج غالباً چھٹی صدی سے ہوا ہے[1] تتبع سے یہ ثابت ہوا کہ ان روایتوں کا بڑا حصہ ان ہی کتابوں کے ذریعہ سے پھیلا ہے جو ان مجالس کی غرض سے وقتاً فوقتاً لکھی گئیں اور جن کے بکثرت حوالے مواہب لدنیہ میں جا بجا آتے ہیں۔

علامہ سیوطیؒ کی خصائص کبریٰ جو حیدرآباد میں چھپ گئی ہے، معجزات کے موضوع پر سب سے زیادہ مبسوط اور جامع تالیف ہے، علامہ ممدوح نے صحاح ستہ کے علاوہ احمد سعید، ابن منصور، طیالسی، ابن ابی شیبہ، حاکم، ابو یعلی بلکہ ان سے بھی فروتر، بیہقی، ابونعیم، بزار، ابن سعید، طبرانی، دارمی بلکہ غیر ممتاز مصنفوں مثلاً ابن ابی الدنیا، ابن شاہین، ابن ابی النجار، ابن مندہ، ابن مردویہ، ابن عساکر، دیلمی، خرائطی، خطیب وغیرہ کی کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا، قوی اور ضعیف اور صحیح و غلط ہر قسم کے واقعات کا انبار لگا دیا اور مختلف دفتروں میں جو کچھ پھیلا تھا ان کو خصائص کی دو جلدوں میں یکجا کر دیا، تاہم مصنف کو یہ فخر ہے، جیسا کہ دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ اس تالیف میں موضوع اور بے سند روایتوں سے اگرچہ احتراز کیا گیا ہے لیکن ضعیف روایتیں جن کی سندیں ہیں وہ داخل کر لی گئی ہیں۔

غور کے قابل امر یہ ہے کہ بلا امتیاز بھلی بری کسی سند کا موجود ہونا، روایت کی معتبری کی حجت کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ یہ کتاب ہے کہ کتاب میں صحیح و غلط، قوی اور ضعیف، مشہور و منکر ہر قسم کی روایتوں کو ان کے درجہ اور مرتبہ کے ذکر کے بغیر پہلو بہ پہلو وہ لکھتے چلے گئے ہیں، اس لئے عام ناظرین کو یہ پتہ نہیں لگتا کہ اس انبار خانہ میں جہاں جواہرات کا خزانہ ہے وہیں خزف ریزوں کا بھی ڈھیر لگا ہے، پوری کتاب میں شاید دس بیس مقام سے زیادہ نہیں جہاں مصنف نے اپنی روایتوں کے درجہ استناد کا پتہ دیا ہو، اس سے زیادہ یہ کہ بعض واقعات کے متعلق باوجود ان کی شدید روایت پرستی کے ان کو بہ تحقیق معلوم تھا کہ صحیح نہیں تاہم چونکہ وہ پہلی کتابوں میں مندرج تھے، ان کی نقل سے احتراز نہیں کیا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے موقع پر عام کتب میلاد میں جو عجیب و غریب واقعات مذکور ہیں ان کو تمامہا دلائل ابونعیم سے نقل کر کے آخر میں لکھتے ہیں۔

هذا الاثر والذي قبله فيهما نكارة شديدة	اس روایت اور اس سے پہلے دو روایتوں میں سخت نامعتبر باتیں
ولم اورد في كتابي هذا اشد نكارة منهما ولم	ہیں اور میں نے اپنی کتاب میں اس سے زیادہ ناقابل اعتبار
تكن نفسي تطيب بايرادهما لكن تبعت الحافظ	روایتیں نہیں لکھیں، میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن
ابا نعيم في ذالك (خصائص ج ۱ ص ۴۹)	حافظ ابونعیم کی پیروی کر کے لکھ دیں۔

ایک اور جگہ خطیب کی ایک کتاب سے وفد نجران کے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود اس روایت کو بے اعتبار سمجھتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

ما اخرج الخطيب في المتفق والمفترق	خطیب نے المتفق والمفترق میں ایسی سند سے جس میں

---

[1] الملک المظفر شاہ اربل مولود ۵۴۹ھ متوفی ۶۳۰ھ نے جیسا کہ ابن خلکان نے اس کے حال میں لکھا ہے مولد شریف بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منایا کرتا تھا، یہ جنگ صلیبی کا زمانہ تھا اس کے لئے ابن دحیہ المتوفی ۶۳۳ھ نے ۶۰۴ھ میں کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر تصنیف کی۔

بسند فیہ مجاھیل (ج ۲ ص ۵۵) مجہول الحال راوی ہیں بیان کیا ہے

ایک اور مقام پر ایک گدھے کا واقعہ نقل کرتے ہیں جو گدھے کی صورت میں ایک جن تھا اور آپ کی سواری میں آنے کا مشتاق تھا، یہ لوگوں کے گھروں میں جا کر اشارہ سے ان کو بلا لاتا تھا، یہ عجیب جانور آپ کو خیبر میں ملا تھا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کے مظالم کی داستان سنائی اور جب آپ نے وفات پائی تو فرط غم سے اپنے کو کنوئیں میں گرا کر جان دے دی، حافظ سیوطی نے ابن عساکر سے یہ واقعہ خصائص میں نقل کیا ہے اور اس پر بے تعرض کئے گزر گئے ہیں، حالانکہ بعینہ اسی واقعہ کے متعلق ابن حبان کے حوالہ سے اپنی دوسری تصنیف اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ میں لکھتے ہیں کہ یہ سرتاپا موضوع ہے۔

محدث صابونی نے معجزہ کی ایک روایت لکھ کر پھر خود ہی اس پر جرح کی ہے کہ اس کی سند اور متن دونوں غریب ہیں، بایں ہمہ وہ اس کے متعلق آخری رائے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ:

ھو فی المعجزات حسن۔ معجزات میں وہ حسن (اچھی) ہے۔

اس پر علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں،

لان عادۃ المحدثین التساھل فی غیر الاحکام والعقائد (ج ۵ ص ۱۲۲) یہ اس لئے کہ محدثین کی عادت ہے کہ عقائد اور احکام کے علاوہ دیگر روایتوں میں وہ نرمی برتتے ہیں۔

لیکن کیا یہ اصول صحیح ہے؟ اور من کذب علی متعمدا کی تہدید سے خالی ہے، معجزات ہوں یا فضائل، ضرور ہے کہ آپ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو، جیسا کہ امام نووی، حافظ عسقلانی، ابن جماعۃ، طیبی، البلقینی اور علامہ عراقی نے اپنی اپنی تصنیفات میں اس کی تصریح کی ہے۔

معجزات کے متعلق غلط اور موضوع روایتوں کے پیدا ہونے کے اسباب

(۱) ان روایتوں کے پیدا ہونے کا بڑا سبب یہ ہے کہ مقبولیت عام کی بنا پر یہ کام واعظوں اور میلاد خوانوں کے حصہ میں آیا، چونکہ یہ فرقہ علم سے عموماً محروم ہوتا ہے اور صحیح روایات تک اس کی دسترس نہیں ہوتی اور ادھر گرمی محفل اور شورا حسنت کے لئے اس کو دلچسپ اور عوام فریب باتوں کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی اس لئے لامحالہ اُن کو اپنی قوت اختراع پر زور دینا پڑا، ان میں جو کسی قدر محتاط تھے انھوں نے ان کو لطائف صوفیانہ اور مضامین شاعرانہ میں ادا کیا، سننے والوں نے ان کو روایت کی حیثیت دے دی یا بعد کو ان ہی بیانات نے روایت کی حیثیت اختیار کر لی اور جو نڈر اور بے احتیاط تھے، انھوں نے یہ پردہ بھی نہیں رکھا بلکہ ایک سند جوڑ کر انھوں نے براہ راست اس کو حدیث و خبر کا مرتبہ دے دیا، حافظ سیوطی علامہ ابن جوزی کی کتاب الموضوعات کے حوالہ سے لکھتے ہیں،

احدھما القصاص ومعظم البلاء منھم یجری لانھم یریدون احادیث تنفق وترقق والصحاح جھوٹی حدیثیں بنانے والوں میں ایک واعظوں کا گروہ ہے اور سب سے بڑی مصیبت ان ہی سے پیش آتی ہے کیونکہ وہ ایسی حدیثیں چاہتے ہیں

---

[1] ج ۱، ص ۱۰۰۰ ۱۴۲ خصائص سیوطی ج ۲ ص ۱۳۵ [2] دیکھو موضوعات ملا علی قاری ص ۹ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔

یقل فیہ ھذا الشأن الحفظ لیشق علیھم ویتفق عدم الدین وھم یحضرھم جھال۔

(آخر کتاب اللآلی المصنوعہ صفحہ ۲۴۹)

جو مقبول عام اور مؤثر ہو سکیں اور صحیح حدیثوں میں یہ بات نہیں اس کے علاوہ صحیح حدیثوں کا یاد رکھنا ان کو مشکل ہے نیز ان کے ساتھ ان میں دینداری نہیں ہوتی اور ان کی مجلسوں میں جاہلوں ہی کا مجمع ہوتا ہے

چنانچہ فضائل و مناقب، عذاب و ثواب، بہشت و دوزخ، واقعات میلاد اور معجزات و دلائل کا جو جعلی دفتر پیدا ہو گیا ہے وہ زیادہ تر ان ہی جاہلوں کا ترتیب دیا ہوا ہے۔

علامہ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ تاویل مختلف الحدیث میں جو اب مصر میں چھپ گئی ہے کہتے ہیں کہ احادیث و روایات میں فساد تین راستوں سے آیا، منجملہ ان کے ایک راستہ واعظین ہیں۔

والقصاص فانھم یمیلون وجوہ العوام الیھم ویستدرون ما عندھم بالمناکیر والغرائب والاکاذیب من الاحادیث ومن شان العوام القعود عند القاص ما کان حدیثہ عجیبا خارجا من فطر العقول او کان رقیقا یحزن القلوب ویستغزر العیون (صفحہ ۳۵۶)

اور واعظین کیونکہ وہ عوام کا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس کو لغو، منکر اور عجیب و غریب باتیں بیان کر کے وہ وصول کرتے ہیں اور عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ اسی وقت تک ان واعظین کے پاس بیٹھتے ہیں جب تک وہ خارج از عقل باتیں یا ایسی مؤثر باتیں بیان کیا کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں اثر پیدا کریں اور ان کو رلائیں۔

آپ کی برتری اور جامعیت کا تخیل

(۲) ان روایات کے پیدا ہونے کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ مسلمانوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء ہیں، آپ کامل ترین شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں، آپ تمام محاسن کے جامع ہیں، یہ اعتقاد بالکل صحیح ہے، لیکن اس کو لوگوں نے غلط طور پر وسعت دے دی ہے اور انبیائے سابقین کے تمام معجزات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دیا اور وہ اس اعتقاد کی بدولت تمام مسلمانوں میں پھیل گئے، بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں اور سیوطی نے خصائص میں اعلانیہ دوسرے انبیاء کے معجزات کے مقابل میں ان ہی کے مثل آپ کے معجزات بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح آپ کی تعلیم تمام انبیاء کی تعلیمات کا خلاصہ اور مجموعہ ہے، اسی طرح آپ کے معجزات بھی تمام دیگر انبیاء کے معجزات کا مجموعہ ہے اور جو کچھ عام انبیاء سے متفرق طور پر صادر ہوا وہ تمام کا تمام مجموعاً آپ سے صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس مماثلت اور مقابلے کے لئے تمام تر صحیح روایتیں دستیاب نہیں ہو سکتیں اس لئے لوگوں نے ان ہی ضعیف اور موضوع روایتوں کے دامن میں پناہ لی، کہیں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا، مثلاً حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے تمام اسماء کی تعلیم کی، دیلمی نے مسند الفردوس میں روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی تمام اسماء کی تعلیم دی، حضرت ادریسؑ کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا نے ان کو بلند جگہ میں اٹھایا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بلندی اس سے بھی آگے تا بہ قوسین تک ہوئی، حضرت نوحؑ کی طوفان کی دعا اگر قبول ہوئی تو آپ کی قحط کی دعا قبول ہوئی، حضرت صالحؑ کے لئے اونٹنی معجزہ تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ نے باتیں کیں، حضرت ابراہیمؑ آگ میں نہ جلے آپ سے بھی آتشیں معجزے صادر ہوئے

حضرت اسماعیلؑ کے گلے پر اگر چھری رکھی گئی تو آپ کا سینہ بھی چاک کیا گیا، حضرت یعقوبؑ سے بھیڑیے نے گفتگو کی، روایت کی گئی ہے کہ آپ سے بھی بھیڑیا ہم کلام ہوا، ابو نعیم میں حکایت ہے کہ حضرت یوسفؑ کو حسن کا آدھا حصہ عطا کیا گیا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا حصہ دیا گیا، حضرت موسیٰؑ کے لئے پتھر سے نہریں جاری ہوئیں، تو آپ کی انگلیوں سے پانی بہا، حضرت موسیٰؑ کی لکڑی معجزہ دکھاتی تھی تو آپ کے فراق میں چھوہارے کا درخت بھی رو دیا اور چھوہارے کی خشک ٹہنی تلوار بن گئی، حضرت موسیٰؑ کے لئے بحر احمر شق ہوا تو آپ کے لئے معراج میں آسمان و زمین کے درمیان کا دریائے فضا بیچ سے پھٹ گیا، یوشعؑ کے لئے آفتاب ٹھہر گیا تو آپ کے اشارے سے آفتاب ڈوب کر نکلا، حضرت عیسیٰؑ نے گہوارہ میں کلام کیا تھا، یہ روایت وضع کی گئی کہ آپ نے بھی گہوارے میں کلام کیا اور آپ کی زبان سے پہلے تکبیر و تسبیح کی صدا بلند ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سب سے بڑا معجزہ مُردوں کو زندہ کرنا ہے اور صرف ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی یہ معجزہ منسوب کیا گیا، ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کہا جب تک آپ میری لڑکی کو زندہ نہ کر دیں گے میں ایمان نہ لاؤں گا، چنانچہ آپ نے اس کی قبر پر جا کر آواز دی اور وہ زندہ نکل کر باہر آئی اور پھر چلی گئی، اسی طرح یہ روایت بھی گھڑی گئی ہے کہ آپ کی والدہ بھی آپ کی دعا سے زندہ ہوئیں اور آپ پر ایمان لائیں۔

(۲) قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاء کے گزشتہ صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشین گوئیاں ہیں اور ان کے مطابق یہود و نصاریٰ کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا، اس واقعہ کو دروغ گو راویوں نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن، تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا چنانچہ ولادتِ نبوی سے قبل علمائے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا بلکہ پرانے گھرانوں اور ویرانوں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں، جن میں آپ کا تمام حلیہ رکھا تھا اور اگلے لوگ ان کو بہت بہت چھپا کر رکھتے تھے بلکہ بعض دیروں میں تو آپ کی تصویر تک موجود تھی، توراۃ و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض پیشین گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں اور وہ آج بھی ہیں لیکن وہ استعارات و کنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں، ان کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلایا گیا۔

عرب میں بت خانوں کے مجاور اور کاہن تھے جو فال کھولتے تھے اور پیشین گوئیاں کرتے تھے، ان کا ذریعہ علم جنات اور شیاطین تھے، چنانچہ جب آپ کے قرب ولادت کا زمانہ آیا تو عموماً بت خانوں سے اور بتوں کے پیٹ سے آوازیں سنائی دیتی تھیں، کاہن مقفی اور مسجع فقروں میں اور جنات شعروں میں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا زمانہ قریب آ گیا، یمن کے ایک بادشاہ کی طرف آپ کی منقبت میں پورا ایک قصیدہ منسوب کیا گیا، ملوک یمن، شاہان فارس اور قریش کے اکابر نے آپ کو خواب میں دیکھا، پتھروں پر اسم مبارک لوگوں کو منقوش نظر آتا تھا، قریش کا مورث اعلیٰ کعب بن لوی ہر جمعہ کو اپنے قبیلے کے لوگوں کو

یکجا کرکے ان کے سامنے خطبہ دیتا تھا جس میں مسجع فقروں اور شعروں میں آپ کے ظہور کی خوشخبری ہوتی تھی، مکہ کے لوگ احبار اور راہبوں کی زبان سے محمد آپ کا نام سن کر اپنے بچوں کا یہی نام رکھتے تھے کہ شاید یہی پیغمبر ہو جائے، مدینہ کے لوگوں کو ان ہی یہودیوں کی زبانی یہ معلوم ہوچکا تھا کہ شہر یثرب آپ کا دار الہجرت ہوگا اسی لئے وہ آپ کے ورود کے منتظر تھے، سطیح کاہن کا آپ کی پیشین گوئی میں ایک طویل افسانہ ہے لیکن اس ذخیرہ کا بڑا حصہ موضوع اور جعلی ہے اور باقی نہایت ضعیف اور کمزور ہے اور ان میں جو ایک آدھ صحیح ہے وہ پہلے گزر چکا ہے۔

شاعرانہ تخیل کو واقعہ سمجھ لینا

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش عالم کی رحمت کا باعث تھی، اس لئے کائنات کا فخر و ناز اس پر بجا ہوسکتا ہے، اگلے واعظوں اور میلاد خوانوں نے اس واقعہ کو شاعرانہ انداز میں اس طرح ادا کیا کہ آمنہ کا کاشانہ نور سے معمور ہوگیا، جانور خوشی سے بولنے لگے پرندے تہنیت کے گیت گانے لگے، مغرب کے چرندوں اور پرندوں نے مشرق کے چرندوں اور پرندوں کو مبارک باد دی، مکہ کے سوکھے درختوں میں بہار آگئی، ستارے زمین پر جھک گئے، آسمانوں کے دروازے کھل گئے، فرشتوں نے ترانۂ مسرت بلند کیا، انبیاء نے روئے روشن کی زیارت کی، فرشتوں نے بچہ کو آسمان و زمین کی سیر کرائی، شیطانوں کی فوج پابہ زنجیر کی گئی، پہاڑ غرور سے اونچے ہوگئے، دریا کی موجیں خوشی سے اچھلنے لگیں، درختوں نے سبزی کے نئے جوڑے پہنے، بہشت و جنت کے ایوان نئے سر و سامان سے سجائے گئے وغیرہ، بعد کے واعظوں اور میلاد خوانوں نے اس شاعرانہ انداز بیان کو واقعہ سمجھ لیا اور روایت تیار ہوگئی۔

آئندہ واقعات کو اشارات میں ولادت کے موقع پر بیان کرنا

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد رسالت میں یا بعد کو جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ان کا وقوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے زمانہ میں تسلیم کرلیا گیا ہے اور ان کو بحیثیت معجزہ کے آئندہ واقعات کا پیش خیمہ بنا لیا گیا ہے، مثلاً آپ کے زمانہ میں بت پرستی کا استیصال ہوگیا، کسریٰ و قیصر کی سلطنتیں فنا ہوگئیں، ایران کی آتش پرستی کا خاتمہ ہوگیا، شام کا ملک فتح ہوا، ان واقعات کو معجزہ اس طرح بنایا گیا کہ جب آپ کی ولادت ہوئی تو کعبہ کے تمام بت سرنگوں ہوگئے، قصر کسریٰ کے کنگرے ہل گئے، آتشکدۂ فارس بجھ کر رہ گیا، نہر ساوہ خشک ہوگئی، ایک نور چمکا جس سے شام کے محل نظر آنے لگے۔

(۶) بعض واقعات ایسے ہیں جن کو کسی حیثیت سے معجزہ نہیں کہا جاسکتا، لیکن تکثیر معجزات کے شوق میں ذرا سا بھی کسی بات میں عجوبہ پن ان کو نظر آیا تو اس کو مستقل معجزہ بنالیا۔ مثلاً حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے اور وہ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی مذکور ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی پالتو جانور تھا، جب آپ اندر تشریف لاتے تو وہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا، جب آپ باہر چلے جاتے تو وہ ادھر ادھر دوڑنے لگتا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو بھی آپ کی جلالت قدر اور حفظ مراتب کا پاس تھا اور آپ کی عظمت و شان سے واقف تھے لیکن درحقیقت یہ کوئی معجزہ نہیں بلکہ عام لوگوں سے بھی بعض جانور اسی

طرح ہل جل جاتے ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت جابرؓ سخت بیمار تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو گئے تو وہ بے ہوش تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کرکے ان کے منہ پہ پانی چھڑکا تو ان کو ہوش آگیا، یہ ایک معمولی واقعہ ہے مگر کتبِ دلائل کے مصنفین نے اس کو بھی معجزہ قرار دے دیا ہے[1]۔

اسی طرح یہ روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختون پیدا ہوئے تھے، یہ روایت متعدد طریقوں سے مروی ہے، مگر ان میں سے کوئی طریقہ بھی ضعف سے خالی نہیں ہے، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ آپ کا مختون پیدا ہونا متواتر روایتوں سے ثابت ہے اس پر علامہ ذہبی نے تنقید کی ہے کہ تواتر تو کجا صحیح طریق سے ثابت بھی نہیں (مستدرک ۲ باب اخبار النبی) اور بقول علامہ ابن قیم (زاد المعاد) اگر یہ ثابت بھی ہو تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی فضیلت نہیں ہے کیونکہ ایسے بچے اکثر پیدا ہوتے ہیں۔

روایات صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تھے یا سجدہ میں جاتے تھے تو آپ کی بغل کی سپیدی نظر آتی تھی، یہ ایک معمولی بات ہے مگر محب طبری، قرطبی اور سیوطی وغیرہ نے اس کو بھی معجزہ اور آپ کا خاصہ قرار دے دیا ہے۔

معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں کتبِ دلائل کے مصنفین نے یہ بھی کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی روایت میں اگر مختلف سلسلہ سند کے راویوں میں باہم موقع، مقام یا کسی اور بات میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا تو اس کو چند واقعے قرار دے دیا، مثلاً ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک اونٹ جو دیوانہ ہو گیا تھا یا بگڑ گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کے پاس گئے تو اس نے مطیعانہ سر ڈال دیا، صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! جب جانور آپ کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو ہم کو انسان ہو کر ضرور آپ کے سامنے سربسجود ہونا چاہیئے، آپ نے فرمایا، اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنا روا رکھتا تو بیوی کو کہتا کہ شوہر کو سجدہ کرے، یہ ایک ہی واقعہ ہے جو ذرا ذرا سے اختلافِ بیان کی بنا پر چودہ پندرہ واقعات بن گئے ہیں۔

الفاظ کے نقل میں بے احتیاطی

(۷) ان کتابوں میں بعض معجزات ایسے مذکور ہیں جن کی اصل صحاح میں مذکور ہے اور اس طرح مذکور ہے کہ وہ کوئی معجزہ نہیں بلکہ معمولی واقعہ ہے لیکن نیچے درجے کی روایتوں میں بے احتیاط راویوں نے الفاظ کے ذرا الٹ پھیر سے اس کو معجزہ قرار دیدیا، صحاح کی متعدد روایتوں میں ہے کہ شانہ مبارک پر ابھرا ہوا گوشت تھا جس کو "خاتم نبوت" کہتے تھے اور آپ کی انگشت مبارک میں جو نقرئی خاتم (چاندی کی انگوٹھی) تھی، اس پر "محمد رسول اللہ" منقوش تھا، بے احتیاط راویوں نے ان دونوں واقعوں کو ملا دیا اور اس طرح واقعہ کی صورت حاکم کی تاریخ نیشاپور، ابن عساکر کی تاریخ دمشق اور ابو نعیم کی دلائل میں جا کر یوں ہو جاتی ہے کہ پشت مبارک کے گوشت کی خاتم نبوت پر کلمہ وغیرہ کی عبارتیں لکھی تھیں۔

---

[1] خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم ص ۵۱ حیدرآباد دکن۔

مشہور عام دلائل ومعجزات کی روایتی حیثیت

دلائل ومعجزات کے باب میں موضوع، منکر، ضعیف، غرض ہر قسم کی قابلِ اعتراض روایات کا اتنا بڑا انبار ہے کہ اگر ایک ایک کرکے اس کی جانچ پڑتال کی جائے تو ایک مستقل ضخیم جلد تیار ہو جائے، لیکن یہاں اس کا موقع نہیں، اس لئے ہم صرف ان روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق و ذوق پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

(۱) اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ روایت آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح وقلم، عرش وکرسی، جن وانس غرض سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا اور پھر لوح وقلم، عرش وکرسی، آسمان وزمین، ارواح وملائکہ سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں۔ اس کے متعلق اول ما خلق اللہ نوری یعنی سب سے پہلے خدا نے میرا نور پیدا کیا[1] کی روایت عام طور سے زبانوں پر جاری ہے، مگر اس روایت کا پتہ احادیث کے دفتر میں مجھے نہیں ملا، البتہ ایک روایت مصنف عبدالرزاق میں ہے یا جابر اول ما خلق اللہ نور نبیک من نورہ۔ اے جابر سب سے پہلے خدا نے تیرے پیغمبر کا نور اپنے نور سے پیدا کیا۔ اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوئے اور انہی سے لوح وقلم، عرش وکرسی، آسمان وزمین اور جن وانس کی پیدائش ہوئی۔

زرقانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی سند نہیں لکھی، ہندوستان میں مصنف عبدالرزاق کی گو دوسری جلد ملتی ہے مگر پہلی نہیں ملتی، دوسری جلد دیکھ لی گئی اس میں یہ حدیث مذکور نہیں اس لئے اس روایت کی تنقید نہ ہو سکی، اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں اور فضائل ومناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے، اس لئے اصولی حیثیت سے اس روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس وپیش ہے، اس تردد کو قوت اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں مخلوقاتِ الٰہی میں سب سے پہلے "قلم تقدیر" کی پیدائش کا تصریحی بیان ہے کہ اول ما خلق اللہ القلم[2]۔

(۲) روایتوں میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدہ میں پڑا رہا، پھر حضرت آدمؑ کے تیرہ وتار جسم کا چراغ بنا پھر آدمؑ نے مرتے وقت شیثؑ کو اپنا وصی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا، اسی طرح یہ درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا رہا، اور حضرت عبداللہ کو سپرد ہوا اور حضرت عبداللہ سے حضرت آمنہ کو منتقل ہوا، نور کا سجدہ میں پڑے رہنا اور اس کا موجود ہونا بالکل موضوع ہے اور نور کا ایک دوسرے وصی کو درجہ بدرجہ منتقل ہوتا رہنا

---

[1] بعض ارباب سیر نے اس بنا پر کہ فضائل میں ہر قسم کی روایات قبول کر لی جاتی ہیں اور خصوصاً وہ جن کی تائید ان کے خیال میں دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے، اس روایت کو اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے زرقانی علی المواہب ج ۱ ص ۴۶ مگر جو علماء ہر قسم کی روایت میں صحت کے پہلو کا خیال ضروری سمجھتے ہیں ان کو اس میں کلام ہے البتہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیاء میں اول مخلوق ہونا ثابت ہے

[2] جامع ترمذی کتاب القدر، ان علماء نے جنہوں نے اول ما خلق اللہ نوری کو قبول کر لیا ہے نور محمدی اور قلم کی اولیت پیدائش پر تطبیق کی کوشش کی ہے۔

بے سروپا ہے۔ طبقات ابن سعد اور طبرانی اور ابونعیم اور بزار میں اس آیت پاک،

اَلَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ (شعراء) — وہ خدا جو تجھ کو دیکھتا ہے جب تو تہجد کی نماز میں کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ کرنے والوں میں تیرے الٹ پھیر کو بھی دیکھتا ہے۔

کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبروں کی پشت بہ پشت منتقل ہونا خدا دیکھ رہا تھا، لیکن اول تو پوری آیت کے الفاظ اور سیاق مطابق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں۔

(۳) روایت ہے کہ یہ نور جب (بلوغ کے وقت) عبد المطلب کو سپرد ہوا تو وہ ایک دن خانہ کعبہ میں سوئے ہوئے تھے سو کر اٹھے تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں تیل لگا ہے اور بدن پر جمال و رونق کا خلعت ہے، یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے، آخرکار ان کے باپ ان کو قریش کے ایک کاہن کے پاس لے گئے اس نے کہا کہ آسمانوں کے خدا نے اجازت دی ہے کہ اس لڑکے کا نکاح کر دیا جائے۔ اس نور کے اثر سے عبد المطلب کے بدن سے مشک کی خوشبو آتی تھی اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا، قریش پر قحط وغیرہ کی جب کوئی مصیبت آتی تھی تو وہ اس نور کے وسیلہ سے دعا مانگتے تھے تو قبول ہوتی تھی۔

یہ روایت ابوسعد نیشاپوری المتوفی ۴۰۶ھ نے اپنی کتاب شرف المصطفیٰ میں ابوبکر بن ابی مریم کے واسطہ سے کعب احبار (نومسلم یہودی) تابعی سے نقل کی ہے، اول تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے اور آگے کی سند نہیں، علاوہ ازیں کعب احبار گو نومسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں تاہم امام بخاری ان کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں، اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادث کی روایات کے سرچشمہ یہی ہیں بیچ کا راوی ابوبکر ابن ابی مریم باتفاق محدثین ضعیف ہے، ان کا دماغ ایک حادثہ کے باعث ٹھیک نہیں رہا تھا

(۴) ابونعیم، حاکم، بیہقی اور طبرانی میں ایک روایت ہے کہ عبد المطلب یمن گئے تھے، وہاں ایک کاہن ان کے پاس آیا اور ان کی اجازت سے ان کے دونوں نتھنوں کو دیکھ کر بتایا کہ ایک ناک میں نبوت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت ہے، تم بنو زہرہ کی کسی لڑکی سے جا کر شادی کرو۔ ان مضمونوں کا مشترک راوی عبد العزیز بن عمران الزہری ہے، اس کی نسبت میزان میں ہے کہ امام بخاری نے کہا، اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔ نسائی نے کہا متروک ہے۔ یحییٰ نے کہا شعر و شاعری کا آدمی ہے، ثقہ نہ تھا، عبد العزیز کے بعد کا راوی اس میں یعقوب بن زہری ہے جس کی نسبت ابن معین کہتے ہیں کہ اگر ثقات سے روایت کرے تو خیر لکھو۔ ابوزرعہ نے کہا، وہ کچھ نہیں وہ واقدی کے برابر ہے، امام احمد نے کہا وہ کچھ نہیں اس کی حدیث لاشے کے برابر ہے، ساجی نے کہا وہ منکر الحدیث ہے علاوہ ازیں اس روایت میں بعض اور مجہول بھی ہیں، حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے لیکن امام ذہبی نے نقد مستدرک میں یعقوب اور عبد العزیز دونوں کو ضعیف کہا ہے۔

(۵) روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ کی پیشانی میں جب یہ نور چمکا تو ایک عورت جو کاہنہ تھی اس نے نور کو پہچانا اور چاہا کہ وہ خود عبد اللہ سے ہم بستر ہو کر اس نور کی امین بن جائے مگر یہ سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی،

اس وقت عبداللہ نے عذر کیا اور گھر چلے گئے، وہاں یہ دولت آمنہؓ کو نصیب ہوئی، عبداللہ نے واپس آکر اس کاہنہ سے اب خود درخواست کی تو اس نے رد کر دی کہ اب وہ نور تمہاری پیشانی سے منتقل ہو چکا۔

یہ روایت الفاظ اور جزئیات کے اختلاف کے ساتھ ابن سعد، خرائطی، ابن عساکر، بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے، ابن سعد میں تین طریقوں سے اس کی روایت ہے، ایک طریقہ میں پہلا راوی واقدی ہے، دوسرے میں کلبی ہے، یہ دونوں مشہور دروغ گو ہیں، تیسرا طریقہ ابویزید مدنی تابعی پر جاکر ختم ہو جاتا ہے، ابویزید مدنی کی اگرچہ بعض ائمہ نے توثیق کی ہے مگر مدینہ کے شیخ الکل امام مالک فرماتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا، ابوزرعہ نے کہا مجھے معلوم نہیں، ابونعیم نے چار طریقوں سے اس کی روایت کی ہے لیکن کوئی ان میں قابل وثوق نہیں، ایک طریقہ میں نضر بن سلمہ اور احمد بن محمد بن عبدالعزیز بن عمر والزہری اور یہ تینوں نامعتبر ہیں، تیسرے سلسلہ میں مسلم بن خالد الزنجی ہیں جو ضعیف سمجھے جاتے ہیں اور متعدد مجاہیل ہیں، چوتھا طریقہ یزید بن شہاب الزہری پر ختم ہے اور وہ اپنے آگے کا سلسلہ نہیں بتاتے اور ان کا حال بھی نہیں معلوم، بیہقی کا سلسلہ وہی تیسرا ہے، خرائطی اور ابن عساکر کا یوں بھی اعتبار نہیں۔

(۶) حضرت عباسؓ سے روایت کی گئی ہے کہ عبد مناف اور قبیلۂ مخزوم کی دو سو عورتیں گنی گئیں کہ جنہوں نے اس غم میں کہ عبداللہ سے ان کو یہ دولت حاصل نہ ہوئی وہ مر گئیں، لیکن انہوں نے شادی نہ کی یعنی عمر بھر کنواری رہیں، اور قریش کی کوئی عورت نہ تھی جو اس غم میں بیمار نہ پڑ گئی ہو، یہی حکایت ہے جس کا غلط ترجمہ اردو مؤلفین میلاد نے یہ کیا ہے کہ اس رات دو سو عورتیں رشک و حسد سے مر گئیں، یہ روایت سند کے بغیر زرقانی شرح مواہب لدنیہ میں بصیغہ رُوِی یعنی بیان کیا گیا ہے، مذکور ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مصنف کو بھی اس کے صحت میں کلام ہے، یہ درحقیقت بالکل بے سند اور بے اصل روایت ہے اور کسی معتبر کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

(۷) روایت ہے کہ اس رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑ گیا اور اس کے چودہ کنگرے گر پڑے اور ساوہ کی نہر (واقع فارس) اور بعض روایتوں میں طبریہ کی نہر (واقع شام) خشک ہو گئی اور فارس کا آتش کدہ جو ہزاروں برس سے روشن تھا، بجھ گیا اور کسریٰ نے ایک ہولناک خواب دیکھا جس کی تعبیر یمن کے ایک کاہن سطیح سے دریافت کی گئی، یہ قصہ بیہقی، خرائطی، ابن عساکر اور ابونعیم میں سند اور سلسلۂ روایت کے ساتھ مذکور ہے، ان سب کا مرکزی راوی مخزوم ابن ہانی ہے جو اپنے باپ ہانی مخزومی (قریشی) سے جس کی ڈیڑھ سو برس کی عمر تھی بیان کرتا ہے، ہانی کے نام کا کوئی صحابی جو مخزومی قریشی ہو اور جو ڈیڑھ سو برس کی عمر رکھتا تھا معلوم نہیں، اصابہ وغیرہ میں اسی روایت کے سلسلہ میں ان کا نام مشکوک طریقہ سے آیا ہے، ان کے صاحبزادہ مخزوم بن ہانی سے محدثین میں بھی کوئی شناسا نہیں، نیچے کے راویوں کا بھی یہی حال ہے، یہاں تک کہ ابن عساکر جیسے ضعیف روایتوں کے سرپرست بھی اس روایت کو غریب کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور ابن حجر جیسے کمزور روایتوں کے سہارا اور پشت پناہ بھی اس کو مرسل ماننے کو تیار ہیں، ابونعیم کی روایت میں محمد بن جعفر بن اعین مشہور وضاع ہے۔

(۸) روایت ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی ماں شفا بنت اوس ولادت کے وقت زچہ خانہ میں موجود تھیں، وہ کہتی ہیں کہ جب آپ پیدا ہوئے تو پہلے غیب سے ایک آواز آئی، پھر مشرق و مغرب کی ساری زمین میرے سامنے روشن ہو گئی، یہاں تک کہ شام کے محل مجھ کو نظر آنے لگے، میں نے آپ کو کپڑا پہنا کر لٹایا ہی تھا کہ اندھیرا چھا گیا اور میں ڈر کر کانپنے لگی، پھر داہنی طرف سے کچھ روشنی نکلی تو آواز سنی کہ کہاں لے گئے تھے؟ جواب ملا کہ مغرب کی سمت۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی میں ڈر کر کانپی اور آواز آئی کہ کہاں لے گئے تھے؟ جواب ملا کہ مشرق کی سمت۔ یہ حکایت ابونعیم میں ہے اس کے بیچ کا راوی احمد بن محمد بن عبدالعزیز زہری نامعتبر ہے اور اس کے دوسرے رواۃ مجہول الحال ہیں۔

(۹) روایت ہے کہ حضرت آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے، اے آمنہ تیرا بچہ تمام جہان کا سردار ہوگا جب پیدا ہو تو اس کے نام احمد اور محمد رکھنا اور یہ تعویذ اس کے گلے میں ڈالنا۔ جب وہ بیدار ہوئیں تو سونے کے پتر پر یہ اشعار لکھے ملے (اس کے بعد اشعار ہیں) یہ قصہ ابونعیم میں ہے جس کا راوی ابوغزیہ محمد بن موسیٰ انصاری ہے جس کی روایتوں کو امام بخاری منکر کہتے ہیں، ابن حبان کا بیان ہے کہ دوسروں کی حدیثیں چرایا کرتا تھا اور ثقات سے موضوع روایتیں بنا کر بیان کیا کرتا تھا، متاخرین میں حافظ عراقی نے اس روایت کو بے اصل اور شامی نے بہت ہی ضعیف کہا ہے، ابن اسحاق نے بھی اس کو بے سند روایت کہا ہے، ابن سعد میں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے ہے جس کی دروغ گوئی محتاج بیان نہیں۔

(۱۰) روایت۔ عثمانؓ بن ابی العاص صحابی کی ماں ولادت کے وقت موجود تھیں، وہ کہتی ہیں کہ جب آمنہ کو درد زہ ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے زمین پر جھکے آتے ہیں، یہاں تک کہ میں ڈری کہ کہیں زمین پر نہ گر پڑیں اور جب پیدا ہوئے تو جدھر نظر جاتی تھی تمام گھر روشنی سے معمور تھا، یہ قصہ ابونعیم، طبرانی اور بیہقی میں مذکور ہے، اس کے رواۃ میں یعقوب بن محمد زہری پایہ اعتبار سے ساقط ہے اور عبدالعزیز بن عمر بن عبدالرحمٰن بن عوف ایک محض داستان گو اور جھوٹا تھا۔

(۱۱) روایت۔ حضرت آمنہ کہتی ہیں کہ مجھے ایام حمل میں حمل کی کوئی علامت معلوم نہ ہوئی اور عورتوں کو ان ایام میں جو گرانی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے وہ بھی نہ ہوئی، بجز اس کے کہ معمول میں فرق آ گیا تھا، قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اس قصہ کو ابن اسحاق اور ابونعیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے، لیکن ابن اسحاق کا جو نسخہ ابن ہشام کے نام سے مشہور اور چھپا ہوا ہے اور نیز دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں، قسطلانی کی پیروی میں دوسرے بے احتیاط متاخرین مثلاً صاحب سیرت حلبیہ اور مصنف خمیس نے بھی ابن اسحاق اور ابونعیم ہی کی طرف اس روایت کی نسبت کی ہے، لیکن ابن سیدالناس نے عیون الاثر میں بجا طور سے اس روایت کے سلسلے واقدی کا حوالہ دیا ہے، دراصل یہ قصہ ابن سعد نے نقل کیا ہے اور اس کی روایت کے دو سلسلے لکھے ہیں، مگر ان میں سے ہر ایک کا سر سلسلہ واقدی ہے اور اس کی نسبت محدثین کی رائے پوشیدہ نہیں علاوہ ازیں ان میں سے کوئی سلسلہ بھی مرفوع نہیں، پہلا سلسلہ عبداللہ بن وہب پر ختم ہوتا ہے جو اپنی پھوپھی

سے روایت کرتے ہیں کہ وہ کہتی ہیں کہ ہم یہ سنا کرتے تھے...... دوسرے سلسلہ کو واقدی زہری پر جاکر ختم کر دیتا ہے۔

(۱۲) ایک روایت اس کے بالکل برخلاف ابن سعد میں یہ ہے کہ غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت وعظمت کے باعث حضرت آمنہ کو سخت گرانی اور بار محسوس ہوتا تھا، وہ کہا کرتی تھیں کہ میرے پیٹ میں کئی بچے رہے، مگر اس بچہ سے زیادہ بھاری اور گراں مجھے کوئی نہیں معلوم ہوا، اول تو یہ روایت معروف اور مسلّم واقعہ کے خلاف ہے، حضرت آمنہ کے ایک کے سوا کوئی اور بچہ ہوا اور نہ حمل رہا، دوسرے یہ کہ اس روایت کا سلسلہ ناتمام ہے، اسی معنی کی ایک اور روایت شدادؓ بن اوس صحابی کی زبانی منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے والدین کا پہلوٹا ہوں، جب میں شکم میں تھا تو میری ماں عام عورتوں سے بہت زیادہ گرانی محسوس کرتی تھی (کنز العمال کتاب الفضائل)، معافی بن زکریا القاضی نے اس روایت پر اتنی ہی جرح کی ہے کہ یہ منقطع ہے یعنی شداد بن اوس اور ان کے بعد کے راوی مکحول میں ملاقات نہیں، اس لئے بیچ میں ایک راوی کم ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کا پہلا راوی عمر بن صبیح کذاب، وضاع اور متروک تھا۔

(۱۳) روایت:۔ جب ولادت کا وقت آیا، خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور بہشتوں کے دروازے کھول دو، فرشتے باہم بشارت دیتے پھرتے تھے، سورج نے نور کا نیا جوڑا پہنا، اس دنیا کی تمام عورتوں کو یہ رعایت ملی کہ سب فرزند نرینہ جنیں، درختوں میں پھل آگئے، آسمان میں زبرجد و یاقوت کے ستون کھڑے کئے گئے، نہر کوثر کے کنارے مشک خالص کے درخت اگائے گئے، مکہ کے بت اوندھے ہوگئے وغیرہ وغیرہ۔

یہ حکایت مواہب لدنیہ اور خصائص کبریٰ میں ابونعیم کے حوالے سے نقل کی گئی ہے، لیکن ابونعیم کی دلائل النبوۃ کے مطبوعہ نسخہ میں جہاں اس کا موقع ہوسکتا تھا وہاں یہ روایت مجھ کو نہیں ملی، ممکن ہے کہ ابونعیم نے اپنی کسی اور کتاب میں یہ روایت لکھی ہو یا یہ مطبوعہ نسخہ ناممکل ہو، بہرحال اس روایت کی بنا صرف اس قدر ہے کہ ابونعیم چوتھی صدی کے ایک راوی عمرو بن قتیبہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کے والد قتیبہ جو بڑے فاضل تھے یہ بیان کرتے تھے، قسطلانی نے مواہب میں اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ وہ مطعون ہے، حافظ سیوطی نے خصائص میں اس کو منکر کہا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تر بے سند اور موضوع ہے۔

(۱۴) روایت:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حمل میں ہونے کی جو نشانیاں تھیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس رات کو قریش کے سب جانور بولنے لگے اور کہنے لگے کہ کعبہ کے خدا کی قسم! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں آگئے، وہ دنیا جہان کی امان اور اہل دنیا کے چراغ ہیں، قریش اور دیگر قبائل کی کاہنہ عورتوں میں کوئی عورت ایسی نہ تھی کہ اس کا جن اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگیا ہو اور ان سے کہانت کا علم چھین لیا گیا اور دنیا کے تمام بادشاہوں کے تخت اوندھے ہوگئے اور سلاطین اس دن گونگے ہوگئے، مشرق کے وحشی جانوروں نے مغرب کے وحشی جانوروں کو جاکر بشارت دی، اسی طرح ایک دریا نے

دوسرے دریا کو خوشخبری سنائی اور پورے ایام حمل میں ہر ماہ آسمان و زمین سے یہ ندا سُنی جانے لگی کہ بشارت کہ حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمین پر ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آیا، حضرت کی والدہ فرماتی تھیں کہ جب میرے حمل کے چھ مہینے گزر گئے تو خواب میں کسی نے مجھ کو پاؤں سے ٹھوکر دے کر کہا کہ اے آمنہ! جہان کا سردار تیرے پیٹ میں ہے، جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ رکھنا اور اپنی حالت کو چھپاتے، کہتی ہیں کہ جب ولادت کا زمانہ آیا تو عورتوں کو جو پیش آتا ہے وہ مجھ کو بھی پیش آیا اور کسی کو میری اس حالت کی خبر نہ تھی، میں گھر میں تنہا تھی، عبدالمطلب خانہ کعبہ کے طواف کو گئے تھے تو میں نے ایک زور کی آواز سُنی جس سے میں ڈر گئی، میں نے دیکھا کہ ایک سپید مرغ ہے جو اپنے بازو کو میرے دل پر مل رہا ہے، اس سے میری تمام وحشت دور ہو گئی اور درد کی تکلیف بھی جاتی رہی، پھر ایک طرف دیکھا کہ سپید شربت ہے، پیاسی تھی، دودھ سمجھ کر اس کو پی گئی، اس کے پینے سے ایک نور مجھ سے نکل کر بلند ہوا پھر میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں گویا عبدالمطلب کی بیٹیاں ہیں، وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں، میں تعجب کر رہی ہوں کہ ان کو کیسے میرا حال معلوم ہوا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ان عورتوں نے کہا، کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم اور یہ حوریں ہیں، میرا درد بڑھ گیا اور ہر گھڑی آواز اور زیادہ بلند تھی اور خوف ناک ہوتی جاتی تھی، اتنے میں ایک سپید دیبا کی چادر آسمان و زمین کے درمیان پھیلی نظر آئی اور آواز آئی کہ، اس کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپا لو، میں نے دیکھا کہ چند مرد ہوا میں معلق ہیں، ان کے ہاتھوں میں چاندی کے آفتابے ہیں اور میرے بدن سے موتی کی طرح پسینہ کے قطرے ٹپک رہے تھے جس میں مشک خالص سے بہتر خوشبو تھی اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش عبدالمطلب اس وقت پاس ہوتے، پھر میں نے پرندوں کا ایک غول دیکھا جو نہیں معلوم کدھر سے آ گئے، وہ میرے کمرے میں گھس آئے، ان کی منقاریں زمرد کی اور بازو یاقوت کے تھے، میری آنکھوں سے اس وقت پردے اٹھا دیے گئے تو اس وقت مشرق و مغرب سب میری نگاہوں کے سامنے تھے، تین جھنڈے نظر آئے، ایک مشرق میں ایک مغرب میں اور ایک خانہ کعبہ کی چھت پر، اب درد زیادہ بڑھ گیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ عورتیں ٹیک لگائے بیٹھی ہیں اور اتنی عورتیں بھر گئیں کہ مجھے گھر کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی، اسی اثنا میں بچہ پیدا ہوا، میں نے پھر کر دیکھا تو وہ سجدہ میں پڑا تھا اور دو انگلیوں کو آسمان کی طرف دعا کی طرح اٹھائے تھا، پھر ایک سیاہ بادل نظر آیا جو آسمان سے اُتر کر نیچے آیا اور بچہ پر چھا گیا اور بچہ میری نگاہ سے چھپ گیا، اتنے میں ایک منادی سُنی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین کے پورب اور پچھم گھما دو اور سمندروں کے اندر لے جاؤ کہ سب اس کے نام نامی اور شکل و صورت کو پہچان لیں اور جان لیں کہ یہ مٹانے والے ہیں، یہ اپنے زمانہ میں شرک کا نام و نشان مٹا دیں گے، پھر تھوڑی ہی دیر میں بادل ہٹ گیا اور آپ دودھ سے زیادہ سفید کپڑے میں لپٹے نظر آئے جس کے نیچے سبز ریشم تھا، ہاتھوں میں سفید موتیوں کی تین کنجیاں تھیں، اور ایک آواز آئی کہ محمدؐ کو فتح و نصرت اور نبوت کی کنجیاں دی گئی ہیں۔

میں نے دل پر جبر کر کے یہ پوری حکایت نقل کی ہے، یہ اس لئے کہ میلاد کے عام جلسوں کی رونق ان ہی روایتوں سے ہے، یہ روایت ابونعیم میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے اور سند کا سلسلہ بھی ہر طرح درست ہے مگر اگر کسی کو اسماء الرجال سے آگاہی نہ بھی ہو اور وہ صرف ادب عربی کا صحیح ذوق رکھتا ہو تو وہ فقط روایت کے الفاظ اور عبارت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دے گا کہ یہ تیسری چوتھی صدی کی بنائی ہوئی ہے اس روایت میں یحییٰ بن عبداللہ البابلی اور ابوبکر بن ابی مریم ہیں، پہلا شخص بالکل ضعیف ہے اور دوسرا ناقابل حجت ہے ان کے آگے کے راوی سعید بن عمرو الانصاری اور ان کے باپ عمرو الانصاری کا کوئی پتہ نہیں۔

(۱۵) اسی قسم کی ایک اور روایت حضرت عباسؓ سے نقل کی جاتی ہے وہ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی عبداللہ جب پیدا ہوئے تو ان کے چہرے پر سورج کی سی روشنی تھی اور والد نے ایک دفعہ خواب دیکھا تو مخزوم کی ایک کاہنہ نے یہ خواب سن کر پیشین گوئی کی کہ اس لڑکے کی پشت سے ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا، جب آمنہ کے شکم سے بچہ پیدا ہوا تو میں نے ان سے پوچھا کہ ولادت کے اثنا میں تم کو کیا کیا نظر آیا؟ انہوں نے کہا کہ جب مجھے درد ہونے لگا تو میں نے بڑے زور کی آواز سنی جو انسانوں کی آواز کی طرح نہ تھی اور سبز ریشم کا پھریرا یاقوت کے جھنڈے میں لگا ہوا آسمان و زمین کے بیچ میں گڑا نظر آیا اور میں نے دیکھا کہ بچہ کے سر سے روشنی کی کرنیں نکل نکل کر آسمان تک جاتی ہیں، شام کے تمام محل آگ کا شعلہ معلوم ہوتے تھے اور اپنے پاس مرغابیوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا جس نے بچہ کو سجدہ کیا، پھر اپنے پروں کو کھول دیا۔ اور سعیرہ اسدیہ کو دیکھا کہ وہ کہتی ہوئی گزری کہ تیرے اس بچہ نے بتوں اور کاہنوں کو بڑا صدمہ پہنچایا، ہائے سعیرہ ہلاک ہوگئی، پھر ایک بلند و بالا سپید رنگ جوان نظر آیا جس نے بچہ کو میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن لگایا، اس کے ہاتھ میں سونے کا طشت تھا، بچہ کے پیٹ کو پھاڑا، پھر اس کے دل کو نکالا اس میں سے ایک سیاہ داغ نکال کر پھینک دیا، پھر سبز حریر کی ایک تھیلی کھولی، اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر مونڈھے کے برابر مہر کی اور اس کو ایک کرتہ پہنا دیا۔ اے عباس یہ میں نے دیکھا۔

اس روایت کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کہ ناقلین نے اس کے ضعف کو خود تسلیم کیا ہے اور حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت اور اس سے پہلے کی دو روایتوں (۱۳، ۱۴) میں سخت نکارت ہے اور میں نے اپنی اس کتاب (خصائص) میں ان تینوں سے زیادہ منکر کوئی روایت نقل نہیں کی اور میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے محض ابونعیم کی تقلید میں لکھ دیا ہے، جن روایتوں کو حافظ سیوطی لکھنے کے قابل نہ سمجھیں آپ ان کے ضعف کے درجہ کو سمجھ سکتے ہیں، سیوطی اس روایت کا ماخذ ابونعیم کو بتاتے ہیں مگر یہ روایت دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملی، یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہی دو سال بڑے تھے، جب آمنہ نے وفات پائی تو وہ سات آٹھ برس کے بچہ ہوں گے۔

(۱۶) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آمنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا قصہ بیان کرتی

تھیں کہ میں حیرت میں تھی کہ تین آدمی دکھائی دیئے جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے تھے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ تھا جس سے مشک کی سی خوشبو آرہی تھی، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت تھا جس کے چار گوشے تھے اور ہر گوشہ میں سپید موتی رکھا تھا اور ایک آواز آئی اے حبیب اللہ! یہ پوری دنیا پورب پچھم، خشکی وتری سب مجسم ہوکر آئی ہے، اس کے جس گوشہ کو چاہیئے مٹھی میں لے لیجئے، آمنہ کہتی ہیں کہ میں نے گھوم کر دیکھا کہ بچہ کہاں ہاتھ رکھتا ہے؟ میں نے دیکھا کہ اس نے بیچ میں ہاتھ رکھا تو کہنے والے کی آواز سنی کہ محمدؐ نے کعبہ کے خدا کی قسم! کعبہ پر قبضہ کرلیا، ہاں یہ کعبہ اس کا قبلہ اور مسکن بنے گا، تیسرے کے ہاتھ میں سپید حریر لپٹا تھا، اس نے اس کو کھولا تو اس میں ایک انگوٹھی نکلی جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت کرتی تھیں، پھر وہ میرے پاس آیا تو طشت والے نے اس انگوٹھی کو لے کر اس آفتابہ سے سات بار اس کو دھویا اور بچہ کے مونڈھے پر مہر کردی، اور حریر میں اس کو لپیٹ کر مشک خالص کے تاگے سے اس کو باندھ دیا اور تھوڑی دیر تک اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھا، ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ یہ رضوان جنت تھا، پھر بچے کے کان میں کچھ کہا جس کو آمنہ کہتی ہیں کہ میں سمجھ نہ سکی اور پھر اس نے کہا، اے محمدؐ! بشارت ہو کہ کسی نبی کو کوئی ایسا علم عطا نہیں کیا گیا جو تم کو نہیں بتا دیا گیا، تم سب پیغمبروں سے زیادہ شجاع بنائے گئے تم کو فتح و نصرت کی کنجی دی گئی اور رعب وداب بخشا گیا جو تمہارا نام سنے گا اس نے تم کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو تو وہ کانپ جائے گا کہ اے خدا کے خلیفہ!

اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ یحییٰ بن عائذ المتوفی ۳۷۶ھ نے اپنی کتاب میلاد میں اس کا ذکر کیا ہے، ابن دحیہ محدث نے بڑی جرأت کر کے اس خبر کو "غریب" کہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے، یہ تمام تر بے اصل اور بے بنیاد ہے،

(۱۷) روایت:۔ آمنہ کہتی ہیں کہ جب ولادت ہوئی تو ایک بہت بڑا ابر کا ٹکڑا نظر آیا جس میں سے گھوڑے کے ہنہنانے اور پروں کے پھڑپھڑانے اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ ابر کا ٹکڑا بچہ کے اوپر آکر چھا گیا اور بچہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، البتہ منادی کی آواز سنائی دی کہ محمدؐ کو ملکوں ملکوں پھراؤ اور سمندروں کی تہوں میں لے جاؤ کہ تمام دنیا ان کے نام ونشان کو پہچان لے اور جن وانس چرند وپرند، ملائکہ بلکہ ہر ذی روح کے سامنے ان کو لے جاؤ، ان کو آدمؑ کا خلق، شیثؑ کی معرفت، نوحؑ کی شجاعت، ابراہیمؑ کی دوستی، اسماعیلؑ کی زبان، اسحاقؑ کی رضا، صالحؑ کی فصاحت، لوطؑ کی حکمت، موسیٰؑ کی سختی، ایوبؑ کا صبر، یونسؑ کی طاعت، یوشعؑ کا جہاد، داؤدؑ کی آواز، دانیالؑ کی محبت، الیاسؑ کا وقار، یحییٰؑ کی پاک دامنی اور عیسیٰؑ کا زہد عطا کرو اور تمام پیغمبروں کے اخلاق میں ان کو غوطہ دو، آمنہ کہتی ہیں کہ پھر یہ منظر ہٹ گیا تو میں نے دیکھا کہ آپؐ سبز حریر میں لپٹے ہیں اور اس کے اندر سے پانی ٹپک رہا ہے، آواز آئی، ہاں محمدؐ نے تمام دنیا پر قبضہ کرلیا اور کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جو ان کے حلقہ اطاعت میں نہ آگئی ہو، کہتی ہیں کہ پھر میں نے دیکھا تو نظر آیا کہ آپؐ کا چہرہ چودھویں رات

کے چاند کی طرح ہے اور مشک خالص کی سی خوشبو آپ سے نکل رہی ہے، دفعۃً تین آدمی نظر آئے، ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتابہ ہے، دوسرے کے ہاتھ میں سبز زمرد کا طشت ہے اور تیسرے کے ہاتھ میں سپید ریشم ہے، اس نے سپید ریشم کو کھول کر اس میں سے انگوٹھی، جس کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی تھیں نکالی، پہلے اس نے انگوٹھی کو سات دفعہ اس آفتابہ کے پانی سے دھویا، پھر مونڈھے پر مہر کر کے بچہ کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیا اور پھر مجھے واپس کر دیا۔

اس حکایت کی بنیاد یہ ہے کہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں السعادۃ والبشریٰ نامی ایک میلاد کی کتاب سے اس کو نقل کیا ہے اور السعادۃ والبشریٰ کا مصنف کہتا ہے کہ اس نے خطیب سے اس کو لیا ہے روایات کے لحاظ سے خطیب کی تاریخ کا جو درجہ ہے وہ کس کو معلوم نہیں، قسطلانی نے اس روایت کو ابونعیم کی طرف بھی منسوب کیا ہے، مگر دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس کا پتہ نہیں، غنیمت ہے کہ حافظ قسطلانی نے خود تصریح کر دی ہے کہ اس میں سخت نکارت ہے۔

(۱۸) روایت: آمنہ کہتی ہیں کہ جب آپ پیدا ہوئے تو ایک روشنی نکلی جس سے تمام مشرق و مغرب روشن ہو گیا اور آپ دونوں ہاتھ ٹیک کر زمین پر گر پڑے (شاید مقصود یہ کہنا ہے کہ آپ سجدہ میں گر گئے) پھر مٹھی سے مٹی اٹھائی (اہل میلاد اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ آپ نے روئے زمین پر قبضہ کر لیا) اور آسمان کی طرف سر اٹھایا۔

یہ حکایت ابن سعد میں متعدد طریقوں سے مذکور ہے، مگر ان میں سے کوئی قوی نہیں، اسی کے قریب قریب ابونعیم اور طبرانی میں روایتیں ہیں، ان کا بھی یہی حال ہے۔

(۱۹) روایت: جس شب کو آپ پیدا ہوئے، قریش کے بڑے بڑے سردار جلسہ جمائے ہوئے تھے ایک یہودی نے جو مکہ میں سوداگری کرتا تھا ان سے آ کر دریافت کیا کہ آج تمہارے یہاں کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟ سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی، اس نے کہا اللہ اکبر! تم کو نہیں معلوم تو خیر، میں جو کہتا ہوں اس کو سن رکھو، آج شب کو اس پچھلی امت کا نبی پیدا ہو گیا، اس کے دونوں مونڈھوں کے بیچ میں ایک نشانی ہے، اس میں گھوڑے کی ایال کی طرح کچھ اوپر تلے بال ہیں، وہ دو دن تک دودھ نہ پیے گا، کیونکہ ایک جن نے اس کے منہ میں انگلی ڈال دی ہے جس سے وہ دودھ نہیں پی سکتا، جب جلسہ چھٹ گیا اور لوگ گھروں کو لوٹے تو معلوم ہوا کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے، لوگ اس یہودی کو آمنہ کے گھر لائے، اس نے بچہ کی پیٹھ پر تل دیکھا تو غش کھا کر گر پڑا، جب ہوش آیا، لوگوں نے سبب پوچھا، اس نے کہا، خدا کی قسم! اسرائیل کے گھرانے سے نبوت رخصت ہو گئی، اے قریش، تم اس کی پیدائش سے خوش ہو، ہشیار! خدا کی قسم! ایک دن یہ تم پر ایسا حملہ کرے گا جس کی خبر چار دانگ عالم میں پھیلے گی۔

یہ روایت مستدرک حاکم میں ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، مگر اہل علم جانتے ہیں کہ حاکم کا کسی روایت کو صحیح کہنا ہمیشہ تنقید کا محتاج رہتا ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک (جلد ۲ ص ۶۰۲) میں حاکم

کی تردید کی ہے، اس کا سلسلہ روایت یہ ہے کہ یعقوب ابن سفیان فسوی ابو غسان محمد یحییٰ کنانی سے اور اپنے باپ (یحییٰ بن علی کنانی) سے اور وہ محمد بن اسحاق (مصنف سیرت) سے روایت کرتے ہیں، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اسحاق نے خود اپنی سیرت سے یہ روایت نہیں لی ہے، ابو غسان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین نے اچھا کہا ہے مگر محدث سلیمانی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے (ایسی باتیں بیان کرنے والا جن کی تصدیق دیگر معتبر بیانات سے نہیں ہوتی) کہا ہے، ابن حزم نے ان کو مجہول کہا ہے، بہر حال اُن تک غنیمت ہے، مگر ان کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں کہ یہ کون تھے اور کب تھے؟ اسی قسم کی ایک اور روایت خیص راہب کے متعلق ابو جعفر بن ابی شیبہ سے ہے اور ابو نعیم نے دلائل میں اور ابن عساکر نے تاریخ میں اس کو ذکر کیا ہے، لیکن زرقانی نے لکھ دیا ہے کہ ابو جعفر بن ابی شیبہ نامعتبر ہے۔

(۲۰) روایت: حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! مجھ کو جس نشانی نے آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا خیال دلایا وہ یہ ہے کہ جب آپؐ گہوارہ میں تھے تو میں نے دیکھا کہ آپؐ چاند سے اور چاند آپؐ سے باتیں کرتا تھا اور انگلی سے آپؐ اس کو جدھر اشارہ کرتے تھے ادھر جھک جاتا تھا، فرمایا، ہاں میں اس سے اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور رونے سے بہلاتا تھا اور عرش کے نیچے جا کر جب وہ تسبیح کرتا تھا تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔

یہ حکایت دلائل بیہقی، کتاب المائتین صابونی، تاریخ خطیب اور تاریخ ابن عساکر میں ہے، مگر خود بیہقی نے تصریح کردی ہے کہ یہ صرف احمد بن ابراہیم جبلی کی روایت ہے اور وہ مجہول ہے، صابونی نے روایت لکھ کر کہا ہے کہ یہ سند اور متن دونوں لحاظ سے غریب ہے، علاوہ ازیں حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شاید ایک ہی دو سال بڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شیر خوارگی کے عالم میں وہ خود شیر خوار ہوں گے!

(۲۱) حافظ ابن حجر نے فتح الباری (ج ۶ ص ۳۴۴) میں واقدی کی سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے گہوارہ میں کلام کیا، ابن سبع المتوفی ــــ کی خصائص میں ہے کہ فرشتے آپؐ کا گہوارہ ہلاتے تھے اور پیدائش کے بعد، سب سے پہلا فقرہ زبان مبارک سے یہ نکلا الحمد للہ کبیرا والحمد للہ کثیرا ابن عائذ وغیرہ میلاد کی بعض اور کتابوں میں اور فقرے بھی منسوب ہیں مثلاً کہ آپؐ نے لا الہ الا اللہ یا جلال ربی الرفیع پڑھا۔

واقدی کی سیر سے مراد اگر واقدی کی مغازی ہے تو اس کا مطبوعہ کلکتہ نسخہ جو میرے پیش نظر ہے اس میں یہ واقعہ مذکور نہیں اور اگر ہوتا بھی تو واقدی کا اعتبار کیا ہے؟ ابن سبع اور ابن عائذ وغیرہ زمانہ متاخر کے لوگ ہیں اور قدماء سے روایات کی نقل میں بے احتیاط ہیں، کسی قدیم ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، معلوم نہیں یہ روایتیں انھوں نے کہاں سے لیں۔

(۲۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت اور شیر خوارگی کے زمانہ کے فضائل اور معجزات جب آپؐ کو حلیمہ سعدیہؓ اپنے گھر لے جاتی ہیں، ابن اسحاق، ابن راہویہ، ابو یعلی، طبرانی، بیہقی، ابو نعیم، ابن عساکر اور ابن سعد

میں بہ تفصیل مذکور ہیں، حلیمہ سعدیہؓ کا آنا اور آپ کا ان کو دیکھ کر مسکرانا، حلیمہؓ کے خشک سینوں میں دودھ بھر آنا، آپ کا صرف ایک طرف کے سینہ سے سیر ہو جانا اور دوسری طرف کا اپنے رضاعی بھائی کے لئے بہ انصاف چھوڑ دینا، آپ کے سوار ہوتے ہی حلیمہؓ کی کمزور اور دُبلی پتلی گدھی کا تیز رو، طاقت ور اور فربہ ہو جانا اور حلیمہؓ کے قبیلہ کی قحط زدہ زمین کا سرسبز و شاداب اور ہرا بھرا ہو جانا، حلیمہؓ کی بکریوں کا موٹا ہونا اور سب سے زیادہ دودھ دینا، آپ کا غیر معمولی نشو و نما پانا، دو برس کے سن میں آپ کے سینہ کا چاک ہونا، حلیمہؓ کا اس واقعہ سے ڈر کر آپ کو آمنہ کے پاس واپس لانا، آمنہ کا حلیمہ کو تسلی دینا، یہ تمام واقعات ان کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

یہ واقعات دو طریقوں سے مروی ہیں ایک طریقہ کا مشترک راوی جہم بن ابی جہم ایک مجہول شخص ہے اور دوسرے کا مشترک راوی واقدی ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلے طریقہ سے اس کو ابن اسحاق، ابن راہویہ، ابویعلی، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کیا ہے، اس کا سلسلہ یہ ہے کہ ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے جہم بن ابی جہم مولی حارث بن حاطب جمحی نے کہا اور وہ کہتا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نے خود بیان کیا یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا جس نے عبداللہ بن جعفر سے سُنا اور عبداللہ بن جعفر نے حلیمہ سعدیہ سے سُنا، اس روایت میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جہم اس روایت کا خود عبداللہ بن جعفر سے سننا یقینی نہیں آتا، بلکہ وہ کہتا ہے کہ عبداللہ بن جعفر یا کسی نے ان سے سُن کر مجھ سے کہا، معلوم نہیں وہ کون تھا؟ اور کیسا تھا؟ ابونعیم وغیرہ متاخرین نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شک سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے، اگر بالفرض جہم نے عبداللہ بن جعفر سے سُنا تو عبداللہ بن جعفر کا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹھ نو برس کے تھے اور ۷ھ کے بعد حبش کے ملک سے مدینہ آئے تھے، حلیمہ سے ملنا اور اُن سے نقل روایت کرنا محتاج ثبوت ہے بلکہ علمائے سیر و رجال میں خود حلیمہ سے ملنا اور ان کے بعد آپ سے ملاقات میں اختلاف ہے، صرف ایک دفعہ غزوہ ہوازن کے موقع پر ان کا آنا کسی کسی نے بیان کیا ہے، مگر اس موقع پر عبداللہ بن جعفر کا جو کم سن تھے موجود ہونا اور ان سے ملنا مطلق ثابت نہیں، جہم بن ابی جہم جو اس روایت کا سر بنیاد ہے، ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسی روایت کی تقریب سے اس کا نام لکھ کر لکھا ہے لا یعرف یعنی معلوم نہیں یہ کون تھا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کا مرکزی راوی واقدی ہے، اس سلسلہ سے ابن سعد، ابونعیم اور ابن عساکر نے اس واقعہ کو لکھا ہے، یہ سلسلہ علاوہ ازیں کہ واقدی کے واسطہ سے ہے موقوف بھی ہے یعنی کسی صحابی تک وہ نہیں پہنچتا، اس کو واقدی زکریا بن یحییٰ بن یزید سعدی سے اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن زید سعدی سے نقل کرتا ہے، ابن سعد نے دوسری جگہ (ج ۱ اول ص ۹۷) ایک اور سلسلہ سے اس کو واقدی سے روایت کیا ہے اور واقدی عبداللہ بن زید بن اسلم سے اور عبداللہ اپنے باپ زید بن اسلم تابعی سے نقل کرتے ہیں، یہ سلسلہ بھی علاوہ ازیں کہ اس کا پہلا راوی وہی واقدی ہے اور روایت بھی موقوف ہے، زید مذکور کی نسبت اہل مدینہ

کلام کرتے تھے اور ان کے بیٹے عبداللہ کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے، اس لیے یہ سلسلہ بھی استناد کے قابل نہیں ہے، ابونعیم نے تیسری روایت میں واقدی کے واسطہ سے ان واقعات کو بے سند لکھا ہے۔

(۲۳) شق صدر یعنی سینۂ مبارک کے چاک ہونے کا واقعہ معراج میں پیش آنا مسلّم ہے مگر بعض لوگوں نے بچپن کے زمانہ میں بھی اس واقعہ کا پیش آنا بیان کیا ہے، بچپن کے وقت کی تعیین میں ان روایتوں میں اختلاف ہے، اکثر روایتوں میں یہ ہے کہ حضرت حلیمہؓ کے پاس قیام کے زمانہ میں یہ پیش آیا، جب عمر شریف غالباً صرف چار برس کی تھی، ایک دو روایتوں میں ہے کہ اس وقت آپؐ دس برس کے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عہدِ طفولیت میں شق صدر کی جس قدر روایتیں ہیں، صحیح مسلم کی روایت کے علاوہ وہ تمام تر ضعیف ہیں صحیح مسلم کی روایت میں حماد بن سلمہ کی غلطی سے معراج کا واقعہ عہد طفولیت میں بیان ہو گیا ہے، اس بارہ میں میں نے اپنی تحقیق شرح صدر کی بحث میں مفصل بیان کی ہے۔

(۲۴) حضرت حلیمہؓ کے پاس قیام کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی راویوں نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بعض یہودیوں نے یا عرب قیافہ شناسوں نے (روایت میں اختلاف ہے) یہ معلوم کر لیا کہ نبی آخر الزمان یہی ہیں اور یہی ہمارے آبائی کیش اور مذہب کو دنیا سے مٹائیں گے، یہ سمجھ کر انہوں نے آپؐ کو خود قتل کرنا چاہا، یا دوسروں کو آپؐ کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا (روایت میں اختلاف ہے)، ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حلیمہؓ آپؐ کو پہلے پہل مکہ معظمہ سے لے کر عکاظ کے میلہ میں آئیں، وہاں قبیلہ ہذیل کا ایک قیافہ شناس بڈھا تھا، عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس آتی تھیں اور فال نکلواتی تھیں، اس کی نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو وہ چلا اٹھا کہ اس کو قتل کر ڈالو مگر آپ لوگوں کی نظر سے غائب ہو چکے تھے، حلیمہؓ آپ کو لے کر چل دی تھیں، لوگوں نے بڈھے سے واقعہ پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی وہ بچہ دیکھا جو تمہارے اہل مذہب کو قتل کرے گا اور تمہارے بتوں کو توڑے گا اور وہ کامیاب ہو گا، اس کے بعد لوگوں نے آپؐ کو بہت ڈھونڈا مگر آپ نہ ملے، حضرت حلیمہؓ نے اس کے بعد پھر آپؐ کو کسی قیافہ شناس یا فال دیکھنے والے کے سامنے پیش نہ کیا، ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد ہی بڈھے کی عقل جاتی رہی اور وہ کفر ہی کی حالت میں مر گیا۔

دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت آمنہؓ نے حلیمہ کو کہہ دیا تھا کہ میرے بچہ کو یہودیوں سے بچائے رکھنا، اتفاق سے جب وہ آپؐ کو لے کر چلیں تو کچھ یہودی راستہ میں مل گئے، انہوں نے آپؐ کا حال سن کر ایک دوسرے سے کہا کہ اس کو مار ڈالو، پھر انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ بچہ یتیم ہے؟ حلیمہ نے کہا، نہیں! میں اس کی ماں ہوں اور اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ اس کا باپ ہے، انہوں نے کہا کہ اگر یہ یتیم ہوتا تو ہم اس کو قتل کر ڈالتے (یعنی آخری پیغمبر کی ایک علامت یتیمی بھی تھی اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ علامت بچہ میں پائی نہیں جاتی، اس سے ان کا یقین جاتا رہا)

یہ روایتیں ابن سعد جلد اول صفحہ ۷۱، ۹۰ میں ہیں، مگر حالت یہ ہے کہ پہلی روایتوں کا ماخذ

واقدی کی داستانیں ہیں اور اس پر بھی ان کے سلسلے ناتمام ہیں، آخری روایت کا سلسلہ یہ ہے کہ عمرو بن عاصم کلابی، ہمام بن یحییٰ، اسحاق بن عبداللہ، گو یہ تینوں عموماً ثقہ اصحاب ہیں مگر ان کی یہ روایت موقوف ہے یعنی آخری راوی اسحاق بن عبداللہ گو تابعی ہیں، مگر وہ کسی صحابی سے اس کا سننا ظاہر نہیں کرتے، معلوم نہیں یہ روایت ان کو کہاں سے پہنچی۔

تقریباً اسی واقعہ کو ابو نعیم نے دلائل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ حلیمہ جب آپ کو مکہ سے لے کر روانہ ہوئیں تو ایک وادی میں پہنچ کر ان کو حبش کے کچھ لوگ ملے (جو غالباً عیسائی ہوں گے)، حلیمہؓ ان کے ساتھ ہو گئیں، انھوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کی نسبت کچھ دریافت کیا، اس کے بعد بہت غور سے انھوں نے آپ کو دیکھنا شروع کیا، دونوں مونڈھوں کے بیچ میں جو مہر نبوت تھی وہ دیکھی، آپ کی آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی، اس کو دیکھتے رہے، پھر پوچھا کہ کیا بچہ کی آنکھوں میں یہ سرخی کسی بیماری سے ہے؟ حلیمہؓ نے کہا نہیں، یہ ہمیشہ سے اسی طرح ہے۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم! یہ پیغمبر ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے چاہا کہ بچہ کو حضرت حلیمہؓ سے چھین لیں، لیکن خدا نے آپ کی حفاظت کی، ابو نعیم کی اس روایت کا سلسلہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے اور اس کے رواۃ مجہول الحال لوگ ہیں۔

(۲۵) کہتے ہیں کہ پیار اور محبت سے حضرت حلیمہؓ آپ کو دھوپ میں نکلنے نہیں دیتی تھیں، ایک دن آپ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں نکل پڑے۔ حلیمہ نے دیکھا تو لڑکی پر خفا ہوئیں کہ تم دھوپ میں کیوں لے گئیں؟ لڑکی نے کہا اماں جان میرے بھائی کو دھوپ نہیں لگتی، میں نے دیکھا کہ اس پر بادل سایہ کئے تھے جدھر وہ جاتا تھا وہ بھی چلتے جاتے تھے اور جہاں وہ رک جاتا تھا وہ بھی رک جاتے تھے اس کیفیت سے وہ یہاں تک پہنچا ہے، ابن سعد نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے، ایک میں تو صرف واقدی کا حوالہ ہے اور اس کے آگے کوئی نام نہیں دیا ہے (ص ۷، ج اول) اور دوسرے میں ہے کہ واقدی نے معاذ بن محمد سے اور اس نے عطا سے اور عطا نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا، ابن سعد کے علاوہ ابو نعیم، ابن عساکر اور ابن طرماح نے بھی اسی سلسلہ سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے مگر اس سلسلہ میں واقدی کے علاوہ معاذ بن محمد مجہول اور نامعتبر ہے۔

یہاں تک تو ہم نے فضائل و معجزات کی غلط اور ضعیف روایتوں کی مسلسل تنقید کی ہے، اگر اسی طرح ہم آخر تک نبھانا چاہیں تو یہ دفتر ان اوراق میں نہیں سما سکتا، اس لئے ہم نے صرف مشہور ترین روایتوں کی تنقید پر قناعت کرتے ہیں۔

(۲۶) سب سے مشہور بحیرا راہب کا قصہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ دس بارہ برس کے تھے تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کا سفر کیا، راہ میں ایک عیسائی خانقاہ ملی، جس میں بحیرا نام ایک راہب رہا کرتا تھا، اس نے آپ کو دیکھ کر اور علامتوں سے پہچان کر یہ جان لیا کہ پیغمبر آخر الزمان اور سردار عالم یہی ہیں، اس نے دیکھا کہ ابر آپ پر سایہ فگن ہے، جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے ہیں اس کی

شاخیں آپ پر جھک آتی ہیں، اس نے آپ کی خاطر قافلہ کی دعوت کی اور ابوطالب سے باصرار کہا کہ اس بچہ کو مکہ واپس لے جاؤ، ورنہ رومی اگر اس کو پہچان گئے تو اس کو قتل کر ڈالیں گے (شاید اس لئے کہ آپ کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا) ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ رومیوں کا ایک گروہ پہنچ گیا، دریافت سے ظاہر ہوا کہ رومیوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ پیغمبر آخر الزمان کے ظہور کا وقت آگیا ہے اس لئے رومیوں نے تحقیق حال کے لئے ہر طرف اپنے دستے روانہ کئے ہیں، بحیرا نے ان سے کہا کہ خدا کی تقدیر ٹل نہیں سکتی، اس لئے بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ۔ وہ رک گئے اور ادھر ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ واپس بھیج دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو آپ کے ساتھ کر دیا اور بحیرا نے کیک اور ناشتہ آپ کے ساتھ کیا۔

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان سب کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں، اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقۂ سند وہ ہے جس میں عبدالرحمان بن غزوان جو ابونوح قراد کے نام سے مشہور ہے یونس بن اسحاق سے اور وہ ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابوموسیٰ اشعریؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی اور دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے، ترمذی نے اس کو حسن و غریب اور حاکم نے صحیح کہا ہے، استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد (طبع اول صفحہ ۱۳) وطبع دوم صفحہ ۱۹۵) میں اس روایت پر پوری تنقید کی ہے اور عبدالرحمان بن غزوان کو اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ سند میں نہ صرف عبدالرحمان بن غزوان بلکہ دوسرے روات بھی جرح کے قابل ہیں۔

(۱) سب سے اول یہ کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ مسلمان ہو کر ۷ھ میں یمن سے مدینہ آتے تھے اور یہ واقعہ اس سے ۵۰ برس پہلے کا ہے، حضرت ابوموسیٰؓ نہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریکِ واقعہ کی زبان سے اپنا سننا بیان کرتے ہیں، اس لئے یہ روایت مُرسل ہے۔

(۲) اس واقعہ کو حضرت ابوموسیٰؓ سے ان کے صاحبزادے ابوبکر روایت کرتے ہیں، مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ ناقدین فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے، امام ابن حنبلؒ نے اس سے قطعی انکار کیا ہے۔ بنابریں یہ روایت منقطع ہے اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔

(۳) ابوبکر سے یونس بن اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں، گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں، یحییٰ کہتے ہیں کہ ان میں سخت بے پروائی تھی، شعبہ نے ان پر تدلیس

کا الزام قائم کیا ہے، امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور ایسی ویسی کہتے ہیں، ابو حاتم کی رائے ہے کہ وہ راست گو ہیں، لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں، ساجی کا قول ہے کہ وہ سچے ہیں اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے، ابو حاکم کا بیان ہے کہ اکثر ان کو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا۔

(۴) چوتھا راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے جس کا نام مستدرک اور ابو نعیم میں ابو نوح قرار ہے، اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے، تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے، مما لیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے، ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرتا تھا اور امام لیث اور مالک سے مما لیک والی حدیث نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔

(۵) حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن غزوان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر بحیرا راہب کا قصہ ہے، اس قصے کے غلط ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ ہے کہ ابو بکرؓ نے بلالؓ کو آپ کے ساتھ کر دیا حالانکہ حضرت ابو بکرؓ اس وقت بچے تھے اور حضرت بلالؓ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

(۶) حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے، حافظ ذہبی مستدرک کی تلخیص میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں اس روایت کو بنایا ہوا خیال کرتا ہوں، کیونکہ اس میں بعض واقعات غلط ہیں (مستدرک ج ۲ ص ۶۱۵)

(۷) امام بیہقی اس کی صحت کو صرف اس قدر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قصہ اہل سیر میں مشہور ہے، حافظ سیوطی نے خصائص میں امام موصوف کے اس فقرہ سے یہ سمجھا ہے کہ وہ بھی اس کے ضعف کے قائل ہیں، اس لئے اصل روایت میں ابن سعد وغیرہ سے چند اور سلسلے نقل کئے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔

(۲۷) اسی قسم کا ایک اور واقعہ دوسری دفعہ کے سفر شام میں جب آپ حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لے کر بصریٰ تک تشریف لے گئے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی تھا، اس کی زبانی روایت ہے کہ ہر جگہ ابر آپ پر سایہ افگن رہتا، کبھی فرشتے اپنے پروں کا سایہ کرتے تھے، ایک عیسائی خانقاہ کے قریب جہاں نسطورا راہب رہتا تھا، آپؐ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا، راہب نے یہ دیکھا تو میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے؟ اس نے نام و نشان بتایا، راہب نے کہا کہ اس درخت کے نیچے پیغمبر کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہرا ہے، پھر دریافت کیا کہ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ یہ سرخی رہتی ہے؟ غلام نے اثبات میں جواب دیا، راہب نے کہا تو یہ یقیناً آخر زمانہ کا پیغمبر ہے، تم کبھی اس کی رفاقت نہ چھوڑنا، اسی درمیان میں ایک شخص سے خرید و فروخت میں کوئی جھگڑا پیش آیا، خریدار نے آپؐ سے کہا کہ تم لات و عزیٰ کی قسم کھاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان کی قسم نہیں کھاتا، راہب نے میسرہ سے کہا خدا کی قسم! یہ پیغمبر ہے، اس کی صفتیں ہماری کتابوں میں لکھی ہیں، میسرہ کا بیان ہے کہ جب

دوپہر کی سخت دھوپ پڑتی تو دو فرشتے آپؐ پر سایہ کر لیتے، جب آپؐ تجارت سے فارغ ہو کر مکہ آرہے تھے، اتفاق سے اس وقت حضرت خدیجہؓ چند سہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر تھیں، حضرت خدیجہؓ کی نظر آپؐ پر پڑی کہ آپؐ اونٹ پر سوار ہیں اور دو فرشتے آپؐ پر سایہ افگن ہیں، انھوں نے یہ منظر اپنی سہیلیوں کو دکھایا اور میسرہ سے اس کا تذکرہ کیا، میسرہ نے کہا پورے سفر میں یہی تماشا دیکھتا آیا ہوں اور اس کے بعد اس نے نسطورا راہب کی گفتگو بھی ان سے دہرائی۔

یہ واقعہ ابن اسحاق، ابن سعد، ابو نعیم اور ابن عساکر میں ہے، ابن اسحاق میں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے، بقیہ کتابوں میں اس کی سند یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین واقدی سے اور واقدی موسیٰ بن شیبہ سے اور وہ عمیرہ بنت عبد اللہ بن کعب سے اور عمیرہ ام سعد بنت کعب سے اور وہ یعلی بن منیہ صحابی کی بہن نفیسہ بنت منیہ سے جو صحابیہ تھیں، روایت کرتے ہیں، واقدی کی بے اعتباری تو محتاج بیان نہیں، اس کے علاوہ موسیٰ بن شیبہ کی نسبت امام ابن حنبل کہتے ہیں، احادیثہ مناکیر، اس کی حدیثیں منکر ہیں، عمیرہ بنت ابن کعب اور ام سعد کا حال معلوم نہیں۔

ابن سعد، ابن اسحاق، بیہقی اور ابو نعیم میں ہے کہ قریش نے جب بنو ہاشم کا مقاطعہ کر کے شعب ابی طالب میں محصور کیا اور باہم ایک معاہدہ مرتب کر کے خانہ کعبہ میں رکھ دیا تو چند سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیمک کو بھیجا جس نے کاغذ کو کھا لیا، ایک روایت میں ہے کہ خدا کا نام چھوڑ کر باقی عبارت کو جس میں بنو ہاشم کے مقاطعہ کا عہد تھا اس نے کھا لیا تھا اور دوسری روایت میں ہے کہ خدا کا نام کھا لیا تھا اور بقیہ عبارت چھوڑ دی تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ سے مطلع فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب سے اس کا ذکر کیا، ابو طالب نے قریش کو اس کی خبر کی اور بالآخر اس واقعہ کے جھوٹے سچ ہونے پر معاہدہ باقی رہنے یا ٹوٹ جانے کا فیصلہ قرار دیا، کفار نے جب کاغذ کو اتار کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تصدیق ہو گئی۔

ابن اسحاق کی روایت بے سند ہے، بقیہ تمام روایتیں یا واقدی اور ابن لہیعہ سے ہیں جن کا اعتبار نہیں اور یا ثقات سے ہیں تو وہ تمام تر مرسل ہیں، ان مرسل روایتوں میں اگر کوئی بہتر روایت ہے تو وہ بیہقی میں موسیٰ بن عقبہ کی ہے جو امام زہری سے اس کو روایت کرتے ہیں، مگر وہ زہری تک پہنچ کر رہ جاتی ہے کسی صحابی تک نہیں پہنچتی۔

(۲۹) مشہور ہے کہ ہجرت میں جب آپؐ نے غار ثور میں پناہ لی تو خدا کے حکم سے فوراً غار کے منہ پر بنولے یا ببول کا درخت اُگ آیا، جس کی ڈالیاں پھیل کر چھا گئیں، کبوتر کے ایک جوڑے نے آ کر وہاں انڈے دے دیئے اور مکڑی نے جالے تن دیئے تاکہ مشرکین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کے اندر ہونے کا گمان نہ ہو، درخت کے اُگنے، کبوتر کے انڈے دینے، مکڑی کے جالا تننے، ان تینوں کا ذکر صرف ابو مصعب مکی کی روایت میں ہے، بقیہ روایتوں میں صرف کبوتروں کے انڈے دینے اور مکڑی کے جالا تننے کا بیان ہے

بہر حال یہ واقعہ کتب سیر میں ابن اسحاق، ابن سعد، دلائل بیہقی اور ابو نعیم میں اور کتب حدیث میں سے ابن مردویہ اور بزار میں ہے، ابن مردویہ، بزار اور بیہقی میں جو روایت ہے، نیز ابن سعد اور ابو نعیم کی ایک روایت ابو مصعب مکی سے ہے جو متعدد صحابہ سے اس واقعہ کا سننا ظاہر کرتا ہے، ابو مصعب سے عون بن عمرو القیسی اس کی روایت کرتا ہے لیکن یہ دونوں صاحب پایۂ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں، ابو مصعب مکی مجہول ہے اور عون بن عمرو کی نسبت ابن معین کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں، امام بخاری فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے، ابو نعیم میں عون بن عمرو کے بجائے عوین بن عمرو القیسی لکھا ہے، یہ عوین بن عمرو بھی بے اعتبار ہے، عقیلی نے اس کا ضعفا میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس کی روایتوں کی تصدیق نہیں ہوتی اور اس روایت کو نقل کرکے لکھا ہے کہ ابو مصعب مجہول ہے[1]۔

استاذ مرحوم نے سیرت جلد اول واقعہ ہجرت میں صرف ابو مصعب کی روایت پر تنقید کی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ابو مصعب کے علاوہ اور دوسرے سلسلوں سے بھی یہ مروی ہے، چنانچہ ابن سعد نے ایک اور طریقہ سے اس واقعہ کی روایت کی ہے، مگر اس روایت کا سر سلسلہ واقدی ہے جس نے متعدد روایتوں کو یکجا کرکے ان کی ایک مشترک روایت ہجرت تیار کی ہے، اس واقعہ کی بہترین روایت وہ ہے جو مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں،

فصعدوا الغار فرأوا على بابه نسج العنكبوت	کفار آپ کی تلاش میں غار کے منہ تک پہنچ گئے دیکھا کہ منہ پر
فقالوا لو دخل ھھنا لم يكن نسج العنكبوت	مکڑی کے جال ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر محمد اس کے اندر
على بابه (ج ۱ ص ۳۴۸)	جاتے تو یہ جال نہ ہوتے،

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا، البتہ اس روایت کی بنا پر اس کو تائیدات میں جگہ دی جاسکتی ہے تاہم یہ روایت بھی قوی نہیں، اس کے راوی مقسم ہیں جو اپنے کو مولیٰ ابن عباسؓ کہتے ہیں، اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے، مقسم کی اگرچہ متعدد محدثین نے توثیق کی ہے اور امام بخاری نے صحیح میں ان سے حجامت کی روایت نقل کی ہے مگر وہ خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہتے ہیں، ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے، ساجی نے لکھا ہے کہ لوگوں نے ان کی روایت میں کلام کیا ہے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ وہ قوی نہیں، اور عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو ساج الجزری ہے اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے مشہور ہے، گو ابن حبان نے اپنے مشہور تساہل کی بنا پر اس کو ثقات میں داخل کیا ہے، مگر محدث ابو حاتم کہتے ہیں کہ اس کی حدیث لکھی جاتی ہے، حجت میں پیش نہ کی جائے، علامہ ذہبی میزان میں اور حافظ ابن حجر نے لسان میں صرف ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے۔

---

[1] دیکھو لسان میزان ترجمہ ابو مصعب مکی و عون بن عمرو اور میزان الاعتدال ترجمہ عون بن عمرو اور عوین بن عمرو۔

(۲) روایتوں میں ہے کہ اسی سفر میں راہ میں ایک جگہ بکریوں کے ایک چرواہے سے آپؐ نے دودھ طلب کیا، اس نے معذرت کی کہ کوئی دودھ والی بکری نہیں، لیکن آپؐ نے اس کی اجازت سے ایک دودھ والی بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا، فوراً دودھ نکل آیا، چنانچہ سب نے دودھ پیا، چرواہا یہ دیکھ کر مسلمان ہوگیا۔

ایک روایت میں ہے کہ یہ چرواہا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے، لیکن عام معجزات کے تحت میں ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا واقعہ زمانۂ ہجرت کا نہیں بلکہ وہ کسی اور زمانہ کا ہے، عبداللہ بن مسعودؓ کا واقعہ مسند طیالسی اور مسند احمد میں خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زبانی صحیح روایات کے ساتھ مذکور ہے، مسند ابویعلی، مستدرک حاکم اور طبرانی میں بجائے عبداللہ بن مسعودؓ کے صرف "عبد" یعنی ایک غلام کا ذکر ہے جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، صحابہ میں سے اس کے راوی قیس بن نعمان سکونی ہیں، یہ صرف ایک دفعہ ایک وفد کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور ان سے صرف یہی ایک روایت مروی ہے، بعضوں نے ان سے ایک اور روایت حدیبیہ کی بھی نقل کی ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہ شریکِ واقعہ نہ تھے، انہوں نے یہ واقعہ کس سے سنا؟ معلوم نہیں، اس لئے یہ روایت مُرسل ہے اس کے ایک راوی عبیداللہ بن ایاد بن لقیط کی گو اوروں نے توثیق کی ہے مگر بزار نے لکھا ہے کہ وہ قوی نہیں، تاہم ذہبی نے تلخیص مستدرک (جلد ۲ ص ۹) میں اور حافظ ابن حجر نے اصابہ (ترجمہ قیس بن نعمان سکونی) میں اس کو صحیح کہا ہے، مگر یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ خود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو واقعہ ہجرت کی مفصل روایت صحیحین میں ہے، اس میں ایک غلام کے بکری کے دودھ پلانے کا واقعہ مذکور ہے مگر اس معجزہ کا وہاں نام و نشان بھی نہیں۔

ہجرت کے موقع پر بے دودھ والی بکری کے تھنوں میں دودھ پیدا ہوجانے کا مشہور ترین معجزہ اُم معبد کے خیمہ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کی راہ میں قبیلۂ خزاعہ کے ایک خاندان کا میدان میں خیمہ تھا، ام معبد اور ابومعبد دونوں میاں بیوی اس خیمے میں رہتے تھے اور مسافروں کو آرام پہنچایا کرتے تھے، بکریوں کی پرورش پر ان کا گزارہ تھا، صبح کو ابومعبد تمام اچھی اور دودھ والی بکریاں لے کر چراگاہ کو نکل گیا تھا صرف بے دودھ والی دبلی بکریاں خیمہ میں رہ گئی تھیں، اتنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا اُدھر سے گزر ہوا، کھانے پینے کی کچھ چیزیں آپؐ نے بقیمت طلب کیں جو نہیں ملیں، خیمہ کے ایک گوشہ میں ایک بکری نظر آئی، آپؐ نے پوچھا کہ ام معبد یہ بکری کیسی ہے؟ اس نے کہا یہ لاغری سے بکریوں کے ساتھ نہ جا سکی، پھر فرمایا کہ اس کے کچھ دودھ ہے؟ جواب دیا یہ دودھ سے معذور ہے، راوی کا بیان ہے کہ امسال خشک سالی تھی اور لوگ قحط میں مبتلا تھے، فرمایا کہ مجھے اس کے دوہنے کی اجازت ہے؟ عرض کی میرے ماں باپ قربان اگر اس کے دودھ ہو تو دوہ لیجئے، آپؐ نے دعا فرمائی اور پھر بسم اللہ کہہ کر تھن میں ہاتھ لگایا، فوراً اس کے تھنوں میں دودھ اتر آیا، دودھ سب نے پی لیا اور کچھ بچ گیا اور قافلۂ نبویؐ آگے روانہ ہوا، کچھ دیر کے بعد ابومعبد آیا دیکھا کہ گھر میں دودھ رکھا ہے، تعجب سے پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا؟ بکریاں تو سب میرے ساتھ تھیں

ام معبد نے سارا قصہ بیان کیا، ابو معبد نے کہا ذرا اس شخص کی صورت و شکل بیان کرو، ام معبد نے نہایت تفصیل سے آپؐ کے حسن و جمال اور شکل و شمائل کی تصویر کھینچی جس کو سن کر ابو معبد نے کہا یہ تو خدا کی قسم قریش والا آدمی معلوم ہوتا ہے جس کا کچھ حال میں سن چکا ہوں، میری آرزو ہے کہ مجھے اس کی صحبت میسر ہوتی اور جب انشاء اللہ موقع مل گیا میں یہ کروں گا۔ اسی وقت مکہ میں کچھ اشعار غیب سے سنے گئے، یہ اشعار بھی روایت میں ہیں، ان اشعار میں ام معبد کا اس واقعہ کا بیان ہے، حضرت حسانؓ نے جب ہاتف کی یہ آواز سنی تو ان اشعار کے جواب میں اشعار کہے (یہ جوابی اشعار بھی روایت میں مذکور ہیں)

یہ روایت بغوی، ابن شاہین، ابن سکن، ابن مندہ، طبرانی، بیہقی، ابونعیم اور حاکم میں ام معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی مذکور ہے اور حاکم نے نہ صرف یہ کہ اس کو صحیح کہا ہے بلکہ اور دیگر طریقوں سے بھی اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر معلوم ہے کہ حاکم کے تصحیح کرنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں، چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کے شرائط کے مطابق نہیں، حافظ ذہبی نے مجملاً اسی قدر لکھا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت حاکم کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اسی سلسلۂ سند سے مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ حزام اپنے باپ ہشام سے اور ہشام اپنے باپ حبیش بن خالد خزاعی سے ناقل ہیں، حزام مجہول ہیں، حبیش بن خالد سے صرف یہی ایک روایت تمام کتب حدیث میں مذکور ہے، حبیش اصل واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، معلوم نہیں انھوں نے کس سے سنا اس لیے یہ روایت اگر ثابت بھی ہو تو مرسل ہے، حاکم نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے ایک انہی حزام اور ہشام بن حبیش کے ذریعہ سے اور دوسرے حر بن صباح سے اور وہ ام معبد کے شوہر ابو معبد سے راوی ہیں، پہلے طریقہ میں حاکم نے یہ کمال کیا ہے کہ حبیش کے بجائے خود ہشام ابن حبیش بن خویلد (یعنی خالد) کو اصل راوی اور صحابی قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ اس طریق سے روایت کا ارسال اور بڑھ گیا ہے ہشام کا صحابی ہونا بھی مشکوک ہے، دوسرے طریقہ میں حر بن صباح گو ثقہ ہیں، مگر ابو معبد سے ان کی سماعت ثابت نہیں، چنانچہ ابن حجر نے تہذیب میں لکھا ہے کہ حر ابو معبد سے مرسل روایتیں کرتے ہیں، یہ تو ان تمام روایتوں کے اوپر کے راویوں کا حال ہے، نیچے کے راویوں میں اکثر مجہول لوگ ہیں، حر والی روایت میں نیچے ایک شخص محمد بن بشر سکری ہے جس کو ازدی نے منکر الحدیث اور ابن عدی نے واہی کہا ہے[1]۔ ابو نعیم نے دلائل میں ایک اور صحابی سلیط ابو سلیمان انصاری بدریؓ سے اس کی روایت کی ہے، سلیط سے ان کے بیٹے سلیمان اور ان سے ان کے بیٹے محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری روایت کرتے ہیں لیکن ان سلیط کا نام صرف اسی روایت کے راوی کی حیثیت سے بعض مؤلفین سیر صحابہ نے کیا ہے، ورنہ ان کا کوئی حال ہم کو معلوم نہیں، سلیط انصاری بدری جو مشہور ہیں، وہ سلیط بن قیس انصاری خزرجی بدری ہیں، ان کے بیٹے کا نام عبداللہ تھا جن سے کو نسل چلی

---

[1] لسان المیزان ترجمہ محمد بن بشر بن ابان السکری۔

نہیں، لیکن ان سے روایت نسائی میں موجود ہے، مگر سلیط ابو سلیمان انصاریؓ بدری سے کوئی روایت اس کے سوا موجود نہیں، اسی لئے اسماء الرجال صحابہ کے مؤلفین میں سے بعض نے ان کو اور سلیط بن قیسؓ انصاری بدری کو ایک سمجھا ہے، اگر ایسا ہے تو سلیمان ان کے بیٹے اور محمد ان کے پوتے کا نام نہ تھا: اور اگر دو ہیں تو اصحاب بدر کے سب نام گنے ہوئے ہیں، ان میں سلیط بن قیس خزرجی کے سوا کوئی دوسرا سلیط نام نہیں، پھر یہ مدینہ کے باشندہ تھے اور ام معبد قبیلہ خزاعہ کی تھی جو مکہ اور مدینہ کے بیچ آباد تھا، معلوم نہیں کہ سلیط انصاریؓ نے کس سے سنا! پھر ان کے بیٹے سلیمان اور پوتے محمد سے ہم کو کوئی واقفیت نہیں، حافظ ابن حجر لسان المیزان میں محمد بن سلیمان بن سلیط الانصاری کے تحت میں لکھتے ہیں۔

قال العقیلی مجهول بالنقل روی عن ابیه عن جده فذکر قصة ام معبد وهو واه وقال لیس هذا الطریق محفوظا فی حدیث ام معبد.... قال ابن منده مجهول۔

علاوہ ازیں ان روایتوں کے الفاظ ام معبد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باہم طرز تخاطب اور اشعار کی زبان اور ابو معبد کی گفتگو میں ایک خاص غرابت ہے جس کو ناقدین حدیث اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہاتف غیب نے تو اشعار مکہ میں لوگوں کو سنائے اور حسانؓ نے جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، مدینہ میں بیٹھے بیٹھے ان کا جواب کہا، ہجرت کے سال میں مکہ کے آس پاس قحط کا پڑنا اور خشک سالی ہونا بھی ثابت نہیں،

مجھے ہجرت کے موقع پر ان دودھ والی روایتوں کے تسلیم کرنے میں اس لئے بھی پس و پیش ہے کہ ہجرت کے رفیق سفر حضرت ابوبکرؓ سے واقعات ہجرت کی جو روایت صحیح بخاری میں مذکور ہے اس میں ایک جگہ چرواہے سے دودھ مانگ کر پینے کا ذکر موجود ہے مگر اس معجزہ کا مطلق ذکر نہیں ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابوبکرؓ کی زبانی یہ قصہ ان الفاظ میں مذکور ہے، دفعۃً ایک چرواہا نظر آیا جو اپنی بکریوں کو ہانکے لئے جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا تم کس کے غلام ہو؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو میں جانتا تھا، پھر میں نے کہا تمہاری بکریوں کے دودھ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن جھاڑ کر پیالہ میں دودھ تو دوہو، اس نے دوہا تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک برتن میں رکھ کر اور تھوڑا پانی ملا کر کہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے آپؐ کے پاس لایا، آپؐ نے نوش فرمایا۔[1]

مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کی ایک اجتماعی زندگی شروع ہو گئی تھی اور خلوت و جلوت میں ہر موقع پر جاں نثاروں کا ہجوم رہتا تھا، اس لئے آپؐ کے واقعات و سوانح کا ایک ایک حرف پہلے سے زیادہ روشن ہو جاتا ہے، اس بنا پر اس زمانہ کے دلائل و معجزات زیادہ محفوظ طریقہ سے احادیث میں مذکور ہیں اور اس عہد کے متعلق جو غلط اور مشتبہ روایات بعد کو پیدا ہوئی ہیں محدثین نے موضوعات میں اعلانیہ ان کی پردہ دری کر دی ہے، اس لئے فن

---

[1] صحیح بخاری باب مناقب المہاجرین [2] علامہ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ کی پانچویں جلد میں ان روایتوں کو مع تنقید کے جمع کر دیا ہے۔

موضوعات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی اس میں تفصیل موجود ہے مثلاً۔

(۱) وہ تمام روایتیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ سے حضرت آمنہ یا کسی اور مردہ کے زندہ ہونے کا بیان ہے وہ سب جھوٹی اور بناوٹی ہیں۔

(۲) وہ معجزے جن میں گدھے، اونٹ، بکری، ہرن، گوہ، بھیڑیئے، شیر وغیرہ جانوروں کے انسانوں کی طرح بولنے یا کلمہ پڑھنے کا ذکر ہے بروایت صحیحہ ثابت نہیں ہیں[1]

(۳) ایسی روایتیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آسمان سے خوانِ نعمت یا جنت سے میووں کے آنے کا ذکر ہے موضوع یا ضعیف ہیں[2]

(۴) وہ روایتیں جن میں حضرت خضرؑ یا الیاسؑ سے ملنے یا ان کے سلام و پیام بھیجنے کا بیان ہے صحت سے خالی ہیں۔

(۵) عوام میں مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ نہ تھا لیکن یہ کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔

(۶) روایت ہے کہ آپؐ قضائے حاجت سے واپس آتے تھے تو وہاں کوئی نجاست باقی نہیں رہتی تھی، یہ سرتاپا موضوع ہے۔

(۷) واعظوں میں مشہور ہے کہ ابوجہل کی فرمائش سے اس کے ہاتھ کی کنکریاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ سے کلمہ پڑھنے لگیں، لیکن یہ ثابت نہیں۔

(۸) وہ تمام حکایات جن سے ہماری زبان میں کتب وفات نامہ اور ہرنی نامہ ترتیب پائی ہیں، تمام تر جھوٹی ہیں۔

(۹) ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ حضرت علیؓ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے، آفتاب ڈوب رہا تھا اور نمازِ عصر کا وقت ختم ہو رہا تھا لیکن حضرت علیؓ نے ادباً آپؐ کو جگانا مناسب نہ سمجھا جب آفتاب ڈوب گیا تو دفعتہً آپ بیدار ہوئے اور دریافت فرمایا کہ تم نے نماز پڑھی، عرض کی نہیں۔ آپؐ نے دعا کی فوراً آفتاب لوٹ کر نکل آیا۔ یہ روایت بھی صحیح طریقہ

---

[1] بعض ضعیف روایتوں میں گو یا آیا ہے لیکن ان کو صحیح کا درجہ حاصل نہیں، ان روایتوں میں سے ایک بھیڑیئے کے بولنے کا قصہ زیادہ مشہور ہے جو دلائل بیہقی، مسند احمد، حاکم اور ترمذی میں بطرق متعددہ مذکور ہے، جن میں سب سے قوی حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بشرط مسلم کہا ہے (مستدرک ج ۴ ص ۴۶۷) لیکن امام بخاری نے کہا ہے کہ اس کی سند قوی نہیں (زرقانی علی المواہب ج ۵ ص ۱۹۳)

[2] اس قسم کی ایک روایت مسند احمد (ج ۴ ص ۱۰۴) دارمی ص ۱۲، نسائی، حاکم، بزار، ابو یعلیٰ اور طبرانی میں سلمہ بن نفیل سکونی سے مروی ہے، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے، لیکن ذہبی نے اس کے استدراک میں اس کو سند صحیح کہا ہے لیکن غرائب صحاح میں قرار دیا ہے (مستدرک حاکم ج ۲ ص ۴۴۷، ۴۸۰، ۴۸۴ و خصائص کبریٰ سیوطی ج ۲ ص ۵۶ حیدرآباد)

سے ثابت نہیں ہے[1]۔

(۱۰) ایک روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک اس قدر روشن تھا کہ اندھیرے میں آپ جاتے تھے تو اجالا ہو جاتا، چنانچہ ایک دفعہ رات کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے سوئی گر گئی، تلاش کی نہیں ملی، دفعۃً آپ تشریف لے آئے تو چہرۂ مبارک کی روشنی میں سوئی چمک اٹھی اور مل گئی، یہ بالکل جھوٹ ہے۔

گو ان میں سے بعض روایتوں کو اہل سیر اور مصنفین نے فضائل نبوی میں اپنی کتابوں میں درج کیا ہے مگر اس سے ان کی صحت ثابت نہیں ہوتی، اور اگر ان میں کوئی روایت سنداً صحیح ثابت ہو جائے تو اس خاکسار ہیچمداں کو اس کے قبول میں کوئی عذر نہیں، وفوق کل ذی علم علیم۔

ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبوی میں کلام نہیں ہے بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کی جائے وہ ہر طرح اصح ہو[2]۔

*

---

[1] بعض علمائے اہل سنت مثلاً قاضی عیاض، ابو جعفر طحاوی اور عام علمائے روافض نے اس روایت کے ضعف کو دور کرنے کی کوشش کی ہے مگر عام ائمہ رجال کا رجحان اس روایت کے موضوع یا کم از کم ضعیف ہونے کی طرف ہے، ابن جوزی نے موضوعات میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ حافظ مزی اور امام ذہبی نے بھی اس کے موضوع ہونے کی تصریح کی ہے (البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۲۸۲)

[2] اس کتاب کے تصنیف کے برسوں بعد حافظ ابن کثیر کی کتاب البدایہ والنہایہ مصر سے چھپ کر آئی ہے جو سیرت پر بڑی مفصل کتاب ہے، اس کی چھٹی جلد میں حافظ موصوف نے معجزات نبویہ کی ہر قسم کی روایتوں کو جمع کر دیا ہے اور ان پر کلام بھی کیا ہے اور ان کے اسناد کی جرح و تعدیل بھی کی ہے، اہل تحقیق حضرات اس کی طرف توجہ فرمائیں۔

بشارات[1]

يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ (اعراف)

(جس پیغمبر کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں)

یہود و نصاریٰ میں یہ خیال ہے کہ کسی پیغمبر کا دعوائے نبوت اس وقت تک مسلّم نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ پچھلے پیغمبروں نے اس کی آمد کی پیشین گوئی کی ہے اور جو اس کی نشانیاں بتائی ہیں وہ مدعی نبوت میں پائی جاتی ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی وہ اسی معیار پر پرکھتے تھے اور بہت سے یہود و نصاریٰ جن کو اس معیار سے تشفی کی دولت حاصل ہوئی، وہ علی الاعلان ایمان لائے اور جو اپنی کمزوری سے اپنے ایمان کا اعلان نہ کر سکے، انہوں نے اسلام کی صداقت کا اعتراف کیا، لیکن جن کے قلوب عناد و تعصب کے گرد و غبار سے تیرہ و تار تھے وہ اس ظلمات سے باہر نہ آسکے اور آبِ حیات کا سرچشمہ ان کے ہاتھ نہ آسکا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے جواب میں فرمایا ہے کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور عیسیٰؑ کی بشارت ہوں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پائی تو مقدس باپ بیٹوں نے مل کر دعا مانگی کہ ہماری اولاد میں ایک پیغمبر اس سرزمین میں مبعوث ہو۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ط
قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝
وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا
مِنْ مَقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى وَعَهِدْنَا إِلَىٰ
إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ
وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ
أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ
فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ
النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ وَإِذْ يَرْفَعُ
إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ

اور یاد کرو جب ابراہیمؑ کے پروردگار نے ابراہیمؑ کا چند باتوں
میں امتحان لیا، پس ابراہیم نے ان کو پورا کیا، خدا نے کہا کہ اے
ابراہیمؑ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا، ابراہیمؑ نے کہا اور میری
اولاد میں سے، خدا نے کہا میرا وعدہ گنہگاروں تک نہ پہنچے گا اور یاد
کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا اور
حکم دیا کہ ابراہیمؑ کے قیام گاہ کو نماز کی جگہ مقرر کرو اور ابراہیمؑ
اور اسمٰعیلؑ کو فرمایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع
سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف کرو اور یاد کرو جب ابراہیمؑ
نے دعا کی کہ میرے پروردگار! اس زمین کو امن کا شہر بنا اور
اس کے رہنے والوں میں سے جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں
ان کو پھل روزی دے، خدا نے کہا جو ان میں سے خدا کا منکر
ہوگا اس کو بھی ہم دنیا کی چند روزہ زندگی میں بہرہ مند کریں گے
پھر اس کو مجبور کرکے عذابِ دوزخ میں لے جائیں گے اور

---

[1] صفحات ذیل میں صرف ان ہی بشارات سے بحث ہے جن کے حوالے قرآن و صحیحین میں مذکور ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝

بقرہ - ۱۵

بہت بُرا ٹھکانا ہے اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانہ کعبہ کی بنیاد رکھ رہے تھے تو انھوں نے دعا کی خداوندا ہماری یہ خدمت قبول کر تو ہی دعا کا سننے والا ہے، نیتوں کا جاننے والا ہے خداوندا ہم کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں بھی ایک گروہ اپنے فرمانبردار کا پیدا کر اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے سکھا ہم سے درگزر کر تو ہی بڑا درگزر کرنے والا اور مہربان ہے، خداوندا ان ہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کر جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے تو غالب اور حکمت والا ہے۔

ان آیات میں بتصریح یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے مل کر خدا کے حضور میں دُعا کی کہ اس شہر میں ہماری نسل سے ایک پیغمبر مبعوث فرما، پھر یہ مقام بعثت مکہ مقرر کیا گیا اور دعا میں حضرت اسماعیلؑ کی بھی شرکت تھی، اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دعا کا مقصود یہ تھا کہ یہ پیغمبر نسل اسماعیل سے ہوگا اور مکہ میں اس کی بعثت ہوگی۔

موجودہ توراۃ کی کتاب پیدائش باب ۱۶ کے آخر اور باب ۱۷ کے اول میں بھی کچھ اس کے اشارات پائے جاتے ہیں۔

> "اور ہاجرہ ابراہیم کے لئے بیٹا جنی اور ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسماعیلؑ (خدا نے دُعا سنی) رکھا (پیدائش ۱۶: ۱۵)
>
> جب ابراہیم ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس نے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے بہ نہایت بڑھاؤں گا تب ابرام منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہوکر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں، ہوں، تیرا عہد ہے، میرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا، کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا اور میں تجھے بہت پھل دوں گا اور قومیں تجھ سے پیدا ہوں گی اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت کے لئے اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں گا اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے، دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ملک ہو اور میں ان کا خدا ہوں گا۔ (پیدائش ۱۷: ۱تا۸)

خدا کا حضرت ابراہیمؑ سے یہ عہد حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش کے بعد ہی اور حضرت اسحاقؑ کی ولادت سے پہلے ہوتا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بشارت اسماعیلؑ کے لئے ہے اسحاق کے لئے نہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ کی بشارت دی، حضرت ابراہیمؑ کو وہم ہوا کہ اس نئی بشارت سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ اسمٰعیلؑ

زندہ نہ رہیں گے اور وہ عہد اسحاق کے ساتھ پورا ہوگا، فوراً بارگاہ الٰہی میں عرض کی،

"کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے"۔ (پیدائش ۱۷: ۱۸)

خدا نے جواب دیا،

"اور اسمٰعیل کے حق میں، میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے بارور کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا" (پیدائش ۱۷: ۲۰)

حضرت ہاجرہ جب حاملہ ہونے کے بعد حضرت سارہ سے خفا ہو کر بیر سبع چلی گئیں تو فرشتہ نے آواز دی، "میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو بیٹا جنے گی، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سن لیا" (پیدائش ۱۶: ۱۰)

حضرت ابراہیمؑ نے جب حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو فاران (مکہ) کے بیابان میں رخصت کیا اور مشکیزہ کا پانی چک گیا اور حضرت ہاجرہ نے گریہ وزاری شروع کی،

"تب خدا نے اس لڑکے (اسمٰعیل) کی آواز سنی اور خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ہاجرہ! تجھ کو کیا ہوا، مت ڈر کہ اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے خدا نے سنی، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں (بیر زمزم) دیکھا، خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان (عربہ)[1] میں رہا..... اور وہ فاران کے بیابان میں[2] رہا"۔ (پیدائش ۲۱: ۱۷ تا ۲۱)

موجودہ توراۃ میں حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش اور ان کی نسل کی برومندی، کثرت اور برکت اور ان کی نسل کے بارہ سرداروں کے پیدا ہونے کی بشارتیں مذکور ہیں اور ان سے قرآن مجید کے بیان کردہ دعائے ابراہیمی اور عہد الٰہی کی تائید ہوتی ہے، الغرض اسی لئے روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کیا ہوں؟ انا دعوة ابی ابراهیم۔ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی نسل میں جس رسول کے پیدا ہونے کی دعا مانگی تھی، اس کے اوصاف یہ گنائے تھے،

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (بقرہ۔ ۱۵)	اے ہمارے خداوند! ان میں (یعنی اسماعیل کی اولاد میں) ایک پیغمبر کو مبعوث کر، جو ان کو تیرے احکام پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک و صاف کرے۔

قرآن مجید نے متعدد مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی اوصاف ظاہر کئے ہیں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ	اسی خدا نے ان پڑھوں میں ان ہی کی قوم سے ایک پیغمبر مبعوث

---

[1] عربہ کے لفظی معنی بیابان کے ہیں [2] قرآن مجید نے اس کو وادٍ غیر ذی زرع یعنی کھیتی کے میدان سے تعبیر کیا ہے [3] طبقات ابن سعد و مستدرک۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِہٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ)

کیا جو اُن کو خدا کے احکام پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (اٰل عمران)

خدا نے مومنوں پر یقیناً یہ احسان کیا کہ ان میں ایک پیغمبر خود ان ہی کی قوم سے مبعوث کیا جو اُن کو خدا کے احکام سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس سے یہ اشارہ صاف واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا مظہر ہے، حضرت عیسیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بشارت دی ہے وہ اس سے بھی زیادہ صاف ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (صف)

اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہارے پاس خدا کا قاصد بن کر، اور مجھ سے پہلے جو توراۃ آئی میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، اور اپنے بعد احمد نام ایک پیغمبر کی خوشخبری لے کر آیا ہوں۔

انجیل یوحنا باب ۱۴ میں ایک آنے والے کی بشارت ان الفاظ میں ہے۔

"اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا "فارقلیط" بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے" (۱۴: ۱۶)

آگے بڑھ کر پھر ہے۔

"لیکن وہ "فارقلیط" جو روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا" (۱۴: ۲۶)

اسی انجیل کے باب ۱۵-۱۶ میں ہے۔

"پر جب وہ "فارقلیط" جسے میں تمہارے لئے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح جو باپ سے نکلتی ہے تو وہ میرے لئے گواہی دے گا"

اسی انجیل کے باب ۱۶-۱۷ میں ہے۔

"لیکن میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی فائدہ ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے گا، پر اگر میں جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آن کر دنیا کو گناہ سے اور راستی سے اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا، گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، راستبازی کے بارے میں اس لئے کہ میں اپنے باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہیں دیکھو گے، عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی بات بتائے گی، اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن

جو کچھ وہ سنے گی سو کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبر دے گی، وہ میری بزرگی کرے گی اس لئے کہ وہ میری چیزوں سے پائے گی اور تمہیں دکھائے گی۔"

انجیل کی ان آیتوں میں حضرت عیسیٰؑ نے جس آنے والے پیغمبر کی بشارت بار بار دی ہے اس کو لفظ "فارقلیط" سے تعبیر کیا ہے، یہ لفظ عبرانی یا سریانی ہے، جس کے لفظی معنی ٹھیک محمد اور احمد کے ہیں، یونانی کے قدیم تراجم میں اس کا ترجمہ "پیریکلوطاس" کیا گیا تھا جو بعینہٖ فارقلیط اور احمد کا ہم معنی ہے، مگر یہ دیکھ کر کہ اس سے اسلام کی تصدیق ہوتی ہے، ذرا سے تغیر سے پیریکلوطاس کے بجائے "پیریکلیطاس" کر دیا گیا ہے جس کا ترجمہ اب عام طور سے "تسلی دہندہ" کیا جاتا ہے، عیسائی اور مسلمان علماء کے درمیان اس لفظ کی تحقیق پر سینکڑوں برس سے مناظرہ قائم ہے اور مسلمان علماء نے خود قدیم عیسائی علماء کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے کہ صحیح لفظ "پیریکلوطاس" ہے، سب سے زیادہ سیدھی بات یہ ہے کہ یہ فقرے حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے نکلے تھے، ان کی زبان سریانی آمیز عبرانی تھی، یونانی نہ تھی، اس لئے جو لفظ ان کی زبان سے نکلا ہوگا وہ عبرانی یا سریانی ہوگا اس لئے یہ بالکل صاف ہے کہ انہوں نے فارقلیط کا لفظ کہا ہوگا جو احمد یا محمد کا مرادف ہے جیسا کہ اوپر کی آیت میں قرآن کا دعویٰ ہے[1]۔

گذشتہ صفحات میں یہ کہیں ثابت کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم توراۃ وانجیل کی انسانی تعلیم سے قطعاً ناآشنا تھے، وہاں ہم یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اس آنے والے پیغمبر کی جو صفتیں گنائی ہیں وہ حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں،

"لیکن وہ فارقلیط (احمد) جو روح القدس (پاکیزگی کی روح) ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائیگا۔ (یوحنا ۱۴: ۲۶)

"وہ فارقلیط (احمد) جو باپ (خدا) سے نکلتی ہے آئے تو میرے لئے گواہی دے گا۔ (یوحنا ۱۵: ۲۶)

"اور وہ (فارقلیط) آن کر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا، گناہ سے اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے راستی سے اس لئے کہ میں اپنے باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے عدالت سے اس لئے کہ اس دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں کہوں پر تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئیگی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتا دے گی اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔ (یوحنا ۱۶: ۸-)

انجیل کے ان فقروں میں آنے والے پیغمبر کی یہ صفات گنائی گئی ہیں۔

(۱) مسیح کی اصلی تعلیم لوگ بھول جائیں گے اس لئے وہ پیغمبر آکر اس کو یاد دلائے گا۔

(۲) وہ مسیح کی ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا اور وہ ساری سچائی کی باتیں بتلائے گا اور سب باتوں کی خبر دے گا۔

(۳) مسیح کی عظمت کو دنیا میں قائم کرے گا اور ان کی گواہی دے گا اور ان پر ایمان نہ لانے پر دنیا کو گنہگار ٹھہرائے گا۔

---

[1] بشارات محمدیہ، خطبہ بشارت محمدی، مصنفہ گاڈفری ہگنس صاحب۔

(۴) اس کی باتیں خود اس کی نہ ہوں گی بلکہ جو کچھ خدا کی طرف سے ان کو سنایا جائے گا وہی کہے گا۔

اس صداقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مسیحؑ کی اصلی تعلیم عیسائی بھلا چکے تھے، توحید کی جگہ تثلیث تھی، حضرت عیسیٰؑ کے تعلیمات صادقہ میں ابنیت، الوہیت مسیحؑ، مجسمہ پرستی اور بیسیوں عقائد فاسدہ کا اضافہ کر دیا گیا تھا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات مبارک ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ کی بھلائی ہوئی باتوں کو پھر یاد دلایا اور بتایا کہ ان کی اصلی تعلیم کیا تھی۔ قرآن مجید نے پورے واشگاف طریق سے نصاریٰ کے عقائد فاسدہ اور غلط تعلیمات کی تشریح کی اور دنیا میں تثلیث کے بجائے توحید کا علم نصب کیا اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی الوہیت کی تردید کی اور حضرت عیسیٰؑ کی ابنیت اور ان کی موت و حیات کے مسئلہ کو صاف کیا۔

اس کے بعد حضرت مسیحؑ نے کہا کہ وہ میری ناتمام باتوں کی تکمیل کرے گا، یہ خصوصیت بھی خاتم النبیینؐ کے سوا اور کسی پر صادق نہیں آسکتی، مسیحؑ کے اس فقرے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مسیحؑ تک دین الٰہی ناتمام ہے اور دوسری یہ کہ آئندہ آنے والے پیغمبر کے ہاتھ سے اس کی تکمیل ہو گی اور وہ سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا اور ساری باتوں کی خبر دے گا، یہ پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے پوری ہوئی، آپؐ کی ذات سے دین الٰہی تکمیل کو پہنچا اور آپؐ نے عقائد، عبادات، اخلاق، احکام، اخبار قیامت، جنت، دوزخ، سزا، جزا وغیرہ کے باتوں کو اس تفصیل، تشریح اور تکمیل کے ساتھ بتایا جس کی مثال دنیا کے کسی پیغمبر کی تعلیم میں نہیں ملتی، اس لئے آپؐ کو خاتم النبیینؐ کا لقب دیا گیا۔

حضرت عیسیٰؑ نے اس پیغمبر کی تیسری نشانی یہ بتائی کہ وہ دنیا میں میری عظمت کو قائم کرے گا اور میرے لئے گواہی دے گا، یہ نشانی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے سوا کسی اور پر صادق نہیں ہو سکتی، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی اصلی شخصیت اور عظمت کو دنیا میں آشکارا کیا اور دوستوں اور دشمنوں کی طرف سے ان پر جو غلط اتہامات قائم کئے گئے تھے ان کی پردہ دری کی اور ان کی نبوت اور رسالت کی گواہی دی اور ان کی صداقت کو تسلیم کرنا اسلام کا ضروری رکن قرار دیا، ان کے حقیقی اوصاف و محامد کی تصویر کو جسے یہود نے دشمنی سے اور نصاریٰ نے محبت سے دھندلی کر دیا تھا، اپنی روشنی سے اجاگر کر دیا، یہودیوں نے ان پر اور ان کی ماں پر جو بہتان باندھے تھے ان کی علی رؤس الاشہاد تردید کر دی اور نصاریٰ نے ان کی ولادت، وفات، ابنیت، الوہیت اور تعلیمات پر رومی مشرکانہ اعمال و عقائد کا جو پردہ ڈال رکھا تھا اس کو چاک کر دیا اور قرآن کی بیسیوں آیتوں میں نہایت صفائی کے ساتھ ان امور کی تشریح کی گئی اور اب کروڑوں دلوں میں ان کی اصلی عظمت اور حقیقی بزرگی کا نقش کندہ ہے۔

چوتھی نشانی حضرت مسیحؑ نے یہ بتائی کہ وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہے گا بلکہ وہی کہے گا جو اس کو اوپر سے سنایا جائے گا، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص وصف ہے، قرآن نے کہا،

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم ۱)	اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ جو کچھ بولتا ہے وہی بولتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشاد فرمایا کرتے تھے اس کو لکھ لیا کرتے تھے، لوگوں نے کہا آپؐ کبھی غصہ میں کچھ کہہ دیتے ہیں، ان کو لکھا نہ کرو، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپؐ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس سے رضامندی اور نارضامندی دونوں حالتوں میں حق اور سچائی کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا، قرآن مجید نے اپنی نسبت بار بار کہا کہ وہ سچائی کی روح ہے، وہ حق ہے، وہ تذکرہ ہے، وہ ہدایت ہے، اور اس کا پیغمبر چراغ ہدایت ہے، رہنمائے عالم ہے، مذکر (یاد دلانے والا ہے) اس تفصیل کے بعد کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے حرف بحرف پوری نہیں ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور ہستی نہیں جس پر یہ اوصاف صادق آسکیں، قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشین گوئی توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس پیشین گوئی کو جانتے تھے،

الَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ (اعراف ۱۹)

جو لوگ اس ان پڑھ پیغام رساں قاصد کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

انجیل میں گزشتہ بشارت فارقلیط کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو اور بھی پیشین گوئیاں مذکور ہیں انجیل لوقا میں ہے، حضرت مسیحؑ نے آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے فرمایا،

"دیکھو میں اپنے باپ خدا کے اس موعود کو تم پر بھیجتا ہوں، لیکن جب تک عالم بالا سے تم کو قوت عطا نہ کی جائے یروشلم میں ٹھہرو۔" (لوقا ۲۴-۴۹)

اس کی چند سطروں کے بعد لوقا کی انجیل ختم ہو گئی ہے اور اس موعود کے ظہور کا کوئی ذکر نہیں، وہ رسول موعود کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی پیغمبر نہیں ہوا، انجیل کے اس فقرہ میں یہ الفاظ غور کے قابل ہیں کہ حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ اس قوت آسمانی کے ظاہر ہونے کے وقت تک شہر یروشلم میں ٹھہرو، اس سے مقصود اس قوت آسمانی کے ظہور تک شہر یروشلم میں محض اقامت نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس رسول موعود کے ظہور تک تمہارا کعبہ اور قبلہ بیت المقدس رہے گا لیکن جب وہ آئے گا تو رخ شہر مکہ کی طرف بدل جائے گا، اسی لئے قرآن مجید نے تحویل قبلہ کے موقع پر یہ کہا ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (بقرہ)

تو تو اپنا منہ مسجد حرام (کعبہ) کی طرف پھیر اور تم جہاں کہیں ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو اور جو اہل کتاب ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ حضرت عیسیٰؑ نے آپؐ کی آمد کی بشارت کس قدر کھلے لفظوں میں دی تھی، اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ میں اپنے بھائی عیسیٰؑ کی بشارت ہوں، انجیل کی دوسری بشارت حضرت یحییٰؑ کے ظہور کے موقع پر مذکور ہے، حضرت یحییٰؑ جب ظاہر ہوتے ہیں، تو لوگ ان

سے پوچھتے ہیں کہ تین آنے والے پیغمبروں میں سے تم کون ہو؟

"یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے؟ اور اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں، تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، پس آیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں اور انہوں نے اس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو نہ مسیح ہے اور نہ الیاس اور نہ وہ نبی ہے تو کیوں بپتسمہ دیتا ہے۔" (یوحنا ۱-۹)

اس فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ توراۃ کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا، جن میں سے دو کے نام الیاسؑ اور مسیحؑ تھے، لیکن تیسرے کا نام صرف وہ نبی سے لیا گیا ہے، یہ تیسرا نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون ہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں یقین رکھتے ہیں کہ اب مسیح کے سوا کوئی اور آنے والا نہیں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات ہے جو نبی اور پیغمبر کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے، مسلمان آپ کو آنحضرت "وہ حضرت" یعنی پیغمبر کہتے ہیں اور مسیحیوں میں آپ کا نام "دی پرافٹ" وہ پیغمبر مشہور ہو گیا ہے۔

صحابہ کرامؓ اور تابعین میں جن لوگوں کو توراۃ سے واقفیت تھی یا علمائے یہود میں سے جو لوگ اسلام لائے تھے ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت گزشتہ صحف انبیاء میں مذکور ہے حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کمسن تھے، مگر وہ مطالعہ کتب کے شائق تھے اور وہ توراۃ پڑھا کرتے تھے، سورہ فتح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (فتح - ۱)

ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، تاکہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی عظمت کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

سورۂ احزاب میں کچھ اوصاف اور زیادہ مذکور ہیں

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (احزاب - ۶)

اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف گنائے گئے ہیں وہ بعینہٖ توراۃ میں ہیں۔

عن عبد الله بن عمرو ان هذه الآية التي في القرآن يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا قال في التوراة يا ايها النبي انا ارسلناك شاهدا ومبشرا وحرزا للاميين انت

عبداللہ بن عمروؓ نے کہا کہ قرآن کی یہ آیت کہ اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا، توراۃ میں یونہی ہے کہ اے نبی ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور امیوں کا حامی و ملجا بنا کر بھیجا، تو میرا بندہ ہے اور میرا

عبدی و رسولی وسمیتک المتوکل لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب بالاسواق، ولا یدفع السیئة بالسیئة ولکن یعفو ویصفح ولن یقبضه الله حتی یقیم به الملة العوجاء بان یقولوا لا اله الا الله فیفتح بها اعینا عمیا واذانا صما وقلوبا غلفا۔

(بخاری تفسیر سورۂ فتح)

ہے اور میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ رکھنے والا رکھا، نہ تندخو نہ سنگدل ہوگا اور بازاروں میں وہ شور نہ کرے گا، وہ برائی کا بدلہ برائی نہ دے گا بلکہ عفو اور درگزر کرے گا اور اس وقت تک خدا اس کی روح قبض نہ کرے گا جب تک اس کے ذریعہ سے ٹیڑھے دین کو سیدھا نہ کرلے گا، لوگ کہنے لگیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خدا نہیں، پس وہ اس دین سے اندھی آنکھوں بہرے کانوں اور نافہم دلوں کو کھول دے گا۔

صحابہؓ کے زمانہ میں کعبؓ ایک مشہور یہودی عالم تھے جو مسلمان ہوگئے تھے، تفسیر طبری میں ہے کہ حضرت عطا تابعی نے اُن سے پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بشارت توراۃ میں مذکور ہے؟ انھوں نے کہا، ہاں ہے، اور اس کے بعد انھوں نے توراۃ کی اسی عبارت کا ترجمہ پڑھا۔ چنانچہ اس وقت توراۃ کے جو نسخے موجود ہیں ان میں اشعیا نبی کی کتاب میں کسی قدر الفاظ کے تغیر کے ساتھ یہ پیشین گوئی اب تک موجود ہے، اور جس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت کعبؓ نے اپنی پیشین گوئی کو اختصار اور اجمال کے ساتھ اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اشعیا نبی کی پیشین گوئی یہ ہے۔

"دیکھو میرا بندہ، جسے میں سنبھالتا، میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے، میں نے اپنی روح اس پر رکھی، وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا، وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا نہ بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے، اس وقت زوال نہ ہوگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں، خداوند خدا جو آسمانوں کو خلق کرتا اور انہیں تانتا جو زمین کو اور انہیں جو اس سے نکلتے ہیں پھیلاتا اور ان لوگوں کو جو اس پر ہیں سانس دیتا اور ان کو جو اس پر چلتے ہیں روح بخشتا ہے یوں فرماتا ہے، میں خداوند نے تجھے صداقت کے لئے بلایا، میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور میں تجھ کو لوگوں کے لئے عہد اور قوموں کے لئے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بندھوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں، قید خانہ سے چھڑائے، یہوواہ میں ہوں، یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی کھودی ہوئی مورتوں کے لئے ہونے نہ دوں گا، دیکھو سابق پیشین گوئیاں بر آئیں اور میں نئی باتیں بتاتا ہوں، اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں، خداوند کے لئے ایک نیا گیت گاؤ، اے تم جو سمندر پر گزرتے ہو، اور تم جو اس میں بستے ہو، اے بحری ممالک اور ان کے باشندو تم زمین کے سرتاسر اس کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے، سلع

---

[1] اس فقرے کا اردو ترجمہ میرے پیش نظر اردو نسخہ میں صحیح نہ تھا، میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۹۹ء سے درست کیا ہے۔

کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثناخوانی کریں گے، خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کے مانند اپنی غیرت کو اسکائے گا، وہ چلائے گا، ہاں وہ جنگ کے لئے بلائے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا، میں بہت مدت سے چپ رہا، میں خاموش ہو رہا اور آپ کو روکتا گیا، پر اب میں اس عورت کی طرح جسے درد زہ ہو چلاؤں گا اور ہانپوں گا اور زور زور سے ٹھنڈی سانس بھی لوں گا، میں پہاڑوں اور ٹیلوں کو ویران کر ڈالوں گا اور ان کے سبزہ زاروں کو خشک کر دوں گا اور ان کی ندیاں بسنے کے لائق زمین بناؤں گا اور تالابوں کو سکھا دوں گا اور اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا، میں انہیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے جاؤں گا، میں ان کے آگے تاریکی کو روشنی اور اونچی نیچی جگہوں کو میدان کر دوں گا، میں ان سے یہ سلوک کروں گا اور انہیں ترک نہ کروں گا، وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں، جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو، سنو اے بہرو! اور تاکو اے اندھو! تاکہ تم دیکھو، اندھا کون ہے، مگر میرا بندہ؟ اور کون ایسا بہرا ہے جیسا میرا رسول جسے میں بھیجوں گا، اندھا کون ہے؟ جیسا کہ وہ جو کامل ہے اور خداوند کے خادم کی مانند اندھا کون ہے؟ تو نے بہت چیزیں دیکھی ہیں، پر ان پر لحاظ نہیں رکھا اور کان تو کھلے ہیں پر کچھ نہیں سنتا، خداوند اپنی صداقت کے سبب راضی ہوا اور وہ شریعت کو بزرگی دے گا اور اسے عزت بخشے گا۔" (باب ۴۲)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت کعبؓ کی پیش کردہ بشارت میں جو الفاظ ہیں وہ حرف حرف اس میں موجود ہیں، پہلا لفظ اس بشارت میں "شاهدا" ہے، یعنی خدا کی طرف سے دو قوموں کے درمیان گواہ اور شاہد ہوگا، اشعیاء میں ہے وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا اور اس عدالت کا وہ گواہ ہوگا، اس کے بعد مبشر کی صفت ہے یعنی وہ نیکوکاروں کو خدا کی بادشاہی کی خوشخبری سنائے گا، اشعیاء کے اس پورے باب میں اس آنے والے پیغمبر کے یہی اوصاف بیان ہوتے ہیں، بعد ازیں "حرزا للامیین" امیوں کا ماویٰ اور پناہ ہے، امی وہ ہیں جن کو اب تک کوئی شریعت نہیں ملی تھی، چنانچہ اشعیاء میں ہے کہ "۔ رسول کے ذریعے اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا، میں ان ہی رستوں (شریعت) پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا" انت عبدی ورسولی یعنی تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے، اشعیاء کے شروع میں ہے "دیکھو میرا بندہ" اور آخر میں ہے، میرا بندہ میرا رسول جسے میں بھیجوں گا، سمیتک بالمتوکل، میں نے تیرا نام خدا پر بھروسہ کرنے والا رکھا، اشعیاء میں ہے، میرا بندہ جس کو میں سنبھالتا ہوں ..... میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا، لیس بفظ ولا غلیظ ولا یدفع السیئة بالسیئة ولکن یعفو ویصفح وہ سنگدل اور سخت نہ ہوگا، یعنی کمزوروں اور ضعیفوں کو نہ ستائے گا اور برائی کا بدلہ برائی نہ دے گا بلکہ معاف کرے گا، اشعیاء تمثیل و استعارہ میں کہتے ہیں، وہ مسلے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھیمی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ عدالت کو جاری کرائے گا۔ ولا صخاب بالاسواق، وہ بازاروں میں نہ چلائے گا

یعنی وہ متین اور سنجیدہ ہوگا، اشعیاء نے کہا وہ نہ چلائے گا، اپنی صدا نہ بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، ولن یقبضہ اللہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء اور اس وقت تک اس کی روح قبض نہ کرے گا جب تک اس کے ذریعہ سے وہ کج دین کو سیدھا نہ کرالے گا، اشعیاء میں ہے اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا، جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا، فیقولوا لا الٰہ الا اللہ تو لوگ کہیں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اشعیاء کہتے ہیں: میں خدا (یہوواہ) اپنی شوکت دوسرے معبودانِ باطل کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو میرے لئے ہوتی ہے کھودی ہوئی مورتوں کے لئے ہونے نہ دوں گا... وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو فیفتح بہ اعینا عمیا و اذانا صما وقلوبا غلفا۔ وہ اس کے ذریعے سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور زیر پردہ دلوں کو کھول دے گا، اشعیاء کہتے ہیں، لوگوں کے عہد اور قوموں کی روشنی کے لئے تجھے دوں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے جو بند ہیں ان کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں ہیں قید سے نکالے...... سنو اے بہرو! تاکو اے اندھو!

حضرت اشعیاء کی یہ بشارت حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے، حضرت اشعیاء نے ان فقروں میں جس نبی کی پیشین گوئی کی ہے وہ یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں کہ نہ تو وہ عیسائیوں میں خدا کے "بندہ اور رسول" کی حیثیت سے تسلیم ہوتے ہیں اور نہ وہ ایک جنگی مرد کی طرح دنیا میں آئے، نہ انہوں نے توحید کو دنیا میں قائم کیا اور نہ بت پرستی کا استیصال کیا، علاوہ ازیں اس پیشین گوئی میں اس کی طرف بھی خاص اشارہ ہے کہ وہ آنے والا نبی قیدار بن اسمٰعیل کی نسل سے اور قیدار کے دیہاتوں میں پیدا ہوگا، قیدار بن اسماعیل کا مشہور خاندان قریش تھا اور قیدار کا دیہات مکہ معظمہ ہے، اس باب ۴۲ سے پہلے جس میں یہ بشارت ہے باب ۴۱ میں بھی اس بشارت کا ایک حصہ مذکور ہے۔

کس نے اس راست باز کو پورب کی طرف سے برپا کیا اور اپنے پاؤں کے پاس بلایا اور امتوں کو اس کے آگے دھر دیا اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا؟ کس نے انھیں (کافروں) خاک کے مانند اس کی تلوار کے، اور اڑتی بھوسی کے مانند اس کی تلوار کے حوالے کیا۔

اس درس میں یہ تصریح ہے کہ وہ راست باز پورب کی طرف سے مبعوث ہوگا، توراۃ کے محاورہ میں پورب[1] کی سرزمین سے عموماً عرب مراد ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ وہ راست باز بندہ اور رسول ملک عرب میں مبعوث ہوگا۔

اس بشارت میں آنے والے پیغمبر کے سب سے پہلے وصف کا ترجمہ "برگزیدہ" کیا گیا ہے جو آنحضرتؐ کے لقب "مصطفیٰ" کا ترجمہ ہے، دوسرا وصف "راست باز" ہے، یہ امین کا وہ لقب ہے جو نبوت سے پہلے اہل مکہ کی زبان سے آپؐ کو ملا تھا، اب حضرت اشعیاء کی بشارت کے ایک ایک لفظ پر غور کرو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] میں نے اپنی تصنیف ارض القرآن ج اول میں جغرافیہ عرب میں توراۃ کے حوالے سے اس کو بتفصیل دکھایا ہے۔

کے اوصاف وحالات سے اس کی عجیب مطابقت ہوتی ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ اس پیغمبر کو بندہ اور رسول کے وصف سے یاد کیا ہے، یہ وہ وصف ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی پیغمبر اس وصف خاص کے ساتھ شہرت نہیں رکھتا، یہ اسلام ہی کا پیغمبر ہے جس کا طغرائے فخر عبدیت اور رسالت ہے، اس نے دنیا میں اپنے نام کا اعلان ہی ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ عبدہٗ و رسولہٗ کسی مسلمان کی کوئی نماز اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی زبان سے تشہد میں یہ نہیں ادا کر لیتا و اشہد ان محمدا عبدہٗ و رسولہٗ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اس موقع پر ایک خاص نکتہ بیان کے لائق ہے کہ دیگر انبیاء جس طرح خلیل اللہ، کلیم اللہ، روح اللہ وغیرہ کے خطابات سے مشرف ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا خطاب "عبداللہ" خدا کا بندہ ہے، معراج میں جو تقرب الٰہی کی آخری منزل اور انسانی رتبہ کی آخری شرف یابی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی لقب خاص سے پکارے گئے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (بنی اسرائیل)	پاک ہے وہ خدا جو معراج میں اپنے "بندہ" کو لے گیا۔

اس کے علاوہ اور متعدد آیتوں میں آپ کو اس خطاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا (بقرہ)	اگر تم کو اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے "بندہ" پر اتارا
تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ (فرقان)	بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے "بندہ" پر قرآن اتارا۔
وَأَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ (جن)	اور جب خدا کا "بندہ" اس کو پکارتے ہوئے کھڑا ہوا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں زانوں کھڑے کر کے کھانا تناول فرماتے تھے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ میں خدا کا بندہ ہوں، اسی طرح کھاتا ہوں جس طرح غلام کھاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا وصف "رسول" ہے گو دنیا میں پیغمبر ہزاروں آئے مگر لفظ رسول سے ان کے نام کو شہرت نہیں، یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا وصف ہے جو تمام مسلمانوں کی زبانوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے ملقب ہیں، یہاں تک کہ عیسائیوں میں بھی دی پرافٹ یعنی پیغمبر مخصوص آپ کا نام ہے قرآن نے بتصریح کہا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (فتح)	محمد خدا کا رسول۔
یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ (منافقون)	خدا کا رسول تمہاری مغفرت چاہے۔
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ (توبہ)	تمہارے پاس خود تمہاری قوم کا رسول آیا
أَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ (حجرات)	تم میں خدا کا رسول ہے۔
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب)	تمہارے لئے خدا کے رسول کے اندر اچھی پیروی ہے۔
یٰٓأَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَیْكَ (مائدہ)	اے رسول تجھ پر جو کچھ اتارا گیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچا دے۔

ان مقامات کے علاوہ اور بیسیوں جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے یہاں تک کہ

حضرت عیسیٰؑ نے جو بشارت دی ہے وہ بھی اسی رسول کے لفظ کے ساتھ دی ہے "مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ" میرے بعد احمد نام ایک رسول آنے والا ہے۔

حضرت اشعیاء نے آنے والے پیغمبر کا تیسرا وصف برگزیدہ بتایا ہے، کون نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مصطفیٰ (برگزیدہ) کے لقب سے عام طور پر مشہور ہیں، حدیث صحیح میں ہے۔

ان اللہ اصطفیٰ کنانۃ من ولد
اسماعیل واصطفیٰ قریشا من کنانۃ
واصطفیٰ بنی ھاشم من قریش واصطفانی
من بنی ھاشم[1]

بے شک خدا نے اولادِ اسماعیل میں سے کنانہ کو برگزیدہ کیا اور کنانہ میں سے قریش کو برگزیدہ کیا اور قریش میں سے بنی ہاشم کو برگزیدہ کیا اور بنی ہاشم میں سے مجھ کو برگزیدہ کیا۔

چوتھی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ جس سے میرا جی راضی ہوا، یہ صفت نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بلکہ آپؐ کے وسیلہ سے تمام پیروانِ محمدی میں عام ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ
یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا (فتح)

محمد خدا کا رسول اور جو اس کے ساتھ ہیں وہ خدا کی مہربانی اور رضا کو ڈھونڈتے ہیں۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (مائدہ، توبہ، مجادلہ، بینہ)

خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ (فتح)

بے شک خدا مومنوں سے راضی ہوا۔

تمام انبیاء کی امتوں سے یہ مخصوص وصف امتِ محمدی ہی کا ہے اس کے پیرو رضی اللہ عنہ کی دعا سے ہمیشہ مخاطب ہوتے ہیں، اس کے بعد اشعیاء اس پیغمبر کا وصف یہ بتاتے ہیں کہ خدا اس سے کہتا ہے، میں نے اپنی روح اس پر رکھی، قرآن نے اس وصف سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متصف کیا ہے۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ)

ہم نے تیری طرف اپنی شان کی ایک روح وحی کی۔

نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (شعراء)

امانت دار روح اس کو لے کر اتری۔

قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ (نحل)

کہہ دے کہ روح القدس نے اس کو اتارا ہے۔

پانچواں وصف یہ بتایا گیا کہ وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا بلند نہ کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا، صحابہؓ نے آپؐ کی سیرت کے خط و خال کی بھی تصویر کھینچی ہے، متعدد صحابہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ کبھی زور سے نہیں ہنستے تھے بلکہ صرف مسکراتے تھے، شمائل ترمذی میں حضرت ہندؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر چپ رہتے، بے ضرورت کبھی گفتگو نہ فرماتے، ایک ایک فقرہ الگ اور صاف اور واضح ہوتا، ہنستے بہت کم تھے، ہنسی آتی تو مسکرا دیتے۔

حضرت عائشہؓ سے ایک شخص نے آپؐ کے اخلاق پوچھے، انہوں نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدگو نہ تھے اور نہ بازاروں میں شور کرتے تھے، حضرت علیؓ سے حضرت حسینؓ نے دریافت کیا کہ آپؐ کے

---

[1] جامع ترمذی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم [2] جامع ترمذی باب ما جاء فی صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

اوصاف کیا تھے؟ فرمایا، آپ شور وغل نہیں کرتے تھے[1]

سفرِ اشعیاء میں اس کے بعد ہے، وہ ملے ہوئے سینٹھے کو نہ توڑے گا اور دھکتی ہوئی بتی کو نہ بجھائے گا مسکینوں، غریبوں اور کمزوروں کو نہ ستائے گا، وہ نرم دل اور نیک خو ہوگا، قرآن مجید نے آپ کے اس وصف کو نمایاں طریق سے بتایا ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (ن)	اور بے شک تو بڑے خلق پر ہے۔
فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران)	خدا کی رحمت کے سبب سے تو ان کے ساتھ نرم ہے، اگر تو کڑوا اور دل کا سخت ہوتا تو یہ تیرے اردگرد سے ہٹ جاتے۔
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ-۱۶)	تمہاری قوم سے تمہارے پاس ایک پیغمبر آیا جس کو تمہاری تکلیف شاق ہوتی ہے، تمہاری بھی خواہی کا حریص ہے اور مسلمانوں پر مہربان اور رحمت والا ہے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا، آپ برائی کے بدلہ برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ معاف کرتے تھے اور درگزر فرماتے تھے، آپ نے کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ آپ خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع تھے، سخت مزاج اور تنگ دل نہ تھے، ہند بن ابی ہالہؓ جو گویا آپ کے آغوش پروردہ تھے، بیان کرتے ہیں کہ آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، خود اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی غصہ نہ فرماتے اور نہ کسی سے انتقام لیتے[2]۔

حضرت انسؓ خادم خاص کہتے ہیں کہ میں نے دس برس آپ کی خدمت کی، مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ کی مجھ سے باز پرس نہ فرمائی[3]، مالک بن حویرثؓ جو ۲۰ دن تک آپ کی صحبت میں رہے تھے کہتے ہیں کہ آپ رحیم المزاج اور رقیق القلب[4] تھے۔

حضرت اشعیاء اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ عدالت کو قائم کرے گا کہ دائم رہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزمان ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور نہ آپ کی شریعت منسوخ ہوگی آپ آخری دین لے کر آئے جو قیامت تک دائم رہے گا، پھر کہتے ہیں کہ، اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مٹا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے یعنی جب تک اس کی شریعت اور تعلیم قائم نہ ہو جائے گی، اس کو موت نہ آئے گی، ظاہر ہے کہ یہ وصف حضرت عیسیٰؑ پر صادق نہیں آتا کہ وہ اپنی تعلیم و شریعت کے استحکام سے پہلے اس دنیا سے اٹھ گئے، یہ مخصوص وصف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے جو اس وقت تک اس دنیا میں تشریف فرما رہے جب تک آپ کی تعلیم و شریعت نے ظہور تام اور استحکامات کامل نہیں حاصل کر لیا، چنانچہ جب یہ بات حاصل ہو گئی تو آپ کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی اجازت ملی، حضرت اشعیاء کی یہ پیشین گوئی،

---

[1] یہ دونوں روایتیں شمائل ترمذی باب خلق النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں حضرت عائشہؓ والی روایت مسند ابوداؤد طیالسی ص ۲۱۲ اور مستدرک حاکم میں بھی ہے [2] یہ تمام روایات شمائل ترمذی میں مذکور ہیں [3] صحیح مسلم وابوداؤد کتاب الادب [4] صحیح بخاری رحمۃ الناس۔

قرآن مجید کے اس سورہ کے مطابق ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ (النصر-۱)

جب خدا کی نصرت اور فتح آچکی اور تو نے لوگوں کو گروہ در گروہ دین الٰہی میں آتے دیکھ لیا تو تیرا فرض انجام پا چکا، اور اس دنیا سے تیری رخصت کے دن قریب آگئے، اب خدا کے حمد و استغفار میں مصروف ہو کر وہ رحم کرنے والا ہے۔

جب یہ سورہ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع کر کے فرمایا کہ خدا کے ایک بندہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ چاہے وہ اس دنیا کو قبول کرے یا دوسری دنیا کا سفر اختیار کرے مگر اس بندہ نے آخرت کو پسند کیا، حضرت ابوبکرؓ یہ سن کر رو پڑے، وہ سمجھ گئے کہ یہ بندہ کون ہے، حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے امتحاناً اس سورہ کا مطلب پوچھا، انھوں نے جواب دیا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اشارہ ہے حضرت عمرؓ نے بھی اس کی تصدیق کی[۱]۔

اس کے بعد اشعیاء کہتے ہیں کہ تمام بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں۔ یہ اسلام ہی تھا جس کی شریعت نہر جیحون اور سیحون سے دجلہ و فرات ہو کر بحیرۂ روم تک اور بحر ہند سے بحر ظلمات تک پھیل گئی اور بڑے بڑے جزیرے اُس کے نور سے منور ہو گئے۔ بعد ازیں اشعیاء خدا کا وعدہ سناتے ہیں کہ میں ہی تیرا ہاتھ پکڑ دوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔ یہ وعدہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پورا ہوا۔ آپؐ نے یکہ و تنہا دعوت توحید کی اس وقت تک اشاعت کی جب تک ملک عرب کا ذرہ ذرہ آپ کے خون کا پیاسا تھا اور خدا کے سوا کوئی آپؐ کا دوسرا دست گیر نہ تھا، اس نے دشمن کے نرغہ میں نازک سے نازک اور خطرناک سے خطرناک تکلوں سے آپؐ کی ذات گرامی کو محفوظ رکھی اور سفر اشعیاء کے وعدے کو قرآن کے ذریعہ سے دوبارہ دہرایا اور مکہ میں عین اس وقت جب دشمنوں کی عداوت کا آفتاب پوری تمازت پر تھا یہ آیت اتری۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ (اسراء)

اور یاد کر اے محمدؐ جب ہم نے تم سے فرمایا کہ تمہارے پروردگار نے لوگوں کو ہر طرف سے روک رکھا ہے کہ تم پر ہاتھ نہ ڈالیں۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (طور)

"اپنے رب کے حکم کا صبر کے ساتھ انتظار کر کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔"

مدینہ میں آکر یہ وعدہ مکرر دہرایا گیا۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ)

اور خدا لوگوں سے تیری حفاظت کرے گا۔

صحابہؓ اپنی جان نثاری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد پہرہ دیا کرتے تھے، جب یہ آیت اتری تو آپؐ نے خیمہ سے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا، لوگو! واپس جاؤ کہ خدا نے میری حفاظت کا خود وعدہ کیا ہے اس وصف کے مستحق حضرت عیسیٰؑ نہیں ہو سکتے، جو عیسائیوں کے اقرار کے مطابق رومیوں کے ہاتھ گرفتار

---

[۱] صحیح بخاری تفسیر سورۂ مذکور۔

ہو کر سولی پر لٹکائے گئے۔

بشارات اشعیاء میں اس کے بعد ہے میں تجھ کو لوگوں کے لئے عہد اور قوموں کے لئے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھوں کو کھولے اور بندھے ہوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید سے نکالے، تاریخ گواہ ہے کہ بشارت کا یہ حصہ بھی پیغمبر اسلام کے وجود سے کس خوبی سے پورا ہوا ہے، قرآن مجید نے بھی بشارت کے اس حصہ کو ان الفاظ میں مکمل کیا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف ۱۹۰)	وہ لوگ جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں توراۃ و انجیل میں لکھا پاتے ہیں وہ ان کو نیکی کا حکم کرتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھی چیزیں ان کے لئے حلال کرتا ہے اور بری چیزیں ان پر حرام کرتا ہے اور ان سے ان کی ان پابندیوں اور زنجیروں کو جو ان پر ہیں ہلکا کرتا ہے تو جن لوگوں نے اس کو مانا اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے وہی کامیاب ہوں گے کہہ دے (اے پیغمبر) اے لوگو! میں تم سب کے پاس خدا کا بھیجا ہوا ہوں
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۔ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب)	اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، ہشیار کرنے والا اور خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (نساء)	اے لوگو! تمہارے پاس خدا کی طرف سے دلیل آچکی ہم نے تمہاری طرف وہ نور اتارا جو ہر چیز کو روشن کرتا ہے۔
وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا (تغابن)	اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتارا۔
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء)	اے محمدؐ! ہم نے تجھ کو تمام دنیا کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔
كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (ابراہیم)	یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے تاکہ تو لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لائے۔
وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ)	لیکن ہم نے اس کو نور بنایا ہے تاکہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ دکھائیں اور تو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتا ہے

اس کے بعد اس بشارت میں ہے کہ آنے والا پیغمبر توحید کامل کا مبلغ، بت شکن اور باطل پرستی کا دشمن ہوگا اور بت پرست کفار و مشرکین کو وہ شکست عظیم دے گا۔

"یہوا (اللہ) میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے (معبودانِ باطل) کو نہ دوں گا اور وہ ستائش جو

میرے لئے ہوتی ہے کھودی ہوئی مورتوں کے لئے نہ دوں گا۔۔۔۔ وہ پیچھے ہٹیں اور نہایت پشیمان ہوں جو کھودی ہوئی مورتوں کا بھروسہ رکھتے ہیں اور ڈھالے ہوئے بتوں کو کہتے ہیں کہ تم ہمارے الٰہ ہو۔"

حضرت اشعیاء کے بعد دنیا میں وہ کون پیغمبر آیا جس نے توحید کامل کی تعلیم اسلام سے واضح تر اور کامل تر دی ہو، جس نے بُت پرستی کی بیخ کنی کی ہو، جس نے بت خانوں کو منہدم کیا ہو، جس نے مشرکین کی صفوں کو درہم برہم کیا ہو اور باطل پرستی کے عَلم کو ہمیشہ کے لئے سرنگوں کر دیا ہو، قرآن اور آپ کی تعلیمات کا بڑا حصہ شرک وبت پرستی کے خلاف جہادِ عظیم ہے اور تمام دنیا کو اعتراف ہے کہ اس فرض کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خوبی اور تکمیل کے ساتھ ادا کیا وہ کسی اور سے نہ ہو سکا۔

بعد ازیں حضرت اشعیاء بتاتے ہیں کہ وہ آنے والا پیغمبر مجاہد اور تیغ زن ہوگا، اور وہ باطل پرستیوں کے خلاف اپنی تلوار اٹھائے گا۔

"خداوند ایک بہادر کے مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی طرح اپنی غیرت کو اکسائے گا، وہ چلائے گا، ہاں وہ جنگ کے لئے بلائے گا، وہ اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا۔"

یہ حضرت عیسیٰؑ کی صفت نہیں ہو سکتی، یہ صرف بدر و احد اور حنین و خندق کے سپہ سالار پیغمبر کی شان ہے۔

"بیابان (عرب) اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔"

اس فقرہ میں آنے والے پیغمبر کا وطن (بیابانِ عرب) اور خاندان (قیدار بن اسمٰعیل) بھی بتا دیا گیا ہے۔

آخر میں ہے۔

"اور اندھوں کو اس راہ سے جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا، میں انھیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا۔"

اس فقرہ میں یہ ارشاد ہے کہ وہ اُمیوں کا پیغمبر اور اس قوم کا داعی ہوگا جس کو کبھی راہِ راست کی ہدایت نہیں ملی، یہ صفت اہل عرب کی ہے، جن کو آپ سے پہلے کوئی صاحبِ شریعت پیغمبر نہیں ملا، حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے تھے جن کو شریعت مل چکی تھی، اس لئے یہ ان کی صفت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ صرف پیغمبرِ عرب کا وصف ہے، چنانچہ قرآن مجید نے صاف کہا۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ (قصص)	تاکہ ان کو ہشیار کرے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ہشیار کرنے والا نہیں آیا۔
اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ. عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰس-۱)	تو یقیناً پیغمبروں میں سے ہے اور سیدھی راہ پر ہے اور یہ غالب مہربان خدا کی طرف سے اترا ہے تاکہ تو ان کو ہشیار کرے جن کے باپ دادا ہشیار نہیں کئے گئے تو وہ غفلت میں ہیں۔
هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا	وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں پیغمبر بنا کر بھیجا ان ہی میں سے

عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعہ)

کھڑا کیا جو ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتا اور کتاب اور دانائی سکھاتا ہے اگرچہ وہ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ
عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ
دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ۔

(انعام - ۲۰)

یہ کتاب ہے جس کو ہم نے اتارا ہے جو برکت والی ہے تو اس کی پیروی کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، یہ کتاب تم کو اس لئے دی گئی تاکہ یہ نہ کہو کہ کتاب تو ہم سے پہلے یہود اور نصاریٰ دو قوموں کو عطا ہوئی اور ہم اس کے پڑھنے سے غافل تھے، یا کہو کہ اگر خاص ہم پر کوئی کتاب اترتی تو ہم ان سے زیادہ راہ راست پر ہوتے، تو تو تمہارے پاس خدا کی طرف سے کھلی دلیل، ہدایت اور رحمت آگئی۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ
اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (سبا)

اور ہم نے ان کو نہ تو کتابیں دیں جن کو وہ پڑھیں اور نہ تجھ سے پہلے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا بھیجا۔

اس بشارت کے تمام فقروں پر جو شخص اس تفصیل سے نظر ڈالے گا اور اس کے ایک ایک فقرہ کی قرآن پاک، احادیث شریف اور سوانح نبویؐ کے ساتھ حرف حرف تطبیق پر غور کرے گا وہ اس یقین کے پیدا کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس بشارت کا مصداق محمدؐ بن عبداللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (حدید - ۱)

وہی جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تم کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جائے۔

سورۂ فتح میں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کی بشارت دی گئی ہے، توراۃ اور انجیل کی ایک اور پیشین گوئی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى
الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا
يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ
فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ
فِي التَّوْرٰىةِ (فتح - ۱)

محمدؐ خدا کا بھیجا ہوا اور جو لوگ اس کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بھاری آپس میں مہربان ہیں، دیکھتے ہو تم ان کو کہ (خدا کے سامنے) رکوع اور سجدہ میں گرتے رہتے ہیں اور خدا کی رحمت اور خوشنودی کے جویاں رہتے ہیں، ان کے چہروں میں سجدہ کرنے کے اثر سے نور ہے ان کی حالت کا بیان توراۃ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا یہ مجموعی وصف فتح مکہ کے موقع پر بیان کیا گیا ہے جو اسلام کی دعوت کی تکمیل، توحید الٰہی کے انجام، خانہ خلیل کی کامل آزادی اور معبودان باطل کی دائمی شکست کا دن ہے اور اس کے بعد کوئی نیا پیغام سنانے والا دنیا میں آنے والا نہ تھا، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت، جس پر ان کی توراۃ اور صحیفہ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بنی اسرائیل کو یہ فرمائی۔

"یہ وہ برکت ہے جو موسیٰؑ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا، اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی، ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے، اس کے سارے مقدس (صحابہ) تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے" (استثنا۔ ۳۳-۱، ۲، ۳)

یہ حضرت موسیٰؑ کا آخری کلام ہے جس میں آخری پیغمبر کی بعثت کی خبر دی ہے اس بشارت میں وہ فاران سے نورِ الٰہی کے طلوع ہونے کی خوشخبری ہے۔ اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں جو قرآن مجید کے بیان کے عین مطابق ہیں۔

(۱) وہ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ (فتح-۴)

محمدؐ خدا کے فرستادہ اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں۔

(۲) اس کے ہاتھ میں ان کے لئے آتشیں شریعت ہوگی۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (فتح-۴)

وہ خدا کے منکروں پر سخت ہوں گے۔

(۳) وہ اپنے لوگوں سے محبت کرے گا۔

رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (فتح-۴)

آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہوں گے۔

(۴) اے خدا اس (آنے والے پیغمبر) کے سارے مقدس لوگ (یعنی صحابہؓ) تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔

تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ
وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ
اَثَرِ السُّجُوْدِ (فتح-۴)

دیکھتے ہو تم ان کو خدا کے آگے رکوع اور سجود میں جھکے ہوئے خدا کی مہربانی اور خوشنودی کے طلب گار ہیں، طاعت و عبادت کے اثر سے ان کے چہروں پر نورانیت ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ اس آنے والے پیغمبر کے مقدس ساتھیوں کی تعداد دس ہزار فرماتے ہیں، فتح مکہ کے دن بعینہٖ یہی دس ہزار مقدسین تھے جو اس فاران سے آنے والے نورانی پیکر کے ساتھ شہر خلیل (مکہ) کے دروازہ میں داخل ہوئے اور اس طرح حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہوا۔

سورۂ فتح میں اس کے بعد ہے۔

وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَہٗ
فَاٰزَرَہٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِہٖ
یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (فتح-۴)

اور ان کی مثال انجیل میں اس کھیت کی ہے جس نے سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹا ہوا پھر اپنی ٹہنیوں پر کھڑا ہوا کھیت والوں کو خوش اور مسرور کر رہا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے یہ تمثیل آسمانی بادشاہی کی دی ہے، چنانچہ انجیل کے مختلف نسخوں میں یہ تمثیل ان مختلف الفاظ میں مذکور ہے۔

> "آسمان کی بادشاہت رائی کے دانہ کے مانند ہے جسے ایک شخص نے لے کے اپنے کھیت میں بویا، وہ سب بیجوں میں چھوٹا ہے، پر جب اُگتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا پیڑ ہوتا ہے کہ ہوا کی چڑیاں آ کے اس کی ڈالیوں پر بسیرا کریں۔" (متی ۱۳: ۳۱، ۳۲، مرقس ۴: ۳۰)
>
> "خدا کی بادشاہت ایسی ہے جیسا ایک شخص جو زمین میں بیج بوئے اور رات دن وہ سوئے، اٹھے اور بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے اس لئے کہ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے پہلے سبزی پھر بال، بعد اس کے بال میں تیار دانے، اور جب دانہ پک چکا تو وہ فی الفور ہنسوا بھجواتا ہے، کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا ہے۔" (مرقس ۴: ۲۶)

حضرت عیسیٰ نے آسمانی بادشاہت کی جو تمثیل دی ہے، قرآن مجید نے اس کو سورۂ فتح میں دہرایا ہے کون نہیں جانتا کہ اسلام کی جسمانی اور روحانی، ظاہری و باطنی دونوں بادشاہیوں کے جلوس و شوکت کا دن فتح مکہ کا دن ہے اور آسمانی بادشاہی کی یہ تمثیل پوری ہوئی کہ محمدؐ نام ایک کاشتکار نے ایک بیج زمین میں ڈالا اور اس سے سینکڑوں ہزاروں خوشے پیدا ہو گئے اور اس نے آسمانی بادشاہی کی منادی کی۔

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو نصیحت کرتے ہیں۔

> "خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھرو۔" (استثنا ۱۸: ۱۵)
>
> "میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے کہوں گا وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کے کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا، لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں تو جان لے کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا ہے واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے تو اس سے مت ڈر۔" (استثنا ۱۸: ۱۹)

عیسائیوں نے اس بشارت کو حضرت عیسیٰ کے حق میں ثابت کرنا چاہا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس کے مصداق حضرت عیسیٰ نہیں ہو سکتے، اس بشارت میں ہے کہ یہ نبی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے مبعوث ہوگا، بنی اسرائیل کے بھائی بنو اسماعیل تھے، اس سے یہ مفہوم ہے کہ وہ پیغمبر نسل اسماعیل سے ہوگا، حضرت عیسیٰ اسماعیلی نہ تھے عیسائی حضرت عیسیٰ کو نبی نہیں مانتے، حضرت موسیٰ نے کہا کہ "وہ آئندہ نبی میرے مانند ہوگا" حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ میں کوئی وجہ مماثلت نہیں ہے، حضرت موسیٰ صاحب شریعت تھے، حضرت عیسیٰ نہ تھے، حضرت موسیٰ جنگ جو اور مجاہد تھے، حضرت عیسیٰ نہ تھے، حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو غلامی سے نکال کر بادشاہی تک

پہنچایا، حضرت عیسیٰ نے ایسا نہیں کیا، حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے ظاہری و معنوی دونوں معنوں میں بادشاہ تھے حضرت عیسیٰ نہ تھے، حضرت موسیٰؑ صرف واعظ نہ تھے، عمل فرما اور کارپرداز بھی تھے، حضرت عیسیٰ صرف واعظ تھے، حضرت موسیٰؑ قوموں اور ملکوں کے فاتح تھے اور حضرت عیسیٰؑ ایک چپہ زمین پر بھی قابض نہ تھے، برخلاف اس کے حضرت موسیٰؑ اور محمد رسول اللہ علیہما السلام میں یہ تمام اوصاف مشترک تھے، اس لئے وہ موعود نبی جو حضرت موسیٰؑ کے مانند پیدا ہونے والا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے، چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے اس بشارت میں جو کچھ فرمایا ہے، قرآن مجید نے اس کی حرف حرف تصدیق کی ہے، قرآن مجید کا بیان ہے کہ خدا نے روز اول تمام انبیاء سے یہ عہد لیا تھا کہ ہر نبی دوسرے نبی کی تائید کرتا جائے اور اپنی امت کو یہ نصیحت کر جائے کہ جب کوئی پیغمبر ان کے پاس آئے تو وہ اس کی تصدیق کرے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۔

(آل عمران - ۹)

اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ ہم جو تم کو کتاب اور دانائی دیں اور پھر کوئی پیغمبر تمہارے پاس آئے جو کتاب اور شریعت تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق کرنا اور ضرور اس کو ماننا اور اس کی مدد کرنا اور فرمایا کہ کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور ان باتوں پر جو ہم نے تم سے عہد پیمان لیا ہے اس کو تسلیم کیا؟ پیغمبروں نے عرض کیا کہ ہاں ہم اقرار کرتے ہیں، فرمایا تو تم گواہ رہو اور تمہارے ساتھ ہم بھی گواہ ہیں۔

حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو آنے والے پیغمبر کی اطاعت کی جو نصیحت فرمائی وہ اس ازلی عہد و پیمان کا ایفا تھا، حضرت موسیٰؑ نے آنے والے پیغمبر کی نسبت ارشاد فرمایا کہ وہ میرے مانند ہوگا، قرآن مجید نے بھی اس کی تصدیق کی۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا (مزمل)

ہم نے تمہارے پاس ایک پیغمبر کو بھیجا ہے جو تم پر گواہ ہے جس طرح کہ ہم نے فرعون کے پاس ایک پیغمبر بھیجا تھا۔

اس پیغمبر کا وصف یہ ہوگا کہ خدا اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا: قرآن مجید نے اپنے پیغمبر کی نسبت کہا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (نجم - ۱)

اور اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو اس سے خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔

توراۃ میں ہے۔

"اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کے کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حساب لوں گا"

قرآن مجید نے بھی یہی اعلان کیا کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے منکر ہوگا اس کو اپنے

حساب کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔

(رعد۔۶)

اور اے پیغمبر عذاب وغیرہ کے جو وعدے ان کفار سے ہم کرتے ہیں، ان میں سے بعض تو تمہاری زندگی ہی میں ہم تم کو پورا کر کے دکھا دیں گے یا ان کے پورا ہونے سے پہلے تم کو دنیا سے اٹھا لیں گے تمہارا کام ہمارے احکام کو ان کو پہنچا دینا تھا اور ان کا حساب لینا میرا کام ہے۔

توراۃ نے حضرت موسیٰؑ کی زبانی اس بشارت میں یہ کہا،

"لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جسے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔"

قرآن مجید نے بھی اس فرمان کی صداقت پر اپنی مہر ثبت کر دی۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (حاقہ۔۲)

اگر پیغمبر (محمد) کچھ جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر کہتا تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی گردن کی شہ رگ کاٹ ڈالتے پھر تم میں سے کوئی اس کو ہم سے نہ بچا سکتا۔

توراۃ نے اس آنے والے پیغمبر کی نشانی یہ بتائی کہ اس کی تمام پیشین گوئیاں سچی ہوں گی۔ سیرت نبویؐ کے تمام ابواب تمہارے سامنے ہیں، دیکھو کہ اس نشانی کی صداقت میں ایک ذرہ بھی کبھی کمی ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رؤیا میں جو کچھ آپؐ دیکھتے تھے وہ سپیدۂ صبح کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔ مسلمان، تو مسلمان خود کفار تک کو اس پر یقین تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں ہوتی، یاد ہوگا کہ غزوۂ بدر سے پہلے ایک صحابی عمرہ ادا کرنے مکہ گئے تھے، انہوں نے قریش کے رئیس اُمیّہ سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تو قتل ہوگا۔ اس پیشین گوئی کا یہ اثر اس پر ہوا کہ کانپ گیا، معرکۂ بدر میں وہ گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتا تھا، جاتے ہوئے اس کی بیوی نے دامن پکڑ لیا کہ کہاں جاتے ہو، تم کو اس مدینہ والے کی پیشین گوئی یاد نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں پیشین گوئیاں کیں اور ان میں سے ایک ایک سچائی کے معیار پر اُتری۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ابن ناطور جو قیصر روم کا محرم راز اور شام کا اسقف (بشپ) تھا اس نے بیان کیا کہ ہرقل قیصر روم منجم تھا، ایک دن وہ دربار میں آیا تو چہرہ متغیر تھا، کسی درباری نے سبب دریافت کیا تو اس نے کہا رات ستاروں کو دیکھ کر یہ نظر آیا کہ "ملک الختان" (ختنہ کا بادشاہ یا فرشتہ) ظاہر ہوگیا، تو تحقیق کرو کہ ختنہ کس قوم میں رائج ہے، درباریوں نے کہا کہ ختنہ تو صرف یہود کرتے ہیں، اس لئے آپ مضطرب نہ ہوں، صوبوں میں حکم جاری کر دیجئے کہ تمام یہودیوں کے یہاں جس قدر بچے پیدا ہوں سب قتل کر دیئے جائیں، اسی اثنا میں حدود شام کے عرب رئیس غسان نے یہ خبر پہنچائی کہ عرب میں ایک پیغمبر پیدا ہوا ہے۔ قیصر نے کہا دریافت کرو کہ کیا عرب ختنہ کرتے ہیں؟ اس کا جواب جب اس کو اثبات میں ملا، تو اس نے کہا، ہاں! یہ اس امت کا ملک (بادشاہ یا فرشتہ) ہے، اور اس

ہ کہ بخاری جزء اول ص ۳، صحیح بخاری مغازی۔

کے بعد اہل دربار سے مخاطب ہو کر کہا کہ اگر تم کو اپنی سلطنت بچانی منظور ہے تو اس پر ایمان لاؤ، درباریوں نے قیصر کی اس ر کو سخت ناپسند کیا، مگر رومیہ میں قیصر کا ایک اور صاحب علم دوست تھا، قیصر نے اس کو لکھا تو اس نے بھی قیصر کی رائے کی تائید کی۔

ہمارے محدثین اس خبر کی صحیح حقیقت نہیں سمجھ سکے ہیں اور اسی لئے ملک الختان کا تلفظ نہ مَلِک (بادشاہ) ہے اور نہ مَلَک (فرشتہ) ہے بلکہ ملاک ہے جس کے معنی فرستادہ اور پیامبر کے ہیں جس کی اصل عربی میں لوکہ یعنی پیغام ہے، اگر یہ لفظ عربی تلفظ میں مَلَک پڑھا جائے تو یہ لفظ اس موقع پر "فرشتہ" کے اصطلاحی معنی میں نہیں بلکہ فرستادہ کے لغوی معنوں میں مستعمل ہوا ہے، قیصر کا یہ لفظ ملاک الختان (ختنہ کا پیامبر) استعمال کرنا درحقیقت "توراۃ" کی ایک پیشین گوئی کی طرف اشارہ ہے، ملاخیانبی کی کتاب میں یہ پیشین گوئی ان الفاظ میں مذکور ہے۔

> "دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کرے گا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو، ہاں "ختنہ کا رسول" جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آئے گا، رب الافواج فرماتا ہے، پر اس کے آنے کے دن کو کون ٹھہر سکے گا، اور جب وہ ظاہر ہوگا کون ہے جو کھڑا رہے گا، کیونکہ وہ سنار کی آگ اور دھوبی کے صابن کی ما" ہے اور وہ روپیہ کا میل کاٹتے ہوئے اور اسے خالص کرتا ہوا بیٹھے گا" (باب ۳)

آج کل کے ترجموں میں "ختنہ کے رسول" کے بجائے "عہد کا رسول" لکھا ہے، یہ ترجمہ صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے جواب میں جس رسول کی بعثت کا وعدہ فرمایا تھا، اس کے متعلق یہ بشارت ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ توراۃ کی زبان میں "ختنہ" نسل ابراہیمی کے جسم پر خدا اور ابراہیم کے باہمی "عہد و میثاق" کی مہر کا نام ہے۔ توراۃ میں جہاں ختنہ کا حکم ہے مذکور ہے۔

> "اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان ہے، جسے تم یاد رکھو یہ ہے کہ تم میں ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو، اور یہ اس عہد کا نشان ہے جو میرے اور تمہارے درمیان ہے" (پیدائش ۱۷، ۱۰)

اس بنا پر "ختنہ" کے بجائے مترجمین نے "عہد" کا لفظ رکھ دیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب مولد کے زمانہ میں اس پیشین کے مطابق اس "رسول الختان" کا یہود و نصاریٰ دونوں کو انتظار تھا اور قیصر روم اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا منتظر تھا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰؑ کے حق میں نہ تھی، کیونکہ اگر ان کے حق میں ہوتی تو ئی قیصر اس کی آمد کا منتظر نہ ہوتا، "رسول الختان" کے لفظ سے اس بات کا اشارہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ وہ مختون قوم میں ظاہر ہوگا اور عیسائی مذہب نے اس رسم کو باطل قرار دیا ہے یہودیت کے بعد اسلام ہی ہے جس نے نسل ابراہیمؑ کے اس عہد کو دنیا میں ہمیشہ برقرار رکھا ہے، توراۃ میں ایک اور بشارت ہے۔

> "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ (استثناء ۳۳-۲)

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حبقوق نبی کے صحیفہ میں پھر دہرایا گیا ہے۔

"خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا، اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی"۔ (۳-۳)

صحیفۂ استثنا کی بشارت میں خداوند کا مظہر تین پہاڑوں کو قرار دیا گیا ہے۔ کوہ سینا، کوہ سعیر، اور کوہ فاران یہ درحقیقت خورشید نبوت کے تین مطلع ہیں، ان میں بہ ترتیب کوہ سینا سے حضرت موسیٰؑ، کوہ سعیر سے حضرت عیسیٰؑ اور کوہ فاران سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں کہ وہ مکہ کی پہاڑیوں کا نام ہے، حضرت حبقوق اس بشارت میں کہتے ہیں کہ وہ تیمان سے آیا، تیمان کے لغوی معنی جنوب کے ہیں اور استعمال میں ملک یمن کو کہتے ہیں اور یہاں یہ دونوں معنی ٹھیک ہیں، پھر کہتے ہیں "اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا" یہ معراج آسمانی کی تشریح ہے، پھر کہتے ہیں "اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی" زمین کا کون گوشہ ہے جو محمدؐ کی حمد سے معمور نہیں، لفظ حمد کہ محمد کا مادہ اور عبادات اسلامی کا آغاز (الحمد الخ) ہے، محمد رسول اللہ کی تلمیح سے لبریز ہے۔

توراۃ کی اس بشارت کو قرآن مجید نے سورۂ والتین کے ان الفاظ میں ادا کیا۔

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (تین)

قسم ہے انجیر اور زیتون کی، طور سینا کی اور اس امن والے شہر کی۔

سب کو معلوم ہے کہ انجیر اور زیتون والا ملک شام ہے جو حضرت عیسیٰؑ کا مولد اور کوہ سعیر کا مبدا ہے طور سینا حضرت موسیٰؑ سے عبارت ہے اور بلد امین یعنی مکہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے۔

علمائے اسلام نے توراۃ اور انجیل کی اور بھی بشارتوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ہم نے صرف ان ہی بشارتوں کا ذکر کیا ہے جن کی طرف قرآن مجید اور احادیث میں اشارے پائے جاتے ہیں، کتب سیر و دلائل میں بہت سی پیشین گوئیاں عرب کے کاہنوں اور بت خانوں کے پجاریوں سے منقول ہیں، لیکن چونکہ ان کا بڑا حصہ اصول روایت کے رو سے کمزور ہے، اس لئے ہم ان کی تفصیل غیر ضروری سمجھتے ہیں، تاہم ان روایات کا قدر مشترک اس قدر ضرور نکلتا ہے کہ عرب بھی ایک پیغمبر کے وجود کا تشنہ تھا، روم و فارس کی دہ سالہ جنگ نے مشرق و مغرب کی سرزمین کو لالہ زار بنا دیا تھا اور خیالات میں تلاش امن کی شورش برپا کر دی تھی اور عرب میں اصحاب الفیل کا واقعہ دلوں میں لرزش پیدا کرنے کے لئے کافی تھا اور یہی وہ موسم دنیا میں روح اعظم کے ظہور کا ہوتا ہے، اس لئے مولد نبی کے قریب زمانہ میں عرب و روم اور یہود و نصاریٰ سب کو توراۃ اور انجیل کی بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا، صحیح بخاری میں حضرت ابو سفیانؓ کی زبانی مروی ہے کہ جب قاصد نبوی دعوت نامہ اسلام لے کر قیصر کے پاس پہنچا ہے اور قیصر نے ابو سفیان کو بلا کر جو اس وقت تک کافر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند استفسارات کئے ہیں اور ابو سفیان نے ان کے جو جوابات دیئے ہیں ان کو سن کر اس نے بھرے دربار میں کہا، تم نے جو کچھ بیان کیا اگر وہ سچ ہے تو ایک دن یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اس کے قبضے میں ہوگی، مجھ کو ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا، اگر ممکن ہوتا میں خود جا کر اس

کی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔[1]

قیصر کے محرمِ راز اور شام کے بشپ ابن ناطور کا بیان اوپر پڑھ چکے ہو کہ قیصر کا خیال تھا کہ ختنہ والے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی، مقوقس شاہِ مصر کے دربار میں جو قاصد نبوی خط لے کر گیا تھا، وہ بھی یہ جواب لایا کہ ہاں ہم کو بھی یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا، حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ سچے پیغمبر ہیں۔[2]

یاد ہوگا کہ یمن کے شہر نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد حاضرِ خدمت ہوا تھا اور فیصلۂ حق کے لئے قرار پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں، لیکن وفد کے سمجھدار عیسائیوں نے وفد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ خدا کی قسم! اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جائیں گے[3]، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی پیغمبر کی آمد کا گمان تھا۔ اسلام سے پہلے زید ایک عرب موحد تلاشِ حق میں مدتوں سرگرداں رہے، وہ پہلے یثرب (مدینہ کا پہلا نام) گئے، دیکھا تو وہاں کے یہودی بھی توحیدِ کامل پر قائم نہ تھے، یہاں سے نکل کر خیبر کے یہودیوں کے پاس گئے اور ان کا بھی یہی حال پایا، وہاں سے شام کے عیسائیوں میں گئے دیکھا کہ وہ بھی مشرک ہیں، آخر شام کے ایک راہب نے کہا کہ اگر تمہیں دینِ حق کی تلاش ہے تو عراق جاؤ، وہاں ایک بزرگ ہیں، زید جب ان کے پاس پہنچے اور لبِ سوال وا کیا تو دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو، زید نے کہا حرمِ مکہ سے، ان بزرگ نے کہا جاؤ تم اپنے وطن کو لوٹ جاؤ، دینِ حق کا وہیں ظہور ہونے والا ہے، وہ لوٹ کر مکہ آئے، لیکن اسلام سے پہلے ان کی وفات ہو گئی۔[4] ورقہ بن نوفل کا واقعہ تم سیرت جلد اول میں پڑھ چکے ہو کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے، بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہؓ آپؐ کو لے کر ورقہ کے پاس گئی ہیں تو ورقہ نے آپؐ کی نبوت کی تصدیق کی اور آرزو ظاہر کی کہ کاش میں آپؐ کی ہجرت تک زندہ رہتا تو آپؐ کی مدد کرتا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا اس وقت انتظار تھا۔

ابن سعد، ابن اسحاق، مسندِ احمد، تاریخِ بخاری، مستدرکِ حاکم، دلائلِ بیہقی، معجمِ طبرانی، دلائلِ ابونعیم وغیرہ میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں بھی ایک آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے تھے اور ان ہی سے سن سن کر اوس و خزرج کے کانوں میں پیغمبر کی بعثت کی خبر پڑی ہوئی تھی، اور اکثروں کے لئے یہ خبر ہدایت کا باعث بنی، چنانچہ ابن سعد کے علاوہ دیگر کتبِ مذکورہ میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسند صحیح مذکور ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ تھے، اثنائے وعظ میں اس نے ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی، لوگوں نے پوچھا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا؟ اس نے ان انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے، اشارہ کر کے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا، انسؓ بن مالک

---

[1] صحیح بخاری کیف کان بدء الوحی۔ [2] سیرت نبویؐ جلد اول [3] سیرت نبویؐ جلد دوم [4] مسند ابو زرعہ۔

سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا آپؐ کی خدمت میں رہا کرتا تھا، اتفاق سے وہ بیمار پڑا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو گئے، اور اس کے باپ سے پوچھا کہ کیا میرا ذکر تم توراۃ میں پاتے ہو؟ اس نے کہا نہیں لڑکے نے فوراً جواب دیا، ہاں یا رسول اللہ! آپؐ کا ذکر ہم نے توراۃ میں پڑھا ۔ اور یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا[1]۔ عربوں اور یہودیوں میں جب لڑائی ہوتی تو یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک پیغمبر آنے والے ہیں، ان کے عہد میں ہم کو کامل فتح ہوگی، قرآن مجید نے ان کے اسی عقیدہ کو دہرا کر ان کے عدم اسلام پر ملامت کی ہے۔

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ-۱۱)

اس سے پہلے کافروں پر اسی آنے والے پیغمبر کا نام لے کر فتح چاہا کرتے تھے، پس جب وہ سامنے آ گئے جس کو انہوں نے پہچان لیا تو انکار کر دیا، کافروں پر خدا کی لعنت ہو۔

قرآن مجید نے اس کے علاوہ اور بھی متعدد مقامات پر یہودیوں کو ان کے اس سابق الیقین کے خلاف ان کے موجودہ اظہار کفر پر ان کی سرزنش کی ہے۔

وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ (بقرہ ۱۷)

جن کو کتاب پہلے دی جا چکی ہے وہ یقیناً ان نشانیوں کی بنا پر جو اس کتاب میں مذکور ہیں، جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۱۷)

جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں، اسلام کی صداقت کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں لیکن ان میں سے ایک فریق جان کر حق کو چھپاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (انعام-۲)

جن کو ہم پہلے کتاب دے چکے ہیں وہ اس کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو۔

یہ ان ہی بشارتوں اور پیشین گوئیوں کا اثر تھا کہ علمائے یہود آنے والے نبی کے متعلق توراۃ کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے اور سوالات کرتے تھے اور آپؐ کا امتحان لیتے تھے اور جب ان کی تشفی ہو جاتی تھی تو وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفر طیارؓ نے اسلام پر تقریر کی اور سورۂ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو نجاشی پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا، خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں، اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی نسبت اسلام کا جو عقیدہ سنا تو نجاشی نے

---

[1] بیہقی باسناد صحیح، مگر یہ روایت صحیح بخاری (کتاب الجنائز) سے کسی قدر مختلف ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ وہ لڑکا اپنے باپ کے مشورہ سے مسلمان ہو گیا۔

زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا کہ واللہ! جو تم نے کہا، عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں[1]۔

کفارِ عرب کو مخاطب کر کے قرآن مجید نے کہا کہ اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَکَفَرْتُمْ بِہٖ وَشَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَکْبَرْتُمْ (احقاف ۱۰)	اے پیغمبر! ان سے کہو کہ غور کرو، اگر یہ قرآن خدا کی طرف سے ہو اور تم اس سے منکر ہو اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے اس طرح کی ایک کتاب نازل ہونے کی گواہی بھی دی اور ایمان بھی لایا اور تم غرور بنے رہے تو ایسی صورت میں تمہارا کیا انجام ہوگا۔
اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (شعراء ۔ ۱۱)	کیا ان کفار کو یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔

*

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲ ۔

خصائصِ محمدیؐ

خصائص وہ امور ہیں جو کسی کی ذات کے ساتھ خاص ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی چیزیں ایسی دی گئی تھیں جو اوروں کو نہیں ملی تھیں، یہ خصائص محمدیؐ دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو صرف آپؐ کے لئے تھے اور آپؐ کی امت میں سے کسی اور کے لئے نہ تھے۔ دوسرے وہ جو صرف آپؐ کو عطا ہوئے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو مرحمت نہیں ہوئے، غرض پہلی خصوصیتیں امت کے مقابلہ میں اور دوسرے انبیاءؑ کے مقابلہ میں تھیں، ہم نے پہلے کا نام "خصائص ذاتی" اور دوسرے کا "خصائص نبویؐ" رکھا ہے۔

اربابِ سیر نے ان خصائص کی توسیع اور کثرت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا بڑا معیار قرار دیا ہے کہ اس سے بارگاہِ الٰہی میں آپؐ کی خصوصیت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ انہوں نے معمولی معمولی سی باتوں کو خصوصیت میں شمار کر کے خصائص نبویؐ کا ایک انبار لگا دیا ہے، مثلاً حافظ ابوسعید نیشاپوری نے شرف المصطفیٰ میں آپؐ کے خصائص کی تعداد ساٹھ لکھی ہے، حافظ سیوطی نے خصائص کبریٰ میں اس پر سینکڑوں کا اور اضافہ کیا ہے، حالانکہ ان میں اکثر کا ماخذ، تاویل بعید، نکتہ آفرینی اور ضعیف روایتیں ہیں۔

بعض ایسی باتیں بھی خصائص میں شمار کر لی گئی ہیں جو گو عام افرادِ امت کے لئے نہیں لیکن امراء اور خلفائے اسلام کا اُن سے اتصاف یا تعلق جائز ہے۔

محدثین نے خصائصِ ذاتی کو یہ وسعت دی ہے کہ انہوں نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ حدیث قولی اور عملی میں اگر تصادم ہو تو حدیثِ قولی کو حدیثِ عملی پر ترجیح ہو گی، یعنی اگر ایک امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہے اور اس کے مخالف دوسرا امر آپؐ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے تو عام امت کو آپؐ کے ذاتی عمل کی تقلید کے مقابلہ میں آپؐ کے قول کی تعمیل کرنی چاہیے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ عمل محض آپؐ کے لئے مخصوص اور آپؐ کے خصائص ذاتی میں ہو لیکن ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اپنی امت کے لئے نمونہ اور عملی مثال ہی بن کر آتے ہیں، خصوصاً حضرت مقتدائے اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے متعلق فرمانِ الٰہی نے اعلان کر دیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ
حَسَنَةٌ (احزاب)

اور تمہارے لئے (اے مسلمانو!) رسول اللہ میں
بہترین اقتدا ہے۔

تو جب آپؐ مقتدائے عالم اور امام اعظم بن کر آئے اور تمام لوگوں کو آپؐ کی تقلید اور پیروی کا حکم دیا گیا تو ایسی حالت میں آپؐ کا ہر فعل ہمارے لئے قابلِ تقلید اور لائق پیروی ہے، بے شک بعض امور ایسے بھی

ہو سکتے ہیں جو بحیثیت پیغمبر آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہوں، لیکن ضرورت ہے کہ دفع التباس اور رفع شک کے لئے ان تمام مخصوص امور کے متعلق ساتھ ساتھ یہ اعلان عام بھی کر دیا جائے کہ یہ مخصوصات نبویؐ ہیں اور یہ عام امت کے لئے نہیں ہیں۔

اس بنا پر اس کے تسلیم کر لینے سے چارہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جس قدر خصائص ذاتی تھے، شریعت نے ان کو برملا واضح کر دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ یہ صرف آپؐ کے ساتھ مخصوص ہیں، اس لئے جن امور کے متعلق یہ تصریح موجود نہیں کہ یہ مخصوصات نبوی ہیں ہیں، ان کو ہرگز خصائص کے باب میں جگہ نہیں دی جا سکتی، اور اس طرح یہ معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو خصائص ذاتی ہیں، وہ چند محدود امور ہیں اور کتاب و سنت نے ان کا مخصوص ہونا عالم آشکارا کر دیا ہے۔

خصائصِ ذاتی

نبوت اور لوازم نبوت سب سے پہلی چیز جو آپ کی ذات مبارک کے ساتھ مخصوص تھی اور جس کا کوئی حصہ افراد امت کو نہیں ملا وہ نبوت اور اس کے لوازم وحی، تشریع، اخبار الٰہی، نزول جبریلؑ، نسخ احکام وغیرہ ہیں، یعنی آپ کے سوا نہ تو کسی فرد امت پر کوئی وحی آئی اور نہ آسکتی ہے، نہ کسی کو کوئی نئی شریعت لانے اور نئے مذہبی قانون وضع کرنے کا اختیار ہے، نہ وہ بے گناہ اور معصوم ہے، نہ اللہ تعالیٰ سے سن کر وہ خبر دے سکتا ہے، نہ اس کے پاس قاصد الٰہی آسکتا ہے، نہ وہ احکام شرعی کو منسوخ کر سکتا ہے وغیرہ، صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو افراد امت کے لئے باقی ہیں اور وہ رویائے صادقہ اور کشف والہام ہیں۔

امور متعلقہ نکاح مسئلہ نکاح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چند امور مخصوص کر دیئے گئے ہیں، جن کی رخصت عام امت کے لئے نہیں۔

(۱) عام مسلمان بشرطِ عدل صرف چار بیویاں ایک وقت میں رکھ سکتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار سے زیادہ رکھ سکتے تھے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس کی رخصت تھی کہ اگر کوئی عورت اپنی خوشی سے مہر کے بغیر آپؐ کی زوجیت میں آنا چاہتی اور آپؐ اس کو قبول کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے، گو ایسا واقع نہیں ہوا، لیکن افراد امت کے لئے بغیر مہر نکاح ممکن ہی نہیں۔

یہ دو رخصتیں تھیں، لیکن ان کے مقابلہ میں اس باب میں آپؐ پر کچھ قیدیں بھی تھیں، جو عام افرادِ امت پر نہیں۔

(۳) آپؐ پر وہی عورتیں حلال تھیں جن کو ادائے مہر یا بغیر مہر کے آپ اپنی زوجیت میں اب تک لے چکے تھے اور رشتہ کی بہنوں میں سے صرف وہی عورتیں آپؐ کی زوجیت میں رہ سکتی تھیں، جنھوں نے آپؐ کے ساتھ ہجرت کی تھی، عام مسلمانوں پر قید نہ تھی۔

(۴) عام مسلمان اہل کتاب کی عورتوں سے جنھوں نے گو اسلام نہ قبول کیا ہو نکاح کر سکتے تھے اور کر سکتے ہیں مگر آپؐ کو اس کی اجازت نہ تھی۔

(۵) جو بیویاں آپؐ کے پاس تھیں، ان میں سے اب کسی کو نہ آپؐ طلاق دے سکتے تھے اور نہ ان کے بعد آپؐ اور کسی سے اب نکاح کر سکتے تھے۔

(۶) آپؐ کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ ان بیویوں میں سے جن کو اپنے قریب کر لیں اور باقی کو پیچھے کر دیں، چنانچہ آپؐ نے چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، زینبؓ اور ام سلمہؓ کو پاس رکھ لیا تھا اور بقیہ کو شرف زوجیت بخشتے

کے ساتھ اپنے سے علیحدہ رکھا تھا اور ان میں آپ ردوبدل بھی کر سکتے تھے۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو آپ کی وفات کے بعد کسی دوسرے کے نکاح میں جانے کی اجازت نہ تھی۔

وَلَا تَنْكِحُوٓا أَزْوَاجَهُۥ مِنۢ بَعْدِهِۦٓ أَبَدًا۔ (احزاب)
اور نہ یہ مناسب ہے کہ اپنے پیغمبروں کی بیویوں سے اس کے بعد کبھی نکاح کرو۔

یہ تمام احکام سورۂ احزاب میں بتصریح تمام مذکور ہیں اور ان کے خاص وجوہ و مصالح ہیں، اصل یہ ہے کہ عرب میں نکاح کی تعداد متعین نہ تھی، بلکہ بنی اسرائیل میں بھی اس کی تحدید نہ تھی، توراۃ میں ایسے انبیاء اور بزرگوں کے نام بھی ہیں جن کی متعدد بلکہ سینکڑوں بیویاں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے عہد شباب میں یعنی ۲۵ سال سے ۵۰ برس کی عمر تک صرف ایک بی بی (حضرت خدیجہؓ) پر کفایت کی۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک ساتھ دو نکاح کئے، حضرت سودہؓ سے جو کبیر السن تھیں اور حضرت عائشہؓ سے جو صرف ۶ برس کی تھیں، اتنی چھوٹی لڑکی سے نکاح ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف دو خاندانوں میں محبت اور یک جہتی کی ترقی ہی کے لئے ہو سکتا تھا، مدینہ میں آکر آپ نے چند نکاح کئے، ان نکاحوں پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں دو قسم کی عورتیں تھیں، ایک وہ جو رؤسائے قبائل کی لڑکیاں تھیں اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لئے تعلقات کی توسیع اور اضافہ تھا، حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی اور حضرت حفصہؓ فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت ام حبیبہؓ ابو سفیان رئیس بنو امیہ کی بیٹی تھیں، حضرت جویریہؓ قبیلۂ بنی المصطلق کی رئیسہ تھیں، حضرت صفیہؓ رئیس خیبر کی دختر تھیں۔

ازواج مطہراتؓ میں دوسری وہ بیوہ عورتیں تھیں جن کا سن زیادہ تھا اور گویا اس طرح ان کی کفالت کا بار آپ نے اٹھایا تھا، چنانچہ حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینب ام المساکین یہ سب بیوائیں تھیں، ایک اور بیوی حضرت زینبؓ بنت جحش تھیں جو گو بیوہ نہ تھیں لیکن مطلقہ تھیں، ان کے شوہر نے ان کو طلاق دے دی تھی، اس تفصیل سے آپ کی کثرت ازواج کے اسباب منکشف ہوئے ہوں گے۔

اس کی تصریح نہیں ملتی کہ سورۂ احزاب میں یہ مخصوص احکام کب نازل ہوئے، لیکن اس بنا پر کہ آپ نے آخری سے آخری نکاح حضرت میمونہؓ سے ۷ھ میں ادائے عمرہ کے زمانہ میں کیا ہے اور اس کے بعد آپ کا کوئی نکاح ثابت نہیں، اس لئے ان احکام کے نزول کی تاریخ اسی ۷ھ کو قرار دیا جا سکتا ہے کہ ۷ھ میں اسلام کی طاقت اپنے کمال کو پہنچ گئی تھی اور خیبر، طائف اور مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تعلقات کے ذریعہ سے کسی نئے قبیلہ کو مطیع کرنے کی ضرورت نہ تھی اور غریب سن رسیدہ مسلمان بیواؤں کی کفالت کی حاجت نہ تھی۔

اس تمہید کے بعد یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام نے ازواج مطہرات کو وقار نبوت کے برقرار رکھنے اور

---

[1] طبقات ابن سعد جزء نساء ص ۹۴۔

ان کو تمام تر احکام اسلامی کے نشر و اشاعت میں مصروف رہنے کا حکم دے کر ان کا آئندہ نکاح ناجائز قرار دیا اور ان کو تمام مسلمانوں کی ماؤں کا رتبہ دیا وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (سورۂ احزاب) اب ایسی حالت میں چار سے زیادہ نکاح کرنے کی ممانعت کا حکم نازل ہوتا ہے، اب جناب رسالتمآب کے لئے اس کے سوا چارہ کار کیا ہوتا کہ وہ انہی بیویوں پر محدود رہیں کہ اگر ان میں سے کچھ کو طلاق دے دی جائے تو چونکہ وہ دوسرے مسلمانوں کے نکاح میں نہیں آسکتیں، اس لئے یہ ان پر صریح ظلم ہوتا، بنابریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو موجودہ بیویوں کو آپ کی زوجیت میں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور طلاق کی رخصت آپ سے سلب کرلی جاتی ہے اور ان محدود ازواج میں سے بھی چند کو قریب رکھنے اور بقیہ کو شرف زوجیت کے ساتھ علیحدگی (ارجاء) کا حکم دیا جاتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، زینبؓ کو اختیار کرتے ہیں اور حضرت سودہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ اور حضرت ام حبیبہؓ سے ارجاء کرتے ہیں[1] کتابیہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے نکاح کی اجازت نہیں دی گئی کہ نبوت محمدی پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے امور دین میں اس پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ اس کو محرم راز ہونے کا شرف بخشا جاسکتا تھا۔

نمازِ شبانہ

شروع میں جب نماز پنجگانہ کے احکام نازل نہیں ہوتے تھے، مسلمانوں پر رات کی نماز (تہجد) فرض تھی، اس کے بعد معراج میں جب پانچ وقت کی نماز فرض ہوگئی تو تہجد کی نماز عام امت پر فرض نہیں رہی بلکہ صرف مستحب رہ گئی لیکن خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ نماز شبانہ فرض مزید کے طور پر باقی رہی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوری پابندی کے ساتھ اس کو ادا کرتے رہے، یہی وہ نماز تھی جس میں دیر تک کھڑے رہنے سے پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا سورۂ بنی اسرائیل جو معراج کی سورہ ہے اس میں نماز پنجگانہ کے بعد ارشاد ہوتا ہے،

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝

اور رات کے حصہ میں بیدار ہو کر نماز پڑھ، یہ تیرے لئے مزید ہے قریب ہے کہ تیرا پروردگار تجھ کو مقام محمود (مرتبہ شفاعت) میں اٹھا لے۔

نمازِ چاشت اور قربانی

اسی طرح چاشت کے وقت نماز عام مسلمانوں کے لئے نفل ہے مگر احادیث میں ہے کہ یہ نماز آپ پر بمنزلہ فرض کے تھی اور اسی کے ساتھ قربانی کا حکم بھی، غالباً یہ حدیثیں سورۂ کوثر کی تفسیریں ہیں۔

اِنَّاۤ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (کوثر)

اے پیغمبر! ہم نے تجھے کوثر عطا کیا تو تو اس کے شکرانے میں اپنے رب کی نماز (چاشت) پڑھ اور قربانی کر۔

مگر یہ بطریق صحاح مذکور نہیں، اسی لئے ہمیں ان کو خصائص نبوی میں شمار کرنے میں اب بھی تامل ہے۔

عصر کے بعد نمازِ دوگانہ

عام امت کے لئے نماز عصر کے بعد سے غروب تک نماز پڑھنا ممنوع ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر میں بعض ازواج مطہراتؓ نے عصر کے بعد نماز پڑھتے دیکھا، دریافت کیا تو فرمایا کہ ایک وفد کی ملاقات میں ظہر کے بعد کی دو رکعتیں مجھ سے رہ گئی تھیں، یہ میں ان کی قضا پڑھتا ہوں، عام امت

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری تفسیر سورۂ احزاب جلد ۲۲ ص ۱۹۔ [2] بحوالہ خصائص کبریٰ سیوطی جلد دوم طبع حیدرآباد۔ [3] ابوداؤد و ترمذی باب الصلوٰۃ بعد العصر

کے لئے تو اس کی قضا واجب نہ تھی، اگر ہوتی بھی تو ایک دفعہ قضا پڑھ لینا کافی تھا، مگر آپ نے اپنے لئے ایک نماز سنت کے ترک عمد کی تلافی کی شاید آخر عمر تک کوشش کرتے رہے۔

صوم وصال

یعنی کئی کئی دن کا متصل افطار کئے بغیر روزہ رکھنا عام امت کے لئے ممنوع ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی دن کا روزہ رکھتے تھے اور بیچ میں افطار کے وقت کچھ کھاتے پیتے نہ تھے بعض صحابہ نے آپ کی پیروی میں اس طرح کا روزہ رکھنا چاہا تو آپ نے روک دیا اور فرمایا، تم میں کون میری طرح ہے، مجھ کو تو میرا پروردگار کھلاتا اور سیراب کرتا ہے[1]۔

صدقہ وزکوٰۃ کھانے کی حرمت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت پر کئی کئی دن کے فاقے گذر جاتے تھے عام مسلمان غربت اور تنگدستی کی حالت میں اس سرمایہ سے فائدہ اٹھاتے تھے، مگر آپ نے اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس مد کی ہر شے حرام کر دی اور کبھی صدقہ کا مال ذاتی مصرف میں لانا گوارہ نہ فرمایا یہاں تک کہ اگر حسنین علیہما السلام لڑکپن کے اقتضا سے صدقہ وفطر کی کوئی کھجور بھی اپنے منہ میں ڈال لیتے تھے تو آپ اگلوا دیتے تھے[2] اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگوں کے مال ودولت کا میل ہے، اس کا اہل بیت نبوت کو لینا جائز نہیں[3] چنانچہ سادات کے لئے قیامت تک اس قسم کے صدقات کا لینا جائز نہیں[4]۔ آپ کے پاس جب کوئی ناواقف شخص کوئی چیز لے کر جاتا تھا کہ اس کو آپ کی خدمت میں پیش کرے تو آپ دریافت فرما لیا کرتے تھے کہ یہ صدقہ ہے یا تحفہ؟ اگر تحفہ کہتا تو قبول فرماتے اور اگر معلوم ہوتا کہ صدقہ ہے تو اجتناب فرماتے[5]۔ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخالفین کی اس بدگمانی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا کہ پیغمبر اسلام کی صدقہ وخیرات کی اس تاکید کا مقصود (نعوذ باللہ) اپنی اور اپنے خاندان کی دائمی پرورش کا سامان تھا۔

*

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصیام [2] صحیح بخاری ومسلم کتاب الزکوٰۃ [3] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ [4] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ [5] صحیح بخاری کتاب الہبۃ۔

خصائص نبوی ﷺ

دیگر انبیاء کے مقابلہ میں جس قدر خصائص آپ کو عطا ہوئے ہیں وہ متعدد معتبر حدیثوں میں مختلف تعداد میں نام بنام خود زبان اقدس سے ادا ہوئے ہیں، صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، مجھے رعب اور دھاک کے ذریعہ سے فتح و نصرت دی گئی، میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی، غنیمت کا مال میرے لئے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لئے حلال نہ تھا، مجھے شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا، مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور میں تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوا۔[1] صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی چھ باتیں گنائی ہیں، مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے، رعب و داب سے نصرت دی گئی، مال غنیمت میرے لئے حلال کیا گیا، تمام روئے زمین میرے لئے مسجد بنی، میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی انبیاء علیہما السلام کا سلسلہ میری ذات پر ختم ہوا۔[2]

احادیث کی دیگر روایتوں میں بعض اور خصائص بھی زبان اقدس سے بیان ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ میرا معجزہ وحی قیامت تک کے لئے ہے، میرے پیرو تمام انبیاء سے زیادہ ہیں، میری نبوت اولین ہے، مجھ کو فلاں فلاں سورتیں دی گئیں جو کسی اور کو نہیں ملیں، فلاں فلاں وقت کی نمازیں خاص میری امت کے لئے فرض ہوئیں مگر حقیقت میں ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو ان ہی چھ عنوانوں کے تحت میں کسی نہ کسی حیثیت سے درج ہیں، سورتوں کی خصوصیت جوامع الکلم میں داخل ہے، بعض نمازوں کے اوقات کا اضافہ ختم نبوت کے مدارج کے اندر ہے، قرآن مجید میں آپ کی دو خصوصیتیں مذکور ہوئی ہیں وہ ان سب کو جامع ہیں یعنی تکمیل دین اور ختم نبوت۔ بہرحال اجمال کو چھوڑ کر ذیل میں ہم کو نمایاں خصوصیات پر قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں ایک تفصیلی نظر ڈالنا ہے۔

رعب و نصرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء دنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے، یا وہ بظاہر کمزور اور بے یار و مددگار تھے اور ان کو دنیاوی طاقت کا کوئی حصہ عطا نہیں ہوا تھا، پیغمبروں کی بڑی تعداد ایسی ہی تھی، دوسرے وہ انبیاء ہیں جن کو دنیا کی ظاہری طاقت بھی ملی تھی اور وہ صرف چند ہیں، حضرت موسیٰ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، مگر ان میں سے کسی کو بھی نام نامی کے رعب اور ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا اور تاریخ اس بیان پر شاہد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز گو الوہی بیچارگی اور عیسوی غربت سے ہوا مگر انجام موسوی طاقت اور داؤدی سلطنت اور سلیمانی شان و شکوہ پر ہوا اور ان سب سے مافوق یہ تھا کہ آپ کی تمام

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلاۃ باب جعلت لی الارض کلہا مسجدا و کتاب التیمم و صحیح مسلم باب المساجد و نسائی باب التیمم۔ [2] صحیح مسلم باب المساجد، ترمذی کتاب السیر و نسائی۔

قوت، طاقت، رعب و ہیبت سب خدا کی راہ میں صرف ہوئی، اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا، بھولوں نے یاد کیا، سننے والوں نے آواز دی اور یہ اثر پیدا ہوا کہ آپ جس راستہ سے نکل جاتے گنہگار اور مجرم سر اطاعت خم کر دیتے اور اپنی سیہ کاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے تھے۔

متعدد حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھے فتح و نصرت، رعب و ہیبت کے ذریعہ بخشی گئی، یہاں تک کہ میری دھاک ایک مہینہ کی مسافت تک پر کام کرتی ہے[1]۔ علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں فنون جنگ پر بحث کرتے ہوئے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی ایک فریق کو جو فتح ہوتی ہے وہ اسی وقت ہوتی ہے جب دوسرے فریق پر پہلے کی تعداد اور مرعوبیت چھا جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو یہ شرف اس لئے عطا ہوا تاکہ مزید خونریزی کے بغیر ملک میں امن و امان اور سکون و اطمینان پیدا ہو جائے اور صداقت حق کے لئے راستہ صاف ہو، قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس وصف کے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (انفال)   عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈالوں گا۔

چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے شہادت دی۔

فَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الرُّعْبَ۔ (احزاب و حشر)   اور خدا نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

چنانچہ بڑے بڑے دل گردہ کے بہادر زہر میں بجھی تلواریں بجا بجا کر آئے مگر جب روئے روشن پر نظر پڑی کانپ کر رہ گئے، بڑے بڑے سرکش قبائل آپ کا نام سن کر دم بخود ہو جاتے تھے، مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرمانروائی کرتے تھے اور جن کو اپنی فوجی قوت اور جنگی سامانوں پر ناز تھا جب انھوں نے سرتابی کی، بے لڑے بھڑے آپ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی، خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے، جب ایک صبح کو ان کے قلعوں کے سامنے دفعۃً کوکبۂ اسلام طلوع ہوا تو ان کے منہ سے چیخ نکل گئی کہ محمد کا لشکر، ابو سفیان جو بارہا ایک فریق مقابل کی حیثیت سے میدان جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا، فتح مکہ کے دن جب حضرت عباسؓ اس کو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الٰہی کا نظارہ دکھا رہے تھے اور رنگ برنگ کے علم نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے تو ہر نئے دستہ اور ہر نئے علم کو دیکھ کر کانپ جاتا تھا، بایں ہمہ اس مجسمۂ ہیبت کا حال کیا تھا، ناآشنا ڈرتے تھے اور وہ ان کو تسکین دیتا تھا، بے خبر اس سے رعب کھاتے تھے، اور آگاہ، پروانہ تھے کہ۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ   محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی کافروں پر بھاری اور
عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَہُمْ۔   آپس میں رحم دل ہیں۔

ایک بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جیسے ہی چہرۂ مبارک پر نظر پڑی، کانپ گیا، فرمایا ڈرو نہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی[2] حضرت محمد

---

[1] صحیح بخاری و مسلم عن ابی ہریرہؓ و احمد و ابن ابی شیبہ و بیہقی و بزار عن علیؓ۔ [2] شمائل ترمذی۔

صحابی نے اپنے بیٹے اسود سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زنان خانہ میں ہیں، آپ کو آواز دو، وہ جھجکنے لگے باپ نے کہا جان پدر! محمد صلی اللہ علیہ وسلم جبار نہیں[1]، یہ ہیبت، یہ وقار، یہ دبدبہ، یہ رعب، تیغ وسنان کی چمک، فوج وعسکر کے تلاطم، جلادوں کی صف بندی اور تیغ بکف سپاہیوں کی نمائش سے نہیں پیدا ہوا بلکہ،

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست ۔ ہیبتِ ایں مردِ صاحب دلق نیست (رومی)

سجدہ گاہ عام اسلام کے علاوہ جس قدر مذاہب ہیں وہ اپنے مراسم عبادت کے ادا کرنے کے لئے چند گھری ہوئی چار دیواروں کے محتاج ہیں، گویا ان کا خدا ان ہی کے اندر بستا ہے، یہود اپنے صومعوں اور قربان گاہوں سے باہر نہ خدا کو پکار سکتے ہیں اور نہ قربانی کے نذرانے پیش کرسکتے ہیں، عیسائی اپنے کنیسوں کے بغیر خدا کے آگے نہیں جھک سکتے، یہاں تک کہ بت پرست قومیں بھی اپنے بت خانوں ہی کی چہار دیواروں کے اندر اپنے دیوتاؤں کو خوش کرسکتی ہیں، لیکن اسلام کے عالمگیر مذہب کا خدا اس آب وگل اور سنگ وخشت کی چہار دیواریوں میں محدود نہیں، وہ ہر جگہ ہے، اور ہر جگہ سے پکارا جاسکتا ہے، کوہ وصحرا، خشکی وتری، مسجد وکنشت[2] ہر جگہ اس کے سامنے سجدہ کیا جاسکتا ہے، وہ جس طرح مسجدوں کے اندر ہے مسجدوں کے باہر بھی ہے، اس کی قربانی مشرق ومغرب ہر جگہ گزرانی جاسکتی ہے۔

اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۔ جدھر منہ پھیرو، اُدھر ہی خدا کا منہ ہے۔ ع

ہر جا کنیم سجدہ بآں آستاں رسد

آپ نے فرمایا کہ میرے لئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔[3] یہ مسئلہ ہر چند ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے اندر وہ صداقت پنہاں ہے جو اسلام کی عالمگیری اور اس کے آخری مذہب ہونے کا اعلانِ عام کرتا ہے۔

پیرووں کی کثرت دنیا میں لاکھوں پیغمبر آئے، مگر آج دنیا میں ان کی تعلیم وہدایت کی ایک یادگار باقی نہیں یہاں تک کہ تاریخ کے اوراق میں بھی ان کا نام ونشان نہیں، وہ انبیاء جن کے صرف حالات معلوم ہیں، ان کی نسبت وہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنے والے چند سے آگے نہ بڑھ سکے حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ایک ایک پیغمبر کا کارنامہ دیکھ جاؤ، حضرت موسیٰؑ کے سوا ایک بھی ایسا نہ ملے گا جس کے ماننے والے سو بھی ہوں، حضرت موسیٰؑ کی کوششوں کے جولانگاہ صرف بنی اسرائیل کے چند ہزار نفوس تھے جو قدم قدم پر راہ حق سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں، کہیں گوسالے کو پوجتے ہیں، کہیں خدا کو ان آنکھوں سے دیکھنے پر اصرار کرتے ہیں، کہیں سرفروشی اور جانبازی سے گھبرا کر میدان جنگ میں جانے سے انکار کر بیٹھتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کے معجزانہ کارنامے صرف اسی قدر اثر دکھاتے ہیں کہ چند دہقانی انسان ان کی شیریں گفتاری کا دم بھرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ مرغ بانگ دے، ابن آدم کو دشمنوں کے پنجے میں اسیر کراتے ہیں اور تین دفعہ اس

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم صہ ۱۰۰۱۔ [2] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیع میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ان گرجاؤں میں جن میں تصویریں نہ ہوتیں نماز پڑھ لیتے۔ [3] صحیح بخاری ومسلم ونسائی وترمذی باب المساجد۔

کے پہچاننے سے منکر ہوتے ہیں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال ہے کہ مکہ کی گلیوں میں آپ نے تنِ تنہا بے یار و مددگار تلاشیانِ حق کو صدائے توحید دی، جواب میں ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی لیکن ۲۳ سال نہ گزرنے پائے تھے کہ ریگستانِ عرب کا ذرہ ذرہ لا الٰہ الا اللہ سے پُر شور ہو گیا اور جب آپ نے اسی مکہ کی سرزمین کے لئے حجۃ الوداع کا اعلان کیا تو کم و بیش ایک لاکھ جاں نثار و فدا کار دائیں بائیں کھڑے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا، جس قدر میری نبوت کی سچائی کا اعتراف کیا گیا کسی اور پیغمبر کی سچائی کا نہیں کیا گیا کہ بعض انبیاء ایسے بھی ہیں جن کو سچا کہنے والا ان کی امت میں صرف ایک ہی نکلا[1]۔

صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا، ایک دفعہ مجھ پر عالمِ مثال میں، قومیں پیش کی گئیں، بعض پیغمبر ایسے تھے کہ ان کے پیچھے صرف ایک ہی دو آدمی تھے، بعض تنہا ہی تھے اُن کے ساتھ کوئی بھی نہ تھا، اتنے میں ایک بڑی بھیڑ نظر آئی، خیال ہوا کہ یہ میری امت ہوگی، تو بتایا گیا کہ یہ موسیٰؑ اور ان کی قوم ہے، پھر کہا گیا کہ دوسرے کنارہ کی طرف دیکھو تو اتنا سوادِ اعظم نظر آیا کہ اس سے افق چھپ گیا، پھر کہا گیا اسی طرح ادھر دیکھو، بڑی تعداد کثیر دکھائی دی، کہا گیا کہ یہ سب تیری امت ہے[2]۔

دعوتِ عام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرووں اور حلقہ بگوشوں کی کثرت تعداد کا ایک اور سبب یہ ہے کہ آپ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے ان کی دعوت عام نہ تھی، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی گلہ بانی تک محدود رکھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت روئے زمین کی ہر قوم اور ہر جنس کی طرف ہوئی، کالے، گورے، رومی، حبشی، عرب، عجم، ترک، تاتار، چینی، ہندی، سب آپ میں برابر کے حق دار ہیں۔

قرآن نے کہا

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا)	اے محمد! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔
تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان)	بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندہ پر قرآن اتارا تاکہ وہ تمام دنیا کو ہشیار کرے

صحیحین میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے نبی خاص اپنی قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں[3]۔ اس معنی کی بکثرت روایتیں حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آئی ہیں، اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ، سب کے پیرووں کو اس کی زندگی میں خود اسی قوم و ملک کے اندر محدود پاؤ گے، لیکن آپ کے حلقہ بگوشوں میں خود آپ کی زندگی میں عرب کے علاوہ سلمان فارسیؓ، صہیب رومیؓ، بلال حبشیؓ سب کو پاؤ گے، سلاطین عالم کے نام آپ کا دعوت نامہ بھی اسی تعمیم دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔

جوامع الکلم دنیا میں جو آسمانی صحیفے اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں، مگر ان میں ایک کے سوا وصفِ جامعیت سے سب محروم ہیں، توراۃ اقوام کی تاریخ اور احکام و قوانین کا مجموعہ ہے، انجیل توحید

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔ [2] ایضاً و بخاری کتاب الطب و باب وفاۃ موسیٰ و کتاب الرقاق۔ [3] بخاری و مسلم کتاب المساجد۔

و رسالت کے سوا تمام دیگر ضروری عقائد سے اور رسم قربانی کے علاوہ تمام دیگر مسائل عبادات سے اور چند معمولی باتوں کو چھوڑ کر تمام دقائق اخلاق سے یکسر خالی ہیں، زبور صرف دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے، سفر ایوبؑ میں صرف عقیدۂ تقدیر و رضا کی تعلیم ہے، امثال سلیمان صرف مواعظ و حکم ہیں، دیگر انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفے صرف توبہ و ندامت پیشین گوئی اور ماتم ہیں، انجیل کا صحیفہ حضرت مسیحؑ کی سرگزشت اور تعلیمات اخلاقی کا مجموعہ ہے، لیکن محمد رسول اللہ کو جو صحیفہ ملا وہ جامع الکلم ہے یعنی وہ تمام باتوں کی جامع ہے، وہ توراۃ بھی ہے، زبور بھی اور انجیل بھی اور کچھ ان سے زیادہ بھی، اس لئے آپؐ نے اپنے خصائص میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے[1]، بیہقی میں حضرت واثلہؓ بن اسقع سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا مجھے توراۃ کی جگہ سبع طول (سات بڑی سورتیں)، اور زبور کی جگہ مئین (تقریباً سو آیتوں والی سورتیں) انجیل کے قائم مقام مثانی دی گئیں اور سور مفصلات[3] زیادہ ملیں، ابونعیم میں یہی روایت ان الفاظ میں ہے کہ مجھے مثانی توراۃ کی جگہ، مئین انجیل کی جگہ، حوامیم زبور کی جگہ اور مفصلات علاوہ بریں ملیں[4]۔

اس لئے قرآن مجید توراۃ، زبور اور انجیل کو جامع ہے اور ان کے سوا کچھ اور بھی ہے، وہ تاریخ اقوام بھی ہے، اخلاق و مواعظ بھی ہے، دعا و مناجات بھی ہے، اس میں دین کامل کے تمام عقائد ہیں، تمام مراسم عبادات ہیں، تمام معاملات کے احکام و قوانین ہیں، اس میں ایک مسلمان کی زندگی کے ہر دور اور ہر شعبہ کے لئے کامل ہدایات اور صحیح تعلیمات موجود ہیں، صرف توراۃ کے اسفار خمسہ یہود کی مذہبی زندگی کا کامل مجموعہ نہیں، صرف انجیل عیسائیوں کی مذہبی حیات کا سرمایہ نہیں، یہاں تک کہ ان کے عقائد و عبادات بھی ان کے صحیفوں کے رہین منت نہیں اور وہ ان کی صحیح تعلیم سے یکسر خاموش ہیں، لیکن اسلام قرآن سے باہر کچھ نہیں، باہر جو کچھ ہے (احادیث) اس کی عملی توضیح و تفسیر ہے، وہی تنہا مسلمانوں کی ہر ضرورت کا کفیل اور ہر سوال کا مجیب ہے اور اسی لئے اس کے پیرو کامل حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ (ہم کو خدا کی کتاب کافی ہے)[5] کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

قرآن جوامع الکلم ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کے اندر سینکڑوں لطائف ہیں، اس کے ایک ایک لفظ سے متکلمین اور فقہاء نے چند در چند مسائل نکالے ہیں اور صوفیا اور ارباب حال نے متعدد نکتے پیدا کئے ہیں، تاہم اس کی لطافتوں اور نزاکتوں کا خاتمہ نہیں ہوا اور اس کی جوامع الکلمی کا حصر نہ ہو سکا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاعتصام و باب التعبیر و مسلم کتاب المساجد۔ [2] بحوالہ خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۹۵۔ [3] سبع طوال مئین اور مفصلات، قرآن مجید کی کئی کئی سورتوں کے مختلف مجموعوں کے نام ہیں۔ [4] ابونعیم عن ابن عباس (بحوالہ خصائص سیوطی ج ۲ ص ۱۲۲) دوسری روایت کے الفاظ پہلے سے زیادہ قرین قیاس ہیں کیونکہ مثانی اور سبع طوال ہماری تحقیق میں ایک ہی ہیں اور پہلی روایت میں ان کو دو بتایا گیا ہے حالانکہ خود قرآن نے سبعا من المثانی (مثانی کی سات سورتیں) کہا ہے حوامیم وہ سورتیں ہیں جن کے شروع میں حم ہے سبعا من المثانی کی تفصیل میں روایات اور علماء کی تشریحات میں بہت سے اختلافات ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سبعا من المثانی سورہ فاتحہ کو کہا گیا ہے جس میں سات آیتیں ہیں، واللہ اعلم بالصواب

[5] صحیح بخاری ذکر مرض و وفات صلی اللہ علیہ وسلم و مسلم کتاب الوصیۃ۔

تکمیل دین اسلام کا صحیفہ جب ایسا جامع ہے تو یقیناً وہ دین بھی جس کو لے کر وہ آیا کامل ہوگا، قرآن مجید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب مسلمانوں کے اجتماع عظیم کے دن (حجۃ الوداع) یہ اعلان عام کیا۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ)

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور اسلام کو دین کی حیثیت سے میں نے تمہارے لئے پسند کیا۔

اسلام قرآن کے عقیدہ کے مطابق اس صحیح مذہب کا نام ہے جو اپنے اپنے وقت میں ہر پیغمبر کو عطا ہوا اور وہ عہد بعہد دنیا کی عمر کے ساتھ مختلف پیغمبروں کے ہاتھوں سے تکمیل کو پہنچتا رہا، یہاں تک کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کی تکمیل پر وہ اپنے معراج کمال کو پہنچ کر تمام ہوگیا اور یہ منصب خاص صرف آپ کی ذات پاک کے لئے روز ازل سے مقدر ہو چکا تھا، آپ نے فرمایا انا خاتم النبیین وآدم منجدل فی طینتہ میں پیغمبر آخر تھا اور آدم ابھی آب وگل میں پڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بلیغ تمثیل میں اسلام کی تکمیل دین کی تشریح فرمائی ہے۔[1] فرمایا میری اور دوسرے انبیاء کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی، لوگ اس کے اندر جاتے ہیں اور اس کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، لیکن دیکھتے ہیں کہ اس کی ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے تو میں وہ آخری اینٹ ہوں، عمارت دین ونبوت ہے، اس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک پیغمبر کا وجود اور اس کا دین وشریعت ہے اور اس کی تکمیل کا آخری پتھر نبی اُمی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود اقدس ہے۔

دائمی معجزہ وہ دین جو مختلف انبیاء علیہم السلام کی وساطتوں سے دنیا میں آتا رہا، چونکہ وہ محدود زمانوں کے لئے آیا کیا، اس لئے ان کے معجزے بھی محدود الوقت تھے، یعنی ایک خاص وقت میں پیدا ہوتے اور مٹ گئے، اب عصائے موسیٰؑ، لحن داؤدؑ، تعبیر یوسفؑ، ناقۂ صالحؑ، نفس عیسیٰؑ کا کہاں پتہ ہے؟ لیکن جو دین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آیا کامل تھا اور قیامت تک کے لئے آیا تھا، بنا بریں اس کے لئے ایک دائمی اور مستقل معجزہ کی ضرورت تھی اور وہ خود صحیفۂ اسلام ہے، صحیحین میں ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہر نبی کو وہ معجزہ ملا جس پر اس کی امت ایمان لائی، لیکن جو مجھے ملا وہ وحی ہے جو خدا نے بھیجی تو مجھے امید ہے کہ میرے پیرو تمام انبیاء سے زیادہ ہوں گے۔[2] یہ خیال مبارک اسی لئے تھا کہ آپ کا معجزہ وحی قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے اس کو دیکھنے والے اور اس پر ایمان لانے والے سب سے زیادہ ہوں گے، دوسرے انبیاء علیہم السلام کے صحیفے، بجائے خود معجزہ نہ تھے اسی لئے وہ تحریف وتغیر سے پاک نہیں رہے اور قرآن دین کا کامل صحیفہ خاتم الانبیاء کی وحی اور دائمی معجزہ بن کر آیا، اسی لئے وہ ہمیشہ کے لئے اپنی حفاظت کا سامان اپنے ساتھ لایا (وَاِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ) (حجر) اور ہم ہی اس کے محافظ۔

ختم نبوت یہ رعب ونصرت، یہ پیرووں کی کثرت، یہ سجدہ گاہ عام، یہ اعجاز دوام، یہ جوامع الکلم، یہ دعوت عمومی، یہ تکمیل دین، یہ آیات مبین خود اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ کے وجود اقدس پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں

---

[1] بخاری ومسلم وترمذی باب خاتم النبیین۔

[2] صحیح بخاری کتاب الاعتصام وصحیح مسلم کتاب الایمان۔

کا خاتمہ ہوگیا اور نبوت اور رسالت کا سلسلہ منتہی ہوگیا اور اب دنیا کسی نئے آنے والے وجود سے مستغنی ہوگئی اسی لئے قرآن پاک نے عہدِ نبوت کے سب سے بڑے مجمع میں یہ اعلان عام کیا کہ:-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ)	آج میں نے تمہارا دین کامل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمہارے لئے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا۔

یہ آیت جو ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو نازل ہوئی اس بات کی بشارت تھی کہ نبوت جس کا مقصد دین کی عمارت میں کسی نہ کسی اینٹ کا اضافہ تھا، وہ آج تکمیل کو پہنچ گئی، لیکن اس سے پہلے سنہ ۵ھ میں بھی یہ بشارت ان الفاظ میں گوش گزار ہو چکی تھی۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (احزاب)	محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن خدا کے پیغمبر اور تمام نبیوں کے خاتم ہیں۔

ختم کے لغوی معنی کسی چیز کو اس طرح بند کرنے کے ہیں کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے۔[1] اسی سے اس کے دوسرے معنی کسی شے کو بند کرکے اس پر مہر کرنے کے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلتی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے اور چونکہ یہ عمل مہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے، اس کے معنی انتہا اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، قرآن مجید میں یہ معنی مستعمل ہوئے ہیں مثلاً

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ۔	آج (قیامت کے دن) ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے (یعنی بند کردیں گے، کہ بول نہ سکیں۔

یہاں ختم کے معنی "بند کردینے" کے بالکل ظاہر ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ (بقرہ)	خدا نے ان (کافروں) کے دلوں پر مہر لگادی ہے (یعنی ان کے دلوں کے دروازے بند کردیئے)

کہ باہر سے جو نصیحت اور ہدایت کی باتیں وہ سنتے ہیں، وہ ان کے دلوں کے اندر نہیں گھستیں اور بے اثر رہتی ہیں۔

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ۔ (جاثیہ)	اور خدا نے اس کے کان پر اور دل پر مہر لگادی (یعنی اس کے کان اور دل بند کردیئے۔

کہ اس کے کان کے اندر دعوتِ رسول کی آواز اور اس کے دل کے اندر اس آواز کا اثر نہیں جاتا۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ (مطففین)	اہل جنت پلائے جائیں گے وہ شراب جس پر مہر لگی ہوگی۔

وہ سربمہر یعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگی کہ یہ خالص شراب ہے، یہ کھلی نہیں کہ اس کے اندر کی خوشبو باہر نکل گئی ہو اور نہ اس کے باہر سے کوئی چیز کسی نے ملادی ہے جس سے اس کی تیزی کم ہوگئی ہے، اسی

---

[1] دیکھو لسان العرب وصحاح جوہری و اساس البلاغۃ زمخشری۔

کے بعد یہ آیت ہے۔

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ (مطففین) اس کی مہر مشک ہوگی (یا) اس شراب کا آخر مشک ہوگا۔

یعنی اس کے ہر گھونٹ کے پینے کے بعد مشک کی بو اس میں سے نکلے گی یا یہ معنی کہ بوتل یا صراحی کا منہ غایت صفائی اور نزاہت کی غرض سے دنیا کی طرح مٹی، لاکھ یا موم کے بجائے مشک خالص سے بند ہوگا۔

بہر حال ان تمام استعمالات سے یہ بالیقین معلوم ہوگا کہ اس لفظ کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں۔ لفظ خاتم کی دو قرأتیں ہیں، مشہور قرأت تو خاتِم (بکسرتا) کی ہے جس کے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہوتے، اور دوسری قرأت خاتَم کی ہے جس کے معنی ہیں وہ شے جس کے ذریعہ سے کوئی شے بند کی جائے اور اس پر مہر لگائی جائے تاکہ وہ کھولی نہ جاسکے اور نہ اس کے اندر کوئی چیز باہر سے جاسکے۔ الغرض دونوں حالتوں میں آیت پاک کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا کہ آپ کا وجود پیغمبروں کے سلسلہ کو بند کرنے والا اور ان پر مہر لگا دینے والا ہے کہ پھر آئندہ کوئی نیا شخص اس جماعت میں داخل نہ ہو سکے۔

آیت پاک کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے وہ ظاہری باپ نہیں ہیں جس کے رشتہ کی بنا پر وراثت اور حرمت نکاح وغیرہ کے احکام جاری ہوتے ہیں، بلکہ وہ روحانی باپ (رسول اللہ) اور سب سے آخری روحانی باپ (خاتم النبیین) ہیں، اس لئے باپ ہونے کے ظاہری احکام کے بغیر آپ سے وہی پدرانہ محبت رکھنی چاہیے اور اسی طرح آپ کی پدرانہ اطاعت کرنی چاہیے۔

احادیث صحیحہ میں لفظ خاتم النبیین کی تشریح بالکل صاف اور واضح ہے۔ مسند احمد میں حضرت ثوبانؓ اور حضرت حذیفہؓ اور ترمذی میں صرف حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے بعد تیس کے قریب جھوٹے نبی پیدا ہوں گے۔

وانی خاتم النبیین لا نبی بعدی۔ بتحقیق میں نبیوں کا خاتم ہوں میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

لا نبی بعدی خاتم النبیین کی تفسیر و تشریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاتم النبیین کے یہی معنی ہیں کہ آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ نے تکمیل دین اور ختم نبوت کی جو مشہور تمثیل بیان کی ہے کہ جس کو ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں اس سے بھی لفظ خاتم النبیین کی پوری تفسیر ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میری اور دیگر انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی عمدہ محل بنوایا ہو، لوگ اس کو آ آکر دیکھتے ہیں اور اس کی عمدگی اور اس کی خوبصورتی پر عش عش کرتے ہیں، لیکن اس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے تو کہتے ہیں کہ اگر یہ اتنا ناتمام رہ جاتا تو خوب ہوتا۔ اس کے بعد مختلف روایتوں میں حسب ذیل الفاظ ہیں۔

فانا تلک اللبنۃ تو میں وہی آخری اینٹ ہوں۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری و تفسیر ابن حیان اندلسی بتفسیر آیت مذکور [2] جلد ۵ صفحہ ۲۷۸ [3] جلد ۵ صفحہ ۳۹۶ اس روایت میں ۲۷ عدد مذکور ہے جن میں چار عورتیں ہوں گی [4] کتاب الفتن حدیث حسن صحیح [5] بخاری و مسلم باب خاتم النبیین۔

فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین[1]۔	تو میں وہی آخری اینٹ ہوں اور سب پیغمبروں کا خاتم ہوں۔
فانا موضع اللبنۃ جئت فختمت الانبیاء[2]۔	تو اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں، میں آیا تو پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا۔
وانا فی النبیین موضع تلک اللبنۃ[3]۔	میں پیغمبروں میں اسی آخری اینٹ کی جگہ ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر انبیاء کے مقابلہ میں اپنے جو مخصوص فضائل گناتے ہیں، ان میں ایک ختم نبوت بھی ہے، چنانچہ صحیح مسلم (کتاب المساجد)، ترمذی کتاب السیر باب الغنیمہ، اور نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔

وختم بی النبیون۔	اور انبیاء مجھ سے ختم کئے گئے۔

سنن دارمی میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

وانا خاتم النبیین ولا فخر (باب ما اکرم اللہ نبیہ علیہ)	اور پیغمبروں کا خاتم ہوں اور اس پر فخر نہیں۔

آپ کا خاتم نبوت ہونا کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا، بلکہ یہ آپ کی وہ خصوصیت تھی جو آپ کے لئے روز اول سے مقرر ہو چکی تھی، آپ نے ارشاد فرمایا۔

انی عبد اللہ خاتم النبیین وان آدم لمنجدل فی طینتہ۔	میں خدا کا بندہ اور خاتم انبیاء تھا اور آدم ہنوز اپنے خمیر خاک میں پڑے تھے۔

حضرت علیؓ کو جب آپ نے اہل بیت کی نگرانی کے لئے مدینہ چھوڑ کر تبوک جانا چاہا اور حضرت علیؓ نے ہمرکاب نہ ہونے پر ملال خاطر ظاہر کیا تو آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا۔

الا ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسی الا انہ لیس نبی بعدی (صحیح بخاری غزوہ تبوک)	کیا تم اس پر خوش نہیں کہ تم میں اور مجھ میں وہ نسبت ہو جو ہارون اور موسیٰ میں تھی، لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

صحیح مسلم (مناقب علی) میں یہ الفاظ ہیں۔

غیر انہ لا نبی بعدی۔	لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔
الا انہ لا نبوۃ بعدی۔	لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبوت نہیں۔

صحیح بخاری (کتاب الانبیاء) اور صحیح مسلم (کتاب الامارۃ) میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ بنو اسرائیل کی نگرانی اور سیاست انبیاء کرتے تھے، ایک نبی جب مرتا تھا تو دوسرا نبی پیدا ہوتا تھا۔

وانہ لا نبی بعدی۔	اور بہ تحقیق میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

---

[1] بخاری باب خاتم النبیین و صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ وعن ابی سعید خدریؓ باب خاتم النبیین [2] صحیح مسلم باب مذکور عن جابرؓ [3] باب فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ترمذی عن ابی بن کعبؓ [4] یہ حدیث حسب ذیل کتابوں میں ہے، مستدرک حاکم تفسیر سورۂ احزاب ج۲ ص۶۰۹، حاکم اور ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے، تاریخ امام بخاری بحوالہ فتح الباری ج۶ ص۴۰۹ و حلیۃ الاولیاء ابی نعیم و شعب الایمان بیہقی (بحوالہ کنز العمال ج۶ ص۱۱۲ حیدرآباد) و مسند احمد ج۴ ص۱۲۷، ۱۲۸۔

جامع ترمذی[1] اور مستدرک حاکم[2] میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کی مدح میں فرمایا۔

لو کان نبی بعدی لکان عمر بن الخطاب۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو وہ خطاب کے بیٹے عمر ہوتے۔

عربی جاننے والے کو معلوم ہے کہ "لو" امر محال کے لئے آتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کا آنا محال ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے پانچ نام ہیں، میں محمدؐ ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ خدا میرے ذریعہ سے کفر کو محو کرے گا، میں حاشر ہوں کہ خدا میرے پیچھے سب کو جمع کرے گا اور میں عاقب (آخری) ہوں الذی لیس بعدہ نبی جس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا[3] جامع ترمذی اور بعض دوسری کتابوں میں آخری فقرہ ان الفاظ میں ہے، الذی لیس بعدی نبی یعنی میں وہ عاقب ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔[4]

صحیح بخاری میں آپ کا ارشاد ہے کہ خوشخبریوں کے سوا نبوت کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! خوشخبریاں کیا ہیں؟ فرمایا، رویائے صالحہ[5] (یعنی سچے خواب) پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو اپنے امور غیب سے مطلع کرنے کے متعدد ذرائع مقرر کئے ہیں، منجملہ ان کے ایک رویائے صالحہ بھی ہے، اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزو مومن کا رویائے صالحہ ہے،[6] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے قوموں میں محدثین (بات کئے گئے) ہوا کرتے تھے، اگر میری امت میں کوئی محدث ہوگا تو وہ عمرؓ ہیں[7] ائمہ حدیث نے محدث کے معنی مُلْہَم کے لکھے ہیں۔

غرض ختم نبوت کے بعد اب جو نعمت اہل ایمان کے لئے باقی رہ گئی ہے وہ صرف دو ہیں، رویائے صالحہ اور الہام، لیکن چونکہ نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں اور نہ اس کی سچائی کی کوئی قطعی شہادت موجود ہے اس لئے کسی مومن کے رویائے صالحہ اور الہامات کسی دوسرے شخص پر بلکہ خود اس پر بھی حجت نہیں اور ان کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل کرنا اور ان کی اطاعت و پیروی کرنا اور ان کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اور ان کی صداقت پر تحدی کرنا ضلالت و گمراہی ہے، ان رویائے صالحہ اور الہامات کے ذریعہ سے جو چیز مومن کو دی جاتی ہے وہ احکام نہیں ہوتے بلکہ صرف خوشخبریاں ہوتی ہیں، یعنی امر غیب اور مستقبل کے کچھ اطلاعات اور مناظر۔

مسند ابن حنبل میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے مرض الموت میں حجرۂ مبارک کا پردہ اٹھایا حضرت ابوبکرؓ امام تھے اور صحابہ کرام صف بستہ پیچھے، اس وقت یہ آخری اعلان فرمایا۔

---

[1] مناقب عمر، حدیث غریب حسن [2] مناقب عمر ج ۳ ص ۸۵ حیدرآباد، حدیث صحیح، بشرط الذہبی [3] صحیح بخاری وصحیح مسلم باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحیح بخاری میں عاقب کی تفسیر مذکور نہیں، مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۸۱ میں یہ حدیث اور عاقب کی یہ تفسیر امام زہری سے مذکور ہے [4] فتح الباری شرح بخاری ج ۲ ص ۳۰۰ [5] صحیح بخاری کتاب التعبیر [6] صحیح بخاری کتاب التعبیر و صحیح مسلم کتاب الرویا و مسند ابن حنبل ج ۳ ص ۱۲۹ عن انس [7] بخاری و مسلم و ترمذی، مناقب عمرؓ

یایھا الناس لم یبق من مبشرات النبوۃ الا الرؤیا الصالحۃ یراھا المسلم او ترٰی لہٗ

اے لوگو! نبوت کی خوشخبریوں (یعنی ذرائع علم و خبر) میں سے اب کوئی چیز باقی نہیں رہی لیکن ایک رؤیائے صالح جو مسلمان اپنے متعلق آپ دیکھے یا کوئی دوسرا اس کے متعلق دیکھے۔

لہ ر ۱۲۰ ص ۲۱۹)

اس سے صاف ہو گیا کہ رؤیائے صالحہ شخصی احوال و مناظر سے متعلق ہے، اسی کتاب میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہمارے مقصد کے اثبات کے لیے اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح ہے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک دن مجلس نبوی میں خدام حاضر تھے، آپ نے فرمایا۔

ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی۔

رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو میرے بعد نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

صحابہ پر یہ بات سخت گزری تو آپ نے فرمایا ولکن المبشرات، لیکن خوشخبریاں باقی ہیں، لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ! خوشخبریاں کیا ہیں؟ فرمایا، مرد مومن کی رؤیائے صالح وہ نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

یہ تمام حدیثیں حقیقت میں جیسا کہ ترمذی و حاکم میں ہے، اس آیت کی تفسیر ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔

ان اولیائے الٰہی کو کوئی خوف اور غم نہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ کرتے تھے ان کو دنیا اور آخرت میں بشارت ہے۔

صحابہ نے پوچھا کہ دنیا میں اُن کے لئے بشارت کیا ہے؟ فرمایا، رؤیائے صالحہ! اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ ان مبشرات کے حصول کا ذریعہ ایمان اور تقویٰ کی تکمیل ہے، اور دوسری یہ کہ ایسے لوگوں کا نام جن کو یہ مرتبہ حاصل ہوا، اولیاء اللہ ہے اور اس لئے ان کے اس رتبہ کا نام ولایت ہوگا، اس کو جزئی نبوت لغوی نبوت، مجازی نبوت، نبوتِ ناقصہ، وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرنا ایسی لفظی گمراہی ہے جو معنوی گمراہی کی طرف مفضی ہے اور اس سے شرک فی النبوۃ کی اسی طرح برائیاں پیدا ہوں گی بلکہ ہوئیں اور ہو رہی ہیں، جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو مجازی معنوں میں ابن اللہ کہہ کر حقیقی معنوں میں عیسائی شرک فی التوحید میں مبتلا ہو گئے، کیونکہ ہر قسم کی نبوتوں کا خاتمہ ہو چکا، دین کی تکمیل ہو چکی، دنیا میں خدا کا آخری پیغام دعوتِ محمدیؐ کے ذریعہ سامعہ نواز ہو چکا معمارِ قدرت اپنی عمارت میں اس آخری پتھر کو اپنی جگہ پر رکھ کر اپنی تعمیر پوری کر چکا اور درجہ بدرجہ ستاروں کے طلوع کے بعد وہ خورشیدِ انور طالع ہوا جس کے لئے غروب نہیں، طرح طرح کی بہاروں کے آنے کے بعد باغِ کائنات میں وہ سدا بہار موسم آگیا جس کے بعد خزاں نہیں۔

شفاعتِ اولین

عرصۂ دار وگیر محشر میں جب جلالِ الٰہی کا آفتاب پوری تمازت پر ہوگا اور گنہگار انسانوں کو امن کا کوئی سایہ نہیں ملے گا، اس وقت سب سے پہلے فخرِ موجودات، باعثِ خلقِ کائنات، سید اولادِ آدمؑ، خاتم الانبیاء، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں میں لوائے حمد لے کر اور فرقِ مبارک پر تاجِ شفاعت

لہ مسند ابن حنبل عن انس جلد ۳ و ترمذی کتاب الرؤیا ۲ؔ تفسیر سورۂ یونس و کتاب الرؤیا و مستدرک حاکم تفسیر یونس دیکھو۔

نکل کر گناہگاروں کی دستگیری فرمائیں گے۔

لفظ "شفاعت" اصل لغت میں شفع سے نکلا ہے، جس کے معنی جوڑا بننے، ایک کے ساتھ دوسرے کے ہونے کے ہیں، چونکہ شفاعت اصل میں یہی ہے کہ کسی درخواست کنندہ اور عریضہ گزار کے ہم آہنگ ہو کر کسی بڑے کے سامنے اس کی عرض و درخواست کو قبول کر لینے کی خواہش کا اظہار کرنا۔ آپ کی شفاعت یہی ہوگی کہ آپ گناہگاروں کی زبان بن کر ان کی طرف سے خداوند ذوالجلال کے اذن سے اس کے سامنے ان کی بخشائش و مغفرت کی درخواست پیش کریں گے، سورۂ اسراء میں ہے۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔ قریب ہے کہ خدا تجھے مقام محمود میں اٹھائے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں تمام صحیح روایتوں میں متعدد صحابہ کبارؓ سے منقول ہے کہ مقام محمود سے مراد رتبۂ شفاعت ہے۔[1] صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انسؓ نے شفاعت کے تمام واقعات بیان کر کے یہ آیت بالا تلاوت کی، پھر حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا، یہی وہ مقام محمود ہے جس کا تمہارے پیغمبر سے وعدہ کیا گیا ہے۔[2] صحیح مسلم میں ہے کہ بصرہ کے کچھ خارج جو گناہ کبیرہ کے مرتکب کو دائمی جہنمی سمجھتے ہیں یعنی ان کے حق میں شفاعت کے اثر کے قائل نہیں، مدینہ منورہ آئے، یہاں مسجد نبویؐ میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی قیامت کے واقعات بیان کر رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب نے بڑھ کر کہا۔ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی! آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟ خدا تو قرآن میں یہ کہہ رہا ہے، یہ کہہ کر قرآن پاک کی ایک آیت پڑھی، جس کا یہ مطلب ہے کہ دوزخی جب دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں ڈال دیے جائیں گے، كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا۔ حضرت جابرؓ نے پوچھا، تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے جواب دیا، ہاں۔ فرمایا، تم نے اس مقام محمود کا حال سنا ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمہارے پیغمبر کو مبعوث کرے گا؟ اس نے کہا، ہاں سنا ہے۔ فرمایا، تو یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام محمود ہے، جس کے ذریعہ سے خدا دوزخ سے جس کو نکالنا چاہے گا نکالے گا۔ یہ سن کر ایک کے سوا باقی سب اپنے اپنے عقیدۂ باطل سے تائب ہو گئے اور بولے کہ کیا یہ بڈھا صحابی رسول پر جھوٹ بولے گا۔[3]

بخاری میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز ہر امت اپنے اپنے پیغمبر کے پیچھے چلے گی اور کہے گی کہ اے وہ   ! خدا کی درگاہ میں ہماری شفاعت کیجئے۔ یہاں تک کہ شفاعت کا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا، یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود میں اٹھائے گا۔[4] جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص اذان سن کر یہ دعا مانگے کہ اے خدا جو پوری دعا اور کھڑی ہونے والی نماز کا مالک ہے، محمدؐ کو وسیلہ اور فضیلت اور وہ مقام محمود عطا فرما جس کا تو نے وعدہ فرمایا تو قیامت کے دن

---

[1] صحیح بخاری و جامع ترمذی و مستدرک تفسیر آیت مذکورہ و صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ۔ [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ ص ۱۱۰۸۔ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ۔ [4] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور۔

اس کے لیے میری شفاعت اترے گی۔[1] آپؐ نے فرمایا کہ ہر نبی کو کوئی نہ کوئی مستجاب دعا دی گئی، میں نے اپنی اس دعا کو اپنی امت کے لئے چھپا رکھا ہے۔[2] پھر فرمایا ہے کہ مجھ کو دیگر انبیاء پر چند فضیلتیں عطا ہوئیں ان میں سے ایک یہ کہ مجھے شفاعت عطا کی گئی۔[3] (یعنی شفاعت اولین) موطا امام مالک۔ اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے متعدد تابعیوں نے یہ متفقہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہر نبی کو ایک مقبول دعا مانگنے کا موقع عطا کیا گیا تو انہوں نے وہ دعا مانگ لی اور وہ قبول کرلی گئی لیکن میں نے اپنی دعا کا یہ موقع قیامت کے دن کے لئے چھپا رکھا ہے اور وہ اپنی امت کی شفاعت ہے۔[4] فرمایا کہ میں سب سے پہلا شفیع ہوں گا اور سب سے پہلا وہ شخص جس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔[5] اور فرمایا کہ میں پہلا ہوں گا جو جنت کی شفاعت کرے گا۔[6]

اس دن جب دنیا کی گناہ گاریاں اپنی عریاں صورت میں نظر آئیں گی اور آدم کی اولاد ترساں و لرزاں کسی شفیع کی تلاش میں ہوگی، کبھی آدم علیہ السلام کا سہارا ڈھونڈے گی، کبھی نوحؑ و ابراہیمؑ کو یاد کرے گی کبھی موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی طرف بے تابانہ لپکے گی، مگر ہر جگہ نفسی نفسی کی آواز بلند ہوگی، بالآخر شفیع المذنبین سید الاولین والآخرین آگے بڑھیں گے اور تسکین کا پیام سنائیں گے۔

حدیث کی اکثر کتابوں میں خصوصاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت حذیفہؓ سے متعدد طریقوں سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ قیامت کے ہولناک میدان میں لوگوں کو ایک شفیع کی تلاش ہوگی، لوگ پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے اور کہیں گے کہ آپ ہمارے باپ ہیں، خدا نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور آپ میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو آپ کے سجدہ کا حکم دیا، آپؑ خدا کے حضور میں ہماری سفارش کیجئے؟ وہ جواب دیں گے کہ میرا یہ رتبہ نہیں، میں نے خدا کی نافرمانی کی تھی، آج خدا کا وہ غضب ہے جو کبھی نہ ہوا تھا، اور نہ ہوگا۔ نفسی، نفسی (اے میری جان! اے میری جان) لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ روئے زمین کے پہلے پیغمبر ہیں، خدا نے آپ کو شکر گزار بندہ کا خطاب دیا ہے آج خدا کے حضور ہماری سفارش کیجئے، وہ کہیں گے ہمارا یہ رتبہ نہیں، آج خدا کا وہ غضب ہے جو نہ کبھی ہوا تھا اور نہ کبھی ہوگا، مجھ کو ایک مستجاب دعا کا موقع عنایت ہوا تھا وہ اپنی قوم کی تباہی کے لئے مانگ چکا۔ نفسی نفسی، تم ابراہیمؑ کے پاس جاؤ۔ مخلوق ان کے پاس جائے گی اور اپنی وہی درخواست پیش کرے گی کہ آپ تمام انسانوں میں خدا کے دوست ہوئے، اپنے پروردگار سے شفاعت کیجئے، وہ بھی کہیں گے، میرا یہ رتبہ نہیں، آج خدا کا وہ غضب ہے جو نہ کبھی ہوا اور نہ کبھی ہوگا، نفسی! نفسی! تم موسیٰؑ کے پاس جاؤ۔ لوگ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ اے موسیٰؑ! آپ خدا کے پیغمبر ہیں، خدا نے اپنے پیام و کلام سے آپؑ کو لوگوں پر برتری بخشی ہے

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آیت مذکور و باب الدعاء عند النداء۔ [2] صحیح بخاری کتاب التوحید و کتاب الدعوات و صحیح مسلم باب الشفاعۃ [3] صحیح بخاری و مسلم کتاب المساجد۔ [4] صحیح بخاری کتاب التوحید و کتاب الدعوات و صحیح مسلم باب الشفاعۃ۔ [5] صحیح مسلم کتاب فضائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ۔ [6] صحیح مسلم کتاب الایمان باب الشفاعۃ۔

اپنے خدا سے ہمارے لئے سفارش کیجئے، کیا آپ ہماری مصیبتوں کو نہیں دیکھتے! حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن سے کہیں گے کہ آج خدا کا وہ غضب ہے جو کبھی نہیں ہوا اور نہ ہوگا، میں نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا، نفسی نفسی! تم لوگ عیسیٰؑ کے پاس جاؤ، حضرت عیسیٰؑ کے پاس لوگ جا کر کہیں گے کہ اے عیسیٰ! آپ خدا کے وہ رسول ہیں جس نے گہوارہ میں کلام کیا اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں، اپنے پروردگار سے ہماری سفارش کیجئے، وہ بھی کہیں گے یہ میرا رتبہ نہیں، آج خدا کا وہ غضب ہے کہ جو نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا نفسی نفسی! تم محمدؐ کے پاس جاؤ، مخلوق آپؐ کے پاس آئے گی اور کہے گی۔ اے محمدؐ! آپ خدا کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور وہ ہیں جس کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہیں آپ اپنے پروردگار سے ہماری شفاعت کیجئے۔ آپ اٹھ کر عرش کے پاس آئیں گے اور اذن طلب کریں گے، اذن ہوگا تو سجدہ میں گر پڑیں گے آپ کے سامنے وہ کچھ کھول دیا جائے گا جو کسی اور کے لئے نہیں کھولا گیا، اللہ تعالیٰ اپنے محامد اور تعریفوں کے وہ معنی اور وہ الفاظ آپؐ کے دل میں القا فرمائے گا جو اس سے پہلے کسی کو القا نہ ہوئے، آپ دیر تک سربسجود رہیں گے، پھر آواز آئے گی، اے محمدؐ! سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا، مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول کی جائے گی، عرض کریں گے الٰہی! امتی امتی! خداوندا میری امت میری امت! حکم ہوگا، جاؤ جس کے دل میں جَو کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوگا اس کو نجات ہے۔ آپؐ خوش خوش جائیں گے اور اس کی تعمیل کر کے اور پھر حمد و ثنا کر کے عرض پرداز ہوں گے اور سجدہ میں گر پڑیں گے، پھر صدائے غیب آئے گی کہ اے محمدؐ! سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا، مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو قبول ہوگی۔ عرض کریں گے الٰہی امتی امتی: حکم ہوگا جاؤ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو وہ بخشا گیا۔ حضورؐ جائیں گے اور پھر واپس آ کر عرض گزار ہوں گے، حمد و ثنا کریں گے اور سر بسجود ہوں گے، آواز آئے گی، جاؤ جس کے دل میں چھوٹی سے چھوٹی رائی کے برابر ایمان ہو، اس کو بھی دوزخ سے نکالوں گا، آپؐ پھر جا کر واپس آئیں گے اور گزارش کریں گے اور حمد و ثنا کر کے سجدہ میں گر پڑیں گے۔ پھر ندا آئے گی، اے محمدؐ! سر اٹھاؤ، کہو سنا جائے گا مانگو دیا جائے گا، شفاعت کرو، قبول ہوگی، عرض کریں گے جس نے بھی تیری یکتائی کی گواہی دی ہو اس کی شفاعت کا اذن عطا ہو۔ صدا آئے گی، اس کا اختیار تم کو نہیں، لیکن مجھے اپنی عزت و کبریائی اور اپنی عظمت و جبروت کی قسم ہے میں دوزخ سے ہر اس شخص کو نکالوں گا جس نے مجھے ایک کہا اور اپنے لئے دوسرا معبود نہیں بنایا، من قال لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔[1]

کمزور انسانوں کو تسکین کا یہ پیام محمد رسول اللہ کے سوا کس نے سُنایا۔

فضائل اخروی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ وہ خصائص تھے جو آپؐ کو پیغمبر، مبلغ دین، صاحب مذہب اور پیشوائے امت ہونے کی حیثیت سے عطا ہوتے تھے، علاوہ بریں آپؐ کو آخرت کی دنیا

---

[1] یہ پوری حدیث صحیح بخاری باب تفسیر بنی اسرائیل کتاب الانبیاء ذکر نوح و صحیح مسلم باب الشفاعۃ میں مختلف صحابیوں سے تھوڑے تھوڑے الفاظ کے تغیر سے مروی ہے ہم نے سب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں بھی مزید فضائل عنایت ہوئے ہیں، چنانچہ آپ نے فرمایا، قیامت میں، میں پیغمبروں کا نمائندہ، امام اور ان کی شفاعت کا پیروکار ہوں گا اور اس پر فخر نہیں[1] پھر فرمایا ہے، میں قیامت کے دن تمام بنی آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں، اور میرے ہی ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا اور اس پر فخر نہیں، اور قیامت کے دن آدم[2] وغیرہ تمام پیغمبر میرے عَلَم کے نیچے ہوں گے اور اس پر فخر نہیں، اور سب سے پہلے میں ہی قبر سے باہر آؤں گا[3] نیز ارشاد ہے، لوگ قبروں سے جب اٹھائے جائیں گے تو سب سے پہلا اٹھنے والا میں ہوں گا، جب وہ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے، تو اُن کی طرف سے بولنے والا میں ہوں گا، جب وہ ناامید ہوں گے تو ان کو خوشخبری سنانے والا میں ہوں گا، اس دن خدا کی حمد کا عَلَم میرے ہاتھ میں ہوگا[4]۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّسَلَّمَ۔

تمت الجزء الثالث من السيرة النبوية
على صاحبها الصلوة والتحية!

بکم جمادی الاولیٰ ۱۳۴۲ھ
سید سلیمان ندوی

اعتنى بتصحيحه وسعى فى تنقيحه محمد محى الدين السّنوالى فاضل دارالعلوم ديوبند

---

[1] ترمذی مناقب نبوی، حدیث حسن صحیح غریب [2] حوالہ مذکور حدیث حسن [3] حوالہ مذکور حدیث حسن غریب۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

منصبِ نبوت

کتاب کا موضوع۔ آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں نبی بعثت کا مقصود بالذات نہ تھیں، بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا، اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی، اور چاہا کہ اس جماعت کو بزور شمشیر مٹا دیں، اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو مسلسل دس سال تک قائم رہا، رفتہ رفتہ اعجاز نبوت حسن تدبیر لطف اخلاق سے تمام معرکے سر ہوتے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا، یہ فتحیہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گو نہایت عجیب حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے، تاہم وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی براہِ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں، دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے، آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ کی سیرت مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں، یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا تمام عالم کے سامنے کامل پیغام اور آخر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرود وحدت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سرِ نو آبادی، الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعتِ ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح، فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیبِ نفوس کی معراج اخیر تھی۔ اور یہ سب اسی پُرآشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باران کے روکنے میں صرف ہو گئے، پیش نظر جلد آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کے ان ہی خدمات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

ی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جد و جہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعر مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں، جن کو حکیم کہتے ہیں، اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے، اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے، نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[1] اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے، یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ، نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں:۔

”نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسٰلَتَہٗ (انعام۔ ۱۵)	اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔
وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (شوریٰ۔ ۵)	اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوجھائیں۔

اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (جمعہ۔ ۱)	یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو وہ چاہے دے

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں، نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں

---

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔ [2] امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے میں نے اپنی طرف سے آیت پوری لکھ دی ہے۔

اسی طرح نوعِ انبیاء کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاضِ عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے، مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جد و جہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت، نوعِ انبیا کے لئے اکتسابی چیز نہیں، لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغازِ وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کی نسبت ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہِ طور پر روزہ کی حالت میں رہے، اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے حرا میں جا کر عبادت میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جن کی سچائی مثلِ سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی، وحی کے بعد بھی آپؐ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپؐ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے، اسی لئے قرآن نے آپؐ کو خطاب کر کے کہا۔

طٰهٰ، مَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (طٰہٰ-۱) (اے پیغمبر!) ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ اس کے حامل میں حسنِ صورت، اعتدالِ مزاج، نشو و نما کی پاکی، حسنِ تربیت، طہارتِ نسب، کرمِ اخلاق، نیک طینتی، متانت، سنجیدگی، دوستانِ الٰہی کے ساتھ نرم جوئی اور تواضع اور دشمنانِ حق کے ساتھ شدت و قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف، اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریاد خواہوں کی فریاد رسی، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے، اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم-۱) تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہ روی سے پاک ہوتا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (نجم-۱) اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قومیں اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، بایں ہمہ وہ متمرد، جابر، جفا پیشہ، تند خو اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں، ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی، اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی ودماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی، جس کے بل پر انسان، حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے، وہ اپنے ان قدسی نفوس و پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سوجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں، ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اور اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی، اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ (کہف۔۱۲) میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق وامتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ

انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں، فکری، قولی، عملی۔ ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں، پہلے دو احتمال بداہۃً غلط ہیں، اب رہ گیا تیسرا احتمال، یعنی بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے وعقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ ہے فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے، جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل وکرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ

نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال وحرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو انسان کا کوئی فرد زندہ رہ سکتا ہے نہ جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان ومال وآبرو کے تحفظ کے اصول وآئین کا نام شریعت ہے انسان کو اس کیلئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ

بُرے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں اس کو تمانع کہتے ہیں، اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے سامان واسباب فراہم کرتا ہے، تعاون کے ذریعہ نکاح وقرابت اولاد واعزہ اور احباب ودوست کے حقوق وتعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی، اور ان کی دولت وجائداد اور عزت وآبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں، جن میں کسی شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو، بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہرحال کوئی خاص شخص یا کسی خاص خاندان قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا، ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لئے یکساں واجب العمل ہو محال ہے اس لئے ضرور ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی وبیرونی احوال وکیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ

یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی، پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا، نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات ان ہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق، اور مخلوق کے درمیان خلق وایجاد وپیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق ومخلوق کے درمیان ایجاد وپیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں۔

(۱) چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے، یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

(۲) ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو مبدء حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لئے ضرور ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے، اسی طرح طبعی حرکت کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب ومہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل ومدبر کی ضرورت ہے اسی لئے قرآن نے ان کے لئے کہا۔

وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا (حم السجدہ) خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا

(۳) اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آسکتیں، اسی طرح ان حرکات کو ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال وحرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کردے۔

(۲) خدا کے حکم دو قسم کے ہیں، تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے، جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے۔

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف-۷)	اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔

تکلیفی حکم صرف انسان کے لئے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ (بقرہ-۳)	اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

مقدمات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں، اسی لئے مرجح کی ضرورت ہے، اختیاری ہیں، اس لئے عقل کی ضرورت ہے، خیر و شر کے محتمل ہیں، اس لئے رہنما کی ضرورت ہے، اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے، اسی قیاس پر انسانوں میں خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوس قدسیہ کے ذریعہ سے ہوگا، اور ان ہی کا نام پیغمبر ہے

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص و طمع، استیلاء و جبر وغیرہ، افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں، اور غور و فکر، علم و معرفت، حسن اخلاق، صبر و شکر، عبادت و طاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں، انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت، اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو، اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے، جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ و عصیان کے نقصانات ظاہر ہوں، عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے، مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص و طمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو بر تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اندرونی وجدان و احساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے، اس لئے نوع انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو، جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق ان کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے، ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں، اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال، انسانوں کے معمولی پیشوں، نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں، مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آتے، جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری

استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ انھوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول و قواعد وضع کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق اور روحانیات اور ملک و ملت کے مصالح و فوائد عام کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول و قواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے، کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے، جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے، ہم کبھی اپنے اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے، اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہٖ اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربے سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہِ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی [illegible] میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی بحث نبوت کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں، ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و طاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور تدبر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے، الا یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنان

عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لئے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

مصلحین کے اقسام مفہّمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کو مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیبِ نفس کے علوم پاتا ہے، وہ کامل ہے، اور جو اخلاقِ فاضلہ اور تدبیرِ منزل کے اصول حاصل کرتا ہے، وہ حکیم ہے، جو علومِ تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے، اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاءِ اعلیٰ کا نزول ہوا، اور وہ اس سے تعلیم پائے اور اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبتِ عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لئے ان کے اعمال کے نتیجے کے طور پر مقدر ہے اور ان کو بداعمالی کے سبب سے ان سے ربانی کی رحمت کو جو دوری ہے یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا، ہشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لئے ان مفہّمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہِ الٰہی سے تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے وہ اس سے خوشنودی اور جو اس سے مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے، یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اول اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثتِ ثانیہ ہے

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ۔ ۱)	وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا، اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے،

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران۔ ۲۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے۔

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۱۰۶) — تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا تھا، فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ "تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیا علیہم السلام آئے، وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپؐ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کیلئے کسی قوم کا انتخاب یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمت الٰہی کا اقتضا اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے، وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے، اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے، مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں، اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لئے بارگاہ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں اگر یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کی جائے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں، مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے قائم ہونے والی اس سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس دین کو درست کرے تاکہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو، جس طرح سے ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کہ اس کو اس کا مستحق بنا دے جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و سلطنت برقرار رہے تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اسکے دوستوں کو کامیابی اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے، قرآن پاک میں ہے۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ — اور ہماری بات اپنے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی

إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (والصفت - ٥)	طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے انبیائے کرام علیہم السلام کے احوالِ مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق وسیع ہوگی، ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے، جس طرح نفسیات اجتماع (سائیکلوجی آف پیپل) یا نفسیاتِ رہنمائی (سائیکلوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں، اس طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ "نفسیات نبوت" کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرزِ گفتار، اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال، غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے، اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روزِ پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے، اس کی تعمیل سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کرتا، آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے، آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور ہر آن اور ہر لمحہ وہ اس میں مصروف ہے، زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں، وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں، بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے، کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے، اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (مومنون-٦)	کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔
أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى (قیامہ-٢)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح لہریں لیتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کی چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک

ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں، لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانۂ ہستی کے ایک ایک پرزے کا حاجتمند ہے، تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض وغایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے، لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے، جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت تو یہ کہتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ۔۳)	اس نے تمہارے لئے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

پھر یہ بھی بتایا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ۔ (حج۔۹)	اے انسان! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اس کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ ط (نحل۔۲)	اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو اور سورج کو اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی، مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آرہی ہے، جمادات نباتات کے، نباتات حیوانات کے، اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آرہے ہیں، اگر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیئے، مخلوقات میں تو اب اس سے کوئی اعلیٰ ہستی نہیں، تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض وغایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (ذاریات۔۳)	اور میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔

عقل وفہم اور ارادہ واختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

(۲) دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم وفہم رکھتی ہیں، لیکن قیاس واستقرا و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کرکے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ واختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیا تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

(۳) تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل وادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا و تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب

کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار و حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں، وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں، ان کے خلاف نہیں ہوسکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم و بیش ہوسکتا ہے، اُن کے ان افعال، حرکات اور آثار کو جبلت، فطرت اور طبیعت کہتے ہیں، ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال، ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام جو ازل سے قیامت تک یکساں، ایک ہی طرح، اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ و اضطرارا سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار ~~وفہم~~ سے صادر ہوتے ہیں، صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں، جن پر خیر و شر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی انجام اور مآلِ کار کو خیال کرکے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر و شر کی ذمہ داری سے بری ہیں، جمادات و نباتات تو اس لئے کہ ان کے افعال و حرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں، یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دے دیئے ہیں، حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال و حرکات بھی تمام تر جبلی و طبعی ہیں، اور وہ جبلت و طبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں، یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطرارًا عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لئے ان سے عصیان نہیں سرزد ہوتا، صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر و شر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل و فہم سے سوچ سمجھ کر مآلِ کار اور انجام پر غور کرکے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے اس لئے وہی خیر و شر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا۔

جمادات و نباتات اور دیگر مخلوقات سے احکامِ الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ
يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ
مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ (نحل)

اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور
جو زمین میں ہے جانداروں میں سے اور فرشتے وہ سرکشی
نہیں کرتے اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں، اور
کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

اسی فطری اطاعتِ الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو جیسا کہ قرآن میں ہے۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا (نحل-۹)

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں اپنے لئے گھر بنالے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل مطیع ہو کر۔

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعتِ الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ، کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ، وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِمَا یَفْعَلُوْنَ۔ (نور-۶)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسرے موجودات و مخلوقات کی طرح مجبور محض نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے، انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے اسی طرح وہ ارادی قدرت و اختیار، جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے، انسان میں ایک حد تک وسیع ہے، علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے، اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی "ارادی تکلیف" کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعتِ الٰہی کے لئے نہیں بلکہ بارادہ اطاعت کے لئے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَہَا وَاَشْفَقْنَ مِنْہَا وَحَمَلَہَا الْاِنْسَانُ (احزاب-۹)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

یہ امانت اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعتِ الٰہی کا نزول ہوا ہے، انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بارادہ اور باختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح بارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کرکے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و اوامر سے ہم کو واقفیت نہ ہو، انبیاء و رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعًا مجبور اور مجبول ہیں، اور کسی قدر با اختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں۔ قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۗ (حج۔ ۲)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ایسے ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص بارادہ اور باعقل اور انجام بیں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں، مطیع اور سرکش۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں سے جس صنفِ مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے، اسی قدر فطرت اس کی دایہ گری کی خدمات زیادہ انجام دیتی ہے اور جس قدر کہ احساس اور اختیار کا دائرہ اصنافِ ہستی میں بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر دستِ فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنفِ کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے، جمادات اپنی نشوونما کے لئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف آنکھیں کھولتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے، حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں، ان کی غذا بے جوتے بے بوئے، بے چھنے نکھارے، بن پکے پکائے، ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں، اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک اس کی جدوجہد، محنت و جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے، اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے، طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر، احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آجاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیے، نباتات وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیے، حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، لیکن انسان کسی قدر اختیار و ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدودِ اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیاء اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی اس ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔

اس اختیار و ارادہ کے مرکز کا نام مذہب کی زبان میں دل ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام

پاتا ہے، انبیاء اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاضِ قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات و اختراعات کہتے ہو ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لئے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں، جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک ان ہی کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالہ مرض کی تدبیریں کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالقِ فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنے اپنے کام انجام دیتا رہتا ہے، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا، جن کو تم اصولِ تمدن، طریقۂ معاشرت، آئینِ عدل و انصاف، اخلاقِ حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو دور شروع ہوتا ہے، اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا غول بن جائے۔

جو تمہارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے، جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمہارے لئے کپڑے بنتا ہے وہ بنکر ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے، اور جو تمہارے لئے مادی کائنات کے چہرے سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں، ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسبِ استعداد اور حسبِ حیثیت درجے ہیں، اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں، بعض وہ ہیں، جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں، یہ عام علماء ہیں، بعض وہ ہیں، جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں، یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہامِ ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، یہ انبیاء ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بننے، اوزار بنانے

جسمانی پرورش کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں، ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے یہ صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر، غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال و افعال اور ہر قسم کے حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی "دل"، کیا انبیاء اور ان کے متبعین کے سوا نوعِ انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی، تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالقِ فطرت کا یہ غرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی و اصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوعِ انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے، کیا اس کی شانِ ربوبیت کے ساتھ سوءِ ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے، وہ ان سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بُنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں، اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت و غربت، سوسائٹی اور مجلس، حکومت اور اقلیم اور جغرافی و قومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے، باہم جوڑ دیتے ہیں، اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوامِ عالم کو اولادِ آدم، اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں، اور ان کے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن و امان پیدا کرتے ہیں، ان کے دلوں سے بغض و کینہ کو نکال کر اخوت و محبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح و غلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ انسانی طبقہ ہے جس کو ہم نبی، رسول اور پیغمبر کہتے ہیں، ان کو گو براہ راست جسم و جسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب و روح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے، تاہم اس دل اور قلب و روح کی اصلاح کے لئے جسم و جسمانیات کی بقدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب و روح کے کاموں کی اصلاح میں اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کے درمیان امن و امان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے، علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر، ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے، کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قویٰ اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے، اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب و علل اور غرض و غایت پر نظر ڈالی جائے تو ایتھکس (فلسفۂ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع و معاشرت) ہے، اگر جسم کی صحت و مرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے، دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا

ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور باایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم و فن علیحدہ اور ہر ایک علم و فن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور و قوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن و امان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب و علل کی تفتیش اور ان میں نظم و تسلسل اور علت و معلول کا رابطہ پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفۂ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب و علل تم کو بتاتے اور نا قابل فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں، خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو، جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے، وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب و علل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر و شر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم و تلقین و فیض صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کر دے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ و بار پیدا کرے، البتہ نبی یہ تمام کام سر انجام دیتا ہے وہ انسانوں کو ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان کے قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کر دیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن و اطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن و اطمینان چاہتا ہے، وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب و علل کی تلاش و جستجو و تشریح کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ وہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسم و رواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اعراف۔ ۲۰)	وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔
رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ (نساء۔ ۲۳)	ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کے اس وعظ و تذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا۔
لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا	ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید - ۳)

اتاری اور عدل کی ترازو تا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن و امان کی زندگی بسر کریں۔

نوعِ انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں، ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیاء اور رسول نوعِ انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائیدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت جسم کے لئے نہیں بلکہ روح کے لئے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجا لاتے ہیں، وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لئے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے، بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں، وہ خیال آرا شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے، جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ، اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (شعراء - ۱۱)

اور شاعروں کے پیرو کار گم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامانِ راحت فراہم کیا ہے اور جو ان کے قلب و روح کا سامانِ راحت بھی بہم پہنچاتا ہے، ان کو اس لئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں، اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو اس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون و اطمینان اور امن و سعادت کی روشنی میں داخل ہوں۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ (حدید - ۱)

وہی خدا ہے جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لئے کیا) کہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

انبیاء بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں، مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لئے نہیں بلکہ خلق کے لئے، وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعامِ شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لئے نہیں، بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں، وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ، استقراء اور قیاس سے نہیں، بلکہ عالمِ اسرار کے مبدءِ علم سے فیض پا کر، وہ بھی حکیم و واعظ کی طرح پُرتاثیر کلام کرتے ہیں، مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں، بلکہ خدا سے سن کر، اور وہ صرف کہتے نہیں، بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں، وہ دوسروں سے کراتے ہیں

وہ خدا سے ہیں، خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں، غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (والنجم-۱)	قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا، نہ بہکا اور نہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے، اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا درانحالیکہ وہ آسمان کے سب کے اوپر کناروں میں تھا، تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی جو وحی کی، نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔
قُلْ اِنَّمَا اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (اعراف-۲۴)	کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں، اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں، ہدایت اور رحمت ہیں۔
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (شعراء-۱۱)	یہ تو عالم کے پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا کہ تو ہشیار کرنے والے میں سے ایک ہو، فصیح عربی زبان میں۔

نکتہ:۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض و نیت سے کرتے ہیں، خود غرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کرکے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی تہ تعلیم کو قرار دیتا ہے کوئی رسم و رواج و معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے لیکن انبیاء کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور اسی کے بدلنے سے سب کچھ بدل سکتا ہے، ان کی غرض خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی معرفت ہوتی ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت و جلال کا ہر منظر خود اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے، تاہم یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی مصلحت یا حصول قوت و طاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ

صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت، خدا کی خوشنودی ہوتی ہے اور باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاء اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے، یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے، ماخذ اور منبع کا فرق، غرض و غایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم و عمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدء، منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو، وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی و الہام ہوتا ہے، اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ، استقراء اور قیاس ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جد و جہد کا منشاء ذاتی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے، مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت کو تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں، نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے، وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے، دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دو جانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ اور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج و لشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ و فساد رک جائے، فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی بات لوگ تسلیم کریں لیکن پیغمبر اپنے پیرووں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں، وہ اگر کبھی قانون و حد و سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں، تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے، اولین نہیں، ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیرووں کو خدا کی قدرت، اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں، بلے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے تختے الٹ دیتے ہیں، انھوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا، ان کی تلوار کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن و امان پیدا کر دیا، لیکن کیا انھوں نے دلوں کے تختے بھی الٹے، اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم منوا سکے، وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضہ اقتدار میں دے سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن و امان پیدا کر سکے، وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم و نسق قائم کر سکے؟

حکماء اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائبات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب و روح کے عجائبات کو بھی دریافت کر سکے؟ وہ ماوراء مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق و تفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی، دوسرے حکماء نے اخلاق کے اسباب و علل کے حدود و ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا؟ اچھائی کے بیج نے نشو و نما پائی؟ اچھے اخلاق

وتعلیمات کے فلسفیانہ رموز و اسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چار دیواریوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا، کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک اپنچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا، یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید پرستی کا درجہ تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر موثر بیان خطیب، ہر دقیقہ رس، متقن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت و رسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پُراسرار عالم غیب سے ہو، وہ غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، عالم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہم سفر و ہمنوا ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

(۳) اس سے خدا کے حکم سے عجیب و غریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں، جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

(۴) فضائل اخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو، اور ہر قسم کے گناہ کے خس و خاشاک سے پاک و صاف ہو کر گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک و صاف نہیں ہو سکتے۔

(۵) وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل و اخلاق کی تعلیم دے اور روز الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

(۶) نہ صرف تعلیم، بلکہ اس میں یہ قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست بنا دے اور جو خدا سے بھاگ گئے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

(۷) اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک و صاف کر کے پیش کرے۔

(۸) اس کی دعوت، جد و جہد اور تعلیم و تلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت و رسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں، مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ، اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ، وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ

اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے، اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق کو

وَيَعْقُوبَ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ
قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ وَأَيُّوبَ وَ
يُوسُفَ وَمُوسٰى وَهٰرُونَ ۚ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۙ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى
وَإِلْيَاسَ ۖ كُلٌّ مِنَ الصّٰلِحِينَ ۙ وَإِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ
وَيُونُسَ وَلُوطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِينَ ۙ وَمِنْ
اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَإِخْوٰنِهِمْ ۖ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ
وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۞ ذٰلِكَ هُدَى
اللّٰهِ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهِ ۚ وَلَوْ أَشْرَكُوا
لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۞ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِنْ يَّكْفُرْ
بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا
بِكٰفِرِينَ ۞ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ
فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُلْ لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِينَ ۞

(انعام - ۱۰)

یعقوبؑ بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوحؑ کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو کہ ہر ایک نیکوکاروں میں سے ہے اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو ہر ایک کو بزرگی بخشی، دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے، اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا، یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ جس کو چاہے چلاتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں کا انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے دوسرے کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اے محمدؐ! تو بھی انہی کی راہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دہانی ہے۔

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں، اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف، خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

(۱) فرمایا "ہم نے ابراہیمؑ کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی" جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

(۲) ارشاد ہوا کہ "ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکوکار تھے" اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

(۳) یہ بھی کہا کہ "ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں یہ ہدایت عطا کریں" جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

(۴) فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب، حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم)، اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی" اس سے معلوم ہوا کہ ان منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

(۵) حکم ہوا کہ "ان کی رہنمائی کی پیروی کر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

(۶) فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا، یہ تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے"۔ اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصد اور مطمح نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق ونسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے، جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

(۱) اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح وسعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

(۲) وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

(۳) وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

(۴) اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ کی نسبت یہ فرمایا گیا۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ رکوع ۱۵)

وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کو یکجا ذکر کیا ہے، جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب وحکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب وحکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک وصاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک وصاف ہو، کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم، اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى (اعلیٰ)

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے پکار اور چھپا، اور ہم تجھ کو آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا، اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہوگا، وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو، پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال کے درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں، پھر اس کو دنیا کے "سمجھانے" پر مامور کرنا، اس رمز کو آشکارا کرتا ہے کہ دوسروں کی تعلیم وتذکیر کا منصب اس کو ملا ہے، اس کے بعد یہ فرمایا کہ "متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے"۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق پہنچانا بھی اس کا فرض ہے[1]۔

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں

---

[1] یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

کا سدباب ہو، لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو خصوصیت کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے۔

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں، یہ مخصوص صفت اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں، ان ہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں، پھل پھول، چوپائے، پرندے، انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسری نوع سے ممتاز اور ہر صنف دوسری صنف سے علیحدہ ہے، گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو اور خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں، یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں، لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں، اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں، جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں، دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہوگئی ہیں، اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورۂ بالا خاصیتیں فطرۃً ودیعت ہیں، لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوعِ انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی، یوروپین، دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل، اخلاق و عادات وغیرہ، بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام انسانی اصناف جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحی ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاقِ فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں، ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے، ادب و انشاء کے خیالی بلند پرواز عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں، اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں، اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے، ہنیبال و نپولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے، افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کرسکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا، سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر کلہاڑی نہ مار سکا، اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل بادل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مندر کو چکنا چور کر دیا، لیکن اگر فردوسی

کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں، انہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف، خصوصیات، اور لوازم ہیں، جو انکو دوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں۔

وہبی استعداد ان میں سے سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں، اور انہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلانِ طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے، جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا، بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار خواص پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض کل خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے، کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنے مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا، بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار، خواص اور کیفیات اسی میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے، شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا کہ میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدمؑ ہنوز آب و گل میں تھے[1] اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے وہ عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہیں، اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں، وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلانِ خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوٰۃ اللہ علیہم کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی، حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے سے پہلے ہی سے آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے، حضرت اسمٰعیلؑ کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہِ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ

---

[1] جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم مناقب محمدی ج ۲ ص ۶۰۰، حیدرآباد۔

کے ساتھ مقدس سفر کے لئے تیاری اور اس کم سنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحٰقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غلامِ علیم کا خطاب پانا، پھر مقدس باپ کی جانشینی اور اورشلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب، کس مقصود کا دیباچہ ہے۔

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰؑ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے ہی فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش کس مبتداء کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغاز عمر میں علم و فہم فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰؑ کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی سعادت مندی، نرم خوئی، پاکی کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، تورات کی حقیقت رسی، کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا اور رویائے آمنہؓ، احوال ولادت و تربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر و برکت، نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہانتاب کا مطلع انوار ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کا یہ حال ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صٰفّٰت۔ ۳)

تو ہم نے ابراہیمؑ کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ خطاب ہے۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝ (طٰہٰ۔ ۲)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق، تیری ماں کے دل میں یہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ (مریم۔ ۱)

اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی، اور تھا پرہیزگار، اور اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا، نافرمان، سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔

كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے عیسیٰؑ

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ (مریم ۲)

اس نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھ کو نبی ٹھہرایا، اور مبارک بنایا، میں جہاں ہوں،

اور محمد کا "امین" نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے،

فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِہٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (یونس ۲)

تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے،

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات، باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل وقیاس سے نہیں بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے، اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوہ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ علم انسانی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے، بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

(۱) **وجدان:-** انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر، بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ، اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

(۲) **فطرت:-** اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہر نوعِ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں، جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور ان ہی سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے، ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں "جبلت" کہتے ہیں، حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرۃً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے، آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا، انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے۔

(۳) **بداہت اولیہ:-** انسان کو کچھ ہوش وتمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا ادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک وشبہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک ہی وقت میں ایک ہی چیز سیاہ وسپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے، وغیرہ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بداہۃً معلوم ہو جاتے ہیں۔

یہ تو بلاواسطہ علم کی تین قسمیں تھیں اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں ایک احساس اور دوسرا عقل، پہلے سے وہ گرد وپیش کی مادی چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج میں موجود نہیں بلکہ عالم الغیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں علم حاصل کرتا ہے۔

(۴) انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں، باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی، سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی اور لامسہ چھوتی ہے، ان ہی کا نام حواسِ خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آکر ٹکراتی ہیں، اسی کا نام احساس ہے ہم چکھ کر مزا پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی و نرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں، ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھاتے ہیں اور دریافت میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے، بیماری میں قوتِ ذائقہ بدل گئی ہے اور اس لئے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوتِ باصرہ نے ہم کو دھوکہ دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور بھاگتی ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتا ہوا جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، بھڑک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں، لیکن کیا در حقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

(۵) علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں، اس کی بنیاد در حقیقت ان ہی معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان، الہام فطری یا جبلت، بداہت اولیہ، اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے، اور ان ہی معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقراء کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں، وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امور کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں، اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقراء پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو، یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکہ دیا ہو یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو، طبیعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا، اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات یا بدیہیات و محسوسات پر مبنی ہو مابعد الطبیعۃ اور فلسفۂ الٰہیات کے مسائل اسی طریقۂ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لئے ان میں اختلافات کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے، مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی، اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاط اور فرق ہو سکتا ہے، غور و فکر، بحث و نظر، تحقیق، جستجو اور ترتیبِ مقدمات جو قیاسِ عقلی کے کارکن اور عامل ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اسی لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطورِ بالا سے ظاہر ہوا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک پیاس لگتی ہے کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے کہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک

اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے، اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے، یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے، دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا، یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آسکتا، یہ احساسات بھی ایک دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں، کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اولیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے دو دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہو سکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہو سکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز ورشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے وقوف ان ہی کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے، جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور جس کو علم معقولات کہتے ہیں، اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں، ایک طرف تو کمی کی سمت میں، وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف وسعت کمال میں، عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بو علی سینا تک سب انہی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پُرخطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے، جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے دوسرا یعنی فطریات کا علم خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں، آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے، تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچا ہے، وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں، بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہیں مشترک تعلق رکھتے ہیں، یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں، تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا ارادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے، وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آکر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں، جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے، اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے، اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی بلحاظ کم مادی و روحانی سے لے کر بیشتر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں،

فراست کے لفظی معنی تاڑ جانے کے ہیں، تاڑ جانے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی، مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے، اسی طرح ہر علم و فن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور اللہ (ترمذی)   مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے

(۲) فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے، فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ہی ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور و فکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور و نظر، فکر و تلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے، یہ چیز بھی اکثر کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرةً عطا ہوئی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایان روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

(۳) کشف کے لفظی معنی تو کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے وہ کبھی اصل صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ خواب عالم خواب کی بات ہے اور

کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں، ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے، ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

(۴) الہام کے لغوی معنی دل میں ڈالنے کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے، جو محنت تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آجاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے، اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں، مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین، علماء، شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

(۵) وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دل منشا کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دل منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں، یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے ذریعہ یقینی ہیں، اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں، اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان، پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات، اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف، یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں، اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں۔

(۱) وحی (اشارہ) سے بات کرنا یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا، یہ اگر حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

(۲) خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا، مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں، اس کو الہام کہہ لو۔

(۳) فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی محفوظ کر لیتا ہے، اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورہ شوریٰ میں ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا
أَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا
فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ إِنَّهٗ عَلِيٌّ

اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے بےشک

حَکِیْمٌ (شوریٰ۔۵) اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتے کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا ہے اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقے سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے، اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے۔

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ، اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (نجم۔۱) نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

الغرض اس امتیاز کے لئے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ[1] وضع کر دیئے گئے ہیں تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقۂ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے، بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے، خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔

نکتہ:۔ اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان طریقوں سے اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے، مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرما لے۔

بہرحال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں، اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائعِ اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پُر اسرار اور ناقابلِ فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعۂ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آسکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائعِ علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپرچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب و کلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات و محسوسات کا علم ہوتا ہے، جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکہ نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات

---

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحبیر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ جلد سوم ص ۲۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیئے۔

میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے، اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو تو شبہ نہیں ہوا کرتا، اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہ نہیں ہوا کرتا، غرض وہ اپنے ان جملہ طبعی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن پاک میں بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔

فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰہِ (یونس۔۲)	تو کہدے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے۔
قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ (نمل۔۵)	کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

رسول کہتے ہیں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ (انعام۔۵)	اور میں غیب نہیں جانتا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے سورۂ جن میں ہے۔

فَلَا یُظْہِرُ عَلٰی غَیْبِہٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (جن۔۲)	تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیُطْلِعَکُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (عمران۔۱۹)	اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔

ان دو آیتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیۃً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور تحقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرما دیا گیا۔

وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (بقرہ۔۳۴)	اور وہ خدا کے ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے، وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا ہے، بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں، مثلاً قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ کل کیا ہوگا؟ ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا، جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت

کے بعض عذر خواہ لوگوں کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انھوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی، خدا نے فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (توبہ - ۷)	خدا نے تجھ سے درگزر کیا، کیوں تو نے ان کو اجازت دی تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ۔ (توبہ)	انھوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیتے یہاں تک کہ حق بات آگئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آگے چل کر ہے۔

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ (توبہ ۱۳)	یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا، بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں رسول ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت

علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں، قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کی اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں، اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا، گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے، وجدان، حواس اور عقل و استدلال ذخیرہ ہیں، ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں، جو علم حاصل نہیں ہوتا، اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیا کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہیں اور اس کا مقابل لفظ "شہادت" ہے، جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیا جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کہا ہے (انعام، رعد، حشر، تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہیں، اور غائب ہے، ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے" الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طرح علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

(۱) زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لئے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ	یہ غیب کی بعض خبریں ہیں ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف تو تو ان

أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (ہود-۴)

کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا
كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ
يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ
(آل عمران-۵)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے لئے) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا، اس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا، اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا، اور نہ دوسروں سے معلوم کیا، اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا، وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ
وَهُمْ يَمْكُرُونَ (یوسف-۱۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا ہے، بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو، تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے، قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا۔

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ
مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ (یونس)

تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے، انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان)

خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي (اعراف-۲۳)

وہ قیامت کو پوچھتے ہیں، کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے۔

وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا

کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے

تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ (لقمان-۴)	کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔

۲- ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا، ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے، جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بیکار ہے، ہم دلّی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے، اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لئے زمانہ حال کے علم کیلئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں، ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا، وہ غیب ہوگا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں، کیا ہے؟ کس کو معلوم۔

وَيَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ (لقمان-۴)	اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے، سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بنا دیئے ہیں، وہ پورے نہ ہوں۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ہود-۱۰)	اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔
اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حجرات)	بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں، جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ عمل سے قطعاً باہر ہیں، ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رویت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ (انبیا-۴)	تو جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں، غیب میں۔
اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (بقرہ-۱)	وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں
وَالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ (مریم-۴)	وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے، غیب میں۔

غیب "میں" کے معنی ہیں بے جانے، بن دیکھے۔ حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آمیز حالات سے بھی روایت اور تجربہ کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطے انکو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلابات، قیامت کے مناظر اور اسکے بعد کے پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان احوال و مناظر کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود

ہونے کے احساس وتعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے، قبروں کا انکشاف، پس پردہ روایت، دوسروں کے موجودہ احوال سے واقفیت وغیرہ، اس علم غیب میں سے بھی پیغمبر کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس وتصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں، خود خدا کا دیدار، فرشتوں کی رویت، جنت ودوزخ کا مشاہدہ وغیرہ، ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے، اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت "ملکۂ نبوت" کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیبِ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے، جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور دماغی قویٰ، حافظہ، تذکر اور غور وفکر کی قوت سے وہ محروم ہیں، ان سے اونچے حیوانات ہیں، جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جاکر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں، ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوتِ احساس ہے، جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کے وہ قویٰ ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی وذہنی قویٰ ہیں، جو حیوانات میں نہیں، اسی طرح انبیاء میں علم وتعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات وعقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے، اس ذریعۂ علم میں غور وبحث اور منطقیانہ فکر ونظر اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور ان ہی کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، بداہتِ اولیہ، احساس اور غور وفکر سے معلومات حاصل نہیں کئے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے، شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں، علم کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے یہی وحی ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل ونقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہِ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا، دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم وفہم کی قوت آغازِ پیدائش ہی میں فطرۃً ودیعت کر دی جاتی ہے، اسی طرح انبیاء میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ وہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم وفہم رکھتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی ہی نہیں بلکہ اتحاد ہی ہے وہ لوگ

جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں، وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں،

ع یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بہ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جن کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور لدنی فہم ہوتی ہے، جس سے غیر انبیاء محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر علانیہ سرفراز ہوتے ہیں، اسی کا نام "ملکۂ نبوت" ہے اور اہم امورِ دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے، اس کا نام "وحی" ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہی دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہِ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہِ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم و فہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے جیسے وحی قرآنی، وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم و فہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوتِ علم و فہم کا نتیجہ ہیں، جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا منشا، ملکۂ نبوت کے ذریعہ وحیِ ربانی کی ترجمانی ہے اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی صحیفہ ربانی، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نورِ نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً "سنت" کہتے ہیں، کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے، کتاب براہِ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنت بالمعنیٰ۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اس تشریح کا مقصود حقیقۃً تلاوت و عدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور لفظ لفظ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں بلکہ صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لئے کتاب کی وحی مدوّن، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور

سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں، اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرأت کیے جا سکتے ہیں، اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ ان کو کتاب الٰہی کہا جا سکتا ہے مگر معنی اصولی حیثیت سے انکی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیرووں اور پھر انکے پیرووں کے مسلسل تعامل سے یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں، بنابریں چونکہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں، اس لئے وہ غیر متلو ہے

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصل حیثیت کلی قانون کی ہے، قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جا سکتا ہے، اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں، جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کی فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے، اس لئے صحابہ کے دریافت پر یا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک اور نکتہ بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اور انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تشریح چاہی اور انھیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے، اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا، اور اس لئے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کے بعینہٖ ان ہی الفاظ کو بلا کم و بیش دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہی الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے تو سوال کی نوبت آئی اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانونِ الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھنے والوں کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے، اس لئے اصل مفہوم و منشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکہ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں، اسی لئے ان کو اصطلاح میں "وحی غیر متلو" کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں، قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت

کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے، یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منشاء الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا: "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے" کبھی ارشاد ہوا: "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے" ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ فرمایا: "تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں" ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے "وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو" حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی، ایک اور مجلس میں صحابہؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون کام پسند ہے فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا۔ دریافت کیا اس کے بعد، فرمایا، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں،

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (بقرہ-۹- نساء-۶)	ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔
وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ (اسرائیل-۳)	وہ بوڑھے ہو جائیں تو ان کو اُف نہ کہو۔
وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ	یہ ماں باپ کے خدمت گزار وہ ہیں جن کی برائیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیان و تشریحات کا ہے[1]۔

احادیث، قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے کلی اور کل احکام کے تحت میں مندرج ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں صرف انکی تشریح فرمائی ہے، اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں، ایک وہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی، اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے، دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی، مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے، اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہل علم کیلئے آسان ہے، تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا، اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے، ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں،

الہام واجتہاد وحکمت

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں احادیث و سنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابل بحث ہے، امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریئے نقل کئے ہیں[2]۔

---

[1] مجھے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالہ (ص ۲۰-۲۹، ۹۱) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۲ھ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص ۱۰۵، ۲۱۱ مطبوعہ سلفیہ مصر ۱۳۴۱ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

[2] کتاب الرسالہ امام شافعی ص ۲۸۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا، اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی، حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرے۔

(۲) رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس کے احکام، دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں، گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

(۳) تمام احادیث نبوی القاء فی الروع ہیں (یعنی رسول کے دل میں خدا نے ڈال دیئے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔

(۴) اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں، کتاب الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوتے تھے۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین رائیں میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں، پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی بھی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القاء فی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں، ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط، عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا، ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا، بلکہ وہ پیغمبرانہ "قوتِ فہم" کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ "قوتِ فہم" کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القاء سے کرو یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوتی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور انکے جزئیات کتاب الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ، استنباط اور فہم اسکی اس پیغمبرانہ قوت علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکماء ملکۂ نبوت اور اہل شرع حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح "اجتہادِ نبوی" کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تعلق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہاء کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیئے کہ رسول اپنی اس حکمت ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی، گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہرحال خواہ فقہاء کے طریق پر اجتہادِ نبوی کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھئے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علم سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لئے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاء گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں، اس لئے امور رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلّم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے

(اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے، مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے، ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم، علم الٰہی کے منشاء کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں[1]۔

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنیً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اسلئے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکہ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

ساتواں مبحث احادیث نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں،

(۱) ایک وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے، اور یہ آیت:۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر-۱)

پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال بہ جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دار و مدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا، قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ کو تعلیم کر دیا تھا، وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا، آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا، ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے، حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت

---

[1] سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کے حوالہ کے لئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بہ التقریر والتحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳ ص ۲۹۴، ۲۹۹ مطبوعہ امیریہ مصر ۱۳۱۶ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح ج ۲ ص ۵۲ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دار و مدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دار و مدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۲) دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ میں صرف ایک آدمی ہوں، جب تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔ اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ میں نے ایک خیال قائم کیا تھا میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو، البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا، اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے، طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا ارشاد کہ تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو، اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دار و مدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادۃً کیا، عبادت نہیں، اتفاقاً کیا، قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے، آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے، وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زیدؓ بن ثابت نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی، اس طرح بیان کیا ہے کہ میں آپ کا پڑوسی تھا، اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بُلا بھیجتے تھے، اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے، تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں!۔

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ نے اپنے زمانہ کی جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں ہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ اب ہم کو حج میں اکڑ اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت! ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔ بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے، لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا، اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ خاص اس کا کوئی اور سبب ہو، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی، اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں، مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ "جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے" نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے، آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ "واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے، اس کو غائب نہیں دیکھتا" اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ (انتہی کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی جو دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کا

تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم سے ماخوذ ہیں، دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، ان کی متعدد صورتیں ہیں۔

(۱) کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ اکڑ کر سعی کریں، تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

(۲) وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں، بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں، مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

(۳) وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے، جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں، مثلاً وضع و لباس، فرش پر نشست، کمبل اوڑھنا، دسترخوان اور چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

(۴) وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا، مثلاً ام زرع اور ان کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

(۵) عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

(۶) زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے، آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ اگر ایسا نہ کیا کرو تو کیا ہو۔ مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہو گئی، لوگوں نے آکر عرض کی، فرمایا میں نے ایسا خیال کیا تھا، انتم اعلم بامور دنیاکم۔ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو، یہ امور تغیر اور رد و بدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں، ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی، یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے، شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے، مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم منصب نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے، اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیات مسائل کی تشریح، اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

(۲) پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یکسر پاک و منزہ

ہوتا ہے، کیونکہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے" اسی لئے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔

"پیغمبرانہ اجتہاد" کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القاء، حکمت ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور اجتہاد نبوی میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے، اس لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے، معنی کی نہیں، مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا، چنانچہ توراۃ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آسکتا ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی، بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو، بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہیں رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے، ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت و بے گناہی

نبی کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے، یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں، عیسائیوں میں صرف ایک مسیحؑ کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے، اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت معمولی چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت و صحت پر اعتبار کیا جا سکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پرجوش اور پر تاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے قرآن نے ان کے جواب میں کہا، درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِينَ	شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اس کا زور انہی پر چلتا ہے جو اس سے

يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِينَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُونَ (نحل - ۱۳)

دوستی کرتے ہیں اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ
اتَّقَوْا وَالَّذِينَ هُمْ مُحْسِنُونَ (نحل - ۱۶)

اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو بے شک خدا ان کے ساتھ ہے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سورۂ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ
تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ يُلْقُونَ
السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ۔

(شعراء - ۱۱)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں ان پر اترتے ہیں جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گنہگار ہوتے ہیں لوگوں کو یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں، کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا ہے۔

وَيْلٌ لِكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ يَسْمَعُ آيَاتِ
اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا
كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ

(جاثیہ - ۱)

پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے، اور پھر اپنے غرور پر اڑا رہتا ہے، گویا اس نے سنا نہیں تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جاتے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا
عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ (آل عمران - ۸)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا، خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا، اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا اور ایک آیت میں فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ
يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ
تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپا لے اور جو کوئی چھپا لے گا، قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور

لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران-۱۷)

ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے وہ اس جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا، اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سناتے، خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے "چن کر پسند کرنے" کا لفظ استعمال کیا ہے جو سر تا سر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (حج-۱۰)

خدا فرشتوں میں اپنے پیغمبر چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں میں سے۔

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران-۴)

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا سے چن کر پسند کیا۔

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا (بقرہ-۱۶)

ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔

حضرت موسیٰؑ کی نسبت فرمایا۔

اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ (اعراف-۱۷)

ہم نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں میں سے چن کر پسند کیا۔

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفا کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوت عمل) والے اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے ہم

بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۚ وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ (ص-٤)

نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورۃ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءَ الزَّكَاةِ ۖ وَكَانُوا لَنَا عَابِدِينَ (انبیاء-٥)

ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے انکو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہوسکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے، سورۃ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا۔

كُلٌّ مِّنَ الصَّالِحِينَ (انعام-١٠)

یہ سب صالحوں میں تھے۔

پھر آگے چل کر فرمایا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (انعام-١٠) ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔ پھر ان کا ذکر کرکے فرمایا وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ۔ اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ چلایا۔ صالح ہونا برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی وسعید اور گنہگار و نیکوکار، دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس اور اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (جاثیہ-٢)

کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے بنائیں گے ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاء کے وصف میں فرمایا۔

الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ (احزاب-٥)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے، ازواج مطہرات کی شان میں ہے۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ ۚ إِنِ اتَّقَيْتُنَّ (احزاب-٤)

اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو، اگر تم متقی ہو۔

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کرکے فرمایا کہ ارادہ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف اور ستھرا بنائے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (احزاب-۴)	اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کردے اے نبی کے گھر والو اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج واولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاء کا کیا ذکر ہے، ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ (نور-۳)	گندیاں گندوں کے واسطے اور گندے گندیوں کے لئے اور ستھریاں ستھروں کے واسطے اور ستھرے ستھریوں کے واسطے یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔

یہاں طیب، پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن، پاکی، اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء۔ درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب)	تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے،

نیز ان کی اطاعت واجب ہے،

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (نساء-۹)	ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اور خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت تصریح ہے کہ آپؐ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران-۳)	اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو تم میری پیروی کرو، خدا تم کو چاہے گا،

کیا کسی گنہگار اور عصیان کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے روشنی کبھی نکلی، اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوتی اور گمراہوں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے، برائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوتِ شر ہے، لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دامِ فریب سے آزاد ہیں،

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا (اسرائیل-۷)	یقیناً میرے بندوں پر تیرا اے شیطان، کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار (اپنے بندوں کی طرف سے) سب کچھ کر دینے کو بس ہے،

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسۂ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (نفس) چھپا ہو یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے اس کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا، مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری جو رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دست گیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتابِ الٰہی اور حکمت ودانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۚ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۚ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۚ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء-۱۷)

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو، اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

اور یقیناً موقع و محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں، خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریب تماشے سے بھی پاک ہیں، البشریت کے اقتضاء سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوتِ حق کو لے کر وہ آئے ہیں، اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبولِ ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں پیدا ہوتی ہوں، لیکن وہ مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں، اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے، فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (حج-۷)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (نجم-۱)

(اے مسلمانو!) تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سابق اور زمانۂ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کاموں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفاء (قسم ثالث، باب اول) میں خفاجی نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں ملا دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاخیار فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے، مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں، ان کے دو اسباب ہیں

اوران اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دیتا ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو، اور ان کا دامن گناہ و عصیان کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے، ایک عبد و غلام خواہ کس قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفاشعار اور مطیع و فرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (شعرا - ۵)

اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت، اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچے ہیں، وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفاشعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے، بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبہ، اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تاکہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (نصر)

جب اللہ کی مدد آچکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع ہونے والا ہے۔

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۙ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَیُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَیَهْدِیَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۙ وَّیَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِیْزًا (فتح - ۱)

ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی، اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب

5 قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا،

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا	مسیح کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب
الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ	فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا
وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء۔ ۲۴)	تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیاء کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبول تام کی بشارت ہے، سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں، ان کو پڑھو، تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز، مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی، اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جانفروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خط عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعت فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت فرمائے۔

عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک مرد ان کو "اے نیک استاذ" کہہ کر خطاب کرتا ہے، اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں،

"تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں، مگر ایک یعنی خدا،" (لوقا۔ ۱۸: ۱۹)

حضرت مسیح کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے، کس قدر غلط ہوگا، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ :-

"اور جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو بخشتے ہیں، تو اپنے قرض ہم کو بخش دے۔" (متی ۶: ۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیت کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے، لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر، بھول چوک سے ہو یا قصداً، اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں، لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں) ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

انبیا علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ "ذنب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جرم، اثم یا حنث کا نہیں۔ ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیان تک کو شامل[1] ہے۔ اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفارِ ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں بلکہ یہی انسانی بھول، چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم اور لطف و عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابلِ مواخذہ نہیں مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے، اس بنا پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک و صاف رکھا جاتا ہے۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ (بقرہ-۴)	تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (طٰہٰ-۷)	پھر خدا نے اس (آدم) کو برگزیدہ کیا، پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ (توبہ-۱۳)	یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔
فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (انبیاء-۶)	پھر ہم نے اس (یونس) کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔
لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (فتح-۱)	تاکہ اللہ تیری اگلی پچھلی فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبۂ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاء کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

(۲) انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت، اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے، جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشامِ جاں کو معطر کرتے ہیں اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے

---

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فروق پر کتابیں لکھی ہیں انھوں نے اس کی تصریح کی ہے ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس و ادیب الاب ہنریکس لا کی کتاب فرائد اللغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ الاثم الذنب الذی یستحق العقوبۃ علیه ولا یوصف به الا المجرم و بین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمداً کان او سهواً بخلاف الاثم فانه ما یستحق فاعله العقاب فیختص بما یکون عمداً والحنث ابلغ من الذنب لان الذنب یطلق علی الصغیرۃ والحنث والکبیرۃ والجرم و یطلق الا علی الذنب العظیم (ص ۹۰، ۹۲) (مطبوعہ کاتولیکیہ ۱۸۸۹ء)

ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی، ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت، اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیاء کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاء کے حق میں مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے۔

أَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيمًا فَآوَىٰ، وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ، وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (ضحیٰ۔۱)

کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے، جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبۃً ضلالت ہی ہے۔

"ضلالت" کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں ہیں بلکہ نادانستہ بھولنے بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں، عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے۔

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ (بقرہ۔۳۹)

بھول جاوے ایک عورت تو یاد دلادے اس کو دوسری۔

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے۔

لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى (طٰہٰ۔۲۰)

نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضال" کے معنی عربی زبان اور محاورہ "قرآن" میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھولے چوکے کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آئی ہے، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسا مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقیہ مر گیا تھا، نبوت پا کر جب وہ لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم میرے فراری مجرم ہو، حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا۔

فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ (شعراء۔۲)

میں نے اس حالت میں کیا تھا کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی، نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کا مرجانا، مارنے والے کا کوئی بالقصد گناہ نہیں، جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے، اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے یہاں "ضلالت" کہا گیا ہے، دوسری جگہ اس کو "غفلت" (بیخبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف-۱)

ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ-۵)

اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

"کتاب وایمان" کے نور وہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت وحالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا اس سے مقصود حقیقی گنہگاری، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے، بلکہ طلب حق، تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے، آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے، یہ ہدایت کا دور ہے، چنانچہ ایک موقع پر انبیاء کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ (انعام-۱۰)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ضلالت ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت ورسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبۃً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے افراط وتفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کی ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے، وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا یا خدا کا جزء یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس

میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں،

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض صرف انسانوں اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز، و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض یاب اور برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے، اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا اور انسانوں میں فرشتہ آتا بھی تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی، پاکدامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں، یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے، وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں، یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا، پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے، تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو، چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا،

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسرائیل-۱۱) کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا،

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسرائیل-۱۰) میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی رہنمائی انسان ہی کر سکتا ہے۔

اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا (تغابن-۱) کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے۔

یہ وہی شبہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دے سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں، بلکہ وہ گنہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی اور انبیاء کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے،

اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (ابراہیم-۲) تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (انبیاء - ۱)	نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔
مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (مومنین - ۲)	نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے۔

مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (شعراء - ۸)	تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔
مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (یٰس - ۲)	تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے۔

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (ہود - ۳)	ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں، لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں، اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے، فرمایا،

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (ابراہیم - ۲)	ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیاء نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں،

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ میں تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں، اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کو مٹانے کے لئے تھا جو انبیاء کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں فرق و امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کی عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے، الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں، گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جس وقت کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے، اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا، اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں، وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جزء ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں، اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدہ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ

قوت ہونی چاہیئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرا دیں، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدا تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ يَتَّخِذُوا عِبَادِي	کیا وہ جنھوں نے کفر کیا، یہ سمجھتے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسولوں
مِنْ دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ	اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے، ہم نے ان
نُزُلًا (کہف۔ ۱۲)	کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا	کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی
إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف ۱۲۰)	ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ	کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ
وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ	تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے
لِلْمُشْرِكِينَ (حم السجدہ)	گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی درخواست کرنی چاہیئے، یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور انکے عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے، چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، جہاں نہریں نہیں وہاں نہریں جاری کر دو، ہمارے سنسان جنگلوں کو باغ و بہار بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو۔

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ	اور انھوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے
الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ	جب تک تو ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے
نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝	لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا کہ تم
أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ	کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو یا خدا کو اور فرشتوں
تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ	کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لئے سونے کا ایک گھر نہ ہو
بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۝ وَلَنْ	جائے، یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر
نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا	چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے

نَقْرَؤُهٗ (بنی اسرائیل-۱۰)

ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں،

یہ امور مشکل و محال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں،

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ وَمَا مَنَعَ
النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا
اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ
مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ
السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (اسرائیل-۱۱)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں، رسول اور لوگوں کو جب اس کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا، مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے کہہ دے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے تو ہم آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اتارتے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوتے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا،

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا۔

هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ
وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (انبیاء)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو،

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا، مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوتی، ان سے کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے آئے ہیں،

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا
اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (انبیاء-۱)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جن کو ہم وحی کرتے تھے، جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے،

یہی جواب سورۃ یوسف میں دیا گیا،

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ
مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف-۱۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے، وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے،

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ
فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَيِّنٰتِ
وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ
يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل-۶)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کر دو، جو ان کی طرف اتارا گیا اور تاکہ وہ سوچیں،

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت

کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے، ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے ایک پیغمبر انسان رہ کر بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے مابہ الفارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے، ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا، وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثلاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لیے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں، ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں، لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں، وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور باایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں وہ ایسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں، جیسے دوسرے کمزور جاہل اور بلید الذہن انسان، یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے کہ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متصل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں أَيُّكُمْ مِثْلِي أَبِيتُ يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِينِي[1] تم میں کون میرے مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ کیا تم انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے۔

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، آپ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا وَكَذٰلِكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ[2] اور اسی طرح سب انبیاء ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں، مگر ان کے دل نہیں سوتے، کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ تم کو اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ایسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے، کیا عام انسانوں کو قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] صحیح بخاری باب الاسراء۔

جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو؟ وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ، اور اس نے اس (فرشتہ) کو آسمان کے کناروں میں دیکھا، کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتساب سے اُمہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا، اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اُمہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ (احزاب۔ ۴) اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو، جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو۔ تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کے مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے، اسی لئے کسی انسان کو صاحبِ وحی ہونے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطا

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی چند فروگزاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا، اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوتی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے، مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی، اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی، مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے، صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں اور اس سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے۔ مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں، ادھر لغزش ہوتی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی، اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا یا ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو خلائے الٰہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے، ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرحِ صدر سے فیصلے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جس کا تعلق حکمِ دینی، شریعتِ ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے، اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین اور شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا و غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرا تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں نہیں ہیں، کیونکہ اجتہادِ نبوی نہ

ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور وفکر، نظر واستدلال اور استقراء وتمثیل کے منطقی اور اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نورِ رسالت فہمِ نبوت، حکمتِ ربانی اور شرحِ صدر پر مبنی وقائم ہوتا ہے، جن میں پیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لئے لفظ "اجتہاد" جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے

ایک اور بحث بھی پیشِ نظر رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوتی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا، وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا، بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا، اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم وکرم اور شفقت کی نگاہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم وکرم وشفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا اقتضا یہ تھا کہ وہ سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں، جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں ۱۔

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آکر بیٹھے آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم بھی آکر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے، وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بدحال بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں، اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے، عبداللہ ابن مکتوم کا آنا جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا، اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ ابن مکتوم کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی، اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی یہ سمجھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ وموعظت کی طرف سراپا متوجہ رہے، اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَمَا يُدْرِيْكَ	تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر
لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى	کہ شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو تیرا سمجھانا کام آتا، وہ جو پروا
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى	نہیں کرتا، سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا

وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ ۝ وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ ۝ وَ
هُوَ يَخْشَىٰ ۝ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ ۝ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝
فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ۝ (عبس۔ ۱)

تجھ پر کوئی الزام نہیں، وہ جو تیرے پاس دوڑا آیا اور (خدا
سے) ڈرتا ہے، تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ
تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا بھلا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا و غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں، اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلے میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے انکو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے، مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا، اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں، علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے، اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجود علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ

(۲) سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مالِ غنیمت حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرِ فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آکر سب سے پہلے سریۂ نخلہ میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا، اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے، جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفاء تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے انکو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے، نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بیکسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب، اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی اور مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے، غلبہ، قوت اور دولت پاکر بھی اس کے نشہ میں سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے، یہ بڑا ہی مشکل کام ہے، جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردعمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے، یہ کوئی آسان کام نہیں، سیاسی و مذہبی تاریخوں میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ ایسا نہ ہو سکا، خود عیسائی قوم کو دیکھئے جس نے یہودیوں اور بت پرست رومیوں کے ہاتھوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں، لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعۃً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے، تو عیسائی قوم کا پچھلا صبر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے، انتقام کے نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوہ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تنگدست

مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسبِ معاش سے محروم اور معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغدار تھے، وہ دفعۃً مغلوب ہو گئے ان کے بڑے بڑے سردار اُن کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے اور انہی کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یکدلی، یکجہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفرقہ اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و ظفر نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوتِ رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت، زرِ فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلافِ رائے رونما ہو گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امرِ اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ اے ابوبکرؓ تمہاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے اور اے عمرؓ تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی۔[1] آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰؑ کی رحمدلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جو ان میں نادار تھے، ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر آزادی کا فرمان عطا کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحیِ الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعۃً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی، مالِ غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصل حقدار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا اس لئے ہم کو ملنا چاہیئے۔[2] یہی اختلاف زرِ فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہوگا، جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (انفال)

(اے پیغمبر!) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ مالِ غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو تم مومن ہو۔

حضرت عبادہؓ بن صامت سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا:۔

فینا اصحاب بدر نزلت حین اختلفنا فی النفل وساءت فیہ اخلاقنا فنزعہ اللہ من ایدینا فجعلہ اللہ الی رسول اللہ صلی اللہ

یہ سورہ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مالِ غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق بُرے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ کتاب المغازی حیدرآباد دکن۔ [2] سیرت ابن ہشام، ذکر الفئ ببدر والاساری ج ۲ ص ۲۹۱ مطبوعہ مصر۔

عليه وسلم فقسمه رسول الله صلى الله عليه وسلم بين المسلمين عن سواء۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں دے دیا تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۔ (انفال - ۹)

کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں تاکہ زمین میں فساد کریں، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے، اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا حلال و پاک کر کے کھاؤ، اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زر فدیہ وصول ہوا یا وصول کیا جا رہا تھا، اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنْ يَعْلَمِ اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (انفال - ۱۰)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے زر فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زر فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زر فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا، ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور ان مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہرحال وہی مال غنیمت اور زر فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرما لیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی، وہ آخر کار اجتہاد نبوی کے مطابق مناسب موقع پر جائز اور حلال و طیب ہی ٹھہرا لیا، اور غلطی غلطی باقی نہیں رہی، مال غنیمت لینے کے متعلق كُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ کا حکم اسی وقت آ گیا اور فدیہ لینے کی اجازت فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً کے الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بد اخلاقی پیدا ہونے والی تھی، اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا، اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیئے گئے۔

تیسرا واقعہ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کی دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر لینے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش

۱؎ سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۹۳ ۲؎ مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرت النبی جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان۔

آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہو گئی، مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگزر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ، عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (توبہ ـ ٦ ـ ٧)

وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے واقف نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقتِ حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا، بہر حال یہاں بھی منشائے خطا اگر خطا کہی جائے تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ منافقین کی نسبت آپ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہو گی، اور فرما دیا گیا تھا کہ:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (توبہ ـ ١٠)

تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے یا نہ مانگے، اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا، یہ اس لئے کہ انھوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا، اس نے آکر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی جس کو آپ فرطِ کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی کہ یا رسول اللہ! اس کے عدمِ مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے، فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہر حال آیتِ بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بیکار و بے سود بتایا گیا تھا، مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس سے تغافل فرمایا کہ ایک مخلص کی دلجوئی تو ہو گی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپنے میں کامیابی ہو جائے گی، اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے، اس لئے حکم ہوا:

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (توبہ ـ ١١)

اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ اس کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گنہگاری کی حالت میں مرے۔

پانچواں واقعہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کیلئے کسی مباح چیز کو جو آپ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا

عہد فرما لیا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کرے اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی، اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا، تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی، اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے، ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتداء میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے، اور یہ ایک طرح سے شریعت الٰہی میں تبدیل و تحریف کا مرادف ہو جاتا، اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبر کو کسی کی دلجوئی اور خاطر داری کی پروا نہ چاہیئے، فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (تحریم-۱)

اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے، مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی و معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس کو اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں، اور اسی وحی الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی، اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے، جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمت الٰہی نے پروا نہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الٰہی و شریعت ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد و ہدایت کی معرفت سے وہ کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسان کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ الٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو، استغفر اللہ ثم استغفر اللہ، اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر اللہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں، جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار شریعت عمر فاروق رضی اللہ عنہ برسر منبر فرماتے ہیں۔

یا ایہا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا لان اللہ کان یریہ وانما ہو منا الظن والتکلف (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

اے لوگو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے، ہمارا گمان، اور از خود کہنا ہے۔

وہ رائے نبوی جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے اور اس کا نام بظاہر اجتہاد اور انسانی رائے نہیں بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے،

حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے، قرآن پاک میں ہے،

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (نساء ۔ ۱۶)

ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دکھایا، سوجھایا، اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی، وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے، جس کی نسبت خود آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا،

انا اقضی بینکم برأیی فیما لم ینزل علیّ (ابوداؤد ۔ اقضیہ)

میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوتی اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دستگیری کرتی اور صحیح راستہ پر لے آتی جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو اراءت الٰہی ہوتی تھی یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ اراءت الٰہی (خدا کی طرف سے سجھایا جانا) تاکہ آپ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں، غلط نہیں ہو سکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مقدمہ سے فرمایا،

"میں ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں" (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے اس لئے امت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سرتاسر مغالطہ ہے، اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں، اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی [illegible] و صواب اور

عادلانہ نہیں ہوتا تھا، یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے اور اس ارادت الٰہی کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا، اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط کے مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی، آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں فَشَتَّانَ بَيْنَهُمَا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا یا برسر باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کر لے، یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا لیکن جب عدالت نبوی نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہو گئی اور غصب حق کے گناہ سے برأت ہو گئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا، گو قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا، مگر عنداللہ جو برسر حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو برسر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا، اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا، اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے صادر فرماتے تھے وہ تمام تر حق منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف، کفر و نفاق تھا، اسی لئے ارشاد ہوا کہ:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء-۹)	سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں اور مان کر قبول کریں۔
وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (احزاب-۵)	اور کسی ایمان دار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے رسول کے بے حکم چلا وہ صریح گمراہ ہوا۔

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم برسر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے، چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ	اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا بلکہ

أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (نور۔ ۶)	وہی بے انصاف ہیں

عقل بشری اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت ورسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں وہی عقل ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی والہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم وتجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں، اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجور کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔ فرمایا، میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا، اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سراپا اطاعت تھے، اس پر عمل کیا، اور ایسا کرنا چھوڑ دیا، پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے، آپ کا پھر گزر ہوا تو ان لوگوں نے صورت حال عرض کی، آپ نے فرمایا میں نے تو یوں ہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا ہے تو کریں، پھر فرمایا،

إِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِيْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔ (ج ۲ ص ۲۶۴)	میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہارے دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔[1]

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ۔	تم اپنے دنیا کے کاموں کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت کے یہ الفاظ ہیں،

فانی انما ظننت ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوا به فانی لَنْ اَكْذِبَ علی اللہ عَزَّ وَجَلَّ۔	میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے، اس سے یہ کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ امور دین وشریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور منجانب اللہ ہے، لیکن کھیتی باڑی، علاج ومعالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا ہے تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے، یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے سے ہے، آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرما لیتے، غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آکر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا محض رائے سے ہے

---

[1] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرأی، ج ۲، ص ۲۶۴ مصر میں ہیں، وص ۲۶۴ طبع کراچی۔

تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں، فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (یعنی امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو) کا حکم خدا کی طرف سے ہے، چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا، لیکن امور جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں بلکہ وحی الٰہی یا فہم نبوی سے ہوا تھا، اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حدیبیہ کے شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحت الٰہی اور حکمت ربانی پر مبنی تھے، ان کے ماننے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ التفات نہ فرمایا، اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہم نبوت سراسر صحیح تھا، اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحت الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت، مشق اور کثرت عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے، لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے، ایک شخص جو فن تعمیر کی عمارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے، بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زور فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہو، وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں، اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفت ربانی کے حقائق، تزکیۂ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ داں عقل رکھتا ہو، اس کو تعمیر و کاشتکاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امور دین و شریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سراپا مبرا اور پاک ہوتا ہے، لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت و سیاست، نظم و نسق، صلح و جنگ، سامان و اسلحۂ جنگ و سواری، صنعت و حرفت، طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کلی مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا، اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں، پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم و نسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو، لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے، اس لئے ان کو ہمیشہ کے

لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت

گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی میں علم و فہم کے تین درجے ہیں، وحی، ملکۂ نبوت، اور عام عقل بشری، ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے[1] اس کی حقیقت ظاہر کی ہے انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں، مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں، سلف صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا)، نبی کی حکمت قلبیہ، توفیق ازلی اور قوت تبیین سے تعبیر کیا ہے، امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبرانہ قوت اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح اسرارِ شریعت کا بیان اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیئے، جن کا تذکرہ قرآن نے جابجا کیا ہے، تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ "علم نبوت" ہے جس کو کہیں ذکر (یاد داشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ)، کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں اراءت (دکھا دینا، سوجھا دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمت نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے آل ابراہیم پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے۔

۱۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (نساء۔)	تو بے شبہ ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت لقمانؑ کی نسبت ہے،

۲۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ (لقمان۔ ۲)	اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے۔

۳۔ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ (ص۔ ۲)	اور ہم نے داؤدؑ کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔

---

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

۴۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ (بقرہ-۳۳)

اور داؤدؑ نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤدؑ کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے، اس میں سے کچھ سکھایا۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔

۵۔ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (زخرف-۶)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے۔

۶۔ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (مائدہ-۱۵)

اور (یاد کرو) جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے۔

۷۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران-۹)

اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی۔

۸۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بقرہ-۱۵)

ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔

۹۔ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۱۸)

جس طرح ہم نے تم میں تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر جتایا ہے۔

۱۰۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران-۱۷)

یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہراتا ہے۔

۱۱۔ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ

وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے

ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعہ-۱)	کھلی گمراہی میں تھے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (نساء-۱۷)	اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کرچکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کردے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے۔

۱۳۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسرائیل-۴)	یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے۔

۱۴۔ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (بقرہ-۹)	اور اللہ کا جو احسان تم پر اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو، خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے۔

خاص طور پر ازواج مطہرات کو خطاب کیا ہے۔

۱۵۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب-۴)	اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

یہ نعمت حسب تعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے۔

۱۶۔ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ-۳۷)	اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخشی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے۔

۱۷۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (نحل-۱۶)	اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کرو۔

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے۔

۱۸۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ حِكْمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر-۱)	اور ان کو اتنے احوال پہنچ چکے ہیں جن میں ڈانٹ ہو سکتی ہے پوری مؤثر حکمت تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئی ہیں جن میں حکمت کا لفظ آیا ہے، ان میں کہیں "حکمت" کا لفظ تنہا آیا ہے اور کہیں کتاب کے بعد آیا ہے، کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک "صحیفہ ربانی" اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے "نوشتہ الٰہی" اور "علم الٰہی" جیسے لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ (اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا) مذکورہ بالا آیتوں میں تو کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفۂ ربانی

یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے توراۃ و قرآن وغیرہ لیکن حکمت کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟

حکمت کے لغوی معنی دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے؟ اس تحقیق کے لیے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے، سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب جمہرۃ اللغۃ میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے۔

فکل کلمة وعظتك او زجرتك او دعتك الى مكرمة او نهتك من قبيح فهى حكمة و حكم (جلد ۲ ص ۱۸۶ حیدرآباد)

ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے۔

الحكمة من العلم والحكيم العالم وصاحب الحكمة والحكيم المتقن للامور (جلد ۲ ص ۲۰۶ مصر)

حکمت یعنی علم، اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم (ج ۱۵ ص ۳ مصر)

اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں۔

والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة الاشياء وايجادها على غاية الاحكام ومن الانسان معرفة الموجودات وفعل الخيرات (ص ۱۲۶ مصر)

اور حکمت، علم اور عقل کے ذریعہ سے سچی اور صحیح بات کو پہنچنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے اصطلاحات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے، ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے[1]۔

۱۔ قال مالك وابو رزين الحكمة الفقه فى الدين والفهم الذى هو سجية ونور من الله تعالى۔

(۱) امام مالک اور ابو رزین کا قول ہے، حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے

۲۔ وقال مجاهد: الحكمة فهم القرآن۔

۲۔ مجاہد کا قول ہے حکمت یعنی قرآن کا فہم۔

۳۔ وقال مقاتل: العلم والعمل به لا يكون الرجل حكيما حتى

۳۔ مقاتل کا قول ہے، حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں، کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ

---

[1] زیر آیت وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الآیۃ ج ۱ ص ۳۹۲ مطبوعہ سعادت مصر

یجمعھا۔	علم اور عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔
۴۔ وقیل: الحکمة القضاء۔	۴۔ بعضوں کا قول ہے، حکمت فیصلہ کرنا ہے۔
۵۔ وقیل: ما لا یعلم الا من جھة الرسول۔	۵۔ کسی کا قول ہے، حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہوسکے۔
۶۔ وقال ابو جعفر محمد بن یعقوب: کل صواب من القول ورث فعلا صحیحا فھو حکمة۔	۶۔ ابوجعفر کا قول ہے، ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔
۷۔ وقیل وضع الاشیاء مواضعھا۔	۷۔ کسی کا قول ہے چیزوں کو اپنی اپنی جگہ پر رکھنا حکمت ہے۔
۸۔ وقیل: کل قول وجب فعله۔	۸۔ ایک اور شخص کا قول ہے، ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو، حکمت ہے۔

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں۔

۱۔ قال مالک: المعرفة بالدین والفقه فی الدین والاتباع له۔	۱۔ مالک کا قول ہے، دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔
۲۔ قال ابن زید: الحکمة الدین الذی لا یعرفونه الا به صلی اللہ علیه وسلم یعلمھم ایاھا قال والحکمة العقل فی الدین وقرء ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا وقال لعیسٰی ویعلمه الکتب والحکمة والتوراة والانجیل، وقرء ابن زید، واتل علیھم نبا الذی اتینه ایتنا فانسلخ منھا قال لم ینتفع بالایات حین لم تکن معھا حکمة قال والحکمة شیء یجعله اللہ فی القلب نور له به۔	۲۔ ابن زید کا قول ہے، حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہی کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰ کے متعلق کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراة اور انجیل سکھاتا ہے۔ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ان کو اس کا حال سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں، تو وہ ان سے الگ ہوگیا، یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کیونکہ ان کے ساتھ حکمت نہ تھی، انہی کا قول ہے کہ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ اپنے بندے کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔
۳۔ عن قتادة: والحکمة ای السنة۔	۳۔ قتادہ سے مروی ہے، حکمت یعنی سنت نبوی۔

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔

۴۔ قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحکمة انھا العلم باحکام اللہ التی لا یدرک علمھا الا ببیان الرسول صلعم والمعرفة	۴۔ ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان و تشریح سے معلوم ہوسکتے ہیں اور ان کی اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں، ان کی

بها وما دل عليه ذلك من نظائره وهو عندي ماخوذ من الحكم الذي بمعنى الفصل بين الحق والباطل۔	معرفت کو کہتے ہیں اور "حکمت" کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں،

"وسمعت من ارضى من اهل العلم بالقرآن يقول: الحكمة سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم (ص ۸)	"میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں۔

وسنته الحكمة التي في روعه عن الله عز وجل (ص ۲۸)	اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو، تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں، حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط صواب و خطا حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقراء کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحب حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت کامل بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ ہی اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف بحرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحت وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں، شاعری انشاء پردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں، اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے، وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے، یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جد و جہد اور سعی و محنت سے نہیں بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام حکمت ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد اس کو معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک لوگوں کو عطا ہوتی ہے اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں، لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت (حکمت) کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمان کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے، اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، "اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی، آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرھویں آیت میں حکمت محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے، شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان،

قرابتداروں اور بیکسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت، ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (اسراء۔ ۴)
یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں یعنی وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے، یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت حکمت والا قرآن ظاہر کی ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (لقمان ویونس) وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یٰس) وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (آل عمران) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "حکمت" کی بعض اہم تعلیموں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آپ مقتطر بنا دیتی ہے، یہ چیز انبیاء کو کتاب الٰہی کے ساتھ ساتھ عام طور پر ملتی ہے، فرمایا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران)
اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانشمندی پر مبنی ہوتا تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی اس لئے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے جن کا نہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا، پندرہویں آیت میں ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى[1] فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب۔ ۴)
اے محمد رسول اللہ کی بیویو! تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و دانائی کی باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امورِ دین سے متعلق نہ ہوتیں تو انکے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں ہے۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (جمعہ۔ ۱)
وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی تعلیم وہ دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، اور جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے، جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔

---

[1] لفظ يُتْلٰى سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لئے خاص ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے بلکہ الفاظِ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ (زخرف ۶)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے، تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی۔

بارھویں آیت میں ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا (نسا - ۱۱)

اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کرے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا، اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا، اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوتی ہے، الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتاب الٰہی کے ساتھ، حکمت ربانی کے انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینۂ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں حکمت، موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول حکمت کو جگہ دی گئی ہے

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (نحل ۱۶)

تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔

سچی صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا۔

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ (قمر ۱)

دل کو پہنچ جانے والی حکمت۔

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور ہر بھلائی کی اصل ہے، پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے اس لئے ارشاد ہوا۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (بقرہ ۳۷)

جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت نیکی (دولت) دی گئی۔

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جن سے حکمت کی حقیقت واضح ہو گی اور کم از کم قرآن اقل میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہو گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا۔

۱؎ ولابین لکم میں حرف علت سے قبل واو آیا کرتا ہے جیسے ولیکون من الموقنین، یہ حرف عطف نہیں۔

اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً وَّاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا — بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔

ایک حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریروں کو جادو کہا گیا ہے، اس تقابل سے ظاہر ہے کہ حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو مفہوم سے بلند تر ہے لیکن سحر و جادو کے مافوق الانسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشر تخیل ضرور ہے، اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل و فہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اور اردو میں اس حقیقت کی حکمت کے ساتھ لفظ "الہامی" بڑھا کر ادا کیا جاسکتا ہے یعنی الہامی حکمت۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرے رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِکْمَةَ فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَیُعَلِّمُهَا (صحیح بخاری کتاب العلم) اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے، تو وہ اس کے ذریعے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے، جب عام انسان کا یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصول دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیئے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ حاکمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے۔

یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ (جمعہ-۱) — وہ رسول ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

(۱) خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا،

(۲) ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک و صاف کرنا اور سنوارنا،

(۳) ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو۔ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا خاتمہ کیا، کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلوا (یعنی تلاوت کرتا ہے) ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتیں پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے، تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے، خصوصاً جب کہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہے، وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہتا ہے، کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ سنا دینا اور پڑھا دینا یا دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا، اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معنی کو پھیلانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے

اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائضِ نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی، اور اس کی تعمیل بھی امت کے لیے ضروری ہوگی، آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہؓ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل کے ذریعہ سے محفوظ رکھا اور وہ احادیث و سنن کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد "حکمت" کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں، کتاب الٰہی، وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن، سینہ نبوی کی طہارتِ حکمت کا، اس مقام پر امام شافعی کی یہ تحقیق پیش نظر رہے۔

وسنتہ الحکمۃ التی القی فی روعہ عن اللّٰہ عز وجل (کتاب الرسالۃ مصر ص ۲۰)

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحکمۃ فہم القرآن حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوتی سنت ہے اور اسی معنی کو امام مالک اور ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ حکمت معرفت دین، فقہ دین اور اس علم دین کو کہتے ہیں، جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کرکے اس کو منور کر دیتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نورِ نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و سینہ میں ودیعت کیا تھا اور جو کچھ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں، مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی، انبیاء کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی، حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کرکے اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔

یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِکَ (مریم-۳)

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضرؑ کے متعلق ہے۔

وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (کہف-۹)

اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر "اپنے پاس سے علم سکھانے" کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت کوشش اور جد و جہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں، جو انسان کے طبعی ذرائع علم و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، یہی علم

خداداد ہے اور اسی لئے صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا (نمل ۔ ۲)

اور بے شبہ ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔

حضرت یوسفؑ کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ (یوسف ۔ ۱)

اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشاء وحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاقِ کلام سے علم کے یکبارگی دیئے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تو تاویلِ احادیث کا علم بیک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے، اسی لئے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں۔

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ (یوسف ۔ ۵)

یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے کہ خواب کی تعبیر بتلاتے وقت ان پر وحی آکر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاء کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا۔

وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۔ (ذاریات ۔ ۲)

اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی۔

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (حجر ۔ ۴)

ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں۔

یہاں لفظ عَلِيْم اختیار کیا گیا ہے، عالم نہیں، اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے، ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے، اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم

بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔

والحکم بالشیء ان تقضی بالشیء بانه کذا او لیس کذا سواء الزمت ذالک غیرک او لم تلزمه (۱۲۶ مصر)

کسی شے پر حکم کرنا، یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔

الحکم العلم والفقه والقضاء بالعدل (ج ۱۵ ۔ ۳)

حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۔ (یوسف ۔ ۳)

اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے۔

وَلُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء-۹)	اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا (انبیاء-۶)	تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھایا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۚ وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا (مریم-۱)	اے یحییٰ! کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (جاثیہ-۲)	اور بلاشبہ ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں، یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے، یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے جیسے:

فَاحْكُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ (ص-۲)	ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔
فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص-۲)	تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔
وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (مائدہ-۶)	اور تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ (انبیاء-۶)	اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔
وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ (شوریٰ-۲)	اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گن کر کہی گئی ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ (انعام)	یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت و سلطنت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمانؑ اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیجئے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا، اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح و صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان

پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا، غلط فہمی کا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالئے۔

> مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (آل عمران ۸۰)

کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھلاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا، ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک جب بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے حکومت و سلطنت نہیں تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو۔

> قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ (انعام ۔۷)

کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو، میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا، وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس سے صاف و صریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم، فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے، شرح صدر کے معنی "سینہ کھولنے" کے ہیں، عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے، اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے، جمہرۃ ابن درید میں ہے۔

> والشرح من قولهم شرحت للشيء اي اوضحته وكشفته وشرح الله صدره فانشرح اذا انسع لقبول

شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے

النحل (۲-۳۴)

قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔

صحاح جوہری میں ہے۔

الشرح الكشف تقول شرحت الغامض اذا فسرته۔

شرح یعنی کشف (کھولنا)، تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کی تفسیر کر دی۔

لسان العرب میں ہے۔

الشرح الكشف يقال شرح فلان امره اوضحه وشرح مسألة مشكلة بينها وشرح الشيء يشرحه شرحا وشرحه فتحه وبينه وكشفه وكل ما فتح من الجواهر فقد شرح ايضا تقول شرحت الغامض اذا فسرته وشرح الله صدره لقبول الخير يشرحه شرحا فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع۔

شرح یعنی کشف ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جاتے تو اس کی شرح کی گئی تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی یعنی تفسیر کر دی، اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا تو وہ وسیع ہو گیا۔

قال ابن الاعرابي، الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البيان، والشرح الفهم۔

ابن اعرابی نے کہا، شرح کے معنی ہیں، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ أَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ (طٰہٰ-۲)

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معنی کے القاء اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ (انشراح-۱)

کیا ہم نے اے محمدؐ! تیرے لئے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔

شرح صدر اور سینہ کھولنے کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رویا یا بیداری میں فرشتوں نے آکر سینہ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لاتے اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔ اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعتاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک و صاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و نسائی ابواب معراج و اسراء و فرائض الصلوٰۃ و مسند احمد بروایت انس بن مالک و سنن ترمذی تفسیر سورۃ الشراح۔

بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے، تو بھی یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینۂ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا، بہر حال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شق صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بھی بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ قرآن پاک میں موجود ہے، سورۂ زمر میں ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (زمر-۳)

بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا پورا یقین آگیا، اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر الٰہی روشنی حاصل ہے یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی وبیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ "شرح صدر" کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں، بلکہ صدر اول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

(۱) پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر لشکر کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آکر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفۂ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس نے اپنی جان ومال کو مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیقؓ جواب دیتے ہیں، خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے، نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے، اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا، اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

فواللہ ما ھو الا ان قد شرح اللہ صدر ابی بکر فعرفت انہ الحق (بخاری کتاب الزکوٰۃ)

تو خدا کی قسم وہ تھا، لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکرؓ کے سینہ کو تو میں نے جان لیا وہی حق ہے۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوگئے، اس وقت حضرت عمرؓ نے آکر حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر لکھ لیا جائے حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، لیکن حضرت عمرؓ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بھی بات آگئی، اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں۔

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہ صدری لذالک ورایت فی ذلک الذی رای عمر (صحیح بخاری جمع القرآن)

تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا، نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی، اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا، ایک جگہ قرآن میں ہے یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (روم) "وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں" ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں، لیکن دوسری جگہ ہے، هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ "کیا وہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں" یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں بلکہ مقصود عام علم ہے، تو یہاں معنی یہ ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے، بلاغت کی کتابوں میں هُوَ يَأْمُرُ وَيُعْطِيْ وَيَمْنَعُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكٰى کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالیے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کیلئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے کہ مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لیے سینہ کھول دیا، مانعین زکوٰۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیا علیہم السلام کے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیاء کے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امور کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتا ہے اور انبیاء کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان دونوں موقعوں پر "لِی" اور "لَکَ" ہے، حضرت موسیٰ کہتے ہیں "میرے لئے سینہ کو کھول دے"، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا ہم نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا" سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لیے" کے اضافہ کی ضرورت اور اس "لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لئے یا تائید کے لیے یا فائدہ کے لئے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہوا۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کا جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوا، اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی نمایاں ہوگا؟ دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور [illegible] کی صورت [illegible] ہمارے سامنے ہیں۔

تبیین کتاب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں، وہ علیٰ قدر مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے اس لئے اس کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب خلفائے راشدین، اکابر صحابہ، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام کو ہمیشہ ملتا رہا، اسی کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یابان علوم نبوت اور حاملین اسرار شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے، فرمایا

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۚ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۚ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؕ (قیامہ۔۱)	تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تاکہ تو اس کی (تلاوت و اشاعت میں) جلدی کرے، بے شک ہم پر ہے قرآن کا جمع کرنا اور اس کو پڑھانا اور جب ہم تجھ کو پڑھا دیں تو تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔

اس بیان و شرح کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوتی ہے جو قرآن میں مذکور ہے، پھر کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوتی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث و سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (نحل۔۶)	اور ہم نے تیری طرف نصیحت (کی کتاب) اتاری تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔

بیان اور تبیین کے لغوی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ "تبیین" اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے، اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہیں، سیاق و سباق اور موقع و محل سے ہو سکتی ہے، مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے،

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (مائدہ۔)	اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کر دے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے،

یہاں "تبیین" صریح طور سے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں "تبیین" کے معنی یقینی طور پر اظہار و اعلان کے ہیں، لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً	اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کر دے اس کو جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لئے

لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (نحل - ۹) رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو وہ اس توضیح و تفسیر کے بعد دور ہو جائے۔ اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے، جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل - ۶)

اور ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتا دے شاید کہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کے معنی ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے۔ امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے کے نہیں، سوچنے اور غور و فکر کرنے کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی۔ اب جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہو گی، اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہو گا، جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے۔

ارمت انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو سکے، لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں رہتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا، تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرا دی، گو انسانی ذرائع حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا، مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے، خلفائے راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نو نو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت، نور بصیرت اور اراۃ الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوتے تھے اپنا ماخذ قرار دیا، اور یہی اصول بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا اور نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلۂ نبوی کے معصوم و مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر پرکھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، اور وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ
بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (نساء ۱۶)

(ہم نے اے پیغمبر! تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ فیصلہ کرے۔

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے، اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو تھا، وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو دوڑے ہوئے عدالت نبوی میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا، لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا
فَرِيقٌ مِنْهُمْ مُعْرِضُونَ ۝ وَإِنْ يَكُنْ لَهُمُ الْحَقُّ
يَأْتُوا إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ
أَمِ ارْتَابُوا أَمْ يَخَافُونَ أَنْ يَحِيفَ اللَّهُ
عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ ۚ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝
إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى
اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ
يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ
اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

(نور ۔ ۷)

اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں، کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں، ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جاتے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا، انہی لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا ہے اور اللہ سے بچ کر چلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء ۔ ۹)

تو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں اور

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ
أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ
اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا (احزاب ۔ ۵)

مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

یہ اطاعت اور مطلق سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت

اور سلطانِ زمانہ کے لئے نہیں، یا انبیاء کے لئے خاص ہے، دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہمِ نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارائت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا، لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحیِ قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضا مندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے بحکمِ خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے، اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے، ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں، اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے خطاب کر کے فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آل عمران-۱۰۰)

اے مومنو! اگر تم اہلِ کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیئے، در آں حالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں ایک تو آیاتِ الٰہی جو انکو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بہکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا، اگر صرف کتاب الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی، تو رسول کے ذکر کی حاجت، بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی، اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتابِ صامت (قرآن) اس کی کتابِ ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا۔

انی تارک فیکما الثقلین کتاب اللہ وسنتی

مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں، اللہ کی کتاب، اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں، قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد جاری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ

انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں، نبوتِ محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے ایک رسول

جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف دو پہلے اوصاف سے الگ ہے، یہ پاک و صاف کرنا آیات الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضان صحبت، حسن اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ بدکار اور گمراہ قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا، ان کا یہ وصف تزکیہ وحی و الہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتاب حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور

اسی لئے نبوت کا سینہ صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے، وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے جس سے اندھے دیکھتے گمراہ راہ پاتے اور ان کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں، خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ	اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکنا
مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ۝ وَّدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ وَ	کرنے والا، خدا کی طرف اسکے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے
سِرَاجًا مُّنِيرًا (احزاب - ۶)	والا چراغ بنا کر بھیجا۔

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان، زبان و دل، خلق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو ان ہی چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوار الٰہی ہیں، تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات و ملکوت کی رویت

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوت سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کی سماعت کرتے ہیں، اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْ إِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے
وَالْأَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (انعام - ۹)	تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔

استعداد نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لئے یہ رویت و بصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوتی، حضرت موسیٰ کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدات روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا (اسرائیل - ۱)	تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

دوسری جگہ ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (نجم-۱)	دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، کیا اس پر اس سے جھگڑتے ہو؟ اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى (نجم-۱)	نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ایک اور مقام پر ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ (تکویر)	اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کنارے میں دیکھا۔

یہ مشاہدہ وحی و الہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماعِ غیب

جس طرح آیات و ملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسۂ بصارت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے، قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء-۲۲) اور خدا نے موسیٰؑ سے بات کی۔

حضور کو حکم ہوا۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (طٰہٰ-۶)	اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انھوں نے اس کی آوازیں سنیں نَادَيْنَا ہم نے پکارا، بار بار یہ مضمون قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ و دعوت

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی قوتیں اس کو بخشی گئی ہیں، ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس کے سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں، ان کو رگِ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا، اور مال و منال اہل و عیال، غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء کی تبلیغ و دعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انھوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار و قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انھی کی دعوت و تبلیغ اور جد و جہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں، اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے ۳۱ : کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (احزاب-۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ بس ہے حساب (اعمال) کے لیے۔

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (طٰہٰ)

فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ ان کی حفاظت کا خود شہنشاہ دو عالم ذمہ دار ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (مائدہ-۱۰)

اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اور تو نے نہ کیا تو اس کے پیغام کے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا، اور اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔

انبیاء کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذاب الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنا، اور انبیاء کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو جاتی ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء-۲۳)

یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کیلئے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔

ان سب نے پیغام الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (اعراف-۹)

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (اعراف-۱۰)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا، اور تمہاری خیر خواہی کر چکا لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ (اعراف-۱۰)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔

یہ بھی فرمایا کہ:

لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ (ہود - ۵)	میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا میری مزدوری تو اس پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا
لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (ہود - ۳)	میں اپنی تبلیغ کے بدلے تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضورؐ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچا دینا، اس کا کام ہے ... اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے نہ اس کا اس کو حق ہے ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفےٰ (برگزیدہ) مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک و صاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والا)، اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا حق تو ہر عربی داں کو حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا، اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں تشریع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصلی شارع ہے اب اگر رسول کے لیے بھی وحی کتابی سے الگ شریعت بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں،

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقۂ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریق خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس

کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے، ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، رہنما و ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے۔

إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرٌ (ص، رعد، نازعات)	تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے

ایک جگہ ہے۔

إِنَّمَا أَنَا مُنْذِرٌ (ص۔ ۵)	میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں

إِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (مائدہ)	ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے مبین اور شارح نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس پیغام کا اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوا لینا نہیں، اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار اور عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے، قرآن میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران۔ ۲)	کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا تو ہدایت پائی اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیغام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کا دیکھنے والا ہے۔

مفہوم بالکل صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا، اس کا فرض ادا ہو چکا اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ (رعد۔ ۶)	تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ إِلَّا مَنْ تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ	تو (اے پیغمبر!) تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ان پر داروغہ نہیں لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے

عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ-۱)

اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما اور فرماں روا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوا لے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ (شوریٰ-۵)

تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

قَالُوا مَا أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَمَا أَنْزَلَ الرَّحْمَٰنُ مِنْ شَيْءٍ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّا إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (یٰسین-۲)

کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسولوں نے کہا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بے شبہ تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں سے منوانا نہیں بلکہ ان تک خدا کا پیام پہنچانا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ كَذَٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَهَلْ عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (نحل-۵)

اور مشرکوں نے کہا، اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (خدا کہتا ہے) کہ ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، تو ہمارے پیغمبروں پر کھول کر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے۔

وَإِنْ تُكَذِّبُوا فَقَدْ كَذَّبَ أُمَمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (عنکبوت-۲)

اگر تم جھٹلاؤ تو کیا ہے، تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے۔

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا تَكْتُمُونَ (مائدہ-۱۳)

رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا، اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (مائدہ-۱۲)

اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو، اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا بوجھ اس پر

وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نور-۷)

ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے اور اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں، لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (نحل-۱۱)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انھوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر کچھ نہیں ہے مگر کھول کر پہنچا دینا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (تغابن-۲)

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

پیغمبر کا قول ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ (ہود-۵)

تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا یعنی میرا فرض ختم ہو چکا۔

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے یہاں یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور بتانے کا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر انکا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت دوسرے ملک کے باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید وہی نبوت وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزاء و سزا اور عمل کی پرسش، اس لحاظ سے انبیاء کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لئے فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الاٰیۃ۔ یعنی خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا جو نوح کو اور دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے، لیکن انبیاء کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جزو توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو ان کے اخلاق و وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء-۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن اس کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، میری ہی پرستش کرو۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (نحل-۵)

اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا

اہم ترین جزو توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض وغایت

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض وغایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جاسکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو نہ کہ گواہ۔

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روزِ الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاد دلانی ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ (اعراف ۔ ۲۲)	اور جب تیرے رب نے بنی آدم کو پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو، ہم اس کو بھول گئے تھے۔

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بہانہ عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا اس لئے فرمایا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء ۔ ۲۳)	رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کا مظہر اور مورد ہے اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لئے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد ۔ ۱)	اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا۔

وَاِنَّكَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (شوریٰ ۔ ۵)	اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا (انبیاء ۔ ۵)	اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں بار بار ہُدیٰ (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت و رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (حدید-۱)	وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی کبھی دونوں پلّے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا،

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (رحمٰن-۱)	اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیئے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ فطرت ہے، اور بالارادہ دنیا کی میزان کا نام قانونِ شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نام نظام عدل اسی خدائی میزانِ فطرت سے چل رہا ہے اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزانِ شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا،

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید-۳)	ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔

انبیاء کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لئے ہے، آج یورپ کے الحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی سچائی کی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے کوئی دیندار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحارا کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی و بدی کی تمیز سے آشنا ہے تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے، آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے بلکہ صحیفۂ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بالواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نیکوکاری

حسن خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بناء پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اس لئے انبیاء کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے اور قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رَحْمَةً وَّهُدًى رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے اور اسی لئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی، خدا نے فرمایا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ۔ ۷)	اور ہم نے تجھ کو اے محمدؐ تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تائید و نصرت

انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے، پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس دعوٰی پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا۔

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ (صٰفّٰت ۔ ۵)	اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہی کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہی کو اور ان کے ذریعہ اہلِ ایمان کو کامیابی ہوگی۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (مومن ۔ ۲۰)	بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے جس دن گنہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لئے برا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعۃً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (یوسف ۔ ۱۲)	یہاں تک کہ پیغمبروں کو اپنی قوم کے ایمان سے مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آ گئی۔

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت اور حفاظتِ دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج و لشکر تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے، منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہر بیچارگی اور

تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوء ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ (ابراہیم ۷) سو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کو آخر جیت ہوگی۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (مجادلہ) اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔

خاتمہ اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

فلسفی را از پیمبر وا شناس　　آبگینہ راز گوہر وا شناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست　　جز دمے کز گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ　　آبگینہ شد سیہ چوں پر زاغ
فلسفی اندر بن چاہ نژند　　نردباں دارد بخورشید بلند
نردبانش می برد تا چند ارش　　پس بخاک افتد نگوں گشتہ سرش
واں پیمبر خود ز بام آسماں　　رشتہ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتۂ جاں را بدیں رشتہ بتاب　　پس بر آ تا بارگاہ آفتاب
ز آسماں پیغمبر آوازت دہد　　فلسفی از خاک پروازت دہد

ایں ز دورت رہ نماید سوئے جاں
واں نخواند خود ترا از کوئے جاں[1]

---

[1] از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء ص ۴۰، ۴۱ مطبوعہ مطبع شمسی حیدرآباد دکن۔

شبِ ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تاریک میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو، بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی، اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی، جس کے لئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے،

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ	جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے
يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (فتح۔۱)	ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، ان ہی کے معبد تھے اور انہی کے ناموں پر بے گنہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو، اور یہ تینوں کے تینوں تجرد و رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی، لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی، لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی، نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطر معنبر

کی خوشبو انسان کے جامۂ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور بتوں کی پرستش کی عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسان کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصہ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی، خود عرب و مضافاتِ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گزری ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا میں حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے، اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوسِ فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا مگر عہد بعثت سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال گھٹتے گھٹتے سایہ سا رہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم و ستم اور امراء کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاص اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی تعمیر ہوتی ہے فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی، اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزدان و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی معبود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا، اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران و برباد اور ترکِ ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے[1]۔ اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا وہاں کوئی

---

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب البدء والتاریخ مقدسی ذکر فرق مانویہ و تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲۔

غیر معمولی بات نہ تھی[1]، یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا[2]، عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزو ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آسکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی، بد اخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے جن کو سجدے کئے جاتے تھے، ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی، رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا، جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۂ استر میں نظر آتا ہے اور یہ کہ مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اول بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا، قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ یہ مصیبت نازل ہوئی کہ اس کے عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملک نہیں، بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امراء اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کیا، اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ خسرو نوشیرواں نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیش زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا، مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا پایۂ تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کیساتھ

---

[1] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۶۲، ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارۃ والفی جلد دوم ص ۲۶)

[2] مورخوں کی تاریخ عالم ج ۸ ص ۹۴

[3] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۶۰۰، پیرس۔

[4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم جلد ۲ ص ۲۲۳

[5] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ پیرس۔

اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری، امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ سنہ ۲۱ھ میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کی طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کیلئے بجھ گئی۔[1]

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوا ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمۂ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی، اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزدان و اہرمن نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے برابر بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انہوں نے جواب میں کہا، ہم عربوں میں دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اسی لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، سر جان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے قزاقان عرب کا لقب دلواتا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں۔

> "یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لئے یادگار ہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن شتر سواروں کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور رہنما ان کا ذکر کرتے تھے اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا، مسلمان، فارسی مورخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اوہام پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے خدا نے محمدؐ کی صداقت کو ظاہر کر دیا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آجاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی ہو جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قعر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو اس کے لیے پرجوش قزاقان عرب کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔"[3]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی، نقاہت و کمزوری "قزاقان عرب" ہی کی ترقی کی کیوں تمہید بنی؟ کیا ننگے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے جو عراق و ایران کے آخر آخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے، واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی، "یزدان" اور "اہرمن" کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا، نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں بادشاہ، عادل و دادگر کا خطاب بھی پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ اُبل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

---

[1] تاریخ طبری واقعات سنہ ۲۱ھ ص ۲۶۰۲ مطبع بریل۔ [2] ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول ص ۱۳۳۔ [3] تفصیل کے لئے فہرست ابن ندیم دیکھو ص ۳۴۲ مصر۔

عیسائی روم

آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے، روم کی قبطی سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی، حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں مبعوث ہو کر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سُنا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں، بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بعد ان کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی اور باپ بیٹے اور روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے[1] وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی پال کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت قرار پائی۔[2] ۳۲۳ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہوگئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبولِ مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہوجاتا، تختِ سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کر دیا، اس کے لئے سوقِ منڈی کی وہ لڑائیاں لڑی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہوگیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیرِ خاکستر آگ بھی زور و شور سے شعلہ زن ہوئی اعیانِ سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہوگئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوگیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں منقسم ہو کر مختلف دعویدارانِ حکومت کے حصہ میں آئی، ناقابل فرمانرواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ وندال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت وحشیوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے مورثِ اعلیٰ نے جو بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانے کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آگیا، مورخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے۔

> "اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت اور بدقسمتی کا سامنا تھا اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پُر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت مخالفوں کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی

ے نیس ص ۵۰۵، ۱۰۔ [1] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جابجا بتصریح مذکور ہیں [2] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد اول ص ۸۸، ۴، ۱۱۹ [3] گبن کی تاریخ زوال سلطنت روم جلد دوم باب ۳۶ و باب ۳۸۔

جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔[1]

امراء نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا، جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی، محصول کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت وعداوت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امراء، وزراء اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں،

”اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین فنا بھی ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال وبربادی سے نہیں بچا سکتی تھی۔“[2]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر دجلہ ونیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی، لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹینین کے زمانہ (یعنی ۵۲۰ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت منتشر وابتر حالت میں، رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھی ہوئی تھیں اور امراء واعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے جعل وفریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز سمجھتے تھے فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فن جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد ورقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی وذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی ومنصب حاصل کرے۔

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کو ایک دم کے لئے چین سے بیٹھنے نہیں دیتے تھے، روم وفارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوتھس، ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا، خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہوگئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔[3]

---

[1] ایضاً ص ۱۶۴ [illegible] ص ۱۶۲ [2] حوالۂ مذکور ج ۲ ص ۲، [3] گبن ج ۳ ص ۳۰۷،

ملک کی عام سیاسی واخلاقی حالت سے قطع نظر کرکے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے، بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنھوں نے عیسائیت قبول بھی کرلی تھی وہ بھی باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے، حضرت عیسیٰؑ اور مریم و روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعیین نے بیسیوں فرقے پیدا کردیئے تھے، جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ وجدال کی نوبت آگئی تھی، یہاں تک کہ سنہ ۴۳۱ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا[1]، اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بار بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا، اس بنا پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے، ان پادریوں کے ایک اسقفِ اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں، ان کی تفصیل کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا، اور ان سب کو جلاوطن کردیا، ان کا مال واسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کردیئے گئے، سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا[2]، سرل کی ایک خاتون دوست ہلیشیا نامی تھی، ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آرہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کردیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اس کلیسا میں لائے جہاں[3] پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کردیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا، یہ واقعات ایسے ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں اپنی اپنی پناہ ڈھونڈتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں انھوں نے اس حقیقت کو واضح کردیا کہ ”شہزادۂ امن“ کا مذہب ان جنگجویوں کے ہاتھوں تباہ وبرباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں، اپنی تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں،

> ”اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہوجانے کے بعد پوری شان وشوکت اور شاہی عظمت

---

[1] گبن ج ۳ ص ۲۴۴ [2] ایضاً ص ۲۰، [3] ایضاً ص ۳۲۲ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب وسائنس ص ۵۵۔

حاصل ہوگئی تھی، اور ہر اس تحریک کی مدد کے لئے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے، اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پرجوش و نادار و فاتح مسند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے جنھوں نے ان کے معبود آتش شمسی کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھتے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی تھی، ان کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد تھی۔[1]

مارس صاحب واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت انکو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

بہرحال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کیلئے باعث ننگ ہے، مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا حضرت مسیحؑ کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی کلیل معمہ کو قابو میں لانے کی سعی کی گئی، جس سے حضرت مسیحؑ کے "وہی ایک ہے" کی تعلیم ہمیشہ کے لئے ان کے مذہب سے ہٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ ایک قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے، ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے، مسیح و مریم، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔[2]

سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"گرجا کے پادریوں (CLERG) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن و محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کئے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی، اکی نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ بغداد کے مناظرات میں مشغول ہوگیا اور ایرینس سیلینس نسطوریس اور یوٹیکیس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں۔ مغربی چرچ میں ڈیمیس اور ارسیلی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈیمیس کی فتح ہوئی، اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نیلس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل کئے ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے اس لئے اس ذریعہ سے ان کو گرانبہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک و احتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی، ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے، جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی، اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم نہ تھا۔

بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو خرابیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی تبدیل ہوگئی ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔

---

[1] مارس کی تاریخ ہندوستان جلد اول ص ۱۸۳، [2] سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [3] سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۶،۲۵۔

عقائد کی خرابی کے علاوہ روم و فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لیے مشہور تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ لوگوں نے روند ڈالا تھا یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے انکی قوت کو زائل کر دیا تھا"[1]

رومیوں نے عیسوی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

"دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں[2] جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے، متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا، عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا، مریم عذرا کو خدا کی ماں کا لقب دیا گیا"[3]

اسی زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا جو حضرت مریم کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے[4] اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلافات باہمی نہایت شدومد سے پیدا ہوتے یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنا پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار رم ہو گیا، اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ و تقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے ا کو بڑی دینی خدمت مل جاتی تھی[5]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی ، مذہبی مناصب کے لیے کشت و خون ایک عام و معمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ب دن میں، ۱۳۷ آدمی کام آئے[6] اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر حصول زت اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں[7]۔

سلاطین اور مذہب کے حاملین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی اسراف اور ہوس پرستی، مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بیدردی کے ساتھ اسے مسرفانہ لہو و لعب اور عیاشیوں میں اڑا دیتے[8]

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ پر شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ

---

[1] معرکۂ مذہب و سائنس، ڈریپر ص ۶۲ [2] ایضاً ص ۶۵، ۶۶ [3] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ ص ۲۶ [4] ایضاً ص ۲۶

[5] ایضاً ص ۱۲۶، ۹۸ [6] تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

میں لے لئے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے، وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو بیاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے کہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔

دینداری کا سب سے اہم جزو تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی، ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کی تکلیف و عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھالی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کر لیا تھا، ماں باپ، عزیز و اقارب، اہل و عیال، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ کے کانٹے تھے، ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی باثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے۔ ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندو، ویدک عہد جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک رہا، دوسرا دور جنگ یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکماء و عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ایک ہزار قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے، اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے۔

(۱) شرک جو ابتداء ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی[1]

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی تھی[2]

(۳) مندروں کے محافظین بد اخلاقی کے سرچشمے تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے تھے[3]

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی، لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظام معاشرت کے لئے تباہ کن تھی[4]

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا[5]

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری و حمایت اور بعض پر جبر و ستم مقصود تھا، مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں۔

---

[1] آر سی دت کی ہندوستان قدیم ج ۳ ص ۷، [2] ایضاً ص ۱۰۰، [3] ایضاً ص ۲۹۳، [4] ایضاً ص ۳۰، [5] ایضاً ص ۳۳۔

(۱) برہمن کو کسی حالت میں، خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو، سزائے موت نہیں دی جا سکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ھ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہیئے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیئے۔[1]

(۶) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالتِ خمار میں جامۂ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔[2]

(۷) شاہراہوں پر آوارہ گرد جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔[3]

(۸) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی، جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

(۹) اوہام اور خیالاتِ فاسدہ، بھوتوں، چڑیلوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون و اوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی، اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا، جنوں، دیوتاؤں، دیبیوں کا شمار از اندازہ قیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانۂ حمد تھا، ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپشا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر رحم و افسوس آتا ہے اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں، انہوں نے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں، وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے تھے۔[4] وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کر دی جاتی تھیں، اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ درآتش ہونا پسند کرتی تھیں، لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے، یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مردوں کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے۔[5] اور مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے، شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا، وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی، قانون کی بنیاد مساواتِ انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی، عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

---

[1] آر سی دت کی ہندوستان قدیم ص ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۴۴ [2] ایضاً ص ۳۴۹ [3] دیکھو ابوزید سیرافی کا سفرنامہ ص ۱۱۵، ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی ص ۸۱

[4] سفرنامہ ابوزید ص ۱۳۰ و احسن التقاسیم مقدسی ص ۴۸۲ [5] مہابھارت کے قصہ کا آغاز ہی صرف ستیارتھ پرکاش سمولاس گیارہ ص ۱۲۷ [6] مسلم حکومت کی تنظیم ہند ص ۲۲۵

اس مختصر خاکہ سے معلوم ہوگا کہ بدء اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اس قوم سے ہو سکتی ہے جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانتدار بنی، اسی لئے قرآن نے ان سے کہا وَلَا تَكُونُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ (بقرہ۔۵) اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ ہو گو یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا، قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا۔

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ۔۹)	ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل تک کر ڈالا، حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو چنانچہ قرآن مجید نے کہا۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى	بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا ان پر داؤدؑ اور مریم
لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا	کے بیٹے عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت کی گئی یہ اس لئے کہ انھوں
وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ	نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے
فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ۔	کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے، منع نہیں کرتے، ان کا
(مائدہ۔۱۱)	کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے زبور (۷۸) میں ہے۔

> "اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھو، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو، تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند جو پیدا ہوں سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو بھلا نہ دیں بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سب کے پھر انھوں نے گناہ کئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا، لیکن انھوں نے اپنے منہ سے اس (خدا) کے ساتھ ریاکاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے کتنی بار انھوں نے بیابان میں اس (خدا) سے بغاوت کی اور وہ ویرانہ میں اسے بیزار کیا، تس پہ بھی انھوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا بلکہ برگشتہ ہوتے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بیوفائی کی، وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف چلے گئے۔"

زبور (۸۱) میں ہے۔

> "اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی زمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا، تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔"

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے حضرت داؤدؑ نے ان کے متعلق یہ دعا کی کہ۔

"تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ رہ نہیں سکتا، جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں، نابود کر دے گا، اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے، اے خدا تو انہیں ملزم جان ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔" (زبور۔ ۵)

حضرت عیسیٰ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا۔

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری قبروں کے مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں، پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے پر باطن میں ریاکار اور شرارت سے بھرے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، بس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو، اے سانپو، اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بچو گے؟" (متی ۲۳، ۲۷-۳۳)

بعینہ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے۔

وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (بقرہ۔ ۷)	اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (بقرہ۔ ۱۱)	کہہ کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو تم پہلے "قتل کرتے رہے" اگر تم مومن تھے۔

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ (آل عمران۔ ۳۰)	بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سکھاتے تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۶۰-۵۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پُر درد داستان کو ان لفظوں میں ادا کیا۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (بروج-۱)	گڑھے والے لوگ مارے گئے، جو کتی آگ کے گڑھے جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے۔

۱۔ ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم گو گناہ کریں ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ[۲] (مائدہ-۳)	ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔
وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ-۹)	اور کہا کہ ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی لیکن چند روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لئے خاص ہیں، قرآن نے کہا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ-۱۱)	کہدے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں، قرآن نے انکے جواب میں کہا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ[۳] (جمعہ-۱)	یہ خدا کی مہربانی ہے وہ جس کو چاہے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (مائدہ-۶)	وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (بقرہ-۹)	تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں، یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ (بقرہ-۹)	اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے۔

نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (بقرہ-۱۲)	جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب پس پشت ڈالتا ہے، گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ	کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہش کے موافق نہ ہو، تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور

فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (بقرہ-۱۱)

کچھ کو مار ڈالتے ہو،

ایک دفعہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے، بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے اور اس جرم کے متعلق حکم کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نو مسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا، آپ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کرے گا (صحیح بخاری و مسلم کتاب الحدود، و ابوداؤد باب رجم الیہودیین)۔

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے دیکھا۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔

(بقرہ-۱۰)

پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو، حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی، اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (بقرہ-۱۱)

ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے، مگر وہ سخت نامعتمد تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس قدر سختی اور بددیانتی کا برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہل کتاب کی نسبت فرمایا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

(آل عمران-۸)

کتاب والوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

توراۃ میں اپنے بھائی کے علاوہ اجنبی سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود، یہود سے نہ لیں اور اہل

عرب جو یہودی تھے ان سے بھاری بھاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علماء ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علماء کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (مائدہ-۹)	اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے کرتوت کتنے برے ہیں، ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں باز رکھتے، ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں،
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ-۶)	جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں،
وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء-۲۲)	اور ان کے سود لینے کے سبب حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے،

اسی لئے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کرکے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ ان سے ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (مائدہ-۷)	ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انھوں نے بچا رکھا تھا ان میں سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (مائدہ-۷)	اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے، وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے، قرآن ان کو خطاب کرکے کہتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (نساء-۷)	اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے اس پر ایمان لاؤ، بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے، معاف کر دے۔
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (نساء-۸)	کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمانؑ کی تعلیم ہے

(بقرہ ۱۲) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کے پھونکتے تھے[1]۔

عرب سے باہر یہودی یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا، عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اس طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی، اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا۔

محمدؓ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقاء جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے، وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے، انہوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو صدقہ وصول کرکے ہم کو دق کر ڈالا، اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بیزار ہو جاؤ گے، انہوں نے کہا کہ میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن میں اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا، انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رُخ چلتی ہے، میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں، اس نے کہا مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے، انہوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو، اس نے کہا اپنی بیویاں گرو رکھو، انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں کیسے گرو رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا اچھا تو اپنے لڑکوں کو گرو رکھو، کہا ہم اپنے لڑکوں کو کیسے گرو رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں اپنے ہتھیار گرو رکھ سکتے ہیں[2]۔

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی، کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کرکے زیور اتار لیتے[3]، علماء اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی، جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا، لفظی موشگافیوں اور ظاہری دینداری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا، اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانۂ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آواز بازگشت تھا، وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا خیال کرتے تھے کہ ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں[4]، اسلام کی اس مصالحانہ دعوت۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۔ ۷)	اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلے میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ (توبہ ۔ ۵) اپنی دولت و

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب باب السحر ص ۸۵۷ [2] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف ص ۵۷۶ [3] دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب [4] صحیح بخاری جلد دوم باب من اتی و دیکھو ص ۱۰۱۹ [5] نساء ۔ ۸

ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے یَدُ اللہِ مَغْلُوْلَۃٌ (مائدہ-۹) خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں؛ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں، وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (بقرہ-۱۱) ان فقروں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں، ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کہ کھو چکے تھے، ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بیتابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ-۱۱) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جن کی پیشین گوئیوں سے توراۃ کے صحیفے بھرے تھے اور ان ہی سے سن سن کر یثرب کے اوس و خزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئی سے باخبر تھے[1]

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے، جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

*

---

[1] سیرت ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا، جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی تو اس کا پایۂ تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعتہً برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ[1] ہے، قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیل عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک یہ نتیجہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے جس سے نظام سلطنت میں ضعف آ گیا، چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذو نواس سے جو مذہباً یہودی تھا رعایا نے بغاوت کی اور شاہ حبش سے اعانت چاہی اس نے ۵۲۵ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذو نواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، ۵۷۵ء میں قبیلۂ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا، اور یمن شاہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے[2] ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ عیسائی ہو گیا، اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے، باقی تمام ملک میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانہ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں ان میں اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ ہے، عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللہی، عبد اللہی، خود قرآن مجید میں کفار کی نسبت کہتا ہے،[3]

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ	اور جو تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو
لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ (لقمان-۳)	بول اٹھیں گے کہ خدا نے، تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔

---

[1] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریئے ہیں، ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے، آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا (سلیمان)

[2] اکثر علمائے انساب کا بیان ہے کہ یہ قبائل یمن سے نکلے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے (سلیمان)

[3] مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا ج اول ص ۶۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان سب میں بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ معبودوں کے انکار سے اسی قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں ان ہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر ان ہی خداؤں سے پڑتا تھا، اس لئے اللہ کا خیال کچھ یونہی سا رہ گیا تھا، ان ہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے ان ہی پر قربانی چڑھاتے تھے، ان ہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین و آسمان بنا کر بے کار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے۔

وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (سورۂ زمر - ۵)	اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو دفعۃً وہ کھل جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے خداؤں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش ہوگا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے چنانچہ وہ کہتے تھے

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر - ۱)	اور ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔

ملائکہ کی الوہیت

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْأُنْثٰى (نجم - ۲) أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى ۝ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ (نجم - ۱)	جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں، تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

اس لئے جس طرح بعض یہود حضرت عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا (آل عمران - ۸)	اور نہ خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔
وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّأَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۲ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا أَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُوْنَ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ۔ (زخرف - ۱، ۲)	اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے، کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لئے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ وَلَدَ اللّٰهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (صفّٰت۔ ۵)

تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا اور وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے خدا نے اس کی تردید میں کہا

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا (الاٰیۃ۔ نجم۔ ۲)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے۔

ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ (سبا۔ ۵)

پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تم ہی کو پوجتے تھے۔

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (صفّٰت۔ ۵)

اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنائی۔

اسی لئے وہ جنات کو خدا کی خدائی میں شریک کرتے تھے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام۔ ۲)

انھوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں۔

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری ہوئی، چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کی بھی پوجا کرتے تھے "بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا۔ ۵) بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں اکثر انہی پر ایمان رکھتے تھے۔ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن) اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انھوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا، چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی، ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (سکان الدراہم) پر جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ قبیلۂ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (اعراف)

خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔

بت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لئے تھے اور جا بجا عظیم الشان بتکدے قائم ہو گئے تھے، یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا، اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی، اس سے زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر نہ ہاتھ آیا، خاک کا ایک تودہ بنا لیا، ایک بکری

---

[1] صحیح مسلم کتاب التفسیر [2] لسان العرب لفظ سکن [3] کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر ص ۳۴۔

لاکر اس کا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا، اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلۂ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا، ایک دفعہ بلقاء گیا، وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لاکر کعبہ میں نصب کیا، چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا، اس لئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے، ان میں ہبل سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر مناۃ، لات اور عزیٰ تھے۔

مناۃ مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے اور قبائل اس کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آکر اتارتے تھے، علیٰحدہ علیٰحدہ بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے[1]

انی حلفت یمین صدق برّۃ بمنات عند محلِ آلِ الخزرج۔	میں نے مناۃ کی سچی قسم کھائی، اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

لات قبیلۂ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا، اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔

عزیٰ ایک درخت تھا، اس کے پاس ایک بت تھا، یہ قبیلۂ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے، قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے[2]

وَاللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنَاۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی، اِنَّھُنَّ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی وَاِنَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرْتَجٰی۔	لات، عزیٰ اور تیسرا مناۃ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گزر کر انسانوں کی قربانیاں ان پر چڑھائی جانے لگیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحبزادے (عبداللہ) کی قربانی کرنی چاہی تھی، وہ اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحیرہ، سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے[3]، بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے ان میں سے ایک پر "ہاں" ایک پر "نہ" لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے "ہاں" کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسم کی تھیں، اصنام و اوثان، انصاب اور بیوت، اصنام و اوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل و صورت کے بت تھے اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو صنم کہلاتے اور اگر سنگ اور مسالہ سے بنتے تو ان کو وثن کہتے اور انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کرکے ان پر پھول چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے، بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، ذوالخلصہ وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے، جن بتوں کے ارد گرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی تھی اس کو عتیرہ کہتے تھے، پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجبہ کہتے تھے، جاہلی شاعر کہتا ہے۔

---

[1] یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ میں ہے [2] معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دارالکتب المصریہ سنہ ۱۳۴۳ھ ص ۱۹۔

[3] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام ص ۱۱۰، ۱۱۱۔

کما طاف بالرجمة المترجم۔ جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے[1]۔

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی، ان کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ع

قبیلہ قبیلہ کا اک بُت جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ بُت[2] تھے، ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، لات، عزیٰ، منات، یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع، ہبل، لیکن جاہلیت کے پرانے مورخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کئے ہیں، ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس بتوں کے نام ہیں، علامہ ذکی پاشا جنھوں نے کلبی کی اس کتاب کو سنہ ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اب تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں، یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں، ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، تلیبان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو سنہ ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں۔

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے۔
لات۔	ثقیف۔
عزیٰ۔	قریش و بنو شیبان بن جابر۔
منات۔	اوس وخزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنو مدحج و اہل جرش۔
یعوق۔	بنو ہمدان و اہل خیوان۔
نسر۔	حمیر۔
ود۔	بنو کلب۔
سواع۔	بنو لحیان۔
اساف۔	بُت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ۔	بُت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر۔	قضاعہ ولخم وجذام وعاملہ وغطفان۔
باجر۔	ازد و طی و قضاعہ۔
ذوالخلصہ۔	بنو امامہ، خثعم، بجالہ، ازد السراة۔
رُضا۔ یا رُضی۔	بنو ربیعہ کا بت خانہ۔
رُیام	حمیر کا بت خانہ۔

---

[1] ان الفاظ کے لئے دیکھو لسان العرب [2] صحیح بخاری باب فتح مکہ

سبحہ۔	
سعد۔	بنی ملکان بن کنانہ۔
سُعیر۔	عنزہ۔
ذوالشریٰ۔	بنو حارث۔
عائم۔	ازد السراۃ۔
عم انس (یا) عمیانس۔	خولان۔
فلس۔	طی۔
ذوالکفین۔	بنو دوس۔
مناف۔	قریش۔
نُہم۔	مزینہ۔
ہُبل۔	قریش۔
یَعل۔	قبائل بنی عدنان۔
یعبوب۔	جدیلہ (بنی طی)
اشہل۔	بنو عبدالاشہل۔
اوال۔	بکر و تغلب۔
بس۔	غطفان کا بُت خانہ۔
بعیم۔	ایک لکڑی کا بُت۔
بلج۔	ایک بُت۔
جبہ۔	" "
جُرَیش یا جُبَرِیش۔	ایک بُت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جُلسد۔	ایک بُت کا نام۔
جہار۔	ہوازن کا معبود۔
دار۔	بنو عبدالدار۔
دوار۔	ایک بُت کا نام۔
ذوالرجل۔	حجاز کا ایک بُت۔
شارق۔	ایک بُت کا نام جس کی طرف عبدالشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنو عبد شمس۔
صدا۔	عاد کا بُت۔

صمودا،	طے کا بُت،
ضمار۔	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ۔
ضیزن۔	منذر اکبر
عبعب۔	قضاعہ۔
عوض۔	بکر بن وائل۔
عوف۔	ایک بُت کا نام۔
غبغب،	اس پر جانور ذبح کئے جاتے تھے۔
فراض۔	سعد العشیرہ۔
کثریٰ	جدیس و طسم۔
کسعہ،	ایک بُت کا نام،
محرق،	بکر بن وائل۔
مران۔	عبد المدان،
مرحب،	حضرموت۔
منہب۔	ایک بُت کا نام۔
ہبار،	عاد،
ذات الودع،	ایک بُت کا نام،
یالیل۔	عبد یالیل۔

ستارہ پرستی

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے، ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (حٰم سجدہ ۵-) نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیبی مانتی تھی (نمل ۲-) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے سورج دیبی کا مندر بنوایا تھا[1]

سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی، اسی لئے قرآن پاک نے کہا۔

وَاَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (نجم ۳-) اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے۔

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے: قبیلہ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دبران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعریٰ العبور کو اور اسد عطارد کو[2]۔

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت

جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقادات تھے وہ جن، شیطان اور بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے، گو اختلاف صورت اور اشغال

---

[1] تاریخ الملوک الارض حمزہ اصفہانی ص ۱۰۰ کلکتہ۔ [2] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۴۳ بیروت۔

کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے جو اجنہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے، ان کا نام غول تھا، یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

جبید بن ایوب العنبری۔

وغولا قفرة ذکر و انثی کان علیہما
قطع البجاد۔

اور بیابان کے دو غول، مرد بھی اور عورت بھی، گویا کہ ان دونوں پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔

مؤنث کو سعلاۃ کہتے تھے۔

ازل وسعلاة وغول بقفرة اذا اللیل
واری الجن فیہ ارنت۔

میں بھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں آواز دیتے تھے۔

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوتی تھی، راجز کہتا ہے۔

یا قاتل اللہ بنی السعلاة،

خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔

بلقیس ملکۂ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے۔

کم جبت دونک من یہماء مظلمة تیہ
اذا ما مغنی جنہ سمراء

کتنی اندھیری گھپ راتوں میں، میں نے صحرا کو قطع کیا، جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔

یہ صحرا نشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے، جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے تو یہ بھی آگ تاپنے کو آجاتے تھے لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

اتوا ناری فقلت منون انتم فقالوا
الجن قلت عموا ظلاما دعوت الی الطعام
فقال منہم زعیم نحسد الانس
الطعاما۔

وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو، انہوں نے کہا ہم جن ہیں، میں نے کہا اس تاریکی میں خوش ہو، میں نے ان کو کھانے کے لئے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسانوں کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، تبار اور عبقر تھے۔

ع، جن البدی رواسیا اقدامہا۔
بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے۔

ع، تحت السنور جنة البقار۔
زرہوں کے نیچے تبار کے بھوت تھے

ع، علیہن فتیان کجنة عبقر۔
اور ان پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔

ان کے اقسام حسب ذیل تھے۔

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے، ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے، ان کا نام اروح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا لے جاتے تھے، حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے، جن ان کو اٹھا لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا، عمرو بن عدی لخمی جو حیرہ کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو واپس کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا لے گئے، مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا[1]

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں سے تأبط شرًّا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور ہیں، طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت کو مار ڈالا تھا، اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں۔

لقيت الغول تسري في ظلام	میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں،
فصدت وانتحيت لها بعضب حسام غير مؤتشب يماني	تو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا
فقد سراتها والبرك منها فخرت لليدين وللجران[2]	تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہ جھل کو کاٹ ڈالا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا

ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا کہ ان کے دوست انسان دونوں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے، اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلاء تھا

يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ ٱلْإِنسِ	اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا،
وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ	اور ان کے دوست جو انسان تھے بولے، اے ہمارے رب ہم میں
بَعْضُنَا بِبَعْضٍ (انعام ۱۵)	سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔

کہانت

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے، اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن رہتا ہے جو وحی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل و صورت بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے، چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا، انھوں نے قیافہ سے پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے، اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی، اس نے کہا میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا،

الم تر الى الجن وابلاسها ويأسها من بعد انكاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها	کیا تم جن کو سراسیمگی ان کی نا امیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے،

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ ہے، میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سو رہا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لاکر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا،

يا جليح امر نجيح رجل فصيح يقول لا اله الا الله	اے جلیح! کامیاب امر، ایک فصیح شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے۔

---

[1] شمائل ترمذی باب سمر۔ [2] یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے، اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں دیکھو کتاب مذکور از ص ۱۴۹ تا صفحہ ۱۰، جزو ششم مطبوعہ مطبع سعادت مصر [3] کتاب البیان والتبیین للجاحظ جلد اول ص ۱۰۴ مطبوعہ مطبع علمیہ مصر۔

اس کے چند ہی دنوں کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، صحیح بخاری (تفسیر سورۃ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ علیل ہوگئے اور دو تین دن رات میں عبادت کے لئے نہیں اٹھے اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

انی ارجوان یکون شیطانک قد ترکک۔	میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان[1] رہتا ہے، قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (شعراء)	کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتے ہیں وہ سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور اکثر وہ جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے ہیں اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزی بہت مشہور تھے، جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں۔

والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفر المجد بنی العشراء للمجد والسناء۔	قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنو عشراء پر غالب آگئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بہت تکلف کے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا اور آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراض کیا۔

ارأیت من لا شرب ولا اکل ولا صاح فاستهل الیس دمه بطل۔	غور فرمائیے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخا نہ رویا کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا

آپ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے (صحیح مسلم دیۃ الجنین و صحیح بخاری باب الکہانۃ) یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے، جب لوگ ان سے غیب کی باتیں پوچھتے یا خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں، یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لئے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے، یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہوگئے تھے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے[2]۔ ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ، اسلام نے آکر اس کو روک دیا[3]۔

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔

شعراء کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے چنانچہ مجمل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشیٰ خود کہتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۳۱ و ۷۹۶۔ [2] فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۰۰ کتاب الطب باب الکہانۃ۔ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۳ و کتاب الطب باب الکہانۃ۔

دعوت خلیلی مسحلاً ودعوا لی بجہنام یدعی للہجین المذمم جبانی اخی الجنی نفسی فداؤہ بافیح جیاش العشیات مرجم[1]۔	میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انھوں نے اس کے لئے جہنام کو پکارا اور یہ کمینہ بد اطوار کے لئے بلایا جاتا ہے مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو شاموں کے وقت سب سے بڑے جوش مارنے والا اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔

جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہوتا تھا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابوالنجم کہتا ہے۔

انی وکل شاعر من البشر شیطانہ انثی وشیطانی ذکر	ہر شاعر کا شیطان تو مؤنث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔

شنقناق اور شیصبان، دو سادات شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے، ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے۔

ولی صاحب من بنی الشیصبانؔ فطوراً اقول وطوراً ہوا۔	میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے، تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔

اوہام پرستی سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آکر بدلہ لیتا ہے[2]، یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرندہ بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے، جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑتا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑتا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے، بکری کے جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی اس کو چھوڑ دیتے، وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جب اونٹوں کی تعداد ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی ایک آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دُم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا، سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورا وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے، واپس آکر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے مکاری کی، سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا، یہ خیال تھا کہ جو شخص لات و عزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے[4]، ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے[5]۔

اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات و خیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی، ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگجوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگجوئی ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسر پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کو جو

---

[1] اعشیٰ کے دیوان مطبوعہ ویانا صفحہ ۱۲۹ میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرعہ اس طرح ہے جہنام جدعاً للہجین المذمم۔ [2] مسند ابوداؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ ص ۳۶۶ [3] یہ باتیں بلوغ الارب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں [4] مسند دارمی ص ۱۰۱ [5] ابن ماجہ [illegible] التختم [illegible] باب [illegible]۔

میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہوکر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا، ان ہی لڑائیوں کو مورخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے۔

هذا الفن لا يستقصا الا محصلا فاقتصرت على ما ذكرت (جلد ۲ ص ۲۷۱ خیریہ مصر)

یہ فن شمار کا استقصا نہیں کر سکتا اس لئے جو کچھ میں نے بیان[1] کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوتیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عبس و ذبیان کی ہے، جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی، دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کے چراگاہ میں جا پڑی، کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کیا، اس بات نے قبیلہ میں آگ لگادی، کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی، عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقع پاکر ایک قتل کر دیا گیا، اس کے انتقام میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، بکر و تمیم میں ایک چراگاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی، اوس و خزرج مدینہ کے دونوں قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں، ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے، اس لڑائی کا خاتمہ انصارِ مدینہ کی بیعت پر ہوا، قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایامِ فجار ہے، ایک مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا، ان میں لڑنا اور مرجانا اور مارنا جاہلیت کا شرف اور قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی، ان لڑائیوں میں سفاکی، بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے، عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بن گیا تھا، اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا ان کے نام یاد رکھے گئے ہیں، دوست و احباب کسی گھر میں جمع ہوتے، شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوا کھیلتے اس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کرکے کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا، لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے کھلاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے رہتے، سامنے فاحشہ مغنیہ عورتیں گاتی بجاتیں اور وہ اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے۔

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد
پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے

---

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبد ربہ جلد ۳، اور امثال میدانی لفظ "یوم"۔

متی تاتنی اصبحک کاسا رویۃ   وان کنت عنہا غانیا فاغن وازدد
جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا، اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو گیا ہے تو جا اور بے نیازی کر۔

ندامای بیض کالنجوم وقینۃ   تروح الینا بین برد ومجسد
میری محفل شراب کے ہم نشیں ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں اور ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منہا رفیقۃ   بجس الندامی، بضۃ المتجرد
اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے، شرابی رفیقوں کی دست درازی سے مانوس اور اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا   علی رسلہا مطروقۃ لم تشدد
جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ   نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی   وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی
اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے۔

ولولا ثلاث ہن من لذۃ الفتی   وجدک لم احفل متی قام عودی
اور اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطفِ ذوق ہیں تو تیری قسم میں اپنی موت کی پرواہ نہ کرتا۔

فمنہن سبقی العاذلات بشربۃ   کمیت متی ما تعل بالماء تزبد
ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی ملامت کا خیال کئے بغیر سرخ وسیاہ رنگ کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب   ببہکنۃ تحت الخباء المعمد
اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پرلطف دن ہوتا ہے، کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرنا ہے۔

کریم یروی نفسہ فی حیاتہ   ستعلم ان متنا غدا اینا الصدی
میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کے سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔

وبرک ہجود قد اثارت مخافتی   بوادیہا امشی بعضب مجرد
اور کتنے بیٹھے ہوئے سوتے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا، جب میں تلوار لے کر چلا۔

فمرت کہاۃ ذات خیف جلالۃ   عقیلۃ شیخ کالوبیل یلندد
تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جو لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا، قیمتی چیز تھی، سامنے آ گئی۔

وقال الا ماذا ترون بشارب   شدید علینا بغیہ متعمد
(اور جب میں نے تلوار سے کونچیں کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا، تو اس بڈھے نے کہا کہ اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ہم پر ظلم کر رہا ہے

فظل الاماء یمتللن حوارہا   ویسعی علینا بالسدیف المسرہد
تو لونڈیاں اونٹنی کے بچہ کو جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے۔

بل انت لا تدرین کم من لیلة   طلق لذیذ لهوها وندامها

..... بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔

قد بتُّ سامرها وغایة تاجر   وافیت اذ رفعت وعز مدامها

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوشی کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہو گئی۔

اغلی السباء بکل ادکن عاتق   او جونة قدحت وفض ختامها

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا، پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم کو خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مُہر توڑ دی جاتی۔

وصبوح صافیة وجذب کرینة   بموتر تأتاله ابهامُها

اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔

بادرت حاجتها الدجاج بسُحرة   لاعلَّ منها حین هبَّ نیامها

میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر کی آواز سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرا لوں۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بُری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے:

الا هبی بصحنک فاصبحینا   ولا تبقی خمور الاندرینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔

مشعشعة کان الحصّ فیها   اذا ما الماءُ خالطها سخینا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں، جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانة عن هواه   اذا ما ذاقها حتی یلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے، اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔

تری اللحز الشحیح اذا اُمرّت   علیه لماله فیها مهینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔

صبنتِ الکاس عنا اُمَّ عمرو   وکان الکاس مجراها الیمینا

اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔

وما شر الثلاثة ام عمرو   بصاحبک الذی لا تصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی   تین میں سب سے بدتر نہیں۔

وکاس قد شربت ببعلبک   واخری فی دمشق وقاصرینا

اور کتنے پیالے بعلبک میں پیے اور کتنے دمشق اور قاصرین میں۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا، شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر)

یہ ہے کہ تجارت کا لفظ "شراب نوشی" مترادف بن گیا تھا، ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیئہ کہتا ہے۔

اذا سحب الریط والمروط الی   ادنی تجاری وانفض اللمم

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

بدر میں قریش کے دولت مند رؤسا مارے گئے تھے، ان کے مرثیے میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص و سرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے۔

وماذا بالقلیب قلیب بدر   من القینات والشرب الکرام

بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے، یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

صبنت الکاس عنا ام عمرو   اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا
وکان الکاس مجراها الیمینا   حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم سنی میں یہ سنا کرتا تھا۔ اِسْقِنَا کَأْسًا دِهَاقًا "شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلاؤ"

صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی ہے تو اس وقت ایک مجلس قائم تھی جس میں حضرت ابو دجانہؓ، ابو طلحہؓ، سہیل بن بیضاء شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کم سن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی کس درجے کے لوگ پیتے تھے کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت[3] سے ہوگا، جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوہ بدر میں حضرت علیؓ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی، حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے، ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام ہے) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں، اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے لوگوں سے پوچھا یہ کس کا کام ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصاریوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا۔

الا یا حمز للشرف النواء   اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لئے۔

حضرت حمزہؓ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لئے، حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے، حضرت حمزہؓ مخمور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور کہا تم سب میرے باپ کے غلام ہو؟

---

[1] صحیح بخاری باب الجزیۃ جلد اول ص ۵۵۸ [2] ایضاً باب ایام الجاہلیہ جلد اول ص ۵۴۱ [3] صحیح بخاری کتاب المغازی غزوہ بدر ص ۵۷۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہؓ نے سنہ ۳ھ میں شہادت پائی ہے، اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایے اور اشارے سے گزر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی، لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابو داؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا، اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے۔ ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شفاء۔	اے خدا شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے

اس پر سورۃ بقرہ کی یہ آیت اتری۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (بقرہ۔ ۲۷)	لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں لیکن فائدے سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے، یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آگیا، ایک صاحبؓ نے امامت کی مگر نشہ کے، نماز میں یاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ کے سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے اس پر یہ آیت اتری،

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔	نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

---

[1] شراب کی حرمت کی یہ تدریجی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ ابو داؤد کتاب الاشربہ) حضرت ابوہریرہؓ (مسند احمد ج ۲ ص ۳۵۱) اور حضرت علیؓ (ابو داؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنھوں نے نشہ کی حالت میں غلط ملط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی صاحب مذکور ہے، حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تکمیل احکام ذکر حرمت شراب) میں ابو داؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن ہے، ابو عبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں میں حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے۔

۱۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمٰن بن عوف طعاما فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت	ابو جعفر رازی نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے ابو عبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی جس سے ہم شراب کے نشہ میں چور ہوگئے اور نماز

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے: لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے حضرت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ فحضرت الصلوٰۃ فقدمونی فقرأت قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون فانزل اللہ یایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰرٰی

(ترمذی تفسیر نساء)

کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)

۲۔ عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن السلمی عن علی علیہ السلام ان رجلا من الانصار دعاہ وعبد الرحمٰن بن عوف فسقاھما قبل ان تحرم الخمر فامھم علی فی المغرب فقرأ قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ فخلط فیھا فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰرٰی حتی تعلموا ما تقولون۔

(ابوداؤد کتاب الاشربہ)

۲۔ سفیان نے عطاء بن سائب سے عطاء نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے ابو عبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی، پھر علیؓ نے نماز مغرب کی امامت کی اور قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کردیا، اس پر آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰرٰی حتی تعلموا ما تقولون۔ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اس کو جان لو۔

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام ہے۔

۳۔ عن سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن السلمی عن علی رضی اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبد الرحمٰن ابن عوف وصلی بھم المغرب فقرأ قل یایھا الکافرون فالتبس علیہ فنزل لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰرٰی (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۳۔ سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبدالرحمٰن سلمی سے، ابو عبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور قُلْ یایھا الکافرون پڑھی لیکن اس میں خلط ہوگیا، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰرٰی الآیۃ۔ نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

۴۔ سفیان بن عطاء بن السائب عن بن (؟)... عبدالرحمٰن عن علی رضی اللہ عنہ انہ کان ھو وعبد الرحمٰن ورجل آخر یشربون الخمر فصلی بھم عبد الرحمٰن بن عوف فقرأ قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ فخلط فیھا فنزلت لا تقربوا

۴۔ سفیان نے عطاء بن السائب سے عطاء نے ابن عبدالرحمٰن سے ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن ابن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا، اس پر یہ آیت

عمرؓ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ وقاص کی دعوت کی، اس میں شراب کا دور بھی چلا یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر یہ حکم آیا (صحیح مسلم فضائل سعدؓ بن وقاص)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) الصلوٰۃ الخ (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

۵۔ خالد بن عبد اللہ عن عطا بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن ان عبد الرحمٰن صنع طعامًا فدعا ناسًا من اصحاب النبی صلعم فیھم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فقرأ قل یاایھا الکافرون ولا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ، الآیۃ۔

(مستدرک حاکم، کتاب الاشربہ)

اتری لا تقربوا الصلوٰۃ۔

۵۔ خالد بن عبد اللہ، عطا بن سائب سے عطا، ابی عبد الرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبد الرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالبؓ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قُل یاایھا الکافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی، اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ الآیۃ۔

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

(۶) سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبد الرحمٰن عن علی رضی اللہ عنہ قال دعانا رجل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضرت صلوٰۃ المغرب فتقدم رجل فقرأ قل یاایھا الکافرون فالتبس علیہ فنزلت لا تقربوا الصلوٰۃ۔ الآیۃ۔

(مستدرک حاکم تفسیر نساء)

۶۔ سفیان، عطا بن سائب سے، عطاء ابو عبد الرحمٰن سے وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قُل یٰاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوٰۃ (الآیۃ)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں:

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبد الرحمٰن بن عوفؓ تھے، دوسری، تیسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے، چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے، جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی اور پانچویں میں ہے کہ امام عبد الرحمٰن بن عوفؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب بھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے، خصوصًا اس آیت کے بعد قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ [illegible] کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے، حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابل تطبیق ہیں، ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابو عبد الرحمٰن سلمی جن کا نام عبد اللہ بن حبیب ہے، وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرفدار حامی شیعہ تھا، بعد کو عثمانی (بنو امیہ کا طرف دار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، روایت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (مائدہ-۱۱)

اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں، تو ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا اس لئے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی بھی جاتی تھیں مگر اوروں کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں اور واقعہ کی اصل صورت وہی ہے جو پچھلی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے، نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں غلط ملط پڑھ دیں، چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لئے یا تو ابو عبد الرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ واری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے ادھر کر دی۔

اس آخری پچھلی روایت کی تائید حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۱؎ عن ابی هريرة قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول الله صلی الله عليه وسلم المدينة وهم يشربون الخمر ويأكلون الميسر فسألوا رسول الله صلی الله عليه وسلم عنهما فانزل الله علی نبيه صلی الله عليه وسلم يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا الآية فقال الناس ما حرم علينا انما قال فيهما اثم كبير وكانوا يشربون الخمر حتی اذا كان يوم من الايام صلی رجل من المهاجرين ام اصحابه فی المغرب خلط فی قراءته فانزل الله فيها آية اغلظ منها يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وكان الناس يشربون حتی يأتی احدهم الصلاة وهو مغيق ثم انزلت آية اغلظ من ذلك يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ فقالوا انتهينا ربنا (مسند احمد جلد ۲)

۱؎ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیهما اثم کبیر ومنافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما الآیہ لیکن لوگوں نے کہا خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے، اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قراءت میں خلط کر دیا، اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى حَتَّى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ، اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا، تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی، يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ اب لوگوں نے کہا کہ خداوندا ہم باز آ گئے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری ہے حضرت ابوعبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے، ابوطلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا، ساقی گری کی خدمت حضرت انسؓ سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ سے زبانی روایت ہے۔

کنت اسقی اباعبیدۃ واباطلحۃ وابی بن کعب فجاءھم اٰت فقال ان الخمر حرمت۔

میں ابوعبیدہ اور ابوطلحہ اور ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ[1] بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبلؓ بھی شریک تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے، تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کردی کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعۃً جام وسبو توڑ ڈالے، یہ صرف ابوطلحہؓ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں، بخاری باب المظالم میں ہے۔

فجرت فی سکک المدینۃ۔

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہوگیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لئے جوا بھی انہی کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے۔

أعیّرتنا البانھا ولحومھا   وذلک عار یا ابن ریطۃ ظاھر

کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔

نحابی بھا اکفاءنا ونھینھا   ونشرب فی اثمانھا ونقامر

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر بھی نہیں، حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارے سے شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہوجاتی ہے جس کو خود علیؓ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں۔

وفی ھذا الحدیث فائدۃ کثیرۃ وھی ان الخوارج تنسب ھذا السکر وھذہ القراءۃ الی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب دون غیرہ وقد برأہ اللہ منھا فانہ راوی ھذا الحدیث (مستدرک تفسیر نساء ج ۲ صـ ۳۰۷)

اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے اس نشہ اور اس غلط قرأت کو امیر المؤمنین علیؓ بن ابی طالب ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کردیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔

(درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن حشانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنایا۔)

[1] فتح الباری جلد (۱۰) مطبوعہ مصر طبع اول ص ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالے جاتے تھے، ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جن کے نام یہ ہیں، فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، نافس، منیح، سفیح، وغد۔ ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے، جن جن کے حصے مقرر تھے، وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتا تھا ان کو ناکامیابی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو برم کا خطاب دے رکھا تھا، جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

وَاِذَا ھَلَکْتُ فَلَا تُرِیْدِیْ عَاجِزًا ۔۔۔ غُسًّا وَلَا بَرَمًا وَلَا مِعْزَالًا

اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، اکھڑ اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔

جوئے کی ایک صورت جس کو رہان کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی جو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کو بازی ہار جانا پڑی۔ رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بی بی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی، عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی، حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقے سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خوری

عرب میں سود خواری کا عام رواج تھا تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے، حضرت عباسؓ بن عبد المطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانہ پر پھیلا رکھا تھا اور اسی تعلق سے سود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے انہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمانؓ اور خالدؓ بن ولید سود پر قرض دیتے تھے، مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل اور حبیب بھی نہایت دولت مند تھے، بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (بقرہ - ۳۸)

مومنو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔

۱؎ یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۳۱ میں ہے ۲؎ ترمذی ص ۱۹۰ ۳؎ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی ۴؎ تفسیر کبیر ج ۲ ص ۲۰۱

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خواری ترک کریں گے[1] اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی[2]۔

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور اس اصل کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گزر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اضافہ کر دیتے تھے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا دیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک مدت معینہ کے لئے کسی کو قرضاً سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گزر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون تمام رقم کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کرا لیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائیداد مستغرق ہو جاتی تھی یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً
وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (آل عمران ۱۳۰)

مسلمانو! دونا، چوگنا، سود نہ کھاؤ، اور خدا سے ڈرو، یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھیں مثلاً اگر راہن میعاد کے اندر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا[3]، مال و دولت سے گزر کر عورتیں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے تھے[4]۔

لوٹ مار عرب میں رہزنی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنھوں نے راہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا، اس قسم کے لوگوں کو لصوص کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی، وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قبیلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا، اس کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ عنقریب آئے گا جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضر موت کا سفر کرے گی، تو چونکہ وہ قبیلہ طے کے ایک رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ ہائیں! طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے۔

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا، تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان سے سلامت گزر نہیں سکتے تھے، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک لے جاتا تھا، چنانچہ "صبح" کا وقت جب کہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا چنانچہ صبح کا وقت عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور سے

---

[1] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف [2] ابوداؤد کتاب الامارت [3] موطا امام مالک ص ۲۴۰ [4] بخاری قتل کعب بن اشرف۔

بولا جاتا تھا، کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے۔

یالہف زیابة للحارث الصابح فالغانم فالآئب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے، لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پاکر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے، بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے اور تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جاکر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شراً شہرت عام رکھتے تھے، تابط شراً کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا، اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں، جنھوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا[1]، بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے[2]۔

عام بدو عربوں میں یہ بدی جتنی عام ہوگئی تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے، دوسری باتوں کے ساتھ یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ آئندہ وہ چوری نہ کریں گے[3]، بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا[4]۔

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیتے تھے، ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا انکس لگا رکھا تھا، حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا[5]۔

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے، اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے[6]۔

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لئے اس کے لئے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی، بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان غرض سب پر پڑتا تھا، چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے جن کو بنی ابیرق کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا، یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے، انھوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار، تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی، آپ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر

---

[1] فتح الباری جلد ۱۲ ص ۷۷، [2] کتاب المعارف ابن قتیبہ [3] صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳، ۱۰۰۲، [4] سورۂ ممتحنہ رکوع ۲ [5] مسلم باب فی صلوٰۃ الکسوف [6] مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم و غفار۔

بھاگ کر مشرکین سے جا ملا۔[1]

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لئے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ وَلَا يَسْرِقْنَ (ممتحنہ - ۲) یعنی وہ چوری نہ کریں گی، شرفاء اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے اس لئے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی، چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زیدؓ کو منتخب کیا جن کو آپؐ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ گزشتہ قومیں صرف اسی لئے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمدؐ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔[2]

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو آپؐ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ایک چادر کے لئے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپؐ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔[3]

سفاکی و بے رحمی و وحشت

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے، لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے، مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ ڈال دیتے، ان کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پانی بند کر دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اس طریقہ سزا کا نام ان کے یہاں صبر تھا، مُردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو بلیہ کہتے تھے۔

زنا اور فواحش

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے تھے، امرؤ القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا، اس کے ساتھ شاہزادہ اور والی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور دوسری عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں اپنے قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں، باوجود اس کے کہ اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

---

[1] ترمذی ص ۳۰ و ۴۴ کتاب التفسیر سورۂ نون۔ [2] بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود۔ [3] دارقطنی ص ۳۴۰ کتاب الحدود

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں[1]۔ فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں جو صاحب الرایات کہلاتی تھیں، ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی، اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں، ان میں سے ایک کا نام عناق تھا، مرثد غنوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کر لوں، اس پر یہ آیت اتری کہ

وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ (نور۔ ۱) — اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوا لیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے، عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں، ایک کا نام مسیکہ اور دوسری کا نام امیمہ تھا، ان دونوں کو زناکاری کرنے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی آیت اتری[3]۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ (نور۔ ۴) — اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں، جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں، مثلاً ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے، جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے، اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے، عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے، صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت معینہ کے لئے نکاح کر لیتے تھے، اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا، پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں۔

---

[1] تفسیر طبری آیت محصنت غیر مسافحات ج ۵ ص ۱۳، مصر۔ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۲۶۹۔

[3] ابوداؤد کتاب النکاح، صحیح مسلم باب التفسیر۔

الیوم یبدو بعضہ او کلہ — آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا جو کھلا ہے اس سے لطف

فما بدا منہ فلا احلہ — اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے۔

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے، کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔[1]

پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے[2]، جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے[3]

سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کرکے ان کو بیوی بنالیتے۔

عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا، عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوح قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آجاتیں اگر صلح ہوجاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہوچکے ہوتے، بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اس کو اشعار میں ظاہر کرتے، بنو ضبیعہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدانِ جنگ میں رسوا کیا، فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فظلت وظلت یرکبون ھبیرھا — تو لوگ عورتوں پر متصرف ہوگئے اور کوئی اگر پردہ بیچ میں

ولیس لہم الا عوالیھا ستر — تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ رحرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے۔

نکحت نساءھم بغیر مھور۔ — ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمرو معدیکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا

امن ریحانۃ الداعی السمیع یؤرقنی — کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے جس نے مجھ کو

واصحابی ھجوع اذا لم تستطع امرا فدعہ وجاوزہ — بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں، اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو

الی ما تستطیع۔ — تو اس کو چھوڑ کر وہ کرو جو کر سکتے ہو۔

طلاق کے لئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے، عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی، نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی، غیلانؓ بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں، وہب اسدیؓ نے اسلام قبول کیا تو آٹھ بیویاں ان کے عقدِ نکاح میں تھیں[4]۔

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے، باپ مرجاتا تو اس کی کل بیویاں، بجز حقیقی ماں کے، تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں گِنی جاتی تھیں۔

---

[1] نسائی باب الاستتار عند الغسل [2] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [3] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیتے جاتے، خوشبو وغیرہ قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی، اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی۔[1] عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا، عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی، اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں میں چھپتا پھرتا۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ	اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی
مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ، يَتَوَارٰى مِنَ	ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ
الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ، اَيُمْسِكُهٗ	جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپا پھرتا ہے
عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ	(اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا زمین
(سورۂ نحل - ۷)	میں دفن کر دے۔

ابو حمزہ ایک رئیس تھا، اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

ما لأبي حمزة لا يأتينا	ابو حمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا،
يبيت في بيت التي تلينا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔
غضبان ان لا نلد البنينا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔
تالله ما ذالك بايدينا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں،
ونحن كالزرع لزارعينا	ہم بطور کھیت کے ہیں۔
تنبت ما قد زرعوه فينا	ہم میں جو بویا جائے گا وہی اُگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی، لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر گڑھا کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے، اس کو عربی میں وأد کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔[2]

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا، ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلا سکے[3]، عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی، وہ اگر آکر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔[4]

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب احداد المتوفی عنہا زوجہا [2] تفسیر ابن جریر و ابن کثیر سورۃ وَاِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ [3] تفسیر یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین [4] تفسیر ولا تعضلوھن۔

۱۱ **وحشت وجہالت** حرام وحلال کی کوئی تمیز نہ تھی، ہر چیز اور ہر جانور کھا سکتے تھے، کھاتے تھے، حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ کھانا عام بات تھی۔[1] چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر کھا لیتے تھے، اگر دن مردار کی ڈنڈے سے مار کر درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے تھے[2]، گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے[3]۔

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا ہے اور اہل عرب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ یہ ہیں۔

وایاک والمیتات لا تأکلنّہا   ولا تأخذن سہما حدیدا لتفصدا
مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا   اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا
وذا النصب المنصوب لا تنسکنہ   ولا تعبد الاوثان واللہ فاعبدا
اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر   اور نہ بتوں کی پوجا کر، بلکہ اللہ کی عبادت کر
ولا السائل المحروم لا تترکنہ   لعاقبۃ ولا الاسیر المقیدا
اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کیلئے مت چھوڑ   اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو
ولا تسخرن من بائس ذی ضرارۃ   ولا تحسبن المرأ یوما مخلدا
اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر   اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے
ولا تقربن جارۃ ان سرہا   علیک حرام فانکحن او تأبدا
اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر   وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر اور یا کنوارہ رہ جا

*

---

[1] اسباب النزول سیوطی آیت حرمت علیکم المیتۃ [2] تفسیر طبری سورۂ مائدہ بیان ماکولات۔

[3] صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح [4] دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیات بھی تھیں، جو دنیا کی تمام قوموں میں ان ہی کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی ان ہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خلاق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعت خاص سے سرفراز کیا۔

صحت نسب

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے، شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے ان کی تردید کی ہمت نہیں کی توراۃ نے حضرت ابراہیم کی جن اولادوں کے نام بتلائے ہیں ان میں سے ایک ایک کا نام سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے سنہ ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے[1] اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں، قدیم یہودی مؤرخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے اور آجکل ایک یہودی ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب[2] ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں، اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط[3] میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ (حج) — تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

حضرت ابراہیم تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیم اور ان کے اہل و عیال کا نظر آتا ہے اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے، وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسم و رواج ہیں، جن کو اسلام نے آکر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ، حج و قربانی کی عادتیں ہیں، اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے، مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے

"اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیرکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے"[4]۔

---

[1] ترجمہ انگریزی سنہ ۱۸۴۴ء جلد اول ص ۵ [2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر صفحہ ۵، ۷، ۶۲۔

[3] سینٹ پال گلیتیوں کے نام باب ۴۔ ۲۵ [4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "السنہ سامیہ" ہم نے ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۷ سے ص ۱۱۶ تک اس پر مفصل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیے ہیں۔

اہل عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا، اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے وہ محفوظ رکھتے تھے، قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلۂ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے، یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل کو دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لئے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا، مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کے حدود تک پھیلی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی، مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا، عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دین حنیفی رکھتے تھے، یہ سب اسی لئے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے۔

محکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیق عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیر و زبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، اسکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران و روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنی حرص و آز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے ریلے کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی مگر قدرت الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا، یہ تمام اہتمام و انتظام اس لئے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد کو برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقا میں کار آمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے، یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے، وہ اُمّی تھے تاکہ ایک اُمّی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے، پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا، اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار، پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا، یہ تمام مواقع اس لئے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا، فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتا تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا، پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی، جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا بآسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاہد نمونہ اور مصلح ہونے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں، ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علمبردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے، وہ لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہو گئے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پرجوش تھے

ساتھ ہی وہ پرجوش بھی تھے، اس لئے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا، ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری کے ساتھ ان کا دل شجاع اور بہادر تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر ہوتی تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی، یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست، اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے، اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ، عقل و دانش سے وہ کافی طور پر بہرہ مند تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابو عبیدہؓ بن الجراح وغیرہ سینکڑوں، ہزاروں صحابہ نے علم و مذہب، اخلاق اور سیاست میں نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انھوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے، ان کے شعراء کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں، ان کے فصحاء کے مقولے سنیئے تو ان کی فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گوہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بیکار رہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے، اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں عرب کے بعض قویٰ بیکار ہو رہے تھے وہ ان کو اپنی یادداشت کے لئے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا، یہی سبب ہے کہ ان کے شعراء اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہاں ہی کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا جو اسرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہل عرب کی ان خصوصیات نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لئے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا، جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی صفت تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ طبع میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہیں ہوتے تھے اور نہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بیباکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے، اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی، مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے

اہلِ عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے اور اہلِ ایران اور اہلِ ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون وچرا اور کیسے کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کرکے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے یہی سبب ہے کہ حکیمانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے، اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے عملی مذہب کو پیش کرکے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا، دور دور سے بدوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تھے اور شک وحجت اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض واخلاق کی عملی تعلیم حاصل کرکے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلہ کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن وناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے، وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کرکے دینی ودنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت ونظریت سے اس کو پاک ومبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب ومشرق، شمال وجنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا،

ان اوصاف کی مصلحت

اہلِ عرب کے ان تمام فطری وطبعی اوصاف واخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لئے منتخب ہو چکی تھی، باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے یہ چند اچھے اوصاف اس لئے ان میں ودیعت کئے گئے تھے تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آئے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد واعانت کے لئے خزانۂ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند وعجم میں تھا نہ روم وفرنگ میں، نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں تھا، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لئے اسی قوم کو برگزیدہ کرکے یہ امانت اس کے سپرد کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں اسمٰعیلؑ کو پسند کیا اور اسمٰعیلؑ کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو، ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں عبد المطلب کے بیٹے عبد اللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب * ، سب سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں (عرب وعجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصہ میں (یعنی عرب میں) بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔[1]

*

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ہیں ۱۲۔

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اسی ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہو گیا، یہ ظاہر ہے کہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے افق سے تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعت کامل عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہے، لیکن کوئی شریعت کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گردوپیش کو اپنا ہم زبان اور اپنا ہم عمل بنا لے۔

اس بنا پر خاتم انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لئے تیار کرنا تھا[1]، دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں، ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار و ذلیل ہے، اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (ہم نے تم کو تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت دی) کا تاج پہن چکی تھی، لیکن اوپر بتفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں کا مادہ مفقود ہو چکا تھا، ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا، رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے، ہندوؤں کا دل و دماغ وہم پرست ہو کر رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشوونما سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا، مشیتِ ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سراپا جہل، سراپا وحشت اور سراپا درندہ بن چکا تھا، کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[2] کا مظہر بن گیا۔

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا	ایسے لوگ کہ ہم اگر ان کو دنیا میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

یدعو قوما الی السنۃ الراشدۃ و یزکیھم و یصلح شانھم ثم یتخذھم بمنزلۃ جوارحہ فیجاھد بھم اھل الارض و یفرقھم فی البلاد وھو قولہ تعالیٰ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۳ مطبوعات مصر	وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

[2] تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لئے (پردہ عدم سے) باہر لائی گئی، جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔

الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (ج۔ ۶)

دیں، اچھی باتوں کا حکم دیں اور بُری باتوں سے روکیں۔

اصلاح و ہدایت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرتِ انسانی سے بالاتر تھا، بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے، لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے، اس کو لڑ کر لے لو اور اس پر تختِ سلطنت جماؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعتوں سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہوگئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی، اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت

عرب کی قوم امی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی، قرآن مجید نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے۔

يٰسٓ ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۔ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (یٰس۔ ۱)

قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہِ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تاکہ تو اس قوم کو آگاہ کرے جس کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۔ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۔ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (ص۔ ۱)

اور انھوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغ گو جادوگر ہے، اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوتے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، اس میں اس (پیغمبر) کی کوئی غرض ہے، ہم نے سُنا تو سابق مذہب میں یہ نہیں سُنا یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (ق۔ ۱)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معاد، ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سراپا حیرت بن جاتے تھے اور نبوت کے

متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیئے تھا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ (فرقان - ۳)

اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔

إِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَإِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (فصلت - ۲)

پیغمبر جب ان کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو وہ فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُّؤْمِنُوْٓا إِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى إِلَّآ أَنْ قَالُوْٓا أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۱۰)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراء صورت میں، یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو اس کے پیچھے خدا اور فرشتوں کا پرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوْعًا أَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا، أَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ (بنی اسرائیل - ۱۰)

انھوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ نہ بہادے یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو جس میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہے ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا نہ گرا دے یا خدا اور فرشتوں کو پرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ لَوْلَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا أَوْ يُلْقٰٓى إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّأْكُلُ مِنْهَا (فرقان - ۱)

انھوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لئے خاص کوئی باغ کیوں نہ ہوا جس سے یہ کھاتا۔

پیغمبر کے لئے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو، میوؤں کے بھرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لئے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (زخرف - ۳)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی، جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً (فرقان-۳)	کافروں نے کہا اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا۔
وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ (بنی اسرائیل-۱۰)	اور کافروں نے کہا، ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ لائے جس کو ہم کر پڑھنے لگیں۔
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ (انعام-۱)	اور اگر کاغذوں میں لکھی ہوئی کوئی کتاب ہم آسمان سے تم پر اتارے جس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے، الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزولِ کتاب کی حقیقت، ہر چیز ان کے لئے حیرت و استعجاب کا سرمایہ تھی۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ (مومنون-۴)	کیا انہوں نے بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔

اس بناء پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہوگئے، لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے، ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سراپا لبیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفاء کے آغوش پروردہ تھے، انہیں کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلامِ الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموزِ نبوت کے دانا چشم پرنم اور دلِ پُرکیف سے۔

إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا (بنی اسرائیل-۱۲)	جن کو ان سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے ایک پیغمبر آخر الزمان کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رو کر وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔
وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ	ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے ہیں، جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہ ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پہ اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں

الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (مائدہ - ۱۱)	اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے، ہم کو بھی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، وہ بھی چشم دل کو بینش حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (بقرہ - ۱۷)	جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔
وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ بقرہ - ۱۱	اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، بمجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہ کا جویاں ہے، حضرت سعید بن زیدؓ، عثمان بن مظعونؓ، صہیب رومیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں، اسی قسم کے لوگ تھے، ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے، لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک تیرہ برس تک آپ کے چہرہ پر نور کو دیکھتے رہے لیکن نور الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلامؓ یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پُرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے، روسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے اور نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں، لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جو ان کی زبان سے آخری نبی کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اس دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوت حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سناں سے دیتے ہیں، لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان اور بحرین کے بڑے بڑے اور عظیم الشان قبائل جو یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کسی قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آواز حق پہنچنے کے ساتھ دفعۃً مسلمان تھے۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں، دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی، آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و دولت سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع، وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کرلے، ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے، عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ، عرب کی قوم، قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا و استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں، وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں، مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں، دین ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے، ان کے شعر و شاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پرجوش مضمون آباء و اجداد اور نام و نسب پر فخر و غرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی دین آبائی کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

(البقرہ - ۲۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو، کہتے ہیں نہیں، بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ۔

(زخرف - ۲)

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا لیکن اس کے دولتمندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم کے پیرو ہیں، تو اس پیغمبر نے کہا اگرچہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم ان ہی کی پیروی کرو گے)؟ انہوں نے کہا ہم تو جو دے کر بھیجے گئے ہو اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اعراف - ۳)	ہو جو تم نہیں جانتے۔
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (مائدہ - ۱۴)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے وہ ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستہ پر چلیں (تب بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے)
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ (لقمان - ۳)	کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، کیا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کا چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم و رواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے دعوت پر لبیک کہا، تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کئے وہ یہ تھے اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، ہم کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے، تو یا تو تم اس کو روکو یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا، ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا، تو کچھ دنوں کے بعد پھر انھوں نے اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا، "اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا، اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ"؛ اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: "اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوش رو جوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے اور ان کو بیوقوف اور نادان کہتا ہے، سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر گفتگو کی اور کہا اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں ایسا آدمی نہیں آیا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو، جو تم لائے ہو، تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی، ہم کو بیوقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا[1] غرض کوئی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔

ان الزامات کی فہرست کو ایک ایک دفعہ پڑھو، معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا، ان پر کتنا بار تھا، اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے، موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کے

---

[1] یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں۔

پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لئے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا، لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے[1]

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے دین آبائی کے مقابلہ میں پذیرائی کے قابل نہ سمجھے، بھتیجے نے بار بار کہا، چچا جان! کلمۂ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔ ابوطالب نے جواب دیا، جان پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا، عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی، آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ چچا جان! اب تو لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں، ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا، ابوطالب کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے، آپ بار بار لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں اور لا الٰہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے[2]، صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے! یہ فقرہ تم کہتے ہو، میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا[3]، ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وہ فقرہ کہہ دیا[4]، بہرحال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس اسلام سے باز رکھنے کے لئے اس سے زیادہ پُرزور اور پُراثر دلیل نہ تھی کہ ابوطالب کیا آبائی مذہب کو چھوڑ دو گے؟ اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہم پرستی عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکلا تو فوراً بلائیں آکر ہم کو لپٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور بیسیوں صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام ان ہی اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزند نہ پیدا ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا، اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا، حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا،

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ (ہود ۵)

ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو ستایا ہے۔

ابتداً جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا[5]، جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے[6]، ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے، وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم

---

[1] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان [2] کتاب الجنائز باب قال المشرک عند الموت لا الٰہ الا اللہ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان باب [4] ابن ہشام وفات ابی طالب [5] ابن کثیر، زمخشری، ابن حیان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے دیکھو تفسیر آیہ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ وغیرہ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ [6] صحیح مسلم باب تخفیف الصلاۃ والخطبہ

کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔[1] حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں کفار نے کہنا شروع کیا کہ لات و عزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔[2] حضرت طفیلؓ بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا دیکھو ذو الشریٰ (بت) کہیں برباد نہ کر دے۔[3]

فتح مکہ کے بعد جب کہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا، تمام لات، عزیٰ، مناۃ، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے، خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا، پجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے، جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا۔[4]

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے لیکن قوانین کارگاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلمان عرب کے بدو اور اعراب ابتداً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو ساتھ یہ توقع بھی کر لیتے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں، اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعۃً وہ متزلزل ہو جاتے تھے، صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ہے۔[5]

کان الرجل یقدم المدینۃ فان ولدت	باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ
امرأتہ غلاما ونتجت خیلہ قال ھذا دین	اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ
صالح وان لم تلد امرأتہ ولم تنتج خیلہ	نہایت عمدہ مذہب ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کہتا کہ یہ نہایت
قال ھذا دین سوء۔	بُرا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی ہے۔[6]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ	اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ کھڑے ہو کر کرتے ہیں
اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ	(یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے لیکن
انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ (حج-۲)	اگر مبتلائے مصیبت ہوتے تو فوراً رو برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے اور اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بد دعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبد اللہ بن زبیرؓ پیدا ہوتے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔[7] سوء اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے، ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں جب حضرت ابو بکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے۔[8] حضرت طفیل بن عمروؓ دوسی نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی، اگرچہ مخلصین اور ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا، تاہم عام لوگ جن کی اوہام پرستی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی، وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل اور عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ

---

[1] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ۔ [2] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زنیرہؓ و سیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین۔ [3] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمروؓ دوسی۔
[4] ابن سعد و طبری ذکر اصنام [5] تفسیر سورہ حج جلد ثانی ص ۶۹۲ [6] صحیح بخاری تفسیر سورۃ حج [7] مستدرک حاکم ج ۳ و اصابہ ذکر عبد اللہ بن زبیر
[8] صحیح بخاری کتاب المرضیٰ و باب مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینہ [9] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

میں آکر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا، تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے[1] اسی طرح ایک بدو نے آکر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوء اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی، آپ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی۔ اور فرمایا۔[2]

المدینۃ کالکیر تنفی خبثہا و تنصع طیبہا۔

مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے

ان ہی اسباب کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی۔

اللھم حبب الینا المدینۃ کحبنا مکۃ او اشد، اللھم وصححہا و بارک لنا فی مدھا وصاعہا وانقل حماھا فاجعلہا بالجحفۃ۔[3]

خداوندا! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے صحیح کر دے، اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔

قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا، ان ہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا، ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے، جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا، مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنی امیہ کی مخالفت اس کے لئے لامحالہ ہونی تھی۔

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا، تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بھی بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔[4]

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی، مدینہ آنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی، خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المحاربین [2] بخاری ج ۱ ص ۲۵۳، کتاب الحج فضائل مدینہ و باب اعتصام السنۃ [3] صحیح بخاری مقدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ [4] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

خوب غور کرو، انصار اسلام لاکر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے، لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعۃً مشتعل ہوجاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا، تو انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج کی تلواریں میان سے نکل آئیں[1] اور بڑی مشکل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ افک میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہوکر اس کی شکایت کی اور حضرت سعدؓ بن معاذ نے کہا یارسول اللہ! اگر وہ (تہمت لگانے والا) ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں اور اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجالاؤں گا، اس پر سعدؓ بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعۃً کھڑے ہوگئے اور کہا،

كذبت لعمر الله لا تقتله ولا تقدر على قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل۔	خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے تو اس کو قتل نہ کرے گا نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جاتی، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے،

فثار الحيان الاوس والخزرج حتى[2] ان يقتتلوا، ورسول الله قائم على المنبر۔	پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہوگئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہوگئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی، بات بڑھی اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ نے عیینہ سے فرمایا "دیت کیوں نہیں قبول کرلیتے؟" اس نے کہا خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں، جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے، اس پر اور شور و غل ہوا، آپ نے پھر یہی الفاظ فرمائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا، چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تھا، اس لئے قبیلہ بنو لیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا، کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکریوں کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو بدک کر بھاگ گیا، یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ سفر میں تھے اس لئے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دے دیئے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔[3]

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کرگیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کردی اور تلواروں کے میان میں کرلینے کا حکم دے دیا، تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا رہا تھا، اس نے زمانہ جاہلیت میں

---

[1] اصابہ ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۸۸، معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے۔ [2] صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔ [3] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۵۵ کتاب الدیات۔

قبیلۂ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا اور وہ لوگ انتقام کے لئے اس کو ڈھونڈ رہے تھے، سوء اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہِ نبوت میں پہنچ گیا، تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا، آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے، ان لوگوں نے حضرت عمرؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ سے سفارش کی درخواست کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

> "خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے، آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے زیادہ نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدودِ حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانۂ جاہلیت کا انتقام لیا، تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔"

چنانچہ آپؐ نے اس کی دیت ادا فرمائی[1]

بنو ثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنو ثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوائیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا لا تجنی والد علی ولد[2] یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا، اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب وحریفِ مقابل تھے، دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا، انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یا للمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی۔ آپ نے نکل کر فرمایا کہ یہ کیا جاہلیت کی پکار ہے۔

مابال دعوی الجاہلیۃ۔ یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا سخت دشمن ہے، اس لئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا، عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر ہو کر اس کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی، ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے۔

وکان لہ ثار فی الجاہلیۃ وکرہ ان یسلم حتی یاخذہ[4] ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔

اسی طرح حضرت عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا، بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انہوں نے اسی

---

[1] مسند امام احمد حنبل جلد ۴ ص ۳۲۔ [2] دار قطنی ج ۲ ص ۳۰۸ [3] صحیح بخاری ج ۱ ص ۴۹۹ ذکر نہی دعوت جاہلیت [4] اسد الغابہ ص ۸۵ ج ۴۔

وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے، حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔[1]

سیاسی مشکلات

جہالت، وحشت، پابندیٔ رسوم آبائی، اثر ذخیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی، تاہم خاص سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلۂ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علمبردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے اور جو حرم کے مناصب دوگانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد و اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے، ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا "محمدؐ کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے؟" تو اس نے صاف کہا کہ میں کیا کہوں محمدؐ کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان کی دعوتیں کھلائیں، انھوں نے خون بہا دیئے ہم نے بھی بہا دیئے، انھوں نے زرپاشیاں کیں، ہم نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعۃً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آگئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں خدا کی قسم ہم کبھی محمدؐ پر ایمان نہیں لا سکتے۔[2] یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھوں قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کاش مجھ کو کاشت کاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔[3]

خوب غور سے دیکھو، بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کر رہا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثل غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف و ہم عہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے، لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر ان ہی یہودیوں کے زیر بار تھے، انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے۔[4] خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے، اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلۂ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ، تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈے نہ تھے، بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ و حشم غرض ریاست و امارت کے تمام سروسامان رکھتے تھے، اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی، یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہوا، اسلام کو چین نصیب نہ ہو سکا، لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت تک محدود نہ تھی، بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہِ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا، عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا، وہ مال غنیمت سے چوتھا وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی، اس کو چھانٹ لیتا تھا، اس کا نام صفی تھا، یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے، یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

---

[1] اصابہ فی احوال اعشیٰ بذکر عمرو بن مالکؓ۔ [2] ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر طبع اول۔ [3] صحیح بخاری واقعہ بدر۔ [4] طبری واقعہ خیبر۔

قبائل میں بھی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لئے ایک کے بدلہ میں دو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہ بدر میں قریش کی فوج میں سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر ان کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ انصار اور قریش کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا، ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آگئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپیڑ دے مارا، اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جاکر شکایت کی، حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا اس کا کیا قصور ہے، تم نے جو کیا، اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا میرا یہ رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کر دیتا ہے میں اس سے باز آتا ہوں، یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا، اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا، اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک درجہ تھا، اس لئے عرب میں تمام روسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا، ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا تھا۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے، ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے، پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت ازبام کیا اور ان کے مذہبی دعاوی کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا، اس لئے انھیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی النضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القری وغیرہ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کئے۔

عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شمالی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہی دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لئے اس ملک میں ایک اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہیں آسکتا تھا، اسی لئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انھوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی، کسریٰ ایران نے یمن کے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعہ معاش اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا اور یہ ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور حج کے چار مہینوں میں جنگ و غارت

سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔

اندرونی عرب تمام دشت و صحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں، باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لئے ان کو غارت گری کرنی پڑی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی اور رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء، چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لئے قائم ہوتے تھے کہ تجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا، دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ما تقدم کے لیے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا۔

اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منہ فی شئ (صحیح بخاری کتاب الشروط ذکر صلح حدیبیہ)

اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے، حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ چوری نہ کریں گے، اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جاتے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا، اس لئے عربوں کو اسلام قبول کرنے کے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں یعنی وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے، تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے، وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے، تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر رکھے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف مقابل تھے، اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعۃً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (۱۴۸ جلد ۴) میں امام شافعی کی روایت سے لکھتے ہیں۔

قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیابا کثیرا وکان کثیر من معاشہا منہ وتاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی صلعم خوفہا من انقطاع معاشہا بالتجارۃ من الشام والعراق اذا فارقت الکفر

امام شافعی کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اسی غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے، تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرتؐ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا

ودخلت في الاسلام وخلاف ملك الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبي صلى الله عليه وسلم اذا هلك كسرى بعده فلم يبق بارض العراق كسرى يثبت له امر بعده وقال اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده فلم يكن بارض الشام قيصر فاجابهم على ما قالوا۔

جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی، اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے گا تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا، چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور آپ نے فرمایا کہ جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا، چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہیں ہوا جس کی وہاں حکومت ہو، اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔

رفع شک

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہلِ مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورا کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویاں اور لامحدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہلِ عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہلِ عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے، جہاد اور تعدد ازدواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدد ازدواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلے نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے، جہاد کے لئے اور بہت سی پابندیاں تھیں جو پہلے بالکل نہ تھیں، جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے، دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے، جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھیں ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے، لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی، ایک ساتھ آٹھ آٹھ دس دس شادیاں کرتے تھے، اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے، اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا، تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ جہالت، عادات رسوم، نفس پرستی، ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہوتی ہے وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم و فنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے لیکن بیہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم و فنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں اور جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں اسلام ایک ایک کا دشمن تھا، ثار یعنی انتقام خون، عرب کے جذبات کا سب سے بڑا منظر تھا، اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا، خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی

کی روح تھی جو فنا کر دی گئی، ابوسفیان رئیس العرب کو بلالؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھروں میں آگئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے سب سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

وَ اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ (البقرہ-۵) اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا سخت ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا نہ کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا لیکن اب حج وہ جاہلیت کا حج نہیں رہا تھا، طوافِ عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی، بڑی دلچسپی کی چیز بُت تھے، وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیئے گئے، مقامِ منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا، بند کر دیا گیا، یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا، اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالمگیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی، زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس و حریر حرام، چنگ و عود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطفِ زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو، تمام دیگر مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بُت ہوتے ہیں لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے۔

*

تبلیغ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کرکے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بُت پرست نہ تھا، اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے، لیکن کارلائل[1] کے بقول نہتے اور یکہ و تنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی، اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ

"تبلیغ" کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں، قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ "انذار" ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تذکیر ہے جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں، بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بدھ مت، باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت، جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے، ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل ہے؟ کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیم دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے اور اس کے داعی و حامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے، کوشش سے نہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک و مقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ و محترم نسل و قوم کے دوسری تمام قومیں جو ناپاک و نجس و کمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس ۷)، عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا، میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا (متی ۱۵-۲۵) پھر فرمایا، مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔ (۲۶) پھر فرمایا، غیر قوموں کی طرف نہ جانا، اور سامریوں کے

---

[1] ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمد)

کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو (متی ۱۰-۶) پھر ارشاد فرمایا: وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو (متی ۷-۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے، یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش و غیر قریش، حجازی و یمنی، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی، بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا، ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ (مدثر) "اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار (و آگاہ) کر۔" پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ (جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا) فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (شوریٰ) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔ فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو، وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (ذاریات-۳) اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ (ق-۳) "قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو" اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علیؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔"[1]

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جد و جہد کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچایئے، اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ
وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ
يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ (مائدہ-۱۰)

اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ
تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے، اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا
کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچا لے گا۔

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغام الٰہی سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو، پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا، سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا۔

وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء-۱۱)

اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ و ہشیار کر۔

---

[1] صحیح مسلم ابوہریرہ

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا. (شوریٰ - ۱)

تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے (بدوی) ہیں اُن کو آگاہ و ہوشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ احساس و عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ. لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (یٰسٓ - ۵)

یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس حد تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے۔

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ. (انعام - ۲)

تاکہ میں تمہیں آگاہ و ہشیار کروں اور اُن کو جن تک میری یہ آگاہ و ہشیار کرنے والی آواز پہنچے۔

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہوتی ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراہیم - ۷)

یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا - ۴)

اور ہم نے تم کو انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا۔

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کرکے یہ اعلان فرما دیں۔

قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف - ۲۰)

اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت و تبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے، فرمایا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا. الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (فرقان - ۱)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمدؐ) پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہان کے لئے ہشیار و آگاہ کرنے والا ہو، وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری عین اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ. وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ. (ص - ۵)

یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے، اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

اگر بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں، وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو بھی نجات کا راستہ نہیں بتایا

اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا، نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاشِ حق کے لئے آپ کے پاس آئے، مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک، دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے، پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچا دی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پُرامن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدال کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو "فتح مبین" قرار دیا اور اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا نازل ہوئی، اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ، قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالبین اسلام لائے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے، مشرکینِ عرب، یہود و عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا، وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے، لیکن صحیفۂ محمدیؐ نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیرووں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (نحل - ١٦)

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش اسلوب طریق سے کر۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے، عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بطریقِ احسن، مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں، یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے جدلیات جن میں مقبولِ عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے، قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت، دوسرے کو موعظتِ حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی بات پیش کر کے اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں، یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں

لے صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ۔

کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں۔ پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا نام موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریقِ احسن ہے، تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قولِ لین حکیمانہ استدلال ہو، یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیرخواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن سے بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغامِ ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ ارشاد بھی ہوتا ہے۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ - ۲)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے، پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعیوں، مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں، مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض اور قولِ بلیغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوتے تھے، یہ حکم ہوتا ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (نساء - ۹)

تو ان سے درگزر کر، اور ان کو نصیحت کر، اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں، اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور درشتی سے درگزر اور ان کو برداشت کرنا چاہیے، دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر ان ہی ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا۔[1] "دینِ الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا، نفرت نہ دلانا۔" یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دینِ الٰہی کو پیش کیا اور کامیابی حاصل کی، دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبولِ عام کی راہ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت، رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے

---

[1] صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد دوم صفحہ ۶۲۲۔

دلوں کو پُرامید اور مسرور بنانا، اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم، پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوٰۃ ہے، پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے فرمایا تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے، تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اس کا رسول ہے، جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ خدا نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دے دیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں[1]۔

تالیف قلب تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیف قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ (توبہ۔ ۸) اس کے لفظی معنی ہیں "دلوں کو ملانا" اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو لطف و محبت، امداد و اعانت اور غمخواری و ہمدردی کرنا ہے، کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کی غنیمت کا سارا مال ان ہی میں تقسیم کر دیا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں، صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت بغض رکھتے تھے، وہ یہ کہتے ہیں کہ مجھ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، جتنا دیا، اور مجھے ان سے سخت بغض تھا، لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں[2]، ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کیجئے، آپ نے اس کو وہ سب دے دیئے، یہ فیاضی دیکھ کر ایسا اس پر اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ سے جا کر کہا، بھائیو! اسلام قبول کرو، محمدؐ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا[3]۔

ایک یہودی کا لڑکا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے، اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچا لیا[4]۔

دعوتِ عقل اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر

---

[1] صحیح بخاری باب مذکور جلد دوم ص ۱۰۶۳ [2] صحیح مسلم باب جودہ صلعم ج ۲ ص ۲۹۰ مصر [3] ایضاً [4] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا ماجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور وفکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا، اس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اپنی تعلیم کی خوبی و مصلحت و حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور وفکر کی ہدایت کی، فرمایا۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۚ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۚ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ؕ (انعام-۱۸)

کہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے سامنے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو، کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔

نیز ارشاد ہوا۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (انفال-۵)

تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جیئے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (یوسف-۱۲)

اور آسمانوں میں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور وفکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران-۲۰)

بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اے ہمارے پروردگار تو نے (یہ عالم) بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا، اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی، فرمایا۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (ذریات)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔

صحیفۂ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرماتے۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق-۱)

یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لئے۔

هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ (اعراف-۲۴)

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ لِلنَّاسِ (جاثیہ-۲)

یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (نساء-۱۱)

کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد-۳)

کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یس-۱)

حکمت والے قرآن کی قسم۔

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ (یونس ولقمان-۱)
یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا و سزا، عبادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں، آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے ہوا اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتلاتے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استعداد اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں، اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے، ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی فرمایا

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (بقرہ-۳۴)
دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے الگ ہو چکی۔

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی، دوسری جگہ فرمایا،

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ
وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (کہف-۴)
اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور غیر اس سے محروم رہیں گے اس لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی منوانا نہیں ہے۔

اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (مائدہ-۱۲)
ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے تسکین دی گئی۔

اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ-۵)
اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیام پہنچا دینا ہے۔

اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ۔ (غاشیہ-۱)
اے پیغمبر تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا
اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ-۵)
پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے، فرمایا،

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ
كُلُّهُمْ جَمِیْعًا، اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی
اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے، تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں سے زبردستی

یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (یونس-۱۰)

کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا، اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اس لئے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ
حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (توبہ-۱)

اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ
دے، یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے
جہاں وہ بے خوف ہو، کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے، اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا، اس کے تبدیل مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیام حق) ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلا وطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں،

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ
الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال-۵)

اور ان کافروں سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے، اور دین
پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

"فتنہ" سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے ایک شخص نے ان سے آکر کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا اور اوپر کی آیت پیش کی، انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ادا کر چکے، جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا اس کو لوگ یا مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے، یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔[1]

میدانِ جنگ میں تبلیغ

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی بھی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آپڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اول یہ کہ تم کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے اگر منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو، اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے، اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے، اس کو مخالفوں نے اس

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم تفسیر انفال ص ۶۰۰۔

صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو یہ ہدایت فرماتے۔

> جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا، اس کو اسلام کی دعوت دے، اگر وہ قبول کر لے، تو پھر اس سے رک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جاوے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے، اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی، قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فے میں اس کا حصہ نہ ہوگا، جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے[1]۔

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزور شمشیر مسلمان بنا لینا، صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو بلاتے رہے اور کہتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں، اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے[2]، اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہؓ بن اثال قبیلۂ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے، یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا، ثمامہؓ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے جواب دیا محمدؐ! میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کر دو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے، اور اگر احسان کر دو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا، اور اگر زر فدیہ ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا، پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا، پھر تیسرے دن ہوا، تیسرے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو، لوگوں نے کھول دیا، وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو چکے تھے، اعجاز مسیحائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے، کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کا اس سے بہتر موقع مل سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن ان سے یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام، اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا، قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (محمد) لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرتضیٰؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں، وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ، پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا، وہ ان کو بتاؤ، خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔ [2] جامع ترمذی ابواب السیر۔ [3] صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں[1]۔ لیکن خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی حکومت قبول کر لی، اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں، بلکہ کفر کا موجب ہے، کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا، اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا اور اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا تو ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے، میں مسلمان ہوتا ہوں، تو اے خدا کے رسول میں کیا کروں، اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا نہیں اس کا قتل جائز نہیں عرض کی یا رسول اللہ میرا ہاتھ اس نے کاٹ دیا، پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا، جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرار توحید سے پہلے تھا[2]۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ آپؐ کے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الٰہ الا اللہ پکار اٹھا، ایک انصاریؓ جو پہلے اس پر جھپٹے تھے، وہ تو رک گئے مگر اسامہؓ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اسامہؓ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا، "اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا"، پھر بار بار یہ فرماتے رہے اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے، اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت تھی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا[3]۔

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے، واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آوری اور لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے، جب وہ مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمۂ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا، کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے آپ نے فرمایا امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں اور جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے"، اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا تو جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الٰہ الا اللہ کہے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو، اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے، اور ہاری ہوئی

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ خیبر [2] صحیح مسلم کتاب الایمان [3] صحیح مسلم کتاب الایمان ص ۵۲، ۱، مصر۔

قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا ہے؟ اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال - ۸)	اگر کفار کا فریق صلح کے لئے جھکے تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى	اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے
يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ	تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کی
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (توبہ - ۱)	امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لئے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو، مگر ایسا نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ پلٹ کر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتے ہوں، لڑنے کو منع کیا ہے۔

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ	تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں، پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی
فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا (نساء - ۱۲)	طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ "یا تلوار یا اسلام" قبول کیا، امن پسندی، اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی،

مسلح تبلیغی جماعتیں

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں، لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منتظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی، جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا، جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا، اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھیں، اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا، اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا تب بھی وہ اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں، واقعہ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بئر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعہ ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا، اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے بنفس نفیس اس فرض کو ادا کرتے رہے، ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس جاتے اور

آنے جانے والوں کو بشارت سناتے، مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا، جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے خود یہاں آتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوتے اس سفر کی مصلحت بھی عجیب و غریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوئی۔

مکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلّغ اور داعی حق حضرت ابوبکرؓ تھے، مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پر جوش نوجوان ان ہی کی تبلیغ سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے، حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلّغ حضرت مصعبؓ بن عمیر ہیں، جن کے موثر وعظوں کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نو مسلموں کی تعلیم کے لئے جو اطراف ملک سے دار الاسلام میں آتے تھے، نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحاب صفہ (چبوترے والے) مشہور ہے، اس میں بعض اوقات سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے اور خود نو مسلموں کو تعلیم دیتے، بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلّغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے تھے، وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر گئے احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں، میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس ۳۵ صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنہوں نے از خود یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں، ابوذر غفاریؓ، طفیل بن عمرو دوسیؓ، جعفر بن طیارؓ، عمرو بن عنبسہؓ سلمی، ضماد بن ثعلبہؓ، خالد بن ولیدؓ، علی بن ابی طالبؓ، مہاجر بن ابی امیہؓ، زیاد بن لبیدؓ، خالد بن سعیدؓ، عدی بن حاتمؓ، علاءؓ بن حضرمی، ابوموسیٰ اشعریؓ، معاذؓ جبلؓ، جریر بن عبد اللہ بجلیؓ، دحیہؓ کلبی، عمرو بن امیہؓ ضمری، مغیرہؓ بن شعبہ، عمروؓ بن العاص، وبرؓ بن یحنس، عروہؓ بن مسعود ثقفی، عامرؓ بن شہر، منقذ بن حبانؓ، ثمامہؓ بن اثال، محیصہؓ بن مسعود، احنفؓ، ابوزید انصاریؓ، عمرؓ بن مرہ، عیاش بنؓ ربیع مخزومی، واثلہؓ بن اسقع، عبد اللہؓ بن حذافہ سہمی، حاطبؓ بن ابی بلتعہ، سلیطؓ بن عمرو بن عبد شمسؓ، شجاعؓ بن وہب اسدی، ان ہی مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی، جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد، غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعت اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے

قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا، وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی، اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا، اس کی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی، مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا، فرمایا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (فرقان-۵)
تو اے پیغمبر منکروں کا کہا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ تو بڑے زور سے جہاد کر۔

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے، فرمایا۔

فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق-۳)
تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہیں قرآن کے ذریعے یاد دلا

قرآن رحمت عالم کا پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض و غایت ہے، فرمایا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (فرقان-۱)
برکت والا ہے وہ جس نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندوں پر اس لئے اتاری کہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کرے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھیں، جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے، اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار کو پہلے دعوت توحید دی جاتی، پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا، اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے، اسی لئے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں، لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن مجید کا طرز خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات، ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں، سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی، اور فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا، اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں وہ خال خال پائے جاتے تھے، وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس سے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان سے خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے

اور ان کے عقائد کی تردید کی اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کیلئے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا، ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا، وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے، گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے، اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھیں جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں، عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت، روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں، لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصارِ مدینہ نے خود مکہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الٰہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلے کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف باسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا، وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلے کے پاس ایک آدمی بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زد و کوب کیا، اس نے آکر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اگر اہل عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے (مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیئے گئے، مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھی، اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے، اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثیٰ نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا، اسی قریہ جواثیٰ کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا[2] بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوتے لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبد القیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۹۵ صحیح علی شرط مسلم [2] صحیح بخاری باب الجمعہ فی القریٰ والمدن۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا، وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دار الہجرت تھا، وہاں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانہ میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا
یَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ
وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ (توبہ-۱۲)

دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارے ہیں، اور اللہ جاننا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اسی قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آکر اسلام لاتے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام بیعت اعرابی تھا، جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی، اس بناء پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔[2]

اشاعت اسلام کے اسباب وذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین حق کو عرب میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبول اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے، تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے،

(۱) اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآن مجید جس مؤثر اور دل کپکپا دینے والے طریقے سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع کا ذکر اوپر ہو چکا، فنا ہو جاتے تھے جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے، قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہر قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا۔

کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ
ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ
تُرْجَعُوْنَ (البقرہ-۳)

تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا، پھر زندہ کرے گا اور پھر اسی کے پاس واپس کئے جاؤ گے،

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ
وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا
یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا
بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّ
تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ

آسمان اور زمین کی پیدائش میں، شب و روز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لئے سود مند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برسنے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں ہواؤں کو چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں

---

[1] صحیح مسلم فضائل جعفرؓ بن ابی طالب و اسماءؓ بنت عمیس [2] صحیح مسلم کتاب الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعۃ۔

وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (بقرہ - ۲۰)

دانشمندوں کے لئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران - ۹)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران - ۲۰)

آسمان و زمین کی خلقت اور شب و روز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لئے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (یونس - ۳)

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کے لئے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعۃً) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آگئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے، اس وقت وہ خدا کو مخلص ہو کر پکارنے لگتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ:

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو، اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

خدا یا ایک قوتِ اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے لیکن غفلت شعاری، اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے، قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے۔

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ابراہیم)

کیا خدا میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (بقرہ - ۳)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی دی، پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے، زیادہ تر بلکہ تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جن سے براہ راست اس کو کام پڑے،

ہے اس کو زیادہ مانتا ہے اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار و نباتات کی روئیدگی، سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لئے ان کو عبودیت کا جو کچھ تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، ان ہی سے محبت رکھتے تھے، ان ہی پر نذر چڑھاتے تھے، ان ہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معرکوں میں انہی کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تجہیل ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا تھا۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ، اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًاۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَمَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔

کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے جب وہ اس کو پکارتے ہیں، اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جس کو خدا کا شریک کہتے ہیں، خدا ان سے برتر ہے، آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو لوٹاتا ہے، اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان و زمین سے روزی دیتا ہے، کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔

کفار و مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ۔ یعنی جب ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا، قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا۔

اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی، فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی

(قیامۃ - ۲)

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا، پھر گوشت کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے۔

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال، ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دلنشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا، اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے ان ذاتی اغراض کا اثر تھا، حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے، حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ، ہم تمہارے لئے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں جب یہ آیت آئی،

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ	تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا
صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (حٰمٓ فصلت - ۲)	ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہا کہ محمدؐ جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ تو شعر ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے[1] بلکہ کوئی اور چیز ہے، حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعر لسانِ عرب میں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحقیق حال کے لئے بھیجا تھا، وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں لیکن میں کاہنوں اور شاعروں دونوں کے کلام سے واقف ہوں، ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انہیں کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا[2]۔

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔

نَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ	خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے
ي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ	اور فحش سے، بُری بات سے اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے
عِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نحل - ۱۳)	وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں[3]۔

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقینِ اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا، پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے، یہ کہہ کر آپؐ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں، عثمانؓ کہتے ہیں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا[4]۔

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ اَمْ	کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا یہ خود خالق ہیں کیا آسمان اور زمین
خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ اَمْ عِنْدَهُمْ	کو ان ہی لوگوں نے پیدا کیا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں ایمان نہیں کیا
خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (طور - ۲)	ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں۔

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۴۴ میں مسند ابو یعلی وغیرہ سے روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔

[2] صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ [3] الجواب الصحیح جلد ۴ ص ۔ بحوالہ عبدالرزاق [4] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۳۱۸ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی۔

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔[1]

طفیل بن عمرو الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے، لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں، لیکن جب اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔[2]

ہجرت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے اس کا جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانیؓ نے جو طائف کے رہنے والے تھے، آپ کو،

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (طارق) قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارے کی،

پڑھتے سنا تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی اور آخر اسلام لائے۔[3]

حضرت ابوبکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا، اسی زمانہ میں انھوں نے ایک مسجد بنوائی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوئی جاتی ہیں۔[4] انصار اول جب مقام عقبہ میں اسلام لاتے تو قرآن ہی سن کر اسلام لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔[5]

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے تحقیق حال کے لیے مکہ میں آئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو، اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا، انھوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے، لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔[6]

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی، جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، صدہا کافر مسلمان ہوئے۔[7]

ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے وہ صرف فصاحت و بلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی و مطالب میں ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ طور۔ [2] ان کے اسلام کا حال ابن الاثیر اسد الغابہ نے بتفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [3] مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۳۳۵ [4] بخاری کتاب الکفالہ ذکر ہجرت [5] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۲۰۲ [6] ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۰ مطبوعہ مصر ذکر ہجرت حبش [7] صحیح ترمذی تفسیر سورۂ روم۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا ہے جیسا اب ہے، لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا، قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا، دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے، وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز، توحید، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دلوں میں گھر کرتے جاتے تھے اور ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام اور اعتقادات باطلہ تھے، جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں، مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے، یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعۃً فنا نہ ہو جاتے، یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ہر معزز رئیس اپنے پورے قبیلے کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوت اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے بار بار دار النبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے، جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی، اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان ریاست و خود سری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لئے اگر کوئی خود غرضی بھی کرنا چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سد راہ ہو سکتی تھی، لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے، مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آسکتا تھا محمد رسول اللہ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں ہے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق، اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت، اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ قرآن مجید نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقِ نبوت پر اسی مقدس اور معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (یونس - ۲)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت تک زندگی بسر کی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔

زندگی کا یہی اعجاز تھا، جس سے ظہورِ نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں ہو سکتا، نبوتِ محمدیؐ کا معتقدِ اولین دنیا میں کون تھا، ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، چالیس برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف و حالات کا تجربہ، وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں "محمدؐ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔"[1]

سن چکے ہو کہ عرب میں آپؐ کی نبوت کا جب چرچا ہوا تو ابوذر غفاریؓ نے انیسؓ اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لئے بھیجا انہوں نے واپس آ کر پیکرِ نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا "میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔"[2]

نبوت کے بعد قریش نے ذاتِ نبویؐ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا، تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی آپؐ کی طرف منسوب نہ کر سکے، اسلام کے سب سے اول اعلانِ دعوت کے موقع پر جب آپؐ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو خطاب کیا اور پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوجِ گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے، تو کیا سچ مانو گے؟ سب نے بیک آواز کہا "محمدؐ! تیری بات آج تک ہم نے جھوٹ نہ پائی"[3]، ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصرِ روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہؐ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق اپنی شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف پیش نہ کر سکے، انہوں نے شہادت دی کہ محمدؐ کبھی جھوٹ نہیں بولے انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں، ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں، یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا یقین کیا۔[4]

کتاب کی دوسری جلد میں آپؐ کے تمام محاسنِ اخلاق، یعنی رفق، ملاطفت، حسنِ معاملت، جود و سخا، عدمِ تشدد، عفو، درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی طور پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیرِ قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا، قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے۔

وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران - ۱۷)

اور محمدؐ! اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی۔ [2] صحیح بخاری جلد اول ص ۴۹۹ قصہ اسلام ابی ذرؓ۔ [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ تبت و صحیح مسلم کتاب الایمان باب وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔ [4] صحیح بخاری بدء الوحی۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی، اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی، صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں، آپ نے دے دیں، اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے کہا، "لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد اس قدر دیتے ہیں کہ ان کو خود اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔"[۱]

فتح مکہ میں جب صفوان بن امیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تین سو اونٹ دے دیئے، خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس قدر دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔[۲] ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگ احد میں قوت بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کے شکم کو اسی نے چاک کیا تھا اس نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا، اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی لیکن دربار رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اٹھی یا رسول اللہ! سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانہ مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔[۳]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے، اس نے کہا کہ میں تو لے ہی کے ٹلوں گا، آپ نے کہا کہ اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں، چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے، صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضی ظاہر کی اور خدمت اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے، آپ نے فرمایا ہاں، لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں، دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے، میں نے یہ گستاخی اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔[۴]

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا تھا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا، گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی، آپ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اس نے کہا کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے، تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا، یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے، دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے اس کے بند گرہ کھول دیئے اور رہا کر دیا، اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا، غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہوا، محمد! زمین پر آپ کے چہرہ سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن وہ آج میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا

---

[۱] صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ باب ما سئل رسول اللہ شیئا قط فقال لا۔ [۲] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا [۳] صحیح مسلم باب مذکور [۴] مسلم جلد ۲ ص ۵۵ باب قضیۃ ہند [۵] مشکوۃ ص ۲۲۰ کتاب الفتن فی اخلاقہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوشنما نظر آتا ہے۔[1]

ایک بار آپ کسی سفر میں تھے اور پانی ساتھ نہ تھا، صحابہؓ نے پیاس کی شکایت کی، آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھری ہوئی لے جا رہی تھی، دونوں صاحب اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے، آپ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیئے، صحابہ نے باری باری سے پانی پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی یہ تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کی محنت کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کا آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں بندھوا کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا، وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا، اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا، بلکہ تربیت یافتگانِ نبوت کے طفیل اثر سے اس کے تمام قبیلہ تک وسیع ہو گیا۔[2]

نبی کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اس کا اخلاق ہی نہیں اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی معصوم شکل و صورت اور اس کی ایک ایک ادا اعجاز اور سراپا اعجاز ہوتی ہے۔

روے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے [illegible] ہو جاتا تھا۔

جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا، حضرت عبداللہ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبر اُن کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ فرما رہے تھے افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام[3] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان میں جونہی پہنچے، حضرت عبداللہؓ بن سلام بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔[4]

ضماد ایک شخص تھے، جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں، وہ آپ کے پاس آئے اور کہا، محمدؐ! میں جنون کا علاج کرتا ہوں، اس کے جواب میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا۔

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ من یھدہ	تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں، میں اس کی حمد کرتا ہوں اور اس سے مدد
اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی	چاہتا ہوں، خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کر سکتا جس
لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ	کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا

---

[1] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۹۰، کتاب الجہاد والسیر [2] بخاری ج ۱ ص ۵۰ کتاب التیمم [3] ابن حنبل ج ۵ ص ۴۵۱ [4] بخاری ج ۱ ص ۵۵۰ باب ہجرۃ النبی صلعم واصحابہ الی المدینۃ۔

لاشریک لہٗ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے، آپ نے تین بار ان کلمات کا اعادہ فرمایا، انہوں نے کہا میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کلام کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں[1]۔

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارث یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے، تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا، بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا، ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا، ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے، اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا[2]۔

انسان کا ۔ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپ کی شکل نہایت پرجلال تھی، چہرہ پُرنور تھا، ۔ وقار اور پُر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا، حضرت عبداللہؓ بن سلام نو مسلم یہودی عالم آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر اسی اثر سے متاثر ہوئے اور بے اختیار بول اٹھے تھے

وجہہ لیس بوجہ کذاب (ترمذی ص ۴۰۹) جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوا تھا،

ھذا وجہ مبارک (ابوداؤد ج جلد ا ص ۲۸۱) یہ مبارک چہرہ ہے۔

بارگاہ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا، ابو رافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ کی خدمت میں آئے تھے، جونہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ ہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا اور آپ کی غلامی کو فخر سمجھا[3]۔

---

[1] مسلم باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ [2] اصابہ جلد ا ص ۲۹۶ تذکرہ حارث [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب یستجن بالامام فی العہود [4] اصابہ و استیعاب۔

اسلام

یا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پر اثر دعوت، اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق و موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا، یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی اخلاق، ایثار، امن، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی، جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا

الا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ السموات والارض (بخاری) — ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پر درد وداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے[1]

قد ترکتکم علی البیضاء لیلھا کنھارھا۔ — میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔

اور آخری حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (مائدہ) — آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائید شہادت بمشکل مل سکتی ہے، لکھتے ہیں،

"محمدؐ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک

---

[1] سنن ابن ماجہ ابواب سنت و بدعت و مستدرک حاکم جلد اول ص ۹۶ و مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۶۔

مذہب عطا کی اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔"[1]

ایک دو در یورپ کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داؤد مجاعص) نے لکھا،

دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[2] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفے، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود امی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبد اللہ قریشی، عرب اور اسلام کا پیغمبر، اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا، اور اپنی قوم اور اپنے پیرووں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے، اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہیں، حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تاکہ اقوام اسلامی کے اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوٰۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی، قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے، قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے، اسی بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا، جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے، مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا، نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے، تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں، اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ رہنے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔

انگلستان کے مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمد" آپ کی نسبت کہتا ہے۔

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا"۔[3]

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور

---

[1] لائف آف محمد، مارگولیوتھ ص ۱۴۹۔ [2] مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔ [3] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون "قرآن" ج ۱۵ ص ۸۹۹۔

عمل سے نہ ہوگئی ہو، اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاء میں خاتم نبوت، اکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی، اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی، حالانکہ آپ نے فرمادیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں، میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں[1]۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیئے، حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے، آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں، نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو[2]۔ نبوت محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپ کی بعثت تھی، اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں، آج بھی تجربہ ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے، لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات کو چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے، چار ابواب پر منقسم ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ نے بتایا ہے کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ، اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان، آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے، اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قولی اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ، ہمارے جسم و جان اور مال و جائیداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے، اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں، اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال [2] جامع ترمذی و سنن ابی ماجہ کتاب الطہارت۔

حیثیت قانون کی نہیں، بلکہ روحانی نصیحتوں، اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے، تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے، اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے کی بجاآوری کا نام عمل صالح ہے اور ان ہی دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے، عمل صالح کی تین قسمیں ہیں، خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی، اور ان کے ساتھ محبت الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ، اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے، الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ ان ہی چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

*

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ، غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے، ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں ان ہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا،

الا و ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ و اذا فسدت فسد الجسد کلہ الا و ھی القلب (صحیح بخاری کتاب الایمان)	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، ہاں وہ ٹکڑا دل ہے،

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے قَلْبٌ سَلِیْمٌ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل قَلْبٌ اٰثِمٌ[1] (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قَلْبٌ مُّنِیْبٌ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے تمام اعمال کا محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ نے فرمایا،

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری آغاز کتاب)	تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے،

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا،

انما لامرئ ما نوی فمن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او الی امرأۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔ (صحیح بخاری آغاز کتاب)	ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہۃً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے، اب صحیح اور صالح عمل کے لئے

---

[1] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے فَاِنَّہٗ اٰثِمٌ قَلْبُہٗ (بقرہ-۳۹)

ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے نہ تسلیم کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے اس لئے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عمل صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے، جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے، عبداللہ ابن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے، مگر بایں ہمہ مشرک تھا، اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بار الٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔[1]

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ اے محمدؐ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے۔ فرمایا کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا "نہیں"، فرمایا واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی، مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی فرمایا کہ میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا، غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپؐ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا، تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔[2]

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا، اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ	جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے
اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا	جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی

---

[1] مصنف ابن ابی شیبہ غزوات نسخہ قلمی دارالمصنفین و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۴۹ مصر۔ [2] صحیح مسلم باب غزوات جلد دوم صفحہ ۱۰۶ مصر۔

كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (ابراہیم-۳)

فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا (نور-۵)

اور جنھوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (نور-۵)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اسی لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی، وہ کام جو گو بظاہر نیک ہوں، لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصل مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ-۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھ دے کر اس طرح نہ برباد کرو، جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر اور جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے اور قیامت پر، جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی، یقین نہیں کرتا، پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، ذرا اس پر پانی برسا اور مٹی دھل کر پتھر رہ گیا، جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اُگے گا نہیں اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے، وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی، کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے اور ہمارے تمام کام

کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے ذلیل جذبات و پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے، انجیل میں ایمان ہی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لئے نہیں بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لئے اور خوارق عادت پر قدرت اور اعتبار پانے کے لئے؎ اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا، عیسائیوں، زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سراپا خیال فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت عملیت پر غالب آگئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصل زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد، اخلاق اور عبادات کی اساس قرار پا سکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال، جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس جہان کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضاجوئی اور اسی کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں، ہمارے دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہوں اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے، اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عمل کی تحریک کا باعث بن سکے پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہو گی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم

؎ متی۔

اور ہر لحظہ لکھتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا الفاظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ ہیں، اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے، ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جاتے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہتا جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیا سے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے، اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے، بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ امور اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا، یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ	جو لوگ غیب (خدا، خدا کی صفات اور ملائکہ) پر ایمان رکھتے ہیں۔
وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ (بقرہ-۱)	اور جو کچھ تم پر (اے محمد) اترا اور تم سے پہلے (پیغمبروں پر) اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیاء اور ان کی کتابوں پر)
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ (بقرہ-۱)	اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (بقرہ-۲۲)	اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر، فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ-۴۰)	پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لاتے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے۔

سورۂ نساء میں ان ہی عقائد کی تعلیم ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ، وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (نساء-۲۰)	اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری، اور جو شخص خدا کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمن باللہ

ایک قادرِ مطلق اور ہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین، اور اس کو ایک جاننا تعلیمِ محمدیؐ کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا، مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصابِ درس کا پہلا سبق اور روحانی معارف و حقائق جسمانی اور اعمال و اخلاق کا سرِ بنیاد قرار دیا، خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (نساء-۱۸)	یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔

پھر اسی کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسماء و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیمِ محمدیؐ کی امتیازی شان ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیؐ کی غرض و غایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الہیاتی فلسفہ نہ تھا بلکہ ایک زندہ قوم، جد و جہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا، اور اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لئے نمونۂ عمل بنانا تھا، اس لئے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطبِ اول تھے، رموز و اسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لئے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاحِ عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لئے سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرامِ فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پُر زور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں

ہیں لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے، اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود ہیں اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال کیا، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفت خلق اور احیاء و اماتت برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح کوئی چیز مقابلہ اور تضاد سے خالی نہیں، اس لئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کئے اور ان کا نام یزدان اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام، نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ۱۲ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا لیکن شرک کا استیصال کل نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک اور ابطال اور رد کیا ہے، اس لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعال خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا، ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لئے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمال مصوری پر اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقۂ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور اگر کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیر مطلق ہے نہ کوئی شر محض، اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے۔

أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَنْ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا (جن۔۱)	آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔
مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ (نساء۔۱۱)	تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔
أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا	کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم ان کو پہنچا چکے ہو

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران-١٧)

تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی، کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے، خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، شر نہیں ہے، ان میں اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں، البتہ جب کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے، حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں دوئی نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لئے الگ اور بری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے، دو نہیں ہیں۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (نحل-٧)

اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ وہ ایک ہی خدا ہے تو مجھی سے ڈرو، اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

(٢) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص، کسی خاص شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر، کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (نساء)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا (نساء-٢٣)

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہے، اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَـيْـــًٔـا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (مائدہ-٣)

وہ لوگ کافر ہو گئے جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں، کہہ دو کہ اگر خدا چاہے کہ مسیح بن مریم کو، اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے اور خدا ہی کے لئے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں سب کی حکومت ہے، وہ جو چاہے کرے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰــهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ۭ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ

اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو، عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری یہ مجال کہ میں ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں، اگر میں نے کہا ہوگا تو تو جانتا ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب دان ہے، میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ

اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ (مائدہ-۱۶)	کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو، جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ حاصل کون و مکان تھے، لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف-۱۲)	کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے، جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گزرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں مثلاً حضرت موسیٰ کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے اور حضرت عیسیٰ روح اللہ تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے، آپ کا کیا لقب تھا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔	میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی، اس پر یہ آیت اتری[1]۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ	تم کو کچھ اختیار نہیں ہے، خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا
يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ (آل عمران)	ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام قبول کرنے کے نہایت خواہشمند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (قصص)	تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ	تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ-۱۰)	بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از اعتدال طرح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے۔

لَا تُطْرُوْنِیْ كَمَا اَطْرَتِ الْيَهُوْدُ	میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ
وَالنَّصَارٰى۔	نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپ راستہ میں جا رہے تھے، ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ نے فرمایا ڈرو نہیں، میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں، جو گوشت کو خشک کرکے کھایا کرتی تھی[5]۔

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہمارے سید آقا ہیں

---

[1] بخاری غزوۂ احد۔ [2] یہ حدیث بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ [3] بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ توبہ۔ [4] بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم۔ [5] شمائل ترمذی و مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۴۸ [illegible]

آپ نے فرمایا، سید خدا ہے۔ لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ نے فرمایا اچھا یہ کہو دیکھو کہیں تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنالے[1]، اصلی الفاظ یہ ہیں۔ قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان۔

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا، اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ نے فرمایا، لوگو، پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمہیں گرنے نہ دے، میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے، مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ[2]

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں، مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا،

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

(۴) شرک کا اصلی عنصر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں، جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں، ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے، خود مسلمانوں میں ہزاروں، لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء و صلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے، اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ أَمْلِكُ لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن شَيْءٍ (ممتحنہ-۱) میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لئے استغفار کی اجازت مانگی تھی، وہ نہیں ملی البتہ درخواست ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کر لوں[3]۔

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری۔ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا، اے قریشیو! اے اولاد عبد المطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں، لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا[4]۔

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں۔

قُلِ ٱدْعُوا۟ ٱلَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِۦ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ ٱلضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا أُو۟لَٰٓئِكَ کہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کو ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے، جن کو یہ لوگ

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب ہل یقول سیدی و ابوداؤد کتاب الادب باب کراہیۃ التمادح [2] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳ [3] صحیح مسلم کتاب الجنائز

[4] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا (بنی اسرائیل - ۶)

پکارتے ہیں، وہ بھی زیادہ قرب حاصل کرنے کے لئے خود خدا ہی کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں، ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے اور نہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں، یہ خیال رفتہ رفتہ دیوتا اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے، تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا، قرآن مجید میں اس کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں، اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنْ یُّنَزِّلَ اٰیَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (انعام - ۴)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا، کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں۔

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد - ۱)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰی تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۱۰)

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ بیچ میں تم نہریں جاری کر دو، یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو، جیسا کہ تمہارا گمان تھا، یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔

(۲) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کئے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جواب تلقین کیا، وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا
نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔
(عنکبوت ۔ ۵)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرتؐ) پر ان کے خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے، کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان (کفار) کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں بے شبہ ایمان والوں کے لئے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوئے۔

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے

(۶) شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاء یا پیشوایان مذہبی کو تحریم وتحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا (توبہ ۔ ۵)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔

تو حضرت عدی[1] نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں، عرض کی کہ ہاں، آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے۔ عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے ہیں لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال وحرام کی تعیین، جائز وناجائز کی تفریق، امر ونواہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذات نبوی کی صفت رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران ۔ ۵)

محمدؐ تو صرف ایک رسول ہے، اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (نساء ۔ ۲۳)

مریم کا بیٹا عیسیٰ اللہ کا صرف رسول تھا

اس حصر سے مقصود یہ ہے کہ انبیاء میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت اور نبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات ہے لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے، سجدہ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایان

---

[1] جامع ترمذی و ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے، اور سلاطین و امراء کو تو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدہ تعظیمی یا سجدہ تحیت جائز تھا، چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا، لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا، سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا، ایک دفعہ ایک صحابی خدمتِ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں، آپؐ نے فرمایا تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے، عرض کی نہیں، فرمایا تو اب بھی نہ کرو، اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[1]، اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے، تو آپؐ کو سجدہ کیا، آپ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا ایسا نہ کرو، اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے[2]۔

صفاتِ الٰہی کی توحید

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکتِ وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں، ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے، اکثر اہلِ مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علمِ غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے، کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتا جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علمِ غیب کی تمام صورتیں باطل کیں، خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (انعام ۔۷)
اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتحِ غیب پانچ ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا[3]۔

(۱) حمل یعنی لڑکا ہو گا یا لڑکی۔
(۲) کل کیا ہو گا۔
(۳) بارش کب ہو گی۔
(۴) کس جگہ موت آئے گی۔
(۵) قیامت کب آئے گی۔

اگرچہ علمِ غیب کی اور بھی صورتیں ہیں لیکن زیادہ تر انہی امور کی نسبت لوگ علمِ غیب کے مدعی تھے اور انہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علمِ غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں، گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا۔

---

[1] ابو داؤد کتاب النکاح باب حق الزوج علی المرأۃ [2] ابن ماجہ باب حق الزوج علی المرأۃ [3] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں بہ تفصیل مذکور ہے۔

وفینا رسول یعلم ما فی غدٍ۔
اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو، وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں[1]، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام۔ ۵)
کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (نمل۔ ۵)
کہہ دے اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں طرح طرح کے فریب کا جال پھیلاتے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہ نے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا "اب نہ جایا کرو"، عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے، فرمایا یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ آیا کرو، بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو باتیں جھوٹ ملا دیتا ہے، کبھی فرمایا کہ فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں، جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں، عرب ان کو عراف کہتے تھے، آنحضرت[2] صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی[3]، علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے ہیں، آپ نے ان کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ بتایا ہے اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس سے انکار کرتا ہے۔

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگون، جز، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدایانہ طریقے مٹ گئے، پرندے اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

مخفی قوتوں کا ابطال

(۹) کائنات میں خدا کے سوا ان غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا، اور دعا و

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں بتفصیل مذکور ہے۔ [2] صحیح بخاری کتاب النکاح [3] مشکوٰۃ باب الکہانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد، ابن ماجہ اور احمد سے کی ہے۔

کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے، ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا اظہار ہو کفر قرار پائے، اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔	(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں
(فاتحہ)	اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشادِ خداوندی ہوا۔

وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا	یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے
بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ	حکم سے اور یہ یہود وہ جادو اور ٹوٹکے سیکھتے ہیں جو ان کو
وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ	نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو
مِنْ خَلَاقٍ۔	حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں، فرمایا،

يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ۔	مصری جادوگروں کے جادو سے یہ اس کو خیال ہوتا تھا
(طٰہٰ - ۳)	کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل کا حکم دے دیا[1] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو، اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں وہ بالکل بے بس ہیں۔

ابو داؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو، اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں، ایک صحابی نے ایک بیمار پاگل پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کی وہ اچھا ہو گیا، اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقعہ عرض کیا، فرمایا کہ میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچی جھاڑ سے روزی کھائی، ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا،

إِنَّ الرُّقَى وَالتَّمَائِمَ وَالتِّوَلَةَ شِرْكٌ۔	بے شک جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے بچھڑانے کے
(ابو داؤد و ابن ماجہ)	تعویذ شرک ہیں۔

ان ہی صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی، گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگہ پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا، وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی، انہوں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کو توڑ کر پھینک دیا، پھر فرمایا کہ عبد اللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک، گنڈے اور میاں بیوی کے بچھڑانے کے تعویذ شرک ہیں، ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھوں میں کچھ پڑ گیا، جب میں جھاڑتی

---

[1] جامع ترمذی باب ما جاء فی حد الساحر و ابو داؤد باب اخذ الجزیۃ من المجوس۔

تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے، تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے، آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں "اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں، ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ ہو۔"

اوہام وخرافات کا ابطال

(۱۰) وہ تمام اوہام وخرافات جن سے مشرک اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمایا کہ ان کی کوئی اصل نہیں، فرمایا:[1]

لا عدویٰ ولا طیرۃ ولا صفر ولا ہامۃ	نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے،
(ابوداؤد وابن ماجہ)	نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا،

العیافۃ والطیرۃ والطرق من الجبت۔	پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری
(ابوداؤد وابن ماجہ)	پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔

ایک اور صحابی آپ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ فال نکالنا شرک ہے، پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو بُرا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔[2] یہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نچھتر "دن کچھ نہیں"[3] یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں، اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے، ان کو آپ نے ایک لفظ سے باطل فرما دیا، فرمایا،

لا غول (ابوداؤد باب فی الطیرۃ)	غول بیابانی کچھ نہیں۔

بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالاتِ فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا،

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا	خدا نے بحیرہ، اور سائبہ اور وصیلہ اور حام
وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ - ۱۴)	نہیں ٹھہرایا،

بحیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھا دیں گے اور اگر مادہ ہوا تو اپنے پاس رکھیں گے، پھر اگر نر و مادہ پیدا ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چلتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استیصال فرمایا، یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے، یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منتج ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریقِ عمل سے روک دیتے

---

[1] یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ما جاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں [2] ابوداؤد وابن ماجہ ذکر فال [3] ابوداؤد وماجہ

ہیں مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں، اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً

(۱) عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند اور سورج میں گرہن لگتا ہے، آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب انتقال کیا تو سورج گرہن لگا ہوا تھا، لوگوں نے خیال کیا کہ ان ہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو مسجد میں جاکر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں، کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا[1]۔

(۲) یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

(۳) ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف رکھتے تھے، ایک ستارہ ٹوٹا، آپؐ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے[2]۔

(۴) شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ ان کو جنات نہ ستانے پائیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے[3]۔

(۵) نظر بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے[4]۔

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام و خرافات کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا، اسلام کی اس اصلاح اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات و حکایات سے کرو جنھوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں، بھوتوں اور چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا، اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

(۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ رکھے تھے اس کا اصل سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی درباری سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ ان کے دربار سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے۔

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس - ۲)

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انھوں نے صاف کہا۔

---

[1] صحیح بخاری باب صلوٰۃ الکسوف [2] مسند ابن حنبل جلد اول ص ۲۱۸ [3] ادب المفرد باب الطیرۃ من الجن ص ۱۸۰، مصر [4] موطا امام مالک باب ما جاء فی نزع التعلیق والجرس من العین ص ۳۷۰۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر-۱)

ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کردیں

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں بہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے، ان کا دعویٰ تھا کہ

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ-۳)

ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں،

قرآن نے کہا،

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ-۳)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے،

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا،

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (آل عمران-۳)

ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی،

قرآن نے کہا،

وَغَرَّهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (آل عمران)

اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹ عقیدہ گڑھ چکے ہیں وہ ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو دھوکا دے رہا ہے،

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی اور طبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لئے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا،

پیغام محمدی نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا،

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (توبہ)

انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے،

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ،

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران)

اور خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر عدل وانصاف کرے گا، قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں ان کی تردید کی ہے، قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا،

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (مائدہ-۱۶)

اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔

وہ کہیں گے بارالٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا تھا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی، میں نے

تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو۔ اب،

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (مائدہ ۱۶)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرستوں عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا، اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں، اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ شفاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (زخرف۔۷)

یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا (مریم۔۶)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔

أَأَتَّخِذُ مِنْ دُونِهِ آلِهَةً إِنْ يُرِدْنِ الرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَا تُغْنِ عَنِّي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَلَا يُنْقِذُونِ۔ (یٰس۔۲)

کیا خدا بر حق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا،

وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَىٰ (نجم۔۲)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لئے چاہے اور پسند کرے۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ (زمر۔۵)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کوئی شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی! (شفیع بننے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہے گا،

وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ (انعام۔۱۱)

اور ہم دیکھتے نہیں تمہارے ساتھ تمہارے ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ وَلَمْ يَكُنْ

اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین ناامید ہوں گے کہ جن کو وہ خدا کا

لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا (روم - ۲)	شریک کار بناتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ	اے فرزندانِ اسرائیل،
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا	اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا
وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا	اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گا اور نہ کچھ اس کے
عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (بقرہ - ۶)	بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآئِيْلَ	اے فرزندانِ اسرائیل ......
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ	اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے
شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا	گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت
شَفَاعَةٌ (بقرہ - ۱۵)	فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے نہ رہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ	اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے
قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ	کچھ خرچ کر دیا کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں بیع نہ
وَّلَا شَفَاعَةٌ (بقرہ - ۳۴)	ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ	کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ گو
اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ	ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی کہہ دے کہ شفاعت
لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ۭ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	کا کل اختیار خدا ہی کو ہے، اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے،
ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (زمر - ۵)	پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا صرف اتنا حصہ تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ	اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا
اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔	اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور
(زمر - ۷)	وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ	یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک

الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم-۶)	(دنیا میں اپنے عمل کے ذریعہ سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادتِ حق اور عہدِ الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لئے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس-۱)	اللہ کی بارگاہ میں، کوئی شفیع نہیں، اس کی اجازت کے بعد
مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ-۳۴)	وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے، لیکن اس کی اجازت سے۔
وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى (نجم)	اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آسکتی، البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔
لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (نباء-۲)	یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو اس کی اجازت دے گا، فرمایا۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ (سبا-۳)	اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی لیکن اس کے لئے جس کے لئے وہ شفاعت کی اجازت دے
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا (طٰہٰ-۶)	اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لئے خدا اجازت دے اور اس کے لئے بات کرنا پسند کرے۔

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش ان ہی کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا، فرمایا۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ (انبیاء-۲)	اور وہ شفاعت نہیں کریں گے لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اس کے خوف سے ترساں ہوں گے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلانِ عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم ہو گئے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ (مدثر-۲)	تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔
مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (مومن-۲)	ظالموں (مشرکوں[1]) کا نہ کوئی دوست (اس دن) ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا، مشرکین ہیں، جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ (نساء-۱۸)	اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔

---

[1] اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان-۲) بے شک شرک بڑا ظلم ہے (صحیح بخاری ذکر لقمان جلد ۱ صفحہ ۴۸۷)۔

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کر سکیں گے، جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی ان ہی کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ تعالیٰ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، یا صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اسی لئے ارشاد ہوا۔

وَأَنذِرْ بِهِ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوا إِلَىٰ رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (انعام-۵)	اور اس قرآن کے ذریعہ سے پیغمبر! ان لوگوں کو ہشیار کر دے کہ اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے، ان کے لئے ان کے رب کے سوا کوئی حامی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔
مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ (السجدہ-۱)	خدا کے سوا تمہارا کوئی حامی اور شفیع نہیں، پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

خدا کی اس صفتِ کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور دنیا والوں کے ساتھ ہے، ان انبیاء کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے، اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضلِ عمیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمتِ الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے، خصوصاً سراپا رحمت نبی جو اس دنیا میں رحمۃ للعالمین اور خدا کی صفتِ رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلافِ موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا،

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ (د ۵)	سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ-۳)	ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں "فلک کج رفتار" اور "دہر ناہنجار" کی شکایت اب تک چلی جاتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلافِ توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو بُرا کہتے تھے۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا، اور فرمایا کہ زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے۔[2] اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو بُرا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔[3] یعنی زمانہ کو جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ بُرا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے، اسی لئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

---

[1] فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۴۴۴ وکتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۰۵ الہ آباد۔ [2] صحیح مسلم الفاظ ادب [3] صحیح بخاری تفسیر سورۂ جاثیہ وکتاب الرد علی الجہمیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۱۶۔

اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو نجوم کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں نجم کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا، حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی، صبح کو نماز کے بعد آپ صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا، صحابہ نے عرض کی کہ خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے، ارشاد ہوا اس نے فرمایا آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے اور کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں نجم سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔[1]

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے، کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کئے جاتے تھے، ۱۰ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے وفات پائی، صحابہؓ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا کسوف و خسوف (گرہن) کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔[2]

غیر خدا کی قسم سے روکنا

۱۳۔ شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا، قریش اپنے دیوتا لات و عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا،[3] لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الٰہ الا اللہ کہہ دے، یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے سنا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو وہ یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے، حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی، ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے، اس پر ایک یہودی نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کہ کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ کعبہ نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو،[4] ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا،[5] دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔[6]

---

[1] صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوٰۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان [2] صحیح بخاری صلوٰۃ الکسوف [3] سنن نسائی کتاب الایمان والنذور

[4] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، صحیح مسلم، نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں [5] نسائی کتاب الایمان والنذور و جامع ترمذی ابواب النذور والایمان و مستدرک حاکم ص ۱۸ ج ۴، کتاب الایمان [6] مستدرک، بحوالہ مذکور

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

۱۴۔ اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت، عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہلِ توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے، اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے، تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں، اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت، عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا، توحید کامل کے معلم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی، اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے، اور جو حضور چاہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرز کلام سے منع فرمایا یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبان پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واو (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جاتے تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمت نبوی میں آکر مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ شرک کرتے ہو، کہتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمدؐ چاہیں، آپ نے صحابہ کو مخاطب کرکے فرمایا یوں کہو کہ وہ ایک ہے جو چاہے، پھر جو آپ چاہیں۔ یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمدؐ جو چاہیں، ان صحابی نے خدمت اقدس میں آکر اپنا یہ خواب بیان کیا، آپ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا، یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمدؐ چاہیں۔ ابوداؤد میں بھی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے، بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے، لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے، ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں، ارشاد ہوا کہ تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا، جو خدا تنہا چاہے، (مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ)۔

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے کہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا، جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی، یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا، اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو۔ آپ نے ازروئے کا اظہار اس لئے فرمایا کہ ان دونوں کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لئے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا کی اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ ..... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، اور ماثورہ خطبوں میں بھی منقول ہے۔

ے نسائی کتاب الایمان والسنۃ و [illegible] ابن ماجہ کتاب الفتن [illegible] ابوداؤد کتاب الادب باب لا تقولوا خبثت نفسی کے ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۱۵ [illegible] کتاب [illegible] بیہقی صفحہ ۱۰ مطبوعہ الہ آباد۔

مشبہات شرک کی ممانعت

۱۵۔ جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا، ان سے بالکل منع کر دیا، لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبدالشمس، عبد مناف، ان ناموں سے سخت منع فرمایا ارشاد ہوا کہ بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں[1]، اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[2]، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا، خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں (حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵ ج ۴)۔

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے، حالانکہ رب خدا ہے، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے، بلکہ یوں کہے کہ میرا بچہ یا بچی اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں، مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے[3]، ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی، وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ نے فرمایا کہ حکم خدا کا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے، تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں، عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپ نے فرمایا، تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں، بولے شریح، مسلم، عبداللہ، آپ نے پوچھا، سب میں بڑا کون ہے، عرض کی، شریح، فرمایا تو تمہاری کنیت ابو شریح ہے[4]۔

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی، ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی، انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو، آپ نے فرمایا یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا، میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو، تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا[5]۔

تصویر بنانے سے سخت منع کیا، اس کی یہی وجہ تھی کہ اول اول لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ ان ہی تصویروں کی پرستش ہونے لگتی تھی، چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا، اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

۱۶۔ شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے، قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر محل بناتے ہیں قبے باندھتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام افعال سے منع کیا ہے، وفات سے پانچ دن پہلے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا، عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے

۱۷۔ یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا، لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے، کوئی طلب شہرت کے لئے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسماء۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب باب الکریم وحفظ المنطق۔ [4] ابوداؤد کتاب الادب باب تغییر الاسم القبیح۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب لا یقول خبثت نفسی۔ [6] صحیح مسلم کتاب المساجد۔

معاوضہ کے لئے کرتا ہے کوئی نمائش اور دکھاوے کے لئے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے، ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے، جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے، اسی لئے قرآن مجید نے کہا۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (فرقان ۔۴) تم نے ان کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے۔

اسی لئے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے، اس بت کو توڑنا توحید کی اصل تکمیل ہے آپ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے۔ ”انما الاعمال بالنیات“ اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہئے جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی، اس کے ایمان و توحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر دین محمدی نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض و غایت مرضاۃ اللہ، اللہ کی خوشنودی مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ مخلص اور وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ذات خدا کو قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض و نیت سے کرے تو درحقیقت اس کام کے لئے اس نے ایک موقت خدا الگ بنا لیا وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں لیکن معنوی و نفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ نے فرمایا جس نے خدا کے لئے دیا اور خدا ہی کے لئے روک لیا، خدا کے لئے چاہا، اور خدا ہی کے لئے عداوت کی اور خدا ہی کے لئے بیاہ کیا، اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا[1]

متعدد[2] صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ریا چھپا ہوا شرک ہے، حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے[3] حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا[4] یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ فرما رہے تھے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں[5] پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے، ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لئے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں[6] حضرت محمود بن لبید انصاریؓ آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے، وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرک اصغر کیا ہے، فرمایا، قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں، تم ان ہی کے پاس جاؤ، جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے[7] حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے، کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں، ہم سب نے عرض کی ہاں، یا رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] مستدرک حاکم ترمذی آخر کتاب الزہد ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں، ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن، اس کے ایک راوی صالح کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔ [2] حضرت ابو سعید خدریؓ، معاذ بن جبل، ابوہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابو سعید بن ابی فضالہ ان صحابیوں کی روایتیں ابن حنبل، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ میں ہیں۔ [3] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ص ۳۲۹ ج ۴ و صحیح۔ [4] ایضاً سابق مسند ابن حنبل مسند شداد بن اوس ص ۱۲۶ ج ۴ [5] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ [6] ابن حنبل مسند محمود بن لبید الانصاری ص ۴۲۸ ج ۵ [7] ابوداؤد و مسند ابن حنبل۔

علیہ وسلم، فرمایا وہ شرک خفی ہے، یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے، تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے[1]۔ ابو سعیدؓ بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا تو ایک منادی آکر پکارے گا کہ جس نے اپنے کسی عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنا لیا ہو تو وہ اپنا ثواب اسی غیر سے مانگے کہ خدا سب سے بے نیاز ہے[2]۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں، تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا[3]۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے، شدادؓ بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ حیات میں ریا کو شرک اصغر گنا کرتے تھے[4]۔ ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذؓ بن جبل صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے[5]۔ اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی نے دیکھا کہ حضرت شدادؓ بن اوس صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار قطار رو رہے ہیں، رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی کہ میرے ماں باپ حضورؐ پر فدا ہوں، اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد بھی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں، عرض کی یا رسول اللہؐ! وہ کیا ہے؟ فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش، میں نے دوبارہ گزارش کی یا رسول اللہؐ! کیا آپ کی امت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا اے شداد! میری امت یقیناً سورج، چاند، بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی، لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی، عرض کی یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے، فرمایا ہاں[6]۔

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے، اور یہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے، انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

*

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الریا والسمعہ [2] سنن ابن ماجہ باب الریا و ترمذی و مسند ابن حنبل [3] ابن ماجہ باب الریا [4] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۳۲۹ دیکھو [5] مستدرک حاکم کتاب الرقاق ج ۴ ص ۳۲۹ صحیح [6] مستدرک حوالہ مذکور، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے، تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۱۲۶ اور سنن ابن ماجہ باب الریا میں ایسے سلسلہ سے مذکور ہے جس میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لئے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید
اور
اس کے ایجابی اصول و ارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد و خیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوت محمدیؐ کا کارنامہ اس سے اہم اور بالاتر ہے، اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں، مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو جن کو دین کا درجہ دے دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا، بت پرستی، جن پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی، غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں، اور ان کی جگہ مرتب، متیقن، سنجیدہ حقائق اور سچائیوں سے معمور چند عقائد کی تعلیم دی، جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کا بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لئے ان کی بعثت ہوئی، ان میں دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا الحاد کا وجود نہ تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی تھی، جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی، اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدیؐ کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوتے تھے، جن میں مشرکین کا وجود تھا ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام طبقوں اور قوموں کے لئے ہوئی، اس لئے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں، اس لئے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، متشککوں، دہریوں، ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتی اور

دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں، مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے، مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے، اس بنا پر وحیِ محمدیؐ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی مغز کو لے لیا ہے، اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحیِ محمدیؐ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جس میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو، مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے، وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (روم-۴)	اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ[1]	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا، اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا (اعراف-۲۲)	اور جب تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ہاں ہم گواہ ہیں۔

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے، وحیِ محمدیؐ نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے، اور اسی زیرِ خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے، وہ انسانوں سے پوچھتی ہے،

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (ابراہیم-۲)	کیا آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے۔

ایک اور مقام پر اس نے کہا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ (طور-۲)

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا ان ہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا ہے، یہ کوئی بات نہیں، بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ کس کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں، نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا، اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے۔

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیا، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالقِ کل کا پتہ دیتا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (آل عمران-۲۰)

آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے۔

وَمِنْ آيٰتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (فصلت-۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے رات، دن اور سورج اور چاند ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑتے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی کا اور لوہے کا ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا، مگر یہ لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں، جس طرح فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے، پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں، وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں، اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں، جہاں پیداوار اور زمین کی نشو و نما کی حاجت ہے اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر مرضی کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ

بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لیے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ سے نیچے زمین کو زندگی بخشنے میں

فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (بقرہ - ۲۰)

اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں کے پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی ادھر اور کبھی ادھر چلنے میں اور آسمان و زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں ان سب میں کچھ بوجھ والوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں۔

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے۔

اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (جاثیہ)

بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا ہے کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل، پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۗ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (انعام - ۱۲)

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے، جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی جدی شکل کے جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو بے شک اس میں ایمان والے لوگوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کی اپنی ہستی کو دلیل بتایا ہے، پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اول تو خود انسانوں کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو، اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا اور اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں دو دلیلیں (ہیں) اور اس

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ
وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ
وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ
يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ
مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ
وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ (روم-۳)

کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لئے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا، اور تمہارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے، اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے، جس سے تم ڈرتے ہو اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس آخری آیت میں آسمان اور زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے، تم سمجھتے ہو کہ یہ باہمی جذب وکشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب وکشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورۂ لقمان میں آسمانوں کے بلا کسی نظر آنے والے سہارے کے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے، اس کے بعد ایک جاندار و بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى
فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَ
بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ، وَاَنْزَلْنَا مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ
كَرِيْمٍ (لقمان-۱)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) سے ذریعۂ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعۃً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں روح پھک جانا، اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے۔

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ
خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ
مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ
فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (سجدہ-۱)

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی، اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی پھر اس کو سڈول کیا اور اس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے، تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قوتیں اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا	اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود
تُبْصِرُونَ۔ (ذاریات - ۱)	تمہاری جانوں کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے۔

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے، ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے، اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ مِمَّا فِي	اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں
بُطُونِهِ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَبَنًا خَالِصًا	کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں
سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ (نحل - ۹)	کے لئے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں

ایک ہی قسم کے پھل ہیں، اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ	اور چھواروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے
مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا، إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً	تم نشہ اور اچھی روزی بھی حاصل کرتے ہیں، اس میں سمجھ والوں
لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (نحل - ۹)	کے لئے دلیل ہے۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَ	بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں
جَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا (فرقان)	ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (نمل - ۷)	اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط انتظام پر بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، ان میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِنْ تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ	تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے!
الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ	پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر دوبارہ
كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ	نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی اور کوئی
حَسِيرٌ (ملک - ۱)	نقص نہ پا سکے گی۔

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں، جن کا استقصا بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل،

(۱) قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

(۲) عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

(۳) کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منتظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے،

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب کا سلسلہ ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا، اگر یونہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، اور نہ کہیں ان کا آغاز ہو سکتا ہے، اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہو سکتی، تسلسل عقلاً بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے، اس بناء پر لامحالہ سلسلۂ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود و کون کی اصلی علت العلل ہے،

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے، اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے، قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے، سورۂ ہود کے آخر میں ہے،

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود ۔ ۱۰)	اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوج اور اس پر بھروسہ کر۔
وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (نجم)	اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہاء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسانی کمزوریوں سے واقف تھے، چند صحابیوں نے آکر عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے، فرمایا، کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی؟ عرض کی، ہاں یا رسول اللہ! فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے، مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا بُرا جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے، یہ کیفیتِ ایمانی کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح آپ نے فرمایا، لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا، آسمان کو خدا نے بنایا، زمین کو خدا نے بنایا، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں، اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا، فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے، جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ میں اللہ پر ایمان لایا[1]۔

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں، اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں، یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقل مند بھی ہیں جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں، اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں، وحی محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور

---

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے، دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے کے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اُگ نہیں سکتا جب تک دانہ اُگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے، پھر اس کے اُگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اُگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

(انبیاء - ۲)

اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے، تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانینِ قدرت، اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے، فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو، تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے، اس کی کوئی علتِ تامہ ہوگی، یہ ظاہر ہے، ایک معلول کی دو علتِ تامہ نہیں ہو سکتیں، کیونکہ علتِ تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو، اب عالم کی علتِ تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علتِ تامہ کے وجود کے بعد، عالم کے وجود میں دوسری علتِ تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علتِ تامہ نہ ہوگی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علتِ تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظامِ عالم کی وحدت ہے، سورج، چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں، جن میں کبھی سرمو فرق نہیں ہوتا، ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (مومنون - ۵)

اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔

(بنی اسرائیل - ۵)

کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ کچھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے وہ (خدا) اس بات سے جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس (خدائے برحق) کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے، بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

اسی وحدتِ نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ
هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ
يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (ملک)

تو خدا کے بنانے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور
تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر رد ہو
کر تھک کر واپس جائے گی۔

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری صحیح دلیل نہیں ہو سکتی، اسی لئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے، یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے، ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکتی اسی لئے اس دنیا کے عالم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب و ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس عمارت کو چند خاص اصول کے بنیادی پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین

خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے، مگر قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے، یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی، اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا تھا، وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں، عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا، ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی، ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، مہیش اور وشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار باہم تقسیم کر لئے تھے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے، اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں، شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سورج، چاند، زمین، آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان، سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں، سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں، اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں، اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں، وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصاف کاملہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناطے سے پاک ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ۔ (زمر - ۱)

وہ ہے اللہ تمہارا رب اس کی بادشاہی ہے اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (زمر -)

آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (انعام - ۲)

آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (انعام - ۹)

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ (قصص-۹)	اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔
لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (شوری-۲)	اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔
هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ (مومن-۷)	وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔
وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ (انعام-۷)	غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے، درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔
اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (آل عمران-۳)	اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔
وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَادَّ لِفَضْلِهِ يُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (یونس-۱۱)	اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ (بقرہ-۳۴)	اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو اونگھ آتی ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، سب کو جانتا ہے اور وہ اس کے علم کے حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔
يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ	جو زمین میں گھستا اور جو اس سے نکلتا ہے جو آسمان سے اترتا اور اس میں چڑھتا ہے، وہ سب کو جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو

مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ، لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (حدید ۱)	تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو اللہ اس کو دیکھتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (فاتحہ ۔ ۱)	سب تعریف اللہ کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔
وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران ۹)	اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔
وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ، فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (بروج ۔ ۱)	وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے بندوں سے محبت کرنے والا ہے تخت کا مالک ہے بڑی شان والا ہے جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔
يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (جمعہ ۔ ۱)	آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔
وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (اسرائیل ۔ ۸)	اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت وجلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، جن وانس، شجر وحجر، بحر وبر سب اس کے جلال وجبروت کے سامنے سربسجود نظر آتے، پھر اس کے سوا کون تھا جو تیرنگ وجود کے ساز سے (اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں کی صدا بلند کرسکتا۔

انسان کا مرتبہ توحید محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے، جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا مانتے ہیں، جنات اور ارواحِ خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کمتر جانتے ہیں، انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سمجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے، قرآن کے ابتدائی سورۃ میں آدمؑ کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے، اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا، اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا، وہ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہ منتخب ہوا، یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو عطا ہوا، نہ زمین کے حصہ میں آیا، نہ پہاڑ اس کے مستحق قرار پائے، صرف انسان ہی کا سینہ تھا جو اس امانت کا خزینہ دار ہوا اور اسی کی گردن تھی جو اس بوجھ کے قابل نظر آئی، فرمایا،

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب ۔ ۹)	ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب نے اس بار امانت کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

وحی محمدی نے انسان کا رتبہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل-۷)	ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔

انسان ہی وہ مخلوق ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوئی۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین-۱)	البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدائی صورت کا عکس قرار پایا، متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا[1] اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے[2] عین میدان جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیئے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے[3] غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا[4] ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ صفات کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت رکھی ہیں، اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے، جس سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیض ربانی کا مورد ظاہر کیا[5] اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہے کیا اس لائق ہے کہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام-۲۰)	اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

تو اب وہ عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کے خاطر بنیں وہ روئے زمین کی چیزوں کی خاطر نہیں بنا ہے۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ-۳)	جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو) تمہارے لئے بنایا۔
اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (حج-۹)	زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی من حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات و ادب المفرد بخاری و احمد عن ابی ہریرۃ و صحیح مسلم کتاب البر، نیز توراۃ میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے، جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا، خدا کی صورت پر اسے بنایا (پیدائش ۵-۱) [2] صحیح بخاری کتاب العتق، و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ [3] صحیح مسلم کتاب البر آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے [4] ادب المفرد امام بخاری باب لا تقل قبح اللہ وجہہ [5] اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لئے نہیں، بلکہ وہ ان کے لئے بنے ہیں، جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لئے نہیں، بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور انسان خدا کے لئے بنا ہے، اس لئے جب کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں مصروف رہنا چاہیئے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند   تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا، تو وحی محمدی نے ان سے کہا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ (نحل-۲)

اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج تمہارے لئے کام میں لگایا، اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدی نے ان انسانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں تم ان کے نہیں ہو۔

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ۔ (نحل-۱)

اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا تمہارے لئے جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا، سمندر کو دیبی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی ان ہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ (نحل-۲)

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور تاکہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو چیرتے پھرتے ہیں اور تاکہ تم خدا کے فضل وکرم (روزی) کی تلاش کرو۔

آگ بھی انسانوں کی مسجود ہے، حالانکہ وہ خود ان ہی کی خدمت میں جل رہی ہے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ (یٰسین-۵)

جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس کو سلگا کر روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو مخلوق بھی ہے، انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور ساری مخلوق اسی کے لئے ہے، پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کی تلقین کی، وہ ان ہی دو اصولوں پر قائم ہے، ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیئے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور علم و اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے، اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں، انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیئے، ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف ایک درگاہ

پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدیؐ نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا، مگر اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں کن کن باتوں سے وہ پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے؟ اس سے کیا مانگنا چاہیے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیے؟ اس کے حضور میں دعا کیونکر کرنی چاہیے؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، برتری اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور وہ احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے؟ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا، عرب جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اس کی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے، اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور لطف و محبت کی زنجیریں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض، اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے منزہ و پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے، انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں، جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے، وہ اندھیرے

کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بےقراروں کی تسلی اور بےکسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کردے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا اصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہوگئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ (آل عمران ۱۹) وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جد و جہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا، اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدار ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْہِیْہِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ (نور۔ ۴) وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت، خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا، خدا نے ان کی توصیف کی کہ،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرہ۔ ۲۰) ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بےخوفی، ان کی صداقت، ان کی راستبازی ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ،

وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَہُوَ حَسْبُہٗ (طلاق۔ ۱) جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے تو خدا اس کو بس کرتا ہے

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ (زمر۔ ۴) کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔

وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ (احزاب۔ ۵) اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیئے۔

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء وصفت دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصول منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے ہیں، لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (منطقی) کی ایک مثال بھی پیش نہ کرسکے جو کچھ کرسکے وہ یہ کہ

صفات عوارض اور خواص کے مختلف۔ اُن سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ عالم ہے تو وراء الورا ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہ طور اسی رمز کی تمثیلی تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصابِ انسانی کے مطابق تعلیم دی، عرب کا جاہلی اللہ نام ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا، لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی وہ قطعاً بیگانہ تھا، دیوانِ عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے، مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا، قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے، لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے، بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ الرحمان کا لفظ بھی مستعمل تھا، جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں، اصحاب الفیل کے عیسائی رئیس ابرہہ کے نام سے سدِ مارب پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے، عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑھ ہو گئی تھی، اس لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوایا تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے۔[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سننے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لئے رحمان کا لفظ مستعمل ہونے کی وجہ سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اس حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا (فرقان۔ ۵)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمٰن کا نام ان کی نفرت کو اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں، اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح وستائش کرتے ہیں۔

اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ (انبیاء۔ ۳)	(مشرک آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدیؐ نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں، اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا . . . تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ (اسرائیل۔ ۱۲)	کہہ دو اے پیغمبر کہ خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری جلد اول ص ۳۷۹۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے، یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام یہوواہ تھا، مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی، دوسرا عام نام الہیم ہے، جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصافِ ذاتی اور اعمالِ ربانی کے ترجمان ہیں، تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے، صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہود کی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خدا یعنی ربُّ الافواج ہے، جو صرف خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے،

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں "باپ" کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے، اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں، ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے، عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ، باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) اور روح القدس حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں، باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے، اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا، اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی، مجرد رہ گیا ہے، اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسمِ صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں برہما، بیشن (وشنو) میں صفات خالق، ممیت (مارنے والا)، اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی ہے، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک، خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں،

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا ہے، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے سراجِ منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا، وہ نبوتِ محمدیؐ کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ نے یہ دعا سکھائی، اے خداوند! تیرے ہر اُس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا اپنی کتاب میں اتارا یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں، حضرت عائشہؓ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی، خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا، تجھ سے درخواست کرتا ہوں[1]، قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا،

---

[1] یہ دونوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی بسند عبداللہ بن مسعودؓ ہے۔

۱۷

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ (الکہف - ۱۲)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے، تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (لقمان - ۳)

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہیں، اور اسی کو زیبا ہیں۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (طٰہٰ - ۱)

نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ، اسی کے لئے ہیں سب اچھے نام۔

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لئے ہے، خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اسرائیل - ۱۲)

کہہ دے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جو چاہو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور جنوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اس کو یاد نہ کرو۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (اعراف - ۲۲)

اور اللہ ہی کے لئے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی کا صحیفۂ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ خدا کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے، قرآن پاک کا کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، وہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوتے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے، اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لئے یہ مثالیں بیان

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (نور-۵)

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِـيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (بقرہ-۳۴)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (حشر-۳)

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَي الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ

کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

اللہ نہیں ہے اس کے سوا اور کوئی معبود وہ ہمیشہ زندہ، تمام دنیا کو سنبھالے ہے اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو وہ جانتا ہے اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جتنے کا وہ چاہے اس کا تخت آسمانوں اور زمینوں کو سمائے ہوئے ہے اور ان دونوں (آسمان و زمین) کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے،

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک پوری سلامتی امن والا ہر شے پر گواہ غالب سب پر قابو والا بڑائی والا ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بتاتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے اور وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے، اور ہر بات کو جانتا ہے وہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے

وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (حدید-۱)

اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے، آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کی آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو، گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کرکے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔[1]

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔ (اخلاص)

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ ایک ہے وہ تنہا اور بزرگ، اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جائے پناہ ہے نہ اس کے کوئی لڑکا ہے اور نہ اس کے ماں باپ ہیں (جنھوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے، جو اس کی بیوی ہو۔

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اسی کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ "صمد" وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو، کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث اور جانشین بھی چھوڑ جاتا ہے، اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے، غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کرسکتے ہو، اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابیؓ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تعلیم سے منور ہو چکا تھا، حضرت ابوہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے تھے کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی، اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے، اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور "صمد" ہوں، جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔[2] حضرت ابوہریرہؓ یمنی عرب ہیں، یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدیؐ سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ تنزیہ و تقدیس کے یہ موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ "صمد" ہے، لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے، "صمد" کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسے علاقہ میں ہو جہاں جب سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو، اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنی جان بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی درجہ کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر

---

[1] مستدرک حاکم تفسیر اخلاص (بیہقی) وجامع ترمذی تفسیر سورۂ مذکور وکتاب الاسماء بیہقی ص ۲۲ (الہ آباد)۔ [2] صحیح بخاری سورۂ اخلاص۔

مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اسی لئے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو، صَمَدٌ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ "صمد" وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں درجہ کمال پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پرواہ، بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبہ کمال ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔[1]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ و تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں۔

ابن عباسؓ۔ وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصریؒ۔ وہ حی و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انسؓ۔ جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعودؓ۔ جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہؓ۔ جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہؒ و شعبیؒ۔ جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہؒ۔ جس سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہؒ۔ باقی غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں، اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، کیونکہ اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے اصلی معنی "چٹان" کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لئے چٹان کا لفظ آیا ہے، استثنا۔ (۳۲-۳۱-۳۰) میں ہے،

"اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی، اور خداوند ان کو اسیر نہ کر دیتا، کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان"

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے، سموایل کے پہلے صحیفہ میں، یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے "خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں" (۲-۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں اَحَدٌ (ایک) اور صَمَدٌ (جائے پناہ) اور یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض

---

[1] کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی لبنٰی ص ۳۰۴ [2] ان معانی کے لئے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی ص ۳۴۳، مفردات القرآن راغب اصفہانی، ابن جریر طبری، ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ۔

وہ یکہ و تنہا، اکیلا، بے ہمتا، بے نیاز، بے پرواہ، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے، لیکن اسی کمال یکتائی کیساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا یعنی سب کی پشتیبان ہے، جو مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے،

فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ۔ ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔

یہ سورۂ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لئے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے، جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے، لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انھوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان ہوتی ہیں، جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ نے فرمایا، بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے[1] ایک اور انصاری صحابی تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد پہلے اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے، ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے، مگر اپنی روش بدلنی منظور نہیں، لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی، تو گزارش کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے، ارشاد ہوا کہ یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی، قتادہ بن نعمان ایک صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے اور لطف حاصل کرتے رہتے تھے، لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے[2]

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی، اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں، صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا[3] خدا طاق ہے، وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے، آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے، پورے سو کیوں نہ مقرر کئے گئے، یہ اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا، اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا، صحیح احادیث میں اسی قدر ہے لیکن ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے، ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے، لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں، پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن مجید میں مذکور نہیں اور بعض نام ایسے جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں، اسی لئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی صرف ان ننانوے میں محصور ہیں بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں، اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید تعلیقاً کتاب الصلوٰۃ [2] مسند احمد بسند ابی سعید خدری [3] صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ہریرہ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابو عوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔

کہ اسماء اور صفاتِ الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے[1]، اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغازِ مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں، استدلال کیا ہے۔

بہرحال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے، یہ تمام نام وہ ہیں جو یا بطور علم اور بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے، ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے، علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے، لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگزر یعنی صفاتِ جمالی ظاہر ہوتے ہیں، دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو صفاتِ جلالی کہتے ہیں، تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصافِ حسنہ اور محامدِ عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفاتِ کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء و صفات ان ہی تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے، اور یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ: یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطور علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لئے استعمال ہوتا تھا، اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے، کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے، بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو، دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے، اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلرَّحْمٰنُ: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے، اس کے معنی رحم والے کے ہیں، اوپر گزر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا، عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا، قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے، بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر درحقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمٰن دو اجنبی ذاتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں، اسی طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (اسرائیل - ۱۲)	اللہ کہو یا رحمٰن جو چاہو کہو، اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

---

[1] تمہید ابو شکور سالمی القول الثالث فی عدد الاسماء، ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

اَلرَّحِیْمُ :- رحم کرنے والا، رحیم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے، جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے، اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مہر پیار محبت کا جذبہ نمایاں ہے اَلرَّحْمٰنُ اور اَلرَّحِیْمُ خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے، کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ ان ہی رحمانی اور رحیمی ان ہی دو صفتوں کا پرتو ہے، اس عالم اور اس عالم دونوں میں اس کی ان ہی دونوں شانوں کا ظہور ہے، اور ہوگا۔

اَلرَّبُّ :- پرورش کرنے والا یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشو و نما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِیْفُ :- لطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ :- معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ :- محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ :- امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

اَلْمُحِبُّ :- محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ :- امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ :- اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول، اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ :- معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ :- حفاظت کرنے والا نگہبان، بچانے والا۔

اَلْوَهَّابُ :- دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

اَلرَّازِقُ، وَالرَّزَّاقُ :- روزی دینے والا، نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

اَلْوَلِیُّ :- دوست، حمایتی، طرف دار۔

اَلرَّؤُفُ :- مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

اَلْمُقْسِطُ :- انصاف والا، عادل۔

اَلْهَادِیْ :- راہ دکھانے والا، رہنما۔

اَلْکَافِیْ :- اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

اَلْمُجِیْبُ :- قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

اَلْحَلِیْمُ :- بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

اَلتَّوَّابُ وَقَابِلُ التَّوْبِ :- توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگزر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

اَلْحَنَّانُ :- ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

اَلْمَنَّانُ :- احسان کرنے والا۔

اَلنَّصِیْرُ :- مدد کرنے والا۔

ذُو الطَّوْلِ :- کرم والا۔

ذُوالْفَضْلِ :- فضل والا۔

اَلْکَفِیْلُ :- بندوں کی کفالت کرنے والا۔

اَلْوَکِیْلُ :- بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

اَلْمُقِیْتُ :- روزی پہنچانے والا۔

اَلْمُغِیْثُ :- فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

اَلْمُجِیْرُ :- پناہ دینے والا۔

اَلْمُغْنِیْ :- بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفات جلالی

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ :- بادشاہ، فرمانروا۔

اَلْعَزِیْزُ :- غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

اَلْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ :- جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ :- سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ :- جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُهَیْمِنُ :- سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَکَبِّرُ :- اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِیْدُ الْعِقَابِ :- سخت سزا والا۔

شَدِیْدُ الْبَطْشِ :- بڑی گرفت والا، جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ :- خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے لیکن صحیفہ محمدیؐ میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے، ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور بلا وجہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے، وہ دور ہو جاتا ہے، فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آل عمران۔ ۱۹۰) بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِیْزٌ (غالب) کے ساتھ حَکِیْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ وہیں یہ بھی کہا گیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ (ص-۵) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرما دیا۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن-۴) اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ دردناک عذاب دینے والا اجمالاً بیان کی گئی تو اس سے پہلے لَذُوْ مَغْفِرَةٍ یعنی بخشش والا (حٰمٓ السجدہ-۵) بھی فرما دیا گیا، غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیشِ نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے ساتھ یا آگے پیچھے خدا کی صفاتِ جمالی کا بھی ذکر ہو، تاکہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی یعنی وہ اسماء و صفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ اور پاکی سے۔

صفاتِ وحدانیت یعنی وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں، اور وہ یہ ہیں۔

اَلْوَاحِدُ:- ایک۔

اَلْاَحَدُ:- ایک۔

اَلْوِتْرُ:- طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفاتِ وجودی یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا و دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

اَلْمَوْجُوْدُ:- وجود والا، ہست۔

اَلْحَيُّ:- ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

اَلْقَدِيْمُ:- وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

اَلْقَيُّوْمُ:- جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اَلْبَاقِيْ:- جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

اَلدَّائِمُ:- ہمیشہ رہنے والا۔

اَلْاَوَّلُ:- وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

اَلْاٰخِرُ:- وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَلْمُقَدِّمُ:- جو سب سے آگے سے ہے۔

اَلْمُؤَخِّرُ:- جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

اَلظَّاهِرُ:- جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ:- جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

اَلْخَبِيْرُ:- خبر رکھنے والا۔

اَلْعَلِيْمُ :- جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ :- جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ :- دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

اَلسَّمِيْعُ :- سننے والا۔

اَلْبَصِيْرُ :- دیکھنے والا۔

اَلْمُتَكَلِّمُ :- بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

اَلْوَاجِدُ :- پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔

اَلشَّهِيْدُ :- حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔

اَلْحَسِيْبُ :- حساب کرنے والا، یعنی چیزوں کا علم حساب کے ذریعے سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار، ان کا بھی جاننے والا

اَلْمُحْصِيْ :- گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد، ان کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُدَبِّرُ :- تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

اَلْحَكِيْمُ :- حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

اَلْمُرِيْدُ :- ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

اَلْقَرِيْبُ :- نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ :- ہر مشکل کو کھولنے والا۔

اَلْقَدِيْرُ وَالْقَادِرُ :- قدرت والا۔

اَلْمُقْتَدِرُ :- اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون چرا نہیں کر سکتا۔

اَلْقَوِيُّ :- زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

اَلْمَتِيْنُ :- مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

اَلْجَامِعُ :- جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

اَلْبَاعِثُ :- اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا، یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اوّل۔

مَالِكُ الْمُلْكِ :- سلطنت کا مالک، جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

اَلْبَدِيْعُ :- نئی نئی چیزیں ادا کرنے والا۔

اَلْوَاسِعُ :- سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِيْطُ :- احاطہ کرنے والا، جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

اَلْمُحْيِيْ وَالْمُمِيْتُ :- جلانے والا اور مارنے والا۔

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ :- سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ۔ عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ:۔ نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِی وَالْمَانِعُ:۔ دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ۔ نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِیُٔ وَالْمُعِیْدُ۔ جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ:۔ اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا)، اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا)، اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا)، اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ، ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے، ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا ہے یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں، جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملایا جائے یعنی اَلضَّارُّ کے ساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِی اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں، بلکہ ایک طرح کی برائی ہے، ہاں نقصان پہنچانے والا عزت و ذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا اس سے مقصود خدا کی قدرت کی وسعت ہے، اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے، جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں، یا ایسا عزت دینے والا جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو وہ اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر مجبور و مضطر ہوگا، اور اس کی قدرت کا یہ کمال نہ ہوگا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہیہ یعنی وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اَلْعَلِیُّ۔ مرتبہ والا۔
اَلْکَبِیْرُ۔ بڑا۔
اَلْجَلِیْلُ۔ بزرگ۔
اَلْغَنِیُّ۔ بے نیاز۔
اَلْمَاجِدُ۔ عزت والا۔
اَلْقُدُّوْسُ۔ پاک۔
اَلْجَمِیْلُ۔ اچھا۔
اَلْعَدْلُ۔ عادل۔
اَلصَّمَدُ۔ بزرگی کی ہر صفت میں کامل۔

اَلْعَظِیْمُ۔ عظمت والا۔
اَلرَّفِیْعُ۔ بلند۔
اَلْکَرِیْمُ۔ شریف۔
اَلصَّادِقُ۔ سچا راست باز۔
اَلْحَمِیْدُ۔ تعریف والا۔
اَلْحَقُّ۔ سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔
اَلْبَرُّ۔ نیک۔
سُبُّوْحٌ۔ ہر عیب سے پاک۔
اَلرَّشِیْدُ۔ سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا۔

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء و صفات کا عقیدہ دینِ محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے یعنی اس کے یہ محامد و اوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں، ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں، اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں، بقیہ اوصاف و محامد انسان کے لئے قابلِ نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد و اوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں، اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد و اوصاف سے نسبت پیدا کرے، اور ان کو خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل و پیروی کی خواہش کرے، محامدِ الٰہی گویا استادِ اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیئے، اس لئے انسان کو بھی اپنے حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر ڈال لینی چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصل وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا ہے کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ۔۴) آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے، خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف و محامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کر سکے گا، یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (بقرہ۔۱۶) خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہلِ تفسیر متفق ہیں کہ اس خدائی رنگ سے مقصود خدا کا "دینِ فطرت" ہے۔

یہ حدیث بھی گزر چکی ہے کہ إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَىٰ صُورَتِهِ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزر چکی ہے کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں بلکہ معنوی شکل و صورت ہے، یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفاتِ کمال کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہیں اور ان میں حدِ بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے، اور انسان کو اخلاق و صفت میں ملاءِ اعلیٰ سے تشبیہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیا و خاصانِ خدا کے اس مقولہ تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو، کا مطلب ہے، حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ حسن الخلق خلق اللہ الاعظم حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلقِ عظیم ہے[1]۔

اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کاملہ کی تین قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں، جلالی، کمالی اور تنزیہی، صفاتِ جلالی جو کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں، اور نہ یہ اوصاف بندگی و عبودیت کے رتبہ کے مناسب ہیں، ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں، یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری اسی لئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، وہ منزلت کے خلعت سے سرفراز ہوا، اور شیطان جس نے ترفع اور غرور ظاہر کیا دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ۔ (بقرہ۔۴) اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص ۱۲۲ بروایت حضرت عمار بن یاسرؓ

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے، اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لئے بڑائی ہے۔

صحیح مسلم میں[1] ابوسعید خدریؓ اور ابوہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عزت اس کا لباس و کبریائی اس کی چادر ہے، خدا فرماتا ہے، تو جو کوئی عزت و کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا، دوسری جگہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے بُرا وہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے، خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں[2] الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ (حشر-۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت و جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور وہ ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے، مگر اس نوازش کے بعد بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوت حق اور ربانی جاہ و جلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں، اور سرِ نیاز اظہارِ بندگی کے لئے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت و جلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا، یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون-۱) اور عزت خدا کیلئے ہے اور اس کے رسول کیلئے اور مومنوں کیلئے ہے۔

حاکم میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت و جلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے، تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہے عزیز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں کہا جائے گا "اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا" (قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے، کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا، اور جو کبریائی کرتا ہے تو وہ خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہتا ہے، جو خدا ہی کے لئے تھی۔[3]

خدا کے صفاتِ کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے، صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام محروم ہیں، ان کی تنزیہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

خدا کے صفاتِ جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لئے حسبِ استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے، عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ خداوندا! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں، اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈالے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا[4] قرآن کہتا ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (نساء-۲۱) اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی معاف کردو تو اللہ بھی معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی، ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی، سزا کا منظر دیکھ کر حضورؐ کے چہرہ کا

---

[1] کتاب الادب باب الکبر ج ۲ ص ۲۰۰ مصر۔ [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔ [3] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵۱ و مستدرک حاکم۔ [4] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ۔

رنگ متغیر ہو رہا تھا، ادا شناسوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو، خدا معاف کرتا ہے اور عفو و درگزر پسند کرتا ہے، تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے، وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا، وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا، ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی غرور ہے فرمایا،

ان اللّٰہ عز و جل جمیل یحب الجمال[2]۔ اللہ تعالیٰ اچھا ہے، جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے،

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے، یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے، خدا جمال والا ہے، وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو[3]۔ یہ روایت بھی ہے "خدا جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے، سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے، صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے[4]۔ روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں "وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاقِ عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے[5]۔"

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں "اے عائشہؓ! خدا نرمی والا ہے، وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے[6]۔" ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا، لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے[7]۔ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا، اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے[8]۔

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے، مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا، رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے، لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ابوداؤد باب فی الرحمۃ) رشتہ داروں اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے، خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع رحم کرے گا میں اس کو قطع کروں گا، جو تجھ کو ملائے گا، اس کو میں بھی ملاؤں گا[9]۔ ترمذی میں یہ تعبیر ان الفاظ میں ہے "میں خدا ہوں، میں رحمان ہوں، میں نے رحم پیدا کیا ہے، اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا، جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا[10]۔ پھر فرمایا، جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا، بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں، جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا[11]۔ آپ نے فرمایا، خدا نے رحم کے سو حصے کئے، ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا، اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچے کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے[12]۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد ۴ ص ۳۸۲ کتاب الحدود۔ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر۔ [3] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔ [4] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل ابن عدی۔ [5] ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔ [6] صحیح مسلم، ابوداؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی فی الآداب۔ [7] صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سورہ بقرہ۔ [8] ابوداؤد باب استحباب الوتر۔ [9] صحیح بخاری باب صلۃ الرحم۔ [10] ابواب البر والصلۃ۔ [11] ترمذی باب مذکور۔ [12] جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

بخل خدا کی صفت نہیں، اس لئے آپ نے فرمایا تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو، ورنہ تم پر تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا[1]، یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جو بندہ دوسرے بندہ کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا[2]، یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں[3] رہو، خدا تمہاری مدد میں ہے۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں، اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے[4]۔ اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا بھی غیرت والا ہے اور مومن بھی غیرت والا ہے، اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو[5]۔

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔

وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (آل عمران-۱۹)	اور بے شک خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس کی اس کل تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا۔

یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ بینکم محرما فلا تظالموا[6]	اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہئے، آپ نے فرمایا۔

ان اللہ طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافۃ فتنظفوا ولا تشبھوا الیھود[7]۔	خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے تو تم پاک وصاف رہا کرو یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا، اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں، انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ ان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام بناتی تھیں، یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دل سے نکال دیا، سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی، بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا، اور وہ بابل و مصر، ہند و ایران کے خدا اور ربکم الاعلیٰ ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آتے جن کا عزل ونصب، دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا، بلکہ خود انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف و ذلیل، مختلف طبقوں اور ذاتوں

---

[1] جامع بخاری باب رحمۃ الولد [2] صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ [3] مسلم کتاب البر والصلۃ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الآخرۃ [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم [5] صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۳ [6] جامع ترمذی باب ما جاء فی غیرۃ من ابواب النکاح [7] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ ومسند ابن حنبل ج ۵، ص ۱۶۰ مصر و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵۔ [8] ترمذی باب فی النظافۃ ص ۵۴۰۔

میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم ہو چکی تھی، اور زمین، قوموں اور ذاتوں کے ظلم و جبر اور غرور و فخر کا دنگل بن گئی تھی توحید نے آکر اس اونچائی نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب و فراز کو برابر کیا، سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے، ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا، اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بہرحال اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا، جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساوات انسانی کے حقیقی کوچہ سے بھی اب تک نابلد ہیں، انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا اور وہ دولت و فقر اور رنگ و قومیت کے امتیازات کو خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے، مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے مساوات کی نعمت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں، اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں، دولت و فقر، رنگ و روپ اور نسل و قومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا، اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (حجرات۔۲)

تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہے۔

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے، عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے کانپتے رہنا چاہیئے، اس کے گوشۂ چشم میں لطف و عنایت کا گزر نہیں، محبت و پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا، وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی کی بالکل غلط تصویر ہے، اللہ تعالیٰ کے جو اسماء و صفات اوپر گذر چکے ہیں، ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُرجلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں، بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار اور لطف اور کرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں، مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہوں سے مغالطہ ہوا:

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

(۲) دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ اس کے خوف و خشیت کو بھی جگہ دی ہے، غور کرو انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں، خوف اور محبت، یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ بھی

آگے پیچھے بھی، ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں، ادعائے محبت کا نتیجہ ناز، تجبر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان ومحبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبہ سے ہو سکتا ہے، اس لئے خالق ومخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے، بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے اور یہی نبوت محمدی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب موجود تھے، ان کے اندر اس مسئلہ میں بھی افراط وتفریط پیدا ہو گئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے، یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف وخشیت اور سخت گیری پر تھی، اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار اور باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا،[1] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے،[2] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم وکرم اور محبت وشفقت کے تذکروں سے معمور تھی، گویا ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف وخشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے،[3] مگر دونوں مذہبوں کے پیرووں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا، اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے، وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان یا انسانوں کا باپ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے، اور نہ تنہا رحم وکرم اور محبت وشفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان وکریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور ورحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۔ وَلَا تُفْسِدُوْا
فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا
وَّطَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ
الْمُحْسِنِيْنَ (اعراف-۷)

(لوگو) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارا کرو، وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو (اس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کے فضل وکرم کی) لو لگاتے ہوئے اسے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ
يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (انبیاء-۶)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا تو ہے، مگر اس کو جبار وقہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر، چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ:۔

---

[1] یرمیاہ ۳۲: ۱۸، ۱۵ وغیرہ [2] خروج ۲: ۲۴، ۵: ۳۴، ۷ واستثناء ۴: ۳۱، ۹: ۲۶، ۱۵ وغیرہ [3] خروج ۲۰: ۶، ۳۴: ۶ وزبور ۸۶: ۱۵، ۱۰۳: ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم وکرم کا ذکر ہے [4] لوقا کی انجیل ۱۲: ۵ و اول پطرس ۲: ۱۷، دوم قرنتیوں ۷: ۱، فلپیوں ۲: ۱۲، الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (یٰس - ۱) اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (ق - ۳) جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبان اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہے۔

وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ۔ اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا، اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے، مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ، دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خمخانۂ عشق کی طرف بلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب دونوں کی جامع تھی، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشکبار رہتی تھیں اور دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا، کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں دونوں منظر آپ کے چہرۂ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے تھے، چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں تو جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی، آپ پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت ہوتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے[1]۔

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے، خوف و خشیت اور رحم و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء "ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے"۔ کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے، جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے، اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا، لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف - ۹) اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن علیہ السلام نے ان الفاظ میں کی۔

رحمتی سبقت غضبی (بخاری) میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا، اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا، اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا،

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۹۳۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ - ۳)

ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا،

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ - ۳)

کہہ دو کہ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں، بلکہ تم بھی انہی انسانوں میں سے ہو جن کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (جمعہ - ۱)

اے وہ جو یہودی ہو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت یعنی خدا کی ملاقات کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمت الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر دعا کی کہ خدایا مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر، آپ نے فرمایا: خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔[1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا! مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج، اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا، یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔[2]

محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیم محمدی کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں، اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا، اس سے نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے، محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے، دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا، اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی مائیں بنیں جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے، خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے، جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پراثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں، اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، سدا سہاگ فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا، راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ ان کے خواص تک کو گمراہ کر دیا، جو لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری معنوں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب۔

میں گرفتار ہو گئے، عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا، ہندوستان کے بھگتوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی، سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں، اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے، اس لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کیلئے ان الفاظ کا استعمال ضلالت اور گمراہی قرار دیا، لیکن وہ ان الفاظ کے اصل معنی اور منشاء کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے، اس کا انکار نہیں کرتا، بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے ناکافی غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ۔ ۲۵)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے کہیں زیادہ مضبوط و استوار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحم و محبت کے اس جسمانی طریقۂ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت و پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں، انسانوں کے تمام خیالات اور تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں، اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کیلئے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو کسی غیر مادی اور غیر جسمانی معنی کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ان دیکھی ہستی کی ذات و صفات کے متعلق جس کو خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اسی لئے نبوت محمدیؐ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یکسر ترک کر دیا، بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانی ہی کی مادی بولی میں کرنا تھا اس لئے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جن کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا، اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا، اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں، ان سے انسانوں کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں، جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے تھے ہر قوم نے اس علم اور نام کیلئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی تھی اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے، وہ لفظ اللہ ہے، اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت

کا یقیناً اختلاف ہے، مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلِہَ سے نکلا ہے اور وَلِہَ کے اصل معنی عربی میں اس غم اور محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق عشق و محبت کے معنی پیدا ہو گئے اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ وَالِہ (شیدا) مستعمل ہے، اس لئے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں، جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں، متحیر اور پریشان ہیں، حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ وہ "ہری من موہن" یعنی "دلوں کا محبوب" کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ "رحمان" اور "رحیم" ہیں، ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں، رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (محبوب، مہربان رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہی صفاتِ ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے، کیا اس سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل ہو سکتی ہے۔

لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ "رحمان" ہے، جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفتِ مبالغہ کا صیغہ ہے

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل - ۱۲)	اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہربان (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کے علاوہ خاص طور سے ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک نام تمہاری نظر سے گزر چکا ہے، ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہو گا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہوتا ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف اَلْوَدُوْد سورۂ ذات البروج میں آیا ہے، جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سراپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے، اس کے سوا خدا کا ایک اور نام "الولی" ہے، جس کے لفظی معنی "یار" اور "دوست" کے ہیں، خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے "الرؤف" ہے، رؤف کا لفظ رافت سے نکلا ہے، رافت کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام "حنّان" ہے جو حَنّ سے مشتق ہے "حَنّ" اور "حنین" اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں، دیکھو وہ ان رشتوں کے نام نہیں لیتا، لیکن ان رشتوں کے سبب سے محبت اور پیار کے جو خاص جذبات پیدا ہوتے ہیں، ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے اور اس طرح مادیت اور جسمانیت کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے، وہ سلام (امن و سلامتی) ہے، یعنی اپنے بے پناہ بندوں کے لئے وہ سراپا امن و سلامتی ہے، وہ مومن (امن دینے والا) ہے، وہ العدل ہے یعنی سراپا انصاف ہے، وہ العفو (معاف کرنے والا) ہے، الوہاب (عطا کرنے والا) ہے الحلیم (بردبار) ہے، الصبور (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) ہے۔ التواب (بندوں کے حال پر رجوع ہونے والا) ہے البَرّ

(نیک) اور مجیب (خبیر) اور المقسط (منصف اور عادل) ہے۔ ان میں سے ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کی تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

توراۃ کے اسفار، انجیل کے صحائف اور وید کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم سے لبریز اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے یکسر خالی ہے، جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں، بات یہ ہے کہ اسلام ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ شرک و کفر کی اس ضلالت و گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سراپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس طرح وہ توحید کی بلند تریں سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتۂ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریعت الٰہیہ کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا، یقیناً مادی اور جسمانی استعارات و مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھتی، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات و مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، باایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا، کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب (باپ) کے بجائے رب کہہ کر پکارتا ہے، وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اب اور رب، ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لمحہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں کچھ گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر یہ تعلق ہر درجہ ناقص، محدود اور آنی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریات زندگی، سامان حیات، نشو و نما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے؟ کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش)، عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک، پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے، جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے، انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت یا مشت استخوان، بشکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان اور ادھیڑ یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم، لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے لفظ رب یکقلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں، جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

اب ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خمخانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حب الٰہی ہے، اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو علانصیب ہو چکی تھی، زبان الٰہی نے شہادت دی،

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (بقرہ-۲)

اور جو ایمان لائے وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشۂ محبت پر باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان، مال، خاندان سب کو قربان اور نثار ہو جانا چاہئے، ارشاد ہوتا ہے،

اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ
وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ
اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا
وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ
رَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی
یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ (توبہ-۳)

اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو ڈر ہے، اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں، تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشۂ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے، چنانچہ جو لوگ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے، ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ
عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ
یُّحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗٓ (مائدہ-۸)

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کر کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیح نے کہا درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، پھر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے، تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں سوز فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں، مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے، خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران-۴)

اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبۂ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی، فرمایا!

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ
لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (مریم-۶)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے، رحمت والا خدا ان کیلئے محبت پیدا کرے گا۔

اس آیت میں محبت کے حصول کے دو ذریعے بتائے گئے ہیں، ایمان اور عمل صالح یعنی نیک کام، چنانچہ طبقاتِ انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (مائدہ و بقرہ - ۲۴)	خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ (بقرہ - ۲۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (آل عمران - ۱۷)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (مائدہ - ۶ و حجرات - ۱)	خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ - ۱)	خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ (صف - ۱)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستے میں لڑتے ہیں۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ (آل عمران - ۱۵)	اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ (توبہ - ۱۳)	اور خدا پاک و صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے پیار کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں، اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں، اور ان سے جو وضو کرکے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں، اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔[1]

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور منغص بنا کر بے فکری کی جنت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے، تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے، پہلے کا نام حزن و غم اور دوسرے کا خوف و دہشت ہے، غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں، جو عاجز و درماندہ انسان کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہتے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں، ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا۔

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (یونس - ۷)	ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا وہ درجہ جو بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام رحم اور رحمت ہے، اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے، اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے، اس کا نام رحمان و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے، وہ نہیں تو کچھ نہیں، اس لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے، مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لئے ہر وقت آمادہ و تیار رہتا ہے، گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر ان کے پاس تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ	اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ

---

[1] احمد بن حنبل مسند ابوذر ج ۵ ص ۱۷۶۔

يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر-٦)

تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیم کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (حجر-٦)

تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبۂ خلعت محبت سے مافوق ہے، اس لئے یہ جواب دیا۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ (حجر-٤)

اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون ناامید ہوتا ہے۔

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں، مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں منجملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے، خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے، وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے، رحمان و رحیم بھی اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کرلی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (انعام-٢)

اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ، اور تسلی کا یہ پیام دو کہ ہمارا بابِ رحمت ہر وقت کھلا رہتا ہے۔

وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (انعام-٦)

اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں، تو ان سے کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کرلیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے براہِ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے تو بے شک خدا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصۂ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف-١٩)

اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے۔

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو از خود اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی، جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا، اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عذاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا، یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے، بارگاہِ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹے جب تک تم مجھے پکارتے رہوگے اور مجھ سے آس لگائے رہوگے میں تمہیں بخشتا رہوں گا، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹے اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں، اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کردوں، خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ

ہوں، مجھے پروا نہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ، اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا، کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔[1]

حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی وفات کا وقت جب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے تو خدا اور کوئی مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا، یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکو کاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔[2]

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں اور جن کی بناء پر دوستوں، عزیزوں اور قرابتداروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رحم و محبت ہے، نیز جس کی بناء پر دنیا میں عشق و محبت کے شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایۂ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے لوگ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں، باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔[3] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں، اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے، صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہؓ نے تنگ آکر کہا، خداوندا! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے، رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی فرمایا، اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔[4] تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے خدا کی محبت کا دروازہ کس طرح کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے کس طرح اس کا شیفتہ کر دیا اور ان کو ذات الٰہی کے ساتھ وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلالؓ کو دیکھو، ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت پر ان کو لٹایا جاتا ہے، ایک گرم پتھر سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کرنے پر ان کو مجبور کیا جاتا ہے، وہ یہ سب تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مگر زبان سے وہی احد احد ایک ایک کا ترانہ نکلتا تھا۔[5] مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے، ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن حرم میں جوش وحدت پرستی سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا باآواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف پتھروں اور ڈھیلوں کی بارش ہوتی ہے، بعض لوگ آکر چھڑا دیتے ہیں، لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبت الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے، اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی تھی۔[6]

ایک صحابی جو رات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے کے لئے متعین تھے، وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد میں مصروف ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور نماز میں محو رہتے ہیں، ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑ دی، کہتے ہیں کہ جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں

---

[1] جامع ترمذی ابواب الدعوات و دیگر کتب احادیث صحیح۔ [2] مسند ابن حنبل ج۵ ص ۴۱۴۔ [3] بخاری کتاب الادب باب ص ۸۹۰۔ [4] بخاری کتاب الحدود باب یکرہ من لعن شارب الخمر ص ۱۰۰۲۔ [5] سیرت ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین و اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۰۶۔ [6] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ۔ [7] صحیح بخاری و سنن ابی داؤد کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔

علیہ وسلم کے دو جانشین عین حالت نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اسی طرح باقی ہے سامنے آرہی ہے، وہ ہر فانی ومیت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے، اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ وہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے یعنی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی، قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا، اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے بھی اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے، اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا، ہاں، کیونکہ اس کو خدا اور رسول پیارے تھے[1]۔ ایک دفعہ آپ نے ایک صاحب کو کسی مہم کا افسر بنا کر بھیجا، وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر سورۃ کے آخر میں قُل ہو اللہ ضرور پڑھتے، جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا، فرمایا، ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے، تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے، فرمایا کہ ان کو بشارت دو کہ وہ رحم کرنے والا بھی ان سے محبت کرتا ہے[2]، یہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی، فرمایا تم نے اس کیلئے کیا سامان کر رکھا ہے، انہوں نے نادم ہو کر شکستہ دل سے عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات وخیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے، وہ صرف خدا اور رسول کی محبت ہے اور بس! فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا، اسی کے ساتھ رہے گا، صحابہؓ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی[3]۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریلؑ سے کہتا ہے کہ فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں، تم بھی اس کو پیار کرو، تو جبریلؑ بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخش جاتی ہے[4]۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی نفلوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں ہاتھ بن جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے[5]۔ یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانہ محمدیؐ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابوسعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید ہیں، لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے، یہ وہ لوگ

---

[1] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی حفر القبر [2] مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین وقصرہا باب فضل قراءۃ قل ہو اللہ احد، یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ صلعم کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔ [3] مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب، بخاری کتاب الانبیاء باب ما جاء فی قول الرجل ویلک۔ [4] مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا حببہ الی عبادہ [5] بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے، وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں[1] تو یہ قابلِ رشک رتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا ہے۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔[2]

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ پر نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا، لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور اسی کی محبت کے سبب سے مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب سے میرے اہل بیت سے محبت کرو[3]، یہ عشق و محبت کی دعوت محبوبِ ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے!۔

عام مسلمانوں میں پیغمبرِ اسلام کا لقب حبیبِ خدا ہے، دیکھو کہ حبیب اور محبوب میں خلعتِ محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں، آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے! وہ کیا مانگتے تھے، کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں محبتِ الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے، انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے لیکن محبوبِ خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں، دعا فرماتے تھے، خداوندا،

اسئلک حبک وحب من یحبک وحب عملٍ یقرب الی حبک (احمد، ترمذی، حاکم)	میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہو اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کر دے،
اَللّٰھُمَّ اجعل حبک احب الی من نفسی واھلی ومن الماء البارد (ترمذی، حاکم)	الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، میرے اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے لیکن حضورؐ کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں بجھتی تھی وہ صرف محبتِ الٰہی کا زلالِ خالص تھا، جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا، عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشقِ الٰہی مسیحؑ کا قول ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا، پھر وہ کون روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضورؐ دعا فرماتے ہیں،

اَللّٰھُمَّ ارزقنی حبک وحب من ینفعنی فی حبک (ترمذی)	خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہو مجھے روزی کر۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے، مگر جانتے ہو کہ اس راہ میں آخری منزل کیا ہے! صحیحین میں ہے۔

ما کان اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما[4]	یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اس طرح

---

[1] اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں، دیکھو مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ فصل ثانی (صفحہ ۴۲۶)

[2] مشکوٰۃ باب مذکور

[3] مشکوٰۃ مناقب اہل بیت بروایت ترمذی

[4] مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان، بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔

محبت کریں جس طرح اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے، اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے خالی ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا اعلیٰ معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں، ثبوت میں قرآن پاک کی یہ آیت پاک بھی پہلے پیش کی جا چکی ہے

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ - ۲۵)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔

لیکن احادیث سے ہمارا دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ پڑی ہے جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آ رہا ہے، اپنی جان بچا رہا ہے، بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے، اسی حال میں ایک عورت آتی ہے، جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے، محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے، اس کو اپنے بچہ کے جوش محبت میں چھاتی سے لگا لیتی ہے اور دودھ پلا لیتی ہے، دفعۃً رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے، اور آپ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے؟ لوگ عرض کرتے ہیں ہرگز نہیں آپ فرماتے ہیں، تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے، خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے۔[1]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں، ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے، یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا، ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے، تو بولی کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا کرے گی، یہ سن کر فرطِ اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔[2]

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے چادر میں باندھ کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو فوراً آکر بچوں پر گر پڑی، ارشاد ہوا، کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔[3]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے؟ انہوں نے کہا، ہاں، فرمایا تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔[4]

جمالِ حق کا پہلا مشتاق اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا پردہ کشا زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلانِ خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جانثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعۃً لب مبارک کھلتے ہیں اور یہ آواز آتی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد [2] سنن نسائی باب ما یرجیٰ من الرحمۃ [3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ و مغفرۃ [4] الادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۵۷، مصر۔

ہے، لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا، یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالتِ نزع میں زبان پر یہ کلمہ تھا، خداوندا رفیق،

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں پر اس کی شانِ بخشش کا ترانہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیغام ربانی ہم کو سنایا

میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے رستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا لیکن جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو، میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو، میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں ہے اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت دنیا کے سب سے بڑے گنہگاروں کے برابر ہو جائیں تو بھی میری شہنشاہی میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈبو کر نکال لی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔

ت کا یہ پرکیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبانِ مبارک سے سنا، تسلی و تشفی کا یہ روح افزا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، عفو و کرم کے بحرِ بیکراں کا یہ ساحلِ امید آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا اور گنہگاروں کو "میرے بندو!" کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلے سے میسر آئی صلی اللہ علیہ وسلم۔

*

---

[1] صحیح مسلم کتاب المساجد۔ [2] صحیح بخاری ذکر نبی۔ [3] صحیح مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۶۰ و ص ۱۷۷ و ادب المفرد امام بخاری باب الظلم ص ۹۵۔ [4] ہم نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیئے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں (دیکھو متی ۲۵۔۵ و ۲۵ تا ۷) مگر دونوں کے ملانے سے وہی فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیئے۔

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِکَتِہٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے اس کا واحد مَلَک مَلاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں، اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کا انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے اور چلا رہے ہیں، یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القاء کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں، ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرِ مو تجاوز نہیں کرتے، گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے وہ انہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیا پر اپنے جو احکام اتارتا یا ان سے کلام کرتا ہے وہ انہی کی وساطت سے کرتا ہے،

دنیا کے تمام مذاہب بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں، یونانی مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام عقول عشرہ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں کے اندر بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے جس سے مقصود وہ اولیں ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی پیدائش کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام امشاسپند ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے یہودی ان کو ایلیم کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھتے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہی ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل اور روح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیوؤں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے ہیں بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں، جو صانع و مصنوعات اور خالق و مخلوقات کے درمیان اس کے حکم کے مطابق عمل پیرا اور کارفرما ہیں،

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی وہ کبھی مخلوق کہی جاتی

تھیں اور کبھی خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی کیفیت تھی، پارسیوں میں امشا سپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی رہتی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خود خدا ان میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشا سپند تھا اور ان کے تحت میں ۳۳، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں ہلاکتوں اور برائیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پرے لیکر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ (فرشتہ) بھی ہوتی تھی، جو اس کی بیوی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثنا و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنیوالے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا، اور اس کو خداوند کہکر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا، کہ کہیں کہیں یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ (دیکھو پی ۱۹، ۱۳ و ۱۸، ۲، ۳، ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے (دیکھو پی ۲۰۶) عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جز (تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صائبیوں میں فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور انکو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے ان کی پرستش ہوتی تھی، اور سمجھایا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقل اول اور عقول عشرہ تمام عالم کے خالق کارفرما اور مرجع کل مانے گئے، اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آکر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے انکی پرستش ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے وہ پاک کیے گئے، اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و بیشمار اور درجہ بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا کام شب و روز صرف آقا کا حکم بجا لانا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا، اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے، قرآن میں انکی ہستی صرف اس قدر تسلیم کی گئی ہے کہ وہ صرف غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں جن کا کام خدا کی حمد و ثنا اور اطاعت و فرمانبرداری ہے خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہی ہیں لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے اسی لیے قرآن پاک نے یہودیوں کی طرح ان کو خداوند کا خطاب

19 نہیں دیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو قابلِ پرستش کے لقب سے یاد کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیوا اور دیوتا، اور دیوی کہا، بلکہ صرف ملک اور رسول کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغاز خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ ملائکہ کا مسجود بنے، چنانچہ اس کو مرتبہ علم میں ان سے بالاتر ٹھہرایا گیا اور خدا کی جس تسبیح اور تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جوہر طبیعت انھوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ (بقرہ: ۳۱)

تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بیشک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے یکساں عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت بخشی گئی ہے کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا گیا ہے کہ آسمان و زمین اور پوری مملکتِ الٰہی میں خدا کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ رکھا ہے جو ہر جگہ کار فرما نظر آتا ہے لوگ انھی ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود آگ میں جلانے کی طاقت ہے لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے کیونکہ وہ بھی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود آگ کے اندر موجود ہے، کچھ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے، جو اس پر حکمراں ہے، یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھکتے ہیں، اسلام کے نظریۂ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العٰلمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں، جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور وہ اسباب و علل جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے اور جن کو بت پرست دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور

نظریے ہیں جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلافِ عقل ہے بلکہ جسطرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، ویسا ہی یہاں بھی کیا جا سکتا ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور انکے اسباب و علل کا مسئلہ عقلاء میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معما آج بھی اسی طرح لاینحل ہے جس طرح پہلے تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لیے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت اربابِ مذہب نے نکالی ہے تو وہ محلِ اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ خلافِ عقل کہی جا سکتی ہے کائنات کے حوادث میں جسطرح مادی علل و اسباب کارفرما ہیں اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں اور ان دونوں قسم کے اسباب کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام بخت و اتفاق رکھتا ہے حالانکہ مسئلہ علل و اسباب کو مان لینے کے بعد بخت و اتفاق کوئی چیز نہیں رہ جاتا، یہی روحانی علل و اسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے اصطلاحات میں فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب و علل کے "قوائے طبعی" سے کرتے ہیں، اور ہم "قوائے روحانی" سے،

اس تقریر کا یہ منشاء نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص و طبائع، اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول و قوانین موجود نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص و طبائع اور اصول و قوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس کو ان ہی اصول و طبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں،

سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال و حرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء، بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ و ریشہ پر حکمران اور مسلط ہے بااین ہمہ وہ روح اصولِ مقررہ کے تحت ہی اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی اس طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابر و باد سے لیکر دریا، پہاڑ، چاند اور سورج تک پر ارواح مقرر ہیں جو ان اشیاء سے خدا کے اصولِ مقررہ کے مطابق یکساں افعال و حرکات کا صدور کراتی ہیں۔ جسطرح ہماری روح اپنے اعضا اور اعضا کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے وہ اشیاء کے مقررہ خواص طبائع کے سہارے پر کرتی ہے اسی طرح ملائکہ بھی انہی مقررہ خواص و طبائع کے ذریعہ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جسطرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح و نفوس واسطہ ہیں، اسیطرح تمام عالمِ مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوسِ مجردہ واسطہ ہیں اور جس

طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالم کائنات کے جو نوعی افعال ہیں ان میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے؛ کیونکہ انسان نے ارادہ پاکر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعال اختیاری کی ذمہ داری باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعے ثواب اور عصیاں کرکے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور انقیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال، حرکات اور خصائص میں یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے یہی حقیقت ہے جو فطرت طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورتوں میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

۱۔ اب ہم کو تعلیمات نبوی یعنی آیات و احادیث سے ملائکہ کی حیثیت کو روشن کرنا چاہیے ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور اس کام میں ان کا بے اختیار ہونا ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (الحج۔ ۱۰)

خدا ہی ہے، جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے بیشک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور جو ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں ہے، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں، اور وہی تمام امور اور انتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (فاطر۔ ۱)

حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کیلئے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں، اور جو روک لے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں، اور وہی غالب دانا ہے۔

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید کرتی ہے، کہ فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ ہے، یا وہ پرستش کے قابل ہیں یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہیے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں :-

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا (انفال:۲)

(یاد کرو) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو،

تَنَزَّلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ (قدر:۱)

اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لیکر نیچے اترتے ہیں،

وہ جس طرح احکام لیکر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں ،

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ (معارج:۱)

فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں ۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا، انہی سے متعلق ہے ،

قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ (سجدہ:۱)

کہدو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے وہ تم پر موت طاری کرے گا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنْفُسَكُمُ (انعام:۱۱)

اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو ،

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ (انفال:۷)

اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

اسی کے ہم معنی اور بھی کئی آیتیں ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تعبیر علل و اسباب کی انہی روحانی قوتوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلق علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد ہی تدبیر ہے جو بحکم الٰہی ملائکہ کے سپرد ہے[1] اس تدبیر کو کبھی اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے ،

وہ کام کی تدبیر کرتا ہے ، اور کبھی ملائکہ کی طرف ،

وَالنَّازِعَاتِ غَرْقًا ۝ وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطًا ۝ وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا ۝ فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا ۝ فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا ۝ (نازعات:۱)

ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی گرہوں کے کھولنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی پھر دوڑ کر (مادی اسباب و علل پر سے) آگے بڑھ جانے والوں کی پھر کام کی تدبیر کرنیوالوں کی قسم ہے۔

یہی ملائکہ خدا اور رسول کے درمیان بھی سفیر ہیں :-

---

[1] صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکہ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ
بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (شوریٰ: ۵)

یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ ایک سفیر بھیجتا ہے وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے،

دوسری جگہ ہے:۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ أَمْرِهٖ عَلٰى
مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (نحل: ۱)

خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے،

خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے:۔

فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ
اللّٰهِ (بقرہ: ۱۲)

پس اس (جبریل فرشتہ) نے (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا،

۴۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لیکر بھی اترتے ہیں۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ إِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى

ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لیکر اترے،

اسی طرح حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی،

إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ
غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم: ۲)

میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔

حضرت لوطؑ کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے آئے اور

قَالُوْا يٰلُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ (ھود: ۷)

کہا، اے لوطؑ! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں، اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے، کیونکہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا،

فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا
وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ
مَّنْضُوْدٍ (ھود: ۷)

تو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں، اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:۔

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ
يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (انفطار: ۱)

بیشک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں لکھنے والے ہیں، جو تم کچھ کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ (ق: ۲) کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے،

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ
وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے خدا کے تعاقب کرنیوالے اس کے

لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ط (رعد : ٢)

سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اسکی نگرانی کرتے ہیں۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ط حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُونَ ٥ (انعام : ٨)

اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔

٦۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں؛

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ط هَٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ٥ (انبیاء : ٧)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا،

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ٥ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ط (فصلت : ٤)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ (احزاب : ٦)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے،

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب : ٧)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں،

وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَن فِي الْأَرْضِ (شوری : ١)

اور جو زمین میں ہیں انکے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں،

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ٥ (آل عمران : ٩)

ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ٥ (بقرہ : ١٩)

جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

٧۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا،

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ط حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ ط (زمر : ٨)

اور کفر کرنیوالے گروہ در گروہ ہانکے دوزخ کیطرف لے جائیں گے یہاں تک کہ جب اسکے پاس پہنچیں گے تو اسکے دروازے کھولدیے جائیں گے اور اسکے داروغہ (فرشتے) کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہیں میں کے پیغمبر نہیں آئے۔

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت

حَتّٰىٓ اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (زمر: ۸)

میں لیجائیں گے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اسکے پاسبان کہیں گے تم پر سلامتی خوش خوش جنت میں ہمیشہ کیلئے داخل ہو جاؤ،

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۳)

اور ان جنتیوں پر فرشتے ہر دروازے سے داخل ہوکر کہیں گے تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ کیا اچھا عاقبت کا گھر ہے،

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (تحریم: ۱)

اس (دوزخ) پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں،

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً (مدثر: ۱)

اور ہم نے دوزخ کا اہلکار فرشتوں ہی کو بنایا ہے،

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کے حاضر باش ہیں،

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (زمر: ۸)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد وثنا میں مصروف ہوں گے،

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى (صفٰت)

اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے،

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ (ص: ۵)

مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔

قیامت کے دن بھی یہ تختِ الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے جو ہر وقت اُس کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار رہیں گے،

وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ (حاقہ: ۱)

اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہونگے،

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۝ (نباء: ۲)

ہرگز نہیں جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا، اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے (دیگر) جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔

۹ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہمیشہ اس کی تہلیل وتقدیس اور حمد وثنا میں مصروف رہتے ہیں، اس کے جلال وجبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں، اور اس کے حضور میں اہل زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں،

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (شوریٰ: ۱)

اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشائش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنیوالا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ فرشتوں کی دعا ہی رحمت وبرکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش ورحمت اسی کے دستِ اختیار میں ہے،

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ (مومن : ۱)	جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔
وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ ۚ یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ۚ (انبیاء ، ۲)	آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں، یعنی فرشتے وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے، اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، سست نہیں پڑتے۔
بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۚ وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۚ (انبیاء ، ۲)	بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔
لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۚ (تحریم ، ۱)	خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے وہ اس میں اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔
وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ (رعد ، ۲)	اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں،
وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ ۔	اور آسمان میں اور زمین میں جو چارپائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں،
وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۚ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۚ (نحل ، ۶)	اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا انکو حکم دیا جاتا ہے،

گذر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کے رو سے عقل اول کی اضطراری پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا، اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصل کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے، اور انہیں کو عالم کا فرمانروا مانتے تھے، یہودی بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خداؤں کا درجہ دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین ۱۶ ، ۱۳ ، ۱۸ و ۱۹ ، ۲ و ۳ ، ۲۲) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ خدا کے بیٹوں کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶ ، ۲)، ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے، اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے، اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے وہ ان کی پوجا کرتے اور انکو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا، اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی، اور بتایا کہ

فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت، عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں، اور نہ خدا کے سامنے کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے دونوں کی تردید کی، اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ط بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ہ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ہ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ہ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّىْ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ط كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ہ (انبیاء: ۲)	مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اس سے پاک ہے بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے واقف ہے وہ شفاعت نہیں کرتے لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے، اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں اور ان سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اسکو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دینگے ایسے ہی ہم ناانصافوں کو سزا دیتے ہیں،
اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط سُبْحٰنَهٗ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ط لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ہ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ہ (نساء: ۲۳، ۲۴)	خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے، اور خدا کا وکیل ہونا کافی ہے۔ مسیحؑ کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور اور نہ مقرب فرشتوں کو (اس سے عار ہے) اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو وہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔
وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہ (آل عمران: ۸)	خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ہ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ج بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ج اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ہ (سبا: ۵)	اور جس دن وہ سب کو جمع کریگا پھر فرشتوں سے کہیگا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے وہ اکثر انہی جنوں پر ایمان لاتے ہیں۔

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۗ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ (نبا ۱، ۲)

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے تو کچھ بول نہ سکیں گے لیکن وہ جس کو مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝ (نجم ۱، ۲)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو چاہے اجازت دے اور پسند کرے۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (اسرائیل ۱، ۳: ۵)

کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے اس قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کو باتیں بیان کی ہیں لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتی ہے کہہ دے اے پیغمبر اگر اس ایک خدا کے برحق کیساتھ اور بھی خدا ہوتے تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کرلیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے، ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْــَٔلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (زخرف ۱، ۲)

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے ہم انکی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی بازپرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان (فرشتوں) کو نہ پوجتے انہیں اس کا (تحقیقی) علم نہیں وہ صرف اٹکل لگاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں،

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اس قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی ہے کہ فرشتے، انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا مگر

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ

جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تو انکو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا انہوں نے کہا ڈرو نہیں

إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمِ لُوطٍ ۝ (ھود: ۷) ہم لوطؑ قوم کی طرف ان کے تباہ کرنے کیلئے بھیجے گئے ہیں

کفارِ قریش کا مطالبہ تھا کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا اسکے جواب میں کہا گیا:

وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَٰهُ رَجُلًا
وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ ۝
(انعام: ۱)

اور اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو آدمیوں کے لیے اسکو
آدمی ہی بناتے اور جس شبہہ میں اب ہم نے انکو ڈالا ہے، ابھی
ہیں پھر بھی پڑے رہتے یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں بلکہ آدمی ہو

اس آیت اور دوسری آیتوں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے تاہم فرشتے کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے۔

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ (مریم: ۲) وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا،

یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو فرشتوں کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا مگر یہ دھوکا جلد رفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی،

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان مادی خواص و طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے، کیونکہ یہی چیز ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لیجاتا ہے، اور حقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ سے اُن کو موثر بناتا ہے اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

وحدتِ سلسلہ

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایتِ ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے، اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ ہونے کا دعویٰ تھا، اور وہ صرف اپنے کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونیکا مستحق جانتے تھے، لیکن تعلیمِ محمدیؐ نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا، آپؐ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں، نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے[1]، ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں خدا کی مخلوق ہیں آپؐ نے فرمایا لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدمؑ) کی اولاد ہو، اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا[1]، اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ و روپ، ملک و مرز و بوم اور زبان سے نہیں، بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے[1]۔

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہو گئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہو گیا۔ بنی اسرائیل جن کو خدا کا کنبہ ہونے کا ناز تھا، تعلیمِ محمدی نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ (مائدہ: ۳)	بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف انہی کے خاندان کا ورثہ ہے جسطرح اہلِ آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف ویدوں کے رشیوں اور منیوں نے سنی، جو وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی اپنی جگہ یہی خیال تھا اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف و عدل و کرم اور رحمتِ عام کے منافی قرار دیا، اور کہہ دیا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (جمعہ: ۱)	یہ (نبوت) اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔
قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ	کہدو کہ ہدایت اللہ کی ہدایت ہے (اسرائیلی علماء اپنے ہم مذہبوں) سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ جیسا دین تم کو دیا گیا کسی اور کو دیا جائے

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ابا بونضرۃ ابی ۵۔ جامع ترمذی آخر کتاب المناقب، قرآن اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ، (آل عمران : ۸)	یا اپنے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہدو کہ نبوت کا فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس کو دیتا ہے اور اللہ کی رحمت سب کے عام ہے اور وہ اپنی مخلوق کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔
مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (بقرہ : ۱۳)	اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرلیتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

بعثت محمدی سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی، ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا، زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوۂ نورانی سے محروم یقین کیا تھا، بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کبھی اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں، اس کی نگاہ میں عرب و عجم، شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب پچھم اتر دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا، اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (یونس : ۵)	اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (نحل : ۵)	اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ (روم : ۵)	اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد : ۱)	اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما آیا۔
وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر : ۳)	اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔
وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراہیم : ۱)	اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا، تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔

اس آخری آیت سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الٰہی تشریح و بیان کے لیے مامور ہے۔

ایک یہودی کے لیے حضرت موسیٰ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں

کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو بحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی ہو سکتا ہے، اور وہ ابراہیمؑ اور موسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی انکی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا وَالنَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَّمُحَمَّدٌ حَقٌّ "سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے"۔ غرض کوئی شخص اسوقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک پہلے موسوی، عیسوی اور سلیمانی و داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اسوقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جبتک دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راستبازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کیطرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۔ (نساء، ۲۱)

بیشک جو لوگ، اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اسکے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں وہی تو حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کیلئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے، اور جو اللہ پر اور اسکے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی مزدوری خدا ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ (بقرہ: ۲۲)

اور فرشتوں پر، کتاب پر، اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (نساء: ۲۰)

اور جنے خدا کا اور اسکے فرشتوں کا، اسکی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا اور قیامت کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ ۔ (بقرہ: ۴۰)

ہر ایک خدا پر اور اسکے فرشتوں اور اس کی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر ایمان لایا ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ (بقرہ: ۱۶، وآل عمران: ۹)

ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ انمیں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اسکی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول، صادق اور راستباز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے، اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے، یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اسلئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیحؑ کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا، اور جبتک

صحیح بخاری باب التہجد ۔

کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اسکو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے یہود آپ کی رسالت، اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محروم رہنا گوارا کیا، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے ان کا محروم رہنا قبول نہ فرمایا، اور ان سے صاف کہا:

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ ھَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَکْثَرَکُمْ فٰسِقُوْنَ (مائدہ ۵ : ۹)

اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے، مگر یہی کہ ہم خدا پر اور جو ہماری طرف اتارا گیا، اور جو پہلے اتارا گیا، اس پر ایمان رکھتے ہیں اور تم میں اکثر بے حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑھتے تھے، تاہم ان کی خاطر سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، تقدس اور معصومیت کا انکار نہیں کیا گیا۔ قرآن نے کہا:

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْیَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُکَ مِنْہُ یَصِدُّوْنَ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِھَتُنَا خَیْرٌ اَمْ ھُوَ مَا ضَرَبُوْہُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ ھُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ (زخرف : ۶)

اور جب مریمؑ کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ نام جو وہ تجھ پر دھرتے ہیں، صرف جھگڑنے کو، بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰؑ بن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے، خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں[1] کی طرح مسلمانوں پر بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرستی کا الزام دھرتے تھے، قرآن نے انکے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے، دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے، قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہی انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے، یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے، قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ، بعض ایسے بھی ہیں جنکو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے، لیکن پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے، مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ، وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا، اور انکی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہے، اسلام سے پہلے نبوت، رسالت، اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی، یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کے تھے، اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے، اور جس کے متعلق وہ یقین رکھتے تھے، کہ اسکی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی تھی[2]، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے، بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے[3]، حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت ان کے

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ہشتم ص ۱۶۷، مصر۔ [2] دیکھو توراۃ صحیفہ تکوین باب ۲۰، ۷۔ [3] تکوین ۱۴ - ۱۸ ۔

ہاں صرف بادشاہ کی ہے، اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنیوالے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں، عیسائیوں کے ہاں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں بیان کی گئی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے، وہ چور اور ڈاکو تھے۔ موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں، وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ انکے ہاں مسلم نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی، اسکے فرائض بتائے اس کی خصوصیات کا اظہار کیا، اور ان سب پر ایمان لانے کو نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپؐ نے بتایا کہ نبوت ورسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے، جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ انکو دکھائیں، وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنیوالے) داعی (خدا کی طرف سے بلانے والے) مبشر (خوشخبری سنانے والے) معلم (سکھانیوالے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے، خدا ان سے ہمکلام ہوتا تھا، اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا، اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے، اور اپنے عہد کے سب سے بہتر انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیے تھا اور خدا ان کے لیے تھا، یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں، جنہوں نے ان کو مانا، نجات پائی، اور جنہوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خداپرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ انکے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کے اتباع کا شوق، اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہوجاتا ہے، اور ساتھ ہی اس نے شانِ نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں انکی طرف منسوب تھیں، ان کو چھوڑ دیا ہے، اور یا ان کی تردید کردی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں، بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی، اسلئے انہوں نے نہایت بیباکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں، باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اسکے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترک وصف ہے، کیونکہ گنہگار گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں، اور اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا، اس بنا پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت وجلالت دنیا میں قائم کی اور جن کو کور باطنوں نے انکی عصمت وبیگناہی کے دامن پر اپنے وہم ونادانی سے داغ لگائے تھے، انکو دھو کر پاک صاف کیا، اور یہ رسالت محمدیؐ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے، قرآن

---

[1] انجیل :

نے اس کی تردید کی، اور حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے کہلوایا:

وَبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا (مریم: ۲)

اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنیوالا، اور مجھ کو خدا نے جبار اور بدبخت نہیں بنایا۔

کیونکہ احکامِ عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروا نہیں کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا (مریم: ۱)

اور خدا نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا جب تک میں جیتا ہوں

یہود حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے، قرآن نے اس الزام کو دور کیا، اور کہا،

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ (تحریم: ۲)

اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔

یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا۔ قرآن نے علانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (بقرۃ: ۱۲)

اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا، بلکہ شیطانوں نے کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت لوطؑ پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں اس کی تردید کی۔

اوپر گذر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لے لینے سے دلوں میں جوش عقیدت نہیں پیدا ہو سکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی، اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاء کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیاء کا نام و نشان صحیفۂ محمدیؐ میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی۔ فرمایا:

اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ كَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰى وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۚ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى

ہم نے (اے محمدؐ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کے پاس بھیجی اور ہم نے ابراہیم کو اور اسمٰعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰ کو اور ایوب اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمانؑ کو وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا، اور خدا نے

تَكْلِيمًا. رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا. (نساء ۲۲)

موسیٰ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانیوالا اور ہشیار کرنیوالا بناکر بھیجا تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آجانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب و دانا ہے۔

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ مِنْهُم مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُم مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (مومن: ۸)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے انہیں کچھ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔

تعلیم محمدی کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں، اور اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو جن کی طرف منسوب کرتی ہیں انکی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بناء پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن اور رام[1] کو بلکہ ایران کے زردشت[2] کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو پیغمبر کہا ہے، بہرحال امکان میں تو شک ہی نہیں، لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے ہیں، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاء کے نام مذکور ہیں، تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں، ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیمبر آئے تھے اگو بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں، اگر ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہیں، تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینۂ غالب ہو سکتا ہے، لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی ہے، اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔

اس قسم کے انبیاء کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں، مگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے پیروان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ. (نحل ۵)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو، اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (انبیاء: ۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھی کو پوجو۔

---

[1] کلمات طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناںؒ [2] ملل ونحل ابن حزم۔

اس لیے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور رہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لانے اور جن کی تبلیغ وتعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور جن کی زندگی اس تعلیم کے شایانِ شان تھی، انکی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کیونکہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کے مطابق انبیاء اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں، اسی بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کیساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے۔ البتہ ان انبیاء میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (بقرہ: ۳۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو نشانیاں دیں اور پاکی کی روح سے اس کی تائید کی۔

آپؐ نے دوسرے انبیاء کی جائز تعظیم وتکریم یہاں تک کی ہے کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپؐ کو یَا خَیْرَ الْبَرِیَّۃِ اے بہترین خلق کہہ کر خطاب کیا، فرمایا وہ تو ابراہیمؑ تھے[1]، ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے عالی خاندان کون تھا؟ فرمایا یوسفؑ پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ[2]۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو بشر پر فضیلت دی، ایک مسلمان یہ کھڑے سن رہے تھے، ان کو غصہ آگیا کہ ہمارے پیغمبرؐ کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو، اور اس کو ایک تھپیڑ کھینچ مارا، اس نے دربارِ نبوتؐ میں جاکر شکایت کی، آپؐ نے ان صحابی کو بلا بھیجا، اور مقدمہ کی روداد سنی، پھر نہایت برہم ہوکر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو، یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔

یہی وہ تعلیماتِ محمدیؐ ہیں، جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات، انسانی اخوت اور تمام انبیاء اور پیغمبروں کے ادب واحترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھ سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ان کی عظمت وجلالت اور ادب واحترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہوگئے۔ وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ نے آکر دفعتہً اس کو مٹادیا، اور انکی پاکی کی گواہی دی جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں، ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب واحترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے، ان کے جائز ادب واحترام

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۱۵۳۔ [2] صحیح بخاری کتاب الانبیاء مناقب حضرت یوسف علیہ السلام ص ۴۷۹ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

کو اپنے ساتھ لیتے گئے،

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت و رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیاء اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ ابن مریم پر تحقیر اً ہنسی آتی تھی[1]، اور جو حضرت موسیٰؑ[2] کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہو گئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے لگے، اور جو آج بھی تمام مسلمانوں میں شائع اور ذائع ہیں، انہوں نے پیغمبروں کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی، ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنا لیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود و سلام پڑھے۔

⁂

کُتُبِ الٰہی پر ایمان

وَکُتُبِہٖ

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے، ہر چند یہ عقیدہ گذشتہ عقیدۂ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے، تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی، تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (بقرہ - ۱) اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمدؐ) اتاری گئی

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود، ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقۂ تعبیر ہے اور اس لیے لایا گیا کہ بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آجاتی ہیں، قرآن پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے انکو تسلیم ہی نہ کرے تو انکی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟ یہی باتیں ہیں، اس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ بما جئت بہ جو کچھ میں لیکر آیا اس پر ایمان لاؤ، قرآن نے کہا:

(بقیہ حاشیہ) [3] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] قرآن پاک سورۂ زخرف رکوع ۶،

[2] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ۔

وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ (محمد: ۱)

اور ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے، اور یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہل قرآن قرآن کیساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اسوقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفۂ محمدی کیساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی منجانب اللہ تسلیم نہ کرے چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع اولیٰ مذکورہ بالا آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (بقرہ: ۱)

اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ سے پہلے اترا۔

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ (بقرہ: ۴۰)

رسول ایمان لایا، اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا، اور اہل ایمان بھی ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاء کا اجمالی ذکر کرکے انکی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (بقرہ: ۱۶)

(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر، اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے۔

آل عمران میں کسی قدر تفصیل ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ (آل عمران: ۹)

کہہ کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندانِ یعقوب پر اتارا گیا، اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اس پر اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا اس پر، ہم ان سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر بھی قرار دیا گیا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰهِ

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو منکر ہے خدا کا اور اسکے فرشتوں کا اور اس

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ ...... فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء: ۲۰)

کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی تکذیب کریں:

اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ (مومن: ۸)

جن لوگوں نے کتاب کو، اور جو پیغام دیکر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، اسکو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے، جب انکی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ گھسیٹے جائیں گے۔

نام کی تخصیص کیساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے، توراۃ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے (اعلیٰ: ۱) اور حضرت داؤدؑ کی زبور اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل اور خود قرآن، انکے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ ہے:

اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى (اعلیٰ) یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں ابراہیمؑ و موسیٰؑ کے صحیفوں میں،

ان کے ماسوا اجمال کیساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى (طٰہٰ: ۸) کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اسکی گواہی ان کو نہیں پہنچی!

وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (شعراء: ۱۱) اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس بنا پر انبیاءؑ کی طرح ان کتابوں پر بھی ہر مسلمان کا تفصیلی و اجمالی ایمان ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان پر ناموں کے ساتھ، اور جن کے نام مذکور نہیں، ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جسکا وجود قرآن سے پہلے ہے، لیکن اسکا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے، اور اسمیں توحید الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگرچہ ہم اسکو بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے، اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کہ اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب[1] یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونیکا شبہہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانیوالا مجبور ہے، کہ صحیفۂ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے، اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں، تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جسکا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں، عقائد میں رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہودی اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کرکے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کرکے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری آسمانی کتابوں کو باطل مان کر بھی جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا،

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقر۔

ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی تمام آسمانی کتابوں کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ تسلیم کریں، جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور غیر قومیں یا مختونین اور غیر مختونین اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے، عیسائیوں میں، مذہبی حیثیت سے مسیحی، یہود اور بت پرست گو تین قومیں مانی جاتی ہیں مگر چونکہ انکے مذہب میں قانون نہیں ہے، اسلیے وہ اکثر امور میں رومن لاء کے پیرو ہیں، لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں، رومی اور غیر رومی، ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے، پارسیوں میں نژاد ان ایران اور بیرونی لوگ دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گذشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار طبقوں میں تقسیم فرمایا، اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں میں برابر عمل ہوتا رہا، یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمان، جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر بھلائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

۲۔ اہل کتاب، یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جنکا نام قرآن میں مذکور ہے، کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں، وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے حدود میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں، ان کو اپنے مذہب پر مجبور نہیں کیا جاتا، انکی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں، ان کا جائز کھانا وہ کھا سکتے ہیں اور وہ اپنا کھانا انکو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل الکتاب، یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ وانجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود انکے علاوہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا، مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے، ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا کیے ہیں، وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں، انکی جان و مال و آبرو اور انکے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

۴۔ کفار و مشرکین، یعنی وہ لوگ جنکے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں

انکو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق حاصل کرنے کیلئے ان سے کہا جائیگا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کرلیں، جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں حرانی مشرکوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کرکے اپنے لیے حقوق حاصل کیے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم نے دنیا میں امن وامان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے، یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کی باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کیلئے آمادہ کیا، اور مجوسیوں، صابیوں، یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی ان میں قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان تمام رسولوں اور انکے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلعم کی تعلیم یہ ہو کہ آدمؑ سے لیکر محمد علیہما السلام تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے، چنانچہ درحقیقت آپ کی یہی تعلیم تھی، اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے، جو آدمؑ سے محمد علیہما السلام تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ سے آتا رہا اور انسانوں کو اسکی تعلیم سکھاتی رہی۔

صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں، ایک دین اور دوسرا شرعہ، نسک اور منہاج، شرعہ اور منہاج کے معنی راستے کے ہیں، اور نسک کے معنی طریق عبادت کے ہیں، دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا اور ایک رہیگا، نور معرفت ایک ہے، خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لیکر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے رہے اسمیں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا اور قوم و ملک کے اختلاف سے اسمیں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا، اور وہاں کے ہر پیغمبر نے اسکی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اسکے صفاتِ کاملہ، انبیاء اور مرسلینؑ کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوقِ انسانی، اخلاقِ فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا، یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں، جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے، اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے، تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص شامل ہو گیا ہے۔

دوسری چیز جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی ترجمان نے شرعہ منہاج اور منسک کہا ہے، وہ جزئیاتِ احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادتِ الٰہی ہر مذہب کا جزء لازم ہے، لیکن طریقِ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے، مگر وہ سمت خاص خاص مصلحتوں کے لحاظ سے مختلف مقرر کی ہے، اسی طرح اعمالِ قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے، مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے، تو بدلتے رہے، مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے ناقابل تبدیل و ناقابل تغیر رہا ہے، انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اس ازلی ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا

کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو قوم کے مناسبِ حال ہوں وہ انکو بتائیں اور سکھائیں،

انبیاءؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحبِ شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جبکہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین و شریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دست برد ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہوگئی، صحیفۂ ابراہیمؑ کے گم ہو جانے کے بعد جسکا نہایت ناقص خلاصہ تورات کے سفرِ تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا، صحیفۂ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر انجیل آئی، اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے اسلیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے، اور قیامت تک کی جائے گی اسلیے اسکے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اسکے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لیے آئمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنتِ نبویؐ کا احیاء اور بدعات کا قلع و قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے، اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحیِ محمدیؐ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

وحدتِ دین کی حقیقت کو وحیِ اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :-

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ
الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ
اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا
الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ
مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ
اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ
يُّنِيْبُ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ
وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ
وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ
بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ
فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ج
وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ج وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ج وَاُمِرْتُ

اُس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو نوح کو کہی اور ہم نے تیرے پاس جو حکم بھیجا اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے، وہ ان پر گراں گزرتا ہے، اور خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے، جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے لوگوں نے وحی کا علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے ہیں اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقتِ مقررہ تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشفِ حقیقت کرکے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی، وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا، سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر

لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۭ (شوریٰ : ۲)	اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ سب اکٹھا کریگا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے ۔

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اُٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوحؑ کو، ابراہیمؑ کو، موسیٰؑ کو اور تم کو اے محمد (صلوٰت اللہ علیہم) عطا کیا گیا ہے، اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ داری کی الگ الگ راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدتِ دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے، حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہؐ تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کیساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم ہو اور یہ اعلان کرو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اہل کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہیں تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں، یا معاملات میں تمہارے ساتھ عدل و انصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے، دو نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس لفظ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں، البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم تم خود ہیں، نہ تم ہمارے کاموں کے جوابدہ ہو اور نہ ہم تمہارے کاموں کے، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں،

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے ۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آل عمران : ۷)	اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے، متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں اگر وہ اسکو قبول نہ کریں تو کہدے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں ۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں، ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (انعام : ۲۰)	بیشک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے تجھ کو ان سے کوئی واسطہ نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، وہ ان کو جتا دیگا جو وہ کرتے تھے ۔

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل دینِ قیم کی جو ابراہیمؑ کا تھا، دعوت دی گئی :

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ
دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا
وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام : ۲۰)

کہہ دے کہ مجھ کو خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف میری رہنمائی کی، جو دین صحیح ہے ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھے۔

غرض اسلام وہ دین قیم ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا، اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحد دین کی پکار ہے جس کی طرف تمام انبیاء اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے، اسی لیے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ
اقْتَدِهْ (انعام : ۱۰)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہی کی راہ پہ چل۔

بعض اسلامی حدود و شرائع کی تشریع کے بعد فرمایا گیا۔

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ
سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (نساء : ۵)

خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھلائے جو تم سے پہلے تھے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے، اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے ہیں کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے کہا گیا:

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ
إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (اعلیٰ : ۱)

بے شبہ یہ بات، اگلے صحیفوں میں تھی یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ایک اور آیت میں کہا گیا:

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (شعراء : ۱۱)

اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن
قَبْلِكَ (حٰمٓ السجدہ : ۵)

(اے محمدؐ) تجھ سے (اس کتاب) میں وہی کہا گیا ہے، جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے، بلکہ یہ اسی پرانی دعوت کی تکرار ہے جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل، یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا، اور ایک ہی حقیقت تھی، جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلعم کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت

تک محفوظ و باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے، اور جو اصل مقصد نہیں، ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہی ہے اور عہدِ محمدیؐ تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے، یہودیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض تھا کہ آپ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں، قرآن نے اس کے جواب میں یہی ہمیشہ کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا، اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے، اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے ہی وابستگی اور لگاؤ تھا، اسلیے یہ ان کا قبلہ بنی، چنانچہ قرآن نے تعیینِ قبلہ کے موقع پر کہا:

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ :۱۸)

اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے، جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو، بلکہ نیکیوں کو اصل اہمیت دو، اس لیے فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (بقرہ :۲۲)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رُخ کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)

اسی طرح خانۂ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر گروہ نے اپنے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کیلئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے اور اسلام نے خانۂ کعبہ کے حج کو اسلیے تجویز کیا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ، وَاِنْ جَادَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (حج :۹)

ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہباً پابندی کرتے ہیں، سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا تو بیشک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے، اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہدے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔

سورۂ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں جنکو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پہلے یہودیوں سے کہا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (مائدہ :۷)

ہم نے توراۃ اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی پیغمبر جو حکمبردار تھے وہ یہود کا فیصلہ کرتے اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے، اور وہ تھے اس پر خبردار۔

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا :-

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ط

اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھے، یعنی تورات اور ہم نے اس کو انجیل دی اسمیں ہدایت اور روشنی ہے، اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی توراۃ کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لیے، اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا،

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا :

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۖ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ، (مائدہ : ۷)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اسکے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اسکو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر،

دیکھو کس خوبی کیساتھ صحیفۂ محمدیؐ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور ان اہلِ مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے، اپنی اپنی کتبِ منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابوں کا امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اسمیں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہواء (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی، یہ اہوا کیا ہیں، کتابِ الٰہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ "افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے (بقرہ : ۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہلِ کتاب کی اہواء کی پیروی نہ کریں اس کے بعد حدود و جزا و سزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات، انجیل، اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا، فرمایا:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ط (مائدہ : ۷)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو بر سرِ باطل کہتے تھے :

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ : ۱۴)

اور یہود نے کہا نصاریٰ کسی راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے :

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا (بقرہ : ۱۴)

اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دینِ ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (بقرہ : ۱۶)

کہہ بلکہ ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جو موحد تھا مشرک نہ تھا تم لوگ کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم و اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا، اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا اور سب پر ایمان لائے، ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے، اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح لائیں جسطرح تم ایمان لائے ہو تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔

یہود اور نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ (بقرہ : ۱۳)

یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا:

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ (بقرہ : ۱۳)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ :- بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ : ۱۳)

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کرکے فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ : ۸)

بیشک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان)، جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی، جو بھی خدا پر اور آخرت پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ان پر خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا، اور اچھے عمل کیے، انکو اپنے کام کا پورا ثواب ملیگا، یعنی جسنے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر اور بت پرستی سے یقیناً پاک تھی، عمل کیا، اس کو اس کا ثواب ملیگا، خدا کی توحید اور روز آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہو سکتا ہے اور اس پر تمام اہل مذاہب کا اتفاق ہے اسلیے رسالت کی تصدیق بھی اسکے ضمن میں داخل ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ

بیشک جو اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس میں ایمان

ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا
وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ
اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ
اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (نسا ۲۱)

کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنیوالا عذاب تیار کیا ہے، اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دیگا اور خدا بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (نور: ۹) مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا، وہ چاروں ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کے ماننے والے ہیں اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے، چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى
تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ج فَلَا تَاْسَ عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا
وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (مائدہ: ۱۰)

کہدے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا، اسکو قائم نہ کرو، اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف اترا ہے، وہ انکی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا تو ان منکروں کا غم نہ کرو، اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے، اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لایا، اور اچھے کام کیے، تو ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے، اس لیے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے ہیں، فرمایا:

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ
اِلَيْهِمْ رُسُلًا ط كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا
تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ
وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ
تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ
قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط وَقَالَ
الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ

بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور انکی طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی انکے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لیکر آیا، تو انہوں نے کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی، سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا پھر ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہو گئے، اور اللہ دیکھتا ہے وہ جو کرتے ہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح ہی اللہ ہے، مسیح نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور

رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ
مِنْ اَنْصَارٍ ۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ
ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ
يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (مائدہ : ۱۰)

تمہارا رب ہے، بیشک جو اللہ کا شریک بنالے گا تو اللہ نے
اس پر جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور
گنہگاروں کی کوئی مدد کرنیوالا نہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے
جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے حالانکہ کوئی اللہ
نہیں، مگر وہی ایک، گروہ اپنے ہی قول سے باز نہ آئے تو ان
میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے "ایمان" کا حال تھا، اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے حسنِ عمل کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اسی کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ
وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (مائدہ : ۱۱)

اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس
پر یہ لوگ ایمان لے آتے تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست
نہ بناتے، لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں، توحید کامل اور رسالت عمومی یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْھًا وَّاِلَيْهِ
يُرْجَعُوْنَ ۔ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ
مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ ۡ وَنَحْنُ
لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ
دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَھُوَ فِي الْاٰخِرَةِ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران : ۹)

کیا وہ دین الٰہی کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جو بھی آسمانوں
میں اور زمین میں ہیں وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار
ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ کہ ہم اللہ
پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم پر اسماعیل پر اور اسحاق پر
اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اتارا، اور جو کچھ موسیٰ اور
عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو انکے رب کی طرف سے ملا ہم سب
کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ہم انمیں سے کسی میں کوئی فرق
نہیں کرتے ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے
سوا اور کوئی دین چاہیگا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا
اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہوگا۔

اسی آیت سے ظاہر ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے، اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا، آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلات باطلہ اور اتباع متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہوگئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو کر اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ

بیشک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی

۲۱ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ، (آل عمران: ۲)

انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر (اے پیغمبر) یہ تجھ سے کج بحثی کریں تو کہہ کہ میں نے اور میرے پیرووں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔

اسی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ط فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ، (آل عمران: ۲)

اور اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام "ہدایت نامہ" ہے یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی امت ہوں کھو دیا تھا، اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی، وہ ناقص تھی، اور اسلام جس کو لیکر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا، اور اس نے نیک کام کیا، اسکو خوف وغم نہ ہوگا۔ ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود توحید کامل ہے، اور اسکا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں، یہود و نصاریٰ کیا مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں، جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو انکے رسول کے ذریعہ سے دنیا میں آئی ہے، یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوت محمدیؐ کا یہ دعویٰ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے، اور اسکے سوا سب ضلالت ہے، بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے، اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ایک کامل ہدایت جو انبیا اپنے وقتوں میں سب ہی لیکر آتے رہے چونکہ انکے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے، اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لیکر آخری دفعہ تشریف لائے اور اب یہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی کبھی ناقص نہ ہوگی، کیونکہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلافات اور تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدیؐ کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو اوپر گذری یہ ہے:-

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ

اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا (آل عمران: ۲)

وہ اسلام لائے، اگر اسلام لائے تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔

سورۂ بقرہ میں ہے:-

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ
اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ
وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ
وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (بقرہ: ۱۶)

(اے مسلمانو!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم پر اور اسمعیل پر اور اسحق پر اور یعقوب پر اور انکی اولاد پر اترا، اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو انکے پروردگار کی طرف سے دیا گیا (سب پر) ایمان لائے ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی، اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد پر ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کو تعلیم محمدی کیطرف دعوت اسی ہدایت کے پانے کیلئے ہے جو اسلام یعنی انبیاء کے دین ازلی کی عبارت ہے جسکو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ
مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلٰى
هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (بقرہ: ۱)

جو اسکو جو تیری (پیغمبر) طرف اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور یہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمت الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدیؐ کو قبول کریں اور وہی نجات کامل کے مستحق ہیں،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ
يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا
يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ
الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ
وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ
الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ
وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ
اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ص

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے تو اس رحمت کو میں ان کیلئے لکھدونگا، جو پرہیزگار ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جسکو وہ اپنے ہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو انکو نیکی کا حکم دیتا ہے، اور برائی سے باز رکھتا ہے اور اچھی چیزیں انکے لیے حلال کرتا اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور انکے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنہوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کیساتھ اتری وہی کامیاب ہیں۔ کہدے (اے پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے سو اللہ

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (اعراف : ۲۰)

اور اس کے اس ان پڑھ پیغامبر رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تاکہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

اس آیت میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اسلیے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزش سے مکدر ہو گیا تھا، وہ صحفِ الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیاتِ احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا، وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں نیز آپ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کئے گئے ہیں اسلیے ہدایتِ عامہ، نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحیِ محمدی کے اندر محدود ہے۔

الغرض دینِ محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو صحیفۂ محمدیؐ لیکر آیا ہے، اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا، کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے، اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقاء کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختمِ نبوت، حسبِ ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیلِ دین قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے، اور اس کے ذریعہ دینِ الٰہی اپنے تمام اصول و فروع و مناسک و مناہج و شرائع کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئیگی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی، خدا نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:۔

> ”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کرونگا، اور اپنا کلام اسکے منہ میں ڈالونگا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا، وہ سب ان سے کہے گا۔“ (استثناء ۱۸-۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد انکے مانند ایک اور نبی آنیوالا تھا جسکے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالیگا، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ کی طرح ایک اور صاحبِ شریعت نبی خدا کے نئے کلام کیساتھ آئیگا، اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:۔

> لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا (یوحنا ۱۴-۲۶)

> اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ اسلیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے ..... میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں، پر اب تم انکی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئیگی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائیگی، اسلیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی، لیکن جو وہ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی (یوحنا ۱۶-۸۰)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا، اور ایک آئندہ آنیوالے کا پتہ دیا، جو اس کی تکمیل کرے گا۔ آخر وہ موعودِ الامم (صلی اللہ علیہ وسلم) آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیو یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں، اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری باتوں کو کامل کرنے کے لیے آئی ہے، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں

جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے اس کی زبان سے یہ اعلان عام کیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (مائدہ: ۱)
آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو انکی سخت گیری کیلئے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے[1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے، بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کیلئے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے اس نے اپنے بعد کسی آنیوالے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا، کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنیوالے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بناء پر قرآن نے ہر جگہ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔

قرآن مہیمن کتب ہے اس دینِ کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (مائدہ: ۷)
اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنیوالا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ: ۷)
اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اس پر شاہد وحاوی ہے۔

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ: شاہد اور امین، قرآن اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہؒ: قرآن سے پہلے جو کتابیں تھیں ان کا وہ امین اور شاہد ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اسکے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی، بلکہ پیغمبرانِ چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا، توراۃ جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی، اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کثرت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی، زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا، اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے انکی کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا انکی بنا پر انکی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا، لیکن قرآن کی نسبت یہ عہد ہوا کہ وہ ہمیشہ کیلئے باقی اور محفوظ رہے گا، اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر: ۱) ہم نے اس نصیحت (کی کتاب) کو اتارا اور بے شبہ ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے

یہ وعدۂ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے۔

---

[1] دیکھو آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ الآیۃ (آل عمران: ۱۰)

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (قیامہ ۱) بیشک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو جمع کر رکھنا، اور اسکا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قرأت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا۔

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۔ (حٰم السجدہ ۵)

اور بیشک یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل اسکے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آسکتا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اُترا۔

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا، یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے زیر کر دیگی، باطل نہ اسکے سامنے سے اسمیں چل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اسلیئے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی، اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے، اس لیے ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدیؐ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اور اب آپؐ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دین کامل اور صحیفۂ الٰہی محفوظ ہو چکا، اور ہدایت ربانی کے دروازے کے بند ہونیکا خطرہ دور ہو گیا، چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدیؐ کے بعد دنیا کی حالت بدل گئی، متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں، زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا، اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا، یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں، ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دین اسلام تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے، یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا، لیکن وہ بعد کو انکے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہیگا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آجائیں جسکی تعلیم انکے پیغمبروں نے دی تھی، تو وہ بھی وہی دین ازلی ہو گا جسکا نام اسلام ہے اور نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ کے دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہیگا، اسی لیے فرمایا گیا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ (نساء ۷)

اے وہ لوگو جنکو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انکو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہگاروں پر جس طرح ہم نے لعنت کی تھی، ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری (قرآن) جو ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں تصدیق کرتی ہے۔

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا اسلیئے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:-

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ
وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ط

اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ ہو۔

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ :۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا
نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ،
وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۔ (بقرہ : ۱۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اسکو مانتے ہیں اور وہ اسکے سوا کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو انکے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین کو پیش کیا، اسکی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی یہی سبب ہے کہ اسلام نے مسلمان ہونے کیلئے صرف یہی ضروری نہیں قرار دیا کہ وہ تنہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لائے بلکہ یہ بھی قرار دیا کہ وہ تمام اگلی نبوتوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لائے چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپکے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے تھے، سورہ سبا میں ہے :

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ
وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (سباء : ۴)

اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے، اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)

اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح کیساتھ فرمایا کہ جو میری عبدیت اور رسالت کیساتھ عیسیٰ ابن مریم کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کریگا، وہ جنت میں جائیگا (بخاری کتاب الانبیاء ذکر عیسیٰ) الغرض وہ ازلی ابدی دین صرف ایک ہی تھا، اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لیکر دنیا میں آئے تھے یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا
صَالِحًا ط اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ؕ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ
اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ
فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ، كُلُّ حِزْبٍۢ
بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (مومنون : ۴)

اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بیشک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو، تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں فرمائی ہے :۔

اَلْاَنْبِيَآءُ اِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى
وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ (بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر عیسیٰ)

تمام انبیا ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے، اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ ۲۲۱) ——— وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (بقرہ: ۱)

اسلام کے سلسلۂ ایمانیات کی آخری کڑی ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (بقرہ: ۱)	اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔
مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (توبہ: ۲۲)	جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔
الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ( )	جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں۔

اخرۃ کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کرکے اکثر موصوف کو حذف کردیتے ہیں، مثلاً "دنیا" کے لفظی معنی "قریب ترین" کے ہیں اور یہ صفت ہے، اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا اَلدَّار (گھر) ہے، اس لیے الدُّنیا کا مفہوم اَلْحَیَاۃُ الدُّنْیَا (قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا اَلدَّارُ الدُّنْیَا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح اَلْآخِر، اَلْآخِرَۃ کا مفہوم اَلْیَوْمُ الْآخِرُ وَالْحَیٰوۃُ الْآخِرَۃُ وَالدَّارُ الْآخِرَۃ، پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے (یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر) اور قرآن پاک میں یہ لفظ انہی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (عنکبوت: ۷)	اور بیشک آخری گھر اصل زندگی ہے۔
وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ (انعام: ۴)	اور بیشک آخری گھر بہتر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں دار (یعنی گھر) کا لفظ موجود ہے۔

أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ (توبہ: ۶)	کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہوگئے۔
الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (مومنون: ۳)	جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی (زندگی) کی ملاقات کو جھٹلایا اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔

ان آیتوں میں الحیاۃ الدُّنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ الْآخِرَۃ سے مراد اَلْحَیَاۃُ الْآخِرَۃ یعنی پچھلی زندگی ہے[2]، اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر

---

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں یوم آخر پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

[2] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بیشمار آیتوں میں مذکور ہے، حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے وَجِیْھًا فِی الدُّنْیَا (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

حشر ونشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۝ (ابراہیم ۔ ۴)	جو ایمان لائے ان کو اللہ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات (کلمۂ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

اس آیت میں "آخرت" سے مراد عالمِ برزخ ہے، اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی، جبکہ ہر چیز اسوقت واضح اور نمایاں ہوگی، اس لیے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا، ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ "قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے[1]"۔

یوم آخر اور حیات آخرت ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہوجائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا رشتہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لیکر ابد (ہمیشہ) تک، جس میں پھر موت وفنا نہیں، پہلے دور کا نام "برزخ" اور دوسرے کا نام "بعث" یا حشر ونشر اور قیامت ہے، اور ان سب کے معنی جی اٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں، لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس کے عالم کا نام قرآن میں اَلْاٰخِرَۃُ، اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ، عُقْبَی الدَّارِ وغیرہ ہے، جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران ۔ ۵) دنیا اور آخرت میں معزز۔ سلسلۂ دعا میں ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ۝ (بقرہ : ۲۵) پروردگار ہمکو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے:

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (بقرہ ۔ ۲۷)	ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔
اِسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (نحل ۔ ۱۴)	انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔
نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حٰم السجدہ ۔ ۴)	ہم ہیں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔

اور کبھی دنیا کے بجائے "اولیٰ" (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے، فرمایا:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (نازعات ۔ ۱)	تو خدا نے اسکو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔
وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (لیل ۔ ۱)	اور ہمارے ہی لیے ہے، پچھلی اور پہلی زندگی۔

(صفحہ ہٰذا) [1] ابن ماجہ وحاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۹۵ ۔ حیدرآباد دکن (ترمذی)

توراۃ وانجیل میں برزخ وقیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہیگی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے آگے سزا و جزا کے دو مقام ہیں، شخصی موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہوجاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کرلیا ہے سلسلۂ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی، دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوجائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس، اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ (توبہ، : ۱۳)	ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیاؔ، برزخؔ اور قیامتؔ ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے، اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہِ راست راحت و لذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نماں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

"برزخ" کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے، جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے، اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو انکو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (رحمان: ۱) ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے۔

وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا (فرقان: ۵)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے، اور وہ کھاری کڑوا ہے، اور انکے بیچ میں ایک پردہ اور رو کی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اسکا نام "برزخ" ہے، سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ:

وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ (مومنون: ۶) اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل "برزخ" کا نام "قبر" ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعر دریا میں یا کسی درندہ یا پرند کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا:

وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ (حج: ۱) بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ بعث صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تودۂ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے ہے، خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ (مومن: ۲)

ہمارے پروردگار تونے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (بقرہ: ۳)

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے، پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے، جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا، یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی،

پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کریگا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوگی جس کے بعد پھر موت نہیں، قرآن ک میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا گیا،

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ، (زمر: ۳)	بیشک تو بھی مرنے والا ہے، اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعوی پیش کرو گے،
ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ (مومنون:)	پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو، پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اسکے سمجھنے کے لیے ایک مختصر سی تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت اللہ تعالی نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب و غریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے، جسکو ہم نیند کہتے ہیں، روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک احساس کا، اور دوسرا تدبیر تغذیہ کا، نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلاتِ ادراک و احساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گرد و پیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشو و نما اور بقا کی تدبیر، دل و دماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے نظام اساسی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے، اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے، اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے، لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے، اسلیے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جسکی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی بولیوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے، قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى أَجَلٌ مُّسَمًّى (انعام: ۷)	اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جانتا ہے جو تم نے دن میں کیا، پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ج فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرٰى إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى ط إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (زمر: ۵)	وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو انکی موت کے وقت وفات دیتا ہے، اور جو نہیں مری انکو انکی نیند میں وفات دیتا ہے، تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدت معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں،

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے برزخ کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پاکر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا۔

يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا (یٰسین: ۴)	اے ہماری خرابی! کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔

غزوۂ احد کے موقع پر یہ ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدانِ جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل نکل کر اپنے مقتل میں خود آجاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران : ۶)

کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کیلئے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر "بعث" لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں[۱]، جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ (انعام : ۷)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے، پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ (حج : ۱)

اور بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں جگائے گا۔

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے، یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔[۲]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل گہری نیند کے مشابہ ہے،[۳]

خواب میں لذت والم انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک و احساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں، مگر اس کے ادراک و احساس کی تخیلی، تمثالی، یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو ہی جسم دیکھتا ہے، جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے، اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں، نیز اس میں درد و رنج اور تکلیف کی تمام وہی کیفیتیں ہوتی ہیں، جو مادی دنیا میں ہیں، اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ چیخ اٹھتا ہے اور اگر اس میں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں، غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی و رنج اور لذت والم، اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی شادی و رنج اور لذت والم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت و تکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اور مادی دنیا کی لذت و تکلیف احساس و ادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت و تکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت و تکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ و آلام کے مختلف مناظر اور ان کے حقائق اور اسباب و علل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب و غریب مطالب سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات و معلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور ان کے تمادی کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں یاد آ گئی

---

[۱] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کیلئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا! تو حضرت علیؓ نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی یا رسول اللہ انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا (ہماری جانیں خدا کے ہاتھ میں ہیں، وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنی میں آیا ہے۔ [۲] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸۰ حدیث حسن غریب۔ [۳] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فهذا المبتلی فی الرؤیا غیر انه، وما له یقظة منها الی یوم القیمة (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔

باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسّم شکلوں میں نمودار ہوجاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اسکو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہوجاتی ہیں، اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اسلئے وہ تمام اچھے اور بُرے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں خواہ وہ انکو انتہا بھول گیا ہو مگر انکی یاد ذہن کے گوشہ سے بالکل معدوم و مفقود نہیں ہوتی.

خواب کی عجیب و غریب صورت وہ ہے جسکو تمثیل کہتے ہیں، جیسے ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمت کعبہ پر وقف کر دینے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا، شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اسکے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرند اسمیں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے اُحد کو ذبح ہوتی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان مو کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا[1] ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں .

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسّم شکلیں نظر آتی ہیں، مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے، اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی و کالی کالی صورتیں نظر آئیں گی، اسیطرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہوکر دکھائی دیتے ہیں.

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں، اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئیگا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدہا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے، تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شبِ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی .

اسی قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا :

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۚ أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۚ (حجرات : ۲)	اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو بُرا نہ کہے کیا تم میں کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مرے بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سو گھن آئی تم کو.

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا :

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (بقرہ ۔ ۳۸)	جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے ٹھوکر کھو دیے ہوں.

---

[1] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں، ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو، حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہؒ ذکر برزخ :

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (نساء - ۱)

وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے۔

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے درد گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے، دوزخ میں انکو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

اِنَّهٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ لَّا یَاْکُلُهٗ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (حاقہ - ۱)

بیشک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اور مسکین کے کھانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے، اسکو وہی گنہگار کھائیں گے۔

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی:

وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ (بقرہ - ۳۶)

اور انکی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں، ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور سرفروشوں کو حیاتِ نو، اور حیاتِ جاوداں کی خوشخبری دی گئی فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ (بقرہ - ۱۹) جو خدا کی راہ میں مارا جائے، اسکو مردہ نہ کہو وہ لوگ زندہ ہیں۔

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دیگا، خدا اسکو بڑھا کر دیگا، جو دوسرے کو معاف کریگا خدا اسکو معاف کریگا، جو دوسروں کی عیب پوشی کریگا خدا اسکی ستاری کریگا، قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا و سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہِ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، انکی نسبت فرمایا:

سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (آل عمران - ۱۸)
یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُکْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (توبہ - ۵)

جس مال کا بخل کیا تھا، قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔
جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، پھر اس سے انکی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اسکا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔

دنیا میں اللہ کے نورِ بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی، اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی، قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْ اَعْمٰی وَقَدْ کُنْتُ بَصِیْرًا، قَالَ کَذٰلِکَ اَتَتْکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا وَکَذٰلِکَ الْیَوْمَ تُنْسٰی (طٰہٰ - ۷)

اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کیلئے تنگ گذران، اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا، خدا کہیگا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آئی تھیں تو انکو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کیساتھ اس آیت میں ہے :

وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (اسرائیل :)

جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا، وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا.

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئیگا، یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا.

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اٰتاہ اللہ مالہٗ فلم یؤدِّ زکاتہٗ مُثِّلَ لہٗ مالہٗ شجاعا اقرع لہ زبیبتان یطوقہ یوم القیامۃ یاخذ بلھزمتیہ ای شدقیہ یقول انا مالک انا کنزک ۔

(بخاری تفسیر ال عمران ج ۲ ص ۵۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اسکو اُچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائیگا جسکا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہونگے، وہ اسکے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ.

اسی طرح وہ حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بنکر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے، ایک حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتۂ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے (مثلت الشمس عند غروبھا) نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے[1]، یہ ظاہر ہے کہ یہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوتی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے، اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے.

گناہوں کی تمثیلی سزائیں اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں، وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہہ رہی ہے، اور جب اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپؐ نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

ذالک عملہ (بخاری کتاب التعبیر)

یہ نہر ان کا نیک عمل ہے.

اس تمہید کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں، بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے، جو ابھی قائم ہے، آپؐ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنیوالے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں انکے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے، اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر کچلا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر[2] اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے، اور

---

[1] ابن حنبل

[2] سنن ماجہ ذکر القبر ص ۳۶۶

پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے، ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے، اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے، پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف، پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں، اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں، اور وہ چیختے ہیں، آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے، نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے، جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا، جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچکر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی، ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے، دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گئے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا، میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ، وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے، میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے، میں نے نظر اٹھا کر دیکھا سپید ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا،

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، لو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا، وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے کلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں چاڑی جاتی تھیں، وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا، اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیمؑ تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ ننھے اور کمسن بچے جو فطرت پر مرے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے بھلے برے کام بھی کیے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔[1]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نماز صبح سے غافل ہو کر بالین راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کے کلپھڑے کا چیرا جانا، زانی و زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسان کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی سنڈی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل و تصویر

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً۔

22 ہے، اور آخر میں نصف حسن عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوء عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے، اور صاف و شفاف نہر کی صورت میں رحمت و مغفرت الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر[1] ہے۔

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر آفاقی (یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی) دنیا کی اشیا کے خواص و صفات کے جاننے میں کی ہے، جن سے سائنس کی ایجادات و اختراعات کا تعلق ہے، لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جسکو قرآن نے انفس کہا ہے، ان انفس یا ارواح کے اوصاف و خصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے، ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، اور اس پر سپر چولزم (علم ارواح) ابھی طلسم فریب عجائبات میں سیطرح گرفتار ہے، جسطرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے متعدد سائنٹیفک تجربے سحر و جادو کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے، بہرحال ابھی تک علم نفس و روح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اسکے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے، بہت سے ہندو اہل فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک کسی شے کے یقین اور وجود، یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔

بہرحال نفس انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاج تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین، اور خارجی وجود میں بہت سی شدید تعلق ہے، مسمریزم نے جو سر تا سر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے، اسی سے معلوم ہوگا کہ مذہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے اسقدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین، کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اسکے وجود کا اقرار کر لو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے، اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے، قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۂ تکاثر میں بیان کیا ہے:-

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ، كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ، لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ، (تکاثر: ۱)

تم کو دولت و نعمت کی بہتات نے غفلت میں ڈال رکھا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا، ابھی نہیں، تم آگے جان لوگے، پھر ابھی نہیں، تم آگے جان لوگے، ہرگز نہیں، اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اسکو دیکھ لوگے۔

بنا بریں اگر انسان اپنے اندر علم الیقین حاصل کرتے جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (تکاثر)

نہیں یہ بات نہیں، اگر تم کو علم یقین ہو، تو دوزخ کو یہیں دیکھ لوگے۔

کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب کے عین مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے، وحی الٰہی نے اسکے جواب میں کہا:

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (عنکبوت: ۶)

وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں، اسکے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر۔

جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں، اور دوزخ انکو گھیرے ہوئے ہے۔

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي ۚ
أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ
بِالْكَافِرِينَ ۝ (توبہ ۔ ۷)

اور انہیں کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیے، ہاں وہ تو آزمائش میں پڑچکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا، بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں، اسلیے انکو یہ اپنے پاس کی دوزخ اسوقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جسکا آنا ایک دن یقینی ہے جب آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اٹھ جائے گا، اسوقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے، اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آجائیں گے، اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کرلیں گے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ (تکاثر ۔ ۱)

پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لوگے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں، اسکے بعد جب قیامت آئیگی تو ہر راز فاش ہو جائے گا، يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں کیساتھ اسطرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا، وہ علم حقیقی اور یقین تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ... فَكَشَفْنَا عَنْكَ
غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (ق ۔ ۲)

اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن، تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اسکے سامنے آجائیں گے، اور دوزخ منظر عام پر آجائیگی، فرمایا:

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ يَوْمَ
يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ
لِمَنْ يَرَىٰ (نازعات ۔ ۲)

جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا، جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے، یاد آجائے گا، اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔

احوال برزخ کا عین الیقین ایک ظرف شاعر (ابو العتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وكل الناس يدخله
يا ليت شعري بعد الباب ما الدار

موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے،
کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پس پردہ کا نظارا تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے، فرمایا:

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ
لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا
كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِنْ وَرَائِهِمْ

جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ (زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر) کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے ایکبار اور دنیا میں لوٹا دے تاکہ دنیا میں جو مال چھوڑ کر آیا ہوں

بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ (مومنون ۶)

اس شاید کوئی نیک کام کروں، ہرگز نہیں، یہ بات ہی بات ہے، جو وہ کہتا ہے اور (اب) ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آجاتی، تو اس کا شک و شبہہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا:

فَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيدُ (ق ۱)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لیکر آگئی، یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت "حقیقت" کا کوئی منظر سامنے ضرور آجاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:-

بالحق من امر الاخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه[1]،

حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اس کو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عز وجل وجاءت ايها الانسان سكرة الموت بالحق اى كشفت لك عن اليقين الذى كنت تمترى فيه[2]،

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بیہوشی حق کو لیکر آگئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ما جاءت به الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد (ج ۵ ص ۷۳)،

اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے، اور پیغمبر جس قیامت اور جزا و سزا کی خبریں لیکر آئے تھے، ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے،

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے:

والمعنى احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذى نطقت به كتب الله تعالىٰ ورسله عليهم السلام،

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابو حیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحر محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے،

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (ق ۲)

ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھولدیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱ [2] تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان ج ۹ ص ۱۹۸

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشافِ تام ہو جاتا ہے، لیکن بہرحال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت موت کے لیے قرآن میں اکثر "خدا کی طرف بازگشت" یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے :-

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْکُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۔ (جمعہ : ۱)	کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے، جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے، تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا،
اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۔ (بقرہ : ۱۹)	ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے،
اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعًا (مائدہ : ۷)	تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ طرزِ ادا بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہے، اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے، جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا سے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰٓی اَجَلٌ مُّسَمًّی ج ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُکُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (انعام : ۷)	اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے، اور دن کو جو کما چکے، اس کو جانتا ہے، پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے :

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ فَنُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (یونس : ۳)	اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے، دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھا لو، پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس جانے کی اطلاع دی ہے اور اہلِ تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری ۱۱ ص ۶۴ مصر)

اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں، جن میں موت کا پورا نقشہ ہے، اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا :

کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ ، وَقِیْلَ مَنْ رَاقٍ	ہرگز نہیں جب روح (انسان کی) ہنسلی تک آ پہنچے اور لوگ کہیں

وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ۙ (قیامہ ۱)

اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا، اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آگیا، اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی، اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے :

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (فجر ۱)

اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چل جا۔

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی دلکش واپسی ہوگی ۔

اس وقت کا سماں وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اسوقت سے اس کی زندگی صرف اسکے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اسکو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں :

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ، وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (انعام ۱۱)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی میں ہوں، اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو اپنے جسموں کے اندر سے اپنی روحوں کو، آج تم کو اس ذلت کی سزا ملیگی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے، اور اسکے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے، اور تم ایک ایک کرکے تنہا جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا ہمارے پاس آئے، اور جو سامان دنیا نے تم کو دیا تھا جس نے تم کو مغرور بنایا تھا، اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کسطرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اسکے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہوجاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ، ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (انفال ۷)

اور کبھی تو دیکھے جسوقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو، یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے، اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہوجاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانونِ عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ۔

نیکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے، ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے ۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ، وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ

پھر کیوں نہیں جسوقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس

تَنْظُرُوْنَ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ
لَّا تُبْصِرُوْنَ، فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ
مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ،
فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ، فَرَوْحٌ وَّ
رَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ، وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ
اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ
الْيَمِيْنِ، وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ
الضَّآلِّيْنَ، فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ،
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ، (واقعہ: ۳)

وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اور ہم اس کے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں، لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا، تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو، تو کیوں نہیں اس روح کو پھیر لا دیتے ہو، اگر تم (اپنے انکار و تکذیب میں) سچے ہو، تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہو تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ (اس سے کچھ کم درجہ) دہنے والوں میں ہو تو تجھ پر سلامتی دہنے والوں میں سے! اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے، بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گذرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق زحمت یا رحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ، ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى
عَذَابٍ عَظِيْمٍ (توبہ: ۱۳)

ہم ان کو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

"عَذَابٍ عَظِيْمٍ" سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے، اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے "دو دور" ان پر اور گذر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے، اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے، قرآن میں آلِ فرعون کے ذکر میں ہے:

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ اَلنَّارُ
يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا، وَيَوْمَ
تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ
اَشَدَّ الْعَذَابِ، (مومن: ۵)

اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا، آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت کی گھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو (پہلے سے بھی) بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں[1] کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے، اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے، اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے، تو دوزخ، پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام، اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے، ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے

---

[1] (یہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ہے)

کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا، مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے، اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اُٹھائے جائیں، اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے[2]۔

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تو ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے، جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے، اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر کی آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے، اس لیے ارشاد ہے:

یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا، وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا، اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا، وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِکَةُ تَنْزِیْلًا، اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِ ݣالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَکَانَ یَوْمًا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا (فرقان: ۳)	جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں، اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آتا ہے) اب اوٹ میں ہو جائے، اور ہم خدا فرماتا ہے ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار و بے سود و معدوم)، جنت والے لوگ (یعنی جنت جنکو ملنے والی ہے)، اس دن ان کے لیے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائیگا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے جائیں گے، اس دن راج سچا خدا کا ہوگا، اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا، اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے، اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لیے کوئی خوشخبری نہیں، اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا، اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خوابگاہ بنی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورۂ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں، فرمایا:

فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَکَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ (محمد: ۳)	پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہرہ اور پیٹھوں کو مارتے ہوئے یہ اس لیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے، بہرحال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنۃ والنار باب عرض مقعد المیت جلد ۲ ص ۵۵۴ مصر [2] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸۴ اور سکرات الموت ص ۹۶۴ [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز ص ۱۸۴ [4] صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص ۳۹۱، مصر۔

سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ
وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ
اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (انعام: ۱۱)

اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو (اپنے جسم کے اندر سے) اپنی روحیں، آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔

اَلْيَوْم جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس آج سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابوالسعود و تفسیر روح المعانی آلوسی)

قوم نوحؑ کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے:

اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (نوح: ۲)

وہ ڈبو دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (تحریم: ۱)

اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں، اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورۂ یٰسین میں ایک خیر خواہ قوم کا ذکر ہے، جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا، اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا، مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ
بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ
وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ
مِّنَ السَّمَاۗءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ (یٰسین: ۲)

کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا، اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری، اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (آل عمران: ۱۷)

بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس، روزی پاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ (نحل: ۴)

جن کو فرشتے (کہ پاک ہوں)، پاک صاف حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلے جنت میں چلے جاؤ۔

قبر کی اصطلاح سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں، اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں، وہ عموماً قبر کی اصطلاح کیساتھ بیان ہوئی ہیں[1] لیکن اس لفظ قبر سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں، بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں، اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے، اور ان ہی کے عذاب، ثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے، وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے، جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے، تم نیند میں ہو، اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پہ پڑا ہے، مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے، یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے، اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے، جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف و راحت سے مل سکتی ہے، اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے، جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے، اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا، جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوگی اور اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں، فرمایا: کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ (مدثر۔۲) یعنی ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی۔" اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم بمنزلہ آلہ کا ہے، دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ و مادیات سے پاک و بری ہوگا، تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی، اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے، کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے:-

وَلَوْ تَرٰٓی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (انفال۔۷)	اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں، ان کے منہ اور پیٹھ پر اور (کہتے ہیں) چکھو جلنے کا مزہ،

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے، مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جسطرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ پر)

---

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے، اور انکی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں یہ غلط فہمی انکو اسلیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر و قبور کیساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب، ثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو انکو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اسی قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں، اس سے اس شبہہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب و ثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں، اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے، اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو، یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے:

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ (قیامہ ۱)

اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں جسم خاکی کی شکل، صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے[1] اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے، اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی، اسی طرح دوزخ و بہشت کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو رویائے صادقہ پہلے گذرا ہے، اس میں جس جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں، وہ تمام تر مثالی ہی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب اور جسم نہیں ہیں جو انکی قبروں میں سڑ گل کر فنا ہو گئے، یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوا میں اڑ کر منتشر ہو گئے یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کا جزء بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے، جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے، مگر قدرت الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا، اور اسکو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا۔[2]

سوال و جواب احادیث صحیحہ میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں، اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں،

اس کی تصدیق قرآن کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (نحل ۴)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک صاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے عملوں کے بدلے جنت میں چلے جاؤ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ (نساء ۱۴)

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں تم کس بات میں تھے، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے

ایک اور آیت ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوْٓا اَيْنَ

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ط (اعراف : ۴)

کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائیگا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو، جو جن و انس میں تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں،

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا، اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے انکی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے، جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا،

قرآنِ پاک میں ایک جگہ کلمۂ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمۂ توحید) اور کلمۂ خبیثہ (بری بات یعنی کلمۂ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمۂ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اسکی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں اور اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں، اور کلمۂ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ (ابراہیم : ۴)

اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھیگا اور آخرت میں بھی، اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحبِ ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا، اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہاں وہ بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول پاک کی صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائید عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی "قول ثابت" پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی (اس قول ثابت سے ہٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پھر یہ اہل ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی، اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہو سکتا تھا جہاں ہنوز اسرار پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوئی، اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے،

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی، یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا یعنی اقرار و انکار

کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواحِ انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورۂ بالا آیات کے بعد ہے جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا انکی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں، اس کے بعد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف: ۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور انکے ماننے سے غرور کیا، اور ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ آیاتِ الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی، اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھرتی رہیں گی، یا اپنے خاکی جسموں کے لگاؤ سے جہاں وہ سپردِ خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی، اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی، اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمتِ الٰہی کا فرشتہ، بلکہ خود زبانِ رحمت اس کے کانوں میں یہ صدا دیتی ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً. فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (فجر: ۱)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جا، تیرا پروردگار تجھ سے خوش، اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاک باز روحیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا، تو انکو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے، فرمایا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (بقرہ: ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

یہ پُر مسرت زندگی کیسی ہوگی، اس کی دوسری سورہ میں ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ،

اور تو انکو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ گمان کر، بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انکو روزی دی جاتی ہے، خدا نے اپنی مہربانی سے انکو جو دیا ہے، اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں، انکی طرف سے بھی خوش ہیں کہ انکو نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ وہ

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ
اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (آل عمران : ۱۷)

غمگین ہوں گے، وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں، اللہ ایمان
والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

یہ پُر مسرت زندگی شہداء کو ملے گی، اسی زندگی کا مقام "خدا کے پاس" بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اُڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں، اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں، اس کے بعد غالباً ہر عقل تسلیم کریگی کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہداء سے بہرحال اعلیٰ و برتر ہیں، اسلئے ان کا مقام بھی اسی احاطۂ قدس کے اندر ہوگا، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیرِ معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہیں، جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالمِ ملکوت میں اُڑ رہے تھے، عالمِ برزخ کے یہ دو اڑانے والے بازو درحقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں، جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے، اور وہ اس پر بھی اسلام کے عَلَم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا
تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ج (حم السجدہ : ۴)

بیشک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے
پھر ثابت قدم رہے، ان پر فرشتے یہ خوشخبری لیکر اترتے
ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت
سنو، جسکا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں
تمہارے رفیق ہیں، اور آخرت میں بھی۔

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت، اسی برزخ کا دلکش سماں ہوسکتا ہے،

۲۔ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے، اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے، قومیں بھی باری باری اس بازیگاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کرکے کسی دوسری کیلئے جگہ خالی کر جاتی ہے، یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے، کائنات جس انتظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے، اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے، غرض

ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئیگا جب ساری بساطِ ہستی الٹ جائیگی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائیگی، اور آسمان و زمین کے کُرّے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا، اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں، اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیا پر حیات و موت طاری ہوگی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں تردید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹس) کو ہو سکتا ہے، اہلِ فلسفہ کا بڑا گروہ اس امکان پر یقین رکھتا ہے، اور اہلِ سائنس بھی اس کو بہرحال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعیات و ہیئت جدیدہ کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں، وہ اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر ہوتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ نظامِ عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے، وہ کرۂ آفتاب ہے، جس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے، آخر ایک دن آئیگا، جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائیگا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائیگی، ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے، اور فضائے ہستی کے تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئیگا جب باہمی توازن باقی نہیں رہے گا، اس وقت تمام کُرّے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے، اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا،

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، انمیں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارہ سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے، اور اسکی ساری آبادی ہباءً منثورا ہو کر رہ جائے۔

بہرحال اسبابِ طبعی کچھ ہوں، مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے، اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات ہیں، اور اس میں اس کو "عدالت کا دن" کہا گیا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے، ایک صدوقی، جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہوگیا تھا، اور قیامت کا منکر تھا، مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا، بدستور اپنے پرانے عقیدہ پر قائم تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو یہودی تھے، وہ قیامت، حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو اور دوسری پر زمینوں کو، تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو، اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا اور ندا آوے گی کہ میں ہوں بادشاہ، انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے، حضرت عیسیٰؑ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں توریت کی ایک آیت سے حیاتِ اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے، ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی، اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے، قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے، قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو سب سے پہلی سورہ میں ہے، وہ یوم الدین ہے، یعنی جزا کا دن، جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جابجا ہیں:

اَلسَّاعَۃُ	وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)	یَوْمُ الْقِیَامَۃِ	کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن)
اَلْیَوْمُ الْحَقُّ	سچا دن (نہ جسکے آنے میں کوئی شک ہے	یَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن، یا مقررہ دن۔
	اور نہ جسکے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)	اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت۔
اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعودہ دن۔	اَلْیَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن۔
یَوْمُ الْاٰزِفَۃِ	قریب آنیوالی مصیبت کا دن	یَوْمٌ عَسِیْرٌ	ایک سخت دن۔
یَوْمٌ عَظِیْمٌ	ایک بڑا دن	یَوْمٌ عَصِیْبٌ	سخت دن۔
یَوْمُ الْبَعْثِ	جی اٹھنے کا دن		
یَوْمُ التَّلَاقِ	باہم ملنے کا دن	یَوْمُ التَّنَادِ	پکار کا دن
یَوْمُ الْجَمْعِ	اکٹھے ہونے کا دن	یَوْمُ الْحِسَابِ	حساب کا دن
یَوْمُ الْحَسْرَۃِ	حسرت کا دن	یَوْمُ الْخُرُوْجِ	قبروں سے نکلنے کا دن
یَوْمُ الْفَصْلِ	فیصلہ کا دن	اَلْقَارِعَۃُ	کھڑکھڑانے والی
اَلْغَاشِیَۃُ	چھا جانے والی	اَلطَّآمَّۃُ الْکُبْرٰی	بڑی مصیبت
اَلنَّبَاُ الْعَظِیْمُ	بڑی خبر	اَلْحَآقَّۃُ	ضرور آنیوالی گھڑی

۱؎ زبور ۹-۱۰۹، ۱۷-۲۲، ۱-۲۱ دانیال باب ۹ ۳۹، ۵۰ انجیل مرقس ۱۲، ۲۲ دانیال ۲۳ صحیح بخاری تفسیر سورۂ زمر متی ۲۲-۲۳، ۳۲-۳۳ ۲۰، ۲۰ [illegible]

اَلْوَعْدُ، وعدہ، اَلْوَاقِعَةُ، وقوع پذیر، اَمْرُ اللّٰہِ، خدا کی بات، اَلصَّاخَّةُ، بہرا کرنے والی گھڑی،

قیامت کے اوصاف یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت، یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً،

یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ (انعام ونحل وطٰہٰ) جس دن نرسنگا پھونکا جائے گا۔
یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (مائدہ: ۳) جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔
یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (شعراء: ۵) جس دن نہ مال کام آئے گا، نہ اولاد۔
وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْہِ (فرقان: ۳) اور جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔
وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ (فرقان: ۳) اور جس دن آسمان پھٹے گا۔
وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ (مومن: ۶) جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔
لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْہِ (آل عمران: ۱) جس دن میں کوئی شک نہیں۔
وَیَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا (نمل: ۱) جس دن ہم ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔
یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (مطففین) جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔
یَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ (قمر: ۱) (جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے
یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْہِ وَاُمِّہٖ جس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور باپ اور اپنی بیوی اور
وَاَبِیْہِ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ (عبس: ۱) اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔
یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا (بقرہ: ۶) جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔
یَوْمَ تَشْھَدُ عَلَیْھِمْ اَلْسِنَتُھُمْ (نور: ۳) جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔
یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا (انفطار: ۱) جس دن کوئی دوسرے کے لیے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔
یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا (دخان: ۲) جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں، جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بیکسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز سے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدم محض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے، چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ	متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی، اور تم کو کس نے بتایا
یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَکُوْنُ	کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنیوالی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں
الْجِبَالُ کَالْعِھْنِ الْمَنْفُوْشِ (قارعہ: ۱)	کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔

23

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (زلزال: ۱)	جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی، اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔
إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ، وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ، وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ، وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ، (انشقاق: ۱)	جب آسمان پھٹ جائیں گے اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں جب زمین پھیلائی جائیگی اور جو کچھ اس میں ہے اسکو ڈالدے گی اور خالی ہو جائے گی۔
إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ، وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ، وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ، عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ (انفطار: ۱)	جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب سمندر چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، اس وقت روح نے جو کچھ پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس کو جان لے گی۔
إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (تکویر: ۱)	جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔
إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ، فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ، وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ، وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ، (مرسلات: ۱)	جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ وہ یقیناً ہونیوالا ہے، جب ستارے ماند کر دیئے جائیں گے اور جب آسمان کھول دیا جائیگا اور جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔
فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ، (قیامہ: ۱)	جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائیگا، اور آفتاب و ماہتاب اکٹھا کر دیئے جائیں گے۔
يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ، (معارج: ۱)	جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔
فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ، وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ (الحاقہ: ۱)	جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے، اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے اس دن ہونیوالی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا، اور اس دن کمزور ہو جائے گا۔
يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَهِيلًا، فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا، (مزمل: ۱)	جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا، اور پہاڑ پگھلتا تانبا ہو جائیں گے، کیونکر متقی ہو سکتے ہیں جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا، آسمان اس دن پھٹ جائیں گے، اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔
يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ، (ابراہیم: ۷)	جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی،

فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ‏(رحمٰن : ۲)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا ‏(واقعہ : ۱)

جب ہونیوالی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور پہاڑ، پراگندہ کیے جائیں گے اسوقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ‏(نبا : ۱)

اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، تو وہ دروازے دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو جائیں گے،

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی برہمی اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ‏(ابراهیم : ۷)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی بدل جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے، جس میں بہت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورۃ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے۔

لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهُ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰى أَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ بَلْ يُرِيْدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ يَسْئَلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُوْلُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ كَلَّا لَا وَزَرَ إِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمُسْتَقَرُّ يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهِ

میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے نفس کی قسم کھاتا ہوں کہ کیا (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم (اسکے مرنے کے بعد) اسکی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے، کیوں نہیں، ہم تو اسکے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھیانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیئے جائیں انسان اس دن کہے گا کہ اب کہاں بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں کہیں بچاؤ نہیں اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو اس نے آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائیگا، بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے،

بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (قیامۃ: ۱) اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے،

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفسِ لوّامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفسِ لوّامہ یعنی ملامت کرنیوالے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو اسکے ہر بُرے کام کے تحت اسکے اندر غمگین و نادم ہوتا ہے، اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے، آخری آیت میں اسی کیفیتِ ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا، بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے، اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشا کرے انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام نفسِ لوّامہ ہے۔

(۱) اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے، جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیکونام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور انکی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے، پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اسکے قوائے عمل سُست پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے، بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں، وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گنہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچکر انکے عملی قویٰ کمزور اور مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں،

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں، تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، کیا ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر نہ سوئیگا یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آلِ فرعون وغیرہ قوموں کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جسطرح شخص کے اندر ایک نفسِ لوّامہ، یا ضمیر کا احساس ہے جو اس کے ہر بُرے فعل کے وقت اسکو ملامت کرتا اور اسکو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے، تو اپنے کو قصوروار جانتا اور گنہگار سمجھتا ہے، اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں کی نادم اور کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتا ہے، اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفسِ لوّامہ بھی اس کو ملامت کرے گا، کائناتِ انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا، اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی، اسی عمومی اعترافِ قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے سورۂ بالا میں نفسِ لوّامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے، اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے[1]۔

(۲) اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے، اس میں سردی و گرمی، بیماری و تندرستی، بقا و فنا، اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے، وہ چیز زندہ رہتی ہے، اور جسوقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے، اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے، ایک درخت میں ایک پھول

---

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ۔

کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا، جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی، وہ پھول شگفتہ رہا، جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی، پھول کی ہستی معرض فنا میں آگئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد و خاندان، جماعتیں، قومیں، بلکہ حیوانات، شجر و حجر، غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائنات ہستی کو لیجئے، اس کو خلاق عالم نے ان ہی متضاد عناصر و اخلاط پر قائم فرمایا ہے، دن رات، روشنی، تاریکی، سردی، گرمی، پانی، آگ، بہار، خزاں، تندرستی، بیماری، دولت افلاس، حیات و موت، آسمان، زمین، نیکی، بدی، خیر، شر، غرض جس کو بھی دیکھو، یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے، ان میں جب تک اعتدال قائم ہے، اس دنیا کی کل چل رہی ہے، جس دن ان کے اعتدال میں فرق آیا وہی اس کی فنا کا دن ہوگا۔

لیکن جسطرح افراد و اشخاص میں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے، اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتہً وہ پھر ابھری، اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچالیگا، بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی، اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا، اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرا جانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی، یہ کرے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے اور پھر سنبھل گئے، مگر فساد و صلاح کا یہ نظام اسی وقت تک چل رہا ہے، جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں اعتدال قائم ہے، جس دن اعتدال فنا ہوگا نظام ارضی کا پورا کارخانہ بھی درہم برہم ہوجائے گا، اسوقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے دے گی۔

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا، وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا، وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا، يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا، بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا، يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ، فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (زلزال: ۱)

جسوقت زمین ہلائی جائیگی، اور جب وہ اندر کے بوجھ کو اگل دیگی، اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے، اس دن وہ اپنی باتیں بیان کریگی کہ اس کے پروردگار نے اس کو حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرا برابر بدی کی ہے، وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

صور قیامت قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر ہے، فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ جب صور پھونکا جائیگا، صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں، اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام ہلالی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقع پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اسلئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے، قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کی بادشاہی ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ جواب دیگا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ اس ایک سب پر غالب آنیوالے کی، غرض وہ دن آسمان و زمین و نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرہ کے

اعلان کا ہوگا، اسلیے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لیے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ واقعۃً اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں،

عربوں کا انکار اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے، لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار تھا جسکے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا، وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے، جاہلی عرب حیات بعد الموت، خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ و باز پرسش اور سزا و جزا سے قطعاً لاعلم تھے، اسی لیے انکو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دار و مدار ہے، عرب کا شاعر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ

اموت ثم بعث ثم حشر، حدیث خرافة یا ام عمرو: کیا موت ہے، پھر جی اٹھنا ہے، پھر اکٹھا ہونا ہے، اے ام عمرو (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں، قریش کا ایک اور شاعر کہتا ہے[1]: یحدثنا النبی بان سنحیی، وکیف حیاۃ اصداء وھام، یہ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے، حالانکہ صدا اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟

(انکا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے، اور آواز دیتا ہے، اسی کا نام انکے ہاں صدی اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیے گئے ہیں، مثلاً۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ (ق: ۱)	کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے یہ لوٹنا بہت دور ہے
ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً (نزعٰت: ۱)	کیا ہم دوبارہ اُلٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈی ہو جائیں گے۔
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسرائیل ۵، ۱۰)	کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔
مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ (یٰس: ۵)	ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا؟

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (جاثیہ: ۳)	انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے ہیں اور جیتے ہیں، اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔
وَقَالُوْا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (انعام: ۳)	اور انہوں نے کہا یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا،

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا (نبا: ۱)	وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔

خباب بن الارت نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک شخص عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا "جب تک تم محمدؐ کا انکار نہ

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب الہجرۃ ص ۵۵۸؛

کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا"۔ انہوں نے کہا "یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں"۔ اس نے کہا کیا مر کر مجھے پھر جینا بھی ہے؟ انہوں نے کہا "بیشک" اس نے مذاق سے کہا "تو اچھا پھر وہیں میرا مال و دولت اور سروسامان ہوگا، وہیں تم دام بھی لے لینا۔"[1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں اہل عرب کا کفر کتنا شدید تھا، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ان میں ہیبت الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر و نشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سراپا اثر ہو جانے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت و قدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے، پھر ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی شدت اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہؓ ناواقف تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ پہلے ایک بڑی سورۃ نازل ہوئی، جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے، یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے، تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے، یہ آیت کہ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ (بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے، اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی کھیلتی تھی، البقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی۔[2]

اس تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے، اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی، تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی جذبہ اور میلان ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن مجید نے بیان کیا ہے،

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُّنكِرَةٌ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ (نحل: ۳)	تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے ان کے دل نہیں مانتے، اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔

اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کریں جس کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے، مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ "روز جزا کا مالک"۔ اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیرووں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے، **اول** یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا، اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہو تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو، اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ (اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور

---

[1] صحیح بخاری تفسیر کہیعص صفحہ ۶۶۱۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۴۸، باب تالیف القرآن۔

إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ، (مومنون: ۶) تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى (قیامہ: ۲) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری بات جو روزِ جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل و منصف ہونا ہے، اگر اچھے اور بُرے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے، اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بُروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں، پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دیکر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے، سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ. فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ، (والتین: ۱)

لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، ان کیلئے نہ ختم ہونیوالا اجر ہے، پھر اسکے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنیوالوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (ص: ۳)

کیا انکو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے انکی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (جاثیہ: ۲)

کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا ہے، کہ ہم ان کو انکی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال بُرا ہے۔

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے، یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اسلیے اسکو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اسکے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی نے اس گتھی کو اسطرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

۱۔ مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور

ہیں اور ان سے استدلال کیا، کہ جب چند آدمی یا پرندے مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے، اور پھر دفعتاً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے، سبزہ نکل آتا ہے، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرتِ الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی، ﴿وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا﴾ (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی) اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

۳۔ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرۂ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی، جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزہ اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا، خدا نے اس کو ہست و موجود کیا، پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی سابق مثال کے اس کارخانے کو پیدا کیا، وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا، جس نے نقشِ اول بنایا، نقشِ ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵۔ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانینِ الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی، پھر جب انہوں نے غرور و نخوت ظلم و ستم اور دوسرے قوانینِ الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی، تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا، عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قوم لوط اور قوم مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ط كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ (مومن ۲)	کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔
اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ (ابراہیم ۲)	کیا نوح کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد تھے، جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہیں ہوئی!

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لمن الملک بجاتی تھیں، ہزارہا سال سے بے نشان ہیں، نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے، اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو رومیوں کے مقابل صدیوں تک برسرِ پیکار رہے، اب ان کی تعداد

چند ہزار سے زیادہ نہیں، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے مالک تھے، اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جسطرح افراد جی کر مر جاتے ہیں، جماعتیں وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا، جب قانونِ الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جسطرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں، وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں، لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے، اور اس میں شک کرتے ہیں، اسیطرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے، حالانکہ ایک وہ دن آئے گا، جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گا، کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا، اس موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے قانونِ طبعی سے منسوخ ہو جائیگا اور جیسا کہ سائنس کہتا ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب، ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ (ابراہیم - ۷)	جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی، اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی،

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے:

قٓ ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ فَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ءَاِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا ج ذٰلِکَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ، قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْھُمْ وَعِنْدَنَا کِتٰبٌ حَفِیْظٌ، بَلْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَھُمْ فَھُمْ فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ، اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِنْ فُرُوْجٍ، وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍۢ بَھِیْجٍ تَبْصِرَۃً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۔ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مُبٰرَکًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ، وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّھَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ، رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا ط کَذٰلِکَ الْخُرُوْجُ، کَذَّبَتْ قَبْلَھُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ	قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے) ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے، بلکہ ان کو اس پر تعجب ہے کہ ان میں ایک آدمی آکر ان کو (قیامت کا) ڈر سناتا ہے، (وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہونگے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہمکو معلوم ہے کہ زمین ان (مردہ جسموں) کی کتنی کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی، پس وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمانوں کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسکو کیسا بنایا، اور کس طرح اسکو سجایا ہے کہ اسمیں کہیں رخنہ نہیں اور زمین پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اسمیں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا، پھر اس سے باغ اور کٹنے کھیت کا اناج اگائے

الرَّسِّ وَثَمُوْدُ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ، اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ، (ق:۱)

اور کھجور کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں یہ بندوں کو روزی پہنچانے کیلئے ہے، اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا، اور کافروں سے پہلے نوح کی قوم، رس والوں اور ثمود و عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا (ان میں سے ہر ایک نے پیغمبر کو جھٹلایا، تو میری دھمکی پوری اُتری کیا ہم پہلے پیدا کرکے تھک گئے (جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے) بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سرِ نو پیدائش میں شک ہے۔

سورۂ قیامت میں بھی اس کا بیان ہے، اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى، (قیامہ:۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھی، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا کیا، یعنی نر اور مادہ کیا، کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (بنی اسرائیل:۱۱)

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو کیا پھر نئے بن کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو (دوبارہ بھی) بنا سکتا ہے،

ایک اور جگہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۝ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ، (روم:۳)

اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کریگا، اور یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے آسان ہے،

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ، (حج:۱)

(لوگو) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو ہم تو پہلے تم کو (اسی مردہ) مٹی سے پیدا کر چکے ہیں (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے۔

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ (یٰس:۵)

وہ بولا کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا، کہدے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

غرض وحیِ محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا، اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشرِ جسمانی اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی اسی گوشت و پوست کیساتھ ہوگی، یا صرف روحانی ہوگی، جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا؟ قرآنِ پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں

کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو، کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا، کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فناشدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے، اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی، بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی، کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل انکے لیے ناقابلِ فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی انکے فہم سے بالاتر تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں، اس لیے مصلحتِ الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے، کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے، اور صاحبِ فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوبِ بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

وَقَالُوٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۔ (سجدہ: ۱)	اور انھوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ) یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُرتعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک وشبہات اس لیے انکو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے، اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد دارِ آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (سجدہ: ۱)	جواب میں کہئے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تمکو موت دیگا، پھر تم اپنے پروردگار کیطرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ، اس عقیدۂ حشر کی اصل روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں، جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں، اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے، اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے، ان کے متعلق جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستانِ وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے کیا ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں، ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن جو شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسان نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہونا چاہیے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا، بلکہ وہ سکا

تصور بھی نہیں کر سکتا ہے، جب انسانی زندگی کا تصور کریگا تو جسم و شکل و اعضا کے ساتھ ہی کریگا اس سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا.

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے، اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت اور کیفیت ہوگی، جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم کے ساتھ تسلیم کیا جائے، ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی، اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیاتِ ثانیہ رکھ دیا گیا.

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے، مگر فاعل کے فاعل بننے کے آلات اور اوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے، اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا اس بنا پر روح محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا، کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے، اس میں بھی جسمانی پیکر و ہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے.

جسم وجسد حشر جسمانی ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائیگا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی، یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائیگی یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اسی دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا جبکہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں، اور اسی طرح جزا و سزا کی راحت و تکلیف کا اصلی مورد روح ہے جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو، روح پر مواخذہ اور ثواب و عذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا اس کی خصوصیات و لوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات و لوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب و رؤیا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے، وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے، اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے ان ہی خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے، اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات وارد کیے جا سکتے ہیں.

خلق جدید چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا، وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لیے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ، بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (ق ۱) بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں،

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا (اسراء ۵) — کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے،

ایک دوسری سورہ میں یہ تلقین ہے:

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (سبا ۱) — بلاشک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو.

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (انبیاء ۷) — جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا، اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائینگے

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ

اس خاکی جسم کے تمام خصوصیات کا بعینہ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ "جسم" سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف و قالب کے لیے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَزِیْزًا حَکِیْمًا (نساء: ۸)	بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے ہم انکو آگ میں ڈالیں گے۔ جب انکی کھالیں پک جائیں گی ہم انکو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی تاکہ وہ عذاب چکھیں بیشک اللہ غالب اور حکمت والا ہے

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی، تو پہلا حصۂ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسیطرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال پر شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوا وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے، ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے، اور وہ روحِ انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے یہی سبب ہے کہ موت و حیات، عذاب و ثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا ہے، وہ نفس یعنی روح ہے:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (زمر: ٦)	تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی،
وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ، (حشر ۳)	اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (تکویر: ۱)	(اس دن) ہر نفس جان لیگا جو اس نے حاضر کیا،
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ، (انفطار: ۱)	(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا،
فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْئًا (انبیاء: ۴)	(تو اس دن) کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جنت کی نسبت ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ، (سجدہ: ۲)	کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں بلکہ روح و نفس پر ڈالا گیا، اور اسی کو تکلیف و لذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ	اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری

جَنَّتِیْ (فجر: ۱)

جنت میں داخل ہوجا

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصل ذمہ دار اور جنت و دوزخ کی لذت و الم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے، اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس و آلۂ احساس کی ہے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں یہ جسم لاکھ بار بدلے، مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے، اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا و سزا مل رہی ہے،

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں، حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ چھپا نہ ہو تو پھر اس مُشتِ خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو انسان بچپن سے لیکر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لحظہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے، بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگیا، پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے، تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے، حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتلائے کہ اس کے ذرّے کیونکر ہر آن جھڑتے اور گھستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا رہا وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما یتحلل بنی، ان کی جگہ لیتی رہی، پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک و بد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جاسکتا ہے، لیکن جسطرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو یہ عذر نہیں کرسکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لیکر بھاگا تھا، اس عرصۂ دراز میں بدل گئے ہیں، اس لیے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ و نیت سے اس کام کو اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا، جس طرح کل تھی بعینہٖ آج بھی ہے، اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعہ کل پہنچ سکتی تھی، بعینہٖ آج بھی پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضاء کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا، جسم کے اعضاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزاء میں پیدا ہوگئی تھی، وہ انکے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے، مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں انکے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے، ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے، چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا، خدا نے فرمایا :۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ،

کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی، اور ان پر سیاہی

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (عبس: ۱)	چھائی ہوگی۔
يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ (آل عمران: ۱۱)	جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے، اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے،

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے، اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آنے گا، ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، دوزخیوں میں کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے، آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے، تو پھر صحیح و سالم نئے جسم نمودار ہوں گے اور پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی، یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے، ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کیمطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

جزا اور سزا

"یوم آخر" یا "یوم دین" پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے، دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہمنوا ہیں۔

جزا اور سزا دیگر مذاہب میں درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اس عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے، اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملیگا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے، اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے، اور کام کرتی ہے، اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوک میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں، وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے، بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے دوبارہ آتی ہے، اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے، اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل نہ رہ جائے اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے، اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے، یعنی وہ نئے نئے جنموں میں سزا بھگتتی ہے، اور اس وقت تک آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے، جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے، اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت میں یہ ہے، کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام صادر نہ ہو، یہی ترکِ عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے، یہاں تک کہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد پھر جب نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا یعنی آواگون کا چکر شروع ہوگا، اور پھر اسیطرح چھٹکارا پانے کی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسیطرح شروع ہوگا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا، الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترکِ عمل کے ذریعہ سے خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے، لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے، ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آجائے، بدی کے ساتھ

24 نیکی کا وجود بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، اور بالآخر دائمی و ابدی نجات میسر نہ ہو، کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم، اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔[1]

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسان کو نجات دلائی ہے۔ انہوں نے موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے، جس میں لوگوں کو اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی۔ مختلف زردشتی فرقوں نے آریہ نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ارداے ویراف کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔[2]

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۳-۱۹) علیٰ ہذا حضرت موسیٰ کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں، نیکو کاروں کے لیے ایک مستقری آبادی کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں، بدکاروں کے لیے ہلاکت، بربادی اور دردناک عذابوں کی خبر ہے، مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کھپایا ہے، حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم (پیدائش ۲۵-۱۰) اور یعقوب علیہما السلام (پیدائش ۴۹-۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا" ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثنا ۶-۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور "جہنم کی آگ" (استثناء ۳۲-۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷-۱۰) روح کی بقاء اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳-۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی تذکرہ ہے (واعظ ۱۲-۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کی بھی تصریح ہے، آخر میں "خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے، کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بُری، عدالت میں لائے گا۔" (واعظ ۱۲-۱۳-۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں، امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانچتا ہے، شریر کی بدیاں اسکو پکڑیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائیگا، وہ بے تربیت پائے مر جائیگا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھریگا۔" (۵-۲۱) دانیال میں ہے کہ "اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں، جاگ اٹھیں گے، بعض حیات ابدی کے لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لیے۔" (۱۲-۲) حزقیال (۲۸) میں جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں[3] صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں، منجملہ ان کے وہ قیامت اور حیات اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے

---

[1] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی و جون سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک مضمون ہے۔ [2] دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل و شرح کی ہے۔ [3] برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقیت وغیرہ۔

مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدوں پر قائم رہا اور قیامت احیائے آخرت اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی ہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی، اور وہاں جنتیوں کو انکی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۲-۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے اور یہودی کیسے ہی گنہگار ہوں، مگر چند روز سے زیادہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (بقرہ ۔ ۱۰ و آل عمران ۔ ۳) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز یا گیارہ مہینے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی اور قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی، حضرت عیسیٰؑ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ "اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے" ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے، مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے، حضرت عیسیٰؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں :۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں۔" (متی ۲۶-۲۹)

وہ یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں :۔

"اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے"۔ (متی ۲۳-۳۳)

اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں :۔

"اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں، اور ابراہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو، اور اس نے پکار کے کہا کہ اے باپ ابراہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں"۔ (لوقا ۱۶-۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو آگ اور گندھک کہا گیا ہے (۱۴-۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں (متی ۱۶-۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی اور جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (۲۶-۱۹)، وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آیا ہے (لوقا ۱۶-۲۴)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ لینے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے،

"مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا" (رومیوں ۴-۸)

"سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا"۔ (رومیوں ۱۴-۱۱)

"لیکن وے اس کو جو زندوں اور مردوں کا حساب کرنے کو تیار ہے، حساب دیں گے" (اول پطرس ۴-۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا

---

[1] کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو نیز سیل کا ترجمۂ قرآن حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸ ؛

بلکہ اس کے تمام ضروری اجزاء فراہم کیے، گذشتہ مذہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں، ان کے نقائص کی تکمیل کی، اور جزا و سزا کے اصول اس صفائی سے بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہوگیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک اس عالم آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس پیکر خاکی اور زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہوگا، تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں، اسلیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں، باہم انکے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہوگئے ہیں ان لفظوں کو سنکر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں، اسی سبب سے بعض کم فہم ان کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں، اور بعض انکی تشریح و تاویل اسطرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لیے وحی محمدی نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہکر عالم آخرت کو بھی عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح انکو مادہ سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ انکا وجود ہی موہوم و فرضی ہوگیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کرکے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی و تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کرکے وحی محمدی نے ایسے جچے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں، جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے، اور ایک عامی بھی، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے، ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سب کیلئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے، ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں، جنکے چاروں طرف اس دنیا کا مادی احوال، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات لپٹے ہوئے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے، وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب آگ کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، جسکو ہم یہاں دیکھتے ہیں، جو انسانوں، درختوں اور ہر اس چیز کو جو اسکے اندر ہوتی ہے، بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے، مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی، اس کے اندر بعض درخت ہونگے جو نہیں جلیں گے، وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں کو چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، اور وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے، "وزن" لفظ سننے کے ساتھ اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں، ترازو، پاسنگ، پلڑے، ڈنڈی اور تولی جانیوالی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی، اس بنا پر ان الفاظ کے لغوی معنی اور انکے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے، اسلیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اسطرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے انکے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہوجائے، بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ

کیا جائے، جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پاجایا جاتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں کہ اگر مراد الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا ہے، مگر ایسا نہیں کیا، تا کہ اسلام مختلف العقول انسانوں کیلئے عالمگیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات واعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ تمام قوانین فطرت کو اس طرح لازم وملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائیگا، تو معاً اس کے وہی خصوصیات ولوازم سامنے آئیں گے، جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے، کہ اس موجودہ دنیا کے معلولات ومسببات اور ان کے موجودہ علل واسباب میں جو لزوم ہے، وہ محض عادی ہے، یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل واسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں، وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں، اگر خدائے تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے، یا نیا عالم خلق کرے، تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات ومخلوقات ہوں، نئے علل واسباب ہوں اور نئے قوانینِ فطرت ہوں، وحی محمدیؐ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (ابراہیم ۔ ۷) (جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائیگی اور آسمان نئے آسمانوں سے)

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی یہی مادی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں، اس بنا پر جسمانیت ومادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں، بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا وسزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وَهُوَ الْهَادِي اِلَى الصَّوَاب۔

اصول جزا اللہ تعالیٰ نے جسطرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جسکو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہلِ مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جسکے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری وساری ہیں، جسطرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مر جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی اصولِ فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جسطرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح اصولِ تزکیۂ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے، پھر جسطرح دوا اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے، ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم ونتائج غرض جسطرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے، اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی

ہے، تو اسکے ساتھ اسکے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور اور خاکساری، بخل و فیاضی، انتقام و عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ و فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک ثمرہ و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جسطرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، اور ان معنوی، روحانی اور نفسی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد، اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں، جسطرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور انکی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسیطرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا، انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور انکی اس تعلیم کا نام شریعت ہے، انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے، جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہمکو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں بہت کچھ سہولت پیدا کردی ہے۔

عقاب و ثواب ردِ عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردِ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے، اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب کہا گیا ہے، قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے، جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے،

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے،

اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (جاثیہ: ۱) جو تم کرتے تھے وہی آج بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے، ایک اور جگہ ہے:

لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی (طٰہٰ: ۱) تاکہ ہر جان کا اس کا بدلہ دیا جائے جو وہ کرتی ہے،

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا و سزا تمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں،

فَاَصَابَھُمْ سَیِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ (نحل: ۴) تو ان کے برے کام ان پر پڑے، اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا، اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں، تو جو کوئی خیر پائے، وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے[1]۔

---

[1] صحیح مسلم، ترمذی کتاب الزہد و مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۵۴ - ۱۶۰ - ۱۷۷ اور ادب المفرد بخاری باب الظلم۔

حصولِ راحت کا اصول یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں، عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرت یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کرکے آئندہ کی راحت کی فکر نہیں کرتے کہ انکی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی خوش آیند ہے، مگر وہ نسیہ ہے اور انکا اصول یہ ہے کہ نقد را بہ نسیہ مگذار۔ لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے، فاتح اور کشورکشا آج اپنی جانیں جوکھم میں ڈالتے ہیں تاکہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے، تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ دولت فراواں سے بہرہ مند ہوں، ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تاکہ اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو، لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تاکہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لائے اور تنگدستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری و ساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اسلیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو، مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اسکے دوام و رکامیابی کا ہم کو یقین ہو، کیونکہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں اسی کے لیے ایمان کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا، ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی، اسی لیے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (قیامت:۱)

(ہرگز نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو، اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو)

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے، اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا، تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے، غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی، یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے۔

وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا (دھر:۱) اور خدا نے انکے صبر کرنے پر انکو باغ اور ریشم کے کپڑے مزدوری دی۔

یہ صبر کیا تھا، دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تاکہ آخرت کی بڑی خوشی حاصل ہو اور یہاں ادائے نیکی اور احتراز جرم کی معمولی تکلیفوں کی برداشت، تاکہ وہاں کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے، اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے، نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلبگار ہوتے ہیں اسلیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے، اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے، وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى (نازعات: ۲)	لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

نامۂ عمل ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے، پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی، اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے، موجودہ سائنس نے بھی یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں) وہ اعمال و افعال کے دوام وجود کے اسلامی عقیدہ کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے،

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ (یونس: ۳)	اسوقت ہر جان جو اسنے پہلے کیا، اس کو آزمائے گی۔
كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ (طور: ۱)	ہر آدمی اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔
كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (مدثر: ۲)	ہر جان اپنے عمل کے بدلے گرو ہے۔
فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (زلزال)	تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا، وہ اسکو دیکھے گا، اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا، وہ اسکو بھی دیکھے گا۔
يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ (آل عمران)	جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے، اسکو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے، ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے خدائی شاہد اسکو سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق: ۲)	جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگراں اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے،

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ط بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۞ (زخرف : ۷)	کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال کو لکھتے ہیں،
اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۞ (یونس : ۳)	بیشک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے ؛

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ، (یونس : ۷)	اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا، اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں لگے ہوتے ہو،

کبھی یہ کہا ہے کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔

فرمایا :-

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ، اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ، (بنی اسرائیل : ۲)	اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ (عمل)، اس کی گردن میں چپکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے، آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلمبند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اسمیں درج ہوتی ہے اسی طرح اعمال انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ط وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۞ (کہف : ۶)	اور نامۂ اعمال رکھا جائیگا، تو گنہگاروں کو تو دیکھے اسمیں جو کچھ لکھا اس سے ڈر رہے ہونگے، اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اسکو شمار کر لیا اور جو کچھ انھوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے، اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

تاہم اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے، تو اسمیں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے، مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہرحال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہیگا، اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا، اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضاء کی شہادت انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر

دل کا آئینہ صاف ہو، تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا :

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ (قیامہ ۱)

بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگرچہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے :

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم (تطفیف)

نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

گویا اسی آیت کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگر وہ توبہ و انابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے، اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے[1]؛

اسی طرح وہ اپنے جن اعضاء سے جو برا کام کرتا ہے، اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہرے پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑ و اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں، انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوانِ بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں انکے اعمال کے آثار و نتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہونگے۔

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ (رحمان ۲)

گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لیے جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبانِ قال پر خداوند عدالت کے رعب جلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک اس کے اعمالِ بد پر گواہی دیدیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ فرمایا،

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ۝ الْيَوْمَ
نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ
وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (یٰسین)
وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ۝
حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ
وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝
وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوا
أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (حٰم السجدہ ۳)

اے گنہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ آج ہم انکے منہ پر مہر لگا دیں گے، اور انکے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں انکے کرتوتوں کی گواہی دیں گے، اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائینگے، اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو انکے کانوں آنکھوں اور انکی کھالوں نے ان پر انکے کرتوتوں کی گواہی دی، انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا،

اس لیے ان اعضاء کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی، جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کو گویائی مراد لیکر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا

---

[1] ترمذی ؛

زیادہ یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کر علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل وانصاف، حق اور ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے،

اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انکو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا:

جَزَآءً وِّفَاقًا، (نباء ۱)	پورا پورا بدلہ

اس برابری ورکمالِ عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (اعراف ۱)	پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے، اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں، جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں، سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔
فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ط وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (قارعہ)	تو جس کی تول بھاری ہوئی تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود، اعمالِ خیر کی کمی و بیشی ہے، پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق وعدل ہے، اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علمِ الٰہی میں موجود ہوگا، اور وہ کسی طرح بیش و کم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے،

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ (شوریٰ ۲)	وہ اللہ جس کتاب کو حق کیساتھ اتارا، اور میزان کو۔

یعنی کتابِ الٰہی، حقانیت کیساتھ اتری ہے، اور اسی کیساتھ میزان بھی جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظامِ کائنات کی ہر چیز میں جو تعدل کامل رکھا ہے، اسکو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے،

وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ (رحمٰن)	اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

حساب | کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے، اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کیساتھ مذکور ہے، اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (انبیاء ۴)	اور ہم قیامت کے دن کیلئے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے تو کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا تو ہم لے آئیں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدمِ ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عملِ انسانی کا کوئی وزن معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائیگا، اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہرحال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے، تو وہ بھی حق پر ہے،

جنت و دوزخ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصودِ الٰہی کیا ہے؟ سو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواحِ انسانی کو سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں؛ مگر اس سعادت و ترقی کی بنیاد خدا نے اعمالِ نیک کے حصول و اعمالِ بد سے پرہیز رکھی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقتِ انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادتِ ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں "بہشت" ہے، اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیا کی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی "دوزخ" ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے، مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو تورات اور قرآن پاک میں مذکور ہے وہ آغازِ خلقت کی محض تاریخ نہیں وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے انکو اور انکی نسل کو ہمیشہ کے لیے دیدی گئی تھی، مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیئے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ انکی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر ظاہر کر چکا تھا کہ

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ ۔ ۴) میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ،

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے انکو جنت میں رکھنا، پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدمؑ اور انکی نسل کی اصل جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے، اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا :

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ج فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ، وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (بقرہ ۔ ۴)	ہم نے کہا کہ تم سب اس جنت سے اترو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم، اور جنھوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا، تو وہی ہیں دوزخ والے وہ اس میں رہا کریں گے ،
قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (طٰہٰ ۔ ۷)	خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ بدبخت ہوگا، اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا، تو اس کیلئے تنگ معاش ہوگی، اور قیامت میں ہم اسکو اندھا اٹھائیں گے ،

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، تورات کی رو سے آدمؑ

کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے، لیکن آدم نے اس کو کھالیا، اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے انکو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں، جب وہ جنت سے نکالے گئے تو ان سے کہا گیا (سفر تکوین ۳:)

"اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اسے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی، اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا، اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹکٹارے اگائے گی، اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدمؑ کو روکا گیا تھا، تصریحاً مذکور نہیں لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا۔ اور شیطان نے یہ کہکر انکو کھلایا کہ "یہ حیاتِ جاوید اور ملکِ جاوداں کا درخت ہے" مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انکی برہنگی کا علم ہوگیا، جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے، فرمایا:

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يَا آدَمُ هَلْ
أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَا يَبْلَى ۝
فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا (طٰہٰ - ۷)

شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیاتِ جاودانی
اور سلطنتِ غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس
درخت کا پھل کھایا تو انکی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔

اب سوال یہ ہے کہ "حیاتِ جاوداں" اور "غیر فانی بادشاہی" سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ جنت سے شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں تم اب ہو اس میں ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں، انسان نے تلاش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کی بنیاد ہے، ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے، وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے گرانبار نہیں، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسلِ آدمؑ میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا: وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (والشمس - ۱) اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم پھر نفس میں اس کی بدی اور اسکی نیکی کو الہام کیا

عجب نہیں کہ قرآنِ پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا
وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝
لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ
وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ (احزاب - ۹)

ہم نے اپنی امانت (تکلیفِ شرعی) آسمانوں اور زمین پر اور
پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور
انسانوں نے اس کو اٹھالیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تا کہ اللہ
نفاق والوں اور نفاق والیوں اور شرک والوں اور شرک والیوں
کو سزا دے، اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو
اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھا لیا، جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور وہ اس تکلیفِ شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی، لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی ر

اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں، کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے، لیکن اگر کاشتکار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے، تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا،

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جد و جہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا، اور جسے شیطان نے آدمؑ کو بلا سعی و محنت، محض بخت و اتفاق سے دلوانا چاہا تھا، بالآخر اس کا ملنا تقدیرِ الٰہی، جد و جہد، سعی و عمل اور نظامِ ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعہ سے مقرر ہوا، جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا،

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (بقرہ: ۴)	یہاں سے تم سب اترو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی، تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم،
اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ○ (طٰہٰ: ۷)	تم دونوں یہاں سے نیچے اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی، تو وہ نہ گمراہ ہوگا، اور نہ بد بخت۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے، اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزد و معاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے۔

فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ○ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ○ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ○ (طٰہٰ: ۷)	تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کر دے تو پھر تو مشقت میں پڑ جائے اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا، نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔

آدمؑ اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوئی، اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی، اور زمین میں آ کر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا، یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں، ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا، جسکے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، جس سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی، اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی فہرستیں پیدا ہوئیں، اور پھر اس لیے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی، عقائد صحیحہ اور عبادات الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصل غذا اور روزی ہے:

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥ (مومنون: ۱)

یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملیگی، چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی،

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ج وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ٥ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (زخرف: ۷)

اور اس جنت میں وہ کچھ ہے، جسکو دل چاہے اور جس سے آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اسمیں ہمیشہ رہنا ہے، اور یہی وہ جنت ہے جسکے وارث اپنے کاموں کے بدلہ تم بنائے گئے۔

اور ان ہی کو منادیِ غیب یہ ندا دے گا:

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥ (اعراف: ۵)

اور ان کو پکار کر کہا گیا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث اپنے ان کاموں کے بدلہ بنائے گئے۔

ملت توحید کے مبلغ اعظم ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ (شعراء: ۵)

اور مجھ کو باغِ نعمت کے وارثوں سے بنا،

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام "تقویٰ" ہے۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ٥ (مریم: ۴)

یہ وہ بہشت ہے جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے جو تقویٰ والا ہوگا۔

انسانی جزاو سزا کے تین گھر انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم برزخ ہے، اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جسکو دارِ آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزاو سزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزاو جزا پر ہے، اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی ﷺ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی جزاو سزا کا مقام قرار دیا۔ انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزاو سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے، گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اسکے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزاو سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہوکر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائیگا اور نئی زمین و نیا آسمان بنے گا، تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کیلئے پیدا کیا جائیگا، اور اسوقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزاو سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دارالجزاء غرض انسان کا پہلا دارالجزاء یہی دنیا ہے، گو اسکے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی ہے، لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اسکو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے، انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت، یہ سب اس زندگی کے

اعمالِ خیر کے نتائج ہیں، ان کے برخلاف، ذلت، رسوائی، بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم، خوف، محکومیت اس کے اعمالِ بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی توراۃ میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دارالجزاء کو دی گئی ہے، بلکہ توراۃ میں یہی خیال سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کے رنج وراحت کی صورت میں اسی زندگی میں ہے کہ تم خدا کے حکموں پر عمل کروگے تو اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، اولادیں برومند ہوں گی، جانور جنیں گے، درخت پھل دیں گے اور دشمن مغلوب ہوں گے، اور اگر خدا کی نافرمانی کروگے تو تم پر وبائیں آئیں گی، قحط پڑیں گے، اولادیں جیتی نہ رہیں گی، جانور مر جائیں گے، شہر تباہ ہو جائیں گے، باغ پھل نہ دیں گے، اور دشمن تم پر چھا جائیں گے، عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے، اور اس ظاہری زندگی کے فوز وفلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دعوت کو لیکر آئے وہ یہودیت اور عیسائیت کے ان افراط وتفریط دونوں سے پاک ہے، اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی وشادابی بھی، اور وہاں کی باغ وبہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آلِ عمران : ۱۵)	تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا، اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی، اور اللہ نیکی کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

ایمان اور عملِ صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (فتح : ۴)	خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

اور یہ بھی اُن ہی سے وعدہ ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور : ۷)	خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر وقیمت بھی زیادہ ہے، اور اسی دنیا کے حسنِ عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (نحل : ۴)	جنہوں نے نیک کام کیے، اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے، اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے، اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسیطرح اس دنیا کی ذلت وخواری اور رسوائی کو بھی فرمایا:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ (حج : ۲)	اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ (بقرہ: ۱۴)

ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، اور آخرت
میں بڑی مار ہے۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (بقرہ: ۲۷)

ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوگئے۔

یہ بھی فرمایا:

فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران: ۶) تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اَعْمٰى (طٰہٰ: ۷)

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ
گزران ہے، اور قیامت میں میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ
وہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔

اشارہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگِ احد میں فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی انکی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا،

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا
اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (آل عمران: ۱۶)

تم میں سے جو لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں، پیچھے ہٹے
انکے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ
وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ: ۱۴)

جو مصیبت تم کو پہنچی، وہ تمہارے ہاتھوں کی کرتوتوں کے باعث اور وہ
بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا
بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ
بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (آل عمران: ۱۲)

ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے، لیکن (جہاں عزت ملی ہے)
وہ خدا کے ذریعہ لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کما لائے
اور ان پر قومی، محتاجی ماری گئی، یہ اس لیے کہ وہ خدا کے
حکموں کا انکار کرتے تھے، اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ
اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدود الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل عام اہلِ کتاب سے کہا گیا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ
اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ: ۹)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف انکے پروردگار کی طرف
سے (اب) آیا گیا، اسکو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (یعنی آسمانی) کھاتے
اور اپنے پاؤں کے نیچے (زمینی خیر و برکت) سے کھاتے۔

ایک اور موقع پر اشارہ ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کے کام کرتے
تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کو کھول دیتے لیکن انہوں نے خدا کے حکم

بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ، (اعراف : ۱۲)

کو جھٹلایا تو ہم نے انکے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا ۔

مگر یہ دار الجزاء فانی ہے لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے: اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزاء جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے، اسلیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصلی مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہیے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے، جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو بھول نہیں جانا چاہیے، اس مسافر کی عقل سلیم کی داد کون دیگا، جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور پر بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے ۔

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ، (اعلیٰ ،)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو، حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائدار ہے ۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ (یوسف : ۷)

اور بیشک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے ۔

اسی طرح گنہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت اور رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (زمر : ۳)

تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا، اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب سب سے بڑا ہے اگر وہ جانتے ،

اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہ بھی لیجاتے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہ سکتا ہے کہ

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ، (طٰہٰ : ۷)

اور آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیرپا ہے ۔

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کے بدولت جو زور و قوت، جاہ و جلال، دولت و مال، اور حکومت و سروری ملے، ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے :

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ (قصص : ۸)

اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول، اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی اللہ کے بندوں پر احسان کر اور (اس دولت سے) زمین میں خرابی نہ چاہ ۔

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سود کا خیال بھول کر بھی نہ آیا ۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ

تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے جو اس دنیا کے سامان آب کر لیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان

يَأْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (اعراف : ۲۱)

اسباب پھر آئے تو پھر لیں، کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں، اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں،

یہ دارالجزاء دارالاصلاح بھی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا، اور اس ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتا دیا کہ اس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو حاصل ہو سکتا ہے، اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدابہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے، پھر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے مواقع عنایت کیے، رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ، گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر، عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہوا، اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مراتب مقرر کیے،

ا۔ نیکی سے برائی کا کفارہ، چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے، یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے، اسی کا نام کفارۂ عمل ہے، "چنانچہ وحی محمدیؐ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی ہے۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ۚ (ہود : ۱۰)

بے شبہ نیکیاں، برائیوں کو دور کر دیتی ہیں،

اس آیت کا یہ بھی منشاء ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اسمیں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی ان شاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں :-

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ۔ (نساء : ۵)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے، اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَاةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكَاةَ وَآمَنتُم بِرُسُلِي وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (مائدہ : ۱)

البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو، اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اور ان کی مدد کرو گے، اور اللہ کو اچھی طرح کا قرض دو گے تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا، اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ (احقاف: ۲)

یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگذر کریں گے،

۲۔ توبہ کفارہ ہے، انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور لغزشوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہوکر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہوکر آئندہ کے لیے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گنہگار سے گنہگار انسان کو بھی خدا کی آغوش محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السلام کا قصور، اور پھر ان کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع، واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک تمثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمتِ الٰہی کے اس پُرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے، اس سے ہندوستان کا برہمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم، اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے، وہ گویا رب العلمین کی طرف سے رحمۃ للعلمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ (مریم: ۴)

مگر جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک کام کیے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی، اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ، (فرقان)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں میں بدل دے گا اور اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان کو بھی بشارت ہے،

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ، اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ، (مائدہ: ۶)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھار لیا تو بیشک اللہ اس پر رجوع ہوگا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ، (طٰہٰ: ۴)

اور بیشک میں اس کو بخشنے والا ہوں جسنے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا،

لیکن توبہ کس کے لیے ہے، اور کس شرط کے ساتھ ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ، وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ (نساء : ۳)	اللہ کو ان کی توبہ قبول کرنی ضرور ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں تو یہی وہ ہیں جنکو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے، اور حکمت والا ہے اور انکی توبہ نہیں ہے، جو بُرے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو، اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کر لے، اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمتِ الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اعراف : ۱۹)	اور جنھوں نے بُرے کام کیے پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا تو بیشک تیرا پروردگار اس کے بعد بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (نساء : ۱۶)	اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے، پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے تو وہ اللہ کو بخشش والا اور رحم کرنیوالا پائے گا۔

۳۔ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ، دنیا میں انسان کو مصائب سے زیادہ بُری اور تکلیف دہ چیز کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہوشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے، صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت، اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت ان ہی مصائب کے زیرِ سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے، تو سنبھل جاتا ہے، اس لیے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کیلئے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ انکی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بیقرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت اور کامیابی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو، لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے، تو دفعۃً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگدستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی ان میں ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جسکو کھا کر سرمست سے سرمست راہگیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی تکلیف سے بندہ میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جابجا بیان کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں، اور اپنی غلطیوں پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و اصلاح کی فکر کریں، فرمایا :-

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ (اعراف : ۱۶)

اور بیشک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے :

وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (اعراف : ۲۱)

اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تاکہ وہ شاید باز آئیں۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ (اعراف : ۱۲)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن وہاں کے رہنے والے کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تاکہ وہ شاید گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا :

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ط اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ : ۱۹)

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

اس اصول کے تحت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ (نساء : ۱۸) جو کوئی برائی کرے گا، اس کا بدلہ اسکو دیا جائے گا، تو میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا مطلب پوچھا، فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ پر عتاب ہے، اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو بخار آجائے، یا وہ کسی اور مصیبت سے دوچار ہوئے، یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اسکو پہنچے، وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے، یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اسطرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے، جیسے بھٹی سے سونا۔[1] دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی ہے، لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے، تیسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمان

---

[1] یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر آخر النساء، سنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز۔

کو کوئی تکلیف یا بیماری، یا غم، یا اذیت نہیں پہنچتی، لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی۔" چوتھی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لیکر اوپر تک جتنی بھی پہنچے، اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں"، پانچویں روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا، اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی، تو وہ اس کے لیے کفارہ، اور اس کو اس گناہ سے پاک و صاف بنانے والی ہے[2]۔"

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمال نیک اور مصائب پر صبر و شکر کے ذریعے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک و صاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (سجدہ: ۲)	اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھائیں گے تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہِ راست پر لانا ہے، اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:-

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ، (نساء: ۲۱)	اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کریگا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا نیکیوں کا قبول کرنیوالا اور تمہارے ہر عمل کو جاننے والا ہے،

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور عالم برزخ اور عالم بعث چونکہ نئے عمل کے محل نہیں، اس لیے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کوئی سوال نہیں پیدا ہو سکتا، صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے، اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے، الّا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے، اور معاف فرمائے،

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اسکی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک و صاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک صاف بننا پڑیگا، یہی عالم برزخ کا عذاب ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے سے جو تھوڑی سی تکلیف پیش آتی ہے، اسکو برداشت کرکے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آکر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک و صاف ہو سکیں تو پاک صاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں، جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی انکی ہے جو یا سرے سے کسی گناہ کے مرتکب

---

[1] صحیح بخاری اوائل کتاب المرضیٰ میں یہ تینوں روایتیں ہیں۔ [2] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیۃ۔

نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے، مگر اعمالِ نیک، توبہ اور مصائب میں صبر و شکر کرکے یا برزخ میں سزا پاکر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پاگئے،

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بناء پر عذابِ برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی بعض آیتوں سے یہ بات بھی کنایۃً نکلتی ہے:

گنہگار حشر کے دن کہیں گے،

وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (انعام: ۱۵)

اور ہم مقررہ وقت جسکو تونے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کرچکے،

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے، کنز العمال میں ایک حدیث ہے،

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّ طُوْلَ مَقَامِ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِہِمْ تَمْحِیْصٌ لِذُنُوْبِہِمْ (کنز العمال، باب عذاب القبر جلد ۸ ص ۹۶) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے،

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

اَکْثَرُ عَذَابِ اُمَّتِیْ فِیْ قُبُوْرِہِمْ[۱]،

میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب انکی قبروں میں ہوگا۔

اس حدیث کا اگر وہ ثابت ہو تو منشاء یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانۂ عذاب میں نکھر کر اور پاک و صاف ہوکر جنت کے قابل ہوجائیں گے اور عذابِ دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن قیم ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔

فَاِنْ وَفَتْ بِالْخَلَاصِ مِنْہَا فِیْ ھٰذِہِ الدَّارِ وَاِلَّا فَفِی الْبَرْزَخِ، فَاِنْ وَفَتْ بِالْخَلَاصِ وَاِلَّا فَفِیْ مَوْقِفِ الْقِیَامَۃِ وَاَھْوَالِہَا مَا یُخَلِّصُہُمْ مِنْ تِلْکَ الْبَقِیَّۃِ[۲]،

اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کیلئے پورا ہوگیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائیگا، تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہوگیا، تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلائیں گے،

رویائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے، وہ منظر دکھایا گیا ہے، جسمیں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہرِ حیات میں نئی زندگی پاکر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں[۳]، غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے،

وَیَوْمَ یَحْشُرُہُمْ جَمِیْعًا ج یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَکْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ج وَقَالَ اَوْلِیٰٓؤُہُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کریگا اے گروہ جن! تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنالیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا

---

[۱] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ باب الوقائع الحشریہ میں نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہوسکا، [۲] شفاء العلیل لابن القیم مطبوعہ حسینیہ مصر ص ۲۲۳ [۳] صحیح بخاری کتاب التعبیر۔

اَجَّلْتَ لَنَا ، (انعام ۱۵)

اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تونے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا، پہنچ چکے ،

یہ الفاظ کہ ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے، یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالمِ برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے، اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے، جواب ملے گا،

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (انعام ۱۵)

فرمائیگا، آتشِ دوزخ تمھارا ٹھکانا ہوا اسمیں سدا رہو گے، لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے بیشک تیرا رب حکمت اور علم والا ہے ،

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمھارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمھاری پاکیزگی ابھی کامل نہیں ہوئی، اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے، پھر جب خدا چاہے گا، تم کو اس سے نجات دیگا، اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے، اسکے علم و حکمت اور مصلحت کا جب تقاضا ہو گا، تم کو نجات ملے گی۔

عذابِ دوزخ کفارۂ گناہ ہے ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے ،

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ، (نساء ۲۱) خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا تمھاری شکرگزاری کو قبول کرنیوالا اور تمھارے دلوں کے حال کو جاننے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو گنہگاروں کے عذاب سے کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی، نہ وہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اسنے اپنے جو قانون مقرر کر دیے ہیں، وہ انکو توڑتا بھی نہیں جس وقت آدمؑ کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا،

اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ، (بقرہ ۴)

یہاں سے تم سب اترو، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ غمگین ہونگے، اور جنہوں نے ناشکری کی، اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو یہی دوزخ والے ہونگے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں مستحقِ دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں، ایک کفران اور دوسری تکذیب، دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں،

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے، بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا، غیظ و غضب کے اظہار کے لیے نہیں، فرمایا :-

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا

ہم نے یہ امانت آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو ان نے اسکے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے اور انسان نے اسکو اٹھایا

---

[1] حسب تفسیر ابن عباسؓ، ابن جریر طبری ج ۸ ص ۲۳ مصر۔

الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (احزاب ۹)

کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تاکہ اللہ نفاق کرنیوالوں اور نفاق کرنیوالیوں اور شرک کرنیوالوں اور شرک کرنیوالیوں کو سزا دے، اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس آیتِ پاک سے صاف ہویدا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی اصل صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے، یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کرکے گناہ کرتا ہے، اور اس لیے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے، تو یہ خود انسان کا فعل ہے، فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (توبہ: ۹)

اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (مومن: ۴)

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے،

لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ: ۱)

کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس لیے بہشت یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس، غرض ہر اچھے برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا تو جسطرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے، اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی اسیطرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہمکو انکے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی، کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایتِ رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے، ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے،

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (نساء: ۲۲)

یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوشخبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنیوالے تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء: ۷)

ہم نے تجھ کو اے پیغمبر، ساری دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجا۔

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول سے انکار کیا، اور طرح طرح کی بد اعتقادیوں اور بد اعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا، اور جس غرض سے خدا نے انکو پیدا کیا تھا، اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا،

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک برباد کرتا، درانحالیکہ انکے رہنے والے نیکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو [illegible]

وَاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۚ (هود : ۱۰)

ایک راہ پر کر دیتا، لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا اور وہ یونہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہوا، اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کے لیے بنایا ہے، عذاب کیلئے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اسکے عذاب کا سزاوار اپنے کو ٹھہرا لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں، لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ (طبری جلد ۱۲ مصر) خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا عذاب کے لیے نہیں،

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اُس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان و رحیم جس کا یہ اعلان ہے،

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ (انعام : ۲) اس خدا نے (مخلوقات) پر رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے،

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (انعام : ۶) تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے،

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (اعراف : ۱۹) اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے، اور

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ (کہف : ۸) تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے، اور

وَرَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ (صحیح بخاری) میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔

وہ اپنے گنہگار و سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کیلئے اپنا منہ موڑ لیگا حالانکہ اُسکی رحمت کسی غرض سے نہیں بلکہ بے غرض ہے، فرمایا،

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (انعام : ۱۶) اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے،

اور تسلی دی ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۚ إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (زمر : ۶)

اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بیشک وہی بخشنے والا رحمت والا ہے۔

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا، اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا منظر اسکے مقام لعنت (دوزخ) سے دوری، اور اسکے مقام رحمت (بہشت) سے قُرب ہے۔

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ (انعام : ۲)

جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا یہ تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد آخرکار اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور وہ ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفاخانہ ہے انسان جب عدم حفظِ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو اسکے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ نہیں ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو بُرے نتائج انسان کے جسم کے اندر پیدا ہوگئے ہیں، انکو دور کرنے کے لیے جسم جدوجہد کرتا ہے،

اس لڑائی کا نام بیماری اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم دردسر، دردشکم، اعضا شکنی اور بے خوابی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاح شرعی میں گناہ اور جن کے نتائج بد کو "عذاب" کہتے ہیں یہ نتائج آتش دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے، اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائج بد کو دور کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگی، وہ اس سے عہدہ برآ ہوگی، خدا کی رحمت سے سرفرازی پاکر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کیلئے قید خانہ ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کیلئے شفاخانہ ہے، بیمار کو شفاخانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں، درد، اعضا شکنی، شدتِ تشنگی، سوزشِ جسم، وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اسکو نشتر دیا جاتا ہے اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے کوئی داغا جاتا ہے، اور ان سب کی تکلیفیں انکو اٹھانی پڑتی ہیں، مگر یہ ساری ایذا رسانی، کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ عدم صحت کی غلط کاریوں کے برے نتائج سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے، اس کو جو تکلیفیں وہاں محسوس ہوتی ہیں، وہ گو شفاخانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں، مگر ان کا سبب شفاخانہ نہیں بلکہ خود اس بیمار کا اصولِ صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیتوں اور صحیح حدیثوں سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے، جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے،

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ، (آل عمران: ۱۴)

اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک خالص کرے، اور کافروں کو مٹائے۔

یہی اصول عذاب آخروی پر صادق آتا ہے، کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہلِ ایمان کی پاکی و صفائی ہے چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ حقوقِ عباد کے بعد حَتّٰى اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ (صحیح بخاری، باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷) یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی،

اس حدیث میں یہ دو لفظ هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا ذرا تشریح طلب ہیں، هُذِّبُوْا کا مصدر تہذیب ہے تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دی جائیں تاکہ ان میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو، اور ترقی کی نئی زندگی انکو مل جائے، اور نُقُّوْا کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہلِ جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی۔

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ، (زمر: ۸)

تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں سدا کے لیے آجاؤ،

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لیے ہر گنہگار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہرحال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا (نبا: ۱)

دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔

لیکن بالآخر ان صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا، اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث رویائے برزخ میں ہے کہ آپؐ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنھوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کیے تھے، ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا جب انکی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جاکر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سپید پانی بہہ رہا تھا، وہ اس میں جاکر پڑ گئے پھر نکل کر آئے تو ان کی وہ بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہوگئے[1]۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی، اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، اس رحمان و رحیم کی رحمت و کرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے، اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں، اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں، اس نظریہ کو پیشِ نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھیے، جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ (رحمٰن ۲)

تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوڑیں گے، پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، پھر آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس و جن سے اس کے گناہ کی نسبت پوچھا نہ جائے گا، تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے، پھر وہ اپنی پیشانی کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے، تو اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو تم جھٹلاؤ گے، یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہگار جھٹلاتے تھے، وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گردش کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیتوں کی تفسیر کسی پہلو سے بھی کیجیے، یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال، مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہِ راست پر آتے ہیں، اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہی کے ذریعے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا قائل اور رسولوں کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہو تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب و جلال کا

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر۔

روز ہوگا، جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑیگا، مگر بالآخر اس رحمان و رحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ، (اور میرے غصے سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کا مصداق شفاعت کی صورتمیں جلوہ گر ہوگا، اور گنہگاروں کو اسکی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک صاف ہو کر پاکوں کی بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا،

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ (تغابن: ۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا، اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (توبہ: ۱۳)

اور دوسرے لوگ جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے،

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں، فرمایا:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝ (مریم: ۵)

اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو تیرے رب کا یہ مقرری فیصلہ ہے، پھر ہم انکو جو خدا سے ڈرے، نجات دینگے اور مشرکوں اور کافروں کو جہنم میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں۔

۱۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے۔" (صحیح بخاری، کتاب الشفاعۃ)

۲۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اسکی جھلس کھا کر نکلیں گے، اور جنت میں داخل ہوں گے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۳۔ حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت والے جنت میں اور دوزخ والے، دوزخ میں داخل ہو چکیں گے، تو خدا فرمائے گا، کہ جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے، تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے، (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۴۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا، پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا، اور پڑا رہوں گا، تو آواز آئے گی کہ اے محمدؐ! سر اٹھا، مانگ، دیا جائیگا، تو میں سر اٹھاؤں گا، اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں انکو دوزخ سے نکالوں گا، اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا، اسی طرح تیسری، پھر چوتھی بار کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۵۔ حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "محمد کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہونگے جن کا نام جہنم والے ہوگا۔" (ایضاً)

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ کے سوال پر آپؐ نے فرمایا کہ میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوصِ قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔ (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۷۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا، اور چاہے گا کہ ان کو جنھوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی، دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دیگا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدمؑ کے بیٹے کی پیشانی کے نشانِ سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کردیا ہے، تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب انکو نکالیں گے تو وہ جلے جلے ہوں گے، پھر ان پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا، تو وہ اس طرح اگیں گے جسطرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جنت والے جنت، دوزخ والے دوزخ میں داخل ہوچکیں گے، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو، تو وہ جل کر کوئلہ ہوکر نکلیں گے، پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیلِ آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۹۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے، آپؐ نے فرمایا کہ "اہلِ دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، وہ اسمیں نہ مریں گے نہ جئیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اسمیں کچھ دیر کے لیے مرجائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی، تو وہ تھوڑے تھوڑے کرکے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے، اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ، تو وہ اس طرح اوگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۱۰۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا، وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا، اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی۔"

۱۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیحین میں روایت ہے کہ خدا فرمائیگا کہ "ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی، اور اہل ایمان نے سفارش کی، اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنیوالوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحمان ورحیم، تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنھوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔" (صحیحین)

۱۲۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حکم ہوگا کہ جس نے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا ہو اور اس کے دل پر جَو برابر بھی نیکی ہو اس کو دوزخ سے باہر کردو، جس نے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اور جس نے "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہا ہو اور ذرہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اس

کو آگ سے الگ کرو (ترمذی صفۃ النار حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں اس قسم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصاء یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (نساء: ۱۸)

بیشک اللہ اسکو معاف نہ کریگا کہ اس کیساتھ شرک کیا جائے اور اسکے سوا جو گناہ ہے وہ اسکو جس کے لیے چاہیگا معاف کر دے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے برأت کی جا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، اس لیے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانونِ ابدی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشایش نہیں احکام الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے جو بمنزلۂ اصل کے ہے، اس کو مذہب کی زبان سے ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جسکا تعلق اعضاء اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک وکفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان وعمل وعرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اسکی روشنی سے ہمیشہ کے لیے نا اُمیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں، اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے، اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمالِ شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذابِ دوزخ کے بعد یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے، اور نجات مل سکتی ہے، ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اسکا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں، ہماری سعی کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک وکفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے، اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اسلیے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحمدل سے رحمدل ممتحن کیلئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اسکو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں، اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۰، ۲۱ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے، تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان و علم و عرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کے لیے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟ دوزخ جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے[1]، ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدتِ دراز کے بعد ایک دن جب جہنم کی آگ

---

[1] دیکھیے حاشیہ صفحہ ۳۰۴ پر

رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔" اسی کیساتھ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا، اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر لکھدیا کہ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي (میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی)۔

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اسکا غضب اسکی رحمت پر سبقت لیجاتا ہے یا برابر ہو جاتا ہے، اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا، اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں، اسلیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اسکے غضب پر اسکی رحمت غالب آئے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہیگا اور یہ وہ دن ہوگا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بنیں گے۔

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں، جو اس وقت تک نجات نہ پاسکیں گے، جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت بھی قرآن میں حسب ذیل تصریحات ہیں،

۱. لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا (نباء: ۱) — وہ دوزخ میں صدہا ہزار سال ٹھہریں گے۔

صدہا ہزار سال کی مدت کس قدر بڑی ہے، پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے یہ ہے:

۲. اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (انعام: ۱۵) — دوزخ ہے تمہارا ٹھکانہ، اسمیں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن جو اللہ چاہے، بیشک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔

(بقیہ حاشیہ) ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور عدم ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل ملل و نحل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کیساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی و ابدی ہے، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ جہنم و جنت دونوں کا وجود دائمی و ابدی ہے، گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہونگے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے، فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا وہ گنہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائیگا، بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا، اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیگا، اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابۂ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں، اور متاخرین میں جس کے پُرجوش حامی حافظ ابن قیمؒ ہیں، یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پاچکیں گے، تو جہنم فنا کر دی جائے گی، حافظ ابن قیمؒ نے اپنی کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح (دونوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) میں قرآن، احادیث، آثار صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے (دیکھو شفاء العلیل، (ص ۲۵۲ تا ص ۲۶۴ حسینیہ مصر اور حادی الارواح از ص ۱۶۷ تا ۲۰۳ جلد دوم مطبوعہ جدید مصر) علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے، مگر اس کی رحمت کا اقتضاء کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے، اور کب کرنا چاہیے،

تیسری آیت میں ہے:-

۳۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ، (ھود: ۹)

وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بیشک تیرا رب جو چاہتا ہے، وہ کرتا ہے۔

دوسری اور تیسری آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو رب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضاء ہے،

قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدم انتہا اور تسلسلِ ابدی پر بتصریح استدلال کیا جاسکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقا اور عدم انقطاع و عدم فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں، چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام و کمال یہاں نقل کرتے ہیں۔ فرمایا،

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ (ھود: ۹)

تو لیکن جو بدبخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور دھکیلنا ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم رہیں مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

دیکھو کہ اہل جنت اور اہلِ دوزخ دونوں کے لیے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثناء فرمایا، مگر اہلِ دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ "مگر جو چاہے تیرا رب، بیشک تیرا رب جو چاہے

تسلیم کیا ہے، (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۷۶) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے، (العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ ص ۱۲۲) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے، وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں، اور ان ہی میں لطف اٹھاتے ہیں، (یعنی اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے، اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، اور توبہ کی توفیق بخشے، اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے (القرص ۳۰) ۱؎ صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ، جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم ۲؎ صحیح بخاری باب وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ ۳؎ صحیح مسلم باب سعۃ رحمۃ اللہ

کرڈالتا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے، اور چاہے تو قائم رکھے، لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا "مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔" اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے، اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف، مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن اہلِ دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے۔[1]

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لیکر اس طرح فرمایا گیا ہے،

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ
وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ أُولٰٓئِكَ
هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ ۙ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۝ (بینہ)

بیشک اہلِ کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بیشک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وہ بہترین لوگ ہیں ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں۔ وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے،

غور سے دیکھو کہ اس میں اہلِ دوزخ کے مقابلہ میں اہلِ جنت کے دوام کی نسبت کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے "عدن" فرمایا جسکے معنی "قیام" اور بسنے کے ہیں پھر "خالدین" کہا کہ وہ اسمیں رہا کریں گے، بعد ازیں "ابدا" فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے،

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے:

وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ
خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۝ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيٰتِنَآ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ
خٰلِدِينَ فِيهَا ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (تغابن ۔ ۱)

اور اس کو ان باغوں میں داخل کریگا، جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے، اور جنہوں نے انکار کیا، اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے، اور وہ بری جگہ ہے،

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور خالدین فیہا ابداً (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے؟ کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کی تعیین سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً،

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ
اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ
ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ ۖ هُمْ
فِيهَا خٰلِدُونَ ۝ (آل عمران ۔ ۱۱)

جس دن کچھ منہ سپید ہوں گے، اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے منہ سفید ہوں ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔

---

[1] تفسیر طبری درمنثور سیوطی، تفسیر آیاتِ ہود، رکوع ۹ و انعام رکوع ۱۵، ۱

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے، اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے، ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابۂ کرام سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئیگا، جب دوزخ کے میدان میں ہو کا عالم ہوگا، اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئیگا، چنانچہ :-

۱۔ طبرانی میں حضرت ابو امامہ صحابی سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم پر ایک دن ایسا آئیگا جب خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائیگا، اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابیؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جہنم پہ ایک دن ایسا آئیگا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے، اور اسمیں کوئی نہ ہوگا۔"

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم میں ایک دن ایسا آئیگا جب اسمیں کوئی نہ ہوگا،

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اگر اہل دوزخ ریگستان عالج کے ذرات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں، پھر بھی ایک دن آئیگا، جب وہ اس سے نکلیں گے۔"

۵۔ عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ جہنم پر ایک دن آئیگا جب اس کے خالی دروازے بھڑبھڑا ئیں گے، اور اسمیں کوئی نہ ہوگا اور یہ اسوقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کر لیں گے:

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی یا ابو سعیدؓ خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے فرمایا کہ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کا استثناء پورے قرآن پر حاوی ہے یعنی جہاں جہاں قرآن میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا (سدا اسمیں رہیں گے) ہے، وہاں مشیت الٰہی کا استثناء قائم ہے۔

۷۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئیگا جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے :

دفع شبہہ | قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ہمیشہ کے لیے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے،

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا، خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ج (احزاب : ۸)	۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔
۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، (جن : ۲)	۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لیے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا،
۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط (نساء : ۲۳)	۳۔ بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں،

ان تینوں آیتوں میں خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جنکے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت تک دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جب تک حسب مشیت الٰہی

---

[1] حافظ ابن قیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر و حدیث سے نقل کیا ہے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں اَبَدًا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خَالِدًا ہے، جیسے هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ (وہ اس میں خالد رہیں گے) یا ایک جگہ ہے:۔

وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (سجدہ:۲) "اور خلود کے عذاب کا مزہ چکھو۔"

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لیے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانۂ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا خالدین کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو، جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے، جہاں اہلِ جنت کو خٰلِدِیْنَ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خٰلِدِیْنَ بھی ہے، وہ ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے۔ برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خلدین کا لفظ ہے، وہاں دوام کے مفہوم کیلئے کوئی قرینہ موجود نہیں، اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانۂ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہلِ ایمان کی سزا میں کبھی خالدین کے ساتھ ابدًا استعمال نہیں کیا گیا ہے، گنہگار اہلِ ایمان میں سب سے بڑی دھمکی اسکو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو، مگر اسکے لیے بھی خالدین کیساتھ ابدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا، وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (نساء: ۱۳) اور جو کوئی کسی با ایمان کو قصداً قتل کرے گا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ خالد (یعنی مدت دراز تک پڑا) رہے گا۔

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہلِ اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشایش کے قائل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں خلود سے مراد "ہمیشگی" نہیں ہے، بلکہ زمانۂ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے، اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا، بنا بریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں، بلکہ عرفی دوام، یعنی مدت دراز کے ہیں، ہم عام طور سے مجرم کے لیے "حبس دوام" کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد ابد تک کیا قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا، بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی درازترین مدت مراد ہے جسکا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے، کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں، اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں، جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہونگے، چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۚ ۱۔ بیشک گنہگار دوزخ میں ہیں، وہ انصاف کے دن اس میں

(بقیہ حاشیہ) ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں، حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر درمنثور تفسیر سورۂ ہود جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورۂ ہود میں ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی (ص ۱۲۳) مطبوعہ حیدرآباد میں بھی روایت ہے۔

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِيْنَ ۝ (انفطار : ۱)

۲۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ط وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝ (بقرہ : ۲۰)

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ج وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ (مائدہ : ۶)

۴۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ (حج : ۲)

۵۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ط كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (سجدہ : ۲)

داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔

۲۔ اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے، اللہ انکے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا، اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں،

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا، اگر اُن کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو، اور اتنا ہی اور ہوتا کہ اس کو فدیہ دیکر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ اُن کی طرف سے قبول نہ ہو اور انکے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اُس سے نکلنے والے نہیں، اور ان کیلئے قائم عذاب ہے۔

۴۔ جب وہ چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں، تو اسمیں لوٹا دیے جائیں گے، اور کہا جائیگا کہ جلنے کی سزا چکھو،

۵۔ اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی، تو اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں، اسمیں لوٹا دیے جائیں گے، اور کہا جائیگا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے،

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں، جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائیگی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائیگا، تو یہ محال ہے، کہ عذاب سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکال کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے، تو اب کی ہم نیکی کا کام کریں گے اس کے جواب میں کہا جائیگا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دیکر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جاسکتی، اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائیگا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے، اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں، مگر اس سے خداتعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی، اور نہ اسکی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے،

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگاروں کے لیے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے مگر ایک ایک آیت کو غور سے

پڑھو کہ ان میں کسی میں بھی دوزخ کے دوام بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے، حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً برائی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران: ۲۰) تو وہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا (مریم: ۳) اس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہوگا، لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے، تو حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے، جس کا اہل اس رحمان و رحیم اور عفو و غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لیے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے اپنی حکمت و مصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے، چنانچہ مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا، لیکن جس کسی کو اس کے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے، تو اس کو اختیار حاصل ہے[1]۔"

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک صاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات و کنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا، کیونکہ اس سے ان میں ندامت اور توبہ کے رجحان کے بجائے خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بےخوفی آجاتی اور ایسا نہ ہونا تنبیہ و صلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لیے ان کی قانونی سزا تو اللہ تعالیٰ نے دائمی عقاب مقرر فرمائی، لیکن آخر کار ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر، ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا، اور امید و بیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعۃً معاف ہو جاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا، اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمالِ بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو معاف نہیں ہو سکتے، اسلام نے آکر ترازو کے ان دونوں پلّوں کو برابر کر دیا، ایک طرف فرمایا كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ، ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے، (مدثر: ۲) اور دوسری طرف فرمایا يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ، خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے (مائدہ) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت

---

[1] بحوالہ شفاء العلیل ابن قیم ص ۲۲۲، مصر۔

اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے جسطرح اس دنیا کا حال ہے کہ اگرچہ خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں، مگر بایں ہمہ اس کا حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے، اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچایا، اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمتِ عام کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ کا کام ہے، پھر اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا، سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزارہا سال کے عقاب دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ انکی تسکین کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاجاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اسکے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں، اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے،

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں، مہینوں، بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں اُن چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے، اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اُس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے، اور آخر میں جان دیدیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گناہ زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے، اس کی تلافی کی مدت، غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت، اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بناء پر مختلف ہوتی ہے، اسی لیے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لیے یکساں نہیں ہو سکتی وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِحَقِیْقَۃِ الْحَالِ،

مشرک وکافر کا آخری انجام اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی، تو کیا اہل کفر وشرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم وکرم کے سزاوار ہو جائیں گے؟ جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک وکفر کا گناہ معاف نہ ہوگا یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے، اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک وکفر کی جزاء، دوامِ عذاب اور خلودِ نار خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا، ہے، یعنی جب تک دوزخ قائم ہے، اس سے انکو نجات نہیں مل سکتی، مگر جب حسب مشیتِ الٰہی وہ دن آئے کہ دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین وکافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:-

قَالَ النَّارُ مَثْوٰکُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝ (انعام ۱۵)	فرمائیگا، دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اسمیں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ بیشک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے غور کے قابل ہے، فرمایا "تیرا رب حکمت اور علم والا ہے" اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور سے رَبّ کا لفظ لانا، یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی، اور اسکے پیغمبر محمد صلعم د

حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن پاک میں یہ تصریح الٰہی ہے:

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ط (مائدہ: ۱۰)

یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

نیز ایک اور آیت میں ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاۤءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ط (اعراف: ۵)

بیشک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، اور انکے ماننے سے غرور کیا تو انکے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے، اور وہ جنت میں داخل نہیں ہونگے تاآنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانونِ جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو دوزخ کے عذاب کا خاتمہ ہو جائے پر بھی جنت کے عالم میں انکا گذر نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دائرہ بہت وسیع ہے، جیسا کہ خود اس نے اہلِ دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

إِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ ط إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ (ہود: ۹) وہ دوزخ میں رہینگے لیکن تیرا رب جو چاہے، بیشک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے، کیونکہ اپنی رحمت کی وسعت کی نسبت اسکا اعلان یہ ہے:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ط (اعراف: ۱۹)

اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیے ہے،

اس رحمتِ عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کی نسبت خدا فرماتا ہے:-

فَإِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ج وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ (انعام: ۱۸)

تو (اے پیغمبر!) اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے، اور اس کا عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے، لیکن خود اسکی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو انکو دنیا ہی میں ہدایت دیکر جنت نصیب کرے، یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے، اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ط (انعام: ۲)

جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا تو خدا نے اس پر رحم کیا،

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو، کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے، اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو، مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بہ تہدید اگر برکشد تیغِ حکم
بمانند کروبیاں صم و بکم
وگر در دہد یک صلائے کرم
عزازیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے، یہ ارشاد ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے:-

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ (مائدہ: ۳)

جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے، اور آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ کے لیے ہے، اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے،

لیکن اس کی یہ مشیت جیسا کہ اس نے (انعام رکوع ۱۵) میں فرمایا ہے، اس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت و حکمت کا تقاضا ہوتا ہے،

اس سے زیادہ اس بات میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدا نے تعالیٰ نے فرمائی اس کی تفریع کا حق کسی کو کیا ہے؟ اس لیے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:-

اَلنَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ (انعام: ۱۵)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اسمیں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ بیشک تیرا پروردگار حکمت والا، اور علم والا ہے۔

جمہور کا مسلک یہ جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہیگا، اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہونگے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی،

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو گنہگار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشائش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کیلئے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے ان کی گنہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، یہ وہ زمین شور ہوں گے جسمیں اس رحمتِ عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

رحمتِ عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کیے ہوئے مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور اس کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے، اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:-

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ (احزاب: ۸)

۱۔ بیشک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کیلئے دہکتی آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں

۲۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ (جن: ۲)

۲۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریگا، تو اس کیلئے جہنم کی آگ ہے، وہ اسمیں ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

۳۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ (نساء: ۲۳)

۳۔ بیشک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھلائے لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ سدا پڑے رہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا، اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہیگی،

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کفار سے کبھی دور نہ ہوگا:

۱. إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝ (مائدہ ۵: ۶)	۱. بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری دنیا کا خزانہ ہو، اور اتنا ہی اسکے ساتھ اور، تاکہ وہ اس کو فدیہ دیکر قیامت کے دن کے عذاب سے چھٹ جائیں، تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے، اور ان کے قائم رہنے والا عذاب ہے۔
۲. وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ (بقرہ ۲۰۱۰)	۲. وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے،

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:-

۳. فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ۝ (جاثیہ ۱، ۳۰)	۳. تو آج اس (دوزخ) سے وہ نہیں نکالے جائیں گے، اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔
۴. أَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُقِيمٍ ۝ (شوریٰ ۵۱)	۴. ہاں کافر و مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہونگے۔

ظلم کا اطلاق قرآن مجید میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہل شرک کا عذاب قائم رہیگا۔

۵. إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ (بقرہ ۱۹۰)	۵. بیشک جنھوں نے کفر کیا، اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی لعنت ہے۔ اسمیں وہ سدا رہیں گے، انکے عذاب میں کمی نہیں کی جائیگی، اور نہ انکو مہلت دی جائے گی،
۶. وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۖ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا (فاطر ۳۰)	۶. اور ان کے لیے جنھوں نے کفر کیا جہنم کی آگ ہے، نہ تو انکا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔

شرک و کفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:-

۷. إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ (نساء ۱۸)	۷. بیشک اللہ اسکو معاف نہ کریگا کہ اسکے ساتھ شرک کیا جائے۔
۸. إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ۝ (محمد ۴)	۸. بے شبہ جنھوں نے کفر کیا، اور خدا کے راستے سے روکا، اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے، تو ان کو ہر گز معاف نہ کیا جائیگا،

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے:

۹. إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ (مائدہ ۱۰)	۹. یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی، اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے،
۱۰. إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ	۱۰. بیشک جنھوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے،

الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (اعراف) اور جنت میں داخل ہونگے تاآنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔

۱۱۔ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران : ۱۸)

۱۱۔ اور (اے پیغمبر) تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، غم میں نہ ڈالیں۔ وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی، ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا، اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی، اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رُخ آپ کے سامنے آگئے؛

بیا کیں داور بہارا بہ بینش داور اندازیم

بہشت و دوزخ کی جزا و سزا بھی تمثیلی ہے اوپر عالمِ برزخ کے ذکر میں ہم بتفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا و سزا تمام تر تمثیلی ہوگی، اس تمثیلی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب و مشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل بخیل مستحقین کو کھانے کے لیے نہ دیگا تو اس کو دوزخ میں زخموں کی دھوون کھانے کو ملیگا، یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دیگا مرنے کے بعد اس کو جانِ تازہ اور حیاتِ نو بخشی جائے گی، وہ دولتمند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے قصر و محل اور پینے کے لیے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی، اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا، تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا،

فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۙ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۙ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ (واقعہ ۲)

وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بیشک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور برے تھے، اس لیے بداعمالی بدصورتی، اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجتمند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا، (ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۳۴۴)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کریگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی

---

[1] حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے؛

نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کریگا، تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کریگا، اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا، خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا (ترمذی ص ۳۲۳)[1]

۳۔ جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا" (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں، وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا، وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، دیکھو کہ دنیا کی معنوی قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری، جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے، جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرتی ہوگی؛ دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی، اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

۳۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے گا[2]، صفت بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبرو ریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا، دیکھو کہ دنیا کی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا[3]، ایک پہلو کا عدم ادائے حق اپنی تمثیلی صورت میں ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں، انہی پر جزا و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے :-

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْٓ اَعْمٰى وَقَدْ
كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا
فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝
(طٰہٰ: ۱)

جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گذران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا فرمائے گا، اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا،

دیکھو کہ دل کی نابینائی، قیامت میں ظاہری نابینائی، اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمت الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا،

دوزخ کی جسمانی سزائیں دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی

---

[1] ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۳ [2] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں مثل لہ مالہ شجاعا اقرع [3] ترمذی

سزاؤں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ آتشِ دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے، بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے۔ ان ہی معنوں میں اَلْجَحِیْمُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے، اور عَذَابُ الْحَرِیْقِ (جلن کا عذاب) بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے، اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كَالِحُوْنَ ○ (مومنون: ۶)	ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں اس میں بگڑ جائیں گی،

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ○ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ○ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ○ (مدثر: ۱)	اور تمہیں کیا معلوم سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے والی،
كَلَّآ اِنَّهَا لَظٰى ○ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ○ (معارج: ۱)	ہرگز نہیں وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی
اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ○ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ○ (مرسلات: ۱)	دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔

۲۔ وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ یہ حکم ہوگا،

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ○ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ○ (مرسلات: ۱)	چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھنی چھاؤں، اور نہ تپش میں کام آسکے۔

۳۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ○ (نباء: ۱)	اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔

۴۔ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آجائے، اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا:

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (طٰہٰ و اعلیٰ)	وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا،

۵۔ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی،

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ○ (محمد: ۲)	اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی اُن کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا۔

۶۔ اور پیپ پئیں گے:

اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ○ (نبا: ۱)	لیکن کھولتا پانی اور پیپ،

۷۔ اُن کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا،

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ○ (حج: ۲)	ان کے سروں کے اوپر گرم پانی ڈالا جائے گا۔

٨۔ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا،

اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْۤ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ (وَالصّٰفّٰت : ٢)	یا سینڈھے کا پھل ...... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں اُس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے، اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ (دخان : ٣)	سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی،

٩۔ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی، جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝ (غاشیہ : ١)	اور اُن کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا لیکن خاردار جھاڑی جو نہ موٹا کریگی، اور نہ بھوک سے بے پرواہ کرے گی۔

١٠۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی،

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ (حاقہ : ٢)	اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون،

١١۔ کھانا نگلا نہ جائے گا:

وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ (مزمل : ١)	اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

١٢۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا،

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۝ (حج : ٢)	کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

١٣۔ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے:

وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ (حج : ٢)	اور ان کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔

١٤۔ گلے میں طوق اور زنجیریں:

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ۝ (مومن : ٨)	جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ کھینچے جائیں گے۔
اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝ (دہر : ١)	ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے۔
مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ۝ (ابراہیم : ٧)	وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

دوزخ میں روحانی سزائیں ان جسمانی سزاؤں کیساتھ روحانی سزائیں بھی ہونگی، جو اہل نظر کی نگاہ میں اُن سے بھی بڑھ کر ہیں، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گذر چکا، وہ دل کو جا کر جھانکے گی فرمایا:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْـِٕدَةِ (ہمزہ: ۱)

سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی ،

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ط (یونس: ۶)

اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے .

يٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ (زمر: ۶)

اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی .

كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ (حج: ۲)

وہ جب جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں .

ذلت کا عذاب :

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ (احقاف: ۲)

تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے .

اس افسوس حسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ اُن کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی ،

لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ط (تحریم: ۶)

آج معذرت نہ پیش کرو ،

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف اُن کو نہ ملے گا ، جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائیگا :

اِخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ (مومنون: ۶)

ذلیل ہو اس دوزخ میں ، اور مجھ سے بات نہ کرو ،

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے ،

كَلَّا ط اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ (تطفیف: ۱)

ہرگز نہیں ، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے ،

اُن میں سے جنھوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا ، اُس دن وہ بھی اُن کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا ، فرمایا :

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ج وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰی ۝ (طٰہٰ: ۷)

اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے اُن کو بھلا دیا ، ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا .

ایسے دوزخی بھی ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے ، وہ اُنکی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گا ، نہ اُن سے کچھ بات کریگا ، اور نہ اُن کی اصلاحِ حال کی کوئی فکر کریگا ، یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے ، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں ، فرمایا :

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (آل عمران: ۸)

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی (جھوٹی) قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ، نہ قیامت میں خدا ان سے بات کریگا ، نہ انکی طرف دیکھے گا ، نہ اُن کو سنوارے گا ، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ،

جنت

جنت کے نام اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً اَلْجَنَّةُ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے، مثلاً جَنَّةُ النَّعِيْمِ (نعمت کا باغ)، جَنَّةُ الْخُلْدِ (بقائے دوام کا باغ)، جَنّٰتُ عَدْنٍ (دائمی سکونت کے باغ)، جَنَّةُ الْمَأْوٰی (پناہ کا باغ)، ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے، مثلاً فِرْدَوْسٌ (باغ)، رَوْضَةٌ (چمن)، دَارُ الْخُلْدِ (ہمیشگی کا گھر)، دَارُ الْمُقَامَةِ (قیام کا گھر)، دَارُ السَّلَامِ (امن و سلامتی کا گھر)

جنت کا دوام اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں، مگر جو چیز یہاں نہیں ہے، وہ بقائے دوام ہے، یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی ہے، یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے، انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانا اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالمِ فانی کی ہر شے آنی جانی ہے، اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے، مگر الم نہیں، مسرت ہے، مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن و اندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جنت کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا، اس نے کہا اے آدمؑ!

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰی (طٰہٰ ۔ ۷)

کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی، جو ان کے حق میں زہر تھی، یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمالِ صالحہ کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا،

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ۝ (فرقان : ۲)

یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا، جو ان کا صلہ ہوگا، اور واپسی کی جگہ،

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے، جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی [illegible]

آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

(۱) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝ (نساء: ۱۸)	اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے ہم ان کو باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔

اس تاکید پر تاکید اور پُرزور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف "خٰلِدِیْنَ" پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہی "اَبَدًا" فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا، کہ "اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے"، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ (نساء: ۸)	۲۔ اور جو ایمان لائے، اور اچھے عمل کیے ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہونگی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،
۳۔ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ (مائدہ: ۱۶)	۳۔ ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے
۴۔ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ (توبہ: ۳)	۴۔ اور (اللہ انکو خوشخبری دیتا ہے) کہ انکے لیے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے، اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔
۵۔ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ (توبہ: ۱۳)	اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں ہیں، اور ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔
۶۔ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ (تغابن: ۱)	۶۔ اس کو ان باغوں میں داخل کریگا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے،
۷۔ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ (طلاق: ۲)	۷۔ اور جو اللہ پر ایمان لائے، اور نیک کام کریں اس کو وہ ان باغوں میں داخل کریگا جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔
۸۔ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ (بینہ: ۱)	۸۔ انکی مزدوری انکے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، انکے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

۹۔ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ	۹۔ اور ان مومنوں کو بشارت دیگا جنہوں نے اچھے کام کیے، کہ ان کے لیے اچھی

لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۙ (کہف:۱)	مزدوری ہے جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے ۔

سورہ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے ذکر کے بعد ہے :

۱۰۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝ۚ (ص:۴)	یہ وہ ہے جسکا حساب کے دن تم کو دیے جانے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے ،
۱۱۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ (ھود:۹)	۱۱۔ اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں، لیکن جو تیرا رب چاہے، وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی ۔

یعنی خدا کی مشیئت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا، لیکن اس کی مشیئت یہی ہوگی کہ ان کیلئے اسکی یہ بخشش دائمی و غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جسکے متعلق اسکی مشیئت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکیگی ،

۱۲۔ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ۙ (توبہ:۳)	۱۲۔ اور وہ باغ جن میں ان کیلئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی ۔
۱۳۔ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ؕ (رعد:۵)	۱۳۔ جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے ۔
۱۴۔ وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ۙ (واقعہ:۱)	اور بہت سے میوے جنکا نہ انقطاع ہوگا، اور نہ جن کی روک ہوگی ۔
۱۵۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ (والتین:۱)	۱۵۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا ،

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے، اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خَالِدِيْنَ اَبَدًا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا، فرمایا :

۱۶۔ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ (دخان:۳)	۱۶۔ جنت میں جانے والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے ۔

لیکن اب ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو، مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے، تو اسکی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا :

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ (حجر:۳)	وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا، اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے ،

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا :

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ (کہف:۱۲)	سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل نہ ہونا چاہیں گے ۔

دوام و بقا اور تسلسل و عدم و انقطاع کی اس تو بر تو تاکید و اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقا، راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصل خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (طٰہٰ : ۷) اور غیر فانی سلطنت، کہکر آدمؑ کو دلائی تھی، اور اسی بہانہ سے اس عالم بقا سے انکو اس عالم فنا میں بھجوا دیا، آخر زمانہ آئیگا، جب آدمؑ کی اولاد کو انکے نیک اعمال کے بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ بادشاہی کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے، اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے بر آنے کی خوشخبری دینے کے لیے کوئی لفظ ہو سکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے، جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو، اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زریں کمر غلام و خدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے نئے مزے اور بلوریں پیالے حسین و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدمؑ کے دشمن نے آدمؑ کے سامنے کی تھی۔

وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (طٰہٰ : ۷) اور غیر فانی بادشاہی۔

آنیوالی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے، مختلف پیغمبروں نے مختلف لفظ استعمال کیے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی، اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھولے پھلے ہیں، کسی روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو ان ہی لوازم اور خیالات کیساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کیساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہکر کسی قدر مادہ سے بلند کریں مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہو سکتے، چنانچہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ [illegible] دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

"میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں" (متی ۲۶ : ۲۹)

آپ نے دیکھا کہ "باپ" کی "آسمانی بادشاہی" میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا۔

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ ان کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی (مکاشفات یوحنا باب ۲۲ : ۲)

"وہاں رات نہ ہوگی، اور وے چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوند خدا ان کو روشن کرتا ہے، اور وے ابد الآباد بادشاہی کریں گے۔" (۲۲ : ۵)

لیکن یہ "بادشاہی" عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچا لیا، اور انکو

وَسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝
مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا
وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ
قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ
وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ
قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا
زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ
عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ
لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ
مُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ
وَّحُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ
شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً
وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (دہر: ۱)

تروتازگی اور شادمانی سے ملایا اور انکے صبر کے بدلے میں ان کو رہنے کے لیے، باغ اور پہننے کیلئے ریشمی کپڑے دیئے، وہاں باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے، ان میں دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈا اور ان کے سائے ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں، انکو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے، اور انکو وہاں وہ پیالہ پلایا جائیگا جسمیں سونٹھ ملی ہوگی، اسمیں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے اور سدا رہنے والے کمسن غلام انکی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں، اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، انکی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور انکو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے، اور ان کا پروردگار انکو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہوگی، اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی،

یہ پورا نقشہ اس عیش و مسرت کا ہے، جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آسکتا ہے، اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہؓ صحابی سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ موسیٰؑ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہوگا، فرمایا وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئیگا تو اس سے کہا جائیگا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جاچکے، اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے، اس سے کہا جائیگا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس تھا، عرض کریگا "خداوندا میں راضی ہوں" فرمائے گا "تیرے لیے اتنا اور اس سے دونا، اور اس سے تگنا اور چوگنا ہے، کہے گا، خداوندا میں راضی ہوگیا" خدا فرمائیگا "تیرے لیے وہ اور اس کا دو گنا ہے، عرض کریگا میں راضی ہوگیا" فرمائیگا، اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے، اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔[1]

باغ کا استعارہ آخرت کے خانۂ عیش و راحت کیلئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اسلیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار، اور کنار آبِ نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور انکو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، تفسیر سورۂ سجدہ (حدیث حسن صحیح)

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوئی ہیں، مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رُخ کرتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے، اور ایسا شادان و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں، وحی محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھینچ جائے۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے، ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے ان کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں،

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (البقرہ: ۳)

اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوشخبری سنا کہ ان کیلئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی وہ جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک طرح کے مشابہ دیا جائیگا اور ان باغوں میں انکی صاف ستھری بیویاں ہونگی، اور ان باغوں میں رہا کریں گے، بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ کی چیز کی مثال بیان کرے۔

ان آیتوں کے سباق و سیاق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کیجئے تو ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کے رو سے ان الفاظ کے دنیاوی لغوی معانی اور اُخروی معنوں میں وہی نسبت ہے، جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (سجدہ: ۲)

تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے انکے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

اس آنکھوں کی ٹھنڈک یعنی لذت و راحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے، اس لیے فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت علم و فہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرما دیا ہے:

قال اللہ اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر[1]

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

---

[1] صحیح بخاری، باب کلام الرب و تفسیر سورہ سجدہ، صحیح مسلم کتاب الجنۃ و ترمذی تفسیر سجدہ۔

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں، اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک "مخفی حقیقت" نہ فرماتا اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جنکو آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سُنا اور نہ وہ کسی انسان کے خیال میں گذریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

بلہ ما اطلعتم علیہ (صحیح بخاری تفسیر سورہ سجدہ)	جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: بلہ ما اطلعکم اللہ علیہ[۱]، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ بلہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اسے بھی درگذر کرو۔"

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو اسکو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبہ شی مما فی الجنۃ مافی الدنیا الا فی الاسماء۔	سفیان ثوری، اعمش سے اور وہ ظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں،

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء[۲]	جنت میں جو کچھ ہے، وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں،

غرض ان الفاظ سے ان ہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں، بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسبت کے سبب سے انکو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اسمیں اشکال نعوذ باللہ، اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور دل ناخلیدہ مفاہیم کیلئے انکی زبان و لغت میں کوئی لفظ ہی نہیں،

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں دونوں اعمال انسانی کی تمثیلیں ہیں اسی لیے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے۔

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (طور: ۱۰)	وہی بدلہ پاؤگے جو تم کرتے تھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائیگا اے میرے بندو، یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل رہے ہیں، تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔

مثلاً وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں و لرزاں رہتے تھے، ان کو جنت میں امن و سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِیْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِیْنَ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (طور: ۱)	کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی، اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچا لیا

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الجنۃ و صفۃ نعیمہا [۲] تفسیر ابن جریر طبری، آیت مذکورہ و بیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ۔

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ڈرتے تھے، وہ قیامت میں گرم لو (سموم) کے عذاب سے بچائے جائیں گے، قہر و غضب کی تمثیل شعلۂ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر و غضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں انکو سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی،

دولتمندی و قوی دست منکرین، غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پہ تحقیراً ہنستے تھے، قیامت میں اس کا الٹا ہو گا کہ یہ ان پر ہنسیں گے، فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا	بیشک گنہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے ......
يَضْحَكُونَ ۝ ..... فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ	.... تو آج ایمان والے کافروں
الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ (تطفیف: ۱)	پر ہنسیں گے۔

نیکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندۂ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا رنگ بنکر ظاہر ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت و قوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل و عیال کیساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہوں گے، اور جو وہاں غمگین تھے، وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے۔

فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝	تو وہ موت کو پکارے گا، اور دوزخ میں داخل ہوگا،
إِنَّهُ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ (انشقاق: ۱)	کیونکہ وہ اپنے اہل و عیال میں (مغرورانہ) خوش تھا،

اور جو نیکوکار وہاں اہل و عیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے ناآشنا تھا، اس کا یہ حال ہوگا کہ

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ	تو اس سے آسان حساب لیا جائیگا اور وہ خوش خوش
أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ (انشقاق: ۱)	اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

قرآن پاک میں بار بار یہ آیتیں یا بعینہٖ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اُن کو باغوں کی خوشخبری سنا
جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (بقرہ: ۳)	جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

ان آیتوں میں ایمان اور عملِ صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کیساتھ آیا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں، جن کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے، بعینہٖ اسیطرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے، اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشوونما کی امید نہیں، اور اگر صرف عملِ صالح ہے، اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ	اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ	جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں
رَبِّهِمْ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۝ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ	گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک

اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ بِاِذْنِ رَبِّھَا وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَ ۰ (ابراھیم : ۴)

مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہر وقت پھل لایا کرتا ہے، اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنت اور کلمۂ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب کہا گیا کہ اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے" تو دوسرے میں ہے کہ وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہیگا، کلمۂ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے[1] جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون صحابی کی وفات کے بعد انکی ایک ہمسایہ صحابیہؓ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے، اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہے، انہوں نے آکر یہ خواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، آپؐ نے اسکی تعبیر میں فرمایا ذلک عملہ یجری لہٗ، یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو انکے لیے بہہ رہی ہے، (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہروں سے ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہونگی، ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمال صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے، علوم نبویؐ کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

واکثر الوقائع الحشریۃ من ھذا القبیل ،.... وبالجملۃ فتشبحات وتتفاوت لما عندھا.... وتتشبح النعمۃ بمطعم ھنیٔ ومشرب مریٔ ومنکح شھی وملبس رضی ومسکن بہی، (ص ۳۶، ھند)

حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں، ..... حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے..... اللہ تعالیٰ کی عنایت مہربانی خوش مزہ کھانے، خوش گوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دلپسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں، اور کیونکر غیر مجسم معانی، اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں، دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو انکی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، اور خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اسکی اطاعت جسکو حقوق اللہ کہتے ہیں، اور دوسری بندگان الٰہی کیساتھ حسن سلوک، بندگان الٰہی کیساتھ جو نیک سلوک کیا جا سکتا ہے، وہ یہی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں، اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں، ان ہی کی نسبت ہم ان کیساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں ان ہی پانچ قسموں پر منحصر ہیں، ایمان و اخلاص و طاعت کی جزا تو خود اللہ تبارک تعالیٰ ہے، وہ اپنے قرب اور اپنے دیدار

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔

سے نوازے گا، عفت و عصمت کی جزا حسین و مہ جبین بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کو کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، بے پناہی کی جزا ابریشم و حریر و دیبا و اطلس الجنت سے بہتر خوشنما لباس ہے، اور رہنے اور بسانے میں حسنِ سلوک کی جزا خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے،

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے،

إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ (طٰہٰ : ۷)

بیشک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا، نہ ننگا ہونا، اور نہ پیاسا ہونا، نہ دھوپ میں رہنا؛

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت نجات ملے گی، تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کی کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اسی لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہلِ بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوانِ نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا، اور پینے کے لیے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پھر پیاسا نہ ہوگا، اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے، اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گذر نہ ہوگا،

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے، انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارا کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو قربان کرتا ہے اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمالِ صالحہ کے بجا لانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے، صبح کے نمازی کو خوابِ سحر کی لذت کو خیرباد کہنا، اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اس طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے،

انسان کو دنیا میں ان اعمالِ صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اسکی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہے، اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں ان ہی کے مناسب و مماثل جو چیزیں ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسامِ شراب و شربت، انواعِ لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآنِ پاک میں ہے؛

فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۝ وَآثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ

پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی (کے ناجائز لطف و آرام) کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز

هِيَ الْمَأْوٰى ۝ (نازعات: ۲)	خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانا بہشت ہے۔

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی میں ہی اس کو ملے گی،

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۝ (آل عمران: ۱۹)	اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کیجائے گی۔

لطف و مسرت کا تصور مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخر ان کی انتہا ان ہی باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں، باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا، اور جب کبھی ہم انکو سمجھنا چاہیں گے، اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو ان ہی چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا، اور ہماری انسانی فطرت ان ہی مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے، اور ان ہی کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے، اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی وہ ہمارے ان ہی مادی و محسوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گے، اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا ہے، تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزؤں کے مطابق ہوگی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (نحل: ۴)	رہنے کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان کیلئے ان باغوں میں وہ ہے جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ (حٰم السجدہ: ۴)	اور تمہارے لیے جنت میں وہ ہے جو تمہارے دل چاہیں، اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے جو تم مانگو۔
لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝ (ق: ۳)	انکے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔
وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ (زخرف: ۷)	اور جنت میں وہ ہے جسکی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔
لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ۝ (فرقان: ۲)	ان کے لیے جنت میں وہ ہے جو وہ چاہا کریں گے ہمیشہ، یہ دینا وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔
لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ (زمر: ۴)	ان کیلئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں گے۔

الغرض جنت وہ مقام ہے، جہاں ہم کو وہ کچھ ملیگا، جہاں تک ہمارا مرغ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے لطف و مسرت وہ بلند سے بلند معیار جو تصور میں آسکتا ہے، وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا، صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامانِ مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپؐ سے پوچھتے رہتے تھے، اور آپؐ جواب دیتے تھے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کرے گا تو خدا فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب کچھ دیا گیا، جس کی تونے آرزو کی تھی، اور اس کے برابر اور بھی[1] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ وہاں کسی کسی چیز کی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی، الا الصور من الرجال[2]

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری" یہ سب کام منٹوں میں انجام پاجائیگا[3]، ایک دن کسی نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں گھوڑے بھی ہوں گے، فرمایا کہ اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ مرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا، دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اونٹ بھی ہوگا، فرمایا اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا، اور تمہاری آنکھیں پسند کریں گی[4]،

جنت میں اہلِ جنت کے مختلف رتبے ہونگے، اسلیے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دیا جائیگا (حتی یتخیل الیہ) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں[5]،

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کیساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہو جانیکا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے اس بنا پر یہاں کی کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی، اسمیں جسمانی و روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں،

دنیا میں کوئی انسان اسوقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان کسی قسم کی ادنیٰ، زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئیگا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک و احتشام

---

[1] صحیح مسلم [2] ترمذی، دیکھو مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ [3] صحیح بخاری [4] ترمذی [5] ترمذی، یہ کل حدیثیں مشکوٰۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں۔

اور لباس و زیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد و تعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ○ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ○ (فاطر: ۴)	رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہونگے انہیں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائینگے اور انکی پوشاک انہیں ریشم ہوگا اور وہ کہیں گے پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا، بیشک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنیوالا ہے، اور نیکیوں کی قدر کرنیوالا، وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اُتارا اور ہم کو وہاں مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔
لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ○ (حجر: ۴)	ان میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا، اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

جنت میں رشک و حسد نہیں موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم کیساتھ سنگدلی، محبت کیساتھ کینہ ہے، یہ گناہ و کینہ اور بغض و حسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے، اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے اُبلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا، ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض و حسد کا خاتمہ ہوگا، اور خالص محبت و اُلفت کے دریا موجزن ہوں گے، فرمایا:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ط (مریم: ۴)	اس میں امن و سلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے،
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ (اعراف: ۵)	اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ○ (حجر: ۴)	اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کو کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا، نہ باہم بغض اور کینہ، سب کے دل ایک دل کی طرح متحد[1] ہوں گے"،

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی، ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت و شراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ و مسرت اور اطمینان و سکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی، یہاں ہر کھانے پینے کیساتھ بول و براز، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوئی ہے، اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں کچھ نہ ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے، لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھنکار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا، اسکو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہونگے، اور نہ انکی

---

[1] صحیح مسلم صفۃ الجنۃ ؛

جوانی نازل ہوگی، وہاں منادی غیب پکار کر کہدیگا، یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑوگے اور وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئیگی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے، اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤگے لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح کوئی چودھویں کے چاند کی طرح۔"

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا، مگر وہاں اس کی زندگی اسکی غذا، اسکے فضلہ، غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات وقوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے، اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا، اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کیساتھ سُن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگا، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر، اور اس عالم آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا، اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی، اور نباتیت فنا ہوکر حیوانیت نمودار ہوئی۔ پھر حیوانیت معدوم ہوکر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رُخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بام ارتقاء تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے، اور یہاں سے دوڑ کر سقف آسمان تک پہنچتا ہے، اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ
جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ
عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ
عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ
خَلْقًا اٰخَرَ ۗ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ۝ (مومنون)

جو فردوس کی وراثت پائیں گے، اور وہ اسمیں سدا رہیں گے، اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا پھر اسکو (رحم انسانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا، پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر اس لوتھڑے کو ہڈیاں بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اسکو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانیوالا (خدا)

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچکر رُک نہیں جائے گی، بلکہ آگے بھی ہوگی، اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ تاریک دنیا میں زیست وحیات کے کچھ قواعد تھے، پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی وحیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اسی طرح اس دنیائے مادی سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

---

[1] یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں:

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ (مومنون: ۱)

پھر بیشک تم اس کے بعد مرنے والے ہو، اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیت پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوعِ انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا، ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلۂ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقائے اصلح کہتے ہیں کہ ان مدارج ترقی کے اثنا میں ہزارہا وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں، جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے، جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد ان ہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی، دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز، جمادی و نباتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کمی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج انہی استعداد والوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی ہی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا بلکہ وہ بقدر استعداد و تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ (تین: ۱)

ان (بہشتیوں) کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشأۂ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے، داہنے بائیں نور ہوگا، پھر بھی دعا کریں گے،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ
اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (تحریم: ۲)

ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے
اے ہمارے پروردگار، ہمارے نور کو کامل کر اور ہم کو معاف
کر، تو ہر بات کر سکتا ہے

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا، ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے، جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن و سلامتی کا گھر انسان امن و سلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن و سلامتی کو اسباب راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے، اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے، اور وہ اس کو نہیں ملتا، لیکن یہاں آکر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن و سلامتی کی ایک دنیا ملے گی، وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحیِ محمدیؐ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا ہے، جس کے معنی امن و سلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ (انعام: ۱۵)

ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے،

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا ہے، وہ حقیقت میں اسی امن و سلامتی کی نوید و بشارت ہے، اسی لیے فرمایا:

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (یونس: ۳)
اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اسی امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کر لیا، وہ یہ تھی لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔

جنت کے ذکر میں امن و سلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے۔

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْھِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ (رعد: ۳)
اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔

وہاں امن و سلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دیگا۔

اِلَّا قِیْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (واقعہ: ۱)
لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے،

اُدْخُلُوْھَا بِسَلٰمٍ ذٰلِکَ یَوْمُ الْخُلُوْدِ (ق: ۳)
اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْھَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا (مریم: ۴)
اس میں سلامتی کے سوا کوئی اور بیہودہ بات نہ سنیں گے۔

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام امین "امن والا مقام" بتایا گیا ہے، فرمایا:

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ مَقَامٍ اَمِیْنٍ ۝ (دخان: ۳)
بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔

مقام رحمت خدا کی رحمت کب نہیں، اور کہاں نہیں، مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آجاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا، وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہوگی، اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کبھی دکھائی نہ دے گا،

یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝ (توبہ: ۳)
ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِیْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۱)
لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اس میں وہ سدا رہیں گے۔

مقامِ نور جنت کا نور وہ مقام ہے جہاں ظلمت وتاریکی کا نام ونشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا، اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان پر انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا،

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (تحریم : ۱)

ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔

اس دن اہلِ ایمان کے نورِ ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی،

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (حدید : ۲)

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کروگے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس دن اہلِ نفاق، اہلِ ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جایئے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک قسم کیلئے روشنی ہو جائے،

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ج (حدید : ۲)

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہلِ ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں،

مقامِ رضوان جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے راضی اور خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ (توبہ : ۳)

ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کی جن میں نعمت الٰہی قائم رہے گی۔

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطورِ تکملہ کے جنت کا ذکر آیا ہے، فرمایا:

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ (حدید : ۳)

اور آخرت میں سخت عذاب ہے، اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جسکا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اسکے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جسکو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

سورۂ آلِ عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا،

لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ

جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے

28 تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ، (آل عمران : ۲)

پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں، اور اللہ کی خوشنودی۔

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے،

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (توبہ : ۹)

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے، اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی ہے، اور یہی بڑی کامیابی ہے،

بہشت کی مطمئن روحوں کو یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے،

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ (فجر : ۱)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اسی طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے؛

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (مائدہ : ۱۶)

خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش،

ان ہی آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے کہ خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دیگا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں، فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پاکر) اب تم خوش ہوئے، عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائیگا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے، فرمائیگا "یہ کہ اپنی رضامندی وخوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔"

مقام طیب وطاہر موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری۔ لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہونگے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا؛

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ، (زمر : ۸)

تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ،

جو زندگی وہاں ملیگی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا؛

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (نحل : ۱۳)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دیکر جلائیں گے، اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

جو گھر وہاں ملیں گے وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے، وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً، (صف : ۲) اور پاک گھر،

جو بیویاں ملیں گی وہ بھی پاک ہوں گی،

وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ، (آل عمران : ۲)

اور پاک بیویاں،

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی،

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ (حج: ۳)

اور اہلِ جنت کو پاکیزہ گفتگو کیطرف رہنمائی کی جائے گی،

ان کے پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی،

شَرَابًا طَهُوْرًا، (دہر: ۱)

پینے کی پاک چیز،

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک، صاف، طیب و طاہر اور تمام روحانی و جسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی،

مقامِ تسبیح و تہلیل اس آرام و لطف کے بعد اہلِ جنت کی روحانی لذت، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوارِ الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہوگا، جہاں قدس و نزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی، وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے،

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ج وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (یونس: ۱)

جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی، اور ان کی آپس کی دعا، سلامتی ہوگی، اور انکی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح و تہلیل کی نئی نئی پُرلطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ٥ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ٥ (حج: ۳)

بیشک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں انہیں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور انکی پوشاک ان میں ریشم کی ہوگی، اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی، اور وہ دکھائے جائیں گے، اس سراپا حمد (ذات) کی راہ،

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمدِ الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالمِ وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ٥ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ج فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ٥ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ج وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ (زمر: ۸)

جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے تو جنت میں چلے جاؤ، اہلِ جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور دیکھے گا کہ فرشتے عرشِ الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہونگے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائیگا اور کہا جائیگا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔

اہلِ جنت کے متعلق قرآنِ پاک میں ایک جگہ ہے:

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا إِلَّا سَلٰمًا وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۔ (مریم: ۴)

وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔

اس صبح وشام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو صبح وشام کی تخصیص کیا تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح وتہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے! اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (صفۃ الجنۃ)

وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اہلِ جنت کو خدا کی تسبیح وتقدیس کا الہام ہوا کرے گا اور شاید قرآنِ پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں،

وَهُدُوْٓا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا إِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۔ (حج: ۳)

اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔

مقامِ قرب اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ، قربِ خاص کا مقام ہوگا، بندہ اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآنِ پاک میں جا بجا ان کے لیے یہ آتا ہے، جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ، ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس، یہ قربِ خاص کے اشارے ہیں، اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے،

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ، فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ، (قمر: ۳)

بیشک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں سچائی کی نشست گاہ میں اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔

دیدار جنت کے سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی، یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا، اور اہلِ جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی،

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ، إِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔ (قیامہ: ۱)

کتنے چہرے اس دن تر و تازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبد اللہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے۔" دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے، اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا،[1] اس تمثیل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو مقصود ہیں، ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک وشبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جسطرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدارِ الٰہی میں کروڑوں کا جو ہجوم ہوگا اس میں خدا کے دیدار سے ایک دوسرے کا مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں، بلکہ جس دن جنتی

---

[1] صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵ ؛

اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهُ سَلَامٌ (احزاب: ۶) ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے سلامتی ہوگی،

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ (یٰسین: ۴) رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ اپنے بندہ سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا[1]۔

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہلِ روایت لفظ کے قائل ہیں، اہلِ عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہلِ حقیقت اس کو اسماء وصفات کی ناقابلِ بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے،

ع بیا کیں داور یہارا بہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر ونشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گذر چکے یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے، اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مر کر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھا، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے، اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ قٓ تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کر ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم، قرآنِ پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف ان کا انکار اقرار سے بدل گیا، بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے، یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا،

اموتٌ ثُمَّ بعثٌ ثُمَّ حشرٌ حدیثُ خرافةٍ یا امَّ عمرو

کیا مرنا ہے، پھر جینا، اور پھر اکٹھا ہونا اے عمرو کی ماں، یہ خرافات باتیں ہیں

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنزِ انکار، رمزِ یقین سے بدل گیا، اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا "ہم آسمان تک پہنچ گئے، اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے[2]۔"

وَاِنَّا لَنَرْجُوْ فَوْقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا، اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے، عرض کرتا ہے کہ جنت یا رسول اللہ؟ آپؐ فرماتے ہیں ان شاء اللہ، دیکھو کر جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں، ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا، جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے سوا خندہ کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی پروا نہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت و دوزخ کے تخیل سے ناآشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح

---

[1] صحیح بخاری ج ثانی باب کلام الرب [2] اصابہ اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی۔

آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جوابدہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی بازپرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشکبار کرتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کو دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سراپا مصروفِ جد و جہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ کسی حقیقت کے متعلق دو صحابیوں میں جھگڑا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں فیصلہ دیدیا، پھر فرمایا میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو، جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں، لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو، تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں، یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا[۱]

حضرت عمرؓ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسولؐ کے عاشق اور شیدا تھے، نیکیوں سے[۲] مالامال تھے، جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مواخذہ اور جوابدہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ اگر وصالِ نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر برابر رہیں تو بھی میں خوش ہوں، اگر جنت نہ ملے تو پرواہ نہیں، مگر الٰہی دوزخ نہ ملے[۳]، وہ نزع کی حالت میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر انکو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا، خدا کی قسم اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی کہ اس کو دیکر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دیدیتا[۴]۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں، اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی، اے کاش میں کچھ نہ ہوتی[۵]۔

قیامت کے متعلق قرآنِ پاک کی یہ عجیب موثر آیت:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ ج إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ
شَيْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ
عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى
النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُم بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ
اللَّهِ شَدِيدٌ ۝ (حج: ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے جس دن اس کو دیکھو گے، ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا سخت عذاب ہوگا۔

جب اتری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ[۶] بدل گیا اور

---

[۱] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ [۲] صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اول ص ۵۵ [۳] صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اول ص ۵۲۱
[۴] ابن سعد جزء النساء ص ۵۱ [۵] صحیح بخاری مناقب عائشہؓ و تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمہ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ [۶] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج ج ۲ ص ۶۹۲

آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے[1]، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد کے عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار کر رونے لگے[2]، حضرت ابوہریرہؓ کو ایکبار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اتنا لئے روایت میں وہ تین دفعہ بیہوش ہوکر گرے، اور جب امیر معاویہ کے سامنے یہ آیت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہوگیا[3]۔

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدانِ جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈ آرہا ہے، ادھر تین سو تیرہ مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپؐ صحابہ کی طرف خطاب کرکے فرماتے ہیں "لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے"۔ ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپؐ فرماتے ہیں ہاں، وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں، آپؐ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے واہ واہ کیوں کہا عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں، فرمایا تم اس میں ہو، یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگا، بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا، بولے اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچکر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوۂ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کے پوچھا یا رسول اللہ! اگر خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا جنت میں، وہ کھجور کھا رہے تھے، ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑکر جان دیدی، اور قیس ایک صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے، انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سائے کے نیچے ہیں، ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا اُس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے، انہوں نے کہا ہاں، یہ سُنکر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کرکے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف میں جا پڑا اور شہادت[4] حاصل کی۔

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے منکر اور کافر عربوں کے دل و دماغ اور ذہن اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں ان کے عقائد و اخلاق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

* * *

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج [2] سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر [3] جامع ترمذی ابواب الزہد [4] یہ تینوں واقعے صحیح مسلم کتاب الجہاد باب ثبوت الجنۃ الشہید میں ہیں، دوسرا واقعہ سنن نسائی میں بھی ہے کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ، ۱۲

قضا و قدر

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (قمر ۳)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا، مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی متقضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح[1] نبیؐ میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے، اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیتِ مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے، جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلۂ ازل کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا، جس طرح مہندس اور انجینیر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسیطرح مہندس ازل خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول و قواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا۔ اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت و حیات، فقر و غنا، کامیابی و ناکامی، تکلیف و راحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیل تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدم و شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں، حضرت یوسف کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گذر کر زبور میں اسکی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۸-۱۴ میں ہے:

> "تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرا جی کو بڑا یقین ہے، جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا، اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں، اور ان کے دنوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔"

اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانۂ حمد اسی لے میں شروع ہوتا ہے۔

> "..... خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا، اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے اس نے ان کو پائداری بخشی، اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔"

انجیل میں اس کی تعلیم "خدا کی مرضی" کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب یہ دعا مانگتے

---

[1] صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ و ابو ہریرہؓ باب الایمان:

فرماتے ہیں، میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو (متی ۲۶-۳۹) اور اسی کا ذکر یوحنا (۵-۳۰-۶-۳۸) اور خطوط (فلیپون ۲-۱۳) میں ہے۔ اور رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح اور اس کی حکمت و مصلحت کی تشریح کی، اور پھر یہ کہاکہ گذشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقتِ ثابتہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کرلی، بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر کرلیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی، اور ایسا اس نے اس لیے کیا کہ صبر و شکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت سے اس کے پیرؤوں کے اندر استقلال و ثبات کی روح اور دنیا کے مصائب و حوادث میں تسلی و تشفی کی قوت پیدا کرے، اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کرلے،

وحی محمدیؐ نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں، ایک قدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اور دوسرا قضا جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں،

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (قمر ۳)	ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔
هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَى أَجَلًا ط (انعام ۱)	وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کردیتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے، کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرمادیا ہے اور متعین کردیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے، اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہوسکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمادیا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیے، موت و حیات، فنا و بقا، اور عروج و زوال، غرض کائنات کی ہر شق اور ہر پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادیے انہی پر وہ چل رہی ہے، قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ط ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ط وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یٰسین ۳)	اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کردی ہے، منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ) ہوکر لوٹتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا ، (حم سجدہ ۲)	اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کردیں

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اُس نے ایک اندازہ مقرر کردیا:

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ (طلاق ۲)	اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے،

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ (واقعہ: ۲) ہم نے تمہارے درمیان موت کو اندازہ کر دیا،

ہر شے میں اللہ تعالیٰ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی ہے، جس کو لوگ قانونِ قدرت کہتے ہیں، اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام معین فرما دیئے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی وزوال، موت وحیات، بیماری وصحت، دولت وافلاس، آرام وتکلیف سعادت وشقاوت ہر ایک کے اصول وقواعد مقرر فرما دیئے ہیں، غرض ان کو آرام وتکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے،

مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ (تغابن: ۲) نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت لیکن اللہ کے حکم سے۔

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی، اس لیے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے، مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بدلتیں نہیں،

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ (فاطر: ۲)

اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی، اور نہ جنتی ہے، لیکن خدا کے علم سے، اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن کتاب الٰہی میں، بیشک یہ اللہ پر آسان ہے۔

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا بچہ جنتی ہے وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا یہ کہ جس کو چھوٹی بڑی جو عمر بھی ملتی ہے، وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں،

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا وقدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر وغرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے، اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر وثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر ومسرت اور ناکامی کے افسوس وحسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے، اور وہ یہی عقیدۂ قضا وقدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر وغرور کرنا بیجا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت ومصلحت کا نتیجہ ہے، اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے، بلکہ اسی جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جد وجہد میں مصروف ہو جانا چاہیے،

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ (حدید: ۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں، لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو، اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔

اس آیتِ کریمہ نے مسئلہ قضا و قدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کے تائید کے لیے مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابۂ کرامؓ کی گردنیں عین کامیابی و فتوحات کی حالت میں خداوندِ قادرِ مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے، اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بیچارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی، کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے، اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہالے جا سکتے تھے اور نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۵)

کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے، جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے، اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا، اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے، اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ وہ دل ہارے نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی، اور دونِ ہمتی نہیں، بلکہ بلندی، استقلال، اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحبِ وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہم ڈرتے نہیں کیونکہ

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا

ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ (توبہ ۷) لیے لکھ دیا ہے وہ ہمارا آقا ہے اللہ پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی مریں گے اور بسترِ راحت پر بھی، اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا، وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے۔

يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران : ۱۶)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے جاتے۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ (نساء : ۱۱)

تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں ہو۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابلِ ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی، نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا، کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں، اور اس طرح یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں کہ اعملوا فکل میسر لما خلق (بخاری) لوگو اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝

بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیزگاری کی، اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا، تو ہم اس کو آہستہ آہستہ

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى ۝ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝ (لیل : ۱)

سختی کی طرف لے چلیں گے، اور اس کی دولت کیا اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے، اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق، جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا، کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے، اور اس کے مطابق اس کی جزا دینا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، خدا کا کام ہے، نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستے دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے، اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت کے نہ ملنے کا نام عدم توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے، خدا فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا، (عنکبوت : ۷)

اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں،

خدا کی طرف سے توفیق و ضلالت کا ملنا، خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (بقرہ : ۳)

اور ہم اس سے گمراہ نہیں کرتے لیکن انہی کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔

غرض پہلے فسق، عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے،

وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۝ (نجم : ۳)

اور انسان کے لیے نہیں لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی، اور بیشک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی،

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے، اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بارآور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور عمل انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر و قدر عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہیں یا مختار؟ حالانکہ یہ سررشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے، جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا، بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا، جس طرح اہل مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں، اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفۂ اخلاق والے، انسان کی آزادئ عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے بیچ جو تصادم ہے، اس کو بمشکل بچا سکتے ہیں۔

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا، ہر دھاگے میں یہ گرہ، اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں، یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے، اور دبے پاؤں اس راستہ سے گذر جایا جائے، یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا، چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ،

آواگون اور کرم کی صورت میں ہے، عیسائیوں میں حضرت آدمؑ کے گناہ اور خدا کی مرضی[1] کے پیرایہ میں ہے، اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے، دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا، خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا، غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پہلے مذاہب کی یہی نوعیتیں[2] تھیں یعنی یا تو انکو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی، یا تھی تو خدا کی قدرتِ مطلقہ اور مشیتِ عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا، یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے ہیں، یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیاء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے، جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ پہ صحیح ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرتِ مطلقہ رکھتا ہے، آسمان و زمین اور بر و بحر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی، اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آ جائے، جس کے اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شاہنشاہی ناتمام ہو،

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی، مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے، اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے، اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے، جس طرح دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت، یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام، اور برے کام پر عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے، بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں، ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرتِ تامہ حاصل ہے، اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو و کل پر حاوی ہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا، اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے، اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا: "اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے، لیکن میری نہیں، بلکہ تیری مرضی پوری ہو"، عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانٹ کی کتاب الاسلام (ترجمۂ عربی) ص ۷۰ سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے

[2] شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیمؒ

بھی مواخذہ اور بازپرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے، اور ان کی تبلیغ کی ہے، ایک طرف وہ کہتا ہے کہ "خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی نہیں گر سکتا" اور دوسری طرف وہ کہتا ہے "ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے"، یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابلِ رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ، اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، یہی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت، اس کی ذمہ داری، تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے، اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو، بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ) اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے، خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقتِ مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اسکو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا، فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ، (کہف: ۴)	تو جو چاہے مومن بن جائے، اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ، (فصلت: ۶)	جس نے نیک کام کیا، تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو، جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ. مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ، فَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ. اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ، (یونس: ۵)	اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، اور اگرچہ وہ سمجھتے نہ ہوں، اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو سجھاؤ گے، اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں، بیشک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے، اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا

اس کو اندھا اور بہرہ بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا، اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے، لوگوں کو قرآن کی ہدایت و ضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکا ہوا ہے، حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (بقرہ:۱)	بیشک جنھوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول سے) انکار کیا، ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہے، وہ ایمان نہ لائیں گے، خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور آنکھوں پر پردہ ہے۔

بلکہ جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا، تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا، اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا:

بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء:۲۲)	بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے، اور یہی خدا کی مہر ہے[1]۔

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق و ہدایت سے سرفراز فرمائے، ارشاد فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ (یونس:۱)	بیشک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا
وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد:۲)	اور جنہوں نے ہدایت قبول کی ان کو ہدایت میں اور بڑھا

ایرانی فلسفۂ خیر و شر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ الجھا دیا ہے، حالانکہ عربی الفاظ خیر و شر کو اعمال۔ خیر و شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت و نعمت و آرام کے اور شر کے معنی غربت، تکلیف اور مصیبت ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ ان ہی معنوں میں آئے ہیں، البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا، تو عمل خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا، جیسے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (زلزال:۱)	جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا، وہ اس کو دیکھے گا، اور جو برائی کرے گا، وہ بھی دیکھے گا۔

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں،

---

[1] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیئے جانے کا ذکر ہے، وہاں اس کے کفر و فسق کی علت بھی ذکر کر دی گئی ہے، اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى، اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے.
کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں کے اچھے اور بُرے کام سب خدا کی طرف سے ہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج، مسرت و تکلیف، دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ "اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا." اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے، جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے، حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے، "الا یہ کہ خود خدا زبردستی انکو مسلمان بنا دینا چاہے، مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر، اور نیک یا بد، بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ، (دہر ۲) تم نہیں چاہو گے، الا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (انعام: ۱۳)	وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں، الا یہ کہ خدا چاہے.
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى (انعام: ۴)	اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا.
فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (انعام: ۱۸)	تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ خود ہدایت دیدیتا.
وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ (نحل: ۱)	اور اگر وہ خدا چاہتا، البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا.

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے اس لیے اس مشیت الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف: ۴)	تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے،
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ، (دہر ۲، مزمل ۱)	تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف کا راستہ اختیار کر لے.
فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا (نبا ۲)	سو جو چاہے اپنے پروردگار کے پاس اپنا ٹھکانا بنا رکھے.
اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (فرقان ۵)	لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اُترتی ہے مگر کن کے لیے، بتصریح فرمایا:

۱. وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ (بقرہ: ۵)	اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو،
۲. فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (صف: ۱)	جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا،
۳. بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (تطفیف)	بلکہ ان کے کام اُن کے دلوں پر زنگ بن گئے،
۴. بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (نساء ۲۲)	بلکہ ان کے کفر کے سبب اللہ نے اُن پر مہر کر دی.
۵. اِنْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ (توبہ: ۱۶)	وہ پھر گئے اللہ نے اُن کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے:

۶. كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (اعراف: ۱۲)	اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے ،
۷. فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ (بقرہ: ۲)	ان کے دلوں میں (پہلے سے نفاق کی) بیماری تھی ، توخدا نے بیماری بڑھا دی ،

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو ، ہر ایک سے یہ صاف و صریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے ، اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت ، گمراہی ، زنگ ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے ، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت ، زنگ ، مہر ، اور بیماری کا اثر علت اور انسانوں کا کفر ، گناہ و نفاق معلول نہیں ہے ، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے ، یعنی انسان کا فسق ، کجی ، زنگ ، کفر ، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے ، اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے ، اور یہی طبعی اصول بھی ہے ، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے ، اور غمگین ہوتا ہے ، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں ، اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی ۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپؐ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا۱؎ اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے ، یہ کلی جہاں چٹکی کہ اس کی خوشبو اڑ گئی ،

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے ، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے ،

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ، (فرقان: ۱)	اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا ۔

* * *

۱؎ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر ۔

ایمان کے نتائج

گذشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارعؐ نے کیا مصلحتیں رکھی ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جا چکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہبِ اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ وہ بحثیں اصول کی تھیں یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے، وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں،

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں، اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے، یہ حقیقت بھی دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا، ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح، تمامتر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے، اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہود نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسوم و رواج کو دی تھی، اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دار و مدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان اور نہ تنہا عمل پر، بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بناء پر اہمیت نہیں دیتا، بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت و سبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے،

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا، تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا،

(اے وہ لوگو! جو ایمان لائے) کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے، اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، اگر تم ایمان والے ہو،

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات، ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے، اور وہی اس کے اہل سزاوار ہیں، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (بقرہ : ۲)	ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں،

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (نور : ۷)	ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کیلئے اللہ و رسول کی طرف بلایا جائے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا، اور ان ہی لوگوں کا بھلا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات : ۱)	ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں،

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران)	اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں،

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے، سورۂ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ ..... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (مومنون : ۱)	بے شبہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے، اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں..... اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے، نماز میں خشوع و خضوع، بے کام باتوں سے احتراز، زکوٰۃ و خیرات دینا، عفت و پاکدامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے، دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین و آخرین نشانی ہے، اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اسی پر زور دیا گیا ہے

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں، ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں، حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کرکے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے

چھپ بھی گیا ہے، ایک حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ نے فرمایا:

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ إِيْمَانًا أَحْسَنُهُمْ	مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے
خُلُقًا (سنن ابی داؤد۔ کتاب السنۃ)	جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

حسنِ اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اسی ہستی سے ہونی چاہیے، جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اور اس کے بعد اسی محبت الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا، جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہرِ ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا:

لَا یُؤْمِنُ احدکم حتی اکون احب الیه	تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان کامل نہیں، جب
من ولدہ و والدہ والناس اجمعین	تک اس کے دل میں میری محبت، اس کی اولاد، والدین
(مسلم و بخاری کتاب الایمان)	اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ اس کو اپنے ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت، پیار اور اخلاص ہو، جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا یؤمن	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم
احدکم حتی یحب لاخیه	میں سے کسی کا ایمان اسوقت تک کامل نہیں، جبتک
او لجارہ ما یحب لنفسه، (بخاری و مسلم	وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کیلئے وہی
کتاب الایمان)	نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے،

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا، جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے، میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے، آپس میں سلام پھیلاؤ۔" (مسلم کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمائش، ریا یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو، فرمایا تین باتیں، جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہے، جتنا آگ میں ڈالا جانا۔" ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے، فرمایا، اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔" فرمایا کہ ایمان کی ستر کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک شرم و حیا ہے۔" یہ بھی تعلیم دی کہ "جس کو خدا اور آخرت کا ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے، جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔" ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے ہٹا دے،

یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے، یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے[1]۔

اس کے بالمقابل آپؐ نے متنبہ فرمایا کہ نفاق کی چار نشانیاں ہیں، جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے، اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے، اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو، اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے[2]۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے، اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے، وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے، اس تقریر سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں، اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عملِ صالح دونوں پر ہے، اسی لیے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے، بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمالِ حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے، جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے، اس بناء پر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے چار سو تریپن صفحے سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان راخستگیِ راہ نیست عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

سلیمان ندوی
دارالمصنفین ـــــ رمضان ۱۳۵۰ھ

واعتنی بتصحیحہ وقد سعی فی تنقیحہ الاحقر المبین محمد محی الدین السواتی فاضل دیو

---

[1] یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں [2] صحیح بخاری کتاب الایمان بحث نظر مسلم ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عملِ صالح

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لے کر آئے اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے ایک ایمان اور دوسری عملِ صالح، کتاب سیرت النبیؐ کی گذشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی، اب یہ پیشِ نظر حصہ عملِ صالح کی تشریح و بیان میں ہے، ایمان بنیادی اصولوں پر یقینِ کامل رکھنے کا نام ہے اور عملِ صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا، کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لیے کافی نہیں جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انہی دو چیزوں یعنی ایمان و عملِ صالح پر مبنی قرار دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عملِ صالح کو نہیں۔ حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عملِ صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون، جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح وہ بنیاد یا ستون کے بغیر بھی کھڑی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا اصول محال ہے لیکن اگر صرف اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فنِ تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کام آمد نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے۔ قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے مگر ہر جگہ بلا استثناء ایمان اور عملِ صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عملِ صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے۔ فرمایا:۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (العصر: ۱)

زمانہ (یعنی اپنی پوری انسانی تاریخ) کی گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور کامیابی کے دروازے کھلے ہیں جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ
ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ
غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (والتین : ۱)

بیشک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا، پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا، لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لیے ناختم ہونے والی مزدوری ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون لوگ بچائے جاتے ہیں، وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے یہود سے جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا:-

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (بقرہ : ۹)

اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے۔ فرمایا:-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ
وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ
یَحْزَنُوْنَ (مائدہ : ۱)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین، اور نصاریٰ، جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل یا قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب و ملت کی ظاہری نسبت پر ہے بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی، اور ایمان اور نکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:-

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ
یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ؕ
وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ
جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰی (کہف : ۱۱)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کریگا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹا کر جائیگا تو اس کو بُری طرح سزا دیگا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کیلئے بھلائی کا بدلہ ہے۔

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ
كٰتِبُوْنَ (انبیاء : ۷)

تو جو کوئی نیک عمل کرے اور مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل کو) لکھتے جاتے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا۔ (مریم : ۴)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائیگا۔

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ۔ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (شوریٰ : ۳)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں، یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (کہف ۱۲)

بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغ فردوس ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا :-

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (کہف : ۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آجانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے، آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا، وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے اس لیے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (حج ۷)

تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۵۴ موقعوں پر یہ آیت ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح بھی ہو۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ (نور: ۷)	تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہی سے تھا۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (فتح: ۴)	اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بخشائش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عملِ صالح کی جگہ احسان یعنی نکوکاری کو جگہ دی گئی ہے مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے۔ فرمایا:۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ: ۱۳)	کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے، نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے۔ اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط[1] میں ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عملِ صالح)، دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو اس کو ایمان کہتے ہیں، پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عملِ صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہیں دو باتوں پر ہے، کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ	وہ ایمان والے مراد کو پہنچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں جو

---

[1] رومیوں کے نام ۳: ۲۸۔

صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ
اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ
فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ
وَالَّذِيْنَ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ وَالَّذِيْنَ
هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْوٰرِثُوْنَ (مومنون : ۱)

نکمی باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔ جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں۔ یہی بہشت کے وارث ہیں۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے، انسان کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے، صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے ہم کو جد و جہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتی ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیونکہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آجانے اور نیک عمل بجالانے کی امید ہو سکتی ہے اور دوسرے کیلئے تو اول ہی سے منزل باقی ہے اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمالِ صالحہ کی قسمیں "عملِ صالح" کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں، تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں، عبادات، اخلاق، معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اس لیے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں مگر فقہاء نے اصطلاحاً یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں، دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے، پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمالِ صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرت النبیؐ کی موجودہ اور آئندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ (بقرہ: ۳)

عبادات کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجا لاتا ہے لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے، ساتھ ہی عبادات کے گزشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل، مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بےخبر تھے وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے، عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے، عقائد میں ان کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انھوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنا لی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے اسی لیے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک "راہب متبتل" کی صورت میں تھا، عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے۔

منارة ممسی راهب متبتل دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کا شام کا چراغ

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خداپرستی نام کو نہ تھی وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔ قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے، یہودیوں پر اس نے بےعلمی، نافرمانی، اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے[1]۔

یہودی جادو، ٹونکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا، غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے، عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیا اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے، انھوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کیے تھے اور ان کا نام انھوں نے دینداری رکھا تھا، سورۂ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے لیکن

---

[1] دیکھو سورۂ مائدہ رکوع ۹، ۱۱، اور سورۂ حدید رکوع ۴ ۔

ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا، اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں، اسی لیے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ، ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (حدید: ۴)

اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور انکی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں پھر انکے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنا اور پیغمبر بھیجے اور مریمؑ کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا اور انکو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰؑ کی پیروی کی انکے دل میں نرمی اور رحمدلی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا چاہیے تھا نہیں نباہا تو ان میں جو ایماندار تھے انکو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے اسی لیے قرآن نے ان کو بار بار کہا :۔

لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (نساء ۲۳، مائدہ: ۱۰) اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے بلکہ انکو قتل کرتے تھے وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ (بقرہ و آل عمران) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ توراۃ میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے:۔

وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ (مائدہ: ۹) اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کو تبلیغ کی۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَاۗءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ (مائدہ: ۱۰)

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس۔ اسکے پہلے پیغمبر گذر چکے اور اس کی ماں ولی تھی۔ دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لیے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں پھر بھی دیکھ وہ کدھر الٹے جاتے ہیں (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے کہہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا

اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

ان کی حالت یہ تھی :-

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (توبہ : ۵)

خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا۔

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستشگاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادت گذار ان کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثناء میں ان معبدوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہراتؓ نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔ ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنالیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کردیتے تھے۔[1]

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ تمام حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں۔ خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں، اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات مومی بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے۔ لات، عزیٰ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے ان پر جانور قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے خانۂ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانۂ کعبہ کے صحن میں جمع ہوکر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہوچکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ "اے خدا! مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں، اگر جانتا تو اسی طرح

---

[1] صحیح مسلم کتاب مساجد۔

عبادت کرتا[1]"

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر میں یہ ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے[2]:۔

واللہ لولا انت ما اھتدینا
ولا تصدقنا ولا صلینا
خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے
نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ہی کی تعلیم تھی جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی، بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر و بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریمؑ اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جارہی تھیں، ایران کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی، ہندوستان سے لیکر کابل، ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں، سمادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی، چین کے کنفوشس اپنے باپ دادا کی مورتوں کے آگے خم تھے، خاص ہندوستان میں سورج دیوتا، گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی، عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی، غرض عین اسوقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر، آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی، ایک بے آب و گیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی :۔

یَاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (بقرہ : ۳)	لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔

سابق کتب الٰہی کے ایمانداروں کو آواز دی گئی :۔

یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ ط (آل عمران : ۷)	اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکار اٹھے :۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ق رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (آل عمران : ۲۰)	خداوندا ہم نے ایمان کے منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دُعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحانگاہ میں آپ کی

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو [2] صحیح مسلم باب خیبر، شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے ؛

زبانِ عبودیت ترجمان سے بارگاہِ الٰہی میں کی گئی تھی :۔

"خداوندا تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تمہارے لیے لڑنے پر آمادہ ہے، خداوندا آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں کبھی تیری پرستش نہ ہوگی[1]۔"

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوتِ محمدیؐ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ :۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (مریم ۶۱)	آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں، نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ، اور رکوع وقیام کی مستحق ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (انعام ۲۰)	بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کیلئے ہے۔

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (کافرون ۱)	اے کافرو! جسکو تم پوجتے ہو اسکو میں نہیں پوجتا، اور تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کو پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔

خارجی رسوم کا وجود نہیں خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم وجان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اسکا پانی اچھالنے سے مطلب[2]، نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے

---

[1] صحیح مسلم اور جامع ترمذی، غزوۂ بدر۔ [2] جیسا کہ ہندوؤں میں ہے ۔

کی ضرورت[1] نہ دیوتاؤں، دیویوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت[2]، نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم[3] نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت، نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف، اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید[4]۔ ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے، اس کے لیے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں اسلام میں عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں، نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں، نہ ربی ہیں نہ حاخام ہیں، نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت، یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے۔ ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو، میں جواب دوں گا۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن: ۶) تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش، دلفریب، مؤثر اور بارعب بنانے کے لیے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا، کہیں ناقوس اور قرنا کی بارعب آوازیں تھیں، کہیں ساز و ترنم اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور، لیکن دین محمدیؐ کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لیے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا تاکہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص و اثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے، بت خانوں سے باہر پوجا نہیں، آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت، نہ محراب و منبر کی حاجت، وہ دیر و حرم، معبد و صومعہ اور مسجد و کنیسہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبر کو نہیں دی گئیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے۔

وجعلت لی الارض مسجدًا[5] اور میرے لیے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنا دی گئی۔

---

[1] جیسا کہ پارسیوں میں ہے ۱۲ [2] جیسا کہ ہندوؤں عام بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں ہے [3] جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے [4] یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں، پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے [5] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب قول النبیؐ جعلت لی الارض مسجدًا وطہورًا۔

تم سوار ہو کر پیادہ، گلگشتِ چمن میں ہو کر ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کر تری میں، ہوا میں ہو کر زمین پر، جہاز میں ہو کر ریل پر ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز بجا لا سکتے ہو یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو۔۱؎

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رُخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے، چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رُخ پر مجتمع کرنے کے لئے تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لیے بھی کسی ایک سمتِ خاص کی حاجت تھی اور اس کے لئے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کی حدود سے پاک ہے وہ ستاروں کے رُخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں، دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رُخ کرتے ہیں، مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی اور جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رُخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رُخ کرو ادھر ہی خدا ہے چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لئے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں، جدھر سواری کا رُخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑائیوں میں ہر رُخ پر نماز برابر ادا کی جا سکتی ہے؛ اگر خدا نخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رُخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا گھونٹ کر، یا دریا میں ڈبا کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح سے بھینٹ چڑھا دے اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں، یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہ کی جائے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے، آپؐ نے فرمایا کہ "جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۲؎"۔

حیوانی قربانی میں اصلاح کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا، عرب میں اسکا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے، کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لاکر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے۔ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا، اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے، چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے، یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور ذبح کر کے اسکا گوشت جلا دیتے تھے اور اسکے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے، ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے

۱؎ صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیعۃ ۲؎ صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ ؛

بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیلوں اور کوّوں کو کھلا دیتے تھے۔ پیغام محمدیؐ نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا، آپؐ نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔ فرمایا :۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج : ۵)	اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔

اسلام نے تمام عبادات میں صرف حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لیے، جو موقع حج پر نہ گئے ہوں، مقام حج کی یاد کیلئے قربانی مسنون کی گئی ہے تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملت حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دُنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیرووں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیام محمدیؐ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا، مصیبتوں کو دور کرنا، جان کا فدیہ دینا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد دو ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لیے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت، غریبوں، مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ چنانچہ فرمایا :۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ (حج : ۵)	ہم نے ہر قوم کے لئے قربانی مقرر کی تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے ان کو روزی کی، تو تمہارا خدا ایک خدا ہے، اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سُنا دے۔
وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (حج : ۵)	اور قربانی کے جانوروں کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے تمہارے لیے ان میں بہت فائدے ہیں، انکو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو تو جب پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو، اسیطرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے، اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپؐ سے پوچھا، آپؐ نے فرمایا خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو، نیک کام خدا کے لئے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ[1]۔ غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں، صرف خون بہانے کے لئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور یہ خون بہانا مشرکوں کے بتوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش کرتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد باب فی العتیرہ۔ جلد دوم ص ۵ ؛

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت اسی لئے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں، بند کردی گئیں، عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور انکو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے، اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر عموماً اسکی قربانی کردیتے تھے اور اسکی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔ رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جسکا نام عتیرہ تھا اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کردی۔

قال لا فرع ولا عتیرۃ[1]   آپ نے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور انکو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی۔

مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ   نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ، اور نہ
وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ (مائدہ : ۱۴)   حام بنایا۔

مُردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا، فرمایا۔

لا عقر فی الاسلام[2]   اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی و سخاوت کی نمائش اسطرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہوکر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے، اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا اسیطرح یہ مقابلہ قائم رہتا جبکے اونٹ ختم ہوجاتے یا ذبح کرنے سے انکار کردیتا وہ ہار جاتا۔ اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا۔[3]

تجرد، ترک لذائذ، ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں عام خیال یہ تھا کہ بندہ جسقدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے، اس لئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی طرح روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ، اس اعتقاد کا نتیجہ تھا، کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کرلیتا، کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا، کوئی سرتاپا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا، کوئی جاڑے کی سردی میں اپنے جسم کو ننگا رکھتا تھا، کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا تھا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا، کوئی تجرد اور ترک دنیا کرکے اہل وعیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا لیکن نبوت محمدی نے یہ راز آشکارا کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے نہ ہماری تنگیفی خدا کی خوشنودی کی

---

[1] ابوداؤد کتاب الاضاحی، ج ۲، ص ۵ [2] ابوداؤد کتاب الجنائز باب کراہیۃ الذبح عند القبر ج ۲، ص ۴۱

[3] ابوداؤد، کتاب الاضاحی، ج ۲، ص ۵

کا باعث ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن و فرزند کی نفرت سے خلق کی محبت نصیب ہوتی ہے نہ ترکِ دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے، اس نے کہا:۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ: ۴۰) خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (حکم) نہیں دیتا۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لیے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں، اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا:۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ: ۲۳) خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرما دیا:۔

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران: ۱۰) جسکو زادِ راہ اور چلنے کی استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (حج: ۱۰) تمہارے لیے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

ان هذا الدين يسر ولن يشاد الدين
احد الا غلبه[1]

یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ
کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا

اور فرمایا:۔

انما انا بعثت بالملة السمحة او السهلة
الحنيفية البيضاء[2]

میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر
بھیجا گیا ہوں۔

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو تاہم وہ دینِ حق کی اصل تعلیم نہ تھی اس لیے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا:۔

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ
اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ
رِعَايَتِهَا (حدید: ۴)

اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے انکو
خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا
تھا، تو جیسا چاہیئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہو گا، یہ سوال کیا:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ
وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (اعراف: ۴)

پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں
کو جنکو خدا نے اپنے بندوں کے لیے بنایا، کس نے حرام کیا؟

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیبیوں کی خوشنودی

---

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ ج ۱، ص ۲۰، باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و سنن نسائی۔
[2] مسند ابن حنبل ج ۵، ص ۲۶۶۔

مزاج کے لیے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا، خدا نے فرمایا:۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (تحریم ۱)	اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لیے حلال کیا تو اس کو اپنی بیبیوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے۔ اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

صحابہؓ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر، یا ذاتی میلانِ طبع کے سبب سے تجرد، ترکِ لذائذ اور ریاضاتِ شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لیکر نہیں آیا۔ قدامہؓ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں"۔ یہ سنکر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے[1]۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے ان سے فرمایا کہ "اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے[2]۔"

اسی قسم کی نصیحت آپؐ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی، آپؐ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں، بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں، آپؐ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے" عرض کی "خدا کی قسم! میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپؐ ہی کے طریقہ کا طلبگار رہا ہوں" فرمایا "میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اے عثمان! خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی[3]۔"

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے، ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپؐ انکو پہچان نہ سکے، انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا "تم خوش رو تھے، تمہاری صورت کیوں ایسی ہو گئی"؟ عرض کی "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں" فرمایا "تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے"! انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپؐ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی، انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپؐ نے مہینہ میں تین روزے کر دیے، انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی تو آپؐ نے ماہِ حرام کے روزوں کی اجازت دی[4]، ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواجِ مطہراتؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپؐ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا، وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم [2] ایضاً [3] ابو داؤد کتاب الصلوٰۃ باب ما یؤمر من القصد فی الصلوٰۃ [4] ابو داؤد باب صوم اشہر الحرم

کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا، انھوں نے آپؐ کی عبادت کا حال سُنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت، آپؐ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا، دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا، تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا کبھی نکاح نہ کروں گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انکی یہ گفتگو سُن رہے تھے، ان کو خطاب کر کے فرمایا "خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں ہے[1]۔

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبطِ نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپؐ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضورؐ اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے[2]۔

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپؐ نے کس اہتمام بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔

آپؐ نے کبھی کبھی بذاتِ خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپؐ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے، آپؐ نے منع فرمایا لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپؐ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں اس لیے انھوں نے افطار نہ کیا، آپؐ نے دو دن روزے رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپؐ نے افطار کر لیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا، تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔ صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں؟ فرمایا "تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے[3]"۔ اسی لیے اسلام میں عام امت کے لیے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گذر ہوا، دیکھا تو ایک کھمبے میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینبؓ نے باندھی ہے، رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا "یہ رسی کھول دو، لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے[4]"

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گذری، حضرت عائشہؓ نے کہا یہ خولاءؓ ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے: فرمایا کہ "یہ رات بھر نہیں سوتی، لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے[5]"۔

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے ہیں، ان کو مخاطب کر کے فرمایا:-

اکلفوا من العمل ما تطیقون فان اللہ لا یمل   اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جسکو کر سکو کیونکہ جب تک

---

[1] صحیح بخاری کتاب النکاح [2] صحیح بخاری و ابو داؤد کتاب النکاح [3] صحیح مسلم کتاب الصوم [4] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر و اوسط طبرانی و ابو داؤد، وعن انس ج ۱، ص ۲ طبع میرٹھ [5] باب الاقتصاد فی الاعمال [6] جمع الفوائد بحوالہ صحیحین و مؤطا و نسائی۔

حتیٰ تملوا فان احب العمل الی اللہ	تم نہ اکتا جاؤ، خدا نہیں اکتاتا، خدا کے نزدیک پسندیدہ وہی
ادومه وان قل[1]	کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑی ہی ہو۔

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے، بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک میں نکیل ڈالکر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے، اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں، حضرت عقبہ بن عامر کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی، عقبہ نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ پوچھا، آپؐ نے جواب دیا خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں، ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں[2]۔ اسی طرح آپ نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے، آپؐ نے اس کو سوار ہونیکا حکم دیا، اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، آپؐ نے فرمایا "میں جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے لیکن تم اس پر سوار ہو لو[3]" ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود چل نہیں سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپؐ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے فرمایا "خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے، اس کو سوار کر دو[4]"

ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے، آپؐ نے پوچھا کہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے، لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابو اسرائیل ہے، اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا، آپؐ نے فرمایا کہ "اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے[5]۔"

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے آپؐ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ "اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ[6]"

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپؐ نے فرمایا:۔

لا تشددوا علی انفسکم فانما ھلک من	اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلی قومیں اپنی جانوں پر
کان قبلکم بتشدیدھم علی انفسھم	سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج
وستجدون بقایاھم فی الصوامع والدیارات[7]	بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، آپؐ نے فرمایا:۔

---

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد مسند ابن ماجہ کتاب الایمان والنذور [3] صحیح بخاری ج ۲ ص ۹۹۱ [4] ابوداؤد ترمذی ونسائی وابن ماجہ کتاب الایمان والنذور [5] صحیح بخاری، ابوداؤد وابن ماجہ کتاب الایمان والنذور [6] صحیح بخاری کتاب الایمان والنذور [7] جمع الفوائد بحوالہ معجم کبیر واوسط للطبرانی وابوداؤد ص ۲۰ باب الاقتصاد فی الاعمال

لا صرورۃ فی الاسلام (ابوداؤد)

اسلام میں رہبانیت نہیں۔

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اژدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے، اسلام اپنے پیروؤں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں، غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں بلکہ ایفائے فرض ہے، ترک عمل نہیں بلکہ عمل، کچھ نہ کرنا نہیں، بلکہ کرنا ہے۔

ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے۔ فرمایا "اے فلاں! تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے"، اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجا لانا ہے، ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں، چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گذر ایک ایسے مقام پر ہوا جس میں موقع سے ایک غار تھا، قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا، آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت بابرکت میں آکر عرض کی یا رسول اللہ! مجھ کو ایک غار ہاتھ آگیا ہے جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں، جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں، آپ نے فرمایا "میں یہودیت اور عیسائیت لیکر دنیا میں نہیں آیا ہوں میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لیکر آیا ہوں[1]۔"

اسلام سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن گوشۂ عزلت اور زاویۂ تنہائی میں بسر کرتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کیساتھ ملکر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی سادی عبادت تھی[2]۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۵، ص ۲۶۶۔ [2] اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے ایک اس شخص کے لیے جسمیں فطرۃً بدی ہے جسکی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ (مومن: ٦)	جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا:۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ (انبیاء: ٢)	جو اسکے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔

سعادت مند اور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (سجدہ: ٢)	میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جنکو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے

(بقیہ صفحہ سابقہ) برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے، صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے، دوسرا وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے[1]۔ اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں، ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر انکی بھلائی کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آجائے دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے، انکی اخلاقی اور روحانی اصلاح اس میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ گناہ کے بارے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔

دوسرا موقع جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے، وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے چنانچہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئیگا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی، جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنوں سے بچا سکے (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدے کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لیے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہے اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اسکے لیے جماعت کے دائرۂ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلۃ راحۃ من خلاط السوء

متضاد معنی ہیں، اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے اس بنا پر صحیفۂ محمدیؐ کی زبان میں "عبادت" بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو، اگر کوئی انسان بظاہر کیسے ہی اچھے سے اچھے کام کرے لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کیلئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امرِ فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ جا بجا ادا ہوا ہے۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى وَلَسَوْفَ يَرْضٰى (لیل: ۱)	دوزخ سے وہ پرہیزگار بچا لیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی نہیں جس کا بدلہ اس کو دینا ہو بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے، وہ خوش ہوگا۔
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ)	صرف خدا کی ذات کی طلب کے لیے جو تم خرچ کرو۔
اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (دہر: ۱)	ہم تو صرف خدا کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (ماعون: ۱)	پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوے کے لیے کام کرتے ہیں۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرما دی ہے کہ:

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری و مسلم)	اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

اسی کی تشریح آپؐ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کر کے مدینہ منورہ آرہے تھے۔

لکل امرء ما نوی فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فاجرہ علی اللہ ومن کانت ہجرتہ الی دنیا یصیبہا او امرأة ینکحہا فہجرتہ الی ما ہاجر الیہ (بخاری باب اول)	ہر شخص کو وہی ملیگا جسکی اسنے نیت کی، اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اسکا ثواب خدا دیگا اگر کسی دنیاوی غرض کیلئے ہے یا کسی عورت کیلئے ہے تو اسکی ہجرت اسی کیطرف ہے جسکی نیت سے اسنے ہجرت کی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے، اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اسکے احکام کی اطاعت ہے، عبادت ہے۔ اگر تم اپنی شہرت کے لیے کسی کو لاکھوں روپیے دے ڈالو، تو وہ عبادت نہیں لیکن خدا کی رضا جوئی اور اسکے حکم کی بجا آوری کیلئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔

تعلیم محمدیؐ کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کے

غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی "عبادت" سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ	اے لوگو اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو
وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۳)	تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصول تقویٰ ہے۔

تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے، جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "تقویٰ کی جگہ یہ ہے"[1] اور قرآن نے بھی "تقوی القلوب"[2] (دلوں کا تقویٰ) کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے، اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے، نماز، روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں، اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کے لیے کرتا ہے۔ مثلاً نماز، دعا، قربانی، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا، اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لیے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے، عبادت ہے، اسلام میں خدا کے لیے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدے کیلئے ہو لیکن اس کام کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا، وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضامندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس کو دفعۃً مٹا دیا، دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت، کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں، دین کے کام ہیں، اس لیے دین اور دنیا کے کاموں میں، کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے، فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اسکو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اسکو کچھ دیر سونے دو، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو، اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے[3] کہ اس کی خدمت کے لیے کچھ وقت نکالو، غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا، خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے، چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا	اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں

---

[1] مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم ظلم المسلم

[2] (حج رکوع: ۳)

[3] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الضیف۔

رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ	روزی کی ہیں، ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو
اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ (بقرہ: ۲۱)	اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے، فرمایا:۔

فَاعْبُدْہُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ (ہود: ۱۰)	اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے۔ فرمایا:۔

فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ (مریم: ۳)	اس کی عبادت کر اور صبر کر۔

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے، ارشاد ہے:۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَۃٌ خَیْرٌ مِّنْ	اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے
صَدَقَۃٍ یَّتْبَعُھَآ اَذًی (بقرہ: ۲۶۳)	جس کے پیچھے ستانا ہو۔

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

کل معروف صدقۃ (بخاری کتاب الادب)	ہر نیکی کا کام خیرات ہے
تبسمک فی وجہ اخیک صدقۃ	تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے
واماطۃ الاذی عن الطریق صدقۃ۔	راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے۔

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ فرمایا:۔

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد	بیوہ اور غریب کیلئے کوشش کرنیوالے کا مرتبہ خدا کی
فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النھار	راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے
ویقوم اللیل (بخاری، کتاب الادب)	برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہو۔

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپؐ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا:۔

الا اخبرکم بافضل من درجۃ الصیام	کیا میں تم کو، روزہ، نماز اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ
والصلوۃ والصدقۃ	کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے، فرمایا:۔

اصلاح ذات البین[1]	وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ ایک دوسرے صحابی حضرت ابو ذرؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے۔ اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا تو ابو ذرؓ نے کہا میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤنگا

---

[1] سنن ابی داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاح ذات البین، ص ۱۹۲۔

آخر انہوں نے افطار کیا، رات ہوئی تو ابوذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے، حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو، پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی، پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا "اے ابوذرؓ! تمھارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمھاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو"۔ حضرت ابوذرؓ نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی، آپؐ نے فرمایا کہ سلمانؓ نے سچ کہا[1]۔

لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ "یا رسول اللہ! تمام کاموں میں سب سے بہتر کون کام ہے" فرمایا "خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا" لوگوں نے پوچھا "کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے" ارشاد ہوا کہ "جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو" انہوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو، فرمایا "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنیوالے کی مدد کر دیا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو اس کا کام کر دو" پھر سوال ہوا اگر یہ بھی نہ ہو سکے فرمایا "تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو، یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو تم خود اپنے اوپر کر سکتے ہو[2]"۔

ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کہیگا کہ "میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا" وہ عرض کریں گے کہ "خداوندا! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائے گا "کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا، تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے"۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا، وہ کہے گا کہ "اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے، وہ فرمائیگا "تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا"۔ اے ابن آدم! میں بیمار ہوا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، وہ کہے گا کہ "اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے" فرمائیگا "تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تو اسکو میرے پاس پاتا یا مجھے اسکے پاس پاتا[3]"۔

اس موثر طریقۂ ادا نے خداشناسی اور خدا آگاہی کے کتنے توبرتو پردے چاک کر دیے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں۔ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں، آپؐ نے انہیں بتایا کہ "اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے اس کا تم کو ثواب ملے گا یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو اس کا بھی ثواب[4] ہے"۔ ابو مسعود انصاریؓ سے ارشاد فرمایا "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ[5] ہے"۔ غریب و نادار صحابہؓ نے دربارِ رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجا لاتے ہیں جو ہم نہیں بجا لا سکتے،

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام والتکلف للضیف، ص ۹۰۶ [2] ادب المفرد امام بخاری باب معونۃ الرجل اخاہ۔
[3] ایضاً باب عیادت المرضیٰ۔ [4] ادب المفرد باب یوجر فی کل شیء [5] صحیح بخاری کتاب النفقات

فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور بحمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے، یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے؛ لوگوں نے کہا "یا رسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے" فرمایا کہ "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا"[1]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسنِ عمل، ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی توبرتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحیِ محمدیؐ نے بالکل صحیح طور سے خلقتِ انسانی کی غرض و غایت، عبادتِ الٰہی قرار دی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ   میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے
(ذاریات: ۳)   کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیتِ پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اسکی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج، اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے، درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، جن میں سے ہر ایک فریضۂ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

۲۔ وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیے کرتا ہے صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

۳۔ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا، جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب کل معروف صدقہ۔

ہوتی ہیں روزہ ہے، یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

۴۔ دنیائے اسلام میں ملتِ ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اور کسبِ روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان **حج** ہے۔

غور کر کے دیکھو، انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہیں اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے، توحید و رسالت کا اقرار کرنا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ دینا اور حج کرنا[1]۔ پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں، انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیاتِ باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب میں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلوتہی کرتا ہے اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت ناکمل ہے اور اس کے لیے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے، یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی، ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرونِ اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوٰتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (نور : ۷)	ہیں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔

ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا، اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں[2] رکھ دے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان [2] سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج ۱، ص ۲۵۲۔ مطبع مصطفیٰ مصر، كلمة واحدة يعطونيها تملكون بها العرب وتدين بها العجم۔

نماز

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تندرست، سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی، اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو، اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو[1]۔ اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو[2]۔ اگر سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو[3]۔

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان و رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسنِ ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے، یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا، انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جابجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔

غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرض نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت، روح کے اس فطری مطالبہ کا جواب ہے، اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنوں کا علاج ممکن نہیں، وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس تقاضائے فطری کی تسلی کے لیے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں۔

---

[1] نیل الاوطار، ج ۲، ص ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی [2] ابوداؤد باب صلوٰۃ الطالب [3] کتاب الصلوٰۃ باب جواز صلوٰۃ النافلۃ علی الدابۃ فی السفر حیث توجہت ؛

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں، اسلام میں اگر ذکر و تسبیح ہے[1] تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا، پارسیوں میں زمزمہ اور ہندوؤں میں بھجن ہیں اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کیلئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے، اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (ابراہیم: ۶) اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں۔ حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کیلئے دعا کرتے ہیں کہ "رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ — " اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ (مریم: ۴) اور وہ اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت شعیبؑ کو انکے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (ہود: ۸) کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اسکو چھوڑ دیں، حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ (انبیاء: ۵) اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ (لقمان: ۲) اے میرے بیٹے! نماز کھڑی کر، حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ: ۱) اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور انکے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (یونس: ۹) اور نماز کھڑی کیا کرو۔ بنی اسرائیل سے وعدہ تھا اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ (مائدہ: ۳) میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔ حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ (آل عمران: ۴) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کہتے ہیں وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ (مریم: ۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود و عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ (آل عمران: ۱۲)	اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں مثلاً آپؐ نے فرمایا کہ "جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح ننگے، نہ پڑھو" (ص ۲) "تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈالو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو" (ص ۳) "نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو" (ص ۱۱۲) "تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو" (ص ۱۷۱) میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ

---

[1] قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لیے اصطلاحی لفظ "خدا کا نام لینا" تھا چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا۔ (پیدائش ۱۲: ۸) حضرت اسحٰقؑ نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶ + ۲۵) حضرت داؤدؑ نے خدا (بقیہ صفحہ آئندہ)

یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے" (ص ۸۴) ان حوالوں[1] سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔

عرب میں جو لوگ اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقۂ عبادت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گذر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ "اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھ کو کیسے پوجوں" یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے[2]۔ لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رُخ نماز پڑھتے تھے، کہنے لگے جدھر رُخ کر لیا[3]۔ عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے[4]۔

وادرکن اعجازاً من اللیل بعد ما
اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

(ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ کو پالیا اس وقت کے بعد جبکہ عبادت گذار حنیفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنیفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بنکر رہ گئی تھی، اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں، وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے[5]۔

دینِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اسکی شکل و صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے صحیفوں میں اس کی اصل شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانتدار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اسکی ادائیگی کے کیا اوقات تھے۔ جو کچھ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم و رواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی کچھ تجویزیں، جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا، سجدہ جو نماز کی روح اور نیازِ الٰہی کی انتہائی منزل ہے اس کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) کا نام لیا (زبور ۱۱۷-۱۱۹) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا، پس نماز پڑھی، اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں مثلاً سفر دانیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کیلئے "دعا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ "صلوٰۃ" کے ہم معنی ہے۔ اسی لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے (متی ۱۷-۲۱) اور (متی ۲۳-۱۴)

[1] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدرآباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیے گئے ہیں۔ [2] ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل [3] صحیح مسلم فضائل ابی ذرؓ [4] لسان العرب لفظ حنف [5] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورشپ) ۱۲

یہود و نصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعثِ تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل و صورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی، قرآن مجید میں ان کی یہ صورتحال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ	انکے بعد انکے وہ جانشین ہوئے جنکو کتاب باپ دادوں سے
عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ	وراثت میں ملی وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے
يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ	ہیں کہ ہم کو معاف کردیا جائیگا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے
مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ	سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پرواہ نہ کریں) کیا ان سے کتاب
اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ	کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ اللہ کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے
خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ	اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اسکو پڑھا اور آخرت
وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا	کا گھر ان لوگوں کے لئے ہے جو پرہیزگار ہیں کیا تم نہیں سمجھتے؟
الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ	اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور انہوں نے نماز کو قائم
(اعراف : ۲۱)	کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنیوالوں کی مزدوری کو برباد نہیں کرتے۔

سورۂ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے :-

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ	ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنھوں نے نماز کو
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ (مریم : ۴)	برباد کردیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے بلکہ زیادہ تر اسکی حقیقت اور اسکی روح کو گم کردینا ہے، مسلمان جب اپنی نماز کے لیے "حی علی الصلوٰۃ" (نماز کے لیے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خداپرستی کی روح اتنی مُردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خداپرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی اور کھیل بنالیتے ہیں۔

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا	اور جب تم نماز کے لیے آواز دیتے ہو تو وہ اسکو ہنسی کھیل
وَّلَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (مائدہ : ۹)	بنالیتے ہیں یہ اس لیے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے، وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے، بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا، حج و طواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کا نام لے لیتے، اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے، موحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا، مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دِق کرتے تھے، ڈھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا :-

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا	اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا
مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً (انفال : ۴)	ہے۔

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لیے ہیں، ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے، دوسرے یہ کہ جب مسلمان نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنا چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی[1]۔ پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو و لعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔

ایک اور آیت میں ہے:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (علق: ۱)	کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، آپ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے، کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے تھے[2]، کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے[3] اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے تو پشت مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارِ نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے[4]۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے آغاز میں تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا دَرّہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا بعد رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے، مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے، ابن اسحاق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے، ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آ گئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہو گئی[5]۔

الغرض جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے۔ ان کی نمازیں بالعموم اخلاص و اثر، سکون و دل جمعی، خشوع و خضوع اور خوف و خشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی، تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو علاوہ نماز کا تھا يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر: ۱) اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہوشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول۔ رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل

---

[1] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [2] ایضاً [3] صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ [4] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئاً من الاذی [5] سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما فرض اللہ سبحانہ من الصلوٰۃ)

کے مدارج طے کرتی ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوشت کے، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے، دھکیل کر نیچے گرا دیا، صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی۔ اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدہ کو حرام قرار کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی، آپؐ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مؤثر دعائیں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا حکم دیا یہودیوں کو نماز کے خضوع وخشوع، راز و نیاز اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونوں کیساتھ ناقابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا، حکم ہوتا ہے کہ:۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ: ۳۱)	نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ:۔

وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (انعام: ۱۱)	اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔
اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج: ۱)	جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (مومنون: ۱)	اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کیساتھ جمے رہو، فرمایا:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ: ۸)	اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو۔

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا:۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (بقرہ: ۳۱)	اللہ خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

تعریف کی گئی کہ:۔

اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (مومنون: ۱)	(کامیاب ہیں وہ مومن) جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

حکم ہوا کہ:۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اعراف: ۷)	تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔
وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اعراف: ۷)	اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کیساتھ پکارو۔
وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اعراف: ۳)	اور خدا کو پکارو، اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جسمیں نماز کو اہمیت نہ د

گئی ہو لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں، آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح، معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں، یعنی کسی مذہب کے پیرووں بلکہ عالموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسا کہ گذر چکا قرآن کے روسے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح، اور مؤکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاءؑ اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لئے اس فریضۂ الٰہی کو دینِ کامل میں ایسی منظم، واضح، مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے، اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت[1] اور اس کا ترک کفر کی نشانی بتائی گئی[2] ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستانِ قدس میں ہوئی جسکو معراج کہتے ہیں[3]۔

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے، چنانچہ سورۂ روم (رکوع : ۴) میں پہلا حکم دیا گیا کہ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دینِ توحید پر سیدھا رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے :-

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (روم ۴) اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے، یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے جسطرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، ایسطرح[4] نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آکر

---

[1] منافقین کی صفت میں ہے، وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالَىٰ (نساء، ۲۰) جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست کاہل ہو کر اٹھتے ہیں: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (ماعون، ۱) افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔

[2] کفار کے بارے میں ہے لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ (مدثر، ۲) "ہم نمازیوں میں نہ تھے" یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو؟

[3] کتب صحاح واقعات معراج و اسراء و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ۔

صلح کی بات چیت شروع کی، تو نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا، آپؐ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کردیا لیکن نماز کے متعلق فرمایا جس دین میں خدا کے سامنے نہ جھکنا ہو، اسمیں کوئی بھلائی نہیں۔" آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ "نماز دل کی روشنی ہے۔" اپنی نسبت فرمایا ہے "نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔" ایک تمثیل میں آپؐ نے فرمایا "انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے۔" یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز آب زلال ہے جو اس آگ کو سرد کردیتا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ "کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جسکا اظہار اسکے اعمال ہی سے ہوسکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے، نماز ہی ہے۔ عین اسوقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپؐ فرمارہے تھے نماز اور غلام[1]۔

نماز کی حقیقت نماز کے لیے اصل عربی لفظ "صلوۃ" ہے، صلوۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں "دعا" کے ہیں، اسلئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے، معاویہ بن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے انکو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمک اللہ کہو، اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہو رہی تھی، معاویہ بھی اس میں شریک تھے، انکے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی، انھوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا، صحابہؓ نے انکو گھورنا شروع کیا، معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے رانوں پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا، اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جارہا ہے۔ نماز ہوچکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کرتا تھا، لوگوں نے معاویہؓ کی طرف اشارہ کیا، آپؐ نے انکو پاس بلاکر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ "نماز، قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اسکی پاکی اور بڑائی بیان کرنیکا نام ہے اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں[2]۔" حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ایک دفعہ فرمایا کہ الدعاء مخ العبادۃ "دعا عبادت کا مغز ہے۔" اور حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ الدعاء ھو العبادۃ "دعا ہی عبادت ہے۔" اس کے بعد آپؐ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے، اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی[3] جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے۔

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ	مجھ سے دعا مانگو میں قبول کرونگا جو لوگ میری عبادت سے
عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَہَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (مومن: ۱)	سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں جائیں گے۔

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "بہترین عبادت دعا ہے۔" اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی ——— قرآن پاک میں حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے، یعنی خدا کی یاد، فرمایا :۔

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال کتاب الصلوۃ جلد ۴ میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں [2] سنن ابی داؤد کتاب الصلوۃ باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ یہ دو روایتیں ہیں ہم نے ان دونوں کو جمع کرلیا ہے [3] یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی کتاب الدعوات میں ہیں، دوسری حدیث ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب الدعاء میں اور مستدرک حاکم کتاب الدعاء میں بھی ہے :

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ : ۱)

اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔

کامیابی اسی کے لیے ہے جو خدا کو یاد کر کے نماز ادا کرتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ : ۱)

کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی۔

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون واطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (رعد : ۴)

ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثباتِ قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ : ۵)

ثابت قدمی اور نماز (یاد دعا) کے ذریعہ اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔

زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر وتوانا کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی بے چون وچرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح ونماز ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل : ۵)

اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے البتہ تم انکی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ (حج : ۲)

کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج چاند تارے، پہاڑ، درخت جانور اور بہت آدمی اسکو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا (کیونکہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)

غور کرو کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثناء خدا کے سامنے سرنگوں ہے لیکن استثناء ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اسکو سجدہ کرتے ہیں اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں اسی لیے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے، انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثناء اطاعت گذار ہے کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی لیکن انسان ذاتی ارادہ واختیار کا ایک ذرہ پا کر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے۔ اسلام کی نماز انھی سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع وفرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت وانقیاد اور بندگی وسرافگندگی کی دعوت دیتی ہے جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز ادا اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے، اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض وغایت

نماز کی روحانی غرض وغایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رازق عالم،

مالک الملک، منعمِ اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر، ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی اور بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور ناقابلِ زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اُٹھا ہوا دیکھیں، جس سے اپنے بُرے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں، صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں ایمان و اسلام کی حقیقت دریافت کی، آپؐ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اسطرح کرو گویا تم اسکو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسکو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔" اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیونکہ اسوقت وہ اپنے رب کیساتھ راز و نیاز کی باتوں میں معروف ہوتا ہے[1]۔ "حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپؐ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپؐ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اسکو جاننا چاہئے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ[2]۔" ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اسکے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اسطرح کی گئی:-

أَقِمِ الصَّلٰوةَ ۖ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (عنکبوت: ۵)	اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے، جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:-

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى (اعلیٰ)	کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:-

إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۚ وَمَنْ	تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰة باب البزاق فی الصلوٰة، صحیح مسلم باب المساجد، مسند احمد جلد ۲ ص ۳۴ و جلد ۳ ص ۶، ۱۸۸، وغیرہ [2] مسند احمد جلد ۲ ص ۶۷، ۱۲۹۔

تَزَکّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَکّٰی لِنَفْسِہٖ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ الْمَصِیْرُ۔ (فاطر: ۳)

اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے، اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا:-

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۙ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۙ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۙ (معارج: ۱)

بیشک انسان تھڑ دلا بنا ہے، جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل، لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں)، جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لیے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔ نماز کے انہی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہؐ! ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو[1] ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]:

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ (ہود: ۱)

اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، انکا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جسکے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب "قلب کا عالم" اور فلسفہ نفسیات یا "دماغی کیفیات" کہتا ہے اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مترتب ہوتے ہیں، سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل

---

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال (ج ۴ ص ۶۷، ۶۸، ۹۲) میں حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں۔ [2] صحیح بخاری کتاب مواقیت الصلوٰۃ (تفسیر سورۂ ہود)

کھول دیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب شکل و صورت اور ماحول (گرد و پیش) نہ اختیار کریں، تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکتی، ہمارے تمام تمدنی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لئے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں، معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و لحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں، شاہانہ رعب و داب کے اثرات پیدا کرنے کے لیے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے، قوی ہیکل چوبدار، عصا بردار، نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمدمہ و دورباش اور نگاہ روبرو کی پُر رعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لیے فضا کا سکون و خاموشی، مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، بزم عروسی کے لئے رنگ و بو، خورد و سرور، گانا بجانا اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے۔

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار، نیز دل و دماغ اور نفس و روح میں پاکی، صفائی و طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لیے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کیے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو و نما ہو، مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کیے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اسکی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیات پر پڑتا ہے اور اسمیں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اسکے اندر مؤثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہے، اندر بنانے کے لئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کر دیگا، اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے، اسی اصول کے ماتحت سکولوں کی تنظیم اور انکی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہمرنگی و ہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہمقدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصل کیفیت سے متکیف ہوں، ان کی حقیقی کیفیت اپنے اثر سے

4 دوسروں کو بھی پُر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا، اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے اسی لیے مجلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آجاتا ہے، نفسیاتِ اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لیے ان طبعی و نفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب، شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز کے مقصود خضوع و خشوع، ذکرِ الٰہی، حمد و ثنا اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں، جن کے لیے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے اسی لیے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے۔ اس کا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکرِ الٰہی ہے جسکے لیے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے چنانچہ خدا نے فرمایا:۔

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ (نساء: ۱۵)	بس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا	جو کھڑے، بیٹھے، اور لیٹے خدا کو یاد کرتے
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: ۲۰)	ہیں۔

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ	ایسے لوگ ہیں جنکو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور: ۵)	کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

نماز متحدہ طریقِ عبادت کا نام ہے دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کی جائے اسکا نام نماز ہے، پہلا طرزِ عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے اسکو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے، وہ تنہائی کا راز ہے جسکو اسطرح خاموشی سے ادا کرنا چاہیے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لئے اسکو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اسکے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اسکو جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی، دوسرے لفظوں میں ہم ان کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل، انفرادی طریقۂ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کیساتھ اوقاتِ مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنیکا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے، البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اسکو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے، جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا، کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا، اب تنہا رہ کر بھی اس کو

وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظامِ وحدت کا اصول اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے، وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصل راز بلکہ سرّ الاسرار ہے، اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ "توحید" ہے، یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پردازی ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے، اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے، نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت آئین و طریق، اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا، جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنھوں نے دعوتِ محمدیؐ کو قبول کیا، فرض تھی، اب اگر انہیں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر چاہے منہ کر کے ادا کر لے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکارا ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں، کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔

غرض اس نظامِ وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار تھا۔ اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و اجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت و شکل میں، واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظامِ وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے، کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسبِ حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے۔ جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اُس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرزِ بیان میں ادا کی گئی ہیں، اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے

ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونیکا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی، اور اس لئے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری و باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا، اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جز، خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدۂ نیاز ادا کریں۔ غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کیے۔

اوپر گذر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے، جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، زمین پر سر رکھدیتے ہیں، نماز کے بھی یہی تین رکن ہیں، چنانچہ آغازِ عالم سے انبیائے کرامؑ نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی، کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھدینا (سجدہ)

ارکانِ نماز معلوم ہو چکا ہے کہ نماز، ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی، حضرت ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی۔

وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ	اور میرے گھر کو طواف کرنیوالوں، کھڑے ہونیوالوں رکوع
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (حج: ۴)	کرنیوالوں اور سجدہ کرنیوالوں کے لئے پاک و صاف کر۔

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلۂ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ	اے مریم! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کر
وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (آل عمران: ۵)	اور سجدہ کر اور رکوع کرنیوالوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس نمازِ مریمی میں بھی، نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور ان میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے مؤخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجود سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائیگا۔

فَاِذَا کُنْتَ فِیْھِمْ فَاَقَمْتَ لَھُمُ الصَّلٰوۃَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَۃٌ مِّنْھُمْ مَّعَکَ وَلْیَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَھُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَکُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِکُمْ (نساء : ۱۵)	جب تو ان میں ہے تو ان کے لیے نماز کھڑی کرنے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لیے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوتی ہے بس لامحالہ رکوع، قیام و سجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکانِ سہ گانہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع، پھر سجود۔

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظوں کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کردیے ہیں جن سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے، بہرحال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے، ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام "پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا" (پیدائش ۱۸-۲۲)

رکوع "اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند" (پیدائش ۱۸-۲)

سجدہ "اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پہ نظر کی، انہوں نے اپنے سر جھکائے، اور سجدے کیے" (خروج ۴-۲۱)

"تب ابرہام (ابراہیم) منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہو کر بولا۔" (پیدائش ۱۷ : ۳)

"تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہاں گدھے کے پاس رہو، میں اس لڑکے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کرکے پھر تمہارے پاس آملوں گا" (پیدائش ۲۲-۵)

"تب اس مرد (حضرت اسحاقؑ کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہے" (پیدائش ۲۴ : ۲۶)

"اور ایسا ہوا کہ جب داؤدؑ پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچا، جہاں اس نے سجدہ کیا" (۲ سموایل ۱۵-۳۲)

زبور میں حضرت داؤدؑ خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:-

"اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا" (زبور ۵ : ۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے، موجودہ انجیل میں دعا و نماز کا ذکر متی ۶-۵، ۱۷-۲۱، ۲۶-۲۶، مرقس ۱۴-۳۲، لوقا ۲۲-۴۱ وغیرہ میں ہے، طریقۂ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لیے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲-۴۱) اور دوسری میں (متی ۲۶-۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عہدِ بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر تورات یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے:۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ	وہ برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی
قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ	ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے
الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ (آل عمران :۱۲)	ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جوڑے نہ رہیں[1]۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔

اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے اب تک چلی آرہی ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے[2]"

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقفِ عام کر دیا۔ انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا۔ مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی، اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم و عمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لیے وہ ازل سے منتخب تھا۔

یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح و تہلیل اور ذکرِ الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے عملِ متواتر کے علاوہ خود قرآنِ پاک سے بھی ثابت ہے، خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَي الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ وَ	نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے
قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا	سامنے ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا
اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا	سوار ہو کر۔ (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو
عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ : ۳۱)	ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکرِ الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اسی کی تفصیل سورۂ نساء میں ہے اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے:۔

---

[1] فتح الباری ابن حجر، ج ۲، ص ۲۲۷ مصر۔ [2] مضمون صلوٰۃ ج ۳، ص ۹۶۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ (نساء : ۱۵)	پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے، بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو۔ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں، اول یہ کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ (نماز) کہا گیا۔ اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو صرف "ذکر اللہ" کہا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو "اقامت صلوٰۃ" (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الٰہی، تسبیح و تہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ "پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو" اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا، اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا، اور قرات کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے۔ اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے:

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے گو اس کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہؓ کو کس طرح کی نماز سکھائی، کیونکہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کیساتھ اس عہد سے لیکر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلّم ہے تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لئے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (بقرہ : ۳۱)	نمازوں پر (عموماً) اور بیچ کی نماز میں (خصوصاً) نگاہ رکھو، اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ : ۱)	اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر : ۱)	اور اپنے رب کی بڑائی کر۔

لفظ اَللّٰهُ اَكْبَرُ جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ (طور : ۲)	اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

پھر قرآن پڑھتے ہیں۔

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ط (مزمل : ۲)

قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں، جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ج وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ○ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (اسرائیل : ۴)

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمان کو پکارو، جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں، اپنی نماز بہت پکار کر پڑھ اور نہ بہت چپکے، بیچ کی راہ تلاش کر، اور کہہ کر حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا، اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اور نہ در ماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے۔ اور اس کی بڑائی کر، بڑی بڑائی۔

چونکہ اس کی یہ حمد سورۂ فاتحہ میں بہ تمام و کمال مذکور ہے اس لیے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں، اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں۔

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (بقرہ : ۵)

اور رکوع کرنے والوں کیساتھ رکوع کرو۔

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (حج : ۱۰)

اے ایمان والو جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تا کہ کامیاب ہو۔

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (واقعہ : ۲، ۳)

تو اپنے بزرگ پروردگار (رب عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (اعلیٰ : ۱)

اپنے برتر رب (رب اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے[1]۔

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورۂ حج (۱۰) ذکر ابراہیم) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوتی ہے سورۂ نساء (۱۵۔ ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے۔ پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرط بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے، یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے، قرآن نے کہا ہے۔

---

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب التسبیح فی الرکوع والسجود ۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق : ۱)   اور سجدہ کر اور قریب ہوجا۔

گویا سجدہ قربتِ الٰہی کی اخیر منزل ہے، شاید اسی لیئے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکامِ عبادت کا مجموعہ ہے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے، جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے، خدا کی تسبیح اور تحمید کا ارشاد ہے، دعا اور استغفار کی تعلیم ہے، دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے، رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے، اس لیے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہوگئے۔ اسی لیئے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قراءتِ قرآن، ذکرِ الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کیئے گئے ہیں ان کی مجموعی تعلیم کا نام نماز ہے، جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں، دوسری طرف ان احکام کی یکجائی اور ان میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے۔ کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے، جو چاہے سجدہ کر لے، جو چاہے صرف قیام کرے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قراءت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائض الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی نہ جماعت ہو سکتی، اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادتِ خاص کہا جا سکتا اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو اُمّت بناتی اور جماتی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعے اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی[1] اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آئندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہے اور پڑھی جا سکتی ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کے نماز کے پڑھنے کی تاکید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جس کو آپؐ نے تمام عمر نماز کی رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورۂ فاتحہ ہے جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے اسی لیئے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ   حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے،

---

[1] مؤطا امام مالک و صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ ؛

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (فاتحہ۔ ۱)

رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے)، (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں تو ہم کو راستہ سیدھا پر چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں، یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان، ہر نماز میں دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے[1]۔ یہ اسلام تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد و ستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے، عبادت کی ادا کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔ جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت "کل جہانوں کا پروردگار" زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان پر پھیلی ہیں سب سامنے آجاتی ہیں "جہانوں" کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل ہوتا ہے، سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، انسان ہوں کہ حیوان، چرند ہوں کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، کل مخلوقات، خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے، خدا کو رحمان رحیم" کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابل بیان لطف و محبت کے سمندروں کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے، "روز جزا کے مالک" کا خیال ہم کو اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے "ہم تجھی کو پوجتے ہیں" کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں "ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں" بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں، یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؛ اس کی شریعت کے احکام ہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا

کہہ دے (اے پیغمبر!) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے، اس کو مت مارو لیکن انصاف کے ساتھ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا

---

[1] جامع ترمذی، قرأت فاتحہ۔

بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا
الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُکَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا
وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ
ذَا قُرْبٰی ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۚ ذٰلِکُمْ
وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝
وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا
فَاتَّبِعُوْهُ ۚ

(انعام ۱۹)

خدا نے تم کو حکم دیا ہے شاید کہ تم سمجھو، اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے، یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیتے جب تم بات بولو تو انصاف کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو، اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو، اور یہ کہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراطِ مستقیم)، تو تم اسی کی پیروی کرو۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں "صراطِ مستقیم" کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کیساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا ناحق قتل نہ کرنا، یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری، بلا اثر و رعایت سچ بولنا، اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفاتِ عالیہ ہیں جن کو "صراطِ مستقیم" کی مختصری ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہے۔

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا، یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ
الصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ
وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (نساء ۹)

اور جو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا، یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ، ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔

اس بنا پر ہر نمازی جس صراطِ مستقیم اور راہِ راست کے لئے دعا کرتا ہے وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین) علیٰ قدر مراتب چل سکے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی کے سبب سے) اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں، یہ گمراہی ہے، اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے؛ پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں، دوسری کا نمونہ یہود ہیں جنہوں نے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے، مسلمانوں کی یہ دعا ہے کہ الٰہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورۂ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح کی

نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے، اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے اس کی نسبت فرمایا:۔

"جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے، اسکی نماز ناقص اور نامکمل ہے، خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان[1] دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، آدھی میرے لیے ہے اور آدھی اس کے لیے۔ بندہ جب الحمد للہ رب العالمین (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری ستائش کی" پھر جب وہ الرحمٰن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری تعریف کی" پھر وہ کہتا ہے مالک یوم الدین (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے "میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی" "اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ "ایاک نعبد و ایاک نستعین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا"۔

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کو جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے، یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل آجی وینک کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پُر معلومات مضمون لکھا ہے تھوڑی دیر کے لیے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"(اسلام کی رو سے) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہیے، ایک دفعہ محمدؐ نے ایک پُر نقش و نگار کپڑے کو اس لیے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اسمیں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، جسمیں محمدؐ نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے" محمدؐ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے، نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان حدیثوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے" اور اسکی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ "سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے"[2]۔

اس دعائے محمدیؐ کا موازنہ دوسرے انبیاءؑ کی مخصوص دعاؤں سے

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کے لیے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو، کوہِ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت حضرت موسیٰؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے، زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے مگر اسمیں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ "داؤد کی نماز" انجیل میں حضرت عیسیٰؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے، ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول اللہ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسن تدبیر، جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہو گا اور پتہ چلیگا کہ اسکی کیا بے مثالی ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لیے اسی کا انتخاب ہوا، اسی لیے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن کعب سے فرمایا تھا کہ نماز میں

---

[1] جامع ترمذی تفسیر فاتحہ و مسند ابن حنبل ج ۲ ص ۲۴۶ مصر

[2] یہ حدیث اوپر گذر چکی۔

جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ تورات میں اُتری نہ انجیل میں، نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے[1]۔" اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا تورات کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ تورات لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لیے کوہ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی، تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے اسوقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی۔

> "خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیما اور رب الفیض و وفا، ہزار پشتوں کے لیے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا۔" (٣٤-٦)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت مؤثر ہیں لیکن خاتمہ نہایت مایوس کُن ہے، پہلے فضل و رحمت کی امید دلاکر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤدؑ کی نماز کی دعا زبور باب ٨٦۔

داؤدؑ کی نماز

"اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سُن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دیندار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جسکا توکل تجھ پر ہے۔ رہائی دے، اے خداوند! مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں۔ اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند! میں اپنے دل کو تیری طرف اُٹھاتا ہوں کیونکہ تو اے خداوند! بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں" وافر ہے۔

اے خداوند! میری دعا سُن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سُنے گا۔ معبودوں کے درمیان اے خداوند تجھ سا کوئی نہیں اور تیری صفتیں کہیں نہیں؛ اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا آئیں گی۔ اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی۔ کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ دکھا، میں تیری سچائی میں چلوں گا۔ میرے دل کو یکطرفہ کر، تاکہ میں تیرے نام سے ڈروں، اے خداوند! میرے خدا! میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا۔ اے خدا! مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور

---

[1] جامع ترمذی، فضائل سورۂ فاتحہ ÷

> انھوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند! خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تاکہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوں کیونکہ تو نے اے خداوند! میری مدد کی اور مجھے تسلی دی :

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول، تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی، اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں :-

> "اے ہمارے باپ! جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آوے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔" آمین۔

نام کی تقدیس' خدا کی حمد' بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے جو دعائے قرآنی میں مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ کے لفظ سے ادا ہوا ہے، نیز استعارہ کی زبان میں "روز کی روٹی" سے مراد دنیاوی روٹی نہ لیجائے بلکہ روح کی غذا یا صراطِ مستقیم لیجائے، اور "قرض" سے مراد فرائض اور حقوق لیے جائیں جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں" "آزمائش" میں نہ ڈالنے اور "برائی" سے بچنے کے معنی وہی لیے جا سکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ "یہ ان کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں" :

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبانِ نبوت سے ادا ہوئیں، کتنی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیلِ دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے، "دعائے محمدی" تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے، خدا کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں' اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت "قرض" لینے پر آمادہ کرتے ہیں، نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے، خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور رکھے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا (یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لیکر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے، رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں، مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ

دعا کے اغراضِ ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لیے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے۔ طرزِ بیان خدا اور بندہ کے شایانِ شان ہے، درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں، اوصافِ الٰہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں، دعا میں عموم ہے وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے، الٰہیت اور روحانیت کا کمال، منتہائے نظر ہے، اس لیے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے، خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت وجلال، رحم وکرم، قدرت وشوکت، شفقت ورافت اور بندہ کے خشوع وخضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر اور پُر اثر بیان، سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟

نماز کیلئے تعینِ اوقات کی ضرورت نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقاتِ نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اس لیے کسی کام کے کرنے کے لیے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس دینِ کامل کو لیکر مبعوث ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولاجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کیساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کرلے کبھی وہ اسکو مستعدی کیساتھ بلا ناغہ انجام نہیں دے سکتا اسی لیے ہر منظم، باقاعدہ اور دوامی عمل کے لیے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے، اسمیں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گذر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گذرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آجاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے جاتے ہیں۔

اوقاتِ نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے یعنی اصولِ وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے، مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور اقلیموں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرۂ ہوا میں لگی ہوئی دوربین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالقِ عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے اور جہاں تک مطلع ومغرب میں نمایاں فرق نہ ہو گا یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہے گا، مختلف ملکوں میں طلوع وغروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی

حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اسوقت وہاں ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو صفوف ارض تو کجا ایک محلہ ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آسکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں اسی لئے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو تفلاؔ کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے :-

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہوگئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جسطرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکرگزاری (حمد) کرتا رہا۔۔۔۔۔ پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے۔" (۶-۱۰ تا ۱۴)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے :-

"پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچالیگا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا سو وہ میری آواز سن لے گا۔" (۵۵-۱۶، ۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے :

"پھر اس نے (حضرت عیسیٰ نے) اس لئے کہ انکو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا، ضرور ہے ایک تمثیل کہی (۱۸-۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی چنانچہ اعمال میں ہے :-

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا۔" (اعمال ۱۰-۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے۔

"پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے۔" (اعمال ۳-۱)

یونانی میں تیسرے پہر کی بجائے "نویں گھڑی" کو لکھا ہے، جس کو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰-۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

"اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا، ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰ) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا جب تم

دعا مانگو تو کہو۔ ۔ ۔ ۔ اس نے ان سے کہا، تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اس کے پاس آکر کہے اے دوست! مجھے تین روٹی ادھار دے" (لوقا۔ ۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں معروف تھے (لوقا ۲۲۔۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے۔ مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے "اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی[1]" بلکہ عربی ترجمے سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے[2] یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دواماً اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وفی الصبح باکرا قام وخرج الی موضع خلاء وکان یصلی ھناک یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کرلیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر)، دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵۔۱۶، ۱۷) میں، صبح کا مرقس (۱۔۳۵) میں، عصر کا اعمال (۳۔۱، ۱۰۔۳۰، ۳۰) میں ہے اور عشاء (رات) کی نماز کا لوقا (۱۱، ۲۲۔۳۹) میں!

نماز کے لیے مناسب فطری اوقات اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز مصروف دعا و نماز میں معروف رہتا مگر انسان کی فطری و طبعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آکر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حیّ علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے۔ تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرائے نقش ہو۔ اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع

---

[1] مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء [2] مطبوعہ مطبع ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۱ء۔

ہوتے ہیں تو ہر وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام وسکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لیے ضرور ہے کہ اسکا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لیے بیخبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لیکر اس جہان سے بیخبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اسوقت کی ان بند ہونیوالی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا، اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشاء سے لیکر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے یہ وقت صرف خواب راحت کے لیے موزوں ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، انھیں کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقاتِ نماز میں ایک نکتہ اوقاتِ نماز کی تعیین میں اسلام کے لیے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جبکہ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے، ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان، ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی جسکی روشنی قلوب انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کیساتھ نمودار ہوتا ہے پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکتِ نیمروز کو فتح کرکے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہوکر نقابِ شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی گل کیا[1] حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ملتِ ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دین محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی میں تھے۔ دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں، جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرۂ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرۂ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقاتِ انحطاط میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہوجاتا ہے اس وقت عشاء کی نماز ادا

---

[1] قرآن پاک سورۂ انعام: ۱۹ ؛

کی جاتی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر کیا ہے :-

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل۔ ۹)	نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، رات کی تاریکی تک، (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔

تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت، اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں[1]۔

اسلام میں طریق و اوقات نماز نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں اور کے کے رکعتیں کر کے پڑھنی چاہیے اور اس کے کیا کیا آداب و شرائط ہیں، ان سب کے لیے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ۔ ۳۱)	نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اور اللہ کے لیے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر (دشمنوں کا) خوف ہو تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔

اس آیت پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے، جس طرح خود قرآن پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریراً اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسلٍ متفقہ تواتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی و نگرانی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت رکھیں اور ان پر مداومت کریں۔ قرآن پاک میں نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ "محافظت" کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں، فرمایا :-

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ (بقرہ۔ ۳۱)	نمازوں کی نگرانی رکھو۔
وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ (معارج۔ ۱)	اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا ۱۲

وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ (مومنین: ۱)	اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔
وَھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ (انعام: ۱)	اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا:۔

اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج: ۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ، وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں، ارشاد ہے:۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (نساء: ۱۵)	بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لیے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں؟ ادائے نماز کے لیے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کیے ہیں۔ صلوٰۃ یا اقامتِ صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کے لیے مخصوص ہے لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح و تحمید اور یاد الٰہی کے لیے بولا جاتا ہے جس کا جزو اعظم تسبیح و تحمید ہے۔ احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں[1] اور اشعار عرب[2] و لغتِ عرب[3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کیساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہو سکتی، کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہو سکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہیے۔

۱۔ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (مزمل: ۱)	۱۔ رات کو کھڑا رہا کر مگر کچھ کم یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا لے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔
۲۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ (المومن: ۲)	۲۔ اور اپنے رب کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر
۳۔ وَسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (احزاب: ۶)	۳۔ اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔
۴۔ وَتُسَبِّحُوْہُ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (فتح: ۱)	۴۔ اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔

---

[1] صحیح مسلم باب الضحیٰ ما رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی سبحۃ الضحیٰ قط وانی لاُسبحہا نیز صحیح مسلم، باب جواز النافلۃ علی الدابۃ و باب وکنت اسبحہ فقام قبل ان اقضی سبحتی [2] اعشیٰ وائل کا شعر ہے وسبح علی حین العشیات والضحیٰ ولا تحمد الشیطان واللہ فاحمدا (شعراء الجاہلیۃ، ج ۳، ص ۲۶۵ [3] لسان العرب، ج ۳، ص ۳۰۱ مصر

۵۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ (اعراف: ۲۴)	۵۔ اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور پست آواز میں، صبح کو اور دوپہر کو یاد کر اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔
۶۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (انعام: ۶)	۶۔ اے رسول! ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔
۷۔ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ الخ۔ الآیۃ (نور: ۵)	۷۔ ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جنکو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔
ظ	
۸۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ (کہف: ۴)	۸۔ اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کیساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔
۹۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (طور: ۲)	۹۔ اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔
ش	
۱۰۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (ہود: ۱۰)	۱۰۔ اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں۔
۱۱۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ (بنی اسرائیل: ۹)	۱۱۔ نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا، بیشک فجر کا پڑھنا پُرحضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تہجد)
۱۲۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (دہر: ۲)	۱۲۔ اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر۔
۱۳۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ (طٰہٰ: ۸)	۱۳۔ کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔
۱۴۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ	۱۴۔ تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو اور جب صبح

تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (روم: ۲)	کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کرو۔
۱۵۔ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (ق: ۳)	۱۵۔ تو ان کافروں کے کہنے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد۔
۱۶۔ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ (نور: ۸)	۱۶۔ فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو، اور عشاء کی نماز کے بعد۔

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں۔ مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لیکر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسل ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ہیں، غدو، غداۃ، بکرۃ، فجر، قبل طلوع شمس اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل، عشی، اور قبل غروب شمس سے مراد عصر، دلوک الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من آناء الیل (کچھ رات گذرے)، غسق الیل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلاۃ العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے، اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جن میں خدا کی یاد اور تسبیح وتحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت، مظلومی اور بے سر و سامانی کے ساتھ ہوا تھا اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی، لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے، سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں آئی ہیں:

يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ	اے کملی اوڑھ کر سونیوالے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات
نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ	اٹھ کر نماز پڑھا کر، آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے
وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۭ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ	کچھ زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ کو عنقریب
قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ	ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں یعنی (شریعت کے مفصل
وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۭ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ	احکام اتارنے والے ہیں) بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے
سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ	میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے
(مزمل - ۱)	کیلئے زیادہ مناسب ہے، بے شبہ تجھ کو دن کے وقت بہت کام کی فرصت حاصل ہے؛

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برس تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی، کیونکہ جہاں وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (شعراء - ۱۱) (اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہوشیار کرو) کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے، وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے.

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ الَّذِيْ يَرٰىكَ	اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا
حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ	ہے جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے، اور نمازیوں میں
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (شعراء - ۱۱)	تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بیشک وہی سنتا اور جانتا ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے، جس کو نماز کے لیے جگانا چاہیے، ایسی پر خطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لیے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا، اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ۔ (طور: ۲)	اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار رکھیے، بیشک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر، جب تو رات کو تہجد کے وقت اٹھتا ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اسکی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی[1] اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلۂ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے، سورۂ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری ہے انھیں معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا۔ (دہر: ۲)	تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان میں سے کسی گنہگار یا اللہ کے ناشکر گذار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ہنوز "اصیل[2]" میں ظہر و عصر اور "من اللیل" (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی کیونکہ کل تین نمازیں تھیں، ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لیے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیتِ بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی "تسبیح و تحمید" باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہیں، حکم ہوتا ہے:-

أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ[3] وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ (ہود: ۱۰)	دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے

---

[1] صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبیر بن مطعم [2] اصیل۔ دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، اساس میں ہے۔ لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اسے اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں جو عصر کے لیے سورۂ روم میں استعمال ہوا ہے [3] طرفی النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا ہے۔ قبل طلوع الشمس وقبل غروبها۔ بالعشی والابکار۔ بالغدو والآصال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرہ اور غدو ہے، دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے۔

کہ انھوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نماز کے اقامت کا حکم دیا گیا ہے، اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں "تسبیح" کے بجائے باقاعدہ "صلوٰۃ" کی اقامت کا حکم آیا ہے اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ	پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور
وَلَا تَطْغَوْا۔	وہ جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے
	چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔

(ہود : ۱۰)

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں، ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارہ میں دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں، پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی، جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا، اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال و ابہام تھا، دوسری میں ظہر و عصر، اور تیسری میں مغرب و عشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں، اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں، سورۂ ق میں جو مکی سورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اوقاتِ خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر اے رسول صبر
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ	کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے
الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ۔	ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر

اور کچھ رات گئے (یعنی عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) سجدہ کر چکنے کے بعد (غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اسکی تسبیح کر)

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے۔ اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی، ایک کی نسبت کہا گیا۔ وَمِنَ الَّيْلِ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقاتِ نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لیے کیا گیا کہ یہ نسبتاً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا، زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں قبل غروب کی نماز کہا گیا ہے ہنوز تفصیل طلب ہے، جس کے اندر ظہر و عصر دونوں نمازیں داخل ہیں، چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے

---

[1] آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے اس لیے ادبار السجود سے ادبار الشمس مراد ہے جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اسکا ڈوب جانا ہے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کیلئے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا اس لیے کلام کی فصاحت کا اقتضاء یہ تھا کہ اب اس کیلئے دوسرا لفظ لایا جائے چنانچہ اس معنی کیلئے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے اس طرز ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کیلئے سجود شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ میں ہو تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ۔ تفسیروں میں حضرت علیؓ سے روایتیں ہیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔

اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکست کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں، چھٹے سال سے لیکر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ	اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو، اور جب صبح
تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ	کرو۔ اور اسی کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور تیسرے پہر
وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (روم: ۲)	کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔ تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں، ظہر کا بالاجمال، دہر، ق، طٰہٰ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طٰہٰ، ق اور روم میں، مغرب کا بالاجمال ہود، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح ق میں، عشاء کا بصورت صلوٰۃ اللیل، مزمل، طور اور دہر میں اور بصورت عشاء بالاجمال طٰہٰ، ہود اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے۔ تمام نمازوں کا بالاجمال تذکرہ بقرہ، اسراء اور طٰہٰ میں ہے۔ طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء، ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوٰتین اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے۔ پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل تھیں یعنی دونوں کو ایک لفظ "قبل الغروب" یا "اصیل" یا "طرف النہار" کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ آخری آیت میں جو سورہ روم کی ہے، ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کیساتھ آیا ہے۔ مگر شام کی نمازیں اجمال ہے یعنی مغرب و عشاء دونوں کو حِيْنَ تُمْسُوْنَ (جب رات کرو) کے ذریعے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں[1] اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے، احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

---

[1] مؤطا امام مالک، مسلم، ترمذی باب القصر فی الصلوٰۃ فی السفر والحضر، بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں فاضل ڈیلک کو بھی یہی شبہ ہوا ہے (دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی ہیں البتہ بضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے ہیں (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

اوقاتِ پنجگانہ اور آیت اسراء محدثین اور مورخین کا اتفاقِ عام ہے کہ نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی، گو اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلوٰۃ اسی معراج میں ہوئی، جسطرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا مگر اسکا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے سورہ اسراء (معراج) کی وہ آیت جسمیں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے حسب ذیل ہے :-

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى	آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک
غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْاٰنَ	نماز کھڑی کر اور فجر کی قراءت قائم کر، بے شک
الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (اسراء : ۹)	فجر کی قراءت میں حضور ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے اسمیں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ "دلوک" ہے۔ دلوک کے اصل معنی "جھکنے اور مائل ہونے" کے ہیں لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ "دلوک الشمس" یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے اور اہل عرب اسکو کن معنوں میں بولتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر، اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ غرض یہ کہ اوجِ کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں، ایک نقطۂ سمت الراس سے، دوسرا نقطۂ تقابل سے اور تیسرا دائرۂ افق سے۔ پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید، اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لیے ایک ایک نماز رکھی ہے، اسطرح "دلوک" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت "غسق اللیل" (رات کی تاریکی) ہے۔ یہ عشاء کی نماز ہے اور اسکو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیئے، جب آفتاب کا چہرۂ نورانی تو بر تو حجاباتِ ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں، صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی، فقہاء میں تاہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے، احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج میں عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کیجاتی ہیں کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کیلئے ہے بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ محض صورۃً دو دو نمازیں ایکساتھ ادا کیجا سکتی ہیں اسکی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے، حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقۃً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

"قرآن الفجر" (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے۔ یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ نمایاں ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کریگا اسلئے ضرور ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں اپنی بَری ظاہر کرے۔ بہرحال اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے، اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے، اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریع کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق مفسرین میں سے بعض نے "دلوک" سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے، اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں، اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کیے ہیں یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے، چنانچہ لسان العرب میں ہے:

ودلکت الشمس تدلک دلوکاً غربت وقیل اصفرّت ومالت للغروب، وفی التنزیل العزیز: أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ" وقد دلکت زالت عن کبد السماء ۔۔۔۔ وقال الفراء عن ابن عباس فی دلوک الشمس انه زوالها الظهر۔ قال و رایت العرب یذهبون بالدلوک الی غیاب الشمس ۔ قال الشاعر:۔	آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب ہوا اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب زرد ہو گیا اور غروب کیلئے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ "دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر" اور آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا۔۔۔ اور فراء نے کہا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ دلوک شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے:۔
هذا مقام قدمی رباح ذبّب حتی دلکت براح یعنی الشمس	"یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے اپنے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا۔
قال ابو منصور وقد روینا عن ابن مسعود انه قال دلوک الشمس غروبها وروی ابن هانی عن الاخفش انه قال دلوک الشمس من زوالها الی غروبها، وقال الزجاج دلوک الشمس زوالها فی وقت الظهر، وذلک میلها للغروب وهو دلوکها ایضاً يقال دلکت براح وبراح ای قد مالت للزوال حتی کاد	ابو منصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ دلوک شمس، "آفتاب کا غروب ہے" اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا ہے کہ دلوک شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لیے جھکنا بھی ہیں اور یہی اسکا دلوک ہے، محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براحِ براح یعنی آفتاب زوال کیلئے جھک گیا یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اسکو دیکھنا چاہے تو اسکی کرن کی شدت

الناظر يحتاج اذا تبصرها ان يكسر الشعاع عن بصره براحته ..... فان قيل ما معنى الدلوك في كلام العرب قيل الدلوك الزوال ولذلك قيل للشمس اذا زالت نصف النهار دالكة وقيل لها اذا افلت دالكة لانها في الحالتين زائلة ..... قال الفراء في قوله براح جمع راحة وهى الكف يقول يضع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد .

کو توڑنے کیلئے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے .... تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں، تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لیے آفتاب کو "دالکۃ" کہتے ہیں جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اسکو "دالکۃ" کہتے ہیں کیونکہ وہ ان دونوں حالتوں میں جھک جاتا ہے ... فراء نے کہا کہ اس قول (شعر بالا) میں جو براح کا لفظ ہے یہ راحت کی جمع ہے جسکے معنی ہتھیلی کے ہیں کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں:

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجاج[1] کہتا ہے:-

والشمس قد كادت تكون دنفا ادفعها بالراح كي تزحلفا
اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر پیلا ہو جائے — میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اسمیں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے، الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے۔ اسکا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے۔ دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اسوقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لیے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لیکر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں، بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں، حالانکہ اسکا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے۔ اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ:-

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں، ظہر جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے۔

---

[1] یہ شعر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں، اور لسان العرب میں دلف اور زحلف کے تحت میں، مذکور ہے:

عصر[2]، جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور مغرب[3]، جب اس کا کامل دلوک سمتِ افق سے ہوتا ہے[1]، اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرأت) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیتِ پاک سے جو سورۂ اسراء میں واقع ہے، اوقاتِ پنجگانہ میں اقامتِ صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہوجاتی ہے۔

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز اس آیتِ کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلانِ اولِ آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقاتِ پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر[2] ہے، اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے۔ پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد عصر پھر مغرب، پھر سونے سے پہلے عشاء، یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلے ہیں اس کے بعد صبح کی نماز ہے جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فصل ہے چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے۔ پھر خاموشی ہوجاتی ہے، یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہوکر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہوجاتا ہے یعنی ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لیے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے جو صبح سے ظہر تک ہے اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت سورۂ اسراء کی آیت کی طرح سورہ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقاتِ پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے:۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ	اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ، آفتاب نکلنے سے پہلے
وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ	اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے
فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (طٰہٰ : ۸)	کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر[1] ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر[2] ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء[3] مراد ہے اور دن کے کناروں میں ظہر[4] اور مغرب[5] ہے۔

اطراف النہار کی تحقیق یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ "اطراف" کا لفظ جمع ہے جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح اور شام، یا تین ہیں، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح، دوپہر اور شام، پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہوجاتا ہے اور ظہر غائب ہوجاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آجاتی ہے مگر پھر بھی صبح مکرر رہی رہتی ہے۔

---

[1] تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انھیں نمازوں کا باختلافِ روایت مراد ہونا مذکور ہے، حضرت ابن مسعودؓ دلوک سے غروبِ آفتاب اور حضرت ابن عباسؓ زوالِ آفتاب مراد لیتے ہیں، اسی طرح غسق اللیل کو بھی بعض لوگ مغرب اور بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوکِ شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء، اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقاتِ پنجگانہ کو بتاتی ہے۔ [2] سیرت ابن ہشام باب ابتداء فرضیتِ صلوٰۃ۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی "دو" پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین، "دو مشرق اور دو مغرب" ہے، دوسری جگہ انہیں کو "مشارق اور مغارب" کہا گیا ہے۔ سورۂ تحریم میں ہے فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں، قلوب (بصیغۂ جمع) نہیں ہو سکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے، اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں۔ اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں، یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک۔ اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں، صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے۔ لیکن چونکہ عصر کا ذکر قَبْلَ غُرُوْبِهَا کے اندر مستقل موجود ہے اس لئے متعین ہو گیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقۂ ثبوت اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقاتِ پنجگانہ کا استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مثلاً:-

١۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ (اسراء: ٩) زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔

یہ ظہر کی نماز ہے۔

٢۔ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (ق: ٣) اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (دہر: ٢) اور اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر[1] کو۔

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (بقرہ: ٣١) (بیچ کی نماز) سورۂ بقرہ میں اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

٣۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (ہود: ١٠) اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی کناروں) میں نماز کھڑی کر۔

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

٤۔ سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نور: ٨) صبح کی نماز سے پہلے۔

اس سے نماز صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ اور عشاء کی نماز کے بعد۔

اس کی رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اُتار دینے کا وقت ہے، ایسے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقات نماز ہیں۔

نماز پنجگانہ احادیث و سنت میں تمام انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص تفوق و امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لیکر آئے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی۔ اور نہ وہ

---

[1] الاصیل الوقت بعد العصر الی المغرب (صحاح جوہری و لسان العرب)

کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرمادی اور خود عمل فرما کر اور اپنے تمام پیروؤں سے اس کی تعمیل کرواکر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہ کی جڑ کاٹ دی، اسلام نے جس روزانہ طریقِ عبادت کو پیش کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اسکے تمام ارکان و آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرمادی۔ اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک قولی و عملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، نماز کس طرح پڑھنی چاہئیے، اس میں کیا کیا پڑھنا چاہیئے، کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیئے، کس وقت کی نماز کی کے رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی صحابہ کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکمِ نماز کے بعد گذری، ایک دن، دو دن نہیں، کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعتِ مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے، یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلف نہ ہوا۔ اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ مدینہ کی مسجد نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنجوقتہ اعلانِ نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا یہ فرض ادا ہوتا تھا، آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروانِ محمدیؐ جہاں بھی رہے اور جہاں بھی پہنچے اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشہاد سفر و حضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے کیا ایسی مستمر، علی الاعلان، متواتر اور دائمی چیز میں کسی کو شک واقع ہو سکتا ہے۔ یہ اہتمام یہ اعلانیہ استمرار اور یہ تاکید بلیغ اس لئے فرمائی تاکہ جسطرح دوسرے پیغمبروں کا طریقِ عبادت بعد کے پیروؤں کے ترکِ عمل سے مشتبہ اور عدمِ صحتِ نقل سے مشکوک ہو گیا، خاتم الانبیاءؐ کی شریعتِ آخرین کا طریقِ عبادت اس سے محفوظ رہے کیونکہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آکر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی، چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدیؐ میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایۃً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں، نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیتِ خمسہ[1] کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعتِ سعید میں دیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے۔ حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری اُمت پر لکھی گئیں، جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں۔ قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ارشاد ہے کہ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام ۲۰) یعنی جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔ اس لیے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اُتر کر خود نماز کے طریقِ ادا اور اس کے اوقاتِ خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتداء اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی[2]۔ اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔

چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا۔ خدمتِ اقدسؐ میں آکر عرض کی یا رسول اللہؐ! آپ

---

[1] بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسراء۔ [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس۔

کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں کیا یہ سچ ہے؟ فرمایا ہاں سچ ہے، عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں[1]۔

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جبریلؑ اترے اور انھوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی۔ یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک، دو، تین، چار، پانچ گنتے جاتے تھے[2]۔ ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں، نہیں رہے گا۔ فرمایا تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے[3]۔ اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آجائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے، پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس وقت ہے[4]۔

ابو برزہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قراءت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا، اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے[5]۔ حضرت جابرؓ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا، اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے[6]۔ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی، مغرب میں سورۃ المرسلات پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی، عشاء میں اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قراءت کی ہے اور صبح میں سورۂ طور پڑھی ہے[7]۔

اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہے اور روایتوں پر کیا موقوف ہے اس وقت سے آج تک تمام اہتیانِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابلِ تردید حجت ہے[8]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب الزکوٰۃ من الاسلام ص ۱۱۔ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ص ۲۴، ۲۵ مصر۔

[2] صحیح بخاری و صحیح مسلم و مؤطا باب اوقات الصلوات الخمس۔

[3] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الصلوات الخمس کفارۃ۔

[4] صحیح مسلم باب اوقات الصلوات الخمس۔

[5] صحیح بخاری باب وقت الظہر عند الزوال۔

[6] صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا۔

[7] ایضاً باب القراءۃ فی الظہر والعصر والمغرب والعشاء والفجر بروایات متعددہ۔

[8] چونکہ بعض مستشرقین نے دانسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات نماز میں غلط فہمی پھیلانی چاہی ہے اسلئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

تہجد اب نفل ہو گئی لیکن کیوں؟ اب نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے نفل ہو گئی۔ چنانچہ پوری آیت یہ ہے :-

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ	نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر، عصر،
وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ	مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قراءت قائم
كَانَ مَشْهُوْدًا وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ	کر بیشک صبح کی قراءت میں حضور ہوتا ہے اور
بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ	رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ
رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (اسراء : ۹)	نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابلِ تعریف مقام میں اٹھائے۔

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب وہ دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہو گئی اور حکم آیا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو[۱]) اس کے بعد اس آیتِ پاک میں جب اقامتِ صلوٰۃ کے اوقاتِ پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز (تہجد) کی فرضیت ساقط ہو گئی، یہاں ایک قابلِ ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیتِ پاک اوقاتِ نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہو گئی۔

قبلہ انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر اوقاتِ نماز کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہوگا، اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دیدی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم، کوئی اُتر اور کوئی دکھن رُخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدتِ نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے[۲]۔ آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے تھے، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں، اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں، اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رُخ کرتی تھیں یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ اسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنا لیا تھا، شامی عیسائی بھی اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے[۳]۔ بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا تورات سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوب کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے

---

[۱] صحیح مسلم ج ۱، باب وجوب قراءۃ الفاتحہ حدیث ارجع فصل فانک لم تصل نیز دیکھو فتح الباری ج ۱، ص ۲۹۲

[۲] الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ [۳] یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ "قبلہ" میں ہیں۔

اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر "بیت ایل" بنالیتے تھے[1]۔ قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رُخ بنائیں اور نماز ادا کریں۔

وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ (یونس: ۹)	اور اپنے گھروں کو قبلہ رُخ کرلو اور نماز کھڑی کرو۔

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعۂ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے۔ حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے:-

"لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف۔ تجھے سجدہ کروں گا" (۵-۷)

سلاطینِ اول میں ہے:-

"جب تیرا گروہ لڑائی کے لیے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے جہاں کہیں تو انہیں بھیجے اور خداوند کے آگے دعا مانگے، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا"۔ (۸-۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے:-

"اور اس زمین کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا، تجھ سے دعا مانگیں" (۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی اس لیے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے:-

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (بقرہ: ۱۸)	اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے جدھر وہ منہ پھیرتی ہے، تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے، ستارہ پرست، یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رُخ یعنی مشرق کو اور صابئی (ستارہ پرست) قطب شمالی کو، عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے مظہر یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے۔ موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔

ابراہیمی قوموں میں اس قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانۂ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاقؑ اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی، دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے تھے جنھوں نے اس کو قبلہ بنالیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانۂ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے

---

[1] سفر تکوین باب ۱۲-۸ ، ۱۳-۴ ، ۲۸-۱۷ ، ۱۹ ۸ ، ۲۱-۱۲ ؛

پڑھا کرتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانۂ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے تھے، کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملتِ ابراہیمی کے لیئے وہی ابراہیمی مسجد (خانۂ کعبہ) قبلہ قرار پائے جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا	اور خدا ہی کے لیئے ہے پورب اور پچھم، تو جدھر رُخ
فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ	کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے، بیشک اللہ بڑی گنجائش
عَلِيْمٌ (بقرہ: ۱۴)	اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیتِ کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے:۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ	بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان
عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ	کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا جس پر وہ تھے، کہدے
الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ	کہ پورب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (بقرہ: ۱۷)	ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	پھیرو البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتاب اللہ
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اسکی محبت
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ	کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں، یتیموں،
ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ	غریبوں، مسافروں سائلوں اور غلاموں کو (آزاد
وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ	کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ	اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ	سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے
فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ	ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور

الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ۔ ۲۲) یہی پرہیزگار ہیں۔

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رُخ کیا جائے عبادت کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں ہے لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام و وحدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لیے س۲ھ میں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ۔ ۱۷) لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جا سکے۔ اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بہ یک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہیں، جس سے ایک لطیف رمزیہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اسکا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیۃً خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں۔

۱۔ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے، ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی مثلاً چراغ، کوئی مومی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گذرا، بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے مثلاً بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر و کواکب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا، مثلاً شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا، اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع اور بیاضِ سحر کا دیباچہ تھی، دینِ توحید کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

۲۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جا سکتا تھا، مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لیے ضرور تھا کہ اسکی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے نمار ستاروں کا طلوع و غروب کا لحاظ کیے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لیے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے متعلق وجہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دینِ توحید کا دینِ شرک بن جانا لازمی تھا۔

۳۔ اسی لیے ملتِ ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدیں

کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا، اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی اور دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

۴۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ، بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا (آل عمران: ۱۰)	بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لیے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ میں ہے
وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ (بقرہ: ۱۵)	اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے کھمبے اٹھا رہے تھے۔

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:-

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (بقرہ ۱۷۱)	اور جنکو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں (خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا) حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے، لکھتا ہے۔

> کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیمؑ) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے، دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد تھا (اسحٰق) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لیے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہیں یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلیتوں کے نام ۲۲۔۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بعید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں "اب کے یروشلم" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کیے تھے۔ ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی "غلام اولاد" نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔ سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی اور فساد

کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا یہ ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصٰی) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانۂ کعبہ کا قبلہ بن جانا گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتداء کا اعلان تھا جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بسلسلۂ معراج

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ (بنی اسرائیل : ۱)	پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانۂ کعبہ) سے اس مسجد اقصٰی (بیت المقدس) تک لے گیا جسکے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیلی سے تھا (یعنی خانۂ کعبہ) وہ عہد کیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے :-

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ مُصَلًّی ؕ وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ۔ (بقرہ : ۱۵)	اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا تو اسنے ان باتونکو پورا کیا، خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانیوالا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا میرا عہد ظالمونکو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیمؑ کے کھڑے ہونیکی جگہ نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیئے پاک رکھو۔

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانۂ کعبہ قرار پایا جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لیے حکم ہوا :-

وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْھَکَ	اور تو جہاں بھی نکلے، مسجد حرام ہی کی طرف

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (بقرہ ۱۸۰) منہ کر۔

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رُخ ہی کر لے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لئے قبلہ کی تعیین کے موقع پر فرمایا:-

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۴) پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں، نہ مشرکوں، بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دُعائیں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے نہ اس کی دُہائی دی جاتی ہے، نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جاکر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے، سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں۔ گھمسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔ یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دینِ محمدیؐ کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف رُخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ "جو ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے وہ مسلمان ہے"[1] اگر خیال کے پر پرواز سے اُڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئیگا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ کر سکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنا دے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا کیونکہ صرف چند سیکنڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراتا اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلۃ۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی اور جسطرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے اس کے لحاظ سے اسوقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا اسی لیے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی۔ جب مدینہ منورہ آکر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں کر دی گئیں لیکن مسافر کے لیے وہی دو رکعتیں[1] قائم رہیں کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے جو اس تخفیف کی علت تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لیے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لیے دو اور بحالتِ خوف ایک[2]۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام و سفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا اور صبح میں کچھ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے "مغرب میں تین اس لیے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لیے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دی گئی ہے[3]"۔

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گذر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کیوقت نماز کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا[4] مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اہلِ توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری براءت ظاہر کریں اسی لیے اسوقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونیکا ثبوت مل سکے[5]۔ یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع و خشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں۔ بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنیوالا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ نیز نماز کے خشوع و خضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا۔ اسلیے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال و انحطاط جس کو غروب کہتے ہیں اسی وقت ہوتا ہے اسلیے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہیے۔ اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے۔

اوتروا یا اھل القرآن فان اللہ	اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا
وتر یحب الوتر (ابو داؤد)	بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام و سکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے طبیعت موزوں ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اسوقت سراپا اثر مجسم کیف نظر آتا ہے اسلیے

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ و صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر و مسند ابن حنبل ج ۶ ص ۲۴۱ و ابن خزیمہ و ابن حبان والبیہقی (فتح الباری ج ۱ ص ۳۹۲) [2] صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر [3] مسند احمد بن حنبل ۶-۲۴۱ [4] صحیح مسلم النہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث [5] عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے یعنی تین جورات کی نماز ہے۔

وقت نماز و دعا کے لئے خاص طرح سے موزوں ہے اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے :-

اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (بنی اسرائیل ۔ ۹) صبح کی نماز کی قراءت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔

اس بنا پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصلی کیفیت کو پیش نظر رکھا یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں مگر حکم دیا گیا کہ قراءت لمبی کر دی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لیکر سو آیتوں تک قراءت کرتے تھے[1]۔ اور اسی نسبت سے رکوع و سجود بھی ہوتا تھا[2]۔

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثناء عامل بھی ہیں تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آ کر ایک رکعت ادا کرے اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کیساتھ ایک، اور اگر وہ دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے، تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں، جب نماز خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نماز قصر کی آیات سورۂ نساء کے پندرھویں رکوع میں ہیں۔

نماز کے آداب باطنی قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لیے متعدد لفظ آئے ہیں مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح اور ذکر الٰہی یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب کو ظاہر کرتے ہیں، نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گل بے رنگ اور شراب بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

اقامت صلوٰۃ ، نماز پڑھنے کے لئے قرآن پاک میں جابجا "اقامت صلوٰۃ" (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اسکے آداب و ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں۔ چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت ، نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب القراءۃ [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ وتخفیفہا فی تمام ؛

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ (بقرہ : ۳۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا۔ نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے کیونکہ نماز میں ذکر و قراءت، تسبیح و استغفار، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے اگر انہیں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اسی قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

خشوع: تیسری چیز خشوع ہے چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے۔

الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔ (مومنون : ۱)

(وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں۔

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں۔ بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت، عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب) اس لئے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے۔ اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہو گئی۔

تبتل: تبتل کے اصلی معنی "کٹ جانے" کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا، ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے، سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے۔ چنانچہ سورۂ مزمل میں ہے:۔

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ
انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ
الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا
ثَقِيْلًا اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْـًٔا
وَّاَقْوَمُ قِيْلًا اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ
سَبْحًا طَوِيْلًا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ
وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (مزمل : ۱)

اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات
اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم و بیش اور
اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات
اتارنے والے ہیں، بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس
کو خوب زیر کرتا ہے اور مؤثر ہوتا ہے، تیرے لئے دن کو
بڑی فرصت ہے۔ اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر
چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اسکی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں، صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کرکے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوا، پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہا

کیا جسکا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کیلئے ہر چیز سے خالی کر لیا (وفرغ قلبہ للّٰہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو، یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرع: تضرع کے معنی زاری اور عاجزی، اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت ہونی چاہیئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط (اعراف: ۷)	تم اپنے پروردگار کو مسکنت و زاری کیساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو۔

اخلاص: نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہوگی اور بعض اہلِ حق کے نزدیک شرک لازم آئیگا۔ فرمایا:۔

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ	اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رُخ کو ٹھیک رکھو اور
مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ط (اعراف: ۳)	خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لیئے ضروری ہے۔

ذکر: نماز خدا کی یاد کے لیے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی اس لیئے فرمایا:۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ: ۱)	میری یاد کے لیئے نماز کھڑی کر

ظاہر ہے کہ "یاد" صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیئے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم و تدبر: نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا اس لیئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں، فرمایا:۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى	نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء: ۷)	(اتنا ہوش آجائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اسکے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اسی بنا پر آپؐ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم و تدبر سے عاری ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز میں جب تم پر نیند غالب آجائے تو سو جاؤ کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو"[2] دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیئے تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے"[3] حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کرلے تو وہ ایسا ہو

---

[1] صحیح مسلم جلد اول باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ باب امر من نعس فی صلاتہ ج ۱ ص ۲۱۲

[3] بخاری و ابوداؤد و مسند احمد عن انسؓ۔

ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا[1]۔

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا، نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لیے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں:۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ	پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے
سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ (ماعون: ۱)	ہیں جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔

ذرا ان الفاظ پر غور کیجیے "ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں، پھٹکار ہو" نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کے لیے جو ظاہری آداب، مثلاً وقت کا لحاظ اور وادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب، مثلاً خشوع و خضوع، تضرع و زاری اور فہم و تدبر وغیرہ ضروری ہیں، ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گزشتہ آداب کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپ نے نماز کی اصل حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک شخص نے آکر نہایت عجلت میں نماز پڑھی، آپ نے فرمایا اے شخص! اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے دوبارہ اسیطرح نماز ادا کی، آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا۔ جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا "اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قراءت کرو، اس طرح اطمینان و سکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو[2]۔"

نماز میں نظر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ میں فرق اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز میں اِدھر اُدھر نہ دیکھا کرو، کیا تمھیں یہ ڈر نہیں کہ تمھاری نظر واپس نہ آسکے[3]۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اسکی طرف ملتفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے[4]۔ طبرانی میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر اِدھر اُدھر نہ دیکھو کیونکہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو[5]۔ مسند بزار میں ہے کہ جب بندہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے؟ تو میری طرف دیکھ"۔ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے۔ پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے، تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے[6]۔

---

[1] مستدرک (ترغیب و ترہیب حافظ منذری جلد اول ص ۲۰۲ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہیے ورنہ چاہیے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں پڑھتے ہیں، انکے معنی ذہن نشین کر لیں اور یہ ہر مسلمان کے لیے بہت آسانی سے ممکن ہے بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم وابوداؤد کتاب الصلوٰۃ [3] مسند احمد بن جابر بن سمرہ [4] مسند احمد جلد ۵ ص ۲۰۲ وابوداؤد باب الالتفات فی الصلوٰۃ [5] طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرۃ بحوالہ کنزالعمال جلد ۴ ص ۱۰۸ [6] کنزالعمال ج ۴ ص ۱۰۸۔

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا "سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے"، صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا "رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا"[1]۔ ایک دفعہ آپؐ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ "اے فلاں! تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتیں کرتے[2]"۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا، کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہیں بجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے۔ تو اپنے ہی فائدے کے لئے نماز پڑھتا ہے[3]"۔ نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے، آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ "نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو[4]"۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے[5]"۔ مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے[6]"۔

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں ارشاد ہوا کہ "جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو[7]"۔ اس سے اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑیا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے مثلاً بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھا لینا چاہئے تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو[8]، اسی طرح اگر استنجا یا قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت حاصل کر لی جائے تب نماز پڑھ لی جائے[9]۔

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے، لیکن مدینہ آکر یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔ ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انھوں نے اس کا ذکر کیا، فرمایا[10]۔

ان فی الصلوٰۃ شغلاً — نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش و نگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز

---

[1] مسند احمد بن قتادہ، ودارمی باب من لا یتم الرکوع والسجود وابن ابی شیبہ وابن خزیمہ وابن حبان وعبد بن حمید وعبد الرزاق وطبرانی فی الاوسط، اخیر لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے [2] مستدرک حاکم فی الصلوٰۃ ج ۱ ص ۲۳۶ (علی شرط مسلم) [3] صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الامر بتحسین الصلوٰۃ [4] صحیح مسلم کتاب المساجد باب النہی عن البصاق فیہا وحاکم فی المستدرک وابوداؤد [5] صحیح بخاری ومسلم کتاب الصلوٰۃ والمساجد [6] ایضاً باب النہی عن البصاق فیہا [7] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار [8] صحیح بخاری ومسلم وابوداؤد وترمذی باب کراہۃ الصلوٰۃ بحضرۃ الطعام [9] صحیح مسلم وابوداؤد وموطائے امام مالک وترمذی وحاکم فی الصلوٰۃ [10] صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ۔

پڑھی، پھر فرمایا "اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لیجاؤ اور انبجانی سادہ چادر لے آؤ[1]"۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا، آپؐ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی، آپؐ نے اس کو اتروا دیا[2]۔

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میسر ہوتا ہو اسی لئے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہیے تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے اس لئے ذرا توقف کا حکم دیا گیا، گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے اس لئے فرمایا کہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے اس لئے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

فانّ الصلوٰۃ مشہودۃ محضورۃ[3] کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے، گذر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپؐ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو بہرحال تم کو دیکھ رہا ہے[4]، کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے، ایک صحابی جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے[5]۔

رات کی نمازوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر عجیب ذوق و شوق کا عالم طاری ہوتا تھا، قرآن پڑھتے چلے جاتے جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم و کرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے[6]۔ آپؐ نے فرمایا کہ نماز دو دو رکعت کر کے ہے، اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع و زاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی ہے اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب! اے رب! کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے[7]۔"

ایک دفعہ آپؐ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قراءت کر رہے تھے، آپؐ نے فرمایا "لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے، تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو[8]۔"

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ "جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو[9]"، کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم باب کراہۃ الصلوٰۃ فی ثوب لہا اعلام [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس [3] صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث [4] صحیح بخاری کتاب الایمان [5] ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ [6] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۹۲ [7] ابوداؤد باب الصلوٰۃ النہار و ترمذی باب ما جاء فی التخشع فی الصلوٰۃ ص ۱۷، مطبوعہ دہلی [8] ابوداؤد صلوٰۃ اللیل [9] مسند احمد، جلد ۵ ص ۴۱۲ عن ابی ایوب

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لیکر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے، اسی لیے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ
بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ
(انعام : ۱۱)

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننا اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے۔ متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے، ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا اب اکسیر بن جاتا ہے۔

۱۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز "ستر پوشی" کا خیال ہے، انسان کا، شرم و حیا کی نگہداشت کے لیے، اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے بلکہ شہر کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی۔

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف : ۳) ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

مردوں کے لیے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لیے پیشانی سے لیکر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور

تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آئی ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے، اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقراء کے بعد دوسری ہی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر: ۱)	اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اور اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو۔ اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت ونظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے، آپؐ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ "یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اس قسم کی نجاستوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔" اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو، ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپؐ گذرے تو فرمایا کہ "اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا" غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لیے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک وصاف رہنے کا خوگر بنایا۔ اور استنجا وبیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں:

نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہؓ طہارت کا اہتمام کرتے تھے خدا نے ان کی مدح فرمائی:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (توبہ: ۱۳)	اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک اور صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے

جب اسلام نے طہارت وپاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کر سکتا ہے۔

۳۔ نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے

7 نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصولوں پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنجوقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے تھے، جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ "اگر میری امت پر یہ شاق نہ گذرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا"

اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رکھتے تھے اس لیے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

غسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم (بخاری، کتاب الجمعہ)

جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا:-

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ: ۲)

اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

۴۔ پابندیِ وقت انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام اوقات مقررہ اوقات پر انجام پائیں۔ انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے اس کو پابند اوقات بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں اس لیے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں۔ وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی کا مقولہ ہے۔

الصلوٰۃ مکیال فمن اوفی بہ ومن طفف فقد علمتم ما للمطففین[1]۔

نماز ایک پیمانہ ہے جسنے اس سے پورا ناپا اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

۵۔ صبح خیزی طب اور حفظانِ صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوعِ آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نمازِ عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے[2]۔ تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو موذن کی پُرتاثیر آواز :-

الصلوٰۃ خیرٌ من النوم

سونے سے نماز بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے۔

۶۔ خدا کا خوف ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اسکا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحمتِ الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے اسکو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں، غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے، اور برائیوں سے بچاتی ہے۔ اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ (العنکبوت : ۵)

بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

۷۔ ہشیاری نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیاتِ الٰہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لیے دعائے مغفرت کا نام ہے اسلیے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھو دیں، نماز کی حقیقت کی منافی ہیں، اسی لیے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی اسکو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا۔

لَا تَقۡرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡتُمۡ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعۡلَمُوۡا مَا تَقُوۡلُوۡنَ (نساء ، ۷)

نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں، قطعاً پرہیز کریگا۔

---

[1] کنز العمال بسند، باب الصلوٰۃ ج ۴ ص ۲۳۰ بحوالہ مصنف عبدالرزاق [2] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء۔

۸۔ مسلمان کا امتیازی نشان مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے اسکے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اسمیں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اسکی اصلاح کر دی، زکوٰۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہو سکتی تھی۔ فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا تھا کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بآسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ (نساء : ۲۱)	اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

نیز فرمایا:-

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ (بقرہ: ۵) خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔

خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

لیس صلوۃ اثقل علی المنافقین من الفجر والعشاء[1]	منافقین پر فجر و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "جب ہم (صحابہؓ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے، تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے[2]"

مدینہ میں آکر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے۔ مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لیے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے، اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ	اور جس قبلہ پر تم تھے اسکو ہم نے قبلہ نہیں بنایا لیکن اسلئے
اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ	تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں ان سے
مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ	الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ
لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ (بقرہ : ۱۷)	گراں ہوا لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل صلوٰۃ العشاء فی الجماعۃ [2] مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین)، ج ۱ ص ۲۱

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے[1]۔

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے:۔

كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجیوشہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی
اذا علوا الثنایا کبروا واذا ھبطوا سبحوا	پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اُترتا تھا تو تسبیح کہتا تھا،
فوضعت الصلوٰۃ علی ذلك (ابوداؤد)	نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے توانئے عمل کو بیدار کرتی ہے۔ جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمدِ باری میں مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجا لانا ضروری سمجھیں اور اس کے لئے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں، ہفتہ میں ایک دن نمازِ جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُرآرام سے پُرآرام وقت میں ممکن تھا مگر اس کے لئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نمازِ جمعہ کا ہر پابند شہادت دیگا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلاتِ وقت کے اتفاقات میں اس کے لئے کس قدر ممد ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔ تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیلِ اخلاق ہے لیکن اصلاحِ اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے۔ روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ فرائض نفس کو تنبّہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے۔ برخلاف ان کے نماز دن میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام و قعود، جہر و خفاء، تسبیح و تہلیل، تکبیر و تشہد نے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفسِ انسانی کو ہشیار اور قلبِ خفتہ کو بیدار کرتی ہے اس طرح نفس کو رات دن تنبّہ ہوا کرتا ہے۔

---

[1] بخاری باب فضل استقبال القبلۃ ۔

۱۱۔ الفت و محبت نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی۔ ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہیں گے۔ قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا
دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ (روم : ۴)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں
سے نہ ہو۔ ان میں سے جنھوں نے اپنے دین میں
پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۱۲۔ غمخواری بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ جب امیر و غریب سب ایک جگہ جمع ہوں گے اور امراء اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

ابتدائے اسلام میں اصحابِ صفہ کا ایک گروہ تھا جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہؓ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لیجا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گذر اوقات کرتا تھا۔ اکثر صحابہ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات و صدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ
يُنْفِقُوْنَ (بقرہ : ۱)

اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے
اس میں سے صرف کرتے ہیں۔

۱۳۔ اجتماعیت اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے تمام قوموں نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کیے ہیں جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں کانفرنسوں، آڈیٹوریموں اور دوسرے جلسے جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص و سرود، شراب خواری، قماربازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک و حسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی ہیں تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لیے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس سے قلب

انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کے بجائے نیکی کے رُخ کی طرف بہے چنانچہ اسلام نے اسی لیے روزانہ جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی، اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیاد ہی دعوتِ خیر پر رکھی گئی ہے۔ حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کیساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگیِ خیال اور اخلاصِ عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

۱۴۔ کاموں کا تنوع انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمہ رنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے بھی مفید کام سے دنیا چیخ اٹھے، اسی لیے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مفید طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی میں شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظامِ عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آکر توڑ دیا۔ پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی۔ پھر جو سلسلہ چھیڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا۔ بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشاء پر جاکر منتہی ہوئی، اب نیند آگئی اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا۔ وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے وہ اس روحانی "انٹرول" (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا ہے۔ وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح، اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لیے نئی قوت پیدا کر لی۔

۱۵۔ تربیت انسان کی عملی کامیابی استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا پھر اس پر عمر بھر قائم رہے اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو۔ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بار سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان میں استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے اس لیے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی اسی لیے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں فرمایا:۔

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (معارج: ۱) وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

احب العمل الی اللہ ادومہ وان قل محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو

(ابوداؤد باب مایؤمر بہ من القصد فی الصلوٰۃ)
ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔

۱۶. نظم جماعت کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو نمازیوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے شانے سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا انکی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے۔ جسطرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درستی پر موقوف ہے اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تک تم خوب ملکر کھڑے نہ ہو گے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔[1]

۱۷. مساوات یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی، حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ سب ایک ساتھ، ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لیے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ، روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ علم و دانش، فضل و کمال اور تقوی و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے۔

۱۸. اطاعت جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے نماز باجماعت مسلمانوں کی اسی زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیے جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لیے بانگِ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعتِ امام کے لیے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہیے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے۔ دوسری طرف امام کو اخلاق صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہیے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے۔ نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک دائمی حرکت ہے جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گذاری کے لیے تیار رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لیے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کو

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف عند الاقامۃ وبعدہا و ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب تسویۃ الصفوف۔

خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاروں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

۱۹۔ معیارِ فضیلت نماز کی امامت کے لئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے اسلئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحبِ علم (اقرأ) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہیں انھیں کو قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے اسی کمسن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا، اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویش و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲۰۔ روزانہ کی مجلسِ عمومی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ" (نماز جمع کرنیوالی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امر اہم سے اطلاع پاتے یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا جس کیلئے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل و سستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی واجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لئے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے اسی طرح جب مسلمان زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی۔ ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارۃ تھا، وہی دار الشوریٰ تھا وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درسگاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد افراد کے باہمی نظم و ارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لئے افراد کا اپنے ہر آرام و عیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلافِ باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام و قائد و سرِ لشکر مان کر اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کو نظم و جماعت، اطاعت پذیری و فرمانبرداری اور وحدتِ قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد و امامت ہے نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرما دیا:-

العهد الذی بیننا وبینهم الصلوٰۃ	ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز

فمن ترکها فقد کفر (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کا کام کیا۔ کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالبِ بے جان، شرابِ بے نشہ اور گلِ بے رنگ و بُو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

عرب کی روحانی کایا پلٹ وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی، اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی۔ اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں اس کی روح یادِ الٰہی کی تڑپ اور ذکرِ الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

دل را کہ مُردہ بُود حیاتے ز نو رسید ——— تا بُوئے از نسیمِ مَیَش در مشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ

وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (نساء: ۲۱) اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

دعوتِ حق اور فیضِ نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکرِ الٰہی سے غافل نہ کر سکیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ — ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید و فروخت
عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (نور: ۵) — کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔

اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لئے بیقراری تھی۔

يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى — جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے
جُنُوْبِهِمْ (آل عمران: ۲۰) — ہیں۔

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سوز و گداز، راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ — جن کے پہلو رات کو خوابگاہوں سے علیٰحدہ رہتے ہیں،
رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ — وہ خوف اور امید کیساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا یَرْكَعُوْنَ
(مرسلات : ۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔

اب ان کی یہ صورت ہو گئی کہ

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ (فتح : ۴)

تم انکو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ :۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ
الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ (زمر : ۵)

اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو انکے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، مکدر ہو جاتے ہیں۔

آفتاب نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا۔

اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ
(انفال : ۱، حج : ۵)

وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہؐ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے، خواہ وہ کھیتی کرتے ہیں یا تجارت یا محنت مزدوری مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یاد الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی۔ دیکھا کہ صحابہ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے[2]۔

صحابہؓ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ کر بسر کرتے تھے، یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی۔

اِنَّ رَبَّكَ یَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰی
مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ
مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَكَ ؕ (مزمل : ۲)

بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا۔ جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے، ذوق و شوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے، دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے، قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری باب التجارۃ فی البز مرسلاً [2] فتح الباری ج ۴ ص ۲۵۳ بحوالہ عبدالرزاق ۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ (شعراء ۔ ۱۱)

اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لیے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا:

یاایہا الناس اطعموا الطعام وافشوا السلام وصلوا باللیل والناس نیام (ترمذی)

اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور اسلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہیں۔

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ "عثمان! تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی"[1] حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے[2] ابوہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے، دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا[3] حضرت عبداللہ بن عمروؓ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی[4] حضرت ابو درداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گذار دیتے تھے، حضرت سلمانؓ فارسی ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے۔ جب رات کو حضرت ابو درداءؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا، حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے[5]۔ کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز قصداً قضا کی ہو، یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے، ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پُرخطر کام کے لیے کہیں بھیجا تھا، جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائیگا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی۔ اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے[6] سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی، چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دو مردوں کا سہارا لیکر مسجد میں حاضر ہوتے تھے[7] پھر وہ جس خضوع و خشوع، محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پُراثر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک بھی اس کا اثر ہوتا تھا[8] حضرت عمرؓ نماز میں اس زور

---

[1] ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ [2] ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبیؐ من اللیل [3] صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب التقشف [4] صحیح بخاری کتاب الصوم [5] ایضاً [6] ابوداؤد باب الصلوٰۃ الطالب [7] نسائی کتاب الامامہ باب المحافظۃ علی الصلوٰۃ [8] صحیح بخاری کتاب الصلوٰۃ باب اذا بکی الامام فی الصلوٰۃ۔

سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی[1]۔ حضرت تمیم داری ایک رات تہجد کے لیے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی، بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے[2]۔ ؎

شب شود صبح و ہماں محو تماشا باشم

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں[3]۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے[4]۔

ایک رات میدانِ جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لیے متعین ہوتے ہیں، ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے، کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے، نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں، ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا، جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورۃ شروع کی تھی، پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دوں[5]۔

اس سے بھی زیادہ پُراثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں، سر و گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آ جاتا ہے، فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تڑکا ہے اسلام کے دائرہ کا مرکز، فاروق اعظمؓ امام نماز میں ہیں، پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتہً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے، آپؓ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے، سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں، پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفۂ وقت کو اٹھایا جاتا ہے[6]۔

حضرت عمرؓ کو جب صبح کی نماز میں زخم لگا، اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لیے جگایا تو بولے ہاں! جو شخص نماز چھوڑ دے، اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی[7]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ و کتاب الصلوٰۃ، باب المسجد یکون فی الطریق [2] اسد الغابۃ تذکرہ حضرت تمیم داری [3] صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین [4] حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصابہ و اسد الغابہ وغیرہ [5] ابوداؤد و کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم

[6] صحیح بخاری واقعہ شہادت عمرؓ [7] مؤطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم۔

حضرت علی مرتضیٰ ؓ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہیں۔[1] امام مظلوم حسین ؓ بن علی ؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیا آپ کو نرغہ میں لیے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آجاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔[2]

نماز میں جس خشوع و خضوع کا حکم ہے، صحابہ کرام نے اس کے یہ نمونے پیش کیے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابو طلحہ انصاری ؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آکر چہچہانا شروع کیا۔ حضرت ابو طلحہ ؓ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ دل میں کہا اس باغ نے فتنہ برپا کیا، یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ راہِ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا، پھلوں کی طرف نظر اُٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ حضرت عثمان ؓ کی خلافت کا زمانہ تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا، راہِ خدا میں دیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عثمان ؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔[3]

---

[1] الریاض النضرہ للمحب الطبری [2] تاریخ طبری کبیر ص ۲۳۳۰ ج ۷ واقعات ۶۱ھ [3] یہ دونوں واقعے موطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب ما یشغلک عنہا میں مذکور ہیں

زکوٰۃ

وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم نماز کے بعد جسکا اصل تعلق خالق و مخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جسکا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جسکا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ باہم پہنچانا ہے، زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جسکا اطلاق تعمیم کیساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے لیکن فقہی اصطلاح میں "زکوٰۃ" صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے، جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں زکوٰۃ بھی اُن عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن اُنکے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بُھلا دیا تھا کہ بظاہر اُنکے مذہبی احکام کی فہرست میں اسکا نام بھی نظر نہیں آتا حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اسکی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جسطرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اسمیں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (بقرہ : ۱۰) (ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ (مائدہ : ۲) (اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔

حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے ذکر میں ہے :۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ کَانَ	اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر، بیشک وہ وعدہ کا
صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا وَکَانَ	سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے
یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ	لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے
عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا (مریم : ۴)	رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کہتے ہیں :۔

وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ	اور (خدا نے) مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور
مَادُمْتُ حَیًّا (مریم : ۲)	زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۔ ۲۷ ۔ ۳۰ ، ۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال (چاندی) واجب تھا (خروج ۔ ۳۰ ۔ ۱۳ ، ۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کیجاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارونؑ

کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونیکی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کیلئے رکھا جاتا تھا، اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۱ اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم، جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لیے رہتی تھی۲ ـــ حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی، بلکہ اُس کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا انجیل لوقا (۱۸ : ۱۰) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش، اور فخر کے لیے دیتا ہے' اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے"۔ اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت میں ہے۔

"اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے، اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے۔

"کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا آسان ہے مگر دولتمند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے"۔ (متی ۱۹/۲۴)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے (متی ۱۷/۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی، اسلئے ان ہی دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے، سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی اس لئے انکی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے، اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی، علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے، تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے، یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا، اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ (بقرہ : ۱۰)	(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) کہ نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنیکے احکام موجود تھے تاہم ان کے لیے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً رقم واجب الادا تھی، جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا اس نے نہایت خوبی اور دقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا، انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار

---

۱ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون خیرات (CHARITY) باب یہودیوں میں خیرات ۔ ۲ توراۃ خروج ۳۰ : ۱۶، ۳۸ : ۲۶

دیا، ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے، سونا، چاندی اور جانور، پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں، سونے چاندی میں چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا، جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی، اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا، اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ وحی میں نماز کے ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے، ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے، قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر "اقام الصلوٰۃ" کے بعد ہی "ایتاء الزکوٰۃ" آیا ہے مثلاً اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ یا اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اُس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہِ نبوی میں آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کیے ہیں تو ہمیشہ آپؐ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے، صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے، چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تین باتوں پر کی تھی، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا" وفد عبدالقیس نے ۵ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپؐ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔[1]

۱۰ھ کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے، تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے انکو توحید کی دعوت دینا، جب وہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز اُن پر فرض ہے، جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو اُن کے دولتمندوں سے لیکر اُن کے غریبوں کو دیجائے گی۔[2]

صحابہؓ میں جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہلِ عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے خلاف تلوار کھینچ لی، حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کریگا میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ خدا کی قسم! جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اسکو دینا پڑیگا۔" حقیقت یہ

---

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸ میں ہیں [2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ [3] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸۔

یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا[1]۔ اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے، اسلام کی تنظیمی زندگی فی الحقیقت دو بنیادوں پر قائم ہے، جن میں سے ایک روحانی نماز باجماعت ہے جو کسی مسجد میں ادا ہو کر قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ ہے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو کر مرتب ہوتا ہے اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی نے خاص زور دیا ہے۔ نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے، مگر اس کی فرضیت کے بعض مقاصد فوت ہو جاتے ہیں یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے، تو شریعت محمدی کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا، اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سر رشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دستگیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت، نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی، اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا، بعض مورخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۲ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اس سے پریشانی ہوئی ہے، حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا، اس کی مقدار، نصاب، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے، خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم "نماز" اور دوسرے کا "زکوٰۃ" ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے بعثت کے وقت آپؐ کی نسبت فرمایا، "آپؐ قرابتداروں کا حق پورا کرتے ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں غریب کو کماتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کی مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں"[2]، غور کرو کیا زکوٰۃ ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے،

---

[1] درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ...... فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (توبہ: ۱۰) ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ...... تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دیدو، و نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۹۶ باب کراہیۃ الاختلاف۔ [2] صحیح بخاری جلد اول باب اول:

سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورت ہے لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکامِ اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا، اسمیں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (مدثر:۱)	اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر:۱)	اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائلِ زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں، مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری، اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا (مزمل:۲)	اور نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبش گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے، اسمیں ہے "اور پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں، اور زکوٰۃ دیں[۱]"۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپؐ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی[۲]۔ ۶ھ میں جب نجاشی نے نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ و صدقہ[۳] کا بھی تذکرہ کیا، ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۵ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔

لیکن چونکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا، بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا، اسلئے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزا اور انکے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی، مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی انکے لیے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں، چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (بلد:۱)	اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی (قرضدار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناطے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

عام قریش پر جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا عتاب آیا:

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ؕ (الماعون:۱)	وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا

---

[۱] مسند احمد جلد اول ص ۲۰۲۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ [۳] صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوٰۃ و کتاب التفسیر۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الفجر : ۱)

یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کو کھلانے کی تاکید نہیں کرتے

اور مسلمانوں کے اخلاص، باہمی ہمدردی اور ان کے جذبۂ ترحم کی تعریف فرمائی کہ :

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (دہر : ۱)

اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج، یتیم، اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو صرف خدا کیلئے کھلاتے ہیں تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

مدینہ منورہ آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچا پکا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ سنہ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا[1] یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی انہوں نے دریافت کیا، یارسول اللہ! ہم کیا خیرات کریں۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ (بقرہ : ۲۷)

وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں

ارشاد ہوا :۔

قُلِ الْعَفْوَ (بقرہ : ۲۷)

کہدو (اے پیغمبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اسکو خیرات کرو)

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جسکا مطلب ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں آئندہ کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھیں[2] کہ اسوقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (بقرہ : ۳۷)

اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کریں اُنمیں سے کچھ خیرات میں دو۔

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے اُن کی تعریف کی کہ۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (بقرہ : ۱)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اسمیں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا، خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے، چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہؓ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جسکے پاس نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے، انہوں نے پھر گذارش کی کہ جس میں اسکی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے، فرمایا کہ وہ فریاد خواہ حاجتمند کی مدد کرے، انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا "تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا

---

[1] تاریخ طبری یورپ، ص ۱۲۸۱ [2] کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری ج ۳ ص ۲۱۶ ÷

صدقہ ہے۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پُر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جاکر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔[2]

لیکن بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اسکا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا، رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کر دیا، اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ: ۱۳) (اے محمد رسول اللہ) انکے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اسکے ذریعہ سے تم انکو پاک صاف کر سکو۔

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے، اسکی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی، یہ تمام احکام و قوانین سورۂ برأت میں مذکور ہیں جو ۹ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط و تفریط تھی۔ توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا (استثناء ۱۴: ۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین نہ تھی، اس بناء پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعیین تھا، کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اُکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں، مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اُٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی، کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کیلئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے، جسکی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور انکا بیوپار کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذریعوں کیلئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف گذر جائیں تاکہ پورے سال کے آمد و خرچ اور نفع نقصان کا میزان لگ سکے اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صناع ہر ایک اپنی آمدنی و سرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے؛ بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک[5] سال لگتا ہے! ان تمام وجہوں سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس، وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے، شریعت محمدی نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اسنے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے؛ چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورہ توبہ میں موجود ہے جسمیں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس دن

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ [2] ایضاً [3] ابن سعد جلد مغازی ص ۱۵ [4] تاریخ طبری جلد ۴ ص ۲۲۲، مطبوعہ یورپ [5] بکری کی مدت حمل چھ مہینے گائے کی نو اور اونٹ کی گیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہے۔

یَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (توبہ: ۵) اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

زکوٰۃ کی مقدار توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقدی میں آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے، نقد و دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے، اسلئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا، انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد و سیاسی (پولٹیکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لیے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی، اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دیدی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال کم و بیش جو چاہے اور جب چاہے خدا کی راہ میں دیدے، اس کا نام **انفاق** یا عام خیرات و صدقہ ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لیے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام **زکوٰۃ** ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج: ۱) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے چنانچہ قرآن پاک میں مَعْلُوْمٌ اور مَعْلُوْمَاتٌ کے الفاظ جہاں آئے ہیں، وہاں یہی مقصود ہے، اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اُسکی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا، عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جسکا حکم توراۃ میں مذکور ہے، اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے، یعنی پیداوار میں دسواں حصہ، اور نقدی میں نصف مثقال، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمت ربانی سے اجناسِ زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانہ تک بعینہٖ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہٖ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں۔

اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے، اس لیے اصول کا اقتضاء یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو، زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے، زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے، عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے، اسی لیے وہ اپنے سرداروں کو مِرْبَاع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے، شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی

یہ دستور ہو، ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا، مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدِ نظر تھی، اس لیے اُس نے چار کو پانچ کر دیا، اس طرح چوتھ (¼) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد اُن کے نائب اپنے ذاتی ضروریات، اہل و عیال کے نان و نفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "خمس" ہے، قرآن پاک نے کہا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ	اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَ	خدا کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت مند کے
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال: ۵)	لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لیے ہے۔

نکتہ: اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں، اور اگر کوئی صرف حصولِ غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی، اور نہ اس کا کوئی ثواب ملیگا، اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرما دی ہے، اس بنا پر درحقیقت وہ مالِ غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظامِ جماعت کا ہے، یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لیے ہے۔

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے، تاکہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر "رکاز" یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آجائے خمس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے، توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عُشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا، شریعتِ محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ، پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی، سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں، تاکہ اُن سے حسب منشا خانگی اور تجارتی فائدہ اُٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں، کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی پتھر[۱] ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں، زمین، جانور، سونا چاندی یا اُن کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں، ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر

---

[۱] قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لیے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسبابِ زینت قرار دیا ہے، فرمایا: حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا (نحل و فاطر) زینت جن کو تم پہنتے ہو (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عُشر ($\frac{1}{10}$) مقرر کیا گیا، زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاص محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا، یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ ($\frac{1}{20}$) مقرر ہوا نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشو و نما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری کا بھی آدھا، یعنی چالیسواں ($\frac{1}{40}$) حصہ مقرر ہوا (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی و بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اسکا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لیکر گاؤں گاؤں شہر بشہر اور ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے، سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی

بقیہ حاشیہ:- یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہا کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں، اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کرلے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو تجارت کے لیے ہیں، تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسری یہ کہ کوئی بدنصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے، تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی لیکن دیانۃً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گنہگار ہوگا، اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ شخص سامان تعیش اور فخر و مباہات کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہی ہوگی جو بیش قیمت باسنوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کرلے، اس کا شمار اسراف میں ہوگا اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریاتِ زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کی جاتی ہے، چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی، یا وہ ٹوٹ جائیں، یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی، بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے، اور وہ ضروریات زندگی کے لیے زر مبادلہ ہے وہ بھی ٹوٹ جائے یا میلا بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں آتی ہے، اسی لیے وہ معیار زر ہیں۔

حاشیہ صفحہ ہذا [1] یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں بیان کیا ہے:

کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دُور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں، اس لیے نسبتہً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات، اور مستحقین کی امداد میں اس "انفاق" یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کرتے ہیں اس بناء پر بھی سخت ضرورت تھی کہ اُن کے لیے قانونی خیرات کی شرح اہلِ زمین سے مختلف رکھی جائے۔

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ امامت و حکومت کے تمام ذاتی و قومی مصارف شامل ہیں، اس لیے وہ کل کا خمس یعنی ($\frac{1}{5}$) مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورہ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ مصارف کی شرح مقدار $\frac{1}{5}$ کا $\frac{1}{8}$ حصہ یعنی ($\frac{1}{40}$) مقرر ہوا یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں ان آٹھ مصرفوں کے لیے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجیے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے، ان دو سو درموں کو پانچ پر تقسیم کر دیجیے تو چالیس ہو جائے گا، یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں $\frac{1}{5}$، $\frac{1}{8}$، $\frac{1}{40}$ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم و تحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانوروں پر زکوٰۃ توراۃ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ[1] کا تھا، لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانۂ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہو سکتا اس لیے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی، شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا، چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت، کیفیت اور کمیت) کی بناء پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا، مثلاً خچر، گھوڑے[2] سے (یا ہندوستان میں ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح متعین ہوئی۔ یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکمتِ ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں، بلکہ فرامین کی صورت میں، لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا، اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں جمع و حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۱ سے ۴ تک	کچھ نہیں	اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
"	۵ سے ۹ تک	ایک بکری	"	۲۵ " ۳۵ "	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
"	۱۰ " ۱۴ "	دو بکری	"	۳۶ " ۴۵ "	اونٹ کا دو سالہ بچہ
"	۱۵ " ۱۹ "	تین بکریاں	"	۴۶ " ۶۰ "	اونٹ کا تین سالہ بچہ

---

[1] احبار، ۲۷- ۳۰، ۳۲ [2] حنیفہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ	بکری	۲۰۰ سے ۴۰۰ تک	تین بکریاں	گائے بیل بھینس	۷۰	ایک تین سال اور ایک دو سال کا بچھڑا
،،	۷۶ ،، ۹۰ ،،	دو سال کے دو بچے						
،،	۹۱ ،، ۱۲۰ ،،	تین سال کے دو بچے	،،	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری	،،	۸۰	تین سال کے دو
،،	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دو سال کا ایک بچہ	گائے بیل	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں	،،	۹۰	تین سال کے تین
،،	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ	بھینس ،،			،،	۱۰۰	دو سال کے دو اور تین سال کا ایک
بکری	ا سے ۳۹ تک	کچھ نہیں	،،	۳۰	ایک دو سالہ بچھڑا			
،،	۴۰ ،، ۱۲۰ ،،	ایک بکری	،،	۴۰	تین سال کا بچھڑا	،،	پھر ہر دس پر	ایک دو سالہ ۔
،،	۱۲۱ ،، ۲۰۰ ،،	دو بکریاں	،،	۶۰	۲ سال کے دو بچھڑے			

نصابِ مال کی تعیین شرح زکوٰۃ کے تعیین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے اُن میں غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی مثلاً اگر دس بیس روپے والوں، یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی، تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ میں غلہ اور مویشی پہ جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ

"خداوند کے لیے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے"۔ (خروج ۳۰-۱۵)

لیکن شریعتِ محمدی نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور اُن غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لیے سرمایہ جمع کر رہے ہیں اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائیگا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال[1] سونے کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم چاندی کے سکے ہیں، یعنی ایک اوقیہ چالیس[2] درہم کے برابر ہے وہ کم سے کم معیارِ دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے،

اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں،	نام
پانچ وسق[3] سے کم پر زکوٰۃ نہیں،	غلہ اور پھل
پانچ عدد ،، ،، ،، ،،	اونٹ
۳۰ عدد ،، ،، ،، ،، ،،	گائے، بیل، بھینس،

---

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولے کے، اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپے کے برابر ہے [2] سنن ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الزکوٰۃ وحد الغنی جلد اول ص ۱۶۳، اصح المطابع لکھنؤ [3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو،

بھیڑ بکری،	۴۰ عدد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
چاندی	۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں،

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہوگئے،

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد، جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں، پانچ وسق غلہ، دو سو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا، درحقیقت ایک ہی معیار ہے، ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے، اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دو سو درم برابر ہیں، اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس درم، یا ۴ مثقال تھی، یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت بھی دو سو درم یا بائیس[1] مثقال ہوگی،

زکوٰۃ کے مصارف اوران میں اصلاحات حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی، یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر و مرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف و سامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی (خروج ۳۰-۱۲)، دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں، وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا (احبار ۱۹-۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل و عیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے، اور لاویوں میں جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گذار ہیں، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے)، اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں، کہ ان سے مسافروں، یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے (استثناء ۱۴-۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی،

۱- وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے، اس بناء پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا، کلیۃً اڑ گیا۔

۲- عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں، اور محرابوں کے طلائی شمعدانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳- حج ان ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زاد راہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

۴- زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی، کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا،

---

[1] ہدایہ جلد اول، باب الزکوٰۃ فی التجارۃ ؛

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مدوں سے بچیں، غریبوں، مسکینوں، مسافروں وغیرہ کو دیدی گئیں

گذشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں، مثلاً

۶۔ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کیجاتی تھی، بلکہ ذخیرہ میں جمع ہوکر اس کا کھانا پک کر غربا میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں، اسلئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دیدی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی، شریعت محمدیہ نے بیس[1] مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کرکے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دیدیا۔

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا، یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہوسکتا، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اُسی نام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹۔ بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے، جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن و طنز کرنے لگتے، اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کردی اور بتادیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں، اور اس رقم سے کس کس کو مدد دیجاسکتی ہے چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصل ذکر ہے،

۱۰۔ اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کیجاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتادیے جاتے، تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش و عشرت کے پُرتکلف سامانوں کے نذر ہوجاتا، اسلئے تاکید کردی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لیگا، اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دیگا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱۔ اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ اسطرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد (بنولاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا، کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا، اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی۔

۱۲۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ الْمَسَاكِيْنِ وَ	زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں، اور زکوٰۃ ـ
الْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ	میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لئے

وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۔ (توبہ : ۸)

ہے جنکے دلوں کو اسلام کیطرف ملانا ہے اور گردن چھڑانے میں جو تاوان بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھرایا ہوا ہے، اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے (اس لیئے اس کی یہ تقسیم علم وحکمت پر مبنی ہے)

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفا کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۔ (بقرہ : ۳۷)

ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کیلئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف انکے نہ مانگنے کی وجہ سے انکو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم انکو ان کے چہرہ سے پہچانتے ہو، کہ وہ حاجت مند ہیں، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے،

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ اُن کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہیئے چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ (بقرہ : ۲۲)

اور جس نے خدا کی محبت پر، (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں، اور (غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے:۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (بقرہ : ۲۶۹)

کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، اور مسافروں کے لیے،

ضرورتمندوں میں ترجیح اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خودغرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور اُن کا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے، لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا، ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں وہ تمامتر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہیں، جو جتنا ہی قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اُس پر اور اُس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے، پھر اہل وعیال کا، اُن کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر مال میں کچھ بچ جائے، تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابتدار ہیں، چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اسی اصول کی رعایت کی گئی ہے،

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابتداروں کو ترجیح دیجائے، تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کریگا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبرگیری کرے تو کل انسانوں کی خبرگیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جسکو دور ہو جانا چاہیے، مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے اس کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب وبعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی وبیشی، قرابت مندوں کو ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو، ان کو اُن لوگوں پر ترجیح ہے، جن کی ضرورت اور حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے، کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجتمند ہوں اور ان میں ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا، یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی، نہ کہ پہلا سبب، اور یہ انسان کی فطرت ہے، کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے،

فقرا اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں انکو ترجیح دیگئی ہے جو فقر وفاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عزت وآبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں، یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا "مسکین وہ نہیں ہے جسکو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہیں"، صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے ارشاد ہوا وہ جسکو حاجت ہے، لیکن اسکا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں[1]۔"

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دیگا، اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اسلیے انکی طرف اسقدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہیے، جو صبر وقناعت کے ساتھ فقر وفاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں، کہ انکی خبر بہتوں کو نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں، دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے، اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔

شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین وتحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو، اور ہر کس وناکس اُس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے، جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان واسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردہ دری ان الفاظ میں کی:-

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا	اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (پیغمبر) زکوٰۃ
مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ	بانٹنے میں طعن دیتے ہیں، اگر ان کو اس میں سے ملے
وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	تو راضی ہوں، اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں اور

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ، باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ۔

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ
اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ
وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ
وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً
مِّنَ اللّٰهِ ط (توبہ ۔ ۸)

کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے انکو دیا اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اسکا رسول دے رہیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہیئے، زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کرنیوالوں کا اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور گردن چھڑانے میں، اور خدا کی راہ میں، اور مسافروں میں یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اسکی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اسکے آٹھ مصرف بیان کر دیے ہیں اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں[1]

اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر و فلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے، لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں دین و ملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں، کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، مبلغین، مذہبی معلمین، طالب العلم، جو لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں اصحاب صُفّہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنیوالے بھی اس میں سے اپنے کام کی اُجرت پا سکتے ہیں، اور وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے وَفِي الرِّقَابِ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور اُنکو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، وَالْغٰرِمِيْنَ (تاوان اُٹھانے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لیئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے[2] اور حسب ضرورت کبھی اس سے مذہبی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لیے

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ، باب من یعطی الصدقۃ وحد الغنی۔

[2] اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صرف نہیں معلوم ہوتی آیت گذر چکی لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

جاسکتے ہیں اور وَابْنِ السَّبِيْلِ (مسافر) میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً راستوں کی درستی، پلوں اور مسافرخانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے، یہ ہیں زکوٰۃ کے وہ آٹھ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی و مذہبی رقم کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی، مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے، نادار یتیموں، بیواؤں اور اُن لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جد و جہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے، یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کیے ہیں جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، انکے ساتھ نیکی، احسان اور حسنِ سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لیے نامزد فرمایا، کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اسکی آزادی کا پورا زرِ فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جسکی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آسکتی، پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اسلیے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اُس وقت تک قائم رکھا جائے، جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں، یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔

مسافر گذشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیشِ نظر رکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ مسافروں کی امداد اور ان کے لیے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی، صحرا اور بیابان، جنگل اور میدان، آبادی اور ویرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا، اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال، عزیز و اقارب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب میں بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں، اُنکے پاس کھانے کے لیے کھانا، پینے کے لیے پانی، سونے کے لیے بستر، اوڑھنے کے لیے چادر نہیں ہوتی، اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آجاتی ہے، اسلیے ضرورت تھی کہ اُن کے آرام و آسائش کا سامان کیا جائے، اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافرخانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے، اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانۂ کہن اور داستانِ پارینہ ہو گئی ہیں اب ہر

(بقیہ حاشیہ) ضروری ہے، نگران کا استدلال جو لِلْفُقَرَآءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو، جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا (حاشیہ صفحہ ہٰذا) کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف، باب الصدقات۔

جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بینک اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں، اور سفر و حضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے، مگر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت و آسائش کے لیے ہوا ہے، اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لیکر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافروں کے لیے قدم قدم پر ہوٹل، ریستوران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیحؑ کی طرح ایک غریب مسافر کے لیے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں، کسی کی جیب میں جب تک کسی بینک کا نوٹ اور چیک نہیں، اس کے لیے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں، کیا یہ انسانیت کے لیے رحم ہے! کیا یہ بنی نوع انسان کے لیے ہمدردی ہے! لیکن ان تمام ملکوں کے طول و عرض میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کے قبضہ میں آئے، سراؤں، مسافر خانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بآرام و آسائش پہنچ جاتا ہے اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اَھلًا باھلی و اوطانًا باوطانی کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا ہے، اور آج بھی اس نظام کی بدولت اُن اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہیں ہیں، غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے، اور امراء اور دولت مندوں کے لیے کیا کہنا کہ ایک پُرانے جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق،

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں، جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لیے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی ترقی و تعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا، جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجا لائیں، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم و نسق کے فرائض انجام دیں، زکوٰۃ اسی نظامِ جماعت کا سرمایۂ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ "زکوٰۃ" کے اندر ہے "زکوٰۃ" کے لفظی معنی "پاکی" اور صفائی کے ہیں، یعنی گناہ اور دوسری روحانی، قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک و صاف ہونا، قرآنِ پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس میں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ	مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف کیا اور
مَنْ دَسّٰهَا (شمس : ۱)	نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔

ایک اور سورہ میں ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (اعلیٰ : ۱)	مراد پایا وہ جو پاک و صاف ہوا۔

یہ تزکیہ اور پاکی و صفائی نبوت کے اُن تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین

چار آیتوں میں آیا ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ ، جمعہ ۱)

وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر اُن کو سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

⁂

تزکیۂ نفس ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدیہؐ میں کتنی ہے! یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے، انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجاء اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا بڑا سبب، ماسوی اللہ کی محبت اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے، زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جوان کی دولت تھی، غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے، اور پھر ان کی صداقت وسچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ: ۱۳)

ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لیکر ان کو پاک وصاف کر۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دُور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے، دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ اُبھرتا ہے، شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لیے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حدِ فاصل قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے:

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ (بقرہ: ۳۸)

خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے بلکہ اُخروی ثواب وگناہ اور برکت وبے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے، لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے، جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے، اور قومی صدقہ وعطا سے قوم کے ذکمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے، اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لیے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی، لیکن صدقہ دینے والے کی مدد کے لیے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ انکو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے؛

اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ اُن کے لیے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے، سود خوار اپنے مال میں اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے، آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے، اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے اسکو کوئی دوسرا نہیں لوٹتا، وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے، دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں، اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے، پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے ایسا ارشاد فرمایا کہ لیس الغنیٰ من کثرۃ العرض ولکن الغنیٰ غنی النفس[1] "تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے، اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے "تونگری بدل ست نہ بمال، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں، بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں، بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر، مزکی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہہ ہو سکتا ہے؟

سود خوار کو دوسروں کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ اُن کی اس حالت سے فائدہ اُٹھائے لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے اس کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں.

باہمی اعانت کی عملی تدبیر زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجتمندوں کی امداد ہے، انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے، اور اس کی تسلی اور تسکین کے لیے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آیند الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذاہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہو سکتی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا، اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لیے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی، خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ "خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا، اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر" آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے، آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی، نہ دولت و امارت عزت و وقار کے مترادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیزگاری، فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی، حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں،

---

[1] بخاری کتاب الرقاق باب الغنیٰ غنی النفس۔

کیونکہ آسمان کی بادشاہت انھیں کی ہے[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار وایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا :-

ان المکثرین ھم المقلون[2] جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں .

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے .

پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں[3] گے .

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا ، وہ ان کی دنیاوی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں ، جنکا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے ، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب وتشویق تک محدود نہیں رکھا ، بلکہ اس کے لیے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں ، ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے ، یہ اخلاقی خیرات ہے ، جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی ، اس لیے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جسکا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد واعانت کے لیے مخصوص کیا ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لیے سپرد فرمایا ، چنانچہ آپ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا ، تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے ، پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

تؤخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم[4] وہ ان کے دولت مندوں سے لیکر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے .

صحابہؓ نے آپؐ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے ، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے "تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب ومعذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی کہ فرمایا اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف ومہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے " اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمھارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو ، خدا نے تعلیم دی :-

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ، وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحیٰ : ۱) تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک .

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجتمند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو ، کہ وہ شرمندہ ہو بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی ، احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا ، فرمایا :-

---

[1] متی ۵ ، ۳ - [2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون ہم المقلون [3] جامع ترمذی کتاب الزہد باب ما جاء ان فقراء المہاجرین یدخلون الجنۃ قبل اغنیائہم [4] صحیح بخاری ، جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ ؛

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی (بقرہ: ۲۶) تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دیکر برباد نہ کرو۔

اس لطف، اس مدارات اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی، اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا، اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا حکم دیدیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی، اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں، جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولتمندی کی بیماریوں کا علاج دولتمندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکۃ الآراء بحث کی حیثیت سے چلا آرہا تھا، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذاہب ہیں جن میں نہ تو دولتمندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی اور غربت کو سراہا گیا ہے بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے، عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول، نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اُس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں لُٹا نہ دے، انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولتمند نے حضرت عیسیٰؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

> "اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا، تب آ کے میرے ہو لے۔"

وہ دولتمند یہ تعلیم سُن کر غمگین ہو کر چلا گیا، تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولتمند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ دولتمند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔" (متی ۱۶ - ۲۱-۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترکِ دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لیے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لیکر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بُری چیز ہے تو اُس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی بُرائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دیکر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے اسلئے یہ طریقہ ہر شخص کے لیے یکساں مفید نہیں ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے جس طرح دولتمندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کا بچانا ایک نبوت عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک بد اور

خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولتمند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لیے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے لعنت نہیں، ہنر ہے عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں، چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو ”خیر اور فضل“ سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں، آپؐ نے فرمایا کہ ”تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں[1]“ آپؐ کے حلقہ بگوشوں میں دولتمند بھی تھے اور غریب بھی، اور دونوں آپؐ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبوں نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لیے جاتے ہیں، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ وہ بھی کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کرپاتے، آپؐ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی دعا پڑھنے لگے، غریبوں نے پھر جاکر عرض کی، تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آرہا تھا اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے حل کر دیا، ایک دفعہ آپؐ نے تقریر میں فرمایا کہ ”لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے“ صحابہؓ نے پوچھا ”یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟“ فرمایا ”دنیا کا باغ و بہار“ (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا ”یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟“ سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہوسکتی ہے آپؐ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا، پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے، پھر فرمایا ”بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے، لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں آکر حد اعتدال سے زیادہ کھالیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہوجاتی ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہوجاتی ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے، فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لیے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا[3]۔“

اس تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرمادیا اور بتادیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے، بلکہ اسکا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے، اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اگر اس کے حصول و صرف کا طریقہ

---

[1] بخاری کتاب الوصایا باب ان یترک ورثتہ اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب الذکر بعد الصلوٰۃ [3] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ، و کتاب الزہد والرقاق باب مایحذر من زہرۃ الدنیا۔

صحیح نہیں، تو وہ بری اور شر انگیز ہے، اخلاقی محاسن و معائب، امیر و غریب دونوں کے لیے یکساں ہیں، ایک سخی و فیاض و متواضع امیر، اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں اس لیے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ انکے اخلاق اور عادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دو طرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں، دھوکا فریب، خیانت لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی، سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ "سود" کو حرام مطلق، اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا، جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اسکو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے، اسی کی ملک قرار دی، چنانچہ فرمایا "زمین خدا کی ہے، اور سب بندے خدا کے بندے ہیں جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے" (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا، ممالک مفتوحہ کو امیرالسلام کی شخصی ملکیت نہیں، بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا، فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا، اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولتمندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیکسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی	بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو
فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	ہاتھ لگا دے وہ خدا اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں
وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً	اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے تاکہ وہ الٹ پھیر کر تم میں
بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (حشر: ۱)	سے دولتمندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین منظر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا، اور جو اس گناہ سے پاک ہوا اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا:-

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ	اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں
ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (حشر: ۱)	مراد پانے والے۔

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیکنامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا:

وَمَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِہٖ وَاللّٰہُ	اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے،
الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد: ۴)	اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیت پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو وہ درحقیقت تمہاری نہیں اصل مالک خدا ہے، اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے، دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے اس آیت پاک کی یہ تعلیم اس جڑ کو کھودتی اور بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (تکاثر: ۱)	پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائیگا۔

اس لیے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہ کی:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ، يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ كَلَّا (ہمزہ: ۱)	برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا، اور عیب چُنتا ہے، جو مال کو سمیٹ کر رکھتا ہے، اور اس کو گن گن کر یہ خیال کرتا ہے کہ اسکا مال اسکے ساتھ سدا رہے گا، ہرگز نہیں۔

فرمایا، رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جسکو خدا نے علم دیا ہے، اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے[1]۔ جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہیں اور کار خیر میں خوب خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (توبہ: ۵)	وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں، اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیے، کل کے لیے کچھ نہ رکھنا چاہیئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا، دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اُس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں، لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھولدی، حضرت موسیٰؑ کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں، اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالے کی گئی ہیں، جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے، یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلے سے کم ہے اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی

---

[1] بخاری کتاب العلم باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ۔

تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لیے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے، اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے، ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی، یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے، اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے، اس کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا، اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی، صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ تھے جو کل کے لیے آج اُٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے، جیسے حضرت ابوذرؓ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابوبکرؓ اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے، جیسے حضرت علی مرتضیٰؓ، اور بعض انصار کرام، خدا نے اُنکی مدح فرمائی:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (دہر: ۱)	اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔
وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر: ۱)	اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود حاجت مند ہوں۔

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لیے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے، اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لیے علیٰ الظاہر وقت امداد مل سکے، اور ساتھ ہی اہل دل اور اہلِ استعداد کے مرتبۂ کمال کے لیے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپروں سے اُڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبۂ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"وایں طائفہ، جان و مال در باختہ اند و با ہیچ کس ماسوا اللہ نہ پرداختہ اند، گفتۂ ایشاں است الفقیر مالہم مباح ودمہ ھدر یعنی درویش صادق آں بود کہ بجون و مال اورا ادعوی نبود ...... اگر مالش برند خوش گردد، گوید	اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا، اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو، اسکو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو ...... اگر لوگ اسکا مال اُٹھا لیجائیں تو خوش ہو کر الحمد للہ اس کے اور خدا

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ما ادی زکوٰتہ فلیس بکنز۔ [2] ترمذی کتاب المناقب فضائل ابی بکرؓ [3] اسد الغابہ جلد ۳ صفحہ ۳۱۶۔

الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتازو، زکوٰۃ نعمتِ دُنیا نزدیک ایں طائفہ محمود نباشد، از آنکہ بخل ناستودہ است و بخل تمام باید تا دو لیست درم را در بند کند، و یکسال محبوس دارد، آنگاہ پنج درم ازاں بدہد۔

کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اُٹھ گیا یہاں تک کہ ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا اچھا نہیں ہے کیونکہ بخالت تعریف کے قابل نہیں، اور اس کیلئے سال میں دو سو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم اُن میں سے خدا کی راہ میں دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے:۔

یکے از فقہاء بر سبیل آزمایش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ در چند لازم آید، گفت جواب بر مذہبِ فقیہاں خواہی، یا بر مذہبِ فقیراں؟ گفت بر ہر دو جواب فرما، شبلیؒ گفت، بر مذہبِ فقیہاں از دو لیست درم بعد از حولانِ حول پنج درم باید داد و بر مذہبِ فقیراں در حال ہر دو لیست درم باید داد و جان بشکرانہ بر سر باید نہاد، فقیہ گفت ما ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم، شبلی گفت ما ایں مذہب از صادقِ ربّ العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ، او ہرچہ داشتہ پیش سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ داد۔ (مکتوب ۳۴۔ سہ صدی)

کسی نے حضرت شبلیؒ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے فرمایا فقہا کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے، کہا دونوں کے، فرمایا فقہا کے مذہب کے مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو درم میں پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو، اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیے۔ فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا وہ سب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا، اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہؓ) کو شکرانہ میں دیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی، آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا تو اسی دن اہلِ استحقاق میں تقسیم ہو جاتا، اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کی چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے تو گھر میں آرام نہ فرماتے، مگر عام اُمت کے لیے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی اُن کے لیے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولتمندوں کے ہر طبقہ کے لیے یکساں کھلا رہے اور اس لیے تاکہ بے قیدی و عدمِ پابندی لوگوں کی سُستی اور عدمِ عمل کا باعث نہ ہو، مقدارِ معیّن کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے، ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور پر پیدا ہو جاتی ہے، بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے

ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی، اور دولتمند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی، عیاشی، اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا دینے تک کے روادار نہیں ہوتے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں، قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس نے جواب میں یہی کہا:

إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِيٓ (قصص: ۸) مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی مشکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب و ہوا، اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے، مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم، اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اُٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنیوالے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ انکی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا، اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے، سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائیداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا، نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملک قرار دیں، قیصریت اور شہنشاہیت کے بجائے جماعت کی حکومت قائم کی، زمینداری کا پرانا اصول جس میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا، اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لیکر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تاکہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تاکہ وہ اسکے ادا کرنے پر مجبور ہو، اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا، اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اُتنے رقبہ میں جتنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی حکومت ہے، پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی، حضرت ابوذر غفاریؓ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے "یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے[1] اور ہر شخص کے پاس جو

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۷۶

کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دیدے اور شام کے دولتمند صحابہؓ نے اُن کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دیکر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیونکہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا، اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنیوالا باقی نہیں رہا۔[1]

اقتصادی اور تجارتی فائدے زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے بہا بڑے فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اوپر گذر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقا اور نمو، بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے، اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لیے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو، اسی لیے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت کوشش اور جد و جہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی جسکو فطرۃً کوئی برداشت نہیں کر سکتا اسطرح زکوٰۃ کا بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دیجائے، کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو، یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو، اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے کامل طور پر فائدہ اُٹھا سکے، صحابہ کرامؓ اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ انکو تجارت میں لگائیں تاکہ اُن کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کرکے یہ نکتہ بتا دیا تھا:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ	اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں،
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، ان کو
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (توبہ: ۵)	سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا، اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں، اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام

---

[1] فتح الباری شرح بخاری ج ۳ ص ۲۷۱ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبد العزیز ص ۲۵۶۔

لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذاب الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں، اسلئے امراء کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے، کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔

فقراء کی اصلاح اب دوسری طرف فقراء کا گروہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شارعین مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اسکا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور وہ ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے اس کو تکلیف ہوگی کیا کوئی عقلمند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہوگا۔

گذشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے، بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے، اور مرہم کا کوئی پھاہا نہیں رکھا، چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سرتاپا مادۂ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لیے پیدا کیا گیا ہے لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور اس پھوڑے کو دور کرنے کے لیے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں، اس نے اس غمگین اور دردمند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد و اعانت کی تدبیریں ہیں، جو اس کے دل کی ڈھارس، اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں، اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لیے جاری کیں، اس لیے اہل حاجت کے لیے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی، لیکن بہ اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو، اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم، اور رحم و محبت کا نہایت بلند منظر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں، اور اس سے دینے والوں کے جذبۂ ایثار اور اُن کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو، گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے، اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں اسطرح اُن کے لیے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی، اور تمام رذیل و پست اخلاق کا گڑھا تیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام نجاستیں آکر جمع ہونگی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کیساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السّلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لیے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم

بنا کر بھیجے گئے ہیں، غریب وامیر اور مسکین و دولتمند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا، بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے، اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم، اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے، اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلوں کو برابر رکھ سکا، اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ وخیرات اور دوسروں کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا، اور اگر غرباء اور فقراء کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دیدی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی، اسی لیئے داعی اسلام علیہ السّلام نے، انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی، ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا۔

اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحیٰ: ۱)	مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے۔

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقراء اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ: ۳۷)	ناواقف انکی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہیں، تو انکو انکی نشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

اور بھیک مانگنے کو خلاف تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے انکو خطاب کر کے کہا:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ: ۲۵)	اور زاد راہ لے کر چلو کہ بہترین زاد راہ تقوے (بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو خالی مت لوٹاؤ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ[1] "اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو" دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہیے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الیدُ العلیا خیرٌ من الید السُّفلیٰ[2] "اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے" (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا، اور دونوں کے لیئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ وخیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب ونفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لیکر باہر نکلتا ہے تو حرص وطمع کے پیاسے اسکو

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرة [2] ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلة۔

چلوؤں میں لے کر پینے لگتے ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان ھذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس[1] یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج اُن فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاقِ شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اُٹھاتے ہیں تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو انکے لازمی اخلاقی نتائج ہیں اُن میں سے کونسی چیز ہے جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقراء اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں، اور در حقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامنِ دل کو نجس بنا دیتا ہے تاہم اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرۃً ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جب نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کیلئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ و خیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے، شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو بُرے اثرات طاری ہو سکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کیلئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کیے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتہً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنونِ کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے دیا جائے، کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دناءت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اسطرح کے لینے والے کی خود داری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہو گی پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے یا اُن میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انھیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی، کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ:

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (دہر: ۱)

ہم تم کو خدا کے لیے کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گزاری بھی نہیں چاہیے پھر صدقہ دینے والوں کو یہ بھی بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب حرفِ غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائے گا، فرمایا:

---

[1] مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقۃ۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ. قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی ط وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ.

(بقرہ: ۳۶)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگذر کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ (بقرہ: ۳۶)

مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دیکر برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے جو شخص لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا، اس قسم کی خیرات کی شان اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو، اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تاکہ اسطرح غریب لینے والے مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنونِ احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے۔ اور اسطرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقرا اور معذوروں کو در بدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لیئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

۲۔ اسی لیئے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے، کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے، تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس لیئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری و دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اخفاء اور چھپا کر دینے کی صورت اس لیئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق

کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔"[1]

لیکن بعض موقع ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو، چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا:-

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ
إِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ: ۳۷)

اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن
اگر تم اس کو چھپا کر فقراء کو دو تو یہ بہت
ہی بہتر ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفاء کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے، مگر فرض زکوٰۃ کے لیے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کیے جاتے ہیں؛ لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے، زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبوتؐ میں تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اسلئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اسطرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہِ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے، اسی لیے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے اسمیں فقراء کو براہِ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفاء کیساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے، اسلئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے، کہ اگر بیت المال و نائبینِ بیت المال کے ذریعہ ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنیوالے دونوں کا حساب پاک رہے، اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے، لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں، اور براہِ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے، بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے اسلئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تاکہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے، پھر ترغیب، اعلان اور اظہار کی ضرورت اسوقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اسقدر کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ کرامؓ کی ترغیب کے لیے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا، مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سے معمولی رقم کے لیے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳- تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے، بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اسکو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ و صدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقۃ ؛

والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو، کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اُسکے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت، حرص اور کمینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہو گی کیونکہ کوئی بُری چیز کسی کو دینے کا منشاء دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے اس لیے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے، روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لیے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لاکر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے، اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاتا تھا، تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ
الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ
تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ
تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (بقرہ : ۳۷)

مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمھارے لیے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور انہیں سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لوگے لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمھاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے (خوبیوں والی ہی چیز پسند کرتا ہے)

۴۔ فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص و طمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگدستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی، تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابۂ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر و فاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ
يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ
التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ
لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ : ۳۷)

صدقات ان فقراء کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (بغرض معاش و تجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے، جو لوگ ان سے ناواقف ہیں خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵۔ لیکن بایں ہمہ حزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری

کی حالت میں اس کی اجازت دی، اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اُٹھا دو، ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپؐ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں، چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔[1]

حکیمؓ بن حزام ایک صحابی تھے، انہوں نے ایک دفعہ آنحضرتؐ سے سوال کیا، آپؐ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے جو اس کو شرافت کے ساتھ لیگا، اس کو اس میں برکت دیجائے گی، اور جو لالچ کے ساتھ لے گا، اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، حکیم نے کہا یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کبھی کچھ نہ مانگوں گا، اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لیے بلاتے تھے، اور وہ انکار کرتے رہے، اور آخر تک[2] اس انکار پر قائم رہے۔

اس کی متعدد اور مثالیں ہیں، اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لیے جو صاحب دست و بازو ہوں، یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح و سالم ہوں بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کردی گئی، فرمایا کہ

لاتحل المسئلة لرجل قوی، ولا لذی	طاقت اور سکت والے اور صحیح و سالم آدمی کے
مرة سوی (ترمذی)	لیے بھیک مانگنا حلال نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

والذی نفسی بیدہ لان یاخذ	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے[3]
احدکم حبلہ فیحتطب علی ظھرہ	کہ تم میں کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ
خیر لہ من ان یاتی رجلا فیسألہ	اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک
اعطاہ او منعہ (کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلہ)	مانگنے، وہ اُسے دے یا نہ دے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا، ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی، آپؐ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے، عرض کی ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے آپؐ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ، اور دیکھو، انہوں نے اس پر عمل کیا، تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے[4] لیے بچ گیا۔

۶۔ لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے، ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپؐ نے فرمایا:۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الاستعفاف عن المسئلۃ [3] ایضاً [4] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ

ليس المسكين الذى ترده الاكلة والاكلتان ولكن المسكين الذى ليس له غنى ويستحى ولا يسأل الناس الحافا	مسکین وہ نہیں ہے جسکو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں، مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہیں ہے لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔

(بخاری کتاب الزکوٰۃ باب قول اللہ عزوجل یسألون الناس الحافا)

پھر یہ بھی بتادیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کردیتا ہے، فرمایا:-

مازال الرجل يسئل الناس حتى ياتى يوم القيامة ليس فى وجهه مضغة لحم، (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب من سال الناس تکثرا)	آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئیگا کہ اُس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھودی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہوسکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کردیا، پست وبلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کردیئے اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتادیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اسکو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرتؐ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لیکر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرتؐ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لیے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا[1]۔ اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر داد وستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

⁂

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۶۸۱ ؛

روزہ

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ)

روزہ کا مفہوم روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے عربی میں اس کو "صوم" کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی "رُکنے اور چپ رہنے کے ہیں"، بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں "صبر" بھی کہا گیا ہے جس کے معنی "ضبط نفس" "ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابطہ اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے، روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا اور پینا اور عورت اور مرد کے جنسی تعلقات، انھیں سے ایک مدت متعین تک رُکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقراء کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتداء اصل میں اسطرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلے ہمارا کھانا اسطرح مردوزن کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ میں سند قبول حاصل نہ کر سکا[1]۔

بہرحال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ~~اور~~ ابتداء حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتداء اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا محتاج نہیں اور یہ آواز بلند مدعی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ
كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
..... شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ
الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى
وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْيَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ، يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ

مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جسطرح تم سے
پہلی قوموں پر فرض ہوا تاکہ تم پرہیزگار بنو .....
ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جسمیں قرآن اُتارا گیا جو
انسانوں کیلئے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں، اور
حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو
پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو،
یا سفر پر ہو، وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے، خدا آسانی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۴ طبع گیارہ۔

الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (بقرہ: ۲۳)

چاہتا ہے، سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرلو، اور یہ روزہ اسلئے فرض ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو، اور تاکہ تم شکر بجالاؤ۔

ان آیاتِ پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام، بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ماہیت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

روزہ کی مذہبی تاریخ قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعۂ احکام کا ایک جزو رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبرِ امّی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا۔ وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے۔

"روزہ کے اصول اور طریقے گو آب وہوا، قومیت تہذیب اور گردوپیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بمشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔"

آگے چل کر لکھتا ہے:-

"گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔"

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ یارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے، گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں، قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے، یونان میں صرف عورتیں تھموفریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں، پارسی مذہب میں گو عام پیرووں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا، خصوصاً مذہبی پیشواؤں کیلئے پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔

یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے، حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گذارے (خروج ۳۴، ۲۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں، لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے، جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لئے اسکو عاشورہ (دسواں) کہتے ہیں، یہی عاشورہ کا دن، وہ دن تھا، جس میں حضرت موسیٰؑ کو تورات کے دس احکام

---

[1] ان تمام حوالوں کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳، طبع یازدہم۔

عنایت ہوئے تھے اسی لئے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے[1]، اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی تبصریح مذکور ہیں[2]۔

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، چنانچہ عیسیٰؑ نے بھی چالیس دن تک روزہ جنگل[3] میں رکھا، حضرت یحییٰ علیہ السلام جو حضرت عیسیٰؑ کے گویا مبشر تھے، وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ[4] دار تھی، یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھا لئے تھے اور زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لیے[5] اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا، غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے، حضرت عیسیٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

> "کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے، پر وہ دن آئیں گے جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا، تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے" (مرقس ۲-۱۸)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰؑ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود ہے، امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں، انہیں فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں، بلکہ غم کے مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا، انہوں نے خود اپنے پیرووں کو بے ریا اور مخلصانہ روزے رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:۔

> "پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پاچکے، پر جب تم روزہ رکھو، اپنے سر میں تیل لگاؤ، اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔" (متی ۶-۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں، وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

> "یہ جنس سوائے دعا، اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی" (متی ۱۷-۲۱)

اہل عرب بھی اسلام سے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے، مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ (یعنی دسویں محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ[6] پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا، مدینہ میں یہود اپنا عاشورہ

---

[1] تورات، سفر الاحبار ۱۶-۲۹-۳۴-۲۳ (۲۳-۲۷ [2] اول سموایل ۷-۶ ویرمیا ۳۶-۶ [3] متی ۴-۲ [4] مرقس ۲-۱۸ [5] قضاۃ ۲۰-۲۶ سموال اول ۷-۶، ۳۱-۱۳، لوقا ۶-۱۶ وغیرہ [6] مسند ابن حنبل جلد ۶ ص ۲۴۴

الگ[1] مناتے تھے، یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ : ۲۳)

مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے، وہ مختلف اغراض کا پابند ہے اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں، اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرضِ نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لیے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے، تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے، لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالیشان عمارتوں، لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند و عیال، زر و مال، اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی، اور زندہ رہے ہیں، بروایتِ عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پُر مسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے، اور وہ مایۂ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدِ رمق پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط و وسعت تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فرق و امتیازات کو محیط ہوگی انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوگی۔

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ

---

[1] بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۵۶۳۔

کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں، اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعۃً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے۔ لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے اس مدت کے اندر انسانوں کو لیے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا، کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے، مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرضِ زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے اس لیے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ "تقویٰ" سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارۃً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۲۳)	مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

روزہ کی غرض و غایت تقویٰ ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا لیکن آگے چل کر قرآن پاک، اسلامی روزہ کی دو اور حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ: ۲۳)	تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو۔

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالمِ روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جسطرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے اسی یقین کے ساتھ طبِ روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے، پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بترتیب ظہور میں آتی ہے، قرآن مجید میں تیرہ مقام پر "سنۃ اللہ" کا لفظ آیا ہے، لیکن اس میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفۂ تاریخ جسطرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے، بعینہٖ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کے اصولِ قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول وقوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لیے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر، ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اسکے دل ودماغ میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے کوہ سینا کا پُرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰؑ) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز وشب بھوکا اور پیاسا رہا۔ اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (حضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نزولِ قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حرام مکہ کے ایک غار میں، ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثنا میں ناموسِ اکبر اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ کا مژدۂ جانفزا لیکر نمودار ہوتا ہے۔

یہ واقعہ کس ماہِ مبارک کا تھا؟

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (بقرہ: ۲۳) — رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اُترا۔

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان: ۱) — ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر: ۱) — ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر اُمّی علیہ السلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامۂ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا، قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ وتنہا بھوکا اور پیاسا سر بہ زانو تھا اس بنا پر اس ماہِ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ کے گوشہ میں یکہ وتنہا رہنا (اعتکاف)، نزولِ وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدیؐ کے لیے ضروری تھا کہ

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ
يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۴)

اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا
تمہیں پیار کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں

---

[1] خروج ۳۴-۲۸ [2] متی ۴-۲ [3] صحیح بخاری حدیث بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب نزول وحی میں اور سیرۃ ابن ہشام بدء بعثت میں ہے [4] روایات سے اگرچہ تصریحًا یہ نہیں ہے معلوم ہوتا کہ آپؐ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن واشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا میں روزے بھی رکھتے تھے جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرت ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے جس کا ایک جزء روزہ ہے، آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی اس قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپؐ ان دنوں روزہ رکھتے تھے۔ دیکھو خضری کی التشریع الاسلامی صفحہ ۳ وصفحہ ۴۔

کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لیے اس ماہ اقدس میں بقدر امکان انہیں حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہیے، جس میں وہ حامل قرآن متکیف تھا، تاکہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات وحالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے، ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا، اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کی تھی، تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لیے تھے اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لیے موزوں ہو سکتا تھا، نماز وحج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا وہ ایک خاموش طریقۂ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا لیکن اسلام نے عبادات کو امراض روحانی کی دوا قرار دیا ہے جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں، یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفتگی اور لذات حسیہ کے انہماک وتوغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ میں یہ تمام ساز وسامان مفقود تھے بلکہ خود کفار کے جور وستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا اس لیے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی، انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا، فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وقت آگیا یا عنقریب آنیوالا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آکر ان کو اپنا فریفتہ بنائے اس لیے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا جن میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا[1] اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، اسلیے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصول اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیروں کیلئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لیے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا، جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے، اس لیے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزوں تھا۔

ایام روزہ کی تحدید روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہیے تھا اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جد وجہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں

---

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ و زرقانی بر مواہب جلد اول ص ۲۰ [2] مقصود زاد المعاد ابن قیم جلد اول ص ۱۶۰ مصر

دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا اس لیے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ کل کے لیے مقرر کیا اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کرکے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لیے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا، یعنی رمضان چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بحسب توفیق روزہ رکھتی ہے چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لیے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ: ۲۳)
اے ایمان والو روزہ تم پر فرض کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا، بلکہ

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۲۳)
جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی اس کے بعد فرمایا گیا

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (بقرہ: ۲۳)
چند گنے ہوئے دن۔

مدت کی تعیین اب بھی نہیں البتہ اس بلیغ انداز سے زمانۂ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا "چند گنے ہوئے دن" اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تاکہ طبیعت متوجہ رہے۔

فَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ: ۲۳)
تو جو بیمار ہو، یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ ہوتا تو یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہوں تو دوسرے دنوں میں رکھو" نیز یہ بھی اشارۃً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گنے ہوئے مقررہ ہوں گے۔ ورنہ مَعْدُوْدٰتٍ (گنے ہوئے) اور عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ (تاکہ تم شمار پورا کرلو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ
مِسْكِيْنٍ (بقرہ: ۲۳)
اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ
اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ (بقرہ: ۲۳)
تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اس کے لیے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔

ان آیتوں میں دیکھیے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی۔ اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لیے فرمایا گیا تھا کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ (چند گنے ہوئے دن) ظاہر ہے کہ سال کے تین سو ساٹھ دنوں میں انتیس[1] اور تیس دن کے روزے چند گنتی کے دن تو ہیں ہی، بہرحال رمضان کو ماہ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ	وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، اس قرآن
الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ	میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت اور حق و
مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ: ۲۳)	باطل کی تمیز کی دلیلیں ہیں۔

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کیے گئے ارشاد ہوا۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ: ۲۳)	تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر روزے رکھے۔

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین و تحدید اور ایاماً معدودات کی تشریح ہو گئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان[2] ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرف زمانہ کو محیط ہوتا ہے، مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے صَامَ شَهْرًا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ "شہر" یعنی "مہینہ" کہا گیا ہے، اس لیے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا، اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوتے ہیں، جیسی روایت

---

[1] عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہیے کہ اَيَّامُ الْعَرَبِ، کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیوں میں محدود کر دے اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے ہزارہا انقلاب کو اَيَّامُ اللّٰهِ کہا ہے (ابراہیم: ۱) انکو نو تک کے انقلابات عالم میں محدود کر دے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (سبا: ۲) اور فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (گزرے ہوئے دن) جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکیں، جمع قلت و کثرت کا یہ قاعدہ کلی نہیں، بلکہ عموماً ان الفاظ کے لیے ہے جن کی جمع قلت و کثرت دونوں مستعمل ہیں، ایام کا لفظ ان میں نہیں اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے اور وہ "ایوام" ہے جو تعلیل کے بعد "ایام" بولا جاتا ہے، سند کے لیے دیکھو یعنی شرح کافیہ جلد دوم بحث جمع مکسر اور لسان العرب لفظ یوم [2] تفصیل کے لیے دیکھو رضی جلد اول مفعول فیہ ظرف زمان ص ۱۶۲ مطبع نولکشور ۱۸۷۸ء، جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ (بقرہ: ۲۲) "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں (پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں، کہہ دیجیے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے" س

ہو، وہی ماہِ صیام پر بھی صادق آئے گا، جیسا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ، تمام صحابہ کرام، خلفائے راشدین اور جمیع فرقِ اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (بقرہ: ۲۳) تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں جو اس ماہِ صیام میں موجود اور حاضر ہو، اس ماہ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر رہنے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہِ صیام آئے، اور شخص غیر حاضر ہو، یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہِ صیام آیا، یا دوسری صورت یہ ہے، شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہاں گذر نہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی، جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہ ہو جو باقی متمدن دنیا میں ہے، مثلاً جن مقامات پر کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں، ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں، تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے۔

لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے۔ تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔[1]

معذورین جو لوگ حقیقت میں اس فریضۂ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لیے ارشاد ہے:۔

يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ: ۲۳)
اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کر لے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا، یا بار بار کے تجربوں کے بعد شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے۔ فرمایا:۔

---

[1] پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کرنے کی اجازت لکھی گئی تھی وہ میری غلطی تھی جس سے میں اب رجوع کرتا ہوں۔ س

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ	تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (بقرہ: ۲۳)	دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ ہی کے عہد سے اختلاف ہے اور وہ آیت یہ ہے:

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ	اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت ہو فدیہ ادا
طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ: ۲۳)	کریں، ایک مسکین کا کھانا

۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقونہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے (فوز الکبیر باب ناسخ و منسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے، اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے اور بڈھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ یطیقون کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاقت کو وسعؔ کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں، تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آجکل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دیکر روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ غربا روزے رکھیں اور امرا فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہوجائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزے رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں، اس لیے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں[1]

---

[1] اطاقۃ طاقۃ کا باب افعال سے مصدر اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاقۃ کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھے ہیں، والطوق الطاقۃ ای اقصیٰ غایتہ وھو اسم لمقدار ما یمکن ان یفعلہ بمشقۃ منہ۔ طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے۔ اطاقت کے اس معنی کی تائید

اب روزہ کے سلسلے میں معذوروں کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو جیسے مرض یا خوف مرض یا سفر تو ان کے لیے یہ آیت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے، قرآن پاک میں ہے:-

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (بقرہ ۴۰)	اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے۔

"جس کی ہم کو طاقت نہیں" کے یہ معنی ہیں، جس کی ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا:-

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (بقرہ: ۴۰)	اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس لیے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں، صحیح نہ ہوگا، بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں۔ اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ

لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (بقرہ ۲۳۱)	آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے ابوداؤد میں ہے:-

عَنْ ابنِ جُبَيْرٍ عن ابن عباس وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة وهما يطيقان الصيام ان يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكينا۔	ابن حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بمشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دونوں بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ یطیقان الصیام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی تھی، اب بحمد اللہ یہ تائید بھی ہاتھ آگئی ہے۔ سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود، شرح ابی داؤد میں اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لکن مع شدة وتعب ومشقة غطية، اسی طرح محدثین حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، فالحمد للہ۔

ان وجوہ سے "وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ" کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ ہوگا، کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ (بقرہ:)

توجوتم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے، اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کرے اسمیں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگی۔ اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری۔۔۔۔ کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے، اور اس عذر کے دُور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابل ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المرض ہو، بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو، تو وہ روزہ قضا کرے، اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے اس کے لیے یہ آیت ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۔

اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب بمشکل روزہ پر قادر ہو اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاولیٰ فدیہ کی اجازت ہوگی، لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض وغایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے جسمانی زحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں گو لغزش گاہیں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لیے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے، چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لیے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاحبار (۱۶-۲۹) میں ہے:

"یہ تمہارے لیے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے۔"

توراۃ کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے:

"اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو، اور کچھ کام نہ کرو۔"

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے "وہ صوم" ہے، صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں جہاں مسلمانوں کو روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیے ہیں:-

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا

خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں

یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (بقرہ: ۲۳)	چاہتا۔

اسلام کا عام قانون ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (بقرہ: ۴۰)	خدا کسی جان کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:۔

یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (اعراف: ۱۹)	وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں ان سے اتارتا ہے۔

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات اور احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لیے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں، بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اسمیں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے ان میں اکثر روزہ صرف پیرووں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا، مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں، پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے، یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے۔

اسلام میں پیشوا اور غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیرووں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ (بقرہ: ۲۳)	اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے، شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہیں، اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں، اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی سختی نرمی بدلتی رہتی ہے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص و استثناء نظر سے نہیں گذری، توراۃ میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو

وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس آکر رہا ہو[1] لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا، بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایامِ حمل میں و رضاعت میں اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں، بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں، مگر وہ اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہیں مستثنیٰ ہیں، بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں، اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ (بقرہ: ۲۳)	اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بہ مشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

ترمذی میں ہے:-

عَنْ انس قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان اللّٰہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم،	حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانیوالی سے روزہ اتار دیا۔

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے اگر انکو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کرکے رفع عذر کے بعد قضا رکھیں۔

۴۔ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روز کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام میں اس میں بھی توسط اختیار کیا، یعنی روزہ کے اوقات میں گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک، صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵۔ جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا، اسلام نے صبح سے شام تک کا روزہ قرار دیا۔

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (بقرہ: ۲۳)	پھر روزہ کو رات تک ختم کرو۔

۶۔ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے، یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے سو کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا، پھر ناجائز تھا، ابتداءً اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا، ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا تیار نہیں ہوا تھا انکی بیوی کھانا پکا رہی تھی وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لیکر آئیں وہ سو چکے تھے اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے دن پھر روزہ کا دن تھا ان کو غش آگیا اس پر یہ آیت اتری:-

---

[1] احبار ۱۶ : ۲۹

وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ	اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک
الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ	رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے
مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ: ۲۳)	ممتاز نہ ہو جائے۔

۷۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے، اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی اور رات کو اجازت دیدی۔

اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی	روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لیے
نِسَآئِکُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ	حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم انکی، خدا
عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ	جانتا ہے کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس
فَتَابَ عَلَیْکُمْ وَعَفَا عَنْکُمْ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ	نے معاف کیا، اب بیویوں سے جا ملو، اور خدا نے
وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَکُمْ (بقرہ: ۲۳)	تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اسکی تلاش کرو۔

۸۔ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے، یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی هریرة من اکل او شرب ناسیا	ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، جو بھول کر کھائے یا پیئے
فلا یفطر فانما هو رزق الله (ترمذی)	تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، کہ یہ تو خدا کی روزی تھی۔

۹۔ اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوتے، بلا ارادہ از خود سرزد ہوتے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال النبی صلعم لا یفطر من	پیغمبر خدا نے فرمایا جسکو قے[1] ہو گئی یا سونے میں غسل
قاء ولا من احتلم (ابو داؤد)	کی ضرورت پیش آگئی، اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۱۰۔ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لیے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے، اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے، حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:۔

"پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں، کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا، اور منہ دھو، تاکہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو، اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارہ تجھے بدلہ دے" (متی ۶-۱۶)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے اس لیے روزہ کی حالت میں سر میں تیل لگانا، سرمہ ڈالنا، خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ

---

[1] قے ہونے کی فقہ حنفیہ میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں ۱۲۔

یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار، ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو، اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجا لانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے بلکہ ہنسی، خوشی رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے ان کے علاوہ کبھی کبھی رات کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن دوسرے روزوں کی صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:۔

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی	تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا
ربی ویسقینی۔	ہے (یعنی روحانی غذا)

لوگوں نے اصرار کیا تو آپؐ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے، جب مہینہ گذر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔

روزہ کے مقاصد اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تعلیم زبانی، محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے، اور ان مصلحتوں اور منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفۂ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے تین مختصر فقروں میں بیان کر دیے ہیں۔

(۱) لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ: ۲۳)	تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اسکی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔
(۲) وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (بقرہ: ۲۳)	تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔
(۳) لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۲۳)	تاکہ تم پرہیزگار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)

اوپر گذر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدتِ متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا، یہاں تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغامِ ربانی نے ان پر نزول کیا، حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کیے، تب توراۃ کی لوحیں ان کو سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے۔ تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے

---

[1] بخاری جلد ۱ صفحہ ۲۶۲ ؛

أبلا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں ایک مہینہ یعنی تیس دن معروف عبادت رہے، اس کے بعد فیضانِ الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے، یہودی بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں، ہم دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے تھے، عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا مگر اُنہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰؑ کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی، اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا:۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ	اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے
الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ	رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں)
مِنْ قَبْلِکُمْ (بقرہ: ۲۳)	روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔

دینِ الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدیؐ کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبرِ صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا شکریہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیمِ ربانی، وہ ہدایاتِ روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ، اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوجِ کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے اُلٹ دیے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشتِ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا، قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:۔

وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ	اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لیے (فرض ہوا) تاکہ
وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝	تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی،
(بقرہ: ۲۳)	اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔

اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے، اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۲۳)	اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔

۱۔ تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی ہے اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے[1]۔

۲۔ اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہیے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھانے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ، محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے، ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرۃً کمزور یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں انکو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے:

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ (بقرہ: ۲۳)	اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے۔

فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (بقرہ: ۲۴)	تو روزہ، خیرات یا قربانی فدیہ دے۔

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو۔

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ، ۲۴)	تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آکر۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے جو منیٰ لیجا کر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو،

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ　　یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔
ذٰلِكَ صِيَامًا (مائدہ : ۱۳)

اگر کوئی بالارادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے، یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (مائدہ : ۱۲)　　تو تین دن کے روزے۔

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کرلے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ (مجادلہ : ۱)　　تو دو مہینے متواتر روزہ۔

اور یہ بھی ممکن نہ ہو،

فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا (مجادلہ : ۱)　　تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت، صدقہ وخیرات، غریبوں کے کھلانے، بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

۳۔ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت، اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے، اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دُور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے، جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی، اور خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا، بقول حافظ ابن قیم سوزِ جگر کے سمجھنے کے لیے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے، روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت "بادِ رواں"[1] کی طرح ہوتی تھی، اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد واعانت اور انکو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴۔ انسان گو کتنا ہی نعمت وناز کے گودوں میں پلا ہو، اور مال و دولت سے مالا مال ہو تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی، اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لیے، بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر و ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے، جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اُٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہے، اور دنیا کی کشمکش جدوجہد، سختی ومحنت کا پوری

---

[1] صحیح بخاری باب بدء الوحی ؛

طرح مقابلہ کر سکے، اسی لیے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی "صبر" کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵۔ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے، طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لیے ضروری ہے، مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے، طبّی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لیے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے، بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶۔ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے، اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

۷۔ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے، جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخرۂ معدی کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

۸۔ روزہ بہت سے گناہوں سے انسانوں کو محفوظ رکھتا ہے اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے، چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی ں اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا[1] ہے اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے، چنا قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلا اگر اس کی سکت نہ ہو،

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ (مائدہ : ۱۲)	تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو،

---

[1] احبار ۱۶ - ۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳، ۲۷ ؛

اَوْعَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ	یا اس کے برابر روزہ، تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے، اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔

(مائدہ ۱۳:۵)

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو،

فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ (نساء ۱۳:۴)	تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لیے دو مہینے کے لگاتار روزے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹۔ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھیے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی، روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو، تھوڑی دیر کے لیے سرد کر دیتا ہے، کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ، شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں، ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے۔ یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیتِ خاطر، یہ جذبات کا سکون ہوتا ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر، اور اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی بازپُرس سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے، اور نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو اُبھارتا ہے، یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے، اس میں تراویح ہے اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے، اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے، اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی، لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی[1]۔

۱۰۔ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ رکھا ہی نہیں گیا، یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا، اسی کی تشریح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا چھوڑ دے[2]"۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے

---

[1] صحیح بخاری باب الوحی جلد اول صفحہ ۳ [2] صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵، و ترمذی باب الصوم ص ۶۴، و ابوداؤد، صوم ص ۲۳۶ و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲

فرمایا، روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے، اور نہ جہالت (غفلہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو، اور گالی بھی دے، تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں[1]، بعض حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کردو[2]" صحابہ نے دریافت کیا، یارسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے، فرمایا "جھوٹ اور غیبت سے[3]" چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے[4]

۱۱۔ تمام عبادات میں، روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲۔ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا اور ملذات کو چھوڑتا ہے، اس لیے،

الصوم لی وانا اجزی بہٖ	روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے،

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (زمر)	صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لیے روزہ دار بھی "صابرین" کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لیے مشکلات کے حل کرنے کے لیے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے۔

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ: ۵)	اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لیے اس کی مہارت اور مشق کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لیے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی کیے گئے ہیں[5]۔

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں ہے جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۵۲۔ صحیح مسلم صوم جلد ۱ ص ۴۲۰ مصر و موطا امام مالک صوم ۹۰، نسائی ۳۵۵ (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (احزاب: ۵)

اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنیوالی عورتیں، اور خدا کو زیادہ یاد کرنیوالے مرد اور زیادہ یاد کرنیوالی عورتیں ان کے لیے اللہ نے تیار رکھی ہے، معافی اور بڑی مزدوری۔

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے، اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ) ۵؎ سنن دارمی ص ۲۸، ۶؎ مجمع الفوائد بحوالہ نسائی ۷؎ مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۱۵۸ میرٹھ ۸؎ فتح الباری جلد ۴ ص ۸۸، ۹؎ صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم ۱۰؎ تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ص ۱۹۹ مصر۔

حج

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ (آل عمران : ۱۰)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خدا پرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے اس کے لفظی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں، اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جاکر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانۂ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہوکر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل، خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی، پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی اس سے ترقی کرکے اس نے ایک قوم اور ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھاگئی۔

مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیمؑ خلیل کے عہد میں ایک خاص خاندان کا تبلیغی مستقر بنا، پھر حضرت اسماعیلؑ کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کرلی، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔

دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورانہ احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ، اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا ہے، عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہوکر اسکی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی، اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی، اسکے بعد معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا، نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اسمیں جمع ہوتی تھیں، اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا[1]۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پاکر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، انکے خاندان اور قوم کے لوگوں نے انکو اسکے لیے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی، یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی

---

[1] توراۃ اور بابل کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔

اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔[1]

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا، اور بحر میت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا، اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو کنعان (فلسطین) میں بسایا، اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جسکو انکے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت مقرر کی، یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر سے مصر و شام سے حجاز و یمن اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں، سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلّہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لیے قوموں کے یہ گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق و شام کی جبّارہ و قہار قوموں کے حدود سے مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں، علیحدہ رہ کر لوگوں میں دینِ حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی خطرہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے، چنانچہ توراۃ کتاب پیدائش میں ان کی تین قربانگاہوں یا "خدا کا گھر" بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

> "تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا، اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے "بیت ایل" (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا، اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔"

(۱۲۔۷۔۸) اس کے بعد ہے:

> "اور وہ (ابراہیمؑ) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت اللہ میں اس مقام تک پہنچا جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیمؑ نے خدا کا نام لیا" (۱۳۔۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا، اور حکم ہوا،

> "اٹھ اور اس ملک کے طول و عرض میں پھر، کہ میں اسے تجھ کو دوں گا۔ اور ابراہیمؑ نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو حبرون میں ہیں جا رہا، اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی" (۱۳۔۱۷۔۱۸)

---

[1] میری تصنیف ارض القرآن جلد اول میں اس پر مفصل بحث ہے۔

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، اور حضرت موسیٰؑ نے بھی بنائے اور آخر حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر کی، جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا، حضرت اسحاقؑ کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی :

"اور اس نے وہاں ذبح بنایا، اور خدا کا نام لیا، اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا، اور وہاں اسحاقؑ کے نوکروں نے کنواں کھودا۔" (پیدائش ۲۶-۲۵)

حضرت یعقوبؑ کو جہاں مقدس رویا ہوئی، وہاں :

اور یعقوب صبح سویرے اٹھا، اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا، اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا، اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا، اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا دسواں حصہ "عشر" تجھے (خدا کو) دوں گا۔" (۲۸-۱۸-۲۲)

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے :

"اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو، کیونکہ اگر تو اس کے لیے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا، اور تو میری قربان گاہ پہ سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔" (خروج ۲۰-۲۵-۲۶)

حضرت موسیٰؑ نے خدا کے حکم کے بموجب :

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لیے بارہ ستون بنائے، اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لیے ذبح کیے اور موسیٰ نے آدھا خون لے کے باسنوں میں رکھا، اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا۔" (خروج ۲۴، ۴، ۶)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربانگاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ، اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربانگاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں، کعبہ، مسجد حرام، اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کی شرائط اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیلؑ تھے، اور یہ بحث بھی وہیں گذر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ جانوروں پہ ہاتھ رکھ دیتا ہے اور وہ جانور اسکی طرف سے قربانی کیے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کیے جاتے تھے وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر مونڈا جاتا تھا جو قربانی یا نذر پیش کیجاتی تھی وہ پہلے قربانگاہ پر لائی یا چڑھائی جاتی تھی، اسکے بعد وہ قربانی کیجاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملتِ ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے تورات اور قرآنِ پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصل بنیاد قربانی تھی، اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصل خصوصیت تھی، اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، تورات کی کتاب پیدائش میں ہے (۲۲-۱۶-۱۷-۱۸)

> "خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا، اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا، اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہو جائے گی، اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

قرآن پاک میں ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (بقرہ: ۱۵)	اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں ان کی آزمائش کی، پھر انہوں نے انکو پورا کیا تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔
وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ، اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ: ۱۶)	اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کر دیا۔
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (صفت: ۳)	اے ابراہیم، تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰٓى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ۔	خدایا تو محمد اور محمد کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی۔

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنے عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی پیشوائی اور آخرت کی نیکی نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس

اندرونی نقش کا ظاہری عکس، اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے اسلام کے لفظی معنی اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کیلئے گردن جھکا دینا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ
(صفت: ۳)

جب ابراہیم اور اسماعیل اسلام لائے (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ
اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ
فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ
الصّٰلِحِیْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ
قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝
(بقرہ: ۱۶)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کریگا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اسکو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اسکے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اسنے کہا میں نے پروردگارِ عالم کی فرمانبرداری کی (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)

الغرض ملتِ ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیمی ملت ہے اور اسی بار امانت کو اُٹھانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اُٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں، اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہو جو اس امانت کو لیکر تمام دنیا میں وقفِ عام کر دے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ
اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِیْمُ، رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ
الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔

ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرمانبردار بنا) اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا، اور ہم کو مناسک (حج) کے دستور بتا، اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہمارے پروردگار اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک اور صاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینہ محمدی کا خزانۂ علمی و عملی تھا، اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ میں اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند

زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن متعدد مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ سے سنہ ۱۸۱۱ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے اس میں اس مقام کا نام "مُرِیّا" لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۹۵ء میں لندن میں چھپا ہے اس کا تلفظ "موریا" کیا ہے، اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے۔

> "خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم، عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خود را کہ یگانۂ تست و او را دوست می داری یعنی اسحاق را بردار و بزمین "موریا" برو، و او را در آن جا بر یکے از کوہ ہائیکہ بتو نشان می دہم برائے قربانی، سوختنی بگذران، بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدھا) خود را بیاراست و دو نفر از نوکران خود را با پسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ، روانہ شد و بسوئے آں مکانیکہ خدا او را فرمودہ بود رفت و در روز سوم ابراہیم چشمان خود را بلند کردہ آں مکان را از دور دید، آنگاہ ابراہیم بخادمان گفت شما ایں جا بمانید تا من با پسر بدانجا رویم، و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد شما باز آئیم۔" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے، اور ہماری جماعت میں سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے، اس لیے یہاں بحث بے محل ہے، بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لیے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزاری جائے وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لیے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی، اور سجدہ کیا، اور وہ قربانگاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جا سکے کہ "میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں" یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں، اور نہ یہود و نصاریٰ کے لیے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے، اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس، یا مسیحؑ کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے کہ بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی، عربوں میں اس قربانی اور اس کی خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آتی ہے، اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف ہے، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں، حضرت

ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں تھیں[1]۔

مکہ اور کعبہ کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد، اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی، اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ،

اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ — سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے
(آل عمران : ۱۰) — بنایا گیا۔

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے، دنیا میں توحید کا پھریرا نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی اَلْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر، اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی فرمایا، اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی، حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سرِ نو بلند کیا، حضرت ابراہیمؑ نے عراق، شام، مصر ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرستوں اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ — اور ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا (حج : ۴) — بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتا دی اور اس کو ان کی جا پناہ اور ٹھکانا بنا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دینِ حق کی تبلیغ کریں۔ توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربانگاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا، کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے، وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لیے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعۂ توراۃ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے

---

[1] اخبار مکہ لازرقی و فتح الباری ذکر ہدم اصنام کعبہ و سیرت ابن ہشام ۔

اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا، کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا، اور کبھی اس کا نام "بیابان" تھا، اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا، لفظ عرب (عربہ) کے اصلی معنی بیابان و صحرا ہی کے ہیں[1]، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ (ابراہیم: ۶)	خداوندا میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لاکر بسایا ہے۔

تو حقیقت میں یہ "بن کھیتی کی ترائی اور بے آب و گیاہ میدان" اس وقت اسکی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی، اور اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دُعا مانگی تھی:

فَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ (بقرہ: ۱۵)	اور خداوندا یہاں رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔

"مکہ" قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی "گھر" کے ہیں[2] اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے، دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانۂ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے، بکہ نام حضرت داؤدؑ کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے، پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں "بک" کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ (آل عمران: ۱۰)	پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہ وہی ہے جو بکہ میں ہے۔

کعبہ کے لغوی معنی "چوکھونٹے" کے ہیں، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا، اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گزرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں[3,4]

---

[1] اخبار مکہ للازرقی، و فتح الباری ابن حجر ذکر ہدم اصنام کعبہ، و سیرت ابن ہشام [2] اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے، از صفحہ ۷۵ تا ۸۰ طبع اول [3] تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۲۲ مصر [4] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰۔

ثمود کا مقام شام و حجاز کی حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں خانۂ کعبہ ہے رومیوں کی تاریخ میں بھی خانۂ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سپہ سالار نے کہا

> "تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں وہ ہر قسم کے ہتھیاروں سے پرہیز کرتے ہیں[1]"۔

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے، جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے[2]۔ یہاں تک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کیساتھ ان کا[3] تذکرہ کرتے تھے، عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصا حصہ تھا اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی، کیونکہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لیے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت جب چھری لیکر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی تو آواز آئی تھی،

اَنْ یّٰاِبْرٰھِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا کَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (صفت: ۳)	یہ کہ اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا ہم ایسا ہی نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا۔

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر، بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کیلئے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا	اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور

---

[1] نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ فرنچ ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۵۸ء

[2] مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیے ہیں

[3] کتاب الامکنہ والازمنہ امام مرزوقی طبع حیدرآباد جلد دوم صفحہ ۱۶۱ باب ۴۰۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاھِیْمَ مُصَلًّی ؕ وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ؕ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ کَفَرَ فَاُمَتِّعُہٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ج اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرَاھِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ ، وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ اِذْ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؕ (بقرہ: ۱۵، ۱۶)

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰھِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا وَّطَھِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ

امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنیوالوں کے لیے پاک کرو اور یاد کر وجب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے، جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا، اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا، پھر اسکو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کردوں گا، اور وہ کتنی بُری بازگشت ہے اور یاد کر جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب (ہماری تعمیر کو) ہم سے قبول فرما، بیشک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے اے ہمارے رب اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بتا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنیوالا اور رحم والا ہے اے ہمارے رب ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں بتائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک وصاف بنائے بیشک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیریگا، بجز اسکے جو اپنے آپ کو نادان بنائے حالانکہ ہم نے اسکو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں نیکو کاروں میں سے ہوگا یاد کر جب اس نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم) بن جا اسنے کہا کہ عالم کے پروردگار کا میں تابعدار (مسلم) بن گیا۔

اور یاد کر جب ہمنے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف قیام اور رکوع اور سجدہ کرنیوالوں کے لیے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور دُور دور کے سفر سے تھکی ماندی (دُبلی سواریوں پر، ہر دور دراز رستے سے آئیں گے، تاکہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہمنے ان کو جو چوپائے

عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ج فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ، ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ط

(حج : ۳)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ، رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ، فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ، رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ط وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (ابراہیم : ۶)

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ط وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔

(آل عمران : ۱۰)

جانور روزی دیے ہیں ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں، تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی، اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا، اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری پیروی کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا، تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے پروردگار، یہ اسلیے تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کریں تو تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ انکی طرف مائل ہوں اور انکو کچھ پھلوں کی روزی دے، تاکہ یہ تیرے شکر گزار رہیں، اے ہمارے پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی کرو شرک سے منہ موڑ کر، اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے، بابرکت اور دنیا کے لیے راہ نما، اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے جس کو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو، اور جو (اس قدرت کے باوجود) اس سے باز رہے تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

یہ وہ آیتیں ہیں، جن کا تعلق اس موضوع سے ہے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے، تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لیے ایک گھر بنائیں یہ ٹھکانا عنایت کیا، جو ازل سے اس کام کے لیے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چاردیواری کو کھڑی کریں، اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا، یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا، اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں، اور ان کو اس لیے یہاں بساتا ہوں تاکہ وہ اس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے رہیں اور تیری خالص عبادت بجالائیں ان میں جو نکوکار ہوں وہ میرے ہیں، اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے، اور خداوندا! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا، جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی اور دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانۂ خدا کا طواف کریں، اور یہاں اسماعیلؑ کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں، اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہوں نہ وہ کسی پر ہتھیار اُٹھا سکتے ہوں، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں، اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پرتکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراۃ کے حوالوں سے گذر چکا ہے کہ ابراہیم اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے تمدن کے ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے، وہاں قربانی گزارتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے، اسی قسم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لیے جو شخص نذر کیا جاتا تھا وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر اُسترا لگاتا تھا، پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے، توراۃ کے فارسی اقتباس میں جو نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے لیے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں "لبیک" کہا اور اردو میں ہے کہ "میں حاضر ہوں" کہا یہی صدا لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ اسلامی حج میں اُٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے۔

یہ بھی گزر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا نثار کرتے تھے حج میں یہ طواف کہلاتا ہے، غرض انہیں سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں "حج" ہے۔

حج کی حقیقت ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معائدہ کو عبودیت کے اظہار کو کسی طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجا لائے اور خدا کی نوازشوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لیے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈواتے نہ ترشواتے ہیں. دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں اور نہ خوشبو لگاتے ہیں اور نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور دوڑتے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے.

لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ (صحیح مسلم)	میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں.

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں، جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لیے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیمؑ دوڑ کر گئے تھے پھر مروہ پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشائش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں روتے ہیں قصور معاف کراتے ہیں اور آئندہ زندگی کے لیے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن[1] ہے یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یادگار، بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر دور دراز کے سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثر دل کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں ایک ہی لباس اور شکل و صورت ایک ہی حالت اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور

---

[1] ترمذی کتاب الحج باب ماجاء من ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج.

جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعا مغفرت کی پکار، گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی گنہگاریوں کا اقرار اور پھر احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لیکر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہو کر، ایسا روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت اور اسی فدویت اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اس میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت میں اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ کے ہی الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں (صحیح مسلم کتاب الحج)

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ (انعام : ۹)	میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔
اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ (انعام : ۲۰)	میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام دنیا کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار کرتا ہوں۔

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی اس لیے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنا پڑیں، روزہ نے بھی یوم عاشورہ سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقۂ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئی تھیں، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بیک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی

وخاندانی نام ونمود کا ذریعہ بنا لیا تھا، چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آکر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ؛

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ : ۲۵)	جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔

۲۔ قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانۂ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی، کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹادی گئیں اور یہ آیت اُتری۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج : ۵)	خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۳۔ اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادِ راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی[4]

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (بقرہ : ۲۵)	زاد راہ ساتھ لے کر چلو، کیونکہ بہترین زاد راہ پرہیزگاری ہے۔

۴۔ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لیے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے اس غرض سے خانۂ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کیلئے کپڑا مستعار دیتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا[5] اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اُتری۔

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۲۰۶ کتاب الحج [2] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ سید الشہداء [3] بخاری جلد ۱ ص ۲۲۶ کتاب الحج۔
[4] بخاری جلد اول ص ۲۰۶ [5] بخاری جلد اول ص ۲۲۶ کتاب الحج ؛

خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۳) ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ[1] کو اس اعلان کے لیے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت یہ رسم اٹھ گئی۔

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لیے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا، چنانچہ یہ آیت[2] اتری:

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ ۲۵) کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔

۶۔ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی، لیکن اسلام نے اس کی کوئی سنت نہیں قرار دیا[3]، یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا، جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا، اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس، تورع، نیکی اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا حکم آیا:

فَمَنْ فَرَضَ فِیْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا
فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ (بقرہ: ۲۵)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں
عورت سے چھیڑ چھاڑ ہے نہ فحاشی ہے نہ لڑائی دنگا ہے
اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہوگی۔

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گنہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے، چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا، اس لیے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ
وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ
لِمَنِ اتَّقٰی (بقرہ: ۲۵)

جو شخص عجلت کر کے ایام تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس
آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی
اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا یعنی حج کا احرام باندھتے تھے، تو چپ رہتے تھے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے انہوں نے اسکو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے[4]۔

---

[1] بخاری کتاب الحج باب لایطوف عریان [2] بخاری کتاب الحج، جلد اول ص ۲۲۶ [3] بخاری جلد اول ص ۵۴۳
[4] بخاری جلد ۱ ص ۵۴۱۔

۱۰۔ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا، کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپؐ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا۔[1] اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں آپؐ نے ایک بار اسی قسم کی عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ "خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہیے۔"[2] اسی سبب سے قربانی کے لیے گھر سے جانور لاتے تھے اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپؐ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکتے ہوئے لیجا رہا ہے فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپؐ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔[3]

۱۱۔ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھس آیا، تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت ملامت کی اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا.[4]

(بقرہ: ۲۴)

گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔

۱۲۔ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈال لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقے سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی،[5] اسی طرح آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپؐ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ،[6] ایک بار آپؐ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جکڑے ہوئے ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جکڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے آپؐ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کرو یہ نذر نہیں ہے نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔[7]

۱۳۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آجائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں، اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص ایام حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔[8]

---

[1] ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع [2] ترمذی کتاب النذور والایمان [3] بخاری جلد ۱ ص ۲۲۹ کتاب الحج [4] ایضاً ص ۲۴۲ [5] نسائی کتاب الحج ص ۴۶۱ باب الکلام فی الطواف [6] بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف [7] فتح الباری جلد ۳ ص ۳۸۶ [8] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ۔

۱۴۔ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو طریقۂ حج کے خلاف سمجھتے تھے اس لیے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لیے آتے تھے وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے، بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے ان کو حج سے سروکار نہ تھا وعکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں، اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس و حرمت کے خلاف نہیں اس لیے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں، فرمایا[1]

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا	تمہارے لیے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں)
مِّنْ رَّبِّكُمْ (بقرہ: ۲۵)	فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا، اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

۱۵۔ صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو چکے تھے انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے جو مشلل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے ان کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے خدا نے جب پہلے خانۂ کعبہ کے طواف کا حکم دیا تھا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی[2]:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ	صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں پس جو شخص حج
اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ	یا عمرہ کرے اس کے لیے ان دونوں کا پھیرا لگانا
عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا (بقرہ: ۱۹)	گناہ نہیں ہے۔

حج کے ارکان اب اس اصلاح، ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی انکی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں۔

احرام۔ تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا نماز کے لیے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے احرام بھی حج کی تکبیر ہے احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط زیب و زینت اور تفریح

---

[1] اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب حج میں تجارت کو برا جانتے تھے اس لیے یہ آیت اتری، دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کیلئے ہو گیا، اسلئے اب اسمیں تجارت مناسب نہیں یہ آیت اس خیال کی تردید کیلئے اتری لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ۔

[2] صحیح بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۳۔

طبع کا ذریعہ نہیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی جان لینا بہرحال خود غرضی بے بی ہے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے، لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی اس لیے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لیجائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لیے باہر رہے۔ یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے جو اس لیے اس وقت کے لیے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل و صورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہِ عالم و عالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ بے تکلف اور زیب و زینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف، یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کیجاتی تھی چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے اس لیے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا)

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو[1]۔" اور حکم ہوا کہ:

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (حج : ۴) اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔

حجر اسود کا استلام، حجر اسود کے لفظی معنی "کالے پتھر" کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قدِ آدم بلند لگا دیا گیا ہے، خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا، کبھی سیلاب میں بہہ گیا، اور کبھی آگ میں جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لیے نکال کر لے گئے، اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا، اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف

---

[1] ترمذی، نسائی، دارمی و مستدرک حاکم۔

کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں، سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ بھی کر کے قناعت کر سکتے ہیں، یہ پتھر کہنے کے لیے تو ایک معمولی پتھر ہے مگر ایک مشتاقِ زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کے مقدس لب، یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، ائمہ اعلام، اکابر اسلام اور علمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں، ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور باایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے[1] نے اس کو چوم کر کہا "اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لیے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا ہے[2]، الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں، جو اب برائے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لیکر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادیِ غیب کی آواز سے رُک گئے اور اسماعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہؓ حضرت اسماعیلؑ کو لیکر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہؓ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا و مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؓ کو نظر آئے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِہِمَا (بقرہ ۱۹)	بے شک صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس کا اس پھیرے لگانا، گناہ نہیں۔

---

[1] یعنی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ [2] مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب الاستلام۔

وقوف عرفہ عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دُعا اور خدا کی حمد میں معروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہوکر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں، یہیں "جبلِ رحمت" کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبۂ عام دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مؤثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے ہر شخص کو داہنے بائیں، آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے اسی لیے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا:

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا	تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس
اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ	خدا کو یاد کرو، اور اس کو یاد کرو،
كَمَا هَدٰىكُمْ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ	جس طرح اس نے تم کو بتایا، اور تم اس
لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ (البقرۃ: ۲۵)	سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔

منیٰ کا قیام یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربان گاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں[1]۔ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا اس لیے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخر کیا کرتے تھے جو اکثر

---

[1] موطا امام مالک، باب ماجاء فی النحر فی الحج۔

لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا،

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (بقرہ: ۲۵)	خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے، جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائیں۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى	اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور
مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا	خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ (حج: ۴)	مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے۔

فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا	تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے
اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ	تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی
فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ	میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات
اِذَا رَجَعْتُمْ (بقرہ: ۲۴)	دن واپس ہو کر۔

حلق راس منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے؛ کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے، ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ (فتح: ۴)	اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔
وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ	اور اپنے سر نہ منڈاؤ، جب تک قربانی اپنی جگہ
مَحِلَّهٗ (بقرہ: ۲۴)	پر نہ پہنچ جائے۔

رمی جمار منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کے لیے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا، انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا، جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا، اور

---

[1] تورات قاضی ۱۳-۵ گنتی ۶-۵ [2] سعد جزء ثانی قسم اول ص ۲، ۳ و سیرۃ ابن ہشام بیر معونہ۔ واقعہ عمرو ابن امیہ وجز ناصیتہ واعتقہ ؁

اسی لیے شیطان کو "رجیم" یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا، جس کا ذکر سورۂ فیل کی آیت تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ میں ہے، اس سے اللہ تعالےٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا، اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے، یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی تَرْمِيْهِمْ کی سنگ باری کی یادگار ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو۔۔۔۔ ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں[1] ہے قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کیطرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا (بقرہ ۲۵)	جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے ہیں، ویسے ہی خدا کو یاد کرو، بلکہ اس سے بڑھ کر۔

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت اوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات واحساس کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کرکے، تغیر واصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا "کہ کنکری مارنے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں[2] ہے اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (حج: ۲)	اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں، جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت وبرکت کے واقعات یاد آتے ہیں؛ اور اسی لیے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شَعَآئِرُ اللّٰهِ اور حُرُمٰتُ اللّٰهِ ہے یعنی خدا کے نشانات اور اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم وزیارت کا نام ارکانِ حج ہے، سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے،

---

[1] مشکوٰۃ باب رمی جمار بحوالہ دارمی وترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح [2] ترمذی، نسائی، دارمی ومستدرک حاکم کتاب الحج؛

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (حج ، ۴)	اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔

صفا و مروہ کی نسبت ہے:

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (بقرہ ۱۹)	اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں۔

اور سورۂ حج میں فرمایا:

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج : ۴)	یہ ہے اور اللہ کے شعار کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری ہے۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب و احترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لیکر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو، وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لیے جائز نہیں، کیونکہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح و آشتی اور امن و امان ہوتا ہے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (بقرہ : ۲۵)	تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔
غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ (مائدہ : ۱)	حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانۂ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے تاکہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ : ۱)	اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو، جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جس کا نام کفارہ ہے، یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی، یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا، فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ	اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو

وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ، وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ
مُتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ
يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًا
بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ
اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ
اَمْرِهٖ ۔ (مائدہ : ۱۳)

،اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اسکے مارے
ہوئے کے برابر بدلہ ہے مواشی میں اسکا فیصلہ تم
میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اسکو کعبہ تک پہنچا
کر قربانی کی جائے، یا اس کے گناہ کا اتارہ ہے، کچھ
محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا اسی کے برابر روزے
تاکہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے ۔

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے، اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آجاتا ہے ۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لیکر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ دنیا و دین کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتر لیے ہوئے معمور ہے، وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لیے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے. نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں ۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیلؑ کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے، آئیے ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں :

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا
وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ
وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ
طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ
اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ۔

(بقرہ : ۱۵)

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع مرکز
اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی
جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کے یہ ذمہ کیا
کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنیوالوں اور سجدہ کرنے
والوں کے لیے پاک و صاف کرو اور جب ابراہیم نے کہا،
میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا، اور اس کے
رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دے ۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَاَرِنَا
مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (بقرہ : ۲۵)

اے ہمارے پروردگار اور ہم کو اپنا تابعدار گروہ بنا،
اور ہم کو ہمارے اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرمانبردار
گروہ بنا اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا اور ہمکو معاف کر تو
بے شک معاف کرنیوالا اور رحم والا ہے اور ان میں
انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ
اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ
وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا
وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ
عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا
اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى
مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (حج: ۴)

اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ بتادی کہ میرا شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کھڑے ہونیوالوں، رکوع و سجود کرنیوالوں کیلئے پاک صاف رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کردے، وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہوجانے والی اونٹنیوں پر سوار ہوکر دور دراز راستے سے آئیں گے تاکہ فائدے کی جگہوں میں آکر جمع ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے انکو جانور روزی کیے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ
الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ
النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَ
مَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ رَبَّنَآ
اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ
زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ
تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔

(ابراهيم: ۶)

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو امن والی بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی رکھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف جھکیں اور ان کو پھلوں کی روزی دے تاکہ شکر گزار رہیں۔

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے:

۱۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں رسول مبعوث ہو، جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

۳۔ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں، آباد ہوئے ہیں، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں، تو تو اس بے ثمر اور شور زمین میں ان کی ر[illegible] سامان [illegible] لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا تاکہ وہ ان سے محبت کریں۔

۴۔ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستے سے لوگ لبیک کہتے

تاکہ یہاں آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔

۵۔ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں، خداوندا تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان ہے اور رحیم ہے۔

۶۔ خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے اس لیے تمام وہ لوگ جو ملّتِ ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیمؑ ہیں اور وہی حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں،

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں،

مرکزیت خانۂ کعبہ اس دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا، یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں، جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں مختلف لباس پہنتے ہیں، مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں، مگر وہ سب کے سب ہی باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو اُمّ القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملّت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصۂ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں، دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں، یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں اس لیے یہ حرمِ ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتی ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملّت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملّت محمدیؐ کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد و کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلہ نے آلِ ابراہیمؑ کے لیے مدتِ دراز

سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے در پے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے، اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے آج دنیا کی قومیں "ہیگ" (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالتگاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں، لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے، یہ حج کا موسم ان کی سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا، یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امورِ خلافت کے تمام اہم معاملات طے پاتے تھے اسپین سے لیکر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آکر، اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فوراً ہی بعد، اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ: ۲۵)	بعضے آدمی ایسے ہیں کہ انکی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو انکے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ پہلے درجہ کے جھگڑالو ہیں اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے ہیں کہ اسمیں بے امنی برپا ہو اور تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا۔

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (بقرہ: ۲۵)	اے ایمان والو، تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ تمہارا وہ کھلا دشمن ہے۔

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں، ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا، ۲۲ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعاً و طاعۃً کہا، آپؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرامؓ

اور ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور دنیا کے تمام گوشوں سے آ کر حرم ابراہیم میں جمع ہو جاتے ہیں اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے، یہیں آ کر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی، عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے اندلسی، سندھی (ہندوستان) سے رومی یمنی فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا، ابن مسعودؓ کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ سے اور ابن عباسؓ کے مسترشد ابوہریرہؓ کے مستفیدوں سے اور انسؓ کے حلقہ کے فیضیاب علیؓ کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے، یہی وہ مرکز تھا جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابۂ کرامؓ اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا، اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور آئمہ مجتہدین کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدون ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔

یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر، دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے، ایک دوسرے سے ملتے، ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے یہیں آ کر چینی، مراکشی سے تونسی ہندی سے تاتاری حبشی سے فرنگی زنگی سے عجمی عربی سے یمنی نجدی سے اترکر افغانی سے مصری، ترکستانی سے روسی الجزائری سے افریقی یورپین سے جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے، زمانہ کے

رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لیے بے چین نظر آتا ہے، پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کو بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا اور خشکی و تری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی، دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی، یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزقِ ثمرات اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بسنے والوں کے لیے رزق کا کوئی سامان کیا جائے، اسی لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی کہ خداوندا میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے زکوٰۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی، لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتے، جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے، حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے (تکوین ۳۷ - ۲۵ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے، خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورہ "لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ" میں ہے وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر اور روم تک جاتے تھے[1]۔

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کے لیے کافی نہ تھی اس لیے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لیے روزی کا سامان تھا، اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا لیں۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور

---

[1] تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھو میری تالیف "ارض القرآن" جلد دوم باب تجارات العرب قبل الاسلام۔

خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں، کھانا، پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور یہی زرِ معاوضہ اہل مکہ کے قوتِ لایموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی خیر ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لیے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا، ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے، تو اس تقریب سے کم و بیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب و گیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دُعا کی مقبولیت حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (بقرہ: ۱۵)

اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔

اس دُعا کا اثر یہ ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے:

وَلَآ اٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا (مائدہ: ۱)

اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے

---

[1] یہ تخمینہ میں اپنے پہلے سفر حج کے تجربہ کی بنا پر جو ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۶ء میں کیا تھا، لگایا تھا، مگر اس کے ۲۳ برس بعد ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۹ء میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے۔ جانوروں کی قیمت بھی چوگنی نظر آئی بکری کی قیمت کم از کم سولہ سترہ روپے، گائے بیل کی قیمت اسی سے سو تک اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی، اب اس تخمینہ کی بنا پر ہر چیز کی قیمت چوگنی ہو گئی ہے۔ "س" ۲۰ محرم ۱۳۷۱ھ اور اب ۱۳۸۰ھ میں تو قیمت کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے (ناشر)

اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، کہ لوگوں سے بھیک مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں، کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے، اور فرمایا:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى
وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ
رَّبِّكُمْ (بقرہ : ۲۵)

اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو، کہ راستہ کا سب سے
اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے، تم پر گناہ نہیں
ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے
چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں، درست نہ تھا کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے یہ مقام گویا مسلمانوں کی عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے، جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آسکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکان حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے وہی ملت ابراہیمی کا مقام ہے، اسلام کا مولد اور قرآن کا مہبط ہے اس لیے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازوؤں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں، اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا منظر بھی سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے، اور اس وقت سرزمین عرب اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت، آج انگریز، ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق

نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار اور افریقہ اور کنیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں۔ وہ اس کے ایک ایک درو دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آکر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمۂ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں، بلا تشبیہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامنِ دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں، تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آکر مسلمان خالص، اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں قرآنِ پاک نے مکہ معظمہ کو "ام القریٰ" یعنی "آبادیوں کی ماں" کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اس کا مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے آدمؑ سے لیکر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لیکر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمامتر تعلق ارضِ حرم کے کوہ و صحرا اور درو دیوار سے ہے، یہیں حضرت آدمؑ نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حواؑ نے آکر ان سے ملاقات کی، یہیں نوحؑ کی کشتی نے آکر دم لیا، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہاں پناہ لی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہیں ولادت پائی، یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی، یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم میں نظر آیا، یہیں وہ خانہ کعبہ ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا، یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام اور عرفات ہیں، جو شعائر اللہ ہیں، یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا، یہی وہ سرزمین ہے جہاں وہ گلیاں

اور راستے ہیں جو جبریل امین کی گزرگاہ تھے، یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحن حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترپن برس (۵۳) بسر کیے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا:

فِيهِ اٰيَاتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ
(آل عمران: ۱)

اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں ابراہیم کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، اور زبان تسبیح وتہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط، اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج: ۴)

اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقویٰ کے سبب سے ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (حج: ۴)

اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لیے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔

خالص روحانیت "حج کی حقیقت" میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں اسی لیے سرور کائنات علیہ الصلوٰت نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ "حج مَبرُور" رکھا ہے یعنی "وہ حج جو سراپا نیکی ہو"۔ اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے، حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ
اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔
(بقرہ: ۱۵)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی، ان کی دوسری دعاؤں کی طرح قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ حج در حقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر، جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کر وہ تو اپنے تائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لیے ہر وقت تیار ہے وہ تو رحم و کرم لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے۔

یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لیکر ڈوبتا ہے"[1]۔

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے یہ بشارت دی کہ "عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں، جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا)"۔ موطا امام مالک میں ہے کہ آپؐ نے یہ خوشخبری سنائی "بدر کے دن، کہ عرفہ کے دن کے سوا زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہیں ہوتا، کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں"، اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے، یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لیے احرام باندھنے کیساتھ لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ (خداوندا میں حاضر ہوں) کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ[2] گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے اس لیے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں اس کے لیے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں، لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں، صدقِ توبہ کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں

---

[1] نسائی و ترمذی و بزار و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد، کتاب الحج جلد اول ص ۱۲۳ میرٹھ [2] سنن ابن ماجہ باب ذکر التوبۃ۔

انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول وہ فضا وہ تمام گنہگاروں کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا و زاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد، جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گذر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بیسیوں مواقع ہیں جہاں حضرت آدمؑ و حواؑ نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی، جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی، جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لیے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان، ہم گنہگاروں کی دعا نے مغفرت کے لیے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابرِ کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے، اور ہنوز آں ابرِ رحمت درفشاں است۔

انسان کی نفسیت (سائیکالوجی) یہ ہے، اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لیے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدِ فاصل کی تلاش کرتا ہے، جہاں پہنچ کر اس کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں اسی لیے لوگ اپنے تغیر کے لیے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحبِ اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی کا مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں، یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں جہاں سے اِدھر یا اُدھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حدِ فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف اور خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لیے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے اسی لیے سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ نے یہ فرمایا:

جس نے خدا کے لیے حج کیا اور اس میں ہوس رانی	مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ
نہ کی اور گناہ نہ کیا، تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے	يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهُ[1]

---

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتبِ صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے۔

اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا۔

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہونگی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں، طواف کی دعاء کا آخری ٹکڑا ہیں:

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ
النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِذَا قَضَيْتُمْ
مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي
الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ
حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اُولٰٓئِكَ
لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ
سَرِيْعُ الْحِسَابِ ط

(بقرہ: ۲۵)

پھر طواف کے لیے وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بیشک خدا معاف کرنیوالا اور رحم کرنیوالا ہے اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح آپ اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو یا ان سے بھی زیادہ تو بعض لوگ (حج کی دعائیں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے، اور ایسوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:

۱۔ حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے، حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لیے آدمی حج کے لیے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے اس لیے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے اس لیے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

عام طرزِ معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے اس لیے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے لوگوں سے اپنے قصور معاف کرواتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۲۔ اسلام آج ہر ملک میں ہے اس لیے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے، تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳۔ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے، جب امیر و غریب جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں نہ کسی کے لیے کوئی جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسبِ حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لیے اس کو خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

الغرض "**حج**" اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رُخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

* * *

جہاد

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (حج : ۱۰)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دیجائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہیں اُن کو اُٹھایا جائے۔

"جہاد" کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں، مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے" جہاد کا لفظ "جہد" سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ، فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اسی کے اصطلاحی معنی بھی ہیں، یعنی حق کی بلندی، اور اسکی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا، اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں، اس راہ میں صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کیلئے اپنی، اپنے عزیز و اقارب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، انکی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، انکے حملوں کو روکنا اور اسکے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جسکے بغیر دنیا میں کوئی تحریک کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے صرف دین کے دشمنوں کیساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے، یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لیکر دنیا میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں، بلکہ عمل اور سراپا عمل ہے، آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد انہیں کیمطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں "جہاد" کا مقابل لفظ "قعود" (بیٹھنا یا بیٹھے رہنا) استعمال کیا گیا ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے، سورۂ نساء میں ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ

مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنیوالوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے

الْحُسْنٰی ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ اَجْرًا عَظِیْمًا (نساء : ۱۳)

خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے، اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ "جہاد" اور "قتال" دونوں ہم معنی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوتے ہیں، اس لیے "جہاد فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور "قتال فی سبیل اللہ" (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے، یعنی ہر "جہاد" "قتال" نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اسی سورہ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں "جہاد بالنفس" اور "جہاد بالمال" یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کیلئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے، یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے، اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (حجرات : ۲)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔

فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ ، الآیہ (آل عمران : ۲۰)

پھر جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا، اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔

جہاد کی قسمیں اب جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ اور جد و جہد کے ہیں، تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو

سکتا ہے۔ علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے اُن صحابہؓ سے جو ابھی ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے فرمایا، تمہارا آنا مبارک، تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں[1]، چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے۔" یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے، کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔" یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں، مگر وہ درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ	اور جنہوں نے ہمارے بارہ میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی)
سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (عنکبوت)	ہم انکو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بےشبہ خدا نیکوکاروں کیساتھ ہے۔

اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لیے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے، اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے، اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا، سورہ کے آغاز میں ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ	اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس
اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (عنکبوت: ۱)	کیلئے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ "ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں، یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اُٹھائے گا ہم اس کے لیے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔" یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورۂ حج میں ارشاد ہوا :

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ	اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ	ہے، اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی،
حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (ع: ۱۰)	تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔

یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا "جہاد اکبر" ہے جس پر ملتِ ابراہیمی کی بنا ہے۔ یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا، ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے[2]، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ المجاهد من جاهد نفسه "یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔" صحیح مسلم میں ہے، ایک دفعہ آپ نے صحابہ سے پوچھا کہ "تم پہلوان کس کو کہتے ہو" عرض کیا "جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے[3]" یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے، اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

---

[1] بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد، ج ۲ ص ۲۸۵ حیدر آباد دکن [2] ایضاً کتاب الایمان ج ۱ ص ۲۹ [3] صحیح مسلم باب من یملک نفسہ عند الغضب جلد ۲ ص ۲۹۶، مصر۔

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اس کا دور کرنا ہر حق طلب کیلئے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے، تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے، اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ	تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے
الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ	کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ اور اچھی نصیحت
هِیَ اَحْسَنُ (نحل: ۲۶)	بھی کرتے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی بھلے اسلوب سے کر۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے، جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقۂ دعوت کا نام "جہاد بالقرآن" ہے، کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل، اپنی آپ موعظت، اور اپنے لیے آپ مناظرہ ہے، قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لیے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اس سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پردوں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا، ارشاد ہوا:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ	تو کافروں کا کہنا نہ مان، اور بذریعہ قرآن کے
جِهَادًا كَبِیْرًا ؕ (فرقان: ۵)	تو ان سے جہاد کر، بڑا جہاد۔

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے "جہاد کبیر" بڑا جہاد اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے[1]، ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لیے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے، اور ان کو اس راہ میں صرف کرے، اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام دے گا، یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

۳۔ جہاد بالمال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لیے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپیے پر موقوف ہیں، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جد و جہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابۂ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں

---

[1] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۱۱۹۔

میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور انہیں سیرابیوں سے دینِ حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لیے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (انفال: ۱۰)	بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ بمشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابلِ لحاظ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے:

انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (توبہ: ۶)	ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم کو معلوم ہو۔
إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات: ۲)	مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔
فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً (نساء: ۱۳)	اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں:

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کیلئے آسان ہے۔

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے۔

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے۔

گر جان طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن دریں است

اس لیے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے۔

۴۔ جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جانے ارشاد ہوا کہ "تمہارا جہاد نیک حج ہے"[1] کہ اس مقدس سفر کے لیے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صنفِ نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمتِ اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپؐ نے اُن سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی، جی ہاں، فرمایا "ففیہما فجاھد" تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو[2]، یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپؐ نے فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد [2] ابوداؤد و ترمذی کتاب الجہاد۔

ان من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر (ترمذی ابواب الفتن)

ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔

۵- اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے اُن تمام اقسام میں شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو، اور اسکی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں، تو اُنکو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبۂ کمال ہے۔ ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لیے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے بدلے اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے، اسی لیے ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (بقرہ: ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے اُن کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔

آلِ عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (آل عمران: ۱۷)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے اُنکو مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس اُن کو روزی دی جا رہی ہے، خدا نے اُنکو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے اس پر وہ خوش ہیں، اور جو اب تک اُن سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں اُن کو خوشخبری دیتے ہیں کہ اُن کو نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ غم میں ہیں۔

ان جاں نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں "شہید" ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندۂ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اُٹھیں گے[1]، اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ (عمران: ۱۴۰) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گویا اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اُترے تھے، لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربارِ الٰہی میں اُس وقت اس لیے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا وہ بھی اپنے حسنِ نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے، اسی لیے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لیے غازی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء: ۱۰)

اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے، وہ پھر یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن

تو جنھوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھر سے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد

دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا
لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ
الثَّوَابِ (ال عمران : ۲۰)

نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور اُن کو جنت میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی خدا کی طرف سے اُن کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

ان آیات کی تفسیر و تشریح میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور اُن اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور مغفرت کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اسقدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیاتِ جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے یہ وہ رُتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کی اور فرمایا کہ "مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کردوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کردوں[1]۔" ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ میں میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

دائمی جہاد یہ تو وہ جہاد ہے جسکا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، بیکاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، ردِ ظلم اور احکامِ الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون، ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک منقطع سلسلہ نظر آئے، سورہ ال عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا
وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔
(ال عمران : ۲۰)

اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو، اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ، اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہادِ محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے۔

* * *

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد ؛

عباداتِ قلبی

یہ اسلام کی اُن عبادات کا بیان تھا جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول انہیں بھی ہے لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے اسلیے تمام امورِ خیر، خواہ وہ جسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہا نے صرف جسمانی اور مالی عبادات سے بحث کی ہے لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی و مالی عبادات کیساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود اُن فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام "قلبی عبادات" رکھا جا سکتا ہے یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عباداتِ پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسدِ بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گو یہاں بے محل ہے مگر کہنے کے قابل ہے کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک بے روح اور دوسری طرف اعمالِ تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر شر کی تمیز کے لیے خلش ہو، یہ "تقویٰ" ہے۔ پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے یہ "اخلاص" ہے۔ پھر اُس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے یہ "توکل" ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال بر آمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے بُرا چاہنے والوں کا بھی بُرا نہ چاہا جائے، یہ "صبر" ہے۔ اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان اور زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ "شکر" ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے

* * *

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں:

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بقرہ: ۱)

یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۳)

اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے
پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقویٰ پاؤ۔

حج کا منشا بھی یہی ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ
تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج: ۴)

اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات)
کی عزت کرتا ہے، تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ
يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (حج: ۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا،
لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لیے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے:

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ (توبہ: ۱۳)

جس نے اس کی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی
کی۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (توبہ: ۱۳)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے:

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (توبہ: ۱۳)

اور سفر میں زاد راہ لیکر چلو اور سب سے اچھا زاد راہ تقویٰ ہے۔

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (بقرہ: ۲۱)

اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (بقرہ: ۳۱)	اور معاف کردینا تقوی سے قریب تر ہے۔
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (مائدہ: ۲)	انصاف کرنا تقوی سے قریب تر ہے
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران: ۱۹)	اور اگر صبر کرو، اور تقوی کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔
وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ (بقرہ: ۲۸)	اور تقوی کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔
وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (نساء: ۱۹)	اور اگر اچھے کام کرو اور تقوی کرو، تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اہل تقوی تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انھیں تقوی والوں کا حصہ ہے:

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ (دخان: ۳)	بے شبہہ تقوی والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (طور: ۱)	بے شک تقوی والے باغوں میں اور نعمت میں ہونگے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (ذاریات: ۱)	شک نہیں کہ تقوی والے باغوں میں اور چشموں میں ہونگے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ (قمر: ۱)	بلاشبہہ تقوی والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ (مرسلات: ۱)	بلاشک تقوی والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (ن: ۲)	یقیناً تقوی والوں کے لیے اُن کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا (نبا: ۲)	بے شبہہ تقوی والوں کے لیے کامیابی ہے۔
اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ (ص: ۴)	لاریب تقوی والوں کیلئے بازگشت کی اچھائی ہے۔

کامیابی اہل تقوی کے لیے ہے گو بظاہر ابتداء میں اہل تقوی کو کسقدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں یا بہت سی حرام اور مشتبہہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے، اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی ہی لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بناء پر کام کے اچھے بُرے نتیجوں کا فیصلہ کرلینا چاہیے، حالانکہ جو جتنا دور بین ہے اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دوربین اور عاقبت اندیش وہ ہیں جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کی دائمی اور دیرپا فائدہ کی بناء پر کرتے ہیں، اور جب انکی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی اُن کی بن جاتی ہے، اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انھیں کی قسمت میں ہوتی ہے۔ فرمایا:-

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اعراف: ۱۵)	اور آخری انجام تقوی والوں کے لیے ہے۔
اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ (ہود: ۴)	بے شبہہ انجام کار تقوی والوں کے لیے ہے۔

وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ. (زخرف: ۳)	اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰہٰ: ۸)	اور انجام کار تقویٰ کے لیے ہے۔

اہلِ تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں، اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ اُن کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی اُن کے ساتھ عقیدت محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے۔

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (انفال: ۴)	تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔
فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (آل عمران: ۸)	تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ: ۱)	اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (جاثیہ: ۲)	اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہیں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں، اور جس کے ساتھ اللہ ہو اُس کو کون شکست دے سکتا ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (بقرہ: ۲۴)	اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔
(توبہ: ۱۶، ۵)	اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔

قبولیت اہلِ تقویٰ ہی کو حاصل ہے ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کیساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا:

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (مائدہ: ۶)	اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔

اس لیے انھیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت، اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہلِ تقویٰ ہی کے لیے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دیدیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورۂ زمر میں ہے:

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ	اور جو سچائی لے کر آیا، اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ، لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ	تقویٰ والے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس
رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ (زمر: ۴)	وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلا نیکی والوں کا۔

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ، اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لیکر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا

نہیں چاہتا۔ لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورۂ بقرہ میں ہے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ
وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ
وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ : ۲۲)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر، اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا، اور نماز کو برپا کیا، اور زکوٰۃ ادا کی، اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف، اور لڑائی میں صبر کرنیوالے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ٹھہرے، اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا، اور بتایا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اُس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا
مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج : ۴)

اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے، اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا، اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے اُن کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ
عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ
امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (حجرات : ۱)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے اُن کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسولؐ کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (الشمس: ۱)	تو ہر نفس میں اسکا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد، اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرۃً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے۔ اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پاتا ہے، صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے اور اُن سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا:

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا (فتح: ۴)	اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پیچ رکھی، نادانی کی پیچ، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا، اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا، اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔

یہاں جنگ و خونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب، اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے، اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ: ۲)	تو تم ان کے عہد کو اُن کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (توبہ: ۲)	تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں، تم بھی ان کیساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَ آتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ (محمد: ۲)	جو لوگ راہ پر آئے خدا نے اُن کی سوجھ اور بڑھائی، اور اُن کو اُن کا تقویٰ عنایت کیا۔

اس سے عیاں ہے کہ "تقویٰ" ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اُس کو ہدایت پہ ہدایت اور فطری تقویٰ پر، مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا :

التقوٰی ھٰھُنا (مسلم)	تقویٰ یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک و شبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیوں کی محرک ہے، اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے؛ اور یہی سبب ہے، کہ وہ قرآن پاک کی رہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد، اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدہا خود ساختہ امتیازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے، اور اس لیے یہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بآواز بلند یہ اعلان کیا۔

جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنایا
اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ	کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں خدا کے نزدیک سب سے
اَتْقٰكُمْ (حجرات : ۲)	معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا الکرمُ التقوٰی یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے، اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔"

* * *

اخلاص

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغۂ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اسکی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب[1]۔

ہشیار ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہوتا ہے، ہوشیار رہو کہ وہ دل ہے۔

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور بُرے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لیے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش جلب منفعت، طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجاآوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (زمر: ۱)

(تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گذاری کو اسی کے لیے، ہشیار ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے خالص اطاعت گذاری

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گذاری میں، خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لیے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا:

اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ (فرقان: ۴) کیا تو نے اسکو دیکھا جسنے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

چنانچہ اسلام کی اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ، وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ، قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (زمر: ۲)

کہدے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گذاری کو اللہ کیلئے خاص کر کے اسکی عبادت کروں، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار ہوں، کہدے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہدے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گذاری کو اسکے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جسکی عبادت چاہے کرو

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ اطاعت گذاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرأ لدینہ وصحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بُت پرستی اور خواہشِ نفسانی کو دخل نہ ہو اور إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (لیل: ۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء علیہم السّلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (شعراء ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰)	اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے

حضرت نوح علیہ السّلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ (ہود: ۳)	اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے

خود ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہدینے کا فرمان ہوا: میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے:

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (سبا: ۶)	کہدے کہ میں نے تم سے جو اُجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لیے میری اُجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے۔

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض، اور صرف خدا کے لیے ہے، دوسری جگہ فرمایا:

لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (شوریٰ: ۳)	میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے، اسکے لیے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اسکے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابتداروں کا حق ادا کرو، اور آپس میں محبت رکھو۔

اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (فرقان: ۵)	کہدے کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اسکی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاوا اور نمائش تھا تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائیگی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اسکی بارگاہِ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزد و اجرت اور

تحسین وشہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین وشہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے:

ہم جو کام بھی کرتے ہیں اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضاء کی حرکت وجنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی جس کا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ ونیت، اور کام کی اندرونی غرض وغایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا، اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن وقبح اور ضعف وقوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق ومعاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض وغایت سے بالا، اور ہر دنیاوی مزد واجرت سے پاک رکھیں، تورات اور قرآن دونوں میں ہابیل اور قابیل آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے اُن میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (مائدہ: ۵)　　خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں، انہیں کا کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین ودنیا میں فوز وفلاح بخشا جاتا ہے، انکو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں اُن کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسلاً فیضیاب ہوتے ہیں اور اُن کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰؑ کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب وغرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب وغرائب میں ظاہری نہیں باطنی صورت کا فرق ہے ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازیگری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی وروحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ،

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى (طٰہٰ: ۲۰)　　اور جادوگر جدھر بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کا اصل پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

* * *

توکّل

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (آل عمران: ۱۷)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرے یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کر دے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورا ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش کا ترک ہی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر و احد اور خندق و حنین میں سواروں، تیراندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کر لو، اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو، اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو، اور اس سے مایوس اور بددل نہ ہو، اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا، اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران میں ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ	اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو، پھر جب
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ	پکا ارادہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بیشک اللہ

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران ۱۷)

اللہ پر بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آسکے گا، اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا، اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مددگار آمد نہیں ہو سکتی اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔

منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا (نساء: ۱۱)

تو ان منافقوں سے درگذر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دیجاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کیے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ (شعراء: ۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر، اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کیلئے اپنی (شفقت کا) بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانیں تو کہدے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے، جب تو رات کو اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گذار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ ہے، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے، وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓى اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ اِنَّ اللّٰهَ

اے پیغمبر خدا سے ڈر اور منافقوں اور کافروں کا کہا نہ مان، بیشک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے، اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی

كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا (احزاب: ۱)

جاتی ہے اسکے پیچھے چل بیشک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے۔

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور مصالحت کر لو، اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہیں دھوکہ نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو اُن کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا۔

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَإِنْ يُّرِيدُوٓا أَنْ يَّخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِيٓ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ (انفال: ۸)

اور اگر وہ صلح کیلئے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ، بیشک وہ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے، اور اگر وہ تجھے دھوکہ دینا چاہیں تو کچھ پرواہ نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے اُسی نے تجھ کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، اُن سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لیے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے:-

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ أَكْثَرَ الَّذِي هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ وَإِنَّهُ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ (نمل: ۶)

بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کرتا ہے جن میں وہ مختلف ہیں اور بیشک یہ قرآن مسلمانوں کیلئے ہدایت اور رحمت ہے، بیشک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہی غالب اور جاننے والا ہے تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا:

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا قُلْ مَآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَآءَ أَنْ يَّتَّخِذَ إِلٰى رَبِّهِ سَبِيلًا وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (فرقان: ۵)

اور میں نے تو اے رسول، تجھے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے کہدے کہ میں تم سے اسکے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ، مخالفین کی پروا نہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہیں:

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ

تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں، تو (اُن سے) کہدو کہ

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ
الْعَظِيمِ۔ (توبہ: ۱۶)

مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود، لیکن وہی اسی پر
میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔

آپس کے اختلاف میں اللہ کا فیصلہ چاہیے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ
إِلَى اللَّهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ
وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (شوریٰ: ۲)

اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس
کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر
میں بھروسہ کرتا ہوں، اور اُسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دیجاتی ہے کہ اُن کے کفر و نافرمانی کی پروا نہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔

كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهَا أُمَمٌ لِتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا
إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ ۚ
قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ (رعد: ۴)

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت
سی قومیں گذر چکیں، تاکہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے
تجھ پر وحی کیا ہے، اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے
ہیں کہہ کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی
اس پر میں نے بھروسہ کیا، اور اُسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد اُن کی شرارتوں سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہیے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیے۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا
فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (الملک: ۲)

کہہ وہی رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی
پر بھروسہ کیا تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

جسطرح ہمارے رسول کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مخالفتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرما دیا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ
يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَ
تَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا
أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا
تُنْظِرُونِ (یونس)

(اے پیغمبر) ان کو نوح کا حال سنا جب اُسنے اپنی قوم
سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے
ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر شاق گذرتا ہے، تو اللہ پر میں
نے بھروسہ کر لیا ہے تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب
مضبوط کر لو، پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے پھر اس
کو مجھ پر پورا کر لو، اور مجھے مہلت نہ دو۔

غور کیجیے کہ حضرت نوح دشمنوں کے ہر قسم کے مکر و فریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت

کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہیں، حضرت ہود علیہ السلام کو اُن کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں،

إِنِّيٓ أُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوٓا أَنِّي بَرِيٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُونَ مِنْ دُونِهٖ فَكِيدُونِي
جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُونِ إِنِّي تَوَكَّلْتُ
عَلَى اللّٰهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ط (ہود : ۵)

میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کر لو، پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے، بھروسہ کر لیا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے:

إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط
وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ
وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (ہود : ۸)

میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں میری توفیق اللہ ہی سے ہے اُس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کی مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے:

قُلْ لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلٰى
مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عٰمِلُونَ، وَانْتَظِرُوٓا إِنَّا
مُنْتَظِرُونَ، وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ
وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ
وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ (ہود : ۱۰)

کہدو اُن سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید، اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے پھر اسکی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ کر۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروا نہ کی۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ
إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهٗ إِذْ قَالُوا
لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا
تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ كَفَرْنَا
بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ
وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ
وَحْدَهٗٓ إِلَّا قَوْلَ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ
لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ أَمْلِكُ لَكَ مِنَ

تمہارے لیے ابراہیم اور اُن کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو اُن سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا، اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں۔ اے

اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ رَبَّنَا عَلَیْکَ تَوَکَّلْنَا	ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف
وَاِلَیْکَ اَنَبْنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ (ممتحنہ: ۱)	ہم نے رجوع کیا، اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرطِ محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح اُن کو بھی کوئی مُصیبت نہ پیش آئے۔ بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازے سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارسازِ حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لیے تدبیر پر بھروسہ نہیں بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ م بَابٍ	اور (یعقوب نے) کہا اے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ
وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ	جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا، اور میں تم کو خدا
مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ	سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا، فیصلہ اسی کا ہے، اسی پر
مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ	میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہیئے کہ بھروسہ کرنے
وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (یوسف: ۸)	والے بھروسہ کریں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا ہے کہ ظاہری تدبیر شانِ توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم اُن کو زبردستی بُت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ	اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آجائیں جب ہم کو خدا اس سے
مِلَّتِکُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا یَکُوْنُ	بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم سے نہیں ہو
لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ	سکتا کہ ہم پھر اُس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا
رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا عَلَی	پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم
اللّٰهِ تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ	سے ہر چیز کو سمائے ہے ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ۔	پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کر دے
(اعراف: ۱۱)	اور تو ہی سب فیصلہ کرنیوالوں سے بہتر فیصلہ کرنیوالا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زر و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا:

یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ	اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لاچکے ہو تو اسی پر
فَعَلَیْهِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ (یونس: ۹)	بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو۔

اُن کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا:

عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً	ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ (یونس: ۹)	قوم کے لیے آزمائش نہ بنا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جسطرح کامیاب بنایا، اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جسطرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے۔

مَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (طلاق: ۱) جو خدا پر بھروسہ کریگا تو وہ اس کو کافی ہے۔

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہیے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا، اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟ ؎

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالیے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت اور پُرزور مخالفتوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ کو چھوڑ کر خدا پر توکل کر دوں (کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا) یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا، اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو[1]، اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے ؎ بر توکل زانوے اشتر بہ بند۔

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشاء کے مطابق ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈا[2] غیر شرعی جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر کو ان چیزوں سے مطلب براری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس خیال کی تردید کی ہے۔ اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے، یہ وہ ہونگے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے بلکہ اپنے پروردگار پر اعتماد اور توکل رکھتے ہیں[3]۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو داغواتا اور تعویذ گنڈا کرتے ہیں وہ توکل سے محروم ہیں[4]۔ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں

---

[1] یہ حدیث بلفظ اعقلها وتوکل ترمذی (آخر ابواب القیامۃ ص ۴۱۴) میں اور قیدہ وتوکل شعب الایمان بیہقی میں اور قیدھا وتوکل خطیب کی رواۃ مالک اور ابن عساکر میں ہے (کنز العمال جلد ۲ ص ۲۳ حیدرآباد

بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں[۶]، اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھ کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں، اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا	زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں، لیکن اس کی روزی
عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (ہود:۱)	خدا کے ذمہ ہے۔

تو وہ اس کے لیے چوری ڈاکہ، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دلتنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّ	اور جو کوئی اللہ سے ڈرے وہ اس کے لیے
یَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ	مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے
وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ؕ	روزی دیگا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا اور جو اللہ پر
اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ؕ قَدْ جَعَلَ	بھروسہ کریگا تو وہ اس کو بس ہے، بیشک اللہ اپنے
اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔	ارادہ کو پہنچکر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لیے
(طلاق:۱)	ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں "خود اعتمادی" کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں، اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے "خدا اعتمادی" کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

⁂

(بقیہ حاشیہ)

[۳] خرمی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے لیکن آیات اور دعاؤں کا لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں [۴] صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق وکتاب الرقاق وصحیح مسلم کتاب الایمان، جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے [۵] جامع ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ الرقی، اصل الفاظ یہ ہیں "من اکتوی او استرقی فھو بریٔ من التوکل" (حاشیہ صفحہ ہذا) [۶] جامع ترمذی ابواب الزہد ص ۳۸۸ وحاکم ؛

صَبْر

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ اُن کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی ”صبر“ کے لغوی معنی ”روکنے“ اور ”سہارنے“ کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے: یعنی اسکے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کے ہیں، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین دفعہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضرؑ کہتے ہیں:

إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۔ وَكَيْفَ تَصْبِرُ
عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا (کہف: ۹)

تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے، اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو جس کا علم تمہیں نہیں۔

حضرت موسیٰؑ جواب میں فرماتے ہیں:

سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا (کہف: ۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت اُن کی زبان سے قرآن یوں کرتا ہے:

إِن كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا
لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا (فرقان: ۴)

یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (دیوتاؤں) سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم اُن پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ
لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (حجرات: ۱)

اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کیلئے بہتر ہوتا۔

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، بااین ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقت مناسب کا انتظار کرنا پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اُٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام

کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپؐ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہوگیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اسوقت بشریت کے اقتضاء سے آپؐ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور دور نظر آنے لگی، اسوقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیے خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئیگا، فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا ۔ (طور: ۲)	(اے رسول) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔
فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ بَیْنَنَا (اعراف: ۱۱)	تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو یہانتک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کردے۔
وَاصْبِرْ حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰہُ وَھُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ ۔ (یونس: ۱۱)	اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے، وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔
فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَۃَ لِلْمُتَّقِیْنَ (ہود: ۴)	ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے۔

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری توقع رکھنی چاہیے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ (روم، مومن: ۶، ۷)	ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے۔

ایسا نہ ہو کہ وعدۂ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو، اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ۔

فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تُطِعْ مِنْھُمْ اٰثِمًا اَوْ کَفُوْرًا ۔ (دہر: ۲)	اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ، اور ان (مخالفین میں) سے کسی گنہگار یا کافر کا کہا نہ مان لے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ اُن کو خیال ہوا کہ اُن کی نافرمان قوم پر عذاب آنے کی غلط خبر ہو رہی ہے اس لیے وہ بھاگ کھڑے ہوئے حالانکہ اُن کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اسلیے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا کہ اے پیغمبر اسطرح تیرے ہاتھ سے صبر کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے۔

فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۔ (ن: ۲)	اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کیساتھ انتظار کر اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔

بیقرار نہ ہونا صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بیقراری نہ ہو، بلکہ اُنکو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے، اور یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئیگا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی:

وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَآ اَصَابَھُمْ (حج: ۵)	اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں سے جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھالیا، فرماتے ہیں:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا
فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ
عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ (یوسف: ۲)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑلی ہے
تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے
جو تم بیان کرتے ہو۔

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سُن کر کہتے ہیں:

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ
عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا (یوسف)

بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے، عنقریب
خدا اُن سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کیساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

إِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ
إِنَّهٗ أَوَّابٌ۔ (ص: ۴۴)

ہم نے بیشک ایوب کو صابر پایا، کیا اچھا بندہ، وہ خدا
کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

يٰۤأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ
إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (صافات: ۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کر گزر، خدا نے
چاہا تو تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں، اور مخالفین جو طعن و طنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنیوالوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کیساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لیے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا۔

يٰۤأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ...
وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ (مدثر: ۱)

اے چادر پوش! اُٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر...
اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی (صبر) کر۔

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ
وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ۔ (احقاف: ۴)

(اے محمدؐ) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے
پیغمبروں نے کی، اور ان (مخالفوں) کیلئے جلدی نہ کر۔

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر، اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں اُن کا مردانہ وار مقابلہ کر۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَاۤ
أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ (لقمان: ۲)

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے
اسکو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

کفار عذابِ الٰہی کے جلد نہ آنے یا حق کی ظاہری بے کسی و بے بسی کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروا نہ کرو اور نہ اُن سے دل کو اداس کرو بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ، اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا۔

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ (ص: ۲)	ان کے کہے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔

اس قوتِ صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے، اور اسکی طاقت پر بھروسہ کیا جائے۔

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ، الآیہ (طٰہٰ ۸، ق ۳)	تو اُن کے کہنے پر صبر کر، اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعنہ و طنز کا دھیان نہ کیا جائے بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف و مروت برتا جائے، فرمایا:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (مزمل: ۱)	اُنکے کہے پر صبر کر، اور اُن سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔

درگذر کرنا صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنیوالوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے، اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردگی دکھائی جائے، قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ. وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ. (نحل: ۱۶)	اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر، اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے، اور اُن کا غم نہ کر اور نہ اُن کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لیے ہو۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ. (رعد: ۳)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی، اور جو ہم نے اُن کو روزی دی اُس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔

فرشتے اُن کو مبارکباد دیں گے اور کہیں گے:

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۳)	تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے کہ اسکے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے کیونکہ یہی اصل ہے جس میں یہ جوہر ہو گا وہ عبادت کی تکلیف بھی اُٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا، اور دشمنوں کی بدی کا

جواب نیکی سے بھی دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کردی گئی ہے کہ درگذر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی جس میں صبر ہوگا۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ
أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ
كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ
صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (فصلت: ۵)

بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا، اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں، اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں اُن پر خدا کا عذاب ہوگا، اسلیے ایک صاحبِ عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے اور معاف کردے، فرمایا:

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ
وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ
ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ (شوریٰ: ۴)

راستہ انھیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں، اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے پُردرد عذاب ہے، اور البتہ جس نے برداشت کیا، اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

ثابت قدمی صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم پر بارہا استعمال کیا ہے، اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا:

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ
الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (بقرہ: ۲۲)

اور صبر کرنے والے، (ثابت قدمی دکھانے والے) مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں جو سچ بولے، اور وہی پرہیزگار ہیں۔

اگر لڑائی آپڑے تو اُس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امامِ وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد و موافقت اور میدانِ جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً
فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ
وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا
فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ۔ (انفال: ۶)

اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو، اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ، اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو، اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، اور صبر دکھاؤ، بیشک اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے۔

حق کے مددگاروں کی ظاہر قلتِ تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دیدی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جانثاروں کو سکھادیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ
يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ
وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۔ اَلْئٰنَ خَفَّفَ
اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ
يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ (انفال: ۹)

اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار، اگر یہ
بیس صبر کرنیوالے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہونگے
اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے
کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی،
اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، تو اگر سو صبر کرنیوالے
(ثابت قدم) ہوں کو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر
والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے،
اور اللہ صبر کرنیوالوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے

میدانِ کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد انھیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے۔

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ
قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ
فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ
وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ
وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (بقرہ: ۳۳)

طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اسکی فوج
کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انھوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے
ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم
سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر و
ثبات دکھانیوالوں کیساتھ ہے، اور جب یہ جالوت اور اسکی فوج کے
مقابلہ میں آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار، ہم پر صبر بہا اور ہمکو ثابت قدمی
بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر،

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتایا ہے کہ خدا انھیں کا ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، اور خدا کے بھروسہ پہ مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا
فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۔ (نحل: ۱۴)

پھر تیرا پروردگار اُن کے لیے ہے جنھوں نے ایذا پانے کے بعد گھر
بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کیساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطرافِ ملک کے کفار سے جب مقابلہ آپڑا، تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ
وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۣ يُوْرِثُهَا
مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو، اور
صبر استقامت سے کام لو، بیشک زمین خدا کی ہے، وہ
جس کو چاہتا ہے، اپنے بندوں میں سے اس کا مالک

لِلْمُتَّقِيْنَ. (اعراف: ١٥)

بناتا ہے، اور انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی، اور بہادرانہ استقامت، اور صبر و ثابت قدمی سے مقابلے کیے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہوگئیں، اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ
بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى
عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا
مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا
كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ. (اعراف: ١٦)

اور اُن لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے، اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں اُن کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سربلند ہوئی کہ اُس نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ
بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يُوْقِنُوْنَ. (سجدہ: ٣)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کیے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثباتِ قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین اور پھر اُن اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوہ اُحد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی بلکہ ستر مسلمان خاک و خون میں لتھڑ کر راہِ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اُن کے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد اُن کو سناتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ
كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۚ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ
اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا

اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اور نہ ان کے دل بودے ہوئے، اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے تھے

فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا	کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور کام
عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ،	میں ہماری زیادتی کو معاف کر، اور ہمارے قدم ثابت رکھ
(آل عمران : ۱۵)	اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن تو بر تو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں، اور فرمادیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگذر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثباتِ قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتح یابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے انہیں کے حصہ میں ہے، جن کو یہ پامردی دل کی مضبوطی اور حق پر ثباتِ قدم کی دولت ملی، حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا	کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ
یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا	نے (آزما کر)، ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے
مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ (آل عمران : ۱۴)	والے ہیں، اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبطِ نفس اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اسوقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر یہی ضبطِ نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو، اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بد دل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے انسانی فطرت کے رازدار کا کہنا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰھَا	اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں پھر اس
مِنْهُ اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ، وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ	سے اسکو تارلیں تو وہ ناامید و ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی
نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ	مصیبت کے بعد اسکو نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے
ذَھَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ،	دور ہو گئیں، بیشک وہ شادان اور نازاں ہے، لیکن وہ جنھوں نے

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰئِكَ
لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ۔ (ہود : ۲)

صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کیے یہ لوگ
ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی کر بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گذرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری، اور عبودیت پر ثبات نفسِ انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لیے حکم ہوا:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا
بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ
(مریم : ۴)

آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا، اور جو ان دونوں
کے بیچ میں ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر اور
اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ : ۸)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اُس پر قائم رہ

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسبِ ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اُن کو خوشخبری سُناتا ہے:

فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ
نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا، وَجَزٰهُمْ بِمَا
صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا۔ (دہر : ۱)

تو اللہ نے انکو اس دن کی بلا سے بچایا اور انکو تروتازگی شادمانی
سے ملایا اور انکے صبر کرنے (یعنی احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے)
کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں، بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گذرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گذر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سُناتا ہے:

أُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا (فرقان : ۶)

ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلافِ طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بُری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اُٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، الوانِ نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ میں شدائد کو آرام و راحت جان کر جھیل جانا، سُود کی

دولت سے ہاتھ اُٹھا لینا، حسن وجمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجاآوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے،

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حُجِبَتْ (حُفَّتْ) الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُجِبَتْ (حُفَّتْ) النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ (صحیح بخاری کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الجنۃ)

جنت ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اسوقت دنیا میں نفس پر شاق گذرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے اسوقت دنیا میں بڑے پُرلطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں، اس عارضی ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کیے بغیر احکامِ الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسبابِ عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور اسوقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے، مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کر لے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا اُنکی چشم بینا اسوقت بھی کھلی ہوئی تھی اور اُن کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے خدا کی وہ دولت جو نیکوکاروں کو بہشت میں ملیگی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ، وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ (قصص: ۸)

جو لوگ حیاتِ دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنھیں علم ملا تھا انہوں نے کہا، تمھارا بُرا ہے، اللہ کی جزا، ان کے لیے جو ایمان لایا اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے ہیں جو صابر ہیں۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ، وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (نحل: ۱۳)

جو تمھارے پاس ہے وہ چک جائے گا، اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے اور یقیناً ہم اُن کو جنھوں نے صبر کیا ان کی مزدوری اُن کے بہتر کاموں پر دیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یاددہانی ہے۔ اس کے بعد ہے:

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (ہود: ۱۰)

اور صبر کر کہ بیشک اللہ نیک کام کرنیوالوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

صبر کے فضائل اور انعامات

یہ مزدوری کیا ہوگی، یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (زمر: ۲)

صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔

جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، اُن میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصّٰدِقِيْنَ
وَالصَّادِقَاتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرَاتِ وَالْخٰشِعِيْنَ
وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ
وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصَّآئِمَاتِ وَالْحٰفِظِيْنَ
فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذّٰكِرِيْنَ
اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرَاتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ
مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيْمًا۔ (احزاب: ۵)

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنیوالے مرد اور بندگی کرنیوالی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور خدا کے سامنے جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنیوالے مرد اور خیرات کرنیوالی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے، معافی اور بڑی مزدوری۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اُس کے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ إِنَّنَآ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ، اَلصّٰبِرِيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ
وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ
بِالْأَسْحَارِ۔ (آل عمران: ۲)

(جنت اور خدا کی خوشنودی اُن کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لاچکے، ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اُٹھالینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنیوالے اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں اُن کے چار اوصاف گنائے ہیں، جن میں پہلا درجہ صبر یعنی محنت سہارنے تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے دوسرا راستی اور استبازی کا تیسرا خدا کی بندگی و عبودیت کا، اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر، اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا،

اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے ساتھ اُن کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں، یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر اُن کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبِ روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ: ۵) اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلیں دور ہونگی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا
تَشْعُرُوْنَ ، وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ
مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ
الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ
مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ
رٰجِعُوْنَ ، اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ قف
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ،

(بقرہ: ۱۹)

اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو، بیشک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں اُن کو مُردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں، اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال (جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوشخبری سنا دو جن کو جب کوئی مصیبت آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں، اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے، یہ لوگ ہیں، اُن پر اُن کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر، ضبطِ نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں، اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر بازگشت اسی کیطرف ہو گی، اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیے، اگر اس راہ میں موت بھی آجائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے۔

⁂

شُکر

وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (اعراف: ۱۷)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو، اور وہ دودھ زیادہ دے" اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہوسکتی ہے دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو، زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کیجاتی ہے، خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹا کفر ہے، اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں کفرانِ نعمت کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا، کفر ہے جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں:

اِنَّا ھَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا	ہم نے انسان کو راستہ بتادیا، (اب وہ) یا شکر گزار
وَّاِمَّا کَفُوْرًا ۔ (دہر: ۱)	(شاکر ہوا) یا ناشکرا (کافر) ہوگیا
لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ	اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمھیں بڑھائیں گے، اور اگر ناشکری
اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ (ابراہیم: ۲)	(کفر) کی تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی ناقدری کا نام ہے، تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے، حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا
لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ
شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (نحل : ۱۶)

دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا
فرمانبردار اسکو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنیوالوں میں
سے نہ تھا، اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکرگزار، اللہ
نے اُسکو چن لیا، اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکرگزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے، احکام الٰہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہیے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ
وَآمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا (نساء : ۲۱)

اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دیکر کیا کریگا
اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصّہ خدا کی راہ میں دیتا ہے، تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگانِ الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے، تو یہ کہا :

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (اعراف : ۲) تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنیوالا نہ پائے گا۔

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا :

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (آل عمران : ۱۵) اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے :

بَلِ اللَّهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِينَ (زمر : ۶) بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکرگزاروں میں سے ہو۔

شکر کے اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں کبھی اُس کا بدلہ دیکر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآن کی اصطلاح میں حمد ہے جسکے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفاتِ کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصل محرک ہیں، اور اسی لیے یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ

سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بناپر قرآنِ پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمدُ سے ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (فاتحہ: ۱) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں، سب کی پرورش، اور زندگی اور بقا اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں، اور نکھر رہے ہیں، اس لیے حمد اسی ایک کی ہے یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے لیکن دنیا جب اپنی تمام منازلِ حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی، اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کیصورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ دوزخ، دوزخ میں جا چکیں گے، وہ وہ وقت ہو گا جب دنیا اپنے اُس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہو گی، جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا تھا، اسوقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سُریلی آواز بلند ہو گی:

وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (زمر: ۸) سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

لَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (روم: ۲) اُسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ جو عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے چاروں طرف
حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہِمْ (مومن: ۱) ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔

بلکہ عرصۂ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (بنی اسرائیل: ۵) اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ (حجر، طہ، مومن، طور، فرقان) اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں، مثلاً کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے،

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں اُن کا شکریہ یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعمیل میں لگا رکھیں اور اُن سے اُن کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جز سے محروم ہیں، مثلاً جو اپاہج اور معذور ہوں، بیمار ہوں، کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں، اُن کو اس سے حصہ دیا جائے، بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے، پیاسوں کو پانی پلایا جائے، ننگوں

کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا، وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا، (فرقان: ۶)

بڑی برکت اس کی ہے جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا، اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے۔ اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کرکے شکر کی ہدایت ہے، یہ شکر اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں، اور دن کی روشنی اور چاند کے اُجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے:

الرَّحِيْمُ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ (سجدہ: ۱)

بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر سے نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان، اور آنکھیں اور دل بنائے، تم کم شکر کرتے ہو۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا، وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (نحل: ۱۱)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیے کان، اور آنکھیں اور دل بنائے۔

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان ہے اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی، اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اسمیں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں اور آنکھ کان سے اسکے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے:

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ، كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (حج: ۵)

تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ اُن کو کھلاؤ جو صبر کیے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بیقرار ہے اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیئے ہیں، تاکہ تم شکر کرو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ۔ (بقرہ: ۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور خدا کا شکر کرو

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ، (نحل: ۱۵) تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے،

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص: ۸) اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے، ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اسکو کوئی قرضہ دے، خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اسکے ضرورتمند بندوں کو یا قابلِ ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔

(بقرہ: ۳۲، حدید: ۲)

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (حدید: ۲، مزمل: ۲) اور خدا کو قرض حسنہ دو

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (تغابن: ۲) اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔

خدا کو قرضِ حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائیگا، اے آدم کے بیٹا! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو جہان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا، تو نے اس کی پرسش نہ کی، اور اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائے گا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا، اے میرے پروردگار تو تو سارے جہان کا رب ہے، میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا، تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا، تو نے اس کو نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا، فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا، تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اسکو پلاتا تو آج تو اسکو میرے پاس پاتا۔[1]

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی و مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہیے۔

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض :

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے، حالانکہ اُن کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی! جو کچھ ملا اُس کے فضل و کرم سے ملا، اور جو کچھ ملے گا وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی، انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، دیکھ کر، اور اُن کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں، بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں، مگر خوب سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے ۔

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اُس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا، جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہے ۔

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا	(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا، اس پر اتراؤ نہیں، اور
يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۨ الَّذِيْنَ	اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں
يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ	کرتا، جو خود کنجوس ہیں، اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے
بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ	کو کہتے ہیں، اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ
اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۔	کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و
(حدید : ۳)	خوبی) سے مالا مال ہے ۔

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے، کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے ۔

خدا نے انسانوں پر جو تو بر تو نعمتیں اتاری ہیں، اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اُس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے ۔

وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (انفال) اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں تاکہ تم شکر کرو ۔

وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا	اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا تاکہ تم اس سے
طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا	تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس
وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ	کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ	اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور تاکہ تم خدا کی مہربانی
تَشْكُرُوْنَ ۔ (نحل : ۲)	ڈھونڈو، اور تاکہ تم شکر کرو ۔

وَکَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ۔ (حج : ۵)

اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ
وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (قصص : ۷)

اور اسکی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اسکے فضل و کرم کو تلاش کرو، اور تاکہ تم شکر کرو

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گنہگار انسان کا کیا حال ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ
اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ۔ (یونس : ۶)

اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے لیکن ان میں بہت کم شکر کرتے ہیں۔

لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا
لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ
(اعراف : ۱)

اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی، اور اس میں تمہارے لیے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے۔ تم بہت کم شکر کرتے ہو۔

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر پُر محبت غضب کا اظہار بھی فرمایا:

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ، (عبس : ۱)

مارے جائیو، انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے۔

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا، تو مالک کا شکر ادا ہوگیا حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں، اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہیں، اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں، لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیفیت نہ ہو، اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو، تو ہم اس محسن کی احسانمندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں، اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد اُن کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (سبا : ۲)

اے داؤد کے گھر والو، شکر ادا کرنے کیلئے نیک عمل کرو

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے، اسی لیے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ
الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ
وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ (نمل : ۲)

اے میرے پروردگار مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو

اس دعا میں بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر میں، شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے میں اُن کے لیے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو نئی نئی نعمتیں اور عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لیے فرمایا :

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ. (ابراہیم : ۲)	اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے
كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ (قمر : ۲)	ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔
وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (آل عمران : ۱۵)	اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے لیے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اُس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا، اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کریگا، اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کریگا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود آپس میں ایک دوسرے انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ (ترمذی کتاب البر والصلۃ) یعنی جو انسانو کا شکر ادا نہ کرے گا، وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا، اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا، تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

تعلیماتِ نبوی کا تیسرا باب

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبویؐ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے۔ اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لیے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے، اس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز و رشتہ دار، دوست و احباب، سب سے تعلقات ہیں بلکہ ہر اس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلہ، وطن، قومیت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں، اور ان تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و ایمان اسی اخلاق کی دولت سے ہے۔ اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس لیے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے راستہ سے بہکنے نہ دے۔ دنیا کے سارے مذہبوں نے کم و بیش اسی کی کوشش کی ہے اور دنیا کے آخری مذہب "اسلام" نے بھی یہی کیا ہے۔ آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور کیا ہے۔ اس کو تفصیل سے بتانا ہے۔

اسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے سارے مذہبوں کی بنیاد اخلاق ہی پر ہے چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے، سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے، انصاف بھلائی اور ظلم بُرائی ہے، خیرات نیکی اور چوری بدی ہے لیکن مذہب کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے خود آپ نے ارشاد فرمایا:۔

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ (موطا مالک حسن اخلاق) میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے بھیجا گیا ہوں۔

یہ امام مالک کی مؤطا کی روایت ہے، مسند احمد، بیہقی اور ابن سعد وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ ہیں، آپؐ نے فرمایا:۔

"اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔" میں تو اسی لیے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کردوں۔

چنانچہ آپؐ نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبر کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق کے لیے مکہ بھیجا، انہوں نے واپس آکر اُس کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی، وہ یہ تھے:۔

رَاَیْتُہٗ یَاْمُرُ بِمَکَارِمِ الْاَخْلَاقِ[2] میں نے اسکو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاق حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بُلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی، اسوقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:۔

> "اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے ہمسائیوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست، زیردستوں کو کھا جاتے تھے، اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا۔ اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خون ریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔"[3]

اسی طرح قیصر روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں، اور قرابت کا حق ادا کریں[4]۔

قرآن مجید نے جابجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کہا ہے:۔

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدر آباد و زرقانی شرح مؤطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ مطبع کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ [2] صحیح مسلم مناقب ابی ذر جلد ۲ صفحہ ۲۹۴ مصر [3] ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدر آباد، جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعہ ہجرت [4] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد ۱۲

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ	یہ پیغمبر ان اَن پڑھ جاہلوں کو پاک وصاف کرتا اور
الْحِكْمَةَ (جمعہ ۱)	ان کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

اس آیت میں دو لفظ فیصلے کے قابل ہیں، ایک پاک صاف کرنا جس کو قرآن پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

۱۔ **تزکیہ** کے لفظی معنی پاک وصاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں۔ قرآن پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے، یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دیا جائے، سورۂ والشمس میں ہے:-

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ	قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا پھر اس میں
تَقْوٰىهَا. قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ	اس کی بدی اور نیکی الہام کردی بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف
خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا. (شمس)	ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسکو مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔

دوسری جگہ ہے:-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ	بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک وصاف کیا اور
رَبِّهٖ فَصَلّٰى (الاعلیٰ)	اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى وَ	پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس
مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى اَوْ يَذَّكَّرُ	وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا یا وہ
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (عبس)	سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام علیہ السلام کی خاص خصوصیت قرار دی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جِلا دیں۔ ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق واعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں۔ چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کیے گئے ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲۔ **حکمت**:- اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت کا ہے۔ گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصہ میں کی جا چکی ہے مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن پاک میں جہاں اس علم وعرفان کے معنی میں ہے۔ جو نور الٰہی کی صورت میں نبیؐ کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسولؐ کی زبان سے کبھی مصالح واسرار اور کبھی سنن واحکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم وعرفان کے ان عملی آثار ونتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصہ اخلاقی تعلیمات کا ہے۔ قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت وتعظیم، قرابتداروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولادکشی، بدکاری، کسی گنا

کی جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے:۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (ع ۴)
یہ حکمت کی ان باتوں میں سے جنکو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورۂ لقمان میں ہے کہ:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ (ع ۲)
اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کر۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کہنے کو کہہ، اور بُری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری اُمورِ خیر کو بھی جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں "حکمت" کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحی محمدی کتاب و حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے۔ یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں۔ خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے، فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (حج: ۱)
اے ایمان والو، رکوع کرو، سجدہ کرو، اپنے رب کو پوجو اور نیکی کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

گویا ایمان کے روح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے جسم کے دو بازو ہیں، ایک عبادت اور دوسرا اخلاق ایک خالق کا حق اور دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام "اسلام" ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیت ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم محمدی نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اخلاق حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الراحمین ہیں اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے۔ مگر حقوق عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرالے، ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ

دی جائیں گی[1]۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی، ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا۔ دوسری وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ وہ نہ معاف فرمائے گا۔ جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے، وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے۔ جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو۔ یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دیگا اور بخش دیگا لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے۔ (مسند احمد و حاکم عن عائشہؓ) اس سے معلوم ہوا کہ معاملاتِ انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہوگا، اسکی اہمیت کتنی زیادہ ہے[2]۔ چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کرلے۔ اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اسوقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہولیا۔

اسلام کے ارکان پنجگانہ اور اخلاق

بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے، بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے۔ قرآن پاک میں یہ نقطہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ احکام الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں، وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔ قرآن پاک اور تعلیم نبوی کے جو اشارات اس باب میں ہیں۔ حضرات صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالی، احیاء العلوم میں لکھتے ہیں :-

"خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لیے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو۔ اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اسوقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو، کتنے نمازی ہیں جنھوں نے گو شراب نہیں پی۔ مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷

[2] یہ اصول فقہ کا مسئلہ ہے دیکھو ہدایہ کتاب الحج ص ۲۱۳ مرتبہ مولانا عبدالحی مرحوم

ادا کرے جس میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کر دے گا۔ پھر فرمایا کہ نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے۔ اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ اے میرے اللہ! جس نے یہ بات نہیں پیدا کی، اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک نماز قبول نہیں کرتا، میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے۔ میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور جو بھوکے محتاج کو میرے لیے کھانا کھلاتا ہے"۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز اسی لیے فرض کی گئی اور اسی لیے حج کے ارکان بنائے گئے تاکہ خدا کی یاد کی جائے" تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کر دیتی ہے۔"[1]

اس اخیر حدیث کو ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہل تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں بسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (سورۂ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کر دیا ہے اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ "جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں"[2]۔ اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپ نے فرمائے ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"[3]۔ ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

اخلاق حسنہ اور ایمان اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو گو مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے اس لیے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے۔ فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ؛	بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نمازوں میں خضوع و خشوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (مومنون ۱)	اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے، ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض)، فیاضی (زکوٰۃ)، پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

---

[1] جلد اول باب فضیلۃ الخشوع ۱۲

[2] تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت، آیت مذکورہ ۱۲

[3] صحیح بخاری و جامع ترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ، کتاب الصوم ۱۲ ؎

اخلاق حسنہ اور تقویٰ اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے تقویٰ ہے۔ وحی محمدی نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں :-

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ۔ ۲۲)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو خدا پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت، تکلیف اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہی ہیں جو راستباز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راستبازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے، اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں :-

اخلاقِ حسنہ اور خدا کے نیک بندہ ہونے کا شرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں خدا کے نزدیک ان کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا :-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا
وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا وَالَّذِيْنَ
يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا وَالَّذِيْنَ
يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ
اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا
وَّمُقَامًا وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا
وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا
وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ
لَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ
اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ج وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ....
وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا

اور رحم والے خدا کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب ناسمجھ لوگ ان سے بات کریں تو وہ سلام کہیں اور جو اپنے پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گذارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے جہنم کا عذاب دور کر، کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے اور جہنم برا ٹھکانا اور مقام ہے اور جو خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان دونوں کے بیچ سے وہ سیدھے گذریں۔ اور جو خدا کے ساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور جو کسی جان کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس کو خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں کہ جو ایسا کریگا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔۔ اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کبھی لغو

بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا (فرقان : ٦)

پر گذرتے ہیں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگذر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور دکرو زور میں شریک نہ ہونا وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں۔

وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ۔ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ، وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (شوریٰ : ۴)

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو ان پر ہے جو لوگوں پر خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور سہہ لے تو یہ ہمت کے کام ہیں۔

أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔

(آل عمران : ۱۴)

جنت ان پرہیزگاروں کیلئے تیار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصہ کو دبالیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور خدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا

یہ وہ ہیں جنکو دہرا ثواب ملیگا اسلیے کہ انہوں نے صبر کیا

صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۔ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (قصص: ٦)	اور وہ برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی بے ہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا عمل اور تمھارے لیے تمھارا عمل ہے۔ تم سلامت ہو، ہم نا سمجھوں کو نہیں چاہتے ۔
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (دہر: ۱)	اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں ۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے۔ ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے ؟

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا :۔

واهدنى لاحسن الاخلاق لا يهدى لاحسنها الّا انت واصرف عنى سيئها لا يصرف عنى سيئها الّا انت۔ (مسلم باب الدعاء فی الصلوٰۃ)	اور اے میرے خدا! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا، لیکن تو ۔

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے ۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے ۔ فرمایا :۔

اکمل المومنین ایمانًا احسنهم خلقًا ۔	مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے ۔

یہ حدیث ترمذی، ابن حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابن حبان میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے ۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاق حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف نفلی کبھی حاصل ہو جاتا ہے ۔ ارشاد ہوا :۔

ان الرجل ليدرك بحسن خلقه درجة قائم الليل وصائم النهار۔	انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے ۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابن حنبل، حاکم، ابن حبان اور طبرانی میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک

یا اس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے وہی درجہ حسن خلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ حسن اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ فرمایا:۔

خیارکم احسنکم اخلاقا (بخاری، کتاب الادب)	تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

ما من شیء یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فانّ صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم والصلوٰة۔	(قیامت کی) ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابن حبان، ابن حنبل، ابوداؤد) میں مختصراً صرف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں۔" اس حدیث نبوی نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں، ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس میں حسن اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

خیر ما اعطی الناس خلق حسن	لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابن حنبل، طبرانی اور ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

احب عباد اللہ الی اللہ احسنهم اخلاقا (طبرانی)	اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسن خلق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے اور در اصل رسول کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ فرمایا:

ان احبکم الیّ واقربکم منی فی الاخرة محاسنکم اخلاقا وان ابغضکم الیّ وابعدکم منی فی الاخرة مساویکم اخلاقا (ابن حنبل، طبرانی، ابن حبان، شعب الایمان، بیہقی[1])	تم میں میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں، ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کیے رکھتی تھیں، دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپؐ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتے گی" اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی[2] ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبر اسلام علیہ السلام

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی کتاب الاخلاق باب اول سے ماخوذ ہیں۔ [2] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یؤذی جارہ۔

کی زبان فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کردیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنت کو لیجائے۔ فرمایا: "انسان کو غلامی سے آزاد کر۔ انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ، اگر تو یہ نہ کرسکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا، اور نیکی بتا اور برائی سے روک، اگر یہ بھی نہ کرسکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک لے[1]، غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاق عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

ایمان کے اوصاف ولوازم ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف واخلاق، ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں۔ جسقدر، ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی، گویا اسی قدر اس ایمان کے مقدار میں زیادتی وکمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق، ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغ زیر دامن ہے۔ جس کی چمک، دمک اور روشنی کا اندازہ اس کی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ آپ نے فرمایا:۔

۱۔ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ جن میں سے ایک حیاء ہے۔

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو (تاکہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو)

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں، اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ جس کو خدا اور اس کا رسول سب سے پیارا ہو۔ جو دوسرے کو صرف خدا کے لیے پیار کرے۔ اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہوجانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا۔ مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵۔ تین باتیں ایمان کا جزء ہیں۔ مفلسی میں بھی خدا کی راہ میں دینا۔ دنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

۷۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی ضمانت میں دیدیں۔

۸۔ ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا (بھوکوں کو) کھانا کھلانا۔ اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا (سلام کرنا)

۹۔ ایک شخص پوچھتا ہے کہ اے خدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا اچھی بات بولنا، اور کھانا کھلانا۔ پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا (سماحت)

۱۰۔ مومن وہ ہے جو دوسروں سے اُلفت کرتا ہے اور جو نہ دوسرے سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے

---

[1] مشکل الآثار امام طحاوی جلد ۴ صفحہ ۳۔ حیدرآباد دکن۔

الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱۔ مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔

۱۲۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے، جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خدا اس کی مدد میں ہوگا، جو کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کریگا تو خدا اسکی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳۔ مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں، مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جاسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصہ سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴۔ جو صاحب ایمان ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵۔ بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے[1]۔

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیے کہ اسلام اور ایمان کا اخلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاقِ حسنہ، صفاتِ الٰہی کا سایہ ہیں لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔ ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفاتِ ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا، نیز بعض ایسی پُرجلال صفتیں ہیں جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کی مقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں۔ خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو۔ الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لیے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے، ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے، ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل[2] ہے۔ اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

[1] یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں، ہم نے ان کو جمع الفوائد اور کنز العمال جلد اول کتاب الایمان سے لیا ہے، کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

[2] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے۔ دیکھو سیرت جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۴۴، ۴۰۵ ؛

اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آکر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہ کیا، اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کیے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے مگر یک تنقیدی نظر یہ بتائے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے؟ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے ان میں درسگاہ عالم کے سب سے آخری معلم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلمین کی دو جماعتیں ہیں، ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی آخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السلام، اور بعض مذہبوں کے بانی، دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی۔ ہم ان میں سے اول کو انبیاء اور مصلحینِ دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں، ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کیے۔ پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکم خداوندی" کو قرار دیا۔ اس حکم و فرمان الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں، نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے، نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے، دوسرے فریق کی تعلیمات میں علت و معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و غایت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفر محض ہے۔ اگر ہے تو بے کیف اور بے مدت مگر ع

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلم کی تعلیم میں حکم خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ دری، امر ربانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔

انبیاء اور حکماء میں جو اصلی فرق اور امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، ان کے مقدس کارنامے اور ان کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز جس کی اخلاقی سخن طرازی، اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوت اور اخلاقی فطرت کا سراغ لگایا ہے، عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک انچ بلند نہ ہوگی وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے، مگر خود تاریکی سے باہر نہیں آتا، وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے، وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے، مگر عزیزوں پر

رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا، وہ سچائی اور راستبازی پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچا اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے، دل اور ہاتھ نہیں، اس لیے اس کے منہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی بلکہ ہوا کے تموج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں، جو ان کی تعلیم ہے وہی ان کا عمل ہے جو ان کے منہ پر ہے وہی دل میں ہے۔ اس لیے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اڑتا اور ہم نشینوں کو معطر بنا دیتا ہے، یہی وہ فرق ہے جو انبیاء اور حکماء یعنی موسیٰ، عیسیٰ، محمد رسول اللہ علیہم السلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے۔ سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحب اخلاق نہ بن سکا مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ اور محمد رسول اللہ علیہم السلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں، اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حسن اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السلام یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں، ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں تاکہ بعد کے آنے والے بھی اس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں، الغرض ایک کامل و مکمل اور آخری معلّم کے لیے حسب ذیل معیاروں پر اترنا ضروری ہے۔

۱۔ اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

۲۔ اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

۳۔ اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبر اسلام علیہ السلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامعِ کمالات نہیں، دنیا کا کوئی پیغمبر یا بانیِ مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب ہو کہ گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے تورات کے پیغمبروں میں سے کونسا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں۔ ان غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو تورات کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ ان کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے۔ حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت موسیٰ علیہما السلام تک تورات کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل و صورت کی پوری

شبیہ دنیا دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی ؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے، ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں ؟

ان انبیاء علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اسلام ہی کے ایک معلّم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ "یہاں (سیرت محمدی) پورے دن کی روشنی ہے جس میں محمدؐ کی زندگی کا ہر پہلو روز روشن کی طرح نمایاں ہے[1]" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ۔ محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو، اس کو جلوت میں برملا بیان کر۔ جو حجرہ میں کہتے سُنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو، الا فلیبلّغ الشاھد الغائب ۔

قول کے ساتھ عمل اب دوسری حیثیت سے غور کیجئے، ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی، اخلاقی احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے ؟ کوہِ زیتون کے پُرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰؑ) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دل کش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے۔ مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں ؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "سب کچھ جو تمہارے پاس ہے جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے[2]" کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریروں کا مقابلہ نہ کرو" کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنوں کو بھی پیار کرو" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا ؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی ؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں بلکہ کہنا ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلّم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے اس کو کر کے دکھایا اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ

---

[1] باسورتھ سمتھ کی کتاب سیرت محمدی ص ۱۰۸ [2] انجیل ۔

اَنۡفُسَکُمۡ (بقرہ: ۵) (کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانوں کو متنبہ کیا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ کَبُرَ مَقۡتًا عِنۡدَ اللّٰہِ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ (صف: ۱) (تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو)

ایک شخص نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ کان خُلُقُہ القرآن[1]۔ جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا۔ اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا، خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا، اگر آپ اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا، کھانے میں زہر دینے والوں سے درگذر کیا، اپنی ذات کے لیے کسی سے انتقام نہیں لیا، جنھوں نے آپؐ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں، مسلح ہو کر بھی کبھی ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت بھی جس نے آپؐ سے کپڑا مانگا خود اپنی ازار اُتار کر اس کے حوالہ کر دی۔ سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کے صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبر کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی پیغمبر اور بانیٔ دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اس کے معاصرین کے سامنے پیش نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لیے پیش کیا، فرمایا:۔

فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (یونس: ۲) (اے منکرو) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔

پھر آپؐ کو خطاب کر کے خود آپؐ سے فرمایا:۔

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (ن: ۱) (اے محمدؐ) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے۔

کامل و مکمل اخلاقی معلم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے، یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک و صاف کر دیتا ہو۔ اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے، کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اُتر سکے۔ یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا۔

یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ (جمعہ: ۱) وہ ان کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ

---

[1] ابوداؤد، باب صلاۃ اللیل۔

نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب و حکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف و مصفیٰ بنا بھی دیتا ہے۔ وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا، کم از کم ایک لاکھ انسان اسکی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے ہیں۔ اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تئیس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

تعلیم اخلاقی کا تنوع اگر کسی معلم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو، پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لیے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے، اخلاق کے دوسرے معلمین کی درسگاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہارا اور خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درسگاہِ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر وقت نشو و نما پا رہی ہے۔ خود معلم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے۔ جس کے اندر علم و فن کا شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کر رہے ہیں۔

آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپؐ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں۔ اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپؐ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ مدینۃ النبیؐ کی اس درس گاہِ اعظم کو غور سے دیکھو، جس کی چھت کھجوروں کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے، اور جس کا نام مسجد نبوی تھا۔ اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں۔ کہیں ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ جیسے فرماں روا زیر تعلیم ہیں، کہیں طلحہؓ و زبیرؓ و معاویہؓ و سعدؓ بن معاذ و سعدؓ بن زبیرؓ جیسے ارباب رائے و تدبیر ہیں، کہیں خالدؓ، ابو عبیدہؓ، سعدؓ بن ابی وقاصؓ اور عمروؓ بن العاصؓ جیسے سپہ سالار ہیں، کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے، کہیں ان زہاد و عباد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں۔ کہیں ابوذرؓ و سلمانؓ و ابو درداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتاو گذارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے۔ کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے فقیہ و محدث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا۔ ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے۔ کہیں غریبوں کی نشست ہے، اور کہیں دولتمندوں

کی مجلس ہے، مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی، سب مساوات کی ایک ہی سطح پر، اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں، سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں[1]۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصولوں کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں میں اُلجھنا ہوگا۔

اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے، مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب و علل کی تلاش، ان کے اصولوں قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعیین، یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیر سایہ نئے نظریوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ ان اسباب و علل، اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے۔ ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے۔ اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے۔ تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انہی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنہیں یونانی اصطلاح میں "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا گیا ہے۔ موجودہ اصطلاح میں پہلے کو "ضمیریہ" اور دوسرے کو "افادیہ" کہہ لیجئے، یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے، پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے اور دوسرا "عقل" پر، پھر اس مسئلے کے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے، ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا مبنیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل مآخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں۔ علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیت، اور پھر بالآخر عقل کا قانون، کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی نقیضیں ہیں، یعنی یہ کہ یہ قوانین اخلاق کسی وحی والہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے، جو لوگ وحی و الہام پر ایمان نہ لا سکے، انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا۔ پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر، جنہوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا، انہوں نے باختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو، انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاقی کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو،

---

[1] اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا، جنھوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا، انھوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا ماخذ قرار دیا۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم، یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی ہے؟ اس لیے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا۔ ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا، جو اخلاق کے امہات مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو، لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے۔ تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کردے۔ فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں، ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات، ضمیر، فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں اسی طرح معیار اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کیساتھ کسی مصلحت عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو۔ اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب حیثیتیں ایک کام میں مجتمع ہوسکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد، خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے، ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جسطرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے۔ ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہوسکتے ہیں! جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جارہی ہو، اسی لیے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قویٰ کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے، اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے۔ اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے، وجدان کہیے، حاسۂ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے۔ اس فلسفیانہ تشقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر مبنی سمجھتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر آب و ہوا، خصوصیات اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرز حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلادلیل متفق اور متحد ہیں۔ اسلیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے جسطرح

دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں۔ اب یہ کاوش کہ جس طرح مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کیلئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لیے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم اخلاق کی اچھائی یا برائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں، یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعہ سے ہم اسطرح اس کا احساس کرتے ہیں جسطرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح، خوبصورتی اور بدصورتی کا، یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو بروقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا برا، عملی حیثیت سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدیؐ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرح کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی اشارات کیے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ ان کے عمل میں ہے اس لیے 'علم بلا عمل' کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے۔ اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کیے ہیں مگر اخلاق کے باب میں اس کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کیے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں، وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں، انھی احکام الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل ہیں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہیے ہونا چاہیے۔ ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی، اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ پھر کرنیوالے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اس کا وجدان بھی یہی ہو۔ اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوع انسان کی کثیر جماعت کا فائدہ بھی سمجھے الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو، یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو، اسی قدر اس کے روحانی اور ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے، کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے۔ اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصول مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے، مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لیے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیے، اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں، اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی۔ مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں کو بھی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے اسی قدر وہ قابل قدر ہوتا ہے۔ ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چُن دیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد یا کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن اگر ہم کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں تو اسکی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہیگی، تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدم اخلاص کے یہ اثرات ہیں تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور برے کام کی بنیاد قرار دیا ہے بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کہ کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا برا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لیے بلایا کہ اسکو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے یا سخت تکلیف پہنچائیں گے، اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بھٹک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی، تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو، مگر اس بُلانے والے کی نیت کی برائی میں اب بھی کوئی شک نہیں، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسنے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا۔ لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے اس کو بلوایا لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بُری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجیے، میری جیب میں روپیوں کا ایک بٹوہ تھا، اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا، جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوہ پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا، تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے برائی کر چکا۔ لیکن فرض کیجیے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوہ مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اُٹھا لیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے۔ راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے، اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بری نیت سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی۔ یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اسکا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بے گناہی بالکل ظاہر ہے، نماز سے

بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لیے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا، سورہ آل عمران میں ہے:-

وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (آل عمران : ۱۵)	اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے، اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اسکی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ : ۲۶)	اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:-

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری، باب اول)	انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لیے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:-

ولکل امرئ مانوی فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (صحیح بخاری جلد اول باب ماجاء ان العمل بالنیۃ)	ہر شخص کے لیے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت خدا و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض دنیا کمانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جسکی غرض سے اس نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لیے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، حسنِ نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج دنیاوی تعریف وستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر و برکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جان ایس میکنزی اپنی تصنیف "مینول آف ایتھکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

> "جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے وہ صاف ہے یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے، یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے، اس کا کام تمام تر ارادہ کی صحیح جہت،

ہی کا بتلاتا ہے۔ جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں ان کا تعلق بھی ارادہ سے ہی ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں:

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے:۔

"اسی لیے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کی جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے۔"[1]

اخلاق کے لیے ایمان کی شرط جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت، یعنی قلب کے عمل پر ہے۔ تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے۔ ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں، تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں، دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمراں ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمراں ہے۔ پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادہ سے وجود قطعی محال ہے۔ اسی لیے وحیِ محمدیؐ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا، ہر نیک عمل کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے۔ فرمایا:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ: ۲۶۰)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر یا ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے، آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے، جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا (نور: ۵)

اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت، کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے جب پاس جائے تو اسکو کچھ نہ پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے۔ یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو۔

أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ مِنْ

یا (خدا اور قیامت کے) نہ ماننے والوں کے کاموں کی

---

[1] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبدالباری ندوی، شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ (نور : ۵)

مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اسکو لہر ڈھکے ہے اس لہر پر دوسری لہر ہے اس پر گھٹا چھائی ہے۔ تاریکیاں ہیں ایک پر ایک، جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اور جسکو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقف اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس، اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا۔ دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غرض و غایت اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کاملہ میں نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض و غایت صحیح ہو۔ عمل قالب ہے تو صحیح غرض و غایت اس کی روح ہے، روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل، غرض و غایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض و غایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہو سکے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لیکر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاص کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند، متعدد غرضیں اور غایتیں ہو سکتی ہیں ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اسکو اس کے گھر تک بآرام پہنچا دیتے ہیں، ہمارے اس کام کی غرض یہ ہو سکتی ہے کہ گھر پہنچ کر بڈھا خوش ہو کر ہم کو مزدوری اور انعام دیگا یہ بھی مقصد ہو سکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب یا عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے، یہ بھی غرض ہو سکتی ہے کہ آج اگر جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے۔ بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی اس خوشی کے لیے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر یہ کام کرتے ہیں۔ غرض ایک ہی قسم کے کام کے یہ تمام مختلف اغراض، مختلف اشخاص کے کاموں کی علت اور محرک ہو سکتے ہیں، لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے، اسی قدر وہ بلند اور قابل قدر ہے، کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے۔ اس کے بعد عزت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصول کے لیے کرنا بھی گو پست مقصد ہے مگر پہلے سے بلند ہے، پھر روحانی خوشی کی فطری خواہش کی تسلی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے۔ مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دنیا کا لگاؤ باقی ہے یہ بالکل فطری بات ہے، کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اسکو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس

کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں لیکن در حقیقت اس میں بھی گو دنیا کی نہیں، لیکن اس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے۔ اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدی میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے۔ مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں:۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں لیکے ڈالدے کوئی بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وہ بُرائی اور بھلائی میں تمیز کر لیتا ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اُٹھتی ہے۔ غریب و لاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذبہ طاری ہوتا ہے۔ قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے۔ یہ قلب کی فطری صلاحیت ہر انسان کے ضمیر میں ہے۔ ہر اچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے۔ لیکن بُری صحبت، بُری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے۔ اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصول اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اس کے نتائج ہیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (الشمس)
(نفس میں) اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر بُرے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے، وحی محمدی کی اصطلاح میں اس کا نام نفس لوامہ (ملامت کرنیوالا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے۔ سورۂ قیامت میں ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (قیامت: ۱)
اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا:۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ (قیامت: ۱)
بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے اگرچہ وہ اپنا اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈالدیتا ہے۔

نواس بن سمعانؓ انصاری ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں، آخر ایک دن اس کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا۔ فرمایا: "نیکی حسنِ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں"۔ اسی طرح وابصہؓ بن معبد نام ایک صاحب خدمتِ نبویؐ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے۔ چاروں طرف جاں نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا "وابصہ قریب آجاؤ" جب وہ قریب جا کر بیٹھے تو فرمایا: "اے وابصہ! میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو، یا تم بتاؤ گے؟" عرض کی "حضور ہی ارشاد فرمائیں" فرمایا "وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو" عرض کی "سچ ہے یا رسول اللہ" فرمایا:۔

یا وابصة استفت قلبك واستفت نفسك
البِرُّ ما اطمأنّ اليه القلبُ واطمأنّت اليه
النفس والاثم ما حاك فی القلب وتردد
فی النفس وان افتاك الناس[1]

اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھ کر، اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو، اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑ بن میں ڈالے، اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں۔

یہی وہ حاسۂ اخلاق ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دل کی صاف و سادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، اگرچہ ہوش میں آکر جب وہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اسکو محروم کر دیتا ہے۔ اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:۔

ان العبد اذا اخطأ خطيئة نكتت
فی قلبه نكتة سوداء فاذا هو
نزع واستغفر وتاب صقل
قلبه وان عاد زيد فيها حتّٰى
يعلو قلبه۔

بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اسکے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے، اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (تطفیف: ۱)

کبھی نہیں بلکہ ان کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چھا گیا تھا۔

---

[1] مسند ابن حنبل، ج ۴ ص ۲۲۸، مصر [2] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزل مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے۔ راستہ کے اِدھر اُدھر دونوں طرف دو دیواریں کھینچی ہوئی ہیں اور ان دونوں میں دو دروازے کھلے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں، راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو، اور اِدھر اُدھر مڑو نہیں، جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اُٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے "خبردار پردہ نہ اُٹھانا، اُٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے" پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کے ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کے حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے .....

هو واعظ الله فی قلب کل مؤمن [1] وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقی ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرت وانبساط یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے، کرنیوالے کو جو خوشی، اور برائی کی باتوں سے اسکو جو رنج ہوتا ہے وہی اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتا اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ گو تمام تر صحیح نہیں ہے۔ تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقۃً کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور برائی سے اسکو انقباض اور رنج ہوتا ہے لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرک نہیں اور نہ ان کو ہمارے کاموں کی غرض وغایت ہونی چاہیے کہ یہ بھی مادی خود غرضی ہے، بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں، ایک غریب لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن وہ اس کی محرک، علت اور غرض وغایت نہیں، اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض وغایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ خدا اور اس کی رضامندی کا حصول،

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرور کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کردی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا، نیکی کی غرض وغایت نہیں بلکہ اب اس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرت نیکی کی غرض نہیں، اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ
قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ (حجرات: ۱)

لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اسکو تمہارے دلوں میں اچھا کرکے دکھایا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے گھن لگا دی، یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:۔

اذا سرتك حسنتك وساءتك سيئتك جب تمہاری نیکی تمہیں خوشی بخشے اور تمہاری بدی تم کو

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ احمد و بیہقی فی شعب الایمان و رزین و ترمذی مختصراً ؛

فانت مؤمن[1]	غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔
من سرته حسنة وساءته سيئة فهو مؤمن[2]	جس کو نیکی خوش اور برائی غم زدہ بنا دے وہ مومن ہے۔
من عمل سيئة فكرهها حين يعمل وعمل حسنة فسر فهو مؤمن[3]	جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی تو مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرت و انبساط اور انشراحِ خاطر کی لذت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقہ لذتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجائش باقی رکھی ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرما دی ہے۔

رضائے الٰہی اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض و غایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے، ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے، یہیں آکر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے حکمائے اخلاق یہ ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور معلمِ حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہیے۔ انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا۔ ایثار اور حسنِ عمل ہے، پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ (بقرہ: ۲۵)	بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی خوشنودی چاہنے کیلئے بیچتے ہیں اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

پھر مال کے متعلق فرمایا:-

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (بقرہ: ۳۶)	اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں،
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ: ۳۷)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (نساء: ۱۷)	اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر دیں گے۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ	اور جنھوں نے خدا کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ چھپے اور کھلے طریقے سے خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دور کرتے ہیں،

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی، جلد ۵، صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول ص ۱۴ حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر، و ابن حبان (ابوداؤد، و عن عمر بن الخطاب [2] طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ، کنز العمال ج ۱، ص ۲۷ [3] مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ ص ۳ حیدرآباد۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۳)	انہی کے لیے ہے پچھلا گھر.

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے .

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (لیل)	جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے.

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے . ایک صحابی پوچھتے ہیں یارسول اللہ! کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے . کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے . کوئی اس لیے کہ اسے شہرت حاصل ہو تو ان میں سے، راہ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے ؟ فرمایا " اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو[1]." ایک دفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب، کسی کے لیے پردہ پوشی، اور کسی کے لیے گناہ ہے. اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں اس کو باندھتا ہے تو اس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے، پردہ پوشی اس کے لیے ہے جو ضرورۃً اس لیے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے[2]."

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سُن کر حضرت معاویہؓ زار زار روئے . حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ گھٹنے ٹیکے گی ، اسوقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہو گا جو قرآن کے عالم تھے اور جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے ، پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا ، کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اتارا تھا. تو تم نے اس پر کیا عمل کیا ؟ وہ عرض کریگا ، بار الٰہا ! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا خدا فرمائے گا تو جھوٹا ہے. فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے . پھر خدا فرمائیگا ، تُو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تُو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا) پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا ، کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا ، یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا ؟ عرض کرے گا کیوں نہیں ! اے میرے رب ، دریافت کرے گا تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا ؟ جواب دیگا میں اہل استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا ، ارشاد ہوگا تُو جھوٹا ہے . فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے . پھر خدا فرمائے گا تُو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تُو بڑا سخی ہے . تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا (تو اپنا بدلہ پا چکا) اس کے بعد وہ لایا جائیگا جو جہاد میں مارا گیا تو خدا اس سے دریافت کرے گا تو کس بات کے لیے مارا گیا ؟ کہے گا خدایا تو نے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد، ج ۱، ص ۳۹۲ [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ ؛

اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا۔ خدا فرمائیگا تو جھوٹا ہے۔ فرشتے بھی کہیں گے یہ جھوٹا ہے۔ خدا کہے گا تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں، تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے[1]۔

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے۔ پھر بولے خدا اور اس کا رسول سچا ہے اور اس حدیث کی تائید میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ہود: ۲)	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے، بے کم و کاست ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں، مگر دوزخ اس دنیا میں انہوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد کیا۔

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت، خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے، جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذات الٰہی ہو جاتی ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (بقرہ: ۳۷)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (رعد: ۳)	اور جنھوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔
وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى (لیل)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (الروم: ۴)	تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اصول اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے۔ توراۃ نے اپنے اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے جس میں کسی اصول اور غرض و غایت اور علت و مصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی۔ انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے۔ تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقت انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے۔ یا گناہوں سے داغدار ہے عیسائیت کی تعلیم

---

[1] جامع ترمذی باب الزہد باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ۔

یہ ہے کہ انسان اصل میں گناہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے۔ کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدم اور حوّا گناہگار تھے، اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں، اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا، اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مر جائے تو وہ گناہگار مرا۔ اور آسمانی بادشاہی کے حدود میں وہ داخل نہ ہوگا بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا، کیونکہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے۔ فِطْرَةَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰی یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روزِ ازل کر چکا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں آ کر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زریں حروف لکھے ہیں، وہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد ان کو ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے۔ فرمایا:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (التین)	ہم نے انسان کو اچھی راستی پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:۔

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ	جس خدا نے تجھے بنایا پھر تجھ کو برابر کیا پھر تجھ کو ٹھیک
صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ (انفطار: ۱)	کیا، پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے، اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے، اس کے بعد یہ آیت ہے۔ جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا ہے اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہیں۔ یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا۔ نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے۔ دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے سورۂ اعلیٰ میں ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی	اپنے بلند و برتر رب کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا۔ پھر
وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی (اعلیٰ: ۱)	برابر کیا اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی

راہ دکھانا یعنی ہدایت، انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح اس میں دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں، سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ	ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا۔ پلٹتے رہے اسکو
فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ اِنَّا ھَدَیْنٰهُ	پھر کر دیا اسکو سنتا دیکھتا۔ ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو
السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا (دہر: ۱)	وہ یا شکر گذار (نیکوکار) ہوتا ہے یا ناشکر (بدکردار)

غرض اس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی، اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا

تاشکر، نیکوکار یا بدکردار اچھا یا برا ہوجانا خود اسکا کام ہے۔ سورۂ شمس میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے:۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔	قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی، پھر ہم نے اسکو الہام کر دیا (یا سوجھا دیا) اسکی نیکی اور بدی تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملا دیا (گندہ کر دیا)

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کیساتھ ہی گناہگار اور عصیان کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصل فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے اسی لیے یہ کہا گیا:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (روم: ۴)	سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کے بنانے میں بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دینِ فطرت اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں، جن کی بنیادی چیز توحید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح و سالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا۔[1] اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحی محمدی نے اسی مسئلہ کو ایک ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے، انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟) انہوں نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا۔ "بَلٰی" (ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے) یہی ازلی اور فطری اعتراف انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ۔"

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت سے معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں آتا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ:۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (فاطر: ۳)	اور ایک گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔
كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (طور: ۱)	ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

الا لا یجنی جانٍ علی ولدہ ولا مولود علی والدہ[2]	ہاں! باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب الایمان [2] سنن ابن ماجہ کتاب الحج باب الخطبہ یوم النحر۔

اسی طرح ان مذہبوں نے بھی جنھوں نے انسان کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا گیا، انھوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے۔ اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے، غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گنہگار اور جہنم کا ایندھن ہے۔ آپؐ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچہ اپنے ہوش و حواس اور عقل و تمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے۔ فرمایا کہ "خدا کا قلم بچہ سے اس وقت کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل و تمیز کو نہ پہنچے[1]۔"

باغ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بن کھلے مرجھا گئیں، اسلام کی نگاہ میں جنت کے پھول ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "جس مسلمان کے تین بچے بچپن میں مر گئے۔ وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنت میں لے جائیں گے[2]۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا "یہ جنت میں جا کر جنتی دایوں کا دودھ پیئے گا[3]۔" اس سے زیادہ یہ کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے۔ فرمایا "خدا کو علم ہے کہ یہ کیا ہوتے[4]۔" لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرما دی۔ ایک دفعہ رؤیا میں حضرت ابراہیم کو دیکھا کہ وہ جنت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم ہے فرمایا یہ وہ کمسن بچے ہیں جو دین فطرت پر مر گئے۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! اور مشرکوں کے بچے؟ فرمایا "اور مشرکوں کے بچے بھی[5]۔" ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مر جانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنتی کہا کرتے تھے لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے، اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا، آپؐ نے مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مر گیا تھا۔ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی "یا رسول اللہ! اس کو مبارک ہو۔ یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی، نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا۔" فرمایا "اے عائشہؓ! اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے کچھ لوگ پیدا کیے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ[7]۔" ایک طرف عیسائیت ہے جو تبسمہ پانے سے پہلے مر جانے والے بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے، دوسری طرف اسلام ہے جو ان کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اور ان کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے "خداوندا! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو۔" احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہو جانے کا ذکر آتا ہے۔ اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے[8] "وہ پھر ایسا معصوم ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے[9]۔"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق و ترمذی فی من لا یجب علیہ الحد۔ [2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد (بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

خوف و رجا اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے، یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گزرے ہیں ایک کو رونے والے فلسفی، دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے ناامیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے، دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل، عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا، پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے، دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو۔ اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں۔ پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوے سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سر انجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے۔ وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ اخیر اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے، اس کی شریعت میں خدا سے ناامیدی اور کفر ایک ہے، وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی ناامید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:-

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (حجر: ۴)	(ابراہیم!) ناامیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی۔

وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْــــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف: ۱۰)	اور اللہ کے فیض سے ناامید مت ہو۔ اللہ کے فیض سے ناامید وہی ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔

اس امت کے گناہ گاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے:-

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (زمر: ۶)	اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر آپ ظلم کیا تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پُرامید رہنے کی تاکید کی ہے آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں[1] یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لیے ہو جاتا ہے۔ اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیت کریمہ ہے:-

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا	بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے، رات کی گھڑیوں میں

(بقیہ حاشیہ) [1] ابن ماجہ کتاب الجنائز [2] صحیح مسلم کتاب القدر [3] صحیح بخاری کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلوٰۃ الصبح [4] یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں، نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد جلد ۲ صفحہ ۳۳۲، ۳۳۳ [5] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا و صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] جامع ترمذی، کتاب الزہد باب فی حسن الظن باللہ تعالیٰ ؛

يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ط (زمر: ۱)

سجدہ کرتا ہے اور کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔

یعنی اس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں، گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور بازپرس کا ڈر بھی ہے اور خدا کی رحمت کی اُمید کا سہارا بھی۔ خدا کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ یہ ڈر اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دے گا۔ اور یہ امید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی۔ اسی لیے ایک مسلمان کا دل ہمیشہ شوءِ انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کر کے قرآن اہلِ ایمان سے کہتا ہے:۔

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ (نساء: ۱۵)

اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مؤمن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اس کو نہیں پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا اور بہرحال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا۔ اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو، خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہرحال ملیگا۔ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور انکو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے۔ ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے۔ جس وقت یہ سطریں لکھ رہا ہوں، وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور خدا کے فضل و کرم سے اس کی آس نہیں ٹوٹتی، امیر ہو کہ غریب تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد، کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پُراُمید رہتا ہے۔ مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے۔ اور یقین رکھتا ہے کہ ناامیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے۔ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ:۔

اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ۔ (آل عمران: ۲۰)

میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

اخلاق اور رہبانیت اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش نیتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے۔ یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ اخلاق کی اس حقیقت

ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے۔ جو رہبانیت، تجرد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے، اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی اہل و عیال، عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے تعلقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطع تعلق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دینداری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدتمند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقتاً ان مذہبی افراد اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصور کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیر پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کر سکیں اور تیسری طرف اپنی عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم و ملت کے فرائض و حقوق کو بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائیں، اسی لیے اسلام نے اپنے اصول اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجردانہ زندگی کی ہمت افزائی نہیں کی ہے۔ نبوت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمع انسانی میں، گھر اور تمام تر انسانی جد و جہد میں شریک ہو کر گزاری ہے، یہی طرز عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جد و جہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عمل صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، تجرد، علیحدگی، خلوت نشینی، ترک عمل اور ترک جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں، ان سے ہٹ کر نہیں۔ وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلق الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں۔ حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں، اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا یہ مستحسن طریقہ نہیں۔ قرآن پاک میں ہے:-

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم: ۱) تم اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار ہے اور نگران ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے

لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔ امیر اپنی رعیت کا چرواہا، مرد اپنے اہل و عیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے[۱]۔

جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اسی لیے وحی محمدی نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (الانفال : ۳)

اور اس فساد سے بچو جو چن کر صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اصحاب سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرض تبلیغ سے بے پرواہ رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

دنیا درحقیقت جد و جہد اور دار و گیر کا ایک میدان ہے۔ جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں، راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں، ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا لحاظ و خیال کرنا پڑتا ہے، اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے۔

ان المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم[۲]۔

وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے۔ اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں، وہ مجمع سے الگ ہو جائیں۔ فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کر کے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کر دے، یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہؓ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔

آپ نے فرمایا کہ: بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے، اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے[۳]۔

---

[۱] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجہا، ص ۷۸۳

[۲] شعب الایمان، بیہقی و جامع ترمذی، کتاب الزہد، ص ۴۱۲

[۳] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے۔ کہ تعلیمِ محمدی میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فرض کا دوسرا نام شرعی امر بالمعروف و نہی عن المنکر (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۲)	تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کیلئے باہر لائی گئی ہو اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو
يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (توبہ: ۹)	وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔

پھر خاص طور سے حکم ہوا:-

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ (لقمان: ۲)	اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ:-

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (العصر)	اور وہ آپس میں سچائی اور ثابت قدمی کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔
وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (بلد: ۱)	اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قومی دل اور قومی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں[1]" عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جس کا نام شخصی آزادی کی بحالی ہے۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گذرا کہ "کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ" (تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیر ذمہ داری لوگوں کی نسبت بازپرس ہوگی)، قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے۔ تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف، لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے۔ اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

---

[1] سفر تکوین ۴-۹ ÷

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی۔ وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اس کو سمجھاتا تھا، تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ، جن کو اللہ تعالیٰ ان کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے لیکن ان پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا۔ جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا۔ بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا، پہلا تو اپنے گناہ کی بدولت اور دوسرا اپنے فرضِ تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے۔ سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے، آخر میں ہے:۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۖ قَالُوْا مَعْذِرَةً إِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ أَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَأَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۢ بَئِيْسٍۢ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ۔ (اعراف: ۲۱)	اور جب ان میں سے ایک فرقہ بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا یا سزا دینے والا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تمہارے رب کے آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے ان کو نصیحت کرتے ہیں، اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے انکو جو منع کرتے تھے بچا لیا اور گناہ گاروں کو انکی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے، کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گناہگار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا، البتہ بھائی کا فرض اس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے، زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اس کا کیا بلکہ رسول کا بھی یہ فرض نہیں۔ فرمایا:۔

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ إِلَّا الْبَلٰغُ (مائدہ: ۱۳، نور: ۷)	رسول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی، اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا:۔

يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ (مائدہ: ۱۴)	اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستے پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اس آیت کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ ”لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ نہ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں“

ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی دریافت کیے تو فرمایا کہ "نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جارہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اسوقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنیوالا ہے جسمیں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے[1]۔"

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟" منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی، ان کی حفاظت نہیں ہوسکتی قوموں کے رسوم و آداب اور اٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور سے ہر شخص کے ذاتی اور نج کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے۔ مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہوکر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان برائیوں کا بُرا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ "بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں بُرائی پھیلنے لگی تو پہلے تو ان کے علماء نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رکے تو وہ ان کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہوگئے، اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی"۔ اس کے بعد آپؐ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا "نہیں، جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو اور اس کو حق پر نہ جھکا دو[2]۔"

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم۔

اس کے چند شرائط لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کر دیگا۔ یہ حق سب سے اول اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان برائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (بقرہ: ۵)	کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش، خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کیساتھ کی جائے، خو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا۔

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی، کتاب التفسیر (مائدہ) میں ہیں، ص ۳۴۸، ۱۹۹۰ء [2] جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (نحل، ۱۶)	تو اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بلا۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا (طٰہٰ، ۲)	تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:۔

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِیْغًا (نساء، ۹)	اور تو ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے دل تک پہنچ جانے والی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن وامان کا قائم رکھنا، امام کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ، اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوت درکار ہے، صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسس اور غیبت کی ممانعت یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی جس کا نام تجسس اور ٹوہ لگانا ہے۔ ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اس کی حالت وکیفیت کی جستجو کرے، یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ ؎ محتسب را درونِ خانہ چہ کار؟

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ وفساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصل راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں، اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے۔ جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے۔ لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی باد تند سے اس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرؤیة یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ وناصح کی طرف سے

اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے چنانچہ وحیِ محمدیؐ نے اسی لیے تجسس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ (حجرات : ۲)

اے ایمان والو! بہت سارے گمانوں سے بچتے رہو، کہ بیشک بعض گمان گناہ ہے اور نہ کسی کا اندر کا ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو برا کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کر سکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو تم کو گھن آئے، اللہ سے ڈرو، بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مُردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مُردہ اپنے اس جسم کی حفاظت نہیں کر سکتا، وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں بُرا کہہ رہے ہو، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کر سکتا، اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے، اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتی، اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس شخص کی، جس کی غیبت کی جائے، اصلاح ہو سکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری برملا ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایاں نہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو ان کو برباد کر دو گے۔[1]

غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں

توسط اور اعتدال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت اور نصرانیت کا دور گذر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو، اسلام دنیا کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آیا، اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل وانصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے، لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے۔ اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے۔[2] اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر گئے، ان کی شریعت میں عدل وانصاف کے قائم کرنے کی روح بہت بہت کم پائی جاتی ہے۔[3] حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لیے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیئے تھے، اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب النہی عن التجسس۔ [2] یہود کی سنگدلی کے سبب سے [3] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لیے۔

ان لفظوں میں فرمایا:۔

"تم نے یہ سُنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت[1]۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ برائی کا برائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو، بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کردو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑلے اسکو چادر بھی دیدو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑلیجائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو، جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بُغض رکھو لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔" (متی، باب ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سُنا گیا تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قانون تھا، جو بالکل عدل وانصاف پر مبنی تھا لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے سن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا، لیکن اسلام نے عدل واحسان، دونوں میں امتزاج پیدا کرکے دنیا کے نظام حکومت کو کامل تر کردیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل: ۱۳) بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعتِ موسوی وعیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہے۔

عدل واحسان "عدل اور احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے۔ "عدل" کے معنی "برابر" کے ہیں، جو شخص کسی کے ساتھ بُرائی کرے، اس کے ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ "عدل" ہے اور اس کو چھوڑ دینا اور معاف کردینا اور درگذر کرنا یہ "احسان" ہے، اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں، قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں اس نے دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانون عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان ومال وآبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے حکومت کو سرے سے مٹانا جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کرکے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کردیا، کبھی دنیا کے لیے قابلِ عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن وامان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہوسکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے، اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی بازپرس نہ کیجائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پاکر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے۔ اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کردینے کا پورا پورا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کرکے جماعت کے

---

[1] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا برائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعتِ محمدیؐ میں پوری طرح برتی گئی کیونکہ وہ دنیا کی آخری شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوتے۔ بعض نیک، نرم مزاج، صابر اور متحمل پیدا ہوتے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا، درگذر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے۔ اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوتے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے۔ اور "برائی، برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضامند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق اور گو ان دونوں کا منشاء ایک ہی ہے۔ مگر انکے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے۔ جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے۔ مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا۔ توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی کامل شریعت لیکر آئے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کی جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول، شریعتِ محمدی میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دیدی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا۔ بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھکر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

اسلام نے ان برائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون کے تحت میں رکھا۔ مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے۔ جو حکومتِ اسلام کیطرف سے دیجا سکتی ہے۔ اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیل نفس کے متعلق تھیں، ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا۔ مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اسطرح شریعتِ محمدیؐ اس حیثیت سے قانون و اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ

اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے، لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتظام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور ذاتی اخلاق کے ذریعے سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ و محسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں۔ لیکن اگر وہ قانون محمدی کے ساتھ ساتھ اخلاق محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ معلوم ہو چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اس کا حکم ہے۔

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائیگا۔ ..... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے، سو جیسا کریگا ویسا پائے گا، توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت"
(احبار ۲۴۔ ۱۷، خروج ۲۱-۱۲۔ گنتی ۳۵-۳۱۔ استثناء ۱۹-۱۱-۱۲)

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے۔

"تم سن چکے کہ کہا گیا، آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے، دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵-۳۸)

لیکن اس سرتاپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کسی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے، اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں، اور جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں۔ اس کی نسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ (بقرہ : ۲۲)	اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا۔ آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۚ	تو اگر اسکے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا، تو دستور کے مطابق اس کی پیروی کرنا اور نیکی کیساتھ اسکو ادا کرنا ہے۔

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ (بقرہ : ۲۲)

یہ تمھارے رب کیطرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے بعد پھر زیادتی کرے تو اسکے لیے دکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجئے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے بعد انکے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہکر بتایا گیا، ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خون بہا لیکر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خون بہا لے لینے کے بعد انتقام لینے پر عذاب الٰہی کا ڈر سنایا گیا، دیکھو اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے۔

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے:۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ (مائدہ ۷)

اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ، تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

۲۔ یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیش نظر رکھتا ہے فرمایا:۔

وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (بقرہ: ۳۸)

اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمھارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔

یہ تو قانون تھا، اب اخلاق دیکھئے:۔

وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (بقرہ : ۳۸)

اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کو اس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشایش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمھارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے۔ فرمایا:۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (نحل)	اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہے اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنیوالوں کے لیے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ: ۴)	اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو، تب وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اسکا ثواب دینا خدا پہ ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانوناً اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے لیکن اگر کوئی مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملیگا اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پہ ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا، دنیا کی جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا! اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے اور نہ افراد کے بڑے حصہ کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے۔ حالانکہ وہی ایک سچے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے، جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے اس نے یہ کہا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دیدیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کیوقت حکم ہوتا ہے۔

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور: ۱)	اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گنہگاروں پر ترس نہ آئے۔ اگر تم کو خدا پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لئے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دیدینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لئے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کیجائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اونچ نیچ اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دیجائے اور اس کے

لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا "اے لوگو! تم سے پہلے قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم! اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا"[1]۔

دوسری طرف عفو کا یہ حال ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا، الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہو[2] تو اس کو قانونی سزا ملی ہو۔ یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے آپؐ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اس میں آپؐ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا[3]۔ یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زر تاوان یا خون بہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا "آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی"[4]۔ یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہو جائیگا تو پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی۔ وہ پکڑا گیا اور عدالت نبویؐ میں پیش کیا گیا، آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائیگا، میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔" فرمایا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے یہ کیوں نہیں کر لیا"[5]۔

یہ تو اس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے اور اس لحاظ سے قانونِ محمدیؐ، موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم ہے، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے، لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگذر کی تعلیم اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار ترین تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے، وہ عفو و درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدائے تعالیٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اس نے پیش کیا ہے۔ جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں۔"

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام : ۱۳)	اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم و ستم اور گالی گلوچ پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ص ۱۰۰۲ [2] ایضاً کتاب الحدود [3] ابوداؤد ونسائی کتاب الدیات [4] ابوداؤد کتاب الحدود [5] ایضاً کتاب الحدود

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ۔ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (اعراف: ۲۴)

معاف کرنے کی خو پکڑ، اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر، اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ وہ ہے سنتا جانتا۔

سکون کی حالت میں عفو و درگذر آسان ہے، مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔ صحابہؓ کی تعریف میں فرمایا:-

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ: ۴)

اور جب غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں،

نیکوکاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیار بننے کا ذریعہ ہے

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۴)

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ اچھے کام کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کردینا بہت بڑی بلند ہمتی کا کام ہے۔ فرمایا:-

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (شوریٰ: ۴)

اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحی محمدیؐ نے اپنے الفاظ میں "عزم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاءؑ اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔ فرمایا:-

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف: ۴)

اور برداشت کر، جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ فرمایا:-

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۔ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان: ۲)

اچھی بات بتا اور بری بات سے روک اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے کہ یہ ہمت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے۔ فرمایا:-

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (آل عمران: ۱۹)

اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑے ہمت کے کام ہیں۔

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسب ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے:-

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ (جاثیہ: ۲)

(اے پیغمبر) ایمان والوں سے کہدو کہ ان کو جو ایام اللہ کی امید نہیں رکھتے، معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی کافر ہیں جو کافر و مشرک ہیں اب دیکھیے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگذر کریں، کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر ان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:۔

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْہُ اَوْ تَعْفُوْا
عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا
(نساء: ۲۱)

اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو یا چھپا کر کرو یا کسی برائی کو معاف کردو (تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہرحال معاف ہی کرنا چاہیے، اسی کے قریب قریب یہ آیت پاک بھی ہے:۔

وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ
اللّٰہُ لَکُمْ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (نور: ۳)

اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگذر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کر دے۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی تم دوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کریگا اسمیں عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

برائی کی جگہ نیکی عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو برائی کرے، نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کردو، بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس تعلیم ربانی پر عمل کرنیوالوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے۔ فرمایا:۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ
ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ
کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ
صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ
(حٰم السجدہ: ۵)

نیکی اور بدی برابر نہیں، تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست۔ اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالیٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو۔ کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بے جا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے، اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ

شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ھَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ وَاَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ (مومنون: ۶)

مشرکوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دے، ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور کہہ کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں،

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:۔

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّھِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ (رعد: ۳)

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم انکو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے برے انجام سے خوف کھاتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے انکو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں، انہی کے لیے ہے پچھلا گھر، ہمیشہ رہنے کے باغ۔

ان سے کہا جائے گا۔

سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ (رعد: ۳)

تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے ہیں کہ تم نے صبر کیا، سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنت کی اس بشارت غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوفِ خدا کا۔ صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ برائی کے بدلہ نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنی ہم قوموں سے جو دلآزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ وہ برائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْہُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ لَا نَبْتَغِی

وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں اور جب کوئی نکمی بات سنتے ہیں، تو اس سے درگذر کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو، ہم کو بے سمجھوں

الْجٰهِلِيْنَ (قصص: ٦) سے مطلب نہیں۔

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجئے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگذر کرتے ہیں بلکہ ان کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قرابت کا حق ادا کرنیوالا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو، بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو[1]" ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ "اے خدا کے پیغمبرؐ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں، میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں" آپؐ نے فرمایا "اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو" یعنی نیکی کے لقمے سے ان کا منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے، خدا کی مدد شامل رہے گی[2]" حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو، تم کہتے ہو کہ اگر لوگ تیرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے، اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، یہ نہیں بلکہ اپنے کو برسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر برائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو[3]"

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں اور پُرفریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی ہدایت ہوئی۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ اِنَّ اللّٰهَ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (مائدہ: ٣)

اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے تو تو ان کو معاف کر اور ان کے قصور سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور ان کے قصوروں سے درگذر کرنا اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، ص ۳۳۳ (طبع دہلی)

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدن اصولِ قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدنی نظامِ حکومت میں قانون کے نفاذ میں ان وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دنیا کا ایک ذرہ بھی ان کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی، ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی ایک اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لیے اسی قدر کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا استیصال صرف اسوقت ہو سکتا ہے جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیے جائیں جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہیں، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں وغیرہ وغیرہ، بہر حال تمدنی نظامِ حکومت کو ایک غیر متمدن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے، وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع و عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی۔ تمدن کے زمانہ میں انسانی ضرورت میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری | مذہب بھی ایک عظیم الشان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جا سکتی ہے اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ و مقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک و اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عقائد میں اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں، جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں، ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی، اور جو چیزیں جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھیں، ان کی ترغیب دی۔ لیکن امر و نہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی و بیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام و شرائع میں باہم امتیاز پیدا کر دیا ہے۔ اس بنا پر جس طرح اس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے۔ جس سے برائیوں کا تمام تر سدِ باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کر لیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو اور عام انسانوں کے لیے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کر دیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کر دیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام

نے اپنے اصول واحکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہوگیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہوگئے ہیں۔ اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت ناکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا ام الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی۔ اس بناء پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہوگیا، صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی، اور ان کا کلی استیصال کیا، شرک کا ایک متداول طریقہ بُت پرستی تھا۔ اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بُت توڑ دیے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کر سکتی تھیں، تصویر بجائے خود کوئی بُری چیز نہ تھی تاہم وہ بُت پرستی کا ایک عام مظہر تھی اس لیے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا کسی کی مدح میں غلو واغراق اگرچہ ایک قسم کی بداخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ وطاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے۔ اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لیے اس سے کام لے سکتا تھا، تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی ہے جس نے اکثر قدیم مذہبوں میں شرک کی صورت اختیار کر لی تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے برسر منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم فانما انا عبدہ فقولوا عبد اللہ ورسولہ (بخاری، کتاب الانبیاء)	میری شان میں مبالغہ نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی شان میں کیا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں۔ تو کہو کہ خدا کا بندہ اور رسول۔

یہ ایک کلی حکم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی، اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کے اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے۔ اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کر کے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال وجواب کے لیے باقی نہیں رکھی یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے۔

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲۔ ہر بُرائی اور بھلائی کے سارے جزئیات کا احاطہ۔

۳۔ نرمی وگرمی، عاجزی وبلند ہمتی، دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلمین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کر دیگا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے

نہیں کیا ہے بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنائی گئی ہے اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیت دیکر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیت احکامِ عشرہ کی ہے یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہِ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے۔ ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسب ذیل ہیں[1]۔ (دیکھو خروج، باب ۲۰)

۱۔ تو اپنے ماں اور باپ کو عزت دے۔
۲۔ تو خون مت کر۔
۳۔ تو زنا مت کر۔
۴۔ تو چوری مت کر۔
۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔
۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو، اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے، لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے اس کے بعد خروج باب ۲۲، اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آگئی ہیں یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے :۔

۱۔ تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔
۲۔ تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔
۳۔ تم میرا نام لیکر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔
۴۔ تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے، تو مزدور کی مزدوری چاہیے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔
۵۔ تو بہرے کو مت کوس، تو وہ جس چیز سے اندھے کو ٹھوکر لگے اندھے کے آگے مت رکھ۔
۶۔ تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔
۷۔ تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔
۸۔ تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔
۹۔ تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ ان کی طرف کینہ رکھ۔
۱۰۔ تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے اٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزت دے۔

---

[1] توراۃ کے اخلاقی احکام :

۱۱۔ اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے تو تم اس کو مت ستاؤ بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲۔ تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کو رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنی اور روح کی طرف دعوت تھی۔ یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے، اخلاق میں بھی جھلکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال، اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یکجا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا۔ اس مشہور اخلاقی وعظ میں بترتیب حسب ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں۔

دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگذر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ایسا تم بھی ان کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں، اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا، اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا۔ اس لیے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں، ان سب کا استقصاء کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا۔ اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی، گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا۔ یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی مبارک نے ان کی تمام جزئیات کا استقصاء کیا اور ان کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا۔ ذیل میں ہم ان اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو و درگذر، توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بخل کی برائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر و غرور کی برائی،

امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا۔ عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ کرنا، صدقہ اور خیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو بُرا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑھانا، نہ بُرے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد واتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکلِ حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بُری بات سے روکنا، اولاد کشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال وجائداد کی نیک نیتی کیساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا۔ بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی بُرائی، آنکھ، کان اور دل کی بازپرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت وعہد کی رعایت، ایثار، تحمل، دوسروں کو معاف کرنا، دشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلے نیکی کرنا، غصہ کی برائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو بُرا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل وانصاف، دشمنوں تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی بُرائی۔ اُلاہنے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاکبازی جتلانے کی برائی، رفتار میں وقار ومتانت، مجالس میں حسنِ اخلاق، ضعیفوں، کمزوروں، اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی برائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرمگاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا۔ بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثباتِ قدم، استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی بُرائی، شراب پینے اور جوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال ودولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانتداری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآنِ پاک ہے۔ ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال میں ہے جو ان کی تفسیر اور تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں۔ ان کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کی بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہے۔ جن میں سے ہر ایک صفحہ میں ۳۰ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نو سو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب وعنوانات میں منقسم ہیں، ان میں سے بعض مکرر باتیں بھی ہیں۔ تاہم ان سے

اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا جو داعی اسلام علیہ السلام کی تعلیمات کی فہرست سے رہ گیا ہو۔ اور جس پر دنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلم کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ہم ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلہ رحمی، ماں باپ کے ساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجتمندوں کی امداد، اندھوں کی دستگیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرضداروں پر احسان، فریادیوں کی فریادرسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گذاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیماروں کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی برائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومتِ عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فحش و بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصہ کو ضبط کرنا، عفو و درگذر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہونا۔ دوسروں کے گھر جا کر ادھر ادھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے دعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت و استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، رازداری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پہ مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضاء، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے۔ منافقت اور دورُخی، چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شراب خوری، زناکاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تحیت، مصافحہ و معانقہ، دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام۔

ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصاء انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے اس کے لیے اخلاقیات کے

صرف کلی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے، اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے، اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور ان کے متعلق صریح احکام دیے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی توضیح کے لیے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے، ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی تفصیل کر دی۔ توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے غلے یا سونے چاندی کے مالک پر عشر یا زکوٰۃ فرض، اور کن کن چیزوں میں فرض ہے۔ شریعت محمدیؐ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری طرح پوری تعیین کر دی۔ وہ اجناس مقرر کر دیے جن میں عشر یا زکوٰۃ واجب ہے۔ ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، ان کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی، اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ. قُلِ الْعَفْوَ ؕ (بقرہ ۲۷)	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہدے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو۔ تو یہ تمہارے کمالِ خلق کی دلیل ہے، انصار جنھوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دور کیں، ان کی تعریف میں خدا نے فرمایا:۔

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر: ۱)	وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو حاجت ہو۔

صحابہ کی مدح میں فرمایا:۔

يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (دہر: ۱)	خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔

قرآنِ پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔

اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو سڑی گلی، خراب اور نکمی ہو۔ قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی دناءت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے۔ فرمایا:۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (آل عمران: ۱۰)

تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک اس میں سے تم خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہے اور جو بھی تم خرچ کرو خدا کو اس کا علم ہے۔

پھر فرمایا:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ (بقرہ: ۳۷)

اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو اس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لیے زمین سے نکالتے ہیں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دو، اور اس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو، مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔

اس آیت پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے" یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے کہ وہ تمہاری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے اس لیے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے اہل و عیال، دستگیر عزیز قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر۔

یَسْــٴَـلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ الْاَقْرَبِیْنَ وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (بقرہ: ۲۶)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں، کہہ دے کہ جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اس سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے، لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو، تو فرمایا مزدوری کرے اور جو ملے اس میں سے کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے۔ صحابہؓ نے عرض کی اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو، فرمایا تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو برائی کرنے سے بچے، یہ بھی صدقہ ہے[1]۔ دوسرے موقع پر فرمایا "اچھی بات کہنا اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دستگیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے[2]" غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقۃ ص ۴۲ مصر [2] جامع ترمذی ابواب البر والصلۃ باب صنائع المعروف۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کرکے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ احسان اس پر جتاؤ، نہ اس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو۔ نہ نمائش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا۔ فرمایا:۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (مدثر ۱)

اور اپنا احسان نہ جتا کر تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (بقرہ ۳۶)

اے ایمان والو! اپنی خیرات کو احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کیلئے خرچ کرتا ہے اور خدا، اور پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی سی نیکی بہتر ہے۔

قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ۔ (بقرہ ۳۶)

اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو صدمہ پہنچایا جائے اور خدا بے نیاز اور بردبار ہے۔

ریا اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصود ہو تو دکھا کر بھی دے سکتے ہو۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (بقرہ ۳۷)

اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری برائیوں کا کفارہ کرے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (بقرہ ۳۸)

جو لوگ اپنا مال رات اور دن، چھپے اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ان کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا نہ غم۔

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی اور خوشی ہونی چاہیے، جبر و کراہت سے نہ ہو کہ یہ منافقت کی نشانی ہے۔

وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ (توبہ ۷)

اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے لیکن کڑھ کر۔

صدقہ و خیرات کھلے دل سے اور صرف خدا کے لیے ہونی چاہیے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ الآیۃ (بقرہ ۳۶)

اور ان کی مثال جو اپنا مال اللہ کی خوشنودی چاہ کر، اور اپنا دل پکا کر کے خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس سے مقصود خود خدا ہو۔

وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ

اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر اور جو خیرات کرو گے

خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (بقرہ: ۳۷)

وہ تم کو پوری ملے گی، تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔

صدقہ وخیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ احکام میں یہ وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ریب اور تخمین کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارہ میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا، اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، اس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو ان کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے، ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الخمر وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعها وعاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه (ابوداؤد، کتاب الاشربہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا شراب پر، اس کے پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے اپنے لیے نچڑوانے والے پر، اس کے لیجانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لیجائی جائے لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتلائے، عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا۔ قرآن مجید میں حرمت شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تعیین فرما دی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من العنب خمرا وان من التمر خمرا وان من العسل خمرا وان من البر خمرا وان من الشعير خمرا (ابوداؤد، کتاب الاشربہ)

آپؐ نے فرمایا: انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی، اور جو سے بھی۔

قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم يقول ان الخمر من العصير والزبيب والتمر والحنطة والشعير والذرة وانی انهاكم

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ شراب انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے اور میں تم کو ہر نشہ آور

عن کل مسکر (ابوداؤد، کتاب الاشربۃ) چیز سے منع کرتا ہے۔

عرب کے مختلف حصوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی اسلیے یہ تعریف عرب کے تمام اصناف شراب کو حاوی تھی، لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا۔ اور یہ ممکن تھا کہ دنیا کے اور حصوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور یہ تحدید ان کو شامل نہ ہو، اس لیے آپؐ نے شراب کی ایک کلی تعریف کی، جو تمام اقسام شراب پر حاوی تھی۔

کل مسکر خمر و کل مسکر حرام (ابوداؤد۔ ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

کتاب الاشربۃ و صحیح مسلم واحمد و ترمذی ونسائی)

کل شراب اسکر فھو حرام۔ (ابوداؤد، احمد، بخاری و مسلم) ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ حرام ہے۔

لیکن حیلہ جو لوگوں کے لیے اب بھی حیلہ جوئی کا موقع باقی تھا، حرمت شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے۔ نشہ ہے لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اسقدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے اس لیے فرمایا:۔

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (ابوداؤد، کتاب الاشربۃ) جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں، تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے، بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدن کے زمانہ میں مہذب اور حیلہ جو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی:۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل مسکر ومفتر (ابوداؤد، کتاب الاشربۃ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشئی و مخدر چیز سے منع فرمایا۔

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی نشئی چیزیں استعمال کریں۔ جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی، جس کو داوی کہتے تھے چنانچہ آپؐ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:۔

یقول یشربن ناس من امتی الخمر یسمونھا بغیر اسمھا (ابوداؤد، کتاب الاشربۃ) آپؐ نے فرمایا کہ میری امت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔

اس کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں ان کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی۔

نھی عن الدباء والحنتمۃ والمزفت والنقیر۔ آپؐ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی، منع فرمایا۔

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی، اس لیے آپؐ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا، اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں، ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں صورتوں میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی، حرمت خمر کے بعد وہ بیکار چیز ہو گئی۔ حضرت ابو طلحہؓ نے آپؐ سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنا لیا جائے لیکن آپؐ نے اجازت نہ دی۔[1]

---

[1] ابوداؤد جلد ۲، ص ۸۰، کتاب الاشربۃ، اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔

ایک بار دیلم حمیری نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں اس لیے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے، آپؐ نے فرمایا کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں، آپؐ نے فرمایا تو اس کو چھوڑ دو، انہوں نے کہا لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے، ارشاد ہوا کہ "اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو"۔[1]

اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی، انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگوں کو روکا ہے۔ تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے۔ لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کے اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے۔ اس کی پوری تفصیل کی، اسکے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا۔ اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں، ان سب کو شریک جرم ٹھہرایا۔

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکل الربٰو وموکلہ وشاھدہ وکاتبہ۔

(ابوداؤد، کتاب البیوع)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حرمت میں استقصاء لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصاء اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لیے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیتہً قلع و قمع نہیں ہو سکتا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوری مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس نے حسنِ اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم میں کر دیا تھا، یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی، حالانکہ دنیا کے امن و سلامتی اور ترقی و خوشحالی کے لیے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے۔ جسقدر ایک مقام پر تواضع و خاکساری کی ضرورت ہے اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے۔ جس طرح عفو و درگذر بلند ہمتی کا کام ہے اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی ویسا ضروری ہے محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لیے ضروری سہی۔ مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نطشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر جرمن فلاسفر نطشے نے مسیحی اخلاق پر جا و بیجا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے۔ وہ اسی لیے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی،

---

[1] ابوداؤد جلد ۲، ص ۰۰، کتاب الاشربہ۔

خواری، اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں، جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہوسکتے۔ وہ کہتا ہے:۔

> "مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے۔ مسیحیت نے طبائعِ انسانی کی تمام خود دارانہ قوتوں کا استیصال کر دینا، اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے[1]۔"

اسلامی اخلاق کا اعتدال لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۰۰ برس بعد اس نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہے جس نے مسیحی نظامِ اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے۔ اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گذری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی، اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی۔ مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریۃً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلاف استعداد اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو۔ تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں، انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی۔ خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بُردبار بھی ہیں اور غضبناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، نا اُمید بھی ہیں اور پُر اُمید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی اور ذلیل و خوار بھی، الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لیے ایک دوا کبھی کارآمد نہیں ہوسکتی۔ بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اسکو کم کر کے قوتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے۔ وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو نہ غصب کرنے والا بنائے۔ وہ نا امید کو پُر امید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے وہ خدا سے مل رہا ہے۔ وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے خدا سے مانگنے والا کر دے۔ وہ ذلیل و خوار کو خوددار اور خوددار کو غیر مغرور بنا دے، وہ اچھی قوتوں کو نشو و نما دے اور بُری قوتوں کا رُخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی بُرائی کو کم سے کم کر دے۔

قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے، قوتِ

---

[1] نطشے از ایم اے مگے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے باب سوم۔

غضب اور قوتِ شہوت، غضب نام ہے اپنے نفس کے مناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوت کا۔ شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوت کا۔ ان دونوں قوتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھے برے اخلاقی جزئیات پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ غضب کی قوت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے مثلاً خودداری، دلیری، آزادی، حق گوئی، بلند ہمتی، بردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبۂ حق، جد و جہد، سعی و محنت، جہاد و پھر جب یہی قوت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے تو تہور بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بسلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبر، ترفع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتلِ نفس وغیرہ کی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور جب یہ قوت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دناءت کے قالب میں ظہور کرتی ہے، اسی طرح شہوت کی قوت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو عفت کہتے ہیں۔ یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ یعنی پاکدامنی، پرہیزگاری، جود و سخا، شرم و حیاء، صبر و شکر۔ قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ، پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس سے حرص و طمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق مسیحیت کی تعلیم کا منشاء انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہ بری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل برا ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کر کے "دشمن کو پیار کرو" اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرد رہو اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گذار دو۔ بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کر دو اور خدائی دشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو۔ کہ انہیں ہدایت ملے اور خدا کے حلال کیے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ لیکن شریعت کے مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو۔ امام غزالی کے بقول اسلام نے غصہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے۔ غصہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہا ہے۔ وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ نہیں کہا۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں دنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جد و جہد جو کچھ ہے، وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں، اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جائے، نہ عفت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں نہ عدل کا وجود ہو نہ امن و امان کا نشان ملے، نہ کسی کی [illegible] محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت

رہے، نہ انسان کی بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہوں، قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور خدا کی یہ دنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں حرکت و جنبش کا نام نہ رہے۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفسِ غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بُری چیز ہے، نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بُری چیزیں ہیں اسی طرح وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلت پسندی، دناءت، بے طاقتی، تملق، کم حوصلگی، بے عملی، سستی، فاقہ زدگی بھی بُرے ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں ان کو رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (آپس میں رحمدل) اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ (مومنوں کے فرمانبردار) کی تعلیم دی، وہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ (کافروں پر بھاری) اور اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (کافروں پر گراں) بننے کی بھی تعلیم دی۔ اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:-

"لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے۔ اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں اور مناسب رہا، تاہم تمدن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقیِ تمدن کے لیے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حریت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار و تواضع اس کے دشمن ہیں۔ خانقاہانہ طرزِ زندگی کا منتہی، فوجی طرزِ زندگی کا اقتضاء یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود رہتی ہے لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ طرزِ زندگی کا مطمحِ نظر ہے، کسی طرح ترقیِ تمدن کے حق میں مفید نہیں پڑ سکتا تھا، اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مترادف ہو جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متاخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے، وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی بلکہ ان کے بجائے دناءت، پست ہمتی، کم ظرفی، بزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اول الذکر میں سیاسی حریت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں، ان سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔" (فصل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق لیکن اس کے بالمقابل معلمِ اسلام علیہ السلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا:- ان اللہ یحب معالی الامور و یبغض سفافھا۔ (بیشک اللہ معالی امور کو پسند اور محقراتِ امور کو ناپسند کرتا ہے)

معالی امور سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام، اور محقرات سے مراد چھوٹی اور ادنیٰ باتیں ہیں اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لیے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنائت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:-

المؤمن القوی خیر واحب الی اللّٰہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ما ینفعك واستعن باللّٰہ ولا تعجز وان اصابك شئ فلا تقل لو انی فعلت کان کذا وکذا ولکن قل قدر اللّٰہ وما شاء فعل فان لو تفتح عمل الشیطان (صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ)

کمزور مسلمان سے قوت ور مسلمان زیادہ بہتر اور خدا کے نزدیک پیارا ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ ہر وہ چیز جو تجھے نفع دے اسکی پوری خواہش کر اور خدا سے مدد چاہ، اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اسمیں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے اور جو چاہا اس نے کیا، کیونکہ یہ اگر (اور مگر) شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

تقدیر، توکل، صبر اور شکر یہ حدیث ان تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر، توکل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے۔ اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادات قلبی کے تحت عنوان جلد پنجم میں کی جا چکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ چاروں تعلیمات اسی لیے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پُر امیدی، استقلال اور ثبات قدم پیدا ہو۔ مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خدا پر بھروسہ اور توکل کر کے کام شروع کر دینا چاہیے۔ اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر و غرور کے بجائے دل سے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اسی کے فضل و کرم سے ہوا، اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور ناامیدی کے بجائے صبر و ثبات پیدا ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ خدا کا منشا یہی تھا (یہی تقدیر ہے)

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:-

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ. اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران ۱۷)

جب تو پکا ارادہ کر لے پھر خدا پر بھروسہ کر، بیشک اللہ متوکلوں کو پیار کرتا ہے، اگر خدا تمہاری مدد کریگا تو کوئی تم پر غلبہ پا نہیں سکتا اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر اسکے بعد کون تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ خدا ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي

کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے پہلے کتاب (الٰہی) میں درج ہوتی ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے یہ اس لیے تاکہ اس پر جو تم سے جا

مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید ۳۱)

رہے، غم نہ کرو، اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ کرو واللہ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنائت کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لیے ہے۔ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب رہے۔ ان کو مشکلات میں خدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دعا سنائی گئی:۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۳۳۰)

اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر و ثبات کا پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ اور ہم کو کافر لوگوں پر فتحیاب کر۔

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۔ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران :۱۵)

اور کتنے نبی تھے کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی، تو خدا کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سست نہ ہوئے اور نہ کمزور ہوئے اور خدا ثابت رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط کر اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (آل عمران: ۲۰)

اے وہ جو ایمان لائے۔ ثابت قدم رہو اور دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو۔ تاکہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہوگا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثبات قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے۔ اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دشمنوں سے پیار کرو مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زریں اصول یہ ہے کہ اپنے دشمنوں کو پیار کرو۔ اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہل معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خود انجیل کے مفسرین[1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے، تم دشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دشمن کے حق میں دعائے خیر کر سکتے ہو مگر تم دشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے۔ کہ یہ دل کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہیں۔

---

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی ؛

اخلاقِ محمدیؐ نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی جس پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے۔ اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے یعنی دشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ بُرا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ جو تم کو بد دعائیں دیں ان کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں۔ ان کو معاف کرو۔ اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو، فرمایا:-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰامِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (مائدہ: ۲)

اے ایمان والو! خدا کے لیے کھڑے ہو جایا کرو. انصاف کے ساتھ گواہ بن کر۔ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو عدل و انصاف کرنے سے باز نہ رکھے۔ انصاف کرو کہ انصاف کرنا پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے اور خدا سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (حٰم السجدہ: ۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، بُرائی کو بھلائی سے دفع کرو تو دفعتہً وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، رشتہ دار دوست کے مانند ہو جائے گا۔ اور اس پر عمل کی توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت والے ہیں اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو خدا کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

۱۔ اس آیت پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور برائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲۔ اس آیت پاک میں جس نیکی اور حُسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہ ان لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دشمن ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

۳۔ دشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے!

۴۔ دشمن کے ساتھ برائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جو صحابہؓ میں بڑے مفسر ہیں، اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں[1]:

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کے برائی کرنے پر حلم اور عفو و درگذر کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور ان کا دشمن بھی دوست کی طرح ان کے آگے سر جھکا دے گا۔"

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲، ص ۱۲۷، و ابن جریر جلد ۲۴، ص ۶۸ - مصر۔

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے گالی دی، وہ سن کر چپ رہے، اس نے دوبارہ وہی حرکت کی، وہ پھر بھی چپ رہے، اس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی، تو وہ چپ نہ رہ سکے! اور کچھ بول اُٹھے، یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوراً اٹھ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی، یا رسول اللہ! کیا آپ مجھ سے خفا ہو گئے؟ فرمایا "اے ابوبکر! جب تک تم چپ تھے، خدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا، جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔"[1]

آپ نے فرمایا "صلہ رحم یہ نہیں ہے کہ صلہ رحم کرنیوالوں کے ساتھ صلہ رحم کرو بلکہ یہ ہے کہ جو قطع رحم کرے اس کے ساتھ صلہ رحم کرو۔"[2] یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں بلکہ دشمنوں کے ساتھ دوستی اصل خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبوی میں آکر عرض کی یا رسول اللہ! مجھے وہ بات بتلایئے جس کے کرنے سے جنت مل جائے۔ آپ نے اس کو چند باتیں بتائیں۔ منجملہ ان کے فرمایا "ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کرو۔"[3]

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی دشمن نہیں ہو سکتا لیکن دیکھو کہ قرآن پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا	(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہدے کہ ان کو جو خدا کے
يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا	دنوں پر یقین نہیں رکھتے، معاف کر دیا کریں، تاکہ خدا
كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (جاثیہ، ۲)	ایسے لوگوں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیوں" اور "سانپوں اور سانپوں کے بچو"[4] والی مسیحیت کے واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اس اولین داعی و واعظ میں ہے جس نے فاتح بن کر، مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، ایک دفعہ مکہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا جس نے اس کو معاف کر دیا۔ جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لیے اہل مکہ کا اشتہار و انعام سن کر اس کا تعاقب کیا تھا[5]، جس نے خیبر میں اپنی زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا[6]، جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا[7]، جس نے حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت کرنیوالی اور ان کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا[8]، جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا[9]، جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا[10] جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا۔ جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محو خواب تھا اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا[11]، جس نے ان طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی[12] جنہوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے۔ جس نے اُحد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنیوالوں کو نیک دعا دی[13] جسنے دشمنوں کے حق میں بد دعا کرنے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لیے نہیں، بلکہ رحمت کے لیے آیا ہوں[14] صلی اللہ علیہ وسلم، انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کیساتھ معاہدہ

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الانتصار [2] صحیح بخاری، کتاب الادب ج ۲، ص ۸۸۱ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کو پورا کرنا تقویٰ پرہیزگاری کی شان بتائی گئی ۔

اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ
يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا
فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ : ۱)

لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد ان کی مدت مقررہ تک پورا کرو ۔ اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے ۔

کفار و مشرکین سے عدم موالات اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے ان احکام کو پیش کرتے ہیں، جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے۔ یقیناً ہر ایک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اسکے ان مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں، خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو، یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو برگشتہ کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ اس قسم کی آیتیں

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ
دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ
مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران : ۳)

ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں تو جو ایسا کرے گا تو اس کو اس سے کوئی علاقہ نہیں مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ چاہو ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَ
اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى
الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (توبہ : ۳)

اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ، تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے ۔

اسی موقع کی ہیں ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہو گی، فطرۃً ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہو گی جو اس حق کے مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے، اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو شہزادہ امن کے اس اعلان کے ہیں ۱؎۔

(بقیہ حاشیہ) ۱؎ مستدرک حاکم کتاب المکاتب ج ۲ ص ۲۱۷ حیدرآباد دکن ۲؎ انجیل متی ۲۳، ۲۵، ۳۳ ۳؎ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔
۴؎ صحیح بخاری کتاب الہبۃ ۵؎ صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبویؐ ۶؎ صحیح بخاری فتح طائف ۷؎ صحیح بخاری باب فتح مکہ۔
۸؎ کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشعار یان فتح مکہ و ہبار بن اسود ۹؎ جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح ص ۵۲۰ ۱۰؎ صحیح بخاری کتاب الجہاد ص ۲۰۰ ۱۱؎ ابن سعد غزوۂ طائف ۱۲؎ فتح الباری ج ۷ ص ۲۰۶ مع باب اُحد ۱۳؎ صحیح بخاری مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱۴؎ مشکوٰۃ باب اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم ؛

"یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا، صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ، اور بیٹے کو اس کی ماں، اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں" (متی کی انجیل باب ۱۰-۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی جو دوسرے نادان بت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی۔ وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحدِ شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے، اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہلِ کتاب سے سازوارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا۔ فرمایا:-

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَ (مائدہ ۸)

اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان سے رفاقت کرے وہ انہی میں ہے، اللہ بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔ اب تو ان کو دیکھتا ہے جنکے دل میں بیماری ہے کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ آجائے۔ تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی) فتح یا (ان کی کامیابی کی) کوئی اور بات اپنے پاس سے بھیجے، تو پھر وہ اپنے دل کی چھپی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، خراب گئے ان کے عمل، پھر وہ رہ گئے نقصان میں۔ اے ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے پھریگا تو خدا کا کچھ حرج نہیں، اللہ اپنے دین کے لیے اور دوسرے لوگوں کو لائیگا، جن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہونگے جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پہ بھاری ہوں گے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ ۹)

اے ایمان والو! اہلِ کتاب اور کفار میں سے ان کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور خدا سے ڈرو۔ اگر یقین رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو، اور کن حالات میں اپنا رفیق کار، محرم اسرار اور مددگار نہ بناؤ، اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آل عمران کی اس آیت میں ہے:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (آل عمران ۱۲)

اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے، جتنی تم کو تکلیف پہنچے ان کو خوشی ہے۔ دشمنی ان کی زبان سے نکل پڑتی ہے اور جو ان کے جی میں چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے۔ ہم نے تم کو پتے جتا دیں اگر تم کو عقل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ملا ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے جن کی روک تھام کے لیے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور ساز باز سے روکا گیا ہے۔

سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ میں ہے۔ فرمایا:-

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (ممتحنہ: ۱)

اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی منکر ہیں۔ وہ رسول کو اور تم کو اس لیے گھر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے اگر تم میری راہ میں لڑائی اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم انکو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو۔ اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم چھپاتے اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ جو تم میں ایسا کرتا ہے سیدھی راہ بھولا ہے اگر وہ (جنکو تم دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع پائیں تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہاری تکلیف پہنچانے کے لیے اپنے ہاتھ بڑھائیں اور برائی کیساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر ہو جاؤ۔ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیے:-

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ

خدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں خدا انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔ وہ انہی سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالیں اور تمہارے

دِیَارِکُمْ وَظَاهَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (ممتحنہ ۲)	نکالنے پر ایک دوسرے مددگار بنیں۔ جو ان سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سُنا دی کہ عنقریب تمھاری فتح ہوگی اور اس وقت یہ دشمنی محبت سے بدل جائے گی فرمایا:۔

عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّجْعَلَ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِیْرٌ (ممتحنہ ۲)	امید ہے کہ اللہ تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے اور اللہ قدرت والا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب ان کے شانِ نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطب رضؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لیے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دیکر مکہ کی سمت روانہ کر دیا کہ قریش خبردار ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی۔ آپؐ نے دو سواروں کو بھیجا کہ راستے سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں۔ وہ خط آیا۔ تو آپ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے۔ عرض کی یا رسول اللہ جلدی نہ فرمائیے، بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں۔ لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں وہاں ان کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں۔ میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی جس کا مکہ والے لحاظ کرتے۔ تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں۔ میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا تم بدر والے لوگ ہو۔ خدا نے تمھارے گناہ معاف کیے ہیں۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الخ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہد عتیق میں بھی مذکور ہیں۔ زبور میں ہے:

> "اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں، تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں، اے خداوند! کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا۔ جو تیرا کینہ رکھتے ہیں۔ کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے اُٹھتے ہیں بیزار نہیں۔ میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں۔ میں انہیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں" (۱۳۹-۱۹-۲۲)

یشوع کے صحیفہ میں ہے:۔

> "اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیے لیئو جو تمھارے درمیان باقی ہیں اور ان کیساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو، اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمھارا خدا پھر ان گروہوں کو تمھارے سامنے سے دفع نہ کریگا بلکہ وہ تمھارے لیے پھندے اور دام اور تمھاری بغلوں کے لیے کوڑے، اور تمھاری آنکھوں میں کانٹے ہوں گے، یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین سے جو خداوند تمھارے خدا نے عنایت کی ہے، نابود ہو جاؤ گے (یشوع باب ۲۳-۱۲)

لہ صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۷۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ۔

قرآن پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے:-

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (نساء : ۱۲)

وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو، جس طرح انہوں نے کفر کیا، تو ان میں سے اپنے دوست نہ بناؤ، یہاں تک کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِىْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (انعام : ۸)

اور جب تو ان کو دیکھے کہ جو میری آیتوں کے شان میں لغو بکتے ہیں تو ان سے کنارہ کر لے، یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری بات میں لگ جائیں اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ان گنہگار لوگوں کیساتھ نہ بیٹھ۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِى الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِىْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (نساء : ۱۴۰)

اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے اور ان پر ہنسی ہوتے، تو ان کے ساتھ جب تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو، ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ احکام اس لیے ہیں تاکہ بری صحبت کا برا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے، ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:-

> "میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو، لیکن نہ یہ کہ بالکل دنیا کے حرامکاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بت پرستوں سے نہ ملو، نہیں تو تمہیں دنیا سے نکلنا ضرور ہوتا، پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا.... غرض کہ تم اس برے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو (اول قرنتیون : ۵)
>
> "اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوئے میں مت جتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کونسا ساجھا ہے اور روشنی اور تاریکی میں کونسا میل ہے، ایماندار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصہ ہے۔ خدا کی ہیکل کو بتوں سے کونسی موافقت ہے..... اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم ان کے درمیان سے نکل آؤ، اور جدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ (۲۔ قرنتیون ۶)

کفار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو ان سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے، عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:-

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ

اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسکو پناہ دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے کلام کو سن لے پھر اسکو

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ (توبہ ۱)

تو اسکی امن کی جگہ تک پہنچا دے یہ اسلیے کہ وہ نادان لوگ ہیں۔

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کیساتھ اس سے زیادہ بھی حسنِ سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی ان کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے۔ فرمایا:-

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰٓ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (لقمان ۲)

اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا، پھر تم سب کو میری طرف آنا ہے پھر میں تم کو جتاؤں گا جو تم کرتے تھے۔

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں منافقین کہتے ہیں، بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو، اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کر لیں یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں، اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں۔ اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو ان کے میل جول سے روک دیا جائے اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ ان سے لڑا جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت سے باز نہ آجائیں، ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امام وقت کو حاصل ہے۔ اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:-

يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا وَمَا نَقَمُوٓا إِلَّآ أَنْ أَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ فَإِنْ يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا

اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بری بازگشت کی جگہ ہے۔ یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا، حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا۔ اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ نہ پا سکے اور انہوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے انکو دولتمند کر دیا، تو اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لیے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ ان کو اس دنیا میں اور آخرت میں

نَصِیْرٍ (توبہ: ۱۰)	دردناک سزا دیگا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ تین رکوع کے بعد سورۃ کے خاتمہ میں مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ: ۱۶)	اے ایمان والو! ان کافروں سے لڑو جو تمھارے ہم سرحد ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور یقین کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لیے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر ان پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیت نبوی میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے۔ کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:-

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (تحریم: ۲)	اے پیغمبر! ان کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی بری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کیے گئے ہیں جو اس انتظام و نظام کی بربادی میں کفار و مشرکین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگدلی اور بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں، اپنے مدعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں اور وہ سورۂ فتح کی حسب ذیل آیت ہے جس میں ایک طرف صحابہؓ کی بہادری اور دوسری طرف ان کی باہمی محبت اور رحمدلی کی تعریف ہے:-

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ (فتح: ۴)	محمد، خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور آپس میں مہر و محبت رکھتے ہیں۔

اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کیساتھ سنگدلی، بے رحمی اور بداخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد، اور شدت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان ان پر ایسے بھاری ہیں کہ کفار ان پر حملہ کرنیکا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے محاورہ کے مطابق اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں، یعنی ان پر غالب اور انکے مقابل میں کافی مضبوط ہیں، ان سے کسی طرح دبتے نہیں۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیے ہیں جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں:-

اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ (مائدہ: ۸)	فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں کافروں پر

---

[1] تفسیر ابن جریر، طبری ج ۱۰ ص ۴۲۶، مصر۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورہ ہود میں ہے :-

يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ (ہود: ۸)	اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے زیادہ بھاری (مضبوط) ہے؟

دوسری آیت میں ہے :-

عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (توبہ ۱۶)	تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔

لسان العرب میں ہے :-

وَرَجُلٌ شَدِيْدٌ قَوِيٌّ وَالْجَمْعُ اَشِدَّآءُ (ج ۳ ص ۲۱۴ مصر)	مرد شدید یعنی قوی اور اس کی جمع اشدّآء ہے۔

قرآن پاک میں اَشَدُّ قُوَّةً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيْتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں :-

اُشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ (طٰہٰ: ۲)	اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (نبا ۱)	اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔
وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ (ص: ۲۰)	اور ہم نے ان کی سلطنت مضبوط کی۔
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (قتال ۱)	پھر مضبوط باندھو۔

شَدِيْد کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلہ میں مضبوط اور سخت رہے اور یہی صحابہ کرامؓ کی صفت تھی، انھوں نے کفار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروا نہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پرزور مقابلہ کیا، دشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا، ان کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، ان کے تیروں کی بوچھار سے لہولہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا، اور جس کی تصدیق کر چکے تھے، پھر اس سے انکار نہ کیا آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود ان سے دبنے لگے! اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رعب ان پر بیٹھ گیا۔ قرآن نے جو پیشینگوئی کی تھی کہ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (آل عمران وانفال) کہ میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دوں گا۔ وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب وحشر ۱) ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا۔

مخالفوں کے دلوں میں اسی رعب کے بٹھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے :-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ (انفال: ۸)	ان کیلئے تم سے جو طاقت ہو سکے، اور گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو۔ کہ اس سے دشمنوں کو مرعوب کر دو۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو۔ بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رعب کھائے۔ اسی لیے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے۔ فرمایا جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لیے ثواب کا موجب ہے جو ضرورت

کے لیے باندھتا ہے اس کے لیے پردہ پوشی ہے اور جو نمائش کے لیے باندھتا ہے وہ اس کے لیے عذاب ہے۔[1] اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی و قومی نفرت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لیے ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیروؤں کو نہیں روکا ہے۔

خدا کے لیے محبت اور خدا کے لیے ناراضی

یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا، لیکن ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی کرنا ہے، محبت اور عداوت موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں، اور تمام جدوجہد، انہی دو برابر جذبات کے نتیجے ہیں، اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرمجوشیاں سرد پڑ جائیں، اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے، برف کا تودہ بن جائے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے اور نامناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو۔ جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خودغرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لیے ہو۔ دوستی و دشمنی، رضامندی اور ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لیے ہو۔ الحبُّ فی اللہ والبغضُ فی اللہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے، یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے۔ وہ جب خیر سے محبت کریگا تو شر سے نفرت بھی کرے گا۔ وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی رہے گا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا، انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یکجا نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ قرآن نے کہا:۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ (احزاب۔ ۱) خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

ع سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجہاد۔

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے :-

"کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا اس لیے کہ یا ایک سے دشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی، یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (متی ۶-۲۴)

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ پولوسؑ[1] نے خدا اور آدمی یعقوبؑ[2] نے خدا اور دنیا، یوحناؑ[3] نے خدا اور دنیا کے بڑے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبت اور عداوت دونوں صرف خدا کے لیے ہونی چاہئیں، اپنی ذات کے لیے نہیں۔ بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ "ایمان کی کونسی زنجیر زیادہ مضبوط ہے؟" عرض کی "خدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے" فرمایا "یہ کہ باہمی میل جول خدا میں ہو، محبت بھی خدا میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو خدا ہی میں ہو"۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ "کونسی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے؟" کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا، آپؐ نے فرمایا "تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ خدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خدا ہی کے لیے محبت اور خدا ہی کے لیے مخالفت ہو"[4]

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں خدا کے لیے کسی سے ناخوشی یا مخالفت یا نارضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض و غایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو، نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو۔ اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں۔ قرآن پاک کی ایک آیت ہے :-

حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ	خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین
وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ (حجرات:۱)	کیا اور کفر اور بدچلنی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیان کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے۔ یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے۔ فرمایا :-

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ	تو اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں
فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (توبہ ۲:)	تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے اور نارضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں، نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابل نفرت اچھوت ہے، نہ ملیچھ ہے نہ چنڈال ہے۔ نہ یہودیوں

---

[1] گلتیوں کے نام (۱-۱۰) [2] یعقوب (۴-۴) [3] یوحنا (۲-۱۵) [4] مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللہ۔

کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یوروپین اور غیر یوروپین کی تقسیم ہے۔ جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے۔ ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل و ابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی، مومن و موحد ہو کر بلال حبشیؓ، صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ کا رتبہ پا سکتا ہے، وہی عمرؓ، وہی سفیانؓ، وہی عکرمہ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے۔ یک نظر ان کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان ان کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:۔

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (آل عمران: ۱۱)	(یاد کرو) جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیان کاری پر ہے توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدل ہو جاتا ہے۔ مبشر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے گنہگاروں کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سنایا کہ:۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (زمر: ۶)	اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ خدا سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپؐ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لا ذنب له[1] "گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔" یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور ان کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سنائی۔ ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے، ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے تو صحابہؓ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا "تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو، خدا کی قسم! مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کو پیار کرتا ہے[2]۔" اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گنہگار پر بددعا نہ کی جائے[3]۔ ماعز بن مالک ایک صاحب تھے جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے۔ واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے۔ تاہم انہوں نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ ان کی درخواست رد کی۔ لوگوں سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں، سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ وہ میدان میں کھڑے کیے گئے اور ان پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگباری کی اور اسی حال میں انہوں نے جان دی۔ صحابہؓ میں بعض ایسے تھے

---

[1] ابن ماجہ باب ذکر التوبہ۔ [2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔ [3] فتح الباری شرح حدیث مذکورہ۔

جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعزؓ کو بُرا کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا "ماعزؓ کے لیے خدا سے مغفرت کی دعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہو سکتی ہے"[1]

اسی طرح قبیلۂ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آ کر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی آپؐ نے فرمایا کہ وضع حمل کے بعد آنا۔ وہ اس کے بعد آئی، فرمایا بچہ کی پرورش کر لو۔ جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا۔ وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساسِ گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا۔ آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون کے چھینٹیں اُڑ کر حضرت خالدؓ بن ولید کے منہ پر پڑیں، انہوں نے عورت کو بُرا کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا تو فرمایا "خالد چُپ رہو، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا"[2]

ترکِ ہویٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک عمل کی اچھائی بھی اسکی غرض و غایت پر موقوف ہے یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کیلئے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اسکے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لیے ہے تو وہ نیکی نہیں، اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں ھویٰ ہے۔ ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال و اعمال و اخلاق کو ہویٰ سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لیے وہ کام کرتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دینِ حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور ان کے سینوں کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہش و ہویٰ کے بُت چھپے ہیں۔ قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا:۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ (جاثیہ: ۳) اے پیغمبر کیا تو نے اسکو دیکھا جسنے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اسی لیے نفس کے تزکیۂ صفائی اور روح کی بلندی و پاکی کے لیے شریعتِ محمدیؐ نے ترکِ ہویٰ کا طریقہ پیش کیا بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہو جائے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بُری خواہش سے پاک ہو جائے کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بُری خواہش سے پاک ہو جائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض و غایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا۔ اسی لیے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں بلکہ ہر بُری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا و ہوس کے ترک کا مطالبہ ہے کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی و ضلالت پیدا ہوتی ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے فرمایا:۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللهِ (قصص: ۵) اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔

پھر فرمایا:۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحدود [2] صحیح مسلم، کتاب الحدود۔

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص ۲) اور خواہش نفسانی کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے وہ اسی ہوٰی کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے۔ فرمایا:۔

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (نساء ۲۰)	عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنت ہے۔ فرمایا:۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (نازعات: ۲)	اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بیشک جنت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبتِ الٰہی دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت اور پیار ہے۔ خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کیساتھ ہو یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر ضروریاتِ دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسنِ اخلاق ہے۔ عقائد کے باب میں محبت الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے۔ مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے۔ اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعیِ خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۴)	کہہ دو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کریگا۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآن پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ بس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں، حسن خلق بھی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بد اخلاقی اور بدکرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسب ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں:۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۷)	اور خدا ایمان والوں کو دوست رکھتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (بقرہ ۲۴، مائدہ ۳)	خدا اچھے کام کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ (بقرہ ۲۸)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران: ۱۷)	خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ ۶، حجرات ۱)	خدا انصاف کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۱۰)	خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (آل عمران ۱۵)	اور خدا صبر کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ (توبہ ۱۳)	اور خدا پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ (صف ۱)	خدا انکو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیاتِ پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسبِ ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:-

فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ (آل عمران ۴)	تو خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (بقرہ ۲۴، ملدہ ۳)	خدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (نساء ۶)	خدا اسکو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا اور شیخی مارنیوالا ہو۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيْمًا (نساء ۱۶)	خدا اسکو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار اور گنہگار ہو۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ (انفال ۷)	خدا خیانت کرنیوالوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ (حج ۵)	خدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (قصص)	خدا اترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ (قصص)	خدا فساد کرنیوالوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (انعام ۷)	خدا فضول خرچ لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (نحل ۳)	خدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ ۴)	خدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ (بقرہ ۲۸)	خدا ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر وغرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لیے ہوئی، یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتوں کا پابند اور بری باتوں سے روک کر آراستہ و پیراستہ بنانا، اسی لیے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (بقرہ ۱۵۱)

وہ (رسول) اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک و صاف کر کے نکھارتا ہے۔

اور اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ

وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (ابن ماجہ باب فضل العلماء)

اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلم کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں، وہ ایک جراح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو، اگر کسی جراح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ زخم کو نہ تو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے، حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کے حدود کو توڑے تو اس کی سزا دیتے تھے[1]۔ قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم میں پکڑی گئی، بعض مسلمانوں نے اُنکی سفارش کرنی چاہی تو آپؐ نے فرمایا، تم میں سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اس کو سزا دیتی تھیں اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے[2]۔

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں، نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا، اتفاق سے اسکو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی، تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا، صحابہؓ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اُس کو مارنے کو دوڑے آپؐ نے روکا اور فرمایا تم سختی کے لیے نہیں بلکہ نرمی کے لیے بھیجے گئے ہو، اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں، یہ نجاست کے لیے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کیلئے ہیں،

---

[1] صحیح بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا [2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو[1]۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالتِ روزہ ایک غلطی ہو گئی، اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو، انہوں نے کہا یہ ہم سے نہ ہو گا، تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا، فرمایا ایک غلام آزاد کر دو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں، فرمایا دو مہینے لگاتار روزے رکھو، عرض کی روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا، فرمایا تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو، عرض کی ہم تو خود کنگال ہیں، فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لیکر پہلے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں، وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضورؐ نے کتنی نرمی کی[2]۔

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل کا موقع ہوتا تھا، آپ نرمی سے سمجھا دیتے اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے۔ ؏

قاہری با دلبری پیغمبر است

اخلاقی فضائل اور رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیے گئے کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکمِ خداوندی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ، کہیں اس کے اچھے یا بُرے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی، اور کہا:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نحل: ۹۰)	بیشک اللہ عدل اور احسان کرنے اور رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی سے منع کرتا ہے تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو، اور اُن سے بچو، تمام انسانوں کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ اس حکم کی پوری پوری تعمیل کریں اس تعمیل میں بندوں کے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے۔ مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ كَمَثَلِ حَبَّةٍ (بقرہ: ۲۶) یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اُگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں، اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول۔ [2] ابوداؤد باب فی الظہار۔

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے قرآن نے اس کو یوں ادا کیا کَمَثَلِ صَفْوَانٍ (بقرہ ۔ ۳۶) اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہہ گئی اور چٹان دھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہوگا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ "جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں"۔ (نساء ۱) پیٹھ پیچھے مسلمان کی برائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی، "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے" (حجرات ۲) کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی برائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے: "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے۔" اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بد اخلاقی کی ہو سکتی ہے۔ قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آکر عدالت نبوی میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی، حضورؐ نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپؐ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سنا کہ "اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا، لیکن اس نے اپنے آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا، حضورؐ یہ سن کر خاموش رہے تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی، آپؐ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم ہیں یا رسول اللہ! فرمایا تم اترو اور گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ، انھوں نے عرض کی اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا، فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھنونی بات ہے[1]۔"

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لیے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور برے کاموں کے برے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور برے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے، اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے برے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا: "مسلمانو! شراب جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے آپس میں عداوت اور دشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔" (مائدہ: ۱۲) شراب اور جوئے کے برے نتیجے یہ ہیں کہ ان کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بیکار ہو جاتا ہے، نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے، جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:۔

---

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیر آیت مذکورہ ج ثالث ص ۲۸۵۔

إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوْءٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا (نساء ۱۴۹)

اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کرو یا اس کو چھپاؤ یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو، تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا نہیں:

ان اللہ جمیلٌ یحب الجمال (صحیح مسلم و ترمذی)

اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

اس لیے بندوں کو بھی چاہیے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو انکو قرآن نے اس طرح کہا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب ۳)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم کے نمونہ سے دی گئی۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ (ممتحنہ ۱)

تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی ہے اور ان کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی برائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بنی اسرائیل ۳)

بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی۔ جابرؓ بن سلیم ایک صحابی دربارِ نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے، جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجا لاتے ہیں، میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ سن کر میں نے دو دفعہ کہا اے اللہ کے رسول آپؐ پر سلام (علیک السلام) آپؐ چپ رہے، پھر فرمایا علیک السلام نہ کہو، یہ مردہ کا سلام ہے، السلام علیک کہو، میں نے کہا کہ کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسول ہوں، جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر میں ہو۔ تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے تو دعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے، میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کسی

بُرا نہ کہو، جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے اس فرمان کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام، یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی بُرا نہیں کہا۔ آپؐ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اسکو کیے جاؤ اور تم کو چاہیے کہ اپنے بھائی سے جب بات کرو تو تمہارا چہرہ کھلتا رہے، یہ بھی نیکی ہے، اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو، اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے، کیونکہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی نشانی ہے[1] اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اسکی عار دلائے، تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس کا وبال اسکی گردن پر ہوگا[2]۔

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجیے کہ آپؐ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے، اس کا اثر یہ ہوا کہ اسکا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی، ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو بتایا جائے یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں، حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو، پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے نصیحت فرمائیے، ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کر۔ اس نے کئی مرتبہ اپنا سوال دہرایا، آپؐ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کر[3]۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے، اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہوگا اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہوجاتی ہوں گی، اس لیے آپؐ نے اس کے لیے یہ علاج تجویز فرمایا جس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول! سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے، فرمایا خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے، فرمایا جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں پسندیدہ ہو، پھر دریافت کیا کہ اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں؟ فرمایا تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کردو، پوچھا اگر یہ بھی نہ بن سکے، فرمایا شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے، جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو (ادب المفرد بخاری ص ۵۴ مصر)

کبھی آپؐ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے، وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے، آپؐ ان کی اس توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو ان کے دل میں اُتر جاتا، ایک دفعہ صحابہؓ سے آپؐ نے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ لوگوں نے عرض کی ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو، نہ سامان ہو، فرمایا میری

---

[1] عرب لوگ فخر و غرور کے لیے ایسا کرتے تھے جیسے عبا کے دامن یا کوٹ کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں غرور کی نشانی تھی۔ [2] سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب، ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب۔

اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لیکر آئیگا لیکن اس نے اس کو گالی دی ہوگی اس پر تہمت لگائی ہوگی اس کا مال کھا گیا ہوگا، اس کا خون بہایا ہوگا، اسکو مارا ہوگا تو اس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ ان لوگوں کو دیدیا جائیگا اگر اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور اس کے ذمہ کچھ لوگوں کا باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اس کے نام لکھ دی جائیں گی، پھر وہ جہنم میں ڈالدیا جائے گا[1]۔

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے یہ دریافت کیا کہ پہلوان تم کس کو کہتے ہو؟ لوگوں نے کہا جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں، فرمایا نہیں یہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے[2]۔

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں، صبر کی تلقین کرنی تھی، تو دریافت فرمایا تم بے اولاد کس کو کہتے ہو؟ صحابہؓ نے عرض کی جس کے بچہ نہ ہو، فرمایا وہ بے اولاد نہیں، بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی[3]۔ (احادیث میں ہے کہ جو بچے کم سنی میں مرجائیں اور ان کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں اُن کی شفاعت کریں گے) اس طریقِ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں، بلکہ اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمھیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپؐ اس جماعت کے اچھے اور بُرے لوگوں کے نام لیں گے) آپؐ نے دوسری بار یہ سوال کیا، پھر تیسری بار پوچھا، ایک شخص نے کہا ہاں، یا رسول اللہ فرمایئے، ارشاد ہوا تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی اُمید کی جائے اور جس کی برائی سے لوگ امن میں ہوں اور تم میں سب سے بُرا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جسکی برائی سے کوئی امن میں نہ ہو[4]۔

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔ ابوہریرہؓ نے کہا میں اے اللہ کے رسول، ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں، گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے، خدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن ہو گے، لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو، تو مسلمان بن جاؤ گے، اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[5] (یعنی دل کی صلاحیت جاتی رہتی ہے)

ایک دفعہ فرمایا "کون مجھ سے اپنے جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں[6]" کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لیے اُٹھے ہوں گے، ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو، دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم [2] ایضاً باب فضل من یملک نفسہ عن الغضب [3] ایضاً [4] ترمذی شریف کتاب الفتن
[5] جامع ترمذی ابواب الزہد [6] صحیح بخاری باب حفظ اللسان ۔

کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں، جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں، ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصہ کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت کرتا ہوں، آپؐ کے غلام ثوبان نے اٹھ کر کہا میں، اے اللہ کے رسول! فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو، چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا[1]۔

سب کو معلوم ہے کہ ارضِ حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا، لوگو! آج کون سا دن ہے؟ لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں، عرض کی اللہ کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا کیا یہ قربانی کا دن نہیں۔ سب نے کہا جی ہاں، پھر پوچھا یہ کون سا مہینہ ہے، پھر سب چپ رہے کہ اس کا نام بدل کر کچھ اور بتائیں گے فرمایا کہ کیا یہ ذی الحجہ نہیں، سب نے کہا جی ہاں، پھر فرمایا یہ کونسا مقام ہے پھر سب خاموش رہے کہ آپؐ کوئی اور نام بتائیں گے، فرمایا کہ کیا یہ بلد الحرام نہیں ہے، سب نے کہا جی ہاں، ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن، اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا مسلمانوں کا خون، مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لیے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں[2]۔

کبھی خاص خاص صاحبوں کو ان کی مناسبتِ طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے، حضرت ابوذر غفاریؓ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے، بڑے ہی زاہد و عابد تھے، ان کے ذوقِ طبع کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا، اے ابوذرؓ! جہاں رہو خدا سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو[3]۔

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا، تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستے سے پتھر، ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی انڈیل دینا بھی صدقہ ہے[4]۔

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپؐ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے، چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسول سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گی (سورۂ ممتحنہ ۲)

عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ آپؐ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ہم ہر حالت میں رسول کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل و انصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی

---

[1] مسند احمد ج ۵ ص ۲۷۵، [2] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ [3] ترمذی باب ما جاء فی معاشرۃ الناس

[4] ترمذی فی صنائع المعروف ۔

ملامت سے نہیں ڈریں گے[1]۔"

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپؐ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی، ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے، اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اسمیں کمی کی تو اسکا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے[2]۔ اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے، سوال سنکر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے، مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خود ہی جواب دے دیتے تھے۔ دریافت فرمایا کہ افتراء کس کو کہتے ہیں پھر خود ہی فرمایا "وہ چغلی ہے لوگوں کے درمیان بات کو اِدھر سے اُدھر پہنچانا[3]۔" ایک بار ارشاد ہوا کہ "تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں"۔ لوگوں نے جواب دیا اللہ اور اس کا رسول جانتا ہے۔ فرمایا تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو"۔ کسی نے کہا اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو تو، فرمایا اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان ہے[4]۔ ایک موقع پر ارشاد ہوا میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ فرمایا ہر کمزور، نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسے پر قسم کھا بیٹھے تو خدا اس کی قسم پوری کر دے، پھر فرمایا کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟ صحابہؓ نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا ہر درشت مزاج شیخی خور، مغرور[5]۔

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اس کو بار بار دہراتے حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ یا رسول اللہ! یہ کیا بات ہے، اس وقت آپ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ ایک دفعہ خود سے فرمایا "خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحب ایمان نہ ہوا"۔ صحابہؓ نے مشتاقانہ پوچھا کون یا رسول اللہ! فرمایا جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہوا[6]۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دینداری اخلاص کا نام ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کس کیساتھ، فرمایا "اللہ کے ساتھ، اس کی کتاب کے ساتھ، اس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کیساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ[7]۔"

* * *

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۱۰ [2] صحیح بخاری ج ۲ ص ۵، کتاب الدیات [3] صحیح مسلم باب تحریم النمیمۃ [4] صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ [5] صحیح مسلم باب جہنم [6] مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین [7] مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیح مسلم و صحیح بخاری۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصول اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کے ان اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں، ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حقوق، فضائل و رذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنھیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائل اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجا لانا ہے اس کو آداب کہتے ہیں مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور و طریق۔ ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی، لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ : ۳)	خدا نے تمہارے (کام کے) لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لیے انسان کو دنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اسکو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے، اسی ذمہ داری کا نام "حق" ہے جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوا:-

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ط (ذاریات : ۱)	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔
وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (معارج : ۱)	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔

وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (بنی اسرائیل، ۳)	اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔
فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ وَالْمِسْکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (روم: ۲)	تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے، تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے، ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے، یہ اُن کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر، ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے۔

وَاٰتُوْا حَقَّہٗ یَوْمَ حَصَادِہٖ وَلَا تُسْرِفُوْا (انعام ۱۷)	اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو، اور فضول خرچی نہ کرو۔

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے، اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں ان کو بھی کچھ دے، جن کو یہ نعمت نہیں ملی، اور اس نعمت کو بے موقع خرچ نہ کرے اور ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع و محل کو نقصان پہنچاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:۔

ان لزوجك عليك حقا ولزورك عليك حقا، (بخاری، صوم)	تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے ملاقاتی کا بھی تم پر حق ہے،
واهلك عليك حقا (” ”)	تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ اس کو کھانا کھلائے کپڑے پہنائے اور اس کے چہرہ پر تھپڑ نہ مارے۔" (ابوداؤد نکاح) ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے اس کے ایک ایک عضو کا اس کے اوپر حق ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

فان لنفسك عليك حقا (بخاری صوم)	بیشک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔
فان لجسدك عليك حقا ولعينيك عليك حقا (” ”)	تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے، اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور سے سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت جب انسان کا تعلق کائناتِ ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے، تو ظاہر ہے اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ انکو نشو ونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ انکو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور انکے آرام آسائش

کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے اور خود انسان کا اپنا اوپر بھی حق ہے کہ اسکا ہر عضو جس غرض کیلئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں، لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لیے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لیے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے، دوسرا یہ کہ انکے قدرتی نشو و نما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے، بلکہ اسکے مناسب اسباب فراہم کرے اور اسکے مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر رکھے، یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ: ۳) زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لیے پیدا کیا۔

کے صریح نتیجے ہیں، کہ جب انسان کے لیے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ ان سے وہی کام لے جس کے لیے وہ بنائی گئیں اور اس لیے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں انکی پرورش و ترقی قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتاً اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہوں[1]۔ اور اسی لیے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]،" اسی سبب سے پھلدار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]۔ ایک اور تمثیلی حکایت میں آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی اور ایک اور شخص پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا، یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی، ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پرس ہوئی[4]۔"

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لیے بھی کیے گئے ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے، جنکی

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعۃ جلد اول صفحہ ۳۱۲ [2] صحیح بخاری مسلم باب مذکور [3] فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکورہ جلد خامس صفحہ ۷ مصر [4] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں۔

تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب مگر ان تمام حقوق کی ادائگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں ہے:

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ انجیل کی طرح مختصر یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبت کرنا لیکن "صرف محبت کرنا" کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیے۔ جو اس محبت کا تقاضا ہے اور اس کے مظاہر ہیں، یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لیے رکھتے ہو[1]"۔ اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لیے چاہتا اور پسند کرتا ہے، وہی دوسروں کے لیے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کلی سرعنوان ہے، لیکن اسلام میں یہ سرعنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے، جن کو اسلام نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی دوری و نزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بیگانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی، مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو، تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے فرض ہے، کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے، اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی[2] ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے، انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے۔ مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے، اور پھر انسانوں میں اہل ملک، قوم قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں، بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پاسکتا ہے، یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابتداروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برتر از حق اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے، لیکن دوسرے قرابتمندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے، لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے، ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے، پھر اسی حالت میں

---

[1] صحیحین کتاب الایمان [2] سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیت۔

ں کا ایک ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے، تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے، ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوسرے تیسرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے، یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید مزاحمت گوارہ کرکے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو، اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا، شریعت محمدی نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نساء : ۶)	اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔
قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (بقرہ : ۲۶)	اے پیغمبر ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں، غریبوں اور مسافر کے لیے اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔
وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (بنی اسرائیل : ۳)	اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین کا اور مسافر کا اور فضول خرچی نہ کر۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب ہیں،

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت، حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے، بلکہ تینوں میں ان کا درجہ خدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے، اور خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:۔

"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے، تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خدا تجھے دیتا ہے دراز ہو،"

(خروج ۲۰ - ۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور اپنے باپ سے ڈرتا رہے۔" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ توراۃ نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ،

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا، اس نے اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔" (احبار ۲۰-۹)

اور وہ جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے گا (خروج ۲۱-۷)

حضرت عیسٰی نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان حکام کی صرف لفظی تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے، فرمایا:

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے، جان سے مارا جائے پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب ہے سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے ماں باپ یا ان کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں، پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا (متی ۱۰-۱۵)[1]

نبوت محمدیؐ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لیے ہوئی ہے اس نے توراۃ و انجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور ان سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشہ کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

۱- اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی، اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیچارگی اور حمل، وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ۔ (لقمان: ۲)	اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے واسطے تاکید کی۔ اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا، اور دو برس تک دودھ پلایا۔
وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (احقاف: ۲)	اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرے، اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ جنا، پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی، ایک شخص نے خدمت قدس میں آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون، فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کی، پھر کون، فرمایا تیری ماں، تین دفعہ آپؐ نے یہی جواب دیا، چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ[2]، ایک دن

---

[1] اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹-۱۹ مرقس ۷-۱۰ و ۱۰-۱۹ لوقا ۱۸-۲۰ [2] صحیح بخاری ج ۲ کتاب الادب ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔[1] ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی یا رسول اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے، کیا میرے لیے کوئی توبہ ہے؟ فرمایا کیا تیری ماں زندہ ہے؟ جواب دیا نہیں! دریافت کیا خالہ ہے؟ گذارش کی ہے، فرمایا "تو اس پر نیکی کر"۔[2] یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپ سے مشورہ چاہتا ہوں، فرمایا کیا تمہاری ماں ہے؟ جواب اثبات میں دیا، فرمایا کہ تم اسی کے ساتھ چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے۔[3]

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں مخلوقات انسانی میں جنس لطیف کی ہی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں، وہ خالق اکبر کی علت فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں، لیکن باپ کی مادی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں، مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا، پھر اس کے جننے کی ..... ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا پھر اس نو پیدا مضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان اپنا ہر ایمان ترک، اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لیے شریعت محمدیؐ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی سزاوار ہے۔

۲۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی، بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے، وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچتے ہیں تو اس پر فرض ہے کہ اپنی ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے، چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی "عزت" کرنے اور ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی، بلکہ ان کی خدمت ان کی اطاعت ان کی امداد اور ان کی دلجوئی، ہر چیز فرض قرار دی، بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو، ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کیساتھ حسن سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر، تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعل اور دوسری علت مادی ہے، سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے، فرمایا:

---

[1] ایضاً [2] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ [3] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ بحوالہ ابن ماجہ، نسائی، حاکم۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ إِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (بقرہ : ۱۰)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیت پاک گو اس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے، لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزت اور بڑائی کے محدود لفظ نہیں بلکہ "نیکی کرنے" کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت اطاعت اور عزت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔

اسی صورت میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے۔

قُلْ مَآ أَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ الآیہ (بقرہ ۲۶)

فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لیے۔

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کیجاتی ہے،

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (نساء : ۶)

اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔

کفار کو جنہوں نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج سے حلال و حرام کی ہزاروں رسمی و خیالی باتیں پیدا کر لی تھیں اللہ تعالیٰ خطاب کر کے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا۔

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (انعام ۔ ۱۰)

کہہ (اے پیغمبر!) آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

معراج کے احکامِ دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ ان کے سامنے اُف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، ان کے حق میں دعائے خیر کرو اور بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو، فرمایا:۔

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۭ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (بنی اسرائیل ۔ ۳)

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو، اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انکو اُف بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا ہو اور ان سے ادب سے بولو۔ اور ان کے لیے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بڑی چیز کوئی نہیں قرار دی گئی اس پر بھی اگر کسی

کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے ہاتھ اٹھانا روا نہیں، بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ ارشاد ہوا:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۚ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (عنکبوت :۱)	اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کیساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہنا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کر دوں گا۔

اتنا ہی نہیں، بلکہ اگر تمہارے بت پرست ماں باپ تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف انکی دعوت کو قبول نہ کرو، لیکن ان کی دنیاوی خدمت۔ اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے، بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے فرمایا:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۚ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۚ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۖ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان :۲)	اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کیساتھ نیکی کرو اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا، کہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے، میرے ہی پاس پھر آنا ہے، اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جسکو تو نہیں جانتا تو انکا کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کیساتھ بھلائی سے گزران کر۔

اس اہتمام کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسانمندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے، مگر دوسری باتوں میں انکا ادب انکی اطاعت اور انکی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھیے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی دعا سے مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لا کر حسن خاتمہ پر مرے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ (ابراہیم :۶)	اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دعا کی۔

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ (نوح :۲)	میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لیے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے، آخری بات ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں ان کی خدمت بجا لاتے ہیں اور ان کے لیے خدا سے طلب خیر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ	اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ

اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (احقاف ۲)

نیکی کرنا اس کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ میں اُٹھایا اور تکلیف کر کے جنا اور تیس مہینوں تک اسکو پیٹ میں رکھنا اور دودھ چھڑانا، یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا، وہ یہاں تک کہ وہ بچہ بڑھ کر جوان ہوا اور چالیس کا ہوا اس نے کہا کہ میرے پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس احسان کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر میرے ماں باپ پر کیا۔ اور اس کی کہ میں وہ کام کروں جسکو تو پسند کرے اور میری اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں، یہی وہ ہیں جن کے پیچھے کام ہم قبول، اور ان کے بُرے کاموں سے درگذر کرتے ہیں یہ جنت والوں میں ہوں گے یہ سچائی کا وہ عہد ہے جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا۔

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضامندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دھل کر صاف ہو جاتی ہے، احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے کہ "ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے"[1] کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے" کسی نے پوچھا یا رسول اللہ! میرے حسنِ معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، دریافت کیا پھر کون، فرمایا تیری ماں، عرض کی پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، گذارش کی پھر کون، چوتھی بار فرمایا، تیرا باپ اور اس کے بعد جو اس سے قریب ہے، پھر جو اس سے قریب ہے ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس قدس میں تشریف فرما تھے، جاں نثار حاضر تھے فرمایا وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، صحابہ نے پوچھا کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا، وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل کر لی ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا، عرض کی پھر کون؟ ارشاد ہوا ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، دریافت کیا پھر کون، فرمایا خدا کی راہ میں محنت اُٹھانا (جہاد)

ایک دفعہ آپؐ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان فرمایا ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا، تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسی گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب ان کی بے کسی بیچارگی اور اضطراب وبیقراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے، ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی اسوقت انہوں نے پورے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد ونسائی وبیہقی کتاب الادب فی البر والصلہ۔

خضوع و خشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیے، ایک نے کہا بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا، میں شام کو جب بکریاں لیکر گھر آتا تھا تو دودھ دھوکر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا، لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے، میں دودھ لیکر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آجاتا اور ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لیے رات بھر سرہانے کھڑا رہا اور وہ آرام کرتے رہے خداوندا اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لیے کیا تو اس چٹان کو اس غار کے منہ سے ہٹا دے، یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی اس کے بعد باقی مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے مگر والدین کی خدمت گزاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے اس لیے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں، جس کو اس کی خدمت گذاری کے لیے وقف ہونا چاہیے تھا اسی لیے ابھی اوپر گذر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گزاری کے بعد رکھا، ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر خدمتِ اقدس میں شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں، عرض کی جی ہاں، ارشاد ہوا تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت کا ذکر ہے احادیث میں بھی وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ "تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے" ایک دفعہ صحابہؓ سے جو خدمت میں حاضر تھے، دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں انہوں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ، فرمایا کہ خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے سیدھے ہوکر برابر ہوگئے اور فرمانے لگے "اور جھوٹی گواہی اور ہاں جھوٹی گواہی"۔[1]

توراۃ میں حقوق والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے وحی محمدیؐ نے بعض حیثیتوں سے ان میں تخفیف کر دی ہے، اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے، مثلاً توراۃ کا یہ حکم

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتب حدیث میں مذکور ہیں، خصوصیات کیساتھ دیکھو، صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، مشکوۃ باب مذکور۔

تھا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے، اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اخروی سزا کا موجب قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ و استغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظر ثانی کی تا زندگی مہلت ملتی ہے، لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے، جو دنیا وی سزا سے زیادہ سخت ہے، اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگدل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہوگا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہوگا، کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو قتل بالقصد کے بجائے اتفاقی سمجھا جائے تاکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو[1]۔

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دی کہ دوسری طرف بیوی کے سامنے ان کو بالکل بے قدر کر دیا ہے لکھا ہے:

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے (پیدائش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو گو (انجیل کے بیان کے مطابق) ماں باپ اور بیوی تینوں سے ناآشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرفداری اور حمایت کی، اور اسی لیے طلاق کو ناجائز قرار دیا (مرقس ۱۰-۲-۱۰) مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابل حل اختلاف ہو، اور اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینا پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے، اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور معاہدہ نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا ہے، اور مٹ کر بدل سکتا ہے، لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابل شکست اور ناقابل تغیر ہے، حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے، مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو پسند نہ تھیں، اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ باپ کی اطاعت کریں،

* * *

---

[1] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہریہ کا اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ باپ کے وفور شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلا قصد سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر فقہائے اس کو قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

اولاد کا حق

اصولِ تعلیم جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا اور اس سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے، مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مذہب لیکر تشریف لائے اسکی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں، وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے، اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتادیا ہے جو ان تمام حقوق کی نہایت جامع متن ہے ان حقوق کی جس طرح تشریح کی جائے یہ متن ان سب پر محیط ہے فرمایا،

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ	جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے اور ہمارے
یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا (ترمذی)	بڑے کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں، یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں اور بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے، جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آتی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے، حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بار گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ انکو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقش زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں، بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہیں، یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے، اور ذریعۂ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی و سنگ دلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا۔ یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے ایک تو مذہبی تھا یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچّہ[1] کی قربانی کریں گے یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی، رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج[2] تھا اور سب سے زیادہ۔ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں کی خوشی اور نذرانے کے لیے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے[3]

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ (انعام :۱۶)

جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصہ لگا لیا ہے اس طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوبصورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں تاکہ یہ دیوتا ان کو (ہمیشہ کے لیے) ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں اور اگر اللہ چاہتا ہے تو وہ ایسا نہ کرتے تو ان مشرکوں کو اور (جو کچھ وہ خدا پر وہ افترا کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایسا حکم دیا ہے۔ اس کو چھوڑ دے۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام :۱۶)

گھاٹے میں ہیں، وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بیجانے قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہو گی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہو گا اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے، نبوت محمدیؐ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لیکر آتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میر سامان ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھود: ۱)

اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبدالمطلب کا عبداللہ کو قربانی دینے کا واقعہ، نیز موطا امام مالک باب مالا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ۔

[2] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول ص ۲۴۰

[3] کشاف زمخشری تفصیل آیت ذیل۔

اس لیے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (اسراء: ۴)

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتلِ اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنالی ہیں، بتادو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (انعام: ۱۹)

کہہ اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو، ہم تم کو اور ان دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا یا رسول اللہ، سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا شرک، پوچھا اس کے بعد فرمایا والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی اس کے بعد، فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھلائے گی۔[1] یہ جواب حقیقت میں آیتِ بالا کی تفسیر ہے، انہی تعلیمات اور نبوت کے اس پر توفیق نے دلوں میں یقین پیدا کردیا کہ رزاق خدا ہے اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے، ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لیکر آتا ہے اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کردیا ہے اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لیے پاک ہوگئی۔

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کردینا تھا، کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں، جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا، اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں، قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (زخرف: ۲)

اور جب ان میں کسی کو اس کے ہونے کی خوشخبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردۂ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے، قرآن مجید نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۚ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و تفسیر سورۂ بقرہ و سورہ فرقان، و کتاب الادب و کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَیُمْسِکُهٗ عَلٰی
هُوْنٍ اَمْ یَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ط (نحل ۔ ۷)

خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت
اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں
چھپا دے (یعنی زندہ دفن کر دے)

یوں تو اس رسم بد کا رواج تمام عرب میں تھا، مگر اخبار عرب کے بعض واقعے کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے[1] زیادہ تھا، بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اقرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے[2]، یہ رسم جس شقاوت اور سنگدلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرتناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت ہے[3] کہ ایک شخص نے آکر خدمت اقدس میں عرض کی، کہ یا رسول اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے، بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے

میری ایک لڑکی تھی جب میں اسکو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی، میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے چل آئی، میں آگے بڑھتا چلا گیا، جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا، وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری پکار تھی، رحمتِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم اس پُر درد افسانہ کو سُن کر آنسو ضبط نہ کر سکے ایک صحابی نے ان صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضورؐ کو غمگین کر دیا، فرمایا اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے۔ پھر ان صاحب سے فرمایا "ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سناؤ" انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہو گئی، پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔"

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں، فرمایا اے قیس ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو، عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس اونٹ ہیں فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو[4]۔"

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں، مائیں خود

---

[1] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۴۳ و کتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۱۰۷ مطبعہ خیریہ مصر، زیر مثل افضل من موؤدۃ

[2] ابن جریر و ابن کثیر و درمنثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزاز (مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورہ تکویر)

[3] سنن دارمی صفحہ اول، یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں، لیکن اس لیے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیل ہی ہمارے سامنے آجائے

[4] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزاز و درمنثور سیوطی بحوالہ مسند بزار و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۂ الشمس کورت ۔

اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لیے حوالہ کرتی تھیں، ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے ع

ما لقی الموؤد من ظلم اُمہ   کما لقیت ذہل جمیعا و عامر

زندہ دفن ہونے والے بچے نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل و عامر نے اٹھائی۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی خدمت میں ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی، فرمایا "ایسا نہ کرو بلکہ کفارہ دے دو"[1]

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لیے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور ان کی پرورش کی، چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا، اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو عرض کی یا رسول اللہ! میں نے اسلام سے پہلے ۳۶۰ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا، فرمایا ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا، کہ خدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان کیا ہے[2] اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثت نبوی سے پہلے دین ابراہیم کے پیرو تھے وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنے آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے، جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ ان کے باپ کو کہتے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں، چاہے ان کو میرے پاس ہی رہنے دو"[3] یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بار آور نہ ہوئیں، لیکن بعثتِ محمدیؐ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کیلئے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے نبوت محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئیں" فرمایا جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہو اور پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچا لیگی وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی"[4] نیز فرمایا "جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے، یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اس کا مرتبہ دو انگلیوں کو اٹھا کر فرمایا کہ یوں برابر ہوگا"[5] غور کیجیے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی، عہدِ محمدیؐ میں آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لیے آپؐ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں ان سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (ممتحنہ) کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔" چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی، فتح مکہ کے دن عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لیے حاضر ہو رہے تھے تو آپؐ نے عورتوں سے خاص طور سے اسکا اقرار لیا اور انہوں نے اقرار کیا،

---

[1] موطا امام مالک باب النہی عن النذر فی معصیۃ اللہ [2] تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی بتفسیر اذا الشمس کورت [3] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰ [4] صحیح بخاری کتاب الادب وصحیح مسلم کتاب البر (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

عید کے اجتماع عام میں عورتوں کے مجمع میں آپؐ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اسکا بھی عہد لیا[1] کہ وہ قتل اولاد کے مرتکب نہ ہوں گی، دوسرے موقعوں پر بھی جو خاتون دربار رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا[2]، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں ان میں ایک چیز یہ بھی تھی، چنانچہ بیعت عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے[3]"

حضرت عبادہؓ بن صامت کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربار رسالت میں حاضر تھے، آپؐ نے فرمایا کہ ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائیگا اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے[4] عبادہ سے فرمایا کہ خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے[5]۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں، ان تمام سنگدلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے کے لیے وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں، قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہیں، غضب الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں، شہنشاہ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (کورت : ۹)	یاد کرو جب (قیامت میں) زندہ دفن ہونیوالی لڑکی سے پوچھا جائے گا تو کس جرم میں ماری گئی۔

کس درجہ بلیغ اور موثر طرز ادا ہے، اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہیں، حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہرہؓ کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے، حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیے کہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے حضرت زیدؓ بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہیے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے، حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میرے ہی گود میں آئی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوشکن منظر کو دیکھتے ہیں،

(بقیہ حاشیہ) [5] مشکوۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی شفقۃ علی الخلق [6] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء (حاشیہ ہذا) صحیح بخاری جلد اول ص ۱۳۲ باب موعظۃ الامام النساء یوم العید (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی جس کی پیدائش کی خبر سن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا، یہ حال ہے کہ ایک لڑکی کی پرورش کے لیے دفعۃً چار چار گود خالی ہو جاتے ہیں، اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے، وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ (فرقان: ۶)	(جنت ان کو بھی ملے گی جو) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا،

عند الناس مذ قام النبی الجواریا	پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں

رضاعت وحضانت اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشوونما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے، چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے، رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے، مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیرخوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اجرت ادا کرنا فرض قرار دیا گیا اور اس شیرخوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (بقرہ: ۳۰)	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لیے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اور شیرخوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس اہمیت کو قبول کیا، اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے۔ فرمایا:

(بقیہ حاشیہ ص) ۲ ترمذی ونسائی وابن ماجہ باب مصافحۃ النساء ومسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ وسلمی بنت قیس ۳ تفسیر ابن کثیر جلد ۹ صفحہ ۳۴۴ بر حاشیہ فتح البیان بحوالہ ابن ابی حاتم ومستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۶۲۳ علی شرط مسلم ۴ صحیح بخاری کتاب الایمان وباب وفود الانصار ومسلم کتاب الایمان ومسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ (مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸ ۵ صحیح بخاری کتاب الادب وکتاب فی الاستقراض وصحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل (صفحہ ہذا) ۱ صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (نساء: ۴)

اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھایا ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشو و نما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ پر ہے اور باپ نہ ہو تو دادا پر، اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثہ پر ہے۔

تعلیم و تربیت ظاہری اور جسمانی نشو و نما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیت کا درجہ ہے، قرآن پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے، اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم: ۱)

اے ایمان والو تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگِ خاندان کا فرض ہے، یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود اُن تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے اُن کی حفاظت ہے، جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں، اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

خدا نے اُن لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بارِ الٰہا! تو انکو ظاہر و باطن کا حُسن، صورت و سیرت کی خوبی، اور دین و دنیا کی بھلائی دیکر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا، فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (فرقان: ۶)

اور (جنت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمکو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادتمند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی و سعادتمندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیے، ایک سورہ میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں، اور اُنکی خدمت کی توفیق چاہتے ہیں، اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دعا کرتے ہیں۔

وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (احقاف: ۲)

اور (اے خداوند) میرے لیے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا، میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا، اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس باب میں وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیم ربانی پا کر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا:

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبوی میں آیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیار کر رہے تھے، اسکو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی، اس نے کہا کیا آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کسی کو پیار نہیں کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی طرف نظر اٹھائی، پھر فرمایا "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں"[2] ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا چاہیے، کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا خدا اُس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی، اس کے ساتھ اُسکی دو کمسن بچیاں بھی تھیں، اسوقت کاشانۂ نبویؐ میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا، ام المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔

ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سدِ رمق سے محروم رکھے، اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دیدیا، حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا، حضورؐ نے سُن کر فرمایا جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ ان کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لیے آڑ بن جائیں گی۔[3] نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اُس کا یہ رتبہ ہوگا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوں گے[4]، اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے، ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچہ کو اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے[5]۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب سے ترجیح نہ دے، ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو، اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے، اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اُسے جنت میں داخل فرمائے گا[6]۔ باہم لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعتِ محمدیؐ میں قائم نہیں، اسی لیے دنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے خلاف اسلام میں بڑے اور پہلوٹے کے امتیازی حقوق نہیں، کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے، یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلاوجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا، ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا، اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہو، انھوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی، دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے، عرض کی نہیں، فرمایا

(بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

---

[1] و [2] یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب: رحمۃ الوالدین میں، نیز دیکھو ابوداؤد۔

تو میں ایسے ظالمانہ عطیہ پر گواہ نہ بنوں گا۔[1]

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے، یا اُس کا کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کردی گئی، اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا، اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اُس کا خاتمہ ہوا۔

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن و شو کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جسطرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ، اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدارج کے لیے عائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے، عیسائی مذہب میں تجرُد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ تھا، اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے۔ اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسنِ معاملہ اور حسنِ سلوک کا ہے، جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناطہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفت و عصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرد کی پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد و عورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لیے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا، حکم ہوا:۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ	اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا بیوہ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو، اگر وہ غریب ہونگے تو اللہ انکو اپنی

(بقیہ حاشیہ) کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ۔ [3] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الاحسان الی البنات [4] ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی ادب الولد [5] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل [2] انجیل قرنتیون ۷-۸

(نور : ۴) مہربانی سے غنی کردیگا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیت پاک کا یہ فقرہ کہ اگر وہ غریب و تنگدست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے ان کو غنی بنا دے گا، یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے، مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک ہی کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے میں فارغ البالی ہو، تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے، ایک تو یہ کہ ایک کام کرنیوالے کے بجائے گھر میں دو کام کرنیوالے ہوں گے اور آگے اولاد کے ذریعہ اور کام کرنیوالے پیدا ہوں گے، اس فلسفہ کا راز اہل دولت نہیں، غریب ہی سمجھ سکتے ہیں، خصوصاً مزدور اور کاشتکار، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے اسلیے جو بیکاری سے غریب ہے، بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں پیدا کرے، خصوصاً اس لیے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردیگی جس کے لیے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہوسکتا، آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور بڑا علم والا ہے، غیب کا علم اسی کو ہے اس لیے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں، نیز اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے، فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ (نساء : ۴)

جو تم میں سے اسکی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کرسکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوا اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے، یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو، اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک قبول ہے۔ دوسرا شبہ یہ تھا کہ یہ نو مسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہونگی تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمام بیان اس لیے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑکر نکاح سے باز نہ رہیں اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔[1]

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں، تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لیے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے چنانچہ زن و شوہر کے باہمی اخلاص و محبت

---

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح۔

کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے فرمایا :۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً
وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ (روم ۔ ۳)

اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا بے شک اسمیں سوچنے والوں کے لیے کتنی نشانیاں ہیں ۔

قرآنِ پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے، وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے، اس کا خلوت خانۂ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے طلاطم میں امن اور سکون اور چین کا گوشہ ہے، اس لیے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لیے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثار قدرت میں شمار کیا ہے، پورے ہوں، یعنی باہمی اخلاص اور پیار مہر و محبت اور سکون اور چین، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے ۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت برائی کی ہے جو زن و شوہر کے باہمی میل جول اور مہر و محبت میں فرق ڈالیں، فرمایا :۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ
الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ
خَلَاقٍ (بقرہ : ۱۲)

تو وہ (یہود) ان سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر بیوی کی دلجوئی کرے، زن و شوہر باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لیے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے ۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ
بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ
اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ
لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ (نساء ۔ ۶)

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں اس لیے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لیے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں تو نیک بیبیاں فرمانبردار رہتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے ۔

آیت کے آخر حصہ کا مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بیبیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت و آبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے ان کو محفوظ کر دیا ہے اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلاف فطرت ہے ۔

مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی

کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے، اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوشی، ایک دوسرے کی زینت، اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، قرآن پاک کی بلاغت دیکھیے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے :-

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ : ۲۳)

عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیسیوں معنی پوشیدہ ہیں تم ان کے ستر پوش ہو، وہ تمہارے لیے تم ان کی زینت ہو، تمہاری وہ، تم ان کی خوبصورتی ہو، وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو، وہ تمہاری، یہی نکاح کے اغراض ہیں، اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق، اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے، فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۔ (نساء : ۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو، جسنے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا اس خدا کا جسکا واسطہ دیکر تم ایکدوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو، اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو، اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے، اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق حقیقی کا، اور ان رحموں (رشتوں) کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں، غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا، اسلیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نکتہ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفت پیدا ہو، قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے: مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (مائدہ : ۱) "پاکدامنی کے لیے، نہ شہوت رانی کے لیے" اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو وہ نکاح کرے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے (ابن ماجہ، نکاح)

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو باہم صلح کے لیے آمادہ رہنا چاہیے اور اصلاح حال کے لیے دونوں کو برابر کوشش کرنی چاہیے، اسی لیے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاح حال کی بار

بار تاکید کی گئی ہے فرمایا اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا (بقرہ: ۲۸) اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں۔ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا (نساء: ۱۹) اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو۔ کہیں اسی اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے:-

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ (بقرہ: ۲۹)	یہ کہ میاں بیوی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے۔

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ اپنی بیویوں کیساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں مجبور ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی زبان مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:-

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ: ۲۸)	اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ، کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شوہر کے معاملہ سے ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کیساتھ حسن سلوک (بِر) پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ) اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:-

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (نساء: ۶)	تو نیک بیویاں شوہروں کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کے مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرمانبردار رہیں ان کے مال و دولت اور ملکیت کی حفاظت ان کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں اور ان کی عزت اور آبرو کی جو خود ان کی عزت و آبرو ہے، شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں، مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض، اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفت ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اسکو جو کہے وہ مانے شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے: (ابن ماجہ، نکاح)

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:- "لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں، تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے، لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو تو اگر وہ تمہاری بات مانیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو، بیشک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے، تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں، جن کا آنا تم کو پسند

نہیں، اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو" (ابن ماجہ کتاب النکاح)

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے فرمایا، جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لیے اس کو علیحدہ کرے (ابن ماجہ ایضاً)

دوسری طرف آپؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں یہاں تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، آپؐ نے یہ طریقہ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لیے اختیار فرمایا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں،

ایک مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:۔

خیرکم خیرکم لاھلہ (ترمذی و دارمی و ابن ماجہ) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لیے سب سے بہتر ہے۔

خیارکم خیارکم لنساءھم (ترمذی) تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لیے بہترین ہیں۔

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک پہچان بتادی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے، جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے، کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے، لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ حال سنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:۔

ولزوجك عليك حقًّا (بخاری کتاب النکاح) اور تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، وہ ہر وقت معمولی معمولی باتوں قصوروں پر ماری پیٹی جا سکتی تھیں، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا، پھر وہ کہتے ہیں کہ "ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار و قطار میں نہیں سمجھتے تھے اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کیے[1]"،

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا، البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی، ارشاد ہوا کہ:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ: ۲۲۸) اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر، اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔

---

[1] صحیح بخاری باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا و تفسیر سورۃ التحریم۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے، یہ اس لیے ہے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں، یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں، یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں ہے، گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں قرآن پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں، فرمایا:-

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (نساء: ۶)	مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس سبب سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی، اور اس لیے کہ انہوں نے اپنا مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں، اس لیے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیے، دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دین مہر، نان و نفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے اس لیے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے، تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوشگواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے، جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو، بعض مرد یہ چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لیکر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں، آپؐ نے ان کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دیکر نصیحت فرمائی کہ "عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے اس کے اسی ٹیڑھا پن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو، اگر اس کو سیدھی کرنے کی فکر کرو تو تم اس کو توڑ ڈالو گے[1]۔" آپؐ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع و راضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ بتایا فرمایا، "اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو، کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دوسری اچھی بات نکل آئے گی[2]"، یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (نساء: ۳)	اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقے سے گزران کرو، اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم نکاح [2] صحیح بخاری مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء۔

25 اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر، اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات اور یکجہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے، اپنے لیے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں، بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ، اور ضروریات کا کفیل ہو، اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومت وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصول کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعوی کا اختیار حاصل ہے[1] انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لیے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اسکی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدرِ ضرورت لے لیا کرے، فتح مکہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ مجھے میری اور میرے بچے کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو[2]۔

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے، جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے، فرمایا تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے اس کی نسبت ہر ایک سے بازپرس ہوگی، مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی: (بخاری اول صفحہ ۷۰۹، باب قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ) نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے، وہ آیت یہ ہے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ	اور جن بیویوں کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور
فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ	خوابگاہوں میں ان سے علیحدگی برتو، اور ان کو مارو، تو اگر
فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (نساء: ۶)	وہ تمہارا کہنا مان لیں، تو پھر ان پر راہ مت تلاش کرو۔

لغت میں "نشوز" کے معنی "اٹھ جانے" کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں، وہ مفسر ابن جریر کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:-

---

[1] اس اختیار کی تشریح میں فقہاء مختلف ہیں تفصیلات کے لیے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہیے نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ ص ۲۶۳ مصر۔

[2] صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل صفحہ ۸۰۸۔

ومعنی ذلك اذا رأیتم منهن ما تخافون ان ینشزن علیکم من نظر الی ما لا ینبغی لهن ان ینظرن الیه ویدخلن ویخرجن، واسترتبتم[1] بامرهن (تفسیر طبری ۵-۳۸ مصر)

اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو انکے "نشوز" کا ڈر ہو، یعنی ادھر دیکھنا جدھر نہیں دیکھنا نہیں چاہیے، اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے

عن محمد بن کعب القرظی اذا رای الرجل تقصیرها فی حقه فی مدخلها ومخرجها قال یقول لها بلسانه قد رأیتك منك کذا وکذا فانتهی (ایضاً)

محمد بن کعب قرظی سے ہے کہ جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی یہ دیکھی تو اب باز آجا۔

فقہ کی کتابوں میں ہے :-

الناشزة هی الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه (عالمگیری النفقات)

نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں، کچھ مفسرین نے اس کو اور وسعت دی ہے، اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پہ بلندی چاہے اس کا حکم نہ مانے اس سے بے رُخی کرے اور اس سے بغض رکھے (تفسیر ابن کثیر)

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں، اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں، آیت مذکور پوری یہ ہے :-

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (نساء : ۶)

مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک) اسلیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے) اسلیے کہ مرد اپنا مال (ان پر) خرچ کرتے ہیں، تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں، اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھربار اور عزت و آبرو کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے اور جنکے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو انکو سمجھاؤ، اور انکو خوابگاہوں میں علیٰحدہ کردو اور انکو مارو تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو پھر ان پر راستہ تلاش نہ کرو۔

اس آیت پاک میں مرد کی ترجیح کی جو باتیں بیان کی ہیں، ان کے نتیجہ پر یہ فرمایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھربار اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں، اس کے بعد[2] کہ جس عورت سے تمہیں نشوز کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو، یا اس سے بات

---

[1] اصل متن تفسیر میں واستبرتم غلط چھپا ہے [2] اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے ارشادات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

کرنا چھوڑ دو، اس پر بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو، اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لیے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے، پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار، مال و دولت اور عزت آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے نشوز کا ڈر ہو تو یہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار، اور عزت و آبرو کی حفاظت جو عورت ان دونوں کو یا دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

"شوہر کی عزت و آبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے آپؐ نے فرمایا سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، اور جب کوئی حکم دے تو مان لے، اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔" اپنی جان کی حفاظت سے مقصود عفت و عصمت ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فقرے ہیں ان میں نشوز کے معنی کی پوری تصریح ہے۔ صحیح مسلم میں ہے :-

وَاتقوا اللّٰہ فی النساء فانّھن عندکم عوان ولکم علیھن ان لا یوطین فرشکم احدًا تکرھونہ فان فعلن فاضربوھن ضربًا غیر مبرح (مسلم)

عورتوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو کہ وہ تمہارے بس میں ہیں، تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی سے نہ روندوائیں، جس کو تم ناپسند کرتے ہو، اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔

ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں :-

استوصوا بالنساء خیرًا فانھن عندکم عوانٍ لیس تملکون منھنّ شیئًا غیر ذٰلک الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فان فعلن فاھجروھن فی المضاجع واضربوھن ضربًا غیر مبرح فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلًا (کتاب النکاح)

عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے بارہ میں، میری وصیت کو قبول کرو، وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم کو اس کے سوا ان پر کوئی اختیار نہیں، مگر یہ کہ کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں اور اگر ایسا کریں تو ان کو خوابگاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو تکلیف دہ نہ ہو، تو اگر وہ تمہارا کہا مان لیں تو ان پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔"

شوہر کے بستر کو روندوانے کا کنایہ اس طرف ہے، کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو اور "کھلی بے حیائی" سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں، لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے، یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ چال چلن سب کو فاحشہ

کی تفسیر میں داخل کیا ہے (تفسیر سورۂ نساء رکوع ۶: ۲)

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع کی تصریح ہے، کہ یہ ضرب غیر مبرح "یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے (تفسیر طبری جلد ۵ ص۴۱ مصر) جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آتی۔ ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ زمانۂ جاہلیت کا دستور تھا، جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے، ایاس بن عبداللہ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو مارا نہ کرو۔ تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ یارسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں تو آپ نے مارنے کی رخصت عطا کی، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیت نبویؐ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکایتیں لے لیکر آئیں، یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا[1] "آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے شوہروں کی شکایتیں لیکر آئی تھیں، یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں ہیں۔" (ابو داؤد و ابن ماجہ و دارمی)

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپؐ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا" یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔

ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یارسول اللہ! میری بیوی بدزبان ہے، فرمایا طلاق دیدو، عرض کی اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے فرمایا تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو[2]" ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے سے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو[3]۔

(بقیہ حاشیہ) [1] یہ پیشِ نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لیے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجراء قاضی کا فرض ہے۔

(حاشیہ ہذا) [1] صحیح مسلم المطلقة ثلثا ۱۲ [2] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرة النساء بحوالہ ابوداؤد [3] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرة النساء بحوالہ صحیح بخاری و مسلم۔

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شوہر کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام صلۂ رحم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم میں صلۂ رحم اور حقوق قرابت کی اہمیت دنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے یہی سبب ہے کہ وحی محمدیؐ میں اسکی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآن پاک میں کم از کم بارہ آیتوں میں اسکی صریح تاکید ہے۔ اور اسکو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے چنانچہ فرمایا۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (روم : ۴)	تو قرابت دار کو حق ادا کرو۔
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (اسرائیل : ۳)	اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کرو۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی ہے کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لیے خود تکلیف اٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصلی نیکی ہے۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی	اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے اور مال کو اس کی
(بقرہ : ۲۲)	محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں، فرمایا۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ	فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو۔ تو وہ ماں باپ اور رشتہ
وَالْاَقْرَبِیْنَ (بقرہ : ۲۶)	داروں کے لیے۔

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک خدائے تعالیٰ کے ان خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا۔

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی۔	(اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور
(بقرہ : ۱۰)	ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیکی کرنا۔

سورۂ نحل میں اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ	بے شک اللہ انصاف اور حسنِ سلوک اور قرابت دار کو
اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی (نحل : ۱۳)	دینے کا حکم کرتا ہے۔

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں، فرمایا:-

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَ	کہدے اے پیغمبرؐ کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے
الْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ (بقرہ : ۲۶)	ماں باپ قرابت والوں یتیموں اور غریبوں کے لیے۔

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے

روک لیں، ارشاد ہوا:-

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ
يُّؤْتُوْٓا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ (نور: ۳)

اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں وہ قرابت مندوں اور محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں،

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے، فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ
إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى (نساء: ۶)

اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعی اسلام علیہ السلام اپنی اُن تمام محنتوں، زحمتوں تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں ان کو پیش آئیں۔ اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی امت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ دار دل اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ، فرمایا:-

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ
فِي الْقُرْبٰى (شوریٰ: ۳)

کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصل رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں، اسی لفظ کی دوسری معروف شکل قطع رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحم مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہم سایگی، کہیں ہم مذاقی کہیں ہم پیشگی کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائضِ محبت کی ادائیگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانیوالے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن، رحمِ مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے۔ اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے، اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ان لوگوں کو جو محبت کی اس فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں۔ وحی محمدیؐ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور ان کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ
يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ
وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (بقرہ: ۳)

اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں۔ اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا، اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے۔ اس لیے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا۔ اس کو میں نے ملایا۔ جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا[1]" اسی مفہوم

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البر والصلہ۔

کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا ہے، جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے، اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے[۱]"۔ ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا، خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا۔ جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا۔ کیا تم اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں[۲]"۔ یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (دو کرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک، محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے۔ اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآنِ پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے سورۂ نساء میں فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ (نساء: ۱)

اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا، اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھیے۔

> ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا خدا کی بندگی کرو۔ کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ۔ نماز پوری ادا کرو۔ زکوٰۃ دو۔ اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا کرو[۳]۔

جبیرؓ بن مطعم صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو صلۂ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رکا رہے گا۔ جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)[۴]۔

ابو ہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلۂ رحمی کرے[۵]"۔ اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے۔ کیونکہ صلۂ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ضرورتمند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے دوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ ان کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صورت میں ملتا ہے۔ اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کیجا سکتی ہے۔ انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال، تکدر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی

---

[۱] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ [۲] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلۃ [۳] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۃ الرحم [۴] ایضاً باب اثم القاطع [۵] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط لہ فی الرزق لصلۃ الرحم

کا برتاؤ صلۂ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں۔ ان کی زندگی میں خانگی مسرت، انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے "صلۂ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔"

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلہ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلے کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے۔ بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وہ دو آدمی ہیں جو ایک دوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔ انسانیت اور اس کے تمدن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھوکا ہے تو دوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اس کو بھی کھلائے۔ اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اسکی تیمارداری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے۔ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دوسرے سے ملا ہو اور ایک کا وجود دوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو۔ اسی لیے ہر مذہب نے ان دونوں انسانوں پر جو ایک دوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو اسی سے تکلیف اور دکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دوسرے سے ملائے رکھنا، ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تاکہ برائیوں کا سدِ باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو۔ اور ایک دوسرے کی محبت اور مدد پر بھروسہ کر کے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں۔ عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے۔ بلکہ وہ عزت و افتخار کا موجب تھے۔ اگر کسی پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا۔ اور اسلیے اسکی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنے شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔ اسلام نے آکر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کیساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔ وحی محمدی نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے۔ جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے۔

لہ صحیح بخاری کتاب الادب باب لیس الواصل بالمکافی ۔

مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے۔ ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدم اس کو حاصل ہے، جسکو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت، یا ہم مذہبی کا، یا کوئی اور دوسرا تعلق بھی ہو۔ قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے۔ ارشاد ہے:

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (نساء ۶)

اور (خدانے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کے ساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)

اس قریب اور بیگانہ کے معنوں میں اہل تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔[1] ایک کہتا ہے کہ قریب کے معنی رشتہ دار و عزیز اور بیگانہ کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں دوسرے کی رائے ہے کہ نزدیک کے معنی ہم مذہب کے ہیں اور "دور" سے مطلب دوسرے مذہب والے ہیں۔ جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے تعلیم محمدی کا منشاء یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسائیوں میں ان کو ترجیح دیجائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو۔ وہ خواہ قرابت اور عزیزداری ہو یا ہم مذہبی ہو۔ یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو۔ بہرحال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمائی، سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسکو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص حالت میں آپ نے فرمایا خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔ جان نثاروں نے پوچھا "کون یا رسول اللہ!" فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں[2]۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "جو خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[3]" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص خدا اور روز جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے[4]"۔

ایک اور موقع پر اس کو تقرب الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا۔ ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھیوں میں بہتر ہے۔ اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے۔ جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے[5]"۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے ان سے فرمایا کہ جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہیں انکو وراثت کا حق نہ دلادیں[6]۔ حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے۔ کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی، اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اسی بناء پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں۔ تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں: فرمایا جس کے گھر کا دروازہ

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور [2] صحیح بخاری کتاب الادب الاثم من لا یامن جارہ بوائقہ [3] صحیح بخاری کتاب الادب [4] صحیح بخاری کتاب الادب [5] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حق الجار [6] صحیح بخاری کتاب الادب۔

تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو[1]۔ اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے، تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ "اے ابوذر! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو، اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبر گیری کرتے رہو[2]۔" ان تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے۔ اس لیے آپؐ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھری کیوں نہ ہو[3]۔" یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے۔ یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے، اور نہ دوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اس کی حقارت کرے۔

ایک مسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ تقاضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے[4]۔"

برائی برائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو۔ لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی۔ تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور برائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ پڑوسن کے مکان میں چوری کرنا کتنا بُرا ہے۔ بدکاری ہر جگہ اس سے ممکن ہے مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کر کے باہر جاتے ہیں، اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے اسلیے توراۃ میں یہ حکم تھا۔

> "تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اسکے غلام، اور اسکی لونڈی، اور اسکے بیل اور اسکے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے۔ لالچ نہ کر۔" (خروج ۲۰-۱۷) "تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔" (احبار ۱۹-۱۳)

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل ان الفاظ میں فرمائی جن میں توراۃ کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے۔ بلکہ اسکو دس گنا زیادہ برا کر کے دکھایا، ایک سوال کے جواب میں فرمایا: "زنا حرام ہے، خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے۔ لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے۔ خدا اور رسول نے اس کو حرام کیا ہے۔ لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرا لے[5]۔"

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں۔ زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔ لوگوں نے ان کا حال آپؐ سے عرض کیا۔ تو فرمایا ان میں کوئی نیکی نہیں ان کو دوزخ کی سزا ملے گی۔ پھر صحابہؓ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں، اور معمولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں۔ فرمایا یہ بیوی جنتی ہوگی[6]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب [2] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی حق الجوار [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتہا [4] مشکوٰۃ از بیہقی و ادب المفرد امام بخاری باب لا یشبع دون جارہ [5] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار۔

حضرت مسیح نے فرمایا تھا "تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو" (مرقس ۱۲-۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی، بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا، ارشاد ہے۔

"تم میں کوئی مومن نہ ہوگا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے، جو خود اپنی جان کیلئے پیار رکھتا ہے۔"[1]

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں، بلکہ خدا اور رسول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا، فرمایا:-

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسول اس کو پیار کرے، یا جس کو خدا اور اس کے رسول کی محبت کا دعویٰ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے"[2] اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے، جو پڑوسی ہوں گے[3] انسان کی خوش خلقی اور بدخلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا۔ فرمایا جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو۔ اور جب برا کہتے سنو تو سمجھو کہ برا کر رہے ہو۔[4]

کوئی پڑوسی اگر برائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو۔ مگر اس کی برائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔ یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ یا رسول اللہ! میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے۔ فرمایا جاؤ صبر کرو۔ اس کے بعد پھر شکایت لیکر آئے پھر یہی نصیحت کی۔ وہ پھر آئے اور یہی عرض کی۔ فرمایا جا کر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بناؤ) ان صحابی نے یہی کیا۔ آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے۔ انہوں نے حقیقت حال بتائی۔ سب نے ان کے پڑوسی کو برا بھلا کہا۔ یہ دیکھ کر وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ وہ ان کو منا کر پھر گھر میں لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے گا۔[5] ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں، پوچھا کیا ہے؟ عرض کی امیر المومنین، گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے، فرمایا، اے جابرؓ! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو، کیا یہ آیت یاد نہ رہی۔[6]

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ
أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَ
اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا (احقاف ۲۰)

جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا، تم اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں لے چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔

(بقیہ حاشیہ) ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] صحیح مسلم کتاب الایمان [2] مشکوٰۃ از بیہقی [3] احمد بن حنبل، مسند عقبہ بن عامر [4] سنن ابن ماجہ [5] ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار و ابو داؤد کتاب الادب باب حق الجوار [6] مؤطا امام مالک باب ماجاء فی اکل اللحم۔

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذت قرار پاتی ہے جس کے مواخذہ کا ان کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اٹھ گئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا۔ انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریلؑ ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنا دیں گے[1]۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچہ جو باپ کے سایہ محبت سے محروم ہے، جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے اس کی ہر طرح خدمت کرے اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے، یہ وہ احکام ہیں جو مکہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔ عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی، مگر جیسا کچھ چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے۔ کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے[2] اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا قرآن پاک میں ان کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ (ماعون)	کیا تو نے اس کو دیکھا جو انصاف کو جھٹلاتا ہے، سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ، وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر: ۱)	نہیں یہ بات نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے تورات میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے۔ کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں۔ (استثنا ۱۴-۲۹، ۲۶-۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی ہے۔ اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کا وقت اس وقت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب باب حق الجوار [2] تفسیر ابن جریر طبری، سورۂ نساء ج ۴ ص ۱۶۰۔

آیا جب مکہ کا یتیم دین کامل کی شریعت لیکر دنیا میں آیا، وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کر کے یاد دلا دیا،

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ ..... فَاَمَّا
الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ (الضحیٰ)

کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا، تو اُس نے پناہ دی۔۔
..... تو یتیم کو نہ دبا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے، یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بے کس گروہ پر رحم و کرم کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ مکی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں، دولتمندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصلی کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو، ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے۔

اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا ذَا
مَقْرَبَةٍ (بلد: ۱)

یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھلانا،

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا، کہ یہ وہ ہیں جو

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا
وَّیَتِیْمًا (دھر: ۱)

اور اُس کی محبت کے ساتھ کھانا کسی غریب اور
یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی۔ سورہ نساء میں اس بےکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے۔ انکو وراثت کا حق دلایا گیا۔ اور متولی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے ان سے کہا گیا۔

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا
الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ
اِلٰۤی اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا (نساء: ۱)

اور یتیموں کو ان کے وارثوں کا چھوڑا ہوا مال دیدو اور
انکے اچھے مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ کرو اور نہ اپنے مال کیساتھ
ملا کر ان کا مال کھا جاؤ۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہے۔

دولتمند یتیم لڑکیوں کو ان کی جائداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے، اور بے والی و وارث بنا کر ان کو ستاتے تھے۔ اس پر حکم آیا۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا
مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (نساء: ۱)

اگر تمکو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو
(انکو چھوڑ کر اور) عورتوں سے جو تمہیں پسند ہو نکاح کر لو۔

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے۔ اور نہ جب تک انکو پورا شعور آ نہ جائے وہ ان کے سپرد کیا جائے۔ بلکہ ان کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد انکی عقل کو دیکھ بھال کر ان کی یہ امانت ان کو واپس کی جائے، فرمایا

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ
لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ

اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمہارے قیام
کا ذریعہ بنایا ہے، نہ پکڑا دو۔ اور ان کو کھلاتے اور پہناتے

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (نساء ۱)

رہو۔ اور ان سے معقول بات کہو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو۔ جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالہ کردو۔

اِن آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو نا سمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے۔ وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے۔ کہ تم اپنا مال انکو نہ دو۔ اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کردینے کا حکم ہے۔ وہاں اس مال کی نسبت یتیموں کیطرف کی گئی کہ تم ان کا مال انکو واپس کردو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اسکی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے۔ جیسی اپنے مال کی، اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اسطرح ایک ایک تنکا تک جنکو واپس کیا جائے، جیسا کسی غیر کا مال دیانت کیساتھ واپس کیا جاتا ہے۔ جس پر تمہارا کوئی حق نہیں، متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد خرچ کرکے برابر کردیتے ہیں کہ یہ بڑے ہوکر تقاضا نہ کر بیٹھیں اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی۔

وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (نساء ۱)

اور اڑا کر اور جلدی کرکے ان کا مال نہ کھا جاؤ کہ یہ بڑے نہ ہوجائیں۔

صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں، تو ان کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا، اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دیگئی۔

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (نساء ۱)

اور جو (متولی) بے نیاز ہے۔ اس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:-

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ (نساء ۱۹)

اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر قائم رہو۔

سورہ انعام نے یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی، اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی ان میں ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (انعام ۱۹)

اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورۂ اسراء کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس کسی اور غرض سے نہ بھٹکنا چاہیے، اور دیانتداری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے (سورۂ اسراء ۴)

یہ تو صاحب جائداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے۔ جو یتیم غریب و مفلس ہوں، انکی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نساء، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش اور انکے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی۔ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ خیرات و صدقات کے بہترین مصرف قرار دیے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث امت کے سرپرست صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے ان نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل ہوں، خود اپنے برابر جگہ دی، فرمایا "میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے۱؎۔" یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر بلا کر لائے اور اس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا، بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۲؎" نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جا رہی ہے۔ اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۳؎۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی، وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے۔ وہ موم سے زیادہ نرم ہو گئے۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کیلئے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے۔ اور ہر ایک اسکی پرورش اور کفالت کیلئے اپنے آغوشِ محبت کو پیش کرنے لگا۴؎۔ بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول فاطمہ بتول اپنے دعویٰ کو اٹھا لیتی تھیں۵؎۔ حضرت عائشہ صدیقہ اپنے خاندان۶؎ اور انصار۷؎ کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لیجا کر دل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۸؎۔

صحابہؓ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانتداری برتنے لگے بلکہ انکی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیرچشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا۔ مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا۔ اور آپؐ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔ وہ یتیم اس پر رو پڑا، آپؐ کو رحم آیا اور اس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اسکو دیدو۔ خدا تم کو اس کے بدلہ جنت دے گا۔ وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا۔ ابوالدحداحؓ صحابی حاضر تھے۔ انہوں نے اس شخص سے کہا کیا تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو۔ اس نے آمادگی ظاہر کی انہوں نے فوراً بدلا لیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۹؎۔

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ مگر اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے۔ جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی عرب پہلی زمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی۔ اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں

۱؎ صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیما و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم ۲؎ ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۳۳۲ و ۳۳۳ بحوالہ ترمذی (یہ حدیث حسن صحیح) ۳؎ ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۳۳۲ و ۳۳۳ بحوالہ ابن ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیما ۴؎ صحیح بخاری باب غیرۃ النساء ۵؎ ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس ۶؎ موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ زکوٰۃ اموال الیتیمی و زکوٰۃ الحلی و کتاب الطلاق ۷؎ مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۹۰ ۸؎ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی و مسند جلد ۶ صفحہ ۳۲ و ادب المفرد امام بخاری باب فضل یعول یتیما ۹؎ استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ ابوالدحداحؓ۔

نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں۔ ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت کے گھر بنائے۔ ان کے وظیفے مقرر کیے۔ مکتب قائم کیے۔ جائدادیں وقف کیں[1] اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں۔ ان کی جائدادوں کی نگرانی، ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں[2]۔ اور یہ وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے۔ اور لندن کے لارڈ میر یا آفس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

بیوہ کے ساتھ حسن سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے، جنکو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے۔ اب وہ بے یار و مددگار، اور بے مونس و غمخوار ہیں۔ نہ ان کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ ان کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے۔ عورت جس کو خدا نے دنیا کے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا۔ اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالے کر دی تھی۔ اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے۔ اب غم والم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر، نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے، بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعیں کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی مِلک ہو جاتی تھی وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا۔ عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا یکجائی پہلو پیش نہ کر سکا۔ ہندوؤں میں اب اسکی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہیے۔ اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے۔ عرب میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کر سکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دین مہر معاف کراتے تھے۔ اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریاد رسی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور اس اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں۔ اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا یعنی شمار کے دن، اس مدت کے گذر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے

---

[1] تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں۔ [2] حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے۔ ان میں بھی خصوصیت کیساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

اس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دیدی۔ اس کا دینِ مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اول ضروری ٹھہرایا۔ پس اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصہ دلوایا۔ عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی، اور اس کے سسر، دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔ اس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو وروں نے نکال دیا ہے۔ اس میں دوبارہ اس کو عزت کیساتھ داخل کا موقع دیا جائے۔ اور کسی شریف شریکِ زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر و عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہوگئی ہے۔ وہ اس کو پھر عطا کیا جائے۔ قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو صریحاً یہ حکم دیا۔

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ (نور: ۴)

اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔

اس سے پہلے کہ یہ حکم اُترے، بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بے کس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اسوقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے آپؐ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ عمر بیوہ سے شادی کی اور پچیس برس تک اسطرح اس کیساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثناء میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کیے جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینبؓ، ام المساکینؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ، اور صفیہؓ بیوہ تھیں جنکی کفالت کا بار آپؐ نے اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیروؤں کیلیے اسکو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔ یہ تو آپؐ کا عمل تھا، قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپؐ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس فرقہ کیساتھ حسن سلوک کرنیوالا بآسانی کر سکتا ہے، فرمایا:

السَّاعی علی الأرملۃ والمسکین کالسَّاعی فی سبیل اللہ واحسبہ قال کالقائم لا یفتر وکالصائم لا یفطر[1]۔

بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنیوالا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ میں دوڑنے والا اور راوی کہتا ہے کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ) اور جیسا وہ نمازی جو نماز سے نہیں تھکتا اور وہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:-

السَّاعی علی الأرملۃ والمسکین کالمجاہد فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النہار ویقوم اللیل (کتاب الادب)

بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ کرنیوالا، خدا کی راہ کے مجاہد کی طرح ہے۔ اور اس کے برابر ہے۔ جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

ان بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وہ تکلیف اٹھاتی ہوں لیکن ان ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اسوقت تک دوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں

---

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و موطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق ؛

جب تک وہ بڑے ہو کر ان سے علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دنیا سے رخصت نہ ہو جائیں۔ یہ فرمایا "میں، اور محنت و مشقت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانیوالی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے وہ حسن و جمال اور جاہ و عزت والی بیوی جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے۔ لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے علیحدہ ہو جائیں۔ یا مر جائیں[1]۔ اسی مقصد کو ابو یعلیٰ کی مسند میں ہے، کہ آپؐ نے اسطرح ایک واقعہ کی صورت میں بھی بیان فرمایا کہ "قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا۔ تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا تو کون ہے۔ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے[2]۔"

حاجتمندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحبِ دولت اور بے نیاز ہو۔ کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اس کو دوسروں کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسانی جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پہ مغرور ہو کر کبھی کسی حاجتمند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ قرآنِ پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے۔

فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات: ۱)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔
فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (معارج: ۱)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کیلئے مقررہ حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں۔ لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگنے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورتمند مراد ہو سکتا ہے۔ جو تم سے کسی مالی مدد کا خواستگار ہو۔ محروم کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ بعض اسکو محروم کہتے ہیں۔ جس کا مالِ غنیمت میں کوئی حصہ نہیں۔ کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو۔ کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو۔ اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو۔ اس معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآن پاک[3] سے ہوتی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے۔ یا عام صدقہ، مفسرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں "حق" کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے۔ اور معارج میں

---

[1] سنن ابو داؤد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

[2] حاشیہ سنن ابی داؤد بتحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبد اللہ ابن نور الدین پنجابی مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

[3] دیکھو لسان العرب لفظ محروم المحارف اور تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ اور سورہ قلم میں اصحاب الجنۃ کے فقرہ نحن محرومون اور سورہ واقعہ میں بل نحن محرومون کے معنی۔

جس میں مطلق "حق" کا نہیں، بلکہ "مقررہ حق" کا بیان ہے "زکوٰۃ" مراد ہو، کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں ہے، بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجتمندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو۔ دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔ قرآن پاک میں دوسرے موقع پر ہے۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (ضحٰی: ۱)	اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر،

یہاں سوال کرنیوالے کے معنی "اغنیٰ" کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں، مگر لفظ کا عموم، وسعت کو چاہتا ہے۔ یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی ہو۔ یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے۔ اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو۔ بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو۔ اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کر دو۔ مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کر دو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ج وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا (نساء: ۱۱)	جو نیک بات کی سفارش کریگا۔ تو اس کے ثواب میں اسکا بھی حصہ ہے۔ اور جو بُری بات کی سفارش کریگا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم ونسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے، یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقتور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے، تاہم الفاظِ قرآنی کی وسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے۔ اور اس میں یہ اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جدوجہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہوگا۔ ایسا ہی بُرے کام کی جدوجہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک بنانا ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے؛

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (مائدہ: ۱)	اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو۔ اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو، اور ڈرو اللہ سے بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ کہ حاجتمندوں کی حاجت برآری ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جسقدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اس کو دینا۔ ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کو ہر مسلمان کو ادا کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:-

مَنْ كَانَ فِي حاجة اخيه كَانَ اللّٰهُ فِي حاجته ومَنْ فرّج عن مُسلم كربة فرّج اللّٰه عنه كربة من كربات يوم القيامة (صحیحین)	جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہیگا۔ تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہیگا اور جو مسلمان کسی مسلمان کی مصیبت کو دور کریگا۔ تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے اس کی کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا۔

---

[1] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے۔ واما من سائلک من ذی حاجۃ فلا تنہر۔ زمخشری، نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے؛

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا :-

واللہ فی عون عبدہ، ما کان العبد فی عون اخیہ۔ (ترمذی باب ماجاء فی الستر علی المسلمین)

اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اسوقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سائل یا حاجتمند آتا تو آپؐ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملیگا[1]۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بیکس حاجتمند کی مدد ہی کیا کرو[2]۔ یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے[3]۔ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلنے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹادے تو خداوند تعالیٰ اسکے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اس کا گناہ معاف کرتا ہے[4]۔

بیمار کے حقوق

دنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے۔ بیماروں اور مریضوں کا ہے۔ یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبرگیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے۔ ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمارداری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں عبادت[5] ہے۔ ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے۔ ان کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے ایک کلی اصول بنا دیا ہے :-

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین و باب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ [2] ایضاً باب کل معروف صدقۃ۔

[3] ترمذی کتاب البر والصلۃ [4] ترمذی کتاب البر والصلۃ [5] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیمار کی حالت میں دیکھنے کو جانا لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں۔ اور اس کی تیمارداری غمخواری اور خدمت گزاری کے بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے اس سے زیادہ یہ ہے کہ اسکی پوری تیمارداری اور خدمت گذاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے ؎

ذهب الرقاد فما يحس رقاد   همّا شجاك ونامت العواد

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے۔ قاعدہ یہ ہے کہ کسی تیماردار اور خدمت گذار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے۔ یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنیوالوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت (باقی بر صفحہ آئندہ)

وَلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (نور: ۸)	اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔
لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ (فتح: ۲)	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى (توبہ: ۱۲) نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے، وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں۔ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى (مزمل: ۲) (خدا کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا (تو تم میں جو بیمار ہو) (بقرہ: ۲۴) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے ان سے اپنے فرائض معاف کر دیے تو بندوں کو کس حد تک ان سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔

اسلام نے مسلمانوں کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذاب شدید سے بچانے کیلئے وہ اسکے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں۔ اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ اس کے آداب تعلیم کیے ہیں۔ اس کی دعائیں سکھائی ہیں۔ اور اس کا ثواب بتایا ہے۔ فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا، خدا اس کے غم کو ہلکا کریگا[2] اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو وہ اسکی عیادت کرے[3]۔ صحابہؓ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا جن میں ایک بیمار کی عیادت ہے[4]۔ ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو فرشتے شام تک اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اسکی مغفرت کے لیے بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں[5]۔ یہ بھی آیا ہے کہ "جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے[6]۔" فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اسکو

میں خدمت گذاری اور تیمارداری سے لیکر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں۔ اور اگر یہاں بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانیکا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمارداری کا ثواب کتنا ہوگا (حاشیہ صفحہ ہذا)

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ و سنن ابی داؤد، اوائل کتاب الجنائز

[2] ابوداود کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم

[3] صحیح بخاری کتاب الجنائز

[4] ایضاً

[5] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز

[6] صحیح مسلم باب عیادۃ المریض، بطرق مختلفہ۔

تسلی اور دلاسا دیوے۔ اور اس کو شفا پانے کے لیے خدا سے دعا کرے[1]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تعلیم سے صحابہ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اسقدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے۔ بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہ تھی۔ آپؐ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے[2]۔ منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں[3]۔ اور اسی سے علماء نے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی[4] ہے۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپؐ نے ان کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تاکہ بار بار ان کی عیادت کیجا سکے[5]۔ رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ ان کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں[6]۔ غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض ایسی بی بیاں فوج کیساتھ رہتی تھیں۔ جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں[7]۔ آپؐ نے اپنے پیروؤں کو عمومیت کیساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ۔ قیدی کو چھڑاؤ اور بیمار کی عیادت کرو[8]" ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسب ذیل مؤثر و دلکش طرز ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ "اے آدم کا بیٹا! میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی۔" وہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے جہان کا پروردگار ہے میں تیری عیادت کیونکر کرتا فرمائے گا "کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا بندہ بیمار ہوا مگر تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا[9]"، تعلیم کی یہ طرز ادا بیمار پرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غمخواری کی کیسی دلنشین تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمت افزائی ہے کہ اسکا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا، اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اسکے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں، جو ان بیماروں کی خدمت کرکے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے۔ ہمکو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے، قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے، یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت سیر و تفریح اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری اور محنت مزدوری کے مشقت والے کام لیے، ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں۔ مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رومیوں میں غیر رومی اسی غلامی

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الجنائز [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز [3] ایضاً [4] مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ [5] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز [6] سیرۃ ابن ہشام، غزوہ بنی قریظہ و ادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت و اصابہ ابن حجر۔ وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھیے [7] صحیح مسلم، غزوہ النساء [8] مسند احمد صفحہ ۳۹۴/۴ [9] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے اور عربوں میں بھی ان کیساتھ یہی برتاؤ تھا۔ بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلے سے وابستہ نہ تھا۔ وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا۔ کیونکہ اسکو اپنی حفاظت کیلئے کسی قبیلہ کی قوت حاصل نہ تھی۔ چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔ اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا۔ نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاہدۂ فضول میں شرکت کی تھی اور جسکو نبوت کے بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔ وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے۔ اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا۔ چنانچہ زیدؓ بن حارثہؓ، خبابؓ بن الارت، بلالؓ حبشی، یاسرؓ یمنی، عمارؓ، صہیبؓ رومی، ابو فکیہہؓ، عامرؓ بن فہیرہ اور سالمؓ غلاموں میں اور لبینہؓ، زنیرہؓ، نہدیہؓ، ام عبیسؓ، اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کے آغوش میں آئیں اور زیدؓ بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے، سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں، اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور انکے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جزو بنا لیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا۔ سورہ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی، جن کاموں کو "گھاٹی" بتایا گیا ہے۔ انمیں ایک فَكُّ رَقَبَةٍ (گردن غلامی کی رسی کو کھولنا) بھی ہے۔ چنانچہ مکی پُرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہؓ حضرت ابوبکرؓ اور دوسرے اہلِ ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا۔ "تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ" یعنی گردن کو آزاد کرنا، بہت سی فروگذاشتوں کا کفارہ قرار پایا، اور غلاموں کے آزاد کرنے کیلئے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا۔ صحابہ نے اپنے پیغمبر کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند دنوں میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ حضرت حکیمؓ بن حزام نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں، اسلام کے بعد سو[1] غلام آزاد کیے۔ حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس[2] غلام آزاد کیے۔ حضرت عبد اللہؓ بن عمر ایک ہزار اور حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف نے تیس[3] ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی۔ شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اسکے بندوں کیساتھ نیکی کی جائے، ان بندوں میں سر فہرست جن لوگوں کے نام ہیں۔ ان میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے فرمایا:-

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ
ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهَ
لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۔ (نساء ۔ ۶)

اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اسکا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی
کرو۔ اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور عزیز پڑوسی اور
بیگانہ پڑوسی کیساتھ اور پہلو کے رفیق کیساتھ اور مسافر کیساتھ
اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں اور
اللہ غرور اور فخاری کرنیوالے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جسکو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے، لیکن اسلام نے اسکی بھی ممانعت کر دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عَبد نہ کہے، بلکہ فتائی میرا جوان کہے اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رَب

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الہجرة [3] یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں

نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں۔ اسطرح ان ذلّت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کردیا اور فرمایا کہ یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں، جنکو خدا نے تمہارے تحت میں کردیا ہے۔ پس جس کو خدا نے تمہارے تحت کردیا ہے۔ تو اسکو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو۔ اور اس کو اتنا کام نہ دیدو جو اس پر بھاری ہوجائے اور بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے[3]۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر صحابہؓ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہوگئی تھی اس بے خانماں افراد کو اُن کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بناکر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا ہے کہ جس غلام کو جو آزاد کریگا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہوگا[4]۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہوگئے ہوں، اُن کو اُن کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو۔ جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو، اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں[5]۔ ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنادیا، اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے۔ جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے لی ہے۔ مگر گذشتہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے خمیر میں داخل ہے۔ اور مغربی تمدن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے۔ آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل وہ ہمارے ساتھ کریگا۔ گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کیساتھ نہیں لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھایا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا ذکر سورۂ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے :۔

هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ	(اے پیغمبر) ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟
اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا، قَالَ سَلٰمٌ	کہ جب (یہ لوگ) اُنکے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی،

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ماینہی عن السباب [3] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ماینہی عن السباب [4] حدیث میں ہے انما الولاء لمن اعتق، ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے۔ دوسری حدیث میں ان انتمی الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ الخ جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت، امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ہو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم کتاب العتق)، [5] کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۳۵ ؛

قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ فَرَاغَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ فَجَآءَ
بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ، فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ
اَلَا تَاْكُلُوْنَ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ
قَالُوْا لَا تَخَفْ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝
(ذاریات: ۲)

ابراہیم نے سلام کا جواب دیا) اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں۔ پھر جلدی سے اپنے گھر جا کر ایک موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے اور ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے تامل کیا۔ (ابراہیم نے) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔

اس حکایت سے آدابِ مہمانداری کے متعلق حسب ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں (۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا اور باہمی سلام سے ہونا چاہیے (۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں (۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔ اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر ان کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے۔ تو وہ از راہِ تکلف اس کو روکیں گے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اہل و عیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے (۴) کسی بہانے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ ان کو آرام کرنے یا دوسرے ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے ان سے الگ ہو گئے۔ (۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا (۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ ان کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے (۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اور ان کے اہل و عیال کے کام آئے۔ اسی لیے جب ان لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا۔ اور ان کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں (۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے۔ اسی لیے ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم لوگ کھا ہی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولد کی بشارت دینے کے لیے آئے ہیں۔

سورہ حجر میں حضرت لوط علیہ السلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسائش کے ساتھ میزبان، مہمان کی عزت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے۔ اسی لیے جب قوم لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السلام نے

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ

کہا یہ میرے مہمان ہیں۔ تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ (حجر: ۵) نہ کرو۔ اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی اشارات تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارمِ اخلاق میں مہمان نوازی کو تصریحًا اسقدر اہمیت دی کہ اسکو ایمانِ کامل کا ایک جزو قرار دیا۔ اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت کیساتھ دے۔ کہا گیا ہے کہ یا رسول اللہؐ اس کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا[1] نیز فرمایا کہ جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے۔ اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے۔ اسکو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے[2] رکھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو۔ اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انھوں نے کہا بیشک، فرمایا ایسا نہ کرو۔ نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیونکہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے[3]۔ ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے، پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے، چاہے وہ لے لے، چاہے چھوڑ دے[4]۔"

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہرحال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہے۔ اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے۔ وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حد ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھائے چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کر دیگئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ کیونکہ اس سے صاحبِ خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے[5] گا۔ اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائیگی۔ جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کریگا۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اسطرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا اور اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ [2] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراہیم المکرمین [3] بخاری کتاب الادب باب حق الضیف [4] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔ [5] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ۔

رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے۔ اور وہ دین کا رشتہ تھا جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی ہو گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ	اے مسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق
وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ٥	ہے اور نہ تم مرو لیکن مسلمان۔
وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا	اور خدا کی رسی سب مل کر مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اور
وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً	ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ	کرو کہ تم دشمن تھے۔ تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا
اِخْوَانًا ٥ (آل عمران، ۱۱)	پھر تم بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِى الْاَرْضِ	اور خدا نے مسلمانوں کے دل ملا دیئے اگر تو زمین میں جو کچھ ہے
جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	سب خرچ کر دیتا۔ تب بھی تو انکے دلوں کو ملا نہ سکتا لیکن خدا نے ملا دیا
اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥ (انفال: ۸)	بیشک وہ ہر مشکل پر غالب آنیوالا اور مصلحت جاننے والا ہے۔

تو اب مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فعل کی قدر کریں۔ اور سب مل کر خدا کے دین کی رسی کو جو ان کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے۔ مضبوط پکڑیں اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں کیونکہ اس رسی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اسکو پکڑے رہیں، فرمایا:۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا	اور اللہ اور رسول کا کہا مانو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو کہ
وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ، (انفال، ۶)	ایسا ہوگا تو ہمت ہار دوگے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

یہی باہمی اتفاق و اتحاد، ملت اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ، اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں باہم الفت و محبت ہو، اب اگر اتفاق سے ان میں اختلاف پیش آجائے تو اس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں خدا و رسول کے حکم کی طرف رجوع کریں۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ	تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس
وَالرَّسُوْلِ (نساء: ۸)	کو اللہ اور رسول کی طرف لٹا دو۔

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں اور جب وہ راضی ہو جائے تو عدل و انصاف سے ان میں صلح کرا دیں۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا	اگر مسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔

فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ (حجرات : ۱)

پھر اگر ایک دوسرے پر ظلم کرے، تو ظلم کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو، تو اگر وہ رجوع کرلے تو ان میں عدل کیساتھ صلح کرادو۔ اور انصاف کرو۔ خدا منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں۔ اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ جنگ و خونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا۔ انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا (بخاری بمظالم)

تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کیجا سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیونکر کیجائے، فرمایا اس طرح کہ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو، جس وقت اس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور شریعتِ اسلامی کو قبول کیا وہ دفعتاً ہمارا مذہبی بھائی ہوگیا۔ خدا نے فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ (توبہ : ۲)

تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں، اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہوگیا۔ اگر اس کے باپ کا نام نسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں، وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی ہے، فرمایا:۔

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (احزاب : ۱)

تو اگر تم اُن کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، اور علاقہ مند۔

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کردے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دیکر اس کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ (البقرہ : ۲۲)

تو اگر قاتل کو اسکے بھائی کیطرف سے کچھ معاف کردیا جائے۔

ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے، کیونکہ:۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (حجرات : ۲)

کیا تم میں کوئی پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیوں کا فرض ہے۔ اور اگر وہ ان کو اپنے اندر شامل کرکے نیک نیتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جزو بنالیں۔ اور ملا جلا کر خرچ کریں۔ تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ یہ ان کے بھائی ہیں۔ جن کی خیرخواہی ان کا فرض ہے، فرمایا:

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (بقرہ : ۲۷) اور اگر تم انکو اپنے میں ملا لو تو یہ بھی جائز ہے کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں

ایک مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کے حق میں دعائے خیر کریں۔ وہ یوں کہتے ہیں :

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (حشر : ۱)
اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر ۔

ایک مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی بُرائی ہے جس کے دور کرنے کے لیے خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے :۔

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (حشر : ۱)
اور ہمارے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے ، اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے ۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کیساتھ پیش آتے ہیں خدا نے مدح فرمائی ،

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح : ۴)
وہ (مسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں ۔

مسلمانوں کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے ۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (مائدہ)
مسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے ۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت ، محبت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے "مسلمان کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے ، محبت کرنے ، اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بیخوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں"[1] ۔ صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا "سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے"[2] ۔ مقصود یہ ہے کہ امتِ مسلمہ ایک جسم ہے اور اسکے سارے افراد اس کے اعضا ہیں بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں ، اور اس دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں ۔ یہی مسلمانوں کا حال ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے ۔

ایک دوسری تمثیل میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مسلمان باہم ایک دوسرے سے ملکر اسطرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اسکے ایک حصہ سے اس کا دوسرا حصہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے"[3] ۔ بخاری میں ہے کہ یہ کہکر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا ، کہ کیسے ایک حصہ سے دوسرا حصہ مضبوط ہوتا ہے اس تمثیل میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جسطرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملکر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن و حصار بن جاتی ہے ۔ اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۳ کتاب الادب و صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ کتاب البر والصلۃ والآداب ، مصر [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۸۹ مصر کتاب البر والصلۃ والادب [3] صحیح بخاری کتاب الآداب ج ۲ ص ۸۹۰ و صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۳۸۹ ، مصر ؛

مسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے۔ جب تک اس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے ملی ہوئی ہے جب یہ اینٹ اپنی جگہ سے کھسک جائے گی، تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائے گی۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہو کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑ دے اور نہ اس کی تحقیر کرے انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اسکا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو۔"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہیگا تو خدا اس کی ضرورت پوری کریگا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اسکی تنگی کو دور فرمائیگا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا۔"[2]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کریگا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کریگا۔ اور جو کسی تنگدست پر آسانی کریگا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کریگا اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھیگا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے۔ جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔"[3]

فرمایا "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔"[4] یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے۔ دوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہؐ! سب سے اچھا مسلمان کون ہے، فرمایا "جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان بچے رہیں۔"[5] یعنی جو مسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مسلمان ہے۔ جریرؓ بن عبداللہ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مسلمان کی خیرخواہی کرنا۔"[6] کئی روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے۔ اور اس سے لڑنا (قتال) خدا کا انکار (کفر) ہے۔"[7] یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا، اور یہ ایک معنی میں خدا کا انکار ہی ہے۔ چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے، فرمایا "کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔"[8]

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ
خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ
عَذَابًا عَظِيْمًا (نساء: ۱۳)

اور جو کوئی کسی مسلمان کو قصداً قتل کریگا، تو اس کا بدلہ دوزخ ہے وہ اس میں پڑا رہے گا، اور خدا اس پر خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب مذکور ج ۲ ص ۳۰۲ مصر [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۳ ص ۱۹ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۳

[4] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶ [5] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۶ [6] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱

[7] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۳ [8] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ ص ۱۲ و ج ۲ ص ۸۹۳

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپؐ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا، پھر فرمایا "دیکھو میرے بعد کافر ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو"[1]، ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم مسلمانوں پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں"[2]، جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے، فرمایا "سب سے بڑا ربا کسی مسلمان کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے"[3]، اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اسکے بچانے کی کوشش کرے، ارشاد ہوا "جو کوئی کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑ دیگا جسمیں اسکی عزت پر حرف آتا ہو اور اسکی آبرو جاتی ہو، تو خدا بھی اسکو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دیگا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کریگا تو خدا بھی اسکی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا"[4]۔

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضگی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیر لے اور یہ ادھر منہ پھیر لے، اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے کہ جو پہلے سلام کی ابتداء کرے"[5]۔ ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہو، اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ، اور کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے"[6]۔ ایک مسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اس کے ایمان کا ہے۔ قرآن نے کہا کہ جب تم کوئی اپنے اظہار اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (نساء: ۱۳) اور اسکو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے یہ نہ کہو تو مومن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مسلمان کہے یا وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں، ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا، اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا، مگر اس پر بھی ان صحابی نے اسکو قتل ہی کر دیا، یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپؐ نے انکو بلا کر دریافت کیا! انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، آپؐ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا "تم اسکے لا الہ الا اللہ کے ساتھ کیا کروگے"، ایک روایت میں ہے کہ فرمایا "کیا تم نے اسکا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا"[7]۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ "مومن کو لعنت کرنا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اسکے قتل کے برابر ہے"[8]۔ یہ بھی فرمایا کہ "جو کوئی اپنے بھائی کو اے کافر کہے، تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا"[9]۔ یعنی اگر وہ درحقیقت کافر تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا، اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے، جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے، ارشاد ہوا کہ "جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا، تو خدا اسکے لیے دوزخ واجب، اور جنت حرام کریگا، ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی، فرمایا درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو"[10]۔ فرمایا "ہر مسلمان پر اسکے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں، سلام کا جواب دینا، اسکے چھینکنے پر خدا تم پر رحمت کرے کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا، اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا"[11]، یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳ [2] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ ص ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ ص ۱۰۴۶ [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۸۹ [4] ایضاً [5] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۹۲۱ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۱۹۳ [6] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۶ [7] پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے، دوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور [8] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ ص ۸۹۳ [9] ایضاً ص ۹۰۱ [10] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ ص ۸۰ معہ [11] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ ص ۲۰۱

دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسنِ تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ "جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے[1]" حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جو کوئی ایمان و اخلاص کیساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا ہے۔ اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے، تو اس کو ثواب کی دو رتی (قیراط) ملتی ہے جن میں سے ہر رتی اُحد کے پہاڑ کے برابر ہوگی[2]" یعنی یہ رتی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہوگی بلکہ یہ اس پیمانے ہوگی جس کا ایک ذرہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کے جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا اس برادرانہ الفت و محبت کے فروغ ہیں، جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہوگا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے[3]"۔ الغرض ملتِ اسلامیہ کی جماعت کا ہر رکن دوسرے کے ساتھ ایسی محبت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے۔ اسکا نفع اپنا نفع اور اسکا نقصان اپنا نقصان سمجھے، ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مسلمان مسلمان کا آئینہ ہے اور مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اسکے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے اس کی حفاظت کرتا ہے[4]"۔ دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتِ اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی، اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں، جیسی آج ہیں۔ ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے، اور آئندہ بھی بنے گی۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا مذہبی فرض ہے، تبلیغ یعنی غیر مسلم انسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اس کے دوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مسلمان سچائی سمجھتا ہے اس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے انسان کو آگاہ اور باخبر کرے اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ ۱۰)	اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا، انسانیت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں، دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے اسی لیے ارشاد ہوا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ	اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف
اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ (مائدہ: ۲)	نہ کرو، عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔

ہر قسم کا بُرا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دوسرے انسان، اور ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے اسکا اصل سبب

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۱۲ کتاب البر والصلۃ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲ [3] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶ [4] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۳۱۲، تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

یہی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا، بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کیلئے آمادہ رہتا ہے۔ یہ آیت پاک انسان کے اسی مادہ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے ابوہریرہؓ اور انس ابن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: 27

لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری: ۲)	آپس میں ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں :۔

لاتباغضوا ولاتحاسدوا ولاتدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری)	ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے خدا کے بندو آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس حدیث پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتاً جنت بن جائے۔ فرمایا لا یرحم لا یُرحم (بخاری) "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا" جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا۔ یا یہ کہ جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا۔ دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کریگا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم زمین والوں پر رحم کرو۔ تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔[1] یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی شان رحمت کو کتنی عمومیت کیساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اسکا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا۔ (بخاری) اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ آپؐ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کیساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا، صحابہؓ نے پوچھا اے خدا کے رسول! کیا جانوروں کیساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے۔ فرمایا، ہر تر جگر کیساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے[2] (بخاری) اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا "جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اسکو مٹا دوگے۔ اور لوگوں کیساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ۔" (باب ماجاء فی معاشرۃ الناس صفحہ ۳۳۱) ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے پانچ باتیں گنائیں جن میں ایک یہ تھی کہ واحب للناس ماتحب لنفسک (یعنی تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو۔ تو مسلمان بن جاؤ گے) الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بنتا۔

کیونکہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے۔ جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو۔ بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی، تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو۔ اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گذر چکا ہے۔ اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقراء اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی بات ہے۔ تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی

---

[1] مستدرک حاکم کتاب البر والصلۃ ج ۴ ص ۱۵۹ [2] یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب میں ہیں نیز ترمذی ابواب البر

خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا، ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی، اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اس کو کچھ دیا۔ پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو، خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے۔ اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں۔ قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لیے ہے۔ فقراء تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب میں ہیں ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔[1]

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا۔ ابن جریج محدث کہتے ہیں۔ کہ قرآن[2] نے اسیروں کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے ہیں۔ ابو میسرہؓ اور عمرو بن شرحبیل صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا۔[4] اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کیساتھ صلہ رحمی کی اجازت دی۔[5] تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہؓ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری۔[6]

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ (بقرہ : ۳۷)	اُنکو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات نہیں، لیکن اللہ جسکو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے، اور جو بھلائی خرچ کرو، وہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہرحال ملے گا۔ مسند احمد میں ہے کہ آپؐ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا۔

لا یؤمن احدکم حتی یحب للناس ما یحب لنفسہ وحتی یحب المرء یحبہ الا للہ عز وجل (جلد ۳ صفحہ ۲۷۲)	تم میں سے کوئی اس وقت پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لیکر آیا تھا اسکا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے۔ اس نے جانوروں کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی، اہل عرب وحشت اور قساوت کیوجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں کو کہتے تھے کہ تم انکو کھاؤ اور اسکو فیاضی سمجھتے تھے۔ دو آدمی

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۲، مصر، [2] سورہ دہر [3] کتاب الاموال امام ابو عبیدہ صفحہ ۶۱۳، ۶۱۴ مصر، [4] بخاری کتاب الجمعہ [5] مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین [6] طبری۔

شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا۔ جو رک جاتا وہ ہار جاتا، یہ سب جانور دوست و احباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ ان واقعات کا ذکر اشعار عرب میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اس کی قبر پر باندھتے تھے اور اسکو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مرجاتا ایسے جانور کو بلیہ کہتے تھے[1] اسلام آیا تو اس نے اس سنگدلی کو مٹادیا۔ عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا کہ کسی ذی روح چیز کو اس طرح نشانہ بنایا جائے[2]۔ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنارہا تھا حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول لیا۔ اور مرغی کیساتھ اس لڑکے کو لیکر اس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے جانور یا کسی اور جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسیطرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنارہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گذر ہوا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ملعون قرار دیا ہے[3]۔ اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکی کاٹ کر کھاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے، وہ مردار ہے[4]۔ یہ ایک خاص صورت تھی، لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی انکے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنیوالے پر لعنت بھیجی[5]۔

بلاضرورت کسی جانوروں کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[6]، ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اگر گنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کریگا۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ، اسکا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اسکو ذبح کرے اور کھائے، یہ نہیں کہ اسکا سر کاٹ کے پھینک دے[7]۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں ان کا مارنا جائز نہیں سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص گنجشک کو بلاضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کریگی کہ فلاں نے مجھ کو بلاضرورت مارا ہے۔ اس کا کوئی فائدہ[8] نہ تھا۔ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا ان سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے انکا مارنا بھی جائز نہیں چنانچہ آپ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور صرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[9]۔

جو جانور ضرورۃً مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں۔ ان کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنیکا حکم دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقے سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ صفحہ ۲۵۵ [2] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ماجاء ما قطع من الحی فہو میت [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [5] مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۲۳۳ [6] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۲۵۰ [7] نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۶۷۹ [8] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۶۶۔

آرام پہنچائے[1]۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے۔ یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں، فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے[2] ہو تو خدا تم پر رحم کریگا۔ یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دیکر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی[3] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ کنکر، پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی۔ اور فرمایا کہ اس سے نہ شکار ہو سکتا نہ دشمن شکست کھا سکتا البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے[4]، مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں، جانوروں کیساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں۔ انکا اصل سبب تھا کہ اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپؐ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اسنے ایک بلی کو باندھ دیا اور آخر وہ اسی طرح بندھی مرگئی[5]۔ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گنہگار ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کیساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو، اگر خدا انکو معاف کردے تو سمجھو اس نے تمھارے بہ کثرت گناہ معاف کردیئے[6]، ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔ آپؐ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے۔ جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولھا ایسی جگہ جلایا ہے۔ جہاں زمین پر یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے دریافت کیا کہ یہ کس نے کیا ہے ان صاحب نے کہا یا رسول اللہ، یہ میں نے کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا بجھا دو بجھا دو[7] غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو، یا جل نہ جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبر کسی درخت کے نیچے اترے تو انکو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا انہوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا۔ پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا۔ اس پر خدا نے اُن کو وحی کے ذریعے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا۔ یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی۔ جس نے کاٹا تھا[8]۔ تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ لائے چڑیا فرطِ محبت سے ان کے گرد منڈلانے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے، واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اسکو بے قرار کیا ہے اسکے بچوں کو چھوڑ دو۔ صحابہ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا۔ تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لیے سزاوار ہے۔

اسی طرح اہل عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جسطرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے، بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کیساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے۔ اسی عدم واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپؐ سے

---

[1] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ۔ [2] مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۳۴۔ [3] نسائی ص ۲۰۰۔ [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندقۃ۔ [5] بخاری کتاب الانبیاء صفحہ ۴۹۵۔ [6] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۱۔ [7] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبد اللہ بن مسعودؓ۔ [8] بخاری جلد اول کتاب الخلق صفحہ ۴۶۷۔

دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں، ان پر بھولے بھٹکے اونٹ بھی آجاتے ہیں اگر میں ان کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کیساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ گئی اتفاق سے اسکو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اُتر کر پانی پی لیا۔ کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے اپنی پیاس کی شدت کو یاد کرکے اس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اُتر کر پانی لایا اور اُسکو پلایا۔ خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خدا نے اسکو بخش دیا۔ صحابہ کرام نے اس واقعہ کو سُنا تو بولے کہ یا رسول اللہ! کیا جانوروں کیساتھ سلوک کرنے سے بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجب ثواب ہے۔[2] صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ یعنی ثواب کا کام ہے۔[3]

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں، صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں۔[4] نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ، خدا نے انکو تمہارا فرمانبردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے۔ تمہارے لیے خدا نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اسی پر پوری کرو۔[5] اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے۔ اس لیے اس حدیث کا مطلب ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے، صرف سفر کی حالت میں اس پر سوار ہونا چاہیے۔

(۲) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے، چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ، اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ، تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے۔[6] ایک بار آپؐ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا، فرمایا ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، ان پر سوار ہو تو انکو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو، اور اُن کو کھاؤ تو اُن کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ۔[7]

ایک بار آپؐ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بلبلایا اور آبدیدہ ہوگیا، آپؐ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا کہ میرا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار [2] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء [3] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم [4] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ [5] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ [6] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔[1]

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار[2] دیا۔

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[3] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجئے، تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کے جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے، قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں، ایک امہات اخلاق اور دوسری فروع اخلاق، امہات اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں، اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوتیں ہیں، قوتِ علمیہ، قوتِ شہوانیہ، اور قوتِ غضبیہ، قوت علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوت شہوانیہ کے اعتدال کا عفت اور قوت غضبیہ کے اعتدال کا شجاعت ہے، اور انہی کے عدم اعتدال کو رذائل کہتے ہیں، پھر ان دونوں قسموں کے اختلاف مدارج سے اچھے اور بُرے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں، یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں، لیکن اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے، کیونکہ اس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں، بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا اور رذائل اخلاق سے عملاً بچانا ہے، اس لیے اس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں، بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور بُرے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اپنی تعلیم میں اس نے اہل فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیا علیہم السلام کی تعلیم اور تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ بُرا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے، گویہ دوسری

(بقیہ حاشیہ) [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم (صفحہ ہذا) [1] ایضاً [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے، اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اسمیں عقلی برائیاں اور خلق خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی دو قسمیں ہیں؛ وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے، رذائل ہیں، ہم نے اوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی کے عنوان میں وہ آیتیں لکھدی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے انکو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے۔ یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآنِ پاک اور احادیث شریفہ میں جا بجا ان کی تصریح ہے لیکن ان کے بیان میں اخلاق شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے، اسی لیے ان کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہونے

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو، اور مسلمانوں کو اس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبویؐ میں زیادہ زور دیا گیا ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے اور غور و فکر کرنیوالوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے، اسمیں کامیابی کی کوشش کرونگا۔

فضائل کی مختصر فہرست جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے، یا ان اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے، قرآنِ پاک اور احادیث نبویؐ میں جا بجا ان کی تفصیل ہے، جیسے :-

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (مومنون ، ۱)

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں جو بیکار باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے اور اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ ان پر کوئی الزام نہیں تو جو اس کے سوا کے خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی اصلی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں [illegible] اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاکدامنی امانت داری اور ایفائے عہد، ایک دوسری جگہ ہے :-

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَـتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ (بقرہ : ۲۲)

اور لیکن اصل نیکی اس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا، اور اپنا مال اسکی محبت کیساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا، اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور اپنے قول کو جب انہوں نے قرار کر لیا پورا کرنیوالے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے بل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے۔

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں، سخاوت، قول و قرار کو پورا کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی سورۂ آل عمران میں ہے :-

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ (آل عمران : ۲)

ثابت قدم رہنے والے، اور سچ بولنے والے، اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنیوالے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے، اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنت کے مستحق ہوں گے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران : ۱۴)

جو خوشحالی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام) خرچ کرتے ہیں، اور غصہ کو روکتے، اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکی کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفو و درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ معارج میں ہے :-

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاۗءَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَاۗىِٕمُوْنَ ۝ (معارج : ۱)

ان جن کے مال میں مانگنے والے، اور مصیبت زدہ کا حصہ مقرر ہے، اور جو روز جزا کو سچ مانتے ہیں، اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بے شبہ ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں اور شرعی باندیوں سے کہ اس میں ان پر کوئی ملامت نہیں، جو اس کے علاوہ چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت و عصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں

میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوتی ہیں۔

سورۂ احزاب میں ان مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشایش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے :-

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب : ۵)	اور سچ بولنے اور سچ بولنے والیاں، صبر کرنیوالے اور صبر کرنے والیاں، اور عاجزی کرنیوالے اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنیوالے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی، صبر، عاجزی، اور عصمت وعفت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے۔

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (ع : ۶)	(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں، اور جاہل جب ان سے جہالت کی باتیں کریں تو وہ کہیں سلامت رہیے۔[1]
(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (〃)	(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔
(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (〃)	(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔
(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (〃)	(۴) اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گذریں تو شریفانہ وضع سے گذر جائیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور صبر وبردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور میانہ روی، اور تیسری میں عدم ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت وسنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے، سورۂ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی۔

اَلَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۭ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول کو توڑتے نہیں اور جسکے جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اس کو جوڑے رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے سہمے رہتے ہیں اور جنہوں نے اپنے مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا، اور نماز کھڑی کی اور ہم نے جو انکو دیا اس سے

---

[1] یا سلام کہیں۔

مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ (رعد: ۲۲،۲۰)

چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں) خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، انہیں کے لیے پچھلا گھر ہے۔

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہوسکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جاسکتا ہے جو خدا کا نام لیکر بندہ بندہ سے کرتا ہے، اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے، وہ اہل قرابت اور حقداروں کے حقوق ہیں ان دو کے سوا ان آیتوں میں ان کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں، یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ (قصص ۸۳)

اس پچھلے گھر کو ہم ان کے لیے کریں گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے، اور آخر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

یعنی غرور و نخوت نہیں کرتے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ)

اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

یعنی غصہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (مائدہ ۶)

بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (بقرہ : ۲۴)

بیشک اللہ نیک کام کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گذر چکی ہیں، اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سر فہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے، اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجے کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آجاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے اس کا دل، اور اس کی زبان باہم ایک دوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں، اسی کا نام صدق یا سچائی ہے، جو سچا نہیں، اس کا دل ہر برائی کا گھر ہوسکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصول کا راستہ آسان ہے کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! مجھ میں چار بری خصلتیں ہیں، ایک یہ کہ بدکار ہوں، دوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھوٹ بولتا ہوں، ان میں سے جس ایک کو فرمائیے، آپؐ کی خاطر سے چھوڑ دوں، ارشاد یہ ہوا کہ جھوٹ نہ بولا کرو، چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا، اب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا، اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گذرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی ہے تو کیا جواب دوں گا، اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دیجائے گی، اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف ہوگا یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا۔ جب رات زیادہ گذری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا تو پھر اسی خیال نے اس کا دامن تھام لیا، کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا، ہاں کرونگا تو ہاتھ کٹیں گے اور نہیں کرتا تو بدعہدی ہوتی ہے، اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا، صبح ہوئی تو وہ دوڑ کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بُری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے۔

یہ روایت سند کی رو سے کتنی ہی کمزور ہو۔ مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے، سچائی کی عادت انسان کو بہت سی برائیوں سے بچاتی ہے، جو سچا ہوگا وہ ہر برائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کریگا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایمان دار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کریگا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا سب کے بھروسے کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول و فعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا کرے گا، غرض جس پہلو سے دیکھئے سچائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصلی بنیاد قرار پائے گی۔

صدق، صفاتِ ربانی میں سے بھی سب سے بڑی صفت ہے خدا سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے:۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا (نساء)
اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے۔

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد فرمایا:۔

وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا (نساء: ۱۸)
وعدہ کیا اللہ نے سچ، اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

خدا سچا ہے، اس لیے اسی کی ساری شریعت سچی ہے، فرمایا:۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (انعام: ۱۸)
اور ہم ہیں سچے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا (آل عمران: ۱۰)
کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔

---

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورہ ن میں کتب سیر کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اسکا ماخذ نہیں معلوم ہوا

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (زمر، ۳۳) — اور جو سچائی کو لیکر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہیں۔

اس آخری آیت میں "سچائی" سے مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں:۔ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ (احزاب، ۳) (اور خدا اور اس کے رسول نے سچ کہا)

چونکہ رسول خدا سے علم پاتے ہیں، اس لیے وہ بھی سچے ہوتے ہیں:۔

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یٰسٓ : ۴) — اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے کیونکہ ان کی ساری باتیں، دعوے، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو ان کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے، اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے، سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (مریم : ۳) — اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ نے اس کو نامزد کیا ہے:۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِدْرِیْسَ اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (مریم، ۴) — اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر کہ وہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا، اس وصف سے ممتاز ہوئیں، فرمایا گیا:۔

وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ (مائدہ : ۱۰) — اور ان (عیسیٰ) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یوسفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے، بندوں کی زبان سے صدیقؑ کہلائے:۔

یُوْسُفُ اَیُّھَا الصِّدِّیْقُ (یوسف : ۶) — یوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسماعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا:۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا (مریم : ۴) — اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا ہوا نبی تھا۔

خدا کی خوشنودی والی جنت جن لوگوں کو ملے گی ان میں وہ بھی ہوں گے جو دنیا میں دوسری صفتوں کے

ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے۔

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ (آل عمران: ۲)
صبر کرنے والے اور سچے۔

خدا نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجرِ عظیم کے وعدے کیے ہیں، اُن میں اسلام و ایمان اور خدا کی فرماں برداری کے بعد پہلا درجہ سچوں اور راست بازوں کا ہے، فرمایا:-

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ (الآیہ)
بے شک اسلام قبول کرنے والے مرد اور عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور عورتیں، اور فرمانبردار مرد اور عورتیں، اور سچے مرد اور سچی عورتیں ....

اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا (احزاب: ۵)
خدا نے اُن کے لیے مغفرت اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

اور سچائی کے کاروبار کا صلہ دوسری زندگی میں ملے گا، اور وہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی، قیامت کی نسبت ہے:-

ہٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُہُمْ (مائدہ: ۱۶)
یہ دن ہے کہ سچے بندوں کو اُن کا سچ کام آئے گا۔

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہوگا، اُسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا، چنانچہ فرمایا:-

لِیَجْزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِہِمْ (احزاب: ۳)
تاکہ اللہ سچے اُترنے والوں کو ان کی سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو، اور ان ہی کی صحبت میں ہو کر ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو، کعبؓ بن مالک اور ان کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جاسکے تھے ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا، اسکی طرف اشارہ کرکے خدا فرماتا ہے:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (توبہ: ۱۵)
اے ایمان لانے والو خدا سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔

اہل تفسیر کے نزدیک یہاں ان سچوں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں، جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا، مگر بہرحال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیت کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں، جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں، بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں، اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتلائے ہیں، بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی لیکن ذرا معنی میں وسعت دیکھئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں، یعنی زبان

کی سچائی، دل کی سچائی، اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے، اور مُنہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اس قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنی ہے، سورۂ احزاب میں ایک آیت ہے:-

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ الآية (۲۱ : ۳)

تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے۔

اس آیت پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے، صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلاً روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مسلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہو سکتا ہے، پھر پوچھا کیا بخیل؟ بھی ہو سکتا ہے، جواب دیا ہو سکتا ہے، پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے، فرمایا نہیں[1]، ایک صحابی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر[2]" (نہیں) مطلب یہ کہ مومن میں ہر برائی ہو سکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے، اسی لیے ارشاد ہوا "کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وہ حق ہی پر کیوں نہ ہو[3]۔ ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے، جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے، اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کرے[4]۔ یہی روایت اس طرح بھی ہے کہ منافق کی علامتیں تین ہیں، جب کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے، اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے[5]، صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے: "اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو[6]"۔

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب [2] عن ابی امامۃ عند احمد، وعن سعد بن ابی وقاص عند البزاز وابی یعلی والطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمر وقد روی مرفوعاً وموقوفاً [3] مسند احمد عن ابی ہریرۃؓ وطبرانی، نیز مسند ابی یعلی عن عمر بن الخطاب، یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب و ترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں [4] صحیح بخاری کتاب الایمان، وصحیح مسلم وابو داؤد و ترمذی و نسائی [5] صحیح بخاری کتاب الایمان وکتاب الادب وصحیح مسلم [6] صحیح مسلم۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے، اور نیکی جنت کو لیجاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لیجاتی ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[1]۔

دل کی سچائی صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہ سے نہیں نکلا منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آپؐ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے، اور آپؐ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی، لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اسلیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (منافقون: ۱) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں، لیکن انکا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نفاق ہے جسکی برائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولتمند پیش ہوں گے، اور ہر ایک اپنے علم و دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کریگا، لیکن ان کارناموں کو سُن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے سب یہی کہیں گے[2]۔ یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہیں کیے گئے تھے تاہم چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا کہ ان کے کارناموں کی حقیقی غرض خدا کی خوشنودی نہ تھی بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچائی عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ضمیر کے مطابق ہو، یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع وخضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے، لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے، ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا، تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع وخضوع نہیں ہے اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں، اس زبان کی سچائی بھی ضروری ہے، اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، خدا نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے
ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ	پھر کسی طرح کا شک و شبہہ نہیں کیا، اور اللہ کے راستے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [2] ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ۔

وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات ۲)

میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اسی لیے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کر دی۔

اس صدق عملی کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اُس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو مثلاً ایک شخص احکام الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے، لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے، اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اُتر سکتے کیونکہ عدم یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (محمد ۳)

اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی سورت نازل ہو پھر جب کوئی سورت اترتی ہے، اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو تو ان پر تف ہو (در اصل ان کی) فرمانبرداری چاہیے (اور) معقول جواب دینا چاہیے اور جب بات ٹھن جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عملی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول و قرار کیا جائے اور جس قول و قرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے اس کو وقت پڑنے پر پورا بھی کر دکھایا جائے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کر لے اور اسمیں کسی قسم کا ضعف نہ ہو لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اسمیں ضعف ظاہر ہو اس لیے صحابہ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے، خدا نے ان کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انسؓ بن نضر کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا اس کی تلافی کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور نیزے تلوار اور تیر کے تقریباً اسّی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی اس لیے خداوند تعالیٰ نے ان کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی[1]:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ

مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے ساتھ انہوں نے (جانثاری کا) جو عہد کیا تھا اسمیں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے

---

[1] بخاری تفسیر سورۂ احزاب۔

مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا لِّيَجْزِيَ
اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ
الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (احزاب: ۳)

ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا بھی تو ردوبدل نہیں کیا، تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے، اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا ان کو معاف کردے[1] بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

صدق عملی کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا حرف، دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار، اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں، بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے، ایک بار ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "میں خدا پر سچائی کیساتھ ایمان لایا ہوں" آپؐ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے "میرا دل دنیا سے پھر گیا ہے، اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں (نماز) اور دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرشِ الٰہی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہل جنت باہم مل جل رہے ہیں، گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں" ارشاد ہوا کہ "تم نے جان لیا، اسی پر قائم رہو[2]"

صحابۂ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صحبتوں میں انکو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا، ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابو بکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گذرے، انھوں نے پوچھا، حنظلہ کیا بات ہے، بولے میں منافق ہو گیا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے ہیں، اور آپؐ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم ان کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دینوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے، اب دونوں بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور یہ واقعہ بیان کیا، ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے[3]۔

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، فرمایا:-

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ (تکاثر) — ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا (تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:-

---

[1] یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا ان کو معاف فرمادے [2] اسد الغابہ تذکرہ حارث بن مالک [3] ترمذی ابواب الزہد

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ
اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ
وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ
ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ
السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ
اِذَا عٰھَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ
صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ٥ (بقرہ ۲۲)

نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی تو ان کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی حب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا، اور (غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی) گردنوں (کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے رہے اور زکوٰۃ دیتے رہے، اور (جب کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے، یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیزگار۔

اِن آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے، اول ان کے ایمان کا کمال، دوسرے ان کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں ان کا ہر طرح پورا اترنا، اور جو لوگ عمل اور علم کے ان تمام فضائل کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا، صدیق کہتے ہیں[1]، جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے مرتبۂ کمال ہے، چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدیق کا نام لیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمرہی کا ذریعہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت ہے۔

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ
مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ
النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ
وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا (نساء: ۹)

اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) اُن (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے، یعنی نبی اور صدیق اور شہید اور (دوسرے) نیک بندے اور (یہ لوگ کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔

سورۂ حدید میں ایمانِ کامل اور جانی (و مالی جہاد) کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے:۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖٓ
اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ (حدید: ۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعے نصیب ہوتی ہے، جس کے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا یہ بحث اوپر گذر چکی ہے کہ انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہوجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے سچائی کی تلقین کی وسعت اور گہرائی کیا سے کیا کی ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

---

[1] الصدیق الذی یصدق قولہ بالعمل (مجمع البحار) صدیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کیساتھ دوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دوسرے کو دینا اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر دوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دوسرے کو دینا، دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا، اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دینا، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے، اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے، اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے، اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (بقرہ:۱) اور ہم نے اُن کو جو روزی دی اس میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کیساتھ خاص نہیں بلکہ یہاں جسطرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی، کہ کیا دی گئی، پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی، خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اسکو اسمیں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو یہ نہیں ملا یا ضرورت سے کم ملا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں سے کچھ ان کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں یا جو اس کے محتاج ہیں، متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن، نماز اور زکوٰۃ ہیں، زکوٰۃ کی اصلی روح یہی سخاوت اور فیاضی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے، یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق الٰہی کی بنیاد ہے اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے، جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا اس میں اپنے ہم جنسوں کی ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا، اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے سورۂ بقر میں خصوصیت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے، فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں سے کچھ خرچ کرو جو

لہ تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور ۔

مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡکٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (بقرہ ۳۴)

ہم نے تم کو دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید ہے نہ دوستی ہے نہ سفارش ہے، اور کافر ہی ہیں ظالم۔

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے، اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے، یا یہ کہ وہ کافر نعمت ہے، جو خدا کی روزی کی نعمت پا کر اس کے شکرانہ میں اسمیں میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر ابھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے، اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمھاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے خرچ کر کے خدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اس دن یہی کام آنے والا ہے۔

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے ضرور ہے کہ اسمیں خلوصِ نیت ہو، اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اُولاہنا دینا ہو، خود رسول کو فرمایا وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَکۡثِرُ (مدثر) اور احسان نہ کر دیا احسان نہ دھر، کہ (زیادہ بدلہ چاہے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا، اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا، ارشاد ہے :۔

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتۡبِعُوۡنَ مَاۤ اَنۡفَقُوۡا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی ۙ لَّهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (بقرہ: ۳۶)

جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اس کے خرچ کے پیچھے نہ تو احسان دھرتے ہیں اور نہ اُولاہنا دیتے ہیں ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس دھری ہے اور نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دناءت ظاہر ہوتی ہے، فرمایا گیا :۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِیۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡهِ ؕ (بقرہ: ۳۷)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اسمیں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں خرچ کرو اس میں سے بُری چیز کے دینے کا قصد نہ کرو کہ تم دیتے ہو، حالانکہ تم اب اس کو لینے والے نہیں، مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو، اس کا دینا بھی پسند کرو جب تک ایسا نہ کرو گے، اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی ہے اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا صاف فرمایا :۔

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ (آل عمران: ۱۰)

ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک تم اُس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو پسند ہے، اور جو بھی تم خرچ کرو خدا جانتا ہے۔

یعنی خدا دل کے حال سے خبردار ہے، کس نیت سے اور کس کا مال تم دے رہے ہو، اس کی حقیقت اور دل سے

چھپی رہے، مگر اس سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے، اور اسی لیے وہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے، اور اسطرح نیکی کے کام میں جو تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا، دنیا میں تو اسطرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو، اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملیگا جو کریگا، فرمایا:-

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ: ۳۷)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے، اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے، اور جو بھی تم خرچ کرو وہ تم کو پورا دیدیا جائیگا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کیجائے گی۔

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے، اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ (بقرہ: ۳۲) کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کرے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (حدید: ۲)

کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض، تو وہ اسکو اسکے واسطے دونا کرے، اور اس کے لیے عزت کی مزدوری ہے،

آگے چل کر پھر فرمایا:-

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (حدید: ۲)

بیشک خیرات کرنیوالے اور خیرات کرنیوالیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے:-

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ (مزمل: ۲)

اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو، بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا، اور ان کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے، ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے۔

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (مائدہ: ۳)

اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض دیتے رہے۔

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا:-

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (مائدہ: ۳)

تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتار دوں گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے، اور خوش نیتی کیساتھ کارِ خیر میں خرچ کرتے

تھے خدا نے ان کی تعریف فرمائی :-

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ط (توبہ ۱۲)

اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں اور ٹھہراتے ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں، اللہ کے نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوشخبری دی :-

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ط سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ۱۲)

ہاں! وہ اُن کے حق میں نزدیکی کا سبب ہے، اُنکو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائیگا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

متقی سخیوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ الآیۃ (آل عمران ۱۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین، تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں کے واسطے جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ میں کیا جائے، ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیونکر ہوگا، دُور ہو جاتا ہے، فرمایا :-

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (بقرہ ۳۶)

ان کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا ہے۔

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے، ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے، خدا گنجائش اور کشائش والا ہے، ان کے ہاں ایک کا سو بن جانا مشکل نہیں ہے اور وہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیت سے یہ دیا ہے۔ اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جو خدا کی خوشنودی کے لیے اچھی نیت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے :-

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِۢرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ، فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (بقرہ ۳۶)

اور ان کی مثال جو اپنا مال خدا کی خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے کو پکا کرنے کو دیتے ہیں، ایک باغ کی سی ہے، جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا، اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی صالح زمین سے اچھی نیت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا، اور پھل سے ثواب مراد ہے، تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے خدا کی راہ میں جو دیا جائے، وہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے، اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے، اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ واللیل میں بیان کیا گیا ہے، فرمایا:-

(۱) فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی
فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی (لیل: ۱)

(۱) تو جس نے (راہِ خدا میں) دیا، اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا تو ہم اس کیلئے (نیکی کی) پکی بات کا راستہ آسان کریں گے

(۲) وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی، الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ
یَتَزَکّٰی، وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی،
اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی، وَلَسَوْفَ
یَرْضٰی (لیل: ۱)

اور اس (دوزخ کی آگ) سے وہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، مگر اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے اور وہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا میں دینے کی عادت، اطاعت و عبادت یا نیک کاموں کے کرنے کی روح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے، یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے، دوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیاوی ناموری یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو، بلکہ مقصود صرف خدا ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اسکا دامنِ دل پاک ہو جائے، تو خدا فرماتا ہے، تو خدا بھی اس کے اس عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وہ بھی خوش ہو جائے گا، اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اس سے دل میں پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے، دنیا کے اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے، اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی برملا تعریف، اور جمع مال حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی، اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیرووں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کیلئے جاتی رہے۔

وَیْلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۝
نِ الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ یَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ (ہمزہ: ۱)

پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی، اور اسکو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے:-

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (الفجر ۱)	اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔

یہی محبت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی، اور میرا مال خرچ ہو جائے گا اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (بقرہ ۳۷)	شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل) کو کہتا ہے، اور خدا تم سے اپنی طرف سے گناہوں کی بخشائش اور فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ کشائش والا ہے، جاننے والا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے یہ دل کی وہ کنجی ہے جس سے عمل اور علم کا ہر بند خزانہ کھل جاتا ہے، حکمت کا یہ خزانہ اسوقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اس کے دل سے دنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس اوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا :۔

یُّؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط (بقرہ: ۳۷)	وہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی اس کو بڑی دولت ملی۔

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے، اس کا سراسر دھوکا ہے اور خدا کا یہ وعدہ کر دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دوات کی محبت ایک آزمائش ہے، اس آزمائش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے، پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا، کیونکہ ہر اونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا، اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِیْمٌ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ط وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ، اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ وَاللّٰهُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ہ (تغابن: ۲)	تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے، اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے، تو اللہ سے ڈرو، جتنا ہو سکے، اور اس کی باتوں کو، سنو اور مانو، اور (راہ خدا میں) خرچ کرو اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنی جان کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اسکو تمہارے لیے دونا کریگا اور تمہارے گناہ معاف فرمائیگا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بردبار ہے۔

ان آیتوں میں انفاق اور کارِ خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے، وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے، قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں، یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتے رہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تمول کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے، اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے، اور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں۔

۱۔ میری چیز ہے میں دوسروں کو کیونکر دوں۔

۲۔ دوسروں کو دوں گا تو میرے کمی ہو جائے گی، جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہوگی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اس نے یہ بتایا اور اپنے پیرووں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں وہ صرف خدا کا ہے، وہی اس کا مالک ہے اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دیجانی چاہیے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (حدید:۱)	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

بخل کی برائی میں کہا:۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران:۱۸)	اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں، جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ انکے حق میں بہتر ہے، بلکہ یہ اُنکے حق میں بُرا ہے، قیامت کے دن اُن کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا، جس کا بخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآن پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے:۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۞	اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آئی ہے:۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ،	آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں، تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہوگئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسول کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعم باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ ان کے دینے سے ہوگا، تردید کی، فرمایا:۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (منافقون) وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں، کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں اُن پر خرچ نہ کرو، تاکہ وہ[1] چھوڑ کر الگ ہو جائیں اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں[2] اور زمین کے، اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں،

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوتی کی کل چل رہی ہے ان کے بل بوتے سے ہے۔ خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے، آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کا ہے، وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے، دوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا، فرمایا:-

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (شوریٰ ۲)	اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور ناپ دیتا ہے، وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں انسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں، اگر ایک میں انسان کی فیاضی، مال کے عدم محبت، ایثار، اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے، تو دوسرے میں انسان کی قناعت پسندی بے طمعی اور جذبۂ صبر کی آزمائش ہے، فرمایا:-

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا (فجر)	سو آدمی جو ہے جب اُس کا مالک اس کو جانچے، پھر اس کو عزت دے اور نعمت دے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزت دی، اور جب اسکو جانچے تو اس کی روزی اس پر تنگ کرے، تو کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے ذلیل کیا، یہ کوئی بات نہیں۔

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونوں خدا کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں دولتمند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آرہی ہے مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں، قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچکر اس کی غلطی بتائی ہے۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ	سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے تو ہم کو پکارے، پھر جب ہم اپنی طرف سے اسکو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ یہ تو مجھے علم پر[3] ملا ہے (خدا فرماتا ہے) بلکہ یہ تو جانچ ہے، مگر بہتیرے اس کو نہیں سمجھتے، یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی، اور جو کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں اور جو ان میں سے گنہگار ہیں ان پر بھی ان کی کمائی کی برائیاں

---

[1] یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں [2] اس کا ایک مطلب تو اہل تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا اور دوسرا یہ کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے (دیکھو روح المعانی جلد ۷ صفحہ ۱۱ مصر ۱۲) [3] چنانچہ قارون کو جب خدا میں خرچ کرنے کی (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ أَوَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَآءُ وَيَقْدِرُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ. (زمر: ۵)	پڑنے والی ہیں، وہ تھکا نہیں سکتے کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے لیے چاہتا ہے، پھیلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، ناپ کر دیتا ہے، اس میں ایمان والوں کے لیے البتہ نشانیاں ہیں۔

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے، اس کا یقین انسان کو آ جائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اس کے لیے آسان ہو جائے اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے، خدا نے فرمایا:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُبِينٍ. (ہود: ۱)	اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں مگر یہ کہ اسکی روزی خدا پر ہے، وہ جانتا ہے جہاں اسکو ٹھہرنا ہے (یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں اسکو سونپا جاتا ہے (یعنی قبر) سب (علم الٰہی) کھلی کتاب میں موجود ہے۔

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اسی کا حصہ تھا۔ اس لیے درحقیقت وہ ہمارا تھا ہی نہیں، اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے ان یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے، وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے خدا تعالیٰ پوچھتا ہے:۔

وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط (نمل: ۵)	اور تم کو کون روزی دیتا ہے، آسمان سے اور زمین سے، اللہ کیساتھ کوئی اور خدا بھی ہے۔

روزی دینا اُسی کا کام ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (ذاریات: ۳) بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے زور آور، مضبوط۔

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طرح طرح کے پُراثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے۔ فرمایا "تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا[1]" یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دوسروں کو نہ دو گے تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کرلیگا اور تم کو نہیں دیگا، ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے، فرمایا تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اس نے آگے بھیجا، اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے[2]" ایک دفعہ آپ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلایا، یا کھا لیا تو اس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اسکو پرانا کر چکا[3]۔

فرمایا "اے ابوذر! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس احد پہاڑ برابر سونا ہو، اور تیسرے دن تک اس میں سے

(بقیہ حاشیہ) نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا، قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (قصص: ۸) قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے (حاشیہ صفحہ ہذا)۔ [1] صحیح مسلم ۲ باب الحث علی الانفاق

[2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ماقدم من مالہ فہو لہ۔ [3] جامع ترمذی باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔ حدیث حسن صحیح۔

ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے، مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں، میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔" پھر فرمایا ہاں جن کے پاس یہاں ہے، ان کے ہی پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا، لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو"[1]

فرمایا رشک دو ہی پر روا ہے، ایک اس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو ہاتھوں سے اسکو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے[2]۔

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اس میں جس کا مصرف صحیح نہ ہو، یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو، اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی برائی قرآن پاک میں آئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے، اور جب موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں، قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پُر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (منفقون : ۲)	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آنے لگے، تو کہے کہ اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوں میں ہو جاتا۔

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ (منفقون : ۲)	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا جب اُس کا وقت آجائے، اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو۔

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کر لینا ہے، ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کونسا صدقہ سب سے بڑا ہے۔ فرمایا یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بڑی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو، حالانکہ وہ اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا[3]۔

فرمایا اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر، اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے بُرا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلعم ما احب ان لی مثل احد ذہبا۔ [2] صحیح بخاری کتاب العلم [3] صحیح مسلم ۱ : ۳۰۱ مصر باب بیان افضل الصدقۃ۔

عِفّت و پاکبازی

عفت و پاکبازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے، جن کا لگاؤ عزت و آبرو سے ہے، اسی لیے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے، جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں، چنانچہ سورۂ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں، ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ
اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ
فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (مومنون: ۱)

اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے تو ان پر کچھ الزام نہیں، لیکن جو اس کے علاوہ کے طلبگار ہوں، تو وہی لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورۂ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے، ان میں ایک عفت اور پاکبازی بھی ہے، فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (معارج: ۱) اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاکدامن ہیں:-

وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (احزاب: ۵) اور اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرنیوالے مرد اور پاسبانی کرنیوالی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفت اور پاکدامنی کے لیے قرآن کی اصطلاح "حفظ فروج" ہے، حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں، اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے، کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لیے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے، مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے، فروج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اس لیے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو، اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضاء میں سے اس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے، اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو، اس طریق تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفت و پاکبازی کا جو تخیل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفت و پاکبازی کے لیے قرآن کا دوسرا لفظ اِحصان ہے جو حِصن سے بنا ہے، جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں، اس سے حَصَانٌ، اِحْصَانٌ، مُحْصِنٌ اور مُحْصَنٌ، الفاظ بنائے گئے ہیں: پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے، اس کے معنی پاکدامن عورت کے ہیں، دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں، یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے، دو دفعہ حضرت مریمؑ کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں، ماضی معروف کے صیغہ میں،

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا
(تحریم : ۲) ..... وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	..... اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا
فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا (انبیاء : ٦)	تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لاکر اپنی حفاظت میں لے لیا، لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آکر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے، فرمایا:-

فَإِذَا أُحْصِنَّ (نساء : ۴)	تو جب وہ نکاح کی قید میں آچکیں۔

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَةٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:-

مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ (نساء : ۴)	حفاظت میں لانیوالے نہ مستی نکالنے والے۔
مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ (۰)	حفاظت میں آنیوالیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے حیوانی خواہش۔ فع کرنا نکاح کا مقصد نہیں، اسی لیے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بیبیاں) دو معنوں میں آیا ہے ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:-

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ (نساء : ۴) اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)

دوسرے شریف آزاد بیبیوں کے معنی میں جیسے:-

وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَنْكِحَ	اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف و آزاد بیویوں کے نکاح
الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ (نساء : ۴)	کا مقدور نہ ہو (تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے:-

حٰفِظٰتٌ لِلْغَيْبِ (نساء : ۴)	پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوت و رسالت کا لازمی جزء ہے، نبی، نبی کے سلسلہ نسب اور نبی کے اہل بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاکدامنی کی شہادت دی اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا
(تحریم : ۲) ..... وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا	..... اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا
فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُوحِنَا (انبیاء : ٦)	تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسفؑ نے جس پاکبازی کا ثبوت دیا، اس کی گواہی خود عزیز مصر کی بیوی نے دی:-

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ (یوسفؑ) اور میں نے اس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لیے کیا :۔

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ (یوسف : ۳) تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کریں، وہ بے شبہہ ہمارے چنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خدا کے چنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰؑ کی تعریف میں فرمایا گیا :۔

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (آل عمران : ۴) اور سردار ہوگا، اور اپنی قوت شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا، اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہل بیت نبویؐ کی زندگی جس عفت، عصمت اور پاکبازی کی تصویر تھی، غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی :۔

اُولٰۗىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (نور : ۳) یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، ان کے لیے بخشش ہے، اور عزت والی روزی۔

عفت و پاکدامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَةٌ[1] آیا ہے، جس کے معنی بہت بڑی برائی کے ہیں، جیسے :۔ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (نساء : ۳) مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی برائی کریں۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ (نساء : ۳) اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس برائی کا مشہور عربی نام زنا ہے، قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل : ۴) اور زنا کے قریب نہ جاؤ، بے شک یہ بڑی برائی اور برا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے، یہ نہیں فرمایا کہ "تم زنا نہ کرنا" بلکہ یہ کہا کہ "تم زنا کے قریب نہ جانا" اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی، بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی، اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا، یا دوسرے غیر شریفانہ حرکات کرنا، ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لیے اسلام نے ان ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا، مثلاً

---

[1] اسکا یہ منشا نہیں کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے، مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ
وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (نور: ۴)

اے پیغمبر ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اور اپنے ستر کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے بڑی ستھری بات ہے، اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذرا سی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے، اس لیے ان پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں، مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لیے زمین پر بھولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جل کر نہ بیٹھیں، کسی عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے، یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں، فرمایا:۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ
وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ
اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى
جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ
اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ
اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ
اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ
لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ
بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ
وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (نور: ۴)

اور اے پیغمبر ایمان والی بی بیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے[1] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام) پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں مگر اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے شوہر کے باپ، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں[2] یا اپنے غلاموں یا اپنے ان مرد نوکروں کے آگے جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں، اور نہ مسلمان عورتیں اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار کو وہ چھپاتی ہیں ان کا پتہ لگ جائے اور تم سب مل کر اے مسلمانوں خدا کے آگے توبہ کرو شاید تم بھلائی پاؤ۔

اور حسب ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے مگر عام کے لیے اس میں بیروی کا نمونہ ہے:۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ

اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر کوئی عورت، اگر تم

---

[1] جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی (یا) انگلیوں کی انگوٹھی، اس لیے چہرہ ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

[2] یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے (روح المعانی) ۱۲

اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (احزاب: ۴)

(اللہ کا) ڈر رکھو، سو تم دب کر (دھیمے سے) بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ خواہش کرے اور نیک بات کہو اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو اور جیسے نادانی کے پہلے زمانہ میں دستور تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے دکھاتی نہ پھرو۔

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ، الآية (احزاب: ۷)

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں اس کے بدوں کہ تم کو اجازت دی جائے (کھانے کی دعوت کے لیے)، داخل نہ ہو۔

گو یہ حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے، مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں، چنانچہ عفت و پاکدامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (نور: ۴)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو، جب تک خبر نہ کر لو، اور ان کے گھر والوں کو سلام نہ دے لو، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیے کہ پردہ کے اوٹ سے مانگے، یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے چنانچہ کاشانۂ نبویؐ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے :۔

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ (احزاب: ۷)

اور جب تم مانگنے جاؤ ان بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے اوٹ سے، اسمیں تمہارے اور انکے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔

یہ حکم گو شان نزول کے لحاظ سے ازواج مطہرات کے سلسلہ سے ہے، مگر اس میں عام مسلمان گھروں کیلئے بھی حسن ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں، تاکہ ان کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے، اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بیبیاں ہیں ان کو چھیڑنا تو کجا ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے فرمایا :۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ[1] بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں)، تو ان کو ستایا نہ جائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا) روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رکیں تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ

---

[1] یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا [illegible] ہو۔ [2] التبرج اظهار الزينة للناس الاجانب (لسان العرب)

فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (احزاب : ۶۰) رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بیبیوں کو جو غلط نماس مزدورتوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے، اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھے تھے، اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو دو حکم دیے۔ شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے بلکہ ان کو شہر بدر کیا جاسکتا ہے اور مسلمان بیبیوں کے لیے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھر سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں، اس کے لیے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں، جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں، اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بیبیاں ہیں، جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[۱] اور لوگ اس کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ ابن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا، مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے، عورتیں بناؤ سنگار کر کے گھر سے نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں بدکار عورتیں شراب کی محفلوں میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے[۲] اور نشان کے لیے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں۔ اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی، بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لیے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے چنانچہ اس پر یہ آیت اتری :۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ
اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (نور : ۳۳)

اور تمہاری لونڈیاں کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لیے زبردستی بدکاری نہ کرایا کرو اور جو ان کو اس پر مجبور کریگا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

اس لیے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا[۳] اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ کسی مسلمان مرد کے لیے اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے، کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی ہے۔ سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی، وحی الٰہی

---

[۱] تفسیر سورۂ طبری تفسیر سورۂ نور صفحہ ۱۲۰ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد [۲] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھیے ؎
رحیب قطاب الجیب منها رفیقة : بجس الندامی بضة المتجرد [۳] صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ ۱۲

نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً	بدکار مرد، بدکار ہی عورت یا مشرک عورت سے نکاح کریگا
وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ	اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا،
وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (نور: ۱)	ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آسکتا ہے۔ اسی لیے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ	گندی عورتیں، گندے مردوں کے لیے ہوتی ہیں، اور گندے
وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ	مرد گندی عورتوں کے لیے، اور پاک عورتیں پاک
لِلطَّيِّبٰتِ (نور: ۳)	مردوں کے لیے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لیے۔

اسی لیے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاکباز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں[1] بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز نہیں، اور ان کی دلیل سورۂ نور کی اوپر والی آیت کے علاوہ اس حدیث سے ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے، ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی کیا جائے۔[2]

غرض اہل ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاکبازی ہے، ان کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصور نہیں آنا چاہیے چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے، ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں، جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے، اور بدکاری نہیں کرتے، فرمایا:۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا	اور جو خدائے برحق کیساتھ کسی اور خدا کو نہیں پکارتے،
اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ	اور کسی ایسی جان کا جس کو خدا نے منع کیا ہے، خون
اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (فرقان: ۶)	نہیں بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔

---

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے، یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے اور اس آیت سے اس کی جو حرمت بظاہر سمجھی جاتی ہے، اس سے مراد اس کی برائی ہے، یا یہ کہ اہل ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا انکحوا الایامیٰ منکم اور فانکحوا ما طاب لکم من النساء سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے، لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے، اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا، چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا، ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زن و شوہر میں کفو ہونا شرط ہے، اور چونکہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ نکاح فریقین میں جو عفیف ہے اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا، ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو، توبہ کرنے کے بعد جائز ہے (دیکھو احکام القرآن، جصاص رازی و تفسیرات احمدیہ ملا جیون و تفسیر کبیر رازی اور روح المعانی، تفسیر آیت مذکورہ)

[2] ابوداؤد کتاب النکاح۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے اس کے بعد جو دو باتیں ہیں ان میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے، اور دوسری عزت و آبرو سے۔

قرآن پاک میں عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں، جن کا بیان اوپر آیا ہے، اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں، ان کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ایک صحابی کو فرمایا کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے، مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں[1] حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ اے اسماء، جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں[2] حکم دیا کہ مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں[3] فرمایا کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہل خانہ کی بے ستری ہو[4] فرمایا کہ "عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے[5]" سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گذرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی، یہ بھی ارشاد ہوا کہ عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ[6] چلے تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے، یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے[7] کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے، یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے، اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو، اور کوئی اندر گھس گیا تو اس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے[8]

یہ ساری ہدایتیں اسی لیے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاکدامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ ان کے لیے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی، تاکہ ان کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ	بدکاری کرنے والی عورت، اور بدکاری کرنے والے
مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (نور: ۱)	مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیاہے مردوں اور عورتوں[9] میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں انکو سنگسار کرنیکا بھی حکم ہے، اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لیے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے ان میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی، فرمایا،

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی نظرۃ الفجاءۃ [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المراۃ زینتھا [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت [5] ابوداؤد کتاب الترجل باب فی المراۃ تطیب للخروج [6] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق [7] مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیھا [8] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت [9] یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی۔

وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ (ممتحنہ۔ ۲)

اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں پاؤں کے بیچ میں بہتان باندھ کر لایا کریں گی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور سے عورتوں سے لی گئی حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو[۱]، یا یہ بات بھی عدم قتل کے عموم میں داخل ہو، اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے، جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ ان میں سے کس کا لڑکا ہے، بعض عورتیں دوسرے کے بچہ کو اپنا بنا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپ دیتی تھیں، یہ ساری باتیں عفت اور پاکدامنی کے خلاف تھیں، اس لیے ان سے باز رکھا گیا، اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں، فتح مکہ کے وقت آپؐ نے قریشی بیویوں[۲] سے اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد[۳] لیا بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا، اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پر بیعت[۴] کی۔

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لیے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹ بدنام کرنے کے جرم میں اسی کوڑے مارے جائیں گے، اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی، اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے، اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے[۵]۔

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور حقوق عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے، اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفت و پاکبازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا، بولے اس کے بعد؟ فرمایا کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا، بولے اس کے بعد، فرمایا یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت نازل[۶] فرمائی:۔

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ

اور جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں، اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اسکو

---

[۱] مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گیا ہے [۲] صحیح بخاری فتح مکہ [۳] تفسیر طبری، سورۂ ممتحنہ [۴] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان [۵] اسکی تفصیل سورۂ نور میں ہے، اسکے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے، بخاری باب اللعان [۶] بخاری کتاب الادب، باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل۔

اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ (فرقان: ۶۰) خدا نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لیے کی گئی ہیں کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک ہیں کہ جن سے یہ اُمید نہیں ہو سکتی ان سے یہ فعل ظہور میں آیا، اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے، چور جس وقت چوری کرتا ہے، اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے، تو مسلمان نہیں رہتا، کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے، اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا، اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگسار کرنا ہے، لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائیگا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے، ایک روحانی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگوں کے اخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی دیں، ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعل قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں جب اس کے شعلے بلند ہوتے تھے، تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ ان کے اندر سے نکل آئیں گے، لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے،[2] یہ عالم برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے برخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت موثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا، خداوند تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں۔[3]

یہ تو وہ شرف ہے جو پاکبازوں کو آخرت میں حاصل ہوگا لیکن پاکبازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں، ایک حدیث میں آپ نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے، جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، کہ دفعۃً پانی برسنے لگا، تینوں نے پانی سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی، سوءِ اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا، اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمال صالحہ کے واسطے سے خدا سے دعا کریں، چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا، ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی: "خداوندا! میری ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں بڑی

---

[1] بخاری کتاب الحدود، و باب الزنا و شرب الخمر۔ [2] بخاری کتاب الجنائز۔ [3] بخاری کتاب الحدود و باب فضل من ترک الفواحش۔

محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دیدوں وہ راضی نہ ہوئی میں نے سو دینار کما کر جمع کیے اور اس کو دیکر اپنی خواہش نفسانی پوری کرنی چاہی، لیکن اس نے کہا کہ خدا سے ڈر، میں فوراً رک گیا، خداوندا اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لیے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے چنانچہ وہ سرک گیا۔[1]

یہ روایت عفت و پاکبازی کو ان اعمال میں شامل کرتی ہے، جن سے خدا کا قرب ملتا اور دعا کو مقبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اسکو پوری دیانت سے رتی رتی دیدے اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوع انسانی کے سپرد کیا ہے، امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب: ۹)	ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اسکو اٹھالیا، بے شبہ وہ ظالم اور نادان ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو خائن ٹھہریں گے۔

خدا کا فرشتہ جو خدا کا پیغام لیکر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا، امانت سے متصف ہوتا تھا، تاکہ بندوں کے لیے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے، اسی لیے قرآن میں اس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے،

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (شعراء: ۱۱)	اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔
مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (تکویر: ۱)	اس کا کہا مانا جاتا ہے، وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت سے یہ کہا:

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ (شعراء: ۱۰)	میں تمہارے لیے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی خدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں اسمیں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے پہلے مکہ والوں کی طرف سے "امین" کا خطاب ملتا، کیونکہ آپ

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعاء من بر والدیہ

اپنے کاروبار میں دیانتدار تھے، اور جو لوگ جو کچھ آپؐ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپؐ جوں کا توں ان کو واپس کردیتے تھے،

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون:۱) اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی فتح مکہ کے وقت[1] انکے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی، اس پر یہ آیت اُتری۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا (نساء:۸) بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کردیا کرو۔

اس حکم کے مطابق یہ امانت ان کو واپس کی گئی، انہوں نے جب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہوگئے۔[2] بہرحال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے، اور معنی کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا، اسی لیے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کیساتھ[3] تکلیفِ شرعی ہے اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں، جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے، اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے، اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے کسی مجلس میں آپ ہوں، اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، کسی نے آپؐ سے اپنے کسی نجی کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے، اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے، یا بے سبب سُستی کرتا ہے یا دیر سے آتا ہے اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے۔

ان مسلمانوں میں جن کو خدا نے فلاح پانے کی خوشخبری سُنائی ہے، وہ بھی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون:۱) اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر کشاف زمخشری [2] ایضاً [3] تفسیر ابن جریر طبری۔

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانیوالی ہے، ان میں بھی وہ داخل ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (معارج، ۱) اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی یا سفر میں گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لیکر گرو رکھی

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیے کہ اپنی امانت ادا کر دے
رَبَّهٗ (بقرہ، ۳۹) اور چاہیے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسے سے غلط فائدہ اُٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں، کہ انہیں چیزوں کا نام خیانت ہے، جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے۔

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (انفال: ۳) اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لیے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری اُن سے نہیں مانگی، اور ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی، اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجیے، تو اس موقع پر قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔

يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ اے میرے باپ، اسکو نوکر رکھ لیجیے، سب سے اچھا نوکر جسکو
الْقَوِىُّ الْاَمِيْنُ (قصص، ۳) آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لیے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے، اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے، اور اس کو پوری دیانتداری کیساتھ انجام دے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو، وہ ایک دو گھنٹہ سُستی سے چپکے چوری بیکار بیٹھا رہے، تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے، لیکن اسلام کی دوررس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا، یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح امانت کے خلاف ہے۔ حدیثوں میں امانت کے بہت سے جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے، اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دو باتیں سُنی تھیں، ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا، دوسری یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ امانتداری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اُتری ہے (یعنی ان کی فطرت ہوتی ہے) پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے) حضرت

حذیفہؓ کہتے ہیں، کہ پھر آپؐ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی بتایا، فرمایا "پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی۔ اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائیگا، جو اُٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، لوگ ایسے ہوجائیں گے کہ لین دین کریں گے، لیکن کوئی امانت داری نہیں کریگا، اسوقت امانتداری کی مثال ایسی کمیاب ہوجائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانتدار شخص ہے، آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے، حالانکہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی[۱]"

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمانداری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے، اس کے بعد بری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا، جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں، اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو، اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا، اور جو کوئی کسی ناجائز کمائی سے کوئی مال پائیگا اور اس میں سے خرچ کریگا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی، اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا، بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے[۲]۔"

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس میں امانت نہیں، اس میں ایمان نہیں[۳]" اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے، ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو آپؐ نے فرمایا "جس سے مشورہ چاہا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے[۴]" اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہیے، الا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **المجالس بالامانۃ** یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہوں، مگر تین موقعوں پر، کہیں

---

[۱] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ کتاب الفتن والرقاق وصحیح مسلم ومسند احمد وترمذی وابن ماجہ۔ [۲] کنز العمال ج ۲ ص۳ حیدرآباد از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ۔ [۳] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از طبرانی اوسط وطبرانی کبیر وابن عدی فی الکامل، و بیہقی فی شعب الایمان۔ [۴] ادب المفرد بخاری باب المستشار مؤتمن۔

کسی کے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبروریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو تو متعلق لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیے[1]۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے[2]۔ راز کے یہی معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے، بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی شخص کسی سے بات کہے اور وہ احتیاطاً ادھر اُدھر اس طرح سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے[3]۔ امانت میں خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی گئی ہے[4]۔

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے، لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیکر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے، یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ "عورتوں کے باب میں خدا سے ڈرو" فرمایا "کیونکہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے[5]۔"

قیامت کی نشانیوں میں سے آیا ہے کہ "سب سے پہلے اس اُمت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہوگی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصہ خدا کے لئے نہیں[6]"، فرمایا میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی، جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے گی[7]، یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کار خیر میں دینے کو جرمانہ، جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے ان کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

شرم و حیا

انسان کا یہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے، عفت اور پاکبازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے، درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصا ہے، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے، اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متصف سب سے پہلے خود خداوند تعالیٰ ہے لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی

---

[1] ابو داؤد باب فی نقل الحدیث۔ [2] ابو داؤد کتاب الادب۔ [3] ایضاً۔ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق۔ [5] صحیح مسلم، حجۃ الوداع۔ [6] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس۔ [7] کنز العمال ج ۲ ص ۱۵ از سنن سعید بن منصور۔

ذات اقدس کے لائق ہیں مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو برائی کرتے دیکھتا ہے، لیکن ان کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا، حدیث میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "عزت اور جلال والے خدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے"[1] ایک دفعہ تین صاحب مسجد نبوی میں آئے آپؐ کے ارد گرد صحابہؓ کا حلقہ تھا ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے، دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے تیسرے صاحب چلے گئے، آپؐ نے فرمایا کہ میں ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذرا سی جگہ میں آ کر بیٹھا، وہ خدا کی پناہ میں آیا تو خدا نے پناہ کی جگہ دی، اور جو پیچھے جا کر بیٹھا، وہ شرمایا خدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا) اور جو چلا گیا اس نے[2] خدا سے منہ پھیرا تو خدا نے بھی اس سے منہ پھیرا۔

سورۂ بقرہ میں ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا (بقرہ ۳) خدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

یعنی کسی حق بات کو ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں، جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے :-

وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ (احزاب ۷) خدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا۔

حدیث میں بھی ہے :-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ۔[3] اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں۔

قرآن اور حدیث کے اس طرز ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خدا کی طرف خدا کی غیرت و حیا کے خلاف ہے، حدیث میں آتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لیے اس نے فواحش کو حرام کیا ہے۔[4]

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں دو لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف ان میں ایسا نمایاں تھا کہ خدا نے بھی اس کا ذکر کیا، ان کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں، تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں، اور جب ان کے باپ نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لیے بھیجا۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ (قصص) تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی ان کے پاس آئی۔

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح و ستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے، بلکہ بڑھتا جاتا ہے، اور اگر بری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا

---

[1] بیہقی کتاب الاسماء والصفات [2] بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام [3] بخاری کتاب الادب باب ما لا یستحیی من الحق

[4] صحیح مسلم کتاب التوبہ، عربی میں غیرت کا لفظ حیاء سے خاص ہے مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب سے ہو جاتے ہیں غیرت کے اصل معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں، جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

ہے، اسی لیے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا، ستر عورت کا خیال، نگاہیں نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا، یہاں تک کہ غسلخانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا اسی لیے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں، اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب بچہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا، آپؐ اینٹیں اُٹھا اٹھا کر لا رہے تھے، آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو، کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے، آپؐ نے ایسا کیا تو آپؐ پر بے ہوشی طاری ہو گئی، ہوش آیا تو زبان مبارک پر تھا میرا تہبند، حضرت عباسؓ نے تہبند باندھ دیا[1] نبوت کے بعد بھی آپؐ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:-

كان النبي صلى الله عليه وسلم اشد حياً من العذراء في خدرها۔[2]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ نشین کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔

بعض موقعوں پر آپؐ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی، مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے، جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے:-

إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ (احزاب: ۷)	تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے، تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لیے اس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے، جب اس میں بزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے، اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیاء کی وجہ سے نہیں کر سکتا، بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے، اس لیے حیا کی حقیقت میں بزدلی کا جو جزو شامل ہے، شریعت مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امر حق کے اظہار میں شرم وحیاء دامن گیر نہ ہو، لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا، اس وجہ سے نقصان اُٹھاتا تھا، اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیونکہ حیاء ایمان سے ہے۔[3]

یہی حیاء جو ایمان کا ایک جزء ہے شرعی حیا ہے، یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے، اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے، اس لیے وہ دونوں ایک ہی ہیں، لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے، ان کو اس شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لیے بذاتہ خود یہ فطری مادہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے، اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہار حق، وعظ وپند، تبلیغ ودعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے، حیا کے طبعی ضعف کو

---

[1] بخاری کتاب الحج باب فضل مکہ وبنیانہا [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء [3] بخاری کتاب الادب باب الحیاء

دور کر دیا جائے اور شریعت کے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے، مثلاً خدا نے قرآنِ مجید میں جابجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذکر کیا ہے، جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالت شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے، خدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خدا نہیں شرماتا، یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا، فرمایا:-

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (بقرہ: ۳)	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (گو) وہ مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ میں صحابۂ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف تو ہو رہی تھی، لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے، تاہم چونکہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آداب نبوت کے خلاف تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے فرمایا:-

إِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ (احزاب ۷)	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی، اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ (بات کے کہنے) میں (کسی کا بھی) لحاظ کرتا نہیں۔

اپنی ذاتی تکلیف کے لیے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش خلقی اور مروت کے خلاف تھا، اس لیے آپؐ کو اس سے شرم آتی تھی، تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا اس لیے خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں شرم و حیا کا موقع نہیں،

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابۂ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا، ایک صحابیہ آپؐ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں، اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم و حیا کے خلاف ہے تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ یا رسول اللہ! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر جنابت کا غسل فرض ہے؟!

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی، اکابر صحابہ اس درخت کا نام بتانے سے قاصر رہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے تاہم چونکہ کمسن تھے اس لیے شرم سے چپ رہے، لیکن چونکہ یہ شرم و حیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی اس لیے جب حضرت عمرؓ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی[1]

انصاریہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں، اور یہ ان کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں،

نعم النساء نساء الانصار لم یکن یمنعهن الحیاء ان یتفقهن فی الدین[2]	انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو حیا نہیں روکتی تھی۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما لا یستحیی من الحق للتفقه فی الدین۔ [2] مسلم کتاب الطهارة باب استحباب استعمال المغتسلة من الحیض فرصة من مسك فی موضع الدم۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ پہنچتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

الحیاء لا یاتی الا بخیر[1] حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی بُرے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے، بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے، کیونکہ یہی جذبہ حیا ہے جو انسان کو برائیوں سے باز رکھتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے کوئی روک نہیں سکتا اس لیے فرمایا کہ:

ان مما ادرک الناس من کلام النبوۃ الاولی اذا لم تستحی فاصنع ما شئت[2]۔ لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کا دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے، کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآن و حدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں، اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے۔ اسی بنا پر حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہر ایک دین کا ایک خاص خلق ہوتا ہے، اور اسلام کا خاص خلق حیاء ہے[3]، یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں[4]، اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے[5]۔ فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم و حیاء کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو، کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول و براز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرماؤ اور ان کا خیال رکھو[6]۔ مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

رحم

رحم بھی انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے، دنیا میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ کسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں، ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا جس کے دل میں اس جذبہ کا کوئی ذرہ نہ ہوگا، اس سے دوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو کم ہے اسی لیے اسلام کی اخلاقی تعلیم میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحیاء [2] بخاری کتاب الادب باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت [3] فتح الباری ج ۱۰ صفحہ ۴۴۴ [4] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ما جاء فی الحیاء [5] صحیح بخاری کتاب الایمان [6] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ما جاء فی الاستتار عند الجماع۔

کے بعد جو نام سب سے زیادہ اور اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی "بڑا رحم والا" ہے اسی کیساتھ دوسرا نام "رحیم" آتا ہے" یعنی رحم سے بھرا ہوا قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خدا کے علم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے، مسلمان کو حکم ہے، جب وہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے ہر سورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے دنیا میں جو کچھ ہے وہ خدا کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے خدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں۔

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (مومن ۔ ۱)	اے ہمارے پروردگار تونے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے۔

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے بلکہ :-

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (حشر ۔ ۳)	وہی رحم والا مہربان ہے۔

مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وہ دعاؤں میں کہیں :-

وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ	اور تو سب رحم کرنیوالوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں، وہ اسی کی رحمت کے آثار اور پرتو ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے، جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف "اتارا" ایک ٹکڑے کو اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے[1]۔

بنی نوعِ انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے، اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور خدا تعالیٰ نے آپؐ کو اسی وصف کیساتھ متصف کیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ	(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آئے ہیں
عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ	تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) انکو تمہاری
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ۔ ۱۶)	بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی امتیں ہیں، اور ان امتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَأْفَةً	اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے
وَّرَحْمَةً (حدید ۔ ۴)	ترس اور رحم ڈال دیا۔

اور اس وصف میں امتِ محمدیہ بھی ان کی شریک و سہیم ہے :-

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ	اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زور آور ہیں
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح ۔ ۴)	آپس میں رحم دل ہیں۔

آپس کے تعلقات میں ایک دوسرے کیساتھ نیکی کا برتاؤ کیا جاتا ہے، اس کو صلہ رحم کہتے ہیں، کیونکہ قرابتوں کے

---

[1] بخاری کتاب الادب۔

سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں، اور رحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے، ایک ہی اصل سے مشتق ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے، اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے، حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ[1] رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے، اور ساری رحم دلیوں کے جذبے اس کی شاخیں ہیں، بچوں کی محبت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک زانو پر مجھ کو ایک دوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے، پھر دونوں کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں[2]۔

ایک بار ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لیکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور لپٹانے لگا، آپؐ نے حالت دیکھ کر فرمایا کہ "تم اس پر رحم کرتے ہو؟" اس نے کہا "ہاں" ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو، اللہ وہ سب رحم کرنیوالوں سے زیادہ رحم کرنیوالا ہے[3]۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا، اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، بولے کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا، آپؐ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ "جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔

ایک اور بدو نے آپؐ سے کہا کہ آپ لوگ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ نہیں چومتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ "خدا نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے"[4]۔

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا امت محمدیہ کا ایک عنصر ہے، اس لیے فرمایا کہ "جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے"[5] اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیردستوں پر کھایا جاتا ہے، تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور امانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے صحابۂ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے:۔ رُحَمَاءُ بَیْنَهُمْ (یعنی وہ لوگ آپس میں رحمدل ہیں)

اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحمدلی و باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد کہ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے[6]، جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں، اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں، اس لیے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ۔ [2] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی [3] ادب المفرد باب رحمۃ العیال۔ [4] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقتہ [5] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الصبیان [6] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔

جس طرح ایک عضو کے درد دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔

اسلام نے جس رحمدلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوع انسان شامل ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا یہ بھی فرمایا کہ رحم کرنیوالوں پر، رحم کرنیوالا خدا رحم کرے گا، زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔[1]

رحمدلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوع انسان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا ایک شخص نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے، یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں آپؐ نے دوبارہ فرمایا کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کریگا جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے وہ اس رحمدلی کے بالکل مخالف تھا اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی ممانعت فرمائی

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے جو بلاغت کی جان ہیں، فرمایا:-

مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ان دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی، رحمدلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ ان ہی لفظوں سے ابھارا جا سکتا ہے اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا بھی رحم نہیں فرمائے گا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے، محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اس لیے اسمیں مسلمان کافر مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں، اور ان کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، ان پر ہلکا بوجھ لادنا اور ان کو سخت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں[2] "غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری بیکسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیر دستوں کی اعانت کرتے ہیں اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ ان سب کو گھیرے ہے، اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں کہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

عدل و انصاف

کسی بوجھ کو دو ٹھیک برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو

---

[1] بخاری ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی رحمۃ الناس و ادب المفرد باب ارحم من فی الارض (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

تو اس کو عربی میں عدل کہتے ہیں[1] اور اس سے وہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں، یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے، اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے، اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل و انصاف کا قدم بھی کم جاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے، علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وہ حق بات کہتا ہے، اور وہی کرتا ہے جو حق ہے[2] قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے، فرمایا:

وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ (مومن : ۲) اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

یہ عدل عملی کی طرف اشارہ ہے، دوسری آیت میں ہے :-

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ (احزاب : ۱) اور اللہ حق بات کہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے عدل قولی کو ظاہر کرتا ہے، اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں :-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (انعام : ۱۴) اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کیساتھ پوری ہو گئی ہے۔

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لیکر زمین تک پھیلا ہے، صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے، وہ اپنی تمام مخلوقات پر اپنی شہنشاہی پورے انصاف کیساتھ قائم کیے ہوئے ہے، اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران : ۲) خدا نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں، اور فرشتوں نے اور علم والوں نے، وہی خدا انصاف کو لیکر کھڑا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کی ضرورت ہے اور نظام عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنیکا حکم فرمایا:-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل : ۱۳) بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنیکا حکم دیتا ہے۔

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے اللہ تعالیٰ نے نظم عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے، اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لیکر ان میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے، مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں، اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ) ۵ صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم ۶ فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۲ مصر۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] مفردات راغب اصفہانی [2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۲۱ الٰہ آباد ؛

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً
أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نساء ۔ ۱)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی (بی بی) کرنا یا جو (لونڈی) تمھارے قبضہ میں ہو۔

عورتوں کی طرح یتیموں کے حقوق کی حفاظت کیلئے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے، اس لیے فرمایا :۔

وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ (نساء ۔ ۱۹)

اور (خاص کر) یہ کہ یتیموں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے اس لیے فرمایا :۔

وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ (انعام : ۱۹) اور انصاف کیساتھ (پوری پوری) ناپ کرو، اور (پوری پوری) تول۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کیجائے، کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ نہایت عام و وسیع ہے اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دنائت ثابت ہوتی ہے اور اس سے روح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ :۔

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (بقرہ : ۳۹)
فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا
أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ
بِالْعَدْلِ (بقرہ : ۳۹)

اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) لکھنے والا انصاف کیساتھ لکھدے۔
پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا، اگر وہ کم عقل ہو یا معذور
یا خود اولئے مطلب نہ کر سکتا ہو تو (جو اس کا مختار کار
ہو وہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (انعام : ۱۹)
...... يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ
شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ
قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ
أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ۔
(مائدہ ۔ ۲)

اور (گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے) جب بات کہو تو گو
(فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ ہو انصاف کا پاس کرو)
...... مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور
لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں)
انصاف نہ کرو (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوہ)
انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے، اور یہ کہ ہر حال میں عدل و انصاف کرنا تقوی کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے، اس پر بھی رسول اسلام علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے۔

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (شوریٰ، ۲)

اور کہدے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری ہے اور مجھے (خدا سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے، اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ ہی ہم سب کو جمع کریگا، اسی کی طرف (سب کو) پھر جانا ہے۔

جس عدل اور برابری کا حکم اس آیتِ پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں، ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں، دوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے، بلکہ وہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو یہ صورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کیساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کیساتھ سختی کا قانون برتا جاتا ہے، خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے، اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص، اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے، ہم سب اس کے غلام ہیں، اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے ہم کو ہمارے اعمال، اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا اس میں جھگڑنے کی کوئی بات نہیں، سب کو قیامت میں اس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے، جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر برا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل و انصاف کی راہ میں ان دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہل ایمان کو اس کٹھن منزل کی راہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے، ارشاد خداوندی ہوا،

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (نساء، ۲۰)

اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کیلئے گواہ بنو، اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا، یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولتمند ہے یا محتاج ہے، تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے، کہا گیا کہ معاملات میں عدل و انصاف کی حمایت، تمہارا مقصد ہو جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے، نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولتمند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا، پھر اس فیصلہ اور

گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچالیا جائے، مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولتمند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ، اور قرابت کو بھی نہ دیکھو جو حق ہو وہ کر دیا کہو پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپالو، تو یہ سب باتیں عدل اور انصاف کے خلاف ہیں، کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں رد و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے، مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کا لحاظ رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے، الغرض یہ ہے کہ عدل و انصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگراں نہیں ہو سکتا اس لیے نہ گواہوں کو اس کے لیے طرفداری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیے، بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر والی ہے۔

لوگ عدل و انصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے، تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے، تمہاری کم بین نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے، وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے، غور کیجیے کہ ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے، کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا، حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی، پھر ایک اور حیثیت سے دیکھیے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی، اور ظلم کی بنیاد رکھی، جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے، غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں گناہ ہے، اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ	اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال میں سے
اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ: ۱۲۰)	گناہ کما کر کچھ کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

اس رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے[۱]۔

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے، اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم

---

[۱] تفسیر روح المعانی۔

دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں، اور ایک دوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں، یعنی اس وقت جب عقل کی قوت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے، فرمایا :-

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا
فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا
عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ
اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا
بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ
الْمُقْسِطِیْنَ (الحجرات: ۱)

اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو پھر اگر اُن میں کا ایک (فرقہ) دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس سے تم (بھی) لڑو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف رجوع کرے پھر جب رجوع لائے تو دونوں میں برابری کیساتھ صلح کرادو اور انصاف کو ملحوظ رکھو بے شک اللہ انصاف کرنیوالوں کو محبوب رکھتا ہے۔

عدل و انصاف حکومت و سلطنت کی عمارت کا ستون ہے، اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں، اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو ارشاد ہوا :-

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى
اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ
تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (نساء: ۸)

بیشک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ، اور یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے فیصل کرنے لگو، تو انصاف کیساتھ فیصلہ کرو۔

اہل تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت پاک میں امانت سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دوسرے پر چاہیے، خدا نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے، اور یہ فیصلہ دوست و دشمن کافر و مسلم سب کیساتھ یکساں عدل و انصاف کیساتھ ہونا چاہیے، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کے معاملات میں حکم ہوا :-

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ
اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (مائدہ: ۶)

اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا، کیونکہ اللہ انصاف کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنیوالوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کیساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے، قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو قوت نطق سے محروم نہ ہو صاحب علم ہو چنانچہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُهُمَآ

اور خدا ایک دوسری مثال دیتا ہے کہ دو آدمی ہیں ان میں کا

اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (النحل، ۱۰)

ایک گونگا اور گونگے کے علاوہ بیکار یا غلام کہ خود کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وہ اپنے آقا کا محتاج ہی ہے کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا کیا ایسا غلام اور وہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں جو لوگوں کو عدل انصاف کی تاکید کرتا ہے اور خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اسکو صفت نطق سے متصف ہونا چاہیے ورنہ وہ حکم نہ دے سکیگا، اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوِ مرتبت کا اظہار ہوتا ہے، اور جب تک وہ قادر نہ ہو علوِ مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا، اور عالم ہونا چاہیے تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت، قدرت اور علم دونوں میں شامل ہے، پہلا شخص گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے، پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا، اسلیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق، معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے، یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے تاہم امام و حاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے، اس لیے حدیث میں امامِ عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لیگا، جن میں ایک شخص امامِ عادل ہوگا[1]

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول و قرار کر لیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران و رعد ۴)	بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ (زمر، ۲)	اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (آل عمران، ۲۰)	(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (روم ۱)	اللہ کا وعدہ ہو چکا ہے، اللہ وعدہ کیخلاف نہیں کرتا۔
وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (حج ۶)	اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔
فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ (بقرہ ۹)	تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا۔
وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (توبہ ۱۴)	اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

---

[1] بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش؛

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے، اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول و قرار کریں اس کے پابند رہیں، سمندر اپنا رخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے، اور کسی سے جو قول و قرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے، وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی اسلام پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (بقرہ۔ ۲۲) اور اپنے اقرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون۔ ۱) اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

ایک دوسری سورہ میں جنتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے اس تصویر کا ایک رخ یہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (معارج۔ ۱) اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا، معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے، اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذکر کیا، اور اس کے بعد عہد کا عام ذکر کیا، یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا، اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا ہے۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (بنی اسرائیل۔ ۴) اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ (قیامت میں) عہد کی بازپرس ہوگی، اور جب ناپ کر دو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور (جب) تول کر دیا ہو تو ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو (معاملہ کا) یہ بہتر (طریقہ) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے، اس لیے تاکیداً پابندی عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول و قرار کی ضرورت نہیں، بلکہ عرف عام کے سارے مسلمات سوسائٹی کے قول و قرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے، یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے، جو روز الست کو بندوں سے اپنے خدا سے باندھا، اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے، اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت

میں کیا گیا ہے، تیسرا عہد وہ ہے جو عام طور سے قول و قرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے، اور چوتھا عہد وہ ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے، ارشاد ہے :۔

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ	جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور اپنے
الْمِیْثَاقَ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ	اقرار کو نہیں توڑتے، اور جو خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے
بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (رعد : ۳)	کا حکم دیا ہے، اُن کو جوڑے رکھتے ہیں۔

اس آیت میں پہلے اس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے، پھر اس قول و قرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے، اسکے بعد اس فطری عہد کا ہے، جو خاص کر اہل قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے، جو خدا کو حاضر و ناظر بنا کر یا خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں، فرمایا :۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا	اور اللہ کا نام لیکر جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرار کرو
تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَقَدْ	تو اس کو پورا کرو، اور قسموں کو پکی کرکے توڑا نہ کرو،
جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا (نحل : ۱۳)	اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن ٹھہرایا ہے۔

اس معاہدہ کے عموم میں صحابہ کرام کے وہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے اور وہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں، جو جاہلیت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے، ساتھ ہی وہ سب معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں جو خدا کا واسطہ دیکر اور خدا کی قسمیں کھا کر بھی مسلمان ایک دوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہد الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے فرمایا :۔

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ	اور اللہ کا قرار پورا کرو، یہ اُس نے تم کو نصیحت کر
بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (انعام : ۱۹)	دی ہے، تاکہ تم دھیان رکھو۔

اس عہد الٰہی میں خدا کے وہ فطری احکام بھی داخل ہیں، جن کے بجالانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے، یا خدا نے تم سے لیا ہے۔ اسی طرح اس نذر اور منت پر مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے، اور انسانوں کے اس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے تھے۔

صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی، اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی، اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو، جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، ان سے لڑنے کی گو اجازت دیدی گئی تھی، اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا پھر بھی یہ حکم ہوا کہ ان کو چار

مہینوں کی مہلت دو۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ (توبہ ۱)

اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو پورا جواب ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، تو پھر لو (تم اے مشرکو!) ملک میں چار مہینے اور یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی، تو ساتھ ہی ان مشرکوں کیساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنہوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا فرمایا:۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۱)

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی، اور نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، بے شک اللہ کو خوش آتے ہیں تقویٰ والے۔

اور ان مشرکوں کیساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالیٰ تقویٰ بتاتا ہے، اور جو اس عہد کو پورا کریں انکو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنہوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کیساتھ ان مشرکوں کیساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنہوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۲)

مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس کے رسول کے پاس کوئی عہد ہو، مگر وہ جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک معاہدہ کیا، جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو بیشک اللہ کو تقویٰ والے خوش آتے ہیں۔

سیدھے رہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو، اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار تقویٰ والوں میں ہے جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں، نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ تعالیٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۱)

مسلمانو! (اپنے) قراروں کو پورا کرو۔

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے اور اصطلاح شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے، چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

"اوفوا بالعہد" خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا

بِالْعُقُوْدِ اور اس قول میں تمام عقد مثلاً عقد بیع، عقد شرکت، عقد یمین، عقد نذر، عقد صلح اور عقد نکاح داخل ہیں، خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضا یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے[1]

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے، اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے، یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے، حسن عہد میں داخل ہے، صحیح بخاری[2] میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ مجھ کو حضرت خدیجہؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا، میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت ان کی سہیلیوں کے پاس ہدیۃً بھیجا کرتے تھے یعنی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد بھی ان کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو ان کی زندگی میں جاری تھا امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "**حُسْنُ الْعَهْدِ مِنَ الْاِيْمَانِ**" اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، آپؐ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں، تمہارا کیا حال ہے، ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟ اس نے کہا کہ اچھا حال رہا، جب وہ چلی گئی تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ آپؐ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی، فرمایا عائشہ! یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے یہاں آیا کرتی تھی اور حسن عہد ایمان سے ہے" یعنی ملنے جلنے والوں سے حسب توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے، اور حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپؐ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے۔

لَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ (احمد طبرانی وابن حبان) جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں۔

یعنی اس قول و قرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے یا بندہ بندہ سے کرتا ہے، پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعہ کا نام دین ہے، اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وہ دین کی روح سے محروم ہے۔

احسان یعنی بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے، اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر محسن کون ہوگا جس کے احسانات کی حد و پایاں نہیں عرش سے فرش تک جو کچھ ہے

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۵۔ [2] بخاری کتاب الادب باب حسن العہد من الایمان۔

وہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے:۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۵)
اور اگر اللہ کے احسان گنو تو ان کو پورا گن نہ سکو گے بے شک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے اس احسان کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر ان کو قیدخانہ سے نجات دی اور وہ ان کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (یوسف: ۱۱)
اور خدا نے مجھ پر یہ احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔

اسی طرح قارون کے قصہ میں اللہ تعالیٰ کے صفت محسن سے متصف ہونے کا اشارہ موجود ہے، فرمایا:

اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص: ۸)
تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔

اس دنیا میں جہاں قدم قدم پر ادلا بدلا اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے احسان[1] حسن سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پورا کیا ہے، اور قرآن مجید میں جابجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے، چنانچہ سورۂ نحل میں حکم کی صورت میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى (نحل: ۱۳)
اللہ انصاف اور لوگوں کیساتھ احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور راحت و رنج کی پرواہ نہیں کرتا، وہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دیدیتا ہے۔ لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے خداوند تعالیٰ نے عدل کیساتھ اس کا ذکر کیا، پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد ہی کیساتھ مخصوص نہیں بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں، اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابتدار، یتیم، محتاج، قرابتدار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں اس لیے

---

[1] اس موقع پر ایک اور بات خیال میں رہے عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں، اردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب خاص وہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں الی باب کے صلہ کے ساتھ ہوگا قرآن پاک میں جہاں جہاں مُحْسِنٌ یا مُحْسِنِيْنَ یا مُحْسِنُوْنَ کے الفاظ بلا صلہ آئے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لیے جائیں گے اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (توبہ: ۱۵)
بے شبہ خدا اچھے کام کرنیوالوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا

لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (زمر: ۶)
کاش اگر میرے لیے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳)
اور اللہ احسان کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے سورۂ نساء کی ایک آیت میں (رکوع: ۵) ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کیساتھ احسان کرنیکا حکم دیا ہے اور باپ ماں کیساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے (بقرہ: ۹، زخرف: ۲، انعام: ۱۹، اسرائیل: ۳)

بہر حال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے لیکن جس کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے، اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرنے اور ہر شخص کو اپنے جان و مال سے فائدہ پہنچائے یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص: ۸)	اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔

احسان کی اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے، خداوند تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی، اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف: ۱۱)	اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں، ان کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا بڑا کام تھا جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو، فرمایا:۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (بقرہ: ۲۹)	طلاق (جسکے بعد رجوع بھی ہو سکتا وہ تو دو ہی طلاقیں ہیں جو) دو دفعہ (کر کے دیجائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو، اور اس کی ادائی میں لیت و لعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو فرمایا:۔

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ،

(بقرہ: ۲۲) پھر جس (قاتل) کو اسکے بھائی (طالب قصاص) کیطرف سے کوئی جزو (قصاص) معاف کر دیا جائے، تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارث مقتول کیطرف سے اسکا) مطالبہ دستور (شرع) کیمطابق اور (قاتل کیطرف سے) وارث مقتول کو خوش معاملگی کیساتھ (خون بہا کا) ادا کر دینا۔

قصور واروں کے قصور کو معاف کرنا اور ان کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے، کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں سے ہوں گے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۴) اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے، اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دیدے تو شوہر

پر نصف[1] مہر واجب ہوتا ہے، یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ خلق ہے اور یا شوہر پورا ادا کر دے، اور آدھا کاٹ نہیں تو یہ مرد کا حسنِ خلق ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:-

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (بقرۃ: ۳۱)

اور آپس میں فضل کو مت بھولو، بے شک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے تو احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں[2] فرمایا:-

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا (نور: ۳)

اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں، وہ قرابتداروں، غریبوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنیوالوں کو نہ دینے کی قسم کھالیں، انکو چاہیے کہ معاف کریں اور درگذریں۔

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک اور جامع لفظ "معروف" کا استعمال کیا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو، معروف میں شامل ہے۔ قرآن کا حکم ہے:-

وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ (اعراف: ۲۴)

اور نیکی کرنے کو کہہ۔

اور اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:-

كُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَةٌ

ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب و امیر کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے، اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے" صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے، فرمایا کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے، فرمایا غریب حاجتمند کی اعانت کرے۔ صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا کہ نیکی کے کرنے کا حکم دے، صحابہؓ نے کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کر سکے، ارشاد ہوا کہ برائی سے باز رہے، کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے۔" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث[3] میں آیا ہے کہ آدمی اپنے اہل و عیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے، وہ صدقہ ہے، کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل[4] ہے۔

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ "بر" کا استعمال کیا ہے، اور اس وسیع دائرے میں کافر و مسلم سب کو شامل کر لیا ہے:-

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا انکے ساتھ احسان کرنے

---

[1] یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو، ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں [2] سعید سے روایت ہے "آپس میں فضل کو مت بھولو" یعنی "احسان کو مت بھولو" ابن جریر طبری ج ۲ ص ۲۲۱ مصر [3] کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکور، بعضوں نے یہاں "فضل" سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا [4] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ مع فتح الباری۔

أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (ممتحنہ ۲)	اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو خدا تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

صحابہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے اس پر یہ حکم آیا[1] کہ ہدایت بخشنا تمہارا نہیں، میرا کام ہے، تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کیساتھ نیکی کرنی، اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے، تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا ارشاد ہوا،

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (بقرہ ۳۷)	تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا، لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے، اور تم جو دوگے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر، اور جو دوگے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی، اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔

گویا احسان کی ایک خاص صورت ہے مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔

نیکی کا بدلہ نیکی ہے دینا اسلام کا وہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دارو مدار ہے، جو نیک کام کریں گے ان کو خدا کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی، ارشاد ہوا۔

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (رحمان ۳)	بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی۔

گو یہ آیت پاک اپنے سباق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے، مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصول کی وسعت دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے، دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے، قرضداروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگدست مقروضوں کو مہلت دینا جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں، ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

عرب میں سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگدل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض نہیں ادا کر سکتے تھے وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا، آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے، بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی آیت سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے:-

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ (بقرہ ۳۸)	اور اگر (کوئی) تنگدست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرمایا کہ قیامت کے[2] دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا جن میں ایک وہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت

---

[1] ابن جریر و ابن کثیر بحوالہ نسائی [2] بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری۔

کھائی اس کو اور بھی مؤکد کر دیا اور قرض کے معاملہ میں تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ ساتھ تقاضا کرنا، اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہیں کرتا تھا لوگوں کو قرض دیتا تھا، اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے، چنانچہ خدا نے اس کے صلہ میں اس سے درگذر کیا، دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں، فرشتوں نے کہا ذرا یاد کرو، اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا، اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں میں آسانی کرتا تھا، اور اگر تنگدست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا[1] تھا، اور تنگدست کا قرض چھوڑ دیتا تھا۔

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے[2] یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا، یا اس کا قرض معاف کر دیگا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔[3]

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص میں محدود نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے، زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو، کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو چھرے کو خوب تیز کر لیا کرو، اور ذبیحہ کو راحت دو۔[4]

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے، ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا تو وہ میری مہمانی نہیں کرتا، تو کیا جب اس کا گذر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ بھی دوں،، فرمایا" نہیں تم اس کی مہمانی کرو۔[5]

ایک موقع پر ارشاد ہوا" ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے، اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔[6]

---

[1] مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر [2] مسلم کتاب البیوع باب فضل [3] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۰ [4] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح [5] جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو [6] جامع ترمذی ایضاً انظار المعسر۔

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تمول یا اور دوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں، دل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے، حضرت براء بن عازبؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتلایئے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو، ارشاد ہوا تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں کو چھڑاؤ" اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں؟ فرمایا نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے، اور دوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے اور لگاتار دیتے رہو، اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ، اور پیاسے کو پلاؤ، اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور برائی کے کام سے باز رکھو، اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو[1]

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتایئے، فرمایا "جو روزی خدا نے دی اس میں سے دوسروں کو دے" عرض کی "اے خدا کے رسول اگر وہ خود مفلس ہو" فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے" عرض کی "اگر اس کی زبان معذور ہو" فرمایا "مغلوب کی مدد کرے" عرض کی "اگر وہ ضعیف ہو مدد کی قوت نہ ہو" فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا آتا ہو، اس کا کام کر دے" عرض کی "اگر وہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو" فرمایا "اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے[2]"۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے، اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سونی پڑ جائے، اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُوٌّ (درگذر کرنیوالا) غَافِرٌ، غَفُورٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنیوالا ہے) اس کی شان یہ ہے :-

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّئَاتِ (شوریٰ : ۳) اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے، اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو یکدم ہلاک کر دے، یا ان کو معاف کر دے فرمایا :- اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ : ۴) (اگر خدا چاہے تو گنہگاروں کو ان کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے :-
وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰہٰ : ۴) اور اس میں شبہ نہیں

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب [2] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب الایمان ج ۱ ص ۶۳

کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشائش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے پھر راہ پر رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ دو جگہ اپنے کو غَافِرٌ (بخشنے والا) پانچ دفعہ غَفَّارٌ (بڑی بخشائش کرنیوالا) اور اتنے ہی دفعہ عَفُوٌّ (معاف کرنیوالا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غَفُوْرٌ (بخشنے والا) کہا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے فرماتا ہے:

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ	یا کسی برائی کو معاف کرو، تو بیشک اللہ معاف کرنے
عَفُوًّا قَدِیْرًا (نساء: ۲۱)	والا قدرت والا ہے۔

لیکن انسان اگر اپنے کسی قصوروار کو معاف کرتا ہے تو اس کی قدرت بہرحال کامل نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں وہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے، تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں[1]۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا، ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے فرمایا:

وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ	اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگذر کریں کیا تم
لَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (نور: ۳)	نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنیوالا اور مہربان ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کیساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو خدا تمہیں معاف کرے گا، اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کی کچھ چھینٹیں پڑنی چاہئیں چنانچہ جن مومنوں کے لیے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے، ان کی ایک صفت یہ بتائی ہے۔

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ (شوریٰ: ۴)	اور جب غصہ آئے تو وہ معاف کرتے ہیں۔

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا غصہ کی حالت میں، جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا، لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں، اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی، لیکن اس سے بڑھ کر وہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلافات درمیان میں ہے کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے، ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی گفتگو سے اور برا بھلا کہہ کر دیتے ہیں ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا	اور اگر تم انکو راہ راست کیطرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں
یَسْمَعُوْا وَتَرٰھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ	اور (بظاہر) وہ تمکو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری
وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ، خُذِ الْعَفْوَ	طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں (اے پیغمبر) درگذر کی خو
وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ	اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان۔

(اعراف ، ۲۴) جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔

کیونکہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے، خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں بُرائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ (مومنون : ۶)

(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو، جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ ان لوگوں کو بھی ان سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں، لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے:

وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِّنْ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ (بقرہ ، ۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب باوجودیکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں، تو معاف کرو اور درگذر کرو، یہاں تک کہ خدا اپنا حکم صادر فرمائے۔

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے، اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزا و سزا کے قائل ہو اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ بُرائی کرتے ہیں، تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ ان کو مل جائے گا، فرمایا:۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لِیَجْزِیَ قَوْمًا بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْھَا ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ تُرْجَعُوْنَ (جاثیہ ، ۲)

ایمان والوں سے کہہ دے کہ انکو جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں، تاکہ لوگوں کو انکے کاموں کا بدلہ ملے جسنے اچھا کیا اسنے اپنے بھلے کیلئے کیا اور جسنے بُرا کیا اس نے اپنا بُرا کیا، پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت کے شان نزول میں لکھا ہے کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی، اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور مسلمانوں کو عفو و درگذر[1] کی نصیحت فرمائی (تفسیر کبیر امام رازی زیر آیت بالا)

---

[1] اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے، عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے، جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے، امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے لکھتے ہیں:۔ (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

غم و غصہ کے اظہار کا اصل وقت وہ آتا ہے جب انسان کی عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے لیکن اس حالت میں بھی اسلام نے عفو و درگذر سے کام لینے کا حکم دیا ہے چنانچہ مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے، اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ
يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ
أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ
(نور۔ ۳)

اور تم میں سے جو لوگ صاحب احسان اور کشائش والے ہیں قرابت والوں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنیوالوں کو (مدد خرچ) نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، بلکہ چاہیے کہ ان کے قصور بخش دیں اور درگذر کریں (مسلمانو) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دوسروں کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا۔

(بقیہ حاشیہ) اس آیت (وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں، اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں، تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں، مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں، جلد ۴ صفحہ ۴۹۶۔

ایک اور آیت (اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ "کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو" ج ۶ ص ۳۔

آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

"کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا، لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں، کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا، اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے، اور عزت و آبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔ (ج ۶ ص ۲۹ طبع دار الطباعۃ العامرۃ مصر۔

آیت یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (جاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ ان سے قتال نہ کیا جائے لیکن جب خدا نے ان سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا، لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے، اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کیا جائے (جلد ۷ صفحہ ۳۰۸، طبع مذکور) میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے خداوند تعالیٰ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کیساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے:۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آلِ عمران ۱۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشائش اور اس جنت کیطرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین وآسمان (کا پھیلاؤ بھی بھلائی) ان پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگدستی (دونوں حالتوں) میں (خدا کے نام پر) خرچ کرتے اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے.

اوپر کی آیت میں متقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہِ خدا میں دینا، اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگذر کرنا اور ان کے لیے دو جزائیں، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت، بیان کی گئی ہیں، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو وہ جنت ہے جس کی حدو پایان آسمان و زمین ہے، اور غصہ روکنا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہوگی، اور وہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کریگا۔

عفو و درگذر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جزء شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مترادف ہوجائے، اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے، اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کردو، جو ذلت اور پستی طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہوجاتی ہے کیونکہ اسلام نے عفو و درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ: ۴) اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب ان پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لیتے ہیں، اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی، اس پر (بھی) جو معاف کردے اور صلح کرے تو اُس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے. بیشک وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا.

(بقیہ حاشیہ) اور مشرکوں اور دوسرے قصورواروں کے ان ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جنکے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق عباد ہیں، یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کردیں اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں، اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں، در منثور میں ابن عساکر سے حضرت ابومسلم خولانی صحابیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے (ج ۶ ص ۲۹ مصر)

برائی کا بدلہ برائی، جماعت کا قانون ہے، اور عفو و درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے، جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس میں عفو و درگذر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے، جس کی مزدوری کی ذمہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمے لی ہے اور بتادیا ہے کہ ظلم کرنیوالے خواہ وہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں، یا وہ انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، خدا کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہوجانے کے بعد عفو و درگذر خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے اسی لیے فرمایا:-

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ
عَزْمِ الْاُمُوْرِ (شوریٰ : ۴)

اور البتہ جو شخص صبر کرے اور دوسرے کی خطا بخش دے تو بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے، اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکر دشمنی دوستی کی صورت میں بدل جاتی ہے:-

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ
عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝ وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا
الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ
عَظِیْمٍ ۝ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ
الْعَلِیْمُ ۝ (حٰمٓ سجدہ : ۵)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں، اگر کوئی برائی کرے تو اسکا جواب اچھائی سے دو، پھر تو تیرے اور جس کے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہی ہوجائے گا گویا دوست ہے ملنے والا، اور یہ بات ملتی ہے انہیں کو جنہیں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے اس کو جس کی بڑی قسمت ہے، اور اگر (اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈھ، بے شک وہی ہے سنتا جانتا۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہوجاتی ہے وہ شیطانی کام ہے، اس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے، حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا:-

"خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا، اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بردباری کا اور برائی کے مقابلہ میں عفو و درگذر کا حکم دیا ہے جب وہ ایسا کریں گے تو خدا ان کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا[1]"

ابو مسعودؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی جان لو، جان لو، مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے، فرما رہے تھے کہ اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے، ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

---

[1] ابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں، آپؐ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے، اس نے پھر یہی پوچھا تب آپؐ نے فرمایا "ہر روز ستر دفعہ"[1] اس سے مقصودِ نبویؐ تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے ان کے رعب و داب اور وقار میں فرق آجائے گا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہوجاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے مگر اس سے کسی پائدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے، اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[2]:-

وَمَا زَادَ اللّٰهُ رَجُلًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا۔	اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہے، نہیں بڑھاتا مگر عزت میں۔

حِلم و بُردباری

حلم و بردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کرلیا جائے اور قصور وار سے اس کے لیے کوئی تعرض نہ کیا جائے یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالیٰ کو حاصل ہے لیکن اس قدرت کے باوجود وہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور انتقام نہیں لیتا، اور اسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے، اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے، ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کردیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے، فرمایا:-

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (بقرہ: ۲۸، مائدہ: ۱۴)	اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ (آل عمران: ۱۶)	بیشک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔
اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (اسرائیل: ۵، ملائکہ: ۵)	بیشک وہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت کا ذکر کردیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کو شامل کیا ہے ارشاد ہوتا ہے:-

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (نساء: ۲)	اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔
اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ (حج: ۸)	بیشک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔
وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا (احزاب: ۶)	اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا بلکہ پورے علم، اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہوکر بردباری فرماتا ہے، ایک جگہ اپنی بردباری

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع۔

کے ساتھ اپنی صفت استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے :۔

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ (بقرہ ۲۶۱) اور اللہ مستغنی اور تحمل والا ہے۔

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے، اس لیے یہ ظاہر فرمادیا کہ وہ مستغنی ہے، اور بردبار ہے۔

انسانوں میں بردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے، مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حلم اگر اس برائی کرنے والے کو رام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اسکو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے، لیکن خدا کی ذات ہر حیثیت سے غنی ہے اسکا حلم کامل استغنا کیساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے لیکن اس کی ایک یہ حیثیت ایسی ہے کہ اس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے، اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں ان میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا اس لیے اس نے اپنے حلم اور دار و گیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے، تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی، اور بردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو، فرمایا :۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ فَاحْذَرُوْہُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ (بقرہ ۳۰،

اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، تو اس سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ بخشش والا ہے تحمل والا۔

یہ آیت عورت کے نکاح ثانی کے سلسلہ میں ہے، یعنی جب تک اس کی عدت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے دل ہی میں رہے تو کوئی حرج نہیں، اس کے بعد ارشاد ہے، کہ اللہ کو تمہارے دل کا ہر بھید معلوم ہے ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، اس لیے ایک طرف تو اسکی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو دوسری طرف اسکی بخشش اور بردباری بھی عام ہے اس لیے اس سے پُرامید بھی رہنا چاہیے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔

اس موقع پر اس کا ارشاد ہے :۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْهُ لَکُمْ اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اسکو دونا کردیگا
وَیَغْفِرْ لَکُمْ، وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ (تغابن : ۲) اور تمہیں معاف کریگا، اور اللہ ہے قدردان اور تحمل والا۔

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلے دو دے گا، اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے، کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصہ آتا ہے تو اسوقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں، اور اس کی خوبیاں نظرانداز ہوجاتی ہیں اس لیے ہمارا غصہ پوری طرح تیز ہوجاتا ہے، لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے یا اس میں ایک عیب ہے مگر اسمیں کچھ خوبیاں بھی ہیں تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کرکے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہوجاتا ہے چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وہ اسکی غلطی سے درگذر کرتا ہے۔

صفت حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے، خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ کسی طرح عذاب الٰہی سے بچ جائے انہوں نے اس کافر باپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے، پھر بھی ان کی بردباری اور تحمل کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں دعائے خیر کرتے رہے، جب تک انکو پوری مایوسی نہیں ہوگئی، اور انکو قطعی طور سے معلوم نہیں ہوگیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے!

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ، ۱۴)	اور (نہ تھا) ابراہیمؑ کا اپنے باپ کیلئے مغفرت کی دعا مانگنا مگر ایک وعدہ کی وجہ سے جو ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے کر لیا تھا، پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہوگیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہوگئے بیشک ابراہیم البتہ بڑے نرم دل (اور) بردبار تھے (کہ آپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اسکی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا.

دوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قوم لوط کی بربادی کی خبر پاکر وہ اللہ تعالیٰ سے عرض معروض کرتے ہیں، ان کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ھود، ۷)	بیشک ابراہیم بردبار، نرم دل اور رجوع کرنیوالے تھے.

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم، عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر و استقلال کے مجموعہ کا نام ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف میں اَوّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسماعیلؑ کی نسبت فرمایا ہے:-

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ (والصّٰفّٰت: ۳)	تو ہم نے ان کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بردبار لڑکے (اسماعیل کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی.

اس کے بعد جب ان کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا ہے:-

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (والصّٰفّٰت: ۳)	اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے (بے تامّل) اس کی تعمیل کیجئے انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے.

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جزو ہے حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو خدا پسند کرتا ہے یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیے آپؐ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ غصہ نہ کرو، اگر غصہ آ بھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التانی والعجلۃ.

نے ارشاد فرمایا کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس[1] پر قابو رکھے، ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص باوجود قدرت کے غصہ کو ضبط کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعام خاص کا مستحق ٹھہرائے گا[2]۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، میں ان کے ساتھ ملتا ہوں وہ کاٹتے ہیں، میں بھلائی[3] کرتا ہوں، وہ بدی کرتے ہیں، وہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں، میں تحمل کو راہ دیتا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو، تو تم ان کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو اور جب تک اس حالت پر قائم رہوگے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی[4]۔

رفق و لطف

رفق و لطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے، جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وہ سہولت سے، اور جو مطالبہ کیا جائے وہ میٹھے طریقے سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے اللہ تعالیٰ نے کئی آیتوں میں اپنے کو "لطیف" فرمایا[5] ہے، اور حدیثوں میں اس کا نام رفیق آیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ہر قسم کے بندوں کیساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے[6] میں رفق و لطف فرماتا ہے، اور اپنے اس تلطف میں وہ ان کی اطاعت اور عدم اطاعت کی پروا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا، اور ان کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا، اور دشمن بھائیوں کو جس طرح ان کے سامنے نادم و شرمندہ کر کے ان کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وہ فرماتے ہیں :۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (یوسف : ۱۰۰)

بے شک میرا رب لطف کرنیوالا ہے جس بات کا چاہے بیشک وہی علم والا حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جسطرح ان کی کامیابی کا ذریعہ بنیں، انکی حکمت

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب [3] یعنی صلۂ رحم کرتا ہوں [4] صحیح مسلم باب الرحم وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم [5] راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں "وہ اپنے بندوں کی راہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے (لفظ لطف)

امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں :۔ خدا کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کیساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کیساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا۔ ابن الاعرابی کا قول ہے، لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم

کو خدا ہی جانتا تھا، اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنے رفق و تلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے :۔

اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ	اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے، جس کو چاہتا ہے روزی
وَ ہُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ (شوریٰ: ۲)	دیتا ہے اور وہی قوت والا غالب ہے۔

اس آیت کے اوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے، اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے، بیچ میں یہ آیت ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطفِ الٰہی کافر و مومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وہ رزق پہنچاتا ہے[2] اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطافِ بے کراں کا ایک نتیجہ

ملّتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہِ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب[3] نہ ہوئی مگر ابراہیمؑ خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی، ارشاد ہوا :۔

اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ لَاَوَّاہٌ حَلِیۡمٌ (توبہ: ۱۴)	بیشک ابراہیم نرم دل بردبار تھے۔

اسی طرح جب وہ قومِ لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ :۔

اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ لَحَلِیۡمٌ اَوَّاہٌ مُّنِیۡبٌ (ہود: ۷)	بیشک ابراہیم بردبار، نرم دل، حق کی طرف رجوع کرنیوالے تھے۔

اَوَّاہٌ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دوسرا اس کے معنی نرم دل بتاتا ہے اور تیسرا دردمند کہتا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینوں باتیں پوری اترتی ہوں، وہ ہر شخص کی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے، وہ دردمند تھے، اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے، یا دل کے نرم تھے، اسلیے جلد پسیج جاتے تھے، اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملتِ حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے لیے ملانا چاہتا تھا چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ، فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو تبلیغ کے یہ آداب سکھلائے جاتے ہیں :۔

فَقُوۡلَا لَہٗ قَوۡلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوۡ یَخۡشٰی (طٰہٰ: ۲) سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا شاید وہ نصیحت پائے یا (خدا) سے ڈرے۔

(بقیہ حاشیہ) تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے ص۲ الٰہ آباد۔

امام غزالی کہتے ہیں :۔ اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے، پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، اس تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وہ مفید ہیں، جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے۔ (روح المعانی تفسیر شوریٰ)

(صفحہ ہذا) [1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الرفق [2] تفسیر روح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے، صاحب روح المعانی اور امام فخر رازی بھی عموم کو اوضح جانتے ہیں [3] حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پا کر اس کے بعد ان سے اپنی علیحدگی ظاہر کر دی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے، اور اس لیے دین حنیف کے مبلغ اعظم اور توحید کے داعی اکبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصہ وافر عنایت فرمایا تھا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے ارشاد ہوتا ہے:-

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ	تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم اُن کے لیے نرم دل
وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا	ہوئے، اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے
مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۷)	تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہوگئے ہوتے۔

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے، تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو، اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگذر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام جن میں شانِ جمال پائی جاتی ہے، یہی رفق و تلطف اور نرم علی و نرم خوئی ہے جس طرح حسن فطرت زینت آرائش سے دوبالا ہوجاتا ہے اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہوجاتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی، فرمایا:-

اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهٗ	نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے
وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ[1]	الگ کرلی جاتی ہے اس کو بدنما بنادیتی ہے۔

"جس چیز" کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے، اِلّا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہے۔

حضرت عائشہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے، اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا،[2] جریرؓ بن عبداللہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا"،[3] اور فرمایا کہ تین خصلتیں جس چیز میں ہوں گی خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا، یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا۔[4]

اس اخلاقی وصف کی تعلیم آپؐ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:-

اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَتَحْرُمُ	کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر
عَلَيْهِ النَّارُ عَلٰى كُلِّ قَرِيْبٍ هَيِّنٍ سَهْلٍ[5]	آگ حرام ہے، ہر اس شخص پر جو لوگوں سے قریب، نرم اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" "یعنی تم کو موت آئے، حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا "وَعَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ"

---

[1] [2] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فی فضل الرفق [3] ترمذی ابواب الزہد [4] ایضاً۔

یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "عائشہ ٹھہر جاؤ خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے، بولیں یا رسول اللہ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا فرمایا! میں نے بھی تو کہہ دیا کہ عَلَیْکُمْ یعنی" تم پر[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی مگر اس میں سختی کا نشان نہیں اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص حدود الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے، اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو، چنانچہ کفار اور منافق جب سمجھانے سے نہ سمجھیں، اور اپنی ضد پر اڑے رہیں، بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے قلع قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے، فرمایا:۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (تحریم ۲)	اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی رکھو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً (توبہ: ۱۶)	اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے وہ تم میں کڑا پن پائیں۔

اسی طرح شریعت کے گنہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجراء میں نرمی نہ برتیں مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:۔

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (نور ۱)	اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے، ام المومنینؓ فرماتی ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا، البتہ جب احکام الٰہی کے خلاف ورزی کی جاتی تو آپؐ اس کو سزا دیتے[2]" امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں آپؐ نے مسلمانوں بلکہ ازواج مطہرات تک پر کسی بات میں سختی برتی ہے[3]، حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

"گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا" (فتح الباری جلد ۱۰ ص ۴۲۹ مصر)

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الرفق فی الامر کلہ۔ [2] بخاری کتاب الادب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسّروا ولا تعسّروا۔ [3] باب ما یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ آسانی کرو، سختی نہ کرو[1] شارحین حدیث نے اسکا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل ومباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجائش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے، ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہوگئی، انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر حقیقت حال عرض کی، ارشاد ہوا کہ ایک غلام کی گردن آزاد کر دو۔ وہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں" فرمایا لگاتار دو مہینے روزے رکھو، گذارش کی کہ یارسول اللہ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھوں؟ فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، عرض پرواز ہوئے کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گذاری ہے، فرمایا کہ صدقہ کے فلاں محصل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوارے لے لو اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا کر جو بچ رہے وہ خود کھاؤ، وہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم میں آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ "میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی"[2]

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے، جس میں کوئی اس کا شریک نہیں :-

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (جاثیہ ۴)	اور اسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وہ کبریائی کریں، ان کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کریں، اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع وخاکساری کے بہت سے مظاہر ہیں، قرآنِ مجید نے ان میں سے نمایاں مظاہر کو لیکر بعض موقعوں پر ان کو حکم دیا ہے، اور دوسرے موقعوں پر ان کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کفار سے درگذر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پُر محبت تواضع کا حکم دیا ہے :-

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (حجر ۶)	اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (شعراء : ۱۱)	اور اپنا بازو جھکا دے ان کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوتے ہیں ایمان والے۔

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پُر محبت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے :-

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (بنی اسرائیل : ۳)	اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو مہر و محبت سے جھکا دے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا [2] سنن ابی داؤد باب فی الظہار ؛

خفضِ جناح یعنی بازو جھکا دینا، تواضع وخاکساری سے استعارہ ہے، جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں، پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے، اس سے یہ استعارہ کیا گیا ہے کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور کبر او ترفع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (الفرقان : ۶)	اور رحمت والے (خدا) کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کیساتھ چلیں، اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (انکو) سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو ان کو رحمت والے خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی، کہ خدا جب رحمت اور مہر وکرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلق خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ (لقمان : ۲)	اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا، اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار) کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے سے بول (کیونکہ) بری سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع وخاکساری اور دنائت وپستی میں بڑا فرق ہے تواضع وخاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر وغرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے، اور دنائت وپستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خودداری کو کھودے، چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو، وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خوددارانہ کبر وغرور کا حکم دیا ہے، صحابہ جب عمرہ کے لیے آئے، تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے ان کو کمزور کر رکھا تھا اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمدؐ اور ان کے اصحابؓ ضعف کی وجہ سے خانہ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے، اس لیے آپؐ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں، تاکہ مشرکوں پر انکی طاقت کا اظہار ہو[2]۔

قوت کے اظہار کا اصل موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر وغرور کو پسند کیا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، جنگ وصدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے اور ظلم وفخر پر اترانا ناپسند[3]۔

بہرحال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خلق ہے، اور ضعف، ذلت، بیچارگی اور بے سروسامانی سے

---

[1] المثل السائر باب نوع و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل ج ۵ ص ۳۰۰ دار الطباعة العامرہ [2] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف و صحیح بخاری عمرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔

مختلف ہے ضعف و ذلت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص خدا کے لیے خاکساری کرتا ہے خدا اسکو بلند کر دیتا ہے"[۱]۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے، لیکن وہ خاکساری سے اس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دیگا کہ ایمان کا جو حلہ پسند کرے اس کو پہن لے[۲]۔

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے، جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تا کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے[۳]۔ اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے، اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیے۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کا پہلو ملحوظ رکھے، تا کہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں، اور باہم مروت اور محبت بڑھے سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں بجھانا اسی ایک صفت کے مختلف جزئیات ہیں، خدا تعالیٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآن پاک میں بھی دہرا دیا ہے:-

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ: ۱۰)	اور کہیو لوگوں سے اچھی بات۔

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے، ایک اور آیت میں یہی حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے، ارشاد ہے:-

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (بنی اسرائیل: ۶)	اور (اے پیغمبر) میرے بندوں سے کہدے کہ وہ بات کہیں جو سب سے اچھی ہو، بیشک شیطان جھگڑواتا ہے آپس میں، بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حصہ میں دعویٰ کی دلیل بھی دیدی گئی ہے کہ خوش گوئی، اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے، اور بدگوئی و بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے، وہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصہ نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے، اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں، اور نرمی سے کہیں، کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبت پیدا ہو، اسی لیے تنابز بالالقاب یعنی

---

[۱] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی التواضع [۲] ترمذی ابواب الزہد [۳] ابو داؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ۔

ایک دوسرے کو بُرے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے، کسی کو یا کافر، یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اس اچھی بات کے خلاف جو آپ اس کو سمجھانا چاہتے ہیں، پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے، فرمایا:۔

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ (حجرات: ۲)	اور نہ تم آپس میں ایک دوسرے کو طعن دو اور نہ چڑھ کا نام لیکر پکارو، ایمان کے بعد گنہگاری برا نام ہے۔

اسی لیے برائیوں کے تذکروں، اور بدگوئیوں کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، ارشاد ہے:۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (نساء: ۲۱)	اللہ کو بُری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو (اس کو حق ہے کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے"[1] اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اونچی ہونی چاہیے اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی و خیرخواہی اور نیکی و بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اللہ اور روزِ جزاء پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے[2]۔ اس حدیث پاک میں ادھر اشارہ ہے کہ اللہ اور روزِ جزاء پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا، اگر تمہیں بھی کوئی بُرا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو اسکی جزاء آج نہیں تو کل اسکو مل کر رہے گی۔ ایک دفعہ آپؐ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا، اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا، پھر ارشاد فرمایا، دوزخ سے بچو، اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے[3]۔

ایک دفعہ آپؐ نے جنت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے، بے تابانہ بولے کہ یا رسول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی؟ فرمایا جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھے جب دنیا سوتی ہو[4]۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اچھی بات صدقہ ہے[5]۔ یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے، اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے، اور ہر سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ نجات کیونکر ملے"، فرمایا "اپنی زبان پر قابو رکھو، اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجائش ہو، اور اپنے گناہوں پر رویا کرو"[6] ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑ کر فرمایا، اس کا ڈر ہے[7]

---

[1] صحیح بخاری باب طیب الکلام [2] صحیح مسلم کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی اللعنۃ [4] ترمذی ماجاء فی قول المعروف [5] صحیح بخاری کتاب الصلح [6] ترمذی باب حفظ اللسان [7] ترمذی ایضاً۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور سب سے آخری درجہ ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ذاتی ضرورت پر مقدم رکھا جائے خود بھوکا رہے اور دوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اٹھائے، اور دوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہؓ کرام میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہ تھا کہ مکے کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا، اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھا کر ان کو آرام پہنچایا، پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دیدی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا، اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور ان کی مدح و ستائش کی[1][2]۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَّمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (حشر: ۱)

اور انکے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں اور ایمان میں جگہ پکڑلی اور محبت رکھتے ہیں ان سے جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو جو ملنے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ ملے ہم کو یہ منظور نہیں، فرمایا اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو، میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے، اور تم کو نہیں پوچھیں گے[3]۔

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا، اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو آپ نے اسی وقت اتار کر ان کے حوالہ کر دی، صحابہؓ نے ان کو ملامت کی تم جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی حاجت تھی، اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے، تم نے کیوں مانگ لی، بولے ان میں نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے[4]۔

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا کاشانہ نبویؐ میں اس وقت پانی کے

---

[1] صحیح بخاری اول مناقب الانصار [2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری [3] صحیح بخاری اول باب مناقب الانصار [4] صحیح بخاری باب حسن الخلق و باب من استعد الکفن۔

سوا کچھ نہ تھا، اس لیے آپؐ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا، یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی، اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے، بولیں صرف بچوں کا کھانا ہے، بولے بچوں کو سلا دو، اور چراغ کو بجھا دو، ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے، البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا "خدا تعالیٰ تمہارے اس حسن سلوک سے بہت خوش ہوا"¹

بعض روایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف ہے² لیکن قرآن پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے، جس میں وہ منفرد ہے، اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسائل میں افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو اُمَّۃً وَّسَطًا (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں ایک، یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے³ اس لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے، انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وہ نہیں بھولا ہے۔

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے:۔

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا (بنی اسرائیل: ۲۲)	اور نہ پکار کر اپنی دعا (یا نماز) میں اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمائش ہو جائے، یا مخالف اس کو سن کر بُرا بھلا کہے اور نہ بالکل چپکے چپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سن سکیں، بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے:۔

ہماری چال ڈھال کیسی ہو، اس کی نسبت حضرت لقمانؑ کے نصائح میں ہے:

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (لقمان: ۱)	اور چل بیچ کی چال۔

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار نہ باقی رہے، اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدوں کی نمائشی چال بن جائے⁴

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں سارے مذہبوں نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے لیکن اسلام نے اس نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دیکر تم خود اپنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت

---

[1] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ و صحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر [2] ایضاً [3] تفسیر کبیر رازی آیت مذکور (بقرہ) [4] ابن جریر طبری در روح المعانی)

آجائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے، فرمایا:۔

وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰی عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل ۳)	اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے، اور نہ اسکو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:۔

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (فرقان: ۶)	اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں، اور ہو اُس کے درمیان اعتدال ہے۔

یعنی نہ اسراف ہو، نہ بخل ہو، درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اکلفوا من الاعمال ما تطیقون۔	اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کر سکو۔

"عمل" کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد، نماز و روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں۱؎ مقصود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو، دوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے، مسند بزاز میں حضرت حذیفہ صحابیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۲؎:۔

ما احسن القصد فی الغنی، ما احسن القصد فی الفقر ما احسن القصد فی العبادۃ۔	دولتمندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے، محتاجی میں میانگی کتنی اچھی ہے، عبادت میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے، لوگ دولتمند ہو کر اس قدر شان و شکوہ، عز و جاہ اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں، اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دنی اور مبتذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خود داری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں، اور یہ بھی بے اعتدالی ہے، ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گر جانا چاہیے۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے حضرت عثمانؓ بن مظعون کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گذر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

۱؎ فتح الباری جلد ۱۱ ص ۲۵۶ ۲؎ بروایت کنز العمال جلد ثانی ص ۶ طبع حیدرآباد دکن۔

خودداری یا عزتِ نفس

یہ وہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے زندگی میں اس کے موقع کثرت سے پیش آتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے، کھانے پینے اوڑھنے پہننے غرض معاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے جس میں یہ وصف نہ ہوگا اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اُونچائی نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزت ہوگی، نہ اسکی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا، اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے، اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزت و وقار سب سے پہلے اس بلند و برتر ذات الٰہی میں ہے جو ساری عزتوں کا مرکز ہے چنانچہ قرآن پاک میں بیسیوں موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام "عَزِیۡزٌ" لیا گیا ہے عزیز کے معنی ہیں عزت[1] والا اور غالب، کہیں کہیں "عَزِیۡزٌ" کے ساتھ (قوی قوت والا) یا مقتدر (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیے اصلی عزت اسی کی ہے اور وہی آپ عزت ہے جو اس کے وسیلہ سے حاصل ہو اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ ادھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور ادھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے انکی دوستی کے بھی طلبگار تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھولدیا۔

اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًاؕ (نساء : ۲۰)

کیا یہ ان کے پاس عزت چاہتے ہیں تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری خدا کے واسطے ہے۔

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے :-

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ جَمِیۡعًاؕ (فاطر : ۲)

جو عزت چاہے تو عزت تو ساری اللہ کی ہے۔

تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ (آل عمران : ۳) (اے خدا!) تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال دیں گے، اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا :-

وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَلٰـكِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ (منافقون : ۱)

اور عزت تو اللہ کے لیے ہے، اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیتِ پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وہ عزت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اونچا رہنا چاہیے، اور اس کو اپنی دینی خودداری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے، اور اسی لیے

---

[1] عزة کا لفظ قرآن میں شدت، غلبہ، عزت و شرف اور نخوت (حمیت) کئی معنوں میں آیا ہے اسلئے ہر جگہ اسکے وہ معنی لیے جائیں گے جو سیاق و سباق کے مناسب ہو، اس کا اصل مفہوم جو اسکے سب معنوں میں مشترک ہے، یہ ہے: کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اسکو کوئی دبا نہ سکے (دیکھو لسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورہ بقرہ و نساء و ص و منافقون) ؛

اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے، تعلیم محمدی کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خودداری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفار کے ساتھ صلح کے شرائط پر جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمالیا تھا، اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ ان کے اندر کام کر رہا تھا، حضرت عمرؓ نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں، ارشاد ہوا "بیشک ایسا ہی ہے" عرض کی "تو پھر ہم یہ مذہبی ذلت کیوں برداشت کریں" ارشاد ہوا میں خدا کا رسول ہوں، اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اس کے بہت آگے تھی، اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصہ دیا جایا کرے گا، لیکن جب انصارؓ کے سرداروں کو بلا کر آپؐ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی:۔

> یارسول اللہ! جب ہم بتوں کو پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے، تب تو ان کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی اور اب جبکہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضورؐ کے بدولت ہم عزت پاچکے ہیں، ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں۔[2]

صحابۂ کرام جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے، ان کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا، اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے اور یقین رکھتا ہے بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز رہتی ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی سربراہی) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے، فرمایا غرور نہیں، خودداری (عزت) ہے، یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (منافقون)

ایک مسلمان صالح بی بی کے کپڑے پرانے تھے، تو بولیں کیا میں مسلمان نہیں، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں، اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔

شیخ ابوحفص سہروردی کہتے ہیں کہ "خودداری (عزت) غرور سے الگ چیز ہے کیونکہ خودداری اپنی ذات کی

---

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجهاد [2] سیرۃ ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعہ احزاب بسند :

حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے، اور غرور اپنی ذات کی اصل حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اوپر لیجانے کو کہتے ہیں[1]۔

یہ خودداری عین شرافت ہے، جس میں یہ خودداری نہیں، لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو، یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگذر کرنا پڑتا ہے قرآن میں سچے مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے :۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (فرقان ۶) اور جب وہ ہو نکلیں بیہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ، اور خودداری کی شان سے گذر جائیں کہ نہ وہ آپ ادھر متوجہ ہوں اور نہ ان شریروں کو انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری، اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھاپن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمائش کی بو تک نہ آئے، یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کا جزء شامل نہ ہو یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمائش میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے، چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں، ارشاد ہوا کہ خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے، غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے[2]۔

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے، کیونکہ گندے آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا کہ کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا، کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا۔ ایک شخص نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا، فرمایا "تمہارے پاس کچھ مال ہے؟" اس نے کہا اونٹ، بکری گھوڑے تمام سب کچھ ہیں" ارشاد ہوا کہ جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل اور احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے[3]۔"

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے، اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے، نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہو سکتی ہے، لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

اِذَا سمعتم الاقامۃ فامشوا الی الصلٰوۃ جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے سکون اور وقار کے ساتھ

---

[1] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورہ منافقون کی آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ کی تفسیر میں لکھے ہیں [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی الکبر [3] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب والخلقان۔

عَلَيْكُمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقَارِ وَلَا تُسْرِعُوا[1]

چلو، جلدی نہ کرو۔

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ جانے پائے، مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے، اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا، آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور اِدھر اُدھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:-

الھدی الصالح والسمت الصالح والاقتصاد جزء من خمسۃ وعشرین جزء من النبوۃ۔

نیک طور طریق، نیک انداز، اور میانہ روی، نبوت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔

کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے، اور وہ خود بھی ان خوبیوں کی بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کرکے خوددار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دَلّ کا ہے، اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل و صورت وضع و لباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور و طریقہ اختیار کرے، اسلام نے خصالِ فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا وقار بولے "خداوند میرے وقار کو اور بڑھا"[2]

فقر و فاقہ کی حالت یا حرص و طمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وہ ایک قابلِ ستائش اخلاقی وصف ہے اور اسی وصف کے ساتھ متصف ہونے کی بنا پر خداوند تعالیٰ نے اصحابِ صفہ کی خاص طور پر تعریف کی ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (بقرہ، ۳۷)

(خیرات تو) ان حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھر سے بیٹھے ہیں ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے، بے خبر (ان کی خودداری کی وجہ) سے ان کو غنی سمجھتا ہے، (تو ان کو دیکھے تو) ان کی صورت سے ان کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خودداری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے صاحب کشاف نے "لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ سوال تو کرتے ہیں لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں" لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ ان کی خودداری کی وجہ سے جو لوگ ان کے حال سے ناواقف

---

[1] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب الی الصلوٰۃ ولیاتہا بالسکینۃ والوقار [2] ادب المفرد باب الختان للکبیر۔

ہیں اُن کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی، اصحاب صفہ صاحب احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اسی بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو انکے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے اس لیے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے، پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفہ لوگوں سے لجاجت و اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے[1]

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے، اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ایک حدیث میں ہے کہ ”جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا“ یہ اس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزت و آبرو گنوادی ہے، چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا، آپؐ نے دیدیا، پھر سوال کیا اور آپؐ نے پھر دیا لیکن جب سب مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ ”میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا، جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے، خدا اسکو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے، خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اسکو صبر دیتا ہے، خدا نے صبر سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خودداری کے منافی ہے، اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص محتاج ہو کر اپنے احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دُور نہیں ہوتی، لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ خدا اسکو بے نیاز کر دے خواہ مرگ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعے۔

روزمرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا بُرا نہیں جانتے لیکن کمال خودداری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے، مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اُٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خودداری کے منافی نہیں معلوم ہوتا، لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خودداری کو صدمہ پہنچے گا اسی لیے کمال خودداری یہ ہے کہ اس

---

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶، ۵۲۷ ÷

قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی۔ لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا (تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا)

ان میں سے بعض صحابہؓ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر ان کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی، آپ نے پہلے تو اس کو اجازت ہی نہیں دی، پھر فرمایا کہ "اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے تو صالحین سے سوال کرو"[1] صالحین کی تخصیص غالباً اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے، ورنہ رفق و ملاطفت کے ساتھ اس کو رد کر دیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وہ عزت اور وہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں، جو مسلمان ہے وہ خدا کے سوا کسی کی پروا نہیں کرتا، وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا، وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اور بحیثیت مسلمان کے وہ اپنا پایہ ساری دنیا سے بلند سمجھتا ہے، اور یقین رکھتا ہے کہ عزت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسول کے لیے ہے، اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے، اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزت کو قائم رکھنا ہے اور اسی فیض تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو" گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی برائی سے پاک اور ہر دنائت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہو گی کہ وہ تزک و احتشام، تکلف و تصنع اور جاہ و حشم کی نمائش کا نام نہیں بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزت اور حق کا فخر اس کو اونچا کر دے کہ اگر وہ غریب و مفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سربلند رہے، اور اگر وہ صاحب امارت و حکومت ہو تو اپنے رعب و دبدبہ کے لیے ظاہری نمائشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے، بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام جا رہے تھے جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالار اسلام حضرت ابو عبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لیکر استقبال کو نکلے جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے، پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے، اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیوں کے مقدس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا، حضرت ابو عبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں، اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اس کو پانی میں لے چل رہے ہیں، یہ وہ موقع

---

[1] ابو داؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسئلۃ و باب فی الاستعفاف میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو اُمنڈ آیا ہے، حضرت عمرؓ نے کہا اے ابوعبیدہؓ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دیکر امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عبرت بناتا، ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا[1]

شجاعت اور بہادری

قَدِیْر (قدرت والا) قَادِر، مُقْتَدِر، قَوِی، جَبَّار (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے) قَاھِر (جو ہر کسی کو دبا دے) غَالِب اور عَزِیْز اللہ تعالیٰ کے لاہی اوصاف ہیں جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی وجسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیرووں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا، کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم و ستم، اور خون ریزی اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوت بذاتہ کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس کے استعمال کا موقع برا ہوتا ہے اس لیے تعلیم محمدیؐ نے بہادری وشجاعت کو سراہا، اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے، کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم وستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کرسکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد کامیاب ہوسکے۔

ان مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں، اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:-

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ۲۲)	اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے وقت ثابت قدم رہیں، وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی متقی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آپڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو کسی جماعت اور ملت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے، اسکا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگادے، اور جب وہ ایسا کر گزرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور ملت کی نظر میں راست باز اور سچا ٹھہرتا ہے، اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے:-

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْھُمُ الْاَدْبَارَ (انفال ۲۰)	اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدانِ جنگ میں مقابل ہو تو ان کو پیٹھ مت دو۔

---

[1] مستدرک حاکم جلد اول ص۶۲ کتاب الایمان، علی شرط صحیحین۔

یعنی جب دشمن سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں، بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "ایمان والے" کہہ کر خطاب کیا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی ایمان، مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوگا۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (انفال : ۲)

اور جو اُن کو اس دن پیٹھ دیگا مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو یا کسی (مسلمان) دستے سے جا ملتا ہو تو وہ اللہ کا غضب لے پھرا اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے۔

یہ تو سلبی تعلیم تھی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (انفال : ۲)

اے ایمان والو جب تم کسی دستے سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو، کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ کافروں کی قوت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (فتح : ۴)

وہ کافروں پر زور آور ہیں۔

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زورمند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے،

ایک اور آیت میں ارشاد ہے :-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال : ۸)

اور ان کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی زور و قوت اور گھوڑے باندھنا تیار رکھو، کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور دوسروں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو۔

اس "قوت" کے لفظ کی تفسیر اس زمانہ کے سامان جنگ و قتال سے کی گئی ہے مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیراندازی مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے ورنہ بعض مفسرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے، غرض اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سامان جو ہر جدید اکرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیار رکھنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے، تاکہ حق کے دشمن ان کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں، اور ان سے معاہدہ کر کے توڑنے کی ہمت نہ کر سکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی برائی کی گئی ہے، بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جا رہی تھی متوحش ہو رہے تھے، اس پر وحی الٰہی نے ان کا ذکر مذمت کے ساتھ کیا۔

---

[۱] تفسیر طبری آیت مذکورہ ÷

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (انفال: ۱) گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں۔

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے:۔

فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (احزاب: ۲)	جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو دیکھے کہ تیری طرف تکر تکر دیکھتے ہیں، ان کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں، جیسے کسی پر موت کی غشی آ جائے۔

سورۂ محمد میں ان کی دل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے:۔

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰى لَهُمْ (محمد: ۳)	جب اتری کوئی ثابت سورت اور مذکور ہوا اس میں لڑائی تو تو ان کو جن کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ تکتے ہیں تیری طرف جیسے ٹک ٹکی لگائے وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے، سو خرابی ہے ان کی۔

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا:۔

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (منافقون: ۱)	اور جب تو انہیں دیکھے، تو ان کے بدن اچھے معلوم ہوں اور اگر بولیں تو ان کی بات تو سنے، جیسے ٹیک سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں جو کوئی چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ دل کی طاقت سے ہے۔ جس سے منافق محروم ہیں، دیکھنے میں تو ان کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، مگر دل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں، ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کرے دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں مگر چونکہ ان کی جڑیں مضبوط نہیں اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اگر اس میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے، اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھیے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے اس لیے ان میں شجاعت اور بہادری نہیں، اسی بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت اور بہادری کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں۔

۱۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں، صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہیے۔

۲۔ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ آ جائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی، اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

۲۔ خدا کی راہ میں مارا جانا، زندگی کا بہترین مصرف ہے، اس خون کے [illegible] گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے، اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلت و کثرت تعداد کی قلت و کثرت پر جدوجہد کی کامیابی و ناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے کامیابی و ناکامی تعداد کی کمیت پر نہیں، بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی و اخلاقی کیفیت پر مبنی ہے، تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان یقین کی قوت موجود ہے تو بفضل خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی۔ اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھا دیا ہے۔

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ: ۳۳)	کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آگیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو ان سے نہیں لڑیں گے۔

اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ (مائدہ: ۴)	اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔

اس وقت ان کی امت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں:۔

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (مائدہ: ۴)	تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو، اور اللہ پر بھروسہ کرو، اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

بدر اور اُحد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:۔

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (انفال: ۲)	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ تعداد میں بہت ہو، اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔
فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران: ۱۷)	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بےشک اللہ توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہاری مدد کریگا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کریگا اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

فتح و شکست حکم الٰہی پر موقوف ہے، اور مدد اسی طرف سے آتی ہے:۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (انفال: ۱)	اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے بے شک اللہ غالب، حکمت والا ہے۔

تعداد کی قلت کی تلافی ایمان کی قوت سے ہوتی ہے، یہ راز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے نہیں بتایا، بلکہ ان کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوشخبری سنا دی، فرمایا کہ ایک پکا مسلمان اپنے دس گنے کے مقابل ہے ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ (انفال: ۹)

اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق دلا، اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر (ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں، اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں، کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کی شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتادی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و توکل کی قوت ہے، اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد اس آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کردی گئی، پھر بھی یہ نرمی وہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے، یعنی یہ ایک مسلمان اپنے سے دوچند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں۔

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (انفال: ۹)

تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں تو دوسو پر غالب ہوں، اور اگر تم سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم خدا غالب ہوں، اور اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمد اللہ مسلمانوں میں پیدا ہے کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے، اور وہ اپنے اس یقین و ایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہیں کرتا، اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں ان کا وہ رعب بیٹھا ہے جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو سال پہلے سے ہے کہ :-

سَنُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران: ۱۶) .... سَاُلْقِىْ فِىْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (انفال: ۲)

ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈالدیں گے۔ .... میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا، چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوگئے۔

وَقَذَفَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (احزاب: ۳)

اوران کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈالدیا۔

وَقَذَفَ فِىْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ (حشر: ۱)

اوران کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈالدیا۔

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے، اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے، اور نہ بلائے آسکتا ہے اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحی محمدی نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے، یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں

سرایت کر گئی ہے، غزوۂ احد میں مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی، اور اس عقیدہ کو یاد دلایا :-

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران : ۵)	اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے، پھر موت سے خوف کیوں ہو، اور اس سے بزدلی کیوں چھائے، جنگِ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا :-

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ (احزاب : ۲)	(اے پیغمبران سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے فرمایا :-

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران : ۱۶)	(اے پیغمبرؐ) کہدے کہ اگر تم اپنے گھروں میں رہتے تو بھی جن کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا، وہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آجاتے۔

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے، یوں بھی غلط ہے کہ مارنا اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے، مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں :-

لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (آل عمران : ۱۷)	اگر یہ (مرنے یا مارے جانیوالے) ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (اور یہ خیال اسلیے ان کے دل میں آتا ہے) تاکہ اللہ ان کے اِسی خیال کو ان کی دلی حسرت بنائے اور (واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہیں تو ٹال لیں :-

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران : ۱۷)	اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے، ان کے خطرہ کا ذکر کرکے ان کی تشفی کی گئی :-

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلٰى أَجَلٍ قَرِيْبٍ	پھر جب ان کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگا جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر، اور کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ ہم کو تھوڑے

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ (نساء : ۱۱)

دن اور مہلت دی (اے پیغمبر) جواب دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے، اور آخرت پرہیزگار کے لیے بہتر ہے، اور تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا جہاں تم ہو گے موت تم کو پالے گی، اگر تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں، پھر میدانِ جنگ سے تم کیوں گھبراؤ، بلکہ ان مجاہدوں کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سُن کر اور تازہ ہو جاتا ہے:۔

اَلَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (آل عمران : ۱۸)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان کیا ہے سو تم ان سے خوف کرو تو اس نے ان کے ایمان کو اور بڑھا دیا، اور بول اُٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ میدانِ جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی وہ دنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے، اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے، اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے، اور وہاں ان کے لیے وہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑا سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ (توبہ : ۱۴)

اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورۂ نساء میں اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لیے دنیا کا سودا کر چکے ہیں، اعلان ہے:۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۚ وَمَن يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا (نساء : ۱۰)

تو دنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور جو اللہ کی راہ میں لڑے، پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے:۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ (آل عمران : ۲۰)

تو جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے، اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، اتاروں گا ان سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا ان کو جنت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وہ ان کی زندگی تھی وہ ان کو از سرِ نو اسی

وقت دیدی جائے گی، اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مُردہ نہ خیال کرو، وہ خدا کے پاس زندہ ہیں:-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ
اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ	زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں، خدا نے انکو
فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (آل عمران ۱۷)	اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔

ان کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے پھر بھی ان کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے:-

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط	اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کو مردہ نہ کہو۔ بلکہ
بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (بقرہ ۱۹)	زندہ ہیں لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں، جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہیں، اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض وغایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسانی غیظ و غضب، اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے، اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی فرمایا:-

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ	چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال، سو اللہ کے پاس بڑا مالِ
مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ	غنیمت ہے تم (اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے، تو خدا نے
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا (نساء ۱۳)	تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا) تو اب تحقیق کر لیا کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھلانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمائش کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ و انتقام کے لیے لڑتا ہے، تو آپ نے ان سب کا مشترک جواب یہ دیا:-

مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ	جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے کے لیے لڑے
هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ [1]	اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ[2] "ایک شخص سے قیامت کے دن اس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ، سو تم اپنا اجر پا چکے، اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا" غرض جس شجاعت کا مقصودِ اصلی ریا و نمائش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے، لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے

---

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ [2] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار و جامع ترمذی۔

اس کو بُرا نہیں کہا ہے کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے، خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اِترائے[1] کیونکہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے، اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے، ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا "لو میں ابن اکوع ہوں"[2]

حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں :-

> "یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے، جس کی ممانعت کی گئی ہے کیونکہ حالت کا اقتضاء یہی تھا اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے، اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں[3]۔"

غزوہ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تو آپؐ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا :-

اَنَا النَّبِیُّ لَاکَذِب اَنَا ابْنُ عَبْدِ المطلب ، میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا، چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی[4]۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا[5] وہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بہادر تھے، ایک بار اہل مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو اُدھر بڑھا وہ خود سرورِ کائنات علیہ الصّلوٰۃ والسلام تھے، آپؐ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آکر فرمایا "خوف کی کوئی بات نہیں[6]"، ایک موقع پر جب بدویوں نے آپؐ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے[7]"، بزدلی اسلام میں ایسا اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے ان میں بزدلی بھی ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیچارگی (عجز) کا ہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے پناہ مانگتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے[8]، ایک روایت میں ہے کہ انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بخل اور دل ہلا دینے والی بزدلی ہے[9]۔

حضرت عبداللہؓ بن ابی اوفی صحابی نے ایک خط لکھ کر بھیجا تھا، اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسول اللہ

---

[1] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [3] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۴ [4] صحیح بخاری غزوۂ حنین و کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم [5] صحیح مسلم باب غزوۂ حنین [6] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب الحمائل و تعلیق السیف بالعنق [7] بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعۃ فی الحرب و الجبن [8] بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن [9] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجرأۃ والجبن

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو[1]" اسی خطبہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ[2]	یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

استقامت

"استقامت" کے لفظی معنی "سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے" کے ہیں، اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے، مشکلیں پیش آئیں مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا چلا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:-

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حٰمٓ السجدہ: ۱)	تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو، آس کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے، سیدھے اسی کی طرف چلے چلو، ایک اور آیت میں بارگاہ الٰہی سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ رہ سے بھٹکو نہ حکم ماننے سے سرکشی کرو۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (ھود: ۱۰)	تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عرب کا گرم ریگستان دین حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا تھا، ذرہ ذرہ کی زبان سے رسول حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے، اس موقع پر رسول اسلام علیہ السلام اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلان حق، اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے اسی دین حق کی طرف سب کو بلاتے رہو، اور ثابت قدمی دکھاؤ، اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (شوریٰ: ۲)	پس اسی کی طرف بلا، اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرما دیا، اور ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [2] ایضاً باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف و باب کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا لم یقاتل اول النہار اخر القتال حتی تزول الشمس بخاری ج ۱ ص ۴۲۱

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (احقاف : ۲)

بیشک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر وہ وہاں پر، جمے رہے تو نہ ڈر ہے اُن کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے، ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا، وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا، ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں انکی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سُنائی دے گی۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (حٰمٓ السجدة : ۴)

بیشک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر جمے رہے، اُن پر فرشتے اُترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے وعدہ ہے۔

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اس سے چمٹ جاؤں ارشاد ہوا، کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ[1] صحابہؓ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا، اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیے ساڑھے تیرہ سو برس گذر گئے، مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت، اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، خود اللہ تعالیٰ نے غزوہ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے، فرمایا:-

إِذْ جَآءُوكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا (احزاب : ۲)

جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان کرتے تھے، وہاں ایمان والے جانچے گئے اور خوب جھڑ جھڑائے گئے۔

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی، اس کی تفصیل ہے، اس کے بعد ہے:-

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَّتَسْلِيمًا (احزاب : ۳)

اور جب ایمان والوں نے کفار کی ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور اللہ اور اُس کے رسول نے سچ کہا اور اُس نے اُنکو یقین اور اطاعت میں اور بڑھا دیا۔

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا ہے تھا، اور اس کو پورا کر دکھایا، ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے:-

---

[1] ترمذی باب ما جاء فی حفظ اللسان ۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (احزاب : ۳)

ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا اس کو سچ کر دکھایا، تو اُن میں کوئی تو اپنا کام پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اس دن کی راہ تک رہے ہیں، جب وہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے، اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا، اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا، اور اس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وہ اصول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا، اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اُترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی، فرمایا:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۗ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (بقرہ : ۲۶)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے ان کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی، اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، سُن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں، ایک تو طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا، اور آخر کامیاب ہوا، اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ : ۳۳)

اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پورا صبر اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاخدود کا ہے، احادیث[1] و سیر میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، اور آخر ان کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا، مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے:۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (بروج ۱)

مارے گئے گڑھے کھودنے والے، آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے، اور جو کچھ وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے، اور وہ ان سے بدلا نہیں لیتے تھے مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔

---

[1] صحیح مسلم و سیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاخدود۔

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے، خباب بن ارت صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا، اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجیے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا، اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا، مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا، اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا، مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا۔[1]

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں، ان ہی خبابؓ بن ارت کا جو اس روایت کے راوی ہیں یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں، آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا، اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے[2] حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی، تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگدل قریش کے ظلم وستم کا یہ سکہ ان کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے، اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ، اس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ (ایک خدا ایک خدا) ہی نکلتا تھا۔ حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانۂ شکر ادا کرتے ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فقرہ جس کو آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب کے جواب میں کہا تھا اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہو گی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے فرمایا! چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دین حق سے باز نہ آؤں گا۔

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مر جائے، یا مارا جائے تو کیا تم اس راستے سے جس پر تم چل رہے ہو، اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت وحیات سے وابستہ نہیں اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ط اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ط وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا (آل عمران: ۱۵)	اور محمدؐ تو ایک رسول ہے، اس سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے، اور جو اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام [2] ابن سعد جلد ۳ تذکرۂ خبابؓ

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران : ۱۵)	اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے، تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ کم پڑا تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دب گئے۔ اور اللہ ثابت رہنے والوں کو پیار کرتا ہے اور نہ تھا ان کا کہنا، مگر یہی کہا اے ہمارے پروردگار بخش ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اسکو بخشدے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثبات قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے، جس کا نام مداومت ہے، یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے، اس پر مرتے دم تک مداومت رہے، اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے، ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجئے اور کبھی نہ کیجئے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے، نماز پڑھنا انسان کے سب سے اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں، فرمایا:۔

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ دَاۗىِٕمُوْنَ (معارج ۱)	لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)

اخلاق کی یکسانی، اخلاق کا بڑا جوہر ہے، اور اس کی مشق مداومتِ عمل سے ہوتی ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے، ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیقہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا عملِ نیک سب سے زیادہ محبوب تھا، فرمایا "وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے"[1] خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے، جسکو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ وہ تھوڑا ہو[2]۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح میدانِ جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور پامردی کا اظہار کرتی ہیں بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اسوقت سب سے زیادہ قابل ستائش سمجھا جاتا ہے، جب مادی قوت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو، اور اسلام نے اسی قابل ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم

---

[1] و [2] صحیح بخاری باب القصد و مداومۃ العمل۔

دیا ہے:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (الحجر ۔ ۶)

پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے، اسکو کھولکر سنا دو، اور مشرکین کی مطلق پروانہ کرو، ہم تم کو تمہاری ہنسی اُڑانے والوں کے مقابلہ میں جو خدا کیساتھ دوسرے دوسرے معبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں۔

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گذر گیا، اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت آگیا، اس لیے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو، اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو اس کے تمسخر اور استہزا کی مطلق پرواہ کرو بلکہ اس کی قوت و طاقت کی بھی پروانہ کرو، سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے، وہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں! ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے، اور ایک دوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:۔

وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (مائدہ ۔ ۸)

اور یہ لوگ کسی ملامت کرنیوالے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہل ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن و طعن کی پرواہ نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے، لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو" ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؛ فرمایا اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہیگا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؛ وہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف، ارشاد ہوگا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا خوف کرنا چاہیے تھا۔

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے اس لیے اُن کے سامنے حق گوئی کو آپؐ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:۔

افضل الجہاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر۔

بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔

دوسری روایت میں کلمہ حق کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیئے گئے ہیں ان میں دوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے، چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سنت کی مخالفت کی، آج تم نے منبر نکالا، حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا، نماز سے پہلے خطبہ دیا، حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا، اس پر حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد میں نے سُنا ہے کہ تم میں جو شخص برائی دیکھے

اور اس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے، لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے[1]۔

صحابہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا رتبہ حق گوئی میں بدرجۂ کمال تھا، یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفارِ قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا، اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہو گئے لیکن اس پر بھی ان کا نشہ نہیں اترا، اور دوسرے دن پھر جا کر اعلانِ حق کیا اور وہی سزا پائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مدح میں فرمایا کہ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں[2]، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی، اس پر انہوں نے بے محابا دار و گیر کی، اور اس میں امیر معاویہؓ کی پروا انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے، جو تم کو معلوم ہے، یہ سن کر حضرت ابوسعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے[3]۔

استغناء

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے:-

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران، ۱۰)

اور جو (مقدور رکھ کے بھی نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے) تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔

اور اس بے نیازی میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، وہی ایک بے نیاز ہے، اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے:-

وَاللهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد، ۴)

اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے، اسلام کے آئینِ اخلاق میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے، اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اس کے سوا کسی اور کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔ قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:-

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (فاتحہ)

(اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

---

[1] سنن ابی ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں تمام حدیثیں مذکور ہیں [2] جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ

[3] ترغیب و ترہیب منذری ۲، باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی

خدا نے جا بجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کار فرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے، فرمایا:-

وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (آل عمران ۱۸)	اور کیسا اچھا کارساز۔
وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا (اسرائیل ۱)	اور تیرا رب کارساز بس ہے۔
اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا (اسرائیل ۱)	میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا (نساء ۱۱)	اور اللہ کارساز بس ہے۔

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے:-

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (زمر ۳)	کیا اللہ اپنے بندہ کو بس نہیں۔

اس لیے کسی شاہ، امیر اور دولتمند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرا اصول جس پر اسلامی استغناء کی بنیاد ہے، وہ قناعت ہے، یعنی یہ کہ کم سے کم جو ملا ہے اس پر طمانیت حاصل کی جائے، اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے:-

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (نساء ۵)	اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (طہ ۸)	اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں، مال و دولت سے ان کی نیت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں، اس لیے وہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم خدا نے اس کو جو کچھ دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے، اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا، اس لیے وہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے، اس بنا پر استغناء و بے نیازی کا تعلق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے، بلکہ روح اور قلب سے ہے اور اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

لَيْسَ الغنى عن كثرة العروض ولكن الغنى غنى النفس (بخاری، رقاق، باب الغنی غنی النفس)	دولتمندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ اصلی دولتمندی دل کی بے نیازی ہے۔

اس حدیث کا ترجمہ شیخ سعدیؒ نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے، تونگری بدل است نہ بمال۔

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپؐ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوذرؓ تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا "ہاں" فرمایا بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی ہے[1]۔ اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے، مال و

---

[1] فتح الباری ج ۱۱ ص ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس

دولت سے پیدا نہیں ہوتی، یعنی خدا انسان کو جو کچھ دیدے اگر وہ اس پر دل سے راضی ہو جائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کو بھی تعلیم دی اور ان سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ، تو سب سے زیادہ بے نیاز ہو جاؤ گے[1]۔ ایک بار چند انصاریوں نے آپؐ سے مال کا سوال کیا اور آپؐ نے ان کا سوال پورا کیا، لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا، آپؐ نے پھر ان کا سوال پورا کیا، جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہو چکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا، جو شخص خودداری چاہتا ہے خدا اس کو خوددار بنا دیتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے[2]۔ اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپؐ سے بار بار مال کا سوال کیا، اور آپؐ نے ہر بار ان کا سوال پورا کیا لیکن آخر میں فرمایا کہ اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے، جو شخص اس کو کھلے دل سے لیتا ہے خدا اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا، ان میں اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ قبول نہیں کیا[3]۔

فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی، اور اس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا[4]۔ حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے[5]۔

⁂

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۲ [2] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستعفاف [3] ترمذی کتاب الزہد [4] زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دار المصنفین باب فی القناعۃ [5] مستدرک حاکم ج ۴ ص ۳۲۵ کتاب الرقاق۔

رذائل

رذائل کے معنی رذائل (یعنی بری خصلتیں)، وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے، جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور انکی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے، بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقیوں کی راہیں مسدود، اور سعادت و اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام اس قسم کے رذائل کے متعدد اوصافی نام قرآن پاک میں آئے ہیں، مثلاً اکثر ان کو مُنْكَر (بری باتیں)، اور فحشاء (بے حیائی)، اور کبھی فَاحِشَةٌ (فحش)، سَیِّئَةٌ (برا)، سُوْء (برائی) مَكْرُوْه (ناپسندیدہ) خِطْاً (ناصواب یا بھول)، اِثْم (گناہ)، عُدْوَان (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے، ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف ہونا کتنا گھنونا اور نفرت کے قابل ہے، اور یہ کہ وہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں، فرمایا:-

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ
نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً
كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ
وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ
لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝
كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ
مَكْرُوْهًا (بنی اسرائیل : ۴) ع ۴

اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو، ہم
ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے، بے شبہ ان کا مار
ڈالنا بڑی چوک ہے اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ
یہ بے حیائی اور بری راہ ہے اور زمین میں اترا کر نہ
چل کہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا، اور نہ لمبائی میں پہاڑ
کو پہنچ جائے گا، ان میں سے جو بری بات ہے وہ تیرے
پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

رذائل کے لیے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ مُنْكَر ہے، چنانچہ سورہ مائدہ میں جن برائیوں کے روک تھام نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے، ان کو ایک ہی لفظ مُنْكَر سے ادا کیا گیا ہے:-

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ
لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (مائدہ : ۱۱)

وہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے
نہ تھے کیا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔

اس بدکار قوم کی برائیاں گنائی جا رہی ہیں، اس سلسلہ میں ہے:-

وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (عنکبوت : ۳)

اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب ہوتے ہو۔

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے:-

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ: ۱۴)	اور منکر سے منع کرنے والے۔
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۲ و توبہ ۹)	اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

اور کہیں فَحْشَآءُ اور مُنْكَر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے :-

فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (نور: ۳)	اور فحشا اور منکر کرنے کو کہتے ہیں۔

نماز کی خوبی یہ ہے کہ :-

تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت ۵۱)	وہ فحشا اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشا، منکر اور بغی کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں، فحشا، منکر اور بغی :-

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نحل: ۱۳)	(مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے، اور فحشا اور منکر اور بغی سے منع فرماتا ہے، تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے، حضرت عثمانؓ بن مظعون کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم و حیا سے اسلام لایا تھا، اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی، لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑ لی[1]۔

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر و شر کی سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے[2]۔

قتادہؒ کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جن اخلاق حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا، اور وہ پسند کیے جاتے تھے، ان میں کوئی خلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو اور کوئی بداخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی آیت میں ممانعت نہ کی ہو[3]۔

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں، فَحْشَآء اور منکر اور بغی، ان میں سے ہر ایک لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشاء کے معنی ان میں پہلا لفظ فَحْشَآءُ ہے، جس کی دوسری صورت فَاحِشَةٌ کی ہے یہ لفظ فحش سے نکلا ہے، جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں[4] اور اس کے دوسرے لازمی معنی قبیح یعنی برائی کے ہیں، کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے وہی فحشاء کہلاتی ہے، قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود اللہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، مثال سے یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر فرما دیں، اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ تعدی حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے، فرمایا :-

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ [2] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۲۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [3] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور [4] الصحاح للجوہری لفظ فحش و لسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش"۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (مومنون، ۱)

اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر، تو انہیں ملامت نہیں کی جائے گی، پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے، اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہو گئے ہیں، قرآن نے کہا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا (اسرائیل: ۴)

اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ "فاحشہ" (یعنی قبیح بات) اور بُری راہ ہے۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے، جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی | دوسرا لفظ مُنْكَر ہے، اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے، اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے، وہ تو جانا پہچانا کام، اسی لیے اس کو مَعْرُوْف (شناسا) کہتے ہیں اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے، اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے وہ مُنْكَر (ناشناسا) ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناشناسا مہمان آجاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:۔

قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (حجر و ذاریات) یعنی لوگ ان جانے اور ان پہچانے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب ان کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا، مگر وہ لوگ ان کو پہچان نہ سکے، اس موقع پر قرآن میں ہے:۔

فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ (یوسف: ۷) یعنی یوسفؑ نے تو ان کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اسکے طور و انداز سے بداہتہً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے، یہ کیفیت بھی مُنْكَر ہے، فرمایا:۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا (حج، ۹)

اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سُنائی جائیں تو کافروں کے چہروں میں تو منکر (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا، نزدیک ہے کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں حملہ کر بیٹھیں۔

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے اسکو مُنْكَر کہا گیا ہے، ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وہ کام ہیں جس کو ہر شخص فطرۃً اور بلاشبہ ناپسند کرتا ہے اور ان کی برائی ایسی کھلی ہوئی ہے کہ اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملت اور ہر اچھے تمدن و تہذیب میں وہ یکساں بُرے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی | تیسرا لفظ بغی ہے جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں:۔

خَصْمَانِ بَغٰی بَعْضُنَا عَلٰی بَعْضٍ (ص:۲)	ہم دو جھگڑنے والے ہیں، ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دیدی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں:۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا	اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی پھیلا دے
فِی الْاَرْضِ (شوریٰ:۳)	تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے:۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ	راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں
وَيَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (شوریٰ:۴)	زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دوسروں پر زیادتی اور تعدی کے ہیں۔

اخلاقِ ذمیمہ بُرے کیوں ہیں اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فَحْشَآء، مُنْکَر اور بغی میں منحصر ہیں، صفاتِ ذمیمہ فَحْشَآء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کر دینے سے دوسرے کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورۂ اعراف کی ایک آیت ہے:۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ	اے پیغمبر! کہدے کہ میرے پروردگار برائی کے سارے
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ	کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ کو اور
بِغَيْرِ الْحَقِّ (اعراف:۴)	ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے ایک فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے، دوسرے گناہ کے کام، اور تیسرے ناحق زیادتی، ان اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں بُرا کہا ہے، اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت بُرائی اور بے حیائی کے کام ہیں، اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اور اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اُٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔[1]

رذائل کی ترتیب ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے، ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے، اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدمِ رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے، اوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے سب سے پہلے فَحْشَآء پھر مُنْکَر پھر بَغی۔

فَحْشَآء میں جس بُرائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے، جیسے ننگے رہنا بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ مُنْکَر سے پوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے، جیسے شوہر کا

---

[1] منطقی اصطلاح میں فحشآء، مُنکر اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے، یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہوسکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

ظلم، باپ کی سنگدلی، اولاد کی نالائقی اور بـعض جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو چھالیتی ہے، جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی دوسرے نظریہ کے رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں، اور پھر وہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

جھُوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بُری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے، یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وہ واقعہ کے مطابق ہوں، اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لیے یہ برائی ہر قسم کے قولی اور عملی برائیوں کی جڑ ہے، انسان کے دل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا، کوئی دوسرا کسی شخص کے متعلق اگر کچھ جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان سے یا عمل سے ظاہر کرے، اب اگر وہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کیخلاف ظاہر کر رہا ہے تو وہ ساری دنیا کو فریب دے رہا ہے، ایسے شخص میں دنیا کی جو برائیاں بھی نہ ہوں وہ کم ہے کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لیے نبی کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو، چنانچہ بعض پیغمبروں کے لیے یہ صفت کے طور پر بولا گیا ہے، فرمایا:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا (مریم: ۴)

اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ بیشک بڑا سچا نبی تھا۔

اسی لیے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہو گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی نبوت کا دعویٰ فرعون کے سامنے پیش کیا، اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰ کے صدقِ نبوت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی، اور کہا کہ جھوٹا نبی نہیں ہو سکتا۔

وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (مومن: ۳)

اگر یہ جھوٹا ہو گا تو اسکا جھوٹ اسی پر پڑے گا، اور اگر سچا ہو گا تو تم پر پڑیگا کوئی وعدہ جو تم کو دیتا ہے، بیشک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا۔ جو بے باک جھوٹا ہو۔

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعی نبوت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں، اور کفار کے طور و طریق پر چلتے

میں روم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوت سے پہلے کیا جھوٹ بولا کرتا تھا، ابوسفیان نے جواب دیا نہیں، قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وہ خدا پر جھوٹ[1] باندھے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے :۔

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ۙ یُّلْقُوْنَ
السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (شعراء ۱۱)

شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر، لا ڈالتے ہیں سنی
بات اور بہت ان میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت اور روش کے سراسر خلاف ہے اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے، ارشاد ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ
كٰذِبٌ كَفَّارٌ (زمر : ۱)

بیشک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو جھوٹا ہے
احسان نہیں مانتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لیجاتا ہے، اور گناہ دوزخ میں اور بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے"[2]۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جنت میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا، جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے، وہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وہ جنت میں داخل ہوا، اس نے پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ! دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔ (مسند احمد اول ص۱۷۶ مصر)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی برائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے جس سے زیادہ بری چیز کوئی دوسری نہیں، اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو گھیرے ہوئے ہے، اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کے بادِ سموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کے لغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے، لعنت کے معنی "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی" کے ہیں، قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بتایا گیا ہے، اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی [2] صحیح بخاری کتاب الادب، باب قولہ تعالیٰ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ و جامع ترمذی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ابو داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب ؛

کیا جھوٹ بولنے اور جھوٹ الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے، مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (آل عمران: ۶) پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا۔

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۝ (نور: ۱) اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بدعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے، حق کا علم رکھ کر بھی اس کے اظہار سے باز رہے، اللہ تعالیٰ نے ایسے جھوٹوں پر لعنت فرمائی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۝ (بقرہ: ۱۹)

بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان، اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے، ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے، اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں، اور اس کو جھوٹا سمجھیں، اس لیے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں، لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں، اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ، اس لیے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا چنانچہ قرآن پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے، فرمایا:۔

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۝ (منافقین: ۱) اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے فرمایا کہ منافق کی پہچان تین ہے، جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں، جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہی ہے مگر وعدہ کر کے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے، اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ گویا اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا، اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی برائی نہیں، بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں، بیسیوں قسم کی دوسری برائیاں بھی لازمی طور سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ، وَمَا يُنْهٰى عَنِ الْكَذِبِ:

پیدا ہو جاتی ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں، جیسے :-

أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (شعراء: ۱۱)	جھوٹ بولنے والا گنہگار
كَاذِبٌ كَفَّارٌ (زمر: ۱)	جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا۔
مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (مومن: ۳)۔	بے باک جھوٹا۔

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی برائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا، اس لیے وہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو جھوٹا ہوگا وہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں مانے گا، کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا، اور اگر وہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کاہے کو آنے لگا اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی بڑے سے بڑے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا، وہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وہ کہا جائے جو دل میں نہیں، یا جو امر کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو لیکن یہ کذب قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے کذب عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے۔

بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا	اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا
يَكْذِبُونَ (توبہ: ۱۰)	اور اس لیے کہ جھوٹ بولتے تھے۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا، ایک قسم کا فریب تو ہے ہی، مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے :-

وَسَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا	اور وہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور ہوتا تو ہم تمہارے
مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ	ساتھ لڑائی میں چلتے، وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے
إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ (توبہ: ۶)	ہیں، اور اللہ کو معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے ان صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنہوں نے اپنی سچائی کا عملاً ثبوت دیا، اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے ان کو منافق کا خطاب دیا ہے، فرمایا :-

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ	تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کے سبب سے اجر دے
الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ	اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا اُن پر رجوع ہو
عَلَيْهِمْ (احزاب: ۳)	(یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے، فرمایا :-

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ (علق: ۱)	جھوٹی خطاکار پیشانی۔

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے، جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے :-

قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ
يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ
بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ (آل عمران: ۱۷)

انہوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے
ساتھ چلیں وہ اسوقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں، وہ
منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔

دل کے ان بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے، اور مسلمانوں کو آ کر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ (نساء: ۹) یہ وہ ہیں جن کے دل کا حال اللہ جانتا ہے۔

ایسے ہی وہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے **جھوٹا ہے**، **ایک** دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا کہ یا رسول اللہ! میری **ایک پڑوسن** (سوتن) ہے کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا، اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدنظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے، فرمایا "جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے[1]" حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا، اور جس نے جو نہیں دیا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے، یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ، اسی طرح جو عالم نہیں وہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے جو دولت مند نہیں وہ دولتمندی کا دکھاوا کرے، یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا درحقیقت دوسرے کو فریب دینے کی کوشش ہے غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی زُور فرمایا ہے[2]۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں، اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو بُرا نہیں جانتے، جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی ہی دیر میں بھول جائیں گے، اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے مگر جھوٹ بہر حال جھوٹ ہے، اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے ایک کم سن صحابی عبداللہؓ بن عامر کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے تو ماں نے میرے بلانے کے لیے کہا کہ یہاں آؤ تجھے کچھ دونگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو ماں نے کہا اسکو کھجور دیدونگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہاں اگر تم اس کو اسوقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا[3]۔

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے، لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویہ سے بچہ کی تعلیم و تربیت پر بُرا اثر پڑتا ہے، بچپن میں بھی کچھ دیکھے اور سُنے گا، اسی سانچے میں ڈھلے گا، اسلیے لوگوں کو چاہیے کہ بچوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب ان کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے کہا جاتا ہے تو وہ تصنع اور

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب [2] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر [3] ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماءؓ بنت یزید نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے، اور پھر کہے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا، ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے[1]۔

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لیے بولا جاتا ہے اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس، اس پر افسوس[2]" کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے، اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں ان کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے، اس لیے اسکی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے لیکن وہ شخص اس کے علم و یقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے، اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب و نقصان میں مبتلا کر دیتا ہے، اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو در آنحالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو[3]"

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زور اور اِفْك وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے:۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ	بتوں کی گندگی اور جھوٹی بات کہنے سے
وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (حج ۳۰)	بچتے رہو۔

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھوٹی شہادت مراد ہے، جامع ترمذی میں ہے کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہؓ نے کہا "ہاں یا رسول اللہ"، فرمایا کہ شرک اور باپ ماں کی نافرمانی (راوی

---

[1] مسند احمد وطبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی ص ۲۴۰ باب فی ذم الکذب) [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب [3] ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وہو لک مصدق۔

کا بیان ہے کہ آپؐ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور کہا کہ "جھوٹی شہادت یا جھوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپؐ خاموش ہو جاتے[1]

اس آیت پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو برائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھوٹ ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

اِفْك اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کسی پر جھوٹ باندھنا مشرک خدا پر جھوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے اِفْك کہا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اس کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے، منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ اِفْك سے تعبیر کیا ہے، (نور: ۱) اور قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِفْك بڑے خبثِ طینت کا کام ہے فرمایا :-

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ (الشعراء : ۱۱) اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پر۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلاتحقیق دوسروں سے کہتا پھرے ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے، اور سوسائٹی میں اس کی بات کی کوئی قدر نہیں ہوتی اسلیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ
بِكُلِّ مَا سَمِعَ (مقدمہ صحیح مسلم) کہتا پھرے۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (مائدہ : ۶) جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے، ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے، اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ لوگ ان کے بیان کو سچا نہیں سمجھتے اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اول تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے، پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی برا ہے اسی لیے قرآن پاک میں اس قسم کے قسم کھانے اور قسم کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے، یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے، اسی لیے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو

---

[1] ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی عقوق الوالدین۔

اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے، تو وہ گنہگار ہوتا ہے، اور اس پر کفارہ لازم آتا ہے، کفارہ یہ ہے کہ وہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے[1]۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ج فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ط فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ط ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ط وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ط (مائدہ: ۱۲)

اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر نہیں پکڑتا، لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے جس کو تم نے گرہ باندھا، تو اس قسم کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا بیچ کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو یا ان کو کپڑا دینا یا ایک غلام آزاد کرنا، تو جس کو یہ پیدا نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ رکھنا یہ ہے تمہاری قسموں کا اتار، جب تم قسم کھا بیٹھو، اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے کھائی جائے، اگر وہ کوئی خلاف شرع، یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے، اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے، یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلافِ شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے، یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے، خدا نے فرمایا:۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (تحریم: ۱)

خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا ہے حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے، اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے حد درجہ بے اعتبار اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (قلم: ۱)

اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا نہ مان۔

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں، اور اس کا اعتبار کریں لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں، اسی لیے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے، اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے، منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب ان پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ منشا نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی، خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے:۔

فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ	پھر کیا جب ان کو اپنے ہی کرتوت سے کوئی تکلیف پہنچے
أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ	پھر تیرے پاس اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری
إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ۝ أُولَٰئِكَ	غرض بھلائی اور ملاپ کی تھی، یہ وہ ہیں جن کے دلوں
الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ (نساء: ۹)	کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

یعنی اللہ جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ، اور جھوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو، تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسول کو خوش کریں:۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ	تمہارے (مسلمانوں کے) آگے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں،
وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضُوهُ	تاکہ وہ تم کو راضی کر لیں، اور اللہ اور رسول کو راضی
إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (توبہ: ۸)	کرنا زیادہ ضروری ہے، اگر وہ ایماندار ہیں۔

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں، اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں:۔

يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ مَا قَالُوا ۭ وَلَقَدْ	خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے نہیں
قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ (توبہ: ۱۰)	کہا، حالانکہ انہوں نے بیشک کفر کی بات کہی۔

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر ان سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائیں گے سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ (توبہ: ۱۲) چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنْ	تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تم اُن سے
تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ	راضی ہو جاؤ، تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو
عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (توبہ: ۱۲)	اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی، خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی فرمایا:۔

وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ (توبہ: ۱۳)

اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

اہلِ نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے:-

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (مجادلہ: ۳)

اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (مجادلہ: ۳، منافقون: ۱)

انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔

یعنی قسمیں کھا کر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ، اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنایا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی:-

وَلَا تَنْقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ط إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ، وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا ط تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَرْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ ط (نحل: ۱۳)

اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو، اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے، بیشک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے، اور اس عورت کے جیسے نہ ہو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کیے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی، تم اپنی قسموں کو آپس میں پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

خدا کا نام لیکر کوئی معاہدہ کرنا، اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو، اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بیوقوف عورت کا تھا جو سوت کات کات کر کھول دیتی، یا ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لیکر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے، اب اگر وہ کوئی قوت پاکر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے، اور یہ ایک کے بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے، یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (آل عمران: ۸)

بیشک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سا مال خریدتے ہیں، آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں، نہ اللہ اُن سے بات کرے گا، اور نہ اُن کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ اُن کو پاک کرے گا، اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر ہے، مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہرحال عام ہے، ایک دفعہ حضرت عبداللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا، اشعثؓ بن قیس صحابی نے کہا "خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اُتری ہے، میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی، اس نے میری ملکیت سے انکار کیا، میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے، میں نے کہا نہیں، تو آپؐ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں نے عرض کی کہ یارسول اللہ وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا اس وقت یہ آیت اُتری[1]۔

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت ان سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں، ان کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپؐ نے تین دفعہ فرمایا "تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔" صحابی کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے، وہ کون ہیں یارسول اللہ! فرمایا جو اپنا لباس گھٹنوں سے نیچے تک لٹکاتا ہے (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے، اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے (مسلم و داؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ) بہرحال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے، اس لیے ان تمام واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا۔" صحابہ نے پوچھا یارسول اللہ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو، فرمایا درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو[2]، حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بڑے بڑے گناہ یہ ہیں خدا کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا، اور جھوٹی قسم کھانا، ایک اور حدیث میں ہے[3] کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لیکر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا[4]" چہرہ کی خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھیٹھائی دکھائی، جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتلانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں، اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں، اس لیے خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے فرمایا: "جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے، لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے[5]۔ روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی، لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور و ابن جریر [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین [3] سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر [4] سنن ابی داؤد کتاب الایمان [5] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی، مسند کی باب ترغیب التجار فی الصدق۔

کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو، کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہو جاتی ہے، کیسے بلیغ فقرے ہیں فَاِنَّهٗ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ (مسلم و نسائی و ابن ماجہ) جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بیباکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے قرآن پاک کی آیت اوپر گذر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلت و خواری کا سبب ہے وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (قلم) حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے[1]۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اس کے خلاف کرنا بہت بڑی برائی ہے، اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے، کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں، جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے، تو اپنے اوپر ایک ذمہ داری اوڑھ لیتا ہے، فرمایا :۔

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل ۔ ۴) بیشک وعدہ کی بازپرس ہوگی ۔

اور جس کی بازپرس خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی ۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ ان کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا، فرمایا :۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ (توبہ ۔ ۱۰)	پس اس کا اثر اُن کے دل میں خدا نے نفاق رکھا اُس دن تک جب وہ اس سے ملیں گے، اس لیے کہ انہوں نے خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا، اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ۔

صحیحین میں ہے کہ منافق کی نشانی تین ہے، جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے، جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے" (صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے) "اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو، اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے" صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے جب تک اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے[2]۔

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بولو تو سچ بولو، اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو، اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو[3]۔

---

[1] ابن ماجہ و صحیح ابن حبان منذری باب ترغیب التجار فی الصدق ۱۲ [2] ترغیب و ترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق

[3] احمد، حاکم، ابویعلیٰ، بیہقی، منذری باب انجاز الوعد ۱۲

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمانداری نہ برتنا خیانت اور بددیانتی ہے، اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اس میں بے جا تصرف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو، یا کسی نے دوسرے پر بھروسہ کرکے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے، اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا، علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمہ وقت اور اپنے متعلقہ قومی اور ملی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملت سے بددیانتی ہے، دوست ہوکر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے، اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں، فرمایا :-

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَخُونُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ وَتَخُونُوٓا۟ أَمَٰنَٰتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (انفال : ۳)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بددیانتی کرو۔

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کرکے پورا نہ کیا جائے، ایمانداری سے ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے، دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی جائے اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے یا مسلمانوں کے چھپے راز ان کو بتائے جائیں اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرف کرے، اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کردے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے[1]" ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا، قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا اگرچہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو، اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو، وہ کہے گا خداوندا! اب کیسے لاؤں دنیا تو ختم ہو چکی، کہا جائے گا اس کو دوزخ کے طبقۂ ہاویہ میں لے جاؤ وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی، تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا، اور اس کے پیچھے گرے گا، یہاں تک کہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا، پھر انہوں نے فرمایا نماز امانت ہے وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے، ناپ بھی امانت ہے اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا، اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث براءؓ بن عازب صحابی کو سنائی، انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی۔

---

[1] صحیحین وغیرہ ۱۲

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَھْلِھَا (نساء ۔ ۸)

بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر جو اس کے بعد آنے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے، خیانت کریں گے امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری نہ کریں گے[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن بُری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک خیانت بھی ہے فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت بُرا اندرونی ساتھی ہے[3]۔

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے مگر ان کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ اس کا بھید کھل جاتا تھا، فرمایا۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَۃٍ مِّنْھُمْ (مائدہ ۔ ۳)

اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے اُن کی ایک خیانت کی۔

یعنی ان کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسول کو ملتی ہی رہتی ہے۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی، اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا۔

ذٰلِكَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (یوسف ۔ ۷)

تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی، اور بیشک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بے وفائی کی، انکی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں، خدا نے فرمایا۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا (تحریم ۔ ۲)

خدا نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بتائی کہ یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی تو یہ دونوں پیغمبر ہو کر بھی، اپنی بیویوں کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے۔

یہ دل کی خیانت تھی۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے، بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ چشم و ابرو

---

[1] مسند احمد بیہقی منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد [2] صحیح بخاری و صحیح مسلم منذری باب مذکور [3] ابوداؤد نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور۔

کے اشاروں سے ہو سکتی ہے، لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی ہر حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے، تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو، اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے، فرمایا:۔

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (مومن : ۲)	اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔

پھر اس سے چھپ کر کیوں کر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غداری اور دغابازی

غداری اور دغابازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دیکر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پاکر اس کے خلاف کیا جائے قرآن پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے عربی میں عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں، اسلام نے اس کی شدید برائی کی ہے، کفار جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے، ان کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:۔

الَّذِينَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ○ فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ○ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ (انفال)	جن سے تو نے معاہدہ کیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ (خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے، سو اگر ان کو تو کبھی لڑائی میں پاؤ تو ان کو ایسی سزا دے کہ ان کے پچھلے دیکھ کر بھاگیں، شاید وہ عبرت پکڑیں اگر تجھ کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو تو برابر کا جواب دے اللہ کو دغاباز خوش نہیں آتے۔

اس آیت میں گو ان کافروں کا ذکر ہے، جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغابازی کرتے تھے مگر دو باتیں ان میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے، دوسری یہ کہ یہ غداری دغابازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے، اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے، بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لیکر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا، پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا، فرمایا:۔

وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (انفال : ۱۰)	اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں تو خدا نے ان پر قابو دیدیا اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے، تو خدا تو سب کا حال جانتا ہے، اور ہر مصلحت اسکو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس نے انکے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا، قیامت کے دن ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی،[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ بدعہدی نہ کرنا[2] یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غداری نہ کیجائے، ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں، سپہ سالاروں کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وہ ان کے قابو میں آجاتا ہے تو اس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اس سے الگ ہوں، اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو[3]

خدا فرماتا ہے :۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۱) اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول قرار) کو پورا کرو۔

عقود کی تعمیم میں وہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں، جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے، یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے[4] ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدت متعینہ کے لیے کوئی معاہدہ کیا، اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیر موصوف اپنی فوجیں لیکر ان کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں، یہ دیکھ کر عمروؓ بن عنبسہ نامی صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلائے اللہ اکبر اللہ اکبر بدعہدی نہیں، امیر معاویہؓ نے بلوا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دیکر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے،" یہ سن کر امیر معاویہ واپس چلے آئے۔ غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی، لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا، اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

بہتان

بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے، یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے، بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا، لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لیے تھوپا جاتا ہے کہ اس کی بدنامی ہو قرآن نے اس کا نام اِفْك رکھا ہے، یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر [2] ایضاً [3] سنن ابی ماجہ وصحیح ابن حبان منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد

[4] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد ؎

بہتان باندھنے میں شریک ہوجاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طعمہ نامی مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر میں چوری کی، مسلمانوں کو اس پر شبہہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا، وہ تلوار کھینچکر کھڑا ہوگیا۔ یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحیِ الٰہی نے دفعتاً حقیقت کا پردہ چاک کردیا۔[۱] دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی، اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کردیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی، لوگوں نے اس کو پکڑا، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا آپؐ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا اس وقت یہ وحی آئی[۲] بہرحال واقعہ جو کچھ ہوا امر مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ۝ (نسآء: ۱۶)

ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ سچی کتاب اتاری ہے، کہ تو لوگوں کے درمیان اسکے ذریعہ جو خدا نے تجھ کو سوجھایا انصاف کر، اور خیانت کاروں کی طرف سے نہ جھگڑ اور اللہ سے قصور معاف کرا بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں، بے شک اللہ خیانت کار گنہگاروں کو دوست نہیں رکھتا وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ سازش کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں اور اللہ ان کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے:۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓــئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (نسآء، ۱۶)

اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ اسکی تہمت کسی بےگناہ پہ دھرے اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

ان آیتوں میں خیانت کاری، تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے، سب سے پہلے تو رسول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور انکی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہگار ہیں اور خدا کی محبت سے محروم ہیں یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں، اور خدا سے نہیں شرماتے، جو ہر جگہ ان کے ساتھ ہے، اور ان کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے، اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے، اگر یہی یقین کسی کو ہوجائے تو وہ کسی پہ تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کرسکتا اس کے بعد یہ سرزنش اس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر

---

[۱] جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء [۲] تفسیر طبری سورۂ نساء آیت اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؎

اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی، وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی نسبت دیتی تھی، خدا نے اسکو بہتان کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے، اس سے یہ بیعت لیجائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی۔

وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَه بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ۔ (ممتحنہ ۲)	اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بری بات ہے، پھر بن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اسکو دلی تکلیف پہنچانا تو بری بات ہے، خدا نے فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (احزاب ۷)	اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ ان کی عزت پر حرف رکھنا ہے اس لیے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے، اسکو کوڑے مارے جائیں۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا (نور ۱)	اور جو لوگ شریف بیبیوں کو عیب لگاتے ہیں، پھر نہ لائے چار گواہ۔ تو ان کو اسی کوڑے مارو، اور انکی گواہی کبھی نہ مانو، اور وہ فاسق ہیں، مگر جنہوں نے توبہ کی۔

اس بہتان کی برائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالیٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا، اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا، حالانکہ وہ بیگناہ ہو، یعنی اس نے وہ جرم نہیں کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا[۱]۔ یہ گویا قذف یعنی تہمت بیجا کی مثالی سزا ہوگی، ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ جس میں جو برائی نہیں، اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے[۲]۔ یعنی اس سے بچنا چاہیے۔

چغلخوری

چغلخور کا کام یہ ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسوخ جتائے، اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی الٹی بات دوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دوسرے کو پہلے پر غصہ آئے اور اس سے نفرت پیدا ہو، اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف

---

[۱] و [۲] سنن ابوداؤد کتاب الادب۔

میں جن کی بات نہیں ماننی چاہیے یہ لفظ کہے ہیں :۔ مَشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ (قلم) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے ۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لیکر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اس کی بات ہی نہ مانی جائے، ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو، فرمایا :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ (حجرات : ۱)

اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو، کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو، پھر اپنے کیے پر پچھتانے لگو.

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور چونکہ اس بد اخلاق کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں، بالخصوص، عزیز و اقارب اور دوست و احباب میں نااتفاقی پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بُرے لوگ کون ہیں، پھر خود ہی فرمایا :۔

المشاؤن بالنميمة المفسدون بين الاحبة (مسند احمد ج ۶ ص ۴۵۹ عن اسماء بنت يزيد) جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں ۔

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبرستان کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔

الا انبئكم ما العضة هي النميمة القالة بين الناس ۔

کیا میں تم کو بتاؤں کہ عضہ کیا ہے، وہ چغلخوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے ۔

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں، اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغلخوری کی حقیقت میں داخل ہے، لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغلخوری میں مشابہت و مناسبت ہے کیونکہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بی بی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے، چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے :۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (بقرہ : ۱۲)

اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں ۔

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت، ماروت سے سیکھتے تھے، لیکن بعض علماء کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا ۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے، مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو یہ ہدایت کی تھی :۔

لا يبلغني احد من اصحابي عن احد شيئا فاني

میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے

احب ان اخرج الیکم وانا سلیم الصدر[1] کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں، بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گذرتی ہے بعض موقعوں پر دوسرے لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں، غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے اور جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ ان کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں، اسی بنا پر اہل عرب چغلخوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں، یعنی جسطرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چن چن کر لاتے ہیں، اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتش فتنہ و فساد کیلئے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسرین کی رائے کے مطابق "حَمَّالَةَ الْحَطَبِ" یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں یعنی چھپ چھپ کر لوگوں کی باتیں سُنتے ہیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتات کہتے ہیں اور ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

لَا یَدخل الجنۃ قتات[2] جنت میں چغلخور داخل نہ ہوگا۔

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تاکہ ان کا اثر بڑھ جائے اسی لیے عربی زبان میں چغلخوری کو "وشایہ" کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں اور اِدھر کی اُدھر لگانے کے لیے چغلخوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے، اسی مناسبت سے چغلخوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہیں، جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے، لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ تحریر کتابت رمز و اشارات سے بھی چغلخوری کی جاسکتی ہے، اور وہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں، یعنی دوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جاسکتا کہ "فلاں شخص یہ کہتا تھا" بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "فلاں شخص یہ کام کرتا تھا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اسکی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دوسرے تک پہنچانا جس سے دوسرا پہلے سے بدگمان ہوجائے۔

(بقیہ حاشیہ [4]) صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لا یستتر من بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل علی نجاسۃ البول [5] مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم النمیمۃ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی القتات ؛

اسی بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ فلاں شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سنے ان کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ترک مالایعنی" کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اور قتل و خون ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے، اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب، فریب، نفاق، غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں، اس لیے وہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہ کبیرہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے، اگر امراء کے درباروں میں تملق و خوشامد کے لیے چغلخوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریح خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے، اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اس کو لوگ گناہ کبیرہ نہیں سمجھتے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے، حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مردوں کی آواز سنی جن پر ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا، فرمایا ان پر عذاب ہو رہا ہے، لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا، حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں ان میں ایک تو پیشاب سے آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا[1]۔

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپؐ نے یہ فرما دیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے، محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اسقدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ ان کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر و موبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے، چنانچہ افک عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ	جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس کی نقل در نقل کرنے لگے اور اپنے منہ
مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا	سے ایسی باتیں کہنے جسکو تم کو مطلق خبر نہیں اور تم نے اسکو ایسی ہلکی
وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ○ (نور: ۲)	(سی) سمجھا حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں، عام دلچسپی کی وجہ سے وہ معمولی خیال کی جاتی ہیں، حالانکہ وہ معمولی نہیں ہوتیں۔

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے، یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل، اور ناقابل اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے، بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے اور کوئی ذریعہ

---

[1] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر۔

نہیں پاتے تو چغلخوری سے کام لیتے ہیں، اس لیے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی بات ناقابل اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:-

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ
مَّشَّآءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ
مُعْتَدٍ أَثِيمٍ (قلم: ۱)

اور تو ایسے کا کہنا نہ مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے، لوگوں پر آوازے کستا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے، اچھے کاموں سے لوگوں کو روکتا رہتا ہے، حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے۔

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں، اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے، اور ان کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے، شریعت نے انکی ممانعت کی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر ان کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن
قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ
مِّن نِّسَآءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا
أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ
الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ، وَمَن لَّمْ
يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ
الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب
بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن
يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ
وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝ (حجرات: ۲)

مسلمانو! مرد، مردوں پر نہ ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں عجب نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو نام دھرو، ایمان لائے پیچھے بدتہذیبی کا نام ہی بُرا ہے اور جو (ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی خدا کے نزدیک ظالم ہیں، مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچتے رہو کیونکہ بعض شک داخل گناہ ہیں اور ایک دوسرے کی ٹٹول میں نہ رہا کرو، اور تم میں ایک کو ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے، بھلا تم میں سے کوئی (اس بات کو) گوارا کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے تو تم کو گھن آئے اور اللہ سے تقویٰ کرو بیشک اللہ رجوع ہونیوالا اور رحم کرنیوالا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہیے، لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے، وہ غیبت ہے، امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارات، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کیے جا سکتے ہیں، اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت پُرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے، اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے، جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں،

۱۔ انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے اس لیے جو چیز اس کی عزت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲۔ لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدتِ غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں اگر چہ یہ بھی ایک بُرا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مر جانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے اسی طرح اگر کوئی شخص رُو در رُو کسی کو بُرا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی، لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی بُرائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے، اور بعینہٖ ایسا ہے، جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

۳۔ لوگ شدتِ محبت سے بھائی کی مردہ لاش کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، اس لیے جو شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے، اس سے اس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ اس لطف و محبت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴۔ مردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مردار گوشت مل جائے تو وہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لیے غیبت اس وقت جائز نہیں ہو سکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے، اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہیے، اور صرف رمز و اشارہ سے کام لینا چاہیے، اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی برائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ شبِ معراج میں میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جس کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ ان سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے، میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے، اور ان کی عزت و آبرو لیتے تھے[1]

اعمال اور اعمال کی جزا و سزا میں مناسبت ہوتی ہے، یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے، یعنی ان کی غیبت کرتے تھے اسلیے عالم برزخ میں انکی یہ سزا مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؛ یہ ان لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں[2]

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزا و سزا کی مناسبت ظاہر ہے، مردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے، اس لیے یہ بدبو اسی مردار خواری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ یہ بھی ہے اور وہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عیوب کی تشہیر و تفضیح

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ [2] ادب المفرد باب الغیبۃ ؛

کی جائے اس لیے جس طرح غیبت کرنیوالے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں اسی طرح ان کے ۱۳: عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو ان سے متنفر کرتی ہے، اسی نکتہ کو آپؐ نے دوسری حدیث میں بلاتشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا "اے وہ لوگو! جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، اور نہ انکے عیوب کی تلاش میں رہو کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا، خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا۔ اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اسکے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کریگا۔[1]

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں، مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لیے کوئی قید نہیں اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں، آپؐ نے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے"، کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں، تو فرمایا اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہوگی، لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہل لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اسکی عدم موجودگی میں کی جائے، باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ سب و شتم میں داخل ہے۔

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں، اور آنکھ کے ذریعہ سے بھی غیبت کیجا سکتی ہے، کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کو نمایاں کرنے کے لیے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے، ایکبار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔[3]

اسی طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے:۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ (قلم ۱)	(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (ادھر کی ادھر) لگاتا پھرتا ہے۔
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ، (ہمزہ)	ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا اور (ان پر) آوازے کستا ہے اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دلخراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمے سے نہیں ہو

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ [2] و [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

سکتی، بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں :۔

(۱) **ھمز**، سامنے، اور **لمز** پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا۔

(۲) **ھمز**، خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی بیان کرنا۔

(۳) **ھمز**، ہاتھ کے اشارے سے اور **لمز** زبان سے غیبت کرنا۔

(۴) **ھمز**، زبان سے اور **لمز** آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

(۵) **ھمز**، برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

(۶) **لمز**، آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی برائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی برائی بیان کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے، لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی برائی بیان کی جائے تاکہ ان کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو، اگر بروں کی برائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو انکی برائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہوسکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا، قرآن پاک میں کافروں مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں، مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغہ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں، یا کفر کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے اس طریقۂ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بروں کی برائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو گلہ کا حق بھی نہیں پہنچتا اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لیے گئے ہیں وہ اس لیے کہ انکی یہ برائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے، قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے قرآن پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا	اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی، لیکن جس پر ظلم ہوا ہو،
مَنْ ظُلِمَ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا (نساء : ۲۱)	اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے، لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے، ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی، آپؐ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے، لیکن جب وہ پاس آیا تو اس نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی[1]، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے اس کے احوال واقعی کا اظہار جائز ہے، غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، اسکو یا تو غیبت ہی نہیں

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما یجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب ۔

کہہ سکتے اور اگر کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے، امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہ سلطانی میں فریاد کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالٌ۔

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب (چنانچہ اسی بنا پر کفار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت ازبام کی ہیں)

(۳) فتویٰ طلب کرنا، اسی بنا پر حضرت ہند بنتِ عتبہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی، اور آپؐ نے سن کر اس کا مناسب جواب دیا۔

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا (چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی غرض سے ایک شخص کو بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيْرَةِ "قبیلہ کا بُرا آدمی" کہا تھا۔

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اس کا عیب ظاہر ہو مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو، مثلاً اعمش یا اعرج، کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک صحابی کو ذو الیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی برائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبیہ اور دوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنث کو مخنث کہنا۔

دُورُخاپن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے لیکن اس قسم کے تعلقات میں دو رخا پن نہیں پایا جانا چاہیے یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے، بلکہ یہ بداخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ چغل خور صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچاتا ہے اور دو رُخا پن آدمی دونوں کی بات ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دو رُخے پن کے لیے صرف ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے، اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دو رُخا کہلائے گا۔ نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے، اسی لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ "ہم لوگ امرا اور حکام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب ان کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں!" بولے "ہم لوگ عہد رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے[1]" اور قرآن مجید میں بھی

---

[1] صحیح بخاری باب ما قیل فی ذی الوجہین۔

نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے :۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ (بقرہ : ۲)

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں ہم (بھی تو) ایمان لاچکے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں ۔

معاشرتی اور دینوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاق منافقوں کو اردو میں دو رُخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں، اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے وعید شدید آئی ہے۔ مثلاً فرمایا "قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے بُرا دو رُخے کو پاؤگے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رُخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔"[1]

ایک اور حدیث میں فرمایا :۔

"دنیا میں جس کے دو رُخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں دو زبانیں ہوں گی۔"[2] یہ گویا اس کی اس عادت ذمیمہ کی تمثیل ہوگی کہ وہ لوگوں سے دو رنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بدنیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسن نیت نظر نہیں آتا، دوسروں کی طرف اَن ہوئی باتیں منسوب کرنے لگتا ہے، دوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وہ بھی کترانے لگتا ہے، اس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ (حجرات : ۲)

اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض وحسد اور دوسرے کے معاملات کے تجسس وتلاش کی بھی ممانعت فرمائی کیونکہ وہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں، فرمایا :

> "تم بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے، تم دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو، اور نہ ایک دوسرے پر بڑھنے کی بے جا ہوس کرو، اور نہ آپس میں حسد رکھو، اور نہ بغض رکھو، اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو، اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے، آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔"[3]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کام کر رہا ہو، یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے، تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے، اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ما قیل فی ذی الوجہین و صحیح مسلم و مالک [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ذی الوجہین۔

[3] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و مالک، باب تحریم الظن ۔

ہے، ایک دفعہ آپؐ اعتکاف میں بیٹھے تھے، رات کو ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی آپؐ سے ملنے آئیں آپؐ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آ گئے، وہ آپؐ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے آپؐ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپؐ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے[1]۔

مداحی اور خوشامد

مداحی اور خوشامد، اخلاق کی پستی، دناءت اور ذلت کی علامت ہے، اور ساتھ ہی جھوٹ کی بھی ایک صورت ہے، اور یہ اس کے لیے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مداحی اور خوشامد کی جاتی ہے، خوشامد اور مداحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں، یہ جھوٹ ہے، دوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا، یہ نفاق ہے، تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے ارباب قدر و جاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے، جس سے اس کی دناءت اور ذلت ظاہر ہوتی ہے۔

بیجا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی، تعریفیں سن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے، اور پے در پے تعریفیں سن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے، اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے، بادشاہوں، امیروں، دولتمندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس طرح وہ بر خود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآن پاک میں یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے[2] اور ان کے انجام کی یہ خبر لکھ دی ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ
اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّھُمْ
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (آل عمران: ۱۹)

جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں اور جو انہوں نے نہیں کیا اس کی تعریف
کیے جانے کو پسند کرتے ہیں تو ان کو نہ سمجھنا کہ وہ سزا
سے بچ جائیں گے اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

ان آیتوں کا شان نزول گو خاص ہے، مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے[3]، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بری بات ہے کہ بن توبہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے، مگر یہ کہ مغفرت الٰہی دستگیری فرمائے، اور قرآن پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں، وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں، اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں، جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ

---

[1] صحیح مسلم باب انہ یستحب لمن روی خالیا بامراۃ یقول ھذہ فلانۃ۔ [2] صحیح بخاری تفسیر آل عمران۔ [3] فتح القدیر شوکانی۔

علیہ وسلم نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کر دیا۔[1] ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن مار دی، اگر تم کو کسی کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وہ واقعی ایسا ہو، اور قطعیت کیساتھ غیب کا حکم نہ لگایا جائے۔[2]

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وہ اس کو سن کر مغرور ہو جائیگا، اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہیں لگانا چاہیے کہ کسی کو دوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں ان کو سن کر ان کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے، ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں، تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی، اور فرمایا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ" مداحی کرنے والوں سے ملو تو ان کے منہ میں خاک جھونک دو"[3] ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ آپؐ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے، تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں، آپؐ نے فرمایا" اس کو سُنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو[4]۔

بُخل

بُخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے۔ یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے، خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بعض دفعہ بے رحمی، بدخلقی اور دناءت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی، اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا، ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اس کے مصارف ہیں، جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرائیلؑ کی آمد کا حال سنایا، تو حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو آپؐ کی نبوت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں۔

"یا رسول اللہ! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں۔ مہمانوں کو کھلاتے ہیں، اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں"۔ (صحیح بخاری، باب بدء الوحی)

---

[1] صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح [2] صحیح بخاری و مسلم و ابو داؤد باب مذکور [3] صحیح مسلم و ابو داؤد باب کراہیۃ التمادح [4] باب یحثی فی وجوہ المداحین۔

غور کیجئے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر، جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہیں ہوتا، ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کے خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں، کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالہ کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے، اس میں دوزخیوں کے سوال و جواب کا ایک مکالمہ ہے۔ ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے، تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دین حق پر اعتراض کیا کرتے تھے، اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ (مدثر ۔ ۲)

تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی، کہیں گے ہم نمازی بھی نہ تھے اور مسکین کو کھلاتے نہ تھے اور بحث کرنیوالوں کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے، اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ جیسا کہ کہا گیا، جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہیں، وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کر سکتا، یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے، فرمایا:۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ (ماعون)

کیا تو نے اُس شخص کو دیکھا جو جزا کے دن کو جھٹلاتا ہے! پس یہی وہ ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے، اور فقیر کو کھانے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کیے بغیر اگر کوئی فیاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں، کیونکہ یہ فیاضی اس اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر نہیں ہو سکتی، جو قبولیت کی سب سے پہلی شرط ہے، بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے، اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی تو وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے، اور کبھی ضائع نہیں جا سکتی۔

ایک اور مکی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہیں، اور اس لیے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے، خدا فرماتا ہے:۔

كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ وَتَأْكُلُونَ

یہ خیال صحیح نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ تم بن باپ کے بچہ کی توقیر نہیں کرتے اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے

التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر)

کو رغبت نہیں دلاتے، اور مردہ کے متروکہ مال کو کھا جاتے ہو، اور مال و دولت سے بڑی محبت رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب کی سب بخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں، سورۂ ہمزہ میں اس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے، جو دولت کی تھیلیوں کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ ان کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائیگا، اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی، حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے، فرمایا:-

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۝ (ہمزہ)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنا کیا اس کو، سمجھتا ہے کہ اسکا مال اسکو ہمیشہ زندہ رکھے گا، ہرگز یوں نہیں، وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرنیوالے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے۔

كَلَّا ۭ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝ (معارج: ۱)

ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے کھال کھینچ لینے والی، پکاریگی اسکو جس نے (حق سے) پیٹھ پھیری اور منہ موڑا اور اکٹھا کیا اور سینتا۔

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے، سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا اور مکان کی چار دیواری نہیں بن سکتیں، اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں، ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ نہیں کرتا وہ اپنے لیے درہم و دینار نہیں جمع کرتا، اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے، فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝ (توبہ: ۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں، اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انکو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے، جبکہ اسکو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائیگا، پھر اس سے انکی پیشانیاں، کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی، اور کہا جائیگا کہ یہ ہے وہ جسکو تم نے اپنے لیے گاڑ کر رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے، اسکو چلتا پھرتا رہنا چاہیے، اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کیخلاف اور اس جماعت کے لیے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ

اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے، روکے رکھتے ہیں، وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ

36

شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۱۸۰)	سمجھیں، بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے، جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں اسکا طوق بنا کر انکے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائیگا

یعنی جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے۔ وہ قیامت کے عالمِ مثال میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا، حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا[1]۔

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلق خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی، اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ نِ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (حدید: ۳۰)	اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا جو آپ بخل کرتے ہیں، اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے، اسی لیے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے، اور عزیز و اقارب بھی محبت نہیں کرتے، اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی مثال کا نام قارون بتایا گیا ہے، جسکا قصہ سورۂ قصص میں ہے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا، اتنا مالدار تھا کہ تمدن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدی ہوتی ہوگی خزانے تو الگ رہے خزانے کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ کا شکر گذار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت میری محنت اور ہنر کا نتیجہ ہے، اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولتمند گذر چکے ہیں جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے، چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی، خدا نے فرمایا:-

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا (قصص: ۸۰)	کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔

زمانہ محمدیؐ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:-

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

مَا اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ (ابی لہب) ابولہب کو اسکا مال اور جو کچھ اسنے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

نفس کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کیجائے، بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کل کی کل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے، اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا ہے۔ جس کا وہ بھی ایک فرد ہے:۔

هَاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَمَنْ یَّبْخَلْ
فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاللّٰهُ الْغَنِیُّ
وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (محمد: ۴)

ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا جا رہا ہے، تو تم میں کوئی بخل کرتا ہے اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے ہی سے بخل کرتا ہے، اور اللہ بے نیاز ہے، اور تم ہی محتاج ہو۔

یعنی اس کے بخل کے بُرے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر نہ عزت نہ آبرو، ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے، ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے، فقراء اس کے لیے بددعا کرتے ہیں، یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے، ہر ایک اسکی دولت کا خواہاں رہتا ہے، اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کر لے، چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں، مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اسمیں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا، لیکن ادھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور ادھر اس کے وارثوں نے اللے تللے اس کو اڑا دیا، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے وہ اس مال مفت کو دم کی دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بری عادتوں میں مبتلا اور آخر میں مفلس و قلاش ہو جاتی ہے۔

خدا اپنے رسولؐ کی زبانی فرماتا ہے:۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ
بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى وَمَا یُغْنِیْ
عَنْهُ مَالُهٗۤ اِذَا تَرَدّٰى (اللیل)

اور لیکن جسنے دینے سے بخل کیا، اور (خدا کی یا نیکی کی باتوں کی) پرواہ نہ کی، اور اچھی بات کو جھٹلایا، تو ہم اسکو سخت کام کیلئے آسان بنائیں گے اور جب وہ گریگا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لیے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے وہ بری عادت و خصلت اور برے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور ان کو صرف اس لیے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے بڑی آسانی سے کر گذرتا ہے، بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا عزیز و اقارب، دوست و احباب سے اس کو مسرت نہیں

ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں، پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی، اس وقت افسوس آئیگا تو اللہ تعالیٰ پہلے ہشیار کر دیتا ہے:-

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (منافقون، ۲)	اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو (ایسا نہ ہو کہ موت آنے لگے) تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا اس کے سامان پہلے سے چاہیے تھا، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے، وہ کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتے ہیں، اور نیکی کے ہر راستے سے منہ موڑ لیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:-

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (توبہ، ۱۰)	اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے پھر جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اسمیں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔

خدا فرماتا ہے بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ (توبہ، ۱۰)	تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے شاید اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں بخل اور بد خلقی[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن برائیوں سے بچنے کی خدا سے دعا مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک بخل بھی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ "خداوندا میں بخل، کسل، بزدلی، کبرسنی، قبر کے عذاب، اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں[2]۔

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے، یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و مبرات کی ترغیبات شریعت محمدی میں اسی لیے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک صاف رہیں۔

یہ بھی پیش نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو کچھ دیا ہے، مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے، تو جو لوگ خدا کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی

---

[1] جامع ترمذی [2] صحیح مسلم۔

سزاؤں کے مستحق ہیں، جس کو علم ملا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے، اسی لیے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے:۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۶)	اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا“[1] اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے اللہ کے حق اور بندے کے حق، اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ، یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے، دیکھئے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجاآوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے:۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ (مدثر: ۲)	کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی، کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے، اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجاآوری سے انحراف، اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے، یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے:۔

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝ (ماعون: ۱)	پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پروا رہتے ہیں وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں یہ حقوق الٰہی سے تغافل ہے اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک، آگ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے، یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے، اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے، اور اس لیے اس کی برائی جتنی بھی کی جائے کم ہے۔

حرص و طمع

حرص و طمع یا لالچ وہ برائی ہے جس میں نفس کی دناءت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے، خصوصاً وہ حرص و طمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو عربی میں ان کو شُحّ کہتے ہیں، جس کی برائی قرآن میں کئی موقعوں پر آئی ہے، خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے، گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا، اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں، شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے، اس لیے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں یا ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم۔

بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے، اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو، اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا عشرت کدہ بن جائیگا، میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے :-

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا (نساء ۱۹)	اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے، اور اگر تم احسان کرو، اور تقویٰ اختیار کرو، تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے۔

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں، اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ جو ہر ایک کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے، جب تک انسان اپنی حرص و طمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی، فرمایا :-

وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (تغابن ۲)	اور خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کی وصف یہ ہے کہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں :-

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (حشر ۱)	اور اپنے اوپر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ خود اُن کو ضرورت ہو، اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

اسی کا نام ایثار ہے، یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا جب تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہو اسی لیے خدا نے فرمایا جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا بلکہ دوسرے کے مال پر نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے، کیونکہ اس میں دو بد اخلاقیاں شامل ہیں، ایک بخل اور دوسری حسد، فرمایا :-

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (نساء ۵)	اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے، مردوں کے لیے اُن کی کمائی ہے اور عورتوں کے لیے اُن کی اور اللہ سے مانگو اس کے فضل میں سے حصہ، بیشک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی، کاش خود اُسے ملتی، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے، اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا، اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی، ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا، اسی لیے فرمایا :۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْہُمْ (حجر ۔ ۶)

اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں، اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اُٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے۔

یہی حرص و طمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "حرص و طمع سے بچو، کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا، اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حلال کو حرام سمجھا"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے، صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے فرمایا "حرص سے بچو، کیونکہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے دبے گناہوں کا خون بہایا، اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں، اسی نے ان کو کہا تو انہوں نے رشتے کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا، اسی نے ان کو فسق و فجور کے لیے کہا تو انہوں نے فسق و فجور کیا"[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان میں سب سے بری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے"[4] حریص آدمی ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے، میرے پاس نہیں، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا، نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے"[5] سبب ظاہر ہے کہ ایمانِ کامل کا نتیجہ صبر، توکل اور قناعت ہے، اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے، ایک دفعہ برائی کے لہجہ میں فرمایا کہ "انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص"[6] کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بھیڑیے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے[7]

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم [2] صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم [3] صحیح ابن حبان و ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجرأۃ والجبن [4] ابوداؤد حاکم [5] نسائی [6] ترمذی [7] ترمذی و صحیح ابن حبان و طبرانی و ابو یعلی و بزار (منذری ۲ ص ۲۳۵)

کا حق رکھتا ہے، کسی دوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے، اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں، اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے، اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے، وہ فطرت کے نظام عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے، اسلام نے اس نظام عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (نساء : ۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکا اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے، غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے، اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھایا، اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا، وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں[1]"۔ جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی، ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک غلہ کا ڈھیر پڑا دیکھا، آپؐ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سوکھا ہے آپؐ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے، فرمایا تو پھر اس کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں، جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں[2] رسول سے اسکا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہوا "وہ جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لیے جھوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملیگا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا[3]"، ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپؐ نے فرمایا اگر اس نے قسم کھالی تا کہ وہ ظلم سے مال زلے لے تو خدا سے جب وہ ملے گا تو خدا اس سے منہ پھیر لیگا[4]"۔

کسی کے مال و جائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو "غصب" کہتے ہیں، غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا:۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا (کہف : ۱۰)

وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی، جو دریا میں محنت کرتے تھے، تو میں نے چاہا کہ اس میں کچھ عیب ڈالدوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین کر لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی برائی تھی، کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا، اس برائی کو برائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غشنا فلیس منا [3] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم [4] صحیح کتاب الایمان باب من، قطع حق مسلم ؛

حضرت سعیدؓ بن زید صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طَوَّقَهُ اللّٰهُ فِي سَبْعِ اَرَضِيْنَ[1] تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا، یا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں گے[2]۔

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے، کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں، حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں، اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلادی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے، کیونکہ میں نے اسکو آگ کا ٹکڑا دیا ہے[3]"۔

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں، اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لیجا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے مت
وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ	کھاؤ اور نہ پہنچاؤ حاکموں تک اس کا معاملہ، تاکہ کھا جاؤ
النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ: ۲۳)	لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پاکر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگار بھرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى	بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا جاتے ہیں، وہ اپنے
ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ	پیٹ میں آگ کھاتے ہیں، اور اب وہ آگ میں
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (نساء: ۱)	بیٹھیں گے۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے اسی لیے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا	اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ
جَزَاۗءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ	ڈالو سزا ان کی کمائی کی، تنبیہ اللہ کی طرف سے اور

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم وغصب الارض، یہ عبارت کئی طرح سے ہے فی سبع ارضین، من سبع ارضین الی سبع ارضین [2] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ ۔

عَزِيزٌ حَكِيمٌ (مائدہ ۶:۵) اللہ ہے زور آور حکمت والا۔

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے، دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے، اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے پھر اسی کے بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں، اور چور چونکہ بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے، اس لیے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے، اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کیلئے مسلمان ہونیوالوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی، سورہ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بی بیوں سے لیا جاتا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ چوری نہ کریں گی۔ فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خاتونیں اسلام قبول کرنے آئیں، تو آپؐ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا، اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کہ یا رسول اللہ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ میرے اور میرے بچوں کیلئے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں فرمایا تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو[1]: اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کیساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہے، اگر ہم اسکو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپ نے لیا ہے حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ آپ نے فرمایا، ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری، اور بدکاری نہ کرو گے، پھر آیت پڑھی، جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دیدی گئی، تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہوگیا، اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے چاہے معاف کر دے چاہے سزا دے[2]۔"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چور پر لعنت بھیجی، فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسی چراتا ہے، پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب النفقات [2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لیے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں کرتا، یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہیں دیکھتا اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا"[1]۔

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے، مگر حق کے ساتھ[2] جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو، یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو، یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی :-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (نساء : ۵)	اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے، جس میں ہر اس مال کو حرام بتایا گیا ہے، جو کسی ناجائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں رعایت لیکر مکر جاتی تھی، یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی، اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزا دیتیں، اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں، خدا کی قسم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا[3]۔

ایک صحابیؓ ایک چادر سرہانے رکھ کر سو رہے تھے، ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا، وہ پکڑ کر آیا تو صحابی موصوف نے آکر سفارش کی کہ یا رسول اللہ! یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی، کیا تیس درہم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی، اور قیمت اس کے ذمہ رہی، آپ نے فرمایا مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا[4]۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا، نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا، اور اگر مالک ہوشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا، اور اگر بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے اسکو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں، اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی برائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے، لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے ان نازک

---

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الحدود [4] ابوداؤد کتاب الحدود۔

نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا تشریح کی اور ان کی برائیوں کی تشہیر کی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے سب سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دیدی جائے یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے خدا نے دنیا میں قائم کیا ہے، اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیے جو شخص دوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے فرمایا:۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ○ وَأَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ○ (رحمان ۱)

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ مت زیادتی کرو ترازو میں، اور انصاف کیساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت گھٹاؤ تول۔

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے، اور یہ بھی چوری ہی ہے اسی لیے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکیدیں آئی ہیں، حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار کی گئی ہے حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ○ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ○ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ (شعراء: ۱۰)

اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو ملک میں فساد پھیلاتے۔

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کرتے ہیں، جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گذر میں آباد تھے۔

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ إِنِّيْ أَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّإِنِّيْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ○ وَيٰقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ (ہود ۸)

اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور گھیر لینے والے دن کی آفت کو تم پر ڈرتا ہوں اور میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ اور تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے، یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے، اور یہ بالآخران کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے، یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے

مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیبؑ کی یہی نصیحت پھر سورہ اعراف میں دہرائی گئی ہے:-

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (اعراف: ۱۱)	تو ناپ اور تول پوری کرو، اور مت گھٹا دو لوگوں کو اُن کی چیزیں اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو، یہ تمہارے لیے بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی، اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (انعام: ۱۹)	اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:-

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (اسرائیل: ۴)	اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو، اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے، اور اس کا انجام اچھا ہے۔

آیت کا آخر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخرکار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر طرف کھلی ہیں، اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا، سورۂ مطففین میں جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا، فرمایا:-

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (مطففین: ۱)	خرابی ہے اس گھٹا کر دینے والوں کی جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں، کیا ان کو یہ خیال نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن کے لیے ان کو اُٹھایا جائے گا، جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان و اسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو، اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو اس میں سے کوئی چیز دوسرے ساجھیوں سے چھپا کر لے لینا غلول کہلاتا ہے، مگر زیادہ تر مال غنیمت میں جو بدنیتی اور چوری کی جائے اس کو کہتے ہیں غنیمت کا مال کوئی بھی لوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصہ ہے، جب

تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصہ الگ الگ نہ کر دے، یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دیدے اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے، اور یہ ایسی برائی ہے جس میں بدعیانتی اور چوری دونوں ملی ہوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصہ ہے تو اس میں سے کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہیے لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہوا ہے، اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصہ ہے، اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہو سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں، اسی لیے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے، تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دوسرا باقاعدہ بانٹ سے پائے وہ یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآن پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیر عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا، اور چونکہ انبیا علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ (ال عمران : ۱۷)	اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔

پھر فرمایا:۔

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (ال عمران : ۱۷)	اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کر لے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لیکر آئے گا، پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

غزوۂ خیبر کے مال غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا، خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اس غلام کو آکر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا، مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو، یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے، لوگوں نے یہ سُنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا اس کو بھی لاکر سامنے ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ آگ کا تسمہ ہے آگ کا۔[1]

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپؐ سے عرض کیا گیا، آپؐ نے فرمایا تم لوگ، اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو، یہ سُن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہے، یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا، تمہارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے، صحابہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو چھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔[2]

---

[1] و [2] ابو داؤد کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول۔

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لیکر آتے پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا اس کے بعد جو لیکر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا، بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا، ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لیکر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا کہ تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی، اس نے کہا سنی تھی پوچھا پھر اسوقت کیوں لیکر نہیں آئے، اس نے معذرت کی، فرمایا تم اس کو قیامت میں لیکر آنا میں نہیں قبول کرتا۔ عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لاکر پیش کریں، فرمایا اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو وہ ایک سوئی بھی چھپا کر لے گا تو وہ غلول ہے، وہ اسکو قیامت کے دن لیکر آئیگا[1]۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقہ سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے، رشوت کے معنی ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دیکر اپنے موافق کرے[2]۔

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے، اہل غرض انکو اسکے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے، اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے، اسلام آیا تو اوہام کا یہ فرقہ ہی اڑ گیا اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی[4]۔

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیے تھے، اس لیے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے، قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے، اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے، اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح و ضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈالدیتے تھے[5]، چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی قرآن مجید کی اس آیت میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا أُولٰٓئِكَ مَا
يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيْمٌ (بقرہ : ۲۱)

خدا نے کتاب سے جو اتارا اس کو جو چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، خدا ان سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول [2] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ [3] مجمع البحار علامہ فتنی [4] ترمذی باب ما جاء فی کراہیۃ مہر البغی [5] صحیح بخاری رجم زانی۔

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لیے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی، ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لیے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے فرمایا :-

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ (مائدہ: ۹)

اور تو ان میں سے بہتوں کو دیکھے کہ وہ گناہ اور زیادتی اور حرام کھانے پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں، ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ : ۶)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانیوالے۔

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے :-

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ : ۲۳)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ، اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے، رشوت کی ممانعت میں صاف و صریح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے[1] رشوت دینے والے پر، یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے، اور جرم کی اعانت قانون اور اخلاق دونوں[2] میں منع ہے۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن رواحہ صحابی کو بھیجتے وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو، یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی، آپس میں چندہ کرکے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کیے اور کہا کہ یہ قبول کرو، اور اس کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سن کر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا "اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا، اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے، یہودیوں نے کہا

---

[1] ابوداؤد کتاب الاقضیہ [2] موطا امام مالک، کتاب المساقاۃ [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ وکتاب الجہاد

یہ تقریر سُن کر کہا کہ یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں[1]۔"

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمال رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی[2]، ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے، اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے، یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی، حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ اس میں سے جو لیجائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن میں لاد کر لائے گا، اونٹ، گائے، بکری جو ہو، پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر تین بار فرمایا[3] خداوندا میں نے پہنچا دیا، اس تقریر میں آپؐ نے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے:۔

سُود خواری

سود خواری، حرص و طمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے، حرص و طمع تو یوں کہ سود خوار اس سود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آجائے، بخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کار خیر میں دیکر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سود خواری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے، اور ظلم یوں کہ وہ سود اور سود در سود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا، اسی لیے سود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:۔

لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝ (بقرہ ۲۸)

نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

یعنی تم نے جتنا دیا ہے، اس سے زیادہ لو، تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے، اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی، وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سودی قرض لیتے تھے، یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا، اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے:۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (نساء ۲۲)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق پر کھانے کے سبب سے

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جا رہی تھی، ہمیشہ کے لیے دور کر دیا،

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ

جو سود کھاتے ہیں وہ ایسے اُٹھیں گے جیسے وہ اُٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیے ہوں،

---

[1] موطا امام مالک کتاب المساقات [2] ابو داؤد کتاب الاقضیہ و کتاب الجہاد [3] صحیح بخاری باب ہدایا العمال ؂

مِنَ الْمَسِّ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ
مِثْلُ الرِّبٰوا ط وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ
الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ط وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ط
وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي
الصَّدَقٰتِ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ
اَثِيْمٍ (بقرہ ۳۸)

یہ اس لیے کہ انھوں نے کہا کہ خرید و فروخت کا معاملہ سود ہی کی طرح کا ہے، اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا، تو اس کا جو پہلے دیا گیا، اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے، اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہے، وہ دوزخ میں رہیں گے، خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پیار نہیں کرتا۔

قیامت میں سود خوار کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی، دنیا میں سود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کار خیر کا خیال نہیں آتا، تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہوئے اٹھیں گے، آیت کے آخیر میں اللہ تعالیٰ نے سود خواروں کو ناشکر گنہگار ٹھہرایا ہے کیونکہ خدا نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ اس سے وہ کار خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے، مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا، اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا، اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سود کا کاروبار کرنے لگے تھے جیسے حضرت عباسؓ بن عبد المطلب اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ، اور اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہوئے اور ان میں سے قرض داروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں، جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ
مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ
تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ج
فَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا
تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ
فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ○ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ
فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (بقرہ ۳۸)

اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال کرو، اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو اگر واقعی مومن ہو، تو اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لیے ہشیار ہو جاؤ، اور اگر تم باز آؤ تو تمہارے لیے تمہارا اصل سرمایہ ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے، اور اگر وہ (مقروض) تنگدست ہو تو اس کو کشائش تک مہلت دو، اور معاف کر دینا تمہارے لیے سب سے اچھا ہے، اگر تم کو سمجھ ہو، اور اس دن سے ڈرو جس میں خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائیگا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اس کا حساب ہوگا تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی، اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا تو خدا کے

یہاں پورا پورا مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کر دینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے، جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کر سکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کر دیتے، اور اسی طرح جب تک وہ قرض نہ ادا کر دیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی، یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہو جاتا، خدا نے فرمایا:-

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَۚ۰ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَۚ۰ (آل عمران: ۱۴)	اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا چوگنا سود مت کھاؤ اور خدا سے تقویٰ کرو، شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ سود خواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک رویائے صادقہ میں سود خواروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے فرمایا میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لیے کنارہ پر کھڑا ہے، پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ پر آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے، وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے، جبرائیل نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سود خوار ہے[1]۔

سزا کی موافقت ظاہر ہے، لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں، سود خوار آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے، اور جو پتھر لقمہ تر بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے تو وہ دولت ہے جس کو وہ سود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے (یعنی دینے والے) سود پر گواہ ہونے والے اور سود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی[2]۔

شراب خواری

شراب خواری اُن عاداتِ ذمیمہ میں سے ہے جن کی بُرائی کھلی ہوئی ہے پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں اسلام سے پہلے جو مذہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے، اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے[3]، لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے، شراب

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین و کتاب التعبیر باب تعبیر الرؤیا بعد صلاۃ الصبح [2] ابوداؤد کتاب البیوع [3] لوقا ۱ - ۱۵۔

عرب کی گھٹی میں پڑی تھی، شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بی بیاں شوہروں[۱] کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں[۲] کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی، مگر سارا ملک اسی مصیبت میں گرفتار تھا، لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی، کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے[۳]، اور ساتھیوں کو اس کے کباب بنا کر کھلا دیتے، ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا، اور اس میں مویشیوں کی بازی لگتی اس کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حصے کیے جاتے، ان کو سب مل کر آپ کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی جاٹ گھٹائی شروع کی پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں، خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیے جو بہت بڑی نعمت ہیں لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو، فرمایا:۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ	اور کھجور اور انگور کے میوے دیے تم ان سے نشہ بناتے
مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	ہو اور اچھی روزی، اس میں ان لوگوں کیلئے خدا
لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (نحل : ۹)	کی نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں نشہ کو رزق حسن کے مقابلہ میں رکھا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نشہ[۴] رزق حسن نہیں آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں[۵] اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے، یہی حال کھجور اور انگور کا ہے، کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک، اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، حکم ہوا:۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى	تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ
تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (نساء : ۷)	تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا، کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا، اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے، لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ	(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوئے کے بارہ میں پوچھتے
اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ	ہیں، کہہ دے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کیلئے

---

[۱] سبعہ معلقہ میں قصیدہ الا ہبی بصحنک [۲] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [۳] سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ [۴] تفسیر کبیر امام رازی [۵] مفسرین کی مختلف رائیں ہیں ÷

أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا (بقرہ ۲۷) کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں، اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے، لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہ آیا تھا اس لیے اس کے فائدہ کے پہلو کو رخصت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے، آخر یہ آیت اتری :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ۝ (مائدہ : ۱۲)

اے ایمان والو! شراب اور جوا اور چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے کام ہیں، شیطان کے، سو ان سے بچتے رہو، شاید تمہارا بھلا ہو، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیر ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر اب تم باز آتے ہو۔

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلا کر کہا خداوندا! ہم باز آ گئے۔[1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم لٹائے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی۔[2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیے ہیں اول یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے ان تینوں اسباب کی سچائی روز روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اوپر کی آیت میں شراب اور جوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے، اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں، ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے، یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور بُرے کاموں میں سے شمار کیا ہے، اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا :۔ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ (قصص : ۲) "یہ ہوا شیطان کے کام سے" یعنی بہت ہی برا کام ہوا، اسی طرح اس آیت :۔ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بنی اسرائیل : ۳) "بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں"، کی روشنی میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوئے، بتوں کے چڑھاوے، اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ

---

[1] ابوداؤد، اشربہ [2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے کون نہیں جانتا، شراب خوری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جن کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں، ایک معاشرتی، اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گذرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے، کتنے قتل، کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کے بدولت روزانہ پیش آتے ہیں، مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد، اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے، بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے قرآن نے اس کیلئے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے، خمر کہتے ہیں چھا جانے کو، اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھالے وہ خمر میں داخل ہے، حضرت عمرؓ نے منبر نبویؐ پر کھڑے ہو کر فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے"[1] فرمایا "جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی، وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپؐ کے سامنے دستِ غیب نے دو پیالے رکھے، ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا، ناموسِ وحی حضرت جبرائیلؑ نے کہا "اس خدا کی حمد جس نے آپؐ کو فطرت کی راہ دکھائی، اگر آپ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی"[3]، گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے"[4]، یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا"[5]۔

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سدِ ذرائع کے طور پر حرام کیے یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا، جن میں شراب عموماً بنائی جاتی ہے، پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھا دیا[6]

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ، ۔ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۱) "گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو" کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا، بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا، سب حرام ٹھہرایا گیا، فرمایا "خدا نے شراب، اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لیجانے و[illegible]ور جس کے پاس لیجائی جائے، سب پر لعنت فرمائی ہے"[7] یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہر نشہ کی چیز حرام ہے، اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو ایسا کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے"[8]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [2] صحیحین کتاب الاشربہ [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً [6] ایضاً [7] ایضاً (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

غیظ و غضب

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بیہودانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے، اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے:۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (آل عمران ۱۴) "اور وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں" اور دوسری جگہ فرمایا وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (شوریٰ ۴) "اور جب اُن کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں"۔ انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے اسی لیے آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے"[1]

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت جاریہؓ بن قدامہ، حضرت ابوذرؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کیا کرو"۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی، تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی، آپؐ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو[2]، مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت میں ساری برائیوں کی جڑ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی، فرمایا: "آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیے گئے ہیں، ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے، اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے، اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے، تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے، اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آجاتا ہے اور رفع بہت دیر میں ہوتا ہے تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے، اور ان میں سب سے بُرا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو، ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے، دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں، تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے"[3]۔

ابوداؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "غصہ شیطان سے ہے، اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے، تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وضو کرلے"[4]۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے"[5]۔

(بقیہ حاشیہ) [9] ابوداؤد کتاب الاشربہ [10] صحیحین وابوداؤد و ترمذی کتاب الاشربہ (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب (بخاری کتاب الادب باب یحذر من الغضب) [2] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب) [3] جامع ترمذی (منذری باب مذکور) [4] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کظم غیظاً [5] ایضاً۔

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہوگئیں، ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہوگیا اور رگیں پھول گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، پھر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ[1] کہے۔

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے :۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰہِلِیْنَ، وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (اعراف : ۲۳)	معاف کرنے کی عادت ڈال نیکی کی بات کہہ اور نادانوں سے درگذر کر اور اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسی قسم کی آیت سورہ حٰم السجدہ (۵) میں بھی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے :۔

"نیکی اور بدی برابر نہیں، برائی کا جواب نیکی سے دے، پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہوگی ڈھیلا ہو جائے گا، جیسے دوست رشتہ والا اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے، اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ، بیشک وہی سننے والا جاننے والا ہے"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرلے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھیے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے، اس سے منشاء یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی، اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

بُغض و کینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے، یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے :۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں پہنچے، معاف کر اور ہمارے دلوں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب ؛

آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (حشر: ۱)	میں ایمان والوں کا کینہ مت رکھ اے ہمارے پروردگار تو بڑی ہی مہربان ہے۔

جنت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے وہاں بغض و کینہ کا گذر نہ ہوگا، فرمایا:۔

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ○ (حجر: ۴)	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا بھائی بھائی ہو کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے،
وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (اعراف: ۵)	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا نکال لیا نہریں ان کے نیچے بہتی ہوں گی۔

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا جنت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشاء ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیے، فرمایا

"اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے کینہ نہ رکھو، اور اے اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ، کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے[1]۔"

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے ابو ایوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے، دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے، اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے[2]۔" ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آکر ملے، پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا دونوں کو مزدوری ملی، اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لیکر لوٹا[3]۔" کئی حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو ان کے اعمال پیش ہوتے ہیں، تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے، لیکن جن دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کر لیں[4]۔" اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے، فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے، اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے، لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیئے جاتے ہیں، جب تک وہ اس باز نہ آئیں[5]۔" یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشائش نہیں، ان میں سے ایک وہ جو اپنے سے کینہ رکھتا ہے[6]۔

ان حدیثوں پر غور کیجئے، شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے، دین دو چیزوں سے عبارت ہے، اللہ کا حق اور بندوں کا حق، جب تک شرک رہے گا اللہ کا کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا اسی طرح جب دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا غرض جس طرح شرک، حق اللہ سے مانع ہے، بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے، اور ان ہی دونوں حقوق سے

عمدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

ظلم

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، یہاں تک کہ کفر و شرک اور عصیاں کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے، مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں قرآن میں اس کے لیے دو اور لفظ بَغْی (سرکشی) اور عُدْوَان (تعدی) آئے ہیں، یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:-

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (اعراف : ۴)	کہدے کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (نحل : ۱۲)	اور خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام و سرکشی سے منع کرتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے، اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ لے سکے، تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں، مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لیے دی گئی تاکہ یہ برائی آگے نہ بڑھنے پائے، فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ : ۴)	اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا عوض اسی طرح کی برائی ہے۔

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی برائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے، تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا، اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا۔

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ : ۴)	پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے بیشک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جا سکتی،

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ (شوریٰ : ۴)	اور جو کوئی اپنے ظلم کیے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔

ملامت اس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے:-

---

(بقیہ حاشیہ) لہ صحیح بخاری ومسلم ومالک، ابوداؤد، ترمذی، نسائی لہ مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد ٹہ سنن ابوداؤد
گہ مالک ومسلم، ابوداؤد، ترمذی والادب المفرد بخاری ٹہ طبرانی فی الاوسط ومسند دیلمی ص ۱۴۳ مصر، ٹہ ادب المفرد بخاری باب الشحناء۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (شوریٰ: ۴)

راہ ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں، ان کے لیے دکھ والی سزا ہے۔

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلب قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی :-

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ ط إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا (اسرائیل: ۴)

اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے، تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے، بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے، تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ جھجکیں گے، دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی، فرمایا :-

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا (نساء: ۲۱)

اور اللہ کو بری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا، مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگوں کریں :-

فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (حجرات: ۱)

تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آئے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی، لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کیجائے اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے، فرمایا :-

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ط إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (مائدہ: ۱)

اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی، اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور نیکی اور تقویٰ کے کام پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک وہ سخت سزا والا ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا اور موثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کوآپریشن ہے اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے، اور صاف و صریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور

ظلم و تعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں شریک نہ ہوا جائے البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم"، صحابہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے، مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے، فرمایا "اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے[1]"، اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیے، ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کردی، اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کیطرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپؐ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے موثر انداز میں سنائی فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ "اے میرے بندو! میں نے اپنے لیے اور تمہارے لیے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو[2]"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائیگا[3]"۔ ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں، ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے ہماری زبان میں اسی لفظ رعایت کیساتھ اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو، کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائیگا، یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہوگی۔ انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے، یہ اندھا پن قیامت کے دن ہولناک ظلمتیں اندھیر بنکر نمودار ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہیے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے[4]"۔ براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے[5]، حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپؐ نے یمن بھیجا تو انکو نصیحت فرمائی کہ "مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اسکے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں[6]"۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیے کہ آج ہی اس سے پاک ہولے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہوگا نہ درہم ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی، اور اگر نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی[7]۔ فرمایا کہ "ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے، پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں[8]"۔

فرمایا اہل ایمان دوزخ سے پاک ہوچکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پل کے پاس روکے جائیں گے وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر ظلم کیے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا، جب اس سے بھی

---

[1] صحیح بخاری ابواب المظالم و صحیح مسلم باب نصر الاخ ظالماً و مظلوماً [2] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۵۴ و صفحہ ۱۶۰ و ادب المفرد بخاری باب الظلم [3] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم [4] صحیح بخاری ابواب المظالم [5] ایضاً [6] صحیح بخاری ابواب المظالم [7] ایضاً [8] صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔

پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی۔[1]

فخر و غرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں، لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے، اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں دنیا میں سب سے پہلے اس بداخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا، اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا۔

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (اعراف ۲)
میں اس سے بہتر ہوں۔

وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں، خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا، اور فرمایا:۔

فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ (اعراف ۲)
یہاں سے اُتر جاؤ، یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں، نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی۔

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں، بلکہ اس تخیل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے، میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حسن میں تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ فرمایا نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔[2]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا، پیغمبروں کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں، اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو اور غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (ابراہیم ۳)
اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے روبرو نکل کر کھڑے ہوں گے تو (جو لوگ دنیا میں) کمزور (تھے اس وقت) ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے، کہیں گے کہ ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا (آج) تم عذاب خدا میں کچھ (تھوڑا سا) ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دیکر فرعون اور اس کے اعیانِ دولت کے پاس بھیجا، لیکن انہوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے۔

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ (مومنون ۳)
تو وہ سب شیخی میں آگئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب المظالم [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو، اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں، اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں،

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِينَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِينَ (ھود: ۳)

اس پر ان کی قوم کے سردار جو (انکو) نہیں مانتے تھے کہنے لگے کہ ہم کو تو تم ہمارے ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو، اور ہمارے نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو ہو گئے ہیں جو ہم میں رذالے ہیں (اور پیرو بھی ہو گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ ہم تمکو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی، قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے، اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے، تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں، بعض جگہ اسکو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ (ص: ۱) لیکن جو لوگ منکر ہیں (دین حق کی) ہیکڑی اور مخالفت میں پڑے ہیں

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبار اختیار کیا ہے:۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (مومن: ۴) جتنے مغرور اور سرکش ہیں اللہ انکے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔

دو موقعوں پر اس کے لیے مختال کا لفظ آیا ہے، یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (نساء: ۶) اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ (نحل: ۳) اللہ مغرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی یہیں دے دی گئی ہے:۔

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ (زمر: ۶) کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں۔

فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (زمر: ۸) تو دوزخ مغروروں کا ٹھکانا ہے۔

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لیے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔

اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں، ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا، مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں، بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں، راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے غرض

اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[1]، اور امام غزالیؒ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں، اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے، اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

یہ بد اخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے، اور اس کے نتائج گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کا استقصا تو مشکل تھا، البتہ شریعت نے ان کے بعض نتائج ظاہر کر دیئے ہیں مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالینا چاہیے۔ ایک بار آپؐ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابہؓ کرام تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے فرمایا کہ عجمیوں کی طرح، تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہوا کرو[2]۔ بڑے بڑے آداب و القاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلاف واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں، عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے برا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلانے[3]"۔

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے مثلاً۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ (بنی اسرائیل: ۴)	اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ (اس دھما کے کیساتھ چلنے سے) تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا، اور نہ (تن کر چلنے سے) پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝ (لقمان: ۲)	اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل، بے شک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو فخار ہو۔

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے:۔

ثَانِيَ عِطْفِهٖ (حج: ۱)	اینٹھتا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ[4]	جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا خدا اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ گذشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل۔ [3] صحیح بخاری۔

[4] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔ [5] ترمذی ابواب الزہد۔

حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اسی میں دھنسا چلا جارہا ہے، اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں، اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے :-

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (فرقان: ٦)

اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں، اور جب جاہل ان سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو (انکو سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو زانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، ایک بدو بھی اسوقت موجود تھا اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے فرمایا "خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا ہے"[1]۔

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے، اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر و غرور کی تردید کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں، حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں، کمل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ جو شخص یہ سب کام کرتا ہے اس میں غرور نہیں پایا جاتا"[2]۔

کبر و غرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں حسب و نسب حسن و جمال، مال و دولت، قوت اور اعوان و انصار کی کثرت، اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر و غرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر و غرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب و نسب کی برتری کا خیال تھا اسکو یہ کہہ کر مٹا دیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (حجرات: ٢)

لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا، اور (پھر) تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (حجرات: ٢) اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تشریح کی، اور فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا، اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں، مومن پرہیزگار اور بدکار بدبخت، تم لوگ، آدم کے نتیجے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے، لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے[3]۔

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے، حسن و جمال کو ایک قابل قدر

---

[1] ابن ماجہ کتاب الاطعمۃ باب الاکل متکئاً [2] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب ؛

چیز قرار دیا، چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپؐ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتا عمدہ ہو، تو فرمایا کہ خدا حسن کو پسند کرتا ہے[1]، یعنی اسکا نام غرور نہیں، البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال، غرور و تکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے، شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے چنانچہ ایک صحابی کو آپؐ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں، جن میں ایک نصیحت یہ بھی کہ تہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے، اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا[2]۔

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی، مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی، اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (حدید: ٣)	(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا اور ظاہری طمطراق اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور اولاد کا خواستگار ہونا (بس یہی کچھ) ہے)

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا، آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا، اور پہن کر پھاڑ ڈالا[4]۔

قوت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ ہر قسم کے تمدنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیے جا سکتے ہیں، اس لیے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابل ستائش وصف ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کو قوی امین کہا ہے اور حضرت لوطؑ نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے:۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ (هود: ٧)	(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی، یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوعِ انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً (روم: ٦)	اللہ (ہی) وہ (قادر مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا، پھر (طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے پر اور سامانِ جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے:۔

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر [2] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار [3] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا [4] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔

38

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ۔ ۸)

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت اور گھوڑوں کے باندھ رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کفار کے مقابلہ کے لیے ساز و سامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جنکو تم نہیں جانتے (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[1] اگرچہ متعدد حدیثوں میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے، تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں، بلکہ تواضع و خاکساری کی فضیلت ہے جو ایک قابل ستائش وصف ہے اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر و غرور کے ساتھ کیا گیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:۔

الا اخبركم باهل الجنة كل ضعيف متضعف الا اخبركم باهل النار كل عتل جواظ متكبر[2]

کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر وہ شخص جو کمزور ہے اور لوگ اس کو کمزور سمجھیں، کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص۔

دوسری حدیث میں ہے:۔

احتجت النار والجنة فقالت هذه يدخلني الجبارون والمتكبرون وقالت هذه يدخلني الضعفاء والمساكين[3]

دوزخ اور جنت نے باہم مباحثہ کیا دوزخ نے کہا مجھ میں جبار اور متکبر لوگ داخل ہوں گے اور جنت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور مسکین لوگ۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابل مدح وصف نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف اس لیے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع و خاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا منبع ہے۔

اعوان و انصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لیے ایک مابہ الامتیاز چیز رہی ہے بالخصوص غیر متمدن قومیں ہمیشہ کثرت مال اور کثرت اولاد پر فخر و غرور کرتی ہیں اور اس فخر و غرور کے نشہ میں دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں، بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں، زمانہ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان و انصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی، اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہ حالت قائم رہے گی، وہ اسی حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے:

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا (کہف ۔ ۵)

میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور (میرا جتھا بھی) بڑا اور زبردست (جتھا) ہے۔

---

[1] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ و ترک العجز۔ [2] بخاری کتاب الادب باب الکبر۔ [3] مسلم کتاب صفات المنافقین و احکامھم باب النار یدخلھا الجبارون۔

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیے اس قدر کبر وغرور جائز نہیں:-

أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ	کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو پہلے
مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا (کہف: ۵)	مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا، پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الٰہی نے اس کی دولت کو ملیامیٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائیدار چیز فخر وغرور کے قابل نہیں، اہل عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے، اور زندوں سے گذر کر مردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے، اس فخر وغرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لیے ایک خاص لفظ "تکاثر" ایجاد ہو گیا تھا جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسانوں کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:- أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (تکاثر: ۱) تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں، بلکہ اجتماعی اور تمدنی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابل فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر وغرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:-

تزوجوا الودود الولود فانی	محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ
مکاثر بکم الامم[1]	کثرت تعداد میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔

آج تعداد کی اسی اقلیت واکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

ریاء

ریاء کے لغوی معنی دکھاوا اور نمائش کے ہیں، انسانی اعمال کی اصل حقیقت انکی نیت اور غرض پر مبنی ہے، اسلیے اعمال کی راستی و ناراستی اور اچھائی کا بہت کچھ مدار غرض ونیت پر ہے، صحیح حدیث میں ہے کہ:-

إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّات	عمل نیت سے ہے۔

اور ریاء اسی نیت یعنی اعمال کی غرض وغایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیتی ہے، جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے، نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی و برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے۔ غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے، کیونکہ اسکا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں، اسی لیے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے، جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو، بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو، فرمایا:-

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ	اور ان (کافروں) جیسے نہ ہو، جو مارے شیخی کے اور لوگوں کے

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی تزویج الابکار۔

بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ (انفال: ۶) دکھانے کیلئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ ریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصۃً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو، اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرک خفی اور شرک اصغر رکھا ہے کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے، اسی لیے خدا فرماتا ہے:۔

اَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ (فرقان: ۴۳) کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے؟

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں تو جو شخص میرے لیے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسی کے لیے ہے جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔"

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کریگا تو ایک منادی پکاریگا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو خدا کے لیے کیا گیا ہے کسی اور کو شریک کر لیا ہے وہ اسکا ثواب اسی سے طلب کرے کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی، بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگوں کے لیے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔[1]

اسلام کے لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے۔ نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے، وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لیے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجا لاتا ہے اس لیے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے اس بنا پر قرآن مجید میں جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ
رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ: ۳۶)

مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور رسائل کو طعن دے کر اس شخص کی طرح اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور روز آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اس لیے وہ نہایت بے پروائی، غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں، اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے مصنوعی خشوع وخضوع، للہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہد رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہیں اس لیے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کیساتھ ادا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس ظاہر کی نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہے رہیں، اسی لیے ایسے شخص کے عمل میں للہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا:۔

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ؛

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوْا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا (نساء: ۲۱)

منافق (مسلمانوں کو دھوکا دیکر گویا) خدا کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ (حقیقت میں) خدا اُن ہی کو دھوکے میں رکھے ہے، اور (یہ لوگ) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں (ظاہر داری کرکے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور (دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کچھ یوں ہی سا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (ماعون)

تو ان (منافق نمازیوں کی دبڑی) تباہی ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے ہیں اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو) ریا کرتے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہؓ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آنکلے اور فرمایا "کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے"، صحابہؓ نے کہا "ہاں" فرمایا "شرکِ خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لیے کھڑا ہوا اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے، اس لیے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے[1]۔

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصل شکل و صورت ہی کو بگاڑ دیا چاہتی ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی، اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا، چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہوسکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی ممانعت فرمائی، مثلاً ان میں پہلی چیز نمود و نمائش ہے، جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے بالخصوص عرب کے فضائلِ اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی، اور لوگ محض نام و نمود کے لیے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے، اسلام نے صدقہ و خیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا، اس لیے قرآن و حدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ و خیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی، تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے۔

إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (بقرہ: ۳۷)

لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا (کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے (کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا)۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا، خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جس میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا[2]۔

---

[1] ابن ماجہ باب الریا والسمعۃ [2] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین۔

عرب کے محاسنِ اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی، اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لیے اظہارِ شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا، اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے دنیا کے بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے اس لیے وہ ریاکاری کی نمائش گاہ بن سکتا تھا، لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی، چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لیے، ایک شخص شہرت کے لیے اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے فرمایا "اس شخص کا جو اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو۔"

آپؐ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریا سے جہاد کرتا ہے تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے، وہی پہلا جواب[1] ملا،

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے، اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی، اس لیے اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی اس کے نتائج بد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مؤثر طریقہ سے بتائے، ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی، یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے ان سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا، خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم صرف اس لیے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا، پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا، اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا، ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو، تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لیے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ، پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈالدیا جائے گا اس کے بعد ایک دولتمند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو تم نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں، پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈالدیا جائیگا[2]

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی، خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے، اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے، یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے لیکن خود بینی کے لیے تنہا انسان کی ذات کافی ہے یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ

---

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ہی العلیا فہو فی سبیل اللہ [2] مسلم کتاب الامارۃ

اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا وہ خود اس کی اختیاری ہیں، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں اسی کا نام عجب اور خود بینی ہے اسی سے نفس میں خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی، یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا اب مسلمانوں کا یہ عجب دور ہوا، تب نصرت الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لیے اور شکست فتح سے بدل گئی، خدا نے فرمایا:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا (توبہ: ۴)

اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی، تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔

اسی لیے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو، بلکہ ان میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (انفال: ۶)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے، نہ اللہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق، ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے، فرمایا:۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا (قصص: ۶)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں جب وہ اپنے گذران میں اترا کر چلیں۔

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا، لیکن ایک وقت آئیگا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی، یعنی قیامت آئیگی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہوگی، اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے[1]۔

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے، ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیزگاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلی کی ممانعت فرمائی ہے:۔

فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ (نجم: ۲)

تم (بہت) اپنی پاکیزگی نہ (جتایا) کرو پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الملاحم ؛

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ: ۳)	اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔
قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ (جمعہ: ۱)	(اے پیغمبر ان یہودیوں سے) کہو کہ اے یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے چہیتے ہو۔

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عُجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہ تھی، لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے، مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے، اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "تم نے اس کو ہلاک کر دیا"۔ ایک بار آپؐ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی، آپؐ نے فرمایا کہ "تم نے اس کی گردن کاٹ لی، اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں[1]"، مدح کی یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عُجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے، اسی لیے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے فرمایا، لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ (حدید: ۳) خدا نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے، چونکہ اسلام عرب میں آیا، اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی، اس لیے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بُری طرح برباد ہو کر فنا ہو جاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے، اور ان بداخلاقیوں کی برائی چھپی نہیں۔

اہل عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوا میں جو کچھ جیتتے، نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں، شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لیے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، یہاں تک کہ دونوں میں ایک کے تمام اونٹ ختم ہو جاتے تھے، تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا[2]۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مایکرہ من التمادح [2] ابو داؤد۔

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی، اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی۔ اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے معدوم ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی، اور دنیوی حیثیت سے مضر یہ تھا کہ وہ تمام مال و دولت کو اڑا کر خود مفلس اور قلاش ہو جاتے تھے، پھر اس قسم کی فیاضی کے لیے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا، تو وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے اس بے اعتدالی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل: ۳)

اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور دولت کو بے جا مت اڑاؤ (کیونکہ دولت کے) بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے، امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں "بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے، کیونکہ وہ لوگ لوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے، پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کے لیے صرف کرتے تھے۔"

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے، یہ تعلیم فیاضی کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیانی حالت کا نام ہے اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے، بلکہ الٹے تمہیں کو لوگ قابل ملامت ٹھہرائیں گے۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (بنی اسرائیل: ۳)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے (اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔

چونکہ یہ اعتدال کا وصف خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان: ۶) اور جو خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ ان کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ کا ہو۔

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیے مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے، سورہ اعراف میں خدا فرماتا ہے:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ

اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک اللہ

لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (اعراف : ۳)
فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

صدقات اور مبرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں، مگر اس میں بھی بعض مفسرین کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں،

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا
حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ
لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (انعام : ۱۷)

درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم کھاؤ، اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے بڑھو اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے، مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے، تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں، تو اسی کا نام حسد ہے اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے کیونکہ عہد رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان کیا تھا کہ انکو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰهُمُ
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء : ۸)

یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے اس پر جلے مرتے ہیں۔

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا
مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ (بقرہ : ۱۳)

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں۔

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے گو وہ اس کو حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے، حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائیں: وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (نسا : ۱۲) ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں ایسے تم بھی مسلمان ہو کر کفر کرو (کافر ہو جاؤ) اور تم سب ایک طرح کے ہو جاؤ۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے، اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے، لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے

اس کو مل نہیں سکتی، اس لیے بالفرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے، لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے، دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذّات مقصود نہیں ہوتا، اس لیے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے تاہم قرآن مجید میں ہے:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (النساء: ۵)

اور خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے اس لیے یہ بھی مذموم ہے، البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں، اسی لیے فرمایا:۔

وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (نساء: ۵)

اور خدا سے اس کا فضل مانگو۔

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے، اور شریعت میں اسی کو مسابقت کہتے ہیں:

حسد کے سات اسباب ہیں۔

(۱) بغض و عداوت، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لیے ایک دشمن کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے، اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (آل عمران: ۱۲)

چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلوں میں (چھپے) ہیں وہ (اس سے بھی) بڑھ کر ہیں۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (آل عمران: ۱۲)

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لیے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے، کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا، اور وہ اس کے اس ترفع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے، اس لیے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا

رہے، تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا (انعام ۶۰)
کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے۔

حسد کا تعجب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کے لیے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے خیال میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی غیر معمولی شرف حاصل ہو جاتا ہے، تو ان کو تعجب ہوتا ہے، اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں، کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے، اور تعجب سے کہتے تھے۔

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل ۱۱)
کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے، تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہو جاتا ہے ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ (یوسف: ۲) جب یوسف کے (بے مات) بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی) بھائیوں کی بڑی جماعت ہے، تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (بن یامین) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے، اس لیے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہو گیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گذرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہو گیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا، لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا۔ اس لیے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے۔ منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا، اس لیے اس کو یہ سخت ناگوار ہوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا[1]۔

(۷) حسد کا ساتواں سبب خبثِ نفس اور بدطینتی ہے کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے، اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے، اس

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین ؛

صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لیے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر ان لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے، اس لیے بیگانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے، جن میں باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے۔ ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لیے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے، اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوت کا رشتہ قائم کرکے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا، اس لیے ان میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے اس لیے اصولاً جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ باہم کر سکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا:

إياكم والظن فان الظن اكذب الحديث ولا تحسسوا ولا تجسسوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تباغضوا وكونوا عباد الله اخوانا (بخاری کتاب الادب باب ما ینہی عن التحاسد والتدابر)

بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے، نہ لوگوں کے عیوب کی ٹوہ لگاؤ، نہ باہم حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو، بلکہ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

المعنى كونوا كاخوان النسب في الشفقة والرحمة والمحبة والمواساة والمعاونة والنصيحة

اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت، غمخواری، محبت، اعانت اور خیرخواہی میں نسبی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے، ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی، اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسن اخلاق جو اخوت کا لازمہ نتیجہ ہیں، یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے چنانچہ حافظ ابن حجر اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

كأنه قال اذا تركتم هذه المنهيات كنتم اخوانا ومفهومه اذا لم تتركوها تصيروا اعداء ومعنى كونوا اخوانا اكتسبوا ما تصيرون به اخوانا مما سبق ذكره وغير ذلك من الامور المقتضية لذلك نفيا واثباتا (فتح الباری جلد دہم ص ۴۰۳)

گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ جب تم لوگ منہیات کو چھوڑ دو گے تو بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی بنا پر بھائی بھائی بن جاؤ، اور یہ اخلاقی خوبیاں وہ ہیں جن کا ذکر اوپر کیا اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے، کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا، کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے، فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے سکوت چھوڑ دو، اور جب بدگمانی پیدا ہو تو مت اس کو سچ سمجھو، اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ[1] لیکن عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا، اور یہ شرارہ خرمن اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا :-

اِیاکم و الحسد فان الحسد یأکل الحسنات کَمَا تأکل النّار الحطب[2].	تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ (فلق)	اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرے۔

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے، اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بیباک نوجوان اور بے تکلف دوست و احباب ہوتے ہیں، مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس قسم کے حالات و واقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت میں :-

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (بقرہ : ۱۵)	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔

اس کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن زمانہ حج کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں[3] کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے، اس لیے اس قسم کے تذکرے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جا سکتے ہیں حالانکہ یہ زمانہ صرف ذکر الٰہی کا ہوتا ہے ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت اور مردوں کے ایک مجمع میں خطبہ دیا اور حمد و ثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے

---

[1] مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری ج ۱۰ ص ۳۰۵ [2] ابو داؤد کتاب الادب فی الحسد [3] دونوں کی تشریحیں الگ ہیں "ا س" ۔

اور اس پر پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردہ میں چھپ جاتا ہے؟" لوگوں نے کہا "ہاں" پھر فرمایا کہ "اس کے بعد لوگوں کی مجلسوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا" اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے، پھر عورتوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تم سب اسی قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟" اس پر ایک عورت نے دو زانوں بیٹھ کر کہا کہ "ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں" فرمایا "تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی، حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے[1]"

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے، اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود والٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے، ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اہمیت کھو دیں گی، اور قول عمل کے لیے ایک دن راستہ صاف کر دے گا، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لیے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے، تاکہ مدعا ظاہر ہو، اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے، چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کیے گئے ہیں مثلاً

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (نساء ۔ ۳) حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی ہم صحبت ہو چکے۔

اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ (نساء ۔ ۷) یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی ان سے صحبت کی ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے، اسی لیے اس نے جماع کو کنایۃً "لمس" (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے، اسلام نے اس کے لیے اور جو الفاظ پیدا کیے ہیں، جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں، لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں، اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب، اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہیے، پاخانہ اور پیشاب کے لیے احادیث میں "قضائے حاجت" کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے، قرآن مجید میں اس کے لیے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ (نساء ۔ ۷) یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہو کر) آیا ہو۔

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لیے استعارۃً اس سے پاخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ پاخانہ بھی ایک استعارہ ہے، جس کی اصل پائیں خانہ ہے، چونکہ پاخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں، اس لیے استعارۃً ان کو پائیں خانہ کہا گیا، پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پاخانہ ہو گیا، اور اب کثرتِ استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی، قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے "برص" کی تعبیر "سوء" کے لفظ سے کی ہے، جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں:۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو اور پھر نکالو

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل۔

بَيْضَاۤءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۤءٍ اٰيَةً اُخْرٰى (طٰہٰ :)	تو وہ بدوں اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو، سفید براق نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ (ہے)

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب و شتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے، زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے، اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لیے خداوند تعالیٰ نے ایک لفظ "فسق" سے اس کی ممانعت کی۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ : ۲۵)	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی۔

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں، بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو بُرا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی برا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا گیا ہے، تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْۤءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (نساء : ۲۱)	اللہ کو بری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو، (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)

اور قرآن و حدیث میں جا بجا بدزبانی سے بچنے کے حکم و مصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں، یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے، اگر ایک شخص کسی کے باپ کو بُرا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی نہ دی جائے، خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (انعام : ۱۳)	اور (مسلمانو!) خدا کے سوا دوسرے جن معبودوں کو یہ پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ (بھی) نادانی سے بڑھ کر خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے، کہا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا "اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔"[1]

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا، آپؐ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے۔" لیکن جب وہ آپؐ کے پاس بیٹھا تو آپؐ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپؐ نے اس کو دیکھا تو بُرا کہا، پھر اس سے نہایت لطف و

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ۔

محبت کیسا تھے ملے، فرمایا، عائشہؓ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں[1]۔"

(۳) بدزبانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے، ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے[2]۔ امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفق و ملاطفت و شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" (تم کو موت آئے) کہا حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا "عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" یعنی تم کو موت آئے، خدا تم پر لعنت بھیجے، اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو[3]۔

(۵) گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا، ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے، اور حیا جس چیز میں ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے[4]۔" اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے، حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے[6]۔

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق ضرور ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر[7] مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا [2] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن [3] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی فاحشا ولا متفحشا [4] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الفحش [5] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای امورہ افضل [6] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الشتم [7] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن

اسلامی خصوصیات کے منافی ہے، اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

لیس المومن بالطعان و لا اللعان و لا الفاحش و لا البذی[1]	جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا لعنت نہیں بھیجتا بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے[2]۔

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن طعن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں، بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی بُرا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں مثلاً جب کوئی شخص حوادث زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو بُرا بھلا کہنے لگتا ہے، یہ نہیں سوچتا کہ ان میں زمانہ کا کیا قصور ہے یہ جو کچھ ہوا ہے مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے بُرا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے، اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ "خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو بُرا بھلا کہتا ہے حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں[3]" یعنی زمانہ کو برا بھلا کہنا خود خدا کو بُرا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر اُدھر اُڑانے لگی، اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس پر لعنت نہ بھیجو، وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے[4]"

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو الگ کر دیا اور یہ[5] اس عورت کی سزا تھی "تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائے جائیں، بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین اور دل آزاری ہو گالی ہے، کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرف عام میں گالی نہیں ہے، لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے، کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہوگا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے پر لوٹ آئے گی[6]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہوگا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہوگا، تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہوگا[7]۔ بہرحال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدس دن، ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ما جاء فی اللعنۃ [2] بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق [3] بخاری کتاب الادب باب لا تسبوا الدہر [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعن [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ [6] بخاری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن، و مسلم کتاب الایمان [7] فتح الباری کتاب الادب باب ما ینہی من السباب واللعن ۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بداخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جاسکتا ہے، جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے، مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت انہی مذکورۂ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں، اس لیے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے، اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و ترتیب میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے اس لیے صرف انہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے، بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں، اور جس قدر رذائل ہیں ان میں انہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی برائی عدمِ صدق ہے، اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو، جھوٹ، غیبت، اخلافِ وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغل خوری، دورخا پن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں، دوسری اساسی برائی حبِ مال ہے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبت ہے، بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلول، ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں، تیسری اساسی برائی حبِ ذات ہے، اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے، حسد، تکبر، عجب، فخاری، غیظ و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی برائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کریگا، وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کرلے گا، یہ تینوں اساسی برائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں جو ان سے اپنا دامن بچائیگا وہ جنت میں آرام پائیگا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ۝ (نازعات: ۲)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا تو جنت اس کی آرام گاہ ہے۔

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب کہلاتے ہیں، ان ہی آداب کی پابندی و عدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے، ان کے آداب میں خوبی اور لطافت ملحوظ رکھنا حسنِ ادب ہے، اس کی پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذب شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے، اور ہر ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے، پیغمبر اسلام علیہ السلام نے اپنی عملی و قولی ہدایات سے مسلمانوں کے لیے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب و عوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں، عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کیا، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب و عوائد کا ماخذ بھی ہے، اسی لیے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لیکر جاتا ہے اور ان کو چند روز میں مہذب اور شائستہ بنا دیتا ہے،

ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارم اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس، کتاب الاستیذان، کتاب الآداب اور کتاب السلام میں درج کیا ہے، ہم صحاح و سنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دینِ فطرت ہے اس لیے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے، یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں، انسانوں کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں، بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ان سب چیزوں کی اصلاح شائستہ اور ناشائستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا، اور نکاح کرنا[1] ایک

---

[1] ترمذی ابواب النکاح ؛

روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا، یعنی ستر عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا، عطر لگانا اور مسواک کرنا، صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے، اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے، یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی ہے[1]،

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی، جبکہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں امام بخاری کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے[2]، ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خصال فطرت پانچ ہیں، ختنہ کرنا، موئے زیر ناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھیں ترشوانا[3]، ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں، مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال نچوانا موئے زیر ناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا، راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا غالباً کلی کرنا ہوگی[4]،

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا، واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال نچوانا، مونچھیں ترشوانا، صفائی کے ضروری لوازم ہیں جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں، جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے، یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے، مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلاف فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

مونچھوں کا بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے، یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لیے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ[5]۔ حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ[6]۔ ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرت مند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، رچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا اثر ہے، جس رنگ کی عینک لگائیے دنیا اسی رنگ کی نظر آئیگی۔

---

[1] توراۃ پیدائش [2] ایضاً [3] باب الختان الکبر [4] صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ [5] ایضاً [6] صحیح مسلم خصال الفطرہ

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے، گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی نسبتاً بہت کم تھا، پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔ زن و شو کی ہمبستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کر لیں نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہو سکتی، فرمایا:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ: ۲)
اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں، فرمایا:۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (مدثر: ۱)
اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔

اگر پاکی کے لیے پانی نہ مل سکے، یا بیماری کے سبب سے پانی کا استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے۔

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (مائدہ: ۲)
تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ، منہ اور پاؤں دھو لیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پر پھیر لیں اس کا نام وضو ہے۔

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (مائدہ: ۲)
جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو، اور اپنے سروں کا مسح کرو، اور اپنے پاؤں دھوؤ۔

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں، تاکہ کسی کی گندگی بدبوئی سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو، قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا کرنا اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے:۔

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝ (بقرہ: ۲۸)
اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لیے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے، مثلاً (۱) آپؐ نے فرمایا جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے، کیونکہ سوتے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے[1]، اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے، سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا[2]

ہاتھ کی صفائی پر اس لیے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک

---

[1] مسلم کتاب الطہارۃ [2] ابوداؤد کتاب الطہارۃ ؛

نہ کرو، اس لیے خیال رکھنا چاہیے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

۲۔ دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے، ضروری بتلائی، مسواک کرنا سنت ٹھہرایا، فرمایا اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا، ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو فرمایا تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں، مسواک کیا کرو۔ (مسند احمد جلد ۱ ص ۲۱۴)

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہیئے[1] یہ اس لیے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

۴۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرکے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں، ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جنب کو چاہیے کہ اس سے پانی لیکر غسل کرے، کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری بھی وہ پانی دوسروں کیلئے ناپاک یا قابل کراہت بلکہ عام حالت میں خود اس کی طبیعت کے لیے گھن پیدا کرے گا۔

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں، نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے، اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہیے کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

۷۔ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیے خصوصاً جبکہ وہ کچی ہو، کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی، اور بدن کو ناپاک کریں گی، یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہیے، ڈھیلے یا کسی اور پاک و جاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھو لینا اچھا ہے، استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے، اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیئے[3]

۱۰۔ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، خوشبو اور تیل لگانا مستحسن ہے بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس لیے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگدست اور پشمینہ پوش تھے، اور محنت مزدوری کرتے تھے، ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی، جو چھپر کی تھی، ایک بار گرم دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے

---

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھئے ۱۲۰

پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو، اور ہر شخص کو جو بہترین تیل میسر ہو سکے لگائے[1]، جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بدبودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی[2]۔

اا۔ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیے، چنانچہ ایک بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسکے بال بکھرے ہوئے ہیں، تو فرمایا کہ اس کے پاس بال ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا، جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھو لیتا[3]۔

اس کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدد و غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے اس بنا پر اسلام نے بعض سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں، مثلاً یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لیے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو، لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہیے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر کپڑے پر نہ پڑنے پائیں، اس سے زیادہ احتیاط تشدد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ شدتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنو اسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے، لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدد کو ناپسند فرمایا اور کہا کاش وہ اسقدر سختی نہ کرتے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے[4]۔

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی:۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ (بقرہ ۲۸)	اور (اے پیغمبر) لوگ تم سے حیض کے بارہ میں دریافت کرتے ہیں تو (انکو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک ہو لیں ان سے مقاربت نہ کرو، اور جب وہ پاک ہو جائیں تو اُن کے پاس آؤ۔

اس کے مطابق آپؐ نے حکم دیا کہ وقاع کے علاوہ اس سے سب کام لے سکتے ہو، اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں، چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی، اور آپؐ کے سر کو دھوتی تھی، ایک بار آپؐ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر مانگی میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے[5]۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [2] مسلم کتاب الصلوٰۃ [3] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب [4] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین [5] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا۔

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہ نے حالت جنابت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا لیکن آپؐ نے فرمایا کہ "مسلمان نجس نہیں ہوتا"[1] یعنی مسلمان جنابت اور حاجت غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت اُم سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات پر چلتی ہوں، یعنی زمین پر گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو بولیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے[2] یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے، وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے، ایک عورت نے آپؐ سے دریافت فرمایا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو رستہ جاتا ہے وہ بدبودار ہے جب بارش ہو تو ہم کیا کریں، فرمایا کہ اس کے بعد اس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ہاں ہے، فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے[3]، غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ زمین میرے لیے پاک کر دی گئی ہے، اور اسی لیے وہ حالتِ[4] تیمم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے، جوتا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام میں اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا اور اس کو تمام صحابہؓ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لیے جائیں، پھر کمر سے دھو کر نجاست دور کر لی جائے، پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے پہلے دونوں ہاتھ دھوتے پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے پھر وضو کرتے لیکن پاؤں نہیں دھوتے پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بالوں کی جڑوں کو ملتے، پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے (مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ)

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا، لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لیے ہر روز نہائے تو مباح ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہ رہی ہو، اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔[5]

---

[1] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الطہارۃ [4] بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت میں [5] صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الخمس کفارہ

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہیے، کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے، لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے، اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں[1]، اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے[2]، ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا[3]، اور اس کو اس تساہل پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی یہ تعلیم اس کیلئے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

۲۔ مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہیے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے، اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے، کتنا بڑا کام ہے، یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیے۔ اسلیے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ کر لینا چاہیے صحابہؓ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپؐ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے، لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپؐ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا، آپؐ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اسکو اپنے لیے جائز کر لیتا ہے[4]، اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے[5]۔

۳۔ انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے، صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کیلئے خاص کر دیے جائیں، چنانچہ سب اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لیے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے اس تخصیص میں ایک طبی اور فطری مصلحت بھی ہے انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں، اس لیے زیادہ تر کاموں کے لیے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے، جدھر قلب نہیں ہے یعنی دایاں پہلو تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے، یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لیے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی چستی اور طاقت ہوتی ہے، اسی لیے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہیے صرف کھانے پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے ایک بار آپؐ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا، مجلس میں آپؐ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے، آپؐ نے دودھ پی کر

---

[1] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [2] ایضاً [3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ [4] ایضاً [5] ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

بدو کی طرف پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنے جانب کا لحاظ ضروری ہے[۱]۔

ایک بار آپؐ کے دائیں جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے، آپؐ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں، اس نے کہا کہ میں اپنا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا، مجبوراً آپؐ نے پہلے اسی کو دیا[۲]۔

۴۔ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہیے بیچ سے نہیں کھانا چاہیے کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی (گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا، اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت سے تعبیر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے[۳]۔

۵۔ اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں[۴] کھانا چاہیے کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھالے، یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص و طمع پر دال ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اسکو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہیے۔

۶۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہیے، کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنیوالوں میں بات بات میں فیہ نکالنے والے کی طرف سے چڑھ اور نفرت پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے، اس لیے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیے، ورنہ چھوڑ دینا چاہیے[۵]۔

۷۔ سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسن معاشرت کا ذریعہ ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے، کہ دوست و احباب، یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے، الگ الگ کھانا بھی جائز ہے، اور ایک ساتھ بھی[۶] لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برکت ہوتی ہے، اس طرح زیادہ برباد نہیں ہوتا، کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ کھاتا ہے، سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں، اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے، پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے، مٹتا ہے اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے ایک بار صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے، فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو، صحابہؓ نے کہا ہاں، فرمایا ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ پڑھ لو تو برکت ہوگی[۷]۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الاشربہ [۲] ایضاً [۳] ترمذی ابواب الاطعمہ باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام [۴] سنن ترمذی ابواب الطعام [۵] بخاری کتاب الاطعمہ نور - ۸ [۷] ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

۸۔ کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منہ کے بل لیٹ کر نہیں کھانا چاہیے کیونکہ روحانیت کے علاوہ طبی حیثیت سے اس لیے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے، کھانے کے لیے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور پاؤں کو گرا کر اسی پر بیٹھ کر کھایا جائے یا دو زانوں بیٹھ کر، اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر کھایا جائے، یا دو زانوں بیٹھ کر[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، میں بندہ ہوں، غلاموں کی طرح کھاتا ہوں، یعنی خاکساری سے[2]۔

۹۔ کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، اِدھر اُدھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے خصوصاً جب کئی آدمی ایک ہی برتن میں ساتھ ہوں، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہو جاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑ لیا ہے تو اس کے لیے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

۱۰۔ کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پوچھنا چاہیے۔

۱۱۔ پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہیے[5] اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے، اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے، اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

۱۲۔ پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑ جائے اور دوسرے آدمی کو مکروہ معلوم ہو پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ گندگی کثافتوں کو لیکر باہر نکلتی ہے، اس لیے اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہیے۔

۱۳۔ پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہیے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے، البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے[7] مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ پانی پینے میں ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پینے سے حاصل ہوتی ہے البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

۱۴۔ پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالے کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پانی لیا، پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز نہیں۔

۱۵۔ کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہیے تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے، یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے[8]۔

۱۶۔ کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا، اس موقع پر کی مختلف دعائیں حدیثوں

---

[1] ایضاً [2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ وابن ماجہ کتاب الاطعمہ و شرح سفر السعادة فیروزآبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی [3] ابوداؤد وابن ماجہ مع زرقانی علی السیرة ج ۴ ص ۳۰۹ [4] بخاری کتاب الاطعمہ [5] بخاری کتاب الاشربہ [6] ابوداؤد کتاب الاشربہ [7] ایضاً موطا امام محمد [8] صحیح مسلم کتاب الاشربہ۔

میں آئی ہیں، جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○

اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔

آدابِ مجلس

آداب مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو، اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو تاکہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو، ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب دکھائے ہیں۔

۱۔ مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے، یعنی یہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہیں بیٹھ جانا چاہیے، یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے، کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنیوالوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے، صحابہؓ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے۔[1] انتہا یہ ہے کہ مسجدوں میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لیے یہ سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں، جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے اسی لیے "تخطی رقاب" یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیر قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

۲۔ مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نہیں بیٹھنا چاہیے[2]، کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا، کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا، اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

۴۔ اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا[4] کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لیے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے اس لیے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

---

[1] آداب المفرد باب یجلس الرجل حیث انتہی [2] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیتان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ [3] ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہو احق بہ [4] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما۔

۵۔ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہیے، ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے[1] کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اسکا منہ ہوگا اور لوگوں کی طرف پیٹھ ہوگی، جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تاکہ سب کو ہنسا سکیں، اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

۶۔ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیئے[2] کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی، اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا ہے، اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے اپنی شخصی خودداریوں اور عزت نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

۷۔ راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہیے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے، اور ہر آیندہ و روندہ کو تکنا بداخلاقی ہے، لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے، یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بری باتوں سے روکنا اور راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا[3]

۸۔ انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے، اس لیے اپنے ہمنشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے، ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے، اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسطرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں، جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے، ان میں الفت و موافقت پیدا ہو جاتی ہے، اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے[4] ایک مشہور مثل ہے، کہ اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ۔" اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے، پھر فرمایا کہ اچھے ہمنشین اور برے ہمنشین کی مثال مشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی جیسی ہے، مشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا، یا اس کو خریدو گے، یا اس کی خوشبو پاؤ گے لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی، یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بو پہنچے گی[5]

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اسکی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے فرمایا کہ اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے، اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور دوسروں

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات [4] ادب المفرد باب الارواح جنود مجندۃ [5] بخاری کتاب البیوع باب فی العطار وبیع المسک۔

کے لیے جگہ بنانے کیلئے کہا جائے تو وہ بُرا مانتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا، فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (مجادلہ: ۲)

اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی کرے گا، اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ، اللہ ان کے رتبے اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا اور اللہ تمہارے کاموں کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، منافقوں کے اس طرزِ عمل کی برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے۔

إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا (مجادلہ: ۲)

یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو۔

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں، وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ بُرا معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا، دوسرے یہ کہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں، اس لیے ارشاد ہوا کہ تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔[1]

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہیے کہ المجالس[2] بالامانۃ قول نبوی ہے[3]۔

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لیے جانا ایک ثواب کا کام ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے، تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لیے ایک مکان بنالیا۔[4]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کیے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوشدلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہیے اسی لیے فرمایا کہ تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے۔[5] ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن و سلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے، چھوٹے بڑے کو، بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا، اور ہے عرب کے لوگ ملاقات کے وقت "انعم اللہ بک عینا" (و انعم اللہ بک صباحاً

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث [3] ایضاً [4] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان [5] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

کہتے تھے یعنی "تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں"، "تمہاری صبح خوشگوار ہو"۔ امراء و سلاطین کے لیے دوسرے الفاظ تھے، ایرانی "ہزار سال بزی"، "ہزار برس جیو"، کا فقرہ کہتے تھے، یورپ کے لوگوں میں صبح کو گڈ مارننگ (اچھی صبح)، شام کو "گڈ ایوننگ" (اچھی شام)، رات کو "گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے، مگر اسلام نے ان سب کے بجائے "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

۱۔ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں "وَالسَّلَامُ عَلَيَّ" (مریم) یا ان کے متعلق کہے گئے ہیں "وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ" (صفت) ظاہر ہوتا ہے۔

۲۔ اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے دنیوی تمتعات مثلاً طول عمر وغیرہ سے اس کو تعلق نہیں، اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے، اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

۳۔ اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف السلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

۴۔ اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی، جو بندگی، کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپؐ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں، تو آپؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپؐ کو سجدہ کیا کریں، تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی[1]۔ ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ، جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے، فرمایا "نہیں"، اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے، فرمایا "نہیں"[2] اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے مصافحہ کرے؟ فرمایا "ہاں"۔

۵۔ دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال، آل و اولاد، دنیا و آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

۶۔ جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے، اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

۷۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور "واچ ورڈ" مقرر کیا ہے، آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بیگانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں، یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأۃ۔

[2] یہ ممانعت اسی موقع سے مخصوص ہے جہاں کوئی شرعی محذور ہو مثلاً ملنے والا امرد ہو یا کوئی اور شہرت انگیز صورت ہو۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی :-

یا ایہا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنۃ بسلام[1]

لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ، اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں تو نماز پڑھو، یہ سب کرو گے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض وغایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اسوقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ[2][3]

سلام کرنے کے لیے شناسا وغیر شناسا، جانے اور انجانے کی تخصیص نہیں[4]، مرد اور عورت کی تفریق نہیں[5] بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں[6]، البتہ اسلام نے سلام کی ابتداء کرنے کے لیے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے، ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے، اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم دی ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے، دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع وخاکساری کا اظہار ہو اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیے[7]

اس مصالح کے لحاظ سے آپؐ نے اپنے اہل وعیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا[8] مجلس سے اُٹھ کر جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیے[9] سلام میں رحمۃ اللہ و برکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے چنانچہ ایک بار ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" آپؐ نے فرمایا "اس کو دس نیکیاں ملیں" دوسرا آدمی آیا تو کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ "آپؐ نے فرمایا" اس کو بیس نیکیاں ملیں" تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" "آپؐ نے فرمایا" اس کو تیس نیکیاں ملیں[10]"

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریقہ سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے، یعنی سلام کرنیوالے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے، ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے :-

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْ رُدُّوْھَا (نساء : ۱۱)

اور (مسلمانو) جب تمکو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم (اسکے جواب میں) اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے کم الفاظ کا جواب دینا اگرچہ فقہا کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحباباً یہ ناکافی ہے۔

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی المصافحۃ [2] ترمذی ابواب الزہد ص ۹۴ [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی افشاء السلام [4] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ [5] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال [6] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان [7] کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی [8] ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ [9] ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود [10] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما ذکر فی فضل السلام ؛

۲۔ ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے اسلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے، اس لیے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزو قرار دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے[1]، مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہل یمن لائے[2] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا، بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ممانعت آئی ہے، لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے، چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا[3]۔

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوشِ محبت اور جوشِ عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں، حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتی تھیں تو آپؐ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے، اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے، اور جب آپؐ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں، ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپؐ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں[4]۔

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے، اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا، ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لیے کھڑے ہوتے تھے، اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے، آپؐ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو، جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں[5]۔

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے[6]۔

۳۔ ملاقات یا کسی اور کام کے لیے کسی کے گھر میں جانے کے لیے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ
بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ، فَاِنْ
لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا
حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا
فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ (نور: ۴)

مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے، اور ان سے سلام علیک کیے بغیر نہ جایا کرو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ جب ایسا موقع ہو تو تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ، یہ (لوٹ آنا) تمہارے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے، اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو جانتا ہے۔

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحۃ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحۃ [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلۃ [4] یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام میں ہیں [5] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل [6] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا۔

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لیے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے[1]۔

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں، لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اسوقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا[2] اس لیے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے[3] تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے، ایک بار ایک شخص آئے اور آپؐ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لیے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے[4]، ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں[5]، ایک بار کسی نے آپؐ کے حجرہ میں تاک جھانک کی، آپؐ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے، فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اسکو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا پھر فرمایا انما جعل الاذن من قبل البصر یا فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر، یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لیے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں[6]۔

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے یہ کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں[7]؟ تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہئے[8]، البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں[9]، اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے[10]، دوکانوں میں جانے کے لیے اور اسی قسم کے دوسرے[11] پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں، خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیے، اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہو گا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آگئی ہیں تو وہ ہوشیار ہو جائیں۔

یہ آداب تو اجنبی اور ناآشنا لوگوں کے لیے تھے، لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں، اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے، یا لونڈی غلام، اس لیے اگر ان کے لیے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہو گی، البتہ خاص خاص اوقات میں جن

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجہن [2] ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی عورات الثلاث [3] ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب [4] ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان [5] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینیہ فلا دیۃ لہ [6] اس کتاب کے صفحہ ۸۰ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں انما الاذن لاجل الرویۃ مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں، دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستیذان، باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم، [7] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان [8] ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان [9] ادب المفرد باب دعاء الرجل اذنہ [10] ادب المفرد باب ما لا یستاذن فیہ [11] ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق ؛

میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں، ان کے لیے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے، اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نماز عشاء کے بعد سے نماز صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے، اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لیے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے فرمایا:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ بَعْدَهُنَّ طَوَّافُونَ عَلَيْكُم بَعْضُكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ (نور: ۸)

مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی غلام) اور تم میں جو سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے کی تم سے اجازت لے لیا کریں (ایک تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب تم دوپہر کو (سونے کے لیے معمول کے مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے) نماز عشاء کے بعد (یہ) تین وقت تمہارے پردے کے وقت ہیں، ان (اوقات) کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں) ان پر (کچھ گناہ کیونکہ وہ) اکثر تمہارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے، (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی ہی تکلیف ہوگی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے، اور (مسلمانو!) جب تمہارے لڑکے حدِ بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کیلئے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو:

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (طہ: ۲) تو تم ان سے نرم بات کہنا۔

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو، فائدہ مند، اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو، اسی لیے فرمایا:۔ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (بقرہ: ۱۰) اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو، یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے انظرنا (ہمارا خیال کیجئے) کی جگہ راعنا کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا، فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا (بقرہ: ۱۳)

اے ایمان والو! رَاعِنَا نہ کہو اُنْظُرْنَا کہو۔

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء (رکوع ۷) میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں، اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو، فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (احزاب: ۹)

اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو، اور بات سیدھی کہو، اللہ تمہارے کاموں کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف کرے گا۔

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو، فرمایا:-

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا (احزاب: ۴)

تو (اے نبی کی بی بیو) دبی زبان سے بات نہ کیا کرو، ایسا کروگی تو جس کے دل میں کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ خدا جانے تم سے کسی طرح کے توقعات پیدا کرلیگا اور بات کرو تو معقول بے لاگ۔

مردوں کو نرم معقول اور دلجوئی کیساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا گیا ہے، فرمایا:

قَوْلٌ مَعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى (بقرہ: ۳۶)

نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے، فرمایا:-

وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ (لقمان: ۲)

اور کچھ اپنی آواز پست کر، کہ سب آوازوں میں بُری آواز گدھوں کی ہے۔

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے، مسلمانوں کی صفت یہ ہو۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (مومنون: ۱)

اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے۔ خدا فرماتا ہے:-

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق: ۲)

آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک نگراں اس پر حاضر رہتا ہے۔

اس لیے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسکو چاہیے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے"۔[1] اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضور کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں، کیونکہ جب ہم بُری بات بولیں گے تو اسکی جزا بھی پائیں گے، ایک اور حدیث

---

[1] کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار والضیف۔

میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں بات ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اسکو مطلب نہ ہو ادھر توجہ نہ دے[1] یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت اس کوزہ میں دریا بند ہے، مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لیے ملی ہے، اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست اور صحیح ہوں پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں، اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے۔ اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (فرقان : ۶)

اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔

گفتگو بضرورت کرنی چاہیے، احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں، اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں[2]، یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے[3]، یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رُخ صرف زبان کے سبب سے ادھر یا اُدھر پھر جاتا ہے یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے اس سے دین بھی سدھرتا ہے اور دنیا بھی، اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں، اسی لیے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا[4]۔

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کیساتھ کہا جائے بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے اسی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے[5]، اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے، ایکبار حضرت عائشہؓ صدیقہ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی، حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے، بلکہ اسطرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپؐ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا[6]، حضرت جابرؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ترتیل و ترسیل پائی جاتی تھی، یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے، اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں:-

كَانَ كَلَامُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایک دوسرے سے الگ الگ

---

[1] موطا و شرح للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد [2] ادب المفرد باب فضول الکلام [3] موطا امام مالک باب ما یومر بہ من التحفظ فی الکلام [4] موطا، امام مالک، باب ماجاء فی ما یخاف من اللسان [5] ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث [6] ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث۔

كلامًا فصلًا يفهمه كل من سمعه[1]۔ ہوتا تھا اور جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہیے، ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لیے بہتر ہوتا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں، کیونکہ اختصار بہتر ہے[2]،

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے، بعض اوقات اس کے ذریعہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے، ان اغراض کے حاصل کرنے کے لیے لوگ نہایت مسجع، مقفیٰ، اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی اور فرمایا کہ "خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑ تا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے"۔ نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوب کلام میں اس لیے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے[3]، خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ قبول نہ کرے گا[4]۔"

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے تاکہ دوسروں کو عدم التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے[5]۔

باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کیساتھ قدم اٹھانا چاہیے، خدا اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا (فرقان: ۶) اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیے، یعنی چال میں غرور و تجبر کے انداز نہ ہوں، فرمایا:۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا (بنی اسرائیل: ۴) اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اسطرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ سکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (لقمان: ۲) اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، بے شک اللہ مغرور اور [illegible] کو پسند نہیں کرتا۔

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشار خیال پیدا ہوتا ہے، عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے گذرتی تھیں تو اپنے پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب الهدی فی الکلام [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام [3] یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو [4] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام [5] ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لا یقبل علی واحد۔

مانعت کی اور فرمایا۔

وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ
مِنْ زِیْنَتِهِنَّ (نور: ۴)

اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپا لے، جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب وزینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آجائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہو جائے کہ یہ شریف خاتون ہے لونڈی نہیں، پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ
الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ط
ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ (احزاب: ۸)

اے پیغمبر! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہدے کہ نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں، اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں، تو کوئی نہ ستائے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ
وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ
اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی
جُیُوْبِهِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ
اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ (نور: ۴)

اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہدے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں، اور اپنا ستر چھپائیں، اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، مگر جو (فطرۃً) کھلا رہتا ہے، اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں، اور اپنا سنگار نہ دکھائیں، لیکن شوہر (وغیرہ محرم) کو (آخر تک پڑھیے)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہیے، کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے، اور عورت کا یہ خیال ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں، اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہیے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے عورتوں کو وسطِ راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہیے، ایک بار راستہ میں مرد اور عورت باہم مل جل گئے تو آپ نے یہ حکم دیا، اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتیں راستہ کی اِدھر اُدھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں[2]۔

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہیے، یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لیے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو بلکہ تم متانت اور وقار کیساتھ آکر جماعت میں ملو[3]۔

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لیے جوتے پہنے جائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو، یعنی جوتے پہن کر چلا کرو، کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[4]۔

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے، یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں

---

[1] یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتون ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق [3] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار [4] ابوداؤد باب الانتعال ۔

جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو کیونکہ یہ ادب و وقار کے خلاف ہے، ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے[1] لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں[2]۔

آدابِ سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس زمانہ میں سفر فرمایا اسوقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے، اس لیے اسکے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا، اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت اور مطابقت رکھتے تھے، عرب کی زمین خشک بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت ہوکی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارت گری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ، ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے، اور صحرا و بیابان کے راستوں میں ضروریات زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

۱۔ سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے، اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے[3]۔ أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ دِيْنَكُمْ وَأَمَانَتَكُمْ وَخَوَاتِيْمَ أَعْمَالِكُمْ یعنی تمہارے دین، امانت، اور خاتمۂ عمل کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

۲۔ سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئیے، اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ پورا دن کام میں آ جاتا ہے اور دھوپ[4] کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتدبہ مسافت طے کرکے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

۳۔ سفر تنہا نہیں کرنا چاہیے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں[5] اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، اور اسباب سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہیے[6] اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں۔

۵۔ سفر سے آنے کیساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا موقع دینا چاہیے[7]۔

۶۔ اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہیے[8]۔

۷۔ سفر رات کو کرنا چاہیے، حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے[9]، اور درحقیقت لو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا

---

[1] ایضاً
[2] ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ
[3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع
[4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر
[5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ
[6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یؤمرون احدہم
[7] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق
[8] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی
[9] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر ۔

ہے، بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لیے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح
وقت اور رات کا وقت،

۸۔ مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔

۹۔ رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے، کیونکہ راستہ سے جانور گذرتے رہتے ہیں، اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ رہتا ہے[1]۔

۱۰۔ جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آجانا چاہیے، کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے[2]۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ (روم ۳)	اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:۔

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا (فرقان: ۵)	اور اسی نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔

سورۂ نبا میں ہے:۔

وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا (نباء ۱)	اور ہم نے نیند کو تمہارے لیے آرام، اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لیے رات کا وقت ہے، اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لیے؛ یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گذرے البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے، جس کا ذکر سورۂ نور، ع ۸ میں ہے:۔ حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَکُمْ مِّنَ الظَّھِیْرَۃِ اور رات آرام میں گذاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں، وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے[3]، یہ تو عام افراد کے لیے ہے لیکن خاصانِ خدا ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:۔

کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ (ذاریات ۱)	یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

---

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق [2] مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ من العذاب [3] بخاری کتاب النکاح۔

۱۔ سنتِ نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتا دیئے ہیں، نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہیے کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے، اور نمازِ عشا پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہیے[۱] یہ اس لیے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے، اور آخر وقت میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے غشی نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشاء کے بعد اس کے لیے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نمازِ عشاء کے بعد بعض ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے[۲]۔

۲۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہیے پھر داہنی کروٹ لیٹنا چاہیے[۳]۔

۳۔ ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو[۴] کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

۴۔ پاکی کی حالت میں سونا چاہیے، بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے[۵]۔

۵۔ پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں[۶]۔

۶۔ ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیے[۷]، کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہبند باندھتے تھے اس لیے اس میں کشفِ عورت کا احتمال ہے البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس طریقہ سے لیٹے تھے[۸]۔

۷۔ سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیے، کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیے، چراغ کو بجھا دینا چاہیے کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھا لے جاتے ہیں، جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے، یہی حال آگ کا بھی ہے، ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگ تمہاری دشمن ہے، جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو[۹]۔

۸۔ سوتے اور سو کر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہیے، سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے:۔

اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَحْيٰى وَاَمُوْتُ، (اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں،

اور جاگے تو کہے:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب النہی عن السمر بعد العشاء [۲] صحیح مسلم باب اکرام الضیف [۳] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم [۴] ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر [۵] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم وباب فی النوم علی طہارۃ [۶] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ [۷] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی کراہیۃ فی ذلک [۸] ترمذی ابواب الاستیذان باب ما جاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیا [۹] بخاری کتاب الاستیذان باب لا تترک النار فی البیت عند النوم وباب غلق الابواب باللیل، مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا گرا دیا جلایا جائے۔

وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ[1]
جس کی طرف اُٹھ کر جانا ہے۔

حدیثوں میں اس موقع کے لیے اور بہت سی موثر دعائیں منقول ہیں۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی، جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے، اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک ضروری جز ٹھہرایا، یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لیے ناف سے لیکر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لیے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں سے گٹوں تک اور لونڈیوں کے لیے پیٹ اور پیٹھ سے لیکر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے[2] جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں، یہاں تک کہ تنہائی میں ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں، ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا خدا تو دیکھتا ہے، اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہیے[3]، ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو بضرورت برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں، تو ان سے شرم کرو، اور ان کا لحاظ رکھو[4]۔

حضرت آدم علیہ السلام اور حوّا کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے، خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اُتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ (اعراف: ۲)
تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا، ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے مگر دنیا میں آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں، عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انہوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورتیں خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے[5] ورنہ یونہی ننگے پھرا کرتے تھے، وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا۔

يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِىْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ (اعراف: ۳)
اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری ستر اور زینت کا سامان، اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب مایقال عند النوم [2] عورت کا چہرہ، قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں [3] سنن ترمذی ابواب الاستیذان والاداب باب ماجاء فی حفظ العورۃ [4] ایضاً باب ماجاء فی الاستتار [5] صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل۔

یٰبَنِیٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف : ۳)	اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت اپنی زینت (یعنی لباس) اختیار کرو۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ (اعراف : ۴)	کہدے! کس نے اللہ کی یہ زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔
قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ (اعراف : ۴)	کہدے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی منع کیا ہے۔

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے، اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے، ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے۔

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ (اعراف : ۳)	اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود ہے؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے، اعمال صالح اور یا شرم و حیا مراد لی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہیے، اسی لیے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے، مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے، کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقویٰ قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں[1] لیکن یہ بھی حقیقت سے دور ہوتا ہے، صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی کا لباس مراد ہے، یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرمادیا ہے، شاہ عبد القادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

"اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو، مرد لباس ریشمی نہ پہنے، اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے، کہ لوگوں کو نظر آدے، اور اپنی زینت نہ دکھاوے" (تفسیر اعراف آیت مذکور)

اسلام میں لباس و پوشاک کی حدبندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے، اس حدبندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:-

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جدوجہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اسلیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں، اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

---

[1] روح المعانی تفسیر آیت مذکور۔

۲۔ مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک، اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

۳۔ عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسیٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی، ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا، اسی لیے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچے نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں، بلکہ آپؐ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہیں۔ فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا، البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں، پہننا ٹھیک نہیں، خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں، یا مولویوں کا نمایشی عبا، جبہ یا صوفیوں کی گیروا رنگ، کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشاء اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے، اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے، عورتوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔

۶۔ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو، یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں، ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی کپڑا پہن کر حضورؐ کے سامنے آئیں تو آپؐ نے فرمایا، اے اسماء جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں۔

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں، ایسی سرخ دھاریوں کی چادر آپؐ نے اوڑھی ہے، زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں آپؐ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے، البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں، اور خوشبو کے لیے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا مردوں کے لیے منع ہے سبز رنگ کی چادر بھی آپؐ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپؐ نے باندھا ہے سیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمایا ہے۔

۸۔ مردوں کے لیے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپؐ نے پسند فرمائے ہیں۔

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیے،

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپؐ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے

تے یہ دعا پڑھتے تھے۔[1]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ كَسَانِيْ هٰذَا
وَرَزَقَنِيْهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِّنِّيْ وَلَا قُوَّةٍ،

اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا، اور روزی کیا بغیر قوت کے بغیر (یعنی محض اپنے فضل سے)

آدابِ مسرت

انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے، ان کی کوئی انتہا نہیں، مال و دولت، علم و فضل، عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں لیکن یہ مسرت جب حد اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا۔

إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللّٰهَ
لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (قصص : ۸)

جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت، اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے، اس لیے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے،

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ
نَزَعْنٰهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ، وَلَئِنْ
أَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ
لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ إِنَّهُ
لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ، (ہود : ۲)

اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے کچھ مہر پھر چھین لیں اس سے تو وہ ناامید، ناشکرا ہو اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچا اس کو تو کہنے لگے گئیں برائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں کرتے بڑائیاں کرتا۔

اور اس کی ممانعت کی ہے۔

وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ
كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (حدید : ۳)

اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اتراتے بڑائی مارتے کو۔

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے، بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل و کرم سے اسکو یہ خوشی حاصل ہوئی، اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجا لانا چاہیے تاکہ غایتِ مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت

---

[1] اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں، میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں، ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جارہے تھے جب عزوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اُتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے، اس کے بعد دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں نے خدا سے اپنی امت کے لیے شفاعت کی دعا کی، تو اس نے میری ثلث امت کے لیے شفاعت قبول کر لی، اس لیے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا پھر میں نے سر اُٹھا کر اپنی امت کے لیے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری درخواست قبول کی، اسلیے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ میں گر پڑا۔ پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لیے اور میری التجا کو قبول کیا تو میں اپنے خدا کے لیے سجدہ میں گر پڑا[1]۔

صحابہ کرام کا بھی یہی دستور تھا، چنانچہ حضرت کعبؓ بن مالک کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پر دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد دیکر اس کی مسرت میں شریک ہوں چنانچہ اس موقع پر صحابہ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارکباد دی[2]۔

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے اس موقع پر اعزہ و احباب کی دعوت کی جاسکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا[3]، اس موقع پر دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنیوالے کا استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپؐ کا استقبال کیا، حتیٰ کہ بچے بھی شامل تھے[4]۔

اجتماعی طور پر اظہار مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے، اور اس مواقع پر اسلام نے اظہار مسرت کے لیے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

فصل ما بین الحلال والحرام الدف والصوت[5] حلال و حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنیکا معاہدہ کیا ہے، اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیعؓ بنت معوذ بن عفراء کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے، چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذؓ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں، جو غزوۂ

---

[1] ابوداؤد کتاب جہاد باب فی سجود الشکر [2] بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالک [3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ باب الاطعام عند القدوم من السفر [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی [5] ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح ✦

بدر میں شہید ہوئے تھے اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا ؎

وَفِینَا نَبِیٌّ یَعْلَمُ مَا فِی غَدٍ — ہم میں ایک پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، اور جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ[1]

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہؓ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا، کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی[2]،

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا، قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعودؓ انصاری بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے تھے اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے انہوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں، اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے انہوں نے کہا تمہارا جی چاہیے تو تم بھی بیٹھ کر سنو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے (نسائی باب اللہو والغناء عند العرس)

عربوں میں رسم تھی کہ دولھا کو بالرفاء والبنین کہہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی :-

بارك اللّٰهُ لك وبارك عليك وجمع بينكما فی خير[3] — تمہارے لیے اللہ مبارک کرے تم پر برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی میں میل ملاپ رکھے۔

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے، اس کو ولیمہ کہتے ہیں جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو[4] اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوارے بھی کھلائے ہیں[5] اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں (نسائی باب الہدیۃ لمن عرس)

مسلمانوں کے لیے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے، زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کیے تھے، جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنوں میں خوشیاں مناتے تھے، اب خدا نے ان کو تمہارے لیے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا، یعنی عید الفطر، اور عید اضحیٰ کے دن[6]، خوشی کے ان دو دنوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا، بلکہ دین حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہار مسرت کے لیے پسند کیا گیا، عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی خوشیوں اور خانہ کعبہ کی بنا پر اور فتح کی، اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ [2] بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ یہدین المرأۃ الی زوجہا ودعاہن بالبرکۃ مع فتح الباری [3] ابوداؤد کتاب النکاح باب مایقال للمتزوج [4] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ [5] نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر [6] نسائی کتاب صلوٰۃ العیدین۔

41 ان دونوں دنوں میں اظہار مسرت کے لیے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں، وہ اشعار گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے، اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں! لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوبکرؓ! ہر قوم کے لیے عید کا ایک دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے"[1] یعنی اس دن گانا مباح ہے[2]۔

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے تھے ایک بار عید کے دن یہ لوگ اس قسم کا کرتب دکھا رہے تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا کہ "ہاں بنو ارفدہ!" اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا، یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپ نے کہا کہ "بس"، انھوں نے کہا "ہاں" ارشاد ہوا تو جاؤ[3]۔

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام "تقلیس" تھا جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لیے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پر کھڑے ہو کر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں، عہد رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہارِ مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا، تو ان کو تعجب ہوتا تھا، چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ تقلیس کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیسؓ بن سعد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھیں بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی[4]۔

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو موقع ایسے مذہبی و قومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کر سکیں اور متین سے متین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کر لے، اسی لیے ان دونوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے، اور آپؐ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، اہل و عیال سے لطف اٹھانے اور یاد الٰہی کے ہیں[5]۔

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو اسلیے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان و شوکت کا اظہار ہو اور لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (بقرہ: ۲۳) کی تعمیل ہو۔

---

[1] بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام [2] بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں [3] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید [4] ابن ماجا کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی التقلیس یوم العید [5] شرح معانی الآثار طحاوی ص ۳۴۹۔

یہاں بعال کا ترجمہ اہل و عیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہیں، جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گذر جاتا ہے عربوں میں فخر و غرور، اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہوگئی تھیں، فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا، اس لیے اظہار فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے، سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیے، چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے :۔

اِذَا مِتُّ فَابکِینِی بِمَا اَنَا اَھلُہٗ	جب میں مرجاؤں تو میرے لیے میرے درجہ کے موافق رونا،
وَشُقِّی عَلَیَّ الجَیبَ یَا ابنَۃَ مَعبد	اور میرے لیے گریبان کو چاک کرڈالنا۔

منہ پر تھپڑ مارنا چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا، عام رسم تھی اور شعرا اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے۔

من کان مسرورًا بقتل مالک	جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوتا تھا،
فلیات نسوتنا بوجہ نہار	تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آکر دیکھے
یَجِدُ النساءَ حواسرًا یندبنہ	وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں
یلطمن اوجھھن بالاسحار	اور صبح کے وقت اپنی گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا، آپ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا، اور گالوں پر طمانچے مارتا، اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاتا اور بین کرتا ہے وہ میری امت میں سے نہیں"[1] یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی، ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو ان کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا، آپ نے منع کرا بھیجا، وہ باز نہ آئیں، دوبارہ منع فرمایا، پھر جب نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ ان کے منہ میں خاک بھر دو[2]۔

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں، اس بنا پر دور دور سے عورتیں بلا کر آتی تھیں، رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے ذریعہ داخل مراسم ہوگئی تھی، یعنی کسی میت کے لیے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا، ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ وہ کونسی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے آپ نے فرمایا یہ کہ "نوحہ نہ کرو" وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آکر روئی تھیں، ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے، آپ نے منع فرمایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں، بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی؛

---

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ما جاء فی النہی عن ضرب الخدود۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن،

لیکن وہ خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں، اس لیے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہ ہوئیں[1]۔

دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں اسکو عربی میں "نعی" کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو فرمان نبوی کی اسقدر احتیاط مدنظر تھی کہ وصیت کی کہ میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے، اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو[2]"

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنیوالے چلتے، اور بخوردان جلا کر لیجاتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لیجائے، راگ سے مقصود کفار ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہوسکتا ہے تب یہ مطلب ہوگا کہ "جنازہ کے پیچھے کوئی آگ، اور باجا نہ لے جائے[4]"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ میں شریک تھے ایک عورت انگیٹھی لیکر آئی، آپ نے اس کو اس زور سے زجر کیا کہ وہ بھاگ گئی[5]۔

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے، صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا، ایک دفعہ آپ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تھا تو فرمایا کہ جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بددعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا[6]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی، اور فرمایا کہ کسی مومن کے لیے یہ جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرائش و زیبائش کرے[7]۔

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے، برا نہیں، لیکن زور زور سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے، اور اس پر سخت تہدید فرمائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم نے جب وفات پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے[8]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے" ائمہ محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلافات ہیں جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور کیلئے حسب حیثیت ماتم کرنیکی وصیت کر جاتے تھے اسی وصیت کیمطابق اُس پر رونے سے اسکو عذاب ہوتا ہے[9]۔

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست، یا محلہ کے لوگ

---

[1] ترمذی تفسیر سورہ ممتحنہ [2] ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی [3] باب الاسلام یہدم ما قبلہ ص ۹۹ [4] ابوداؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد [5] اسد الغابۃ جلد ۴ ص ۲۹۵ مصر [6] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی النہی عن التسلب مع الجنازۃ [7] ترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا۔ [8] مسلم کتاب الفضائل باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال [9] فتح الباری جلد ۳ ص ۱۲۲ ؛

اس کے ہاں کھانا بھیجیں، کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا[1]۔

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے، صبر اور دعا، دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ: ۵) صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے، یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا مگر وہ نہیں مانی، بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا آپؐ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیے[2]۔

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ: ۱۹) اسی لیے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ، پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے، جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے، اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے:۔

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (حدید: ۳) تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے، مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے، آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ خیز شکل پیدا ہو جاتی ہے اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "جمائی شیطان کی جانب سے ہے، اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے" تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے[3]، بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کر لے، کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے[4]، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے[5] اس لیے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعة الطعام لاہل المیت [2] ایضاً [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب [4] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التثاؤب [5] حجۃ اللہ البالغہ آداب۔

۱۔ پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمہائی روکنے کی چیز ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے، ہاہ ہاہ نہ کہنا چاہیے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے۔[1]

۲۔ جمہائی کے برخلاف آپؐ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے[2]۔ ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے، لیکن جمہائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے اس لیے چھینک عمل کے لیے نشاط اور جمہائی اس کے لیے کسل پیدا کرتی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی بخرے نکلتے ہیں اور اس طریقے سے وہ شفاء کا ذریعہ بن جاتی ہے، اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور "الحمد للہ" کہے دوسرے لوگ اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہیں[3]۔

۳۔ تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے، بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے اس لیے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہیے اور اس طریقے سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا[4]۔

۴۔ انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپؐ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمہائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف و تردید نہیں کی ہے، بلکہ بعض کی تائید کی ہے[5]، بہرحال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے، اس لیے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہیے۔

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپؐ کے سامنے ڈکار لی تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنی ڈکار کو روکو، کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے[6] اس حدیث سے پرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد و نوش، نشست و برخاست اور وضع و لباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات میں، فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کیے ہیں۔

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب

[2] ایضاً

[3] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف تشمیت العاطس

[4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس

[5] فتح الباری جلد ۱۰ صـ ۵۰۹

[6] ترمذی ابواب الزہد صـ ۴۰۹

۱۔ بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کی رو سے مفید ہیں۔

۲۔ بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے، اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

۳۔ بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں، حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی ہے، ان کے علاوہ اور اصول و قواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں، اور بعض میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے، اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں، ان مصلحتوں کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس میں امورِ ذیل کا لحاظ رکھا۔

۱۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے، اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی اس لیے شریعت نے ان سے پہلے، ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کر دیں جو خدا کو یاد دلاتی ہیں۔

۲۔ بعض افعال و اشکال شیطانوں کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً ایک جوتا پہن کے چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا، اس لیے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کر دیتی ہیں مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا، اس لیے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔

۴۔ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے، مثلاً حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

۵۔ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسانوں کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے۔

اس تفصیل کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی اسلام کے احکام میں اور رسول انام علیہ السلام کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں، اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی، غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی

---

[1] حجۃ البالغہ ص ۲۶۳۔

گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار، اور طریق زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام اسلام کا خاص تمدن ومعاشرت ہے۔

اسلام نے ان آداب میں بڑی لچک رکھی ہے یعنی ان میں جو اصلی اور بنیادی باتیں ہیں، ان کی تو قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں پوری تاکید کردی ہے اور اسی تاکید سے ان کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، لیکن ان میں بعض ایسے امور بھی ہیں جو وقتی مصلحت، عرب کی ملکی معاشرت اور زمانہ کے حالات کے بدلنے سے بدل سکتے ہیں، اسی لیے ان کے متعلق کوئی ایسی تاکید نہیں کی جس سے ان کا شعار اسلامی ہونا ظاہر ہو، یا ان کے چھوڑنے پر کوئی وعید فرمائی گئی ہو اور اسی لیے ان کے دینوی مصالح اور فائدے بھی بتا دیئے گئے ہیں، ان کے معنی یہ ہیں کہ اگر ان میں کچھ ایسا تغیر کیا جائے جس سے اصل مقصد فوت نہ ہو بلکہ اس کی خوبی اور زیادہ بڑھ جائے تو وہ برا نہیں، جیسے جہاں ہاتھ دھونے میں اصل مقصد صفائی اور پاکیزگی ہے وہاں اگر مٹی کی جگہ صابون استعمال کیا جائے، تولیے کام میں لائے جائیں، کھانے میں ہاتھ کے بجائے چمچوں سے کھانا نکالا جائے، چھری سے گوشت کاٹا جائے[1]، پلیٹیں بدلی جائیں یا صفائی اور ستھرائی کے اور دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں، یا ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملکی طریقہ کا جائز لباس پہنیں، حلال کھانا کھائیں، بیٹھنے اور سونے کے مناسب سامان استعمال کریں تو ان کی پوری اجازت ہے لیکن اس اجازت کے باوجود ایک مرتبہ عشق ومحبت کا ہے، جو لوگ اس راہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا عزم رکھتے ہوں، ان کے لیے زمانہ کچھ ہی بدل جائے مگر انکی نظر میں وہی ادائیں محبوب ہیں جو محبوب سے نسبت رکھتی ہیں۔

---

[1] ہمارے فقہاء نے اسی کو سنن الہدیٰ اور سنن الزوائد کی اصطلاحوں میں بیان کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری سے گوشت کاٹ کر کھایا ہے۔

حکمتِ ربّانی کا چشمۂ نور

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

ناظرین! آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی اخلاقی ہدایتوں کا ایک ایک لفظ آپ کی نظر کے سامنے آگیا، آپ نے دیکھا کہ اسلام کا فلسفۂ اخلاق کتنا مکمل اس کی تعلیم کتنی کامل اس کے تہذیب و تمدن کے اصول کتنے اعلیٰ اور اس کی اخلاقی تربیت کے نظریے کتنے بلند ہیں اور یہ سب کچھ ایک نبی اُمّی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبانِ وحی ترجمان سے ادا ہوا، اگر حضور علیہ السلام کی صداقت کی کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی ایک چیز کافی تھی کہ جس بلندی تک حکمائے زمانہ، فلاسفۂ روزگار اور قوموں کے معلم پہنچنے سے عاجز رہے، معلمِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی تعلیم کے سہارے کے بغیر وہاں تک پہنچ گئے۔

اگرچہ یہ بات خود بھی اپنی جگہ پر بہت بڑی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی یہ ہے کہ اس قوم کو جو تہذیب سے ناآشنا اخلاقِ عالیہ سے بیگانہ، اور سلیقہ و شعور سے عاری تھی، نہ صرف اخلاق و تمدن کے ایسے بلند حکیمانہ اصول اور نظریے سکھائے بلکہ اپنی تعلیم و تربیت کے صیقل سے ان میں ایسی جلا پیدا کر دی کہ دنیا ان کے اخلاقی جلووں کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ دعا قبول ہوئی یا یہ کہیے کہ وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اسماعیلی نسل کے خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لیے کی گئی تھی يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ، یعنی ایسا نبی جو ان اُمّیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک و صاف کر کے نکھار دے۔ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پُر بہار بنا گیا، صلی اللہ علیہ وسلم۔

اُمیدوارِ رحمت
سید سلیمان ندوی
۹ ذیقعدہ ۱۳۵ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ
وَاَصْحَابِہِ الطَّاہِرِیْنَ

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود معاملات کا اطلاق فقہائے حقوقِ عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً بعض فقہائے شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا اُمورِ دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امورِ دین کے متعلق ہیں، اشخاص کی بقاء مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں، (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقاء مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقاء ہے تو ان کو عقوبات کہیں گے[1] (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین و دنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائیگا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑجائے گی، یہ قسمیں کی ہیں، **عباوات** جیسے نماز روزہ وغیرہ، اور **عادات** جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام، اور تیسری چیز **معاملات** ہے جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز **جنایات** ہے جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے، (جیسے قصاص حدود و تعزیرات)

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیم رحؒ نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح و طلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبرو ریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

---

[1] کشاف، اصطلاحات الفنون احمد تھانوی، مطبوعہ کلکتہ ج ۱ ص ۲۳ بحوالہ توضیح و تلویح

معاملات سے ہماری مراد لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکامِ شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جنکا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جس کا قانونی نام مدینہ ہے اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لیے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں امارت و خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی سنہ ۴۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابو یعلی حنبلی المتوفی سنہ ۴۵۸ھ، لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، اور اسی لیے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال، یا کتاب الخراج رکھا ہے، جیسے کتاب الاموال ابو عبید بن سلام المتوفی سنہ ۲۲۴ھ اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی سنہ ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحیی بن آدم القرشی المتوفی سنہ ۲۰۳ھ، اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیئے جاتے ہیں جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے نئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی اس لیے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں رد و بدل اور نئی ضرورتوں کے لیے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق اُن تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زائد افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں، معاشرتیات، اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں، اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے، معاشرتیات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آجائے گا اور سیاسیات میں حکومت و سلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اس لیے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا مگر موجودہ زمانے

میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصاً اس لیے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ توقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نصّاً اکثر خالی ہیں اور انکی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لیجانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہدِ نبوی کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا ماخذ خود ذاتِ نبوی علی صاحبہا الصّلوٰۃ ہے اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے، یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بارہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ۷، جمادی الثانیہ سنہ ۱۳۸۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان سنہ ۱۳۹۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رُک جانا پڑا، ۲۳ شعبان سنہ ۱۳۹۲ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم چل کر رُک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۲ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے مگر انجام عالم الغیب کو معلوم۔ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ۔

دیگر مذاہب اور معاملات دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، ہندوستانی مذہبوں میں بھی دونوں قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علم الٰہی اور علم مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الٰہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلانِ طبع قانون کا معیار ہے کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف رائے دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ وارانہ ہوا و ہوس اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانین جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پر حکم نافذ کرتی ہے۔ اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو

جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم، امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار، طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لیے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی اس جوش و خروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ یک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے، ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں، تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گم رہ جاتی ہے اور جمہور کی کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لیے قدم قدم اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص و طمع، غرور تکبر، ہوا و ہوس، رشوت اور انتفاع ناجائز، خوف و ہراس اور مکر و حیلہ کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

قانون الٰہی کی ضرورت اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل و انصاف کی یہ میزان خود دست الٰہی میں ہو، وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں، کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے جس کو اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے جو تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ (شوری: ۲)	وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔
وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ (حدید: ۲)	اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

کتاب اور میزان میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل و انصاف اور

حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات چل رہا ہے، اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

اَلرَّحْمٰنُ ہ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ہ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ہ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ہ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ہ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ہ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ہ (رحمٰن : ۱)

رحمت والا خدا جس نے قرآن سکھایا، انسان کو بنایا اور اسکو گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے تحت ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اسکے لیے زمین میں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تاکہ تول میں کمی بیشی کرو اور تول کو انصاف کیساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے اس لیے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصدُ ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصدُ ارادہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصدُ ارادہ کی دولت و نعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصدُ ارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے۔

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (انعام : ۱۹)	اور ناپ تول کو پورا کرتے رہو۔
فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ (اعراف : ۹)	تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔
اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (ہود : ۹)	ناپ اور تول کو پورا کرو۔
وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ (ہود : ۹)	ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیاء بھی مراد لی جا سکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں[1]، ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لیے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لیے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیے دوسری ترازو سے اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (تطفیف : ۱)

پھٹکار ہے ان کم کر دینے والوں پر جو اپنے لیے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

---

[1] تفسیر طبری میں آیات میزان سورہ حدید اور سورہ رحمان وغیرہ میں دیکھئے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (حدید : ۳)

اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری اور عدل کی ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لیے کئی فائدے ہیں۔

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لیے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری، صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں قانون الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہیے جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی قانون الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اس لیے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے اس لیے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں۔ جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ)، گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی، آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے در پے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بدم بدل رہے ہیں سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب و گل کی دنیا پر حکمراں تھا، آج بھی وہی ہے اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی، نہ چودہویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح : ۳) خدا کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔

فطری حقوق و معاملات کی یکسانی ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا، نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں، سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا، حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور

رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضامندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت ہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے جب کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزا رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے، البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیے قانون الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام کے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل ہر مجموعۂ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لیے اُس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں اُبھری نظر آتی ہیں جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے، وہاں کالے گورے، یورپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیئے ہیں یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے، فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لیے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے، چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں اُن کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، ان کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام ہے، اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع و فریب کا استیصال ہے[1]۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک و اقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون خدا کا ہے، خدا کے سارے بندوں کے لیے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا ایشیائی، ہندی ہوں یا حجازی، عجمی ہوں یا تاتاری، سب کے لیے یکساں اور سب کے لیے برابر ہیں۔

ایک اصولی فرق بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہو گی جو اس کے

---

[1] علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام، اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، اس بناء پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں ایک وہ جو اس قانون کو قانونِ الٰہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدائے واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں دوسرے وہ جو گو اس خاص قانونِ الٰہی کو نہیں مانتے لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانونِ الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانونِ الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفۂ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانونِ الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھی وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفۂ الٰہی سے نا آشنا اور ہر قانونِ الٰہی سے محروم ہیں ان کو مشرک کہتے ہیں، اسلامی قانونِ الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ **معاملات** کے حدود کیا ہیں اور اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیے ایک حاکمانہ طاقت و قوت کا وجود ضروری ہے، جو ہر چیز کو احکامِ شرع اور نظامِ عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جز ہیں۔

۱۔ اس حاکمانہ طاقت و قوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملاتِ انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام، اور اس کے اسرار و مصالح۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپؐ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف و خطر کی جا سکے اور اس کے لیے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ
مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی
ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ
اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (نور: ۷)

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، یہ وعدہ کیا کہ
وہ انکو زمین میں حاکم بنائے گا، جیسا کہ انکو حاکم بنایا تھا جو
ان سے پہلے تھے اور ان کیلئے انکے اس دین کو جسکو اس نے انکے واسطے
پسند کیا ہے جما دیگا اور انکو انکی اس بے امنی کے بعد امن دے گا،
میری بندگی کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لیے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تاکہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے:۔

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ
الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ (انفال: ۵)

اور ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور
سب حکم اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ
حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (بقرہ: ۲۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے، اور آخرت میں
بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت تندرستی روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے۔ دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃٌ ط
وَلَدَارُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ وَّلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِیْنَ
(نحل: ۴)

اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے دنیا میں بھلائی
ہے اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں
کا گھر کیا اچھا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے۔

فَاٰتٰھُمُ اللّٰہُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ

تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب

الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (آل عمران: ۱۵)

عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے،

جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل: ۶)

اور جنہوں نے گھر چھوڑا خدا کے لیے ستائے جانے کے بعد ہم اُن کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے، اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ (اعراف: ۱۹)

اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (هود: ۲)

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (شوریٰ: ۳)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران: ۱۵)

جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا

جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے

مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (بنی اسرائیل : ۲)

ہیں جس کو جو چاہتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر، دھکیلا جا کر، اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو یہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (نساء : ۱۹)

تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اسکو معلوم ہو کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلبگار ہے اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا (نساء : ۸)

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی، اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں :-

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (مائدہ : ۴)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (بقرہ : ۳۲)

بے شبہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا :-

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ (بقرہ : ۳۲)

اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دیدے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا :-

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ (ص : ۲)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی :-

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ (ص: ۳)	اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران: ۳)	اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنا دیا ہے:۔

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ (الانبیاء: ۷)	بے شک زمین کے مالک میرے صالح بندے ہوتے ہیں۔ اس اعلان میں خدا کے فرمانبردار لوگوں کے لیے پیام ہے۔

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے فرمایا:۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ o اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (حج: ۶)	اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے وہ کہ اگر ہم ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور بُرے کاموں سے باز رہتا ہوگا،

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دینِ حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیے اُٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہیے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشاء کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا:۔

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (نور: ۱)	اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے، اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ	تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول

وَرَسُوْلِہٖ (بقرہ : ۳۸)

سے لڑنے کے لیے خبردار ہو جاؤ.

اس لیے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا[1]. جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں لوٹ مار کریں، قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور قید یا جلاوطنی ہے، اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:۔

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ
فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (مائدہ : ۵)

یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے.

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی.

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ
لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (اعراف : ۵)

خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو. زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے.

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ
وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ
تَعْمَلُوْنَ (اعراف : ۱۵)

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو.

آخر جب وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی نوکر غلام اور بے کس قوم خلافتِ الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا
فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا (اعراف : ۱۶)

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی ہے اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے.

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے تو دفعتہً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی:۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ

اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کہ تم دو دفعہ

---

[1] ابوداؤد، باب اخذ الجزیہ ؛

فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِیْرًا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا. ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِیْرًا. اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا (بنی اسرائیل ۱)	زمین میں فساد کروگے اور بڑی سرکشی کروگے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا، اور تم کو مال اور اولاد سے مدد کی، اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کروگے تو اپنے لیے اور برا کروگے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تاکہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کردیں۔

اہلِ خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کیے گئے ہیں وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہشیار کر دیا گیا تھا۔ کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیر وگے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی، چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے، اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں، اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی بُرے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا۔

عَسٰی رَبُّكُمْ اَنْ یَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا. اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ	امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا، اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کروگے، تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا

وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل :۱)

رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے، اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی اُمید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہو گئی، کیونکہ انہیں سُنا دیا گیا:

اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ :۵)

تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج (بقرہ :۱۰)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا، اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کر لیا اور (تم اس بات کے) گواہ ہو، پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔ اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دیکر انکو چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ انکا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) ہے کہ تم کتاب (خدا) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی انکو ہمیشہ کے لیے بھلا دیا اور فرمایا:

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (بقرہ :۱۰)

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنائی گئی:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا کی مسجدوں میں

يُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (بقرہ : ۱۴)

خدا کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لیے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، انکو سولیوں پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے۔

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (مائدہ : ۵)

یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے، اور آخرت میں ان کے لیے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنا لیا تھا، یہ سزا سنا دی گئی :۔

لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (مائدہ : ۶)

دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں، ان کے لیے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے :۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ (حج : ۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم (و دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے تاکہ (لوگوں کو) خدا کے راستے سے گمراہ کر دے، اس کے لیے دنیا میں ذلت ہے، اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آتش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحی الٰہی نے خبردار کر دیا :

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ۔ (اعراف : ۱۹)

(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی)، اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ذلت، قومی مسکنت اور غضب الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے، کیونکہ انہوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا، خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الٰہی کو توڑتے رہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ
وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ
النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا
وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (بقرہ: ۷)

اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے چپٹا دی گئی، اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے، یہ اس لیے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لیے مہلت کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی، اس پر خدا نے قیامت تک کے لیے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی:۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا
عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (آل عمران: ۱۲)

یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چپٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آجائیں، اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لیے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے، یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

دوسری سورہ میں ہے:۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ
سُوْٓءَ الْعَذَابِ
اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ
لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (اعراف: ۲۱)

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے شخص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں، بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کونسا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کیے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر جزیہ سے یعنی ان کی اسی محکومی اور غلامی سے کی ہے قرآن پاک کی دعا میں ہے:۔

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ
تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ
مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ (آل عمران)

اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے، تیرے ہاتھ میں خیر ہے۔

ان آیتوں میں لف و نشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل و قومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال و کردار سے ہے، احکام الٰہی سے انحراف، انبیاء و معلمین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دیئے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا:۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ. (اعراف: ۱۹)

(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود) بنا لیا تھا، ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفتری کے لیے ہے، جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں دربدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا۔

وَمَن يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِن مُّكْرِمٍ (حج: ۲)

اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) خدا رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل و جان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت و برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شرع میں ایمان، اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عملِ صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور فتوحات کا چشمہ ابلتا ہے خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيمِ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے ان کے گناہ محو کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے اور اگر وہ تورات و انجیل کو اور جو (اور کتابیں) انکے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل

مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۹:)

ہوئیں انکو قائم رکھتے تو (ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انہوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا، تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی،

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (اعراف ۱۲:)

اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات (کے دروازے) کھول دیتے، مگر انہوں نے تو تکذیب کی سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور ۷:)

جو لوگ ان میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادیگا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا:۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (فتح ۳:)

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، سو اس نے غنیمت کی، تمہارے لیے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لیے ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۙ وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الصف ۲:)

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو، اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں بہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشتہائے جاودانی میں (تیار) ہیں، داخل کریگا، یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنادو۔

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (توبہ: ۵)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح و سورۂ صف میں دہرائی گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورہ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پوری ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لیے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورہ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے:-

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال: ۵)

اور لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم خدا کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی و جسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو، وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کر وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:-

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا وَّمَغَانِمَ كَثِیْرَةً یَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِیْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ...... وَّاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا (فتح: ۳)

(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا، اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں، اور خدا غالب حکمت والا ہے، خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی...... اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے۔ اور وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خیبر کی فتح ہے، جو بیعت رضوان کے

فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے چنانچہ اسی سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی :۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (فتح: ۱)

(اے محمد!) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح اور صاف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بُت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس فتح و نصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا :۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (نصر: ۱)

جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی دعوت، فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی، اس موقع پر ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا، اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کیلئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لیے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں، اسلیے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور: ۷)

جو لوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادیگا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور انکے دین کو جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کریگا اور خوف کے بعد انکو امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دُور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت

کا قیام ہوا اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اُسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپؐ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو بُرا نہ کہیں، لیکن آپؐ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔[1] کیونکہ آپؐ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لیکر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے :-

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ (زخرف ۱۰)

اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لیے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیوی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا، اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیے تلوار اُٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا، سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورۃ ہے[2] مسلمانوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے،

وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (مزمل ۲)

(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

یہ جنگ کی پیشینگوئی اُس زمانے میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ و سناں کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، وفد رؤسائے قریش کی گفتگو۔ [2] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل و بیہقی و حاکم و احمد۔

اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی، سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لیے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے، اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فصلت کی آیتیں پڑھیں جن کو سُنتے ہی عتبہ حیرت میں آگیا، اور واپس آکر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے، نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے اُن کے منہ سے سُنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لیے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں انگلی ہلانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی، لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا، اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی۔

> "اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے تم باپ دادوں کو بُرا کہتے ہو، ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈالدیا، تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں، اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے، نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سُناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں، اگر تم اس کو مان لوگے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہوگیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی، جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی، اس لیے قریش کی قومی

بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا، لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاحِ عالم کا اخلاقی وسیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجاتی تھی اور اسی لیے اس کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح ہو جائے، ابو طالب بھتیجے سے کہتے تھے، جانِ عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں، ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں گے اور عجم ان کے زیر نگیں ہو گا، ابو جہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے، ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں، اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ[1]

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں "اے لوگو! کہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمہاری بادشاہی میں ہو گا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہو گا اور تم جنت میں بادشاہ ہو گے"[2]

بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انام علیہ السلام کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے، بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے۔ اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لیے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں، ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہو گا اس کو اس سے چھیننے کے لیے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے، انصاری نے ایک آواز سے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ کی یہ سب باتیں منظور لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا جنت اور فتح و نصرت[3]

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لیکر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی، اور آخر تلوار کو تلوار سے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام [2] طبقات ابن سعد جز ۱ ص ۱۴۵، لائیڈن [3] طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹، لائیڈن۔

گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام میں کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و البشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا۔ اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہؓ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں، دم بردم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر اُمنڈتا چلا آ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جاں نثار صحابہؓ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آ جاتا ہے جسکو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضورؐ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب پر چنگاری نکلتی ہے جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضورؐ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آ جائے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے۔ مدائن تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم کو ملے گا، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگ ہوگی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کا جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی[1]

لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشینگوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں، یہ اس لیے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں، اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت و طاقت، شان و شوکت اور مال و دولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش و عشرت، یہ دولت و حشمت اور جاہ و مال، سوء مآل کا موجب ہو

---

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں پیشینگوئیوں کے بیان میں ہیں۔

جائے گا۔ اسی لیے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت وحشمت اور مال و دولت دنیا کی نہیں بلکہ صرف آخرت کی آرائش کے لیے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ کھیتی دنیا کے لیے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیے فوز و فلاح کا موجب ہے:۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (شوریٰ ، ۳)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں بڑھا دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (آل عمران : ۱۵)

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اسکو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے، اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولتِ فانی کے پیچھے دولتِ باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ (نحل ، ۶)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لیے وطن چھوڑا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (توبہ ، ۶)

کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (قصص : ۶)

اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (اعلیٰ : ۱)

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (اعراف: ۲۱)

اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے کیا تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں:-

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (زمر: ۳)

پھر اُن کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ سمجھ رکھتے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى (طٰہٰ: ۷)

اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کیے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (ہود: ۲)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم ان کے اعمال کا بدلا انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اسمیں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرکاہ سے بھی کمتر ہے:-

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (توبہ: ۶)

دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (رعد: ۳)

اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ (آل عمران ۱۹، حدید: ۲)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لیے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے برتنا چاہیے جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے:-

اِنَّ الدُّنْيَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ۔

دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیے ہیں:۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا.	وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لیے بنا:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (الذاریات : ۳)	اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لیے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لیے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (قصص : ۷)	اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

انہی معنوں میں الدُّنیا مزرعۃ الاٰخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے۔ ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں، فرمایا گیا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (نور : ۷)	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا، اور خوف کے بعد امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پرواہ ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں، اور اگر اس امن و اطمینان اور ما

طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا، نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (حج: ۶)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں، تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کرسکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

عہدِ نبویؐ میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظامِ حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہلِ عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظامِ حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سرِ پُرغرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۸ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدودِ شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا، یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظامِ سلطنت یا نظامِ تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظامِ سلطنت اور نظامِ تمدن کا آتا تھا، ان سے الگ یا ان سے بالاتر کسی نظامِ زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط، سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو، بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانونِ الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی

شرک کا دوسرا راستہ ہے لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے، اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپؐ ساری دنیا کی اصلاح کے لیے آئے تھے مگر آپؐ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپؐ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ : ۱۷)

اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارا بتانے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امتِ مسلمہ کے لیے اور یہ امتِ مسلمہ دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپؐ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپؐ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپؐ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا لیکن آپؐ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے زیادہ پُرخطر تھا اور ابتداء میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپؐ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آگیا۔ اس بنا پر اسلام کے دائرہ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپؐ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اسکو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبولِ اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہو گا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاجِ مرصع اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہ حبش نے آپؐ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپؐ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن

کے تمام روسائنے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوہ تبوک نے آپؐ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپؐ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

اَلْيَوْمَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔	زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

اِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى بَعْدَهٗ وَاِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ ۔	جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اسکے بعد کوئی کسریٰ نہیں، اور جب قیصر ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون جسکی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا، یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں حاکم ہے، شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آ جاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لیکر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کر کے سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی

بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہِ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمانروا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا و سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب، ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا، ظاہری تو اس لیے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے، اور جن کو توڑنا اور فناہ کرنا ضروری تھا اور اس کے لیے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لیے کام میں لائے، کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ایسے ودیعت رکھی گئی تھی عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلاء اخلاص، للّٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اسلیے اولاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار، اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لیے اختیار کر رکھا تھا، مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشوونما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاکباز راہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتو صحبت اور تعلیم تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر، ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیے دو شرطیں لازمی ہیں:

ا۔ یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

۲۔ یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساسِ اولین محض اخلاصِ قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا

اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی وعجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، نجد وحجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آکھڑے ہوگئے اور بادشاہی وشہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق ومغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیئے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہل عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت وفیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردارانِ قبائل کے لیے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع، نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے عام مجالس میں لوگوں کو سردارانِ قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا کہتا ہے:

وننکر ان شئنا علی الناس قولهم ولا ینکرون القول حین نقول
اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اسکو رد نہیں کر سکتے

سردارانِ قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمی الا حمی اللہ ورسولہ۔ اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان وتجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر وجواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امراء علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس وفرش حرام کیے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے حرام ٹھہرے، امامِ وقت اور اس کے احکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا، حاجب ودربان کے پہرے اٹھ گئے، چاؤش ونقیب رخصت کر دیئے گئے، طلائی ونقرئی وزمردیں تخت اٹھوا دیئے گئے، امام اور اس کے حاکم عام

مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملاکر نشست کرتے تھے، اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لیکر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لیے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی جس کے شاہان وقت عادی تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کردیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپؐ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپؐ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنیوالوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں، لوگ اشارہ سے بتلاتے، صحابہؓ نے چاہا کہ کم ازکم ایک چبوترہ ہی بنادیا جائے، جس پر آپ جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپؐ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو، تو ان کے لیے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں صحابہؓ کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپؐ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دیدی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو انکو چھوڑ دیتے تھے پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اسکا ہاتھ کاٹتا۔[1]

ایک بار آپؐ صحابہ کو مال تقسیم فرمارہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپؐ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپؐ نے اس سے کو نچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپؐ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کردیا۔[2]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں

---

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے مثلاً کراہۃ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان۔

[2] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸، کتاب الحدود۔

میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمائیے لیکن آپؐ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں[1]۔ ابطالِ سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانونِ عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا، معاف فرمایا، اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات و عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کاملہ ہی آپؐ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ رسمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپؐ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا خدا کے نزدیک سب سے بڑا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے، ایک دفعہ آپؐ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا، یہ تو اللہ کے لیے ہے، آپؐ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپؐ کو دوسرے انبیاء علیہم السّلام پر فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپؐ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپؐ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے گہن نہیں لگتا[2]۔

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا آپؐ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی[3]۔

ایک بار آپؐ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں[4]، محمدؐ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپؐ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔ حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپؐ نماز پڑھ رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر" آپؐ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ "تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمتِ الٰہی کو محدود کر دیا" حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا

---

[1] ابوداؤد [2] بخاری باب الکسوف [3] مسند ج ۱ ص ۳۴۳ [4] مسند اسود بن السریع [5] بخاری ج ۲ ص ۸۹۰ کتاب الادب۔

اظہار اس فقرہ میں کیا تھا، جب یہ سلاطین زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک رہتا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اُس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپؐ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے، زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندانِ ہاشم پر حرام فرمادی اور اس کو بحکم الٰہی عام غربا اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے:

قال ما اوتیکم من شیئ وما امنعکم ان انا الا خازن اضع حیث ما امرت[1]	میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا:

انما انا قاسم واللہ یعطی۔	میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دیدیا جاتا تھا اور حضورؐ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضورؐ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہِ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضورؐ اس کی آمدنی اپنے صوابدید سے اپنے خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کے ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرمادیا تھا کہ یہ مسلمانوں کے ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرتؐ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپؐ کے اُس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپؐ کی ضرورت کی چیزیں رہتی

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵ کتاب الخراج والامارۃ۔

تھیں، دیکھا تو آپؐ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی، ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی، اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں، جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپؐ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے اُدھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور حضورؐ اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں، ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! دعاء فرمایئے کہ خدا آپؐ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دے دیئے ہیں۔ آپؐ دفعتاً اُٹھ بیٹھے اور فرمایا: کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیئے گئے ہیں[1]؟

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھئے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع[2] ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے[3] اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیسؓ بن سعد ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے تھے، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپؐ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[4]۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذروگے تو سجدہ کروگے؟ عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے[4]۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا آپؐ نے حیرت سے فرمایا: معاذ یہ کیا؟ عرض کی: یا رسول اللہ میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضورؐ کو سجدہ کروں، ارشاد ہو کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[5]۔

---

[1] بخاری و مسلم کتاب النکاح، باب الایلاء۔ [2] یعنی پیوند دار۔ [3] معارف۔ [4] ابوداؤد کتاب النکاح۔ [5] ابن ماجہ کتاب النکاح۔

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب وجوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ تکبر و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمندوں کی دولتمندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامِ الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولتمندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ مینی مہرے تھے، آپؐ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا[1]

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات تصنعات اور غلامی و عبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا۔ اسلام کے نظامِ حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہِ نبوت میں ایک طائرِ بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، نا آشنا بدو آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا، اور حضورؐ خوشدلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپؐ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضورؐ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے:

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس

---

[1] دونوں واقعے ابوداؤد، کتاب الخراج میں ہیں۔

غم میں روتے تھے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں سفارش ہے، عرض کی تو قبول سے معذور ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا[۱]۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپؐ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے، یا اپنی رائے سے؟ فرمایا، رائے سے، انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہیے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا، اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

انتم اعلم بامور دنیاکم تم اپنے دنیاوی معاملات میں جنکا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیے کرتے ہونگے، اس لیے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گزر ہوا تو دریافت فرمایا، انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو، ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہوں تم آزاد ہو[۲]۔

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی پر مبنی ہوتا جس کی اطلاع حضورؐ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے اس لیے وہ جوشِ اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: بے شبہ ہوں، انہوں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہ ہیں، انہوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا انہوں نے کہا کہ کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں کہا

---

[۱] صحیح بخاری، باب تکون الحرۃ تحت العبد، و باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرۃؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔ [۲] صحیح مسلم باب الفضائل۔

تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سال کریں گے؟ انہوں نے کہا، نہیں! آپؐ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے، لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انہوں نے بھی وہی جواب دیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا، اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض و معروض کی، مگر حضورؐ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اسی طرح اسی واقعۂ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدتِ شوقِ زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لیے ان کو حزن و ملال ہوا اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیلِ ارشاد میں تسائل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضورؐ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپؐ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحتِ ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گذرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، ام المؤمنین نے چہرہ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا، آپؐ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپؐ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپؐ خود اپنا احرام کھول دیں چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا، شمعِ نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امرِ الٰہی سے تھا اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امورِ تجربیہ سے تھا، اس لیے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔[1]

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔ ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۸۰، کتاب الشروط وحاشیہ اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ نعوذ باللہ علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لیے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کے فیض سے حاصل ہوئی تھی

پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں، اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا، قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لیجائے، لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپؐ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آبپاشی کر کے پانی روک لیں یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے[1] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مالِ غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپؐ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑاؤں، لیکن آپؐ نے ان کو روک دیا[2] اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ اس کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہنچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چین منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے بُرے اسلوب سے بھی آپؐ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل میں آپؐ کے بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لیے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں اس لیے ان پر نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام و عمال کے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الفقر ج ۲ ص ۶، [2] بخاری جلد اول ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام ؛

فرمایا: "ہاں! مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کہ ان کی دعا اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی، اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو۔"[1]

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف و کرم فرمایا، اور عدل و انصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپؐ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپؐ کی گردن سرخ ہوگئی آپؐ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لادو، کیونکہ جو لادو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا، حضورؐ نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفراللہ، نہیں استغفراللہ، نہیں استغفراللہ، اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے، اس کا بدلہ نہ دو، مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپؐ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جَو اور دوسرے پر کھجوریں لاد دی جائیں۔[2]

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے، اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا، اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوادیا۔[3]

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپؐ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکالیا، گھر میں آکر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لاکر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اُسنے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی، لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، اس کو چھوڑدو اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کرکے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپؐ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے، اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوادیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لیکر پلٹا تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپؐ کے حلم و عفو اور حُسن معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: "محمدؐ! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔"[4]

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بےجا و ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہوچکی تھی۔

---

[1] صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۶۶ کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء السعاۃ [2] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب الحلم [3] ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان [4] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۶۸

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت و سست کہہ کر کہا کہ ”اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو“، حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا، او خدا کے دشمن! تو رسول اللہؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر کہا: عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں، یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو، یہودی حلم و عفو کے اس پُر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔[1]

ایک دفعہ آپؐ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اُڑا لیں اور دام نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سُن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔[2]

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپؐ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا، آپؐ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سُنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی، ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور و تبختر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے اس سے بھلا بُرا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپؐ کی خدمتِ اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصلِ جہنم کر سکتی تھی، با ایں ہمہ آپؐ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیے تھا کہ آپؐ کا یہ اسوہ آئندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیے عملی سبق ہو، اور اس کے لیے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے تاکہ آئندہ آنے

---

[1] یہ روایت بیہقی، ابن حبان، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفا از شہاب خفاجی) [2] جامع ترمذی، کتاب البیوع۔

والے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذاتِ شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امرائی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاصِ قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا، جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز ناآشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذاتِ اقدسؐ سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشمِ ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اسکو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپؐ مشورہ کرتے تھے، ایک تو اسلیے کہ انسے رائے لینے میں انکا دل بڑھے اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپؐ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے، اسلیے آپؐ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنیوالے خلفاء و امراء کے لیے مثال و نظیر کا کام دے، آپؐ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران ع ۱۷)
اے رسولؐ! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بنفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ ع ۴)
ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزاء وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشاء صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو، نہایت

مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپؐ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپؐ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا، انہوں نے الصّلوٰۃ جامعۃٌ کہکر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، چنانچہ آپؐ نے اسی طریقہ کیمطابق[1] حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپؐ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑے ہم تو یہیں رہیں گے، خدا کی قسم! اگر آپؐ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے اس کے بعد جب آپؐ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی یا رسول اللہ! آپ حسب فرمان الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے، اس پر انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہیے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا، اور وہیں جا کر قیام فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپؐ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے، لوگوں نے مختلف رائیں دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کیمطابق فدیہ لیکر ان کو رہا کر دیا۔

احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں، اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پُرجوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہیے اور حضورؐ کا صحابہؓ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

---

[1] مصنف عبد الرزاق وطبقات ابن سعد وکتاب المراسیل لابی داؤد وفتح الباری ابن حجر وروض الانف سہیلی (بقیہ برصفحہ آئندہ)

غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو سامان غنیمت میں آپؐ کے پاس آیا ہے، واپس کر دیا جائے، آپؐ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا، ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپؐ نے ان کی درخواست قبول کر لی اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپؐ نے تمام صحابہؓ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے، جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں، جس وقت پہلا مالِ غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دیدیا جائے گا، تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یارسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں"۔ آپؐ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار رائے کو کافی نہیں سمجھا، فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے، اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائمقام و عریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیے، چنانچہ ان قائمقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپؐ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی[1]۔

احادیث کی کتابوں کا استقصاء کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

قیامِ سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر رندگی، بہیمیت، مکر و فریب، و غل و سازش ظلم و ستم اور جور و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ السلطان ظل اللہ فی الارض یاوی الیہ کل مظلوم من عباد اللہ[2] یعنی صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے جس کے امن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے کہ

السلطان العادل المتواضع ظل اللہ و رمحہ فی الارض[3]	عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔

(بقیہ حاشیہ) و زرقانی علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان، نووی میں ہے فشرعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذالک اما بوحی او باجتہادہ صلی اللہ علیہ وسلم علی مذہب الجمہور فی جواز الاجتہاد لہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس ہو عملا بمجرد المنام ہذا مما لا یشک فیہ بلا خلاف [1] ابو داؤد و ترمذی، باب بدء الاذان [2] ترمذی تفسیر کتاب التفسیر سورۂ انفال (حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابو داؤد کتاب الجہاد، صحیح بخاری کتاب المغازی [2] و [3] یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ ابن نجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ (بقیہ برصفحہ آئندہ)

خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔"

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں، ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی وظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا، امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لیے صلح کر لی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے، یہ سن کر انھوں نے اپنی فوج ہٹالی[۱]۔

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گذاری، اور خراج کے وصول کرنے کے لیے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتہً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے، یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہوگئی ہے، ہر فرد رموز سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے لیکن با ایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور ملکوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح

(بقیہ حاشیہ) ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع نہیں، بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفا، و مزیل الالتباس عطا و حلبی لفظ سلطان، یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قدیم عربی میں السلطان، کے معنی بادشاہ کے نہیں، بلکہ طاقت و قوت کے ہیں، جو انگریزی لفظ پاور کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے، اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عمال حکومت پر بھی اس صفت کا اطلاق ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے نائب ہیں، سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے۔ السُلطان ولیّ "مَن لا ولیّ لہ" یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے، یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لیے اس کا ہر جائز نائب شدہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا، بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش۔

کے لیے دی جاتی ہے لیکن بااین ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت و حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے اس لیے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔

اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا، صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لیے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیئے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں، لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لیکر واپس جاتا تھا، صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے:-

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللھم صل علی آل فلان، فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللھم صل علی آل ابی اوفی (بخاری کتاب الزکوٰۃ ص: ۲۰۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لیکر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لیکر آئے، تو آپ نے فرمایا کہ خداوندا! ابو اوفی کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدیؓ بن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا حصہ ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اول صدقۃ بیضت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووجوہ اصحابہ صدقۃ طی جئت بھا (مسلم ج ۲ کتاب الفضائل)

پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

---

[1] مسلم ج ۲، کتاب الفضائل؛

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لیکر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

صدقات قومنا[1] یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے[2]۔

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نورِ ایمان سے چمک اُٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہِ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں، یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعترافِ جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے، انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انہیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے! (صحیح مسلم باب الرجم)، یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے، آپؐ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمائیے، اسی طرح وہ بار بار اعترافِ جرم کرتے تھے اور آپؐ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپؐ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپؐ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ کو قبول کر لیتا[3]۔

اس واقعہ سے قانونِ سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا، کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

---

[1] و [2] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ و کتاب الاجارۃ باب من آجر نفسہ

[3] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۵ و صحیح بخاری، کتاب الحدود۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انہوں نے از خود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتویٰ پوچھو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضور نے ان کی شدت علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی[1] کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے جنہوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے ویسے لطف اندوزی کی ہے، گو ہم بستر نہیں ہوا، تو یہ گنہگار موجود ہے اس پر اللہ کا حکم جاری فرما دیجئے[2]

غزوہ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پہ اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کیجئے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضور نے دیت ہی پر زور دیا یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے میری مغفرت کے لیے دعا فرمائیے[3]

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لیے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا سے نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہؓ نے اس بنا پر جرم کا اعتراف کیا کہ دنیاوی سزا کے اجراء سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہؓ نے ماعزؓ پر اس لیے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم درگذر کر سکتی ہے، رعایا کیساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطبؓ ابن بلتعہ ایک صحابی تھے، انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت

---

[1] ابوداؤد، باب فی اقامۃ الحد علی المریض [2] ایضاً باب یصیب الرجل دون الجماع و صحیح بخاری حدود [3] ابوداؤد، کتاب الدیات ✧

دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑادوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہ تھا، اسلئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کردوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہوجائے، آپؐ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو، لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑادوں، لیکن آپؐ نے فرمایا، کیا وہ اہلِ بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بنا پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ

جو چاہو کرو، کیونکہ جنت تمہاری قسمت میں لکھی جاچکی ہے۔

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا کے رسول کو سب سے زیادہ علم ہے۔[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جسکو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دیا جاسکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جز بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دوراندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپالے، لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارو مدار اخلاص باللہ، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص اعتماد کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطبؓ بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادة (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸) حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کردیا ہے:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔

بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے۔

انّ الامیر اذا ابتغی الریبة فی النّاس افسدھم۔

جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کردے گا۔

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویة قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انّك ان اتبعت عورات النّاس

حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو انکو

---

[1] بخاری ج ۲ کتاب المغازی ص ۵۶۰ ؛

افسدتھم وکدت ان تفسدھم برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دوگے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا[1] حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے فرمایا کہ "ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔"

دخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے، انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لیے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ "درگذر کرو" دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں حضرت عقبہ نے پھر فرمایا کہ "درگذر کرو" کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ

من رای عورۃ فسترھا کان کمن احییٰ موءودۃ۔ جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ "تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے"، اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعت علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کیساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے، اس لیے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے، اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کیلئے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے معائب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ ان سے بچنے کے لیے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ

---

[1] یہ تمام حدیثیں ابو داؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النہی عن التجسس میں ہیں۔

ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے، اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبۂ محبت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگذر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے لئے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے، سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ یہ لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں انہیں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس لیے لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور حاکم کیلئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہانبانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے، لیکن اس طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں امن و اطمینان پیدا ہو جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں مساوات کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اُس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں، ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

ان اللہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا۔ بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دیگا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت اٹھایا تھا، انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا، ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے، انہوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے

انہوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں[۱]۔

دنیوی حکمراں لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں، غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے، لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیرہ تھا، اور اسلیے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملات حکومت میں خود آپ کا طرزِ عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیاضانہ طرزِ عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انکو لے چلنا چاہیے کیونکہ وہ ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لیکر مبعوث ہوئے ہیں[۲] یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپؐ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اُس نے کہا ہاں، آپؐ نے دریافت فرمایا کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں، آپؐ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا[۳]۔

لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں چاہتی آپؐ کو اپنے کام کے لیے ہاتھ پکڑ کر لیجاتی، ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور کہا کہ مجھے آپؐ سے ایک ضرورت ہے، آپؐ نے فرمایا تم اپنے کام کیلئے مدینہ کی جس گلی میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپؐ اسکے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دیدیا[۴]

عدیؓ بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو انکو شک تھا کہ آیا حضورؐ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب اُنکی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اُٹھے کہ حضورؐ بادشاہ نہیں کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی میں پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد فوراً آپؐ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعرابی آپؐ کی خدمت اقدس میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے، اور حضورؐ ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپؐ کی چادر پکڑ کر کھینچی تو آپؐ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا[۵]

بعض لوگوں سے اس قسم کے گناہ ہو جاتے تھے جن کے لیے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا لیکن ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر سکتے تھے تو

---

[۱] مسلم ج ۲، ص ۳۹۰، کتاب الادب [۲] ابوداؤد ج ۲ ص ۳۰۹ کتاب الحدود [۳] ابوداؤد ج ۲ ص ۲۴۲ کتاب الحدود، جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لیے بحکم ان الحسنات یذہبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی [۴] مسلم ج ۲، ص ۲۹۴ [۵] بخاری ج ۲ ص ۹۰۰

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے، ایک صحابی نے اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے، اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار کر لیا[1]، لیکن آخر ایک[2] رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کر لی، صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کیا، آپؐ نے دو بار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہاں! ہاں! یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو جو کہا ہے آپؐ حکم فرمائیں، فرمایا: ایک غلام آزاد کر دو، انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپؐ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یا رسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپؐ نے فرمایا تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقے سے بسر کی ہے، آپؐ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر کھجوریں دیدے گا اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہؐ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطینِ دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ انکی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظامِ سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظامِ سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوشِ عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبویؐ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے، فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی، کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، نہ یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضورؐ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا ہو گیا اگر سچا نکلا (بخاری، کتاب الایمان)

---

[1] ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دیدی جائے، جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں برابر ہے، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے [2] اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپؐ کہتے ہیں کہ آپؐ خدا کے رسول ہیں اور آپؐ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے بنائے فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے، اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپؐ کو بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں، اس نے پھر عرض کی کہ آپؐ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا، کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپؐ کو بھیجا، کیا خدا نے آپؐ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بیشک! پھر کہا: آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا، اس نے کہا قسم ہے اس کی جس نے آپؐ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپؐ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا، ہاں! پھر کہا: آپؐ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں، فرمایا: ہاں! سچ کہا، عرض کی، اس کی قسم جس نے آپؐ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا، ہاں! اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا، ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضورؐ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سوار ہی مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اُترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا، تم میں محمدؐ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضورؐ نے فرمایا، ہاں کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا جو چاہو پوچھو، اس نے کہا میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر فرمایا خدا کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہی نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا ہی کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپؐ کو حکم دیا ہے کہ آپؐ ہمارے دولتمندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا، خدایا ہاں! اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لیکر آپؐ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں میں ضمام بن ثعلبہ ہوں (بخاری، کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے اور شیفتگی وجاں نثاری کا ایک اور واقعہ سنئے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام

جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گذرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (ابوداؤد، کتاب الحدود، ۲، ص ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ، عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، اور وہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپؐ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا، مغیرہ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپؐ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپؐ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اسکے بجا لانے کے لیے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپؐ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ و جلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اسکی اسقدر عزت کرتے ہیں جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لیکر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجا لانے کے لیے پیش دستی کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیے لڑتا ہے، جب آپؐ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔[1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش، خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انہوں نے کہا:

ایانا نرید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضها البحر لاخضناها ولو امرتنا ان نضرب	یا رسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈالدیں تو ہم ڈالدیں گے

---

[1] بخاری ج ۱ ص، ۳ کتاب الشروط

اكبادها الى برك الغماد[1] لفعلنا (مسلم کتاب الجہاد باب غزوۂ بدر)	اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد[1] پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے۔

غزوۂ احد میں جب آپؐ نے کفار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہؓ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپؐ کو روکا، اس سے زیادہ جوشِ محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا:

بابی انت وامی لا تشرف یصبك سهم من سهام القوم نحري دون نحرك (بخاری کتاب المغازی، غزوۂ احد)	میرے باپ ماں آپ پر قربان، آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھیے کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا۔ چنانچہ غیر قوموں کو عمالِ نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپؐ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا "یہ تو بہت ہے۔" انہوں نے کہا اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے:

هذا الحق به تقوم السماء والارض قد رضينا ان ناخذ بالذي قلت[2]	انصاف اس کا نام ہے اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن انہوں نے کہا: اے دشمنانِ خدا تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں، جو محبوب ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں[3]

---

[1] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام [2] ابو داؤد ج ۲ ص ۵، کتاب البیوع [3] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۱

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو[1]، اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سر تا پا سلطنت ہے مگر سلطنتِ الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے جل شانہٗ وتعالیٰ اسمہٗ بادشاہی اسی کی ہے حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس کا مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے، آپؐ کے احکام کی بجا آوری عین احکامِ خدا کی بجا آوری ہے:

وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (نساء: ۱۱) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

آپؐ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپؐ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے اُن میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

---

[1] انجیل۔

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصٰی امیری فقد عصانی[1]۔

جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اس نے میرا کہا مانا، جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکام الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لیے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسبِ حکم الٰہی کیا جائے وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسبِ احکام الٰہی اللہ کے لیے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و موکدات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورۂ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساسِ فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا:

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ. يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص:۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے تو اپنے پروردگار سے انھوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے۔ اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲، ص ۱۰۵۷، و صحیح مسلم کتاب الامارۃ ج ۲، ص ۲۲۳ مصر۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں معروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الٰہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں معروف رہے۔

جامع ترمذی و مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ما من امام یغلق بابه من ذوی الحاجة والخلة والمسکنة الا اغلق اللہ ابواب السماء دون خلته و حاجته و مسکنته (ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۷)	جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔
من ولی من امر المسلمین شیئاً فاحتجب دون خلتهم و حاجتهم و فقرهم و فاقتهم احتجب اللہ عز وجل یوم القیامة دون خلته و فاقته و فقره (مستدرک حاکم کتاب الاحکام ج ۴، ص ۹۳ حیدرآباد)	جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لیے نہیں کھڑی کی اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لیے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں[1] کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لیے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگوایا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اسکی خبر پہنچی تو انہوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمد بن مسلمہؓ کو اس لیے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعد ابن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے (ابن حنبل ج ۱ ص ۵۴ مصر)

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہل حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کرے (ترمذی ابواب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ	امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کر دیا کرو، اور جب

---

[1] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لیے اذن کا حکم ہے اسلیے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفائے نے گھروں کی دربانی پر لوگ متعین کر رکھے تھے مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ لیے پہرہ داروں کی ؛

النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (نساء : ۸)

لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو، خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے، بیشک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے، مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے علم) کی طرف رجوع کرو، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (رحمٰن : ۱)

اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لیے بھی تولو:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (مطففین : ۱)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پہ جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب انکو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنیوالا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (مائدہ، حجرات : ۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنیوالوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنیوالے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنیوالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (آل عمران ۶ - ۱۴۰)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (شوریٰ : ۴)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور یہ حسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

(وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ ۔ ۷) اور جو اللہ کے اُتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

الا ایھا الناس لا یقبل اللہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ما انزل اللہ۔ (مستدرک ج ۴، ص ۸۹ کتاب الاحکام)

ہاں اے لوگو! جو امام، خدا نے جو قانون اتارا ہے اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے، اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے اور اس لیے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے جو لوگ اس فریضہ سے حسبِ احکامِ الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لیے آخرت میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اُتریں ان کے لیے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لیے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

الامام الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۵ کتاب الاحکام)

وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے وہ نگران کار ہے اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص کے متعلق بازپرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گذر گیا، اس کے لیے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آرائش ہے اور جو اس میں اُلجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطھا بنصیحتہ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ (بخاری و مسلم حوالہ سابق)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبیداللہ بن زیاد انکی عیادت کو آیا انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سُنا ہے:

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ الا حرّم اللہ

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کیساتھ غداری

علیه الجنة (مسلم، کتاب الامارة)	کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا ۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے، ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ ہے، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے :

انّ شرّ الرّعاء الحطمة (مسلم، کتاب الامارة)	سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے ۔

تو تو ان میں سے نہیں، اس نے کہا، آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں، (فوراً) بولے، کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں :

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفاء ہوں گے، اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ تو ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ فرمایا پہلے کی بیعت کرو، پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُھُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاھُمْ ۔ (صحیح بخاری)	کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اسنے انکے سپرد فرمائی ہے ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے :

اللھم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیھم فاشقق علیه ومن ولی من امر امتی شیئا فرفق بھم فارفق به (مسلم)	اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لیکر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے :

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته والرجل راع علی اھل بیته وھو مسئول عنھم والمرأة راعیة علی بیت بعلھا وولده وھی مسئولة عنھم والعبد راع علی مال سیده وھو مسئول عنه الا فکلکم راع وکلکم مسئول	ہاں! تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص ورعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائیگی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے

عن رعیتہ (مسلم و صحیح بخاری)

اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ہاں ہشیار رہو، تم سب نگران کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگراں کے بابت بازپرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آتے ہیں، یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو در حقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُرمحبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں عملاً استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

ان المقسطین عند اللّٰہ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن وکلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمہم واہلیہم وما ولوا.

(صحیح مسلم کتاب الامارۃ)

بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امراء) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

ان احب الناس الی اللّٰہ یوم القیامۃ وادناہم مجلسًا امام عادل وابغض الناس الی اللّٰہ وابعدہم منہ مجلسًا امام جائر.

(ترمذی ابواب الاحکام)

بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا، جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیرخواہی سے دور ہوں گے وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے، فرمایا:

● ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم و لا ینصح لھم الا لم یدخل معھم الجنۃ (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کیساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

ما من وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللّٰہ علیہ الجنۃ (صحیح بخاری، کتاب الاحکام)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔

انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ و یتقی بہ فان امر بتقوی اللّٰہ وعدل فان لہ بذالک اجرًا وان امر بغیرہ فان علیہ وزرًا (نسائی کتاب البیعۃ)

امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لیے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزاء و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں کیونکہ[1] دین کے معنی احکام الٰہی ہیں یا قوانین الٰہی ہیں۔ یہ احکام الٰہی اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزء ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل و تدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہیے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ اور اجراء کے لیے ہے

---

[1] حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محمل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کے تلاش نہیں کرنی چاہیے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیے۔

اور یہی عین دین ہے، اسلام میں جس قتال وجہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اُخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کرام کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ تنفیذ اور اجرا وہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ
وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا
مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ
فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (انفال ۲)

اے اہل ایمان جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اسکا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ: ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ
وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا
لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آل عمران ۲۰)

تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا اور جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے ہاں کا بدلہ ہے، اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے:

وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (نور ۱) اور ان دونوں مجرموں کیساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے اسیطرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (بقرہ ، ۲۳۱)	اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے، سورۂ انفال کی اس آیت میں

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (انفال ، ۳)	اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم (قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام، یوسف) اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا (نحل ، ۷)	اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی سی تشریح کی ضرورت ہے عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سائے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدی نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے اس لیے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِكِ النَّاسِ ○ اِلٰهِ النَّاسِ ○ (الناس : ۱)	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی۔

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ (حشر: ۳)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا
فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (مومنون: ۶)	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (جمعہ: ۱)	بادشاہ حقیقی، پاک ذات، زبردست حکمت والا ہے۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ دفعہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو "الملک الحق" یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس "لوگوں کا پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن وامان والا) کہا گیا، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق کی صفت آئی ہے، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفت آئی ہے ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و جفا کی قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہنِ انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضروری لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا،

ان اخنع الاسماء عند اللہ رجل تسمی ملک الاملاک (صحیح بخاری، کتاب الادب)	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے فرمانروا کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائمقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائمقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائمقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے۔ مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، توراۃ میں یہ بیان صرف آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا بیان اسلام کے

دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض احکام الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں[1]۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (بقرہ: ۴)	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قائمقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے، اس لئے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔ (بنی اسرائیل: ۷)	ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائمقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (بقرہ: ۴)	تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ لَمْ یَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ (اعراف: ۲)	اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنیوالوں میں نہ تھا۔

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لیے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ - اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (انعام : ۲)	اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے بےشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بےشبہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے ؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین، فرمایا :

وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (اعراف : ۹)	اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوح علیہ السّلام کے بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا :

وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَادٍ (اعراف : ۱۰)	اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ (ہود : ۵)	تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے :

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ (انعام : ۱۶)	اور خدا چاہے گا تو تم کو لیجائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ ط (نور : ۷)	اللہ نے تم میں سے ان سے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا۔ جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (انعام: ۱۹)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنائے۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَکْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَمَّا
ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَمَا
کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْقَوْمَ
الْمُجْرِمِیْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی
الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ
کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: ۲)

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو، جب انہوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں، اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لیکر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَکَذَّبُوْهُ فَنَجَّیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ
فِی الْفُلْکِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ
(یونس: ۸)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچا لیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ
فَمَنْ کَفَرَ فَعَلَیْهِ کُفْرُهٗ (فاطر: ۴)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ
فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص: ۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کیساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَف سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

۱۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (اعراف و مریم ۷/۲۱)

توان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

اُخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (اعراف: ۱۶)

میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے:

۲۔ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَةً فِی

اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین

الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ (زخرف : ٦) میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تینوں آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير امّا لغيبة المنوب عنه وامّا لموته وامّا لعجزه وامّا لتشريف المستخلف (ص ۱۰۰ مصر)

خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اسکی موت کے سبب سے ہو یا اسکے اپنے منصب سے عاجز ہونیکے سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لیے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں معنی کے لیے مختلف قول نقل کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کرے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اس کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (حدید : ۱)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے۔

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے

صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے :

ان الاموال التی فی ایدیکم انماھی اموال اللہ بخلقہ وانشاءہ لہا وانما مولکم ایاھا وخولکم للاستمتاع بہا، وجعلکم خلفاء فی التصرف فیہا۔	وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (در حقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے، اسی نے تمہارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے :

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیہا	وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

رُوح المعانی میں ہے :

جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ عزوجلّ فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقۃً۔	اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب کا سرعنوان ہے، یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ (بقرہ ، ۴)	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے،

اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً مِّنِّىْ يَخْلُفُنِىْ فِى الْحُكْمِ بَيْنَ خَلْقِىْ۔	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا، میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے :

ان اللہ تعالیٰ اخبر الملٰئکۃ انہ جاعل فی الارض خلیفۃ لہ یحکم فیہا بین	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی

خلقه بحکمه (ص ۱۰۴، مصر)

مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد به آدم علیه السلام لانه كان خليفة الله تعالى فى ارضه وكذالك كل نبى استخلفهم فى عمارة الارض وسياسة الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امره فيهم لا حاجة به تعالى الى من ينوبه بل لقصور قبضه وتلقى امره بغير وسط۔

اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گذری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے، اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدولِ حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کئے گئے ہیں اُن سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی، اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی بنا سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے! اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے، جس کا آدمؑ کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جس سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا

اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل: ۷)	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنے بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (تین: ۱)	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لیکر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ: ۲)	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقاتِ الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

وَخَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ: ۳)	اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا ہے۔
وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ (نمل: ۲)	اور وہی تو ہے جسنے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔
اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ (جاثیہ: ۱)	اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کردیا۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ (ابراہیم: ۵)	اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کردیا۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (ابراہیم: ۵)	اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے، اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب: ۹)	ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان

ہی ہے یہ امانت الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت وخلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات ومحاسن واوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیے عاریتہً ملے ہیں، یہ حدیث کہ فَاِنَّ اللہ خلق ادم علی صورتہ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول تَخَلَّقُوْا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت وریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی وروحانی سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست وگریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ (میں نے انسان اور جن کو اسی لیے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

◆

امتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابتِ الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہلِ سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیاء علیہم السّلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امتِ محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ و التسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گا، اسی لیے قرآن پاک اور احادیث نبویؐ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے ہیں:

ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ (واقعہ: ۱) ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں ہے۔

وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ (جمعہ: ۱) اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنچا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کتابوں میں ہے (کنز ۶-۲۲۰۰)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح[۱] بخاری و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے۔

نحن الاٰخرون السابقون۔ ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہونگے، حدیث کا یہ ٹکڑا المستدرک حاکم بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز ۶۱-۲۳۰۰)

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب التعبیر۔

ابن ماجہ میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نحن اخرالامم (کنز، ۶-۲۳۰)

ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امت محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لیے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اب ظاہر ہے کہ اسکی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے، اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اسکو پورا کر دیگا، گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لیے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدبیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا، اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے، تو وہ بھی اسباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا، اسی لیے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لیے حاملین قرآن کو بھی تاقیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا، اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کیساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (انعام:)

ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق ہی کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیے ہے، یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا[1]

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران)

اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسیطرح انکے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں[2]، مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، گو گمراہ ہوں[3] بہرحال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں اور

---

[1] تفسیر خازن، تفسیر آیت مذکورہ [2] تفسیر ابن جریر، تفسیر آیت مذکورہ [3] تفسیر روح المعانی، تفسیر آیت مذکورہ

عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبۂ عام حاصل ہوجائے، جیسا کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

لا تزال من امتی امة قائمة بامر الله لا یضرهم من خذلهم ولا من خالفهم حتی یأتیهم امر الله وهم علی ذلك (بخاری، علامات النبوة)	میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو لیکر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اسکا کچھ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔
لا یزال ناس من امتی ظاهرین حتی یأتیهم امر الله وهم ظاهرون (بخاری، علامات النبوة)	میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔
لا یزال من امتی قوم ظاهرین علی الناس حتی یأتیهم امر الله (بخاری، کتاب التوحید)	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔
لا یزال من امتی امة قائمة بامر الله لا یضرهم من کذبهم ولا من خذلهم حتی یأتی امر الله وهم علی ذلك (بخاری، کتاب التوحید)	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لیکر قائم رہے گا اسکے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اسکو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔
لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خذلهم حتی یأتیهم امر الله وهم کذلك (مسلم، کتاب الامارة)	میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اسکے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اسکا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔
لن یبرح هذا الدین قائمًا یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة (مسلم، کتاب الامارة)	یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت آجائے۔
لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة (مسلم، کتاب الامارة)	میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہیگا، اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔
لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لا یضرهم من خذلهم او خالفهم حتی یأتی امر الله وهم ظاهرون علی الناس (مسلم، کتاب الامارة)	میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

ولا تزال عصابة من المسلمین یقاتلون علی الحق ظاهرین علی من ناواهم الی یوم القیامة (مسلم، کتاب الامارة) مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہیگی، اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

لا تزال عصابة من امتی یقاتلون علی امر اللہ قاھرین لعدوھم لایضرھم من خالفھم حتی یأتیھم الساعة وھم علی ذالك (مسلم کتاب الامارۃ)

میری امت کی ایک جماعت خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی، اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے، اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں[1]۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تسکین کی خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گی تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، ایک حدیث ہے العلماء ورثة الانبیاء[2]، یعنی امت محمدی کے علماء انبیاء کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلاۃ والسلام کی ذات اقدس پر ختم ہوگیا، بلکہ نبوت کے فضائل کمالات و فرائض سے ان کے حسب استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا، اور وہ تبلیغ دین، ہدایت خلق، دعوت حق، اقامت دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفع شبہات، ابطال مبطلین اور رد بدعات وغیرہ ہیں۔ اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی، تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

کادت ھذہ الامة ان تکون انبیاء کلھا (مسند طیالسی، ص ۳۵۴، عن ابن عباس و مسند احمد و ابو یعلی) قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامۃ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوٰت اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا[3]، یہ شاید اس لیے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت

---

[1] دیکھئے کنز العمال ج ۶، ص ۲۲۱، ۲۲۵ [2] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعدد مروی ہے، اور محدثین نے اس لیے اس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفاء عجلونی۔ (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لاتی ہے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے:

[۲] اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، انہیں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۝ (مومن: ۶)	مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا۔

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ	اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی۔

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ۔	ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو۔

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے۔

"شہید" اور "شاہد" کے لغوی معنی "حاضر" کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لیے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے اسکی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لیے، اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیے، اسی لیے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

۱۔ حامی اور مددگار کے معنی میں:

وَادْعُوْا شُہَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (بقرہ: ۳)	اور اللہ کے سوا اپنے حامیوں کو بلاؤ (کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

وَلَوْ کَانَ بَعْضُہُمْ لِبَعْضٍ ظَہِیْرًا (بنی اسرائیل: ۱۰)	اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ (حج: ۲)	اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ص ۴۴ ت حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لتکونوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّادُمْتُ فِيْهِمْ (مائدہ: ۱۲)	(حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا نگراں رہا۔

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (نساء: ۶)	بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔

۵۔ امور خیر کی تعلیم، یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنیوالے کے معنی میں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ: ۱۷)	اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو، اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۲)	قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد، حامی، مددگار اور گواہ ہے وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اسکا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظام عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے۔ رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا

انھوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ میرے پاس تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا تمھارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد اور ان کی امت، تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے۔ یہ ارشاد فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطاً الخ (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو) (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزء ہے یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ	اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ) تم کو (ساری
مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ	امتوں) میں چنا ہے، اور اللہ نے تمھارے دین میں کوئی
سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا	تنگی نہیں رکھی، تمھارے باپ براہیم کا دین، اسی نے تمھارا
لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا	نام مسلم پہلے رکھا، اور اس قرآن میں بھی، تاکہ رسول
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۝ (حج۔ آخر)	تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا (عادل و معتدل امت)، خَيْرَ اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت)، هُوَ اجْتَبٰكُمْ (تم کو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی برتری، اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتباکم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اس لیے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغامِ الٰہی کی دعوت و تبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الٰہی کی دعوت و تبلیغ تا بہ قیامت امت محمدیہ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

”تمام انبیاء علیہم السّلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے، کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے،“ (باب حقیقۃ النبوۃ)

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام وتعلیمات وآداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لیکر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پاکر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ (جمعہ: ۱)	وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۲) قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:

فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ۔	تم لوگ آسانی پیدا کرنیوالے بنا کر بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت وتبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لیے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح وتزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں آخری حکم:

فلیبلغ الشاهد الغائب (میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں)

صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لیے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیے جاری وساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے، ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (توبہ: ۱۵)	تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ دین کا علم سیکھتے، اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ وہ حذر کرتے۔

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گذر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران : ۱۲)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو بتاتے ہو، اور بُری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کیلئے سرفروشی کرے، اور اسی لیے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران : ۱۱)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بُلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور بُرے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانیوالے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا نیا خون لیکر آئیں اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر انشاء اللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہیگا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آکر اس فرض کو ادا کرے گی۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۝ (توبہ : ۶)

اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو خدا کے پورے فرمانبردار ہوں گے اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔

پھر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (مائدہ : ۸)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے، اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنیوالے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی اللہ

کی راہ میں جہاد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہارِ حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے۔

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰکُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ ۭ هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰکُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ۝ (حج ۱۰)

مومنو! رکوع کرتے اور سجدہ کرتے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، اور نیک کام کرو تاکہ فلاح پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی (اور تمھارے لیے) تمھارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمھارا نام مسلمان رکھا تھا، اور (اس کتاب میں بھی وہی نام رکھا ہے) تاکہ پیغمبر تمھارے بارے میں شاہد ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمھارا دوست ہے اور خوب دوست اور خوب مددگار ہے۔

اس آیتوں سے اس شاہدِ امم اور مجتبائے عالم امت کے حسبِ ذیل آثار و علامات ہیں:

(۱) ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی (۲) ادائے زکوٰۃ پر عامل (۳) ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط (۴) رکوع و سجود و عباداتِ الٰہی کی خوگر (۵) امورِ خیر پر حریص (۶) راہِ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امتِ محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی انشاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے، اسی لیے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے، کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا، اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی، تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گذاری کا صلہ سمجھنے کے لیے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قویٰ سے اپنے کو متصف قرار دیا، اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی، ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نورِ نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا[1]، اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے، اور مصر کے فرعون اپنے کو رَعْ یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اسی لیے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغفور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السَّماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا، یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے[2]۔ اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رومولس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مریخ کی اولاد تھے[3]۔ ولادتِ مسیح کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے، اور ان کی پرستش کی جاتی تھی، یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پاکر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں، ان ہی سب کے پیش نظر اربابِ تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم، مضمون یونان [2] تاریخ روما ص ۳، دارالترجمہ حیدرآباد دکن [3] ایضاً ص ۲۹، ۳۰

قرار دی ہیں، مثلاً اوتاری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

۱۔ اوتاری سے مفہوم تھیاکریسی ہے، یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا یا خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت و اثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکبر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دیکر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زعیمی (آمرانہ) وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لیے کسی مدت معینہ کے لیے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے۔ اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے، جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکریٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں سے مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کیے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے۔ اسی کے مطابق اسکو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت

کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی، اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) ثابت کرنے کے لیے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں اُن کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اسلیے اہلِ نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ نہ اوتاری ہے، نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے بلکہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات وفضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح ومثالب سے خالی ہے اس لیے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی کبھی زعیمی کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے لیکن اگر اس کے اصل رُخ سے دیکھیے اور اس کے ایک ایک خط وخال کا جائزہ لیجیے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہِ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لیے اس کو منتخب کیا ہے تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسولؐ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں اربابِ شوریٰ اور اہلِ حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افرادِ امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون وچرا عمل کرنا امت کے لیے ضروری ہے اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جاسکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہلِ سیاست کے بنائے ہوئے نظریاتِ حکومت میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہر شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جزء کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور خدا کے بتلائے ہوئے اور تعلیم کیے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہے کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ جماتی ہے تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبے سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانۂ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے، اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اصل اسلامی نظام حکومت کی برقراری کیلئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ : اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ۸) حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے۔ اس لیے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنہوں نے نمرود و فرعون بن کر دعویٰ بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہ ان سلاطینِ عالم کو اس لیے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے لہذا امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں،

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ۸)	حکم نہیں، مگر اللہ کا۔
اَلَا لَہُ الْحُکْمُ وَھُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ (انعام ۷)	ہاں! اسی کے لیے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔
لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (قصص ۷)	اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے، وہ زمین، آسمان، اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کر سکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کر سکتا ہے، اور نہ ان کے قواعد و قوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کر سکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا، فرمایا :

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (بقرہ ۳۵)	تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہو گیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، حقیقت میں

اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش سے ہوتے ہیں :

اَللّٰھُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران : ۳) اے اللہ سلطنت کے مالک تو جسکو چاہے سلطنت دے ۔

اس لیے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کی طرح اُس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اسنے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرما دیئے ہیں ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین ذہین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں ۔

ان احکامِ الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر یہ مشتمل ہوں، بے شبہ اہلِ عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہیے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب ترتیب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہلِ عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا :

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے ۔

۱- اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام و یوسف : ۸) حکم صرف اللہ کے لیے ہے ۔

۲- اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف : ۷) ہاں اسی اللہ کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا ۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادثِ عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے :

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ اِنِ الْحُكْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ
(انعام : ۷)

جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ میرے پاس نہیں،
حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی
بات تبلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنیوالا ہے ۔

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے۔

وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (یوسف : ۸)

اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے حل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے :

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّہَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (اعراف : ۷)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کیلئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ اَمر اور حُکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے :

لَا تَعْبُدِ الشَّیْطٰنَ (مریم : ۵)

شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے :

اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ (یٰسین : ۴)

یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاء اور آئمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکام الٰہی کی تبلیغ اجراء اور تنفیذ کے لیے حکم الٰہی کے تحت ہے، ارشاد الٰہی ہے :

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۸) اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (نساء: ۷)	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکم خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر بجا لایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (توبہ: ۴)	اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا (توبہ: ۵)	انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے، اور مریم کے بیٹے مسیح کو، حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران: ۷)	اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارا اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوتی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکورہ پڑھی تو عدی نے کہا "وہ ان کو معبود نہیں بناتے، فرمایا کیوں نہیں، انہوں نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انہوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں فذالک عبادتهم ایاهم[1] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے[2]۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے، اور اسی کا نام وضع حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ماتحت بلا وساطت حکم خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانونِ الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لیجاتے تھے، یا ان کے فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا چنانچہ بعض اصولی احکامِ عدل و انصاف اور طریق اطاعتِ احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ (نساء ۹)	کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس کو جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ایمان لائے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں، حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے "کل معبود من دون الله" اور اہلِ تفسیر نے شانِ نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں، جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لیے اس کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دیکر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (مائدہ ۷)	اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر [2] ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ (طلاق ۱)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (طلاق ۱)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (نساء ۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ و رسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون و شریعت کی حقیقت تحلیل و تحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کرلے تو اس کا نام "افتراء علی اللہ" خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (نحل ۱۵)

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال، حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لیے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشینگوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہوجائے مگر وہ ان کے لیے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعتِ الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکامِ الٰہی سے آگاہ فرماتے

تھے، اور اس حیثیت سے آپؐ کا ہر حکم حکمِ الٰہی ہے، لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ نے ایک چیز کو اپنے لیے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا

> يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (تحریم ۱: ۱)
>
> اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپؐ کو منع فرما دیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیے مخصوص نہ ہو امت کے لیے حکم الٰہی کے تحت شرع کا حکم رہتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپؐ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذنِ الٰہی کے بھی حق تشریع ہے، جو صحیح نہ تھا، اسی لیے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی کا مبلغ اور قانونِ ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

> وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ (توبہ ۱۰: ۴)
>
> اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے، اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

> اعلم انه لا حاكم سوى الله تعالى ولا حكم الا ما حكم به، ويتفرع عليه ان العقل لا يحسن ولا يقبح ولا يوجب شكر المنعم وانه لا حكم قبل ورود الشرع (۱۱۳، ۱۔ مصر)
>
> جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور اسی اصل مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ برا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے، اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانونِ شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے

اور اسی کا قانون قانون ہے اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو با اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا بُرا کہہ سکتی ہے، علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لا خلاف فی انہ رب العلمین (ص ۲۰۸۹) اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگار عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں۔

"حسن و قبح اور شے کے اچھے یا بُرے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے، اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا بُرا ہے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی جیسے علم اچھا ہے اور جہل بُرا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا بُرے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔" (ص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے، اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے، مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے اختلاف اسی میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے ذریعہ سے سمجھا جا سکتا ہے، یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا فرمایا وہ بُرا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ)، اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے لیکن جب تک اللہ تعالیٰ الحکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا" (المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

"اس مسئلہ پر کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون وحاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکام الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔"

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۰ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے۔

"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کہتے ہیں کہ اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اسوقت بھی عقل کے روسے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا (ص ۱۶، ارشاد الفحول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے تو افعال کا حسن وقبح کے ساتھ اتصاف، امر ونہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر ونہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن وقبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن وقبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں؛ لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورۂ بالا حسن وقبح بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں (ص ۱۴)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے[1]، اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ "قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے" یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر ونہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے عقل کبھی اس حکمت ومصلحت کو پا لیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشاء نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضع شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت

---

[1] تہذیب منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا ہے۔

خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول، اور کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا، تغیر و تبدل اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے، جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیے یوں سمجھیے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، تپنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات و احادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنیوالی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہا نے فتاویٰ کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جا سکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

الحمدللہ جلد ہفتم ختم شد

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی۔ ان صفحات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزء ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھائے، اور آپؐ نے وہ انسانوں کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور اُنھیں کا ایک ایک آئین آپؐ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل، اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپؐ نے اُن کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انھیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، عملاً صاف، واضح اور متعین ہے، اور زمانۂ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے، اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوعِ انساں کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اس لیے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا اُن پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اُتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا

صَلَوَاتُ اللہِ عَلَیْہِ وَبَرَکَاتُہٗ

مغفرت کا طلب گار سنہ ۱۳۵۴ھ
سید سلیمان ندوی ۱۲ جمادی الثانیہ

عرضِ ناشر

——— اس جلد کے آخر میں ایک ضمیمہ تھا، اب جدید کتابت میں اس کی تمام عبارتیں کتاب کے اندر اصل مقامات پر کتابت کرادی گئی ہے ——— فقط ——— ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سیرت النبیؐ جلد پنجم ختم ہوئی

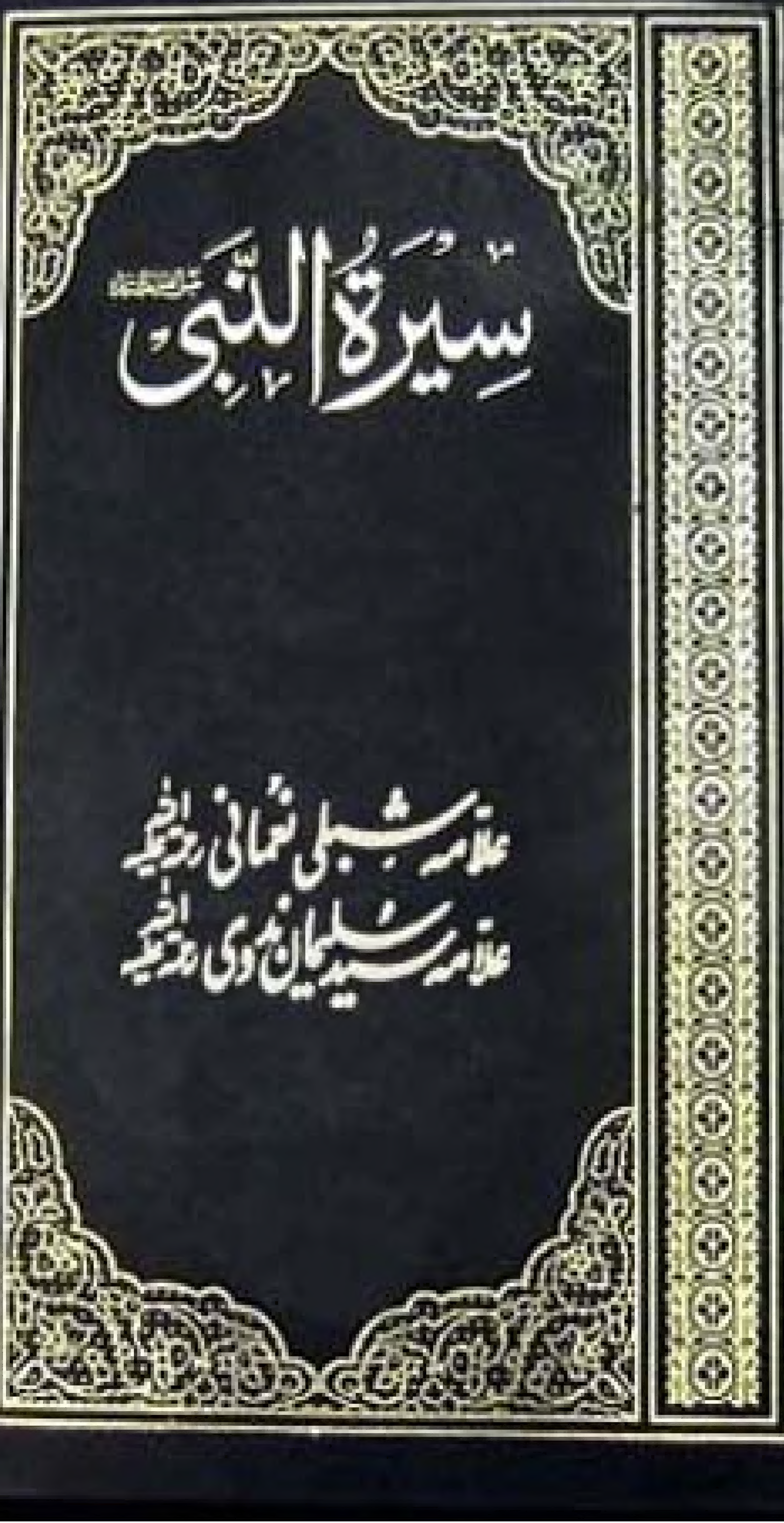

سیرۃ النبی ﷺ

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ